اس شمارے کے قلمکار

غلام رسول مہر
نیاز فتحپوری
چشتی کیانی
محمد دین فوق
عابد علی عابد
ڈاکٹر محمد باقر
پروفیسر شجاع الدین
شوکت تھانوی
خواجہ نور الٰہی
کسریٰ منہاس
خواجہ احمد عباس
عشرت رحمانی
راجہ مہدی علی خاں
سراج نظامی
عبد الحمید یزدانی
شہرت بخاری
حکیم موسیٰ [illegible]
[illegible] ترمذی
عبدالحسن ہاشمی
ڈاکٹر حسن [illegible]
سردار علی

علاؤالدین سالک
رفیق احمد صدیقی
حفیظ جالندھری
محمد عبداللہ قریشی
احمد ندیم قاسمی
کرنل عبدالرشید
شورش کاشمیری
شاہد احمد دہلوی
شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
احسان دانش
یوسف جمال انصاری
نسیم انور
ملک شمس
شیخ عبدالشکور
مصطفیٰ زیدی
ڈاکٹر مختار [illegible]
مسعود نظامی
حافظ عباداللہ
احمد سعید
[illegible]



زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

لاہور نمبر

عہدِ غزنوی سے دورِ حاضر تک کی تاریخ

سنہ ۱۰۱۳ء سے سنہ ۱۹۶۱ء تک

۹۲

فروری سنہ ۱۹۶۲ء

مدیر: محمد طفیل

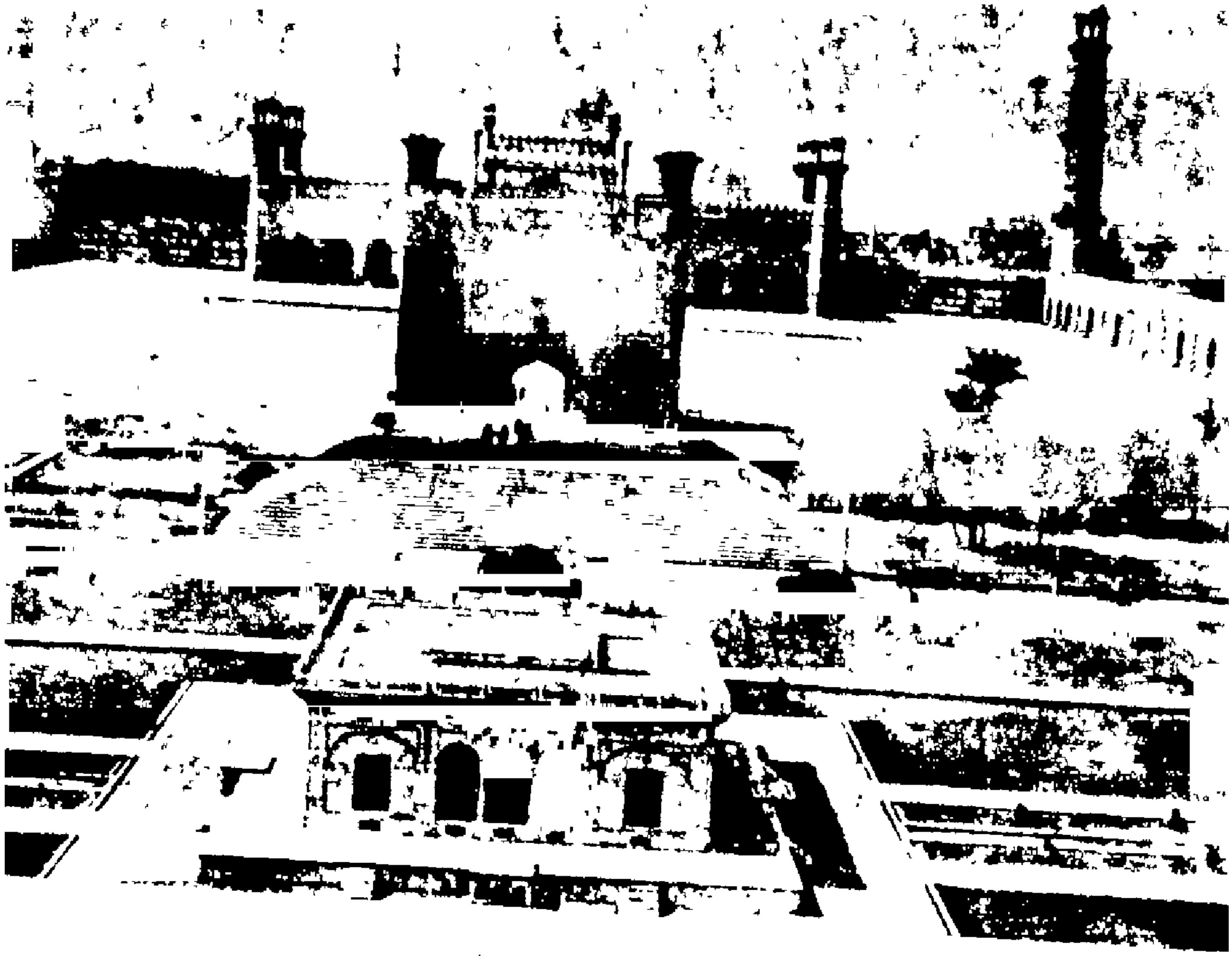
ادارہ فروغ اُردو ۔ لاہور

قیمت پندرہ روپے

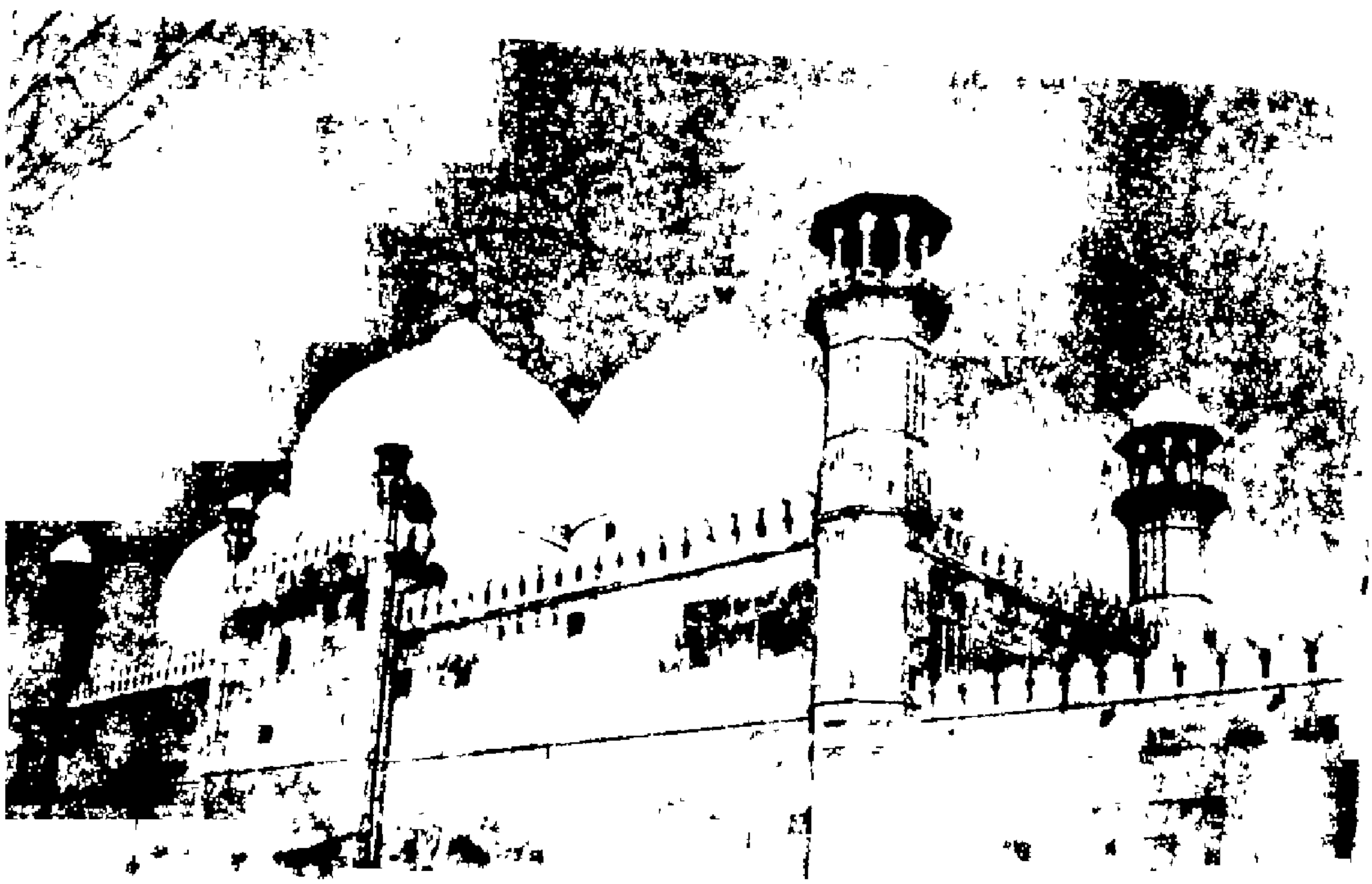


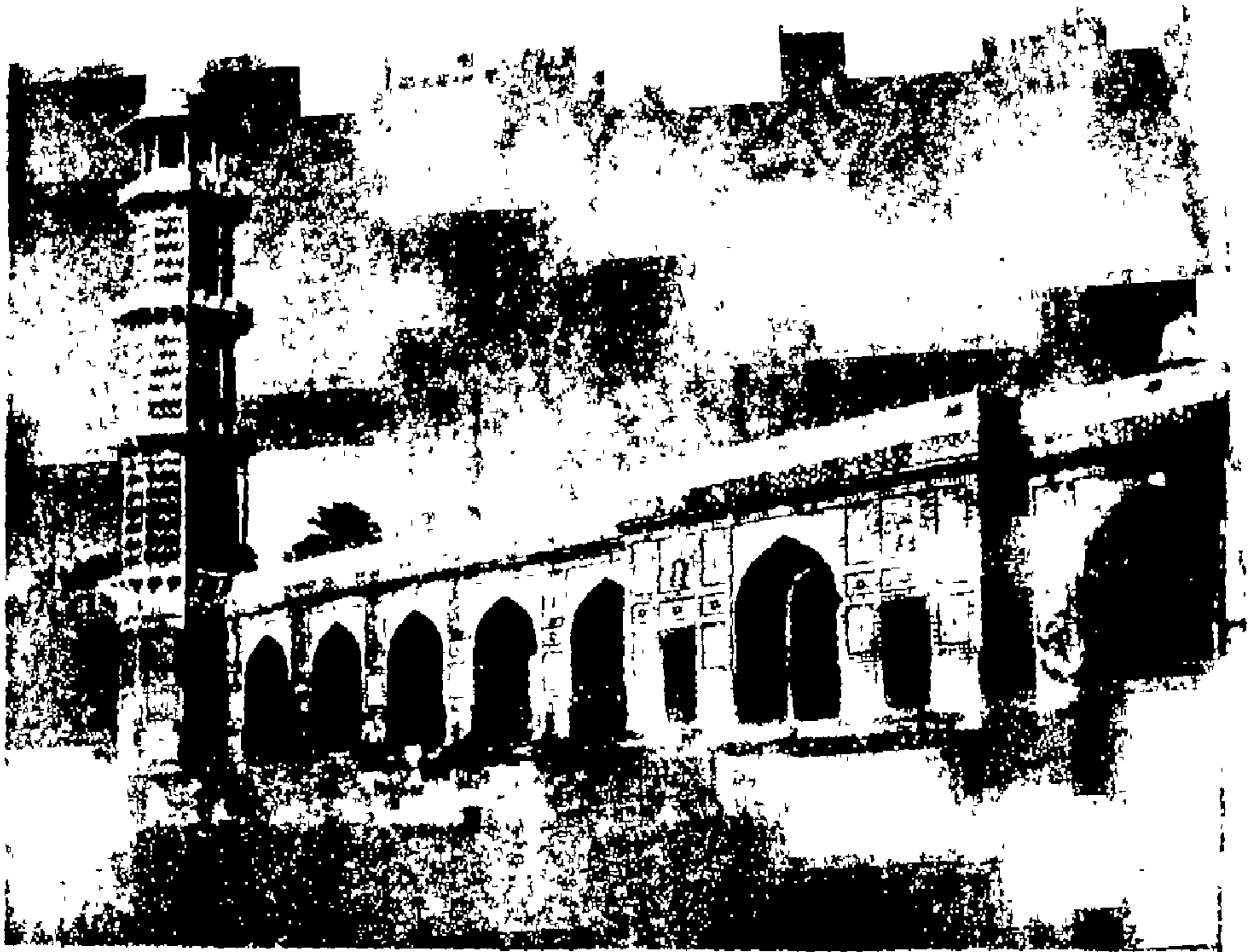
لاهور





شاہی مسجد





مقبرہ جہانگیر





شالامار

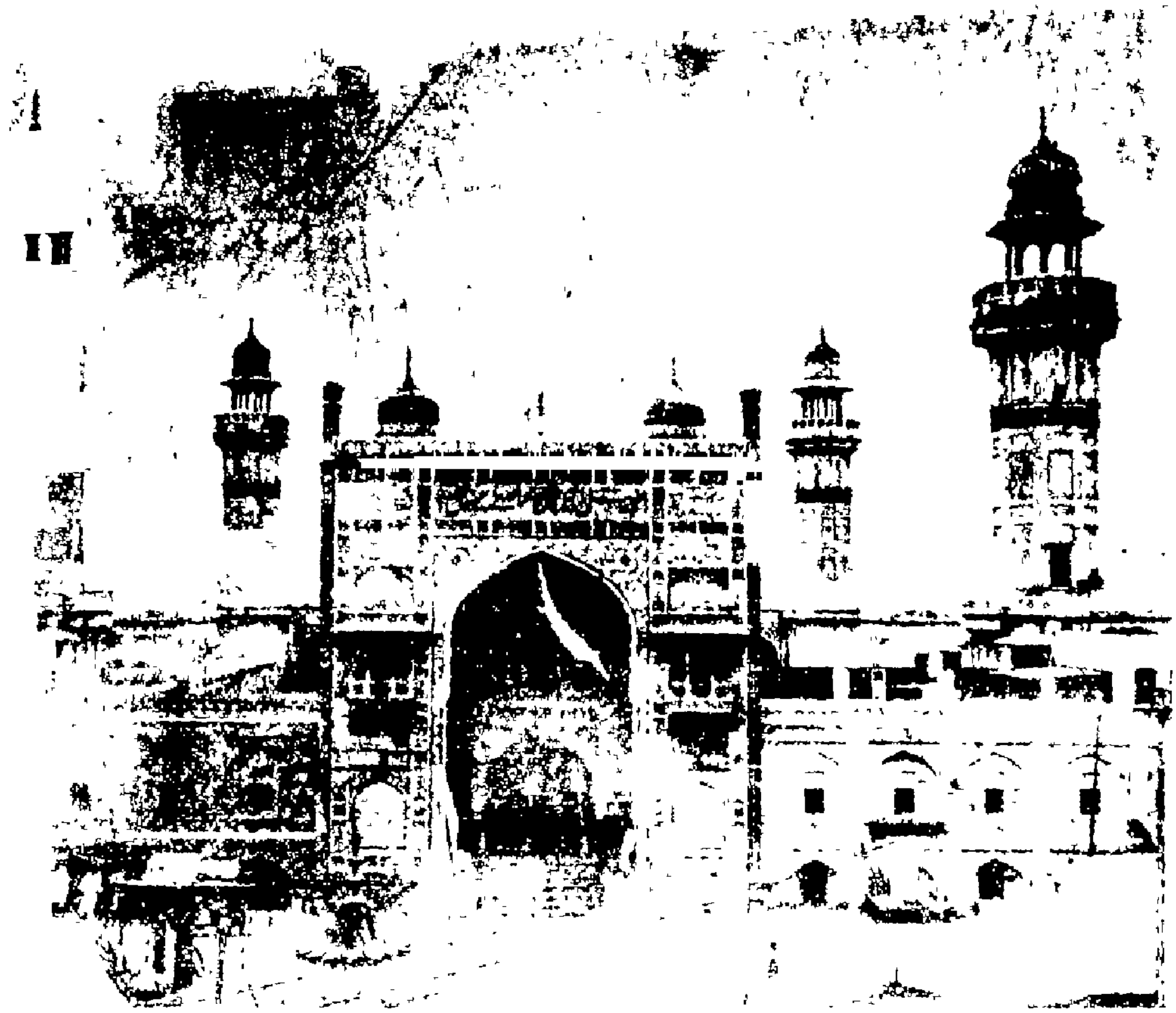


دربار
داتا گنج بخـ



درگاہ
میاں میر صاحب

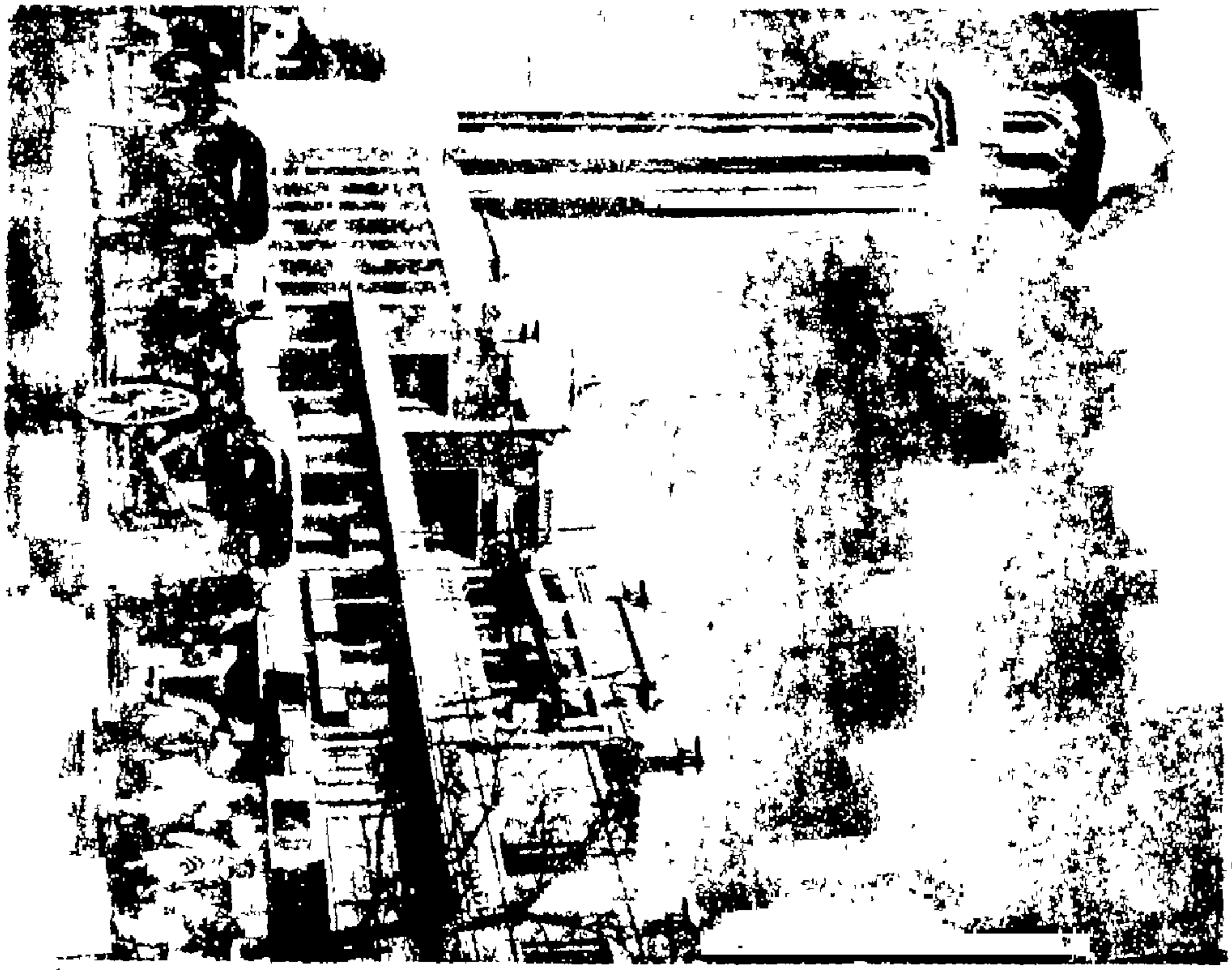


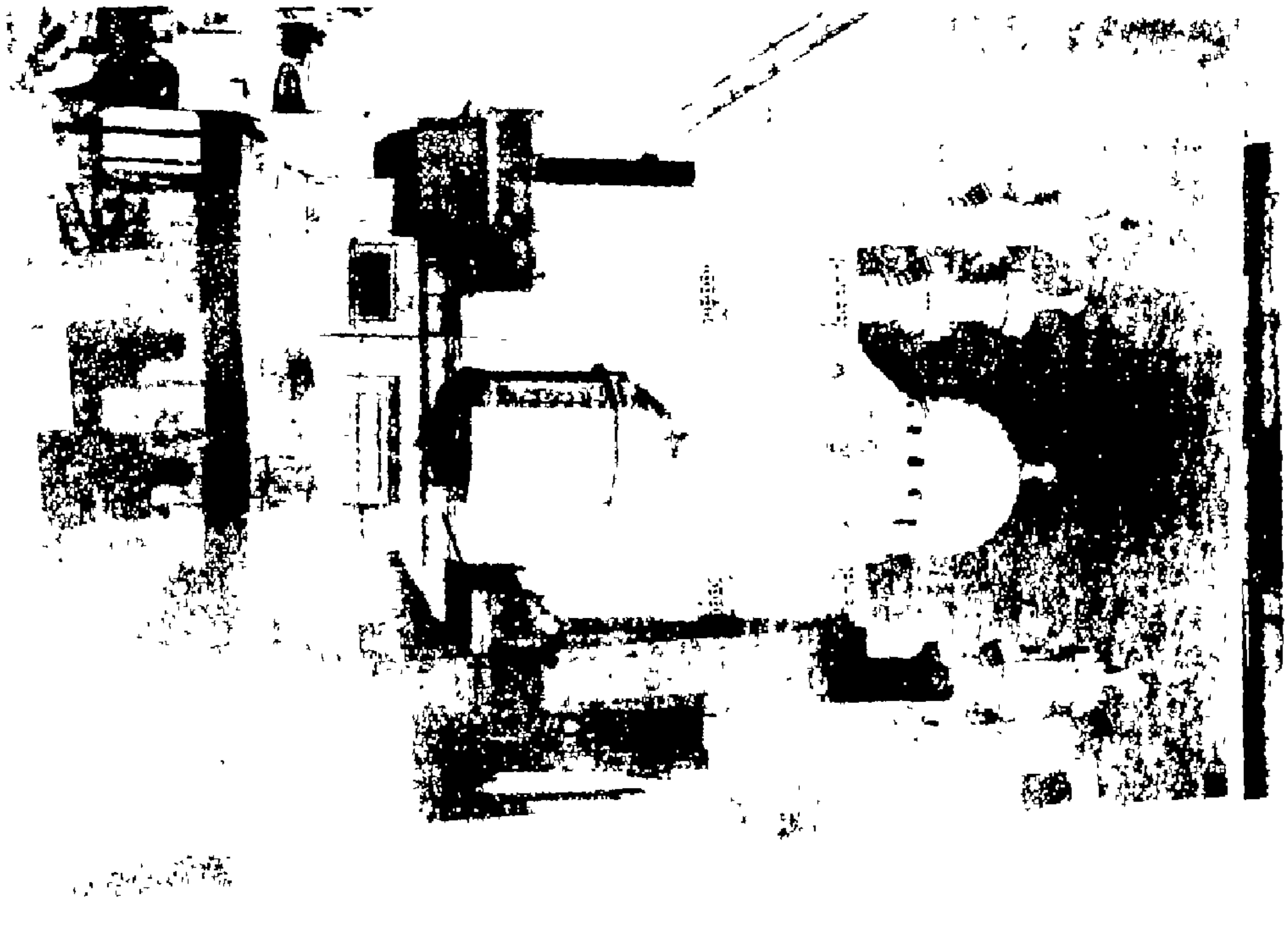


مسجد وزیر خان



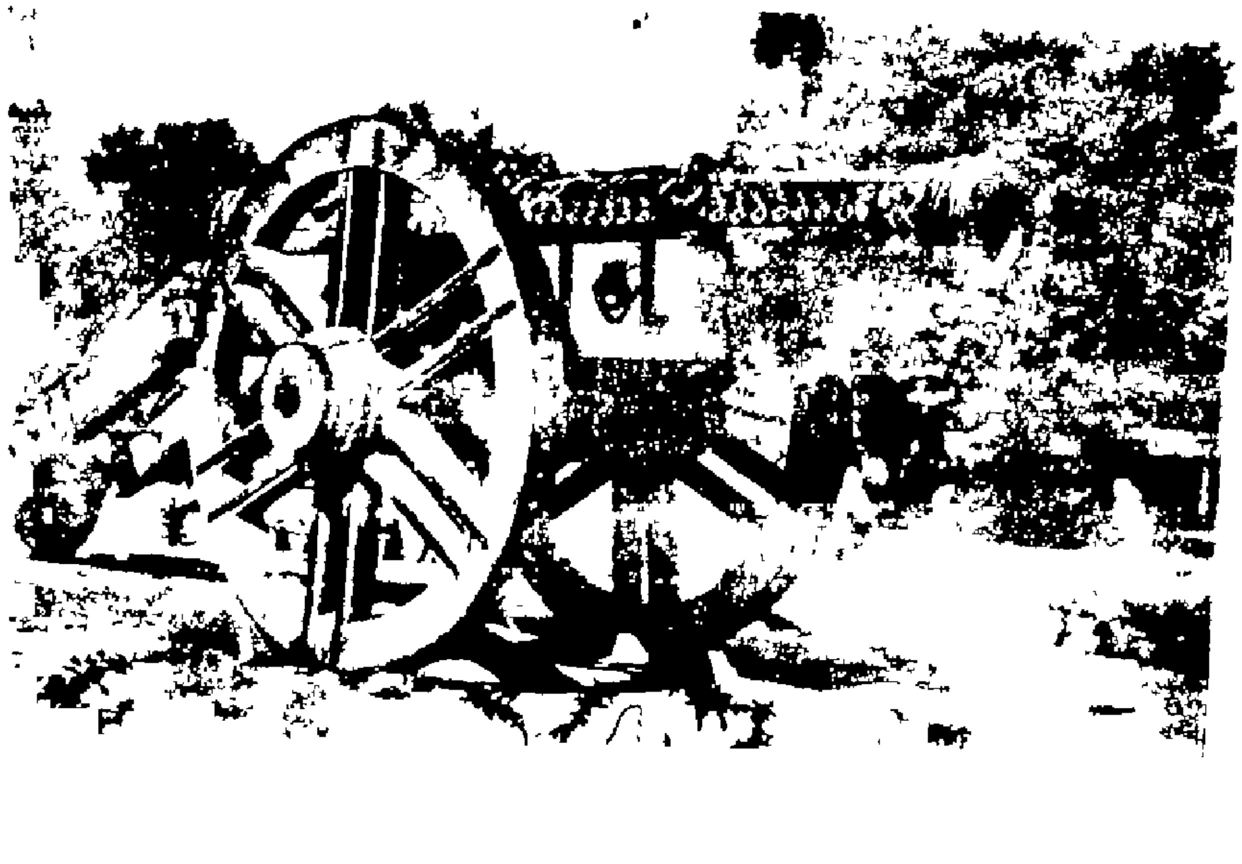
سنہری
مسجد







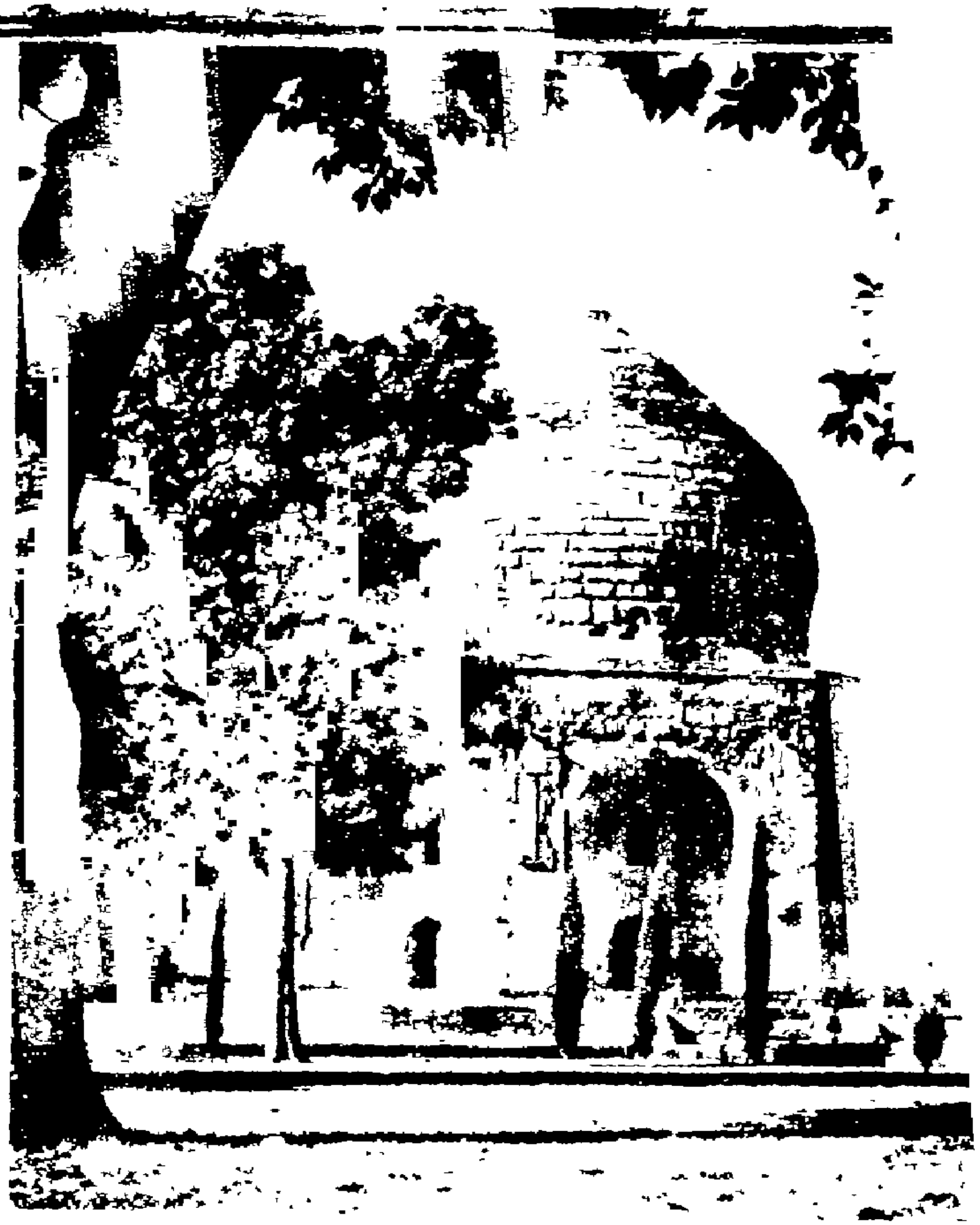
قلعہ لاہور کا دیوان خاص



زمزمہ



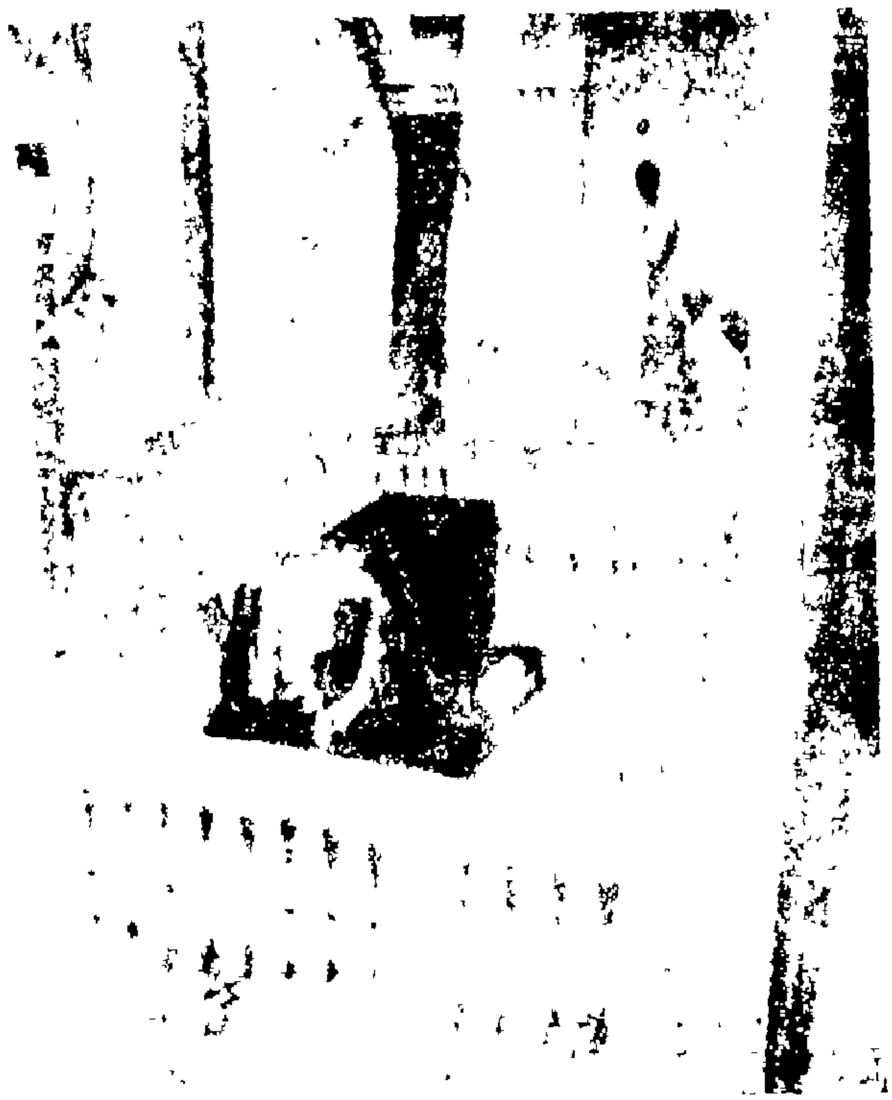
چوبرجی



[illegible]



مزار قطب الدین ایبک



مقبرہ ایاز



بارہ دری کامران



کا-ان فاداہ



پنجاب پبلک لائبریری



پنجاب یونیورسٹی

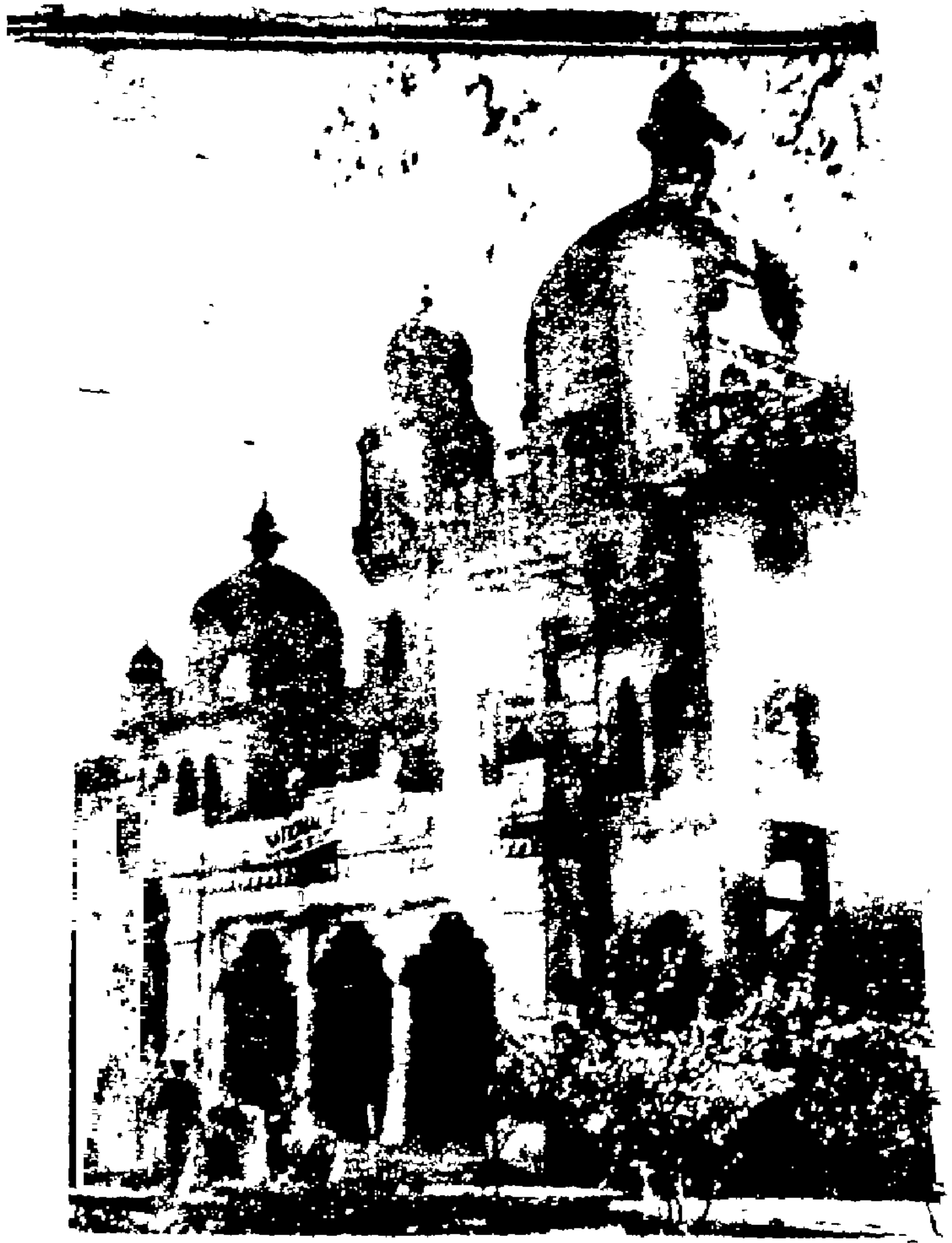






گورنمنٹ کالج







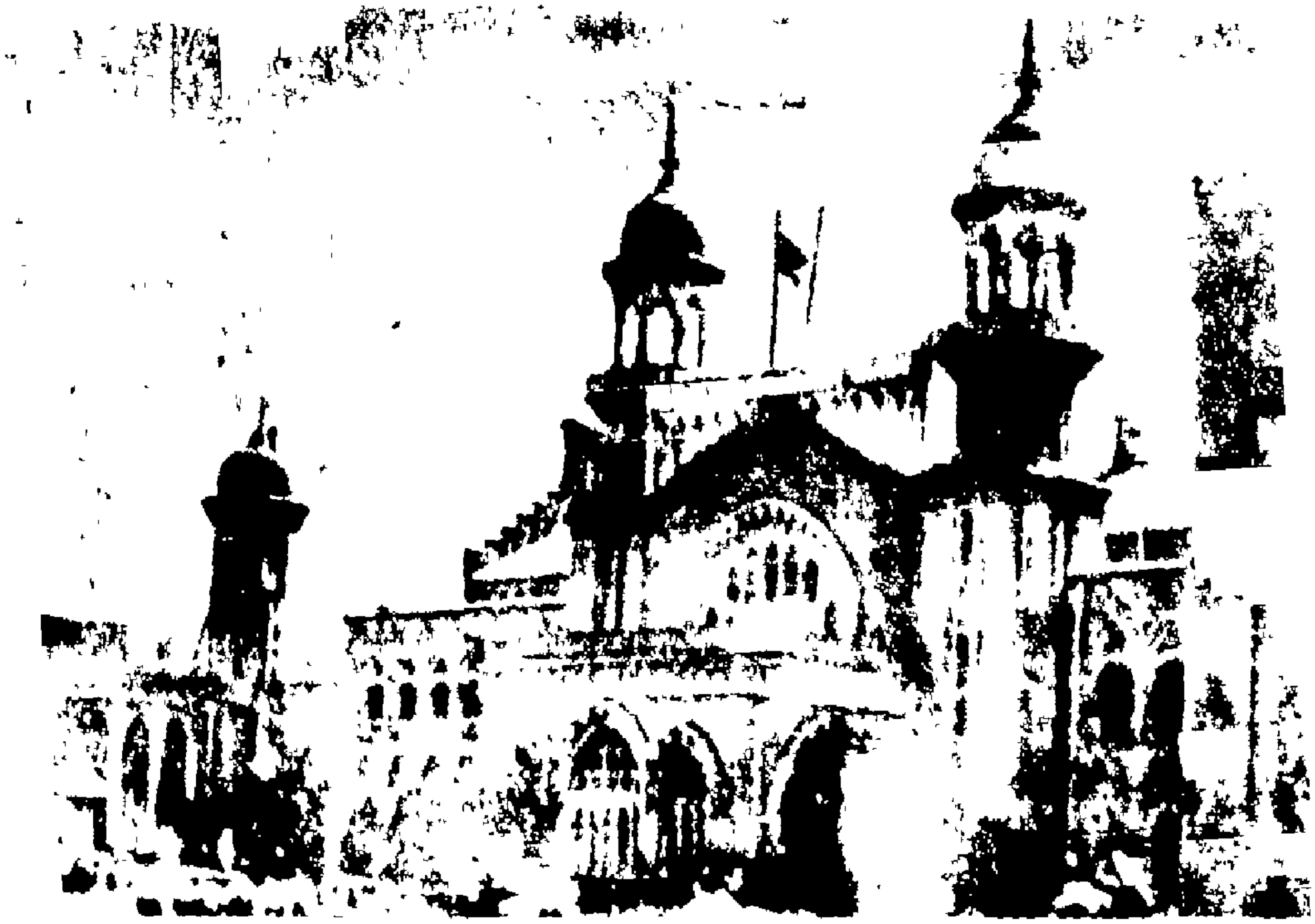
چڑیا گھر



گنگارام ہسپتال



فاطمہ جناح میڈیکل کالج



ہائی کورٹ





منٹگمری ہال



الحمرا



میو ہسپتال



عجائب گھر کے چند نوادر



جہانگیر



مجسمہ مہاتما بدھ



سکہ سلطان محمد غوری



مزار علامہ اقبال

لاہور

کی

سیاسی، ثقافتی، مذہبی

اور

علمی و ادبی تاریخ

لاہور

لاہور

ترتیب

شہر لاہور (باغات و مزارات)، ۱۴۰

شباب لاہور۔ عہد مغلیہ میں

عہد حکومت خالصہ

سنہ ۱۸۵۷ء تا حال

علمائے کرام، دینی مدرسے، ۴۴۱

عبدالوحید خاں، ۷۲۰	سردار خاں، ۷۲۱	فیروز نظامی، ۷۲۱
بھائی لال، ۷۲۱	غلام حسن شگن، ۷۲۲	میاں علم الدین، ۷۲۲
خواجہ خورشید انور، ۷۲۲	رفیق غزنوی، ۷۲۲	عبداللطیف خاں، ۷۲۲
چھوٹے عاشق علی خاں، ۷۲۲		

ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے

برکت علی خاں، ۷۲۳	علی بخش قصوری، ۷۲۳	نیاز حسین شامی، ۷۲۳
بشیر ماہی، ۷۲۳	علی بخش ظہور، ۷۲۳	شریف غزنوی، ۷۲۳
نذیر امرتسری، ۷۲۳	حامد علی بیلا، ۷۲۴	عبدالشکور بیدل، ۷۲۴
مہدی حسن، ۷۲۴	سائیں اختر، ۷۲۴	عنایت حسین بھٹی، ۷۲۴
سلیم رضا، ۷۲۴	فضل حسین، ۷۲۴	امداد حسین، ۷۲۴
منیر حسین، ۷۲۵	برکت گوسٹے والا، ۷۲۵	ظریف، ۷۲۵

گانے والیاں

سردار بائی، ۷۲۵	زیب النساء، ۷۲۵	انور بائی، ۷۲۵
شمشاد بیگم، ۷۲۶	عیدن بائی اکھیاں والی، ۷۲۶	بہار بخش، ۷۲۶
عیدن بائی چلسیاں والی، ۷۲۶	خورشید بائی، ۷۲۶	عنایت بائی ڈھیرو والی، ۷۲۷
روشن آرا بیگم، ۷۲۷	مختار بیگم امرتسری، ۷۲۸	فریدہ خانم، ۷۲۸
نورجہاں، ۷۲۸	شمشاد کوثر، ۷۲۸	زاہدہ پروین، ۷۲۸
نسیم بیگم امرتسری، ۷۲۸	اقبال بانو، ۷۲۸	وحیدہ خانم، ۷۲۹
زینت بیگم، ۷۲۹	آشا پوسلے، ۷۲۹	کوثر پروین، ۷۲۹
آئرن پروین، ۷۲۹	زبیدہ خانم، ۷۲۹	منور سلطانہ، ۷۲۹
نورجہاں جونیئر، ۷۲۹	امۃ الرشید، ۷۲۹	

سارنگی نواز

بڈھے خاں قصوری، ۷۲۹	غلام محمد قصوری، ۷۳۰	حیدر بخش فلوسا، ۷۳۰
چھوٹے کالے خاں، ۷۳۱	بابا علی بخش، ۷۳۱	بلے خاں، ۷۳۱
برکت علی خاں، ۷۳۲	چنوں خاں، ۷۳۲	نتھو خاں، ۷۳۲
بھیتو خاں، ۷۳۲	نبی داد خاں، ۷۳۲	جھنڈو خاں، ۷۳۲
فضل الٰہی، ۷۳۲	گل محمد عرف گلو، ۷۳۲	حسین بخش، ۷۳۲
مہر دین خورشید، ۷۳۲		

طبلہ نواز

قادر بخش، ۷۳۳	استاد بڈھے خاں، ۷۳۳	فقیر بخش پشاوری، ۷۳۳
حاجی فدا حسین، ۷۳۴	خادم حسین، ۷۳۴	الطاف حسین، ۷۳۴
عنائتی خاں، ۷۳۴	شوکت حسین، ۷۳۴	طفیل علی، ۷۳۴
کرم الٰہی قصوری، ۷۳۴	فضل حسین قصوری، ۷۳۵	نبی بخش کالریا، ۷۳۵
میراں بخش گل والیہ، ۷۳۵	کرم بخش، ۷۳۵	استاد نیاز علی، ۷۳۵
صادق حسین ڈھائی دھاڑا، ۷۳۵	فتح دین گادم، ۷۳۵	ارشاد علی، ۷۳۶

ستار نواز

محمد شریف پونچھ والے، ۷۳۶	فتح علی پٹیالوی، ۷۳۶	سراج احمد قریشی، ۷۳۶

قوال

علی بخش خاں، ۷۳۶	مبارک علی خاں فتح علی خاں، ۷۳۶	محمد بوٹا بیگم کوٹی، ۷۳۷
محمد علی فریدی، ۷۳۷	حافظ عطا محمد، ۷۳۷	بھائی بوٹا، ۷۳۷
		[illegible] احمد، ۷۳۷

میوزک ڈائرکٹر

کلارنٹ نواز

پیانو نواز

نے نواز

سرود نواز

اکھاڑے، ۷۴۱

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ آپ کی خدمت میں لاہور نمبر پیش کر سکوں —— الحمدللہ!

اگر میں اس نمبر کے بارے میں کچھ سچی باتیں بھی کہوں گا تو ایسے فقرے ضرور راہ پا جائیں گے۔ جن سے کچھ میری تعریف اور کچھ اس نمبر کی اہمیت کے پہلو نکلیں گے۔ ایسی صورت میں سبھی یہ کہیں گے —— فوتا ہے —— اس لیے مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ خاکساری کا وہ انداز اختیار کروں جو سبھی کو بھائے۔ سو بندہ پرور! اس ہیچمدان کی طرف سے عرض ہے کہ اس عاجز، ناچیز اور پُر تقصیر انسان نے جو یہ "کارنامہ" سرانجام دیا ہے اُسے لمبے چوڑے دعووں کی زد میں لا کر آپ کو بدمزا کرنے کا ارادہ نہیں۔

میری ادنیٰ سی کوشش یہ تھی کہ یہ نمبر اپنے مواد کے اعتبار سے لاہور پر موجود کتابوں سے زیادہ وقیع، زیادہ جامع اور زیادہ متنوع ہو۔ اب دیکھ لیجیے کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ تکمیل کا دعویٰ مجھ ایسے ادارتی گنہگاروں کو زیب نہیں دیتا۔

اس نمبر میں جتنی بھی چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر چند سطریں مطبوعہ نظر آجائیں تو اپنے اس نیازمند کو معاف کر دیجئے گا۔ اس لیے کہ میں اس جرم میں اہل قلم کا شریک نہیں ہوں۔

پہلے میں نے مکاتیب نمبر پیش کرتے ہوئے توبہ کی تھی یا اب یہ نمبر پیش کرتے ہوئے کی ہے۔ مکاتیب نمبر کا تو یہ تھا کہ اہل دل (جن خطوں میں ادیبوں نے اہلِ دل ہونے کا ثبوت دیا تھا وہ ابھی میرے پاس محفوظ ہیں) اور اہلِ قلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جمع کرنا تھا۔ اس نمبر کے سلسلے میں ضخامت طلب موضوعات کو سمیٹنا تھا۔ جو موضوع جسے دیا وہ وہیں ٹھٹک گیا، میں وہیں اٹک گیا۔

میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ اس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملتی ہے۔ وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے۔ گنہگار ضرور ہوں۔ مگر اتنا بھی نہیں!

میں آج ادب کی وادیوں سے نکل کر تاریخ کے میدان میں آن پہنچا ہوں۔ بے شک راہیں پُرپیچ اور اَن جانی تھیں۔ مگر میرے جنون نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ اب یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ جنون اور تاریخ کے اس معرکے میں کون جیتا، کون ہارا۔

یوں تو ہر شہر، شہر ہی ہے۔ مگر بعض شہر، اپنی آغوش میں رہنے بسنے والوں کی پوری تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔ لاہور بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے۔ نقوش نے لاہور کا تاریخی اور تہذیبی سرمایہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے —— دوسرے تاریخی شہر بھی "دیوانوں" کا منہ تک رہے ہیں۔

محمد طفیل

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

لاہور ــــ تاریخ قدیم کی نظر میں

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

اللہ تعالےٰ کے نام کا مادہ "لا" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے جو تمام مذاہب میں معمولی اختلاف سے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم تاریخ میں مشہور شہروں کے نام اسی مادہ سے ترکیب دیئے گئے ہیں۔ سید عبداللطیف اپنی تاریخ لاہور میں، لاہور کے نام کی مختلف شکلیں پیش کرتے ہیں جن کا بطور پس منظر پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آئندہ مباحث میں یہ شکلیں ذہن نشین ہو کر پیش نظر رہیں۔ یہ تراکیب مندرجہ ذیل ہیں :-

اوّل :- لاہور کے آباد کرنے والے کا نام "لوہ" تھا۔ یہ "لوہ" رام چندر جی کا بیٹا تھا۔

دوم : وشنوا بھاگا میں اس کا نام "لوپور" بھی آیا ہے۔

سوم : راجپوتوں کی تاریخ میں اس کا نام "لوہ کوٹ" بھی لکھا گیا ہے۔

چہارم : فتوح البلدان کے مصنف نے اسے "الہاور" کہا ہے۔

پنجم : نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق (مصنفہ الادریسی) میں اس کو "لوہاور" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

ششم : البیرونی نے اسے "لہاور" لکھا ہے جس کو ایلیٹ نے مختلف طریق سے پڑھا ہے، مثلاً لوہاور، لہاوور، لوہارو اور لہور۔

ہفتم : امیر خسرو لاہور کو "لہانور" لکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے۔

از حد سامانہ تا لہانور

ہیچ عمارت نیست مگر در قصور

ہشتم : سید عبداللطیف کا یہ بھی کہنا ہے کہ تھورنٹن (THORNTON) نے "لہانور" "لہانگر" کو لاہور کی بگڑی ہوئی شکل بتایا ہے۔

نہم : جامع التواریخ میں رشیدالدین اسے "لاہور" ہی لکھتا ہے۔

دہم : پٹولومی (PTOLOMEY) نے اسے "لوبوکلا" لکھا ہے۔ ممکن ہے لوبو سے "لوا" اور "لوہ" مراد ہو۔

بہرحال یہ مختصر سی فہرست ہے جو لطیف کی تصنیف لطیف میں ہمیں ملتی ہے۔ ان میں قدیم ترین ماخذ جو مسلمان مؤرخ

ے پیش کیے ہیں وہ ہماری نگاہ میں پنجاب کے دارالخلافہ لاہور سے متعلق نہیں۔ بلکہ ضلع مردان میں صوابی تحصیل کے لاہور سے متعلق ہیں۔ ہم اس کے متعلق آئندہ صفحات میں کچھ گذارشات پیش کریں گے۔ فی الحال ہم اس میں ایک اور حوالے کا اضافہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں وہو ھذا۔

یا ذ رہے : نعت فرس میں اسدی طوسی "سداھرا" کے تحت لکھتے ہیں "نام باغی است بلوھاور" اور پھر حقوری ہروی کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے "حقوری گوید" ———

ای سرو کشمری است ای باغ سداھرا

ہرگز دمی نیابی [و] یک روز نگذری

حقوری ہروی محمود غزنوی اور ابیرونی کا ہم عصر تھا۔ یہ باغ سداھرا کہاں تھا اس کا کوئی سراغ لاہور (پنجاب) میں نہیں ملتا۔ البتہ اسے اگر "شاہدرا" کا ماخذ مان لیا جائے تو شاید کچھ بات بن جائے۔ کیونکہ یہاں ایک قدیم باغ کا پتہ ملتا ہے "سداھرا" اور "شاہدرا" کے حروف ایک ہی ہیں، ممکن ہے نقل کلمہ کی وجہ سے (METATHESIS) یہ تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

لاہور کے نام کی وجہ تسمیہ جو ہم یہاں پیش کرنے والے ہیں یہ ایک بالکل مختلف اور نیا نظریہ ہے جو آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔ ازالہ بریں دو ایک بار خود ہم نے اپنے مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس کی تفصیل آج یہاں پیش کی جائے گی۔ اول اول ۱۹۴۵ء میں ندوۃ المصنفین کے مجلہ برہان میں ہمارا ایک مقالہ اس موضوع پر نکلا تھا اور اس کے بعد پھر ایک مضمون ہم نے پاکستان ہسٹری کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۵۵ء میں پڑھا جو بعد میں اس کی روئداد میں شائع ہو گیا تھا۔

لاہور کے نام کا آغاز سمجھنے کے لیے ہمیں بہت دور تاریخ قدیم میں شرق الاوسط کی سیر کرنا ہو گی۔ یہ وہ وقت ہے جب مختلف قوموں کا انشعاب ایک سیلاب کی طرح امڈتا ہوا دنیا میں پھیل رہا تھا۔

لاہور برعظیم کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اس کا زمانہ موہنجو دارو اور ہڑپا کا زمانہ ہے۔ مگر لاہور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ متواتر چلا آیا ہے اور کبھی برباد نہیں ہوا۔ مورخین اور ماہر آثریات (ASSYRIOLOGISTS) یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں دو قدیم ترین شہر ہیں جو کبھی برباد نہیں ہوئے۔ اور مسلسل آباد چلے آتے ہیں۔ ایک ان میں کا دمشق ہے اور دوسرا اربیل ہے! ہمارا یہ کہنا ہے کہ لاہور بھی اسی زمانے کا قائم شدہ شہر ہے۔ اور یہ بھی کبھی برباد نہیں ہوا۔ جس طرح ہڑپا، موہنجو دارو، بابل، نینوا، آشور اور تخت جمشید وغیرہ تباہ و برباد و غیر آباد ہو گئے۔ لاہور کو ختماً یہ فخر حاصل ہے کہ وہ دنیا کے تین قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے جو کبھی برباد نہیں ہوا اور متواتر آباد ہی چلا آیا ہے۔ لاہور کی تاریخ تین ہزار ق م سے بھی پہلے کی ہے۔ ہم پہلے لاہور کی قدامت پر چند ایک شواہد پیش کریں گے۔

جو لوگ لاہور کے رہنے والے ہیں اور شہر کے اندر خوب گھومے پھرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ لاہور کا پرانا شہر جو فصیل کے اندر ہے وہ ایک بلندی (ٹیلہ) پر واقع ہے۔ (MOUND)۔ یہ بات قلعہ کی طرف سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب ہم روشنائی دروازہ سے شیرانوالہ گیٹ کی طرف بڑھتے ہیں تو شہر کی اٹھان ہمیں نظر آتی ہے۔ اور پھر خود شہر کے اندر

مقامات ایسے ہیں جہاں تیس چالیس سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ اکثر ایک سڑکیں ایسی ہیں جن میں بڑا نشیب و فراز ہے۔ یہ شیوالہ مندر کے سامنے جو نیا بازار ہے اس کے دائیں ہاتھ ایک مسجد ہے (زیور سجد) جو سڑک کی سطح سے پچاس فٹ ہے۔ اور اس کے میناروں کی بلندی سڑک کی سطح تک پہنچتی ہے۔ یہ تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ لاہور ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ حقیقت لاہور شہر کے مضافات میں بھی ٹیلے نمایاں ہیں اور زمانہ قدیم میں شہر لاہور انہی ٹیلوں پہ واقع تھا جو اب گنجان آبادی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ ان میں کا ایک ٹیلہ (MOUND) جو یہ جی ہے اور دوسرا بدھو کا آوا۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہاں قدیم ٹیلوں پہ آبادیاں تھیں۔ اور ٹیلے اس بات کا اہم ثبوت ہیں کہ آبادیاں نہایت قدیم ہوں گی۔ اس امر کی تصدیق موہنجو دارو، ہڑپا، اور بابل کے غیر آباد ٹیلوں سے ہو سکتی ہے۔ جن صاحب نے مشرق وسطیٰ کی سیر کی ہے اور قدیم مقامات کے آثار دیکھے ہیں انھیں یہ بات سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ اور وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ قدیم شہر یا ان کے آثار ہمیشہ بلند ٹیلوں پر واقع ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ یہ ٹیلے کیونکر بنتے ہیں اور یہ آبادیاں ان پر کس طرح بس جاتی ہیں یہ علم آثار قدیمہ کا ایک اہم موضوع ہے۔ لاہور کی طرح مشرق الاوسط میں بھی آباد شہر قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں، مثلاً موصل، کرکوک، اربیل اور دمشق۔ یہ تمام بلندیوں پر واقع ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا مزار موصل کے قریب بلندی پر نینوا کی بغل میں واقع ہے۔ جب راسم اور بوٹا نے (RASSAM AND BOTA) یہاں مکان خرید کر کے ان کے سردابوں میں کھدائی شروع کی تو ان کو کئی ایک خط میخی کے کتبے دستیاب ہوئے جو اس ٹیلے کی قدامت کا بین ثبوت تھے۔ مختصر یہ کہ ایک بستی پہلے پہل ہی سے موجود ہوتی تھی۔ زمانے کے حوادث کی وجہ سے یہ نیست و نابود ہو جاتی، کبھی دشمن تباہ کر کے آگ لگا دیتا۔ کبھی بھونچال اس کو تباہ کر دیتے اور کبھی عذاب الٰہی سے یہ نیست و نابود ہو جاتی۔ ہمارا ذاتی نظریہ ہے کہ جو بستی عذاب الٰہی سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے وہ دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوتی۔ دیگر حوادث کی وجہ سے تباہ شدہ بستیاں از سر نو آباد ہو جایا کرتی ہیں۔ عذاب الٰہی سے تباہ شدہ بستیاں مندرجہ ذیل تصور کی جا سکتی ہیں (۱) بابل (۲) نینوا (۳) اشور (۴) تخت جمشید (۵) ہڑپا (۶) موہنجو دارو اور (۷) ٹیکسلا۔ ان کا دوبارہ آباد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اور جو بستیاں عذاب الٰہی سے تباہ نہیں ہوتیں وہ از سر نو آباد ہو جایا کرتی ہیں جو لوگ بعد میں آتے ہیں وہ ان بستیوں کے مناسب محل وقوع کو پسند کر کے یہاں آباد ہو جاتے ہیں اور اسی گری ہوئی بستی کی اینٹوں سے ایک نیا شہر تعمیر کر لیتے ہیں یہ سلسلہ متواتر کئی ہزار سال تک جاری رہتا ہے۔ شہر گرتے اور بنتے رہتے ہیں پھر گرتے اور پھر بنتے ہیں۔ غرضیکہ اس اصول کے مطابق جو شہر آج کل ان قدیم جگہوں پہ موجود ہیں وہ کچھ بلندی پر واقع نظر آتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ وہاں پر پہلے ہی سے کوئی ٹیلہ یا بلندی موجود تھی اور اس پر معماروں نے شہر کی تعمیر شروع کر دی ہو۔ بلکہ یہ ایک ارتقائی امر ہے۔ البتہ جو بستیاں پہاڑوں کی بلندیوں پر آباد کی گئی تھیں ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور ان کا ان ٹیلوں سے کوئی تعلق نہیں یہ ٹیلے مصنوعی ہوتے ہیں اور پہاڑ قدرتی طور پر تخلیق پاتے ہیں۔ اور ہم اس وقت میدانی بستیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

ہم نے مقالے کے شروع میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لفظ کا مادہ "لا" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ ہے۔ اس لیے جب کبھی بھی انسانوں کو مل کر بستیاں قائم کرنے کا موقعہ ملا تو انھوں نے اللہ کے نام پر ہی اس کا نام تجویز کیا اور یہ کسی نہ

در کسی نہ کسی زبان میں اس کا مفہوم "بیت اللہ" نکل آیا! بابل کا اصل نام "باب الی" تھا یعنی
کسی شکل میں تخلیق پا گیا۔ اربیل کا اصل نام "اربعہ ایلو" تھا یعنی جہاں چار دیوتاؤں کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ یونانیوں نے اسے اربیلہ
بیت اللہ۔ [اربعہ ایلو، یعنی چار دیوتاؤں کا شہر۔ جہاں تثلیث کے تصور سے پہلے چار دیوتا پوجے
کہہ کر (ARABELA) پکارا۔ ان کے نام یہ ہیں (۱) اندرا (۲) ورونا (۳) متھرا۔ اور (۴) آشورا۔ جب آرین اقوام برعظیم میں وارد ہوئیں
جاتے تھے۔ یاد رہے کہ مہابھارت کی جنگ میں اس دیوتا کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ جو تثلیث آرین ساتھ
تو آشور دیوتا کو پیچھے چھوڑ آئیں۔ آہستہ آہستہ ان ناموں میں تبدیلی ہو گئی اور ڈھائی ہزار
لے کر آئے وہ یہ تھی (۱) اندرا (۲) ورونا۔ اور (۳) متھرا۔ جو ایک دم دار ستارہ تھا اس کا تصادم اس کرۂ زمین سے ہوا تو اس کی دم جاتی رہی
سال قبل مسیح جب زہرہ (VENUS)
اور یہ ایک سیارہ (PLANET) بن گیا۔ تمام سیارگان کی تخلیق اسی طرح ہوئی ہے۔ جب زہرہ سیارہ بن گیا تو اس
نے اپنا اثر روئے زمین کی مخلوق پر ڈالا۔ چنانچہ موسم اور فصلیں اس سے متاثر ہوئیں اور انسان نے یہ اثر محسوس کیا۔ اور اس
کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اور یہ مذہبی عقائد میں متعارف ہوا۔ اس سے پہلے یونانیوں نے اسے وینس (VENUS)
دیوتا کہہ کر پوجا۔ اور جب آرین اقوام نے اسے اپنی تثلیث میں شامل کر کے اس کو وشنو کا نام دیا۔ چنانچہ برعظیم میں جب
آرین وارد ہونے والے تھے تو ان کی تثلیث مندرجہ ذیل دیوتاؤں پر مشتمل تھی (۱) اندرا (۲) متھرا۔ اور (۳) وشنو۔ یہ تثلیث
بہت بعد میں موجودہ شکل میں آئی (۱) برہما (۲) وشنو اور (۳) مہیش ملاحظہ ہو۔
(WORLDS IN COLLISION BY EMANVAL VALINKOVSKY)
اسی طرح کئی ایک اور مقامات ہیں جن کی بنیاد مذہبی طور پر ان دیوتاؤں پہ رکھی گئی۔ مثلاً حضرو کے قریب ایک مقام
تربیلا ہے جہاں آج کل حکومت پاکستان دریائے سندھ پہ ایک بند ترتیب دے رہی ہے۔ اس کا اصل نام تربا ایلو تھا
(TRIBA ILV) یعنی تین دیوتاؤں کے پوجنے کی جگہ۔ اس مقام کے متصل دریائے سندھ کے پار، ریاست امب کا دارالحکومت
امبیلا ہے جس کا اصل نام امبا ایلو (AMBA ILV) تھا جہاں امبہ دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ اور غالباً یہ کہنا مبالغہ آمیز
نہ ہوگا کہ بھارتی پنجاب کا انبالہ درحقیقت امبالہ یا امبا ایلو ہی تھا۔ شہروں کے ناموں میں اکثر تکرار دیکھی گئی ہے۔ گویا امبیلا
اور انبالہ کا ماخذ امبہ دیوی ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تنت کا دارالخلافہ لاسہ
بھی بیت اللہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہ شہر آرین تہذیب کا بڑا مرکز ہے۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ جب آرین اقوام
وارد و اس برعظیم میں ہوا۔ اور وہ وادی سندھ میں بڑھتے چلے آئے تو جب لاہور پہنچے تو انھوں نے اس کا نام "لاآ"
رکھ دیا۔ اس بات کو تقریباً پانچ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ ہمارا ذاتی فکر ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لفظ "آر" کہاں سے
اور کس طرح آیا اور اس کا کیا مطلب ہے، تو اس کی وضاحت ہم ذیل میں اختصاراً عرض کرتے ہیں۔
تاریخ قدیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آرین لوگوں کا سیلاب جب ایران پہ امنڈا تو وہ بہت
تک جاری رہا۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ ایک ماہ یا ایک سال کے اندر وسط ایشیا یا قطب شمالی سے اٹھ کر ایران میں آ بسے
بلکہ یہ سلسلہ ہجرت متواتر (ARCTIC HOME IN THE VEDAS BY B.G-TILAK)

صدیوں تک جاری رہا۔ اور آرین اقوام کے کئی مختلف گروہ مختلف وقتوں میں مختلف راستوں سے آتے رہے۔ چنانچہ ان کا ایک گروہ اناطولیہ میں داخل ہوا جس کو تاریخ میں حتی (HITTITES) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور گروہ بھی تھا جو اگرچہ اناطولیہ میں داخل تو نہیں ہوا مگر اناطولیہ کے جنوب مشرق میں آباد ہوگیا۔ جو علاقہ انھوں نے قبضے میں لیا اس کا حدود اربعہ وہی ہے جو یونانیوں نے میڈیا (MEDIA) یا [مادا] کا بتایا ہے۔ اس گروہ کا نام میتانی (MITANI) تھا یہی وہ لوگ تھے جو آگے چل کر تاریخ میں ہوری (HURRIS) کہلائے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ میتانی قوم ہوری ہی کی اولاد سے تھی۔ (EARLY ANATOLIA BY SETON LLOYD) بہر حال یہ لوگ دجلہ تک پھیل گئے۔ اور ہلال خصیب (FERTILE CRESCENT) کے شمالی علاقہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ ان کی اصل راجدھانی جو میڈیا سے مطابقت رکھتی ہے کردستان کا علاقہ ہے۔ گویا کردوں کے آبا و اجداد ہوری قوم کے لوگ تھے۔ میتانی اور ہوری قوم کے تہذیب و تمدن میں ایک گونہ مماثلت ثابت کی جا چکی ہے۔ بوغاز کوئی (BOGAZKUI) سے خطِ میخی (CUNCIFORM INSCRIPTION) کی جو خط و کتابت برآمد کی جا چکی ہے اور جس کو تل العمارنا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (TELL EL AMARNA) اور جو اس وقت برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ دسترتھ اسی قوم سے تھا۔ چنانچہ اس کا تفصیلی حوالہ (THE MAKERS OF CIVILISATION IN RACE AND HISTORY BY L.A. WADDELL) میں دیا گیا ہے۔ یہ خط و کتابت مصر کے فرعون اخناطون (AKHNATON) اور راجہ دسترتھ کے مابین ہوئی اور اس کا موضوع یہ تھا کہ فرعون مصر نے راجہ دسترتھ کی لڑکی اپنے بیاہنے کے لیے مانگی تھی۔ تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ خود اخناطون بھی ایک میتانی عورت کے بطن سے تھا۔ نہ ہی صرف یہ بلکہ اس بات کے بھی شواہد مل چکے ہیں کہ مصر کا اولین بادشاہ جس نے اپنے آپ کو فرعون کہہ کر پکارا، راجہ دسترتھ کا بیٹا رام چندر تھا۔ اس کا نام خطِ میخی کے کتبوں سے امرسین یا ترم سین تشخیص کیا گیا ہے۔ یہ مثال بطور نقل کلمہ (METATHESIS) کے پیش کی جاتی ہے سین کے معنی میتانی زبان میں "چندر" ہی کے ہیں۔ اس امرسین نے اپنا لقب "بارو" رکھا۔ چونکہ عربی میں حرف "پ" نہیں ہوتا اس لیے اس کو بعد میں بالترتیب "فارو"، "فاراع" اور "فرعون" کہا گیا جس کو یونانیوں نے "فیرو" (PHAROAH) بنا دیا۔ ویڈل صاحب نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ پارو کا نام ان کا تجزیہ کردہ ہے باقی ترتیب فرعون کے لفظ کے ارتقا پر ہماری اپنی ہے۔

اگر یہ سب کچھ درست ہے تو کرو قوم کورو ہوئی۔ اور مہابھارت کا کوروا ستھان یا کورو کشیتر کردستان ہوا جو قدیم میڈیا یا مادا کے حدود اربعہ سے مطابقت اور مماثلت رکھتا ہے۔ اور مہابھارت کی یہ مشہور جنگ پانی پت کے گرد و نواح کی بجائے شرق الاوسط کے اس اہم خطہ میں وقوع پذیر ہوئی۔

یہی ہوری قوم جب جنوبی ہلال خصیب میں وارد ہوتی ہے (یہ اس برعظیم کے دَرُوڈوں سے پیشتر کا واقعہ ہے) تو ہوار (HAR) کہلاتی ہے۔ اور اس نے اپنا دارالخلافہ "ہور" یا "اُر" کلدانی بنایا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ چنانچہ اس ہوری قوم نے اپنی تثلیث میں ایک اور اضافہ کیا اور متھرا کو گرا کر ابراہیم

علیہ السلام کے نام پر برہما ملا دیا۔ اور بعد میں یہ قوم جب وادیٔ سندھ میں وارد ہوئی تو اس کی تثلیث یوں مرکب تھی (۱) برہما (۲) وشنو اور (۳) اندرا۔

چنانچہ دراوڑ وادیٔ سندھ کے وقت یہ قوم ہنود کہلاتی تھی۔ اور یہ قوم آج تک سندھ کے علاقے میں موجود ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہ لوگ ہڑپا اور لاہور تک پہنچے۔ اور لاہور کے مقام پر قابض ہو کر اس مقام کا نام انھوں نے "لاہور" رکھ دیا۔ "لاآر" دونوں میں بہت کم فرق ہے "آر" کا مطلب "آباد ہونے والا" یعنی (SETTLERS) ہے۔ کیا یہ بات قرین قیاس نہیں کہ جو قوم ہلال خصیب سے بڑھ کر موہنجوداڑو اور ہڑپا تک پہنچ سکتی ہے وہ لاہور تک نہ آ سکتی تھی؟ اسی قوم نے لاہور کی بنیاد رکھی اور اسی قوم کے نام پر لاہور کا اصل نام "لاآر" رکھ دیا گیا۔ اس ترکیب کے معنی بھی بیت اللہ ہی کے ہیں۔ لاہور کا نام اول روز سے ہماری دانست میں یہی چلا آتا ہے جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے بدلتا رہا ہے لور آرین اقوام کا قدیم ترین مرکز اس برعظیم میں جو اس وقت آباد ہے یہی لاہور ہے۔ جس طرح لاسہ کا مطلب بیت اللہ ہے اسی طرح لاآر کا معنیٰ بھی بیت اللہ ہی ہے۔ اگر تحت اللفظ لاہور کا ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنیٰ بھی بیت اللہ ہی نکلتے ہیں یعنی اللہ کا آباد کیا ہوا۔ تو پھر اللہ کا ہی گھر ہوا۔ اکبر اعظم نے پراباگ کا نام الٰہ آباد رکھا۔ یہ پراباگ کا ترجمہ تھا۔ پارو اور پرا ایک ہی لفظ ہے دونوں کا مطلب اللہ ہی ہے یا (LORD) جس طرح سنسکرت کا پرابھو۔ اس کے معنی بھی (LORD OF THE LAND) ہی ہیں۔ ان ہوروں کا ذکر سکندر مقدونی کا مورخ پلوٹارک (PLUTARCH) بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بہادر اور جنگجو قوم یہی ہے۔

اب ہم قدیم مسلم مورخین کے "لوہاور" کو بغور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں پر واقع ہے۔ فتوح البلدان، ادریسی اور البیرونی بالترتیب لاہور کو "لوہاور" "الہاور" اور "لہاور" لکھتے ہیں۔ ان سب کا زمانہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال کا ہے۔ عتبی تاریخ یمینی کا مصنف جو محمود غزنوی کا مورخ تھا، لکھتا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنی پہلی تین مہموں میں دریائے چناب کو عبور نہیں کیا! ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اس نے دریائے چناب کو عبور نہیں کیا تو وہ لاہور (پنجاب) کس طرح پہنچ گیا؟ عتبی یہ بھی کہتا ہے کہ انندپال کی فوجیں محمود غزنوی کے مقابلے کے لیے لوہاور سے آگے بڑھیں جو کہ انندپال کا گرمیوں کا ہیڈکوارٹر تھا۔ بڑی ہی عجیب بات ہے لاہور (پنجاب) گرمیوں کا ہیڈکوارٹر ہو حالانکہ اس کا دارالخلافہ ہنڈ تھا۔ آ سے پنجاب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لوہاور کا ذکر پانینی (PANINI) جو کہ بدھوں کا ایک بہت بڑا صرف و نحو کا عالم تھا کرتا ہے، وہ بھی یہاں ایک عرصہ تک رہا۔ لاہور (پنجاب) بدھوں کا کبھی بھی مرکز نہیں رہا۔ درحقیقت یہ لوہاور آج بھی موجود ہے اور آباد ہے، یہ ایک ٹیلہ پر واقع ہے اور ضلع مردان کی تحصیل صوابی کا ایک قصبہ ہے جو ہنڈ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی البیرونی اور دیگر مسلمان مورخین کا لوہاور، الہاور اور لہاور ہے۔ ڈاکٹر ناظم مرحوم نے ایک خط میں جو انھوں نے ڈاکٹر محمد باقر کو لکھا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ خط ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اپنی کتاب LAHORE PAST AND PRESENT میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ محمود غزنوی کی مہموں پر مطبوعہ روداد پاکستان ہسٹری کانفرنس ۱۹۵۵ء ص ۱۲۳۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ لاہور ایک ٹیلہ پر واقع ہے ۔ ہمارا قیاس کہتا ہے کہ اگر اس ٹیلے کے وسط میں کسی ایک مقام پر عمل نقب کے ذریعہ (EXCAVATIONS) کھدائی کی جائے اور اسے پچاس ساٹھ فٹ گہرائی تک لے جایا جائے تو کئی ایک تہذیبوں کے آثار مل سکتے ہیں ۔ کچھ عرصہ ہوا کہ لاہور کے قلعہ کے اندر کھدائی شروع کروائی گئی تھی جس پر کئی ایک جانب سے اعتراض بھی ہوئے ہوں گے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک ہمیں معلوم نہیں ہو سکا ۔ ہمارا یقین ہے کہ قلعہ بھی چونکہ ایک ٹیلہ پر ہے، اگر اس کو گہرا کھودا جائے تو بالترتیب اس میں سے مندرجہ ذیل تہذیبیں برآمد ہو سکتی ہیں ۔

(۱) سکھ

(۲) مسلم

(۳) ہندو

(۴) بدھ (؟)

جب یہ تمام حقائق منظر عام پر آ جائیں گے تو جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ سب کچھ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا ۔ ع

برافگن پردہ تا معلوم گردد

کہ یاران دیگرے را می پرستند

لاہور

(تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

لاہور کی قدیم تاریخ پر روایات، قیاسات اور حکایات کی دھند کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ کوشش کے باوجود علمی اور یقینی طور پر یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس شہر کا نام کب اور کیسے رکھا گیا؟ لیکن تحقیقی کاوش سے جو مواد دستیاب ہو سکا ہے وہ پیش خدمت ہے۔

میری تحقیق کے مطابق لاہور کا ذکر سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری کی ایک تالیف حدود العالم میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کی تاریخ تصنیف ۳۷۲ھ ہجری (۹۸۲ء عیسوی) ہے۔ اس کتاب میں درج ہے:

"لهور شہریست با ناحیت بسیار و سلطانش از دست امیر ملتانست
و اندرو بازارہا و بت خانہاست و اندرو درخت چلغوزہ و بادام و جوز ہندی
بسیارست و ہمہ بت پرستندہ اندر وی ہیچ مسلمان نیست" (حدود العالم ص ۴۴)

ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی کئی سال تک ہندوستان میں رہا اور محمود غزنوی کے حملوں کے وقت یعنی گیارھویں صدی عیسوی میں وہ ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کر رہا تھا۔ وہ اپنی مشہور تالیف تاریخ الہند میں لکھتا ہے کہ لاہور ایک شہر نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے جس کا دار الخلافہ مندھوکور ہے:

"ثم فیما بین المغرب والشمال الی آدت هورنسعة
والی جنبیرسنة والی مندهوکور نصبة لوهاور علی
شرق نهر ابراوه ثمنیة" (تاریخ الہند، ص ۱۰۱)۔

کنہیا لال کے بقول شیخ احمد زنجانی نے اپنی تصنیف تحفۃ الواصلین میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ رسالہ ۴۳۵ھ ہجری (۱۰۴۳ء عیسوی) میں لکھا گیا ہے۔ کنہیا لال اپنی تصنیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

"شیخ احمد زنجانی صاحب رسالۂ تحفۃ الواصلین جس نے وہ کتاب ۴۳۵ھ ہجری

عہد سلطان مسعود غزنوی بمقام لاہور اس کے علماء و فضلا کے حال میں لکھی ہے۔"

(تاریخ لاہور، ص ۹)۔

افسوس ہے یہ رسالہ کوشش کے باوجود مجھے کسی معروف کتاب خانے سے دستیاب نہیں ہو سکا۔

ابو سعید عبدالحی بن الضحاک بن محمود گردیزی نے اپنی تصنیف زین الاخبار (۴۴۲ھ / ۱۰۵۰ء) میں ترتیب ... کشمیر پر محمود غزنوی کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" و چون سنة اثنی عشر و اربعمائه اندر آمد قصد کشمیر کرد و حصار لوهرکوت را اندر پیچید و یک ماه آنجا قیام کرد۔ و از آنچه قلعه بغایت منیع و محکم بود نتوانست کشاد۔ و اندرین سال امیر نصر بن ناصرالدین رحمة الله فرمان یافته بود و امیر یوسف بن ناصرالدین رحمة الله با یمین الدوله رفته بود۔ و چون لوهرکوت گشادن ممکن نگشت از آن دره بیرون آمد به جانب لوهور تاکیشر برفت " (زین الاخبار، ص ۷۹)۔

جب سلطان مسعود اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا والی بنا کر بھیجتا ہے تو یہی مصنف صوبے کا نام لاہور بتاتا ہے :

" پس امیر مجدود بن مسعود را رحمهما الله ولایت لاهور داد و طبل و علم داد و او را با حشم و حاشیت سوی لاهور بفرستاد و خود سوی غزنین آمد" (زین الاخبار، ص ۱۰۴)۔

سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم اور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ ۴۶۵ھ (۱۰۷۲ء) اور ۴۶۹ھ (۱۰۷۶ء) کے درمیان فوت ہوئے۔ آپ اپنی گرانقدر تصنیف کشف المحجوب میں رقمطراز ہیں :

" من اندر دیار هند در بلده لهانور که از مضافات ملتان است در میان ناجنسان گرفتار شده بودم " (کشف المحجوب، برگ ۵۶ ب)۔

گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور ایرانی مورخ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی نے تین جلدوں میں غزنویوں کی تاریخ مرتب کی ہے۔ وہ اپنی اس تالیف تاریخ بیہقی میں ۴۲۵ھ (۱۰۳۳ء) کے واقعات کے ضمن میں مندکگور کے قلعے کے ساتھ لاہور کا ذکر کرتا ہے۔ مندکگور اسی لفظ کی دوسری شکل ہے جسے بیرونی نے مندھوکور لکھا ہے :

" و نیمهٔ این ماه رمضان سنه خمس و عشرین و اربعمائه نامهٔ رسید از لهور که احمد ینالتگین با بسیار مردم آنجا آمد و قاضی شیراز و جمله مسلمانان در قلعهٔ مندکگور رفتند " (تاریخ بیہقی، ص ۵۲۳)۔

ابوالفرج رونی غزنوی عہد کا مشہور شاعر ہے۔ وہ سلطان محمود کے پوتے سلطان ابراہیم کا قصیدہ مدحیہ لکھتے ہوئے لاہور کا نام لوہاور بتاتا ہے :

"کشید رایت منصور سوی لوہاور
بفال نیک تو زاکنسد بدو تقویم"

(دیوان رونی، ص ۹۶)

مشہور عرب جغرافیہ دان ابو عبداللہ محمد بن محمد بن عبداللہ الادریسی اپنی تصنیف **نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق** میں شہر کا نام **لہاور** لکھتا ہے۔

مشہور ایرانی عالم اور طبیب شرف الزمان طاہر مروزی نے اپنی تالیف **طبائع الحیوان** چھٹی صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں مرتب کی۔ وہ شہر کا نام **لوہور** لکھتا ہے:

"وفی اراضی لوھور مدینۃ یقال لھا رامیان فیھا
صنم مضطجع وحولہ اصنام قیام وفیھا صنم
حفر مموہ بالذھب وھو صنمھم ..." (طبائع الحیوان، ص ۳۹)

خالص ادبی کتابوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے سابقہ پنجاب کے مشہور فارسی گو شاعر مسعود سعد سلمان کے اشعار دستیاب ہوتے ہیں جو اس نے گیارھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھے ہیں۔ اور جن میں اس نے شہر کا نام لوھور، **لہاور**، لاوھور، **لوہاور**، اور لاہور نظم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

ور دلیش ونیستی ز لوہور برکندہ بحضرتم فرستاد

———

رسید عید و من از روی حور دلبر دور
چگونہ باشم بی روی آن بہشتی حور
مرا کہ گوید کای دوست عید فرخ باد
نگار من بہ **لہاور** و من بہ نیشابور

———

ای لاوھور ویک بی من چگونہ ای
بی آفتاب تابان روشن چگونہ ای

———

محملی باید از خداوندم کہ اندروی لوھور آید
کہ ہمی زآرزوی **لوہاور** جان و دل در تنم ہمی ناید

———

گرما بہ سہ داشتم **بلاہور** وین نزد ہمہ کسی عیان است

(دیوان مسعود سعد سلمان)

ابو الحسن علی بن زید بیہقی الملقب با بن فندق نے اپنے وطن بیہق کی ایک تاریخ ۵۶۳ھ (۱۱۶۸ء) میں لکھی۔ اس میں غزنویوں کی حدودِ سلطنت بیان کرتا ہوا وہ لکھتا ہے:

"ملک ایشان از دیار خراسان و عراق منقطع گشت و با غزنی افتاد فی شہر ثمان وعشرین واربعمائہ، و از غزنین منقطع شدہ است و باد یار لوہاور و برشاور و آن طرف افتادہ از سنہ خمس وخمسین وخمسمائۃ"

(تاریخ بیہقی، ص ۷)

یاقوت بن عبداللہ نے اپنی عظیم الشان تصنیف معجم البلدان ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں مکمل کی۔ وہ اسے لوہور، لہاور کے ناموں سے یاد کرتا ہے:

"لوھور بفتح اوله وسکون ثانيه والهاء واخره راء والمشهور من اسم هذا البلد لهاور وهي مدينة عظيمة مشهورة في بلاد الهند"

(معجم البلدان، جلد چہارم، ص ۳۷۱)۔

لاہور کی تاسیس کی روایتی تاریخ سنیے۔ تاریخی طور پر یہ پہلی دستاویز ہے جو لاہور کی تاریخ تاسیس کا ذکر کرتی ہے اور اسے شریف محمد بن منصور نے ضمنی طور پر اپنی مشہور تالیف آداب الحرب والشجاعہ میں درج کیا ہے۔ یہ کتاب سلطان التمش کے زمانے (۱۲۱۱ء سے ۱۲۳۶ء) میں فن حرب پر لکھی گئی تھی۔ شریف محمد بیان کرتا ہے:

"و در تاریخ چنین آمدہ است کہ رج بن کھند راکہ والی لوہور بود و بنای لوہور او نہادہ است او بگذشت۔ پسری بود او را بہرت نام مردی عادل۔ روزگاری آرمیدہ داشت و آنجا در لوہور مسجد خشتی است بتخانہ کرد۔ و صورتی از سنگ بفرمود تا بتراشیدند و آنرا آفتاب نام کردہ بود و مذہب او آفتاب پرستی بود و عمری دراز یافتہ بود، نود و سہ سال از آنجملہ ہفتاد و پنج سال امیر لوہور بود"

(آداب الحرب والشجاعہ، برٹش میوزیم کا خطی نسخہ، برگ ۱۲۲)

مشہور ہندی شاعر امیر خسرو نے اپنی مثنوی قران السعدین میں ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں مغل کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے شہر کا نام لاوہور درج کیا ہے:

از قدم شوم مغل آن بلاد — نام و نشان ز عمارت نداد

از حد سامانہ و تا لاوہور — ہیچ عمارت نہ مگر در قصور

مشہور مورخ رشید الدین نے اپنی تصنیف جامع التواریخ میں شہر کا نام لوہاور بتایا ہے:

"پس آنچہ میان شمال و مغرب است تا اوت صور نہ و تا بجنیر ششش، و تا مندھو کو رقصبۂ لوھاور بر شرق نہر ابرادہ ہشت فرسنگ ....."

(جامع التواریخ، برگ ۶۶۱ ب)

ہمایوں کے عہد میں حیدر میرزا دوغلت نے کشمیر فتح کیا۔ وہ بعد میں اس ملک کا خود مختار حاکم بن گیا۔ اُس نے ۹۴۸ھ ۔ ۹۵۳ھ کے درمیان اپنی تصنیف **تاریخ رشیدی** مرتب کی۔ تبت کے مختلف علاقوں کا ذکر کرتا ہوا وہ لاہور کے محل وقوع کو بھی یوں زیر بحث لاتا ہے:

"چنانچہ عقبہ بالا شدن از جانب بارکند سانجو است و عقبہ فرود آمدن بر جانب کشمیر عقبہ اشکار دو است۔ ازان تا این عقبہ بیست روزہ راہ باشد و ہم چنین بر مغرب زمستان ختن بعضی از بلاد ہند واقع است، چوں لاہور و سلطانپور و باجوارہ" (تاریخ رشیدی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا خطی نسخہ، برگ ۶۰۴)۔

جمال الدین حسین انجو جہانگیر کا درباری تھا۔ اُس نے فارسی کا ایک ضخیم لغت ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں ترتیب دیا اور اپنے محسن جہانگیر کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام **فرہنگ جہانگیری** قرار دیا۔ اس فرہنگ میں اُس نے شہر لاہور کی جو مختلف شکلیں گنائی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ ان شکلوں کے استناد کے لیے اُس نے ایرانی اور ہندی فارسی گو شعرا کے شعر بھی شہادت کے لیے پیش کیے ہیں:

لاوھور و لانہور و لوھاور و لوھور و لھاور و لھاوار و لھانور نام شہر یست از ملک ہندوستان کہ بلاہور اشتہار دارد:

ابوالفرج رونی:

بلاوھور در آمد میان موکب خویش
بنزہتی کہ بر آید شب چہاردہ ماہ

امیر خسرو فرماید:

از حد سامانہ تا لانہور ۔۔۔ ہیچ عمارت نیست مگر در قصور

از ابوالفرج رونی است:

کشید رایت منصور سوی لوھاور ۔۔۔ لطالعی کہ تو لاکند بدو تقویم

حکیم سنائی منظوم ساختہ:

ای بزرگان غزنہ و لوھور ۔۔۔ چشم بد زین زمانہ باد ادور

شیخ نظامی راست:

ندیم خاص بودش نام شاپور ۔۔۔ جہان گشتہ ز مشرق تا لہانور

یہ سادہ اور مستند تاریخ ہے جو شہر لاہور، اس کے نام اور اس کی تاریخ کے متعلق مجھے دستیاب ہوئی ہے اور میں نے اسے من وعن درج کر دیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

(۱) لاہور کا اولین ذکر ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں کتاب حدود العالم میں ملتا ہے۔ اس سے پہلے کسی مورخ، جغرافیہ دان نے لاہور کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) لاہور کے نام کی مختلف شکلیں مختلف مصنفوں کے ہاں ملتی ہیں اور ان کی فہرست یہ بنتی ہے:

لھوّر

لوہاور

لوھور

لہانور

لوھاوور

لھاوور

لاوھور

لھاور

لاہنور

لھاوار

لاہور

(۳) منڈھکور، منڈکور یا منڈگکر کا شہر صوبۂ لاہور کا دارالخلافہ تھا۔ لیکن یہ شہر لاہور سے الگ شہر تھا۔

(۴) ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں لاہور پر حاکم ملتان کا نمائندہ حکومت کرتا تھا اور ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء میں لاہور ملتان کے توابع میں سے تھا۔ یعنی اس وقت تک لاہور کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی۔

(۵) کم از کم ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء تک اس شہر میں کوئی مسلمان موجود نہ تھا اور یہاں صرف ہندو آباد تھے۔

(۶) کوئی ایسی معاصر شہادت موجود نہیں جس سے حتمی طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں آدمی نے اسے فلاں موقع پر فلاں تاریخ کو آباد کیا تھا۔ روایت اس کی تاسیس کو مختلف ناموں سے منسوب کرتی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(الف) راجہ پریکھت جو پانڈووں کی اولاد میں سے تھا۔

(ب) لوہار چند جو راجہ دیپ چند کا بھتیجا تھا۔

جیسے کہ ابھی بیان کیا گیا ہے یہ لاہور کے عہدِ اسلامی کی وہ تاریخ ہے جس کا سراغ کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ تاریخ نہ تو شہر کی معین تاریخ تاسیس تک راہنمائی کرتی ہے نہ اس کے موسس تک۔ لاہور دفعتہً دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں تاریخی کتابوں میں نمودار ہوتا ہے۔ اور یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس سے پیشتر کے تاریخی شواہد ہمیں نہیں ملتے اس لیے ہمیں ان قیاسات کو بھی

زیر بحث لانا پڑا ہے جو شہر کے نام اور تاریخ تاسیس کے متعلق کیے گئے ہیں۔ میں ان پر تاریخی تقدم و تاخر سے بحث کروں گا۔

سنہ ۱۹۵۳ء میں میں کتاب خانہ ملی تہران میں چند علماء کی صحبت میں موجود تھا۔ لاہور کے نام کی وجہ تسمیہ کی بحث چل نکلی تو تہران ریڈیو کے مشہور افسانہ خواں آقای صبحی نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ "لاہور" ایک مرکب لفظ ہے اور دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دو لفظ "لاو" اور "ہور" ہیں۔ لغت ہای محلی میں ایران میں "لاو" کے معنی شہر کے ہیں۔ اور "ہور" سورج کے معنوں میں عام استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سعدی کے اس شعر میں:

نور گیتی فروز چشمۂ ہور
سخت آید بچشم موشک کور

اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "لاہور" کے معنی "سورج کا شہر" ہے۔

یہ توجیہہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن میں نے صبحی جیسے عالم کی قیاس آرائی کی داد دی۔

برنیر (BERNIER) فروری سنہ ۱۶۶۵ء میں موسیو دی مرویلیز (MONSIEUR DE MERVEILLES) کو ایک خط میں لکھتا ہے: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لاہور قدیم بوسیفیلوس (BUCEFALOS) ہے یا نہیں۔ سکندر یہاں کا کافی معروف ہے اور اُسے یہ سکندر فیلقوس یعنی سکندر ابن فلپ پکارتے ہیں۔

خلاصۃ التواریخ کا مصنف سجان سنگھ وحید سنہ ۱۱۰۷ھ/ سنہ ۱۶۹۵ء میں عام طور پر مشہور روایت کا ذکر کرتا ہے۔ کہ لاہور کو رام چندر کے بیٹے "لو" نے بسایا تھا۔ اور یہ کہ جب لاہور برباد ہوا تو سیالکوٹ پنجاب کا دار الخلافہ بنا دیا گیا تھا:

"لاہور مصر یست منعقد بین بر کنارہ دریای راوی۔ آبادی آنرا بہ لو خلف
راجہ رام چند نسبت میدہند۔ در بعضی تواریخ لہور و لہاور نیز مینویسند چون
از گردش دوار بعہد امتداد ادوار در ارکان آبادی آن انہدام رہ داد قلیل نشان
معموری ماند دار الحکومت این ولایت شہر سیالکوٹ گردید"

(خلاصۃ التواریخ، ص ۶۴)

ایک پنجابی شاعر خیر اللہ فدا کا خیال ہے کہ ایاز لاہور کا بانی تھا۔ وہ اپنی مثنوی مرزا صاحباں میں سنہ ۱۱۵۵ھ/ سنہ ۱۷۴۲ء میں لکھتا ہے:

نیست در ہیچ کشوری شہرے — شہر دیگر بخوبی لاہور
زین بنا حسن و عشق مقصود است — بانی او ایاز محمود است

(مثنوی مرزا صاحباں، میرے کتاب خانے کا خطی نسخہ، برگ ۶۲)

حدیقۃ الاقالیم کے مصنف مرتضٰی حسین نے اپنی تصنیف میں سنہ ۱۲۰۲ھ/ سنہ ۱۷۸۷ء میں تقریباً سجان سنگھ وحید کے بیان کو دہرا دیا ہے:

"لاہور شہر یست در ہندوستان بر ساحل دریای راوی۔ مؤلف خلاصۃ التواریخ

بہ نویسند کہ ہندوان آنرا بخلف رام چندر کہ لھور نام داشت نسبت میدہند۔"
(حدیقۃ الاقالیم، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا خطی نسخہ، برگ ۸)۔

مندرجہ ذیل مصنفین نے رام چندر کے لڑکے لو کو لاہور کا بانی قرار دیا ہے :

ٹاڈ (۱۸۳۹ء) :

" رام کے دو لڑکے تھے : لو اور کش - رانا کا خاندان آل الذکر کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتا ہے - بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے لاہور تعمیر کیا تھا "
(ٹاڈ راجستھان، جلد اوّل، ص ۲۵۲)۔

بوٹے شاہ (۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۷ء) :

" شہر لیست باستانی کہ بنای آنرا بہ لو پسر راجہ رام چندر پسر جسرت نسبت میکنند " (تاریخ پنجاب، کتب خانہ دانشگاہ پنجاب کا خطی نسخہ، برگ ۱۶)

چشتی (۱۸۶۷ء) :

" راجہ رام چندر کے دو بیٹے ایک کشو اور دوسرا لوہو تھے - لوہو نے شہر لاہور آباد کیا " (تحقیقات چشتی، ص ۷۹۳)۔

کنہیا لال (۱۸۸۲ء) :

" عموماً مشہور ہے کہ مہاراجہ رام چندر اوتار کے فرزند مسمی لو نے یہ شہر آباد کیا اور لو پور نام رکھا تھا - صدہا بلکہ ہزارہا سال کی مدت گذرنے کے سبب لو پور کا لفظ بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا "

(تاریخ لاہور، ص ۷)۔

سر رچرڈ ٹمپل (۱۸۸۴ء) :

" لاہور کا نام لاہا وار (یا لاہ کا قلعہ) سے بنایا گیا ہے جو عموماً لو سے منسوب کیا جاتا ہے جو رام چندر کا بیٹا تھا "
(پنجاب نوٹس اینڈ کوئیریز، مارچ ۱۸۸۴ء، ص ۶۸)۔

گلاب سنگھ (۱۸۸۴ء) :

" لاہور کو مختلف ناموں لہار، لاہار، لُہار، لوہاور، اور لاہاور سے پکارا گیا ہے - ہندو روایت کے مطابق اس کا نام رام چندر کے لڑکے لو سے منسوب ہے - جب بعد میں اس شہزادے کی حکومت کو زوال ہوا، تو دارالخلافہ سیالکوٹ منتقل کر دیا گیا - سلطان محمود غزنوی کے عہدِ حکومت میں اُس کے

محمود ملک ایاز نے شہر کو دوبارہ آباد کیا اور یہاں ایک محکم قلعہ تعمیر کیا۔"

(پنجاب نوٹس اینڈ کوئیریز، فروری ۱۸۸۳ء، ص ۵۷)۔

یونانی کلاسیکی ادب میں بھی سکندر کے ساتھ لاہور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ گو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکندر ضرور راوی سے گزرا ہے۔ اور اس نے راوی کو موجودہ شہر کی زمین کے قریب سے ہی عبور کیا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ اگر سکندر کے زمانے میں اس شہر کی کوئی اہمیت یا عظمت ہوتی تو تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام ضرور محفوظ ہوتا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ پہلی صدی عیسوی تک یہ شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح ہمیں مشہور جغرافیہ دان سٹرابو کے ہاں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ گو سٹرابو نے اپنی تصنیفات ۲۰ قبل مسیح اور ۱۹ بعد مسیح کے درمیان مرتب کی ہیں۔ پلینی نے اٹک سے الہ آباد تک جانے والی شاہراہ کی تفصیل ۲۳ اور ۷۹، عیسوی صدی کے درمیان قلمبند کی ہے۔ اس میں بھی لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔

لیکن دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس نے جو جغرافیہ مرتب کیا ہے۔ اس میں ایک مقام لبوکلا کا ذکر موجود ہے جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے قدیم جغرافیہ دانوں میں بیانات کی صحت کے اعتبار سے بطلیموس کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے، یہ مشہور جغرافیہ دان ۱۵۰ عیسوی میں سکندریہ میں زندہ تھا۔ اور اس نے اپنے جغرافیہ میں ایک علاقے کسپیرا (کشمیر؟) کا ذکر کیا ہے جس کی حدود دریائے بداسپاس (جہلم)، سنداپل (چندربھاگا یا چناب) اور ایدرس (راوی) تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس علاقے میں اٹک اور پاٹلی پتر کے درمیانی راستے پر لبوکلا کا شہر موجود ہے۔ مشہور مستشرق ولفرڈ (WILFORD) اس شہر کے محل وقوع اور نام کی لفظی مشابہت سے اسی لبوکلا کو لاہور کا شہر قرار دیتا ہے۔ مشہور جغرافیہ دان اور ماہر آثار کننگھم بھی ولفرڈ سے اتفاق کرتا ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کی آراء سے اتفاق کریں تو لاہور کی تاریخ تاسیس دوسری صدی عیسوی کا آغاز قرار پاتا ہے۔

واکر (WALKER)، ہنٹر (HUNTER) اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لاہور کے مقالہ کا مصنف بیان کرتا ہے کہ مشہور چینی بدھ زائر ہیوانگ چوانگ (جسے عام طور پر غلطی سے ہیون سانگ لکھا جاتا ہے) ۶۳۰ عیسوی میں پنجاب آیا تھا اُس نے اپنے سفرنامہ میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کننگھم نے چینی سیاح کے سفرنامہ کی جو تفاصیل شائع کی ہیں، ان میں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہیوانگ چوانگ نے جس شہر کو "برہمنوں کا عظیم شہر" کے نام سے یاد کیا ہے ممکن ہے وہ لاہور ہی ہو۔ ہیوانگ چوانگ کہتا ہے کہ میں اس شہر سے جالندھر گیا اور راستے میں پٹی کے شہر سے گزرا۔ چنانچہ پٹی اب بھی اس راستے پر موجود ہے۔ لیکن یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ہیوانگ چوانگ کا گذر لاہور کی بجائے قصور بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر بھی اس کی بتائی ہوئی تفاصیل مکمل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بوثوق نہیں کہا جا سکتا کہ ہیوانگ چوانگ لاہور سے گذرا ہوگا۔ اس لیے ہم یقینی طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیوانگ چوانگ کے زمانے یعنی ساتویں صدی عیسوی تک کا یقینی ذکر کہیں نہیں ملتا۔

۱؎ ملاحظہ ہو کننگھم کا جغرافیہ، ص ۲۲۵ — ۲۲۰، ولفرڈ کا ہندوستان کا تقابلی جغرافیہ، ص ۲۰ —

ایک انگریز مصنّف کے بقول لاہور کی تاریخ تاسیس اور وجہ تسمیہ کے متعلق یہ ایک منفی سی تخمین ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر سکا ہوں۔ لیکن اس تحقیق سے مندرجہ ذیل نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں :

۱۔ لاہور مختلف شکلوں کے ناموں سے پکارا جاتا رہا۔

۲۔ بطلیموس کا لبوکلا (شاید لاہور) دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں موجود تھا۔

۳۔ لاہور کا ذکر معین طور پر نویں صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ ملتا ہے۔

۴۔ گیارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے اس شہر کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ گویا اس کی مشہوری کا زمانہ نو سو سال سے زیادہ نہیں۔

سیاسی اور ثقافتی تاریخ

پروفیسر محمد شجاع الدین

غزنوی دور میں ایک مسلمان محقق علامہ ابوریحان البیرونی وارد ہند ہوئے۔ انھوں نے بہت سی عالمانہ کتابیں لکھیں جن میں قانون مسعودی اور کتاب الہند بہت مشہور ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب بے حد مقبول ہے۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں علامہ مذکور نے ہند و علوم و فنون کا ذکر کیا ہے۔ اور ہندوستان کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں۔

علامہ ابوریحان البیرونی المتوفی ۴۴۰ھ مدتوں ہندوستان میں مقیم رہے۔ انھوں نے بھیس بدل کر سنسکرت زبان اور ہندو علوم سیکھے۔ کیونکہ برہمن اپنے علوم اور زبان کسی غیر برہمن کو پڑھانے کے روادار نہ تھے۔ مسلمان تو پلید اور ناپاک تھا ہی۔ خود ہندو قوم کی اکثریت کے لیے لکھنا پڑھنا ایک مہا پاپ تھا۔ کسی اچھوت اور شودر کے کان میں سنسکرت کے کسی لفظ کے پڑ جانے کا کفارہ یہ تھا کہ پگھلا ہوا سیسہ اس کے کان میں ڈالا جائے۔ بہرحال ایک مسلمان محقق کا علمی ذوق ملاحظہ ہو کہ بھیس بدل کر اور ہفت خوان رستم طے کر کے ہندو علوم سے واقفیت حاصل کی اور ایک ایسی کتاب تالیف کی جسے آج بھی محققانہ کتب میں خاص رفعت حاصل ہے۔ مشہور جرمن مستشرق زاخو مترجم کتاب ہذا کے قول کے مطابق یہ کتاب غیر جانبدارانہ تحقیق کا شاہکار ہے۔ (دیکھو "الہند" کے انگریزی ترجمہ کا دیباچہ اور OXFORD HISTORY OF INDIA صفحہ ۱۹۴ جلد اول)

علامہ موصوف کا بیان ہے کہ ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ ان میں جذبۂ ملی مفقود تھا اور مشترک خطرے کے وقت بھی متحد نہ ہوتی تھیں۔ رعایا شکایات تحریری صورت میں پیش کرتی تھی۔ اور مقدموں کا فیصلہ نہایت دقیانوسی اور بھدے طریقوں سے کیا جاتا تھا۔ خواہ جرم کی نوعیت کچھ ہی ہو۔ قانون برہمن کو کسی قسم کی سزا کا مورد ٹھہرانے کا روادار نہ تھا۔ برہمن ہر طرح کے ٹیکسوں کی ادائیگی سے مستثنٰی تھے۔ جرائم کی سزا کے طور پر اعضا کی قطع و برید رائج تھی۔ لوگ بت پرست اور توہم پسند تھے۔ ستی کی وحشیانہ رسم کا عام رواج تھا۔ اور ذات پات کی غیر فطری تقسیم کے سبب لوگ مختلف جماعتوں میں بٹے ہوتے تھے۔ معمولی ضروریات زندگی سے بھی انھیں محروم رکھا جاتا تھا۔ اور ان کی حالت بہائم سے بھی بدتر تھی۔ لوگوں میں کیمیا گری اور ا کو جوان بنانے والی دوائیوں کی تلاش کا شوق پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں نے سرزمین پنجاب پر قدم رکھا تو اس خطہ کی حالت یہی تھی۔ کسی فرد یا کسی قوم کا دوسرے ملک کو فتح کرنا

نقل مکانی کے بعد اس میں جا آباد ہونا جرم نہیں۔ اگر ہم اس امر کو جرم قرار دیں تو دنیا کے تمام بڑے بڑے فاتح اور جرنیل مجرم ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ فاتح قوم نے مفتوحہ قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور مفتوحہ ممالک کی حالت سدھارنے اور اس کے تہذیب و تمدن و ترقی کے سلسلے میں کیا قدم اٹھایا۔

اس میں شک نہیں کہ لاہور ایک قدیم بستی ہے۔ لیکن ہم بوثوق یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب اور کس کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ سرزمین پنجاب مدتوں دوسرے ممالک سے نقل مکانی کرکے آنے والے قبیلوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کی تاخت کا ہدف بنی رہی ہے۔ اس لیے اس کے شہر اور قصبے ہمیشہ آباد اور برباد ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح لاہور بھی مسلمانوں کے دور سے قبل کئی بار آباد اور برباد ہوا۔ لیکن جہاں تک اس شہر کی آبادی اور شہرت کا تعلق ہے مسلمانوں کی آمد سے قبل اس کی وہ اہمیت نہ تھی۔ جو سلاطین اسلامیہ کے زیر اقتدار اسے حاصل ہوئی۔ اسلامی دور سے قبل جو سیاح بھی واردِ پنجاب ہوئے وہ اس کا ذکر نہیں کرتے۔

لاہور غزنوی دور میں

اسلامی دور سے قبل پنجاب پر راجہ جے پال برسر اقتدار تھا۔ اس کی حکومت پشاور سے پرے لمغان تک تھی۔ الپتگین نے اپنے آقا منصور سامانی سے علیحدہ ہو کر غزنی میں ایک الگ سلطنت کی بنیاد ڈالی تو راجہ جے پال نے اپنی سرحد کے پاس ہی ایک نئی سلطنت کے قیام کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تباہی کے درپے ہوا۔ جلد ہی الپتگین کا انتقال ہو گیا اور امرائے دولت نے اس کے غلام سبکتگین کو امیر منتخب کیا۔

اسی اثنا میں راجہ جے پال نے غزنوی سلطنت پر حملہ کیا۔ لمغان کے قریب راجہ اور سبکتگین کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ شدتِ سرما راجہ کی فوج کی ہزیمت کا باعث بنی۔ راجہ نے ادائیگی خراج کا وعدہ کر کے جان بچائی اور غزنوی کے چند امرا کو اس لیے ہمراہ لے کر واپس ہوا۔ کہ خراج کی رقم لے آئیں۔ مگر اپنے دارالسلطنت میں پہنچ کر اس نے عہد شکنی کی اور امرائے غزنی کو نظر بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ ایک اور جنگ کی صورت میں رونما ہوا جس میں پھر راجہ کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ مگر مسلمان حکمران کی دریا دلی، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی دیکھیے کہ باج گذاری اور اطاعت شعاری کا وعدہ لے کر راجہ کو پھر چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں امیر مذکور راہی ملکِ عدم ہوا اور زمامِ اقتدار اس کے فرزند محمود کے ہاتھ آئی۔

محمود کو نوجوان اور ناتجربہ کار خیال کر کے راجہ جے پال نے ایک بار پھر بخت آزمائی کا فیصلہ کیا اور فوج لے کر اس کی مملکت پر حملہ کیا مگر جواں سال اور جواں ہمت محمود سے منہ کی کھائی۔ راجہ جے پال تین بار پے در پے ایک ہی غنیم سے شکست کھا چکا تھا اس لیے ملک کے رواج کے مطابق بطورِ کفارہ زندہ چتا میں جل گیا۔

جے پال کے مرنے کے بعد اس کا فرزند انند پال تخت نشین ہوا۔ اس نے باپ کی شکستوں کا داغ مٹانے کے لیے ایک تجویز سوچی اور تمام ہندوستان کے راجاؤں سے گٹھ جوڑ کر کے ایک لشکرِ عظیم جمع کیا اور پشاور کی راہ لی۔ درہ خیبر کے متصل دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ باوجودیکہ تعدادِ سپاہ سامانِ جنگ اور زر و مال کے حساب سے راجہ انند پال محمود سے بڑھا ہوا تھا مگر اللہ کے فضل سے قدرت نے محمود کو فتح دی۔ شکست کے بعد انند پال نے پھر باجگذاری کا عہد کیا اور واپس چلا آیا۔

ابوالفتح حاکم ملتان باطنی مذہب کا پیرو تھا اور اسلام کے سوادِ اعظم کا باغی تھا۔ محمود اسے سزا دینے کے لیے نکلا تو اس نے راجہ انند پال کو کہلا بھیجا کہ چونکہ تم ہمارے باجگذار ہو اس لیے ہمارے لشکر کی امداد کرو۔ مگر راجہ نے محمود کے حکم

کو ماننے کی بجائے ابوالفتح کی حمایت شروع کر دی۔ محمود نے ملتان کی مہم سے فارغ ہو کر اُس کی طرف رُخ کیا۔ راجہ شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ اب محمود کے لیے موقع تھا کہ وہ پنجاب پر قبضہ کر لیتا۔ مگر اُس نے پھر قدیم ہندو خاندان کی حکومت کو بحال کر دیا اور انند پال کے لڑکے ترلوچن پال ثانی کو حاکم لاہور بنا دیا۔

مگر یہ بھی اپنے باپ دادا سے کم نہ نکلا۔ جب محمود کانگڑہ کے پہاڑی راجاؤں کی گوشمالی کر رہا تھا یہ فتنہ و فساد پر اُتر آیا۔ محمود نے یہ خبر سُنی تو فی الفور لاہور کی سمت آیا۔ نواحِ شہر میں ایک جنگ ہوئی جس میں راجہ کو شکست ہوئی اور وہ شہر میں محصور ہو گیا۔ محمود نے شہر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ چند ماہ بعد مقابلہ کی تاب نہ لا کر راجہ بھاگ نکلا اور لاہور پر محمود کا قبضہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۰۲۲ء کا ہے۔ (تاریخ فرشتہ ص ۲۴۔ زین الاخبار ص ۷۹)

کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ فتح لاہور کے بعد محمود غزنوی نے اپنے چہیتے غلام ایاز کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔ اُس نے لاہور کو از سرِ نو آباد کیا۔ مرتضےٰ حسن کی کتاب "حدیقۃ الاقالیم" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسی طرح اورنگ زیب کے عہد کا مؤرخ سجان رائے بٹالوی بیان کرتا ہے کہ ایاز نے لاہور میں قلعہ پختہ تعمیر کرایا اور اسے از سرِ نو آباد کیا۔ (خلاصۃ التواریخ ص ۶۲) عام ادبی روایات بھی ایاز ہی کو لاہور کا بانی قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ خیراللہ فدا لاہوری اپنی مثنوی "سسی پنوں" میں لکھتا ہے:۔

بانیِ او ایاز و محمود است

زیں بنا حسن و عشق مقصود است

مگر ہم عصر فارسی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح لاہور کے بعد محمود نے ایاز کو لاہور کا حاکم مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عہدے پر ۱۰۳۷ء میں فائز ہوا۔

۱۰۲۱ء تک غزنوی سلاطین کی یہی خواہش رہی کہ پنجاب میں مقامی ہندو راجپوت راجہ برسرِ اقتدار رہے لیکن جب الحاقِ پنجاب ناگزیر ہو گیا تو محمود نے پنجاب کو اپنی مملکت کا باقاعدہ جزو قرار دے دیا۔ اور یہاں اپنے حاکم مقرر کیے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمود نے لاہور کے متصل محمود پور نام ایک قلعہ بنوایا جو کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس میں امراء حکام رہتے تھے۔ اس قلعہ میں ٹکسال بھی تھی۔ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور (بزبان انگریزی) میں مسلمان بادشاہوں کے سکوں کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ وہ سلطان محمود کے ایک سکے کی عبارت بھی درج کتاب کرتے ہیں۔ جو ۴۱۹ھ میں بمقام محمود مضروب ہوا۔ (کتاب ہذا ص ۲۹۷)۔

غزنوی دور کے مشہور محقق علامہ ابو ریحان البیرونی کتاب الہند میں (لوآرو) لاہور کا ذکر بطور ایک صوبہ کے کرتے ہیں جس کا تخت قلعۂ مندھوکور تھا۔ (دیکھئے کتاب الہند عربی متن مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء ص ۱۰۱۔ کتاب مذکور انگریزی ترجمہ مرتبہ: جلد اول ص ۲۰۶)

"قلعہ مندھوکور دریائے ایراوا (راوی) کے کنارے جانب شرق واقع تھا۔ کننگھم صاحب اپنی کتاب "جغرافیہ ہند قدیم" (انگریزی) میں رقمطراز ہیں کہ مندھوکور محمود پور کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لیکن یہ امر درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ البیرونی جو محمود

…ہی کتاب میں محمود پور کی بجائے مندھوکور کیوں نہ لکھتا۔ اوّل تو خود محمود کے زمانے میں نام کا بگڑنا قرین قیاس نہیں۔ دوسرے البیرونی جو فارسی عربی زبانوں کا فاضلِ اجل اور زکی الاصل تھا اصل نام کی بجائے بگڑا ہوا نام نہ لکھتا۔ اور اگر لکھتا تو اس امر کی وضاحت کے اصل نام بھی لکھتا۔

تھارنٹن صاحب کا خیال ہے کہ مندھوکور سے مراد مان کوٹ ہے جو سیالکوٹ کے متصل ایک قلعہ ہے۔ (لاہور بزبانِ انگریزی صفحہ ۱۱۳) مگر یہ امر بھی درست نہیں۔ کیونکہ البیرونی نے اس قلعہ کا طول بلد اور عرض بلد دیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ موجودہ لاہور کے قریب جانب شمال واقع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بستی لاہور کے متصل واقع ہوگی جو فوج کی چھاؤنی اور قیام کے سبب سے مشہور ہو گئی۔

ایاز کے زمانے میں قلعہ لاہور تعمیر ہوا تو غالباً اس جگہ چھاؤنی نہ رہی اس لیے ایاز کے عہد اور اس کے بعد کے زمانے کی تاریخ میں مندھوکور کا نام نہیں ملتا۔

سنہ ۱۰۴۰ء مطابق سنہ ۴۳۲ھ میں شہزادہ مودود نے لاہور پر چڑھائی کی تو شہزادہ مجدود لاہور کے قلعہ میں محصور ہو گیا (تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۴) ایاز نے ۱۰۳۷ء میں لاہور کے امور کی زمام تھامی۔ اور قلعہ شہر پناہ اور شہر لاہور کی تعمیر شروع کرائی معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۴۰ء میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

غزنوی دور میں پنجاب کی سرحد سرہند اور ہانسی تک تھی ابو الفضل بیہقی کی کتاب تاریخ مسعودی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پنجاب کو مختلف اقطاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ہر قطع کا حاکم مقطع کہلاتا تھا۔ جالندھر دوآب، جہلم، ملتان وغیرہ مختلف اقطاع پنجاب میں شامل تھے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ مسعودی صفحہ ۲۹۶۔ صفحہ ۳۲۷)

دار السلطنت میں دو حاکم تھے ایک سپہ سالار اور دوسرا قاضی کہلاتا تھا۔ سپہ سالار کے فرائض میں غیر ممالک کا دفع کرنا، ملک کو حملہ آوروں سے بچانا اور ماتحت راجاؤں اور رئیسوں سے خراج وصول کرنا شامل تھا۔ قاضی تمام مالی امور اور اندرونی معاملات کا جن میں محکمہ عدالت بھی شامل تھا ذمہ دار تھا۔ دونوں کی حیثیت مستقل تھی۔ وہ ایک دوسرے کے اثر سے آزاد اور صرف سلطان کے سامنے جواب دہ تھے۔

سب سے پہلے قاضی کے عہدے پر ابو الحسن علی شیرازی اور سپہ سالار کے عہدے پر عبداللہ قراتگین کا تقرر ہوا۔ اس دو عملی کا مقصد یہ تھا کہ کوئی حاکم آمر مطلق بن کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔ لیکن عملی طور پر یہ نظام ناکارہ ثابت ہوا۔ اور مختلف معاملات میں یہ دونوں حاکم ایک دوسرے سے دست و گریبان رہنے لگے اور ملک میں گڑبڑ مچی رہی۔

تاریخ مسعودی (صفحہ ۶۳۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی نے ۱۰۳۷ء میں اپنے فرزند امیر مجدود کو حاکم لاہور مقرر کیا۔ بقول فرشتہ (صفحہ ۴۴) اپنے باپ کے مشہور آقا غلام ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ امیر مجدود ابھی بچہ تھا اس لیے عملی طور پر ایاز ہی حاکم لاہور تھا۔ جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہو چکا ہے ایاز نے شہر لاہور کو از سر نو آباد کیا۔ قلعہ اور فصیل بھی بنوائے۔ ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ (ایاز کے مکمل حالات کے لیے ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت اگست و نومبر ۱۹۴۳ء میں مشتاق احمد بھٹی کا تحقیقی مقالہ دیکھیے)۔

پنجاب سنہ ۱۱۸۶ء تک غزنوی سلاطین کے زیر سایہ رہا۔ اس دور میں ہمیشہ بہت مقتدر لوگ یا شاہی خاندان کے افراد حکومت لاہور پر متعین کئے جاتے تھے۔ پنجاب پر غزنوی قبضہ اس قدر مستحکم ہوا کہ غزنی اس خاندان کے احاطۂ اقتدار سے پہلے نکلا اور لاہور بعد میں۔ اس خانوادہ کے آخری تین بادشاہوں نے لاہور کو صدر مقام قرار دے کر یہیں اقامت اختیار کی۔

غزنوی دور کی معارف پروری اور علم نوازی کی داستانیں زبان زد انام ہیں۔ اس عہد میں غزنی، علماء و فضلا کا مسکن و ماوی بن چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے حکام کے دربار میں علما کی تعداد کثیر نظر آنے لگی۔ اس زمانہ میں بے شمار مسلمان خاندان دوسرے ممالک سے تلاش معاش یا کاروبار تجارت یا تبلیغ وغیرہ مقاصد کے لئے لاہور میں آباد ہو گئے۔ مقامی باشندے بھی جوق در جوق مسلمان ہونے لگے اور یہاں ایک مسلم سوسائٹی عالم وجود میں آ گئی۔

غزنوی دور میں جو علما و فضلا لاہور میں مقیم تھے ان میں مخدوم علی ہجویری المتوفی ۴۶۵ھ، فخر الدین حسین زنجانی المتوفی ۴۳۱ھ، سید اسماعیل محدث و مفسر المتوفی ۴۴۸ھ، مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ اور ابو الفرج رونی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر تین بزرگوں کے مزارات اب تک لاہور میں زیارت گاہ انام ہیں۔ شیخ علی ہجویریؒ نے لاہور ہی میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" تالیف کی۔ یہ کتاب فارسی نثر میں علم تصوف پر غالباً سب سے پہلی تالیف ہے۔ اور اس میں تصوف اور درویشی کے رموز و اسرار نہایت عالمانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

مسلمان امرا نے ترویج علوم کے لئے بہت سی درسگاہیں لاہور میں قائم کیں۔ جن سے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس قسم کے مدارس میں خانقاہ بو نصر قابل ذکر ہے۔

غزنوی دور کا شہرۂ آفاق شاعر مسعود سعد سلمان لاہور میں پیدا ہوا۔ یہیں اس نے تعلیم حاصل کی اور اسی جگہ وہ پلا بڑھا۔ عنفوان شباب میں وہ حاکم پنجاب شہزادہ سیف الدولہ محمود کا ندیم بن گیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ سے اس کا باپ سلطان ابراہیم غزنوی ناراض ہو گیا تو اس نے محمود کے ساتھ مسعود کو بھی بغاوت کے شبہ میں دس سال تک نظر بند رکھا۔ وہ خود لکھتا ہے:

هفت سالم بکوفت سو و دهک
پس از آنم سه سال قلعهٔ نای

مسعود کی رہائی کے فوراً بعد سلطان ابراہیم فوت ہو گیا۔ اور اس کا فرزند علاء الدولہ مسعود تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اس نے اپنے فرزند شیر زاد کو حاکم پنجاب اور ابو نصر فارسی کو نائب حاکم اور سپہ سالار مقرر کیا۔ ابو نصر نے جو کہ جوہر شناس تھا، مسعود کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے جالندھر دوآب کا حاکم مقرر کیا۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے اور ہمیشہ صوبہ لاہور کا حصہ رہا۔ اس تعین پر مسعود نے ایک قصیدہ بو نصر کی مدح میں لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

ملکا حال خویش خواہم گفت
نیک دانم کہ آید ت باور

کچھ عرصہ بعد ابو نصر فارسی معتوب بارگاہِ سلطانی ہوگیا اور اس کے تمام متعلقین مسعود سعد سلمان سمیت نظر بند کر دیئے گئے۔ مسعود کو قلعہ مرنج میں بھیج دیا گیا۔ (واضح رہے کہ تمام قلعے جو بطور شاہی قید خانہ استعمال کیے جاتے تھے کوہ سلیمان کی پہاڑیوں میں واقع تھے) جو نظر بندی پر مسعود لکھتا ہے ؎

آتشِ شعلِ من نجستہ ہنوز
دودِ عــــزلم برآمد از روزن

وداع کرد مرا دولت نکردہ سلام
فراق جست ز من پیش ازانکہ بُرد وصال

تین سال کے قریب وہ قلعہ مرنج میں قید رہا۔ آخر ثقۃ الملک طاہر بن علی کی سفارش سے اُسے رہائی ملی اور زندگی کے باقیہ ایام اس نے لاہور میں گزارے۔

شہر لاہور ہمیشہ مرکزِ اسلام رہا ہے اور مسلمانوں کو یہ شہر بہت ہی عزیز ہے۔ اور آج سے آٹھ سو سال پہلے مسعود سعد سلمان کو بھی رہے جو اُنس تھا وہ اُن اشعار سے ظاہر ہے جو اس نے ایام نظر بندی میں لاہور سے دور قلمبند کیے۔

غزنوی دور سے لے کر نواب معین الملک کے زمانے تک جو علاقے صوبہ لاہور کا جز رہے ہیں اُن سے آج بھی مسلمانوں کو اسی طرح محبت ہے جس طرح آج سے آٹھ سو سال قبل مسعود سعد سلمان کو لاہور سے تھی۔ خدا جانے سلطان محمود غزنوی نے کس مبارک وقت ملتان سے لے کر سرہند اور بھنڈ (اٹک) کا علاقہ اپنی سلطنت میں باقاعدہ طور پر شامل کیا کہ یہ علاقہ آج بھی اپنے دامن میں ہزاروں مسجدوں، قبروں اور اسلامی یادگاروں کو لیے ہوئے ہے اور اسی میں مملکتِ پاکستان قائم ہوئی ہے۔

لاہور غوریوں کے دور میں

۱۱۸۶ء میں سلطان معز الدین سام محمد غوری نے غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک سے لاہور لے لیا اور اس طرح پنجاب اُس کے مقبوضات میں شامل ہوگیا۔ ۱۱۹۲ء میں مقام تراوڑی راجہ پتھورا کو شکست دینے کے بعد اُس نے دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس سے ایک سال بعد جے چند کو شکست دے کر قنوج اور بنارس پر بھی تسلط جما لیا۔ سلطان نے اپنے وفاکیش غلام قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۲۰۶ء تک ایبک بطور نائب السلطنت ہند اس ملک پر حکمران رہا۔ اس دوران اس نے مشرق میں بنگال اور بہار تک اور جنوب میں کالنجر اور گوالیار تک تقریباً تمام شمالی ہندوستان پر تسلط جما لیا۔ اور نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

ملک معز الدین سام محمد غوری لاولد تھا اس نے ایبک کی وفاشعاری اور معاملہ فہمی کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ اس کی وسیع ہندوستانی سلطنت کو اس کی وفات کے بعد سنبھالنے کا ایبک سے زیادہ اور کوئی شخص اہل نہیں۔ ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں سلطان آخری بار وارد ہند ہوا تو اُس نے لاہور میں ایک عظیم الشان جشن کا اہتمام کیا جس میں تمام اعیانِ دولت اور ارکان سلطنت نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر سلطان معز الدین نے قطب الدین ایبک کو ملک کا خطاب دیا جو عموماً اُمرا اور شاہی خاندان کے افراد کو ملا کرتا تھا۔ اور اُسے ہندی مقبوضات میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ سلطان کا یہ فیصلہ ہر لحاظ سے مستحسن اور مناسب تھا۔ کیونکہ یہ تمام

علاقہ ایبک ہی کی سعی سے فتح ہوا تھا۔ اور علاوہ ازیں ایبک ایک بیدار مغز اور رعایا پرور حاکم تھا (دیکھئے تاریخ فخرالدین مبارک شاہ صـ۲۹-۲۸ تاریخ مبارک شاہی صـ۱۳)

محمد غوری کی شہادت

مذکورہ صدر جشن کے بعد سلطان معزالدین سام محمد غوری غزنی واپس جا رہا تھا کہ جہلم کے نواح میں دمیک کے مقام پر باغی کھوکھروں نے اُسے شہید کر دیا۔ جشنِ ولی عہدی کے بعد ملک قطب الدین ایبک دہلی چلا گیا تھا۔ اور یہ زہرہ پاش خبر اُس نے وہیں سُنی۔ لازمی طور پر اُسے اپنے محسن کی وفات پر بہت رنج ہوا۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اصلاح مملکت اور خیرِ خلق خدا کو اپنے ذاتی غم پر مقدم سمجھا اور فی الفور لاہور کا رُخ کیا۔ بروز منگل بتاریخ ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۹ جون ۱۲۰۶ء ایبک لاہور کے نواح میں پہنچا۔ اہالیان لاہور کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو شہر میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ اور لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت اُس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ ایبک ۲۵ جون بروز پیر بڑے تزک و احتشام سے لاہور میں داخل ہوا۔ اور قصرِ ہمایوں میں اقامت اختیار کی۔ دوسرے روز جشن تخت نشینی منعقد ہوا اور سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کا فرمانروا بن گیا۔ (تاریخ فخرالدین مبارک شاہ صـ۳۳-۳۱۔ تاج المآثر روٹوگراف یونیورسٹی لائبریری ورق ۸ ب)

ایبک کا دور

سطور بالا کے مطالعہ سے قارئین کرام پر یہ امر واضح ہو چکا ہو گا کہ ایبک کے زمانہ میں لاہور کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ تمام جشن یہیں منعقد ہوا کرتے تھے اور یہ شہر مسلمان علما و فضلا کا مرکز تھا۔

تاج الدین حسن بن نظامی صاحب تاج المآثر لکھتا ہے۔ (روٹوگراف ورق الف ۸۲) کہ اس زمانہ میں یہ شہر "مرکز اہل بِر و تقویٰ و منشاء اصحابِ فضل و فتویٰ و مامن زہاد و عباد اور مسکنِ اقطاب و اوتاد" بن چکا تھا۔ اور یہاں کی نوے فیصدی آبادی زیورِ علم سے مزین تھی۔ اس جگہ فخر مدبر مبارک شاہ اور تاج الدین حسن نظامی جیسے محققین اور مورخین۔ شیخ عبدالعزیز مکی المتوفی ۶۱۲ھ سید احمد توختہ ترمذی المتوفی ۶۰۲ھ۔ اور شیخ یعقوب زنجانی المتوفی ۶۰۴ھ جیسے علما اور اصفیا مقیم تھے۔ علاوہ ازیں مجد ادیب، شاعر اور فاضل یہاں موجود تھے جن میں سے چند ایک کے حالات لباب الالباب عوفی کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

فخر مدبر نے اپنی کتاب شجرۂ انساب یا بحر الانساب بارہ سال کی محنت اور ایک ہزار کتابوں کے مطالعہ کے بعد مقام لاہور تالیف کی۔ یہ کتاب اُس نے سلطان قطب الدین ایبک کی خدمت میں پیش کی۔ سلطان یہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس مؤلف کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اور حکم دیا کہ اس کا ایک نسخہ خاص اہتمام سے شاہی کتب خانے کے لیے تیار کیا جائے۔ (تاریخ فخرالدین مبارک شاہ صـ۱۱-۱۰)

یہ واقعہ جہاں سلطان قطب الدین ایبک کی معارف پروری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ وہاں اس امر کا بھی ایک بیّن ثبوت ہے۔ کہ اس زمانے میں لاہور میں اس قدر کتب خانے موجود تھے۔ کہ فخر مدبر کو اپنے مطلب کی ایک ہزار کتابوں سے متمتع ہونے کا موقع مل گیا۔

اس وقت تمام شمالی ہند مسلمانوں کے زیرِ نگین تھا۔ اور لاہور "مرکزِ اسلامِ ہند" شمار کیا جاتا تھا۔ (تاریخ مذکور صـ۳۵) جا بجا مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تھیں (تاریخ فخرالدین مبارک شاہ صـ۲۶) سلطان کی رعایا پروری اور معدلت گستری کا یہ عالم تھا کہ ملازمانِ شاہی میں سے کوئی شخص رعایا کو ستانے یا اُن سے زبردستی کچھ لینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ (تاریخ مذکور صـ۳۳)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قطب الدین ایبک کا جشنِ ولی عہدی لاہور میں منعقد ہوا۔ اسی شہر میں وہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء میں وہ چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر اسی شہر میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ (طبقاتِ ناصری ص ۱۳۰-۱۳۱) اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا۔ (تاج المآثر از حسن نظامی نیشاپوری۔ روٹوگراف پنجاب لائبریری فولیو نمبر ب ۸۶)

سلطان کی قبر پر ایک نہایت عالیشان مقبرہ سلطان شمس الدین التمش نے تعمیر کرایا (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۵) یہ عالیشان مقبرہ ہر زمانہ میں زیارت گاہِ انام رہا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانے میں بھی یہ مزار زیارت گاہِ مردم "بودہ" (منتخب التواریخ۔ نول کشور ایڈیشن ص ۱۶ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ایڈیشن ص ۵۶) دورِ مغلیہ میں شہر کی توسیع ہوئی تو اس مقبرہ کے متصل جو آباد ہوا وہ بقول مفتی تاج الدین محلہ قطب غوری کے نام سے موسوم ہوا۔ (میگزین اورینٹل کالج بابت نومبر ۱۹۴۳ء ص ۴۴) اس سے سلطان کے مقبرہ پر ہر سال ۱۴ رجب کو ایک عرس منعقد ہوا کرتا تھا (ضمیمہ میگزین ہذا بابت فروری ۱۹۴۷ء ص ۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقبرہ کو مسلمانوں کی نظروں میں ایک خاص تقدس حاصل ہے اس مقبرہ پر نہایت عمدہ سنگِ مرمر کا دومنزلہ گنبد تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں مع دیگر متعلقہ عمارات کے مسمار کرا دیا گیا (تحقیقاتِ چشتی ص ۲۳۹)۔

انگریزی دور میں اس نواح میں آبادی ہو گئی تو قبر ایک رہائشی مکان کی چھت کے نیچے آ گئی۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے یہ مکان منہدم کر دیا ہے اور اب سلطان کی قبر کھلی جگہ یعنی آسمان کی چھت کے نیچے ہے۔ جون ۱۹۶۱ء میں عمارتِ مقبرہ کی بنیادیں دیکھنے کے لیے اس محکمہ کے کارکنوں نے قبر کے اردگرد کھدائی کی مگر انھیں بنیادوں کے آثار نہیں ملے۔ اسی لیے بعض حلقوں میں قبر کے محلِ وقوع کے متعلق شک کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

لاہور سلاطینِ دہلی کے دور میں

سلطان قطب الدین ایبک کے جانشینوں کے عہد میں بھی لاہور کی علمی و تمدنی روایات قائم رہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۲۱۸ء سے پنجاب پر چنگیزی منگولوں کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ لوگ آئے دن پنجاب اور سندھ پر یلغار کرتے رہتے تھے۔ اور ان کے حملوں کا سلسلہ دو صدیوں تک جاری رہا۔ ان کے حملوں نے پنجاب کے مختلف شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دسمبر ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے ملک معز الدین بہرام شاہ کے عہد میں حملہ کیا۔ مقابلہ کی تاب نہ لا کر حاکم شہر ملک . . . . کرہ کش دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ منگولوں نے شہر کو خوب تاراج کیا۔ اس واقعہ کے بعد شہر لاہور کا دورِ زوال شروع ہو گیا۔ (طبقاتِ ناصری انگریزی ترجمہ از میجر راورٹی ص ۶۵۵ جلد اوّل)

منگولوں کے استیصال کے لیے شاہانِ دہلی میں سے سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق نے جو مساعی کیں وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ پاکستان کو کافر منگولوں کی تاخت سے بچانے کے لیے جا بجا چھاؤنیاں مقرر کی گئیں۔ اور وقت کے بہترین جرنیلوں کو پنجاب میں سرحدوں کا محافظ متعین کیا جاتا تھا۔

عام طور پر منگول پنجاب پر درۂ بولان، سندھ اور ملتان کی راہ سے تاخت کیا کرتے تھے۔ حاکم پنجاب اس وقت ملتان یا دیپالپور میں رہا کرتا تھا۔ تاکہ ان کا راستہ روکنے میں آسانی رہے۔ علاوہ ملتان یا دیپالپور کے سامانہ، سنام، ہٹی کرام اور ہانسی وغیرہ مختلف مقامات میں فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ تاکہ منگولوں کو مستقر حکومت دہلی کی طرف جانے سے روکا جائے۔ ان

اسباب کی بنا پر شہر لاہور کی رونق اور عظمت جو غزنوی اور غوری سلاطین کے زمانے سے اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی خاک میں مل چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا جسے سیاسی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اور نہ اس دور کی سیاسی تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس دور کی ہمعصر فارسی تاریخوں میں لاہور کا سب سے زیادہ ذکر یحییٰ سرہندی کی کتاب تاریخ مبارک شاہی میں ملتا ہے مگر یہ شخص بھی لاہور کا ذکر اکثر بطور صوبہ یا علاقہ کے کرتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی اہمیت ختم ہونے کے بعد یہ شہر لاہور علما و فضلاء سے خالی ہو گیا۔ چونکہ یہ شہر منگولوں کے راستہ میں پڑتا تھا اور دارالحکومت ملتان اور دیپالپور منتقل ہو جانے کے سبب اس شہر پر منگولوں کی تاخت کے امکانات بھی کم ہو گئے تھے۔ اس لیے اہلِ علم اس گوشۂ تنہائی اور عافیت کو غنیمت سمجھتے ہوئے یہاں پناہ گزیں ہوتے رہے۔ اس دور کے ان بزرگوں میں جن کے مزار لاہور میں اب بھی موجود ہیں۔ سید مٹھا المتوفی ۶۹۱ھ [illegible] پیر بلخی (مدفون بازار کشمیری) سید اسحاق گازرونی (مدفون مسجد وزیر خان) المتوفی ۷۸۶ھ) شیخ سراج الدین عرف [illegible] قابلِ ذکر ہیں۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ شمالی افریقہ، مصر، شام، حجاز، عراق و ایران سے ہوتا ہوا ۷۳۴ھ میں دہلی پہنچا۔ اس نے ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی۔ وہ پنجاب میں بھی آیا۔ لیکن اس نے اپنے سفرنامہ میں نہ لاہور کا ذکر کیا ہے اور نہ وہ اس شہر کو دیکھنے آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا اور اسے کوئی شہرت حاصل نہ تھی۔

محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانے میں بھی لاہور کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ فیروز تغلق کی وفات کے بعد ملک میں بدامنی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ تو پنجاب میں جسرت کھوکھر اور شیخا کھوکھر نے سر اٹھایا۔ یہ دونوں بھائی غیر مسلم تھے۔ اور انھوں نے دیپالپور، لاہور، جالندھر وغیرہ پنجاب کے مختلف قصبوں کو تاخت و تاراج کیا۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ تو لاہور پر یہ دونوں بھائی قابض تھے۔ مغل فاتح کی آمد پر انھوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور دہلی تک اس کے ہمراہ گئے۔ فتح دہلی کے بعد وہ امیر تیمور سے یہ وعدہ کرکے لاہور چلے آئے کہ باشندگانِ شہر سے چندہ جمع کرکے وہ سلطان کی خدمت میں نذرانہ پیش کریں گے۔ لاہور آکر انھوں نے یہ وعدہ بھلا دیا۔ بلکہ سمرقند جاتے ہوئے چند مغل سردار نواحِ لاہور سے گزرے تو انھیں بہت تنگ کیا۔ اس پر تیمور نے اپنے پوتے پیر محمد کی سرکردگی میں ان کی تادیب کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ شہزادے کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور وہ معقول زرِ تاوان وصول کرکے واپس چلا گیا۔ تیمور نے سید خضر خان کو ہندوستان کی حکومت سپرد کی۔ یہ بھی انتشار کا زمانہ تھا۔ اس خاندان کے ایک تاجدار سید مبارک شاہ نے پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے پوری کوشش کی۔ اس نے لاہور کو از سرِ نو آباد کیا۔ وہ ۱۴۲۱ء میں لاہور آکر ایک ماہ تک دریائے راوی کے کنارے خیمہ زن رہا۔ قلعہ اور شہر پناہ کو تعمیر کیا۔ اور ملک الشرق محمود حسن (تاریخ مبارک شاہی یحییٰ سرہندی ص ۱۹۷) کو حاکم پنجاب مقرر کرکے لاہور میں رہنے کا حکم دیا۔ اس دن سے لاہور کی ترقی کا دور شروع ہوا۔

لودھیوں کا دور

سادات کے بعد لودھیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ترقی کا وہ سلسلہ جو سید مبارک شاہ کے دور میں شروع ہوا تھا۔ اس خاندان کے تاجداروں کے زمانہ میں جاری رہا۔ یہاں بہت سے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جن میں مدرسہ کاکو شاہ چشتی، مدرسہ سید فیروز گیلانی، اور خانقاہ حضرت عبدالجلیل قابلِ ذکر ہیں۔

ان دو بزرگوں کے یہاں شیخ موسیٰ آہن گر اور بایزید ہاشمی بھی مقیم تھے۔ موخر الذکر کا خستہ حال مقبرہ نولکھا چرچ کی حدود میں ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے یادگار محفوظ قرار دیا جائے۔ اس دور میں دولت خاں لودھی نے باؤلی اور بلغ وغیرہ بہت سی عمارتیں بنوائیں۔

لاہور دَورِ مغلیہ میں

عہد ظہیر الدین محمد بابر

خانوادہ تیمور یہ کا چشم و چراغ بابر عمر شیخ مرزا کا فرزند تھا۔ اس کی والدہ قتلغ نگار خانم یونس خاں کی بیٹی تھی جو چنگیز خاں کی اولاد سے تھا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی رگوں میں وسطِ ایشیا کے دو نامور اور خون آشام فاتحین کا خون تھا۔ ان میں سے چنگیز خاں تو کافر تھا مگر تیمور مسلمان تھا۔ اول الذکر منگول تھا اور موخر الذکر چغتائی ترک۔ ان دونوں کی کشور کشائی اور جہانبانی کی داستانیں زیبِ اوراقِ تاریخ ہیں۔ چنگیز خاں اور اس کے منگولوں کی وحشت اور بربریت کی خوفناک کہانیاں قاری کو لرزہ براندام کر دیتی ہیں۔ قبولِ اسلام کے بعد منگول مہذب و متمدن ہو گئے۔ ان کی گندی عادتیں نفاست میں بدل گئیں اور کردار کی بلندی نے بداخلاقی کی جگہ لے لی۔

تیمور کی وفات کے بعد وسطِ ایشیا میں اس کے اخلاف نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان ریاستوں کے حکمران اکثر بر سرِ پیکار رہتے تھے۔ ان میں فرغانہ کی ریاست بھی تھی جس کا دارالحکومت اندیجان ایک سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں چھوٹا سا دلفریب شہر تھا۔ جس کی نہریں پھلواریاں اور پھلوں کے باغات عجب خوش منظر تھے۔

۱۴۹۴ء میں عمر شیخ مرزا ایک حادثہ کا شکار ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد گیارہ سال کی عمر میں وہ فرغانہ کے تخت پر بیٹھا مگر ترکستان کے سیاسی حالات نے اسے چین سے حکومت نہ کرنے دی اور اپنے بک جدّ بلوں کی سنگدلی اور احسان ناشناسی کی وجہ سے وہ چند جاں نثاروں کی معیت میں دشوار گزار پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ان حوادث نے بابر کو جفاکش، مستقل مزاج اور بہادر بنا دیا۔ تقدیر نے ۱۵۰۴ء میں اس بادیہ گرد نوجوان ترک کے سر پر کابل کی حکومت کا تاج رکھا۔

اس وقت دہلی میں سکندر لودھی برسرِ اقتدار تھا۔ جس نے ۱۴۸۸ء سے ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ اس کا جانشین ابراہیم لودھی ناتجربہ کار اور تیز طبیعت نوجوان تھا۔ جس نے پٹھان سرداروں کو ناراض کر لیا۔ ہندوستان میں آباد ہونے والے پٹھان سرداروں میں ابھی قبائلی نظام کی خصوصیات موجود تھیں۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی بارگاہ میں وہ بے تکلف چلے جاتے تھے اور وہ بھی اپنے درباری اُمرا اور معاون سرداروں سے بے جھجک ملتے جلتے تھے۔

ابراہیم یہ چاہتا تھا کہ درباری اُمرا اس کے پاس شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئیں اور درباداری کی رسوم کے مطابق اس سے یوں خطاب کریں جیسے بادشاہوں سے رعایا کرتی ہے۔ اس امر نے سرداروں کو مایوس اور ناراض کر دیا اور وہ اسے اپنی ذلت خیال کرنے لگے۔ اس مایوسی اور بے اطمینانی کی فضا میں جن اُمرا نے کابل کے چغتائی تاجدار ظہیر الدین محمد بابر

کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی ان میں بادشاہ کا چچا عالم خان اور اس کا ہم قبیلہ دولت خاں لودھی صوبہ دار پنجاب شامل تھے۔ دولت خاں کے دو لڑکے غازی خاں اور دلاور خاں تھے۔

یہ دعوت نامہ بابر کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے کا بہانہ بن گیا۔ بابر نے پانچ بار اس برصغیر پر یلغار کی بعض پاکستان پر بابر کا قبضہ پہلے چار حملوں ہی میں مکمل ہو چکا تھا مگر اپریل ۱۵۲۶ء کے آخری حملہ میں اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کی پہلی لڑائی میں شکست دے کر دہلی آگرہ پر قبضہ کیا۔ اور ہندوستان کا تاجدار بن گیا۔

۱۵۲۴ء میں بابر لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے وارد پنجاب ہوا۔ راولپنڈی ڈویژن کے گکھروں کو مسخر کرتا ہوا وہ لاہور پہنچا۔ بہار خاں لودھی۔ مبارک خاں لودھی اور بعض دوسرے امرا نے جو سلطنت دہلی کے وفادار تھے۔ اور دولت خاں کی سرکوبی کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس کا راستہ روکا۔ پٹھان لشکر بہت زیادہ تھا۔ اس ٹڈی دل اور چغتائی لشکر میں نواح لاہور میں معرکہ کارزار گرم ہوا۔ جس میں کافی کشت و خون کے بعد میدان بابر کے ہاتھ رہا۔ فاتح لشکر نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اسے خوب لوٹا اور بازاروں کو نذر آتش کیا۔

لاہور میں صرف چار دن قیام کر کے بابر دیپال پور کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں کی محافظ فوج نے مزاحمت کی۔ مگر فاتح نے انہیں شکست دے کر دیپال پور پر قبضہ کر لیا۔ دیپال پور میں دولت خاں اپنے بیٹوں سمیت بابر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ بہار خاں لودھی اور مبارک خاں لودھی کی قیادت میں آنے والی فوج کے ڈر سے بلوچوں کے پاس پناہ گزیں تھے۔ بابر کا ارادہ دیپال پور سے دہلی پر حملہ آور ہونے کا تھا۔ دولت خاں نے مشورہ دیا کہ وہ کچھ فوج بھیج کر تہارہ پر حملہ کرے جہاں اسمٰعیل خاں جلوانی فوج لیے پڑا تھا۔ تاکہ بابر کے دہلی کی طرف کوچ کرتے وقت وہ اُسے نقصان نہ پہنچائے۔ بابر نے تہارہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ ایک روز دلاور خاں نے اُسے تخلیہ میں بتایا کہ اس مشورہ سے دولت خاں کا مقصد اس کی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔ ایک حصہ تہارہ پر حملہ کرے اور دوسرا دیپال پور میں اس کے پاس رہے۔ تاکہ بابر کی طاقت بٹ جانے تو وہ پنجاب کو اپنے قبضہ میں لے آئے۔ اس پر بابر نے دولت خاں اور غازی خاں کو نظر بند کر لیا۔ مگر جلد ہی بعض امرا کے کہنے پر انہیں رہا کر کے جالندھر دوآب میں سلطان پور کے مقام پر جاگیر عطا کی۔ اور خود مشرقی پنجاب کی طرف بڑھا۔ مگر جلد ہی اُسے خبر ملی کہ دولت خاں اور غازی خاں نے سلطان پور میں جنگی تیاریاں کر کے شوالک کی پہاڑیوں کی راہ لی ہے دولت خاں جیسے سردار کا باغیانہ رویہ ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ اس پر بابر نے دہلی کا ارادہ ترک کیا اور دلاور خاں کو بلا کر اس پر انعامات کی بارش کی خان خاناں کا خطاب دیا اور جاگیر عطا کی۔ بعد ازاں بابر لاہور آیا۔ لیکن جلد اُسے کابل جانا پڑا۔ اس مہم میں اگرچہ وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔ لیکن پنجاب کا بہت سا حصہ اُسے مل گیا۔ اس لیے اس خطہ کو مختلف اضلاع میں تقسیم کر کے وہاں اپنے حاکم مقرر کیے اور میر عبدالعزیز کو ناظم صوبہ لاہور مقرر کیا۔ کلانور محمد علی تاجک کے سیالکوٹ خسرو کوکلتاش کے اور دیپال پور سلطان علاؤالدین کے حوالے کیا۔ موخرالذکر ابراہیم لودھی کا عزیز اور تخت دہلی کا اس کا حریف تھا۔ بابا خشکہ لقب ایک دلاور ترک سپاہی کو علاؤالدین کے طریق کار کی نگرانی کے لیے چھوڑا اور کابل کی راہ لی۔ بابر کے منہ موڑتے ہی دولت خاں اور غازی خاں شوالک کی پہاڑیوں سے نکلے اور سلطان پور کی جاگیر پر قبضہ کر کے

...درخاں کو قید کر دیا۔ اس کے بعد وہ دیپال پور کی طرف بڑھے بابر کے مقرر کردہ حاکم علاؤالدین کو شکست دے کر شہر پر قبضہ ... علاؤالدین کابل کو بھاگا اور تمام ماجرا کہانی بابر کے گوش گزار کی۔

یہ سنتے ہی ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ء کو بابر کابل سے روانہ ہوا۔ اور دسمبر ۱۵۲۵ء میں گکھڑوں سے نبٹتا ہوا سیالکوٹ پہنچا۔ ... سے اس نے شاہم بیگ اور نور بیگ کو لاہور کے سنگوں یعنی بابر کے متعینہ ترک سرداروں کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ دشمن کی طاقت ... کا اندازہ کر کے اُسے اطلاع دیں۔ یہاں علاؤالدین لودھی محمد علی حاکم کلانور اور خواجہ حسین اُس سے آملے۔

دولت خاں اور غازی خاں چالیس ہزار فوج لیے لاہور کے متصل راوی دریا کے کنارے پڑے تھے بگر انھیں بابر سے ... کی جرأت نہ ہوئی۔ دولت خاں نے نوٹ کے قلعہ میں پناہ لی اور غازی خاں شوالک کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ بابر نے ... کے قلعہ پر حملہ کر کے دولت خاں سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اس واقعہ سے چند روز قبل دولت خاں دو دو تلواریں لٹکائے لاف ... زنی ... کرتا پھرتا تھا۔ بابر نے حکم دیا کہ وہ دونوں تلواریں گلے میں لٹکائے وہ اس کے سامنے پیش ہو چنانچہ اس ہیئت ... میں وہ بابر کے سامنے لایا گیا۔ اس کی کرتوتوں کے باوصف بابر نے اُسے معاف کر دیا اور اس پر نوازشات کیں۔ اس ... بابر غازی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُسے شکست دی۔ وہ بھاگ کر دہلی ابراہیم لودھی کے پاس چلا گیا۔ اسی اثنا ... دلاور خاں بھی جسے باپ اور بھائی نے قید کر رکھا تھا۔ بھاگ کر بابر کے پاس آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد بہت ... دولت خاں لودھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اور ان اُلجھنوں سے نجات پائی۔

پنجاب کے انتظامات سے فراغت پا کر بابر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اور اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم سے جم غفیر کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت و تاج حاصل کیا۔

بابر نے اگرچہ پانی پت کے میدان میں اپنے حریف کو شکست دے کر مرکزی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس فیصلہ کن جنگ میں فتح پانی اس کے مصائب میں اضافے کا موجب بنی۔ ہندوستان میں دو جنگجو قومیں راجپوت اور پٹھان تھے ... راجپوتوں کی بہت سی ریاستیں تھیں۔ مگر میواڑ کا تاجدار رانا سنگا ... رام سنگھ عرف رانا سانگا بلا کا بہادر اور خون آشام جرنیل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ... بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والوں میں شامل تھا۔

رانا سانگا کا خیال تھا کہ تیمور کی طرح اس کا یہ جلیف بھی سلطنتِ دہلی کو تباہ و برباد کر کے واپس چلا جائیگا۔ اور پھر ... کے کھنڈروں پر اُسے راجپوت سطوت کا قصرِ رفیع تعمیر کرنے کا موقع مل جائے گا۔

جب پانی پت کی جنگ کے بعد اُس نے کابل جانے کا نام نہ لیا تو رانا سانگا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اور وہ کھلم کھلا جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

راجپوتوں کے علاوہ ہندوستان کے پٹھان جو سیالکوٹ سے لے کر سہسرام تک تمام شمالی ہندوستان میں آباد تھے بابر اور اُس کے مغل سرداروں کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے انھیں ہندوستان سے نکالنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

مزید برآں ہندوستان کی گرم آب و ہوا اس ملک کے اجنبی لوگ اور اُن کی عجیب و غریب رسوم و عادات مغل امرا کو ناپسند تھیں اور وہ جانتے تھے کہ بابر جس قدر بھی جلد ممکن ہو مالِ غنیمت سمیٹ کر کابل واپس چلا جائے۔ اگرچہ بابر خود بھی ہندوستان کی آب و ہوا

یہاں کے باشندوں کی عادتیں معاشرت اور عادات کو ناپسند کرتا تھا اور تزکِ بابری میں اس جگہ بہت سی ضروری چیزوں کے فقدان کا رونا بھی رونا ہے۔ اس کے باوصف اس نے ہندوستان میں مقیم رہنے اور یہاں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وادیٔ سندھ اور بالخصوص وادیٔ گنگا و جمنا کی زرخیزی نے اُس کے دامن کو تھام لیا۔ ان حالات میں بابر کی اقامتِ ہند کا تمام وقت زیادہ تر راجپوتوں اور پٹھانوں کے خلاف جنگی مہموں میں گزرا اس نے پے در پے شکستیں دے کر شمالی ہند کے بہت سے حصے پر قبضہ جما لیا خونریزی و تیغ زنی کے ان مشاغل کے باوصف بابر اپنی تزک کی ترتیب میں مصروف رہا۔ علاوہ ازیں انتظامِ سلطنت اور تعمیرِ عمارات کی طرف بھی توجہ دی۔

بابر کا وطن اندیجان دامن کوہ میں ایک خوبصورت شہر تھا۔ جہاں چشموں کے پانی کی بہتی ہوئی نہریں، سرو صنوبر کے بلند و بالا درخت اور گل و لالہ کے نکہت بار تختے فردوس بریں کا منظر پیش کرتے تھے۔

پردیس میں وطن کا سا سماں باندھنے اور گرمیوں کی جھلس دینے والی دوپہروں کو آرام سے بسر کرنے کے لیے آگرہ میں بابر نے ایک باغ لگوایا۔ جسے دورِ مغلیہ کے آفاقی باغوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی کہنا چاہیے۔

افسوس ہے کہ بابر کو ہندوستان میں اپنی خداداد قابلیت کے جوہر دکھلانے اور کامل سلطنت سنوارنے کا موقع نہ ملا۔ دسمبر ۱۵۳۰ء میں وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اُس کی لاش پہلے آگرہ کے باغ میں بطور امانت دفن کی گئی اور بعد ازاں کابل میں تدفین کے لیے بھجوا دی گئی۔ بابر کی قبر کابل میں اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

عہد نصیر الدین ہمایوں

آگرہ میں ہمایوں باپ کی رحلت کے بعد ۱۵۳۰ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق بھائیوں کو شریکِ سلطنت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی اثنا میں کامران نے جو کابل اور قندھار کا گورنر تھا۔ پنجاب کا رُخ کیا۔ بظاہر اُس کا ارادہ بھائی کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے کا تھا۔ لیکن فی الواقع اس کی نظر حصولِ تخت و تاج کے موقع کی تلاش تھی۔ کامران عسکری کو اپنے علاقہ کے انتظام کے لیے چھوڑ آیا تھا۔

ہمایوں نے یہ خبر سنی تو کامران کو کہلا بھیجا کہ اس کی جاگیر میں پشاور اور لمغان کے علاقے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ کامران اس پیش کش سے مطمئن نہ ہوا اور وہ لشکر ہمراہ کی معیت میں لاہور کی طرف بڑھتا رہا۔ میر یونس علی جسے بابر نے لاہور کا گورنر مقرر کیا تھا ہمایوں کا طرفدار تھا۔ کامران نے لاہور پر حملہ کرنے کی بجائے حکمتِ عملی سے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

کامران کے دربار میں قراچہ بیگ نام ایک معتمد امیر تھا۔ کامران نے اُسے دربار میں ڈانٹا اور اظہارِ ناراضگی کیا۔ بیگ مذکور اس پر بددل ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت لاہور میں پناہ گزین ہوا۔ میر یونس علی کو یہ معلوم ہوا تو وہ شہر سے باہر اُس کے استقبال کے لیے گیا اور اُسے بڑے اعزاز سے شہر میں لایا اور بے حد مدارات سے کام لیا۔ اس سارے قصہ میں بناوٹ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کسی بہانے قراچہ بیگ لاہور میں گھس جائے اور موقعہ پا کر شہر پر قبضہ کرے۔ ایک شب محفل نشاط و انبساط دیر تک قائم رہی۔ محفل کے اختتام پر میر یونس علی کے سپاہی گھروں کو جا چکے تھے۔ قراچہ بیگ نے موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے آدمیوں کی مدد سے

میر یونس علی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کراچہ بیگ کے آدمیوں نے دروازوں پر قبضہ کر کے راتوں رات کامران کو اطلاع دے دی۔ جو اسی انتظار میں تھا۔ دوسرے روز وہ فوج کثیر لیے بڑے تزک و احتشام سے شہر میں داخل ہوا۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قابض ہو گیا۔ میر یونس علی کو رہا کر کے اجازت دے دی گئی کہ وہ ہمایوں کے پاس چلا جائے۔ لاہور پر کامران کا قبضہ دراصل ستلج تک تمام پنجاب پر تسلط کا پیش خیمہ بنا۔ ہمایوں نرم مزاج اور رحم دل تو تھا ہی، اس نے کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب پر بھی بھائی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔

ہمایوں کے اس حسنِ عمل پر مرزا کامران نے بطور شکریہ بہت سے بیش بہا تحائف بھیجے۔ اس کے بعد وہ خط و کتابت میں بڑی انکساری سے اپنے آپ کو ہمایوں کا نیاز مند ظاہر کرتا۔ لیکن یہ انکساری اور عقیدت وقتی تھی۔ موقعہ آنے پر کامران نے بھائی کو نقصان پہنچانے سے مطلق دریغ نہ کیا۔

محمد زمان مرزا کا حملہ

محمد زمان مرزا سلطان حسین مرزا والئے خراسان کا پوتا تھا۔ ازبکوں نے ان کی سلطنت پر قبضہ کر لیا تو یہ بابر کے دربار میں چلا آیا۔ بابر بڑے احترام سے پیش آیا اور اپنے دربار میں اسے ایک بلند منصب دیا۔ اور اپنی ایک بیٹی سے ان کی شادی بھی کر دی۔ اس اعتبار سے وہ ہمایوں اور کامران کا بہنوئی تھا۔ ۱۵۳۵ء میں وہ پنجاب آیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ مرزا کامران اس وقت قندھار کی جانب کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ لوٹا۔ اس کی آمد پر محمد زمان مرزا محاصرہ اٹھا کر بھاگ نکلا۔

کامران فنونِ لطیفہ کا دلدادہ، شاعری کا رسیا اور فنِ تعمیر کا شیدائی تھا۔ اس نے اپنے مقبوضات کا انتظام بڑی تندہی سے کیا۔ لاہور میں اس نے ایک عالیشان باغ وسطِ ایشیا کے باغات کے نمونہ پر لگوایا۔ تاکہ گرمیوں کے ایام میں تمازتِ آفتاب سے بچنے پناہ لینے کے کام آئے اور علاوہ اس کے موسمِ بہار اور موسمِ سرما میں بھی شعروادب کی محفلیں اور راحت و عشرت کے جشن یہاں منعقد کیے جا سکیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں آگرہ کے باغ کے بعد یہ دوسرا مغلیہ باغ تھا۔ خدا معلوم کس مبارک ساعت میں اس باغ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ کہ اس کے بعد مغلوں کے دورِ اقتدار میں بے شمار باغات یہاں عالمِ وجود میں آ گئے۔ ان میں ہر باغ بہت طراوت اور رعنائی و دلکشی میں دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس کے باوجود شہرِ باغات، چمن آسمی لاہور کا یہ پہلا باغ شاہجہان کے دور تک مقبول تھا۔ شاہجہانی دور کا منصب دار اور شاعر ظفر خاں احسن یوں رقمطراز ہے:

بکام دل چو احسن تا توانی
بباغِ کامران کن کامرانی

کامران جیسے صاحبِ ذوق شہزادے کے باغ کی تزئین و نزہت کا جو عالم ہو گا وہ آج ہم چشمِ تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اس باغ کی ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری جو آج سے سال بھر پہلے دریا کے دائیں کنارہ پر تھی آج اس کے وسط میں ایک جزیرہ نما[1] میں اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب حالتِ سیلاب میں پانی کا کوئی تیز ریلا اسے بہا کر لے جائے گا۔

---

[1] نومبر ۱۹۶۱ء میں بارہ دری دریا کے بائیں کنارے پر ہے اور پانی اس کے دائیں جانب بہہ رہا ہے۔

بیا و نقش عمارات شہریاراں بیں
کہ ایں سپہر جفا پیشہ چوں بہ بست و شکست

عہدِ جلال الدّین محمد اکبر

سنہ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں حادثہ کا شکار ہو کر راہی ملکِ عدم ہوا۔ تو اس وقت اکبر پنجاب میں کلانور کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ اس وقت اکبر کی عمر ۱۳ سال ۴ ماہ کی تھی۔ اور وہ اپنے اتالیق اور اپنے خاندان کے جانثار جرنیل بیرم خاں کی معیت میں افغان باغیوں کے استیصال کے لیے مقیم تھا۔ یہ خبر ملتے ہی اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ کلانور مغلیہ دور میں صوبہ لاہور کا ایک اہم شہر تھا۔ عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں رقمطراز ہیں کہ اکبر نے اس شہر میں بعدازاں عالی شان عمارات تعمیر کرائیں مگر اب وہ تعمیرات مرورِ زمانہ سے برباد ہو چکی ہیں۔ صرف پکی اینٹوں کا ایک چبوترہ باغ میں باقی ہے۔ اور یہ اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا تھا۔ کلانور آج ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

شاہ ابوالمعالی کی بغاوت

شاہ ابوالمعالی سادات کاشغر میں سے تھا۔ وہ دلاوری کے علاوہ متناسب الاعضا اور خوبصورت بھی تھا۔ ہمایوں کی وفات کے وقت وہ لاہور میں مقیم تھا۔ اگرچہ سکندر سور اور دیگر پٹھان باغیوں کے استیصال کے لیے اکبر کو پنجاب کی طرف بھیجتے وقت لاہور کی صوبہ داری اس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مگر ابوالمعالی ابھی تک لاہور میں مقیم تھا۔ اکبر کی تخت نشینی پر کلانور میں ایک جلسۂ عام کا انعقاد قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے شاہ ابوالمعالی[1] کو بھی دعوت دی گئی۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ابھی میں مرحوم شہنشاہ کا سوگ منا رہا ہوں۔ لہٰذا کسی ایسی تقریب میں میری شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر میں اس تقریب میں شرکت کروں تو بادشاہ سلامت میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھیں گے مجھے اس اجتماع میں کہاں جگہ دی جائے گی اور میرے استقبال کے لیے کیا انتظام ہوں گے۔

بہرحال اسے دربار میں طلب کیا گیا اور بیرم خاں نے تولک خاں قوچین کے ذریعہ اسے گرفتار کرا لیا۔ بیرم خاں کا خیال یہ تھا کہ اس مغرور اور گستاخ انسان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ مگر اکبر اس امر پر رضامند نہ ہوا۔ بہرحال اسے آہنی سلاسل میں باندھ کر لاہور لایا گیا۔ اور پولیس کے افسرِ اعلیٰ (کوتوال) پہلوان گل گز کے سپرد کر دیا گیا۔ کوتوال کی لاپروائی کے باعث شاہ ابوالمعالی بندی خانے سے بھاگ نکلا۔ اس پر کوتوال کو زیرِ حراست لے لیا گیا۔ شاہی عتاب کے ڈر اور ذلت کے خوف سے کوتوال نے خودکشی کر لی۔

خضر خواجہ خان صوبہ دار لاہور

خضر خواجہ خاں ہمایوں کی ہمشیرہ گلبدن بیگم کا شوہر تھا۔ گلبدن اپنے بھائیوں کی طرح شعر و ادب کی شیدائی اور زیورِ علم سے پیراستہ تھی۔ اس نے بعدازاں اکبر کے ایما پر اپنے بھائی کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ہمایوں نامہ تالیف کی تھی اس کتاب کا متن اور انگریزی ترجمہ ۱۹۰۲ء میں

---

[1] ہمایوں شاہ ابوالمعالی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اکثر شاہی تقاریب میں اسے اپنے قریب جگہ دیتا تھا اور "فرزند" کے خطاب سے نوازا تھا۔

ایک فاضل برطانوی خاتون مسز بیورج نے شائع کرایا تھا۔ گلبدن بیگم کا شوہر خضر خواجہ خان ایک قابل ترکی امیر تھا۔ اکبر نے اسے لاہور کا گورنر مقرر کر کے سکندر سوری کے استیصال کے لیے خاص ہدایات دیں اور خود اپنے اتالیق اور درباری امرا سمیت دہلی کا رُخ کیا۔

لشکر شاہی ابھی جالندھر میں تھا کہ یہ خبر آئی کہ ہیموں بقال نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے شاہی کارندوں کو اس شہر سے نکال دیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ ہیموں کے استیصال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں سکندر سوری پٹھانوں اور پہاڑی راجاؤں پر مشتمل ایک لشکر جرار لے کر پہاڑوں سے نکلا اور لاہور کا رُخ کیا۔ خضر خواجہ نے خوش ہو کر فوج لے کر چمیاری[1] کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ دشمن وہاں سے صرف دس کوس دور تھا۔ حاکم لاہور نے دو ہزار منتخب سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج بطور ہراول دشمن کی طرف بھیجی۔ سکندر نے فی الفور اس پر حملہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ اس شکست کے بعد خضر خواجہ لاہور لوٹ آیا۔ سکندر سوری نے مغل لشکر کا تعاقب کیا مگر جلد ہی اس نے تعاقب کو ترک کر کے آس پاس کے علاقوں سے زبردستی مالیہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اکبر کی لاہور میں آمد

چمیاری کے حادثہ کی خبر اکبر کو ملی تو اس نے خضر خواجہ خان کی مدد کے لیے اپنے ایک درباری سکندر خان کو خان عالم کا خطاب اور سیالکوٹ بطور جاگیر عطا کر کے لاہور کی طرف بھیجا۔ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو اکبر نے ہیموں کو پانی پت کے تاریخی میدان میں شکست دی۔ اور امور دہلی سے فراغت پا کر سات دسمبر ۱۵۵۶ء کو اپنے اتالیق اور سرپرست بیرم خاں کی معیت میں عازم لاہور ہوا۔ اکبر کے جالندھر پہنچنے کی خبر ملی تو سکندر سوری نواح لاہور سے بھاگا اور مانکوٹ کے پہاڑی قلعہ میں پناہ لی۔ شاہی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا اور شملہ ہوشیارپور میں دسوہہ کے مقام پر خیمے لگا دیئے۔ بعد ازاں مانکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طوالت پکڑی اور محصورین کے لیے مقابلہ مشکل ہو گیا۔ خوراک کی کمی کے باعث لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ تو ایک ایک کر کے سکندر سوری کے بہت سے ساتھی چوری چھپے بادشاہ سے جا ملے۔ اس پر سکندر سوری نے اپنے بیٹے عبدالرحمن اور غازی خاں سوری کو بطور تحفہ چند ہاتھی دے کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور صلح کا ملتجی ہوا۔ اتکہ خان اور پیر محمد خان کی کوشش سے صلح ہو گئی۔ سکندر سوری نے قلعہ بادشاہ کے حوالے کر کے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ واقعہ ۲۱ جولائی ۱۵۵۷ء کا ہے۔ اس صلح کے بعد فوج خوشی خوشی لاہور کی طرف بڑھی۔ اکبر چار مہینے اور چودہ دن لاہور میں رہا۔ اس دوران صوبہ لاہور کی انتظامیہ کو منظم کیا اور تخت مل نامی ایک پہاڑی سردار کو بجرم سرکشی سزائے موت دی۔ اسی زمانے میں بیرم خاں کے ہاں ایک فرزند تولد ہوا جس نے بعد ازاں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں عبدالرحیم خان خاناں کے نام سے

---

[1] چمیاری ضلع امرتسر کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں۔ اور تقسیم پنجاب ۱۹۴۷ء سے قبل لاہور میں بے حد مقبول تھے۔ چھابڑی والے خاص طور پر یہ آواز لگاتے تھے "خربوزے چمیاری دے" چمیاری لاہور کے شمال مشرق میں ۵۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

[2] ابوالفضل اکبرنامہ جلد دوم صفحہ ۴۸ تا ۶۰۔ بدایونی جلد دوم ص ۱۳ تا ۱۲۔

شہرت پائی۔ لاہور کو یہ عزت حاصل ہے کہ شعر و ادب کا یہ ہر دلعزیز اور نادرۂ روزگار فن کار یہاں پیدا ہوا۔

حسین خاں ٹکریہ

سات محرم ۹۶۵ھ کو بادشاہ عازم دہلی ہوا اور لاہور میں مہدی قاسم خاں کے بھانجے اور داماد حسین خاں کو گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص ذات کا پٹھان اور بلا کا بہادر تھا۔ مان کوٹ کے محاصرے میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس کے بھائی حسن خاں نے تو اس معرکہ میں ناموس سلطنت پر اپنی جان قربان کر دی۔ حسین خاں تیغ زنی کی دھاک بٹھاتے ہوئے باعزت میدان جنگ سے لوٹے اور خدمت گزاری کے صلہ میں لاہور کی صوبہ داری حاصل کی۔

حسین خاں راسخ العقیدہ اور دین دار انسان تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کی صوبہ داری کے زمانہ میں جب انہیں دنیا کی ہر نعمت میسر تھی جو کی روٹی کھاتا اور سادہ بستر پر سوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو۔ لمحات فرصت علما و سادات اور مشائخ کی صحبت میں گزارتا تھا۔ تہجد کی نماز کبھی قضا نہ کی۔ بے شمار مقابر اور مساجد تعمیر اور مرمت کرائیں۔

ایک بار ایک دراز ریش اور معزز انسان اس کے دربار میں آیا۔ اسے کوئی عالم یا شیخ خیال کرتے ہوئے یہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ مگر بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہندو ہے۔ اس پر بہت جز بز ہوئے اور حکم دیا کہ ہندو اپنے لباس پر کندھے کے پاس ایک رنگین کپڑے کا ٹکڑا سلوا لیا کریں۔ اس حکم پر باشندگان لاہور جن کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی ہر زمانے میں مسلّم رہی ہے اسے حسین خاں ٹکریہ کہنے لگے۔

بیرم خاں کا زوال

بیرم خاں ہمایوں، اکبر اور ان کے خاندان کا جاں نثار اور وفادار تھا۔ اس کی وفاداری پر کبھی بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمایوں کو ہندوستان کے تخت پر دوبارہ بٹھانے والا اور سلطنت اکبری کی جڑیں اس سر زمین میں مضبوط کرنے والا یہی شخص تھا۔ شخصی حکومتوں میں امرا اور درباریوں کی رقابتیں اور سازشیں جو گل کھلاتی ہیں اس کی داستان بہت عبرتناک ہے۔ ہیموں اور سکندر سوری کے ہنگاموں سے فرصت ملی تو ارباب غرض نے بیرم خاں کو اپنے عزائم کے راستے کا سنگ گراں خیال کرتے ہوئے نوجوان سال بادشاہ سے اسے ٹکرا دیا۔ اس سازش میں بادشاہ کو بچپن میں دودھ پلانے والی خواتین بی بی انگہ اور ماہم انگہ پیش پیش تھیں۔ ترکی زبان میں دودھ پلانے والی دایہ کو انگہ کہتے ہیں۔ اس کے شوہر کے لیے لفظ اتکہ یا انگہ آتا ہے۔ بی بی انگہ کا شوہر شمس الدین انگہ شاہی دربار میں مقتدر تھا۔ اس کا لڑکا مرزا عزیز کوکلتاش بعد میں اعلیٰ مدارج پر پہنچا۔ ماہم انگہ کا بیٹا ادہم خاں تھا۔ ان دونوں عورتوں کے تمام اعزہ اور متوسلین کو مجموعی طور پر تاریخوں میں انگہ خیل کا نام دیا جاتا ہے۔

بیرم خاں طبیعت کا سخت تھا۔ بدامنی اور جنگوں کے عبوری دور میں اس کی حزم و سختی اور سخت گیری استحکام حکومت کے لیے سود مند تھی مگر امن کے دور میں جب حاسد اور دشمن مستعد کار ہوں بیرم خاں کی حکمت عملی ناکام رہی۔ بیرم خاں بادشاہ کی نظروں سے گرا تو شمس الدین انگہ کو فرمان ملا کہ لاہور پہنچ کر اس شہر میں میر محمد خان کلاں کو متعین کر دو اور خود بارگاہ شاہی میں پہنچو۔

شمس الدین انگہ اس وقت بھیرہ میں تھا۔ اس نے فی الفور احکام خسروی پر عمل کیا۔ میر محمد خان کلاں کو غالباً

حسین خاں ٹکریہ کی معزولی کے بعد مقرر کیا گیا جو بیرم خاں کا بدخواہ تھا۔ شمس الدین اتکہ جب بارگاہِ سلطانی میں پہنچا تو اسے ان نوازشات و انعامات سے نوازا کہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اور صوبہ لاہور میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ اور اسے خاص ہدایت دی کہ لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا تاکہ خان خاناں اس علاقہ میں فتنہ پردازی کرنا چاہیں تو انھیں روک دیا جائے۔ اور اس صوبہ میں امن بحال رکھا جائے۔ ان کے عازمِ لاہور ہوتے ہی اکبر خود بھی اتکہ خاں کے لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ اکبر لدھیانہ میں مقیم تھا کہ اسے بیرم خان خان خاناں کے اتکہ خاں سے شکست کھا کر شوالک کے پہاڑوں کی طرف فرار ہو جانے کی خبر ملی۔ اور اسی اثنا میں شمس الدین اتکہ خان قیدیوں کو لیے دربارِ شاہی میں باریاب ہوا۔ اسے خانِ اعظم کا خطاب ملا اور پنجاب میں وسیع علاقے بطور جاگیر اسے اور اس کے متوسلین کو ملے۔[1]

نومبر ۱۵۶۱ء میں شمس الدین محمد اتکہ خان لاہور سے بارگاہِ خسروی میں خراجِ عقیدت ادا کرنے گیا اور بہت سے تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے اسے وزیرِ اعظم کا عہدہ عطا کیا اور صوبہ لاہور کے امورِ سلطنت کی نگہبانی خانِ کلاں قطب الدین محمد خان کے سپرد ہوئی۔ تین برس کے عرصہ میں خانِ کلاں کے علاوہ اور بھی لوگ اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوتے رہے۔

مرزا حکیم کا حملہ

۱۵۶۴ء میں میر محمد خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اکبر کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا نے اسی کے زمانہ میں لاہور پر حملہ کیا تھا۔ اکبر نے حکیم مرزا کو کابل کی حکومت عطا کر رکھی تھی۔ ۱۵۶۶ء میں وہ پنجاب میں آیا۔ اور بھیرہ کے نواح میں غارت گری شروع کی۔ اس کے بعد وہ بڑی تیزی سے سفر کرتا ہوا لاہور پہنچا اور مہدی قاسم خان کے باغ میں خیمہ زن ہوا۔ یہ باغ شہر سے باہر دریا کے کنارے واقع تھا۔ اس پر میر محمد خان صوبہ دار لاہور نے پنجاب کے جاگیرداروں کو جن میں اتکہ خیل کے امراء کی اکثریت تھی مدد کے لیے بلایا۔ اور قلعہ کو خوب مضبوط کر لیا۔ مرزا حکیم نے قلعہ پر حملہ کیا مگر منہ کی کھائی۔ اور باغ میں واپس آ گیا۔ اکبر کو خبر ملی تو وہ دہلی اور سرہند کے راستے عازمِ لاہور ہوا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر مرزا حکیم پریشان ہو کر کابل کو بھاگا۔ فروری ۱۵۶۷ء کے آخر میں اکبر لاہور پہنچا اور قطب الدین محمد خان اور کمال خان گکھڑ کو مرزا حکیم کے تعاقب میں بھیجا۔ انھوں نے کچھ دور مرزا کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا ارادہ کہیں رکنے کا نہیں واپس چلے آئے۔

شکارِ قمرغہ

مرزا حکیم کے قضیہ سے فراغت پا کر اکبر نے شکارِ قمرغہ کا انتظام لاہور سے پانچ کوس کے فاصلہ پر کیا۔ قمرغہ ترکی لفظ ہے اور اس شکار کا انتظام یوں کیا جاتا تھا کہ بہت سے لوگ، دائرہ کی صورت میں جنگل کے بہت سے علاقے کو گھیرے میں لے لیتے تھے۔ اس طرح بہت سے جنگلی جانور محصور ہو جاتے تھے۔ دائرے کو آہستہ آہستہ تنگ کیا جاتا اور محصور جانوروں کا شکار کیا جاتا۔ پندرہ ہزار کے قریب جنگلی جانور اس موقع پر شکار کیے گئے۔ بادشاہ کے بعد امرا اور اس کے بعد عوام کو شکار کی اجازت دی گئی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس موقع پر قیامِ لاہور کے دوران بادشاہ نے امورِ دولت میں بے حد دلچسپی لی۔ اور زمینداروں کے وفد اس سے ملتے رہے۔ محمد باقی حاکم ٹھٹھہ کا سفیر بھی اسی موقع پر اکبر کی مجلس میں باریاب ہوا۔ مارچ ۱۵۶۷ء میں شہنشاہ نے صوبہ لاہور کی حکومت پھر میر محمد خان اتکہ کے سپرد کی۔ یہ شخص شمس الدین محمد خان اتکہ

---

[1] ابوالفضل اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۴۔ منتخب التواریخ بدایونی جلد دوم صفحہ ۴۳۔

کا بڑا بھائی تھا۔ جو پہلے بھی اس صوبہ کا حاکم رہ چکا تھا۔ اور خود بادشاہ آگرے کو روانہ ہوا۔

اتگہ خیل کا تبادلہ

اکبر نے اپنی حکومت کے تیرھویں برس کے وسط ۱۵۶۸ء میں یہ فیصلہ کیا کہ پنجاب میں جس قدر اتگہ خیل کے لوگ ہیں انھیں پنجاب کی حکومت سے علیحدہ کر دیا جائے اور حسین قلی خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا جائے۔ اُسے خانِ جہاں کا خطاب دیا گیا۔ ابوالفضل (اکبر نامہ ابوالفضل جلد دوم صفحہ ۳۳۲-۳۳۳) اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جب ایک ہی گروہ کے مختلف لوگ ایک مقام پہ جمع ہو جائیں تو ان کا اور قوم کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ انھیں وہاں سے منتشر کر دیا جائے۔ اکبر کے تدبر اور دور اندیشی نے اُسے مشورہ دیا کہ سیاسی مصلحت اسی میں ہے کہ اتگہ خیل کے وفا شعار افراد جو مدت سے ایک ہی صوبے کی انتظامی مشینری کے اجزا بن چکے ہیں شاہی دربار میں آئیں اور دوسرے صوبوں میں اعلیٰ عہدوں پہ تعیناتی کے ذریعہ نام حاصل کریں۔ یہ لوگ اگست ۱۵۶۸ء میں بمقام آگرہ بارگاہِ اکبری میں حاضر ہوئے۔

اتگہ خیل کی معزولی کے بعد حسین قلی خاں اور اس کا بھائی اسمٰعیل قلی خاں صوبۂ لاہور کے انتظامات میں مصروف ہو گئے
(طبقات اکبری نظام الدین احمد صفحہ ۲۸۶)

اکبر پاک پٹن میں

اکبر نے مارچ ۱۵۷۱ء میں حضرت فرید الدین شکر گنج کے مزارِ مبارک کی زیارت کے لیے اجودھن کا سفر اختیار کیا۔ آج کل اس شہر کو پاکپٹن کہتے ہیں۔ شہر اور حضرت فرید الدین کا روضہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے کیونکہ دریائے ستلج کبھی اس شہر کے متصل بہتا تھا۔ جس سے اسے پتن شیخ فرید یا پاک پٹن کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ اجودھن بہت قدیم تاریخی شہر ہے۔ جو کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا۔ اس شہر کے بلند ٹیلے کے نیچے کئی آبادیوں اور کئی تہذیبوں کے آثار مدفون ہیں۔

اکبر کو سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بزرگوں سے بے حد عقیدت تھی اور یہی عقیدت اُسے بارگاہِ فریدیہ میں لے گئی۔

پاکپتن اس وقت خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ کی جاگیر میں تھا۔ اُس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک شاہانہ دعوت کا انتظام کیا۔ پاکپٹن سے نکل کر اکبر سیر و شکار سے دل بہلاتا اور دیپالپور ہوتا ہوا ۲ مئی ۱۵۷۱ء کو لاہور پہنچا۔ حسین قلی خان صوبہ دار نے رسومِ ارادت و خدمت ادا کیں۔ لاہور میں صوبہ دار کی درخواست پر اکبر نے اس کی تعمیر کردہ عمارات کو دیکھا۔ حکومت لاہور کے معائنہ کے بعد اکبر نے حصار کی راہ لی۔

۱۵۷۳ء میں لاہور کے امرا اور اکابر دربارِ شاہی میں ہدیہ عقیدت و مودت پیش کرنے کے لیے آگرہ گئے حسین قلی خاں اس جماعت کا سربراہ تھا۔ اکبر نے ان کی ارادت کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور انھیں شاہی اعزازات سے نوازا حسین قلی خاں کو خانِ جہاں کا خطاب ملا۔[1]

۱۵۷۵ء میں خانِ جہاں کو بنگال کی مہم پہ روانہ کیا گیا۔ اور لاہور کا صوبہ دار شاہ قلی خاں[2] محرم کو مقرر کیا گیا۔ جو بہادر اور

---

۱ - بدایونی منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۶۵ - اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۴۰ -

۲ - اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۲۳۰ - بدایونی جلد دوم صفحہ ۲۱۸ -

بہتر امید تھا۔

شاہ قلی محرم کی معزولی

۱۵۷۸ء میں ممالک محروسہ کا دورہ کرتے ہوئے صوبہ لاہور میں پہنچا کھوکھووال کے قریب دریائے بیاس کو عبور کرنے کے بعد آیا۔ یہاں داخل ہوا تو بہت سے فریادی پیش ہوئے ایک بارگاہ خسروی میں حاضر ہوئے کہ شاہ قلی محرم صوبہ دار لاہور ستمگروں اور جفاکاروں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں تساہل سے کام لیتا ہے۔ اور اسی باعث نظام حکومت کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ رعایا نواز بادشاہ نے ستم زدوں کی دلجوئی کی۔ شاہ قلی محرم عتاب شاہی کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ سعید خان صوبہ دار لاہور مقرر ہوا اسے رعایا پروری اور مظلوموں کی دادرسی کے لیے خاص ہدایات دی گئیں۔

مرزا حکیم کا دوسرا حملہ

محرم ۹۸۹ھ مطابق فروری ۱۵۸۱ء میں اکبر کا سوتیلا بھائی مرزا حکیم پھر لاہور پر حملہ آور ہوا۔[1] یہ حملہ اس نے محض کابل اور اپنے ماموں فریدون خان کی ترغیب پر کیا۔ اس کا مقصد ہندوستان کے تخت و تاج کو اپنے تصرف میں لانا تھا۔ اس کے ہراول دستوں کے سردار شادمان خان کو دریائے سندھ کے کنارے مان سنگھ نے جو اکبر کا راجپوت سردار تھا شکست دے کر مار ڈالا مگر مرزا حکیم دریائے سندھ عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اکبر کو اطلاع ملی تو اس نے سپاہ کو آٹھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے کر لاہور کا رخ کیا۔ دہلی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مرزا حکیم اپنے لاؤ لشکر سمیت لاہور پہنچ کر مہدی قاسم خان کے باغ میں مقیم ہے۔

مرزا کے لاہور پہنچنے پر سعید خان صوبہ دار لاہور اور بھگوان داس، مان سنگھ، سید حامد، محمد زمان وغیرہ امرائے رہے شہر میں بیٹھ گئے۔ دروازے بند کر دیئے اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ مرزا کے امرا شیر خواجہ، علی زدہ اور [illegible] وغیرہ شہر پر حملہ کرتے مگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اس دوران میں مرزا لاہور پر اپنے آدمی کی لاف زنی کے باوصف قابض نہ ہو سکنے پر بہت پریشان ہوتا رہا۔ اور اپنے متعلقین سے الجھتا رہا۔ اسی زمانہ میں اکبر کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور مرزا حکیم ۲۰ فروری ۱۵۸۱ء کو راہ پیمائے کابل ہوا۔ اس موقعہ پر مرزا حکیم اکیس روز لاہور میں مقیم رہا۔

راجہ بھگونت سنگھ صوبہ دار لاہور

جنوری ۱۵۸۳ء میں سعید خان کی جگہ راجہ بھگونت سنگھ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۵۸۴ء میں راجہ بھگونت سنگھ مرزا شاہ رخ کی معیت میں بادشاہ سے ملاقات کے لیے فتح پور سیکری گیا۔ اکبر نے ان کے استقبال کے لیے شیخ ابراہیم چشتی اور راجہ دانیال کو بہت سے دوسرے امرا کی معیت میں بھیجا۔ جو انہیں بصد احترام شاہی دربار میں لائے۔ ۱۶ فروری ۱۵۸۵ء کو بڑے تزک و احتشام سے شہزادہ سلیم کی شادی بھگونت سنگھ کی لڑکی سے ہوئی۔[2] ۱۵۸۶ء میں راجہ بھگونت سنگھ کو حکم ہوا کہ وہ راجہ مان سنگھ کو فوجی مدد دے۔ جو یوسف زئی پٹھانوں سے برسر پیکار تھا۔ دریائے سندھ پار کر کے وہ خیر آباد کی سرائے میں فوجی امور کا انتظام کر رہا تھا کہ یکایک

۱؎ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۳۰۴۔ فریدون خان مرزا حکیم کی والدہ ماہ چوچک بیگم کا بھائی تھا۔

۲؎ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۱۵۴ ۔ بدایونی جلد دوم صفحہ ۳۴۱۔

پاگل ہوگیا۔ اسے قابو کیے گئے۔ سامان خان نام ایک طبیب ایک روز اس کی نبض پکڑے اس کا طبی معائنہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگونت سنگھ نے خنجر نکال اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اکبر کو علم ہوا تو اُس نے چند اطبا کو جن کے نام حکیم حسن، حکیم ہمادیلہ اور دولت خان تھے راجہ کے پاس بھیجا تاکہ اس کے اعزہ جسے مناسب سمجھیں راجہ کے علاج کے لیے متعین کر دیں۔ انھوں نے یہ خدمت ہمادیلہ کے سپرد کی جس کے علاج سے ایک طویل مدت کے بعد راجہ کو افاقہ ہوا۔

اسماعیل قلی صوبہ دار لاہور

راجہ بھگونت سنگھ کی علالت پر اسمعیل قلی کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن بہت جلد نا تجربہ کاری اور رندی کے سبب وہ ہر دلعزیزی کھو بیٹھا۔ اور اکبر کی نگاہِ التفات سے محروم ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے معزول کر کے حج پر جانے کا حکم دیا۔

اکبر کی لاہور میں اقامت

مئی ۱۵۸۶ء میں اکبر نے لاہور کو دارالحکومت مقرر کیا اور یہاں اقامت اختیار کی تاکہ شمال مغربی سرحد اور افغانستان کی مہموں کی نگرانی ایک قریبی مقام سے کی جائے۔ علاوہ ازیں کشمیر اور سندھ کی فتح کی طرف توجہ مبذول کی جا سکے۔ مزید برآں اپنے آبائی وطن ترکستان کی بازیابی کا خیال مغل حکمرانوں کے دل سے کبھی نہ گیا تھا۔ انھوں نے بلادِ ہند میں رشکِ فردوس باغ، فلک رفعت محلات اور ترکی حمام بنوائے اور اپنے وطن کی سی فضا پیدا کی۔ وسیع علاقے مسخر کیے اور وہ خزائن جمع کیے کہ قارون کا خزانہ بھی اُن کے سامنے ہیچ تھا مگر فرغانہ کی یاد آلِ بابر کے دل سے نہ گئی۔ چنانچہ اکبر کے قیام لاہور کے مقاصد میں کشمیر، پٹھان قبائل اور سندھ کی فتح کے علاوہ وسطِ ایشیا کی تسخیر بھی شامل تھی۔

لاہور پہنچ کر اکبر راجہ بھگونت داس کی حویلی میں مقیم ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا قلعۂ شاہی اس قابل نہیں تھا کہ وہاں اقامت اختیار کی جائے۔ ۱۵۸۶ء کے اختتام تک اکبر کشمیر پر تسلط جما چکا تھا۔ اسی سال اُس نے مختلف صوبوں کے حکام کے تبادلوں کا فیصلہ کیا۔ اور یہ طے کیا کہ ہر صوبہ میں دو دو ایک ہی قابلیت کے حاکم مقرر کیے جائیں تاکہ اگر اُن میں سے ایک دربار شاہی میں آیا ہوا ہو یا کسی مہم میں مصروف ہو تو دوسرا انتظامِ ملک کی طرف متوجہ رہے۔ علاوہ ازیں مرکز سے بھی ایک دیوان اور ایک بخشی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں راجہ بھگونت داس کو دوبارہ صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ رائے بال سنگھ اُس کا نائب متعین ہوا (ابوالفضل۔ اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۱۱)

مرزا رستم صفوی کی آمد

اکبر ابھی لاہور میں مقیم ہوا ہی تھا کہ مرزا رستم نام ایک ایرانی شہزادہ جو شاہ اسمٰعیل صفوی والیِ ایران کا پوتا تھا۔ ناراض ہو کر لاہور چلا آیا۔ اور اکبر سے پناہ کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے اس کے استقبال کے لیے حکیم عین الملک، خانِ خاناں اور زین خاں کوکہ کو بھیجا جنھوں نے شہر سے چار کوس دور اُس کا شاہانہ استقبال کیا۔ اور کمالِ اعزاز سے اُسے شہر میں لائے۔ بادشاہ نے اُسے شرفِ ملاقات بخشا اور دلاسا دیا۔ سکونت کو مناسب مکان اور متعلقہ ساز و سامان کے علاوہ ایک کروڑ ٹنکہ نقد اور پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ کچھ عرصہ مرزا رستم لاہور کا گورنر بھی رہا۔ ۷۲ سال کی عمر میں اس نے شاہجہاں کے دور میں وفات پائی۔ اس کی ایک بیٹی دارا شکوہ کی بیوی تھی۔

مرزا نظام الدین کا انتقال

۱۵۹۳ء میں مرزا نظام الدین احمد سینتالیس سال کی عمر میں بمقام لاہور راہیِ ملکِ عدم

ہوئے اور انھیں اپنے باغ میں دفن کیا گیا۔ آج نہ اس مقبرے کا اور نہ ہی باغ کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ بدایونی کا بیان ہے کہ باشندگانِ لاہور میں شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہوگی جو اس سانحہ پر اشک بار نہ ہوئی ہو۔ مرزا ایک فقید المثال عالم اور مورخ تھا۔ اس کی کتاب طبقاتِ اکبری عصری واقعات کا ایک مستند ماخذ ہے۔

لاہور قیامِ شاہ کے سبب دارالحکومت بن چکا تھا اس لیے مرکزی دیوان اور بخشی ہی صوبائی حکومت کے ان عہدوں کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ٹوڈرمل اور بھگونت داس کی وفات

نومبر ۱۵۸۹ء میں اکبر کابل میں دورہ کر رہا تھا کہ اسے راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگونت داس کی وفات کی خبر ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور میں راجہ ٹوڈرمل کا انتقال ہوا۔ شمشان بھومی میں اسے جلا کر واپس آئے تھے تو راجہ بھگونت داس [illegible] ہوئی اور وہ بھی چل بسا۔

ٹوڈرمل اور بھگونت داس مقتدر امرائے دربار میں سے تھے۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ لاہور سے ٹوڈرمل نے بادشاہ کو ان کے دورۂ کابل کے زمانہ میں لکھا کہ بیماری اور بڑھاپے نے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے۔ موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ اجازت ہو تو گنگا جی چلا جاؤں اور وہیں زندگی کے آخری سانس لوں۔ بادشاہ نے پہلے تو اجازت دے دی مگر بعد ازاں اُسے کہلا بھیجا کہ آخری دم تک اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دیتے رہو۔ کیونکہ اس سے بڑی عبادت کوئی نہیں۔

اجازت نامہ ملنے پر ٹوڈرمل لاہور سے روانہ ہو گیا تھا۔ دوسرا فرمان اُسے لاہور سے پندرہ میل دور اپنے تعمیر کردہ تالاب کے کنارے ملا جہاں وہ خیمہ زن تھا۔ اس دیانت دار جفاکش اور وفا کیش سردار کی اطاعت شعاری ملاحظہ ہو کہ فرمانِ اکبری ملتے ہی اُلٹے پاؤں لاہور واپس آیا اور یہاں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور چونیاں کا باشندہ تھا۔ جو اب ضلع لاہور کی ایک تحصیل کا صدر مقام اور ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ وہاں اب بھی چند پرانی عمارتیں اور ٹوڈرمل کی حویلیاں موجود ہیں۔ لاہور میں بھی ٹوڈرمل نے عمارتیں بنوائیں۔ اس نے اکبر کے محکمہ مالیات کی از سرِ نو تنظیم کی اور اس میں نئی نئی اصلاحات جاری کر کے حکومت کے واجبات کی وصولی کا بہتر انتظام کیا۔ لاہور میں ٹوڈرمل کی حویلی بھاٹی دروازے کے اندر تھی۔ غالباً یہ وہی حویلی ہے جس میں آجکل لاہور کے مشہور علم دوست بزرگ فقیر سید غیث الدین قیام پذیر ہیں۔

ٹوڈرمل کا تالاب

ٹوڈرمل نے نواح لاہور میں آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے چند تالاب بنوائے تاکہ ان میں بارش یا سیلاب کا پانی جمع رہے اور سال بھر اس نواح کے زمینداروں کے کام آئے۔

ٹوڈرمل کا مذکورہ صدر تالاب کاہنا کاچھا ریلوے سٹیشن سے تقریباً ایک میل دور کاہنا گاؤں کے متصل واقع ہے۔ تالاب کافی وسیع و عریض ہے۔ مغلئی اینٹوں اور سفید چونے کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ہڈیارہ نالہ کا فالتو پانی بارش کے دنوں میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ ہڈیارہ اب بھی تالاب اور ریلوے لائن کے درمیان بہہ رہا ہے۔ تالاب میں بارش اور سیلاب کا پانی اب بھی جمع رہتا ہے۔ لیکن آج اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ سے زیادہ نہیں ہے۔ کیا خوب ہو کہ محکمہ آثارِ قدیمہ اسے محفوظ کرے۔ اور

محکمہ سیاحت نالہ اور بلند پارہ نالہ کے نواح کو ایک سیرگاہ بنا دے تو "عظیم تر لاہور" کی ایک اہم ضرورت اس سے پوری ہو سکتی ہے۔ مغلیہ دور کے نظام آبپاشی کے مطالعہ کے لیے اس کی حفاظت ضروری ہے۔

قلیچ خان صوبہ دار لاہور

صوبہ دار لاہور بھگوان داس اور دیوان سلطنت ٹوڈر مل کی وفات کے بعد قلیچ خان اندجانی نے صوبۂ لاہور کی باگ ڈور سنبھالی۔ بادشاہ نے مادھو سنگھ (ابوالفضل جلد سوم صفحہ ۵۷۰ - منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۷۱ - ۳۷۲) کو اس کی نیابت کے لیے روانہ کیا۔

قلیچ خان تین برس تک اس عہدے پر فائز رہا۔ یہ شخص ترکی امرا میں سے تھا اور اندجان کا باشندہ ہونے کے سبب بادشاہ کا ہم وطن تھا۔ لاہور میں دریا کے کنارے اس کا باغ تھا۔

خواجہ شمس الدین خوافی

سنہ ۱۵۹۲ء میں اکبر نے صوبوں کے انتظام کے لیے ایک نیا نظام رائج کیا۔ اس کے تحت ۱۲ فروری ۱۵۹۲ء کو پنجاب، ملتان اور کابل کے صوبوں کو شمس الدین خوافی کے سپرد کیا۔ یہ شخص خراسان کے ایک مردم خیز شہر خواف کا باشندہ اور دربار اکبری کا ایک معتمد رکن تھا۔ دو سال بعد سنہ ۱۵۹۴ء میں اسے لاہور کی ٹکسال کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ اس نے سکہ سازی کی اصلاح اور سکوں کے اوزان کے تعین کا انتظام کیا۔ لاہور میں ایک ٹکسال شہر کے شمالی جانب ٹکسالی دروازے کے اندر تھی۔ شہر کے وسط میں رنگ محل کے قریب ایک گلی بنام ٹکسالی بازار موسوم ہے۔ یہاں بھی کبھی ٹکسال رہی ہوگی۔ ایاز کی قبر اسی گلی کے متصل ہے۔

عرفی کی وفات

فارسی زبان کا قصیدہ بے مثال شاعر عرفی سنہ ۱۵۹۱ء میں بمقام لاہور راہیٔ ملک عدم ہوا۔ فصیل شہر کے متصل ایک تکیہ میں اسے دفن کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد کوئی شخص غلطی سے اپنے کسی عزیز کی قبر سمجھ کر اس کی ہڈیاں نجف اشرف لے گیا اور جوانا مرگ شاعر کا اپنا فرمودہ سچ ثابت ہوا۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنند و گر بہ تتار

شیخ مبارک کی وفات

۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) کو دربار اکبری کے مقتدر رکن فیضی، ابوالفضل اور ابوالخیر کے والد شیخ مبارک بمقام لاہور راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اس کی تاریخ ملا عبدالقادر بدایونی نے "شیخ کامل" سے نکالی ہے (منتخب التواریخ جلد سوم)۔

شیخ مبارک اپنے دور کے بلند پایہ عالم اور کامیاب مصنف تھے۔ چار جلدوں میں تفسیر قرآن بعنوان منبع العیون لکھی۔ آگرے میں ان کا مدرسہ تھا جہاں ان کے فرزندوں اور ملا عبدالقادر بدایونی کے علاوہ اور بہت سے ارباب علم نے تعلیم حاصل کی۔ اکبر کے قیام لاہور کے سبب یہ بھی لاہور رہتے تھے کہ نشانۂ تیر اجل ہوئے۔ لاہور میں ان کی حویلی جو مبارک حویلی کے نام سے موسوم ہے موچی دروازے کے اندر واقع ہے۔ اس وقت یہاں امام باڑہ ہے جسے لاہور کے مشہور قزلباش خاندان نے وقف کیا تھا۔ اگرچہ اس حویلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق کنہیا لال[1] نے ایک مختلف روایت بیان کی ہے مگر ہم نے جو کچھ بچپن میں بڑے

---

[1] تاریخ لاہور صفحہ ۳۳۷

پڑھوں سے رستا تھا لکھ دیا ہے۔ شیخ مبارک کی لاش کو تدفین کے لیے آگرہ لے جایا گیا۔

اکبری جہاز

۱۵۹۴ء میں اکبر نے لاہور میں راوی کے کنارے ایک جہاز[1] بنوایا جو ۵۳ گز لمبا تھا جس میں سال اور ملاطہ کی مضبوط لکڑیوں کے ۲۹۳۶ تختے خرچ ہوئے۔ اس کی تیاری پر شہنشاہ نے بہ نفسِ نفیس اسے دیکھے گئے اور راوی کے راستے اسے لہری بندر بھیجا گیا۔ دورِ مغلیہ میں راوی میں عام کشتی رانی ہوتی تھی۔ امرا کی سیر و تفریح کی سجی سجائی کشتیوں کے علاوہ بار برداری کی کشتیاں بھی چلتی تھیں اور لہری بندر تک سامان آتا جاتا تھا۔

بعض دیگر واقعات

اکبر کے قیام لاہور کے واقعات میں ایک تو راجہ کلیان مل کے بیٹے رائے سنگھ کی لڑکی سے شہزادہ سلیم کی شادی[2] ہے۔ دوسرا عبداللہ ایک حاکم توران نے اکبر کو خط لکھا جس میں اس کے الحاد کو ہدفِ اعتراض بنایا۔ اس کے جواب میں اکبر نے ایک وفد اس کے دربار میں بھیجا جو میران صدر جہاں اور حکیم ہمام پر مشتمل تھا۔ علاوہ ازیں ملک الشعرا فیضی نے کچھ عربی اشعار رکھے۔

قیل ان الالٰہ ذو ولد   قیل ان الرسول قد کہنا
ما نجا اللہ والرسول معا   من لسان الوری فکیف انا

فیضی کی وفات

۱۵۹۵ء میں دربار اکبری کا نامور عالم فیضی جو ایک مفسر اور عالم ہونے کے علاوہ ایک کامیاب سیاستدان اور نامور شاعر بھی تھا لاہور میں فوت ہوا۔ مرض الموت میں خود اکبر سرہانے گیا۔ وفات کے بعد اس کی نعش بھی باپ کی طرح تدفین کے لیے آگرہ لے جائی گئی۔

اکبر کی لاہور سے روانگی

۱۵۹۹ء تک اکبر نے لاہور کو دارالحکومت بنائے رکھا۔ اس سال دکن کی مہموں کے سلسلہ میں اکبر لاہور سے روانہ ہوگیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے آگرہ میں گزارے۔ لاہور سے روانگی پر اکبر نے بیگمات اور شہزادہ خرم کو یہیں چھوڑا۔ جو ایک سال بعد آگرہ گئے۔ شہزادہ خرم ۱۵۹۱ء (۱۰۰۰ھ) میں بمقام لاہور پیدا ہوا اور آٹھ نو برس کی عمر تک یہیں رہا۔ اس کی پرورش اور ابتدائی تربیت نامور دادا کی نگرانی میں ہوئی۔

خواجہ شمس الدین خوافی کی وفات

۱۶۰۰ء میں خواجہ شمس الدین خوافی صوبہ دار لاہور کا انتقال ہوا۔ یہ شخص ایک اچھا منتظم اور تجربہ کار کارکن تھا۔ اکبر کو اس کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ لاہور میں اس نے اپنی حویلی، حمام اور باغ وغیرہ تعمیر کرائے تھے۔ اس کی عمارات کا علاقہ جس میں اس کے اعزہ ملازمین اور شاگرد پیشہ رہتے تھے۔ محلہ خوافی پورہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جہاں اس کے خاندان کے لوگ زوالِ دولتِ تیموریہ تک آباد رہے۔ شمس الدین یہیں اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

شمس الدین کی وفات کے بعد اس کے بھائی مومن خاں کو صوبہ دار لاہور مقرر کیا گیا[3]۔ ۱۶۰۲ء میں اس اس عہدے پر قلیج خاں

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۶۵۱۔
[2] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۳۲۶ ۔ [3] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۱۴

کو دوبارہ متعین کیا گیا اور اکبر کی وفات تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔

عہد نورالدین جہانگیر

اکبر اعظم کی وفات کے بعد اُن کا چہیتا بیٹا سلیم ۳۶ سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اُس نے صوبہ لاہور کی باگ ڈور سعید خان کے سپرد کی جو معتمد اُمرا میں سے تھا۔ صوبہ دار آگرہ سے لاہور روانہ ہونے لگا تو شاہِ عادل نے اُسے کہا "میرا نقصان کبھی ظلم کو برداشت نہیں کرے گا خواہ ظالم کوئی ہو۔ ہماری نظر میں چھوٹا بڑا سب برابر ہیں۔ اگر تم نے یا تمہارے کارکنوں نے ظلم یا ناجائز سختی سے کام لیا تو بغیر کسی لحاظ کے تمہیں سزا دی جائے گی" شہنشاہ کی یہ نصیحت نہ صرف سعید خان بلکہ تمام درباریوں نے گوشِ ہوش سے سنی۔ [?]

خسرو کی بغاوت

جہانگیر کو تخت نشین ہوئے ابھی چھ ماہ نہ گزرے تھے کہ اُس کے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کر دی جہانگیر کی رائے ہے کہ جوانی کے خمار اور ناتجربہ کاری نے اور نالائق مصاحبوں کی فتنہ پردازی نے خسرو کو اس کام پر آمادہ کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۶۰۶ء کو وہ اکبر کے مقبرے کی زیارت کے بہانے قلعۂ آگرہ سے نکلا۔ اور اپنے خیر خواہ ساڑھے تین سو سواروں کے ہمراہ بھاگ گیا۔ جہانگیر کو خبر ملی تو وہ فی الفور اُس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ متھرا میں اُسے حسین بیگ بدخشانی ملا جو بدخشاں سے بارگاہِ شاہی میں آ رہا تھا۔ خسرو نے نامعلوم بہلا پھسلا کر اُسے کیا سبز باغ دکھائے کہ شیشے میں اُتار لیا۔ اس کے ہمراہ ایماق قبیلے کے دو سو بدخشانی نوجوان تھے۔ سیاہ بختوں کا یہ گروہ جہاں جاتا سوداگروں اور عام مسافروں کے قافلے لوٹ لیتا۔ ہوڈل پہنچ کر جہانگیر نے شیخ فرید کو چیدہ سواروں کے ایک دستے کے ہمراہ ہراول کے طور پر بھیجا۔

جہانگیر کے دلی پہنچنے پر خسرو پانی پت کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ دلاور خان نے جو بادشاہ کا وفادار تھا خسرو سے پیشتر لاہور کا رُخ کیا تاکہ راستے میں تمام تاجروں اور شاہی ملازموں کو اس حادثہ کی خبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرے۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق وہ خسرو سے قبل لاہور پہنچا۔ اور شہر کے دفاع کے انتظامات درست کئے۔ شاہی ملازمین اور باشندگانِ شہر نے بکمال وفاداری اُس کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے دو روز بعد خسرو لاہور پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اُس نے حکم دیا کہ جنگ کی تیاری کی جائے اور شہر کے کسی ایک دروازے کو جلا کر شہر میں گھسنے کا راستہ بنایا جائے۔ اُس نے اپنے ہمراہیوں سے وعدہ کیا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد وہ سات روز تک اسے لوٹنے کی اجازت دے گا۔ آخر کار خسرو کے ساتھی قلعے کا ایک دروازہ جلانے میں کامیاب ہو گئے مگر دلاور خان حسین بیگ دیوان اور نورالدین قلی کوتوال شہر کی مساعی سے فی الفور قلعہ شاہی کے دروازے کے پیچھے دیوار بنا دی گئی۔

سعید خان کشمیر کی مہم سے واپس آتے ہوئے چناب پر خیمہ زن تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ ایک دم لاہور روانہ ہو گیا۔ راوی کے کنارے پہنچ کر اُس نے قلعہ بند سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اُسے شہر میں داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ شب کی سیاہی میں اُسے چند ہمراہیوں سمیت قلعہ میں لے گئے۔

خسرو نے ابھی نو روز تک ہی اپنے محاصرے کو جاری رکھا تھا کہ لشکرِ جہانگیری کے پہنچنے کی خبر ملی۔ یہ سنتے ہی باغی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور انھوں نے محاصرہ اٹھا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور خسرو جالندھر کی طرف روانہ ہوا۔ جہانگیر کی آمد سے قبل اہالیانِ شہر نے دس بارہ ہزار سواروں کی منتخب فوج مرتب کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوج اکثر و بیشتر رضاکاروں پہ مشتمل تھی۔ بھیروال کے مقام پر جو جالندھر اور امرتسر کے درمیان دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے شاہی فوج اور خسرو میں جنگ ہوئی۔ شیخ فرید اور سادات بارہہ نے وفاداری اور جاں نثاری کے جوہر دکھائے۔ اور خسرو کو شکست دی۔ جہانگیر سلطان پور سے روانہ ہو کر گوبند وال کے پل پر تھا کہ شمسی توشک چی نے فتح کی خوش خبری سنائی اور بادشاہ سے "خوش خبر خان" کا خطاب پایا۔ توشک چی بادشاہ کے بستر وغیرہ سامانِ استراحت کا بندوبست کرنے والے افسر کو کہتے تھے۔ شیخ فرید نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ باغیوں کے بہت بڑے لشکر کو جو بدخشانی سواروں پہ مشتمل تھا شکست دی۔ خسرو نے شکست کے بعد کابل جانے کا فیصلہ کیا مگر سودھرا کے مقام پر دریائے چناب کو عبور کرتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ اسی اثنا میں جہانگیر لاہور آ کر مرزا کامران کے باغ میں مقیم ہو چکا تھا۔ لاہور میں مرزا کامران کا ایک باغ تو وہ تھا جس کی یادگار ایک شکستہ حال بارہ دری کنارِ آب حالات کی سنگ دلی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کا دوسرا باغ موجودہ ریلوے اسٹیشن کے نواح میں واقع تھا اور بقول لطیف[2] باغ دلکشا کہلاتا تھا موخر الذکر باغ کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جالندھر کی جانب سے لاہور آتے ہوئے جہانگیر اسی باغ میں خیمہ زن ہوا۔ اول الذکر باغ میں راوی کے اس پار جا کر خیمہ زن ہونا خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

جہانگیر کا بیان ہے کہ ۳ محرم ۱۰۱۵ھ کو باغ کامران میں خسرو کو ہتھکڑی اور بیڑی میں جکڑ کر چنگیزی قانون کے مطابق اس کی بائیں جانب سے سامنے لایا گیا۔ حسین بیگ اور عبدالرحیم اس کے ساتھیوں کو علی الترتیب اس کے دائیں اور بائیں کھڑا کیا گیا۔ خسرو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ حسین بیگ کو گائے کی تازہ کھال اور عبدالرحیم کو گدھے کی تازہ کھال میں بند کر کے گدھوں پر رکھ کر شہر میں پھرایا جائے تاکہ فتنہ پرداز عبرت حاصل کریں۔ چونکہ گائے کی کھال پہلے خشک ہو گئی اس لیے حسین بیگ چار پہر زندہ رہ کر دم گھٹنے سے مر گیا۔ گدھے کی کھال دیر میں خشک ہوتی ہے اور عبدالرحیم کے بعض ہوا خواہ اسے باہر سے تر بھی کرتے رہے اس لیے وہ زندہ بچ گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باغ کامران سے قلعہ تک سڑک کے دو طرفہ سولیاں نصب کی جائیں اور ان پر خسرو کے ساتھیوں کو جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی پھانسی دے دیا جائے۔ بادشاہ نے یہ منظر قلعہ لاہور کے شاہ برج سے دیکھا جو اکبر نے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے بنوایا تھا۔ خسرو کو ایک ہاتھی پہ بٹھا کر ان سولیوں کے درمیان سے گزارا گیا۔ اور ایک گرز بردار از روئے تمسخر اسے کہتا جاتا تھا کہ اپنے متبعین کی سلامی قبول فرمائیے۔ خسرو آہنی زنجیروں میں جکڑا پریشان حال، اداس و ملول بادلِ بریاں و دیدۂ گریاں یہ ہولناک منظر دیکھتا گزر گیا۔ جن لوگوں نے خسرو کی سرکوبی میں کارہائے

---

[1] تزکِ جہانگیری انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۶۷ - ۶۹ ۔ اردو ترجمہ از سلیم واحد سلیم صفحہ ۸۱ - ۹۶
اقبال نامہ جہانگیری معتمد خان رائل سوسائٹی ایڈیشن صفحہ ۱۴ - ۱۷

[2] سید محمد لطیف لاہور صفحہ ۴۳

نمایاں انجام دیتے تھے انہیں انعامات سے نوازا گیا۔ مثلاً شیخ فرید بخاری کو مرتضیٰ خان کا خطاب دیا گیا اور بھیرووال بطور جاگیر عطا ہوا۔ اور جن لوگوں نے باغی شہزادے کی مدد کی تھی انہیں سخت سزائیں دیں۔ بدقسمتی سے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو بھی اس لپیٹ میں آ گئے۔ گرو صاحب کا قیام بیاس کے کنارے گوبندوال میں تھا جہاں لوگ حصولِ خیر و برکت کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ جب باپ کا باغی خسرو لاہور کی جانب آتا ہوا گوبندوال کے پاس ٹھہرا تو گرو جی نے نہ صرف اُس کی مالی امداد کی بلکہ اُس کے ماتھے پر زعفران کا ٹیکا لگاتے ہوئے اُسے اشیرباد دی ظاہر ہے اس سے گرو جی کے تمام معتقد خسرو کے ہوا خواہ بن گئے۔ بادشاہ نے خسرو کے زوال کے بعد ان کی تمام جائیداد ضبط کر دی اور انہیں قتل کرا دیا۔

باغیوں کو سزا دینے کے بعد بادشاہ کامران کے باغ سے قلعۂ شاہی میں چلا آیا اور وہاں تقریباً ایک سال ٹھہرا۔ اس کے بعد صوبہ کابل کے دورے اور سیر و شکار کی نیت سے ۱۶ مارچ ۱۶۰۷ء کو قلعہ سے نکلا اور راوی کے دوسرے کنارے باغ دلآمیز میں چار دن ٹھہرا۔ یہاں اُس نے لاہور کی حکومت قلیج خاں کے سپرد کی اور اُسے ہدایت کی کہ میراں صدر جہاں اور میر شریف آملی کے مشورے سے امور حکومت کو انجام دے۔

کابل کی سیاحت سے بادشاہ سلامت بخیریت تین دسمبر ۱۶۰۷ء کو لوٹے اور تقریباً دو ہفتے یہاں قیام کر کے آگرہ کو رخصت ہوئے۔ شب برات کا تہوار لاہور میں منایا گیا اور یہاں قوام الدین کو دیوان، شیخ یوسف کو بخشی اور جمال الدین کو کوتوال مقرر کر کے انہیں حسب حیثیت خلعت عطا کیے گئے۔ صوبہ داری پر قلیج خاں ہی قائم رہے۔

شیخ فرید صوبہ دار لاہور

۱۶۱۱ء میں قلیج خان کو چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دے کر صوبہ کابل میں بھیج دیا تاکہ شرپسند باغیوں کا قلع قمع کر کے وہاں امن قائم کرے اور مرتضیٰ خان شیخ فرید بخاری کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ شیخ فرید بخاری نے لاہور میں اپنی عمارات (حویلی۔ باغ۔ حمام وغیرہ) بنوائیں۔ اور اُن کے متصل ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ یہ عمارات بھاٹی دروازے کے باہر لوئر مال پر اُس نواح میں واقع تھیں جہاں آج ڈسٹرکٹ کورٹس اور تحصیل وغیرہ کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ شیخ فرید کی عمارتیں سکھ گردی میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ شیخ فرید نے بادشاہ کی اجازت سے قلعۂ کانگڑہ پر حملہ کیا۔

اگرچہ قلعہ بعد میں فتح ہو گیا لیکن ۱۶۱۶ء میں شیخ فرید بخاری کا انتقال ہو گیا۔ جہانگیر نے تزک[1] میں مرحوم کی خدمات کا ذکر کر کے اظہارِ تحسین فرمایا ہے۔

لاہور میں وبا

اسی سال ملک بھر میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا پنجاب کے بعض علاقوں سے شروع ہو کر لاہور پہنچی جس کی وجہ سے بے شمار لوگ لاہور میں ہلاک ہو گئے۔ لاہور سے یہ وبا سرہند۔ دوآبِ گنگ و جمن اور دہلی تک گئی۔ اس کی وجہ سے شہروں کے شہر اُجڑ گئے اگرچہ تزک میں جہانگیر نے اس بیماری کا نام نہیں لیا مگر قرائن سے کہا جاتا

---

[1] تزکِ جہانگیری۔ انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۴۲۔ ۳۴۴۔

ہے کہ یہ وباطاعون تھی۔

تزکِ جہانگیری کے اُردو مترجم سلیم واحد سلیم صاحب کا خیال ہے کہ یہ بخاری ملیریا تھی۔ یہ وبا آٹھ سال تک مغلیہ ہند کے شہروں میں تباہی پھیلاتی رہی۔[1]

مرزا غیاث صوبیدار لاہور

مرتضیٰ خاں شیخ فرید بخاری کی وفات کے بعد مرزا غیاث بیگ (نورجہاں کے والد) کو لاہور کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ آقا فاضل کو اُن کا نائب بنایا گیا اور ایک سال بعد ۱۶۱۷ء میں آقا فاضل کو فاضل خاں کا خطاب اور اعتماد الدولہ کو بادشاہ کے خاصہ کے ہاتھیوں میں سے جگجوت نام ایک ہاتھی بطور انعام دیا گیا۔

۱۶۱۸ء میں اعتماد الدولہ مدار المہام یعنی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور ان کی سفارش پر صوبہ لاہور کی حکومت قاسم خاں کے سپرد کی گئی۔ یہ پہلے احدیوں کے بخشی تھے۔ قاسم خاں اعتماد الدولہ کا داماد اور نورجہاں کی بڑی بہن منیجہ بیگم کا شوہر اور بادشاہ کا ہم زلف تھا۔

بادشاہ شیخوپورہ میں

۱۶۲۰ء مطابق سنہ ۱۰۳۰ھ میں کشمیر سے واپسی پر بادشاہ نے جہانگیر آباد (موجودہ نام شیخوپورہ) اور شاہی شکارگاہ ہرن مینار میں شکار کھیلا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ شاہزادگی کے زمانے میں یہ جگہ اُس کی شکارگاہ تھی۔ اور اُس نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کر کے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی اور اسے سکندر معین کے سپرد کیا تھا۔ اس وقت نام شیخوپورہ تھا تخت نشینی کے بعد بادشاہ نے جہانگیر آباد رکھ دیا مگر وہ رائج نہ ہوسکا۔ تخت نشینی کے بعد یہ گاؤں سکندر معین کو بطور جاگیر دیا گیا اور حکم دیا کہ یہاں ایک تالاب، مینار اور دولت خانہ (یعنی قلعہ) تعمیر کیا جائے۔ اُس کی وفات کے بعد یہ جاگیر ارادت خاں کو ملی جس نے ان عمارات کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ڈیڑھ لاکھ کے خرچ سے یہ عمارات مکمل ہوئیں۔ بقول جہانگیر یہ شکارگاہ بادشاہوں کے شایانِ شان ہے۔ اس جگہ حاکم لاہور نے حاضرِ خدمت ہو کر شرفِ حضوری حاصل کیا اور بطور نذر پچاس مہریں پیش کیں۔ یہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ دریائے راوی کے کنارے مومن عشقباز[2] کے باغ میں خیمہ زن ہوا۔ یہ باغ دریائے راوی کے کنارے تھا اور اس میں چنار اور سرو کے نہایت عمدہ پیڑ تھے بادشاہ نے تزک[3] میں باغ کی تعریف کی ہے مگر آج نہ کوئی مومن عشقباز کو جانتا ہے اور نہ اس نواح میں اس باغ کا محلِ وقوع بتا سکتا ہے۔

کوس میناروں کی تعمیر

چودھویں سال جلوس[4] یعنی ۱۶۱۸ء میں بادشاہ نے حکم دیا کہ آگرہ سے لاہور تک شاہراہِ اعظم پر ہر کوس کے فاصلے پر ایک مینار تعمیر کیا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر ایک

۱؎ اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۸۸، ۸۹۔ تزک انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۴۴۰۔ اردو ترجمہ صفحہ ۴۴۸۔

۲؎ "عشقباز" دورِ مغلیہ میں بطور اصطلاح کبوتر باز کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

۳؎ تزک انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحہ ۱۸۲، ۱۸۳۔ اردو ترجمہ صفحہ ۶۵۳۔ اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۷۱

۴؎ تزکِ جہانگیری اُردو ترجمہ صفحہ ۵۷۳۔

کنواں کھدوا جاتے تاکہ مسافر ان کنوؤں سے فائدہ اٹھائیں۔ جہانگیر تزک میں رقمطراز ہے کہ اس سے قبل اس کے حکم سے آگرہ سے دریائے اٹک تک سڑک کے دونوں طرف درخت لگائے گئے تھے۔ آگرہ سے بنگال تک اس سے قبل اسی طرح درخت لگائے جا چکے تھے۔ ان انتظامات کے بعد مغلیہ سلطنت میں سفر کرنا بے حد آرام دہ ہو گیا۔ جہانگیر کے بنوائے ہوئے کوس مینار اب بھی پرانی شاہی سڑک پر لاہور اور آگرہ کے درمیان ملتے ہیں۔ لاہور میں ایک کوس مینار ریلوے اسٹیشن سے مشرق کی جانب جہاں مغلپورہ اور امرتسر کی طرف جانے والی ریلوے لائنیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ دونوں لائنوں کے درمیان اس جرنیلی سڑک کے متصل جو گڑھی شاہو سے مغل پورہ کے کارخانوں کی طرف جاتی ہے واقع ہے۔ یہ مینار فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے اگرچہ اس کوس مینار کے متصل اس وقت پرانی شاہراہ کے آثار نہیں ملتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے مغلیہ دور کی شاہراہ گزرتی ہوگی۔ یہ شاہراہ شہر کے دہلی دروازے سے نکل کر محلہ چوک دارا سے ہوتی ہوئی محلہ مغل پورہ میں آجاتی تھی اور مغل پورہ سے ہوتی ہوئی دہلی کی جانب چلی جاتی تھی۔

جہانگیر قلعہ لاہور میں

پیر کے روز ۵ محرم سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق ۳۰ نومبر سنہ ۱۶۲۰ء کو جہانگیر اندر نام ایک ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں گیا اور سارا راستہ سڑک پر سیم و زر کے سکے لوگوں میں لٹاتا گیا۔ اور چار بجے بعد دوپہر قلعے میں داخل ہوا۔

بادشاہ نے قلعہ کی اس قیام گاہ میں نزولِ اجلال فرمایا جو معمور خان کے زیر اہتمام حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ بادشاہ لکھتا ہے کہ دلکش محلوں اور روح افزا نشیمن گاہوں کو کمال شائستہ روزگار معماروں نے تعمیر کیا ہے اور چابک دست مصوروں نے کمال نزاکت سے منقش کیا ہے اور در و دیوار کو تصویر کشی سے زینت بخشی ہے۔ علاوہ ازیں سر سبز و شاداب باغیچوں سے جو محل سے متصل ہیں اعلیٰ قسم کے پھولوں کا نظارہ دلفریب و دلکش ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

ان عمارتوں پر سات لاکھ کے قریب روپیہ خرچ ہوا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادہ خرم کے نئے محل کو ملاحظہ فرمایا۔ قاسم خان حاکم لاہور کی دعوت پر بادشاہ اس کے باغ میں گئے۔

سنہ ۱۶۲۳ء میں قاسم خان کی جگہ صادق خان[1] کو چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب دے کر صوبہ دار لاہور مقرر کیا۔

سنہ ۱۶۲۵ء میں کابل سے واپسی پر بادشاہ لاہور ٹھہرا اور یمین الدولہ آصف خان کو صوبہ دار[2] لاہور مقرر کیا۔ علاوہ ازیں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ بھی اسے پیش کیا گیا۔

---

[1] تزک انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۵۹، اردو ترجمہ صفحہ

[2] معتمد خاں۔ اقبال نامہ جہانگیری ۲۷۸۔ مآثر الامرا انگریزی ترجمہ جلد اول صفحہ ۲۸۷

جہانگیر کی وفات

اکیسویں سالِ جلوس (۲۶-۱۶۲۵ء) کے آخری ایام میں بادشاہ راہ پیمائے کشمیر ہوا اور بائیسویں
سالِ جلوس کے آغاز تک وہاں مقیم رہا۔ لاہور سے روانگی کے وقت ان کی طبیعت ناساز تھی۔
اقامتِ کشمیر سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ بیماری بڑھتی رہی اور بادشاہ کمزور ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ گھوڑے پر بھی سوار نہ ہو سکتا تھا
اور پالکی میں ادھر اُدھر جاتا تھا۔ آخر موسمِ سرما کے آغاز کے وقت بادشاہ نے لاہور آنے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اسی اثنا
میں بہرام گلہ پہنچ کر شکار کا پرانا شوق عود کر آیا۔ مگر یک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے حضرت شہنشاہ کی طبعِ رنجور کو اور اداس
کر دیا۔ ایک پہاڑی لڑکا جو شکار کے جانوروں کو گھیر کے نشانہ کی زد میں لاتا تھا۔ ایک بلند چٹان پر سے پھسل کر نیچے گرا۔ اس
نے ایک جھاڑی کو پکڑ کر جان بچانے کی کوشش کی لیکن جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی اور وہ فضا میں معلق ہو کر زمین پر آ گرا۔ اور راہی
ملکِ عدم ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اُن کی بے قراری اور بے آرامی بڑھتی گئی اور راجوری پہنچ کر حالت بگڑنے لگی۔ اور تنفس میں
دشواری پیدا ہو گئی۔ صبح کے قریب اُن کی سانس اکھڑنی شروع ہوئی۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو صبح
کے وقت بادشاہ کی روح اُن کے وجودِ خاکی کو الوداع کہہ کر عالمِ بقا کو روانہ ہو گئی۔[1]
لاش لاہور لا کر دریائے راوی کے اُس پار نور جہاں کے باغ میں دفن کی گئی۔ جہاں شاہ جہاں نے وہ نادرۂ روزگار
مقبرہ بنوایا جو آج تک زیارت گاہِ خلق ہے۔

عہدِ شہاب الدین شاہجہان

گوسفندِ قربانی مرزا داور بخش

راجوری میں جہانگیر کا انتقال ہوا تو شاہجہان دکن میں تھا۔ اُس کا خسر یعنی ملکہ
ممتاز محل کا باپ آصف خاں شاہی لشکر کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ کے انتقال پر
اُس نے فی الفور بنارسی نام ایک ہرکارے کو دکن روانہ کیا۔ خط لکھنے کا وقت نہ تھا اس لیے اپنی مہر کی انگشتری بطورِ ثبوت
ہرکارے کے سپرد کی۔ مجبوری میں خسرو کا بیٹا داور بخش بحالتِ نظربندی لشکرِ شاہی کے ہمراہ تھا۔ آصف خاں نے ایک
سیاسی چال چلی اور خانِ اعظم ارادت خاں کو اعتماد میں لے کر داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ جب وزیرِ سلطنت
آصف خاں نے اُسے یہ خوش خبری سنائی تو اُسے یقین نہ آیا۔ آخر اُسے گھوڑے پر بٹھا شاہی چتر لگا کر لشکر میں لے جایا گیا
تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ داور بخش زیب دہِ تخت و تاج ہو گئے ہیں۔ اور مغلیہ سلطنت کا تخت خالی نہیں۔
اسی اثنا میں نور جہاں نے بارہا بھائی کو ملاقات کے لیے بلایا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتا رہا اور یہیں سے نہ
ملا۔ نور جہاں نے جہانگیر کے ایک فرزند شہزادہ شہریار سے اپنی دختر لاڈلی بیگم کی شادی کی ہوئی تھی۔ یہ لاڈلی بیگم اُس کے
پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔ شہریار اس وقت لاہور میں تھا۔ نور جہاں کی خواہش شہریار کو تاجدارِ ہند بنانے کی تھی تاکہ اُس کا
اقتدار قائم رہے۔ آصف خاں نے اپنی لڑکی ارجمند بانو کی شادی شہزادہ خرم شاہجہان سے کی ہوئی تھی۔ اُس کی چال یہ تھی

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری۔ معتمد خان صفحہ ۲۹۰ - ۹۲۔

کہ شاہجہان باپ کا جانشین ہے اور اس کی بیٹی ملکۂ ہندوستان کہلائے۔ اس لیے اس نے معتمد کارکنوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ملکہ پر کڑی نگرانی رکھیں اور اسے کسی سے ساز باز نہ کرنے دیں۔

بیچارے داور بخش کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ بیچارہ شاہجہان کے پہنچنے تک شاہ شطرنج بنایا گیا تھا۔ بھمبر کے قریب کوچ کرتے نماز جمعہ کا وقت آیا تو داور بخش کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

لاہور میں شہریار کو باپ کے انتقال کی خبر ملی تو اس نے اپنی بیوی لاڈلی بیگم کے مشورے سے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں جو شاہی خزانہ وغیرہ تھے ان پر قبضہ کر لیا۔ امرا اور عوام کو اپنا حامی بنانے اور فوج جمع کرنے کے لیے اس نے بے دریغ روپیہ لٹانا شروع کر دیا اور ایک ہفتہ میں ستر لاکھ کے قریب روپیہ خرچ کر دیا۔ جہانگیر کے بھائی دانیال کا بیٹا مرزا بایسنغر بھی اس سے مل گیا۔ جسے سالار فوج مقرر کیا گیا۔ شہریار نے دریا کے کنارے اپنی فوج پھیلا دی۔ آصف خان بے شمار فوج کی معیت میں داور بخش کو شاہی ہاتھی پر سوار کر کے اور خود دوسرے ہاتھی پر بیٹھے لاہور کی طرف بڑھا۔ شہر سے تین کوس کے فاصلے پر گجرات کی طرف جانے والی سڑک پر شہریار کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ پہلے ہی حملہ میں شہریار کی سپاہ تتر بتر ہو گئی۔ شہریار خود دو تین ہزار سواروں کی معیت میں شہر سے متصل اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک ترکی غلام نے شکست کی خبر سنائی۔ جسے سنتے ہی شہریار گھبرا گیا اور دشمن سے مقابلہ کرنے کا کوئی پروگرام نہ بنا سکا۔ اور گھبرا کر قلعہ میں گھس گیا۔ اگلے روز شاہی لشکر لاہور پہنچا اور اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محافظین قلعہ سے آصف خان کی ساز باز ہو گئی اور رات ہی رات خان اعظم ارادت خان قلعہ میں گھس گیا۔ اگلے روز باقی امرا اور فوج قلعہ پر قابض ہو گئی۔ شہریار حرم سرا میں چھپ گیا مگر ایک خواجہ سرا اسے پکڑ لایا اور داور بخش کے حضور پیش کر دیا جس نے اس کی نظربندی کے احکام نافذ کیے۔ اور دو تین روز بعد اسے اندھا کر دیا گیا۔ آصف خان نے خفیہ طور پر ان تمام واقعات کی رپورٹ لاہور سے شاہجہان کو بھیج دی۔

شاہجہان کی تخت نشینی

بنارسی نام ہندو ہرکارہ جسے آصف خان نے کشمیر سے دکن بھیجا تھا ۲۰ دن کے بعد ۱۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو جنیر کے مقام پر شاہزادے سے جا ملا۔ باپ کے انتقال کی خبر سن کر شاہجہان نے رسوم ماتم ادا کیں اور ۲۰ دسمبر کو شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اسی اثنا میں شاہجہان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ داور بخش عرف مرزا بلاقی جو کل تک شہنشاہ ہندوستان تھا اپنے بھائی گرشاسپ سمیت قید کر دیا گیا[1] اور چند روز بعد دونوں بھائی شہریار اور شہزادہ دانیال کے بیٹے طہمورث اور ہوشنگ لاہور ہی میں قتل کر دیے گئے۔

شاہجہان کی تخت نشینی کے فوراً بعد خدمت پرست خان رضا بہادر کو لاہور کا حاکم بنا دیا گیا۔ مگر جلد ہی یہ عہدہ آصف خان کے سپرد کیا گیا۔ چونکہ اس کے سپرد وزارت کا عہدہ اور دیگر اہم فرائض تھے۔ اس کی جگہ ۱۶۲۸ء ہی میں

۱؎ اقبال نامہ جہانگیری معتمد خان ص ۳۰۳۔

قلیچ خان کو مقرر[1] کیا گیا۔ مگر ایک سال بعد اس کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا اور اس کی جگہ عنایت یزدی کو حاکم لاہور مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۶۳۲ء میں اسے نااہلی کی وجہ سے اس عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ وزیر خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔

شاہجہان کا زمانہ ثقافتی اور صنعتی ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں بہت کم سیاسی واقعات اور جنگی مہمیں وقوع پذیر ہوئیں۔

دارا شکوہ کی علالت

شاہجہان اپنے ساتویں سال جلوس یعنی سنہ ۱۶۳۴ء میں لاہور آتے ہوئے بیاس کے کنارے خیمہ زن تھا۔ کہ دارا شکوہ کی بڑی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کا اثر شہزادے کی طبیعت پر ہوا۔ اس کی صحت رنج و الم سے خراب ہو گئی۔ اور آخرکار اسے تپ محرقہ ہو گیا۔ اس بنا پر نہ صرف شہنشاہ، بلکہ جہاں آرا کو بھی بے حد قلق ہوا۔ ہم سفر اطبا شہزادے کی تشخیص مرض نہ کر سکے اس پر بادشاہ نے وزیر خان کو بلایا جو فن حذاقت میں ماہر اور شہزادوں کی طبیعت سے واقف تھا۔ شاہی فرمان ملتے ہی وزیر خان کیمپ میں پہنچا اور شہزادے کا مناسب طریقے سے علاج کیا۔ اس کی تندرستی کے بعد شاہی قافلہ لاہور کی طرف بڑھا۔ اور شہر سے متصل خواجہ ہوشیار کے تالاب کے کنارے ۵ اپریل سنہ ۱۶۳۴ء کو خیمہ زن ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ ہوشیار کا تالاب کہاں تھا۔

شاہجہان لاہور میں

اگلے روز بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی طرف گئے۔ وزیر خان صوبہ دار لاہور نے عمائد و اکابر شہر کو ساتھ لے کر بادشاہ کا استقبال بڑے تزک و احتشام سے کیا۔ بادشاہ سلامت قلعہ میں داخل ہوئے اور وزیر خان نے زر و جواہر نقرئی و طلائی ظروف۔ قالین، گھوڑے، اونٹ تمام سامان جو تقریباً چار لاکھ روپے کی مالیت کا ہو گا بادشاہ[2] کی نذر کیا۔

۲۰ اپریل سنہ ۱۶۳۴ء کو شہنشاہ اور شاہزادگان کو یمین الدولہ آصف خان نے اپنے محل میں مدعو کیا۔ اس دعوت پر آصف خان نے اپنے دل کے تمام حوصلے نکالے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ محل قلعہ کے نواح میں تھا اور شاہی مسجد کے جنوب کی طرف نخاس کا میدان تھا۔ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ نخاس دہلی دروازے کے باہر موجودہ لنڈا بازار کے نواح میں تھا۔ نخاس سرائے کی طرح ایک عمارت ہوتی تھی جس میں چاروں طرف کمرے اور دکانیں ہوتی تھیں ان میں تاجر اپنا مال فروخت کرتے تھے۔ درمیان میں وسیع میدان تھا۔ اس میدان میں بھی سوداگر مختلف اجناس لاتے تھے جن میں لونڈی غلام اور ہاتھی گھوڑے اونٹ سے لے کر سوئی سلائی تک ہر چیز شامل ہوتی تھی۔ لاہور میں بیرون دہلی دروازہ جو نخاس تھا اس کا کاشی کار صدر دروازہ جو بہت خوب صورت تھا۔ انگریزی دور کے آغاز تک موجود تھا۔ میاں سلطان ٹھیکیدار نے سرائے اور لنڈا بازار کی تعمیر کے وقت حویلی آصف خاں چوک دارا وغیرہ عمارات کے کھنڈروں کو صاف

۱؎ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد اول صفحہ ۱۲۱، ۱۲۵۔ شاہجہان نامہ محمد صالح کمبوہ جلد اول صفحہ ۳۰۵ و ۲۷۱

۲؎ ملا محمد صالح کمبوہ۔ شاہجہان نامہ (عمل صالح) جلد دوم صفحہ [illegible]

بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰۹۔

کر کے اپنشیں حاصل نہیں تو اس دروازے کو بھی مسمار کرا دیا۔ آصف خاں کی حویلی اسی نواح میں واقع تھی اور اس محلے میں بیس لاکھ روپیہ کے صرف سے دس سال کی مدت میں تعمیر ہوئی تھی۔[1]

تعمیر عمارات

اقامتِ لاہور کے زمانہ میں شاہجہان نے قلعہ کی عمارات کی مرمت کرائی اور بہت سی نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ بعض عمارتیں پرانی عمارتوں کو مسمار کرنے کے بعد از سر نو بنوانی پڑیں۔ چنانچہ جہانگیر کے تعمیر کردہ شاہ برج کو یمین الدولہ آصف خاں کے ذوق کے مطابق اس کی نگرانی میں از سر نو بنوایا گیا۔ وزیر خان کی نگرانی میں غسل خانہ اور خواب گاہ کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اس دعوت کے بعد شہنشاہ نے شیخو پورہ کے ہرن مینار میں سیر و تفریح کے سلسلہ میں تین دن گزارے۔ یہاں بھی تالاب کی درمیانی بارہ دری جو جنت مکانی جہانگیر کی تعمیر کردہ تھی مسمار کرا کے از سر نو بنوانے کا حکم دیا اور اس پر ۸۰ ہزار روپیہ خرچ کیا۔

درویشوں سے ملاقات

اسی دوران میں بادشاہ نے حضرت میاں میر سے ملاقات کی۔ جو سلسلہ قادریہ کے ایک مقتدر بزرگ تھے۔ ان کی علمی اور روحانی عظمت کی بہت دھوم تھی۔ چونکہ حضرت میاں میر کو دنیاوی زر و جواہر کی پرواہ نہ تھی۔ اس لیے بادشاہ نے ان کی خدمت میں ایک تسبیح اور ایک سفید پگڑی بطور نذرانہ پیش کی۔

علاوہ حضرت میاں میر کے بادشاہ نے شاہ بلاول سے بھی ملاقات کی جو زہد و تقدس کے باعث لاہور اور نواحِ شہر میں بہت معروف تھے۔

زیارت مقبرۂ جہانگیر

اسی دوران میں شاہ جہاں اپنے باپ کے مقبرے کی زیارت کو بھی گیا اور وہاں حاجتمندوں میں دس ہزار روپیہ متوفی کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کیا۔

وزیر خاں کا تبادلہ

بارھویں سال جلوس (۱۰۴۹ھ مطابق ۱۶۳۹ء) میں شاہ جہاں کابل سے لاہور آ رہا تھا تو اسے یہ شکایت ملی کہ وزیر خاں حاکم لاہور سے کچھ نامناسب حرکات سرزد ہوئی ہیں اور لوگ اس سے ناراض ہیں۔ بادشاہ نے اس کے تبادلے کے احکام صادر فرمائے اور اس کی جگہ معتمد خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔

علی مردان خاں کی آمد

شہنشاہ ایران کی طرف سے علی مردان خاں قندھار کا گورنر تھا۔ اگرچہ وہ حکمران خاندان کے رشتہ داروں میں سے تھا تاہم اس کے تعلقات شاہ اور اس کے وزیر سے خراب ہو گئے۔ اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے قندھار ان کے حوالے کیا۔ شاہجہان نے علی مردان خاں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بڑی عزت افزائی کی اور اسے اپنے اعلیٰ منصب داروں میں جگہ دی۔ علی مردان خاں پہلی بار لاہور میں شاہجہان سے ملا۔ وہ قلعہ میں پہنچا تو معتمد خان میر بخشی اور تربیت خاں نے اس کا استقبال کیا۔ خان نے شہنشاہ کے حضور پہنچ کر سونے کی ایک ہزار مہریں نذر کیں۔ شہنشاہ نے اسے خلعتِ فاخرہ مرصع جیغہ اور جڑاؤ خنجر ڈھال تلوار سمیت عطا کیا۔ اور ایک خاص ہاتھی کوہ شکن نام بطور تحفہ دینے کے علاوہ چھ ہزار کا منصب بخشا۔ اعتماد الدولہ کی حویلی وقتی طور پر سکونت کے لیے دی۔ علاوہ ازیں ۱۰ لاکھ روپیہ بطور سفر خرچ

---

[1] عمل صالح جلد دوم صفحہ ۸ ۔ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳

... ہزار روپیہ ملازموں کے لیے عطا کیا۔ الغرض علی مردان خاں کو اپنے ملک سے غداری کا اچھا صلہ مل گیا۔ مغلیہ سلطنت کو فائدہ یہ ہوا کہ قندھار کے علاوہ ایک ماہر انجینئر اور سمجھ دار منصب دار مل گیا جس نے لاہور میں عالیشان عمارات بنوائیں۔ مغلپورہ میں علی مردان خاں نے اپنی والدہ کا فلک بوس مقبرہ بنوایا۔ بعد ازاں وہ خود بھی اسی مقبرہ میں دفن ہوا۔ سکھوں کے دور میں اس مقبرہ کا بہت سا پتھر اتروا لیا گیا۔ اس سے عمارت کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کی تزئین و آرائش ختم ہو گئی۔ یہ شکستہ حال مقبرہ مغل فن تعمیر کی ایک اہم مثال ہے۔ اور جس سے مغلیہ عظمت کے مٹتے ہوئے آثار نمایاں ہیں ریلوے سٹور اور کیریج شاپ کے درمیان موجود ہے۔

علی مردان خاں ایک سرد ملک سے تازہ تازہ آیا تھا شاہجہان نے اسے کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ اور اس کے متعلقین کو بھی اعلیٰ عہدے دیئے۔

لاہور میں شاہ جہان کے مشاغل

قیام لاہور کے زمانے میں شاہجہان بارہا جہانگیر کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا اور وہاں ہزاروں روپے فقیروں، مسکینوں، عالموں، حافظوں اور ان لوگوں میں تقسیم کیے جو مقبروں کے متعلقہ اداروں سے وابستہ تھے۔ معراج شریف اور بارہ وفات کے موقعوں پر بھی بے انتہا روپیہ مسکینوں میں تقسیم کیا گیا۔ لاہور میں بادشاہ اور امرا کی طرف سے جن میں آصف خان۔ علی مردان خان۔ وزیر خان اور افضل خان شامل تھے۔ عیش و نشاط کی ایسی ایسی محفلیں ترتیب دی گئیں کہ چشم فلک نے ان کی نظیر نہ دیکھی ہو گی۔

تیرھویں سال جلوس میں (سنہ ۱۰۴۹ھ مطابق سنہ ۱۶۳۹ء) علی مردان خاں نے بادشاہ کے حضور درخواست دی کہ اس کے متعلقین میں ایک شخص ہے جو نہریں نکالنے کے فن میں ماہر ہے۔ اسے اجازت دی جائے کہ وہ راوی سے ایک نہر اس مقام سے نکالے جہاں وہ میدان میں داخل ہوتا ہے اور اس نہر کا پانی بادشاہی باغات کو سیراب کرنے کے علاوہ نواح لاہور کے باغات کی آب پاشی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس ماہر کا نام بعض مورخوں میر جانی بیگ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا مقبرہ شالامار کے قریب موجودہ باغبانپورہ کی حدود میں واقع تھا۔ انگریزی دور میں اسی شخص نے جس کی تحویل میں یہ مقبرہ تھا اسے مسمار کر کے جگہ اپنے مکان میں شامل کر لی۔ مقبرے کے نواح میں جو محلہ آباد ہے اس کا نام محلہ جانی بیگ رکھا گیا ہے۔

شاہ نہر اور شالامار باغ کی تعمیر

شاہجہان نے نہر کی تعمیر کی اجازت دے کر اس کام کے لیے ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا۔ راجپور کے مقام سے یہ نہر نکالی گئی جو شاہ نہر کہلائی۔ مگر اس کی تعمیر میں کچھ نقائص رہ گئے تھے جو ملا علاء الملک تونی نے بادشاہ کے حکم سے دور کیے۔ نہر کی تکمیل پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک عدیم النظیر باغ کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ ۳ ربیع الاول سنہ ۱۰۵۱ھ مطابق ۱۲ جون سنہ ۱۶۴۱ء کو اس کی بنیاد رکھی گئی اور خلیل اللہ خاں کو اس کام کی تکمیل کے لیے نامزد کیا گیا۔ ۷ شعبان سنہ ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۶۴۲ء کو شاہ جہان نے اس باغ کی رسم افتتاح ادا فرمائی۔ یہ باغ چھ لاکھ روپے کے خرچ سے وجود میں آیا۔ یہ لاہور کا شالامار باغ ہے۔ اس کے تین طبقے ہیں۔ بلند ترین طبقہ باغ فرح بخش کہلایا۔ اور نیچے کے دو طبقے فیض بخش کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شمال مغربی سرحد سے فارغ ہو کر بادشاہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۶۴۲ء کو ان باغوں سے جہاں ان کی تعمیر کے بعد سے وہ مقیم تھا آگرہ کی جانب روانہ ہوا

اور دوالئی سے آیا۔ ۔۔۔ ۔ ر نلی سعید خان بہادر ظفر جنگ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔

۱۶۴۱ء میں بادشاہ نے سعید خان بہادر ظفر جنگ کو قندھار کا گورنر مقرر کیا اور لاہور میں اس کی جگہ قلیج خان کو متعین کیا۔

نورجہاں کا مقبرہ ۱۸ دسمبر ۱۶۴۵ء کو ملکہ نورجہاں راہیِ ملکِ عدم ہوئی۔ آپ سے ۲ لاکھ روپے سالانہ پنشن ملتی تھی جو وہ مسکینوں، درعاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ اور اس کا زیادہ حصہ مفلوک الحال لوگوں کی جوان سال نا کتخدا لڑکیوں کی شادی پر خرچ ہوتا تھا۔ ملکہ کو اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اس مقبرہ کا شکستہ حال ڈھانچہ شاہدرہ میں ریلوے لائن کے متصل واقع ہے۔ نورجہاں جیسی نفیس طبع خاتون کا تعمیر کردہ مقبرہ خدا جانے کس رنگینی اور رعنائی کا مرقع ہوگا۔ اور کس اہتمام سے یہ تعمیر ہوا ہوگا۔ سکھ گردی نے اس کی تمام نفاست و زیبت ختم کر دی۔

جعفر خان اور قاضی افضل اپریل ۱۶۴۶ء میں جعفر خان کو لاہور کا گورنر اور اُس کے بھائی بہرام کو بخشی اور وقائع نویس مقرر کیا گیا۔ سردار خان لاہور کا قلعہ دار متعین ہوا۔ جعفر خان ۲۹ مئی ۱۶۳۹ء کو کابل کے مقام پر بادشاہ سے ملا۔ اور وہ خزانہ جو راجہ سنگھ اکبرآباد (آگرہ) سے لاہور لایا تھا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ خزانہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپے اور تین لاکھ اشرفیوں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ نے اُسے خلعت فاخرہ سے نوازا اور میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا۔ اور اُس کی جگہ لاہور کا گورنر قاضی افضل کو مقرر کیا۔

داراشکوہ اور لاہور ۱۶۵۲ء میں داراشکوہ کو ملتان، لاہور اور کابل کے صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ تاکہ وہ ان صوبوں کے ذرائع کو استعمال میں لاکر قندھار پر حملے کی تیاریاں مکمل کرے۔ اُس نے بہت بڑا توپ خانہ، سپاہ اور سامان رسد تیار کیا۔ ان تیاریوں کی تفصیل ملا محمد صالح کمبوہ کی کتاب عمل صالح (جلد سوم صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۶) میں ملتی ہے۔

قاضی افضل خان کے بعد ۱۶۵۱ء میں شیخ عبدالکریم کو لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اُن کے بعد ۱۶۵۵ء میں خواجہ معین خان اس عہدہ پر متعین ہوئے اور ۱۶۵۸ء میں بہادر خان کو یہ عہدہ ملا۔ شاہجہان کے دور کا آخری حاکم لاہور سید عزت خان تھا۔ سرحدی صوبوں کا نائب السلطنت ہونے کے باوصف داراشکوہ شاہی دربار میں رہتا تھا۔ اور گاہے گاہے اس خطہ میں آیا کرتا تھا۔ تمام امورِ حکومت کا انتظام مقامی حکام کرتے تھے۔

عہد اورنگ زیب عالمگیر

فرزندانِ شاہ جہاں میں جنگِ تخت نشینی ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہان بیمار ہوا۔ بیماری نے اسے اس قدر نڈھال کر دیا کہ ما سے نقاہت کے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ داراشکوہ جو باپ کا لاڈلا بیٹا تھا اور اکثر دربار میں رہتا تھا امورِ جہانبانی کو اپنے تصرف میں لے آیا جس طرح دارا کو ۱۶۵۲ء

لہ بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۱۱، ۳۱۷ ۔ عمل صالح صفحہ ۳۷۳، ۳۷۷ ۔

...ر نال مغربی صوبجات کا (یعنی اُس خطہ کا جسے آج کی اصطلاح میں مغربی پاکستان کہا جائے گا) نائب السلطنت مقرر کیا گیا تھا
سی طرح شجاع کو بنگال کا اور اورنگ زیب کو دکن کا اور مراد کو گجرات کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ باپ کے بیمار ہونے پر
...نے دارالسلطنت سے صوبجات کی طرف جانے والی ہر ڈگر کو بند کر دیا اور شاہجہان کے ایلچیوں کو نظر بند کر دیا اس پر
شاہزادوں نے یہ سمجھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور دارا شکوہ اس خبر کو چھپا کر مرکزی حکومت میں اپنی طاقت مستحکم کر رہا ہے۔

سب سے پہلے مراد نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد یہی حرکت شجاع نے کی۔ آخر کار اورنگ زیب اور مراد میں معاہدہ ہو گیا کہ دارا شکوہ کو بادشاہ نہ بننے دیا جائے۔ دونوں اپنی فوجیں لے کر شمال کی جانب بڑھے۔ نربدا کے کنارے دھرمت کے مقام پر مرکزی حکومت کی فوجوں سے اُن کی لڑائی ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ راٹھور اور قاسم خان مرکزی حکومت کی فوجوں کے سالار تھے۔ انہیں شکست ہوئی اور شاہزادوں کی فوجیں آگرہ کی جانب بڑھیں۔ ساموگڑھ کے مقام پر جو آگرہ سے جانب مشرق ۱۰ میل کے فاصلہ پر دارا اور اورنگ زیب کی فوجوں میں فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور وہ دہلی کی طرف بھاگا۔ اورنگ زیب نے اُس کا تعاقب کیا۔

دارا شکوہ فی الفور لاہور پہنچا اور ۱۵ جولائی ۱۶۵۸ء کو شہر پر قابض ہو گیا۔ اُس نے اُمرا اور اکابر کو بے دریغ روپیہ دیا اور اپنے گرد بیس ہزار سوار[۱] جمع کر لیے۔

اسی اثنا میں اورنگ زیب کے لاہور کی طرف بڑھنے کی خبر گرم ہوئی۔ وہ لوگ جو روپے اور منصب کے لالچ میں دارا کے گرد جمع ہو گئے تھے ساموگڑھ اور اورنگ زیب سے مرعوب ہو کر اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر دارا شکوہ نے چار ہزار کے قریب سوار اور کچھ توپیں لے کر ٹھٹھہ اور ملتان کی طرف بڑھا۔ لاہور میں اُس نے داؤد خان کو چھوڑا تاکہ اورنگ زیب کا راستہ روکے اور کشتیوں کو تباہ کر دے۔ کشتیوں کی بربادی کی صورت میں عالمگیر کے لیے پنجاب کے دریاؤں کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا۔

دریائے ستلج کو عبور کر کے اورنگ زیب نے اپنے فرزند شاہزادہ محمد اعظم کو لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا اور خود ملتان کی طرف دارا کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ مگر ملتان میں بھی دارا کے اپنے آدمیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور حوصلہ ہار بیٹھے دارا کو ملتان چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اورنگ زیب نے صف شکن خان کو اُس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اور خود لاہور چلا آیا۔ لاہور پہنچ کر اُس نے شالامار باغ میں اقامت اختیار کی اور ۳ اکتوبر ۱۶۵۸ء کو شاہزادہ محمد اعظم امرائے لاہور کی معیت میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کی معیت میں قلعہ جا کر اس کے مکانات کا معائنہ کیا اور امان اللہ خان قلعہ دار کو ہدایات دیں۔ قلعہ سے شالامار واپس آتے ہوئے بادشاہ نے مسجد وزیر خان میں نماز ظہر باجماعت ادا کی۔ اور شام کو شالامار واپس پہنچا۔

اورنگ زیب نے خلیل اللہ خان کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور اُسے ایک کروڑ سالانہ کی مالیت کی جاگیر عطا کی۔ لشکر خان سابق حاکم کشمیر کو حاکم ملتان اور خواجہ اسمٰعیل کرمانی کو دیوانِ لاہور مقرر کیا۔ ان انتظامات سے فراغت پا کر اورنگ زیب

---

[۱] عالمگیر نامہ۔ منشی محمد کاظم صفحہ ۱۷۸

دہلی پر عالمگیر [illegible] روانہ ہوگیا۔

شاہجہان کے دو رفرزندوں کی رزم آرائی کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب کو اپنے بھائیوں پر فتح ہوئی اور اورنگ زیب ہندوستان کا حکمران ہوا۔ شاہجہان کو پیرانہ سالی میں تخت و تاج سے محروم ہو کر قلعہ آگرہ میں نظر بندی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔

خلیل اللہ خاں کا انتقال

۱۶۶۲ء میں خلیل اللہ خاں عالمگیر سے ملاقات کرنے عازمِ دہلی ہوا کہ راستے ہی میں بیمار ہوگیا۔ دہلی پہنچ کر اُسے بادشاہ کی طرف سے حکم ملا کہ کچھ عرصہ آرام کرے۔ تقرب خان وغیرہ شاہی اطباء اُس کا علاج کرتے رہے مگر وہ ۲ فروری ۱۶۶۲ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ بادشاہ اُس کے ہاں ماتم پرسی کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔ خلیل اللہ کی بیوہ حمیدہ بانو بیگم بادشاہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔

عالمگیر کا سفرِ کشمیر

۱۰۷۳ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۶۶۲ء بادشاہ سفرِ کشمیر کے ارادے سے نکلا۔ اور لاہور کی راہ لی۔ اور ۱۰ فروری ۱۶۶۳ء کو لاہور پہنچ کر شالامار باغ میں اس نے ایک ہفتہ قیام کیا ۱۸ فروری کو بادشاہ اور شاہزادہ محمد اعظم ایک ہی ہاتھی پر سوار شہر کی طرف گئے اور قلعہ میں قیام فرمایا۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ بادشاہ نے فیروز خاں کی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ مآثرِ عالمگیری کا بیان ہے کہ یہ "مسجد در فضاءِ بیرونِ قلعہ نزدیک بدر وازۂ ہتھیہ پول" واقع تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی قدیم مسجد قلعہ کے مغرب میں واقع ہوگی جو موجودہ شاہی مسجد کی تعمیر کے وقت مسمار کر کے اس کی جگہ بھی شاہی مسجد میں شامل کر لی گئی ہوگی۔ معلوم نہیں کہ مسجد کے بانی فیروز خان کون تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمیشہ اسی دھوم دھام سے یہاں نمازِ جمعہ ادا ہو۔

اڑھائی مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد بادشاہ ۳ مئی ۱۶۶۳ء کو کشمیر جانے کے ارادہ سے لاہور سے نکلا اور راوی کے پار باغ دلکشا میں مقیم ہوا یہاں اُس نے ایک جشن منعقد کیا اور اُس کے بعد گجرات۔ بھمبر اور راجوری کے راستے کشمیر روانہ ہوا۔ اس موقع پر مشہور فرانسیسی سیاح برنیر بھی شاہی کیمپ کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔

بارشوں کی شدت اور کثرت کی وجہ سے لاہور میں بہت سے مکان گر گئے تھے۔ علاوہ ازیں راوی میں طغیانی بھی آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے شہر کی عمارتوں کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔

کشمیر روانہ ہونے سے قبل بادشاہ نے لاہور کو راوی کی سرکش موجوں سے بچانے کے لیے ایک مضبوط بند بنانے کا حکم دیا تاکہ شہر محفوظ رہے۔ چنانچہ شالامار باغ کے نواح سے لے کر قلعہ تک بند تعمیر ہوا۔ یہ بند مغلیہ دور کی چھوٹی اینٹوں اور چونے سے بنوایا گیا۔ دریا کی جانب جا بجا سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور اس کے عقب میں باغات تھے۔ بند پر جا بجا امراء نے بارہ دریاں اور سیر گاہیں بنوائیں اور مغلیہ دور کے نفاست پسند طبائع نے اسے ایک نہایت خوب صورت سیرگاہ میں تبدیل کر دیا۔

ہم عصر مورخ سجان رائے بٹالوی لکھتا ہے کہ اس بند کی تعمیر سے جسے سدِ سکندری کہنا چاہیئے بادشاہ "لبِ دریا را مانندِ لبِ خوباں بیر راست"۔ اس بند نے برسوں لاہور کی عمارات کو راوی کے سیلاب سے بچایا حتیٰ کہ راوی نے اپنی یہ گزرگاہ ترک کر دی۔ انگریزی دور کے آغاز میں لاہور کے زمینداروں نے بند کے اُن حصوں کو جو اُن کی زرعی زمینوں میں آ گئے تھے مسمار

کرتے اینٹیں شہر میں فروخت کر دیں۔ یا اپنے شکستہ مکانوں کی تعمیر میں صرف کر لیں۔ آج سے پچیس تیس سال قبل اس بند کے کچھ حصے کی بنیادیں موضع چاہ میراں کے متصل نظر آتی تھیں مگر اب اس ہر دو جگہ نئی آبادی عالم وجود میں آ گئی ہے۔

شاہی مسجد کی تعمیر

۱۸ مئی ۱۶۷۰ء کو محمد امین خان کو لاہور کی حکومت سے علیحدہ کر کے کابل متعین کیا گیا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد فدائی خان کوکہ جو عالمگیر کا رضاعی بھائی تھا لاہور کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس کے انہوں نے ۱۰۸۴ھ مطابق ۱۶۷۳ء میں شاہی مسجد کی یادگار چھوڑی۔ خلاصۃ التواریخ کے بیان کے مطابق اس پر چھ لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہوا۔ اس مسجد کی تعمیر سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ شہر سے متصل دریا کے کنارے ایک ایسی مسجد تعمیر کرائی جائے جس میں لاہور کے تمام مسلمان بیک وقت نماز ادا کر سکیں۔

امانت خاں کا دور

ستمبر ۱۶۷۵ء میں سید احمد کو امانت خان کا خطاب دے کر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جو ڈیڑھ سال تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس کے بعد انہیں اجمیر کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ امانت خان کی یادگار ایک سرائے پرانی شاہراہ اعظم پر لاہور اور امرتسر کے درمیان واقع ہے۔ اس میں ایک گاؤں آباد ہے جو "سرائے" کہلاتا ہے۔ اور اب ہندوستان کی حدود میں آ گیا ہے۔ امانت خان کے بعد قوام الدین خان[1] کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

اناج کی کمی

ستمبر ۱۶۷۸ء میں لاہور میں اناج کی کمی کے سبب سامان خوراک کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ حکومت کی طرف سے مناسب کارروائی کی گئی۔

تیرہ برس کے واقعات

سنہ ۱۶۸۰ء میں صوبہ لاہور کے حکام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ سید علی اکبر قاضی لاہور اور ان کے بھتیجے سید فاضل ایک طرف اور قوام الدین خان صوبہ دار لاہور اور نظام الدین کوتوال دوسری طرف تھے۔ اس جھگڑے میں سید علی اکبر جو بہت دیانت دار تھے مارے گئے۔ بادشاہ کو اطلاع ملی تو اس نے کوتوال کو موت کی سزا دی اور صوبہ دار کو اجمیر اپنی بارگاہ میں[2] طلب کر لیا۔

عالمگیر نے اس واقعہ کے بعد سنہ ۱۶۹۰ء میں شہزادہ محمد اعظم کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا تاکہ مذکورہ بالا جھگڑوں سے جو فساد یا تکدر پیدا ہو گیا تھا دور کیا جا سکے۔ شہزادہ اعظم کے بعد مکرم خان لاہور کے حاکم بنے اور ان سے سپاہ دار خان تھے جو خان جہاں بہادر کا لڑکا تھا۔ نومبر ۱۶۸۶ء میں حکومت لاہور کا چارج لیا مگر جلد ہی اسے اس عہدۂ جلیلہ سے علیحدہ ہونا پڑا اور شہزادہ محمد اعظم کے کارندے امور حکومت کا انتظام کرتے رہے۔ اپریل ۱۶۹۱ء سے ۱۶۹۳ء تک خان جہاں بہادر صوبہ دار لاہور رہے۔

ابراہیم مہابت خاں

اورنگ زیب نے دکن سے ابراہیم خان کو مہابت خان کا خطاب دے کر حاکم لاہور نامزد کیا۔ مگر وہ

---

[1] مستعد خاں مآثر عالمگیری صفحہ ۱۵۰

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۱۸۸

تھوڑے ہی عرصہ بعد فوت ہوگیا۔ باغبان پورہ میں مہابت خاں کا باغ ہے جس کے کچھ حصّے پر جدید سکونتی مکانات بن گئے ہیں۔ باغ کے وسط میں ایک وسیع چبوترہ پر مہابت خاں کی قبر ہے۔ علاوہ اس کے باغ کی فصیل کا کچھ حصّہ اور چند کمرے بھی باقی ہیں۔ یہ مکان اسی ابراہیم مہابت خاں کی آخری آرام گاہ ہے۔ مہابت خاں دورِ مغلیہ میں ایک خطاب تھا جو مختلف زمانوں میں مختلف اُمرا کے نام کا جزو رہا ہے۔ جہانگیری دور کا مہابت خاں تاریخ میں زیادہ مشہور ہے۔ لہٰذا عام طور پر یہ باغ اور مقبرہ اُسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا ہے یہ باغ اور مقبرہ ابراہیم مہابت خاں عالمگیری کا ہے۔[1]

نواب میاں خاں سنہ ۱۶۹۶ء میں مکرّم خاں و ابونصر خاں یکے بعد دیگرے ایک ہی سال میں لاہور کے حاکم بنے۔ ان کے بعد غالباً حفظ اللہ خاں الملقب بہ میاں خاں جو شاہجہان کے شہرۂ آفاق وزیرِ اعظم سعد اللہ خاں کے فرزند ارجمند تھے لاہور کے حاکم بنے۔ ان کی وسیع حویلی میاں خاں رنگ محل اور تلی خانہ شہر کے وسط میں تھے۔ حویلی کا تو صرف صدر دروازہ ہی باقی ہے۔ باقی حصّے پر ایک وسیع محلہ آباد ہو گیا ہے جو حویلی میاں خاں کہلاتا ہے۔ حویلی کی عمارات کے بعض حصے محلے کے چند مکانات کے اندر اب تک موجود ہیں۔ اسی محلے میں کٹڑی عزیز الدین ہے جس کا راستہ مسجد چینیاں والی کے قریب ہے۔ اس کٹڑی میں نواب میاں خاں کا حمام تھا۔ جو دورِ مغلیہ کے ترکی حماموں کی طرز پر بنوایا گیا تھا۔ رنگ محل میں انگریزی حکومت کے قیام پر فارمن نام ایک پادری ماہرِ تعلیم نے مشن ہائی سکول قائم کیا تھا۔ عمارت کہنہ ہو جانے کے سبب بعد ازاں اسے مسمار کرا کے سکول کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی جس میں سکول اب تک قائم ہے اور ایک صدی سے زیادہ ہو گیا ہے کہ اس مدرسہ کے ذریعہ پادری صاحبان باشندگانِ شہر کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کر رہے ہیں۔ لاہور کی ثقافتی تاریخ میں اس سکول کا مقام بہت اہم ہے۔

نواب میاں خاں کا باغ اور مقبرہ موجودہ محلہ سنگھ پورہ کے سامنے بھوگی وال کے پاس نہایت عبرت ناک حالت میں ہے۔

شاہزادہ معظم صوبہ دارِ لاہور فروری سنہ [illegible]ء میں صوبۂ لاہور شاہزادہ محمد معظم کے حوالے کر دیا گیا۔ اور اورنگ زیب کی وفات تک شاہزادہ موصوف کے کارندے یہاں حکومت کرتے رہے۔ بطور صوبہ دار یا نائب السلطنت شاہزادے کا نام لیا جاتا تھا اور اُس کا نمائندہ نائب ناظم یا نائب صوبہ دار کہلاتا تھا۔ ایسے نائب ناظموں میں منعم خاں قابلِ ذکر ہے، جو کسی زمانے میں دیوان صوبۂ کابل بھی رہ چکا تھا۔

عالمگیر کا انتقال ۳ مارچ سنہ [illegible]ء کو دکن میں اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا اور اسے دولت آباد کے متصل خلد آباد میں شیخ زین الدین اور دیگر اکابرِ ملت کے مقبروں کے قریب دفن کیا گیا۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق اُس کی قبر سادہ رکھی گئی۔

برسرِ گورِ غریباں گنبدِ گردوں بس است

لاہور جانشینانِ اورنگ زیب کے زمانے میں اورنگ زیب نے سنہ [illegible]ء کے قریب شاہزادہ معظم کو

---

[1] مفصل حالات کے لیے راقم الحروف کا مضمون "مہابت خاں کا باغ اور مقبرہ"، رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت جون سنہ ۱۹۴۳ء میں دیکھیے۔ یہاں یہ بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ رسالہ مہ کالج (لاہور) میگزین (CRESCENT) کے بعد یہ میرا پہلا مضمون تھا جو کسی ادبی مجلہ میں چھپا۔

لاہور، کابل اور ملتان وغیرہ کے صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کر کے شمال مغربی سرحد پر بھیج دیا تھا تاکہ ان دونوں صوبے کے انتظام میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت شاہزادہ کابل میں تھا اور اس کا معتمد کارندہ منعم خاں لاہور میں متعین تھا بتاریخ ۱۱ر مارچ ۱۷۰۷ء کو شہزادے کو بمقام پشاور باپ کی وفات کی خبر ملی اور اس نے فی الفور روانگی کی تیاری کی۔ اگلے روز اسے منعم خاں کا خط ملا جس نے شہزادے کو تخت نشینی کی مبارک باد دی اور اسے فی الفور دکن کی طرف روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ شہزادہ معظم جسے اب شاہ عالم بہادر شاہ اول کے نام سے یاد کیا جانے گا۔ لاہور پہنچا تو منعم خان نے شہر سے کچھ فاصلے پر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور چالیس لاکھ روپے معمول نذرانہ پیش کیا۔ شاہ عالم نے فوج توپ خانہ اور دیگر سامانِ حرب کا معائنہ کیا۔ منعم خاں کو شاہ عالم نے وزیر مقرر کیا۔ اور لاہور ہی میں اپنے نام کا سکہ ضرب کرایا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔

ابھی بادشاہت کا اعلان دہ لاہور پہنچنے سے قبل پل شاہ دولہ پر کر چکا تھا۔ یہ پل لاہور سے جانب شمال چوبیس میل کے فاصلہ پر ڈیک نالہ پر گجرات کے مشہور بزرگ شاہ دولہ نے تعمیر کرایا تھا۔ منعم خان نے اپنے تمام مدد کے لئے تو تیاریاں کی تھیں اور صوبہ لاہور کے تمام ذرائع کو متوقع جنگِ تخت نشینی کی تیاریوں کے لیے وقف کر دیا تھا اس کے پیش نظر وزیر کے عہدے کے لیے سب سے موزوں تھا۔

پنجاب کی فوجوں اور خزانوں کے ہمراہ بہادر شاہ اول دہلی پہنچا اور وہاں کے خزانوں اور فوجوں کو حاصل کر کے آگرہ کا رخ کیا۔ اس کا فرزند شہزادہ عظیم الشان بنگال اور بہار کا حاکم تھا۔ اسے وفات سے کچھ عرصہ قبل اورنگ زیب نے دکن طلب کیا تھا۔ ابھی وہ پٹنہ علاقے کی حدود میں تھا کہ دادا کی وفات کی خبر ملی اور وہ بنگال کے تمام خزانے اور چالیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ آگرہ کی طرف بڑھا۔ اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بہادر شاہ کی آمد پر شاہ باقی خان قلعہ دار آگرہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اب گویا تمام شمالی ہند اور مرکزِ حکومت یعنی دہلی اور آگرہ کے ذرائع آمدنی شاہ عالم کے تصرف میں تھے۔

دکن میں شہزادہ اعظم نے احمد نگر کے کیمپ میں ۱۴ر مارچ کو ہی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مشکل دکن میں روپے کی کمی تھی۔ مرہٹوں کے خلاف جنگوں کی وجہ سے تمام روپیہ خرچ ہو چکا تھا اور فوج کی تنخواہیں بھی واجب الادا تھیں۔ تورانی امرا نظام الملک کی سرکردگی میں اس سے علیحدہ رہے مگر ایرانی امرا اسد خان اور اس کے فرزند نصرت جنگ کی قیادت میں شہزادہ اعظم سے مل گئے اور اس نے مرہٹوں کی جنگوں کے آزمودہ کار مگر بد دل سپاہیوں کی معیت میں شمال کا رخ کیا۔ آگرہ سے کچھ فاصلہ پر سامو گڑھ کے قریب جاجو کے مقام پر اعظم اور معظم میں جنگ ہوئی۔ اعظم کے ہاں توپوں کی کمی تھی اور معظم نے اپنے بھاری توپ خانہ سے گولہ باری کر کے دکنی فوجوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس جنگ میں اعظم اور اس کا لڑکا بیدار بخت مارے گئے اور اس کا مثیاد الاحباء بڑی طرح زخمی ہوا۔ اس فتح کے بعد بہادر شاہ دو مہینے آگرہ میں آرام کرتا رہا اور پھر راجپوتانے کا رخ کیا۔ اسی اثنا میں اسے خبر ملی کہ اس کے بھائی کام بخش کی حرکات اس کی توجہ خصوصی کی مقتضی ہیں۔ اگرچہ بادشاہت کا اعلان کرنے کے بعد دکن کا کافی حصہ اس کے قبضے میں تھا مگر اس کے طفلانہ اور ظالمانہ طرزِ عمل نے اس کے متوسلین کو بے حد خائف کر دیا تھا۔ بہادر شاہ دکن پہنچا اور ۱۳ر جنوری ۱۷۰۹ء کو حیدرآباد سے کچھ فاصلے پر شاہی فوج کے ایک دستے نے جس کی قیادت منعم خاں کر رہا تھا۔ کام بخش کا مقابلہ کیا۔ اس وقت صرف ساڑھے تین سو آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ شہزادہ مہلک طور پر زخمی ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کی دکن میں

آمد پر کام بخش کے تمام ہوا خواہ یا تو دشمن سے مل گئے اور یا عزلت گزیں ہو گئے تھے۔

شمالی ہند کو واپسی

اسی اثنا میں راجپوتانے سے وحشت ناک خبریں موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اور شاہ عالم کو فی الفور اجمیر جانا پڑا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد راجپوتوں نے مغلیہ سیادت کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اجمیر میں بادشاہ کو صوبۂ لاہور سے بندہ بیراگی کی سفاکی اور غارت گری کی روداد ملی اور بادشاہ نے لاہور آنے کا ارادہ کیا۔

بندہ سنگھ کا خروج

لاہور سے رخصت ہوتے وقت شاہ عالم نے صوبۂ لاہور اپنے فرزند معزالدین جہاں دار شاہ کے حوالے کیا تھا۔ وہ خود تو باپ کی معیت میں روانہ ہوا اور لاہور میں سید اسلم خاں کو نائب ناظم اور عاقل خاں کو دیوان مقرر کر گیا تھا۔ شاہی فوجوں کو جنگ تخت نشینی میں مصروف اور صوبۂ لاہور کو فوج سے خالی پا کر سکھوں کے مشہور لیڈر اور گورو گوبند سنگھ صاحب کے مبینہ نائب بندہ سنگھ بیراگی نے سکھ رضا کاروں کو جمع کر کے نہ صرف مغلیہ حکومت بلکہ پنجاب کی مسلم آبادی کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر دیا۔

بندہ بیراگی سنہ ۱۶۷۰ء میں ریاست پونچھ کے قصبہ راجوری میں پیدا ہوا۔ اس کا اپنا نام لچھمن دیو اور اس کے باپ کا نام رام دیو تھا وہ ڈوگرہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپنے ہی بیراگی بنا اور مادھوداس اور بندہ بیراگی کے لقب سے مشہور ہوا۔ وہ سادھوؤں کے ہمراہ گھومتا پھرا دکن پہنچا جہاں اس کی ملاقات گورو گوبند سنگھ سے ہوئی اور وہ ان کا معتقد ہو گیا۔ بنا بر مرگ گورو گوبند سنگھ نے اسے کچھ نصیحتیں کیں اور مغلیہ حکومت کے خلاف سکھوں کی رہنمائی کے لیے پنجاب کی طرف روانہ کیا۔

بندہ بیراگی جسے سکھ "بابا بندہ سنگھ بہادر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں ایک سفاک اور ستم گر انسان تھا۔ عام ڈوگروں کی طرح مسلمانوں کی دشمنی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے نہ صرف مغلوں کی سرکاری فوجوں سے جنگ کی بلکہ جہاں کہیں بھی اسے مسلمانوں کی بستی نظر آئی اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ حالانکہ گورو گوبند سنگھ صاحب کا طرزِ عمل یہ نہ تھا۔ وہ صرف حکومت کی فوجوں سے لڑتے تھے۔ بندہ نے مشہور کر دیا کہ اس کے پاس ایک ایسا جادو ہے جس کے اثر سے کوئی فوج اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بندہ بیراگی کے لشکر میں راسخ العقیدہ سکھوں کے علاوہ (جو پنتھ کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر حکومت سے نبرد آزما تھے) بہت سے لٹیرے، اوباش اور جرائم پیشہ قسم کے لوگ لوٹ مار کے لالچ سے آ شریک ہوئے۔ شوالک کی پہاڑیوں میں بندہ بیراگی نے اپنا اڈہ بنایا۔ وہاں سے نکل کر اس نے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے میں سادھورا، سنام، سمانہ اور سرہند وغیرہ مختلف شہروں کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد جمنا پار کر کے سہارن پور، گنگوہ اور نانوتہ وغیرہ بہت سی اسلامی بستیاں لوٹ لیں۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالندھر دوآب کا رخ کیا اور اس شاداب اور آباد خطے کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔

بندہ کا طریق کار یہ تھا کہ جس خطے پر حملہ کرنا ہوتا پہلے وہاں کے لوگوں میں جاسوسوں کے ذریعہ اپنی جادوگری کی داستانیں مشہور کر کے لوگوں کو پست ہمت بنا دیتا۔ مغلوں کے تعیش پسند سپاہی اور سالار توہم پرستی کے سبب جادوگری اور شعبدہ بازی

سے ڈر کر میدانِ جنگ سے بھاگ جاتے تھے۔ بندہ بیراگی کے سوار کسی بستی کو مسخر کرنے کے بعد اسے بے دریغ لوٹتے۔ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتا۔ عورتوں کی آبرو ریزی کرتا، اور حاملہ عورتوں کے پیٹ کاٹ کر تڑپتے بچوں کو نکالنا اور انھیں نوکِ نیزہ پر اچھالنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ ہم عصر مورخ خوافی خاں کی کتاب "منتخب اللباب" کے علاوہ مآثر الامرا اور سیر المتاخرین کے اوراق بندہ بیراگی کی سفاکیوں کی المناک داستان سے بھرے پڑے ہیں۔ غیر مسلم مورخ پروفیسر گنڈا سنگھ، بھائی پرمانند اور لالہ دولت رام وغیرہ بھی ان مظالم کا اقرار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زیرِ حکومت ۷۰۰ سال تک بے عزتی اور غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد جوشِ انتقام اور حصولِ آزادی کے جذبے نے بندہ بیراگی کے ساتھیوں کو غیر متوازن بنا دیا تھا اور وہ عام بے سمجھ اور پر امن مسلم آبادی کو ہدفِ مظالم بنا کر گویا [illegible] کہ اورنگ زیب تک تمام مسلمان بادشاہوں کی فتوحات کا بدلہ لے رہا تھا۔

جالندھر دوآب کی پامالی کے بعد بندہ نے باری دوآب کا رخ کیا۔ بٹالہ کا مردم خیز قصبہ جو صدیوں سے علم و حکمت کا مخزن اور علما و فضلا کا مسکن چلا آ رہا تھا برباد کر دیا اور اس کے مدرسوں اور کتب خانوں کو آگ لگا دی۔ بندہ بیراگی کے غارت گروں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور شالامار باغ سے پرے پرے مضافاتِ لاہور کو بھی لوٹ لیا۔

حیدری فوج کی تشکیل

لاہور میں سنسنی پھیل گئی۔ نواحی دیہات کے لٹے ہوئے لوگ شہر میں آنے لگے۔ یہ لوگ طرح طرح کی کہانیاں اپنے ہمراہ لاتے اور شہر میں مختلف قسم کی افواہوں نے لوگوں کو ہراساں کر دیا۔ انھیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ بندہ لاہور پر یلغار کرنے والا ہے۔ مغلوں کے زیرِ سایہ [illegible] دو سو سال سے فتنہ و فساد سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔ اور یہاں کے لوگ بے حد خوش حال اور متمول تھے۔ باغی اسے لوٹنے کی آرزو رکھتے تھے کہ اسے تاراج کیا جائے۔ اس وقت سید محمد اسلم نائب ناظمِ صوبہ لاہور اور کاظم خاں دیوانِ لاہور تھا۔ فوج کی شہر میں کمی کے باعث یہ لوگ حالات پر قابو نہ پا سکے اگرچہ شاہ عالم اول کو پنجاب کی صورتِ حال کی اطلاعات مل چکی تھیں۔ مگر اس کے جلد پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ان حالات میں لاہور کے دفاع اور باشندگانِ لاہور کے حوصلے کو قائم رکھنے کے لیے ایک رضاکار فوج کی تشکیل کی گئی اور اس کا نام حیدری فوج رکھا گیا۔ اس فوج کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانانِ لاہور کو جمع کر کے فوجی تعلیم اور جنگی قواعد سے آشنا کیا جائے اس کی تنظیم کا کام میر تقی۔ محمد عنایت خاں۔ تجار بیگ اور مصطفےٰ خاں نے اپنے ذمے لیا۔ اس کے لیے باشندگانِ لاہور سے مالی امداد بھی لی گئی۔ بعض منصف مزاج اور امن پسند ہندو بھی جو مغلیہ حکومت کے مداح تھے اور بندہ کی انسانیت سوز حرکات کو ناپسند کرتے تھے۔ اس تحریک کی پشت پر تھے۔ ان ہندوؤں میں لاہور کے ایک متمول امیر راجہ بہار مل بھی تھے۔ جو اکبر کے مشہور درباری اور معتمد دیوان راجہ ٹوڈر مل کے اخلاف میں سے تھے۔ فوج کی تنظیم و تربیت کا کام بڑی مستعدی سے کیا گیا۔ علما نے بندہ بیراگی کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سکھوں کو اسلام کا دشمن اور خلقِ خدا کا رہزن قرار دے کر علما نے ان کے خلاف جنگ کا فتویٰ دیا۔

حیدری علم

اس اعلان کے بعد جہاد کا سبز ہلالی پرچم عید گاہ میں نصب کر دیا گیا۔ اس جھنڈے کو علمِ حیدری کہا جاتا تھا۔ یہ عید گاہ جہانگیر کے دور میں بنائی گئی تھی۔ اس کا محلِ وقوع موجودہ پل راوی شاہدرہ کے قریب تھا۔ اس مسجد کے

متصل ایک بارہ دری تھا جو مانا ہوا تر پولیہ کہلاتا تھا۔ حیدری فوج کی تشکیل اور اعلانِ جہاد کے بعد مسلمانوں میں جوش و خروش بے حد بڑھ گیا لیکن شہر کے اندر بسنے والے پُر امن غیر مسلموں میں سے کسی کا انھوں نے بال تک بیکا نہ کیا۔ حیدری فوج علی مرتضٰے خلیفۂ رسول اللہ سے منسوب تھی اور اس کا نعرۂ جہاد "فضلِ پنج تن یا علی" تھا۔

دو آبہ باری کے سکھ جتھے

دو آبہ باری کے دیہات میں بسنے والے سکھوں نے اپنے جتھوں کو خوب منظم کیا ہوا تھا۔ ان کا ایک جتھا جو تھا حصۂ لاہور کی تاخت کے لیے الگ کر دیا گیا تھا۔ تاکہ بندہ بیراگی کے "بنفسِ نفیس" لاہور پر تاخت کرنے سے پہلے یہ لوگ مضافاتِ شہر اور بیرونی محلّوں پر حملے کر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیں یہ جماعت شہر سے کچھ دور راوی کے کنارے موضع بھرت میں مقیم تھی۔ اور قلعہ بھگونت رائے پر قبضہ کر چکی تھی۔ اس قلعے سے نکل کر سکھ جتھے نواحِ شہر کو تاراج کرتے اور لوٹ کا مال لے کر پھر اس قلعہ میں جا گھستے تھے حیدری فوج کے غازیوں کا ایک دستہ موضع بھرت گیا اور ان غارت گروں کی تادیب کے بعد واپس چلا آیا۔

کوٹلہ بیگم کا معرکہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ بہت سے سکھ کوٹلہ بیگم نام ایک گاؤں میں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ گاؤں موضع چمیاری کے متصل تھا۔ حیدری فوج ان کے استیصال کے لیے روانہ ہوئی۔ لاہور سے چل کر مجاہدین نے موضع بھیلو وال میں قیام کیا۔ وہاں چند رضاکاروں کو جو فوج کے نظم و ضبط کی پروا نہ کرتے ہوئے راستے میں نامناسب حرکات کے مرتکب ہوئے تھے سزا دی گئی۔ اس کے بعد حیدری فوج نے آگے بڑھ کر کوٹلہ بیگم کا محاصرہ کر لیا۔ اب ایک طرف سکھ تھے جو جنگ چھاپہ مار کے اصولوں کے ماہر تھے اور جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے کے سبب بہت جفاکش ہو چکے تھے۔ دوسری طرف لاہور کے مسلمان تھے جو کئی پشتوں سے شہر میں امن و امان اور راحت و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ تاہم جوشِ جہاد اور محبتِ اسلام میں انھوں نے کمال پامردی اور دلاوری سے محاصرہ جاری رکھا۔ سکھ بھی جم کر لڑتے رہے۔

اسی اثنا میں غازی فوج کے کچھ حصّہ میں بے دلی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور بعض لوگ راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ سرِ شام ایک زبردست آندھی آئی اور زور کی بارش ہونے لگی۔ شہر کے لوگوں کے لیے جنگل میں یہ ہنگامہ باد و باراں طوفانِ نوح سے کم نہ تھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور آخر محاصرہ اُٹھا کر انھوں نے بھیلو وال کا رُخ کیا۔ اس جگہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ باقاعدہ فوج اس قلعہ میں گھس گئی اور عام غازیوں نے باہر میدان میں خیمے لگا لیے۔ کچھ سکھ ان کے تعاقب میں آ گئے اور رات بھر بھیلو وال کی متصلہ جھاڑیوں اور درختوں میں چھپے رہے۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے اچانک بے خبر حیدری فوج کے کیمپ پر حملہ بول دیا جس سے بے حد سراسیمگی پھیلی۔ بہت سے مجاہد شہید ہوئے اور بقیۃ السیف رضاکار بمشکل لاہور پہنچے۔ جو زعما اس جنگ میں کام آئے اُن میں مرتضٰے خان اور راجہ بہار مل قابلِ ذکر ہیں۔[1]

---

[1] دیکھئے۔ عبرت نامہ از سید محمد قاسم عبرت لاہوری۔ مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ چہار گلشن پنجاب۔ تاریخ گورو خالصہ۔ تاریخ پنجاب (انگریزی) سید محمد لطیف۔ بندہ سنگھ بہادر از سردار گنڈا سنگھ۔

حیدری فوج کی اس ناکامی کا سبب بظاہر تو طوفانِ باد و باراں معلوم ہوتا ہے مگر حیدری فوج میں اور بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ جو شکست کا سبب بنیں۔ سید محمد قاسم نے عبرت نامہ میں حیدری فوج سے طرزِ عمل کی بہت مذمت کی ہے اور کرنال جنگ کی ذمہ داری انہیں پر ڈالی ہے جہاں تک حیدری فوج کی شامتوں کا تعلق ہے۔ ان سے باشندگانِ لاہور کو فائدہ یہ ہوا کہ بندہ بیراگی نے لاہور کو مسلح اور مضبوط خیال کرتے ہوئے اس شہر پر حملہ نہ کیا۔ اور یہ مقام بربادی سے بچ گیا۔

خطبۂ جمعہ

گیارہ اگست ۱۷۱۱ء کو شاہ عالم اول لاہور پہنچا اُس وقت میں جب پنجاب میں سکھ۔ ہند میں جاٹ اور راجپوت اور دکن میں مرہٹے مسلمانوں کی حکومت اور سطوت توڑ کیا اُن کی ہستی مٹانے کے درپے تھے۔ بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "وصیِ رسول اللہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ جمعہ کے دو رکعت نماز سے پہلے امام خطبہ پڑھتا ہے جس کے آخر میں اہلِ سنت کی مساجد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین اور حضرات حسنین کے نام لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ وقت کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ مغلیہ دور میں خلفا اور بزرگان دین کے بعد بادشاہ وقت کا شجرہ امیر تیمور تک پڑھا جاتا تھا۔ اثنا عشری شیعوں کے ہاں چہاردہ معصومین کے اسمائے گرامی کا ذکر ہوتا ہے۔ اسماعیلی شیعہ اپنے اماموں کے اسماء خطبہ میں لاتے ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ بادشاہ شیعہ بن گیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر بادشاہ شیعہ مذہب سے وابستگی کی وجہ سے یہ حکم دیتا تو خطبہ میں پہلے تین خلیفوں کے ناموں کو حذف کرا دیتا اور اثنا عشری اماموں کے اسما کا اضافہ کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن مورخین نے نماز اور خطبہ میں "وصیِ رسول اللہ" کے الفاظ کے اضافہ کے سوا خطبہ میں کسی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا۔ بادشاہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ اکثر احادیث میں حضرت علی کے لیے ان الفاظ کا ذکر ملتا ہے اس لیے خطبہ میں اُن کے دیگر القاب کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

بادشاہ کی اس تجویز کو بعض فقیہوں نے ناپسند کیا۔ چنانچہ احمد آباد اور کشمیر وغیرہ میں فسادات بھی ہوئے اور خطیب مارے گئے۔ لاہور میں فقیہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی خطبہ نہ پڑھا جائے۔ لاہور پہنچنے پر بادشاہ نے حاجی یار محمد، محمد مراد اور بعض دیگر عالموں کو دربار میں طلب کر کے کئی روز ان سے مناظرہ کیا آخر حاجی یار محمد کی جرأت اور بے باکی سے متاثر ہو کر بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا اور اجازت دے دی کہ خطبہ اسی طرح پڑھا جائے جس طرح اورنگ زیب کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ اس سے یہ فتنہ فرو ہوا۔

بہادر شاہ کی وفات

جنوری ۱۷۱۲ء کے وسط میں بادشاہ کی صحت خراب ہو گئی اور ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ مولوی مراد اللہ محفوظ خان اور مولوی عبدالقادر نے لاش کی تجہیز و تکفین کی مگر گیارہ اپریل تک لاش اسی طرح کیمپ میں پڑی رہی۔ جنگ تخت نشینی کے فیصلے کے بعد ملکہ مہر پرور اور چین قلیچ محمد خان کی نگرانی میں دہلی بھیجی گئی اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے روضہ کے متصل ایک مسجد کے صحن میں دفن کی گئی۔

شاہ عالم اول کے بعد پھر کسی مغل بادشاہ کو لاہور آنا نصیب نہ ہوا۔

فرزندانِ شاہ عالم اوّل میں جنگِ تخت نشینی

مغلیہ خاندان میں انتہائی شائستگی علمی اور سیاسی سربلندی کے باوصف یہ کمزوری بھی رہی کہ وہ کوئی اصول جانشینی متعین نہ کر سکے اُن کے خاندان نے بھی روایت قائم کی کہ اپنے پیش رو کا وارث بقول ابن بطوطہ اپنے عزیزوں کے خون میں سے گذر کر تختِ حکومت تک پہنچتا تھا۔ تقریباً

ہر بادشاہ کو اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے۔

بہادر شاہ اول کے قیامِ لاہور کے دنوں میں جب اس کی صحت دن بہ دن گر رہی تھی اُس کے چاروں بیٹے تختِ حکومت کے لیے تگ و دو میں لگ گئے۔ اُن کی باہمی بے اعتمادی اور خصومت بڑھنے لگی۔ اور امرا ان شہزادوں سے ساز باز کرکے اس دشمنی کی آگ کو ہوا دینے لگے۔ سب سے بڑا لڑکا جہاندار شاہ ان سب میں مقابلتاً تہی دامن تھا۔ اُس کے پاس بمشکل ایک سو کے قریب سوار ہوں گے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ باپ کی وفات کے بعد ملتان چلا جائے جہاں وہ حاکم رہ چکا تھا اور جہاں عمائدِ شہر اُس سے مانوس تھے۔ وہ اُن کی مدد سے اس خانہ جنگی میں حصہ لینا چاہتا تھا۔

دوسرا لڑکا عظیم الشان اپنے دادا اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے آخری برسوں میں کم و بیش دس سال تک بنگال اور بہار کا حاکم رہ چکا تھا۔ جاجاؤ کی جنگ میں وہ باپ کے پاس آیا اور پھر شاہی دربار اور کیمپ ہی میں رہا اور اپنے صوبے میں اپنے فرزند فرخ سیر کو بطور حاکم چھوڑ آیا تھا۔ روپے کی فراوانی کے سبب امرا اور عمائد اور سپاہ اُس کی مٹھی میں تھے۔ اور سب کا خیال تھا کہ یہ شہزادہ جو عقل و دانش اور فہم و فراست میں بھی اپنے بھائیوں سے ممتاز ہے تخت و تاج کا مالک بنے گا۔ اسی لیے بھائی اُس سے حسد کرتے تھے۔ تیسرا لڑکا رفیع الشان باپ کا لاڈلا تھا اور قیامِ کابل کے زمانے میں اُس کا سب سے اہم مشیر تھا۔ چوتھا بھائی جہان شاہ باپ کے اعتماد میں رفیع الشان کا شریک تھا۔ باپ کے زمانۂ حکومت میں علیل رہنے کے سبب امورِ سلطنت میں نمایاں دلچسپی نہ لے سکا تھا۔

ذوالفقار خان وزیر نے بھی عظیم الشان کے حضور باریابی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر اُس کے ایک ادنے درباری شیخ قدرت اللہ کی بدتمیزی نے وزیر کو عظیم الشان سے دور کر دیا اور وہ جہاندار شاہ سے آس لگا بیٹھا۔ ذوالفقار خان نے تینوں بھائیوں کو عظیم الشان کے خلاف منظم کر دیا۔ اُن کے درمیان معاہدہ ہوا اور اُس پر کاربند رہنے کے حلف اٹھائے گئے۔ اس معاہدے کی رو سے جہاندار شاہ کو شہنشاہِ ہند بننا تھا۔ خطبہ و سکہ اُس کے نام کا چلنا تھا۔ کابل، ملتان اور ٹھٹھہ کے صوبے جہاں دار شاہ کو اور نربدا کے جنوب میں دکن کا علاقہ جہاں دار شاہ کو ملنا تھا۔ مالِ غنیمت تینوں بھائیوں میں یکساں تقسیم ہونا تھا۔ یہ خفیہ معاہدہ ذوالفقار خان نے دونوں شہزادوں کو غالباً غافل کرنے کے لیے کرایا تھا۔ اسی قسم کا ایک معاہدہ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیب، مراد اور شجاع میں بھی ہوا تھا مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو ان کے دادا کے معاہدے کا ہوا تھا۔

لاہور کے نواح میں بادشاہ اور شہزادے خیمہ زن تھے۔ بادشاہ کی وفات کی خبر گرم ہوتے ہی امرا چاروں شہزادوں میں سے کسی ایک سے جا ملے۔ کیمپوں کے ملحقہ تاجر اور شاگرد پیشہ بال بچوں کو سنبھالے شہر میں چلے گئے۔ شاہی کیمپ اور حرم اور بادشاہ کی نعش کی حفاظت کے لیے صرف چند امرا اسلام خان مہر آتش حمیدالدین خان اور دربار خان وغیرہ رہ گئے۔ اگر یہ لوگ بھی بھاگ جاتے تو یقیناً شاہی کیمپ لٹ جاتے۔ شاہی کیمپ اور شہر کے درمیان شالامار کے قریب بہت سے لٹیرے اور بدمعاش جمع تھے۔ انھوں نے لوٹ مار مچا دی۔ شہر میں پناہ لینے والوں کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ امرا کو لوٹ اور بربادی نظر آ رہی تھی سپاہ نے تنخواہوں کا بقایا وصول کرنے کے لیے خزانچیوں اور بخشیوں کے کیمپوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اور جو کچھ ملا اُسے غنیمت سمجھا کیمپ کے علاوہ شہر کے باشندے بھی ہراساں تھے۔ اور شہر کے نواح میں چاروں شہزادوں کی لاؤ لشکر سمیت موجودگی کی صورت میں جنگ لازمی تھی۔ الغرض بادشاہ کی موت نے قیامتِ صغریٰ کا نقشہ پیش کر دیا۔

عظیم الشان نے دریا کے کنارے اپنے کیمپ کے گرد توپیں لگا دیں اور اس طرح اپنے آپ کو محصور کر لیا۔ چار پانچ روز تینوں بھائیوں نے تیاری کر کے عظیم الشان کے خلاف سازشوں میں صرف کر دیئے۔ ذوالفقار خاں وزیر نے ان تیاریوں میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم الشان کی توپوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعہ اور فصیل شہر سے بڑی بڑی توپیں اتروائیں اور میدان جنگ میں لے گیا۔ ان میں سے تین توپیں اس قدر بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو کھینچنے کے لیے ۲۵۰ بیلوں اور پانچ چھ ہاتھیوں کی ضرورت تھی۔ ان تیاریوں کے بعد تینوں بھائیوں نے اپنے پرانے کیمپوں کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے کے قریب کھلے میدان میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس دوران عظیم الشان نے غلطی یہ کی کہ اپنے کیمپ سے باہر نکل کر بھائیوں پر حملہ نہ کیا۔ اس کے حامی امرا میں سے مرزا شاہ نواز خان صفوی۔ امین الدین خان۔ نعمت اللہ خان۔ راجہ مکھن سنگھ کھتری۔ راجہ راج سنگھ بہادر اسے سمجھاتے تھے کہ کھلے میدان میں نکل کر حریفوں پر حملہ بول دینا چاہیئے۔ مگر شہزادہ انھیں یہی جواب دیتا کہ "اللہ کے باشد" یعنی کچھ انتظار کیجیے۔ اس سے امرا کافی بے دل ہو گئے۔

عظیم الشان کو اپنی دولت پر بہت اعتماد تھا۔ اگرچہ اسے اپنے حامیوں اور سپاہ پر خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے اناج فروش بنجاروں سے عہد لیا ہوا تھا کہ وہ اس کے کیمپ میں غلے کی کمی نہ ہونے دیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ حریفوں کے لشکر افلاس اور اناج کی کمی کے باعث میدان سے بھاگ نکلیں گے۔ ان تمام چیزوں کے باوصف عظیم الشان کا کیمپ سے باہر نہ نکلنا اور بھائیوں کو تیاری کی مہلت دیے دینا اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ ذوالفقار خان کا عظیم الشان کے خلاف ہو جانا بھی بہت نقصان دہ تھا۔ ۱۴ مارچ ۱۷۱۲ء کو تینوں بھائی عظیم الشان کے مورچوں کے بالمقابل پہنچ گئے۔ دونوں طرف سے دلاوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ نکلتے اور مردانگی کے جوہر دکھا کر واپس چلے جاتے۔ ایک دو بار عظیم الشان کے مورچوں پر شبخون بھی مارے گئے جو سلیمان خان پنی اور شاہ نواز خان صفوی کی مساعی سے ناکام رہے۔ ۱۵ مارچ کو محصورین نے توپوں سے گولہ باری کی جس نے اگرچہ حریفوں کے چھکے چھڑا دیئے مگر انھوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ اور شمالی جانب سے عبدالصمد خان ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ شاہ نواز خاں شہزادے کی اجازت کے بغیر دو ہزار سوار لے کر حصار سے باہر نکل گیا۔ عبدالصمد خان اور جانی خان نے اس کو روکا۔ جہاندار شاہ کی سپاہ بھاگنے کو تھی کہ جہاں شاہ کی فوج بھی آ نکلی۔ اور شاہ نواز خاں کو پسپا کر دیا۔

اس معرکہ میں شاہزادہ قدرے زخمی ہوا اور شاہ نواز خاں کو جانی خان نے پشت پر تلوار کے دو زخم لگائے۔ مختار خان نے خوب بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس معرکہ میں عظیم الشان کے حامیوں میں سے رضا خاں اور کریم خان مارے گئے۔ دوسرے روز رفیع الشان پانچ ہزار سوار لیے حریف پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے کا جواب توپوں کے گولوں سے دیا گیا۔ مگر رفیع الشان کے سواروں کے مسلسل حملوں نے ان کے منہ پھیر دیئے۔ اسی اثنا میں جہاندار شاہ کے سپاہی ایک طرف سے عظیم الشان کے حفاظتی مورچوں پر چڑھ گئے اور اندر تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ سلیمان خان پنی ۵۰۰ پٹھان سپاہی لیے ان کے مقابلے پر آ گیا۔ شاہ نواز خاں کی فوج کے ۲۰۰ سپاہی گل خان کی قیادت میں ان کی مدد کو آ گئے اور دشمن کو بھگا دیا۔ سلیمان خان نے ان کا تعاقب کیا اور رفیع الشان کی فوج کے قلب کے سامنے آ گیا۔ اور عام معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ رفیع الشان کی مدد کو ذوالفقار خان

آگیا۔ اسی اثنا میں تُل خان کو ایک تیر گلے پر لگا اور وہ مارا گیا۔ سلیمان خان بھاگ کر مورچوں کے پیچھے آگیا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اُس روز فریقین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

ایک شب شاہ نواز خان نے کچھ قلماق غلام جہاندار شاہ کو خفیہ طور پر اُس کے خیمے میں جا کر اُسے قتل کر دینے پر مامور کئے۔ یہ لوگ رات کو خیمے کے اندر گھسے تو ایک خواجہ سرا نے ٹوکا جسے انھوں نے قتل کر دیا۔ اُس کی لاش خیموں کے رسّوں پر گری جو ہل گئے۔ علاوہ ازیں مرنے سے قبل اُس کی ایک چیخ بھی نکلی۔ اس پر حرم کی ایک قلماق ملازمہ رحیمن نام باہر نکلی خواجہ سرا کی لاش اور چند اجنبی دیکھ کر اس نے شور مچا دیا۔ اس پر وہ آدمی بھاگے رحیمن نے اُن کا تعاقب کیا۔ اُن میں سے ایک شخص کا پاؤں رسّے میں اُلجھا اور وہ گر پڑا۔ رحیمن نے خنجر سے اُس کا کام تمام کر دیا اور خود بھی قدرے زخمی ہوئی۔ اتنے میں بہت سے پہرہ دار آگئے۔ اور اس بھیڑ میں بقیہ آدمی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنگ تخت نشینی کے خاتمے پر جب جہاندار خان نے جشن منایا تو رحیمن کو "رستمِ ہند" کا خطاب دیا۔

تیسرے دن شاہزادوں نے اپنی توپیں جو شہر سے میدانِ جنگ میں پہنچ گئی تھیں۔ نئے مورچوں پر نصب کر لیں جن کی گولہ باری سے محصورین بہت گھبرائے۔ اس سے تنگ آکر بہت سے اُمرا نے محاصرے سے نکلنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ علاوہ اس کے دست بدست لڑائی بھی جاری رہی جس میں محصورین کی طرف سے سلیمان خان پنی۔ شاہ نواز خان۔ کیسری سنگھ۔ راجہ دیا بہادر ناگر نے اپنی اپنی سپاہ کی مدد سے حصہ لیا اور حملہ آوروں کی طرف سے راجہ پرتھی راج بندیلہ۔ عبدالصمد خان۔ فتح اللہ خاں وغیرہ نے بہادری دکھائی۔ اسی اثنا میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ عظیم الشان میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔

تین دن کی جنگ کوئی فیصلہ نہ کر سکی تو ذوالفقار خان کو نئی ترکیب سوجھی۔ بہت سے اُمرا فوجیں لیے دریا کی ریتی میں پڑے تھے اور وہ تقریباً غیر جانبدار تھے۔ اگرچہ اُن کے کیمپوں میں گاہے گاہے متحارب لشکروں سے توپوں کے گولے آگرتے تھے۔ ذوالفقار خاں نے بہادر شاہ اوّل کی وفات کے بعد سپاہی متعین کر دیئے تھے کہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ دریا کے مختلف گھاٹوں پر بہت سخت پہرہ تھا۔ ذوالفقار خاں کے دل میں خیال آیا کہ اگر گھاٹوں پر سے پہرہ اُٹھا لیا جائے تو یہ اُمرا اپنے متوسلین سمیت خطرہ کے پیشِ نظر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ خود عظیم الشان کے لشکر سے بہت سے لوگ بال بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے بھاگ گئے۔ ان لوگوں کو حریفوں نے کچھ نہ کہا بلکہ آسانی سے بھاگنے دیا۔ اس سے بھگوڑوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بھاگنے والے اُمرا میں مہابت خان اور خانِ زمان (جو مرحوم منعم خان وزیر کے بیٹے تھے) اور حمیدالدین خان عالمگیری بھی تھے۔ جو راوی پار چلے گئے۔ بقولِ قاسم خان عبرت لاہوری انھوں نے شاہی مسجد میں پناہ لی۔ چوتھے روز چھ گھنٹے متواتر جنگ ہوئی۔ کیسری سنگھ مارا گیا۔ عبدالصمد خان نے کمال جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا۔

شاہ نواز خاں بری طرح زخمی ہوا اور اُسے سترہ تیر لگے بعد ازاں انھیں زخموں کی وجہ سے وہ فوت ہو گیا۔ شاہ نواز خاں[1] صفوی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اِس کا شجرۂ نسب چند واسطوں سے شاہ اسمٰعیل صفوی والیٔ ایران تک پہنچتا تھا جنھوں نے ۱۵۰۱ء سے ۱۵۲۴ء تک حکومت کی تھی۔ یہ خاندان کئی پشتوں تک اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہا۔ مغلیہ شاہی خاندان سے ان کی رشتہ داریاں بھی

---

[1] ذخیرۃ الخوانین جلد اوّل از شیخ فرید بکھری (کراچی ۱۹۶۱ء ایڈیشن) مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱۔ اس خاندان کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہو ہیں اور وقتاً فوقتاً اِس دو دمانِ عالیہ کی سات عفت شعار بیٹیاں خانوادۂ تیموریہ کے مختلف شاہزادوں کے محلوں کی زینت بنیں شاہ نواز خاں کے بعد اِس خاندان کا کوئی فرزند ناموری حاصل نہ کر سکا - نام لیوا تو اس خاندان کے برصغیر میں اب بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گے -

پرنمی راج اور عبدالصمد خاں دشمن کو دباتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور آخر کار جہاندار شاہ کی فوجیں عظیم الشان کے مورچوں میں گھس گئیں حتٰی کہ عظیم الشان کا بڑا بیٹا محمد کریم میدان سے بھاگ کر راوی کے پار ایک غریب دُھنیے کے گھر میں جا چھپا - جہاں سے اُسے بعد از اں گرفتار کیا گیا - محمد قاسم عبرت کا بیان ہے کہ اُس نے محلہ تلیغہ (تل بگہ) میں جو ٹکسالی دروازے کے باہر تھا ایک جولاہے کے گھر میں پناہ لی - اُس کے بہت سے سپاہی بھی بھاگ کر شہر میں جا چھپے - یہاں تک کہ ساٹھ ستر ہزار فوج میں سے آخری روز شاہزادہ کے گرد بمشکل دو ہزار سپاہی ہوں گے - بیان کیا جاتا ہے کہ اُس روز عظیم الشان کے ذاتی جنگی ہاتھی نے اُسے سوار نہ ہونے دیا اور جماوت کے قابو نہ آیا اُس کی جگہ دوسرا ہاتھی لایا گیا - آغازِ جنگ کے بعد تیز آندھی چلنے لگی اور کنارِ راوی کی ریت بادلوں کی طرح اُڑنے لگی سوائے تاریکی کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا - اور سوائے توپوں کی آوازوں کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا شاہزادہ کے ہاتھی پر بھی گولے گرنے لگے - بعض خیر خواہوں نے اُسے بھاگ کر بنگال یا دکن چلے جانے کا مشورہ دیا مگر اُس نے ایک نہ مانی - اِسی اثنا میں ایک گولہ ہاتھی کی سونڈ پر لگا اُس کی سونڈ زخمی ہو گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا - امین الدین خاں نے گھوڑے پر تعاقب کیا مگر ہاتھی اس رفتار سے بھاگا کہ گھوڑا پیچھے رہ گیا - حتٰی کہ ہاتھی دریا میں گھس گیا اور سوار سمیت دلدل میں غرق ہو گیا - جب امین الدین خان کنارے پر پہنچا تو نیچے ہلتی ہوئی دلدل میں ہاتھی کی خوفناک چنگھاڑ اور سوار کی آخری چیخوں کے سوا کچھ نہ تھا - اور اس طرح تخت کے بہترین اور سب سے طاقتور وارث کا خاتمہ ہو گیا - امین الدین کو اس حادثہ کا اس قدر صدمہ ہوا کہ تن تنہا ساری رات درخت کے نیچے گزار دی - اور اگلے روز شہر میں چلا گیا - معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ موجودہ گاؤں لکھو ڈہیر کے قریب شالامار باغ سے غالباً نو دس میل دُور وقوع پذیر ہوا تھا -

اس واقعہ کے بعد ذوالفقار خان بہت مغرور ہو گیا اور اُس نے چھوٹے دونوں شہزادوں جہان شاہ اور رفیع الشان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا - اُس کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کا بھی خاتمہ کر دیا جائے - مالِ غنیمت کی تقسیم پر اختلافات شروع ہوئے اور ان کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی گئی - ذوالفقار کے ارادوں کو بھانپ کر دونوں بھائیوں نے جنگ کی تیاری کا آغاز کیا اور عظیم الشان

دیگر افراد کے حالات کے لیے دیکھئے صمصام الدولہ شاہ نواز خان کی کتاب مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۷۰۶ جلد سوم صفحہ ۲۹۶، ۶۷۷، ۶۹۲ -

لہ بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادہ کریم نے ایک روز خوراک وغیرہ ضروریات کا انتظام کرنے کے لیے ایک ہیرا جولاہے کو دیا - وہ غریب آدمی ایک بیش بہا ہیرا فروخت کرتا ہوا گرفتار کر لیا گیا تفتیش پر اُس نے ساری کہانی بیان کر دی - اور شاہزادے کو پکڑ کر ہدایت کیش واقعہ نگارِ کل جہاندار کی خدمت میں لے گیا - اُس نے شہزادے کو ذوالفقار خان کے حوالے کر دیا جس نے اُسے دو روز قید رکھ کر مروا ڈالا - کہتے ہیں کہ قتل سے قبل شاہزادے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ کہا کہ وہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے اُسے تھوڑا سا پانی اور روٹی دے دی جائے مگر کسی نے بھی اُس کی التجا کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اُس پر مطلق رحم نہ کھایا - شہزادہ محمد کریم کی لاش جہانگیر کے مقبرے میں دفن کر دی گئی - مقبرے کے سامنے باغ میں دو احاطے قبروں کے ہیں انھیں میں محمد کریم کی قبر بھی ہے -

کے سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ مارچ ۱۷۱۲ء کو جہاں شاہ اپنے پہلے کیمپ سے جو مزار حضرت میاں میرؒ کے قریب تھا آگے بڑھا اور موضع باغ دو گوجر کے متصل جہاں شاہی شکارگاہ میں خیمے لگا دیئے۔ جہاندار شاہ نے کوکلتاش خان اور عبدالصمد خان کو جو اب میر آتش کے عہدہ پر فائز ہو چکا تھا اس کے خلاف بھیجا۔ جنگ توپوں کے مقابلہ تک محدود رہی۔ جہاں شاہ کا میر آتش رستم دل خان تھا۔ اگلے روز ۲۸ مارچ کو لو اور گرمی کے باوصف جہاں شاہ نے رستم دل خان، جانی خان اور مخلص خان اپنے جرنیلوں کو حریف پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رستم دل خان نے جہاندار شاہ کے ہراول دستوں کو بھگا دیا اور جلد اس کے قلب میں پہنچ گیا۔ اور جہاندار شاہ کے بڑے لڑکے معزالدین کو گرفتار کر لیا۔ اس سے تھوڑی دور ایک چھوٹا جنگی خیمہ تھا جہاں جہاندار شاہ نے اپنی محبوبہ لال کنور کی معیت میں رات گزاری تھی۔ اس اچانک حملے کی خبر سنکر وہ ہاتھی پر سوار ہو کر میدان میں نکلا اور لال کنور شہر کی طرف بھاگی اور دارا شکوہ کی حویلی میں جو اب اسے مل چکی تھی پناہ لی۔

رستم دل خان نے دشمن کو دھکیل کر جہاندار شاہ کے ہاتھی کے پاس پہنچنے کی کوشش کی۔ شہزادے کے محافظین دلیر دل خان، لطف اللہ خان اور رائے صورت سنگھ ملتانی نے اپنے آقا کی حفاظت کی پوری کوشش کی۔ شہزادے نے بھی آہنی عماری کے گوشے میں چھپ کر جان بچانے کی اس طرح کوشش کی کہ دشمن دھوکے میں آگیا کہ عماری خالی ہے اور شہزادہ اتر کر کہیں چلا گیا ہے۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ جہاں شاہ مارا گیا ہے۔ اس اطلاع نے رستم دل خان کے چھکے چھڑا دیئے۔

جہاں شاہ لڑتا لڑتا گرد و غبار کے سبب اپنی فوج سے علیحدہ ہو گیا اور چند ساتھیوں اور سپاہیوں کے ہمراہ ایک بڑے سے گاؤں کے پاس جا پہنچا جس میں جہاندار شاہ کے کچھ بندوقچی بھاگ کر چھپے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی آن پہنچے ہیں تو انھوں نے بندوقیں چلانی شروع کر دیں جس پر جہاں شاہ کے آدمیوں نے سمجھا کہ دشمن کی بہت سی فوج مقابلے میں ہے۔ وہ حوصلہ ہار کر بھاگنے لگے۔ سپاہیوں کی بزدلی پر جھلا کر جہاں شاہ نے ہاتھی کو آگے ریلا۔ حتیٰ کہ چند دلیر جانبازوں کے جھرمٹ میں وہ لڑتا لڑتا اپنے بیٹے فرخندہ اختر سمیت مارا گیا۔ اُدھر جہاندار شاہ مایوس ہو کر میدان جنگ سے بھاگنے ہی والا تھا کہ ذوالفقار خان اس کے حریف بھائی کا سر لے کر اس کی خدمت میں پہنچا اور اسے مبارکباد دی۔

رفیع الشان کا خاتمہ

جہاں شاہ اور جہاندار شاہ کے معرکہ میں رفیع الشان میدان جنگ سے دو کوس دور اپنی فوجیں لیے نتیجے کا منتظر کھڑا تھا۔ نجومیوں نے اسے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ انجام کار وہی کامیاب ہو گا۔ جہاں شاہ کے خاتمے کی اطلاع ملتے ہی اس نے اپنا خواجہ سرا یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ جہاندار شاہ کا اس کے متعلق کیا ارادہ ہے۔ خواجہ سرا کیمپ میں پہنچا تو سارا دن کی جنگ کے بعد جہاندار شاہ اور اس کا وزیر سو چکے تھے۔ البتہ کوکلتاش خان نے جو سخت بیوقوف انسان تھا خواجہ سرا سے کہا "شاید آپ جہاں شاہ سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ وہ دیکھئے سامنے میدان میں باپ بیٹے کی لاشیں پڑی ہیں۔ رفیع الشان سے کہیئے کہ اگر وہ لڑنا چاہتا ہے تو اس کا بھی یہی انجام ہو گا" خواجہ سرا نے واپس آ کر اپنے آقا کو بتایا کہ جہاندار شاہ کے عزائم خطرناک ہیں۔ اسی وقت مجلس مشاورت طلب کی گئی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ سوا پہر چڑھے ۲۸ مارچ ۱۷۱۲ء کو رفیع الشان نے جہاں قلی خان اور منعم خان کو توپخانہ لیکر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فتح اللہ خان جیسے بادشاہ نے بہت سا روپیہ دیا تھا اور وہ سپاہی جو زبردست خان (نبیرہ علی مردان خان) کی قیادت میں لڑنے کے لیے بھیجے گئے تھے دشمن سے جا ملے۔ ناتجربہ کار نئے سپاہی میدان سے بھاگ گئے۔ شمشیر خان، حافظ خان، کاظم خان، نجم ثانی، انوپ سنگھ ناروکا اور اس کے گیارہ عزیز اور نور خان افغان شہزادے کے ہاتھی کے سامنے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ رفیع الشان آخر کار تلوار ہاتھ میں لیے ہاتھی سے اترا اور دست بدست جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔

جہاں دار شاہ کا دورِ حکومت

یکے بعد دیگرے سب حریفوں کو ختم کرنے کے بعد جہاندار شاہ سریر آرائے سلطنت مغلیہ ہوا۔ ۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء کو میدانِ جنگ ہی میں خیمے لگا لیے گئے تاکہ ضروری رسوم کی ادائیگی کے بعد جہاندار شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔

نئے بادشاہ کے وفاداروں، معاونوں اور اُس کے بھائیوں سے غداری کرنے والے ابن الوقت اور موقعہ شناس امرا کو انعامات اور اعلیٰ عہدے دیے گئے۔ زبردست خاں کو اُس کے دادا کا لقب علی مردان خاں بطور خطاب عطا کر کے لاہور کا گورنر بنا یا گیا۔ رستم دل خاں کو جو اسیروں میں تھا انتہائی مظالم کا ہدف بنا کر قتل کر دیا گیا اور اس کی ضبط شدہ جائداد جو بیس لاکھ روپیہ کی مالیت کی تھی عبدالصمد خاں کو عطا کی گئی۔

یکم مئی ۱۷۱۲ء کو جہاندار شاہ لاہور سے دہلی روانہ ہوا۔ وہ عظیم الشان فوج جسے لے کر بہادر شاہ اوّل بندہ بیراگی کے استیصال کے لیے واردِ پنجاب ہوا تھا، بھائیوں کی خانہ جنگی میں برباد ہو گئی۔ جہاندار شاہ باپ کے مشن کو بھلا کر بقیۃ السیف فوج اور امرا کے ہمراہ لاہور سے ایسے وقت چلا کہ اُس کے بعد پھر کسی مغل تاجدار کو لاہور آنا نصیب نہ ہوا۔ اس کی فوج کے ہمراہ بہادر شاہ اول جہاں شاہ اس کے فرزند فرخندہ اختر اور رفیع الشان کے تابوت تھے جنھیں دہلی میں سپردِ خاک کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ دہلی جا کر بادشاہ اور اس کی محبوبہ لال کنور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اسی اثنا میں عظیم الشان کا دوسرا لڑکا فرخ سیر جو بہار میں تھا باپ کا بدلہ لینے اور دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے اٹھا۔ سادات بارہہ کے سردار سید عبداللہ اور سید حسین علی خاں اُس سے مل گئے۔ اور آخر کار فرخ سیر چند معرکوں کے بعد دہلی پر قابض ہو گیا۔ ۱۱ فروری ۱۷۱۳ء کو جہاں دار شاہ دس مہینے اور ۲۵ دن حکومت کرنے کے بعد نہ صرف تخت و تاج بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اور اسے ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

عبدالصمد خاں ناظمِ لاہور

اسی اثنا میں لاہور کا حاکم زبردست خاں (علی مردان خاں) فوت ہو گیا اور اُس کی جگہ عبدالصمد خاں کو لاہور کا حاکم ۲۲ فروری ۱۷۱۳ء کو مقرر کیا گیا۔ اُس کا سوتیلا بھائی اعتمادالدولہ محمد امین خاں بہادر مرکزی حکومت کا بخشیٔ ثانی مقرر ہوا تھا۔ یہ محمد امین خاں چین قلیچ خاں (مآثرالامرا جلد اوّل صفحہ ۳۴۶) (نظام الملک اصل بانیٔ سلطنت حیدرآباد دکن) کا چچا زاد بھائی تھا۔ عبدالصمد خاں پنجاب میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کے فرزندوں میں جنگِ تخت نشینی، جہاں دار شاہ کے عیش و عشرت اور فرخ سیر سے اس کی جنگوں کے سبب بندہ بیراگی کو اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل کر میدانی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے اور مسلمانوں کو بے پناہ نقصان پہنچانے کا موقعہ مل چکا تھا۔ بندہ اب پہلے سے زیادہ مضبوط اور خونخوار ہو چکا تھا۔ سادھورے کے قریب بندہ نے ایک مضبوط قلعہ بنوایا اور وہاں مقیم تھا۔ عبدالصمد خاں نے اپنے فرزند زکریا خاں فوجدارِ جموں اور زین الدین احمد خاں فوجدارِ سرہند کی مدد سے بندہ کو کئی معرکوں میں شکست دی۔ تقریباً آٹھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر گورداسپور کے قریب لوہگڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں بندہ بیراگی مقیم تھا۔ مقابلے کی تاب نہ لا کر بندہ بیراگی نے ہتھیار ڈال دیے اور شاہی حکام نے ۷ دسمبر ۱۷۱۵ء کو اُسے گرفتار کر لیا۔ ان خون آشام اسیروں کو زکریا خاں اور قمرالدین خان کی

نگرانی میں دہلی بھجوا دیا گیا۔ بندہ کو آہنی پنجرہ میں بند کر کے بھیجا گیا۔ ان اسیروں کی تعداد ۷۴۰ تھی۔

بندہ اور اس کے ساتھی دہلی میں ابراہیم خاں میر آتش اور سربراہ خاں کوتوال کے حوالے کر دیے گئے جو انھیں بہادر شاہ اول کے مرقد کے پاس لے گئے اور جس طرح بندہ سنگھ بہادر نے ہزاروں بے گناہ مسلمان مرد عورت اور بچوں کا خون بہایا تھا اُسے اور اس کے ساتھیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا (منتخب اللباب خوافی خاں جلد دوم ص ۷۶۶)

بندہ بیراگی کا خاتمہ عبدالصمد خاں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

بندہ بیراگی کی جادوگری اور شعبدہ بازی کی کہانیوں نے عام مسلمان سپاہیوں کو اُس سے مرعوب کر دیا تھا۔ عبدالصمد خاں حضرت عبیداللہ احراری کی اولاد سے تھا اور خود زاہد و متقی اور عابد شب زندہ دار تھا۔ دن اس کا گھوڑے کی پشت پر دشمنانِ اسلام سے شمشیر زنی میں بسر ہوتا اور رات مصلّٰیِ عبادت پر۔ خدا نے اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور اسلامی آبادیوں کو غارت آتش کرنے والے بندہ کا جادو خانوادۂ نقش بند کے اسی درویش شمشیر زن کی مساعی کے سامنے باطل ہو گیا۔ اور پنجاب میں امن و امان اور خوشحالی و فارغ البالی کا دور شروع ہوا۔

فرخ سیر کی موت

دہلی میں امرا کی طاقت بڑھ گئی وہ مختلف جماعتوں میں بٹ کر اپنے خود غرضانہ عزائم کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ بادشاہ گر سید بھائی فرخ سیر کو تنگ کرنے لگے اور آخر کار اُسے ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو معزول کر دیا گیا۔ تقریباً دو ماہ کی قید کے بعد ستائیس اور اٹھائیس اپریل کی درمیانی شب کو اُسے مروا دیا گیا۔ اور اُس کی لاش ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دی گئی۔

ایک برس میں تین تاجدار

اس واقعہ کے بعد سید بھائیوں کا زور بہت بڑھ گیا اور ۱۷۱۹ء میں انھوں نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ (شاہجہان ثانی) کو تخت پر بٹھایا۔ آگرے میں نکوسیر نے کوس شہنشاہی بجایا۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ آخر کار قرعۂ فال محمد شاہ کے نام پڑا۔ اور وہ تختِ حکومت پر بٹھایا گیا۔ یہ دونوں شہزادے بیوہ خانے سے لیے گئے تھے اور بیس اکیس سال ان کی عمر تھی۔ دونوں دق کا شکار تھے۔ افیون کی عادت نے صحت اور خراب کر دی تھی۔ مگر خود غرضوں نے ان کی صحت کا خیال نہ کیا اور یہ دونوں برس کے اندر اندر فوت ہو کر قطب مینار کے نزدیک درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے قریب دفن ہوئے۔

محمد شاہ کا دور

۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کا فرزند روشن اختر محمد شاہ کے لقب سے دہلی میں تخت نشین کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ سلیم گڑھ کے بیوہ خانے میں جب سید بھائیوں کے نمائندے اسے بادشاہ بنانے کے لیے لینے گئے تو اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی کہ مجھ بیوہ پر رحم کرو اور میرے یتیم بچے کو بادشاہ نہ بناؤ۔ اور اس کی جوانی پر رحم کھاؤ۔

۱۷۱۹ء میں گویا مغلیہ حکومت اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ تاجپوشی خونریزی کا پیش خیمہ سمجھی جاتی تھی۔

شاہی خاندان کے افراد کی خود غرضیوں اور خانہ جنگیوں نے امرا کو اپنی طاقت بڑھانے اور اپنی اغراض کے لیے شاہی خاندان کو آلۂ کار بنانے اور حکومت کو نقصان پہنچانے کا موقعہ دے دیا تھا۔ بہر حال محمد شاہ نے ۲۹ سال حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت کے تمام واقعات سے ہمیں سروکار نہیں کیونکہ ربع صدی کے طویل دورِ حکومت میں وہ ایک بار بھی لاہور نہ آیا۔ اور اُس کا زیادہ وقت لال قلعۂ دہلی کی سنگین دیواروں

کے اندر گزرا۔ محمد امین خاں کی سعی اور بادشاہ کی دوراندیشی نے ملک کو بادشاہ گر سید بھائیوں سے نجات دلائی۔ اس کے بعد اگر محمد شاہ اپنی وسیع مملکت کے مختلف خطوں کا دورہ کرتا رہتا جس سے حکومت کے اہل کاروں اور منصب داروں کا احتساب ہوتا اور سرحدوں کی حفاظت اور ساحل بحر کی نگرانی کا خاطر خواہ انتظام کرتا تو یقین ہے کہ مغلوں کا گرتا ہوا وقار سنبھل جاتا اور نظام حکومت کا بکھرتا ہوا شیرازہ درست ہو جاتا لیکن عالم یتیمی میں بیوہ خانے کے اندر پلا ہوا نوجوان حکومت کے تقاضوں کو کما حقہ نہ سمجھ سکا۔ اس کے تورانی وزرا محمد امین خان۔ نظام الملک آصف جاہ اور قمرالدین خاں نے حالات کی اصلاح کی طرف توجہ کی مگر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے حکومت کی کمزوری اور نظام سلطنت کی پراگندگی کو بالکل واشگاف کر دیا۔ اور مغل شہنشاہیت کا بھرم کھل گیا۔

ناظمان لاہور

جہاں تک صوبۂ لاہور کا تعلق ہے یہاں ۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۶ء تک عبدالصمد خاں دلیر جنگ اور ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۵ء تک اُن کا فرزند زکریا خاں ناظم رہے۔ ۱۷۲۶ء سے ۱۷۳۷ء تک عبدالصمد خاں صوبۂ ملتان کا ناظم رہا اور اُن کی وفات کے بعد صوبۂ ملتان بھی زکریا خاں کو مرحمت ہوا۔ اس دور میں صوبجات کے ناظموں کو اپنے علاقوں کی اندرونی حکومت کے سلسلہ میں مکمل اختیار تھا۔ اور نظامتیں اور صوبہ داریاں موروثی بن گئی تھیں۔ یہ لوگ شہنشاہ دہلی کی وفاداری کا دم ضرور بھرتے تھے۔ سکہ اور خطبہ انھیں کے نام کا تھا اور صوبہ دار انھیں کے نام پر اپنی مرضی اور قابلیت کے مطابق حکومت کرتا تھا۔

عبدالصمد خاں اور زکریا خاں بیدار مغز حکمران تھے۔ انھوں نے صوبجات لاہور و ملتان کا انتظام اس قابلیت سے کیا کہ اس کی مثال اُس صدی کی تاریخ پاکستان و ہند میں مشکل سے ملے گی۔ ۱۷۱۳ء سے لے کر لاہور پر بھنگی مثل کے سکھ سرداروں کے قبضے تک لاہور کی تاریخ صوبائی ناظموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ موجودہ انجینئرنگ کالج کے عقب میں محلہ بیگم پورہ عبدالصمد خاں کی بیوی بیگم جان بی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس کے ہر گوشے میں اس خاندان کے فلک رفعت محلات خوبصورت باغات اور قیمتی مقبرے تھے جن کا سلسلہ باغبانپورہ سے چاہ میراں تک پھیلا ہوا تھا۔ ۲۶ جولائی ۱۷۳۷ء کو عبدالصمد خاں اور ۱۷۴۵ء میں زکریا خاں فوت ہو کر بیگم پورہ ہی میں دفن ہوئے عبدالصمد خاں کی کاشی کار مسجد، بیگم جان، بہو بیگم، شرف النساء اور ملکہ زمانی وغیرہ کی چند قبور بعض حویلیوں اور حماموں کے کھنڈرات اب تک وہاں موجود ہیں۔ بندہ بیراگی کا خاتمہ عبدالصمد خاں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی ناظمان لاہور نے سکھوں کو پے در پے شکستیں دی تھیں اس لیے سکھ انتقامی جذبے سے بار بار بیگم پورہ پر حملے کرتے اور اسے لوٹتے تھے، ان کی لوٹ مار اور آتش زنی سے بیگم پورہ کی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ بیگم پورہ کے مفصل تاریخی حالات ذیل کی مستند کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں:۔

«بدائع وقائع» از آنند رام مخلص ہمعصر مورخ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ورق ۲۲۰ (الف)

عبرت نامہ مفتی علی الدین روٹوگراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری ورق ۳۶ (الف)

تحقیقات چشتی صفحات ۶۴۱ - ۶۴۴   تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۲۶۸-۲۹۳

ہسٹری آف لاہور از سید محمد لطیف صفحہ ۱۲۸   لاہور عہد مغلیہ میں از منشی محمد الدین فوق مرحوم

نواب زکریا خاں

نواب زکریا خاں اپنے والدین کے چہیتے فرزند تھے اور نواب عبدالصمد خاں نے انھیں بے حد لاڈ پیار سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کس سال کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ لیکن ۱۷۱۳ء کے واقعات کے ضمن میں وہ بھی بندہ بیراگی کے خلاف معرکوں میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت

آپ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ ہو۔ آپ کا انتقال ۱۷۴۵ء میں ہوا۔ آنند رام مخلص اور دیگر ہم عصر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر چنداں زیادہ نہ تھی، اور ان کا انتقال ایک بے موقع حادثہ تھا۔ اگر اس وقت نواب کی عمر پچاس سال کے قریب تصور کر لی جائے تو اُن کی پیدائش ۱۶۹۵ء کے قریب عالمگیر کے عہد میں ہوئی۔

نواب زکریا خاں کے اطوار و اخلاق اور طریق حکمرانی کے بغور مشاہدے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کمال اہتمام سے کیا گیا تھا اور علاوہ علوم مروجہ و اسلامیہ کے آپ کو فنونِ حرب سے بھی واقف کرایا گیا۔ نواب زکریا خاں کی شادی نواب محمد امین خاں وزیر دہلی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جو اُن کے سوتیلے چچا تھے اور جن کی بیگم آپ کی حقیقی خالہ تھیں۔

نواب زکریا خاں کی زوجہ کو محل میں بہو بیگم کا خطاب حاصل تھا۔ صفحات تاریخ میں آپ کے دو فرزندوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کے اسماء نواب یحییٰ خاں اور نواب شاہ نواز خاں تھے۔

نواب زکریا خاں ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۵ء تک انیس سال صوبۂ لاہور کے ناظم رہے۔ ان کی معدلت پژوہی اور رعایا پروری اور اتّقا تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ بقول غلام علی نقوی صاحب "عماد السعادت" ان کے عدل و انصاف کے سامنے نوشیرواں کا عدل و انصاف فسانۂ بے اصل معلوم ہوتا ہے۔

ان کے عہد میں لاہور کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی بار چپقلش ہوئی۔ مگر انھوں نے کمال رواداری سے کام لیتے ہوئے فریقین میں صلح کرا دی اور یہی امران کی حکومت کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کی دلیل ہے۔

ہرنام سنگھ نے "سعادت جاوید" میں ان کے عدل کی ایک نہایت دلچسپ داستان بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر بھیس بدل کر شہر میں گشت لگایا کرتے تھے۔ اور ہر مقدمے کا فیصلہ جو ان کے پاس آتا تھا، کمال غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔

اس دور میں پنجاب کے مختلف شہر صنعت و حرفت کے مراکز تھے اور پنجاب کی مصنوعات کی دُور دُور تک مانگ تھی۔ رعایا خوشحال اور زمیندار مالا مال تھے۔ یوں تو تمام صوبہ لاہور ہی معراج ترقی پر فائز تھا۔ مگر جالندھر دوآبہ اور چار محال کے علاقے خاص طور پر ممتاز تھے۔ (چار محال سے مراد گجرات، پسرور، اورنگ آباد اور سیالکوٹ کا علاقہ تھا)

اس وقت بے شمار علماء و فضلاء پنجاب کے مختلف شہروں میں مقیم تھے جو ترویج علوم میں مشغول تھے۔ لاہور، گجرات، سیالکوٹ اور جالندھر تو گویا رشک خطۂ یونان تھے۔ حضرت حامد قاری جن کا مدرسہ محلہ مغلپورہ لاہور میں تھا۔ اور حضرت شاہ محمد غوث جن کا مزار باغ بیرون دہلی دروازہ میں واقع ہے۔ اس دور کے ممتاز اور مقتدر علماء میں سے تھے۔

دیوان لکھپت رائے: — دورِ مغلیہ میں ہندو ہمیشہ اعلیٰ عہدوں پر فائز نظر آتے ہیں۔ چنانچہ نواب زکریا خاں کے دور میں بھی دیوان یعنی مہتمم مالیات کا عہدہ دیوان لکھپت رائے کے پاس تھا۔ اس کا بھائی جسپت رائے بھی سرکار لاہور میں کسی عہدے پر متمکن تھا۔ یہ لوگ لاہور کے ایک مقتدر کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب صاحب ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ ان کی سر بفلک حویلیاں شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع تھیں۔ دیوان لکھپت رائے نے کوٹ لکھپت نام ایک گاؤں لاہور کے متصل آباد کیا جو اب تک موجود ہے۔

نواب زکریا خاں اور نادر شاہ

۱۷۳۸ء میں ایران کا بادشاہ نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ صوبہ کابل کے گورنر ناصر خاں نے دہلی کی مرکزی حکومت کو امداد کے لیے بارہا لکھا۔ مگر وہاں

ارباب اقتدار عیش و نشاط اور نشۂ پندار میں مست تھے۔ انھوں نے ان درخواستوں کی طرف توجہ نہ کی۔ اور نادر شاہ صوبۂ کابل کی فتح کے بعد دریائے اٹک عبور کر کے صوبۂ لاہور میں داخل ہو گیا۔ نواب زکریا خاں نے بھی دہلی کے ارباب حل و عقد کو متعدد مراسلے لکھے۔ مگر وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے تیاری شروع کر دی اور شہر لاہور کی فصیل پر توپیں چڑھا کر بچاؤ کا خوب انتظام کیا۔ نادر شاہ کا لشکر بے حد تجربہ کار اور جنگجو سپاہ پر مشتمل تھا۔ نواب زکریا خاں نے دیکھا کہ وہ تن تنہا مرکزی حکومت کی امداد کے بغیر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ حملہ آور سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ صلح کے بعد وہ نادر شاہ سے خود ملا جو اس کی دانائی معاملہ فہمی اور دور اندیشی پر بہت خوش ہوا۔ اور بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ وصول کر کے دہلی کی طرف چلا گیا۔ نواب زکریا خاں کی دوراندیشی نے تیس لاکھ روپے کے عوض لاہور کے پانچ لاکھ باشندوں کو اس تباہی و بربادی سے بچا لیا جو امرائے دہلی کی باہمی رقابت اور عاقبت نااندیشی کے سبب دہلی کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

دہلی کی بربادی کے بعد نادر شاہ وطن کی جانب جاتے ہوئے پنجاب میں نواب زکریا خاں سے ملا۔ اور اس وابستگی کی بنا پر جو اُسے نواب سے تھی۔ یہ کہا کہ آپ مجھ سے جو فرمائش کرنا چاہتے ہیں، بلا توقف کیجیے۔ وہ پوری کی جائے گی۔ نواب زکریا خاں کی خداترسی اور نیک دلی ملاحظہ ہو۔ جواب دیا کہ آپ وہ ہزارہا ہندوستانی اسیر اور اہل فن جو اپنے لشکر کے ہمراہ ایران لیے جا رہے ہیں۔ رہا کر دیں۔ نادر شاہ نواب زکریا خاں کی نیک نیتی اور رعایا پروری سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔ اور یہ لوگ نواب صاحب کے جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

نواب زکریا خاں کے دور کی بغاوتیں

صوبہ پنجاب جنگجو قبائل کا مستقر ہونے کے سبب اکثر فتنہ و فساد کا شکار ہوتا رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی بڑا زمیندار یا جاگیردار کسی ناظم سے ناراض ہوتا تھا جھٹ علم بغاوت بلند کر کے اور خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتا تھا۔ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو بندہ بیراگی کے فتنے کے استیصال کے علاوہ عیسیٰ خاں منج اور حسین خاں خویشگی کے خلاف معرکہ آرا ہونا پڑا اور سخت خونریز جنگوں کے بعد ان کی بغاوتیں فرو ہوئیں۔ نواب زکریا خاں کے دور میں بھی صوبہ لاہور میں چند سرکشوں نے فتنے برپا کیے۔ مگر نواب نے کمال تدبر و حکمت سے ان کی سرکوبی کی اور اس صوبے میں امن و امان قائم رکھا۔ ذیل میں ان بغاوتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جنگ پناہ بھٹی بقول صاحب "مآثر الامرا" مفسدانِ تمرد پیشہ" سے تھا۔ اور حسن ابدال سے لے کر دریائے راوی کے کنارے تک تاخت و تاراج کیا کرتا تھا۔ نواب زکریا خاں نے اس کے استیصال کے لیے اپنے ایک معتمد لعبہ کو رامل کو بھیجا۔ جس نے جنگ پناہ کو میدان جنگ میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میر مار ایک مقتدر زمیندار تھا۔ جنگ پناہ کے استیصال کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اور باری دوآب میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے ایک ترکی الاصل جرنیل قزاق بیگ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے باغی مذکور کو شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا اور لاہور میں اُسے بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

راجگان جموں کا دستور تھا کہ جب لاہور میں کوئی دلیر اور جری حاکم ہوتا تو وہ شاہ دہلی کے باج گذار بن جاتے۔ اور جب کوئی کمزور صوبے دار برسر اقتدار آتا تو بغاوت اور سرکشی اختیار کر لیتے۔ نواب عبدالصمد خاں کے دور میں دھوپ دیو والیٔ جموں نے بغاوت کی۔

قلب سے اس کی کما حقہ سرکوبی کی۔ اور اس نے باقاعدگی خراج کا وعدہ کر کے اطاعت قبول کر لی۔ نواب صاحب کے ملتان تشریف لے جانے پر اس سے پیشتر بغاوت کی یہ خبر سنتے ہی نواب زکریا خاں فوج جرار کی معیت میں اس کی تادیب کے لیے روانہ ہوا۔ اُدھر سے آدینہ بیگ خاں حاکم جالندھر دوآب بھی ان کی مدد کے لیے آگیا۔ نواب عبد الصمد خاں بھی ملتان سے جموں پہنچے۔ ایک زبردست معرکے کے بعد راجہ جموں کو شکست ہوئی راجہ نے تاوان جنگ ادا کر کے مصالحت کر لی۔ جب تک نظامت پنجاب مضبوط ہاتھوں میں رہی۔ ڈوگرے جموں کو سرکشی کی جرأت نہ ہوئی لیکن ۱۷۴۸ء میں نواب معین الملک کی اچانک موت کے بعد جب پنجاب میں ہلچل مچ گئی۔ تو راجہ دھوپ دیو کے فرزند رنجیت دیو نے پھر سرکشی اور خودسری اختیار کر لی۔

نواب زکریا خاں کی وفات

نواب زکریا خاں کا انتقال لاہور میں یکم جولائی ۱۷۴۵ء کو ہوا۔ اس رعایا پرور اور معدلت گستر حاکم کی وفات عوام کے لیے صدمۂ جاں ستاں سے کم نہ تھی۔ چنانچہ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی شہر میں کہرام مچ گیا۔ بقول سید محمد قاسم نواب صاحب کے جنازے کے ہمراہ خلق خدا بلا امتیاز مذہب و ملت نالہ کناں تھی۔ شندرام مخلص اپنی کتاب "بدائع وقائع" میں لکھتا ہے کہ نواب صاحب کے جنازے پر اس قدر پھول برسائے گئے کہ شہر میں اس وقت پھول نایاب ہو گئے۔ اور کسی قیمت پر نہ ملتے تھے۔ نواب زکریا خاں کو بیگم پورہ میں مقبرہ حضرت ایشاں کے قریب کاشی کار مسجد کے شمالی جانب خاندانی احاطہ قبور میں باپ کی قبر کے متصل دفن کیا گیا۔

حضرت ایشاں خواجہ محمود خاوند المتوفی ۱۰۵۲ھ کا لقب ہے۔ آپ جہانگیری اور شاہ جہانی دور کے ایک مقتدر بزرگ تھے آپ کا موجودہ ثریا بوس گنبد نواب زکریا خاں ہی نے بنوایا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے حضرت مادھو لال حسین کے مزار کے متصل ایک مسجد بنوائی۔ اس پر بہت سے کاشی کار کتبے ہیں یہ مسجد اب اگرچہ از سر نو تعمیر ہو چکی ہے۔ لیکن کاشی کار کتبے اب تک باقی ہیں۔

زکریا خاں کا انصاف

اس جگہ ہم زکریا خاں کے عدل کی ایک داستان زیب قرطاس کرتے ہیں اس واقعہ کو ایک ہم عصر غیر مسلم مورخ "ہرنام سنگھ" نے "سعادت جاوید" میں بیان کیا ہے اور کتاب مذکور کے اس اقتباس میں شامل ہے جو ایلیٹ اور ڈاؤسن کی انگریزی تاریخ "ہندوستان کی کہانی اس کے اپنے مورخین کی زبانی" میں درج ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ زکریا خاں کے دورِ نظامت میں لاہور کے کسی محلہ میں ایک نیک نہاد ہندو عورت رہتی تھی جو حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی اور ایک زمانہ اس کی عفت شعاری کا معترف تھا۔ ایک اوباش طبع مسلم نوجوان بھی لاہور میں مقیم تھا۔ لوگ اسے آغا کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ جہاں کوئی ماہ جبیں نازنیں پر نظر پڑی۔ اسے کسی نہ کسی طرح ورغلا کر اس کے گلشنِ عفت کو پامال کر ڈالا۔

اتفاق سے ایک روز اس ظالم نے مذکورہ صدر ہندو عورت کو دیکھا۔ اور اسے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ اس نے بہت سے پاپڑ بیلے۔ مگر کسی طرح بھی وہ اس پری کو شیشہ میں نہ اتار سکا۔ آخر کار اس نے ایک عجیب چال اس عفیفہ کو پھنسانے کے لیے بچھایا۔ ایک روز اس نے اپنے احباب کو دعوت دی کہ فلاں ہندو کی بیوی نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو کر میرے حبالۂ نکاح میں آ رہی ہے۔ اس لیے احباب میرے غریب خانہ پر رونق افروز ہوں۔ اس تقریب پر اس نے علاوہ اپنے دوستوں کے بہت سے معززین شہر کو بھی مدعو کیا۔ مقررہ وقت پر حاضرین کے روبرو ایک عورت مکلف لباس میں ملبوس چادر میں منہ چھپائے لائی گئی۔ ایک مولوی نے پہلے اسے کلمہ پڑھا کر

مشرف بہ اسلام کیا۔ بعد ازاں آغا مذکور سے اس کا نکاح پڑھ دیا اور حاضرین نے ضیافت کے بعد ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

دوسرے روز آغا اوباش طبع نوجوانوں کی معیت میں اس ہندو کے مکان پر پہنچا اور اسے کہا کہ تمہاری بیوی اسلام قبول کرنے کے بعد میرے نکاح میں آچکی ہے وہ اب تمہارے ہاں نہیں رہ سکتی لہٰذا اسے میرے ساتھ روانہ کر دو۔ یہ سن کر اس ہندو پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اس نے غیظ و تحیر سے آغا کو کہا کہ میری زوجہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ وہ تمہارے مکان پر جا کر مسلمان کس طرح ہوئی اور نکاح کب پڑھا گیا۔ اس پر آغا نے وہ لوگ پیش کئے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اب تو ہندو مذکور بہت گھبرایا اور اس کے تمام احباب و اقربا بھی بہت نادم ہوئے۔ ایک دو سمجھدار آدمیوں کے مشورے پر لالہ نے اپنی زوجہ سے کہا کہ وہ اس معاملہ پر روشنی ڈالے یہ کہانی سن کر اس عورت کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس نے شوہر سے کہا کہ جب میں گھر سے نکلی تک نہیں اس شخص کا دعویٰ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ میں مرنا قبول کروں گی مگر اس کے ہمراہ نہ جاؤں گی۔

اس پر عورت کے اقربا کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے یہ حکایت باور کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر آغا نے ہندوؤں سے کہا کہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ جس قدر یہ جھگڑا طول پکڑے گا۔ اسی قدر آپ کی بدنامی ہوگی۔ آپ اپنے گھر کی تلاشی لیں۔ اگر آپ کے کپڑوں کے صندوقوں سے مسلمان عورتوں کے پہننے کا لباس عروسی جسے زیب تن کر کے عورت مذکور نے مجھ سے نکاح پڑھوایا تھا برآمد ہو جائے تو میں سچا ورنہ دروغ گو۔ مجھے بلا ثبوت اس دعوے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔

ہندوؤں نے گھر میں خوب اچھی طرح دیکھ بھال کی تو ان کے ایک صندوق میں واقعی مسلمان دلہنوں کے پہننے کا لباس مل گیا۔ جسے دیکھ کر وہ سب سناٹے میں آ گئے تاہم ان کی غیرت نے اجازت نہ دی کہ عورت کو اس کی مرضی کے بغیر مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

آغا کے لئے چپ چاپ واپس آنے اور قاضی کی عدالت میں لالہ کے خلاف دعوے دائر کرنے کے سوا اور کوئی طریق کار نہ تھا۔ قاضی نے طرفین کے بیان لے کر اور یہ سننے کے بعد کہ ہندو عورت کے کپڑوں میں مسلمان عورتوں کے لباس کا سا عروسی جوڑا مل گیا اور ثقہ لوگوں کی اس گواہی پر کہ ہمارے سامنے عورت مشرف بہ اسلام ہو کر آغا کے نکاح میں آئی یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ زنِ مذکورہ اسلام قبول کر کے ایک مسلمان کے حبالۂ نکاح میں آچکی ہے اب اسے کسی حالت میں اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مرتد ہو کر ایک مشرک کی زوجہ بن جائے۔

قاضی کے فیصلہ کے خلاف ہندوؤں نے صوبہ دار کی عدالت میں اپیل کی تمام واقعہ نواب زکریا خاں کے گوش گزار ہوا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ نواب کا دستور تھا کہ وہ شام کے بعد بھیس بدل کر بیگم پورہ کے محلوں سے نکلا کرتے تھے اور شہر میں گھوم کر رعایا کے حالات سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔ اس روز وہ حسب معمول بیگم پورہ سے نکلے تو پہلے ہندو مذکور کے محلہ میں گئے۔ وہاں انھوں نے چند سادھوؤں کو باتیں کرتے سنا کہ اس عورت کو تو ہم ایک مدت سے جانتے ہیں۔ اس کے اطوار میں ہم نے سوائے نیک چلنی اور پاک دامنی کے اور کچھ نہیں دیکھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پارسا عورت جو گھر سے بھی بہت کم باہر نکلتی ہے۔ دوسرے محلہ میں مسلمانوں کے ہاں جا کر ان کا مذہب قبول کر کے ایک مسلمان سے شادی کر لے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔

عورت کے محلہ میں اس نوع کی باتیں سن کر نواب زکریا خاں نے آغا کے محلہ کی راہ لی وہاں انھوں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ آغا بے حد مکار اور عیار ہے اس نے ضرور چالبازی کی ہے اور اس پری کو کسی نہ کسی طرح شیشہ میں اتارنا چاہا ہے۔ ہم نے چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو مولوی صاحب کے سامنے آتے اور کلمہ پڑھتے دیکھا تو ضرور ہے مگر خدا جانے اس میں کیا عیاری ہے۔

اس کے بعد نواب صاحب سیدھے بیگم پورہ اپنے محل میں واپس آئے انھیں عورت کی شرافت اور آغا کی شرارت کی شہادت تو مل گئی مگر یہ معاملہ حل نہ ہوا کہ اسلامی طرز کا لباس عروسی اس عورت کے کپڑوں سے کیسے ملا۔ اور وہ کس طرح وہاں پہنچا۔ وہ تا دیر اس معاملہ پر غور کرتے رہے آخر کار کپڑوں کے خیال نے ان کا ذہن دھوبن کی طرف منتقل کیا۔

صبح ہوتے ہی نواب زکریا خاں نے اس دھوبن کو دربار میں طلب کیا جو اس ہندو عورت کے گھر کے کپڑے دھویا کرتی تھی اور اس سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس ڈرامہ میں اس کا کس قدر حصہ ہے پہلے تو وہ عورت انکار کرتی رہی مگر جب ذرا سختی کی گئی تو اس نے اقرار کر لیا کہ آغا کے لالچ دینے اور بہکانے پر میں نے ہی وہ لباس ہندو عورت کے گھر میں اس کی نظر بچا کر رکھ دیا تھا۔ اور نکاح والے دن بھی میں ہی چادر میں لپٹی ہوئی مولوی صاحب کے روبرو آئی تھی۔ اور انھوں نے مجھے ہندو عورت قرار دیتے ہوئے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کیا تھا۔ اور آغا سے نکاح پڑھ دیا تھا۔

یہ سنتے ہی ناظم پنجاب نے حکم دیا کہ آغا اور دھوبن دونوں کو پھانسی کی سزا دی جائے جن کی اس حرکتِ قبیح نے نہ صرف شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا کی بلکہ احکامِ شرعی کی بھی توہین کی۔ اس طرح بیگم پورہ کے نواب زکریا خاں نے اپنی بیدار مغزی اور معدلت پژوہی سے سماج کو ان خبیث روحوں سے نجات دلائی جن کا مشغلہ شرفا آزاری اور حرامکاری تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ہر مقدمہ میں نواب صاحب اسی طرح نہایت کاوش سے تحقیقات کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے تاکہ نہ کوئی بے گناہ مارا جائے اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی ہو۔ اور ان کی اسی سعی اور احتیاط کا نتیجہ تھا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور لوگ خوشحالی و فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

احمد شاہ درانی

احمد شاہ صوبہ ہرات کے سدوزئی افغانوں کے ایک خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ان کا خاندان "ابدالی" کہلاتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابدالی درحقیقت "عبدعلی" تھا جو بگڑ کر ابدالی بن گیا۔ خلیفہ رسول علی مرتضیٰ سے عقیدت کی بنا پر یہ لوگ "عبدعلی" کہلاتے تھے۔ "ابدالی" کی ایک اور وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کا نام ابدال تھا۔

احمد شاہ کا باپ زمان خان ہرات سے ملتان چلا آیا تھا۔ اور احمد شاہ کی پیدائش ملتان میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ خاندان ہرات واپس چلا گیا جہاں احمد شاہ کے بڑے بھائی ذوالفقار خاں نے خاصی اہمیت حاصل کر لی۔ ایران پر نادر شاہ کا تسلط ہوا۔ تو اس نے ابدالیوں کو نواحِ قندھار میں آباد کیا۔ احمد شاہ اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور اس نے بہت جلد اپنی دلاوری اور بہادری کے سبب نادر شاہ کے دربار میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ وہ اس کے ذاتی محافظ دستے کا جو چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ سالار مقرر ہوا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے ایرانی قزلباش سپاہیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور سازش کر کے ۹ جون ۱۷۴۷ء کی رات کو شاہی کیمپ میں نادر شاہ کو قتل کر دیا۔ ان کا ارادہ دوسرے روز افغان سپاہ پر حملہ کر کے انھیں نقصان پہنچانے کا تھا۔ لیکن احمد شاہ کی سعی سے افغان سپاہی قتل و غارت سے بچ گئے۔ احمد شاہ نے مقتول شہنشاہ کے خزائن و ذخائر کے بہت سے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ کوہِ نور ہیرا بھی اس کے ہاتھ لگا۔ یہ ہیرا نادر شاہ دہلی سے لے گیا تھا۔ اور افغان سپاہ کی مدد سے اس نے نادر شاہ کی سلطنت کے مشرقی حصہ پر جو کہ اکثر و بیشتر موجودہ افغانستان پر مشتمل تھا قبضہ کر لیا۔

تاجِ حکومت سر پر رکھتے ہی احمد شاہ نے مغلیہ ہندوستان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ نادر شاہ کے ہمراہ ۱۷۳۹ء میں یہاں آیا تھا۔

یہاں کی حکومت کی کمزوری اور اکابر حکومت کی آرام طلبی کی بنا پر اُسے یقین تھا۔ کہ ذرا سی دوڑ دھوپ کے بعد وہ بآسانی نہ صرف مغلوں کے خزانوں کا وارث بن سکتا ہے۔ بلکہ تمام ہندوستان پر تسلط جما سکتا ہے۔ اس نے جلد ہی صوبہ کابل کو ناصر خان سے چھین لیا۔ اور دریائے سندھ سے کر خراسان تک تمام علاقے کا فرمانروا بن گیا۔

احمد شاہ نے جلد پنجاب پر یلغار کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہ افغان سپاہ کی توجہ سازشوں اور اندرونی جھگڑوں سے ہٹا کر بیرونی جنگوں کی طرف مبذول کرنا چاہتا تھا۔ لاہور کے حالات یہ تھے کہ ۱۷۴۵ء تک یہاں زکریا خاں برسرِ اقتدار رہا۔ اس کی زندگی میں یہاں کے حالات بالکل درست رہے۔ لیکن یکم جولائی ۱۷۴۵ء کو زکریا خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی بیگم پورہ کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔

نواب زکریا خاں کے تین فرزند تھے یحییٰ خاں شاہ نواز خان اور میر باقی۔ یہ تینوں بھائی ایک ہی ماں کے شکم سے تھے ان کی والدہ نواب زکریا خاں کے سوتیلے چچا نواب محمد امین خاں کی بیٹی اور وزیر قمر الدین کی بہن تھی۔ ان میں بڑا بھائی یحییٰ خاں اپنے ماموں میر قمر الدین خاں کا داماد بھی تھا۔ نواب زکریا خاں کی وفات کے وقت یحییٰ خاں دہلی گیا ہوا تھا۔ میر قمر الدین نے اسے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ اور سفارش کی کہ اسے ناظم لاہور و ملتان مقرر کر دیا جائے۔ مخالف جماعتوں کے اثر سے محمد شاہ شہنشاہ دہلی اس امر کو پسند نہ کرتا تھا۔ کہ زکریا خاں کے بعد اس کے فرزند کو ہی ناظم لاہور و ملتان مقرر کیا جائے۔ اس لیے اُس نے وزیر کی درخواست پر کسی فرصت کے وقت غور کرنے کا وعدہ کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ قمر الدین خاں نے یحییٰ خاں کو لاہور روانہ کیا تاکہ وہ نظامت سنبھال لے اور خود شاہی فرمان کے حصول کی کوشش کرنے لگا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد ۳ جنوری ۱۷۴۶ء کو اس امر کا فرمان ملا کہ ناظم پنجاب تو وزیر قمر الدین ہوگا۔ لیکن وہ دہلی میں رہ کر امور وزارت انجام دے گا۔ لیکن پنجاب میں اس کا نائب یحییٰ خان حکومت کرے گا۔

شاہ نواز خاں باپ کی زندگی میں جالندھر دوآب کا حاکم تھا۔ اسے باپ کی وفات کی خبر ملی تو وہ ۲۱ نومبر ۱۷۴۵ء کو بیگم پور چلا آیا۔ اسی اثنا میں یحییٰ خاں دہلی سے آکر حکومت لاہور پر قابض ہو چکا تھا۔ شاہ نواز نے باپ کے ترکہ سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ اور کئی ماہ تک دونوں بھائیوں میں بحث و تکرار رہی۔ آخر کار ان کی سپاہ میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ ایک فیصلہ کن معرکہ میں شاہنواز خاں شکست کھا کر بٹالہ کی طرف بھاگا اور مختلف مقامات پر اس نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر یحییٰ خاں نے اس کے خلاف وسیع پیمانہ پر فوجی کاروائی کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ اطلاع پاکر شاہنواز سیدھا لاہور آیا اور بیگم پورہ کے متصل خیمہ زن ہوا۔ ۱۷ مارچ ۱۷۴۶ء کو دونوں بھائیوں میں بیگم پورہ کے قریب ایک جنگ ہوئی۔ شاہنواز خاں کے رفیق آدینہ بیگ نے یحییٰ خاں کی فوج پر حملہ بولا اور اس کے جرنیل مومن خاں کو اس کی ماتحت فوج سمیت ان کی خندقوں سے بھگا دیا۔ دوسرا روز شاہنواز خاں نے خود فوج کی کمان کی اور مومن کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

۲۱ مارچ ۱۷۴۶ء کو شاہنواز بیگم پورہ میں داخل ہوا۔ اور نظامتِ پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس نے دیوان لکھپت رائے کو معزول کر کے اس کی جگہ کوڑا مل کو اپنا دیوان مقرر کیا۔ اور آدینہ بیگ خاں کو جالندھر دوآب کا حاکم متعین کیا۔ لاہور کی حکومت پر یہ غاصبانہ قبضہ مغلیہ مرکزی حکومت کی بے عزتی تھی۔ لیکن وزیر قمر الدین شاہنواز خاں کے خلاف فوجی کاروائی کرنے سے قبل اپنے داماد یحییٰ خان کو رہا کرانا چاہتا تھا۔ مبادا شاہنواز اُسے موت کے گھاٹ اتار دے۔ وزیر نے شاہنواز کو کئی خط لکھے۔ پہلے نرم اور شفقت آمیز پھر بہت سخت۔ لیکن اس نے یحییٰ خاں کی رہائی کی یہی شرط پیش کی۔ کہ اُسے حکومت لاہور کا شاہی فرمان عطا کیا جائے۔ خوش قسمتی سے یحییٰ خان چند ماہ کی قید کے بعد اپنے پھوپھی دُروانہ بیگم زوجہ نواب جانی خاں کی مدد سے قید سے نکل کر دہلی بھاگ جانے میں کامیاب

ہوگیا۔ اب شاہنواز بہت گھبرایا، اور اُسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے سفیر دہلی بھیجے تاکہ وہ شہنشاہ سے حکومت لاہور کا فرمان حاصل کریں۔ لیکن یہ سفارت ناکام رہی۔......

شاہ نواز کا احمد شاہ دُرّانی سے معاہدہ

انھیں ایام میں آدینہ بیگ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ قندھار کے فرمانروا احمد شاہ درانی سے مدد لے۔ احمد شاہ درانی کو جب یہ پیغام ملا کہ لاہور اور ملتان کا ناظم اسے اپنا حکمران ماننے کو تیار ہے تو وہ بہت ہی خوش ہوا۔

آدینہ بیگ بہت خود غرض، مکار اور فتنہ پرداز شخص تھا۔ ادھر اس نے شاہنواز کو اس بکھیڑے میں پھنسایا۔ اور ادھر دہلی یہ پیغام پہنچایا کہ ناظم لاہور مغلیہ سلطنت سے غداری پر آمادہ ہے۔ وزیر قمرالدین یہ سُن کر بہت گھبرایا۔ اس نے اپنے بھانجے کو ایک طویل خط لکھا کہ ہمارا خانوادہ مدتوں سے مغلیہ حکومت کا معتمد چلا آرہا ہے۔ ہمارے لیے یہ باعثِ ننگ ہے کہ ہم نمک حرامی کریں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی سلطنت کے وفادار رہ کر احمد شاہ درانی کو مغلیہ ہندوستان کی سرحدوں میں گھسنے سے روکو۔ بلکہ کابل کا مثل صوبہ بھی درانی تسلط سے آزاد کراؤ۔

ماموں کی ان مشفقانہ نصیحتوں کا اثر شاہنواز پر یہ ہوا کہ اس نے احمد شاہ درانی کو ہندوستان میں بڑھنے سے روکنے کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ اسی کے کہنے پر وہ اس ملک میں آرہا تھا۔

احمد شاہ درانی نے شاہنواز کے سفیر سے دوستی اور تعاون کی شرائط طے کیں۔ عہد نامہ لکھا گیا۔ جس پر تمام متقدر درانی اعیان دولت نے دستخط کئے اور وہ اٹھارہ ہزار سپاہ کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا۔ پشاور سے اس نے ہارون خان سدوزئی کو شاہنواز خان کے پاس بھیجا تاکہ اس سے نئے سیاسی حالات کی تفاصیل پر بات چیت کرے۔ ہارون خاں لاہور پہنچا۔ تو یہاں کا عالم ہی بدلا ہوا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر ہارون فی الفور واپس درانی لشکر میں پہنچا۔ جو اس وقت رہتاس کے پاس تھا۔ اور تمام حالات احمد شاہ کے گوش گزار کئے۔ اس نے لاہور پر حملہ کر کے شاہنواز کو اس بدعہدی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن صابر شاہ نے اُسے روکا۔ اور بادشاہ سے کہا کہ میں اپنے آبائی شہر لاہور کی بربادی پسند نہیں کر سکتا۔ مجھے اجازت دو کہ لاہور جا کر میں خود شاہنواز کو سمجھاؤں۔

صابر شاہ

صابر شاہ ایک نیم مجذوب درویش تھا۔ لاہور اس کا آبائی وطن تھا۔ اس کا دادا جس کا نام یا غالباً لقب استا حلال خور بیان کیا جاتا ہے۔ کابل میں گھوڑوں کے امراض کا طبیب تھا۔ اس نے بعد ازاں دنیا ترک کر کے درویشی اختیار کر لی اور اس کے زہد و اتقا کی بنا پر اُسے لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس کا لڑکا یعنی صابر شاہ کا باپ حسین شاہ بھی فقیر تھا۔ صابر شاہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور اس پر سُکر غالب تھا۔ نادر شاہ کی زندگی ہی میں حضرت امام رضا کے صاحبزادے حضرت سلطان ابوالحسن علی کے روضہ پر مشہد میں صابر شاہ کی احمد شاہ سے ملاقات ہوئی۔ اور اس درویش نے احمد شاہ کو بادشاہت کی بشارت دی۔ صاحبِ تخت و تاج بننے کے بعد بادشاہ صابر شاہ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور بہ کمالِ احترام پیش آتا تھا۔

صابر شاہ لاہور پہنچا۔ تو یہاں کے بے فکروں نے یہ بے پر کی اُڑائی کہ چونکہ احمد شاہ درانی کے پاس توپ خانہ کم ہے اس لیے اس نے اپنا جادوگر بھیجا ہے تاکہ جادو کے زور سے ناظم لاہور کا توپ خانہ بیکار کر دے۔ شاہنواز خاں نے صابر شاہ کو دربار میں بلایا۔ اور اس سے لاہور آنے کا مقصد پوچھا۔ صابر شاہ نے شاہ نواز کو احمد شاہ درانی سے اپنا پہلا معاہدہ نبھانے اور اپنی بات پر قائم رہنے کو کہا۔ اور اسے یہ بتایا کہ بصورتِ دیگر احمد شاہ کے عساکر لاہور کو پامال کر دیں گے۔ اور تم باشندگانِ شہر کو بربادی سے بچا سکو گے۔ شاہنواز خاں

بدمعاش اور عاقبت نااندیش نوجوان تھا۔ اس نے درویش کی بے باکانہ گفتگو کو اپنے حضور گستاخی قرار دیا اور حکم دیا کہ اس زبان دراز کے گلے میں پگھلی ہوئی گرم چاندی ڈالی جائے۔ اس سزا کو درویش برداشت نہ کر سکا۔ اور گرم سیال چاندی کے گلے میں اترتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ بس خود کو صابر شاہ کی موت کے پردہ میں بیگم پورہ کی بربادی نظر آنے لگی۔ شاہنواز خان نے صابر شاہ کی لاش بے گور و کفن پھنکوا دی۔ جسے بعد ازاں افغانوں نے شاہی مسجد کے عقب میں دفن کیا۔ جہاں ایک تکیہ میں جو شاہی مسجد کے غربی جانب لیڈی ولنگڈن ہسپتال اور سڑک کے درمیان واقع ہے۔ اس کی قبر اب تک موجود ہے۔ لاہور کا یہ خیر خواہ جو باشندگان شہر کو بربادی سے بچانے کے لیے اپنی جان گنوانے کے باوجود انھیں تباہی سے نہ بچا سکا۔ اب اسی شہر میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

احمد شاہ دُرّانی کا حملہ

احمد شاہ درّانی ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو شاہدرہ پہنچا۔ اسے صابر شاہ کا انجام معلوم ہوا تو مارے غم و غصہ کے بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ اس نے شاہدرہ سے شمال کی طرف بڑھ کر دریا پار کیا اور شالامار باغ کے متصل خیمہ زن ہوا۔ شاہنواز نے بیگم پورہ[۱] کی فصیلوں پر توپیں چڑھا لیں۔ اور اس کے دفاع کا مناسب بندوبست کیا۔ اس کے پاس ستر ہزار فوج اور بہت سی توپیں تھیں۔ توپ خانہ کا نگران اعلیٰ میر نعمت خاں بخاری تھا۔ اسلحہ اور تعداد سپاہ کے اعتبار سے احمد شاہ درانی کسی طرح بھی ناظم لاہور کا ہم پلہ نہ تھا۔ لیکن یہ نااہل اور نالائق حکمران احمد شاہ جیسے زیرک اور جفاکش جرنیل کا مقابلہ نہ کر سکا۔

۱۱ جنوری کو مزار شاہ بلاول کے قدیم محل وقوع کے پاس جہاں بعد میں راجا شیر سنگھ کی سمادھ بنی۔ دریائے راوی کی پرانی گزرگاہ کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں شاہنواز کا دست راست حشمت اللہ خاں مارا گیا۔ قصور کا افغان سردار جملہ خاں اپنے لشکر سمیت اس کا ساتھ چھوڑ کر احمد شاہ درّانی سے مل گیا اور شام کے قریب ناظم لاہور کی فوج تتر بتر ہو کر شہر کے مختلف محلوں کی طرف بھاگ گئی۔ دہلی سے ابھی تک کوئی کمک نہ پہنچی تھی۔ نہ وہاں سے کسی مدد کی توقع ہو سکتی تھی۔ باشندگانِ شہر کو تقدیر کے حوالے کر کے شاہنواز راتوں رات چند معتبر و معتمد ساتھیوں کی معیت میں خزانے کا بہت سا روپیہ لے کر دہلی بھاگ گیا۔

بیگم پورہ کی بربادی

۱۲ جنوری ۱۷۴۸ء کو احمد شاہ درانی بیگم پورہ میں داخل ہوا اور لوٹ مار اور قتل عام کا حکم دیا۔ افغان سپاہ کو بیگم پورہ کے محلوں سے بے اندازہ دولت ملی اور زر و جواہر کے وہ ذخیرے جو ربع صدی سے جمع ہو رہے تھے۔ آنِ واحد میں لٹ گئے۔ خلقِ خدا بے دریغ تہ تیغ ہوئی۔ اور بڑی بڑی عالی نژاد خواتین بے آبرو ہوئیں۔ آخر میر مومن خاں۔ سید جمیل الدین۔ میر نعمت خاں بخاری۔ دیوان لکھپت رائے اور دیوان صورت سنگھ وغیرہ اکابر لاہور بصورت وفد احمد شاہ درانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور تیس لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کر کے رحم کی درخواست کی۔ جو مقبول ہوئی۔ قتل و غارت کا سلسلہ بند ہوا۔ بے گناہ درویش کی موت کا انتقام ختم ہوا اور باشندگانِ بیگم پورہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیگم پورہ سے درّانی سپاہ کو اس قدر مال و دولت اسلحہ، توپیں اور ہاتھی گھوڑے ملے کہ انھوں نے لاہور کے باقی محلوں کی طرف کہ جن کا سلسلہ اس زمانے میں میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ آنکھ اٹھا کر

---

[۱] واضح رہے کہ اس دور میں بیگم پورہ کے فلک بوس مکانات، محلات، باغات شاہی، دفاتر اور بازاروں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے گرد ایک مضبوط فصیل دفاع کے لیے تھی۔

بھی سند کیا۔

احمد شاہ درّانی تقریباً ایک ماہ یکم پورہ میں مقیم رہا۔ اس نے اپنا سکّہ جاری کیا۔ اور پنجاب کے تمام سرداروں کو مطیع کیا۔ ۱۹ ار فروری کو قصور کے افغان سردار جملہ خان کو لاہور کا ناظم مقرر کرکے وہ دہلی کی طرف بڑھا۔ لیکن سرہند کے قریب میر معین الملک خاں نے جو وزیر قمرالدین خاں کا جواں بخت و جواں ہمت فرزند تھا۔ اسے شکست دی۔ وہ لاہور واپس آیا اور یہاں سے اس نے کابل کا رخ کیا۔

میر معین الملک ناظم لاہور (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۳ء)

سرہند کی لڑائی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میر معین الملک کو ناظم لاہور مقرر کیا گیا۔ مگر یہ نظامت اس کے لیے کانٹوں کا تاج ثابت ہوئی۔ احمد شاہ کے حملوں کی وجہ سے سکھوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقعہ مل چکا تھا۔ انھوں نے امرتسر کے قریب رام راؤنی نام ایک قلعہ تعمیر کیا اور جسا سنگھ کلال نے جو اس وقت سکھوں میں سربرآوردہ تھا خالصہ دل نام سکھوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ خالصہ دل کا مطلب سکھ فوج ہے۔ (عمدۃ التواریخ۔ سوہن لال سوری جلد اول صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

میر معین الملک جسے عرف عام میں میر منّو کہا جاتا تھا۔ ایک بیدار مغز اور دور اندیش حاکم تھا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی پنجاب میں قیام امن کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے سکھوں کی غیر قانونی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لیے پروگرام بنایا۔

اسی اثنا میں راجہ کوڑامل دیوان لاہور کی سعی سے کچھ عرصہ کے لیے حکومت اور سکھوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔

احمد شاہ درّانی کا دوسرا حملہ (۱۷۴۹ء - ۱۷۵۰ء)

سرہند کی شکست کی خفت مٹانے کے لیے احمد شاہ درّانی نے ۱۷۴۹ء کے موسم سرما میں قندھار سے اپنی فوج کے ہمراہ کوچ کیا۔ اس نے دسمبر کے وسط میں دریائے سندھ عبور کیا۔ معین الملک کو صوبہ لاہور کے دفاع کے لیے مرکز سے کوئی امداد نہ مل سکتی تھی۔ احمد شاہ تیموری ایک کمزور اور آرام طلب حکمران تھا۔ وزیر صفدر جنگ ایرانی پارٹی کا رکن ہونے کی وجہ سے معین الملک کی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اُن کی حریف تورانی پارٹی کا رکن تھا۔ میر معین الملک نے اپنے ذاتی وسائل سے مقابلہ اور روک تھام کی کوشش کی۔ سید عوض خاں اور دیوان لکھپت رائے کو لاہور میں امور حکومت کی نگرانی کے لیے چھوڑا اور خود فوج لے کر سودھرا کے مقام پر وزیر آباد سے چار میل جانب مشرق چناب کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ احمد شاہ درّانی چناب کے دوسرے کنارے پہنچ کر وہیں رُک گیا۔ دونوں میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ احمد شاہ درّانی نے مطالبہ کیا کہ چار محال[1] کا مالیہ ہر سال اُسے دیا جائے۔ میر منّو نے ادھر گفت و شنید کو طول دیا۔ ادھر شہنشاہ کے پاس فوجی مدد کے لیے ایک خط دہلی روانہ کیا۔ مگر فوجی امداد کی بجائے یہ جواب ملا کہ احمد شاہ درّانی کا مطالبہ مان لیا جائے۔ چنانچہ احمد شاہ درانی سے صلح کر لی گئی۔ اور حملہ آور ڈیرہ غازی خاں اور قلات کے راستے قندھار واپس چلا گیا۔

اگرچہ راجہ کوڑامل کی سعی سے سکھوں کے تعلقات حکومت کے ساتھ خوشگوار تھے مگر میر منّو کے قیام سودھرا کے زمانے میں

---

[1] دور مغلیہ میں صوبۂ لاہور کے دو ضلعے جالندھر دوآب اور چار محال بے حد زرخیز شمار کیے جاتے تھے۔ چار محال میں سیالکوٹ پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کے اضلاع شامل تھے۔

سکھوں نے موقع پاکر لوٹ مار شروع کر دی اور مضافات لاہور کو بھی لوٹ لیا۔ احمد شاہ درانی کی روانگی کے بعد اس نے سکھوں کی تادیب کی طرف توجہ دی۔

احمد شاہ درانی کا تیسرا حملہ (۱۷۵۱ء - ۱۷۵۲ء)

حسبِ وعدہ میر منو نے سال کے اختتام پر چار محال کی آمدنی احمد شاہ کو نہ بھیجی۔ اس پر درانی نے پھر پنجاب پر فوج کشی کا ارادہ کیا اور پشاور پہنچ کر بارو خاں کو بطورِ سفیر معین الملک کے دربار میں بھیجا کہ خراج کی ادائیگی کی یاد دہانی کرائے۔ معین الملک نے جواب دیا کہ حالات کی خرابی کے باعث مالیہ جمع نہیں ہو سکا۔ جونہی کہ رقم اکٹھی ہو گی بھیج دی جائے گی۔ اس کے بعد درانی نے راجہ سکھ جیون مل کو بطورِ سفیر بھیجا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ معین الملک نے نو لاکھ روپیہ بھیج دیا اور یہ وعدہ کیا کہ بقایا احمد شاہ درانی کے فوجیں ہٹا کر واپس چلے جانے پر دے دیا جائے گا۔ درانی یہ روپیہ لے کر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اس پر معین الملک پچاس ہزار سپاہی اور چار سو چھوٹی توپیں جنھیں "جزائر" کہتے ہیں لے کر آگے بڑھا اور شہر سے ۲۲ میل دور پل شاہ دولہ[۱] پر دشمن کو روکنے کے لیے مورچے لگائے۔ احمد شاہ درانی نے یہ راستہ ترک کر دیا اور جنوبی سمت اس مقام سے دور سفر کرتا ہوا راوی کے کنارے بمقام غازی پور پہنچ گیا۔ یہاں سے راوی کو عبور کر کے وہ موضع نیاز بیگ کے راستے لاہور پہنچا۔ اور چکر کاٹ کر بیگم پورہ سے کچھ فاصلے پر شاہ بلاول کے مزار کے متصل ڈیرے ڈال دیے۔

معین الملک لاہور پہنچا اور شہر کے دفاعی انتظامات درست کیے۔ درانی نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو چار ماہ تک جاری رہا اور شہر کے چاروں طرف پچاس پچاس میل تک کا علاقہ برباد ہو گیا۔ کنوؤں میں پانی تک ختم ہو گیا اور شہر میں جانوروں کا چارہ اور انسانوں کی خوراک کمیاب بلکہ نایاب ہو گئی۔ شہر کی صفائی کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ شہر کی خندقوں اور فوجی چھاؤنیوں میں ہر طرف غلاظت اور بدبو تھی۔ اس نازک وقت پر بھی دہلی سے کوئی امداد نہ آئی۔

ان حالات میں معین الملک نے کیمپ کو دس میل دور لے جانے کا فیصلہ کیا مگر یہ بھید کھل گیا۔ پانچ مارچ ۱۷۵۲ء کو جب معین الملک کی فوجیں مورچوں سے نکلیں تو درانی سپاہ نے ان پہ ہلہ بول دیا۔ معین الملک اس بہادری اور دلاوری سے لڑا کہ خود احمد شاہ درانی جو ایک بہادر اور جنگجو سردار تھا عش عش کر اٹھا۔ راجہ کوڑا مل دیوان صوبہ ملتان اور آدینہ بیگ فوجدار جالندھر دوآب بھی معین الملک کی امداد پر تھے۔ شالامار باغ کے متصل محمود بھٹی نام ایک گاؤں ہے جسے آج کل محمود بوٹی کہتے ہیں۔ اس آبادی سے متصل ایک پرانا اینٹوں کا بھٹا تھا۔ میر منو نے اس پر بھی مورچے جما دیے۔ اس معرکے میں راجہ کوڑا مل مارا گیا اور آدینہ بیگ بمشکل جان بچا کر بھاگا۔ شام کے قریب معین الملک بھی پسپا ہو کر قلعۂ لاہور میں چلا گیا۔ درانی نے اس فتح کے بعد شالامار باغ میں ڈیرے لگا دیے۔

---

[۱] شاہ دولہ نام ایک مشہور ولی اللہ گجرات میں مدفون ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی پل بنوائے جن میں یہ پل بھی شامل ہے جو نالہ ڈیک پر ہے۔ اگر شاہدرہ سے پرانی سڑک کے راستے امین آباد جائیں تو شاہدرہ سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر یہ پل آتا ہے۔ شکستہ حالت میں یہ پل اب تک موجود ہے اور دورِ مغلیہ کے پلوں کے فنِ تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی مرمت پرانے فنِ تعمیر کے مطابق کرا کر اسے یادگارِ محفوظ قرار دے دیا جائے۔

دوسرے روز جہاں خاں وزیر کے ذریعہ شالامار باغ میں احمد شاہ درانی اور میر معین الملک کی ملاقات ہوئی۔ درانی نے اس کی بہادری دلاوری عزم اور جنگی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ اسے رستم ہند اور فرزند خاں کا خطاب دے کر خلعت عطا کیا۔ اور ایک کثیر رقم بطور تاوان جنگ لے کر اپنی طرف سے صوبجات لاہور و ملتان کا ناظم مقرر کیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ احمد شاہ درانی نے اس ملاقات میں معین الملک سے پوچھا کہ وہ اپنے فاتح سے کس سلوک کی توقع رکھتا ہے میر معین الملک نے فی الفور جواب دیا، کہ وہی سلوک جس کی ایک بہادر سپاہی دوسرے بہادر سپاہی سے توقع کر سکتا ہے۔ اس جواب سے احمد شاہ درانی بہت محظوظ ہوا اور اس نے بعد ازاں یہ دریافت کیا کہ اگر اس جنگ میں معین الملک فاتح ہوتا تو وہ اس سے کیا سلوک کرتا۔ معین الملک نے جواب دیا کہ "آپ کو گرفتار کر کے دہلی اپنے آقا کے پاس بھیج دیتا۔"

اس کے بعد احمد شاہ درانی نے اپنے سفیر قلندر بیگ کو اپنے ہم نام احمد شاہ تیموری کے دربار میں دہلی بھیجا کہ صوبجات لاہور و ملتان کو احمد شاہ درانی کے حوالے کر دے۔ بادشاہ نے سفیر کو دیوانِ عام میں شرفِ باریابی بخشا اور عہد نامے پر مہر لگا کر سفیر کے حوالے کر دیا اور پنجاب بادشاہِ دہلی کی سلطنت سے نکل کر احمد شاہ درانی کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ اسی دوران احمد شاہ درانی نے عبداللہ خاں کو ایک فوج دے کر کشمیر کی تسخیر کے لیے بھیجا جس نے مغل حاکم ابو القاسم خاں کو شکست دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ نے سکھ جیون مل کو کشمیر کا حاکم اور عبداللہ خاں کو اس کا نائب مقرر کیا۔

اب معین الملک احمد شاہ درانی کی طرف سے پنجاب پر حکومت کرنے لگا۔ پنجاب اور کشمیر سے بھی جب تک درانی کو خراج ملتا رہا اس نے ان صوبوں کے اندرونی نظم و نسق کو بحال رکھا۔ عملی طور پر صوبائی نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد معین الملک کوئی ڈیڑھ سال کے قریب زندہ رہا یہ وقت اس نے سکھوں کی تادیب اور پنجاب میں امن قائم کرنے میں گزارا۔ سکھ غارت گروں کی سرگرمیاں جنگ ممدوٹ کے بعد بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر وہ لوگ میر منو کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ بہرحال ان کے عزم اور دلولے کا اندازہ ذیل کے شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے جو ان دنوں سکھوں میں زبان زد عوام تھا

منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے ———
جوں جوں سانوں وڈدا اساں تیوں تیوں دونے ہوئے

یا

میر منو دے سوئے اُتوں اُتوں لا پڑے ——— ہیٹھوں دونے ہوئے

سنہ ۱۷۵۲ء کے آخر میں پرچہ لگا کہ سکھوں نے نواح لاہور میں لوٹ مار شروع کر دی ہے میر منو کل فوج لے کر شہر سے نکلا اور سات کوس دور دریا کے کنارے تلک پور کے متصل خیمے لگا دیئے۔ سکھوں نے یہ سنا تو منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میر منو نے ان کے تعاقب میں چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کئے جو سکھوں کا تعاقب کر کے انھیں پکڑ لاتے۔ ایک روز اس نے خواجہ مرزا خاں کو اور چند دوسرے مغل جمعداروں کو سکھوں کے استیصال کے لیے بھیجا۔ بعد ازاں وہ خود سوار ہو کر شکار کے لیے نکلا۔ شکار سے واپسی پر وہ موضع آدان کے نو تعمیر قلعے میں ٹھہرا۔ یہ قلعہ اُس نے خود بنوایا تھا اور وہاں کچھ سپاہی مقیم تھے۔ وہاں میر منو نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیا۔

تین بجے کے قریب اٹھ کر وضو بنایا۔ ظہر کی نماز ادا کی۔ سبز رنگ کی ساٹن کا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوا اور قلعہ سے باہر نکلا۔ اسی اثنا میں خواجہ مرزا سکھ مقتولوں کے سر لایا اور ناظم کے سامنے پیش کئے۔ معین الملک نے ان سپاہیوں کو انعامات دیے۔ اور گھوڑے

کو معہ ناتا ہوا اپنی لشکر گاہ کو روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وہ یکلخت بیمار ہو گیا۔ اطبا نے جو لشکر کے ہمراہ تھے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا مگر آدھی رات کے قریب وہ راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ (تذکرہ از طہماس قلی مسکین۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری لندن میں ہے (ورق ۸۸-۸۷) اس نسخے سے میر منو کی وفات کے حالات مجھے انگلستان سے ایک عزیز دوست اور شاگرد محمد اکرم چندپال نے بھیجے ہیں۔ اس کتاب سے سر جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر ہری رام گپتا نے بھی استفادہ کیا ہے)۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا اور مر گیا مگر اس سلسلے میں طہماس قلی مسکین کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ طہماس قلی نواب معین الملک کے متوسلین میں سے تھا اور اس کی وفات کے وقت موقعہ پر موجود تھا۔ لہٰذا اس کی رائے زیادہ معتبر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا انتقال زہر خورانی سے ہوا۔

معین الملک خان کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی لشکر گاہ میں کہرام مچ گیا۔ اس موقعہ پر اُن کی بیوی مغلانی بیگم نے بڑی ہوشمندی سے کام لیا۔ نواب کی لاش معتمد آدمیوں کے سپرد کر کے اُس نے تین دن تک سپاہ میں تنخواہ تقسیم کی جو برسوں سے واجب الادا چلی آ رہی تھی۔ بیگم کا ارادہ یہ تھا کہ فوج کو خوش کر کے خود حکومتِ لاہور پر قبضہ کر لے۔ اسی اثنا میں لاہور کے نائب ناظم بھکاری خان نے اپنے ۵۰۰ آدمی نواب کی لاش کے گرد کھڑے کر دیے اور اُسے تدفین کے لیے دہلی لے جانا چاہا۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ مرحوم نواب کی لاش سمیت بیگم تمام اور دیگر افرادِ خانہ کو دہلی پہنچا دے اور دربارِ شاہی سے صوبۂ لاہور کا فرمان اپنے لیے حاصل کر لے۔ بیگم کا ارادہ لاش کو لاہور لا کے دفن کرنے اور اپنے شیر خوار بیٹے محمد امین خاں کے نام پر حکومت کرنے کا تھا۔ تمام ہندوستانی فوجی سردار بیگم کے ساتھ تھے۔ تورانی سپاہی اور سردار بھکاری خاں کے ہمنوا تھے۔ بیگم نے قاسم خان کو مامور کیا کہ وہ تورانی سرداروں کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر بیگم کے پاس لائے۔ بیگم نے طہماس قلی مسکین کو نواب کی لاش کی حفاظت کے لیے بھیجا اور اس کے پہنچتے ہی بھکاری خاں کے آدمی الگ ہو گئے۔ قاسم خاں سوائے خواجہ مرزا خاں کے باقی تمام تورانی اور مغل سرداروں کو بیگم کی خدمت میں لے آیا۔ صرف خواجہ مرزا تین سو سواروں کے ساتھ بھکاری خاں کا ہمنوا رہا۔ اس کے بعد بیگم نے نواب کے جنازے کو لے کر لاہور کا رُخ کیا۔

لاہور لا کر نواب کا تابوت بیگم پورے میں حضرت ایشاں کے روضے کے قریب نواب عبدالصمد خاں کے تعمیر کردہ "احاطہ قبور خاندانِ ناظماں" میں دفن کر دیا گیا۔

نوٹ:۔ بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ میر معین الملک دورانِ شکار میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا اور مر گیا۔ اُن میں —— W. FRANCKLIN فرینکلن بھی شامل ہے جس کی کتاب HISTORY OF THE REIGN OF SHAH ALAM لندن سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی۔ ملاحظہ ہو اُس کا صفحہ ۵۔

شیر سنگھ کے زمانہ میں (سید محمد لطیف کے قول کے مطابق راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کے ایام میں) ایک ہندو سنیاسی نے مشہور کیا کہ شہید گنج کے قریب (موجودہ ریلوے سٹیشن کے نواح میں) ایک قدیم مقبرہ میر منو کا ہے۔ اور اس کی لاش وہاں طلائی تابوت میں مدفون ہے۔ سکھوں کو مغل بادشاہوں۔ لاہور کے ناظموں اور خاص کر میر منو سے بے حد نفرت تھی۔ انھوں نے مبینہ مزار کو کھود ڈالا اور انھیں اس میں سے کچھ بھی نہ ملا۔ انگریزی دور کے آغاز میں انگریزی شراب کے ایک سکھ تاجر نے مقبرے کی عمارت میں دوکان کھول لی۔ اب اس مقبرے کا صحیح محلِ وقوع معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً مسمار ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقبرہ مغلیہ دور کے کسی اور مقتدر فرد کا مدفن تھا۔ طہماس قلی مسکین جو ان کی وفات کے واقعات کا عینی شاہد ہے یہ بیان کرتا ہے کہ انھیں بیگم پورے کے احاطہ قبور میں دفن کیا گیا تھا۔

معین الملک خاں کے دَور کی عید

بیگم پورہ کے محلات میں عید کی آمد سے کئی روز قبل اس تہوار کو پوری شان سے منانے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ ہر سمت فضا میں مسرت و انبساط جلوہ گر نظر آتی۔ محلات کی آرائش و زیبائش اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ عید کی رات سب کی آنکھوں میں کٹتی۔ سرکاری اہل کار اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں سرگرم نظر آتے مبادا کوئی کمی رہ جائے۔

عید کے روز صبح کی نماز اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر نواب معین الملک زنانہ محل میں تشریف لاتے۔ جہاں ان کی بیگم عید کے لیے دلباس میں ملبوس ان کا استقبال کرتیں۔ وہ سویّوں اور دیگر شیریں ماکولات و مشروبات سے کام و دہن کی ضیافت کرنے کے بعد محافظ دستہ کی معیت میں عیدگاہ کا رخ کرتے۔

ناظمانِ پنجاب کے دور میں نمازِ عید جامع جہانگیری میں ہوا کرتی تھی۔ یہ مسجد شہنشاہ جہانگیر نے بازار ترپولیہ میں بنوائی تھی۔ جو کافی وسیع اور زرنگار و کاشی کار تھی۔ مغلیہ سطوت و حکومت کے زوال کے بعد بازار لُٹ گیا۔ اُجڑی ہوئی مسجد میں رنجیت سنگھ کے عہد میں توپیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ انگریزی دور کے آغاز میں اسے محکمہ ریلوے کے کسی افسر نے سکونتی کوٹھی کے طور پر استعمال کیا اور آخر اسے مسمار کر دیا گیا۔

یہ مسجد موجودہ ریلوے گودام کے نواح میں چونگی والے چوک کے پاس واقع تھی بیگم پورہ کے قریب ہونے کے سبب ناظمانِ پنجاب یہاں نمازِ عید ادا کیا کرتے۔ عمائد و اکابر لاہور بھی اسی جگہ نماز کے لیے جمع ہوتے۔ عام باشندگانِ لاہور بھی یہاں گروہ در گروہ کھنچ آتے یہاں تک کہ اس وسیع مسجد میں تِل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ نماز و خطبہ کے بعد جو شخص بھی پنجاب کے خوش خصال ناظم کے پاس آتا آپ اس سے بلا امتیاز مقام و مرتبہ خندہ پیشانی سے مصافحہ کرتے۔

نماز کے بعد نواب معین الملک، اپنے محافظ دستہ کی معیت میں کہ بلند بالا و رعنا ترکی و خراسانی نوجوانوں پر مشتمل ہوتا تھا بیگم پورہ کی راہ لیتے۔ باشندگانِ شہر شوق دید میں سڑک کے دو رویہ کھڑے سواری کے جلوس کا نشاط و انبساط کے نعروں سے خیر مقدم کرتے۔

کھانا کھانے کے بعد جناب بیگم صاحبہ کی معیت میں فیلِ خاص پر سوار ہو کر نواب معین الملک خاں پریڈ کے میدان کی راہ لیتے جہاں فوج کا معائنہ ہوتا۔ فوجی جوان نشانہ بازی کے مقابلوں میں شریک ہوتے اور اپنی عسکری مہارت کے کارنامے دکھا کر انعام حاصل کرتے۔

عصر کے بعد نواب درگاہ حضرت شاہ ابو المعالی پر حاضر ہوتے۔ آپ سلسلۂ عالیہ قادریہ کے ایک مقتدر اور برگزیدہ شیخ تھے۔ ان کا مزار آج بھی مرجعِ انام اور زیارت گاہِ عوام ہے۔ دورِ ناظماں میں عید کے روز ایک عظیم الشان میلہ یہاں لگتا تھا۔ لاہور کے لوگ بہ کمالِ اشتیاق و ارادت یہاں جمع ہوتے تھے۔ دُور دُور تک دکانیں لگ جاتی تھیں۔ جن میں چہار دانگ عالم کے نوادر اور قسم قسم کی مٹھائیاں بکتی تھیں۔ طرح طرح کی دلچسپیاں اور مختلف نوع کی دلفریبیاں لوگوں کو شادمانی کی فضا میں مسرور و مخمور رکھتی تھیں۔ مختصر یہ کہ نواب معین الملک اور بیگم صاحبہ ایک دوسرے کی معیت میں اس یومِ سعید کی خوشیوں سے بہرہ اندوز ہوتے۔

نواب میر معین الملک کے عہد میں میر منشی کے عہدہ پر سید محمد قاسم عبرتؔ لاہوری فائز تھے۔ آج کل کی اصطلاح میں انھیں چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ سمجھیے۔ آپ لاہور کے ایک مقتدر علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تالیف عبرت نامہؔ کے مخطوطات مشرق و مغرب کے مختلف کتب خانوں میں ملتے رہے۔

عبرت کی بیاض بھی پراگندہ و بوسیدہ حالت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔
سید محمد قاسم کا دستور تھا کہ وہ عید کے موقع پر نواب صاحب کی خدمت میں قصیدۂ تہنیت پیش کیا کرتے تھے۔ ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں عیدالفطر ۳ ستمبر اتوار کے روز منعقد ہوئی۔ اس عید پر سید صاحب نے ذیل کا قصیدہ بارگاہِ ناظم میں پیش کیا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور سید صاحب کو خلعت اور انعام سے نوازا:

شکر اللہ بس مبارک عیدِ رمضاں آمدہ   وقت عیش و خرمی ہنگامِ احساں آمدہ
ایں خجستہ عید بر نواب صاحب سال و مہ   باد فرخ، وہ کہ ہاتف مژدہ گویاں آمدہ
آں معین الملک غازی رستمِ ہندوستاں   کز نہیبِ تیغ تیزش برق لرزاں آمدہ
رفت رمضاں شد قبول از فضلِ حق صوم و صلوٰۃ   موسم خوش وقتی و سیرِ گلستاں آمدہ
سرو استادہ بخدمت سبزہ ہا سر بر قدم   گل شگفتہ ہر طرف بلبل غزل خواں آمدہ
ہم زمینِ خیبر تو اے منبع دریائے فیض   بہر سیرابیٔ عالم ابر و باراں آمدہ

میر قاسم منشی سرکار از صدق و صفا
روز و شب بہرِ دعایت سجدہ گرداں آمدہ

میر منو کی وفات

افسوس کہ عیش و نشاط کی یہ محفلیں تادیر قائم نہ رہ سکیں۔ حوادثِ روزگار کی بجلیوں نے مغلیہ سطوت کی بہ آخری محفل جلا کر راکھ کر دی۔ ۱۷۵۳ء میں نواب معین الملک خاں اچانک فوت ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے زمامِ اختیار سنبھالنے کی کوشش کی مگر ان کی مساعی بارآور نہ ہو سکیں اس متلاطم فضا میں جب امرائے دولت خود غرض تھے اور ہر طرف سکھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایک طرف درانی تاکہ اور دوسری طرف مرہٹہ سپاہ پنجاب کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھی۔ حکومتِ پنجاب کا سنبھالنا ایک پردہ نشین خاتون کے بس کا روگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ہر طرف بربادی، تباہی اور افراتفری پھیل گئی۔ اور سکھ پنجاب پر قابض ہو گئے۔ لاہور کی تمام مسجدیں حکومت کے قبضے میں چلی گئیں۔ شاہی مسجد میں ہاتھی گھوڑے بندھتے تھے۔ بازار ترپولیہ والی عیدگاہ میں توپیں ڈھلنے کا کارخانہ تھا۔ عید کی نماز ہوتی تو کہاں ہوتی۔ نہ اسلامی تفوق کا زمانہ رہا اور نہ عید کی خوشیاں۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

پنجاب کا شیر خوار ناظم

شہر سے دور فوجی کیمپ میں معین الملک خاں کی اچانک موت سے مغلانی بیگم کے سر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس بہادر خاتون نے اپنے ذاتی غم پر قابو پا کر عنانِ حکومت سنبھالنے کی کوشش کی اور بھکاری خان کی سازش کو ناکام بنایا۔ اس نے دہلی خط بھیج کر احمد شاہ تیموری سے اپنے شیر خوار دو سالہ بچے کے لیے فرمانِ حکومت حاصل کرنا چاہا۔ احمد شاہ تیموری نے باوجود اس امر کے کہ وہ صوبجات لاہور و ملتان اس سے قبل احمد شاہ درانی کے حوالے کر چکا تھا۔ میر منو کی وفات کی خبر ملتے پر دیوانِ خاص (قلعہ دہلی) میں ایک خاص تقریب منعقد کی اور اپنے سہ سالہ فرزند محمود خاں کو ان صوبوں کا نائب السلطنت مقرر کیا اور نواب مرحوم معین الملک کے دو سالہ فرزند محمد امین خاں کو اس کا نائب نامزد کیا اور میر جمیل الدین خاں کے ہاتھ محمد امین خاں کے لیے ایک شاہی خلعت ارسال کیا۔ امورِ سلطنت کا انتظام میر مومن خاں کے سپرد تھا۔ لیکن عملی طور پر حکومت مغلانی بیگم کے

بالمقرری۔

میر مومن خان ایک نیک دل انسان تھے۔ امورِ حکومت کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ اِن کی قبر دربار حضرت داتا گنج بخش کی مسجد کے صحن میں ہے۔ اس وقت قبر کا مقام صحن مسجد کے خشتی فرش میں سنگِ مرمر کی ایک سِل ظاہر کرتی ہے جس پہ کوئی کتبہ نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس سِل پر میر مومن خان کا نام کندہ کرا دیا جائے۔ مسجد کی توسیع پر ۱۳۲۹ھ / ۱۹۲۱ء میں میر صاحب کی قبر جو پہلے ایک بلند چبوترے پر تھی مسمار کر دی گئی اور نشان کے لیے اس مقام پر فرش میں سفید پتھر لگا دیا گیا۔

مغلانی بیگم نواب جانی بیگ کی صاحبزادی تھیں جو تورانی امرا میں سے تھے اور صوبہ لاہور کی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ جانی بیگ کی بیوی دردانہ بیگم نواب عبدالصمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ جانی بیگ کا مقبرہ باغبانپورہ جاتے ہوئے دروازہ گلابی باغ سے آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ کھیتوں میں واقع ہے۔ مقبرہ چوکور ہے اور اس کے اندر ٹوٹی قبروں کے چند نشانات ہیں۔ جانی بیگ سید علیم اللہ چشتی صابری حسنی بلخی مدفون جالندھر کا مرید تھا اور سید صاحب مذکور لاہور آنے پر اکثر اس کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

مغلانی بیگم اور میر مومن محض احمد شاہ تیموری کے فرمان سے مطمئن نہ تھے۔ فی الواقعہ صوبجات ملتان و لاہور ۱۷۵۲ء سے احمد شاہ درانی کی سلطنت کا حصہ تھے۔ چنانچہ درانی کے حاکم پشاور جہان خاں کی وساطت سے احمد شاہ درانی سے یہ اجازت حاصل کی گئی کہ محمد امین خاں پنجاب کا ناظم ہوگا اور میر مومن خاں اس کا نائب۔

بھکاری خان میر معین الملک خان کے زمانے میں بقول سیر المتاخرین "مختار و مدار المہام سرکار معین الملک بود" (جلد سوم ص ۱۵) اس کا باپ روشن الدولہ ظفر یار خان محمد شاہ کے زمانے کے مقتدر امرا میں سے تھا اور میراں سید بھیک مدفون کہرام کے مریدوں میں سے تھا۔ اس نے چاندنی چوک دہلی میں کوتوالی کے قریب سنہری مسجد تعمیر کرائی۔ بھکاری خاں کو یہ نام میراں سید بھیک سے نسبت کی بنا پر باپ نے دیا۔

قیام لاہور کے زمانے میں بھکاری خاں کی یہی کوشش رہی کہ وہ ناظم لاہور بن جائے۔ چنانچہ باشندگانِ شہر میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے ۱۷۵۳ء کے آغاز میں اُس نے لاہور کے ڈبی بازار میں جو اس وقت بھی تجارت کا مرکز تھا سنہری مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کے تین سنہری گنبد اس نواح کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔

طہماس قلی مسکین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر معین الملک کو بھکاری خان ہی کی سازش سے زہر دیا گیا تھا۔ تاکہ میدان خالی ہو تو وہ اطمینان سے نظامت کا عہدہ حاصل کر کے دادِ حکومت دے۔ مگر بیگم نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ بیگم اور اپنے حریف میر مومن خاں کو برسرِ اقتدار دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتا تھا۔ اس نے وزیر دہلی انتظام الدولہ سے سازباز کی۔ انتظام الدولہ میر معین الملک کا بھائی تھا اور وہ اپنی بھابی کو ناپسند کرتا تھا۔ اُس نے اپنے دستخطوں سے ایک فرمان جاری کیا۔ بھکاری خاں کو نائب ناظم مقرر کیا مگر مغلانی بیگم نے اس فرمان کو کوئی وقعت نہ دی۔ اس پر بھکاری خان نے زبردستی لاہور پر قبضہ کر لینے کا پروگرام بنایا۔ اُس نے دربار میں جانا بند کر دیا۔ اپنی حویلی پر توپیں نصب کریں اور فوج جمع کرنی شروع کی جس میں زیادہ تر قصور کے پٹھان تھے۔

بیگم نے فوجی سرداروں کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ حتیٰ کہ بھکاری خاں کے حامی خواجہ مرزا خان کو بھی اُس سے علیحدہ کر لیا۔ جسے امین آباد کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ بیگم نے سازش کر کے بھکاری خان کو گرفتار کر لیا اور خواجہ سعید خان کی نگرانی میں اُس کی حویلی کے اندر نظر بند

دیا۔ بھکاری خاں کے بعد پٹی کے فوجدار قاسم خاں نے بغاوت کی مگر وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔

محمد امین خاں کی وفات

مغلانی بیگم ان مصائب کا مقابلہ کر ہی رہی تھی کہ مئی ۱۷۵۴ء میں اُسے ایک اور صدمہ پہنچا۔ لاہور کے شیرخوار ناظم محمد امین خاں کا انتقال ہو گیا اور اُس کی وفات کے بعد بھی باپ کی طرح چہرے سے لے کر ناف تک بدن کا رنگ سیاہ ہو گیا جو زہر خورانی کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ صدمہ جانکاہ تھا مگر بیگم نے ہمت ہاری اور اپنے سفیر دہلی اور قندھار بھیجے تاکہ درّانی اور مغل دونوں فرمانرواؤں سے اپنے لیے فرمانِ حکومت حاصل کرے۔ سفیر دہلی پہنچا تو احمد شاہ تیموری اور وزیر عماد الملک میں جھگڑا چل رہا تھا۔ اس لیے سفیر کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اسی اثنا میں احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا۔ اور عالمگیر ثانی کو جو جہاندار شاہ کا فرزند تھا دہلی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اُس نے ۲۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء کو میر مومن خاں کو لاہور اور ملتان کے صوبجات کا ناظم مقرر کیا۔ مگر بیگم نے حکومت اُس کے حوالے نہ کی۔

انتشار و بدامنی کا دور

ان حالات میں انتظامِ حکومت بہت بگڑ گیا۔ ملتان میں احمد شاہ درّانی نے الگ گورنر مقرر کر دیا۔ حسن ابدال وغیرہ کے علاقے اُس کے حاکم پشاور کے ماتحت تھے۔ چار محال میں رستم خاں حاکم تھا جو براہِ راست درّانی کے ماتحت تھا۔

امرتسر، بٹالہ، کلانور اور پٹھانکوٹ وغیرہ کے شمالی علاقے سکھوں کا گڑھ بن چکے تھے۔ کانگڑہ اور شوالک کے پہاڑی علاقوں کے ہندو راجے خود مختار ہو گئے تھے۔ جالندھر دوآب میں آدینہ بیگ خان تقریباً خود مختار تھا۔ اور بیگم کی حکومت نواحِ لاہور کے چند اضلاع تک محدود تھی۔ اور اُن پر بھی مغل اور ترک فوجی سردار قابض تھے۔ لاہور میں حکومت کا یہ عالم تھا کہ دیوان اور بخشی وغیرہ اعلیٰ عہدیدار صبح سویرے میر مومن خان کے ہاں جمع ہوتے اور وہاں سے سب لوگ مغلانی بیگم کی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہنچتے اور آداب بجا لاتے۔ بیگم امورِ حکومت کے متعلق اپنے احکام خواجہ سراؤں کے ذریعے انھیں بھیجتی۔ خواجہ سراؤں میں تین آدمی میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں حیابت ممتاز تھے۔ یہی لوگ بیگم کے مشیر اور ہمراز تھے مگر ان کی آپس میں نہ بنتی تھی اور اکثر متضاد احکام دیا کرتے تھے ؎

گفتۂ خواجہ سرایان ہمہ کجا شد پیش رفت

کی برآید کام مرداں زاں فریق نامراد

چند دنوں بیگم کے دشمنوں نے اُسے بدنام کرنا شروع کیا اور مختلف لوگوں سے اُس کے خراب تعلقات کی خانہ ساز حکایتیں وضع کر کے شہر کے اوباش اور غیر ذمہ دار لوگوں میں پھیلانی شروع کر دیں۔

اسی اثنا میں بھکاری خان نے نظر بندی کے باوصف خواجہ محمد سعید خان سے جو خواجہ مرزا خاں کا بھائی تھا سازباز کی۔ خواجہ مرزا خاں ایک ازبک ترک سوار تھا۔ اپنے ہم وطن تین سو سواروں کے ساتھ معین الملک خان کے دربار میں ملازمت حاصل کی۔ اور اسے سکھ باغیوں کے استیصال کے لیے متعین کیا گیا۔ نواب کی وفات پر یہ بھکاری خان سے مل گیا۔ لیکن بیگم کے تدبر نے اسے خان مذکور سے علیحدہ کر لیا۔ اور خان کا خطاب دے کر امین آباد کا فوجدار مقرر کیا۔ اسی اثنا میں پانچ چھ ہزار تازہ وارد ترکی سپاہی اُس کے ایک بھائی خواجہ قلمی کی قیادت میں اس سے آملے۔ اس سے خواجہ مرزا خاں کی طاقت بڑھ گئی۔ اس نے اپنے علاقہ میں سکھوں کا قلع قمع کر کے امن قائم کیا۔ خواجہ مرزا خاں کی مدد سے بیگم کو محروم اقتدار کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ خواجہ مرزا امین آباد سے فوج لے کر لاہور کی طرف بڑھا اور بآسانی

شہر پر قابض ہو گیا۔ بیگم کو جبراً اس کی حویلی سے دوسرے مکان میں منتقل کر کے اُسے لوٹ لیا گیا۔ ترک سپاہیوں نے خواجہ مرزا کی مخالفت نہ کی۔ مگر بیگم کی نظر بندی اور اس کی حویلی کی تاراجی کی خبر سُن کر سات آٹھ ہزار پوربیہ سپاہی خواجہ مرزا خاں کے لشکر پر ٹوٹ پڑے مگر شکست کھائی۔ خواجہ مرزا نے صوبہ دار لاہور رہنے کا اعلان کر دیا۔ چند روز وہ ٹھاٹ سے حکومت کرتا رہا اور ترک امرا نے اُس سے خوب تعاون کیا۔ عاشور علی خاں۔ بالا باش خاں۔ فرمان بیگ خاں۔ ابراہیم خاں وغیرہ امرا کے علاوہ خود بھکاری خاں اُس کے حضور سلام کو حاضر ہوتے۔ کچھ عرصہ بعد ان سرداروں کی باہمی رقابتیں پھر اُبھر آئیں اور خواجہ مرزا خاں اپنی قلمرو میں امورِ حکومت کو کما حقہٗ انجام نہ دے سکا۔

مغلانی بیگم نے نظر بندی ہی کے دوران اپنے ماموں خواجہ عبداللہ خاں کو جو عبدالصمد خاں دلیر جنگ کا چھوٹا لڑکا اور نواب زکریا خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ احمد شاہ درانی کے دربار میں بھیجا اور لاہور کے ترک سرداروں کے خلاف شکایت کی کہ انھوں نے مغلانی بیگم کو جو شاہ کی مقرر کردہ صوبہ دار تھی نظر بند کر کے ناجائز طور پر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ یہ سنتے ہی شاہ نے پشاور کے درانی گورنر جہاں خاں کے چھوٹے بھائی امان خاں کو حکم دیا کہ وہ دس ہزار سپاہ لے کر لاہور پہنچے اور بیگم کو لاہور کی حکومت واپس دلائے۔ جہاں خاں نے خواجہ مرزا کو شکست دے کر قید کر لیا۔ بہت سے دوسرے ترک امرا بھی اسیر ہوئے اور لاہور کو امان خاں کے سپاہیوں نے خوب لوٹا۔ بیگم لاہور کی ناظم مقرر کی گئی اور خواجہ عبداللہ اس کے نائب بنے۔

بھکاری خان کا انجام

نظامت لاہور کے حصول کے بعد بیگم نے بھکاری خاں کی مشکیں کسوا کر اپنے حضور طلب کیا اور محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے اسے جوتے لگوائے یہاں تک کہ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ بیگم نے اپنے ہاتھ سے اُسے خنجر کے دو زخم لگائے جس سے بھکاری خاں کا دم نکل گیا۔ بیگم نے اُس کی لاش شہر سے باہر خندق میں پھنکوا دی۔ یہ واقعہ اپریل ۱۷۵۵ء کا ہے۔

بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ بھکاری خاں بڑا خوبرو۔ متقی اور عالم تھا۔ بیگم نے معین الملک کی وفات کے بعد بُری نیت سے اُس پر ڈورے ڈالنے چاہے مگر اسے شیشے میں نہ اتار سکی۔ اس ناکامی پر ناراض ہو کر بھکاری خاں کو مروا دیا۔ یہ کہانی طہماس قلی مسکین کے بیانات کی روشنی میں بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اور خان مذکور کا قتل سیاسی واقعات کا نتیجہ تھا۔

حکومت نواب عبداللہ

امان خان واپسی پر خواجہ مرزا خان اور دوسرے خود سر ترک مغل امرا کو اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا۔ اُس کی واپسی پر خواجہ عبداللہ نے میدان خالی پا کر پندرہ بیس ہزار پیادے اور سوار جمع کیے اور نظامت لاہور پر قبضہ کرنا چاہا۔ بیگم کو معلوم ہوا تو اُس نے انعام و اکرام کا لالچ دے کر اُس کے سپاہیوں کو ورغلانا چاہا مگر خواجہ عبداللہ نے میر مومن خاں اور درانی ایجنٹ ہادی خاں کی مدد سے بیگم کو نظر بند کر دیا اور خود جولائی ۱۷۵۵ء میں زمامِ حکومت سنبھال لی اُسے سپاہ کو مطمئن رکھنے کے لیے روپے کی بے حد ضرورت تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ اُس نے جبر و تشدد سے روپیہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایک روز اُس نے شہر کے دروازے بند کر کے باشندگان لاہور کو بلا تمیز مذہب و ملت لوٹنا شروع کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ وہ بھکاری خاں کے حامی تھے۔ اس گیر و دار میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ اسی زمانے میں لاہور میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی۔

حکومت نواب عبداللہ۔ نہ رہی چکی نہ رہا چُلہا (چولھا)

ان حالات میں غلہ اور اجناس خوردنی بے حد مہنگے ہو گئے اور لوگ بھوکے مرنے لگے۔

آدینہ بیگ کا لاہور پر قبضہ

آدینہ بیگ ذات کا ارائیں اور شرق پور کا باشندہ تھا۔ یہ وہ شرقپور نہیں جو لاہور کے قریب راوی کے دائیں کنارے ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے۔ بلکہ یہ شرق پور جالندھر کے قریب واقع تھا۔ اور اب شرپور کہلاتا ہے۔ آدینہ بیگ نے ایک مغل گھرانے میں پرورش پائی اور شاہی ملازمت اختیار کی۔ اور رفتہ رفتہ جالندھر دوآب کا فوجدار مقرر ہو گیا۔ معین الملک کی وفات کے بعد اس کا تعلق لاہور سے بالکل برائے نام رہ گیا اور یہ جالندھر دوآب کا عملی طور پر خود مختار حاکم بن گیا۔ اپریل ۱۷۵۵ء میں اُس نے قطب خاں روہیلہ فوجدار سرہند کو شکست دے کر اس سرکار پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور بیاس سے لے کر جمنا تک کا علاقہ اس کے زیرِ تصرف آگیا۔ قطب خاں شہنشاہ دہلی کا باغی تھا۔ اور اس اقدام سے اس نے دربارِ دہلی کی خوشنودی بھی حاصل کر لی تھی۔

لاہور کے حالات نے آدینہ بیگ خاں کو اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کا ایک درخشاں موقع دیا۔ خواجہ عبداللہ سے لوگ نفرت کرتے تھے۔ کوئی اور حریف میدان میں نہ تھا۔ آدینہ بیگ نے لاہور پر فوج کشی کی۔ خواجہ عبداللہ مقابلہ کیے بغیر سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ اور آدینہ بیگ شہر پر قابض ہو گیا۔ مگر وہ تھوڑا عرصہ یہاں رہ کر جالندھر واپس چلا گیا اور صادق بیگ خاں کو اپنا نائب مقرر کیا۔

اِن حالات میں مغلانی بیگم نے دہلی کے وزیر غازی الدین خاں عماد الملک کو مدد کے لیے خط لکھا۔ یہ شخص میر معین الملک کا بھانجا تھا اور مغلانی بیگم کی بیٹی عمدہ بیگم کی اس سے منگنی ہو چکی تھی۔ عماد الملک نے موقع کو غنیمت جانا اور پنجاب کی سیاسیات میں دخیل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وزیر کو اُس وقت روپے کی ضرورت تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ لاہور سے اُسے کافی روپیہ مل جائے گا۔

اس موقع پر مغلانی بیگم نے عمدہ بیگم کی رخصتی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ عماد الملک اُس وقت دہلی کی ایک ذہین و فطین خاتون گنا بیگم سے شادی کر چکا تھا تاہم وہ عمدہ بیگم کی رخصتی کا بھی متمنی تھا جو اس کے مرحوم ماموں کی بیٹی تھی۔ گنا بیگم علی قلی خاں ہفت ہزاری کی بیٹی تھی جو عالمگیر ثانی کا درباری امیر تھا۔ گنا بیگم حسن و جمال میں بے مثال۔ اور شعر و سخن میں با کمال تھی۔ بڑے بڑے اکابر جن میں لکھنؤ کے نواب وزیر شجاع الدولہ بھی تھے۔ اُس سے شادی کے متمنی تھے۔ مگر اس کی قسمت میں عماد الملک کی بیوی بننا لکھا تھا۔ یہ انتخاب بہت ہی بُرا ثابت ہوا کیونکہ ۱۷۵۷ء میں جب احمد شاہ درانی نے دہلی پر قبضہ کیا تو گنا بیگم کو مغلانی بیگم کے حوالے کر دیا۔ اور اس نے گنا بیگم کو اپنی کنیز بنا لیا

(FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, J.N. SARKAR, VOL. III. P.108 - 109)

شکار کے بہانے عماد الملک ۱۵ جنوری ۱۷۵۶ء کو ولی عہد سلطنت شہزادہ عالی گہر کو ہمراہ لیے دہلی سے نکلا۔ اُس کے ساتھ دس ہزار سپاہ تھی۔ سرہند کے مقام پر اُسے آدینہ بیگ کا پیغام ملا "آپ سرہند ہی ٹھہریے اور کسی خواجہ سرا کو دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ میرے پاس بھیج دیجیے میں اپنے سپاہ کی مدد سے لاہور پر اُس کا قبضہ کرا دوں گا۔ اگر آپ خود وہاں گئے تو کام مشکل ہو جائے گا"

چنانچہ عماد الملک نے نسیم خاں خواجہ سرا کو کچھ سپاہ کے ساتھ جالندھر بھیجا اور ستلج کے کنارے ماچھی واڑہ کے مقام پر بقیہ فوج کے ساتھ قیام کیا۔ آدینہ بیگ نے صادق بیگ خاں کو اپنے دس ہزار سپاہیوں کی معیت میں وزیر کی فرستادہ فوج کے ساتھ لاہور بھیج دیا۔ اس فوج نے شاہ گنج قیام کیا اور پھر تمام لشکر مغلانی بیگم کے ہاں سلام کے لیے گیا۔ واپسی پر یہ لوگ خواجہ عبداللہ کے پاس گئے اور اس نے صادق بیگ خاں کو خلعت عطا کیا۔ مگر اس کے باوجود وہ خوفزدہ ہو کر جموں کی طرف بھاگ گیا۔

مغلانی بیگم کی گرفتاری

وزیر کا خط مغلانی بیگم کو دیا گیا جس میں کہ اس نے عمدہ بیگم کی رخصتی کے لیے درخواست کی ہوئی تھی۔ بیگم نے پھر زمامِ حکومت سنبھالی اور عمدہ بیگم کی رخصتی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک ماہ بعد عمدہ بیگم کو ایک نہایت اچھا جہیز دے کر جس میں اعلیٰ پوشاکیں۔ بیش قیمت زیورات۔ گھر کا تمام ساز و سامان خواجہ سرا اور ملازم شامل تھے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ تین ہزار سپاہی دولہن کے ہمراہ بھیجے گئے اور چار مارچ ۱۷۵۸ء کو وہ بمقام ماچھی واڑہ وزیر کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

عماد الملک کا اگلا قدم مغلانی بیگم کی گرفتاری کی تدبیر تھی۔ اس نے سید جمال الدین خاں۔ نثار محمد خاں۔ شیر جنگ۔ حکیم عباد اللہ خاں اور خواجہ سعادت یاب خاں کو آدینہ بیگ کے پاس بھیجا کہ بیگم کو بھی وزیر کے کیمپ میں لے آنے کی تدبیر کی جائے۔ آدینہ بیگ بھی مغلانی بیگم کا لاہور سے اخراج پسند کرتا تھا۔ اس نے ان اکابر کو کچھ فوج کے ہمراہ لاہور بھیجا۔ ان لوگوں نے اس کی حویلی کا محاصرہ کر لیا۔ چند خواجہ سرا اندر گئے بیگم کو جگایا اور ایک پالکی میں ڈال کر باہر لے آئے اور یہ پالکی فی الفور شہر سے باہر لشکر گاہ میں پہنچا دی گئی۔

مغلانی بیگم ۲۸ مارچ کو بحالتِ اسیری ماچھی واڑہ پہنچی۔ عماد الملک اس کے استقبال کو آیا۔ جونہی دونوں کی ملاقات ہوئی بیگم نے انتہائی غصے کے عالم میں یہ دھمکی دی کہ "تمہارا طرزِ عمل سلطنت دہلی اور امرائے دولت کی بربادی کا سبب بنے گا اور میری بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بہت جلد احمد شاہ درانی دہلی پہنچے گا۔"

عماد الملک نے تیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض آدینہ بیگ خاں کو لاہور اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا۔ سید جمیل الدین خاں کو لاہور میں اس کا نائب نامزد کیا اور ۹ مئی ۱۷۵۸ء کو وزیر کا کیمپ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

خواجہ عبداللہ لاہور میں

سید جمیل الدین ایک بہادر اور باحوصلہ انسان تھا۔ وہ لاہور پہنچا تو اس نے شہر کو برباد اور رعایا کو قلاش پایا۔ وسائل کی کمی کے باوصف اس نے انتظامِ حکومت درست کرنے کی کوشش کی اور اجناس کی قیمت معمول پر لانے کے لیے منڈیوں کے چودھریوں پر سختی کی۔ اس کی بہادری کے سلسلے میں مسکین لکھتا ہے۔

"ایک بار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سید جمیل الدین سیر و شکار کے لیے شہر سے باہر گیا تھا تب جا بکلا دس پندرہ ہزار سکھوں پر مشتمل ایک جمعیت نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ہمراہ تقریباً ایک ہزار سپاہی تھے۔ اتنی قلیل سپاہ کے باوصف اس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسے بھگا دیا۔" اللہ اللہ ہمارے دورِ زوال میں بھی کیسی کیسی نادرِ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اگر ہماری مرکزی حکومت کا شیرازہ نہ بکھرتا اور ہماری منتشر طاقتیں ایک مرکز پر جمع رہتیں۔ تو کبھی بھی پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم نہ ہوتی ؎

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

سید جمیل الدین کا دورِ اقتدار بہت ہی مختصر ثابت ہوا ؎

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

خواجہ عبداللہ جموں سے سیدھا قندھار گیا اور تمام داستان احمد شاہ درانی کو سنائی کہ دربارِ دہلی نے آدینہ بیگ کو لاہور اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کر دیا ہے اور مغلانی بیگم کو قید کر کے عماد الملک دہلی لے گیا ہے۔ درانی کے لیے یہ خبر ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ لاہور اور ملتان کو ۱۷۵۲ء کے معاہدۂ شالامار کے بعد اپنی قلمرو کا حصہ شمار کرتا تھا اور مغلانی بیگم کو اپنی صوبہ دار سمجھتا تھا۔ اس نے ایک فوج دے کر

جنگ باز خاں کو خواجہ عبداللہ کے ہمراہ بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ خواجہ مرزا وغیرہ ترک جمعداروں کو بھی لے آیا۔ جو درانی کے پاس نظر بند تھے۔ سید جمیل الدین نے آدینہ بیگ کو امداد کے لیے لکھا۔ مگر اُسے جواب ملا کہ درانی کے عساکر سے لڑنا فضول ہے۔ آپ جالندھر چلے آئیں دونوں مل کر کوئی پروگرام بنائیں گے۔ سید جمیل کے لاہور سے چلے جانے کے بعد باشندگانِ شہر میں سے بھی اکثر لوگ جدھر کسی کے سینگ سمائے بھاگ نکلے۔ جنگ باز خاں ۲۴ اکتوبر ۱۷۵۶ء کو لاہور میں داخل ہوا۔ خواجہ عبداللہ خاں کو ناظم اور خواجہ مرزا خاں کو اُس کا نائب مقرر کیا۔ درانی سپاہ نے شہر کو خوب لوٹا۔ نئے حاکموں کو اطمینان سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور سکھوں نے جو اُس وقت تک بہت طاقتور ہو چکے تھے انھیں بے حد پریشان کیا۔

احمد شاہ درانی کا چوتھا حملہ
جنوری تا اپریل ۱۷۵۷ء

مغلانی بیگم نے دہلی سے احمد شاہ درانی کو خط لکھا کہ وزیرِ دہلی نے پنجاب کی حکومت اُس سے چھین لی ہے اور اُسے میر مومن، آدینہ بیگ اور سید جمیل کی غداری نے تباہ کیا ہے۔ آپ اس کا بدلہ لینے کے لیے دہلی پر حملہ کریں۔ وہاں کے حالات دگرگوں ہیں اور فتح و نصرت آپ کے قدم چومے گی۔ میرے خسر وزیر قمرالدین خاں کے محل میں کروڑوں روپے کا اثاثہ ہے۔ یہی حال دوسرے امرا کا ہے۔ یہ سب مال و دولت اپنی ملکیت سمجھئے۔

احمد شاہ درانی ایسا موقع ہاتھ سے کب دے سکتا تھا۔ اس نے قلندر بیگ خاں کو بطورِ سفیر شہنشاہ دہلی عالمگیر ثانی کے دربار میں بھیجا کہ وہ وزیر کے اس طرزِ عمل کی وضاحت کرے کہ اس نے لاہور اور ملتان کے صوبوں پر مغل ناظم مقرر کر دیے ہیں حالانکہ ۱۷۵۲ء سے یہ صوبے درانی مقبوضات میں شامل ہیں۔ مگر اس سفارت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ احمد شاہ درانی قندھار سے پشاور آیا اور اپنے ہراول دستے جہاں خان سپہ سالار اور اپنے فرزند تیمور شاہ کی قیادت میں روانہ کیے۔ یہ لشکر اٹک، حسن ابدال اور گجرات ہوتا ہوا امین آباد پہنچا۔ آدینہ بیگ خان اُس وقت باری دوآب میں جلال آباد کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ درانی لشکر کی آمد کی خبر سن کر وہ صادق بیگ اور سید جمیل کو لے کر دریائے بیاس پار کر کے سرائے نور محل میں چلا گیا۔ وہاں سے تھارا اور ہریانہ ہوتا ہوا کانگڑہ کی پہاڑیوں میں کالی بلوان نام ایک جگہ پناہ گزیں ہوا جو ہوشیار پور سے ستر میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ جہاں خان نے جالندھر دوآب میں آدینہ بیگ کا پیچھا کیا۔ مگر اُسے پکڑ نہ سکا۔ اس بار احمد شاہ درانی بغیر کسی رکاوٹ کے پنجاب کو روندتا ہوا دہلی کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ عماد الملک نے شہر کے دفاع کے لیے کوئی انتظام نہ کیا اور ایسے درویشوں کی تلاش میں رہا جن کی دعا سے بغیر لڑے دشمن قابو میں آ جائے۔ درانی کے سرہند پہنچنے کی خبر ملی تو اُس نے مغلانی بیگم کو ۱۰۰ سواروں کی معیت میں احمد شاہ درانی کے پاس بھیجا تاکہ وہ سمجھا بجھا کر اُس کا غصہ ٹھنڈا کرے اور دہلی کو تباہی سے بچائے۔ بیگم کرنال کے مقام پر اُس سے جا ملی اور احمد شاہ درانی اُسے ہمراہ لے کر آگے بڑھتا گیا۔ نریلا کے مقام پر نجیب الدولہ اور عماد الملک یکے بعد دیگرے درانی کے کیمپ میں پہنچے اور اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو درانی دہلی میں داخل ہوا۔ اس کی سپاہ نے شہر کو بے دریغ لوٹا۔ مغلانی بیگم کی نشان دہی پر بڑے بڑے قدیم خاندانی امرا کی حویلیاں تاراج ہوئیں اور بالخصوص اُس کے خسر قمرالدین خاں کے خاندان کو لوٹا گیا۔ مغلانی بیگم کی ساس شولاپوری بیگم کو قید کر کے بڑی اذیت پہنچائی گئی۔ اور اس کا تمام زر و مال لوٹ لیا گیا۔ لوٹ مار کے دوران بہت سے لوگ مارے گئے۔ اس دوران میں درانی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی بیٹی زہرہ بیگم سے کی۔ اس نے خود مرحوم بادشاہ محمد شاہ کی سولہ سالہ گلفام اور پری اندام لڑکی

حضرت بیگم سے زبردستی شادی کی۔ مغلانی بیگم کی کارگزاری سے احمد شاہ درانی اس قدر خوش ہوا کہ اُسے سلطان مرزا کا خطاب دیا اور یہ کہا کہ اب تک میں تمہیں بیٹی سمجھتا تھا۔ آج سے تمہیں اپنا بیٹا شمار کروں گا۔ اور اسے خلعتِ شاہانہ بھی عطا کیا۔

دہلی سے واپسی پر احمد شاہ درانی نے تیمور شاہ کو پنجاب میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور جہان خاں کو اس کے پاس چھوڑا۔ مغلانی بیگم پنجاب کی حکومت، بلکہ کم از کم پنجاب میں ایک بڑی جاگیر کی متمنی تھی۔ مگر اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور اُسے صرف تیس ہزار روپے سالانہ وظیفے پر ٹرخا دیا گیا۔

جہاں خاں نے اقامتِ لاہور کے زمانے میں حصولِ زر کے لیے بہت سختی کی۔ ایک بار مغلانی بیگم کو بھی پیٹا۔ آدینہ بیگ خاں کو جالندھر دوآب کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اسے ادائیگی خراج کے لیے تنگ کرنا شروع کیا۔ درانیوں کے طرزِ عمل سے تنگ آ کر آدینہ بیگ خاں نے مرہٹوں کو پنجاب پر حملے کے لیے بلایا۔ مرہٹوں کی آمد پر جہان خاں پہلے لاہور سے شاہدرہ چلا گیا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہ کر اپنی فوج سمیت پشاور کی راہ لی۔ مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور ۷۵ لاکھ روپے سالانہ خراج پر آدینہ بیگ کو پنجاب میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ وہ خود لاہور میں مقیم ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ اُس نے خواجہ مرزا خاں کو صوبائی دارالحکومت میں چھوڑا اور خود بٹالہ میں اقامت اختیار کی۔ خواجہ مرزا خاں مغلانی بیگم کی سازشوں سے بہت ڈرتا تھا۔ اُس نے آدینہ بیگ خاں سے درخواست کی کہ وہ بیگم کو اپنے ہمراہ بٹالہ لے جائے۔ بٹالہ کے قریب آدینہ بیگ نے آدینہ نگر نام ایک قصبہ بسایا جو آج دینہ نگر کہلاتا ہے۔ آدینہ بیگ بیگم کو اپنے ہمراہ دینا نگر لے گیا۔ اور بڑے احترام سے اُسے اپنے پاس رکھا۔ بعد ازاں بیگم جموں میں جا کر آباد ہو گئی۔ اور وہیں ۱۷۸۰-۱۷۷۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

احمد شاہ درانی کا پانچواں حملہ
۱۷۵۹ء — ۱۷۶۱ء

چوتھے حملے کے بعد احمد شاہ درانی نے لاہور اور ملتان کے صوبوں کے علاوہ سرہند سرکار کو بھی (جو صوبہ دہلی کا حصہ تھی) اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اُسے مرہٹوں کے لاہور پر قابض ہو جانے کی خبر ملی تو وہ غیض و غضب سے بھرا ۱۷۵۹ء کے موسمِ خزاں میں فوج کثیر لے کر لاہور پہنچا۔ اس کی آمد پر مرہٹے پنجاب خالی کر کے دہلی چلے گئے۔ شاہ نے شاہ ولی خاں کے بھتیجے کریم داد خاں کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا اور خود سرہند کی راہ لی۔ وزیر عماد الملک نے اس خوف سے کہ بادشاہ عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ (برادرِ میر معین الملک) کہیں اس کے خلاف احمد شاہ درانی سے نہ مل جائیں۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو مروا ڈالا۔ اور ایک شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تختِ دہلی پر بٹھا دیا۔ اس بار احمد شاہ درانی زیادہ عرصہ ہندوستان میں مقیم رہا اور اس نے مرہٹوں کے خلاف کارروائی کی۔

پانی پت کی یہ تیسری جنگ تاریخ کی مشہور فیصلہ کن لڑائیوں میں سے تھی۔ لشکرِ اسلام نے احمد شاہ درانی کی قیادت میں جس بہادری اور دوراندیشی سے جنگ لڑی وہ اوراقِ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ۱۲ جنوری ۱۷۶۱ء کو آخری معرکہ ہوا اور سداشو بھاؤ اور اس کا بھتیجہ وشواس راؤ جو پیشوا کا بیٹا تھا۔ ہزارہا مرہٹہ سپاہیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آئے۔ باقیماندہ مرہٹہ سورما سراسیمگی کے عالم میں میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ ۳۰ ہزار مرہٹہ سپاہی مارے گئے۔ ۲۲ ہزار قید ہوئے۔ دو لاکھ مویشی کئی ہزار اونٹ ۵۰۰ ہاتھی اور بے انتہا زر و جواہر درانی لشکر کے ہاتھ لگے۔ اس شکست کا مرہٹہ حکمران بالاجی باجی راؤ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غم سے گھل گھل کر ۶ ماہ کے اندر راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

فتح کے اگلے روز احمد شاہ درانی پوشاکِ فاخرہ زیبِ تن کئے کوہِ نور اور دیگر ہیرے اپنے تاج لگائے حضرت لوعلی قلندر کے مزار پر فاتحہ کے لیے گیا۔ اور وہاں بہت سا روپیہ بطورِ خیرات تقسیم کیا۔ بعد ازاں شاہی لشکر دہلی گیا اور دو ماہ وہاں آرام کرنے کے بعد ۲۲ مارچ ۱۷۶۱ء کو عازمِ قندھار ہوا۔

احمد شاہ درانی کا چھٹا حملہ (۱۷۶۲ء)

۱۷۶۱ء کے موسمِ گرما کے آغاز میں قندھار جاتے ہوئے احمد شاہ درانی نے زین خاں کو سرہند میں صادق خاں آفریدی کو جالندھر دواب میں خواجہ عبید خاں کو لاہور میں اور خواجہ مرزا خاں کو چار محال میں حاکم مقرر کیا۔ جب تک احمد شاہ درانی یہاں رہا سکھ شوالک کی پہاڑیوں میں چھپے رہے۔ احمد شاہ کے اٹک پار جاتے ہی یہ لوگ حشرات الارض کی طرح اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور تاخت و تاراج شروع کر دی۔ رچنا دوآب میں ۴ ہزار سکھوں نے خواجہ مرزا خاں کو بھگا دیا اور سرہند میں زین خان کا محاصرہ کر لیا۔ اس جگہ مالیر کوٹلہ کے پٹھان سردار بھیکن خاں نے نہایت پامردی سے اُن کا مقابلہ کیا۔ سکھوں نے اُس کی جاگیر کو تباہ و برباد کر دیا۔ احمد شاہ درانی کے لیے یہ خبر بہت روح فرسا تھی اس نے نور الدین خان کو افواج دے کر پنجاب بھیجا۔ جسے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی سکھوں کی شکرچکیہ مثل کے سردار چڑت سنگھ نے (جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دادا تھا) شکست دے کر بھگا دیا۔ اس پر خواجہ عبید خاں حاکم لاہور نے ہمت کر کے چڑت سنگھ کے شہر گوجرانوالہ کا محاصرہ کر لیا مگر بُری طرح شکست کھائی اور بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچا۔

لاہور پہ سکھوں کا قبضہ اور اُن کا پہلا سکہ (۱۷۶۱ء)

ان تمام مذکورہ صدر واقعات نے سکھوں کا حوصلہ بڑھایا اور جسا سنگھ کلال اہلو والیہ سردار کپور تھلہ کی قیادت میں سکھوں نے لاہور پر حملہ کیا۔ خواجہ عبید خان کو شکست دے کر مار ڈالا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ بقول لشادپسر[1] بری

بلاہور سکے بے شعور یا قسمت

دل خالصہ نے جسا سنگھ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا یعنی اب پنجاب کا بادشاہ احمد شاہ درانی کی بجائے جسا سنگھ تھا۔ اس موقعہ پہ سکھوں نے پہلی بار اپنا سکّہ بھی لاہور کی ٹکسال میں ضرب کیا۔ جس پر ذیل کے الفاظ تھے :-

سکہ زد در جہاں بفضل اکال — ملکِ احمد گرفت جسا کلال

پنجاب کے مسلمان سرداروں نے یہ سکّے اور تمام واقعات کی تفصیل احمد شاہ درانی کو لکھ بھیجی اور یہ سنتے ہی وہ اپنے عساکرِ قاہرہ لیے عازمِ پنجاب ہوا۔

احمد شاہ درانی اپنی فوجیں لیے عقاب کی طرح جھپٹا اور بہت جلد پنجاب پہنچ گیا۔ اُس نے سنا کہ سکھ لدھیانہ سے ۲۲ میل دور مالیر کوٹلہ کے پاس کپ کے مقام پر مقیم ہیں اور ان کی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے سکھوں کی عادت تھی کہ وہ شاہ کی آمد کی خبر سُن کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپتے تھے اور کھلے میدان میں اُس کے عساکر کا مقابلہ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ اس بار شاہ نے اپنی نقل و حرکت کی خبر بے حد پوشیدہ رکھی اور غیر مانوس راستوں سے گزرتا ہوا سکھ کیمپ کے سامنے جا پہنچا۔ یہاں تک کہ سکھوں کو بھاگنے کی فرصت نہ ملی اور

---

[1] ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو سکھوں نے امرتسر میں دیوالی کا تہوار منایا اور گورمتہ کر کے لاہور پہ حملہ بول دیا۔ اور شہر پہ قبضہ کر لیا۔

درانی فوج نے انھیں شکستِ فاش دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سکھ اور احمد شاہ درانی کھلے میدان میں باہم نبرد آزما ہوئے۔ کم از کم دس بارہ ہزار سکھ اس معرکہ میں کام آئے۔ آپ کی جنگ کو سکھ "گولو گھارا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی وہ تباہی انگیز جنگ جس میں ان کی قوم کو لہو میں نہلوا دی گئی۔ اس معرکے کے بعد احمد شاہ نے کچھ عرصہ قیام کیا اور سکھوں کی تادیب جاری رکھی۔

بارہ دسمبر ۱۷۶۲ء کو احمد شاہ لاہور سے قندھار روانہ ہوا۔ اور اس نے کابلی مل نام ایک ہندو کو لاہور کا ناظم مقرر کیا۔ جب تک وہ یہاں رہا سکھ کمین گاہوں میں چھپے رہے۔

احمد شاہ درانی کا ساتواں حملہ

احمد شاہ درانی کی واپسی کے بعد سکھوں نے پنجاب میں پھر کشت و خون کا بازار گرم کر دیا۔ مئی ۱۷۶۳ء میں انھوں نے قصور پر حملہ کرکے پٹھان سردار مل کو شکست دی اور شہر کو لوٹ لیا۔ جون میں جالندھر دوآب کو تاراج کیا۔ درانی کے سپہ سالار جہان خان کو نومبر کے وسط میں چناب کے کنارے شکست دے کر بھگا دیا۔ دسمبر میں مالیر کوٹلہ پر انھوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۴ جنوری ۱۷۶۴ء کو انھوں نے سرہند پر حملہ کرکے زین خاں حاکم شہر کو مار ڈالا اور فروری میں دوآب گنگ و جمن پر جو نجیب الدولہ کا علاقہ تھا ہلہ بول دیا اور سہارنپور اور میرٹھ کے ضلعوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اس کے بعد سکھوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور کابلی مل سے مطالبہ کیا کہ ذبیحہ گاؤ بند کیا جائے اور قصابوں کو قتل کر دیا جائے۔ کابلی مل نے بہانہ سازی سے کام لیا مگر اس کی پیش نہ گئی۔ آخر کار اس نے چند قصابوں کے ناک اور ہاتھ کاٹ کر شہر سے باہر نکال دیا۔ اس پر سکھ محاصرہ اٹھا کر چلے گئے۔

سکرچکیہ مسل کے سردار چڑت سنگھ نے جہلم تک تمام علاقے کو تاراج کرکے قلعہ رہتاس پر قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ درانی کو جب رہتاس سے لے کر روہیل کھنڈ تک تمام علاقے میں سکھوں کی تخریبی کارروائیوں کی اطلاع ملی تو اس نے پنجاب پر حملہ کرکے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ۱۸۰۰۰ فوج جمع کی اور بلوچستان کے سردار نصیر خاں کو لکھا کہ وہ جہاد میں اس کا ساتھ دے۔ نصیر خاں حج کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن پنجاب اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم سے بچانے کے لیے اس نے حج کا ارادہ ملتوی کیا اور جہاد کی نیت سے بلوچ رضاکاروں کے دستے لے کر احمد شاہ درانی سے آملا۔ اس کے ہمراہ ۱۲۰۰۰ سپاہی تھے۔ احمد شاہ درانی پہلے روانہ ہو چکا تھا اور نصیر خاں اسے ایمن آباد میں آملا تھا۔ اس کے بعد دونوں سردار لاہور پہنچے۔ راستے میں نصیر خاں ایک رات شاہدرہ ٹھہرا۔ لاہور پہنچ کر احمد شاہ نے قلعہ لاہور کے دیوانِ عام میں دربار کیا اور لاہور کے عمائد کو اس میں صلاح مشورے کے لیے بلایا۔ سب نے نصیر خاں کی تجویز کو پسند کیا اور بیلی جنگل پر جہاں کچھ سکھ چھپے ہوئے تھے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز یہ خبر ملی کہ سکھوں نے قراول پر حملہ کر دیا ہے۔ قراول سپاہیوں کے اس دستے کو کہتے تھے جو سازوسامان، عورتوں، بچوں اور شاگرد پیشہ کیمپوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی جوشِ جہاد میں نصیر خاں خود ایک فوج کے ہمراہ لڑنے کے لیے نکلا اور میدانِ کارزار میں مرنے سے بال بال بچا۔ احمد شاہ درانی اور نصیر خاں کچھ عرصہ پنجاب کے مختلف حصوں میں سکھوں کے خلاف لڑنے کے بعد واپس ہوئے۔ رہتاس

نوٹ: کپ سے فتح مند لشکر ۳ مارچ ۱۷۶۲ء کو لاہور پہنچا اور ۱۲ دسمبر تک احمد شاہ لاہور میں مقیم رہا۔ اس دوران میں جولائی کا مہینہ اس نے ضلع گورداسپور کے تاریخی شہر کلانور میں گرمی سے بچنے کے لیے گزارا۔

کے قلعے تک دونوں اکٹھے گئے۔ وہاں سے احمد شاہ اٹک اور پشاور کے راستے عازم کابل ہوا اور نصیر خاں نے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مقام پر اسمٰعیل خاں کی مدد سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور ڈیرہ جات میں سے گزرتا ہوا قلات جا پہنچا۔ احمد شاہ درانی کے اس حملے کے حالات اور سکھوں کے خلاف بلوچوں اور پٹھانوں کی ترک تاز کے حالات قاضی نور محمد نے فارسی نظم میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب چھپ چکی ہے۔ قاضی نور محمد نصیر خاں بلوچ کے لشکر کے ہمراہ قلات سے آیا تھا۔ اس نے کا مقصد سکھ غارت گروں کا قلع قمع کرکے پنجاب میں امن کی فضا قائم کرنا اور مسلمان رعایا کو غارت گری سے بچانا تھا۔ مگر چند ماہ سکھوں کے خلاف لڑنے کے بعد یہ دونوں مجاہد واپس چلے گئے اور پنجاب میں سیاسی فضا کو مسلمانوں کے لیے ساز گار بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

احمد شاہ درانی کا آٹھواں حملہ

اپریل ۱۷۶۵ء میں احمد شاہ واپس ہوا تو سکھوں نے تقریباً ایک ماہ بعد لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۶۶ء کے موسم خزاں میں احمد شاہ درانی نے آٹھویں بار پنجاب پر فوج کشی کی۔ جہلم کے قریب چرٹ سنگھ آٹھ ہزار سپاہی لیے مقابلے پر آیا مگر شکست کھا کر مارا گیا۔ ۱۷ دسمبر کو احمد شاہ لاہور کے قریب فاضل آباد پہنچا۔ اس پر سوبھا سنگھ۔ لہنا سنگھ۔ گوجر سنگھ لاہور کے تین حاکم اور ہیرا سنگھ اور عجب سنگھ جو لاہور میں تھے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے حالانکہ ان کے پاس آٹھ دس ہزار فوج تھی۔ گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ قصور چلے گئے۔ عجب سنگھ اور سوبھا سنگھ پاک پٹن چلے گئے۔ ۲۲ دسمبر کو وہ لاہور پہنچا۔ اس واقعہ کے بارے میں پنجاب میں یہ شعر مشہور ہوا ؎

سوبھے دی سوبھا گئی۔ گجر دا گیا مال
لہنے نوں دینا آیا۔ تینوں ہوئے کنگال

اسی اثنا میں لاہور کے لوگوں کا ایک وفد شاہ سے ملا۔ اور انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ لہنا سنگھ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دے کیونکہ وہ دوسرے سکھ سرداروں کے مقابلے میں زیادہ نیک دل اور رعایا کا خیر خواہ ہے۔ بادشاہ نے اُسے لاہور بلا کر پنجاب میں اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ کیا مگر لہنا سنگھ نے احمد شاہ درانی کے ماتحت یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس سے دوسرے سکھ سردار ناراض ہو جائیں گے۔ اس نے شاہ کا ارسال کردہ خشک میوہ بھی واپس کر دیا۔ اور اُسے کہلا بھیجا کہ یہ میوے ہم غریب دیہاتی زمینداروں کے کھانے کی چیز نہیں۔ ہماری خوراک تو جوار اور باجرہ وغیرہ ہے۔

لاہور سے احمد شاہ درانی نے سرہند کا رخ کیا۔ اس سفر میں چرٹ سنگھ اور لہنا سنگھ نے شاہ کے لشکر کے سامان پر حملہ کیا اور کچھ لوٹ مار کرکے بھاگ گئے۔ یہ لوگ پندرہ سے پچیس میل کے دائرے میں شاہ کے لشکر کے گرد منڈلاتے رہے۔ انھوں نے کہیں جم کر مقابلہ نہ کیا بلکہ جہاں موقع ملتا چھاپہ مار کر شاہی لشکر کو نقصان پہنچاتے۔

۷ ارجنوری ۱۷۶۷ء کو چرٹ سنگھ۔ ہیرا سنگھ۔ لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جہان خاں پر حملہ کیا جو اُس وقت بمقام امرتسر مقیم تھا۔ تین گھنٹے تک لڑائی ہوئی۔ پانچ چھ ہزار کے قریب سپاہی زخمی ہوئے یا مارے گئے۔ شاہ جو سرہند کی طرف جا رہا تھا اور امرتسر سے زیادہ دور نہ تھا۔ یہ خبر سنتے ہی امرتسر پہنچا اور سکھوں کو بھگا دیا۔ جب احمد شاہ سفر کرتا ہوا دریائے ستلج کے کنارے ماچھی واڑہ کے گھاٹ پر پہنچا تو سکھوں نے اس پر پھر حملہ کیا۔ اور لشکر کو کچھ نقصان پہنچا کر بھاگ گئے۔

سرہند کے مقام پر پھولکیاں مثل کے سردار امر سنگھ کو احمد شاہ نے خلعت۔ علم۔ راجہ راجگاں کا خطاب اور سرہند کی صوبہ داری

کا پروانہ دیا۔ اور اُسے کہا کہ وہ سالانہ خراج کی رقم شاہ کو پہنچا دیا کرے۔ یہاں سے اُس نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ واپسی پر وہ ڈیڑھ ماہ تک ماچھی واڑہ میں مقیم رہا اور یہاں سکھوں کے اجتماع کے متعلق سنتا وہاں فوج روانہ کرتا۔ اسی اثنا میں پرچہ لگا کہ سکھوں کی ایک جماعت نے نجیب الدولہ کے علاقے گنگا دوآب پر حملہ کر کے نانوتہ، انبیٹہ، میرٹھ اور بارہ سادات کو لوٹ لیا۔ احمد شاہ نے جہان خاں کو اُن کے تعاقب میں بھیجا اور اس نے تقریباً سوا سو میل کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے ان غارت گروں کو اچانک جا لیا۔ سکھوں کو اس کی اچانک آمد کا خیال تک نہ تھا۔ بہرحال شاملی اور کیرانہ کے درمیان جنگ ہوئی اور سکھوں کو شکست دے کر بھگا دیا گیا۔

احمد شاہ درّانی کا نواں حملہ (۱۷۶۸ - ۱۷۶۹ء)

دسمبر ۱۷۶۸ء میں احمد شاہ درانی نے سکھوں کی تسخیر کے لیے پنجاب کا رُخ کیا۔ اس کے ہراول دستے ایمن آباد پہنچ چکے تھے اور وہ خود چناب کے کنارے تھا کہ وہ اپنے لشکر میں گڑبڑ کی وجہ سے واپس چلا گیا۔

احمد شاہ درّانی کا دسواں حملہ (۱۷۶۹-۱۷۷۰ء)

دسمبر ۱۷۶۹ء میں احمد شاہ ایک بار پھر اپنے ہندی مقبوضات میں امن قائم کرنے اور سکھوں کو قابو میں لانے کے لیے عازمِ ہند ہوا مگر اس بار پشاور ہی سے اُسے واپس جانا پڑا۔

احمد شاہ درّانی ایک بہادر سپاہی اور قابل جرنیل تھا۔ اس کے ہندوستان پر حملے اور وسط ایشیا میں اُس کی فوجی مہموں نے اُس کی سپاہ گری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ اگرچہ اس کی ہندوستانی فتوحات کا اُس کے خاندان یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا تاہم ہر طرف اُس کا طوطی بولتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۶۸ء کے بعد غالباً بڑھاپے کی وجہ سے اُس کا اپنے لشکر پر وہ قابو نہ رہا جو اس سے قبل اسے حاصل تھا۔

جہان خاں سپاہ سالار ۲۴ مارچ ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا اور اس سے دو سال ایک ماہ بعد اپریل کی ۱۴ تاریخ کو ۱۷۷۲ء میں احمد شاہ درانی بھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ احمد شاہ درّانی کو قندھار میں دفن کیا گیا اور ۹۰ ہزار روپے کی لاگت سے ایک عالیشان مقبرہ اس کی قبر پر تعمیر کیا گیا۔

احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بادشاہ بنا جس نے ۱۷۷۳ء سے ۱۷۹۳ء تک حکومت کر کے وفات پائی۔

لاہور سکھوں کے عہد میں

یوں تو بندہ بیراگی کے زمانے ہی میں پہلی بار سکھوں نے مضافات لاہور کو لوٹ لیا تھا مگر میر منو کی وفات کے بعد جب درّانی کے پیہم حملوں اور مقامی امرا کی خود غرضی سے حکومتِ لاہور کا شیرازہ بکھر گیا تو پنجاب کے دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ لاہور کی تاراجی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

شاہ کی آمد پر سکھ چھپ جاتے اور اس کی غیر حاضری میں مسلمانوں کی بستیوں کو لوٹتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے۔ اس زمانے میں اسلامیانِ لاہور نے شہر کے دفاع کے لیے حیدری فوج بھی مرتب کی۔ لاہور مغلیہ دور میں ایک وسیع شہر بن گیا تھا۔ دُور دُور تک اس کی آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ شہر چھتیس گزروں یعنی محلوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے صرف نو گزر اکبری دور کی بنا کردہ فصیل کے اندر پرانے شہر میں

سے تھے باقی ستائیس گز راس شہر کے مشرق اور جنوب اور شمال مشرق میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ علاوہ ان محلوں کے باغات اور مقابر اور بزرگانِ دین کے مزارات تھے جو مختلف محلّوں کے درمیانی علاقوں میں موجود تھے۔ بڑے بڑے محلوں کے گرد الگ فصیلیں تھیں شہر کے نواح میں ان محلّوں سے پرے میلوں تک سبزیوں اور اناج کے زرخیز اور لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ شہر میں جا بجا سر بفلک عمارتیں تھیں۔ مسجدوں کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مینار سر بفلک گنبد نکہت و نور کے پیکر اولیائے کرام کے مزارات تھے۔ لاہور کی اس عظمت و نزہت کو احمد شاہ درانی کے حملوں اور سکھوں کی یورشوں نے خاک میں ملا دیا۔

ساتویں حملے کے بعد ۱۷۶۵ء میں احمد شاہ درانی واپس ہوا تو لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جو بھنگی مثل سے تعلق رکھتے تھے۔ دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ لاہور کا رخ کیا۔ اور بیگم پورہ کے نواح میں ڈیرے ڈال دیے۔ کابلی مل حاکم لاہور شہر میں نہ تھا۔ اس کا بھتیجا امیر سنگھ چچا کی غیر حاضری میں اس کے فرائضِ منصبی انجام دے رہا تھا۔ بھنگی سرداروں نے پہلے اُن پوربیوں سے ساز باز کی۔ جو قلعہ لاہور میں ملازم تھے پھر قلعہ میں کام کرنے والے مسلمان باغبانوں کو انعام و اکرام کے لالچ میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان لوگوں نے پروگرام یہ بنایا کہ باغبان قلعہ کی دیوار میں ایک سوراخ بنا دیں گے تاکہ سکھ اندر جا سکیں۔ چنانچہ گوجر سنگھ اپنے منتخب سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں اکبری ایوان کے راستے جو قابلین خانہ کے متصل تھا غداروں کے بنائے ہوئے شگاف سے قلعے میں گھس گیا اور ہتھیا پول دروازہ کھول دیا اس نے لہنا سنگھ اور اپنے دیگر ساتھیوں کو اس کامیابی کی اطلاع دینے کے لیے قلعے کے ایک چوبی مکان کو آگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر بقیہ سکھ بھی قلعہ میں گھس آئے اور اس طرح بھنگی بآسانی قلعے پر قابض ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھنگی قلعے کے شمال مشرقی گوشے سے اندر گھسے تھے۔ قلعے کے شمال میں جو بیرونی فصیل ہے وہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس لیے ہتھیا پول دروازہ کے باہر دریا کے کنارے وسیع ریتلا میدان تھا۔ جہاں کچھ فاصلے پر گوجر سنگھ کے ساتھی مقیم تھے۔ اگلے روز امیر سنگھ بخشی حاکم لاہور پانچ ہزار بندوقچی لے کر قلعے کی طرف بڑھا۔ علاوہ ازیں اس نے اس بڑی توپ سے قلعے پر قبضہ کرنے والے سکھوں پر گولہ باری کی جو مستی دروازے کے ملحقہ برج پر رکھی تھی۔

اسی اثنا میں تارا سنگھ جو مزنگ پر قابض تھا شہر میں آن گھسا۔ اس پر امیر سنگھ کی فوج میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ بھاگ گئے۔ تارا سنگھ امیر سنگھ کو اسیر کر کے مزنگ لے گیا۔ اسی روز بعد دوپہر نیاز بیگ کا سکھ سردار سوبھا سنگھ بھی آن پہنچا اور شاہ عالمی دروازے کے اندر دیوان لکھپت رائے کے بھتیجے میگھ راج کھتری کی حویلی میں آ اترا۔ ان تینوں سرداروں کے سپاہیوں نے جن کے ساتھ نواح لاہور کے دیہاتی بھی آن ملے تھے شہر کو خوب تاراج کیا۔ اکابرِ لاہور کی ایک جماعت جو چودھری روپا۔ لالہ بشن سنگھ اور مہاراج سنگھ دبیرگانِ دیوان صورت سنگھ مقیم اندرون موری دروازہ) میر شہتو شاہ حافظ قادر بخش اور میاں محمد عاشق وغیرہ پر مشتمل تھی قلعے میں جا کر گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ سے ملی۔ انھوں نے لوٹ مار کے خلاف شہر کی حفاظت کے لیے اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ لاہور گورو کا کوٹھا (مکان) کہلاتا ہے۔ اسی شہر میں گورو رام داس جی پیدا ہوئے پلے اور پروان چڑھے۔ اسے برباد کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس پر حکام نے شہر کے دروازے بند کروا دیے اور لوٹ مار کو ختم کرنے کے لیے گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ خود سوار ہو کر شہر میں گھومنے لگے اور لوٹ مار ختم کر کے امن قائم کیا۔ اس طرح گورو صاحب کے احترام نے شہر کو لوٹ مار سے بچا لیا۔ لاہور کی ملکیت میں سوبھا سنگھ بھی ان کا شریک تھا۔ اُسے لاہور کا جنوبی حصہ جس میں نیاز بیگ۔ مزنگ۔ اچھرہ اور چوبرجی شامل تھے دیا گیا۔ اُس نے دورِ مغلیہ کے ایک قدیم باغ میں جو اورنگزیب

کی لڑکی زیب النساء کے نام منسوب کیا جاتا ہے اقامت اختیار کی اور اس کی مضبوط دیواروں کے اندر نواں کوٹ نام ایک بستی آباد کی۔ اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ نواں کوٹ کی آبادی اب تک موجودہ ملتان روڈ پر موجود ہے۔ گوجر سنگھ کو شہر کا مشرقی حصہ، کابلی مل کی حویلی سے لے کر شالامار باغ تک دیا گیا۔ اس نے قلعہ گوجر سنگھ آباد کیا۔ جو آج موجودہ میکلوڈ روڈ پر شہر کا ایک آباد محلہ ہے۔ گوجر سنگھ کا تعمیر کردہ قدیم دروازہ اور کچھ قدیم مکانات اب تک موجود ہیں۔ لہنا سنگھ کو شہر کا مرکزی حصہ، قلعہ، شاہی مسجد اور مستی، کشمیری اور شیرانوالا دروازے کا علاقہ ملا۔

شکر چکیہ مثل کے سردار چڑت سنگھ والیٔ گوجرانوالہ نے جب ان سرداروں کے لاہور پر قابض ہونے کی خبر سنی تو وہ بھی چلا آیا اور مال غنیمت سے اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ لوگ چڑت سنگھ کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور مال غنیمت سے اُسے کچھ دینا بھی نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ چڑت سنگھ کو زم زمہ توپ پیش کی جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ بیل موجود نہ ہونے کے سبب وہ توپ لے جا نہ سکے گا۔ چڑت سنگھ ایک باہمت شخص تھا۔ اُس نے اپنے دو ہزار سپاہیوں کو جو ہمراہ لایا تھا توپ کھینچنے پر لگا دیا اور وہ اسے گوجرانوالہ لے گئے۔ (سوہن لال سوری عمدۃ التواریخ جلد دوم صہ ۱۲) ۔ زمزمہ توپ وہی ہے جسے ہم آج مال روڈ پر عجائب گھر کے متصل دیکھتے ہیں۔ یہ توپ احمد شاہ درانی نے پانی پت کی تیسری لڑائی سے پہلے لاہور میں بہت سی دوسری توپوں کے ساتھ بنوائی تھی اور مرہٹوں کے خلاف اس جنگ میں استعمال کی تھی۔ واپسی پر وہ اسے لاہور چھوڑ گیا تھا۔ چڑت سنگھ لے قلعے کے شاہ برج سے اتروا کر لے گیا تھا۔

۱۷۶۷ء کے بعد یہ سہ حاکمان بغیر کسی مخالفت کے لاہور پر حکومت کرتے رہے۔ ان کا دور حکومت دہشت اور بربریت کی ایک گھناؤنی یادگار ہے۔ یہ حاکم مغلیہ دور کی عمارات سے سنگِ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر اور دھاتیں اتار کر فروخت کرنے میں بھی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ آخر موت کے سنگدل ہاتھ نے انھیں اقتدار سے محروم کر دیا۔ گوجر سنگھ ۱۷۹۱ء میں اپنے رفقاء سے پہلے راہیٔ ملکِ عدم ہوا اور اُس کی جگہ اُس کے فرزند صاحب سنگھ نے لی۔ ۱۷۹۶ء میں سوبھا سنگھ فوت ہوا اور اُس کا لڑکا مہر سنگھ اُس کا جانشین بنا۔ آخر کار ۱۷۹۸ء میں لہنا سنگھ بھی دنیا سے رخصت ہوا اور اس کی جگہ اُس کے فرزند چیت سنگھ نے لی۔

۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا فرزند زماں شاہ تخت نشین ہوا۔ تیمور شاہ اپنے نامور باپ کے مقابلے میں ایک آرام طلب حکمران تھا۔ اُس نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے کوئی مناسب کارروائی نہ کی زماں شاہ ایک دلیر بہادر اور جری نوجوان تھا۔ اُس نے اپنے دادا کے مقبوضات کو سکھوں سے پاک کرنے کا تہیہ کیا اور چار بار پنجاب پر فوج کشی کی جن میں دو بار وہ لاہور تک آیا۔ زماں شاہ کے طریق کار میں خامی یہ تھی کہ قندھار میں اپنے آپ کو مضبوط کیے بغیر اُس نے پنجاب پر فوج کشی کی اور ہر بار قندھار اور کابل کے صوبوں میں بدامنی اور گڑبڑ کی خبریں سن کر اُسے واپس جانا پڑا۔ ۱۷۹۵ء میں اُسے رہتاس کے قلعے سے واپس جانا پڑا۔ ۹۷-۱۷۹۶ء میں وہ لاہور تک آیا۔ اس بار سکھ مثلوں کے سرداروں کو آزادانہ اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے پچیس تیس برس گزر چکے تھے۔ مگر ابھی تک اُن میں اتنی جرأت اور خود اعتمادی پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ اس جواں سال حکمران کا مقابلہ کرتے۔ اس کی آمد کی خبر سن کر اکثر سکھ سردار جن میں لاہور کے تینوں حاکم شامل تھے شہر چھوڑ کر جنگلوں میں جا چھپے۔ زماں شاہ نے اپنے وزیر شیر محمد خاں کی مدد سے سکھ سرداروں کو اطاعت قبول کرنے اور خراج کی ادائیگی کے عوض اپنے اپنے مقبوضات پر حکومت کی اجازت کے لیے راضی کرنا شروع کیا۔ اس اثنا میں شاہ زماں کو اپنے

بھائی شاہ محمود کی بغاوت کی خبر ملی اور وہ بغیر کوئی انتظام کئے لاہور سے واپس چلا گیا۔

۱۷۹۸ء میں زماں شاہ آخری بار لاہور آیا حسبِ معمول سہ حاکماں شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور وہ بغیر کسی روکاوٹ کے لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس نے قلعے کی دیواروں کے نیچے راوی کے کنارے کیمپ لگایا اور ایک ماہ یہاں مقیم رہا۔ زماں شاہ درانی کا وزیر شیر محمد خاں اور وفادار خاں اس دوران اس مسئلے پر بحث کرتے رہے کہ سکھوں کے بارے میں کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ وفادار کا خیال تھا کہ سکھوں کو بالکل برباد کر دیا جائے۔ وزیر شیر محمد خاں کا خیال تھا کہ سکھوں کو اس طرح ختم کرنا آسان کام نہ ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ اُن میں سے جو سردار ہماری اطاعت قبول کرنے پر تیار ہو جائیں انھیں ساتھ ملا لیا جائے۔ اسی دوران میں قصور کا پٹھان سردار نظام الدین خاں بھی شاہ زماں سے آملا۔ اس کی رائے تھی کہ سالانہ خراج کے عوض پنجاب اس کے حوالے کر دیا جائے اور اُسے پنجابی مسلمانوں پر مشتمل ایک فوج تیار کرنے کے لیے کچھ روپیہ دیا جائے تاکہ وہ سکھوں کو قابو میں رکھ کر پنجاب میں ایک بار پھر اسلامی حکومت قائم کر دے۔ معاملہ ابھی تجاویز تک ہی تھا اور پیشتر اس کے کہ شاہ کوئی فیصلہ کرتا کہ اُسے اپنے بھائی شاہ محمود کی بغاوت کی خبر ملی اور اُسے یکدم واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد پھر شاہ زماں کو واپس لاہور آنے کا موقع نہ ملا۔

واپسی پر شاہ زماں اس قدر جلدی میں تھا کہ سیلاب کی وجہ سے وہ اپنی کچھ توپیں جہلم کے کنارے چھوڑ گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ پار کرتے وقت کشتیوں کا پل ٹوٹ جانے کے سبب دریا میں گر کر پھنس گئی تھیں۔ اور بادشاہ اس قدر جلدی واپس جانا چاہتا تھا کہ انھیں نکلوا کر ہمراہ نہ لے جا سکا۔ سکرچکیہ مثل کے سردار رنجیت سنگھ نے بارہ میں سے آٹھ توپیں نکلوا کر کابل بھجوا دیں۔ شاہ زماں نے اس خدمت پر خوش ہو کر اُسے لاہور پر حکومت کرنے کا اجازت نامہ بھیج دیا۔

رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت

(۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۹ء)

شاہ زماں سے سندِ حکومت لے کر رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ اُس نے اپنے ایک اعتمادی کارکن قاضی خان کو لاہور بھیجا تاکہ وہ یہاں کے ارائیں چودھریوں سے بات چیت کر کے رنجیت سنگھ کے بارے میں اُن کی رائے معلوم کرے۔ وہ لاہور آ کر مختلف ارائیں اکابر سے جن میں مہر محکم دین بھی شامل تھا ملا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ اتنے بڑے مقصد یعنی حصولِ لاہور کے لیے محض ارائیوں کی امداد پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں۔ لاہور میں بسنے والی دیگر برادریوں کے چودھریوں سے بھی بات چیت کر لینی چاہیئے۔

زماں شاہ درانی کے جانے کے بعد اگرچہ سہ حاکمانِ لاہور شہر میں واپس آ گئے تھے مگر ہر طرف بے اطمینانی اور پریشانی کے آثار تھے۔ مسلمان بالخصوص بہت مضطرب تھے کیونکہ شاہ کی واپسی کے بعد اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں نظام الدین خاں والیٔ قصور نے لاہور کے بہت سے مسلمان اکابر سے ساز باز کر کے شہر پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس وقت اسلامیانِ پنجاب میں یہ شخص بہت اہم تھا اور اس تگ و دو میں تھا کہ پنجاب میں پھر سے اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ اس نے شاہ کی واپسی پر خود لاہور پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ مگر ماجھے کے سکھ جاٹوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ اگر اس محبِ ملت خاں کی مساعی بار آور ہو جاتیں تو ۱۷۹۸ء ہی میں "مغربی پاکستان" کا اسلامی صوبہ عالمِ وجود میں آ جاتا اور رنجیت سنگھ کو کبھی لاہور کا مہاراجہ بننے کا موقع نہ ملتا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے قاضی خان کو لاہور خفیہ مشن پر بھیجا تھا۔ اس کے بعد قاضی عبدالرحمٰن رام نگری کو بھیجا۔ یہ شخص میاں محمد عاشق۔ میاں جان محمد۔ مہر محکم دین لواں کوٹی۔ عابد خان (اناری والا)، محمد عظیم۔ حافظ محمد باغبان پورہ۔ مہر شادی تعلقہ بند۔ احمد علی بھنڈمہ۔ حکیم حاکم رائے۔ بھائی گربخش سنگھ۔ محمد باقر۔ محمد طاہر۔ مولوی محمد سلیم اور مفتی محمد مکرم سے ملا۔ ان میں دو کے سوا باقی سب مسلمان تھے۔ قاضی عبدالرحمٰن نے ان اکابر کے دستخطوں سے ایک عرضداشت تیار کی جس میں رنجیت سنگھ سے وفاداری کا عہد کیا گیا تھا۔ حکیم حاکم رائے یہ عرضداشت لے کر قاضی کے ہمراہ رنجیت سنگھ کے پاس گیا۔ قاضی کو اس کامیابی پر خلعت عطا ہوا۔ قرار یہ پایا کہ حملہ لاہوری دروازے کی طرف سے کیا جائے اور تھوڑی سی مدافعت کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیا جائے۔

ان واقعات کے بعد رنجیت سنگھ بٹالہ اپنی ساس سدا کور کے پاس گیا جو کنہیا مثل کے سردار گوربخش سنگھ کی بیوہ تھی۔ اس کی مدد اور مشورے سے رنجیت سنگھ نے پانچ ہزار فوج اکٹھی کی اور لاہور کا رخ کیا۔ مجیٹھ کے مقام پر میاں محمد عظیم باغبان ملا جو لاہور کے حالات سے اُسے آگاہ کرنے کے لیے گیا تھا۔ لاہور کی طرف روانگی کی اطلاع پوشیدہ رکھی گئی اور یہ ظاہر کیا گیا کہ سرکار دربار صاحب امرتسر کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں۔ راتوں رات سفر کرتے ہوئے چار جولائی ۱۷۹۹ء کو وہ دہلی دروازہ لاہور کے باہر جا پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اور وہاں مدافعت کا سخت انتظام تھا۔ اس پر رنجیت سنگھ پیچھے ہٹا اور شاہ بلاول کے مزار کے قریب خیمہ زن ہوا۔ آدھی رات کو وہ نواب وزیر خاں کے باغ میں چلا آیا جس کی وسطی بارہ دری آج کل پنجاب پبلک لائبریری کی عمارات میں شامل ہے۔ اس باغ میں مہر محکم دین اُسے ملا اور مہر سنگھ (جو کہ از سہ حاکمانِ شہر ہے) نے بطور ضیافت اُسے مٹھائی بھیجی۔ رنجیت سنگھ نے اسے کہلا بھیجا کہ وہ گوجرانوالہ جا رہا ہے اور راوی عبور کرنے کے لیے اُسے کشتیاں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ کشتیوں کا انتظام کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ گھاٹ پر گیا اور ملاحوں کو انعام دے کر شام کو واپس چلا آیا۔ اکابرِ لاہور نے (جن سے رنجیت سنگھ کی ساز باز تھی) کہلا بھیجا کہ ہم لوہاری دروازہ کی بجائے خضری (موجودہ شیرانوالہ) اور کشمیری دروازوں کے درمیان فصیلِ شہر توڑ کر آپ کی فوجوں کے لیے راستہ بنا دیں گے۔ مگر اس فیصلہ کی اطلاع رنجیت سنگھ کو بہت دیر سے ملی اور پانچ جولائی کی صبح کو پو پھٹے اس کے سپاہیوں نے لوہاری دروازے پر حملہ بول دیا تھا۔ اُن کی توقع کے خلاف دروازہ نہ کھلا اور نہ ہی فتح ہو سکا۔ ناکام ہو کر رنجیت سنگھ نے فوجوں کو واپس بلایا اور شاہ بلاول اپنے کیمپ میں چلا گیا۔ یہاں انھوں نے شہر کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا اور شہر میں اپنے حامیوں کو اس کی اطلاع بھیج دی۔ محاصرے کی تکالیف کا اندازہ کر کے وہ لوگ بہت پریشان ہوئے اور اگلے روز لوہاری دروازہ کھول دینے کا عہد کیا۔ چھ جولائی کو رنجیت سنگھ لوہاری دروازے کی طرف بڑھا۔ چیت سنگھ خود فوج لیے اُس کی حفاظت کو موجود تھا۔ رنجیت سنگھ نے مائی سدا کور والی بٹالوی فوج کو دہلی دروازے کے محاصرے کے لیے بھیج دیا۔ بعض سپاہیوں نے جو رنجیت سنگھ سے ملے ہوئے تھے۔ چیت سنگھ کو دہلی دروازے پر حملہ کی مبالغہ آمیز خبریں پہنچائیں۔ اور جب چیت سنگھ اُدھر متوجہ ہوا تو اُس کی غیر حاضری میں لوہاری دروازہ کھول دیا گیا۔

دروازہ کھلتے ہی رنجیت سنگھ اندر گھسا اور آگے بڑھ کر حویلی دیوان لکھپت رائے پر حملہ کر دیا جو شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع تھی اور اس میں مہر سنگھ رہتا تھا۔ یہاں تھوڑی سی لڑائی بھی ہوئی اور مہر سنگھ نے بھاگ کر ایک بھُس فروش کے ہاں پناہ لی مگر گرفتار ہو کر رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس سے نہایت اچھا سلوک کیا گیا اور اُسے اجازت دے دی گئی کہ اپنی جائداد منقولہ لے کر چلا جائے۔

اسی دوران مائی سدا کور نے دہلی دروازہ فتح کر لیا۔ چیت سنگھ بھاگ کر قلعہ میں چلا گیا۔ اس پر رنجیت سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

چیت سنگھ نے قلعہ کی دیواروں، شاہی مسجد کے برجوں اور میناروں سے محاصرین پر گولہ باری شروع کر دی۔ جو دوپہر سے شام تک جاری رہی۔ اگرچہ اس کا توپ خانہ بہت مضبوط تھا پھر بھی اس نے مائی سدا کور کے ذریعے صلح کی گفت و شنید شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ نے اُسے غنیمت جانا اور سات جولائی کو اُس نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ چیت سنگھ کو جاگیر دے کر موضع وانیکی بھیج دیا۔ اگلے روز اس نے قلعے میں دربار کیا جس میں اکابرِ لاہور جمع کیے گئے۔ معاونین کی خدمات کا خلعتوں اور انعاموں سے اعتراف کیا گیا۔ مہر محکم دین جس کی سعی سے لوہاری دروازہ کھولا گیا تھا 'بابا' کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ بعض دوسرے لوگوں کو 'صاحب' اور 'مہربان' کے خطاب دیے گئے۔ رنجیت سنگھ کی اس کامیابی نے اُسے پنجاب کے دوسرے سکھ اور غیر سکھ سرداروں سے ممتاز کر دیا۔ سب اُسے مرکزی شہر لاہور کا راجہ اور شاہ زمان کا نمائندہ خیال کرتے ہوئے بنظرِ احترام دیکھنے لگے۔

لاہور پر رنجیت سنگھ کے قبضے نے اُس کے حریفوں کے دلوں میں اُس کی مخالفت کا جذبہ بیدار کر دیا۔ نظام الدین قصور یہ۔ گلاب سنگھ بھنگی امرتسریہ اور صاحب سنگھ گجراتیہ اور جسّا سنگھ رام گڑھیہ اپنی فوجوں کو اکٹھا کر کے لاہور کے قریب بھسین نام ایک گاؤں میں جمع ہو گئے۔ اگر یہ متحدہ فوج لاہور پر حملہ کر دیتی تو رنجیت سنگھ کے لیے اُن کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا مگر اُس کی خوش قسمتی سے ان میں جذبۂ رقابت بیدار ہو گیا اور وہ دو ماہ تک کچھ نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں گلاب سنگھ بھنگی کثرتِ شراب نوشی کے سبب راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس کی موت کے بعد یہ لشکر تتر بتر ہو گیا اور رنجیت سنگھ خطرے سے نکل گیا۔

اس کے بعد رنجیت سنگھ نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی وفات تک وہ دریائے ستلج تک تمام پنجاب۔ کشمیر۔ پشاور۔ ہزارہ اور ڈیرہ جات کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر چکا تھا اور وہ مجرودہ سے پھلور تک تمام علاقے کا بلا شرکتِ غیرے حاکم تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے لیے 'سرکار' کا لقب تجویز کیا اور اپنا سکہ لاہور کی ٹکسال سے جاری کیا۔

پچیس اپریل ۱۸۰۹ء کو بمقام امرتسر رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان مٹکاف کی سعی سے دوستی کا معاہدہ ہوا اور رنجیت سنگھ نے وعدہ کیا کہ وہ ستلج پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ اس وعدہ کو رنجیت سنگھ نے تا زیست نبھایا۔ اور اپنی فتوحات کا رُخ مشرق کی بجائے شمال اور مغرب کی طرف بدل لیا۔

۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع جو زمان شاہ کا بھائی تھا۔ حکومت و حشمت سے محروم ہو کر لاہور پہنچا۔ رنجیت سنگھ نے اُسے اکبری دروازے کے اندر مبارک حویلی میں بطورِ مہمان ٹھہرایا مگر مہمانی کا حق اس طرح ادا کیا کہ اُس سے زبردستی کوہِ نور ہیرا چھین لیا۔

رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تو یہ شہر جو تقریباً نصف صدی قبل تہذیب و ثقافت کا ایک درخشاں مرکز تھا برباد ہو کر اُجڑ چکا تھا۔ کچھ لوگ اکبری دور کے "بارہ دروازوں" اور تیرھویں موری "والے شہر کے اندر آباد تھے۔ اور شہر سے باہر میلوں تک شکستہ عمارتیں۔ اجڑے محلوں اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر تھے۔ ان کھنڈروں کے درمیان متعدد قومی یادگاریں، باغوں۔ مقبروں، مسجدوں اور خانقاہوں کی صورت میں موجود تھیں۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کو اپنا دار الحکومت اور شاہی قلعے کو اپنی قیامگاہ قرار دیا۔ مغلیہ دور کی خالی اور متروکہ حویلیوں کو اپنے سرداروں کے حوالے کیا۔ شہر کے گرد دفاع کے لیے نہایت بلند دوہری فصیل تعمیر کرائی۔ بیرونی فصیل میں فوجی نقطۂ نظر سے اہم کونوں پر برج بنوا کر اُن میں توپیں رکھوائیں۔ دونوں فصیلوں کے درمیان خندق تھی۔ جس میں دریا سے پانی آتا تھا

رنجیت سنگھ کا چالیس سالہ دورِ حکومت خوشحالی کا ایک طویل زمانہ تھا۔ اس میں شہر کی آبادی بڑھی اور شہر میں بے شمار نئے مکانات

حویلیاں، مندر، گوردوارے اور باغیچے تعمیر کی گئیں۔ نئی تعمیرات معماری کے ایک نئے مکتبِ خیال کا ارتقا ہونے لگا۔ قلعے میں بھی رنجیت سنگھ نے اپنے ذوق کے مطابق رد و بدل کیا۔ شیش محل اور جو سب سے نمایاں عمارتیں ہیں، وہ رنجیت سنگھ ہی کی یادگار ہیں۔ اس سلسلہ میں رانی جنداں کا محل بھی توجہ طلب ہے۔ ان تمام تعمیرات کے لیے اور ان کے علاوہ دربار صاحب امرتسر، رام باغ اور دیگر عمارات کی تعمیر کے لیے بے شمار اینٹ پتھروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ قدیم شہر کے کھنڈروں کی اینٹوں کو ان کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اگر اس مقصد کے لیے کھنڈر ہی کو استعمال کیا جاتا تو مناسب تھا۔ مگر اینٹ اور پتھر کے لالچ اور مسلمانوں کے خلاف قومی تعصب نے سکھوں کو مجبور کیا کہ بے شمار مقدس اور اہم قومی یادگاروں کو مسمار کر دیں۔

رنجیت سنگھ کے دور میں اگرچہ رعایا کے تمام طبقات امن کی زندگی بسر کرتے تھے مگر دربار میں سب سے زیادہ عزت سکھوں کو حاصل تھی۔ انھیں فوجوں میں بھرتی کیا جاتا تھا اور بیش بہا جاگیریں ملتی تھیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کا درجہ تھا جو عام طور پر محکمہ مالیات اور دوسرے دفاتر میں تھے۔ دفتری زبان فارسی تھی، جو تمام طبقوں کے لوگ مسلمان مولویوں سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ معاشرے میں بلا امتیاز مذہب و ملت استادوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مسلمان عام طور پر معمولی شاگرد پیشہ یا نجی ملازم تھے۔ اگر کسی کام کے لیے کوئی آدمی نہ ملے تو یہ کام مسلمان کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ہاں توپ خانہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کی نگرانی میں تھا۔ الٰہی بخش کمیدان، محمد شاہ اور غوث خاں وغیرہ اسی توپ خانہ سے منسلک تھے۔ اگرچہ شہر میں کچھ مسجدیں آباد بھی تھیں اور چند نئی بھی تعمیر ہوئیں مگر اہم مساجد سے رنجیت سنگھ کا سلوک بے حد افسوسناک تھا۔ شاہی مسجد کے صحن میں اصطبل تھا جہاں فوجی گھوڑے بندھتے تھے۔ مسقف حصے میں فوجی گودام تھا اور بقول سید احمد بٹالوی مرکزی محراب میں بیت الخلا تھا۔ شہر سے باہر جو مسجدیں اور مقبرے تھے اُن میں بھی فوجی گودام تھے۔ مسلمان اس قدر پس چکے تھے کہ باوجود احساس کے دم نہ مار سکتے تھے۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں رنڈی بازی زوروں پر تھی۔ شہر کے اکثر بازاروں میں چکلے تھے۔ ان رنڈیوں میں رقص و موسیقی کی ماہر فنکار بھی تھیں۔ ایک بار بسنت کے موقع پر شالامار باغ میں جشن ہو رہا تھا۔ مہاراجہ اور سب درباری بسنتی لباس میں ملبوس تھے۔ کئی طرحدار طوائفیں مصروفِ رقص تھیں۔ ایک قتالۂ روزگار رقاصہ پہ جس کا نام موراں تھا مہاراجہ کا دل آ گیا چنانچہ وہ مصاحب قرار پائی اور مہاراجہ صاحب خلوت و جلوت میں اُسی کے ساتھ نظر آنے لگے۔ اُس کے عزیز مالا مال ہو گئے۔ مہاراجہ اکثر بنفسِ نفیس اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس کے نام کا موراں شاہی سکہ بھی جاری کیا گیا۔

موراں نے شاہ عالمی اور لوہاری دروازوں کے درمیانی بازار میں شہر کے اندر ایک مسجد بنوائی اور اس میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ مسجد اب تک موجود ہے۔ موراں کی قبر گورستانِ میانی میں حضرت طاہر بندگی قدس سرہ کے احاطے میں ہے۔ مہاراجہ نے امرتسر کی ایک طوائف گل بہار بیگم عرف گل بیگم سے باقاعدہ شادی کی تھی۔ گل بیگم کی حویلی اور گلی اندرونِ شہر رنگ محل کے پاس واقع ہے۔ اُس کا باغ اور مرقد گورستانِ میانی سے متصل اب تک موجود ہے۔ حال ہی میں اس باغ کے متصل گورستان کی زمین میں ایک وسیع محلّہ آباد ہو گیا ہے جو باغ گل بیگم

---

[1] رنجیت سنگھ نے بہت سے کشمیری برہمن اور کائستھ کارکن ہندوستان سے منگوا کر اپنے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے۔ یہ لوگ مغلیہ دربار اور دیگر درباروں میں انتظامِ ملکی کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں کشمیری برہمن بے حد مہذب اور شائستہ تھے۔ راجہ دینا ناتھ، دیوان گنگا رام اور راجہ جودھیا پرشاد وغیرہ جلیل القدر لوگ اسی گروہ میں سے تھے۔

کہلاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی حویلیوں میں سب سے اہم کنور نونہال سنگھ کی حویلی ہے جو سکھ دور کے فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس کی دیواروں پر مصوری کے چند دلچسپ اور قابلِ مطالعہ شہکار ہیں۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی رنجیت سنگھ نے بڑے تزک و احتشام سے شام سنگھ اٹاری والے کی لڑکی سے کی تھی

اس دور میں جو خاندان برسرِ اقتدار آئے اُن میں فقیر نور الدین کا خاندان بھی تھا۔ یہ اور ان کے چھوٹے بھائی فقیر عزیز الدین اور اس خاندان کے بعض دوسرے افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ فقیر صاحبان صوفی منش علم دوست۔ مخیر اور شریف مزاج لوگ تھے۔ ان کے والد فقیر غلام محی الدین سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ کے ایک مقتدر شیخ تھے۔ اس خاندان کے اخلاف اب تک لاہور میں موجود ہیں جن میں فقیر سید مغیث الدین ہر طرح سلفِ صالحین کی یادگار ہیں۔

شہر سے باہر سکھ امرا نے باغ بھی لگوائے تھے۔ اگرچہ یہ باغ مغلیہ دور کے باغات کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے تاہم غنیمت تھے۔ ان میں سے اکثر دستبردِ زمانہ سے مٹ گئے ہیں مگر چند ایک اب تک اپنے بانیوں کی یادگار باقی ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے سکھ دور کے امرا کی طرزِ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت سید احمد کا جہاد

یوں تو برصغیر ہند و پاکستان میں گذشتہ ایک ہزار سال کے اندر بے شمار مجاہد اکابر پیدا ہوئے۔ مگر سید احمد شہید اور اُن کے رفقا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی کو ہماری ملی تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان مجاہدین نے ایک ایسی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کر کے انھیں جہاد و قربانی کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا۔ سید احمد شہید کو جب سکھوں کے مظالم کا علم ہوا کہ اُن کی مملکت میں صلوٰۃ و اذان تک کی اجازت نہیں۔ مسجدوں میں گھوڑے بندھتے ہیں اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً سکھوں میں بٹھائی جاتی ہیں تو انھوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ مجاہدین مشرقی پنجاب۔ بہاولپور اور شکارپور کے راستے شمال مغربی سرحد پر پہنچے۔ سید صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ کوہ سلیمان۔ پشاور۔ ڈیرہ جات اور ہزارہ وغیرہ علاقوں کے مسلمانوں کو منظم کر کے رنجیت سنگھ کی فوج سے ٹکرایا جائے اور پنجاب کو آزاد کرانے کے بعد شمالی ہندوستان کو فتح کر کے یہاں شرعی نظام قائم کیا جائے۔

سید احمد کے جہاد نے رنجیت سنگھ اور اس کے سکھ سرداروں کو بہت پریشان کیا۔ پسے ہوئے مسلمان بھی آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ سید کہیں امام مہدی ہی نہ ہو۔ رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین کے ذریعے لاہور کے سیدوں اور پیروں کی فہرست تیار کرائی اور حکومت کی طرف سے اُن کے وظائف مقرر کر دیے۔ لاہور کی مشہور زیارت گاہ مزار مادھو لال حسین کے سجادہ نشین سے دوستانہ روابط استوار کیے اور بعض اسلامی درگاہوں پر چڑھاوے بھی چڑھائے تاکہ مسلمانوں کو وہ بزعمِ خود مطمئن کر سکے۔

رنجیت سنگھ اُس علاقے میں حکمران تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اُس کی سلطنت کو اگر شمال مغرب سے پٹھانوں کے حملے کا ڈر تھا تو مشرق میں انگریزوں کا۔ مملکت کے اندر بھی رعایا کو قابو میں رکھنے اور متوقع بغاوتوں کو روکنے کے لیے زبردست فوج کی ضرورت تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو زیادہ مضبوط، منظم اور بہتر بنانے کے لیے بہت سے یورپین جرنیل ملازم رکھے۔ جن میں نپولین کے چار سابق فرانسیسی جرنیل بھی شامل تھے۔ ان کے نام ونٹورا۔ ایلارڈ۔ کورٹ اور اویٹیبل تھے۔ ونٹورا کی چھاؤنی موجودہ سول سیکرٹریٹ کے مقام پر تھی اور وہ خود مقبرہ انارکلی"

میں رہتا تھا۔ ایلارڈ کی چھاؤنی موجِ دریا بخاری کے مزار کے متصل کیپ ہاؤس پرانی انارکلی میں واقع تھی۔ جہاں اب انکم ٹیکس کے دفاتر ہیں۔
ایوی ٹیبل کی چھاؤنی بدھو کے آوے سے متصل تھی۔

جنرل کورٹ کی چھاؤنی مقبرہ نصرت خاں کے متصل اس جگہ تھی جہاں آج مغل پورہ میں ریلوے کیرج شاپ ہے نصرت خاں کا مقبرہ کیرج شاپ کے اندر اب بھی موجود ہے اور کیرج شاپ کے ملازمین اس میں نماز ادا کرتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے جانشین

۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا اور کھڑک سنگھ اس کا بڑا لڑکا وارث تخت و تاج ہوا۔ اس نے محض ایک سال اور تقریباً چار ماہ حکومت کی ہو گی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کھڑک سنگھ کی نعش کو ٹھکانے لگا کر واپس آ رہے تھے کہ حضوری باغ کے دروازے کی چھت کا کچھ حصہ غالباً متوفی مہاراجہ کے سوگ میں چلنے والی توپوں کے دھماکے سے گر پڑا۔ نونہال سنگھ جسے اب باپ کا جانشین بننا تھا اور وزیر دھیان سنگھ کا بھتیجا اودھم سنگھ بری طرح زخمی ہو گئے۔ لیکن نونہال سنگھ ان زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس حادثہ کے بعد وزیر دھیان سنگھ نے شیر سنگھ کو بٹالہ سے بلا بھیجا کہ اُسے تخت نشین کیا جائے۔

شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا اور ایک بہادر نوجوان تھا۔ مہاراجہ کی زندگی ہی میں اس نے یورپین جرنیلوں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ سید احمد شہید کو شکست دینے والی فوجوں کا سالار بھی شہزادہ تھا اور اس کامیابی کے بعد تو اس کی خوب دھاک بیٹھ گئی تھی۔ کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ کی وفات کے بعد اب تخت و تاج اُسی کا حق تھا۔ مگر اسی دوران میں کھڑک سنگھ کی بیوی چند کور نے جو نونہال سنگھ کی والدہ تھی اور دیگر رانیوں کی طرح شوہر کے ساتھ ستی نہ ہوئی تھی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بہت سے سرداروں نے جن میں بھائی رام سنگھ، سردار عطر سنگھ اور اجیت سنگھ سندھاں والیہ شامل تھے رانی کا ساتھ دیا۔ رانی صاحبہ نے کمالِ دانشمندی سے امورِ حکومت کو سنبھالا۔ وزیر دھیان سنگھ نے شیر سنگھ سے خفیہ ساز باز جاری رکھی۔ کیونکہ رانی اُسے ناپسند کرتی تھی۔ شیر سنگھ نے افواجِ لاہور کے بعض دستوں کو انعام و اکرام کے لالچ میں اپنے ساتھ ملا لیا اور بٹالہ سے جہاں اس کی جاگیر تھی اپنی فوجوں کو لے کر ۱۴ فروری ۱۸۴۱ء کو وہ لاہور پہنچا۔ اور بدھو کے آوے پر قیام کیا۔ یہاں آ کر اُسے معلوم ہوا کہ دھیان سنگھ جموں میں ہے۔ بہرحال اُس نے بڑھ کے قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ شیر سنگھ نے اپنے بندوقچیوں کو شاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا دیا جہاں سے انھوں نے محصورین پر قلعہ میں گولہ باری کر کے انھیں کافی نقصان پہنچایا۔ اسی اثنا میں دھیان سنگھ بھی جموں سے آ گیا اور اُس نے شیر سنگھ کو سمجھایا کہ جنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مقصد میں کامیابی کے لیے حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ اس پر شیر سنگھ نے وزیر دھیان سنگھ کو مکمل اختیار دیا کہ وہ جس طرح چاہے کام کرے۔ دھیان سنگھ نے لڑائی بند کی اور ایک ایلچی اپنے بھائی گلاب سنگھ کے پاس بھیجا جو رانی کا طرفدار تھا۔ اور اُس سے گفت و شنید شروع کی۔ ان دونوں بھائیوں کی سعی سے راضی نامہ ہو گیا اور رانی نے غالباً اپنی پوزیشن کمزور پا کر راضی نامے کو قبول کر لیا۔ ۱۸ جنوری ۱۸۴۱ء کو شیر سنگھ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ رانی کو بکمالِ احترام جاگیر عطا کر دی گئی۔ یہ خاتون نومبر ۱۸۴۰ء سے لے کر جنوری ۱۸۴۱ء تک کوئی ساڑھے تین مہینے پنجاب کی تاجدار رہی۔

شیر سنگھ نے سندھاں والیہ سرداروں سے بہت اچھا سلوک کیا اور ان کی جاگیریں بھی بحال رکھیں مگر ان کا دل نئے مہاراجہ کی طرف سے صاف نہ ہوا اور انھوں نے اُس کے خلاف خفیہ سازشیں جاری رکھیں۔

شیر سنگھ مردانہ کھیلوں کا بے حد شائق تھا اور اسے کشتی کے فن سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اکثر شہر سے باہر اپنے پہلوانوں کو لے جاتا

ان کی کشتیوں سے محظوظ ہوتا۔ چنانچہ قاسم خاں کے مقبرے کے متصل ایک وسیع اکھاڑہ تھا جہاں اس کے درباری پہلوان ورزش کرتے اور انعام حاصل کرتے۔ ان پہلوانوں میں ایک غریب الدیار کشمیری مسلمان پہلوان بھی تھا جس نے بعد ازاں انگریزی دور کے آغاز میں سرکاری ٹھیکہ داری حیثیت سے بہت نام پیدا کیا۔ لاہور کے لوگ اسے میاں سلطان کے نام سے اب تک یاد کرتے ہیں۔ اس کی اپنی سکونتی حویلی دہلی دروازہ کے اندر رہی۔ دروازہ کے باہر لنڈہ بازار میں اس کی سرائے اور احاطہ واقع ہیں۔

اکھاڑے اور کشتیوں کی وجہ سے لوگ قاسم خان کے گنبد کو کشتیاں والا گنبد کہنے لگے۔ بعد ازاں اس گنبد کے متصل جمعدار خوشحال سنگھ نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ انگریزی دور کے آغاز میں یہ مقام پنجاب کے حاکم اعلیٰ کی سکونت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ بتدریج اس کے نواح میں نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں۔ اور ایک وسیع رقبہ اس کوٹھی میں شامل کر لیا گیا۔ انگریزی دور میں پنجاب کے تمام لفٹیننٹ گورنر اور گورنر اسی جگہ رہتے تھے۔ آج مغربی پاکستان کے گورنر عالی جناب ملک امیر محمد خاں اسی جگہ اقامت پذیر ہیں۔

سمت ۱۹۰۰ بکرمی میں یکم اسوج کو (مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء) شیر سنگھ دریا کے کنارے بارہ دری شاہ بلاول میں فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ اجیت سنگھ سندھاں والیہ نے اسے ایک بندوق پیش کی کہ انگلستان سے بن کر انگریزی فوج کے لیے آئی ہے۔ مہاراجہ نے دیکھنے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو سنگدل سردار نے بندوق چلا دی۔ اس صدمے سے شیر سنگھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لہنا سنگھ سندھاں والیہ نے مہاراجہ کے خورد سال بیٹے کنور پرتاپ سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد سازشی قلعہ کی طرف گئے اور وزیر دھیان سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ دھیان سنگھ کی حویلی شہر کے اندر قلعہ کے قریب ہیرا منڈی میں واقع ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کی ابتدا اسی حویلی میں ہوئی۔ اخبار عام بھی پہلے پہل اسی جگہ سے نکلا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس میں دیال سنگھ ہائی سکول تھا۔ اور اب سی مسلم لیگ ہائی سکول ہے۔ دھیان سنگھ کی سمادھ حویلی کے احاطے میں واقع ہے۔ ۱۹۵۹ء کے موسم گرما میں محکمہ آثارِ قدیمہ نے قلعہ لاہور میں کھدائی کرائی تو اس حویلی کے احاطے میں بھی مرمت کے لیے زمین کھودی۔ زمانۂ قبل از اسلام کی اینٹیں اور کچھ دیگر نوادر ملے جو سی مسلم لیگ ہائی سکول کے فرض شناس ہیڈ ماسٹر نے قلعہ میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے پاس بھیج دیے۔ محکمہ مذکور کے کارکنوں نے یہاں کچھ کھدائی بھی کی مگر نہ قلعہ اور نہ اس حویلی سے برآمد ہونے والے نوادر کی کوئی سائنٹفک رپورٹ شائع کی۔

شیر سنگھ اور اس کے فرزند کی سمادھ بارہ دری شاہ بلاول کے متصل چاہ میراں کے قریب واقع ہے۔ انگریزی عہد میں یہاں بسنت کو سکھ جمع ہو کر گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا کرتے تھے۔

وزیر دھیان سنگھ کا ایک فرزند ہیرا سنگھ تھا جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اسی کے نام پر ہیرا منڈی مشہور ہے۔ ہیرا سنگھ نے بوڑھے باپ کے ظالمانہ قتل کا واقع سنا تو قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ سندھاں والیہ سردار قلعے کے اندر تھے۔ ہیرا سنگھ نے شاہی مسجد کے میناروں پر ہلکی توپیں جنھیں زنبورک کہتے تھے چڑھا دیں اور قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ گولے قلعے کے محلات پر گرنے لگے۔ اگر ہم ہتھیا پول دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی بڑی سیڑھی سے اوپر جائیں تو شمن برج کی بیرونی دیواروں پر ان گولیوں کے نشان آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس معرکہ میں لہنا سنگھ مارا گیا اور اجیت سنگھ بھاگنے کی کوشش میں دیوار سے گر کر چل بسا۔ قلعہ پر ہیرا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے سورگباش مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فرزند دلیپ سنگھ کو جو رانی جنداں کے بطن سے تھا تخت پر بٹھایا اور خود وزیر بن کر داد حکمرانی دینے لگا۔

ہیرا سنگھ کے دو بڑے دشمن تھے۔ سچیت سنگھ جو اس کا چچا تھا اور سردار عطر سنگھ سندھاں والیہ جو تھانیسر میں مقیم تھا۔ سچیت سنگھ فوج لیکر لاہور آیا۔ ہیرا سنگھ نے اس کی سرکوبی کے لیے فوج متعین کی۔ مدرسہ میاں وڈا کے قریب جنگ ہوئی۔ اس ہنگامے میں مدرسہ مذکور کی عمارتوں اور کتب خانے

کو بے حد نقصان پہنچا۔ آخر کار رنجیت سنگھ مارا گیا اور چچا کی موت نے بھتیجے کو بغیر کسی رکاوٹ حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اسی اثنا میں عطر سنگھ سندھاں والیہ جو انگریزی علاقے میں تھا فیصلہ سے عازم لاہور ہوا تاکہ ہیرا سنگھ سے حکومت کی باگ ڈور چھین لے۔ ۲ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے دریائے ستلج عبور کیا اور بھائی بیر سنگھ کے پاس چلا گیا۔ باوا صاحب دیہاتیوں میں اپنے زہد و اتقا کی بدولت بے حد مقبول تھا۔ اسی اثنا میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک اور بیٹا کشمیرا سنگھ اُن سے آملا۔ ہیرا سنگھ نے سپاہیوں میں یہ بات پھیلا دی کہ عطر سنگھ انگریزوں کی امداد سے لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر خالصہ فوج جوش و خروش سے بڑھی اور عطر سنگھ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اس طرح ہیرا سنگھ نے اپنے حریفوں سے نجات پائی۔

وزیر ہیرا سنگھ کا ایک برہمن مشیر تھا جس کا نام پنڈت جلا تھا۔ یہ اس کا خاندانی پروہت اور استاد بھی تھا۔ اس نے ہیرا سنگھ کی وزارت کے زمانے میں بہت منہ زور ہو کر اپنی حدود سے تجاوز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز اس نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی والدہ رانی جنداں اور اُس کے ماموں سردار جواہر سنگھ کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا۔ انھوں نے فوج کو ہیرا سنگھ اور پنڈت کے خلاف بھڑکایا۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء کو ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا فوج کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے اور جموں کی راہ لی۔ جواہر سنگھ کی حامی فوج نے انھیں راستے ہی میں جا لیا اور ایک معرکہ میں دونوں مارے گئے۔

اس کے بعد دربار میں جواہر سنگھ اور لال سنگھ کا طوطی بولنے لگا۔ ۱۴ مئی ۱۸۴۵ء کو فوج اُس سے بھی ناراض ہو گئی اور ۲۱ ستمبر کو اُسے مار ڈالا۔ اس سانحہ کے بعد لال سنگھ وزیر اور تیجا سنگھ کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

رانی جنداں نے اپنے بھائی سردار جواہر سنگھ کے قتل کا بدلہ لینے اور خودسر فوج کو سزا دینے کے لیے ۱۸۰۹ء کے معاہدۂ امرتسر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انگریزی علاقے پر حملہ بول دیا۔ رانی نے فوج کو یہ یقین دلایا کہ انگریز خالصہ سرحد پر مقیم فوجوں کی تعداد دن بدن بڑھا رہے ہیں اور اس کا مقصد لاہور پر قبضہ کرنا ہے۔ ان حالات میں سکھ فوج نے بہتر یہی خیال کیا کہ انگریزوں کے حملے کا انتظار کرنے کی بجائے خود حملہ کر دیا جائے۔ سکھ فوج جو فرانسیسی جرنیلوں کی تربیت یافتہ تھی بے حد طاقت ور تھی اور کمپنی کی فوجوں کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی تھی۔ مگر موجودہ حالات میں اُن کی کامیابی مشکل تھی۔ ۷ ارنومبر ۱۸۴۵ء کو انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا اور ۱۱ دسمبر کو سکھ فوج نے ہری کے پتن کے مقام پر دریائے ستلج کو عبور کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خالصہ فوج کے کچھ دستے لاہور سے انگریزوں کے خلاف لڑنے جا رہے تھے کہ دربار داتا گنج بخش[۴] کے نواح سے گزرے۔ وہاں کوئی مجذوب کھڑا تھا جس نے فوج کو دیکھ کر کہا "برائے استقبالِ فرنگیاں می روند"۔ ستلج کے پاس مُدکی، فیروز شہر، بدووال، علی وال اور سبراؤں کے مقام پر جنگیں ہوئیں۔ ان جنگوں میں بہادری سے لڑنے کے باوجود سکھوں کو شکست ہوئی اور رنجیت سنگھ کی کمالِ محنت سے تیار کی ہوئی فوج تباہ و برباد ہو گئی۔

ان پیہم شکستوں سے بددل ہو کر بعض سکھ سپاہیوں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ لاہور پہنچ کر رانی جنداں اور راجہ دلیپ سنگھ کو قتل کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ کسی اور کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ مگر یہ ارادہ پروان نہ چڑھ سکا۔ بہرحال سکھ فوج کا شیرازہ بکھر گیا اور انگریزی فوجوں نے ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو آگے بڑھ کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۹ مارچ کو عہدنامہ لاہور ہوا جس کی رو سے انتظام سلطنت راجہ دلیپ سنگھ کے بالغ ہونے تک ایک کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کونسل کو انگریزوں کی نگرانی میں کام کرنا تھا۔ سکھ فوج اس معاہدہ کو پسند نہ کرتی تھی۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کو چیلیانوالہ کی لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد ۲۱ فروری کو گجرات کی جنگ ہوئی جس میں لارڈ گف نے سکھ فوج کو بالکل تباہ کر دیا۔ ملتان میں دیوان مولراج نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی مگر شکست کھا کر اسیر ہوا۔ ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اسی روز فیروز پور سے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے اعلان کیا کہ سکھ حکومت کا تمام علاقہ انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا گیا ہے مگر سرکار انگریزی ہمیشہ دلیپ سنگھ کے ساتھ "بعزت و تعظیم" پیش آئے گی۔ اور ان سکھ سرداروں کی جاگیریں جو انگریزوں سے نہیں لڑے محفوظ رہیں گی۔ پنجاب کی مسلمان، سکھ اور ہندو رعایا سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ اور وہ سردار جو حکومت انگریزی سے لڑے ہیں ان کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں گی۔ پنجاب میں جو قلعے ہیں۔ وہ گرا دیے جائیں گے۔ بلکہ "آنچناں تدبیر بہ عمل خواہد آمد کہ بعض مردم ملک پنجاب را قدرت بر جنگ و فساد با سرکار انگریزی نباشد۔"

خورد سال مہاراجہ دلیپ سنگھ کو حکومت کی نگرانی میں انگلستان لے جایا گیا اور ہزار پاؤنڈ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔ انھیں انگریزی تعلیم دی گئی اور عیسائی مذہب میں داخل کر لیا گیا۔

لاہور انگریزی دور میں

الحاق پنجاب کے بعد ایک انتظامی بورڈ قائم کیا گیا جو براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھا۔ اس بورڈ کے صدر کرنل ہنری لارنس تھے جنھیں بعد ازاں سر کا خطاب دیا گیا۔ ان کے ساتھیوں میں جان لارنس تھے جنھیں بعد ازاں لارڈ لارنس بنا دیا گیا۔ تیسرے رکن رابرٹ منٹگمری تھے جو بعد ازاں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر بنے۔ ۱۸۵۳ء میں اس انتظامی بورڈ نے سر جان لارنس کو پنجاب کا پہلا چیف کمشنر مقرر کیا۔ اسی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی ہوئی اور وہ سکھ جن کی سلطنت آٹھ سال پہلے انگریزوں نے چھینی تھی۔ اس جنگ آزادی میں انگریزوں کے ماتحت دہلی کے مغل بادشاہ کے خلاف لڑنے پر تیار ہو گئے۔ ریاست ہائے پھولکیاں کے تمام ذرائع انگریزوں کے لیے وقف تھے۔ لارنس کی حکمت کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ سکھ پرانے تاریخی واقعات کے پیش نظر بہادر شاہ ظفر کو سکھوں کا دشمن سمجھ کر اس کے خلاف جوق در جوق انگریزی فوج میں داخل ہونے لگے۔ بادشاہ کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ سکھوں کا دشمن نہیں۔ محاصرۂ دہلی کے دوران اور فتح دہلی کے بعد سکھوں نے ہر خورد و نوجوان کو مغل خیال کرتے ہوئے بڑے جوش و خروش سے تہ تیغ کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے شعلے لاہور تک پہنچ چکے تھے۔ ۱۲ مئی کی صبح کو قلعہ لاہور اور چھاؤنی دونوں جگہ بغاوت کا خطرہ تھا۔ اس وقت قلعہ میں فوج رہتی تھی اور اس کے علاوہ یہاں خزانہ اور اسلحہ خانہ تھے۔ قلعہ شہر سے متصل تھا۔ اور اس پر قبضہ کا مطلب شہر کا باغیوں کے قبضہ میں چلا جانا تھا۔ مگر سازش کامیاب نہ ہوئی۔ صبح پانچ بجے گورا فوج قلعہ میں پہنچ گئی۔ دیسی فوج سے قلعہ کا چارج لے لیا۔ اور میاں میر چھاؤنی میں دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ اس سے لاہور میں بدامنی کا خدشہ جاتا رہا۔ اسی اثنا میں فیروز پور چھاؤنی میں بعض دیسی فوجی دستوں کے انگریزوں کے خلاف ہو جانے کی خبریں اڑیں۔ اور یہ بھی سنا گیا کہ ان دستوں نے ستلج پار کر کے لاہور کی طرف مارچ شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے لاہور کے فوجی اور ملکی حاکموں کو بہت پریشان کیا۔ مسٹر رابرٹ کمشنر، ایجرٹن ڈپٹی کمشنر، ایلیٹ اسسٹنٹ کمشنر اور لیفٹیننٹ گلیور بریگیڈیر کاربٹ وغیرہ بہت ہی مستعد

۱۴ مئی کو دوپہر کے قریب یہ خبر ملی کہ میاں میر چھاؤنی کے سپاہی بغاوت کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اس سے لاہور کی انگریزی آبادی بالخصوص علاقہ انارکلی میں رہنے والے انگریزوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لاہور کی انگریز فوج کی مستعدی سے یہ ہنگامہ دب گیا۔ جو سپاہی چھاؤنی سے بھاگ

انھیں ماجھے کے سکھوں نے گرفتار کر کے مسٹر ٹامس اسسٹنٹ کمشنر قصور کے حوالے کر دیا۔ یاد رہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف علمِ جنگ بلند کرنے والے دیسی سپاہی زیادہ تر پوربیہ اور اودھ کے باشندے تھے اور انھیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کرنے والے وہ سکھ تھے جن سے انگریزوں نے صرف آٹھ برس پہلے حکومت چھینی تھی۔

لاہور پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو شہر کے نواح میں چاروں طرف سکھ فوج کی بہت سی چھاؤنیاں تھیں جو انگریزوں نے ختم کر دیں۔ انارکلی کے وسیع علاقے میں جو لاہوری اور موری دروازے سے لے کر چوبرجی اور مزنگ تک پھیلا ہوا تھا اور رجھاں و نطورہ اور ایلارڈ میت کی سو نیلوں کی چھاؤنیاں تھیں۔ انگریزی فوج کی چھاؤنی قرار پایا۔ ۱۸۵۷ء میں انارکلی کے علاقے کو مختصر پا کر کچھ فوجی دستے میاں میر کے میدان میں متعین کیے گئے اور انارکلی کا علاقہ سول سٹیشن قرار پایا۔ لاہور کے قدیم شاہی قلعے میں اور شاہی مسجد میں بھی گورا فوج رہتی تھی۔ شاہی مسجد تو بعد میں واگذار کر دی گئی مگر قلعے میں ۱۹۲۴ء تک گورا فوج مقیم رہی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لاہور کے دفاع کے لیے حسبِ ذیل انتظامات کیے گئے۔

(۱) قلعہ شاہی میں اسلحہ جمع کیا گیا اور چار ہزار آدمیوں کے لیے چھ ماہ کی خوراک ذخیرہ کی گئی۔ صرف ایک دروازے (یعنی ہتھیا پول) کے سوا قلعے کے باقی تمام دروازے دیوار چن کر بند کر دیے گئے۔

(۲) ان تمام سپاہیوں کی چھٹی منسوخ کر دی گئی جو رخصت پر تھے اور انھیں کیپٹن ٹریور کی کمان میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔

(۳) انارکلی کے یورپین باشندوں نے ایک رضاکار فوج جمع کی جو ۱۲۰ رضاکاروں پر مشتمل تھی یہ لوگ انارکلی کے سول سٹیشن میں پہرہ دیتے تھے۔

(۴) خطرے کے سگنل متعین کیے گئے اور خطرے کے وقت عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے اور خود ایک مقررہ جگہ جمع ہونے کا اہتمام کیا گیا۔

(۵) لاہور کی سڑکوں پر گھوڑا سوار پولیس متعین کر دی گئی۔

(۶) ۹ جون کو پچیسویں نیٹو انفنٹری کے دو آدمیوں کو انارکلی کی پریڈ گراؤنڈ میں توپوں سے اڑا دیا گیا۔ یہ سزا انھیں بغاوت کے جرم میں فوجی عدالت نے دی تھی۔

انفرادی نوعیت کے بعض واقعات رونما ہوئے جن میں بعض بے حد دلچسپ تھے۔ مثلاً ایک شخص ہاتھ میں تلوار لیے شہر کے ایک دروازے سے باہر نکلا اور دروازے کے سنتری کو قتل کر کے سرکلر روڈ سے ہوتا ہوا کشتیوں کے پل کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک گھوڑا سوار سپاہی نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ کئی لوگوں کو اس شک میں کہ ہندوستان کے "باغیوں" سے ان کی سازباز ہے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۲۳ مئی کو مقامی اخباروں پر شدید سنسر (احتساب) عائد کیا گیا۔ ۲۹ جون کو لاہور کی ہندوستانی آبادی (اردو بولنے والے لوگ) جس میں سول حکام اور گھریلو ملازم شامل تھے غیر مسلح کر دیے گئے۔ ۲۲ اگست کو بیکار قسم کے ہندوستانیوں کی گنتی کی گئی تاکہ انھیں لاہور بدر کیا جائے۔ ہفتے میں دو بار ان کے قافلے ہری کے پتن پہ فوج کی نگرانی میں بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ چند ہفتوں میں ۲۵۲۶ ہندوستانیوں کو واپس بھیجا گیا۔

۳۰ جولائی کو چھبیسویں نیٹو انفنٹری نے میاں میر میں بغاوت کر دی۔ انھوں نے چند افسروں کو جن میں میجر سپنسر بھی شامل تھے مار ڈالا۔ اور تاریک آندھی میں جو اس وقت چلنے لگی تھی۔ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر نے انھیں راوی کے کنارے شکست دی۔ اس قسم کے واقعات کو روکنے کے لیے پولیس کی چوکیاں مقرر کی گئیں۔ ۷ ستمبر کو مسٹر ایجرٹن ایکٹنگ ڈپٹی کمشنر لاہور ضلع کے

جنوب مغربی حصے میں گیا تاکہ پنجاب کے ایک مسلم قبیلہ کھرل کے "باغیوں" کو دیہات کی مسلم آبادی کو برگشتہ کرنے سے روکے۔ اس طرح حکام کو کئی بار دیہاتی علاقے کی نگرانی کے لیے جانا پڑا۔ لاہور کے دونوں جیلوں کو مضبوط کیا گیا۔ اور ان پہ کڑی نگرانی کی جانے لگی تاکہ کوئی دیسی پلٹن جیل پر حملہ کرکے قیدیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا لے۔ اگرچہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح لاہور جنگ آزادی کا اہم مرکز نہ بن سکا تاہم یہاں حالات مخدوش ہونے کا کافی خدشہ رہا۔ لاہور کے بہت سے لوگ جن میں سکھوں کی تعداد بہت زیادہ تھی دہلی، لکھنؤ اور دوسرے مراکز پہ محبان وطن کے خلاف انگریزی فوجوں میں شامل ہو کر لڑے اور واپسی پہ بہت سا روپیہ کما کر لائے۔

۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ نے براہ راست حکومت شروع کی۔ یکم جنوری ۱۸۵۹ء سے پنجاب ایک لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ اور سر جان لارنس جو اس وقت پنجاب کا چیف کمشنر تھا پہلا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا۔ اسی سال فروری کے آخر میں جان لارنس خرابی صحت کی بنا پہ چھٹی لے کر انگلستان چلے گئے اور سر رابرٹ منٹگمری اس عہدہ پر مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں پرانے شہر کی خندق بند کر دی گئی اور اس پر باغات لگا دیے گئے۔ شہر کے گرد جو دوہری فصیل تھی اس میں سے بیرونی فصیل بالکل مسمار کرا دی گئی اور اندرونی فصیل آدھی کر دی گئی تاکہ شہر میں تازہ ہوا بآسانی آ سکے۔ اس باغ کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ شہر کو ایک رئیس کی نگرانی میں دے دیا گیا تاکہ وہ اسے شاداب اور آباد رکھے۔ اور ان میں زیادہ تر پھل دار درخت لگائے گئے۔ سر رابرٹ منٹگمری جنوری ۱۸۶۵ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان سدھارے اور ان کی روانگی پر پنجاب کے رؤسا نے چندہ کرکے بطور یادگار منٹگمری ہال تعمیر کرایا جو اب تک لارنس باغ (حال جناح باغ) میں اس کی یادگار موجود ہے۔ یہ باغ مال روڈ پہ ایک وسیع قطعہ میں سر جان لارنس کے نام پر لگوایا گیا تھا۔ اس میں جو مصنوعی پہاڑیاں ہیں وہ اینٹیں پکانے کے پرانے پژاوے ہیں۔ گول باغ اس سے پرانا ہے اور لارنس باغ کے وجود میں آنے سے پہلے انگریزوں کی سیرگاہ تھا۔

۱۸۶۵ء میں جوڈیشل کمشنر کا عہدہ منسوخ کرکے لاہور میں چیف کورٹ قائم کیا گیا۔ اس میں دو جج تھے۔ پہلی مرتبہ مسٹر اے۔ اے رابرٹس اور مسٹر چارلس بال نوئس (BOULNOIS) چیف کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔

لاہور پر انگریزوں کا عمل دخل ہوا تو اس کی آبادی قدیم شہر تک محدود تھی۔ شہر کے اندر بازار اور گلیاں بہت تنگ تھیں اور آبادی بے حد گنجان تھی۔ جا بجا درباری امرا اور رؤسا کی حویلیاں تھیں۔ شہر کے چاروں طرف دوہری فصیل اور خندق تھی اور میلوں تک مغلیہ دور کے محلات کے کھنڈر تھے۔ جن کی اینٹیں جدید تعمیرات میں استعمال ہوتی تھیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں محلوں، حویلیوں اور شہر کی حویلیوں پر جو اینٹ صرف ہوئی وہ انھیں کھنڈروں سے حاصل کی گئی۔ ان کھنڈروں میں قدیم باغات، مقبرے، مزارات اور حمام بھی تھے۔ اینٹ اور پتھر کے لالچ میں اکثر اوقات مضبوط اور مستحکم تاریخی عمارات کو بھی برباد کر دیا جاتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے امرا نے جا بجا کھنڈر صاف کرکے باغات لگوائے تھے۔ جن سے نہ صرف پھل پھول حاصل ہوتا تھا بلکہ نواحِ شہر کی فضا بھی شاداب ہو گئی تھی۔ علاوہ ان باغات کے میلوں تک سکھ فوج کی چھاؤنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سکھ دور کے باغات کے حالات دیوان امرناتھ اکبری نے اپنی کتاب ظفرنامہ رنجیت سنگھ کے آخر میں دیے ہیں۔ علاوہ ازیں مفتی تاج الدین[1] کی کتاب تاریخ ضلع لاہور میں بھی ان باغوں اور چھاؤنیوں کے حالات مرقوم ہیں۔

---

[1] اس غیر مطبوعہ کتاب کا واحد معلوم شدہ نسخہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کے کتب خانے کی زینت ہے۔ راقم نے مدت ہوئی اس کی زیارت کی تھی۔ اور اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد مولوی صاحب ممدوح نے اس کے ضروری اقتباسات اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرائے تھے۔ (ملاحظہ ہو: نومبر ۱۹۴۳ء، فروری ۱۹۴۴ء)

انگریزی دور میں بھی برسوں ان کھنڈروں کی اینٹیں عمارتوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ ان عمارتوں کی بنیادیں بھی کھود دی گئیں۔ انگریزی دور کے آغاز میں اینٹیں زیادہ تر بنیادوں ہی سے حاصل کی گئیں۔ اس سے جا بجا گڑھے پڑ گئے۔ جو موسم برسات میں تالابوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ بند پانی میں عفونت پیدا ہوتی اور مچھر پرورش پاتے تھے۔ حکومت نے انھیں بند کرا کے حکم دیا کہ کوئی شخص بغیر اجازت ان بنیادوں سے اینٹیں نہ نکالے اور جو اجازت لے کر اینٹیں نکالے وہ بعد ازاں مٹی یا ملبے سے گڑھوں کو ہموار کر دے۔ راقم کے مجموعۂ نوادراتِ تاریخی میں اس دور کی ایک عرضی ہے جو میرے پردادا (محمد نظام الدین) نے حکامِ لاہور کی خدمت میں پیش کی تھی کہ انھیں چوک دارا کے علاقے سے (موجودہ رام گلی) اینٹیں نکالنے کی اجازت دی جائے اور ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ بعد ازاں گڑھوں کو ہموار کر دیا جائے گا۔ ۱۸۶۴ء سے لے کر غالباً ۱۸۸۵ء تک عماراتِ عہدِ مغلیہ کی بنیادوں کی اینٹیں انگریزی دور کی سرکاری اور ذاتی عمارتوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ اس کے بعد جدید طرز کے بھٹے قائم ہو گئے اور ڈبل اینٹیں بننے لگیں۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل با غبانپورہ۔ چاہ میراں۔ گڑھی شاہو۔ گنج۔ اچھرہ۔ مزنگ۔ قلعہ گوجر سنگھ وغیرہ تحصیل لاہور کے گاؤں شمار کیے جاتے تھے۔ اور مثال کے طور پر انھیں یوں لکھا جاتا تھا موضع مزنگ تحصیل و ضلع لاہور۔ مگر آج نہ صرف یہ بلکہ سوڈی وال اور والڈ وال بلکہ حلقوں تک بھی لاہور کے محلے ہیں۔ ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مختلف صورتوں میں یہاں انگریزوں کا عمل دخل رہا اور شہر کی وسعت بتدریج بڑھتی رہی۔ سرکاری دفاتر۔ ہائیکورٹ۔ ریلوے کے دفاتر اور کارخانے شہر کی رونق اور آبادی میں اضافے کا اہم ترین سبب بنے۔ زیادہ آبادی پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں بڑھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی وسعت کسی خاص سکیم کے مطابق نہ ہوئی۔ اسی لیے بعض ایسے علاقے جن کی سطح بلند نہیں اور جہاں بارش کے وقت پانی کھڑا ہو جاتا ہے گنجان آباد ہو گئے۔ ایسی آبادیاں قدیم شہر کے اندرونی حصے کے گنجان محلوں سے زیادہ گندے اور تکلیف دہ ہیں۔ اندرونِ شہر کبھی بھی پانی ٹھہرا نہیں رہتا خواہ کتنی ہی زیادہ بارش کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس گوالمنڈی اور مصری شاہ کے علاقے ذرا سی بارش ہو تو نہر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے مہاجرین اور دیہات و قصبات سے واردِ لاہور ہونے والے مقامی باشندوں کی وجہ سے شہر اور وسیع ہو گیا ہے۔ اگر حالات سازگار رہیں تو یہ شہر اور زیادہ وسیع ہو جائے۔ پاکستان کے قیام کے بعد گلبرگ۔ رحمن آباد اور شادباغ وغیرہ نئے محلے وجود میں آئے ہیں۔ یہ محلے خاص نظام اور سکیم کے ماتحت آباد کیے گئے ہیں اور صحیح معنوں میں قابلِ دید ہیں۔

۹ فروری ۱۸۷۰ء کو ملکہ وکٹوریہ کا دوسرا بیٹا ڈیوک آف ایڈنبرا لاہور آئے اُن کے اعزاز میں گورنمنٹ ہاؤس منٹگمری ہال وغیرہ میں سرکاری تقاریب منعقد ہوئیں۔ یکم جنوری ۱۸۷۶ء کو شہزادہ ویلز لاہور آئے۔ لاہور کے سٹیشن پر لیفٹیننٹ گورنر۔ فوجی اور ملکی حکام اور شہر کے سربرآوردہ یورپینوں نے شہزادے کا استقبال کیا۔ شہزادے کے اعزاز میں شہر کو خوب سجایا گیا اور اُن کے اعزاز میں اہم تقاریب منعقد ہوئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ لاہور میں شہزادہ نے سکھ دور کے ہتھیاروں کا معائنہ کیا۔ وہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی توپ دیکھی جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کے کھلونے کے طور پر بنائی گئی تھی اس کھلونے سے شہزادہ بہت محظوظ ہوا اور حکم دیا کہ اسے انگلستان بھیج دیا جائے۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا۔ ملکہ کو بحیثیت حکمران جو ہر دلعزیزی پنجاب میں حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی حکمران کو ہوئی ہو۔ لوگ سکھا شاہی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ملکہ کے دور میں ہر طرف امن و سلامتی کا دور شروع ہوا۔ لوگ آزادی سے اپنے مذاہب پر عمل کرنے لگے ضروریاتِ زندگی سستی تھیں اور لوگ نیک نیت اور متوکل تھے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے انیسویں صدی میں نمائشیں بھی منعقد کی گئیں چنانچہ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۸۱ء کی نمائشیں اسی عہد کی یادگار ہیں۔

۱۴ نومبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء کو پنجاب پبلک لائبریری قائم ہوئی۔ اس سے قبل بھی اس عمارت (بارہ دری وزیر خاں) میں لائبریری تھی۔ ۱۸۸۶ء میں رؤسائے پنجاب کے بچوں کے لیے ایچی سن کالج قائم کیا گیا۔ لیڈی ایچی سن ہسپتال ۱۵ فروری ۱۸۸۸ء کو قائم ہوا۔ یہ ادارے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن کے نام پر قائم کیے گئے تھے۔ ۱۸۸۸ء کے وسط نومبر میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل انڈیا لاہور آئے۔ جنوری ۱۸۹۰ء میں پرنس البرٹ وکٹر جو ملکہ وکٹوریہ کے پوتے اور شہزادہ ویلز کے بیٹے تھے لاہور تشریف لائے۔ اور اُن کا شہر میں ہاتھی پر بٹھا کر جلوس نکالا گیا۔ ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو انھوں نے عجائب گھر کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ سر جیمز لائل لیفٹیننٹ گورنر نے شالامار باغ میں پارٹی کا انتظام کیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں شہر لاہور آریہ سماج، عیسائی مشن اور انجمن حمایت اسلام وغیرہ جماعتوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ انھیں ایام میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا۔ اور سردار دیال سنگھ اس کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے۔ انھیں دنوں سر سید احمد خاں بھی لاہور آکر لوگوں سے خطاب فرماتے رہے۔ لاہور کے باشندے ان تمام انجمنوں اور اداروں سے بہرہ ور ہوئے اور ان تقریروں نے اُن کے سیاسی، مذہبی اور روحانی میلانات کی تشکیل اور ارتقا میں نمایاں حصہ لیا۔ جنگِ طرابلس اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد لاہور کی سیاسی فضا متلاطم ہوئی۔ اکابر اور قائدین کی پرجوش تقریروں نے اُن کے طبائع کو بے حد متاثر کیا اور خلافت، احرار، کانگریس، خاکسار، لیگ، ہندو مہا سبھا اور اکالی دل وغیرہ سبھی جماعتیں یہاں فعال رہیں۔ اور لاہور کے در و دیوار ان ہنگاموں سے گونجتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں یہاں کنارِ راوی پر انڈین نیشنل کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اور آزادی کامل کی قرارداد پاس کی گئی۔ جون، جولائی ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج اور مزار حضرت کاکو شاہ سکھوں نے مسمار کر دیے۔ مسلمانوں نے حکومت کو یہ یاد دلانے کی ناکام کوشش کی کہ ان کی کتاب آئین میں تحفظِ اماکنِ مقدسہ کا قانون بھی ہے۔ مگر انگریز کی سیاسی مصلحتیں آڑے آئیں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنجاب میں صوبائی خود مختاری کے اصول کے تحت ۱۹۳۵ء کے قانونِ حکومت ہند کے مطابق آئینی وزارت قائم ہوئی۔ سکندر حیات خاں پہلے وزیر اعظم بنے۔ ان کے دور کا اہم واقعہ شاہی مسجد کی مرمت کا انتظام ہے۔ اور اسی انتظام کی رُو سے یہ مسجد جو قریباً کھنڈر بن چکی تھی گویا از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ محمد اقبال فوت ہوئے اور شاہی مسجد کے صدر دروازے کے باہر جنوبی جانب انھیں دفن کیا گیا۔ ان کا مزار آج لاہور کی اہم ترین زیارت گاہ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں سردار سکندر حیات خاں فوت ہوئے اور انھیں مسجد کے باہر شمالی جانب دفن کیا گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم محمد علی جناح کی سیادت میں اسلامیانِ برصغیر کی مساعی رنگ لائیں اور پاکستان کی آزاد حکومت عالم وجود میں آئی۔ جس کا مستقبل بفضلِ ایزدی نہایت درخشاں ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

فہرست فرمانروایانِ لاہور اور اُن کا عہدِ حکومت

خاندانِ چچ (؟ — ۳۸۹ ہجری / ؟ — ۹۹۹ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	چچ	؟	؟
۲	بنہرت	؟	؟
۳	تھنرت	؟ — ۳۸۰	؟ — ۹۹۰
۴	چندرت	۳۸۰ تا ۳۸۹	۹۹۰ تا ۹۹۹

ہندوشاہیہ خاندان (بھٹی راجپوت) (۳۸۹ تا ۴۱۷ ہجری / ۹۹۹ تا ۱۰۲۶ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	جے پال	۳۸۹ تا ۳۹۳	۹۹۹ تا ۱۰۰۲-۳
۲	انندپال	۳۹۲ تا ۴۰۴	۱۰۰۲ تا ۱۰۱۳
۳	تروچن پال	۴۰۴ تا ۴۰۵	۱۰۱۳ تا ۱۰۱۴

نوٹ:- تروچن پال ۲۲-۱۰۲۱ء میں فوت ہوا اور بھیم پال ۱۰۲۶ء میں۔ مگر انھوں نے ۱۰۱۴ء کے بعد لاہور پر حکومت نہیں کی۔

خاندانِ غزنویہ (۴۰۵ تا ۵۸۲ ہجری / ۱۰۱۴ تا ۱۱۸۶ عیسوی)

نمبر شمار	فرمانروا کا نام	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱	محمود یمین الدولہ	۴۰۵ تا ۴۲۱	۱۰۱۴ تا ۱۰۳۰
۲	محمد جلال الدولہ	۴۲۱ تا ۴۲۱	۱۰۳۰ تا ۱۰۳۰
۳	مسعود اول ناصر الدین	۴۲۱ تا ۴۳۲	۱۰۳۰ تا ۱۰۴۲
۴	مودود شہاب الدولہ	۴۳۲ تا ۴۴۱	۱۰۴۲ تا ۱۰۴۹
۵	مسعود دوم	۴۴۱	۱۰۴۹
۶	علی ابوالحسن بہاء الدولہ	۴۴۱ تا ۴۴۳	۱۰۴۹ تا ۱۰۵۱
۷	عبدالرشید عزالدولہ	۴۴۳ تا ۴۴۴	۱۰۵۱ تا ۱۰۵۲
۸	طغرل	۴۴۴	۱۰۵۲ تا ۱۰۵۲
۹	فرخ زاد جمال الدولہ	۴۴۴ تا ۴۵۱	۱۰۵۳ تا ۱۰۵۹

۱۰ — ابراہیم ظہیر الدولہ	۴۵۱ تا ۴۹۲	۱۰۵۹ تا ۱۰۹۹
۱۱ — مسعود سوم علاء الدولہ	۴۹۲ تا ۵۰۸	۱۰۹۹ تا ۱۱۱۴
۱۲ — شہزاد کمال الدولہ	۵۰۸ تا ۵۰۹	۱۱۱۴ تا ۱۱۱۵
۱۳ — ارسلان سلطان الدولہ	۵۰۹ تا ۵۱۲	۱۱۱۵ تا ۱۱۱۸
۱۴ — بہرام شاہ یمین الدولہ	۵۱۲ تا ۵۴۷	۱۱۱۸ تا ۱۱۵۲
۱۵ — خسرو شاہ ظہیر الدولہ	۵۴۷ تا ۵۵۵	۱۱۵۲ تا ۱۱۶۰
۱۶ — خسرو ملک تاج الدولہ	۵۵۵ تا ۵۸۲	۱۱۶۰ تا ۱۱۸۶

خاندانِ غور و خاندانِ غلاماں (۵۸۲ تا ۶۸۹ ہجری / ۱۱۸۶ تا ۱۲۸۹ عیسوی)

۱ — محمد غوری شہاب الدین	۵۸۲ تا ۶۰۲	۱۱۸۶ تا ۱۲۰۶
۲ — قطب الدین ایبک	۶۰۲ تا ۶۰۷	۱۲۰۶ تا ۱۲۱۰
۳ — آرام شاہ	۶۰۷	۱۲۱۰
۴ — شمس الدین التتمش	۶۰۷ تا ۶۳۳	۱۲۱۰ تا ۱۲۳۶
۵ — رکن الدین فیروز شاہ	۶۳۳ تا ۶۳۴	۱۲۳۶
۶ — رضیہ	۶۳۴ تا ۶۳۷	۱۲۳۶ تا ۱۲۳۹
۷ — بہرام شاہ معز الدین	۶۳۷ تا ۶۳۹	۱۲۴۰ تا ۱۲۴۱
۸ — مسعود شاہ علاؤ الدین	۶۳۹ تا ۶۴۴	۱۲۴۱ تا ۱۲۴۶
۹ — محمود شاہ ناصر الدین	۶۴۴ تا ۶۶۴	۱۲۴۶ تا ۱۲۶۶
۱۰ — بلبن غیاث الدین	۶۶۴ تا ۶۸۵	۱۲۶۶ تا ۱۲۸۶
۱۱ — کیقباد معز الدین	۶۸۵ تا ۶۸۹	۱۲۸۶ تا ۱۲۸۹
۱۲ — کیومرث شمس الدین	۶۸۹	۱۲۸۹

خاندانِ خلجی (۶۸۹ تا ۷۲۱ ہجری / ۱۲۸۹ تا ۱۳۲۱ عیسوی)

۱ — فیروز شاہ دوم جلال الدین	۶۸۹ تا ۶۹۵	۱۲۸۹ تا ۱۲۹۵
۲ — ابراہیم شاہ رکن الدین	۶۹۵	۱۲۹۵
۳ — محمد شاہ اول علاؤ الدین	۶۹۵ تا ۷۱۵	۱۲۹۵ تا ۱۳۱۵
۴ — عمر شاہ شہاب الدین	۷۱۵ تا ۷۱۶	۱۳۱۵ تا ۱۳۱۶

۵ - مبارک شاہ قطب الدین	۷۱۶ تا ۷۲۱	۱۳۱۶ تا ۱۳۲۱
۶ - خسرو شاہ ناصر الدین	۷۲۱	۱۳۲۱

خاندان تغلق (۷۲۱ تا ۸۱۵ ہجری / ۱۳۲۱ تا ۱۴۱۲ عیسوی)

۱ - تغلق شاہ اوّل غیاث الدین	۷۲۱ تا ۷۲۵	۱۳۲۱ تا ۱۳۲۴
۲ - محمد تغلق	۷۲۵ تا ۷۵۲	۱۳۲۴ تا ۱۳۵۱
۳ - فیروز شاہ	۷۵۲ تا ۷۹۰	۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸
۴ - تغلق شاہ	۷۹۰ تا ۷۹۱	۱۳۸۸ تا ۱۳۸۸
۵ - ابوبکر شاہ	۷۹۱ تا ۷۹۲	۱۳۸۸ تا ۱۳۸۹
۶ - محمد شاہ	۷۹۲ تا ۷۹۶	۱۳۸۹ تا ۱۳۹۳
۷ - سکندر شاہ	۷۹۶	۱۳۹۳
۸ - محمود شاہ	۷۹۶ تا ۷۹۷	۱۳۹۳ تا ۱۳۹۴
۹ - نصرت شاہ	۷۹۷ تا ۸۰۲	۱۳۹۴ تا ۱۳۹۹
۱۰ - تیمور کا حملہ	۸۰۱	۱۳۹۸
۱۱ - محمود شاہ	۸۰۲ تا ۸۱۵	۱۳۹۹ تا ۱۴۱۲
۱۲ - دولت خاں لودھی	۸۱۵ تا ۸۱۷	۱۴۱۲ تا ۱۴۱۴

خاندان سادات (۸۱۷ تا ۸۵۲ ہجری / ۱۴۱۴ تا ۱۴۴۸ عیسوی)

۱ - خضر خان	۸۱۷ تا ۸۲۴	۱۴۱۴ تا ۱۴۲۱
۲ - مبارک شاہ	۸۲۴ تا ۸۳۷	۱۴۲۱ تا ۱۴۳۴
۳ - محمد شاہ	۸۳۷ تا ۸۴۹	۱۴۳۴ تا ۱۴۴۵
۴ - علاؤالدین	۸۴۹ تا ۸۵۲	۱۴۴۵ تا ۱۴۴۸

خاندان لودھی (۸۵۲ تا ۹۳۲ ہجری / ۱۴۴۸ تا ۱۵۲۶ عیسوی)

۱ - بہلول	۸۵۲ تا ۸۹۴	۱۴۴۸ تا ۱۴۸۹
۲ - سکندر	۸۹۴ تا ۹۲۳	۱۴۸۹ تا ۱۵۱۷
۳ - ابراہیم	۹۲۳ تا ۹۳۲	۱۵۱۷ تا ۱۵۲۶
۴ - بابر کا حملہ	۹۳۲	۱۵۲۶

خاندانِ مغلیہ (۹۳۲ تا ۹۴۷ ہجری / ۱۵۲۶ تا ۱۵۴۰ عیسوی)

۱ — ظہیر الدین بابر	۹۳۲ تا ۹۳۷	۱۵۲۶ تا ۱۵۳۰
۲ — نصیر الدین محمد ہمایوں	۹۳۷ تا ۹۴۷	۱۵۳۰ تا ۱۵۴۰

افغان خاندانِ سوری (۹۴۷ تا ۹۶۲ ہجری / ۱۵۴۰ تا ۱۵۵۵ عیسوی)

۱ — شیر شاہ	۹۴۷ تا ۹۵۲	۱۵۴۰ تا ۱۵۴۵
۲ — اسلام شاہ	۹۵۲ تا ۹۶۰	۱۵۴۵ تا ۱۵۵۲
۳ — محمد شاہ	۹۶۰ تا ۹۶۱	۱۵۵۲ تا ۱۵۵۳
۴ — ابراہیم	۹۶۱ تا ۹۶۲	۱۵۵۳ تا ۱۵۵۴
۵ — سکندر شاہ	۹۶۲	۱۵۵۵

خاندانِ مغلیہ (۹۶۲ تا ۱۱۱۸ ہجری / ۱۵۵۵ تا ۱۷۰۷ عیسوی)

۱ — ہمایوں نصیر الدین محمد	۹۶۲ تا ۹۶۳	۱۵۵۵ تا ۱۵۵۶
۲ — جلال الدین اکبر	۹۶۳ تا ۱۰۱۴	۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵
۳ — نور الدین جہانگیر	۱۰۱۴ تا ۱۰۳۷	۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷
۴ — شہاب الدین شاہجہان	۱۰۳۷ تا ۱۰۶۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸
۵ — محی الدین عالمگیر اورنگ زیب	۱۰۶۸ تا ۱۱۱۸	۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷

دورِ آخر کے مغل حکمران (۱۱۱۹ تا ۱۱۷۳ ہجری / ۱۷۰۸ تا ۱۷۵۹ عیسوی)

۱ — قطب الدین شاہ عالم اول بہادر شاہ اول	۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴	۱۷۰۸ تا ۱۷۱۲
۲ — جہاندار شاہ	۱۱۲۴ تا ۱۱۲۴	۱۷۱۲ تا ۱۷۱۳
۳ — فرخ سیر	۱۱۲۵ تا ۱۱۳۱	۱۷۱۳ تا ۱۷۱۹
۴ — رفیع الدرجات	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۵ — نکوسیر	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۶ — رفیع الدولہ	۱۱۳۱	۱۷۱۹
۷ — محمد شاہ	۱۱۳۱ تا ۱۱۶۱	۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸

۸ - محمد ابراہیم	۱۱۳۲ تا ۱۱۳۳	۱۷۲۰
۹ - احمد شاہ	۱۱۶۱ تا ۱۱۶۷	۱۷۴۸ تا ۱۷۵۴
۱۰ - عالمگیر دوم	۱۱۶۷ تا ۱۱۷۳	۱۷۵۴ تا ۱۷۵۹
۱۱ - احمد شاہ ابدالی	۱۱۷۳ تا ۱۱۸۲	۱۷۵۹ تا ۱۷۶۸

خاندان درانی (۱۱۶۵ تا ۱۲۱۴ ہجری / ۱۷۵۲ تا ۱۷۹۹ عیسوی)

۱ - احمد شاہ درانی	۱۱۶۵ تا ۱۱۸۵	۱۷۵۲ تا ۱۷۷۲
۲ - تیمور شاہ	۱۱۸۵ تا ۱۲۰۵	۱۷۷۲ تا ۱۷۹۳
۳ - زمان شاہ درانی	۱۲۰۵ تا ۱۲۱۱	۱۷۹۳ تا ۱۷۹۹

سکھوں کا دور (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۵ ہجری / ۱۷۹۹ تا ۱۸۴۹ عیسوی)

۱ - رنجیت سنگھ	۱۷۹۹ تا ۱۸۳۹
۲ - کھڑک سنگھ	۱۸۳۹ تا ۱۸۴۰
۳ - نونہال سنگھ	۱۸۴۰
۴ - چند کور	۱۸۴۰ تا ۱۸۴۱
۵ - شیر سنگھ	۱۸۴۱ تا ۱۸۴۳
۶ - دلیپ سنگھ	۱۸۴۳ تا ۱۸۴۹

انگریزی دور (۱۸۴۹ تا ۱۹۴۷ عیسوی)

۱ - ایسٹ انڈیا کمپنی	۱۸۴۹ تا ۱۸۵۸
۲ - وکٹوریہ	۱۸۵۸ تا ۱۹۰۱
۳ - ایڈورڈ ہفتم	۱۹۰۱ تا ۱۹۱۰
۴ - جارج پنجم	۱۹۱۰ تا ۱۹۳۶
۵ - ایڈورڈ ہشتم	۱۹۳۶ تا ۱۹۳۶
۶ - جارج ششم	۱۹۳۶ تا ۱۹۴۷ (المتوفی ۱۹۵۲)

حکومت پاکستان (۱۹۴۷ عیسوی)

۱ - قائداعظم محمد علی جناح	۱۹۴۷ تا ۱۹۴۸

۲ -	خواجہ ناظم الدین	۱۹۴۸ تا ۱۹۵۱
۳ -	ملک غلام محمد	۱۹۵۱ تا ۱۹۵۵
۴ -	سکندر مرزا	۱۹۵۵ تا ۱۹۵۸
۵ -	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۱۹۵۸

لاہور کے حاکموں، ناظموں اور نائب السلطنتوں کی فہرست

نمبر شمار	نام حاکم	سنین ہجری	سنین عیسوی
۱ -	چچ	؟	؟
۲ -	بنرت	؟	؟
۳ -	تضرت	؟ تا ۳۸۰	؟ تا ۹۹۰
۴ -	چندرت	۳۸۰ تا ۳۸۹	۹۹۰ تا ۹۹۹

ہندو شاہیہ خاندان (۳۸۹ تا ۴۱۷ ہجری / ۹۹۹ تا ۱۰۲۶ عیسوی)

۱ -	انند پال	۳۸۹ تا ۴۰۴	۹۹۹ تا ۱۰۱۳
۲ -	ترلوچن پال	۴۰۴ تا ۴۰۵	۱۰۱۳ تا ۱۰۱۴

خاندان غزنویہ (۴۰۵ تا ۵۸۲ ہجری / ۱۰۱۴ تا ۱۱۸۶ عیسوی)

۱ -	سارُوغ	۴۰۵ تا ؟	۱۰۱۴ تا ؟
۲ -	نامعلوم الاسم امیر	۴۱۲ تا ؟	۱۰۲۱ تا ؟
۳ -	عبداللہ قراتگین	؟	؟
۴ -	ابوالفتح دمغانی	؟	؟
۵ -	ابوالفرج کرمانی	؟	؟
۶ -	اریارق (الیارق)	؟ تا ۴۲۲	؟ تا ۱۰۳۱
۷ -	احمد نیالتگین	۴۲۲ تا ۴۲۵	۱۰۳۱ تا ۱۰۳۴
۸ -	نامعلوم الاسم امیر	۴۲۵ تا ۴۲۷	۱۰۳۴ تا ۱۰۳۷
۹ -	مجدود (زیر اتالیقیٔ ایاز)	۴۲۷ تا ۴۳۳	۱۰۳۷ تا ۱۰۴۱
۱۰ -	نامعلوم الاسم امیر	۴۳۳ تا ۴۴۰	۱۰۴۱ تا ۱۰۴۸

۱۱ — ابوالقاسم محمود	۴۴۰ تا ۴۴۱	۱۰۴۸ تا ۱۰۴۹
۱۲ — علی بن ربیع (خود مختار حکمران)	۴۴۱ تا ۴۴۳	۱۰۴۹ تا ۱۰۵۱
۱۳ — نشتگین حاجب	۴۴۳ تا ۴۴۴	۱۰۵۱ تا ۱۰۵۲
۱۴ — نامعلوم الاسم امیر	۴۴۴ تا ؟	۱۰۵۲ تا ؟
۱۵ — حاجب طغاتگین	؟	؟
۱۶ — محمد باہلم	۵۰۹ تا ۵۱۲	۱۱۱۵ تا ۱۱۱۸
۱۷ — سالار حسین	۵۱۲ تا ؟	۱۱۱۸ تا ؟
۱۸ — خسرو ملک	۵۵۵ تا ۵۸۲	۱۱۶۰ تا ۱۱۸۶

خاندانِ غور و خاندانِ غلاماں (۵۸۲ تا ۶۸۷ ہجری / ۱۱۸۶ تا ۱۲۸۸ عیسوی)

۱ — علی کرماج	۵۸۲ تا ؟	۱۱۸۶ تا ؟
۲ — قطب الدین ایبک	۵۹۰ تا ۶۰۲	۱۱۹۴ تا ۱۲۰۵
۳ — محمد	۶۰۲ تا ۶۰۳	۱۲۰۶ تا ۱۲۰۷
۴ — ناصرالدین قباچہ	۶۰۳ تا ۶۱۴	۱۲۰۷ تا ۱۲۱۸
۵ — ناصرالدین محمود شاہ	۶۱۴ تا ؟	۱۲۱۸ تا ؟
۶ — ملک علاؤالدین شیر خانی	۶۳۴ تا ۶۳۴	۱۲۲۶ تا ۱۲۳۶
۷ — ملک عزالدین کبیر خانی	۶۲۴ تا ۶۳۷	۱۲۲۶ تا ۱۲۳۹
۸ — ملک اختیارالدین کرہ کش	۶۲۷ تا ۶۳۹	۱۲۲۹ تا ۱۲۴۱
۹ — معظم خان شیر خان	۶۳۹ تا ۶۵۱	۱۲۴۱ تا ۱۲۵۲
۱۰ — ارسلان خان	۶۵۱ تا ؟	۱۲۵۳ تا ؟
۱۱ — معظم خان قتیر خان	؟ تا ۶۶۸	؟ تا ۱۲۷۰
۱۲ — قآن الملک محمد	۶۶۸ تا ۶۸۵	۱۲۷۰ تا ۱۲۸۶
۱۳ — ملک ترکی	۶۸۵ تا ؟	۱۲۸۶ تا ؟

خلجی اور تغلق خاندان (۶۸۹ تا ۸۱۷ ہجری / ۱۲۸۹ تا ۱۴۱۴ عیسوی)

۱ — ارقلی خان	۶۹۱ تا ؟	۱۲۹۲ تا ؟
۲ — غازی ملک	۷۰۴ تا ۷۲۱	۱۳۰۴ تا ۱۳۲۱

۳ ـ ملک تاتار خرد	؟ تا ۷۴۲	؟ تا ۱۳۴۲
۴ ـ شیخا کھوکھر	۷۹۶	۱۳۹۴
۵ ـ نصرت کھوکھر	۷۹۶	۱۳۹۴
۶ ـ عادل خان (ملک کاندھو)	۷۹۶ تا ۸۰۱	۱۳۹۴ تا ۱۳۹۸
۷ ـ شیخا کھوکھر	۸۰۱	۱۳۹۸
۸ ـ خضر خاں	۸۰۱ تا ۸۱۷	۱۳۹۸ تا ۱۴۱۴

خاندان سادات (۸۱۷ تا ۸۵۲ ہجری / ۱۴۱۴ تا ۱۴۴۸ عیسوی)

۱ ـ ملک راجب	۸۲۴	۱۴۲۱
۲ ـ ملک محمود حسن	۸۲۵	۱۴۲۱
۳ ـ ملک سکندر تحفہ	۸۲۵ تا ۸۳۵	۱۴۲۱ تا ۱۴۳۲
۴ ـ شمس الملک	۸۳۵	۱۴۳۲
۵ ـ نصرت خاں گرگ انداز	۸۳۵ تا ۸۳۶	۱۴۳۲ تا ۱۴۳۳
۶ ـ اللہ داد کاکا لودھی	۸۳۶	۱۴۳۳
۷ ـ شیخ علی	۸۳۶	۱۴۳۳
۸ ـ شمس الملک	۸۳۶	۱۴۳۳
۹ ـ عماد الملک	۸۳۶ تا ۸۴۵	۱۴۳۳ تا ۱۴۴۱
۱۰ ـ بہلول خان لودھی	۸۴۵ تا ۸۵۲	۱۴۴۱ تا ۱۴۴۸

خاندان لودھی (۸۵۶ تا ۹۳۲ ہجری / ۱۴۴۸ تا ۱۵۲۶ عیسوی)

۱ ـ دولت خاں	؟ تا ۹۳۰	؟ تا ۱۵۲۴
۲ ـ میر عبدالعزیز	۹۳۰ تا ۹۳۱	۱۵۲۴ تا ۱۵۲۵

خاندان مغلیہ (۹۳۲ تا ۹۴۷ ہجری / ۱۵۲۶ تا ۱۵۴۰ عیسوی)

۱ ـ میر یونس علی	؟ تا ۹۳۷	؟ تا ۱۵۳۰
۲ ـ میرزا کامران	۹۳۷ تا ۹۴۷	۱۵۳۰ تا ۱۵۴۰
۳ ـ حیدر میرزا	۹۴۷	۱۵۴۰

خاندانِ سُوری (۹۴۷ تا ۹۶۲ ہجری / ۱۵۴۰ تا ۱۵۵۵ عیسوی)

۱ — خواص خان	۹۴۷	تا	۹۵۰	۱۵۴۰	تا	۱۵۴۳
۲ — ہیبت خان نیازی	۹۵۰	تا	۹۵۴	۱۵۴۳	تا	۱۵۴۷
۳ — تاتار خان کوسی	۹۵۴	تا	۹۶۲	۱۵۴۷	تا	۱۵۵۵

خاندانِ مغلیہ (۹۶۲ تا ۱۱۱۸ ہجری / ۱۵۵۵ تا ۱۷۰۷ عیسوی)

۱ — شاہ ابوالمعالی	۹۶۲	تا	۹۶۳	۱۵۵۵	تا	۱۵۵۶
۲ — خضر خواجہ خان	۹۶۳	تا	۹۶۵	۱۵۵۶	تا	۱۵۵۷
۳ — حسین خان	۹۶۵	تا	۹۶۷	۱۵۵۷	تا	۱۵۶۰
۴ — شمس الدین محمد خان انکہ	۹۶۷	تا	۹۶۹	۱۵۶۰	تا	۱۵۶۱
۵ — نامعلوم الاسم امیر	۹۶۹	تا	۹۷۲	۱۵۶۱	تا	۱۵۶۴
۶ — خانِ کلاں میر محمد انکہ	۹۷۲	تا	۹۷۶	۱۵۶۴	تا	۱۵۶۸
۷ — خانِ جہاں حسین قلی خان	۹۷۶	تا	۹۸۳	۱۵۶۸	تا	۱۵۷۵
۸ — شاہ قلی خان محرم	۹۸۳	تا	۹۸۶	۱۵۷۵	تا	۱۵۷۸
۹ — سعید خان	۹۸۶	تا	۹۹۱	۱۵۷۸	تا	۱۵۸۳
۱۰ — راجہ بھگونت داس	۹۹۱	تا	۹۹۴	۱۵۸۳	تا	۱۵۸۶
۱۱ — عصمت قلی	۹۹۴			۱۵۸۶		
۱۲ — راجہ بھگونت داس	۹۹۴	تا	۹۹۸	۱۵۸۶	تا	۱۵۸۹
۱۳ — قلیج خان	۹۹۸	تا	۱۰۰۰	۱۵۸۹	تا	۱۵۹۲
۱۴ — خواجہ شمس الدین خوافی	۱۰۰۰	تا	۱۰۰۸	۱۵۹۲	تا	۱۶۰۰
۱۵ — مومن	۱۰۰۸	تا	؟	۱۶۰۰	تا	؟
۱۶ — قلیج خان	۱۰۱۰	تا	۱۰۱۴	۱۶۰۲	تا	۱۶۰۵
۱۷ — سعید خان چغتائی	۱۰۱۴	تا	۱۰۱۵	۱۶۰۵	تا	۱۶۰۷
۱۸ — قلیج خان	۱۰۱۵	تا	۱۰۱۸	۱۶۰۷	تا	۱۶۱۰
۱۹ — مرتضےٰ خان	۱۰۱۸	تا	۱۰۲۵	۱۶۱۰	تا	۱۶۱۶
۲۰ — اعتمادالدولہ غیاث بیگ	۱۰۲۵	تا	۱۰۲۷	۱۶۱۶	تا	۱۶۱۸

۲۱ - قاسم خان	۱۰۲۷ تا ۱۰۳۲	۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲
۲۲ - صادق خان	۱۰۳۲ تا ۱۰۳۵	۱۶۲۲ تا ۱۶۲۵
۲۳ - آصف خان	۱۰۳۵ تا ۱۰۳۷	۱۶۲۵ تا ۱۶۲۸
۲۴ - خدمت پرست خان	۱۰۳۷ تا ۱۰۳۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۲۸
۲۵ - آصف خان	۱۰۳۸	۱۶۲۸
۲۶ - قلیچ خان	۱۰۳۸ تا ۱۰۳۸	۱۶۲۸ تا ۱۶۲۹
۲۷ - عنایت اللہ یزدی	۱۰۳۸ تا ۱۰۴۱	۱۶۲۹ تا ۱۶۳۲
۲۸ - وزیر خان	۱۰۴۱ تا ۱۰۴۹	۱۶۳۲ تا ۱۶۳۹
۲۹ - معتمد خان	۱۰۴۹ تا ۱۰۵۲	۱۶۳۹ تا ۱۶۴۲
۳۰ - سعید خان بہادر ظفر جنگ	۱۰۵۲ تا ۱۰۵۴	۱۶۴۲ تا ۱۶۴۴
۳۱ - قلیچ خان	۱۰۵۴ تا ۱۰۵۷	۱۶۴۴ تا ۱۶۴۷
۳۲ - جعفر خان	۱۰۵۷	۱۶۴۷
۳۳ - قاضی افضل	۱۰۵۸ تا ۱۰۶۲	۱۶۴۸ تا ۱۶۵۱
۳۴ - شیخ عبدالکریم	۱۰۶۲ تا ۱۰۶۶	۱۶۵۱ تا ۱۶۵۵
۳۵ - خواجہ معین خاں	۱۰۶۶ تا ۱۰۶۷	۱۶۵۵ تا ۱۶۵۶
۳۶ - بہادر خان	۱۰۶۷	۱۶۵۶
۳۷ - سید عزت خان	۱۰۶۷ تا ۱۰۶۸	۱۶۵۶ تا ۱۶۵۸
۳۸ - خلیل اللہ خان	۱۰۶۸ تا ۱۰۷۲	۱۶۵۸ تا ۱۶۶۲
۳۹ - ابراہیم خان	۱۰۷۲ تا ۱۰۷۸	۱۶۶۲ تا ۱۶۶۷
۴۰ - محمد امین خان	۱۰۷۸ تا ۱۰۸۰	۱۶۶۷ تا ۱۶۶۹
۴۱ - نامعلوم الاسم امیر	۱۰۸۰ تا ۱۰۸۶	۱۶۶۹ تا ۱۶۷۵
۴۲ - امانت خاں (سید احمد خاں)	۱۰۸۶ تا ۱۰۸۷	۱۶۷۵ تا ۱۶۷۶
۴۳ - نامعلوم الاسم امیر	۱۰۸۷ تا ۱۰۸۹	۱۶۷۶ تا ۱۶۷۸
۴۴ - قوام الدین خان	۱۰۸۹ تا ۱۰۹۱	۱۶۷۸ تا ۱۶۸۰
۴۵ - شہزادہ محمد اعظم	۱۰۹۱ تا ؟	۱۶۸۰ تا ؟
۴۶ - مکرم خان	؟ تا ۱۰۹۷	؟ تا ۱۶۸۵
۴۷ - سپہدار خان	۱۰۹۷ تا ؟	۱۶۸۵ تا ؟

۴۸	شہزادہ محمد اعظم خاں کے ایجنٹ	؟ تا ۱۱۰۲	؟ تا ۱۶۹۰
۴۹	خانِ جہاں بہادر	۱۱۰۲ تا ۱۱۰۵	۱۶۹۰ تا ۱۶۹۳
۵۰	مہابت خان ابراہیم	۱۱۰۵ تا ۱۱۰۸	۱۶۹۳ تا ۱۶۹۶
۵۱	مکرم خان	۱۱۰۸	۱۶۹۶
۵۲	ابونصر خان	۱۱۰۸ تا ؟	۱۶۹۶ تا ؟
۵۳	ابراہیم خان	؟ تا ۱۱۱۱	؟ تا ۱۶۹۹
۵۴	محمد معظم	۱۱۱۱ تا ؟	۱۶۹۹ تا ؟
۵۵	زبردست خاں	؟ تا ۱۱۱۶	؟ تا ۱۷۰۴
۵۶	شہزادہ محمد معظم کے ایجنٹ	۱۱۱۶ تا ۱۱۱۸	۱۷۰۴ تا ۱۷۰۷
۵۷	نائب گورنر منعم خاں		

دورِ آخر کے مغل حاکم (۱۱۱۹ تا ۱۱۷۳ ہجری / ۱۷۰۸ تا ۱۷۵۹ عیسوی)

۱	سید اسلم خاں (نائب ناظم)	۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴	۱۷۰۸ تا ۱۷۱۲
۲	زبردست خاں علی مردان خاں	۱۱۲۴ تا ۱۱۲۵	۱۷۱۲ تا ۱۷۱۳
۳	عبدالصمد خاں بہادر (دلیر جنگ)	۱۱۲۵ تا ۱۱۵۰	۱۷۱۳ تا ۱۷۳۷
۴	زکریا خاں (عزالدولہ خان بہادر)	۱۱۵۰ تا ۱۱۵۸	۱۷۳۷ تا ۱۷۴۵
۵	یحییٰ خان	۱۱۵۸	۱۷۴۵
۶	شاہنواز خان	۱۱۵۸ تا ۱۱۶۱	۱۷۴۵ تا ۱۷۴۸
۷	جملہ خان	۱۱۶۱	۱۷۴۸
۸	میر منو (معین الملک)	۱۱۶۱ تا ۱۱۶۷	۱۷۴۸ تا ۱۷۵۳
۹	امین الدین خان	۱۱۶۷ تا ۱۱۶۹	۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵
۱۰	آدینہ بیگ خان	۱۱۶۹ تا ۱۱۷۰	۱۷۵۵ تا ۱۷۵۶
۱۱	تیمور شاہ	۱۱۷۰ تا ۱۱۷۱	۱۷۵۷ تا ۱۷۵۸
۱۲	آدینہ بیگ خان	۱۱۷۱	۱۷۵۸
۱۳	خواجہ مرزا خان	۱۱۷۱ تا ۱۱۷۲	۱۷۵۸ تا ۱۷۵۹
۱۴	ساما (مرہٹہ)	۱۱۷۲	۱۷۵۹

خاندانِ درّانی کے عہد کے حاکم (۱۱۷۳ تا ۱۱۸۲ ہجری / ۱۷۵۹ تا ۱۷۶۸ عیسوی)

۱ - حاجی کریم داد خان	۱۱۷۳	۱۷۵۹
۲ - سربلند خان	۱۱۷۳ تا ۱۱۷۴	۱۷۶۰ تا ۱۷۶۱
۳ - خواجہ عبید خان	۱۱۷۴ تا ۱۱۷۵	۱۷۶۱ تا ۱۷۶۲
۴ - احمد شاہ خود لاہور میں مقیم رہا	۱۱۷۵ تا ۱۱۷۷	۱۷۶۲ تا ۱۷۶۳
۵ - کابلی مل	۱۱۷۷ تا ۱۱۸۱	۱۷۶۳ تا ۱۷۶۷
۶ - دادن خان	۱۱۸۱ تا ۱۱۸۲	۱۷۶۷ تا ۱۷۶۸

سکھ دور کے گورنر (۱۱۸۲ تا ۱۲۶۵ ہجری / ۱۷۶۸ تا ۱۸۴۹ عیسوی)

۱ - گوجر سنگھ	۱۷۶۸ تا	۱۷۹۱
۲ - لہنا سنگھ	۱۷۶۸ تا	۱۷۹۸
۳ - سوبھا سنگھ	۱۷۶۸ تا	۱۷۹۷
۴ - صاحب سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۷۹۱
۵ - چیت سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۷۹۸
۶ - مہر سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۷۹۷
۷ - رنجیت سنگھ	۱۷۹۹ تا	۱۸۳۹
۸ - کھڑک سنگھ	۱۸۳۹ تا	۱۸۴۰
۹ - نونہال سنگھ	۱۸۴۰ تا	۱۸۴۰
۱۰ - چند کور	۱۸۴۰ تا	۱۸۴۱
۱۱ - شیر سنگھ	۱۸۴۱ تا	۱۸۴۳
۱۲ - دلیپ سنگھ	۱۸۴۳ تا	۱۸۴۹

انگریزی دور کے گورنر (۱۸۴۹ تا ۱۹۴۷ عیسوی)

۱ - ہنری لارنس	انتظامیہ بورڈ کے اراکین
۲ - جان لارنس	
۳ - چارلس گرنوائل منسی	۱۸۴۹ تا ۱۸۵۳

۴ - سر جان لارنس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۹ (چیف کمشنر پنجاب)

انگریزی دور کے نائب گورنر (لیفٹیننٹ گورنر)

۱ -	سر رابرٹ منٹگمری	۱۸۵۹	تا	۱۸۶۵
۲ -	سر ڈانل میکلوڈ	۱۸۶۵	تا	۱۸۷۰
۳ -	سر ہنری میرین ڈیورنڈ	۱۸۷۰	تا	۱۸۷۱
۴ -	سر رابرٹ ہنری ڈیوس	۱۸۷۱	تا	۱۸۷۷
۵ -	سر رابرٹ آئکزا یجرٹن	۱۸۷۷	تا	۱۸۸۲
۶ -	سر چارلس امفرسٹن ایچیسن	۱۸۸۲	تا	۱۸۸۷
۷ -	سر جیمز براڈ ووڈ لائل	۱۸۸۷	تا	۱۸۹۲
۸ -	سر ڈی فٹز پیٹرک	۱۸۹۲	تا	۱۸۹۷
۹ -	سر ڈبلیو۔ایم۔ینگ	۱۸۹۷	تا	۱۹۰۲
۱۰ -	سر سی۔ایم ریواز	۱۹۰۲	تا	۱۹۰۵
۱۱ -	سر ڈی۔سی۔جے ایبٹسن	(قائمقام)	۱۹۰۵	
۱۲ -	سر سی۔ایم۔ریواز	۱۹۰۵	تا	۱۹۰۷
۱۳ -	سر ڈی۔سی۔جے ایبٹسن		۱۹۰۷	
۱۴ -	ٹی۔جی۔واکر	(قائمقام)	۱۹۰۷	
۱۵ -	سر ڈی۔سی۔جے ایبٹسن	۱۹۰۷	تا	۱۹۰۸
۱۶ -	سر ٹی جے واکر	(قائمقام)	۱۹۰۸	
۱۷ -	سر ایل۔ڈبلیو۔ڈین	۱۹۰۸	تا	۱۹۱۱
۱۸ -	جے میک ڈونی	(قائمقام)	۱۹۱۱	
۱۹ -	سر ایل۔ڈبلیو۔ڈین	۱۹۱۱	تا	۱۹۱۳
۲۰ -	ایم۔ایف۔اوڈوائر	۱۹۱۳	تا	۱۹۱۹

انگریزی دور کے گورنر

۲۱ -	سر ای۔ڈی میکلیگن	۱۹۱۹	تا	۱۹۲۴	(۳ جنوری ۱۹۲۱ء سے اس عہدہ کا نام گورنر ہو گیا)
۲۲ -	سر ڈبلیو۔ایم۔ہیلی	۱۹۲۴	تا	۱۹۲۸	

۲۳ — سر جی۔ ایف۔ ڈی مونٹ مورنسی ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۲

۲۴ — سکندر حیات خان (قائم مقام) ۱۹۳۲

۲۵ — سر جی۔ ایف۔ ڈی مونٹ مورنسی ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳

۲۶ — سر ایچ۔ ڈبلیو ایمرسن (قائم مقام) ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴

۲۷ — سکندر حیات خان (قائم مقام) ۱۹۳۴

۲۸ — سر ایچ۔ ڈبلیو ایمرسن ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۸

۲۹ — سر ایچ۔ ڈی کریک (قائم مقام) ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۱

۳۰ — سر بی۔ جے۔ گلینسی ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۶

۳۱ — سر ای۔ ایم جنکنز ۱۹۴۶ تا ۱۹۴۷

دورِ پاکستان کے گورنر

۱ — سر رابرٹ فرانسس مودی ۱۹۴۷ تا ۱۹۴۹

۲ — سردار عبدالرب نشتر ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۱

۳ — ابراہیم اسمٰعیل چندریگر ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۳

۴ — میاں امین الدین ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۴

۵ — مشتاق احمد گورمانی (وحدت مغربی پاکستان کا قیام) ۱۴ اکتوبر
۱۹۵۴ تا ۱۹۵۷

۶ — اختر حسین ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۰

۷ — ملک امیر محمد خان ۱۹۶۰ تا حال

مآثر لاہور

باغات و مزارات

مؤلفہ منشی محمد الدین فوق مرحوم
مرتبہ محمد عبداللہ قریشی

منشی محمد الدین فوق مرحوم مدیر اخبار کشمیری لاہور تاریخ اور صحافت کے مجمع البحرین تھے۔ انھوں نے اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ بیشمار تاریخی کتابیں بھی لکھیں۔ مآثر لاہور ان کا آخری کارنامہ ہے جو انھوں نے اپنی وفات (۴ ستمبر ۱۹۴۵ء) سے ایک سال قبل انجام دیا۔ میں نے بڑی محنت سے ان اوراق کو جمع کیا، ان پر مفید حواشی لکھے، جہاں جہاں اضافے کی ضرورت سمجھی اضافہ کیا اور جن عنوانوں کے تحت وہ کسی وجہ سے لکھنا چھوڑ گئے تھے ان پر خود لکھا۔ (محمد عبداللہ قریشی)

ابتدائیہ

راقم (محمد الدین فوق) کے کئی مضامین لاہور کے ماہوار رسائل شباب اردو[1] اور قوس قزح[2] میں لاہور کے تاریخی حالات پر شائع ہوتے رہے۔ اکثر احباب کا تقاضا تھا کہ ان مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں چھاپ کر محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۲۰ء میں "لاہور عہدِ مغلیہ میں" کے نام سے طبع کر دیا گیا۔ اب نہ شباب اردو ہے نہ قوس قزح اور نہ مضامین لاہور کا مجموعہ ہی باقی ہے۔ اس لیے ۱۹۲۳ء میں لاہور کے باغات و مزارات پر جو مواد مزید جمع کیا گیا تھا، اس کی طباعت کے متعلق پھر احباب نے تحریک کی۔ خصوصاً مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے نے جو خود بھی اہل قلم ہیں اور جن کا ذوقِ تاریخ طبیعت ثانیہ بن چکا ہے، ان کی طباعت و حفاظت پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ اگر سارا مواد طبع نہیں ہو سکتا تو لاہور کے باغات قدیم کا ذکر "باغوں کا شہر" کے نام سے ضرور چھاپ دیا جائے۔

لیکن لاہور کے قدیم شاہی باغات اور کئی دوسرے باغات مزاروں اور مقبروں کے ساتھ ملحق نظر آئے۔ اس لیے باغات کے ساتھ مقبروں کے ماضی و حال کی کیفیت کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ بلکہ ایسے مزارات کا ذکر بھی کر دیا گیا جن کا تعلق کسی باغ سے نہ تھا۔ صرف مزار اور باغ ہی کا ذکر نہیں بلکہ صاحبان باغات اور صاحبانِ قبور کے جس قدر قابلِ ذکر حالات مل سکے وہ بھی لکھ دیئے گئے جس سے ان کے سوانحِ زندگی اور لاہور کے بعض تاریخی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سوانح حیات نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ تھا۔

بزرگانِ دین میں سے جن کا ذکر اس جگہ کیا گیا ہے، چند ایک کے حالات راقم نے اپنی ۱۹۰۴ء کی تصنیف "یادِ رفتگاں" میں بھی لکھے ہیں لیکن اب زیادہ تحقیق کے ساتھ دوبارہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اکثر مزارات پر فاتحہ خوانی اور زیارت قبور سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے لہو و لعب، کھیل تماشہ، ناچ مجرا اور قوالی کی مجلسوں سے دل بہلایا جاتا ہے، افسوس! جو مقام عبرت حاصل

---

[1] یہ رسالہ خان احمد حسین خان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جو بیشمار کتابوں کے مصنف تھے اور جن کا انتقال نوّے برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو لاہور میں ہوا۔ انھوں نے ساٹھ برس ادب و صحافت کی خدمت کی۔

[2] رسالہ قوس قزح کے مدیر وحید کیلانی اور مدیرانِ اعزازی مولانا محمد علم الدین سالک اور محمد عبداللہ قریشی تھے جو آثارِ لاہور کے مرتب و مکمل ہیں۔

کرنے اور موت سے غافل نہ ہونے کے لیے ہے۔ وہاں بھی حظِ نفس ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ بعض مزاروں پر تو قمار بازی، شراب خوری اور بھنگ نوشی کی دکانیں کھل جاتی ہیں اور ان سامانوں سے جن کو خبیث الامم کہا گیا ہے، اس قسم کی نامشروع اور خلافِ تہذیب حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ آج کو مسلمان کتنے ہوئے ایک صحیح العقائد مسلم کو شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔

زیارت قبور کے متعلق بعض ضعیف و قوی احادیث کی وجہ سے علمائے اسلام میں اختلاف ہے تاہم موت کو یاد کرنے کے لیے زیارت قبور گناہ کا باعث نہیں۔ لیکن بزرگوں اور صوفیوں کے مزاروں پر جن لغویات و فواحشات سے کام لیا جاتا ہے ان کو بدعت بلکہ گناہ قرار دینے میں کسی کو کوئی وجہِ اختلاف نہیں۔

علم تصوف و سلوک کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بقول علامہ سلیمان ندوی "طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ اگر ان کے سمجھنے میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کی جائے تو ہدایت کی بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جاتے ہیں . . . . احکامِ الٰہی کی بہ اخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے دگر ہیچ اور جو اس کے علاوہ کچھ کرتا ہے وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور حسنِ سلوک سے ناآشنا ہے"

غور کرو۔ حضرت علی ہجویری اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور بعد کے صوفیائے کرام نے لاہور میں مذہب اور دین کی خدمت کچھ کم نہیں کی بلکہ عوام کو ایمان و ایقان کی دولت سے مالا مال کیا۔ لیکن آج ان کے مزاروں پر کیا ہوتا ہے؟ کوئی جبیں سائی کرتا ہے، کوئی اپنی دعا مانگتا ہے جو صرف خدائے واحد ہی سے اس کے حکم "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے مطابق مانگی جا سکتی ہے۔ پھر عرس کے دنوں میں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ قوالی ہوتی ہے، تماشے ہوتے ہیں، پہلے طوائفوں کے ناچ بھی ہوتے تھے اور ان کے قدر دان ان پر روپے نچھاور کرتے تھے لیکن سابق پنجاب اسمبلی کے ایک قانون نے بزرگانِ دین کے مزاروں پر سے اس بدعت کو بند کر دیا ہے۔

سماع اور قوالی کا اب تک رواج ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن صوفیائے چشت اور دیگر طریقے کے صوفیاً انسان کی روح کو تین چیزوں کا مشتاق سمجھتے ہیں۔ عبادتِ الٰہی، خوش جمالی اور خوش آوازی۔ مگر قوالی کی شرطیں اس قدر کڑی اور قوال اور حاضرین کے لئے اس قدر پابندیاں ہیں کہ ہر کس و ناکس اس کے سننے کا اہل نہیں ہو سکتا اور طوائفوں اور بے ریش قوالوں اور مزامیر کی قوالی کو تو قطعاً حرام کہا گیا ہے۔ ان شرطوں پر غور کرو اور پھر اپنی قوالیوں کو دیکھو۔ ایک فرقہ تو سرے سے قوالی کا قائل ہی نہیں۔ لیکن جو گروہ قوالی کو غذائے روح تصور کرتا ہے کیا وہ نہیں دیکھتا کہ قوال یا حاضرین میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو قوالی کی شرطیں پوری کرتا ہے؟ بلکہ آج کل کی قوالی تو اپنی بدعات و خرافات کی وجہ سے منکرات شرعیہ کی ایک کھلی ہوئی شہادت ہے۔

یہ چند سطور صرف اس لئے لکھی گئی ہیں کہ صاحبان قبور اور قبروں کے حالات لکھ کر قبر پرستی اور پیر پرستی کی وکالت داری کو فروغ دینا مقصود نہیں بلکہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

لاہور کے حالات میں مفتی غلام سرور، رائے بہادر کنہیا لال۔ جج محمد لطیف اور مولوی نور احمد چشتی نے بہت کچھ لکھا ہے۔[1]

---

[1] فوقؔ مرحوم نے جن بزرگوں کے نام لیے ہیں انھوں نے لاہور کے متعلق اپنی تاریخیں انیسویں صدی عیسوی کے آخر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں نے صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ بعض اور بزرگوں کے حالات لکھ کر ان کا تکملہ ۱۹۴۲ء تک کر دیا ہے یا بعض مقامات پر تاریخی نقطۂ نگاہ سے ان سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ "مآثر لاہور" میں قدیم و جدید باغات لاہور کا ذکر ہے یا مسلمان بزرگوں اور صوفیا و مشاہیر کے حالات اور ان کے مقبروں کی کیفیت درج ہے۔

عہد غزنویہ، غلامان، تغلق، و لودیہ وغیرہ

ان خاندانوں کا طویل عہدِ حکومت ۱۰۲۱ء ۴۱۲ھ سے لے کر ابراہیم لودھی کی شکست اور وفات کے زمانہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء تک پانچ صدیوں میں ختم ہوتا ہے اس طویل عرصہ میں لاہور کو اکثر کیا بیشمار بزرگانِ دین کی اقامت اور ان کی آخری آرام گاہ ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ ان میں سے کئی ایک کا ذکر لاہور کی تاریخوں اور مختلف کتابوں میں درج ہے۔ لیکن بہت کم ہیں جن کے مزار اور مقبرے اب تک سلامت رہ سکے ہیں۔

ان ایام میں باغات کا چنداں رواج اور شوق نہ تھا اور اگر کہیں باغات تھے بھی، تو انقلاب زمانہ نے ان کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس طویل عہد میں تاریخوں سے صرف پانچ باغات کی کیفیت معلوم ہو سکی ہے اور آج ان کا بھی کہیں وجود نظر نہیں آتا۔ صرف وہ مقبرے اپنے تقدس اور احترام کی وجہ سے سلامت ہیں جن کے ساتھ باغات موجود تھے۔

شاہ حسین زنجانیؒ

چاہِ میراں میں ہے بیشک مرقدِ شاہ حسینؒ
اے فلک لیکن کہاں اب باغِ زنجاں دیکھئے

زنجان، اندجان، سنجان، خراسان کی طرف کے مشہور قصبے ہیں۔ اندجان اور زنجان کے مردم خیز خطوں نے دین و دنیا میں نامور ہستیاں پیدا کی ہیں۔ شیخ فرخ زنجانی، شاہ حسینؒ زنجانی، سید یعقوب زنجانی بہت بڑے ظاہری و باطنی پیشوا گزرے ہیں۔ ان میں آخر الذکر دونوں بزرگوں کے مزار لاہور میں مرجع خلائق ہیں۔ ان کے علاوہ میر عبدالعزیز زنجانی عہد محمد شاہی میں لاہور کے مشہور عالم اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے عرفی کے مشہور قصیدہ کے تتبع میں لاہور کے متعلق ایک طویل قصیدہ لکھا ہے جس کا کچھ حصہ تذکرۃ الاخبار (ایک قلمی کتاب) سے مئی ۱۹۲۵ء کے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں طبع ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) میں لکھی گئیں۔ بلیسویں صدی عیسوی میں خود ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ ڈاکٹر محمد باقر کی کتاب "لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ" سید ہاشمی فرید آبادی کی کتاب "مآثر لاہور" اور محمد ولی اللہ خان کی کتاب "لاہور کی عظیم یادگاریں" حضرت نوری کی وفات کے بعد حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ کرنل بھولا ناتھ کی تاریخ لاہور جو پنجابی زبان میں ہے، ان سے کچھ پہلے کی تصنیف ہے ——— (مرتب)

شاہ حسینؒ زنجانی کی ورودگی لاہور کے متعلق لاہور کے تمام مؤرخ مختلف الرائے ہیں۔ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) کے مصنف محمد لطیف نے تو ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقاتِ چشتی لکھتے ہیں کہ "آپ سید یعقوب زنجانی صدر دیوان کے ہمراہ لاہور تشریف لائے"۔ اور صدر دیوان کے متعلق صفحہ ۲۳۷ پر آپ کا ارشاد ہے کہ وہ ۵۳۵ھ بعہد بہرام شاہ غزنویؒ اور صفحہ ۲۳۸ پر لکھتے ہیں کہ ۵۵۷ھ میں تشریف لائے تھے۔ اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علی ہجویری ۴۳۱ھ میں لاہور آئے اور ان کے آنے سے ایک دن قبل شاہ حسینؒ زنجانی انتقال فرما چکے تھے۔ اور آپ ان کے جنازہ میں شامل ہوئے تھے یعنی ایک طرف ان کی آمد کا سال ۵۳۵ھ و ۵۵۷ھ بتاتے ہیں اور دوسری طرف اس سے زیادہ دلچسپ غلطی یہ کرتے ہیں کہ ۴۳۱ھ ہی میں ان کو واصل بحق کر دیتے ہیں۔

تاریخ لاہور کا مصنف رائے کنہیا لعل ان سے بھی دو قدم آگے چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہ حسینؒ زنجانی سلاطین غوریہ کے زمانہ میں لاہور آئے۔ یہ زمانہ غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کی گرفتاری ۵۸۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔

ہسٹری آف لاہور کا مصنف گو ان کی ورودگی لاہور کا سال نہیں بتاتا۔ لیکن یہ لکھتا ہے کہ حضرت علی ہجویری ۴۳۱ھ میں لاہور آئے اور اسی سال شاہ حسینؒ زنجانی کا انتقال ہوا۔

مفتی غلام سرور بھی لاہور کے ایک قابل مصنف اور شاعر گذرے ہیں۔ انھوں نے بھی آپ کی آمدِ لاہور کا سال نہیں لکھا لیکن اتنا بتایا ہے کہ شاہ حسینؒ زنجانی اور سید یعقوب صدر دیوان لاہور میں اکٹھے ہی تشریف لائے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کی آمد اور شاہ حسینؒ کی وفات کا ایک ہی سال بلکہ ایک ہی یوم ہے۔

ان اختلافات اور ان عجیب و غریب بیانات پر راقم اپنی تصنیف "سوانح داتا گنج بخش" میں کچھ بحث کر چکا ہے۔ بعد کے مطالعہ سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر سبکتگین ۳۶۶ھ مطابق ۹۷۷ء میں غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ اور مقامی خرخشوں سے فارغ ہو کر اسی سال ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور صاحب تاریخ فرشتہ کے قول کے مطابق چند مقامات فتح کر کے اور ان میں مساجد تعمیر کرا کے واپس چلا گیا۔ یہ تمام علاقے راجہ جے پال والیٔ لاہور کی مملکت میں تھے۔ اس نے نہ صرف صلح کر لی بلکہ دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی نذرانہ دینے کا وعدہ کیا۔ جب سلطان کے سفیر رقم موعودہ اور ہاتھی لینے کے لئے لاہور آئے۔ تو راجہ نے ان کو قید کر لیا۔ سبکتگین کو خبر ہوئی تو غم و غصہ کے ساتھ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس سال اس کا جواں مرد اور شجاع فرزند محمود بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان کی فوجوں نے اپنی سرحد سے پار ہو کر راجہ کے مقبوضات لمغان و نواحات کو پامال کر کے پشاور تک قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ لاہور تک نہ آ سکے۔ راجہ نے کسی نہ کسی طرح ان کو ٹال دیا۔ یہاں تک کہ ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔

اس کے چار سال بعد محمود نے ۱۰۰۰ء میں پہلی دفعہ اور ۱۰۰۲ء میں دوسری دفعہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور پشاور اور اوہند تک جو دریائے اٹک کے کنارے ہے پہنچا۔ ۱۰۰۴ء میں اٹک اور جہلم عبور کر کے بھیرہ کے راجہ کو شکست دی۔ اور یہاں راجہ جے پال کے نواسے سکھ پال کو جو مسلمان ہو چکا تھا۔ حاکم مقرر کیا۔ ۱۰۰۵ء میں ابوالفتح داؤد والیٔ ملتان اور راجہ

جے پال کے بیٹے انند پال کو شکست دی۔ اس کے چند سال بعد راجۂ لاہور کو کامل شکست دے کر اس نے پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ بنا لیا۔

مندرجہ صدر واقعات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ محمود اپنی تخت نشینی سے ۲۴ برس بعد یعنی ۱۰۲۲ء میں بھیرہ تک پہنچا اور دو برس بعد یعنی ۱۰۲۴ء میں لاہور میں داخل ہوا۔ پس جب ۱۰۰۵ء یعنی ۳۹۵ھ سے پہلے لاہور مسلمانوں کے قبضہ ہی میں نہیں آیا تو مسلمان واعظ اور تبلیغ والے کس طرح قیام رکھ سکتے تھے خصوصاً اس حالت میں جب کہ والیٔ لاہور اور والیٔ غزنی آپس میں سخت دشمن اور ایک دوسرے کی جان کے لاگو تھے۔ قیاس یہی ہے کہ لاہور میں آپ ۳۹۵ھ یا اس کے بعد تشریف لائے۔ اور ۴۳۱ھ میں جس پر سب مورخ متفق ہیں آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ زمانہ تھا جب سلطان محمود کے فرزند سلطان مسعود کی حکومت اپنے آخری لمحے گزار رہی تھی۔

جس دن آپ کی وفات ہوئی اسی دن حضرت علی ہجویریؒ اپنے مرشد کے ارشاد کے مطابق لاہور پہنچے۔ اور آپ کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ آپ دونوں پیر بھائی تھے۔ جیسا کہ حضرت علی ہجویریؒ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔

شاہ حسینؒ زنجانیؒ قریباً ۳۶ - ۳۷ سال لاہور میں رہے۔ اس طویل عرصہ میں ہزاروں غیر مسلم ان کے علم توحید کے نیچے آئے اور ہزارہا تشنگانِ حقیقت جامِ توحید سے سرشار ہوئے۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں شاہ حسینؒ زنجانیؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ در سیاحت شیخ حسینؒ ازرائیؒ را دریدہ اند۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ خواجۂ اجمیریؒ کا سال ولادت ۵۳۷ھ اور سالِ وفات ۶۳۳ھ ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس ظاہری دنیا میں حضرت خواجہ اجمیریؒ کی ملاقات اپنی ولادت سے بھی پہلے شیخ حسینؒ ازرائیؒ سے ہو چکی ہو۔ دونوں روحانی بزرگ تھے۔ باطنی ملاقات وہ بھی خواجۂ اجمیریؒ کی ولادت کے بعد ہوئی ہو تو تعجب کا مقام نہیں۔

دارا شکوہ سکینۃ الاولیاؒ[2] (ترجمہ صفحہ ۱۸) میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں جیو (یعنی حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ) ایک دن زنجانی باغ میں بھی یادِ حق میں مشغول رہے۔ لیکن وہ زنجانی باغ یا باغ زنجان جو ان کے نام سے موسوم تھا۔ کہاں تھا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔

آپ کا مزار چاہ میراں[3] میں ہے۔ اور ایک بڑی جو بعض باغ کے اندر ہے۔ یہ باغ سکھوں کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔

---

[1] دارا شکوہ سفینۃ الاولیاء کے خاتمہ پر لکھتا ہے "در شب بست و ہفتم ماہ رمضان المبارک سال یک ہزار و چہل و نہ (۱۰۴۹ھ) کہ سال بست و پنجم از سن ایں فقیر است بہ اتمام رسید" یعنی یہ کتاب اس نے بعمر پچیس سال لکھی تھی۔

[2] سکینۃ الاولیاؒ اس نے ۲۸ سال کی عمر میں لکھی تھی۔

[3] یہ مقام لاہور کی ویرانیوں کے بعد درندوں اور خوفناک جانوروں کا مسکن تھا۔ آج سے دو سو سال پیشتر لہنا سنگھ حاکم لاہور کے حکم سے ایک مسلمان نے اس کو آباد کیا تھا۔

ممکن ہے یہ بانی بنیاد دوبارہ پھر احداث کیا گیا ہو۔ اور یہی وہ مقام ہو جو باغِ زنجان کہلاتا تھا۔ اور آپ کے باغ ہی میں آپ کا مزار بنایا گیا ہو۔

آپ کا مزار ایک قدِ آدم خشتی چار دیواری کے اندر ہے۔ مزار کے سرہانے خشتی چراغ دان ہے۔ مزار پر گنبد کوئی نہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزار بہت قدیم زمانہ کا ہے اور شاہانِ مغلیہ یا امرائے مغلیہ سے بھی کسی نے اس مزار پر عالیشان گنبد بنانے کا خیال نہیں کیا۔ مزار کا دروازہ مشرق کی طرف ہے۔ شمال کی جانب ایک خشتی دالان ہے۔ چار دیواری کے باہر ایک چاہ چرخی دار اور اس کے پاس ہی چند قدیم قبروں کے آثار ہیں۔

میر عبدالعزیز عزیزؔ زنجانی "قصیدہ در صفت لاہور" میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

بہ درگاہ شہنشاہ حسین شاہ زنجاں رَو
کہ اسرارِ الٰہی در مزارِ او عیاں بینی

اس مزار کی حفاظت و نگہداشت کا تعلق سید یعقوب زنجانی عرف شاہ صدر دیوان کے مزار کے متولیوں کے ساتھ ہے۔ لیکن نہ اس مزار کے ساتھ کوئی معافی ہے نہ کوئی اراضی۔ نہ خانقاہ کا ہجوم یہاں رہتا ہے کہ چڑھاوے کی آمدنی آتی ہو اس لیے مزار کی حالت اچھی نہیں۔

شاہ اسمٰعیل

دیکھ کر پہلے مزارِ شاہ اسمٰعیل کو
غور سے پھر انقلابِ چرخِ گرداں دیکھیے

شاہ اسمٰعیل کا اصل وطن کسی نے نہیں لکھا۔ البتہ اس پر سب مورخین کا اتفاق ہے کہ آپ غزنوی عہد کی ابتدا میں لاہور آئے۔ آپ ہر جمعہ کو وعظ فرماتے تھے اور ہر وعظ میں بقول صاحب تحقیقاتِ چشتی ڈھائی سو غیر مسلم مسلمان ہوا کرتے تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال "تاریخ لاہور" کے صفحہ ۳۰۰ پر لکھتے ہیں کہ آپ کے وعظوں کی تاثیر سے ہزارہا لوگ جامۂ اسلام پہنتے تھے۔ حدیث و قرآن کے حافظ تھے۔ آواز ایسی اچھی تھی کہ جس کان میں پڑ جاتی کھنچا چلا آتا تھا۔

رائے بہادر کنہیا لال کے قول کے مطابق آپ ۴۱۲ھ میں اور صاحب تحقیقاتِ چشتی کی رائے میں آپ ہندو راجگان کے آخری عہد میں اور صاحب "خزینۃ الاصفیا" کے بیان کی رو سے آپ ۳۹۵ھ میں بعہد سلطان محمود غزنوی لاہور آئے، مگر سب نے قریب قریب ایک ہی زمانہ بتایا ہے۔ اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ آپ ۴۱۲ھ میں لاہور آئے ہیں۔ اسی سنہ میں سلطان محمود غزنوی فتح کشمیر کو اپنے احاطۂ قدرت سے باہر دیکھ کر لاہور کی طرف آیا تھا۔ اس وقت لاہور میں راجہ جے پال کا پوتا جے پال دوم جس کو فارسی مورخ پور جے پال لکھتے ہیں۔ پنجاب کا راجہ تھا۔ وہ محمود کے آنے کی خبر سن کر راجہ اجمیر کے پاس بھاگ گیا اور سلطان نے شہر پر بلا مقابلہ قبضہ کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور لاہور کو غزنی کے ماتحت ایک صوبہ قرار دیا۔ بادشاہی افواج کے ساتھ علماء و فضلا کی ایک کثیر تعداد بھی ہوتی تھی۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مولانا شاہ اسمٰعیل غزنوی فوج کے ہمراہ لاہور آئے

ہوں اور خدمت دین و اشاعتِ اسلام کے لیے لاہور ہی کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا ہو۔ ان کے بیان میں وہ ملائمی اور شان کی زبان میں وہ تاثیر تھی کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

لاہور میں کامل چھتیس برس تک اسلام کا یہ زبردست مبلغ دین فطرت کی اشاعت میں سرگرم رہا۔ ۴۴۸ھ میں آپ وفات پا گئے۔ حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کی آمد سے پیشتر یہاں شاہ حسین زنجانی موجود تھے۔ شاہ اسمٰعیل کی ان دونوں بزرگوں سے ضرور ملاقاتیں ہوئی ہوں گی لیکن کسی مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کشف المحجوب بھی جو حضرت علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے اس بارہ میں خاموش ہے۔

اس امر کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ آپ کس مسجد میں جمعہ پڑھاتے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ لاہور میں مستقل اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس لیے لشکر اسلام اور مسلمان حکام و عوام کے لیے سرکاری طور پر کوئی نہ کوئی مسجد محمود ہی کے زمانہ میں تعمیر ہو چکی ہوگی۔

اس زمانہ میں مغلیہ عہد کے سے گنبد نما عالیشان مقبروں کا رواج نہ تھا۔ اس لیے ان کا مقبرہ نہایت سادہ بنایا گیا۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور کے صفحہ ۳۰۱ - ۳۰۰ پر لکھتے ہیں "اس متبرک مقبرہ پر گنبد نہیں ہے۔ مگر نہایت قدیم مکان ہے۔ اسلامی سلطنت کے وقت مکان کے ساتھ بہت بڑا باغ بھی تھا اور مزار سے جانب غرب جو کنواں ہے اس پر چرخ چوب چلتا تھا" عہدِ مغلیہ اور سکھوں کے زمانہ میں اس باغ اور مزار کو جو حادثات پیش آئے ان کا ذکر "باغ سمت کہار" میں دیکھیے جس کا ذکر عہدِ خالصہ کے باغات لاہور میں درج ہے۔ رائے بہادر کنہیا لال کے زمانہ ۱۸۸۴ء میں ان کے مزار کی زمین مجاور نے انگریزوں کے پاس فروخت کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی کوٹھی میں شامل کر لی قدیمی کنواں بھی اسی کوٹھی میں آ گیا۔

اس باغ اور مقبرہ کے ساتھ جو زمین بتائی جاتی ہے وہ ایک طرف یورپین کیتھیڈرل سکول اور رومن کیتھولک گرجا گھر کے وسیع احاطہ تک پھیلی ہوئی تھی جس کی پشت کا حصہ اس سڑک تک ہے جو ای پلومر کے دواخانہ سے ہو کر سیدھی مزنگ کو جاتی ہے مشرق کی طرف اس مقبرہ کی جو حدود تھیں وہ ان کوٹھیوں تک پھیلی ہوئی تھیں جو پانی والے ٹینک کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہیں۔ اس باغ کی چار دیواری جنوب کی طرف حیات برادرس فرنیچر میکرز کی دوکان سے بھی پرے تھی۔ راقم ۱۸ ستمبر ۱۹۲۳ء کو مزار اور صاحب مزار کے حالات دریافت کرنے کے لیے وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ زمین بہت تھی متولی بیچ بیچ کر کھا گئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیا جلد دوم میں صفحہ ۲۳۰ پر بحوالہ تحفۃ الواصلین لکھتے ہیں :-

"اول کسے از واعظان اسلام در لاہور تشریف آورد و خلق

؎ راقم کے لڑکپن کے زمانہ میں یہاں چاہ روان رہتا تھا اور اس کے ساتھ زیر کاشت اراضی بھی تھی، یہاں اکثر مسلمان اور ہندو اپنے ان بچوں کو جو پھوڑے پھنسیوں سے بیمار رہتے تھے لا کر نہلایا کرتے تھے۔ جب سے یہاں کوٹھیاں تعمیر ہوئی ہیں اور زنانہ کالج بن گیا ہے کنواں بند ہو گیا ہے اور کنویں میں نلکہ لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن پھر بھی لوگ یہاں آتے جاتے ہیں۔ اس کا نام پنجابی زبان میں "پانی والیاں دا کھوہ" ہے۔

ما بہ نور اسلام روشن کرد۔ او بود . . . . . . و از کتب معتبرہ
و اقوالِ صحیحہ ثابت گشتہ کہ شخصے کہ اول در لاہور درس کلام مجید
خواند شیخ اسمٰعیل بود۔"

پنجاب میں اسلام کے اس مبلغ۔ درسِ قرآنیہ کے نامور مدرس۔ کلام الٰہی اور ترجمہ و سنّت سے واقف کرانے والے بزرگ کے مزار کے ساتھ نااہل مجاوروں اور دین فروش متولیوں کا یہ سلوک۔ ع
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

سچ کہا علامہ اقبالؒ نے ؎

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اور وہ بھی بیچ کر کھا جانے والے۔

مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے سکول کی عمارت کے ساتھ ساتھ (جو درحقیقت اسی مزار کی زمین ہے) سڑک کے دائیں طرف تھوڑی چھوٹی سات سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مزار آتا ہے۔ سنگِ مرمر کہیں نہیں۔ البتہ مزار پختہ اینٹوں کا ہے پرانے چراغدان بنے ہوئے ہیں، مزار اس قدر ٹوٹی حالت میں ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں مسلمان ہر روز قبر کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور اس بزرگ کی روح کو کوئی دو ہاتھ اٹھا کر دعائے خیر کے چند کلمات بھی نہیں کہتا جس کے ہر وعظ میں ہر جمعہ کو صدہا غیر مذاہب کے لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔

وہ باغ جو خدا جانے کتنی بڑی وسعت رکھتا تھا اور وہ مقبرہ جس کی حدود دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں آج اس سمندر کی طرح ہے جو انقلاب زمانہ کے زبردست تھپیڑوں سے حلقۂ گرداب میں آنسو بن کر رہ گیا ہو، باغ کا تو اب یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، مقبرہ کے بلند چبوترہ کے سوا ایک چپہ زمین بھی اس مزار کے ساتھ نہیں، قریباً سو سال یا کچھ عرصہ سے دو درخت ایک نیم اور ایک پیپل کا، اس مزار کو مع ایک اور چھوٹے سے مزار کے ابرِ رحمت بن کر سایہ کئے ہوئے ہیں۔

ابو النجم ملک احمد ایاز

کر دیا آباد جس نے از سرِ نو شہر کو آج اُس کا مقبرہ اور باغ ویراں دیکھئے

ایاز[۱] سلطان محمود غزنوی کا محبوب غلام تھا۔ اس کا ذکر غزنوی عہد کی اکثر تاریخوں اور دربارِ محمودی کے اکثر شعراء

---

[۱] ایاز پر ایک جامع مضمون لاہور کے نوجوان ریسرچ سکالر مسٹر مشتاق احمد بھٹی نے لکھا ہے جو اورینٹل کالج میگزین کے دو نمبروں میں چھپا ہے۔ قابل مضمون نگار نے اس مضمون کے لئے بڑی کاوش کی ہے اور مندرجہ ذیل کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ مجالس العشاق۔ منطق الطیر۔ طبقات ناصری۔ فرہنگ آنند راج۔ زین الاخبار گردیزی۔ دستنہ۔ تاریخ بیہقی۔ مثنوی نالی۔ قصائد فرخی اور دیگر شعرا کا کلام۔ راقم نے اس مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کے کلام میں ملتا ہے۔ زلالی نے جو مثنوی پونے پانچ سو صفحوں کی لکھی ہے۔ اس میں اس نے محمود و ایاز کے عشق کو انتہائی درجہ پر پہنچا کر ایک اچھا خاصا افسانہ بنا دیا ہے۔ لیکن دوسرے شعرا اور مورخین نے ایاز کے حسن و وفا کے ساتھ اس کی خدمات شاہانہ، شجاعت و جنگ آزمائی اور انتظامی و مدبرانہ قابلیت کا ذکر کر کے اس کو ایک بہادر جرنیل، منتظم حاکم اور اپنے بادشاہ کا محبوب اور جاں نثار غلام ظاہر کیا ہے۔

عہد عالمگیری کے مصنف منشی سجان رائے بھنڈاری نے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں ایاز کو کشمیری الاصل لکھ کر ایک اور بھی غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

" ایں ایاز خلف والیٔ کشمیر بود۔ بہ نو دو سالی ہمراہ پدر خویش
در شکارگاہ رسید۔ جمع از عیاران آدم دزد بہ قابو ئے کہ یافتند
ایاز را بدست آوردہ ازاں ولایت بدر رفتند۔ و در بدخشاں آں
لعل درج شاہی را بدست سوداگرے بہ قیمت خاطر خواہ فروختند"

اس کے بعد سوداگر بدخشاں سے غزنی آتا ہے اور ایاز کے حسن صورت کی شہرت محمود تک پہنچتی ہے۔ وہ اس کو دیکھتا ہے اور ہزار جان سے عاشق ہو کر سوداگر کی بتائی ہوئی قیمت سے بھی زیادہ قیمت پر اسے خرید لیتا ہے۔

خلاصۃ التواریخ کے ان افسانوی الفاظ میں زلالی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب تک غلاموں کا رواج رہا۔ غلاموں کی اکثریت کس ملک سے آیا کرتی تھی۔ اور محمود کے زمانے میں کشمیر کی کیا حالت تھی۔ اور کیا کشمیر کی کوئی قدیم یا بعد کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تاریخ خلاصۃ التواریخ کے مذکورہ صدر الفاظ کی تائید کرتی ہے

محمود ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں تخت پر بیٹھا اور ۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء) میں انتقال کر گیا۔ چونتیس ۳۴ سال کے اس عرصہ میں اس نے دو حملے کشمیر پر کئے۔ ایک ۱۰۱۵ء میں جبکہ کشمیر پر دیدا رانی حکمران تھی دوسرا حملہ ۲۳-۱۰۲۲ء میں کیا جب راجہ سنگرام[1] کشمیر کا راجہ تھا۔ مگر دونوں حملوں میں ناکام واپس آیا تھا۔ کشمیر کی کسی تاریخ میں کشمیر کے کسی راجہ کے فرزند کا چرواہوں یا بردہ فروشوں کے ہاتھوں میں جانے اور شکارگاہ سے گم ہو جانے کا ذکر نہیں۔ نیز دیدا رانی ۹۷۶ء سے ۹۹۷ء تک دو بیٹوں یا دو ایک پوتے کی سرپرست بن کر اور ۹۹۸ء سے ۱۰۱۶ء تک خود براہ راست کشمیر کی حکمران رہی ہے اس کے عہد میں اس کا کوئی بیٹا یا پوتا "عیاران آدم دزد" کے ہاتھ نہیں آیا۔ اور نہ کوئی شکار کو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصنف نے ایاز کے کشمیری الاصل ہونے کا ماخذ کہاں سے لیا ہے۔

ابو القاسم فرشتہ ایاز کو حبشی الاصل، مجالس العشاق کا مصنف اور نظامی عروضی اسے ترک لکھتے ہیں۔ فرخی اس کا نام ایاز بن اویماق لکھتا ہے۔ ایاز ترکی لفظ ہے اور اس کے معنے خوشگوار دھوپ یا صاف رات کی شبنم ہیں۔ اویماق بھی ترکی لفظ ہے

---

[1] مولوی محمد حبیب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی کتاب سلطان محمود غزنوی میں اس راجہ کا نام راجہ سالی لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ صحیح نام سنگرام ہے۔

معنے قبیلہ و انگشتانہ۔ فرہنگ آنندراج میں ایاز کو ایاس بھی لکھا ہے[1]۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ترکستان کی حدود دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ترکی غلام گھر گھر میں موجود تھے۔ بلکہ محمود کا باپ بھی ایک ترکی غلام تھا اور ہندوستان کے بادشاہوں میں بھی ترک غلاموں کا عام رواج تھا۔ اور ترک غلاموں نے عروج حاصل کر کے ہندوستان میں بادشاہت بھی کی ہے۔ اس لئے ایاز ترک بچہ تھا کشمیری بچہ نہ تھا۔ مجالس العشاق کا مصنف لکھتا ہے:۔

"بریک نوبت صد و بیست غلام ترک آوردہ بودند۔ اکثر صاحب
جمال۔ و در حد اعتدال و ایاز یکے از ایشاں بود۔ چوں آں کاروان
غلاماں را بر غزنی رسانید مقربان ذوی البصیرہ را فرستادند
کہ آنچہ لائق باید بجہت بادشاہ بخرند و باقی را گذارند کہ بہر کس
کہ خواہند۔ فروشند۔"

مجالس العشاق کے مصنف کی تحریر کے مطابق غلام فروشوں کی یہ جماعت ۳۹۶ھ میں غزنی میں آئی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ ایاز ان ایام میں بیمار اور نحیف و کمزور تھا۔ تمام غلام بادشاہ کے لیے خرید لیے گئے۔ لیکن ایاز کو کمزور اور نحیف دیکھ کر خریدنے سے انکار کر دیا گیا۔ ایاز اپنی بدقسمتی پر روتا تھا اور اس ذلت پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ محمود کو خبر ہوئی۔ اس نے میر قافلہ کو واپس بلوایا۔ ایاز کو بے کس دیکھ کر اس کی حالت پر رحم کیا۔ اور فرمایا۔ میں نے ایک سو انیس غلام اپنے لیے خریدے اور اس کو محض خدا کے لیے خریدتا ہوں۔ چنانچہ صاحب مجالس العشاق لکھتے ہیں:۔

"حالت او را در دل سلطان تاثیرے تمام کرد۔ کسے را دوانیدہ
ایشاں را باز گردانید و فرمود کہ ایں یک صد و نوزدہ غلام را
برائے خود خریدم و ایں یکے را از بہر خدا مے خرم او را نیز بیع
کنند۔"

اس زمانے میں غلاموں کو غلام نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کو مختلف علوم و فنون سکھائے جاتے اور ان سے فرزندوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ کسی کو علوم دین پڑھائے جاتے کسی کو قرآن شریف حفظ کرایا جاتا۔ کسی کو فقیہہ و محدث بنایا جاتا۔ اور کسی کو کتابت کا کام سکھایا جاتا تھا۔ غلاموں کی زیادہ تعداد فوج خاص میں بھرتی کی جاتی جو بادشاہ کی خاص فوج سمجھی جاتی تھی۔ اور جو بادشاہ پر جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت سر بکف رہتی تھی۔

غلاموں کا دفتر اور محکمہ الگ ہوتا تھا۔ اور اس محکمے کا کوئی تعلق خزانہ یا وزارت سے نہ ہوتا تھا۔ ایاز غلاموں کے اس شاہی دستہ کا سالار تھا۔ محمود نے ایاز کی تعلیم و تربیت[2] کا بھی خاص اہتمام کیا۔ فرخی نے (۴۲۲ھ) کے قصیدہ مسعودیہ میں اور

---

[1] از مضمون مسٹر مشتاق احمد بھٹی۔ ایم۔ اے ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی۔ مندرجہ اورینٹل کالج میگزین۔
[2] مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف "خیام" کے صفحہ ۲۴۲ کے حاشیہ میں ایاز کے متعلق لکھتے ہیں "ابن رازی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابوالفرج رونی نے اپنے اشعار میں ایاز کی تیر اندازی اور شہسواری کے کمالات اور مختلف لڑائیوں میں اس کی شجاعت و زور آزمائی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایاز نے آداب مجلس، خدمت گذاری اور وفاشعاری کے علاوہ سپاہیانہ اوصاف میں بھی شہرت حاصل کر لی تھی۔

۴۲۱ھ میں محمود کی وفات کے وقت ایاز غزنی ہی میں تھا۔ محمود کے بعد اس کا فرزند محمد بعض امرا کی تحریک و اعانت سے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس وقت محمود کا دوسرا فرزند غزنی سے باہر نئے مفتوحہ علاقوں میں تھا۔ محمد چار ماہ تک داد عیش دیتا رہا۔ وہ عالم تھا علم نواز تھا لیکن رات دن راگ رنگ کی محفلیں گرم رکھتا تھا۔ اور ایاز اور اس کی جماعت کے جانباز جو فتوحات محمودی کا رنگ دیکھے ہوئے تھے ایک سرفروش اور قلعہ شکن بادشاہ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ آخر ایاز اور اس کی جماعت کی کوششوں سے مسعود کامیاب ہو گیا۔ ایاز کے ساتھ ہندو فوج کے سپہ سالار سوندھ رائے یا سرہند رائے نے جنگ کی لیکن سرہند رائے کے واقعہ قتل نے ایاز کو ظفر مند کر دیا۔ مسعود نے بادشاہ ہو کر اس کی بڑی قدر کی۔ چالیس ہزار دینار کے عطیہ کے علاوہ نسبت کا صوبہ جاگیر میں دیا اور قزدار کا خراج عطا کیا۔ فرخی لکھتا ہے ؎

خداوند جہان مسعود محمود	کہ او از زر ہمے بخشد بہ خروار
جز او را از ہمہ میران کرا داد	بہ یک بخشش چہل خروار دینار
بدو بخشند مال خطۂ نسبت	خراج خطۂ مکران و قزدار

تعجب یہ ہے کہ ایاز کی اس شجاعت اور وفاداری اور ان انعامات و عطایا کے باوجود جب احمد حسن میمندی وزیر سلطان مسعود نے ری کی گورنری کے لیے ایاز کا نام پیش کرتا ہے تو مسعود کہتا ہے :-

"ایاز از بس ناز و عزیز آمدہ است۔ ہر چند عاقل بچہ بر ماست از سرائے
و گرنہ بودہ گرم و سرد نہ چشیدہ است و بہ ہیچ تجربت نیفتادہ
است و نے را نباید کہ پیش ما باشد"

۴۲۲ھ میں ایاز کی عمر کا اندازہ چھبیس سال لگایا جاتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس عمر میں وہ کچھ زیادہ گرم و سرد چشیدہ نہ تھا۔ لیکن مسعود کے انکار کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسے سرفروش اور جاں نثار فدائی کو تخت نشین ہونے ہی مرکز سے دور بھیجنا پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ۳ ذی قعدہ ۴۲۷ھ کو (استقلال حکومت کاملہ کے بعد) جب اپنے فرزند امیر مجدود

نے ہفت اقلیم میں عوفی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایاز بابا افضل کاشانی کا جو ایک فاضل حکیم، صوفی اور محمود غزنوی کا ہمعصر تھا۔ شاگرد تھا، سلطان نے جب ایک مرتبہ بابا افضل کو قید کر دیا تو بابا نے سلطان کی مدح میں جو قصیدہ لکھا وہ ایاز ہی کی وساطت سے پیش کیا۔ اور اسی کی سفارش سے اس نے رہائی پائی۔ ساتھ ہی علامہ سید سلیمان ندوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ عوفی کی (ایک تصنیف) لب الالباب میں یہ بیان مجھے نہیں ملا۔ ممکن ہے ان کی کسی اور تصنیف میں ایاز اور بابا افضل کے تعلقات کا ذکر ہو۔

کو جو ابھی کم سن شاہزادہ مجدود بہ لاہور بھیجا گیا تو بقول فرشتہ وہ مجدود کا دست راست اور اتالیق تھا، اور سپہ سالار لاہور اور قاضی القضاۃ لاہور دونوں اس کے ماتحت تھے۔

لاہور کی از سر نو تعمیر در حقیقت اسی زمانہ میں ہوئی ہے۔ البیرونی اور بیہقی پنجاب کا دار الحکومت مندھوکور نام ایک شہر کو لکھتے ہیں۔ یہ مندھوکور کہاں تھا؟ شیخ محمد لطیف اپنی کتاب تاریخ لاہور میں تھامسن صاحب کے حوالہ سے اسے سیالکوٹ کے متصل بتاتے ہیں۔ بہر حال محمودی حملوں سے مندھوکور بالکل بے نشان ہو چکا تھا۔ اس لئے مسعود کے عہد کے بعد کی تاریخوں میں یہ نام کہیں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کی بجائے لاہور کا نام آتا ہے جس کی بنیاد ایاز نے رکھی تھی۔ اور جس کے متعلق خیر اللہ فدا لاہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

بانئے او ایاز محمود است

زین بنا حسن و عشق مقصود است

صاحب حدیقۃ الاقالیم و صاحب خلاصۃ التواریخ بھی لکھتے ہیں :-

"ملک ایاز بہ آباد ہیئے آن کوشیدہ و شہرے بہ تجدید

و قلعہ پختہ تعمیر یافت۔"

ایاز اور مجدود پنجاب سے آگے بڑھ کر ہانسی اور تھانیسر قبضہ میں لا چکے تھے۔ اور دہلی فتح کر کے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے خواب دیکھ رہے تھے کہ اس کو بڑے بھائی امیر مودود کے حملہ ہند اور باپ کے واقعہ قتل کی اطلاع ملی۔ یہ ۴۳۳ھ کے اواخر کا واقعہ ہے چنانچہ وہ ہانسی سے ۶ ذی الحجہ ۴۳۳ھ کو لاہور پہنچ گیا جہاں وہ عید الضحیٰ کی صبح کو دفعتہ اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی ابو النجم ملک احمد ایاز بھی لاہور میں انتقال کر گیا۔

تاریخ ہندوستان میں مولوی ذکاء اللہ اور دوسرے کئی مصنفوں نے فرشتہ کے ان الفاظ "ایاز نیز دریں چند روز وفات کرد" کے مطابق اس کا سال وفات ۴۳۳ھ ہی لکھا ہے لیکن مسٹر مشتاق احمد بھٹی ایم اے نے اپنے قابل قدر مضمون میں فرہنگ آنندراج کے یہ الفاظ "ایاز عمر معقول دریافتہ ——— در چہار صد و چہل و نہ وفات یافتہ" لکھ کر اس کو بائیس سال کی طویل مدت تک لاہور کا ناظم قرار دیا ہے اور طبقات ناصری کے انگریزی مترجم ریورٹی کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ فرخ زاد بن مسعود کے عہد میں جن مشہور آدمیوں نے وفات پائی ان میں ایاز بھی تھا۔[5]

مودود نے ۴۴۱ھ میں انتقال کیا۔ اور ۴۴۳ھ میں فرخ زاد کو غزنی کی حکومت نصیب ہوئی۔ ۴۳۳ھ سے ۴۴۳ھ تک ایاز کا نام تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر ریورٹی کا حاشیہ اور فرہنگ آنندراج کا متن دونوں صحیح ہیں یعنی اس عرصہ میں ایاز

؎ مآثر لاہور تالیف سید ہاشمی فرید آبادی کے صفحہ ۵۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اثیر نے بھی اس کا سال وفات ۴۴۹ھ اور مہینہ ربیع الاول دیا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

زندہ تھا تو اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیئے کہ ۱۰۴۱ء کے بعد محمود کی اولاد میں جو شاہانہ جنگیاں شروع ہوئیں وہ ان کی وجہ سے خانہ نشین ہو چکا تھا۔

ایاز کی تعریف (شجاعت و وفاداری وغیرہ) کے متعلق عنصری - فردوسی - فرخی اور غفاری وغیرہ شعراء نے قصائد لکھے ہیں اور محمود سے بارہا گراں قدر انعامات حاصل کئے ہیں۔ محمود نے فردوسی کو اسی کے ہاتھ شاہنامہ کا صلہ بھی بھیجا تھا۔ چونکہ وہ انعام حسب وعدہ طلائی سکوں میں نہ تھا۔ اس لیے فردوسی نے لوٹا دیا۔ اور بادشاہ کے خوف سے غزنی سے اس حالت میں بھاگ گیا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایاز نے چوری چھپے اپنے آدمیوں کے ہاتھ کچھ نقدی اور سامان سفر اس کو بھجوا دیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایاز کے مقبرہ کے ساتھ ایک وسیع باغ تھا جس کا کچھ وجود سکھ حاکمان لاہور کے زمانہ میں بھی موجود تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب وہاں سکے مضروب کرانے کے لیے ٹکسال بنایا اور چند عمارتیں تیار کرائیں تو باغ مٹ گیا۔ اسی ٹکسال کی وجہ سے جہاں یہ مزار واقع ہے اس کو ٹکسالی بازار کہتے ہیں۔ کشمیری بازار کے خاتمہ پر سامنے کی دو دکانوں میں گوبند عطار کی مشہور دکان کے پاس سے ایک مختصر اور تنگ سی گلی (بنام ٹکسالی بازار) ملک ایاز کی قبر کو جاتی ہے جو پیچ کھاتے ہوئے سوہا بازار کو نکل جاتی ہے۔ ایاز کی قبر سطح زمین سے بلند ایک چبوترہ پر ہے۔ جس کی لمبائی ۹ فٹ دس انچ اور چوڑائی سات فٹ چھ انچ ہے۔ احاطہ مزار میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ ہے جو چھوٹے سے صحن میں کھلتا ہے۔

۱۸۹۲ء میں[1] اس کی قبر پر کھجور کا ایک درخت تھا۔ لیکن اب درخت کی بجائے وہاں ایک لچہ کی بیل ہے جو مزار کی چوبی چھت پر چھائی ہوئی ہے۔ قبر کا تعویذ سیمنٹ کا ہے۔ اس پر غلاف پڑا رہتا ہے۔ مزار کے مغرب میں ایک چھوٹا سا مسجد نما بنا ہے۔ اس کی چھت بالکل معمولی ہے جو غالباً مرمت کے وقت بعد میں ڈالی گئی ہے۔

۱۸۸۴ء کا مصنف (رائے بہادر کنہیا لعل) اپنی تاریخ لاہور میں لکھتا ہے:-

"اس مزار کے ساتھ بہت بڑا احاطہ اور باغیچہ تھا۔ جو
بسبب گذشتنے عرصہ دراز کے ملیامیٹ ہو گئے اب بھی
بازار کی طرف کی کچھ دکانیں اس مزار سے متعلق ہیں"

آج ۱۹۲۴ء کا مصنف یعنی ناچیز راقم دیکھتا ہے کہ اس مزار کے ساتھ اس کے چھوٹے سے دروازہ کے پہلو میں ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں ایک درزی بیٹھتا ہے۔ جو پانچ روپیہ ماہوار کرایہ دیتا ہے۔ جس سے اس مزار کی مرمت وغیرہ ہوتی رہتی ہے۔

مزار کے سامنے الہ آباد بنک کا دفتر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ بہت بڑا کنواں ہے جو غالباً اس کے باغ کی آبیاری کے لیے بنایا گیا تھا۔ وہ ہندوؤں کے قبضہ میں ہے۔ اس مزار کے گرد و پیش کوچہ دھونیاں اور گلی بھنگناں

---

[1] خان بہادر محمد لطیف اپنی ہسٹری آف لاہور مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں اس درخت کا حوالہ دیتے ہیں۔

میں سب ہندو آبادی ہے[1]۔

گنجِ شہیداں

دیکھیے قرباں گہِ تسلیم کا منظر کبھی
دیکھیے لاہور میں گنجِ شہیداں دیکھیے

لاہور میں تین مقامات گنجِ شہیداں یا شہید گنج کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک گنجِ شہیداں موچی دروازہ کے باہر مقبرہ حضرت شاہ ابوالمعالی کے جنوب رویہ ایک بلند ٹیلہ پر ہے۔ جو کسی زمانہ میں بلکہ آج سے سو سال پیشتر لاہور کا ایک بہت بڑا قبرستان تھا اور قبرستان گنجِ شہیداں کے نام سے موسوم تھا۔

اس گنجِ شہیداں کے متعلق تحقیقاتِ چشتی (صفحہ ۱۰۵) میں یہ عجیب روایت درج ہے کہ "محمد بخش و امام بخش گلے زئیاں چوبداران مہاراجہ کھڑک سنگھ کی قبروں کی چار دیواری کے پاس دو قبریں حضرت امام جعفر و حضرت امام صادق کی ہیں۔ یہ دونوں قبریں خام ہیں، یہ بزرگ عہد سلطان محمود غزنوی میں لاہور آئے تھے۔ کافروں سے لڑتے رہے اور شہید ہو گئے۔ سر ان کا کافروں نے کاٹ لیا اور باقی جسم یعنی دھڑ برابر لڑائی میں مصروف رہا، یہ دھڑ جب لڑتے لڑتے اس جگہ آیا جہاں ان کی قبریں ہیں تو لوگوں نے تعجب سے کہا دیکھو بے سر بدن لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ دونوں دھڑ گر پڑے۔"

یہ ایسا ہی دلچسپ مگر غلط واقعہ ہے جیسا بی بی پاک دامنان کے متعلق مشہور ہے۔ یہی واقعہ یعنی بے بدن لڑنے کی داستان حضرت پیر ذکی رحمن کے نام پر لاہور کا ذکی دروازہ (بعد میں یکی دروازہ مشہور ہے) کے متعلق بھی زبان زد چلی آتی ہے حضرت امام جعفر اور حضرت امام صادق اور سلطان محمود غزنوی کا زمانہ اور لاہور کے راہبر سے دونوں اماموں کی جنگ۔ اس کے متعلق ع

چہ خوش گفت سعدی در زلیخا

کے سوا کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اسی شہید گنج کی چار دیواری کے ساتھ مصنف تحقیقاتِ چشتی کے ننہال کا قدیمی قبرستان ہے۔ ان کی والدہ کی قبر پر سرہانے کی طرف یہ اشعار تحریر ہیں ——

سیدہ بیگم چوں آں شیریں مقال — زیں جہاں گردید مہمانِ بہشت
سالِ وصلش جست چوں چشتی ز غیب — گفت ہاتف شاہ حورانِ بہشت

---

[1] یہ حالات حضرت فوق مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں لکھے تھے۔ افسوس کہ اگست ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو ۱۹۴۷ء کے فرقہ وار فسادات اور تقسیم ہندوستان سے پیدا شدہ حالات سے اس مزار اور اس کے اردگرد کی عمارتوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا بھی ذکر کرتے۔ سیلابِ انقلاب جب آتا ہے تو بڑی بڑی سر بفلک عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ یہی حال یہاں بھی ہوا۔ اب نہ الہ آباد بنک کا دفتر ہے نہ ہندوؤں کی آبادی۔ مکانات راکھ کا ڈھیر ہو چکے ہیں۔ کنواں پٹ کر سڑک کے نیچے دب چکا ہے۔ مزار کے ساتھ کی دکان ڈھے چکی ہے۔ احاطہ مزار وسیع ہو گیا ہے اور آس پاس بہت سی نئی عالی شان عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔ (مرتب)

ایک شہید گنج سکھوں نے ان سکھوں کے نام پر لاہور کے سٹیشن کے متصل چوک دارا شکوہ میں بنا رکھا ہے، جو نواب میر معین الملک معروف میر منو گورنر لاہور اور فرخ سیر بادشاہ ہند کے زمانہ میں اسی مقام پر قتل کئے گئے تھے، اس کا ذکر علیحدہ اپنے موقعہ پر ہوگا۔

تیسرا گنج شہیداں اس علاقہ میں ہے جو تکیہ سادھواں اور مسجد چینیاں والی تک پھیلا ہوا ہے اور مسلمانوں میں اصل گنج شہیداں اسی علاقہ کا نام ہے۔ اس گنج شہیداں کی قبریں کچھ تکیہ سادھواں میں تھیں کچھ مسجد چینیاں والی کے پاس اور کچھ بازار سریانوالہ معروف بازار حکیم دین شہید میں تھیں۔ اب تو صرف چار یا پانچ قبریں متفرق مقامات پر نظر آ رہی ہیں اور وہ بھی گلی کوچوں اور مکانات میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ قبریں شہر کے اندر بہت قدیم زمانہ سے تھیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ جب محمود نے لاہور شہر پر قبضہ کیا تو اس وقت جو مسلمان جہاں جہاں شہید ہوا وہیں اس کی قبر بنا دی گئی۔ چونکہ لاوارث تھیں۔ اس لئے مرور ایام سے ان قبروں کا انہدام شروع ہوا اور جس نے چاہا ان کی ہڈیوں پر اپنے مکانوں کی بنیادیں رکھ دیں۔

اس گنج شہیداں کا کچھ ذکر رائے بہادر کنہیا لعل نے تاریخ لاہور میں (صفحہ ۱۶۹ پر) اور مفتی غلام سرور لاہوری نے حدیقۃ الاولیا میں (صفحہ ۱۴۷ پر) کیا ہے۔ کنہیا لعل نے جو کچھ لکھا ہے وہ حدیقہ کے حوالہ سے لکھا ہے اور صاحب حدیقہ نے تحفۃ الواصلین کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ "مزار شہید گنج تکیہ سادھواں میں واقع ہے۔ اس مقام پر اگرچہ ایک قبر ہے مگر یہاں ہزارہا شہیدوں کی قبریں تھیں، بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں جب پنجاب کی حکومت غزنویہ کمزور ہوگئی تو راجہ اننگ پال جو راجہ جے پال کا بیٹا تھا۔ راجگان ہند کی فوج لے کر لاہور پر چڑھ آیا۔ چھ مہینے تک شہر کے تمام لوگ لڑتے رہے ہندوؤں نے ہزارہا مسلمانوں کو تہ تیغ کیا مسجدیں گرا دیں۔ اور بت خانے دوبارہ قائم کر دیئے لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد غزنی سے کمک آئی تو اننگ پال لاہور چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

مندرجہ صدر الفاظ تاریخ لاہور میں حدیقہ اور حدیقہ میں تحفۃ الواصلین کے حوالہ سے درج ہیں۔ لیکن ان واقعات کا تاریخ سے بظاہر کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بہرام شاہ (سال وفات ۵۴۷ھ) اپنی پینتیس یا چالیس سالہ طویل حکومت میں، بے شک کئی دفعہ ہندوستان میں آیا۔ لیکن کسی ہندو راجہ سے اس نے اس عہد میں لڑائی نہیں کی۔ بلکہ اس عرصہ میں وہ اپنے ہی سپہ سالاروں کی سرکشیوں کو دبانے کے لیے آیا۔ ۵۱۱ھ میں اس نے محمد باہلیم سپہ سالار لاہور پر حملہ کیا۔ اور اس کا قصور معاف کرکے پھر اس کو لاہور کا سپہ سالار مقرر کر دیا لیکن چند سال کے بعد محمد باہلیم نے مزید قوت حاصل کرکے پھر بغاوت کی اور ملتان میں اس نے بادشاہی افواج کا مقابلہ کرکے اپنے بیٹوں سمیت شکست کھائی۔ (تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ جلد اول صفحہ ۲۷۷)

البتہ اس سے سو سال یا کچھ زیادہ عرصہ پیشتر سلطان مودود بن سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے زمانہ (وفات مودود ۴۴۱ھ) میں دہلی کے راجہ نے دو تین اور راجاؤں کو ساتھ ملا کر پہلے ہانسی اور تھانیسر کو فتح کیا پھر قلعہ نگرکوٹ پر قبضہ کرکے دس ہزار فوج کے ساتھ لاہور کا محاصرہ کر لیا مسلمانوں پر بھی انھوں نے تشدد کیا۔ اور قریباً پانچ ہزار مسلمان انھوں نے گرفتار بھی کر لیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان مودود مغربی فتوحات میں مصروف تھا۔ اور پنجاب کے غزنوی امرا باہمی نااتفاقیوں سے

اپنی حکومت کو کمزور کرتے رہتے تھے، لیکن ہندو راجاؤں کی اس عظیم یلغار نے امرائے غزنویہ کی آنکھیں کھول دیں اور سب نے متفق ہو کر مقابلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کی لڑائی کے بعد راجاؤں میں اختلاف پڑ گیا۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور مسلمانوں نے اپنے پانچ ہزار قیدی ان سے چھڑا لیے۔ (تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ جلد اول صفحہ ۲۶۶)

اس لحاظ سے گنج شہیداں کے شہدا کا تعلق بہرام شاہ غزنوی کے عہد سے نہیں بلکہ سلطان مودود کے زمانہ سے ہے۔

سید احمد توختہ ترمذی

مٹ گیا ہوتا نشان قبر احمد توختہ
خدمت نامی سے پھر اس کو نمایاں دیکھئے

ترمذ ملک ترکستان میں ایک شہر ہے جس طرح اندراب کے سادات اندرابی مشہد کے مشہدی کہلاتے ہیں اسی طرح جو سادات ترمذ سے ہندوستان آئے وہ سادات ترمذی کہلائے۔ ترمذ میں سادات کی حکمرانی بھی رہی ہے آپ کا نام سید احمد تھا۔ ترمذ سے چونکہ ہندوستان میں آئے تھے۔ اس لیے ترمذی کہلاتے تھے۔ لیکن لاہور میں سید احمد توختہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ توختہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنے کھڑا ہونے کے ہیں۔ چنانچہ پیر فرخ بخش لاہوری لکھتے ہیں۔

آں در زماں کہ پا بہ طلب در نہادہ بود
در حکم شیخ خویش بپا ایستادہ بود

"بپا ایستادہ" رہنے کی توضیح میں لکھا ہے کہ ایک دن آپ کے مرشد نے آپ کو یاد فرمایا۔ آپ جب حاضر ہوئے تو شام کا وقت تھا۔ حجرہ کا دروازہ بند تھا۔ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع یا دستک دینے کو خلاف ادب سمجھ کر ساری رات حجرہ کی دہلیز کے پاس کھڑے کھڑے گزار دی کہ شاید شیخ یاد فرمائیں، جب صبح ہوئی اور آپ کے مرشد نے حجرہ کا دروازہ کھولا اور آپ کو باہر ایستادہ پایا تو "توختہ" کہہ کر مخاطب فرمایا۔ اسی دن سے آپ کا نام سید احمد توختہ مشہور ہو گیا۔ صاحب تاریخ جلیلہ (نامی صاحب) صفحہ ۹۵ پہ لکھتے ہیں کہ سید منصور علی شاہ اجنالوی کے خاندانی نوشتوں کے مطابق کہ سید احمد توختہ کے والد سید احمد تختہ شال رسول شہاب الدین غوری کے زمانہ میں لاہور آئے بلکہ لکھا ہے کہ ان کا مزار بھی لاہور ہی میں ہے۔ لیکن لاہور میں نہ ان کے مزار کا کسی کو پتہ ہے اور نہ کسی نے ان کے ورود لاہور کو تسلیم کیا ہے۔ جیسا کہ سردار اعظم مکران اور ان سے قبل لاہور کے مصنفین نے لکھا ہے کہ خود سید احمد توختہ لاہور تشریف لائے۔ قدیم مصنفین لاہور نے نہ ان کی اولاد و کور کا کہیں ذکر کیا ہے نہ اولاد اناث کا۔ البتہ نامی صاحب مصنف تاریخ جلیلہ نے اپنی خاندانی غیر مطبوعہ کتابوں کے حوالہ سے ان کی جس اولاد کا ذکر کیا ہے اس کا کچھ بیان مزار بی بی پاک دامناں کے سلسلہ میں ہوگا۔

آپ کا مزار اکبری دروازہ کے اندر محلہ چلہ بی بیاں میں واقع ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں عام قبرستانوں کے علاوہ شہر

؎ از تاریخ جلیلہ مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی لاہوری ص ۹۳ - ۹۴ -

کے اندر بھی اکثر نعشیں دفن کی جاتی تھیں جیسا کہ آج بھی لاہور شہر کے اندر بیسیوں قبریں اپنی قدامت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ اس لیے جس جگہ آپ مدفون ہیں وہاں یا تو آپ ہی کے زمانہ میں قبرستان تھا یا آپ کے دفن کیے جانے کے بعد وہاں قبرستان بن گیا۔ آپ کے ورود لاہور کا سال کسی نے بھی نہیں لکھا نہ آپ کی عمر کسی نے لکھی ہے۔ صرف صاحب حدیقۃ الاولیاء نے آپ کا سال وفات سنہ ۵۶۲ھ لکھا ہے۔ لیکن ماخذ نہیں بتایا کہ کہاں سے لیا ہے۔ مکران کے موجودہ سردار اعظم سردار بائے خان کے خط (مندرجہ تاریخ جلیلہ) سے واضح ہوتا ہے کہ سید احمد توختہ سلطان قطب الدین بادشاہ کیچ مکران کے زمانہ میں مکران میں کچھ عرصہ ٹھہر کر پھر لاہور آئے لیکن سلطان قطب الدین کس سنہ میں مکران کے بادشاہ تھے اس کا سردار اعظم کو بھی علم نہیں۔ البتہ ان کے پوتے شہزادہ عمیدالدین حاکم کا جو سید احمد توختہ کے نواسے تھے سال پیدائش سنہ ۵۰۷ھ لکھا ہے۔ اور شاہزادہ کی والدہ بی بی حاج کا سال وفات سنہ ۵۲۳ھ بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسی دوران میں سلطان قطب الدین بھی انتقال فرما گئے، اس سے ان کا سال وفات سنہ ۵۲۳ھ سمجھنا چاہیے اور چونکہ سید احمد توختہ کچھ عرصہ مکران میں قیام کر کے اور اپنی بیٹی حاج بی بی کو شاہزادہ مکران کے عقد میں دے کر خود لاہور چلے آئے تھے اس لئے یہ لکھنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ لاہور میں اس زمانہ میں آئے جب لاہور میں خسرو شاہ غزنوی (از اولاد محمود غزنوی) کی حکومت تھی۔ جو ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء سے سنہ ۵۹۸ھ تک رہی۔ اس لیے سید احمد توختہ کی آمد لاہور کا تعین سنہ ۵۶۰ھ کے قریب مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سید احمد توختہ کے مزار کی شرقی جانب مستری فضل دین کا مکان تھا۔ یہیں برسر کوچہ ایک پختہ قبر کسی نامعلوم الاسم کی اب تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ نامی صاحب تاریخ جلیلہ کے صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں مستری فضل دین مذکور نے اپنا نیا مکان بنانے کے لیے جب دیواریں گرائیں اور بنیادیں کھودیں تو ان بنیادوں سے بے شمار انسانی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ اور دو گنبدوں کے آثار بھی نکلے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے لڑکپن کے زمانے میں حضرت توختہ کے مزار کے باہر جانب جنوب ایک غار سا پڑ گیا تھا جو بہت گہرا تھا اور تہ خانہ سا معلوم ہوتا تھا۔ میرے والد صاحب نے وہ غار بند کرا دیا۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مزار ضرور تہہ خانہ میں ہوگا اور یہ تعویذ بطور نشان اوپر بنا دیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۳ء سے قبل یہ مزار نہایت خستہ حالت میں تھا۔ اندرونی و بیرونی دونوں فرش مٹ چکے تھے، دیواروں کا پلستر بھی اتر چکا تھا دروازہ بھی نہایت بوسیدہ تھا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی۔ مزار کے حجرہ اور برآمدہ کو اچھی طرح مسقف کرایا اور یہ ایک منزل بنا کر وہاں کتب خانہ رکھا۔ اور نیچے نمازیوں اور زائرین کی جائے آرام۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ۲ رجب سنہ ۱۳۳۲ھ کو مزار پر ختم قرآن ہونے کے بعد نامی صاحب کو دستار سجادہ نشینی باندھی گئی اور وہ اب تک اس مزار کی خدمت کرتے ہیں۔

بی بی پاک دامناں

گو ہیں پنہاں وہ نظر سے دل کی آنکھوں سے مگر
پاک دامن بی بیوں کے پاک داماں دیکھئے

بی بی پاک دامناں کا ذکر تحقیقات چشتی کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف یادِ رفتگاں (سنہ ۱۹۶۰ء) میں تفصیل سے لکھا

تھا۔ اس وقت تک سب کا یہی خیال تھا کہ ان بی بیوں میں جن کی تعداد چھ بتائی جاتی ہے۔ ایک بی بی حاج نام حضرت علیؓ کی بیٹی تھی اور پانچ بی بیاں ان کے بھائی حضرت عقیل کی صاحبزادیاں تھیں جو واقعہ کربلا کے بعد اپنی جان بچا کر لاہور آ گئیں اور لاہور میں چونکہ اس زمانہ میں ہندو راجگان کی حکومت تھی۔ اس لئے وہ ان کے خوف سے دعا کر کے زمین میں سما گئیں۔ راقم نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں صاحب تحقیقات کی اس تحقیقات کو ناقابل یقین سمجھ کر اس پر شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ اب مزید تفصیلی حالات (مندرجہ تاریخ جلیلہ) سے ظاہر ہوا ہے کہ ان بی بیوں میں جن کے نام تاج۔ حاج۔ حور۔ نور۔ گوہر اور شہباز تھے نہ کوئی حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھی نہ حضرت عقیل کی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جب لاہور میں کوئی مسلمان ہی نہ تھا تو ان کو اپنے وطن سے ہزارہا میل دور یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟ اور پھر وہ عورتیں اپنی تنہائی اور بے کسی کے عالم میں اتنی دور صحیح سلامت کس طرح پہنچ گئیں وہ لاہور کی نسبت تو شام یا حرمین الشریفین میں جا کر زیادہ محفوظ رہ سکتی تھیں جو کہ کربلا سے نزدیک تر مقامات تھے یا ہو ہیں تو ان کی کوئی زبان بھی نہ جانتا تھا۔ پھر تاج۔ گوہر اور شہباز وغیرہ نہ عربی نام ہیں نہ اس زمانہ کے عربوں میں یہ نام مروج تھے۔

تاریخ جلیلہ (مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی) میں جو خط سردار اعظم مکران کا درج ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت سید احمد توختہ جب ترمذ سے کیچ مکران پہنچے تو ان کے ہمراہ ان کی دو صاحبزادیاں بی بی حاج اور بی بی تاج تھیں، بی بی حاج کا نکاح آپ نے شہزادہ مکران سلطان ہمام الدین (خلف سلطان قطب الدین) سے کر دیا اور اس کام سے فارغ ہو کر آپ لاہور روانہ ہو گئے۔ آخر آپ مکران میں چند سال ٹھہرے ہوں گے۔ بادشاہ مکران نے آپ کی علمی فضیلت اور خاندانی بزرگی کی وجہ سے آپ سے رشتہ لینے کا سوال کیا ہوگا۔ اس وقت بی بی حاج کی عمر ۱۷ - ۱۸ سال سے کیا کم ہو گی۔ مورخین لاہور نے لکھا ہے کہ اس بی بی کے بطن سے سلطان حمید الدین حاکم سنہ ۵۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور سردار مکران اپنے خط میں اور صاحب تاریخ جلیلہ صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں کہ ابھی وہ تین ہی سال کے تھے کہ بی بی حاج کا مکران ہی میں انتقال ہو گیا۔ لیکن قبر آپ کی لاہور میں بتائی جاتی ہے اور لاہور کے محلہ چہلہ بی بیاں[1] کی آپ سرتاج بیان کی جاتی ہیں جو کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء اور صاحب تاریخ جلیلہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بی بی حاج اور تاج وغیرہ کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ حضرت علیؓ یا حضرت عقیل کی صاحبزادیاں ہیں۔ لیکن لاہور میں اس عام روایت کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بی بیاں دشمنوں کے خوف سے اپنی عزت و عصمت کو بچانے کے لیے زمین میں زندہ سما گئیں۔ صاحب تاریخ جلیلہ صفحہ ۹۹ پر ان بی بیوں کے زمین میں سما جانے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے قبل صفحہ ۴۶ پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ "سیادت پناہی بی بی حاج شہزادہ حمید الدین کو تین سال کی عمر میں چھوڑ کر انتقال فرما گئیں" نیز اپنی تاریخ میں وہ کیچ مکران کے موجودہ رئیس سردار بائے خاں کا جو خط نقل کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بی بی حاج نے اس زمانہ میں انتقال کیا جب ان کے فرزند

---

[1] یہ محلہ اندرون اکبری دروازہ لکڑ منڈی کے متصل واقع ہے۔ اسی محلہ میں خانقاہ سید احمد توختہ اور پیر غلام دستگیر نامی کا مکان اور چہلہ بی بیاں واقع ہیں۔ اسی محلہ میں خواجہ کمال الدین مسلم مشنری ووکنگ (انگلستان) اور خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ایم۔ اے پی ایچ ڈی کے قدیم مکانات تھے۔

حمید الدین کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ اور چونکہ سید احمد توختہ اپنی صاحبزادی بی بی حاج کا نکاح شہزادہ بہاؤ الدین سے کرنے کے بعد لاہور چلے آئے تھے۔ اس لیے منکوحہ ہونے کی وجہ سے بی بی حاج بھی انہی میں رہیں اور وہیں ان کے ہاں چار فرزند ہوئے جن میں سب سے چھوٹے شہزادہ حمید الدین تھے۔ اور وہیں بی بی حاج کا انتقال ہوگیا چونکہ سب نے شہزادہ حمید الدین کی ولادت سنہ ۵۰۰ھ لکھی ہے اور اس کے تیسرے سال بی بی حاج کا انتقال ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا سال وفات ۵۰۳ھ سمجھنا چاہیئے۔

لیکن تعجب ہے کہ اس پر بھی ان کی قبر لاہور میں بتائی جاتی ہے اور ان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ آپ زمین میں سما گئی تھیں مگر یہ صحیح ہے کہ لاہور گزٹیر شاہو میں بی بیاں صاحب کے نام سے ایک بہت قدیم قبرستان موجود ہے۔ دارا شکوہ بھی سکینۃ الاولیاء میں بی بی حاج۔ تاج کے قبرستان کا ذکر کرتا ہے۔ اور وہ اس کا جائے وقوع شہر کے جنوب میں موضع بھیکو وال کے نزدیک بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس قبرستان میں بیر کے ایک درخت کے نیچے حضرت میاں میرؒ بیٹھا کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے تین سو سال پیشتر بھی یہ مقبرہ بی بی حاج و تاج یا بیوی صاحبان کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن ثابت نہیں ہوتا کہ بی بی حاج بھی یہیں دفن ہیں اور پھر زمین میں زندہ سما جانے کے واقعہ پر محض خوش عقیدہ اور کرامت پسند لوگوں کو ہی یقین آسکتا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ

جس خزانے سے ملی دولت ایماں اجمیر کو
آئیے لاہور میں وہ گنجِ عرفاں دیکھئے

حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ کے سوانح عمر حضرت فوق مرحوم کے قلم سے طبع ہو چکے ہیں۔ بلکہ یہ کتاب دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں طبع ہوئی دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں۔ قریباً پونے دو سو صفحے کی کتاب ہے لیکن اس غیر مطبوعہ کتاب میں جس کا نام "مآثر لاہور" ہے۔ چونکہ لاہور کے تمام مشہور مزاروں اور باغوں کا حال درج ہے۔ اس لیے مختصر طور پر اس میں بھی حضرت کے سوانح اور ان کے مزار کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ خصوصاً گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں حضرت کے مزار کے ارد گرد بعض نئی تعمیرات نے جو اضافہ کر دیا ہے۔ ان کا ذکر از دیادِ معلومات اور یادگار کا باعث ہوگا۔ (مرتب)

حضرت کا اصل نام ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی ہے۔ وطن غزنی تھا چونکہ غزنی کے محلہ ہجویر میں رہتے تھے۔ اس لیے ہجویری الغزنوی کہلاتے تھے۔ حضرت شیخ ابوالفضل بن حسن الختلی کے مرید تھے۔ اور انہی کے ارشاد کے مطابق پینتیس چالیس سال کی عمر تھی کہ ۴۳۱ھ[1] میں غزنی سے لاہور تشریف لائے۔ یہ زمانہ سلطان مسعود بن سلطان محمود کا تھا۔ آپ سے پہلے یہاں آپ کے

---

[1] حضرت علی ہجویریؒ سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں اس کی وفات (۴۲۱ھ) سے قریباً دس سال بعد (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پیر بھائی شاہ حسین زنجانیؒ (جن کا مزار کھوتی میران لاہور میں ہے) لوگوں کی ہدایت و تبلیغ اسلام کے لیے موجود تھے۔ لیکن جس دن آپ لاہور پہنچے۔ اسی دن ان کا انتقال ہوا۔ آپ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ اس واقعہ کی تفصیل سکینۃ الاولیاؒ۔ فوائد الفواد اور خزینۃ الاصفیا میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے لاہور سے پہلے آپ کے پیر بھائی خواجہ حسین زنجانیؒ لاہور میں موجود تھے۔ لیکن آپ کے مرشد نے جب ایک دن آپ کو لاہور جانے کا حکم دیا تو آپ نے جواب میں عرض کیا۔

"برادرم حسین زنجانیؒ پیش ازیں در لاہور مامور است

حالا در ما موریت بندہ چہ حکمت است"

شیخ ابوالفضلؒ آپ کے مرشد نے فرمایا۔

"بروید۔ در آں جا ساکن شوید ترا بہ سبیل حکمت

چہ کار"

چنانچہ آپ حسب ایماء مرشد لاہور آئے۔ رات کا وقت تھا۔ آپ نے رات کہیں گزاری۔ صبح دیکھا کہ لوگ کثیر تعداد میں ایک جنازہ لیے جا رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاہ حسین زنجانیؒ کا جنازہ ہے۔ یہ سن کر آپ مرشد کے فرمان کی حکمت اور رمز کو پہنچ گئے۔

لاہور میں آپؒ نے اپنی جائے اقامت کے پاس ایک مسجد تعمیر کرائی۔ شہزادہ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاؒ میں لکھا ہے کہ "مسجدے کہ خود ساختہ بودند محراب آں نسبت بہ مساجد دیگر مائل بہ سمت جنوب است"۔ یعنی جو مسجد آپؒ نے تعمیر کرائی اس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوب کی طرف مائل تھا۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا۔ کہ قبلہ صحیح نہیں۔ آپ نے علما کو موقعہ پر آنے کی دعوت دی اور خود امام بن کر نماز پڑھائی "بعد از نماز بہ حاضراں گفتند کہ نگاہ کنید کہ کعبہ بہ کدام سمت است۔ حجاب ہا از میان برخاست و کعبہ مجازی نمودار گشت"۔ یعنی نماز کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اب دیکھو کعبہ کس سمت ہے۔ تمام حجاب درمیان سے اٹھ گئے اور کعبہ سامنے نظر آنے لگا۔ غرض قبلہ کو اپنے سامنے بالمشافہ موجود پا کر تمام علماؒ نے معذرت طلب کی اور اس کرامت کی بدولت آپ کی شہرت دور و نزدیک سب جگہ پھیل گئی۔

آپ کا سلسلہ رشد و ہدایت اخیر دم تک جاری رہا۔ کشف المحجوب اور کشف الاسرار تصوف میں آپ کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ رائے راجو ایک ہندو سالار جو غزنوی کی طرف سے یہاں ایک معزز عہدے پر تھا۔ اس نے آپؒ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا۔ نام اس کا شیخ ہندی رکھا گیا۔ آپ کے روضہ کے موجودہ متولی اور مجاور اسی بزرگ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کا لقب گنج بخش مشہور ہے۔ اس کے متعلق یہ روایت عام ہے۔ کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے یہاں چلہ کاٹ کر اور

لاہور آئے اور سلطان ابراہیم کے زمانہ (۴۵۱ھ تا ۴۸۶ھ بقول بعض ۴۹۲ھ) میں وفات پا گئے۔ مسعود سے ابراہیم تک حسب ذیل بادشاہ غزنی کے تخت پر بیٹھے۔ امیر مودود (مسعود بن مودود (صرف چار یوم) بہاء الدولہ۔ ابوالحسن علی بن مسعود بن محمود (دو سال) سلطان عبدالرشید بن محمود (ایک سال) طغرل نمک حرام (۴۰ یوم) فرخ زاد (۴۴۳ھ تا ۴۵۱ھ) اس کے بعد ابراہیم۔

منکشف ہو کر فیض حاصل کیا۔ تو آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

اس پر آپ کا نام گنج بخش مشہور ہو گیا۔ لیکن آپ کی کتاب کشف الاسرار سے ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کا یہ نام مشہور ہو چکا تھا چنانچہ آپ اس کتاب میں خود لکھتے ہیں :-

اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے۔ حالانکہ تیرے
پاس ایک حبہ بھی نہیں۔ گنج بخشی تو اسی کو سزاوار ہے
جو مالک الملک ہے !!

حضرت علی ہجویری کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ اس وقت سلطان ابراہیم غزنوی افغانستان اور پنجاب کا بادشاہ تھا۔ اسی بادشاہ نے آپ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔ شہزادہ دارا شکوہ لکھتا ہے۔ کہ ہر جمعہ کو خلقت انبوہ در انبوہ روضہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے۔ گویا نو سو سال سے ہر جمعرات کو بے شمار مخلوق آپ کے مزار پر فاتحہ کے لیے جاتی ہے۔ اور اس مزار پر جسے عوام "دربار صاحب" کہتے ہیں میلہ سا لگ جاتا ہے۔

آپ کے احاطہ مزار کے اندر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے حجرۂ اعتکاف اور مسجد کے علاوہ نواب امام الدین صوبہ کشمیر کی قبر اور کئی اور قبریں ہیں۔ بیرونی عمارتوں میں دانی چند کور کا تعمیر کردہ دالان، مقبرہ نواب میر مومن خان، (تعمیر ۱۸۰۸ء) قبر نواب غلام محبوب سبحانی اور مسجد بنا کردہ میاں غلام رسول کھٹہ الاقابلِ ذکر ہیں۔

آپ کے مزار پر پہلے گنبد نہیں تھا۔ ۱۲۷۸ھ میں حاجی نور محمد نام ایک بزرگ نے گنبد تعمیر کرایا اور مسجد قدیم کو گلزار شاہ فقیر کی حسنِ سعی سے دوبارہ مرمت نصیب ہوئی۔

حضرت خواجہ اجمیریؒ کے علاوہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور کئی دیگر مشائخ نامدار یہاں سے فیوض و برکات حاصل کر چکے ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے بھی اس مزار پر انوار پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔ میر عبدالعزیز زنجانی اس مزار کے متعلق لکھتے ہیں ؎

مزار در نثار شاہ ہجویری ندیدستی
کہ نخل آسا بہ پیرانوش جوش قلس مجال بینی
گدائے درگہش از منزلت شاہ جہاں یابی
غلام خادمش از مرتبہ مخدوم جہاں بینی

مقبرہ کی طرف جانے کا راستہ اور فرش، دروازہ کا چوکھٹہ، اس کے دائیں بائیں کے چبوترے اکبر ہی کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کے عہد میں بہت سے مقبرے اور مسجدیں منہدم ہو گئیں۔ اس مزار پر عرس کے موقع پر جو ہر سال ۲۰ صفر المظفر کو ہوتا ہے ایک ہزار روپیہ نقد بطور نذر بھیجا کرتا تھا اور اپنے طویل عہد میں اس نے چند بار اس مزار کی مرمت بھی کرائی

سمت ۱۸۹۵ب میں مہارانی چند کور رانی مہاراجہ کھڑک سنگھ نے احاطہ مزار کے اندر ایک شاندار دالان اپنے صرف سے تیار کرایا۔ جو اب تک موجود ہے۔

چند سال ہوئے میاں غلام رسول کھوڑ والے نے یہاں ایک عالیشان مسجد قریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی۔

[اس مسجد کے دروازے پر علامہ اقبالؒ کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۱۳۴۰ھ میں از سر نو تعمیر ہوئی تھی ـــ

سال بنائے حرم مومناں — خواہ ز جبریل و ز ہاتف مجو
چشم بہ "المسجد الاقصیٰ" فگن — "الذی بارکہ" ہم بگو
[illegible] ھ [illegible]

مادہ تاریخ میں قرآن کریم کے پندرھویں پارہ کی ابتدائی آیت کی طرف اشارہ ہے "المسجد الاقصیٰ" اور "الذی بارکہ" دونوں ٹکڑوں کے عدد ملانے سے سال تاریخ سنہ ۱۳۴۰ھ حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ ان زندہ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے عظیم علمی کارنامے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکے پھر بھی جو کچھ ہم تک پہنچ سکا۔ اس سے ان کی عظمت اس طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ صوفیہ متقدمین و متاخرین میں ان کی مثال تلاش کرنا آسان نہیں۔ ان کی علمی استعداد کے متعلق مصنفین اجمالاً ایک فقرہ لکھتے ہیں کہ "جامع بود میان علوم ظاہر و باطن" اور کشف المحجوب کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے اگرچہ ملا جامیؒ نے اپنی کتاب نفحات میں دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اور مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا میں کشف المحجوب کی بے حد تعریف کی ہے مگر ان تمام اقوال سے زیادہ موثر اور جامع قول حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلوی کا وہ ملفوظ ہے جو غیر مطبوعہ "درر نظامی" میں ملتا ہے فرماتے ہیں:۔

"کتب تصوف میں شیخ علی ہجویریؒ کی کتاب "کشف المحجوب"
کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اگر کسی طالب صادق کو مرشد کامل نہ مل
سکے۔ اسی کتاب کو مطالعہ کرے۔ اس کی مراد پوری ہو جائے گی میں
نے خود اس کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔"

(بحوالہ تصوف اسلام از مولانا عبدالماجد دریابادی)

یہ ہے شیخ علی ہجویریؒ کا وہ کارنامہ جس کی وجہ سے آپ آسمان صدق و صفا پر مہر درخشاں کی طرح چمک رہے ہیں۔ آپ نے اس کتاب کا آغاز ہی علم سے کیا ہے اور علم باطن یا طریقت کے ساتھ علم ظاہر یا شریعت کو نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"علم ظاہر سے مراد معاملات کا علم ہے اور علم باطن سے مقصد نیت کا صحیح کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان دو میں سے صرف ایک کو حاصل کرے تو وہ قطعی ناکام رہے گا۔ کیونکہ ان دونوں کو حاصل کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اگر علم ظاہر حاصل کر لیا اور باطن کی پیدا

نہ کی تو یہ منافقت ہوگی اور اگر صرف باطن کے درپے ہوا۔ (اور ظاہری علم سے بے نیاز رہا۔ تو یہ الحاد و زندیقیت ٹھہری۔ باطن کے بغیر
صرف ظاہری شریعت نقص ہے اور ظاہری شریعت کے احکام کو سمجھے اور عمل کئے بغیر صرف باطن پر قناعت ہوا و ہوس ...... انبیاء اور
اولیاء کو بھی علم ہی کے ذریعے اللہ تعالٰے کی معرفت حاصل ہوئی۔ کوئی شخص علم سے بے نیاز رہ کر وادیٔ عرفان و سلوک میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"بقول محمد بن فضل علم کی تین قسمیں ہیں۔ علم من اللہ۔ علم مع اللہ۔ علم باللہ۔ آخری علم، علم معرفت ہے جس کے ذریعے انبیاء و اولیاء
نے اللہ تعالٰے کو پہچانا۔ اس کے بغیر وہ بھی اس کو نہ جان سکے۔"

"علم من اللہ سے مراد علم شریعت ہے۔ یعنی اللہ تعالٰے کے احکام و فرائض کا علم اور علم مع اللہ طریق حق کے مقامات اور اولیاء
کے درجات کا علم ہے۔ اور شریعت کو قبول کئے بغیر معرفت درست ہو ہی نہیں سکتی جس کو معرفت کا علم نہیں ہوتا اس کا دل جہالت کی موت کا شکار
ہے۔ اور جسے علم شریعت حاصل نہیں۔ وہ نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔"

ایک جگہ خدا رسیدہ بزرگوں کے آداب کی تصریح اس طرح فرماتے ہیں:۔ "سالک وہ ہے جو ہر حال میں احکام الٰہی کی پیروی
کرے۔ بندوں کا حق ادا کرے کسی شیخ کا مرید ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کے لیے ہلاکت ہے۔ وہ ہر درویش کا بعزت خیر مقدم کرے۔
اس کا سفر یا تو بہ نیت حج ہو یا برائے جہاد یا تحصیل علم کے لئے یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کے ارادہ سے۔ اس کا کھانا پینا حلال
ہو اور اتنا جتنا مریض کھاتے ہیں۔ دنیا دار کی دعوت قبول نہ کرے۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو سوئے۔ خاکساری اور تواضع سے چلے۔
رعونت اور تکبر سے کنارہ کش رہے۔ خاموشی اختیار کرے۔ کہ یہ گفتار سے بہتر ہے لیکن زبان پر حق جاری ہو۔ جو کچھ مانگے خدا سے مانگے۔
مجرد رہنا سنت کے خلاف ہے۔ اور اس حالت میں نفسانی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے۔ مگر جس سالک کا ارادہ خلقت سے دور
رہنے کا ہو۔ اس کے لیے مجرد رہنا زینت ہے۔"

کشف المحجوب کے آخر میں سماع پر بحث ہے۔ حضرت ہجویریؒ کے نزدیک سماع جائز ہے مگر اس کے لیے حسب ذیل
شرطیں ہیں:۔

سالک بلا ضرورت سماع نہ سنے اور طویل وقفہ کے بعد سنے تاکہ اس کی تعظیم دل میں قائم رہے۔ محفل سماع میں مرشد موجود ہو۔
عوام شریک نہ ہوں۔ قوال فاسق نہ ہوں۔ سماع کے وقت دل دنیاوی علائق سے پاک ہو۔ طبیعت لہو و لعب کی طرف مائل نہ ہو۔ اگر وجد
کی کیفیت طاری ہو جائے تو اس کو تکلف کے ساتھ نہ روکے۔ اور یہ کیفیت جاتی رہے۔ تو تکلف کے ساتھ اس کے جذب کرنے کی
کوشش نہ کرے۔ وجد کے وقت کسی سے مساعدت کی امید نہ رکھے۔ اور کوئی مساعدت کرے تو اس کو نہ روکے۔ قوال کے گانے کی
اچھائی اور برائی کا اظہار نہ کرے۔ محفل سماع میں لڑکے نہ ہوں۔

حضرت ہجویریؒ نے سماع کے وقت رقص کو کسی حال میں بھی پسند نہیں کیا۔

کشف المحجوب اور کشف الاسرار کے علاوہ حضرت کی تصنیفات سے حسب ذیل کتابوں کے نام ملتے ہیں:۔
(۱) منہاج الدین (اس میں اہل صفہ کے مناقب لکھے تھے) دوسری کتابوں کے مضامین ان کے نام سے ظاہر ہیں (۲) کتاب الفناء
والبقاء (۳) اسرار الخرق والمؤنات (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) بحر القلوب (۶) الرعایۃ لحقوق اللہ۔
لیکن ان کتابوں کا اب کہیں وجود نہیں۔ چونکہ آپ شہرت سے دور بھاگتے تھے اس لئے جو کتابیں آپ نے اپنے نام کے

انھیں بھی اپنی مطلب پرستی اور نا اہل لوگوں نے انھیں اپنا لیا اور وہ اس طرح قعرِ گمنامی میں چلی گئیں —— مرتب]

سید یعقوب زنجانیؒ

گو گذشتہ دور کی سی وہ نہیں رونق کوئی
پھر بھی فیضِ قبرِ شاہ صدر دیوان دیکھئے

تحقیقاتِ چشتی اور تاریخ لاہور (کنہیا لال) میں لکھا ہے کہ آپ ۵۳۰ھ میں بعہد سلطان بہرام شاہ غزنوی[1] سید شاہ حسین زنجانی اور شیخ المشائخ سید اسحاق زنجانی[2] کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں مصنفوں نے شاہ حسین کی وفات ۴۳۱ھ لکھی ہے۔ بلکہ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) کے مصنف سید محمد لطیف اور راقم نے بھی سوانح داتا گنج بخشؒ میں شاہ حسین زنجانی کا سال وفات ۴۳۱ھ ہی لکھا ہے اور اسی پر سب مصنف متفق ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ مذکورہ دونوں مصنفوں کا یہ بھی تسلیم کرنا کہ شاہ حسین زنجانی ۴۳۱ھ میں وفات پا گئے اور یہ بھی لکھنا کہ وہ ۵۳۰ھ میں بعہد سلطان بہرام شاہ لاہور آئے کس طرح درست ہو سکتا ہے بلکہ تحقیقاتِ چشتی کے مصنف نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ "ان ہرسہ زنجانی بزرگوں کے ساتھ شیخ علی الحق بھی جن کا مزار سیالکوٹ میں ہے اور جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے تشریف لائے تھے"۔ لیکن جب تاریخ کی چھان بین کی جائے تو یہ واقعہ بھی ہر طرح غلط نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ سیالکوٹ کی تاریخوں میں امام علی الحق کی آمد کا ذکر سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ سلطان فیروز شاہ بعمر پچاس سال ۷۵۲ھ میں دہلی کا بادشاہ ہوا۔ ۷۸۹ھ میں عالم پیری کی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں اس نے اپنے فرزند کو سلطنت سونپ دی اور ۱۳ رمضان ۷۹۰ھ کو پیر نود سالہ ہو کر اس نے انتقال کیا۔

شاہ یعقوب زنجانی اور ان کے ساتھی شاہ حسین زنجانی محمود یا مسعود اول کے زمانہ میں لاہور تشریف لائے۔ شاہ حسین زنجانی تو ۴۳۱ھ میں انتقال فرما گئے۔ شاہ یعقوب زنجانی کا سال وفات صاحب تحقیقاتِ چشتی و صاحب تاریخ لاہور ۴۶۰ھ لکھتے ہیں جو قرینِ قیاس نہیں۔

تحقیقاتِ چشتی میں ان کے مزار کی متعلقہ عمارات و قبور کا مفصل حال درج ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ احاطہ مزار کی قبروں کے علاوہ یہاں وارثانِ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور قاضیانِ لاہور کے قبرستان بھی تھے۔ مزار کے مغرب کی طرف قصاب خانہ اور مزار کے متصل پہلوانوں کا اکھاڑہ تھا۔ قبر پر سنگِ مرمر کا تعویذ تھا اور ایک نشست گاہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی تھی۔ جہاں انھوں نے مزار حضرت علی ہجویریؒ کی طرح اعتکاف کیا تھا۔ اس زمانہ میں (یعنی آج سے نوے سال قبل) پرانی مسجدوں کے آثار باقی تھے۔ مشرقی جانب سبزی منڈی تھی جس کی وجہ سے یہاں بہت رونق رہتی تھی۔ اسی طرف دیوان رتن چند داڑھی والے کا تالاب تھا اور اس کے لیے بھی احاطہ مزار سے کچھ زمین لے لی تھی۔ خانقاہ کے محرابی دروازہ میں سنگِ سیاہ تھا۔

---

[1] بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن مسعود اول بن محمود غزنوی اپنے بھائی ارسلان شاہ کو قتل کرنے کے بعد ۵۱۱ھ میں بادشاہ بنا اور طویل حکومت کے بعد اس نے ۵۵۲ھ میں انتقال کیا۔ [2] سید اسحاق زنجانی کے نام سے لاہور میں کسی بزرگ کا کوئی مزار نہیں ملتا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد ۱۸۸۴ء کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال لکھتا ہے "یہ چبوترے کے غرب کی سمت پختہ عمارت ایک عالی شان مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس کی تین محرابیں متصل ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی وہاں کئی عمارتیں ہیں۔ پہلے ہر جمعرات کو یہاں میلہ ہوتا تھا۔ اب ہر سال ۱۶ رجب کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ لیکن اب کچھ چرچا نہیں۔ کیونکہ دونوں طرف سے لالہ رتن چند کے تالاب اور ان کی سرائے نے مزار اور اس کی متعلقہ عمارتوں کو چھپا دیا ہے۔"

اب معلوم نہیں اس مزار کی متعلقہ زمینیں متولیوں نے بیچ دیں یا لوگ خود بخود قابض ہوتے گئے۔ راقم نے ۱۹۰۲ء میں وہاں جو کچھ دیکھا آج (۱۹۶۲ء) میں وہ بھی نظر نہیں آیا۔ جنگلہ کا کٹہرا لکڑی کا تھا۔ مسجد تو وہاں کوئی نہ تھی۔ لیکن معدوم سے آثار ضرور تھے۔ قصاب خانہ اور کشتی گیروں کے اکھاڑے نابود ہو چکے تھے۔ قصاب خانہ غالباً اس زمانہ میں یہاں سے اٹھایا گیا جب ۱۸۸۱ء میں میو ہاسپٹل اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع ہوئی۔ قبرستان بھی اس زمانہ میں بند ہو چکا تھا۔ احاطہ مزار کی جو زمین دیوان رتن چند کی سرائے اور تالاب سے بچ سکی وہ یار لوگوں کے کام آئی چنانچہ اب وہاں کئی مکانات موجود ہیں۔ انہیں میں خانقاہ کے متولی بھی رہتے ہیں۔ کچھ زمین زنانہ ہسپتال والوں نے لے لی۔ سرائے رتن چند ہی میں سبزی منڈی لگتی تھی۔ جب ۱۹۲۷ء میں لاہور میں ہندو مسلمانوں کا فساد عظیم ہوا تو ہندوؤں نے سبزی منڈی بیرون موچی دروازہ کا بائیکاٹ کر کے اس سرائے میں ایک ہندو سبزی منڈی قائم کر لی تھی۔ چونکہ وہ ہنگامی جوش تھا قائم نہ رہ سکی۔ اب وہاں ماڈل ٹاؤن اور دوسری بس کمپنیوں کا اڈا ہے۔

شاہ صدر دیوان کا مزار اب نظروں سے بالکل پوشیدہ ہے۔ میو ہسپتال کی شمالی دیوار کے سامنے ایک چھوٹی سی تنگ گلی ہے۔ اس گلی کے اوپر لکھا ہوا ہے "راستہ درگاہ حضرت سید یعقوب شاہ صدر دیوان" اس راستہ کے دائیں طرف سرائے رتن چند کی پشت اور بائیں ہاتھ کو شمالی و مغربی جانب زنانہ ہسپتال کی طویل دیوار ہے۔

خانقاہ کے محرابی دروازہ سے گزر کر ایک پختہ چار دیواری کے اندر شاہ صدر دیوان کا ایک چبوترہ پر مزار ہے۔ اس چبوترہ کا جنگلہ اور چبوترہ کی قبروں کی مرمت اور چبوترہ کا فرش ایک کشمیری نے ۱۳۶۰ھ میں خشتی تعمیر کرایا تھا اس کا نام تاج دین ولد فضل الدین ڈنڈوالا تھا۔ چبوترہ پر پانچ قبریں ہیں تین قبروں کے بعد حضرت صدر دیوان کا مزار ہے اور ان کے بعد اسی چبوترہ پر ایک اور قبر ہے آپ کی قبر دوسری قبروں سے ذرا بلند ہے۔ جنوب کی طرف ایک بوسیدہ سے چبوترہ پر گیارہ قدیم قبریں ہیں اور پرانے وَن کے درخت ہیں۔ پیپل کا درخت بھی حال ہی میں لگایا گیا ہے چار دیواری سے باہر خانقاہ کے دروازہ کے ساتھ ہی شمال کی طرف ایک کنواں ہے اور بڑ کا درخت ہے اس وقت آپ کے مزار کے ساتھ نہ کوئی مسجد ہے نہ کسی مسجد کے آثار ہی[1] ہیں نہ خواجہ اجمیریؒ کی اعتکاف گاہ ہے۔

جہاں آپ کا مزار ہے یعنی شاہ عالمی دروازہ کے باہر سرائے رتن چند اور زنانہ ہسپتال کے درمیان وہاں زمانہ قدیم میں محلہ یا طلا بخاری کے نام سے ایک متمول محلہ آباد تھا۔ تاریخ لاہور (مفتی تاج الدین) میر غلام علی آزاد بلگرامی صاحب خزانۂ عامرہ نے شاہ فقیر اللہؒ قریب لاہوری کے ساتھ اسی محلہ میں ملاقات کی تھی۔ آپ کے متعلق وہ لکھتے ہیں "در محلہ بخارائے لاہور سکونت داشت" صاحب تذکرۃ الاخیار سید نجم الدین

البتہ سید اسحاق گازرونی کا مزار مسجد وزیر خاں کے صحن میں موجود ہے اور وہ شاہ حسین زنجانی کی وفات کے بہت عرصہ بعد لاہور میں آئے۔ ان کے حالات علیحدہ لکھے گئے ہیں۔

[1] مسجد اب دوبارہ تعمیر ہو گئی ہے۔ (مرتب)۔ [2] یہ تذکرہ بزمانہ محمد شاہ ۱۱۴۵ھ میں لکھا گیا۔

المعروف بہ علی الاکبر علوی) لکھتے ہیں۔

"مزار پُر انوار حضرت صدر شاہ زنجانی در بخارائے کہ در محلہ لاہور است الاآں گذر بخارا نامند او آنجا ست" میر عبدالعزیز بن عزیز زنجانی جو شاہ صدر دیوان ہی کے ہم وطن اور لاہور کے رہنے والے تھے۔ اپنے قصیدے میں اس جگہ کو محلہ بخارا ہی لکھتے ہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بخارا خورد بہ لاہور است اذ بنگر نگر اینک
کہ از ابنرو پرستان قبۂ اسلامیاں بینی
بہر سو تاجرے فاروں بیساری موسیٰ اطواری
کہ از روئے عطوفت بر گدایاں مہرباں بینی
اگر در بارگاہ دین پناہ صدر شاہ آئی
کہ خاک آستانش سرمہ روحانیاں بینی
نہ ہے عکس جمالِ ایزدی یعقوب زنجانی
کہ اندر حضرتش طائف صف کرّو بیاں بینی

سید یعقوب زنجانی ہی کا دوسرا نام شاہ صدر زنجانی تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک

جائے عبرت ہے کہ جس منزل کے اوپر ہو مہر
اس کے نیچے مدفن شاہِ غلاماں دیکھئے

شہاب الدین غوری کی وفات (۶۰۲ھ) کے بعد اس کے تین غلاموں میں جو سب کے سب بڑے پایہ کے بادشاہ ہوئے۔ قطب الدین ایبک اس کا داماد اور متبنیٰ بھی تھا۔ ایبک کی حقیقت یہ ہے کہ ترکستان کے ایک سوداگر نے اسے چھوٹی سی عمر میں خریدا تھا جب وہ اسے نیشاپور میں لایا تو وہاں کے قاضی فخر الدین کوفی نے اسے خرید لیا۔ قاضی نے اپنی اولاد کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کی۔ یہاں تک کہ چھوٹی عمر ہی میں حافظ قرآن ہو گیا، اور عربی و فارسی پر اس نے عبور حاصل کر لیا۔ ایک سوداگر نے اس ہونہار بچہ کو معقول قیمت دے کر قاضی سے خرید لیا۔

یہ نیا سوداگر اس غلام بچہ کو غزنی میں سلطان شہاب الدین کے پاس لے آیا۔ سلطان نے بہت سلہ و بیش دے کر اس کو اپنے لئے خرید لیا، ایبک اس کو اس لیے کہتے تھے کہ اس کی چھ انگلیاں تھیں اور چھنگلیا ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا نام ایبک[1] (شل) مشہور ہو گیا۔

---

[1] تازہ تحقیقات کے مطابق ایبک ایک ترک قبیلہ کا نام ہے۔ یہ قطب الدین کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ طبقات ناصری سے معلوم ہوتا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایبک شہاب الدین کے ہمراہ رہ کر ہر جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا اور بادشاہ کی نظروں میں روز بروز عزت حاصل کرتا گیا۔ محمد غوری نے تھانیسر کی جنگ کے بعد ہندوستان میں اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس نے اپنی نیابت (۱۱۹۳ء سے ۱۲۰۶ء تک) کے زمانے میں ہندوستان کے بڑے بڑے علاقے غزنی کی سلطنت میں شامل کر دیئے۔

بادشاہ کی چونکہ صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ اس لیے اس نے ایبک کو شجاع و دلیر، سخی و فیاض اور فرماں پذیر دیکھ کر اپنی بیٹی کا اس سے نکاح کر دیا۔ ترکی نژاد ہونے کی وجہ سے شجاعت تو ماں کے پیٹ سے لے کے نکلا تھا۔ فیاضی میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اس کو بہت سا انعام و اکرام دیا۔ اس نے چشم زدن میں وہ تمام نقد و جنس فراشوں، ملازموں اور اپنے بھائی ترک نژادوں میں تقسیم کر دیا۔

یوں تو ہندوستان میں یہ برسوں تک رہا۔ لیکن بادشاہ کی وفات کے بعد صرف چار سال (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) بادشاہ رہا۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کو غزنی اور غور سے کوئی تعلق نہ رہا، اس لحاظ سے قطب الدین ایبک ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا خود مختار بادشاہ تھا۔

شہاب الدین غوری کے واقعہ قتل کے بعد جب اس کا برادر زادہ سلطان محمود غزنی اور غور کے تخت پر بیٹھا تو اس نے قطب الدین ایبک کو جو اس وقت ملک قطب الدین کہلاتا تھا۔ چتر، جلوس شاہی اور خطاب سلطانی اور ہندوستان کی حکومت کا حکم ارسال کر دیا۔ ان دنوں قطب الدین ایبک لاہور میں تھا اور بادشاہ ہو کر بھی عموماً لاہور ہی میں رہتا تھا۔ چنانچہ لاہور ہی میں منگل کے دن ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۳ھ کو اس نے تاج شاہی سر پر رکھا اور سکہ اور خطبہ اپنے نام سے جاری کیا۔ منشی سجان رائے عالمگیری خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے :-

"یازدہم ربیع الاول ۶۰۳ھ سکہ و خطبہ بنام خود کرد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ہونے کے ساڑھے تین ماہ بعد اس نے اپنا سکہ چلایا۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس

کہ اس زمانے میں کئی ترک امیر ایسے تھے جن کے ناموں کے بعد میں لفظ ایبک آتا تھا۔ مثلاً بہاؤ الدین ایبک وغیرہ۔ ترکستان میں اب بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جو روسی وفد آیا تھا اس میں دو ترک ادیب بھی تھے جن میں سے ایک کا نام آقائے موسیٰ ایبک تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ نام اب بھی مستعمل ہے۔ وہ ایبک کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔

ایبک کا لفظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہے "ای" کے معنے چاند اور "بک" کے معنے خان ہیں۔ یعنی چاند خان۔ چنانچہ قطب مینار کے کتبہ میں بھی ای بک علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالب اپنے متعلق لکھتے ہیں ؎

ایبکم از جماعت اتراک در تمامی ز ماہ دہ چندیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب جو ترک تھے ایبک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے ایبک ترکوں کے کسی قبیلہ یا خاندان کا نام ہے۔ (مرتب)

قدر عرصہ تک خاموشی کا کیا مطلب ؟

قطب الدین ایبک کی سخاوت و فراخ دستی اور سیر چشمی نے اس کو لکھ بخش اور لکھ داتا کا خطاب دلا رکھا تھا۔ قطب صاحب کی لاٹھ جس کو قطب مینار بھی کہتے ہیں اسی کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کے قریب ہی اس نے ایک خوبصورت مسجد بھی بنوائی تھی جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس کو مسجد قوۃ الاسلام کہتے تھے۔[1]

جس بادشاہ نے بڑے جاہ و جلال سے ہندوستان میں حکومت کی جس نے لاکھوں اور کروڑوں روپے مستحقین کو لٹا دیئے۔ جس کے عدل و انصاف کے افسانوں سے تاریخوں کے اوراق لبریز ہیں جس کی شجاعت نے دشمنوں کو زیر اور جس کی سخاوت نے لوگوں کو محکوم اور جس کے عدل نے رعایا کے ہر طبقہ کو احسان مند اور شکر گذار بنا رکھا تھا چشم بصیرت ہو تو دیکھو کہ جس شخص نے مخلوقِ خدا کو اپنی حکومت کے ایام میں اس قدر آرام دے رکھا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ کس حال میں ہے ؎

دوسرا رخ زندگی کا کتنا عبرت خیز ہے
چشم عبرت سے ذرا گورِ غریباں دیکھئے

قطب الدین ایبک کو چوگان (پولو) کا بڑا شوق تھا۔ لاہور میں ایک وسیع میدان چوگان کے لیے وقف تھا۔ کئی قسم کے عربی اور ترکی اور ہندی گھوڑے صرف چوگان کے لیے مختص تھے ۱۲۱۰ء مطابق ۶۰۷ھ میں لاہور میں چوگان کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر انتقال کر گیا۔ اور یہیں دفن ہوا۔ تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے کہ لاہور میں چوگان بازی میں مصروف تھا کہ ناگاہ گھوڑے سے گرا اور زین کا اگلا حصہ جو لوہے کا بنا ہوا تھا اس کے سینہ پر اس زور سے لگا کہ وہ جاں بر نہ ہو سکا اور وہیں فوت ہو گیا۔ وہ چار برس بادشاہ رہا۔ اور فتح دہلی سے لے کر آخری دم تک ہندوستان میں اس کی عمر بیس برس چند مہینے تھی۔

تاریخ ہندوستان مصنفہ سید عبد القادر ایم اے میں صفحہ ۲۳۲ پر لکھا ہے :-

" ابتدا میں اس کی قبر پر گنبد بنا ہوا تھا اور ہر سال یہاں
میلہ لگتا تھا۔ لیکن مرور زمانہ سے گنبد گر گیا اور چبوترہ
جس پر قبر واقع تھی منہدم ہو گیا "

قبر کی شان و عظمت گنبد تک ہی محدود نہ تھی۔ ہندوستان کا سب سے پہلا مسلمان بادشاہ ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کے بیٹے آرام شاہ یا سلطان شمس الدین التمش نے جو اس کا غلام اور داماد تھا اور آرام شاہ کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ اس کی قبر اور اس کے احاطے کو وسیع پیمانے پر تعمیر نہ کرایا ہو[2] مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد اس جلیل القدر بادشاہ کی قبر

---

[1] چونکہ تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور میں اس بادشاہ کے متعلق کوئی ذکر نہ تھا اور ہسٹری آف لاہور میں تھا بھی تو بالکل مختصر اور اس کے مزار کے متعلق وہ بھی خاموش ہے۔ اس لیے قطب الدین ایبک کے حالات ذرا تفصیل سے لکھنے پڑے۔

[2] تاریخ مبارک شاہی سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۱۵ء میں جب سلطان شمس الدین التمش اپنے حریفوں کو شکست دے کر لاہور پہنچا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عرصہ دراز تک کس مپرسی کے عالم میں رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں کی عملداری میں اس مقبرہ کی تمام متعلقہ عمارات جن میں مسجد، باغ، فصیل، ڈیوڑھیاں اور دالان وغیرہ تھے مسمار کر دی گئیں۔

سلطان کی یہ قبر اس وقت انارکلی بازار میں ہسپتال روڈ پر ایک مختصر سی گلی میں واقع ہے اور یہ عظیم المرتبت بادشاہ ایک دولت مند ہندو وکیل کے بالاخانے کے نیچے ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ اگر انگریزی حکومت کا محکمہ آثار قدیمہ اس جلیل القدر شہنشاہ کی ٹوٹی پھوٹی قبر کی طرف توجہ نہ کرتا اور اس کی مرمت کرا کے اس کو محفوظ یادگاروں میں شامل نہ کر لیتا تو یہ معمولی آثار بھی نظر نہ آ سکتے۔ لاہور میونسپل کمیٹی (کارپوریشن) نے اس بازار اور گلی کا نام جہاں یہ مزار واقع ہے ایک اسٹریٹ رکھ کر اس کا نام تھوڑا بہت پھر زبانوں پر جاری کر دیا ہے[1]۔

پیر مکی رحمۃ اللہ علیہ

پیر مکی کے مزار پاک کے انوار فیض
آنکھ لائق دیکھنے کے ہو تو ہاں ہاں دیکھیے

حضرت پیر مکی کا ذکر لاہور کی تاریخوں کے علاوہ خزینۃ الاصفیا میں بھی درج ہے۔ جو بزرگان دین کے حالات و سوانح میں ایک ضخیم فارسی تذکرہ ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحفۃ الواصلین کے حوالے سے لکھا ہے جو راقم کو دستیاب نہیں ہو سکی۔

خزینۃ الاصفیا میں آپ کا نام سید شیخ عزیز الدین مکی درج ہے۔ صاحب تاریخ لاہور نے سید جلال الدین لکھا ہے تحقیقات چشتی اور یادِ رفتگاں (مصنفہ راقم) میں نام کی بجائے صرف پیر مکی لکھا ہوا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے آپ کا سالِ وفات ۱۲۱۲ھ لکھا ہے اور قطعہ تاریخ یہ درج کیا ہے۔

تو اس نے حکم دیا کہ سلطان مرحوم کے مرقد پر اس کے شایانِ شان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ سنگ سفید کی ایک عظیم الشان عمارت عالم وجود میں آئی جو تیموریوں کے عہد تک زیارت گہ عوام تھی (منتخب التواریخ نولکشور ایڈیشن ص ۱۶) بلکہ مغلیہ سلطنت کی بربادی کے بعد ۱۷۴۳ء تک یہاں ۱۴ رجب کو ہر سال میلہ منعقد ہوتا تھا (ضمیمہ اوریئنٹل کالج میگزین لاہور بابت فروری ۱۹۴۷ء) (مرتب)

[1] یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد حالات بدل گئے۔ ہندوؤں کی جگہ مسلمان مہاجرین نے لے لی اور عنانِ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو غیر ملکی حکومت اور ہندوؤں کے طریق کار کے خلاف اس لیے برسرِ پیکار تھے کہ ان کا طرزِ عمل مسلمانوں کے ملی حقوق اور تاریخی آثار کی حفاظت کے لیے سازگار نہ تھا۔ توقع تھی کہ یہ لوگ اپنے قول کی پاسداری کرتے ہوئے اسلامی آثار قدیمہ کی مناسب نگہداشت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، قبر کی بے حرمتی پہلے سے زیادہ ہوتی رہی۔ اب محکمہ آثار قدیمہ نے کئی سال کی جد و جہد کے بعد قبر کے اوپر کا مکان گرا کر میدان صاف کرا لیا ہے۔ شاید باغیچہ وغیرہ بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے (مرتب)

ز دنیا چو شد در بہشت معلیٰ　　شہ دین و شیخ زمن پیر مکی
وصالش بگو آفتاب حسین　　بخواں نیز پیر حسن پیر مکی

۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) کا وہ زمانہ تھا جب تاج الدین یلدوز خوارزم شاہ سے شکست کھا کر کرمان اور سبوران سے ہوتا ہوا اور سلطان شمس الدین التمش کو للکارتا ہوا پنجاب و تھانیسر تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہیں آ کر وہ قید ہوا اور بدایوں میں اجل طبعی یا زہر خورانی سے وفات پا گیا۔ اس حساب سے آپ کی وفات سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں ہوئی اور آپ کے مزار سے بھی اس واقعہ کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن صاحب تحقیقاتِ چشتی نے تذکرۃ الفقراء کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت سعد الدین مکی بعہد شاہجہان حضرت علی ہجویری معروف داتا گنج بخش ؒ کے مزار پر معتکف ہونے کے لیے لاہور آئے تھے اور چند برس رہ کر انتقال کر گئے۔ ان کا مزار شاہجہان کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اور سال وفات آپ کا ۱۲ ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ مزار کی تعمیر سے کوئی علامت عہد شاہجہانی کی تعمیرات کی نظر نہیں آتی، مزار عہد شاہ جہانی سے بہت پہلے زمانہ کا ہے۔

صاحب تاریخ لاہور (صفحہ ۲۳۲ پر) لکھتے ہیں کہ آپ مکہ معظمہ سے لاہور آئے اور آپ ہی کے سامنے سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر یورش کی۔ اس وقت پنجاب پر خسرو ملک غزنوی کی حکومت تھی۔ خسرو نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ ابھی ایک سال تک کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ دوسرے برس شہاب الدین نے لاہور پر اور بعد میں پرتھی راج کے دارالحکومت دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی آپ کے قیام لاہور کے متعلق (ص ۲۵۶ پر) یہی واقعہ لکھا ہے۔ اور اس میں شہاب الدین کے حملۂ لاہور کا سال ۵۸۲ھ بتا کر حضرت پیر مکیؒ کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے ایک سال کے خطرہ کی مدت کو چھ سال تک وسعت دی ہے۔ آپ لکھتے ہیں :-

"آنحضرت دعا کرد و فرمود کہ از جانب حق تا شش سال
دیگر ترا امان است بعد ازاں قبضۂ مملکت ایں اقلیم
بدست شاہانِ غور بر دادہ اند۔ شہاب الدین باز در
سال پانصد و ہشتاد (۵۸۶ھ) براہ سیالکوٹ
عزم لاہور کرد۔ و اول قلعہ سیالکوٹ تعمیر کردہ بہ محاصرۂ
لاہور پرداخت و فتح نمود"

تاریخ ہندوستان جلد اول مولینا ذکاء اللہ میں شہاب الدین غوری کی فتح لاہور کے حالات میں (ص ۲۹۰ پر) یہ درج ہے کہ سلطان ۵۷۶ھ (۱۱۷۹ء) میں لاہور آیا۔ خسرو ملک نے صلح صفائی اور اپنے فرزند خسرو شاہ کو یرغمال دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ یہ وہی سال ہے جس سال شہاب الدین لاہور سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اور حضرت پیر مکیؒ نے خسرو ملک سے فرمایا تھا کہ اس سال یہ بلا ٹل جائے گی۔ سلطان ۵۸۲ھ میں پھر لاہور آیا اور اس نے ہندوستان میں خاندانِ غزنویہ کا خاتمہ کر دیا۔ خزینۃ الاصفیاء کے سنین کی نسبت تاریخ ہندوستان کے سنین جو بہت سی قدیم تاریخوں کے مطالعہ کے بعد مصنف نے لکھے ہیں۔ زیادہ قابلِ

استفادہ ہیں۔
صاحب خزینۃ الاصفیاء کی تحریر کے مطابق آپ ۳۶ سال تک لاہور میں مقیم رہے اور بعد وفات یہیں دفن ہوئے۔
آپ نے زندگی بھر تدریس علوم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزارہا لوگ آپ کے وعظ و نصیحت سے مستفیض ہوتے رہے۔
تحقیقاتِ چشتی میں یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی ان کو حضرت علی ہجویریؒ کا استاد بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے محمود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے تھے۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ صحیح حال کوئی نہیں بتا سکتا، زیادہ بھروسہ تحفۃ الواصلین کی تحریر پر ہے۔

پیر بلخیؒ

پیر بلخی چشم ظاہر بیں تھے اک صوفی بزرگ
چشم باطن سے انھیں غازی مسلماں دیکھئے

پیر بلخیؒ کے حالات حدیقۃ الاولیاء میں مختصراً اور تاریخ لاہور میں بحوالہ تحفۃ الواصلین کسی قدر تفصیل سے درج ہیں لیکن دونوں نے ان کے اصل نام سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ اصل وطن بلخ تھا۔ اس لیے بلخی کہلاتے تھے۔
صاحب حدیقۃ الاولیا کی تحریر (ص ۱۶۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان کے تصرف بلخ کے بعد آپ اپنا وطن ترک کر کے لاہور آ گئے۔ چونکہ بلخ شاہ خوارزم کے ماتحت تھا۔ اس لیے شاہ خوارزم بھی لاہور آ گیا جب اسے معلوم ہوا کہ چنگیز خانی فوج میرا تعاقب کر رہی ہے تو وہ لاہور سے دہلی چلا گیا۔ چنگیز خانیوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ اور اسی محاصرہ میں پیر بلخی اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ہمراہ (کفار مغل و تاتار سے) جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔
لیکن تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ خوارزم کو لاہور آنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اور چونکہ وہ لاہور نہیں آیا۔ اس لیے تعاقب کنندگان بھی لاہور نہیں آئے۔ شاہ خوارزم کے ورود ہند کا واقعہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد (۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء) میں ہوا ہے۔ شاہ خوارزم جس کا نام سلطان جلال الدین تھا چنگیز خاں کے خوف سے جس کا مذہب یہ تھا کہ شہروں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور جس کا ایمان یہ تھا کہ مفتوحہ ممالک کی نسلِ انسانی کو خاک و خون میں ملا ڈالے۔ اپنا ملک تباہ و خارت کرا کے سندھ کی طرف نکل آیا۔ تاتاری اور مغل بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پیچھے پہنچے۔ سلطان شمس الدین التمش کو خبر ہوئی تو اس نے طوفان چنگیز خانی سے جو اپنے ہلاکت آفریں اثر کے لحاظ سے طوفان نوح سے کم نہ تھا نجات حاصل کرنے کے لیے شاہ خوارزم کو کہلا بھیجا کہ اس ملک کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے موافق نہیں۔ وہ مطلب سمجھ گیا اور سیستان اور کیچ مکران کی راہ سے ہندوستان سے باہر چلا گیا اور مغلوں کی فوج بھی واپس چلی گئی۔[1] تاریخی واقعات کی رُو سے شاہ خوارزم نہ لاہور آیا ہے نہ لاہور سے دہلی گیا ہے اور نہ چنگیز خاں نے لاہور کا محاصرہ کیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیر بلخی درویش صفت بزرگ تھے، وہ سندھ سے لاہور چلے آئے اور خوارزم شاہ کے ساتھ نہیں گئے جو چنگیز خان کے خوف سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

---

[1] تاریخ ہندوستان مصنفہ مولوی ذکاء اللہ مرحوم جلد اوّل۔ ص ۳۰۴، ۳۰۵۔

مصنف تاریخ لاہور پیر بلخی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ لاہور میں آکر مقیم ہو گئے، اور جب چنگیز خان کے پوتے قتلغ خان نے لاہور پر حملہ کیا تو بادشاہ دہلی کی فوج میں شامل ہو کر جن مقامی لوگوں نے دادِ شجاعت دی۔ ان میں پیر بلخی بھی تھے جو اسی لڑائی میں درجۂ شہادت کو پہنچے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ التمش کی وفات ۲۱ شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۶ء کے بعد تاتاریوں اور مغلوں نے لاہور پر کب یورش کی۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ اپنی بہن سلطانہ رضیہ کو پہلے گرفتار اور بعد میں قتل کرانے کے بعد ۶۳۹ھ میں بادشاہ ہوا۔ تاریخ ہندوستان میں اس بادشاہ کے عہد کا جو سب سے عظیم واقعہ درج ہے وہ ترکوں کا حملۂ لاہور ہے۔ اس زمانے ۱۲۳۹ء میں بہرام شاہ کی طرف سے لاہور (یعنی صوبہ پنجاب) کا گورنر قراقش نام ایک سردار تھا۔ چنگیز خانی مغلوں نے خراسان اور غزنی سے نکل کر لاہور کو گھیر لیا اور کئی مہینے تک لاہور کا محاصرہ کئے رکھا۔ لکھا ہے قراقش اپنی فوج کو لے کر کسی نہ کسی طرح نکل کر بھاگا دہلی چلا گیا۔ اس لیے ۱۶ جمادی الآخر ۶۳۹ھ کو مغلوں نے جو سب کے سب غیر مسلم تھے مسلمانوں اور عام باشندوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا۔[1]

گویا مغلوں نے التمش کے زمانہ (۶۱۸ھ) میں نہیں بلکہ اس کے فرزند بہرام شاہ کے زمانے (۶۳۹ھ) میں اکیس سال کے بعد لاہور کو غارت کیا ہے۔ اور چونکہ پیر بلخی ۶۱۸ھ کے زمانہ ہی سے لاہور میں مقیم تھے۔ اس لیے اس عرصہ میں ان کی عبادت و ریاضت کی وجہ سے اکثر لوگ ان کے ارادت مند ہو چکے ہوں گے۔ انھوں نے بھی اس جنگ میں جو مغل کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی مردِ غازی کی طرح شرکت کی اور درجۂ شہادت کو پہنچے۔

لاہور میں آپ کے مزار پر ایک طویل چوبی تختہ آویزاں رہتا ہے جس پر متولی خانقاہ ماسٹر محمد حسین خان مرحوم حسینی روشنائی منجم و جفار و تاجر کتب کشمیری بازار نے آپ کے حالاتِ زندگی لکھوا رکھے ہیں۔ ان میں بھی وہی باتیں لکھی ہیں جو تاریخ لاہور اور حدیقۃ الاولیاء میں درج ہیں۔ اور جن پر گذشتہ سطور میں تاریخی نکتہ نظر سے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس تختۂ چوبی پر آپ کا سن وفات ۱۲۱۱ء لکھا ہوا ہے۔ لیکن لاہور میں وہ ۱۲۲۱ء میں بزمانہ التمش آتے ہیں اور ۱۲۳۹ء میں بزمانہ بہرام شاہ جنگ مغولاں میں شہید ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ۱۲۱۱ء کو ان کا سالِ شہادت قرار دینا قطعاً غلط ہے۔

جس جگہ آج ان کا مقبرہ ہے اسی جگہ ان کا حجرہ تھا۔ یہیں ان کو دفن کیا گیا۔ اس واقعہ کے پانچ سو سال کے بعد نواب بھکاری خان رستم جنگ امیر الامرائے لاہور نے جب میر معین الملک عرف میر منو کے زمانہ میں سنہری مسجد تعمیر کرائی اور اس کی زینت کے لیے بازار کو سیدھا کرنا چاہا تو یہ مزار سرِ راہ آ گیا۔ مزار کا بہت سا حصہ تو گرا دیا گیا لیکن نواب نے حجرہ کو جس کے اندر پیر بلخی مدفون تھے محرابی دروازہ بنا کر پختہ کمرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ آپ کا مزار کشمیری بازار میں سرِ راہ واقع ہے۔ اور دہلی دروازہ سے شہر میں جاتے ہوئے بائیں ہاتھ آتا ہے۔

آج سے پچاس سال قبل اس مزار کی عمارت میں ایک میوہ فروش کی دکان تھی اور کوئی شخص مزار کے اندر فاتحہ کے لیے

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد اوّل مصنفہ مولوی ذکاء اللہ ص ۳۱۳۔

نہیں جا سکتا تھا۔ اور دکان کی وجہ سے یہاں مزار کی موجودگی کا بھی کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ قریباً پچیس سال گذرے ہیں کہ مسلمانانِ کشمیری بازار نے مزار کے قابض پر عدالت میں اس بنا پر دعویٰ دائر کیا کہ یہاں ایک شہید ولی اللہ کا مزار ہے۔ اور اس دکان کی وجہ سے خلقِ خدا اس مزار پر فاتحہ خوانی کرنے سے محروم ہے۔ یہ مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا۔ آخر ہائی کورٹ نے اس کا قبضہ ناجائز قرار دے کر ہر مسلمان کو بے روک ٹوک مزار پر آنے اور فاتحہ پڑھنے کی اجازت دے دی۔

موجودہ دس بارہ سال سے اس خانقاہ کے متولی کی طرف سے ماسٹر محمد حسین خان ماہر علم جفر جن کی کتابوں کی دکان مزار کے بالکل سامنے ہے۔ اس خانقاہ کے منتظم ہیں۔ آپ نے مزار کے بیرونی چبوترہ کے پاس پانی کا نل لگوا دیا ہے۔ ہر جمعرات کو چراغاں ہوتا ہے۔ ہر قمری مہینے کے پہلے جمعہ کو قرآن کریم کے ختم کے بعد تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے اور قوالی بھی۔ ماسٹر صاحب نے مزار کے چاروں طرف خوبصورت جنگلے کے علاوہ خوشنما مسہری لگوا رکھی ہے۔ اور مزار کے اندر اور باہر سیمنٹ کا فرش بنوا دیا ہے۔

[پیر بلخی کا سنگِ مزار

میں حضرت فوق مرحوم کے اس تحقیقی مضمون میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری خوش قسمتی سے لاہور کے عجائب گھر میں ایک عربی کتبہ موجود ہے جس پر کوفی و نسخی خط میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے۔ یہ غالباً پیر بلخی کے مزار ہی کا پتھر ہے :-

"ھذا مقبرۃ الشہید الشیخ ابو الحامد الحسن ابن محمد الحسین ابو بکر الذکری
البلخی رحمۃ اللہ وقد عاش ثمانیۃ وتسعین سنۃ وفات فی یوم الجمعۃ التاسع
من ذی الحجہ وھی یوم عرفہ من ثلثۃ واربعین وستمائۃ"

(یعنی یہ مقبرہ شیخ ابو الحامد الحسن بن محمد الحسین ابو بکر الذکری البلخی
رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ تحقیق وہ ۹۸ سال جب زندہ تھے اور ۶۴۳ھ میں جمعہ
کے روز ۹ ذی الحجہ کو جو عرفہ کا دن تھا شہید ہوئے)

اس کتبے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا اسم گرامی حسن تھا اور کنیت ابو الحامد۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام محمد الحسین ابو بکر تھا۔ آپ بلخ کے رہنے والے تھے۔ ۵۹۵ھ میں لاہور تشریف لائے اور یہیں ۶۴۳ھ میں جمعہ کے روز ۹ ذی الحجہ کو شہید ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب لاہور میں سنہری مسجد تعمیر کی گئی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سڑک کو سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مزار کو چھوٹا کیا گیا اور اسی شکست و ریخت میں کتبہ یہاں سے خرد برد ہو کر کسی طرح عجائب گھر میں پہنچ گیا۔ جہاں اب تک محفوظ ہے ـــــ مرتب]

میراں بادشاہ سید اسحاق گازرونی

عہدِ تغلق کے بزرگ اولیں لاہور میں

روضۂ اسحاقی میں آنکھوں سے پنہاں دیکھیے

شہزادہ دارا شکوہ اپنی مشہور تصنیف سفینۃ الاولیاء میں شیخ ابو اسحاق بن شہریار گاذرونی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "گاذرون[1] کے رہنے والے تھے جو فارس میں واقع ہے۔"

یہ کسی نے نہیں لکھا کہ آپ کب آئے اور کس طرح آئے۔ لاہور میں ان کا کیا سلسلہ تھا، عمر کیا تھی اور اس وقت بادشاہ کون تھا۔ تاریخ لاہور کنہیا لال میں ان کا سال وفات ۷۸۶ھ درج ہے اور سید محمد لطیف کی ہسٹری آف لاہور انگریزی کے صفحہ ۱۶۲ پر لکھا ہے کہ آپ لاہور میں تغلق بادشاہوں کے زمانے میں آئے۔ ۷۸۶ھ میں (آپ کی وفات کے وقت) دہلی میں سلطان فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ چونکہ اس نے بقول مختلف ۳۷ سے ۳۸ سال تک بادشاہت کی ہے۔ اس لیے خیال ہے کہ سید اسحاق اس کی طویل حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۸۹ھ) کی ابتدا میں تشریف لائے ہوں گے۔

خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ اخبار الاخیار لکھا ہے کہ سید صفی الدین جو شہر اوچ (ریاست بہاولپور) کے بانی تھے سید اسحاق گاذرونی کے ہمشیر زادے تھے۔

لاہور میں سید اسحاق کا قیام اکثر وہیں رہتا تھا جہاں اب آپ کا مزار واقع ہے اور جو مسجد نواب وزیر خاں کے صحن میں ہے۔ شہر لاہور کے مسلمان آج تک ان کے نام کا احترام کرتے ہیں اور انہیں میراں بادشاہ کہتے ہیں۔ نواب وزیر خاں نے قلعہ کی تعمیرات کے بعد اپنے نام نیک کی یادگار رہنے کے لیے وسط لاہور میں اسی مقام کو پسند کیا جہاں آپ کا مزار واقع ہے۔

مصنف تاریخ لاہور لکھتے ہیں کہ "ان کی وصیت کے مطابق ان کے مزار کا احاطہ پختہ خشتی بنایا گیا۔ لیکن قبر خام بنائی گئی۔" کچھ عرصہ کے بعد قبر پر ایک درخت پیدا ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے بیل کی طرح ساری قبر کو ڈھانپ لیا۔ چونکہ اس کے پتے اکثر لوگ متبرک سمجھ کر لے جایا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا نام پیر سبز مشہور ہو گیا۔ جب نواب وزیر خان نے اس جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ایک متصلہ مکانات بھی خریدے اور درخت کاٹ کر قبر پختہ بنا دی۔ گویا آپ کی وفات سے قریباً اڑھائی سو سال بعد آپ کا مزار اس ترکیب سے پختہ تعمیر کرایا گیا کہ مسجد کے عین وسط میں حوض کے متصل آپ کی دوسری قبر تیار ہو گئی۔

مسجد وزیر خاں کے صحن میں جاتے ہی ایک چھوٹا سا دالان نظر آتا ہے اس کے سامنے آپ کا نقلی مزار پختہ موجود ہے۔ دالان کی چھت قدیم وضع کی منقش ہے۔ چھوٹی چھوٹی دس سیڑھیاں نیچے اتر کر اصلی یعنی زمین دوز مزار ایک بلند چبوترہ پر دکھائی دیتا ہے اس کے گرد سبز رنگ کی رنگی ہوئی لکڑی کا جنگلہ ہے۔ سرہانے چراغدان ہے۔ روشنی کے لیے چھوٹے چھوٹے دریچے بھی موجود ہیں۔ قبر بہت لمبی ہے۔ اس پر سبز غلاف پڑا رہتا ہے۔ چوکھنڈی اور مزار کا فرش سیاہ و سفید خوبصورت چوگوشہ

---

[1] اصل نام کاذرون ہے۔ شیراز سے تین دن کی مسافت پر آباد تھا۔ علامہ قطب الدین شیرازی مصنف درۃ التاج لغرۃ الدباج کے والد شیخ ضیاء الدین مسعود ابن مصلح اسی وطنیت کے لحاظ سے کاذرونی کہلاتے تھے، علامہ شیرازی کی پیدائش بماہ صفر ۶۳۴ھ اور وفات بعمر ۷۶ سال بماہ رمضان ۷۱۰ھ ہے (دیکھو رسالہ معارف اعظم گڈھ بابت جون ۱۹۴۴ء)

تیمروں کا ہے۔

۱۳-۱۴ رجب کو آپ کا سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں ختم قرآن شریف اور نعت خوانی کے علاوہ جھنڈا بھی ہوتا ہے۔ چڑھاوے اور نذر نیاز کی آمدنی میں کئی حصہ دار ہیں جن کی تقسیم باری باری سے ہوتی ہے۔ آج کل اس مزار کے متولی حاجی فخرالدین ہیں۔

سید صوفؒ

رہنمائے دین و دنیا پیر سید صوف
کر گئے کیا کام پنہاں و نمایاں دیکھئے

یہ بزرگ شاہانِ تغلق کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سال وفات ۸۰۶ھ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل سرحد ہندوستان عبور کرکے پنجاب میں آکر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ اور ان کی لوٹ مار اور غارت گری کا سلسلہ ایک سو سال قبل سے چلا آتا تھا۔ بلکہ دلی اور لاہور میں اکثر مغل آباد بھی ہو گئے تھے۔ اس عہد میں انہی کی وجہ سے محلہ مغل پورہ قائم ہوا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بھی بیرونی مغل برابر مار دھاڑ کرتے اور جو کچھ ملتا لوٹ کھسوٹ کر پھر واپس چلے جاتے۔ سب سے زیادہ زور ان کا لاہور پہ ہوتا تھا۔ یہ دولت مند شہر تھا اور دہلی کے عین رستے میں تھا۔

حضرت سید صوف جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ ہی میں لاہور آئے۔ اس زمانے کے صوفی اور علماء آج کل کے بظاہر خلوت نشین مگر مریدوں کی گرداوری کرنے والے صوفیا کی طرح نہ تھے۔ وہ اہل دل بھی تھے۔ اہل درد بھی۔ اہل قلم بھی تھے اور اہل سیف بھی۔ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑتی تھی تو وہ شاملِ جہاد بھی ہو جایا کرتے تھے۔ غرض جب وہ مسند ارشاد پر متمکن ہوتے تو اپنے مواعظ حسنہ اور فیض صحبت سے لوگوں کے دلوں سے زنگ کدورت دور کرتے اور جب دین کی حرمت اور لوگوں کے جان و مال اور آبرو بچانے کا موقع آتا تو اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایسا ہی ایک موقعہ جب سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں آیا تو آپ دشمن کو للکار کر اس کے سامنے آگئے۔ اور میدان جنگ میں خاک و خون سے نہا کر مرتبہ شہادت کو پہنچ گئے۔ یہ واقعہ ۸۰۶ھ میں سلطان فیروز شاہ کی وفات کے تیرہ سال بعد پیش آیا۔

جہاں آپ کا مقبرہ واقع ہے یہ مقام اس زمانے میں محلہ رڑہ کہلاتا تھا۔ آج اس کا نام چوک مسجد نواب وزیر خان ہے۔ ابتدا میں آپ کی قبر ایک چبوترہ پر تھی جس پر کوئی چھت وغیرہ نہ تھی۔ کئی سو سال تک یہی حال رہا۔ لودھی بادشاہوں کی حکومت کے زمانے میں نادر خان نام ایک امیر نے جب اپنی حویلی محلہ رڑہ میں اس قبر کے متصل تعمیر کرائی تو اس کے گرد ایک حجرہ خشتی تیار کرا کر اس کو اپنی حویلی کے وسیع احاطے کے اندر لے لیا۔ وہ حویلی شاہ جہان کے زمانہ تک موجود تھی۔ نواب وزیر خان نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خرید لی اور یہاں مسجد تعمیر کرائی۔ اور مزار کو نئے سرے سے تعمیر کرا کے موجودہ شکل دے دی لیکن قبر کی اس سادگی کے باوجود عوام یہاں کثرت سے آتے تھے اور فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ سکھوں کے زمانے میں بھی یہاں کافی رونق ہوا کرتی تھی۔

تحقیقاتِ چشتی اور تاریخ لاہور کے مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت سید صوف (سید اسحاق گازرونی عرف میراں بادشاہ) کے ہم عصر اور ہم عہد تھے۔ اور چونکہ دونوں کا زمانہ سلطان فیروز شاہ تغلق سے تعلق رکھتا ہے اور دونوں کا سالِ وفات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے ان کے ہم عہد و ہم جلیس ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

آپ کی قبر بھی مزار میراں بادشاہ کی طرح مسجد وزیر خان سے بہت پہلے بنی ہوئی تھی۔ سکھوں کے عہد میں وزیر خان کے چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کرا لیے تھے جس سے مسجد کی نمائش اور زیب و زینت میں فرق آ گیا تھا۔ اس لیے سنہ ۸۵ء میں چوک کے اندرونی مکانات سرکاری حکم سے گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر ایک وسیع میدان بنا دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر میجر میکریگر اس مزار کو بھی منہدم کرانا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کے عرض معروض کرنے پر اور بقول بعض خود ہی ہیبت زدہ ہو جانے کے بعد اس ارادہ کو ترک کر دیا۔ ان ایام میں میاں محمد سلطان کاشمیری نے جو لاہور کا ٹھیکیدار اعظم تھا اور اسی محلہ کے قریب دہلی دروازہ کے اندر اپنی عالیشان حویلی میں رہتا تھا۔ آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا اور قبر کا تعویذ بھی نیا لگوایا۔ گنبد کی تعمیر سے مزار کی رونق اور بھی زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ روضہ کی شمالی دیوار پر حسب ذیل عبارت سنگ مرمر کے ٹکڑے پر تحریر ہے :-

"بصوابدید صاحب عالی مناقب میجر جارج میکریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر
ضلع لاہور مقبرہ متبرکہ حضرت سید صوف قدس سرہٗ تعمیر کردہ شیخ سلطان
ٹھیکہ دار سرکار فیض آثار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ سنہ ۱۸۵۲ء سمبت ۱۹۰۹
سنہ ۱۲۶۸ھ بہ اتمام رسید"

اس مزار کے ساتھ نہ کوئی دکان ہے نہ کوئی معافی ہے جس کی آمدنی سے اس کی مرمت و حفاظت ہوتی رہے۔ نذر نیاز کی آمدنی از قسم معافی تیس روپیہ سالانہ بتائی جاتی ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ۱۷ رجب کو ہوتا ہے۔ عرس میں نعت خوانی ہوتی ہے۔ ختم ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ رونق قوالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو یوم عرس کے علاوہ بھی کبھی کبھی ہوتی رہتی ہے۔ —

کس لیے ہم آئے؟ اور کیا کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

اس مزار کی نگہداشت۔ اخراجاتِ عرس اور مجاور کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ مزار کے باہر احاطہ مزار میں برنے کا وہ درخت اب تک موجود ہے جس کا حوالہ مولوی نور احمد چشتی نے سنہ ۱۸۶۴ء میں اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں دیا ہے۔ برنے کے ساتھ ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں مجاور کی رہائش ہے۔ احاطہ مزار کے باہر لیکن بالکل ملحق ایک کنواں ہے جو جاری ہے۔ احاطہ مزار سنگِ مرمر کے ایک چھوٹے سے جنگلے سے گھرا ہوا ہے۔ مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ اور اس کے اوپر یہ عبارت سنگِ مرمر کی تختی پر لکھی ہوئی ہے :-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"روضۂ اقدس سلطان العارفین زبدۃ الکاملین منظور بارگاہ ایزد حضرت
سید سید صوف فیض بخش عظیم انوار اللہ مرقدہ در عہد بادشاہ
ابوالمظفر فیروز شاہ تغلق"

گنبد کے اندر شرقی غربی جانب کی دیواروں میں روشنی کے لیے پنجرے لگے ہیں ان کے علاوہ دیواروں میں چار محراب بھی ہیں۔ مزار سنگِ مرمر کے جنگلے کے اندر ہے اور سرہانے عبارت کے ساتھ اشعارِ ذیل درج ہیں:

مدفن شیخ المشائخ حضرت پیر سخی سید سید صوف فیض بخش رحمۃ اللہ
علیہ الحسنی سہروردی سنہ وصال ۷۸۶ھ

کس دل زندہ کی ہے یہ تربت عظمت نشاں
خاک جس کی چومنے کو جھک رہا ہے آسمان

فیض بخش گنج وحدت مرشد فرخ جبیں
صوفیٔ صافی نہاد و رہبر دنیا و دیں

غازہ روئے شہادت زینت قوم و وطن
سرفروش و غازی و شہداد کش مرعب فگن

سرخرو ہو کر جہادِ فی سبیل اللہ سے
مردِ مومن لے رہا ہے خوابِ شیریں کے مزے

بیرونی جنگلے کے باہر ایک نوٹس قوالوں کے لیے آویزاں ہے جس پر لکھا ہے کہ قوالوں کے لیے وضو لازمی ہے۔ اور حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے۔ چودھری عبدالرشید تبسم ایم اے کا یہ شعر کس قدر برمحل ہے ؎

خدا کے نام سے کرتا ہے دل آغاز مے نوشی
تبسم دید کے قابل ہے اس کافر کی دینداری

سید بلندؒ

خویش و بیگانہ نے گو اکثر مٹا ڈالے مزار
ہو نہ جائے گل یہ شمعِ راہِ عرفاں دیکھیے

مصنفِ تحقیقاتِ چشتی و تاریخ لاہور نے زبانِ خلق کے بھروسہ پر لکھا ہے کہ حضرت سید سید بلند میراں بادشاہ یعنی حضرت سید اسحاق گازرونی کے بھائی تھے[۱]۔ بھائی ہوں یا نہ ہوں دونوں کا مشرب اصلاحِ خلق اللہ تھا۔ اس لیے یہ معنوں میں ہم خیال۔ ہم مشرب اور اس لحاظ سے کہ ان کا مزار بھی مسجد وزیر خان کی بنیاد سے بہت پہلے اسی محلہ میں موجود تھا ان کے ہم عصر

---

[۱] ۔ مولوی نور احمد چشتی اور رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی کتابوں میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ دوسری تاریخوں اور تذکروں کی ورق گردانی سے بھی ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچے کہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے۔ چونکہ دونوں کی زندگی کا مقصد ایک تھا اس لیے ہم ان کا روحانی رشتہ ہی قائم کر سکتے ہیں ——— (مرتب)

بھی تھے۔

مسجد وزیر خاں کے شمالی دروازہ سے صرف بازار کے فاصلے پر پرانی کوتوالی کے چوک سے آتے ہوئے بائیں ہاتھ اور دہلی دروازہ کی جانب سے آتے ہوئے دائیں ہاتھ کو ایک کٹڑہ کے اندر آتا ہے۔ یہ کٹڑہ مسجد کے ساتھ ہی نواب وزیر خاں نے ۱۰۵۱ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کی آمدنی کو مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا۔

وزیر خاں نے مزار کی تعمیر بھی کرا دی تھی اور اس کٹڑہ کے اندر کئی دکانیں آمدنی کے لئے بنا دی تھیں، ایک بہت بڑا کنواں بھی جس میں چاہ بچہ اور ٹونٹی کے آثار اب بھی قائم ہیں اور جس پر لوہے کی دو چرخیاں چلتی ہیں احداث کرایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

اس کٹڑہ میں جانے کے لیے سب سے پہلے ایک قدیم ڈیوڑھی آتی ہے جس کی چھت اس زمانہ میں شاہجہانی عمارتوں کے نمونہ پر ہی ہوگی۔ لیکن آج گھاس پھوس اور بوسیدہ و بدنما لکڑیوں سے "مزین" نظر آتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ڈیوڑھی ہی سے گھر کی رونق پہچانی جاتی ہے تو ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

کٹڑہ کا میدان جس کے اندر کنواں ہے اور جہاں پہلے لوہاروں کی دوکانیں ہوا کرتی تھیں اور بعد میں کپڑے کی مارکیٹ قائم ہو گئی تھی۱؎ اب بالکل خراب و خستہ نظر آتا ہے۔ حضرت کا مزار جو ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہی مغرب کی جانب نظر آتا ہے۔ ایک تنگ و تاریک رستہ طے کرنے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ مزار سے شرق کی طرف متولی نے اپنا مکان بنا کر اس کو بالکل نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ قبر کا تعویذ حضرت میراں بادشاہ کی قبر کے تعویذ کی طرح بہت طویل ہے اور لکڑی کے سبز جنگلہ کے اندر آپ ایک سبز غلاف کے نیچے خواب استراحت فرما رہے ہیں۔

تحقیقات چشتی (ص ۰۷۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کے زمانے میں راجہ دینا ناتھ نے اس کٹڑہ کو اپنا اصطبل بنا لیا تھا۔ یہاں پنجشنبہ (جمعرات) کو اکثر لوگ آیا کرتے تھے، اب وہ بات تو نہیں رہی البتہ سالانہ عرس ہوتا ہے۔ قوالی نہیں ہوتی۔ نعت خوانی اور بھنڈارہ سے رونق ہو جاتی ہے۔

آپ کے مزار کی چھت کافی بلند ہے اور چونکہ چاروں طرف مکانات ہیں اس لیے روشنی کے لیے چھت میں روشندان رکھے ہوئے ہیں۔

پیر زکی شہید رح

بکی دروازے کے اندر حضرت پیر زکی
کس طرح اسلام پر ہوتے ہیں قرباں دیکھیے

۱؎ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے حکام کی مدد سے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ نے کپڑا مارکیٹ بھی یہاں سے اٹھا دی ہے۔ دکانیں اور مکانات بھی گرا دیئے ہیں۔ اب ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی مزار صاف نظر آتا ہے۔ (مرتب)

پیر زکی کا ذکر تحفۃ الواصلین کے حوالہ سے رائے کنہیا لال نے تاریخ لاہور (ص ۱۶۷) میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جن ایام میں مغلوں نے (ان مغلوں سے مراد نامسلم مغل ہیں) سواحلِ ہند کو عبور کر کے لاہور کو محاصرہ میں لیا۔ اور اہل لاہور نے شاہی فوجوں کے ساتھ مل کر ان سے جنگ کی۔ تو ان میں پیر زکی بھی شامل تھے۔ ان دنوں شہر لاہور کا ایک دروازہ وہیں تھا جہاں آج آپ کا مزار یکی دروازہ سے باہر سر راہ واقع ہے۔ یہیں آپ نے کافر مغلوں سے جنگ کی اور یہیں شہید ہوئے۔

لاہور میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب آپ کا جسم آپ کے سر سے علیحدہ ہو گیا۔ تو آپ کا جسم بے سر ہو کر بھی دشمنوں سے لڑتا رہا۔ آخر جہاں وہ تھک کے رہ گیا وہیں آپ کے دھڑ یعنی جسم بے سر کی قبر بنی۔ جو ایک چار دیواری کے اندر یکی دروازہ سے شہر میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ آتی ہے اور آج بھی مرجع ہے۔ سر چونکہ دروازہ کے باہر یکی دروازہ کے نیچے ہی جہاں آپ کا قیام رہتا تھا، کٹ چکا تھا۔ اس لیے سر کی قبر دروازہ کے نیچے ہی بنا دی گئی۔

ہندوستان پر کافر مغلوں کے حملے سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان علاؤ الدین مسعود کے زمانہ ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء سے شروع ہوئے ہیں اور ان کا سلسلہ ۷۹۰ھ تک جاری رہا ہے۔ پچاس سال کے اس عرصہ میں ہندوستان پر سلطان ناصر الدین محمود، سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی، سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان فیروز شاہ تغلق نے حکومت کی۔ گو ہر حملہ میں مغل پسپا ہوتے رہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی جانیں بھی گئیں مگر یہ سخت جان حملہ آور شمالی ہند کو پامال کر کے دہلی تک پہنچ جاتے تھے۔ لاہور، ملتان اور نواح دہلی بالخصوص اور بعض دوسرے مقامات ہمیشہ ان کی جولانگاہ بنے رہے۔ اس لیے پیر زکی کی شہادت کا واقعہ انہی پچاس برس کے اندر سمجھنا چاہیئے۔

پیر زکی کہاں سے آئے۔ کب آئے۔ وہ لاہور ہی کے تھے یا کسی اور مقام کے۔ لاہور میں ان کے کیا مشاغل تھے۔ وہ اصل پیر تھے یا بعد میں لوگوں نے ان کو پیر بنا دیا؟ اس کے متعلق تاریخ لاہور بالکل خاموش ہے۔

آپ کی قبر دو جگہ ہے اور دونوں جگہ عقیدت مند فاتحہ کے لیے جاتے ہیں۔ یکی دروازہ کے پہلو میں آپ کے سر کا چھوٹا سا مزار ہے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شہر کے چاروں طرف پختہ اور گہری خندق کھدوائی تو ہر دروازے کے سامنے آمد و رفت کے لیے پل بھی بنوائے۔ آپ کی رہائش اور آپ کی آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے اس دروازہ کا نام زکی دروازہ تھا جو بعد میں یکی دروازہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس لیے یکی دروازہ پر بھی پل بنایا گیا۔ جب انگریزی عہد آیا تو یہ دروازہ چونکہ بوسیدہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے غیر مستحکم تھا۔ اس لیے گرا دیا گیا۔۔۔ وہ قبر بالکل علیحدہ نظر آنے لگی۔

آج کل سائیں قمر الدین (عمر قریباً ساٹھ سال) اس مزار کا جاروب کش ہے۔ یکی دروازہ کے لوگوں نے باہمی چندہ سے مزار کی مرمت کرا دی ہے۔ عرس عیدوں کے تیسرے اتوار کو ہوتا ہے جس میں ختم قرآن شریف کے علاوہ قوالی بھی ہوتی ہے۔

دولت خاں لودھی

دولت آباد اور باغ دولت آباد اب کہاں
اس سے بڑھ کر جو دکھائے چرخ گرداں دیکھیے

سلطان ابراہیم لودھی بادشاہ دہلی کے زمانہ (۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء — ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء) میں اس کی طرف سے پنجاب کا حاکم دولت خاں لودھی تھا۔ ابراہیم نے اپنے بڑے بڑے امیروں کو مغرور و متکبر اور شک و شبہ کی وجہ سے ناراض کر رکھا تھا۔ بلکہ بقول صاحب حیات لودھی (حصہ سوم ص ۱۰۱ تا ۱۰۲) تیئیس امیروں کو قتل کرا کر ان کی لاشیں لٹکوا رکھی تھیں۔ دولت خاں کے بیٹے غازی خاں نے جب دہلی میں ان لاشوں کو لٹکتے ہوئے دیکھا اور ابراہیم کا نعرہ انا ولاغیری سنا۔ تو کانپ اٹھا۔ لاہور آ کر باپ سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا کہ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی۔

دولت خاں نے اپنے دوسرے بیٹے دلاور خان کو کابل میں بابر کے پاس بھیجا اور تخت دہلی پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ امیر تیمور کے حملۂ ہند کے زمانہ (۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء) سے مغربی پنجاب (بھیرہ، خوشاب، چناب، چنیوٹ) کا بہت سا ملک اور لاہور بابر کے کسی نہ کسی نوابح کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ بابر اس دعوت کو فال نیک تصور کر کے کابل سے روانہ ہوا۔ لیکن اس عرصہ میں دولت خاں کا خیال بدل چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے غازی خان کے ہمراہ چالیس ہزار فوج لے کر نکلا۔ لیکن بابر ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں لاہور میں داخل ہو گیا اور ۱۰ رجب ۹۳۲ھ کو پانی پت کے میدان میں اس نے سلطان ابراہیم سے جنگ کی۔ اسی جنگ میں کہ جمعہ کا دن تھا۔ ابراہیم مارا گیا اور سلطنت لودھی کا خاتمہ ہو گیا۔

دولت خان نے اپنے عہدِ حکومت میں لاہور کو بہت ترقی دی۔ اپنے نام سے اس نے ایک بہت بڑی سرائے تعمیر کرائی جس میں صدہا آدمیوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ سرائے کے عین قرب میں ایک عالی شان باغ تعمیر کرایا۔ باغ اور سرائے کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ایک جگہ حضرت میاں میرؒ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کہ دولت خان کی باؤلی کے پاس پرانی عیدگاہ کے قریب احمد بیگ خان کی بہن کے مقبرہ کا گنبد ہے آپ وہاں بھی کبھی کبھی یادِ حق کیا کرتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پرانی عیدگاہ کہاں تھی؟ جہانگیر نے اپنے زمانہ میں سب سے پہلے لاہور میں عیدگاہ تیار کرائی جہاں مسلمان عیدین کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وقائع جہانگیری کے حوالہ سے صاحب تحقیقات چشتی (ص ۶۴۰ پر) لکھتے ہیں کہ عیدگاہ اور اس کی تعمیرات کے لیے جہانگیر نے بیس[2] لاکھ روپیہ منظور کیا تھا [اس عیدگاہ میں کس قدر عمارتیں تھیں اور وہ کس طرح اور کس زمانہ میں تباہ ہوئیں؟ اس کا ذکر قدیم مساجد لاہور میں انشاء اللہ کیا جائے گا ——— مرتب]

خان بہادر نج محمد لطیف ہسٹری آف لاہور (ص ۵۵ پر) اس عیدگاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ جہان کو جب لاہور میں عید کا تہوار آتا تھا۔ تو وہ عیدگاہ کو جاتے ہوئے اور بعد از نماز وہاں سے آتے ہوئے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے ہاتھی پر سے چاندی اور سونے کے سکے پھینکا کرتا تھا۔

صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں کہ اس شاہی عیدگاہ کی ایک عمارت کے گنبد میں محکمہ ریلوے کے ایک صاحب بہادر مدھیانہ ور بند کر کے وہاں رہا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیدگاہ ریلوے اسٹیشن کے قرب و جوار ہی میں تھی۔ اس عیدگاہ کے متصل ہی دارا شکوہ نے دولت خاں کی باؤلی کا پتہ بتایا ہے۔ اور چونکہ باؤلی کا تعلق بھی باغ یا سرائے ہی سے معلوم ہوتا ہے اس لیے قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ دولت خان کا باغ اور اس کی سرائے ریلوے اسٹیشن کے احاطہ سے لے کر دھوکے آوے کے درمیان کہیں

ہوں گے۔

تحقیقات چشتی (ص ۵۸۲ و ۵۸۳ پر) لاہور کے ایک محلہ دولت آباد کا ذکر ہے جو بجائے خود ایک شہر تھا۔ اس کا محل وقوع سنٹرل جیل اور موضع مزنگ کے درمیان بتایا گیا ہے۔ دولت آباد کے گرد کئی قلعے تھے جو مختلف لوگوں کے نام سے مشہور تھے۔ یہاں سید عبدالقادر ثانی کا مزار بھی ہے۔ جو سنہ ۹۴۴ھ/۱۴۹۴ء میں بغداد سے لاہور آئے تھے۔ اور سنہ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں وفات پا گئے تھے جب مغل حکومت کو زوال آیا تو ملک کی ویرانی کے ساتھ ہی دولت آباد۔ سرائے دولت خان اور باغ دولت خان اور قلعہ جات دولت آباد کسی کا نام بھی نہ رہا۔

شاہ عبدالجلیلؒ چوہڑ بندگی

گنج عرفاں ہے کہ ہے درگاہ شاہ عبدالجلیل
آیئے ایمان کی شمع فروزاں دیکھیے

حضرت سید احمد توختہ اور بی بی پاک دامناں کے ذکر میں کیچ مکران کے بادشاہ سلطان قطب الدین کا ذکر آیا ہے جن کے فرزند شاہزادہ بہاؤالدین کی مناکحت حضرت سید احمد توختہ کی صاحبزادی بی بی حاج سے ہو چکی تھی۔ اسی بی بی کے بطن سے سلطان حمیدالدین حاکم پیدا ہوئے جن کو سلطان التارکین اس لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے بیس سال کی حکومت کے بعد دنیا اور عیش و آرام دنیا کو ترک کر کے فقر اور درویشی کا جامہ پہن لیا تھا۔ ان کے دو فرزند تھے۔ فرزند خورد شیخ تاج الدین کی اولاد مٹو مبارک۔ (ریاست بہاولپور) اور بعض دوسرے مقامات میں آباد ہے اور فرزند اول شیخ نورالدین کی اولاد تحصیل جھنگ۔ تحصیل شاہدرہ تحصیل لاہور اور تحصیل چونیاں وغیرہ مقامات پنجاب میں آباد ہے۔ شیخ نورالدین کی پانچویں پشت میں شیخ عبدالجلیل پیدا ہوئے جو اپنے علم و عمل کی وجہ سے قطب العالم چوہڑ شاہ بندگی کہلائے۔

"چوہڑ شاہ بندگی" کے الفاظ کی وجہ تسمیہ میں مولانا نامی تاریخ جلیلہ کے صفحہ ۷۰ پر لکھتے ہیں کہ چوہڑ ریاست بہاولپور میں جہاں سے آپ لاہور رونق افروز ہوئے عام نام ہے۔ اس لیے چوہڑ بندگی لقب ہوا۔ آپ علم ظاہر و باطن حاصل کر کے اپنے والد شیخ ابوالفتح کی وفات کے بعد طالبان حق کی رہنمائی میں مشغول ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اشارۂ غیبی کے مطابق اور پاک پٹن کی زیارت سے فیض روحانی حاصل کرنے ہوئے لاہور تشریف لے آئے اور اس مقام کو اپنی اقامت گاہ بنایا جو اس زمانہ میں کوٹ کروڑ کے نام سے موسوم تھا۔ یہ مقام آپ کی موجودہ خانقاہ کے پاس ہی لودھیوں کے زمانہ میں خاصا آباد تھا۔ اور شہر سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ لیکن مغلوں کے عروج کے زمانہ میں جب لاہور کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو یہ بستی شہر کا ایک حصہ بن گئی اور اس کا نام محلہ حاجی سرائے مشہور ہوا۔ لیکن اب بقول مولانا نامی نہ وہاں کوئی کوٹ کروڑ کا نام جانتا ہے نہ محلہ حاجی سرائے کا۔ اب تو یہ سارا علاقہ قلعہ گوجر سنگھ کے نام سے موسوم ہے۔

لاہور کے کسی قدیم مصنف بلکہ خاندان جلیلہ کے قابل اہل قلم اصحاب میں سے بھی کسی نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کس سنہ میں لاہور آئے صرف اتنا لکھا ہے کہ بہلول لودھی ۸۵۵ھ لغایت ۸۹۴ھ مطابق ۱۴۵۱ء لغایت ۱۴۸۹ء کا زمانہ تھا۔

حضرت قطب العالم کے چار اور بھائی بھی تھے۔ ان میں شیخ جمال الدین ابوبکر نے تذکرہ قطبیہ کے نام سے آپ کے سوانح لکھے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا تذکرہ نویسوں کی طرح کرامت نویسی ہی کو سب سے زیادہ مدِنظر رکھا ہے چنانچہ صاحب تاریخ جلیلہ نے تذکرہ قطبیہ کے حوالہ سے آپ کی بہت کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ سکندر لودھی بادشاہ ہندوستان دولت خان لودھی اور دیگر اکابر سلطنت کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ حسن سوری نام ایک افغان اپنے بیٹے کو مرید کرانے کے لیے آیا۔ آپ نے حسن سوری کے لڑکے کو جس کا نام فرید تھا۔ بادشاہ سے بھی اونچی جگہ پہ بٹھایا۔ دولت خان لودھی اور بادشاہ کو یہ بات ناگوار خاطر ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔ جو فعل فقیروں سے سرزد ہو وہ بے معنی نہیں ہوتا۔ افغان بچہ افغانوں کے نام کو روشن کرے گا اور پھر فرمایا ؎

قادرا قدرت تو داری ہر چہ خواہی آں کنی
ہر گدائے را کہ خواہی در دمے سلطاں کنی

چنانچہ یہی فرید سوری ۹۴۷ھ میں ہمایوں کو ملک سے نکال کر شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ اور وہ سب سے پہلے آپ کے آستانے پر حاضر ہوا اور لنگر خانہ کے اخراجات کے لئے ایک ارشاد لکھ کر پھر کسی اور کام میں مصروف ہوا۔ لیکن ہندوستان کی تمام تاریخیں پڑھ جاؤ وہ لودھیوں کے زمانہ کی ہوں یا مغلوں کے عہد کی ان میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہ ملے گا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ سیاسی تاریخ لکھنے والوں کا کچھ اور مقصد ہوتا ہے اور صوفیا کے حالات اور کرامتیں لکھنے والوں کے کچھ اور مدِنظر ہوتا ہے۔

بہرحال آپ کے علم و فضل میں کسی کو کلام نہیں۔ سلہریا، بھٹی، کھوکھر اور چوہان قوم کے اکثر راجپوت آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ آپ صاحب روحانیت تھے۔ قلب آسائش دنیا سے پاک تھا۔ حکم الٰہی کے ماتحت آپ کا صاحب کرامت ہونا بعید بھی نہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ راہ چلتے ہوئے ایک شخص کو کوئی جانور ذبح کرتے ہوئے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ایک ہمراہی نے عرض کی۔ یا شیخ جو چیز شرع میں حلال ہو اس سے منہ پھیر لینا کیا؟ آپ نے فرمایا ؎

بہ شرع گرچہ حلال است در مروت نیست
ہلاک صید کہ او نیز چوں تو جانور است

تذکرہ قطبیہ اور دیگر تاریخ ہائے لاہور میں لکھا ہے کہ سلطان بہلول لودھی نے آپ کی فضیلت و بزرگی دیکھ کر آپ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ باوجود اس کے اپنی روزی خود پیدا کرتے تھے اور غلہ خود مہیا کرتے تھے۔ اور کسی مرید یا ملاقاتی کو تکلیف نہ دیتے تھے۔ بلکہ تذکرہ قطبیہ میں تو یہاں تک بھی لکھا ہے کہ آپ اور آپ کی زوجہ جو سلطان زادی تھی اکثر اوقات مل کر غلہ پیسا کرتے تھے۔

قطب العالم شیخ العالم صاحب کشف و کرامات ایک بادشاہ وقت کے داماد ایک بادشاہ کے قابل احترام بیسیوں اور ہزاروں مریدوں کے پیر صاحب علم و فضل اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے ہیں۔ محنت مشقت کرتے ہیں اور پیٹ پالتے ہیں۔ لنگر خانے کے اخراجات کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کسی سے نذرانہ نہیں لیتے اپنے جائے قیام پر لوگوں کو درس قرآن و حدیث

رہتے ہیں۔ مریدوں کی گداوری نہیں کرتے اور نہ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے چودھویں صدی کے آرام طلب ملنگ نامدار خرقہ پوشوں اور سجادہ نشینوں کے لیے سبق نہیں ہے۔ علامہ اقبال سچ کہہ گئے ہیں ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

خراب کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلےٰ کمالِ زراقی

عزّہ ماہ رجب سنہ ۹۱۰ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۵۰۴ء کا دن تھا۔ آپ کے کئی ارادت مند جن میں شیخ موسیٰ آہن گر اور شیخ زین الدین غازی بھی موجود تھے کہ آپ کی حالت بدل گئی اور سر سجدہ میں رکھ کر جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سکندر لودھی اس وقت لاہور میں موجود تھا۔ غسل کے وقت وہ بھی حاضر تھا۔ آپ کا مقبرہ عہد شاہانِ لودھی کی یادگار ہے۔ مقبرہ اور اس کی حدود کا مفصل حال تحقیقاتِ چشتی میں درج ہے۔ مزار کا احاطہ جو اس وقت ساڑھے چار کنال زمین کے اندر ہے میکلوڈ روڈ پر دفتر روزنامہ زمیندار کے عقب میں ہے ایک چار دیواری کے اندر ایک قدیم مسجد آپ ہی کی تعمیر کردہ اب تک موجود ہے مسجد کے ساتھ ایک تہ خانہ زمین دوزوں میں ہے۔ مغربی جانب اس تہ خانہ کا دروازہ ہے۔ چند زینے اتر کر لب زینہ ایک ڈیوڑھی آتی ہے شمالی رویہ زینے اتر کر مزار ہے اوپر عبادت خانہ ہے۔ ڈیوڑھی اس تہ خانہ کی سردار کھڑک سنگھ سندھانوالیہ نے (بزمانہ حکومت خالصہ) غلام محی الدین قریشی کے زیر اہتمام تعمیر کرائی۔ غلام محی الدین شاہ آپ کی اولاد سے تھے۔ ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ پر یہ قطعہ تاریخ درج ہے ؎

مکان خانقاہ قطب عالم
چوں از تعمیر نو زینت پذیرفت
بتاریخ بنائش ہاتف غیب
بنائے از غلام محی دیں گفت
۱۲۶۴ھ

احاطہ مزار کی دیواروں اور اندرونی عمارتوں کی حالت کہنگی اور عدم توجہی کے سبب خراب و خستہ ہو رہی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں جب مزار حضرت عبدالجلیل کا انتظام و انصرام پیر غلام دستگیر نامی کے سپرد ہوا۔ تو انھوں نے ع نام نیک رفتگاں ضائع مکن پر عمل کر کے ان کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ بلکہ پرانے مکانات مسجد اور مزار اور چاہ پختہ کی مرمت کے علاوہ مشرق کی جانب چند نئے مکانات بھی تعمیر کر دیئے۔

نامی صاحب نے آپ کی شان میں جو اشعار لکھے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل کئے جاتے ہیں: ؎

تو مسلماں کردہ از یک نظر
کافراں را بے گماں عبدالجلیل
ستھراں و راجپوتان و مغل!
بودہ اندت خادماں عبدالجلیل

ہست ہر قومے ارادت مند تو
اندریں ہندوستان عبدالجلیل
روضۂ پاکت زیارت گاہ خلق
نام تو وردِ زبان عبدالجلیل
ناؔمی احقر گدائے لاہوریست
شد بہ مدحت تر زبان عبدالجلیل

آپ کی دو بیبیاں تھیں ۔ ایک سلطان بہلول لودھی کی لڑکی ۔ دوسری ایک افغان سردار کی بیٹی تھی ۔ دوسرا نکاح آپ نے سلطان زادی کے انتقال کے بعد کیا تھا ۔ پہلی بی بی سے آپ کے فرزند ابوالفتح ثانی تھے اور دوسری سے شیخ بہاؤالدین ابوالفتح ثانی یعنی سلطان بہلول لودھی کے نواسے کی اولاد آپ کے مزار پر قابض چلی آتی ہے ۔ حضرت ابوالفتح ثانی کی چھٹی پشت میں شیخ ابوالحسن ثانی بڑے جید بزرگ گزرے ہیں ۔ ان کے پوتے پیر کرم شاہ المشہور پیر مبیسنا شاہ (واقعہ شہادت ۱۲۰۰ھ ۱۸۰۵ء) کے چار فرزند تھے ، پیر وارث شاہ ، پیر قلندر شاہ ، پیر سکندر شاہ ، پیر فرخ بخش ۔ ان چاروں بھائیوں نے اپنی تصانیف اپنے علم و فضل اپنے علم شریعت و طریقت سے اپنے خاندان کا نام پنجاب اور ہندوستان میں بھی مشہور کیا ۔ ان کی تصانیف اور ان کی زندگیوں کے حالات ناؔمی صاحب نے تاریخ جلیلہ میں تفصیل سے لکھے ہیں ۔ پیر غلام محی الدین شاہ قریشی جنھوں نے ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں تہ خانہ کی ڈیوڑھی تعمیر کرائی تھی ، پیر قلندر شاہ ہی کے فرزند تھے ۔ پیر غلام محی الدین کے دو فرزند اور تین بیٹیاں تھیں ۔ بیٹوں میں پیر محمد اشرف شاہ کے اہتمام میں بزرگوں کے مزارات (دربار پیراں ، لاہور) رہے ہیں ۔ آپ نے اپنی وصیت (۲۴ فروری ۱۹۱۶ء) کے مطابق موضع بھٹے وڈ کی اراضی (قریب دو گھماؤں) خانقاہ پیر قلندر شاہ کی حفاظت و تعمیر کے لیے اور چاہ موسومہ چوہڑ شاہ بندگی معہ متعلقہ اراضی واقعہ قلعہ گوجر سنگھ لاہور خانقاہ حضرت عبدالجلیلؒ کے اخراجات کے لیے علی الدوام وقف فرما کر تولیت ان کی پیر غلام دستگیر ناؔمی کے نام کر دی ۔ ناؔمی صاحب نے جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے ۔ ان خانقاہوں کی حفاظت و تعمیر میں نمایاں حصہ لینے کے علاوہ اس موقف سے اپنے خاندان کے نامور بزرگوں کی کئی کتابیں طبع کرائی ہیں ۔ تاریخ جلیلہ کے نام سے ایک ضخیم مصور تاریخ طبع کی ہے ۔ ایک اخبار بھی الجلیل کے نام سے جاری کیا تھا ۔ پیر غلام دستگیر ناؔمی ، پیر مراد شاہ کے چوتھے بھائی پیر فرخ بخش کے فرزند پیر حید شاہ کی دختر کے بطن سے ہیں ۔

شاہ کاکو چشتیؒ

شاہ کاکو کا مزار اور باغ دونوں مٹ گئے
رو بیٔے جب تک در و دیوار سنگھاں دیکھئے

اکثر تذکرہ نویسوں نے اس بات کا رونا رویا ہے کہ صوفیا و صلحاء کے حالات لکھنے والوں نے کسی بزرگ کے سال پیدائش و وفات کا بہت کم ذکر کیا ہے اور ان بزرگوں کے حالات لکھنے میں زیادہ تر عقیدت مندانہ رنگ کا اظہار ہوتا ہے کسی واقعہ کے ساتھ سنہ کا لکھنا بارِ گراں اور کرامتوں اور مافوق العادات کارناموں کا تفصیل سے ذکر کرنا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے ۔

راقم کو بھی اکثر بزرگوں کے حالات لکھنے میں اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہی مشکل حضرت شاہ کاکوؒ کے حالات میں پیش آ رہی ہے۔ مثلاً لاہوری مصنفوں میں صاحب تحقیقات چشتی اور صاحب تاریخ لاہور اور صاحب خزینۃ الاصفیاؒ نے بھی آپ کا سالِ ولادت نہیں لکھا۔ نہ آپ کے وطن کا ذکر کیا ہے۔ نہ یہ لکھا ہے کہ کس بادشاہ کے عہد میں آپ گذرے۔ اور اگر کوئی واقعہ لکھا بھی ہے۔ تو اس پر غور نہیں فرمایا کہ اس واقعہ کو تاریخ سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ چنانچہ صاحب تحقیقات و صاحب تاریخ لاہور حضرت شاہ کاکو کے متعلق لکھتے ہیں کہ "آپ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلی کے مرید اور خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ملنے والوں میں تھے" لیکن بابا گنج شکرؒ جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پیر طریقت تھے۔ ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں پیدا ہوئے اور بعمر پچانوے سال ۵ محرم ۶۷۰ھ کو وفات پا گئے۔ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ صفر ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء کو انتقال فرما گئے۔

صاحب تذکرہ شیخ جوہر قطب العالم شاہ عبد الجلیل کے حوالہ سے صاحب خزینۃ الاصفیا اور صاحب تاریخ جلیلہ شیخ کاکو کا سالِ وفات ۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء لکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کاکو جو خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ۱۵۰ سال اور بابا فرید الدین گنج شکر سے ۲۱۰ سال بعد فوت ہوئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیاؒ (ص ۴۰۰ جلد اول میں) یہ بھی لکھتے ہیں کہ "نسب شریف وے بہ چند واسطہ بہ حضرت فرید الحق والدین گنج شکر مے رسد" اس سے واضح ہوتا ہے شیخ کاکو حضرت بابا صاحب کی تیسری چوتھی پشت میں تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو شیخ کاکو کا حضرت بابا صاحب اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے مستفیض ہونا اور بھی مشکل نظر آتا ہے۔

غرض اس قسم کی فرو گذاشتیں ہیں۔ جن کو اولیائے کرام کے تذکرہ نویس ذہن میں نہیں رکھتے۔

حضرت شیخ کاکو شیخ نور الدین نام ایک بزرگ سے ابتدا میں تحصیلِ علم کرتے رہے۔ جب لاہور آئے تو شیخ پیر محمد چشتی سے فیض کامل حاصل کیا۔ اور پھر لاہور ہی میں ساری عمر گذار دی۔ بیشمار لوگ آپ کے فیض صحبت اور آپ کے ارشادات سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ آپ ۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء میں بزمانہ سلطان بہلول لودھیؒ[1] لاہور میں وفات پا گئے۔ ان کے فرزندوں میں شیخ اسحاق صاحبِ حال و قال گذرے ہیں۔ شیخ عارف چشتی لاہوری جو شاہجہان کے زمانہ میں لاہور کے مشہور اہل اللہ بزرگ تھے شیخ اسحاق ہی کے مریدانِ باکمال میں تھے۔

جہاں حضرت شیخ کاکو کا مزار ہے وہیں آپ کی اقامت گاہ تھی۔ آپ ہی کے دم قدم کی بدولت اس محلہ کا نام گذر شاہ کاکو یا محلہ شاہ کاکو مشہور تھا۔ جب دارا شکوہ نے اپنی حویلی میں جس کے کھنڈروں پر اب سرائے میاں سلطان اور اس کے ملحقات آباد ہیں۔ اقامت اختیار کی تو اس محلہ کا نام محلہ دارا شکوہ اور چوک دارا شکوہ مشہور ہو گیا۔ اس مزار کے شمالی رو بہ محلہ جوہریاں اور جنوب رو بہ محلہ نخاس تھا جہاں پہلے سوداگران اسپ رہا کرتے تھے۔ بعد میں نواب عبد الصمد خان اور نواب معین الملک کی نظامت کے ایام میں سکھ لیٹروں اور باغیوں کو پھانسی ملا کرتی تھی۔ مزار کے شرقی رو بہ ایک بہت خوبصورت

---

[1] تخت نشینی بہلول لودھی ۱۷ ربیع الاول ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء۔ وفات ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء۔

باغ تھا جو نواب شاہنواز خاں گورنر لاہور اور احمد شاہ ابدالی بادشاہ کابل کی جنگ میں خراب و خستہ ہو کر برباد ہو گیا۔ ۱۷۶۶ء میں باغ کی زمین پر کاشت ہوا کرتی تھی۔ بلکہ حضرت کے مزار کے چاروں طرف زراعت ہی زراعت نظر آتی تھی۔

حضرت شاہ کاکو ؒ چونکہ مرفوع الحال تھے اور بالکل دنیا داروں کی طرح رہتے تھے۔ اس لیے بہت کم لوگ آپ کے روحانی کمالات سے آگاہ تھے۔ یہاں تک کہ حضرت میاں میر ؒ کے زمانہ تک بھی لوگ اس مزار کو بوجہ اس کی سادگی اور کچھ صاحب مزار کے کمالات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے معمولی مزار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت میاں میر ؒ اس جگہ آئے اور فاتحہ پڑھ کر اپنے یاروں سے فرمایا کہ یہ مزار ایک کامل بزرگ اور بہت بڑے ولی کا ہے۔ اس زمانہ سے لوگوں کو آپ کے صاحب کمال ہونے کا علم ہوا۔ ان ایام میں نو مسلم شیخ (خوجہ برادری) نے اس مزار کی طرف توجہ کی اور چونکہ بعض منتیں پوری ہو جانے کی وجہ سے اس درگاہ سے ان کو خاص عقیدت ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس مزار پر ربیع الاول کی ہر بارھویں تاریخ کو عرس منانا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ ساڑھے تین سو سال تک برابر جاری رہا۔

عرس کے ایام میں چراغاں اور قوالی کے علاوہ رقص و سرود کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ فاتحہ خوانی کے ساتھ نان حلوا بھی تقسیم ہوتا تھا اور فرش فروش سائبان اور قناتیں بھی لگائی جاتی تھیں۔ لیکن ان تکلفات کو دیکھ کر مزار کے اندر سے ضرور یہ خاموش صدا آتی ہو گی۔ ؎

تم اس کے واسطے بیکار کیوں زحمت اٹھاتے ہو
تہِ مدفن مجھے کیا فائدہ ہو گا چراغاں سے

آپ کی رحلت سے کچھ عرصہ بعد مرقد کے متصل ایک اور مسجد اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر ہوئی اور دارا شکوہ بن شاہ جہاں کے زمانہ میں اسی کے نام پر محلہ دارا شکوہ بھی آباد ہوا۔ جس کو چوک دارا شکوہ بھی کہتے تھے۔ جب مغل حکومت نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں کے بعد رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگی اور سکھوں نے رفتہ رفتہ بام عروج پر چڑھنا شروع کیا تو مسلمانوں کے مقبروں اور ان کی مسجدوں اور ان کی شاندار عمارتوں کی شامت آگئی۔ چنانچہ اس مسجد اور اس مقبرہ پر بھی سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب سکھوں کی سب سے بڑی بے آئین حکومت یعنی سہ حاکمان لاہور کے بعد ۱۷۹۸ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا۔ تو اس نے بھی یہاں سکھوں کا قبضہ برقرار رکھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد جب پنجاب پر انگریزوں کا پرچم لہرایا تو مسلمانوں کو داد فریاد کا موقع ملا۔ دیوانی دعوے بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ ۱۹۳۵ء کی کڑکتی ہوئی گرمیوں میں جانی قربانیاں بھی ہوئیں۔ لیکن کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اور کچھ مسلمانوں کی خود غرضانہ پارٹیوں کی بدولت ہر بار ناکامی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں نے مسجد کو گوردوارہ بنا لیا اور قبر اس کے چبوترہ اور اس کے قدیم درخت بیری کا نام و نشان تک نہ رہنے دیا۔ یہ المناک واقعہ جولائی ۱۹۳۵ء کے عشرہ اول میں سر ایمرسن کی گورنری اور سر سکندر حیات خاں کی وزارت کے ایام میں پیش آیا۔

۱۹۳۵ء سے اب تک کہ ۱۹۴۴ء ہے۔ لنڈا بازار کے سرے پر مسجد شہید گنج (اور اب گوردوارہ شہید گنج) کے سامنے چاہ میاں سلطان کے رُخ پولیس کے چند سپاہی رہتے ہیں۔ وہاں روزانہ گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا ہے بازار یعنی مغرب کی جانب ایک مضبوط۔ بلند اور پختہ خشتی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ گوردوارہ کے دو دروازے ہیں۔ ایک بازار شہید گنج کی طرف

سرا نیلا بازار کی طرف ٹیکنیکل سکول کی دیوار کے بالمقابل سڑک کا ما عمنہ چھوڑ کر۔ دونوں دروازوں پر سکھوں اور پولیس کا پہرہ
ہوتا ہے اور کسی مسلمان کو گوردوارہ کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔[1]

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شیخ موسیٰ آہن گرؒ[2]

[یہ بزرگ لودھی بادشاہوں کے زمانے میں یہاں موجود تھے اور اپنی روزی لوہار کا کام کر کے کماتے تھے۔ ابتدا میں شیخ سعد اللہ بن شیخ یوسف کے شاگرد اور مرید ہوئے جو حضرت بہاؤ الحق ملتانیؒ کے سجادہ نشین تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوتے اور کچھ عرصہ ان کی تربیت میں رہے۔ شیخ ان کی علمی اور روحانی قابلیت سے اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی خانقاہ کے متصل تین بیگھہ زمین ان کو عطا کر دی اور یہ وہاں رہنے لگے۔ یہ جگہ اس زمانے میں کوٹ کروڑ کہلاتی تھی۔ اسی جگہ قلعہ گوجر سنگھ کے متصل میکلوڈ روڈ پر آپ کا مزار واقع ہے۔

شیخ موسیٰ کی طبیعت جلالی تھی۔ مفتی غلام سرور لاہوری، رائے بہادر کنہیا لعل اور سید محمد لطیف کا بیان ہے کہ "ایک روز شیخ موسیٰ اپنی بھٹی کے پاس بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک ہندو عورت اپنا تکلا سیدھا کرانے کے لیے آئی۔ آپ نے تکلا تو آگ میں ڈالا اور خود ٹکٹکی باندھے اس عورت کی طرف دیکھنے لگے۔ عورت نے خیال کیا کہ یہ شخص شاید بدنیتی سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ تلملا سی گئی اور بولی کہ آپ میرا کام کیوں نہیں کرتے۔ میری طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سن کر شیخ موسیٰ جلال میں آ گئے اور آپ نے کہا: "اے عورت! میرا دھیان تو صانعِ حقیقی کی صناعی پر تھا۔ میں یہ تکلا جو آگ کے انگارے کی طرح سرخ ہے اپنی آنکھوں میں پھیرتا ہوں۔ اگر میں نے تجھے بری نیت سے دیکھا ہو تو میری روشن آنکھیں بریاں ہو کر اندھی ہو جائیں۔" یہ کہہ کر آپ نے وہ تکلا اپنی آنکھوں میں پھیرا مگر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا بلکہ تکلا سونے کا ہو گیا۔ اس واقعہ سے وہ عورت بہت متاثر ہوئی۔ آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے ساری عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہی۔ اس کی قبر بھی شیخ موسیٰ کے احاطے کے شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے۔"

شیخ موسیٰ کے سال وفات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر شجاع الدین لکھتے ہیں کہ "شیخ عبدالجلیلؒ سے کسبِ فیض کے بعد شیخ موسیٰؒ عمر بھر لاہور میں اقامت گزیں رہے۔ آپ کے ہادیٔ طریقت حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی ۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) میں فوت ہوئے۔ حضرت موسیٰ آہنگر کا سال وفات خزینۃ الاصفیاء وغیرہ اولیاء کے تذکروں میں ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) مرقوم ہے۔ آئینِ اکبری اور ملا نظام الدین احمد کی کتاب طبقاتِ اکبری میں آپ کی تاریخ وفات دورِ اکبری کا ابتدائی زمانہ بیان کی جاتی ہے۔ اکبر ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) میں سریر آرائے ہندوستان

---

[1] یہ قیام پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب سکھ یہاں نہیں ہیں۔ گوردوارہ بند پڑا ہے۔ باہر مسلمان سپاہی پہرا دے رہے ہیں۔ یاتری سال کے سال آتے ہیں اور زیارت کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ مسلمان اب بھی اس جگہ کے دعویدار ہیں مگر حکومت خاموش ہے۔ (مرتب)

[2] شیخ موسیٰ آہن گر کے حالات مرتب کے قلم سے ہیں۔

ہوا۔ اس لحاظ سے شیخ کا سال وفات کم از کم ۱۵۵۵ء یا ۱۵۵۸ء سمجھنا چاہیئے۔ بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے شیخ کے بعد پچاس سال سے زیادہ عرصہ زندہ رہے ہوں۔ لیکن ابوالفضل اور نظام الدین احمد جیسے معتمد اور ثقہ ہم عصر مورخین کا متفقہ بیان بھی اس قابل نہیں کہ رد کر دیا جائے۔ پس اگر شیخ عبدالجلیل کی وفات کے وقت آپ کی عمر تیس بتیس سال کی ہو تو آپ کا اسی پچاسی سال کی عمر پا کر دورِ اکبری کے آغاز میں فوت ہونا خلافِ تحقیق معلوم نہیں ہوتا[1]۔

شیخ موسیٰ لودھیوں کے بعد سوری بادشاہوں کے عہد میں بھی معزز رہے کیونکہ شیر شاہ سوری خود حضرت شیخ عبدالجلیل کا معتقد تھا۔ اور اس نے آپ کی خانقاہ کو جاگیر بھی عطا کی تھی۔

شیخ موسیٰ کا مقبرہ میکلوڈ روڈ پر قلعہ گوجر سنگھ کے قریب نو تعمیر مکانوں کے درمیان واقع ہے۔ گنبد ایک مختصر سے احاطے میں ہے جس کے نیچے ایک بلند چبوترے پر قبر ہے۔ مقبرہ سے ملحق ایک مسجد ہے۔ گنبد چوکور ہے۔ اس پر فیروزی رنگ کی نہایت خوبصورت گلکاری کی ہوئی ہے۔ یہ گنبد لاہور میں منبت کاری کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس کی شکل مقبرہ سید فیروز گیلانی سے ملتی جلتی ہے جو ۱۵۲۰ء میں فوت ہوئے اور جن کا مزار نسبت روڈ پر واقع ہے۔

لاہور کی لوہار برادری کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آپ کے معتقد ہیں۔ آپ کا عرس آپ کے عقیدت مندوں کی دو پارٹیاں سال میں دو موقعوں پر علیحدہ علیحدہ کرتی ہیں۔ ایک پارٹی ۲۰ صفر المظفر کو اور دوسری غیر معین تاریخوں میں[2]۔ اب سے دو سو سال قبل آپ کا عرس ۲۲ ربیع الآخر کو ہوا کرتا تھا[3]۔ ——— [مرتب]

پیر شیرازی

ان کا مزار لاہور کے محلہ چوڑے موری میں واقع ہے۔ نام ان کا پیر سراج الدین تھا مگر لوگ عام طور پر انھیں "پیر شیرازی" کہتے ہیں۔ یہ بزرگ سلطان محمد تغلق کے عہد میں بخارا سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ بہت بڑے عالم اور عارف تھے۔ تدریس و تلقین کے سبب ہزارہا لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ بادشاہ نے شہرت سنی تو ان کو شہر کا قاضی مقرر کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔ بادشاہ سخت ناراض ہو کر ان کے درپے آزار ہوا۔ مگر انھوں نے تعلیم و تلقین کا دروازہ بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وفات کے بعد بھی اسی حجرے میں دفن ہوئے۔ مزار ان کا پختہ بنا ہوا ہے اور عمارتوں میں گھر گیا ہے[4]۔ ——— [مرتب]

---

[1] مضمون "حضرت شیخ موسیٰ آہنگر" مطبوعہ حمایت اسلام لاہور ۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۔

[2] تاریخ جلیلہ مصنفہ پیر غلام دستگیر نامی مطبوعہ ۱۹۳۷ء ص ۳۳۴۔

[3] ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۴۷ء ص ۲۹۔ [4] تاریخ لاہور کنہیا لال ص ۱۵۲۔

شبابِ لاہور

(عہدِ مغلیہ میں)

بن گئے گورِ غریباں کس طرح شاہی محل
آئیے یہ بھی طفیلِ چرخِ گرداں دیکھئے
درسِ تمہیدِ خزاں ہے جلوۂ رنگِ بہار
چشمِ عبرت سے تماشائے گلستاں دیکھئے

بابر نے ۱۵۲۴ء سے ۱۵۲۶ء تک تین بار لاہور پر حملہ کیا۔ پہلے حملے میں اس نے برافروختہ ہو کر اپنی فوج کو شہر لوٹنے کی اجازت دی۔ فوج نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کا کچھ حصہ جلا بھی دیا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد دولت خاں لودھی حاکم لاہور نے بابر کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ بابر دو مرتبہ آیا اور آخری مرتبہ تو لاہور اور سرہند سے گزر کر پانی پت پر افغانوں کے ساتھ ایک عظیم جنگ کی جس میں سلطان ابراہیم مارا گیا۔

مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں کیا قائم ہوئی کہ دہلی، آگرہ وغیرہ مقامات کے ساتھ ہی لاہور کی قسمت بھی چمک اٹھی اور اس کا ستارۂ اقبال عروج پر آ گیا۔ بابر کے جانشینوں کے عہد میں لاہور نے وہ رونق حاصل کی کہ اس کی آبادی اس زمانے کے مؤرخین کے قول کے مطابق نو سے بارہ میل کے اندر تھی۔

بابر کے جانشینوں کے زمانے میں جو کیفیت لاہور کی رہی ہے اس کا مجمل سا بیان یہاں کیا جاتا ہے :-

دورِ ہمایونی

ہمایوں نے کابل، قندھار اور پنجاب اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کامران کو دے دیئے۔ کامران نے سب سے پہلے لاہور میں خوش نما عمارات کی طرح ڈالی۔ تھارنٹن صاحب کے قول کے مطابق ایک عالی شان محل مع ایک وسیع باغ کے جو نولکھا سے راوی تک پھیلا ہوا تھا، تعمیر کرایا۔ اب اس باغ اور محل کا کہیں نشان تک نہیں۔ اس کے علاوہ دریا کے پار ایک عالی شان باغ اور خوبصورت بارہ دری کی بنیاد رکھی۔ اسی بارہ دری میں جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو کو ۱۶۰۶ء مطابق ۱۰۱۴ھ میں بغاوت کے جرم میں قید کیا تھا۔ اس بارہ دری کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے جس کی شکستہ دیواریں دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں۔

کامران مرزا نے اپنے عہد میں لاہور کو بے حد رونق دی۔ جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تو وہ اپنے بھائی کے پاس لاہور چلا آیا۔ لیکن جب شیر شاہ کے خوف سے کامران کابل بھاگ گیا اور ہمایوں جو دھپور اور راجستان کے جنگلوں اور ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا ایران چلا گیا تو شیر شاہ بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس نے اپنی پنج سالہ حکومت میں، نہایت عام کے بڑے بڑے کام کیے۔ مگر لاہور چونکہ مغلوں کا مرکز تھا اس لیے اسے لاہور سے خاص عداوت تھی۔ اس نے لاہور کو تباہ کر کے اس کی بجائے سیالکوٹ کو پنجاب کا دارالخلافہ مقرر کرنا چاہا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔[1]

عہدِ اکبری

چودہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۵۵۴ء میں ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے لاہور میں داخل ہوا۔ اہلِ لاہور نے اس کی واپس آنے پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور اس شہر میں جسے شیر شاہ اور اس کا بیٹا خاک میں ملانا چاہتے تھے، عظیم پیمانے پر چراغاں کیا گیا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کے انتقال کے بعد اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں لاہور کو جو رونق ہر پہلو سے نصیب ہوئی، اس کے بعد عہد شاہجہانی کے سوا اور کسی عہد میں نہیں مل سکی۔

اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک یعنی کامل پندرہ سال لاہور کی آبادی اور رونق کے لیے لاہور میں مقیم رہا۔ عہد اکبری کے یورپی اور ہندوستانی سیاحوں اور مورخین نے لاہور کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مسٹر طامسن ہربرٹ نامی ایک سیاح ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا۔ اکبر ان دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے کسی شہر سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا سال کے آٹھ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے۔ بازار اچھے بارونق اور پختہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے دریائے راوی کے ذریعے جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے صاف کیے جاتے ہیں۔ یہاں کی قابلِ دید عمارات میں قلعہ، محلات، حمام، تالاب۔ باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔ قلعہ بہت بڑا ہے۔ جسے اکبر نے اپنے قیام لاہور کے ایام میں پختہ حصنی بنوایا اور اس میں رفیع الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قلعہ کے بارہ چوڑ دروازے ہیں جن میں سے تین کا منہ شہر کی طرف ہے، اور نو کا باہر جنگل کی طرف۔[2]

---

[1] تاریخ پنجاب ترجمہ محمد لطیف صفحہ ۲۵۔

[2] آجکل صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے جو ڈیوڑھی گوردوارہ جن دلیرا در سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل ہے۔

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لاہور کے متعلق لکھتا ہے:-

"لاہور بزرگ شہریست میان دو آبہ باری۔ در بزرگی و انبوہ مردم
کم ہمال۔ درین دولت ابد پیوند قلعہ وارک او از خشتِ پختہ
ساختہ اند و چون چندگاہ پایۂ تخت شدہ والا کاخہا برافروختہ آمدہ
ودلکشا باغہا شادابی دیگر بخشید و گوناگون مردم بر شہر راہ بیگانہ شدہ
و شگرف کارہا بہر ساختند و در انبوہی و بزرگی از اندازہ گذشت"

لاہور میں شال بافی اور پشمینہ کا کام اس کثرت سے ہوتا تھا کہ لاہور اس زمانہ میں چھوٹا کشمیر معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں یہاں کی شال بافی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"و از توجہ شاہنشاہی در لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شدہ"

اسی لاہور میں جہاں سولھویں صدی عیسوی میں ایک ہزار سے زیادہ شال بافی کے کارخانے تھے، وہاں آج بیسویں صدی میں ایک بھی نہیں۔

لاہور ہی سے اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسی شہر میں بیٹھ کر اقوام سرحد کی گوشمالی کی۔ اسی شہر میں اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے خیر پورہ[1] اور دھرم پورہ کے نام سے دو عظیم الشان غریب خانے (POOR HOUSES) قائم کیے۔ اسی شہر میں اکبر نے ملا احمد ٹھٹھوی کو تاریخ الفی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کو راماین۔ جامع رشیدی اور بہارت کے تراجم اور ملا محمد شاہ آبادی کاشمیری کو تاریخ کشمیر لکھنے کا حکم دیا۔ اسی شہر میں فیضی نے ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء میں مثنوی نل دمن لکھی۔

۱۵۹۵ء میں اکبر لاہور ہی میں تھا کہ گوا سے پرتگیزی پادریوں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی۔ ان پادریوں نے اپنے دلچسپ سفرناموں میں لاہور کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہر ایسا بارونق اور آباد ہے اور اس میں شاہی محلات کے علاوہ امرا و وزراء کے ایسے ایسے عالی شان مکانات ہیں کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادشاہ ان ایام میں راوی کے ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جہاں اس کے رہنے کے لیے ایک خوشنما بنگلہ بنایا گیا تھا[2]۔

لاہور میں اکبر نے اپنے نام پر ایک منڈی بھی تعمیر کی۔ جسے آج تک اکبری منڈی کے نام سے پکارتے ہیں نیز ایک دروازہ بنایا جس کا نام اس کے نام پر اکبری دروازہ[3] رکھا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کی موجودہ شکل بہت تبدیل ہو چکی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ عمارتوں کی وضع قطع اکبری عہد کی سی نہیں ہے۔

ابوالفضل نے لاہور میں ایک عظیم الشان مکان "فضل آباد" کے نام سے تعمیر کیا۔ اسی جگہ ابوالفضل اور فیضی کے

---

[1] خیر پورہ کی عمارت کا کچھ حصہ اب بھی دارانگر کے قریب سڑک میاں میر[rh] کی بائیں جانب موجود ہے۔
[2] آج کل اس جزیرہ اور بنگلہ کا نشان تک نہیں۔
[3] اکبری دروازہ حال ہی میں مسمار کر دیا گیا ہے (قریشی)

باپ شیخ مبارک نے ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء میں انتقال کیا۔

ہمایوں کے زمانہ کے ایک بزرگ جنھوں نے سوری خاندان کے عہد میں بڑا عروج پایا تھا، اکبر کے وقت میں بھی پورے عروج پر تھے۔ نام ملا عبد اللہ اور خطاب مخدوم الملک تھا۔ ان کے املاک اور مکانات جو شاہی ایوانات سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے، لاہور میں تھے۔ ملا ئے مذکور نے ان مکانات کے اندر بڑی بڑی قبریں بنوا رکھی تھیں جن پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے اور وہاں ہی سے چراغ جلنے لگتے تھے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی کہ یہ مقبرے اور مزار نہیں بلکہ دفینے اور خزانے ہیں۔ جب ان قبروں کو کھودا گیا تو اس قدر زر و دولت برآمد ہوئی کہ بادشاہ دنگ رہ گیا۔ یہ سب مال تین کروڑ روپے کا تھا جو اینٹوں کی شکل میں صندوقوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ آخر یہ سب مال جو خلق خدا کے گلے گھونٹ گھونٹ کر جمع کیا گیا تھا، اکبری خزانے میں داخل کر لیا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوان داس کے محلات دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے تھے مگر اب ان کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بیٹا عبد الرحیم خان خاناں جس کی فیاضی و سخاوت نے حاتم کو بھی مات کر دیا تھا لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا جہاں اس کے باپ کا رفیع الشان محل لاہور کے لیے باعثِ نازش تھا۔

[راجہ مان سنگھ، امیر زا قلیچ خاں، نظام الدین مصنف طبقاتِ اکبری وغیرہ امرائے دربارِ اکبری کے باغات نے لاہور کو باغِ ارم اور ان کے محلات نے اس کو عروس البلاد بنا رکھا تھا۔ بادشاہ کی فیاضی، سیر چشمی اور علمی قدر دانی نے شاعر، مصور، مؤرخ علماء، فضلاء، اہلِ سیف، اہلِ قلم، صناع اور کئی قسم کے باکمال لاہور میں جمع کر دیئے تھے ——— مرتب]

حکیم ہمام کے بھائی حکیم علی گیلانی کا حوض[1] اسی لاہور میں تھا جسے اس قابل حکیم نے ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء میں اس حکمت کے ساتھ تعمیر کیا کہ بڑے بڑے انجینیئر حیران رہ گئے۔ اس حوض میں یہ خوبی تھی کہ اس کی تہ تک ایک زینہ کے ذریعے جانا پڑتا تھا اور وہ زینہ ایک ایسے حجرے یا کمرے میں جا کر ختم ہوتا تھا جو حوض کی تہ کے نیچے واقع تھا۔ یہ حجرہ رقبہ میں ۳۶ مربع گز تھا اور سنگین حوض کی تہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس کی چھت پر ایک بلند مینار اور حجرہ کے چاروں طرف پل تھے۔ حجرے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے لیکن پانی اندر نہیں جا سکتا تھا۔

اکبر عجائبات کا عاشق تھا۔ اس نے بہ نفسِ نفیس اس حوض کو ملاحظہ فرمایا۔ کپڑے اتار کر غوطہ لگایا اور حجرہ میں داخل ہو گیا۔ اس حجرہ میں ایک تکیہ اور چند کتابیں مطالعہ کے لیے رکھی تھیں۔ حجرہ میں ہوا اور روشنی کا پورا انتظام تھا۔ بادشاہ کو مختصر سی حاضری بھی دی گئی جسے اس نے نہایت شوق سے نوش فرمایا۔ ہوا خواہ باہر تھے۔ وہ بہت گھبرائے۔ جب بادشاہ باہر آیا تو سب کو اطمینان ہوا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر حکیم موصوف کو منصب پنج صدی عطا کیا۔

جہانگیر نے بھی اس حوض کا اپنی تزک میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

" حجرہ نہایت روشن ہے جس کا راستہ اسی حوض میں سے

---

[1] بحوالہ مآثر الامرا، تاریخ لاہور (انگریزی و اردو) دربارِ اکبری، تاریخ ذکاء اللہ۔

ہے۔ مگر پانی کی ایک بوند اندر نہیں جاتی۔ دس بارہ
آدمی حجرہ میں بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔" (ترجمہ)

جہانگیر نے حکیم علی گیلانی کو منصب دو ہزاری اور اس کے بیٹے حکیم عبدالوہاب کو پانصد سوار کا منصب عطا کیا۔
۱۰۰۹ھ میں اسی نمونے پر ایک اور حکیم نے فتحپور سیکری میں ایک حوض بنانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوا

اکبر کے زمانے میں دریائے راوی نہایت جوش و خروش سے بہتا اور شاہانِ مغل کی قدم بوسی کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا پانی اس قدر گہرا تھا کہ اس میں جہاز چلا کرتے تھے۔ رؤسائے شہر اور امرائے دربار نفیس، دل آویز اور رنگین جھالردار کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے اور گرمی کے موسم میں خنک اور مرطوب ہوا کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔

۱۵۹۲ء میں راوی کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز لمبی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ شہتیر سال اور ناجو کے استعمال کئے گئے۔ اور ۴۶۸ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس پر کام کرتے رہے۔ تیار ہو جانے پر ایک ہزار آدمیوں نے دس روز میں بڑی مشکل سے اسے دریا میں ڈالا۔ اور لاہری بندر (موجودہ ٹھٹھہ) جو سکھر کے متصل دریائے سندھ پر واقع ہے، پہنچایا۔ جہاز وزنی تھا اور دریا میں پانی کم تھا، اس لیے جہاز کو جا بجا ٹکنا پڑتا، آخر بصد مشکل جہاز منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اس زمانے میں ایسے ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے جو دریا کا زور بڑھا کر گذرگاہ کو جہاز رانی کے قابل بنا لیتے۔ اس لیے آمد و رفت جاری نہ رہ سکی۔ شہنشاہ نے ۱۵۹۵ء میں ایک اور جہاز تیار کرایا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے وزن کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی یہ جہاز ۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک بآسانی جا پہنچا۔ اس کا مستول ۳۷ گز کا تھا اور ۸۳۳۲۴۱ روپے اس پر لاگت آئی تھی۔[1]

زندہ دل بادشاہ نے جہاں جہاز چلا دیئے وہاں کشتیوں کا کیا شمار ہو گا۔ اور پھر جب امرا و وزرا اور خود شہنشاہ کشتیوں کی سیر کرتے ہوں گے اور عام لوگ بھی اپنی اپنی باکرایہ کی کشتیوں میں دریا کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے تو وہ وقت کیا فرحت افزا ہوتا ہو گا۔

۱۵۹۱ء کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ (سندھ) پر یورش کی۔ سامانِ جنگ خشکی کے راستے کے علاوہ راوی کے ذریعے ٹھٹھہ بھیجا گیا۔ دربارِ اکبری میں لکھا ہے :-

"بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ پچاس ہزار
ایک دفعہ، پھر لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں
اور دیگر سامانِ جنگ راوی کے ذریعہ ٹھٹھہ کو بھیجا جہاں مرزا
جانی حاکم ٹھٹھہ سے کئی دن تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ خان
خاناں مرزا عبدالرحیم اس مہم کا سپہ سالار تھا اور علاوہ دیگر

---

[1] دربارِ اکبری بحوالہ اکبرنامہ صفحہ ۱۱۲ ۔

کشتیوں کے کل پچیس (۲۵) جنگی کشتیاں لے کر ٹھٹھہ سے وہ چلا تھا
اور ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء کے جشن نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کر کے
لاہور لے آیا تھا۔"

اکبر کے زمانے میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب و غریب طبیعت لے کر آیا تھا۔ جر ثقیل اور جیوبعاست کے عمل کرتا۔ علم ہیئت کے آلات رکھتا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھتا اور خود دکھاتا، آگرہ کی طرح لاہور میں بھی آتشکدے تعمیر ہوئے۔ نوروزی جشن کو کھلے بندوں سورج کی پرستش ہوتی۔ برہمن اپنے مذہبی تہوار کے دن میں اس کی پیشانی پر تلک لگاتے تھے۔ علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علماً فضلاً اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کراتا تھا۔

اکبر نے شہر کا بہت سا حصہ اور قلعہ از سر نو تعمیر کرایا اور لاہور کو بہت رونق دی۔ اس کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور گے باہر ایک اور لاہور بنا رہو گیا جسے بیرون شہر کی آبادی (CIVIL STATION) کہتے ہیں۔ شاہجہان کے زمانے تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور "شکارگاہ" بھی رہا ہے۔ ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء کا ذکر ہے کہ اکبر نے اپنے سوتیلے بھائی حکیم مرزا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد لاہور میں قیام کیا اور ایران و توران کے بادشاہوں کے طریق پر "شکار قمرغہ" یا جرگہ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر چالیس کوس کے دائرے سے قراول اور شکاری جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے پانچ کوس پر شکار کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور رنگ رنگ شگون نظر آئے۔ اس زمانہ میں لاہور کے اردگرد بے شمار جنگل تھے جو ایک طرف قصور، شرق پور اور شیخوپورہ اور دوسری طرف امرتسر تک پھیلے ہوئے تھے۔

اکبر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں لاہور کو چھتیس حلقوں میں تقسیم کیا۔ ہر حلقے کو گذر کہتے تھے۔ نو گذر شہر کے اندر اور باقی شہر کے باہر تھے۔ مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب لاہور قدیم میں ان کی تفصیل یوں دی ہے :۔

نام گذرہائے اندرون شہر لاہور

آبادی اندرون شہر کی نو گذروں پر منقسم تھی :۔

گذر چھچھہ دیوانی ۔ ابتدا اس کا موچی دروازہ اور منتہا اس کا رنگ محلہ مسجد نظام بخاری اور پیپل وہڑہ اور حویلی میاں خان اور محلہ قاضی محمد اسلم اور محلہ اخوند محمد فاضل و کوچہ بلوچاں شوارع چپ و راست دروازہ شاہ عالمین سے دروازہ اکبری تک اسی میں داخل تھی۔

گذر محمی ہٹہ ۔ مبتدا اس کا دروازہ شاہ عالمین اور منتہا اس کا وہی رنگ محلہ۔ جملہ کوچہ ہائے مابین ویسا ہی اسی کا ضمیمہ ہیں۔

گذر وچھو والی ۔ یہ گذر اوسط شہر میں ہے۔ وسط اس کا جہاں سردار مصر بیر چند داس نے حویلی بنوائی۔ اور

جتنے کوچے اور شوارع اس کے دہنے بائیں واقع ہیں۔ اسی کی شاخیں ہیں۔

گزر مبارز خان۔ ابتدا اس کا کوچہ ڈوگراں علاقہ شاہ عالمی دروازہ اور منتہا اس کا محلہ جوڑے موری اور لاہوری منڈی بلکہ اکثر لاہوری منڈی اور جس قدر رستے اور کوچے اس کے متصل ہیں۔ اس کے ساتھ متصل ہیں حتیٰ کہ بھاٹی دروازہ کی طرف شرقی اور ایک طاق دروازہ اسی میں شامل ہے۔

گزر تلواڑہ۔ جس قدر عمارات بازار بھاٹی دروازہ کی جانب غرب ہیں تا چورستہ بازار ٹبی اسی میں داخل ہیں۔

گزر وڈہ۔ یہ گزر اور گزروں سے بہت بڑا ہے جتنے محلے اور کوچے اور بازار اندرون دروازہ دہلی و نیز اکثر طرق و شوارع اندرون دروازہ اکبری ہیں۔ تا چورستہ رنگ محل اسی کی شاخیں ہیں۔ ایام سلف میں بموقع کوتوالی کے اوسط گزر مذکور کے ایک گاؤں تھا جس کو وڈہ کہتے تھے۔ جب وہ وسط شہر میں آگیا۔ وہ بستی اسی نام سے موسوم رہی۔

گزر شیخ محمد اسحاق۔ ابتدا اس کا شہری دروازہ اور منتہا اس کا چورستہ متصل حویلی جرنیل الٰہی بخش جس قدر طرق و شوارع چپ و راست ہیں اس کے متعلق ہیں۔

گزر شہباز خان۔ جس قدر آبادی زیر دیوار جنوبی قلعہ بادشاہی ہے تا چورستہ جرنیل الٰہی بخش مذکور اس کا ضمیمہ ہے۔

گزر مانک چوک۔ مسیت ٹھٹھہ سے تا بہ فصیل دروازہ ٹکسالی، شامل بنت ٹکسال۔

نام محلہ و بستیہائے بیرون فصیل شہر

آبادی بیرون حصار شہر بنا بیس گزر پر منقسم تھی۔ اور ہر ایک گزر یعنی بچند محلہ و کوچہ و بڑی ہا و قلعہ ہا و شوارع و اسواق چونکہ بسبب نہ ملنے کسی کتاب معتبر کے مفصل حال نہیں لکھ سکتا، کہ کون کون گزر اور کون کون محلہ اور بستی متعلق فلاں فلاں گزر کے تھی، اس واسطے جو کچھ حال مجھ کو بملاحظہ کوک و بہ بینہ معلوم ہوا۔ بموجب اس کے لکھا جاتا ہے۔

محلہ حاجی سوائے۔ بیرون موچی دروازہ لغایت موقعہ آبادی قلعہ گوجر سنگھ۔ یہ قلعہ گوجر سنگھ سمت ۱۸۵۵ میں گوجر سنگھ حاکم لاہور نے تعمیر کرایا۔ پہلے یہاں حویلی گوجرمل نامی کھتری کی تھی، اور پاس اس کے ایک سرائے تھی۔

محلہ طلا بخاری۔ بیرون دروازہ شاہ عالمی تھا، جس موقعہ پر چھجو بھگت کا چوبارہ ہے یہ جگہ اوسط میں تھی۔ پاس اس کے جانب جنوب ایک چورستہ تھا۔

محلہ پیر عزیز مہرنگ۔ جو کہ بالفعل موضع مزنگ مشہور ہے، پیر مہرنگ جلال الدین اکبر کے عہد میں فقیر بابرکت اور ایزدی عظمت تھا، اس نے اس موقعہ پر مکان سکنی معمور کیا تھا، اس واسطے اس بستی کا نام محلہ پیر مہرنگ مشہور ہوا، بعد ازاں کہ آبادی بیرون شہر ویران ہوئی یہ بستی بطور موضع شہر سے علیحدہ ہو گئی، اور بتدریج اس کی گرد چار بیس اور چند بستیاں آباد ہوئیں، بموجب تفصیل ذیل:۔ کوٹ عبداللہ شاہ، کوٹ مداہر، تاج پورہ۔ قلعہ مہرزادہ۔ قلعہ

مہر انرکھان - مبارک پورہ، بستی مہتراں - محلہ نندولی - کوئی پورہ، بھونڈپورہ - درآں حالیکہ لاہور میں تین حاکم تھے، بہسان بھاگ سنگھ پاستانک حاکم تھا، اور یہ حصہ اس کا لاہور سے علیحدہ تھا راجہ صاحب کے عمل میں بھی اس کا حصہ علیحدہ اور جمعدار خوشحال سنگھ کو تمام گاؤں بطور جاگیر مرحمت تھا۔

محلہ ابو اسحاق - جانب شرق مہرنگ ابو اسحاق فقیرزادہ نبیرہ پیر عزیز مہرنگ تھا، اس نے بعہد اکبر مرحوم ایک طرف محلہ بہ مہرنگ کے حویلی بنوائی، اس واسطے جس قدر آبادی اس کے گرد و دیوار میں ہوئی اسی کے نام موسوم ہوئی۔ مقبرہ اس کا ہنوز ایک گوشہ موضع مہرنگ میں موجود ہے۔

گوٹ کروڑی - جانب مشرق محلہ جابو سولئے - جس موقع پر مقبرہ شیخ موسیٰ لوہار کا ہے - یہ جگہ درمیان محلہ مذکور کے تھی۔

محلہ دلاوری - گوشہ شمال و جنوب، محلہ پیر مہرنگ کے تھا جس موقع پر مقبرہ سید چراغ بخاری کا ہے۔ وسط محلہ تھا۔

قطب غوری - لاہوری دروازہ سے باہر تھا جس جگہ قبر قطب غوری کی ہے، یہ جگہ درمیان محلہ مذکور کے تھی، واضح رہے کہ یہ قطب الدین وہ شخص ہے جس کو اہل تواریخ قطب الدین ایبک لکھتے ہیں جس نے ۶۰۲ھ میں بعد مرنے شہاب الدین محمد غوری کے تخت لاہور اور دہلی پر اجلاس فرمایا تھا۔ وہ اس جگہ دفن کیا گیا، اس بستی کا نام محلہ قطب غوری قرار پایا۔

لکھی محلہ - لاہوری دروازہ کے باہر قطب غوری کی جانب مغرب تھا۔ اس جگہ ایک بازار عالی شان تھا۔ لاکھوں ہی بیٹھتے تھے۔ اسی واسطے اس بستی کو لکھی محلہ کہتے تھے۔

رسول پورہ - بامقبرہ سید شاہ چراغ بخاری کے اس محلہ میں اکثر سید رہتے تھے، اور انھوں ہی نے اس بستی کو آباد کرکے رسول پورہ نام رکھا۔

چوک دارا - شاہ برج موچی دروازہ سے جانب مشرق ایک گولی بندوق کی مسافت پر دارا شکوہ ابن شاہ جہاں نے بعہد شاہ جہاں اپنے رہنے کو حویلی عالی شان اور بازار مربع اور درمیان میں اس کے چوک منقطع اور ایک باغ بہت عمدہ اور وسیع اور ایک کٹرہ مبنی بہ بیوت متعدد بنوایا تھا۔ اس لیے بعد اس کے اس بستی کا نام چوک دارا قرار پایا۔ اور تا وقتیکہ دارا شکوہ جیتا رہا۔ یہ قطعہ نمونہ بہشت رہا، بعد ویرانی ریاست ذوی الاسلام سکھوں نے یہاں سے لاکھوں روپیہ زقیمت رنگوں کا جو یہاں رہتے رہے پایا، اور عمارات دارا شکوہ سے ہزاروں روپیہ کا پتھر از قسم جواہرات مہاراجہ صاحب کے عہد میں اکثر اینٹ اس کی خندق پر لگی، بعد اس کے کشمیریوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ سالہائے دراز تک اینٹ بکتے رہے - اور جن کو قسمت نے یاری دی ان کو کھنڈروں سے خزانہ ملا - اور جس موقعہ پر خاص حویلی دارا شکوہ کی تھی تا خاتمہ ریاست سکھاں اس جگہ بارود سرکاری بنتا رہا، اس عمل میں وہاں جیل زنانہ ہے۔ اور جس جگہ یہ باغ دارا شکوہ کا تھا - وہاں اب محمد سلطان نے سرائے پختہ بنوایا دکانیں نیز ایک طرف میں چھوٹا سا باغ بنوایا۔

محلہ جوہریاں ۔ چوک دارا شکوہ کی جانب مشرق و جنوب میں جس کی جانب مغرب و شمال میں محلہ حاجی سوائی تھا۔

محلہ شاہ کاکو ۔ دیوار شرقی مسجد مقبوضہ بھائی گنڈا سنگھ گرنتھی الحال معروف شہید گنج سے محلہ نخاس تک کم فاصلہ گولی بندوق پر گوشہ شرق و شمال واقع تھا۔ شاہ کاکو ایک فقیر خدا پرست تھا جس کی قبر زیر دیوار شرقی مسجد مذکور ہے۔ اس واسطے یہ بستی اسی کے نام پر موسوم رہی۔

نخاس ۔ مکان سرکاری بہ شکل سرائے معمور تھا جو مغلوں کے دوران میں یہاں گھوڑے بکتے تھے۔ بہ سبب ناموری مکان کے بستی محلہ نخاس کہلاتی تھی۔ دروازہ نخاس کا جو کہ مانند دروازہ مسجد وزیر خاں بہت عمدہ وضع پر منقطع اور برنگ آمیزی کاشی و بستی و صنعت کاری و گلکاری موجود تھا۔ تا خاتمہ ریاست سکھاں کھڑا رہا۔ جب محمد سلطان نے سرائے بنوائی۔ وہ اینٹ یہاں کارآمد ہوئی۔

محلہ حاجی نالہ ۔ دروازہ دہلی سے نخاس تک نولکھ۔ شاہ برج دروازہ کی کے مقابل جانب شمال نواب علی مردان خان نے تخمیناً دو سو بیگھہ زمین پر باغ بنوایا تھا جس کا نام نولکھا رکھا۔ پس بہ سبب ناموری باغ جس قدر آبادی اس کے پیرامن میں تھی اس کے نام پر موسوم ہوئی۔ اب بھی اس قطعہ زمین کو جس میں چند کنوئیں جاری ہیں نولکھا کہتے ہیں۔ مشخصہ بھی اس کا علیحدہ ہے اس باغ کی بارہ دری بھی اب تک موجود ہے۔ جس کو سردار لہنا سنگھ مجیٹھیہ نے اپنی مرضی کے موافق ترمیم کر کے کوٹھی عالی شان بنوائی۔

سید سر ۔ جس موقعہ پر بالفعل اسٹیشن ریلوے ہے اس کے پاس ایک تالاب تھا جس کو ایک سید نامی معروف پیر مہنگا کے مریدوں نے بنوایا تھا۔ پیر مہنگا فقیر آدمی تھا۔ جس کے ہزاروں دولت مند مرید تھے۔ اصلی نام اس کا عبدالخالق تھا بعد تیاری اس تالاب کے جس کو ہندی میں سر کہتے ہیں اس بستی کا نام سید سر قرار پایا اور موجودہ نام گڑھی شاہو ہوا۔

کھوئی میراں ۔ دہلی دروازہ سے جانب شمال فاصلہ ایک کوس پر اس جگہ پر ایک سید معروف میراں نے کھوئی گراتی اور مکان بنوایا تھا جس کا نام کھوئی میراں مشہور ہوا۔ عمل چغتائیاں میں جب آبادی بیرون شہر اس موقعہ تک پہنچ گئی اور متصل اس کے مکانات معمور ہو گئے۔ تو اسی نام سے اس بستی کا نام زبان زد عوام رہا۔ جن دنوں میں لاہور میں حکومت تین حاکموں کی تھی۔ لہنا سنگھ اور الحکام مذکورہ نے اس کو بطور دیہہ آباد کیا۔ اب بھی اس کا مشخصہ شہر سے الگ ہے۔

منڈوی شہزادہ پرویز ۔ کھوئی میراں سے تھوڑے فاصلے پر جانب مشرق میں شہزادہ پرویز نے جو کسی بادشاہ چغتائی کا بیٹا تھا بنام خود منڈوی آباد کی تھی اور ایک بازار مربع اور حویلی عالی شان بنوائی اور اسی جگہ دفنایا گیا۔ اس واسطے اس بستی کا نام منڈوی پرویز مشہور ہوا۔ چشتی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ پرویز بیٹا شاہجہان کا تھا جو کہ خورد سالی میں مر گیا۔

چوہٹہ سوداں ۔ کھوئی میراں سے جانب جنوب چوہٹہ بازار سوداں تھا۔ اور اس میں اکثر سودا کرتے تھے۔

دروازہ مندر ۔ پاس پڑاوہ بدھو کہار کے جو کہ لاہور سے فاصلہ دو کوس تک جانب مشرق ہے ایک مندر ہنود کا تھا اور اس کا دروازہ بہت عمدہ وضع پر بنا ہوا تھا۔ پس جو بستی اس کے قرب و جوار میں تھی اس کے نام سے معروف تھی۔

بیگم پورہ ۔ لاہور سے فاصلہ تین میل پر جانب شرق متصل موضع باغبانپورہ و بھوگی وال والدہ نواب خان بہادر

نے مکانات سکنی تعمیر کرنے اور پیرامن اس کے چاردیواری پختہ بنوائی تھی۔ بعد اس کے نواب خان بہادر نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے کئی مسجدیں اور بازار اور چوک بنوائے اور چپ و راست میں اس کے لواحق اور اقارب و ذریات نے مکانات سکنی تیار کرائے۔ جن دنوں میں نواب خان بہادر صوبہ لاہور تھا سب بستیوں سے اس بستی میں بہت رونق تھی اور دولت تھی۔ خاص سے بیگم پورہ تک ایک بازار تھا جس پر لاکھ پتی بیٹھتے تھے اور بیچنے اس سے جس موقعہ پر بیگم پورہ معمور ہوا کوچہ تیلیاں تھا۔ اب بیگم پورہ ہے۔ نہ کوچہ تیلیاں۔ ٹوٹے پھوٹے ہوئے چند مقبرے اور آثار مکانات ہیں اور کچھ نہیں۔

محلہ شتکی ۔ درمیان بیگم پورہ اور شالامار کے۔ ایک شتکی نامی مقرب اکبر مرحوم تھا۔ اس نے بموقع آبادی بھوگیوال حویلی بنوائی۔ بسبب نامور ہونے اس کے نام بستی کا نام محلہ شتکی قرار پایا۔

نیلی وہیڑا ۔ باغبانپورہ سے مغرب کی طرف اس میں اکثر نیلی رہتے تھے۔ اب اس جگہ میں گورستان نظر آتا ہے۔

بڑھی پھلواری ۔ جانب مغرب نیلی وہیڑے کے بڑی اور مٹھی اور گڑھی قلعہ کو کہتے ہیں۔

محلہ گنج ۔ متصل اسٹیشن ریلوے میاں میر اس کی جانب شمال و مغرب میں مقبرہ بہادر خان کا کہ منہدم پڑا ہوا موجود ہے۔ محلہ مذکور کے درمیان میں جانب خلیفہ ... مشرق مبتدا آبادی شہر کا تھا۔ بعد زوال ریاست چغتائیاں ویران ہو کر بعد کئی برسوں کے پاس اس جگہ کے جانب مشرق بہ فاصلہ مسافت گولی بندوق از سر نو آباد ہوا۔ اب موضع کہلاتا ہے اور ملکیت اس کی اراعیوں کی ہے۔

مقبرہ ابوالخیر ۔ الحال معروف گڑھی شاہو لاہور سے گوشہ شرق و جنوب میں بفاصلہ ایک کوس، ابوالخیر فقیر تھا۔ اس نے اس جگہ بر سکونت اختیار کی اور کوٹھی بنوائی۔ اس لیے اس بستی کا نام کوٹھی ابوالخیر پایا۔ ایام غدر سکھاں میں لوگ اٹھ گئے اور مکانات ویران ہو گئے۔ اس ویرانی کی حالت میں ایک راجپوت نو ماہی نے یہاں رہنا اختیار کیا۔ بعد اس کے گوجر سنگھ حاکم لاہور نے اس ویرانہ کو بطور گڑھی آباد کیا اور سکونت وجہ کے ... جب سے گڑھی شاہو مشہور ہوا۔

بستی میاں میر ۔ جانب شرق و شمال و مغرب مزار میاں میر صاحب مرحوم جس قدر آبادی تھی بستی میاں میر کہلاتی تھی۔ حال میاں میر صاحب کا بیان مقابر میں لکھا جاوے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دولت آباد ۔ جانب مشرق پیر مہر کے ساتھ ساتھ محلہ ابواسحاق کے قلعہ دولت آباد تھا۔ تعمیر اور آبادی اس کی وارثان سید عبداللہ ... مقبرہ و درمیان بستی مذکور کے ... بعد اس کے ... سادات کرام نے اور چند قلعے آباد کئے۔ قلعہ میر محمود، قلعہ میر ارشد خان، قلعہ میر کفایت خان۔ ازاں بعد بعہد حکومت نواب خان بہادر و فرزندان نواب خان بہادر دو اور قلعے تیار ہوئے۔ قلعہ میر نواب محمد، قلعہ میر اکبر۔ اب ان قلعوں اور بستیوں کا نام و نشان نہیں ملتا مگر ایک چاہ ہے جس کو چاہ میر والا کہتے ہیں۔ پہلے ان قلعوں کی اس جگہ کو محلہ دولت آباد کہتے تھے۔ قلعہ میر یعقوب ۔ یہ قلعہ پاس دولت آباد شرق و جنوب میں حاجی پورہ طرف جنوب قلعہ میر یعقوب، قلعہ غلام پور پاس تالاب کھوکھاں کے مغرب و جنوب میں، بڑھی شاہ پور مغرب میں جھیلے پور کے۔

خوجوں کا محلہ ۔ پاس محلہ ابو اسحاق کی جانب شمال، بالفعل اس محلہ سے ایک مسجد ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے جس کو خوجوں کی مسجد بولتے ہیں۔

باغ نخلی ۔ جس موقعہ پر تھانہ انارکلی اور عجائب گھر معمور ہے نواب وزیر خان امیر شاہ جہان نے باغ بنوایا جس میں ہزارہا اشجار سبز و رطب تھے اسی واسطے لوگ اس باغ کو نخلی بولتے تھے۔ اور اسی نام سے تمام بستی موسوم رہی۔ بالفعل اس باغ سے چند درخت خرما اور ایک بارہ دری موجود ہے جس کو حکام نے کتاب گھر قرار دیا۔ اس باغ کی جانب مغرب باغ زیب النسا تھا۔ اب اس موقع میں موضع نواں کوٹ آباد ہے اس باغ کے جانب شمال باغ انارکلی تھا، جس قدر آبادی ان باغوں کے گرد و جوار میں تھی انھیں کے نام پر معروف تھی جانب شمال باغ انارکلی کے محلہ پیر بھاون تھا۔ اب اس موقعہ پر نام باڑہ ہے۔

شیش محل ۔ جانب شمال محلہ پیر بھاون مزار مخدوم ہجویری کی، اس محل کی طرف جنوب میں تھی۔ کسی بیگم نے بعہد سلاطین چغتائی شیش محل بنوایا تھا۔ اس واسطے اس تمام بستی کا نام شیش محل قرار پایا۔ اب اس کا نام و نشان نہیں بجز نام رہا۔ جیسے ندی اس قلعہ کی لاہور سے علیحدہ ہے۔

تل بھوکا ۔ جانب مشرق شیش محل کے تا دیوار فصیل غربی لاہور دروازہ ٹکسالی تک۔

محلہ شیخ اشرف ۔ بھاٹی دروازہ سے تا ایں مرتفع مکانات دار العدالت ضلع، شیخ اشرف عہد عالمگیر میں بڑا بھاری عالم تھا بیرون بھاٹی دروازہ اس نے مسجد عالی شان اور مکانات سکنی بنوائے۔ اس لیے اس بستی کا نام محلہ شیخ اشرف مشہور ہوا۔ جب وہ مر گیا تو قبر اس کی بھی اسی جگہ ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وقت تعمیر خندق کے اس مسجد و دیگر عمارات شیخ اشرف کو بارود سے اڑا دیا اور نعش اس کی اس جگہ سے نکال کر میانی میں دفنائی۔

بند عالمگیری ۔ مستی دروازہ سے تا محمد ولبرٹی واسطے روک دریا اور حفاظت شہر کے عالمگیر نے بند پختہ بنوایا تھا اور بحکم بادشاہ ہر ایک امیر نے اس پر مکانات سیرگاہ اور متصل مکانات باغ جانفزا تعمیر کرائے۔ اس واسطے جو عمارت اس بند پر اور متصل اس کے ہوئی بند عالمگیری مشہور ہوئی۔

محلہ فدائی خان ۔ بیرون دروازہ اکبری نیچے فصیل شہر کے تا دروازہ دہلی، فدائی خان امیر عالمگیر تھا جس کے اہتمام میں مسجد بادشاہی تیار ہوئی۔ اس نے اس موقع پر مکانات سکنی بنوائے تھے۔ اس لیے اس تمام بستی کا نام محلہ فدائی خان مشہور ہوا۔

پنڈ ڈھولاں ۔ جہت شرق و شمال محلہ پیر جو تنگ موقع مکان چلہ شاہ مقیم درمیان آبادی کے تھا۔

میانی ۔ جہت مغرب و جنوب محلہ پیر جو تنگ جس قدر آبادی تھی میانی کہلاتی تھی۔ اگرچہ محلہ ہائے متعلقہ شہر سے الگ تھے مگر ان کا ہر حال ضمیمہ شہر تھا مفصل حال اس کا بیان مقابر و امکنہ دریہ میں لکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

کمبو واڑہ ۔ جانب شمال آبادی شہر جس موقع پر اب کوٹھی و اکبر ڈاکٹر ہینوی ولدا صاحب کی ہے۔ باہر اس آبادی سے اب تالاب موجود ہے جس کو تالاب کمبواں بولتے ہیں۔ یہ آبادی بھی شہر میں داخل نہ تھی مگر الگ بھی نہ تھی۔

عہد جہانگیری

اکبر کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لاہور جہانگیری عہد میں بھی ہندوستان کے کسی شہر سے کم نہیں رہا۔ ۱۶۲۶ء میں دو انگریزوں نے لاہور کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے۔ حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعۂ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے لیے سوداگر جہازوں میں اپنا مال لادتے ہیں اور دریا کے کنارے ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں۔"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے!! راوی اور جہاز! یہ دونوں باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ پھر خشکی کی تجارت اور بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹوں کی ہر سال ایران کو روانگی!! کیا آج بھی جبکہ تہذیب و آسائش اپنی انتہائی منزل پر پہنچ چکی ہے یہ باتیں نظر آتی ہیں؟

جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے ہی مہینے اہل لاہور کو ایک عجیب دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کی اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ باپ کی تخت نشینی کے بعد چار ماہ تک تو خسرو خاموش رہا پھر دفعتہً آگرہ کے قلعہ سے نکل بھاگا اور دس ہزار سواروں کی جمعیت میں دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ آتے ہی حکم دیا کہ قلعہ کو فتح کر کے سات روز تک شہر کو بے دریغ لوٹو۔ بچہ، جوان، بوڑھا، عورت جو ملے اسے قتل کر دو اور شہر کو آگ لگا دو۔

فوج ایک دروازہ کو جلا کر شہر میں ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آ پہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن راستہ میں سوہدرہ (متصل وزیر آباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ جہانگیر اس وقت مرزا کامران کی بارہ دری میں جو راوی کے کنارے واقع ہے مقیم تھا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے جن میں حسن بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبدالرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں گڑوائیں اور ان سات سو قیدیوں کو یکدم پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ خسرو کو پابہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا اور جس راستے اس کے سات سو ہمراہی سخت اذیتوں سے مارے جا رہے تھے، اسی راستے لے کر قلعہ میں بھجوا دیا گیا تاکہ وہ اپنے باغی ہمراہیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس کے سپہ سالار حسن بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبدالرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرا دیا اور یہ دونوں دم گھٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک

قید رہا۔ آخر ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی کی حالت میں مر گیا۔ لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔

اکبر یورپین پادریوں کی بے حد عزت کرتا تھا لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لیے خزانۂ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کئے شاہجہان نے جو اکبر اور جہانگیر کی نسبت شریعت کا زیادہ پابند تھا، تخت پر بیٹھتے ہی اس گرجا کو مسمار کرا دیا اور پادریوں کے وظیفے ضبط کر لیے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۶۶۵ء میں) ایک فرانسیسی سیاح تھیوناٹ لاہور آیا۔ اس وقت تک اس گرجا کے آثار باقی تھے لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور میں گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کا ایک قابلِ ذکر واقعہ گذرا۔ گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کی آپس میں عداوت تھی۔ دیوان نے گورو کے خلاف گورنر لاہور کے کان بھر لیے اور کہا کہ گورو کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو یوں آزاد رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ گورو ارجن دیو قید کر لیے گئے اور وہ قید ہی میں انتقال کر گئے۔ جب ان کا بیٹا گورو ہرگوبند جوان ہوا تو اس نے دیوان کے خلاف بادشاہ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ دیوان گورو ہرگوبند کے حوالہ کر دیا گیا اور ہرگوبند نے اسے قتل کر کے باپ کا انتقام لیا۔

جہانگیر نے قلعہ میں بہت سی عالی شان عمارتوں کا اضافہ کیا اور اس کے امرا و وزرا نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔

جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال اُنس تھا۔ ۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دارالسلطنت ہی بنا لیا اور ۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفرِ کشمیر کے دوران راجوری کے قریب وفات پائی تو لاہور ہی میں دفن کئے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ اسے چہیتی بیگم نورجہاں کے باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا عظیم الشان مقبرہ دریائے راوی کے دائیں کنارے پر قصبہ شاہدرہ کے پاس واقع ہے اور عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہے۔

عہدِ شاہجہانی

جہانگیر کے انتقال کے وقت نورجہاں کا داماد اور جہانگیر کا بیٹا شہریار لاہور میں موجود تھا۔ اس نے سات دن میں سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے بے فکروں کی ایک فوج جمع کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاہجہان جو نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کا داماد تھا، اس وقت دکن میں تھا۔ وہ آصف جاہ کے اشارہ سے پر لگا کر آگرہ میں پہنچا۔ ادھر آصف جاہ نے یہ چال چلا کہ خسرو مرحوم کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو زندان خانہ سے نکال کر شہریار کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور سلطنت کی مبارکباد دی۔ داور بخش سمجھ گیا کہ نورجہاں اپنے داماد اور آصف جاہ اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہیں اور میں محض گوسفندِ قربانی ہوں۔ اس نے آصف جاہ کا شکریہ ادا کر کے تخت و تاج سے انکار کر دیا۔ لیکن آصف جاہ نے اس قدر قسمیں کھائیں اور ایسا یقین دلایا کہ وہ اجل گرفتہ شہزادہ آخر کار رضامند ہو گیا۔ وہ شہریار سے لڑا اور شہریار کو شکست

ہوگئی۔ آصف جاہ اور داور بخش فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے اور آصف جاہ نے شہریار کی آنکھیں نکلوادیں۔ اس موقعہ پر بدنصیب شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

زنرگس گلاب ار چہ نتواں کشید
کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من
بگو کور شد دیدۂ آفتاب
۱۰۳۷ھ

شاہجہان نے آگرہ پہنچ کر آصف جاہ کو کہلا بھیجا کہ لاہور میں جس قدر شہزادے موجود ہیں سب کو ٹھکانے لگادو چنانچہ ۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء بروز ہفتہ آصف جاہ نے داور بخش کو تخت سے اُتار کر قید کر دیا اور شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا۔ شہزادہ داور بخش نے آصف جاہ کو اس کے قول و قسم یاد دلائے مگر وہاں کون سنتا تھا آخر جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء کو مندرجہ ذیل شہزادے ایک ہی وقت میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے گئے :۔

(۱) شہزادہ داور بخش (۲) اس کا بھائی گرشاسپ۔
(۳) شہریار داماد نورجہان (۴) طہمورس اور (۵)
طہماسپ (پسران سلطان دانیال پسر اکبر)

شاہجہان نے بادشاہ ہو کر اپنے باپ جہانگیر کا عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) جو سالہا سال گزر جانے اور سکھوں کے زمانہ کی دستبرد کے بعد بھی ہندوستان کی لاجواب عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ نورجہاں نے بھی ۱۶۲۶ء میں اسی عہدِ حکومت میں وفات پائی جس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں روضۂ جہانگیر کے نمونہ پر "جارچمن" کے اندر تعمیر کرایا تھا۔

آصف جاہ نے بھی، جس کی کوششوں سے شاہجہان کو تخت ہند نصیب ہوا، اسی کے عہدِ حکومت میں ۱۶۴۱ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کو آصف خان یمین الدولہ بھی کہتے ہیں۔ مآثر الامرا میں اس کے بہت سے حالات درج ہیں۔ بہت ہی بسیار خور تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک من شاہجہانی خوراک دن رات میں کھاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار میں میاں سلطان کی سرائے اور اس کا ٹھنڈا کنواں اور باغ موجود ہے، وہاں آصف جاہ کی عالی شان حویلی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ عہد عالمگیری کے مؤرخ منشی سجان رائے بٹالوی نے اس حویلی کے متعلق لکھا ہے :۔

"از عمارات منازل بادشاہزادگان و امرائے والاشان خصوص عمارت
آصف خاں عرف ابوالحسن بن اعتماد الدولہ از دیاد آبادی گردید"[1]

---

[1] خلاصۃ التواریخ صفحہ ۶۵

مآثر الامرا اور ظفر نامہ شاہجہان میں لکھا ہے کہ اس حویلی پر بیس لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔ حویلی کیا تھی ایک خاصا قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ[1] کے عقب سے لے کر شہید گنج، سرائے میاں سلطان اور ریلوے ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام، مسجدیں، دو نالے، تالاب، حوض، فوارے، باغ اور زنانہ مردانہ محلات تھے۔ شاہجہان اس میں کئی مرتبہ آیا تھا۔ دہلی، آگرہ اور کشمیر میں آصف جاہ کی جائداد کا جائزہ لیا گیا تو اڑھائی کروڑ روپیہ نقد درج رجسٹر ہوا۔ بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد بیس لاکھ روپیہ اس کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا اور حویلی شہزادہ داراشکوہ کو مرحمت فرمائی۔ باقی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کی گئی۔

جہانگیر نے قلعہ لاہور میں کچھ عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن شاہجہان کو پسند نہ آئیں۔ اس لیے نواب وزیر خاں بانیِ مسجد وزیر خاں کو حکم ہوا کہ سب عمارات از سر نو تعمیر کرائی جائیں۔ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان پھر آگرہ سے لاہور آیا۔ علی مردان خاں قندھاری بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ شاہجہان نے اسے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور ایک خلعت فاخرہ انعام دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ علامی افضل خاں وزیر سلطنت تھے۔

شاہجہان ۱۶۳۹ء میں پھر لاہور آیا۔ علی مردان خاں اور داراشکوہ پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ علی مردان خاں نے اہلِ ایران کے طور و طریق پر شب برات کی روشنی کا تماشا بادشاہ کو دکھایا۔ مختلف شکلوں کے تختوں اور چھتوں پر طاق بندی کی۔ اہل لاہور نے اس قسم کی کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسی شب بادشاہ نے دس ہزار روپیہ غربا میں تقسیم کیا اور اسی رات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا فاضل کو چار چار سو اشرفی انعام میں دی گئی[2]۔

لاہور میں شاہجہان کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے جو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔

شاہجہان کے عہدِ حکومت میں بھی کئی فرنگستانی سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں لاہور کی تعریف اس طرح کی ہے:-

(ترجمہ) "آگرہ سے روانہ ہوتے ہمیں اکیسواں دن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا جس میں آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد نہیں ہیں۔ نقوش) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ

---

[1] مولوی محمد انشاء اللہ خاں آنریری مجسٹریٹ و مالک و ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے مکان کا نام ہے۔

[2] تاریخ محمد شاہی (قلمی) مصنفہ خوشحال چند سانی۔

پیادہ چل رہے تھے کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ غرض گھوڑے سے گھوا چلتا تھا اس لیے ہم واپس آ گئے پتھہ کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے جہاں نان بائی اور مختلف دکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر ہم نے بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ بکری۔ گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا۔ البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دوکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہیں۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں۔ نقوش) ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے جو میدہ سے بنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا کھانا دونوں وقتوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط اور ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بے حد متاثر ہوئے خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے بلکہ در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے اور وہاں سے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغ محلات تالاب اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں اس کے بڑے بازار کا نام "بازار دلکشا" ہے۔ اس میں اس قدر دولت ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔[1]

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور کو ہوئی وہ اکبر کے زمانہ سے بھی زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دُور دُور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے اور باغات و محلات کی کثرت نے لاہور کو گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ نواب علیم الدین الملقب بہ وزیر خان نے اپنی

---

[1] "بازار دلکشا" معلوم نہیں کس جگہ واقع تھا۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوب کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہوگا۔

عالی شان مسجد شہر کے اندر بنائی جو اب تک لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ نواب وزیر خان کا باغ۔ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کا فلک نما مکان جو آج "رنگ محل" یعنی حویلی میاں خاں کے نام سے موسوم ہے۔ نواب وزیر خان کا مکان "پری محل" جس کے کھنڈرات اب بھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نظر آتے ہیں۔ دائی لاڈو کے مکان و زینت ابوانات جو باغ مہان سنگھ اور باغ رتن چند کے علاوہ تھے کے آس پاس تھے اور جہاں اب بھی دائی لاڈو کی مسجد موجود ہے۔ نیز محلہ دائی انگہ جو ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا اور جہاں اب بھی مسجد دائی انگہ موجود ہے۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں جنہیں محکمہ ریلوے نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے بیسیوں محلے لاہور کی زیبائش و شہرت کا باعث تھے۔

یہ شرف لاہور ہی کو حاصل ہے کہ نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان نے اپنی ابتدائی زندگی حصول علم میں اسی جگہ گزاری اور پھر جب بادشاہ کو اس کی قابلیت کا علم ہوا تو لاہور میں اسے شرف باریابی بخشا اور چار ہی سال کے اندر اس کو تمام ہندوستان کا مدار المہام بنا دیا اور پھر جب سعد اللہ خاں نے وفات پائی تو اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کو اعلیٰ منصب عطا کیا اور اس کے دو دیگر بیٹوں زمرہ متوسلین کے روزینے مقرر کر دیئے۔

دارا شکوہ چونکہ صوفی منش شہزادہ اور سلطنت کا ولی عہد تھا۔ اس لیے پنجاب کے لوگ اور خصوصاً اہالیان لاہور اس کے نہایت گرویدہ تھے۔ شہزادہ بھی ان سے بہت مانوس تھا۔ اس نے کئی عالی شان محلات تعمیر کرائے اور ایک پُرفضا چوک اپنے نام سے اس جگہ قائم کیا جہاں لنڈا بازار میں آج کل "مسجد شہید گنج" واقع ہے۔ ایک مسجد[1] بھی تعمیر کرائی جس کی ایک بچی کھچی دیوار ریلوے ٹیکنیکل اسکول کی تعمیر کے زمانہ میں مسمار کر دی گئی تھی۔

دارا شکوہ کے دم سے لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح وہ اسلامی تصوّف کا دلدادہ تھا۔ اسی ذوق شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجلس میں ایک طرف صوفیا بیٹھتے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ اکبر کی طرح مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں کے مباحثے کراتا اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کراتا تھا۔

دارا شکوہ اور گورو ہرگو بند میں بہت موانست تھی۔ جب گورو جی امرتسر سے آتے تو مہینوں دارا شکوہ کے مہمان رہتے اور مسائل تصوّف کے ذکر اذکار سے صحبت گرم رکھتے۔

[شاہی یادگاروں کے علاوہ امرا اور بیگمات کے محلات میں مجموعہ ہائے دبستان سرائے موجود تھے۔ ہر شہزادہ اور ہر امیر اپنا ایک نہ ایک محل رکھتا تھا جس میں باغ کے ساتھ آبشار، فوارے، حوض اور چھوٹی چھوٹی نہریں لازمی تھیں۔ پھر محلات کی کئی شاخیں ہوتی تھیں۔ زنانہ محل علیحدہ، مردانہ محل علیحدہ۔ درباری کمرے اور دیوان خانے الگ۔ باغات زنانہ و مردانہ الگ۔

اس زمانے میں امرائے لاہور کے اکثر مقبرے اور بزرگان دین کے اکثر مزار بھی باغوں ان کے باغوں میں بنائے جاتے تھے یا ان مقبروں کی تعمیر کے ساتھ ہی باغ احداث کرائے جانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ بہرحال مقبرہ اور باغ قریباً لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں بہت سے باغوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے عہد میں موجود تھے اور اب نابود نا معلوم

---

[1] تاریخوں میں اس مسجد کا ذکر دارا شکوہ کی بیوی ستارہ بیگم کے نام سے آتا ہے۔ (مرتب)

ہیں چند ایک کے نام یہ ہیں۔

باغ قاسم خاں ۔ یہ وہی قاسم خاں ہے جس نے ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء میں اکبر کے حکم اور اہلِ کشمیر کے ایک وفد کے مشورے سے کشمیر فتح کیا تھا۔ دارا شکوہ لکھتا ہے :۔

"حضرت میاں میرؒ اکثر اوقات اس درخت کے نیچے جو
قاسم خاں کے باغ کی دیوار کی پچھلی جانب چاردیواری
میں واقع ہے دن کو عبادتِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے
تھے۔"

باغ جواہر خاں ۔ یہ باغ ایک جھیل کے متصل تھا۔ دارا شکوہ کے زمانے میں وہ جھیل پانی کے نیچے دب کر نابود ہو چکی تھی۔

باغ محمد تقی دیوان بیوتات ۔ یہ امیر شہنشاہ جہانگیر کا دیوان بیوتات تھا معلوم نہیں یہ باغ کس جگہ واقع تھا۔ دارا شکوہ نے صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "حضرت میاں میرؒ اس باغ میں کبھی کبھی دن کا کچھ حصّہ گزارا کرتے تھے۔"

باغ ہوشیار خاں ۔ (ہسٹری آف لاہور ص ۵۴) دارا شکوہ لکھتا ہے کہ "اس باغ سے مشرق کی طرف کنڈی زراعت ہے۔ وہاں سبزی اُگنے تک حضرت میاں میرؒ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔"

غرض عہد ہا امرا، علماء، شعراء، اور شہزادے لاہور میں دفن تھے۔ ان کے مدفن نہایت عالی شان تھے۔ ان کی قبروں کے ساتھ اوقاف تھے۔ ان کے مقبروں کے گنبدوں سے ان کا جاہ و جلال ظاہر ہوتا تھا۔ وہ عبرت و بصیرت کی ایک زندہ تصویر بھی تھے۔ آج ان کی قبروں کا نشان تک بھی موجود نہیں۔ ان بے نشان مرقدوں کا نام بنام ذکر کہاں تک کیا جائے؟ ـــ مرتب

عہدِ عالمگیری

اگرچہ باپ کو نظر بند کر کے عالمگیر (اورنگ زیب) ۱۶۵۸ء میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب تک بھائی موجود تھا خصوصاً دارا شکوہ جو ولی عہد تھا اس وقت تک اسے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے پنجاب کا رُخ کیا جو دارا شکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دارا شکوہ جہاں کہیں بھی ہوگا، بھاگ کر آخر لاہور ہی میں جائے گا اور وہاں سے تیار ہو کر مقابلہ کو نکلے گا۔ چنانچہ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ دارا شکوہ بھاگ کر پہلے شالامار باغ میں پہنچا اور وہاں سے زمین دوز سرنگ کے ذریعے قلعہ میں داخل ہوا اور اپنا خزانہ جو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا تھا ہمراہ لے کر ملتان کے رستے بھکر اور سندھ کو چلا گیا۔ تقریباً چودہ ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے اور توپ خانہ اور کارخانجات شاہی یہ سب اس کے علاوہ تھے۔ بڑی بڑی کشتیوں میں یہ سب اسباب لدوا کر راوی میں ڈالا اور وہاں سے ملتان پہنچا۔ اس کے جانے کے بعد شہزادہ اعظم شاہ اورنگ زیب کا بیٹا، ایک زبردست فوج لے کر لاہور پہنچا۔ مگر خیریت گزری کہ لاہور والوں کو کوئی تکلیف نہ دی گئی۔ اس کے چند ماہ بعد اورنگ زیب بھی لاہور پہنچا اور شالامار باغ کے پہلے تختے میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ ہاتھی پر سوا

ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ قلعہ کی سیر کی اور واپسی پر مسجد وزیر خاں میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باغ میں چلا گیا۔ مہمات پنجاب کا کام شہزادہ اعظم اور قلعہ دار اور خلیل اللہ خاں گورنر لاہور کو سپرد کر کے خود شجاع کے استیصال کے لیے واپس چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور میں آیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گزر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔

لاہور میں عہد عالمگیر کی تین یادگاریں ہیں جن میں سے دو مٹ گئی ہیں لیکن ایک موجود ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت موجود رہے گی۔ ان یادگاروں کا مختصر سا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سنہ ۱۶۶۳ء میں عالمگیر لاہور میں تھا کہ اس کے قابل اور دانا وزیر فاضل خاں نے ۲۷ ذیقعدہ کو ستر سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ اس نے اپنا عالی شان مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تیار کرا لیا تھا بادشاہ کے حکم سے وہیں دفن کیا گیا۔ بادشاہ اس مقبرہ پر نوبت بخشی کرنے کو تھا لیکن وزیر کی وفات پر اس نے وہ جشن ملتوی کر دیا۔ خدا جانے کس قدر عظیم الشان مقبرہ تھا مگر اب معلوم بھی نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا۔

دوسری یادگار ایک بند تھا جو عالمگیر نے ۱۶۶۲ء میں لاہور کو راوی کی دستبرد سے بچانے کے لیے باندھا تھا۔ اس بند کا ذکر لاہور کی اردو انگریزی تاریخوں میں کہیں کہیں نظر سے گزرتا ہے لیکن خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"در عہد حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی چوں دریائے راوی جانب شہر رو نہاد۔ و از صدمات آں بہ اکثر عمارات و باغات آسیب رسید در سنہ چہارم جلوس و الا برائے تعمیر بند مستحکم کہ انہدام عمارات تواند بود حکم مقدس بصدور پیوست فرماں پذیران بند بہ درازئے دو کروہ بہ استحکام تمام بستند۔ و بہ محافظت شہر سد عالمگیری بلسان سد سکندری بروئے کار آوردند و در اکثر جا مانند تالاب زینہ آراستہ لب دریا را بہ مثال لب خوباں تقریب ساختند۔ و خوانین والا شان نشیمن ہائے دلکشا و منازل فرح افزا شقت بر دریا احداث نمودہ زینت افزائے شہر شدند۔ و از ابتدائے سال چہارم نہایت حال کہ زیادہ از چہل می گزرد۔ وہ ہر سال ترمیم و تعمیر از سرکار بادشاہی میشود و برائے بند وبست مبلغ کلیہ بہ خرچ می رود۔"

اس روح افزا کیفیت کو ذرا ذہن میں لائیے جب کہ بند عالمگیری مکمل ہو چکا تھا اور اس کے کناروں پر تالاب

کی سیڑھیوں کی طرح نہانے اور سیر و تفریح کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں اور امرائے والا شان نے وہاں خوشنما بنگلے دلفریب مناظر کی سیر کے لیے تعمیر کیے تھے اس زمانہ میں دریا کے کنارے پر کیا کچھ رونق نہ ہو گی! مگر آہ! آج وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں۔

اس بند کے کچھ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں راقم الحروف کے اخبار پنجہ فولاد کا دفتر لنڈا بازار لاہور کے چنگڑ محلہ میں تھا۔ وہاں ایک شخص نے اپنا مکان بنانے کے لیے جب بنیادیں کھودیں تو اندر سے ایک طویل پختہ دیوار نکلی جو مسجد شہید گنج کی طرف سے آتی تھی اور علاقہ محال "نولکھا" کی طرف جاتی تھی۔ مالک مکان نے اس دیوار میں سے اس قدر اینٹیں نکالیں کہ اسے نئی اینٹیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ بھری شاہ اور چاہ میراں[1] کے درمیان اب بھی اس بند کے آثار ملتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بند ریلوے سٹیشن اور لنڈا بازار کے درمیان سے چاہ میراں کی طرف جو اس زمانہ میں دریا برد زمین تھی، نکل جاتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا مؤلف اس بند کا طول دو کوس بتاتا ہے۔

عالمگیر کی تیسری یادگار لاہور کی شاہی مسجد ہے جو لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کا پتھر دراصل دارا شکوہ نے اس غرض سے ہندوستان سے منگوایا تھا کہ چوک دارا شکوہ سے لے کر حضرت میاں میرؒ کے مزار تک ایک پختہ سڑک بنوائے اور حضرت کا روضہ تعمیر کرائے جو صدہا سال تک یادگار رہے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ عالمگیر نے تمام سنگ سرخ ضبط کر کے لاہور میں جامع مسجد تعمیر کرا دی اور خدام میاں میر صاحبؒ کی معروضات پر حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جو آج تک قائم ہے۔ آج کل دریائے راوی اس مسجد سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں بہتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بادشاہی مسجد اور قلعہ کے بالکل متصل بہتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے :-

"اگرچہ در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است اما بر کنارہ
دریا محاذی دولت خانہ والا حضرت عالمگیر بادشاہ مسجد عالی
از سنگ بنا فرمودہ اند کہ زیادہ از پنج لک روپیہ بر آں صرف
شدہ"

عالمگیر کے زمانے میں لاہور کا ایک نامور شاعر ابوالبرکات منیر کے نام سے گزرا ہے۔ عالمگیر کو اشرفی اور روپیہ کے سکے

---

[1] "چاہ میراں" جو عام طور پر "میراں دی کھوہی" کے نام سے مشہور ہے اسی علاقہ میں واقع ہے جہاں پہلے دریا بہتا تھا۔ بند عالمگیری کی وجہ سے جب دریا یہاں سے ہٹ گیا تو یہ جگہ خشک ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بن ہو گیا جس میں اکثر درندے رہتے تھے اور "بچاڑے" (جنگلی لوگ) جو لاہور اور مضافات پر ڈاکہ زنی کر کے اسی بن میں چھپ جاتے تھے۔ لہنا سنگھ حاکم لاہور نے سمت ۱۸۰۰ بکرمی میں یہاں ایک بستی قائم کی اور اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کی۔ سب سے پہلے ایک میر صاحب نے یہاں ایک کھوئی (چاہ خورد) تعمیر کی۔ انہی کے نام پر موضع کا نام "میراں دی کھوہی" یعنی چاہ میراں مشہور ہو گیا۔ سکھوں کے زمانہ میں یہاں بہت سے باغات لگائے گئے حضرت شاہ حسین زنجانی کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔

ہے۔ مگر پانی کی ایک بوند اندر نہیں جاتی۔ دس بارہ
آدمی حجرہ میں بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔" (ترجمہ)

جہانگیر نے حکیم علی گیلانی کو منصب دو ہزاری اور اس کے بیٹے حکیم عبدالوہاب کو یا نصد سوار کا منصب عطا کیا۔

۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں اسی نمونے پر ایک اور حکیم لے سخید درسیکری میں ایک حوض بنانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔

اکبر کے زمانے میں دریائے راوی نہایت جوش و خروش سے بہتا اور شاہان مغل کی قدم بوسی کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا پانی اس قدر گہرا تھا کہ اس میں جہاز چلا کرتے تھے۔ رئیسانِ شہر اور امرائے دربا نفیس، دل آویز اور رنگین جہازوں اور کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے اور گرمی کے موسم میں خناک اور مرطوب ہوا کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔

سنہ ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۲ء میں راوی کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الٹی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ شہتیر سال اور ناجو کے استعمال کیے گئے۔ اور ۶۸۴ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۲۴۴ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس پر کام کرتے رہے۔ تیار ہو جانے پر ایک ہزار آدمیوں نے دس روز میں بڑی مشکل سے اسے دریا میں ڈالا۔ اور لاہری بندر (موجودہ ٹھٹھری جو سکھر کے متصل دریائے سندھ پر واقع ہے) پہنچایا۔ جہاز وزنی تھا اور دریا میں پانی کم تھا اس لیے جہاز کو جا بجا رکنا پڑا۔ آخر بہ صد مشکل جہاز منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اس زمانے میں ایسے ایسے روشن، وسیع اور یہ سامان کہاں تھے جو دریا کا زور بڑھا کر گذرگاہ کو جہاز رانی کے قابل بنا لیتے۔ اس سبب آمد و رفت جاری نہ رہ سکی۔ شہنشاہ نے سنہ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں ایک اور جہاز تیار کرایا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے وزن کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی یہ جہاز پہلا جہاز سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک بآسانی جا پہنچا۔ اس کا مستول ۲۷ گز کا تھا اور ۱۲۰۲۰۳۲ روپے اس پر لاگت آئی تھی۔[1]

زندہ دل بادشاہ نے جہاں جہاز چلائے ہیں، یا اں نشیں، کیا شمار ہوگا۔ اور پھر جب امرا و وزرا اور خود شہنشاہ کشتیوں کی سیر کرتے ہوں گے اور عام لوگ بھی اپنی بساط بھر کشتیوں پر دریا کی ٹھنڈی ہواسے لطف اندوز ہوتے ہوں گے تو وہ وقت کیا فرحت افزا ہوتا ہوگا۔

سنہ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ (سندھ) پر لشکر کشی کی۔ سامانِ جنگ خشکی کے راستے کے علاوہ راوی کے ذریعے ٹھٹھہ بھیجا گیا۔ دربار اکبری میں لکھا ہے :-

"بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ، پچاس ہزار ایک دفعہ، پھر لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں اور دیگر سامانِ جنگ راوی کے ذریعہ ٹھٹھہ کو بھیجا جہاں مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ سے کئی دن تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ خان خاناں مرزا عبدالرحیم اس مہم کا سپہ سالار تھا اور علاوہ دیگر

---

[1] دربار اکبری بحوالہ اکبر نامہ صفحہ ۱۱۲ -

"کشتیوں کے کل پچیس۲۵ جنگی کشتیاں لے کر لاہور سے وہ چلا تھا
اور ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء کے جشن نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کر کے
لاہور لے آیا تھا"

اکبر کے زمانے میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب و غریب طبیعت لے کر آیا تھا۔ جو تقدیس اور تسبیحات کے عمل کرتا۔ علم ہیئت کے آلات رکھتا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھتا اور خود دکھاتا آگرہ کی طرح لاہور میں بھی اس کے تسلسلے نہیں رہے۔ نوروز کی صبح کو کھلے بند دن سورج کی پرستش ہوتی۔ برہمن اپنے مذہبی تہوار دن میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے۔ علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علما فضلا اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کرتا تھا۔

اکبر نے شہر کا بہت سا حصہ اور قلعہ از سر نو تعمیر کرایا اور لاہور کو بہت رونق دی۔ اس کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہو گیا جسے بیرونِ شہر کی آبادی (CIVIL STATION) کہتے ہیں۔ شاہجہان کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور "شکارگاہ" بھی رہا ہے۔ ۹۷۴ھ ۱۵۶۶ء کا ذکر ہے کہ اکبر نے اپنے سوتیلے بھائی حکیم مرزا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے لاہور میں قیام کیا اور ایران و توران کے بادشاہوں کے طریق پر "شکار قرغہ" یا جرگہ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر چالیس کوس کے دورے سے قراول اور شکاری جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے پانچ کوس پر شکار کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ اس زمانہ میں لاہور کے اردگرد بے شمار جنگل تھے جو ایک طرف قصور، شرق پور اور شیخوپورہ اور دوسری طرف امرتسر تک پھیلے ہوئے تھے۔

اکبر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں لاہور کو چھتیس حلقوں میں تقسیم کیا۔ ہر حلقے کو گذر کہتے تھے۔ نو گذر شہر کے اندر اور باقی شہر کے باہر تھے۔ مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب لاہور قدیم میں ان کی تفصیل یوں دی ہے :۔

نام گذرہائے اندرون شہر لاہور

آبادی اندرون شہر کی نو گذروں پر منقسم تھی :۔

گذر پچھہ دیوانی ۔ ابتدا اس کا موچی دروازہ اور منتہا اس کا رنگ محلہ مسجد نظام بخاری اور پیپل وہڑہ اور حویلی میاں خان اور محلہ قاضی محمد اسلم اور محلہ اخوند محمد فاضل و کوچہ بلوئے و شوارع چپ و راست دروازہ شاہ عالمی سے دروازہ اکبری تک اسی میں داخل تھی۔

گذر مچھی ہٹہ ۔ مبتدا اس کا دروازہ شاہ عالمین اور منتہا اس کا وہی رنگ محلہ۔ جملہ کوچہ ہائے بیرون و بسیار اسی کا ضمیمہ ہیں۔

گذر دچھووالی ۔ یہ گذر اوسط شہر میں ہے۔ وسط اس کا جہان سردار مصر ہر چرنداس نے حویلی بنوائی۔ اور

جتنے کوچے اور شوارع اس کے دہنے یا دہنے واقع ہیں۔ اسی کی شاخیں ہیں۔

گذر مبارک خان ۔ ابتدا اس کا کوچہ ڈوگراں علاقہ شاہ عالمی دروازہ اور منتہا اس کا محلہ جوڑے موری اور لاہوری منڈی بلکہ اکثر لاہوری منڈی اور جس قدر رستے اور کوچے اس کے متصل ہیں۔ اس کے ساتھ متصل ہیں۔ حتیٰ کہ بھاٹی دروازہ کی طرف شرقی اور ایک حاق دروازہ اسی میں شامل ہے۔

گذر تلواڑہ ۔ جس قدر عمارات بازار بھاٹی دروازہ کی جانب غرب ہیں تاچورستہ بازار ٹبی اسی میں داخل ہیں۔

گذر ددھرہ ۔ یہ گذر سادر گذروں سے بہت بڑا ہے جتنے محلے و کوچے اور بازار اندرون دروازہ دہلی و زکی اور اکثر طرف و شوارع اندرون دروازہ اکبری ہیں تاچورستہ رنگ محل اسی کی شاخیں ہیں۔ ایام سلف میں بمد فتح کوتوالی کے اوسط گذر مذکور سے ایک گاؤں تھا۔ جس کو ددھرہ بولتے تھے۔ جب وہ وسعد شہر میں آگیا۔ وہ بستی اسی نام پر موسوم رہی۔

گذر شیخ محمد اسحاق ۔ ابتدا اس کا خضری دروازہ اور منتہا اس کا چورستہ متصل حویلی جنرل الٰہی بخش جس قدر طرق و شوارع چپ و راست میں ہیں، اس کے متعلق ہیں۔

گذر شہباز خان ۔ جس قدر آبادی زیر دیوار جنوبی قلعہ بادشاہی ہے تاچورستہ جنرل الٰہی بخش مذکور اس کا ضمیمہ ہے۔

گذر مانک چوک ۔ سید مٹھا سے لغایت فصیل دروازہ ٹکسالی و شاہ برج ٹکسالی۔

تمام محلہ و بستیہائے بیرون فصیل شہر

آبادی بیرون حصار شہر ستائیس گذر پر منقسم تھی۔ اور ہر ایک گذر میں بچند محلہ و کوچہ و بڑی باد قلعہ ہا و شوارع و اسواق ہو کہ بسبب نہ ملنے کسی کتاب معتبر کے مفصل حال نہیں لکھ سکتا، کہ کون کون گذر اور کون کون محلہ اور بستی متعلق فلاں فلاں گذر کے تھی، اس واسطے جو کچھ حال مجھ کو بلا حظہ مشکوک دریہ بینہ معلوم ہوا۔ بموجب اس کے لکھا جاتا ہے۔

محلہ حاجی سوائے ۔ بیرون موچی دروازہ لغایت موقعہ آبادی قلعہ گوجر سنگھ۔ یہ قلعہ گوجر سنگھ سمت ۱۸۵۵ میں گوجر سنگھ حاکم لاہور نے تعمیر کرایا۔ پہلے یہاں حویلی گوجر مل نامی کھتری کی تھی، اور پاس اس کے ایک سرائے تھی۔

محلہ طلا بخاری ۔ بیرون دروازہ شاہ عالمی تھا جس موقعے پر آج کل بھگت کا چوبارہ ہے یہ جگہ اوسط میں تھی۔ پاس اس کے جانب جنوب ایک چورستہ تھا۔

محلہ پیر عزیز جہز نگ ۔ جو کہ بالفعل موضع مزنگ مشہور ہے، پیر مہزنگ جلال الدین اکبر کے عہد میں فقیر بابرکت اور امیرزی عظمت تھا، اس نے اس موقعے پر مکان سکنی معمور کیا تھا، اسی واسطے اس بستی کا نام محلہ پیر مہ نگ مشہور ہوا، بعد ازاں کہ آبادی بیرون شہر ویران ہوئی یہ بستی بطور موضع شہر سے علیحدہ ہو گئی، اور بتدریج اس کی گرد چار میں اور چند بستیاں آباد ہوئیں، بموجب تفصیل ذیل:۔ کوٹ عبداللہ شاہ، کوٹ مذاہر، تاج پورہ۔ قلعہ مہرباد۔ قلعہ

مہاراج کھاں، مبارک پورہ، بستی مہتراں - محلہ [illegible] ہونڈپورہ - درآں حالیکہ لاہور میں تین حاکم تھے یعنی
لہنا سنگھ [illegible] حاکم تھا اور [illegible] صاحب کے عمل میں بھی اس کا حصہ [illegible] اور
[illegible] کو نام گاؤں بطور جاگیر مرحمت ہوا

محلہ ابو اسحاق - جانب [illegible] ابو اسحاق [illegible] تھا۔ اس نے بعہد اکبر مرحوم
ایک طالب علم [illegible] آبادی اس کے گرد و جوار میں ہوئی اس کے نام سے موسوم ہوئی۔
مقبرہ اس کا [illegible] ایک گوشہ موضع [illegible] میں موجود ہے۔

کوٹ کروڑی - جانب شرق محلہ حاجی [illegible] جس موقع پر مقبرہ شیخ موسیٰ آہنگر کا ہے۔ یہ جگہ درمیان
محلہ [illegible] کے ہوں۔

محلہ دولاوری - [illegible] شمال و جنوب محلہ [illegible] کے تھا جس موقع پر مقبرہ سید چراغ بخاری کا ہے
وسط محلہ تھا۔

قطب غوری - لاہوری دروازہ سے باہر تھا اس جگہ تربت قطب غوری کی ہے، یہ جگہ درمیان محلہ مذکور کے تھی۔
واضح رہے کہ یہ قطب الدین وہ شخص ہے جس کو اکثر تواریخ قطب الدین ایبک لکھتے ہیں جس نے ۱۲۰۶ء میں بعد مرنے
شہاب الدین محمد غوری کے تخت لاہور اور دہلی پر اجلاس فرمایا جب وہ اس جگہ دفن کیا گیا، اس بستی کا نام محلہ قطب غوری
قرار پایا۔

لکھی محلہ - لاہوری دروازہ کے باہر قطب غوری کی جانب مغرب تھا۔ اس جگہ ایک بازار عالی شان تھا۔
لاکھپتی بیٹھتے تھے۔ اسی واسطے اس بستی کو لکھی محلہ کہتے تھے۔

رسول پورہ - بامقبرہ سید شاہ چراغ بخاری کے اس محلہ میں اکثر مرید رہتے تھے، اور انھوں ہی نے اس بستی
کو آباد کر کے رسول پورہ نام رکھا۔

چوک دارا - شاہ برج [illegible] دروازہ سے جانب مشرق ایک گولی بندوق کی مسافت پر دارا شکوہ ابن شاہ جہاں
نے بعہد شاہ جہاں اپنے رہنے کو حویلی عالی شان اور بازار مربع اور درمیان میں اس کے چوک متقطع اور ایک باغ بہت عمدہ
اور وسیع اور ایک کٹڑہ مبنی بہ بیوت متعددہ بنوایا تھا۔ اس سبب سے بعد اس کے اس بستی کا نام چوک دارا قرار پایا۔ تا وقتیکہ
دارا شکوہ جیتا رہا، یہ قطعہ نمونہ بہشت رہا، بعد ویرانی ریاست دولت اسلام سکھوں نے یہاں سے لاکھوں روپیہ
زیر زمین [illegible] کا جو یہاں رہتے رہے پایا، اور عمارات دارا شکوہ سے ہزاروں روپیہ کا پتھر از قسم جواہرات اتارا، مہاراجہ
صاحب کے عہد میں اکثر اینٹ اس کی خندق پر لگی، بعد اس کے کشمیریوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ سالہائے دراز تک
اینٹ بیچتے رہے۔ اور جن کو قسمت نے یاوری دی ان کو کھنڈروں سے خزانہ ملا۔ اور جس موقعہ پر خاص حویلی دارا شکوہ
کی تھی، تا خاتمہ ریاست سکھاں اس جگہ بارود سرکاری بنتا رہا، اس محل میں وہاں جیل زنانہ ہے۔ اور جس جگہ پر باغ
دارا شکوہ کا تھا۔ وہاں اب محمد سلطان نے سرائے پختہ بنوایا (کذا) نیز ایک طرف میں چھوٹا سا باغ بنوایا۔

محلہ جوہڑ یابلی۔ چونکہ دارا شکوہ کی جانب مشرق و جنوب مسجد کی جانب غرب و شمال میں محلہ حاجی سوائے تھا۔

محلہ شاہ کاکو۔ بازار شرقی مسجد مقبرہ [illegible] گدڑ تھی لہان سرے شہید گنج سے محلہ نخاس تک کہ فاصلہ گولی بندوق پر گوشہ شرق و شمال میں تھا۔ شاہ کاکو ایک فقیر [illegible] مرد تھا جس کی قبر زیر دیوار شرقی مسجد مذکور ہے۔ اس واسطے یہ بستی اسی کے نام پر موسوم رہی۔

نخاس۔ مکان سرکاری بہ شکل مربع تو رستا، چونکہ دوران میں یہاں گھوڑے بکتے تھے، بسبب نامور ہی مکان کے یہ بستی محلہ نخاس کہلاتی تھی۔ دروازہ نخاس کا جو کہ مانند دروازہ مسجد وزیر خان بہت عمدہ وضع پر قطع اور بہ رنگ آمیزی کاشی و لیقبی و صنعت کاری و گلکاری دیدہ تھا۔ تاہم آخر ریاست سکھاں کھڑا رہا۔ جب محمد سلطان نے [illegible] بنوائی وہ اینٹ یہاں کار آمد ہوئی۔

محلہ حاجی نالہ۔ دروازہ دہلی سے نخاس تک نولکھا۔ شاہ برج دروازہ کی کے مقابل جانب شمال نواب علی مردان خان نے تخمیناً دو سو بیگھہ زمین پر باغ بنوایا تھا جس کا نام نولکھا رکھا تھا۔ یہ بسبب [illegible] بستی آبادی اس کے پیرامن میں تھی اسی کے نام پر موسوم ہوئی۔ اب بھی اس قطعہ زمین کو جس میں چند سو بیگھہ [illegible] نولکھا کہتے ہیں۔ [illegible] اس باغ کی بارہ دری بھی اب تک موجود ہے جس کو [illegible] نے اپنی مرضی کے موافق ترمیم کر کے کوٹھی عالی شان بنوائی۔

سبیدسر۔ جس موقعہ پر بالفعل اسٹیشن ریلوے ہے اس کے پاس ایک تالاب تھا جس کو ایک [illegible] نامی معروف میر مہنگا کے مریدوں نے بنوایا تھا۔ میر مہنگا فقیر آدمی تھا جس کے ہزاروں [illegible] معتقد تھے۔ اصل نام اس کا عبداللطیف تھا۔ بعد تیاری اس تالاب کے جس کو ہندی میں سر کہتے ہیں اس بستی کا نام سبیدسر [illegible] پایا اور وہ نام گم ہو گیا۔

کھوئی میراں۔ دہلی دروازہ سے جانب شمال فاصلہ ایک کوس پر اس جگہ پر ایک سید معروف میراں نے کھوئی کھدوائی اور مکان بنوایا تھا جس کا نام کھوئی میراں مشہور ہوا۔ عمل چغتائیاں میں جب آبادی بیرون شہر اس دفعہ تک پہنچی اور متصل اس کے مکانات معمور ہو گئے تو اسی نام سے اس بستی کا نام زبان زد خوام رہا۔ کچھ دنوں میں [illegible] لہنا سنگھ اور الحکام مذکورہ نے اس کو بطور [illegible] آباد کیا۔ اب بھی اس کا [illegible] مشہور ہے لگ ہے۔

منڈوی شہزادہ پرویز۔ کھوئی میراں سے تھوڑے فاصلے پر جانب مشرق میں شہزادہ پرویز نے جو کسی بادشاہ [illegible] کا بیٹا تھا بنام خود منڈوی آباد کی تھی اور ایک بازار مربع اور حویلی عالی شان بنوائی اور اسی جگہ دفنایا گیا۔ اس واسطے اس بستی کا نام منڈوی پرویز مشہور ہوا۔ چشتی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ پرویز شاہ جہان کا [illegible] جو کہ خورد سالی میں مر گیا۔

پچھتہ سوداگراں۔ کھوئی میراں سے جانب جنوب چوہٹہ بازار [illegible] تھا۔ اور اس میں اکثر سوداگر رہا کرتے تھے۔

دروازہ مندر۔ پاس پیر [illegible] لاہور سے فاصلہ دو کوس کے جانب مشرق ہے ایک مندر ہنود کا تھا اور اس کا دروازہ بہت عمدہ وضع پر بنا ہوا تھا۔ پس جو بستی اس کے قرب و جوار میں تھی اس کے نام سے معروف تھی۔

بیگم پورہ۔ لاہور سے فاصلہ تین میل پر جانب شرقی متصل موضع باغبانپورہ و بھوگی وال والدہ نواب خان بہادر

نے مکانات سکنی تعمیر کیے اور پیرامن ان کے چار دیواری پختہ بنوائی تھی۔ بعد اس کے نواب خان بہادر نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے کئی مسجدیں اور بازار اور چوک بنوائے اور چپ و راست ہیں اس کے لواحق اور اقارب و ذریات نے مکانات سکنی تیار کرائے۔ جن دنوں میں نواب خان بہادر صوبہ لاہور تھا سب بستیوں سے اس بستی میں بہت رونق تھی اور دولت تھی۔ خاص سے بیگم پورہ تک ایک بازار تھا جس پر لکھ پتی بیٹھتے تھے اور پہلے اس سے جس موقعہ پر بیگم پورہ معمور ہوا کوچہ تیلیاں تھا، اب بیگم پورہ ہے۔ نہ کوچہ تیلیاں۔ ٹوٹے پھوٹے ہوئے چند مقبرے اور آثار مکانات ہیں۔ اور کچھ نہیں۔

محل مشکی۔ درمیان بیگم پورہ اور شالامار کے ایک مشکی مراسی مقرب اکبر مرحوم تھا۔ اس نے موقع آبادی بھوگیوال جو محل بنوایا بہ سبب نامور ہونے کے اس تمام بستی کا نام محل مشکی قرار پایا۔

نیلی وہیڑہ۔ باغبان پورہ سے مغرب کی طرف اس میں اکثر نیلی رہتے تھے۔ اب اس جگہ میں گورستان تیلیاں ہے۔

بڑھی پھلواڑی۔ جانب مغرب نیلی وہیڑہ کے بڑھی اور ٹھٹھی اور گڑھی قلعہ کو کہتے ہیں۔

محلہ گنج۔ متصل اسٹیشن ریلوے میاں میر اس کی جانب شمال و مغرب میں مقبرہ بہادر خان کا کہ ہنوز ٹوٹا پھوٹا موجود ہے۔ محلہ مذکور کے درمیان میں تھا یہی محلہ بجانب مشرق مبتدا آبادی شہر کا تھا۔ بعد زوال ریاست چغتائیاں ویران ہو کر بعد کئی برسوں کے پاس اس جگہ کے جانب مشرق بہ فاصلہ مسافت گولی بندوق از سر نو آباد ہوا۔ اب یہ موضع کہلاتا ہے اور ملکیت اس کی ارائیوں کی ہے۔

ٹھٹھی ابوالخیر۔ بالفعل معروف گڑھی شاہو لاہور سے گوشہ شرق و جنوب میں بہ فاصلہ ایک کوس ابوالخیر فقیر تھا اس نے اس جگہ پر سکونت اختیار کی اور کوٹھی بنوائی۔ اس لیے اس بستی کا نام ٹھٹھی ابوالخیر پایا۔ ایام غدر سکھاں میں لوگ اٹھ گئے اور مکانات ویران ہو گئے۔ اس ویرانی کی حالت میں ایک راہی شاہو نامی نے یہاں رہنا اختیار کیا۔ بعد اس کے گوجر سنگھ حاکم لاہور نے اس ویرانہ کو بطور جاگیر آباد کیا اور ملکیت زمین کے ارائیوں کو دی۔ جب سے گڑھی شاہو مشہور ہوا۔

بستی میاں میر۔ بجانب شرق و شمال و مغرب مزار میاں میر صاحب مرحوم جس قدر آبادی تھی بستی میاں میر کہلاتی تھی۔ حال میاں میر صاحب کا بیان مقابر میں لکھا جاوے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دولت آباد۔ جانب مشرق میر مہر تک کے ساتھ ساتھ محلہ ابواسحاق کے قلعہ دولت آباد تھا۔ تعمیر اور آباد اس کی وارثان سید عبدالقادر ثانی جس تا مقبرہ درمیان بستی مذکور کے تھا کرائی تھی۔ بعد اس کے بتدریج پاس اس کے مکانات کرا مٹے اور چند قلعے آباد کیے۔ قلعہ میر محمودؒ۔ قلعہ میر ارشد خانؒ۔ قلعہ میر کفایت خانؒ زاں بعد بہ عہد حکومت نواب خان بہادر و فرزندان نواب خان بہادر دو اور قلعے تیار ہوئے۔ قلعہ میر نواب محمدؒ۔ قلعہ میر اکبرؒ۔ اب ان قلعوں ا بستیوں کا نام و نشان نہیں رہا مگر ایک چاہ ہے جس کو چاہ میر والا کہتے ہیں۔ پہلے ان قلعوں کی اس جگہ کو محلہ دواجہ پورے تھے۔ قلعہ میر یعقوب۔ یہ قلعہ پاس دولت آباد مشرق و جنوب میں حاجی پورہ طرف جنوب قلعہ میر یعقوب، قلعہ علی پور پاس تالاب کمہاراں کے مغرب و جنوب ہیں، بڑھی شاہ پور مغرب میں بھلے پور کے۔

کھوجوں کا محلہ ۔ پاس محلہ ابو اسحاق کی جانب شمال ، بالفعل اس محلہ سے ایک مسجد ٹوٹی پھوٹی رہ گئی ہے جس کو کھوجوں کی مسجد بولتے ہیں ۔

باغ نخلی ۔ جس موقعہ پر تھانہ انارکلی اور عجائب گھر معمورہ ہے نواب وزیر خان امیر شاہ جہان نے باغ بنوایا جس میں ہزارہا اشجار سبز و رطب تھے اسی واسطے لوگ اس باغ کو نخلی بولتے تھے ۔ اور اسی نام سے تمام بستی موسوم رہی ۔ بالفعل اس باغ سے چند درخت خرما اور ایک بارہ دری موجود ہے جس کو حکام نے کتاب گھر قرار دیا ۔ اس باغ کی جانب مغرب باغ زیب النساء تھا ۔ اب اس موقع میں موضع نیاں کوٹ آباد ہے اس باغ کے جانب شمال باغ انارکلی تھا جس قدر آبادی ان باغوں کے گرد و جوار میں تھی انہیں کے نام پر معروف تھی جانب شمال باغ انارکلی کے محلہ پیر بھاون تھا ۔ اب اس موقعہ پر نام باڑہ ہے ۔

شیش محل ۔ جانب شمال محلہ پیر بھاون مزار تھا و مزار پیر بیگی کی ، اس محلہ کی طرف جنوب میں تھی ۔ کسی بیگم نے بعہد سلاطین چغتائی شیش محل بنوایا تھا ۔ اس واسطے اس تمام بستی کا نام شیش محل قرار پایا ۔ اب اس کا نام و نشان نہیں بجز نام رہا ۔ جمعیت دی اس قلعہ کی لاہور سے علیحدہ ہے ۔

تل بھوگا ۔ جانب مشرق شیش محل کے تا دیوار فصیل غربی لاہور دروازہ ہا سائی تک ۔

محلہ شیخ اشرف ۔ بھاٹی دروازہ سے تا غایت موقع بنائے دار العدالت ضلع ، شیخ اشرف عہد عالمگیر میں بڑا بھاری عامل تھا ۔ بیرون بھاٹی دروازہ اس نے مسجد عالی شان اور مکانات سکنی بنوائے ۔ اس لیے اس بستی کا نام محلہ شیخ اشرف مشہور ہوا جب وہ مر گیا تو قبر اس کی بھی اسی جگہ ہوئی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وقت تعمیر خندق کے ان مسجد و دیگر عمارات شیخ اشرف کو بارود سے اڑا دیا اور نعش اس کی اس جگہ سے نکال کر میانی میں دفنائی ۔

بند عالمگیری یعنی دروازہ سے تا ٹھوٹو بلوچ واسطے روک دریا اور حفاظت شہر کے عالمگیر نے بند پختہ بنوایا تھا اور بحکم بادشاہ ہر ایک امیر نے اس پر مکانات سیر گاہ اور عقب مکانات باغ جا نفزای تعمیر کرائے ۔ اس واسطے جو عمارت اس بند پر اور متصل اس کے ہوئی بند عالمگیری مشہور ہوئی ۔

محلہ فدائی خاں ۔ بیرون دروازہ اکبری نیچے فصیل شہر کے تا دروازہ دہلی ، فدائی خاں امیر عالمگیر تھا جس کے اہتمام میں مسجد بادشاہی تیار ہوئی ۔ اس نے اس موقع پر مکانات سکنی بنوائے تھے ۔ اس لیے اس تمام بستی کا نام محلہ فدائی خاں مشہور ہوا ۔

بنگہ ڈھولاں ۔ جہت شرق و شمال محلہ پیر مہرنگ موقع مکان چلہ شاہ مقیم درمیان آبادی کے تھا ۔

میانی ۔ جہت مغرب و جنوب محلہ پیر مہرنگ جس قدر آبادی تھی میانی کہلاتی تھی ۔ اگرچہ محلہ ہائے متعلقہ شہر سے الگ تھے مگر اہل ہر حال ضمیمہ شہر تھی تفصیل حال اس کا بیان تا بر دامکنہ دیباچہ میں لکھا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ ۔

کنبو واڑہ ۔ جانب شمال آبادی شہر جس موقع پر اب کوٹھی ڈاکٹر (ڈاکٹر) ہنری (کذا) صاحب کی ہے بالفعل اس آبادی سے اب تالاب موجود ہے جس کو تالاب کنبوواں بولتے ہیں ۔ یہ آبادی بھی شہر میں داخل نہ تھی مگر الگ بھی نہ تھی ۔

عہدِ جہانگیری

اکبر کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لاہور جہانگیری عہد میں بھی ہندوستان کے کسی شہر سے کم نہیں رہا۔ ۱۶۲۶ء میں دو انگریزوں نے لاہور کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے۔ حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعۂ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے لیے سوداگر جہازوں میں اپنا مال لادتے ہیں اور دریا کے کنارے ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں۔"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے!! راوی اور جہاز! یہ دونوں باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ بحر خشکی کی تجارت اور بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹوں کی ہر سال ایران کو روانگی!! کیا آج بھی جبکہ تہذیب و سائنس اپنی انتہائی منزل پہ پہنچ چکی ہے یہ باتیں نظر آتی ہیں؟

جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے ہی مہینے اہلِ لاہور کو ایک عجیب دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کی اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ باپ کی تخت نشینی کے بعد چار ماہ تک تو خسرو خاموش رہا پھر دفعتہً آگرہ کے قلعہ سے نکل بھاگا اور دس ہزار سواروں کی جمعیت میں دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ آتے ہی حکم دیا کہ قلعہ کو فتح کر کے سات روز تک شہر کو خوب لوٹو۔ بچہ، جوان، بوڑھا، عورت جو ملے اسے قتل کر دو اور شہر کو آگ لگا دو۔

فوج ایک دروازہ کو جلا کر شہر میں داخل ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آ پہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن راستہ میں سودھرہ (متصل وزیر آباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ جہانگیر اس وقت مرزا کامران کی بارہ دری میں جو راوی کے کنارے واقع ہے مقیم تھا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے جن میں حسن بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبدالرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں گڑوائیں اور ان سات سو باغیوں کو یکے بعد دیگرے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ خسرو کو پابہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا اور جب راستے سے اس کے سات سو ہمراہی سخت اذیتوں سے مارے جا رہے تھے، اسی راستے سے قلعہ میں بھجوایا گیا تاکہ وہ اپنے باغی ہمراہیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس نے سپہ سالار حسن بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبدالرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرا دیا اور یہ دونوں دم گھٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک

قید رہا۔ آخر ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی کی حالت میں مر گیا۔ لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔

اکبر یورپین پادریوں کی بے حد عزت کرتا تھا لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لیے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کیے۔ شاہجہان نے جو اکبر اور جہانگیر کی نسبت شریعت کا زیادہ پابند تھا، تخت پر بیٹھتے ہی اس گرجا کو مسمار کرا دیا اور پادریوں کے وظیفے ضبط کر لیے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۶۶۶ء میں) ایک فرانسیسی سیاح تھیونات لاہور آیا۔ اس وقت تک اس گرجا کے آثار باقی تھے لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور میں گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کا ایک قابلِ ذکر واقعہ گزرا۔ گورو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کی آپس میں عداوت تھی۔ دیوان نے گورو کے خلاف گورنر لاہور کے کان بھرے اور کہا کہ گورو کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو یوں آزاد رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ گورو ارجن دیو قید کر لیے گئے اور وہ قید ہی میں انتقال کر گئے۔ جب ان کا بیٹا گورو ہرگوبند جوان ہوا تو اس نے دیوان کے خلاف بادشاہ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ دیوان گورو ہرگوبند کے حوالہ کر دیا گیا اور ہرگوبند نے اسے قتل کر کے باپ کا انتقام لیا۔

جہانگیر نے قلعہ میں بہت سی عالی شان عمارتوں کا اضافہ کیا اور اس کے امراء و وزراء نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔

جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال انس تھا۔ ۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دارالسلطنت ہی بنا لیا اور ۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفرِ کشمیر کے دوران راجوری کے قریب وفات پائی تو لاہور ہی میں دفن کیے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ اپنی چہیتی بیگم نور جہاں کے باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا عظیم الشان مقبرہ دریائے راوی کے دائیں کنارے پر قصبہ شاہدرہ کے پاس واقع ہے اور عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔

عہدِ شاہجہانی

جہانگیر کے انتقال کے وقت نور جہاں کا داماد اور جہانگیر کا بیٹا شہریار لاہور میں موجود تھا۔ اس نے سات دن میں سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے بے فکروں کی ایک فوج جمع کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاہجہان جو نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا داماد تھا، اس وقت دکن میں تھا۔ وہ آصف جاہ کے اشارہ سے پر لگا کر آگرہ میں پہنچا۔ ادھر آصف جاہ نے یہ چال چلا کہ خسرو مرحوم کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو زندان خانہ سے نکال کر شہریار کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ اور سلطنت کی مبارکبادی سے داور بخش یہ سمجھ گیا کہ نور جہاں اپنے داماد اور آصف جاہ اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہیں اور میں محض گوسفندِ قربانی ہوں۔ اس نے آصف جاہ کا شکریہ ادا کر کے تخت و تاج سے انکار کر دیا۔ لیکن آصف جاہ نے اس قدر قسمیں کھائیں اور ایسا یقین دلایا کہ وہ اجل گرفتہ شہزادہ آخر کار رضامند ہو گیا۔ وہ شہریار سے لڑا اور شہریار کو شکست

ہو گئی۔ آصف جاہ اور داور بخش فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے اور آصف جاہ نے شہریار کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس موقعہ پر بدنصیب شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی:—

نرگس گلاب اگرچہ توان کشید
کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من
بگو کور شد دیدۂ آفتاب
۱۰۳۷ھ

شاہجہان نے آگرہ پہنچ کر آصف جاہ کو کہلوا بھیجا کہ لاہور میں جس قدر شہزادے موجود ہیں سب کو ٹھکانے لگا دو۔ چنانچہ ۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء بروز ہفتہ آصف جاہ نے داور بخش کو تخت سے اتار کر قید کر دیا اور شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا۔ شہزادہ داور بخش نے آصف جاہ کو اس کے قول و قسم یاد دلائے مگر وہاں کون سنتا تھا آخر جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء کو مندرجہ ذیل شہزادے ایک ہی وقت میں تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے:—

(۱) شہزادہ داور بخش (۲) اس کا بھائی گرشاسپ۔
(۳) شہریار داماد نورجہاں (۴) طہمورس اور (۵)
طہماسپ (پسران سلطان دانیال پسر اکبر)

شاہجہان نے بادشاہ ہو کر اپنے باپ جہانگیر کا عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے جو سالہا سال گزر جانے اور سکھوں کے زمانہ کی دستبرد کے بعد بھی ہندوستان کی لاجواب عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ نورجہاں نے بھی ۱۶۲۶ء میں اسی عہدِ حکومت میں وفات پائی جس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں روضۂ جہانگیر کے نمونہ پر "چار چمن" کے اندر تعمیر کرایا تھا۔

آصف جاہ نے بھی جس کی کوششوں سے شاہجہان کو تخت ہند نصیب ہوا، اسی کے عہدِ حکومت میں ۱۶۴۱ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کو آصف خان یمین الدولہ بھی کہتے ہیں۔ مآثر الامراء میں اس کے بہت سے حالات درج ہیں۔ بہت ہی بسیار خور تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک من شاہجہانی خوراک دن رات میں کھاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں جہاں آج کل منڈیا بازار میں میاں سلطان کی سرائے اور اس کا ٹھنڈا کنواں اور باغ موجود ہے، وہاں آصف جاہ کی عالی شان حویلی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ عہد عالمگیری کے مورخ منشی سجان رائے بٹالوی نے اس حویلی کے متعلق لکھا ہے:—

"از عمارات منازل بادشاہزادگان و امرائے والاشان خصوص عمارت
آصف خان عرف ابوالحسن بن اعتماد الدولہ از و باد آبادی گردید"[1]

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۶۵

ماثر الامراء اور ظفر نامہ شاہجہان میں لکھا ہے کہ اس حویلی پر بیس لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔ حویلی کیا تھی، خاصا ایک قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ[1] کے عقب سے لے کر شہید گنج۔ سرائے میاں سلطان اور ریلوے ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام۔ مسجدیں۔ دمدمے۔ تالاب۔ حوض۔ فوارے۔ باغ اور زنانہ مردانہ محلات تھے۔ شاہجہان اس میں کئی مرتبہ آیا تھا۔ دہلی، آگرہ اور کشمیر میں آصف جاہ کی جائداد کا جائزہ لیا گیا تو اڑھائی کروڑ روپیہ تک درج رجسٹر ہوا۔ بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد بیس لاکھ روپیہ اس کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا اور حویلی شہزادہ دارا شکوہ کو مرحمت فرمائی باقی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کی گئی۔

جہانگیر نے قلعہ لاہور میں کچھ عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن شاہجہان کو پسند نہ آئیں۔ اس لیے نواب وزیر خاں بانی مسجد وزیر خاں کو حکم ہوا کہ سب عمارات از سر نو تعمیر کرائی جائیں۔ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان پھر آگرہ سے لاہور آیا۔ علی مردان خان قندھاری بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ شاہجہان نے اسے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور ایک خلعت فاخرہ انعام دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ علامی افضل خاں وزیر سلطنت تھے۔

شاہجہان ۱۶۳۹ء میں پھر لاہور آیا۔ علی مردان خاں اور دارا شکوہ پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ علی مردان خاں نے اہل ایران کے طور و طریق پر شب برات کی روشنی کا تماشا بادشاہ کو دکھایا۔ مختلف شکلوں کے تختوں اور چھتوں پر طاق بندی کی۔ اہل لاہور نے اس قسم کی کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسی شب بادشاہ نے دس ہزار روپیہ غربا میں تقسیم کیا اور اسی رات علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا فاضل کو چار چار سو اشرفی انعام میں دی گئی[2]۔

لاہور میں شاہجہان کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے جو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔

شاہجہان کے عہد حکومت میں بھی کئی فرنگستانی سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں لاہور کی تعریف اس طرح کی ہے :-

(ترجمہ) "آگرہ سے روانہ ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا جس میں آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد نہیں ہیں۔ نقوش) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ

---

[1] مولوی محمد انشاء اللہ خاں آنریری مجسٹریٹ و مالک ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے مکان کا نام ہے۔
[2] تاریخ محمد شاہی (قلمی) مصنفہ خوشحال چند ساکن۔

پیادہ چل رہے تھے کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ غرض گھوڑے سے گھوڑا چھلتا تھا اس لیے ہم واپس آ گئے۔ شہر کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے جہاں نان بائی اور صناعت کا بازار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ بکری۔ گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ بندروں کا گوشت بھی مل سکتا تھا۔ البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دوکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہیں۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں)۔ تیسری ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے جو میدہ سے بنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا کھانا دو تین آنوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط اور ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے سے بلکہ در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے اور وہاں سے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغ عمارات، تالاب اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بڑے بازار کا نام "بازار دلکشا" ہے۔ اس میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔[1]

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور کو ہوئی وہ اکبر کے زمانہ سے کہیں زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دور دور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے اور باغات و محلات کی کثرت نے لاہور کو گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ نواب علیم الدین الملقب بہ وزیر خان نے بھی

---

[1] "بازار دلکشا" معلوم نہیں کس جگہ واقع تھا۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوب کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہوگا۔

عالی شان مسجد شہر کے اندر بنائی جو اب تک لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ نواب وزیر خاں کا باغ۔ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کا فلک نما مکان جو آج "رنگ محل" میں حویلی میاں خاں کے نام سے موسوم ہے۔ نواب وزیر خاں کا مکان "پری محل" جس کے کھنڈر اب بھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نظر آتے ہیں۔ دائی لاڈو کے آسمان مرتبت ایوانات جو باغ مہان سنگھ اور باغ رتن چند ڈاڑھی والا کے آس پاس تھے اور جہاں اب بھی دائی لاڈو کی مسجد موجود ہے۔ پھر محلہ دائی انگہ جو ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا اور جہاں اب بھی مسجد دائی انگہ موجود ہے۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں جنہیں محکمہ ریلوے نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے بیسیوں محلے لاہور کی زیبائش و شہرت کا باعث تھے۔

یہ شرف لاہور ہی کو حاصل ہے کہ نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان نے اپنی ابتدائی زندگی حصول علم میں اسی جگہ گزاری، اور پھر جب بادشاہ کو اس کی قابلیت کا علم ہوا تو لاہور میں اسے شرف باریابی بخشا اور چار ہی سال کے اندر اس کو تمام ہندوستان کا مدار المہام بنا دیا اور پھر جب سعد اللہ خاں نے وفات پائی تو اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کو اعلیٰ منصب عطا کیا اور اس کے دوسرے بیٹوں اور متوسلین کے روزینے مقرر کر دیئے۔

داراشکوہ چونکہ صوفی منش شہزادہ اور سلطنت کا ولی عہد تھا۔ اس لیے پنجاب کے لوگ اور خصوصاً اہالیان لاہور اس کے نہایت گرویدہ تھے۔ شہزادہ بھی ان سے بہت مانوس تھا۔ اس نے کئی عالی شان محلات تعمیر کرائے اور ایک پرفضا چوک اپنے نام سے اس جگہ قائم کیا جہاں ننگا بازار ہے، آج کل "مسجد شہید گنج" واقع ہے۔ ایک مسجد ۱؎ بھی تعمیر کرائی جس کی ایک پچی کچی دیوار ریلوے ٹیکنیکل اسکول کی تعمیر کے زمانہ میں مسمار کر دی گئی تھی۔

داراشکوہ کے دم سے لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح وہ اسلامی تصوف کا دلدادہ تھا۔ اسی ذوق شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجلس میں ایک طرف صوفیا بیٹھتے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ اکبر کی طرح مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں کے مباحثے کراتا اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کراتا تھا۔

داراشکوہ اور گورو ہرگوبند میں بہت موانست تھی۔ جب گورو جی امرتسر سے آتے تو مہینوں داراشکوہ کے مہمان رہتے اور مسائل تصوف کے ذکر اذکار سے صحبت گرم رکھتے۔

[شاہی یادگاروں کے علاوہ امرا اور بیگمات کے محلات بھی مینو سواد بستان بنے ہوئے تھے۔ ہر شہزادہ اور ہر امیر اپنا ایک نیا محل رکھتا تھا جس میں باغ کے ساتھ آبشار، فوارے، حوض اور چھوٹی چھوٹی نہریں لازمی تھیں۔ پھر عمارات کئی قسم کی ہوتی تھیں۔ زنانہ محل علیحدہ، مردانہ محل علیحدہ، دربار کے کمرے اور دیوان خانے الگ۔ باغات زنانہ و مردانہ الگ۔

اس زمانے میں امرائے لاہور نے اکثر مقبرے اور بزرگان دین کے اکثر مزار بھی بنائے۔ ان کے باغوں میں تماشے چلتے تھے یا ان مقبروں کی تعمیر کے ساتھ ہی باغ بھی لگائے جانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ بہرحال مقبرہ اور باغ قریباً لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ داراشکوہ نے اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں بہت سے باغوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے عہد میں موجود تھے اور اب نابود نا معلوم

۱؎ تاریخوں میں اس مسجد کا ذکر داراشکوہ کی بیوی ستارہ بیگم کے نام سے آتا ہے۔ (مرتب)

ہیں چند ایک کے نام یہ ہیں :۔

باغ قاسم خاں ۔ یہ وہی قاسم خاں ہے جس نے ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں اکبر کے حکم اور اہلِ کشمیر کے ایک وفد کے مشورے سے کشمیر فتح کیا تھا۔ داراشکوہ لکھتا ہے :۔

> "حضرت میاں میرؒ اکثر اوقات اس درخت کے نیچے جو
> قاسم خاں کے باغ کی دیوار کی پچھلی جانب چار دیواری
> میں واقع ہے دن کو عبادتِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے
> تھے۔"

باغ جواہر خاں ۔ یہ باغ ایک جھنگی کے متصل تھا۔ داراشکوہ کے زمانے میں وہ جھنگی پانی کے نیچے دب کر نابود ہو چکی تھی۔

باغ محمد تقی دیوان بیوتات ۔ یہ امیر شہنشاہ جہانگیر کا دیوان بیوتات تھا۔ معلوم نہیں یہ باغ کس جگہ واقع تھا۔ داراشکوہ نے صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "حضرت میاں میرؒ اس باغ میں کبھی کبھی دن کا کچھ حصہ گزارا کرتے تھے۔"

باغ ہوشیار خاں ۔ (ہسٹری آف لاہور ص ۳۴۵) داراشکوہ لکھتا ہے کہ "اس باغ سے مشرق کی طرف گندی ندی ہے۔ وہاں سبزی اُگنے تک حضرت میاں میرؒ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔"

غرض صدہا امراء، صلحاء، شعراء، اور شہزادے لاہور میں دفن تھے۔ ان کے مدفن نہایت عالی شان تھے۔ ان کی قبروں کے ساتھ اوقاف تھے۔ ان کے مقبروں کے گنبدوں سے ان کا جاہ و جلال ظاہر ہوتا تھا۔ وہ عبرت و بصیرت کی ایک زندہ تصویر بھی تھے۔ آج ان کی قبروں کا نشان تک بھی موجود نہیں۔ ان بے نشان مرقدوں کا نام بنام ذکر کہاں تک کیا جائے؟ (مرتب)

عہدِ عالمگیری

اگرچہ باپ کو نظر بند کر کے عالمگیر (اورنگ زیب) ۱۶۵۸ء میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب تک بھائی موجود تھا خصوصاً داراشکوہ جو ولی عہد تھا اس وقت تک اسے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے پنجاب کا رخ کیا جو داراشکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ داراشکوہ جہاں کہیں بھی ہو گا، بھاگ کر آخر لاہور ہی میں جائے گا اور وہاں سے تیار ہو کر مقابلہ کو نکلے گا۔ چنانچہ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ داراشکوہ بھاگ کر پہلے شالامار باغ میں پہنچا اور وہاں سے زمین دوز سرنگ کے ذریعے قلعہ میں داخل ہوا اور اپنا خزانہ جو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا تھا ہمراہ لے کر ملتان کے راستے بھکر اور سندھ کو چلا گیا۔ تقریباً چودہ ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے اور توپ خانہ اور کارخانجات شاہی یہ سب اس کے علاوہ تھے۔ بڑی بڑی کشتیوں میں یہ سب اسباب لدوا کر راوی میں ڈالا اور وہاں سے ملتان پہنچا۔ اس کے جانے کے بعد شہزادہ اعظم شاہ (اورنگ زیب کا بیٹا) ایک زبردست فوج لے کر لاہور پہنچا۔ مگر خیریت گزری کہ لاہور والوں کو کوئی تکلیف نہ دی گئی۔ اس کے چند ماہ بعد اورنگ زیب بھی لاہور پہنچا اور شالامار باغ کے پہلے تختے میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ ہاتھی پر سوار

ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ قلعہ کی سیر کی اور واپسی پر مسجد وزیر خاں میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باغ میں چلا گیا۔ مہمات پنجاب کا کام شہزادہ معظم اور قلعہ دار اور خلیل اللہ خاں گورنر لاہور کو سپرد کر کے خود شجاع کے استیصال کے لیے واپس چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور میں آیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گزر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔

لاہور میں عہد عالمگیر کی تین یادگاریں ہیں جن میں سے دو تو مٹ گئی ہیں لیکن ایک موجود ہے اور انشاء اللہ تا قیامت موجود رہے گی۔ ان یادگاروں کا تھوڑا تھوڑا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۶۶۳ء میں عالمگیر لاہور میں تھا کہ اس کے قابل اور دانا وزیر فاضل خاں نے ۲۷ ذیقعدہ کو ستر سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ اس نے اپنا عالی شان مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تیار کرا لیا تھا۔

بادشاہ کے حکم سے وہیں دفن کیا گیا۔ بادشاہ اس موقعہ پہ کوئی جشن کرنے کو تھا لیکن وزیر کی وفات پر اس نے وہ جشن ملتوی کر دیا۔ خدا جانے کس قدر عظیم الشان مقبرہ تھا مگر اب معلوم بھی نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا۔

دوسری یادگار ایک بند تھا جو عالمگیر نے ۱۶۶۲ء میں لاہور کو راوی کی دستبرد سے بچانے کے لیے باندھا تھا۔ اس بند کا ذکر لاہور کی اردو انگریزی تاریخوں میں کہیں کہیں نظر سے گزرتا ہے لیکن خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"در عہد حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی چوں
دریائے راوی بجانب شہر رو نہاد۔ و از صدمات آں بہ اکثر عمارات
و باغات آسیب رسید در سنہ چہارم جلوس والا برائے تعمیر
بند مستحکم کہ انہدام عمارات قرا ندید و حکم مقدس ابعدور پیوست
فرماں پذیراں بند بہ درازی شش کروہ بہ استحکام تمام بستند۔ و
بہ محافظت شہر سد عالمگیری بسان سد سکندر و بروئے کار آوردند
و در اکثر جا مانند تالاب زینہ آراستہ لب دریا را بہ مثال لب
خوبان تقریب ساختند۔ و خواتین والا شان نشیمن ہائے دلکشا
و منازل فرح افزا مشرف بر دریا احداث نمودہ زینت افزائے
شہر شدند۔ و از ابتدائے سال چہارم فہابت حال کہ زیادہ
از چہل می گزرد۔ و در ہر سال ترمیم و تعمیر از سرکار بادشاہی میشود
و برائے بندوبست مبلغ کلیہ بہ خرچ می رود۔"

اس روح افزا کیفیت کو ذرا ذہن میں لائیے جب کہ بند عالمگیری مکمل ہو چکا تھا اور اس کے کناروں پر تالاب

کی سبزہ بیلوں کی طرح تھا تے اور سیر و تفریح کے لیے سبزہ خیابان موجود تھیں اور امرائے والا شان نے وہاں خوشنما بنگلے دلفریب مناظر کی سیر کے لیے تعمیر کیے تھے اس زمانہ میں دریا کے کنارے پر کیا کچھ رونق نہ ہوگی! مگر آہ! آج وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں۔

اس بند کے کچھ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں راقم الحروف کے اخبار پنجہ فولاد کا دفتر لنڈا بازار لاہور کے چوگلہ محلہ میں تھا۔ وہاں ایک شخص رہتے تھے اپنا مکان بنانے کے لیے جب بنیادیں کھودیں تو اندر سے ایک طویل پختہ دیوار نکلی جو مسجد شہید گنج کی طرف سے آتی تھی اور علاقہ محلہ "نولکھا" کی طرف جاتی تھی۔ مالک مکان نے اس دیوار میں سے اس قدر اینٹیں نکالیں کہ اسے نئی اینٹیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ مصری شاہ اور چاہ میراں[۱] کے درمیان اب بھی اس بند کے آثار ملتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بند ریلوے سٹیشن اور لنڈا بازار کے درمیان سے چاہ میراں کی طرف جو اس زمانہ میں دریا کے نزدیک تھی، نکل جاتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا مؤلف، اس بند کا طول دو کوس بتاتا ہے۔

عالمگیر کی تعمیری یادگار۔ لاہور کی شاہی مسجد ہے جو لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کا پتھر دراصل دارا شکوہ نے اس غرض سے ہندوستان سے منگوایا تھا کہ چوک دارا شکوہ سے لے کر حضرت میاں میرؒ کے مزار تک ایک پختہ سڑک بنوائے اور حضرت کا روضہ تعمیر کرائے جو صدہا سال تک یادگار رہے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ عالمگیر نے تمام سنگ سرخ ضبط کر کے لاہور میں جامع مسجد تعمیر کرا دی اور خدام میاں میر صاحبؒ کی معرفت حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جو آج تک قائم ہے۔ آج کل دریائے راوی اس مسجد سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں بہتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بادشاہی مسجد اور قلعہ کے بالکل متصل بہتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے:

"اگرچہ در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است اما بر کنارہ
دریا محاذی دولت خانہ والا حضرت عالمگیر بادشاہ مسجدے عالی
از سنگ بنا فرمودہ اند کہ زیادہ از پنج لک روپیہ بر آں صرف
شدہ۔"

عالمگیر کے زمانے میں لاہور کا ایک نامور شاعر ابوالبرکات منیر کے نام سے گزرا ہے۔ عالمگیر کو اشرفی اور روپیہ کے لیے

۱؎ "چاہ میراں" جو عام طور پر "میراں دی کھوئی" کے نام سے مشہور ہے اس علاقہ میں واقع ہے جہاں پہلے دریا بہتا تھا بند عالمگیری کی وجہ سے جب دریا وہاں سے ہٹ گیا تو یہ جگہ خشک ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بن ہو گیا جس میں اکثر درندے رہتے تھے اور "بچا دھے" (جنگلی لوگ) جو لاہور اور مضافات پر ڈاکہ زنی کر کے اسی بن میں چھپ جاتے تھے۔ لہنا سنگھ حاکم لاہور نے سمت ۱۸... بکرمی میں یہاں ایک بستی قائم کی اور اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کی۔ سب سے پہلے ایک میر صاحب نے یہاں ایک کھوئی (چاہ خورد) تعمیر کیا انہی کے نام پر موضع کا نام "میراں دی کھوئی" یعنی چاہ میراں مشہور ہو گیا۔ سکھوں کے زمانہ میں یہاں بہت سے باغات لگائے گئے۔ حضرت شاہ حسین زنجانی کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔

> کس طرح معلوم ہوگا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔ آپ نے کہا جس روز تم بادشاہ کے لشکر میں پہنچو گے۔ اس روز بڑی تیز آندھی آئے گی۔ تمام قناتیں گر پڑیں گی خیمے اکھڑ جائیں گے۔ مشعلیں اور چراغ بجھ جائیں گے لیکن صرف ہمارا ڈیرہ ہوگا جہاں چراغ بجھنے نہ پائے گا۔ چنانچہ جب وہ لوگ چتوڑ واپس پہنچے اور بادشاہ کو آپ کا پیغام سنایا۔ تو معاً سرِشام سخت اندھیری آئی۔ تمام شامیانے اور خیمے گر پڑے۔ ہوا کے زور سے شمعیں گل ہو گئیں۔ آخر تھوڑے سے وقفہ کے بعد بادشاہ ان کی تلاش کو نکلا تو دور سے ایک چراغ نظر آیا۔ بادشاہ پا برہنہ ان کے پاس پہنچا آپ نے فرمایا جاؤ۔ قلعہ انشاء اللہ تعالیٰ کل فتح ہو جائے گا آپ بھی قلعہ کے پاس گئے اور تین بار زبان مبارک سے بہ آواز بلند "اللہ" کہا۔ چنانچہ دوسرے روز قلعہ فتح ہو گیا۔"

اقبال نامہ اکبری میں مہم چتوڑ کے تفصیلی حالات (ص ۱۶۵ تا ۱۶۷ تک) درج ہیں۔ لکھا ہے کہ بادشاہ وسط ربیع الاول ۹۷۴ھ میں چتوڑ کی مہم پر روانہ ہوا۔ پنج شنبہ ۱۹ ربیع الاول ۹۷۵ھ کو اہل قلعہ محاصرہ میں آ گئے۔ اور ۲۵ شعبان کو جے مل کے مارے جانے پر یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ اس وقت اکبر کی عمر پچیس سال کی تھی۔ گویا محاصرہ کی تاریخ سے لے کر فتح کے دن تک اکبر کو اس مہم میں پانچ ماہ اکیس یوم صرف کرنے پڑے۔

لیکن تعجب ہے کہ اقبال نامہ اکبری دربار اکبری اور طبقات اکبری وغیرہ میں کسی جگہ مہم چتوڑ کے سلسلہ اس واقعہ کا ذکر نہیں۔ بہرحال آپ کے تقدس کی وجہ سے یا اس واقعہ کی بدولت اکبر ان کا بڑا احترام کرتا تھا چتوڑ سے واپس آ کر آپ لاہور میں مقیم ہو گئے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ اکبر نے آپ کو نو لاکھ روپیہ کا علاقہ بٹالہ وغیرہ مقامات میں دیا تھا۔ صاحب تحقیقات یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی اولاد کے پاس فرمان عطائے جاگیر مہری و دستخطی اکبر بادشاہ موجود ہے۔ حدیقۃ الاولیاء اور تاریخ لاہور میں جاگیر کی رقم ایک لاکھ روپیہ درج ہے۔ بہرحال رقم نو لاکھ تھی یا ایک لاکھ۔ آپ نے اپنی عالیشان حویلی تعمیر کرائی۔ لنگر خانہ ایک بٹالہ میں، ایک بمقام خان فتا[1]، ایک پسیا نوالہ اور ایک خاص لاہور میں جاری کیا۔ لاہور میں آپ کا لنگر خانہ آپ کے مزار کے متصل ہی تھا۔ اور آپ کے مکانات بھی اسی نواح میں تھے لیکن اب کسی کا وجود نظر نہیں آتا۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ بٹالہ میں بھنڈاری اور مودی آپ کے لنگر خانہ کے مہتمم تھے۔ اب تک ان کی اولاد انہی ناموں سے مشہور ہے۔

آپ کا مقبرہ آپ کی زندگی ہی میں ایک بلند ٹیلہ پر اکبر بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اور آخر آپ اکبر بادشاہ کی وفات سے ایک سال پیشتر ۱۷ ربیع الاول ۱۰۱۲ھ کو بحکم "کل نفس ذائقۃ الموت" انتقال فرما گئے۔ آپ وفات کے وقت موضع خان فتا میں تھے جو بٹالہ سے تین کوس کے فاصلہ پر آپ کی جاگیر میں تھا۔ جس مقام پر آپ کو غسل دیا گیا عقیدتمندوں نے وہاں بھی ایک قبر بنا دی جو آج تک موجود ہے۔ آپ کے فرزند کلاں سید صفی الدین آپ کی نعش لاہور لے آئے۔ اور روضہ عالیہ میں جو بادشاہ کے حکم

---

[1] خان فتا اور پسیا نوالہ دونوں آپ کی جاگیر میں تھے اور بٹالہ کے قرب و جوار میں تھے۔

سے پہلے ہی سنہ [illegible]ھ میں تیار ہو چکا تھا دفن کئے گئے۔

آپ کے روضہ کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے۔ جو اندر کی طرف سے سیاہ پتھر کی لکیروں سے اب بھی پرانی نقاشی و صنعت کا ثبوت دے رہا ہے۔ شمال کی جانب چراغ دان کے اوپر دیوار میں جالی ہے اس کے علاوہ اور بھی روشن دان ہیں۔ روضہ کے اندر گیارہ قبریں ہیں جو آپ کے فرزندوں اور عزیزوں کی ہیں۔

اس کے متصل ان کی عالیشان حویلیاں تھیں۔ وسیع لنگر خانہ تھا اور درویشوں اور مسافروں کے رہنے کے لیے قیام گاہیں موجود تھیں لیکن اب یہ وہی عالیشان درگاہ ہے جو چاروں طرف سے پراپرٹی بھارت بلڈنگ (سابق نام کپورتھلہ ہاوس[1]) اور مہاراجہ پراپرٹی ڈیلنگ اور ایک بڑے چوڑے ورکشاپ کے شکنجہ میں آئی ہوئی ہے۔ اور جس کو اس سڑک پر سے جو فتح چند گرلز کالج (سابق نام کوٹھی سرشادی لال) کو جاتی ہے ایک تنگ سی گلی میں سے رستہ نکلتا ہے۔ یہ روضہ دور سے نظر آتا تھا لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے جدید عمارات نے اس کو پس پردہ کر دیا۔ رائے بہادر کنہیا لال اپنی تاریخ لاہور (۱۸۸۴ء) میں اس روضہ کے اپنے مکانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس مقبرہ کی چار دیواری کے متعلق بہت سی عمارات ہیں چنانچہ مسجد پختہ و مکان سکونت خادمان خانقاہ و چاہ وغیرہ سب پختہ عمارت کے موجود ہیں۔ لیکن آج ساٹھ سال کے بعد کیا حال ہے ؎

دل برباد میں اڑتی ہے اب خاک
یہ بستی غیرتِ جنت کبھی تھی

روضہ کے باہر مگر چار دیواری کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف قریباً بیس بائیس قدیم قبریں ایک بلند چبوترہ پر نظر آتی ہیں۔ اس چبوترہ کے اندر مسجد کے متصل ایک اور چبوترہ ہے ایک قبر اس پر بھی ہے[2]۔ بائیں طرف تین پرانی قبروں سے آگے ون کے ایک درخت کے نیچے روضہ کی سیڑھیوں کے متصل تین نئی قبریں ہیں۔ ان پر الفاظ ذیل درج ہیں۔

"سید انصار علی شاہ (وفات ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء) - ان کے والد سید حسین علی شاہ ولد سید محمد شاہ سجادہ نشین موج دریا (وفات ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء) زوجہ سید حسین علی شاہ (وفات ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ء)۔ یہ تینوں قبریں حضرت موج دریا کی ذریات ہی سے تعلق رکھتی ہیں"

روضہ بھی ایک چبوترہ پر ہے جس کے اندر اور باہر پختہ فرش ہے۔ دروازہ کی پیشانی پر زرد حروف میں ایک پتھر پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے جو اب تک صاف پڑھی جاتی ہے:-

"روضہ مقدس زبدۃ الواصلین قدوۃ العارفین مقبول بارگاہ باری میراں سید محمد شاہ موج دریا بخاری نور اللہ مرقدہ۔ در عہد اکبر بادشاہ تعمیر یافت"

---

[1] اسی باغ اور عمارت کا نام گڑی باغ تھا۔ جس میں آج کل انکم ٹیکس کا دفتر واقع ہے۔ (مرتب)

[2] تاریخ لاہور میں ص ۲۸۲ پر لکھا ہے کہ یہ قبر جو مقبرہ کی حدود سے باہر ہے سید زندہ علی بن سید عبدالرحیم بن صفی الدین بن میراں محمد شاہ موج دریا کی ہے۔ زندہ علی بھی بڑے خدا پرست بزرگ تھے۔

تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ روضہ کے ہر ایک پہلو پر اشعار لکھے ہوئے ہیں لیکن اب کوئی شعر نظر نہیں آتا۔ ان کے ایک فرزندان کی دوسری (غیر سید) بی بی سے شہاب الدین نہرابی تھے جن کا مزار موضع بھوگی وال کے متصل ہے وہ بھی صاحب کرامات بیان کیے جاتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سالانہ نذر و پیشکش کے علاوہ اس خانقاہ کے اخراجات کے لیے چالیس روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔ کہاں ایک لاکھ کی جاگیر کہاں چالیس روپے ماہوار اور کہاں آج کا زمانہ نہ لاکھ نہ چالیس۔ ان کی اولاد کا کچھ حصہ بٹالہ میں ہے اور کچھ لاہور میں۔

مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو عرس کی رسم کو قطعاً ناجائز سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی یادگار منانے ہی کے خلاف ہے لیکن ایک طبقہ بھی ہے جس کی اکثریت ہے اور جو عرس کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ چاہتا ہے کہ بزرگان سلف کی یادگار قائم رہے اور ان کے حالات جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دینی و دنیوی فوائد کے لیے ہوں بیان کیے جائیں۔ عرس کے ایام میں اگر ان باتوں کی بجائے ڈھول ڈھمکہ۔ ناچ۔ مجرا۔ ہاؤ ہو۔ اور کھیل تماشہ ہو تو یقیناً سب مسلمان اس کے انسداد کے لیے متفق ہیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی ہے کہ بزرگوں کے عرسوں میں زیادہ تر انہی باتوں اور انہی مشاغل کی وجہ سے رونق ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت موج دریا بخاری کے عرس پر بھی جو ہر سال ۱۷ ربیع الثانی کو ہوتا ہے یہی شغل ہوا کرتا تھا جیسا کہ صاحب تحقیقات چشتی (ص ۴۷۶ پر) لکھتے ہیں "رات کو چراغاں اور بھنڈارہ اور صبح کو مجلس طوائفاں اور سرود قوالاں ہوتا ہے اور تماشائی کثرت سے شب باش ہوتے ہیں"

۱۶ - ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۰ - ۱۱ اپریل ۱۹۴۴ء کو بھی آپ کا عرس دھوم دھام سے ہوا۔ ۱۰ اپریل کو نماز مغرب کے بعد درگاہ کو غسل کرایا گیا۔ نعت خوانی ہوئی۔ میلاد شریف بھی ہوا۔ ۱۱ اپریل کو مجلس سماع یعنی قوالی نے سماں باندھا اور لنگر تقسیم ہوا۔ طوائفان لاہور کا ناچ اس سبب سے نہ ہو سکا کہ پنجاب میں مزاروں اور خانقاہوں پر طوائفوں کے ناچ مجرے کی قانوناً قطعاً ممانعت ہو چکی ہے۔ صاحب مزار یعنی حضرت موج دریا کی زندگی ان کے علم و فضل اور ان کی فیاضی و مسافر نوازی کے متعلق کوئی شخص بھی ایک کلمہ تک نہ کہہ سکا۔ اُس بزرگ کی روح جس کے وجود سے سینکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں کو دینی و دنیوی فوائد پہنچے اپنے مزار پر یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر کیا کڑھتی ہوگی۔

ع مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

خان اعظم

خان اعظم میرزا کوکہ کے اُجڑے باغ میں
دفتر ہستی کے اوراق پریشاں دیکھیے

شمس الدین محمد اتگہ خان غزنی کا رہنے والا تھا۔ پہلے میرزا کامران کے پاس رہا پھر قنوج کی لڑائی میں جو شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان ہوئی موجود تھا۔ ہمایوں شکست کھا کر دریا سے پار جا رہا تھا اور کنارہ چونکہ بلند تھا اس لیے باہر نکلنے کے لیے پریشان تھا۔ شمس الدین ساحل پر کھڑا تھا۔ اس نے بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا بادشاہ نے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام و پتہ بتایا۔ قسمت نے

یا مدد کی۔ بادشاہ گو پریشان حال تھا لیکن اس نے اس کی بیوی کو اکبر کی اتا (دایہ) بنا کر بی بی انگہ کا خطاب دیا۔

ہمایوں جب ایران سے واپس آیا تو اس نے اکبر کو حصار کی جاگیر اور شمس الدین کو انگہ خاں کا خطاب دے کر اس کے ہمراہ کیا۔ رفتہ رفتہ اس کو پنجاب کی حکومت ملی۔ جب اس نے جالندھر کے قریب بیرم خان کو شکست دی تو اس کو اعظم خاں کا خطاب ملا۔ یوسف محمد خاں کوکلتاش اور میرزا عزیز کوکہ اس کے دو فرزند تھے۔ میرزا عزیز جس کو باپ کے بعد خان اعظم کا خطاب ملا۔ اکبر کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ کھیلا تھا۔ اکبر اس کی ماں بی بی بیگم کی اپنی حقیقی ماں سے بھی زیادہ عزت کرتا تھا اسی وجہ سے میرزا ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ گستاخیاں کرتا اور وہ ان گستاخیوں کے جواب میں یہی کہتا "میانِ من و خان اعظم دریائے شیر حائل است" میرے اور خان اعظم عزیز کے درمیان ایک جوئے شیر بہتی ہے جس کو میں عبور نہیں کر سکتا۔

اکبر کی مذہبی ایجادوں بلکہ بدعتوں کا وہ ہمیشہ مخالف رہا۔ بادشاہ نے سنہ ۳۹ جلوس میں ایک دفعہ اصرار کے ساتھ بلایا تو جواب میں لکھا "عثمان و علی کی جگہ حضور نے فیضی و ابوالفضل کو مقرر کر رکھا ہے۔ باقیوں کے لیے کیا انتظام کیا ہے۔" یہ لکھ کر خود جہاز میں سوار ہو کر حجاز چلا گیا۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے تاریخ کہی ہے

بجائے ما شناس شہ خان اعظم — دلے در زعم شاہنشاہ کج رفت

چو پرسیدم بہ دل تاریخ ایں سال — بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

میرزا نے حرمین میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپے مستحقین کو دیئے۔ سنہ ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں جب واپس آیا تو بادشاہ نے صوبہ بہار عنایت کیا۔ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں جب جی جی بیگم اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے خود اس کے تابوت کو کندھا دیا اور اظہار ماتم کے طور پر ہندوؤں کی طرح بھدرا کرایا۔ سر اور مونچھوں کے بال منڈائے اور اس کی تقلید میں جی جی انگہ کے فرزندوں کے علاوہ اور بہت سے اُمرا نے داڑھیاں مونچھیں اور سر کے بال منڈائے۔

شاہزادہ سلیم کا فرزند کلاں سلطان خسرو جو راجہ مان سنگھ کی بہن کا بیٹا تھا اس کا داماد تھا۔ دوسرا داماد شاہزادہ مراد اکبر کا بیٹا تھا جو ۳ محرم ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء کو پیدا ہو کر ۲۸-۲۹ سال کی عمر میں ۱۰۰۷ھ یا ۱۰۰۸ھ کو دکن میں انتقال کر گیا۔ جہانگیر کبھی اس کی گستاخیوں کی وجہ سے اس پر ناراض ہوتا اور نظر بند کر دیتا اور کبھی باپ کی عنایات قدیم کا لحاظ کر کے اس کو رہا کرتا اور پھر اس کا منصب بحال کر دیتا۔ جہانگیر کے جلوس ۸ سنہ میں جب داور بخش فرزند خسرو کو گجرات کی صوبے داری ملی تو میرزا عزیز کوکہ خان اعظم اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور وہیں احمد آباد میں ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء میں انتقال کر گیا۔

اکبر ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور میں رہا۔ چودہ پندرہ سال کے عرصہ میں اس نے لاہور کا ستارہ عروج و اقبال کے کمال تک پہنچا دیا۔ قلعہ کی شاہی عمارتوں کے علاوہ اس کے امرا و وزرا نے کئی عالیشان محل اور باغ لاہور میں تعمیر کرائے۔ انہی میں خان اعظم کا مکان در باغ بھی تھا۔ مکان تو اب عدم پتہ ہونے کی وجہ سے لامکان ہے۔ دارا شکوہ البتہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ یہ باغ شیخ جوہر کے باغ اور مقبرہ کے متصل ہے۔ اب نہ شیخ جوہر کا مقبرہ کہیں نظر آتا ہے نہ اُس کا باغ۔

سکینۃ الاولیا میں لکھا ہے خان اعظم کے باغ میں شاہزادہ مراد مرحوم کا جو عالیشان محل ہے وہاں حضرت میاں میر کبھی کبھی دن کے وقت یادِ حق کیا کرتے تھے۔ چونکہ شاہزادہ مراد خان اعظم کا داماد تھا۔ اس لیے اُس نے اِسی کے باغ میں محل تعمیر کرالیا ہوگا

یا خان اعظم کے محل ہی میں رہتا ہوگا۔

خان اعظم کس پایہ کا امیر تھا؟ اکبر اور جہانگیر اس کی گستاخیوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور رہتے۔ بہت سی مہمات میں شامل رہا۔ دو شاہزادے اس کے داماد تھے۔ ایک کا اتالیق بنا پھر اس کے محل اور باغ کی زیب و زینت کو نگاہ میں لاؤ کس لاگت کثیر سے یہ بنے ہوں گے۔ آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ؎

نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا — فقط ایک نام کوئی رہے گا

قلیچ خاں اندجانی

ایک باغ اندجاں پر ہی نہیں جور فلک
بستیاں آباد جو تھیں آج ویراں دیکھئے

قلیچ خاں اندجان کا رہنے والا تھا۔ آگرہ میں آکر امرائے اکبری میں داخل ہوا۔ مختلف خدمات کے بعد جاگیرات اور مناصب حاصل کیے۔ جب اکبر نے راجہ بھگوان داس اور راجہ ٹوڈرمل کو کشمیر کے انتظام کے لیے آگرہ سے روانہ کیا تو قلیچ خان کو بھی ان کے ساتھ کشمیر جانے کا حکم ہوا لیکن لاہور پہنچا تھا کہ بادشاہ کے دوسرے حکم کے مطابق بعض مہمات ملکی کی انجام دہی کے لیے اُسے لاہور ہی میں قیام کرنا پڑا۔

۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں شاہزادہ دانیال کو جب الہ آباد کی صوبے داری ملی تو قلیچ خاں (کہ شاہزادہ کا خسر بھی تھا) اکبر کے حکم سے اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ سال جلوس چہل و ششم (۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء) میں بادشاہ نے اُس کو لاہور کی حکومت (صوبیداری) عطا کی۔

جہانگیر کے زمانہ (۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء سال دوم جلوس) میں وہ پھر پنجاب آیا جہاں چھٹے سال جلوس تک وہ داد حکمرانی دیتا رہا۔

قلیچ خان کے متعلق مآثر الامرا جلد سوم میں لکھا ہے کہ صاحب صلاح و تقویٰ تھا اپنے مذہب (تسنن) میں بڑا سخت بلکہ متعصب تھا۔ پنجاب کا گورنر ہونے کے باوجود طالبان علوم کو درس دیتا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک مدرسہ دینیہ بھی جاری کر رکھا تھا جہاں فقہ اور تفسیر و حدیث کی تعلیم ہوتی تھی اُس کی کوشش سے پنجاب کے مختلف اقطاع میں علوم شرعیہ کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔ وہ شاعر بھی تھا۔ الفتیٰ اُس کا تخلص تھا۔ یہ رباعی اس سے یادگار ہے۔

عاشق ہوس وصال در سر دارد — صوفی ز رتقے خرقہ در بر دارد
من بندۂ آں کسم کہ فارغ ز ہمہ — دایم دل گرم دیدۂ تر دارد

قلیچ خان کے بیٹوں میں میرزا سیف اللہ اور میرزا چین قلیچ نہایت بلند مرتبہ اور نامی رئیس گزرے ہیں۔

نواب قلیچ خان ناظم لاہور کی مدح میں طالبا شاعر نے ایک رات میں چوراسی بیت کا قصیدہ لکھا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی روانیٔ طبع پر ناز کرتا ہوا لکھتا ہے ؎

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہل سخن — منم کہ نیست چو من قابلے ز اہل کلام
گواہ ایں دو سہ معنی ہمیں قصیدہ بس است — کہ یافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

پڑھو اور غور کرو۔ کہ ایسے جلیل القدر امیر اور حاکم ملک نے کس شان و شکوہ سے اپنے باغ کی تعمیر میں کس شوق و دلبستگی کا اظہار کیا ہوگا اور وہ باغ کس اعلیٰ پیمانہ پر ہوگا؟

لیکن آج حالت یہ ہے کہ لاہور کے لوگ باغ تو کجا اس کے بانی کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔ اور بانی بھی وہ جو برسوں تک ان کا جلیل القدر حاکم رہا ہے۔ داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں صرف اتنا بتایا ہے کہ میرزا کامران نے اپنے باغ کے سینے جو نہر بنائی ہے قلیج خاں اندجانی کا باغ اُس کے جنوب میں واقع ہے۔ اُس باغ کے اندر جو عمارت ہے اور جو آج کل خستہ حالت میں ہے حضرت میاں میر ودن کو کبھی کبھی یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔

جہانگیر کے زمانہ میں گو اس کے فرزند اعلیٰ مراتب پر متاز تھے لیکن داراشکوہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ قلیج خاں کی وفات سے پچیس سال کے اندر ہی اس کے باغ اور اس کی اندرونی عمارات کی حالت خستہ ہو گئی تھی۔ اور اگر وہ اسی طرح کسمپرسی کی حالت میں رہا ہوگا تو دورِ عالمگیری تک وہ خاک میں مل چکا ہوگا۔

راجُو باغ

کیجئے اندازۂ ویرانیٔ گلزار راج
جب کہیں گلزار کوئی گل بداماں دیکھئے

جہانگیر سفر پنجاب ۱۰۱۴ھ کے واقعات کا ذکر کرتا ہوا تزک میں لکھتا ہے۔

"خسرو (اس کا باغی فرزند) جب لاہور میں تھا۔ تو راجو اور رابتہ نے شہر میں بہت
لوٹ مچائی تھی۔ راجو کو میں نے سُولی پر چڑھایا اور رابتہ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار
روپیہ جرمانہ وصول کر کے شہر کے غربا اور ستم زدہ لوگوں میں تقسیم کیا۔"

جہانگیر کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجو نے جس کا نام شاید راج محمد ہو۔ یہ باغ اکبر کے عہد میں تعمیر کیا تھا اور یہ دونوں شخص جو لاہور کے امراء میں تھے، خسرو کے طرف دار تھے۔ راجو سادات بارہ میں سے تھا۔ اکبر کے عہد میں ہزار یانصدی کا منصب دار تھا۔

داراشکوہ سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے راجو کا باغ دولت آباد اور اچھرہ کے متصل ہے۔ اچھرہ تو موجود ہے جس کو لاہور قدیم بھی کہتے ہیں دولت آباد کا پتہ نہیں۔ شاید دولت خاں لودھی ناظم لاہور کے نام پر کوئی محلہ یا کوئی گاؤں لودھیوں کی حکومت کے زمانہ میں آباد ہوا ہو۔

ملک علی کوتوال

؎ حسرتِ کُشتہ کا نظارہ اگر منظور ہو کوتوالِ اکبری کا باغ ویراں دیکھئے

اکبر کے زمانہ میں ملک علی کے نام سے لاہور کا ایک زبردست کوتوال گذرا ہے۔ داراشکوہ نے اس کے باغ کا ذکر کیا ہے

لیکن اس کا جائے وقوع نہیں بتایا نہ آج کوئی اس کا اور اس کے باغ کا نام جانتا ہے۔

تحقیقات چشتی نے ملک علی کو توال کا کچھ ذکر کیا ہے۔ خطۂ میانی کے گورکن کسی اور طریقہ سے بیان کرتے ہیں اور مصنف حقیقت الفقرا[1] سید پیر محمد کسی اور طرح بیان کرتا ہے۔ لیکن سب نے یہی لکھا ہے کہ وہ مادھو لال حسین کے زمانہ میں لاہور کے کوتوال تھے انھوں نے مادھو لال حسین (جن کا اصلی نام شیخ حسین تھا) کے ساتھ کچھ سختی کی تھی۔ اور انہی کی بددعا نے ان کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آخر اکبر کے حکم سے ملک علی کوتوال قتل کیا گیا مگر جس طریقہ سے وہ قتل کیا گیا۔ ناقابل تسلیم ہے اور غالباً اسی لیے رائے کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

ملک علی کوتوال اور اس کی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی قبریں خطۂ میانی صاحب میں موجود ہیں۔ ان کی قبروں کے ساتھ دو مسجدیں بھی ہیں ایک زنانہ قبور کے ساتھ ایک مردانہ کے ساتھ۔

باغ ویران اور ناپید ہے۔ مقبرہ موجود مگر کسمپرسی کی حالت میں۔

میرزا مومن

باغ مومن۔ بادشاہوں کا رہا جس میں قیام

اب وہی نابود برباد اور ویران دیکھئے

دارا شکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر باغ مومن میں بھی کبھی کبھی اپنے یاروں کے ہمراہ دن کا کچھ حصہ گزارا کرتے تھے۔ خان بہادر سید محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور میں تزک جہانگیری کے حوالہ سے مومن کو میرزا مومن عشق باز لکھا ہے۔

اکبر کے زمانہ میں چند عشق باز گذرے ہیں جن کا ذکر اقبال نامہ اکبری میں درج ہے۔ میرزا مومن کا نام ان میں نظر سے نہیں گذرا۔ بہرحال جہانگیر نے تزک میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سکندر خان ہراول کی جاگیر اس کے مرنے کے بعد اندخانی کو دی گئی۔ جاگیر کے پاس ہی ایک شاندار شکارگاہ بنوائی گئی۔ جو بادشاہوں کے شایان شان تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے۔

"ہم یہاں ہر جمعہ اور ہفتہ کو دو دن قیام کرتے اور مختلف شکاروں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں قاسم خاں لاہور کا گورنر تھا اور وہ پچاس سنہری اشرفی نذر دیا کرتا تھا۔
ایک تختہ گھاس کے فاصلہ پر برلب دریائے راوی مومن عشق باز کا باغ ہے اس باغ میں قسم قسم کے عمدہ عمدہ پودے اور طویل اور دلکش سرو کے درخت ہیں جو آم کے پودوں سے جو ابھی بار آور نہیں ہیں گھیرے ہوئے ہیں۔"

اس خوبصورت باغ میں بادشاہ نے اپنے شاہی خیمے لگا دیئے۔ چند روز کے قیام کے بعد محرم ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں اندر نامی ہاتھی

---

[1] سال تصنیف ۱۱۱۰ھ فارسی نظم! اس کتاب میں حضرت مادھو لال حسین اور ان کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی کی نظر سے یہ کتاب گذر چکی ہے۔ اب ناپید ہے۔

بر دار ہو کر بادشاہ نے باغ مومن کو الوداع کہا اور بطور تصدق ہاتھی پر سے دولت بکھیرتے ہوئے طلوع آفتاب سے دو گھنٹے کے بعد شہر (لاہور) میں داخل ہوئے۔

بادشاہ کی عظیم الشان شکارگاہ شیخو پورہ کے متصل دریائے پار تھی۔ اس شکارگاہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مومن کا باغ جس کی تعریف میں بادشاہ خود رطب اللسان ہے شاہدرہ اور شکارگاہ کے درمیان ہی تھا۔

آج اس باغ کا کوئی نام بھی نہیں جانتا نہ اس کا کوئی نشان باقی ہے۔

زین خاں کوکلتاش

زین خاں بھی مٹ گیا اور زین خاں کا باغ بھی
جس سے تھی لاہور کی زینت وہ ویراں ہو گئے

زین خاں کی ماں پیچہ جان اکبر کی ایک انگہ تھی اس کے باپ کا نام خواجہ مقصود علی ہروی تھا جو صدق و دیانت کے ساتھ متصف تھا۔ وہ مریم مکانی (اکبر کی والدہ) کے معتبر و متدین ملازموں میں تھا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) خواجہ مقصود علی کے بھائی خواجہ حسن ہروی کا داماد تھا۔ سلطان پرویز اسی بیگم کے بطن سے ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں پیدا ہوا تھا۔

زین خان کوکہ کو اکبر نے سال ۳۱ جلوس کے آغاز میں پنج ہزاری منصب عطا کر کے کابل کی حکومت سپرد کی۔ مہمات یوسف زئی اور سوات و باجوڑ میں اس نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ جلالہ روشنائی (کابل) اور زابلستانی شورش کو فرو کرنے کے بعد اس کو لاہور کی حکومت پر تعینات کیا گیا۔

بادشاہ کے اکتالیسویں سال جلوس میں شاہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر) جو زین خان کے چچا خواجہ حسن کا داماد تھا۔ زین خان کی بیٹی پر جو خوبصورتی میں شہرہ وافر رکھتی تھی عاشق ہو گیا۔ یہاں تک کہ صبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اکبر نے پہلے تو اس کو براہ راست منع کیا پھر اوروں کے ذریعہ سمجھایا لیکن یہ مرض بڑھتا ہی گیا۔ آخر بادشاہ نے مجبور ہو کر سنہ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں جشن ازدواج مقرر کیا۔ زین خاں کی ایک بیٹی میرزا انور خلف خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش کے بیٹے سے بیاہی گئی جو عہدِ جہانگیری میں دو ہزار کا منصب دار تھا۔

زین خاں کو راگ کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کئی ساز خود ایجاد کئے۔ شاعر بھی تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

آراستم نمی دہد ایں چرخ کج خرام
تار رشتہ مراد بہ سوزن نمی آورم

اس نے ایک مرتبہ لاہور میں اپنے مکان پر بادشاہ کی دعوت کی وہ برسوں تک لاہور میں کیا سارے ہندوستان میں یادگار رہی۔ اس نے حوض کی شالوں کا جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھیں چھبیس گز طول و عرض کا ایک چبوترہ بنایا تین حوض بنائے ایک کو گلاب سے بھرا ایک کو زعفران کے رنگ سے ایک کو ارگجہ کے عرق سے ایک ہزار طوائف کو مدعو کیا اور ان سب کو ان حوضوں میں نہلایا۔ شیر و شکر کی ندیاں بہا دیں۔ حویلی کے وسیع صحن میں پانی کی بجائے گلاب کا چھڑکاؤ کرایا۔ پیش کش میں جواہر و مرصع

آلات اور ہاتھی دیئے۔ اس زمانہ میں قلیچ خاں گھوڑوں کی کثرت، سعید خاں خوبصورت خواجہ سراؤں کی افراط اور زین خاں ہتھنیوں کی بھنات کے لیے مشہور تھے۔

لاہور میں اس نے عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔ اس کے اصطبل میں گھوڑوں اور ہاتھیوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی حویلیاں اور املاک موچی دروازہ کے باہر جنوب کی طرف جہاں آج حضرت شاہ ابوالمعالی کا مزار اور قلعہ گوجر سنگھ کا جنوبی حصہ آباد ہے تھیں۔ اکبر کے زمانہ میں اس محلہ کا نام محلہ زین خاں تھا۔ زین خان نے اس علاقہ میں ایک باغ بھی تعمیر کرایا تھا جس میں ساون بھادوں کا نظارہ قابل دید تھا۔ چونکہ شاہجہان نے شالامار باغ اس کے کئی سال کے بعد لاہور میں تعمیر کرایا اس لیے گمان غالب ہے کہ باغ زین خاں کے ساون بھادوں کی نقل شالامار باغ کے ساون بھادوں میں کی گئی ہے۔ فوارے اور روشیں اور عمارتیں باغ کی رونق و زینت کا باعث تھیں۔ ساون بھادوں سے شمال اور مغرب کی طرف ایک منزل کی اونچائی پر فواروں کا فیضان عام جاری تھا۔ اس باغ میں کئی چبوترے کئی دالان اور کئی قالبوتی بنانے منقش و مزین تھے۔ باغ کی چار دیواری کے دروازے کے متعلق مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں "ایک شخص چوہدری رکن محمد سے بیان کرتا ہے کہ وہ دروازہ میں نے دیکھا ہے" پچیس تیس سال سے مسمار ہو گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ دروازہ آج (۱۹۶۲ء) سے قریباً سوا سو سال پیشتر موجود تھا۔

باغ کی آبیاری اور ساون بھادوں اور ان کے تالاب کی رونق کے لیے بڑے بڑے کنوئیں موجود تھے۔

کئی لوگ احمد شاہ ابدالی اور اس کے بعد کی بدامنی کے ایام میں فصیل شہر کے اندر جا کر آباد ہو گئے تھے لیکن اس پر بھی محلہ خوب آباد تھا۔ سب سے پہلے اس پر جے سنگھ کاہنیہ[1] نے دست تعدی دراز کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ (۱۷۶۴ء تا ۱۷۷۴ء یا مابعد) میں زین خاں کا پوتا نورالدین خاں موجود تھا۔ ہر چند وہ نادر شاہی حملوں اور احمد شاہ ابدالی کی متواتر یورشوں اور سکھوں کی شورشوں میں بہت کچھ لٹ چکا تھا تاہم وہ زین خان کا پوتا تھا اس کی ساکھ ابھی قائم تھی۔ اس نے جے سنگھ کنہیا کو دس ہزار روپیہ نقد جرمانہ دے کر اپنے محلہ والوں کو اس کے ظلم سے بچایا اور یہ تحریر لکھوائی کہ آئندہ کوئی سکھ اس محلہ پر دست درازی نہ کر سکے گا۔ لیکن منہ کو لہو لگ چکا تھا اور اس زر جرمانہ کی شہرت ہو چکی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بھنگی مثل کے سردار جگت سنگھ نے اس محلہ پر دھاوا بول دیا۔ نورالدین خاں نے جے سنگھ کھنیہ کی سند دکھائی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر محلہ والوں نے بھی ہاتھ پاؤں ہلائے باقاعدہ جنگ ہوئی۔ لیکن پیش نہ گئی لوگ مکانات خالی کر کے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگ شہر میں آ گئے۔ کئی باہر دیہات میں چلے گئے۔ محلہ اجاڑ اور برباد ہو گیا۔ بعد میں لوگ لاوارث سمجھ کر اینٹوں تک اکھاڑ کر لے گئے۔

اس بربادی کی وجہ سے محلہ زین خاں کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ابتدائی حکومت میں بلکہ اس سے قبل ہی میدان زین خاں مشہور ہو گیا۔ مہاراجہ کے زمانہ میں حویلی زین خان کی کچھ دیواریں۔ پختہ حمام اور زنانہ خانہ موجود تھا۔ مگر اسی کے زمانہ میں یہ بھی نیست و نابود ہو گئے۔

---

[1] سکھوں کی بارہ مثلوں میں یہ ساتویں تھی۔ جے سنگھ اس مثل کا بانی تھا چونکہ وہ موضع کاہنا متصل لاہور کا رہنے والا تھا اس لیے یہ مثل کاہنیہ یا کھنیہ کے نام پر مشہور ہوئی باہمی تقسیم کے بعد اس کو امرتسر اور پہاڑوں کا درمیانی قطعہ لوٹ مار کے لیے ملا۔

زین خاں کے پوتے نورالدین خاں کے باپ کا نام مصنف تحقیقات چشتی نے نہیں لکھا۔ نہ نورالدین خاں کا انجام بتایا ہے۔ البتہ زین خاں کے بڑے بھائی سیف خاں کوکہ کے متعلق اقبال نامہ اکبری میں درج ہے کہ وہ چار ہزاری منصب پر سرفراز تھا۔ احمد آباد کی لڑائی میں بادشاہ پر جان نثار کر گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شیر افگن خاں و امان اللہ خاں بادشاہ نے دونوں کو اعلیٰ منصب دیئے۔

زین خاں کار فرما بھی تھا۔ کارکن بھی تھا مگر شراب کثرت سے پیتا تھا۔ ۱۰۱۰ھ میں آگرہ میں تھا کہ پیمانۂ زندگی دہیں لبریز ہو گیا۔

جب زین خاں کا باغ اور اس کے مکانات تباہ و منہدم ہو کر میدان زین خاں بن گئے۔ تو اس وسیع میدان میں لوگوں نے کاشت کاری بھی شروع کر دی چنانچہ ۱۸۵۸ء تک بھی (بزمانہ رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور) اس میں کچھ زمین مزروعہ تھی اور کچھ زمین پر قبریں بننا شروع ہو گئی تھیں۔

شاہ بلاول

رنگ لائی داغہائے اشک پر خوں کی بہار
کھنچ گئی دامن پہ تصویر گلستاں دیکھئے

شاہ بلاول قادریہ سلسلہ کے ایک بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام سید عثمان اور دادا کا نام سید عیسیٰ تھا۔ سید عیسیٰ ہمایوں بادشاہ کے ساتھ ہرات سے ہندوستان آئے۔ بادشاہ نے وہ علاقہ جاگیر میں دیا جہاں آج قلعہ شیخوپورہ معہ ملحقات آباد ہے۔ شاہ بلاول یہیں پیدا ہوئے اور اکبر کے زمانہ میں لاہور آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے مولوی ابوالفتح[1] سے علوم ظاہری اور شیخ شمس الدین قادری[2] (وفات ۱۰۲۱ھ) سے علوم باطنی حاصل کئے۔ بعمر ستر سال ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء[3] میں بعہد شاہجہان انتقال کر گئے۔ موضع بھوگیوال کے متصل دریا کے کنارے دفن ہوئے۔ عالیشان گنبد ان کے مزار پر بنایا گیا۔ باغ بھی مزار کے ساتھ ہی تعمیر ہوا۔

مہاراجہ رنجیت کے عہد میں دریا نے رُخ بدل کر مقبرہ کی ایک دیوار گرا دی۔ مہاراجہ کے حکم سے فقیر نورالدین نے ان کی لاش جو صندوق میں تھی قبر سے نکلوا کر راجہ دینا ناتھ کے باغ کے متصل دفن کرا دی۔ لکھا ہے کہ جس دن ان کا تابوت قبر سے نکالا گیا۔ ہزار ہا مسلمان زیارت کو گئے۔ دو سو سال کے بعد بھی نعش بدستور ویسی کی ویسی تھی۔ دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی[4]۔

---

[1] صاحب خزینۃ الاصفیا نے جلد اول میں صفحہ ۱۶۱ پر مولوی ابوالفتح کا نام مولوی فتح محمد لکھا ہے۔

[2] مرید حضرت شاہ ابواسحاق جن کا مزار مزنگ میں مرجع خلائق ہے۔ [3] وقت عشا شب دوشنبہ ۲۸ شعبان

[4] صاحب خزینۃ الاصفیا نے جلد اول کے صفحہ ۱۶۳ میں ان کی قبر کے متعلق یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ان کا مقبرہ زمانہ سابق میں دریائے راوی کے کنارے تھا جب ۱۲۵۰ھ میں دریا کا رُخ مقبرہ کی طرف ہو گیا تو مزار کے انہدام کے خوف سے صندوق نعش کا نکال کر دوسری جگہ دفن کیا۔ اور اب ان کا مزار پُر انوار بیرون دہلی دروازہ واقع ہے لیکن دہلی دروازہ کے باہر نزدیک تر شاہ بلاول کا کوئی مزار نہیں ہے۔ راجہ دینا ناتھ کا باغ بھی چونکہ دہلی دروازہ کے باہر ہی کافی فاصلہ پر ہے اور شاہ بلاول کا مزار جدید بھی چونکہ دینا ناتھ کے متصل ہی ہے۔ غالباً اس لحاظ سے اس کو بیرون دہلی دروازہ لکھا ہوگا۔

یہ وہی باغ ہے جہاں ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ شیر سنگھ اور اُس کا بارہ سالہ خوبصورت فرزند (پرتاب سنگھ) بے رحم سندھانوالیوں کے خونیں ہاتھوں سے تہ تیغ ہوئے۔

شاہ بلاول کے دوبارہ دفن کئے جانے کے تقریباً نصف صدی بعد کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال ۱۸۸۴ء میں مزار شاہ بلاول کے متعلق لکھتا ہے۔

"چار دیواری[1] پختہ ہے مکان کا دروازہ شالامار باغ کے پرانے رستہ میں جنوب کی طرف ہے۔ اس کے اندر وسیع میدان ہے اور یہ سب زمین خانقاہ کے متعلق ہے اس کے وسط میں ایک اور چار دیواری ہے جس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے اندر پختہ فرش ہے۔ اس میں مزار اور مزار کا تعویذ بھی پختہ ہے۔ لیکن عدم مرمت اور عدم خبر گیری کے باعث دیواریں گر گئیں اور چار دیواری کے اندر مکانات خستہ و شکستہ ہو رہے ہیں۔"

یہ بھی لکھا ہے کہ ہر سال ۲۸ شعبان کو یہاں میلہ ہوتا ہے اور رات کو لاہور کے ہندو مسلمان بکثرت آتے اور اکثر آتش بازی چھوڑا کرتے تھے۔

اللہ اکبر! کیا زمانہ تھا اور کیسے لوگ تھے۔ مسلمان بزرگ کی لاش کو دریا برد ہونے سے بچانے کے لیے اس کی قبر ایک سکھ بادشاہ کسی اور جگہ نئے سرے سے تعمیر کراتا اور وہیں اس کو دفن کراتا ہے اور اُس قبر اور احاطہ قبر کی چار دیواری ایک ہندو رئیس اپنی گرہ سے تعمیر کرتا ہے اور پھر اُس کے عُرس پر ہندو مسلمان اور سکھ سب جمع ہوتے ہیں۔ ع

خواب و خیال ہو گئیں اگلی حکایتیں

محبوب الواصلین کے حوالہ سے مصنف تحقیقات چشتی نے ان کی بہت سی کرامتیں لکھی ہیں۔ شاہجہان۔ آصف جاہ۔ دارا شکوہ اور اکثر امرا ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت میاں میر بھی لاہور میں تھے۔ دونوں بزرگوں کا ایک دلچسپ واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حضرت میاں میر کی خدمت میں نقد نیاز پیش کی، انھوں نے انکار کیا۔ پھر بادشاہ شاہ بلاول کے پاس گئے انھوں نے روپیہ لے لیا۔ اور خادم مطبخ سے کہا اللہ تعالےٰ روزی رساں ہے اس سے کچھ دن لنگر خانہ کا کام چلتا رہے گا۔ بادشاہ نے کہا۔ حضرت میاں میر نے میری پیش کش قبول نہ کی اور آپ نے قبول کر لی اس کا کیا باعث ہے آپ نے فرمایا حضرت میاں میر ملکی صفات ہیں ان کی توجہ حکام دنیا کی طرف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں درویش اور مسافر آرام پاتے ہیں اور لنگر خانہ میں جو موجود ہو وہ ان کو کھانے کو ملتا ہے اس لیے ہمیں روپیہ کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ بادشاہ پھر حضرت میاں میر کے پاس گئے۔ ان سے بھی عرض کیا آپ نے میری پیش کش قبول نہ فرمائی اور حضرت شاہ بلاول نے قبول فرمائی۔ حضرت میاں میر

---

[1] چار دیواری اس مزار کی راجہ دینا ناتھ نے تعمیر کرائی تھی (تحقیقات چشتی صفحہ ۱۶۲)

نے فرمایا وہ بزرگ ولی کامل اور دریا کی مانند ہیں۔ میں ان کے سامنے ایک معمولی تالاب ہوں۔ دریا میں اگر کوئی پلید چیز پڑ جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا لیکن تالاب پلید ہو جاتا ہے۔

بادشاہ یہ سن کر جب قلعہ میں گیا تو سجدات شکر بجا لایا اور کہا الحمد للہ کہ میرے زمانہ میں ایسے ایسے بزرگ بھی موجود ہیں۔

لیکن تاریخ ہندوستان جلد ہفتم ظفر نامہ شاہجہان میں مولانا ذکاء اللہ دہلوی ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۴ء کے واقعات جلوس ہفتم میں لکھتے ہیں : —

"شاہجہان جب سے بادشاہ ہوا تھا نہ لاہور گیا تھا نہ کشمیر۔ وہ ۲۴ شعبان ۱۰۴۲ھ کو اکبر آباد سے پنجاب روانہ ہوا۔ ۲۳ کو دہلی ۱۶ رمضان کو انبالہ اور ۶ شوال کو لاہور داخل ہوا۔ ملکی نظم و نسق کے بعد وہ میاں محمد میر کی ملاقات کو گیا۔ ان کے کمال صوری و معنوی مقبول خلائق تھے۔ اُن کی خانقاہ کے خدام کو دو ہزار روپیہ دیا اور حضرت میاں میر کو ایک تسبیح اور ایک دستار سفید پیش کی۔"

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ایں فقیر یک مرتبہ بخدمت ایشاں رسیدہ آثار ریاضت و مجاہدت بسیار از بشرۂ شیخ ظاہر شد۔"

حضرت شاہ بلاول کا لنگر بڑا وسیع تھا۔ یہاں تک کہ ایک داروغہ مطبخ موجود تھا لیکن وہ خود نان جوین اور ساگ چولائی کے چند نوالوں کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ حاجت مندوں کی سفارشیں امراء وزراء بلکہ بادشاہ تک کرتے تھے اور لوح سفارش نامہ پر اللہ بس باقی ہوس تحریر فرمایا کرتے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے باغ شاہ بلاول میں بارہا مختصر سے دربار اور جشن کیے ہیں ان کا مفصل ذکر عمدۃ التواریخ کے مختلف دفتروں میں درج ہے۔ دفتر سوم حصہ اول میں لکھتے ہیں : —

"درعین بارش باراں سرکار والا اقتدار صبح در شاہ بلاول تشریف شریف آوردند۔ در تمام گھوڑا چڑھ بلائے (سواراں) خاص ارشاد شد کہ مکلف بہ لباس بسنتی از قسم کمخواب وغیرہ بیروں و اندروں قلعہ مبارک ہر دو طرف ایستادہ صف بستہ ایستادہ شوند...... باز سرکار از باغ شاہ بلاول مراجعت ساختہ......" (ص ۶۱)

پھر اسی دفتر کے حصہ دوم (ص ۱۲۴) میں جشن ہولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : —

"تاکید بہ فراشاں جہت انتصاب خیام فرحت انجام در باغ شاہ بلاول وزیباش فرش، فروش جلوہ صدور بخشید۔ طوائف رقاصہ ملبس بہ لباس شایاں حاضر و بہرہ یاب شدند۔"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک ارشاد (مندرجہ عمدۃ التواریخ دفتر دوم ص ۳۴۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو باغ

شالامار کی طرح اس باغ کی آرائش و زیبائش کا خاص خیال تھا۔ جیسا کہ الفاظ ذیل سے معلوم ہوگا۔

"باغبانان شاہ بلاول و شالامار باغ را ایمائے گردید کہ باغات صدر را بہ خوب ترین آئین مصفا

و پاکیزہ باید ساخت۔ و سرکار دولتمدار بتاریخ نوزدہم ماہ مذکور از موضع ترگھڑا انتہاص رایات

عالیات ساختہ وارد باغ شاہ بلاول و از آں جا در شالا باغ رونق بخش شدند"

باغ و مزار شاہ بلاول کے پاس ہی شکارگاہ بھی تھی۔ مہاراجہ اکثر شکار کھیلنے کے لیے آتے اور یہیں آرام فرمایا کرتے تھے۔ شاہ بلاول کا مزار اب دو جگہ ہے۔ ایک تو گھوڑے شاہ اور باغ راجہ دینا ناتھ کے پاس جو بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اور ایک وہاں ہے جہاں مہاراجہ شیر سنگھ کی قتل گاہ ہے یہیں دراصل پہلا مزار تھا۔ اب وہاں ایک چھوٹی سی قبر نشان کے طور پر موجود ہے جو شیشم کے دو درختوں کے درمیان بنی ہوئی ہے۔

میرزا نظام الدین احمد

جس کے اک اک برگ پر تھی داستانِ رنگ و بو

بے نشاں وہ آج سب حسن گلستاں ہو گئے

ان کے باپ کا نام محمد مقیم تھا۔ ہروی کہلاتے تھے۔ طبقات اکبری جیسی عظیم کتاب کے مصنف تھے۔ یہ جامع تاریخ فارسی زبان میں آپ نے ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء میں مکمل کی۔ یہ تاریخ عہد اکبری کی ایک مشہور تاریخ ہے۔ بادشاہ اس قسم کے جواہر گرانمایہ کو جب محو لئے ظہور و شہرت میں نشوونما کے قابل پاتا تو مرحمت و اعتماد کے چھینٹوں سے ان نونہالوں کی آبیاری کرتا۔

لاہور میں اکثر قیام رہتا تھا یہیں مکان تھا اور یہیں ایک باغ بھی لگوایا تھا جہاں اپنے احباب کے ساتھ بہار و خزاں کے مد و جزر دیکھا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے ان کی خدمات کا تعلق فوج کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ ان کی وفات کی کیفیت میں دربار اکبری اور تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء کے سفر کے مہینہ میں بیمار ہو کر لشکر سے واپس آرہے تھے اور دریائے راوی کے کنارے پہنچے ہی تھے کہ ۲۳ صفر کو سفینۂ حیات موت کے کنارے جا لگا ؎

ذوقؔ اس بحر جہاں میں کشتیٔ عمر رواں

جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا

بالکل نوجوان تھے۔ پینتالیس سال کی عمر تھی۔ اگر زندگی وفا کرتی تو خدا جانے ان کی قابلیت اور کیا کیا جوہر دکھاتی۔ اس سے زیادہ ان کے باغ کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ خدا جانے کہاں تھا۔ کیسا تھا۔ کس محنت اور شوق سے لگایا گیا تھا اب تو کھنڈروں کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ البتہ اس زمانہ کے حالات پر نظر ڈال کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ دریا کے پار شاہدرہ کے نواح میں کہیں ہوگا۔

مآثر الامرا جلد اول (ص ۶۶۱) میں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اکبر کے ۳۴ ویں سال جلوس ۹۹۸ھ میں جب یہ خان اعظم (صوبہ گجرات) کے پاس تھے تو بادشاہ نے ان کو لاہور میں یاد کیا۔ وہ ستر سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ چھ سو کوس

کا فاصلہ بارہ دن میں طے کر کے لاہور اس وقت پہنچے جب بادشاہ تیئسویں سال جلوس کی تیاریاں کر رہا تھا چونکہ اس قدر فاصلہ کا اتنی تھوڑی مدت میں طے کر لینا عجیب بات تھی۔ اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ نظام الدین اپنی فشتر سوار جماعت سمیت ہمارے پیش ہو۔ اس کے بعد خواجہ پر روز بروز اعتماد زیادہ ہوتا گیا۔ صاحب مآثر لکھتے ہیں "درراستی و درستی یگانۂ وقت و در کارردانی و معاملہ فہمی سر آمد اقران بود"

مادھو لال حسین

باغباں پورہی وہ صبحۂ جہاں اے اہل دل　　روبروئے عشق عقل کل کو حیراں دیکھیے
زندگی میں مگر ہے من تو شدم تو من شدی　　بعد مرنے کے بھی اک قالب میں دو جاں دیکھیے

(مادھو لال حسین[1] کے متعلق تین کتابیں بہت ہی پرانی ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ ایک تو رسالہ "بہاریہ" ہے جس کے مصنف منشی بہار خاں تھے۔ یہ سب سے قدیم تصنیف ہے جو اکبر بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ منشی بہار خاں کو شاہ حسین سے خاص عقیدت تھی۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے انھیں شاہ حسین کا روزنامچہ لکھنے پر مقرر کر رکھا تھا۔ شہزادہ داراشکوہ نے اپنی کتاب حسنات العارفین میں اور مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں اس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔

دوسری قدیم کتاب حقیقت الفقرا ہے جو شاہ حسین کے خلیفہ شیخ مادھو کے مرید شیخ پیر محمد نے فارسی نظم میں لکھی تھی۔ یہ کتاب شاہجہان کے عہد کی ہے۔

تیسری کتاب داراشکوہ کی مشہور تصنیف حسنات العارفین ہے جس میں دو تین جگہ شاہ حسین کا ذکر آتا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ بھی بازار میں ملتا ہے۔ باقی دونوں کتابیں آج ناپید ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقات چشتی ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء میں تصنیف کی۔ اس وقت یہ دونوں کتابیں ان کے مطالعہ میں آئی تھیں۔ ممکن ہے اب بھی کہیں ہوں۔ انھی کتابوں کی مدد سے چشتی نے مادھو لال حسین کے حالات مرتب کیے تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی اپنی تالیف خزینۃ الاصفیا جلد اول میں صفحہ ۱۴۱ پر اور حدیقۃ الاولیاء کے صفحہ ۱۵ پر ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی نظر سے بھی یہ کتابیں گزر چکی ہوں۔

سید محمد لطیف جج اور رائے بہادر کنہیا لال کی تواریخ لاہور کے بعد اردو میں منشی محمد الدین فوق مرحوم نے ۱۹۰۰ء میں ایک مختصر سا رسالہ "شالامار باغ کی سیر" لکھا جس میں ضمناً مادھو لال حسین کے حالات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس کتاب کا آخری ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد "تاریخ شالامار باغ" کے نام سے ۱۹۲۴ء میں چھپا۔ اس سے زیادہ معتبر کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۲ء کے انڈین آرکیالوجیکل رسالہ میں جو سر رچرڈ ٹمپل کی ادارت میں چھپتا تھا مصر کے ایک انگریز کیپٹن کرسول کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس چھوٹی سی کتاب کو تاریخ پنجاب کا ایک اہم جزو تسلیم کیا گیا ہے۔

مادھو لال حسین کے کچھ حالات فوق صاحب کی کتاب یادِ رفتگاں میں بھی ملتے ہیں جو ۱۹۰۴ء کی تصنیف ہے اور آج کل نایاب ہے۔ البتہ راقم الحروف کے پاس ایک نسخہ موجود ہے۔

---

[1] یہ حالات مرتب نے لکھے ہیں۔

۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم۔اے پی ایچ۔ڈی نے جو اُس وقت پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کے لیکچرار تھے شاہ حسین کا پنجابی کلام چھاپا اور ان کے حالات بھی گورمکھی پنجابی اور اُردو میں لکھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر ایک خاص تعلیمی مقصد تھا۔ اس لیے انھوں نے حالات کی نسبت زیادہ زور ان کی کافیوں اور بیتوں پر دیا اور ان کے کلام کی خوبیاں گنوائیں۔

میرے مضمون کے ماخذ یہی آخرالذکر کتابیں ہیں جو چھپ چکی ہیں اور ان ہی سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

شاہ حسین کے جد اعلیٰ کلس رائے یا کلس رائے لاہور کے ایک کھتری بزرگ تھے۔ ذات ان کی ڈاہڈا تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ ہندو رہنے کی حالت میں اور مسلمان ہونے کے بعد کیا کاروبار کرتے تھے؛ اس کے متعلق سب خاموش ہیں۔ البتہ ان کے فرزند شیخ عثمان کے متعلق سب تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ان کا پیشہ بافندگی تھا۔ اسی بنا پر شیخ عثمان کے بیٹے شیخ حسین بھی حسین جولاہا کے نام سے مشہور ہیں۔

شیخ حسین ۹۴۵ھ؍۱۵۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد شیخ عثمان تل نگھ نام ایک محلے میں رہتے تھے جو ٹکسالی دروازہ کے باہر دریا کے قریب واقع تھا۔ تل یا ٹلہ ٹیلے کا بگڑا ہوا نام ہے۔ تل نگھ کی مسجد میں حافظ ابوبکر ایک بزرگ امامت بھی کرتے تھے اور بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔ وہ نگھ کے مردم خیز قصبہ کے رہنے والے تھے جو تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم میں واقع ہے اور جہاں آج بھی عالم اور فاضل موجود ہیں۔ شاید انہی بزرگوں کے نام پر یہ محلہ تل نگھ کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ حسین کو اسی محلے کی مسجد میں حافظ ابوبکر کے پاس بٹھایا گیا اور انھوں نے چھوٹی سی عمر میں چھ پارے حفظ کر لیے۔

اسی اثنا میں شیخ بہلول دریائی اس مسجد میں تشریف لائے۔ اس وقت شیخ حسین ساتواں پارہ حفظ کر رہے تھے۔ شیخ بہلول نے ان سے وضو کے لیے پانی طلب کیا اور کہا کہ دریا نزدیک ہے، وہیں سے لے آؤ۔ آپ دریا پر گئے۔ وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے ایک نظر ڈال کر سارا قرآن حفظ کرا دیا۔ شیخ حسین پانی لے کر واپس آئے۔ شیخ بہلول نے وضو کیا اور نماز پڑھائی۔ تھوڑے دنوں بعد ماہ رمضان آ گیا۔ شیخ حسین نے نماز تراویح پڑھائی اور سارا قرآن مجید ستائیس راتوں میں سنا دیا۔ اسے شیخ بہلول کی کرامت پر محمول کیا گیا۔ اس سے شیخ حسین کی بھی شہرت ہو گئی۔

شیخ بہلول موضع چنیوٹ کے رہنے والے تھے جو لاہور سے سات میل کے فاصلے پر واقع تھا، شیخ حسین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ واقعہ ۹۵۵ھ؍۱۵۴۸ء کا ہے۔ چنانچہ حقیقت الفقراء کا مصنف لکھتا ہے ؎

درزمانے کہ شیخ سوئے حسین آمد از بہر جستجوئے حسین
وقت خوش بود ساعتے مسعود سال پنجاہ و پنج نہصد بود

سال تاریخ اوست بے تاخیر
حق شدہ ہادی حسین فقیر

رسالہ بہاریہ اور حقیقت الفقراء چونکہ اعتقادی رنگ کی کتابیں ہیں، اس لیے ان میں صدہا کرامتیں آپ کے متعلق درج ہیں۔ لکھا ہے کہ شیخ حسین نے چھبیس سال زہد و ریاضت میں گزارے۔ قرآن و حدیث پر انھیں پورا عبور تھا۔ نماز گزار کیا

تہجد گزار تھے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ بارہ سال متواتر پابندی کے ساتھ مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش پر حاضری دیتے رہے۔ ایک روز شیخ سعد اللہ سے جو لاہور کے نامور عالم تھے علم تفسیر پڑھ رہے تھے۔ تفسیر مدارک کا درس تھا جب آیت وما الحیوٰۃ الدنیا الا لہو و لعب آئی تو استاد نے اس کے معانی میں بیان کیا کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار اور محض لہو و لعب ہے۔ شیخ حسین نے کہا مجھے قال نہیں بلکہ حال درکار ہے۔ آخر لہو و لعب کہنے سے اللہ تعالیٰ کا مطلب کیا ہے۔ جب وہ خود دنیا کی زندگی کو لہو و لعب کہتا ہے تو ہم اس کا کہنا کیوں نہ مانیں اور مفت میں مردود مطلق کیوں بنیں ؟

رسالہ بہاریہ میں لکھا ہے اس وقت آپ کی عمر چھتیس سال تھی، آپ ناچتے کودتے مسجد سے باہر نکلے اور تفسیر کی کتاب کنوئیں میں پھینک دی، جب دوسرے ہم سبق طلبہ نے بُرا مانا تو کتاب کو کنوئیں سے باہر آنے کا حکم دیا۔ کتاب اچھل کر باہر آگئی دیکھا تو وہ بالکل خشک تھی۔

دارا شکوہ لکھتا ہے کہ شیخ حسین ڈیڈا ایک مجلس میں موجود تھے۔ وہاں ایک کتاب پڑی تھی، پوچھا کونسی کتاب ہے ؛ جواب میں دیوان حافظ کا نام لیا گیا، آپ نے دیوان اٹھا کر کھولا تو یہ شعر نکلا ؂

چشمۂ چشم مرا اے گل خنداں دریاب
کہ بہ امید تو خوش آب روانے دارد

آپ نے یہ شعر پڑھ کر کتاب زمین پر دے ماری اور کہا کہ حافظ بھی بوڑھی عورتوں کی طرح روتا ہی مرگیا۔ اس واقعہ کا ذکر دارا شکوہ نے اس موقع پر کیا ہے جہاں واسطی اور بایزید بسطامی جیسے بزرگوں کے یہ اقوال درج کئے ہیں کہ سب لوگ وہم اور امید کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔ یہی بات شیخ حسین نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھ کر کہی۔

دارا شکوہ نے شیخ حسین کو ملامتیوں کے گروہ کا سردار لکھا ہے لیکن جہاں تک مشائخ طریقت کے اس گروہ کا تعلق ہے ؛ تصوف کی مشہور کتاب کشف المحجوب میں اس کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں :-

پہلی صورت یہ ہے کہ ایک شخص سیدھی راہ چلتا ہے، نیک نیتی سے اپنا کام کرتا ہے، خود احکام خداوندی بجالاتا اور دینی معاملات میں دین پروری کی رعایت کرتا ہے۔ اس پر لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں مگر وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ایسے مومنوں کی صفت قرآن کریم میں یہ بیان فرمائی گئی ہے :-

ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من
یشاء واللہ واسع علیم ۔

ترجمہ :- یعنی خاصان خدا ملامت سے نہیں ڈرتے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ کا علم بڑا وسیع ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں میں ہر دلعزیز اور صاحب عزت ہو اس کی طبیعت اس میں لگ جائے مگر وہ اپنا دل اس طرف سے موڑ کر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور تکلف سے ایسا طریق اختیار کرے جس سے لوگ متنفر ہو کر اس سے الگ ہو جائیں اور اسے بُرا بھلا کہنے لگیں۔ لیکن شریعت کو اس سے کچھ نقصان نہ ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو طبعی کفر اور گمراہی دامن گیر ہو۔ اس سبب سے وہ شریعت کی متابعت ترک کرے اور کہے کہ یہ ملامتی طریقہ ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنی رائے پر عمل کرے اور لوگ خواہ اسے کچھ کہیں، کسی نام سے پکاریں، وہ پروا نہ کرے۔ اس قسم کی ملامت ریاکاری ہے اور تارک فرض دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

شیخ حسین عالم و فاضل تھے ایک آیت قرآنی کی تفسیر کے الٹ پھیر نے ان کی کایا پلٹ دی۔ انھوں نے ملامتیہ طریق اختیار کیا اور ڈنکے کی چوٹ اس کا اظہار کیا۔ وہ اعلانیہ شراب پیتے تھے گانا سنتے تھے۔ طوائفیں ان کی مجلس میں آتی تھیں اور رقص و سرود سے ان کی محفل گرماتی تھیں۔ وہ داڑھی مونچھ منڈواتے تھے اور ان کے حلقہ نشیں بھی سب اسی رنگ میں رنگے ہوتے تھے نماز روزہ سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کرا دیتا، اس وقت تک ان کا مرید نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے مرید کو داڑھی مونچھ صاف کرانے کے بعد اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ دیتے تھے۔ اگر وہ پی لیتا تو مریدوں میں شامل سمجھا جاتا۔ نہیں تو مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے پاس گئے اور کہا مجھے بھی اپنے مریدوں میں داخل کر لیجئے۔ شیخ حسین نے جواب میں جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ملا! کیوں مجھے رسوائے عالم کرنا چاہتے ہو۔ تم میرے کام کے آدمی نہیں ہو۔ اس لیے میں تمھیں اپنا مرید نہیں کر سکتا، نہ تم ڈاڑھی منڈواتے ہو نہ شراب پیتے ہو۔ ملا عبدالحکیم نے کہا۔ اگر دلیل سے قائل کرو گے تو جو کہو گے مانوں گا۔ شیخ نے کہا۔ نہیں تم خشک ملا ہو۔ تم کبھی نہ مانو گے۔ جاؤ اپنا کام کرو اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔

ان ظاہری بدعتوں اور خلاف شرع باتوں کے باوجود شہزادہ دارا شکوہ نے حسنات العارفین میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی زبانی شیخ حسین کی دو چشم دید کرامتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

شیخ حسین کے مرشد شیخ بہلول کو جب آپ کی ان حرکات کا علم ہوا تو وہ فوراً لاہور تشریف لائے اور شیخ حسین سے فرمایا کہ آج میرے ساتھ نماز پڑھو اور نماز ہی میں سارا قرآن ختم کر دو چنانچہ آپ نے نماز شروع کی۔ جب سورہ "الم نشرح لک صدرک" پر پہنچے تو بے اختیار ہنس پڑے اور نماز ختم کر دی۔ دارا شکوہ کا خیال ہے کہ شاہ حسین نے شاید اس سورہ پاک کا مفہوم یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تیرے سینے کو توحید اور معرفت سے نہیں کھولا اور تجھ پر دہم اور انانیت کا بار نہیں ڈالا جو تیری پشت کو پست کرتا ہے اور کیا ہم نے تجھ کو ذکر سے مذکور تک نہیں پہنچایا۔ اس لیے کہ ہر فنا کے بعد بقا ہے اور بے شک جس کو ہم نے فنا بخشی، اسے بقا دے کر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ پس جب تو نے انانیت اور ہستی موہوم سے فراغت حاصل کر لی ہے تو ہماری ہستی پر قائم ہو جا اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جو ظاہر اور باطن کا رب ہے۔

اس واقعہ کے بعد وہ کبھی اپنے مرشد سے نہ ملے۔

اکبر کے زمانے میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری شیخ الاسلام تھے۔ وہ اکبر کے مذہبی خیالات کے مخالف اور ابوالفضل کے دشمن تھے اور اس کو تمام فتنوں کا بانی سمجھتے تھے۔ وہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس آئے اور گجرات پہنچ کر انتقال کر گئے۔ بہت مالدار تھے مگر اتنے کنجوس کہ مرنے کے بعد ان کے خزانے سے تین کروڑ روپیہ نکلا۔

اکبر کے قیام لاہور کے ایام میں یہ بھی لاہور میں تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں بحوالہ معارج الولایت لکھا ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے شیخ حسین کو ساز و نواز کے ساتھ بازار میں جاتے دیکھا۔ جس دھوم دھڑکے اور ہیئت کذائی سے وہ جا رہے تھے، اس کو شیخ الاسلام نے شریعت کے خلاف سمجھا۔ انھوں نے شیخ حسین کو سزا دینا چاہی اور شاید کچھ سوال جواب بھی کئے۔ شیخ الاسلام گھوڑے پر سوار تھے۔ شیخ حسین نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ کلمۂ توحید اور اقرار رسالت میں ہم تم برابر کے شریک ہیں۔ لیکن حج اور زکوٰۃ سے تو فارغ ہے اور نماز روزہ میں نے ترک کر رکھا ہے۔ پھر مجھ میں اور تجھ میں فرق کیا ہے۔ میں سزا کا کیوں مستحق ہوں اور تم کیوں نہیں؟

شیخ الاسلام نے اس وقت تک فی الواقع حج نہ کیا تھا اور اس قدر دولت مند ہو کر کبھی زکوٰۃ و خیرات بھی نہ دی تھی۔ اس لیے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور حسین کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

شیخ حسین کا مشرب یہ تھا کہ سے شام تک گانے بجانے والے ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے حواری و مرید سب داڑھی مونچھ منڈا کر مست الست پھرا کرتے تھے۔ وہ قرآن کے حافظ، حدیثوں کے شیخ اور علم میں صاحب کمال تھے۔ لیکن اُن کا عمل قرآن و حدیث کے سراسر خلاف تھا۔ اس پر بھی لوگ انہیں صاحب کرامت جانتے تھے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ شہزادہ سلیم اور حرم سرائے اکبری کی اکثر بیگمات شیخ حسین کی عقیدت مند تھیں۔

صاحب حقیقت الفقراء نے آپ کے خادموں کی تعداد نو ہزار اور مریدوں کی ایک لاکھ پچیس ہزار بتائی ہے جن میں سولہ خلیفے بہت نامور ہوئے ہیں۔ ان میں چار تو غریب کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے، چار کا خطاب دیوان، چار کا خاکی اور چار کا بلاول تھا۔ دیوانوں میں پہلے دیوان حضرت کے محبوب شیخ مادھو، دوسرے گورکھا، تیسرے الہ دیوان تھے۔ یہ سب لاہور میں دفن ہیں۔ چوتھے دیوان بخشی کی قبر بیجاپور میں ہے۔

پہلا شاہ غریب وزیرآباد سے تین کوس کے فاصلے پر بمقام رتی ٹھٹھ مدفون ہے۔ دوسرا موضع لنگو والی (وزیرآباد) میں، تیسرا چیلا پور علاقہ دکن میں اور چوتھے شاہ غریب کی قبر شاہ حسین کی قبر کے پاس لاہور میں ہے۔

خاکیوں میں پہلے خاکی مولا بخش اور دوسرے خاکی شاہ لاہور میں بجوار مزار حسین مدفون ہیں۔ تیسرے خاکی شاہ وزیرآباد میں اور چوتھے حیدر بخش خاکی دکن میں پیوند زمین ہیں۔

بلاول نام کے خلیفوں میں پہلے شاہ رنگ بلاول، دوسرے بدھو بلاول، تیسرے شاہ مست بلاول لاہور میں اور چوتھے شاہ بلاول دکن میں مدفون ہیں۔

شاہ حسین کے ملنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ ان کے دوستوں میں مولانا اسمٰعیل عرب کا نام لیا جاتا ہے جو ہمایوں بادشاہ کے قائم کردہ مدرسۂ دہلی کے مدرس اعلیٰ تھے۔ وہ جب کبھی لاہور آتے شیخ حسین سے ضرور ملتے۔ ان کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ چوروں کے ہاتھوں دہلی میں قتل ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ شیخ حسن طبیب[1] سرہندی نے بھی حافظ شیخ حسین کو دیکھا تھا اور ان کے کئی قول ان کو یاد تھے۔ وہ اکثر

---

[1] حسنات العارفین کے اردو ترجمہ میں کہیں "طبیب" کی جگہ غلطی سے "طبیب" چھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اس کو "شیخ طبیب سرہندی" بنا دیا۔ لیکن ابوالفضل کے حوالے سے اقبال نامہ اکبری کے مصنف نے جس طبیب شاہی کا ذکر کیا ہے وہ یہی شیخ حسن طبیب سرہندی تھے جو شیخ حسین سے ملا کرتے تھے۔

شیخ حسین کے پاس آمد و رفت رکھا کرتے تھے۔ شیخ بینا یا شیخ ملیا اسی شیخ سربندی کے فرزند تھے جن کو فن جراحی اور ہاتھیوں کے علاج میں کمال حاصل تھا۔ اکبر کو ایک مرتبہ شکار کھیلتے ہوئے ہرن نے جو زخم لگایا تھا وہ انھیں کے علاج سے اچھا ہوا تھا۔[1]

پہلے تو حسین نومسلم زادہ ہونے کی وجہ سے شیخ حسین، حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے حافظ حسین، باپ کے پیشہ بافندگی کی وجہ سے حسین جولاہا اور درویش صفت ہونے کے لحاظ سے شاہ حسین کہلاتے تھے۔ لیکن اب ایک ایسا دور آیا کہ اس نے پہلے تمام ناموں پر خط تنسیخ کھینچ کر ان کا نام مادھو لال حسین مشہور کر دیا۔ چنانچہ آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :۔

مادھو یا مادھو لال شاہدرہ کا ایک برہمن زادہ تھا جو بقول تحقیقات چشتی ۹۸۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس وقت حافظ شیخ حسین کی عمر ۳۸ سال تھی۔ صاحب تحقیقات لکھتے ہیں کہ مادھو کی عمر تین برس کی تھی جب وہ شاہ حسین کے منظور نظر ہوئے۔ لیکن صاحب خزینۃ الاصفیا، جلد اوّل صفحہ ۲۶۱ پر لکھتے ہیں :۔

"روزے سوار ے رفت کہ شیخ حسین را نظر بر جمال وے افتاد۔ و بہ ہزار جان مفتون محبت وے گشت۔ و در شاہدرہ سکونت اختیار کرد"

ان ایام میں مادھو کے والدین شاہدرہ میں دریا کے پار رہتے تھے اور شیخ حسین کا مسکن لاہور کے ٹکسالی دروازہ کی بیرونی حدود میں تھا۔ یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ مادھو گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور آیا ہو، شیخ کے مکان کے پاس سے گزرا ہو اور شیخ نے اس کو مہر و محبت کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ لیکن اس بات کا امکان بہت مشکل ہے کہ مادھو نے تین سال ہی کی عمر میں جبکہ وہ اپنی ماں کی گود میں تھا اور لاہور سے دور رہتا تھا، شیخ حسین کو فریفتہ کر لیا ہو۔ بہرحال اس زمانے میں شیخ حسین قلندرانہ وضع اختیار کر چکے تھے اور ملامتیہ طریقہ رکھتے تھے۔ ہر بات میں ان کا وظیفہ یہ تھا ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

آپ اس برہمن زادے کا نام پتہ اور حسب نسب دریافت کر کے خود بھی شاہدرہ میں جا بیٹھے۔ اس وقت مادھو کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ شادی شدہ تھا۔ آپ کی توجہ سے متاثر ہو کر مادھو نے بھی آپ کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ شراب نوشی میں بھی ان کا شریک رہنے لگا۔

یہ قصہ بہت طویل ہے۔ اور تحقیقات چشتی کے مصنف نے خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ مادھو اور شیخ حسین کے عشق و محبت کے افسانوں میں بہت سی بے سروپا باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مادھو کے وجود سے انکار کرنا اور پھر دونوں کے تعلقات کو جھٹلانا کسی واقعہ نگار کے بس کا روگ نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ حسین کو مادھو سے محبت تھی۔ اس کی شکل دیکھے بغیر انھیں کل نہ پڑتی تھی۔ چونکہ

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۲۹-۱۷۰۔

سچی اور پاک محبت تھی ۔ اس سبب سے مادھو پر بھی اس کا اثر ہوا اور آخر وہ مسلمان ہو کر ان کا مرید ہو گیا ۔ اس جگہ شاہ حسین کے ان پنجابی شعروں کا اندراج شاید بے محل نہ ہو گا :-

تسیں رَل مِل دیو مبارکھاں[1] میرا سوہنا سجن گھر آئیا ہی
جس سجن نوں میں ڈھونڈھدی وتاں سو سجن میں پائیا ہی
ویہڑا ناں آنگن میرا بھیا سہادنا ماتھے نور سہائیا ہی
کہے حسین فقیر نماناں مرشد[2] دوست[3] ملائیا ہی

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر لاجونتی، باوا بدھ سنگھ اور منشی مولا بخش کشتہ غرض جس کسی نے بھی شاہ حسین کے متعلق کچھ لکھا ہے، سب کو لتاڑ ڈالا ہے ۔ کسی پر کوئی اعتراض کیا ہے اور کسی پر کوئی ۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر بالکل نہیں دیکھا ۔ ڈاکٹر لاجونتی کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ :-

"اس نے بڑا ظلم کیا ہے کہ شیخ حسین کا نام ہی مادھو لال حسین لکھ دیا ہے اور ادھر ادھر کی کرامتوں اور گپوں سے حسین کو ملوث کر دیا ہے اور دارا شکوہ کی شطحیات (حسنات العارفین) نہیں دیکھی ۔"
"مادھو برہمن کا قصہ بھی محض گپ ہے اور حسین کے تصوف کو بدنام کرتا ہے ۔ حسین کی کافیوں میں مادھو کا کہیں نام نہیں ہے ـــ وغیرہ وغیرہ"

اب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا اپنا طرز عمل دیکھئے ۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں مکمل کلام شاہ حسین لاہوری" مرتب کر کے پنجابی زبان اور فارسی رسم الخط میں شائع کیا ۔ اس کتاب میں واقعی آپ نے مادھو کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ نہ اس کے برہمن ہونے کا نہ بعد میں مسلمان ہونے کا اور نہ حسین سے اس کا کوئی تعلق ظاہر کیا ہے ۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں آپ نے ایک اور تصنیف "حالات و کافیاں مادھو لال حسین" شائع کی ۔ اس کتاب کا نام ہی آپ نے مادھو لال حسین تجویز کیا ۔ پھر دیباچے کے صفحہ اول پر لکھا :-

"لاہور میں جو ہمارے صوفی اور شاعر کا مولد ہے آپ مادھو لال حسین کے نام سے پکارے جاتے ہیں ۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مادھو آپ کے خلفا سے ایک شخص کا نام تھا ۔ اس کے ہندو ہونے کی طرف مادھو اور حسین کی باہمی دوستی کے قصوں میں خاصا واضح اشارہ موجود ہے ۔ مادھو یا مادھو لال آپ کا مرید ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا"

---

[1] مبارکاں [2] گورو [3] خدا

مطلب یہ ہے کہ میں جس محبوب کی تلاش میں در در کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ میرے گھر آ گیا ہے ۔ تم سب مل کر مجھے مبارک دو ۔ اس کی پیشانی سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں ۔ گھر آنگن اس کی آمد سے جگمگا اٹھا ہے ۔ مسکین حسین جانتا ہے کہ یہ وصال مرشد کامل کی توجہ سے میسر آیا ہے ۔

اس طرح جو اعتراض آپ نے ڈاکٹر لاجونتی پر کیا تھا اس کا خود بھی اعادہ کیا۔ آپ کہیں گے تو سہی کہ ؎

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مگر جب آپ کو خود ہی ان سب باتوں کا اقبال ہے تو اس پر مزید حاشیہ آرائی بے سود ہے۔ البتہ ثبوت کے لیے شاہ حسین کے ایسے اشعار کا اندراج نامناسب نہ ہو گا جن میں گو مادھو کا نام لے کر انھوں نے اس کے ہندو یا برہمن ہونے یا دریا پار (یعنی شاہدرہ) رہنے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اشاروں کنایوں میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پوتھی کھول دکھا بھائی باہمناں
پیارا کدوں ملیسی سانمنا

اس بیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محبوب دوسری طرف یعنی دریا پار رہتا ہے۔ اور دوسرے ہندوؤں میں عام دستور ہے کہ وہ کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے برہمنوں سے شگون لیا کرتے ہیں۔ یہ خالص ہندوانہ رسم ہے۔ چونکہ شاہ حسین کا منظور نظر ہندو تھا اس لیے وہ یہاں ہندوانہ رسم و رواج کا ذکر کرتے ہیں۔

پھر دوسری جگہ اس کا پتہ نشان اس طرح بتاتے ہیں ؎

من اٹکیا بے پرواہ نال　　اوہ دین دنی دے شاہ نال
قاضی ملاں متیں دیندے　　کھرے سیانے راہ دیندے
عشق کی لگے راہ نال

ندیوں پار رانجھن دا ٹھانا　　کیتا قول ضرورت جانا
منتا کراں ملاح نال

اس کافی کے دوسرے بند سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ حسین کا محبوب ندی کے اُس پار رہتا ہے جسے ملنے کیلئے دریا عبور کرنا ضروری ہے اور دریا ملّاح کی مدد کے بغیر عبور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کی منتیں کی جا رہی ہیں۔ اس طرح انھوں نے ندی، ملاح اور رانجھن کے کنایوں سے اپنے معشوق کے ٹھکانے کی طرف اچھا خاصا اشارہ کر دیا ہے۔

مندرجہ ذیل کافیوں میں لال کا لفظ مادھو لال کے نام کی صحیح غمازی کرتا ہے ؎

پیارے لال کیا بھرواسا[1] دم[2] دا
اُڈیا بھور۔ تھیا پردیسی۔ اگے راہ اگم[3] دا
کُوڑی دنیا کُوڑ پسارا[4]۔ جیوں موتی شبنم[5] دا
جنہاں میرا شوہ[6] ریجھایا۔ تنہاں نہیں بھو جم[7] دا
کہے حسین فقیر سائیں دا۔ چھوڑ سر پر[8] بھسم دا

---

[1] تکیہ، بھروسہ، یقین [2] سانس [3] غیب [4] جھوٹا [5] ذلیل [6] یار [7] ملک الموت کا ڈر [8] خاکی جسم

یعنی پیارے لال! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔
جب روح تن سے نکل گئی تو آدمی دوسری دنیا کا ہو گیا۔ جہاں کا حال کسی کو معلوم نہیں۔
یہ دنیا اور اس کا تمام کھیل جھوٹا ہے۔ شبنم کے قطرے کی طرح اس کی کوئی حقیقت نہیں۔
جس نے اپنے مولا کو راضی کر لیا، اسے موت کا کوئی ڈر نہیں رہا۔
فقیر حسین کہتا ہے کہ خاکی جسم تج کر روحانی زندگی اختیار کر۔
دوسری جگہ شاہ حسین پھر لال کی تکرار کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

مائے نی کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال
دھواں دُھکھے میرے مرشد والا جاں پھولاں تاں لال
سُولاں مار دیوانی کیتی بِرہوں پیا ساڈے خیال
دُکھاں دی روٹی سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال
کہے حسین فقیر نمانا شہ ملے تاں تھیواں نہال

یعنی اے ماں! میں اپنے درد فراق کا حال کسے سناؤں؟ مرشد کے عشق نے آگ لگا رکھی ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے۔ چھیڑنے سے شعلے اٹھتے ہیں۔ سوز و کرب نے دیوانہ کر دیا ہے۔ محبت کر کے روگ لگا بیٹھا ہوں۔ خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو ملتا ہے۔ ہر دم آہ و زاری سے کام ہے۔ آتشیں آہیں نکلتی ہیں۔ جنگل جنگل ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر لال نہیں ملتا۔ مل جائے تو جان میں جان آئے۔ زندگی سنور جائے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ کا ارشاد ہے کہ حسین اور مادھو کی محبت کا ذکر کر کے حسین کے تصوف کو بدنام کر دیا گیا ہے۔ اول تو معلوم نہیں وہ کس قسم کا تصوف ہے جس میں دن رات شراب کا دَور چلتا ہے۔ پھر پیر و مرشد کے تعلق میں مولانا روم اور ان کے مرشد شمس تبریز، امیر خسرو اور ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور اسی طرح بعض دیگر صاحبان سلوک کے درمیان جو محبت عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس قسم کی پاک محبت سے نہ تصوف کبھی بدنام ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ کو حسین کی شراب نوشی سے بھی انکار ہے۔ فرماتے ہیں :-

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شیخ حسین کو اکبر کے روبرو مواخذہ میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ داڑھی منڈواتا اور کھلم کھلا شراب خوری کرتا تھا۔ مگر یہ محض افسانہ ہے۔ اس بارے میں کوئی مصدقہ شہادت بہم نہیں کی گئی۔ دارا شکوہ کے بیانات کو ہم بجا طور پر معتبر سمجھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسین صوفیہ کے فرقہ ملامتیہ سے تھا۔"

پھر خود ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"شیخ کی روش عجیب تھی۔ صبح سے شام تک گانے بجانے والوں کے ساتھ منڈھی داڑھی سے شہر میں مست الست رندانہ چکر کاٹتے رہتے۔ کبھی کسی کے داؤ پیچ میں

نہ آئے۔ بہت سی کرامات اور خارق فطرت امور آپ سے ہویدا ہوئے۔"

اس کے بعد ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:۔

"شراب نوشی، ریش تراشی اور کرامات کی صحت و عدم صحت کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔ مگر یہ تو ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ کلام میں کہیں شراب کا نام تک نہیں۔ نہ صاحب اعجاز ہونے کا دعویٰ ہے نہ ہی احکام شرع سے تجاوز کی تحریک و ترغیب ہے۔ یہاں تک کہ رندی و مستی، ناز و انداز کا بھی کہیں مظاہرہ نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شیخ صاحب شراب کا استعمال کرتے تھے اور داڑھی منڈوانے پر زور دیتے تھے۔ اس صورت میں بھی ان پر کوئی اتہام و الزام عاید نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان کے یہ کام نفس پروری کے لیے نہیں بلکہ نفس کشی کے لیے تھے۔ نفس کا آخری اور سب سے زبردست عیب غرور و شہرت پسندی ہے اور غرور و شہرت پسندی کے عیب دور کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایسے کام دیدہ و دانستہ کیے جائیں جن سے ہر طرف سے بدنامی، لعنت و ملامت کے آوازے کسے جانے لگیں۔ اس متواتر ملامت کی برداشت سے نفس یقیناً حلیم ہو جائے گا اور دنیا سے بھاگ کر سیدھا خدا کی آغوش میں پناہ لے گا۔ نفس کو اس بات کا یقین ہو جائیگا کہ دنیا ظاہر پرست ہے۔ کسی کے باطن کی پاکی سے اسے کوئی غرض نہیں۔

شیخ صاحب کو دارا شکوہ ایسے نکتہ شناس مرد نے اپنے عصر کے گروہ ملامتیہ کا امام بے وجہ نہیں کہا۔"

دارا شکوہ نے حسین کی شراب نوشی اور داڑھی مونچھ منڈانے کے علاوہ ان کی چند ایک کرامتوں ہی کا ذکر کیا ہے اس کے سوا شیخ حسین کے متعلق دارا شکوہ کی تعلیمات میں اور کچھ نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کو سب سے معتبر سمجھ کر اس کے مندرجہ واقعات اپنی دوسری کتاب "حالات و کافیاں مادھو لال حسین" میں درج بھی کرتے ہیں اور پھر شراب نوشی، ریش تراشی اور کرامات کی صحت و عدم صحت کی ذمہ داری راویوں پر ڈالتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ شاہ حسین کی کافیوں میں شراب کا کہیں نام نہیں آیا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا کلام ان کے مطبوعہ اشعار سے زیادہ نہ ہوگا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی بے اعتدالیوں کا اکثر جگہ اظہار کیا ہے۔ کیا کونڈی ڈنڈا، بھنگ، صافی، مرچ، رنگ، پوست، بالٹی، مٹکا اور کھانڈ (چینی) کا اہتمام کرنے کے بعد بھی شراب کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

دنیا والے نوں دنیا دا مان تاں ننگاں[1] نوں ننگ منی
تاں اسیں ننگ نہ دنیا دا اسے ہندی جنی[2] کھنی

---

۱ دنیا داروں کو دنیا پر مان ہوتا ہے مگر رند مستوں کو رندی پر ناز ہے۔

۲ ہمارے حال پر عورتیں تک ہنستی ہیں۔

دنیا چھوڑ فقیر تھیا[1] سے جاگی پریم کنی
کہے حسین فقیر سائیں دا جانے آپ دھنی[2]

اور دیکھیے فقیر کی تمنا کیا ہے۔ کوئی حسرت رہ نہ جائے ؏

گوڈا دئیں سوٹا دئیں کوٹھی دئیں بھنگ دی
صافی دئیں مرچاں دئیں بے تھنگی[3] دئیں رنگ دی
پوست دئیں باٹی دئیں چاٹی دئیں کھنڈ دی
گیان دئیں دھیان دئیں مہاں کتھا[4] دھونگ دی
شاہ حسین فقیر سائیں دا ایہہ دعا ملنگ[5] دی

ڈاکٹر موہن سنگھ کو باوا بدھ سنگھ سے بھی شکایت ہے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں :-
"یہ غلط ہے کہ شیخ حسین کی پریت ہندوؤں کے ایک لڑکے مادھو لال سے تھی۔
اس کو باواجی نے ہیر رانجھے کا قصہ بنا دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ باوا بدھ سنگھ نے نہیں بلکہ شاہ حسین نے خود ہی اس واقعہ کو اپنے مختلف اشعار میں ہیر رانجھے کا قصہ بنا دیا ہے۔ وہ انہی دو لفظوں کے ہیر پھیر میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی قریباً پندرہ بیس کافیوں میں ہیر رانجھے کے الفاظ موجود ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں ؏

ماہی ماہی کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن رانجھن مینوں سبھ کوئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی

یعنی رانجھے کے نام کا ورد کرتے کرتے میں خود رانجھا بن گئی۔ اب مجھے کوئی ہیر کے نام سے نہ پکارے۔

ڈولی پائے لے چلے کھیڑے نامیغوں عذر نہ زور
رانجھن سانوں کنڈیاں پائیاں دِل وِچ لگیا زور
مچھی وانگوں پئی تڑپھاں فتا ور دے ہتھ ڈور
کہے حسین فقیر سائیں دا کھیڑیاں دا کوڑا شور

---

[1] ہم نے دنیا چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اس سے محبت جاگ اٹھی۔
[2] اب اللہ بہتر جانتا ہے ہمارا حشر کیا ہوگا۔
[3] بے اندازہ
[4] صحبت صالح کی عظمت
[5] ملنگ درویشوں کا ایک فرقہ ہے جسے ننگ و ناموس کی پروا نہیں ہوتی۔

اس کافی میں ہیر کی شادی، کھیڑوں کا ڈولی لے جانا اور اس موقعہ پر ہیر کا تلملانا اور بے قراری ظاہر کرنا دکھایا گیا ہے اور آخر میں سب کچھ خدا کے ہاتھ سونپ کر دل کو تسلی دی گئی ہے۔

ہاتھی عشق مہاوت رانجھا۔ انکس دے دے ہوڑیئے
کہے حسین فقیر سائیں دا لکڑی پریت نہ توڑیئے

اس میں ہاتھی کو عشق، مہاوت کو رانجھا اور منزل کی دشواریوں کو کھونٹے سے تشبیہہ دے کر محبت نبھانے کی استدعا کی گئی ہے۔

جے ٹک رانجھا درس دکھاوے تاں ہیر عذابوں چھٹے   شاہ حسین فقیر سائیں دے رانجھے باجھوں رہوں رسانڑے
جے ملساں تاں شانت آوے

اس میں بھی ہیر کا ماہی بے آب کی طرح رانجھے کے فراق میں تڑپنا دکھا کر اپنے ہجر کی مجبوری اور لذت وصال کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

جنگل بیلے پھرا ڈھونڈھیندی رانجھن بیرے سنگے
میں آ بیاں میرا ڈھول نہ آیا ہیر کوکے وچ جھنگے

یہاں رانجھے کا ہیر کے باپ کی ملازمت اختیار کر کے جنگل میں بھینسیں چرانے کی طرف اشارہ ہے۔

منشی مولا بخش کشتہ کے متعلق ڈاکٹر دیوانہ لکھتے ہیں:—

"منشی مولا بخش کشتہ نے اپنی کتاب "پنجاب دے ہیرے" میں لکھا ہے کہ حسین پنجابی کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے لیکن نہ اس اطلاع کا ماخذ بتایا ہے اور نہ ہی ان کا فارسی کا کوئی شعر ہی لکھا ہے۔ اس لیے یہ بالکل غلط ہے۔"

کشتہ صاحب نے چونکہ اپنی کتاب پنجابی زبان اور گورمکھی حروف میں لکھی تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شاہ حسین کے فارسی اشعار کا اندراج مناسب نہ سمجھا ہو لیکن یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ شاہ حسین عربی فارسی دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ اگر وہ پنجابی میں شعر کہہ سکتے تھے تو فارسی زبان میں شعر کہنا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ البتہ جس طرح ان کے اکثر پنجابی اشعار بے وزن اور قافیہ ردیف کی قید سے آزاد ہیں اسی طرح ان کے فارسی اشعار بھی ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنی موج اور بے خودی و مستی کے عالم میں شعر کہتے تھے اس لیے وہ علم عروض کا چنداں خیال نہ رکھتے تھے، ان کے بعض فارسی اشعار تحقیقات چشتی میں ایک بہت ہی قدیم بیاض سے نقل کیے گئے ہیں جو آج سے ایک صدی قبل اس زمانے کے سجادہ نشین مزار مادھو لال حسین کے پاس موجود تھی۔ بخوف طوالت ان کے صرف دو شعر جن کا وزن قافیہ درست ہے۔ نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

شاہدے خود را چو دیدم مست مست   تا لب لعلش رسیدم مست مست
ما ہمہ دردیم و درمان نیز ہم   بادۂ صافیم و مستان نیز ہم

افسوس کہ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اپنی کتاب میں سب سے چوکھی جنگ لڑی مگر ان کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ؎

دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو   دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیے

شاہ حسین ۱۰۰۸ھ میں شہنشاہ اکبر کی وفات سے سات سال قبل فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔ صاحب تحقیقات المغفرت نے "مست عشق ازل" اور "ہے محبت مست" سے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں آپ کی تاریخ وفات کا قطعہ یوں درج کیا ہے ؎

طالب عشق و عاشق جانباز ۔۔۔ ماہ عالم حسین نور العین
گشت خوشحال دل بتولیدش ۔۔۔ نیز سلطان سید الثقلین
ہم زہم شد امین رب مست ۔۔۔ طرفہ تولید او بزینت و زین
گفت سرور محقق سر مست ۔۔۔ سال ترحیل آں شہ کونین
شیخ محمود و نیز شیخ زماں ۔۔۔ رحلتش ہست شمع عشق حسین
ہست شیخ حسین وصالش ہم
اہل دل بے نیاز خلق حسین

ایضاً

شاہنشہ دیں حسین مخدوم ۔۔۔ خورشید زمیں حسین مخدوم
درسال ولادتش رقم کن ۔۔۔ ہادی و امین حسین مخدوم
درسال وصال او بفرما
ہادی یقین حسین مخدوم

ابتدا میں مزار آپ کا شاہدرہ کے پاس بنایا گیا مگر جب دریائے راوی نے اپنا رخ بدلا تو آپ کا صندوق نکال کر باغبانپورہ کے شمال میں اس جگہ دفن کیا گیا جہاں اب آپ کی خانقاہ واقع ہے۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں [illegible] آپ کا خلیفہ مادھو فوت ہوا تو وہ بھی آپ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ احاطہ مزار کی چار دیواری پختہ ہے۔ دروازہ کلاں جس سے آمد و رفت ہوتی ہے بجانب غرب ہے۔ احاطے کے درمیان میں اونچے چبوترے پر قبر کے تعویذ ہیں۔

شاہان چغتائی میں سے جو بادشاہ لاہور آتا وہ آپ کے مزار پر حاضر ہو کر نذریں چڑھاتا اور مجاوروں اور سجادہ نشینوں کی پرورش کرتا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آور بھی اس درگاہ پر آ کر جھکے۔ ناظمان لاہور بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔ نواب زکریا خاں نے آپ کی خانقاہ سے مغرب کی جانب ایک مسجد بنوائی جو اب تک موجود ہے۔ معزالدین جہاندار شاہ جب اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے ہاتھ سے تنگ آ کر آپ کے مزار پر آیا تو اس نے عہد کیا کہ اگر خداوند کریم نے مجھے بادشاہی عطا کی تو میں آپ کے مزار پر طلائی چوبوں کا سائبان اور روپیہ اشرفی سے بھری ہوئی دو دیگیں نذر کروں گا۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ تخت نشین ہوا تو اس نے دلی خلوص اور عقیدت مندی سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جس سے مزار کا احاطہ اور چار دیواری حضرت بلاول کی سعی سے بہت عمدہ تیار ہو گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آپ کی کرامات کا حال سن کر خانقاہ کی مرمت اور سالانہ عرسوں کے اخراجات کے لیے مفصلہ ذیل معافیاں عطا کیں :۔

(۱) چاہ موراں والہ جس کی زمین ۲۴۲ بیگھہ تھی۔
(۲) چاہ مان والا جس کی اراضی ۲۰ بیگھہ تھی۔
(۳) چاہ پیرو الا جس کا رقبہ ۲۴۴ بیگھہ تھا۔
(۴) چاہ لکینم جس کی زمین ۲۶ بیگھہ تھی۔
(۵) ضلع امرتسر میں ایک چاہ جس کی زمین ۱۰ بیگھہ تھی۔
(۶) موضع فتح گڑھ ضلع لاہور میں ایک بیگھہ زمین۔
(۷) اٹاری ضلع امرتسر میں سات بیگھہ زمین۔
(۸) موضع کوٹ بیگم میں تین بیگھہ زمین۔

ان کے علاوہ مہاراجہ خاص عرس اور بسنت کے واں بھی بہت کچھ امداد دیا کرتے تھے۔ وہ بسنت کا دربار یہیں لگاتے اور یہیں نذریں وصول کرکے امرا کو خلعتیں بخشتے تھے۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا مگر سکھوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ سارا کھیل بگڑ گیا اور آمدنی بند ہو گئی۔

عرس سال میں ایک بار اب بھی ہوتا ہے۔ پہلے قمری حساب سے یکم رجب کو ہوتا تھا۔ اس صورت میں عرس کی تاریخ کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں پڑتی تھی۔ اور نزدیک و دور سے آنے والوں کو موسم کے ادل بدل سے تکلیف ہوتی تھی۔ ۱۸۶۳ء سے قمری تاریخ بدل کر مارچ کا آخری ہفتہ مقرر کر دیا گیا۔ اس رات مزار اور اس کے تمام احاطے میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر عوام میں یہ عرس میلہ چراغاں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ چراغاں کی بہار دیکھنے اور مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد لوگ تفریح کے لیے شالامار باغ میں چلے جاتے تھے جو بالکل ہی قریب واقع ہے۔ آہستہ آہستہ عرس کو تو لوگ بھول گئے اور اسے شالامار باغ کا میلہ ہی سمجھنے لگے۔ یہ میلہ پنجاب کا ایک قومی تہوار بن گیا ہے۔ جس میں شہری اور دیہاتی یکساں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے اس موقعہ پر مال مویشی کی منڈی بھی لگتی ہے اور اس میلہ کو ایک تجارتی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ——— مرتب]

شاہ ابوالمعالیؒ

دید کے قابل ہے شہ ابوالمعالی کا مزار
جس جگہ ہر اہل دل کو فاتحہ خواں دیکھئے

آپ کا اصل نام شاہ خیرالدین محمد اور مشہور شاہ ابوالمعالی تھا۔ سلسلۂ قادریہ کے نامی بزرگ تھے۔ رغربتی اور معالی تخلص تھا۔ فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔ صوفیانہ عقائد کی کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان تھے۔ رسالہ غوثیہ حضرت غوث الاعظم کی منقبت میں اور تحفۂ قادریہ ان کی کرامتوں کے اظہار میں لکھا۔ حلیۂ سرور دو عالم، گلدستہ باغ ارم، مونس جاں اور زعفران زار بھی آپ کی یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ایک قلمی نسخہ ہشت محفل نام موجود ہے جس میں آپ کے وہ ملفوظات ہیں جو آپ کے صاحبزادے محمد باقر نے جمع کیے تھے۔

[آپ کے بزرگ سادات کرمان سے تھے۔ اس لیے آپ کرمانی بھی کہلاتے تھے۔ ہسٹری آف لاہور کے مصنف سید محمد لطیف نے (صفحہ ۲۰۲ پر) پنجاب میں آپ کا وطن بھیرہ ضلع شاہ پور لکھا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبت اویسی رکھتے تھے آپ نے ان کا مرتبہ "اولیائے اولین و بعصرین و آخرین" میں سب سے بلند و بالا دکھایا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

جز دم قادرم نیست بہ خاطر حاضر
ہست در خیر دلشستم بزباں یا قادر

بلکہ آپ نے حضرت غوث پاکؒ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ بقول صاحب مقامات معالیہ اکثر مشائخ قادریہ چشتیہ سہروردیہ اس کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ جب کسی کو کوئی مشکل پیش آئے تو مغرب کے بعد اس قصیدہ کو پڑھے۔ کشائش رزق اور روشن ضمیری کے علاوہ ہر ایک مصیبت سے نجات پائے گا۔ اس قصیدہ کا نام مفرح الاتراح ہے۔ اگر کوئی خود نہ پڑھ سکتا ہو تو قصیدہ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہے اور اگر خواندہ ہے تو بھی کھڑا ہو کر پڑھے۔ قصیدہ کے چند ابیات حسب ذیل ہیں ؎

ہست دائم در طواف کعبۂ کوئش دلم — در رہ صدق و صفا ایں است حج اکبرم
چشم من تا از ہوائے خلد کوئش کوثر است — آب حسرت می خورد رضواں ز حوض کوثرم
چندروزے شد کہ محرومم ازاں رُو مردہ ام — جلوۂ جاں پرورم فرما کہ تا جاں پرورم
اے صبا از من بہ آں سلطان جیلانی بگو — سوختم اکنوں بیا بر بادۂ خاکسترم
بے جمال جاں فزایت زندگانی مشکل است — رحمتے ورنہ تن و ایں خرقہ باہم بدرم
نیست یا غوثے بہ من جرم و گنہ از ہیچ رُو — رُو مکش از من کہ بس بیدل خراب و اخترم

چیست در پیش کرم ہائے تو جرم غربتی
الکرم یا غوث الاعظم بالکرم الکرم

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اور حضرت کے فرزند کلاں سید شاہ محمد باقر نے فوائد دو جہانی میں آپ کی فضیلت اور آپ کی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ ۱۰ ذی الحجہ عید الضحیٰ کے دن ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کو بعہد جہانگیر وفات پا گئے۔ تاریخ لاہور کے مصنف نے آپ کا انتقال بعہد شاہجہان لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ آپ کے والد کا نام سید رحمت اللہ تھا جن کے دو اور بھائی تھے۔ ایک حضرت شیخ داؤد بندگیؒ جن کا مزار شیر گڈھ میں نہایت شاندار گنبد نما ہے۔ دوسرے سید جلال الدین جن کا مزار سندھ میں ہے۔ شاہ ابوالمعالیؒ اپنے چچا حضرت شیخ داؤد بندگیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انہی کے ارشاد سے شیر گڈھ کو خیر باد کہہ کر اکبر کے زمانہ میں لاہور آئے۔ عمارات و تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ شیر گڈھ سے لاہور تک اکثر مقامات میں آپ نے کنوئیں، تالاب اور باغ تعمیر کرائے۔ اس وقت بھی شیر گڈھ سے لاہور کے درمیان اکثر عمارات پختہ آپ سے یادگار ہیں۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیا (صفحہ ۱۴۹ پر) لکھتے ہیں :-

"از شیر گڈھ تا لاہور چند جا مقامات وے بہ عمارت پختہ اند و چھوک ہائے شاہ ابوالمعالی اشتہار دارند"

آپ کے فرزندوں میں شاہ محمد باقر صاحب علم و فضل گزرے ہیں۔ ان کی تصنیف فوائد دو جہانی زیادہ تر شاہ ابوالمعالیؒ کی کرامتوں اور پیری و مریدی کے تعلقات ہی سے وابستہ ہے۔ صاحب تذکرۃ العارفین نے بھی آپ کی اکثر کرامتیں درج کی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ملا شاہ بدخشانی کے دل میں جو دارا شکوہ کے مرشد تھے ایک دن خیال گزرا کہ میں دل و جان سے حضرت غوث الاعظمؓ کا معتقد ہوں۔ حضرت پیران دستگیرؒ کو بھی میرے اس اعتقاد کی خبر ہے کہ نہیں۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک لق و دق بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اتنے میں حضرت پیران پیر تشریف لائے۔ ایک دستار سفید عنایت فرما کر کہا: "اے ملا شاہ! ہم تمہارے حال سے بے خبر نہیں۔ اس کے ثبوت میں تمہارا سر برہنہ دیکھ کر یہ دستار تم کو عنایت کرتے ہیں۔ حضرت ملا شاہ فرماتے ہیں کہ جب میں صبح کے وقت خواب سے بیدار ہو کر گھر سے باہر نکلا تو حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کا ایک خادم مجھے بلانے کے لیے آ رہا تھا۔ جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایک دستار سفید مجھ کو عنایت فرمائی اور کہا "یہ دستار رات کو حضرت غوث الاعظمؓ نے آپ کو بخشی تھی"۔ ——— مرتب]

شاہ ابوالمعالیؒ کی وفات ۶۵ سال کی عمر میں ہوئی۔ اپنی زندگی ہی میں آپ نے اپنے مقبرہ کی تعمیر شروع کر دی تھی جس کی تکمیل آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند شاہ محمد باقر کے ہاتھوں ہوئی۔ شاہ محمد باقر ہی نے آپ کے مزار کا گنبد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے روضۂ مبارک کی طرز پر تعمیر کرایا۔ مقبرہ کے دو دروازے ہیں۔ ایک شمالی ایک جنوبی۔ جنوب رویہ دروازہ پر بہ خط عربی "إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا يَمُوْتُوْنَ بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ" لکھا ہوا ہے۔ مقبرہ کے آٹھ در کشادہ۔ چار بند کل بارہ جن میں سات کٹہرے لگے ہیں۔ بلند چبوترہ پہ قبر ہے جو زمین مقبرہ سے ۶ فٹ اونچی ہے۔ چبوترہ پر تین قبریں اور بھی ہیں۔ ایک شاہ ابوالمعالیؒ کے فرزند کلاں شاہ محمد باقر کی۔ ایک شاہ محمد رضا خلف شاہ محمد فاضل آپ کے پوتے کی۔ تیسری آپ کے نواسہ حاجی شاہ محمد فاضل کی ہے۔ اس سے علیحدہ ایک چار دیواری ہے جس میں حضرت کے عزیزوں کی قبریں ہیں۔

عہد شاہان سلف سے اس مزار کے ساتھ دو چاہ معہ اراضی ایک موضع سیالاں تحصیل چونیاں میں اور دوسرا موضع خان پور ضلع شیخوپورہ میں بطور معافی واگذار ہیں۔ ان کے علاوہ موضع جھلن وال میں بھی کچھ اراضی ہے اور یہ سب ان کی اولاد کی ذاتی جائداد تصور کی جا رہی ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے ارادت مندوں کی تعداد ہزارہا تک تھی۔ وہ ان کی زندگی میں بھی ان کی خدمت کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مزار پر چڑھاوے بھی شروع رہے اور ان کے جانشینوں کی خدمت گذاری بھی ہوتی رہی۔ مزار کے چڑھاووں کی آمدنی ان کی اولاد ذکور و اناث میں تقسیم ہوتی ہے وہ اس طرح کہ نواسے چودہ ایام کی آمدنی کے حقدار ہیں۔ باقی ایام ان کے پوتوں کے حصے میں آتے ہیں۔

آپ کے مزار پر عرصہ دراز سے چار میلے ہوتے ہیں۔ ایک عرس کا میلہ جو نواسوں کی طرف سے ۵ ربیع الاول اور پوتوں کی طرف سے ۶ ربیع الاول کو ہوتا ہے۔ پھر عیدین پر بھاری میلے لگتے ہیں جن میں بے شمار خلقت جمع ہوتی ہے۔ ایک میلہ شب برات کو بھی ہوتا ہے۔ ان ایام میں قوالی کا بھی خوب چرچا رہتا ہے۔ لوگ کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔ قوالی کے علاوہ اس مزار پر عیدین اور عرس کے دنوں میں طوائفوں کا ناچ بھی ہوتا تھا جس میں عوام کے علاوہ خواص بھی شریک ہوتے تھے بلکہ یہاں تک

کہ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی آتا رہا ہے۔

ایک مرتبہ عیدالفطر کے دن نواب مظفر خاں شہید والی ملتان کے فرزند نواب سرفراز خاں کو جو اپنے بھائی نواب ذوالفقار خاں کے ہمراہ لاہور میں مقیم تھے مہاراجہ نے شرق پور کا علاقہ جاگیر میں دے کر سہ پہر کے وقت روضۂ شاہ ابوالمعالی ؒ کی طرف کوچ کیا اس کی کیفیت صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھتے ہیں :-

"در تاریخ مذکور وقت سہ پہر سرکار دولتمدار بنا بر مشاہدہ اجتماع خلائق بہ تزک و تجمل
مالا کلام بہ طرف روضۂ شاہ ابوالمعالی متوجہ شدہ ۔ در مسجد بنا کردہ غوثہ خاں قیام
فرحت ارتسام آوردہ۔ تا سہ پاس بہ ملاحظہ تماشائے طوائف رقاصہ مشغول شد"

یہ فتح ملتان ۱۸۷۵ء کے بعد کا واقعہ ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں (جس کو آج ۱۹۴۴ء میں بوقت تحریر مضمون ساٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے) صفحہ ۲۸۸ پر لکھتے ہیں کہ عرس کے دنوں میں خلقت کا بے پناہ ہجوم رہتا ہے۔ پہلے روز رات کو چراغاں ہوتا ہے اور طوائف رقاصہ آ کر ناچتی ہیں۔ دوسرے دن قوالی ہوتی ہے۔

لیکن خدا بھلا کرے وزارت سکندری کا جس میں خانقاہوں اور مزاروں پر طوائفوں کے گانے بجانے کے خلاف قانون پاس ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اکثر بزرگان دین کے مزاروں پر طوائفوں کی وہ دھما چوکڑی ہوتی تھی اور ان کے دل پھینک قدر دانوں کی بدولت روپیہ کی بارش نہیں بلکہ ژالہ باری سے دین داریان اور شریعت اسلامیہ کی کھیتیاں تباہ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ قوالی کا سلسلہ تو اب بھی موجود ہے۔ لیکن مزارات کو ان بدعات اور تماشوں سے نجات مل چکی ہے۔

آج (۱۹۴۴ء) سے پچیس سال پیشتر حضرت شاہ ابوالمعالی ؒ کی اولاد سے ان کے سجادہ نشین سید طالب محی الدین عرف سید مہتاب شاہ قادری نے "کمالات قادریہ عرف مقامات معالیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو راقم کو بھی تحفتہً ملی تھی۔ اس کتاب میں بھی اولیاء اللہ کی کرامات۔ وظیفہ "شیئاً للہ" کی برکات۔ طالب و مرشد کے روحانی تعلقات اور پیری و مریدی کی ضرورت کا ذکر ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں کے منکر ہیں ان کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر مہر الٰہی (ختم اللہ علیٰ قلوبہم) ثبت کر کے اور ان کو گمراہ بیان کر کے مادر زاد اندھے لکھا گیا ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی ؒ کے مزار پر بے شمار کبوتر رہتے ہیں۔ ان کی رسم سب سے پہلے آپ کے ایک صاحبزادے شاہ محمد درویش المشہور بہ قعر پوش نے ڈالی تھی۔ رفتہ رفتہ رواج ہو گیا اور وہ جہانگیر کے زمانہ سے اب تک چلا آتا ہے۔

مقبرہ سے مغرب کی جانب آپ کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے جس کو سکھوں کے زمانہ میں غوثی خاں افسر توپ خانہ نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے اندر جو چوبی پنجرہ ہے وہ نور ایمان والہ گلے زئی زرین فروش نے آج (۱۹۴۴ء) سے ایک سو سال قبل بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ بعض اور لوگوں نے بھی دالان اور کمرے مختلف اوقات میں تعمیر کرائے۔

مزار کا گنبد مختلف قبروں سے گھرا ہوا ہے۔ جنوبی دروازہ کے اندر دائیں طرف حکیم مفتی سلیم اللہ خاں استاد الاطبا (وفات ۷ جنوری ۱۹۲۷ء مطابق ۵ رجب ۱۳۴۵ھ) کی قبر ہے۔ ان کے پاس ہی چودھری عزیز الدین کی قبر پر اشعار ذیل درج ہیں۔

یہ اشعار سید محمد حسین شاہ سالک سجادہ نشین آلو مہار ضلع سیالکوٹ کے کہے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب ساکن ضلع سیالکوٹ میں میرے ہم درس تو نہ تھے البتہ ہم مدرسہ تھے۔ صاحبزادہ فیض الحسن احراری انھیں کے فرزند ہیں ؎

حیف صد حیف چودھری عزیزالدین	از مریداں خاص شاہ امین
بہ حکم قضائے رب قدیر	رخت بستہ بسوئے خلد برین
بہر سالک ندائے کرد سروش	از وصالش غلام شد بہ زمین
	۱۳۳۶ھ

ان قبروں سے مشرق کی سمت ایک اور قدیم احاطہ ہے جس میں کئی قبریں ہیں۔

شاہ ابوالمعالیؒ کے مزار کے قرب و جوار میں بہت بڑا قبرستان تھا۔ یہیں زین خان کے محلات تھے۔ انہی محلات کے انہدام پر یہ مقام میدان زین خاں کہلایا۔ اسی میدان کو لوگوں نے قبرستان بنا دیا۔ راقم نے قبرستان اور اس کے میدان میں بارہا عیدین کے میلے دیکھے ہیں۔ اب قبرستان کو مٹا مٹا کر پھر یہاں گلی کوچے اور مکانات بن گئے۔ صرف حافظ ولی اللہ محدث کاشمیری کا مزار چوک میوہ منڈی سے ذرا آگے فلیمنگ روڈ پہ ایک معمولی سی چار دیواری میں سلامت رہ گیا ہے۔ اس چار دیواری میں پانچ سات قبریں ہیں۔ ایک ملنگ جاروب کش کر زنی میلش وہاں رہتا ہے۔ رہتا ہے اس مزار کی خدمت اور حافظ صاحب کا عرس حاجی قادر بخش مرحوم کے خاندان کی طرف سے ہوتا ہے

چوک شاہ ابوالمعالیؒ میں سرراہ ایک قدیم چار دیواری ہے جس کے اندر اور باہر نشیب میں ابو میہ شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ نشیب کی قبروں میں ایک قبر سلطان اسمٰعیل جان۔ ان کی اہلیہ اور شاہزادہ والا گوہر بیرسٹر (وفات ۲۳ فروری ۱۹۲۶ء) کی قبور ہیں۔ سلطان اسمٰعیل جان کی قبر کے تعویز پر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی طرف سے یہ قطعہ سال وفات درج ہے ؎

از جہاں شہزادہ اسماعیل رفت	آں امیر ابن امیر ابن امیر
از فلک آمد بگوشِ من ندا	سالِ آں مغفور از مغفور گیر
	۱۳۲۶ھ

شاہ شمس الدین

شاہ شمس الدین کے روضہ کا باغ خوشنما
بن گیا ہے آج جس عبرت کا ساماں دیکھئے

شاہ شمس الدین سلسلۂ قادریہ کے سادات میں حضرت شاہ ابو اسحاق دمزنگ کے مرید اور شاہ بلاول کے پیر بھائی تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں لاہور کے صوفیائے عظام میں شمار ہوتے تھے۔ جہانگیر ان کا بڑا احترام کرتا تھا اور شاہزادہ خرم (شاہجہان) بھی ان کا ارادت مند تھا۔ ۱۱ رجب ۱۰۲۱ھ کو بزمانہ جہانگیر وفات پا گئے۔ شاہجہان نے کہ اُن دنوں شاہزادہ تھا آپ کا روضہ تعمیر کرایا۔ روضہ کے چاروں گوشوں پہ چار مینار تھے جو مسمار ہو کر پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ قبر کا تعویذ جس پر سبز غلاف پڑا رہتا ہے۔ سنگ کار ہے۔ اور اس پر یہ دو شعر بہ خط نستعلیق تحریر ہیں ؎

چو شمس الملل زیں جہاں رخت بست	بیارامت ایزد بر اُنش بہشت
بہ جستم ز پیر خرد سال او	بگفت از سر لطف جا شنج بہشت

جب جہانگیر کو خبر ہوئی کہ حضرت کا انتقال ہو گیا ہے اور شاہزادہ خرم کے حکم سے ان کا مزار تعمیر ہو رہا ہے تو بادشاہ نے روضہ کے گرد ایک عالیشان باغ احداث کرایا۔ جو عہد محمد شاہی تک آباد تھا۔ اس کے بعد یہ باغ طوائف الملوکی اور شورش سکھاں کے ایام میں ناپید ہو گیا۔ مقبرہ ابھی تک موجود ہے اور گورنمنٹ ہاؤس اس مقبرہ کے قریب ہی ہے۔

باغ دلکشا[1] و مقبرہ جہانگیر

غنچۂ دل کھل گیا کھلتے ہی پھر مرجھا گیا
دلکشا میں فرحت و عبرت کا سامان دیکھئے

یہ باغ دراصل نواب مہدی قاسم خان نے جو اکبر کے معزز اور نامی سرداروں میں تھا۔ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء کے قریب دریائے راوی کے پار تعمیر کرایا۔ ان کے اقتدار کا اس سے اندازہ کر لو۔ کہ ان کا بھانجا حسین خان ٹکریہ لاہور کا گورنر رہا ہے۔

اس باغ کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ اپنے بانی کے نام سے باغ مہدی قاسم خان ہی اس کا نام تھا۔ نواب چونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لیے مہر النساء بیگم جب نور محل سے نور جہاں بنی تو اس نے اس باغ پر قبضہ کر لیا اور نام اس کا دلکشا[2] رکھا اور دل کھول کر اس میں عمارات کا اضافہ کیا اور اس کو وہ رونق دی کہ شالامار باغ سے پہلے اس کے مقابلہ کا کوئی باغ اُس وقت لاہور میں نہ تھا۔

جب باغ دلکشا میں جہانگیر دفن کیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگ باغ دلکشا کا نام بھول گئے۔ اور اس کا نام مقبرہ جہانگیر مشہور ہو گیا آج لاہور میں بہت کم لوگ ہیں جن کو یہ علم ہے کہ مقبرہ جہانگیر جس چار دیواری کے اندر واقع ہے اس کا نام کبھی باغ مہدی قاسم خان اور باغ دلکشا بھی تھا۔

چار دیواری کے اندر باغ کی زمین ایک سو بیگھ ہے۔ تیس بیگھ زمین عمارتی ہے۔ باغ کے اندر پختہ روشیں اور سڑکیں موجود ہیں۔ یہ عالیشان باغ خیابانوں فواروں حوضوں اور بارہ دریوں سے آراستہ ہے اور بلند و پختہ چار دیواری میں محدود ہے۔ غربی دیوار میں بہت بڑا دروازہ ہے جس میں سے ہاتھی معہ عماری گذر سکتا ہے۔ چار دیواری کے باہر چار بہت بڑے وسیع کنوئیں موجود تھے جن میں سے ایک کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال (۱۸۸۴ء میں) لکھتے ہیں دریا بُرد ہو چکا ہے۔ غربی دیوار کی طرف جو کنواں ہے وہ اب تک موجود ہے۔ اس کنوئیں میں اب ٹیوب ویل لگا دیا گیا ہے۔ جس سے باغ سیراب ہوتا ہے۔ یہ بڑا دروازہ جس میں سے ہاتھی معہ عماری گذر سکتا تھا ہمارے دیکھتے دیکھتے بند ہو گیا ہے۔ باغ کا اصل دروازہ یہی تھا۔ اس دروازہ کی عمارت سنگ سرخ کی تھی جس پر سنگ مرمر سے گل کاری کی گئی تھی۔ اوپر اللہ کا نام کندہ تھا۔ یہ دروازہ دو منزلہ ہے اور پچاس فٹ بلند ہے۔ اس کے چاروں گوشوں پر چھوٹے چھوٹے چار مینار ہیں۔ اس دروازے کے بالمقابل ایک بارہ دری تھی جو آج نابود ہے۔

---

[1] مفصل حالات کے لیے دیکھو راقم کی تصنیف "لاہور عہد مغلیہ میں"

[2] جج محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور صفحہ ۲۵۰ پر اس باغ کا نام باغ دل آمیز یا باغ دلکشا لکھا ہے۔

باغ کی مشرقی دیوار اور اس دیوار کی بارہ دری کو دریا نے برباد کر دیا۔

اس باغ کے اندر بارہ حوض تھے۔ ہر حوض میں فوارے پانی کی اچھل کود سے دل بہلاتے تھے۔ ایک حوض دریا برد ہو چکا ہے۔

اس باغ کے قدیم درختوں میں چند ایک درخت پیپل و برگد وغیرہ موجود ہیں۔ کھجوروں کے درخت بھی نسلاً بعد نسلاً قدیم نخلستان کی یاد دلاتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر اب نئے فیشن اور انگریزی طرز کے مطابق بہت سی نئی روشیں بھی بن گئی ہیں اور نئی قسم کے گل و گلزار بھی وہاں دکھائی دیتے ہیں۔

عہد محمد شاہی کا ایک شاعر میر عبدالعزیز زنجانی لاہوری اپنے ایک طویل قصیدہ میں جو لاہور کے باغات اور محلوں اور گلی کوچوں کے متعلق ہے۔ دلکشا کے متعلق لکھتا ہے:

به گلگشت نعیم از عبره خواہی دلکشا باغیست ‏ ‏ ‏ ‏ که ہر گل از نظاره رشک روئے حوریاں بینی

چو لیلیٰ لالہ را خنداں و مغرور چمپاں بینی ‏ ‏ ‏ ‏ چو مجنوں بید مجنوں را دل افگار و نواں بینی

بیان سبزه داین لالہ داین سایہ و این گل

ندارد آں لطافت ہا که وصفش در بیاں بینی

فصیل باغ کی دیواروں پر چاروں طرف ایک مسقف غلام گردش بنی ہوئی ہے جو شاہی باڈی گارڈ کے سپاہیوں اور خدام سلطنت کے قیام کے لیے مخصوص تھی۔

جہانگیر نے ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ باغ دلکشا کے عین وسط میں شاہجہان کے حکم سے اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ اس کے مصارف کے لیے جاگیر مقرر ہوئی۔ قرآن پڑھنے والے پانچ سو ملازم رکھے گئے۔ جو نوبت بہ نوبت جہانگیر کے مزار پر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ جب زوال سلطنت مغلیہ کے بعد سکھ حکومت کے عروج کا زمانہ آیا تو نہ جاگیر رہی نہ قرآن خواں حافظ رہے۔ مسلمانوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ مزاروں کا کیا خیال رکھتے۔

مزار ہشت پہلو اندر سے گنبد نما ہے۔ میانہ میں ایک چبوترہ سنگ مرمر کا عرضاً ۹ فٹ، طولاً ۱۳ فٹ اور ارتفاعاً ½ ۱ فٹ ہے۔ اس چبوترہ پر قبر کا تعویز سنگ مرمر کے ایک ٹکڑہ کا ہے۔ جو ½ ۲ فٹ بلند، پونے دو گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہے۔ چبوترہ اور قبر پر سنگ عقیق، سنگ لاجورد، سنگ سلیمانی، نیلم، زہر مہرہ، سنگ مرجان، سنگ ابری وغیرہ قیمتی پتھروں سے گلکاری کی ہوئی ہے۔ تعویز کے دائیں بائیں باری تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ سرہانے کی طرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر یہ آیت درج ہے "ھو الغفار الذنوب قال اللہ تبارک و تعالیٰ یا عبادی الذین اسرفو علیٰ انفسھم لا تقنطو من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم۔ ایک طرف کل نفس ذائقۃ الموت کی تمام آیت تحریر ہے۔ سر کی طرف لکھا ہے:۔ ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب و الشھادۃ ھو الرحمٰن الرحیم۔ پائینتی کی طرف یہ تحریر ہے۔ مرقد منور اعلیٰ حضرت غفران پناہ نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ ۱۰۳۷ھ

مقبرہ کا اندرونی فرش سنگ مرمر، سنگ مریم، سنگ موسیٰ، سنگ ابری وغیرہ کے مختلف پتھروں سے مزین ہے۔

جس طرح اس مقبرہ کی عمارت عالیشان تھی اور شاہی شان و شوکت کا اس سے اظہار ہوتا تھا ویسا ہی سکھوں نے اس کے ساتھ سنگدلی کا ثبوت دے کر اس کو عبرت انگیز بنا دیا۔ اس مقبرہ کو کس قدر صدمے پہنچے اور اس کے ساتھ سکھ حکومت نے کیا سلوک کیا۔ اس کی کیفیت رائے بہادر کنہیا لال کی تاریخ لاہور کے صفحات ۲۱۳ تا ۲۲۶ میں درج ہے۔ یہاں کچھ مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

مقبرہ کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیوں کے علاوہ شمع جلانے کے جو مرمریں ستون تھے۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اکھاڑ کر امرتسر پہنچائے گئے۔ اور دربار صاحب کے پل پر لگائے گئے۔ پھر اور مقامات سے جس قدر قیمتی پتھر اتروائے گئے وہاں چونے کا پلستر کرا دیا گیا۔ مقبرہ کا دروازہ مغرب کی جانب ہے اور مقبرہ کا کمرہ اوپر سے مسقف ہے۔ اس سقف کے اوپر بالائی چبوترہ پر پھر سنگ مرمر کی قبر بنائی گئی تھی جو نشان کے طور پر تھی۔ یہ دو نوں چھتیں سنگ مرمر کی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چھت کے اوپر بارہ دری تھی جو مہاراجہ کے حکم سے اتروا دی گئی۔ بعض کے خیال میں سوبھا سنگھ یا لہنا سنگھ حاکم لاہور نے یہ سلیں اتروائیں اور چونکہ اس طرح سے قبر بے پردہ ہو گئی تھی اور جب کبھی بارش ہوتی تھی تو قبر اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچتا تھا، اس لیے اس نے اس پر چوبی چھت بنوا دی۔[1]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے ارجن سنگھ پسر ہری سنگھ نلوہ بھی اس جگہ کچھ عرصہ مقیم رہا۔ اس کے ایام قیام بھی اس عمارت کے لیے ہولناک زلزلے سے کم نہ تھے۔ اس نے کئی جگہ سے سنگ مرمر کی جالیاں اکھڑوا لیں۔ پھر مہاراجہ نے یہ مقبرہ اپنے فرانسیسی فوجی افسر جنرل امائر کو رہنے کے لیے دیا۔ جس کی وفات کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کی اس فلک پایہ عمارت کو برباد کرنا شروع کیا۔ یعنی جب امیر دوست محمد خاں والیٔ افغانستان کا بھائی سردار سلطان محمد خاں بھائی سے ناراض ہو کر لاہور آیا تو مہاراجہ نے اس کو شاہدرہ جاگیر میں دے کر یہ باغ اور مقبرہ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ چند سال اس باغ اور مقبرہ کی عمارتوں میں رہا۔ اندر کی دیواروں میں جس قدر نگینے تھے اس کے ہمراہی وحشی افغانوں نے پتھر توڑ کر ان کو نکال لیا اور باغ کو اپنی بے تمیزی اور گھوڑوں اور جانوروں کا اصطبل بنا کر خراب کر دیا۔

ان صدمات کے باوجود مقبرہ اور اس کی عمارت کی خوش اسلوبی، استقامت، پائداری اور سنگینی دیکھ کر معمار خود حیران رہ جاتا ہے۔

مقبرہ کے اوپر جانے کے لیے چاروں طرف سنگ سرخ کے زینے بنے ہوئے ہیں۔ چاروں گوشوں پہ چار برج ہیں اور ہر برج پہ ایک ایک مینار۔ ہر مینار سو فٹ بلند ہے اور اس میں اکسٹھ سیڑھیاں ہیں۔ ہر مینار کی ہر ایک کھڑکی میں جو ہوا اور روشنی کے لیے ہے۔ سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے تھے۔ وہ بھی مہاراجہ نے اکھڑوا لیے اور ان کی جگہ خشتی چونے کے کٹہرے بنوا دیئے۔

مقبرہ کی عمارت ایک سنگین مربع چبوترے پر ہے جس کا ہر ضلع ۲۶۰ فٹ ہے۔ یہ پانچ فٹ بلند ہے۔

---

[1] یہ چوبی چھت نہایت بدنما تھی اور ایسی نفیس عمارت میں بڑی بد مذاقی کا ثبوت دیتی تھی۔ اس لیے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۱۰ء میں اسے گرا دیا اور چھت کو سنگ مرمر کی سلوں سے ڈھک دیا۔ (مرتب)

الحاق پنجاب کے بعد انگریز حکام نے سنہ ۱۸۸۹-۹۱ء میں مقبرہ کی مرمت کرائی جس پر ساڑھے بارہ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس کے بعد بھی مرمت کا کام جاری رکھنے کے لیے اکتالیس ہزار چھ سو روپیہ کی منظوری دی گئی۔ انھوں نے چھت کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیاں لگوائیں۔ باغ از سر نو آباد کیا۔ مقبرہ کی بالائی چھت جو لکڑی کی بنائی گئی تھی، بالکل خراب ہو گئی تھی۔ رائے بہادر کنہیا لال اگزیکٹو انجنیئر و مولف تاریخ لاہور کی معرفت کئی ہزار روپے کی لاگت سے مرمت کرائی گئی۔ جب دریا اس باغ اور مقبرہ کی چار دیواری سے ٹکرانے لگا تو گورنمنٹ انگریزی نے کئی ہزار روپیہ خرچ کر کے ایک بند بنوایا جس سے مقبرہ آئندہ کے لیے غرقابی کے اندیشہ سے بچ گیا۔

لیڈی ڈفرن نے جب وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے ہمراہ اپریل ۱۸۸۶ء میں لاہور کی سیاحت کی تو اس نے مقبرہ کے متعلق اپنی والدہ کو خط میں لکھا: —

"مقبرہ بھی ایک بڑی مربع عمارت ہے جس کے کونوں پر چار بلند مینار ہیں۔ اس کے سقف اور برآمدے نقش و نگار سے خوب آراستہ ہیں اور مقبرہ میں داخل ہونے کے تمام راستوں میں تراشے ہوئے اور جالی دار مرمریں دروازے ہیں۔ قبر سفید ہے اور اس میں اطالوی وضع پر رنگین مرمر کے ٹکڑوں کا کام کیا گیا ہے۔ اس عمارت کی چھت بھی مرمریں ہے۔ پھر ہم اس سے اور بھی اوپر ایک مینارے کی آخری حد تک شہر کے نظارے کے لیے پہنچے۔ یہ واقعی ہمارے لیے ایک ناشائستہ اور نازیبا امر تھا کہ جہانگیر کی قبر کے اوپر ہم جائے نوشی کرتے لیکن ہم نے ایسا کیا اور اس نظارے سے لطف اندوز ہوئے۔"

[قیام پاکستان کے بعد ہماری اپنی حکومت نے اس مقبرہ کی مرمت کے لیے پونے دو لاکھ روپیہ کی منظوری دی۔ لیکن چونکہ سنگ مرمر، سنگ احمر، سنگ خطوط، سنگ بادل اور سنگ سیاہ پاکستان میں دستیاب نہ ہوتے تھے۔ اس لیے یہ ہندوستان سے درآمد کیے گئے۔ ان کے پہنچنے میں کچھ دیر لگی۔ اس دوران مقبرہ کے مینار کا ایک چھجا خود بخود گر گیا جس کی وجہ سے سیر کرنے والوں میں سے ایک مرد ایک عورت ہلاک اور پانچ چھ افراد مجروح ہو گئے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کے بعد میناروں میں داخلہ بند کر دیا اور خطرے کے نشانات بھی نصب کر دیے۔ اب مرمت کے بعد یہ مینار اپنی اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور مقبرہ کے دوسرے حصوں میں کافی اصلاح ہوئی ہے۔

اس باغ میں ہر سال بار کا میلہ نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر گرمیوں میں آتا ہے۔ جب آفتاب کی حدت جوبن پر ہوتی ہے۔ دھوبی اور شہر کے بے فکرے اس میں بکثرت حصہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر اتوار کو اکثر شرفا اور سیاحت پسند لوگ پارٹیاں بنا کر تفریح طبع کے لیے اس باغ میں آتے ہیں اور دوپہر کا کھانا اسی جگہ کھا کر شام کو واپس جاتے ہیں، اہل اخبارات میں سے کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کا برسوں تک یہ معمول رہا کہ وہ ہر سال اپنے عملے اور کارخانہ کے ملازمین کو مقبرہ جہانگیر میں ایک شاندار دعوت دیتا۔ اب چند برسوں سے اخبار کے ساتھ یہ دستور بھی بند ہے۔

۷ جنوری ۱۹۲۳ء کی سہ پہر کو اس باغ میں ایک عظیم الشان گارڈن پارٹی منعقد ہوئی جس میں چھ سات سو معزز اصحاب لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ وغیرہ مقامات سے مدعو تھے۔ سرجان مینارڈ، لارڈ میکلیگن گورنر پنجاب معہ اپنے وزرا کے پرنسس دیپ سنگھو (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی) ہائی کورٹ کے جج، اعلیٰ عہدیدار، خطاب یافتہ رؤسا، راجے، نواب، پنجاب کونسل کے ممبر، ڈاکٹر، وکیل، مدیران اخبارات، شعرا غرض ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ یہ پارٹی معززین لاہور نے حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو نائٹ (سر) کا معزز خطاب ملنے کی خوشی میں دی تھی۔

اب مقبرہ جہانگیر اور اس قسم کی دوسری شاہی عمارتوں اور باغوں میں تفریحی پارٹیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بلکہ کئی قسم کی پابندیاں لگا دی گئی ہیں ——— مرتب]

شیخ حسین جامی

جس کا اک ادنےٰ سا خادم تھا شہ ہندوستان
قبر اس جامی کی عبرت گاہ انساں دیکھئے

جہانگیر کے عہد میں یہ بزرگ لاہور کے نامور علما میں شمار ہوتے تھے ان کا درس بھی جاری تھا۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں بڑے ادب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"میری تخت نشینی سے چھ مہینے قبل (۱۰۱۴ھ میں) شیخ حسین جامی نے جو درویش شیرازی کے مریدوں میں ہے اور اس وقت مسند درویشی پر متمکن ہے۔ مجھے لکھا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ اولیائے بزرگ اور دوسرے حضرات نے سلطنت ہندوستان کا بوجھ آپ کے کندھوں پر رکھا ہے۔ آپ اس خوش خبری سے قوی دل اور مطمئن ہو کر فتوح غیب کے منتظر رہیں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب سلیم نے باپ سے ناراض ہو کر بغاوت پر کمر باندھی ہوئی تھی اور الہ آباد میں مقیم تھا۔ اس کے ساتھ ہی مولینا جامی نے بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ جب خداوند کریم آپ کو سلطنت عطا کرے تو خواجہ زکریا جو سلسلہ احرار سے ہے اس کی تقصیرات پر عفو کا قلم پھیر دیا جائے۔

جب جہانگیر تخت نشین ہو گیا۔ تو اس کو اپنے فرزند خسرو کی بغاوت اور شورش دبانے کے لیے آگرہ سے لاہور تک آنا پڑا۔ وہ یہاں آکر حسین جامی سے بھی ملا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"کابل جانے سے پیشتر میں نے شیخ حسین جامی سے ملاقات کی اور چونکہ اس نے مجھے خواب کے ذریعہ تخت کی بشارت دی تھی اور اس کی خواہش بھی ظاہر ہو گئی تھی اس لیے میں نے اس کی خانقاہ کے لنگر خانہ کے لیے بیس لاکھ درم جو چالیس ہزار روپیہ کے قریب ہوتے تھے مقرر کئے۔"

جہانگیر کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولینا جامی صرف مولوی اور مدرس ہی نہیں تھے بلکہ صاحبِ دل اور روشن ضمیر درویش بھی تھے اور اُن کے ہاں ایک لنگر خانہ بھی تھا جہاں فقرا اور مسافروں کا قیام رہتا تھا۔

ان کی تاریخ وفات کا کہیں ذکر نہیں۔ تحقیقات چشتی (ص ۱۷۵) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قبر قبرستان میانی کی ایک چار دیواری کے اندر زبان زد روز ہے۔ اس کے گوشہ شمالی و مشرقی میں ایک چبوترہ مع دیوار مسجد ہے جس کے ساتھ ایک کنواں چرخی دار بہت قدیمی اور غالباً اسی زمانہ کا ہے۔ مولینا جامی کی قبر حضرت طاہر بندگی کی چار دیواری سے شمال و مشرق کی جانب ہے اور ایک محراب دار دیوار مسجد کے نشان سے ذرا آگے ہے۔

فیض باغ[1]

باغ کے مٹنے پہ روتے ہیں زمین و آسماں
سیل دریا دیکھئے اور ابر گریاں دیکھئے

دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں صرف اتنا لکھا ہے۔ "فیض کے باغ میں جہاں اب دل آرام کی دایہ کا مقبرہ ہے باؤلی کے اُوپر حضرت میاں میر یادِ حق میں مشغول ہوا کرتے تھے۔" اس سے زیادہ اس باغ کے متعلق اور کچھ نہیں معلوم۔ فیض کون تھا؟ دل آرام کون تھی؟ جس کی دایہ بھی اتنی مشہور رہتی کہ شہنشاہ ہندوستان کا ولی عہد اس کا حوالہ دیتا ہے۔ پھر اس کا مقبرہ، یقیناً اس کی عمارت شاہجہانی یا جہانگیری عہد کی یادگار ہوگی۔ وہ باغ وہ مقبرہ کہاں تھا؟ اللہ اکبر ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

دل آرام کے متعلق کتابوں میں ایک غیر مستند واقعہ درج ہے۔ کسی نے اس کو شاہ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران کی بیوی لکھا ہے لیکن مصنف مشاہیر نسواں (مولانا محمد عباس ایم۔ اے) تذکرہ بہار کے حوالہ سے اس کو جہانگیر کی ایک بیگم لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ واقعہ منسوب کرتے ہیں۔ جس میں جہانگیر کسی شاہزادہ کے ساتھ اس شرط پر شطرنج کھیلتا ہے کہ جو ہار جائے وہ اپنی بیوی دوسرے کے حوالے کر دے۔ یہ واقعہ پایۂ ثبوت سے گرا ہوا ہے نہ جہانگیر سے اس قسم کی توقع ہو سکتی ہے۔ اور نہ کسی مستند تاریخ میں اس کا ذکر ہے۔ البتہ دلچسپی کے طور پر اخباروں اور رسالوں سے نقل ہوتا ہوا بعض کتابوں میں درج ہو گیا ہے[2]۔

نواب مرتضےٰ خاں

جس کے گل بوٹے کبھی رشکِ بہارِ خلد تھے ۔۔۔ آج وہ ناپید باغ مرتضیٰ خاں دیکھئے

اصل نام شیخ فرید بخاری وطن تھا اس لیے فرید بخاری کہلاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں ہزار پانصدی کے منصب پر تھے۔

---

[1] فیض باغ کے نام سے جو بستی شہر لاہور سے مشرق کی طرف ریلوے پل کے پار نئی آباد ہوئی ہے اس کا ذکر علیحدہ درج ہوگا۔
[2] ملاحظہ ہو کتاب زمانہ حاضر جابیاں مطبوعہ لاہور ۱۹۲۲ء

جہانگیر ان کے متعلق لکھتا ہے: ۔

"شیخ فرید میرے باپ کے عہد میں میر بخشی تھا۔ میں نے ۱۲؍محرم ۱۰۱۴ھ کو اُسے پنجاب کا صوبہ جو تمام ممالکِ محروسہ میں سب سے بڑا صوبہ ہے مقرر کیا اور شال خاصہ عنایت کی۔"

کارنامہ جہانگیری میں لکھا ہے کہ جہانگیر نے اس کو خلعت و شمشیر مرصع و دوات قلم مرصع عنایت کرنے کے علاوہ یہ کہہ کر بھی اس کی سرافرازی کی کہ میں تجھ کو صاحب السیف والقلم تصور کرتا ہوں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ فرید دونوں باتوں کی اہمیت رکھتا تھا چنانچہ خسرو (فرزند جہانگیر) کی بغاوت میں جو شجاعت اور پامردی اُس نے دکھائی اور جس طرح وہ خسرو کو گرفتار کرکے بادشاہ کے پاس جو باغ میرزا کامران میں مقیم تھا لایا اس فتح عظیم پر بادشاہ نے اس کو مرتضےٰ خاں کے خطاب کے علاوہ پنج ہزاری منصب اور نقارہ اور علم اور اسپ مع ساز و کمربند مرصع عنایت کیا۔

۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء کے واقعات میں جہانگیر لکھتا ہے کہ قلیچ خاں کو پنجاب کی صوبیداری سے واپس بلا کر میں نے پھر مرتضیٰ خاں کو پنجاب کی نظامت دینے کا حکم جاری کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے درمیان میں وہ کسی اور خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کے واقعات میں لکھا ہے کہ مرتضیٰ خاں حاکم پنجاب نے ایک سو سے کچھ زیادہ زربفت کے تھان اور عراقی اور ترکی گھوڑے لاہور سے بھیجے۔ اسی سال کہ ۱۱ جلوس جہانگیری تھا۔ مرتضیٰ خاں کو فتح کانگڑہ کا حکم دیا گیا۔ وہ فوج قاہرہ لے کر کانگڑہ پہنچا لیکن ابھی مہم سر نہ ہوئی تھی کہ وہ اسی دوران میں انتقال کر گیا۔

جہانگیر اس کی وفات پر لکھتا ہے: ۔

"۳؍ربیع الاول کو مجھے مرتضیٰ خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ میرے قدیمان دولت میں سے تھا میں نے اس کا منصب ششش ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار تک پہنچایا تھا۔ اور اس کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا تھا مجھے اس کی وفات کی خبر ناخوش سے بہت صدمہ ہوا۔"

نواب مرتضیٰ خاں نے اپنی عمر کا کافی حصہ لاہور میں گذرا یہاں اُس نے ایک عظیم الشان باغ بھی تیار کیا تھا۔ داراشکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے یہ باغ ہوشیار خان کے باغ کی مشرقی جانب۔ شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر کے نزدیک واقع ہے۔ لیکن اب اُسے باغ وزیر خاں کہتے ہیں۔

مرتضیٰ خاں نے اپنا باغ عہد جہانگیری میں تعیر کرایا لیکن معلوم ہوتا ہے وہ لاولد مرا۔ اُس کی کسی اولاد کا نہ جہانگیر نے ذکر کیا ہے اور نہ کسی اور نے۔ اس لیے باغ لاوارث ہو کر شاہجہان کے زمانہ میں نواب وزیر خاں کے قبضے میں آگیا۔

چونکہ عہد موجودہ میں پنجاب پبلک لائبریری بارہ دری نواب وزیر خاں کا دوسرا نام ہے اور یہ بارہ دری باغ وزیر خاں کے عین وسط میں ہے اور باغ وزیر خان۔ باغ مرتضیٰ خاں کے کھنڈروں پر آباد ہے اس لیے باغ مرتضیٰ اُسی جگہ تھا جہاں آج پبلک لائبریری ہے۔ باغ ہوشیار خان کے محل وقوع کا علم نہیں ہو سکا نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کون تھا یہ نام اس قسم

کا ہے کہ عہد مغلیہ کا ایک خطاب معلوم ہوتا ہے غالباً اصل نام اور کچھ ہوگا۔

شہزادہ پرویز

جب کلی ہنستی ہوئی یا گل کو خنداں دیکھئے
میرے ویراں باغ میں شبنم کو گریاں دیکھئے

شاہزادہ پرویز جہانگیر[1] کا بیٹا اور شاہجہان کا بھائی تھا۔ باپ کے حکم سے راجپوتانہ اور دکن کی مہمات میں سپہ سالاری کرتا رہا۔ جب شاہجہان نے بعالم شاہزادگی کہ اُس وقت شاہزادہ خرم کہلاتا تھا چغتائی وراثت کا ثبوت دیا یعنی باپ سے بغاوت کی۔ تو جہانگیر نے پرویز کو چالیس ہزار فوج۔ بہت بڑا توپ خانہ اور بیس لاکھ کا خزانہ دے کر اُس کی تنبیہ کے لیے بھیجا۔ داراشکوہ جو پرویز کا بھتیجا اور داماد[2] تھا۔ سکینۃ الاولیا میں شاہزادہ مذکور کے ایک باغ کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے اس باغ کی عمارت میں حضرت میاں میر کبھی کبھی تشریف لاتے اور یادِ حق میں مشغول ہوتے تھے۔

تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع کوٹ خواجہ سعید (متصل لاہور) میں شاہزادہ پرویز نے ایک نادر باغ لگایا تھا اور یہاں رفتہ رفتہ اس قدر رونق ہو گئی تھی کہ باغ کا منصلہ علاقہ محلہ سے ترقی کر کے ایک موضع کہلا رہا تھا اور یہاں جو منڈی[3] تھی وہ پرویز آباد کہلاتی تھی۔

تحقیقات چشتی میں مولوی نور احمد چشتی اور تاریخ لاہور میں رائے بہادر کنہیا لعل لکھتے ہیں کہ موضع خوجہ سعید میں شاہزادہ پرویز کا یہ مقبرہ اندر باہر سے سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا اس کے فرش میں بھی سنگ مرمر ہی تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے یہ تمام سنگ مرمر اُتار کر دربار صاحب امرتسر بھیجا گیا۔ اور یہاں معمولی اینٹوں سے مرمت کرادی گئی۔ رائے کنہیا لال لکھتے ہیں چونکہ یہ مرمت بھی قابل مرمت ہو چکی تھی اس لیے سرکار نے میری معرفت اس کی مرمت کرائی۔

یہ تو صحیح ہے کہ یہ مقبرہ نہایت عالیشان تھا۔ اور یہ عمارت عہد شاہجہانی کی یادگار ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ اس مقبرہ میں شاہزادہ پرویز دفن ہے۔ اس کے علاوہ مصنف تاریخ لاہور لکھتے ہیں۔ پرویز باپ (جہانگیر) کی وفات کے بعد سفر کشمیر سے واپس آرہا تھا اور لاہور پہنچا ہی تھا کہ آصف جاہ نے اُسے قتل کرادیا۔ تحقیقات چشتی کا مصنف سنہ وفات اس شاہزادہ کا ۱۰۸۱ھ (بعہد عالمگیر) لکھتا ہے یہ دونوں باتیں واقعات کے خلاف ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں جب جہانگیر کابل

---

[1] مصنف تحقیقات چشتی نے صفحہ ۸۵۵ میں پرویز کو شاہجہان کا فرزند لکھا ہے جو غلط ہے۔

[2] داراشکوہ کی شادی ۱۰۴۲ھ میں پرویز کی لڑکی سے ہوئی تھی۔

[3] باغ راجہ تیجا سنگھ عرف باغ راجہ شیخوپورہ کے متصل اب بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آتے ہیں جن پر ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ریزوں اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں کچھ آبادی تھی۔ یہیں ایک قدیم چاہ ہے جس کی اندرونی دیواروں میں ایک برگد (بڑھ) کا اور ایک پیپل کا درخت ہے کنواں غیر آباد ہے۔

سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو اُس کو دکن کی تحریروں سے شاہزادہ پرویز کے متعلق یہ خبریں ملیں کہ "کثرت شراب کی وجہ سے وہ دردِ قولنج میں کچھ عرصہ مبتلا رہ کر آخر ۶ صفر ۱۰۳۵ھ کو انتقال کر گیا[1]" شاہزادہ پرویز اس کی تاریخ وفات ہے ۱۰۳۵ھ کی پیدائش کے مطابق اس کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی تھی۔ دکن سے لاش اس کی آگرہ میں لائی گئی جہاں اپنے باغ میں وہ دفن کیا گیا[2] غرض نہ اُس کی قبر لاہور میں ہے اور نہ وہ ۱۰۸۱ھ میں مرا ہے اور نہ لاہور میں وہ فوت ہوا ہے۔ یہ بھی اسی قسم کی ایک دلچسپ "مؤرخانہ غلطی" ہے جس طرح شہزادی زیب النساء کا مقبرہ اب تک نواں کوٹ (لاہور) میں بیان کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ تحقیقات چشتی وغیرہ میں درج ہے حالانکہ اس کا مقبرہ دہلی کے تیس ہزاری باغ میں ہے۔

یہ دونوں مصنف اپنی تاریخوں میں شاہزادہ کا مقبرہ لاہور میں بتاتے ہیں حالانکہ وہ لاہور میں نہیں ہے لیکن اُس کے باغ لاہور کا پتہ نہیں بتاتے جو درحقیقت آگرہ کی طرح لاہور میں بھی تھا۔ دارا شکوہ جو شاہزادہ کا داماد اور شاہجہان کا فرزند اکبر تھا اپنی کتاب میں اس کے عالیشان باغ اور اس کی عمارات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "حضرت میاں جیو صاحب (یعنی حضرت میاں میر) دن کے وقت اپنے آدمیوں کے ساتھ باغیچہ موانی اجل کی عمارت میں بھی جایا کرتے تھے جو سلطان پرویز کے باغ کے نزدیک ہے۔" پرویز شہنشاہ ہندوستان کا فرزند تھا۔ جوانی کا عالم۔ مناظر قدرت کا عاشق۔ دولت کی افراط۔ اقبال جہانگیری کا سایہ اس سے سمجھ لو۔ باغ کس پایہ کا ہوگا اور اس میں کیسی کیسی خوشنما عمارتیں تعمیر ہوئی ہوں گی جن کا آج نشان تک بھی وہاں نظر نہیں آتا۔

اس مقبرہ سے جس کے کچھ آثار باقی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی عالی جاہ ہستی اپنی آخری آرام گاہ سمجھ کر لیٹی ہوئی ہے۔ لیکن اُس رفیع المنزلت ہستی کا نام کیا ہے اس کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ راقم نے ۱۹۲۳ء میں اور اس سے قبل اس گنبد کو بارہا دیکھا ہے۔ گنبد ہشت پہلو ہے۔ قبر کچی ہے اور تعویز قبر جو سنگ مرمر کا تھا غائب ہے۔ قبر تک جانے کے لیے مشرق کی طرف شمالاً جنوباً سیڑھیاں ہیں جنوب کی طرف سات اور شمال کی طرف پانچ اور وہ بھی شکستہ۔ مقبرہ کا چبوترہ سطح زمین سے پانچ فٹ بلند ہے۔ سیڑھیوں کے سامنے شمال کی طرف دور تک ایک پختہ فرش کے نشان نظر آتے ہیں چبوترہ کے نیچے چاروں طرف زمین نشیب میں ہے۔ ایک پختہ نہر کے آثار بھی موجود ہیں جو باغ راجہ تیجا سنگھ تک چلی جاتی ہے۔

راقم ۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء کو پھر اس نامعلوم ہستی کے مقبرہ کو دیکھنے کے لیے گیا۔ ۱۹۲۳ء کے زمانہ سے حالات بالکل مختلف تھے۔ قبر جو سنگ مرمر کے اُتارے جانے سے خراب حالت میں تھی۔ چوہدری محمد حسین سکنہ خاص سمانہ ضلع گوجرانوالہ نے اس کی مرمت کرا کر اس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی پر یہ عبارت لکھوا رکھی تھی:۔

"دارا شکوہ بھائی عالمگیر شاہجہان کا بیٹا۔ خاندان قادری ۱۰۶۹ھ"

گنبد کے اندر کا فرش بھی اس دردمند شخص نے پختہ بنوا دیا ہے۔ لیکن گنبد کے باہر جو قدیم پختہ فرش ہے اس کی حالت بہت خستہ و خراب ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جو سیڑھیاں نظر آتی تھیں ۱۹۴۴ء میں ان کا کوئی وجود نظر نہ آیا۔ گنبد زراعتی زمین سے گھرا ہوا ہے اور یہ زمین گنبد کی سطح سے کافی نشیب میں ہے۔

---

[1]، [2] کارنامہ جہانگیری جس کا حوالہ مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان جلد ششم صفحہ ۲۲۲ سے لیا گیا ہے۔

چودھری محمد حسین نے "صاحب قبر" کا نام دارا شکوہ بتانے اور لکھنے میں سخت تاریخی غلطی کی ہے۔ ان کو شاید معلوم نہیں کہ دارا شکوہ دہلی میں قتل کیا گیا اور وہیں مقبرہ ہمایوں میں وہ دفن کیا گیا۔ اس گنبد میں جو عالی جاہ ہستی دفن ہے وہ ضرور خاندان شاہی سے تعلق رکھتی ہے لیکن نام اس کا معلوم نہیں ہو سکا اور غالباً اسی سبب سے یہ مقبرہ محکمہ آثار قدیمہ کی حفاظت میں نہیں آ سکا۔ اس گنبد کے سامنے ایک اور گنبد نظر آتا ہے جو اس سے کچھ بڑا ہے۔ اس کے چار بڑے بڑے محرابی در ہیں۔ گنبد کے اندر پختہ فرش اب تک موجود ہے۔ قبر بھی پختہ ہے لیکن بالکل شکستہ اور بوسیدہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گرد جو سنگ مرمر تھا اس کو اتارتے ہوئے قبر کی اینٹوں کو بھی توڑ دیا گیا۔ گنبد کی اندرونی دیواروں پر اب تک قدیم نقوش کے کچھ نہ کچھ آثار موجود ہیں۔ گنبد کا بیرونی چبوترہ نابود ہو رہا ہے۔ گنبد کے اوپر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چار میناریاں ہیں۔ یہ گنبد بھی موضع کوٹ خواجہ سعید کی حدود میں واقع ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ مقبرہ دارا شکوہ کی دائی کا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔ نہ کوئی معتبر روایت اس کے متعلق کسی اور سے سنی ہے۔

یہ دونوں گنبد جو عہد جہانگیری و شاہجہانی کی یادگار ہیں اور جن کے اندر یقیناً معزز ہستیاں آرام کر رہی ہیں — اگر محکمہ آثار قدیمہ کے ماتحت آجاتے۔ تو تھوڑی سی لاگت سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ سکتے تھے۔ لیکن اب تو حوادث روزگار سے زیادہ دیر تک بچتے نظر نہیں آتے۔

انارکلی۔

ذرہ ذرہ آئینہ ہے انقلاب دہر کا
چشم عبرت سے اگر دنیا کو اے جاں دیکھئے

انارکلی کا نام زمانہ اکبری کے یوروپین سیاحوں کے علاوہ لاہور کے مصنفوں میں مصنف تحقیقات چشتی مصنف تاریخ لاہور اور مصنف ہسٹری آف لاہور نے لکھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے سنہ ۱۸۹۹ء میں راقم نے انارکلی کے نام سے ایک ناول لکھا اسی ناول کی بنیاد پر ڈھاکہ کے ایک بنگالی ڈرامہ نویس نے ایک تھیئٹر کے لیے ڈرامہ تصنیف کیا اور سب سے آخر سید امتیاز علی تاج نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر ایک ضخیم ڈرامہ لکھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود محققین کے نزدیک انارکلی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا اس کی حقیقت ایک افسانہ سے زیادہ نہ تھی۔

اس افسانہ کی بنیاد سب سے پہلے عہد اکبری و جہانگیری کے یورپین سیاحوں نے رکھی جن میں ولیم فنچ - ایڈورڈ ٹیری اور ہربرٹ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ہربرٹ لکھتا ہے "اکبر کی ایک چہیتی بی بی کا نام انار تھا۔ جہانگیر نے اس سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی اکبر کو خبر ہوئی بڑا طیش آیا۔ لیکن جہانگیر (سلیم) کے معافی مانگنے پر معاف کر دینے کا وعدہ کر کے بادشاہ اس کو حرم سرا میں لے آیا۔ حرم سرا میں آتے ہی پھر طیش آ گیا اور بیٹے کو ایسے مکے مارے کہ وہ گر پڑا اور کہا اے احمق اور گدھے تو نے کس طرح میرے وعدے پر یقین کر لیا۔" یہ انگریز سنہ ۱۶۲۶ء میں یعنی وفات اکبر سے اکیس سال بعد ہندوستان آیا تھا۔

ولیم فنچ جو سنہ ۱۶۱۱ء میں اکبر کی وفات سے چھ سال کے بعد ہندوستان آیا۔ ہربرٹ سے بھی دو قدم آگے چلتا ہے۔

وہ لکھتا ہے:-

"شیخ فرید کی مسجد کے پاس شہر کے باہر ایک بہت بڑی عمارت کھڑی ہے یہ شاہزادہ دانیال کی ماں کا مزار ہے جس کا نام انار کلی تھا اور اکبر کی بی بی تھی۔ شہزادہ سلیم کی نیت اس کے متعلق کچھ اچھی نہ تھی بادشاہ نے اس کو محل کی دیوار میں زندہ چنوا دیا۔ اور اس پر جہانگیر نے بادشاہ ہو کر اپنی محبت کی یاد میں ایک بہت عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔"

بعض مصنفوں نے انار کلی کا اصل نام نادرہ بیگم یا شرف النسا بیگم لکھا ہے۔ اور انار کلی کی وجہ تسمیہ میں رقم طراز ہیں کہ اکبر کی جے پوری رانی (امبیر رانی) نے اس کا رقص دیکھ کر اس کو انار کلی کا خطاب دیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ خود بادشاہ نے اس کو انارکلی کا خطاب دیا تھا۔

ان مصنفوں کے ایک ایک لفظ کی تردید پنجاب کے مشہور محقق و مؤرخ مولینا علم الدین سالک ایم۔ اے نے بڑی قابلیت سے کی ہے۔ ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد اکبری کے معاصر مؤرخین ابوالفضل۔ عبدالقادر بدایونی اور بخشی نظام الدین احمد کسی نے بھی اس واقعہ کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ ان میں عبدالقادر بدایونی بے باک نویسی میں تیغ برہنہ تھا۔ وہ ابوالفضل اور فیضی اور ٹوڈرمل اور بیربر تو کجا بادشاہ تک کو بھی اپنی شمشیر قلم اور تیغ زبان سے گھائل کر جاتا تھا۔ دربار اکبری کا یہ نکتہ چین مؤرخ اس قسم کا واقعہ دیکھ کر کہ ایک عورت ذات کو محبت کی پاداش میں دیوار میں زندہ چنوا دے کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔

پھر قریب العہد مؤرخین میں بزمانہ جہانگیر مصنف اقبال نامہ جہانگیری مصنف مآثر جہانگیری مصنف ریاض الشعرا والہ داغستانی اور خوافی خاں وغیرہ کئی مصنف گذرے ہیں کسی نے اس انسانیت سوز واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ ان میں خوافی خان اور والہ داغستانی دونوں جہانگیر کے مخالف تھے۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں اپنا نامۂ اعمال دل کھول کر بیان کیا ہے اور کسی واقعہ پر اس نے سیاسی ملمع کاری سے کام نہیں لیا۔ اس نے اپنے ہر عیب کو ڈنکے کی چوٹ ظاہر کیا ہے۔ لیکن ساری کتاب پڑھ جاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں پاؤ گے۔

پھر اکبر کے حالات پر نظر ڈالو۔ اس کی پچاس سالہ حکومت کے عرصہ میں چھان پھٹک کر دیکھو۔ اس کو رحم دلی کا مجسمہ پاؤ گے۔ اس نے کئی باغیوں کو معاف کر کے آغوش محبت میں لیا۔ جب جہانگیر نے ایک موقع پر خادم درگاہ کی کھال کسی جرم میں کھچوا دی تو اسے سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ کوئی تاریخ اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ اکبر نے کسی عورت پر اس قسم کا ظلم ڈھایا ہو۔

یورپین سیاحوں سے اس قسم کی غلط بیانیاں کر کے مغل حکومت کو بدنام کرنے کی بہت ناکام کوششیں کی ہیں۔ ان لوگوں نے انارکلی کی وفات ۱۵۹۹ء (۱۰۰۸ھ) لکھی ہے۔ گویا انہی ایام میں اکبر اور جہانگیر لاہور میں تھے۔ یہیں اکبر نے جہانگیر کو تکئے مارے اور یہیں اس نے قلعہ کے شیش محل میں بیٹھ کر انارکلی کا رقص دیکھا۔ یہیں سلیم نے انارکلی کو کنکھیوں سے دیکھا اور مسکراہٹ بھی ظاہر کی۔ اور یہیں اکبر نے اس کو دیوار میں زندہ چنوائے جانے کا حکم دیا۔ لیکن کیا تاریخ اس واقعہ کی شہادت دیتی اور اس کی تائید کرتی ہے؟ تاریخ سے تو علی الاعلان ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۸ھ میں جو انارکلی کے زندہ چنوائے جانے کا سال ہے نہ اکبر لاہور میں تھا نہ جہانگیر۔ اکبر مہمات دکن میں اور جہانگیر رانائے چتوڑ کی مہم میں مصروف تھا۔ جہانگیر نے یہ دیکھ کر کہ باپ دارالحکومت آگرہ سے صدہا کوس کے فاصلہ پر لڑائی میں مصروف ہے چتوڑ کی مہم کو ناتمام چھوڑ کر بغاوت پر آمادہ ہو کر آگرہ پر قبضہ کر لینا چاہا۔ اکبر کو

خبر ہوئی تو وہ مہم دکن کو چھوڑ کر ۱۶۰۱ء میں سیدھا آگرہ پہنچ گیا۔ جہانگیر کو آگرہ آنے کی ہمت تو نہ ہوئی البتہ الہ آباد پر قابض رہ کر ۱۶۰۴ء تک باپ کو پریشان کرتا رہا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ۱۰۰۸ھ یعنی ۱۶۰۰ء سے ۱۰۱۱ھ تک اکبر اور سلیم میں ملاقات نہیں ہو سکی۔ نہ لاہور میں کسی اور جگہ۔ ان تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں شیش محل ہی میں باپ کے سامنے جہانگیر کا انارکلی سے آنکھیں لڑانا، اکبر کا طیش میں آکر اس کو گھونسے مارنا اور احمق اور گدھا کہنا، یورپین مصنفوں کے اختراعات کا کمال سمجھنا چاہیے۔

دارا شکوہ اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا[1] میں حضرت میاں میر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے آپ (یعنی حضرت میاں میر) شہر کے جنوب کی طرف باغ انارکلی کے اُس گنبد میں جو باغ مذکورہ کی جنوبی دیوار کے کونے میں ہے دن کو کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔

عہد مغلیہ کے قدیم مصنفوں میں دارا شکوہ ہی پہلا مصنف ہے جس نے آج سے تین سو سال قبل انارکلی کا نام لکھا ہے۔ لیکن اس کے لکھنے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انارکلی کسی عورت کا نام تھا یا اس باغ کو باغ انارکلی کیوں کہتے تھے۔ اسی بنا پر مولینا سالک نے انارکلی کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں انارکلی لاہور کا مقبرہ اور انارکلی بٹالہ[2] کی عمارت تعمیرات کی ایک قسم ہیں جو ظاہری شکل و شباہت میں انار کی کلیوں سے ملتی جلتی ہیں۔

---

[1] یہ کتاب دارا شکوہ نے بعمر ۲۴ سال ۱۰۵۲ھ سے ۱۰۵۳ھ کے مختلف اوقات میں لکھی تھی۔ یعنی واقعۂ انارکلی کے چالیس سال کے بعد۔

[2] انارکلی بٹالہ کے متعلق میرے شفیق مکرم خان بہادر میاں الطاف حسین خاں ریٹائرڈ ایس ڈی او و رئیس بٹالہ ۱۱ جنوری ۱۹۴۴ء کے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں :-

"شہر بٹالہ کے مشرق رویہ شمشیر خان کروڑی (حاکم بٹالہ) نے ایک وسیع تالاب تعمیر کرایا۔ اور اس کے متصل ایک حجرہ بنوا کر اس میں اپنی قبر بنوائی اور وہیں وہ دفن ہوا۔ اس کی مشرقی جانب ایک چونہ گچ عمارت واقع ہے۔ جس کو مہاراجہ شیر سنگھ نے اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں تعمیر کرا کر لاہور کی انارکلی کے نام پر اس کا نام انارکلی رکھا۔ عمارت بڑی مضبوط ہے تمام سقف اور صحن چونہ گچ ہے لکڑی کا کہیں نام تک نہیں۔ اس عمارت کی کرسی تین چار فٹ کی بلندی پر ہے۔ پادریوں نے یہ عمارت ۹۹ سالہ LEASE پر لے رکھی ہے۔ تیس بتیس سال LEASE میں سے رہتے ہیں مشن سکول جس کا نام اس کے بانی پادری کے نام پر BARING SCHOOL (بیرنگ اسکول) تھا۔ پہلے اسی عمارت میں تھا۔ اب وہ سکول تو وہاں سے ہٹا کر شہر میں لے آئے ہیں وہاں اب مشن کالج قائم کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ انارکلی کے آس پاس مشن والوں نے کچھ کوٹھیاں بنائی ہوئی ہیں۔ پادری لوگ ان میں رہتے ہیں۔ مسٹر ایس۔ پی سنگھا رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے بھی تالاب کے کنارے شہر کی جانب ایک باغ اور کوٹھی اپنی رہائش کے لیے خرید کی ہے۔ تالاب اور انارکلی شہر کی تفریح گاہیں ہیں مستورات اور مردمان شہر ہر شام کو بہ تعداد کثیر آتے ہیں۔ انارکلی کے ساتھ پادریوں نے ایک گرجا بھی بنا رکھا ہے۔ ان سب کوٹھیوں کی آبادی کو انارکلی کہتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن سے یہ مقام آدھ میل کے فاصلہ پر ہے۔" عمدۃ التواریخ۔ دفتر پنجم ص ۹۲ میں انارکلی بٹالہ کی اس عمارت کے متعلق لکھا ہے کہ بڑے صاحب نے دیوان ٹیک چند کو حکم دیا کہ "بارہ دری در قلعہ بٹالہ مسمار سازند و آنچہ اسباب اندرونی بارہ دری بودہ باشد نیلام سازند"

مولینا نے لکھا ہے کہ بٹالہ اور لاہور کی "انارکلیوں" میں بہت حد تک مماثلت ہے اور دونوں کا افسانہ بھی بہت کم اختلاف کے ساتھ ایک ہی قسم کا ہے۔ راقم کے خیال میں مماثلت کی وجہ تو یہ ہے کہ مہاراجہ شیر سنگھ نے جب بٹالہ اس کی جاگیر میں تھا۔ انارکلی لاہور کی عمارت کے نمونہ پر بٹالہ میں انارکلی کی عمارت تعمیر کرائی تھی اور افسانہ کی مماثلت تو محض افسانہ ہی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مقبرہ کے ساتھ جو باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ یا مقبرہ بننے سے پیشتر اس جگہ جو باغ تھا۔ اس میں اناروں کے درخت بکثرت تھے یا وہ باغ ہی اناروں کا تھا اور شاید اس کا نام باغ انار یا انار باغ ہو۔ اور وہ رفتہ رفتہ انارکلی باغ کے نام سے موسوم ہو گیا ہو۔ لاہور میں انگوری باغ، گلابی باغ اور بید مشک باغ بھی اسی طرح اپنی اپنی مخصوص پیداوار کے لحاظ سے مشہور رہے ہیں۔ یہ قیاسات تو باغ انارکلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق ہیں لیکن آخر یہ مقبرہ کس کا ہے۔ جو قبر انارکلی کے نام سے مشہور ہے جس کے فراق میں جہانگیر نے اپنے جذبات دلی کا اظہار مندرجہ ذیل پُر درد شعر میں جو تعویز قبر پر کندہ ہے کیا ہے۔

؎ آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

مولینا سالک لکھتے ہیں یہ قدسی نقش خاتون سلطان پرویز کی والدہ زین خاں کوکہ کی دختر اور جہانگیر کی چہیتی بیوی تھی۔ اسی بیگم کے بطن سے ۹۹۶ھ میں بمقام کابل سلطان پرویز پیدا ہوا تھا۔ اکبر اس شادی کے خلاف تھا جیسا کہ زین خاں کوکہ کے حالات میں قبل ازیں لکھا جا چکا ہے لیکن اکبر نے بیٹے کا عشق بلکہ جنون دیکھ کر شادی کی اجازت دے دی تھی۔ یہ بیگم ۱۰۰۸ھ میں لاہور ہی میں انتقال کر گئی۔ جہانگیر جو اُس وقت شاہزادہ تھا لاہور سے باہر ایک مہم پر گیا ہوا تھا اور اکبر مہمات دکن میں مصروف تھا۔

سلیم نے اس کی آخری آرامگاہ پر ایک عظیم الشان مربع مقبرہ تعمیر کرایا۔ سرہانے کی طرف باری تعالیٰ کے ننانوے نام بہ حروف عربی خط جلی لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے پہلوؤں پر جہانگیر کا وہ پُر درد شعر درج ہے۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ سرہانے کی طرف ہی "مجنون سلیم اکبر" کے الفاظ درج ہیں۔ یہ شعر اور یہ الفاظ ایک مغموم و محزون دل کے گہرے صدمے کو ظاہر کر رہے ہیں۔ قبر کے تعویز پر مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ وفات ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) اور ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) سال تعمیر درج ہے۔ اس گنبد نما مقبرہ کی دو منزلیں ہیں۔ دونوں منزلوں کے آٹھ آٹھ دروازے ہیں۔ کئی کھڑکیاں اور کئی روشندان ہیں۔ گنبد کے گرد آٹھ بُرجیاں ہیں اور ہر بُرجی میں ایک ایک دروازہ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۵ ماگھ سمت ۱۸۷۳ب کو باغ انارکلی میں شہزادہ کھڑک سنگھ کو ولی عہدی کا خلعت دینے کے لیے ایک بہت بڑا جشن کیا۔ سارا باغ اور اس کی چار دیواری راجوں اور سرداروں کے خیموں اور فوج کی نمائش اور ہزارہا تماشائیوں کے جمگھٹے سے بھر گیا اور کئی روز تک یہاں ہنگامہ عیش و عشرت گرم رہا۔

لالہ سوہن لال سوری جو مہاراجہ کے درباری تھے۔ عمدۃ التواریخ کے دفتر دوم صفحہ ۱۹۲ میں اسی جشن کے متعلق لکھتے ہیں: ۔

"سوم ماہ ذی القعدہ سرکار دولتمدار در گنبد انارکلی تشریف بردہ خیمہ کلاں مکلف خاصہ برپا و نصب کنانیدہ و صاحبزادہ موصوف را بر فرش عالی مسند ریاست و سرداری جوں

میمنت مانوس ساختہ وجمیع سرکردگان را بالمشافہ طلبیدہ نذرہا دہانیدند۔ وبعدازاں
تمام اہلکاراں و دفتریاں و وکیلاں و منشیاں و کارداراں موافق رتبہ و طاقت
خود ہا بہ ادائے نذرانہ پرداختند۔ بعدازاں وقت سہ پہری سرکار والا مدار صاحبزادہ
موصوف را بہ اتفاق یکدگر بہ فیل نشاندہ بہ تزک و شان بیکراں تشریف در
قلعہ بردند۔"

اس کے بعد جب اللارڈ صاحب و ونتورا صاحب فرانسیسی باشندے مہاراجہ کے پاس آ کر ملازم ہوئے تو ان کا ڈیرہ گنبد انارکلی میں رکھا گیا اور ایک سو پیادہ سکھ فرانسیسی طرز جنگ کی تعلیم کے لیے ان کے سپرد کیا گیا۔ مہاراجہ تعلیم کے نتائج دیکھنے کے لیے خود انارکلی آئے اور فوج کا معائنہ اور ان کے کام دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ہزار روپیہ فرانسیسی افسروں کو پانچ سو روپیہ سکھ سپاہیوں کو انعام دے کر ایک ہزار روپیہ چھاونی انارکلی کی عمارت کے لیے دیا۔

۷ ماہ ساون سمت ۱۸۹۷ب کو مہارانی نکائین (والدہ شہزادہ کھڑک سنگھ) کا انتقال ہو گیا اسی دن پچھلے پہر ان کا بیان اٹھایا گیا اور انارکلی کے باغ میں اس کو آگ لگائی گئی۔ شہزادہ کھڑک سنگھ پا پیادہ حویلی نکیں سے بیان کے ہمراہ باغ انارکلی تک آیا۔ غرض سکھوں کے زمانہ میں باغ بالکل برباد ہو گیا چار دیواری کی اینٹیں خشت فروشوں نے ختم کر دیں بلکہ بنیادوں تک اکھاڑ کے لے گئے۔ مقبرہ کا چبوترہ سنگ مرمر کا تھا وہ مہاراجہ نے اترو الیا۔ قبر کا تعویز جس پر اسمائے الٰہی اور اشعار وغیرہ تحریر تھے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔

انگریزوں کا زمانہ آیا تو انھوں نے مقبرہ کو گرجا گھر بنا کر نام اس کا سینٹ جیمس چرچ رکھ دیا اور برج کلاں پر سنگ سرخ کی دو فٹ طویل ایک صلیب لگا دی جو آج تک موجود ہے۔ اور قبر کے مرمریں تعویز کو جس کو سکھ حکومت کے عہد میں ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا ایک گوشہ میں رکھ کر بند کر دیا۔

صلیب اس وقت بھی گنبد انارکلی پر موجود ہے[1] لیکن اس عمارت کو اب بطور گرجا گھر نہیں بلکہ بطور ریکارڈ آفس دفتر فنانشل کمشنر استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں حسب ضرورت بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں ——

سرائے شاہجہان

مٹ مٹا کر پھر بھی ہے قائم سرائے شاہجہاں
راہ پر آ ہی گئی رفتار دوراں دیکھئے

مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے درمیان۔ مقبرہ جہانگیر سے بالکل ملحق شہنشاہ شاہجہان کی تعمیر کرائی ہوئی ایک وسیع سرائے ہے۔ مقبرہ جہانگیر کا مغربی دروازہ سرائے کے اندر نکلتا ہے۔ یہ سرائے عام مسافروں کے لیے وقف تھی۔ درمیان میں وسیع میدان ہے اور چاروں طرف مسافروں اور راہگذروں کے آرام کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ اُسی زمانہ کا ایک ہشت پہلو کنواں بھی موجود ہے۔ عمارت نہایت پختہ ہے۔ ہر حجرہ یا کوٹھڑی کے آگے ایک پختہ قالبوتی برآمدہ ہے۔ مشرق کی طرف پچاس

[1] اب یہ صلیب وہاں سے اتار کر لاہور کتھیڈرل کے احاطے میں بطور یادگار محفوظ کر دی گئی ہے — (مرتب)

کوٹھڑیاں ہیں بڑا دروازہ مقبرہ جہانگیر کی طرف نکلتا ہے۔ اس دروازے کے دونوں جانب پچیس پچیس کوٹھڑیاں ہیں۔ سرائے کے شمال اور جنوب کی طرف تیس تیس کوٹھڑیاں ہیں۔ یہ سرائے طول و عرض اور استحکام میں شاہجہانی عمارتوں کا ایک نمونہ ہے اس سرائے میں اسی عہد کی ایک مسجد بھی ہے۔ (جس کا ذکر لاہور کی مسجدوں کے سلسلہ میں دوسری جگہ درج ہے۔ مرتب)

اس سرائے کے دو دروازے ہیں ایک جنوب کی طرف دوسرا شمال کی طرف۔ ان دونوں دروازوں سے ہاتھی معہ ہودج گزر سکتا ہے۔

[مغل بادشاہوں کے عہد تک تو اس سرائے یا جلوخانہ کو شاہی گارڈ کے سپاہیوں اور باغ کے ملازموں کی رہائش کے لیے استعمال کیا جاتا رہا لیکن سکھوں نے اس کو چھاؤنی بنا لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جنرل ونتورا، اوق تولیہ اور مسٹر کارن کے علاوہ اور کئی فرنگی افواج خالصہ میں نوکر تھے۔ انہی میں ایک موسیٰ نامی فرنگی بھی تھا جس کے متعلق لالہ سوہن لال عمدۃ التواریخ دفتر دوم (ص ۲۵۴ میں) لکھتے ہیں:۔

"موسیٰ نامی فرنگی کہ مختار در بعضے امورات می باشد، او را تاکید مزید صورت بستہ کہ معہ پلاٹن منیعہ خود کوچیدہ ملحق بہ ڈیرہ صاحبزادہ موصوف (یعنی شہزادہ شیر سنگھ) باید شد"

صاحب عمدۃ التواریخ کے ان الفاظ سے کہ "بتجویز مامور ریئے فرانسیسیاں پیش نہاد فیض مآثر می باشد" معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرانسیسی تھا۔

موسیٰ فرنگی کئی لڑائیوں میں شامل رہا ہے۔ اس کا قیام اپنی پلٹنوں سمیت اسی سرائے میں رہتا تھا۔ سمت ۱۸۸۵ بکرمی کے واقعات میں صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم (ص ۲۶۹ میں) لکھتے ہیں:۔

"موسیٰ فرنگی کہ از چندے بمرض اسہال مبتلا بود بتاریخ یازدہم ماہ ربیع الاول روز چہارشنبہ بوقت یک پہر روز باقی ماندہ از بار ہستی سبکدوش گردیدہ کوس رحلت از عالم فانی بہ جہان جاودانی بہ نواخت۔ خلیفہ نورالدین وغیرہ اہل کاراں در چھاؤنی نزدیک آب راوی واقع اندرون سرائے مقبرہ مشارٌالیہ را بہ کمال اعزاز مدفون ساختند"

موسیٰ فرنگی کی پلٹنوں کے قیام اور مصنف عمدۃ التواریخ کے الفاظ "چھاؤنی سرائے مقبرہ" سے صاف ظاہر ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جس طرح باغ و مقبرہ انارکلی اور میدان میاں میر اور باغ بیگم پورہ مقبرہ نواب ابوالحسن وغیرہ لاہور میں کئی چھاؤنیاں تھیں، اسی طرح سرائے شاہجہانی کو جو مقبرہ جہانگیر کے اندر واقع ہونے کی وجہ سے سرائے مقبرہ کہلاتی تھی، چھاؤنی بنا لیا گیا تھا ـــــ مرتب]

۱۸۵۹ء میں جب لاہور میں ریل کا کارخانہ اور ریلوے اسٹیشن بنانے کی تجویز ہوئی، تو اس سرائے میں پتھر کے کوئلہ اور لکڑی کے اس قدر انبار جمع کیے گئے کہ جن کی کچھ انتہا نہ تھی۔ کوئلہ کی بدولت تمام میدان سیاہی مائل نظر آتا تھا۔ لیکن آخر یہ تجو

مسترد کر دی گئی اور سرائے اور مقبرہ آصف جاہ اور مسجد شاہجہانی ریلوے حکام کے قبضے میں آنے سے بچ گئے۔

اپریل ۱۸۸۵ء میں لیڈی ڈفرن اس سرائے کا ذکر کرتی ہوئی لکھتی ہیں کہ

"جہانگیر کے مقبرہ کے پاس ہمیں ایک سرائے نظر آئی جو انسانوں اور چارپایوں کی میزبانی کے لیے ایک بہت بڑا گھر ہے۔ یہ عمارت تباہ حالت میں تھی"

راقم نے ۱۸۹۴ء میں ۱۸۵۹ء کے کوئلہ کے کچھ کچھ نشانات اس سرائے میں دیکھے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں غلام پہلوان اور کیکر سنگھ کی مشہور کشتی کے لیے جس میں غلام پہلوان فتح یاب ہو کر رستم ہند کہلایا تھا، اس سرائے کی صفائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے محکمہ آثار قدیمہ نے دیگر آثار قدیمہ کی طرح اس کی حفاظت اور صفائی بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ سرائے کا میدان اب ایک خوشنما سیرگاہ اور تفریح کا ایک دلچسپ مقام ہے اور صدر دروازے میں محکمہ آثار قدیمہ نے اپنا دفتر قائم کر رکھا ہے۔

آصف جاہ[1]

مقبرہ بھی باغ بھی دونوں تباہ حالت میں ہیں

سرنوشت روضۂ آصف کا عنواں دیکھئے

[لاہور کی تاریخ میں مغل بادشاہوں سے زیادہ کسی نے فن تعمیر کی طرف اتنی توجہ نہیں کی۔ ان کے طفیل لاہور کو بہت سی خوبصورت عمارتیں اور نفیس باغ نصیب ہوئے۔ شاہدرہ کی سرزمین جو طول و عرض میں ایسی وسیع نہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس کی خاک میں ہندوستان کا ایک پُر شوکت شہنشاہ۔ ایک عالی دماغ ملکہ اور ایک نہایت زبردست وزیر باتدبیر دفن ہیں۔ اور ان کے عالیشان مقبروں کو آثار قدیمہ کے ایسے حیرت انگیز اور نادر نمونے ہونے کا فخر حاصل ہے جو فنی اعتبار سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ جہانگیر کے مقبرہ میں مغلیہ طرز تعمیر کی تمام خصوصیتیں اپنی پوری پاکیزگی، عظمت و شان اور دلکشی کے ساتھ جمع ہیں۔ نورجہاں بیگم کا مزار نہایت سادگی اور لطافت کے ساتھ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نورجہاں اور اس کی پیاری بیٹی لاڈلی بیگم کو اپنی آغوش میں سلائے گل فسردہ کی طرح بہار شباب میں اپنے لٹ جانے پر ماتم کناں ہے اور زبان بے زبانی سے ملکہ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے ؎

دریا تری ہمت نے مرکر بھی بہا ڈالے

مرقد نے ترے معبد غیروں کے بجا ڈالے

آصف جاہ کا ہشت پہلو مقبرہ جس کا حباب آسا گنبد کبھی لاہور کے سب سے خوبصورت اور رفیع الشان گنبدوں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی خوشنما چینی کاری کی وجہ سے سارے عالم میں مشہور تھا۔

ان کے علاوہ یہاں سے کچھ فاصلہ پر لاہور کے سب سے پہلے مغل حاکم میرزا کامران کی بارہ دری بھی اپنی ویرانی

---

[1] اس عنوان کے تحت شعر تو نوق صاحب کا ہے لیکن باقی سارا مضمون مرتب کا لکھا ہوا ہے۔

پسپری کے باوجود دریائے راوی کے کنارے ہی نہیں بلکہ درمیان زمین میں اپنے پیر مضبوطی سے جمائے نہایت وقار و تمکنت سے کھڑی تین سو سال سے پانی کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

تاریخی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے اب بھی ان عمارتوں کو وہ اہمیت اور فوقیت حاصل ہے کہ کوئی سیاح لاہور میں آکر انھیں دیکھے بغیر آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اور ان کے نظاروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس وقت آصف جاہ اور اس کا مقبرہ ہمارا موضوعِ بحث ہے۔ جانتے ہو یہ آصف جاہ کون تھا؟ اس کے متعلق اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ یہ اعتماد الدولہ مرزا غیاث کا لڑکا۔ نورجہاں کا بھائی۔ ملکہ ممتاز محل کا باپ اور شہنشاہ شاہجہان کا سپہ سالار تھا اور اس کا اصل نام مرزا ابوالحسن تھا۔ جہانگیر نے اسے مختلف مراتب و مناصب سے ترقی دے کر ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء میں لاہور کا گورنر بنایا اور ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار کا منصب اور آصف جاہ کا خطاب دیا۔

یہ آصف جاہ ہی تھا جس کی ہمت و تدبیر سے شاہجہان کو ہندوستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ اگر وہ جہانگیر کی وفات کے بعد اپنی بہن نورجہاں کو فی الفور نظر بند نہ کر لیتا۔ شہزادہ داور بخش پسر سلطان خسرو خلف جہانگیر کو ”گوسفند قربانی“ بنا کر ہندوستان کا برائے نام بادشاہ نامزد نہ کرتا اور سلطنت کے دوسرے دعویداروں کو مٹا کر اس کے لیے رستہ صاف نہ کر دیتا، تو نہ جانے شاہجہان کو ہندوستان کا تخت و تاج حاصل کرنے میں کتنی دشواریاں پیش آتیں اور کس قدر دقتوں کا سامنا ہوتا۔ شاہجہان بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہمیشہ اس کا احسان مانتا اور جب موقع ملتا اس کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بزرگوں کی طرح اس کی عزت و تکریم کرتا۔ اور اس جوہر قابل کی کماحقہ قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ وہ اپنے دل میں اس کے متعلق ادب و احترام کے کس قدر جذبات رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ شاہجہان کے اُس خط سے ہو سکتا ہے جو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے دستِ خاص سے لکھ کر اپنے معتمد خاص کے ہاتھ اسے بھیجا تھا۔ اس خط میں بادشاہ نے ان القاب سے اسے مخاطب کیا تھا:۔

”دانائے رموزِ سلطنتِ عظمیٰ۔ واقفِ اسرارِ جلالتِ کبریٰ۔ سرخیلِ یکرنگانِ وفادار۔
سالارِ یکجہتانِ حق گزار۔ کار فرمائے اربابِ سیف و قلم۔ مدبّرِ امورِ عالم۔ زبدۂ
خوانینِ عالی شان۔ قدوۂ امرائے بلند مکان عضد الخلافہ۔ یمین الدولہ۔ عموئے
دانا آصف خاں“

اور پھر لکھا تھا کہ:۔

”وہ خلعت جو جلوس کے دن پہنا تھا آپ کے لیے بھیجتا ہوں۔ آپ عمو کو
بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت کرتے
ہیں اور بندر لاہری بطریق انعام مرحمت کرتے ہیں۔ آپ اس منصب سے بھی
زیادہ کے مستحق ہیں۔ لیکن سردست ہماری یہ عنایتیں آپ کو مبارک ہوں“

جہانگیر کے انتقال سے کچھ پہلے اور شاہجہان کے ابتدائی عہد میں آصف جاہ لاہور اور ملتان دونوں صوبوں کا گورنر تھا۔ ۱۰۳۷ھ میں جب وہ شہزادہ اورنگ زیب۔ شجاع اور دارا شکوہ کو ہمراہ لے کر لاہور سے آگرہ روانہ ہوا اور وہاں

سنہ ۱۵ رجب کو نوروز کی تقریب پر بادشاہ کے جشن قمری میں شامل ہوا تو قدردان بادشاہ نے اس کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر اور منصب نہ ہزاری ذات و نہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عطا فرمایا۔ یہ جلیل القدر منصب اور عروج و اقتدار اس وقت تک دوسرا کوئی تیموری امیر یا شہزادہ حاصل نہ کر سکا تھا۔

یکم ربیع الاول ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء کو شاہجہان نے اپنی اکتالیسویں سالگرہ کے موقعہ پر یمین الدولہ آصف جاہ خان خاناں کا خطاب اور تمام ہندوستانی افواج کی سپہ سالاری کا عہدہ عطا کیا۔ اس حیثیت سے وہ دکن میں جا کر گلبرگہ اور بیجاپور کی اکثر لڑائیوں میں شامل ہوا اور مرتے دم تک اسی عہدہ پر مامور رہا۔

آصف جاہ عہد شاہجہانی کا امیر الامرا تھا۔ اس کی تنخواہ آج کل کے حساب سے ساڑھے چالیس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اس کی دولت و امارت کا کچھ شمار نہ تھا۔ اس کے تمام عزیز و اقارب اور فرزند حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر ممتاز تھے۔ وہ بادشاہ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ روپیہ جمع کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ فرزندوں اور قرابت داروں کی عمر آرام و آسائش سے گذرے۔ اور چونکہ میرے سب عزیز مراحم خسروانہ سے خوشحال ہیں۔ میری تمام دولت و جائیداد حضور ہی کی ہے۔ اس نے ایک وصیت نامہ بھی لکھا جس میں اپنا سب مال و زر بادشاہ پر نثار کر دیا۔

آصف جاہ اپنے باپ اعتماد الدولہ مرزا غیاث کی طرح مخصوص علمی قابلیت کا مالک تو ضرور تھا۔ مگر اس کی کوئی علمی یادگار موجود نہیں۔ وہ بسیار خوری میں بہت زیادہ شہرت رکھتا تھا۔ فن تعمیرات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے بیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس سال کے عرصہ میں ایک عالیشان حویلی لاہور کے میدان نخاس میں تیار کرائی۔ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں جب بادشاہ لاہور گیا تو یمین الدولہ نے اس حویلی میں اس کی دعوت کی۔ اور پانچ لاکھ روپیہ نذر پیش کیا۔ یہ میدان نخاس دہلی دروازہ کے باہر تھا۔ جہاں آجکل راستے میاں سلطان۔ لوہا بازار۔ لنڈا بازار اور شہید گنج واقع ہیں۔ حویلی کیا تھی، خاصا قلعہ تھا۔ وطن بلڈنگ کے عقب سے لے کر شہید گنج اور ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر حمام۔ مسجدیں۔ دفاتر۔ تالاب۔ حوض۔ فوارے۔ باغ اور زنانہ و مردانہ محلات تھے۔ آصف جاہ کے انتقال کے بعد یہ حویلی شہزادہ دارا شکوہ کے حصے میں آئی۔ اور وہ اس میں رہنے لگا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کو اب چوک دارا شکوہ کہتے ہیں۔ مگر حویلی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء کو لاہور میں سلطنت کا یہ زبردست ستون صرصر اجل کے ایک ہی جھونکے سے گر پڑا۔ "مرزے افسوس آصف خاں" سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ بادشاہ کو اس کی وفات سے بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے آصف جاہ کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جو صوبۂ بہار کا گورنر تھا ماتمی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا۔ اور اس کے دوسرے بیٹے بیٹیوں، بیگم اور دیگر متوسلین و متعلقین کو بڑے بڑے مراتب اور بیش بہا خلعت دے کر ان کی دلجوئی کی اور حکم دیا کہ اسے جہانگیر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ مقبرہ کے چاروں طرف ایک بلند چار دیواری کے اندر باغ بنایا جائے اور اس کی تربت پر ایک ایسا عالیشان گنبد تعمیر کیا جائے جو اس کے نام کی طرح بلند۔ اس کے کارناموں کی طرح بے عیب اور اپنی ساخت میں بے نظیر اور یادگار ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور چار سال کے عرصہ میں بیس لاکھ روپے کی لاگت سے مقبرہ آصف جاہ تعمیر ہوا۔

لاہور میں آصف جاہ کا مقبرہ ایک عظیم تاریخی عمارت ہے۔ اور اس دور سرخوشی کی ایک درخشاں یادگار جب ہندوستان

کی بہار و خزاں شاہجہان کے ہاتھ میں تھی، اور وہ اسے آرائش دینے کے علاوہ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے اور اسے جنت نشان بنانے میں اپنے بہترین صنعتی ذوق کا ثبوت دے سکا۔ آج انقلاب زمانہ سے اس کی صورت اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ چند واقف حال لوگوں کے سوا کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی تر و تازگی کا عالم کیا تھا اور اب کیا رہ گیا ہے۔ بنانے والوں نے اسے کس محبت و دلسوزی سے بنایا اور سنوارا تھا، لیکن اجاڑنے والوں نے اسے کیسی بے دردی سے تاراج و پامال کر دیا ہے۔ اس کی بہار کیسی گل بداماں تھی اور اس کا جوبن کس طرح خزاں کے ہاتھوں لٹ گیا ہے۔

آپ خود ہی انصاف سے کہئے کہ جب سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بڑھاپے میں اس کی مضبوطی اور دلفریبی کا یہ حال ہے تو شباب میں اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اور وہ آنکھوں کو کس طرح مسرور اور دل و دماغ کو کس طرح مسحور نہ کرتا ہوگا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فنون لطیفہ میں فن تعمیر کی حیثیت شاعری، مصوری اور موسیقی سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس کی ترقی سیاسی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اقبال یا ٹیگور کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ بادشاہ کی سرپرستی کے بغیر چند غیر فانی نظمیں لکھ دیں اور قوم سے اپنی دماغی محنت کی داد پا کر اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر لیں۔ لیکن معمار یا مصور یہ نہیں کر سکتے کہ تن تنہا اٹھیں اور لاکھوں روپے اپنی جیب سے صرف کر کے لاہور کے پہلو میں کوئی بادشاہی مسجد کھڑی کر دیں یا مقبرہ جہانگیر یا شالامار باغ کے نمونے کی کوئی خوبصورت عمارت بنا دیں۔ اس کے لیے سیاسی طاقت۔ شاہی دولت۔ حکومت کی سرپرستی اور فنون لطیفہ کے پاکیزہ ذوق کی موجودگی اور یکجائی نہایت ضروری ہے۔ جب تک کسی ملک کے حکمرانوں کا ذوق ایک خاص لطافت۔ ایک خاص نفاست اور ایک خاص نزاکت کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اور وہ اس کے لیے روپیہ پانی کی طرح نہ بہائیں اس وقت تک اچھا فن تعمیر پیدا نہیں ہوتا۔ مغلوں کو خدا نے ان چیزوں سے بہرہ وافی عطا کیا تھا۔ اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

دنیا جانتی ہے کہ آصف جاہ کی بیٹی کے لیے تاج محل تعمیر کرانے میں شاہجہان نے اپنی بہترین محبت صرف کی۔ لیکن آصف جاہ کے لیے اس کے دل میں شکر گذاری کے جو جذبات تھے ان کا صحیح عکس یہ مقبرہ تھا جو فرش سے لے کر گنبد تک سفید سنگ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے اندر کا فرش یا ہشت پہلو چبوترہ کا فرش، قبر کا تعویز۔ حوضوں کے کنارے یہاں تک کہ عالیشان دروازے کی ڈیوڑھی کا فرش بھی سنگ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے آٹھ دروازے اور آٹھ دہلیزیں اور باہر مرغولوں پر ہر جگہ سنگ سرخ اور اس کے دو رویہ کانسی کا کام تھا۔

مقبرہ میں سونے چاندی کی قندیلیں اور بیش قیمت جھاڑ فانوس تھے۔ قرآن پڑھنے والوں کے لیے ایک حافظ خانہ، ایک مطبخ خانہ اور چند دیگر مکانات تھے جن میں چوکیدار اور محافظ وغیرہ رہا کرتے تھے۔ جب پنجاب کی حکومت سکھوں کے قبضے میں آئی تو انھوں نے پتھر کے لالچ میں یہ تمام عمارتیں گرا دیں۔ سونے چاندی کا سامان لوٹ لیا۔ اس کا پُرفضا چمن اجاڑ دیا اور باغ کے درختوں کو کاٹ کر کف دست میدان بنا دیا ؎

شکست شیشۂ دل را اگر صدائے نیست
کہ ایں صدا بہ قیامت بلند خواہد شد

یہ کچھ سکھوں پر ہی موقوف نہیں۔ سیلاب انقلاب جب بھی آتا ہے تو اس کی سطح پر سربفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی نظر آتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ نے ہر زمانے میں اس قسم کی دردناک مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔ بخت نصر اٹھا اور بیت المقدس کو برباد کر گیا۔ ایرانی آئے اور بابل کے قدیم تمدن کو تاراج کر کے چلے گئے۔ رومی نکلے اور کارتھیج کی سرزمین کو آگ اور خون سے بھر دیا۔ سکندر یونان سے نکلا اور ایران کی در و دیوار کے ایک ایک نقش کو مٹا آیا۔ تاتاری اُٹھے اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اس کے قدیم آثار و تہذیب کو دجلہ میں ڈبو گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ لاہور کی بارہ دری اور دربار صاحب امرتسر کی تعمیر کے وقت کئی اسلامی عمارتوں کو تباہ و برباد کیا۔ مقبرہ جہانگیر اور نور جہاں کی طرح اس عالیشان مقبرہ کو بھی نقصان پہنچایا اور قبر کے تعویز کو چھوڑ کر جس پر باری تعالیٰ کے ننانوے نام اور قرآنی آیات کندہ تھیں اور جو ان کے کسی کام نہ آ سکتا تھا۔ سنگ مرمر کا ایک ٹکڑہ بھی اس پر نہ رہنے دیا اور عمارت کو بالکل کھنڈر بنا کر اس کا سارا عز و جاہ خاک میں ملا دیا۔ مشہور انگریز سیاح ولیم مور کرافٹ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی ہی میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لیے آیا تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ :-

"مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ میں جو نشست گاہ بنائی ہے۔ اس میں اور
مقبروں کے علاوہ نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر بھی اس کے
فرش اور گنبد سے اکھاڑ کر لگایا ہے۔"

اس مقبرہ کے چبوترہ پر جو چار فوارہ دار حوض ہیں۔ اور وہ ہشت پہلو نہر جو مقبرہ کے گرد چکر لگاتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر مٹی کے بڑے بڑے تودوں اور انباروں کے نیچے دبی ہوئی تھی، اور لاہور کے لوگوں کو اس کا بالکل علم نہ تھا۔ باغ کا کچھ حصہ بھی شاہدرہ کے ایک سکھ خاندان کے قبضہ میں تھا۔ حکومت انگلشیہ نے قابضوں کو معاوضہ دے کر اسے پھر باغ کے ساتھ شامل کیا اور حوضوں اور نہروں کو صاف کر کے باغ اور مقبرہ کی رونق و زیبائش کو بحال کیا۔

[illegible] میں گورنمنٹ پنجاب نے رائے بہادر کنھیا لال ایگزیکٹو انجینئر لاہور ڈویژن کی معرفت اس عالیشان مقبرہ کی کچھ مرمت کرائی اور یہ اسی مرمت کا نتیجہ ہے۔ کہ یہ رعب دار اور ہیبت ناک عمارت گرنے سے بچ گئی۔ اور اس وقت سے اب تک حوادث دہر کا مقابلہ کر رہی ہے۔

۱۹۰۴-۰۵ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند و گورنر جنرل کی توجہ سے جب محکمہ آثار قدیمہ قائم ہوا تو مقبرہ کے گنبد کی سیڑھیاں جو پتھر اکھاڑتے وقت بالکل توڑ دی گئی تھیں۔ از سر نو بنائی گئیں اور سنگ مرمر کا تعویز جو باری تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی وجہ سے بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اپنی اصلی جگہ پر نصب کیا گیا۔ اس تعویز پر دو طرف تو باری تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ سرہانے کی طرف هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب و الشهادة هو الرحمٰن الرحیم اور بالائے تعویز کل نفس ذائقة الموت لکھا ہوا ہے۔ حروف کئی جگہ سے اکھڑ گئے ہیں۔

سرکاران لاہور کے زمانے میں سکھوں نے مقبرہ کے چونہ گچ چبوترہ کے دونوں پہلوؤں پر پیپل کے دو بڑے بڑے درخت لگا کر اپنی بدمذاقی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ تین حاکم سردار لہنا سنگھ، سوبھا سنگھ اور گوجر سنگھ تھے جو احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے

لاہور پر قابض ہو گئے تھے۔ اور اسے تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے حاکم بن بیٹھے تھے۔ چونکہ یہ مقبرہ کی خوبصورتی کے لیے بہت بڑی روک تھے، اس لیے اب یہ درخت اکھاڑ دیے گئے ہیں۔

مقبرہ کے بالکل محاذ میں مغرب کی سمت جو پختہ مسجد ہے۔ یہ بھی طوائف الملوکی کے زمانے میں اُجڑ چکی ہے۔ اور عہد برطانیہ میں ۱۸۸۰ء سے پیشتر محکمہ ریلوے کے کسی انگریز ملازم کی کوٹھی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اب نہ وہاں کوٹھی ہے۔ نہ صاحب بہادر۔ مسجد کے آثار البتہ نظر آ رہے ہیں۔

اس مقبرہ کی موجودہ عبرت ناک حالت دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ بنانے والوں نے تو لاکھوں روپے صرف کر کے اسے ایک یادگار بنایا۔ مگر بگاڑنے والوں کو ذرا ترس نہ آیا۔ اس عمارت کا حُسن اگرچہ لُٹ چکا ہے۔ مگر شاہجہان کے جذبات شکر گذاری نے جو رفعت اسے بخشی ہے۔ وہ آج تک قائم ہے۔ ننگی اینٹوں کے اس گنبد کی چوٹی پر اب اکثر گدھ بسیرا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لاجواب سڈول پن میں ایک ایسی کیفیت ہے کہ بار بار دیکھئے تب بھی دل سیر نہیں ہوتا۔

آصف جاہ کے گنبد سے بہتر گنبد پنجاب نے پھر نہیں دیکھا۔ اس کا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ شاہجہانی دور کے مشہور انجنیئر نواب علی مردان خاں کے مقبرہ کا گنبد ہے۔ جو مغلپورہ میں ہے۔ مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر اب بھی کاشی کاری کے رنگین ٹکڑے جو زمانے کی دست برد سے بچ رہے ہیں۔ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ روغن اب بھی اسی طرح نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آج ہی بنے ہیں۔

آصف جاہ کی زندہ یادگاروں میں نشاط باغ کشمیر اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اب بھی مشہور ہے۔ یہ شالامار باغ کشمیر سے کچھ فاصلہ پر جنوب کی جانب ڈل کے کنارے واقع ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسم بامسمیٰ ہے۔ "گلزار نشاط و عیش دلہا" سے اس کی تاریخ تعمیر ۱۰۴۴ھ برآمد ہوتی ہے۔

اس کے بارہ چبوترے جو بُرج آسمانی کی طرز پر بنے ہیں۔ ڈل کے مشرقی ساحل سے بتدریج پہاڑ کی بلندی تک چلے گئے ہیں۔ باغ کے درمیان سے ندی سبزۂ خوابیدہ کو بیدار کرتی۔ پھولوں کو شادابی بخشتی ہر تختے کے خاتمہ پر ایک آبشار بناتی باغ کے باہر ایک حوض میں گر کر ڈل میں شامل ہونے کے لیے اس تندی اور تیزی سے سفر طے کرتی ہوئی جاتی ہے کہ جابجا جھاگ کے تودے لگ جاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک نہر کی تمام لمبائی میں فواروں کی ایک قطار چلی گئی ہے۔ ان کے چلنے سے باغ کی زندگی بہجت و انبساط اور مسرت و شادمانی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ پھولوں کی کیاریاں، گلاب اور دیگر رنگا رنگ کے گل بوٹوں کے تختے سرِ تسخیر بن کر دیکھنے والوں کے دلوں میں اترنے لگتے ہیں اور باغ نشاط و مسرت کا ایک مخزن جاوید بن جاتا ہے۔ قدسی مشہدی کہتا ہے ؎

دلت را گر ہوائے انبساطست   نشاطِ عمر در باغِ نشاطست

اور گو یہ تین سو سال سے انقلابات دہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مگر آج بھی اس کا منظر اس قدر حسین اور دلآویز ہے کہ کسی طرح نگاہ سیر نہیں ہوتی۔ سبز پوش قمری تخزن کا زاویۂ نگاہ کی ہر تبدیلی پر ایک جدید صفت نگاہ پیش کرنا، ایک ایک ذرّے سے طراوت و خورمی کا اُبل پڑنا، لطافت ہوا کا بدن میں ایک نئی روح پھونکنا اور پانی کا ہر پیچ و خم پر ایک نیا لوچ دل میں پیدا کرنا۔ ایسی

چیز ہیں نہیں جنھیں انسان کبھی فراموش کر سکے۔ یہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی ایسی سرزمین میں پہنچ گئے ہیں جہاں کی ہر ہر چیز ہم سے خراجِ شباب طلب کرتی ہے ——— مرتب]

نورجہاں بیگم

اب کہاں نورجہاں بیگم کے وہ چاروں چمن
مقبرہ بھی صورت گورِ غریباں دیکھئے

نورجہاں کون تھی اس کی پیدائش کس مسافرت اور بیکسی کے عالم میں ہوئی۔ پرورش کہاں پائی۔ کن محلوں میں پروان چڑھی۔ ایران سے آگرہ اور آگرہ سے علی قلی خاں عرف شیر افگن خاں کی بیگم بن کر کس جاہ و جلال کے ساتھ بردوان پہنچی۔ پھر کن حسرت ناک حالات میں بیوہ ہو کر آگرہ واپس آئی۔ اور آخر شہنشاہ جہانگیر کی نظروں میں چڑھ کر کس طرح ملکۂ ہند کہلائی؟ ان تمام حالات سے ہر پڑھا لکھا خصوصاً مدرسہ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔

نورجہاں نے جہانگیر کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا جو کچھ وہ کہتی تھی بادشاہ وہی کرتا تھا اور جو کچھ وہ چاہتی تھی وہی ہوتا تھا۔ اس کا بھائی میرزا ابوالحسن آصف جاہ شاہجہان کا خسر اور جہانگیر کا وزیر اور سپہ سالار تھا۔ اس کا خالو ابراہیم خان بنگال کا گورنر اور ابراہیم خاں کا بھتیجہ — احمد بیگ کٹک کا حاکم تھا۔ غرض نورجہاں کے تمام عزیز اور رشتہ دار جہانگیر کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے۔

نورجہاں کے بطن سے جہانگیر کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ نورجہاں کی صرف ایک بیٹی شیر افگن خاں سے تھی اور وہ جہانگیر کے فرزند شہریار سے بیاہ دی گئی تھی۔ آصف جاہ نے اپنی بیٹی نواب[1] عالیہ بیگم کا نکاح شاہزادہ خرم سے کیا ہوا تھا۔ یہی عالیہ بیگم بادشاہ بیگم ہو کر ممتاز الزمانی ممتاز محل کہلائی اور یہی شاہزادہ خرم بادشاہ ہو کر شاہجہان کہلایا۔

معاملات سلطنت میں باپ بیٹے اور بہن بھائی کی محبت میں عجیب انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ جہانگیر دمہ کی بیماری کی وجہ سے عموماً بیمار رہتا تھا۔ نورجہاں اور آصف جاہ دونوں اس کو چراغِ سحری سمجھ رہے تھے۔ اب آصف جاہ کی یہ خواہش تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا داماد شاہجہان تخت پر بیٹھے اور نورجہاں اپنے داماد شہریار کو سلطنت دلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ نورجہاں نے بادشاہ کو کوشش کر کے نہ صرف شاہجہان سے ناراض کرا دیا بلکہ اُس کے وکیل کی دربار میں آمد و رفت بند کرا کر اُس کی کئی جاگیروں کو شہریار کے نام منتقل کرا دیا۔ شہزادہ خرم نے بڑے بڑے معتمد جہانگیر کے پاس اپنی بے گناہی کے اسباب دریافت کرنے کے لیے بھیجے۔ انھوں نے بہت کچھ کہا سُنا بھی۔ لیکن جہانگیر نے کوئی توجہ نہ کی اور آخر شاہجہان نے تنگ آ کر اعلانیہ مخالفت بلکہ بغاوت شروع کر دی اور ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء سے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء تک باپ بیٹوں کی لڑائیوں میں بڑے بڑے نامور اور معتبر افسر

---

[1] منگنی کی رسم ۱۵ ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء میں ہوئی اور شادی کی رسم ربیع الاول ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں۔ اس وقت بیگم کی عمر ۱۹ سال ۱۲ روز شمسی اور شاہزادہ کی عمر ۲۰ سال ایک ماہ آٹھ یوم شمسی تھی (ظفر نامہ شاہجہان ص ۵)

مارے گئے۔ نورجہاں کا خالو ابراہیم خان بھی جو بادشاہ کی طرف سے شاہزادہ کی فوجوں سے جنگ آزما تھا انہی لڑائیوں میں کام آیا۔
۳ جمادی الثانی ۱۰۳۴ھ (۱۶۲۵ء) کو شاہجہان نے اپنے دو فرزند داراشکوہ اور عالمگیر دو لاکھ روپیہ کی پیش کش کے ساتھ جہانگیر کے پاس عفو تقصیرات کے لیے بھیجے۔ اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہوئی۔

۱۰۳۶ھ (۱۶۲۷ء) میں جہانگیر کشمیر میں تھا اور شاہجہان مہمات دکن میں مصروف تھا۔ آصف جاہ، اس کا بیٹا شائستہ خاں، نورجہاں، شہریار اور دیگر امرا، وزرا سب بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ انہی دنوں شہریار بادشاہ سے اجازت لے کر اپنی بیماری کے علاج کے لیے لاہور چلا آیا۔ اُدھر کشمیر سے واپس آتے ہوئے جب رستے ہی میں جہانگیر کا انتقال ہو گیا[1] تو آصف جاہ نے بہن کے طرفداروں پر پہرے بٹھا دیئے اور شاہجہان کے پاس بادشاہ کی وفات اور فوراً آگرہ پہنچنے کا پیغام بھیجا۔ اور شہزادہ داور بخش پسر سلطان خسرو عرف بلاقی کو جو اس کی قید میں تھا برائے نام بادشاہ بنا۔ قربانی کا بکرا بنا کر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں باپ کی وفات کی خبر سن کر شہریار نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ شہریار نے بایسنغر خاں خلف شاہزادہ دانیال کو جو جہانگیر کی وفات کے وقت آصف جاہ کی قید سے بھاگ آیا تھا، سپہ سالار اور میر افضل خان میر سامان جہانگیر کو مہمات کل و جزو کا افسر بنا رکھا تھا۔ افضل خاں درپردہ شاہجہان کا طرفدار تھا اور بظاہر شہریار کے ساتھ تھا۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو لاہور سے تین کوس پر لڑائی ہوئی۔ شہریار کی سپاہ کو شکست ہوئی وہ دوڑ کر قلعہ میں آ گیا۔ آصف جاہ کے آدمیوں نے شہریار اور اس کی بیوی لاڈلی بیگم کو جو نورجہاں کی بیٹی تھی شاہی محل سے نکال کر قلعہ کے ایک محفوظ مقام میں نظر بند کیا اور دوسرے روز شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔
اسی موقعہ پر شہریار نے یہ رباعی کہی تھی ؎

زرنرگس گلاب ارچہ نتواں کشید — کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من — بگو کور شد دیدۂ آفتاب

جب شاہجہان دکن سے آگرہ پہنچ گیا تو اس نے اپنا ایک دستخطی فرمان سید امانی رضا بہادر مخاطب بہ خدمت پرست خاں کے ہاتھ یمین الدولہ آصف خاں آصف جاہ کے نام لاہور بھیجا کہ ناشدنی (شہریار کو کہتے تھے) بلاقی، گرشاسپ اور فرزندان دانیال طہمورث و ہوشنگ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دو۔ اور ہو سکے تو ہمارے پاس بھجوا دو۔ ورنہ ٹھکانے لگا دو۔ ۲۱ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو یہ فرمان آصف جاہ کے پاس پہنچا اسی دن منبر پر شاہجہان کے نام کا لاہور میں خطبہ پڑھا گیا اور ۲۵ جمادی الاول کو پانچوں شہزادے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے ؎

شرب سلطنت ہماہ چناں شیریں است — کہ از پئے آں خون برادر ریزند

---

[1] غالباً بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ جہانگیر کے نام سے اس کی ایک قبر مقام چنگس میں بھی ہے جو کشمیر کے رستے پر راجوری اور تھنہ کے درمیان ایک مقام ہے جس کے ایک طرف سرسبز پہاڑ ہے اور دوسری طرف ایک نالہ ہے۔ یہ قبر ڈاک بنگلہ اور پولیس چوکی چنگس کے متصل ہے اس پر ایک سبز جھنڈا اور تعویذ قبر پر سبز غلاف رہتا ہے۔ قبر خاصی لمبی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں جہانگیر کی انتڑیاں دفن کی گئی تھیں۔ اگر انتڑیاں بھی ہوتیں تو بھی یہاں ضرور کوئی شاہی عمارت ہوتی۔

نور جہاں لاہور میں تھی اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی داماد کے نابینا ہونے کا واقعہ سنا۔ پھر اس کے قتل کی خبر بھی سنی۔ لیکن بھائی کی قید میں ہونے کی وجہ سے دم نہ مار سکتی تھی۔ اور بادشاہ کے مرنے کے بعد وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

جہانگیر کی وفات اور اپنے داماد کی موت کے بعد جب تک وہ زندہ رہی لاہور ہی میں رہی اُس کے پاس باپ (اعتماد الدولہ) کی دولت تھی، خود بھی امیر کبیر تھی اور اپنا علیحدہ شاہانہ دربار رکھتی تھی۔ جہانگیر کے بعد یہ بالکل خانہ نشین ہو گئی۔ شاہجہان نے دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ اپنے خاوند کے بعد اٹھارھویں سال ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) کو انتقال کر گئی۔

نور جہاں جب تک زندہ رہی مستحقین اور سفید پوشوں کے علاوہ غربا، یتامیٰ، بیوہ عورتوں اور غریب گھرانوں کے لیے اس کا دم سرچشمہ حیات تھا۔ اس نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائیں ان کے جہیز کا سامان اپنے پاس سے دیا۔ اہلِ علم کی قدردانی کی۔ اور کوئی حاجت مند اُس کے دروازہ سے خالی نہ گیا۔ دل کشا اسی کا باغ تھا۔ لیکن اس میں اس کا خاوند دفن تھا۔ پھر اسی باغ کی دیگر عمارت میں یمین الدولہ آصف جاہ (وفات ۷ ارشعبان ۱۰۵۱ھ مطابق ۱۶۴۱ء) کا مقبرہ بن چکا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے لیے اس مقبرہ کی چاردیواری کے باہر اپنا رہائشی محل تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف چار چھوٹے چھوٹے باغ لگا کر نام ان کا چار چمن رکھا۔ ہر چمن کا طول و عرض سو سو گز تھا۔ مکانات جن میں خدمت گار عورتیں اور دیگر ملازمین کی رہائش تھی سب مٹ گئے۔ بلکہ اس کے اپنے رہائشی محل کا بھی کہیں نام نشان نہیں اور نہ ان کی کہیں کیفیت نظر آئی۔ اس لیے مقبرہ نور جہاں بیگم کی جو کیفیت ظفر نامہ شاہجہان میں بحوالہ شاہجہان نامہ درج ہے پہلے اس کو بالاختصار لکھتا ہوں پھر اس کی موجودہ حالت کا ذکر کروں گا:-

> "یہ مقبرہ روضۂ جہانگیر کے جلو خانہ کے غرب میں واقع ہے اس کا گنبد سطح سے بلندی تک مثمن تھا۔ قطر اس کا پندرہ گز۔ اصطلاح ہشت گانہ۔ اندر کی طرف آٹھ نشیمن اور باہر کی طرف آٹھ پیش طاق۔ ہر طاق طول میں سات۔ عرض میں چار اور ارتفاع میں گیارہ گز۔ بطرز نیم مثمن۔ عمارت کے اندر سنگ مرمر۔ اور باہر سنگ ابری۔ سنگ مرمر۔ سنگ زرد اور طرح طرح کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ مقبرہ کے بلند چبوترہ اور قبر کی اندرونی عمارت میں انواع و اقسام کے رنگین پتھروں سے پرچین کاری ہے۔ آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی بطریق پرچین کاری اس میں منقش ہیں۔ عمارت کے اندر جو فرش ہے۔ اس میں قسم قسم کے خوبصورت پتھر گرہ بندی کے طریق پر لگے ہوئے ہیں۔ گنبد کے گرد جو مثمن چبوترہ ہے۔ اس کا قطر ساٹھ گز ہے۔ اور وہ سرتاپا سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس چبوترہ کے چاروں طرف حوض ہیں۔ ہر حوض کا طول نو اور عرض ساڑھے سات گز ہے۔ اس مقبرہ اور روضۂ جہانگیر کی شرقی دیوار مشترک ہے یعنی جو دیوار مقبرہ جہانگیر اور سرائے اور مقبرہ آصف جاہ

کے گرد چھائی ہوئی ہے۔ وہاں دیوار چار چمن اور مقبرہ نورجہاں کو روضہ جہانگیر سے ملحق کرتی
ہے۔ اس مقبرہ کے عقب میں ایک مسجد ہے اور اس کے مشرق میں ایک خوبصورت مسجد نما
عمارت ہے۔ باغ کے جنوب کی سمت ایک دروازہ ہے۔ یہ تمام عمارت اور اپنا مقبرہ
اور بیگم نورجہاں نے اپنی زندگی میں تین لاکھ روپیہ کی لاگت اور چار سال کی طویل مدت
میں تعمیر کرایا تھا"

یہ اس مصنف عنایت نامہ خلف ظفر خاں احسن گورنر کشمیر کے الفاظ ہیں جو نورجہاں کی موت کے بعد بھی دیر تک زندہ رہا ہے۔

چار چمن اور اس کے گرد کھنڈروں کے بیچ درخت کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مقبرہ اور اس کی دیگر عمارات کبھی قابل دید سیر گاہیں تھیں، سکھوں کے زمانہ میں اور اس کے بعد ان کی یہ حالت تھی کہ کوئی سیاح کوئی شاعر اور کوئی اہل دل ایسا نہ تھا جو یہاں آیا ہو اور اپنے حسرت و الم کو مجروح کئے نہ گیا ہو۔ شاعروں نے بڑے بڑے دردانگیز اور عبرت خیز اشعار نورجہاں کے مزار خستہ پر لکھے ہیں۔ جس مقبرہ کی دیواریں روضہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے ساتھ تھیں لیکن انگریزی عہد ۱۸۶۰ء کے پس و پیش ریلوے والوں نے ریلوے لائن بنا کر بالکل علیحدہ کر دیا ہے چنانچہ اب مقبرہ آصف جاہ و مقبرہ نورجہاں کے درمیان ریلوے لائن حد فاصل ہے۔ آج اس مقبرہ پر کوئی گنبد نظر نہیں آتا سیدھی سادی چھت ہے۔ مقبرہ کے چار چمن اور چہار دیواری دار چمن تو سہ حاکمان لاہور کے زمانہ (۱۷۶۵ء لغایت ۱۷۹۷ء) ہی میں تباہ ہو چکے تھے۔ سکھوں کی بادشاہت بھی اسلامی عمارات کے لیے کچھ مفید ثابت نہ ہوئی۔ سنگدلی و شقاوت قلبی نے یہاں تک جرأت کی کہ قبروں کی حرمت بھی ان سے نہ ہو سکی۔ ملکہ عہد کی قبر کی دیواروں اور اس کے دروازوں کا سنگ مرمر تو الگ فرش کے خوبصورت پتھر بھی ان کی ناپاک نگاہوں سے نہ بچ سکے۔

نورجہاں کی قبر پر نہ آیات قرآنی ہیں نہ اسمائے الٰہی ہیں نہ دیواروں پر رنگ برنگ پتھروں سے کچھ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔
ان مرمریں پتھروں کو کیا اکھاڑا کہ چند سال کے بعد اپنی ہی جڑیں اکھڑ گئیں ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

۱۸۶۴ء کا مصنف جس نے رنجیت سنگھ کا زمانہ دیکھا تھا اس مقبرہ کی خستہ حالی کا ذکر کرتا ہوا تحقیقات چشتی میں (ص ۷۷۹) لکھتا ہے :۔

"مرقد نورجہاں کے گرد بڑا باغ تھا۔ اب زراعت ہوتی ہے اور چند درخت خرما
کے موجود ہیں۔ سکھ تمام پتھر اکھاڑ کر لے گئے اب مقبرہ کی عمارت خشتی ہے ۔ نہ
سنگ مرمر ہے نہ سنگ سرخ۔ قبروں کے نشان اوپر ہیں نیچے تہ خانہ ہے جس میں
صرف تعویز قبر خشتی کھڑا کر رکھا ہے"

۱۸۸۴ء کا مصنف رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور (ص ۳۳۰، ۳۳۱ پر) اس کے متعلق لکھتا ہے :۔

مقبرہ کی تمام عمارت قالبوتی ہے۔ چبوترہ کے اوپر دو قبریں ہیں۔ ایک نورجہاں کی ایک اُس کی بیٹی کی۔ جنوب کی طرف اوپر جانے کا زینہ ہے۔ نیچے ایک مسقف تہ خانہ ہے جس کا رستہ سلامی کے طور پر جنوب کی سمت ہے۔ دونوں قبریں سنگ مرمر کی تھیں۔ باہر کی دیواروں پر سنگ سرخ اور فرش پر سنگ ابری تھا۔ جب اس کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر اتار لیا گیا تو اس کی باری بھی آگئی۔ مہاراجہ کے حکم سے تہ خانہ کا دروازہ کھلوایا گیا۔ تو اس میں دو نعشوں کا آبنوسی صندوق دو مرمریں مہدوں میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ سنگ مرمر تو اکھاڑ لیا گیا اور نعشوں کے صندوق زمین میں دفن کر دیئے گئے۔ اور مقبرہ کی مرمت اینٹ اور چونہ سے کرا دی گئی چبوترہ اور اس کے تعویذ خشتی بن گئے۔ بالائے سقف خشتی فرش لگ گیا۔ اس کی منڈیریں بھی بن گئیں لیکن تہ خانہ کا دروازہ بند نہ کیا گیا۔ وہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اکثر لوگ میلا (پاخانہ) کر جاتے ہیں۔"

آج سے قریباً پینتالیس سال پیشتر ۱۸۹۹ء میں راقم نے اس مقبرہ کی جو حالت دیکھی تھی اُس میں اور ۱۸۸۲ء کی حالت میں چنداں فرق نہ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے مال مویشی چرانے والے چرواہے اندر ان کے چوپائے جگہ جگہ لیٹے پڑے تھے۔ ان کے پیشاب اور گوبر کی کثرت سے عفونت آ رہی تھی۔ فرش کے سنگ ابری کی جگہ خاک اڑ رہی تھی۔ دیواروں پر سنگ مرمر کی جگہ چونہ کی لپائی تھی۔ تہ خانہ کے اندر جہاں ملکۂ ہندوستان اور اس کی بیٹی کی قبریں تھیں اور جو بالکل بے نشان تھیں۔ دیہاتیوں، چرواہوں اور بدتمیزوں نے پردہ کی جگہ دیکھ کر پاخانہ پھرا ہوا تھا۔

۱۹۰۵ء میں یا اس سے ایک دو سال قبل مہاراجہ بردوان کہ اُن کے آباؤ اجداد کا اصل وطن لاہور ہی ہے۔ لاہور آئے شالامار باغ مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے بعد جب انھوں نے نورجہاں بیگم کے پُرحسرت انجام پر ایک نظر کی تو دل پکڑ کر رہ گئے انھوں نے گورنمنٹ پنجاب کو اس مقبرہ کی نگرانی و مرمت کے لیے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اس کے بعد جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا تو لاہور کی کئی قدیم عمارات کے ساتھ یہ مقبرہ بھی سرکاری نگرانی میں آگیا۔ چنانچہ اب مقبرہ کے گرد ایک آہنی خاردار جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سرسبز و شاداب روشیں بنا کر چار چمن کی یاد تازہ کر دی گئی ہے اور قبر کا تعویذ اور چبوترہ بھی سنگ مرمر کا بنا دیا گیا ہے۔

قبروں کے پاس ہی شرقی دیوار کے ساتھ حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی حاذق الملک بہادر مرحوم کی طرف سے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر ذیل کے اشعار درج ہیں:-

تاریخ وفات ملکہ نورجہاں

پس از فراق دہ و ہشت سال شد یکجا — رواں مہرنسا بیگم و ملک بہ جناں
بہ یاد بانوئے ہندوستاں سرود قلم گفت — سنین ہجرت و تاریخ عیسوی توأماں
ہزار و پنجاہ و پنج رفتہ از ہجرت — بلے بہ پیش جہانگیر رفتہ نورجہاں

حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں در ۱۹۱۳ء مطابق سنہ ۱۳۳۱ھ
ایں لوح را نصب کردند

اب سرکار کی توجہ سے اس مقبرہ پر ایک سرکاری آدمی بھی موجود رہتا ہے۔ مقبرہ نور جہاں کے متصل ہی سڑک کلاں کے کنارے نائنر شاہدرہ کے پاس تحصیل شاہدرہ قائم ہونے سے اس آسودۂ آغوش راوی کے مزار پر اکثر لوگوں کی روزانہ آمد و رفت رہتی ہے۔ درسیاح بھی دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

حضرت میاں میرؒ

روضۂ شیخ محمد میر بالا پیر کو ہر بیمار ئیے دردِ روح درماں دیکھئے
شیخ نتھا[1] بھی ہیں خواجہ بہاری[2] بھی ہیں باصفا یاروں کی بزمِ خلد ساماں دیکھئے

اصل نام میر محمد[3] اور لقب میاں میر یا شاہ میر تھا۔ داراشکوہ سکینۃ الاولیا میں میر محمد کی جگہ میاں میر نام مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ ہندی زبان میں "میاں" صاحب کو کہتے ہیں اور "جی" تعظیم کا لفظ ہے۔ اس لیے سب آپ کو حضرت میاں جی کہتے ہیں۔

حضرت میاں میر کا ۹۳۸ھ / ۱۵۳۱ء میں سیوستان میں پیدا ہوئے جو ٹھٹھہ اور بھکر کے درمیان واقع ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے۔ ایک بڑا اور دو چھوٹے۔ ان کے نام یہ تھے۔ قاضی بولن۔ قاضی عثمان اور قاضی طاہر۔ دو بہنیں بھی تھیں جن میں جمال خاتون

---

[1] شیخ نتھا حضرت میاں میر کے محبوب مریدوں میں تھے۔ ۱۰۲۶ھ میں آپ وفات پا گئے۔ حضرت میاں میر آپ کے جنازہ میں شامل تھے اور آبدیدہ ہو کر فرماتے تھے" اس فقیر خانے کا فقر میاں نتھا لے گئے۔ اس لیے جب ہمارا وقت آئے تو ہمیں بھی ان کے پاس ہی دفن کرنا۔ میاں نتھا صاحب کشف و کرامات تھے۔ جن، جمادات اور نباتات تک آپ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ سکینۃ الاولیا میں داراشکوہ نے آپ کے حالات میں بہت کچھ لکھا ہے۔

[2] خواجہ بہاری نے لاہور کے ایک فاضل ملا فاضل نام سے علوم ظاہری اور حضرت میاں میر سے علوم باطن حاصل کیے۔ تجرید، توکل اور تعزید میں ممتاز تھے۔ کوئی مرید پکی ہوئی روٹی دے آتا تو کھا لیتے۔ نقد و جنس کو قبول نہ کرتے۔ حضرت میاں میر کی وفات کے بعد آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ داراشکوہ لکھتا ہے جب ۱۰۵۱ھ میں صفی میرزا والیے ایران نے قندھار پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو میں ان کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا۔ فرمایا اس کی کیا طاقت ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی ادھر دیکھ سکے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد خبر آئی کہ اس کو کسی نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

[3] آپ کے حالات مندرجہ ذیل کتب میں میری نظر سے گزرے ہیں:۔
سکینۃ الاولیا، تحقیقات چشتی، خزینۃ الاصفیا، تاریخ لاہور، ہسٹری آف لاہور (انگریزی) باد ورفنگاں۔ تاریخ جلیلہ۔ چونکہ سب مصنفوں کا ماخذ سکینۃ الاولیا رہی ہے۔ اس لیے راقم بھی جو کچھ لکھ رہا ہے داراشکوہ کی خوشہ چینی کے طفیل ہے لیکن ماخذ صفا کے مطابق ہے۔

صاحب کشف و کرامات گزری ہیں۔ آپ کے والد کا نام قاضی سائیں دتا اور دادا کا نام قاضی قلندر فاروقی تھا جو بقول بعض اٹھائیسویں پشت میں حضرت فاروق اعظمؓ سے ملتے ہیں۔ حضرت میاں میر سیوستان کے ایک بزرگ شیخ خضر سے بیعت تھے۔

پچیس سال کی عمر تھی کہ اکبر کے زمانہ میں آپ لاہور تشریف لائے۔ آپ نے اس مسجد میں قیام کیا جہاں مولانا سعد اللہ اور کبھی کبھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے شاگرد مولانا نعمت اللہ کا حلقہ درس ہوا کرتا تھا۔ دارا شکوہ ان استاد شاگرد کے متعلق لکھتا ہے "دونوں اپنے عہد کے عالم فاضل اور باطنی علوم سے آراستہ تھے۔" دارا شکوہ کے اُستاد علوم ظاہری حضرت اخوند میرک شیخ تھے۔ اور اخوند میرک کے استاد مولانا نعمت اللہ تھے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے "میرے استاد فرماتے تھے کہ ہمارے استاد مولانا نعمت اللہ نے فرمایا کہ کئی سال تک حضرت میاں میر نے ہم سے علم تحصیل کیا اور ہم انہیں پڑھاتے رہے لیکن ان کے باطنی صاحب کمال ہونے سے ہم مطلق بے علم رہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ علوم معقول و منقول میں اپنے ہم سبقوں پر فوقیت لے گئے۔

علوم سے فارغ ہو کر باغوں اور جنگلوں میں نکل جاتے یا بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کیا کرتے۔ ایک دن جو موج آئی تو لاہور سے پیدل سیدھے سرہند جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر گھٹنے کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی ایک بزرگ آپ کی تیمارداری کرتے یہاں تک کہ آپ کے فضلہ کو اپنے ہاتھ سے اٹھاتے۔ اس خدمت کے عوض آپ نے اس کو اپنا مرید کیا اور آپ کے مریدوں میں سب سے پہلا مرید یہی حاجی نعمت اللہ تھا جس نے بعد میں سلوک و تصوف میں درجہ کمال حاصل کیا۔

سرہند سے آپ پھر لاہور تشریف لائے اور محلہ باغبانپورہ میں جسے دارا شکوہ کے زمانہ میں محلہ خوافی پورہ[1] کہتے تھے مقیم ہوئے اور پھر اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اسی محلہ میں رہے۔

آپ بہت کم لوگوں کو مرید کیا کرتے تھے جو ان کے تجربہ میں درست اترتا تھا اور جس میں کامل اہلیت دیکھتے تھے اسی کو مرید کرتے تھے اور چونکہ ان کی شرط اول یہ شعر ہوتا تھا ؎

شرط اول در طریق معرفت دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

اس کے بعد اس کو کم کھانے کم بولنے اور کم سونے کے علاوہ اور کئی ریاضتیں بتائی جاتیں اس لیے عوام کو مرید ہونے کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ آپ کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ مرید کو ارشاد اور تربیت کا فائدہ پہنچے۔ یہ مقصد تو نہیں تھا کہ بعض مشائخ کی طرح جو نذر نیاز اور شہرت کے لیے پیری مریدی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ارشاد و سلوک کو دکانداری کا ذریعہ بنا لیں۔ جیسے وہ پیر ہوتے ہیں ویسے ہی ان کے مرید بھی ہوتے ہیں۔ ملا شاہ بدخشانی لکھتے ہیں ؎

کسانیکہ حضرت بنام اندلند — چہ حضرت زحضرت زپا تا سراند
ہمہ حضر وقت اند از رنگ و بو — ازیں خضرہا خود حذر ہا کو
سر بوریائے کہ دارند جا — کجا بوریا مسئلہ بوئے ریا

---

[1] صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں محلہ خوافی پورہ وہیں تھا جہاں آج صدر بازار انارکلی ہے۔

مریداں فزوں تر زد تو دو زخانند — چہ دانم مرید اند یا مرتد اند

سر نغرہ ہر صبحدم تا بہ شام

بہ نغرہ ار خروار خوردہ طعام

آپ کو لاہور آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ یا کم سے کم آپ کی کچھ زیادہ شہرت نہ تھی۔ انہی ایام میں آپ کا بھائی اپنے وطن سے ان کی تلاش میں آیا۔ آپ فرماتے ہیں میں اس کو کھانا کھلانے کے لیے متفکر تھا۔ اس لیے کہ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے بھائی کو تو حجرے میں بٹھایا اور آپ باغ میں گیا وہاں دو رکعت نماز ادا کی اور خدا سے دعا مانگی کہ اے پروردگار میرے پاس بھائی آیا ہے اور تیرے سوا میرا کوئی پروردگار نہیں کہ جس سے کچھ امید رکھوں میرے پاس تو کچھ بھی نہیں فرماتے ہیں غیب سے ایسی آواز آتی ہوئی معلوم ہوئی کہ دعا مانگنے سے پہلے ہی ہم نے تیری خواہش کو پورا کر دیا ہے۔ چنانچہ میں ڈیرے پر آیا تو ایک شخص موجود تھا طعام کے علاوہ وہ نقدی بھی لایا تھا۔ نام پوچھا تو کہا خدا کا بندہ ہوں اور ہمارے کھانا کھا چکنے کے بعد خالی برتن لے کر اور سلام کہہ کر چلا گیا۔

آپ صرف ایک قسم کا طعام کھایا کرتے اور وہ بھی مٹی کے برتن میں۔ اور پھر اپنے ارادت مندوں کو بھی اس میں شامل کرتے۔ اور شیخ محمد لاہوری کے ہاں اس بنا پر کہ وہ عیال دار ہے۔ اس کا حصہ بھیج دیا کرتے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ غذا صرف زندہ رہنے اور یادِ الٰہی میں مصروف رہنے کے لیے کھاتے تھے نہ کہ پیٹ بھرنے کے لیے۔ اگر کوئی شخص پے در پے کھانا پکا کر لاتا تو اسے منع کرتے۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا اس سے توکل جاتا رہتا ہے اور دل میں ہر وقت امید سی لگی رہتی ہے۔

آپ اپنے گرد زیادہ جمگھٹا پسند نہیں کرتے تھے۔ سارا دن جنگلوں، باغوں اور قبرستانوں میں بسر کرتے۔ آپ کے عقیدت مند جو آپ کے ہمراہ ہوتے، وہ بھی الگ بیٹھتے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو سب اکٹھے ہو جاتے اور باجماعت نماز پڑھتے۔ شام کی نماز کے بعد حجرے کو اندر سے زنجیر لگا کر کواڑ بند کر لیا کرتے اور جب کوئی ملاقات کے لیے صدا کرتا تو دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت دیتے اور اس کے حق میں دعا کر کے کہتے "تمھیں بھی آخر کوئی کام ہے اور ہمیں بھی ہے۔ بیکار بیٹھنے سے کیا حاصل۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔"

جہانگیر کی وفات (۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ بعمر ۶۰ سال) کے بعد شہریار داماد نور جہاں نے لاہور میں بادشاہت کا مدعی ہو کر ۷۵ لاکھ روپے ایک ہفتہ میں خرچ کر کے پندرہ ہزار فوج جمع کر لی اور علماء و فضلاء کو خوش کر کے اپنا طرفدار بنا لیا۔ آصف جاہ برادر نور جہاں نے شہزادہ داور بخش پسر خسرو خلف جہانگیر کو برائے نام بادشاہ بنا کر مقابلہ کیا اور شہریار کو شکست دے کر اندھا کرا دیا۔

شہریار نے اپنی چند روزہ بادشاہی کے دوران حضرت میاں میر کے پاس اپنا آدمی بھیجا کہ آپ خود میرے پاس آئیں یا اپنی دستار مبارک بطور تبرک ارسال کریں۔ آپ نے دونوں باتوں سے انکار کرتے ہوئے کہلا بھیجا کہ فقیروں کو بادشاہوں سے کیا مطلب اور کیا تعلق! شہریار کو یہ جواب پسند نہ آیا۔ اس نے ایک اور معتبر کو آپ کے پاس بھیجا کہ جس طرح بھی ہو آپ کی دستار حاصل کر کے لائے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ حضرت نے آخر نہایت ناراضگی کے عالم میں دستار مبارک اپنے سر سے اتار کر زمین پر دے ماری اور کہا "لے جاؤ" ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ناخلف اندھا کر کے مار ڈالا گیا۔

جہانگیر، شاہجہان اور دارا شکوہ نے آپ سے کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ دارا شکوہ آپ کے خلیفہ ملا شاہ بدخشانی کا مرید تھا لیکن آپ سے بھی حسن عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے سکینۃ الاولیاء آپ کے حالات میں لکھی ہے۔ جہانگیر پر ان کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ وہ دنیاوی تعلقات توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "تمہارا وجود خلق اللہ کی پاسبانی کے لیے ہے اور تمہارے عدل کی برکت سے فقراء تک سبھی اپنے کام میں مشغول ہیں۔ پہلے تم اپنے جیسا خلقت کی نگہبانی کے لیے کوئی پیدا کرو۔ پھر ترک دنیا کا خیال دل میں لاؤ۔"

جہانگیر نے ان کو دو عریضے بھی لکھے جن میں اپنی نیازمندی کا اظہار کیا۔

شاہجہان بھی لاہور میں دو مرتبہ آپ سے ملا۔ دارا شکوہ بھی ساتھ تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ جب ہم آپ کے حجرہ میں داخل ہوئے تو آپ نے سلام دعا کے بعد بادشاہ سے فرمایا "عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبرگیری کرنی اور اپنی تمام ہمت اپنی ولایت کی آبادی و سرسبزی میں صرف کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر رعیت آسودہ اور ملک آباد ہے تو سپاہ آسودہ اور خزانہ پُر رہے گا۔" اس کے بعد مذہبی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر بادشاہ سے میری علالت کی کیفیت سُن کر مجھے پانی دم کر کے دیا جس سے ایک ہفتہ کے اندر مجھے صحت کامل ہو گئی۔

دوسری مرتبہ جب شاہجہان آپ سے ملنے کو آیا تو شال کی دستار اور کھجوروں کی تسبیح نذر کو لایا اور عرض کی کہ آپ چونکہ دنیاوی مال سے کنارہ کش ہیں اس لیے یہ نذر قبول فرمائیں۔ آپ نے دستار تو واپس کر دی لیکن تسبیح قبول فرما کر چند دنوں کے بعد دارا شکوہ کو عنایت کر دی۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ "تسبیح خوانی آپ کو پسند نہ تھی بلکہ تسبیح جب کسی کے ہاتھ میں دیکھتے تو ہندی کا ایک شعر پڑھتے جس کا مضمون حسب ذیل رباعی نے خوب ادا کیا ہے" ؎

تسبیح بہ من عجب در آمد بزبان — گفتا کہ مرا چرا کنی سرگردان
گر دل بہ عوض ہمے بگردانی تو — دانی کہ برائے چیست خلق انسان

دارا شکوہ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی یہاں تک کہ وہ آپ کے چبائے ہوئے اور پھینکے ہوئے لونگ بھی کھا لیتا اور جب بالاخانے پر آپ کے پاس جاتا تو جوتی اتار کر ننگے پاؤں جاتا۔ وہ لکھتا ہے۔ بعض حاضرین کو یہ امر ناگوار گزرتا تھا لیکن میں کمال ارادت و خلوص سے اس کو اپنی سعادت مندی سمجھتا تھا۔ آپ کو بھی دارا شکوہ سے کمال الفت تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص سلام کو آیا۔ پوچھا کیا نام ہے اور کیا کام کرتے ہو؟ اس نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ سرکار! دارا شکوہ کا ملازم ہوں۔ یہ سُن کر اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا

ع

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

آپ فرماتے تھے۔ لباس اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ کوئی شخص پہچان نہ سکے کہ یہ درویش ہے، صوفی ہے، فقیر ہے یا کیا ہے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کا قول نقل کر کے فرمایا کرتے کہ صوفی وہ شخص ہے جو نہ ہو لیکن میں کہتا ہوں اگر ہو تو بھی نہ ہو۔ اسی بنا پر آپ اپنے مرید خاص شیخ نتھا لاہوری کو "نہ تھا" (نابود) کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک مطلب پرست دنیادار سے کہا "تم لوگ کوئی نیک عمل کرنے کے بغیر درویشوں سے اپنی مشکلات آسان کرانی چاہتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ تم بھوکے کا پیٹ بھر دو۔ ننگے کو کپڑا دو۔ حاجتمندوں کی حاجتیں اللہ کے دیے ہوئے مال سے پوری

گروہ وہ تمہاری حاجتیں پوری کرے گا۔"

آپ لوگوں کی آؤ بھگت اور شہرت سب کو محض دکھلاوا اور نمائش سمجھتے تھے۔ آپ کے سر پر کم قیمت کپڑے کی پگڑی اور بدن پر موٹے کپڑے کا کرتہ ہوتا تھا۔ کپڑے جب میلے ہو جاتے تو دریا پر جا کر خود اپنے ہاتھ سے صاف کرتے۔ البتہ کپڑے ہمیشہ صاف اور ستھرے رکھتے اور اپنے اصحاب کو بھی صفائی کی تاکید کرتے۔

فقیر تھا۔ ایسے تکلفات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ گھر میں نئے بھی نہیں پرانے بوریے کا فرش رہتا تھا۔ اسی فرش پر شہنشاہ جہانگیر، شاہجہان، شہزادے اور امراء بیٹھا کرتے تھے۔

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور کئی اور علماء و فضلاء بھی آپ کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ ان کا کچھ ذکر سکینۃ الاولیاء میں موجود ہے۔ آپ علماء کو بھی اور اپنے یاروں کو بھی اکثر اس حدیث پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے:۔

لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (یعنی قلب کی حضوری کے بغیر نماز نہیں ہوتی)

اور کہتے کہ اگر یہ نہیں تو نماز تنہا کیا اور باجماعت کیا بے کار ہے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے۔ عالم و فاضل اور صوفی کامل ہونے کے باوجود آپ نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ لیکن جب کبھی آپ کسی حدیث یا آیت یا بزرگوں کے مشکل اشعار و اقوال کے معنے بیان کرتے تو حاضرین جن میں علماء و فضلا بھی ہوتے دنگ رہ جاتے۔

دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نغمہ و راگ سنا کرتے لیکن نہ آپ نے کسی قوال کو کبھی بلایا نہ کسی قوال کو کبھی ہمراہ رکھا اور نہ سماع کے دوران کبھی وجد و رقص کیا۔ قوال جب کبھی خود بخود آتے اور مجلس سماع گرم ہوتی تو اس وقت آپ کے چہرے سے کمال سرور ظاہر ہوتا۔ ریش مبارک کا ایک ایک بال کھڑا ہو جاتا اور چہرہ چمکنے لگتا لیکن وقار و تمکنت کی وجہ سے کوئی حرکت آپ سے ظہور میں نہ آتی۔

آپ فرمایا کرتے۔ انسان تین چیزوں نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے ان میں سے نفس کی اصلاح شریعت سے، دل کی طریقت سے اور روح کی حقیقت سے ہوتی ہے لیکن سب سے بڑا مرتبہ شریعت کا ہے۔

آپ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک لاہور میں رہے۔ آخر وہ وقت آگیا جس سے نہ کوئی پیغمبر بچ سکا ہے نہ کوئی ولی بزرگ۔ بڑھاپے کی وجہ سے آپ اکثر بیمار رہتے تھے لیکن نماز کسی حالت میں ترک نہ کرتے تھے۔ پاؤں میں ایک مرتبہ شدت کا درد رہا تو بیٹھ کر ہی نماز پڑھ لیا کرتے۔ اخیر عمر میں بصارت میں بھی فرق آگیا تھا۔ موت سے قبل پانچ روز مرض اسہال میں مبتلا رہے۔ آخر ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو منگل کے روز محلہ خوانی پورہ میں اپنے حجرے کے اندر آپ کا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

وفات سے ایک روز قبل نواب وزیر خاں حاکم صوبہ پنجاب عیادت کو آیا۔ بڑی مشکل سے اس کو حجرے کے اندر آنے کی اجازت ملی۔ نواب نے کہا۔ ایک حکیم حاذق کو ہمراہ لایا ہوں۔ اجازت ہو تو وہ علاج کرے۔ آپ نے فرمایا "اب حکیم مطلق ہی کافی ہے"۔

جب دوسرے دن نواب وزیر خاں نے انتقال کی خبر سنی تو رؤسا و علمائے شہر کے ہمراہ نماز جنازہ میں شامل ہوا چونکہ آپ کی وصیت تھی کہ جہاں ہمارے دوست میاں نتھا وغیرہ دفن ہیں۔ وہیں ہم کو بھی دفن کرنا۔ اس لیے آپ کے فرمان کے مطابق اس

مقام پر جو شہر لاہور سے آدھ کوس کے فاصلہ پر گوشۂ جنوب مشرق میں اور موضع دارا پور المشہور بہ ہاشم پور کے متصل ہے آپ کو دفن کیا گیا۔ اسی مقام کا نام آپ کے نام پر آج میاں میر ہے۔ ایک فاضل شخص ملا فتح اللہ نے یہ تاریخ لکھی۔

میاں میر سر دفتر عارفاں ... کہ خاک درش رشک اکسیر شد
سفر جانب شہر عقبیٰ چو کرد ... چو ں زیں محنت آباد دلگیر شد
خرد بہر سال وصالش نوشت
بہ فردوس والا میاں میر شد

۱۰۴۵ھ

آپ نے آخری لمحوں میں فرمایا۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ یہاں تک کہ دم چھوٹ گیا اور سانس سینے میں چلا گیا پھر دو مرتبہ آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہا اور اللہ ہی کے پاس چلے گئے۔ سکینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ نے اپنی چشم دید اور حضرت کے مریدوں سے سن کر آپ کی کئی کرامتیں لکھی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ رحمت ایزدی جن کے شامل حال ہو اور قلب جن کا آفتاب سے زیادہ روشن اور شیشہ سے زیادہ صاف اور آلائش دنیا سے پاک ہو۔ ان کے صاحب کرامت ہونے میں کون شک و شبہ کر سکتا ہے۔

دارا شکوہ لکھتا ہے حضرت میاں جیو رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے وفات کے بعد مجھے شور زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور میری قبر کو بھی سادہ رکھنا کیونکہ ؎

صورت قبرم ز بعد مرگ ویراں خوشتر است
نیستی مانند من با خاک یکساں خوشتر است

پھر فرمایا۔ دیکھنا میری ہڈیوں کو نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دوکان نہ بنا لینا۔

آپ کے ارادت مندوں میں حضرت ملا شاہ بدخشانی۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی۔ میاں نتھا لاہوری۔ خواجہ بہاری۔ ملا محمد سیالکوٹی۔ حاجی مصطفےٰ سرہندی۔ ملا حامد گجر۔ ملا روحی مسمی بہ ابراہیم۔ ملا خواجہ جلال لاہوری۔ حاجی صالح کاشمیری۔ شیخ ابوالمکارم ملا محمد سعید کاشمیری۔ میاں مفتی محمد مراد لاہوری وغیرہ کئی اصحاب بہت مشہور ہیں جن کی تفصیل سکینۃ الاولیاء میں درج ہے۔ ان میں سے کئی ایک کی قبریں گورستان حضرت میاں میر میں موجود ہیں۔ آپ کے مقبرہ سے مغرب کی طرف سڑک چھاؤنی میاں میر جو سیدھی ریلوے سٹیشن سے آتی ہے اور مشرق کی جانب ریلوے لائن ہے جو ملتان کو جاتی ہے۔ پہلے میاں میر چھاؤنی کے نام سے ریلوے سٹیشن تھا لیکن اب چند سال سے حکام ریلوے نے اس سٹیشن کا نام لاہور کنٹونمنٹ (چھاؤنی) رکھ دیا ہے۔ مقبرہ کے گرد بلند اور پختہ چار دیواری ہے جس کے اندر مغرب کی جانب تین گنبدوں والی ایک عالیشان مسجد ہے۔ چار دیواری کے اندر رنگ سرخ کا فرش ہے۔ فرش کے درمیان سنگ مرمر کا ایک چبوترہ پانچ فٹ مرتفع ہے۔ عرس کے ایام میں اکثر زائرین اس چبوترہ پر آرام کرتے ہیں۔

آپ کا عرس ہر سال ہفتم ربیع الاول کو ہوتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات کے لیے ہزارہا آدمی دور و نزدیک سے آ جاتے ہیں۔ دروازہ آمد و رفت سے لے کر چبوترہ رنگ مرمر تک دو رویہ دکانیں لگ جاتی ہیں۔ صاحب تحقیقات چشتی (ص ۲۶۱ پر آج سے تقریباً سو سال پہلے کی حالت بیان کرتے ہوئے) لکھتے ہیں "بیرونی دروازہ کے باہر غرب کی جانب ایک دوکان شراب کی بھی کھل جاتی ہے اور

گئی اکھاڑے چرسیوں اور ساقیوں (حقہ پلانے والوں) اور صافتوں کے تکئے بن جاتے ہیں۔"

اللہ اکبر یہ اس بزرگ کے مزار کا حال ہے۔ جو شریعت کو سب پر مقدم سمجھتے تھے۔ جو حضورِ قلب کے بغیر ہر نماز کو نماز نہ سمجھتے تھے۔ جنھوں نے آخری وقت میں ہدایت کی تھی کہ میری قبر کو دوکان نہ بنا لینا۔ جو حتی الامکان عوام کو آزمائش کے بغیر مرید نہ کرتے تھے۔ جو تہجد نماز با جماعت ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے مزار پر شراب نوشی کی دکان اور بھنگیوں اور چرسیوں کا اجتماع۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دربار صاحب امرتسر، رام باغ امرتسر اور بارہ دری حضوری باغ کی تعمیر اور زینت کے لیے جب لاہور کے مزارات سے پتھر اکھڑوانے شروع کیے تو سنگ سرخ کی ضرورت کے لیے حضرت میاں میر کے روضہ پر آئے اور حکم دیا کہ جس قدر اس مقبرہ اور اس کے نواح میں موجود ہیں سب اکھاڑ کر امرتسر پہنچائے جائیں بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ فلاں جگہ فلاں پتھر اور فلاں پتھر فلاں دالان میں لگایا جائے لیکن یہ حکم دے کر آپ ابھی باہر نکلے ہی تھے اور اپنی دل پسند گھوڑی لیلی پر سوار ہوئے ہی تھے کہ گھوڑی بے قابو ہو گئی۔ مہاراجہ نے ہر چند سنبھلنے کی کوشش کی لیکن سنبھل نہ سکے اور آخر گر پڑے کچھ چوٹیں بھی آئیں تھوڑی دیر تک بے ہوش بھی رہے ہوش آیا تو کہا ہم کو اس بزرگ پیر کے مقبرہ کی بے حرمتی کرانے کی کافی سزا مل گئی ہے۔ ہمارے تمام احکام اس بارہ میں منسوخ سمجھے جائیں ہم نے اب توبہ کی ہے یہ کہہ کر مزار پر پیدل واپس آئے۔ پانچ سو روپیہ مزار پر نذر گزارا اور توبہ کی اور مزار پر سعیدی کیے جانے کا حکم دیا۔ صاحب عمدۃ التواریخ لالہ سوہن لال سوری نے اپنی تاریخ میں گو مہاراجہ کے گھوڑی سے گرنے اور مزار کو گرانے کا حکم دینے کا ذکر نہیں کیا لیکن تاریخ کے دفتر سوم حصہ دوم کے صفحہ ۲۹۸ پر مزار کی مرمت کرانے اور نذرانہ دینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مبلغ پانصد روپیہ در باب تیاری شکست و ریخت مکان میاں میر صاحب حوالہ فرمودند
و بہ خلیفہ نور الدین جہت درستی آں عمارت ارشاد صادر گردیدہ"

اس کے بعد ہر سال مزار پر آتے اور نذر گزارتے۔ ان کی دیکھا دیکھی امراء و وزراء بھی آتے اور سجادہ نشین اور مجاوروں اور درویشوں کو کافی روپیہ دے جاتے بلکہ امراء وزراء میں سے اکثر ہر روز حاضری دیا کرتے۔ صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں۔ مجاور خاصے دولتمند ہو گئے۔ خوب چین اڑاتے رہے۔ معمولہ درویشوں کے علاوہ اور دوسرے بھی گدا اور فقیر آتے اور شام کو جیبیں بھر کر لے جاتے۔

سنگ سرخ کی وجہ سے حضرت میاں میر کے روضہ اور بادشاہی مسجد کا بہت کچھ باہمی تعلق بنایا جاتا ہے۔ عام روایت یہی ہے اور اسی کو مصنف تاریخ لاہور، تحقیقات چشتی اور ہسٹری آف لاہور نے بھی لکھا ہے کہ دارا شکوہ نے اپنے پیشوا حضرت میاں میر کے مزار کی تعمیر کے سبب جو سنگ سرخ جمع کیا تھا جب عالمگیر نے دارا شکوہ کا خاتمہ کر دیا تو اس نے یہ پتھر یہاں سے اٹھوا کر شاہی مسجد کی عمارت میں صرف کر دیا۔ لیکن یہ روایت اس لیے غلط ہے کہ حضرت میاں میر کا انتقال ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ہوا تھا۔ دارا شکوہ کا قتل ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کے اواخر میں ہوتا ہے۔ کیا ۲۴-۲۵ سال کے عرصہ میں وہ ان کا مزار تعمیر نہ کرا سکتا تھا اور پتھر وہاں اس نے یونہی رکھ چھوڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت میاں میر کا مزار دارا شکوہ کی زندگی میں اسی کے اہتمام سے تیار ہو چکا تھا جیسا کہ لاہور کے نامور محقق مولانا علم الدین سالک ایم۔ اے لکھتے ہیں "اس عمارت کی وضع بالکل تاج محل کی عمارات سے ملتی ہے۔ وہی نقش و نگار ہیں۔ وہی

رنگ آمیزیاں ہیں۔ ایسی حالت میں یہ لکھنا کہ مزار حضرت میاں میر کا تمام پتھر بادشاہی مسجد کی عمارت میں صرف کیا گیا حقیقت سے بعید ہے۔"

شہزادی نادرہ بیگم

خانۂ دل میں لگا رکھی ہے داغوں نے اک آگ
آئیے اور شوق سے سیر چراغاں دیکھئے

نادرہ بیگم کی کیفیت جو لاہور کی تاریخوں میں درج ہے وہ بہت زیادہ حیرت انگیز ہے اس کے متعلق تحقیقات چشتی تاریخ لاہور۔ ہسٹری آف لاہور (انگریزی) ان تینوں تاریخوں میں ایک ہی مضمون کو سب نے نقل در نقل کیا ہے۔ یہاں ہسٹری آف لاہور (ص ۱۷۷) سے مختصر سا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"نادرہ بیگم داراشکوہ کی بہن تھی۔ وہ بچپن ہی میں حضرت میاں میر کے پاس رہا کرتی تھی نو سال کی عمر میں حضرت کو نماز ظہر کے وقت وضو کرایا کرتی تھی جب گیارہ سال کی عمر کو پہنچی تو حضرت نے فرمایا۔ بیٹی اب تم جوان ہو۔ اب وضو نہ کرایا کرو۔ شاہزادی کو اس خدمت سے معزول ہونے کا سخت قلق ہوا۔ اور وہ اسی صدمہ سے رات کو انتقال کر گئی[1] اور حضرت کے حکم سے یہیں دفن ہوئی۔ داراشکوہ نے اس کی یادگار میں اس کی قبر پر عالیشان بارہ دری تعمیر کرائی۔"

لیکن بادشاہنامہ عالمگیری کے مصنف نے (ص ۷۸[2]) پر نادرہ بیگم کی موت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی کیفیت ذیل کی سطور سے معلوم ہوگی۔

"جب اواخر ۱۰۶۹ھ میں ملک جیون زمیندار دھاندر نے داراشکوہ کو اپنا مہمان بنا کر گرفتار کر لیا۔ انہی دنوں داراشکوہ کی بیگم نادرہ بیگم جو اپنے اور اپنے خاوند کے مصائب کی وجہ سے بیمار تھی اور ان مصیبت خیز ایام میں اس کے ساتھ ہی تھی۔ اسہال کی وجہ سے وہیں انتقال کر گئی۔ اس کی وصیت کے مطابق داراشکوہ نے اس کی لاش لاہور بھیجی جو حضرت میاں میر کے احاطہ میں دفن کی گئی۔ مرحومہ کے تابوت کے ہمراہ اس بیکسی کے عالم میں بھی ستر آدمی تھے۔"

شاہجہان کی چودہ اولادوں میں چھ شاہزادیاں تھیں۔ حورالنسا بیگم۔ ثریا بانو بیگم۔ حسن آرا بیگم تو بچپن ہی میں بن کھلے مرجھا گئی تھیں۔ جہاں آرا بیگم (جس کا خطاب بادشاہ بیگم یا بیگم صاحب تھا) اور روشن آرا بیگم۔ باپ کے بعد بھی زندہ رہیں اور چھٹی شاہزادی

---

[1] یہ واقعہ ۱۰۴۲ھ کا ہے بلکہ مصنف تحقیقات نے تو لکھا ہے کہ شوال کی چودہ تاریخ کو وہ دفن ہوئی۔

[2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد ہشتم ایڈیشن اول۔

گوہر آرا بیگم تھی جس کی ولادت پر ذیقعد ۱۰۴۰ھ میں شاہجہان کی بیگم ممتاز محل انتقال کر گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نادرہ بیگم کے نام سے شاہجہان کی کوئی اولاد نہ تھی اور اس لیے وہ دارا شکوہ کی ہمشیرہ بھی نہ تھی

پھر وہ کون تھی؟ اس کے لیے ہمیں ظفر نامہ[1] شاہجہان کا صفحہ ۶۴ دیکھنا چاہیے جس میں ۱۰۴۲ھ کے واقعات میں لکھا ہے۔

"۲ شعبان ۱۰۴۲ھ میں سلطان پرویز[2] (خلف جہانگیر) کی بیٹی سے شاہزادہ دارا شکوہ کا نکاح ہوا۔ بزم نشاط و چراغاں نے آرائش پائی اور آتش بازی کے عجائبات ہوئے شاعروں نے تہنیت نامے لکھے اور تاریخ ہوئی۔ ع

قِراں کردہ سعدین بر برج جلال

اس شادی پر بہ تفصیل ذیل ۳۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ سرکار خالصہ کا ۶ لاکھ۔ بیگم صاحب یعنی دارا شکوہ کی بہن جہاں آرا بیگم کا ۱۶ لاکھ اور دلہن کی والدہ کا دس لاکھ۔"

مختصر یہ ہے کہ بارہ دری جو نادرہ بیگم کے نام سے مشہور ہے اور جس کے اندر ایک قبر بھی ہے وہ ضرور نادرہ بیگم ہی کی ہے جو سلطان پرویز کی بیٹی جہانگیر کی پوتی۔ شاہجہان کی بھتیجی اور دارا شکوہ کی بیوی تھی۔ لیکن نہ یہ وہ نادرہ بیگم ہے جس کا ذکر لاہور کی تاریخوں میں درج ہے اور نہ دارا شکوہ نے اس کی عمارت تعمیر کرائی ہے۔ چونکہ دارا شکوہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں احاطہ حضرت میاں میر میں اکثر عمارات شروع کرا رکھی تھیں جو اس کے زوال اور اس کی موت کی وجہ سے بند ہو گئیں اور انہی ایام میں نادرہ بیگم کی نعش بھی لاہور آ کر دفن ہو چکی تھی اور چونکہ اکثر کتب سے یہ بھی ثابت ہے کہ بعد میں عالمگیر نے اس احاطہ کی نامکمل عمارات کو تکمیل تک پہنچایا اس لیے قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نادرہ بیگم کی بارہ دری اور اس کا ملحقہ تالاب اور پل بھی عالمگیر ہی کے حکم سے تیار ہوا۔

تالاب کے عین درمیان یہ بارہ دری اب بھی موجود ہے۔ تالاب کی اینٹیں چھاؤنی میاں میر کی تعمیر کے دوران میں میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے ذریعہ اکھاڑی گئیں[3] تالاب کا اب کہیں نشان تک بھی نہیں البتہ اس کی نشیبی زمین موجود ہے جو اس مٹے ہوئے تالاب کا پتہ بتا رہی ہے اور جہاں اب زراعت اور کاشت ہوتی ہے۔ اس کا پل جس کے ۲۱ میں سے تیس محراب موجود ہیں۔

---

[1] ظفر نامہ شاہجہان جو مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی تصنیف ہے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں عہد شاہجہانی کی مندرجہ ذیل تاریخوں کا نچوڑ ہے۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ عمل صالح محمد صالح کمبوہ۔ پادشاہنامہ محمد امین قزوینی۔ شاہجہان نامہ عنایت خاں آشنا۔

[2] پرویز جہانگیر کے حکم سے دکن اور الہ آباد کی مہمات پر رہا۔ جب شاہجہان نے بعالم شاہزادگی باپ سے بغاوت کی تو جہانگیر نے پرویز ہی کو اس کی تنبیہہ کے لیے بھیجا۔ شراب بکثرت پیتا تھا بعمر ۳۵ سال دکن ہی میں انتقال کر گیا۔ ۱۶۲۵ء تاریخ وفات ہے۔ ۶ صفر ۱۰۳۶ھ کو آگرہ میں اپنے باغ میں دفن ہوا۔

[3] تحقیقات چشتی (ص ۸۷۵ پر) میں لکھا ہے کہ ان اینٹوں کی قیمت محبوب شاہ سجادہ نشین درگاہ حضرت میاں میر کو میجر میکر یگر ڈپٹی کمشنر لاہور کی عدالت سے دو سو پچاس روپے ملی۔

بغتہ چونہ گچ ابھی تک نظر آرہا ہے۔ بارہ دری میں جس قدر سنگ مرمر تھا وہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ میں اکھاڑ لیا گیا۔ نادرہ بیگم کی قبر حسب سابق موجود ہے۔

مسدم بلکہ غیر موجود تالاب کے شمالاً جنوباً دو نہایت بلند ڈیوڑھیاں تھیں جن میں ہزاروں ہزار آدمی سما جاتا تھا۔ تالاب کے چاروں کونوں پر سنگ سرخ کے ہشت پہلو چار بنگلے تھے۔ جن کے نشان ۱۸۶۲ء تک موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ اب اس کہنہ بارہ دری کے علاوہ ہر جگہ خاک کے ڈھیر نظر آتے ہیں ؎

واہ کیا نیرنگ ہیں افلاک کے
ڈھیر دیکھے گل رخوں کی خاک کے

مخدومہ بیگم و نواب ابوالحسن خاں

ہر قدم پر آبلے وحشی کے روتے ہیں لہو
خار زار دشت میں رنگ گلستاں دیکھیے

اس باغ و مقبرہ کی کیفیت اور ابوالحسن خاں کے حالات کی ترتیب کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے مدد لے رہا ہوں:۔

۱۔ ہسٹری آف لاہور۔ خان بہادر سید محمد لطیف جج
۲۔ تحقیقات چشتی۔ مولوی نور احمد چشتی
۳۔ تاریخ لاہور۔ رائے بہادر کنہیا لال ہندی۔
۴۔ کارنامۂ جہانگیری جلد ششم تاریخ مولوی ذکاء اللہ
۵۔ ظفر نامہ شاہجہان جلد ہفتم " "
۶۔ بادشاہ نامہ عالمگیری جلد ہشتم " "
۷۔ تاریخ کشمیر جلد دوم مصنفہ فوق
۸۔ متفرق مضامین

تحقیقات چشتی میں صفحہ ۷۷۳ پر "مقبرہ ابوالحسن خاں بن آصف خاں" کے عنوان سے لکھا ہے:۔

"ابوالحسن خاں بن آصف خاں بن اعتماد الدولہ طہرانی کے مقبرہ کا گنبد بہت بڑا تھا۔ بعہد مہاراجہ شیر سنگھ ۷ ساون سمت ۱۸۹۹ ب کو بجلی کے صدمہ سے گر کر خراب ہو گیا۔"

پھر یہ بھی لکھا ہے:۔

"یہ آصف خاں ابوالحسن بن اعتمادالدولہ غیاث بیگ خاں طہرانی تھا اور نورجہاں کا حقیقی بھائی تھا۔ ۱۰۵۱ھ میں بعہد شاہجہاں انتقال کر گیا۔"

نیز لکھا ہے:۔
"شاہدرہ میں جہانگیر کے مقبرہ کے پاس جس آصف خاں ابوالحسن کا مزار ہے ——— وہ

آصف خاں ابوالحسن جہانگیری تھا اور یہ آصف خاں ابوالحسن شاہجہانی ہے جس کو شاہجہان
نے یمین الدولہ عموی بجان برابر خان خاناں وغیرہ کے خطابات دے تھے۔ آصف خاں
خطاب شاہی تھا اور ہر عہد میں آصف خاں ہوتے رہے ہیں۔"

یہ تو واقعی صحیح ہے کہ آصف خاں شاہی خطاب تھا اور ہر عہد میں کسی نہ کسی کو یہ خطاب ملتا رہا ہے۔ چنانچہ بزمانہ جہانگیر ایک آصف خاں جعفر کے نام سے بھی گزرا ہے (دیکھو ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۳۰)۔ لیکن یہ عجیب تحقیقات ہے کہ جو آصف خاں یا آصف جاہ مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نورجہاں کے درمیان دفن ہے اس کو تو جہانگیری بنا یا گیا ہے اور جس ابوالحسن آصف خاں کا پتہ تین میل کے فاصلے پر شالامار باغ کی سڑک کے دائیں ہاتھ دیا جاتا ہے۔ اس کو نورجہاں کا بھائی اور شاہجہان کا وزیر بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام تاریخ دان جانتے ہیں کہ شاہجہان نے اپنے خسر، وزیر اور سپہ سالار کو یمین الدولہ اور عموی بجان برابر کا خطاب دیا تھا۔ وہ اُس کے حکم سے جہانگیر کے مقبرہ کے پاس دفن کیا گیا تھا۔ ہسٹری آف لاہور کا مصنف (ص ۱۰۸ میں) لکھتا ہے :-

"آصف خاں یا آصف جاہ میرزا ابوالحسن برادر نورجہاں کا مقبرہ۔ مقبرہ جہانگیر کے سامنے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس کی وفات ۱۰۵۱ھ / ۱۶۴۱ء میں ہوئی۔"

کارنامہ جہانگیری (ص ۲۹۲ پر) لکھا ہے :-

"۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ کو یمین الدولہ آصف خاں خان خاناں سپہ سالار نے وفات پائی اس کی وفات سے شاہجہان کا عیش مکدر ہو گیا اُس نے حکم دیا کہ اس کو جہانگیر کے روضہ کی غربی جانب مدفون کریں اور اس کی تربت پر ایک گنبد عالی تعمیر ہو یمین الدولہ ۱۰۲۹ھ / ۱۶۲۹ء میں سپہ سالار مقرر ہوا تھا۔"

مصنف تحقیقات چشتی نے جو شجرہ لکھا ہے وہ بھی درست نہیں وہ لکھتے ہیں ابوالحسن خاں بن آصف خاں بن اعتماد الدولہ طہرانی حالانکہ صحیح یہ ہے کہ خواجہ محمد شریف طہرانی کے دو فرزند تھے۔ ایک طاہر۔ دوسرا میرزا غیاث بیگ جو بعہد اکبر ہندوستان آیا اور جسکی لڑکی مہرالنساء بیگم کو جہانگیر نے ملکۂ ہند بنانے کے بعد اعتماد الدولہ کا خطاب دیا۔ اعتماد الدولہ جب گردش روزگار کی بدولت ہندوستان آیا تو اُس وقت اُس کے ہمراہ بیوی کے علاوہ دو لڑکیاں اور ایک فرزند ابوالحسن تھا۔ نورجہاں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ جہانگیر نے مہرالنساء کو نورمحل اور نورمحل سے جب نورجہاں بنایا تو اُس کے باپ کے ساتھ ہی اس کے بھائی کو بھی مناصب و مراتب عطا کئے۔ اور یہی ابوالحسن جب شاہجہان کا خسر بنا تو یمین الدولہ عموی بجان برابر۔ دانائے رموز سلطنت عظمیٰ۔ مدبر امور عالم۔ کار فرمائے ارباب سیف و قلم۔ زبدہ خوانین عالیشان وغیرہ القاب سے سرفراز کیا گیا۔

رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور نے بھی تحقیقات چشتی ہی کا تتبع کیا ہے۔ نام میں تھوڑا سا فرق رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "ابوالحسن یوسف خان بن اعتماد الدولہ نورالحسن خان طہرانی۔ یہ ابوالحسن نورجہاں بیگم کا حقیقی ماموں تھا۔ اور امرائے عہد جہانگیری میں ممتاز تھا۔"

ابوالحسن یوسف خاں اور اعتماد الدولہ نورالحسن خان کے نام اب تک کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرے اور نہ نورجہان کے کسی ماموں کا نام کہیں نظر آیا ہے۔ عجیب تماشا یہ ہے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد آپ لکھتے ہیں یہی ابوالحسن یوسف خاں شاہجہان کے زمانے میں

* یمین الدولہ بہادر بجان برابر خان خاناں بازوئے راست دولت چغتائی" کہلایا۔ یا بہ الفاظ دیگر یہی ابوالحسن نورجہاں کا بھائی بھی تھا اور ماموں بھی۔ اس کے مقبرے کا جائے وقوع رائے کنہیا لال نے بھی وہی بتایا ہے جو مصنف تحقیقات چشتی نے لکھا ہے اور جس کی تصیح سطور مسبوق الذکر میں کی جا چکی ہے۔

رسالہ معارف اعظم گڈھ کے جنوری ۱۹۴۵ء کے پرچہ میں مقبرہ ابوالحسن تربتی کے متعلق جو مضمون چھپا ہے۔ اس میں بھی راقم مضمون نے مورخین لاہور کی ان پریشان اور مختلف البیان تحریروں کے متعلق لکھا ہے:۔

"صاحب تحقیقات چشتی اپنی کتاب میں ابوالحسن کے مقبرہ کا ذکر تو کرتے ہیں مگر کسی جگہ اس کو ابوالحسن آصف خاں برادر نورجہاں سے خلط ملط کیا ہے اور کبھی ان کا فرزند بتایا ہے۔ ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ ابوالحسن آصف خاں سے علیحدہ کوئی اور ابوالحسن تھا...... رائے کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور (اردو) کے بیان کے مطابق صاحب مقبرہ ابوالحسن یوسف خاں طہرانی نورجہاں کے ماموں تھے۔ سید محمد لطیف اس مقبرے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کو ابوالحسن آصف برادر نورجہاں سے علیحدہ کوئی اور ابوالحسن بتاتے ہیں مگر نہ چشتی اور نہ لطیف یہ بتاتے ہیں کہ آخر یہ کون ابوالحسن تھا؟"

جس مقام پر یہ مقبرہ واقع ہے وہاں کسی زمانے میں لاہور کا مشہور اور دولتمند محلہ مغل پورہ آباد تھا جس کی شوکت گذشتہ اور عظمت رفتہ کی دل دوز داستان اب بھی لاہور کی تاریخوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس محلہ میں عالیشان محلات اور باغات تھے۔ اب اس محلہ کا بہت سا حصہ ریلوے جنرل سٹور اور سڑک شالامار باغ اور بیگم پورہ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ یہیں نواب ابوالحسن خاں کا مقبرہ ہے جو اس وقت ریلوے احاطہ میں آ چکا ہے اور شہر سے شالامار باغ کو جاتے ہوئے دائیں طرف آتا ہے۔ اس مقبرہ کی پہلے کیا حالت تھی، اب کیا ہے اور صاحب مقبرہ کون ابوالحسن ہے؟ یہ کیفیت سطور ذیل سے معلوم ہو سکے گی۔

کارنامۂ جہانگیری اور ظفر نامۂ شاہجہان میں جو جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کی تاریخوں کا نچوڑ ہیں، تین ابوالحسن نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہی ہے جو نورجہاں کا بھائی اور ممتاز محل (ارجمند بانو بیگم) کا باپ ہے اور جس کو شاہجہان نے یمین الدولہ آصف خاں (المشہور آصف جاہ) وغیرہ کے خطابات دیے تھے۔ دوسرا ابوالحسن مشہدی تھا جس کو جہانگیر نے لشکر خاں کا خطاب دیا اور شاہجہان نے اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا۔ تیسرا ابوالحسن خاں وہ ہے جس کو جہانگیر نے اپنے باغی بیٹے سلطان خسرو کی محافظت و نگہبانی پر مقرر کیا۔ اسی خواجہ ابوالحسن خاں سے ابوالحسن لشکر خاں نے نظامت کابل کا چارج لیا تھا۔ ۱۰۴۱ھ کے اواخر میں شاہجہان نے اسی خواجہ ابوالحسن خاں کو جو اپنے مناصب و اعزاز اور جاگیرات کی وجہ سے شاہانہ ٹھاٹھ رکھتا تھا، ناظم کشمیر مقرر کیا۔ وہ چونکہ اب ضعیف العمر تھا، اس لیے اس نے اپنے فرزند ظفر خاں کو جس کا اصل نام احسن اللہ اور خطاب ظفر خاں تھا اپنا قائم مقام بنا کر کشمیر روانہ کیا اور ۱۰۴۲ھ میں جب خواجہ ابوالحسن خاں کا انتقال ہو گیا، تو بادشاہ نے ظفر خاں کو کشمیر کا مستقل گورنر کر دیا۔

یمین الدولہ ابوالحسن آصف جاہ کا مقبرہ تو مزار نورجہاں و جہانگیر کے قریب ہی دریا کے پار موجود ہے ـــ دوسرے

ابوالحسن خاں مشہدی عرف شکر خاں کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکا۔ تیسرا خواجہ ابوالحسن خاں[1] پہلے خسرو باغی کا لاہور میں نگہبان رہا پھر جہانگیر نے اس کو مختلف ممالک میں بھیجا۔ وہ اور اس کا فرزند ظفر خاں احسن زیادہ عرصہ کابل میں (بہ حیثیت گورنر یا نائب گورنر) اور لاہور ہی میں رہے۔ ظفر خاں کو چند سال تک باپ کی وفات کے بعد نظامت کشمیر کی وجہ سے کشمیر بھی رہنا پڑا۔ اس نے اپنی مثنوی میں بھی لاہور کابل اور کشمیر ہی کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کا باپ ۱۰۴۲ھ میں بوجہ ضعیفی خانہ نشین ہو چکا تھا اور چونکہ دیگر امراء کی طرح اس کے عالیشان مکانات بھی لاہور میں موجود تھے۔ اس لیے اس نے اپنے آخری ایام بہ آرام بسر کرنے کے لیے لاہور ہی میں اقامت پسند کی اور غالباً اس لیے بھی کہ اس کا فرزند ظفر خاں احسن کشمیر کا نائب گورنر تھا اور دہلی اور آگرہ کی نسبت لاہور سے کشمیر بہت نزدیک تھا اور نیز اکثر امراء لاہور میں مستقل طور پر اقامت رکھتے تھے۔[2]

لاہور کی تاریخوں کے سوا اس کا خطاب آصف خاں اور کہیں نظر نہیں آیا۔ لاہور ہی میں ابوالحسن خاں نے ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوا جیسا کہ صاحب مآثر الامراء (جلد دوم ص ۷۶۵ پر) اس کے فرزند ظفر خاں احسن گورنر کشمیر کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"در لاہور بساط ہستی در نورد و در مقبرۂ پدر مدفون گشت"

ان الفاظ سے نہ صرف نواب ابوالحسن خاں کا مدفن ہی لاہور میں پایا جاتا ہے بلکہ اس کے فرزند نواب ظفر خاں احسن کی آخری آرام گاہ بھی لاہور ہی معلوم ہوتی ہے۔

مصنف تحقیقات چشتی اور مصنف تاریخ لاہور دونوں نے نواب خواجہ ابوالحسن خاں کا سال وفات ۱۰۵۰ھ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ سال وفات یمین الدولہ نواب آصف خاں (ابوالحسن) کا ہے نواب خواجہ ابوالحسن خاں کا سال وفات جیسا کہ قبل ازیں لکھا جا چکا ہے ۱۰۴۲ھ ہے۔

ابوالحسن خاں کے مقبرہ کا گنبد بہت بڑا اور دو منزلہ تھا اس کے چاروں طرف آٹھ کمرے تھے۔ انہی کمروں کی چھت بطور گنبد دور دور سے نظر آتی تھی۔ گنبد سنگ سرخ کا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جنرل اوی طویلہ فرانسیسی نے یہاں میگزین (بارود خانہ) بہ زیر نگرانی کمیدان جھوپ سنگھ قائم کیا ہوا تھا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد حکومت (۷ ساون سمت ۱۸۹۹ب) کو بجلی کے حادثہ سے میگزین اڑ گیا۔

۱۔ مسٹر شجاع الدین ایم۔ اے (لاہور) اپنے مضمون مقبرہ ابوالحسن تربتی مندرجہ معارف اعظم گڈھ جنوری ۱۹۴۵ء میں لکھتے ہیں۔ "اس کا وطن تربت حیدری تھا جو خراسان کے دارالحکومت مشہد مقدس سے جنوب کی سمت مائل بہ مغرب تقریباً بہتر میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ وہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا۔"

۲۔ نواب ابوالحسن خاں کے حالات راقم نے ۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو لکھے تھے۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں "مقبرہ ابوالحسن تربتی" کے متعلق اعظم گڈھ کے رسالہ معارف میں مسٹر شجاع الدین ایم اے (لاہور) کا جو مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ بھی لکھتے ہیں "لاہور کی آب و ہوا دہلی اور آگرہ سے بہتر اور ایران و خراسان سے مشابہت و نزدیک تر ہونے کی وجہ سے اکثر غریب الوطن امرائے (عہد مغلیہ) نے اسی شہر کو اپنا وطن قرار دے کر یہاں فلک بوس محلات، رشک فردوس باغات اور عالی شان مساجد و مقابر بنوا کر اس شہر کی گوناگوں خوبیوں کو چار چاند لگا دیے تھے۔"

اور اپنے ساتھ کئی آدمیوں کو مجروح کر کے آٹھ دس آدمیوں کو بھی اُٹھا کر لے گیا۔

لیکن اس صدمۂ عظیم کے باوجود گنبد ابھی تک کھڑا ہے مصنف تحقیقاتِ چشتی کے زمانہ ۱۸۶۰ء اور مصنف تاریخ لاہور کے زمانہ ۱۸۸۴ء تک اس گنبد کے نقش و نگار کچھ نہ کچھ موجود تھے۔ مقبرہ کے اندر بھی عہد شاہجہانی کے تمام آثار پائے جاتے تھے۔

۱۸۶۲ء کے بعد محکمہ نزول (سرکار انگریزی) نے اس مقبرہ کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کو نیلام کر دیا۔ اور خشت فروشوں نے اس کی بنیادوں کو ایسا کھود اکہ نشان تک باقی نہ رکھا۔

لاہور میں مغل شہزادوں اور مغل اُمرا کے جس قدر مزار نظر آتے ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی باغ بھی ہوتا تھا۔ وہ باغ یا تو اُس امیر یا شہزادہ نے پہلے ہی احداث کرایا ہوا ہوتا۔ یا اُس کی وفات کے بعد اُس کے مقبرہ کے گرد وہ باغ تعمیر کیا جاتا۔ مقبرہ ابوالحسن خان کے چاروں طرف بھی ایک وسیع باغ تھا۔ اور اس کے گرد اس کی اپنی بنائی ہوئی کئی عمارتیں تھیں۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے یہ عمارتیں عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ تک موجود تھیں چونکہ کوئی محافظ نہ تھا۔ لوگوں نے اینٹیں اکھاڑ لیں۔

اس گنبد کے جنوب رویہ ایک مدور چاہ کلاں ۱۸۸۹ء تک موجود تھا۔ یہ اتنا بڑا کنواں ہے کہ اس پر دس بارہ چرخ چوب (رہٹ) بہ آسائش و فراغت چل سکتے ہیں۔ اسی عظیم کنوئیں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ باغ ابوالحسن خان کو پانی ملا کرتا تھا۔ اس کنوئیں کے اندر ایک خوابی در بچہ بھی تھا۔ جو اُس سرد خانہ سے ملتا تھا جو مقبرہ کے نیچے بنایا گیا تھا۔

اسی احاطہ کے اندر نواب مخدومہ بیگم کے مقبرہ کا گنبد بھی ہے۔ یہ بیگم نواب ابوالحسن خاں کی بیوی تھی۔ خاوند کی وفات کے بعد سنہ ۱۰۶۶ھ میں انتقال کر گئی۔ اس نے اپنا مقبرہ اسی باغ کے اندر اپنی زندگی ہی میں بنوا لیا تھا۔ خاوند کے ادب و احترام کے لحاظ سے اُس نے اپنے مقبرہ کا گنبد ذرا چھوٹا بنوایا تھا۔ یہ مقبرہ مربع صورت کا ہے اس کے چاروں طرف چار قالبوتی دروازے ہیں اندر کاشی کا کام ہے۔ قبر اور قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا تھا لیکن سکھ عہد حکومت کی نذر ہو گیا۔[1] تحقیقات چشتی (ص ۲۷۸ پر) لکھا ہے کہ یہ عورت بڑی قابل اور شاعرہ تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی قبر پر ایک ہزار حافظ قرآن۔ قرآن خوانی کے لیے مقرر کر رکھے تھے اور صدہا کنوئیں خرید کر اس مزار کے ساتھ وقف کر رکھے تھے۔ عہد محمد شاہ بادشاہ میں حضرت حامد قاری اس کارخانہ عبادت کے مہتمم تھے۔ یعنی اس مزار کے متعلق جس قدر مصارف ہوتے تھے وہ انہی کی معرفت تقسیم ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نواب خان بہادر زکریا خاں ناظم لاہور کے زمانہ تک حفاظ کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ لیکن اب کیا ہے؟

دل برباد میں اُڑتی ہے اب خاک
یہ بستی غیرت جنت کبھی تھی

راقم نے دیکھا کہ اُس رشک فردوس باغ، اُن عالیشان مکانات اور اُن سنگ مرمریں مقبروں کی جگہ زمیندار حقہ پی رہے ہیں۔ ہل چل رہے ہیں۔ گل و بلبل کی جگہ زاغ و زغن کا بسیرا ہے اور وہ بلند ترین منقش گنبد جن سے شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب عبرت کا ایک دردناک مجسمہ بنے ہوئے ہیں جہاں بہت سے حفاظ قرآن خوانی کے لیے موجود رہتے تھے وہاں آج کوئی اشک حسرت

---

[1] تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۲۶۳

پہلسے والا بھی نہیں ہے

از خزاں پامال کرد افسوس گردوں باغ را ‌ ‌ ‌ ‌ جائے بلبل داد اے حسرت زمانہ زاغ را

خواجہ ایاز

باغ و مسجد کے در و دیوار سے آئی ندا
گھر خدا کا دیکھ کر سوئے گلستاں دیکھئے

مولوی نور احمد چشتی تحقیقات چشتی (ص ۶۵۷) میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ ایاز نواب علی مردان خاں کے متعلقین میں ایک امیر کبیر تھا شالامار باغ کی تیاری کا حال سن کر اس نے مہر مہنگا کو روپیہ بھیجا کہ میرے نام سے لاہور میں ایک باغ تعمیر کرائے۔ مہر مذکور نے شالامار باغ کے مشرق رویہ اس روپیہ سے ایک باغ تعمیر کرایا اور جو روپیہ بچا اس سے مسجد بنوا دی۔ خواجہ ایاز نہ خود یہاں آیا نہ اس نے باغ دیکھا اور نہ مسجد دیکھی"

رائے بہادر کنہیا لال اپنی تاریخ لاہور (ص ۲۸۱، ۲۸۲) میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ ایاز شاہجہان کے عہد میں ایک امیر کبیر آدمی تھا اور شالامار باغ کے کارخانہ عمارت میں نواب علی مردان خان کے ماتحت کام کیا کرتا تھا۔ وہ شالامار باغ کا میر عمارت تھا۔ اس نے مسجد کے علاوہ ایک باغ بھی اپنے نام سے شالامار باغ سے بجانب مشرق تعمیر کرایا"

یہ تو مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ ایاز نہ خود لاہور آئے نہ اپنی تعمیرات دیکھے نہ لاہور سے اُسے کوئی تعلق ہو۔ اور وہ دہلی یا آگرہ سے ہزارہا روپیہ ایک واقف یا ناواقف شخص کو لاہور میں تعمیر باغ کے لیے ارسال کر دے۔ البتہ رائے کنہیا لال کی تحریر اس لیے قابل وثوق معلوم ہوتی ہے کہ ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۱ء موافق تیرہ ۱۳ سال جلوس میں جب شاہجہان نے لاہور میں شالامار باغ کی تعمیر کا حکم دیا تو نواب علی مردان خاں صوبہ پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا میرے ہمراہ ایک شخص ہے جو نہروں کی کھدائی میں کمال رکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں دریائے راوی کے اس مقام سے جہاں وہ کوہستان سے نکل کر ہموار زمین پر بہتا ہے ایک نہر نکال کر لاہور تک لا سکتا ہوں۔ بادشاہ نے اس نہر کے لیے جس کا نام بعد میں شاہ نہر رکھا گیا ایک لاکھ روپیہ علی مردان خان کو عطا کیا"

نواب علی مردان خان کے ان الفاظ سے کہ میرے ہمراہ ایک شخص ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلقین یا متوسلین ہی سے تھا۔ علی مردان خان قندھار سے آ کر ۱۵ رجب ۱۰۴۸ھ کو بمقام لاہور شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور دوسرے ہی سال اُس کو پنجاب کی نظامت عطا ہوتی ہے، اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر اس نے اپنے ایک متوسل کو جو اپنے فن میں قابل و لائق تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا ہو۔ گو لاہور کے علاوہ دوسرے مؤرخوں نے اس کا نام نہیں لکھا لیکن اکثر مقامی اور جزوی امورات تاریخوں میں تفصیل سے

نہیں ہوتے البتہ وہ شالامار باغ کا میر عمارت تھا نہ مہتمم۔ مہتمم خلیل اللہ خاں تھا اور میر عمارت استاد جانی جس کا مقبرہ بھی اسی کی نواح میں موجود ہے اور جس کا ذکر تحقیقات چشتی میں ہے وہ صرف شاہ نہر کا بانی تھا۔ جو لاہور سے قریباً پچاس کوس (جو بیس) کے فاصلہ سے لائی گئی تھی۔

باغ خواجہ ایاز کی بہاریں تو بانی کے کچھ عرصہ بعد ہی بادِ صرصر میں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں لیکن اس کی سخت جانی کی بدولت اس کی پختہ چار دیواری جس کے اندر چند عمارتیں بھی اُسی زمانہ کی ہیں۔ اب تک موجود ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے تو اس باغ کو لاوارث قرار دے کر خالصہ میں شامل کیا پھر سردار شمشیر سنگھ سندھانوالیہ کو بخش دیا۔ اور اب اس کی اولاد اس پر قبضہ میں ہے۔

خواجہ ایاز کی خوبصورت مسجد پر مہر منگا کی اولاد کا قبضہ ہے۔ مسجد کے تین گنبد برنگ سیاہ ۱۸۶۴ء تک موجود تھے۔ میانہ میں ایک مربع حوض جو طولاً و عرضاً دس دس گز اور ارتفاعاً ایک گز ہے موجود ہے۔ اندرون مسجد کی دیواریں استرکاری منقش اور گُل کاریں۔ مسجد کی سنگ مرمر کی سل پر عربی الفاظ کے علاوہ "بندۂ درگاہ خواجہ ایاز" کے الفاظ بھی تحریر تھے۔ اس مسجد کے نزدیک ہی شمال رویہ خانقاہ مادھو لال حسین ہے۔ یہ مسجد مقفل رہتی تھی۔ اب آباد کر دی گئی ہے۔

نواب خاں دوراں نصرت جنگ بہادر

مقبرہ و باغ نصرت خاں بہادر کو خزاں
کر گئی ہے کس طرح پامال و ویراں دیکھئے

خواجہ حصاری نقشبندی کا پوتا اور خواجہ صابر کا بیٹا تھا (مآثر الامرا جلد اول) شاہ جہان نے اس کو ماہی مراتب کے علاوہ خان دوراں کا خطاب دیا۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں :-

"۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء میں بعہد عالمگیر وفات پائی اور اسی کے حکم سے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں اس کا گنبد نما مقبرہ بنا"

ہسٹری آف لاہور کے مصنف نے سال وفات ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۳ء لکھا ہے۔ یہ زمانہ شاہجہان کا ہے عالمگیر کا نہیں۔ مآثر الامرا جلد اول میں لکھا ہے :-

"وہ ہفتم جمادی الاول کی رات کو ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں بمقام لاہور انتقال کر گیا"

اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہان اس وقت کشمیر میں تھا۔ وہیں اس کو اس کی وفات کی خبر ملی۔ اس کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ ایک کشمیری برہمن بچہ (نو مسلم) نے جو اس کے ذاتی خدمتگاروں میں تھا، ایک جمدھر اس کے پیٹ میں گھونپ کر اس کو ہلاک کر دیا نواب کے خدام نے یہ کیفیت دیکھ کر اور شور سن کر اس لڑکے کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں :-

"۱۸ سال جلوس میں شاہجہان نے اس کو دکن سے لاہور بلایا اور پھر اپنے ہمراہ کشمیر لے گئے۔ کشمیر ہی سے اس کو لاہور کی صوبیداری پر نامزد کیا۔ لاہور میں ایک کشمیری برہمن زادہ اسلام قبول کر کے اس کے معتمد خدمتگاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ خان ایک رات سویا ہوا تھا اور جامہ خواب میں تھا کہ اس برہمن پسر کشمیری نے اس کے پیٹ میں جمدھر کے

کئی دار کئے گئے کہتے ہیں کہ ۷ اتنا کھنے لگے لیکن اس کے ابرو پر بل تک نہ آیا۔ اس کے
ہوش و حواس برقرار رہتے ہے۔

وہ ایک دن اور دوسری رات کا کچھ حصہ زندہ رہا۔ اس نے اپنی تمام جائداد کا جائزہ لیا اور لڑکے لڑکیوں کے حصے مقرر کر کے اپنے ہاتھ سے وصیت نامہ لکھا۔ پھر بادشاہ کے نام ایک عرضداشت لکھی جس میں بتایا کہ میری جائداد میری وصیت کے مطابق میری اولاد کو تقسیم کی جائے۔ جو باقی بچے وہ سرکار کی دولت ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی وصیت کے مطابق اس کی جائداد نقد، جنس، عمارات، باغات اس کی اولاد میں تقسیم کر دی اور ساٹھ لاکھ روپیہ جو باقی بچا وہ خزانہ شاہی میں داخل کر لیا۔ بلکہ صاحب مآثر کے قول کے مطابق بادشاہ نے اس کی وصیت سے بھی زیادہ اس کے فرزندوں کو دیا۔ پھر بھی ساٹھ لاکھ روپیہ بچ رہا۔

خواجہ کا سرکاری خطاب "یمین الدولہ خان دوراں بہادر نصرت جنگ" اور منصب ہفت ہزاری اور ہفت ہزار سوار تھا۔

نواب خان دوراں فوج اور لشکر کی سرداری، معرکہ آرائی، سخت گیری اور قلعہ کشائی میں ہمیشہ بے نظیر افسر ثابت ہوتا رہا ہے۔

سنہ ۱۰۴۳ھ مطابق سنہ ۱۶۳۳ء میں اس نے ججہار سنگھ بندھیلہ راجہ اور چھا (ٹیکم گڑھ) کو جو علامہ ابوالفضل کے قاتل کا بیٹا تھا۔ بڑی سخت لڑائیوں کے بعد نہ صرف شکست دی بلکہ اس کو اور اس کے بیٹے بکرجیت کے سر اور ان کی انگوٹھیاں نشان فتح کے طور پر بادشاہ کے پاس بھجوائیں۔ اس کے باقی فرزندوں اور پوتوں میں تین مسلمان ہو گئے اور دو تلوار کے گھاٹ اترے۔ رانیوں میں رانی پدبتی جس کو جوہر کے طور پر راجہ ججہار سنگھ نے خود زخمی کر دیا تھا تھوڑے دنوں کے بعد مر گئی اور باقی عورتیں مسلمان ہو کر محل کے پرستاروں میں داخل کر دی گئیں۔

سنہ ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء میں جب دارا شکوہ کی سازش اور بادشاہ کی ناراضگی کی وجہ سے اورنگ زیب نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کے ارادے سے کمر سے تلوار کھول دی تو بادشاہ نے اس کی جاگیر ضبط کر کے خان دوراں کو دکن کی صوبیداری عنایت کی اور منصب میں پنج ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا اضافہ کیا۔

اسی سال راجہ سنگرام گونڈ کے مرنے پر جب اس کے ایک غلام مارد گونڈ نے راجہ کے بیٹے کو ریاست سے محروم کر کے خود راجگی لے لی اور بادشاہ سے سرکشی اختیار کی تو خان دوراں خاں اس کے استیصال کے لیے فوراً اس کے سر پر پہنچا۔ سارد تھوڑی سی لڑائی کے بعد اواخر محرم ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء میں اطاعت اختیار کر کے اس کی پناہ میں آ گیا۔ خان دوراں خان اپنے بھائی محمد صالح کو پانچ سو سوار اور سات سو پیادے دے کر اور اس کا محافظ مقرر کر کے آپ واپس چلا آیا۔ یہ محرم کا ذکر ہے۔ اس کے تیسرے مہینے کے بعد ہی ۶ جمادی الاول کو جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے اپنے ایک خادم کے ہاتھ سے اس کی ہلاکت ہو جاتی ہے۔

اس کا ایک بھائی تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ تین بیٹے تھے ایک سید محمد جو ججہار سنگھ کی جنگ میں باپ کے ساتھ تھا دوسرے کا نام سید محمود تھا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو منصب ہزاری ذات و ہزار سوار دیا اور عبدالنبی تیسرے بیٹے کو جو بارہ برس کا تھا منصب پانصدی دو سو سوار عطا کیا۔

بیٹے خود امیر تھے امیر زادے تھے۔ اپنے جلیل القدر باپ کا مقبرہ المعزول[1] نے اس کی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق تیار کرایا۔

---

[1] چونکہ عالمگیر کی تخت نشینی سے چودہ سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے عالمگیر کا اس کے مقبرے سے کوئی تعلق نہیں اور چونکہ شاہجہان کا بھی کہیں ذکر نہیں اس لیے اس کے فرزندوں نے ہی تعمیر کرایا۔ (مرتب)

تحقیقات چشتی سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبرہ کی چار دیواری کے اندر چالیس کنال زمین تھی۔ اس میں ایک مسجد بھی ہے۔ دو اصطبل بھی ہیں۔ مقبرہ کا عالی شان گنبد بھی ہے، ایک چاہ کلاں بلکہ کلاں تر مگر بے چرخ چوب ہے۔ صرف دو چیزیں یہاں نہیں ہیں ایک باغ اور دوسرے بر کا نشان۔

یہ مقبرہ جو گنبد نصرت خاں یا مقبرہ نستر خاں کے نام سے مشہور ہے، مقبرہ ابو الحسن سے شرق رویہ مائل بہ جنوب واقع ہے۔ دروازہ کلاں کی سقف گنبد نما ہے۔ گنبد اور اس کے متصل مکانوں میں کئی ڈیوڑھیاں، کئی زینے، کئی شاہ نشین، کئی غلام گردشیں اور کئی جھجیاں ہیں۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں :—

"غلام گردش اندر کی طرف سے تمام سفید اور منقش اور سقف محرابی گل کاری دیواروں پر نقاشی مع تصاویر جانوران"

جانوروں کی تصویریں یا انسانی تصویریں کوئی مسلمان اپنی عمارت یا قبر پر نہیں بنوا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ سکھوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جرنیل کورٹ صاحب نے اس مقبرہ کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی کوٹھی بھی اسی کے احاطے کے اندر تعمیر کی۔ وہ مہاراجہ کے توپ خانے کا افسر تھا۔

صاحب تحقیقات چشتی، مصنف تاریخ لاہور اور مصنف ہسٹری آف لاہور نے یہی لکھا ہے کہ نواب خان دوراں نصرت جنگ لاہور میں مدفون ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے مصنف آج سے قریباً ایک صدی پیشتر کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ لیکن آج سے قریباً اڑھائی سو سال پیشتر کا مصنف نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں اپنی کتاب مآثر الامراء جلد اول میں صفحہ ۷۵۷ پر لکھتا ہے :—

"اس کا آبائی قبرستان گوالیار میں تھا۔ اس کی لاش کو وہاں لے گئے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا انتقال ضرور لاہور میں ہوا لیکن اس کی لاش کچھ عرصہ کے بعد گوالیار لے گئے اور وہیں اس کو دفن کیا گیا۔ لاہور میں ممکن ہے بطور امانت دفن کیا گیا ہو۔ چونکہ اس کی اولاد لاہور ہی میں تھی اس لیے ممکن ہے بعد میں ان میں سے کسی کو انتقال کے بعد یہاں دفن کیا گیا ہو اور مقبرہ نواب نصرت جنگ ہی کے نام سے مشہور رہا ہو۔

خان دوراں نصرت جنگ نے حکومت دکن کے ایام میں وہاں کئی عمارات تعمیر کرائیں۔ کئی سرائیں بنوائیں۔ لاہور میں جو ان دنوں عروس البلاد کا درجہ رکھتا تھا، اس کے شوق تعمیرات سے کس طرح خالی رہ سکتا تھا، کیا عجب ہے اس جگہ اس کا محل ہو اور اسی کے کسی حصہ کا یہ گنبد ہو۔ یا اگر مقبرہ ہی ہو تو اس میں وہ خود دفن نہیں بلکہ اس کا کوئی فرزند دفن ہوگا۔

صاحب مآثر لکھتے ہیں رعایا اس کی سخت گیری اور تشدد سے نالاں رہتی تھی۔ جب اس کے انتقال کی خبر برہان پور پہنچی تو لوگوں نے بڑی خوشی منائی اور مسرت کا اظہار کیا "شیرینی و قند و شکر در دوکان ہا نماند کہ مردم بہ شکرانہ بخش نہ کردند"

مقبرہ کے آٹھوں پہلوؤں کی عمارت دو منزلہ تھی۔ کئی محراب تھے اور ہر محراب قالبوتی، گنبد نہایت بلند، وسیع اور خوشنما، اس کے عین درمیان نواب نصرت جنگ یمین الدولہ کی قبر تھی۔ جرنیل کورٹ صاحب نے بہت سی جدید عمارتیں بنا کر اس کی صورت ہی تبدیل کر دی۔ قبر کو بالکل مٹا کر وہاں پختہ فرش بنوا دیا۔ بلکہ مسجد کو بھی اپنی جدید کوٹھی میں شامل کر لیا۔

باغ بہت وسیع تھا مگر زوال مغلیہ کے بعد جب لاہور کی بیرونی آبادی برباد ہو گئی تو یہ باغ بھی اجڑ گیا۔ صرف مقبرہ

دگیا۔ اس کے ساتھ جرنیل کورٹ صاحب نے وہ سلوک کیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

جب انگریزی راج آیا تو سرکار نے کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ اینٹیں اس کی لالہ میلا رام ٹھیکہ دار (بعد میں رائے بہادر) لے گئے بلکہ جو مدور و وسیع کنواں تھا اس کی اینٹیں بھی نکال لی گئیں۔ حکومت نے ۱۸۸۲ء سے پیشتر اس مقبرہ کی مرمت رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور کی معرفت کرائی تھی۔

حضرت ملّا شاہ بدخشی

مقبرہ و باغ ملّا شاہ بدخشانی کا حشر
عبرت بیں نگیئے رنگ گلستاں دیکھئے

آپ کا اصل نام شاہ محمد، لسان اللہ لقب۔ باپ کا نام ملا عبدی (عبد محمد) تھا جو اپنے وطن موضع ارکسا علاقہ روستاق ولایت بدخشاں کے قاضی تھے۔ جیسا کہ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

ملک من از ملک ہا ملک بدخشاں آمدہ
از بلاد و از روستاق اختیار از ارکسا

بدخشی یا بدخشانی کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ وطن سے آکر تین سال کشمیر رہے۔ پھر آگرہ گئے۔ وہاں سنا کہ لاہور میں حضرت میاں میرؒ ایک بہت بڑے بزرگ ہیں جن سے جہانگیر بھی ملتا رہا ہے اور شاہجہان بھی۔ آپ آگرہ سے ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء میں لاہور آئے حضرت میاں میر کو صاحب کمال دیکھ کر ان کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔ لیکن حضرت نے آپ کو اس وقت تک مرید نہ کیا جب تک تین سال مختلف ریاضتوں میں آپ کو آزما نہ لیا۔ [ایک دن آپ نے فرمایا "ملا! تو امتحان میں پورا اترا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تجھے علم باطن سکھایا جائے۔ جا۔ اپنے کپڑے دھو کر آ۔"

ملا خوشی خوشی اٹھے۔ دریا پر آئے اور کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص سینے تک پانی میں ڈوبا دریا میں کھڑا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کپڑے میرے حوالے کرو تاکہ میں دھو دوں۔ چونکہ ملّا اس کو پہچانتے نہ تھے۔ اس لیے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ کپڑے دھو کر آپ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارے کپڑے خضر دھونے کو مانگتا تھا۔ تم نے اسے کیوں نہ دیئے۔ اس دن سے حضرت میاں میر نے اپنی خاص توجہ آپ کی طرف مبذول کی اور مس خام کو کندن بنا دیا۔ ــ مرتب]

ملا شاہ تیس سال تک حضرت میاں میر کی خدمت میں رہے۔ آپ نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی میں گزارا اور بہت کم آرام کیا۔ چونکہ سرد ملک کے رہنے والے تھے، مرشد کی اجازت سے گرمیوں میں کشمیر اور سردیوں میں لاہور رہا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ کشمیر میں آپ کا قیام قلعہ اکبری (ناگر نگر) کے درمیان کوہ ہری پربت پر ہوتا تھا۔ اس پر فضا مقام سے سری نگر کا اکثر حصہ دکھائی دیتا ہے ؎

کوہ ماراں بکمر لعل بدخشاں دارد | ایں چنیں بخت کجا تخت سلیماں دارد

دارا شکوہ کے علاوہ اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم عرف بیگم بادشاہ یا بیگم صاحب بھی ملا شاہ کے عقیدتمندوں میں شامل تھی۔ بادشاہ بیگم کے نام آپ کے چند مکتوب بھی سکینۃ الاولیاء میں درج ہیں۔ اسی عقیدت مندی کی بنا پر شہزادی نے قلعہ کی چار دیواری کے اندر زیارت مخدوم صاحب کے پہلو میں ملا شاہ کی عبادت و ریاضت کے لیے چالیس ہزار روپیہ میں ایک مسجد اور حمام اور بیس ہزار روپیہ میں ان کے خدام اور ملاقاتیوں کے لیے چند اور عمارتیں تعمیر کرائیں جن کی تاریخ تکمیل اس مصرع سے نکلتی ہے کہ

یک جائے وضو آمد و یک جائے نماز

۱۰۵۹ھ ——— ۱۶۴۹ء

شاہجہان جب کشمیر میں تھا تو عمارات کی تکمیل کے بعد ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء کو ملا شاہ کی ملاقات کو گیا۔ باغ ملا شاہی کے نام سے آپ کا ایک باغ گاندربل تحصیل سری نگر میں بھی تھا۔ باغ تو ویران ہے۔ البتہ باغ کی اندرونی عمارتوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ یہاں ڈوگرہ شاہی راج میں عرصہ دراز تک نائب تحصیلدار کی کچہری رہی ہے۔

[قیام کشمیر کے دوران آپ اکثر قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے تصوف کے رنگ میں تفسیر شروع کی۔ ابھی پارہ اول بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آپ پر جذبہ طاری ہو گیا اور آپ کو درس بند کرنا پڑا ——— مرتب]

[حضرت ملا شاہ جب کبھی بادشاہ کے آنے کی خبر سنتے تو عصا ہاتھ میں لے کر خیابان کی سیر میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح آپ بادشاہ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونے سے بچ جاتے۔ جب دیکھتے کہ بادشاہ جانے کی تیاری کر رہا ہے تو پہلے ہی اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیتے ——— مرتب]

آپ اپنے حجرہ میں کبھی چراغ نہیں جلاتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور میں رات کے وقت شہزادہ دارا شکوہ آپ سے ملنے کے لیے آیا۔ آپ نے چراغ مٹی کا منگوا کر جلایا اور شاہزادہ سے کہا کہ آج تم آئے تو ہمارا حجرہ بھی روشن ہو گیا اور یہ شعر پڑھا ؎

تو چراغ است دریں خانہ نو بر انہ ما

روشن از آتش عشق تو شدہ خانۂ ما

آپ نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ کرامتوں کے متعلق کسی نے پوچھا تو فرمایا۔ امت محمدیہ کے اولیاء کو لازم ہے کہ توحید پھیلانے، حقیقی ایمان کی کیفیت بیان کرنے، مردہ دلوں کو زندگی بخشنے، بند قفلوں کو کھولنے اور خستہ جانوں کو شفا دینے کا شغلہ جاری رکھیں۔ کیونکہ مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑانے، بندھی ہوئی گرہوں کو کھولنے اور یاد خدا سے غافل لوگوں کو جگانے کے سوا نہ کوئی کرامت ہے، نہ کوئی کشف اور نہ کوئی اولیائی۔

حضرت ملا شاہ بڑے عالم اور کامل شاعر تھے۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے وہ صاحب دیوان ہیں۔ ان کے مجموعہ میں مکتوبات، مثنویات، رباعیات بھی ہیں۔ تخلص شاہ ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء جلد اول میں (ص ۱۷۴ پر) لکھتے ہیں:-

"دیوان ولی و دیوان ملا شاہ و دیوان دارا شکوہ کہ ہر سہ کتاب معدن مضامین توحید اند بہ نظر ایں احقر گذشتہ اند"

[ملا شاہ کی کلیات کے قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ پہلی جلد مندرجہ ذیل رسائل پر

مشتمل ہے :-

(۱) قرآن پاک کی چند سورتوں کی تفسیر جسے تفسیر شاہ باشاہ تفسیر کے تاریخی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں لکھی گئی۔ اس میں سورۂ فاتحہ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورۂ یوسف کی تفسیر درج ہے۔

دوسری جلد منظومات پر مشتمل ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل رسائل ہیں :

(۲) رسالہ بسم اللہ۔ اس کی بحر وہی ہے جو نظامی کی مخزن اسرار کی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خال و خط و زلف و قد مستقیم

(۳) رسالہ حمد و نعت و منقبت	(۴) یوسف زلیخا
(۵) رسالہ دیوانہ	(۶) رسالہ مرشد
(۷) رسالہ دلوبہ	(۸) رسالہ ہوش
(۹) رسالہ تعریفات خانہا و باغات و منازل کشمیر	(۱۰) رسالہ نسبت

جلد سوم میں مندرجہ ذیل رسائل ہیں :-

(۱۱) رسالہ شاہ نبیہ	(۱۲) دیوان اوّل
(۱۳) دیوان دوم	(۱۴) شرح رباعیات
(۱۵) رقعات	(۱۶) قصائد عربی ——— مرتب]

سکینۃ الاولیاء میں آپ کی اکثر رباعیاں اور غزلیں تبرکاً درج ہیں۔ یہاں بھی چند اشعار دیے جاتے ہیں ؎

شکر کہ امروز شد دولت فرمائے ما — رتبۂ اعلیٰ گرفت ہمت والائے ما
رشتۂ تسبیح یار شتۂ زنار شد — رہ سوئے یگانہ دارد مرشد دانائے ما
قید غلامی نماند از نگہ احساس او — فاضی و مفتی نگر رحمت مولائے ما

———

آرے ایں راست کہ مرغیم ولے سیمرغیم — دائم ما تا چہ بود تا چہ بود دانہ ما
مدتی بود ز پئے افسون گر فنا پئے عشق — آتش بقیہ گوشش بود افسانۂ ما

———

در رہ عشق آنکہ ما را کشت — غیر ما کس نبود ست قاتل ما
از میاں ہیبت پردہ حائل — شاہ خود بندہ بود حائل ما

———

کار با ید کرد گو فرزند پیغمبر بود — گو حسب نبود نباشد سود از ایں انساب

این بیان مسلک از بہر توحید است و بس | چون بمنزل شد برائے گشت بیدلی شتاب
دست عارف فوق ایدیہم ید اللہ آمدہ | از ترانی خوش شود زلن ترانی مدعا

جزو و کل گر دو شود کل جزو جزو و کل یکیست
جزو کل از یک دگر این نیست مستثنیٰ شود

ذرہ خورشید است خورشید است ہر یک ذرہ
بر چنین سر چشم گر بینا شود بینا شود

نیست پستی اگر پستے بالائے در دوست
ہر کہ بالا دید ہر پستی دو بالا شود

حضرت میاں میر اور ان کے خلفا، ملا شاہ، میاں نتھا، خواجہ بہاری وغیرہ اور دیگر لوگ جہاں مدفون ہیں اس کے قرب ہی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مواضعات ہاشم پورہ، غیاث پور، دارا پور، عالم گنج اور چنت پورہ آباد تھے۔ حضرت میاں میر کی قبر کے مقام کا ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں حوالہ دیتا ہوا غیاث پور اور عالم گنج کا نام بدین الفاظ لیتا ہے :-

"قبر گرامیش در موضع غیاث پور است نزدیک بہ عالم گنج دارالسلطنت لاہور"

ان میں سے موضع ہاشم پورہ کو دارا شکوہ نے برباد کرا دیا کیونکہ وہاں کے جاٹ زمیندار حضرت میاں میر کے فقراء کے ساتھ جھگڑتے رہتے اور ان کے مال مویشی اور گھوڑے چھین کے لے جایا کرتے تھے۔ جب سرکار انگریزی نے چھاؤنی میاں میر کی تعمیر شروع کرائی تو باقی گاؤں بھی یہاں سے اٹھا دیے گئے اور ان سب دیہات کی زمین میدان میاں میر کہلانے لگی۔

دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء سے ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء کے درمیان لکھی۔ اس میں حضرت میاں میر، ملا شاہ اور میاں نتھا وغیرہ کے حالات اور ان کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ اس میں وہ حضرت ملا شاہ کی عمر کے بارے میں جو اس کے مرشد تھے، لکھتا ہے :-

"آپ کی عمر اس وقت ۵۷ برس ہے۔ سخت سے سخت ریاضتیں کرنے کے باوجود
ان کا رنگ سرخ ہے اور وہ قوی الجثہ اور ہشاش بشاش ہیں"

مصنف ہسٹری آف لاہور نے ملا شاہ کی وفات کا سال ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء لکھا ہے۔ فہرست کتب بانکی پور لائبریری میں ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء ظاہر کیا گیا ہے۔ صاحب تحقیقات چشتی، مصنف خزینۃ الاصفیا اور مخبر الواصلین ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء لکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ملا شاہ کا مقبرہ ان کے مرید دارا شکوہ نے قیمتی پتھروں سے تعمیر کرایا۔ دارا شکوہ اور عالمگیر کے واقعات بتلاتے ہیں کہ شاہ جہان ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء میں تخت و تاج سے محروم ہو جاتا ہے اور عالمگیر اپنے بھائی دارا شکوہ کو ۲۹ یا ۳۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء اور بقول بعض یکم محرم ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء کو قتل کرانے کے بعد غرہ جمادی الاول ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء سے غرہ رمضان ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء تک اپنے جلوس کا سال اول شمار کرتا ہے۔ جمادی الاول ۱۰۶۸ھ میں شاہ جہان کی نظر بندی کے ساتھ ہی دارا شکوہ کی بے اطمینانی

زندگی بلکہ اس کی خرابی و تباہی کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ملا شاہ کی وفات ۱۰۶۹ھ یا ۱۰۷۰ھ بھی تصور کر لی جائے تو دارا شکوہ ان کی قبر کس طرح تعمیر کرا سکتا تھا جو ۱۰۶۹ھ کے اواخر میں خود بھی قتل ہو چکا تھا اور جمادی الاول ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء سے کر اپنی گرفتاری کے ایام تک مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس لیے حضرت ملّا شاہ کا مزار دارا شکوہ کے بعد تعمیر ہوا ہے۔

بادشاہنامہ عالمگیری کے مصنف مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم (ص ۸۲ ایڈیشن اول پر) لکھتے ہیں حضرت ملّا شاہ اپنے مرید دارا شکوہ کی شہادت کے بعد بھی زندہ تھے اور کشمیر میں گوشہ نشین تھے بلکہ لکھا ہے کہ جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو انھوں نے بادشاہ کے جلوس پر ذیل کا قطعہ بھی لکھا۔

من دل من چوں گل خورشید بشگفت	کآمد حق و غبار باطل را رفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را	ظل الحق گفت الحق ایں راحق گفت

مولانا ذکاء اللہ لکھتے ہیں اس رباعی میں تصوف کا انداز ہے اور مرید کامل کے ابطال ارادت کی طرف اشارہ ہے۔ دارا شکوہ سکینۃ الاولیاء میں حضرت ملّا شاہ کو "ظاہر و باطن میں کامل" "سالک راہ طریقت" "واقف رموز حقیقت" "مقتدائے زمانہ" لکھنے کے علاوہ کئی صفحے ان کے فضائل اور ان کی کرامتوں کے بیان میں لکھ کر ان کے مرید اور حلقہ بگوش ہونے پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت ملا شاہ بھی آپ پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے دارا شکوہ جب اول ہی اول آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کا ہاتھ بطور مصافحہ پکڑ کر فرمایا "اے عزیز میں نے اپنے کسی مرید یا دوست سے اس قسم کا مصافحہ نہیں کیا۔ میں تجھے دل و جان سے پیار کرتا ہوں میں انشاء اللہ آخرت میں بھی تیری امداد کروں گا"۔ تعجب ہے کہ ایسا شفیق و مہربان پیر ایسے اخلاص مند مرید کے متعلق ابطال ارادت کا اشارہ کرے اور اس کے دشمن اور قاتل کو شاہ حق آگاہ کہے۔ معلوم نہیں مصنف بادشاہنامہ عالمگیری نے یہ واقعہ کہاں سے لیا ہے ممکن ہے عالمگیر کے خوف سے حضرت ملا شاہ نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ رباعی کہہ دی ہو۔

دارا شکوہ کے بعد حضرت ملا شاہ کشمیر سے لاہور چلے آتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے بعد بعمر ۱۰۷ سال وفات پا جاتے ہیں "ملا شاہ جان داد در توحید" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ملا شاہ کے مزار پر اور احاطہ حضرت میاں میر کے اندر چند اور خاص خاص قبریں ہیں۔ ان پر سنگ سرخ کا استعمال بکثرت ہے اور یہ وہی سنگ سرخ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دارا شکوہ نے یہاں جمع کیا تھا اور جس کا کثیر حصہ بادشاہی مسجد کی تعمیر میں صرف ہوا تھا۔

ریلوے سڑک اور مزار خواجہ بہاری سے غرب رویہ اور روضہ حضرت میاں میر سے بجانب غرب و جنوب ایک وسیع باغ کے اندر حضرت ملّا شاہ کا مزار واقع ہے۔ جب زوال مغلیہ کی وجہ سے اہل لاہور کو لٹیروں نے لوٹنا شروع کیا۔ تو روضہ حضرت میاں میر و ملا شاہ کے نواحی دیہاتیوں نے اس باغ کو اس کی مضبوط خشتی بلند و بالا اور ۱۲۰ گز لمبی دیوار کی وجہ سے جائے پناہ بنا لیا۔ اور اپنے مسکنی مکانات سے ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ رفتہ رفتہ یہ باغ ایک گاؤں بن گیا۔ اور آج وہی باغ میاں میر کے نام سے موسوم ہے۔

باغ کے اندر حوض مسدود۔ مگر نشان موجود۔ اس باغ کے چاروں گوشوں پر چار برجیاں تھیں ان کے علاوہ اور بھی کئی برج تھے جو مسمار ہو گئے۔ ایک برج پر ایک سجادہ نشین حنیف شاہ نے قلعہ نما دو، عمارت تعمیر کرا کر اس میں ایسے طاقچے رکھوائے جن میں سے بندوق کا نشانہ مارا جا سکتا تھا اس برج کے باہر چرخ چوب والا آسمانی کنواں تھا جس کے پانی سے باغ کو سیراب کیا

باتھا فصیل باغ کے ساتھ بھی کئی لوگوں نے مکانات تعمیر کرائے اور چار دیواری کے برجوں پر بھی کئی مکان تعمیر ہو گئے۔

مزار کی تمام سنگین عمارات انقلابی دور کے ہاتھوں ملیامیٹ ہو گئیں۔ ایک گوشے میں ایک مسجد خشتی ہے جس کے فرش کے میانہ میں ایک چبوترہ ایک فٹ بلند اور قریباً ۸ فٹ لمبا تھا جس میں سنگ سرخ کے سوا اور کوئی پتھر نہ تھا۔ اس چبوترہ پر ایک عمارت تھی جس کے ستون سنگ سرخ کے تھے۔ عہد حکومت خالصہ چبوترہ، عمارت، ستون، سنگ سرخ سب سنگین دلی کی نذر ہو گئے۔

خانقاہ کے اوپر تابوتی چھت کا ایک مکان ہے زیر سقف تمام فرش سنگین بہ سنگ ابری جس میں خط کاری اور گل کاری نے عجب بہار بنا رکھی ہے۔ قبر کا تعویز سنگ مرمر کا تھا اب چونہ لگا ہے۔ عرض اس مقبرہ میں سنگ مرمر کی جس قدر سلیں تھیں اور سنگ مرمر کے جس قدر بھی پتھر سے تھے۔ اور سنگ موسیٰ سنگ ابری اور سنگ سرخ کے جو قیمتی پتھر تھے وہ یہاں سے اتروا کر رام باغ امرتسر کی بارہ دری کے لیے بھجوائے گئے۔

حضرت شاہ چراغ

نور بخش مہر و ماہ وجہاں روضۂ شاہ چراغ
جو نہ بجھنے پائے وہ شمع فروزاں دیکھئے

ان کا اصل نام سید عبدالرزاق تھا۔ والد کا نام عبدالوہاب بن سید عبدالقادر ثالث بن محمد غوث بالا پیر۔ سادات گیلان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگ قصبہ اوچ (بہاول پور) سے ست گھرہ (منٹگمری) میں آئے۔ ست گھرہ سے ان کے جد امجد محمد غوث بالا پیر یہاں پہنچے۔ یہ زمانہ غالباً ہمایوں بادشاہ کا تھا۔ آپ نے شہر سے باہر جنوب مشرق کی طرف قیام کیا۔ اور اپنے علاقہ کا نام (بقول صاحب تحقیقات چشتی) رسول پورہ رکھا۔ لیکن جب ہمایوں نے لنگر خان بلوچ کو لاہور میں جاگیر دی اور لنگر خان نے یہاں اپنے عالیشان مکانات تعمیر کرائے اور رفتہ رفتہ یہاں ایک محلہ آباد ہو گیا تو رسول پورہ کی جگہ گذر لنگر خان کے نام نے لے لی۔ اب نہ رسول پورہ ہے نہ محلہ لنگر خان۔ نہ عالیشان مکانات کے کوئی آثار۔

جب سید عبدالرزاق پیدا ہوئے تو ان کے جد امجد صاحب حیات تھے۔ انھوں نے فرمایا "نور خانہ چراغ پیدا شدہ است کہ خانہ خاندان ما از منور گردد" اس لیے شاہ چراغ کے خطاب سے مشہور ہو گئے اور یہ نام کچھ ایسا مشہور رہا کہ عوام اصل نام کو بھی بھول گئے۔

آپ واقعی علوم ظاہری و باطنی میں صاحب کمال ہوئے۔ شاہجہان ان کے خاص عقیدتمندوں میں تھا۔ اور چونکہ بادشاہ کو بھی عقیدت تھی اس لیے شہر کے امراء و شرفاء سب ان کے خدمت گذار تھے۔ بلکہ صاحب تحقیقات چشتی نے (ص ۸۸ میں) اور صاحب خزینۃ الاصفیاء نے (جلد اول ص ۱۷۲ میں) لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ساتھ اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے منظور نہ فرمایا۔ صاحب تحقیقات نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حالات میں نے خادم درگاہ فقیر موجی شاہ سے سنے ہیں جو درگاہ کی خدمت بھی کرتا ہے اور آمدن بھی لیتا ہے اور چونکہ خزینۃ الاصفیاء[1] تحقیقات چشتیہ سے بعد کی تصنیف ہے۔ اس لیے دونوں کا ماخذ اس

---

[1] حدیقۃ الاولیاء میں بھی یہی الفاظ درج ہیں لیکن خزینہ اور حدیقہ دونوں ایک ہی مصنف مفتی غلام سرور مرحوم کی تصانیف سے ہیں۔

روایت کے متعلق خادم درگاہ کی زبان ہی ہے جو خادم کے بے علم ہونے کی وجہ سے اور بھی ناقابل قبول ہے۔

بہرحال حضرت شاہ چراغ کی دینی عظمت اور دنیوی وجاہت اس روایت کے بغیر بھی مسلمہ ہے۔ وہ سیاحت کے بھی بڑے شوقین تھے۔ اور زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔

آپ ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) کو وفات پا گئے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے کہ آپ کا مقبرہ شاہجہان نے تعمیر کرایا۔ صاحب تاریخ لاہور و صاحب تحقیقات چشتی لکھتے ہیں۔ عالمگیر کے حکم سے یہ روضہ تعمیر ہوا۔ اور صحیح یہی ہے کہ یہ روضۂ عالیہ عالمگیر کے عہد میں یا عالمگیر کے حکم ہی سے تعمیر ہوا ہے۔ اس لیے کہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) میں تو شاہجہان آگرہ کے قلعہ میں نظر بند تھا اور موت ہی نے اس نظر بندی سے اس کو رہائی دلائی تھی۔

روضہ کی عمارت مربع صورت میں پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے۔ دروازہ اس کا جنوب کی طرف ہے۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں اس وقت انتیس قبریں موجود ہیں۔ جن میں چار پانچ ایسی ہیں کہ شاید دو چار سال تک ان کی صفائی ہو جائے گی وَن کے قدیم درخت بھی چھ سات موجود ہیں[1]

روضہ کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے۔ گنبد کے نیچے آٹھ قبریں ہیں۔ ایک شاہ چراغ رح کی، ایک ان کے صاحبزادے زین العابدین کی اور تیسری سید عبدالقادر ثانی کی۔ باقی ان کے اور عزیزوں کی ہیں۔ قبروں پر سفیدی کا پلستر ہے۔ کسی کا نام درج نہیں۔ گنبد کے اوپر کا حصہ قدیم نقش و نگار کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔

مزار سے شرقی سمت چرخی دار چاہ کے پاس ایک قدیم درخت وَن کے نیچے جس کا فرش بھی پختہ ہے نواب خان بہادر خاں (گورنر لاہور) کے والد کی قبر بیان کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔

[مسجد کلاں [illegible] میں نواب زکریا خاں نے اپنی والدہ بیگم جان کی وصیت کے مطابق اس کے زیورات بیچ کر تعمیر کرائی۔ اس کے مشرق کی طرف ایک چھوٹا سا بلند چبوترہ ہے۔ اس چبوترہ پر چار قبریں ہیں۔

مولوی نور احمد چشتی کی مندرجہ ذیل عبارت سے جو تحقیقات چشتی کے صفحہ ۸۹ پر درج ہے یہ غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ ان میں بڑی قبر نواب زکریا خاں کی والدہ کی ہے:۔

"روضہ شاہ چراغ کی دیوار شرقی کے متصل قبر والدہ خان بہادر نواب کی خشتی زیر درخت وَن موجود ہے۔"

حالانکہ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۴۴۶ پر بیگم پورہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس تحریر کی خود ہی تردید کر دی ہے:۔

"...... مشرق کی طرف میانہ باغ میں ایک گز زمین سے بلند مربع ایک چبوترہ

---

[1]، [2] صاحب تحقیقات چشتی ص ۸۹ پر لکھتے ہیں کہ ۳۹ قبریں اس وقت موجود ہیں اور گوندی اور وَن کے درختوں کی تعداد ۲۵ ہے لیکن اب درختوں کو کٹوا کر اور چند قبروں کے انہدام سے تھوڑا سا میدان احاطہ مزار کے اندر بنا لیا گیا ہے۔

اس کے میانہ میں ایک مشت بلند اور چبوترہ تمام سنگ مرمر کا تھا مگر جالا سنگھ وغیرہ اکھیڑ کے لے گئے۔ اس پر دو قبریں تھیں ایک بہو بیگم زوجہ اور دوسری بیگم جان والدہ نواب خان بہادر کی۔"

بیگم جان کو چونکہ حضرت شاہ چراغ سے خاص عقیدت تھی اور مسجد شاہ چراغ بھی اسی کی وصیت کے مطابق تعمیر ہوئی تھی، اس لیے چشتی کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ حالانکہ بیگم جان کا مزار بیگم پورہ کی بستی کے جنوب میں مسجد زکریا خاں کی شرقی جانب چند گز کے فاصلے پر موجود ہے۔

چنانچہ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور میں صفحہ ۱۳۸ پر لکھا ہے :-

"مسجد (زکریا خاں) کی شرقی جانب چبوتروں پر دو اور قبریں ہیں۔ یہ بہو بیگم اور بیگم جان کی قبریں ہیں۔ اوّل الذکر نواب خان بہادر کی بیوی اور دوسری ان کی والدہ تھیں۔"
(نواب زکریا خاں کی بیوی کا نام فخر النساء بیگم تھا جو نواب قمر الدین خاں وزیر دہلی کی بہن تھی)

رائے کنہیا لال تاریخ لاہور میں صفحہ ۲۸۱ پر لکھتے ہیں :-

"اس چبوترہ پر دو قبریں زنانہ زوجہ و والدہ نواب خان بہادر کی تھیں۔ چونکہ یہ عمارت بیگم جان والدہ نواب خان بہادر نے اپنی عین حیات میں بنوائی تھی۔ اس سبب سے اس کا نام بیگم پورہ مشہور ہے۔ الحمد للہ کہ نام اب تک باقی ہے۔ اگرچہ قبریں اکھڑ گئی ہیں۔ مرمت بذریعہ مؤلف کتاب سرکار نے کرائی" ——— مرتب]

سکھوں کے زمانے میں مقبرہ شاہ چراغ اور اس کی متصلہ قدیم عالی شان مسجد شاہ چراغ میگزین کا کام دیتی تھی۔ انگریزوں کی عملداری (۱۸۴۹ء میں) آئی تو مقبرہ اور مسجد میں چھوٹی سی دیوار بندی ہو گئی۔ مقبرہ کو تو مقبرہ ہی رہنے دیا گیا لیکن مسجد کو کوٹھی کی شکل میں تبدیل کر کے ڈپٹی کمشنروں کی اقامت گاہ بنا دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنروں کے بعد یہ جگہ دفتروں میں تبدیل ہو گئی اور سیشن جج کی عدالت یہاں لگنے لگی۔

آج سے چند سال پیشتر یہ جگہ بالکل اجاڑ اور غیر آباد سی تھی۔ احاطے میں جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ چار دیواری خستہ حال تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی ایجی ٹیشن کے بعد جب مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو مل گئی اور سرکار نے اپنا قبضہ اس پر سے اٹھا لیا تو اس اجاڑ جگہ ریزرو بنک کی عالیشان عمارت تعمیر ہو گئی اور اس چار دیواری کو جس میں والدہ نواب خان بہادر کی قبر بیان کی جاتی ہے، از سر نو تعمیر کر کے اس کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا۔

آج سے ستر اسی سال کی تصنیف تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس چار دیواری کے گرد ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس لیے کہ اس جگہ اب بھی پختہ خیابان کے آثار نظر آتے ہیں۔ درختوں کے جھنڈ جن میں وَن کے درخت زیادہ نہ تھے۔ راقم نے بھی یہاں دیکھے تھے۔ بہر حال اب مقبرہ شاہ چراغ مسجد شاہ چراغ اور اس مختصر سی چار دیواری کی حالت نسبتاً بہتر ہے۔ جمعہ اور جماعت کی نمازوں میں اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔

باغ چوبرجی بادشاہ بیگم

بادشاہ بیگم نے رکھی تھی بنا جس باغ کی — آج اس کو حل اوراق پریشاں دیکھئے
ایک ڈیوڑھی کے سوا باقی نہیں کوئی نشاں — اس نشاں میں غور سے عبرت کا ساماں دیکھئے

اس باغ کی بنا اور بانیہ کے متعلق لاہور کے مورخوں اور ان کی تقلید میں بعض اور مصنفوں نے عجیب و غریب غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ سب سے پہلے مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں یہ افسانہ لکھا کہ میا بائی جس کے متعلق چوبرجی کے مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش ہے:۔

ساخت میا بائی فخر نساء
روضۂ عالی ارم احتشام

اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النساء کی کنیز تھی۔ اسی کی زیر نگرانی زیب النساء نے یہ عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ باغ کی تکمیل کے بعد جب شاہزادی اس کے ملاحظہ کے لیے روانہ ہوئی تو راستے میں سب لوگوں سے یہی کہتے سنا کہ شاہزادی میا بائی کا باغ دیکھنے جا رہی ہے۔ چونکہ باغ کی شہرت ان کی کنیزک کے نام پر ہو چکی تھی اور شاہزادی اپنے کانوں سے سن چکی تھی، اس لیے ملاحظہ و معائنہ کے بعد اس نے میا بائی کی خدمات سے خوش ہو کر یہ باغ جس پر اس کا کئی لاکھ روپیہ صرف ہو چکا تھا اسی کو بخش دیا اور اپنے لیے اس نے ایک نیا باغ اس سے کچھ فاصلے پر، جہاں اب نواں کوٹ آباد ہے، بنوایا۔ اسی داستان کو بعد میں ہسٹری آف لاہور، تاریخ لاہور اور ایجوکیشن ان مسلم انڈیا کے مصنفوں نے دہرایا بلکہ راقم نے خود بھی اپنی کتاب "لاہور عہد مغلیہ" (۱۹۲۷ء) میں باغ چوبرجی کی بانیہ زیب النساء بیگم ہی کو قرار دیا۔ لیکن خدا بھلا کرے پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم اے ایڈان کے بعد مولانا عبداللہ قریشی بی۔ اے کا جنھوں نے بڑی چھان بین کے بعد حقیقت کو افسانے سے جدا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زیب النساء کا اس باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا محمد عبداللہ قریشی کا مضمون اس قابل ہے کہ اسے من و عن نقل کیا جاتا ہے:۔

[لاہور سے ملتان کو جاتے ہوئے یونیورسٹی گراؤنڈ سے ذرا آگے چل کر سڑک کے مغرب کی جانب ایک عالیشان عمارت کا دروازہ آتا ہے جس کے شکستہ در و دیوار اور کاشی کار نقش و نگار سے صنادید پاک و ہند کے آثار کا پتہ چلتا ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ اوپر نیچے کئی ہوادار کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر چار خوبصورت ہشت پہلو مقطع برج (مینار) بھی تھے جن کی مناسبت سے

اسے "چوبرجی" کہتے ہیں۔ ۱۸۴۳ء کے بعد اس کا ایک مینار گر گیا اور اب صرف تین مینار باقی رہ گئے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کے گرد لوہے کا جنگلا لگا کر باقی آثار کو محفوظ کر دیا ہے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کر کے اسے تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

اس عمارت میں دورِ شاہجہانی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ساری عمارت قالبوتی ہے اور اس کے مختلف حصوں میں ایسا تناسب پایا جاتا ہے جو اسلامی فنِ تعمیرات کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ اس میں سبز، نیلے اور زرد رنگ کی خوشنما ٹائلیں لگی ہیں اور ٹائلوں پر نہایت نفیس گلکاری اور نقاشی کی گئی ہے۔ نقش و نگار کی تازگی ابھی تک باقی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والا ابھی بنا کر ہٹا ہے۔ صدیاں گزر چکیں۔ کیسے کیسے انقلابات آئے۔ زمانہ نے سینکڑوں رنگ بدلے۔ حکومتیں تبدیل ہوئیں مگر یہ نقش و نگار ہر قسم کے تغیر و تبدل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ نسلوں اور موسموں کا ردوبدل بھی انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ ان کا رنگ روغن جیسا آج سے سینکڑوں برس پیشتر تھا ویسا ہی آج بھی ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس عمارت کا شمال مغربی مینار گر چکا ہے اور اس کے گنبد کسی قدر بوسیدہ ہو گئے ہیں۔

اس دروازے کے عقب کا تمام نشیبی حصہ کھیت بن گیا ہے اور باقی اطراف میں بہت سی نئی عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں جن میں پونچھ ہاؤس کا وسیع احاطہ بھی شامل ہے۔ پونچھ ہاؤس کا عالیشان بنگلہ پہلے پہل ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد میں لارڈ لارنس کی قیام گاہ کے طور پر اس وقت تعمیر ہوا تھا جب وہ سکھ فوج کی گوشمالی کے لیے گورا فوج کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا۔ اس کے بعد یہ بنگلہ چارلس بولنوائس (CHARLES BOULNOIS) کے قبضے میں چلا گیا جو چیف کورٹ پنجاب کے پہلے بیرسٹر تھے۔ پھر سر میریڈتھ پلوڈن (SIR MEREDITH PLOWDEN) کے تصرف میں رہا جو چیف جج تھے۔ اس احاطے میں میاں بائی کا مقبرہ بھی تھا جو سکھوں کے عہد حکومت میں مسمار ہو کر نابود ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ "چوبرجی" کی تاریخی عمارت کسی باغ کی ڈیوڑھی تھی جو اپنی وسعت اور خوبصورتی و نقاشی کی بدولت شالامار باغ سے دوسرے درجہ پر تھا۔ اس پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس کی ایک حد نواں کوٹ کی چار دیواری اور میانی صاحب سے ملتی تھی، تو دوسری حد مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ اور پیر مکی تک پہنچی تھی۔ اس کی مغربی دیوار کے نیچے دریائے راوی بہتا تھا جس نے باغ کی عمارات کو بہت نقصان پہنچایا۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے جب ۱۸۶۷ء میں مولوی نور احمد چشتی اپنی کتاب "تحقیقات چشتی" لکھ رہے تھے، تو اس باغ کی چار دیواری اور اس کے متعلقہ مکانات کی بعض بنیادوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار موجود تھے۔ مگر اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں۔ صرف یہ دروازہ ہی زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گیا ہے جس سے اس کے بانی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

دروازے کی پیشانی پر مشرق کی جانب نیلے حروف میں بخطِ جلی آیت الکرسی منقوش ہے اور آیت الکرسی کے آخر میں "۱۰۵۶ھ" درج ہے جو اس عمارت اور باغ کا سنہ تعمیر ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شعر درج ہیں جن سے اس باغ کے بانی کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع مٹ چکا ہے ؎

بفضل قادر و قیوم و خالق دوراں — بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضوان
بگشت مرحمت ایں باغ بر میاں بائی — ز لطف صاحب زبیدہ بیگم دوراں

(ترجمہ: ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جو قادر و قیوم اور زمانے کا پیدا کرنے والا ہے، بہشت کا نمونہ یہ باغ تیار ہوا اور زمانے کو آراستہ کرنے والی "بیگم صاحب" نے از رو لطف و کرم یہ باغ میاں بائی کو بخش دیا)

مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش ہے ؎

ساخت میاں بائی فخر النساء

روضۂ عالی ارم احتشام

درمیانی خواب گاہ کے ہر دو جانب شمال اور جنوب والی چھوٹی محرابوں میں دائرے کے درمیان "اللہ" کا لفظ بخط نسخ منقوش ہے۔

مقامی روایات کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ میاں بائی اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کی کنیز یا کھلائی تھی۔ زیب النساء نے جب اس جگہ باغ احداث کرنا شروع کیا تو اس کا تمام انتظام و انصرام اپنی عزیز کنیز میاں بائی کے سپرد کیا۔ جب باغ مکمل ہو گیا تو شہزادی ملاحظہ کے لیے روانہ ہوئی۔ راستے میں اسے معلوم ہوا کہ لوگ اس باغ کو میاں بائی کا باغ سمجھتے ہیں۔ اس نے یہ سن کر کہ باغ نے ایک کنیز کے نام سے شہرت پائی ہے، ارادہ کر لیا کہ میں یہ باغ میاں بائی کو دے دوں گی۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئی تو میاں بائی جھک کر آداب بجا لائی اور شہزادی کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی۔ شہزادی نے دروازے سے اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھایا جب تک یہ اعلان نہ کر دیا کہ میں نے تمہاری قابلیت اور خدمات سے خوش ہو کر یہ باغ تمہیں بخش دیا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے لیے ایک نیا باغ اس سے کچھ فاصلے پر نواں کوٹ میں بنوایا۔[1]

یہ دلچسپ افسانہ جسے تاریخ لاہور کی تقریباً ہر کتاب میں بڑی آب و تاب سے جگہ دی گئی ہے۔ بظاہر جتنا دلچسپ ہے اصل میں اتنا ہی بے سروپا اور حقیقت سے دور بھی ہے۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "دختران ہند" میں بڑی چھان بین کے بعد اصلیت سے پردہ اٹھایا ہے، اور حقیقت کو افسانے سے جدا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زیب النساء کا اس عمارت اور باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہ تھا۔

زیب النساء ۲۰ شوال ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء کو پیدا ہوئی تھی اور ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں جب یہ باغ تعمیر ہو رہا تھا۔ اس کی عمر آٹھ نو سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ تھی۔ ایک کم سن بچی کو خواہ کتنی ہی ہوشیار اور غیر معمولی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہو رفاہ عامہ سے اس قدر دلچسپی لینے اور اتنا بڑا ایثار کرنے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ پھر اس وقت زیب النساء کا باپ شہزادہ اورنگ زیب اپنے بھائی دارا شکوہ کی سازشوں سے تنگ آ کر اپنے منصب سے مستعفی ہو چکا تھا اور ترک دنیا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بادشاہ اس سے ناراض تھا۔ دربار میں اسے کوئی رسوخ حاصل نہ تھا۔ ایسے پر آشوب زمانے میں اس کی کم سن بیٹی سے کسی باغ کی تعمیر کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟

اگرچہ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جو تختہ عمارت کی دیوار پر آویزاں ہے اس پر لکھا ہے کہ "زینده بیگم" کوئی تاریخی شخصیت نہ تھی مگر بعض مورخوں نے "زینده بیگم" ہی کو ایک مستقل شخصیت بنا کر اس کے گرد ایک اچھا خاصا تواریخی اور ادبی ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔

---

[1] تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ سید محمد لطیف صفحہ ۱۸۸ ـ ۱۹۰

ج محمد لطیف مولوی نور احمد چشتی اور رائے بہادر کنہیا لال کے خیال میں یہ زیب النسار بیگم ہی کا دوسرا نام تھا لیکن مسٹر ایس ایم جعفر نے اپنی تصنیف "ایجوکیشن ان مسلم انڈیا" کے ایک باب میں تعلیم یافتہ بیگمات کا ذکر کرتے ہوئے "زبیدہ بیگم" کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شاہجہان کی بیٹی تھی۔ اس کی نظموں کا ایک بہت بڑا مجموعہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شاہجہان کی سات بیٹیوں حورالنسار، جہاں آرا، روشن آرا، ثریا بانو بیگم، گوہر آرا بیگم وغیرہ میں سے جہاں آرا اور روشن آرا کے سوا کسی کو سن بلوغ تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ ان دونوں کے علاوہ کسی نے ملکی سیاست اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ بھی نہیں لیا نیز زبیدہ بیگم کے نام سے اس کی کوئی بیٹی ہی نہ تھی۔

اس عمارت کی پیشانی پر جو کتبہ موجود ہے اس پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ خوبصورت باغ شاہ جہان کی قابل اور فاضل بیٹی جہاں آرا نے بنوایا تھا جسے شاہجہان نے پچاس لاکھ سالانہ کی جاگیر اور بے شمار زر و جواہر عطا کر کے اس کی الگ سرکار مقرر کر دی تھی۔ جہاں آرا کو اس زمانے میں "بیگم صاحب" کہتے تھے۔ تیموریوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے حرم کی خواتین کو اصل نام کی بجائے کسی خاص لقب سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی تاریخوں میں جہاں کہیں جہاں آرا بیگم کا نام ہے وہاں "بیگم صاحب" ہی کے لقب سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی بعض یادگاروں کے نام بھی کچھ ایسے ہی ہیں جیسے کشمیر میں "صاحب آباد" اور اجمیر شریف میں بیگمی دالان وغیرہ۔ "زبیدۂ دوراں" فقط شاعرانہ ستائش ہے جس کے معنی زمانے کو زیب و زینت دینے والی یا آراستہ کرنے والی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے یہ باغ جہاں آرا نے بنوایا اور اپنی کنیز یا کھلائی میا بائی کو مرحمت کیا۔

اُس دور کی کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیب النسار نے لاہور میں کوئی باغ بنوایا تھا۔ لاہور کے باغوں کا ذکر تاریخوں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے جن میں ملا محمد صالح کمبو کی کتاب "بہارستان سخن" شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب "سکینۃ الاولیا" اور منشی چندر بھان برہمن کی کتاب "چہار چمن" خاص شاہجہانی دور میں لکھی گئی ہیں۔ سکینۃ الاولیا ۱۰۵۲ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں یوں تو حضرت میاں میرؒ کے ملفوظات اور ان کے مشہور خلفا کا تذکرہ ہے مگر ایک باب ایسا بھی ہے جس میں ان تمام عمارات اور باغات کا ذکر ہے جہاں حضرت میاں میرؒ دن کے وقت نکل جایا کرتے تھے۔ اور یک سوئی سے عبادت کیا کرتے تھے۔ اس باب کے مطالعہ سے لاہور کی اکثر عمارتوں اور باغوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس طویل فہرست میں جہاں آرا کے کسی باغ کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ چندر بھان برہمن کی مشہور کتاب چہار چمن میں جو اس کے بعد لکھی گئی، لاہور کے مشہور باغوں میں سے باغ دلکشا، باغ دل آمیز، باغ کامران، باغ نولکھا اور باغ شالیمار کے علاوہ "نامِ بیگم العالم بیگم صاحب جہاں آرا بیگم" کے ایک باغ کا ذکر موجود ہے لیکن زیب النسار کے کسی باغ کا ذکر نہیں ——— جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیب النسار نے اس وقت تک لاہور میں کوئی باغ نہیں بنایا تھا۔ البتہ جہاں آرا بیگم کا باغ تعمیر ہو چکا تھا اور یقیناً وہ یہی باغ تھا جس کی عمارت پر ۱۰۵۶ھ تحریر ہے۔

اس کی تائید و تصدیق اورنگ زیب کے ایک رقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ جو اس نے ان ہی دنوں شہزادگی کے عالم میں اپنی بہن جہاں آرا کے نام لاہور سے لکھا تھا۔ اورنگ زیب ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے لاہور پہنچا۔ بادشاہ نے جو اس سے پہلے لاہور پہنچ چکا تھا دوسرے ہی دن اسے شہزادہ مراد بخش کی جگہ بلخ اور بدخشاں کا صوبہ دار مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ فی الفور وہاں چلا جائے۔

اورنگ زیب ۱۵ محرم ۱۰۸۵ھ ۱۶۷۴ء تک لاہور میں مقیم رہا اور اس کے بعد افغانستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس نے لاہور کے تمام باغات دیکھے اور ان پر تبصرہ کیا۔ جہاں آرا کا باغ جو اس چوبرجی باغ کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس وقت زیر تعمیر تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی تعریف کی اور اس میں چند مناسب تبدیلیاں کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا:-

"ہم نے پچھ روز صاحبہ سرکار علیا کے باغ کی سیر کی۔ ہماری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس کے تالاب اور عمارتیں جو ابھی ابھی بنی ہیں، دیکھ کر ہمیں بے حد مسرت ہوئی۔ یہ جگہ نہایت عمدہ تفریح گاہ ہے۔ اگر فراست[1] خاں کی عمارت کو گرا کر محل کے طریقے پر نہایت قرینے سے ایک نشیمن بنا لیا جائے اور بعض دوسرے تصرفات کر لیے جائیں تو یہ ایک بے نظیر سیرگاہ بن سکتی ہے۔"[2]

اس باغ میں تالاب وغیرہ بھی تھے اور اس کے پاس فراست خاں کی کوئی عمارت بھی ہو گی۔ لیکن اب نہ تالاب باقی ہیں نہ آبشار، نہ کوئی بارہ دری اور نہ باغ کی چار دیواری ہی قائم ہے۔ صرف یہ ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے جس کے نقش و نگار زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔ ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی ‌ ‌ ‌ ‌ بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ جہاں آرا بیگم کی وفات کے بعد عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں اس کی جائداد زیب النساء کی جاگیر میں دے دی تھی جیسا کہ دہلی کے تیس ہزاری باغ اور کشمیر کے صاحب آباد کے متعلق تاریخی شواہد ملتے ہیں اس لیے بعد میں یہ باغ اسی کے نام سے مشہور ہو گیا ——— مرتب]

زیب النساء کا مقبرہ[3]

[یہ مسئلہ مدت سے زیر بحث ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بڑی بیٹی شہزادی زیب النساء کی قبر لاہور میں ہے یا دہلی میں؟

ایک جماعت اس امر کی دعویدار ہے کہ زیب النساء نے اپنی زندگی میں اپنی قبر لاہور میں بنوائی تھی اور وفات کے بعد وہ اسی میں دفن کی گئی۔ چنانچہ نواں کوٹ لاہور میں جو مقبرہ زیب النساء کے نام سے مشہور و موجود ہے وہ اس کا بدیہی ثبوت ہے۔

دوسری جماعت اس کے خلاف یہ کہتی ہے کہ زیب النساء قلعہ سلیم گڑھ میں فوت ہوئی تھی اور اسے دہلی میں دفن کیا گیا تھا۔

---

[1] فراست خاں اس زمانے میں کوئی امیر ہوگا اور یہ نام اس کی دانائی کی وجہ سے شاہی خطاب معلوم ہوتا ہے۔
[2] رقعات عالمگیری نمبر ۱۴۵
[3] یہ مضمون مرتب کے قلم سے ہے۔

جہاں تک اس مسئلے کے متعلق تحقیق کی گئی ہے یہی نتیجہ نکلا ہے کہ زیب النساء واقعی سلیم گڑھ میں فوت ہوئی تھی جو لال قلعہ دہلی ہی کے ایک حصے کا نام تھا اور بادشاہ کے حکم سے اسے تیس ہزاری باغ دہلی میں دفن کیا گیا تھا جو جہاں آرا بیگم کا متروکہ تھا اور اس وقت زیب النساء کے قبضے میں تھا، عالمگیر ان دنوں دکن کے معرکوں میں مصروف تھا۔ اسے وہاں اطلاع بھیجی گئی چنانچہ مآثر عالمگیری کا مصنف جو عالمگیر کا معاصر مورخ تھا اور جس کے بیان میں غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا، سنہ ۱۱۱۳ھ کے واقعات میں لکھتا ہے۔

"دارالخلافہ کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ نواب تقدس جناب زیب النساء بیگم اللہ تعالےٰ کی رحمت سے پیوست ہو گئیں۔ بادشاہ کا دل اس خبر سے بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بے طاقتی کی وجہ سے بے قرار تھا صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بادشاہ نے سید امجد خاں، شیخ عطا اللہ، حافظ خاں (جسے تذکرہ سپغتائیہ کا مصنف حافظ خاں عرف نور محمد لکھتا ہے) کو حکم دیا کہ وہ شہزادی کے نام پر صدقات اور خیرات غریبوں میں تقسیم کریں اور بیگم کا مقبرہ باغ سی ہزاری میں بنوائیں جو اسی کا متروکہ تھا۔" ۱؎

زیب النساء کی قبر پر ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی اور یہ مقبرہ ایک مدت تک لوگوں کی زیارت گاہ بنا رہا چنانچہ مرزا سنگین بیگ اپنی کتاب سیر المنازل میں لکھتا ہے:۔

"کابلی دروازہ کے باہر شارع عام پر تکیہ بھولو شاہ فقیر کے شمال کی جانب زیب النساء کا مقبرہ اور لال پتھر کی مسجد ہے۔"

اس عمارت کی ایک دیوار پر خط ثلث میں یہ عبارت کندہ تھی:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

هذا المرقد البنت الكبرى للعبد المذنب العاصي المغفور
برحمة الرحيم الكريمة الحافظة زيب النساء المرجو
من عباد الله الصالحين ٥ ان يدعوا لها بالغفران والرضوان
وتاريخ فوتها قوله سبحانه "وادخلي جنتي"

۱۱۱۳ھ (مطابق ۱۷۰۲ء)

سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید دہلی ۱۸۵۳ء میں تصنیف کی۔ اس کے صفحات ۴۳ ، ۷۷ کے مطالعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ۱۸۸۵ء میں جب راجپوتانہ ریلوے تعمیر ہوئی تو یہ مقبرہ مسمار کر دیا گیا۔ چنانچہ مسٹر بیل لکھتا ہے کہ زیب النساء کا مزار کابلی دروازہ کے پاس دہلی میں تھا۔ لیکن راجپوتانہ ریلوے بنانے وقت اسے منہدم کر دیا گیا۔ ۲؎

۱؎ مآثر عالمگیری کلکتہ ایڈیشن صفحہ ۴۶۲

۲؎ دیکھو بیل صفحہ ۴۲۸

اس سلسلے میں رسالہ پنجاب نوٹس اینڈ کوریز بابت ماہ اپریل [illegible] بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس کے صفحہ ۱۲۲ پر اس کے مرتب نے اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دی ہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس واقعہ کو بھول گئے اور زیب النساء کی قبر کے رہے سہے نشانات بھی لوگوں کی بے توجہی کا شکار ہو گئے۔

تیموریوں میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وفات کے بعد ان کی نعش ایک مقام سے اکھاڑ کر دوسرے مقام پر دفن کی گئی ہو یا ایک جگہ سے ہٹا کر کسی ایسی جگہ پہنچائی گئی ہو جو سینکڑوں کوس کے فاصلے پر ہو۔ بابر اور ممتاز محل کی نعشیں امانت کے طور پر آگرہ اور زین آباد باغ میں دفن کی گئی تھیں مگر زیب النساء کے متعلق کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی نعش امانت کے طور پر پہلے دہلی میں دفن کی گئی اور بعد میں لاہور لائی گئی۔

دراصل زیب النساء کے مزار کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دورِ حاضرہ کے سوانح نگاروں نے پیدا کی ہیں جن میں شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج۔ رائے بہادر کنہیا لال ہندی۔ مولوی نور احمد چشتی۔ مرزا حیرت دہلوی۔ محمد دین فوق اور مولوی احمد دین بی۔ اے کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اپنے قیاس سے کام لیا ہے یا بازاری افسانوں کو تاریخی روایات کا درجہ دے دیا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ زیب النساء کا مزار دہلی میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نواں کوٹ لاہور کا مزار جو زیب النساء کے نام سے مشہور ہے اور اس کے گرد و نواح کی باقی عمارات آخر کس کی ہیں؟ کم از کم ان کے بارے میں یہ کہنا تو سراسر غلط ہے کہ یہ زیب النساء کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔

جہاں تک مقبرہ کا تعلق ہے اس کی قبر کی ساخت ایسی ہے کہ اسے کسی عورت کا مزار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیموریوں میں یہ عام دستور تھا کہ وہ خواتین کی قبر دو منزلی بناتے تھے۔ یعنی اصل قبر نیچے تہ خانے میں ہوتی تھی اور خالی تعویز اوپر کی سطح پر ہوتا تھا۔ جس پر ایک تختی کا نشان بھی بنایا جاتا تھا۔ نور جہاں کا مقبرہ اور ممتاز محل کا روضہ اس کی مثال ہیں۔ نواں کوٹ لاہور کی قبر نہ دو منزلی ہے نہ اس پر تختی کا نشان ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے مرد کی قبر ہے جو شاہجہان کے عہد میں فوت ہوا۔

نواں کوٹ کا علاقہ تیموریوں کے عہد میں ایک اہم سول اسٹیشن تھا۔ اس کی چار دیواری۔ باغوں کے برج۔ بارہ دریاں۔ محلات کے نشان اور گرد و نواح کی قبور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس وقت یہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ یہ تمام عمارتیں ایک ایک دو دو سال کے وقفے میں تیار ہوئی ہیں اور ان میں شاہجہانی دور کے فنِ تعمیر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ زیب النساء کے مقبرہ کا گنبد اور فرش بھی عالمگیری دور کی خصوصیات کا حامل نہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد کا نہیں بلکہ شاہجہانی دور کی یادگار ہے۔

تاریخوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں چار جلیل القدر امیر لاہور میں فوت ہوئے۔ پہلا علی مردان خان۔ دوسرا آصف جاہ۔ تیسرا نصرت خان اور چوتھا افضل خان علامی۔ ان میں اول الذکر ہر سہ کے مقبرے تو لاہور میں موجود ہیں مگر افضل خان علامی کا مقبرہ موجود نہیں۔ وہ [illegible] میں فوت ہوا۔ بادشاہ اس وقت کابل گیا ہوا تھا۔ واپسی پر لاہور میں افضل خان کے رشتہ داروں کے پاس تعزیت کے لیے گیا۔ بہت ممکن ہے کہ افضل خان علامی کے محلات نواں کوٹ ہوں اور اسے وفات کے بعد یہاں دفن کیا گیا ہو۔

جج محمد لطیف اور بعض دوسرے بزرگوں نے اگرہ کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افضل خاں کی قبر جمنا کے اس پار چینی کے روضہ میں ہے۔ مگر ای ڈبلیو سمتھ صاحب کا خیال ہے کہ اگر اس روضہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا طرزِ تعمیر دورِ عالمگیری سے ملتا جلتا ہے۔ اسے شاہجہانی دور کی عمارت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ چینی کے روضہ میں دو قبریں ہیں۔ ایک زنانہ اور دوسری مردانہ۔ افضل خاں علامی کی بیوی اس سے بہت پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اس کے کوئی لڑکی بھی نہ تھی۔ جسے اس روضہ میں دفن کیا گیا ہو۔ پس لاہور میں جو مقبرہ زیب النساء کے نام سے مشہور ہے وہ افضل خاں علامی کا ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زیب النساء دہلی میں فوت ہو کر تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی۔ نواں کوٹ لاہور کے مقبرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی ملحقہ عمارات بھی اس کی بنائی ہوئی تھیں بلکہ یہ افضل خاں علامی کی یادگار ہیں۔ چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں اس کی جائداد زیب النساء کو مل گئی ہو۔

ذیل میں "زیب النساء کی قبر" کے عنوان سے ایک نظم پیش کی جاتی ہے جو مہاراج بہادر برق دہلوی نے آج سے چالیس سال قبل اس وقت کہی تھی جب محکمہ آثار قدیمہ نے خاک کے تودوں کو ہٹا کر زیب النساء کی قبر برآمد کی تھی ؎

زیب النساء کی قبر جو تھی خاک میں نہاں ۔۔۔ صدیوں کے بعد اس کا ملا گم شدہ نشاں
مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے ۔۔۔ تھا گنج بے بہا اسی میدان میں نہاں
مٹی میں مل رہا تھا ورثہ شاہوار حیف ۔۔۔ اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں
شاید پس فنا یہ تخلص کا تھا اثر ۔۔۔ مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں
اگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے ۔۔۔ ممنونِ جستجو نہیں روداد بے کساں
تصویرِ دستبردِ حوادث ہے سر بسر ۔۔۔ ابھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقش پائیماں
گنبد ہے مقبرہ ہے نہ لوحِ مزار ہے ۔۔۔ تعویزِ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں
نے شمع ہے نہ چادرِ گل ہے نہ قبر پوش ۔۔۔ مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں
ویرانئ لحد ہے مجاورِ سرِ فراز ۔۔۔ زائر ہجومِ یاس تباہی ہے پاسباں
ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا ۔۔۔ سبزہ تو کیا کہ شکل نمو بھی نہیں عیاں
اڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی ۔۔۔ چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں
روتی ہے بے کسی سرہانے میں کھڑی ہوئی ۔۔۔ تربت پہ کسمپرسی کا عالم ہے نوحہ خواں
بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی ۔۔۔ ہیں ذرہ ہائے ریگِ بیاباں گہر فشاں
ہے اس کی خوابگہ یہ شبستانِ خاک اب ۔۔۔ زیبندہ جس کے دم سے تھے قصرِ فلک نشاں
جو دخت ماہوش شہ ہندوستان کی تھی ۔۔۔ تھا مصدرِ سخا و کرم جس کا آستاں
روشن چراغ بزمِ سخن جس کے دم سے تھا ۔۔۔ مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں

اس کو نہیں فنا ہے یہ مٹیا محل نصیب — دامن کو جس کے گرد سرِ راہ تھی گراں
سچ ہے نہیں زمانے کو یک وضع پر قرار — نیرنگِ روزگار چنیں ہے گہے چناں
برحق کہ بے ثبات ہیں اسباب ظاہری — سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں
ہے امتیاز شاہ و گدا تا بہ زندگی — ہے زیرِ خاک پست و بلندی عز و شاں

وہ آج غرقِ خوں ہیں جو کل محو ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

——— مرتب]

شاہی خشت پز بدھو

جس پژاوہ پر رہا شاہی مکاں آراستہ — آیئے اور آج اس کو مرگ میداں دیکھئے
جس پژاوہ سے ہوئی قائم بنائے شہلا باغ — واں مزارات مسیحی و مسلماں دیکھئے

جہانگیر کے زمانہ میں لاہور کا ایک کمہار سدھو نام اس مقام پر جہاں بدھو کا آوا مشہور ہے اور جو سڑک شالامار باغ کے کنارے واقع ہے۔ چھوٹا سا پژاوہ بنا کر اینٹیں پکانے کا کام کیا کرتا تھا۔ جب بزمانہ شاہجہان شالامار باغ کی تعمیر شروع ہوئی۔ تو سدھو کے بیٹے بدھو کو اینٹیں بہم پہنچانے کا حکم ملا۔ اس باغ کی چار دیواری اور اس کی عمارات کے لیے لاکھوں کروڑوں اینٹوں کی کھپت تھی اس لیے آوے کی حدود بہت دور تک پھیل گئیں اور بدھو اب بدھو کمہار نہ رہا بلکہ شاہی خشت پز کہلانے لگا۔ اور امراء اور حاکم صوبہ تک اس کی رسائی ہو گئی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت میاں میر کا ایک مرید عبدالحق نام بارش کی شدت میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا آگ کی تلاش میں یہاں آیا۔ بدھو کے ملازموں اور خود بدھو نے استہزا ہو سے کام لے کر اس کو جوتے مار کر نکلوا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ آوے کو پکانے کے لیے خس و خاشاک۔ کوڑا کرکٹ اور لکڑیوں کے ہزارہا من صرف ہو گئے۔ لیکن اینٹیں پختہ نہ ہو سکیں۔ بدھو اسی غم میں بیمار ہو گیا۔ اس نے ایک رات باپ کو خواب میں دیکھا جو اس کو غم و غصہ کی حالت میں کہہ رہا تھا کہ اگر تو اپنی بہتری چاہتا ہے تو اس فقیر سے اپنی تقصیر معاف کرا۔

بدھو دو چار دن کی تلاش کے بعد درویش عبدالحق سے ملا اس کے پاؤں پر گر پڑا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ درویش نے کہا حکم الٰہی ایسا ہی تھا۔ اب اینٹوں کا پختہ ہونا تو ناممکن ہے البتہ یہ نیم پخت اور سڑی ہوئی اینٹیں بھی پختہ اینٹوں کے نرخ پر فروخت ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہی ایام میں لاہور میں اس کثرت سے عمارات شروع ہوئیں کہ اس کی تمام اینٹیں اصلی نرخ پر فروخت ہو گئیں۔

درویش عبدالحق کا انتقال ۱۰۸۲ھ میں بعہد عالمگیر ہوا۔ بدھو نے اس کی قبر گنبد بہادر خاں کے شمال کی طرف تعمیر کرائی۔ چند برس کے بعد جب بدھو کا اپنا انتقال ہوا تو اس کی قبر بھی اس درویش کے متصل ہی تعمیر کی گئی۔ اس قبر کے جنوبی جانب کچے چبوترہ پر پانچ نامعلوم الاسم قبریں بنی ہوئی ہیں ان قبروں کے آثار کا پتہ مؤرخین لاہور ۱۸۹۲ء تک برابر دیتے آئے ہیں۔

لیکن ۱۹۰۸ء یا اس کے قریب ریلوے حکام نے جب ریلوے جنرل سٹور کی عظیم الشان اور وسیع عمارت اور اس کی طویل و بلند دیوار بنائی۔ تو بہت سے مقبرے جنرل اسٹور کی حدود میں آ گئے۔ جنرل اسٹور کی شمالی دیوار سڑک شالامار باغ کے ساتھ ساتھ پڑاوہ بدھو کے میسی کی قبرستان سے شروع ہو کر مقبرہ علی مردان سے بھی جو جنرل اسٹور ہی میں اب شامل ہے بہت آگے چلی گئی ہے۔ اس دیوار کی بیرونی جانب سڑک شالامار کے کنارے شاہجہانی طرز کا ایک گنبد نظر آتا ہے۔ جس کے شمالی محراب پر ایک تختی بحکم ڈپٹی کمشنر لاہور اس مضمون کی چسپاں ہے کہ

"اس مقبرہ کو خراب کرنے والے کے ساتھ قانونی سلوک کیا جائے گا جرمانہ یا قید۔
یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ یہ حکم ۲؍ اگست ۱۹۱۸ء کا مجریہ ہے۔"

راقم الحروف نے ۱۹۲۳ء میں روضہ حضرت ایشاں کے ایک ضعیف العمر خادم سائیں کامل دین سے جو چالیس سال سے اسی درگاہ میں رہتے ہیں اور بعض اور لوگوں سے "صاحب مقبرہ" کا نام دریافت کیا۔ چند ایک نے لاعلمی ظاہر کی لیکن سائیں کامل دین اور دیگر اصحاب نے کہا کہ مشہور یہی ہے کہ یہ قبر بدھو کی ہے جس کے نام پر بدھو کا آوا ہے۔

اس مقبرہ کے اندر دو قبریں ہیں۔ غربی جانب جو قبر ہے وہ ذرا چھوٹی ہے۔ اور شرقی جانب کی قبر ذرا بلند ہے مقبرہ کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا نمونہ ہے۔ گنبد پر نقش چینی کا کام ہے۔ جو ہر چند بہت کچھ مٹ گیا ہے تاہم ابھی اس کے آثار باقی ہیں۔ چاروں محرابوں پر اس اعلیٰ کاریگری کے نشانات ابھی تک مٹی ہوئی شکل میں نظر آ رہے ہیں جو کاسنی اور گلابی خطوط کی لکیروں اور مختلف بیل بوٹوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔

مقبرہ کا بیرونی چبوترہ پندرہ پندرہ قدم مربع ہے وہ اکثر جگہ سے شکستہ ہے۔ مقبرہ کے دریچوں پر جو عمارت چاروں طرف بڑھی ہوئی ہے وہ بالکل گر گئی ہے۔ ایک بہت بڑا کریر کا درخت چبوترہ کے غربی جنوبی گوشہ پر موجود ہے۔ اس مقبرہ کے گرد اور بھی سات آٹھ درخت کریر کے موجود ہیں۔

اس گنبد سے قریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلہ پر مشرق کی طرف اسی زمانہ کا ایک کنواں شکستہ و تباہ حالت میں ہے۔ مقبرہ کا دروازہ شمال یعنی سڑک شالا باغ کے رخ پر تھا چنانچہ ایک طویل چبوترہ کے آثار اب تک نظر آ رہے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی افسروں میں اوی طبیلہ (AVITABILE) فوجی افسر ہونے کے علاوہ وزیر آباد اور پشاور کا گورنر بھی رہا ہے۔ یہ ۱۸۲۷ء میں ملازم ہوا۔ اس کی تنخواہ ۱۶۶۶ روپے ماہوار تھی۔ اس نے پڑاوہ بدھو کی بلندی پر یورپین طرز کی ایک کوٹھی بنائی تھی۔ جس کو بیل بوٹوں اور گملوں سے سجا رکھا تھا۔ کوٹھی پر جانے کے لیے پڑاوہ پر ایک سڑک بھی بنا رکھی تھی۔ کئی لوگ اس کوٹھی کو بارہ دری اور بنگلہ بھی کہتے تھے۔ جنرل اوی طبیلہ اسی مقام پر سپاہ کے پنچ صلاح مشورہ کے لیے طلب کرتا تھا۔ اور یہاں بڑی رونق رہتی تھی اُس زمانہ میں اپنی بلندی کی وجہ سے یہ مقام فرحت بخش تصور کیا جاتا تھا۔

۱۸۴۱ء میں جب راجہ دھیان سنگھ کے ایما سے شہزادہ شیر سنگھ اپنی جاگیر بٹالہ سے لاہور آیا۔ تو ۱۴ جنوری کو اُس نے اسی کوٹھی میں قیام کیا اسی جگہ فوج کے ۱۰۰ افسر اور پنچ جو شہزادہ شیر سنگھ کے طرفدار تھے جمع ہوئے اور اسی مقام پر توپوں کی سلامی سے اہل شہر اور اہل قلعہ کو شہزادہ شیر سنگھ کے مہاراجہ پنجاب ہونے کی اطلاع دی گئی۔

جب سرداران سندھانوالیہ نے مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے وزیر مہاراجہ دھیان سنگھ اور ولی عہد پنجاب شہزادہ پرتاپ سنگھ کو قتل کر دیا۔ تو اسی مقام پر راجہ ہیرا سنگھ نے چالیس ہزار فوج کے سامنے سندھانوالیوں کے خلاف ایک پُرجوش اور اشتعال انگیز تقریر مہاراجہ اور وزیر کا انتقام لینے کے لیے کی۔

سکھ حکومت کے خاتمہ (۱۸۴۹ء) کے بعد اس پژاوہ کی کھدائی شروع ہو گئی۔ بنگلہ مسمار ہو گیا۔ روشیں مٹ گئیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اس آوے کی کھدائی سے بہت سی زمین نکل آئی تھی لیکن آوے کے آثار ابھی قائم تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں جب راقم اس طرف گیا تو اس ٹیلہ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ جو زمین اس پژاوہ کو مٹانے سے برآمد ہوئی تھی اس میں عیسائیوں کا قبرستان بنا دیا گیا تھا۔ اب نہ بدھو کا آوا ہے نہ سکھ حکومت کے زمانہ کا بنگلہ۔ مسیحی قبرستان اور گنبد بدھو کے درمیان جنرل اسٹور کی دیوار کے ساتھ گورنمنٹ نے ایک گول سا چبوترہ بنا کر اس پر ایک دیوار چار فٹ کھڑی کر دی ہے جس پر سنگ مرمر کی تختی میں یہ انگریزی عبارت درج ہے:-

"THE SITE BUDHU KA AWAH AND THE HOUSE OF GENERAL AVITABILE"

مقام یا موقع بدھو کا آوا (کوٹھی جنرل اے ٹی) طویلہ

یہ چبوترہ شالا باغ کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو آتا ہے اس کے گرد لوہے کی ایک زنجیر لگی ہوئی ہے۔

پژاوہ بدھو کے متصل دو قبرستان ہیں اور دونوں سر راہ واقع ہیں۔ پہلے اسلامی قبرستان آتا ہے جہاں ایک مسجد قدیم چاہ، وضو خانہ اور غسل خانہ موجود ہے۔ اب چند سال سے مسجد کے عقب میں ایک جنازہ گاہ بھی پختہ اینٹوں کے فرش سے تیار ہو گئی ہے اکثر لوگوں نے قبرستان میانی صاحب کی طرح یہاں بھی اپنے اپنے احاطے بنا لیے ہیں۔ اس قبرستان میں اس قدر مردے دفن ہو چکے ہیں کہ ہر قبر کھودنے پر کسی نہ کسی لاش کا کوئی نہ کوئی نشان مل جاتا ہے۔ قبرستان کی عام حالت ردی ہے۔ چند ایک پرانی قبریں بھی موجود ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مسیحی قبرستان ہے جس کے گرد ایک طویل چار دیواری چار چار فٹ تک بلند ہے۔ بہت سی قبریں پختہ یا خام ہیں بہت سی قبروں پر صلیب کے نشان ہیں۔ کئی ایک پر سنگ مرمر کی تختیاں نصب ہیں جن پر مرنے والے کی عمر، تاریخ وفات اُس کا نام درج ہے۔ جس طرح اسلامی قبروں پر قرآنی آیات یا عبرت انگیز اشعار لکھے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح مسیحی مقبرے پر چند درد انگیز الفاظ سے قبرستان کا نظارہ کرنے والوں کو عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ چند قبروں کی عبارتیں مسیحی مذاق دکھلانے کو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ایک عورت (ستیندرو کمار سنگھا بنگالی عیسائی لیڈی) کی قبر پر اس کی عمر ۴۳ سال پانچ ماہ اور تاریخ وفات ۱۰ نومبر ۹ درج کرنے کے بعد لکھا ہے:-

"تیرے نوکر، تیرے شاندار کام اور تیرے فرزند موجود ہیں اور تیری عزت بڑھاتے ہیں"

آٹھ سال کے ایک بچہ کی قبر پر لکھا ہے:-

"نوخیز اور شیریں پھول جو ابھی غنچہ ناشگفتہ تھا۔ توڑ ڈالا گیا۔ جو ابھی دنیا کے رنج و عیش سے قطعی نا آشنا تھا۔ ابھی اس نے اپنے والدین کی محبت کا پھل نہیں چکھا تھا۔ کہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔"

اسی مضمون کو ایک اُردو شاعر نے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ایک پچیس سالہ نوجوان کی قبر پر یہ الفاظ مندرج ہیں :-

"تیری محبت میرے دل میں قائم ہے اور وہ قائم رہے گی کیونکہ محبت کا قائم رکھنا عیسائیت کا فرض ہے۔"

ایک ۴۹ سال کی عمر والے کی قبر پر ذیل کے الفاظ ہیں :-

"اے خدا اس کو بہشت میں جگہ دے اور اس کی نیکیوں کو ہماری مغفرت کا ذریعہ بنا!"

مسٹر فضل بھی جو پنجاب بائبل سوسائٹی کے مشہور سیکرٹری لاہور کے علم دوست نوجوان اور اعلیٰ مترجم تھے اسی جگہ دفن ہیں۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں ۲۱ اگست ۱۹۱۰ء کو وفات پا گئے۔ ان کی قبر ان کی بیوی نے بنوائی ہے۔ سنگ مرمر کا سادہ تختہ جس کے گرد لوہے کا جنگلہ ہے قبر پر نصب ہے اُس پر لکھا ہے :-

"اپنے پیارے خاوند کی یاد میں" "مبارک ہیں وہ جو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں اور اپنی جانفشانیوں اپنی محنتوں اور اپنی شاندار خدمات کے بعد جن کی اوروں کو بھی پیروی کرنی چاہیئے دائمی آرام گاہ میں چلے جاتے ہیں وہ مرتے نہیں کیونکہ صرف قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔"

ایک اکیس سالہ نوجوان کی قبر پر جس نے ایسٹر کے دنوں میں انتقال کیا مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :-

"ایسٹر کی خوشی دلانے والی صبح کو تمام مُردوں کی روحیں اپنے باپ کو اپنی بہن کو بچے کو اور ماں کو ملنے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکلتی ہیں۔"

حضرت ایشاںؒ

باغ ہے گو حضرت ایشاں کا پامال خزاں
مقبرہ کی اب بھی تقدیس نمایاں دیکھئے

اصل نام سید خواجہ شاہ وند محمود ہے حضرت ایشاں (آں شان یا آں جناب) ادب کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کے مفصل حالات کشمیر کی تاریخوں اور کتاب رضوانی میں درج ہیں۔ رسالہ رضوانی آپ کے فرزند خواجہ معین الدین احمد نقشبندی کی تصنیف سے ہے تحقیقات چشتی میں (ص ۲۴۰ پر) لکھا ہے :-

"آپ محمد حسین آخری بادشاہ کشمیر کے زمانہ میں کشمیر آئے چونکہ آپ کے پند و نصائح اور موعظہ حسنہ سے اکثر شیعہ سنیوں کی جماعت میں داخل ہو رہے تھے۔ اور بادشاہ خود

شیعہ تھا اس لیے اس نے آپ کو کشمیر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ نے ایک ماہ کی
مہلت مانگی لیکن اسی دوران میں اکبر نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ محمد حسین بھاگ گیا۔ اس کا
بیٹا جنگ میں مارا گیا اور اکبری افواج نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔"

ایسے ہی الفاظ آپ کے ورود کشمیر اور حکم اخراج کے متعلق رائے کنہیا لال نے بھی لکھے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں کوئی بادشاہ محمد حسین کے نام سے نہیں گزرا۔ البتہ چک خاندان سے حسین شاہ چک ۹۷۱ھ سے ۹۷۸ھ تک کشمیر میں حکومت کرتا رہا ہے۔ وہ اور اس کی اولاد جو ۱۶ ذی قعد ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء تک کشمیر میں حکمران رہی ہے، متعصب شیعہ تھی۔ لیکن حضرت ایشاں ان کے زمانہ میں کشمیر نہیں آئے۔ بلکہ بقول صاحب تاریخ کبیر کشمیر (ص ۶۲) ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں تو وہ پیدا ہی ہوئے تھے۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ آپ اکبر کے آخری ایام میں کشمیر تشریف لائے۔ اور یہی ہسٹری آف لاہور کے مصنف نے بھی لکھا ہے۔

بخارا آپ کا وطن تھا اور وہیں مدرسہ سلطانیہ سے بیس سال کی عمر میں آپ نے دستار فضیلت حاصل کی۔ سیلانی طبع تھے۔ سمرقند، ہرات، قندھار، کابل سے ہوتے ہوئے اور وہاں اہالیان کو علوم ظاہری و باطنی کا فیض پہنچاتے ہوئے آپ کشمیر میں رونق افروز ہوئے۔

تحقیقات چشتی میں یہ بھی درج ہے کہ کشمیر کے سنی شیعہ فساد میں آپ شیعوں کے خلاف اور اہل سنت والجماعت کے مددگار تھے اور اس فساد کی وجہ سے سری نگر میں بدامنی کا اندیشہ تھا اس لیے جہانگیر کے حکم سے آپ آگرہ میں بلائے گئے۔ لیکن محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد (۱۱۴۶ھ) کا مصنف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری اپنی تاریخ المشہور تاریخ اعظمی میں (ص ۱۳۸، ۱۳۹) پر لکھتا ہے:-

"جملہ واقعات شدیدہ کہ در عہد ظفر خاں (ناظم کشمیر بعہد شاہجہان) کہ در کشمیر رو داد قضیہ مردم
اہل تسنن با مردم اہل تشیع است .... ظفر خاں در ضمن شکایت بہ مبالغہ و تفاوت
بہ حضور برنگاشت حکم پادشاہی بر طلب حضرت خواجہ صدور یافت۔ مجرد ورود حکم از
خانہ حرکت فرمودند .... بعد زیارت بزرگان شاہجہان آباد بہ امر سلطان در لاہور
توطن فرمودند"

یہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء کا واقعہ ہے۔

شاہجہان نے آپ کو ایک لاکھ سنہری ٹنکہ عطا کیا جس سے آپ نے باغ اور مسجد کے علاوہ اپنا مقبرہ بھی تیار کرایا۔ تاریخ کبیر کشمیر کا مصنف لکھتا ہے۔ امرائے شاہجہانی میں سعید خاں[1] ایک نامور امیر تھا۔ اُس نے آپ کا مقبرہ بنوایا۔ نواب وزیر خاں بھی آپ کا

---

[1] سعید خاں چار ہزاری ذات دو ہزار و پانصد سوار کا منصب رکھتا تھا۔ بادشاہ کے جلوس سوم ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں اس نے پشاور اور سرحد میں افغانوں کی شورش دبائی۔ اس لڑائی میں شادماں خاں والی پکھلی اور خضر خاں گکھڑ بھی اس کے معاون تھے۔ ذیقعدہ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں سعید خاں نے قزلباشوں کے حملہ سے ایک عظیم جنگ کے بعد بصوابدید علی مردان خاں قندھار کو بچایا۔ بادشاہ نے سعید خان اور جنگ کے کارگزاروں کو خلعت، منصب اور انعامات عطا کئے۔

عقیدت مند تھا۔ ممکن ہے نواب سعید خاں اور نواب وزیر خاں یا دونوں میں سے کسی ایک نے تعمیر مقبرہ میں آپ کی خدمت کی ہو۔

آپ کے دو فرزندوں کا کشمیر کی تاریخوں میں ذکر ہے۔ ایک خواجہ معین الدین نقشبندی جو آپ کے ہمراہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں لاہور آئے تھے اور پھر حضرت نے ان کو خانقاہ فیض پناہ سری نگر اور لنگر کی خدمت گزاری اور دین اسلام کی خدمت کے لیے بادشاہ سے واپس کشمیر جانے کی اجازت لے دی تھی خواجہ معین الدین کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب علم و فضل تھے۔ تاریخ کبیر کشمیر میں (ص ۴۲ پر) ان کے متعلق لکھا ہے ـــــ "صبیہ خواجہ عبدالرحیم وہ بیدی از بطن خواہر عالمگیر بادشاہ غازی در عقد نکاح ایشاں بود"

عالمگیر کی بہنوں کا ذکر اسی کتاب میں ایک دو جگہ ہو چکا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کی چار بہنیں سات سال کے اندر اندر ہی انتقال کر گئی تھیں اور اس کی بہن جہاں آرا بیگم عرف بیگم صاحب اور روشن آرا بیگم نے شادیاں ہی نہیں کیں۔ اس کی کسی ساتویں بہن کا ذکر ہندوستان کی کسی تاریخ میں نہیں ہے۔

خواجہ معین الدین احمد نے بعمر ۷ سال محرم ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں تین فرزند چھوڑ کر انتقال کیا۔ ان کی اولاد آج تک کشمیر میں آباد اور موجود ہے۔ ان کی ذریات میں خواجہ نور الدین محمد آفتاب (ولادت ۱۰۸۵ھ وفات ۱۱۵۶ھ) اور خواجہ کمال الدین شہید (شہادت ۱۰ رجب ۱۱۸۸ھ) کشمیر میں بہت مشہور ہو کر گزرے ہیں۔

حضرت ایشاں اور حضرت میاں میر کے درمیان صوفیانہ بحث مباحثہ بذریعہ تحریر بھی ہوتا رہا ہے۔ آپ ہر جمعہ کو اپنی مسجد میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ نواب زکریا خاں گورنر لاہور چونکہ آپ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اس کی زندگی تک آپ کے مزار پر بہت رونق رہی ہر ہفتہ آٹھویں دن مستحقین اور خدام درگاہ کو کھانا اور نقدی تقسیم کیا کرتا تھا۔

حضرت نے باغ بڑے شوق سے تعمیر کرایا تھا۔ اور وہ آپ کے روضہ کے متصل شمال کی جانب کنوئیں کے پاس تھا۔

گلاب سنگھ بھونڈیہ نے جب بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بیگم پورہ اور گنبد نواب خان دوراں میں چھاؤنی قائم کی تو اس باغ کی چار دیواری کو گرا کر اس کو برباد کر دیا۔ روضہ اور مسجد اور باغ کے ساتھ نواب زکریا خاں نے جو اراضی وقف کی ہوئی تھی وہاں چھاؤنی کے گھوڑے اور بیل اور گدھے باندھے گئے۔

آپ کا مزار بہت بلند سنگین پختہ چونہ گچ ہشت پہلو صورت کا ہے۔ ہر پہلو پر قابوتی محراب اور سقف پر عالیشان گنبد ہے جس پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ روضہ کے اندر عین وسط میں آپ کی قبر ہے اس کے مشرق وجنوب میں ایک قبر ہے وہ ان کے فرزند خواجہ بہار الدین کی بتائی جاتی ہے۔

سکھوں کے زمانہ میں چونکہ روضہ کے اندر بارود بھری رہتی تھی اس لیے ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ جب انگریزی دور آیا تو بارود خانہ اس روضہ سے نکلوا کر دریا میں پھینکوایا گیا اور یہ روضہ اور مسجد سرکار نے شامل نزول کر دیں چونکہ اکثر اسلامی مقامات شامل نزول ہو کر نیلام ہو چکے تھے۔ اس خوف سے سید محمود آغا صاحب متولی کی تحریک سے مسلمانان لاہور نے بہ سرکردگی انجمن اسلامیہ پنجاب

ؔ کشمیر کی تاریخوں میں آپ کے صرف دو فرزندوں کا ذکر ہے خواجہ معین الدین احمد نقشبندی اور خواجہ تاج الدین البتہ آپ کی اولاد و احفاد کثیر تعداد میں ہے۔

معرفت خاں بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خاں مرحوم گورنمنٹ سے بعض مسلمانان اس مقبرہ کی واگذاری کا مطالبہ کیا جو گورنمنٹ نے منظور کر لیا چنانچہ
۲۵ مئی سنہ ۱۸۹۵ء کو ٹاؤن ہال لاہور میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں مسٹر ڈونی سابق کمشنر پنجاب نے اعلان کیا کہ خانقاہ حضرت ایشاں
صاحب جن کی مسلمانان لاہور بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں اور جو محکمہ نزول میں اب تک چلی آتی تھی۔ گورنمنٹ نے مہربانی فرما کر بہ الحاق اُس
اراضی نزول بمیت یہ خانقاہ مسلمانان پنجاب کے حوالے کر دی ہے۔
(بعد میں جج چیف کورٹ پنجاب)
خان بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خاں مرحوم اور میاں محمد شاہ دین ہمایوں بیرسٹر ایٹ لا
نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا چنانچہ آج (سنہ ۱۹۴۳ء میں) اڑتالیس سال سے یہ متبرک مکان مسلمانوں
کے قبضہ میں ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور (ص ۲۴۴) پر لکھتے ہیں:۔
مسجد کا حوض، مسجد اور روضہ سب کسمپرسی کی حالت میں تھے

"گلاب سنگھ بہروندیہ نے یہاں چھاؤنی بنا کر اس عالی جاہ مکان کو برباد کر دیا۔ چار دیواری
گرادی، باغ اجاڑ دیا۔ مسجد کے صحن اور متفرق قبروں کی اینٹیں خشت فروشوں[1] نے نکال
لیں۔ مزار کے اندر کی احاطہ میں بارود بھر کر مزار کا تمام سنگ مرمر اتار لیا۔"

خواجہ عبدالاحد کاشمیری جو حضرت خواجہ خاوند محمود کی اولاد سے تھا، سر ہنری لارنس ریذیڈنٹ پنجاب کے زمانہ (۱۸۴۶ء)
میں کشمیر سے لاہور آیا۔ اس نے اپنے عالیشان جد امجد کے روضہ کی جب افسوسناک حالت دیکھی تو سر ہنری لارنس سے اس کی مرمت
کی اجازت لے کر اس پر بہت سا روپیہ خرچ کیا۔ مزار اندر کا دوبارہ تعمیر کرایا۔ باہر کے مزار بھی درست کرائے اور مسجد کی مرمت
بھی کرائی۔
چونکہ اخراجات مرمت کے لیے کوئی صورت مستقل نہ تھی اس لیے رفتہ رفتہ یہ مکان پھر غیر آباد ہو گیا۔ سنہ ۱۸۵۱ء سے سنہ ۱۸۸۴ء
کے درمیان سرکار انگریزی نے رائے کنہیا لال کی معرفت اس کی دوبارہ مرمت کرائی پھر سنہ ۱۹۰۰ء میں حضرت سید محمود آغا متولی[2] (وفات ۱۸۸۰ء)
کے برادر خورد حضرت میرجان شاہ نے سنہ ۱۹۱۰ء میں صحن مسجد روضہ کی دیواروں اور روضہ کے گنبد بلکہ کلس تک کو بھی درست کرایا۔ حوض
کے چاروں طرف پختہ فرش ہے۔ مسجد کے حجرے دو منزلہ ہیں۔ ایک حجرہ شمال کی طرف ہے ایک جنوب کی طرف درمیان میں مسجد کے
پانچ دروازے ہیں جن میں وسط کا دروازہ سب سے بڑا ہے۔

---

[1] خشت فروش سب مسلمان تھے ؎ جور کہ تو میکنی بر اسلام ——— در ملت کافرے ندیدم

[2] حضرت ایشاں کے مزار کا دروازہ مغرب کی طرف ہے اس کے سامنے ہی مسجد اور مسجد کا حوض ہے۔ دروازہ کے اوپر
سنگ مرمر کی تختی پر عبدالرشید سجادہ نشین خانقاہ کی طرف سے الفاظ ذیل درج ہیں۔ تاریخ وفات حضرت ایشاں ۲ ار شعبان المعظم
سنہ ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء۔ مزار حضرت میرجان صاحب مرحوم ؎
کاملاں را نور دیدہ جان جاناں عارفاں ——— نور چشم خواجگاں نام پاکش میرجاں
مزار حضرت سید محمود ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۲ء ان تینوں بزرگوں کے مزار گنبد کے اندر ہیں۔

حاجی میر جان شاہ اور سید محمود آغا کی قبریں حضرت ایشاں کے مزار کے شرقی پہلو میں ہیں۔ جنوب کی طرف روضہ کے اندر ہی اور چھ قبریں ہیں روضہ کا فرش پختہ ہے اور دیواروں پر گل کاری اور بیل بوٹوں کا کام ہے۔

۱۹۲۳ء میں سائیں کامل دین نے جو چالیس سال سے یہاں کے خدمت گزار اور ضعیف العمر بزرگ ہیں۔ راقم کو بتایا کہ اس روضہ کے ساتھ ننانوے کنال زمین وقف ہے جس میں بذیارت مسجد ملحقہ مکانات مزار وغیرہ مزروعہ رقبہ سب شامل ہے۔ قریباً دو تین سال ہوئے گورنمنٹ نے میکلگن ٹیکنیکل کالج (موجودہ نام پنجاب انجینئرنگ کالج) کے لیے اکتیس بگھہ زمین اس وقف سے لے کر معاوضہ میں بیگم پورہ سے صرف ۲۵ کنال اراضی دی ہے۔

یہاں سال میں دو عرس ہوتے ہیں ایک شعبان کی تیسری شب اور دوسرے دن کو جو میر جان شاہ صاحب کے وصال کا یوم ہے دوسرا ۱۲ ذی الحجہ کو جو سید محمود آغا صاحب کا یوم وفات ہے۔ عرس میں ختم خواجگان ہوتا ہے وعظ خوانی اور رات کو پرتکلف کھانے کی وجہ سے بھی اکثر لوگ آجاتے ہیں۔

صحن مسجد کے پاس جنوب کی طرف ایک چوبی مسقف تخت پوش ہے جس پر نقاشی کے کام کے علاوہ آئینہ بندی بھی ہے یہاں حضرت میر جان شاہ اعتکاف کیا کرتے تھے۔

حضرت ایشاں کے روضہ اور بیگم پورہ سے شمال کی طرف ایک بلند ٹیلہ کھڑا ہے۔ یہ پزاوہ (آوا) ہے یہیں آپ کے روضہ اور اس کی متعلقہ عمارات کے لیے اینٹیں پختہ ہوئی تھیں اور یہیں بیگم پورہ کے محلات۔ مکانات اور مسجد کے لیے اینٹیں پختہ ہوتی رہیں۔ اس پزاوہ میں سے کچھ زمین کالج والوں نے نکال لی ہے اور کچھ اب محکمہ جرائم پیشہ اپنی نو آبادی کے لیے نکال رہا ہے۔

دروازہ کلاں کے سامنے دونوں طرف شہزادگان کابل کی قبریں ہیں۔ مزار گنبد سے جنوب کی طرف خانصاحب مولوی فیروزالدین مالک فیروز پرنٹنگ ورکس کا خاندانی قبرستان ہے جس میں چھوٹی بڑی ۲۸ قبریں ہیں انہی میں آپ کے بھائی مولوی فتح دین بسمل اڈیٹر اخبار پنجاب پنچ۔ مولوی فضل دین اڈیٹر اخبار رفاہ عام اور منشی دین محمد اڈیٹر اخبار میونسپل گزٹ کی قبریں بھی ہیں۔ اس احاطہ مزار کے دروازہ پر یہ رباعی درج ہے ؎

اس خواب حیات کی عدم ہے تعبیر | ہر شخص کو مرنا ہے جواں ہو یا پیر
نیچے اوپر زمیں کے ہیں نقش و نگار | یہ صفحۂ خاک ہے دو رویہ تصویر

نواب وزیر خاں

ہر طرف چھائی اداسی گر گئے در و دیوار | باغ کہتے تھے جسے اب اس کو میداں دیکھئے
رہ گئی بارہ دری یا رب سلامت اشکر ہے | اب نہ صبح عیش کو شام غریباں دیکھئے

[اصل نام[1] حکیم علیم الدین انصاری اور لقب نواب وزیر خاں تھا چنیوٹ (ضلع جھنگ) کے رہنے والے تھے چنیوٹ وہی مردم خیز خطہ ہے جس کی خاک سے شاہ جہان بادشاہ کا وزیر اعظم علامی سعداللہ خاں جیسا زبردست فاضل پیدا ہوا۔ یہاں

---

[1] از مرتب

نواب وزیر خاں اور سعد اللہ خاں کی بہت سی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ نواب وزیر خاں کے محلات کے آثار شہر کے جنوب مشرق میں ایک نہایت مضبوط اور پختہ فصیل کے اندر واقع ہیں۔ مقامی لوگ اس کو "ریتی" کہتے ہیں۔ آج کل ان بوسیدہ حجروں میں دھوبی اور لوہار آباد ہیں۔

حکیم علیم الدین انصاری شیخ عبداللطیف کے بیٹے اور شیخ حسام الدین کے پوتے تھے۔ ان کے حالات لکھنے میں ہمارے مورخوں نے بڑی بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔ تاریخ ولادت کے متعلق بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور فلسفہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ طبابت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے اس وقت کے مشہور حکیم داؤدی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور تکمیل کے بعد بیس برس کی عمر میں قسمت آزمائی کے ارادے سے لاہور کا رخ کیا۔ اس لحاظ سے قیاساً آپ کی پیدائش کا سال ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء ہو سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان پر جہانگیر حکمران تھا۔

کچھ عرصہ لاہور ٹھہرنے کے بعد حکیم علیم الدین دہلی روانہ ہو گئے۔ مگر جب وہاں بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا تو اکبر آباد چلے گئے جہاں تھوڑے ہی عرصہ میں کام چل نکلا اور آپ کی شہرت نے شہزادہ خورم (شاہجہان) کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس نے اپنے ملازموں کی سلک میں منسلک کر لیا۔[1]

تھوڑے ہی دنوں میں آپ شہنشاہ، شہزادگان اور بیگمات حرم کے مزاج شناس ہو گئے۔ خلوص نیت اور رسوخ ارادت نے دیوان بیوتات کے رتبے تک پہنچایا اور امانت و دیانت نے اس سے بھی بڑھا کر اوّل میر سامان اور بعد میں دیوان کے بلند پایہ عہدے پر فائز کر دیا۔

شہزادہ خورم آپ کی دل و جان سے عزت کرتا اور ہیرج مرج کے دنوں میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مآثر الامرا کا بیان ہے کہ "حکیم صاحب نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی بلکہ اس عرصہ میں جو کچھ کمایا اس میں سے بھی دس بارہ لاکھ روپیہ شاہی ضرورت کی دواؤں پر صرف کر دیا۔[2]

حقیقت میں جس واقعہ نے حکیم علیم الدین کو نوابی کے بلند مرتبے پر پہنچایا وہ ملکہ نور جہاں کا حیرت انگیز علاج تھا چنانچہ جب ملکہ نے لاہور آ کر غسل صحت کیا تو حکیم صاحب کو ایک لاکھ روپے کا خلعت عطا کیا اور سات لاکھ روپے نقد پیش کیے۔ ملکہ نے اپنا زیور اتار کر حکیم کی نذر کیا۔ اس پر حرم کی تمام کنیزوں نے اپنا زیور اتار کر ملکہ پر تصدق کیا۔ ملکہ نے وہ زیور بھی حکیم کو بخش دیا۔ اس طرح حکیم صاحب نے ایک دن ہی بائیس لاکھ روپے حاصل کیے۔

۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں جب شہزادہ خورم شاہجہان کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکیم علیم الدین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خلعت فاخرہ اور خنجر مرصع مرحمت فرمایا۔ ایک گھوڑا با زین مطلا، ایک اونٹ، ایک علم، ایک نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دیا اور پانچ ہزار ذات اور سہ ہزار سوار کے جلیل القدر منصب پر سرفراز کیا۔[3]

---

[1] مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۳۳ — بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۲۴۶

[2] مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۳۴۔

[3] ایضاً بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۱۱۷۔

پنجم سال جلوس میں جب فتح خاں دولت آبادی نے خراج دینا بند کر دیا تو شاہجہان نے حکیم علیم الدین کے سواروں میں اضافہ کر کے ان کا منصب پنج ہزاری ذات اور پنج ہزار سوار کر دیا۔ اور انھیں قلعہ دولت آباد کی تسخیر اور فتح خاں کی سرکوبی پر مامور کر کے ہزار سواروں کے ساتھ برہانپور سے رخصت کیا۔ فتح خاں اس بات کی خبر سن کر ڈر گیا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر درگاہ معلی میں روانہ کر دیا۔ حکیم موصوف بھی راستے سے لوٹ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ ان کی اس کارگزاری پر اتنا خوش ہوا کہ انھیں نواب وزیر خاں کا لقب دے کر صوبہ پنجاب کا ناظم مقرر کر دیا۔ چنانچہ حکیم صاحب متواتر سات سال یہ خدمت بڑے اچھے طریقے سے انجام دیتے رہے[1]

سنہ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۴ء میں بادشاہ نے کشمیر جاتے ہوئے قلعہ لاہور کی عمارات میں شاہ برج، دولت خانۂ خاص اور آرام گاہ دولتخانہ کو جو جہانگیر کے زمانے میں بنی تھیں ناپسند کر کے وزیر خاں کو ان کی تجدید کا حکم دیا اور انھوں نے اپنی نگرانی میں انھیں دوبارہ بنوالیا۔

سنہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں وزیر خاں نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے ایک عالیشان حویلی تعمیر کرائی۔ یہ حویلی شاہ عالمی دروازے کے اندر تھی۔ اسے پری محل کہتے تھے جسے ۲۶ جمادی الثانی کو شاہجہان نے اپنے ورود سے مشرف کیا۔ وزیر خاں نے پا اندازی کی رسم ادا کرنے کے بعد بے شمار روپیہ بادشاہ پر سے نچھاور کیا۔ اس کے بعد عراق کا گھوڑا، عراق کی مخمل، گجرات کی ساٹن اور سونے کا تخت، دان میں کی قیمت پچاس ہزار روپیہ تھی بادشاہ کی خدمت میں ہدیۃً پیش کئے۔ بادشاہ نے اس میں فقط دو لاکھ کی اشیاء قبول کیں[2]

یکم شعبان سنہ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کو جب شاہ جہاں دارالسلطنت لاہور سے گزر رہا تھا تو وزیر خاں نے نہایت قیمتی تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ نے اسی وقت ایک خلعت خاصہ، ایک گھوڑا طلائی ساز و سامان کے ساتھ اور ایک ہاتھی انھیں عنایت کر کے صفدر خاں کی جگہ دارالخلافہ اکبر آباد کا صوبہ دار نامزد کر دیا[3]

نواب وزیر خاں اکبر آباد میں دس ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکے۔ وہ ۱۲ جمادی الاول سنہ ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء کو اکبر آباد میں بعارضہ قولنج فوت ہو گئے۔ بادشاہ کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو اس نے درگاہ ایزدی میں ان کی مغفرت کی دعا کی اور ان کے فرزندوں (سعید خاں اور صلاح الدین خاں میر توزک) کو طلب کر کے شاہانہ الطاف سے نوازا[4]

نواب وزیر خاں نہایت سلیم الطبع، بے حد متقی اور پرہیزگار تھے۔ انھوں نے تمام عمر نہایت سادگی اور بے تکلفی میں بسر کی اور نماز عصر کبھی بغیر سنت کے ادا نہ کی۔ ان کا ذاتی خرچ بہت کم تھا۔ اس لیے انھوں نے بہت سامال و اسباب جمع کیا۔ لیکن وہ بخشش اور جود کی نعمت سے محروم تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں پر ان کا حال بدل جاتا اور رحم غصہ سے منقلب ہو جاتا تھا۔ وہ فرط ارادت سے شاہی کاموں کی انجام دہی میں خاص خوشی محسوس کرتے تھے[5]

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۲۷۴ - مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۲۵

[2] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۶۶

[3] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۱۵

[4] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۴۱

[5] مآثر الامرا جلد سوم ص ۹۳۶

نواب وزیرخاں کو رفاہ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ لاہور میں مسجد وزیرخاں کے علاوہ حمام، بازار، محلات، مساجد، باغ، بارہ دری اور دکانیں سب انہی کا جذبہ کا نتیجہ ہیں۔ گو ان میں سے بہت سی چیزیں امتداد زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی ہیں مگر اب بھی بہت سی عمارتیں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے باقی ہیں۔ انھوں نے وزیر آباد بسایا اور اس میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑیں جن میں سے بعض اب بھی موجود ہیں۔ — مرتب]

نواب وزیرخاں نے لاہور میں اس مقام پر جہاں آج پنجاب پبلک لائبریری ہے اپنا وسیع باغ تعمیر کرایا جو نخلیہ وزیرخاں یا نخلستان وزیرخاں کے نام سے مشہور تھا۔ اب بھی کھجور کا کوئی نہ کوئی درخت وہاں نظر آجاتا ہے۔ باغ کے درمیان ایک عالیشان دو طبقہ بارہ دری تعمیر کرائی جس کے چاروں طرف ایک بلند چبوترہ خشتی واقع ہے۔

جب احمد شاہ نے زمان شاہ بادشاہ کابل کے فرمان کے بموجب ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی اور اندرون شہر کے رؤسا نے بھی جو سہ حاکمان لاہور کے ظلم و ستم اور ان کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آچکے تھے اس کا ساتھ دیا تو وہ سب سے پہلے نواب وزیرخاں کے اس باغ ہی میں فروکش ہوا۔ باغ میں اس کی فوجوں نے ڈیرے ڈال کر اس کو تباہ کرنا شروع کیا اور بارہ دری میں رنجیت سنگھ نے بذات خاص قیام کیا۔ یہیں سے وہ ۷ ہاڑ سمت ۱۸۵۶ بکرمی کو معہ فوج سوار ہو کر لوہاری دروازہ کے رستے شہر میں داخل ہو گیا۔

۱۷۹۹ء سے ۱۸۴۹ء تک جب تک کہ سکھوں کا راج رہا۔ بارہ دری اور باغ دونوں سکھوں کی چھاؤنی کہلاتے رہے۔ جب سرکار انگریزی کا عمل دخل ہوا۔ تو سکھوں کی تقلید میں گورے سپاہیوں کے لیے یہ چھاؤنی بنائی گئی۔ باغ تو ویران ہو گیا اور بارہ دری میں چونکہ حکام قیام رکھتے تھے اس لیے سلامت رہ گئی۔ جب چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہو گئی تو یہاں محکمہ بندوبست والوں نے اپنا اڈہ قائم کیا۔ ان کے بعد محکمہ تار نے اس پر قبضہ کیا۔ ان سے خلاصی ہوئی تو عجائب خانہ کے سامان کے لیے اس کو مال گودام بنایا گیا۔ غرض وہ بارہ دری جہاں نواب وزیرخاں گورنر پنجاب اپنی کچہری کیا کرتے تھے برسوں تک مختلف لوگوں اور محکموں کا فٹ بال بنی رہی۔

اب اس بارہ دری میں ابتدائے ۱۸۶۴ء سے پنجاب پبلک لائبریری یعنی کتاب گھر ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اعلیٰ پیمانہ پر اس کی مرمت بھی کرائی ہے چونکہ یہ لائبریری مقبول عام ہے اور بڑے وسیع پیمانہ پر قائم ہے اور طالبان علوم کثرت سے آتے ہیں اس لیے اب اس کے دو حصے کر دیے گئے ہیں انگریزی زبان کا لٹریچر بارہ دری کی دونوں منزلوں کے علاوہ نئی دو منزلہ عمارت میں ہے اور مشرقی لٹریچر کی کتابوں کے لیے علیحدہ مکان اسی احاطہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جو یک منزلہ ہے۔

دارالشکوہ کی تصنیف (سکینۃ الاولیاء) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وزیرخاں کے باغ سے پہلے بھی یہاں ایک باغ تھا چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت میاں میر اپنے یاروں سمیت کبھی کبھی ان کا کچھ حصہ مرتضیٰ خاں کے باغ میں بھی گذارا کرتے تھے۔ جسے اب وزیرخاں کا باغ کہتے ہیں۔ اسی باغ کے متصل شیخ عبدالرحمٰن درویش کی قبر ہے اور اس قبر کے غربی جانب ہوشیار خاں کا باغ ہے

۱؎ مفتی محمد اکرم۔ لالہ حاکم رائے۔ محمد طاہر۔ مفتی محمد باقر۔ مہر محکم دین وغیرہ۔

حضرت میاں میر کی وفات ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں ہوئی ہے۔ اور دارا شکوہ نے اپنی کتاب ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں شروع کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر کی وفات کے بعد نواب وزیر خاں نے مرتضیٰ خاں کے باغ کی بنیادوں پر اپنا باغ مع بارہ دری تعمیر کرایا ہے۔ پرانی انارکلی کے تھانہ کے آگے سے سول سیکریٹریٹ کے دفاتر کی طرف جائیں تو بارہ دری نواب وزیر خاں یعنی لائبریری کے متصل ہی دائیں ہاتھ بلند چبوترہ پر ایک بہت پرانی قبر موجود ہے۔ شاید یہی شیخ عبدالرحمن درویش کی قبر ہو۔ اب مرتضیٰ خاں اور ہوشیار خاں کے باغات کا کیا پتہ چلے گا۔ انقلاب زمانہ کی صرصر نے سب کی جڑیں اکھیڑ دیں۔

لاہور کے لوگوں کو معلوم ہے کہ جب ڈھولی گلے میں ڈھول ڈال کر ضلع ڈیرہ غازی خاں کی طرف سخی سرور کی خانقاہ پر جاتے ہیں تو اُن کے جھنڈوں کے جھنڈ لاہور کی سڑکوں، بازاروں اور کوچوں میں نظر آتے ہیں ان کو اصطلاح عام میں "سنگ" کہتے ہیں یہ لوگ ڈھول بجاتے ہوئے کچھ بے معنی اور بے تال سے گیت گاتے ہیں۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لیتے ہیں اور "جھنیاں" ڈلاتے (لوری دیتے) اور اپنی داڑھیوں سمیٹ ناچتے اور کودتے ہیں۔ بچوں کے والدین پیسہ دو پیسہ یا غلہ دیتے ہیں لاہور میں سے جب یہ لوگ گذرتے ہیں تو یہاں ان کا میلہ لگ جاتا ہے سکھوں کے زمانہ سے پیشتر یہ میلہ باغ نواب وزیر خاں میں لگتا تھا۔ جب سکھوں نے یہاں چھاؤنی بنالی۔ تو میلہ کو ذرا پرے جگہ مل گئی۔ انگریزی چھاؤنی کے ایام میں بھی یہی حال رہا۔ مصنف تحقیقات چشتی لکھتے ہیں "مخلوقات ارذل اور عورات فاحشہ اس میلہ پر بکثرت جاتی تھیں۔ لوہاری دروازہ سے لے کر باغ وزیر خاں تک شیطان کا بازار بڑا گرم رہتا تھا۔"

سمت ۱۸۸۰ بکرمی سے جس کو آج سمت ۲۰۲۰ بکرمی میں سوا سو سال ہونے کو ہے میلہ کا رُخ بدل گیا ہے۔ اب میلہ صرف تین دروازوں (لوہاری، موچی اور دہلی) پر ہوتا ہے مگر رونق بڑی رہتی ہے اور جھلا اس میں کثرت سے شامل ہوتے ہیں اس میلہ پر جو ہر منگل کے دن تین دروازوں پر ہوتا ہے۔ مٹی کے برتن کثرت سے فروخت ہوتے ہیں۔ اس کو قدموں کا میلہ کہتے ہیں۔

بدرالدین شاہ عالم بخاری

دل ہے اور اس میں فقط دو چار مردہ حسرتیں
گلشن شاداب کو اب خانہ ویراں دیکھئے

اس بزرگ کا مزار لاہور میں پرانی تحصیل کے پاس مزار سبز گنبد کے نام سے مشہور ہے۔ آپ سادات بخاری سے تھے شاہجہان کے زمانہ میں وفات پائی۔ نواب سعداللہ خاں ان کے ارادتمندوں میں تھے۔ انھوں نے سبز گنبد کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ عمارت اس گنبد کی نہایت مستحکم چینی کار ہے۔ پھر مقبرہ کے طویل احاطہ اور میدان کے چاروں طرف ایک عالیشان باغ نصب کرایا۔ پرانی تحصیل کے اندر جو بہت بڑا کنواں ہے وہ اسی باغ کے متعلق تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جب راجہ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے قلعہ کے نزدیک اپنی حویلی بنانے کا ارادہ کیا، تو اس باغ اور مقبرہ کے سوا اس کو کوئی اور جگہ نہ ملی۔ مقبرہ پر تو نظر عنایت ہی رہی البتہ احاطہ مزار کے دوسرے مکانات اور باغ کو منہدم کرا کر ایک عالیشان حویلی تعمیر کر دی گئی یہ باغ اور مقبرہ تو پھر بھی دو سو سال تک سلامت رہے بلکہ مقبرہ تو اب بھی سلامت ہے۔ لیکن وہ حویلی پچیس سال تک بھی سلامت

حویلی تھی ۱۸۴۹ء میں سرکار انگریزی نے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور یہ حویلی بھی سرکاری قبضہ میں آگئی۔ سب سے پہلے لاہور کی تحصیل یہیں قرار پائی۔ اور دس سال تک تحصیلدار کی یہاں کچہری ہوتی رہی جب سے تحصیل بن گئی تو یہاں پولیس مقرر ہوئی جو اب تک چلی آتی ہے۔ اسی جگہ کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ بھی کچہری کرتے رہے۔ باغ کے کچھ ٹوٹے پھوٹے آثار پولیس چوکی کے سامنے سر بازار موجود ہیں۔ چونکہ مزار کا احاطہ بہت وسیع تھا اس لیے اب اس میں چند محلے آباد ہو گئے ہیں۔ مقبرہ کے ارد گرد دکانیں اور مکانات بن گئے ہیں۔ ایک تنگ سی گلی سے مقبرہ کو رستہ جاتا ہے۔ آج سے پچیس تیس سال پیشتر وہاں قوالی کی چند مجلسیں راقم نے بھی دیکھی ہیں۔

حضرت سیّد محمود

گل کو خنداں دیکھئے بلبل کو گریاں دیکھئے
باغ عالم میں طلسم رنگ امکاں دیکھئے

سید محمود کون بزرگ تھے۔ اصل وطن کہاں تھا۔ لاہور میں ان کے کیا مشاغل تھے۔ لاہور کی کوئی تاریخ ان سب باتوں کا جواب دینے میں خاموش ہے۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ بعہد شاہجہان ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں فوت ہوئے۔ اس مقبرہ کے غربی جانب ایک باغ بھی تھا کہ بہت کم باغات لاہور میں اس کی ٹکر کے تھے۔ زوال حکومت مغلیہ تک موجود تھا۔ وہ باغ انھوں نے خود احداث کرایا تھا یا ان کی وفات کے بعد ان کے مزار کے ساتھ تعمیر کیا گیا اس کے متعلق بھی سب تاریخیں خاموش ہیں۔ سہ حاکمان لاہور کے زمانہ میں جو در حقیقت نامی ڈاکوؤں کی حکومت کا عہد تھا جہاں اور اسلامی عمارات و باغات پر تباہی آئی۔ وہاں یہ باغ بھی نیست و نابود ہو گیا۔

شیخ طاہر بندگی

شیخ طاہر بندگی کے مرقد پُر نور کو
خطۂ میانی میں شمع بزم عرفاں دیکھئے

شیخ محمد طاہر نام تھا۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں بعہد اکبر بادشاہ پیدا ہوئے ابتدا میں شاہ اسکندر بن شاہ کمال کیتھلی کے مرید ہوئے پھر حضرت شیخ احمد کابلی سرہندی المشہور مجدد الف ثانی کے صاحبزادگان شیخ محمد معصوم و شیخ احمد سعید کے اتالیق مقرر ہوئے۔ حضرت مجدد کے ہم صحبت تھے اور بعد میں ان کے مرید بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن حضرت مجدد نے یاران محفل سے فرمایا کہ حاضرین مجلس میں سے جو سب کے سب مسلمان ہیں ایک شخص کی پیشانی پر "ہو الکافر" لکھا ہوا ہے۔ آپ کے سب اخلاص مند مرید اپنی اپنی جگہ خوفزدہ ہو گئے اور سب نے عرض کیا کہ یا حضرت وہ کون بدنصیب ہے جو اسلام کی نعمت ترک کرکے کفر کا زنار گلے میں پہنے گا ہم سب پریشان متفکر ہیں۔ آپ نے شیخ محمد طاہر کا نام لیا۔ اس پر سب دم بخود ہو گئے۔ کیونکہ شیخ طاہر نہایت عالم فاضل اور صاحبزادگان حضرت مجدد کے استاد تھے اور کسی کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہو کے رہے گا۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سرہند کی ایک ہندو عورت پر جو ہر روز مندر میں "متھا ٹیکنے" کے لیے جایا کرتی تھی آپ فریفتہ ہو گئے۔ اور جب بات چیت کا کوئی موقعہ ہاتھ نہ آیا تو بھیس بدل کر اور زنار گلے میں ڈال کر اور پیشانی پر قشقہ لگا کر مندر کے پوجاری بن بیٹھے۔

حضرت مجدد کی اس پیشین گوئی کا بڑا چرچا ہوا۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہ حیران و پریشان تھے کہ ایسا شخص جس کے سینہ میں علم کا دریا نہیں سمندر بہ رہا ہے کس طرح راہ راست سے بھٹک گیا ہے۔ خود حضرت مجدد کو بھی کم فکر نہ تھا۔ آخر انھوں نے شیخ طاہر کے راہ ہدایت پر آنے اور طریق دین متین اختیار کرنے کی دعا مانگی جو درگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور پھر حضرت مجدد کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے۔

حضرت مجدد نے آپ کو لاہور رہنے کا حکم دیا۔ آپ نے لاہور آ کر محلہ شیخ اسحاق میں جو فصیل لاہور کے اندر تھا، رہائش اختیار کی۔ اسی محلہ کے کھنڈروں پر جمعدار خوشحال سنگھ نے قلعہ نما حویلی تیار کی جو آج راجہ تیجو پورہ کے نام سے موسوم ہے۔ موتی بازار اور جوڑہ مندری بھی اسی محلہ میں شامل ہے۔

آپ یوں تو پہلے ہی فاضل اجل اور عالم متبحر تھے لیکن حضرت مجدد کی توجہ خاص سے آپ کو تھوڑے ہی عرصہ میں مراتب عظمیٰ تک پہنچا دیا۔ لاہور میں آپ کے علم و فضل اور آپ کے زہد و اتقا کی شہرت گلی گلی پہنچ گئی۔ آپ بھی رات دن طالبان حق کی تلقین میں مصروف رہتے تھے۔

اس زمانہ میں خطہ میانی[1] کے رئیس حافظ جان محمد تھے۔ حافظ صاحب بہ منت آپ کو میانی صاحب میں لے آئے۔ یہاں بھی وہی رونق اور وہی علمی و دینی شغل جاری رہا۔ آپ کسی معاوضہ کے بغیر وعظ و تدریس کا کام کرتے تھے۔ اور کسی سے ایک حبہ تک نہ لیتے تھے۔ اور بقول صاحب خزینۃ الاصفیا

"وجہ معیشت آں داشت کہ کتب فقہ و حدیث بخط خود نوشتہ و محشی ساختہ و تصحیح نمودہ۔ می فروخت و ازاں وجہ حلال قوت خود می کرد" (ص ۶۱۹)

روحانیت کے مدارج اعلیٰ پر پہنچ کر بھی حضرت مجدد سے جو آپ کی عقیدت تھی اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا چنانچہ صاحب تذکرہ آدمیہ (شیخ آدم بنوری) آپ کا ایک خط نقل کرتے ہیں جو آپ نے لاہور آ کر ان کی خدمت میں لکھا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب میں سرہند سے لاہور آیا تو اپنے آپ سے کہتا تھا:۔

"اے نادان مقصود را در سرہند گذاشتہ کجا می روی۔ اما از غیب ندا شد کہ راہی شو و توقف مکن آخر کشاں کشاں در لاہور آورد و ندو بگوشہ مسجدے حیران و پریشان نشستم۔"

شیخ آدم مجددی نقشبندی بنوری حالانکہ خود صاحب مدارج تھے لیکن وہ بنور سے پیدل چل کر لاہور آپ کی خدمت میں آئے اور نسبت قادریہ میں فیض کامل آپ سے حاصل کر کے واپس گئے۔

---

[1] تحقیقات چشتی میں (ص ۱۶۷ پر) لکھا ہے کہ بزمانہ اکبر بادشاہ یہاں ایک گاؤں آباد تھا جس میں عام طور پر علما یعنی عالم لوگ ہی رہتے تھے اور چونکہ پنجابی زبان میں علما کو ملوانا یا میاں کہتے ہیں اس لیے اس محلہ یا گاؤں کا نام میانی صاحب مشہور ہو گیا۔

حافظ جان محمد کے بعد ان کے فرزند ابو محمد قادری رئیس میانی قرار پائے لیکن ایک شرعی مسئلہ نے علماء میں ایسا تفرقہ عظیم پیدا کیا
مت سے لوگ فتنہ و فساد کے خوف سے یہاں سے چلے گئے۔ اور میانی میں وہ رونق نہ رہی۔ اس اثنار میں کمنڈ سے میر علی نام ایک
ن یہاں آئے۔ انھوں نے ابو محمد قادری کے ساتھ جو شیخ طاہر بندگی کے مریدوں میں تھے۔ میانی کے حصے بخرے کر لیے۔ اور میانی کو
از سر نو آباد کیا۔ میر علی نے کمنڈ سے اپنے پانچ بزرگوں کی قبریں کھدوا کر اور ان کی نعشوں کے صندوق نکلوا کر یہاں منگوا لیے۔ اور ان کو
ر سر نو نئی قبروں میں دفن کرایا۔ اس زمانہ سے میانی کا نام پنج ڈھیر قرار پایا لیکن یہ نام زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔
اسی میانی میں آپ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں بعمر ۹۵ سال ۸ محرم کو جمعرات کے دن وفات پا گئے۔ آپ کا مزار میانی صاحب کے طویل و
عریض شہر خاموشاں (قبرستان) کے لیے باعث برکات ہے۔ اور آپ کے احاطہ مزار بلکہ آپ کے قرب و جوار میں دفن ہونا باعث
برکت و نجات سمجھا جاتا ہے ؎

ہمیں یاں کی جنھوں نے روشنی گور غریباں ہیں
وگرنہ مت کے ویرانہ کو کون آباد کرتا ہے

آپ کا مزار سب سے پہلے شیخ ابو محمد یہاں کے رئیس اور آپ کے مرید (وفات ۱۰۵۰ھ) نے تعمیر کرایا۔ آج سے قریباً
۱۱۴ سال پیشتر شاہزادہ غلام محمد ایوب شاہی نے چبوترہ بنوایا اور سمت ۱۸۹۹ بکرمی میں فقیر فضل دین ملازم راجہ دھیان سنگھ نے چار دیواری
بنوا دی۔ آپ کی چار دیواری کے اندر اور باہر بہت سی قبریں ہیں وہ خطہ میانی جو علماء و صلحا کا مسکن تھا۔ رفتہ رفتہ قبرستان بن گیا۔ اب
وہاں صاحب حیات تو کوئی عالم نہیں ہے۔ البتہ یہ خطہ صدہا بلکہ ہزارہا علماء و صلحا کا مدفن ہے۔
آپ کے احاطہ مزار کے پاس مشہور قبروں میں میاں پیارا شاعر کی قبر بھی ہے جو لاہور میں پنجابی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے
قریب ایک اور چار دیواری میں موراں طوائف معشوقہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قبر ہے۔ یہ وہی موراں ہے جس کے نام کا لاہور میں سکہ چلتا
رہا ہے۔
آپ کی دو بیویاں تھیں لیکن اولاد کسی سے نہیں ہوئی۔ دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ البتہ آپ کی معنوی اولاد میں ہزارہا لوگ
ہیں جن میں پانچ بڑے نامور خلیفہ گذرے ہیں جن کے ارادتمندوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے ان بزرگوں میں سب سے پہلے ابو محمد قادری لاہوری
کا نام آتا ہے جن کا مزار آپ کی چار دیواری کے گوشہ جنوبی میں ایک پختہ چبوترہ پر ہے۔ دوسرے سید موسیٰ (مزار دہلی) تیسرے حضرت آدم
بنوری جو حضرت مجدد کے علاوہ آپ سے بھی فیض یافتہ ہیں (مزار مدینہ) چوتھے شیخ لکھن مست یا کھلن مست جن کی قبر موری دروازہ
باہر میونسپل باغ کے اندر ہے۔ یہ قبر نواب غلام محبوب سبحانی رئیس لاہور نے تیار کرائی تھی۔ پانچویں شیخ ابوالقاسم (مدفن جدہ)

نواب علی مردان خاں

باغ کے غم میں ہے ڈیوڑھی باغ کی نوحہ کناں
اور اب کیا رنگ لائے چرخ گرداں دیکھیے
فاعتبروا یا اولی الابصار کو پڑھتے ہوئے
قبر نواب علی مردان خاں ہاں دیکھیے

ایران کا ایک امیر زادہ گنج علی خاں ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں شاہ ایران کی طرف سے قندھار کا ناظم تھا۔ بادشاہ اس کا بڑا ادب

اور اس کو بابا کہا کرتا تھا اس کے انتقال پر اس نے اس کے بیٹے علی مردان خاں کو ناظم قندھار مقرر کرکے "بابائے ثانی" کا خطاب دیا۔ لیکن ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ضرور ہوتا ہے۔ گو بادشاہ مہربان تھا لیکن امرائے دربار میں علی مردان خان کے نامہربانوں کی کمی نہ تھی چنانچہ رفتہ رفتہ امرائے حاسد نے بادشاہ کو اس سے بدظن کردیا اور کہا کہ وہ تو خودسری اور سرکشی پر آمادہ ہے۔ بادشاہ نے امتحان کے لیے اُس کو لکھا کہ اپنا بیٹا ہمارے پاس بھیج دو۔ علی مردان کی نیت صاف تھی اس نے اپنے سترہ سالہ فرزند محمد علی خاں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا لیکن بادشاہ کی بدگمانی علی مردان خاں کے دشمنوں نے پھر بھی کم نہ ہونے دی بلکہ ایسا برافروختہ کیا کہ شاہ طہماسپ صفوی نے اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔

یہ دیکھ کر علی مردان خاں نے سعید خاں سے سازباز کی جو شاہجہان کی طرف سے کابل کا گورنر تھا۔ سعید خاں نے شاہجہان کو لکھا وہ اپنے باپ کے زمانہ میں قندھار کے ہاتھ سے چلے جانے اور واپس لینے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اُس نے علی مردان کو خلعت ارسال کیا اور دو لاکھ روپے اُس کے لیے اور ایک لاکھ روپیہ اُس کے عزیزوں اور خادموں کے لیے ارسال کیا چنانچہ علی مردان خاں نے ۲۴ شوال ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۸ء کو قندھار میں شاہجہان کے نام کے سکے مسکوک کرائے اُس کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ اور قندھار شاہجہانی امراء کے حوالہ کرکے آپ ۸ رجب ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء کو لاہور پہنچ گیا جہاں بادشاہ اس وقت مقیم تھا۔

[مذکرہ بالا انعامات کے علاوہ قندہار سے چل کر لاہور آنے کا تمام خرچ شاہی خزانے سے ادا ہوا۔ اس خرچ کا اندازہ ایک لاکھ روپیہ بتایا جاتا ہے اور بیس ہزار روپے کا انعام اس کے نوکروں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں حسین بیگ اور علی بیگ کو جو علی مردان خاں کے قریبی رشتہ دار تھے، نقد انعام کے علاوہ خلعت فاخرہ و خنجر مرصع اور جلیل القدر عہدے بھی تفویض ہوئے[1]

اسی سال بروز یک شنبہ بتاریخ دوم رجب شاہجہان کا دربار لاہور میں منعقد ہوا۔ علی مردان خاں نے اس تقریب پر اہل ایران کے طور و طریق کے مطابق جشن چراغاں کا اہتمام کیا۔ اس نے صحن خاص و عام اور تمام در و بام پر مختلف شکلوں میں طاق بندی کرکے سارے علاقے کو بقعۂ نور بنا دیا۔ بادشاہ نے جھروکۂ درشن میں بیٹھ کر خود اس کا تماشا کیا اور مبلغ دس ہزار روپیہ غربا و مساکین میں تقسیم کیا۔ اسی شب ملا عبدالحکیم اور ملا فاضل کو چار سو اشرفی انعام ملی تھی[2] —— مرتب]

بادشاہ نے علی مردان خاں کو شش ہزاری شش ہزار سوار کا منصب دے کر ۲۲ رجب کو ناظم کشمیر نامزد کرکے اس کے ایک رشتہ دار علی بیگ کو اُس کی نیابت پر کشمیر روانہ کیا بادشاہ نے اس موقعہ پر علی مردان خاں کو پاندان سنہری عطا کرکے کہا۔ اس ملک کا سب سے بڑا تحفہ پان ہے اس کی عادت ڈالو۔ ۱۱ شعبان کو اسے پانچ لاکھ روپیہ اور بنگالہ کی ململ اور دوسرے ملکوں کے کپڑے دس بقچوں میں عنایت کیے۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں اُس کو امیر الامرا بنا کر اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب دے کر پنجاب کی صوبیداری عنایت کی۔ پھر ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں نئے شاہ ایران کو تہنیت و تعزیت کا خط لکھ کر اور دو لاکھ روپے کے تحائف دے کر اس کے بیٹے محمد علی خاں کو بھی ہندوستان میں منگوا لیا۔

---

[1] عمل صالح قلمی نسخہ ورق ۴۷ - ۴۴۶

[2] عمل صالح قلمی نسخہ ورق ۴۵۳

ماثر الامرا، جلد دوم میں لکھا ہے :۔

"علی مردان خان در صوبہ داری لاہور فقرائے تارک صلوٰۃ و صوم را کہ خود را بے قید نامند و مرتکب اقسام فسق و فجور مے شوند مقید نمودہ بہ کابل فرستاد"

اس کی حکومت کے ایام میں کوئی مشٹنڈا فقیر اور ملنگ درویش بے نماز نظر نہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے بادشاہ کی دعوت کی جس میں ایک سو خوان معہ طلائی سر پوش اور تین سو نقرئی تھے۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ایک ابراہیم خان جس کے نام پر سودھرہ کا نام ابراہیم آباد رکھا گیا۔ دوسرے عبداللہ بیگ جس کو بعد عالمگیر گنج علی خان کا خطاب ملا۔ تیسرے اور چوتھے اسحٰق بیگ و اسمٰعیل بیگ جو دارا شکوہ کی ایک جنگ میں مارے گئے۔ ابراہیم خان زمانہ عالمگیر کشمیر اور لاہور کا گورنر بھی رہا ہے۔ ابراہیم خان کے دو بیٹے تھے ایک زبردست خان جو اودھ اور اجمیر میں گورنر رہا۔ دوسرا یعقوب خان جو عالمگیر کے عہد میں آصف الدولہ صوبہ لاہور کا نائب تھا اور جس کو باپ کی وفات کے بعد ابراہیم خان کا خطاب ملا۔

۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۷ء میں جب شاہزادہ اورنگ زیب کو بلخ و بدخشاں کی مہم سپرد ہوئی۔ تو علی مردان کو بھی اس کے ساتھ ہی بھیجا گیا۔ ان لڑائیوں میں علی مردان خان نے ازبکوں کے ساتھ اس جلادت و شجاعت سے جنگ کی کہ شاہزادہ نے اس کو مرحبا اور آفریں کہہ کر گلے سے لگا لیا۔

شاہجہان کے جلوس کی ۳۱ ویں ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء میں امیر الامرا نواب علی مردان خان بمرض اسہال بیمار رہا۔ چونکہ کشمیر کی آب و ہوا اس کی طبیعت کے موافق تھی اس لیے بادشاہ سے رخصت لے کر وہ کشمیر چلا گیا۔ لیکن رستہ ہی میں ۱۲ رجب ۱۰۶۷ھ مطابق اپریل ۱۶۵۷ء کو انتقال کر گیا اور اس کی نعش لاہور میں اس کی ماں کی قبر کے پہلو میں جو امیر الامراء کے باغ میں واقع تھی دفن کی گئی۔ ایک شاعر نے اس کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے ؎

امیر صاحب دولت مشیر صاحب حشمت	ثنا گوئے علی و مرد حق آگاہ مرداں خاں
سفر چوں کرد زیں دنیائے دوں سوئے بقا آخر	ندا آمد بتاریخش کہ حق آگاہ مرداں خاں

۱۰۶۷ھ

بادشاہ کو اس کے مرنے سے کمال ملال ہوا اُس نے اس کی اولاد اور اُس کے نوکروں اور خویشوں کو ان کی لیاقت کے مطابق عہدے دیئے۔ اس کا کل اثاثہ ایک کروڑ روپیہ نکلا جس میں سے بادشاہ نے تیس لاکھ اُس کے بیٹے ابراہیم علی خان کو بیس لاکھ، اُس کے دوسرے تین بیٹوں میں تقسیم کر کے باقی پچاس لاکھ روپیہ ضبط سرکار کر لیا۔

نواب علی مردان خان ایک زبردست انجینئر تھا۔ اسے باغات و عمارات کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کابل، کشمیر میں انہار جاری کرائیں باغات بنوائے۔ دہلی کی نہر جو شہر اور قلعہ کے درمیان پھرتی ہے اسی کی یادگار ہے۔ نہر فیروزپور جو دہلی سے حصار کو جاتی ہے۔ اس کی درستی اسی کے ہاتھوں ہوئی۔ مادھو پور کے قریب جو نہر راوی سے نکل کر شالامار باغ کو سیراب کرتی ہے اسی کے ماتحت جاری ہوئی کشمیر میں باغ علی مردان خان کے کھنڈر بڈشاہی تعمیرات کے کھنڈروں پر وچار ناگ میں اب بھی نظر آ رہے ہیں۔ پشاور، اور کابل اور نملہ میں بھی (کابل سے اسی میل جنوب مشرق کی طرف) باغات و عمارات کی صورت میں اس کی

یادگاریں موجود ہیں۔

ان حالات کو پڑھ کر اندازہ لگاؤ کہ لاہور میں جہاں اس کا اکثر قیام رہتا تھا بلکہ شاہجہان اس کی عالیشان حویلی میں خود جایا کرتا تھا۔ اس نے جو باغ بنایا وہ کس شان اور کس شوق سے بنایا ہوگا۔ آج اس باغ کا صرف ایک ڈیوڑھی کے سوا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ مؤرخ کا بیان ہے کہ اس ڈیوڑھی کے شمال رویہ ایک اور ڈیوڑھی تھی۔ ایک قدآدم حوض اس باغ کے اندر سنہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء تک (آج سے ۹۲ سال قبل) موجود تھا مگر گردش ایام نے اس کو بھی میاں محمد سلطان کی معرفت مسمار کرادیا آہ ع

حرف سب میٹ دیئے نام و نشاں کے تو نے

ڈیوڑھی کے درمیان باہر کی طرف ایک بہت بڑا محراب ہے۔ جس پر لاجوردی، بسنتی اور سبز و سفید رنگ کا کاشی کار کام ہے۔ اس محراب کے اندر ایک اور محرابی در ہے جس کو گوردت سنگھ کرنیل بلیتن معراں نے بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں بند کرا کے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ سنہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء تک اس ڈیوڑھی کی نچلی منزل میں کچھ لوگ بے کرایہ رہتے تھے۔ اُوپر کی منزل خالی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے اس کے کچھ عرصہ بعد محکمہ نزول نے نچلی منزل بھی خالی کرالی تھی۔ اس لیے کہ رائے کنہیا لال نے اپنی تاریخ لاہور میں جو سنہ ۱۲۸۱ھ کے بیس سال بعد لکھی گئی ہے ان منزلوں کے بالکل خالی ہونے کا ذکر کیا ہے اور اب تک کہ سنہ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء ہے خالی پڑی ہیں۔

ڈیوڑھی کے اوپر کئی دالان۔ کئی کمرے۔ کئی کوٹھڑیاں اور کئی کھڑکیاں ہیں۔ سقف قالبوتی۔ استرکاری منقش۔ فرش اور زینے پختہ۔ یہ بیرونی ڈیوڑھی کا حال تھا۔ اندر کی ڈیوڑھی جس کا اب نشان تک بھی نہیں خدا جانے اپنے اندر کیا کچھ صنعتی خوبیاں رکھتی تھی۔ باغ کے فوارے۔ حوض اس کی اندرونی عمارتیں یہاں تک کہ اس کی چار دیواری آج سب بے نام و نشان ہیں۔ ریلوے حکام نے اچھا کیا کہ مسلمانوں کی گذشتہ عظمت و شوکت کی اس ٹوٹی پھوٹی علامت کو بھی جنرل سٹور کی بلند و بالا دیواروں کے اندر چھپا دیا کہ مسلمان کیا کوئی بھی اس کو نہ دیکھ سکے ؎

چشم ماہ کندہ شد از دست فلک بہتر شد
تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداریٔ ما

اب آیئے اس کے مقبرہ کی عالیشان مگر مٹتی ہوئی عمارت کی طرف۔ جو باغ ہی کے اندر ڈیوڑھی سے جنوب کی طرف چند قدم کے فاصلہ پر بصورت ہشت پہلو واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے بلند آٹھ محرابی در تھے۔ جن میں گلاب سنگھ بھونڈ یہ نے بیگم پورہ کی طرح میگزین رکھ کر سات در بالکل بند کر دیئے تھے اور صرف ایک در کھلا رہنے دیا تھا۔ محرابوں کے اندر اور باہر جو گل کاریاں تھیں انھوں نے ان کو بے تہیں کو مات کر رکھا تھا۔

مقبرہ کے گرد چاروں طرف چونہ گچ پختہ ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جو سطح زمین سے تین چار فٹ بلند ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں راقم نے دیکھا کہ یہ چبوترہ بوسیدہ ہو کر مسمار ہو رہا تھا۔ ہر چند لاہور کی قدیم عمارات کی صنعت مذہبی مقامات کا تقدس اور آخری آرام گاہ ہونا یعنی مقبروں کی عبرتناک کیفیت بھی ان عمارتوں کو خراب اور برباد کرنے والے سنگدلوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکی۔ تاہم اس مقبرہ کی دیواروں پر بعض اونچی اونچی عمارات کی طرح سنگ سرخ اور سنگ ابری کے قیمتی پتھر نظر آ رہے ہیں۔

گنبد کے نیچے تہ خانہ ہے اور اس میں تین قبریں ہیں۔ ایک قبر پختہ ہے دو قبریں خام ہیں ایک نواب علی مردان کی اور

ایک اس کی والدہ کی ہے۔ تیسری قبر اُس کے کسی فرزند یا خویش کی ہو گی۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں سرکار انگریزی کے حکم سے رائے کنہیا لال نے اس مقبرہ کی مرمت کرائی۔ سیڑھیاں درست کرا کر تہ خانہ صاف کرایا گیا لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں قبروں کی اینٹیں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ تہ خانہ ناصاف تھا۔ تہ خانہ تک جانے کے لیے جو سیڑھیاں تھیں وہ شکستہ حالت میں تھیں۔ تہ خانہ دراصل اس گنبد کی منزل اول ہے اور کافی وسیع ہے۔ سقف اس کا قالبوتی اور فرش پختہ ہے۔ اکثر محرابوں میں گلکاری سنہ ۱۹۱۰ء تک صاف نظر آتی تھی۔ تہ خانہ میں روشندانوں کی وجہ سے کافی روشنی آتی ہے۔ اس مقبرہ کی دوسری منزل وہ ہے جو چار فٹ بلند چبوترہ کی سطح کے برابر ہے اور جس پر قبر کا تعویذ ہے اسی کے نیچے تہ خانہ ہے جو ایک روشندان سے صاف نظر آتا ہے۔ اس منزل کے متعلقہ مکانات کو گرا کر گلاب سنگھ بھونڈیہ نے چھاؤنی کی تعمیر کی تھی۔

تیسری منزل یعنی گنبد تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔ دونوں راستوں کے زینے تہ خانہ کے زینوں کی طرح اس ردی حالت میں تھے کہ بڑی مشکل سے اوپر جاتے ہوئے کر کے راقم ایک مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں وہاں تک پہنچا تھا۔ چھت گنبد کی پختہ چونہ گچ ہے مگر لمبی خودرو گھاس نے اس کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس چھت سے جب سطح زمین کی طرف ذرا جھک کر دیکھیں تو خوف سا معلوم ہوتا ہے۔ ہر منزل پر چھوٹے چھوٹے خوش وضع گنبد روشنی کے لیے موجود ہیں لیکن بالکل شکستہ حالت میں ہیں۔ ان قبروں کے تعویذ سنگ مرمر کے تھے فرش پر رنگ سرخ اور سنگ ابری کی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں وہ سب سنگین دلوں نے اُتار لیں۔

انگریزی عمل داری کی ابتدا میں زمیندار لوگ اس زمین پر جو باغ اور عمارات سے گھری ہوئی تھی اور سکھوں کے عہد میں اجاڑ اور بنجر ہو گئی تھی کاشت اور زراعت کرنے لگے۔ مقبرہ کے اندر وہ بھوسہ، چارہ اور لکڑیاں رکھا کرتے۔ اور کوئی نہ کوئی ٹوٹی پھوٹی چارپائی بھی وہاں موجود رہتی۔ راقم نے یہ کیفیت اپنی آنکھوں سے وہاں سنہ ۱۹۱۰ء میں دیکھی ہے۔ اس مقبرہ کی شان و عظمت اس کے نقش و نگار اور اس کی صنعت کاری اور عمارت کی پختگی ہی سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ بقول رائے کنہیا لال و مولوی نور احمد چشتی کسی بڑے سے بڑے مقبرہ کا بھی گنبد اتنا بلند و بالا نہیں ہے۔

علی مردان خاں کے باغ کی ڈیوڑھی اور اس کے مقبرہ کا گنبد چونکہ ساتھ ہی ساتھ ہیں اس لیے حکام ریلوے نے ڈیوڑھی کی طرح گنبد کو بھی ریلوے جنرل سٹور کی حدود میں شامل کر کے اس کے گرد قد آدم سے بھی اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے ؎

یادگارِ ہستیٔ ناپید تھا دنیا میں تُو — تجھ میں مل جاتا تھا لوگوں کو نشانِ آرزو
اِک جہانِ آرزو تھا دیدۂ بینا میں تُو — تجھ میں تھا سویا ہوا اک کاروانِ آرزو

شالا مار باغ

یادگار شاہجہاں لاہور میں ہے شالامار
جس کا ہر تختہ گلستاں در گلستاں دیکھئے

شالامار باغ کے متعلق راقم نے سب سے پہلے ایک چھوٹا سا پمفلٹ فروری سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھا جو سنہ ۱۹۲۴ء تک بہت سے اضافہ اور مزید مضامین کے ساتھ کئی بار چھپا۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے آخری اڈیشن میں اس کا حجم ۹۶ صفحہ تک تھا۔ اس جگہ بھی شالامار باغ کے متعلق

کچھ لکھا جانا ہے اس لیے کہ باغات لاہور کا ذکر شالامار باغ کے تذکرہ کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہے ہے

لفظ شالامار کی وجہ تسمیہ کے متعلق چونکہ زمانہ شاہجہان کے مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے بعد کے تمام مصنفین قیاس آرائیوں سے کام لے کر کبھی تو لکھتے ہیں اس کا نام شعلۂ ماہ ہے اس لیے کہ تادر شاہی مورخوں نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ کبھی لکھتے ہیں کہ چونکہ شالامار باغ کشمیر کی تقلید میں یہ باغ احداث ہوا تھا اس لیے اس تقلید کے سوا اصل وجہ کوئی اور نہیں ہے۔

اب شالامار باغ کشمیر کی وجہ تسمیہ میں کہا جاتا ہے کہ اگنی پوران میں ایک پھول کا نام شالی مالی ہے جو دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا ہے چونکہ یہ پھول اس علاقہ میں کثرت سے ہوتا تھا اس لیے اس کا نام شالی مالی ہی مشہور ہو گیا۔ اس زمانہ میں کشمیر پر راجہ پرورسین (سنہ ۱۶۲۲ء) کی حکومت تھی اور اس نے اور اس کے امرا نے بھی وہاں اپنے محلات تعمیر کرائے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس باغ کا نام سنہ ۱۶۲۲ء میں شالی مالی تھا اور یہ کشمیر کے مشہور باغوں میں تھا تو پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں جو آج سے قریباً نو سو سال قبل کی تصنیف ہے اس کا نام کیوں نہ لکھا۔ سب سے پہلے شالی مار کا نام ابوالفضل نے لکھا ہے۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں سنہ ۹۹۴ھ سے سنہ ۱۰۱۴ھ تک ہم شالی مالی میں شالی مار کے نام سے اکبر کا احداث کیا ہوا ایک باغ دیکھتے ہیں جہانگیر کے عہد میں بھی اس کا نام شالی مار ہی تھا چنانچہ جہانگیر کا درباری شاعر مرزا محمد سلیم لکھتا ہے ؎

شنیدم شاہ روشن دل جہانگیر | زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر
چو شد دامان دریا جلوہ گاہش | بسوئے شالی مار افتاد راہش

شاہجہان کے زمانہ میں شالیمار کا نام شالامار ہو چکا تھا چنانچہ عہد شاہجہان کا گورنر کشمیر ظفرخان احسن جو دو دفعہ کشمیر کا گورنر رہا ہے اپنی مثنوی میں لکھتا ہے ؎

بوصف شالامار آں خلد ثانی
ملک ہر گوشہ در گوہر فشانی

بعض نے شالامار کو ترکی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شالامار باغ کی جگہ اس کا نام شہلا باغ مشہور ہو گیا اور آج تک وہی نام زبانوں پر جاری ہے بہرحال یہ باغ جو پنجاب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کشمیر ہی کے شالامار باغ کے نمونہ پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ باغ شاہجہان نے نواب علی مردان خاں کی زیر نگرانی سنہ ۱۰۴۲ھ/۱۶۴۲ء میں تیار کئے جانے کا حکم دیا جیسا کہ ذیل کے قطعہ تاریخ سے معلوم ہوگا ؎

چوں شاہجہاں پادشاہ حامئے دیں | آراستہ شالامار باطرز نفیس
تاریخ بنائے ایں ز رضوان جستم | گفتا کہ بگو "نمونۂ خلد بریں"

ان چار مصرعوں پر بادشاہ نے شاعر کو خلعت فاخرہ کے علاوہ دس ہزار روپیہ نقد دیا۔ اس باغ کی تعمیر پر چھ لاکھ اور اس کی شاہ نہر

۱۔ شالامار باغ اور جھیل ہارون کے درمیان ہارون کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی بلند پہاڑی پر زمانہ قدیم کے محلات محکمہ آثار قدیمہ نے برآمد کئے ہیں اور راقم ان کو دیکھ چکا ہے۔

پر دو لاکھ کل آٹھ لاکھ روپیہ ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں صرف ہوا۔

شاہجہان باغ اور اس کی عالیشان عمارات اور اس کے فواروں اس کی آبشار اور اس کے ساون بھادوں اور تالاب اور روشوں کی تیاری کے بعد سب سے پہلے ۱۲ شعبان ۱۰۵۱ھ کو اس باغ میں داخل ہوا۔

بادشاہ جب کبھی لاہور آتا اور اس کے حرم ساتھ ہوتے تو باغ میں کثرت عمارات کی وجہ سے خیموں کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ اس باغ کے سات تختے یا طبقے تھے اور ہر طبقہ کا علیحدہ علیحدہ نام تھا مثلاً مہتابی باغ۔ گلابی باغ۔ انگوری باغ۔ عنایت باغ۔ اب یہ چار طبقے ناپید ہیں۔ مندرجہ ذیل تین طبقے موجود ہیں۔ باغ فیض بخش۔ باغ حیات بخش۔ باغ فرح بخش۔ اب انہی طبقوں کا نام شہلا باغ ہے اور انہی کے اندر۔ ساون بھادوں۔ آبشار کلاں۔ فوارے۔ بارہ دری کلاں (جس کے نیچے آبشار کلاں ہے) تخت سنگ مرمر۔ سرد خانہ۔ حوض سنگ یشب۔ شاہی حمام۔ خواص پورہ۔ خواب گاہ۔ نگار خانہ یا نگاہ خانہ وغیرہ ہیں۔

عہد محمد شاہی کا ایک شاعر (میر عبدالعزیز نجانی لاہوری) اپنے ایک طویل قصیدہ میں باغ شالامار کے متعلق لکھتا ہے ؎

ارم را گر ندیدی شالہ مار شاہ را بنگر | کہ در یک یک چمن صد صد چو رضوان باغباں بینی
سحر ہر روز پر گلہائے الوان بنگری زانساں | کہ وقت شام ہر شب پر ز انجم آسماں بینی

اس وقت جن طبقوں کا نام شہلا باغ ہے ان کی لمبائی مجموعی طور پر اڑھائی صد گز اور چوڑائی ۲۴۰ گز ہے۔ باغ کے ہر سہ جانب بارہ دریاں ہیں اور بیچ میں ایک چبوترہ ہے جس پر سے لوگ ایک پل پر سے ہو کر گذرتے ہیں۔ مغلیہ باغات میں آبپاشی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اسی لیے جو روشیں یا سڑکیں باغ میں بنائی جاتی تھیں وہ پھولوں کی کیاریوں کی سطح سے اونچی ہوتی تھیں اور باغ میں جو مربع قطعات زمین ہوتے تھے وہ دو تین فٹ اور نشیب میں ہوتے تھے اور ان میں اونچے اونچے اور بڑے بڑے میوہ دار درخت لگائے جاتے تھے۔

شالامار باغ کے بالائی طبقہ کی نہر بیس فٹ چوڑی ہے اور ہر طبقہ کی نہر میں چھوٹے چھوٹے فوارے جاری ہیں۔ اس باغ میں جو آبشار کلاں ہے وہ قلعہ دہلی کی آبشار کے نمونہ پر بنائی گئی ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء کا ایک انگریز سیاح (بزمانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ) اپنے سفرنامہ میں اس باغ کے منظر ساون بھادوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس مکان کے فرش میں ہزارہا سوراخ ہیں جن سے پانی جاری رہتا تھا۔ دیواروں میں شمع رکھنے کے لیے طاق بنائے گئے ہیں اور چھت کے اوپر پانی کی چادر گرتی تھی بڑی نہر کے آخر پر بارہ دری کلاں ہے جس کے نیچے سے ہو کر پانی آبشار کی صورت میں تالاب کلاں میں جاتا ہے جس میں ۱۴۴ فوارے پدم کے پھول کی طرح تھے۔ آبشار کے پاس دو فٹ اونچا سنگ مرمر کا جو تخت ہے اسی پر بیٹھ کر بادشاہ باغ اور فواروں کے لطف اندوز نظارہ سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔"

بارہ دری کلاں کو آج جس بستر میں محسوس و پیکنے ہو وہ شاہان مغل کے زمانہ میں ایک یادگار عمارت تھی۔ رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور ص ۳۵۵ میں لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے بارہ دری کلاں سے جو بالائے آبشار ہے سنگ مرمر کی سلیں اور پتھر جالیوں نکلوائیں

انہوں نے بعد ازاں امرتسر میں بھجوا دیا۔ بعد میں سفیدی سے درستی کرا دی۔ باغ کے اندر جو عمارتیں تھیں اور جہاں جہاں سنگ مرمر لگا تھا سکھ حاکمان لاہور نے جو رنجیت سنگھ سے پہلے سہ حاکمان لاہور کے نام سے لاہور کے حکمران تھے۔ اتروا لیا اور رہا سہا رنجیت سنگھ نے ختم کر دیا۔ تخت سنگ مرمر کے اکھاڑے جانے کی بھی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن جب اس کا ثابت اکھڑنا اور پھر قائم ہونا مشکل نظر آیا تو رنجیت سنگھ نے ارادہ ترک کر دیا۔ چنانچہ تخت کی وہ ٹوٹی ہوئی جگہ جس کو بعد میں لوہے کے شکنجہ سے جکڑ دیا گیا ہے اب تک موجود ہے۔

شاہجہان کے بعد عالمگیر بھی اس باغ میں چند مرتبہ آیا ہے۔ دارا شکوہ تو اکثر آیا کرتا۔ زیب النساء بیگم تو دنوں نہیں مہینوں تک اس باغ کی پُرکیف بہار سے بہرہ اندوز ہوتی رہی ہے۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ عالم اول اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں بھی اور پھر حصول سلطنت کے بعد بھی باغ میں آتا رہا ہے اس کی وفات بھی (۱۷۱۲ء میں) لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کسی مغل بادشاہ کو شالامار باغ دیکھنا اور لاہور تک آنا نصیب نہیں ہو سکا۔

نادر شاہ نے جب لاہور اور اس کے بعد دہلی پر حملہ کیا ہے تو اسی باغ میں قیام کیا اور یہیں ناظم لاہور نواب ذکریا خاں نے نادر شاہ سے معذرت خواہ ہو کر اور نذر دے کر صلح کر لی تھی۔ نادر شاہ نے یہ دربار بارہ دری کلاں میں کیا تھا۔ پھر نواب معین الملک عرف میر منو کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی اپنے حملوں میں اسی باغ میں دربار اور جشن کیا کرتا۔

رنجیت سنگھ نے بھی اپنے پوتے شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی (اوائل مارچ ۱۸۳۷ء) کی تقریب پر بہت بڑا جشن جو کئی دن تک جاری رہا اسی باغ میں کیا۔ اس جشن میں برطانوی کمانڈر انچیف اور کئی انگریزوں کے علاوہ پنجاب اور کوہستان کے سب راجے بھی شامل تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے پیش رو سکھ سہ حاکمان لاہور نے اس باغ کے قیمتی پتھروں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ رنجیت سنگھ نے اس کی بند شدہ نہر کو از سر نو جاری کرایا۔ وہ جب کبھی امرتسر کے درشنوں کو جاتا اور بالعموم جاتا ہی رہتا تو اس کی پہلی منزل شالامار باغ میں ہوا کرتی۔ چنانچہ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں اس نے باغ کی بند شدہ نہر کو دوبارہ جاری کرنے کا حکم دیا اور نہر کھودنے والوں کو انعام و اکرام دیے۔ صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے ص ۶۲ میں مہاراجہ کے امرتسر سے واپس آنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "ومن بعد رونق بخش باغ شعلہ ماہ المشہور شالامار و شالا باغ شدند۔ شاہ نہر بہ اسم ہنسلی
> کہ پیش از تشریف سرکار دولتمدار در تالاب شالا باغ افتادہ بود، از معائنہ آں بسیار
> منفرح و منشرح گردیدہ یک راس اسپ و جوڑے لکے گرہ طلائی بہ نہر کناں مرحمت و عنایت
> فرمودہ در دار السلطنت لاہور رونق افروز شدند"

اس نہر کے دوبارہ جاری ہونے سے جو قریباً نصف صدی سے خراب و خستہ ہو کر بند پڑی تھی۔ شالامار باغ میں نئے سرے رونق اور آبادی ہو گئی۔ چنانچہ اس رونق و نزہت کا ذکر مصنف عمدۃ التواریخ پھر صفحہ ۶۹ پر بدیں الفاظ کرتا ہے:۔

> "سرکار فیض آثار از امرتسر بہ سواری فیل کوہ تمثیل در شالہ باغ رونق بخش شدند

...... شالا باغ بہ تازگی صورت آرائش و پیرائش یافتہ و شاہ نہر یعنی نہر ہنسلی بر کمال لطافت و نزاکت جاری و ساری و تمام حیاض و چمنستان و آبشار ہائے در ساون بھادوں در جمیع اوقات مملو از آب مے باشد۔ و نظارگیاں را از مشاہدۂ آں انواع انواع راحت و اقسام اقسام مسرت شامل اوقات فرخندہ آیات مے گردد"

۱۸۲۰ء میں جب ولیم مورکرافٹ ایک انگریز سیاح لاہور آیا تو مہاراجہ نے اس کو شالا باغ ہی میں ٹھہرایا مورکرافٹ نے اپنے سفرنامہ (مطبوعہ ۱۸۴۱ء) میں اس باغ کا اور اس میں اپنی اقامت چند روزہ کا ذکر کیا ہے پہلے ہی تختہ میں کنوئیں کے ساتھ جو بارہ دری ہے وہاں سیاح مذکور کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہیں اس کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا۔ مہاراجہ مورکرافٹ کو سو روپیہ روزانہ "در وجہ ضیافت" بھیجا کرتا تھا۔

۱۸۳۹ء مطابق سمت ۱۸۹۵ میں کپتان صاحب سنے لالہ کشن چند کی زبانی مہاراجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ شالا باغ راحت افزا مقام ہے لیکن بعض مقامات سے اس کی شکست و ریخت نے اس کو خراب کر رکھا ہے۔ نواب گورنر جنرل آپ کی ملاقات کے لیے آنے والے ہیں۔ اگر سرکار اس کی تعمیر و ترمیمت سرے سے کرا دیں تو زمانہ میں ایک یادگار رہے گی۔ چنانچہ ۷ اہاڑ کو مہاراجہ نے خلیفہ نورالدین کو باغ کی آرائش و زیبائش اور مرمت وغیرہ کا حکم صادر کیا۔

[۱۸۲۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک روز مہاراجہ اپنے درباریوں سمیت اس باغ کی سیر کر رہا تھا کہ شالامار کی وجہ تسمیہ پر بحث چھڑ گئی۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی کا قول نقل کر کے اپنے خیال کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ بیان کی۔ لیکن مہاراجہ نے کہا کہ اس کا نام "شالامار" اس لیے نہیں ہو سکتا کہ پنجابی زبان میں اس لفظ کے معنی خدا کی مار یا لعنت و پھٹکار کے ہیں۔ جس جگہ سے انسان زندگی کا حظ اٹھائے اسے اس نام سے کیوں پکارا جائے۔

کسی نے کہا کہ یہ لفظ ترکی زبان کا ہے جس کا مطلب خوشی کا مقام ہے مگر رنجیت سنگھ نے کہا۔ اگر ایسا ہوتا تو مرزا مہدی ایرانی کو تاریخ جہانگشائے نادری میں شالامار کی بجائے شعلہ ماہ کا لفظ وضع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی! آج سے اس باغ کا نام شملا باغ" ہوگا۔ آئندہ اسے اسی نام سے پکارا جائے[1] چنانچہ یہ نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا اور عوام آج تک اسے شملا باغ یا شالا باغ ہی کہتے ہیں ——— مرتب]

الحاق پنجاب (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء) کے بعد سرکار انگریزی نے اس کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ جنوری ۱۸۷۶ء میں پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم آنجہانی)، ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈفرن ۱۸۹۴ء میں لارڈ ایلگن اور ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن جو وائسرایان ہند تھے اس باغ میں آتے رہے بلکہ جو وائسرائے بھی لاہور آیا اس نے جب تک مقبرہ جہانگیر اور شالامار باغ کو نہیں دیکھ لیا اپنی سیاحت کا لطف نہیں اٹھایا۔ امیر حبیب اللہ خاں والئے افغانستان بھی ۴ مارچ ۱۹۰۷ء کو اس باغ میں آئے تھے۔ ملک معظم جارج پنجم بھی بزمانہ شہزادگی یہاں رونق افروز ہوئے تھے۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ از سیتارام کوہلی ص ۹۷-۹۸

لارڈ ڈفرن اور لیڈی ڈفرن اپنے سٹاف کے ہمراہ اپریل ۱۸۸۵ء میں لاہور آئے تھے۔ لیڈی ڈفرن نے اس سیاحت میں شالامار باغ کے متعلق جو خطوط[1] اپنی ماں کو انگلستان میں لکھے ان کا تھوڑا سا ذکر ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:—

بدھ (چہار شنبہ) ۱۵ اپریل ۱۸۸۵ء

"ہم نے شالامار باغ کے لیے (جہاں ہمارے اعزاز میں ڈنر دیا جانا تھا) پانچ میل کی مسافت (گورنمنٹ ہوس سے) طے کی۔ اور یہ پوری سڑک مشعلوں سے منور اور روشن تھی۔ باغ کی دیوار جو ستر ایکڑ پر محیط ہے ایک مسلسل روشنی کے باعث ممتاز ہوتی نظر آئی۔ جب ہم گاڑی میں سے ایک کمان کے پاس اُترے تو ہمیں ایک حقیقی مدینۃ النور نظر آیا۔ ہمارے سامنے پانی کا ایک راستہ دکھائی دیا جس کے وسط میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوارے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس پرستان کی نہر کے دونوں طرف چبوترے آتشی تختے اور روشیں اور بلند درختوں کے عظیم جھنڈ تھے جن میں مختلف قسم کے چینی کے چراغ اور رنگ برنگ کی روشنیاں متداخل و متقاطع نظر آتی تھیں۔ آگ اور پانی کی یہ قطاریں باغ کو ہر سمت میں قطع کرتی گزرتی تھیں اور بہت چبوترہ کے اختتام پر درختوں کا ایک قسم کا قلعہ سا نظر آیا۔ جہاں ڈنر کی میزیں بچھی پڑی تھیں۔ اس کے دوسری جانب پانی کا ایک منور حوض ہمیں نظر آیا۔ یہ حد سے زیادہ دلفریب تھا۔ پانی پہلے باغ میں سے عین اس مقام سے گزرتا تھا جس کے اوپر ہم بیٹھے ہوئے تھے اور یہ نہر ایک آبشار کی صورت میں دوسری جانب نچلے چبوترے کے پاس گرتی تھی۔ اگر کوئی شخص اس منور کو شاب میں گھومتا اور ٹھہر کر دیکھتا تو حاضرین اس کو اس سلسلۂ فن کی آخری لڑی بنتے اور اس منظر کو مکمل کرتے نظر آتے۔ غرض ہمارا ماحول بالکل شاعرانہ حیثیت رکھتا تھا۔

میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ روشنی کا انتظام کس طرح کیا گیا ہے باغ میں گھومنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ پانی کے نزدیک ہزاروں لاکھوں مٹی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں تھیں جن میں تیل ڈال کر فتیلے روشن کئے گئے تھے۔ تمام عمارتوں کے گرد اسی قسم کی روشنی کی قطاریں تھیں۔

اس دلفریب منظر سے جدا ہوتے وقت واقعی ہم نے بڑی کلفت محسوس کی۔"

[قیام پاکستان کے بعد سے اس وقت تک بے شمار بادشاہوں دنیا کے مشہور لوگوں اور غیر ملکی سیاحوں نے اس باغ کی سیر کا لطف اٹھایا ہے۔ ہز امپیریل میجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران کو ان کی آمد لاہور کے موقعہ پر اہل شہر کی طرف سے ایک نہایت شاندار استقبالیہ

---

[1] یہ خطوط "ہماری وائسرائی زندگی ہندوستان میں" کے نام سے چھپ چکے ہیں (از مضمون حمید اللہ صاحب مخزن جولائی ۱۹۲۹ء)

جمعرات ۹ مارچ ۱۹۵۸ء کو اسی باغ میں دیا گیا۔ شہنشاہ کی نشست کا انتظام دوسرے تختے کے تالاب کے درمیان کی بارہ دری میں تھا۔ اس کے بعد جمعہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو امیر فیصل ثانی شاہ عراق اور پرنس عبدالالہ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۵۴ء کو شاہ سعود بن عبدالعزیز والیٔ حجاز۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۵ء کو جمہوریہ ترکیہ کے صدر جلال بایار۔ ۱۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو جارڈن (اُردن) کے شاہ حسین اور ملکہ زین الشرف۔ ۲ ستمبر ۱۹۵۵ء کو مصر کے ڈپٹی پرائم منسٹر ونگ کمانڈر جمال سلیم۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو جمہوریہ ترکیہ کے وزیراعظم عدنان مندریس۔ بدھ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کو عوامی (سرخ) چین کی ریاستی کونسل کے وزیراعظم اور وزیر امور خارجہ چو این لائی۔ منگل ۱۰ فروری ۱۹۵۹ء کو ڈیوک آف ایڈنبرا پاکستان کے مہمان کی حیثیت سے اس باغ میں تشریف لائے اور اہل شہر کی طرف سے ان کا شایان شان خیر مقدم ہوا۔

ان کے علاوہ پنڈت جواہر لعل نہرو وزیراعظم بھارت۔ امریکہ کے پریذیڈنٹ آئزن ہاور انگلستان کی ملکہ الزبتھ اور جاپان کے وزیراعظم کے مسز اکیدا کو اہل شہر کی طرف سے اسی باغ میں استقبالیہ دعوت دی گئی غرض دنیا کا کوئی سیاح پاکستان کی سیر کو اس وقت مکمل نہیں سمجھتا جب تک اس عظیم الشان باغ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا۔ —— مرتب]

گلابی باغ

آبشاریں۔ حوض۔ فوارے ہوئے سب بے نشاں
رنگ کیا لایا ہے باغِ بیگ —— سلطاں دیکھئے

لاہور سے شالامار باغ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر گلابی باغ کے نام سے ایک عالیشان منقش و گُل کار دروازہ اپنے بانی کی یاد میں نوحہ کناں نظر آتا ہے۔ یہ دروازہ اُس باغ کی ڈیوڑھی سے تعلق رکھتا ہے جو میرزا غیاث بیگ ایرانی کے عمزاد بھائی میرزا سلطان بیگ نے ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء میں تعمیر کرایا۔

صاحب تحقیقات چشتی (ص ۴۰۳ پر) لکھتے ہیں "سلطان بیگ حسب الطلب شاہجہان ایران سے ۱۰۶۶ھ میں ہندوستان آیا اور اپنے بھائی میرزا غیاث بیگ کی سفارش سے جو شاہجہان کی بیٹی سلطان بیگم کا داماد تھا پنجاب کا میر بحر مقرر ہوا اور اسی سال اس نے یہ باغ لاہور میں تعمیر کرایا۔"

صاحب "تاریخ لاہور" نے یہ تو نہیں لکھا کہ میرزا سلطان بیگ ہندوستان میں کب آیا البتہ اس نے بھی صاحب تحقیقات کے ان الفاظ سے اتفاق کیا ہے کہ اُس کا بھائی میرزا غیاث بیگ شاہجہان کا داماد اور اس کی بیٹی سلطان بیگم کا خاوند تھا۔

لاہور کی انگریزی تاریخ ہسٹری آف لاہور کا مصنف میرزا غیاث بیگ کو اپنے دونوں پیش رو مصنفوں کی طرح بادشاہ کا داماد تو تسلیم کرتا ہے مگر میرزا سلطان بیگ کے ورود ہند کا سال ۱۰۵۹ھ مطابق ۱۶۴۹ء بتاتا ہے۔ جو صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ میرزا سلطان بیگ ۱۰۶۶ھ میں ہندوستان وارد ہو کر اسی سال لاہور میں ایک عظیم الشان باغ تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا اُس کا چچازاد بھائی میرزا غیاث بیگ فی الواقعہ بادشاہ کا داماد اور شہزادی سلطان بیگم کا خاوند تھا۔ اور سلطان بیگم کے نام سے بادشاہ کی کوئی لڑکی بھی تھی یا نہیں؟

عہد شاہجہانی کی قریباً تمام تاریخوں میں شاہجہان کی اولاد ذکور و اناث کے نام درج ہیں۔ ظفر نامہ شاہجہان (ص ۱۲۷) میں

حوالے سے جو عہد شاہجہانی کی تمام فارسی تاریخوں کا عطر مجموعہ ہے یہاں بادشاہ کی تمام لڑکیوں کے نام مع سنہ ولادت و وفات لکھے جاتے ہیں۔

حورالنساء بیگم	ولادت ۸ر صفر ۱۰۲۲ھ	وفات بعمر ۲ سال یک ماہ
جہان آرا بیگم عرف بادشاہ بیگم	" ۲۱ر صفر ۱۰۲۳ھ	اس نے تمام عمر شادی نہیں کی
روشن آرا بیگم	" ۲ر رمضان ۱۰۲۶ھ	اس نے تمام عمر شادی نہیں کی
ثریا بانو بیگم	" ۲ر رجب ۱۰۳۰ھ	وفات بعمر سات سال ۲۳ر شعبان ۱۰۳۷ھ
حسن آرا بیگم	" ۱۰ر رمضان ۱۰۴۰ھ	وفات بعالم شیرخواری
گوہر آرا بیگم	" ۱۷ر ذیقعد ۱۰۴۰ھ	انہی کی پیدائش پر ممتاز محل کا انتقال ہو گیا تھا۔

شاہجہان کی چھ شاہزادیوں میں دو شاہزادیوں (جہاں آرا بیگم و روشن آرا بیگم) کے سوا باقی سب چھوٹی عمر ہی میں چل بسی تھیں اور ان دونوں شہزادیوں نے جن میں اول الذکر دارا شکوہ کی معاون اور مؤخر الذکر اورنگ زیب کی ہوا خواہ تھی شادیاں ہی نہیں کیں۔ پھر معلوم نہیں سلطان بیگم بادشاہ کی کونسی لڑکی تھی، میرزا غیاث بیگ جس کا خاوند تھا۔ اس لیے ان تمام مصنفوں کا یہ لکھنا کہ وہ بادشاہ کا داماد تھا قطعاً غلط ہے۔ البتہ ایران کے شاہی خاندان سے منسلک ہونے کی وجہ سے وہ بادشاہ کا مقرب ضرور تھا۔

میرزا سلطان بیگ کو بادشاہ نے ایک انگریزی رائفل بطور تحفہ عنایت کی تھی۔ میرزا ایک دن ہرن مینار (شیخوپورہ) کی طرف شکار کو گیا۔ بھری ہوئی بندوق ہاتھ میں تھی خدا جانے کیا واقعہ ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ میں پھٹ گئی اور وہ اسی صدمہ سے بارہ کے دن۔ ۱۸ر شوال ۱۰۶۸ھ کو خود ہی قضا کا شکار ہو گیا۔ اس واقعہ سے ۲۷ دن پیشتر ۱۲ر رمضان ۱۰۶۸ھ کو شاہجہان نظر بند ہو چکا تھا۔

میرزا سلطان بیگ لاہور ہی میں دفن ہوا لیکن کتاب تحقیقات چشتی جو لاہور کی سب سے پرانی تاریخ ہے اس کی قبر کا صحیح پتہ بتانے سے معذور ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کوئی کوٹ خواجہ سعید میں بتاتا ہے اور کوئی متصل باغ۔ اختتام باغ کا سال ۱۰۶۶ھ ہے چونکہ باغ کا بچا کھچا دروازہ ہی اس کی مٹی ہوئی شان و شوکت ظاہر کر رہا ہے اس لیے خیال ہے کہ باغ کے احداث اور اس کی اندرونی عمارتوں کی تکمیل میں پانچ چار سال ضرور لگ گئے ہوں گے۔

باغ کی وسعت کا اندازہ یہیں سے لگ سکتا ہے کہ اس کے چاروں گوشوں پر چار ڈیوڑھیاں تھیں اور ہر ڈیوڑھی عالیشان، خوبصورت اور منقش تھی۔ بڑی ڈیوڑھی کے اندر جو شالامار باغ کو جاتے ہوئے سر راہ ہر راہ رو کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جو گلابی باغ کے نام سے موسوم ہے۔ ایک بہت بڑا کنواں آب رسانی کے لیے موجود تھا جس کو راقم نے بھی ۱۹۰۱ء میں دیکھا تھا۔ تحقیقات چشتی (ص ۶۴۳) سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرقی و شمالی گوشہ میں بھی قریباً بیس قدم کے فاصلہ پر ایک چاہ کلاں تھا۔ آج یہ دونوں کنویں نابود ہیں۔

باغ کی اندرونی عمارات۔ ان کی بارہ دریاں، محرابی اور قالبوتی دروازے، چونہ گچ فرش اور نشست گاہیں اس کے اعلیٰ مذاق کی شاہد تھیں۔ جس ڈیوڑھی کا نام اب گلابی باغ ہے وہ اس باغ کی جنوبی ڈیوڑھی ہے۔ باغ کی اس ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ پر کاشی کار کام ایسا خوبصورت اور مضبوط ہے۔ جو تین سو سال گذر جانے کے باوجود ہنوز تر و تازہ مگر اپنی گذشتہ عظمت کا مرثیہ خواں ہے۔ اس دروازہ پر بہت سے کتبے ہیں بطور یادگار ان سب کو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

بڑے کتبہ میں لکھا ہے "افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ محراب کی پیشانی پر لاجوردی رنگ سے اشعار ذیل

بقلم جلی تحریر ہیں —

بانیٔ باغ سخاوت، فاتح باب کرم
آنکہ از دارائے گردوں ساخت باغ چوں ارم

اہل معنے بردوامش خواستند از حق دعا
بہر سلطاں را الٰہی دار دائم محترم

اس کے نیچے یہ تاریخی رباعی درج ہے —

خوشا باغے! دارد لالہ داغش
گل خورشید مہ زیبد چراغش

ز تقویم خرد پرسید غازی
گلابی باغ شد تاریخ باغش
۱۰۶۶ھ

شرق رویہ محراب کی منزل دوم پر بخط نستعلیق یہ شعر درج ہے —

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

یہ خوبصورت دروازہ میلہ شالامار باغ کے تین دنوں میں پولیس چوکی کا کام دیتا ہے۔

باغ کے اندرونی حصہ میں صرف ایک عمارت جو بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے نام سے موسوم ہے، موجود ہے۔ باغ کی دیگر تمام عمارتیں غارت گروں نے پتھر نکال نکال کر اور اینٹیں بیچ بیچ کر خاک میں ملا دیں۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں احاطہ باغ کے اندر چونہ پیسنے اور اینٹیں بنانے کی چکیاں تھیں، جگہ جگہ غلاظت اور سنگریزوں کے ڈھیر تھے مزدوروں کا ایک چھوٹا سا جھونپڑا بھی تھا۔ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو راقم جب پھر وہاں گیا تو دیکھا کہ گلابی باغ کی ڈیوڑھی سے کر بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے چبوترہ تک ایک سڑک قریباً چھ فٹ چوڑی بن چکی ہے۔ جس کے دونوں طرف یوکلپٹس کے درخت لگے ہوئے ہیں سنہ ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ ڈیوڑھی کے پاس ہی ایک خوشنما کوٹھی بنی ہوئی ہے۔ جو ذیلدار باغبانپورہ کی ملکیت بتائی گئی۔ اس میں کوئی انگریز مسٹر پام رہتے ہیں جو ریلوے کارخانہ میں فورمین ہیں۔ یہ کوٹھی اور اس کے نوکر خانے سب اسی باغ کی زمین میں ہیں۔ بلکہ بارہ دری کے علاوہ شمال کی طرف جو کھیت ہیں وہ بھی اسی احاطہ میں تھے۔ تاریخوں میں باغ کے جن مکانات کا ذکر ہے، ان میں آج بارہ دری کے علاوہ جس کی کیفیت آئندہ سطور میں لکھی جائے گی۔ کوئی قدیم عمارت نظر نہیں آتی۔ البتہ بارہ دری سے آگے ایک چھوٹی سی نہر گزر کر قریباً پانچ چھ فٹ بلند ایک طویل و عریض ٹیلہ نظر آتا ہے، جو منہدم عمارتوں کا پتہ دیتا ہے اور اس پر جو فروختی نشانات (پختہ حد بندیوں کی صورت میں) لگے ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلہ مختلف گاہکوں کے پاس فروخت ہو چکا ہے یا فروخت ہونے کے لیے باقی ہے۔

بارہ دری مقبرہ دائی انگہ

قبر کا تعویز بھی اور سنگ مرمر بھی نہیں
سینکڑوں منظر ہیں اس منظر میں پنہاں دیکھیے

گلابی باغ کے منقش دروازہ کے عین سامنے یوکلپٹس درختوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھری ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک آتی ہے۔ جو بارہ دری مقبرہ دائی انگہ کے چبوترہ تک جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد بارہ دری کا پختہ چبوترہ آتا

بہت کم لوگ ہیں جو صاحب مقبرہ کے نام سے واقف ہیں۔

ہسٹری آف لاہور میں سید محمد لطیف (ص ۲۳۴) اور تاریخ لاہور میں رائے بہادر کنہیا لال (ص ۳۱۰ پر) لکھتے ہیں "گلابی باغ سے چند قدم شمال کی طرف دایہ انگہ کی قبر ہے جو سلطان بیگم کی دایہ تھی۔ سلطان بیگم نے یہ باغ اپنی دایہ کو بخش دیا تھا" گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ شاہجہان کی کسی بیٹی کا نام سلطان بیگم نہ تھا اس لیے دایہ انگہ اس کی دایہ بھی نہ تھی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میرزا سلطان بیگ لاولد انتقال کر گیا ہوگا۔ اس زمانہ میں اُمرائے دربار کی جائدادوں کا کثیر حصہ بادشاہوں کو بازگشت ہو جایا کرتا تھا جس کی اکثر مثالیں مغلوں کے دور حکومت میں ملتی ہیں اس لیے ممکن ہے عہد عالمگیری میں یہ باغ دایہ انگہ کو جو دائی لاڈو کی طرح واقعی شاہی دایہ بھی عنایت ہو گیا ہو۔

دایہ انگہ کا اصل نام زیب النسا تھا شاہجہان کے عہد میں اس کا بڑا عروج رہا ہے اس کی ایک عالیشان مسجد "مسجد دائی انگہ" کے نام سے لاہور ریلوے سٹیشن کے پاس موجود ہے۔ جو برسوں تک ضبط سرکار رہی ۱۹۰۳ء سے آزاد ہے اور مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں۔

اس مربع بارہ دری کے اندر جس کے باہر چاروں طرف پختہ اینٹوں کا فرش اب تک اس کی قدامت کا پتہ دے رہا ہے دو قبریں ہیں جن میں سے ایک دائی انگہ کی ہے اور دوسری قبر کے متعلق لاہور کی تاریخیں خاموش ہیں۔ ان دونوں قبروں کا سنگ مرمر اور سنگ مرمر کے تعویذ غارتگروں نے اتار لئے اور قبروں کو مسمار کر دیا۔ رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور (ص ۳۱۱ پر) لکھتے ہیں "اس مقبرہ کی مرمت اب سرکار نے بذریعہ مولف کتاب کے کرائی ہے۔ جس سے پھر بارونق ہو گیا ہے" یہ ۱۸۸۳ء کا واقعہ ہے جب راقم ۱۹۰۱ء میں گیا تو مقبرہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ تہ خانہ کی چھت کا ایک گوشہ پھٹا ہوا تھا۔ اکثر مقامات سے اینٹیں اور چونا اکھڑا ہوا تھا۔ اور بارہ دری کسمپرسی کی حالت میں تھی۔

بارہ دری کا اندرونی احاطہ جس میں قبریں ہیں دونوں طرف سے سات سات قدم ہے۔ اس کے چار دریچے ہیں۔ دیواروں پر گل کاری کے دھندلے سے نشان اب بھی نظر آتے ہیں۔ دریچوں کے باہر چاروں طرف ایک پختہ تابوتی غلام گردش ہے جس کے نقش و نگار ماند پڑ گئے ہیں۔ قبروں کی اندرونی دیواروں پر چاروں طرف دو دو سطروں میں نہایت خوشنما عربی حروف میں سورۃ الفتحہ لکھی ہوئی ہے لکھنے والے کا نام محمد صالح ہے۔ جو اس طرح ہے "کتبہ محمد صالح غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیوبہ سنہ ۱۰۸۲ھ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دایہ انگہ کا انتقال ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۱ء میں ہوا ہے۔

تحقیقات چشتی میں (ص ۳۴۵ پر) لکھا ہے "دو محرابوں کے باہر شمال رویہ سقف پر فوارہ کے نشان موجود ہیں۔ بارہ دری کے اندر قد آدم محراب پر "یا اللہ یا اللہ" تحریر ہے۔ یہ سنہ ۱۸۶۴ء کا ذکر ہے۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں رائے کنہیا لال نے ان کا ذکر نہیں کیا اور ۱۹۴۳ء میں راقم نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔ ۱۹۲۳ء میں یا اس سے کچھ پہلے جب محکمہ آثار قدیمہ نے گلابی باغ کی حالت درست کی تو اس مقبرہ کی بھی کچھ مرمت کی گئی۔ بڑے گنبد کے علاوہ چھوٹی گنبدیاں بھی اکثر جگہ سے مرمت کی گئی تھیں۔ بارہ دری کے بیرونی فرش کے چاروں طرف اب لوہے کا جنگلہ ہے اور ڈپٹی کمشنر لاہور کی طرف سے یہاں اور گلابی باغ کی ڈیوڑھی پر ایک حکم چسپاں ہے جس کے مطابق ان عمارات کے خراب کرنے والے کو سزائے قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

بارہ دری سے مغرب کی طرف آہنی جنگلہ کے باہر ایک جھلار ہے جس سے کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چند معمولی درجہ کے نئے مکانات بھی کچھ عرصہ سے بن گئے ہیں۔ جھلار کے باہر اُن عمارتوں کے کھنڈروں کے نشانات نظر آتے ہیں جو اس باغ کے اندر واقع تھیں۔

شیخ محمد اسمٰعیل عرف میاں وڈا

فیضِ روحِ شیخ اسمٰعیل کی برکات سے
ہو رہا ہے آج بھی واں حفظِ قرآں دیکھئے

شیخ محمد اسمٰعیل حافظ قرآن و عالم دین۔ صاحب تدریس رہنما علوم اور مشائخ اہل یقین تھے۔ ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں بزمانہ شہنشاہ اکبر موضع جبہ بالا پنیہ (ڈاکخانہ ریلوے جنکشن) میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام فتح اللہ تھا۔ ذات کے کھوکھر زمیندار تھے۔ باپ دادا زراعت کاری کرتے تھے۔ آپ کے والد میاں فتح اللہ زراعت کے علاوہ علم فقہ و حدیث میں بھی واقفیت کامل رکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش کے بعد نقل مکانی کر کے موضع لنگر مخدوم پر شیخ عبدالکریم میں چلے آئے۔ جو طریقہ سہروردیہ کے متشرع فاضل اور عارف کامل تھے۔ پانچ سال کی عمر میں میاں اسمٰعیل علوم دینی کی تعلیم کے لیے شیخ عبدالکریم کی درس گاہ میں آ گئے۔

جب آپ بارہ سال کے ہوئے تو استاد نے درویشان درس کے لیے آٹا ہم پہنچانے کی خدمت آپ کے سپرد کی۔ چند سال تک یہ کام چلتا رہا۔ ایک دن آٹے کو دیر ہو گئی۔ مہتمم مطبخ شیخ کے پاس پہنچا۔ آپ نے ایک درویش کو تاخیر کا باعث دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ درویش جب چکی خانہ میں آیا تو دیکھا کہ اسمٰعیل سر بسجود ہیں اور چکی خود بخود چل رہی ہے۔ وہ حیران و متحیر ہو کر شیخ کے پاس دوڑا آیا۔ شیخ یہ سن کر خود وہاں گئے ”دید کہ آسیا بحکم غیب درگردش است و اسمٰعیل سر بمراقبہ انداختہ از دنیا و ما فیہا خبر ندارد۔“ آپ بھی یہ حال دیکھ کر واپس چلے آئے۔ جب تھوڑی مدت کے بعد اسمٰعیل آٹا لے کر آئے تو شیخ نے کہا آج سے چکی پیسنے کی خدمت تم سے چھڑائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کام کی خاطر تم کو تکلیف دینا درحقیقت فرشتوں کو تکلیف دینا ہے۔

آپ علم باطنی میں صاحب کمال ہو کر بیٹا ئیس سال کی عمر میں لنگر مخدوم سے لاہور آئے اور آتے ہی چالیس دن تک مزار حضرت علی مخدوم گنج بخش ہجویری پر معتکف رہے۔

آپ نے اپنا مستقل قیام محلہ تیل پورہ میں رکھا۔ محلہ تیل پورہ زمانہ قدیم میں اسی جگہ آباد تھا جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ وہاں ایک مسجد زمانہ قدیم سے تھی لیکن ایک ہندو جوگی کا اس پر قبضہ تھا۔ وہ مسجد آپ نے اس سے واگذار کرائی اور وہیں درس و ہدایت خلق کا شغل اختیار کیا۔ اس مسجد کی مرمت بعد میں زمانہ شاہجہان کی کسی شاہی دایہ نے کرائی تھی۔ یہ مسجد آپ کے مزار کے احاطہ میں واقع ہے اور اس زمانہ سے لے کر اب تک کہ سوا تین سو سال گذر چکے ہیں درس قرآن برابر جاری ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔

حضرت شیخ محمد اسمٰعیل فرمایا کرتے تھے کہ حفظ قرآن کا فیض خدا چاہے تو میرے بعد بھی جاری رہے گا چنانچہ نہ صرف آپ کی اولاد و احفاد میں قرآن کے حفاظ اب تک چلے آ رہے ہیں بلکہ آج تک آپ کی درس گاہ سے ہزاروں اور لاکھوں بینا و نابینا قرآن حفظ

ؔ صاحب تحقیقات چشتی (ص ۲۹۴ پر) لکھتے ہیں۔ آپ اس وقت تلاوت قرآن شریف میں مشغول تھے۔

ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں آپ کی درگاہ و درس کے متولی حافظ احمد الدین موجود تھے۔ مصنف خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور نے آپ کو اور آپ کے والد حافظ شرف الدین (وفات سنہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) کو دیکھا ہے۔

۵ شوال ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء کو بعہد عالمگیر حضرت شیخ اسمٰعیل وفات پا گئے۔ آپ کے دروازہ مزار پر یہ قطعہ تحریر ہے :-

شنو تاریخ آں دریکئے معنی — کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف

دل و جاں کردہ قربان الٰہی — کہ اسماعیل ثانی بود بے حرف

عالمگیر نے آپ کا فیضان عام دیکھ کر سات مزروعہ چاہات جو مسجد کے گرد و نواح میں تھے۔ آپ کے لنگر اور طلبا اور درویشوں کے اخراجات کے لیے معافی میں دیئے۔

لاہور میں مشہور ہے کہ اگر کسی کا ذہن کند ہو اور وہ آپ کی قبر پر سے "لماس" کا تنکہ کھالے تو اس کو قرآن شریف جلدی حفظ ہو جاتا ہے۔ اب بھی اس خانقاہ کے ساتھ دو چار مزروعہ (اراضی اسی بیگھہ) عطیہ مہاراجہ رنجیت سنگھ موجود ہے۔ مہاراجہ خود بھی حافظ شرف الدین متولی کے زمانہ میں اس خانقاہ میں حاضر ہو کر نذر دیتے رہے ہیں۔ ایک قدیمی چاہ شاہان مغلیہ کے زمانہ کا بھی اس مزار کے ساتھ ہے۔ صاحب تحقیقات چشتی کے زمانہ میں یہاں ۱۲۰ نابیناؤں، یتیموں، لنگڑوں اور تندرستوں کو جو حفظ قرآن میں مصروف رہتے تھے۔ دو وقتہ خوراک کے علاوہ لباس بھی ملتا تھا اور رہائش بھی ان کی یہیں ہوتی تھی۔

مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے قتل کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ابتدائی ایام (۱۸۴۳ء) میں راجہ ہیرا سنگھ وزیر خلف راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سوچیت سنگھ برادر راجہ دھیان سنگھ کے درمیان جو لڑائی درس میاں وڈا کے متصل ہوئی اس میں خانقاہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کئی قرآن شریف ضائع ہو جانے کے علاوہ دینی علوم کا کتب خانہ بھی ضائع ہو گیا۔ اس وقت حافظ شرف الدین متولی زندہ تھے۔ انھوں نے راجہ سوچیت سنگھ سے بار بار کہا کہ یہ جگہ آپ کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ آپ شالامار باغ میں چلے جائیں وہ جگہ محفوظ ہے۔ راجہ سوچیت سنگھ نے کہا کہ ہم تمہاری خدمت کریں گے کوئی فکر نہ کرو۔ اس وقت صرف پچاس آدمی اُس کے ہمراہ تھے۔ راجہ ہیرا سنگھ کو خبر ہوئی وہ پنڈت جھلا کے ہمراہ توپ خانہ اور فوج لے آیا۔ افسران فوج نے راجہ ہیرا سنگھ سے کہا کہ یہ فقیروں اور درویشوں کا مکان ہے توپ کے گولوں سے تباہ ہو جائے گا۔ راجہ ہیرا سنگھ نے کہا ہم اس کی مرمت کرا دیں گے۔ راجہ سوچیت سنگھ نے جو احاطہ خانقاہ کے اندر تھا۔ درویشوں کو بطور تصدق پچیس روپے عطا کئے اسی اثنا میں گولہ باری شروع ہو گئی جس کے صدمہ سے مزار کی ایک دیوار گر پڑی اور لڑائی دست بدست شروع ہو گئی۔ آخر راجہ سوچیت سنگھ مارا گیا۔

اس کے بعد راجہ ہیرا سنگھ کے حکم سے خانقاہ کی مرمت تو ہوئی لیکن کتابوں کا نقصان کسی طرح پورا نہ ہو سکا۔ درس اب بھی جاری ہے۔

شیخ سعدی بلخاری

قبر سعدی تو سلامت ہے کسی صورت مگر — گلشن سعدی ہے گلشن یا بیاباں دیکھئے

شیخ سعدی شاہجہان اور عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کے ایک بزرگ تھے۔ تاریخ لاہور میں (ص ۲۰۱) پر لکھا ہے کہ

ب مجالس میں ان کی سینکڑوں کراماتیں درج ہیں۔ پہلے فوج شاہجہانی میں ملازم رہے۔ لیکن طبیعت میں چونکہ استغراق تھا اس لیے نوکری چھوڑ پہلے شیخ اسد اللہ کے مرید ہوئے لیکن جب شیخ نے ان کا استغراق دیکھا تو وہ اپنے مرشد حضرت شیخ آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی کے پاس لے گئے۔

شیخ آدم بنوری بیت اللہ جاتے ہوئے ان کو لاہور چھوڑ گئے جہاں چالیس سال آپ رہے یہیں آپ نے ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء میں بعد الگیارہ انتقال کیا۔ آپ کی نظر بعض اثر سے آسیب زدہ مریضوں کو بہت جلد آرام آجاتا تھا۔ خزینۃ الاصفیا اور مناقب سید آدم بنوری میں بھی آپ کے حالات درج ہیں۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی قبر پر گنبد تو نہ بنایا گیا مگر احاطہ مزار میں اور بہت سی پُرتکلف عمارتیں تعمیر کرائی گئیں خصوصاً ایک وسیع باغ نے جو احاطہ قبر کے گرد کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس جگہ کو بہت رونق دی۔

آپ کی قبر جو پختہ خشتی چونہ گچ ہے دو فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے قبر کے گرد ایک چار دیواری بطور بارہ دری تھی۔ باغ کی آبیاری کے لیے دو بڑے بڑے کنوئیں بھی تھے۔ ایک سکھوں کے زمانہ میں باغ کے ساتھ ہی اُجڑ گیا۔ دوسرے کنوئیں پر مزنگ کے ہدایت خاں بلوچ نے قبضہ کر لیا جس نے باغ کی زمین پر زراعت شروع کر دی چنانچہ اب اس کی اولاد اس پر قابض ہے۔

اب صرف مزار اور اس کی چار دیواری باقی ہے۔

مہابت خاں

مقبرہ و باغ دونوں نے یہ مل کر دی ندا
آیئے تصویر محرومیئ ارماں دیکھئے

مورخین لاہور میں مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور لاہوری نے سب سے پہلے لاہور اور اس کے نواحی حالات پر خامہ فرسائی کی۔ ان میں بھی مولوی نور احمد چشتی کی کتاب تحقیقات چشتی زیادہ مشہور رہی۔ ان کے بعد رائے بہادر کنہیا لال اور جج محمد لطیف نے تاریخ لاہور پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ہسٹری آف لاہور (انگریزی) مصنفہ جج محمد لطیف کا درجہ بہت بلند ہے۔

مہابت خاں کے مقبرہ کے متعلق لاہور کی قدیم تاریخوں میں جو کچھ لکھا ہے، پہلے ان کا اقتباس درج کرتا ہوں۔ مصنف تحقیقات چشتی (ص ۲۶۲ پر) اسرار الامرا[1] کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

> "اصل نام ان کا مہابت خاں خان خاناں، باپ کا نام غیور بیگ کابلی تھا۔ عوام محبت خاں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مقبرہ اور باغ اپنی حین حیات تعمیر کرایا۔ ہفت ہزاری منصب رکھتے تھے۔ شاہجہان نے ان کو خطاب اور جاگیر اور ماہی مراتب عطا کر رکھا تھا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں بمقام لاہور بمرض تپ انتقال کر گئے اور اپنے باغ کے اندر اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں دفن ہوئے۔"

---

[1] مآثر الامرا تو ایک مشہور ضخیم کتاب تین جلدوں میں ہے۔ معلوم نہیں اسرار الامرا کونسی کتاب ہے؟

مصنف ہسٹری آف لاہور لکھتے ہیں :۔

"اس کا حقیقی نام زمان بیگ اور اس کے باپ کا نام غیور بیگ کابلی تھا۔ جہانگیر اپنی توزک میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔ میری ولی عہدی کے زمانے میں زمان بیگ احدی کی خدمات انجام دیتا تھا اور پانصدی کے منصب پر تھا۔ میں نے تخت نشینی کے بعد اسے مہابت خاں کا خطاب اور ڈیڑھ ہزاری منصب دیا اور خلافت کا بخشی بنایا۔"

جہانگیر نے پھر اس کو ہفت ہزاری منصب دے کر افواج کا کمانڈر انچیف بنایا۔ جب شاہجہان نے جہانگیر سے بغاوت کی تو مہابت خاں کو اس کی اصلاح و تنبیہ کے لیے بھیجا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مہابت خاں نے طاقت حاصل کر کے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا۔ آخر نور جہاں نے بڑی حکمت عملیوں اور خون خرابے کے بعد اس کو مہابت خاں کی قید سے رہائی دلائی۔ اس کے بعد مہابت خاں کو دکن کا صوبہ ملا جہاں اس نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ خان خاناں اس کا خطاب تھا۔ وہ ۱۶۳۴ء میں وفات پا گیا۔ پھر حاشیہ (ص ۱۵۶) میں لکھتے ہیں :۔

"مہابت خاں اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے دکن بھیجا گیا تھا۔ وہیں بمقام برہان پور بعارضہ ناسور انتقال کر گیا"

اس لیے لاہور میں جو باغ اور مقبرہ شالامار باغ سے مغرب اور باغبانپورہ سے جنوب کی طرف سڑک شالامار باغ کے متصل واقع ہے وہ اس مہابت خاں کا نہیں جس کا نام زمان بیگ تھا اور جس کو جہانگیر نے خان خاناں کا خطاب دیا تھا اور جس نے جہانگیر کو کابل جاتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے اپنے پانچ سو جان نثار راجپوتوں کے ساتھ نظر بند کر دیا تھا۔

زمانہ بیگ کا فی الواقعہ برہان پور میں انتقال ہو چکا تھا جس کی تصدیق ایلیٹ اور بادشاہ نامہ شاہجہان سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی وفات کی اطلاع ۱۴ جمادی الاول ۱۰۴۳ھ کو بادشاہ کو ملی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مہینہ کے ابتدائی حصہ ہی میں فوت ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ مہابت خاں خان خاناں کو بھگندر (ناسور) کا عارضہ ایک عرصہ سے تھا۔ اس کے اسی دیرینہ رفیق نے اس کی جان لی معتمد خاں نے برجستہ تاریخ کہی۔ "زمانہ آرام گرفت"[1]

---

[1] "زمانہ آرام گرفت" سے ۱۰۴۵ھ سالِ وفات نکلتا ہے۔ بادشاہ نامہ کے حوالہ سے ج محمد لطیف ۱۶۳۴ء لکھتے ہیں۔ ظفر نامہ شاہجہان میں مولوی ذکاءاللہ صفحہ ۱۷۶ پر جلوس ہفتم شاہجہانی یعنی ۱۰۴۳ھ / ۱۶۳۴ء کے واقعات میں ذکر کرتے ہیں :۔
"خان زمان ۱۴ جمادی الاول ۱۰۴۳ھ کو اپنے باپ کی درشت خوئی اور آزار جوئی سے تنگ آ کر بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ اسی تاریخ کو بادشاہ کو برہان پور میں مہابت خاں کے انتقال کر جانے کی اطلاع ملی۔ انگریزی ۱۶۳۴ء ہجری سال ۱۰۴۳، ۱۰۴۴ کے مطابق ہے۔ لیکن قطعہ تاریخ سال وفات ۱۰۴۵ھ ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ بادشاہ کو اس کی موت کی اطلاع ۱۰۴۳ھ میں ملتی ہے۔ ممکن ہے تاریخی قطعہ کے مصرع اول میں دو عدد کے تخرجہ کا اشارہ ہو۔

۱۹۲۳ء میں جب راقم اس مقبرہ اور باغ کو دیکھنے کے لیے دوبارہ گیا تو کوئی اس باغ کو محبت خاں، کوئی مہابت خاں اور کوئی دارا شکوہ کا باغ بتاتا تھا۔ چونکہ یہ باغ میاں فیملی باغبانپورہ کے قبضے میں تھا، راقم نے میاں حق نواز مرحوم بیرسٹر کو اصلیت کی تحقیق کیلئے خط لکھا۔ انھوں نے ۱۲ فروری ۱۹۲۳ء کو جواب لکھا کہ:۔

"باغ مذکور اس وقت میاں شاہنواز[۱] صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور وارثان میاں ظہور الدین کی ملکیت میں ہے۔ غالباً دارا شکوہ نے اس کو تعمیر کرایا۔ میاں کریم بخش مرحوم کی زبانی ایک دفعہ سنا تھا کہ اس کے وسط میں جو قبر تھی وہ مہابت خاں کی تھی۔"

چونکہ تاریخ میں ایک ہی مہابت خاں جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے سے مشہور چلا آتا ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ اس لیے لاہور میں یہی مشہور رہا ہے کہ یہ اسی مہابت خاں کی قبر ہے جس نے جہانگیر کو نظر بند کیا تھا لیکن اس کی وفات چونکہ برہانپور (دکن) میں ہوئی، اس لیے شیخ محمد لطیف نے اس قبر کو زمانہ بیگ مہابت خاں کی قبر لکھنے میں وہ غلطی نہیں کی جو مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تحقیقات میں کی لیکن یہ نہیں بتایا کہ آخر یہ کس مہابت خاں کی قبر ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے مہابت خاں کا اصل نام زمان بیگ یا زمانہ بیگ تھا۔ خطاب مہابت خاں اس کو جہانگیر نے دیا تھا اور اس زمانہ میں عمدۃ الملک، حمدۃ الملک، نصرت جنگ، فیروز جنگ، اعتمادالدولہ وغیرہ کے علاوہ اس قسم کے خطابات کا جن کے آگے خان کا لفظ آتا تھا، زیادہ چرچا تھا۔ چنانچہ بہرہ مند خاں، مقرب خاں، آصف خاں، وزیر خاں، امانت خاں، خوش خبر خاں، محمد قلی خاں، اعتماد خاں، معتمد خاں، سعادت خاں، لشکر خاں، خانہ زاد خاں بہت سے خطابات خدمات کے عوض ملا کرتے تھے۔ انہی میں مہابت خاں بھی ایک خطاب تھا۔ چنانچہ اس کے تین بیٹوں میں سب سے بڑے لہراسپ خاں کو مہابت خاں ثانی[۲] اور دوسرے کو جس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا، خانہ زاد خاں کا خطاب ملا اور تیسرے بیٹے امان اللہ کو جہانگیر نے الہ داد خاں، پسر جلال افغان کی شورش (۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء) دور کرنے پر شمشیر خاصہ عنایت کی[۳]۔

اسی طرح دکن کے ایک نامور شخص محمد ابراہیم خاں کو جو ابوالحسن تانا شاہ والیٔ گولکنڈہ کی فوج کا سپہ سالار اور خلیل اللہ خاں کے خطاب سے ممتاز تھا، عالمگیر نے فتح گولکنڈہ کے بعد ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں مہابت خاں کا خطاب اور ہفت ہزاری ہشت ہزار

---

[۱] ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں میاں شاہنواز کی والدہ نے مسجد کی مرمت بھی کرائی۔

[۲] بادشاہ نامہ عالمگیری (جلد ہشتم تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ) میں ص ۲۷۷، ۲۷۸ پر لکھا ہے کہ مہابت خاں بادشاہ (عالمگیر) کی خدمت میں بڑا گستاخ تھا اور اس سے سر دربار بعض ایسی حرکات ہو جاتی تھیں جو بادشاہ کو ناگوار گزرتی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو مہم دکن پر روانہ کیا تو جعفر خاں وزیر سے خلوت میں کہا کہ مہابت خاں کو سمجھاؤ کہ سر دربار ایسے لغو کلمات عرض نہ کیا کرے۔

[۳] کارنامہ جہانگیری مولوی ذکاء اللہ دہلوی صفحہ ۱۲۸

سوار کا منصب[1] دیا۔ اسی مہابت خاں کو جس کا نام محمد ابراہیم اور حیدر آبادی خطاب خلیل اللہ خاں تھا، دو سال کے بعد بادشاہ نے لاہور کا گورنر مقرر کیا۔

مہابت خاں محمد ابراہیم صوبہ دار لاہور کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ مآثر الامراء جلد دوم میں درج ہے۔ لکھا ہے :

اس زمانے میں عاقل خاں میر عسکری خوافی الاصل (دکن) سے لاہور آیا۔ چونکہ عاقل خاں عالمگیر کا پروردہ تھا، اس نے بادشاہ سے قلعہ لاہور دیکھنے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے صوبہ دار مہابت خاں کے نام پروانہ لکھا کہ اس کو قلعہ دیکھنے کی اجازت دی جائے لیکن مہابت خاں نے بادشاہ کو جواب میں لکھا کہ میں بعض وجوہات سے نہ اس کو قلعہ دیکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں اور نہ اس کو ملاقات کے لیے اپنے پاس بلا سکتا ہوں۔ اول یہ کہ حیدر آبادی اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو سیر و تماشا کے بہانہ سے شاہی عمارات دکھائی جائیں۔ دوسرے یہ کہ ملاقات میں جس قسم کے سلوک کا وہ مجھ سے تمنی اور خواہش مند ہے وہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عاقل خاں قلعہ کی سیر سے محروم رہا۔ لکھا ہے کہ وہ بڑا بد مزاج اور آزاد منش تھا۔ سنہ ۱۱۰۸ھ میں انتقال کر گیا۔ شاعر تھا۔ رازی اس کا تخلص تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود ہجر کہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

راقم یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اعظم گڑھ کے رسالہ معارف بابت جون ۱۹۴۲ء میں مہابت خاں کے باغ اور مقبرہ کے متعلق (محمد شجاع الدین ایم۔ اے لاہور کا) ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

"مہابت خاں زمانہ بیگ کا انتقال برہان پور میں ہوا لیکن اس کی وصیت کے مطابق اسے دہلی میں شاہ مردان علی مرتضےٰ کی قدم گاہ کے قریب دفن کیا گیا۔"

اس کے بعد وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "مہابت خاں چونکہ لاہور کا گورنر ہو چکا تھا اور رقعات عالمگیری نولکشور ایڈیشن رقعہ نمبر ۱۴۵ میں مرقوم ہے کہ "مہابت خاں حیدر آبادی ظاہر اور لاہور گذشت۔ وغیرہ از نبیرہ کہ بپدرش بحضور پدر رحلت کردہ وارث دیگر ندارد۔ بر قبولی بیوتات آں جا بر نگارد....." اور چونکہ ایران کو خیر باد کہے مدت گزر چکی تھی، حیدر آباد سے بھی اب کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے اغلب گمان ہے کہ لاہور ہی میں وہ سپرد خاک کیا گیا ہو اور لاہور میں جو مزار مہابت خاں کے نام سے منسوب ہے وہ اسی حیدر آبادی مہابت خاں کا ہو۔"

مہابت خاں چونکہ ضعیف العمر تھا، ممکن ہے اس نے لاہور آ کر اپنی زندگی ہی میں مقبرہ اور مقبرہ کے ساتھ اس زمانہ کے رواج کے مطابق باغ بھی احداث کرا لیا ہو اور چونکہ لاہور میں ایک سال ہی کے اندر سنہ ۱۰۹۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تھا،

---

[1] ابوالحسن، مدن پنڈت (مادنا برہمن) اور اس کے بھائی اکنہ کی ہر بات کو وحی آسمانی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دونوں مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ جب شاہزادہ عالمگیر (شاہ عالم) نے مدنا اور اکنا کو شکست دی تو انھوں نے ابوالحسن کو خلیل اللہ کے خلاف بھڑکا کر اس کے قتل کا حکم لکھوا لیا۔ خلیل اللہ خاں کو علم ہوا تو وہ بھاگ کر شہزادہ کی فوج میں چلا آیا اور اس کی معرفت عالمگیر کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے اسے خطاب و منصب کے علاوہ پچاس ہزار روپیہ نقد بھی دیا۔

بس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کے نبیرہ (پوتے) نے باغ اور مقبرہ کی عمارت کی تکمیل کی ہو۔

تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ باغ کی کل زمین دو بیگہ سوا تین کنال تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن صاحب تحقیقات چشتی نے باغ کی عمارات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ اس مختصر سے باغ کو باغ دلکشا ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ باغ کی عمارات اپنے خوردہ کاری محرابوں نشست گاہوں، طاقچوں، برجوں اور چبوتروں، بارہ دریوں، فواروں، حوضوں کی وجہ سے اکثر قدیمی باغات پر فوقیت رکھتی تھیں۔ باغ کی دو قد آدم بلند دیوار کے اندر ایک آسمانی کنواں بھی تھا جو موجود تو ہے مگر اب آسمانی نہیں رہا۔ ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی اسی زمانہ کی ہے۔

مہابت خاں کی قبر ایک پختہ چبوترہ پر تھی۔ چبوترہ کے چاروں طرف ۱۸۶۰ء تک چوسر کی شکل میں چار خیابان بھی تھے۔ بادشاہ گردی کے زمانے میں محمود نام ایک زمیندار نے اس پر قبضہ کر کے زراعت شروع کر دی۔ جب رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو اس نے یہ باغ فقیر عزیز الدین کو دے دیا۔[1] فقیر عزیز الدین نے از سر نو اس کو آباد کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا فرزند فقیر چراغ الدین بھی اس کی مرمت رکھیت اور غور پرداخت کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں یا اس کے پس و پیش وارثان فقیر چراغ الدین نے جہانگیر اینڈ کمپنی پارسی سوداگران کے پاس اس کو صرف نو سو روپیہ میں فروخت کر دیا۔

پارسی سوداگران کی ملکیت کی وجہ سے یہ باغ پارسی سیٹھوں کا باغ کے نام سے مشہور ہو گیا اور قریباً ۴۰-۴۲ سال تک یہ باغ اسی نام سے مشہور رہا۔ اس دوران پارسی لوگ مسجد اور قبر کا بہت ادب و احترام کرتے رہے۔ قبر پر ہر جمعرات کو ان کی طرف سے چراغ جلایا جاتا اور مسجد کو کوڑا کرکٹ سے صاف کیا جاتا تھا۔

۱۸۹۰ء میں یا اس کے قریب میاں ظہور الدین مرحوم باغبانپوری نے میاں میر کے ایک پارسی سے چھ ہزار روپیہ میں یہ باغ خرید لیا۔ اب یہ باغ انہی کے ورثا کی ملکیت ہے۔

۱۹۴۳ء میں باغ اور مقبرہ کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ دیوار بیرونی تو ابھی تک نیم شکستہ حالت میں موجود ہے۔ صدر دروازہ جو مغرب کی جانب ہے، بند رہتا ہے اس کے اوپر پارسیوں نے ایک منزل اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرائی تھی یہ ان کے عہد کی یادگار سمجھنی چاہیے۔ چھوٹے سے چبوترہ پر جو درمیان میں کچا ہے مہابت خاں کی قبر تھی، اب وہ قبر امتداد زمانہ سے مٹ چکی ہے ؎

بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعد مرگ
پاک ہیں یاروں کی رسم فاتحہ خوانی سے ہم

باغ کی شمالی جانب درخت ہیں اور مشرق کی طرف کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ بقول محمد شجاع الدین صاحب کسے معلوم ہے کہ اس ویرانے میں

---

[1] ہسٹری آف لاہور میں یہ باغ دارا شکوہ کے نام سے درج ہے۔ لکھا ہے کہ مہاراجہ شیر سنگھ نے یہ باغ سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کو دے دیا اور اس کے بیٹے نے اس کی عمارتیں اور دیواریں گرا کر اس کی اینٹیں فروخت کر دیں۔ پھر لکھا ہے کہ اس باغ کی دس ایکڑ زمین مولوی ظہور الدین وکیل باغبانپوری کے قبضہ میں ہے۔ مصنف ہسٹری آف لاہور کی اور باتیں تو صحیح ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یہ باغ دارا شکوہ نے احداث کرایا تھا۔

خاور و گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے ابو الحسن قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کا سپہ سالار عالمگیر کے عہد کا ایک ہفت ہزاری امیر اور پنجاب کا سابق حاکم محو خواب ہے۔

باغبانپورہ کی انجمن تبلیغ الاسلام نے فروری ۱۹۴۲ء سے باغ کے ایک ملحقہ دالان میں ایک مکتب جاری رکھا ہے جس میں بچے پڑھتے ہیں۔ باغ کے قرب و جوار میں "نئی آبادی" نے کچھ رونق پیدا کر دی ہے۔

نواب میاں خاں

دیکھنا ہو باغ عالم میں اگر رنگ فنا
آئیے پھر باغ نواب میاں خاں دیکھنے

نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان کا فرزند تھا۔ حکومت لاہور کی نیابت پر بھی فائز رہا۔ اس کی فلک رفعت حویلی اب بھی لاہور میں "حویلی میاں خاں" کے نام سے رنگ محل لاہور کے متصل اپنے باقماندہ دروازہ کی ڈیوڑھی سے اپنی شان و شوکت اور رفعت و وسعت کا ثبوت دے رہی ہے۔ حویلی کے وسیع احاطہ میں تو صدہا لوگ اپنے اپنے نو تعمیر مکانات میں رہائش پذیر ہیں البتہ دروازہ کی بیرونی دیوار میں جو عین بازار میں واقع ہے سرکار انگریزی نے سنگ مرمر کی ایک تختی لگا کر اور اس پر حویلی مذکور کی کچھ کیفیت لکھ کر اس کو محکمہ آثار قدیمہ میں داخل کر لیا ہے۔

نواب میاں خاں پنجاب کا نائب ناظم اور اس باپ کا بیٹا تھا جس کی ہر ادا پر شاہجہان قربان ہوتا تھا اس لیے نقلئے نام کے لیے اس نے لاہور میں اس عالیشان حویلی کے علاوہ ایک بے نظیر باغ بھی تعمیر کرایا۔ جو اپنے فواروں۔ حوضوں۔ نہروں۔ آبشاروں اور مختلف طبقوں کے لحاظ سے ایک بہترین یادگار تھا۔ لاہور کی تاریخوں سے اس باغ کے انقلابی دور کے جن مصائب کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکی ہے۔ وہ سطور ذیل سے ظاہر ہے: —

باغ کے جنوب کی طرف ایک ڈیوڑھی کلاں مع دروازہ چوبی کھٹ چوبی موجود تھی۔ اس کے آگے پھر ایک اور مختصر سی ڈیوڑھی تھی جس کے چند زینے طے کرنے کے بعد باغ میں پہلا قدم رکھا جاتا تھا۔ باغ کے عین درمیان جنوب کی طرف ایک مربع حوض تھا اس کے سر پر شمالی دیوار کے ساتھ آبشار "سراپا سنگ سبز" کا لطف دکھاتی تھی۔ ڈیوڑھی کے اوپر ایک خوشنما منقش منزل تھی جس کی بارہ دری پر بیٹھ کر دور دور کی کیفیت نظر آیا کرتی تھی۔ جگہ جگہ سنگ سیاہ کا فرش تھا زینے بھی سنگ سیاہ ہی کے تھے۔ باغ کے بالمقابل دو مسجدیں "مسجد اور جواب مسجد" تھیں۔ یہ مسجدیں گو ویران ہیں لیکن اب بھی موجود ہیں اور شاید دنیا میں اپنی قسم کی پہلی ایجاد ہے کہ مسجد کے مقابل ایک اور مسجد صرف خوشنمائی اور زینت کے لیے بنا دی گئی ہو۔

نواب میاں خاں کے غلام مشکی نام کی زیر نگرانی یہ باغ اور اس کے مکانات جو حقیقتاً محلات ہی کا نمونہ تھے تعمیر کرائے گئے تھے۔ اس لیے اس باغ کو "مشکی محل" بھی کہتے ہیں اس تعمیر کے ساتھ ہی غلام کا نام بھی صفحات تاریخ میں زندہ رہ گیا ہے یہ باغ جس میں نواب میاں خاں کا مقبرہ بھی اس کی وفات (۱۰۸۲ھ) کے بعد تعمیر ہوا ہے موضع بھوگیوال نزیل لاہور کے غربی جانب ہے۔ اور بھوگیوال اور اس باغ کے درمیان صرف ایک ہی سڑک ہے۔

راقم ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو بسنت کے دن جب مواضعات چاہ میراں۔ بھوگی وال۔ سمادھ حقیقت رائے اور باغبانپورہ کے بعض "آثار قدیمہ لاہور" دیکھنے کے لیے گیا۔ تو باغ میاں خاں کی عبرت ناک حالت سے بھی بڑا متاثر ہوا۔

باغ میاں خاں پر جس کی عمارات اور جس کے عالیشان مقبرہ کی تعمیر خدا جانے کتنے عرصہ میں ہوئی ہوگی اور کتنی عظیم لاگت اس پر صرف ہو چکی ہوگی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آموں کے درخت جو غالباً مابعد زمانہ کے تھے موجود تھے۔ چار دیواری عہد قدیم کی جو بہت دور تک تھی۔ معدوم تھی۔ زمانہ مابعد کی چار دیواری بھی تین طرف سے گر چکی تھی صرف جنوبی غربی گوشہ کی دیوار کا کچھ ٹکڑا موجود تھا۔ شمالی اور غربی جانب درختوں کے متصل باغ کی موجودہ حدود ہی میں زراعت کا کام جاری تھا۔

اس باغ نے اپنی زندگی میں کئی دور دیکھے ہیں۔ پہلا دور تو نواب میاں خاں کی زندگی کا ہے۔ اس دور میں فوارے چلتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبشاریں جاری تھیں۔ ہر روش پھولوں کی کیاری اور ثمردار درختوں کی شاخ شاخ ثمردار تھی۔ نواب کبھی حوض کے کنارے باغ کی بہار دیکھتا۔ کبھی ڈیوڑھی کی بالائی منزل پر اپنے مصاحبوں سمیت مجلس گرم کرتا۔ یہ باغ اُس دور میں روح افزا تھا۔ اور روح کی بہرافزائش اُس کے بعد بھی اُس کے سید متبنّٰی کی اولاد کی فارغ البالی کے زمانہ تک رہی۔ لیکن جونہی مغل حکومت کو زوال آیا سکھ سورماؤں نے جنگلوں۔ جھاڑیوں اور جھنگیوں سے سر نکال کر نہ صرف اہل لاہور اور نواحی مضافات کو لوٹا۔ بلکہ عمارات قدیمہ کو بھی تہس نہس کر دیا۔ ان ظالموں نے باغ کے مکانات (ڈیوڑھیاں۔ بارہ دریاں وغیرہ) برباد کر دیں۔ اینٹیں خشت فروش لے گئے۔ اور بیش قیمت پتھر جس بڑے ڈاکو کے ہاتھ لگے وہ لے گیا۔

سمت ۱۸۹۰ ب کا زمانہ تھا کہ تیسرے دور میں یہ باغ سوچیت سنگھ کے قبضہ میں آیا۔ اس نے قبر کے تعویز سنگ سیاہ پر ہاتھ مارا اور قبر کو بالکل بے نشان کر دیا۔ دونوں بالمقابل مسجدوں کے درمیان جن کا صحن آٹھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد آتا ہے ایک وسیع بارہ دری ہے۔ اس کی دیواروں پر اس نے سکھ گروصاحبان کی تصاویر کھچوائیں۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس نے گرا دیں۔ چند ایک نئی تعمیر کرائیں۔ باغ کی چار دیواری کو مضبوط کرایا۔ اس زمانہ میں اس کا نام "باغ راجہ سوچیت سنگھ" تھا۔

چوتھا دور اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری زمانہ میں آیا۔ یہ باغ اُس نے شیخ امام الدین صوبہ کشمیر کو دے دیا۔ نواب شیخ امام الدین گو مسلمان تھا۔ لیکن جس ماحول میں اُس کی سیاسی پرورش ہو رہی تھی اس میں اسلامی عمارات کا ادب و احترام مفقود میں داخل تھا۔ چنانچہ اُس نے بھی مقبرہ کے بڑے چبوترہ سے پتھر کی بہت سی سلیں اکھڑوا کر اپنی حویلی (واقعہ سوتر منڈی) میں استعمال کیں۔ مقبرہ کے چبوترہ کی یہ جگہ اب تک خالی پڑی ہوئی ہے۔

پانچواں دور اس باغ پر نواب صاحبان قزلباش کے زمانہ میں آیا۔ سکھ حکومت کی تباہی کے بعد انگریزی عملداری میں بہت سے اسلامی مقبرے اور باغات نقشہ نزول میں درج ہو کر نیلام ہوتے رہے۔ انہی میں باغ میاں خاں بھی نیلام ہو گیا جس کو ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۴ء میں یا اس کے قریب نواب رضا علی خان[1] قزلباش نے ۲۲۰۰ سو روپیہ میں خرید لیا۔ چنانچہ اب اس کا نام باغ نواب رضا علی خاں ہے۔ ۱۸۸۹ء تک قدیم عمارت میں سے جنوبی سمت کی ڈیوڑھی کے علاوہ حوض مربع اور آبشار کے کچھ آثار بھی موجود تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نہ

---

[1] وفات نواب رضا علی خاں جون ۱۸۶۵ء

کہیں ڈیوڑھی کا نشان ہے اور نہ حوض اور آبشاری کا کہیں وجود ہے ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

شیخ جان محمد لاہوری

دیکھئے گنجینۂ علم حدیث و فقہ و دیں　　　روضۂ جان محمد کو بھی اے جاں دیکھئے

شیخ اسماعیل عرف میاں کلاں (میاں وڈا) کے اعظم ترین بلکہ محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔ لاہور کے محلہ پرویز آباد میں جو بیرون لاہور کی آبادی کا ایک مشہور محلہ تھا سکونت رکھتے تھے۔ وہیں شیخ عبدالمجید مرید حضرت شیخ اسماعیل میاں وڈا سے الف بے تے شروع کی اور وہیں لکھنے پڑھنے کا ہوش سنبھالا۔ ایک دن اپنے اُستاد کے ساتھ حضرت میاں وڈا کی خدمت میں گئے۔ میاں صاحب نے آپ کے چہرہ سے بچپنے تا فت ستارۂ بلندی" دیکھ کر فرمایا کیوں بیٹا کبھی جب اپنے استاد سے علم حاصل کر کے فاضل ہو جاؤ گے۔ تو کبھی کبھی تکرار حدیث کے لیے ہمارے پاس بھی آجایا کرو گے؟

جان محمد اُس وقت ابھی بچہ ہی تھے، ادب اور شرم کی وجہ سے جواب نہ دے سکے۔ شیخ عبدالمجید آپ کے اُستاد نے کہا، بیٹا کہو اگر آپ کی توجہ سے مجھے علم کی دولت نصیب ہو گئی۔ تو میں خدمت اقدس میں ضرور حاضر ہوا کروں گا۔ جان محمد نے حضرت میاں صاحب کی خدمت میں یہی الفاظ عرض کیے اس پر میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر خدائے علیم و خبیر کی جناب میں آپ کے ازدیاد علم اور خدمات دین حقہ کے لیے دعا مانگی۔

چنانچہ ابھی زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ جان محمد نے علوم ظاہری میں استعداد کامل حاصل کر لی۔ اور فقہ و حدیث میں اُسے اتنے مسائل ازبر ہو گئے اور اس کا ذہن رسا بعض مشکل نکات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچ جاتا کہ وہ اس کے پڑھانے سے عاجز آ گیا۔ چنانچہ شیخ عبدالمجید فرماتے ہیں کہ "جان محمد از من زیادہ تر قوت علمی حاصل کردہ است، و ہنوز طائر ہمتش بلند پرواز است" چنانچہ شیخ عبدالمجید نے آپ کو شیخ تیمور کے سپرد کیا جو لاہور کے نامور علماء میں سے تھے اور جن کی درس گاہ سے نامور عالم پیدا ہوتے رہے۔ شیخ حامد قادری سہروردی بھی شیخ تیمور ہی کے شاگرد و مرید تھے۔ جن کو صاحب خوارق و کرامات بھی بیان کیا جاتا ہے۔ شیخ تیمور بھی آپ کی قابلیت کا لوہا مان گئے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ نے درس گاہ تیموریہ سے بھی دستار فضیلت حاصل کر لی۔

اب شیخ جان محمد بالکل فارغ التحصیل تھے۔ اور آپ کو بچپن کا وہ وعدہ بھی یاد تھا جو حضرت میاں وڈا کے ساتھ آپ نے اُن کی درس گاہ میں حاضر ہونے کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ ایک روز کہ وہ روز سعید تھا آپ حضرت کی خدمت میں گئے۔ حجرہ کے پاس پہنچے، آواز دی، حضرت نے اندر بلایا اور بغل گیر ہو کر ملے اور اپنی مسرت کا اظہار کیا اس کے بعد شیخ جان محمد ہر دو شنبہ اور جمعہ کے دن حضرت کی درس گاہ میں آتے۔ اور تکرار حدیث سے استفادہ کرتے۔ اور جہاں شبہ ہوتا دریافت کرتے۔ جب تک حضرت میاں صاحب زندہ رہے۔ شیخ جان محمد نے اپنے وعدہ میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا۔

چونکہ سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں اس لیے معلوم نہیں کس عمر میں آپ نے انتقال کیا۔ البتہ بزمانہ بہادر شاہ شاہ عالم اوّل

خلف عالمگیر سنہ ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء میں آپ وفات پا گئے۔ پہلے پرویز آباد میں کہ آپ کا مسکن تھا آپ کو دفن کیا گیا۔ چند سال کے بعد اس محلے کے نمبردار کے خواب میں جو آپ کا مرید بھی تھا۔ آئے اور فرمایا میری نعش کو یہاں سے نکال کر حضرت میاں صاحب کے مزار کے پاس لے جا کر دفن کرو۔ خواب کے بعد نمبردار نے قبر سے آپ کی نعش کا صندوق نکالا اور حضرت میاں صاحب کے مزار کے پاس دفن کیا۔ آپ کے مزار پر ذیل کے اشعار ثبت ہیں ؎

جہان معنے و جان محمد — کہ از عشق محمد گشت محمود
خرد از فضل حق تاریخ سالش — وصال عاشق و معشوق فرمود

خزینۃ الاصفیا (جلد دوم ص ۱۰۴) میں ایک اور شیخ جان محمد سہروردی کا ذکر ہے۔ وہ شیخ اسمٰعیل المشہور میاں وڈا (میاں صاحب کلاں) کے مرید تھے۔ اور عالم و فاضل اور جامع کمال ظاہر و باطن تھے۔ مسجد قصاب خانہ میں جو آباد دیئے شہر کے باہر ہے درس دیا کرتے تھے ہزارہا لوگ ان کے چشمہ درس و تدریس سے فیض یاب ہوئے لیکن آپ نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ اور نہ کوئی اجرت کبھی طلب کی۔ چکی پیس کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ شیخ اسمٰعیل کو خبر ہوئی پوچھا گذارہ کی کیا صورت ہے۔ کہا بہر حال شکر ہے "بہ آرام تمام مے گذرد" حضرت شیخ اسمٰعیل نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ آپ چکی پیس کر بسر اوقات کرتے ہیں۔ درس بھی اور اس قدر شاقہ محنت بھی۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں کہ شیخ اسمٰعیل نے ایک تعویز فراخی رزق حلال کے لیے لکھ کر دیا۔ آپ تھوڑے ہی دنوں میں دنیا کی نعمتوں سے مستغنی ہو گئے لیکن ان سے عرض کیا کہ مجھے دولت عقبیٰ چاہئے اس دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت آپ حضرت شیخ کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ سنہ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء میں آپ انتقال فرما گئے۔ لاہور سے باہر شرق رویہ مسجد قصاب خانہ قدیم کے متصل آپ کا مزار ہے۔

تحقیقات چشتی میں بھی (ص ۲۰۲ تا ۲۰۶) ان کا حال درج ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ آپ مسجد قصاب خانہ کے امام تھے اور چکی پیس کر امامت کرتے اور طلباء کو درس دیتے تھے۔ سنہ ۱۰۶۰ھ میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ لوگوں کی درخواست پر حضرت شیخ اسماعیل نے اپنے مرید شیخ جان محمد کو وہاں درس و امامت کے لیے بھیجا۔ تحقیقات میں سال وفات آپ کا ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء لکھا ہے۔ میاں جان محمد صاحب اولاد تھے۔ ان کی اولاد موضع چک مجاہد (غرب رویہ دریائے چناب) رہتی ہے۔ سنہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں ان کی اولاد سے ایک شخص حافظ درویش یہاں آیا تھا اور وہ میاں احمد الدین سجادہ نشین درس میاں وڈا کو اس مزار کا متولی بنا گیا تھا۔ یہ مسجد اور مزار اب سجادہ نشینان درس میاں وڈا کے ماتحت ہے۔

پیر محمد خاں عدالتی

کر دیا تھا جس نے ویرانہ کو بھی رشک بہار
آج وہ رشک بہار خلد! ویراں دیکھئے

جن دنوں نواب شاہ نواز خاں خلف شہریار الدولہ نواب زکریا خاں حاکم لاہور تھا۔ ان ایام میں پیر محمد خاں عدالتی بہت مشہور شخص گزرا ہے جو اہل لاہور کے دیوانی و فوجداری مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ اسی لیے وہ عدالتی کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ پیر محمد خاں نے

سنہ ۱۱۵۹ھ میں ایک وسیع باغ تعمیر کرایا۔ پھر باغ کے اندر ہی اپنا مقبرہ بھی بنوایا جس پر ایک بلند گنبد اب تک اُس کی یادگار موجود ہے۔ باغ ہر سال نذرِ خزاں ہوتا تھا اور ہر سال فصلِ بہار پھر اُس کو سرسبز و شاداب کر جاتی تھی لیکن سکھوں کے عہد میں بادِ صرصر کی بجائے بادِ حوادث کا مقابلہ یہ باغ نہ کر سکا۔ اور آخر تباہ ہو کر بے نشان ہو گیا۔ البتہ مقبرہ ایک خام بدرو کے کنارہ لاٹ صاحب کی کوٹھی یا گورنمنٹ ہاؤس کے شرق رویہ اس سڑک پر موجود ہے۔ جو میاں میر کی طرف نکل جاتی ہے۔

نواب جانی خاں

ابر گریاں دیکھئے گلہائے خنداں دیکھئے
ہر طرح نیرنگئے گردون گرداں دیکھئے

انتظام الدولہ نواب جانی خاں نواب میر معین الملک کا بھائی اور نواب قمر الدین خاں وزیر احمد شاہ بادشاہ دہلی کا بیٹا تھا۔ جس طرح میر معین الملک کو عام لوگ میر منّو کہتے تھے اسی طرح ممکن ہے جانی خاں کا اصل نام جان محمد خاں ہو۔

بادشاہ کی طرف سے نواب معین الملک پنجاب کا حاکم تھا اور صوبۂ لاہور کہلاتا تھا۔ اس کا بھائی نواب جانی خاں افواجِ پنجاب کا سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ درّانی نے جو حملہ سنہ ۱۱۶۲ھ میں لاہور پر کیا ہے۔ اُس کا محاذ بیگم پورہ۔ باغبانپورہ اور حضرت ایشاں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی لڑائی میں نواب جانی خاں ۲۰ رجب کو اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہوا نثار ہو گیا۔

معین الملک نے بھائی کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ مغلوں کے دستور کے مطابق مقبرہ کے چاروں طرف ایک وسیع و عریض باغ بھی تعمیر کیا۔ مقبرہ کی عمارت مربع تھی۔ اندر باہر سے استرکاری۔ اپنے خوبصورت نقش و نگار سے یہ عمارت شاہانِ مغلیہ کی عمارت کی یاد دلاتی تھی۔

لیکن آج پونے دو سو سال کے بعد باغ اور مقبرہ کی کیا حالت ہے۔ مقبرہ کے احاطہ میں ہر چند زمیندار بھوسہ وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں لیکن اس بری بھلی حالت میں بھی وہ موجود ہے۔ لیکن باغ اُس خزاں کی نذر ہو چکا ہے جس کے بعد بہار کا کوئی موسم نہیں آتا۔ جو زمین تختۂ گلزار بنی ہوئی تھی جہاں رنگ برنگ کے گل بوٹے اور قسم قسم کے ثمردار درخت تھے۔ وہاں اب زمینداروں کے ہل چلتے ہیں۔ اور کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ صرف باغ کی پختہ ڈیوڑھی نوحہ خوانی کے لیے موجود ہے۔ سکھوں کے بعد سرکار انگریزی نے یہ ڈیوڑھی نزول میں لے لی۔ اور سنہ ۱۲۸۲ھ میں یعنی نوے سال کے بعد ہی یہ عالیشان ڈیوڑھی شیرا نامی ایک زمیندار نے ایک سو ایک روپیہ میں خرید لی۔

یہ حشر ہے اُس جلیل المرتبت شخص کی قبر اور اُس کے مقبرہ کے باغ کا۔ جس کے ہاتھ میں تمام صوبہ پنجاب کی کمان تھی اور جس نے لاہور کو اغیار کے حملوں سے بچانے کے لیے اپنی زندگی کو چمکتی ہوئی تلواروں، بال سے باریک نیزہ کی انی اور گرجتی ہوئی توپوں کی نذر کر دیا۔

امیر الاُمرا بادشاہ گر

شادیٔ غم بارشِ ہستی میں نظر آتے ہیں ساتھ
گُل کو خنداں دیکھیے شبنم کو گریاں دیکھیے

مقبرہ نواب حافی خاں[1] اور مقبرہ پیر سید سراج الدین[2] کے متصل ہی ایک بزرگ حضرت شاہ بخاری[2] کے نام سے آسودہ ہیں۔
اُن کے قریب ہی چند اور قبریں بھی ہیں۔ یہیں ایک ایسے جلیل القدر شخص کا باغ تھا۔ جو اپنے بھائی سید عبداللہ خاں کی طرح بادشاہ
تو نہیں تھا مگر تمام ہندوستان کی بادشاہت جس کو وہ چاہتا تھا دے سکتا تھا۔ بہادر شاہ اول بن عالمگیر کے بعد محمد شاہ رنگیلے
تک پانچ بادشاہ تختِ ہند پر متمکن ہوئے۔ اور ہر بادشاہ کو انہی دونوں بھائیوں کی مدد سے تخت نصیب ہوا۔ یہاں تک کہ محمد شاہ
کو بھی جس کا نام بعالم شہزادگی روشن اختر تھا۔ انہی دونوں بھائیوں نے تخت و تاج کا مالک بنایا۔
امیر الامرا کا نام سید حسین علی خاں تھا۔ عہد عالمگیری میں اس کا عروج ہوا۔ عہد فرخ سیر میں ہفت ہزاری امیر الاُمرا کا خطاب
ملا۔ اور ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں دکن کے رستے میں ایک گہری سازش کی وجہ سے جس میں محمد شاہ بادشاہ بھی شامل تھا قتل ہو گیا۔
جہاں باغ تھا وہاں اب زراعت ہوتی ہے زمیندار ہل چلاتے اور کاشتکاری کرتے ہیں۔ صرف باغ کے اندرونی
حصہ کی تین گنبدوں والی ایک مسجد موجود ہے۔ صحن مسجد میں فرشِ خشتی ہے باغ کی زمین کی وسعت سات بیگھہ تک بیان کی
جاتی ہے۔
باغ عالمگیری عہد میں بنا رہا اس کے بعد۔ اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ حسین علی خاں کی جاہ و منزلت کو دیکھو۔ اور پھر غور
کرو کہ اُس باغ کی جہاں اب خاک اُڑ رہی ہے کیا کچھ شان و شوکت ہوگی۔

بیگم پورہ

"باغ بیگم پُر" کی ویرانی کو بھی کیجیے گا یاد
فصلِ گل میں جب کہیں گلہائے خنداں دیکھیے
بن گئے شاہی محل کس طرح سے عبرت محل
آئیے اور انقلاب حشر ساماں دیکھیے

شاہ عالم بہادر شاہ اول کے عہد (۱۱۱۹ھ سے ۱۱۲۴ھ/۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء) میں بخارا سے ایک نوجوان عبد الصمد خان نام اپنے بزرگ
حضرت خواجہ خاوند محمود عرف حضرت ایشاں کے مزار کی زیارت کے لیے وارد پنجاب ہوا۔ یہاں لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی۔
وہ علم و فضل کے ساتھ سپاہیانہ اوصاف بھی رکھتا تھا اور بقول صاحب تحقیقات چشتی (ص ۶۴۴) جب وہ لاہور آیا تو اس کے ساتھ بیس سوا

---

[1] یہ پختہ گنبد دار مقبرہ ابھی موجود ہے۔ قبر نیچے تہ خانہ میں ہے گنبد کے نیچے تعویذ قبر ہے۔ سنہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں بعہد محمد شاہ بادشاہ آپ نے وفات پائی۔

[2] اسی روضہ کے متصل بلند کرسی پر شاہ بخاری (وفات سنہ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء) کی قبر ہے۔

بھی تھے۔

تھوڑا عرصہ لاہور ٹھہر کر وہ دہلی گیا۔ بادشاہ نے اس کی قدر دانی کی۔ فوج میں اس کو خاص اعزاز بخشا۔ اور ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں بندہ بیراگی کی تنبیہہ کے لیے اُس کو افواج پنجاب کا سپہ سالار بنایا۔ فرخ سیر کے زمانہ (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) میں اُس نے بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب اس نے حسین خاں خویشگی (حاکم نواح قصور) کو قتل کر کے اس کی شورش کا قرار واقعی علاج کیا تو نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے پہلے خطاب پر سیف الدولہ کے خطاب کا اضافہ ہوا۔ یہی نواب عبدالصمد خاں ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء سے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء تک کشمیر کا گورنر بھی رہا ہے۔

چونکہ حضرت ایشاں اس کے جدِ اعلیٰ تھے۔ اس نے اپنے محلات مزار حضرت ایشاں کے قرب ہی میں تعمیر کرائے اُس زمانہ میں یہ مقام شہر لاہور کا ایک بیرونی محلہ تھا اور اس کا نام مغلپورہ تھا۔ اور امرائے شہر کے مکانات زیادہ تر اسی نواح میں تھے۔ اس کی موت ملتان میں ہوئی اور دفن اس کو بیگم پورہ میں کیا گیا۔

اس کے دو فرزند تھے بڑے کا نام نواب زکریا خاں تھا جو باپ سے ناراض ہو کر دہلی چلا گیا تھا اور وہاں سے باپ کے نام نظامت ملتان اور اپنے نام نظامت لاہور کا شاہی حکم محمد شاہ کے دربار سے لے کر آیا تھا۔ زکریا خاں کا پورا نام شہریار الدولہ خاں بہادر نواب زکریا خاں ہے مگر وہ زیادہ تر نواب خان بہادر خاں اور نواب زکریا خاں کے نام سے مشہور ہے۔ نواب زکریا خاں نواب قمرالدین خاں وزیر احمد شاہ بادشاہ (خلف محمد شاہ) کا داماد اور نواب میر معین الملک عرف میر منو[۱] کا جو بعد میں لاہور کا گورنر بھی رہا ہے بہنوئی تھا۔ ۱۱۵۸ھ میں فوت ہو کر باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔ اس کی والدہ کا نام نواب بیگم جان تھا۔ اسی کے نام پر بیگم پورہ آباد ہے۔ دوسرے فرزند کا نام نواب خواجہ عبداللہ[۲] خاں تھا۔ یہ محمد شاہ اور احمد شاہ کے زمانہ میں گورنر لاہور رہا ہے۔ احمد شاہ[۳] ابدالی نے ۱۱۶۱ھ میں جب پنجاب پر حملہ کیا ہے تو لاہور میں اس کو شکست دی تھی۔ اس کی والدہ کا نام نواب شرف النسا بیگم تھا۔ مقبرہ سرو والا میں جو بیگم پورہ کے متصل واقع ہے یہ بیگم دفن ہے۔ نواب بیگم جان نے یہ محل نہیں بلکہ قلعہ تعمیر کرایا۔ محل کا دَور بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس کی فصیل کا کچھ حصہ جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ سکا ہے۔ مقبرہ سرو والا کی طرف کچھ کھنڈروں کی صورت میں اور کچھ دیوار کی صورت میں زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

نقل کی نہیں لیتے ہم ایسے تھے ہم ایسے تھے
مگر ہم جیسے تھے ذی جاہ دنیا میں کم ایسے تھے

بیگم پورہ کے اندر جو عمارات تھیں اور باغ بیگم جان اس قلعہ نما محل کے اندر جس شان میں تھا ان سب کی مفصل کیفیت تحقیقات چشتی میں درج ہے۔

۱؎ اسی میر منو کے متعلق سکھوں کا یہ پنجابی شعر مشہور ہے ؎

میر منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے ۔۔۔ جیوں جیوں سانوں وڈھدا اسی دُونے دُونے ہوئے

۲؎ اسی نواب کے متعلق لاہور میں یہ زبان زد خلایق ہے ؎

حکومت نواب عبداللہ ۔۔۔ نہ چکی رہی نہ چُلا

۳؎ احمد شاہ ابدالی نے اس حملہ میں لاہور کو اس قدر لوٹا کہ اس کا ایک ایک سپاہی مالا مال ہو کر گیا۔ مشہور ہے ؎

محلات بیگم پورہ کے دو حصے تھے ایک مردانہ ایک زنانہ۔ دونوں حصوں میں نواب عبدالصمد خاں اور ان کے فرزندوں اور اولاد در اولاد کی قبریں ہیں جو سالہا سال تک لاہور ہی کے نہیں بلکہ مملکت پنجاب کے ناظم یعنی گورنر رہے ہیں۔ اور ایسے با اختیار اور ذی اقتدار کہ کسی پارلیمنٹ یا کونسل اور کسی اسمبلی کے ماتحت نہ تھے۔ جو چاہتے تھے سیاہ و سفید کرتے تھے۔ آج ان کے محلات ان کی قبروں ان کی یادگاروں اور ان کی اولادوں کا حال دیکھ کر دشمن کا دل جوش کھائے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

گلگونۂ اشکے ہیں در دیدۂ خوں بارے
ایں لالہ نہ روید در دامن کہسارے

راقم خود بھی تین چار مرتبہ بیگم پورہ اور اس کے نواحات میں گیا ہے۔ گلابی باغ بھی، مقبرہ دائی انگہ بھی دیکھا۔ نواب شرف النساء بیگم کا بلند مقبرہ سرو والا بھی دیکھا۔ دو تین اور حجرے اور مزار اور پرانے آثار بھی دیکھے جن میں ایک حجرہ نواب عبدالصمد خاں کے مرشد کا بھی ہے۔ باقیوں کے نام تک کسی سے معلوم نہ ہو سکے۔ بیگم پورہ کی فصیل کا بیرونی حصہ دیکھا۔ اس کے اندر اس کا بے نام و نشان باغ۔ اس کے بوسیدہ چبوترے، اس کے ٹوٹے ہوئے مقبرے۔ عالیشان مسجد اس کا حوض، آسمانی کنواں، حمام اور محلات اور ان کی موجودہ بستیوں پر ایک نظر ڈالی اور شکستہ دیواروں، پھٹی ہوئی قبروں ٹوٹے ہوئے چبوتروں، اُجڑے ہوئے باغ اور پرانے سخت جان چونہ اور مصالح غرض بیگم پورہ کے چپہ چپہ سے درد ناک آواز آئی ؎

چند لمحوں کے لیے یہ ساز عشرت روک کر
آپ سن لیں داستان خانہ ویرانی مری

اس داستان خانہ ویرانی کا خلاصہ یہ ہے کہ باغ آج سے دو سو سال قبل اپنے پورے جوبن پر تھا۔ پھول اور میوے شاخوں پر جھومتے اور مہوشان پری رُو صبح و شام گھومتے تھے۔ آج وہاں زراعت ہوتی ہے۔ اور کسی کے گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہاں کبھی وہ باغ تھا جس کو اس کی بانیہ نے بہار بے خزاں بلکہ سدا بہار سمجھ کر احداث کرایا تھا۔ اور جس کی آبیاری کی یادگار آسمانی کنواں اب بھی ایک دیوار کی اوٹ میں جھاڑیوں اور کانٹوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور جس کے عین درمیان وہ مسجد منقش و گلکار ابھی تک موجود ہے۔ جس کے چاروں کاشی کار مینار گو بے درد ہاتھوں نے گرا دیئے۔ لیکن درمیانی بلند گنبد کے اندر سے اب بھی صدائے اللہ اکبر بلند ہو رہی ہے۔

مسجد کے باہر تمام چینی کا کام ہے۔ حوض کے مشرق کی طرف باغ کے اندر ایک چبوترہ تھا جو سفید سنگ مرمر کا تھا اس مرمریں چبوترہ پر ایک قبر نواب بیگم جان کی اور ایک نواب بہو بیگم نواب زکریا خاں کی بیگم کی تھی۔ سردار جوالا سنگھ سنگ مرمر کا تختہ اکھاڑ کر لے گیا۔ قبریں لٹی پٹی رہ گئیں۔

سہ حاکمان لاہور کے زمانہ میں بیرون لاہور کی آبادی لوٹ مار کی وجہ سے ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی اس لیے بیگم پورہ اُجاڑ ہو گیا۔ نواب معین الملک اور نواب عبدالصمد خاں نے بندہ بیراگی اور اس کی معتقد جماعت کا چونکہ قرار واقعی انتظام کیا تھا اور ان کو چُن چُن کر مارا تھا اس لیے جب احمد شاہ بادشاہ دہلی کی موت ۱؍شعبان ۱۱۶۷ھ مطابق جولائی ۱۷۵۴ء کے بعد مغل حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی تو پنجاب میں سکھوں نے پھر سر نکالا۔ اور لاہور تین سکھ سرداروں (لہنا سنگھ، گجر سنگھ، سوبھا سنگھ) کے ماتحت آگیا اور ان کا نام سہ حاکمان لاہور لکھا جانے لگا۔ سکھ اور بندو چونکہ نواب معین الملک اور نواب عبدالصمد خاں سے جلے ہوئے تھے اور ان کو میر منوا

ابوسمند خاں کہا کرتے تھے۔ اس لیے نواب عبدالصمد خاں کی اولاد سے جو لوگ لاہور میں تھے سکھوں نے ان کو تنگ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ کئی لوگ لاہور سے باہر چلے گئے۔ ان میں نواب عبداللہ خاں کا فرزند نواب خواجہ عنایت اللہ کابل کو جائے پناہ تصور کر کے وہاں چلا گیا۔ لیکن وطن اور اپنے محلات و مکانات اور جائداد کثیر کی یاد بے چین رکھتی تھی۔ آخر وہاں سے امیر کابل یا کسی وزیر امیر کی سفارش لے کر گجر سنگھ احد الحاکم لاہور کے پاس آیا۔ گجر سنگھ نے سفارش تو مان لی۔ لیکن وہ اس کا لاہور میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے اس کو اپنا وکیل بحاضر دربار کابل بنا کر واپس روانہ کر دیا۔

میاں خزانہ باغبانپورہ کے دو زمینداروں خدا بخش و مراد بخش کو بیگم پورہ اور اس کی اراضیات آباد کرنے کے لیے لے آیا۔ پھر اور لوگ بھی آئے۔ خدا بخش نے جو کنواں کھدوایا تھا۔ بیگم پورہ کی فصیل کے کھلے درون اور مقبرہ سرو والا کے درمیان اب بھی وہ قدیم گھر بے آباد چاہ ڈل کی صورت میں موجود ہے۔

جب راجہ سنسار چند کٹوچ کانگڑہ والے کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور بلایا تو بیگم پورہ کے محلات اس کو رہنے کے لیے عطا ہوئے۔ سمت ۱۸۷۵ ب میں سنسار چند نے بیگم پورہ جس کا مالیہ سالانہ اس وقت صرف ایک سو روپیہ تھا اپنے برہمنوں کو دے دیا۔ لہنا سنگھ مجیٹھیہ کے بیٹے دیسہ سنگھ نے بیگم پورہ کے محلات دیکھے تو مچل اٹھا۔ سنسار چند کے برہمن پہاڑ کے رہنے والے تھے دیسہ سنگھ نے ان کو پہاڑ میں سو روپے کی جاگیر مہاراجہ سے دلوا کر بیگم پورہ پر آپ قبضہ کر لیا۔

اس اثنا میں نواب عنایت اللہ خاں سفیر کابل کا فرزند کلاں نواب غازی خاں کابل سے لاہور آیا۔ سردار دیسہ سنگھ چونکہ ان ایام میں لاہور میں نہ تھا، اس لیے اس نے آتے ہی بیگم پورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ بقول شاعر؎

ہم نے راحت بھی اگر پائی تو اک آن کی آن
اختر بخت جو چمکا بھی تو جگنو کی طرح

سنہ ۱۸۹۵ بکرمی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے یہاں چھاؤنی مقرر ہوئی۔ گلاب سنگھ بھوونڈیہ کی چار پلٹنوں ایک رجمنٹ سوار اور سات توپوں نے یہاں اودھم مچایا۔ اس نے یہاں کی شاہی محلات گرالئے اور کئی نئی عمارتیں اپنے مطلب کی بنوائیں۔ اپنا مکان اس نے مسجد کے اوپر بنایا۔ اس مسجد میں جہاں پانچ وقت خدا کا نام لیا جاتا تھا۔ رات دن گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنے لگیں؎۲۔ جہاں کہیں سنگ مر

؎۱ اس کے فرزند اول نواب زکریا خاں ناظم لاہور کے دو بیٹے تھے ایک حیات اللہ خاں جس کو بادشاہ نے شاہنواز خاں کا خطاب دے کر ملتان کا نواب بنایا تھا۔ لاہور میں بھی یہ گورنر رہا ہے اس کی رہائش بھی بیگم پورہ ہی میں تھی۔ مدفن اس کا ملتان میں ہے۔ دوسرے فرزند کا نام نواب یحییٰ خاں ہے وہ بھی لاہور کا گورنر رہا ہے۔ ضلع لاہور میں یحییٰ نگر (عرف آبا نگر) اسی کا آباد کردہ ہے۔ وہ بھائی کے خوف سے حیدرآباد دکن چلا گیا۔ اس کی اولاد وہیں آباد ہے نواب شاہنواز خاں کی اولاد بھی لاہور میں نہیں ہے اس لیے سکھوں اور ہندوؤں کا سارا زور نواب خواجہ عبداللہ خاں ناظم لاہور کی اولاد پر تھا جو لاہور میں موجود تھی۔

؎۲ مسجد کے پانچ کلاں دسے ہیں۔ رنگ روغن بالکل تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ بیگم پورہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مرد و زن کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے میں جب ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو وہاں گیا تو کوئی رونق نظر نہ آئی۔ نماز عصر میں امام کے مقتدی صرف
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آیا یا اکھاڑ لیا گیا۔ باغ کو اُجاڑ کر میدان بنا دیا گیا۔ ان ایام میں بیگم پورہ چھاؤنی گلاب سنگھ بھوونڈیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ خدا بخش نمبردار کو مصرقہ مدو ناں کی تہمت لگا کر یہاں سے نکال دیا گیا اور ایک بھوئے سے باغیچہ کی باغبانی اور حفاظت کے لیے کریم بخش کو ملازم رکھ لیا گیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی سنہ ۱۸۶۰ء میں اپنی کتاب میں اس باغیچہ اور کریم بخش کی نمبرداری کی موجودگی کا ذکر کرتے ہیں لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں راقم نے اس باغیچہ کا کوئی نشان نہیں دیکھا۔ البتہ کریم بخش نمبردار کی اولاد بیگم پورہ میں موجود ہے۔

نواب غازی بخار ہنے کے پاس صد ہا قبالہ جات اپنی آبائی جائداد خرید کردہ نواب زکریا خاں کے موجود تھے۔ اکثر مکانات پر اس نے قبضہ بھی کیا لیکن کوشش کے باوجود بیگم پورہ کا قبضہ اس کو نہ مل سکا۔ لوگ اس کا بہت ادب کرتے تھے۔ وہ ایک سو سال کی عمر پا کر ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء میں فوت ہو گیا۔

چار آدمی تھے۔ ان میں بھی تین مسافر تھے۔ اور واقعی اس مختصر سے گاؤں میں جس کو درحقیقت زبردستی گاؤں بنا لیا گیا ہے۔ وہ رونق کہاں ہو جو لاہور کی دوسری مسجدوں میں ہے ؎

اک زیب چمن اک زیب گلو اور اک بر شبنم کے موتی
صحرا میں جو کھل کر مرجائے اس پھول کی قسمت کیا کہیے

لیکن غیرت الٰہی اس کو اور زیادہ بے آباد نہ دیکھ سکی اور اس کی آبادی و رونق کا اس مردِ خدا کو ذریعہ بنایا جس کے متعلق بیگم پورہ کی یہ مسجد اپنی دھیمی مگر اخلاص بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

یہ مردِ خدا چوہدری فخرالدین احمد ہیں جو یتیم خانہ و مدرسہ تعلیم القرآن کے بانی و مہتمم ہیں۔ انھوں نے یتیم خانہ کے لیے یہاں دو کنال زمین خرید کر اڑھائی منزل عالیشان عمارت تعمیر کی ہے۔ یہ عمارت مسجد کے بالکل متصل ہے۔ یتیم خانہ میں تقریباً سوا سو یتیم ہیں۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی ہے۔ ان کے لیے استاد بھی ہیں اب یہ تمام یتیم اور یتیم خانہ کا عملہ اس مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ ربانیئے یتیم خانہ کو مخاطب کر کے یہ عالیشان مگر بے رونق مسجد دل ہی دل میں شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ کہتی ہو گی ؎

میں ہجر میں مرنے کے قریب ہو ہی چکی تھی
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکی تھی

۱؎ میاں کریم بخش کے فرزند کا نام الٰہی بخش تھا۔ وہ بھی نمبردار تھا۔ یہ اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی دختر کی اولاد ذکور و اناث کو بیگم پورہ ملا۔ اس کی لڑکی کے تین فرزند چوہدری فقیر محمد، ملک محمد شریف نمبردار، بابو محمد اقبال ہیں۔ تینوں بھائیوں نے فصیل کے اندر اپنی اپنی کوٹھیاں بنائی ہیں مغرب کی طرف جو مکانات ہیں وہ ان کی ہمشیرگان کے حصے میں آئے ہیں۔ درمیانی کوٹھی جس کے سامنے ایک طویل پختہ چبوترہ ہے اور جس پر تین قبریں بھی ہیں بابو محمد شریف نے تعمیر کرایا ہے۔ اسی کے پاس آٹھ در والا ایک چھوٹا سا گنبد تھا جس کے اندر "قدم رسول" تھا جو نواب زکریا خاں کہیں سے لائے تھے سکھوں کے زمانے میں کہیں غائب کر دیا گیا۔ بابو محمد اقبال کی کوٹھی دروازہ کلاں کے متصل ہے۔ ڈیوڑھی بھی انہی کے قبضے میں ہے جس میں سے ہاتھی مع ہودے گزر سکتا ہے اور جس کے اوپر نہایت اچھی نشست گاہ ہے۔ چوہدری فقیر محمد کی کوٹھی زنانہ محل میں بنائی گئی ہے اور اس کے ساتھ ایک خوشنما برآمدہ تعمیر کر کے اس کو وسعت دی گئی ہے۔ اس محل کے اوپر ایک حوض کے نشان ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آسمانی کنواں بند پڑا ہے۔ میاں کریم بخش باغبانپورہ کے رہنے والے تھے۔ ان سہ برادران کے والد کا نام میاں قادر بخش تھا۔ ان کی جائداد بیگم پورہ کے علاوہ باغبانپورہ کوٹ خواجہ سعید میں بھی ہے۔

نواب زکریا خاں اور نواب عبدالصمد دلیر جنگ کی قبروں والے تھڑہ (چبوترہ) سے مغرب کی طرف ایک اور چبوترہ ہے جس پر مندرجہ ذیل پانچ خشتی قبریں ہیں :-

(۱) نواب خواجہ عنایت اللہ (۲) قلندر شاہ فرزند دوم نواب عنایت اللہ (۳) نواب غازی خاں فرزند اول نواب عنایت اللہ خاں (۴) مائی سہاگن بیگم اہلیہ نواب غازی خاں (۵) صاحب بیگم دختر نواب غازی خاں

نواب خواجہ عبداللہ خاں کی قبر بھی شرقی رویہ بیگم پورہ موجود ہے۔ وہاں اور بھی دو تین قدیم مقبرے ہیں لیکن شرف النساء بیگم کے مقبرہ کے سوا کسی کا صحیح پتہ نہیں ملتا۔

تحقیقات چشتی میں سنہ ۱۸۶۵ء تک نواب زکریا خاں کی اولاد اور اس کی ذریات کا جو ذکر کیا ہے بڑا عبرت ناک ہے۔ ان میں کوئی سلائی کر کے پیٹ پالتا تھا۔ کوئی کوچوانی کرتا تھا کوئی میاں محمد سلطان ٹھیکیدار کے دفتر میں منشی تھا۔ فوجوں میں ملازم ہونے کی وجہ سے بعض ایک سفید پوش بھی تھے مگر خاندان کی عام حالت عبرت انگیز تھی ؎

نشان عظمت ایں خاندان چہ می پرسی
ہر دگر آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

بیگم پورہ کا سالانہ مالیہ جو رنجیت سنگھ کے زمانے میں ایک سو روپیہ تھا۔ اب ہزار بارہ سو روپیہ کے قریب ہے۔ دروازہ کلاں کے سامنے ہی شمال کی طرف ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جو درحقیقت بیگم پورہ کی عمارات کا آوا ہے۔ یہ تبہ یا ٹیلہ آج محکمہ نزول کے ماتحت ہے اور اس کے دامن میں اقوام جرائم پیشہ کی آبادی ہے جس کے لیے سرکار نے مکانات بنا دیئے ہیں۔ یہ لوگ ریلوے کارخانوں میں نوکریں اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ نگرانی ہوتی ہے۔ ان کے سپرنٹنڈنٹ اور ان کا عملہ بھی زیب النساء کی پختہ عمارات میں رہتا ہے۔

شرف النساء بیگم

مٹ گیا شرف النساء کا باغ بھی تالاب بھی
قبر کا کچھ کچھ نشاں باچشم حیراں دیکھئے
"تیغ و قرآں را جدا از من مکن" تو نے کہا
کاش ان آنکھوں سے پھر وہ تیغ و قرآں دیکھئے

نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں جاوید نامہ پر ایک قابل اہل قلم جناب "چودھری" نے ۳۵ صفحہ میں ایک سیر حاصل اور نکتہ آموز مضمون لکھا ہے جس میں شرف النساء بیگم اور اس کی قبر کا ذکر بھی ہے جو درحقیقت مسلمانان پنجاب کی تاریخ کا ایک دردناک منظر ہے۔ شرف النساء بیگم کون تھی اس کے خیالات کیا تھے۔ اس کی قبر کے ساتھ بعد کے حاکموں نے کیا سلوک کیا اس کو جناب چودھری نے نثر میں اور سر محمد اقبال مرحوم نے نظم میں واضح طور پر لکھا ہے۔

لیکن اس مضمون میں ایک تاریخی غلطی ہو گئی ہے۔ جناب چودھری نے شرف النساء بیگم کو جس کا مقبرہ لاہور میں مقبرہ سرو والا کے نام سے مشہور ہے۔ نواب خان بہادر زکریا خاں کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خاں کی پوتی لکھا ہے۔ یہ غلط ہے نواب عبدالصمد خاں کے صرف

دو بیٹے تھے نواب خان بہادر زکریا خاں و نواب عبداللہ خاں۔ بیٹی کوئی نہ تھی۔ نواب زکریا خاں کے بھی صرف دو فرزند تھے نواب شاہنواز خاں و نواب یحییٰ خاں۔ شرف النساء بیگم نواب عبدالصمد خاں کی دوسری بیوی اور اُس کے دوسرے فرزند نواب عبداللہ خاں کی والدہ تھی۔ نواب عبدالصمد خاں اور ان کے دونوں بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں بہ اوقات مختلف لاہور کے گورنر رہے ہیں۔ اور اُن ایام میں پنجاب کا گورنمنٹ ہاؤس وہ جگہ تھی جہاں آج بیگم پورہ آباد ہے۔ اس گورنمنٹ ہاؤس کی عمارتوں کے کھنڈروں اور اس کی قبروں اور مسجدوں کا حال بیگم پورہ کی تفصیلات میں قبل ازیں لکھا جا چکا ہے۔ انہی میں ذرا فاصلے پر نواب شرف النساء بیگم کا مقبرہ بھی سرو والا مقبرہ کے نام سے موجود ہے۔

یہ مقبرہ ایک بلند چبوترہ پر ہے۔ اس سے مغرب کی جانب بیگم پورہ کی منہدم فصیل ہے۔ جس کے دس محرابی در اب تک سلامت ہیں۔ فصیل کی دیوار میں ان محرابوں کے کھلے رہنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ کوئی کہتا ہے چونکہ اس طرف زنانہ محلات تھے اس لیے فصیل کے اندر والے حصہ میں بھی باغ تھا اس باغ کا ذکر مؤرخین لاہور نے بھی کیا ہے۔ اور فصیل سے باہر بھی چونکہ تالاب اور باغ تھا اس لیے فصیل کے یہ محرابی در جو آج تک چشم حیراں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف کی آمد و رفت کے لیے رکھے گئے تھے۔

اسی طرف شرف النساء بیگم نے اپنے چھوٹے سے باغیچہ میں جس کے پہلو میں ایک تالاب بھی تھا۔ اپنا چبوترہ عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کیا تھا۔ سیڑھی لگا کر وہ اس چبوترہ پر جا بیٹھتی اور ہر روز صبح کی نماز کے بعد وہیں تلاوت کرتی۔ وہ اپنے پاس ہمیشہ ایک مرصع تلوار بھی رکھا کرتی۔ وہ تیغ یا قرآن اور قرآن یا تیغ کو نہ صرف اپنا بلکہ ہر مسلمان کی نجات کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ تلاوت کے بعد وہ قرآن شریف اور تلوار وہیں چھوڑ کر آپ چبوترہ سے نیچے اُتر آتی۔ اس متقی اور شجاع عورت نے آخری دم تک اپنا یہی معمول رکھا۔ جب اُس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو اس کی وصیت کے مطابق اسی چبوترہ میں اس کو تیغ و قرآن کے ساتھ دفن کیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کی قبر پر گنبد تعمیر کیا گیا جس پر کلمات الٰہی بھی درج ہیں۔ گنبد کی تین اطراف بند کر کے اُن پر سبز رنگ میں سرو کے درخت بنائے گئے ہیں جن سے اس مقبرہ کا نام سرو والا مقبرہ مشہور ہو گیا۔ گنبد کاشی کار اور منقش ہے۔ اس مقبرہ کے مغرب کی طرف پانی کی ایک کھائی اور سرکنڈے ہیں۔ جہاں باغ اور تالاب تھا۔ وہاں اب زراعت ہوتی ہے۔ چبوترہ کے متصل صرف ایک شیشم کا درخت کھڑا ہے۔

حکومت مغلیہ کی کمزوری اور افغانی حملہ آوروں کی یلغاروں اور امرائے دربار کی باہمی آویزشوں سے جب پنجاب میں بدامنی کا دور شروع ہوا تو جس طرح اور اسلامی عمارات و قبور کی شامت آئی شرف النساء بیگم کا مقبرہ بھی اس خیال سے کھودا گیا کہ اس کا چبوترہ جو بلند ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہے اور یہاں ضرور خزانہ جمع ہے لیکن یہاں تلوار اور قرآن اور نعش کے سوا کیا رکھا تھا۔ ناخدا ترسوں نے قبر کو پھر بند کر دیا اور معلوم نہیں تلوار خصوصاً قرآن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ گورنمنٹ انگریزی نے ۱۸۸۲ء میں از سرِ نو اس کی مرمت کرائی۔ سرکار انگریزی نے جس طرح دیگر قدیم شاہی عمارات اور مقبروں پر ان کی حفاظت کے لیے بورڈ لگا رکھے ہیں۔ یہاں بھی ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس کا مقصد ہے کہ اس مقبرہ کو خراب کرنے والا سزا اور قید دونوں کا مستحق ہو گا لیکن ؎

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا غم کریں

علامہ اقبال مرحوم نے جاوید نامہ میں شرف النساء کا جو محل جنت میں دکھایا ہے وہ لعل ناب سے تعمیر ہوا ہے جو اپنی ضو فشانی آفتاب سے خراج وصول کرتا نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قلزم ما این چنین گوهر نزاد — هیچ مادر این چنین دختر نزاد
خاک لاهور از مزارش آسمان — کس نداند راز او را در جهان

اقبال مرحوم نے یہ نظم بڑی طویل اور بڑے دل نشین اور موثر انداز و الفاظ میں لکھی ہے۔ ماں کو جو آخری وصیت اُس نے کی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

بر لبِ اُو چوں دمِ آخر رسید   سُوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر   سُوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند   کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس   دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن   تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است   تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

پھر مولانا روم کی زباں سے فرماتے ہیں : ؎

عمرہا در زیرِ ایں زریں قباد   بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات   اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد   گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد   شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت   خود بداں آنچہ در پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد   اندراں کشور مسلمانی بمرد

حضرت شاہ محمد غوث

شہ محمد غوث کی ہے بارگہ وہ جائے امن
خفتگانِ قبر جس کے زیرِ داماں دیکھئے

حضرت شاہ محمد غوث کا شجرہ نسب سترھویں پشت تک حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا سید عبداللہ گیلان سے مختلف ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے پشاور آ کر مقیم ہو گئے آپ کے فرزند سید حسن اسی لحاظ سے پشاوری کہلاتے ہیں اور سید حسن پشاوری کے فرزند اول حضرت شاہ محمد چونکہ مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد لاہور ہی میں اقامت اختیار کر چکے تھے اس لیے وہ لاہوری کہلائے اور حضرت سید حسن کے فرزند دوم شاہ محمد فاضل نے جن کا مزار سری نگر کے محلہ خانیار میں زیارت دستگیر کے اندر ہے کشمیر میں سکونت کر لی تھی اس لیے وہ اور ان کی اولاد سب کشمیری کہلا رہے ہیں۔

رسالہ غوثیہ حضرت شاہ محمد غوث کی تصنیف سے ہے اس میں آپ لاہور آنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چوں من بہ تلاش حق در لاہور رسیدم شب در مقبرۂ عالیہ میاں میر لاہوری کہ بہ لاہور است بسر گذرانیدم۔ شبے حضرت میاں میر بر من ظاہر شدند و توجہ معرفت فرمودہ شغلے عطا کردند" پھر حضرت کے ارشاد قلبی کے مطابق آپ دوسرے دن حضرت شیخ حامد کے پاس پہنچے جو مزار حضرت علی ہجویری

عرف داتا گنج بخش کے متصل رہا کرتے تھے اور لاہور کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ بزمانہ شاہجہان ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء (یعنی وفات حضرت میاں میر) کے بعد لاہور میں تشریف لائے۔ حضرت شاہ دولہ جن کے نام پر پنجاب میں شاہ دولہ کے چوہے مشہور ہیں آپ کے ہمعصر تھے۔ حضرت شاہ دولہ (وفات ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء یا ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء) کا مزار گجرات میں مرجع خلائق ہے۔ حضرت شاہ محمد غوث کی وفات کا سال تحقیقات چشتی میں ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء تاریخ لاہور اور خزینۃ الاصفیاء میں ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء درج ہے۔ تحقیقات چشتیہ میں یہ قطعہ بھی (۱) تاریخ ہے۔

محمد غوث پیر رہنمائے ... کہ بُد در سیدان دیں مرتاض
بتاریخ وصال آں شہ دیں ... ندا آمد کہ "سید پیر فیاض"

سید پیر فیاض سے ۱۱۶۷ھ نہیں بلکہ ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء برآمد ہوتے ہیں کاتب کی غلطی نے ۱۱۶۳ھ کو ۱۱۶۷ھ بنا دیا ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں بھی سالِ وفات کا حسب ذیل قطعہ درج ہے جس سے ۱۱۵۲ھ نکلتے ہیں۔

حیف محمد غوث رفت از جہاں ... سالِ وصل آں حبیبِ متقی
عارف مخدوم سالک کن رقم ... ہم بہ فرما راہ بر سید سخی

اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں تاریخی قطعات مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیاء کے طبعزاد ہیں۔ معلوم نہیں اس یک بام و دو ہوا کا کیا باعث ہے۔

مصنف تحقیقات چشتی (ص ۱۵۲ میں) لکھتے ہیں حضرت کی وفات کو آج ایک سو چار سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ مصنف[1] نے اپنی یہ کتاب ۱۲۸۲ھ میں تصنیف کی ہے۔ ۱۲۸۲ھ سے ۱۰۴ سال منہا کرنے کے بعد ۱۱۷۸ھ برآمد ہوتے ہیں اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مصنف مذکور نے ان کا سال وفات ۱۱۷۷ھ لکھا ہے۔ راقم کی کتاب یادر رفتگاں میں بھی آپ کا سال وفات ۱۱۷۷ھ درج ہے۔ ایک سال کا فرق کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بہرحال سال وفات ۱۱۷۷ھ ہے یا ۱۱۷۸ھ لیکن ۱۱۶۷ھ یا ۱۱۵۲ھ غلط ہے۔ آپ کی وفات شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ہوئی ہے۔

تحقیقات چشتی میں یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں آپ کا مزار ہے وہاں فدائی خاں[2] کوکہ عالمگیری کی حویلی تھی۔ فدائی خاں کا انتقال ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں ہوتا ہے۔ یہ وہی فدائی خاں ہے جس کے اہتمام سے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں لاہور کی بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۰۸۴ھ یا فدائی خاں کی وفات (۱۰۸۹ھ) سے حضرت شاہ محمد غوث کی وفات ۱۱۷۸ھ کے

---

[1] مولوی نور احمد چشتی سال پیدائش ۱۲۴۴ھ سال تصنیف تحقیقات چشتی بعمر ۳۸ سال ۱۲۸۲ھ طباعت کتاب بار اوّل بعد از وفات مصنف ۱۲۸۶ھ طباعت بار دوم ۱۳۲۴ھ۔

[2] اصل نام مظفر حسین تھا۔ دور شاہجہانی میں اس نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ ۳۰ سنہ جلوس میں شاہجہان نے اس کو فدائی خاں کا خطاب عطا کیا۔ عالمگیر کے زمانہ میں کوکلتاش دکوکہ) ہونے کی وجہ سے اس کا ستارہ اقبال اور بھی چمکا۔ پھر دارا شکوہ اور سلیمان شکوہ کی مہم پر عالمگیر نے اس کو بھیجا۔ ۱۳ سنہ جلوس عالمگیری میں وہ لاہور کا گورنر ہوا۔ ۲۰ سنہ جلوس میں بنگال کا اور ۲۱ سنہ جلوس میں بہار کا گورنر مقرر ہوا اور یہیں ۹ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ کو انتقال کر گیا۔

درمیان فدائی خاں کی حویلی جس میں عہد مغلیہ کے بعض گورنر اپنی رہائش بھی رکھتے تھے۔ زوال مغلیہ اور نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں کی وجہ سے بہت ٹوٹ پھوٹ چکی ہو گی اور یہیں حضرت نے اپنے ڈیرے ڈال لئے ہوں گے اور یہیں بعد وفات آپ کا مزار بھی بنا۔

حضرت شاہ محمد غوث علوم ظاہر و باطن میں صاحب کمال تھے۔ ان کے وجود مبارک سے مسلمانوں کو یقیناً دینی و دنیوی نعمتیں حاصل ہوئی ہوں گی اور آپ کے اخلاق اور آپ کی تعلیمات سے یقیناً بہت لوگوں نے اسلام قبول کیا ہو گا۔ لیکن آپ کے تذکرہ نویسوں نے ان کی چند کرامتوں کے سوا ان کے سوانح زندگی کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا۔

ان کی ایک کرامت جو مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیا اور مولوی نور احمد مصنف تحقیقات چشتی نے ان کی وفات کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے اور مہاراجہ کھڑک سنگھ کے ولی عہد کنور نونہال سنگھ نے ایک فرنگی ولاروس یا ڈلاروس کی صلاح سے بیرون شہر کے متصلہ مکانات اور بیرونی درختوں کو منہدم کرانا اور کٹوانا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں مہاراجہ کھڑک سنگھ اپنے فرزند کنور نونہال سنگھ اور وزیر راجہ دھیان سنگھ کے ہاتھوں بے دست و پا تھا اور نونہال سنگھ ہی سب کام خود مختارانہ کرتا تھا چنانچہ اس کے حکم سے بہت سی عمارتیں منہدم ہو گئیں اور ہزار ہا درخت بیخ و بنیاد سے قطع کر دیے گئے۔ اسی سلسلہ میں حضرت کے مزار کی بیرونی چار دیواری بھی منہدم کر دی گئی۔ مسلمانوں نے بہت واویلا کیا اور درخواستیں تک دیں کہ اس متبرک خانقاہ کے انہدام سے مسلمانوں کا دل نہ دکھایا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے شور و پکار کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ابھی اندرونی چار دیواری کے گرانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ مہاراجہ کھڑک سنگھ جو دراصل اپنے ناخلف فرزند کی قید میں تھا اور اسی کے اشارہ سے اس کی موت بھی واقع ہوئی انتقال کر گیا۔ دوسرے دن جب کنور نونہال سنگھ اپنے باپ کی نعش سپرد آتش کر کے واپس آ رہا تھا تو روشنائی دروازہ متصلہ قلعہ سے دیوار کا کچھ حصہ اور ایک سنگ عظیم کنور نونہال سنگھ اور میاں اودھم سنگھ خلف مہاراجہ گلاب سنگھ کے سر پر آ گرا جس سے دونوں اسی رات کو انتقال کر گئے۔

یہ واقعہ اتفاقیہ تھا جیسا کہ بعض کے خیال میں ماتمی توپوں کی آواز سے دیوار ہل گئی تھی۔ یا کسی سازش کا نتیجہ تھا جس میں مہاراجہ گلاب سنگھ کو بھی متہم کیا جاتا ہے۔ بہرحال حضرت کا مزار انہدام سے بچ رہا بلکہ قطع درختاں و انہدام عمارات کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا اور اس بات کی ایک عام شہرت ہو گئی کہ وہ نونہال بانع نوجوانی اس بزرگ کے مزار کی گستاخی کی سزا بھگت کر حکمرانی و بادشاہی کی ہزاروں حسرتیں دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے ناشاد و نامراد گیا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں جب لاہور کے گرد گہری خندق بنی تو آپ کا مزار اب خندق میں آ گیا۔ جب انگریزی عہد میں خندق بھری گئی تو خندق کی جگہ باغ بنا دیا گیا۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ اب یہ مزار گول سڑک (سرکلر روڈ) اور باغیچہ ممتاز الدولہ دیوان اجودھیا ناتھ کے کے درمیان واقع ہے۔ اور گول سڑک سے مغرب کی سمت ہے۔ دیوان اجودھیا ناتھ کے باغ کا جو حضرت شاہ محمد غوث کے مزار کے ساتھ تھا۔ اب کوئی پتہ نہیں ہے۔ تحقیقات چشتی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کی کلاں چار دیواری کی غربی دیوار کے ساتھ باغیچہ دیوان کی چار دیواری تھی۔

مشرق کی طرف اس مزار کے احاطہ کے تین دروازے ہیں درمیانہ دروازے کے جنوب میں چاہ چرخی دار اور اس کے ساتھ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے ایک کمرہ ہے۔ اس دروازے کے سامنے پانی کا مربع حوض ہے۔ جو عرصہ سے بند تھا۔ میاں غلام نبی کاشمیری کو ٹھیدار سوداگر پشمینہ

نے اس کو نئے سرے سے آراستہ کرا کر اس کے درمیان فوارہ نصب کرایا۔ حوض[1] کے ساتھ ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی جس کا صحن بھی کھلا ہے اور جس کے اندر بھی تین طویل صفیں نمازیوں کی آسکتی ہیں۔ مسجد کے درمیانہ طاق پر سطر اول میں "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے یہ دو شعر ہیں ؎

سالِ بنا گفت دلِ از رُوئے دیں — مسجد زیبائے غلام نبی
پئے تعمیر مسجد گشت تاریخ — عبادت خانۂ زیبائے اعلیٰ

شاہ ابوالمعالی کے مزار کی طرح یہاں بھی کافی تعداد میں کبوتر رہتے ہیں۔ مزار کی اندرونی چار دیواری کا دروازہ کالاں جنوب اور دروازہ خورد مشرق کی طرف ہے۔ حضرت کا مزار ایک بلند چبوترہ پر واقع ہے۔ اس چار دیواری کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے۔ مزار کے گرد ہشت پہلو پنجرہ سنگ مرمر کا ہے۔ دو مزار ہیں جو مزار کسی قدر بلند ہے وہ آپ کا ہے دوسرا مزار آپ کی اہلیہ محترمہ کا ہے۔ دونوں قبروں پر غلاف پڑے رہتے ہیں۔ مزار کے سرہانے چند اشعار تحریر ہیں۔ مغرب کی جانب زائرین کے بیٹھنے اور ورد و وظائف کے لیے تین دروں والا ایک حجرہ ہے اور شمال کی طرف چار دروں والا دوہرا کمرہ ہے۔ جہاں اکثر لوگ قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ مسجد کے پاس سے شمالی جانب ایک تنگ سا راستہ آتا ہے اس سے آگے ایک احاطہ میں افغانی شہزادوں کی قبریں ہیں۔ اور دوسرے احاطہ میں جو ذرا بلندی پہ ہے —— خان بہادر ڈپٹی محمد برکت علی خاں مرحوم[2] اور ان کے اعزہ کی قبریں ہیں۔ شہزادوں میں ایک قبر سردار احمد علی خاں ولد سردار محمد علی خاں درانی اولاد میر شیر علی خاں مرحوم والیٔ افغانستان کی ہے۔ تعویذ قبر پر کلمات اللہ درج ہیں۔ مشرقی جانب ۱۲ اشعار ہیں۔ تین اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

سفر کرد سردار احمد علی — ازیں دار حادث بہ ملک قدم
ز ابن محمد علی خاں بدارست — جدش شیر علی خاں والا ہمم
برآمد بہ فال حسن سال حال — کہ احمد علی خاں امیر ارم

ایک قبر سردار ولی محمد خاں خلف امیر دوست محمد خاں درانی (وفات ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء) کی ہے۔ جس پر آیات کے علاوہ مغرب کی سمت کئی شعر بھی ہیں۔ ایک قبر سردار محمد اسمٰعیل خاں خلف سردار محمد امین خاں والیٔ قندہار ولد امیر دوست محمد خاں مرحوم فرمانروائے افغانستان کی ہے جس پر لکھا ہے درزمان حبس بمقام برج مثمن قلعہ لاہور یوم شنبہ ۷ ار صفر ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نظربندی کی حالت میں وفات پائی تھی۔

مزار سے مشرق کی طرف جہاں کبوتر خانہ ہے عام قبرستان ہے۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں یا اس سے قبل بقول صاحب تحقیقات چشتی چوالیس قبریں سادات وغیرہ کی موجود تھیں اور پچاس درخت بیری گوندی۔ کیکر وغیرہ کے تھے لیکن اب تو صرف ایک درخت برگد کا موجود ہے۔ برگد کا ایک اور بہت بڑا درخت ہمارے دیکھتے دیکھتے کاٹ دیا گیا۔ اس قبرستان میں عام مُردے دفن نہیں ہوتے بلکہ خاص خاص

---

[1] یہ حوض پہلے کھلے صحن کے درمیان میں تھا اور سطح زمین سے گہرا ہونے کی وجہ سے صفائی کے وقت پانی نکالنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اب متولیوں نے اسے ایک گوشے میں کر کے قدرے اونچا کر دیا ہے —— مرتب

[2] سال ولادت ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء وفات دوشنبہ ۵ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء بعمر ۷۰ سال

لوگوں کو اور وہ بھی بدقت جگہ ملتی ہے پرانی قبروں میں سے چند قبریں موجود ہیں جن میں چار قبریں ایک چھوٹے سے احاطہ میں ہیں دو پر نام بھی درج ہیں۔ ایک پر خواجہ سید محمد شاہ صاحب نقشبندی وفات ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء اور یہ شعر درج ہے ؎

جبرئیل خردہ چیدے وفاتش چہ خوش آورد　　　فردوس بریں است وطن گاہ محمد

دوسری قبر ان کے فرزند خواجہ سید عبدالرحمن نقشبندی وفات ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء کی ہے۔ دونوں قبروں کے تعویذ جن پر یہ کتبے درج ہیں مرمریں ہیں۔ اس قبرستان کی چار اور قبریں قابل ذکر ہیں۔ ایک قبر شاہزادہ محمد حشمت رسالدار میجر خلف شاہزادہ سلطان سعد نبیرہ احمد شاہ درانی کی ہے۔ جس پر شاہزادہ سلطان علی سلطان کے بارہ شعر درج ہیں۔ چار حسب ذیل ہیں ؎

محمد حشمت جوان رشید　　　ز ضرب تفنگ عدو شد شہید
بہ ہنگام شب سلطنت ہشت بود　　　کہ در لکھنؤ ہم چو بسمل طپید
بہ تاریخ ہشتم زماہ مئی　　　ز دنیا بہ سوئے جناں آرمید
بیکایک زہاتف ندا شد بلند　　　کہ مغفور شد آں جوان سعید

۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

ایک قبر حاجی معراج الدین سیٹھ نوالہ کی والدہ اور ایک اُن کی اپنی ہے۔ والدہ کی قبر پر سرہانے کی طرف کتبے کی جانب یہ شعر ہے ؎

ہُو کا عالم ہے وہاں اے قبلہ گاہ تیرے بغیر　　　ہائے کیا سنسان ہے وہ گھر ترا تیرے بغیر

حاجی معراج الدین (وفات ۱۰ مئی ۱۹۴۲ء) کی قبر پر علامہ اقبال کے اشعار کے علاوہ ذیل کے دو شعر بھی ہیں ؎

مرنے والے ہو تجھے گلشن فردوس نصیب　　　ہر گھڑی فضل خداوند رہے تیرے قریب
شامل حال ہمیشہ ہو عنایت اس کی　　　تیری تربت پہ برستی رہے رحمت اس کی

سید بہادر شاہ عجائب روزگار (قلمی کتابیں اور فرمان شاہی بیچنے والے، وفات ۱۳۴۲ھ) اور مولانا محمد اشرف علی امام مسجد حضرت شاہ محمد غوث وفات ۱۴ اگست ۱۹۲۴ء کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ خان صاحب مولوی محمد الدین کاشمیری بی۔ اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ و فیلو پنجاب یونیورسٹی کی قبر بھی اسی جگہ ہے۔ مولانا نہایت ہمدرد ہیڈ ماسٹر اور محکمہ تعلیم پنجاب کے لیے باعث فخر تھے۔ ۱۰ صفر ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ جولائی ۱۹۳۰ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے مزار پر اشعار ذیل درج ہیں ؎

محمد دین خان صاحب شاخوان　　　قدم بکشاد بر آواز رضواں
چو بودہ رکن دار العلم پنجاب　　　رسانیدے بہ ملک خویش فیضاں
محمد دریں پیرو دین محمد　　　نمودہ جان و دل بر فرقت قرباں
حلیم الطبع صالح نیک کردار　　　بجان و دل ہی خواہ عزیزاں
تعجب نیست کز درد جگر مُرد　　　کہ عمرے بود ہمدرد مسلماں
خدایا اجر اعمالش عطا کن　　　بفردوس بریں دارش مہماں
رقم زد کلک ہاتف سال رحلت　　　رضی اللہ عنہ عبد یزداں

۱۳۴۹ھ

ان کے علاوہ اور بھی چند اشعار ہیں۔

خان بہادر چوہدری رحمت اللہ خاں لاہور شہر کے نیک نام اور ہر دلعزیز کوتوال تھے۔ ۸ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ مطابق ۴ مئی ۱۹۱۴ء کو انتقال فرما گئے۔

ان کی قبر پر ذیل کے اشعار درج ہیں :-

آہ ناگہ زجام دہر شہید — شربت کل من علیہا فان

در جنت شتاب بکشادند — رفت بہ مدام بہ سوئے باغ جناں

تیرگی در جہاں ہویدا شد — رخ بہ پوشید نیر رخشاں

در زمہر جہاں گذشت صد افسوس — ہست تاریخ "رحمت اللہ خاں"

۱۳۳۲ھ

[اسی احاطے میں میاں فیروز الدین احمد کی آخری آرام گاہ ہے۔ وہ مشہور قومی کارکن اور نڈر سپاہی تھے۔ بچپن سے وفات تک مسلمانوں کی خاطر لڑتے رہے اور ہر آڑے وقت میں ان کے کام آتے رہے۔ وہ تحریک خلافت کے زمانے میں علی برادران کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایک رضاکار کی حیثیت سے میدان عمل میں اس وقت کودے جب ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ علما نے فوج اور پولیس کی نوکری کو حرام قرار دیا تو وہ نہایت جرأت اور بے باکی سے فوجی چھاؤنی میں فتوے تقسیم کرنے چلے گئے اور بغاوت پھیلانے کے جرم میں قید کر دیئے گئے۔

۱۹۲۱ء میں ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کا سیکرٹری اور آل انڈیا خلافت ورکنگ کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ لاہور کے بریڈلا ہال میں جمیعت العلمائے ہند کانفرنس ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے میاں فیروز الدین احمد کو مولانا محمد علی رجمنٹ کے نام سے رضاکاروں کی ایک جمیعت مرتب کرنے اور اجلاس کو کامیاب بنانے کا پہلا انعامی تمغا عطا کیا۔

۱۹۲۸ء میں علی برادران نے ان کو خلافت اور کانگرس کے مشترکہ اجلاس کلکتہ کو کامیاب بنانے کے لیے لاہور سے مدعو کیا۔ نہرو رپورٹ کے خلاف انھوں نے اپنے رفقا کے ساتھ لاہور میں چھپن فیصدی حقوق کا مطالبہ شروع کیا اور آخر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر کے چھوڑا۔ لکھنؤ میں قیصر باغ کی آل انڈیا یونٹی کانفرس میں وہ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ پنجاب کی طرف سے شریک ہوئے۔

شہید گنج تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ باغ بیرون موچی دروازہ کے پبلک جلسوں میں آپ نے سر ہربرٹ امرسن گورنر پنجاب کو ان کی سکھ دوستی کی وجہ سے "سر امر سنگھ" کا خطاب دیا اور اس سلسلے میں جیل بھیج دیئے گئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے مجلس اتحاد ملت کی بنیاد رکھی۔ یہ مجلس انگریزی حکومت کی اس حکمت عملی کا جواب تھی کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"۔ یہ ہندوؤں کے لیے بھی ایک زبردست ہوا تھی۔

جب قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں نئی روح پھونکنے کی مہم چلائی تو لکھنؤ کے اجلاس میں میاں فیروز الدین احمد نے پہلی دفعہ "قائد اعظم محمد علی جناح" کا نعرہ لگایا جسے سب نے پسند کیا اور محمد علی جناح کی منظوری سے یہ خطاب ان کے نام کا جزو بنا دیا گیا۔ اسی بنا پر میاں فیروز الدین احمد کو "نقیب ملت" کہا جاتا تھا۔ مگر ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مدت کے اس نقیب کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ میاں فیروز الدین احمد اب ہم میں موجود نہیں مگر ہر پاکستانی کے دل کے ساز میں ان کی گرمی آواز موجود ہے اور جب تک قائد اعظم کا نام زندہ ہے میاں فیروز الدین احمد کا نام بھی زندہ رہے گا۔

حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے مغرب کی طرف شاہزادگان کابل کی قبروں کے پاس میونسپل پرائمری سکول ہے جہاں رات کو علوم مشرقیہ کی پڑھائی ہوتی ہے۔ اس سکول اور دارالعلوم السنہ شرقیہ کا دروازہ اور برآمدہ میونسپل باغ کے اندر ہے۔ اب اس کے آگے پختہ سڑک بن گئی ہے۔

مزار کے شمال کی طرف کسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کا کتب خانہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں مسلمانوں کے مشہور انگریزی اخبار پنجاب آبزرور اور بعد میں آبزرور کا دفتر قائم ہوا جس کی ادارت میں سر شیخ عبدالقادر اور ملک برکت علی شریک رہے ہیں۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی جو عرصہ سے منہدم ہو چکی ہے۔ اب اس کی جگہ یک منزلہ عمارت ہے جس میں میونسپل ریڈنگ روم اور لائبریری قائم ہے ——— مرتب]

عہد حکومت خالصہ

[احمد شاہ ابدالی[1] کے پے در پے حملوں کے بعد جب سلطنت تیموریہ کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، مرہٹوں کی طاقت پانی پت کے مقام پر مغلوب ہو چکی اور پنجاب میں کوئی ایسی شخصیت نہ رہی جو سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ کر سکتی، تو بارہ سربرآوردہ سکھ سرداروں نے اپنے اپنے جتھے قائم کر کے بغیر کسی مزاحمت کے پنجاب کے مختلف حصوں پر اپنا تسلط جما لیا اور ۱۷۶۷ء کے قریب دریائے جہلم سے سہارنپور تک تمام میدانی علاقے میں خالصہ راج قائم ہو گیا۔ صرف ملتان، سندھ اور کشمیر مسلمانوں کے قبضے میں تھے۔ جموں اور کانگڑہ کے پہاڑی علاقوں پر ہندو راجپوت حکمراں تھے۔

سکھوں کے جتھے چونکہ مساوات کے اصول پر قائم ہوئے تھے، اس لیے برابری کے خیال سے انہیں مثل کہا جاتا تھا۔ یہ مثلیں اپنے بانی کے نام وطن یا کسی اور وصف کی بنا پر جدا جدا ناموں سے یاد کی جاتی تھیں۔ مثلاً بھنگی مثل[2]۔ رام گڑھیہ۔ کنہیا۔ اہلو والیہ۔ سکر چکیہ۔ نکئی۔ ڈلی والی۔ نشاں والیہ۔ کروڑ سنگھیہ۔ شہید یا نہنگ۔ فضیل پورہ اور پھلکیاں۔

سکھوں کی متحدہ طاقت تقریباً ستر ہزار سوار تھی مگر ان کی کوئی مرکزی حکومت نہ تھی جو مختلف سرداروں کو قابو میں رکھ سکتی۔ ہر سردار اپنے دائرہ حکومت میں خود مختار تھا۔ جو کسی کے جی میں آتا کرتا، کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ وہ آپس میں بھی دست و گریباں ہونے سے پس و پیش نہ کرتے۔ البتہ کسی بیرونی حملے کے وقت یہ سب سردار مل جاتے اور خالصہ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پنتھ کی حفاظت کے لیے لڑتے اور جب وہ خطرہ ٹل جاتا تو پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے۔ غرض ہر طرح بد انتظامی تھی اور یہ دور سکھا شاہی کہلاتا تھا۔
اسی لاقانونی کے زمانے میں ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو گوجرانوالہ میں سکر چکیہ مثل کے سردار مہان سنگھ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا

---

[1] اضافہ از مرتب۔

[2] اس مثل کا بانی سردار جسا سنگھ جاٹ تھا جو موضع پنجوار ضلع امرتسر کا رہنے والا تھا۔ جسا سنگھ کے بعد اس مثل کی باگ سردار جگت سنگھ نے سنبھالی جو بھنگ کا عادی تھا۔ اس وجہ سے یہ بھنگی مثل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ سردار گوجر سنگھ، سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ جنہوں نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کر کے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا، اسی مثل کے سردار تھے۔ ان کے نام پر قلعہ گوجر سنگھ قلعہ سوبھا سنگھ اور قلعہ لہنا سنگھ آج تک آباد ہیں۔ ان کو سہ حاکمان لاہور بھی کہا جاتا ہے۔

جس کا پیدائشی نام بدھ سنگھ تھا مگر اس کے باپ نے رسول نگر فتح کرنے کی خوشی میں اس کا نام رن جیت سنگھ رکھا۔ یہی رنجیت سنگھ باپ کے مرنے کے بعد ۱۴ اپریل ۱۷۹۰ء کو دس سال کی عمر میں گدی کا مالک بنا۔ اس نے مار دھاڑ کر کے کئی مثلداروں کو ختم کیا۔ اور باقیوں کو پناہ دے کر اپنا مطیع بنا لیا۔ آخر اپریل ۱۸۰۱ء میں بیساکھی کے موقعہ پر اس نے لاہور میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کر کے مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔ اور اپنے نام کا سکہ چلایا۔

رنجیت سنگھ نے لوگوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے کے لیے پنچائتیں مقرر کیں مسلمانوں کے فیصلے شریعت کے مطابق کئے جانے کا اعلان کیا۔ قاضیوں مفتیوں اور عالموں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں۔ چنانچہ لاہور کا پہلا قاضی نظام الدین مفتی محمد شاہ اور سعد اللہ چشتی تھے۔

اس نے شہر کو محلوں میں تقسیم کر کے ہر محلے اور برادری کا چوہدری مقرر کیا جو کاریگر اور صناع سکھوں کی لوٹ مار کے ڈر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے انھیں واپس بلا کر اپنی اپنی جگہ پھر سے بسایا چنانچہ کوچہ لوہاراں، کوچہ زرگراں، کوچہ کمان گراں، کوچہ قاضی خانہ، گجر گلی، کوچہ نقاشاں، کوچہ نقارچیاں، کوچہ درزیاں، کوچہ دھوبیاں، کوچہ ماشکیاں، کوچہ چابک سواراں کوچہ تیراہیاں، کوچہ کوٹھی واراں، کوچہ کندی گراں، کوچہ دریائی بافاں، کوچہ میخ کٹاں، کوچہ وان وٹاں، کوچہ سرکی بنداں، کوچہ پتری ماراں، کوچہ تاریاں، بازار سادہ کاراں، کوچہ پٹولیاں، کوچہ دفتری کٹاں، کوچہ خراسیاں، کوچہ چابک سواراں، کوچہ ہواگراں، کوچہ گھونگرو سازاں، کوچہ مٹی پٹاں، کوچہ کمہاراں، کوچہ سراجاں، کوچہ چنگڑاں، کوچہ ڈوگراں، کوچہ ٹوپیاں، کوچہ کاغذیاں، رٹہ تیلیاں، کٹڑہ پوربیاں، کوچہ ڈفالیاں، کوچہ پٹ رنگاں، کٹڑہ تارکشاں، کوچہ لکڑہاراں، کا چھو پورہ، کوچہ کوفت گراں، پڑ بازار، کوچہ نانباں، کوچہ جوگیاں، کوچہ مفتیاں، تکیہ سادھواں، کناری بازار اور بازار شیشہ موتی وغیرہ بعض محلے اس زمانے اور کچھ اس سے پہلے کی یادگار ہیں۔

شہر کی حفاظت کے لیے رنجیت سنگھ نے کوتوالی اور پولیس تعینات کی چنانچہ پہلا کوتوال امام بخش خرسوار تھا حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق مریضوں کے لیے خیراتی شفاخانے کھولے جن میں یونانی طریق سے علاج کیا جاتا تھا حکیم نور الدین شفاخانوں کے افسر اعلیٰ تھے۔ شہر کے گرد دوہری فصیل بنوائی، کھائی کھدوائی جس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس طرح رعایا آرام سے زندگی بسر کرنے لگی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں کا دور ختم ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چالیس سال بڑے ٹھاٹھ سے حکومت کی۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو اس کی وفات[1] کے وقت

---

[1] ایک شاعر نے تاریخ وفات یوں کہی ہے ؎

چو مہاراجہ بہادر شیر دل رنجیت سنگھ — کوچ کرد از ملک دنیا جانب دار البقا
سال تاریخش عطا از راہ در رسم تعمیہ — زد رقم بر تختہ اندوہ با درد و اعنا
بے سر و پا گشت آہ از مرگ او در روزگار — فضل و خیرات و شجاعت ثروت و جود و سخا

آخری مصرعے کے چھ صفاتیہ الفاظ کے پہلے اور آخری حرف نکال دینے کے بعد باقی ماندہ حروف ض ۸۰۰ - ی ۱۰ - ر ۲۰۰ - ا ۱ - ج - ا ۱ - ع ۷ - ر ۲۰۰ - و ۶ - ہ ۵ - خ ۶۰۰ کے اعداد ۱۸۹۶ ہوتے ہیں۔ جو بکرمی سمت ہے۔

اس کی وسیع سلطنت کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل تھا جس کی ایک حد لداخ، اسکردو اور تبت سے ٹکراتی تھی۔ دوسری درۂ خیبر سے چل کر کوہ سلیمان کی پہاڑیوں سے ملتی تھی۔ جنوب میں شکارپور سندھ تک پہنچتی تھی اور مشرق میں انگریزوں کے ساتھ دریائے ستلج مقرر ہو چکی تھی۔ اس کے خزانے میں کروڑوں روپیہ نقد، بیشمار سونے کی مہریں اور تقریباً بیس لاکھ روپیہ مالیت کے ہیرے جواہرات موجود تھے۔ ان کے علاوہ دنیا کا بہترین اور بے مثال ہیرا کوہ نور بھی اس کے توشہ خانے کو چار چاند لگا رہا تھا۔

بقول منشی محمد الدین فوق مرحوم "مہاراجہ رنجیت سنگھ فتوحات کے لحاظ سے ایک طرف سکندر اعظم کا اقبال، درباری نو رتنوں کی وجہ سے مغل اعظم شہنشاہ اکبر کی قسمت اور داد عیش و عشرت دینے کے لیے رنگیلے بادشاہوں کی طبیعت لے کر آئے تھے۔ لیکن دوسری طرف ملک گیری کی ہوس میں دوست، دشمن، ہندو مسلمان اپنے پرائے کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

ان سب باتوں کے باوجود مناظر قدرت اور انواع و اقسام کے باغات و چمنستان اور پھل پھلواڑیوں کا وہ شوق تھا کہ دہلی دروازہ سے لے کر شالامار باغ تک جو پانچ میل کا فاصلہ ہے دو رویہ سبزہ زار، کھیتوں کی بہار اور باغات کی کثرت سے ہرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس رستہ کا ذکر ہے جو سلطان پورہ اور مزار گھوڑے شاہ سے ہو کر باغبانپورہ اور بھوگیوال سے دامن بچاتا ہوا شالامار باغ کو نکل جاتا ہے۔ یہی رستہ قدیم بادشاہی رستہ کہلاتا تھا۔ ان ایام میں کہیں سبزہ لہلہاتا نظر آتا، کہیں دور دور تک گل و گلزار کے تختے دکھائی دیتے۔ جب ۱۸۳۸ء میں سر ہنری فین سپہ سالار افواج ہند، مہاراجہ کی دعوت پر لاہور آیا، تو مہاراجہ اس کے ساتھ شالامار سے اسی رستے قلعہ میں آیا۔ سر ہنری فین سبزہ زار کی یہ روح افزا کیفیت دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور مہاراجہ کی اس جدت کی اس نے بہت تعریف کی۔

باغ دیوان کرپارام، باغ راجہ دینا ناتھ اور بہت سے باغات اسی رستے پر تھے اور چونکہ یہی قدیم رستہ تھا، اس لیے مہاراجہ کا حکم تھا کہ اس رستے میں کبھی خشک زمین کا کوئی قطعہ نظر نہ آئے۔ اس لحاظ سے یہ باغ اور اس علاقے کے سبزہ زار بہت بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے خود بھی کئی باغات لاہور میں احداث کرائے، ہر باغ میں ایک مکان دل کشا بنوایا۔ جہاں وہ فراغت و فرصت کے دنوں میں جاتا اور سیر و تفریح سے دل بہلاتا۔

خالصہ عہد میں تخریب کا جتنا کام ہوا تعمیر کا اتنا نہیں ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی بہت سی اسلامی عمارات کو مٹایا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے اور اس کی بعض رانیوں نے کئی ایک مزارات کی مرمت بھی کرائی، مجاوروں کے روزینے مقرر کیے مسجدیں تعمیر کرائیں اور مسلمان فقراء کی قدمبوسی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو بہت بڑی سعادت سمجھا۔

بسنت کے دن مہاراجہ مزار مادھو لال حسین پر سلام کو جاتا اور گیارہ سو روپیہ نقد اور دو لنگیاں دوشالے خانقاہ پر چڑھاتا۔ مہاراجہ نے اس مزار کے لیے بہت سی معافیاں واگذار کیں اور زبانی فرمایا :

"میں شاہانِ چغتائی کی برابری کے لائق تو نہیں مگر حسبِ المقدور

مدد خرچ برائے فقیرانِ خانقاہ واگذار کرتا ہوں"

مہاراجہ کے عہد میں اس خانقاہ کے گدی نشین سائیں صوبے شاہ تھے۔ مہاراجہ کو ان پر بڑا اعتقاد تھا۔ جب تک سائیں صوبے شاہ

زندہ رہے، مہاراجہ ہر مہم پر جانے سے پیشتر ان سے اجازت طلب کرتا۔

رسول شاہی فقیروں میں شاہ فدا حسین بہت نامی فقیر گزرے ہیں۔ وہ سر سید احمد خاں کے نانا نواب دبیر الملک کے سگے بھائی تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کو دو سو روپیہ ماہانہ بطور نذر دیا بھجوایا کرتا تھا۔

روضہ حضرت داتا گنج بخش کی چار دیواری بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے سمت ۱۸۸۰ بکرمی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مع سقف ہائے او نیا رکرائی۔

لاہور میں مستان شاہ ایک مجذوب فقیر تھے جن کی قبر خطۂ مہانی میں ہے۔ مہاراجہ ان کا بہت ادب کرتے تھے اور خزانہ سے ایک روپیہ یومیہ بطور نذرانہ ان کی خدمت میں بھجوایا کرتے تھے۔

حضرت یعقوب زنجانی صدر دیوان کا مزار تالاب رتن چند داڑھی والا کے متصل ہے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس مکان کی خبر گیری رکھتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔

قلعہ کے قریب پریڈ کے میدان میں (جسے پہلے منٹو پارک اور اب اقبال پارک کہتے ہیں) ایک مکان جھنگی چراغ شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ چراغ شاہ، سید علی شاہ گیلانی دکنی کے مرید تھے۔ سید علی شاہ ۱۲۰۷ھ میں ملک دکن سے لاہور تشریف لائے اور ۱۲۲۷ھ میں انتقال کر گئے۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کئی دفعہ شاہ صاحب کے پاس بمراد عقدہ کشائی مہمات آتے اور نذریں پیش کیا کرتے، لیکن حضرت نے ایک دفعہ بھی ان کی نذر قبول نہ کی۔ مہاراجہ نے یہ بے طمعی دیکھ کر اپنے ایک مصاحب حکما سنگھ کو حکم دیا کہ وہ شاہ صاحب کے پاس بیٹھے اور سرکار میں اطلاع دے کہ واقعی یہ لالچ میں یا حضرت ہم کو دکھانے کے لیے ہے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہوا کرے وہ سرکاری رسد خانے سے مہیا کی جایا کرے۔

حکما سنگھ کئی مہینے آتا جاتا رہا لیکن شاہ صاحب نے کسی سے کوئی فرمائش نہ کی۔ نہ اس سے کچھ طلب کیا۔ صرف دو وقت روٹی کھا لیتے اور بس۔

یہ سن کر مہاراجہ اور بھی معتقد ہو گیا۔ ایک مرتبہ بہاں دریا چڑھ آیا۔ سب لوگ بھاگ گئے۔ مہاراجہ نے چند کشتیاں بھیجیں کہ شاہ صاحب کو سوار کر کے قلعہ میں لے آئیں۔ انہوں نے واپس کر دیں اور کہا کہ پانی کا زور صرف آج کے دن تک ہے کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مہاراجہ کے عہد میں مائی بھاگی ایک مجذوبہ تھی۔ لاہور کے قریب موضع خواجہ سعید میں رہتی تھی۔ مہاراجہ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپیہ نذر پیش کیا لیکن وہ ترش روئی سے پیش آئی۔ مہاراجہ کی دیکھا دیکھی امیر وزیر بھی آنے لگے۔ مائی بھاگی ان سب کو گالیاں دیتی اینٹیں اور پتھر مارتی۔ تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ امراء اور خود مہاراجہ اینٹیں کھاتے اور اس کے آگے آگے بھاگتے۔

سمت ۱۸۸۰ بکرمی میں مہاراجہ سخت بیمار ہو گئے۔ راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سوچیت سنگھ بہت سا نقد و جنس لے کر مائی بھاگی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مہاراجہ صاحب بیمار ہیں اور آپ کو یاد کرتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے جلیل القدر عہدہ داروں کو ناکام لوٹنا پڑا۔ آخر مہاراجہ نے اپنے بیٹے شہزادہ کھڑک سنگھ کو بھیجا جو منت خوشامد کر کے اس کو اپنے ساتھ لائے

مائی بھاگی گیارہ روز تک سرکار کے پاس رہی۔ مہاراجہ کی طبیعت رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی یہاں تک کہ گیارھویں روز بالکل آرام آگیا۔ بحالیِ صحت کے شکرانے میں مہاراجہ نے بصرفِ زرِ کثیر مائی بھاگی کو ایک عالی شان حویلی بنوا دی اور وقتاً فوقتاً اس کے تکیہ اور لنگر کی خدمت کرتے رہے ——— مرتب]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے طویل عہدِ حکومت میں اور اس کے بعد کے مختصر دَور میں سکھ سرداروں نے لاہور میں بہت سے باغ تعمیر کرائے جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں صرف چند باغات کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

بادامی باغ

فقیر سید عزیز الدین امرائے رنجیت سنگھ میں سب سے زیادہ معتمد اور دانا وزیر و مشیر اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے دربار میں ممتاز ترین ہستی تھے۔ اس دَور کے متعلق ان کی ہر بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ خان بہادر فقیر سید قمرالدین آنریری مجسٹریٹ ان کے فرزند تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کچھ سُنا اور بیان کیا، اس کی بنا پر خان بہادر سید محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:۔

"جس جگہ کا نام اب بادامی باغ ہے یہ جگہ ایامِ قدیم میں شہزادی "گل بادام"[1] کے نام سے مشہور تھی جس کا مزار مستی دروازہ اور خضری دروازہ (موجودہ نام شیرانوالہ دروازہ) کے درمیان واقع تھا۔ اس مزار پر سنگِ مرمر کا بیش قیمت پتھر تھا۔ سکھ سرحاکمان لاہور کے زمانے میں یہ عالی شان خوب صورت مقبرہ اور اس کا ملحقہ باغ تباہ و برباد ہو گیا۔"

اس تباہی و بربادی کے باوجود اس شہزادی کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ جگہ اسی کے نام سے بادامی باغ مشہور ہو گئی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد میں جو سہ حاکمان لاہور کے زمانے سے بدرجہا غنیمت تھا، اس باغ کو دوبارہ رونق دی اور امرود، انار، نارنگی، رنگترہ، چکوترہ، جامن، انا شہانی، آم اور آڑو وغیرہ ثمر دار درختوں کے علاوہ باداموں کے بوٹے بھی بکثرت لگوائے تاکہ بادامی باغ صحیح معنوں میں بادامی باغ کہلائے۔

[منشی سوہن لال نے عمدۃ التواریخ میں کئی جگہ اس باغ کا نام "باغ پائین دیوار قلعہ" لکھا ہے۔ چنانچہ دفتر دوم کے صفحہ ۴۰۳ پر لکھتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ

---

[1] مغلوں کے زمانے میں کسی شہزادی کا نام گل بادام نظر سے نہیں گزرا۔ نہ جہاں آج بادامی باغ واقع ہے وہاں کوئی میدان تھا۔ بلکہ یہاں آج بھی زمین کھودنے سے ریگ بکثرت نکلتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہاں پہلے دریا بہتا تھا۔ ممکن ہے گل بادام کا نام انارکلی اور گل بکاؤلی کی طرح محض افسانہ ہو یا اس کا کچھ تعلق مہاراجہ کی اپنی رانی گل بیگم یا گل بہار سے ہو جس کا مقبرہ گل بیگم کے باغ میں موجود ہے جو قبرستان میانی میں واقع ہے۔ (مرتب)

شالہ باغ اور باغ شاہ بلاول کی سیر کے بعد" باغ پائیں دیوار قلعہ" میں رونق بخش ہوئے۔ پھر باغ کی بہار کے متعلق لکھتے ہیں" وخیام فرحت ارتسام بہ آں رسیدہ آب مشعشب کنا بیدہ بہ سیر دگل گشت شگفتہ و گلزار یشبو کہ بہ ایوان مختلف دا شکال متنوعہ الاوضاع و بہ صنایع و بدایع باغبان مرتب شدہ بود متوجہ شدند"——— مرتب]

مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ (۱۸۴۲ء) میں جب لارڈ آکلینڈ وائسرائے ہند نے اس شرط پر امیر دوست محمد خاں کو انگریزی علاقہ سے کابل میں بھیجا منظور کر لیا کہ اس کے بدلے میں جرل سیل اور دیگر انگریز قیدیوں کو افغان بہ اعزاز تمام ہندوستان روانہ کر دیں تو مہاراجہ شیر سنگھ کے مشورہ سے ان معزز قیدیوں کے تبادلے کا مقام لاہور ہی قرار پایا اور ان شرائط کی تکمیل کی ذمہ داری مہاراجہ نے خود قبول کی۔ یہ معزز مہمان ہولیوں کے ایام میں لاہور پہنچے۔ مہاراجہ نے ہولیوں کے دربار کے لیے بادامی باغ ہی کو پسند کیا۔ جس کے دلکش سبزہ زاروں پر مستی دروازہ سے باہر نکلتے ہی اہلِ لاہور کی نگاہ سب سے پہلے پڑتی تھی۔

مہاراجہ کے حکم سے بادامی باغ کو خیابانوں میں تقسیم کر کے وسط میں ایک خوبصورت عارضی بنگلہ بنایا گیا۔ موزوں اور مناسب مقامات پر آبشار بنائے گئے۔ ہر خیابان میں پانچ پانچ فوارے نصب کیے گئے جن میں پانی کی جگہ عطر اچھلتا تھا۔

پھاگن کی ۲۹ تاریخ تھی کہ صبح کے نو بجتے ہی قلعہ سے توپوں کی آواز بلند ہوئی۔ رسالے اور پلٹنیں زرق برق وردیاں میں ملبوس باجہ نوازوں کی معیت میں اس سڑک پر سے گزرنے لگیں جو بادشاہی مسجد سے باغ کے عارضی بنگلے تک بنائی گئی تھی۔ مہاراجہ چھ گھوڑوں کی گاڑی پر سوار ہو کر اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوا اور سنگ مرمر کے فرش پر جہاں طلائی کرسیاں موجود تھیں سب بیٹھ گئے۔ نغمہ سرائیوں، ناچ مجروں اور اراکین سلطنت سے تعارف کرانے کے بعد یہ عظیم الشان جلسہ ختم ہوا۔ ایک کہن سال بزرگ کا بیان ہے کہ" اس تقریب پر اس قدر عطر خرچ ہوا کہ پانچ چھ سال تک باغ کی مٹی سے عطر کی خوشبو آتی رہی"[1]

انگریزوں کی عملداری کے آغاز (۱۸۴۹ء) تک یہ مشہور و معروف باغ قلعہ کے شمال کی طرف موجود تھا۔" انگریز صاحبان مع میم صاحبات" بادانوگوں کے ہمراہ شام کے وقت اس باغ کی سیر سے دل بہلایا کرتے تھے۔ اس وقت باغ میں انگریزی باجا بجتا تھا اور صدہا تماشائی جمع ہو جاتے تھے۔

۱۸۶۰ء میں اس باغ کا نام کمپنی باغ رکھا گیا اور اس کے مہتمم لاہور کے سب سے پہلے روزانہ انگریزی اخبار لاہور کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر ہنری کوپ قرار پائے۔ چونکہ یہ مقام شہر کے بالکل متصل تھا اور انگریزوں کی آمد و رفت یہاں بکثرت تھی، اس لیے انگریزوں نے دلچسپیوں سے قدرے فاصلے پر رہنے کے لیے اس باغ کو فروخت کر کے اس کے بدلے لارنس گارڈن تعمیر کر لیا۔ جس سے اس باغ کی عظمت و خصوصیت جاتی رہی اور اسے پوچھنے والا کوئی نہ رہا۔ یہاں تک کہ جھاڑ جھنکار اُگ آئے اور یہ جنگل

---

[1] خالصہ اخبار لاہور ۱۷ مئی ۱۹۱۸ء۔

کا نمونہ بن گیا۔

۱۸۵۹ء میں اجرائے ریل کے لیے ریلوے کارخانوں کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے امرتسر تک گاڑی روانہ ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں یا اس کے لگ بھگ لاہور سے وزیر آباد تک ریلوے لائن بنی جس سے بادامی باغ کی بہت سی زمین ریلوے لائن اور اسٹیشن کے احاطے میں آگئی۔

تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہوا کہ ریلوے لائن کے پار باداموں کے چند درخت موجود تھے۔ اب نہ وہ گل بادام ہے نہ اس کا مزار اور باغ۔ البتہ لوہے کے کارخانے اور رہائشی مکانات بن گئے ہیں اور غلہ منڈی کے لیے جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔

گیا حسن خوبان دل خواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

باغ مہاراجہ رنجیت سنگھ

[ایک انگریز مورخ نے مہاراجہ کے ایک باغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لاہور میں ہردوار کا ایک جوگی آیا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ایک صندوق میں بند ہو کر بغیر خورد و نوش کے زمین کے اندر جتنا عرصہ مقرر کیا جائے اتنے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مہاراجہ کو قدرتی طور پر اس کے دعوے پر یقین نہ آیا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اس کا امتحان لیا جائے۔

اس کے لیے ایک دن مقرر کیا گیا اور فقیر نے مہاراجہ کے باغ میں تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ مہاراجہ اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی موجودگی میں فقیر نے اپنا کمال دکھایا۔ اس نے اپنے نتھنے، کان اور منہ کے سوا باقی تمام سوراخ جن کے راستے اس کے جسم میں ہوا داخل ہو سکتی تھی، بند کر دیئے اور اپنے آپ کو برہنہ کر کے کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ جس وقت اس کی زبان لوٹا کر اس کے حلق کو بند کیا گیا تو وہ فوراً بے ہوش ہو گیا اور اس پر غفلت و بے حسی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد تھیلا بند کیا گیا اور اس پر مہاراجہ کی خاص مہر لگا دی گئی۔ پھر اس کو چھوٹے سے لکڑی کے صندوق میں رکھ کر مقفل و سر بہ مہر کیا گیا۔ اس بکس کو ایک تہہ خانے میں رکھا گیا اور اوپر مٹی ڈال کر جو بو دیئے گئے۔ اس تہہ خانے کے اوپر مکان تھا اس کا دروازہ بھی مقفل کیا گیا۔ چاردیواری مکان کے گرد موجود تھی۔ اس کے دروازے کو بھی اینٹوں سے چن کر بند کر دیا گیا۔ مکان کے باہر سپاہیوں کا پہرا لگا دیا گیا تاکہ کوئی شخص اس جگہ کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔

چالیس دن اور رات نہایت سخت نگہبانی اور محافظت کی گئی۔ اس عرصہ کے گزر جانے کے بعد فروری ۱۸۳۷ء کی کسی تاریخ کو مہاراجہ اپنے نبیرہ کنور نو نہال سنگھ اور چند سرداروں نیز جرنیل ونتورہ، کپتان ویڈ اور ڈاکٹر میکر یگر کے ہمراہ اس جگہ فقیر کو نکالنے کے لیے آئے۔ ان کے علاوہ بھی ہزارہا لوگ یہ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ باہر کی اینٹیں اور مٹی علیحدہ کی گئی۔ مکان کا قفل کھولا گیا اور تہہ خانے سے صندوق نکال کر باہر کھلی ہوا میں لایا گیا۔ ڈاکٹر میکر یگر کا بیان ہے:۔

"ہم نے دیکھا کہ فقیر ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا اور جب اس چادر

کو اٹھایا تو اس آدمی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس کے ہاتھ اور بازو پسلیوں کے ساتھ لگے ہوئے اور وہ دو زانو بیٹھا تھا۔ جوگی نے عمل ہونے سے پیشتر اپنے ہوش میں آنے کا جو علاج بتایا تھا۔ اس کے مطابق پہلی تدبیر یہ کی گئی کہ اس کے سر پہ گرم پانی ڈالا گیا۔ اس کے بعد آٹے کی گرم روٹی اس کے سر کی چوٹی پہ رکھی گئی۔ پھر موم کی ایک گولی اس کے نتھنے میں سے نکالی گئی۔ اس پر اس نے زور سے دم لیا۔ اب اس کا منہ کھولا گیا اور زبان جو تالو کے ساتھ لگائی گئی تھی اصلی جگہ پہ لائی گئی۔ پھر گھی سے اس کی مالش کی گئی اور ہونٹوں پر بھی گھی لگایا گیا۔

اس وقت تک مجھے کلائی میں نبض کی کوئی حرکت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ جسم کی حرارت صحت کے معمولی درجے سے بھی زیادہ تھی۔ ٹانگوں اور بازوؤں کو سیدھا کر کے آنکھیں کھولی گئیں۔ ٹانگوں پر خوب مالش کی گئی اور آنکھوں پہ کسی قدر گھی چھڑکا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے ڈیلے مدھم اور پھیلے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی مردہ آدمی کے ہوتے ہیں۔ اس وقت فقیر نے ایسی علامت ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جان پڑ رہی ہے۔ نبض چلنے لگی اور جسم کی غیر طبعی حرارت بھی فوراً کم ہو گئی۔ اس نے ایک دو دفعہ بولنے کی کوشش کی مگر ضعف کے سبب سے اس کی آواز نہ نکل سکی۔ آخر چند لفظ اس کے منہ سے نکلے مگر آواز ایسی نرم اور کمزور تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز قائم ہوتی گئی اور اس نے بعض آدمیوں کو جو کھڑے تھے پہچان لیا۔ اس کے بعد وہ مہاراجہ سے جو سامنے بیٹھے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے تھے، ہم کلام ہوا۔

جس وقت فقیر گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا تو اس مرحلہ کی کامیابی کو مشتہر کرنے کے لیے توپیں سر کی گئیں اور دوسری طرح سے بھی اظہارِ مسرت کیا گیا۔ مہاراجہ نے ایک بھاری طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈالی، ہاتھوں کے جڑاؤ طلائی کڑے، شال دوشالے اور اسباب نمائش بھی اس کو انعام دیا۔

جس باغ میں حبسِ دم کا یہ واقعہ پیش آیا تھا اور جہاں بے اندازہ مخلوق یہ تماشا دیکھنے جمع ہوئی تھی، وہ رنجیت سنگھ

کے نام سے موسوم تھا اور قلعہ کے سامنے حضوری باغ کے اس دروازہ کے متصل تھا جو شمال کی طرف ہے اور آجکل بند رہتا ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال پیشتر اس دروازے کے اوپر مہاراجہ حسین ناظم لکھنوی کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں سے مہاراجہ کی سمادھ کو بھی رستہ جاتا تھا۔ یہ باغ بادشاہی مسجد کی شمالی دیوار کے نیچے جنوب کی طرف چلا جاتا تھا۔

اسی باغ میں مہاراجہ کو نذر آتش کیا گیا اور یہیں ان کی سمادھ بنائی گئی۔ چنانچہ عمدۃ التواریخ کے دفتر سوم حصہ پنجم کے ص ۱۵۶ پر لکھا ہے:

"در باغیچہ سرکار دالا متصل دروازہ زیر مسجد بادشاہی حضور والا را بعد از اشنان در حطب صندل بنشانیدند و سرکار دانت پرکاش و جیسن سائی ساختہ شاہل سوز سرکار گشتہ چون سر مبارک را بر زانوئے خود نہاد۔ تمامی مہرولداں سر بہ سجدہ فرود آوردند۔ باز روغن زرد انداختہ و پھر خس نہادہ آتش دادند۔"

آج پورا ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرا کہ اس باغ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور صرف کتابوں میں اس کا تذکرہ رہ گیا۔ ع

انقلابات ہیں زمانے کے۔ ——— مرتب[1]

حضوری باغ

[2][زمانے ایسی کتنی عظیم یادگاریں زمین کے سینے میں دفن ہیں جنھیں انسان نے ہزاروں تمناؤں کے ساتھ تعمیر کیا تھا یہ ایک دردناک حقیقت ہے۔ لیکن اس سے بھی دردناک یہ بات ہے کہ تاریخ کے جو قیمتی نشانات زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں ان کی حقیقت سے بھی ہم پوری طرح واقف نہیں۔

تاریخ کی انہی یادگاروں میں ایک لاہور کا حضوری باغ بھی ہے۔ جو بظاہر کھلے دل لاہور میں ایک ایسے مقام پر ہے۔ جو بذات خود تاریخ کے ایک اہم باب کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ باغ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس وقت بنوایا جب اس نے کابل کے بدنصیب حکمران شاہ شجاع سے دنیا کا اہم ترین ہیرا کوہ نور چھیننے کے بعد لاہور میں ایک جشن عام منعقد کیا اور خوشی منائی۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مہاراجہ زر و جواہر کا بڑا مشتاق تھا اور اس کا یہ اشتیاق لالچ کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ فروری ۱۸۱۳ء میں جب وہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ متوفی جودھ سنگھ والئے وزیر آباد کے مقبوضات اپنے تصرف میں لائے تو اسے یہ خبر پہنچی کہ شاہ شجاع والئے کابل اپنے حریف دوست محمد خاں سے شکست کھا کر اس کے ملک میں پناہ لینے آ رہا ہے۔ اور اگرچہ

---

[1] یہ مضمون مرتب نے از سر نو تفصیل سے لکھا ہے۔
[2] حضوری باغ کے حالات مرتب کے قلم سے ہیں۔

اس کی بہت عزت اور خاطر مدارات کی گئی۔ مگر وہ اس وقت زیادہ عرصہ یہاں قیام نہ کر سکا اور جلد ہی واپس چلا گیا۔

مارچ ۱۸۱۳ء میں وہ پھر لاہور آ گیا۔ اور اس کی بیوی نے جو پہلے سے یہاں موجود تھی اسے بتایا کہ مہاراجہ نے دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ مہاراجہ کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہو گیا کہ کوہ نور ہیرا اسے دے دیا جائے اور اس کے عوض میں جاگیر لے لی جائے۔

یہ مشہور اور نایاب ہیرا جو ڈیڑھ انچ لمبا اور ایک انچ چوڑا تھا۔ دہلی میں تختِ طاؤس کی زینت رہ چکا تھا۔ وہاں سے وہ نادر شاہ کے ہاتھ آیا جس کے انتقال کے بعد احمد شاہ نے اپنے باپ کے ورثہ میں اسے پایا۔ اور اب یہ شاہ شجاع کے قبضے میں تھا۔ چونکہ یہ الماس نہایت قیمتی تھا۔ اس لیے مہاراجہ کی خواہش تھی کہ جس طرح بن پڑے یہ ہیرا اس کے پاس آ جائے۔ ادھر شاہ شجاع چاہتا تھا کہ یہ نادر چیز اس کے ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر دونوں فریقوں کی موجودہ حالت ایک جیسی نہ تھی۔ مہاراجہ با اختیار تھا اور شاہ شجاع بے بس اور بنا ہوا مہرہ۔

مہاراجہ نے بادشاہ کی ضد پر غالب آنے کے لیے سختی تک کی اور ہیرا اپنے قبضہ میں لانے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا کہ الماس اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر جب کسی حجت سے کام نہ چلا تو مجبوراً کوہ نور دینے پر راضی ہو گیا۔ یکم جون ۱۸۱۳ء کو مہاراجہ کوہ نور ہیرا لینے کی خاطر شاہ شجاع کی خدمت میں گیا۔ وہ اس وقت مبارک حویلی میں مقیم تھا۔ جو آج کل قزلباش خاندان کے قبضے میں ہے اور موچی دروازہ کے اندر چوک نواب صاحب میں واقع ہے۔ بادشاہ نے مہاراجہ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اس کو عزت و توقیر سے بٹھایا۔ اور ایک گھنٹے تک دونوں بڑی متانت کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد مہاراجہ بے تاب ہو گیا اس نے ایک مصاحب کو اشارہ کیا کہ وہ بادشاہ کو اس ملاقات کا مقصد یاد دلائے اس کا جواب تو کچھ نہ ملا مگر بادشاہ نے اپنی آنکھوں سے ایک خواجہ سرا کو کچھ اشارہ کیا جو اسی وقت جا کر ایک چھوٹا سا ڈبہ اٹھا لایا اور اسے قالین پر دونوں کے درمیان رکھ دیا۔ مہاراجہ نے اس ڈبے کو کھولنے کا حکم دیا۔ ایک ہی نظر میں اس نے الماس کو پہچان لیا۔ اسے اٹھایا اور واپس آ گیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے بیس ہزار روپے اور کئی دیگر قیمتی جواہر دے کر رہائی حاصل کی اور بہت سی مصیبتیں اٹھانے کے بعد انگریزی حکومت کی پناہ لی۔ یہاں اس کا معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور وہ اس پناہ میں اس وقت تک لدھیانہ میں رہا جب تک اسے دوبارہ تخت کابل حاصل ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے اس بدنصیب مہمان سے "کوہ نور" ہیرا چھیننے کے بعد لاہور میں ایک عظیم الشان جشن عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنے خرچ سے چراغاں کریں اور خوشیاں منائیں۔ سارا شہر مہاراجہ کے حکم سے خوشیاں منا رہا تھا۔ صرف شاہ شجاع کی "مبارک حویلی" ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔

اسی جشن کے موقعہ پر مہاراجہ نے حکم دیا کہ لاہور کے قلعہ اور بادشاہی مسجد کے درمیان جو وسیع چبوترہ اور کھلا میدان موجود ہے۔ اس میں ایک باغ لگایا جائے۔ چنانچہ منشی سوہن لال اپنی مشہور کتاب عمدۃ التواریخ دفتر دوم کے صفحہ ۱۲۹ پر سمت ۱۸۶۹ بکرمی کے واقعات میں لکھتا ہے:۔

"سرکار دولت مدار کا واجب الاطاعت حکم ممالک محروسہ کے
کارپردازوں کے نام صادر ہوا کہ ایک نیا باغ مسجد اور قلعہ

کے درمیان جس قدر جلد ہو سکے بنایا جائے۔ اس لیے
ماہر باغبان نئے باغ کی تیاری میں مستعدی کے ساتھ سرگرم
ہوئے۔"

مہاراجہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں فقیر عزیز الدین کی نگرانی میں یہ باغ احداث ہوا۔ اور اس کا نام حضوری باغ رکھا گیا۔ مہاراجہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس موقعہ پر جمعدار خوشحال سنگھ نے جو مہاراجہ کی ڈیوڑھی کا جمعدار تھا۔ عرض کیا کہ باغ کے درمیان ایک بارہ دری بھی نشست شاہی کے لیے سنگ مرمر کی بنی چاہیئے۔ مہاراجہ نے کہا۔ بات تو ٹھیک ہے مگر پنجاب میں سنگ مرمر کہاں سے آئے گا؟ جمعدار نے کہا سرکار کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ لاہور کا تمام شہر مقبروں اور مزاروں کے پتھروں کی بدولت سنگ مرمر کی کان بنا ہوا ہے۔ سرکار جس قدر چاہیں اس کان سے پتھر نکلوا سکتے ہیں اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں چنانچہ بارہ دری کی تجویز منظور ہو گئی۔ اور خلیفہ نورالدین کے نام پروانہ جاری ہوا کہ حضوری باغ کے روبرو شاہی مسجد کے چبوترہ پر ایک سنگین اور متین بارہ دری بنائی جائے۔ اسی بنا پر سرکار عالی کی تاکید کے بموجب کامل معماروں کو اس کے بنانے اور ترمیم کرنے میں لگایا گیا" عمدۃ التواریخ دفتر دوم صفحہ ۲۵۶)

اس بارہ دری کی تعمیر اور زیب و زینت کے لیے مقبرہ زیب النساء (نواں کوٹ) مقبرہ شاہ شرف (متصل بھاٹی دروازہ) مقبرہ نورجہاں۔ مقبرہ آصف جاہ اور مقبرہ جہانگیر وغیرہ سے پتھر اکھڑوا دیا گیا۔ اور دو سال کے عرصہ میں یہ باغ۔ اس کی بارہ دری اور فوارے سب درست ہو گئے۔

" اس بارہ دری کی عمارت سہ منزلہ ہے۔ نیچے کی منزل یعنی تہ خانہ میں پندرہ سیڑھیاں اتر کر جاتے ہیں۔ زینہ سرخ پتھر کا ہے سیڑھیوں کے آگے ڈیوڑھی ہے جس کے تین طرف سنگ مرمر کی دہلیزیں لگی ہیں۔ تہ خانہ کے وسط میں ایک قابونی بارہ دری ہے۔ جو اب تک چونے سے بنی ہے۔ اس کے چاروں طرف غلام گردش ہے جس میں روشندانوں کے ذریعے سے روشنی آتی ہے جو اوپر کی منزل میں رکھے گئے ہیں۔

اس بارہ دری کی دوسری منزل تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ باہر کا کھلا ہوا سنگ مرمر کا چبوترہ ہے۔ جو بارہ دری کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، یہ چبوترہ آٹھ فٹ چوڑا اور تین فٹ زمین سے اونچا ہے اس کے وسط میں چاروں طرف ایک ایک فٹ اونچا ایک چبوترہ ہے جو اصلی چبوترے کی دیوار سے کچھ بڑھا کر بنایا گیا۔ اس چھوٹے سے مربع چبوترہ کو شہ نشین کہتے ہیں بارہ دری میں دربار کرتے وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نشست اسی شہ نشین پر ہوتی تھی۔ اس چھوٹے بڑے چبوترے پر سنگ مرمر کا فرش ہے۔ جس میں دوہرے رنگدار پتھر بھی لگائے گئے ہیں۔ بڑے چبوترے پر جانے کے لیے ہر سمت دو دو سیڑھیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ جن کے چار چار زینے ہیں۔

" بڑے چبوترے سے گزر کر بارہ دری کی اصلی عمارت شروع ہوتی ہے۔ جو چبوترے سے دو فٹ بلند ہے اس میں تین تین دہن قابونی مرغولی چاروں طرف رکھے گئے ہیں۔ دوہرے دوہرے ستون نہایت خوشنما ہیں جن پر منبت کاری کی گئی ہے۔ تینوں دہنوں کے بغل میں ایک ایک دروازہ ہے جس پر سنگ مرمر کی چوکھٹیں لگی ہیں۔ ان دہنوں سے جب اندر جائیں تو دس فٹ زمین غلام گردش

کا چبوترہ دوسری بارہ دری آتی ہے جس کے اوپر تیسری منزل ہے۔ اس میں بھی بارہ در ہیں مگر ستون اکہرے ہیں۔ چھتیں ہر منزل کی سنہری منبت کاری اور آئینہ کاری سے منقش ہیں۔ باہر کی طرف چھت کے برابر سنگِ مرمر کا چھجہ بنایا گیا ہے جس پر بطور منڈیر سنگِ مرمر کی جالیاں جڑی ہیں۔ تیسری منزل پر جانے کے لیے رنگ مرمر کا زینہ ہے جس میں سولہ سیڑھیاں ہیں (خلاصہ تاریخ لاہور از رائے بہادر کنہیا لعل)۔

مشہور سیاح ولیم مورکرافٹ اپنے سفر نامہ مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء کے صفحہ ۳۹ پر حضوری باغ کی بارہ دری کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :۔

"اس باغ کے اندر ایک چھوٹی سی سہ منزلہ عمارت ہے
جس کی درمیانی منزل میں لکڑی کا خوبصورت کام ہے اور
جس کی رنگین منقش چھت میں چھوٹے چھوٹے شیشے جڑے
ہیں۔ بارہ دری کے باہر ایک خوبصورت فوارہ ہے جو
ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ اس میں خس کی ٹٹی لگا کر گرمی کے دنوں
میں بارہ دری سے خواب گاہ کا کام لیا جاتا ہے۔"

اس بارہ دری میں مہاراجہ اکثر جشن عیش و نشاط منایا کرتا تھا۔ منشی سوہن لعل عمدۃ التواریخ کے صفحہ ۲۶۰ پر لکھتا ہے :۔

"ہولی کے جشن کی محفل عیش و نشاط حضوری باغ میں منعقد
ہوئی اور مہاراجہ نے اس میں جلوس فرمایا۔ تمام سرکردہ
اہل کار، راجے اور اطراف و اکناف کے وکیل ہولی کے
اس جشن میں شریک ہوئے۔"

حضوری باغ کے جنوب مشرق کی طرف ایک گلاب خانہ بھی تھا جس میں شراب کشید کی جاتی تھی اور مہاراجہ کے لیے اس کے لائق اور قابل درباری حکیم فقیر نور الدین ادویہ تیار کرتے تھے۔

ڈاکٹر مارٹن جو جون ۱۸۳۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں پہلی دفعہ لاہور پہنچے اور کئی سال تک رنجیت سنگھ کے دربار میں رہے، اس گلاب خانے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ [illegible]س کو گلاب خانہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں گلاب اور بید مشک وغیرہ کشید کیا جاتا ہے۔" یہیں انھوں نے سب سے پہلے اپنا مطب جاری کیا اور یہیں وہ فقیر عزیز الدین اور فقیر نور الدین کو جو رنجیت سنگھ کے مشہور منشی اور مشیر کار تھے، دوا سازی کے طریقے اور کیمیا گری کے گر بتایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ رنجیت سنگھ کے لیے کابلی انگوروں سے شراب بنائی جاتی تھی۔ یہ شراب ہندو اور سکھ بناتے تھے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کو نزدیک آنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ وہ کہیں شراب کو بھرشٹ نہ کر دیں[2]۔

اس کے بعد مارٹن لکھتا ہے کہ "سرکاری دواخانہ بھی حکیم نور الدین کے سپرد تھا جہاں وہ مہاراجہ کو خوش کرنے کے لیے

---

[1] یہ منزل ۱۹ جولائی ۱۹۳۲ء کو باد و باراں کے صدمے سے اچانک گر گئی اور اب تک اس کی مرمت نہیں ہو سکی۔

[2] ڈاکٹر مارٹن رنجیت سنگھ کے دربار میں، از سید عبد القادر مطبوعہ الطبیب لاہور نومبر ۱۹۴۲ء۔

قسم قسم کی مسک ادویہ اور کشتہ جات تیار کیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔"

جنوری ۱۸۴۱ء میں حضوری باغ، قلعہ اور بادشاہی مسجد کے گرد ایک عظیم جنگ ہوئی۔ راجہ گلاب سنگھ، سردارانِ سندھانوالیہ، جمعدار خوشحال سنگھ اور رانی چند کور جو قلعہ کے اندر تھے ایک طرف تھے اور شہزادہ شیر سنگھ جسے سب خالصہ نے پنجاب کا مہاراجہ تسلیم کر لیا تھا۔ دوسری طرف تھا۔ اس کے ہمراہ ستر ہزار پیدل فوج تھی۔ اور پچاس ہزار متعلقین فوج تھے۔ ان ایام میں بادشاہی مسجد سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا۔ شیر سنگھ حضوری باغ کی بارہ دری میں بیٹھ کر اپنے افسروں کو مقامات جنگ پر جانے کا حکم دیتا تھا۔ جب اس کی مدد سے قلعہ پر توپیں ایک دم چلائی جاتی تھیں تو دیوار و در دہل جاتے تھے اور بہادر سے بہادر نوجوانوں کے کلیجے دہل جاتے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی جھڑپوں کے بعد شیر سنگھ کو حضوری باغ چھوڑنا پڑا۔ محاصرہ کے سات دن بعد جب شیر سنگھ کی فوج نے بادامی باغ میدان پر ہٹا۔ اور حضوری باغ سے اپنی لاشیں اٹھانی شروع کیں تو ۴۸۶ آدمی، ۶۱۰ گھوڑے اور ۲۰۳ بیل مردہ پائے گئے۔

جب سبراؤں کی جنگ (۱۰ فروری ۱۸۴۶ء) کے بعد نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ۱۸ فروری کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے پاس بمقام للیانی (قصور) حاضر ہو کر سکھ فوج کی حماقتوں کی پاداش میں معافی مانگی۔ اور وائسرائے نے معافی دینے کے بعد انگریزی فوج کی حفاظت میں اسے ۲۰ فروری کو قلعہ لاہور میں داخل کیا تو سر ہنری گف کمانڈر ان چیف سپاہ انگلشیہ ایک دستہ فوج لے کر بادشاہی مسجد اور حضوری باغ پر قابض ہو گیا۔ آخر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزی فوج باغ انارکلی اور بارہ دری نواب وزیر خاں میں چلی گئی۔ اور حضوری باغ اور بادشاہی مسجد کو انگریزوں نے واگذار کر دیا۔ (بارہ دری نواب وزیر خاں لاہور کے عجائب گھر کے عقب میں واقع ہے۔ اس میں آجکل پبلک لائبریری قائم ہے۔)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جو باغ، فوارے اور حوض بارہ دری کے گرد بنائے گئے تھے۔ قریباً ایک سو سال کے عرصہ میں نہ صرف وہ مٹی میں دب گئے بلکہ بارہ دری کی دو تین سیڑھیاں بھی زمین نگل گئی۔ یہاں تک کہ لاہور کے لوگ بھول گئے کہ یہاں کوئی فوارہ تھا۔ اور سیڑھیاں بھی موجودہ سیڑھیوں سے زیادہ تھیں۔ قریباً چالیس پچاس برس ہوئے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے عہد میں ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ نے کسی پرانے نقشہ کے مطابق گم شدہ سیڑھیوں، فواروں اور حوض کا پتہ لگایا چنانچہ تھوڑی سی زمین کھودنے پر یہ سب کچھ برآمد ہو گیا اور باغ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ بقول حضرت فوق مرحوم ؎

تمہارے تیر کے زخموں کے شاید کچھ نشاں نکلیں
ہمارے دل کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں

اس موقعہ پر لاہور کے اکثر لوگ یہ گم شدہ حوض، فوارے اور سیڑھیاں دیکھنے جاتے تھے۔ اور حیران ہوتے تھے کہ زمین کس طرح اپنے دفینے اگل رہی ہے۔

باغ کا نظارہ دلفریب ہے۔ عیدین کے دنوں میں اور بعض خاص خاص تقریبوں پر باغ میں بہت رونق ہوتی ہے۔ فوارے چھوٹتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں اکثر لوگ بارہ دری میں آکر بیٹھتے اور باغ کی تفریح سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ باغ کے سامنے بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے ایک طرف علامہ سر محمد اقبال کا خوبصورت مزار ہے اور دوسری طرف سر سکندر حیات خاں وزیراعظم

پنجاب کی قبر ہے ——— مرتب]

باغ راجہ دھیان سنگھ

راجہ دھیان سنگھ راجۂ راجگان کہلاتا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وزیرِ اعظم تھا۔ اس نے نالہ یعنی پرانے دریا کے کنارے ایک عالی شان باغ تعمیر کرایا۔ جس میں جامن اور آم کے درخت خصوصیت سے بہت زیادہ تھے۔ اس کی چار دیواری بڑی مضبوط تھی۔ لیکن انقلاب کے زبردست ہاتھوں سے کوئی آہنی دیوار بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ چار دیواری موجود نہیں البتہ دائرہ رکس کے عقب میں قلعہ اور مستی دروازہ کے باہر سرکلر روڈ کو طے کرنے کے بعد جامن اور آم کے درخت نظر آتے ہیں۔ باغ کے زیادہ حصے میں اب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

راجہ سوچیت سنگھ، راجہ ہیرا سنگھ، میاں اودھم سنگھ اور تمام ڈوگرہ سرداروں کی سمادھیاں اسی باغ میں واقع ہیں۔ جب نو ماہ کی وزارت پنجاب کے بعد رانی جنداں کے بھائی راجہ جواہر سنگھ کو بدھ سمت ۱۹۰۲ ب میں فوج خالصہ نے قتل کر دیا تو اس کی آخری وصیت کے مطابق اسی باغ میں سمادھ راجہ سوچیت سنگھ کے متصل اس کی سمادھ بھی بنائی گئی۔ رانی جنداں اسی مقام پر آکر اپنے بھائی کے ماتم میں سینہ کوبی کرتی اور بہ آواز بلند رویا کرتی اور سنگھ فوج کے افسروں کو گالیاں دیا کرتی۔ اسی باغ میں راجہ جواہر سنگھ کے ساتھ اس کی چار رانیاں ستی ہوئیں۔ جنھوں نے چتا پر بیٹھ کر سکھوں کو بد دعائیں دیں اور ان کی سلطنت کے تباہ ہو جانے کی دعائیں مانگیں۔ اب یہ سمادھیں باوامی باغ کے ریلوے مال گودام کے متصل ہیں۔

["۹ روپہ سمت ۱۹۰۳ ب کو صاحب کلاں (ریذیڈنٹ) نے کارداروں کے نام
پروانہ جاری کیا کہ فوج انگریزی آرہی ہے۔ گذر وبرو وال سے لاہور تک
جو پلٹن انگریزی آئے اس کے لیے ہر منزل پر رسد، دانہ، گھاس، لکڑی،
چارپائی وغیرہ خدمات کا مکمل انتظام کیا جائے اور یہ تمام سامان باغ بیرون
قلعہ میں جہاں سمادھ اودھم سنگھ و راجہ سوچیت سنگھ ہے جمع رکھا جائے۔"
(عمدۃ التواریخ دفتر پنجم ص ۲۹)۔ چونکہ یہ باغ راجہ گلاب سنگھ کے قبضے
میں تھا اس لیے اس تمام سامان کی ذمہ داری قاضی محکم دین وکیل راجہ گلاب سنگھ
کو سونپی گئی ——— مرتب]

مہاراجہ رنبیر سنگھ خلف مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ خلف راجہ رنبیر سنگھ ان سمادھوں پر متھا ٹیکنے کے لیے آیا کرتے تھے اور گرنتھیوں کو نذر نیاز دے جایا کرتے تھے۔

باغ دیوان کرپا رام

دیوان کرپا رام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ایک نامی امیر کبیر گزرا ہے۔ یہ کنجاہ ضلع گجرات کا رہنے والا،

دیوان موتی رام گورنر کشمیر کا بیٹا اور دیوان حکم چند کا پوتا تھا۔ راجہ دھیان سنگھ کی عداوت کی وجہ سے ۱۸۳۱ء میں اسے کشمیر کی نظامت سے واپس بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ آخر اس نے نو لاکھ روپیہ دے کر اس قید سے رہائی پائی۔ لیکن راجہ دھیان سنگھ نے پھر بھی اس کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ وہ مہاراجہ کی اجازت کے بغیر بنارس چلا گیا جہاں ۱۸۴۲ء میں انتقال کر گیا۔ پنجاب میں وہ چار لاکھ روپیہ سالانہ کا جاگیردار تھا۔

لاہور میں موری دروازہ کے اندر اس کی عالی شان حویلیاں تھیں۔ اس قدیم شاہی رستہ پر جو لاہور سے شالامار باغ کو جاتا ہے، دیوان کرپارام نے ایک قلعہ نما عمارت تعمیر کرا کے اس کے اندر عالی شان باغ ثمردار درختوں کا لگایا۔ شوالہ بھی بنوایا بلکہ باغ کی چار دیواری کے باہر ایک وسیع تالاب بھی کھدوایا جس کی پختہ سیڑھیوں کے نشان اب تک نظر آتے ہیں۔ تالاب کے بیچ درمیان میں ایک بارہ دری بھی تعمیر کرائی جو اس وقت شکستہ حالت میں ہے۔

اس مقام پر جہاں یہ باغ اور اس کے ملحقات تھے، ودری شاہ کا مزار تھا جو شاہجہان کے زمانے میں فوت ہوئے تھے۔ اس کے ارد گرد گل بوٹے اور اشجار نصب تھے۔ دیوان کرپارام نے خانقاہ کی تمام مشمولہ زمین اپنے باغ کے وسیع احاطے میں شامل کر لی۔

اسی باغ کی چار دیواری کے اندر اب موضع سلطان پورہ آباد ہے۔ سلطان کمبوہ دیوان کرپارام کے باغ کا مالی تھا۔ اسی نے سب سے پہلے یہاں مکان بنایا اور اسی کے نام پر یہ باغ سلطان پورہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ باغ کی چار دیواری کے اندر جو باہر سے ایک طویل طویل قلعہ نما عمارت معلوم ہوتی ہے آج سے نصف صدی پہلے پچاس ساٹھ گھروں کی آبادی تھی۔ تالاب کی دوسری طرف بھی قریباً اسی قدر آبادی موجود ہے۔ باغ کے جنوب میں ایک بازار بھی بنام بازار کرپارام آباد تھا لیکن اب نہ باغ ہے نہ بازار، نہ دیوان کرپارام کا کوئی نام لیتا ہے۔ نام ہے تو اس مالی سلطان کا جو اس کی نگاہ میں بالکل بے حقیقت تھا۔ یہ باغ جو اب موضع سلطان پورہ کے نام سے مشہور ہے لاہور کے محال نولکھا میں شامل ہے۔

باغ مصر دیوان چند ظفر جنگ بہادر

مصر دیوان چند کو ان کی خدمات کی وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ظفر جنگ بہادر کا خطاب دے رکھا تھا۔ پھر ان کو کشمیر کی نظامت کا جلیل القدر عہدہ عطا کیا۔ جس طرح مہاراجہ کے اور درباریوں نے لاہور میں اپنے مکانات تعمیر کرائے تھے، اسی طرح مصر دیوان چند کا بھی ایک وسیع مکان یہاں موجود تھا۔

مصر دیوان چند نے دیگر امرائے دربار کی طرح لاہور میں ایک باغ بھی تعمیر کرایا جس میں مختلف اقسام کے ثمردار بوٹے لگائے گئے تھے۔ جب مصر دیوان چند کا ۱۹ جنوری ۱۸۲۵ء کو انتقال ہوا تو اسی باغ کے جنوب رویہ ان کی سمادھ تعمیر ہوئی۔ یہیں حضرت نادی شاہ (وفات ۹ شعبان ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء) کا مزار ہے۔

جب انگریز ریذیڈنٹ کے ماتحت مہاراجہ دلیپ سنگھ کی نابالغی کی وجہ سے دربار لاہور میں کونسل بنی تو مسٹر ہارڈ سمتھ ۱۹۰۲ب کو صاحب عالیشان ریذیڈنٹ نے سرداران خالصہ سے پوچھا کہ متصل مزار گنج بخش بطرف مغرب کس شخص کا باغ ہے سرداروں نے

عرض کیا یہ باغ بناکردہ مصر دیوان چند سرگباشی ہے۔ ریذیڈنٹ نے پوچھا کہ اب اس کا کوئی وارث باقی ہے۔ جواب دیا گیا کہ اس کا ایک حقیقی بھائی تھا وہ بھی مرچکا ہے اب اُس کا برادر زادہ موجود ہے مگر وہ کسی قابل نہیں قصبہ گوندلاں والا (متصل گوجرانوالہ) اُس کو قوت لا یموت اور عیال و اطفال اور متعلقین کی پرورش کے لیے سرکار سے ملا ہوا ہے وہیں وہ رہتا ہے۔ صاحب نے فرمایا کہ باغ اب صاحب لوگوں کو ملنا چاہیئے تاکہ گورہ لوگ یہاں سیر و سیاحت کیا کریں۔ سرداروں نے عرض کیا "تمام ملک و مال و اسباب صاحبان عالیشان است" چنانچہ صاحب نے اس باغ پر قبضہ کر لیا۔

پنجاب میں سکھوں کی اپنی خام خیالیوں، خودسریوں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی صغیر سنی کی وجہ سے یہ حال تھا۔ کہ لاہور میں انگریزی فوج کے بغیر امن قائم ہونا مشکل تھا۔ اور دربار پر انگریزوں کی ہیبت اس قدر چھا گئی تھی۔ کہ بڑے بڑے سردار، صاحب ریذیڈنٹ سے اختلاف رائے کی جرأت نہ کر سکتے تھے بلکہ ہر بات پر ہر سردار اور ہر وزیر و امیر کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا "خوب صلاح است۔ بہتر و انسب است۔ بہتر و احسن است۔ بسیار خوب است۔ ہمیں طور خواہد شد خوب است۔ درست است"

آخر ۱۸۴۹ء میں جب انگریزی عملداری کو یہاں کامل استحکام ہو گیا۔ تو اس باغ کا نام کمپنی باغ رکھ دیا گیا۔ اور اس میں ایک تالاب اور ایک گیند گھر بھی بنایا گیا اور انگریزی قسم کے بیل بوٹے لگائے گئے۔ لیکن ۱۸۶۲ء میں سرکار انگریزی نے تالاب، گیند گھر اور مقبرہ کو چھوڑ کر باقی باغ اور اس کی زمین اکاسی سو روپیہ میں نیلام کے ذریعے فروخت کر دی۔

باغ ونتورہ یا کڑی باغ

[جرنیل ونتورہ سکھ فوج کے نامی گرامی افسروں میں تھا۔ وہ اٹلی کا باشندہ تھا۔ نپولین کی نظر بندی کے بعد روزی کی تلاش میں یہاں پہنچا اور کئی ماہ کی کوشش کے بعد خالصہ فوج کو یورپین طریقے پر قواعد سکھانے کے لیے ۱۸۲۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوا۔ دو ہزار پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی ——— مرتب] مہاراجہ کی پیادہ فوج اسی کے زیرِ نگرانی قواعد دان فوج بنی تھی۔ یہ قریباً بیس برس تک خالصہ دربار میں رہا۔

۱۸۲۵ء میں لدھیانہ کے مقام پر جرنل ونتورہ کی شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی جس کا انتظام کپتان ویڈ نے کیا۔ مہاراجہ نے ونتورہ کو اس تقریب پر دس ہزار اور دوسرے رؤسا و امرا نے تیس ہزار روپیہ بطور تنبول دیا۔

پشاور کا وہ مشہور گھوڑا جس کا نام لیلیٰ تھا اور جس کی خواہش سلطان روم اور شاہ ایران کو بھی تھی، جرنیل ونتورہ ہی ۱۸۲۷ء میں پشاور کے حاکم سردار سلطان محمد خاں سے فوج کشی کر کے اور کئی جانیں گنوا کے لایا تھا۔ جب یہ گھوڑا لاہور آیا تو مہاراجہ بہت خوش ہوا اور اس نے جرنیل ونتورہ کو دو ہزار کا قیمتی خلعت عطا کیا۔

جرنیل ونتورہ مہاراجہ کے مقرب ذمہ دار افسروں میں تھا۔ جب انگریزی سفارت نے دریائے سندھ کے رستے لاہور آنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو مہاراجہ، جو بڑا زود فہم تھا، سفارت کا اصل مقصد سمجھ گیا۔ اس نے فوراً جرنیل ونتورہ کو ایک دستہ فوج دے کر ڈیرہ غازی خاں اس غرض سے بھیجا کہ نواب بہاول پور کے ساتھ اس کا اجارہ ختم کر کے ڈیرہ غازی خاں کو براہ راست سکھ سلطنت میں شامل کر لے۔ چنانچہ جرنیل ونتورہ نے فوراً اس پر عمل کیا۔

ایک مرتبہ ایک ضرب بندوق دونالی پر ایک طرف مہاراجہ کا نام اور دوسری طرف ونتورہ کا نام انگریزی اور فارسی حروف میں کندہ کرایا گیا۔

[جرنیل ونتورہ کو پہلے انارکلی کے مقبرہ میں جگہ دی گئی۔ پھر اس نے قریب ہی
شہر سے جنوب کی طرف زمین لے کر اپنا ایک وسیع باغ تعمیر کرایا۔ جو ونتورہ
باغ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ باغ پرانی انارکلی میں ایبٹ روڈ پر حضرت
موج دریا بخاری کے روضہ کے بالکل متصل اس جگہ واقع ہوا تھا جہاں آجکل
انکم ٹیکس کا دفتر اور منشی چیمبرس واقع ہیں۔ اور ایک وسیع مسجد بھی بن رہی ہے
جسے مدینہ مسجد کہتے ہیں ——— مرتب]

جرنیل ونتورہ کے ہمراہ ایک اور فرانسیسی افسر جرنیل الارڈ بھی آئے تھے اور چونکہ دونوں ایک ہی دن مہاراجہ کے ہاں ملازم ہوئے تھے اور تنخواہ بھی دونوں کی یکساں یعنی اڑھائی ہزار روپیہ ماہوار تھی، اس لیے دونوں اسی باغ میں ایک کوٹھی بنا کر رہا کرتے تھے۔

[جرنیل الارڈ فرانس کا رہنے والا اور نپولین بونا پارٹ کی فوج کا اعلیٰ عہدیدار
تھا۔ جنگ واٹرلو کی شکست کے بعد ونتورہ کے مشورے سے پٹھانوں کے بھیس
میں ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا ۱۸۲۲ء میں لاہور پہنچا۔ کچھ ٹوٹی
پھوٹی فارسی جانتا تھا۔ مہاراجہ نے ملازم رکھ لیا۔ سکھوں کے قواعد دان رسالے
اسی نے تیار کئے تھے۔

۵ اپریل ۱۸۲۷ء کو جرنیل الارڈ کی لڑکی میری شارلوٹ
(MARIE CHARLOTTE) کا انتقال ہوا اور وہ اسی باغ کے ایک
اونچے آوے (ٹیلے) پر دفن کی گئی۔ اس صدمے سے جرنیل الارڈ کی صحت خراب
رہنے لگی اور وہ کچھ عرصہ کے بعد رخصت لے کر بیوی بچوں سمیت فرانس چلا گیا
جہاں سے قریباً اٹھارہ ماہ بعد پھر لاہور واپس آیا۔ مہاراجہ نے خوب آؤ بھگت کی۔
جنوری ۱۸۳۹ء میں اس بہادر جرنیل کا پشاور میں یکایک حرکت قلب
بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش لاہور لائی گئی اور فوجی اعزاز
کے ساتھ اس کی لڑکی کی قبر کے پاس دفن کی گئی۔ چنانچہ باغ کی پرانی جنوبی دیوار
کے ساتھ درختوں کے گھنے جھنڈ میں احاطہ باغ کے اندر ہشت پہلو چبوترے پر چھوٹے سے گنبد کے نیچے باپ بیٹی دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ گنبد
کے اندر فرش پر فرانسیسی زبان میں اور گنبد کے باہر دروازے پر فارسی حروف
میں کتبے نصب ہیں۔ فارسی کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنبد موسیو الارڈ نے

اپنی لڑکی میری شارلوٹ کے انتقال کے بعد اس آرزو کے ساتھ خود بنوایا تھا کہ
"الٰہی جائش زیر بہشت برین باد"
اس پر میری شارلوٹ کے انتقال کی تاریخ سنہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) مطابق سمت ۱۸۸۴ب
بھی درج ہے —— مرتب]

مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب حالات ضلع لاہور میں اور مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں لکھا ہے کہ جب جنرل ونتورہ فرانسیسی کی دختر مر گئی تو اس زمانے میں لاہور میں چونکہ عیسائیوں کا کوئی قبرستان نہ تھا، اس لیے اپنی ہی کوٹھی کے ایک ٹیلے پر اس کو دفن کر دیا گیا۔ پنجابی زبان میں چھوٹی عمر کی لڑکی کو کڑی کہتے ہیں اس لیے اس دن سے اس کوٹھی و باغ کا نام باغ ونتورہ کی بجائے کڑی باغ مشہور ہو گیا۔

[اوّل تو کتبہ[1] کی موجودگی میں یہی بات سرے سے غلط ہے کہ وہ جرنیل ونتورہ کی لڑکی تھی جو درست ہونے کے بعد یہاں دفن کی گئی۔ صاحب عمدۃ التواریخ نے دفتر سوم کے حصہ سوم میں صفحہ ۳۵۰ پر) لکھا ہے:-

"۱۸۳۶ء میں جب جنرل ونتورہ نے مہاراجہ کی خدمت میں بطور پیش کش ایک گھوڑا، پنج ہزار نقد اور ایک تھان مخمل پیش کیا۔ اس وقت اس کی لڑکی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے بھی چند اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ مہاراجہ نے جنرل ونتورہ سے اس کے گھر کے حالات پوچھے اور اس کی لڑکی کے نام پنج ہزار روپیہ کی جاگیر عطا کی۔"

پھر یہ کہنا بھی کسی طرح درست نہیں کہ اس وقت لاہور میں عیسائیوں کا کوئی قبرستان[2] نہ تھا۔ حالانکہ اکبر کے وقت میں گوا سے جو جیسوٹ مشن آیا تھا، اس نے اپنا گرجا مدرسہ اور قبرستان یہاں بنا رکھا تھا۔ سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں موضع ہری پھلواری جھنگ سے بارہ بیگھے مزروعہ زمین خرید کر اس قبرستان میں اور شامل کی گئی۔ یہ قبرستان کیتھیڈرل اسکول اور گرجا سے ملحق ریگل سینما کے سامنے واقع ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ موسیو جنرل الارڈ نے بیٹی سے محبت کی بنا پر اس کا مرقد اپنی کوٹھی کے احاطے میں بنوایا ہے۔

ا ۔ دیکھو تاریخ لاہور از سید محمد لطیف ص ۱۹۶ جس میں فرانسیسی کتبہ نقل کیا گیا ہے۔ اس کتبے میں موسیو جنرل الارڈ اور اس کی دختر میری شارلوٹ کے نام درج ہیں۔

یوں دفن میرے ساتھ دلِ بے قرار ہو
چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہو

ونتورہ باغ کے کرڈی باغ مشہور ہونے کی وجہ بھی دل کو نہیں لگتی۔ دراصل مہاراجہ کے حکم سے ان کے ماتحت راہگان اور انگریز مہمان جب کبھی لاہور آتے تھے اسی باغ میں اقامت گزیں کیے جاتے تھے اور مہمانوں کی آمد و رفت کے لیے خلیفہ نور الدین کو اس باغ کی آرائش و زیبائش کا حکم ہوتا رہتا تھا۔ مہاراجہ کی وفات کے بعد ۱۸۴۶ء میں سر فریڈرک کرڈی لاہور کے انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔ وہ جب تک یہاں رہے اسی باغ میں مقیم رہے۔ یہ وجہ اس کے کرڈی باغ مشہور ہونے کی ہے ——— مرتب]

معلوم نہیں اس باغ نے جنرل ونتورہ اور جنرل الارڈ کے بعد کتنے انقلاب دیکھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک یہ باغ معہ کوٹھی ریاست کپورتھلہ کے قبضے میں رہا اور کوٹھی اہلووالیہ یا کپورتھلہ ہاؤس کہلاتا رہا۔ ریاست نے اس کی حالت و حیثیت کو برقرار رکھا۔

۱۸۸۴ء میں جب سر سید احمد خاں لاہور آئے تو ۲ فروری کو اسی باغ میں ان کا لیکچر ہوا جس میں انھوں نے اہلِ پنجاب کو "زندہ دلان پنجاب" کا خطاب دیا۔

[قیام پاکستان سے دس پندرہ سال پہلے یہ جگہ مہاراجہ کپورتھلہ نے بھارت انشورنس کمپنی کے ہاتھ بیچ دی جس نے اس کے ایک حصے میں جدید طرز کے چند رہائشی فلیٹ تعمیر کرائے۔ پھر بھی عمارات کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ اب کوٹھی انکم ٹیکس کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ میری شارلوٹ اور جنرل الارڈ کی قبروں کے بلند گنبد کے آگے منقش پیچیبرس کی رفیع الشان عمارت کھڑی ہو گئی ہے اور ایک گوشے میں عظیم الشان مسجد بن رہی ہے جس کا نام مدینہ مسجد رکھا گیا ہے ——— مرتب]

باغ سردار جوالا سنگھ

سردار جوالا سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارسوخ درباری سردار مت سنگھ بھڑانیہ کا بیٹا تھا۔ مت سنگھ مہم کشمیر بار اول ۱۸۱۳ء میں مارا گیا تھا۔ جوالا سنگھ کو مہاراجہ نے اس کے باپ سے الگ سوا لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دی ہوئی تھی۔ اس سردار نے ملتان۔ کشمیر اور منکیرہ کی لڑائیوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

بھڑانہ میں چونکہ ان کی جاگیر تھی اس لیے بھڑانیہ یا بھڈانیہ کہلاتے تھے۔ مہاراجہ کے دربار میں سردار جوالا سنگھ

کا بیٹا رسوخ تھا۔ جب سردار تیج سنگھ (بعہد انگریزاں راجہ تیج سنگھ) کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تو مہاراجہ نے پہلے دن سردار جوالا سنگھ کو اپنی طرف سے ماتمی خلعت۔ دوشالہ۔ تھان کم خواب اور دستار وغیرہ پارچات دے کر ماتم پرسی کے لیے بھیجا۔ اور دوسرے دن خود گئے۔

ایک مرتبہ تھانہ دار کانگڑہ کو اس کی بعض حرکات و شکایات کی بنا پر مہاراجہ موقوف کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں شورش زیادہ نہ ہو جائے اس نے دیوان بھوانی داس اور سردار جوالا سنگھ کو خفیہ ہدایات اور کچھ فوج دے کر وہاں بھیجا جنھوں نے اس کو بے خبری ہی میں جا دبوچا۔

چونکہ لاہور میں اکثر امرا و وزرا نے اپنی عالی شان حویلیاں تعمیر کرا رکھی تھیں اور مہاراجہ کو باغات کا شوق تھا بلکہ امرائے دربار کو باغات کی تعمیر کے لیے کہا بھی کرتا تھا اس لیے اکثر سرداروں اور وزیروں نے اپنی اپنی جاگیروں کے علاوہ لاہور میں بھی باغات تعمیر کرا رکھے تھے۔ چنانچہ سردار جوالا سنگھ نے بھی شالامار باغ کی سڑک پر ایک باغ اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرایا۔ ابھی باغ تیار ہی ہو رہا تھا کہ شہزادہ کھڑک سنگھ کو مہاراجہ اسے دیکھنے کے لیے آئے اور آرائش باغ کی تاکید کر گئے۔ باغ کے پاس ہی شکارگاہ تھی۔ مہاراجہ اکثر آتے اور یہیں خیمہ وغیرہ نصب کرتے۔

ایک مرتبہ مہاراجہ مع کپتان صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر سہ پہر کے وقت باغ میں آئے اور پلٹن کی قواعد کا باغ میں ملاحظہ فرمایا۔

ایک مرتبہ صاحبان عالیشان کے ساتھ مہاراجہ نے باغ جوالا سنگھ ہی میں ملاقات کی اور فرشی دربار کی بجائے کرسیوں کا ایک مختصر دربار منعقد فرمایا۔

مہاراجہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ کپتان صاحب (قائم مقام گورنر جنرل) نے لدھیانہ سے پنج ہزار سردار نہ ارسال کیا۔ مہاراجہ نے غسل صحت کے لیے باغ جوالا سنگھ ہی کو منتخب کیا۔ یہ اتنا بڑا باغ تھا کہ اس میں ایک اچھا خاصا دربار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عمدۃ التواریخ دفتر سوم حصہ دوم ص ۲۰۱ میں مرقوم ہے۔

"تمام سرکردگان عالی شان و دفتریاں و منشیان و وکیلان
اطراف و اکناف درباب گذرانیدن نذرات سعادت
دو جہاں حاصل ساختند"

مہاراجہ دلیپ سنگھ اور صاحبان انگریز کے اقتدار لاہور کے زمانہ میں یہ باغ سمت ۱۹۰۴ ب میں بطریق دھرم ارتھ دیوبھان برہمن کو ملا۔ چنانچہ صاحب کلاں نے ۱۳ بیساکھ سمت مذکور کو اس باغ کا نقشہ ملاحظہ فرمایا۔ لیکن ۱۴ ساون سمت ۱۹۰۵ ب کو یہ باغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سیر و شکار کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

باغ دیوان رتن چند داڑھی والا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا یہ قابل منشی حضور نویسی کے معزز عہدہ پر سرفراز تھا۔ پہلے دیوان خطاب ملا۔ پھر

لمبی داڑھی کی وجہ سے مہاراجہ نے داڑھی والا کا خطاب دیا اور یہ خطاب ایسا مقبول ہوا کہ اصل نام کا ایک جزو ہو گیا۔ ۱۸۷۲ء میں آپ انتقال کر گئے۔

دیوان رتن چند کو عمارات کا بہت شوق تھا شہر کے اندر ایک عالی شان حویلی تعمیر کرائی۔ شاہ عالمی دروازہ کے باہر سرائے۔ تالاب۔ باغ اور شوالہ تعمیر کرایا۔ جس جگہ یہ باغ واقع ہے وہاں محلہ دائی لاڈو کے عالیشان مکانات اور عظیم الشان باغات کی بنیادیں اور کھنڈرات اب تک موجود چلے آتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں بزمانہ مہاراجہ دلیپ سنگھ انہی کھنڈروں پر باغ کی کھدائی اور تعمیر شروع ہوئی۔ خشت فروش قدیم دیواروں کی بنیادوں کو لاوارث دیکھ کر کھود کھود کے گڑھے بناتے اور اینٹیں فروخت کیا کرتے تھے۔ دیوان رتن چند نے اس زمین کو صاف اور ہموار کرایا۔ اور یہاں ایک وسیع اور عالیشان مکان و باغ بنا کر اپنی یادگار قائم کی۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں چونکہ پنجاب کے والیانِ ریاست نے اپنے مکانات لاہور میں تعمیر نہیں کرائے تھے اس لیے مہاراجہ کشمیر۔ مہاراجہ پٹیالہ اور بعض دوسرے والیانِ ریاست جب کبھی لاہور آتے تو اسی باغ میں ٹھہرا کرتے تھے۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ باغ کے چاروں کونوں پر چار پختہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جن میں دیوان رتن چند کے جانشینوں نے بہت کچھ ترمیم اور ایزادی کر دی ہے۔ درمیانی بارہ دری دو منزلہ ہے اور اس میں ایک بڑا وسیع سرد خانہ ہے۔ بارہ دری کی دیواروں میں فوارے ہیں اور صحن میں ایک بڑا کشتی نما حوض بنا ہوا ہے جس کے گرد فواروں کی موج بہار عجب لطف دیتی ہے۔ باغ کے دروازہ کی ڈیوڑھی چار منزلہ ہے اور اپنی گولائی کی وجہ سے بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اندر نگاہ پڑتے ہی دو رنگ سروں کی دو رویہ قطار دکھائی دیتی ہے۔ باغ کا رقبہ سات ایکڑ کے قریب ہے۔ ایک بلند اور طویل دیوار نے جس کا ارتفاع بارہ تیرہ فٹ سے کم نہیں باغ کے احاطہ کو اپنی آغوش میں لیا ہوا ہے۔

باغ کی زمین سخت ہے۔ جہاں جہاں کھدائی ہوتی ہے۔ وہاں سے اینٹیں نکلتی ہیں جو پتہ دیتی ہیں کہ یہاں کسی زمانہ میں عمارتیں موجود تھیں۔ پرانے درختوں میں پیپل۔ نیم۔ شیشم۔ جامن۔ املی وغیرہ موجود ہیں۔ چونکہ زمین سخت ہے اس لیے کھاد ڈالنے سے موسمی پھول اور چھوٹی جڑھوں والے درخت بکثرت ہوتے رہتے ہیں۔

تمام پرانے باغات میں یہ باغ سب سے بہتر حالت میں ہے اس کے اندر ایک مردانہ ہائی سکول اور ایک زنانہ کالج بھی ہے۔ اس باغ کے ایک طرف میو ہسپتال اور ایک طرف ٹریبیون کا دفتر اور مسجد دائی لاڈو واقع ہے۔

[۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان عالمِ وجود میں آیا اور حالات ایسے پیدا ہوئے کہ آبادیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ ہندو اور سکھ یہاں سے ہندوستان چلے گئے اور وہاں کے مسلمان یہاں آنے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت قادیان سے مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کی جماعت کے اکثر افراد نے لاہور پہنچ کر اس علاقے کی اکثر عمارتوں پر قبضہ کیا۔ رتن باغ اور اس کی ملحقہ کوٹھی مرزا بشیر الدین محمود کے حصے میں آئی مگر باغ کی دیکھ بھال میں کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔

جب شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ضروریات کے پیش نظر میو ہسپتال کی توسیع لازمی ہو گئی اور مغربی پاکستان کے قیام کے بعد سرکاری ملازمین اور بیرونی مریضوں کے لیے یونٹ ہسپتال قائم کرنے کی تجویز عمل میں لائی گئی تو رتن باغ سب سے پہلے اس منصوبے کی زد میں آیا۔ چنانچہ اسے صاف کر کے اس کی جگہ ون یونٹ ہسپتال بنا دیا گیا۔ اب باغ اور اس کی چار دیواری کا کوئی وجود باقی نہیں۔ البتہ کوٹھی شکست و ریخت سے بچ گئی ہے اور اسے ڈاکٹروں کے استعمال کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

اخبار ٹریبیون کا دفتر بھی ۱۹۴۷ء میں یہاں سے انبالہ منتقل ہو گیا تھا اور اب وہاں پاکستان ٹائمز پریس قائم ہے جہاں سے پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار اور سپورٹ ٹائمز وغیرہ اخبار اور رسالے نکلتے ہیں ——— مرتب]

باغ راجہ دینا ناتھ

راجہ دینا ناتھ کو پنڈت گنگا رام نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی دفتر کے دیوان تھے ۱۸۱۵ء میں لاہور بلوایا۔ ۱۸۲۶ء میں کشمیری خاندان کے اس چشم و چراغ کو مہاراجہ نے دیوان کا خطاب دیا۔ ملکی دفاتر کا افسر اعلیٰ اور اعلیٰ جاگیردار بنایا۔ حکومت خالصہ کے بعد سرکار انگریزی نے بھی دیوان دینا ناتھ کی خدمات و قابلیت کے اعتراف میں راجہ کا خطاب عطا کیا۔ اور کلانور کا علاقہ جاگیر میں دیا۔ دیوان امرناتھ اکبری تخلص اور دیوان رام ناتھ اصغری تخلص آپ ہی کے فرزند تھے۔

آپ کی عالیشان حویلی دہلی دروازہ کے اندر اب تک موجود ہے۔ آپ نے شالامار باغ کے پرانے رستہ پر مزار گھوڑے شاہ کے متصل جہاں سے کوٹ خواجہ سعید کو رستہ جاتا ہے اپنا باغ تعمیر کرایا۔ اس باغ کی چار دیواری تیرہ چودہ فٹ بلند تھی باغ کی شرقی جانب عین شاہی رستہ پر اس دیوار کے کچھ آثار موجود ہیں اسی جگہ دیوار کی بغل میں ایک کنواں بھی ہے یہاں راجہ دینا ناتھ کے زمانہ میں ہر راہرو اور مسافر کو گرمیوں کے دنوں میں سبیل لگا کر پانی پلایا جاتا تھا۔

مشرقی دروازہ جس کا اب کوئی نشان نہیں آمد و رفت کے لیے تھا۔ باغ کے اندر بارہ دریاں، شہ نشین، چبوترے، حوض ایسے خوب صورت تھے کہ یہ باغ اپنی سرسبزی اور خوبی عمارات میں بے نظیر تصور کیا جاتا تھا۔ لاہور کے صدہا بلکہ ہزارہا لوگ راجہ دینا ناتھ کی زندگی تک اس باغ میں سیر و تفریح کے لیے آتے تھے اور بڑی رونق رہتی تھی۔ اس باغ کے جنوب رویہ جو بارہ دری تھی وہ نہایت خوب صورت اور پختہ تھی اب وہ بے مرمت اور خراب حالت میں ہے فوارے اور حوض بھی مرٹ مٹا گئے ہیں۔

باغ کنہیا لعل کمپو والا

جہاں بھارت بلڈنگس کے دفاتر اور دفتر اخبار ٹریبیون (اب پاکستان ٹائمز او امروز) اور باغ دیوان رتن چند داڑھی والا (جس کی جگہ اب وَن یونٹ ہسپتال بن گیا ہے) اور باغ مہاں سنگھ کا احاطہ اور محلہ کوٹھیاں اور بورڈنگ میڈیکل کالج واقع ہیں۔ وہاں شاہجہان کے زمانہ میں اُس کی دائی لاڈو کا بارونق اور آباد محلہ موجود تھا۔ چوتھے سال جلوس شاہجہانی یعنی ۱۰۴۱ھ میں دائی لاڈو نے سب سے پہلے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جو اس وقت تک موجود ہے اور انجمن اسلامیہ پنجاب (کی مجلس نصاب اوقاف کمیٹی کے) اہتمام میں ہے۔ لیکن اب مسجد اور اس کا احاطہ بالکل مختصر رہ گئے ہیں۔ چاہ کلاں قدیمی کنہیا لعل کمپو والا نے گرا دیا۔ اس کی اینٹیں نکلوا کر زمین کنوئیں کی اپنے باغ میں شامل کر لی۔ مسجد کا حوض جس میں بہت بڑا فوارہ بھی تھا اب بالکل بند ہے۔

تحقیقات چشتی میں لکھا ہے۔ کہ اس مسجد اور محلہ کی کچھ زمین لے کر کنہیا لعل کمپو والا نے شمال کی طرف ایک باغ تعمیر کرایا بلکہ اس زمانہ میں کنہیا لعل نے اپنی طرف سے ایک سادھو کو مسجد میں بٹھا دیا سکھا شاہی زمانہ تھا مسلمان بچارے دم نہ مار سکے۔ جنوبی سمت دو کالوں کے درمیان جو چھوٹا سا کنواں ہے وہ اسی سادھو بسنت گر کا بنایا ہوا ہے۔ صحن مسجد کے ایک گوشہ میں مائی لاڈو اور اس کے خاوند محمد اسمٰعیل کی قبر ہے۔

کنہیا لعل نے باغ تو تعمیر کرایا لیکن اس کی رونق اُس کے دم تک ہی رہی اب اُس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ایک آندھی تھی کہ آئی اور چلی گئی۔ دائی لاڈو کا نام ہر کہ ومہ کی زبان پر آج بھی موجود ہے۔

باغ بھائی مہاں سنگھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاص الخاص اور مقرب ترین مصاحبوں میں بھائی گوربخش سنگھ ایک ممتاز رئیس تھے۔ پیر مرد ہونے کے باوجود نہایت خوش گو اور ظریف طبع تھے اور مہاراجہ کی بزم عیش و سرور میں برابر کے شریک تھے مصنف عمدۃ التواریخ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب سرکار کسی پر مہربان ہوتے یا کسی کی تعریف کیا کرتے تھے تو بھائی گوربخش سنگھ بھی چار کلمے اپنی طرف سے کہہ کر مہاراجہ کی تائید کر دیا کرتے تھے۔ اور اگر وہ اُن پر ناراض ہوتے۔ تو گوربخش سنگھ اُس کے اور بھی کردہ ناکردہ عیب گِن گِن کر بتا دیتے بلکہ لکھا ہے کہ گلستان کے اس شعر پر ان کا صحیح عمل ہوتا تھا ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

بھائی گوربخش سنگھ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس کی موت سے ایک دو دن پیشتر مہاراجہ اُس کی عیادت کے لیے اُس کے مکان پر گئے۔ اُس کے چار فرزند تھے۔ بھائی دل سنگھ جو ایک جنگ میں مارے گئے تھے۔ مہاں سنگھ۔ بھاگ سنگھ۔ سرجن سنگھ۔ مہاراجہ نے ان کے باپ کی وفات کے بعد ان کے عہدوں کو بحال رکھا اور ان پر وقتاً فوقتاً اپنی

نوازشوں کا اظہار کیا۔

ان میں سب سے زیادہ شہرت بھائی مہان سنگھ نے حاصل کی جس کا نام آج تک بھی باغ بھائی مہان سنگھ کی وجہ سے زندہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکھوں کے زمانہ عروج و اقبال میں جو باغ لاہور میں سب سے پہلے بنا وہ باغ مہان سنگھ ہی ہے۔ اور اس کا کچھ ثبوت مصنف عمدۃ التواریخ کے انتخاب دفتر سوم ص ۴ سے بھی ملتا ہے جہاں لکھا ہے کہ

"بھائی مہان سنگھ باغ دلفریب متصل چوبارہ چھجو بھگت
جی تیار کنانیدہ"

کم سے کم باغ رتن چند واڑھی والا اس باغ کے بعد بنا ہے اگر اس باغ سے پہلے اس کا وجود ہوتا تو مصنف متصل چوبارہ چھجو بھگت کی بجائے جو سب تا زیادہ فاصلہ پر ہے "متصل باغ رتن چند" لکھتا۔

یہ باغ ایسے اعلیٰ پیمانہ پر تھا کہ روزمرہ سینکڑوں لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اس کے فوارے، عمارات حوض، بارہ دریاں، روشیں سب قابل دید تھیں۔ بھائی مہان سنگھ ہر روز باغ میں آتے تھے اور تماشائیوں کا ہجوم دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

یہ باغ جس کی یہی چار دیواری اب بھی اس کی قدامت کا ثبوت دے رہی ہے شاہ عالمی دروازہ کے باہر مسجد وائی لاڈو کے قریب اور بورڈنگ میڈیکل کالج کے بالمقابل واقع ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جس طرح باغ رتن چند داڑھی والا خانہ وائی لاڈو کے کھنڈروں پہ آباد کیا گیا تھا اسی طرح اس باغ کی بنیادیں بھی وائی لاڈو کے قدیم آثار پر ہی کھڑی کی گئی ہیں۔

بھائی مہان سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی باغ کی تر و تازگی خزاں کی نذر ہو گئی۔ چند سال کے بعد بھائی سوابا سنگھ نے یہ باغ پادریوں کے پاس فروخت کر دیا۔ تا حال وہ باغ پادریوں کے قبضہ میں ہے۔ چار دیواری اسی زمانے کی موجود ہے۔ باغ کی شکل بہت کچھ بدل گئی ہے۔ بلکہ اب یہ باغ یورپین پادریوں اور دیسی عیسائیوں کی آبادی کی وجہ سے اچھی خاصی نو آبادی معلوم ہوتا ہے۔ مکانات انگریزی وضع کے بن گئے ہیں۔ البتہ باغ کا نام اب تک باغ مہان سنگھ ہی ہے۔

باغ سردار لہنا سنگھ سندھانوالیہ

رنجیت سنگھ کے یک جدی۔ مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے فرزند شہزادہ پرتاپ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے قاتل سردار لہنا سنگھ کا باغ۔ باغ شاہ بلاول کے کھنڈروں پر آباد ہے۔

جب اجیت سنگھ نے مہاراجہ شیر سنگھ اور راجہ دھیان سنگھ کو ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو۔ اور لہنا سنگھ نے اسی تاریخ کو شاہزادہ پرتاپ سنگھ کو قتل کیا۔ تو یہ مقام جہاں یہ سانحہ پیش آیا۔ باغ و بارہ دری شاہ بلاول کے نام سے موسوم تھا۔ اسی باغ میں مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے فرزند پرتاپ سنگھ کی سمادھیاں موجود ہیں۔

اس واقعہ کے بعد سندھانوالیہ سرداروں نے نابالغ شہزادہ دلیپ سنگھ کو مہاراجہ اور لہنا سنگھ کو وزیر اعظم بنایا۔

لہنا سنگھ نے اس باغ کی چار دیواری ازسر نو تعمیر کرائی - اور اس کو خوب رونق دی - اپنے عروج کے زمانہ میں وہ ضرور اس باغ کو اور رونق دیتا - لیکن خون ناحق نے بہت جلد اس کو کیفر کردار تک پہنچا دیا یعنی لہنا سنگھ بھی قتل ہو گیا -

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

باغ ابھی تک موجود ہے اس میں آموں کے درخت بکثرت ہیں -

باغ راجہ تیجا سنگھ

چاہ میراں سے شمال مشرق اور مقبرہ شہزادہ پرویز سے شمال کی جانب یہ باغ واقع ہے - راجہ تیجا سنگھ جمعدار خوشحال سنگھ کا بھائی تھا اس نے بڑے شوق اور بہت بڑی لاگت سے یہ باغ جو نہایت وسیع اور کئی عالی شان مکانات سے گھرا ہوا ہے تعمیر کرایا تھا - اس کی چار دیواری بلند مضبوط اور مستحکم تھی جو ۱۹۰۵ء تک برقرار قائم تھی - درختان ثمردار میں سے اب صرف آم باقی ہیں جن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے - بڑی بارہ دری کی کرسی زمین سے دو فٹ بلند ہے چبوترہ کا فرش پختہ ہے اور اس کے چاروں گوشوں پر ایک ایک شہ نشین بنا ہوا ہے - اس بارہ دری کے کئی کمرے ہیں چھتیں ان کی کشمیر کی چھتوں کی طرح منقش ہیں عمارت سہ منزلہ ہے -

اس کے متصل ایک اور بارہ دری ہے جس کا دروازہ گول گھر کی طرح بنا ہوا ہے - اس کی سیڑھیاں اس کا فرش اور اس کے مختلف برآمدے سنگ مرمر سے مزین ہیں جو معلوم نہیں کس مقبرہ یا مسجد سے اتار اگیا ہے -

"۱۷ ہاڑ سمت ۱۹۰۵ ب کو صاحب کلاں (ریذیڈنٹ) باغ سردار (بعد میں راجہ) تیجا سنگھ میں تشریف لے گئے - سردار نے میوہ جات کی ڈالیوں کے علاوہ ایک گھوڑا، مالائے مروارید، قلغی اور رومال نذر دیا - صاحب نے گھوڑا واپس کر دیا اور فرمایا کہ ۱۸ ہاڑ کو ایک پلٹن گورہ اور چار پلٹن گورہ مع دس ضرب توپ روانہ ملتان ہو رہی ہے - لازم ہے کہ چند منزل کشتی اور پانصد اعراب تیار رکھو - سردار نے عرض کیا کشتی یک صد دوں گا اور اعراب جس قدر بہم ہو سکے گا -" (عمدۃ التواریخ)

اس کی وسیع و عریض چار دیواری میں سے صرف مغربی دیوار نامکمل سی موجود ہے - پرانا دریا ایک نالہ کی صورت میں اس باغ کے شمال مغرب کی طرف چند ہی قدم کے فاصلہ پر ہے - اس باغ میں باغ و مقبرہ شہزادہ پرویز کے متصل سے ایک قدیم نہر بھی آتی ہے جس کی وجہ سے باغ سرسبز رہتا ہے - اس باغ میں کنوئیں کے علاوہ بجلی سے بھی پانی آتا ہے اور کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے بڑے بڑے نل لگے ہوئے ہیں -

باغ کے اندر بہت سی عمارتیں ہیں ایک قدیم لنگر خانہ بھی ہے جس کے اندر ایک غیر آباد کنواں بھی ہے - لنگر خانہ کی عمارت

بالکل شکستہ اور بے سقف ہے۔ بارہ دری کلاں کے سامنے ایک حوض نما تالاب ہے۔ باغ کے بڑے کنوئیں اور راجہ تیجا سنگھ صاحب کی سمادھی کے ساتھ باغ کے کلاں دروازہ سے باہر برگد (بڑھ) کا ایک اتنا بڑا درخت ہے۔ کہ اس سے کلاں درخت آج تک راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ باغ کی کل زمین جس میں زراعتی زمین بھی شامل ہے ایک سو دس بیگھہ بیان کی جاتی ہے۔

افسوس ہے باغ کی حالت اچھی نہیں۔ یہ باغ راجہ صاحب شیخوپورہ (موجودہ راجہ صاحب کا نام راجہ دھیان سنگھ) کی ملکیت ہے۔ ان کی عالی شان قلعہ نما حویلی لاہور میں موجود ہے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ معلوم ہوا ہے اپنی رہائش کے لیے شہر سے باہر ایک کوٹھی لے رکھی ہے۔ اس باغ میں وہ کبھی بھولے بھٹکے آنکلتے ہیں۔ اگر اس باغ کی آرائش و زیبائش کا ان کو خیال ہو۔ تو یہ لاہور کی ایک بہترین سیرگاہ بن سکتا ہے۔

اس باغ سے چند قدم کے فاصلہ پر مغربی جانب نامعلوم گنبد کے نزدیک جس کو دارا شکوہ کی دائی کا گنبد کہتے ہیں جاتی ہیں مندر دریاگر کے نام سے ایک عالی شان عمارت تیار ہوئی ہے۔ یہ عمارت آٹھ کنال سولہ مرلہ میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ ہر حصہ کی چار دیواری پختہ ہے اور علیحدہ علیحدہ ہے۔ دونوں حصوں کے درمیان قریباً آٹھ دس فٹ کی سڑک ہے۔ جس حصہ میں باوا دریاگر کی سمادھی ہے اس کے دروازہ پر ذیل کی عبارت درج ہے:

"مندر دریاگر۔ باوا رام ناتھ او گڑھ پیر جی کے اپکار کے ساتھ
سیٹھ کالو رام، وہری رام پیراں ٹھاکر دھیان سنگھ راجپوت
پردھان بہ دیسی دھارمک سبھا لاہور نے سیوا کرائی ۱۹۴۲ء"

اس کے نیچے یہ الفاظ ہیں " استھان باوا دریاگر جی مہاراج "ایک طرف یہ بھی لکھا ہے "غیر مذہب کے لوگوں کو اندر آنا منع ہے"۔ اس حصہ میں ایک مندر اور کئی عمارتیں ہیں۔ راقم باوا رام ناتھ سے بھی ملا جس کو پیر جی بھی کہتے ہیں۔ بالکل ننگے دھڑنگے۔ کمربند لنگوٹ باندھے ہوئے۔ سر، داڑھی مونچھ بلکہ ٹانگوں کے بال تک صفاچٹ۔ تیل کی مالش کر رہے تھے۔ خوب موٹے تازے۔ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ باوا دریاگر کا سال وفات سمت ۱۸۵۶ ب بتاتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو موضع خواجہ سعید میں جہاں ان کی سمادھی ہے کچھ جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

ابتدا میں سمادھی معمولی تھی۔ کوئی مندر بھی نہ تھا معمولی کٹیا تھی اب (۱۹۴۲ء میں) خاصی رونق ہے۔ سیٹھ صاحبان کی طرف سے لنگر جاری ہے۔ چند ایک سادھو سنت موجود رہتے ہیں دوسرے حصہ میں چند ثمردار درخت لگائے گئے ہیں۔ سبزی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اور ایک نہایت خوب صورت چھوٹا سا مندر تعمیر ہو رہا ہے۔ دوسرے حصہ کی چار دیواری کے ساتھ ہی مسلمانوں کا قبرستان ہے اور چونکہ دیوار کے ساتھ ہی تین چار کچی قبریں ہیں اندیشہ ہے کہ ان کی ضرور کسی دن صفائی ہو جائے گی۔

باغ جمعدار خوشحال سنگھ

جمعدار خوشحال سنگھ کنکھل ضلع سہارن پور کا ایک قبول صورت (گوڑ) برہمن تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لیے سکھ ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک یہ کشمیر کا ناظم بھی رہا۔ مگر جب اہل کشمیر اس کے ظلم و تشدد سے تنگ آ گئے تو مہاراجہ نے اس کو کشمیر سے واپس

ملا لیا لاہور میں اس کی عالیشان حویلی اور وسیع و خوشنما باغ بہت مشہور تھا۔

مہاراجہ خود بھی اس باغ میں آیا کرتے اور جمعدار کی عزت افزائی کیا کرتے تھے چنانچہ جب ١٩ محرم ١٢٣٣ھ (١٨١٨ء) کو اس باغ میں آئے تو جمعدار نے ایک خوب صورت اور قیمتی گھوڑا بطریق نذر پیش کیا۔ اور دوسری دفعہ جب ٨ محرم ١٢٣٧ھ (١٨٢١ء) مطابق سمت ١٨٧٨ ب کو دسہرہ کے دن یہاں آئے تو دربار بھی یہیں منعقد ہوا۔ صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم میں (ص ٢٩١ پر) لکھتے ہیں :

"وکیلان ہر طرف و سرکردگان عالیشان بہ ادائے نذر و نیاز
پرداختند۔ وقت سہ پہری قواعد پلاٹن مشاہدہ و معائنہ
فرمودہ انعام حوالہ بعضے کساں ساختند"

اسی باغ میں اس کے بیٹے رام سنگھ اور اس کے بھائی راجہ پنجاب سنگھ اور اس کی اپنی سمادھ ہے۔ یہ باغ لاہور کے مشہور و معروف باغوں میں تھا مگر جب ١٨٤٢ء میں مہاراجہ شیر سنگھ نے رانی جند ان سے قلعہ لے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ تو سکھ فوج جمعدار خوشحال سنگھ سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی کی طرف روانہ ہوئی۔ جمعدار بھی بے خبر نہ تھا اس نے حویلی کی دونوں جانب توپیں لگا رکھی تھیں وہ اپنی حفاظت کے مکمل انتظام اور اپنی قلعہ نما حویلی کے استحکام کے باعث بچ گیا۔ سکھ فوج یہاں سے ناکام ہو کر اس کے باغ واقعہ بیرون مستی دروازہ کی طرف گئی اور چشم زدن میں درخت کاٹ کر اور عمارت گرا کر ہرے بھرے باغ کو کف دست میدان بنا دیا۔

چند دنوں کے بعد جمعدار نے باغ کی چار دیواری اور بارہ دری دوبارہ تعمیر کرائی۔ درخت جو کٹے ہوئے تھے چونکہ جڑوں سے نہیں کاٹے گئے تھے کچھ تو وہی سرسبز ہو گئے۔ اور کچھ نئے لگائے گئے ١٨٤٤ء میں جمعدار خوشحال سنگھ کا انتقال ہو گیا۔

[باغ کی موجودہ حالت نہایت افسوسناک ہے سمادھوں کی چار دیواری بھی بالکل شکستہ ہے۔ اور باغ کی چار دیواری کا تو کہیں وجود بھی نظر نہیں آتا۔ اس باغ کے شمال کی طرف ریلوے لائن ہے جنوب کی طرف واٹر ورکس۔ قلعہ اور حکیم نیر واسطی کی نیر منزل ہے۔ باغ کے کثیر حصے میں زراعت اور کھیتی کا کام ہوتا ہے یہ باغ بھی راجہ صاحب شیخوپورہ کی ملکیت میں تھا۔ اب پتہ نہیں کون مالک ہے ——— مرتب]

باغ سردار رتن سنگھ گرجاکھیہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں رتن سنگھ گرجاکھیہ نے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک باغ تعمیر کیا اور اس کی نہایت پختہ چار دیواری بنوائی اور اس میں کئی قسم کے ثمردار اور بے ثمر درخت لگوائے لیکن جب دیوان رتن چند داڑھی والے کا مہاراجہ کے دربار میں عروج ہوا۔ تو اس ساری زمین پر جس طرح بھی ہو سکا اس نے قبضہ کر لیا اور انگریزی عملداری میں جس کی ابتدا پنجاب میں ١٨٤٩ء سے ہوتی ہے اس نے ایک سرائے تعمیر کرائی اور ایک تالاب بنوایا چنانچہ سرائے کی چار دیواری اب بھی وہی ہے جو رتن سنگھ نے اپنے باغ کے لیے بنوائی تھی البتہ اس کو کچھ بلند کر دیا گیا ہے۔ سرائے میں جو کنواں ہے وہ بھی رتن سنگھ کے باغ

کل شکستہ اور بے سقف ہے۔ بارہ دری کلاں کے سامنے ایک حوض نما تالاب ہے۔ باغ کے بڑے کنوئیں اور راجہ شیر سنگھ صاحب
کی سمادھی کے ساتھ باغ کے کلاں دروازہ سے باہر برگد (بڑھ) کا ایک اتنا بڑا درخت ہے۔ کہ اس سے کلاں درخت آج تک راقم کی
نظر سے نہیں گذرا۔ باغ کی کل زمین جس میں زراعتی زمین بھی شامل ہے ایک سو دس بیگھہ بیان کی جاتی ہے۔
افسوس ہے باغ کی حالت اچھی نہیں۔ یہ باغ راجہ صاحب شیخو پورہ (موجودہ راجہ صاحب کا نام راجہ دھیان سنگھ)
کی ملکیت ہے ان کی عالی شان قلعہ نما حویلی لاہور میں موجود ہے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ معلوم ہوا ہے اپنی رہائش کے لیے شہر سے
باہر ایک کوٹھی لے رکھی ہے۔ اس باغ میں وہ کبھی جو بھولے بھٹکے آ نکلتے ہیں۔ اگر اس باغ کی آرائش و زیبائش کا ان کو خیال ہو۔ تو یہ لاہور
کی ایک بہترین سیرگاہ بن سکتا ہے۔

اس باغ سے چند قدم کے فاصلہ پر مغربی جانب نامعلوم گنبد کے نزدیک جس کو داتا شکوہ کی دائی کا گنبد کہتے ہیں حال ہی میں
مندر دریا گر کے نام سے ایک عالی شان عمارت تیار ہوئی ہے۔ یہ عمارت آٹھ کنال سولہ مرلہ میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ ہر حصہ کی
چار دیواری پختہ ہے اور علیحدہ علیحدہ ہے دونوں حصوں کے درمیان قریباً آٹھ دس فٹ کی سڑک ہے جس حصہ میں باوا دریا گر کی سمادھی
ہے اس کے دروازہ پر ذیل کی عبارت درج ہے:

"مندر دریا گر۔ باوا رام ناتھ و اگڑ بہیر جی کے ناپکار کے ساتھ
سیٹھ کالو رام و ہری رام بہیرا و ٹھاکر دھیان سنگھ راجپوت
پردھان پر دیسی دھارمک سبھا لاہور نے بنوا کرائی سمت ۱۹۴۲"

اس کے نیچے یہ الفاظ ہیں" استھان باوا دریا گر جی مہاراج "ایک طرف یہ بھی لکھا ہے "غیر مذہب کے لوگوں کو اندر آنا منع
ہے"۔ اس حصہ میں ایک مندر اور کئی عمارتیں ہیں۔ راقم باوا رام ناتھ سے بھی ملا جس کو بہیر جی بھی کہتے ہیں۔ بالکل ننگے دھڑنگے۔ کمر بند
لنگوٹ باندھے ہوئے۔ سر، داڑھی مونچھ بلکہ ناخنوں کے بال تک صفا چٹ۔ تیل کی مالش کر رہے تھے۔ خوب موٹے تازے۔ پہلوان معلوم
ہوتے تھے۔ باوا دریا گر کا سال وفات سمت ۱۸۵۶ ب بتاتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو موضع خوجہ سعید میں جہاں
ان کی سمادھی ہے کچھ جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

ابتدا میں سمادھی معمولی تھی۔ کوئی مندر بھی نہ تھا۔ معمولی کٹیا تھی اب (سنہ ۱۹۴۲ء میں) خاصی رونق ہے۔ سیٹھ صاحبان کی طرف
سے لنگر جاری ہے۔ چند ایک سادھو سنت موجود رہتے ہیں دوسرے حصہ میں چند ثمر دار درخت لگائے گئے ہیں۔ سبزی وغیرہ کی کاشت
ہوتی ہے اور ایک نہایت خوب صورت چھوٹا سا مندر تعمیر ہو رہا ہے۔ دوسرے حصہ کی چار دیواری کے ساتھ ہی مسلمانوں کا قبرستان
ہے اور چونکہ دیوار کے ساتھ ہی تین چار کچی قبریں ہیں اندیشہ ہے کہ ان کی ضرور کسی دن صفائی ہو جائے گی۔

باغ جمعدار خوشحال سنگھ

جمعدار خوشحال سنگھ کنکھل ضلع سہارن پور کا ایک قبول صورت (گوڑ) برہمن تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لیے
سکھ ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک یہ کشمیر کا ناظم بھی رہا۔ مگر جب اہل کشمیر اس کے ظلم و تشدد سے تنگ آ گئے تو مہاراجہ نے اس کو کشمیر سے واپس

بلکہ لاہور میں اس کی عالیشان حویلی اور وسیع و خوشنما باغ بہت مشہور تھا۔

مہاراجہ خود بھی اس باغ میں آیا کرتے اور جمعدار کی عزت افزائی کیا کرتے تھے چنانچہ جب ۱۹ محرم ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) کو اس باغ میں آئے تو جمعدار نے ایک خوب صورت اور قیمتی گھوڑا بطریق نذر پیش کیا۔ اور دوسری دفعہ جب ۸ محرم ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) مطابق سمت ۱۸۷۸ ب کو دسہرہ کے دن یہاں آئے تو دربار بھی یہیں منعقد ہوا۔ صاحب عمدۃ التواریخ دفتر دوم جلد (ص ۲۹۱ پر) لکھتے ہیں:

"وکیلان ہر طرف و سرکردگان عالیشان برائے نذر و نیاز
پرداختند۔ وقت سہ پہری قواعد پلاٹن مشاہدہ و معائنہ
فرمود۔ و انعام حوالہ بعضے کسان ساختہ"

اسی باغ میں اس کے بیٹے رام سنگھ اور اس کے بھائی راجہ تیجا سنگھ اور اس کی اپنی سمادھ ہے۔ یہ باغ لاہور کے مشہور و معروف باغوں میں تھا مگر جب ۱۸۴۲ء میں مہاراجہ شیر سنگھ نے رانی چند ان سے قلعہ لے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ تو سکھ فوج جمعدار خوشحال سنگھ سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی کی طرف روانہ ہوئی۔ جمعدار بھی بے خبر نہ تھا اس نے حویلی کی دونوں جانب توپیں لگا رکھی تھیں وہ اپنی حفاظت کے مکمل انتظام اور اپنی قلعہ نما حویلی کے استحکام کے باعث بچ گیا۔ سکھ فوج یہاں سے ناکام ہو کر اس کے باغ واقعہ بیرون مستی دروازہ کی طرف گئی اور چشم زدن میں درخت کاٹ کر اور عمارت گرا کر ہرے بھرے باغ کو کف دست میدان بنا آئی۔

چند دنوں کے بعد جمعدار نے باغ کی چار دیواری اور بارہ دری دوبارہ تعمیر کرائی۔ درخت جو کٹے ہوئے تھے چونکہ جڑوں سے نہیں کاٹے گئے تھے کچھ تو وہی سرسبز ہو گئے۔ اور کچھ نئے لگائے گئے ۱۸۴۴ء میں جمعدار خوشحال سنگھ کا انتقال ہو گیا۔

[باغ کی موجودہ حالت نہایت افسوسناک ہے سمادھوں کی چار دیواری بھی بالکل شکستہ ہے۔ اور باغ کی چار دیواری کا تو کہیں وجود بھی نظر نہیں آتا۔ اس باغ کے شمال کی طرف ریلوے لائن ہے جنوب کی طرف واٹر ورکس۔ قلعہ اور حکیم نبی واسطی کی نئی منزل ہے۔ باغ کے کثیر حصے میں زراعت اور کھیتی کا کام ہوتا ہے یہ باغ بھی راجہ صاحب شیخوپورہ کی ملکیت میں تھا۔ اب پتہ نہیں کون مالک ہے —— مرتب]

باغ سردار رتن سنگھ گرجاکھیہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں رتن سنگھ گرجاکھیہ نے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک باغ تعمیر کیا اور اس کی نہایت پختہ چار دیواری بنوائی اور اس میں کئی قسم کے ثمردار اور بے ثمر درخت لگوائے لیکن جب دیوان رتن چند داڑھی والے کا مہاراجہ کے دربار میں عروج ہوا۔ تو اس ساری زمین پر جس طرح بھی ہو سکا اس نے قبضہ کر لیا اور انگریزی عملداری میں جس کی ابتدا پنجاب میں ۱۸۴۹ء سے ہوتی ہے اس نے ایک سرائے تعمیر کرائی اور ایک تالاب بنوایا چنانچہ سرائے کی چار دیواری اب بھی وہی ہے جو رتن سنگھ نے اپنے باغ کے لیے بنوائی تھی البتہ اس کو کچھ بلند کر دیا گیا ہے۔ سرائے میں جو کنواں ہے وہ بھی رتن سنگھ کے باغ

کی یادگار ہے۔ تالاب ابھی تک موجود ہے۔ اس کے اردگرد کئی مکانات بن چکے ہیں۔ اس کے مشرق کی طرف جو سڑک ہسپتال سے ہو کر مزنگ کو جاتی ہے۔ اس پر بہت سی دکانیں راجکمار بلڈنگس کے نام سے بن چکی ہیں اور تالاب کو جانے کا یہیں بڑا دروازہ بھی ہے۔ تالاب کے شمال کی طرف دیوان رتن چند کی سمادھ بھی ہے۔ اب سرائے میں مختلف لاریوں اور بسوں کے اڈے ہیں۔

باغ ہری سنگھ نلوہ

محلہ مسجد دائی لاڈو نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں۔ اس کی وسعت۔ آبادی اور رونق کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ کہ باغ کنہیا لال کپور والا۔ باغ بھائی نہال سنگھ۔ باغ رتن چند داڑھی والا۔ باغ رتن سنگھ گرجاکھیہ سب اسی محلہ اور احاطہ کے مضافات اور کھنڈروں پر آباد تھے۔ آج جہاں لاہور میڈیکل کالج اور میو ہسپتال ہے۔ وہ بھی اسی احاطہ کا ایک حصہ ہے۔ سب سے پہلے یہاں سردار ہری سنگھ نلوہ نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشہور جرنیلوں میں تھا۔ زمین کو ہموار کرا کے ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا اس میں بہتر سے بہتر ثمردار درخت نصب کرائے اور ایک بہت بڑا کنواں تعمیر کرایا جس سے باغ کو سیراب کیا جاتا تھا۔ لیکن اس باغ کی عمر ابھی پندرہ بیس سال ہی کے قریب ہوئی تھی۔ کہ سکھوں کے طرز عمل نے پنجاب ان کے قبضہ سے نکلوا کر انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

۱۸۴۹ء میں انگریز پنجاب پر قابض ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں جب سرکار نے یہاں ہسپتال بنانے کی تجویز کی تو اس کی عمارت کے لیے باغ ہری سنگھ کی وسیع زمین ہی پسند کی گئی۔ چنانچہ وہ باغ جو ایک نامور اور دولت مند مسلمان محلہ کی عمارتوں کے کھنڈروں پر بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے تیار ہوا تھا۔ برباد ہونا شروع ہوا۔ اس کی تمام اندرونی عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ اس ہسپتال کے اندر پیپل کے قدیم درختوں کے پاس جو بہت بڑا کنواں ہے وہ باغ ہری سنگھ کی واحد یادگار ہے۔ یہ ہسپتال ۱۸۷۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ ۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہفتم کی وفات کے بعد اس کی عمارتوں میں لاکھوں روپے کی لاگت سے اور بھی توسیع کی گئی۔

باغ موراں والا

موراں لاہور کی ایک مشہور حسینہ و جمیلہ طوائف تھی جس کا نام اس کے غیر معمولی عروج و اقبال اور اس کی شاندار عمارات کی وجہ سے ابھی تک اہلِ لاہور کے دلوں سے فراموش نہیں ہوا۔ وہ اس عیش دوست مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی جو شیر پنجاب کہلانے کے باوجود شاہی خدم و حشم کے ساتھ موراں کے مکان پر جاتا اور اہلِ دربار کو حکم دیتا کہ موراں کے دربار میں سلام کر کے ہمارے دربار میں آیا کرو۔ موراں کا عروج اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ مہاراجہ کے حکم سے موراں شاہی گز۔ موراں شاہی باٹ اور موراں شاہی سکے تیار ہو گئے۔

مہر محکم دین جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا قبضہ دلایا اور جس کو مہاراجہ باپو کہہ کر پکارا کرتا تھا خاص دربار میں تھا۔ موضع نواں کوٹ جہاں غلط طور پر زیب النساء بیگم کا مقبرہ بیان کیا جاتا ہے اسی محکم دین کا آباد کردہ ہے۔ اس معز

اور نامور شخص کو اسی طوائف نے بھرے دربار میں مہاراجہ سے ذلیل کرایا اور اس کی تمام جائداد ضبط کرا دی۔

سمت ۱۸۷۴ ب میں موراں کا انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ کے حکم سے اس کی قبر نہایت پختہ اور عالی شان بنائی گئی۔ مہاراجہ خود اس کی قبر پر گئے۔ موراں کی بہن مولاں بھی وہاں موجود تھی۔ اس کو چار کنوئیں جن کے ساتھ سینکڑوں بیگھہ اراضی تھی عطا کر آئے۔

موراں نے ایک قرآن شریف کسی اعلیٰ خوشنویس سے لکھوایا تھا جس پر اس نے کئی سو روپیہ کاتب کو دیا تھا۔ قرآن شریف اس نے ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں مزار حضرت داتا گنج بخش کی نذر کر دیا۔ پاپڑ منڈی (شاہ عالمی دروازہ) اور چوک متی کے درمیان ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں اس نے جو مسجد تعمیر کرائی وہ اب تک موجود ہے۔ اس مسجد کی امامت اور آبادی کے لیے مہاراجہ نے ذاتی طور پر کوشش کی تھی۔ مندر ٹھاکر بھیرو کی تعمیر میں جو موضع اچھرہ کے قریب ہے موراں نے اس کے سیوک جوالا ناتھ کو جس نے موراں کی والدہ بیگم کا آسیب دور کیا تھا چالیس ہزار اینٹ اور بہت سا روپیہ مندر کی تعمیر کے لیے دیا۔

موراں نے اپنے عروج و اقتدار کے زمانہ میں دیگر رؤسائے دربار کی طرح موری دروازہ کے باہر اپنا ایک عالی شان باغ بھی تعمیر کیا۔ جس کی چار دیواری قد آدم تھی۔ جس کا بڑا دروازہ (مین گیٹ) نہایت خوبصورت اور نقش و نگار اور تصاویر بوقلموں سے مرصع تھا۔ اس باغ کے متصل پرانے کھنڈروں پر باوا دھونا داس نامی ایک سادھو نے مندر بنانا شروع کیا موراں اس کی عقیدت مند تھی اس نے مندر کی تعمیر میں بہت مدد دی۔ مندر کا کنواں اور سر راہ جو نشست گاہ ہے وہ موراں ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ باغ کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ لوگوں نے وہاں کچھ مکانات بنا لیے ہیں اور کچھ زمین اس سڑک میں آگئی ہے۔ جو رائے میلا رام کے کارخانہ سے رائے گلاب سنگھ کے چھاپہ خانہ کی طرف آکر بڑی سڑک کے ساتھ مل جاتی ہے۔

باغ رانی گل بیگم

موراں کی وفات کے بعد امرتسر کی ایک خوبصورت طوائف گل بیگم کی قسمت چمکی یہاں تک کہ اس کے چھوٹے بڑے رشتہ دار سب مہاراجہ کی عنایات خسروانہ کے شجر ثمردار سے بار آور ہو گئے۔

مہاراجہ کو تعلق تو اس کے ساتھ تھا ہی لیکن وہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کرنے کے لیے بھی بے تاب رہتا تھا۔ گل بیگم کا مہاراجہ پر اس قدر اثر تھا کہ پسران منشی شیو دیال کے تمام جرائم اس کی سفارش سے معاف ہو گئے۔ اور ان کو نظر بندی اور حبس سے نجات ملی۔

آخر شادی کا دن بھی آگیا۔ مہاراجہ خود امرتسر میں آیا اس وقت اس کی عمر (۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کی پیدائش کے مطابق) اکیاون سال تھی۔ شادی کی تاریخ سمت ۱۸۸۸ب (۱۸۳۱ء) کے ماہ اسوج کی چودہ کو قرار پائی۔ مہاراجہ نے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ پھر دربار صاحب۔ ہر مندر جی۔ بنگہ بھائی صاحبان اور بھائی گوبند رام کے درشن کو گئے۔ اس کے بعد رام باغ میں آئے جہاں ہر قسم کا سامان عیش و نشاط مہیا و مرتب تھا۔ بڑے بڑے سرداروں۔ ماتحت راجگان۔ امراء و زراء بلکہ صاحبان انگریز تک نے قبول کیے اور اس تقریب میں شمولیت کی۔

اسی تاریخ کو سہ پہر کے وقت زیورات و جواہرات کے ساتھ زعفرانی لباس پہنا۔ اور فراشوں کو حکم دیا کہ بنگلہ نقرہ میں خیمے اور قناتیں اور شامیانے لگا دیں اور چونکہ ایک رقاصہ اور طوائف کے ساتھ شادی کا انتظام ہو رہا تھا اس لیے لاہور اور امرتسر کی تمام ناچنے اور گانے والی طوائفوں کو اس نقرئی بنگلہ میں حاضر ہونے کی دعوت دی گئی۔ شراب اور اکل و شرب کا خاص اہتمام کیا گیا۔ [illegible] نوازوں اور سازندوں اور مطربوں کو جو رقاصہ طوائفوں کے ساتھ حاضر تھے تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ گل فروشوں نے گل ہائے رنگا رنگ سے بنگلہ کو چمنستان بنا دیا۔ ہر شخص لباس فاخرہ پہنے ہوئے موجود تھا۔

مہاراجگان راجہ وهیان سنگھ کو جو راجۂ کلاں کے نام سے موسوم تھے بقول شاعر یہ حکم ہوا ؎

آتی ہے چمن میں مرے گلرو کی سواری
اے باد صبا خاک اڑانا نہیں اچھا

چنانچہ مہاراجہ کے ارشاد اور راجۂ کلاں کے ایما پر بنگلہ کے اندر سب کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ کوئی افسر کوئی سردار اور کوئی ادنیٰ آدمی بنگلہ کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک منقش پینس میں سوار ہو کر گل بیگم بسنتی لباس پہنے ہوئے "در دست و پا حنا کردہ و از سر تا پا بہ زیورات طلائی مرصعی آراستہ و پیراستہ شدہ درون بنگلہ وارد گشت" (عمدۃ التواریخ دفتر سوم حصہ دوم ص ۱۵۱)

اس کے بعد خود مہاراجہ بنگلہ میں داخل ہوئے اور بنگلہ کے باہر طوائفوں نے صفیں باندھ کر ناچنا اور گانا شروع کیا۔ سرداروں اور متوسلین نے سرکار پر روپے نچھاور کئے۔ مہاراجہ نے طوائفوں کو سات ہزار روپیہ انعام دیا۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد ایک طلائی کرسی پر مہاراجہ بیٹھے اور دوسری پر گل بیگم نے اجلاس کیا۔ مہاراجہ کو سہرا باندھا گیا اور اس میں عقد مروارید لگایا گیا۔ اور گل بیگم کی ناک میں طلائے مروارید کی نتھ ڈالنے کے بعد آوازۂ مبارک بادی سے آسمان گونج اٹھا۔ شام کو آتش بازی کے تماشا سے جگمگاتا رہا۔

گل بیگم اب باقاعدہ مہاراجہ کی رانی بنی اس کا نام گل بہار گل بیگم رکھا گیا۔ اور پروانے لکھے گئے کہ کاغذات میں اس کا نام "بیگم صاحبہ" لکھا جائے۔

مہاراجہ بکرمی سمت ۱۸۸۸ میں جب کٹاس گئے تو گل بیگم ہمراہ تھی۔ کٹاس سے واپسی پر ۲ مگھر کو گل بیگم کے ہمراہ عین بارش باراں کے وقت باغ چھوٹا رام میں آکر قیام کیا۔ جب بارش تھم گئی تو سہ پہر کو یہاں سے مع بیگم صاحبہ ہاتھی پر سوار ہو کر مستی دروازہ آئے۔ اور چونکہ گل بیگم کے ساتھ لاہور میں یہ پہلا داخلہ تھا۔ اس لیے مستی دروازہ سے جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ اور موتی بازار۔ ٹکسالی بازار۔ سٹھاں (کسیرا) بازار۔ پاپڑ منڈی۔ حویلی شہزادہ کھڑک سنگھ اور سید مٹھا سے ہوتے ہوئے حضوری باغ آئے۔ رستہ میں محتاجوں۔ غریبوں اور تماشائیوں کے لیے ہاتھی پر سے ہزارہا روپیہ بطور زر افشانی لٹاتے آئے۔ دف نواز اور رباب والے بھی ہمراہ تھے۔ حضوری باغ میں قدم رکھتے ہی توپوں کی سلامی نے آسمان میں ایک گونج پیدا کر دی۔

گل بیگم کے آتے ہی مہاراجہ کے حرم میں کیا منہ بند کلیاں اور کیا شگفتہ پھول جس قدر تھے سب مرجھا گئے۔ اس کے رہنے کے لیے الگ محل تعمیر ہوا جس کا وجود "حویلی گل بیگم" کے نام سے رنگ محل اور حویلی میاں خاں کے درمیان کوچہ گل بیگم میں اب

تک بھی موجود ہے۔

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں گل بیگم نے خطۂ میانی بین مزنگ کے متصل اپنے عالی شان باغ کی بنیاد رکھی۔ باغ کا دروازہ جس کی پیشانی نقش و نگار کے جھومر سے آراستہ ہے غربی جانب سے دو منزلہ اور بہت اونچا ہے۔ بالاخانہ کے تین دریچے بھی منقش اور رنگین ہیں دروازہ باہر سے محرابی ہے۔ جس کے وسط میں چند اشعار نیلے رنگ سے لکھے ہوئے ہیں جو منتظم باغ کے نام اور فرزند رانی گل بیگم اور باغ کے سال تعمیر پر روشنی ڈالتے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

بفضلِ قادرِ بے چوں ز دستِ گل بیگم — کہ ہست رانیۂ دوران و ملکۂ عالم
بنا پذیر شد این باغ رشکِ خلدِ بریں — بہ اہتمامِ علی بخشِ اہلِ جود و کرم
خوشا نصیب کہ فرزند خویش خلف دارد — کہ مشتہر شدہ سردار خان چوں حاتم
زہے است باغ کہ از بوئے خلد آید — از ین ست سال بنائش زہے زباغِ ارم
ظہور سال ز آباد باغ رانی شد — عطارد از سر ارقام چوں گرفت قلم
فرید[1] خبر بنا را آنکہ کہ تاریخش — فرشتہ گفت عمل آباد باغ گل بیگم
چو سیر گاہ خوش ساخت رانی دوراں — برائے سال بنا گفت باغ سیر رقم
بدستِ کاری و معمار یئے غلام علی — بنا شد است خوش این باغ مرجع عالم ۱۲۷۳

ان کے علاوہ حسب ذیل دو اشعار بھی ہیں:۔

سال تاریخ بنائے باغ چوں جستم بگفت — بلبلم آباد باغ رانی گل بیگم است
از سر آباد قمری سال سمت راچہ خوش — گفت نو آباد باغ رانی گل بیگم است

باغ میں کئی قسم کے ثمردار اشجار تھے۔ کئی مکانات۔ بالاخانے۔ حوض۔ چاہ۔ فوارے۔ آبشاریں۔ سڑکیں اور روشیں۔ غسل خانے۔ گنبد کلاں گنبد خورد جن میں سے کئی ایک کی دیواریں اور چھت منقش استرکار اور چونہ گچ تھے۔ اب چاروں طرف سناٹا ہے خاک سی اُڑ رہی ہے۔ چاہ کلاں کے اندر جس کا عمق بہت دور تک ہے سنگ مرمر کی ایک تختی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"مالک این چاہ رانی گل بیگم صاحبہ بنت شیخ محمد اکبر زوجہ
مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب سرگباشی"

باغ کے جنوب رویہ ایک بڑا چبوترہ پختہ چونہ گچ۔ ہے جس کی متصلہ عمارتوں کی درمیانی برجی کے محراب میں ایک ٹکڑا سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے جس پر ذیل کے اشعار تحریر ہیں ؎

بر زمین تازہ چوں بہشتِ بریں — باغ با آب و تاب گل بیگم

---

[1] یہ الفاظ صاف نہیں پڑھے گئے نام مولوی فریدالدین وطن مزنگ وفات ۱۸۴۲ء بعمر قریباً سو سال۔ مزنگ کا شاعر مولوی پارس علی پارس انہی کا فرزند تھا۔

ہست سردار خاں بانی باغ خلف مستطاب گل بیگم

سال تعمیر باغ خورم گفت امن باغ جناب گل بیگم

باغ کی جنوبی حدود میں رانی گل بیگم کا مقبرہ ہے جو باغ کی تعمیر کے ساتھ ہی اُس نے اپنی زندگی میں بنوا لیا تھا۔ گل بیگم ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں انتقال کر گئی۔ قبر سیاہ پتھر کے چبوترہ پر ہے۔ قبر کا تعویذ سنگِ مرمر کا ہے جب اس کا متبنیٰ ابیٹا سردار خاں مر گیا تو وہ بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔ سردار خاں کے زمانہ میں قبر پر کمخواب کا غلاف اکثر پڑا رہتا تھا اور چار باغبان باغ و حفاظت سرسبزی اور مکانات متعلقہ باغ کی نگہداشت کے لیے اپنے عملہ سمیت ہر وقت موجود رہتے تھے۔

اب باغ کا تو کہیں وجود نظر نہیں آتا۔ البتہ پختہ دیواریں کھڑی ہیں۔ گنبد بھی دُور سے دکھائی دیتا ہے بعض دیواروں کے آثار اور نشان بھی موجود ہیں۔

الحاقِ پنجاب کے بعد جب سکھ رانیوں کی پنشنیں سرکار انگریزی نے مقرر کیں تو رانی گل بیگم بھی چونکہ بیاہتا رانی تھی اور رانی جنداں کی جلا وطنی کے بعد بھی سب سے زیادہ استحقاق رکھتی تھی اس لیے سب سے زیادہ پنشن بارہ سو روپے ماہوار اسی کو ملی۔ اس کی اپنی جاگیر بھی معقول تھی۔ وہ بڑی مالدار تھی اُس کا اپنا عملہ اور دفتر تھا۔ اُس کے خاندانی حکیم۔ حکیم کریم اللہ اور اس کے دیگر ملازمین اور متعلقین کی قبریں اُس کی قبر کے متصل ہی اسی باغ میں ہیں۔

باغ ہمت کہار

ہال روڈ پر جہاں باغ و مقبرہ حضرت شاہ اسماعیل کی چار دیواری تھی مرورِ زمانہ سے ایک ایسا وقت آیا کہ اس چار دیواری کے متصل بلکہ باغ و مقبرہ کی زمین کے کچھ حصّہ میں بھی بڑے بڑے ساہوکاروں، تاجروں اور متمول لوگوں کے عالیشان مکانات تعمیر ہو گئے۔ اور ان دولت مندوں کی وجہ سے اس ٹکڑہ کا نام لکھمی محلہ مشہور ہو گیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دنوں میں جب لوٹ مار ہونے لگی۔ تو کچھ لوگ فصیل شہر کے اندر چلے آئے۔ کچھ جموں کی طرف چلے گئے جو کہیں نہ جا سکے۔ وہ مال و اسباب سمیت غارت گروں کی نذر ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا۔ تو سہ حاکمانِ لاہور کے ظلم کی بدولت یہاں کے عالیشان مکان کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے اسی زمانہ میں جمعدار خوشحال سنگھ کے ایک اہلکار ہمت قوم کہار نے جو مواضعات مزنگ و اچھرہ کا مستاجر بھی تھا۔ بہت سا حصّہ ہموار کرایا اور یہاں ایک دلکش باغ اور اس کے ساتھ کئی پختہ مکانات تعمیر کرائے۔

تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ جب خشت فروش بنیادیں کھودتے اور زمین صاف کرتے تھے تو اکثر دفینے نکلتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد شاہی روپیہ کا بھرا ہوا دیگچہ نکلا تھا۔

---

۱ نام مولوی غلام حسن تخلص خورم۔ وطن لاہور۔ فارسی کے علاوہ ریختہ میں بھی کہتے تھے۔ ان کی پنج گنج ایک مشہور تصنیف ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

انگریزی عملداری کے وقت ہمت کے کم ہمت پوتے حاکم نام نے وہ باغ میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے پاس فروخت کر دیا۔ محمد سلطان نے باغ کو صاف کرا کر وہاں ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ جہاں اس زمانہ کے ڈپٹی کمشنر ہال صاحب نے رہائش اختیار کی اور اسی کے نام پر وہ ہال صاحب کی کوٹھی مشہور ہو گئی بلکہ اس سڑک کا نام بھی جو سیدھی مزنگ کو جاتی ہے چوک ہرجس تک ہال روڈ ہی مشہور ہے۔ سڑک کے ایک طرف رومن کیتھولک گرجا۔ یورو پین کیتھڈرل سکول اور قبر شاہ اسماعیل ہے اور دوسری طرف یعنی بائیں جانب چاہ مانتاں اور رومن کالج ہے[1]۔ کسی کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہاں کبھی کوئی باغ بھی تھا۔

باغ چھاؤنی جمعدار خوشحال سنگھ

سید بدر الدین گیلانی ایک بزرگ شاہجہان کے زمانہ میں لاہور کے اس مقام پر رہتے تھے جہاں آجکل گورنمنٹ ہاؤس واقع ہے اسی جگہ ان کی عالیشان مسجد تھی اور اسی جگہ ان کے نام سے ایک محلہ آباد تھا۔ ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۱ء میں بعہد عالمگیر ان کا انتقال ہو گیا۔ مقبرہ کی عمارت تعمیرات شاہی کا پتہ دیتی ہے۔

یہ محلہ مع مسجد و مقبرہ دیر تک آباد رہا۔ سر حاکمانِ لاہور کے زمانہ میں جب بیرون لاہور کی بستیاں ویران ہونے لگیں تو رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شہر کے پہلوانوں نے گنبد کے متصل کشتیوں کا اکھاڑہ بنا لیا اور یہ گنبد کشتی والا گنبد کے نام سے مشہور ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کے اواخر عہد میں فوج کی چھاؤنی جمعدار خوشحال سنگھ کے ماتحت گنبد کے متصلہ میدان میں مقرر ہوئی۔ جمعدار نے گنبد کو گرا کر ہشت پہلو کوٹھی بنوائی اور اس کے ساتھ ہی ایک باغ چھوٹے پیمانہ پر مگر نہایت دیدہ زیب تعمیر کرایا۔

سرکار انگریزی کے عہد میں ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت کے مطابق پہلے لورنگ صاحب ڈپٹی کمشنر پھر میجر میک گریگر ڈپٹی کمشنر پھر منٹگمری صاحب کمشنر (بعد میں لاٹ صاحب) یکے بعد دیگرے اس باغ اور کوٹھی میں مقیم رہے۔ منٹگمری صاحب کے زمانہ میں اس باغ اور کوٹھی پر راجہ تیجا سنگھ برادر جمعدار خوشحال سنگھ کا قبضہ تھا۔ لاٹ صاحب نے یہ باغ راجہ تیجا سنگھ سے لیا اور اس کے عوض سیالکوٹ میں اس کو وہاں حاکم رہنے کی حویلی دے دی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے وہ کوٹھی گورنمنٹ ہاؤس چلی آتی ہے۔ کوٹھی کے بیرونی حصے میں نہایت مکلف اور وسیع باغ ہے جس میں طرح طرح کے ثمردار اور بے ثمر درخت نصب ہیں۔ بے شمار گملوں سے باغ کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ باغ میں ایک عمیق حوض ہے۔ اور اس سارے رقبے کو ایک پختہ دیوار محیط کئے ہوئے ہے۔ ہر سال اس کوٹھی میں اور اس وسیع اراضی میں اس قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے کہ جمعدار خوشحال سنگھ کے زمانہ کی کوئی عمارت وہاں موجود نہیں۔ البتہ سید بدر الدین گیلانی کا مقبرہ کوٹھی کی زیریں منزل میں بدستور موجود ہے۔

باغ ٹھاکر دوارہ بھوری سرکار

یہ باغ اس مندر اور ٹھاکر دوارہ کے ساتھ ملحق ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک رانی بھوری سرکار نام نے مہاراجہ شیر سنگھ

---

[1] گورنمنٹ کالج فار ومن یہاں سے تبدیل ہو کر کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے اور اب وہاں انسپکٹر آف سکولز کا دفتر ہے۔

کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ باغ بڈھے دریا کے کنارہ پر نالہ کے پل سے پار واقع ہے باغ نہایت وسیع تھا اور اس کے ساتھ بہت سی زرعی زمین بھی تھی اس میں مکانات بھی تھے جہاں باغبان اور کاشت کار رہتے تھے اور کئی کنوئیں بھی تھے۔ سنہ ۱۸۳۰ء تک اس باغ میں بہت رونق تھی کئی پختہ مکانات موجود تھے۔ سادھ سنت بھی رہتے تھے اور لنگر خانہ کے لیے آٹا پیسنے کا ایک خراس بھی تھا۔

نالہ سے پار مغرب کی طرف بڑ اور آموں کے درختوں کے درمیان مندر اور ٹھاکر دوارہ کی عمارتیں تو موجود ہیں مگر باقی عمارتیں کچھ شکستہ ہیں کچھ مسمار ہو چکی ہیں۔ باغ کی چار دیواری بھی نہیں ہے۔ البتہ آموں کے درخت موجود ہیں۔

باغ پچھو بھگت

جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں پچھو بھگت ایک بہت بڑے فقیر کامل گزرے ہیں۔ ان کا مکان شاہ عالمی دروازہ کے باہر اس جگہ تھا۔ جہاں میو ہسپتال لاہور کا بڑا دروازہ ہے۔ اور دروازہ سے آگے چند قدم کے فاصلہ پر بائیں طرف ان کی سمادھ بھی موجود ہے۔

صاحب عمدۃ التواریخ انتخاب دفتر دوم کے صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں کہ چالیس سال سے یہاں ایک بزرگ مہاتما پرشوتم داس رہا کرتے تھے بڑے صاحب یمن و برکت اور ریاضت کش تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پرشوتم داس کا قاعدہ تھا کہ سرکار کی طرف سے جو کچھ ان کو نقد و جنس ملا کرتا وہ محتاجوں اور مسکینوں کو دے دیا کرتے۔

ان کے بعد باوا دوارکا داس جو پرشوتم داس کا چیلہ تھا گدی پر بیٹھا۔ اس کو عمارات و باغات کا شوق تھا۔ چنانچہ مہاراجہ کی طرف سے جو کچھ اس کو ملتا تھا وہ تعمیرات میں صرف ہو جاتا تھا اس نے جنوب کی سمت ایک باغ تعمیر کرایا اور اس میں شاندار عمارات تیار کرائیں۔ سمت ۱۸۸۰ ب / ۱۸۲۳ء میں باوا دوارکا داس بھی انتقال کر گیا۔

باوا دوارکا داس کے بعد اس باغ اور ان مکانات دلفریب کا وہ حال ہوا جو مولانا حالی کے اس شعر کے مطابق نظر آتا ہے ؎

ان کے جاتے ہی بدل جاتی ہے گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

چنانچہ سمت ۱۸۸۷ ب / ۱۸۳۰ء یعنی دوارکا داس کی وفات سے سات ہی سال کے بعد کے واقعات میں صاحب عمدۃ التواریخ لکھتے ہیں کہ باغ اور مکانات سب رہن ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوارکا داس کا جو جانشین تھا وہ فضول خرچ اور عیش پرست تھا۔

جب انگریزوں کا راج آیا۔ اور انھوں نے لاہور میں میڈیکل کالج بنانے کا ارادہ کیا۔ تو باغ اور باغ کے مکانات کی صفائی ہو گئی اور صرف باوا پچھو بھگت کی سمادھ باقی رہ گئی۔ جو کالج کے احاطہ میں اب تک محفوظ و سلامت چلی آتی ہے۔

فیض باغ راجہ دینا ناتھ

سکھوں کے عہد میں ایک درویش سائیں ہادی شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ راجہ دینا ناتھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے

کے لیے چاہ میراں کے رستے میں ایک باغ تعمیر کرایا۔ اس میں پختہ مکانات بھی بنوائے اور باغ کی چار دیواری بھی پختہ کرائی۔ راجہ دینا ناتھ ہر دوسرے تیسرے دن بادی شاہ کے سلام کو آتا تھا چونکہ امیر الامرا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا رکن تھا اس لیے اس کی دیکھا دیکھی اور بہت سے لوگ بھی یہاں آنے لگے۔

اس باغ کے ساتھ کافی زمین تھی جہاں کاشت بھی ہوتی تھی اور ایک کنواں بھی تھا جس سے اس باغ کی آبیاری ہوا کرتی تھی۔ راجہ نے فیضانِ عام پہنچانے کے لیے اور اس خیال سے بھی کہ ان کو اپنے اعتقاد کے مطابق یہاں سے فیض پہنچتا رہتا تھا اس باغ کا نام فیض باغ رکھا۔

آج سے پچاس سال قبل دیوار بندی کے شکستہ سے آثار موجود تھے اور گو بعض باغ کی زمین میں کاشت ہوتی تھی لیکن اس کی شرقی جانب بید مشک۔ گلاب۔ سنگترے اور کھٹے میٹھے درختوں کے باغات تھے۔ اور کہیں کہیں کاشت بھی ہوتی تھی یہ سب باغات فروخت ہو کر مکانات کی صورت میں آباد ہو گئے۔ چنانچہ آج فیض باغ ایک باغ کا نام نہیں بلکہ ایک نو آبادی کی صورت میں آباد ہے۔

بادی شاہ کی قبر بھی اسی باغ میں ہے۔ اس کی قبر ذرا بلند چبوترے پر ہے اور بڑ کا ایک گرانڈیل درخت اس پر سایہ کناں ہے۔ اس کے پاس ہی کمہاروں کا ایک چھوٹا سا پژاوہ ہے جہاں برتن وغیرہ بنتے اور پکائے جاتے ہیں۔ مکانات جو باغ کے اندر تھے ابھی تک موجود ہیں وہاں زمیندار اور مزدور لوگ رہتے ہیں۔

یکی دروازہ کے باہر سے جو سڑک ریلوے پل کے نیچے سے ہو کر چاہ میراں کو جاتی ہے اور جس کا نام سڑک نواب میاں خان ہے یہ اس باغ کے مکانات کے پاس سے ہو کر گزرتی ہے۔

بادی شاہ نے پہلی بیوی عالم بی بی کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح پناہ بی بی نام ایک عورت سے کیا جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو عالم شاہ نام ایک شخص سے بیاہی گئی۔ عالم شاہ نے بھاٹی دروازہ کے ایک شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ عالم شاہ کے مرنے کے بعد اس کے داماد اور اس کی لڑکی نے یہ باغ اور اس کی زمین اور مکانات وغیرہ سب فروخت کر دیے[1]۔

---

[1] یہ حالات راقم کو میاں شہاب الدین مرحوم زرگر ساکن اندرون دہلی دروازہ لاہور نے بتائے تھے جنھوں نے قریباً سو سال کی عمر میں ۱۹۳۴ء میں وفات پائی ہے۔

۹۱

سنہ ۱۸۵۰ء تا حال

میاں محمد سلطان

گردش افلاک نے جس کو کیا خانہ بدوش
عزم و ہمت کی بدولت اس کو "سلطان" دیکھیے

میاں سلطان ایک بیوہ ماں کا بیٹا اور ایک مفلوک الحال اور غریب الوطن کا شمیری خاندان کا نونہال تھا۔ اس کے تفصیلی حالات مشاہیر کشمیر اور تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم میں درج ہیں۔ اس نے محنت مزدوری بھی کی۔ صابن اور چونہ کا کام بھی کیا۔ اینٹوں کا آوہ بھی قائم کیا۔ کشتی گیری بھی کی بلکہ اپنی پہلوانی کی بدولت مہاراجہ شیر سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انعام و اکرام کے علاوہ ایک گھوڑا بھی حاصل کیا اور آخر اس کی نیک نیتی اور اس کے عزم راسخ اور اس کے استقلال نے اس کو رفتہ رفتہ وہ عروج دکھایا۔ کہ اپنی دولتمندی۔ فیاضی اور اپنی ہردلعزیزی سے وہ لاہور کا بے تاج بادشاہ کہلاتا رہا۔

چونکہ خورد سالی ہی میں اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور ماں اس کی بیوہ تھی اس لیے اس کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا۔ اس کا سارا کاروبار اہل کاروں کے ہاتھ میں تھا جن کی خیانت و بددیانتی کا شاکی رہنے کے باوجود وہ ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتا رہا۔ اہل کاروں کے ہاتھ رنگنے کے ساتھ ہی اس کی اپنی سخاوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ دور بین لوگوں کو اس کے انجام سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ اس نے اپنی فیاضی میں ہندو مسلمان سکھ کی تمیز کبھی روا نہیں رکھی۔ وہ سب کو بلا تفریق مذہب و ملت دیتا تھا اور ہر ایک کی بے دریغ مدد کرتا تھا۔

۸ [۵ رفروری سنہ ۱۸۵۶ء کے اخبار کوہ نور لاہور میں ایک خبر درج ہے۔ جس کے مطالعہ سے میاں سلطان کی عالی حوصلگی، منکسر المزاجی، انتہا درجہ کی نیک سیرتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آقا و مولا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ خبر یہ ہے :-

" اخبار ہفتہ گذشتہ میں لکھا گیا تھا کہ آج (یعنی منگل گذشتہ کو) میاں سلطان ٹھیکیدار کو بروئے خوشنودی سرکار خلعت ملے گا۔ سو اسی دن معز الیہ کو دربار چیف کمشنری میں خلعت ہفت پارچہ مع جوڑی کڑہ طلائی و خطاب مندرجہ ذیل

عطا ہوا،

"زبدۃ الافسران لائق العنایت محمد سلطان"

کہتے ہیں کہ وقت عطائے خلعت کے جناب چیف کمشنر بہادر نے بزبانِ خاص اول چند کلمات موجب خوشنودی سرکار کے ان کی نیک کرداری و خوش رفتاری کے فرمائے اور بعد اس کے فرمایا کہ جملہ حکام آپ کو آئندہ چوکی دیں گے اور ہماری خوشی ہے کہ آپ کو خطاب نوابی کا دیا جائے کہ اس کو انھوں نے بمقتضائے عادت خوشی اپنی کے نامنظور کیا۔ پھر فرمایا کہ نواب کا خطاب اگر قبول نہیں فرماتے تو "خانی" کا خطاب دیں؟ اس پر بھی وہی لفظ فرمایا کہ مجھے اس سے بھی معاف رکھیئے اور آخر کار حسب فرمائش صاحب ممدوح کے یہ درخواست کی کہ میرے نام کے ماقبل صرف نام محمدؐ کا کافی ہے۔ امیدوار ہوں کہ سرکار یہی نام منظور رکھے۔ چنانچہ یہی درخواست منظور ہوئی اور اس ادا سے اور بھی زیادہ موجب خوشنودی صاحبِ ممدوح ہوا۔

محمد سلطان کی نیک نامی و خوش خلقی کا بیان طول ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے موافق اگر ان کو حاتم سے نسبت دیں تو بجا ہے۔ اس بزرگ نے ایک عالی شان سرائے بیرون دہلی دروازہ بنائی ہے کہ جس کے وسط میں ایک بڑی پرنمود مسجد بنائی ہے اور ہر طرف مکانات بجہت آسائش مسافروں کے واسطے بنائے ہیں۔ اسی ہزار روپے سے زیادہ اب تک لگ چکے ہیں اور آئندہ تعمیر جاری ہے۔ اس سرائے میں رعایت احسن صالحانہ بہ شرط ہے کہ کسی مسافر سے ایک حبہ تک نہیں لیا جاتا، اور غربا و مساکین کو کھانا اور گزارہ ملتا ہے۔ ایسے مخیر اور صاحبِ ہمت اشخاص دنیا میں بہت کم ہوں گے۔ خدائے کریم ان کی نیک نیت میں برکت دے اور اجر خیر کا جزائے خیر بخشے" ——— مرتب]

میاں سلطان کو پرانے مقبروں اور شکستہ مسجدوں کی اینٹوں کے ٹھیکے ملتے تھے۔ اس سبب کئی مقبرے اور کئی مسجدیں اس کے مزدوروں کے ہاتھوں بے نام و نشان ہو گئیں۔ پری محل جو نواب وزیر خان نے شاہ عالمی دروازے کے اندر بنایا تھا، رنگ محل جو نواب میاں خان کی حویلی کا حصہ تھا اور مسجد ستارہ بیگم عرف قدسیہ بیگم کے انہدام کا ذمہ دار بھی اسی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے کئی مزارات کی مرمت بھی کرائی اور مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ کئی کنوئیں کھدوائے۔ دہلی دروازہ کے اندر اس کی عالی شان حویلی اور دہلی دروازہ کے باہر لنڈا بازار سرائے میاں سلطان اب تک اس کی یادگار ہیں۔

[لاہور کا ریلوے اسٹیشن ابتدا میں اسی کے ہاتھوں تعمیر ہوا۔ ہسٹری آف لاہور

میں لکھا ہے کہ

"اس عمارت کا نقشہ مسٹر ڈبلیو برٹن سی ای نے بنایا اور اسے جلیل القدر ٹھیکیدار بارک ماسٹری محمد سلطان نے تعمیر کیا۔ سنگِ بنیاد سر جان لارنس (بعد میں لارڈ لارنس لفٹننٹ گورنر پنجاب) نے ۱۸۵۹ء میں رکھا اور عام پبلک کے لیے پہلی ٹرین ۱۸۶۲ء میں لاہور سے امرتسر تک چلی۔ تمام عمارت قلعہ نما اور نہایت نفیس ہونے کے علاوہ حسنِ کاری کا ایک پائدار نمونہ ہے۔ اس پر تقریباً پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا" — مرتب]

اننگ کا پل بھی اسی نے بنوایا۔ لیکن ان دونوں ٹھیکوں میں افسروں کے اختلاف رکھنے کی وجہ سے اس کو بہت کچھ زیر بار ہونا پڑا اور آخر ایک موضع اور اپنی حویلی کے سوا سب اپنی تمام جائداد مہاراجہ رنبیر سنگھ فرمانروائے جموں و کشمیر کے پاس پانچ چھ لاکھ روپیہ میں رہن رکھنی پڑی۔ مہاراجہ نے اس کی زندگی تک پانچ سو روپیہ ماہوار اس کے لیے مقرر کر دیا۔ آخر لاہور کا یہ لکھ پتی مزدور اسی سال کی عمر پا کر ۴ فروری ۱۸۷۶ء مطابق ۷ ماہ رمضان ۱۲۹۴ھ کو وفات پا گیا۔ اس کی قبر احاطہ طاہر بندگی کے باہر سڑک کے کنارہ جو سیدھی پونچھ روڈ تک جاتی ہے۔ بالکل سادہ حالت میں ہے۔

۱۹۰۳ء میں مسٹر سی ایچ اٹکنسن ڈپٹی کمشنر لاہور نے از سرِ نو اس کی قبر کی مرمت کرائی۔ اور قبر کے سرہانے ایک پتھر پر حسبِ ذیل الفاظ لکھوائے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

میاں محمد سلطان مرحوم بانی سرائے سلطان و لنڈا بازار۔ تاریخ وفات ۴ فروری ۱۸۷۶ء مطابق ۷ ماہ رمضان ۱۲۹۴ھ

بحکم جناب مسٹر سی۔ ایچ اٹکنسن صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور ۱۹۰۳ء

قبر کے گرد سرخ پتھر کا جنگلہ ہے جو دس گیارہ فٹ لمبا اور چھ سات فٹ چوڑا ہے۔ تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ سرہانے جس پتھر پر نام ہے وہ مرمر ہے لیکن کئی حرفوں سے سیاہی اڑ گئی ہے اور اس کی غربی و جنوبی جانب لکیر آ گئی ہے۔ جنگلہ کا پتھر بھی جنوبی سمت سے اکھڑ رہا ہے۔ سرہانے ایک لال ٹین بھی بوسیدہ اور شکستہ آویزاں ہے جو غالباً ۱۹۰۳ء ہی سے چلی آتی ہے۔

اس قبر کے بالکل مقابل جنوب کی طرف اس کے عزیز رشتہ دار میاں محمد بوٹا پہلوان رستمِ ہند کی قبر ہے جس نے ۶۰ سال کی عمر میں ۱۷ اپریل ۱۹۰۴ء مطابق ۳۰ محرم ۱۳۲۲ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔ اس کی قبر پر نواب فصیح الملک بہادر میرزا داغ دہلوی (استادِ راقم الحروف) کا قطعۂ ذیل درج ہے:

وہ دلاور اور وہ شہ زور دنیا سے گیا
جس کی شہ زوری سے تھا شیرِ نیستاں منفعل
داغ نے یہ مصرعۂ تاریخ برجستہ کہا
رستمِ ہند آہ بوٹا پہلوانِ دلپذیر (۱۳۲۲ھ)

ان قبروں سے ذرا فاصلے پر مین سڑک کے کنارے اس رستہ پر جو سیدھا روڑاں والے چھپڑ کے قبرستان کو جاتا ہے مولانا محبوب عالم اور ان کے بھائی منشی عبدالعزیز مالکان پیسہ اخبار کی قبریں ہیں۔ مولانا محبوب عالم کے حالات "اخبار نویسوں کے حالات" مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں مختصر طور پر درج ہو چکے ہیں اور اب ان کی مفصل سوانح عمری ان کے صاحبزادے منشی عبدالمجید اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور شائع کر رہے ہیں۔ مولانا مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مسٹر عبدالحمید جو برسوں انگلستان اور افریقہ میں رہ چکے ہیں اور وہاں سے واپسی پر بمبئی سے ایک نہایت کامیاب اخبار خاتون نکالتے رہے ہیں آج کل لاہور میں ہیں۔ آپ ایسٹرن ٹائمز ایک انگریزی اخبار کے مالک و اڈیٹر ہیں جو پہلے ہفتہ وار تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اس کو روزانہ کر دیا۔ مارچ ۱۹۴۲ء کے آخری اور اپریل کے ہفتہ اول میں جب مسٹر محمد علی جناح لاہور میں تھے تو انھوں نے اس اخبار کو مسلم لیگ اور پاکستان کے پراپگنڈا کے لیے ایک لاکھ روپیہ میں خرید لیا۔ مولانا مرحوم کے تیسرے فرزند مسٹر عبدالرشید تجارتی کاروبار میں مصروف ہیں۔

مولانا مرحوم ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ اصل وطن فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ ہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آپ نے پیسہ اخبار کے علاوہ اور بھی کئی اخبار اور رسالے جاری کیے۔ آپ کی لائبریری ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ قیمت کی تھی۔ آخر دم تک آپ نے مطالعہ کا شغل جاری رکھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور کئی اڈیٹران اخبارات نے آپ کے ہاں ٹریننگ حاصل کی جن میں ایک راقم الحروف بھی تھا۔

آپ بعمر ۶۷ سال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو وفات پا گئے۔ آپ کے جنازہ کے ہمراہ سر میاں محمد شفیع، سر میاں فضل حسین، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (بعد میں سر) اور کئی معززین شامل تھے۔

آپ کی قبر کا چبوترہ سنگ مرمر کا ہے۔ تعویذ پر سفید حروف میں کلام الٰہی درج ہے۔ قبر کے سرہانے جو مرمریں پتھر ہے اس پر ذیل کی عبارت تحریر ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کل نفس ذائقۃ الموت

خوابگاہ خلد آشیاں خادم اسلام حاجی مولوی محبوب عالم مرحوم مغفور

سحرگاہے بگورستاں رسیدم — دراں گردے پر از انوار دیدم
معلیٰ تربت محبوب عالم — ز ہاتف سال تاریخش شنیدم

ان کی قبر کے بالکل متصل مغربی جانب ان کے دست راست یعنی ان کے بھائی منشی عبدالعزیز مالک و مہتمم پیسہ اخبار کی قبر ہے جن کی قبر کے تعویذ کے سرہانے یہ تحریر ہے۔

میاں عبدالعزیز مرحوم سابق مالک و مہتمم پیسہ اخبار خلف الصدق میاں اللہ دین مرحوم

۸ شعبان ۱۳۳۷ھ مطابق ۹ مئی ۱۹۱۹ء بروز جمعہ بوقت سہ پہر

خدا نے جگہ ان کو جنت میں دی ۱۳۳۷ھ

لاہور کے مشہور محقق مسٹر محمد حفیظ حفظ العلوم والے آپ ہی کے فرزند ہیں۔

باغ چھوٹا لال[1]

[انگریزوں کے ابتدائے عہد میں لالہ چھوٹے لال دہلی کے ایک نامی رئیس لاہور میں رہتے تھے انھوں نے نہایت شوق، محنت اور صرف زرِ کثیر سے ایک نہایت خوب صورت باغ لاہور میں اس سڑک پر تعمیر کرایا جو گورنمنٹ ہاؤس سے میاں میر کی طرف جاتی ہے۔ یہ باغ گورنمنٹ ہاؤس کے متصل ہی تھا اور رقبہ میں گو بہت بڑے باغوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا مگر خوب صورتی اور دلآویزی میں اس کی شہرت کسی اور باغ سے اپنے زمانے میں کم نہ تھی۔

اس کے دروازے کے قریب ایک خوب صورت نشست گاہ تھی جس کی دیواروں میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔ باغ کے مغرب کی جانب ایک بارہ دری تعمیر کی گئی جس کی چھت خوب صورت بیش قیمت پتھر کے ستونوں سے آراستہ تھی، بارہ دری کے جنوب میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ باغ کے جنوبی حصے میں ایک اور بارہ دری تھی جس کے اندر کی دیواروں میں قدِ آدم تصویریں عجب لطف دیتی تھیں۔

پھولوں کے پودے اس باغ میں بکثرت تھے اور سیر و تفریح کے لیے یہ چھوٹا سا باغ نہایت پر فضا معلوم ہوتا تھا۔ دروازے پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ہوا تھا:۔

" چھوٹا لال کا باغ "

راوی کا پل بن جانے کی وجہ سے صبح کی سیر کے وقت لوگوں کا رخ عموماً دریا کی طرف ہو گیا، سیر کے شوقین شہر کے گرد و جو چاروں طرف باغات ہیں وہاں چکر لگانے لگے۔ چھوٹا لال کے وارثوں نے بھی باغ کی طرف وہ توجہ نہ کی جو بانی خود رکھا کرتا تھا۔ اس لیے اگلی پود کو اس باغ کے وجود کا بھی علم نہ رہا ——— مرتب]

مولانا آزاد دہلوی

نید سے جو نظم حسن و عشق کی آزاد تھا
آج زندانِ لحد میں وہ سخنداں دیکھیے

آپ اُس باپ کے نامور فرزند تھے جس نے ہندوستان میں دہلی شہر سے سب سے پہلے اردو میں اردو اخبار کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کو شہنشاہانِ مغل کے آخری (برائے نام) تاجدار ابوظفر بہادر شاہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ آپ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۸ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ عربی کالج دہلی میں آپ نے تعلیم پائی۔

---

[1] از مرتب۔

حافظ ڈپٹی مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی۔ مولانا محمد ذکاء اللہ مؤلف تاریخ ہندوستان آپ کے ہم جماعتوں میں تھے اور اپنی قابلیت سے تینوں ہی شمس العلما کے خطاب سے نوازے گئے۔

آپ ایام غدر (۱۸۵۷ء) کے بعد ۱۸۶۵ء میں کہ عین جوانی کا عالم تھا۔ دہلی سے لاہور آ گئے۔ اس زمانہ میں سر ڈانلڈ مکلاڈ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ ان کے ایما سے آپ نے بلخ بخارا اور ایران تک کا سفر کیا۔

۱۸۶۷ء میں آپ نے لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ اس میں غزلوں کے علاوہ اخلاقی اور نیچرل نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ آپ نے اس مشاعرہ میں جو غزل سب سے پہلے پڑھی اس کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

لیکن آپ کی توجہ زیادہ تر نیچرل شاعری کی طرف رہی اور غالباً اس غزل کے سوا آپ نے مشاعرہ میں کوئی اور غزل نہیں پڑھی۔ درحقیقت اسی مشاعرہ نے پنجاب اور بعد میں تمام ہندوستان میں اخلاقی شاعری کی بنیاد رکھی۔ مولانا حالی۔ مولانا الطاف دین بیکس۔ لالہ رام چند رو ہلوی۔ الٰہی بخش رفیق۔ تلوا چند تارا سوہن حلوا فروش۔ مولانا فیض الحسن ادیب اور کئی اور اصحاب اس مشاعرہ کی روح و رواں تھے۔

آزادؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو گل و بلبل کے پھندوں سے آزاد کیا۔ اور اس میں حقیقی اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ آپ کا مجموعہ نظم طبع ہو چکا ہے اور وہ حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے۔ شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک طویل نظم میں جس طرح بیان کی ہے۔ وہ فی الحقیقت محویت اور وجد کا مرقع ہے۔ اسی نظم میں ایک شعر ہے۔

عالم تمام بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

آزادؔ۔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ گو ان کے حالات بمقابلہ اور شعرا خصوصاً حکیم مومن خاں مومنؔ انھوں نے آبِ حیات میں بہت تفصیل سے لکھے بلکہ بقول معترضین بڑھا چڑھا کر لکھے۔ لیکن شاعری میں استاد کا رنگ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ ان کی شاعری سلیس سادہ اور آسان ہے اور قصائد کے دقائق سے پاک ہے۔

مولانا شبلی کی ان سے چشمک رہتی تھی۔ مکاتیب شبلی میں ان کا خط ۳۶ اس کا مظہر ہے لکھتے ہیں "آزاد کی کتاب آج دہلی سے آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ ادھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو دری معلوم ہوتا" یہ اشارہ مولانا آزاد کی کتاب سخندانِ پارس کے متعلق ہے۔ پھر مولانا شبلی خط ۱۶۷ میں لکھتے ہیں "آزاد کا سخندانِ پارس حصہ دوم نکلا سبحان اللہ۔ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے آزاد نے نظم کا حصہ تذکرۃ الشعرا کے لیے اُٹھا رکھا ہے جو اسی قدر ضخیم ہے اور چھپ رہا ہے" یہ ان کے بیٹے (مولانا محمد ابراہیم مصنف) کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط ۴ ارمئی ۱۹۰۷ء کا لکھا ہوا ہے۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ان کے کمال انشا پردازی کے معترف تھے۔ حیات شبلی (ص ۸۰۹) میں لکھا ہے: "مولانا

محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے ان سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی جبکہ ان کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ مولانا ان کو اُردو کا سب سے بڑا انشاپرداز مانتے تھے اور فرماتے تھے کہ آزاد اُردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشاپرداز ہے "

آپ کی نثر کا بے ساختہ پن لاجواب ہے۔ نیرنگِ خیال ہو یا آبِ حیات۔ دربارِ اکبری ہو یا سخندانِ پارس جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھو۔ اُسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

اُٹھا اُٹھا کے رکھ کے سو سو بار اس کو
اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

شمس العلما مولانا شبلی، شمس العلما مولانا آزاد سے جب لاہور میں ملے ہیں تو ان کے ساتھ دو اور شمس العلما بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آزاد کا دماغ ان کو جواب دے چکا تھا۔ اس ملاقات کا مختصر سا ذکر افاداتِ مہدی (ص ۲۴۳) میں بھی ہے۔ مہدی (وفات ۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء) مرحوم لکھتے ہیں:-

" پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے "چشمک" کا گذر نہیں۔ ایک واقعہ دلچسپ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھتا ہوں:

لاہور میں پہلی دفعہ (غالباً ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے) جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ نذیر احمد (شمس العلما) ملنے کے لیے گئے حالی (شمس العلما) اور غالباً شمس العلما شبلی بھی ساتھ تھے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو طبع شدہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوتے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد۔ آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا۔ کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچّہ" کی مشقِ سخن پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے "

مہاراجہ سر رنبیر سنگھ والیئے جموں و کشمیر خود عالم تھے اور عالموں کے قدر دان تھے ان کے مدار المہام دیوان کرپا رام بھی صاحبِ تصانیف تھے۔ ایسے قدر دان مہاراجہ اور ایسے فاضل مدار المہام کی نظروں سے مولانا آزاد کب تک پوشیدہ رہ سکتے تھے چنانچہ فروری مارچ ۱۸۸۳ء کے ایام میں آپ کو جموں سے تاریخ کشمیر لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور تنخواہ پوچھی گئی آپ نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا لیکن پھر ایک خاص آدمی آیا اور اس نے دربار کی طرف سے مستقل ملازمت کی تحریک کی۔ لیکن آپ نے اُس کو

بھی صاف جواب دے دیا۔ اس پر آپ میجر سید حسن صاحب بلگرامی مرحوم (حیدرآباد دکن) کو اپنے ۸ اپریل ۱۸۸۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

"میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انہی میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب کیا لکھوں جس کا منہ کالا ہے۔"[1]

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ کشمیر کی تاریخ لکھتے۔ تو دربار اکبری کی طرح دربار شاہی اس شان سے سجاتے کہ کشمیر کی اسلامی حکومت کا نقشہ دلوں پر نقش ہو جاتا۔

آپ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں بیس پچیس سال تک عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ کے صدہا شاگرد اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے ہیں اور ان میں اچھے اچھے شاعر اور ادیب ہوئے ہیں۔

آپ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں جبکہ آپ سرکاری ملازم تھے انہی ایام میں آپ نے دربار اکبری کو مکمل کیا تھا لیکن نظر ثانی باقی تھی۔ صدمات و ضعف کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ضعف دماغ نے مجھے نکما کر دیا ہے رات کو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ مقتضائے سن سے آزاد بیچارا بڈھا ہو گیا اور صدمات زمانہ نے توڑ دیا۔ اپنے مسودے بستوں میں بند پڑے ہیں دیکھتا ہوں اور نہ سنتا ہوں کہ ہائے نظر ثانی نہیں کر سکتا۔"[2]

رفتہ رفتہ ضعف دماغ نے خلل دماغ تک نوبت پہنچا دی شہر کے باغوں اور شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے۔ لوگ جو ان کو جانتے تھے دیکھتے تھے اور پہروں نظر حسرت سے دیکھتے رہتے تھے اور آپ کا اس پر عمل تھا ؎

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
آں را کہ فکر بیش غم روزگار بیش

راقم نے بھی شہر کے بیرونی باغوں اور سڑکوں پر اکثر دفعہ آپ کی زیارت کی ہے۔ تین چار دفعہ گفتگو کا موقع بھی ملا ہے مگر وہ گفتگو ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کا مصداق ہوتی تھی۔ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو یہ عظیم القدر ہستی اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ عمر آپ کی تراسی سال کی تھی۔ آپ کے شاگرد مولانا سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے تاریخ رحلت میں لکھا۔ ؎

ہوشیاراں گفتند رفتہ اُو بہ خلد

ہر چند قریباً پندرہ بیس سال سے ان کا دماغ اور قلم دونوں معطل تھے لیکن ان کا وجود محسن اردو اور اپنی طرز تحریر کا موجد ہونے کے لحاظ سے بساغنیمت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی وفات کا سارے ہندوستان میں جہاں جہاں اردو جاننے اور سمجھنے والے تھے ماتم منایا گیا۔ تعزیتی جلسے ہوئے۔ اخبارات نے مضامین لکھے۔ مولانا شبلی کو خبر ہوئی تو اسی وقت مدرسہ بند کرا دیا۔ اور تعزیت کا ایک جلسہ

---

[1] از مکتوبات آزاد۔ ص ۶۲ ۔ [2] مکتوبات آزاد۔ خط بنام ناصر نذیر فراق دہلوی۔

کرایا جس میں سب سے پہلے خود انھوں نے تقریر کی۔ اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرے سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدتِ غم کا اثر محسوس ہوتا تھا (حیاتِ شبلی ص ۴۰۹)

[مولانا آزاد کی قبر امام باڑہ گامے شاہ لاہور میں ہے جہاں مجلسِ یادگارِ آزاد ہر سال یومِ آزاد کے موقع پر پھول چڑھاتی اور فاتحہ خوانی کرتی ہے ——— مرتب]

رام باغ عرف نیا شالا باغ

انیسویں صدی کے اواخر میں رائے پنڈت جبار دھن لاہور کے بہت بڑے رئیس گزرے ہیں۔ موری دروازہ کے باہر ہر سال موسم سرما میں غریبوں اور محتاجوں کو کمبل اور لحاف تقسیم کیا کرتے تھے اور عموماً سفید پوش غربا بھی ان کی ضیافتوں سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔

اولادِ نرینہ سے محروم تھے لیکن نقا کے نام کے لیے ذوق کا یہ شعر ان کو یاد تھا ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

چنانچہ ۱۸۹۰ء میں انھوں نے نواں کوٹ سے مغرب کی طرف لاہور سے چار میل کے فاصلہ پر پانچ سو کنال کے رقبہ میں ایک وسیع و عالیشان باغ کی بنیادیں کھدوانی شروع کیں۔

آج ۱۹۴۴ء میں یورپ کی جنگِ عظیم کی وجہ سے اور ملکوں کے علاوہ ہندوستان میں ہر چیز گراں بلکہ گراں تر ہو رہی ہے اسی سلسلہ میں مزدور کی یومیہ اجرت دو روپیہ اور راج معمار کی یومیہ اجرت تین سے چار روپے کے درمیان ہے۔ لیکن ۱۸۹۰ء میں ایک مزدور کی اجرت اڑھائی آنہ یومیہ اور راج معمار کی اجرت آٹھ آنہ سے زیادہ نہ تھی۔[1] پنڈت جبار دھن اپنی طبعی فیاضی کی بدولت ہر مزدور کو نہ صرف دو پیسہ یومیہ زیادہ دیا کرتے تھے بلکہ اُن کے حکم سے ان کے مزدوروں کو غلہ گندم بھی بازار کے نرخ سے سیر دو سیر فی روپیہ زیادہ ملا کرتا تھا۔ اُن کے برادر زادہ پنڈت ہری کشن نے جو دو سال سے باغ کے انچارج ہیں راقم الحروف کو بتایا ہے کہ "اس باغ پر اُن کاغذات کے مطابق جو ہمارے پاس محفوظ ہیں بیس لاکھ روپیہ لاگت آچکی ہے"

۱۸۹۵ء تک باغ میں اس قدر رونق ہو گئی تھی کہ شہر اور گرد و نواح کے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ پنڈت جبار دھن اُس زمانہ میں زندہ تھے۔ وہ خود باغ میں موجود رہتے تھے اور لوگوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوتے تھے راقم السطور نے سب سے پہلے ۱۸۹۵ء ہی میں اس باغ کی سیر کی ہے اور اسی سال بانیٔ باغ پنڈت جبار دھن سے ملاقات بھی کی ہے۔

۱۹۰۶ء میں اس چمنستان کے بانی کی بہارِ عمر کو صرصرِ موت نے ختم کر دیا۔ اس کی سمادھ بھی اسی باغ میں جہاں اس

---

[1] ۱۸۹۰ء میں اُس کے قریب بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک گندم ایک روپیہ کی بیس چوبیس سیر آتی تھی اور گھی ایک روپے کا ڈیڑھ دو سیر، دودھ ۲۰ سیر اور گوشت چار پانچ آنہ سیر ہوتا تھا لیکن آج ۱۹۴۴ء و ۱۹۴۵ء میں گندم فی من دس روپے بکتی فی روپیہ ۳-۴ چھٹانک گوشت سوا روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ سیر اور دودھ آٹھ آنہ سیر ملتا ہے اور اب تو اشیا کی قیمتیں اور بھی گراں ہو گئی ہیں ——— مرتب)

کے پرائیویٹ مکانات تھے۔ موجود ہے۔

اب اس وسیع وعریض باغ کے مالک آنجہانی کے بھائی پنڈت رکھو کیش ہیں اور مہتمم باغ پنڈت ہری کشن ہیں جو آنجہانی کے برادر زادہ ہیں۔ پنڈت ہری کشن اپنے بزرگ خاندان کی اس دائمی یادگار کو ترقی و رونق دینے میں ساعی رہتے ہیں اور دور دور سے بوٹے اور درخت منگواتے رہتے ہیں اور خود باغ میں موجود رہتے ہیں۔

بانیٔ باغ نے باغ کا نام "رام باغ" رکھا۔ سنگِ مرمر کی ایک تختی پر انگریزی حروف میں بانیٔ باغ کے نام کے ساتھ یہی نام تحریر ہے مگر عوام میں اس نام نے کوئی شہرت حاصل نہ کی۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی ہی میں بلکہ ۱۸۹۵ء ہی میں جبکہ باغ کی افتتاحی رسم عمل میں آئی تھی اس باغ کا نام نیا شالامار باغ مشہور ہو چکا تھا اور ہزارہا آدمی جو اس باغ کی سیر کے لیے جایا کرتے تھے اسے نیا شالامار باغ ہی کہتے تھے۔ اس باغ کا دوسرا نام باغ پنڈت جنارد من بھی ہے مگر نیا شالا باغ کی شہرت کے مقابلہ میں اس نام کو بھی فروغ نہ ہو سکا۔

نیا شالا باغ مشہور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شالامار باغ کے سوا لاہور کے تمام دیگر باغات سے جو موجود ہیں یا آباد ہیں اس باغ کی زمین بہت زیادہ ہے۔ پھر اس میں جگہ جگہ فوارے۔ حوض۔ تالاب اور آبشاریں ہیں اور کئی مکانات آباد ہیں اور یہ طرز تکلف چونکہ شالامار باغ کے سوا لاہور کے اور کسی باغ میں نہیں ہے اس لیے عوام نے اس کو نیا شالامار باغ کہنا شروع کر دیا۔

اُس طویل سرزمین کا رقبہ جہاں باغ۔ سڑکیں۔ فوارے۔ روشیں۔ تالاب۔ مکانات۔ چبوترے سبھی کچھ شامل ہیں پانچ سو کنال بتایا جاتا ہے۔ باغ کے جنوبی و غربی بیرونی گوشہ میں سوا دو سو کنال زمین ابھی خالی پڑی ہے یہاں صرف زراعت ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو پنڈت ہری کشن مہتمم باغ ہذا نے بتایا کہ یہ تمام زمین عنقریب باغ کے ساتھ ہی شامل کر لی جائے گی۔ اور یہاں ثمر دار درخت لگائے جائیں گے۔ اور فی الواقعہ اگر یہ زمین باغ کے ساتھ شامل کر دی گئی تو کچھ شک نہیں کہ اس کی وسعت اصلی شالامار باغ سے بھی بڑھ جائے گی۔ گو شاہجہانی باغ کے ڈیزائن اُس کے طبقات۔ اُس کی عمارات کی عمدگی و پختگی۔ بڑے تالاب کی رونق۔ اُس کے فواروں کی لہر بہر۔ آبشاروں کے لطف۔ ساون بھادوں کی موج بہار۔ تخت سنگ مرمر وغیرہ کے مقابلہ میں اس باغ کی ہمسری کی اس کے آگے کچھ حقیقت نہیں۔

اس قدر عظیم رقبہ کے لیے حقیقتاً ایک نہر کی ضرورت تھی مگر معلوم ہوتا ہے نہر کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اور بظاہر اس کا انتظام مشکل بھی تھا۔ کیونکہ دریائے راوی اس باغ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے ایک میل موضع باجوساجرا اور ایک میل اس سے آگے دریا ہے۔ دو میل سے نہر کاٹ کر لانا اور زمینداروں سے دو میل تک نہر کے لیے زمین حاصل کرنا اور پھر حکومت کی اجازت یہ سب باتیں ٹیڑھی کھیر نظر آتی تھیں۔

آب پاشی کے لیے باغ کے اندر نو چاہات کا انتظام کیا گیا۔ یہ کنوئیں عموماً چلتے رہتے ہیں۔ چند کنوئیں باغ کی چار دیواری سے باہر بھی ہیں۔ باغ کے بڑے حصہ میں جو عوام کی سیر و تفریح کے لیے وقف ہے ایک آسمانی کنواں ہے جس کے ذریعہ فواروں میں پانی جاتا ہے اب موجودہ مہتمم باغ پنڈت ہری کشن چاہ کلاں کے سرے پر جس کی گہرائی سطح آب سے بھی بیس فٹ نیچے ہے چالیس گھوڑوں کی طاقت کا ایک انجن لگا رہے ہیں۔

باغ دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ پرائیویٹ باغ کہلاتا ہے۔ جہاں رائے پنڈت جنار دھن خود رہتے تھے دوسرا عوام کے لیے ہے جو پرائیویٹ باغ سے رقبہ و وسعت اور عمارات و اشجار میں بہت بڑا ہے دونوں باغوں کو ایک سڑک جدا کرتی ہے جو باغ ہی کی زمین سے ہو کر موضع سانده کی طرف چلی جاتی ہے پرائیویٹ باغ بائیں جانب ہے اور وقف عام باغ دائیں جانب ہے دونوں باغوں کی چار دیواری کہیں پختہ قد آدم ہے کہیں بنیاد پختہ بنا کر ان پر لکڑیاں لگا دی گئی ہیں دونوں باغوں میں جانے کے لیے یوں تو کئی ایک رستے ہیں مگر اصل رستے دو ہی ہیں جن کے بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔

بڑے باغ یا وقف عام باغ میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ چھوٹے چھوٹے فوارے آتے ہیں جو سنگ مرمر کی مورتیوں کی شکل میں ہیں ان میں کئی ایک مورتیاں ٹوٹ گئی ہیں بعض مورتیوں پر رنگ اس قدر غالب آگیا ہے کہ سنگ مرمر نظر ہی نہیں آتا۔ اس باغ میں بہت سی سڑکیں۔ روشیں۔ نیا پان۔ گل بوٹے۔ درختان بے ثمر و ثمردار۔ حوض۔ فوارے۔ کمرے۔ بارہ دریاں۔ آسمانی کنواں۔ تخت سنگ مرمر۔ دو شیر۔ قد آدم محافظ سپاہیوں کی تصویریں۔ فواروں کے لیے پانی جمع کرنے کے تالاب۔ مختلف نشست گاہیں سیر کرنے والے کے دل کو فرحت دیتی ہیں۔

آسمانی کنویں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بارہ دری ہے جس کا فرش سفید و سیاہ سنگ مرمر کا ہے۔ اس کے نیچے ایک خوب صورت سی آبشار ہے جس پر پانی لہریں مارتا ہوا پانچ فواروں والے حوض میں جاتا ہے جس کا وسطی فوارہ دوسرے فواروں سے بڑا ہے۔

اسی باغ کے اس حصہ میں جو سڑک کے کنارے ہے دو شیروں کی تصویروں کے پاس رنگین فوارے ہیں فواروں کی شکل بھی رنگ دار ہے۔ اور جب ہولی کے دن آتے ہیں تو ان سے پانی بھی رنگدار ہی نکلتا ہے۔ اور شور دہ شہزادہ ہو کے بغیر عبیر و گلال کے پھینکے جانے کا لطف آتا ہے۔

اس باغ میں مالٹا۔ آڑو۔ آلوچہ۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ نارنگی۔ آم (سبندوری۔ تمی۔ کاٹھے۔ ہینڈڈل وغیرہ) امرود۔ انار۔ لیموں۔ میٹھا۔ کھٹا۔ گل گل کے درخت ہیں۔ ان کے علاوہ سفیدہ۔ ماجو کے درخت اور کئی قسم کے اور درخت مختلف پھولوں کی بہار دکھانے والے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ایسے گلاب کے بھی وہاں بوٹے ہیں جن کو ہرا گلاب کہتے ہیں جس کے پتے بھی ہرے ہوتے ہیں جس کی کلی بھی ہمیشہ ہری اور جس کا پھول بھی ہمیشہ ہرا رہتا ہے اور جو نہایت بھلا اور خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔

رنگین فواروں کے پاس ہی سڑک کے پاس ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ جس کے دونوں طرف قد آدم محافظ سپاہیوں کی مع ان کی بندوقوں کے تصویریں ہیں دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جس پہ سنگ مرمر ہی کا ایک تخت ہے۔ تخت کا دایاں بازو موجود ہے بایاں شکستہ صورت میں الگ پڑا ہوا ہے۔

جس طرح تخت کے دروازے کے ساتھ پانچ بڑے فوارے ہیں اسی طرح اس کے سامنے جو تالاب ہے وہاں بھی سنگ مرمر کے پانچ کلاں فوارے موجود ہیں۔ سنگ سرخ کی آٹھ سیڑھیوں کے بعد تالاب کا دروازہ آتا ہے۔ دروازے سے تالاب تک چند قدم کا جو رستہ ہے وہاں بھی سنگ سرخ ہے۔ بلکہ اس تالاب کے گرد جو چبوترہ ہے اور چبوترہ پہ چاروں طرف جو مسقف برآمدے ہیں ان کے ستون اور چھت سب سنگ سرخ کے ہیں۔ تالاب قد آدم گہرا ہے اور مستطیل ہے۔ اس کے

ٹھنی موسمِ بہار کا لطف دے رہی ہے۔ اس قسم کی نارنگیاں بیرک برابر ہوتی ہیں بعض اس سے بھی کم۔ ذائقہ ترش ہوتا ہے اس لیے کھانے کے کام کم آتی ہیں۔ بارہ ماسی درخت کا پھل اہلِ بصیرت کو پیدائش سے لے کر موت تک کی تمام منازل کی دلچسپ مگر عبرت انگیز کیفیت دکھاتا ہے۔

آبشار طلاں کے متصل باغ کے مالیوں اور دیگر ملازموں کے جن کی تعداد بیس نفر تک ہے رہنے کے لیے کوارٹر بنے ہوئے ہیں یہ کوارٹر بانیٔ باغ کے زمانہ میں خصوصاً جن دنوں یہاں صدہا مزدور اور راج کام کیا کرتے تھے ایک بارونق بازار کا کام دیتے تھے۔ یہیں سودا سلف بھی فروخت ہوتا تھا۔

دونوں باغوں میں ثمردار درختوں کی تعداد چار پانچ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ باغ کا کل سالانہ خرچ بارہ ہزار اور آمدنی آٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ اتوار کو باغ میں اچھی رونق ہو جاتی ہے۔ مہتمم صاحب نے کہا ہے کہ نئے انجن کے لگ جانے سے ہر اتوار کو فوارے جاری ہوا کریں گے اس وقت اور بھی زیادہ رونق ہو گی۔

[مگر یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا
تقسیم ملک کے وقت اس باغ کے پھلوں کا ٹھیکہ لالہ کرم چند مدیر ہفتہ وار
اخبار پارس لاہور اور ان کے بھائی کے پاس تھا۔ وہ اس کی خوب دیکھ
بھال کرتے تھے۔ ان کے لاہور سے چلے جانے کے بعد اس باغ کی جو
درگت ہوئی اور لاوارث سمجھ کر جس طرح اس کی بوٹیاں نوچی گئیں اس
کا ذکر لاحاصل ہے ——— مرتب]

شاہ نظام الدین لودیانوالہ[1]

خطۂ میانی کے قبرستان کے گنبد میں اب
ہر سیّد لودیانوالے کو نہاں دیکھئے

شاہ نظام الدین لودیانوالہ خاندان قادریہ عالیہ سے صاحبِ شریعت و طریقت گزرے ہیں۔ لاہور کا محلہ پیر گیلانیاں انہی کے نام پر مشہور ہے جہاں ان کی حویلی اب تک موجود ہے۔

اس خاندان میں کئی پشتوں سے فیضِ طریقت جاری تھا۔[2] چنانچہ ایوب صابر[3] ابن علف سیّد مبارک حقانی گیلانیؒ تک ان کا سلسلہ اس طرح ملتا ہے :-

---

[1] ان کے حالات مرتب نے لکھے ہیں۔
[2] حدیقۃ الاولیاء صفحہ ۱۵۱-۱۵۲۔
[3] ان کا مزار قبرستان میانی (لاہور) میں ہے۔

• سید نظام الدین بودبا نوالہ بن سید احمد شاہ بن سید قائم شاہ
بن سید جانی شاہ بن سید احمد شاہ بن سید رسول شاہ بن سید المشہور
بالو شاہ بن سید عبدالواحد بن سید نظام الدین حسن بن سید ابو صابر
میر میراں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین "

گورستان میانی صاحب کی جنازگاہ سے چند قدم آگے مائیں ہاتھ ایک بہت بڑا احاطہ ہے جس میں پختہ چار دیواری کے اندر اس خاندان کے بہت سے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ پیر نظام الدین بودبا نوالہ کے روضہ کا عالی شان گنبد بھی اسی چار دیواری میں ہے۔ ان کا انتقال ۹۱ برس کی عمر پاکر ۲۲ رجب بروز جمعہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء کو ہوا۔ مگر روضہ کی عمارت پیر سید صغر علی شاہ سجادہ نشین نے ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) میں تعمیر کرائی۔ گنبد کا کلس سنہری اور دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ باقی تین طرف جالی دار محرابیں ہیں۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد گنبد کے نیچے ایک نفیس چونہ گچ چبوترہ پر دو قبریں ہیں۔ جن میں سے ایک پیر بودبا نوالہ کی اور دوسری پیر جان امام کی ہے۔ پیر نظام الدین کی قبر کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے ؎

مرقد پر نور حضرت پیر گیلانی ولی — شاہ نظام الدین سید بودبا نوالہ سخی
کرد ازیں دنیا بعمر نود و یک سالش سفر — روز جمعہ بست و دو ماہ رجب وقت سحر
بہر سال ہجری آں ماہ جبین مومنیں — گفت شائق ماہ جبیں شد رونق خلد بریں
۱۳۱۱ھ

شد بنا ایں روضہ در عہد جناب محترم
پیر سید حضرت اصغر علی شاہ ذی کرم
در ۱۳۴۶ھ

گنبد کے اندر دوسری قبر شاہ نظام الدین کے فرزند پیر جانی شاہ کی ہے۔ وہ ۱۳۴۲ھ میں فوت ہوئے۔ پیر اصغر علی شاہ جنھوں نے روضہ کی عمارت بنوائی انہی کے خواہر زادے تھے۔ ان کے مرقد کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے ؎

مرقد پُر نور حضرت سید عالی مقام — ہادیٔ حق پیر سید بادشاہ جان امام
معروف حضرت پیر جانی شاہ گیلانی ولی — ابن حضرت پیر سید شاہ نظام الدین ولی
در سن ہفتاد و نہ عمرش نمود از ما سفر — روز شنبہ ہفدہم ذی قعدہ وقبل از سحر
۷۹

جست شائق سال فوت آں امام متقی
قدسیاں خلد گفتند ادخلوہا خالدین
۱۳۴۲ھ

روضہ کی دیواروں پر اسمائے الٰہی اور کلمہ طیبہ لکھے ہیں۔ فرش خوب صورت سیاہ و سفید ٹائیلوں کا ہے۔ لوہے کی ایک پیٹی نذر نیاز کے لیے رکھی ہے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام بھی ہے۔ ایک مجاور دن رات وہاں موجود رہتا ہے۔ گنبد کے باہر ایک اور چبوترہ ہے جس پر ان کے خاندان کے دوسرے افراد کی قبریں ہیں۔ مسجد بھی ہے اور کنواں بھی۔ پہلے یہاں ہر سال عرس کے موقعہ پر بڑا بھاری میلہ لگتا تھا جس میں قوالی بھی ہوتی تھی اور پتنگ بازی بھی۔ طوائفیں بھی سلام اور مجرا کو آتی تھیں مگر پیر اصغر علی شاہ

کی وفات کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہے ۔ اب پاک پتن سے ہی بیاں سال کے سال حویلی پیر گیلا نیاں میں آتی ہیں اور عرس کر کے چلی جاتی ہیں ۔

پیر عبد الغفار شاہ

عمر جن کی کٹ گئی عشق رسول اللہ میں
اُن کی قبروں پر فرشتے فاتحہ خواں دیکھئے

کشمیر میں شیخ مسعود نروری اپنے علم و عمل اور زہد و اتقا کی وجہ سے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے اسلاف بغداد سے ملتان اور ملتان سے لاہور آئے ۔ شیخ مسعود اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جو لاہور سے کشمیر تشریف لے گئے اور سری نگر کے محلہ نرورہ میں رہنے کی وجہ سے نروری کہلائے ۔ شیخ الحدیث علامہ وپیر مولانا محمد انور شاہ کاشمیری دیو بندی جو شیخ مسعود ہی کی ذریات سے ہیں مکتوبات الخطبہ میں اپنے بزرگوں کے وارد ہند ہونے کا الفاظ ذیل میں ذکر کرتے ہیں: "وفی المکتوبات الخطبۃ عند خلف الشیخ ان سلفہ جاء ومن بغداد الی الہند ودخلوا ملتان ثم ارتحلوا الی بلدۃ لاھور ثم الی الکشمیر واللہ اعلم "

یہ خاندان پشت ہا پشت سے اہل علم و اہل اللہ چلا آتا ہے ۔ اس خاندان کی شاخیں کشمیر، مظفر آباد، دیو بند، پونچھ اور لاہور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔

شیخ مسعود کی ذریات سے جو شاخ لاہور میں ہے اس کے بزرگ پیر مصطفیٰ شاہ تھے جن کا سلسلہ شیخ مسعود تک آٹھ[1] پشتوں کے بعد ملتا ہے ۔ آپ بڑے سیلانی طبع تھے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں کے علاوہ بغداد تک پہنچے اور جب واپس آئے تو بار علاقہ ملتان کے جنگل میں قیام فرمایا ۔ اور وہیں یادِ حق میں مصروف رہتے ۔ لوگ اس بیابان میں آپ کے پاس آتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے ۔ یہ آپ ہی کے بابرکت قدوم کا نتیجہ تھا ۔ کہ حکومت نے یہاں نہر جاری کی اور جہاں ویرانہ تھا وہاں ایک گاؤں بنام چک نمبر ۵/۱۵ آباد ہو گیا ۔ آبادی کے آٹھ نو سال کے بعد آپ انتقال فرما گئے ۔ اس علاقہ کے لوگ آپ کو قطب زماں اور صاحب کرامات تصور کرتے ہیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے ۔ اور اس مزار کی سجادہ نشینی پیر محمد اشرف بن پیر عبد الغفار شاہ بن احمد پیر بن پیر مصطفےٰ شاہ کے سپرد ہے ۔

پیر مصطفےٰ شاہ خود تو پنجاب میں تھے لیکن ان کے فرزند احمد پیر یا پیر احمد شاہ کشمیر ہی میں تھے۔ آخر ان کو بھی پنجاب کی کشش کشمیر سے لاہور لے آئی ۔ اُن ایام میں ان کے فرزند پیر عبد الغفار کی عمر گیارہ سال تھی ۔ لاہور ہی میں پیر عبد الغفار نے علوم دین

---

[1] ۔ مصطفےٰ[1] شاہ بن نور[2] شاہ بن فاضل[3] شاہ بن عبد الوہاب[4] بن عبد القادر[5] شاہ بن طاہر[6] شاہ بن یعقوب[7] شاہ بن شیخ عبد اللہ[8] بن شیخ مسعود[9] ۔ عبد القادر شاہ کا مزار ترگہ پدہ علاقہ عمل تحصیل ہندواڑہ میں ہے ۔ یہ شاخ ترگہوری بھی کہلاتی ہے ۔

حاصل کیے۔ یہیں آپ کا نکاح ایک سادات خاندان میں ہوا۔ لیکن دو ہی سال کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا پھر آخر دم تک اپنی زندگی بصورت تجرد گزار دی۔ صرف ایک فرزند پیر محمد اشرف آپ کی یادگار ہیں۔

۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں آپ نے ایک دینی مدرسہ مسجد تکیہ سادھواں میں بنام مدرسہ غوثیہ قائم کیا جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور صرف و نحو وغیرہ عربی علوم کی تعلیم کے لیے آپ نے باعمل عالموں سے مدد لی اور مثنوی مولانا روم کا درس اپنے ذمے رکھا۔ آپ کی درسگاہ سے طلباء کو کتابیں مفت ملتی تھیں اور ان کی رہائش وغیرہ کا انتظام بھی آپ ہی کے ذمہ تھا۔ درود شریف کے عاشق تھے مختلف قسم کے درود شریف ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر مفت تقسیم کرتے تھے۔

پیر عبدالغفار بڑے متوکل اور بابرکت بزرگ تھے۔ اپنی تمام زندگی میں نہ کسی کے پاس گئے اور نہ کبھی دستِ سوال کسی کے آگے دراز کیا۔ اس کے باوجود آپ کا دسترخوان دوست دشمن فقیر، امیر، مسافر مقیم کے لیے یکساں کشادہ تھا۔ بالخصوص خطہ کشمیر کے نوواردوں کے لیے آپ کا مسکن ان کی فرودگاہ تھا۔ آپ دینی کاموں، صوفیانہ رسالوں اور اسلامی اخباروں کی زرِ نقد سے بھی امداد دیا کرتے تھے۔ آپ خود پیر تھے عالم تھے لیکن آپ نے کبھی کسی کو مرید نہیں بنایا البتہ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد لاہور، امرتسر، جموں، پونچھ، کشمیر کے علاوہ افغانستان اور دور دور تک تھی۔ آپ کبھی لاہور سے باہر نہیں گئے نہ کبھی مریدوں کی گرداوری کی۔

آپ زمانہ ساز اور بدنام پیروں اور عالموں کی اصلاح کے بہت بڑے متمنی تھے خصوصاً کشمیر کے نام نہاد اور بعض دغاباز پیروں اور واعظوں کے افسوسناک حالات آپ سنتے تو آپ کو بہت صدمہ ہوتا۔

آپ صرف سادہ کشمیری ٹوپی اور پیرہن تہمد زیب تن فرماتے۔ اکثر طریق عمل یہ تھا کہ جب جی چاہا۔ علی الصبح چند مخلصین کو ہمراہ لے کر حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رح یا حضرت میاں میر رح۔ یا حضرت ایشان رح یا شاہ حسین زنجانی رح کے مزارات پر چلے جاتے۔ ہمراہ کلام اللہ اور دلائل الخیرات وغیرہ وظائف کا صندوقچہ۔ خوشبو اگر کی بتیاں۔ اور سامانِ چاء ساتھ ہوتا اور تین گھنٹہ تک دلجمعی و یکسوئی کے ساتھ ختم پڑھتے اور ارواح بزرگان سے استفادہ کرتے۔

آپ نے کبھی گرفتارانِ مراسم اور شیدائیانِ نمائش کی طرح جبہ و قلہ اور تسبیح اور سبز و سرخ لباس سے اپنے آپ کو آراستہ نہیں کیا۔ زندگی ہمیشہ صحیح معنوں میں درویشانہ بسر کی۔ جو کچھ ہاتھ آتا۔ کسی مستحق کو دے دیتے یا درویشوں اور طلبہ کو کھلا دیتے۔ اپنے لیے نہ کوئی مکان بنوایا نہ کوئی سامان و اسباب دنیوی بہم پہنچایا۔ ساری عمر مسجد کے بالائی حجرہ میں گذار دی۔ وفات ۱۷ رجمادی الثانی چہارشنبہ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۱۱ء کے وقت آپ کی جیب سے صرف چار روپے چند آنے نکلے۔ جو لنگر خانہ کے خرچ کے لیے موجود تھے۔ آپ کی عمر ۶۳-۶۴ سال کے قریب تھی۔

آپ کے وصال کا واقعہ حیرت ناک ہے۔ آپ نماز عشاء کے لیے اپنی مسجد ہی میں وضو کر رہے تھے اور بایاں پاؤں دھونا باقی تھا کہ یکایک آپ کو اختلاجِ قلب کا دورہ ہوا۔ ڈاکٹر محمد الدین ناظر کا مکان پاس ہی تھا اُن کو اطلاع ہوئی وہ آئے اور دوا لیتے آئے لیکن آپ نے ہزار کوشش کے باوجود بھی دوا نہ پی اور پونے دو گھنٹہ کے اندر ہی واصل بحق ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد الدین ناظر نے تاریخ وفات میں ذیل کا قطعہ لکھا

بشنو حال وصال عبداللہ　　پیر عبدالغفار عالی جاہ

در وضو نماز وقت عشا ——— ناگہاں داد جان بحکم الہ
بہر سال او دعا از ناظر ——— گفت سرمست جام عشق الہ

نماز جنازہ درگاہ حضرت شاہ محمد غوث کے غربی باغ میں پڑھی گئی۔ حاضرین کی تعداد کا اندازہ بیس پچیس ہزار سے کم نہ تھا۔ جن میں مسلمانوں کے جملہ فرقوں کے لوگ شامل تھے۔

[آپ پہلے پہل مسجد سادھواں ہی کے ایک گوشہ میں بطور امانت دفن کئے گئے۔ بعد ہی جب آپ کا شاندار روضہ گل بیگم کے باغ کے متصل تعمیر ہو گیا تو نعش کا صندوق وہاں منتقل کر دیا گیا۔ آپ کے فرزند پیر اشرف شاہ کا مکان بھی روضے کے قریب ہی ہے اس لیے روضے کی دیکھ بھال ہر وقت ہوتی رہتی ہے — مرتب]

شمس العلما مولینا حائری[1]

بات جن کی تھی نبات اور وعظ۔ وعظ دلنشیں
آج ان کو زینت شہر خموشاں دیکھئے

[آپ کا اصل وطن شہر قُم مملکت ایران تھا۔ سلسلۂ نسب امام علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے رضوی کہلاتے ہیں۔ آپ کے جدِ امجد سید حسین القمی ایران سے وارد کشمیر ہوئے اور پشمینہ کا کاروبار کرنے لگے۔ آپ کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں آباد ہے۔

سید حسین کی چوتھی پشت میں پھر آقا سید حسین ہوئے جو نہایت ہوشیار تاجر تھے۔ وہ پنجاب اور ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور نواب واجد علی شاہ کی قدردانیوں سے مستفید ہوئے۔

۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء میں فرخ آباد کے مقام پر علامہ سید علی حائری کے والد ابوالقاسم سید محمد پیدا ہوئے جنھوں نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم حاصل کیا۔ اور فقہ، اصول، عقائد اور علم تفسیر و حدیث وغیرہ میں وہ نام پیدا کیا کہ شاہ اودھ کے دربار سے مجتہدِ اعلیٰ، سلطان العلماء اور فاضل ابوالقاسم وغیرہ خطابات حاصل کئے۔

نواب علی رضا خاں قزلباش کے زمانے میں مولانا سید ابوالقاسم اپنے والدین کے ہمراہ لاہور پہنچے۔ یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ آپ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر نواب نوازش علی خاں اور نواب ناصر علی خاں قزلباش حج بیت اللہ اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جاتے ہوئے ارکان و مناسک حج کی تعلیم کی غرض سے آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ عراق میں آپ نے مفتی شیخ مرتضیٰ انصاری سے بعض علمی مباحث کئے جن کی وجہ سے آپ فاضل ہندی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ مجتہدینِ ایران میں سے اکثر نے آپ کو اجتہاد کی سندیں عطا فرمائیں۔

---

[1] آپ کے حالات مرتب نے لکھے ہیں۔

حج و زیارت سے واپس آنے پر نوابوں نے آپ کو کشمیر کی بجائے لاہور رہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ آپ نے یہاں مقیم ہو کر مذہب شیعہ کی تعلیم کے لیے مدرسۂ امامیہ جاری کیا جس کے تمام مصارف نواب نوازش علی خاں نے اپنے ذمے لیے۔

۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں مولانا ابوالقاسم نے کوچہ شیعاں میں امامیہ جامع مسجد تعمیر کرائی جس میں نماز جمعہ، عیدین اور نماز خمسہ پڑھنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مولانا اپنے وعظوں میں احکام شرعیہ اور حقائق قرآن مجید کمال تہذیب اور بے تعصبی سے بیان فرمایا کرتے تھے۔

عمر کی چھہتر منزلیں طے کی تھیں اور تفسیر لوامع التنزیل کی بارہ جلدیں تکمیل تک پہنچی تھیں کہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء کو انتقال فرما گئے۔ اور حسب وصیت امام باڑہ گامے شاہ لاہور میں دفن کئے گئے۔

علامہ سید علی حائری آپ ہی کے فرزند اکبر اور جانشین تھے جو ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ منطق، اصول فقہ اور علم تفسیر و حدیث اپنے والد ماجد سے پڑھے۔ پھر بغرض تکمیل علوم عتبات عالیات (عراق و عرب) کو روانہ ہوئے سامرہ میں عرصہ تک سرکار مرزا محمد حسن شیرازی اور مرزا حبیب اللہ رشتی نجفی کے درس میں شریک رہے اور ان دونوں بزرگوں کے علاوہ آقا سید کاظم طباطبائی۔ آقا مازندرانی، ملا محمد کاظم خراسانی اور سید ابوالقاسم طباطبائی نے آپ کو اجازے مرحمت فرمائے۔

پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں آپ کے مقلد بہت زیادہ تھے۔ باقی ہندوستان میں بھی آپ کے مقلدوں کی کمی نہ تھی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقعہ پر آپ پنجاب کے شیعوں کی طرف سے دربارِ دہلی میں مدعو کیے گئے۔

۱۹۱۴ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو آپ اس کے صدر قرار پائے۔ آپ کے صدارتی خطبہ نے کانفرنس کی کایا پلٹ دی۔ شیعہ کالج لکھنؤ کے قیام کے سلسلے میں بھی آپ متعلقہ اجلاس کے روح و رواں تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی خاطر جب سر آغا خاں چندہ جمع کرنے کی غرض سے وفد لے کر لاہور آئے تو علامہ حائری کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انھوں نے ایک بہت بڑی رقم حضرت علامہ کی خدمت میں بطور نذر پیش کی۔ مولانا نے بخوشی وہ تمام رقم اپنی طرف سے چندہ میں عطا فرما دی۔

مولانا نہایت وجیہہ، بے حد جامہ زیب اور بہت ہی خوش گلو تھے۔ جب خطبہ پڑھتے تھے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کی تقریر قرآن و حدیث کے تحت نہایت مدلل ہوا کرتی تھی۔ جس میں جملہ مذاہب کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں بھی آپ کے وعظ کافی رونق کا باعث ہوتے تھے۔ آپ کی ہر دلعزیزی دیکھ کر انگریزی حکومت نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔

مولانا اردو، فارسی، عربی کی ۲۷ کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کے والد مرحوم فارسی زبان میں قرآن مجید کی جو تفسیر "لوامع التنزیل و سواطع التاویل" تیس جلدوں میں لکھنے کی داغ بیل ڈال گئے تھے، مولانا نے اس میں پندرہ جلدوں کا اضافہ کیا ستائیسویں پارہ کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ بلاوا آ گیا اور آپ ۲۸ جون ۱۹۴۱ء کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کا جنازہ

علم ہائے ماتمی کے ساتھ اُٹھایا گیا۔ مدارس ہائے اسلامیہ و کالج بند کر دیئے گئے اور آپ کو کربلائے گامے شاہ بیرون بھاٹی دروازہ میں دفن کیا گیا۔

آپ پہلے اندرونِ شہر چوک نواب صاحب متصل مسجد نواب صاحب قزلباش رہا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے شہر سے باہر وسن پورہ میں اپنا مکان تعمیر کرا لیا اور وہیں ایک وسیع مسجد بھی بنوائی جسے جامعۂ حائری کہتے ہیں۔ اس میں جمعہ اور جماعت کی نماز باقاعدہ ہوتی ہے۔

علامہ مرحوم اپنے پیچھے ایک بہت بڑا دینی کتب خانہ چھوڑ گئے ہیں جس میں عربی، فارسی، اُردو کی سینکڑوں مطبوعہ اور نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں۔ آپ کی اولاد نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے ملازمتیں اختیار کر لیں جس سے علم و عرفان کا یہ سلسلہ بظاہر آپ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ ـــــ مرتب]

علم دین شہید

پہلے کچھ ذرّے چمک اُٹھے جبینِ حشر پر
پھر صدا آئی کہ اب خاکِ شہیداں دیکھئے

غازی علم الدین شہید ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو لاہور بازار سرفروشاں[1] کے ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام طالع محمد تھا۔ ذات سے شیخ تھے اور کام نجاروں کا کیا کرتے تھے۔ علم الدین اپنے والد کا دوسرا فرزند تھا۔ فرزند اوّل کا نام محمد الدین ہے اور وہ کارخانہ میں ملازم ہے۔

علم الدین اپنے بھائی کی طرح ناخواندہ تھا لیکن قدرت نے جس بصیرت حمیت اور غیرتِ اسلامی کا سبق اس کو دیا تھا اس سے ہزاروں اور لاکھوں تعلیم یافتہ محروم تھے۔

۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ گڑھی شاہو کے مشہور عبادت گذار بزرگ مولانا تاج الدین کے انتقال اور ان کے جنازہ کی اہمیت نے اس کے دل میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس وقت اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس واقعہ سے بظاہر اس خام طبع لڑکے نے جو اثر قبول کیا اس پر ہزاروں پختہ مغزانِ عقل نثار کئے جا سکتے ہیں۔ غازی مرحوم کے چچا حاجی نور دین کا بیان ہے۔ کہ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ زندگی ہو تو ایسی ہو اور موت ہو۔ تو ایسی ہو۔ جس سے کسی کو کچھ نصیحت و عبرت حاصل ہو سکے۔ مولانا تاج الدین کے جنازہ میں ہزاروں لوگ شامل تھے اور خصوصاً کارخانہ ریلوے کے مسلمان ملازم تو اُمڈ کر چلے گئے تھے۔ اس اجتماعِ عظیم نے اس کے معصوم دل پر جو اثر لیا اس کا مفہوم شاید اس شعر سے کچھ ادا ہو سکے

خوش حیات است کسے را کہ پس از جاں دادن
دوستاں بر سرِ خاکش بہ زیارت آیند

---

[1] اس بازار کا پنجابی نام بازار سر یاں والا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ذبیحہ بکروں کے سر اور پائے فروخت ہوتے ہیں چونکہ علم دین شہید اسی محلہ کا رہنے والا تھا اس لیے مسلمانوں نے اس کی یادگار میں اس بازار کا نام اس کے نام پر بازار علم دین شہید رکھ دیا ہے۔

انہی دنوں لاہور کے ایک آریہ کتب فروش راجپال نام نے ایک سخت بدنام، شر انگیز، دشمن امن اور دل آزار کتاب رنگیلا رسول کے نام سے چھاپی تھی جس پر مسلم پریس اور مسلم پبلک اپنی تحریروں اور جلسوں تقریروں کے ذریعہ اظہارِ ناراضگی کر رہے تھے۔

علم الدین گو ناخواندہ محض تھا۔ لیکن عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگیلا رسول کے متعلق جو جلسے ہوتے تھے ان میں شامل ہوتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو گہرے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کا وقت تھا۔ جو کچھ اس نے سوچا تھا اس کے انجام سے بے خبر ہو کر وہ بے خوف و خطر راجپال کی دکان کی طرف گیا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور جاتے ہی اس کی گردن پر چھری پھیر کر باہر آ گیا۔ لیکن ابھی تھوڑی دُور آیا تھا کہ پھر واپس گیا۔ اس اثنا میں ایک شورِ عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ گرفتار ہو گیا۔

اس واقعۂ قتل پر ہندو مسلم اخبارات میں دیر تک چرچا رہا۔ خیر خواہانِ وطن اور رہنمایانِ امن نے مصنفوں اور پبلشروں کو بانیانِ مذاہب اور مقدس روحانی بزرگوں کے احترام کی ہدایت کی اور گورنمنٹ نے اس قسم کی امن شکن دل آزار اور فتنہ انگیز تحریروں کے لیے ایک خاص قانون کے ذریعہ سزائیں مقرر کیں۔

راجپال کا قصہ تو ختم ہو چکا تھا۔ اب علم الدین کو قانون اور ہندو تختہ دار پر لٹکوانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایک سال یا اس سے کچھ کم عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ بعض مسلمان وکلاء نے اپنی خدمات جمعیت اسلامی کے جوش میں مفت پیش کیں۔ لیکن یہ واقعہ دن دہاڑے ہوا تھا۔ اور علم الدین جس کی عمر اپنے مقدمہ کے آخری ایام میں اکیس سال سے زیادہ نہ تھی موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ آخر اس کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ اور اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ لاہور میں فساد ہو جائے گا حکام اس کو میانوالی میں لے گئے۔

اس واقعہ سے چونکہ سارا ہندوستان بالخصوص پنجاب متاثر ہو رہا تھا اس لیے علم الدین کے میانوالی جیل میں آتے ہی مسلمانوں کے جگہ جگہ جلسے ہونے لگے۔ اس کے والدین اور دوسرے رشتہ دار بھی میانوالی آ گئے۔ مسلمانانِ میانوالی نے نہایت فراخدلی سے اپنے پریشان خیال میزبانوں کی خاطر تواضع کی۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ علم الدین شہید کی آخری ملاقات کے لیے اس کے ورثا جیل میں بلائے گئے۔ علم الدین کے چچا حاجی نور الدین کا بیان ہے کہ اس نے سب کو نماز کی تاکید کی۔ یہ خبر سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ لوگ دیہات سے ڈھول بجا بجا کر نکلتے تھے اور ٹولیوں کی ٹولیاں میانوالی میں جمع ہو رہی تھیں کہا جاتا ہے کہ شہر سے جیل تک دو میل کے فاصلہ میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ اس خبر کے سننے کے باوجود کہ آج غازی علم الدین کی شہادت کا واقعہ ہونے والا ہے مسلمانوں کے جذبات قابو میں تھے۔ پولیس کا بھی معقول انتظام تھا کسی قسم کا کوئی فساد نہ ہوا۔

میاں علم الدین کے چچا حاجی نور الدین بیان کرتے ہیں کہ جب جلاد (پھانسی) اس کے گلے میں رسہ ڈالنے کے لیے آیا۔ تو اس نے رسہ کو خود پکڑ لیا اس کو بوسہ دیا اور اپنے گلے میں خود ڈال لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حکام نے اس کی لاش جیل کے متصل ہی دفن کر دی۔ لیکن لاہور میں اس کی لاش کو لاہور لانے کے لیے ایک شورِ عظیم اٹھا۔ آخر سر میاں محمد شفیع، سر محمد اقبال اور دوسرے معززین نے امن و امان کا ذمہ لیا اور پندرہ دن کے بعد لاش کو لاہور لانے کی اجازت ملی۔ سر محمد شفیع خود میانوالی گئے اور لاش کو اپنے ہمراہ لائے۔

چوبرجی کے پاس چاند ماری کا جو وسیع میدان ہے وہاں مولوی شمس الدین بخاری نے جو حافظ اور قاری بھی تھے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جنازہ میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ آدمی شامل تھے اس شان کا جنازہ آج تک لاہور میں چشمِ فلک نے نہیں دیکھا۔ انتہا یہ ہے کہ اکثر دفتروں اور محکموں کے مسلمان کلرک، افسرانِ مجاز کی اجازت کے بغیر خود بخود شاملِ جنازہ ہو گئے تھے۔ جنازہ گاہ میں پولیس کا کوئی آدمی نہ تھا۔ لیکن سڑکوں اور شاہراہوں پر ہاڑی پولیس کافی تعداد میں موجود تھی۔

انبارِ جنازہ۔ جذبات میں اس قدر تلاطم۔ فرزندانِ اسلام میں یہ جوش و خروش۔ اتنا عظیم اژدہام۔ لیکن کسی قسم کی کوئی بدامنی نہ ہونے پائی۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ اس غیرت و حمیتِ اسلامیہ کے نوخیز پتلے کو حضرت میانی کے عظیم و عریض قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

علم الدین شہید کے مزار کی تعمیر میں عوام کی امداد کے علاوہ سب سے زیادہ حصہ حاجی مستری الٰہی بخش نے لیا جو اپنے آپ کو "خادم گیارھویں شریف" لکھا کرتے ہیں۔ یہ مزار۔ مزار پیر بودیا لوالہ سے چند قدم آگے قبرستان کی اندرونی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مزار کی شرقی دیوار میں پانچ جالیاں ہیں۔ جالی نمبر ا کے متصل یہ شعر درج ہے ؎

خواجہ بسے اجمیر میں اور غوث بسے بغداد
دونوں ساچے پیر ہو۔ رکھیو ہمری لاج

جالی نمبر ۲ کے متصل یہ مصرعہ لکھا ہوا ہے۔ ؏

سینوں میں رہے جذبہ سدا عشقِ محمد کا

جالی نمبر ۳ درمیانی جالی ہے اس کی دیوار کے اوپر "یا حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" درج ہے۔ اس جالی کے دائیں طرف یہ عبارت درج ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون۔ ؎

عشق میں جاں سے گزرتے ہیں گزرنے والے
مر کے زندہ ہیں رہِ یار پہ مرنے والے

جالی نمبر ۴ کے ساتھ یہ مصرع درج ہے۔ ؏

قیامت تک رہے آباد ساقی تیرا میخانہ

نمبر ۵ کے اوپر جلی قلم سے لکھا ہے "مزارِ منور غازی علم الدین شہید" ؎

جو عاشق ہیں نہیں ڈرتے کسی سے
کٹاتے ہیں سرِ بازار گردن

ع کوچۂ عشق ہے یہ رہگذرِ عام نہیں

جالی ۱۲، ۱۳ کے درمیان ذیل کے دو شعر قابلِ مطالعہ ہیں :-

بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے
مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ اس دروازہ کے شرقی حصہ کی دیوار میں چار جالیاں ہیں۔ پہلی جالی کے پاس یہ الفاظ درج ہیں" عاشقِ رسولؐ غازی علم الدین شہید" پھر یہ عبارت اور اشعار درج ہیں :-

آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان سے گریز کرنے والا۔ کیا حضور کے نام پر شہید ہونے والے کی عزت کا نظارہ اس کے جنازہ سے معلوم نہیں ہوا اگر دین و دنیا میں بھلائی چاہتے ہو۔ تو محبوب خدا پر جان قربان کرو۔ اور عاشقانِ مصطفٰےؐ کی چوکھٹ پکڑ لو۔ جو منکر ہے وہ کافر ہے۔

اسلام کے جھنڈے کو جب غازی اُٹھا لیں گے
تکبیر کے نعروں سے دُنیا کو ہلا دیں گے
اسلام زمانے میں دبنے کو نہیں آیا
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا وہ دبا دیں گے
مسلم کو حقیقت میں تم سمجھے ہو کیا لوگو
یہ مٹنے مٹانے بھی دُنیا کو مٹا دیں گے

ع رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جو تری محفل میں ہے

مزار کے دروازہ کی پیشانی پر یہ الفاظ درج ہیں :

یا اللہ   غازی علم الدین شہید   یا محمد

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سنگِ بنیاد دستِ مبارک الحاج حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری
متولی و سجادہ نشین میاں طالع محمد والد بزرگوار میاں علم الدین شہید

قبر کے سرہانے سنگِ مرمر کا جو پتھر ہے اس پر ذیل کی عبارت درج ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد غازی علم الدین

تاریخ پیدائش ۴ دسمبر ۱۹۰۸ء تاریخ شہادت ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء

اس کے نیچے کچھ بے ڈھنگے سے پنجابی اور کشمیری زبان کے اشعار ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل شعر صحیح نظر آتا ہے ؎

جامِ اُلفت پیجئے سر راہِ حق میں دیجئے

مال و زر اور زندگی قربان اس پر کیجئے

قبر بے سقف ہے۔ اس قبر کے علاوہ اس مزار کے گرد و پیش چار اور قبریں ہیں جن میں ایک پختہ قبر غازی شہید کے تایا مہر بخش (وفات ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء) کی ہے۔

غازی شہید کی قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ قبر سے مغربی جانب مسجد نما ایک درہ ہے جس کے درمیان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تحریر ہے شمال اور مشرق کی طرف بھی برآمدے ہیں۔ دروازہ کے ساتھ ہی شرقی جانب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے پانی کا نل احاطہ مزار کے باہر موجود ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک عیال دار مجاور کا مکان بھی ہے۔ درگاہ کے خادم کو ماہانہ ملا کرتا ہے۔

غازی علم الدین شہید کے والد میاں طالع محمد ان ایام میں مقروض ہو گئے تھے۔ لوگوں نے غازی مرحوم کی شہادت کے بعد ان کی اعانت کی۔ ان کا تمام قرضہ اتر گیا۔ اور چونکہ وہ خود ہی اپنے فرزند کی قبر کے سجادہ نشین تھے۔ اس لیے چڑھاوا اور نذر نیاز میں کافی رقوم آتی تھیں۔ میاں طالع محمد اور مرحوم شہید کی والدہ بھی اپنے فرزند کی شہادت کے کچھ عرصہ کے بعد فوت ہو چکے ہیں ان کی قبریں بھی اسی مزار کے اندر ہیں۔ باپ کیسا خوش نصیب تھا کہ خدا نے اس کو وہ فرزند دیا جس کا دل عشقِ رسولؐ اور حمیت اسلامی سے گداز تھا۔ جو اپنی عاقبت بھی سنوار گیا اور باپ کا قرضہ بھی اتار گیا۔

ہر سال شہید غازی کا عرس ہوتا ہے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے اور مرحوم کے ورثاء کی طرف سے جن کے سرکردہ اب حاجی نور الدین ہیں فقرا کو ٹھنڈا رہ تقسیم ہوتا ہے۔

حسن دین شہید

زندگی کچھ قوم نے پائی ہے جن کی موت سے

خطۂ مبانی ہیں وہ گنج شہیداں دیکھئے

تحصیل اجنالہ ضلع امرت سر کے ایک گاؤں کوٹلی سے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۸ء میں مولا بخش نام ایک شخص ترک وطن کرکے لاہور آگیا۔ لاہور میں اس نے آہن گری کا کام شروع کیا۔ اس کے فرزند کلاں کا نام محمد شفیع ہے۔ جو لاہور اندرون یکی دروازہ میں فلور مل کا مالک ہے۔ اس سے تین چار سال چھوٹا اس کا بھائی حسن الدین تھا۔ جو ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا۔ اور اپنے بھائی کے پاس آہنگری کا کام کرتا رہا۔

حسن الدین اپنی شادی کے بعد مصری شاہ میں جو لاہور کے شمالی حصہ کی ایک وسیع مسلم نو آبادی ہے اپنے سسرال کے ہاں رہا کرتا تھا۔ چونکہ اس کی شہادت کا تعلق مسجد شہید گنج لاہور کے واقعۂ ہائلہ سے ہے اس لیے اس واقعہ پر کچھ اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے۔

مسجد شہید گنج لاہور ۸ رجولائی ۱۹۳۵ء کو سکھوں نے گرا دی۔ ان کے اس فعل سے (بقول مولانا مخدوم مرید حسین قریشی سجادہ نشین حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتان) مسلمانانِ لاہور کے دلوں میں جو ہیجان عظیم پیدا ہوا اُس سے تمام صوبے کے مسلمانوں کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ مسلمان خواندہ تھے یا ناخواندہ، جاہل تھے یا عالم۔ جوان تھے یا بوڑھے۔ مسجد کے انہدام کی تفصیلات روزانہ اخباروں میں پڑھتے تھے اور بے چینی سے پوچھتے تھے کہ آخر سکھوں نے خانۂ خدا کو (جو ہر چند کہ سالہا سال سے انہی کے قبضہ میں تھا) کیوں گرایا؟ اور جبکہ ان کی طرف سے ایسا دل آزار فعل ظہور میں آچکا ہے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

ذمہ دار لوگ خاموش رہے۔ اور نوجوان اس وقتی جوش و غصہ سے بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ باہر دیہات سے اور شہر کے اکثر حصوں سے جن میں دہلی دروازہ اور ریکی دروازہ کے عوام کی کثرت تھی لوگ جوق در جوق چلے آتے تھے۔ اور مسجد شہید گنج تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے لیکن حکومت نے امن و آشتی قائم رکھنے اور لاہور کیا بلکہ سارے پنجاب کو فرقہ وارانہ جنگ سے محفوظ رکھنے کے لیے مسجد منہدمہ کے چاروں طرف پولیس اور فوج کا پہرہ قائم کر رکھا تھا۔

اسی اثنا میں دفعتہً واقعات نے ایک اور نازک صورت اختیار کر لی۔ چار مقامی لیڈر خارج البلد کر دیئے گئے جس سے حالات زیادہ پیچیدہ ہو گئے۔ اور عوام ان واقعات سے اور بھی زیادہ بھڑک اٹھے مسلمان سکھوں پر اور سکھ مسلمانوں پر اکے دُکے حملے کرنے لگے۔

حسن دین بھی جس کی عمر اس وقت چوبیس سال کی تھی اُنہی نوجوان جوشیلے لڑکوں میں شامل تھا۔ جو خانۂ خدا کی اس بے حرمتی کو مسلمانوں کی اور اسلام کی توہین سمجھ رہے تھے اور انتقام لینے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ لیکن مسجد شہید گنج کن قانونی پیچیدگیوں کی بدولت اب تک مسلمانوں کو نہ مل سکی۔ ان سے قطعی لاعلم تھے۔ نومبر کے ابتدائی ایّام کا ذکر ہے حسن دین جیسا کہ اس کے بھائی مستری محمد شفیع کا بیان ہے۔ ایک خواب سے پریشان اور بے تاب ہو کر کلہاڑی ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلا۔ اور مصری شاہ کے علاقہ میں جہاں اس کا مکان تھا اس نے دو راہگیر سکھوں پر کلہاڑی سے حملہ کر دیا۔ جن میں ایک تو زخمی ہو کر بچ گیا مگر دوسرا جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کے والدین اور گھر کے سب لوگ اس واقعہ سے قطعاً بے خبر تھے۔ آخر وہ گرفتار ہو کر سیشن سپرد ہوا جہاں ۱۹ دسمبر کو صاحب سیشن جج نے اس کی موت کا حکم صادر کیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی۔ لیکن موت کا وقت چونکہ مقرر ہو چکا تھا اس لیے سزا کا حکم بحال رہا۔ ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کو یہ نوجوان لڑکا جو مذہبی غیرت کی وجہ سے انجام سے قطعاً بے خبر تھا۔ تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اس کا والد بیٹے کے غم میں ایک ہی سال کے اندر ۱۹۳۷ء میں چل بسا۔ جب عوام میاں علم الدین شہید کی قبر پر آتے ہیں تو اس قبر پر بھی جو اس کے ساتھ ہی ہے فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔

غازی علم الدین شہید کے مزار کے بالمقابل جنوب کی طرف ایک چھوٹے سے احاطۂ مزار کے بعد غازی حسن الدین شہید

پکی قبر آتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی تین سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مزار کا پختہ چبوترہ آتا ہے جس کے بین درمیان سنگِ مرمر کے اندر خام قبر ہے اور مزار کے سرہانے شمال کی طرف ایک مرمریں تختی پر یہ الفاظ تحریر ہیں :-

یا اللہ   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط بل احیاءٌ

ولٰکن لا تشعرون۔

؎ بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مرقد مبارک

غازی حسن الدین شہید رحمۃ اللہ کہ بتاریخ ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ
مطابق ۲۹ جون سنہ ۱۹۳۶ء برتختۂ دار جامِ شہادت نوشید

؎ کشتگانِ خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

انا للہ وانا الیہ راجعون

حکیم الامت سر اقبال

کر گیا مُردوں کو زندہ جس کا پیغامِ حیات
آج وہ اقبال زیرِ خاک پنہاں دیکھئے

شیخ[1] محمد اقبال ۲۲ فروری سنہ ۱۸۷۳ء کو صوبہ پنجاب کے مردم خیز شہر سیالکوٹ میں ایک معزز کشمیری خاندان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف پشت ہا پشت سے صوفی منش اور درویش صفت بزرگ چلے آتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے اسلاف میں ایک بزرگ نے جو برہمن تھا اور ذات سے سپرُو سنہ ۹۰۰ھ یا اس کے قریب اسلام قبول کیا ان کا وطن کشمیر میں موضع چیسکو تحصیل کولگام تھا اور ان کا مزار چرارِ شریف میں مزار احاطہ شیخ نورالدین ولی میں اب تک موجود ہے۔

شیخ محمد اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا راقم کو ان سے بمقام سیالکوٹ شرفِ ملاقات کی عزت حاصل رہی ہے ان کی صوفیانہ مجلسیں آج بھی کئی لوگوں کو یاد ہیں شیخ محمد اقبال کے دادا شیخ محمد رمضان مصنف بھی تھے اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں چند ایک کتابیں بھی لکھی تھیں اور تصوف ان کو وراثت میں ملا تھا۔

شیخ محمد اقبال نے ایف اے تک سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کی اور بی اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور

---

[1] ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مفصل حالات مشاہیر کشمیر اور تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم مصنفہ راقم سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

سے پاس کیے - اپنے اسلاف کی طرح تصوف ان پر بھی غالب تھا۔ سیالکوٹ ہی میں بزمانہ طالب علمی شعر کہتے تھے - لاہور میں آکر علمی ترقیوں کے ساتھ شاعری کو اور بھی چلا ہوئی - ۱۸۹۹ء میں جبکہ راقم کی عمر بائیس سال، اور ان کی عمر چھبیس سال تھی راقم نے بہارِ گلشن نامی غزلوں کی ایک کتاب میں ان کی چند ایک غزلیں شائع کیں - اور سب سے پہلے ان کے حالات کے متعلق اسی کتاب میں چند سطور لکھیں - ایم اے پاس کرنے کے بعد اس زمانہ میں وہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر تھے -

وہ موسیقی اور قوالی کے دلدادہ تھے - اور بزرگانِ دین کے حالات سے انھیں دلچسپی تھی - چنانچہ جب ۱۹۰۲ء میں راقم نے یادِ رفتگان اپنی ایک تصنیف ان کے پاس سیالکوٹ بھیجی جہاں وہ گرما کی رخصتوں کی وجہ سے مقیم تھے تو مجھے اخیر ستمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" بعض بعض باتوں نے جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا - خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے زمانہ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ اہل اللہ کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے ، میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حُسنِ ظن کا دُور ہو جانا ہے - بھائی فوقؔ - خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش میں رہو - جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے "

اسی زمانہ کی ایک غزل میں انھوں نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے - ؎

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے سفینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ! ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۹۰۵ء میں جب وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لیے ولایت روانہ ہوئے تو دہلی میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے روضہ پر حاضر ہو کر فاتحہ کے بعد دیر تک دعا مانگتے رہے اور اس تقریب پر جو انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی شان میں نظم لکھی اس سے ان کی بے انتہا عقیدت اور صوفیائے کرام سے لازوال ارادت کا اظہار ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں : -

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری - فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
پھل ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

پھر آ کے رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو
وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

آپ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۲۵ جولائی ۱۹۰۸ء کی رات کو دہلی پہنچے۔ علی الصبح اپنے احباب کے ساتھ خانقاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں حاضر ہوئے اسی شوق و عقیدت کے ساتھ۔ جو ولایت روانہ ہونے کے وقت آپ سے ظاہر ہوئی تھی۔ حضرت کے مزار کے پہلو میں کھڑے ہو کر دیر تک دست بہ دعا رہے۔ سارا دن یہیں قیام کیا۔ قوالی کا لطف بھی اٹھایا۔ شام کو میرزا غالب کی قبر پر بھی گئے۔ میر نیرنگ اور مقبول احمد نظامی نے آمدِ اقبال پر نظمیں پڑھیں۔

صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا احترام آپ کی رگ و پے میں سما چکا تھا۔ آپؒ کا عقیدہ تھا کہ صوفیاؒ نے محض حسنِ عمل اور اخلاقِ محمدی کے ذریعہ اسلام کو وہ رونق دی ہے کہ ہندوستان کے سات آٹھ کروڑ مسلمان یقیناً انہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن ہے۔ وہ رہبانیت کے خلاف ہے وہ گھر بار اور اہل و عیال کو ترک کر کے جنگلوں اور بیابانوں کی زندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ یکسوئی حاصل کرنے کے لیے بیشک خلوت اور عزلت نشینی کی ضرورت ہے لیکن ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوتا۔

میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالےٰ نے تزکیۂ نفس میں صاحبِ کمال کیا ہے۔ وہ تیر از کمان رفتہ اور آب از جُو رفتہ واپس لا سکتے ہیں ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیرِ رفتہ باز گرداند ز راہ

اس بارہ میں ان کا اپنا شعر بھی ہے ؎

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

صاحبانِ قبور سے حاجات طلب کرنا جس طرح خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کی جاتی ہیں سخت ترین گناہ ہے۔ یہاں تک البتہ درست ہے کہ فاتحہ پڑھی جائے عبرت حاصل کی جائے اور موت کو یاد کیا جائے بلکہ میں تو اس بات کا بھی قائل ہوں کہ کسی صاحبِ دل کے مزار پر جانے سے صفائے باطنی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔[۱]

---

[۱] از رسالہ طریقت لاہور جولائی ۱۹۱۴ء

زیستی ہے نگاہِ نارساجس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں

پیر کی صحبت سے بشرطیکہ وہ پیر دکاندار نہ ہو۔ مرید اپنے اخلاق و اعمال سنوار سکتا ہے۔ لیکن پیر روشن ضمیر اور اہل اللہ ہو اور مرید اہل دل اور اہل ذوق ہو۔ اور اس کے قلب میں گرمی اور اس کی روح میں تڑپ ہو۔

شاد اقبال میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام آپ کے چند ایسے خطوط بھی ہیں جن میں آپ نے اہل اللہ بزرگوں کے متعلق اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "دیار پیر سنجر" کی ضرور زیارت کیجئے۔ میں بھی ایک روز تخیلات کی ہوا میں اڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ فضائے آسمانی سے یہ آواز آرہی تھی ـــ

فرشتوں نے کانوں سے جس کو سنا تھا
ہم آنکھوں سے وہ زیر و بم دیکھتے ہیں

۵ جنوری ۱۹۱۷ء کے خط میں ایک پنجابی پیر کے متعلق مہاراجہ کشن پرشاد کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "وہ بڑے ہشیار آدمی ہیں۔ اور پیری مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔"

۷ مارچ ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں: "آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوب نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔"

۲۰ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں: "ایک اور بزرگ لاہور کے قریب ہیں ذرا بارش ہو۔ تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب دعا ہونگا۔"

۱۶ فروری ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں: "۲۸ فروری کو دہلی جانے کا قصد ہے۔ وہاں سے ممکن ہوا تو سرکار خواجہ (اجمیر)[1] میں بھی حاضر ہونگا اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے خواجہ حسن نظامی رفیق راہ ہو گئے تو کیا عجب کہ ـــ

دل بے تاب جا پہنچے دیار پیر سنجر میں
میسر ہے جہاں درمان درد ناشکیبائی

۲۹ مارچ ۱۹ء کے خط میں دہلی جانے اور اجمیر تک نہ پہنچ سکنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دہلی گیا دو دفعہ روضہ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا مگر افسوس کہ پیر سنجر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ پھر جاؤں گا اور اس آستانے کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر واپس آؤں گا۔ دہلی میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہت اچھی قوالی سنائی۔ سرکار بہت یاد آئے۔"

ڈاکٹر اقبال نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء کے طویل خط میں جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک جگہ

---

[1] یعنی اجمیر شریف۔

لکھا ہے : "دو سال کا عرصہ ہوا میں نے تصوف کے بعض مسائل سے کسی قدر اختلاف کیا تھا اور وہ اختلاف ایک مدت سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے کوئی نئی بات نہ تھی۔"

مگر اس بحث نے بہت طول کھینچا۔ نثر و نظم میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے گئے۔ اور کہا گیا ہے

وائے بر ایں پختگانِ عقلِ خام ——— اولیا را میش و بزرگ و ند تام

از دم کم رشتگاں الحذر ——— الحذر از بد سگالاں الحذر

مخالفانہ مضامین کے جواب میں ڈاکٹر اقبال نے ایک طویل مضمون "سرِ اسرارِ خودی" کے نام سے لکھا جس میں ظاہر کیا کہ "میرا مذہب یہ ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کے فرائض کو یک جا کیا ہے۔ اور اس طرح بنی نوع انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ سکھایا ہے کہ تمہارا مقصود اعلیٰ اعلائے کلمۃ اللہ ہے وہاں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ "لا تنس نصیبک من الدنیا (دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر) دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ اسلام کی تعلیم نہیں بلکہ صحیح اسلامی تعلیم یہ ہے کہ "ترک الاسباب جہالۃ والاعتماد علیہا شرک" یعنی اسباب دنیا کا ترک کرنا جہالت ہے اور ان پر اعتماد کرنا شرک ہے۔ اسلام نے دنیا میں جس حصہ کو حاصل کرنے کی تاکید کی ہے اس کا جو طریق بتایا ہے اسی کا نام شریعت اسلامیہ کا وہ حصہ ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

عجمی تصوف (عجمی اس لیے کہ اس کے تدوین کرنے والوں میں بیشتر عجمی تھے) سے اور وحدت الوجود کے مسئلہ سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں سے قوت عمل مفقود ہو گئی ہے۔ تصوف کا تو لفظ بھی رسول اکرم صلعم کے زمانہ میں نہ تھا اس کا استعمال سب سے پہلے ۱۵۰ھ میں شروع ہوا۔ اس کے عجمی حامیوں نے آخر اس کو مسلمانوں کی بربادی کا باعث بنا دیا۔"

ڈاکٹر صاحب اپنے ایک اور مضمون "اسرارِ خودی اور تصوف" میں لکھتے ہیں :

"میں اگر صوفیا کا مخالف ہوں تو صرف اس گروہ کا جس نے محمد عربی کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے حضرات صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہ صلعم کی راہ پر قائم ہے اور سیرت صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے میں اس گروہ کا خاک پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادتِ دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک مدت تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے . . . . . میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نظام عالم میں داری و ساری نہیں بلکہ وہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسول ہے اور جو اس ذریعہ سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا کہ انھوں نے بار بار اقرار کیا ہے۔ تصوفِ اسلامیہ کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ مسئلہ وحدت الوجود کو جس نے تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا تھا۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ہر وحدت الوجودی کو زندیق سمجھتے تھے۔ اور فی الواقعہ اکثر اہلِ تصوف اسی مسئلہ کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کا اقتضا یہ ہے کہ ہستیٔ مطلق مختلف مظاہر میں مودار ہے اور اس کے علاوہ دیگر تمام ہستیاں محض تخیل اور وہم ہیں۔ اس مسئلہ نے علماء اہلِ فلسفہ کے علاوہ اہلِ دل اور اہلِ درد کے دربار میں بھی قبولیت حاصل کر لی۔ فارسی شعراء کے کلام اور اہلِ وجد کی محفلوں میں اس مسئلہ کو سر آنکھوں پہ جگہ دی گئی چنانچہ اسی مسئلہ کی بدولت جس کو شعرائے ایران اور ہندوستان کے فارسی شعراء اور اہل وجد کی محفلوں نے زیادہ فروغ دیا۔ کارِ دنیا ہمہ ہیچ سمجھا جانے لگا۔ اعمال و افعال کی پابندی۔ نیک و بد کی ذمہ داری سب کچھ ذاتِ باری کو سونپ دی گئی نتیجہ یہ کہ بقول مولانا محمود علی ایم اے یہ وہ بسرکھو رہے تھے اقوم کے کاہل اور عیش پسند افراد نے کہ انھی کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے اپنے تئیں اس پتہ سے بھی حقیر سمجھا جو درخت سے ٹوٹ کر ہوا کے زور سے اڑتا پھرتا ہے۔ اور قوتِ عمل کے ہر ایک جذبہ اور تہذیبِ نفس کی ہر ایک کوشش سے بیگانہ رہ گئے۔

اقبال لکھتے ہیں زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دکھ پہنچانے کی قوت کا ہے زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ کہ موت اور وحدت الوجود اور سکر کا مسئلہ موت سے بھی بدتر ہے۔ وحدت الوجودی ایک تنکا اس لیے نہیں توڑ سکتا کہ تنکے کو دکھ پہنچے گا۔ اسی مسئلہ نے خودداری اور خود شناسی اور قوتِ عمل سے مسلمان کو محروم کر دیا۔ ایک پٹھان وحید خان جو ایک ہندو جوگی کا مرید اور فلسفہ ویدانت (وحدت الوجود) کا قائل تھا اس عقیدہ کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

تھے ہم پورن پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے قدموں میں آیا ہوں۔ اب ایک تنکا تک بھی نہیں توڑ سکتا اسی لیے وہ مسلمانوں کی بربادی کا بوجھ ایک حد تک ایسے ہی صوفیوں اور شاعروں پر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اقبال کو کسی سے خواہ مخواہ ضد نہ تھی وہ ظاہر نما صوفیوں اور بے مصرف شاعروں کی طرح اس زمانہ کے ظاہر پرست ملاؤں سے بھی اس لیے ناراض تھے کہ انھوں نے اپنے پیٹ کے لیے مذہبی اکھاڑے بنا رکھے ہیں۔ بحث و تکرار۔ بدگوئی و غیبت ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی نظروں میں وسعت نہیں ان کے دلوں میں حرارت اور ان کے کلام میں اخلاص نہیں وہ ان کے متعلق اپنے نرالے اندازِ بیان میں کس جلے دل سے کہتے ہیں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

ڈاکٹر اقبال خود صوفی تھے۔ درویش منش تھے۔ مولانا روم کو پیرِ طریقت سمجھتے، بزرگوں کا سب سے ادب کرتے اور اولیاء اللہ کی کرامتوں کے قائل تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

البتہ اُن کو موجودہ دَور کی پیری مریدی اور آجکل کے خانقاہی مشرکانہ مذہب سے نفرت تھی وہ موجودہ پیروں کو جو سال بھر غریب مریدوں کی گرد اوری کرتے اور دعوتیں اُڑاتے اور ان سے نذرانے لیتے رہتے ہیں۔ قوم کے لیے وبالِ جان تصور کرتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

علامہ اقبال نے تمام عمر درویشانہ زندگی بسر کی اور اس درویشی میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ایک طرف تو سرکار نے اُن کو سَر کا معزز خطاب عطا کیا اور دوسری طرف دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور فلسفیوں کے ساتھ ان کا نام لیا جانے لگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قوم مُردہ کو اپنی نظموں کے ذریعہ ایسا پیغام دے گئے۔ کہ آج ہر مسلمان کا منجمد خون حرکت میں آ رہا ہے ؎

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد

اقبال نے شاعری کی پُرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے خیالات کی دُنیا الگ بسائی، ان کے کلام میں جو قوت و توانائی ہے وہ مشرق کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں انھوں نے فلسفہ میں فلسفۂ خودی کے اچھوتے تصور کا اظہار کیا اور اس مُردہ تصوف میں جو ایک طویل زمانہ سے ہماری خودداری زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ نئی رُوح پھونک دی۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ سکون و جمود کی ہر دلدادہ قوم کو عمل و حرکت کی تعلیم دے کر حیاتِ جاوداں کا پیغام سُنایا۔

مثنوی مولانا روم اکثر آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی اُس کے اکثر اشعار ترنم سے پڑھتے آپ کی حالت متغیر ہو کر بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے۔

قرآن شریف کی تلاوت ایسے ذوق و شوق ایسے درد و محبت اور ایسے سوز و گداز سے کرتے تھے کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا روتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا زور بڑھ گیا اور گلا خراب ہو جانے کے

باعث آواز میں بہت تنگ گئی۔ تو ڈاکٹروں کے منع کرنے سے آپ کا یہ طریقِ تلاوت بھی چھوٹ گیا۔

رسولِ اکرم صلعم کی ذات اقدس سے آپ کو والہانہ عشق تھا۔ ان کے کلام سے عشقِ رسول صلعم کی ادنیٰ سی جھلک نظر آتی ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک رباعی لکھی کہ بارِ الٰہا قیامت کے دن میرے گناہوں کی پرسش سے درگذر کر۔ لیکن اگر تو ایسا نہ کر سکے تو کم از کم نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہوں کے سامنے میرا مواخذہ نہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

خدا ہی کو اس بات کا علم ہے کہ اُن کے سینہ میں عشق و عرفان کا کیسا تلاطم خیز چشمہ نہیں سمندر تھا۔ بقول مدیر رسالہ البیان (دسمبر ۱۹۳۸ء) اُن کے دل میں درد تھا اُن کے لبوں پر آہیں تھیں اور اُن کی آنکھوں میں آنسو۔ انھوں نے ملّتِ مرحومہ کے غم میں جس ساز کو چھیڑا ہے اُس سے ماتم سرائی کی آوازیں بھی نکلتی ہیں اور اُمید و رجا کے نغمے بھی بلند ہوتے ہیں وہ قوم کے بہترین نباض اور قرآن کے بہترین مبلغ تھے اُن کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا صحیح اور اصلی مرض ترک قرآن ہے اور اس کا صحیح اور اصلی علاج ارجعوا الی القرآن۔

آخر یہ مردِ حق آگاہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پینسٹھ سال دو ماہ کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ جنازہ میں ساٹھ ستر ہزار سے کم مخلوق نہ تھی۔ ان کے ماتم کی وجہ سے تمام اسلامی مدارس بند ہو گئے۔ ان کے جنازہ کے آگے آگے انہی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ بہت سے ہندو اور سکھ بھی ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے جنازہ کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ پنجاب کے تمام وزرا اور وزیر اعظم (سر سکندر حیات) اور دیگر بڑے بڑے لوگ بھی جنازہ میں شامل تھے۔ جنازہ بادشاہی مسجد میں پڑھا گیا۔ اور رات کے گیارہ بجے ہندوستان کے اس فلاسفر شاعر اور صوفی اور علامہ دہر کو مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بائیں طرف سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کے عالمگیر ماتم پر شعرائے ہند و پنجاب نے اس قدر نظمیں لکھیں کہ ان کی گنتی دشوار ہے۔ آپ کے متعلق کچھ ماتمی نظمیں ایک کتاب کی صورت میں بھی طبع ہو چکی ہیں۔

[حکیم الامت علامہ اقبال کا مزار سرخ پتھر سے نہایت خوبصورت بنایا گیا ہے۔ عمارت شاعرِ مشرق کی وفات کے تیرہ سال بعد مکمل ہوئی۔ اس کے جنوب کی طرف دروازہ اور باقی تین طرف جالیاں ہیں۔ تعویذ کا پتھر افغانستان کی حکومت نے سردار صلاح الدین سلجوقی افغان کونسل کی تحریک پر تحفۃً دیا تھا۔ یہ اسی قسم کا قیمتی پتھر ہے جیسا بابر کی قبر پر بھی لگا ہوا ہے۔ روشنی میں اس سے لاجوردی رنگ کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ قبر کے سرہانے قرآن پاک کی آیات اور اقبال کے یہ دو شعر ہیں جو افغانستان والوں نے منتخب کر کے کندہ کرائے تھے ؎

نہ افغانیم و نی ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اندرونی دیواروں پر زبورِ عجم کی ایک غزل کے یہ شعر نہایت خوش خط نقش ہیں جو اقبال کے پیغام کا نچوڑ ہیں ——

دمِ مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمودِ لالۂ صحرا نشیں ز خونابم
چنانکہ بادۂ لعلی بساتگیں کردند
بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم
دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند
درآ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب
کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

مقبرہ کی تعمیر پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اپنے ملک کے لوگوں کے علاوہ بیرونی ممالک کا کوئی سیاح، کوئی سرکاری مہمان، کوئی سیاسی یا ثقافتی مشن یا وفد لاہور آکر علامہ کی قبر پر حاضر ہوئے بغیر نہیں رہتا ——— مرتب]

سر سکندر حیات خاں

جو گورنر بھی رہا اور چیف منسٹر بھی رہا
آج وہ زیرِ لحد مشہورِ دوراں دیکھئے

خان بہادر نواب سر سکندر حیات خاں کھٹر خاندان کے نامور فرزند تھے۔ کھٹر خاں شہاب الدین غوری کے حملۂ ہند کے ایام میں اس کے ساتھ ہی افغانستان سے آیا تھا۔ اس کے چھ فرزندوں میں چوتھا فرزند فیروز خاں تھا۔ جس کی اولاد فیروزال کہلاتی ہے۔ فیروزال سے پھر اور کئی شاخیں دریک۔ رتنال۔ بلوان۔ کھرل اور عیسیال نکلتی ہیں جن کا مفصل ذکر تاریخ ابلیان

پنجاب ایڈیشن اول (صفحہ ۵۷۳ تا ۵۷۷) میں درج ہے۔

فیروز خاں کی اولاد سے کئی پشتوں کے بعد جمال خاں نے اپنے بیٹے جلال خاں کے نام سے جلال سر ایک گاؤں جنگل میں جہاں درخت اور سبزہ زار بکثرت تھے آباد کیا۔ لیکن شاہجہان جب کابل کو جاتے ہوئے حسن ابدال کے پاس سے گذرا تو اس نے اس گاؤں کے قریب ۱۶۲۵ء، ۱۶۴۵ء میں ایک سرائے اور ایک محل تعمیر کرایا۔ اور اس کے خوشنما منظر اور بہتے ہوئے پانی اور دلفریب درختوں کے جھنڈ کو دیکھ کر بے ساختہ واہ کہا اور آخر میں جلال سر کی بجائے اس موضع کا نام واہ ہی مشہور ہو گیا۔ اور اسی نام سے کھٹر خاندان کی یہ شاخ واہ والی شاخ کے نام سے موسوم ہے۔ جلال خاں کی چوتھی پشت میں محمد حیات خاں ایک نامور شخص گذرا ہے۔ جس نے اپنی شجاعت اور وفاداری اور اپنے تدبر اور اپنی انتظامی قابلیت سے اس خاندان کو چار چاند لگا دیئے۔ راقم کو جموں میں جب وہ کونسل جموں و کشمیر کے ممبر تھے ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء میں نیاز بھی حاصل رہا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ہمیشہ ان کو "باپو" کہا کرتے تھے۔

نواب محمد حیات خاں نے غدر ۱۸۵۷ء میں اور اس سے قبل کپتان ایبٹ اور جنرل نکلسن کے ہمراہ بڑی خدمات انجام دی ہیں آپ کو خان بہادر سی آئی ای اور نواب کا ذاتی خطاب ملا۔ اسسٹنٹ کمشنر۔ کابل فیلڈ فورس کے پولیٹیکل افسر اور صوبہ پنجاب میں ڈویژنل جج رہے۔ چھ فرزند چھوڑ کر آپ ۱۹۰۱ء میں وفات پا گئے۔

آپ نے بنوں میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہنے کے ایام میں "حیات افغانی" ایک کتاب افغان قبائل کی تشریحات اور علاقہ سرحد و بنوں کے حالات میں لکھی ہے جو مستند سمجھی جاتی ہے اور آجکل نایاب ہے۔

آپ کے فرزندوں میں آپ کے دوسرے فرزند سکندر حیات خاں نے نہ صرف پنجاب اور ہندوستان بلکہ انگلستان میں بھی لازوال شہرت حاصل کی ہے۔

آپ ۵ جون ۱۸۹۲ء کو ملتان میں جہاں آپ کے والد نواب محمد حیات خاں ڈویژنل جج تھے پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد آپ علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ جہاں میٹرک پاس کیا۔ تھوڑا عرصہ کالج میں رہے تھے کہ ڈاکٹری تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ ابھی دو ہی سال کا عرصہ وہاں گذرا تھا کہ برادر بزرگ خان محمد اسلم حیات خاں کی وفات کی وجہ سے آپ کو واپس آنا پڑا۔

آپ کا خاندان سپاہیانہ اوصاف کا مالک ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ میں اور تیسری افغان لڑائی میں آپ شامل رہے اور گورنمنٹ برطانیہ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور ضلع اٹک کی طرف سے کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں یا اس کے بعد چند ماہ تک بہاولپور کے وزیراعظم بھی رہے۔ ۱۹۲۹ء میں آپ سر فضل حسین کی جگہ ریونیو ممبر بنے۔ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۴ء میں دو مرتبہ قائم مقام گورنر پنجاب مقرر ہوئے اور آپ سب سے پہلے پنجابی تھے جن کو یہ جلیل القدر عہدہ ملا۔ ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بھی رہے۔ اور آپ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ جب ہندوستان میں وزارتوں کا آئین قائم ہوا۔ تو آپ پنجاب کے سب سے پہلے وزیراعظم قرار پائے اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وزارت عظمیٰ کے فرائض کامیابی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

آپ کے زمانہ وزارت میں جماعت خاکساراں اور مجاہد دل اور مجلس احرار اور کئی اور تحریکوں کا بڑا زور تھا۔ آپ کی سیاسی دانشمندی اور انتظامی لیاقت ان تحریکوں پر غالب آتی رہی آپ ہی کی وزارت اور سر ایمرسن کی گورنری کے زمانہ میں مسجد شہید گنج صحیح معنوں میں شہید ہوئی۔ اس مسجد کے حصول میں بہت سی قانونی پیچیدگیاں تھیں اس لیے مسلمان کامیاب نہ ہو سکے۔ اور سکھوں نے مسجد کے ساتھ وہ سلوک کیا۔ جو ان کو اخلاقاً اور احتراماً نہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن سر سکندر حیات کی کوششوں سے لاہور کی ایک اور عظیم الشان مسجد۔ بنام مسجد شاہ چراغ جو مدت دراز سے سرکاری قبضہ میں چلی آتی تھی۔ مسلمانوں کو مل گئی۔ جس کے ساتھ آمدنی کے کافی ذرائع بھی ہیں اور جہاں پر رونق جمعہ ہوتا ہے۔

لاہور میں شہنشاہ عالمگیر کی تعمیر کی ہوئی مسجد جو بادشاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے عرصہ سے مرمت طلب تھی۔ آپ کی ذاتی کوششوں اور آپ کے مذہبی جذبہ کے طفیل گورنمنٹ پنجاب۔ حضور نظام دکن اور زمینداران پنجاب نے قریباً دس گیارہ لاکھ روپیہ اس کی مرمت کے لیے دیا۔ چنانچہ انجمن اسلامیہ پنجاب کی نگرانی میں اس مسجد کی مرمت ہو رہی ہے۔

پہلی جنگ یورپ کی طرح دوسری عالمگیر جنگ میں بھی جو ستمبر ۱۹۳۹ء سے تا دم تحریر (۱۳ مارچ ۱۹۴۴ء) جاری ہے آپ نے قابل قدر مدد دی۔ آپ ہی کی مساعی پیہم سے کئی لاکھ پنجابی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے۔ اسی جنگ میں آپ دو مرتبہ مصر کے مشرقی محاذ پر بھی گئے جہاں آپ نے ہندوستانی فوجوں کا بچشم خود معائنہ کیا۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے فرزند سردار میجر شوکت حیات خاں (ولادت ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء) کو فوجی کالج ڈیرہ دون میں تعلیم دلانے کے بعد فوج میں بھجوایا۔ جہاں وہ عالمگیر جنگ میں مشرق وسطیٰ کی فوجوں کے ساتھ ۴۰ء سے دسمبر ۴۲ء تک رہے بلکہ اسی اثنا میں پانچ ماہ تک جنگی قیدی بھی دشمن کے پاس رہے۔ بعد میں آپ وزارت پنجاب کے سب سے کم عمر وزیر بھی ہوئے۔

آپ کے انتقال کا واقعہ نہایت رقت خیز۔ درد انگیز اور عبرت نما ہے۔ ۲۶ و ۲۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو آپ کے فرزند اور صاحبزادی کی شادیاں تھیں۔ ۲۶ کی شام کو آپ نے شادیوں سے فراغت پائی۔ نو بجے کے قریب آپ نے پیٹ اور قلب کے پاس تکلیف محسوس کی، اجوائن اور فروٹ سالٹ کا استعمال کیا۔ جس سے آپ کو کچھ افاقہ معلوم ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب آپ اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ آخری بات چیت کر کے اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے فرزند میجر شوکت حیات خاں نے (جو صرف تین چار روز پیشتر رخصت پر آئے تھے) آپ کو بستر پر بے ہوش پایا۔ ٹیلی فون پر اسی وقت تین ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ لیکن وہ ابھی پہنچنے نہ پائے تھے۔ کہ دل کی حرکت بند ہو جانے سے آپ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ المناک واقعہ جس میں غافل انسانوں کے لیے صدہا سبق ہیں صرف چند منٹوں میں ختم ہو گیا۔

اجل کا وقت مقرر سہی مگر یارب
یہ ایک کھیل ہے یا شان کردگاری ہے

چشم زدن میں آدھی رات کے قریب یہ عشرت کدہ ماتم سرا بن گیا۔ ابھی شامیانے قناتیں اور میز کرسیاں اور تمام ساز و سامان اسی طرح پڑا تھا اور مبارک باد کے تاروں اور خطوط اور مہمانوں کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا اور ابھی سہرے باسی ہار بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ صرصر موت نے چراغ زیست کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیا۔

—

وہ سہرے جن کی مہک سے رہی فضا لبریز
پڑے ہیں خاک پہ سرگشتۂ خزاں ہو کر

۲۷ دسمبر کے آفتاب کا چراغ جھلملا کر خاموش ہو رہا تھا کہ اس ممتاز سیاستدان اور نامور مدبر و منتظم شخصیت کو
جامع عالمگیری کی دیوار کے سایہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی عمر پچاس سال چند ماہ تھی۔ اللہ اکبر! اسی شامیانہ کے نیچے
جہاں شادمانی کے سارے سامان علی حال موجود تھے اور ابھی مہمان رخصت بھی نہ ہوسکے تھے کہ وہیں آپ کی میت رکھی گئی۔
آپ کا جنازہ پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا جس میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی انگریز سب موجود تھے۔ جنازہ روانہ ہونے
کے وقت پولیس آن ڈیوٹی نے سلامی دی۔ پنجاب اسمبلی اور عجائب گھر کے قریب بھی سلامیاں دی گئیں اس ماتمی جلوس کے ہمراہ بہت
خلقت تھی۔ بادشاہی مسجد کے سامنے جب جنازہ آیا تو فوجی گوروں نے سلامی دی۔ گورنر پنجاب بھی اس وقت موجود تھے۔ بے شمار
خلقت مسجد کے اندر اور باہر سیڑھیوں پر موجود تھی۔ راقم بھی جنازہ میں شامل تھا۔ قریباً ایک لاکھ آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ شام
کے ۷ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے کہ رسم تدفین عمل میں آئی۔

ان تقریبوں پہ مبارک بادیوں کے تار ابھی آ ہی رہے تھے کہ ماتمی تاروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ وائسرائے ہند۔
مسٹر چرچل وزیر اعظم انگلستان۔ مسٹر ایمری وزیر ہند۔ جنرل ویول موجودہ وائسرائے ہند جو اس زمانہ میں کمانڈر انچیف تھے۔ قائد اعظم
مسٹر جناح۔ فرمانروایان جموں بھوپال۔ رام پور۔ بہاولپور۔ نظام دکن۔ نواب چھتاری۔ گورنر پنجاب کے علاوہ صدہا تار آپ کی موت
پر آئے تھے۔

علامہ سر محمد اقبال کے مزار کے عین مقابل بادشاہی مسجد کے دہنے بازو میں پنجاب کی اس ممتاز ترین ہستی کی آخری آرام گاہ
ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی ان دو مختلف ممتاز ہستیوں کے مقبرے ایک ہی نقشہ کے مطابق تعمیر کیے جائیں گے۔
مرحوم کی سیاست سے یقیناً کئی لوگوں کو اختلاف رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی کشادہ دلی۔ فراخ حوصلگی۔
بے تعصبی۔ بے غرضی اور منکسرامزاجی کی وجہ سے تمام لوگ ان کی عظمت و ہردلعزیزی کے قائل تھے۔
مرحوم گورنر پنجاب۔ ڈپٹی گورنر ریزرو بنک۔ ریونیو ممبر۔ وزارتِ عظمیٰ کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچ کر بھی حقوق اللہ
اور حقوق العباد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب یکم جنوری ۱۹۴۳ء کے انقلاب میں لکھتے ہیں چونکہ
صبح سے ۵ بجے اور اس کے بعد بھی کارِ سرکار اور ملاقاتیوں کے ہجوم سے انھیں فرصت نہ ملتی تھی۔ بلکہ بعض وقت کھانا بھی وقت پر
نہ کھا سکتے تھے اس لیے نماز ظہر کے اکثر قضا ہو جانے سے انھیں بہت تکلیف ہوا کرتی تھی ایک دفعہ جب سالک صاحب نے
عرض کیا کہ مہماتِ امور کی مصروفیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اکثر ظہر و عصر جمع کی ہیں کہنے لگے حضورؐ کے مہمات امور اور
ہمارے کاروبار دنیوی میں بڑا فرق ہے۔ خدا جانے مجھے یہ نمازیں جمع کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ روزوں کے سختی سے پابند تھے
سفر میں بھی انھوں نے روزہ کبھی ترک نہیں کیا۔ ماہ رمضان میں ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ کوٹھی کے پھاٹک پر پہرہ دار سپاہی دوپہر
کے وقت کچھ کھا رہے ہیں۔ آپ نے انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا کہ ان آدمیوں کو فوراً واپس بلا لو میری کوٹھی کے احاطہ کے اندر ماہ مبارک
کی بے حرمتی ناقابلِ برداشت ہے۔ چنانچہ وہ آدمی فوراً وہاں سے ہٹا دیئے گئے۔

سر سکندر حیات مرحوم کو بزرگانِ دین سے گہری عقیدت تھی۔ دہلی یا حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوتا تو سب سے پہلے اولیائے کرام کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتے اور ان کے فضائل کا تذکرہ فرماتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش ؒ کے مزار پر بھی آتے رہتے ہیں۔ راقم کے ایک دوست ملازم ریلوے کی ڈیوٹی آپ کی ریزرو ریلوے گاڑی کے ساتھ عموماً رہتی تھی ان کا بیان ہے کہ میں نے بارہا ان کو گاڑی میں بھی نماز و وظائف پڑھتے دیکھا ہے۔ "ہائے سکندر اعظم" سے آپ کا سالِ وفات برآمد ہوتا ہے۔

جناح باغ

[مال روڈ کے دائیں طرف، گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے، لارنس ہال اور منٹگمری ہال کے آگے ایک بہت وسیع و عریض باغ ہے جس کا رقبہ ایک سو بارہ ایکڑ ہے۔ سنہ ۱۸۶۰ء تک یہ جگہ بالکل اجاڑ اور ویران پڑی تھی۔ ۱۸۶۲-۱۸۶۱ء میں انگریزوں نے چندہ جمع کر کے لارڈ لارنس کی یادگار کے طور پر یہاں لارنس ہال اور ۱۸۶۶ء میں ہندوستانی رئیسوں کے عطیات سے منٹگمری ہال تعمیر کیا اور ان کے آگے ایک مختصر سا باغ لگایا۔ مگر ۱۸۶۵ء میں انھوں نے بادامی باغ کی زمین فروخت کر کے اس کی آمدنی سے یہاں اور زمین خریدی۔

ابتدا میں اس باغ کا نام لارنس باغ تھا جس کی تاریخ مردان علی رعنا نے ۵ر جولائی ۱۸۶۲ء کے ہفتہ وار اخبار کوہ نور لاہور میں اس طرح کہی تھی ؎

لفٹنٹ پنجاب تھے سر جان لارنس ——— تھے نیک نام بسکہ وہ صاحب دل و دماغ
باغ جہاں میں نام رہے تاکہ تا بہ حشر ——— لاہور میں یہ ان کا بنا یادگار باغ
رعنا نے نام باغ سے ڈیڑھ سے لیے عدد ——— روشن سن مسیح ہوا صورت چراغ

اس وقت سے اب تک اس باغ کا ایک حصّہ محکمہ زراعت و باغبانی کی نگرانی میں "بستان العقاقیر" یعنی نباتاتی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، ایک حصّہ چڑیا گھر کے قبضہ و تصرّف میں ہے اور ایک حصّہ پبلک کی سیر و تفریح کے لیے وقف ہے، جس کا انتظام لاہور کارپوریشن کے ہاتھ میں ہے، اس باغ کی نہر باری دوآب کی ایک شاخ سیراب کرتی ہے۔

باغ میں کم و بیش اسی ہزار درخت اور مختلف قسم اور نوع کے پودے اور گل بوٹے ہیں۔ برِعظیم پاک و ہند میں پیدا ہونے والے پیپل، بڑ، جامن، آم اور دوسرے عام درختوں کے علاوہ اس میں آسٹریلیا، اسپین، شام اور جنوبی یورپ سے کئی قسم کے خوب صورت درخت لا کر لگائے گئے ہیں جن میں چیل، چنار، شمشاد، یوکلپٹس، لیچی، کاجو اور خروبہ وغیرہ بھی ہیں۔

اس باغ میں کرکٹ، ٹینس اور ہاکی کی متعدد گراؤنڈیں بھی ہیں۔ کرکٹ کی گراؤنڈ غالباً سارے پاکستان میں اپنی نظیر آپ ہے۔ نیشنل اسٹیڈیم کی تعمیر سے پہلے کرکٹ کے بین الاقوامی مقابلے اسی گراؤنڈ میں ہوتے تھے۔ بچوں کی تفریح کے لیے منٹگمری ہال کے مشرق کی جانب بہت اچھا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ اوپن ایئر تھیئٹر بھی اسی باغ میں واقع ہے۔ ایک پہاڑی نما ٹیلے پر بڑی عمدہ سیر گاہ ہے۔ جیم خانہ کلب کی سرپرستی میں ایک لائبریری بھی قائم ہے۔ جس میں ہزارہا کتابیں ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد اس باغ کا نام لارنس باغ کی بجائے جناح باغ ہو گیا ہے۔ اسی کے ایک حصّے کو نہایت خوب صورتی سے آراستہ کر کے قائد اعظم کی ہمشیرہ کے نام پر گلستانِ فاطمہ کہتے ہیں۔ اب اس کے قریب جدید طرز کی ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی ہے جو باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے علاوہ تفریح کرنے والوں کو خدا کا نام یاد دلاتی رہتی ہے ——— مرتب]

علمائے کرام، دینی مدرسے

محمد علم الدین سالک

یوں تو پاک و ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون کی اشاعت شروع ہو گئی تھی کیونکہ مسلمان جہاں جاتا ہے علم کی مشعل ہاتھ میں لے کر جاتا ہے اور استقلال حاصل کرتے ہی علم و عرفان کی دولت لٹانی شروع کر دیتا ہے لیکن تیموریوں کا زمانہ دراصل علوم و فنون کی اشاعت کا زریں دور ہے۔ لاہور ان کے زمانے میں دوسرا بغداد، قرطبہ اور شیراز بنتا ہے اور اسے اتنی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دلی اور آگرہ بھی اس پر رشک کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ملک امن و امان کا گہوارہ تھا، لوگ فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے ملک کو نجات حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے اہلِ فضل و کمال پوری دلجمعی کے ساتھ اشاعت علوم میں مشغول تھے اور طالب علم بڑی آسانی کے ساتھ ان کی صحبت میں بیٹھ کر دلی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی لاہور ایک بڑا شہر تھا اور وقتاً فوقتاً اس سے علم و عرفان کے چشمے پھوٹتے اور کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان کے اکثر حصوں کو سیراب کر جاتے تھے مگر منگولوں کی پیہم یورشیں اور خود ملک کی لامرکزیت ان حالات کو تادیر قائم نہ رہنے دیتی تھی۔ اس لیے یہ سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ سلطانی دور میں بعض نامور عالم ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے باہر کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا مگر ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز دربار اور بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ سارے سلطانی دور میں شاذ ہی دلی کے کسی سلطان کو لاہور آنے اور یہاں قیام کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ اس لیے اس دور میں دلی اور آگرہ ہی ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنے رہے۔

اس مقالہ میں ہم نے تیموریوں کی آمد سے لے کر عالمگیر کی وفات تک کا زمانہ خاص طور پر سامنے رکھا ہے۔ بعد کے دور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد یہاں افراتفری اور اختلال پیدا ہو جاتا ہے، امن و امان لٹ جاتا اور عوام کے حالات اتنے خراب ہو جاتے ہیں کہ لاہور کی رونق آدھی بھی نہیں رہتی۔ شہر مختلف صدموں کا شکار ہوتا ہے۔ مرہٹے اور سکھ عوام کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹتے، آبادیوں کو تباہ کرتے اور مکانوں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔ اس پریشان ماحول میں بھی علم کی جوت جگتی رہتی ہے اور علما تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے لاہور کو اپنے تسلط میں لے لیا اور ان کے حکم سے ۱۸۵۰ء میں لاہور کے تحصیلدار لالہ اجودھیا پرشاد نے مردم شماری کی تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے سب چیزوں سے

بڑھ کر علم و عرفان کے مرکزوں کو محفوظ رکھا ہے۔ ذیل کا گوشوارہ ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہوگا:۔

شہر کی آبادی	پچاس ہزار تین سو پانچ
دکانیں اور مکان	اٹھائیس ہزار چھ سو چورانوے
ہاتھی	پچپن
اونٹ	تین سو اٹھارہ
گھوڑے	پندرہ سو پچانوے
بیل	چھبیس سو ستاسی
گائے	تئیس سو پندرہ
بھینس	چھ سو چالیس
فارسی سکول	ایک سو سولہ
عربی سکول	چھتیس
عربی فارسی مشترکہ سکول	چوالیس
شاستری سکول	اڑتیس
باغات	تیس

مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کو سمجھنے کے لیے ان کے نظریہ تعلیم کی وضاحت ضروری ہے۔ آج تعلیم کو اقتصادی قدر و قیمت کی نگاہ سے جانچا جاتا ہے۔ پہلے مسلمانوں کے نزدیک تعلیم کی غرض و غایت بالکل مختلف تھی۔ تعلیم میں قرآن پاک اور اس کی تفسیر کو مرکزی حیثیت دی جاتی تھی۔ دوسرے علوم محض قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے حاصل کیے جاتے تھے۔ فقہ، حدیث، عقائد، صحبت اور بیعت کے ذریعے ناکردہ کار نوجوانوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور ان سب سے بڑھ کر اخلاص باللہ کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اسلامی تعلیم کی یہی اساس تھی۔ ہر اسلامی ملک میں نظام تعلیم انہی بنیادوں پر استوار کیا جاتا تھا۔ آج ہم بلاخوف تردید اسے آزاد تعلیمی نظام کہہ سکتے ہیں۔ اس نظام کی تشکیل میں امام الحرمینؒ، امام غزالیؒ، امام فخر الدین رازی، نصیر الدین طوسی، قطب شیرازی، علامہ جلال الدین دوانی، قطب الدین رازی، میر فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ولی اللہ اور علامہ بحر العلوم نے حصہ لیا۔ آج یہ نظام ختم ہو چکا ہے۔ اس کی داستان اوراق پارینہ ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گئی ہے۔ اس کے نشانات تک محو کر دیئے گئے ہیں۔ مگر روایات سے جن باتوں کا پتہ چلتا ہے ان سے اس نظام کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس نظام میں اُستاد کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور اس میں خاص خاص اوصاف کا ہونا لازمی تھا۔ اُستاد ایک متحرک یونیورسٹی ہوتا تھا۔ اس کی نقل و حرکت علمی وقار کا پہلو لیے ہوتی تھی۔ اس کی زندگی اور زندگی کا ہر پہلو طالب علم کے لیے علمی نمونہ تھا جس کی تقلید کرنے پر طالب علم مجبور ہوتا تھا۔

تاریخ میں بعض بعض مقامات پر اس قسم کے فقرے ملتے ہیں کہ فلاں امیر یا بادشاہ نے مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس سے ہرگز یہ

مراد نہیں کہ اس وقت مدارس کی عمارتیں اسی طریقے پر تعمیر کی جاتی تھیں جس طرح آج کل کی جاتی ہیں۔ بلکہ واقعات ہمیں بتلاتے ہیں کہ اس قسم کی تعمیرات سے ان کی غرض و غایت اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ اگر انھیں کوئی مقام پسند آتا، وہاں کی فضاؤں میں گم ہو جاتے یا پس منظر اس کا تقاضا کرتا کہ وہاں کوئی عمارت تعمیر کی جائے تو وہ بسا اوقات محلات اور سیرگاہوں کی بجائے مدارس کی عمارت کھڑی کر دیا کرتے تھے ورنہ جہاں تک درس گاہوں کا تعلق ہے ہندوستان میں ہر مقبرہ، ہر خانقاہ اور ہر مسجد مدرسے کا کام دیتی تھی اور اہلِ دول ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

بابر کے اجداد

بابر کی اولاد نے صدیوں برعظیم پاک و ہند پر بڑی شان سے حکومت کی۔ ان کی حکومت اپنی شوکت و عظمت اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے آج بھی ہر ایک سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔

آلِ بابر تیمور کے جانشین اور وارث تھے ——— وہ تیمور جو دنیا کی نگاہوں میں ایک سفاک اور جابر حکمران، خونخوار انسان اور ظالم و سنگدل فاتح تھا۔ اس کی تصویر میں کشت و خون، لوٹ مار اور جبر و تشدد کے نشانات خاص طور پر نمایاں کیے جاتے ہیں۔ مورخ لکھتے ہیں کہ وہ جہاں جاتا، آگ اور خون کا کھیل کھیلتا، لوٹ مار کرتا اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا اور جب چاہتا انھیں ذبح کر کے ان کی کھوپڑیوں سے مینار کھڑے کر دیتا۔ وہ شہروں کو لوٹتا اور انھیں نذرِ آتش کر دیتا۔ اس کے جلو میں آگ اور خون کے دریا بہتے اور جہاں اس کا قدم جاتا مظلوموں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔

مگر یہ اس کی تصویر کا فقط ایک رُخ ہے۔ تیمور ملک گیری، کشور کشائی اور جہانگیری کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی بھی سرپرستی کرتا تھا اور اس میں بھی ہمیں وہی جوش و خروش نظر آتا ہے جو ہم اس کی ملک گیری کے معرکوں میں دیکھتے ہیں۔ گبن کہتا ہے:

"تیمور اپنے خاص الخاص دوستوں میں بہت متین اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ گو وہ عربی زبان سے ناواقف تھا مگر ترکی اور فارسی بڑی بے تکلفی اور روانی سے بولتا تھا وہ مشہور علماء کے ساتھ تاریخ اور دوسرے علمی مضامین پر گفتگو کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتا تھا۔"[1]

تیمور علوم و فنون کا قدردان تھا اور اہلِ کمال کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ اس کی داد و دہش کا یہ اثر ہوا کہ اس دور کے بڑے بڑے عالم، شاعر اور فاضل خود بخود اس کے دربار میں کھنچ آئے اور اس طرح سمرقند اور بخارا دنیا کے بہترین ثقافتی، علمی اور ادبی مرکز بن گئے۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدارس اور کتب خانوں کی گرتی ہوئی عمارتیں آج بھی اکثر شہروں میں ملتی ہیں۔ اس نے اشاعتِ علوم و فنون میں جس سرگرمی کا اظہار کیا وہ کسی اور فاتح کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

تیمور ہر وقت اور ہر موقعہ پر، بزم ہو یا رزم، میدانِ جنگ ہو یا محفلِ طرب، علماء و فضلا کی ایک زبردست جماعت اپنے ساتھ رکھتا تھا جنگ سے فارغ ہونے کے بعد وہ ان کی خدمت میں ایک ادنیٰ طالب علم کی طرح بیٹھتا۔ علم و حکمت کے موتی چنتا اور بڑی عقیدتمندی کے ساتھ ان کی باتوں سے مستفیض ہوتا۔ ہندوستان کے حملے میں جب دہلی کے شہنشاہ سلطان محمود سے معرکہ آرائی ہوتی تو اس وقت بھی برابر علماء

---

[1] گبن تاریخ عروج و زوالِ روما باب ۵۵۔

بڑے عالم اس کے ساتھ تھے۔ امیر تیمور نے ان سے پوچھا "آپ کا مقام کہاں ہونا چاہیئے؟" وہ ہاتھیوں سے بہت ڈرے ہوئے تھے اس سبب انھوں نے کہا کہ ہماری صفیں بیگمات کے خیموں کے پیچھے آراستہ کی جائیں۔ چنانچہ امیر تیمور نے ایسا ہی کیا۔[1]

دہلی جاتے ہوئے امیر تیمور کو تلنبہ (ضلع ملتان) میں ایک معرکہ پیش آیا۔ مگر معمولی سی جھڑپ کے بعد شہر پر قبضہ ہو گیا۔ تیمور اپنی تزک میں لکھتا ہے :۔

"میرے وزراء نے تلنبہ کے باشندوں پر دو لاکھ روپیہ تاوان ڈالا اور اسے وصول کرنے کے لیے کارندے مقرر کئے۔ شہر میں سادات بھی آباد تھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے تھے اور علمائے اسلام بھی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث کہلاتے ہیں۔ سادات اور علما میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اس بنا پر میں نے حکم دیا کہ ان دونوں جماعتوں سے کسی قسم کا تاوان وصول نہ کیا جائے۔ بلکہ میں نے انھیں اپنے حضور میں طلب کر کے خلعت اور عربی گھوڑے عطا کئے۔"[2]

تیمور اپنی تزک میں ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ یہ میرا حکم تھا کہ جو لوگ طبقہ سادات اور علما سے تعلق رکھتے ہوں ان کا احترام کیا جائے، ان کی ہر ضرورت پوری کی جائے۔ اور ان کے ساتھ پوری پوری رعایت برتی جائے۔"[3]

ملا شرف الدین علی یزدی امیر تیمور کے کردار پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ :۔

"صاحبقران کے ساتھ سفر و حضر میں سادات، علماء، فضلا، اہل فضل و دانش برابر رہتے تھے۔ اس کے حکم کے مطابق وہ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتے صاحبقراں کے افعال و اقوال، ملک و ملت کے احوال پوری تحقیق کے ساتھ لکھتے، ان میں نہ تصرف کرتے نہ اضافہ۔ . . . حتیٰ کہ صاحبقران کی شجاعت و بسالت میں بھی انھیں مبالغہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔"[4]

امیر تیمور کی یہ معارف پروری اور علم نوازی اس کی نسل میں منتقل ہوتی رہی۔ اس کا پوتا الغ بیگ ریاضی، علم ہیئت اور نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا۔ الغ بیگ کے دونوں بیٹے حقیقی معنوں میں صاحب سیف و القلم تھے اور نظم و نثر پر پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔ شاہ رخ میرزا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ سلطان حسین میرزا والیے ہرات کا دربار اپنی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے اس زمانے میں بے نظیر تھا۔ میراں شاہ، محمد سلطان، بایسنغر اور عمر شیخ وغیرہ کے نام بھی دنیا کی علمی و ادبی تاریخ میں آفتاب و ماہتاب

---

[1] ظفر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۱۔ [2] ایلیٹ جلد سوم صفحہ ۴۱۴۔
[3] توزک تیموری صفحہ ۱۱۴۔
[4] ظفر نامہ جلد اول صفحہ ۲۴ - ۲۵

کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا مستشرق کہتا ہے :۔

"ان کے دورِ حکومت نے ترکوں کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا۔ ان کی شہرت چمک اٹھی۔ ان کی سرگرمیوں نے ادبا اور علما کے گروہ کے گروہ اپنی طرف کھینچ لیے جن کے علمی و ادبی کارناموں نے ایک دفعہ پھر عربوں کے تمدنی و ثقافتی کارناموں کی یاد تازہ کر دی۔ شاہ رخ میرزا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ الغ بیگ نے ریاضی اور علم نجوم جیسے دقیق مضامین کے مطالعہ میں نام پیدا کیا۔ اس خاندان کی تاریخ شعرا، فلاسفہ، علما اور فضلا کی وجہ سے شہرت عام کی مالک بن گئی اور آج مشرق میں ہر جگہ ان کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے" [1]

بابر کا باپ عمر شیخ میرزا اپنی علمی اور ادبی حیثیت سے فرغانہ کی روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ بابر اپنی تزک میں اس کی تصویر کشی کرتا ہوا یوں لکھتا ہے :۔

"عمر شیخ میرزا حنفی مذہب رکھتا تھا۔ وہ خوش عقیدہ تھا۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدہ پڑھتا۔ بیشتر وقت تلاوت قرآن پاک کرتا۔ وہ خواجہ عبیداللہ احرار کا مرید تھا۔ خواجہ احرار اسے فرزند کہتے تھے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ خمسہ نظامی، مثنوی مولانا روم، خمسہ خسرو۔ تاریخ کی بیشتر کتابیں اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ شاہنامہ سے خاص شغف تھا۔ طبیعت اگرچہ موزوں تھی مگر شعر نہ کہتے تھے"

یہ تھے بابر کے والد عمر شیخ میرزا۔ بابر کی والدہ قتلق نگار خانم بھی اکثر علوم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ وہ تاشقند کے مشہور سردار یونس میرزا کی بیٹی تھی جو فارسی کا زبردست انشا پرداز اور اسلامی علوم کا بہت بڑا فاضل تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو خود تعلیم و تربیت دی تھی۔ اس کی دوسری بیٹی خوب نگار خانم میرزا حیدر دوغلات صاحب تاریخ رشیدی کی ماں تھی۔ میرزا حیدر تاریخ رشیدی میں اپنے نانا یونس خاں کی قلمی تصویر یوں پیش کرتا ہے :۔

"خان موصوف بارہ برس تک مولانا شرف الدین علی یزدی کی صحبت میں رہے اور ہر قسم کے فضائل حاصل کیے۔ ان کے پایہ کا خان نہ ان سے پہلے ہوا ہے نہ ان کے بعد۔ جب مولانا یزدی کا انتقال ہو گیا تو خان موصوف یزد سے عراق، فارس اور آذربائیجان کی طرف چلے گئے۔ وہاں بھی تحصیل علوم کی۔ پھر شیراز پہنچے۔ وہاں کی علمی صحبتوں میں بھی شریک رہے۔ یہاں تک کہ لوگ تعظیم و تکریم کی بنا پر انھیں استاد یونس کے نام سے یاد کرتے تھے"

---

[1] ہارٹ آف ایشیا صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰ -

"خان موصوف بہت سے فضائل کے مالک تھے۔ قرآن کی قرأت خوب کرتے تھے۔ موسیقی اور مصوری میں بھی کافی مہارت تھی، ان کی طبیعت بھی موزوں تھی۔"[1]

عہد ظہیر الدین بابر ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء تا ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء

بابر ان سب سے متأثر تھا۔ بالخصوص اپنی نانی ایسان دولت اور والدہ قتلق نگار خانم سے۔ تزک میں وہ اس کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بابر بنانے والی میری ماں اور میری نانی ہیں۔ یہ ہر حالت میں سائے کی طرح میرا ساتھ دیتی رہیں۔ بابر زبردست شاعر اور قادر الکلام نثر نگار تھا۔ اس کی تزک چغتائی ترکی ادبیات کا شاہکار ہے۔ بابر سادہ فطرت تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی تزک کی سادہ نگاری ہے۔ اس کا سینہ محبت، شفقت اور انسانی ہمدردی کا خزینہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے انقلابات دیکھے۔ عسرت و تنگدستی میں دن گزارے۔ شان و شوکت کے ساتھ تخت شاہی پر بھی جلوس کیا مگر اس کی طبیعت کی درویشی اور علم و معارف پروری ہر حالت میں قائم رہی۔ اس کی تزک سے اس زمانے کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک دلکش مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

قدرت نے بابر کو ہندوستان میں زیادہ دن رہنے کا موقع نہ دیا۔ ورنہ وہ اسے وسط ایشیا اور ایران کا مد مقابل بنا دیتا۔ بہرحال اس نے یہاں پہنچ کر علما کی قدردانی کی اور انھیں موقع دیا کہ وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ علم اور ادب کی خدمت میں مصروف ہو جائیں۔ ملا زین الدین خوافی وسط ایشیا سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے آگرہ میں مدرسہ قائم کیا۔ بابر نے دل کھول کر اس کی سرپرستی کی۔ یہاں کے قدیم مدرسے جو سیاسی افراتفری کی وجہ سے بہت حد تک ناکارہ ہو چکے تھے بابر کی سرپرستی سے ان میں پھر رونق پیدا ہونی شروع ہوئی

بابر کو لاہور میں زیادہ دیر ٹھہرنے کا موقع نہ ملا۔ ورنہ وہ یہاں بھی علم و ادب کی آبیاری کرتا اور اپنی معارف پروری کا ثبوت دیتا، اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جب لاہور اس کے قبضے میں آیا تو دولت خاں لودھی والئ لاہور کا عظیم الشان کتب خانہ اس کے ہاتھ آیا۔ اس میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ بابر نے چند قلمی نوادرات اپنے پاس رکھے، کچھ کامران اور کچھ ہمایوں کو دے دیئے۔ جو کتابیں باقی بچیں وہ اپنے خاص خاص امیروں اور لاہور کے نامور علما میں بانٹ دیں۔

عہد نصیر الدین ہمایوں ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء تا ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء

بابر کے چاروں بیٹوں نے علم و ادب کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کیا۔ بالخصوص کامران نے شاعری میں اور ہمایوں نے ریاضی اور علم نجوم میں مگر بابر کے بعد ہمایوں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اس میں باپ کی ساری خوبیاں موجود تھیں البتہ وہ عزم صمیم کی دولت سے محروم تھا اور اس کی طبیعت میں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسے ساری عمر

---

[1] تاریخ رشیدی انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۷ ۔

پریشانی میں مبتلا رہنا پڑا - اس کے دشمن اور بھائی اس کے لیے یکساں وبالِ جان تھے مگر ان پریشانیوں کے باوجود اس نے علم کی مشعل کو روشن رکھا - اسے جب موقعہ ملتا اپنی تسکینِ قلب و روح کے لیے علما کی بزم آرائی کرتا - ملا نظام الدین ہروی کے قول کے مطابق اس کی صحبت میں عالم، فاضل اور بڑے بڑے امیر ہر وقت موجود رہتے تھے - اس کی علمی محفلیں رات کے پہلے حصے میں شروع ہوتیں اور صبح تک جاری رہتیں - ان محفلوں میں آدابِ نشست و برخاست کا خاص خیال رکھا جاتا، اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے[1]

ایک دن کا ذکر ہے کہ دربار خاص منعقد تھا - ہمایوں کے تمام امیر اور مقربین اس میں موجود تھے - بیرم خاں خانِ خاناں بھی شریک تھا - ہمایوں اسی کو خطاب کر رہا تھا - رات زیادہ گذر چکی تھی، بیرم خاں کئی راتیں جاگ کر بسر کر چکا تھا اس لیے نیند کے مارے اس کا برا حال تھا - اس کی آنکھیں بند ہو ہو جاتی تھیں - اچانک بادشاہ کی نگاہ اس پر پڑی - اس نے بیرم کو اس حالت میں دیکھ کر کہا -

" بیرم با من بہ شما می گویم "

بیرم خاں چونک پڑا - آداب بجالایا - اور عرض کی - قربانت شوم - بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ تین مقامات پر تین چیزوں کی حفاظت واجب ہوتی ہے، بادشاہ کے حضور میں آنکھوں کی، درویشوں کے حضور میں دل کی اور علماً کے سامنے زبان کی - میں حضور کی ذات میں تینوں صفات موجود پاتا ہوں - اس لیے سوچ رہا ہوں کہ کس کس کی حفاظت کروں - اس جواب سے ہمایوں خوش ہو گیا اور تکدر کے تمام آثار اس کے چہرے سے غائب ہو گئے - (مآثر الامرا جلد اول)

بیرم خاں اس دور کی سب سے بڑی شخصیت ہے - وہ ہمایوں کا دوست، سپہ سالار، مشیر اور وزیر تھا - دونوں کے دونوں علم پرور اور ادب نواز تھے - ان کی آپس میں علمی اور ادبی موضوعات پر خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی - جب ہمایوں کی قسمت نے پلٹا کھایا اور اس کا ستارہ عروج پر آنے لگا تو اس نے فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی - کامران کے خلاف مہم جاری کی اور قندھار پر حملہ کیا - بیرم خاں اس وقت کسی اور مہم میں مصروف تھا - ہمایوں نے بڑی سمجھداری سے فوج کو لڑایا اور قندھار کو محاصرے میں لے لیا - یہ قلعہ بہت مضبوط تھا - اس کی فصیل سات گز چوڑی تھی - اس لیے بعض امیروں کا خیال تھا کہ اس کا تسخیر ہونا کچھ آسان بات نہیں - مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قندھار پر شاہی پرچم لہرانے لگا - ہمایوں کو اس سے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی - اس نے اس خوشی میں اپنے دیرینہ رفیق اور وفادار سپہ سالار کو بھی شریک کرنا چاہا - اور ایک خط میں فتح کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی یہ نظم جو اسی واقعہ کے متعلق تھی بیرم خاں کے پاس روانہ کی ؎

باز فتح ز نصیب بوئے نمود — کہ دل دوستاں از و بکشود
شکر للہ کہ باز شادانیم — بر رخ یار و دوست خندانیم
دشمناں را بکامِ دل دیدیم — میوۂ باغِ فتح را چیدیم

---

[1] طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۸۴ - ۸۵ -

روز نو روز بیرم است امروز — دل احباب بے غم است امروز
ہمہ اسباب عیش آمادست — دل لشکر و صالت افتادست
گوش خرم شود ز گفتارت — دیدہ روشن شود ز دیدارت
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم — عزم تسخیر ملک سند کنیم

ہر درے بستہ کشادہ شود

ہر چہ خواہیم ازاں زیادہ شود

اس خط کے حاشیے پر اپنی یہ رباعی بھی درج کی ہے

اے آنکہ انیس خاطر محزونی

چوں طبع لطیف خویشتن موزونی

بے یاد تو نیستم زمانے ہرگز

آیا تو بہ یاد من محزوں چونی

بیرم خاں نے خط پڑھا۔ اس کا جواب لکھا اور آخر میں اپنی یہ رباعی درج کی ہے

اے آنکہ بذات سایۂ بے چونی

از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی

چوں می دانی کہ بے تو چوں می گذرد

چوں می پرسی کہ در فراقم چونی

ہمایوں کو علم نجوم اور ریاضی کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ایک طالب علم کی طرح یہ علوم حاصل کیے اور ان کا مطالعہ زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھا۔ چرخیات اور فلکیات کے اس مذاق کی بدولت ملک میں علم ہیئت کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اس کے مطالعہ میں اکثر لوگ دلچسپی لینے لگے اور ان علوم کا چرچا شاہی دربار سے نکل کر ملک میں عام ہو گیا۔ ہمایوں نے عملی طور پر تجربات کیے۔ کرے اور اصطرلاب بنوائے۔ اس کے بعد ان کا رواج مدارس میں عام ہو گیا۔ وہ خود بھی ایک خاص قسم کے اصطرلاب کا موجد ہے جسے اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں۔

ہمایوں کے زمانے میں لاہور اصطرلاب سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بنے ہوئے کرے اور اصطرلاب آج بھی بعض عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کی لائبریری میں ۱۶۴۹ء کا بنا ہوا ایک اصطرلاب موجود ہے جس پر یہ کتبہ کندہ ہے :-

" عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ

الہ داد اصطرلابی ہمایونی لاہوری ۱۰۵۹ھ "

اس خاندانی اصطرلاب کے بارے میں تاریخ کی ورق گردانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آئین اکبری سے فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ

جنت آشیانی ہمایوں کے زمانے میں مولانا مقصود ہروی مشہور اصطرلاب ساز تھے۔ یہ اصطرلاب، کرہ اور دوسرے ہیئت اور نجوم کے آلات کی تجارت کرتے تھے۔ ان میں بعض اصطرلاب ایسے بھی ہوتے تھے جو لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ ضیاء الدین اور اس کے خاندان کے بنائے ہوئے اصطرلاب اور کرے ہندوستان کے بعض اور کتب خانوں کی بھی زینت ہیں۔ چنانچہ نواب سالار جنگ بہادر حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں ایک اصطرلاب ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

"صنعت استاد الہ داد اصطرلابی لاہوری سنہ ۹۷۵ھ"

استاد الہ داد کا زمانہ اس کتبے کی رو سے اکبر کا دورِ حکومت ہے۔ اس مشہور استاد کے باپ ملا قائم محمد کا بنایا ہوا اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید اللہ ہاری کے پاس تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے اسے خود دیکھا تھا۔ اس پر یہ عبارت درج ہے:۔

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الہ داد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۹۳۳ھ"

قائم محمد کا تیار کیا ہوا کرہ بانکی پور کے مشہور کتب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں تیار ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف یہ کتبہ منقوش ہے:۔

"تمت این کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب کہ جمیع از ان چہل و ہشت صورت مرصودہ نمودہ اند۔ اہل (۹) علما و حکماء نجیم چنانچہ مرصودہ در رصد مرزا الغ بیگ است در تقویم بہ کوکب ثابتہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکماء و علما این فن تا این تاریخ سنہ ۱۰۴۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے اور ہر ستارہ اور برج کے نزدیک چاندی کی میخ ہے۔

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین کے بنائے ہوئے کرے اور اصطرلاب بھی ادھر اُدھر مل جاتے ہیں۔ پھلواری شریف میں اس کا بنایا ہوا کرہ مولوی یوسف صاحب کے کتب خانے میں ہے۔ اس کا وزن سوا پونڈ ہے۔ یہ کرہ اس خاندان کے قبضے میں ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۳ء سے چلا آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں (جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے) ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء کا بنا ہوا ایک اصطرلاب ہے۔

اسی طرح جلیبہ کالج علی گڑھ میں بھی اس کا بنایا ہوا ایک کرہ موجود ہے جو ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء میں تیار ہوا تھا۔ ۱۰۷۱ھ کا بنا ہوا ایک کرہ برلین کے عجائب خانے میں ہے۔ اس کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے بعض اور کتب خانوں میں بھی لاہور کے اس مشہور اصطرلاب ساز خاندان کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خاندان کا آغاز شیخ الہ داد کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جس کا تعلق ہمایوں بادشاہ سے تھا۔ اس کا بیٹا ملا عیسیٰ تھا جو اپنے وقت کا فاضل اور عالم تھا۔ علم کی دولت کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خاندانی فن سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ اس خاندان کا آخری فرد جسے کرہ اور اصطرلاب سازی میں ناموری حاصل ہوئی وہ ضیاء الدین محمد تھا۔ وہ قائم محمد کا بیٹا تھا اور ملا عیسیٰ کا پوتا۔ اس نے شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ پایا۔ اس خاندان کی بدولت کرہ سازی اور اصطرلاب سازی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ (اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء)

ہمایوں کے اس مذاق کو دیکھ کر شعراء نے ان علوم و فنون کی اصطلاحات کو اپنے قصیدوں میں بڑی بے تکلفی سے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیرم خاں نے ہمایوں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں یہ مصطلحات بڑی بے تکلفی سے استعمال کی ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس قصیدے کا ایک حصہ ہمارے لیے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے ؎

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار
آں بدر کز میانہ شہابش کند گذار
با آنکہ می کنند بہ دخور برابری
آمد بجاں ز حلقہ بگوش شاں شہریار
تا رو بہ چشم کوکبہ آفتاب را
چوں مہچہ لوای شہنشہ نامدار
پیوستہ آسماں و زمیں زیر حکم اوست
ہمچوں نگین خاتم شاہ جم اقتدار
برکف نہادہ خواں زری بہ زر اشرفی
تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف
بر درگہش سپہر نہد روی انقیاد

اس ترقی اور ہمایوں کی سرپرستی کے باوجود اس دور کے مدارس اور علماء کا حال بہت کم دستیاب ہوتا ہے کیونکہ ہمایوں جب تک ہندوستان میں رہا اسے چین سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ تاہم لاہور ایک علمی مرکز ضرور بنا رہا۔ اس دور کے جن عالموں نے اشاعت علوم و فنون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کا حال درج ذیل ہے:۔

سید عبداللہ لاہوری ہمایوں کے زمانے میں لاہور کے حالات بڑے پر آشوب تھے۔ ان حالات میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود بعض علماء نے اس مشعل کو روشن رکھا اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔ ان میں سید عبداللہ لاہوری کا نام سر فہرست ہے۔ آپ سید عبدالخالق بخاری کے فرزند رشید اور سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے۔ معقولات اور منقولات میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ

"تمام عمر شریف خود در تعلیم و تدریس فقہ و حدیث و تفسیر بسر بردہ۔"[1]

آپ نے دولت دنیا کی کبھی پروا نہ کی، نہ کسی امیر اور وزیر کے سامنے دست سوال دراز کیا مگر اپنے دروازے سے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیا۔ آپ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار شیخ جان محمد لاہوری کے مزار کے پاس واقع ہے۔

[1] علمائے ہند صہ ۱۰۳۔

شیخ حمید سنبھلی آپ سنبھل کے جلیل القدر فرزند ہیں۔ وقت کے علامہ اور تفسیر میں یکتا ئے روزگار تھے۔ قرآن کریم کی باریکیوں کو خوب کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا۔ ہمایوں آپ کا بہت معتقد تھا۔ جب ہمایوں شاہ طہماسپ صفوی کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ مسخر کرنے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھا تو آپ اس سے ملنے کے لیے کابل گئے۔ راستے میں کچھ عرصہ لاہور ٹھہرے۔ تفسیر اور قرآن کے عاشق آپ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کے اصرار پر کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور انہیں پڑھایا۔ یہاں سے چل کر آپ کابل پہنچے۔ بادشاہ سے ملاقات کی۔ ایک دن آشفتہ ہو کر بادشاہ سے کہا :۔

"بادشاہم! تمام لشکر شما را رافضی دیدیم"

بادشاہ نے پوچھا۔ یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

"ہر جا نام لشکریان شما یار علی بخش علی حیدر علی
یافتم در ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاران دیگر بودہ باشد"[۱]

بادشاہ کو غصہ آیا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے زمین پر پھینکا اور کہا کہ میرے دادا کا نام عمر شیخ ہے۔ مجھے اور کسی کا پتہ نہیں۔

عہد جلال الدین اکبر ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کرنے اور مدارس کو فروغ دینے والا اکبر ہی ہے۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ علوم و فنون کی تاریخ ایک نیا ورق الٹتی ہے اور تعلیم کو غیر معمولی طور پر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ہمیں یہاں اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس دور میں تعلیم کو جس قدر فروغ حاصل ہوا اس میں سیاسی اغراض کو قطعاً دخل نہ تھا۔ تعلیم آزاد تھی۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ نہ حکومت اس میں دخل دینا گوارا کرتی تھی نہ اہل تعلیم اسے برداشت کر سکتے تھے کہ تعلیم اس طرح ہو جس طرح حاکم وقت چاہتا ہے۔

اکبر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ امی محض تھا مگر یہ دعویٰ بالکل بے اصل معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس صورت میں کہ ہمایوں خود عالم و فاضل تھا۔ علم اس خاندان کی میراث تھا اس نے بیٹے کی تعلیم کے لیے پورا پورا بندوبست کیا، جب بھی اکبر کے کسی علم سے کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی ہمایوں نے اسے ہٹا کر دوسرا عالم مقرر کر دیا۔ اس حد تک تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اکبر کھیل کود اور سیر و شکار کا زیادہ شوقین تھا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اکبر حرف شناسی تک نہ جانتا تھا۔ ہاں جب ہم اس کا مقابلہ اس خاندان کے دوسرے شہزادوں سے کرتے ہیں تو وہ علم کی دولت کے لحاظ سے بالکل بے مایہ نظر آتا ہے۔ اور اگر اس پر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ جاہل و امی تھا تو کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اکبر نے یہاں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ کیا، کوئی جاہل یا امی انسان کر سکتا ہے؟ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے

۱۔ دربار اکبری۔

"بادشاہ نے حرف آموزی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جس کی بدولت بچے برسوں کی تعلیم مہینوں میں ختم کر لیتے تھے۔" ؎۱

اکبر نے بادشاہ بننے کے بعد اپنی تعلیمی کمی کو کئی صورتوں سے پورا کر لیا تھا وہ علوم و فنون کا سرگرم حامی، بہت زیادہ شوقین اور قدردان تھا۔ اس سلسلے میں بڑے سے بڑا فاضل بادشاہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فارسی ادب کی تمام مشہور اور معیاری کتابیں سنیں ان میں سے چند ایک کا ذکر ہمیں آئین اکبری میں ملتا ہے۔ مثلاً - بزم نامہ - حدیقہ حکیم سنائی - کیمیائے سعادت - گلستان اور بوستان - شاہنامہ فردوسی - خمسۂ نظامی، مثنوی مولانا روم - جام جم - خمسۂ امیر خسرو - کلیات جامی - کلیات خاقانی - دیوان انوری، مکتوبات شرف الدین یحییٰ منیری اور تاریخ کی تقریباً تمام مستند کتابیں۔ ان کتابوں میں سے ہر روز اسے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ یہ ایسا معمول تھا جس میں اکبر نے کبھی فرق نہ آنے دیا۔ جہاں پڑھنے والا کتاب کو ختم کرتا وہاں اکبر اپنے ہاتھ سے نشان بنا دیتا اور جب کتاب ختم ہو جاتی تو اپنی جیب سے پڑھنے والے کو انعام دیتا۔ نقیب خاں عام طور پر اسے تاریخ سنایا کرتا تھا۔ اس طرح کتابیں سن سن کر اس کا مطالعہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ کوئی تاریخی واقعہ ہو یا علم و فن کی بات، تصوف کا مسئلہ ہو یا علم و حکمت کے نکات، فلسفہ ہو یا الٰہیات اکبر ان پر مربوط تقریر کرتا۔ ہر پہلو سے بحث اٹھاتا۔ اور اس میں پورے انہماک اور سرگرمی سے حصہ لیتا۔

اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے زمانے میں بعض یگانۂ روزگار ہستیاں اس کے گرد و پیش جمع ہو گئی تھیں۔ علاوہ ازیں اس کا زمانہ کتنا ہی پر عظمت کیوں نہ ہو مگر درحقیقت یہ زمانہ علمی اور فنی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھا۔ اسی بنا پر اکبر کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ ہندوستان میں آلِ بابر کی حکومت علم پروری معارف نوازی کی ایک مسلسل تاریخ ہے لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کا یہ قصر رفیع اکبر جیسے کم سواد بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوا۔ اس کی توجہ، مربیانہ سرپرستی اور قدردانی کی بدولت ایک طرف تو سنسکرت اور عربی زبان کی مشہور کتابوں کے تراجم فارسی میں ہوئے، دوسری طرف فارسی زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان تصانیف کی کثرت کو دیکھ کر ایک فاضل مستشرق ڈاکٹر لینے اسے فارسی ادب کی "ہندی بہار" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اس عہد میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لیے جا بجا مدارس قائم ہوئے اور تعلیم میں نئے نئے تجربات کیے گئے۔ یہ اکبر کی طبیعت کی اپج کہیے یا جدت طرازی کا جذبہ کہ اس نے انسان کی حقیقی زبان معلوم کرنے کے لیے گنگ محل قائم کیا اکبر نے پہلی مرتبہ یہ کوشش کی کہ تعلیم عام ہو۔ اس نے اس سلسلے میں پوری توجہ مرکوز کی، پورے خلوص کے ساتھ تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے مقابل میں اس کی ساری فتوحات اور سرگرمیاں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے زمانے میں عام سکولوں کا رواج ہوا۔ مشترکہ سکول جاری ہوئے جن میں ہندو اور مسلمان ایک ہی استاد کی خدمت میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف طلبا کے لیے مختلف قسم کے نصاب

؎۱ آئین اکبری جلد اوّل آئین ۲۵ -

مقرر کیے۔ چنانچہ ہندوؤں کے لیے بھی ایک خاص نصاب مقرر ہوا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے، علامی ابوالفضل لکھتا ہے:۔

> "اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی، تاریخ مرتبہ بہ مرتبہ پڑھیں اور ہندی علوم میں سے بیاکرن، نیائے، بیدانت، پاتنجلی کا مطالعہ بھی کریں۔"[1]

اس قسم کے قوانین نے مدرسوں اور مکتبوں میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا، اور یہی سلطنت کی رونق کا باعث بن گئے۔ چنانچہ ابوالفضل بڑے فخر کے ساتھ لکھتا ہے:۔

> "ازیں طرز آگہی مکتب را رونق دیگر گرفت و مدرسہ را فروغ تازہ یافت۔"[2]

دورِ حاضر کا ایک ہندو فاضل اکبر کے اس اقدام کو سراہتا ہوا یوں رقم طراز ہے:۔

> "یہ اکبر کی دور اندیشی اور منظم حکمت عملی تھی کہ اس کی بدولت ہندی علوم و فنون کی حفاظت کا انتظام ہو گیا اور ہندو نوجوانوں کی تعلیم کا ان کی اپنی تہذیبی روایات کے مطابق خاطر خواہ بندوبست ہو گیا۔ اور پھر اکبر نے ہندو اور مسلمان طالب علموں کے لیے مشترکہ تعلیم بھی رائج کی۔ اس نے عبادت خانہ بنوایا جہاں ہندو علماء کے ساتھ بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس نے ہندوؤں کی قدیم کتب کے ترجمے کا حکم دیا جس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندو تہذیب کا بڑا قدردان تھا اور اس کی اشاعت کے لیے بڑے جوش و خروش سے کوشاں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ممتاز علماء اور فضلا کو جو فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری میں خاص طور پر مشہور تھے شاہانہ سرپرستی میں لے کر ان کی تربیت کی۔"[3]

اکبر کے عہدِ حکومت میں ایک اور بڑا انقلاب آیا جس نے اس ملک کی تہذیبی اور ثقافتی روایات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ تعلیم ثقافت کا سب سے بڑا مظہر ہے اس لیے اس کا متاثر ہونا بھی ضروری تھا۔ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں راجہ ٹوڈرمل نے اپنی مشہور مالی اصلاحات کا ڈھانچہ پیش کیا۔ اکبر نے انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایک فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی ایک شق تھی کہ تمام مملکت کے طول و عرض میں فارسی زبان کو دفتری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ آئندہ سے ہر مقام، ہر جگہ اور ہر دفتر میں ہر قسم کارروائی فارسی زبان میں ہوا کرے گی۔ اس سے قبل دفتر کا تمام کام ہندی زبان میں ہوتا تھا۔ اب ہندی کو یک قلم ترک کر کے فارسی اختیار کیا گیا۔

فارسی کو سرکاری درباری زبان بنانے کے لیے سب سے پہلا کام کشمیر کے نیک نہاد سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ نے

---

[1] [2] ۔ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۲۰۲۔

[3] N-N-LAW, PROMOTION OF LEARNING UNDER MOHAMMADAN RULE, P.171.

اُٹھایا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لیے اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں سلطان سکندر لودھی نے فارسی کو رائج کرنے کی کوشش کی مگر خود اس کے افغان امیر اس اقدام کے خلاف تھے۔ اس لیے ایک محدود طبقے کے سوا کسی نے بھی اس سلسلے میں سلطان سے تعاون نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے فارسی کو اختیار بھی کیا وہ بھی اپنے دفتروں کا تمام ریکارڈ ہندی میں لکھتے تھے۔ اکبر کے فرمان کا یہ اثر ہوا کہ ہندی کی جگہ فارسی کو دے دی گئی اور دفتری زبان تبدیل کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی کیونکہ فارسی دان پہلے سے موجود تھے۔ ہندی میں وہ ریکارڈ پہلے سے رکھ رہے تھے۔ اس لیے آناً فاناً سارا ریکارڈ فارسی میں منتقل ہو گیا۔

فارسی زبان اختیار کرنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ سوا اعلیٰ تعلیم کے باقی ساری تعلیم فارسی میں ہونے لگی۔ ہندوؤں نے فارسی سیکھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانی تمدن و معاشرت سے متاثر ہوئے۔ تنگ نظری، تنگ دلی جن کا شکار وہ صدیوں سے چلے آتے تھے ان میں کسی حد تک کمی واقع ہونے لگی۔ اس کے علاوہ ایک نئی ثقافت عالم وجود میں آئی جس کی بنا ایک زبان بنی جسے ہندو اور مسلم پڑھا لکھا طبقہ بولتا، اسی میں اظہار خیال کرتا اور اسی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتا تھا۔ اسی ثقافت کو وہ اپنی میراث سمجھتا اور اسی کا دلدادہ تھا۔ آخر سنہ ۱۸۰۰ء میں انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے یک زبانی تہذیب کی بجائے سہ زبانی تہذیب ملک میں رائج کی۔ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ قائم کیا جس کے بعد ہندی اردو تنازعہ پیدا ہوا اور اسی میں پھر بنگالی بھی شریک ہو گئی۔

فارسی کی بدولت ہندوؤں کے ہاں ادب کا بڑا شستہ مذاق پیدا ہوا۔ اکبر کے زمانے میں منوہر، جو راجہ لون کرن والیئے سانبھر کا بیٹا تھا بڑے عمدہ شعر کہتا تھا۔ وہ کبھی اپنے آپ کو میرزا منوہر اور کبھی محمد منوہر کہتا اور اس پر فخر کرتا۔ اس کا ایک شعر سننے کے قابل ہے [1]

یگانہ بودن و یکتا شدن ز چشم آموز
کہ ہر دو چشم جدا جدا نمی نگرند

تعلیم کے سلسلے میں اکبر نے کچھ نئے تجربات بھی کیے۔ ان میں سے سب سے اہم تجربہ بچوں کی تعلیم کا ہے۔ بچوں کی تعلیم ہر قوم میں بڑی اہم رہی ہے اور اس کے بارے میں اکثر تجربات ہوتے رہے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اکبر نے جو طریقہ ایجاد کیا وہ آجکل کی ابتدائی تعلیم سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا جن کی زبان ہندی تھی اور اس زبان کو مسلمانوں کی زبانوں کے خلاف بائیں سے دائیں طرف لکھا کرتے تھے۔ حروف تہجی بھی بہت حد تک مختلف تھے۔ اس لیے فارسی حروف ہندو بچوں کو سکھانا اور ذہن نشین کرانا قدرے دشوار تھا۔ چنانچہ حروف شناسی کو آسان بنانے کے لیے اکبر نے یہ ہدایت کی کہ استاد شروع شروع میں بچوں کو مفرد حروف کی شناخت کرائے۔ پھر اعراب اور مرکب حروف بتائے اس کے بعد چھوٹے چھوٹے جملے سکھائے۔ بعد میں اشعار اور لمبی لمبی عبارتیں پڑھوائے۔ جب یہ طریقہ تعلیم آزمایا گیا تو اس میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ بچے جو چیز برسوں میں حاصل کرتے تھے وہ اب مہینوں اور ہفتوں میں حاصل ہونے لگی۔ ابوالفضل

[1] بدایونی جلد سوم صفحہ ۲۰۱ - مآثر الامرا جلد سوم ص ۱۱

اس آئین کو بڑی تفصیل کے ساتھ یوں لکھا ہے :-

"تمام ممالک میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بچے سالہا سال مکتب میں گزارنے میں اس طویل مدت کے بعد وہ صرف حروف مفردات اور چند اعراب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بچوں کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ صرف اور ضائع ہو جاتا ہے۔

"جہاں پناہ نے حکم دیا کہ پہلے لڑکوں کو حروف تہجی لکھنا سکھایا جانے اور اس امر کی کوشش کی جائے کہ وہ حروف کی مختلف شکلوں اور شوشوں سے بخوبی واقف ہو جائیں اس طرح لڑکے ابتدا میں فقط حرف کی شکل اور اس کا نام یاد کریں دو روز میں تمام حروف تہجی ختم کرکے وہ حروف کے جوڑ اور پیوند لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔

"ایک ہفتہ اس پر عمل کرنے کے بعد طالب علم میں اس قدر استعداد ورد اغیب ہو جاتی ہے کہ وہ کسی نثر یا نظم کا ایک حصہ یاد کر لیتا ہے۔ اس امر کی بجد کوشش کی جانی چاہیئے کہ بچہ خود بخود حروف کا جوڑ بند پہچانے اور انھیں ملا کر الفاظ کو نکالے اور بخوبی سمجھ کر سکے۔ ان امور میں استاد کو بہت کم مدد دینا چاہیئے۔ استاد ہر روز پانچ امور پر توجہ رکھے اور ان کی نگہداشت کرتا رہے۔ حروف کی شناخت۔ الفاظ کے معنے مصرع، شعر اور آموختہ، غرضکہ اس طریقہ تعلیم کے مطابق ایک سال کا نصاب ایک مہینے میں ختم ہو گیا۔ اور اہل علم حیرت زدہ ہوئے۔"[1]

اکبر کے آخری ایام کا ایک فاضل شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ کرتا ہوا بتاتا ہے۔ کہ یہ تعلیم کیسے شروع ہوئی مجھے کس طرح ابتدائی مراحل طے کرائے گئے اور پھر کس طرح میں نے علم کی منزل مقصود کو پایا۔ وہ اپنی مشہور کتاب اخبار الاخبار کے آخر میں مجمل طور پر یوں فرماتے ہیں کہ

"حروف تہجی کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن پاک کے مرکب حروف سے میری تعلیم کا آغاز ہوا بہر سعد والد روزانہ قرآن کریم کی چند سطریں لکھ کر مجھے پڑھاتے میں نے اس طریقے سے حروف تہجی کی شناخت کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم شروع کی اور اس میں میرے والد کو بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس طریقہ سے مجھے قرآن کریم کے دو تین جز پڑھائے۔ ان کی بدولت قرآن پڑھنے کا ملکہ مجھ میں اچھی طرح پیدا ہو گیا۔ قرآن پاک جسے عام طور پر بچے برس ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصے میں ختم کرتے ہیں میں نے اسے دو تین مہینوں میں ختم کر لیا۔"[2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اس کے بچوں کو حروف تہجی رٹائے جائیں اور اس کے بعد انھیں ا ب ت کی شکلیں بتائی جائیں کیوں نہ ان کے سامنے الحمد، اللہ وغیرہ الفاظ لکھ کر ان کی پہچان کرائی جائے۔ یہ

---

[1] آئین اکبری جلد اول آئین ۲۵ صفحہ ۱۴۳ - [2] اخبار الاخبار صفحہ ۳۱۱ -

بات تجربات چاہتی ہے۔ حضرت محدث کے والد اسے آزما چکے ہیں۔ اپنے مدارس میں اس کا تجربہ کرنا چاہیے شاید یہی طریقہ مفید ہو۔

اکبر کے زمانے سے پہلے دنیائے اسلام میں اور خاص کر ہندوستان میں تعلیم اور نصاب تعلیم میں بہت بڑا انقلاب آچکا تھا۔ قرآن اور قرآنی علوم کے ساتھ ساتھ معقولات، فلسفہ، منطق اور کلام کا مطالعہ ہونے لگا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں تغلقیہ حکومت ملتان کے دو فاضل مولانا عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ تلنبی سلطنت کے انقلاب کی وجہ سے بھاگ کر دہلی آگئے۔ مولانا عبداللہ دہلی میں اور مولانا عزیز اللہ سنبھل میں بیٹھے۔ دونوں نے مسند علم بچھائی۔ علم کے پیاسے خود بخود کھنچے ہوئے وہاں پہنچے۔ یہ دونوں بزرگ معقولات کے بڑے ماہر تھے اور انہی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اب ان کی بدولت معقولات کا چرچا ہونے لگا۔ علما کی توجہ بھی قرآن اور علوم قرآنی سے ہٹ کر فلسفہ، منطق اور علم کلام کی طرف ہو گئی چنانچہ ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

"فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آں مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ
و افسانہ رائج و مفروض"[1]

ان حالات میں حکمت اور فلسفہ کا ایک طوفان اٹھ کر ایران و توران سے بھی ہندوستان میں داخل ہوا۔ کیونکہ یہاں کے حکمرانوں نے فلسفہ وغیرہ کا پڑھنا اور پڑھانا حکماً روک دیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل منطق و فلسفہ نے ایسی ایسی خفیف حرکتیں کیں جو نہ صرف علما کی متانت اور علم کے وقار کے منافی تھیں بلکہ ان سے صریحاً اسلام کا استہزا ہوتا تھا۔ یہ منطقی اور معقولی لوگ جب کسی نیک طینت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے "یہ گدھا ہے" اپنے اس دعوی کے ثبوت میں یہ منطقی دلیل پیش کرتے کہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں۔ پھر یہ گدھا نہیں تو اور کیا ہے؟ جب اس قسم کی حرکتیں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ اور علما نے توران کے بادشاہ عبداللہ خان ازبک سے استدعا کی کہ وہ منطق کا پڑھنا حرام قرار دے اور اس کے پڑھنے پڑھانے والوں کو ملک سے نکال دے۔ چنانچہ کئی معقولی جیسے قاضی ابوالمعالی، ملا مرزاجان، ملا عصام الدین، وغیرہ وہاں سے نکالے گئے اور ان میں سے اکثر ہندوستان چلے آئے[2]

جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو ایران کے علمائے متاخرین جیسے محقق جلال الدین دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث الدین منصور اور میرزاجان کی تصانیف اپنے ساتھ لائے اور یہاں درس جاری کئے جن میں لوگ بڑی کثرت سے شامل ہوئے۔ اس طرح منطق اور معقولات کا رواج یہاں عام ہو گیا۔

امیر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانے میں میر فتح اللہ شیرازی اس سلسلے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف اکبر کے مشیر مالیات تھے تو دوسری طرف وہ راجہ ٹوڈرمل کو سلطنت کا میزانیہ تیار کرنے میں مفید مشورے بھی دیا کرتے تھے۔ ان کاموں سے جو وقت بچتا وہ درس و تدریس میں صرف کرتے تھے۔ امیروں کے بچوں کو وہ خاص طور پر ان کے گھر جا کر پڑھاتے تھے۔ ویسے بھی کوئی ان کے پاس پڑھنے کے لیے آتا تو وہ دریغ نہ کرتے۔ اکبر نے ان کی خدمات سے خوش ہو کر عضدالملک کا خطاب عطا کیا۔ میر فتح اللہ شیرازی کو کام کرنے کا بہت کم وقت ملا کیونکہ وہ کشمیر سے واپس آتے ہوئے تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔

---

[1] بدایونی جلد دوم صفحہ ۳۰۶ - ۳۰۷ - [2] تاریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۰ -

حکیم الملک گیلانی | معقولات اور منطق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں لودھیوں کے زمانے میں ایک خاص انداز سے مدارج پذیر ہوتے گئے۔ ان کا دائرہ چند کتابوں تک محدود تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ تیموریوں کا عہد حکومت ہے۔ اس میں انھیں اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ صوفیوں کی خانقاہوں میں بھی اس قسم کی بحثیں چل نکلیں۔ چنانچہ ایک دن شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ایک مجلس برپا ہوئی اس میں حکیم الملک گیلانی بھی شریک تھے۔ حکیم موصوف نے شروع میں مذہب، فقہ، فقہا کے مقام پر گفتگو شروع کی۔ پڑھتے پڑھتے اس نے حکما کے طریقہ کی تعریف کی اور پھر علم حکمت کی عظمت کا تذکرہ کیا، اسی دوران میں اس نے شیخ بوعلی سینا کے بارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا مقام فقہا اور علمائے دین سے بہت اونچا ہے۔ یہ زمانہ بھی بڑا پُر آشوب تھا۔ کیونکہ ملک بھر میں علما اور حکما ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ ہر روز ان میں جھگڑے ہوتے، مناقشات پیدا ہوتے اور مجادلے تک نوبت پہنچی۔ ملا بدایونی ابھی نئے نئے دربار اکبری سے وابستہ ہوئے تھے۔ وہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے حکیم الملک کی تفریرپسی اور علما کی مذمت میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے تین عربی شعر پڑھے اور آخر میں انھوں نے مولانا جامی کی مشہور مثنوی تحفۃ الاحرار کا یہ شعر پڑھ کر سب کو خاموش کر دیا [1]

نور دل از سینۂ سینا مجو

روشنی از چشم نابینا مجو

شیخ نے ملا کی داد دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ معرکے خوب گرم رہتے۔ مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں اور دربار شاہی ان معرکوں کی صدائے باز گشت سے ایک مدت تک گونجتے رہے۔ آخر حکیم الملک نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا اور مذہب کی حمایت شروع کی۔ ۹۸۶ھ / ۱۵۷۹ء میں اسی موضوع پر اس کا مجادلہ ابوالفضل سے ہوا۔ حکیم نے ابوالفضل کی کج بحثی سے تنگ آکر اسے "فضلہ" کہا۔ ابوالفضل کی شکایت پر اکبر نے حکیم کو حج کے لیے روانہ کر دیا [2]

حکیم الملک جن کا نام شمس الدین تھا اکبر کے دربار میں طبیب، عالم اور منصب دار شاہی تھے۔ وہ اکبر کے معالج خصوصی بھی تھے۔ طب کے علاوہ ان کا محبوب مشغلہ بقول علمائے ہند [3]

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے۔"

اکبر کے زمانے میں معلمی اور مدرسی میں کتنی کشش تھی کہ بڑے بڑے منصب دار اور مقربان شاہی اپنے فرائض کی ادائگی کے بعد فالتو وقت اسی مشغلے میں صرف کرتے۔ وہ طلبہ کو بغیر معاوضے کے تعلیم دیتے اور پھر اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ انھیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور اپنے گھر سے کھلاتے اور ان کا اتنا خیال رکھتے کہ ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ یہ ایثار آج آپ کو نہ کسی درس گاہ میں نظر آئے گا اور نہ کسی یونی ورسٹی میں، ہاں قدیم طرز کی درس گاہوں میں اکثر ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی | ان تشویشناک حالات میں جب کہ دربار شاہی میں اسلامی علوم و فنون کی کوئی حیثیت نہ تھی اس زمانے کے علما اگر قرآن اور حدیث کی طرف رجوع بھی کرتے تو وہ اس غرض کے لیے ہوتا تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اس کی تفسیر کریں اور جو اقدام وہ کر چکے ہیں اس کا جواز قرآن پاک اور حدیث سے نکالیں، اسی

---

[1] بدایونی جلد سوم ص ۹۱۔ [2] بدایونی جلد دوم صفحہ ۲۷۵۔ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۵۔

رنگ میں تفسیریں لکھی گئیں۔ اسی انداز میں احادیث کو معانی پہنائے گئے۔ مدارس کے اندر یہی سلسلہ جاری تھا۔ فلسفہ اوج شباب پر تھا۔ اور قرآن اور حدیث کا درجہ ثانوی تھا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی دنیائے اسلام سے علوم و فنون کی سند فراغت لے کر ہندوستان واپس آچکے تھے اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے۔ انھوں نے ان تشویشناک حالات کو دیکھا۔ ان پر غور کیا۔ آخر انھوں نے ہمت کی اور نصاب تعلیم میں جو انقلاب آ رہا تھا اسے روکنے کا تہیہ کیا اور کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ پہلے کی طرح قرآن پاک اور حدیث کو علوم دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا جاتے اور علوم دین کے ہر طالب علم پر یہ حدیث نقش کر دی جائے کہ جس شخص نے قرآن کریم کی تفسیر میں اپنی رائے کو دخل دیا پس اس نے کفر کیا۔

انہی خطرناک حالات کا احساس حضرت مجدد الف ثانی کو بھی ہوا۔ انھوں نے بھی اپنے بعض دوستوں کو لکھا کہ ہم اور تم اپنے عقائد کتاب و سنت کے مطابق اس طور پر کہ علمائے حق نے کتاب اور سنت سے سمجھے اور اخذ کیے ہیں صحیح کریں کیونکہ ہمارا اور تمھارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابل اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے خیالات کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہی رکھتا ہے اور وہیں سے انھیں اخذ کرتا ہے[1]۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے دینی نصاب تعلیم میں پھر سے قرآن و حدیث کو سب سے مقدم قرار دینے کے لیے کام کرنا شروع کیا اور آپ نے بڑے زور و شور سے اعلان کیا کہ علم فقط وہی ہے جو دین و ملت کی تقویت اور بقا کا موجب ہو اگر وہ یہ مقصد پورا نہیں کرتا تو وہ کچھ نہیں۔ چنانچہ آپ نے اس اعلان کے ساتھ یہ شعر بھی درج کیا جو ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

علم دیں فقہ است و تفسیر و حدیث
ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

چنانچہ آپ نے اپنے مدرسہ میں اسی پر عمل کرنا شروع کیا اور ہر طالب علم اور دین دار پر یہ بات واضح کی کہ اگر علم حاصل کرنے کی غایت معاشی پریشانیاں دور کرنا اور مال و دولت کمانا ہے تو پھر علم کی بجائے زراعت، تجارت اور معماری وغیرہ کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے نصاب میں اہم تبدیلیاں کیں اور دوسرے علمائے حق کو اپنے ساتھ ملا کر اس نصاب کو کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر مدارس میں علوم قرآنی پڑھائے جانے لگے اور ان کی طرف خاص توجہ مبذول ہو گئی۔ ان درس گاہوں میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جس قدر طالب علم یہاں سے فارغ ہوتے، ان کے سامنے ایک خاص مسلک ہوتا جس سے سرمو تجاوز کرنا وہ پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اس تعلیم نے ان کے دلوں میں خدا کا خوف، آنکھوں میں حیا اور سینوں میں نور قرآن بھر دیا تھا۔ وہ فرض کو فرض سمجھتے اور اس کا بجا لانا عبادت سے زیادہ ضروری خیال کرتے۔ غیرت و حمیت، خودی و خودداری ان کے کردار کے نمایاں پہلو ہوتے۔ خلوص، للہیت اور ایثار وہ بلند مقاصد تھے جنھیں وہ برسوں ان مدارس میں پاک دل، پاک منش، خدا ترس اور خدا پرست اساتذہ کی زیر تربیت رہ کر حاصل کرتے۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ اس میں کسی قسم کی عار یا شرم محسوس نہ کرتے۔ اس کی بدولت انھیں اپنی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہوتا۔ وہ ہر قدم پورے اعتماد کے ساتھ اٹھاتے اور یہ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے نہ مشکل کو

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانیؒ دفتر اول مکتوب نمبر ۱۵۸۔

مشکل سمجھا نہ اس کے ڈر سے جو قدم آگے بڑھایا اسے واپس لیا۔ اس ملک کی آزادی میں انھی علما نے سب سے بڑھ کر کام کیا اور ہر تحریک میں انھی کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہو یا سید احمد شہید کی تحریک جہاد، خلافت کی تحریک ہو یا آزادیِ وطن حصولِ پاکستان کی جد و جہد، ان سب میں انھی مدارس کے فارغ التحصیل علما کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔ ان کی آتش بیانی نے ایسے خطرناک موقعوں پر عوام کے دلوں کو گرمایا جب کہ بڑے بڑے امیروں، سیاست دانوں اور مدبروں کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔

جیسوٹ مشن اکبر کے دور کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں الاقوامی حیثیت اختیار کرتا ہے اور اکبر کی سرپرستی میں یورپ کے کچھ پادری اس کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ یہ جیسوٹ تھے جو تبلیغ مذہب کے شوق میں یہاں آئے تھے اکبر نے خود ان کو گوا سے دعوت دے کر اپنے پاس طلب کیا۔ ان سے انجیل کے مطالب سمجھنے کی کوشش کی اور انھیں اجازت دی کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے مدارس جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں انھوں نے اپنا ایک مدرسہ جاری کیا۔ یہ پادری سنہ ۱۵۹۱ء میں لاہور آئے۔ اکبر نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ انھیں لاہور کے شاہی قلعہ میں رہنے کے لیے جگہ دی اور سامان خورد و نوش سے بے نیاز کر دیا۔

ان پادریوں نے یہاں مدرسہ جاری کیا جس میں امرا کے بچے تعلیم کے لیے آتے۔ ان میں اکبر کا اپنا بیٹا اور پوتا بھی تھے۔ یہ پادری نہ صرف ان بچوں کو عام تعلیم دیتے بلکہ پرتگالی زبان بھی سکھلاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکبر اور اس کا دربار عیسائیت قبول کر لیگا مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور وہ مایوس ہو کر گوا جانے کی تیاریاں کرنے لگے مگر سنہ ۱۵۹۴ء میں پادریوں کا ایک دوسرا گروہ یہاں وارد ہوا اور اس نے اس کام کو جاری رکھا۔ کچھ لوگ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہوئے۔ حلب کے ایک عیسائی میرزا سکندر نے اپنی کچھ جائداد اور چند سو روپے نقد اس مشن کو دیئے تاکہ وہ عیسائیوں کے قبرستان کے لیے جگہ خرید سکیں۔ چنانچہ سنہ ۱۰۲۱ھ/سنہ ۱۶۱۲ء میں موضع ہری چھلواری مہر ننگ میں بارہ بیگھے زمین مزروعہ ایک پختہ چاہ کے ساتھ خریدی گئی۔ اس زمین پر آجکل کیتھڈرل سکول اور اس کا ملحقہ گرجا ہے یہ قطعہ زمین ریگل سینما کے سامنے واقع ہے۔

سنہ ۱۰۲۲ھ/سنہ ۱۶۱۳ء میں جہانگیر ان سے ناراض ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پرتگالیوں کی ایک جماعت نے چار جہازوں پر ڈاکہ ڈالا جو مکہ مکرمہ سے حاجیوں کو لے کر واپس آ رہے تھے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے جس سے پادریوں اور پرتگالیوں کی چیرہ دستیوں کا ثبوت ملتا ہے جو انھوں نے مذہب کے نام پر روا رکھیں۔ ان حرکتوں کی بنا پر کبھی گرجے بند ہوتے اور کبھی شاہانہ مہربانی اور رواداری کی بنا پر واگذار کیے جاتے رہے۔ آخری مرتبہ "متعصب اورنگ زیب" نے اپنے جلوس کے چودھویں سال ایک فرمان کے ذریعے سے واگذار کیا۔ یہ فرمان یوں ہے:۔

> "فدا خان غلام عالمگیر پادشاہ سنہ ۱۰۸۱ھ/سنہ ۱۶۶[illegible]ء .... متصدیان حال و استقبال مہمات ہری پھلواری متعلقہ صوبہ دارالسلطنت لاہور بدانند کہ چوں دوازدہ بیگھہ زمین زرعی بایک چاہ پختہ و چندے درخت/از موضع جماعہ مہر ننگ ہری پھلواری مذکور حسب رہد پادری یوسف وغیرہ پادریان فرنگی واقع است بموجب فرمان در وجہ انعام آنہا برائے مقابر/وغیرہ مقرر شد۔ قدغن می رود کہ اراضیٔ مذکورہ را بدستور بہتیں/برطبق

فرمانِ مسلّم دانستہ احدے مزاحم و متعرض نہ گردد و تغیر و تبدیل بآں راہ ندہد۔ دریں باب موجب/معین دانستہ تخلف و انحراف جائز ندارند/ تحریراً فی التاریخ ششم ذی حجہ ۱۴ سنہ"

جیسوٹ پادریوں نے جو مدرسہ لاہور میں جاری کیا تھا اس کے محل وقوع کے بارے میں عام واقعہ نگاروں اور مؤرخوں کا خیال ہے کہ اورینٹل کالج کے مشرق کی جانب انارکلی بازار میں دھنی رام روڈ کے سامنے واقع تھا۔ اس کے ساتھ ایک گرجا بھی تھا۔ آج اس کی جگہ سینٹ فرانسس ہائی سکول اور کیتھولک چرچ واقع ہیں۔

پادریوں کی بدولت اس وقت کے نظامِ تعلیم میں معقولات کی گرتی ہوئی عمارت کو ایک مرتبہ پھر سہارا مل گیا۔ مگر یہ کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ نہ ہی اس سے کچھ عمدہ نتائج مترتب ہوئے کیونکہ اس وقت یورپ کا عام اندازِ تعلیم مذہب کی بالادستی پر مبنی تھا اور تعلیم کا سارا دارومدار عیسائیت پر منحصر تھا۔

اکبر وقتاً فوقتاً سیاسی اور ملکی ضروریات کے ماتحت لاہور آیا جایا کرتا تھا مگر سولھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں جب وسط ایشیا، افغانستان اور ایران کے باعث سلطنت تیموریہ کے سرحدی حالات کچھ ابتر ہو گئے تو اکبر نے پندرہ برس تک لاہور میں مسلسل اور مستقل قیام کیا تاکہ وہ یہاں رہ کر اپنے ہمسایہ ملکوں کے سیاسی حالات کی کڑی نگرانی کر سکے۔ یہ زمانہ درحقیقت لاہور کی تعمیر اور ترقی کا زمانہ ہے۔ دربار، دربار کے متعلقین، فوجی سردار، بڑے بڑے جاگیردار اور علما و فضلا سب کے سب آگرہ اور فتح پور سیکری کی سکونت ترک کر کے لاہور میں آباد ہو گئے۔

اکبر نے شہر کو آباد کیا۔ اس کے گرد فصیل بنوائی جسے حصار کہتے تھے۔ باغات لگوائے اور ہر قسم کے علوم و فنون کی مربیانہ سرپرستی کی۔ اسی دور میں لاہور میں بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے اور نزدیک و دور سے طلبہ جوق در جوق تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آنے جانے لگے۔ چنانچہ اس شہر کی رونق بڑھ گئی۔ ہر عالم اور ہر شاعر جو ہندوستان آتا، اس کی پہلی منزل لاہور ہوتی۔ ملّا عبدالنبی کہتا ہے کہ "یہ بات دنیا والوں کے درمیان شہرت رکھتی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ ہندوستان آئے جب وہ یہاں سے واپس جائے گا تو اس کے دل میں یہ تمنا باقی رہے گی کہ وہ ایک مرتبہ پھر اسے دیکھے۔" ایک اور مقام پر وہ کہتا ہے کہ "جن ایام میں میں مشہد مقدس میں مقیم تھا، ہر طرف سے مسافر اور تاجر آتے، ان کی زبان پر دارالامان ہند کی تعریف اور توصیف ہوتی تھی۔" (میخانہ ص ۵۰۱)

جب ملّا عبدالنبی ایران سے لاہور پہنچا تو وہ یہاں کے حالات سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"عجب ملکے بہ نظر این حقیر درآمد۔ ارزانی و فراوانی"

اسی طرح صاحب ہفت اقلیم امین الدین رازی لکھتا ہے:۔

"لاہور میں فضلا اور علما کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ وہ گنتی اور شمار میں نہیں آ سکتے"

(ہفت اقلیم خطی نسخہ ورق ۱۳۳ الف)

ملّا عبدالباقی نہاوندی خان خاناں کے دربار کی علمی، ادبی اور شعری دلچسپیوں کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے کہ:۔

"دراں وقت دارالسلطنت لاہور دار الشعراء گردید"

(مآثر رحیمی جلد سوم)

ان اقتباسات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لاہور اکبر کے وقت میں ایک بہت بڑا علمی اور ثقافتی مرکز بن چکا تھا۔ اس میں اکبر کی خاندانی روایات کو بہت دخل حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایران میں جو حالات صفوی خاندان کی بدولت پیدا ہو چکے تھے وہ بھی اس کے بہت حد تک ذمہ دار تھے۔ نیز علوم و فنون کی سرپرستی میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک مقابلہ اور مسابقہ سا ہو رہا تھا۔ ہر خاندان یہی کوشش کرتا تھا کہ وہ معارف نوازی، ادب پروری اور ثقافتی سرگرمیوں میں دوسرے سے بازی لے جائے۔ اس مسابقت میں خاندان تیموریہ ایران کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ ایران کے چوٹی کے علماء، فضلاء، شعراء اور باخود بخود ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آئے۔

مشرق میں شاہی دربار ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اگر عوام کے مزاج اور طبعی رجحانات کا اندازہ لگانا ہو تو دربار کی سرگرمیوں کا تجزیہ کر لیا جائے۔ اس واسطے کہ بادشاہ کے مذاق کے ساتھ ساتھ دربار اور عوام کا مذاق بھی بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اکبر کے امرا نے بادشاہ کی تقلید میں اپنا دست کرم بڑھایا۔ جن علما کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہو سکی، انھیں اپنے دربار میں جگہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر امیر کا دربار اسی رنگ میں رنگا گیا اور ہر طرف علم اور ادب کے چرچے ہونے لگے۔ معارف نوازی اور ادب پروری امارت کے لوازمات تھے اس دور میں عبدالرحیم خان خاناں، مرزا عزیز کوکلتاش، خان زمان علی قلی خان سیستانی، حکیم ابوالفتح گیلانی، ابوالفضل، فیضی اور دوسرے امرا کے علمی کارنامے ایک علیحدہ تفصیل کے متقاضی ہیں۔

اکبر کے زمانے میں لاہور میں ایک تازہ رونق پیدا ہوئی۔ اس کا سبب امن و امان اور سکون و طمانیت کی وہ دولت تھی جو ایک مدت کے بعد یہاں کے بسنے والوں کو نصیب ہوئی۔ اب علماء نے درس و تدریس کی مسند بچھائی اور علم کا نور سینوں میں بھر دیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار، شہید گنج، محلہ دارا شکوہ اور سلطان کی سرائے واقع ہیں، اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ نخاس کہلاتا تھا۔ یہاں ایک بزرگ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی درس دیا کرتے تھے۔ آپ کا احترام لاہور کا بچہ بچہ کرتا تھا۔ ملا بدایونی کے قول کے مطابق لوگ آپ کو اپنے وقت کا ولی سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل ہندوستان کے نومسلموں کی ایک غیر معروف جماعت ہے، یہ جماعت عام طور پر کول (علی گڑھ) میرٹھ اور سنبھل وغیرہ شہروں میں آباد ہے۔ بعض مورخوں کو بنی اسرائیل سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہودی ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ قرین قیاس یہ بات ہو سکتی ہے کہ ان کے آباء اجداد میں کوئی بزرگ اسرائیل کے نام سے ہوا ہو گا۔ اسی نسبت سے یہ اپنے آپ کو بنی اسرائیلی کہنے لگے بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ قرون ترکوں (تغلق) کے دور حکومت میں یہاں آباد ہوئے مگر یہ بات بھی بے بنیاد ہے۔ تاریخ کی مستند کتابوں میں ان کا تذکرہ اکبر کے زمانے میں ملتا ہے۔ بنی اسرائیل تعلیم و تعلم، علوم و فنون، تصوف و سلوک کے علاوہ خطاطی و نساخی میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے نامور عالم پیدا ہوئے جن میں سب سے زیادہ شہرت شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کو ہوئی۔

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کے والد مولانا فتح اللہ دانشمند تھے۔ آپ نے اکثر علوم اپنے والد سے حاصل کئے۔ جب وہ

فوت ہو گئے تو علم کا شوق کشاں کشاں آپ کو دیپال پور لے گیا جہاں آپ شیخ بایزید کے درس میں شریک ہوئے۔ جب آپ نے وہاں سے سندِ فضیلت حاصل کر لی تو آپ لاہور واپس آ گئے۔ اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ اسی دوران آپ نے شیخ اسحاق کاکو کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں، بختاور خاں صاحبِ مرآۃ العالم لکھتے ہیں :-

"بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کتب سلوک کا درس دیتے ہوتے تو آپ پر حالت طاری ہو جاتی اور آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے دو دو تین تین دن یہی حالت طاری رہتی، کھانا پینا حتیٰ کہ نماز تک چھوٹ جاتی۔ جب آپ حالت صحو میں آتے تو خادم سے قضا شدہ نمازوں کی تعداد پوچھتے۔ انھیں ادا کرتے اور درس و تدریس کے محبوب مشغلے میں محو ہو جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ پر روحانی غلبہ کی حالت میں ایک کیفیت طاری ہوتی۔ آپ چپ چاپ آباؤ اجداد کی قبروں کی طرف نکل جاتے۔ کسی ٹوٹی پھوٹی قبر میں لیٹ کر کپڑا اوڑھ لیتے۔"[1]

جن ایام میں اکبر نے اجتہاد کا دعوےٰ کیا اس نے دیگر علماء کے ساتھ آپ کو بھی اپنے حضور طلب کیا۔ آپ پالکی میں سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بعض موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکبر نے آپ سے پوچھا "انسان واصل بحق کیسے ہوتا ہے"؟ آپ نے جواب دیا "جیسے میں آپ کی خدمت میں پہنچ گیا"۔ بادشاہ نے کہا۔ یہ جواب بڑا مبہم ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا۔ آپ کے اور بندے کے درمیان طبقۂ امراء کئی طرح سے وسیلہ ہیں۔ میں نے وسیلہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر آپ تک نہ پہنچ سکا۔ جب آپ نے خود بلا لیا اور میں بغیر کسی وسیلے کے آپ سے واصل ہو گیا۔ اسی طرح انسان لاکھ کوشش کرے کہ واصل بحق ہو جائے لیکن جب تک حق تعالےٰ نہ چاہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے طلب ہو تو وہ مقصد کو پا لیتا ہے اور واصل بحق ہو جاتا ہے۔ بادشاہ نے بڑے اعزاز و احترام سے آپ کو رخصت کیا۔

جب آپ چلے آئے تو بادشاہ نے اپنے مقربین سے کہا کہ اس مردِ حق سے سلفِ صالحین کی بو آتی ہے۔[2]

شیخ اسماعیل نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تقویٰ و طہارت میں بسر کیا۔ لیکن جوانی کی پاکبازی اور کہولت کی متقیانہ زندگی کو بڑھاپے کے عالم میں ایک سخت حادثہ پیش آیا جس سے آپ کے وابستگان دامن کو سخت کوفت اور پریشانی ہوئی۔ جب آپ عالم پیری کی طرف بڑھے اور سر کے بال جھک گئے اور داڑھی پر سفیدی کا نور نمایاں ہوا تو طبیعت نے ایک دم پلٹا کھایا اور آپ کسی مطربہ پر عاشق ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر کے رندانہ زندگی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ آپ اس حد تک بڑھ گئے کہ شراب جیسی ناپاک چیز سے بھی پرہیز نہ رہا۔ شیخ کے بے شمار شاگرد تھے۔ انھیں سخت صدمہ ہوا جس طرح شیخ صنعان ایک ترسازادی کے عشق میں دیوانہ ہو گئے تھے اور ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کی اصلاح کے لیے کوشش کی تھی اسی طرح شیخ سعد اللہ کی اصلاح کے لیے بھی سب لوگ آمادہ ہوئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر کا محتسب بھی ان لوگوں میں شریک ہو گیا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں :-

---

[1] [2] مرآۃ العالم ورق ۴۸۷ -

"ایک دن آپ اس مُطربہ کے ساتھ شراب پی رہے تھے کہ محتسب اور طلبہ کی جماعت اکٹھی ہوئی اور دیوار پھاند کر اس مکان میں داخل ہو گئی جہاں یہ محفلِ ناؤ نوش جاری تھی۔ انھوں نے تمام آلاتِ طرب توڑ دیئے۔ وہ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کو گرفتار کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ شیخ نے کہا۔ اگر میں نے ایک غیر شرعی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو تم تین افعال کے مرتکب ہوئے ہو۔ اوّل تو بغیر اجازت دیوار پھاند کر اندر داخل ہوتے ہو۔ دوسرے تم نے اس سلسلے میں تجسّس سے کام لیا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ تیسرے دروازے کو کھٹکھٹائے بغیر یہاں چلے آئے ہو۔ تم میری نسبت سزا کے زیادہ مستحق ہو۔"

(منتخب التواریخ جلد سوم ص۵۳)

وہ جماعت شرمندہ ہو کر واپس چلی گئی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی۔ ایک مرتبہ پھر آپ حلقۂ درس میں آئے اور طلبہ میں علم کی دولت لٹانے لگے۔ اب آپ نے امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء العلوم کو اپنا دستور حیات بنایا۔ درس کے بعد جتنا وقت بچتا وہ عبادت اور ریاضت میں بسر کرتے۔

آپ بہت سی تصانیف کے مالک بھی ہیں۔ جن میں امام غزالی کی مشہور کتاب جواہر القرآن کی شرح خاص طور پر مشہور ہے۔ اکبر بھی آپ کی علمی شہرت سے متاثر تھا۔ اس نے ایک مرتبہ خلوت میں آپ کو باریابی کا شرف بخشا۔ منجملہ اور باتوں کے اس نے آپ سے یہ بھی سوال کیا کہ آپ کس قوم سے ہیں۔ شیخ نے بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ

"جماعت نوسندہ ہا"

جنھیں ہندی زبان میں کالستھ کہتے ہیں۔ اکبر کو آپ کی یہ بے تکلفی بہت پسند آئی۔ ملّا بدایونی کہتے ہیں:-

"مجھے آپ سے پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا میں نے آپ سے ملتان کی ویرانی لاہور کی آبادی، ملتان کے سلاطین لنگاہ خاص کر سلطان حسین کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے۔ آپ نے ان سوالوں کا جواب بڑی فصاحت و بلاغت سے دیا۔ مجھ پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔" (منتخب التواریخ جلد سوم ص۵۴)

شیخ سعد اللہ ہاتھ کے سخی اور دل کے نرم تھے۔ کبھی کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہیں گیا۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ معاش کے تمام ظاہری اسباب سے محروم تھے۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ مدد معاش قبول کریں مگر آپ نے ہر بار انکار کر دیا۔ بدایونی کے قول کے مطابق آپ تقریباً اسّی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ مگر صاحب مرآۃ العالم کا بیان ہے کہ بلفظ ذاکر یعنی ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ء) آپ کی تاریخ ولادت اور بلفظ حکیم یعنی ۷۸ برس آپ کی عمر تھی۔ اس حساب سے آپ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء یا ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں فوت ہوئے۔ شہر کے چھوٹے بڑے، ہر فرقہ اور ہر خیال کے لوگ آپ کے جنازے میں شریک تھے۔

شیخ اسحاق کاکو

آپ کے استاد شیخ اسحاق کاکو المتوفی ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل تھے۔ آپ بڑے متوکل اور متورع تھے۔ تمام عمر درس میں گزاری، تمام علوم و فنون کے جامع تھے۔ بڑے صوفی مشرب

بزرگ تھے، خود حق گو تھے اور حق گوئی کے حامی۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی سوال پوچھتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ ساری عمر کسی امیر یا وزیر کے گھر نہیں گئے نہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کہیں جا رہے تھے۔ ایک شخص نے آپ کو مزدور خیال کرتے ہوئے کہا۔ دودھ اور چاول کا یہ دیگچہ اٹھا لو اور میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ آپ نے چپ چاپ اسے اٹھا لیا۔ نہ زبان پر انکار تھا نہ دل میں نفرت، اس شخص کے پیچھے پیچھے اس کے مکان پر آ گئے اور دیگچہ اس کے حوالے کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس فعل سے میرا دل آئینے کی طرح صاف ہو گیا۔ بدی اور برائی کے داغ دھبے دھل گئے۔ آپ نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ مرنے کے بعد آپ کا مزار نخاس ہی میں بنایا گیا جسے ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے شہید کر دیا۔

شیخ اسحاق کاکو، جوانی میں شکار کے بہت دلدادہ تھے۔ وہ اس میں مصروف ہو کر بہت خوش رہتے۔ جب بھی آپ کو درس سے فرصت ملتی تو باز رکھتے اور دوسرے شکاری جانور رکھے۔ شکار کو نکل جاتے۔ اکثر شکار آپ پیادہ پا ہی کھیلتے تھے، کاکو آپ کے والد بزرگوار کا نام ہے۔ اہلِ لاہور آپ کی ولایت کے قائل تھے۔

ملا جمال تلوی

دورِ اکبری میں تلہ ایک بہت مشہور محلہ ہوا کرتا تھا۔ یہ محلہ وہاں واقع تھا جہاں آجکل دیوان رتن چند داڑھی والے کی سرائے اور باغ، چوبارہ چھجو بھگت، میو ہسپتال زنانہ و مردانہ، بھارت بلڈنگ اور گاندھی سکوئر واقع ہیں۔ اسی جگہ شیخ جمال تلوی کی درس گاہ تھی۔ آپ ہر قسم کے علوم و فنون میں کامل، علم تفسیر و حدیث میں ماہر اور فقر و سلوک میں بہرہ وافی رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ پورے بارہ برس تک آپ ہر روز مزار اقدس پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتے رہے خواہ طوفان ہو یا بارش، اس معمول میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کو طعام میسر نہ آیا۔ اس پر چند دن گذر گئے۔ بھوک کے مارے آپ کی طبیعت پریشان اور دل مضطرب ہو رہا تھا۔ آپ اسی عالم میں خانخاناں کے باغ کی طرف چلے گئے اور ایک توت کے درخت کے نیچے شاخ کو ہاتھ میں پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ توت کا موسم دو مہینے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اچانک درخت کی شاخوں میں سرسراہٹ سی ہوئی اور ایک نورانی وضع کا بزرگ درخت کی شاخ پر بیٹھا نظر آیا۔ جمال نے اس بزرگ کی جانب دیکھا۔ اس نے بڑے لطف اور مہربانی سے فرمایا۔

"جمال! کیا توت کھاؤ گے؟"

شیخ جمال نے جواب دیا۔

"ہاں!"

اس بزرگ نے شاخ کو جھاڑا۔ توت زمین پر گرے اور شیخ جمال نے انھیں چن چن کر کھانا شروع کیا۔ اس بزرگ نے ایک مرتبہ پھر شاخ کو ہلایا۔ توت اور گرے۔ مولانا جمال نے انھیں اٹھا کر پھر کھایا۔ حتیٰ کہ ان کی بھوک جاتی رہی۔ شیخ جمال کہتے ہیں کہ وہ حضرت شیخ علی ہجویری تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ پانچ روپے تمھارا یومیہ مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر آپ غائب ہو گئے۔ مولانا جمال تلوی فرماتے ہیں :۔

"از آں روز مردم از امرا و شاگرداں وغیرہ ہم ہدایہ می فرستند حساب می کنم

روزی پنج رو پیہ شود و سلہ[1]

آپ مشہور صاحب دل بزرگ حاجی مہدی کے قرابت داروں میں تھے۔ مولانا نے اوچ کے مشہور عالم ملا اسماعیل سے علوم و فنون حاصل کیے۔ ملا بدایونی کہتے ہیں کہ[2] "اس وقت وہ اپنے وقت کے اعلم العلما ہیں اور سب سے مشہور مدرس۔ آپ کا درس نزدیک و دور شہرت رکھتا ہے۔ آپ نے آٹھ برس کی عمر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اب (۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں) آپ کی عمر پچاس اور ساٹھ کے بیچ میں ہے۔ آپ بڑے خوش تقریر اور منطق گو ہیں اور معقولات و منقولات کی باریکیوں کو بڑی آسانی سے شاگردوں کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ بڑے شفیق استاد ہیں، قرآن پاک کے حافظ، صاحب تقویٰ و طہارت اور صلاح و فلاح ہونے کے علاوہ اخلاق حسنہ کے مجسم پیکر ہیں۔ فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی اصلاح اکثر مقامات پر آپ ہی نے کی ہے۔"

ملا بدایونی آپ کی تعریف ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں ؎

چہ بست بحث علم اگر تا فرق فرقدی رود
ذکر مولانا جمال الدین محار می رود

شیخ منصور لاہوری | شیخ منصور لاہوری اکبری دور کے ایک امیر کبیر تھے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے زندگی بسر کی۔ ایک مدت تک وہ مالوہ کے قاضی رہے۔ وہاں سے تبدیل ہو کر پنجاب میں بجوارہ اور عدود دامن کوہ کے نظم و نسق پر متعین ہوئے۔ جہاں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور وہ ترقی پا کر ادھر ادھر مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ اکبر نے انھیں ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی۔ ان کا علمی پایہ اس قدر بلند تھا کہ ملا بدایونی فرماتے ہیں:-

"ہندوستان میں جس قدر عقلی علوم رائج ہیں وہ ان کے ماہر تھے اور یہ علوم ان کے دماغ میں حاضر رہتے تھے۔ وہ خوش طبع، سلیم الفہم اور کشادہ دست تھے۔ امرا اور سرداروں سے بہت صحبت رکھتے تھے۔"

سرکاری خدمات کی وجہ سے انھیں اس قدر وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھ سکیں۔

مولانا علاؤ الدین | شیخ منصور کے ایک صاحبزادے مولانا علاؤ الدین تھے۔ افتادِ طبیعت کے لحاظ سے وہ اپنے باپ کی ضد تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس سے پرہیز کرتے تھے۔ اکبر نے انھیں ہر چند منصب پیش کیا مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ وہ درس و افادہ ہی میں مشغول رہے اور ساری عمر اسی شغل میں گزار دی۔ شاگردوں سے ان کا سلوک یہ تھا کہ جو کچھ جاگیر سے آتا سب طلبہ کی ضروریات پر صرف کر دیتے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ،

"از جملہ ملایان در ہند بعد از پیر محمد خان شیروانی و ملا نور محمد ہیچ کس دیگر بہ بذل و کرم و ایثار و انتثار ضرب المثل نہ شد۔" (بدایونی جلد سوم ص ۱۵۶)

---

[1] مراۃ العالم ورق ۴۹۰ - [2] بدایونی جلد ۳ ص ۱۰۵ -

شیخ منور لاہوری | آپ شیخ سعد اللہ بن اسرائیل کے بھانجے اور شاگرد تھے قرآن کریم کے حافظ اور ہفت قرأت کے ماہر تھے۔ بیس سال میں تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد مسند درس بچھائی اور تدریس علوم میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ آپ اکثر تفسیر کا درس دیا کرتے اور اس درس میں حافظے کی مدد سے تمام متداول اور مشہور تفسیروں کے حوالے پیش کرتے جو دوسروں کے لیے کرامت سے کم نہ تھا۔ آپ کی شہرت لاہور کی چار دیواری سے نکل کر ہندوستان گیر ہوئی اور اکبر کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اس نے آپ کو ملازمت کی دعوت دی مگر توکل و استغنا کے اس بادشاہ نے اسے قبول نہ کیا، درس و تدریس کے سلسلے کو اپنے لیے کافی سمجھا۔

جب ملک میں مذہبی اختلافات شروع ہوئے اور دربار اکبری علمائے سوء کی بدولت ہر قسم کی بدعتوں کا مرکز بن گیا تو آپ نے دوسرے علمائے حق کے ساتھ مل کر صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ انھیں مغلوں کے کالے پانی یعنی گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا جہاں آپ ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء میں دنیا کی گیر و دار سے آزاد ہو گئے۔

آپ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں۔ حدیث میں آپ نے مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح لکھی۔ اس کے علاوہ شرح بدیع البیان، شرح ارشاد قاضی بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ نے اکبر کے حکم سے معجم البلدان کا ترجمہ شستہ اور آسان فارسی میں کیا۔ اس ترجمہ میں ملا احمد ٹھٹھوی اور قاسم بیگ بھی آپ کے شریک کار تھے۔ یہ کتاب ملکوں اور شہروں کے حالات پر عربی زبان میں تالیف ہوئی تھی۔[1]

شیخ مبارک ناگوری | ناگور راجپوتانے میں ہمارے علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اب ایک گمنام سا قصبہ ہے اور اس کی شہرت وہاں کے ہیلوں کی وجہ سے ہے۔ شیخ مبارک اسی جگہ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ گھر سے تعلیم حاصل کر کے احمد آباد گجرات کا رخ کیا کیونکہ ان دنوں بڑے بڑے جید عالم اس جگہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۶ محرم ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) کو آگرہ پہنچے اور ایک مجذوب کے ایما پر وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پورے پچاس برس مسند درس پر بیٹھ کر لوگوں کو مستفیض کرتے رہے۔ یہیں ۹۵۴ھ میں فیضی اور ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں ابو الفضل پیدا ہوتے۔

سلیم شاہ سوری کے زمانے میں مخدوم الملک کو بے حد اقتدار حاصل ہوا۔ اس نے پوری قوت سے بدعتیوں، مہدویوں اور دوسرے بد عقیدہ لوگوں کا استیصال کرنا شروع کیا۔ شیخ مبارک آزاد خیال اور آزاد مشرب تھے ان کا سینہ تعصب کے داغ دھبوں سے بالکل پاک تھا۔ وہ سب سے ملتے۔ گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے ملاقاتیں کرتے۔ یہ بات مخدوم الملک کو بری طرح کھٹکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شیخ مبارک بھی اس کا ہمنوا ہو جائے اس مقصد کے لیے اس نے کئی طریقے اختیار کیے مگر شیخ نے اپنی وضع نہ بدلی۔ جب سید محمد مہدی کے خلفا میں سے شیخ علائی کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ اور ان کے قتل کا فتویٰ علما سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو شیخ مبارک نے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سلیم شاہ دل سے اس بات کا معترف تھا کہ شیخ علائی بالکل بے گناہ ہے مگر مخدوم الملک کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا، اس نے بات ٹالنے کے لیے معاملہ شیخ بڈھا بہاری

---

[1] مرآۃ العالم از بختاور خاں ورق ۴۸۸ھ - تذکرہ علمائے لاہور از مفتی محمد الدین فوق ص ۲۲

کے پاس بھیج دیا۔ اس پُرآشوب زمانے میں سلیم شاہ سوری، مخدوم الملک، شیخ بڈھا اور شیخ علائی محض چار شخصیتیں ہی نہ تھیں بلکہ یہ چار عناصر تھے۔ چار تحریکیں تھیں۔ چار رجحانات تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان کے معاشرہ اور دینی احوال کو بنانے اور بگاڑنے کا کام سر انجام دیا۔

شیخ مبارک کی مخالفت کا اثر یہ ہوا کہ مخدوم الملک ان کے درپے آزار ہو گیا اور مخالفت کا یہ طوفان اکبر کے ابتدائی ایامِ حکومت تک بپا رہا۔ اس سے جس قدر ہو سکا اس نے شیخ مبارک کو ستایا۔ اذیتیں پہنچائیں اور پریشان کیا۔ آخر خانِ اعظم میرزا عزیز کوکلتاش آڑے آیا اور شیخ کو پناہ ملی۔ اب مصیبتوں کا طوفان چھٹ گیا۔ دربارِ شاہی سے شیخ کا تعلق قائم ہو گیا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ پڑھنا پڑھانا شروع کیا۔

۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں کشمیر اور اس سے زیادہ قبائلی علاقے میں گڑبڑ ہوئی۔ اکبر لاہور آیا۔ یہاں اسے ایک طویل عرصے تک پھر قیام کرنا پڑا۔ شیخ ابوالفضل بھی ساتھ تھا۔ اسے باپ کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے ایک عریضے کے ذریعے باپ سے گزارش کی کہ وہ لاہور تشریف لے آئیں چنانچہ ۶ رجب ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) کو آپ لاہور تشریف لائے۔ ابوالفضل کے آباد کیے ہوئے محلے فضل آباد میں قیام کیا اور درس و تدریس کے محبوب مشغلے میں مشغول ہو گئے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ

"اب آپ علومِ ظاہری پر کم گفتگو کرتے تھے۔ درس و گفتگو کا موضوع توحیدِ باری تعالیٰ اور ذات و صفاتِ باری تعالیٰ ہوتا تھا۔ لاہور کے اکثر طالبانِ علم اور متلاشیانِ حق آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔" (خاتمہ آئین اکبری جلد سوم)

انھیں ایام میں شیخ مبارک بینائی سے محروم ہو گئے۔ دل کی بصیرت قائم تھی۔ آپ نے اپنی مشہور تفسیر منبع نفائس العیون یہیں لاہور میں مکمل کی۔ یہ تفسیر کبیر کی طرز پر ہے اور چار جلدوں میں ہے۔ ملا بدایونی کہتا ہے:۔

"جن دنوں شیخ یہ تفسیر لکھ رہے تھے آپ وظیفے کے طور پر ابنِ فارض کا قصیدہ تائیہ جو سات سو اشعار پر مشتمل ہے اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ کعب ابن زہیر اور دیگر وظائف پڑھا کرتے تھے۔" (بدایونی جلد سوم صـ ۷۴)

یہ سب نعتیہ قصائد ہیں۔ اس سے شیخ کے مذہبی عقائد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تفسیر آج ناپید ہے۔

آخری عمر میں شیخ کی گردن پر پھوڑا نکلا۔ گیارہ روز بیمار رہ کر ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ملا بدایونی لکھتا ہے:۔

"علامۂ بایں جامعیت بہ نظر نیامدہ" (ایضاً صـ ۷۴)

شیخ معقولات اور منقولات، ریاضی، منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ، علم شعر و معما اور علوم قرآنی میں اپنا عدیل و سہیم نہ رکھتے تھے۔ موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس فنِ لطیف کے سلسلے میں ہم نے جو سامان بہم پہنچایا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے۔ کسی دن ہم دکھائیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ منّو،

میاں تان سین اور دیگر عاودنوں کو بلا بھیجا اور انھیں کہا کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں۔ شیخ نے سب کو سنا۔ آخر میں میاں تان سین سے مخاطب ہوئے اور کہا۔

"شنیدہ ام تو ہم چیزے میتوانی گفت"

اس پر میاں تان سین نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ جسے سُن کر آپ نے کہا "ہاں کچھ جانوروں کی طرح بولیاں بول لیتے ہو"۔

شیخ علم قرآت کے بھی ماہر تھے۔ علم تجوید کا مشہور رسالہ شاطبیہ انھیں ازبر تھا۔ اس پر اکثر درس دیتے خود قرأت عشرہ کے ماہر تھے۔ قرآن پاک کے حافظ تھے۔ شیخ نے ہمیشہ علم کی آن اور عالم کے وقار کو بحال رکھا۔ وہ کبھی اور کسی صورت میں بھی بادشاہ یا ارباب دولت کے گھر نہیں گئے۔ البتہ ایک آدھ مرتبہ اکبر کے مجبور کرنے پر شاہی محل میں ضرور گئے۔ وہ بڑے سیر چشم اور فیاض تھے ان کی سخاوت اور دریا دلی عجیب و غریب طریقوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اپنے دستر خوان کے علاوہ ملازمین کے لیے ہر روز طعام کے ہزار طبق اور اس کے لوازمات تیار کرانے اور ان میں تقسیم کرتے۔ ان کے نوکر چاکر بیش قیمت زیورات، اعلیٰ کپڑوں کے تھان لیے ہر وقت حاضر رہتے۔ یہ انعام میں بانٹنے کے لیے ہوتے تھے۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ کسی امر ممنوع کے مرتکب نہ ہوتے۔ لباس میں بالکل تکلف نہ برتتے۔ دستار کے نیچے موٹے کپڑے کی ٹوپی اور قبا کے نیچے ویسا ہی کپڑا پہنتے تھے۔ ان کے دستر خوان پر ان کے لیے ہمیشہ مکی اور باجرے کی روٹی، اُبلا ہوا ساگ اور رشی چاولوں کا خشکہ ہوتا تھا۔

وفات کے بعد شیخ کو فضل آباد میں امانتاً سپرد خاک کیا گیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ سنہ ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں اس نگار نامہ (اکبر نامہ) کا معمار ابوالفضل، فضل آباد میں پدر گرامی اور مادر بزرگوار کی خواب گاہ پر حاضر ہوا۔ ان کے ارشاد کی بنا پر ان دونوں برگزیدگان الٰہی کے نقش اکبر آباد روانہ کئے۔ وہاں اسنے پُرانے ٹھکانے میں انھوں نے آرام کیا۔

بیل مفتاح التواریخ میں لکھتا ہے کہ شیخ مبارک فیضی اور ابوالفضل لاڈلی کے روضہ میں جو اکبر کے روضہ سے مشرق کی جانب کوس بھر کے فاصلے پر ہے دفن ہوئے مگر یہ غلط ہے۔ ابوالفضل کا اپنا بیان ہے کہ بابر بادشاہ نے جمنا کے اس پار چار باغ آباد کیا تھا۔ اس شگرف نامہ (آئین اکبری) کا نقاش وہیں پیدا ہوا۔ والد اور بڑا بھائی وہاں سوتے ہیں (آئین اکبری جلد سوم خاتمہ)

مّلا مبارک کی زندگی پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا دو تہائی حصّہ بڑی مصیبت اور پریشانی میں کاٹا مگر ان پر آشوب حالات میں بھی وہ سبق پڑھاتے رہے اور کتاب پڑھتے رہے یہی اُن کی زندگی کا مقصد عظیم تھا۔ اسے آپ نے عزیز رکھا اور معلمی پر فخر کیا۔ حالانکہ دربار میں انھیں بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مدرسی میں کوئی خاص کشش تھی کہ دنیاوی جاہ و جلال پر لات مار کر اکثر لوگوں نے اسی پر قناعت کی اور اگر کبھی کوئی سرکاری ملازمت میں آ بھی گیا تو اس نے فرصت کے اوقات میں اس مشغلے کو جاری رکھا۔ اس سے اس زمانے کے معلم کے مقام اور درجے کا پتہ چل سکتا ہے۔

ملا بدایونی برسوں آپ کے درس میں شریک ہوتا رہا جب شیخ مبارک فوت ہوئے تو اس نے بڑی منافقت سے کام لیتے ہوئے آپ پر چند بے بنیاد الزام لگائے۔ ان کی زندگی کے واقعات سب کے سامنے ہیں ان میں زمانہ سازی اور حبِ جاہ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اگر آپ زمانہ ساز ہوتے تو وہ مخدوم الملک کی ہاں میں ہاں ملاتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مخدوم الملک کی مخالفت دنیا بھر کی مصیبتوں کو دعوت دینا ہے۔ اس علم کے ساتھ آپ نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور مصائب و آلام کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ دوسرا

الزام حُبِ جاہ کا ہے۔ شیخ بدایونی کے قول کے مطابق عمر بھر دربار سے دُور دُور رہے۔ حالانکہ اگر انھیں حُبِ جاہ ہوتی تو محضر کے مرتب کرنے کے بعد صدر الصدور اور اس سے بڑا عہدہ بھی پا سکتے تھے۔ وہ اوامر و نواہی میں اس قدر متشدد تھے کہ ان کی محفلِ وعظ میں اگر کوئی سونے کی انگوٹھی یا حریر کا لباس، شُرخ رنگ کا موزہ یا زرد و سُرخ لباس پہن کر شریک ہوتا تو آپ اسے اپنی مجلسِ وعظ سے نکال دیتے اور اگر کسی کا تہ بند یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا تو حکم دیتے کہ جتنا حصہ بڑھا ہُوا ہے اسے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے۔
(بدایونی جلد سوم ص۷۳)

شیخ معین لاھوری

شیخ معین، ملا بدایونی کے قول کے مطابق انسانی لباس میں فرشتہ تھے۔ آپ مشہور واعظ اور مصنف مولانا معین کے پوتے تھے۔ مولانا معین واعظ مشہور کتاب مدارج النبوت کے مصنف اور دیوانِ معین کے مالک ہیں۔ یہ دیوان منشی نولکشور نے خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا ہے جو غلط ہے۔ یہ مولانا معین واعظ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

شیخ معین کو اکبر نے کچھ عرصہ کے لیے لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ آپ نے اس مدت میں دیانت اور امانت کے علاوہ اس حلقے میں بھی شہرت حاصل کی کہ جب کوئی قضیہ آپ کی عدالت میں پیش ہوتا تو آپ فریقین کی منت و زاری کر کے انھیں اس پر آمادہ کر لیتے کہ آپس میں مصالحت کر لیں اور ایسا کرتے ہوئے فرماتے۔

”میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے غلط فیصلہ نہ ہو جائے تاکہ قیامت کے دن مجھے اس کا جوابدہ نہ ہونا پڑے۔“

جب کبھی کوئی عورت خاوند کے غائب ہو جانے کے باعث تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرتی تو آپ اسے یہ کہتے کہ گزارہ مجھ سے لو اور خاوند کا انتظار کرو شاید وہ آ جائے۔ اور کچھ نہ کچھ رقم مددِ معاش کے طور پر اپنے پاس سے مقرر کر دیتے۔ لیکن سب سے نمایاں پہلو جو ہمیں آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے وہ اشاعت علوم و فنون ہے۔ فرصت کے اوقات میں خود درس دیتے اور مددِ معاش کے طور پر جو کچھ ملتا اسے یوں صرف کرتے کہ کاتبوں کو نفیس اور نادر کتابیں نقل کرنے کا حکم دیتے پھر خود ان کا مقابلہ اصل کتب سے کرتے اور خوب اچھی جلد بندی کروا کر طالب علموں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک مدت تک آپ کے یہی طور طریقے رہے اور آپ نے ہزارہا کتابیں طالب علموں میں تقسیم کیں۔ آپ ۹۹۵ھ / ۱۵۸۷ء میں فوت ہوئے۔ افسوس آپ کے دونوں لڑکے جوہرِ علم سے عاری رہے۔ ایک نے کبوتر بازی میں اور دوسرے نے کشتی گیری میں شہرت حاصل کی۔

شیخ موسےٰ حداد

آپ سنت کے عاشق تھے۔ خلاف سنت قدم اٹھانا پسند نہ کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ سے دلی عقیدت تھی۔ انہی کے مسلک پر چلتے تھے۔ اپنے وقت کے بہترین قاری تھے۔ قرآن کریم جب سوز و گداز سے پڑھتے تو اڑتے ہوئے پرندے بھی ٹھہر جاتے۔ سنگدل سے سنگدل انسان کا دل موم کی طرح پگھل جاتا۔ آپ ولی کامل تھے، علوم ظاہری و باطنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ان گنت تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو شیخ موسیٰ قاری بھی لکھا ہے اور کہا ہے کہ آپ علم تجوید میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور قرأت کے رموز و نکات خوب جانتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی ایامِ حکومت میں فوت ہوئے۔

ملا یادی محمد | لاہور کے رہنے والے تھے۔ اسی جگہ پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ انھیں ہمیشہ طالب علمی پر ناز رہا۔ معقولات سے بچتے تھے البتہ علم دین سے خاص شغف تھا۔ فقہ میں کمال پیدا کیا۔ حدیث دلی شوق و ذوق سے پڑھی اور جہاں کہیں کسی محدث کا پتہ سنا وہاں پہنچ کر حدیث میں اس سے فیض حاصل کیا۔ دینی علوم کو خوب سمجھتے تھے اور ان پر کافی غور و خوض کرتے رہتے تھے۔ دل محبت الٰہی سے لبریز تھا۔ طبیعت میں سوز و گداز بھی تھا۔ اہل اللہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اپنے مرشد کے حکم سے اپنے مکان کے سامنے مسجد بنائی۔ وہاں درس دینا شروع کیا۔ اسی مسجد میں نماز پنجگانہ بھی پڑھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی شہرت اور عظمت عطا کی۔ آپ ایک لمبی مدت زندہ رہنے کے بعد ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں فوت ہوئے۔ (طبقات شاہ جہانی (قلمی))

مولانا محمد مفتی | اکبری دور کے بڑے مشہور معلم تھے۔ ان کا درس خاص طور پر مشہور تھا۔ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں پورا پورا درک رکھتے تھے۔ فقہ میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس شہرت کی بنا پر انھیں عہدۂ افتاء پیش ہوا۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عرصہ انھوں نے مفتی کے فرائض بھی ادا کیے۔ دیانت اور تقویٰ ایک معلم کے لیے لازمی چیزیں ہیں اور آپ کی طبیعت میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ اس لیے لوگ آپ کا احترام کرتے تھے اور حکومت کے عمال بھی بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد اس کام سے آپ کی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ آپ نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اب فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے حدیث اور تفسیر پر بھی زور دینا شروع کیا۔ فن حدیث میں کمال پیدا کیا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ ہر بار جب آپ بخاری شریف اور ترمذی شریف ختم کرتے تو بہت بڑی دعوت کا بندوبست کرتے جس میں بڑے پر تکلف کھانے اور حلوے ہوتے تھے۔ اس دعوت میں فقرا کھانے کا انتظام خاص طور پر تیار کیا جاتا۔ شہر کے تمام عالم اور فاضل اس موقع پر جمع ہوتے۔ ویسے بھی ہر صاحب علم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ سے استفادہ کرنا فخر سمجھتا تھا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

> "جب میں اپنی کتاب لکھ رہا ہوں (یعنی ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں) تو آپ کی عمر نوے برس کی ہے۔ آپ بہت نحیف اور منحنی ہو گئے ہیں قویٰ میں ضعف آ گیا ہے۔ ان مجبوریوں کی بنا پر آپ نے درس بند کر دیا ہے مگر آپ کے فاضل بیٹے آپ کے درس کو چلا رہے ہیں۔ یہ بیٹے تمام کمالات اور فضائل میں اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔"
>
> (بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۴)

مولانا الہ داد لنگر خانی | لاہور کی بیرونی آبادی ہمایوں کے زمانے سے بڑھنی شروع ہوئی تھی سب سے پہلے گزر لنگر خاں آباد ہوا۔ لنگر خاں شاہ محمود لنگاہ والئ ملتان کا سپہ سالار تھا۔ جب بابر نے شاہ حسین ارغون والیٔ ٹھٹھہ کو ملتان کا علاقہ جاگیر میں دیا اور وہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے آیا، تو اس نے بڑے زور شور سے ملہ کی گزرگاہ سے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ سلطان محمود لنگاہ اس کے مقابلے کے لیے تیار ہوا۔ مگر اپنے آپ میں مقابلے کی تاب نہ پا کر اس نے گفت و شنید سے معاملہ طے کرنا چاہا۔ اور چند آدمیوں کو شاہ حسین ارغون کے پاس بھیجا جب وہ واپس آئے

تو اسی رات سلطان محمود لنگاہ فوت ہو گیا۔ مشہور یہ کیا گیا کہ قولنج کے شدید حملے کی تاب نہ لا کر سلطان فوت ہوا ہے مگر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ لنگر خاں نے اسے زہر دے دیا۔ لنگر خاں اسی وقت سلطان حسین لنگاہ کو جو سلطان محمود کا جانشین تھا، چھوڑ کر سلطان حسین ارغون سے آملا۔ معمولی سے محاصرے کے بعد شہر پر سلطان ارغون کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے خواجہ شمس الدین کو اپنا نائب مقرر کیا اور لنگر خاں کو خواجہ کا مشیر۔

لنگر خاں نے خواجہ شمس الدین کو پریشان کر کے وہاں سے بھگا دیا اور خود ملتان پر قابض ہو گیا۔

بابر کے مرنے کے بعد ہمایوں نے ملتان پر لنگر خاں کی مدد سے قبضہ کیا۔ جب لاہور کی آبادی کی کوشش ہوئی تو ہمایوں نے لنگر خاں کو لاہور میں محل بنانے کی اجازت دی۔ اس نے محل کے گرد ایک محلہ آباد کیا۔ وہیں سکونت اختیار کی۔ وہاں پختہ حویلیاں اور مکانات تعمیر ہوئے۔ یہ علاقہ سہ حاکمانِ لاہور کے زمانے تک آباد رہا۔ مزنگ کی موجودہ آبادی کے شمال مغرب میں گڑھی لنگر خاں واقع تھا جہاں آج کل مسجد شاہ چراغ، سٹیٹ بنک، اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر اور ہائی کورٹ واقع ہیں۔

مولانا الہ داد اکبر کے زمانے میں یہاں درس دیا کرتے تھے۔ آپ فرشتہ سیرت اور بلند اخلاق معلم تھے۔ سنت کے عاشق اور شیفتہ تھے۔ اس سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا تقویٰ اور طہارت اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ لوگوں میں متقی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ انھیں تمام متداولہ علوم و فنون میں پوری پوری مہارت حاصل تھی۔ آپ درس و تدریس میں ہمیشہ مصروف رہتے اور بڑی قناعت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ارباب دنیا سے میل جول رکھنا یا کسی امیر کے گھر جانا انھیں گوارا نہ تھا۔ کئی دفعہ کوشش کی گئی کہ وہ مدد معاش قبول کر لیں مگر آپ نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔

اکثر امرا اور منصب دار حصول برکت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن آپ ان کی پروا نہ کرتے بلکہ ان سے بہت کم میل ملاپ اور صحبت رکھتے۔ بختاور خاں کا بیان ہے کہ بعض امیر رات کے وقت ان کے گھر میں روپیہ وغیرہ پھینک جاتے۔ اس سے ان کی غرض و غایت آپ کی قناعت پسندی اور توکل کی آزمائش تھی۔ علی الصبح آپ کے وابستگانِ دامن ان رقوم کو آپ کی خدمت میں لے جاتے۔ آپ یہ رقم لے کر امیروں کے گھروں میں پھرتے اور جس کی رقم ہوتی اسے واپس کر کے دم لیتے۔ اس میں بڑی احتیاط اور تجسس سے کام لیتے تاکہ حق، حقدار کو پہنچ جائے۔

مولانا الہ داد اور ان کی آل اولاد کی بسر اوقات کا انحصار ان چند چکیوں کی اجرت پر تھا جو آپ نے اپنے گھر میں لگا رکھی تھیں محلے کی عورتیں آتیں اور تھوڑی سی اجرت دے کر ان چکیوں سے آٹا پیس کر لے جاتیں۔ یہ اجرت آپ کا ذریعہ معاش ہوتی تھی۔ ملا بدایونی کا بیان ہے کہ جب وہ اپنی تاریخ لکھ رہا تھا تو اس وقت آپ کی عمر اسی برس کے قریب تھی۔ اس پیرانہ سالی میں بھی آپ برابر درس دیتے تھے۔ (بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۵۴)

چند دیگر علماً ان ایام میں اور بھی بہت سے عالم لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے نام تو تاریخوں میں محفوظ ہیں مگر حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بعض مؤرخین نے ان کے کردار کو ایک آدھ فقرے میں نمایاں کیا ہے ان علماً میں قاضی صدر الدین لاہوری بڑے فاضل اور متقی تھے۔ عقلی اور نقلی علوم میں بڑے متبحر تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ وہ کئی برس تک لاہور کے قاضی بھی رہے۔ (طبقاتِ اکبری جلد دوم صفحہ ۳۰)

ملا ابوالفتح لاہوری کا درس بھی بہت مشہور تھا آپ تقویٰ اور دیانت میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے۔ آپ کے بھائی ملا عبدالجلیل شہر کے مفتی تھے۔ آپ کے متوسلین میں ملا عبدالرحمٰن لاہوری بھی بڑے مشہور مدرس تھے۔ انہی کے معاصر امام الدین لاہوری تھے جو ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ عام علما کے مسلک کے خلاف وہ سرکار سے مدد معاش لیتے اور وظیفہ پایا کرتے تھے۔ ان کا درس عوام میں ہر دلعزیز تھا۔ اکثر طلبہ کا ہجوم رہتا۔

ملا اسحاق کاکر لاہوری بھی زبردست فاضل اور متبحر عالم تھے۔ ملا نظام الدین ہروی طبقات اکبری میں لکھتا ہے کہ ان کے پائے کے عالم ہندوستان بھر میں بہت کم ہیں۔ وہ تقویٰ اور طہارت کے پیکر ہیں۔ فقر و غنا، توکل و قناعت ان کا شیوہ ہے۔ کسی سے سوال کرنا وہ غیرت کے منافی سمجھتے ہیں۔ آپ نے بہت لمبی عمر پائی۔ جس وقت ملا نظام الدین ہروی طبقات اکبری مرتب کر رہے تھے اس وقت آپ کی عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور آپ اس پیرانہ سری میں بھی درس دیتے اور طلبہ بڑے ذوق و شوق سے اس میں شریک ہوتے تھے۔ (طبقات اکبری جلد دوم ص ___)

شیخ نعمت لاہوری، شیخ نورالدین کمبوہ لاہوری، ملا ہاشم کمبوہ، ملا شمس خاں کمبوہ لاہوری، ملا بایزید لاہوری بھی اس دور کے فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ طلبہ کا گروہ کثیر ان سے مستفیض ہوتا تھا۔

مفتی اسماعیل بھی لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں تکمیل تعلیم کی اور پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

قاضی نور اللہ شوستری اکبر کے زمانے میں ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ دیانت، امانت اور گوناگوں کمالات سے آراستہ تھے۔ اس بنا پر اکبر نے انہیں لاہور کا قاضی مقرر کیا۔ آپ فرصت کے اوقات میں طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ مجالس المومنین کے نام سے آپ نے ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ علوم عقلی و نقلی میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔

ملا حسام الدین لاہوری کی رنگت خوب سرخ و سفید تھی۔ اس لیے سرخ کے لقب سے مشہور تھے۔ ملا نظام الدین ہروی کہتا ہے کہ لاہور کے علما کے برخلاف آپ علوم عقلی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ان کو خوب جانتے تھے۔ اسی کے باعث آپ کو شروع میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ دینیات میں بھی آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ فلسفہ پڑھانے میں خوب مہارت تھی۔ آپ ہمہ صفت موصوف تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کے دور کی علمی، ادبی، شعری اور عرفانی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں اس قدر ارباب کمال ہیں کہ وہ شمار میں نہیں آ سکتے۔

(منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۵۸)

اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ زمانہ تاریخ کا زریں زمانہ تھا۔ اس دور میں ملک نے نہ صرف اقتصادی اور معاشی ترقی کی بلکہ ہر قسم کے علوم و فنون کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر اکبر کا دور حکومت سیاسی طور پر بہت اہم ہے تو علمی و عرفانی نقطۂ نظر بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ لاہور اکبر کے قیام کی وجہ سے دہلی اور آگرہ سے بازی لے گیا تھا۔ یہاں گھر گھر علمی چرچے تھے اور یہاں کا ہر آدمی شعر و ادب کی زبان میں بات کرتا تھا۔

عہد نورالدین جہانگیر ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء

تیموریوں میں جہانگیر بڑا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ زمانے نے جن لوگوں کو غلط بخشی سے کام لے کر صحیح مقام عطا نہیں کیا۔ ان میں ایک جہانگیر بھی ہے۔ وہ اگر شہنشاہ ہند کی بجائے شاعری اور ادب میں پڑ جاتا تو اس کا مقام اتنا بلند ہوتا کہ برعظیم ہند و پاکستان اس پہ ناز کرتا۔ وہ اگر نیچرل سائنس کا محقق بننا چاہتا اور اس کے حوالے تحقیق کے سلسلے میں کوئی عجائب خانہ (میوزیم) کر دیا جاتا تو وہ ان علوم میں حیرت انگیز انکشافات کا موجد ہوتا۔ اگر وہ خطاطی اور مصوری کو پیشے کے طور پر اختیار کرتا تو بہت بڑا خطاط اور مصور ہوتا جو ان فنونِ لطیفہ کی باریکیوں پر بھی گہری نظر رکھتا مگر قدرت نے اسے ہندوستان کا تخت و تاج عطا کیا اور سلطنتِ عظیم کی بھاری ذمہ داریاں اس کو سونپ دیں جنھیں اس نے ذمہ داری کے پورے پورے احساس کے ساتھ ادا کیا، اور ہندوستان کے بادشاہوں میں اس نے نہ صرف ایک ممتاز مقام حاصل کیا بلکہ اپنی انفرادیت کو بہر صورت قائم رکھا۔

سلیم اس کا نام تھا اکبر پیار سے اسے شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے لیے نورالدین جہانگیر نام اور لقب اختیار کیا۔ چنانچہ وہ تزک میں لکھتا ہے:۔

"چون پادشاہ شدم بخاطر رسید کہ نام خود را تغیر باید داد کہ این اسم محل اشتباہ است بنام قیاصرۂ روم، ملہم غیب بخاطرم انداخت کہ کار پادشاہان جہانگیری است۔ خود را جہانگیر نام نہم و لقب خود را چون جلوس در وقت طلوع حضرت نیر اعظم و نورانی گشتن عالم واقع شدہ نورالدین سازم۔" (تزک جہانگیری نولکشوری ص۳)

جہانگیر بڑی بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے اس کی تعلیم و تربیت میں خاص اہتمام کیا گیا۔ خاندانی رسم و رواج کے مطابق جب اس کی عمر چار سال چار ماہ اور چار یوم کی ہوئی تو بڑی شان و شوکت کے ساتھ محلات میں رسم تسمیہ خوانی ادا ہوئی۔ دعوت کا اہتمام ہوا۔ خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور انعامات تقسیم ہوئے[1]

مولانا میر کلاں جو اپنے وقت کے زبردست محدث اور عالم تھے اور تقویٰ و طہارت میں اپنی مثال آپ تھے شہزادہ کے پہلے اتالیق مقرر ہوئے۔ ملک الشعراء فیضی بھی اس کے استاد رہے۔ مولانا علی احمد نشانی بھی جو بڑے صاحب دل بزرگ، ہیئت، طبیعات، املا و انشا اور خطاطی میں بے نظیر و بے مثال تھے کچھ عرصہ تک اسے پڑھاتے رہے۔ چہل حدیث سید صدر جہاں نے پڑھائی۔ عبدالرحیم خان خاناں اور قطب الدین خاں انگہ بھی شہزادے کے اتالیق رہے۔ ان کی صحبت اور تربیت سے جہانگیر کی طبیعت میں بڑی شگفتگی پیدا ہوئی۔ علم و ادب کا ذوق، شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کا صحیح صحیح مذاق پیدا ہو گیا۔ وہ ترکی زبان میں خوب ماہر تھا چنانچہ اس نے بابر نامہ جو چغتائی ترکی میں تھا اصل زبان میں مطالعہ کیا۔ جو نسخہ اس کے زیر مطالعہ آیا، اس کے آخری چار باب غائب تھے۔ وہ جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے نقل کر کے اس میں شامل کیے۔

---

[1] اکبر نامہ جلد دوم ص۱۲۰، ص۱۲۱۔ طبقات اکبری جلد دوم۔ بدایونی جلد دوم۔

تُوزکِ جہانگیری اس کا اپنا روزنامچہ ہے جس میں وہ اپنے حالات بلاکم وکاست بیان کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تاریخ اور جغرافیہ کا صحیح مذاق رکھتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے وہاں کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پوری پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ علم حیوانات اور نباتات کے ساتھ بھی اسے طبعی لگاؤ ہے۔ تُوزک اس بارے میں ہمارے سامنے بیش بہا معلومات پیش کرتی ہے۔ وہ شعر و شاعری کا بڑا شستہ مذاق رکھتا ہے۔ تُوزک میں متعدد مقامات پر وہ مزے لے لے کر شعر و سخن کے تذکرے کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خان خاناں نے اپنے مشاعرے کے لیے مولانا جامی کا یہ مصرع طرح دیا۔ ؎

ہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید

جہانگیر نے فی البدیہہ اس پر مطلع کہا ؎

ساغرے بر رُخِ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

جہانگیر کو جب معلوم ہوا طرحی مصرع مولانا جامی کا ہے اور بہت رواں ہے تو اس نے غزل نکلوا کر دیکھی۔ اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوا کہتا ہے :۔

”غیر از ان مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگرے کلامے نساختہ۔ بغایت سادہ و ہموار گفتہ“ (تُوزک جہانگیری ص ۳۳۳ م دکلمات الشعرا از سرخوش ص ۲۲ م)

اسی طرح ایک مرتبہ اس کے دربار میں امیر الامرا شریف خان فارسی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

جہانگیر کے اشارے پر سب نے اس پر غزلیں کہیں۔ ملا احمد مہرکن کا شعر اسے پسند آیا ؎

اے محتسب بگریۂ پیر مغاں بترس
یک خم شکستن تو بہ صد خوں برابر است

جہانگیر نے خود اس زمین میں یہ شعر کہا ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بہ صد خوں برابر است

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ نور جہاں نے جہانگیر کے اس شعر کے جواب میں یہ شعر کہا ؎

چوں تافتم از تو رُخ کہ توی قبلۂ مراد
رُخ تافتن ز قبلہ بہ صد خوں برابر است

ایک دفعہ کسی شاعر نے ایک قصیدہ جہانگیر کی مدح میں لکھا اور سنانا شروع کیا۔ ابھی اس نے پہلا ہی مصرع پڑھا تھا

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے وہیں ٹوک دیا اور کہا۔ علم عروض جانتے ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ جہانگیر نے کہا۔

"اگر عروض می بودی گردنت می زدم"

اور پھر تقطیع کر کے بتایا کہ مصرع کا دوسرا رکن "لت بر سرت" آتا ہے جو انتہائی گستاخی ہے[1]

مے شاعر جو کلال زادہ تھا اس کا واقعہ بھی سرخوش نے بیان کیا ہے۔ نورجہاں کی سفارش سے وہ بارباب ہوا۔ جہانگیر نے کہا ان لوگوں کا کام جاروکشی اور شاہی سواری کا انتظام ہے۔ شاعری سے انہیں کیا مناسبت ہو سکتی ہے مگر نورجہاں کے اصرار پر اس نے شعر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

مئی بگیر بہ سرے دار دلے نصیحت گر
کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے ہنس کر کہا یہ ہے پیشے کی رعایت[2]

نورجہاں نے ایک مرتبہ پھر مئی کلال کی تقریب کرائی۔ بادشاہ نے شعر پڑھنے کا حکم دیا۔ حسنِ اتفاق سے اس نے پہلا شعر یہ پڑھا ؎

من می روم و برق زناں شعلہ آہم
اے ہمنفساں دور شوید از سر راہم

بادشاہ نے مسکرا کر کہا "بہ بیند بازپیشۂ خود را جلوہ دادہ و رعایت نمودہ"[3]

ان چند مثالوں سے جہانگیر کے ذوقِ سخن کا پتہ چل سکتا ہے۔ بادشاہ کے اس مذاق کا اثر تمام ملک پر ہوا، شعر و شاعری کے چرچے عام ہو گئے اور ادب کے ساتھ ایک خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔

جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد یہ حکم دیا کہ وہ مدارس جو کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں ان کی مرمت کی جائے اور ان میں پھر سے تعلیم و تدریس کا بندوبست کیا جائے چنانچہ تاریخ جان جہاں کا مصنف جو جہانگیر کا معاصر تھا لکھتا ہے کہ وہ مدرسے جو گذشتہ تیس برس سے درندوں اور پرندوں کے بسیرے بنے ہوئے تھے پھر سے آباد ہوئے۔ طلبہ جوق در جوق ان میں داخل ہونے شروع ہوئے اور جو لوگ پڑھنا اور پڑھانا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے دنیا سے الگ تھلگ ہو کر وہاں بیٹھ گئے اور اطمینان کے ساتھ علوم و فنون کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔

پرانے مدرسوں کے ساتھ ساتھ نئے مدرسے بھی قائم ہوئے۔ محمد معصوم دیوان گجرات نے جیلپور میں ایک مدرسہ کی عمارت تعمیر کی۔ اور اس کے لیے معلم مقرر کئے۔ سیف خاں ناظم گجرات نے احمد آباد میں اپنے خرچ پر مدرسہ قائم کیا۔ جہانگیر نے یہ حکم نافذ کیا کہ جو شخص لاوارث مر جائے اس کی جائداد سرکاری تحویل میں لے کر اس کی آمدنی سے خانقاہیں، مدرسے، پل اور سرائیں تعمیر کی جائیں[4]

بادشاہ کی اس توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو تھوڑا بہت بھی علم سے لگاؤ رکھتا تھا درس دینے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

۱؎ کلمات الشعرا ص ۲۲ ۲؎ کلمات الشعرا ص ۱۰۹ ۳؎ کلمات الشعرا ص ۱۰۹
۴؎ خوافی خاں جلد اول ص ۲۴۹

حتیٰ کہ شاعر بھی اس میں مشغول ہو گئے۔ علی احمد سندیلوی اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہے کہ ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء میں بادشاہ کیمپ فتح پور میں تھا۔ طالب آملی بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ منشی فیروز کے دل میں طالب کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ طالب تالاب کے کنارے ایک خیمے میں مقیم تھا۔ دیوان کے اجزا اس کے سامنے پڑے تھے جب منشی فیروز وہاں پہنچا تو مصافحہ اور معانقہ کے بعد طالب نے اس سے پوچھا۔ کیسے تشریف لانے ہوئے؟ اس نے کہا۔ آپ کے کچھ شعر سُنے تھے۔ ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس لیے حاضر ہو گیا۔ طالب نے پوچھا آپ کو کونسے شعر پسند آئے۔ فیروز نے چند شعر سُنائے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

مردم ز رشک چند بہ بینم کہ جام مے
لب بر لبش گذارد و طالب تہی کند

طالب یہ شعر سُن کر اچھل پڑا۔ اسے گلے لگایا اور اس کے ذوقِ ادب کی داد دی۔ کہا۔ کمر بند کھول لیجیے اور آرام فرمائیے۔ آپ کی صحبت میں ایک دو دن بڑے لطف سے گزاریں گے۔

عین اس وقت، ایک مغل دیوانِ خاقانی لیے وہاں آیا اور طالب سے پڑھنا چاہا۔ طالب نے معذرت کی۔ مگر مغل نہ مانا۔ دیوان کھولا اور ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ جس کا پہلا مصرع یوں تھا۔ ؏

در پردۂ دل آمد دامن کشاں خیالش

طالب کی علمی استعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ اناپ شناپ باتیں کہنی شروع کیں۔ منشی فیروز ہنس پڑا۔ طالب نے جھنجھلا کر کہا۔ کہ ایسے اشعار تمہارے ہندوستان میں درس کے قابل سمجھے جاتے ہیں، میں ایسے شعر انگشت پا سے لکھ سکتا ہوں۔ منشی فیروز نے کہا شعر کہنا اور بات ہے، سخن سنجی اور سخن فہمی اور چیز ہے۔ طالب افسردہ دل ہو کر چپ ہو گیا۔ منشی فیروز بھی اس حرکت پر پشیمان ہوا اسے خوش کرنے کے لیے بولا۔ کل دربار میں لوگوں نے آپ کے کس شعر پر اعتراض کیا تھا۔ طالب نے یہ مصرع پڑھا۔

عنبر افسردہ ام در پردہ وارم بوئے خوش

اور کہا آصف خاں نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ عنبر کو افسردہ نہیں کہہ سکتے۔ اوروں نے اس کی تصدیق کی تھی۔ منشی فیروز نے کہا خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے تو پھر عنبر کا کیا قصور؟ خاقانی کا مصرع ہے

کز فیض او بسنگ فسردہ رسد نما

منشی فیروز اپنے زمانہ کے زبردست فاضل، ادیب، نقاد اور شاعر تھے۔ انھیں اساتذہ کے ہزاروں شعر نوک بر زبان تھے چنانچہ اس بارے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ تذکروں میں درج ہے۔

ایک دن منشی فیروز کی قیام گاہ پر شعرا کا اجتماع ہوا۔ اس میں طالب آملی، ملا عطائی۔ انور لاہوری اور دوسرے شعرا شریک تھے۔ شعر خوانی ہو رہی تھی کہ شیدا اکبر آبادی بھی آ پہنچا۔ سب نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے صدر مقام پر بٹھایا۔ اس سے فرمائش کی کہ اپنا تازہ کلام سنائیں، اس نے یہ شعر پڑھا ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

سب شاعر شیدا کی لاف و گزاف اور بے ہودہ گوئی سے تنگ آئے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ اس کی گوشمالی کی جائے۔ ملا فیروز اس سے واقف تھے۔ چنانچہ یہ شعر سن کر انھوں نے کہا۔ یہ تو رودکی کے شعر کا چربہ ہے اور اس کا یہ مصرع پڑھا ؎

عشق را پیمبر دیسکن حسن را آذر یدگار تری

شیدا نے اپنا دوسرا شعر پڑھا ؎

ز بس کہ کرد غمت بہ تہ بہ ہر جگہ ناخن
چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

ملا فیروز نے کہا۔ یہ مطلع غیاثائی حلوائی کے اس شعر کا سرقہ ہے ؎

از بسکہ سینہ کندم ناخن درو نشست
چو پشت ماہیست سراپائے سینہ ام

شیدا اس پر بگڑا۔ مگر یہ شعر پڑھ کر داد چاہی ؎

بہ صحرا مو فشانی دشت پر سنبل شود
در بہ دریا بار و بشوی خار ماہی گل شود

فیروز نے کہا کہ ملا کاتبی دو سو برس پہلے اس مضمون کو یوں باندھ چکا ہے ؎

گر بہ دریا افتد از عکس جمال او فروغ
خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا بگڑ کر ہرزہ سرائی پر اتر آیا۔ اور کہا اگر آپ کو اپنی سخن فہمی پر ناز ہے تو اس نعتیہ شعر کے برابر کوئی شعر پڑھیے ؎

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد
از روی ادب مہر خدا بر پشتت

ملا فیروز نے بڑی بے تکلفی سے ہاتفی کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

نبوت را توی آں نامہ در مشت
کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شیدا بہت خفیف ہوا اور فحش بکنے لگا۔ حاضرین نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کلام سنانے پر اصرار کیا۔ بڑی رد و کد کے بعد اس نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

زلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

ملا فیروز نے کہا کہ میں اپنے مہمان عزیز کی خاطر چپ رہنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ ورنہ کسی استاد کا یہ شعر اس کا ہم معنی پہلے سے موجود ہے ؎

کس نیاید بمصرعِ پیچیدۂ زلفِ کجت
گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

شیدا خاموش ہو گیا۔ ہرچند حاضرین نے شعر خوانی کی خواہش کی مگر وہ اپر سکوت بنا رہا۔ مجلس ختم ہوئی۔ شیدا چلا گیا۔ آئندہ کے لیے اس نے دستور بنا لیا کہ جس محفل میں ملا فیروز موجود ہوتا اس میں شعر نہ پڑھتا۔

ایک مدت کے بعد ملا شیدا منشی فیروز کے گھر حاضر ہوا، اس سے پوچھتے ہی سوال کیا کہ " از اشعار من کدام بیت پسند خاطرِ عالی افتاد " ملا فیروز نے یہ شعر پڑھا ؎

لے بروے تو کز و آئینہ را چشم نیاز
شانہ را دستِ دعا در شبِ زلفِ تو دراز

ملا شیدا نے کہا۔ " عمرت دراز باد کہ این ہم غنیمت است "۔ [1]

شخصی حکومتوں میں شاہی دربار تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہیں سے تہذیب و ثقافت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور عوام کے دل و دماغ کو سیراب کرتی ہیں۔ جب تخت و تاج کا وارث سخن شناس اور باذوق ہو اور علم و ادب سے دلی لگاؤ رکھے تو پھر ملک بھر میں علم و ادب کی محفلیں کیوں نہ برپا ہوں۔ جہانگیر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں شعر کا دلدادہ، ادب کا شیفتہ اور فنونِ لطیفہ کا عاشق تھا۔ قدرت نے اسے نقد و نظر کا ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ وہ باکمال ہستیوں کی دل کھول کر قدردانی کرتا، انھیں مرتبہ اور سرپرستی سے نوازتا مگر ایسا کرنے سے پہلے انھیں صحیح معیار پر پرکھتا۔ جب وہ اس معیار پر پورے اترتے تو پھر ان کے سر پر دستِ شفقت رکھتا اور موقعہ دیتا کہ وہ ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ہو کر اپنے کام میں لگ جائیں۔ آرٹ اور علوم و فنون ایک تحریک ایک رہنمائی اور ایک توجہ کے محتاج ہوتے ہیں، جہاں ان خوابیدہ نغموں کو چھیڑا گیا وہاں نغموں کا سیلاب امڈ آیا۔ اور تمام فضا ان سے متاثر ہو کر گونج اٹھی۔

جہانگیر اور اس کے دربار پر ایک نظر ڈالو یہ بات روزِ روشن کی طرح حقیقت بن کر سب کے سامنے آجائے گی کہ قدرت نے انھیں اس مقصد کے لیے یکجا کیا کہ ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ جب قبضۂ شمشیر سے ہٹے تو وہ قلم دان پر ہو۔ رزم آرائیوں اور جنگی معرکوں سے جب فرصت ملے تو بزم آرائی کا مشغلہ جاری ہو شعر و سخن کی محفلیں جمیں۔ ادب اور معارف کے جلسے گرم ہوں گویا کبھی تو وہ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیں اور کبھی بزمِ شعر و ادب میں خراجِ تحسین وصول کریں۔ ان کے علاوہ فرصت کا بیشتر حصہ علمی معرکے سر کرنے اور علوم و فنون کی اشاعت کرنے میں صرف کریں۔

اس وجہ سے سلطنتِ تیموریہ کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ثقافت، تہذیب، معارف اور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ لاہور کا بچہ بچہ شعر و ادب کا مذاق رکھتا، شعر و ادب کی زبان میں باتیں کرتا، وہ کسی پیشہ کسی حرفہ سے تعلق رکھے دست بکار و دل بیار کے مصداق کام بھی کرتا اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتا۔ وہ ہاتھوں سے ریشم رنگتے مگر اپنی محفل کو اپنی رنگین نوائی اور رنگین بیانی سے بیجو و کرد یتے۔ وہ گلکاری کا پیشہ اختیار کرتے مگر ساتھ ہی ساتھ شعر و ادب کے گلدستے سنوارتے۔ سپاہی میدانِ

---

[1] تذکرہ حسینی صفحہ ۱۴۳–۱۸۰۔ مخزن الغرائب قلمی نسخہ ورق ۲۱۶ ، ۲۱۵ ب

جنگ میں شمشیر زنی کرتا مگر محفل آرائیوں میں اس کی زبانِ تیغ سب کو مسخر کر لیتی۔ وہ توپ خانے میں میر آتش کے ماتحت آگ اور خون کا کھیل کھیلتا مگر بزم آرائی کے وقت اس کی آتش بیانی اور طبع کی روانی تمام محفل کو بسمل کی طرح تڑپا دیتی۔ تلوار فروش ناشناتی کو نازک خیالی سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے مگر اس دور میں لاہور کے نان پز شعر گوئی میں کسی سے کم نہ تھے۔ حکاک، رفو گر، تیر گر، بھی جذباتِ شعر میں ڈوب کر بات کرتے تھے، یہ باتیں ایک الگ صحبت کی محتاج ہیں۔ کسی وقت لاہور کی ادبی زندگی پر لکھنے کا اگر موقعہ ملا تو ان تمام پہلوؤں کو واضح کیا جائے گا۔

لاہور ثقافت کا مرکز تو اکبر کے زمانے ہی میں بن چکا تھا، جہانگیر کے زمانے میں اس کو اور زیادہ رونق نصیب ہوئی۔ جہانگیر کو لاہور سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

طالب آملی دِلّی، ملتان، سرہند اور لاہور میں گھومتا رہا مگر اسے سب سے بڑھ کر لاہور پسند آیا۔ اس کا دل یہیں لگا۔ اس کا ایک قصیدہ لاہور کی تعریف میں بھی ہے۔ چنانچہ وہ اس قصیدے میں کہتا ہے ؎

گمانم نیست کاندر ہفت کشور
بود شہرے چو آب و تاب لاہور
میان بکشا و خوش واکش کہ در ہند
فراغت نیست جز در خواب لاہور

یہاں اس نے شاہ ابوالمعالی کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ ان کی منقبت میں کہتا ہے ؎

کنم زان رو مرید آسا شب و روز
کرامت ہا بیان در باب لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشد من
یکے قطب است از اقطاب لاہور

ایک اور قصیدے میں وہ لاہور کی تعریف کرتا ہے۔ یہ غالباً لاہور کے موسم برسات کا تذکرہ ہوگا ؎

نہ آگرہ تا بخیابان گلشن لاہور
رفیق بودم با ابرہائے بارانی

شاپور طہرانی اسی دور کا ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ نور جہاں کے قرابت داروں میں تھا۔ وہ تاجر تھا اور اکثر مختلف شہروں میں آتا جاتا تھا۔ طالب اور شاپور میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ طالب لاہور میں جا کر شاپور سے ملا۔ وہ اپنی ایک غزل میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے ؎

بحمد للہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم
ہمان رشک عطار د شاعر مشہور را دیدم

بخسرو دانشم بیدئے نیازے در سخن طالب
از در سوختم چوں صنعت شاپور را دیدم
چہ خوش حالم کہ بعد از مدتے یک سالہ مہجوری
خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

ملا عبدالنبی نے اپنے مشہور تذکرہ میخانہ میں لاہور کا جا بجا ذکر کیا ہے ۔ وہ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر لاہور کو ایک نئے خطاب سے نوازتا ہے ۔ کبھی وہ اسے دار الامان کہتا ہے ۔ کبھی دار الشعراً ۔

ایک موقعہ پر وہ لاہور کو " خانۂ عافیت خردمنداں " کہتا ہے ۔ اس سے لاہور کی علمی اور ثقافتی زندگی کا دھندلا سا تصور ہو سکتا ہے ۔

جہانگیر نے اشاعت علوم و فنون کے سلسلے میں ایک کام یہ بھی کیا کہ جہاں کہیں وہ دورے پر جاتا منتخب اور نادر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لے جاتا ۔ وہاں کے علماء سے ملاقاتیں کرتا ، ان کے ساتھ علمی مباحث پر گفتگو کرتا اور تحفۃً یہی کتابیں پیش کرتا ۔ جب وہ گجرات کے دورے پر گیا تو اس کے ساتھ کتابوں کا بہت بڑا مجموعہ تھا ۔ احمد آباد گجرات میں علماؑ و مشائخ سے صحبت گرم کی اور رخصت کے وقت ان میں کتابیں بھی تقسیم کیں ۔ ان میں ملا حسین الواعظ کاشفی کی تفسیر حسینی اور زمخشری کی تفسیر کشاف اور میر خواند کے روضۃ الصفا کا ذکر اس نے خاص طور پر اپنی توزک میں کیا ہے ۔

اسی دورے میں جب وہ محمود آباد میں مقیم ہوا تو اس کی ملاقات حضرت شاہ عالمؒ کے نبیرہ سید محمد سے ہوئی ۔ رخصت کے وقت جہانگیر نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سید موصوف اس سے کچھ مانگیں مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ یہ امر ہمارے مسلک کے خلاف ہے انکار کر دیا ۔ بادشاہ نے بہت اصرار کیا ۔ آخر میں قرآن کریم کی قسم دی کہ وہ ضرور کچھ طلب فرمائیں ۔ سید موصوف نے کہا اب کہ بادشاہ نے کلام پاک کی قسم دلائی ہے تو پھر وہ مجھے کلام مجید کا ایک نسخہ مرحمت فرمائیں ۔ جہانگیر بہت خوش ہوا اس نے یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید جو شاہی کتب خانے کے نوادرات میں شمار ہوتا تھا منگوا کر سید محمد کے حوالے کیا ۔ اپنے قلم سے اس کی پشت پر تاریخ اور مقام لکھا ۔ بعد میں سید سے فرمائش کی کہ آپ کلام مجید کا

" بلغات ریختہ لفظ بلفظ فارسی "

ترجمہ کر کے اپنے فرزند سید جلال کے ہاتھ میرے پاس بھجوا دیں ۔ جہانگیر کے الفاظ یہ ہیں :-

" بمشار الیہ فرمودیم کہ مصحف بعبارت سلیس خالی از تکلف و تصنع ترجمہ نماید و اصلاً بہ شرح و بسط و شان نزول آں مقید نہ شدہ بلغات ریختہ قرآن را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بہ معنی تحت اللفظ نیفزاید و بعد از تمام آں مصحف مصحوب فرزند خویش جلال الدین سید روانہ درگاہ سازد " (توزک جہانگیری ص ۲۲۵)

اس عبارت کے نقل کرنے کی غایت یہ ہے کہ اس میں لفظ ریختہ اور لفظ بہ لفظ فارسی کے سمجھنے میں توزک کے ترجمہ کرنے والوں نے غلطی کھائی ہے ۔ انگریزی ترجمہ میں بلغات ریختہ کا ترجمہ SIMPLE WORDS یعنی سادہ الفاظ میں کیا گیا ہے مگر

عبارت کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا۔ مولانا احمد علی سیماب جنھوں نے تزک کا اُردو ترجمہ کیا ہے انھوں نے اس کا ترجمہ زبان ریختہ کیا ہے جس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اگر جہانگیر کو فارسی ترجمہ درکار ہوتا تو خود اس کے دربار میں ایرانی علماء و فضلا کی کمی نہ تھی۔ وہ کسی سے فرمائش کر سکتا تھا، نیز اس سے پہلے قرآن پاک کے متعدد فارسی ترجمے ہو چکے تھے، نئے ترجمے کی ضرورت کیا تھی۔ گجراتی عالم سے ترجمہ کی فرمائش کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ ترجمہ زبان ریختہ میں ہو اور رسم الخط فارسی ہو۔ کیونکہ گجرات میں گجراتی رسم الخط اس زمانے میں اسی طرح رائج تھا جیسے آج بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان ایام میں علاقہ گجرات میں گجری یا گوجری اُردو میں کتابیں لکھی جاتی تھیں اور ریختہ کا لفظ اُردو زبان ہی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

زبان کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں "لاہوری" پنجابی کے لیے مستعمل ہوتا تھا۔ چنانچہ پکھلی (ہزارہ) کے ایک قبیلے قارلغوں کا ذکر کرتا ہوا جہانگیر کہتا ہے کہ امیر تیمور جب ہندوستان سے واپس ہوا تو وہ اس قبیلہ کے لوگوں کو یہ علاقہ دے گیا تھا۔ تب سے وہ یہیں آباد ہیں۔ اب تو بالکل پنجابی بن گئے ہیں اور "لاہوری" زبان بولتے ہیں۔ جہانگیر کے الفاظ ہیں :-

"الحال خود لاہوری محض اند و بزبان چناں تکلم کنند"[1]

کتابوں کے سلسلے میں جہانگیر نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ وہ کتابوں کا بے حد شوقین تھا اور انھیں حسین و جمیل دیکھنا چاہتا تھا اس واسطے اس نے کتابیں مصوّر کرنے کے فن کو بے حد فروغ دیا۔ گو اس کی ابتدا اکبر نے کی تھی لیکن اس کے معراج کا زمانہ جہانگیری دور ہے۔ مسٹر مارٹن کہتا ہے کہ جہانگیر بڑی بڑی قیمت دے کر مصوّر کتابیں خریدتا اور اکثر کتابوں کو اپنی سرپرستی میں مصوّر کرایا کرتا تھا۔[2]

جمعہ کی رات وہ علما کی صحبت میں بسر کرتا۔ علمی بحثیں ہوتیں۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ تاریخی، مذہبی، دینی اور فلسفیانہ مسائل زیر بحث آتے۔ وہ بڑی متانت اور دلچسپی سے علما کی باتیں سُنتا اور جہاں ضرورت ہوتی خود بھی شریک بحث ہوتا۔ علما کی ان حوصلہ افزائیوں سے علوم و فنون کو فروغ حاصل کرنے کا بہت عمدہ موقعہ ملا۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس شریف پیشے کو اختیار کرے جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے مکاتب اور مدارس جا بجا قائم ہو گئے۔ اور جو شخص جس جگہ اور جس وقت چاہتا تحصیل علوم میں مشغول ہو جاتا۔ نہ عمر کی قید ہوتی نہ ذرائع کا سوال پیدا ہوتا۔

ان علما کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ ان کا ایک خاص مسلک تھا۔ اور وہ اس کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کرتے تھے وہ درس و تدریس کا مشغلہ اس واسطے اختیار نہ کرتے تھے کہ اس سے وہ مال و دولت کے انبار جمع کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے خیال میں یہ ایک مذہبی فریضہ تھا جسے بجا لانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ نہ وہ کسی کی تحسین کے محتاج تھے اور نہ کسی کی تعریض کو خاطر میں لاتے تھے۔ اگر ان کا ضمیر مطمئن ہے تو وہ اسے آخری دم تک جاری رکھتے۔ اگر ان کو اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوتا وہ درس و تدریس کی مسند کو خالی کر کے گوشۂ عزلت میں جا بیٹھتے اور ریاضت شاقہ میں مصروف ہو جاتے۔ وہ جہاں ایک دفعہ درس دینا شروع کرتے وہیں کے ہو جاتے۔ نقل مکانی یا ایک جگہ کو ترک کر کے دوسری جگہ چلے جانا ان کے نزدیک علم کے ساتھ بے وفائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بعض

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۲۹

[2] MINIATURE PAINING AND PAINTERS OF PERSIA, INDIA AND TURKEY, VOL. I, p. 58.

ایسے معلمین اور علما کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے ایک جگہ بیٹھ کر اسّی نوّے برس تک درس دیا۔

جہانگیری دَور درحقیقت اکبری دَور کا تتمہ ہے۔ لاہور میں مدارس جاری ہو چکے تھے۔ علما نے درس کے لیے مقامات تعین کر لیے تھے اور ان کی محنت، ریاضت، شگفتگی، قابلیت کے باعث ان کی شہرت لاہور کی حدود کو پھاند کر نہ صرف ہندوستان کے ممالک محروسہ میں پھیل چکی تھی بلکہ ایران، ترکستان اور روم تک پہنچ چکی تھی اور وہاں کے طالبانِ علم ان کے درس میں شریک ہونے کو لمبی لمبی منزلیں طے کر کے چلے آتے تھے۔ ان سے استفادہ کرنے کے بعد بعض اپنے وطن مالوف کو واپس چلے جاتے اور بعض یہیں کے ہو رہتے۔ اکبر کے زمانے میں ایرانی علما کی مہاجرت کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ابھی تک جاری تھا اکبر فوت ہو گیا اور جہانگیر مسند آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی حالات میں سوا اس کے اور کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا کہ وہ مذاق اور مزاج کے لحاظ سے اپنے باپ سے زیادہ ادب نواز، معارف پرور اور علم گستر تھا۔ وہ اکثر علوم و فنون میں ماہر فن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے علما کو اکبر سے بڑھ کر جہانگیر سے قدر افزائی کی امید تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں باریاب ہوں۔ اس کی سرپرستی حاصل کریں اور جو زیادہ متوکل، متقی اور پرہیزگار تھے وہ حکومت اور حکومت کی سرپرستی سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض میں مشغول تھے۔

ملا عبدالسلام لاہوری

سب سے مشہور اور متبحر عالم جن کے مدرسے کو جہانگیری دَور میں سب سے اوّل شہرت حاصل ہوئی وہ ملا عبدالسلام لاہوری تھے۔ انھوں نے ہر مشہور عالم سے استفادہ کیا اور اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ سفر بھی کیے اور مقامی طور پر بھی تکمیل تعلیم کی۔ چنانچہ لاہور میں آپ شیخ اسحاق کاکو، شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی اور قاضی صدرالدین جالندھری کے درس میں شریک ہوتے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ آپ نے اکبر کے وزیر مالیات امیر فتح اللہ شیرازی سے ریاضی اور تفسیر پڑھی۔ میر فتح اللہ اپنے وقت کا بہت بڑا مفسر تھا۔

ملا عبدالسلام منقولات و معقولات میں کامل و اکمل تھے۔ پچاس برس مسندِ درس پر بیٹھ کر علوم و فنون کی اشاعت کی۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر نہایت برجستہ حواشی لکھے۔ جب آپ یہ حواشی لکھ رہے تھے تو بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس سلسلے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے اسے اہل فضل کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے قبول کیا اور درست مانا۔ لیکن کثرت درس کی وجہ سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ میں اسے سینہ سے سفینہ میں منتقل کرتا اور قید تحریر میں لاتا۔ اب میری عمر نوّے کے لگ بھگ ہے۔ قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں حافظہ کی قوت جواب دے گئی ہے۔ اکثر مطالب ذہن سے نکل گئے ہیں۔"
(مراۃ العالم بختاور خاں ورق ۴۹۱-الف)

ملا عبدالسلام کے درس نے بڑے بڑے باکمال عالم و فاضل پیدا کیے جن میں ملا عبدالسلام دیوی اور میرک شیخ ہروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مآثر الامرا کا مصنف لکھتا ہے کہ "ملا عبدالسلام لاہوری نے پچاس برس تک پڑھایا۔ اس عرصے میں ان کے سپرد فتاویٰ نویسی بھی تھی۔ انھوں نے اس سے وقت بچا کر درس کا سلسلہ جاری رکھا۔"

ملا نظام الدین ہروی طبقاتِ اکبری میں لکھتا ہے کہ "ملا عبدالسلام لاہوری فحول علمائے لاہور بود۔"[1]

[1] طبقاتِ اکبری جلد دوم صفحہ ۴۶۹

ملا عبدالسلام نوّے برس کی عمر پا کر ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔ یہ شاہجہانی حکومت کا پہلا سال تھا۔

مبرک شیخ ہروی

مبرک شیخ ہروی ایران سے لاہور آیا۔ وہ عہد جہانگیری کے مشہور فاضل اور قاضی محمد اسلم کا بھتیجا تھا۔ اس وقت ملا عبدالسلام کا درس معراجِ شباب پر تھا اور اس کی شہرت و عظمت کا سکہ چلتا تھا۔ اسی بنا پر مبرک شیخ اپنی فضیلت کے باوجود ان کے درس میں شریک ہوا اور جب یہاں سے فارغ ہوا۔ تو جہانگیر نے اسے پہلے داراشکوہ اور بعد میں دوسرے شہزادوں کی تعلیم پر مامور کیا۔ شاہ جہان کے زمانے میں وہ دو ہزاری منصب دار تھا۔ عالمگیر نے اسے تمام مملکت کا صدر الصدور بنایا۔ مبرک شیخ ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء میں فوت ہوا۔

سید سر

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آزاد حکومتوں میں دو پیشے بہت معزز سمجھے جاتے تھے اور اکثر لوگ انھیں ہی اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک سپہ گری اور دوسرا تعلیم و تعلّم۔ ان میں تعلیم و تعلّم کا پیشہ بڑا شریف اور بجد معزز سمجھا جاتا تھا۔ سپاہی زادے بھی اس کوشش میں رہتے تھے کہ وہ معلمی کے پیشے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ جن دنوں سکندر سوری شاہ اٹک کے پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک سید زادہ باہر سے آیا اور اس کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ یہ سید عبدالواسع تھا جو ایک گمنام سپاہی کی حیثیت سے جنگوں میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتا رہا۔ آخر کار اکبر کے ابتدائی ایام حکومت میں سرہند کے قریب ایک جنگ میں مارا گیا۔

اس کا بیٹا ملا سید عبدالخالق تھا جو عالم و فاضل، زاہد و متقی، عبادت گذار اور ریاضت کیش تھا۔ فقہ، اصول، حدیث، معانی، ادب، منطق اور قرآنی علوم کی ہر شاخ میں عالم متبحر تھا۔ باپ اگر سپاہی تھا تو بیٹا علم و عرفان کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ اس نے باپ کے خلاف دین اور علوم دین کی خدمت اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور لاہور میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ مدرسے کے پاس ایک تالاب بھی کھدوایا۔ آپ کی مناسبت سے یہ تالاب سید سر اور گرد و نواح کی آبادی گذر سید سر کے نام سے مشہور ہوئی۔ جہاں یہ مدرسہ، آبادی اور تالاب تھا وہاں اس وقت برٹ انسٹی ٹیوٹ اور ریلوے افسروں کی کوٹھیاں ہیں۔

مدرسہ جاری کرنے سے پہلے سید عبدالخالق ایک حجرے میں رہتے اور ریاضت او نفس کشی کر کے تصوّف کی منازل طے کر رہے تھے۔ یکایک طبیعت میں انقلاب آیا اور آپ سعدیؔ کے ان اشعار پر عمل پیرا ہو گئے ؎

صاحبدلے بہ مدرسہ آمد زخانقاہ
بشکست عہدِ صحبت اہلِ طریق را
گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می برد زموج
ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

حجرہ نشینی ترک کی اور مسند درس پر قدم رکھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ آپ کی ذات ظاہری اور باطنی علوم کا مجمع البحرین تھی اس لیے زبان میں تاثیر اور نگاہ میں جذب تھا۔ جو پڑھاتے وہ دل میں اتر جاتا اور جو کہتے اس کے ساتھ عمل کی

قوتیں بیدار ہو جائیں۔ طلبا استاد کا رنگ لے کر مدرسے سے نکلتے۔ گویا اخلاقی تربیت اور تعمیرِ انسانیت آپ کے درس کے دو نمایاں پہلو تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے درس کو بڑی ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور دنوں میں اس کی شہرت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

جن دنوں اکبر سیاسی مصالح اور ہمسایہ ملکوں کے سیاسی حالات کے مطالعہ کے لیے لاہور میں مقیم تھا اس کے کانوں تک آپ کی شہرت پہنچی۔ اس نے اس مدرسے کے نام ایک گاؤں اور دوسرے دو گاؤں میں سے نو سے بیگھے زمین وقف کی تاکہ مدرسے کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور تعلیم کا کام بے کھٹکے چلتا رہے۔ مولانا سید عبدالخالق ایک مدت تک اس مدرسے میں کام کرتے رہے۔ آپ کے فوت ہونے کے بعد آپ کے فرزند سید عبدالوہاب نے یہ مسند سنبھالی اور اپنے نامور باپ کے انداز میں درس دینا شروع کیا۔ مدرسے کی رونق روز بروز ترقی کرتی گئی۔ جب سید عبدالوہاب نے داعیِ حق کو لبیک کہا تو سید عبدالقادر ان کے جانشین ہوئے۔ سید عبدالقادر کے بعد سید عبداللہ نے یہ خاندانی فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ درس نواب زکریا خاں کے زمانہ تک پوری رونق پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ سکھوں کی تاخت و تاراج نے شہر کی بیرونی آبادی میں ہلچل مچادی۔ لوگ ان کی لوٹ مار سے خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آبادیاں ویران ہو گئیں درس بند ہو گئے جہاں کسی کے سینگ سمائے وہیں جا چھپے۔ مدرسہ سید سر بالکل برباد ہو گیا۔

سید عبدالخالق نے مدرسے کے ساتھ جو تالاب تعمیر کیا تھا اس کے بارے میں لوگوں میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ عوام میں یہ تالاب بڑا متبرک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگ پھوڑے پھنسی والے بچوں کو نہلاتے اور وہ شفایاب ہوتے۔ مولوی نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ جب ہم اپنی کتاب تحقیقات چشتی کے سلسلے میں وہاں گیا تو نہ وہاں مدرسہ تھا نہ تالاب اس کی بجائے ہرے بھرے کھیت تھے۔ مگر عقیدت مند وہاں سے مٹی اٹھا لے جاتے اور پانی میں بھگو کر پھوڑے پھنسی والے بچوں کے جسم پر ملتے اور وہ بچے اسی طرح شفا پاتے۔

مولوی محمد سعید اعجاز

جہانگیری عہد میں مولوی محمد سعید اعجاز دہلی سے لاہور آئے اور چونکہ وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ درس میں بسر کرتے تھے۔ اس لیے لاہور میں بھی انھوں نے یہ مشغلہ جاری کیا۔ محمد افضل سرخوش کلمات الشعرا میں لکھتا ہے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ علوم معقول و منقول کی تحصیل میں بسر ہوا۔ انھوں نے ان کی بدولت اکتساب فضائل کیے۔ فارغ ہونے کے بعد زیادہ تر وقت علم دین کے درس دینے میں صرف کیا اور ہمیشہ طلبا کے "افادت و افاضت" میں مصروف رہے (ص۶)۔ جب وہ لاہور آنے لگے تو انھوں نے یہ مطلع عارفانہ کہا ؎

کشیدہ ام ز جنون ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیرِ مے فروش نماند

سرخوش نے جب یہ مطلع سنا تو بہت متاثر ہوا اور اس کے جواب میں یہ مطلع کہا ؎

گداخت جرأتِ حسن تو ام خروش نماند
چوں برگ گل ز تنم جز لب خموش نماند

مولانا محمد سعید اعجاز اپنے معاصرین میں ظاہری اور معنوی کمالات کی وجہ سے ممتاز تھے۔ وہ مکارم اخلاق کا پیکر تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مگر اس سے ان کے علمی کمالات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

ملا بایزید

نویں صدی ہجری کے وسط میں گیلان کا ایک سید گھرانا وہاں سے ہجرت کرکے ملتان میں آباد ہوا۔ یہ خانوادہ اپنے علاقے میں علمی شہرت رکھتا تھا۔ ادب سے اور مذہبی علوم سے بھی اسے لگاؤ تھا۔ اس لیے جب یہ ملتان پہنچا تو لوگ بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اس خانوادے کے کئی افراد نے اپنی آزادانہ روش کو قائم رکھنے کی خاطر پڑھنے پڑھانے کا شغل اختیار کیا۔ ملتان پہنچ کر اس خاندان کے جس بزرگ نے سب سے پہلے گمنامی سے نکل کر شہرت حاصل کی وہ سید نجم الدین تھے۔ بابر انھیں دہلی لے گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے بایزید نے پھر آبائی پیشے کی طرف رجوع کیا۔ علوم و فنون پڑھے اور فضیلت کی سند حاصل کی۔ دہلی سے لاہور آگئے اور یہاں درس شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی ذات اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ علم کے پیاسے آپ کی خدمت میں آتے۔ فیضیاب ہوتے اور آپ کی توجہ سے صاحب درس بن کر نکلتے۔

مولوی عبدالحکیم گیلانی

ملا بایزید کے تین بیٹے تھے مگر ان تینوں میں سے سید عبدالحکیم کو سب سے بڑھ کر شہرت حاصل ہوئی۔ وہ جہانگیری دورِ حکومت میں جوان ہوئے۔ علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور باپ کی گدی سنبھالی۔ انھوں نے اس جوش و خروش سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر جگہ ان کا نام گونجنے لگا۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ مولوی نور احمد چشتی ایک زبانی روایت کے مطابق ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء قرار دیتے ہیں۔ ان کا مقبرہ شاہ شمس قادری کے مزار کے مغرب کی طرف اور گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب رویہ واقع تھا۔ جب سرکار انگریزی نے انارکلی سے میا نمبر تک جدید سڑک (مال روڈ) بنانی چاہی تو مقبرہ سڑک کے اندر آکر مسمار ہو گیا۔

مولوی عبدالحکیم بڑے متوکل اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ دربار شاہی میں حاضر ہونے کے لیے آپ کو بار بار دعوت دی گئی مگر آپ ہر بار ٹال گئے اور پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے شغل میں لگے رہے۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ جو کوئی آپ سے ملتا آپ کے خلق عظیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ شاگردوں کے لیے آپ کی ذات چشمۂ رحمت تھی۔

مدرسہ قلیج خاں

انہی ایام میں قلیج خاں اندجانی کا مدرسہ بھی بہت مشہور تھا۔ یہ مدرسہ اکبری دور میں قائم ہوا اور قلیج خاں اس میں خود درس دیا کرتا تھا۔ قلیج خاں اکبر کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ ایک بہادر سپاہی، سمجھدار سپہ سالار، نغز گو شاعر، متبحر عالم، زبردست فاضل اور نہایت متقی اور پرہیزگار تھا۔ جن ایام میں وہ لاہور کا گورنر تھا وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے بعد باقی وقت تعلیم و تدریس میں صرف کرتا تھا۔ وہ عام طور پر تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر منقولات میں درس دیا کرتا تھا۔

صاحب مآثر الامرا نے ذخیرۃ الخوانین کے حوالے سے قلیج خاں کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کا بیان ہے کہ سنہ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں قلیج خاں جون پور میں اپنا محل تعمیر کرنے کے لیے بنیادیں کھدوا رہا تھا۔ بنیاد کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک گنبد کے نشان نظر آئے۔ قلیج خاں کو اطلاع دی گئی۔ وہ موقعہ پر آیا اور دس دن تک بڑی احتیاط کے ساتھ اس گنبد کی کھدائی کراتا رہا۔ تمام امیر موقعہ پر جمع تھے۔ آخر ایک دروازہ نمودار ہوا جس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ قلیج خاں نے تالا توڑا اور ایک جم غفیر کے ساتھ گنبد میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص جوگیوں کی طرح آسن جمائے بیٹھا ہے۔ جونہی اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور آدمیوں کی آہٹ پائی تو سر اٹھایا اور ہندی زبان میں پوچھا

"کیا رام چندر کا اوتار ہو چکا ؟" جواب دیا گیا "ہاں" پھر اس نے کہا "آیا سیتا راون کے پنجے سے نکل کر رام چندر کو مل گئی بنا یا گیا "ہاں" پھر اس نے پوچھا "آیا کرشن کا اوتار متھرا میں ہو چکا ؟"

کہا گیا کہ اس واقعہ پر چار ہزار برس گزر چکے ہیں۔ پھر اس نے دریافت کیا "خاتم الانبیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور عرب میں ہو چکا ؟"

سب نے جواب دیا کہ آپ کی وفات پر ایک ہزار برس بیت چکے ہیں اور آپ کے دین کی وجہ سے باقی تمام دین باطل ہو چکے ہیں۔

پھر اس نے پوچھا "کیا گنگا کا پانی جاری ہے ؟"

جواب دیا گیا "ہاں ! ابھی تک آبرو بخش عالم ہے" اس پر اس نے کہا "مجھے باہر نکالو"

سات خیمے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لگائے گئے۔ وہ ہر روز ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے خیمے میں جاتا اور اس طرح آٹھویں دن باہر نکلا۔ وہ اہل اسلام کی طرح نماز پڑھتا۔ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا تھا۔ وہ چھ مہینے زندہ رہا اور پھر فوت ہو گیا۔[1]

ملا یوسف اپنے وقت کے فاضل اجل تھے۔ تحقیق اور تدقیق میں کمال رکھتے تھے۔ ہر مسئلہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے کوئی بات بغیر سند اور حوالے کے پیش نہ کرتے۔ شروع شروع میں آپ نے مولانا جلال سے تحصیل علوم کی اور کچھ عرصہ تک ملا عبد اللطیف کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ جب تحصیل علوم سے فارغ ہوئے تو درس و تدریس شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اکبر کی طرف سے اشارہ ہوا۔ آپ نے شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ مگر اس میں بھی دل نہ لگا۔ اسے ترک کر کے لاہور چلے آئے اور پھر پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ بختاور خاں کہتا ہے کہ

"اب کی مرتبہ آپ بارہ برس تک مسند افادہ پر متمکن رہے" (مراۃ العالم ورق : ۴۹)

عید گاہ جہانگیری جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی جسے بعد میں عید گاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا بازار اور دوسری عمارتیں تھیں۔ ان تمام عمارتوں کی تعمیر پر بیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تھا۔ مدرسے کی عمارت انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت تک نہایت خستہ حالت میں قائم تھی۔ یہ عمارت لاہور سٹیشن کے نزدیک امرتسر کو جانے والی سڑک کے دائیں طرف واقع تھی۔ تحقیقات چشتیہ کے فاضل مصنف نے اس عمارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ یہ عمارت بہت خوبصورت اور جالی دار تھی اور ریلوے افسروں کی رہائش کے کام آتی تھی جب اسٹیشن کو وسعت دی گئی تو یہ مسجد گرا دی گئی۔[2]

شاہجہان کے وقت میں یہ مدرسہ پورے عروج پر تھا۔ عمارتوں اور بازار کی تمام جائداد اس کے نام وقف تھی۔ شروع شروع میں نور جہاں کے ایما پر مولوی عنایت حسین اس مدرسہ کے مہتمم اور صدر المدرسین بنے۔ حافظ حبیب مسجد کی امامت بھی کرتے تھے اور درس بھی دیتے تھے۔ سید مقبول حسین اس وقف کے امین تھے۔ ان کے علاوہ پچاس کے قریب مدرس، منشی اور دیگر کارندے وغیرہ تھے جو اس مدرسے کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ مدرسہ احمد شاہ ابدالی کے حملے تک دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا اور سکھ گردی میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔

---

[1] مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۳۰۷۔

[2] سید محمد لطیف جج نے تاریخ پنجاب ۱۸۹۱ء میں تصنیف کی۔ وہ عید گاہ جہانگیری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ قدیم عمارت اثنائے انطباع کتاب میں منہدم کر دی گئی" (دیکھو حاشیہ ص۲۹۴) (قریشی)

عہد شہاب الدین شاہجہان ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء

پیشتر اس کے کہ ہم عہد شاہجہانی میں لاہور کے مشہور مدارس اور علماء کا ذکر کریں ہم مجمل طور پر شاہجہان کے علمی مذاق اور تعلیم کے متعلق کچھ باتیں سپردِ قلم کرنا چاہتے ہیں۔

اکبر جیسے دادا کی آغوش میں شاہجہان نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کی تعلیم اس وقت کے بہترین فضلاء کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اس کا پہلا استاد قاسم بیگ تبریزی تھا جو معقولات اور منقولات کے علاوہ ایک صاحب دل بزرگ بھی تھا اور سلوک میں کافی ریاضتیں کر چکا تھا۔ وہ مرزا جان تبریزی کا شاگرد رشید تھا۔ اس کے علاوہ شیخ مبارک کے خلف الصدق شیخ ابوالخیر نے بھی شہزادہ کو درس دیا۔ امینائے قزوینی اور ملا محمد صالح شاہجہان کے اساتذہ میں حکیم دوائی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اکبری دور میں حکیم عین الملک شیرازی کو حکیم دوائی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ وہ ملا عبدالقادر بدایونی کا دستِ راست اور علامہ دوانی کی نسل سے تھا مگر اس کا انتقال ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ شہزادے کا استاد نہیں ہو سکتا۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اعزاز حکیم عین الملک دوائی کے خواہر زادے حکیم علی گیلانی کو حاصل ہوا ہو گا کیونکہ بعد کے مورخ اسے بھی حکیم دوائی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شہزادگی کے ایام میں شاہجہان اکثر حکیم علی گیلانی ہی کی صحبت میں رہا اور اس کی صحبت نے شاہجہان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ حکیم علی گیلانی دورِ اکبری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہے طب کی دنیا نے شیخ الرئیس کے بعد اتنا بڑا طبیب پیدا نہیں کیا۔ اس کی عظمت پر شرح قانون شیخ گواہ ہے۔ اس کا دماغ اختراع پسند تھا۔ لاہور اور آگرہ میں اس نے ایک ایسا حوض تیار کیا جس کے نیچے چند کمروں کی بیٹھک تھی اور حوض کا پانی معلق رہتا اور چھت کا کام دیتا تھا۔ اکبر اور جہانگیر نے خود اس حوض کی سیر کی۔ حکیم علی گیلانی حدیث میں شیخ عبدالنبی کا شاگرد تھا، طب اور فلسفہ حکیم عین الملک شیرازی اور شیخ فتح اللہ گیلانی سے اکتساب کیے تھے۔ وہ یونانی فلسفہ کا ماہر تھا۔ اس نے شہزادے کے دل پر ایسا اثر چھوڑا جو مدت العمر قائم رہا۔ عمل صالح کے قول کے بموجب حکیم دوائی گیلانی ہی بادشاہ کا ایک استاد تھا جس کے حقوق دوسرے اساتذہ سے فائق تھے۔ شاہجہان کہا کرتا تھا کہ

"حکیم دوائی آموزگار ماست۔ حق تعلیم او بر ما از استادان دیگر بیش است"[1]

تاتار خاں کو ترکی زبان سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ جہانگیر کو کہنا پڑا کہ "اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ شہزادہ خرم میں کیا کمی ہے تو میں کہوں گا کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا"

مغل شہزادے محض کتابی کیڑے ہی نہیں ہوتے تھے۔ انھیں اس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی کہ دماغ کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت بھی ہو۔ اکبر نے میر مراد جوینی کو تیر اندازی سکھانے کے لیے مقرر کیا چنانچہ ۱۵۹۷ء میں جب اکبر آخری مرتبہ کشمیر گیا تو اس نے خرم کو لاہور میں چھوڑا تاکہ میر مراد جوینی (جو اس زمانے میں لاہور کا بخشی تھا) اسے تیر اندازی کی مشق کرائے اور شہزادہ تعلیم فور بجا لائے۔

دکن میں وہ دارا کے ہمراہ گیا۔ وہاں راجہ شال باہن کو شمشیر زنی اور تفنگ اندازی سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس تعلیم و تربیت

---

[1] عمل صالح جلد اول ص ۳۲

کا اثر یہ ہوا کہ شہزادہ جوان ہو کر شمشیر زنی، تیر اندازی اور شہسواری کا شائق بن گیا۔

شاہجہاں کی علمی قابلیت کے بارے میں تفصیلات پیش کرنا کچھ آسان بات نہیں۔ کیونکہ اس کی کوئی مستقل معنوی یادگار ہمارے پاس محفوظ نہیں۔ اس کے افسانہ ہائے حیات کا سرنامہ اس کی شوکت و جبروت ہے جو اس کی شاندار عمارات اور لطیف و نفیس یادگاروں سے ہویدا ہے۔ اس نے نہ تو اپنے باپ کی طرح کوئی علمی یادگار چھوڑی نہ بیٹے کی طرح اس کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ موجود ہے۔ البتہ لال قلعہ دہلی جامع مسجد اور تاج محل کے در و دیوار اس کے حسن ذوق کے آئینہ دار ہیں مگر پھر بھی اس دور کی علمی تاریخ معارف نوازی کے افسانوں اور علمی و ادبی دلچسپیوں سے خالی نہیں۔ اس کا دربار ارباب علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں موروثی خصوصیتوں سے کافی حد تک بہرہ اندوز تھا۔ اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ ملا لطف اللہ مہندس لاہوری نے جو دارا شکوہ کا مقرب خاص تھا، ایک خط میں دربار کی علمی زندگی کا مرقع اس طرح پیش کیا ہے ؎

وحید دہر امانی بن مہابت خاں — دلے بجان زمانست شیرہ دوراں
دگر یگانہ ظفر خاں تخلص احسن — ربودہ گوئے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خاں — بود بہ بحر سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحید زمن شادمان خشم پرور — بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی — بقائے نام شدہ از دولت سخندانی
مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد — کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد
لبیب اثر محمد حسین آشوب است — سخنورے کہ سخن ہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان است طالبائے کلیم — کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد جان — بہ عہد شاہجہاں گوئے ربودہ از اقران
الہی ہمدانی ست در سخن استاد — سخنوریست کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ امی نخواند ہیچ کتاب — ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا نزانہ او — خوش است ہمچو نوا ہائے عاشقانۂ او

فصیح از منہ فنی کہ چوں غزل می گفت
چوں عندلیب نو لخواں دردگر می سفت

(اسپرنگر ص ۱۱۶)

یہ فقط شعراء کے نام ہیں۔ علماء اور فضلا کی فہرستیں اس کے علاوہ ہیں۔

شاہجہاں کی علمی قابلیت کا پتہ تاریخ کے بعض بعض واقعات سے بھی ملتا ہے جو مورخین نے کہیں کہیں قلمبند کر دیے ہیں۔ ایک مرتبہ جب شاہجہاں کی سفارت عراق گئی تو سلطان کے وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تہافتہ الفلاسفہ میں قدم علم و نفی علم رب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اہل سفارت نے یہ اطلاع بادشاہ کو پہنچائی۔ شاہجہاں

نے اپنے وزیر علامہ نواب سعد اللہ خاں کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھو کر دہ ہفتہ عشرہ میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کریں جسے سلطان عراق کے پاس ارسال کیا جائے۔ شاہجہان کا یہ فرمان پہلی مرتبہ رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا کہ:۔

"شاہجہان کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے کہ اس نے مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا۔ اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا۔ . . . . . سعد اللہ خاں کی علمی استعداد تو مشہور ہے۔ لیکن شاہجہان کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتی ہے کہ کچھ کم نہ تھی۔ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اس کو سمجھ سکتا ہے۔" (معارف جلد ۱۰ نمبر ۴)

ایک مرتبہ شاہجہانی دربار پوری شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ ہر ولایت کے دانشور اور فاضل اس میں موجود تھے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی اور ہر درباری اس گفتگو کو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ حکیم مشرب اور حکمت پژوہ شہنشاہ جو علمی ذوق اور تحقیق کا شوق بھی رکھتا تھا، ان مباحثوں میں دخل دے رہا تھا۔ ہوتے ہوتے سلسلۂ گفتگو کا رُخ بادشاہوں کی طرف پلٹا۔ یمین الدولہ آصف خاں نے سکندر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس جلیل القدر اور عالی مرتبت بادشاہ کو فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس کی عظمت کی یہ حالت ہے کہ کسی دانا اور حکیم نے اس راست گفتار اور درست کردار بادشاہ کے کسی قول اور فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ بادشاہ نے یہ سنا تو فرمایا کہ چونکہ سکندر فیلقوس کی نبوت محل نظر ہے اور علمائے تاریخ سکندر ذوالقرنین کو اس سے الگ شخصیت قرار دیتے ہیں، مجھے اس پر دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ جب دارا کا قاصد خراج لینے کے لیے اس کے پاس پہنچا اور خراج کا بقایا حساب اس طلائی بیضے کے ساتھ طلب کیا جو اس کا باپ ہر سال دارا کے پاس بھیجا کرتا تھا تو سکندر نے اس کے جواب میں کہا ع

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

اوّل باپ کی نسبت ایسا کہنا کمال سوء ادب ہے۔ دوسرے سکندر نے حزم اور احتیاط کو ترک کر کے نوشابہ کے دربار میں ایلچی کی حیثیت سے جانا گوارا کیا جو اتنے بڑے بادشاہ کے شایانِ شان نہ تھا کیونکہ دانا اس فعل کا ارتکاب نہیں کرتا جس کا انجام پشیمانی ہو اور جس کا علاج اس کے دستِ قدرت سے باہر ہو۔ تمام امراء اور فضلا نے بادشاہ کے کلام کی تائید کی۔[1]

۲۳ ذیقعدہ یا بقول عمل صالح ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۴۶ھ کو دربار میں ملکی معاملات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو کسی نے کہا کہ فلاں صوبہ کا دیوان جزرسی کے خیال سے خلق اللہ پر جبر اور تشدد روا رکھتا ہے۔ بادشاہ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس کا یہ طرز عمل آئین کارگزاری کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ "سخت گرفتن کارہا و تنگ کردن مساحت امور باعث آں می شود کہ سستی و فتور در اساس پیش رفت کارہا افتد و عرصۂ ملک بر فتنہ و فتنہ گراں فراخ گردد۔" دوسرے لفظوں میں شاہجہان کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا کے معاملات مصالحت اور مسامحت کے بغیر طے نہیں پا سکتے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بڑی بڑی ملکی مہمات اور عظیم الشان معاملات ترک مدارا اور عدم مواسا سے بگڑ جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ان معاملات سے متکفلوں کے دل و دماغ میں انتشار اور پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے ع

سخت می گیرد جہاں بر مردمانِ سخت کوش

---

[1] عمل صالح جلد اوّل ص ۱۴۱۔ منتخب اللباب جلد اوّل ص ۵۴۲۔ بادشاہنامہ جلد اول حصہ دوم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ احکام دین اور امور شریعت میں حق پر تھے اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے تھے۔ بلکہ بعض امور ایسے تھے جن میں اغماض ضروری تھا مگر آپ نہ فرماتے تھے۔ اس واسطے آپ کے ایام خلافت میں شورش عظیم برپا ہوئی جس کا ذکر کتابوں میں مذکور ہے

بادشاہ کی اس گفتگو پر سید جلال بخاری صدر الصدور نے عرض کیا کہ جناب امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے۔ ایک حق، دوسرا باطل اور میں چاہتا ہوں کہ یہ حق پر ہی قائم ہو۔ صدر الصدور کی یہ بات نہ چلی۔ بادشاہ نے اس مقولے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک فصیح و بلیغ تقریر کی جو معاصرین نے اپنے ہاں نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :-

"اگر اس مقولے کی صحت پر یقین کر لیا جائے تو پھر بھی لازم آتا ہے کہ ہم یہ یاد کریں کہ شیخین نے اپنی خلافت کے ایام میں باطل کا طریقہ اختیار کیا حالانکہ وہ ہر حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے کی پیروی کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آنحضرت موجودات اور اکرم مخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن حق گذار دیندار کیسے قبول کر سکتا ہے کہ ان برگزیدہ خدا کے زمانۂ صدق نشان میں باطل رائج ہوا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی کی وجہ سے صحابہ کے دلوں سے اختلاف کا رنگ دھل کر صاف ہو گیا تھا۔ ان کی طبیعتوں کے صفحات باہمی اختلافات سے یکسر خالی تھے۔ نبی اکرم کے قول و فعل لوگوں کے لیے مقاصد کے حصول کا سرمایہ تھے۔ اس لیے وہ انکی پیروی سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ یہی حالت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں تھی۔ جب ان نفوس قدسیہ کا زمانہ با سعادت گزر گیا اور رسول اللہ کے زمانہ سے دور ہٹ جانے کی وجہ سے عدل اور مساوات میں خلل پیدا ہوا تو لوگ صداقت سے دور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناب ذوالنورینؓ کی شہادت کا حادثہ روپذیر ہوا جس کے ساتھ ایسی فتنہ انگیزی کا آغاز ہوا جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانے میں برگ و بار لائی اور تمام مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے گئی۔" ۱؎

عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں اپنے فرزند عزیز شہزادہ محمد اعظم کو لکھتا ہے :-

"فرزند عالیجاہ! ہمارے بزرگ اعلیٰ حضرت (شاہجہان) کی بیاض سے چند فقرے ہمیں پسند آئے جو ہم دلی محبت کی بنا پر تمہیں لکھتے ہیں کہ تم بھی اس سے لطف اندوز ہو۔

یہ چیزیں بہترین اعمال ہیں، بڑے آدمیوں کو منہ نہ لگانا۔ مقصد حل نہ ہونے کی صورت میں رنجیدہ نہ ہونا۔ نیک خصلت اور نیک بخت آدمیوں کو رنجیدہ نہ کرنا۔ آخرت میں سرخرو ہونے کیلئے نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا اور اچھے آدمیوں کی ٹوہ میں لگے رہنا جو اپنے اندر کام

۱؎ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۲۵۳ ۔ ۲۵۵ + عمل صالح جلد دوم صفحہ ۲۳۴

کی استعداد رکھتے ہوں۔ جاہل آدمیوں کو اپنے ہاں آنے کی اجازت نہ دینا مستحق لوگوں کو سوال کرنے سے پیشتر حسب توفیق کچھ نہ کچھ دینا۔ بزرگوں اور فاضل ہستیوں کی عزت کرنا طبیعت کو عدل و انصاف میں مصروف رکھنا۔ بدعقیدہ لوگوں کی طرف رجوع نہ کرنا جو لوگ اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کر کے گوشوں اور زاویوں میں بیٹھے ہیں ان کے حالات سے غافل نہ ہونا بے لاگ اور حق گو لوگوں کے وجود کو غنیمت تصور کرنا اور اپنے حضور ایسے لوگوں کو جگہ دینا جو آخرت کے کاموں کو درست کرنے والے ہیں۔"

۱۰۴۲ھ میں شاہجہان کی خدمت میں ایک نہایت عجیب تحفہ لاہور میں پیش کیا گیا۔ یہ تحفہ تربیت خاں اپنے ہمراہ بلخ سے لایا تھا۔ تربیت خاں کو شاہجہان نے نذر محمد خاں والیٔ بلخ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اسے قیام بلخ کے دوران قرآن پاک کا ایک ایسا نایاب و بیش بہا نسخہ ملا جو خاندان تیموریہ کی قدسیہ منش خاتون شاد ملک قاسم بنت سلطان محمد میرزا بن جہانگیر میرزا بن صاحبقران کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ نسخہ خط ریحان میں بکمال حسن و لطافت سے تحریر کیا گیا تھا۔ بسم اللہ کی با سے تمت کی تا تک ایک ہی قلم سے تھا۔ اس کے خاتمہ پر بیگم نے اپنا نسب نامہ خط رقاع میں نہایت خوش خط لکھا تھا۔ بادشاہ کو یہ نسخہ بہت پسند آیا اور اسے شاہی کتب خانے میں داخل کیا۔

ان چند واقعات سے شاہجہان کے علمی مذاق اور طبیعت کے رجحان کا پتہ چل سکتا ہے۔ تمام مورخ کہتے ہیں کہ اس کا علمی ذوق دوسرے شہزادوں سے کم نہ تھا۔ وہ رات کو سونے سے پیشتر شیریں آواز پڑھنے والوں سے اکثر تاریخ کی کتابیں سنا کرتا تھا جن میں تزک بابری ظفر نامہ تیموری اور اکبر نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہجہان کو خوش نویسی میں بھی اچھا خاصا درک حاصل تھا۔ وہ اس فن کا خاص طور پر دلدادہ تھا۔ دور شاہجہانی کی تعمیرات کے کتبے اس کے اس مذاق کا صحیح پتہ دیتے ہیں۔ نستعلیق کی ترقی کا زمانہ اسی کا زمانہ ہے۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص میر علی ہروی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی چیز لائے اسے یک صدی کا عہدہ دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں خوش نویسی اور خطاطی کو خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ عمل صالح کی مندرجہ ذیل عبارت سے شاہجہان کے عام علمی اور فنی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"بسے بر بنا مذکہ بہ تفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ در جمیع فنون و فضائل دقائق نکتہ فہمی را با علیٰ درجات کمال رسانید و در عرض اندک مایہ مدتے بے آنکہ کار بطول کشد ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختۂ مشق از ریختۂ قلم مشکین رقم چوں صفحۂ رخسار نوخطان بحسن خط زینت گرفت۔"[1]

شاہجہان لاہور میں پیدا ہوا تھا اس لیے یہ شہر اسے خاص طور پر عزیز تھا۔ اس کے عہد میں لاہور نے گوناگوں ترقی کی۔ اس وقت ایران اور ہندوستان کے تعلقات بظاہر بڑے خوشگوار تھے دونوں سلطنتیں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتی تھیں مگر ایران شیعہ دنیا کا مرکز ہونے کی بنا پر ہندوستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ دکن میں بیجاپور وغیرہ شیعہ سلطنتیں تھیں۔ ایرانی بادشاہ تیموریوں کے ساتھ

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۱

دوستانہ تعلقات رکھنے کے باوجود خفیہ طور پر دکن کی ان شیعہ ریاستوں کو تیموریوں کے خلاف تخریب پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ قندھار کی وجہ سے یہ تعلقات اب بالکل خراب ہو رہے تھے۔ وسط ایشیا میں ازبک خاندان کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر نذر محمد خاں والیٔ بلخ اور عبدالعزیز خان وغیرہ تیموریوں سے ہمسری کا دعویٰ رکھتے تھے۔ یہ خطرات اکبر کے وقت سے اب تک بدستور قائم تھے۔ افغانستان میں کبھی کبھی امن وامان قائم ہو جاتا تھا مگر پھر فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ ان حالات میں مغل بادشاہوں کو اپنی توجہ زیادہ تر لاہور ہی پر رکھنی پڑتی تھی۔ شاہجہان پہلی فرصت میں لاہور آتا اور بخارا اور قندھار کے بگڑے ہوئے حالات اور ایرانیوں کی سازشوں کا قلع قمع کرتا مگر خان جہاں لودھی کی بغاوت نے اسے ایسا کرنے کی مہلت نہ دی۔

اس وقت تک لاہور میں جہانگیر کی بیگمات موجود تھیں۔ شاہجہاں چاہتا تھا کہ وہ بھی اکبر آباد چلی آئیں۔ چنانچہ محرم ۱۰۳۸ھ میں اس نے حکم دیا کہ معتقد خاں سرہند سے روانہ ہو کر لاہور جائے اور تمام بیگمات اور ان کے نوکر چاکروں کو اکبر آباد لے آئے۔

شاہجہان کے زمانے میں لاہور ایک بہت بڑا علمی اور تمدنی مرکز تھا جو تمام ایشیا میں شہرت رکھتا تھا اور جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ بادشاہ نے اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چل کر علوم وفنون کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں جابجا مدارس جاری ہوئے۔ علماء نے اپنے فیضان کو عام کیا۔ گلی گلی، کوچے کوچے مکتب کھل گئے اور تعلیم عام ہو گئی۔ محمد صادق طبقات شاہجہانی میں لکھتا ہے کہ اس وقت ہر گاؤں میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ کوئی قصبہ تعلیمی چرچے سے خالی نہ تھا۔ پنڈت ڈلاولا اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ تمام مدرسے بالکل آزاد تھے اور ان میں سے اکثر مقامی اوقاف اور نیک دل لوگوں کی سخاوت پر چلتے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی اپنی مشہور تصنیف مآثر الکرام میں شاہجہانی دور کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "پانچ پانچ دس دس کوس پر شرفا کی آبادیاں تھیں جنھیں سلاطین وقت سے وظائف اور زمین مدد معاش کے طور پر ملی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائی ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے مدرسوں نے ہر جگہ طالب علموں کے لیے علم کے دروازے کھول رکھے تھے اور ان کا نعرہ تھا کہ "علم طلب کرنے والو ادھر آؤ"۔ علم کے طالب گروہ در گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتے۔ جہاں کے حالات ان کو موافق آتے، وہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے۔ ہر آبادی کے صاحب توفیق لوگ طالب علموں کو اپنے ہاں ٹھہراتے اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ خیال کرتے۔"

یہ حالات عام تھے مگر اودھ اور الہ آباد کے صوبے میں یہ باتیں خاص طور پر پائی جاتی تھیں۔ پنجاب امن وامان کا گہوارہ تھا۔ شاہجہاں کئی مرتبہ یہاں دورے پر آیا۔ لاہور سے چار مرتبہ کشمیر اور متعدد بار کابل گیا۔ ان دوروں کی تفصیلات مکمل طور پر ہمعصر مورخین میں ملتی ہیں۔ ان سے مولانا آزاد بلگرامی کے بیان کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔

سب سے عجیب بات جو ہمیں اس سلسلے میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تعلیم بالکل مفت ہوتی تھی۔ طلبہ کو نہ فیس کی فکر تھی۔ نہ بورڈنگ کے اخراجات کی۔ طعام وقیام اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی مدرسہ کے ذمے ہوتی تھی۔ طلبہ جب چاہتے اور جس جگہ چاہتے تعلیم

حاصل کرنے کے لیے چلے جاتے، اگر ہمت باندھ کر تحصیل علم میں مشغول ہوتے اور فاضل بن کر درس گاہ سے نکلتے۔ پھر جو کچھ پڑھا ہوتا اس کا فیض دوسروں کو پہنچاتے۔ امرا کا طبقہ طلبہ کا سب سے بڑا مربی تھا۔ وہ حسب توفیق ان کی مدد کرتا اور تحصیل علم کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا اپنی دینوی وجاہت کیلئے ضروری اور آخرت کے لیے توشہ خیال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی گاؤں کوئی قریہ، کوئی محلہ اور کوئی گلی درس و تدریس سے خالی نہ تھی۔ سب سے زیادہ اس بات کا چرچا جونپور، الہ آباد اور دوسرے مشرقی صوبوں میں تھا جس کی بنا پر شاہجہان کہا کرتا تھا کہ

"پورب شیراز ماست"

یہ سلسلہ بقول مولانا آزاد بلگرامی ۱۱۳۰ھ تک قائم رہا۔ جب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری محمد شاہ کے آغاز جلوس میں اودھ کا حاکم ہوا تو یہ بساط الٹ گئی۔[1] منوچی کہتا ہے کہ شاہجہان کے زمانے میں لاہور بڑے بڑے فضلا کا مرکز تھا اور ان کے گرد بیشتر طلبہ رہتے تھے۔

دارا شکوہ ۱۰۴۲ھ میں اپنے باپ کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے لاہور آیا۔ جب اس نے اپنا تذکرہ سفینۃ الاولیاء لکھا تو اس نے لاہور کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا:۔

"لاہور ایک نہایت معزز اور ممتاز شہر ہے۔ اس جیسا دوسرا کوئی اور شہر روئے زمین پر نہیں۔ آج وہ اولیائے صالحین اور علماء و فضلا کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں بہت سے مشائخ اور اولیاء اللہ کے مزار ہیں۔ ایک مشہور روایت ہے کہ شہر لاہور کے محلہ تلہ میں اس دیباسے قبل جو عہد جہانگیری میں چھپی تھی۔ مرد و زن۔ صغیر و کبیر تین ہزار حفاظ تھے۔ اب بھی اس شہر میں ان گنت تعداد حفاظ ہے۔" (سفینۃ الاولیاء اردو ترجمہ ص ۱۹۸)

(" " فارسی ص ۱۶۵ مطبوعہ ۱۸۷۲ء)

مدرسہ دائی لاڈو

دائی لاڈو جو شاہجہان کی دایہ تھی، بہت مال دار اور پرہیزگار خاتون تھی۔ وہ شیخ سلیم چشتی کی مریدہ تھی اور فریضہ حج بھی ادا کر چکی تھی۔ اس کے محلات لاہور کے محلہ زین خاں میں تھے۔ یہ محلہ کبھی "گذر تلہ" بھی کہلاتا تھا۔ شاہجہان کے زمانے میں محلہ دائی لاڈو کے نام سے مشہور رہا۔ جہاں پہلے رتن باغ تھا اور اب "ون یونٹ ہسپتال بن گیا ہے"، بھارت بلڈنگ، جہاں سنگھ کا باغ، بسنت روڈ اور گاندھی پارک واقع ہیں، وہیں یہ محلہ آباد تھا۔ دایہ مذکور نے ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں وہاں اپنی مسجد بنوائی جو اب تک موجود ہے۔ مسجد میں دائی لاڈو اور اس کے خاوند کی قبریں بھی ہیں۔

دائی لاڈو نے اس مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور اپنی جائداد کا بہت سا حصہ اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کیا۔ مدرسہ کے پہلے شیخ (پرنسپل) مولانا عصمت اللہ تھے۔ مولانا کی شہرت دور دور تک تھی۔ وہ بے حد پرہیزگار اور متقی تھے۔ معقولات اور منقولات میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ مولانا کی کشش ہر طرف سے طلبہ کو وہاں کھینچ لائی اور تھوڑے ہی دنوں میں مدرسہ ایک زبردست تعلیمی مرکز بن گیا۔

دائی لاڈو ۵ محرم سنہ ۵ جلوس کو فوت ہوئی۔ اس کا خاوند اس کی وفات سے دس ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ ان کے فرزند محمد شکوہ

---

[1] مآثر الکرام صفحہ ۲۲۱-۲۲۲

سنے اس ادارے کو بدستور چلایا اور قائم رکھا۔ چونکہ وہ لاولد تھا اس نے اپنی تمام جائداد مدرسہ کے نام وقف کر دی۔

یہ مدرسہ نواب زکریا خاں کے زمانے تک قائم رہا جب سکھ لاہور پر قابض ہوئے تو انھوں نے دیگر علمی اداروں کے ساتھ اسے بھی تباہ کر دیا۔ مدرسہ کی عمارت اور حویلیاں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئیں۔ ۱۸۵۱ء میں جب رتن چند ڈاڑھی والا نے اپنا رتن باغ اور حویلی تعمیر کی تو یہیں کی عمارتوں کو کھدوا کر اینٹیں حاصل کیں۔ مسجد کے ایک طرف میاں سکھ کا باغ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ علاقہ اجڑا تو عیسائیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنے ادارے قائم کئے۔ وہ جگہ بھی دائی لاڈو کی ملکیت تھی جس جگہ آج کل میڈیکل کالج کا نالا اب گراؤنڈ اور ہوسٹل ہیں۔ وہاں کبھی سربفلک عمارتیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ جب نالا اب کھدا رہا تھا تو اس کے نیچے سے پختہ اینٹوں کی بنیادیں نکلی تھیں۔

درس میاں وڈا یا مدرسہ تیل واڑہ

دوسرا اہم مدرسہ جو اس دور میں قائم ہوا، وہ آج کل درس میاں وڈا یا بڑے میاں کا درس کہلاتا ہے۔ اس مقام پر شاہجہان کے زمانے میں محلہ تیل واڑہ آباد تھا۔ اور یہ شہر کے سب سے متمول اور شاندار سول اسٹیشن مغلپورہ کا ایک حصہ تھا۔

اس درس کے بانی مولانا محمد اسمٰعیل سہروردی تھے۔ آپ ذات کے کھوکھر تھے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آپ کی ولادت ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۷ء میں ترکراں علاقہ پوٹھوہار میں ہوئی۔ آپ کے والد فتح اللہ بن عبداللہ بن سرفراز تھے۔ ابتدا میں آپ شیخ عبدالکریم سہروردی کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت آپ کی سکونت موضع لنگر میں تھی جو دریائے چناب کے کنارے ایک آباد گاؤں تھا۔ آپ کی طالب علمی کا ایک مشہور واقعہ مفتی غلام سرور لاہوری نے "خزینۃ الاصفیا" میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آپ علوم دینی کی تحصیل میں ہمہ تن مصروف تھے تو آپ کی گھر بار جو برس تھی مولانا عبدالکریم کے درس کے ساتھ لنگر بھی تھا جہاں سے طلبہ کو کھانا ملتا تھا۔ ہر طالب علم باہمی تعاون، خلوص، ایثار، نیک نیتی اور محبت و شفقت کے جذبہ سے کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا۔ تمام طالب علم آپس میں بھائیوں بھائیوں کی طرح رہتے تھے جس سے یہ درس گاہ ایک برادری معلوم ہوتی تھی۔ حسد، کوتاہ بینی، غرور اور تنگ نظری جو آج کل کی درس گاہوں کا خاصا ہیں یہاں بالکل معدوم تھے۔ میاں محمد اسمٰعیل کے سپرد لنگر کے لیے آٹا پیسنا تھا۔ وہ مدتوں یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ چکی ان کے حجرے میں ہوتی تھی اور وہ وقت مقررہ پر آٹا لنگر میں پہنچا دیتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ آٹا وقت پر نہ پہنچا۔ آپ کے ساتھیوں نے کچھ عرصہ انتظار کیا پھر وہ پریشان ہوئے کہ کہیں میاں محمد اسمٰعیل بیمار تو نہیں ہو گئے۔ آپ کا ایک ہم سبق آپ کے حجرے کی طرف آیا اور چپ چاپ اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ میاں اسمٰعیل تو مراقبہ میں ہیں۔ چکی خود بخود چل رہی ہے اور آٹا پس رہا ہے۔ وہ دبے پاؤں واپس استاد کے پاس آیا۔ اسے واقعہ کی اطلاع دی۔ شیخ عبدالکریم کو اس بیان سے کچھ تعجب سا ہوا۔ وہ خود وہاں پہنچے اور جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔ وہ شاگرد کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دل ہی دل میں ان کی تعریف کرنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد میاں اسمٰعیل کو ہوش آیا۔ وہ آٹا لے کر لنگر میں پہنچے۔ پھر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ تاخیر کی معافی مانگیں۔ استاد نے کہا "اے نور نظر! آج سے تم یہ تکلیف نہ کرنا۔ تمہارے مشاغل میں ہرج ہوتا ہے۔" میاں اسمٰعیل استاد کا یہ حکم سن کر ڈر گئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ استاد نے کہا کہ تمھیں تکلیف دینے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میاں اسمٰعیل نے خدمت کے لیے اصرار کیا تو استاد نے فرمایا۔ اچھا۔ اگر تم ضرور ہی کچھ نہ کچھ خدمت کرنا چاہتے ہو، تو پھر تمھاری یہ خدمت مقرر کی جاتی ہے کہ دن بھر مطالعہ میں مشغول رہو۔ فقط دو وقتہ

دودھ دوہ کر ہمارے ہاں پہنچا دیا کرو۔ آپ نے شفیق استاد کے ارشاد کی تعمیل دل و جان سے کی۔

کچھ عرصہ بعد مخدوم عبدالکریم کے پڑوسیوں نے میاں اسمٰعیل کو صالح اور متقی دیکھ کر یہ خواہش کی کہ ہمارا دودھ بھی تم ہی دوہ دیا کرو۔ آپ نے وعدہ کیا اور استاد کی خدمت کے ساتھ ساتھ مخلوق کی خدمت بھی شروع کر دی۔ آپ کی عادت تھی کہ دودھ کے تمام برتن ایک جگہ جمع کر کے سر کے اوپر اٹھا لیتے اور پھر گاؤں کا رُخ کرتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ مخدوم عبدالکریم اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اسمٰعیل کے سر پر جو برتن رکھے ہوئے ہیں وہ سر سے قدرے بلند ہیں اور آپ پر استغراق کا عالم طاری ہے۔ قدم خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے انھیں یقین کامل ہو گیا کہ آپ ولایت کے درجہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اب ان کے مزید قیام کی ضرورت نہیں، مدرسہ کی پابندی سے آپ کو مزید تکلیف ہو گی۔ اب استادی اور شاگردی کے ظاہری تعلقات سے آپ بے نیاز ہیں۔ چنانچہ آپ نے میاں اسمٰعیل کو طلب کیا اور فرمایا "اب آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ کسی اور مقام کی جانب تشریف لے جائیں۔" میاں اسمٰعیل نے حاضر باشی پر اصرار کیا مگر استاد نے انھیں سمجھایا کہ فرض کی بجا آوری میں اب مزید تساہل و تغافل کی ضرورت نہیں۔ وقت آگیا ہے کہ آپ مسند رُشد و ہدایت پر متمکن ہوں اور خلق اللہ کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔"

میاں اسمٰعیل نے دریافت کیا کہ مجھے کہاں جانے کا حکم ہے؟ استاد نے دریائے چناب کی جانب اشارہ کیا۔ چنانچہ آپ استاد کی ہدایات کے بموجب وہاں سے روانہ ہوئے اور دس میل چلنے کے بعد دریائے چناب کے کنارے ایک شیشم کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر یادِ حق میں مصروف ہو گئے۔

چند یوم کے بعد کچھ طالب علم آنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد ایک سو بیالیس تک پہنچ گئی۔ آپ نے ان کی تعلیم اور روحانی تربیت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سخت قحط پڑا۔ کھانے کو روٹی کا ٹکڑا تک میسر نہ آتا تھا۔ ایک بڑھیا آپ کی خدمت میں ایک روٹی لے کر حاضر ہوئی۔ آپ نے وہ روٹی ایک طالب علم کو دی۔ اس نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اس طرح وہ روٹی گھومتی گھماتی پھر آپ تک پہنچ گئی۔ طلبہ کی یہ باہمی ہمدردی، ایثار اور خلوص دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے۔ یہ منظر آپ کو بہت پسند آیا۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا "تمہارا یہ ایثار ظاہر کرتا ہے کہ تم دنیوی علائق سے بالکل پاک ہو گئے ہو اور روحانیت میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہو کہ جسمانی تکلیف تمہارے لیے کوئی تکلیف نہیں رہی۔ اس حالت میں اگر تم چاہو تو طیور کی مانند اڑ سکتے ہو۔"

طالب علموں پر بار بار آپ کی نگاہ پڑتی تھی اور آپ کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ طبیعت میں کیف اور اس کیف سے وجد پیدا ہوا۔ اسی وجد کی حالت میں آپ نے زبان حق ترجمان سے فرمایا "تم سب اڑ جاؤ۔" یہ سنتے ہی وہ سب پرندوں کی طرح اُڑ گئے اور جو جو مقام شیخ نے ان کے لیے مقرر کیا تھا، وہاں پہنچ کر دعوت و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ البتہ ایک طالب علم جس کا نام محمد فاضل تھا۔ آپ کے پاس رہ گیا۔ وہ جب اڑنے لگا تو آپ نے اپنی لاٹھی اس کی ٹانگ پر ماری اور کہا "تو ہمارے پاس رہ۔" وہ گر پڑا اور عصا کے صدمے سے لنگڑا ہو گیا۔ پنجابی میں لنگڑے کو لنگا کہتے ہیں۔ اس لیے وہ مقام جہاں وہ آپ کے ساتھ مقیم رہا موضع لنگے کے نام سے مشہور ہو گیا۔ محمد فاضل وہیں فوت ہوا اور اس کا مزار وہیں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ایک دن میاں اسمٰعیل ریاضت میں مشغول تھے کہ ہاتف غیب سے اشارہ ہوا کہ آپ لاہور جائیں۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس برس تھی۔ لاہور پہنچ کر محلہ "نبل دراڑہ" میں آپ نے قیام کیا۔ یہ محلہ اسی جگہ تھا جہاں آپ کا دربار اور مسجد واقع ہیں۔ آپ نے وہاں درس و تدریس

اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نیک کام کو شروع کرنے سے پیشتر آپ نے حضرت شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش رح کے مزار پُر انوار پر چلہ کشی کی۔ جب آپ چلہ کشی کے بعد واپس ہوئے تو طلبہ کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئی۔

محلہ تیل واڑہ کے ساتھ ہی ایک اور محلہ آباد تھا جسے گنج پورہ کہتے ہیں۔ وہاں ایک قدیم مسجد تھی جس کی ظاہری حالت بگڑ رہی تھی۔ اور ایک ہندو جوگی نے زبردستی اس پر قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ یوگ میں بہت کامل تھا اور گرد کے لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی مگر دل ہی دل میں سب کڑھتے تھے کہ مسجد اس سے خالی کرانی چاہیئے۔

ایک دن میاں اسمٰعیل کو باطنی اشارہ ہوا کہ اس جوگی کو مسجد سے نکالیں۔ آپ جوگی کے پاس تشریف لے گئے۔ اسے بڑی نرمی سے سمجھایا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے تم اسے خالی کر دو۔ وہ یہ سن کر مسکرایا اور استہزا کرنے لگا۔ کہا کہ اگر طاقت ہے تو خالی کرا لو۔ تم دیکھو گے کہ مسجد میرے ساتھ جائے گی۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مسجد کو اشارہ کیا اور اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ آپ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ آپ نے وہی عصا مسجد کی دیوار کو مارا اور کہا کہ بس کھڑی رہ۔ کہتے ہیں کہ مسجد وہیں تھم گئی۔ جوگی نے آپ کے قدم پکڑ لیے اور آپ کی اجازت سے چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ اس دن سے آپ نے اسی مسجد میں قیام کرنا شروع کیا۔ شاہجہان کی ایک دایہ نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرا دیا۔ یہ مسجد اب تک موجود ہے۔

میاں اسمٰعیل قرآن پاک، حدیث، فقہ، تفسیر اور علوم دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ہزاروں لوگ آپ کے درس سے فیضیاب ہوتے تھے ایک مدت قلیل میں آپ کی شہرت دور دور پہنچ گئی۔ آپ کی زبان میں اللہ تعالےٰ نے عجیب تاثیر دی تھی۔ کتنا ہی غبی اور کُند ذہن طالب علم آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوتا، چند ہی ماہ میں حافظ قرآن ہو جاتا۔

ایک دفعہ ایک نوجوان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر کہنے لگا کہ میری بیوی قرآن پاک کی حافظہ ہے۔ ہماری شادی کو چند ہی یوم ہوئے ہیں۔ پہلی رات جب ہم اکٹھے ہوئے تو بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم حافظ قرآن ہو؟ میں نے کہا نہیں! اس نے کہا کہ جب تک تم قرآن پاک حفظ نہ کر لو اس وقت تک میرے پاس نہ آؤ۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں کیا کروں! آپ نے فرمایا کہ تم چھ ماہ ہمارے پاس ٹھہر جاؤ۔ انشاء اللہ تعالےٰ تم حافظ قرآن ہو جاؤ گے۔ اس پر وہ زار زار رونے لگا اور کہنے لگا کہ میں تو ناظرہ قرآن مجید بھی نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اتنی جلدی حفظ کیسے کر لوں گا اور اتنے عرصے کے لیے اپنی بیوی کی جدائی کیونکر گوارا کر سکوں گا! وہ روتا تھا اور بار بار سرد آہیں بھر کر آپ سے دعا کی درخواست کرتا تھا کہ آپ اگر آپ توجہ نہ فرمائیں گے تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اس کے رونے پر آپ کو ترس آ گیا اور آپ نے فرمایا کہ اچھا۔ کل صبح فجر کی نماز کے وقت تم میرے دائیں ہاتھ ایسی جگہ کھڑے ہونا جہاں سلام پھیرتے وقت میری نظر پڑ سکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ کی نظر کیمیا اثر سے دائیں جانب جتنے آدمی صف میں بیٹھے تھے حافظ قرآن ہو گئے۔ اور بائیں طرف والے ناظرہ خوان بن گئے۔ وہ نوجوان آپ کو دعائیں دیتا اور شکریہ ادا کرتا خوش خوش گھر آیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "فیض قرآن بعد فوت از خاک قبر ما جاری خواہد ماند" چنانچہ یہ فیضان اب تک جاری ہے۔ آپ کے مدرسے میں اس وقت بھی بہت سے لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں۔

آپ ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں بمقام لاہور فوت ہوئے۔ آپ کی تاریخ وفات سید محمود نے جن کا مزار درس کے مغرب میں واقع ہے یوں لکھی ہے ؎

شنو تاریخ آں دریائے معنی | کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف
دل و جاں کرد ستہ بان الٰہی | کہ اسمٰعیل ثانی بود بے حرف

۱۰۸۵ھ

آپ کا مزار درس کے احاطے میں ہے اور آپ کی وصیت کے بموجب کیا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد مولانا محمد صالح پچپن برس تک اس مدرسہ کے مہتمم رہے۔ جن کی وفات کے بعد حافظ محمود یہاں درس دیتے رہے۔ ان کے بعد حافظ معز الدین اور ان کے بعد حافظ شرف الدین اس مدرسہ میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ حافظ شرف الدین ۱۲۵۵ھ میں فوت ہوئے تو ان کے بیٹے حافظ احمد دین نے درس قرآن کا کام اپنے ذمہ لیا۔

جب سلطنت اسلامیہ کو زوال آیا اور پنجاب میں سکھ گردی شروع ہوئی تو دوسرے اسلامی اداروں کے ساتھ اس مدرسے کو بھی سکھوں کے ہاتھوں بہت سا نقصان پہنچا۔ سب سے زیادہ نقصان مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد میں ہوا۔ اس وقت وزارت کے سلسلے میں سوچیت سنگھ ڈوگرہ اور راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کے درمیان سخت کشمکش ہو رہی تھی۔ سوچیت سنگھ یہ چاہتا تھا کہ وہ وزارت پر قبضہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ لاہور پہنچا اور جب وہ اس مدرسہ کے قریب آیا تو شام ہو چکی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ رات مدرسہ میں بسر کرے۔ حافظ شرف الدین جو یہاں کے مہتمم تھے، سوچیت سنگھ کا یہ ارادہ دیکھ کر بہت ڈرے۔ آپ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر آپ کی آمد کی اطلاع ہیرا سنگھ کو ہو گئی تو وہ فی الفور یہاں دھاوا بول دے گا۔ اس طرح فقیروں کی کٹیا تباہ ہو جائے گی۔ پاس ہی شالامار باغ ہے۔ یہ ہمارے مدرسہ سے زیادہ محفوظ اور وسیع ہے۔ آپ اس میں چلے جائیں۔ راجہ سوچیت سنگھ نے کہا کہ اگر مدرسہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو میں ذمہ دار ہوں گا۔ مگر حافظ شرف الدین کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ مدرسے کا سامان جس قدر ہو سکے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے رات کی تاریکی میں کچھ اسباب اور اپنے اہل و عیال کو پاس ہی کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا۔

صبح ہوتے ہی ہیرا سنگھ توپ خانہ لے کر وہاں پہنچ گیا اور اس نے بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ توپ خانہ حرکت میں آیا اور گولوں سے مدرسہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ سوچیت سنگھ مارا گیا۔ مدرسہ اور اس کی عمارت جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئی۔

انگریزی عہد کے آغاز میں میاں سلطان ٹھیکیدار نے اپنا حلوہ والا رکھ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔ مدرسہ اس کی آمدنی سے چلنے لگا اور اس میں ایک مرتبہ پھر رونق آ گئی۔

مدرسہ میانی صاحب

انہی ایام میں لاہور کے مغربی حصے میں ایک اور زبردست مدرسہ تھا جہاں درس و تدریس کا کام بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ اس مدرسہ کے بانی شیخ محمد طاہر تھے جو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ محمد طاہر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ سرہند میں مرشد زادوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ پھر مرشد نے آپ کو حکم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لے جائیں اور وہاں درس و تدریس کا کام شروع کر دیں۔ چنانچہ آپ اپنے پیر کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔ یہاں پہنچنے پر جو حالات پیش آئے اور جو خیالات آپ کے دل میں پیدا ہوئے، آپ انھیں اپنے ایک عریضہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"حضرت سلامت! احقر الخدمت محمد طاہر بعرض می رساند کہ چوں از آستانۂ علیا متوجہ لاہور شدم، در ہر قدمے باخود می گفتم کہ اے نادان! مقصود را در سرہند گذاشتہ کجا می روی۔ اما از غیب ندا شد کہ راہی شو و توقف مکن۔ آخر کشاں کشاں در لاہور آوردند و بر گوشہ مسجدے حیران و پریشان نشستم۔ ناگاہ روح پر فتوح حضرت خواجہ نقش بند ظاہر شد و باعث گشت کہ بکارے کہ مامور شدہ مشغول شو۔ امتثالاً لامرہم و امر کم چند کس را مشغول ساختم۔ حالا مجلس گرم است و ارواح مشائخ عظام فوج در فوج تشریف می آرند و التفات کثیرہ می فرمایند خصوصاً حضرت غوث الاعظم و خواجہ بزرگ نقش بند و حضرت گنج شکر در ذکر و نماز تشریف فرما می شوند۔ و جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہم با چند ہزار اصحاب نامدار تشریف آوردہ رونق افروز محفل می شوند۔ و نوازشہای فرمایند و در فقیر عکاف بہ خلوت خاص و نسبت تازہ سرافرازہ گردانند و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا الطاف بسیار نمودہ بندہ را بتشریفات خاصہ بنواخت و قبل ازیں ہر یک از نسبت ثلاثہ یعنی نسبت نقش بندیہ و قادریہ و چشتیہ نوبت بہ نوبت روی داد۔ و گاہے مختلط ہم می شود و گاہے غالب مغلوب ہم می گردد۔ و یک نوبت چشتیہ غلبہ عظیم می کرد بہ حدے کہ از نسبت ہائے دیگر نا امید گشتم۔ دریں ضمن نسبت نقشبندیہ غلبہ کرد۔ و دیگر نسبت ہا را زیر نمودہ حالا ہر سہ نسبت یکے شدہ اند۔ دریں ایام سیر در نسبت مشائخ عظام کم است و در نسبت اصحاب نبویہ زیادہ تر است و سوائے نسبت خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اکثر اوقات بندہ در نسبت حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ الملک الاکرم می باشد و بسیار خوش می ماند و مطلوب فقیر ہم ہمیں است کہ ہمیں نسبت پیغمبری ترقی و زیادتی پذیرد والسلام"

آپ کے درس میں ہزارہا لوگ شامل ہوتے اور اعلیٰ مراتب پر پہنچتے۔ آپ تمام عمر کسی امیر کے پاس نہیں گئے نہ ان کو اپنے قریب آنے دیا۔ آپ کسب حلال سے روزی کماتے اور احادیث و تفاسیر کی کتابوں کی کتابت کر کے بسر اوقات کرتے۔ پھر رات رات بھر یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہ جاتا۔ آپ کی وفات جمعرات ۸ محرم سنہ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء کو ہوئی اور اپنے مدرسہ کے ایک گوشے میں دفن ہوئے۔

آپ کے بعد مولانا ابو محمد قادری اس مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس مدرسے کے گرد ایک زبردست محلہ آباد ہو گیا جو محلہ میانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان ایام میں "میاں" پڑھے لکھے اور فاضل آدمیوں کو کہتے تھے چونکہ اس محلہ میں لاہور کے بڑے بڑے فاضل اور عالم لوگ رہتے تھے اس لیے یہ محلہ میانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ سیالکوٹ میں میانہ پورہ اس محلہ کا نام ہے جس میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رہا کرتے تھے۔

اس مدرسہ کے ساتھ ایک زبردست کتب خانہ بھی تھا جو سلطنت اسلامیہ کے زوال تک قائم رہا۔ رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور

میں لکھتے ہیں :۔

> "سکھوں نے اس محلہ کو لوٹتے وقت اس بیش بہا کتب خانہ کو بھی آگ لگادی۔ اس طرح ہزارہا نادر کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ سکھوں کے ایام حکومت میں یہ محلہ اور مدرسہ اجڑ گیا اور آبادی معدوم ہو گئی۔"

اس وقت یہ سارا علاقہ قبرستان کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ غالباً اس سے بڑا قبرستان اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس کے وسط میں شیخ محمد طاہر بندگیؒ کا مزار ہے۔ اس مزار کے گرداگرد ایک چار دیواری تھی جو اب گر چکی ہے۔ مزار ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے مشرق کی طرف مولانا ابو محمد اور سید خیر شاہ، جو کسی زمانہ میں اس مدرسہ کے مہتمم تھے، کی قبریں ہیں۔ مغرب کی جانب ایک قدیم مسجد ہے۔

مدرسہ خیر گڑھ

جس مقام پر آج کل شاہو کی گڑھی آباد ہے، اس جگہ کو اکبر اعظم کے زمانے میں شیخو گڑھی کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے یہ مختصر سی بستی اپنے پیارے بیٹے شہزادہ سلیم کے نام پر بسائی تھی جسے وہ شیخ سلیم چشتیؒ کے احترام کی بنا پر شیخو بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ شاہجہان کے ایام حکومت میں بغداد سے ایک نہایت زبردست فاضل اور جید عالم مولانا ابو الخیر لاہور میں وارد ہوئے۔ ان کی شہرت تھوڑے ہی عرصہ میں پھیل گئی اور گھر گھر ان کے علم و فضل کے چرچے ہونے لگے چنانچہ حکومت کے ایما پر انھوں نے درس و تدریس کے لیے ایک مدرسہ شیخو کی گڑھی میں جاری کیا۔ آپ نے مدرسہ کے لیے ایک عالی شان عمارت تعمیر کی جس کے ساتھ ایک وسیع مسجد بھی تھی۔ طلبہ کے قیام کے لیے اعلیٰ قسم کے حجرے تھے۔ اس عالیشان مدرسے کی فصیل اور دیواریں قلعہ نما تھیں۔ مدرسہ کا تمام خرچ لاہور کے شاہی خزانے سے ادا ہوتا تھا۔ تشنگان علم دور دور سے یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ ایک طرح سے اس مدرسہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

مولانا ابو الخیر نے بہت لمبی عمر پائی۔ مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے پوری ایک صدی درس و تدریس کے فرائض ادا کیے اور آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شیخ جان محمد حضوری جیسے علامہ دہر نظر آتے ہیں۔ مولانا ابو الخیر ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۳ء میں فوت ہوئے۔

آپ کے بعد اس مدرسہ کا انتظام آپ کے خلیفہ مولانا محمد نعیم کے ہاتھ آیا۔ انھوں نے اس فیض کو برابر جاری رکھا یہاں تک کہ سکھوں کی غارت گری شروع ہو گئی اور سارا لاہور ان کے مظالم کا تختۂ مشق بن گیا۔ لاہور کے دوسرے حصوں کی طرح یہ علاقہ بھی ویران ہو گیا اور مدرسہ کو بہت نقصان پہنچا۔ کچھ مدت تک یہ علاقہ کسمپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ مولوی نور احمد چشتی تحقیقات چشتی میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں ملیجے کا ایک تیلی شاہو نام یہاں وارد ہوا۔ وہ دن کے وقت بکریاں چراتا اور رات کے وقت ڈاکے مارتا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ جو علاقہ شیخو گڑھی سے خیر گڑھ بنا تھا وہ اب اس کے نام پر گڑھی شاہو کہلاتا ہے ؎

پردہ داری می کند بر قصر قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

مولانا ابو الخیر کا مزار گڑھی کی چار دیواری کے اندر چند اور قبروں کے ساتھ بلند چبوترے پر واقع ہے اور آپ کی تعمیر کردہ مسجد و مدرسہ کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے۔

مدرسہ ابوالحسن خاں تربتی

یہ لاہور کا مشہور مدرسہ تھا اور سب سے خوبصورت اور امیر گنذر مغلپورہ میں واقع تھا۔ نواب ابوالحسن خاں دورِ جہانگیری کا ایک امیر کبیر تھا۔ اور وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ اس کا لڑکا ظفر خاں احسن کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے کئی حویلیاں، محل، باغ اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔ جب وہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) میں فوت ہوا تو اس کی وصیت کے بموجب اسے ایک وسیع باغ میں دفن کیا گیا۔ مقبرہ کی عمارت دو منزلہ تھی اور یہ عمارت گرد و نواح کی تمام عمارتوں سے بلند تھی۔ کاشی کا خوبصورت کام دیکھنے والوں کے دلوں پر عجیب اثر کرتا تھا۔

نواب مرحوم کی بیگم محمدہ مہرجہاں کہلاتی تھی۔ وہ مختلف اسلامی علوم و فنون میں اچھا خاصا درک رکھتی تھی اور ضروریات زمانہ سے آشنا تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی یادگار میں یہ مدرسہ جاری کیا اور ایک ہزار حافظ اس کام کے لیے مقرر کیے کہ وہ باری باری اس کے خاوند کے مزار پر قرآن کریم پڑھا کریں۔ یہ نیک خاتون بروز دوشنبہ ۴ شعبان ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) کو فوت ہوئی اور اسی باغ میں ایک علیحدہ مقبرہ میں دفن کی گئی۔

مدرسہ کے معلمین میں سب سے نمایاں نام شیخ حامد قاری کا ہے جو ایک مدت تک اس کے صدر مدرس اور مہتمم رہے۔ مولانا حامد قاری نہایت فصیح البیان واعظ اور فاضل اجل تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کے ہاں استفادہ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ آپ ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں فوت ہوئے اور مدرسہ کے ایک کونے میں دفن کیے گئے۔ آپ کی تصانیف میں دو کتابیں اچھی خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ ایک تو آپ کے ملفوظات ہیں اور دوسری حرمت حقہ۔

آپ کی وفات کے بعد حافظ رحمت اللہ اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے مگر آپ کا زمانہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ لاہور ان ایام میں سکھ سرداروں کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ بدامنی تھی۔ قتل و غارت کی گرم بازاری تھی۔ اس لیے اطمینان قلب اور امن جو تعلیم کے لیے ضروری ہیں بالکل مفقود تھے۔ یہ عالیشان مقبرہ اجڑ گیا اور سکھا شاہی میں ایک میگزین کا کام دینے لگا۔ اس وقت یہ ڈیفنس اسٹور کی چار دیواری میں گھرا ہوا ہے۔

مدرسہ شیخ بہلول

یہ مدرسہ بھی شاہجہان کے زمانے میں لاہور کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ "مآثر الامراء" کا مصنف کہتا ہے کہ شیخ بہلول ایک جید عالم اور زبردست فاضل تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں نصف النہار پر تھا۔ اس مدرسے میں قاضی محمد اسلم نے تعلیم پائی جو خواجہ کوہی کی اولاد سے تھے اور مشہور صاحب دل بزرگ ہوئے ہیں۔ جب وہ ہرات سے لاہور پہنچے تو تکمیل تعلیم کے لیے اس مدرسے میں داخل ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ کا شمار ہندوستان کے مشاہیر علما میں ہوا۔

قاضی اسلم کے بیٹے میر زاہد نے بھی اسی مدرسے میں تعلیم پائی۔ وہ علم الکلام اور حکمت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے "شرح مواقف" اور بہت سی دقیق کتابوں پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

مدرسہ ملا فاضل قادری

یہ مدرسہ اس جگہ تھا جہاں آج کل جیل روڈ اور وارث روڈ کا اتصال ہوتا ہے۔ ملا فاضل قادری ایک نیک دل بزرگ تھے۔ حکومت انھیں مدد معاش دیتی تھی جسے وہ مدرسے پر صرف کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد شاہ شرف نے اس کام کو جاری رکھا۔ استاد اور شاگرد دونوں کی قبریں ابھی تک مدرسہ کے محل وقوع

کا پتہ دیتی ہیں۔ صاحب تحقیقات چشتیہ کا بیان ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ ایک عالی شان مسجد بھی جو اب بالکل مٹ چکی ہے۔

مدرسہ ملا خواجہ بہاری

یہ مدرسہ دہلی دروازے کے اندر واقع تھا۔ بہت مشہور تھا۔ نواب سعداللہ خاں اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ ملا خواجہ بہاری کا اصل وطن حاجی پور تھا جو قصبہ گوماپور (بہار) میں واقع تھا آپ چھوٹی سی عمر میں علم حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن سے نکلے۔ کچھ مدت تک قصبہ کورا میں شیخ جمال اولیا کے پاس رہے۔ وہاں سے فیضان حاصل کرکے لاہور آئے اور ملا فاضل لاہوری سے ظاہری علوم کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ ملا محمد فاضل اپنے ہونہار شاگرد سے بہت خوش تھے اور انھیں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ ان ایام میں حضرت شیخ میاں میر کا باطنی فیض عام تھا۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور ان کی توجہ سے باطنی علوم میں بھی کامل ہو گئے۔

ملا خواجہ بہاری عالم علوم فقہ و حدیث و تفسیر تھے۔ تذکرہ "علمائے ہند" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ملا بہاری فقیہ محدث مفسر واقف اسرار حقانی بود"

حضرت میاں میر کی وفات کے بعد آپ کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ خاص و عام گروہ در گروہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ داراشکوہ سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں آپ ایک عرس پر تشریف لے گئے۔ وہاں توحید پر گفتگو شروع ہوئی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس بحث میں حصہ لیا۔ آپ پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ پاس ہی آگ جل رہی تھی۔ آپ اٹھے اور الاؤ میں بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد باہر نکلے تو دیکھا گیا کہ آگ نے آپ کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ آپ نے فرمایا "توحید یہ ہے کہ اس کے قائل پر کوئی چیز اپنا اثر نہیں کرتی۔"

آپ کے استغنا کی حالت یہ تھی کہ شاہجہان ایک دفعہ آپ کی ملاقات کے لیے آیا تو آپ یہ خبر سن کر وہاں سے چل دیئے۔ جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں طمانیت قلب کھونا نہیں چاہتا۔ ایک فقیر کو بادشاہوں کی ملاقات سے کیا سروکار؟

داراشکوہ لکھتا ہے کہ ایک دن آپ شالامار باغ کی سیر کو گئے۔ وہاں دو تین مرتبہ آپ نے فرمایا "مجھے طلب نہیں کرتے اور اگر وہ طلب کریں تو مرشد کی قبر کے پاس دفن کرنا۔ آپ کی وفات ۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء میں واقع ہوئی۔ آپ کا مدرسہ بہت مشہور تھا۔ کسب علوم کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔

شیخ جان اللہ

لاہور کے علماء میں شیخ جان اللہ بھی بہت مشہور تھے۔ آپ شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے اور ظاہری و باطنی علوم میں پوری پوری استعداد رکھتے تھے۔ وہ شروع شروع میں علم حاصل کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ فارغ ہونے کے بعد یہیں درس دینے لگے۔ مگر خدا کی لگن دل میں ایسی لگی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تھانیسر چلے گئے۔ اور شیخ نظام الدین بلخی کے مرید ہو گئے۔ زہد و ریاضت اور عبادت میں ہمہ تن مستغرق رہنے لگے۔ پیر کے ساتھ حج کعبہ بھی کیا۔ ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں آپ کا وصال ہوا۔

شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری

مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے۔ آپ بھی شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے۔ جب اکبر اعظم نے مخدوم الملک کو مجبور کرکے حج پر روانہ کیا تو آپ بھی باپ کے ہمراہ تھے اور جب مخدوم الملک واپس آئے تو آپ بھی ہندوستان چلے آئے۔ باپ کے مسموم ہونے کے بعد آپ لاہور پہنچے اور لوگوں

کو ہدایت و تلقین شہود حق کی خلقت کا ہجوم آپ کے گرد جمع رہتا تھا۔ آپ کی خانقاہ اور مدرسہ موضع نواں کوٹ میں افضل خاں علامی کے باغ کے نزدیک تھے۔ آپ عالم عامل اور فاضل کامل تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف فصوص الحکیم خاص و عام میں مشہور ہے۔ آپ کی ایک اور کتاب اسرار الطیبہ در بیان ذکر و شغل سلسلہ عالیہ چشتیہ بھی مشہور ہے۔ آپ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار موضع نواں کوٹ میں واقع ہے۔

شیخ جان محمد لاہوری

ایک اور فاضل جو اس زمانے میں لاہور کی رونق تھے شیخ جان محمد لاہوری تھے۔ شریعت اور طریقت دونوں کے ماہر تھے۔ لاہور کے باہر جہاں آج کل کوٹ خواجہ سعید واقع ہے، وہاں ان ایام میں ایک محلہ آباد تھا جسے پرویز آباد کہتے تھے۔ آپ کی سکونت اسی محلے میں تھی۔ آپ زیرک اور ذہین تھے اور حضرت میاں صاحب کلاں کے خلیفہ شیخ عبدالمجید سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کا استاد آپ کو لے کر حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس بچے کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم عالم ہو جاؤ تو ہمارے ساتھ تکرار حدیث کرنا۔ آپ فرطِ حیا سے خاموش رہے۔ استاد کے اشارہ پر عرض کیا کہ اگر حضور کی توجہ سے مجھے کامیابی حاصل ہوئی تو ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضان حاصل کروں گا۔ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ پڑھی اور دعائے خیر کی۔ چنانچہ جب آپ شیخ عبدالمجید سے فارغ ہو گئے تو آپ کو ایک اور فاضل شیخ تیمور لاہوری کے سپرد کیا گیا۔ وہاں سے بھی آپ کو جلد سند فراغت مل گئی۔

اس کے بعد آپ پھر میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی توجہ سے باطنی علوم میں بھی کامل ہو گئے۔ میاں صاحب نے ایک دن فرمایا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ چنانچہ جب تک میاں صاحب زندہ رہے آپ دوشنبہ اور جمعہ کو تکرار حدیث کے لیے حاضر خدمت ہوتے رہے۔ آپ کا اکثر وقت درس و تدریس اور عبادات میں گزرتا تھا۔ آپ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں فوت ہوئے اور پرویز آباد میں دفن ہوئے۔

آپ کی وفات کے چند سال بعد وہاں کے نمبردار نے خواب دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں ہماری نعش کو میاں صاحب کے مرقد کے متصل دفن کر دو۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہاں سخت بلاؤں کا نزول ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

مدرسہ شیخ جان محمد سہروردی

جس جگہ آج کل چوبچہ گردرام رائے اور گنبد نصرت جنگ واقع ہیں، ان کے درمیان ایک عظیم الشان مسجد اور مدرسہ واقع تھے۔ یہ مسجد قصاب خانہ کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں آپ درس دیا کرتے تھے۔ آپ نہایت فاضل ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع تھے اور میاں صاحب کلاں کے مرید با اخلاص۔ آپ کے استغنا کی حالت یہ تھی کہ آپ سے ہزاروں آدمی پڑھتے مگر آپ کسی سے کچھ نہ مانگتے۔ کوئی کچھ پیش بھی کرتا تو آپ انکار کر دیتے۔ چکی پیس کر روٹی کماتے۔ درس کے علاوہ آپ مسجد کے امام بھی تھے۔ مفتی غلام سرور کا بیان ہے کہ جب میاں صاحب کا چرچا عام ہوا تو لوگوں نے التجا کی کہ آپ ہماری مسجد میں درس شروع کریں۔ آپ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا مگر اپنے شاگرد اور مرید مولوی جان محمد سہروردی کو وہاں بھیج دیا چنانچہ آپ بیک وقت امام، مدرس اور واعظ تھے۔ آپ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار مسجد کے متصل بنایا گیا۔

مدرسہ وزیر خاں

یہ مدرسہ لاہور کا بہت مشہور مدرسہ تھا۔ اس کا بانی حکیم علیم الدین انصاری تھا جسے شاہجہان نے نواب وزیر خاں کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس نے اپنی مسجد ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں تعمیر کرنی شروع کی جیسا کہ مندرجہ ذیل کتبوں سے معلوم ہوتا ہے

سال تاریخ بنائے مسجد عالی مقام
از خرد جُستم بہ گفتا سجدہ گاہ اہلِ فضل
۱۰۴۴ھ

تاریخ ایں بنائے چوں پرسیدم از خرد
گفتا بگو کہ بانیٔ مسجد وزیر خاں
۱۰۴۴ھ

نواب وزیر خاں نے ۱۰۴۱ھ میں بہت سی جائداد اور املاک اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کی۔ یہ وصیت نامہ شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج اور مولوی نور احمد چشتی نے "تاریخ لاہور" اور "تحقیقات چشتی" میں نقل کیا ہے۔ اس وصیت کی رُو سے مسجد اور مدرسہ کے بانی نے مسجد کے اندرونی دروازے کی دکانیں جلد سازوں، صحافوں وغیرہ کے استعمال کے لیے وقف کی ہیں اور حجروں میں طالب علم، جدول ساز، کاتب وغیرہ رہ سکتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کا بیان ہے کہ میں نے اس کا صحیح مصرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جج محمد لطیف کا بیان ہے کہ مسجد کے قبضے میں بہت بڑی جائداد تھی جو دہلی دروازے سے لے کر براتی کوتوالی کے چوک تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ مسجد اور مدرسہ خاص طور پر لاہور کے علمی حلقوں میں مشہور تھا۔ چندر بھان برہمن "چہار چمن" میں لکھتا ہے کہ "جمعہ کا دن عام تعطیل کا دن ہوتا تھا۔ اس دن لاہور کے اربابِ فضل و کمال، فصحائے خوش بیان، شعرائے شیریں زبان اور دوسرے شوقین لوگ جو ایران، توران اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے لاہور آئے ہوتے تھے، اس مسجد میں اکٹھے ہوتے اور آپس میں مبادلۂ خیالات کرتے تھے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اردگرد کتب فروش اپنی دکانیں رکھتے تھے اور نوشت و خواند کا تمام سامان یہاں فروخت ہوتا تھا۔ چندر بھان برہمن لکھتا ہے:۔

"کتب بے شمار از عربی و فارسی و دیگر نسخہائے معتبر از تواریخ و مثنوی و دواوین متقدمین و
متاخرین و منشآت و فکرات و رقعات و قطعات و نوشتجات خوشنویسان روزگار و سائر
آلات و ادواتِ مشق از ہر قسم و ہر جنس بمعرضِ خرید و فروخت می آید چہ آزادیٔ مکتب
نشیناں مخصوص ایں روز است از ہر کوچہ و ہر کوئے جوانان نو رسیدہ بیاض در دست و
گل بر سر بہ تقاضائے عہدِ شباب خراماں خراماں بہ سیر بازار کتاب می آیند" [1]

یہ بازار دوپہر تک قائم رہتا۔ اس کے بعد لوگ نماز جمعہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔ اس بیان کی تائید بعض اور کتب سے بھی ہوتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے حسان الہند مولانا آزاد بلگرامی کے زمانے تک بھی وزیر خاں کی مسجد کا صحن علمی اور ادبی اغراض کی خاطر استعمال ہوتا رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ شاہ آفریں لاہوری نے حاکم لاہور سے ذکر کیا اور حاکم نے میرے سامنے بیان کیا کہ ایام سابق میں مسجد وزیر خاں کے صحن میں شعرا مجلس سخن آراستہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی ایک محفل میں شامل ہوئے۔ جہاں ناصر علی سرہندی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

---

[1] چہار چمن قلمی ورق ۱۴

صریرِ خامہ می دانم کہ طبعت می سازد
دیدہ نامہ، دل صد پارہ شد، قاصد رسید این جا

اعجاز اکبر آبادی نے اس پر اعتراض کیا کہ "ہرگاہ صریرِ خامہ کہ عاشق از راہ درد و دراز مکتوب می نویسد با طبعش نمی سازد و صدائے دریدن نامہ کہ شوخ تر از صریر خامہ است چہ قسم بہ او ساخت"۔ شاہ آفریں نے جواب دیا کہ "صریرِ خامہ خود معشوق باد می سازد"۔ یہ سُن کر اعجاز خاموش ہو گیا۔[1]

یہ بازار سکھوں کے زمانے تک بہت مشہور رہا اور لاہور میں سب سے بارونق بازار خیال کیا جاتا تھا جہاں نہ صرف سامانِ نوشت و خواند فروخت ہوتا تھا بلکہ بڑے بڑے مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور نادر کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں، یہاں ہر وقت ایسے کاتب، مصوّر، صحاف، جلد ساز وغیرہ موجود رہتے تھے جن کا ذریعہ معاش مختلف کتابوں کی نقل اٹھانا اور انھیں مصور کرنا ہوتا تھا۔ اس مدرسے کی پوری تاریخ اور اساتذہ کرام کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ دو مشہور استادوں کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے ان میں ایک تو ملا محمد صدیق تھے اور دوسرے مولانا غلام محمد عرف استاد گامو

مولوی محمد صدیق لاہوری

آپ کے آبا و اجداد کابل سے چل کر لاہور آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد حنیف اپنی علمی شہرت کی بنا پر مسجد وزیر خاں کے امام مقرر ہوئے۔ آپ کی والدہ قاشغند کی رہنے والی تھیں۔ مولانا محمد صدیق دوشنبہ ۲۹ محرم ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے رسم و رواج کے مطابق بسم اللہ خوانی کی رسم پانچ برس کی عمر میں مولانا محمد عابد نے ادا کی۔ ملا محمد اسلام نے آپ کو قرآن پاک پڑھایا۔ بعد میں آپ کو قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس پُر آشوب زمانے میں لاہور میں بڑے بڑے جید اور متبحر عالم موجود تھے۔ مولانا محمد صدیق نے ان سب سے فیض پایا۔ ان کے اساتذہ میں مولانا عابد، مولانا شہریار، مولانا حفیظ اللہ، مولانا ناصر اللہ، مولانا ظہور اللہ خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ آپ نے حدیث کی خاطر حجاز کا سفر کیا اور اس کی سند شیخ یحییٰ بن صالح مکی سے حاصل کی۔ وہ مسجد الحرام میں درس دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں پہنچ کر آپ نے شیخ ابوالحسن مدنی سے حدیث کا تکرار کیا اور ان سے بھی سند حاصل کی۔ شیخ ابوالحسن بڑے پایہ کے محدث تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر مولانا محمد صدیق لاہور واپس آئے اور اپنے باپ کی جگہ وزیر خاں کی مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ امامت کے ساتھ ساتھ آپ نے پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ بھی شروع کیا اور اس میں شہرت حاصل کی۔

ایک مرتبہ فتح پنجاب کے بعد احمد شاہ ابدالی نے آپ کے پیچھے نماز عید ادا کی۔ آپ زبردست عالم، فقیہ، محدث، ادیب اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ آپ نے فیضی کے مشہور رسالہ موارد الکلم کے جواب میں بے نقط حروف میں ایک رسالہ لکھا۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

بیا اے مومن سنّی بہ بیت اللہ اندر شو — طہارت ساز از خونِ دل و یاقوتِ احمر شو
چو رو آری بہ محرابِ عبادت شاد کن محشر — گدازی از ریاضت نفس را و صدف چوں زر شو
فریضہ چوں ادا کردی بہ امرِ حضرتِ رحماں — یکاں بار از مزارِ سید الحاق انور شو
حصولِ غلبہ از قرب چنیں کامل شود تارک — خدائے آل و اصحابِ رسول اللہ اکبر شو

---

[1] خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۹

مولانا محمد صدیق نے تیمور شاہ کے عہد حکومت ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۹ء میں انتقال فرمایا۔

امام گاموں آپ مولانا محمد صدیق کے خلف الرشید تھے۔ قرآن پاک کے حافظ اور رائج الوقت علوم و فنون کے ماہر تھے۔ آپ بھی مسجد وزیر خاں کے امام تھے۔ رنجیت سنگھ مہاراجہ پنجاب آپ کا دل سے احترام کرتا تھا۔ مسجد وزیر خاں محض آپ ہی کی وجہ سے سکھوں کی دست برد سے محفوظ رہی۔ ورنہ شاہی مسجد، بیگم شاہی مسجد اور دوسری مساجد کی طرح یہ بھی سکھوں کے گھوڑوں کا اصطبل یا بارود خانہ بنتی۔ آپ بڑے نیک دل، نیک طینت اور نیک خیال بزرگ تھے۔ اہل اللہ کے بڑے دلدادہ اور درویشوں کے خدمت گزار تھے۔ زہد و تقویٰ کی بنا پر آپ قرآن پاک کی کتابت کرتے۔ اس سے جو میسر آتا اس میں سے کچھ حصہ اپنے اوپر صرف کرتے اور کچھ اہل علم اور درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ زبان میں اتنی تاثیر تھی کہ جب آپ وعظ کہتے تو سنگدل سے سنگدل انسان متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ آپ اپنے درس کے طالبعلموں کا بڑا خیال رکھتے ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور انھیں پریشان ہوتا نہ دیکھ سکتے۔ آپ نے ایک قصیدہ ہجو المقلدین کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اپنے حسب نسب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

این غریب ابن حافظ صدیق   از دل و جاں غلام این ہر چار
سنی و قادری و حنفی ام   از روافض خوارج بے زار

گر تو پرسی کہ اسم جسم چیست   تو غلام محمدم پندار
در تخلص غریب پنداری   گر بخوانی تو نظم من اے یار
بہ حقیقت اگر نظر بہ کنی   نہ تخلص نہ اسم و جسم شمار

خلفائے راشدین کی منقبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہم ابا بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ نیز   چارم آں شاہ حیدر کرارؓ

اس قصیدہ کے ابتدائی شعر یہ ہیں ؎

گنج مخفی ست سر تو اے دلدار   بے خبر زاں نشستہ چوں مار
خبر نشر طاست می کنم بشنو   پنبہ از گوش خویش بیروں آر
چیست آں پنبہ خواب غفلت تو   باش ازیں خواب جان من بیدار
گر تو بیدار باشی اے جانم   پیش تو من عجب کنم گفتار
گوش جاں کن شنو حدیث از من
تا شوی ہمچو گل تو خوشبو دار

آپ طریقت میں شیخ عبداللہ بلوچ مہر نگوی کے مرید تھے۔ آپ صاحب تصانیف کثیر ہیں جن میں کتاب شمس التوحید خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ فارسی نثر میں ہے۔ اس میں توحید کا مسئلہ بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ شب شنبہ ۵ ذی الحج ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء کو فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ مسجد وزیر خاں کے احاطے کے باہر جنوب کی جانب ایک بلند گنبد کے نیچے ہے۔ جہاں سالانہ آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

آپ کے خاندان میں مسجد وزیر خاں کی امامت بڑے عرصہ تک رہی۔ آپ کے پڑپوتے مولوی فرزند علی تھے۔ ان کی مسجد کے متولیوں سے مقدمہ بازی ہوئی۔ جس سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

مولانا محمد فاضل بدخشی

آپ لاہور کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ عمل صالح کا مصنف انھیں "بحر مواج فیض بخشی" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ عقلی اور نقلی علوم میں یگانۂ روزگار تھے۔ یہ علوم انھوں نے کابل، توران اور شیراز کے فضلا سے حاصل کیے تھے۔ آپ تفسیر اور اصول میں ملا جمال لاہوری کے شاگرد تھے اور مشکل سے مشکل مسائل چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔

جب جہانگیر سریر آرائے ہند ہوا تو آپ عین عالم شباب میں تھے۔ بادشاہ نے آپ کی شہرت سن کر قاضی اردو کا جلیل القدر عہدہ پیش کیا جسے آپ نے قبول کیا اور شاہجہان کے ۸ جلوس تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ جب آپ بوڑھے ہو گئے تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے آئے اور یہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

ملا عبدالسلام دیوی

ملا محمد فاضل بدخشی کے معاصرین میں ملا عبدالسلام دیوی بھی تھے۔ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں ایک قصبہ ہے۔ آپ ملا عبدالکریم کے نواسے تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت اور نشوونما کاکوری میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے نانا سے حاصل کی۔ آپ صحیح النسب سید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے فاضل اور کامل تھے۔ اکثر تذکرہ نگار آپ کو "ملائے اصولی" بھی کہتے ہیں۔ ایک مورخ آپ کا ذکر کرتا ہوا آپ کو "اعلم علمائے عصر و فخر کملائے دہر استاد اساتذہ زماں قدوۂ فضلائے دوراں" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ آپ جامع معقولات و منقولات ملا عبدالسلام لاہوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد شاہجہان کے عہد میں آپ اپنے استاد کی جگہ مدرس بھی رہے۔ اکثر علمائے ہندوستان مثلاً ملا قطب الدین شہید سہالوی کے والد ملا عبدالحلیم۔ ملا دانیال چوراسی۔ ملا عبدالقادر فاروقی آپ کے شاگردوں میں تھے۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر اپنی مشہور تصنیف کشف المتواری (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ ملا عبدالسلام مرحوم مخدوم عبدالملک کے شاگرد اور انھیں کے تربیت یافتہ تھے۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں ان کو شاہی لشکر میں مفتی کا عہدہ دیا گیا مگر لاہور کی آب و ہوا پھر انھیں کھینچ لائی اور وہ یہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے۔[1] آپ اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ انشراحات معالیہ آپ کی تصانیف میں سے ہے۔ آپ نے اپنے رہنے کے لیے قصبہ دیوہ میں ایک حویلی بھی بنوائی تھی جسے بعد میں آپ نے اپنی لڑکی کے نام ہبہ کر دیا۔

شیخ خیرالزمان صدیقی رسالہ باغ و بہار میں لکھتے ہیں :-

> "در عہد خویش نظیر نداشت۔ شاہجہاں بادشاہ بہ سبب او ستاویش و تبحر علوم بسیار اکرام
> او می کرد و نزد خود می نشاند۔ سند افتائے اردوے معلیٰ بنام ملا بود۔ تا عرصۂ ممتد خدمت
> مذکور از و تعلق می داشت"۔[2]

شیخ مذکور آپ کی حریت کے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ معہ شاہجہان آباد (جو اس وقت زیر تعمیر تھا) دیکھنے کے لیے گیا۔ بادشاہ قلعہ کی فصیل ملاحظہ کر رہا تھا کہ ملا عبدالسلام کو بھی ایک ضروری کام سے

---

[1] حیات شبلی ص۱۷

[2] باغ و بہار (قلمی)

بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا وہ بھی فصیل پر چلنے لگے۔ چونکہ انھیں دیوار پر چلنے کا ربط نہ تھا۔ اس لیے ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہا:-

"اے ملا! از مرگ این قدر می ترسی کہ بر دیوار رفتن نمی توانی"

آپ نے فرمایا:-

"چگونہ نہ ترسم چو اکہ مثل من ہزار سال چرخ اگر چرخ زند و گر پیدا نہ شود و مانند بادشاہ بسیار ممکن اند"

قدردان بادشاہ پر ملا کے ان الفاظ کی تلخی گراں نہ گزری۔ بلکہ وہ مسکرایا اور چپ ہو رہا۔

شیخ خیر الزمان آپ کے متعلق ایک اور واقعہ بھی بیان کرتے ہیں جس سے آپ کی حاضر جوابی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ دارشکوہ نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت ظل اللہ اور خلیفہ رسول اللہ ہیں۔ اس لیے خاص و عام اور ادنیٰ و اعلیٰ پر لازم ہے کہ مرتبہ بلحاظ واقفہ پایۂ خود شناختہ باشند۔ آپ کے تمام وابستگان دامن اور رعایا اسی نقطۂ نظر سے آپ کا ادب اور احترام کرتی ہے مگر ملا عبدالسلام ہیں کہ دعویٰ قرآن فہمی اور حدیث بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ آپ کا کما حقہٗ احترام نہیں کرتے۔ وہ قرآن پاک کی اس نص صریح یعنی "اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم" کے معانی بھی خوب سمجھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔

بادشاہ کچھ عرصہ خاموش رہا۔ جب دارشکوہ نے دوبارہ یہی بات کہی تو بادشاہ نے فرمایا کہ جب ملا دربار میں آئے تو مذکورہ بالا آیت کے معنوں کے متعلق اس سے سوال کرنا اور اس کا صحیح مفہوم دریافت کرنا۔

جب ملا عبدالسلام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دارا نے ان سے آیت کے معنی پوچھے۔ ملا نے کہا سیدھی سادھی آیت ہے اور اس کا مفہوم بھی بالکل صاف اور واضح ہے "یعنی اللہ اور اللہ کے رسول اور اس کے نائب کی اطاعت کرو"۔ دارا نے پوچھا:-

"نائب عبارت از کدام شخص است"

ملا نے کہا:-

"نائب رسول آں کس اند کہ خلق را براہ دین می آرند"

پھر فرمایا کہ ان معانی کے ہوتے ہوئے بادشاہ کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ وہ ہمارے مطیع رہیں۔

دارا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ بادشاہ نے مسکرا کر فرمایا "بایا شنیدی جواب ملا" [1]

ملا عبدالسلام دیوی کے کئی فرزند تھے۔ وہ بھی اپنے وقت کے مشاہیر میں شامل تھے۔ ان میں ملا نور الہدیٰ، ملا نظام الدین احمد ملا سید عبدالحفیظ، ملا عبدالباقی شارح مثنوی مولانا روم اور ملا عبدالصمد مفسر قرآن کے نام اکثر تذکروں میں ملتے ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف اشرفات معانیہ ہے۔ جسے آپ نے اپنے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی کے لیے ان کے درس کے زمانے میں فن و حکمت و منطق میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے علاوہ تہذیب المنطق اور منار الاصول کی شرحیں بھی آپ نے لکھی ہیں۔

مولانا عبداللطیف سلطان پوری

انہی ایام میں مولانا عبداللطیف سلطانپوری کی ذات لاہور کی علمی سوسائٹی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ آپ ایک زبردست ادیب عالم اور فاضل تھے۔ شاہجہان نے

---

[1] باغ و بہار (قلمی)

دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی تعلیم آپ کے سپرد کی۔ جس سے آپ کے علمی شکوہ کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے آپ کی بینائی زائل ہو گئی تھی۔ اس لیے عمر کے آخری ایام آپ نے اپنے وطن میں بسر کیے۔ آپ فلسفہ کے زبردست ماہر تھے اور فلسفیانہ مسائل کی گتھیاں چٹکیوں میں سلجھا لیتے تھے۔ آپ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں فوت ہوئے "آفتاب علم بلا آمد کسوف"[1] آپ کی تاریخ وفات ہے۔

ملا یعقوب لاہوری

آپ لاہور کی منفرد شخصیت اور عمل صالح کے مصنف ملا محمد صالح کے معاصرین میں سے تھے۔ اس نے آپ کا ذکر شاہجہانی دور کے علماء میں کیا ہے۔ آپ مختلف علوم و فنون میں باکمال تھے۔ فقہ، اصول فقہ و حدیث، تفسیر، منطق، معانی اور کلام میں آپ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی، اخلاق اور دیگر صفات انسانی میں آپ لاثانی و بے نظیر تھے۔ فرشتہ سیرت اور انسان صورت تھے۔ آپ کی ذات اس زمانے میں غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ آپ کا وجود سرچشمہ فیض اور منبع خیر تھا۔ آپ کے علمی کمالات اہل پنجاب کے لیے باعث فخر تھے۔ آپ نے ہندسہ اور علم ہیئت میں بھی اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کی جزئیات تک سے واقف تھے۔ ملا محمد صالح کہتے ہیں کہ جب آپ منطق اور معانی پر گفتگو کرتے تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔ گویا جادو کو زبان لگ جاتی تھی۔ جب اپنے شاگردوں میں بیٹھ کر درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عالم بالا سے علوم و فنون کی بارش آپ کے قلب پر ہو رہی ہے اور ملہم غیب آپ کی زبان سے بول رہا ہے۔ ان کمالات اور خوبیوں کو دیکھ کر ملا محمد صالح کہتا ہے کہ

"الیوم در ہمہ باب با ہمہ حساب بر دیگر فضلا مزیت نمایاں دارد"

(عمل صالح جلد سوم ص ۳۹۲)

آپ کی درس گاہ کہاں تھی؟ اس بارے میں تحقیق کے باوجود کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ شاید اپنے ڈیرے پر ہی درس دیتے ہوں۔

ملا جمال نیشاپوری

ملا کمال اور ملا جمال دو بھائی تھے۔ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ دونوں اکٹھے وطن سے نکلے۔ اور لاہور پہنچے۔ مولانا کمال تو ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں فوت ہو گئے مگر مولانا جمال نے اپنا مدرسہ جاری کیا اور ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ جب آپ بوڑھے ہو گئے تو آپ کے صاحبزادے مولانا یوسف نے باپ کی جگہ سنبھالی اور مدرسہ کو خوب فروغ دیا۔ یہ مدرسہ شاہجہان کے زمانے میں بہت مشہور تھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کہاں واقع تھا۔

ملا یوسف لاہوری

آپ عالم باعمل تھے۔ لوگ آپ کے زہد و اتقا کی وجہ سے آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ آپ اکبری عہد کے مشہور فاضل ملا جمال تلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اپنے باپ مولانا جمال کے علاوہ ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کیا۔ آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر مذہبی علوم و فنون کی طرف تھا۔ تفسیر، حدیث، تاریخ اور دیگر منقولات و معقولات میں فضیلت حاصل کی۔ تفسیر پر زیادہ دل جمتا تھا۔ اسے خوب پڑھا، مطالعہ کیا اور اس میں کافی محنت و ریاضت کی۔ آخر اس میں یکتائے روزگار ہو گئے۔ تفسیر کے رموز و غوامض کو اتنے عمدہ اور اچھوتے انداز میں بیان کرتے تھے کہ دل میں اترتے چلے جاتے تھے۔ علوم فلسفہ و حکمت میں بھی اچھی خاصی مہارت تھی مگر ان کی شہرت کا محور قرآنی علوم ہی تھے۔ آپ ملا عبدالحمید لاہوری کے قول کے مطابق پچاس برس تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بہت سے لوگ آپ سے بہرہ مند ہوئے اور درجہ کمال تک پہنچے۔ آپ نے اسی برس کی عمر پائی۔ مولانا عبداللطیف سلطان پوری آپ کے درس میں شامل ہوتے رہے ہیں۔

---

[1] بادشاہنامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۳۴۲

ملا یوسف نے اکثر درسی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے بھی لکھے۔ ان میں شرح دیوان حافظ خاص طور پر مشہور ہے۔ آپ نے کچھ عرصہ کے لیے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی مگر اسے ترک کر کے پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔[1]

ملا جامی لاہوری

بہت بڑے فاضل تھے۔ عمر کا اکثر حصہ درس و تدریس میں صرف کیا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

هر کس که دل از مدار دنیا برداشت　　　عبرت ز شمار کار دنیا برداشت
گویند زمین بر سر گاو است بلے　　　گاو است کسے که بار دنیا برداشت

آپ کا انتقال سنہ ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۱ء میں بہ عہد عالمگیر ہوا۔ آپ کی قبر احاطہ مقبرہ طاہر بندی میں ہے اور اس کے ساتھ ایک مختصر سی مسجد بھی ہے۔

مفتی محمد باقر لاہوری

یہ بھی لاہور کے ممتاز اور معزز علما میں شمار ہوتے تھے۔ آپ شہر کے ایک حصے کے مفتی بھی تھے۔ آپ کے نام پر چوہٹہ مفتی باقر اب تک موجود ہے۔ وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔

ملا عبدالحمید لاہوری

ایک زندۂ جاوید مورخ تھے جن کا نام بادشاہ نامہ کی وجہ سے علمی دنیا میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ عمل صالح کے بیان کے مطابق آپ لاہور کے رہنے والے تھے اور سنہ ۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۴ء میں فوت ہوئے۔ آپ علامہ ابوالفضل کے شاگرد رشید تھے اور طرز انشا میں اپنے استاد کی نقل اتار سکتے تھے۔ آپ کی شہرت کی ابتدا لاہور ہی سے ہوئی جہاں بہت عرصہ تک درس و تدریس میں مشغول رہے مگر حالات نے موافقت نہ کی۔ برگشتہ خاطر ہو کر ٹھٹھہ چلے گئے۔ ایلیٹ اور اس کے دوسرے مقلدین نے ٹھٹھہ کی جگہ پٹنہ لکھا ہے جو درست نہیں۔ شاہجہانی اور عالمگیری دور میں ٹھٹھہ علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پٹنہ علمی دنیا میں کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

ٹھٹھہ پہنچ کر ملا عبدالحمید لاہوری عزلت نشین ہو گئے۔ مگر آپ کی علمی اور ادبی قابلیت کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ فرمان جاری ہوا کہ ملائے موصوف کو دربار میں پیش کیا جائے۔ ملا عبدالحمید جب بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے تو بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے عہد حکومت کے واقعات قلمبند کیے جائیں اور اس دور کی تاریخ ابوالفضل کے اکبر نامہ کی طرز پر لکھی جائے۔ ملا نے حامی بھری اور بادشاہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ بیس سال تک کے واقعات نہایت رنگین عبارت میں تحریر کیے۔ بقیہ حالات پیری کی وجہ سے قلم بند نہ ہو سکے۔ اس دوران بادشاہ نے دو دفعہ آپ کو روپیہ میں تلوایا۔

بادشاہ نامہ تاریخ کی نہایت اہم کتاب ہے جس میں شاہجہان کے زمانہ کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ تمدن، معاشرت اور تہذیب کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

نواب سعد اللہ خاں

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دربار میں پہنچنے سے پہلے نواب سعد اللہ خاں بھی لاہور میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ اپنے استاد کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے تھے یا آپ کا کوئی علیحدہ مدرسہ تھا۔

قرون وسطیٰ کی تاریخ میں یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ وہ شخصیتیں جن پر ملک و ملت کو ناز ہو سکتا ہے اور جنھیں ہم اپنے لیے باعثِ افتخار خیال کرتے ہیں، ان کے حالات قعر گمنامی میں گم ہیں۔ نواب سعد اللہ شاہجہانی دور کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ ان کی ذات پر

---

[1] قرآۃ العالم ورق ۱۹۱ ب

کل و فضل کو ناز ہے۔ تدبر و سیاست فخر کرتے ہیں۔ ان کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران اور عراق تک پہنچی۔ وہ اپنے وقت کے بہترین دماغ اور ایسے نیک نام وزیر تھے جن کو راعی اور رعایا دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ مگر آج ان کے حالات ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

سعد اللہ خاں چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ ان کا باپ تھیم قبیلہ سے تھا۔ یہ جاٹوں کی مشہور شاخ ہے۔ مورخوں نے ان کی قومیت کے متعلق طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں۔ خلیفہ محمد حسین صاحب سفر نامہ پنجاب کے فٹ نوٹوں میں تحریر فرماتے ہیں:—

"سعد اللہ خاں کے زمانہ کے مورخوں نے اس کی قومیت کا کچھ ذکر نہیں لکھا۔ البتہ خافی خاں نے اسے شیخ سعد اللہ لکھا ہے جو ہندوستان میں اکثر نومسلم لوگوں کے لیے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ مگر اس کے ہم وطنوں کا بیان ہے کہ وہ تھیم تھا جو ایک ایسی قوم ہے کہ وہاں کی مسجدوں اور مکتبوں کے ملا اکثر اسی خاندان کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک ظن غالب یہ ہے کہ یہ کوئی ہندوی الاصل قوم ہے مگر چونکہ ان کے میراثی ان کے سلسلہ نسب میں کچھ عجیب و غریب نام بیان کر کے اور پھر تان کر کے ملک عرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے میرے دوست جو بالفعل خاص چنیوٹ کی منصفی کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنھوں نے براہ مہربانی تکلیف فرما کر میری خواہشوں کے مطابق اس کی تحقیق کی تھی، یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید یہ لفظ تمیم کی خرابی ہو جو عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کے نام کا ایک جز ہے اور ان گنواروں نے اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے جو فی زمانہ ان اضلاع میں عموماً ہے بگاڑ کر تھیم کر لیا ہو۔"

صاحب مآثر الامراء میر عبدالرزاق صمصام الدولہ شہنواز خاں خوافی اورنگ آبادی کا قول ہے کہ وہ قصبہ چنیوٹ متعلقہ صوبہ لاہور کے شیخ زادوں سے تھا اور اس کا سلسلہ قریش کے قبیلہ بنی تمیم سے ملتا ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:—

"از شیخ زادہائے قصبہ چنیوٹ مضافات صوبۂ لاہور در اصلش از بنی تمیم قریش"

ان کے علاوہ مراۃ العالم، طبقات شاہجہانی وغیرہ نے بھی اسے شیخ زادہ ہی لکھا ہے جو خافی خاں کے قول کے بموجب نومسلموں کا لقب تھا۔

علامہ سعد اللہ خاں کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتیہ میں لکھا ہے:—

"سعد اللہ خاں کے باپ کا نام امیر بخش تھا۔ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء کو پنج شنبہ کے دن سعد اللہ پیدا ہوا۔ اسی شام کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ یہ لڑکا بڑا کم بخت پیدا ہوا کہ پیدا ہوتے ہی باپ کو کھا گیا۔ پانچ برس کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ پھر آوارہ پھرتے اور بادیہ گردی کرتے ہوئے لاہور آ پہنچا اور اس طرح علم حاصل کرنا شروع کیا کہ رات کو گدائی کرتا اور دن کو پڑھتا تھا۔ دہلی دروازہ کے قریب اس مقام پر جہاں اب نواب وزیر خاں کی مشہور مسجد ہے، ایک مسجد تھی، اس میں رہا کرتے تھے۔"

تحقیقات چشتی کے اس بیان کے خلاف ایک مقامی روایت یہ بھی ہے کہ جب سعد اللہ خاں کی والدہ حاملہ تھی تو ایک دن اس نے سیب کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ سعد اللہ کا باپ زمیندار تھا۔ ان دنوں سیب کا ملنا ممکن نہ تھا۔ اتفاق سے ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ سعد اللہ کا باپ سالار کے پاس پہنچا اور سیب کی فرمائش کی۔ قافلہ سالار نے پوچھا کہ تمہیں سیب کس مقصد کے لیے درکار ہے۔ سعد اللہ کے باپ نے سارا قصہ سنایا۔ قافلہ سالار نے پوچھا تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میں ایک معمولی زمیندار ہوں۔ اس نے سیب پیش کرتے ہوئے کہا۔ یقیناً جو بچہ پیدا ہوگا وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک ہوگا۔ اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت ہوئی تو وہ اپنے زمانے کی منفرد شخصیت ہوگا۔

بختاور خاں مراۃ العالم میں نواب سعد اللہ خاں کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"جس زمانے میں سعد اللہ خاں افلاس کی وجہ سے پریشان اور مضطرب تھا اور لاہور میں تحصیل علوم و فنون میں مشغول تھا۔ وہ اکثر ملا خواجہ بہاری کے ہاں کسب علوم باطنی و تزکیہ نفس کیلئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ملا خواجہ بہاری کو بھی آپ سے خاص انس ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حالت جذب میں آپ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ وزیر شہنشاہ ہند کو بلاؤ۔ حاضرین ملا کے اس تعجب انگیز فقرے کو سن کر سخت متحیر ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اشارہ کس کی طرف ہے اور کسے طلب کیا جا رہا ہے۔ نہایت ادب سے دریافت کیا گیا تو ملا نے کہا کہ سعد اللہ کو بلاؤ۔"

آخر ملا خواجہ بہاری کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ اردو زبان کے سحر نگار انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد اپنی مشہور تصنیف آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سعد اللہ خاں چنیوٹ اور عبد الحکیم سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ دونوں گمنام گھروں کے لڑکے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ عبد الحکیم اگرچہ اوّل سبق میں پیش قدم تھے مگر قسمت کے سعد اللہ خاں پیش قدم نکلے۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے شاہجہان کے وزیر ہو گئے اور علامہ کا خطاب علم و فضل کی شہرت پر طرّہ ہوا۔"

شاہجہان کے دور حکومت کا چودھواں سال تھا۔ موسوی خاں صدارت پر فائز تھا کہ بادشاہ کو خبر پہنچی:۔

"ملا سعد اللہ خاں بحلیہ فضائل و کمالات عقلی و نقلی و حفظ قرآن مجید و حسن تقریر و لطف تحریر متحلی است و در ذہن وقاد و فکر نقاد و کثرت معلومات و بسطت مقدمات مشارق و مساہم ندارد"[1]

اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس استعداد و قابلیت کا عالم ہو اور وہ ہماری معارف نواز سلطنت کی تربیت سے محروم رہے۔

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹

اس لیے فوراً موسوی خاں کے نام فرمان جاری ہوا کہ وہ اسے حضور میں پیش کرے۔ ملا عبدالحمید لاہوری کہتا ہے :۔

"بموسوی خاں صدر حکم شد کہ آں حاوی فضائل را بسعادت بساط بوس مستعد گرداند"[1]

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ ۷ ارمضان ۱۰۵۰ھ کو سعداللہ خاں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ بادشاہ کی مردم شناس نگاہوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ جوہر قابل کارگزاری اور معاملہ فہمی کی پوری پوری استعداد رکھتا ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ اسے سرکاری ملازمت میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اسے خلعت خاصہ کے علاوہ طویلہ خاص سے ایک گھوڑا بھی عطا ہوا اور عرض مکرر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ عرض مکرر کا عہدہ بادشاہ کے خاص معتمد اور مقرب کو ملا کرتا تھا۔ بڑے بڑے امیر اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ سعداللہ خاں کا اس جلیل القدر عہدے پر فائز ہونا صاف بتاتا ہے کہ شاہجہان میں مردم شناسی کا جوہر کس حد تک پایا جاتا تھا۔ اس نے ایک ہی ملاقات میں اس کے جوہر بھانپ لیے اور طبیعت کی سلاحیتوں کو سمجھ لیا۔

خافی خاں نے اس موقعہ پر ایک اور بات بھی لکھی ہے جو چنداں دقیع تو معلوم نہیں ہوتی مگر اس نے اپنی طرف سے خوب نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سعداللہ ایک مرتبہ دربار میں پیش ہوا تھا۔ بادشاہ نے قاعدے کے بموجب اس کا روزینہ مقرر کرنا چاہا لیکن سعداللہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خافی خاں نے یہ نہیں بتایا کہ اس انکار کی وجہ کیا تھی۔ وہ کب اور کس جگہ بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اس کی تقریب دربار میں کس نے کرائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خافی خاں نے یہ واقعہ ویسے ہی لکھ دیا ہے جسے اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ تمام معاصرین اور قریب العہد مورخین اس پر متفق ہیں کہ جونہی خاں موصوف کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچی، اسے دربار میں طلب کیا گیا اور منصب اور عہدہ دے دیا گیا[2]۔

ایک اور مورخ سعداللہ خاں کی دربار شاہجہانی میں رسائی کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے :۔

"ایران کے بادشاہ نے صاحبقران ثانی شاہجہان کو لکھا کہ "جہان" بہت سے ملکوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک ہندوستان بھی ہے۔ آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ دنیا کے حکمران نہیں۔ پھر اپنا لقب "شاہ جہان" کیوں اختیار کر لیا ہے؟ اعتراض واقعی بڑا وزنی اور وقیع تھا۔ بادشاہ نے درباری علماء اور فضلا کو حکم دیا کہ اس تحریر کا معقول جواب لکھیں۔ صاحب راحت مقال لکھتا ہے کہ ان ایام میں سعداللہ، شیخ عبدالمومن سنبھلی کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت پر مامور تھے۔ شیخ دربار میں دیوان تن تھا۔ اس نے اس واقعہ کا ذکر سعداللہ سے کیا۔ سعداللہ نے کہا کہ اگر میری رسائی دربار شاہی میں ہو تو میں اس معمّا کو چٹکیوں میں حل کر سکتا ہوں۔

دیوان نے موقعہ پا کر بادشاہ کے حضور عرض کیا۔ چنانچہ سعداللہ خاں کی طلبی کا فرمان جاری ہوا۔ وہ دربار میں پہنچا اور عرض کیا کہ ابجد کے حساب سے "جہان" اور "ہند" کے اعداد برابر ہیں۔ پس شاہ جہان در اصل شاہ ہند ہے۔ شاہ جہان کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ سعداللہ کی قدر و منزلت بڑھنے لگی۔ اور اسے بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کلیم ہمدانی ملک الشعرائے دربار شاہجہانی کے ساتھ ہے۔ اس نے اس مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۱۹

[2] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ عمل صالح۔ مراۃ العالم وغیرہ

ہند و جہاں زروئے عدد چوں برابر است
بر شہ خطاب شاہ جہاں زاں مقرر است

محمد افضل سرخوش کلمات الشعرا میں اس واقعہ کو معمولی سے اختلاف کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے :-

"وقتے کہ خوندکار روم در تہنیت نامہ جلوس والا تحریر نمود کہ شما خود را شاہ جہاں لقب کردہ اید۔ اگر ملک ما و ایران و توران وغیرہ داخل جہان است شما بادشاہی آں جا ندارید۔ بہتر ایں نام ساختہ و محمد ا عبداللہ۔ عبدالرحمن و عبدالرحیم است سازیں امار انتخاب کنید۔ بادشاہ بعد مطالعہ در فکرے شدہ بہ آصف خاں یمین الدولہ مصلحت کردند کہ باید ایں لقب خطاب را تغیر داد۔ کلیم خبر یافتہ قصیدہ : در مدح گذرانید و ایں مضمون را بایں بیت جواب داد ؎

ہند و جہاں زروئے عدد چوں برابر است
بر شہ خطاب شاہ جہاں زاں مقرر است

بادشاہ خوش وقت شد۔ و ہمیں بیت را در جواب نوشتند و کلیم را بزر سنجیدند" [1]

مولوی نور احمد چشتی فرماتے ہیں کہ لاہور سے فارغ ہو کر سعد اللہ خاں دہلی پہنچا اور آصف خاں پسر اعتماد الدولہ کے لڑکوں کو پڑھانے پر مشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازم ہوا اور یہ واقعہ وہاں پیش آیا۔

کلمات الشعرا کے بیان کے سامنے یہ بیان کچھ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ سرخوش ایک معاصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ (۱۶ ۱۶۴۲ء) کو بادشاہ کا جشن سالگرہ منعقد ہوا۔ حسب دستور بادشاہ کو سونے چاندی میں تولا گیا اور یہ سب اشیاء مستحق لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ تلاوان کی رسم کے بعد بادشاہ نے شاہی تخت پر جلوس کیا۔ شہزادوں اور امیروں نے نذریں پیش کیں۔ دریا دل بادشاہ نے درباری امیروں اور سلطنت کے کارندوں کو طرح طرح کی عنایات سے نوازا۔ ملا سعد اللہ خاں کو ایک ہاتھی خیل خانہ سرکار سے مرحمت ہوا اور اس کے منصب میں پانصد سوار کا اضافہ کیا گیا۔ ملا عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ملا سعد اللہ خاں نے اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر تھوڑی سی مدت میں بہت ترقی کر لی اور ایک سال کے اندر اندر اسے "خانی" کا خطاب حاصل ہوا۔ ہزاری ذات اور دو سو سوار کا منصب بھی مل گیا۔ پہلے عہدے کے علاوہ دولت خانہ خاص کی داروغگی کا عہدہ بھی ملا۔ دولت خانہ خاص جسے اکبر کے ایام حکومت میں غسلخانہ کہتے تھے مشکوئے معلیٰ اور دیوان خانہ خاص و عام کے درمیان واقع تھا۔ بادشاہ دیوان عام سے اٹھ کر یہیں آتا۔ چونکہ اس کے متصل حمام تھا۔ اس واسطے اسے "غسلخانہ" کہتے تھے۔ بادشاہ وہاں خاص خاص امور کے متعلق اپنے معتمد امیروں سے مشورہ کرتا۔ وہاں منتخب ہی امیر جا سکتا تھا جسے بادشاہ خود طلب کرتا۔ حتیٰ کہ شہزادے بھی بغیر اجازت وہاں داخل ہونے کے مجاز نہ تھے۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں "غسلخانہ" کی بجائے اسے "دولت خانۂ خاص" کہتے تھے۔

"دولت خانہ خاص" کی داروغگی ایک بڑا اعزاز تھا جو راسخ الاخلاص امیروں کو وفاپرورانہ خدمات کے معاوضے میں بڑی بڑی

---

[1] کلمات الشعرا، صفحہ ۹۵

امیدوں کے بعد حاصل ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت قلیل میں سعداللہ خاں نے اپنی وفا۔ امانت۔ دیانت اور اخلاص کا کتنا گہرا اثر بادشاہ اور اہل دربار کے دل میں پیدا کر دیا تھا[1] سعداللہ خاں نے اپنے جدید عہدے کے فرائض اتنی ذمہ داری اور تندہی سے ادا کیے کہ قدر شناس بادشاہ نے اسی سال ۸ ار رمضان کو خلعت خاصہ۔ دو ہزاری ذات اور پانچ سو سوار کا منصب عطا کرتے ہوئے میرسامان کا عہدہ بھی اسے دے دیا۔ میرسامان کا عہدہ وزارت سے لگ بھگ ہوتا تھا۔ اس عہدے کے فرائض اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ دیگر مہمات کی طرف توجہ نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس لیے داروغگی دولت خانہ خاص باقی خاں کو عوض مکرر کا عہدہ میرک شیخ کو دے دیا گیا۔[2]

۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں سعداللہ خاں دیوانی خالصہ شریفہ پر فائز ہوا اور شاہی فرمانوں کی اصلاح اس کے سپرد کرتے ہوئے اسے یہ اعزاز بخشا گیا کہ فرامین کی پشت پر دارا شکوہ کی مہر کے بعد اپنے دستخط بھی ثبت کر دیا کرے۔

۲۰ رجب ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) کو بادشاہ نے سعداللہ خاں کو اچھابل (کشمیر) میں جسے اس وقت صاحب آباد کہتے تھے۔ وزارت کل کا خلعت عطا فرمایا۔ اب سعداللہ خاں سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ وزارت کل کے سلسلے میں صاحب مآثرالامرا ایک عجیب و غریب قصہ بیان کرتا ہے۔ خان دوراں صوبہ دار دکن کے انتقال کی خبر جب دربار میں پہنچی تو شاہ جہاں نے اسلام خاں مشہدی سے جو اس وقت وزیر اعظم تھا فرمایا کہ دکن کی صوبہ داری کے لیے تم کس کا نام تجویز کرتے ہو۔ اسلام خاں یہ سن کر اپنے ڈیرے پر آیا اور اپنے مشیروں سے صلاح لی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں بادشاہ سے درخواست کروں گا کہ مجھے دکن کا صوبہ دار بنا دیا جائے۔ اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزارت عظمیٰ کو چھوڑ کر حکومت دکن پر جانا کہاں کی دانائی ہے۔ خان نے کہا تم بالکل درست کہتے ہو۔ بادشاہ سعداللہ خاں کا لوہا مان چکا ہے۔ اس کا دلی منشا یہ ہے کہ سعداللہ خاں وزیر اعظم بنے اور میں خود اس کے لیے جگہ خالی کر کے دکن جانے کی خواہش ظاہر کروں۔ بہتر یہی ہے کہ میں ایسا ہی کروں۔ بادشاہ بھی خوش ہو جائے گا اور سعداللہ خاں پر میرا احسان بھی ہو گا۔ چنانچہ اسلام خاں مشہدی اسی شام بادشاہ کے حضور حاضر ہوا اور عرض کی کہ دکن کی صوبہ داری کشاں کشاں مجھے یہاں لے آئی ہے۔ بادشاہ خوش ہو گیا۔ کہا اگر تم دکن جانا چاہتے ہو تو اپنی جگہ کس کے حوالے کرو گے؟ اس نے عرض کیا کہ میں اس عہدے کے لیے سعداللہ خاں سے بہتر کسی کو نہیں پاتا۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اسلام خاں کو دکن بھیج دیا اور سعداللہ خاں کو وکیل السلطنت کا عہدہ عطا کر دیا۔

سعداللہ خاں نے اپنی وزارت کے ایام میں بہت سی فوجی خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس کی وزارت کا زمانہ نہایت مبارک اور اعلیٰ دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایک عام قاعدہ تھا کہ کروڑیوں کو تحصیل زر کے معاوضے میں پانچ فیصدی مجرا دیا جاتا تھا۔ یعنی ایک کروڑی اگر سو روپیہ وصول کرے تو وہ پچانوے روپے شاہی خزانے میں داخل کرے باقی پانچ روپے اپنے معاوضے کے طور اپنے پاس رکھ لے۔ سعداللہ خاں نے کفالت سرکار کے خیال سے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ پانچ روپے حاصل کرنے کے لیے کروڑی ایک سے پانچ روپے رعایا سے وصول کرے۔ اسی معمولی سی ترمیم سے رعایا کو بہت سی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سعداللہ خاں نے جب اس پر سوچ بچار کی تو وہ رعایا کی پریشانیوں کا خیال کر کے کانپ اٹھا اور اپنی اس ترمیم پر وہ عمر بھر نادم رہا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ کاش ان دن

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۲۰

[2] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۴۷

میرا ہاتھ سوکھ جاتا۔ میرا قلب ناکارہ ہو جاتا جب میں نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔

سعد اللہ خاں کو غریب رعایا کی پریشانیوں کا اس قدر احساس تھا کہ محالات خالصۂ شاہی کی بقایا مال گزاری کی فہرست اس کے سامنے رکھی گئی تو اس پر اس نے یہ حکم لکھا کہ "اس برف کے انبار کو آفتاب کے سامنے رکھو۔ سورج کی گرمی کے بعد جو باقی بچ رہے اسے وصول کرنے کی کوشش کرو۔" دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ جن لوگوں میں بقایا ادا کرنے کی طاقت نہیں ان سے بقایات وصول کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں پنجاب میں بارش نہ ہوئی فصلیں خشک ہو گئیں۔ شدید اور ہولناک قحط نمودار ہوا۔ رعایا پرور شہنشاہ نے حکم دیا۔ کہ پنجاب کے مختلف مقامات پر دس لنگر خانے جاری کیے جائیں اور ہر ایک سے دو سو روپے روزانہ کی خوراک مسلمانوں کو پکی پکائی اور ہندوؤں کو جنس خام کی صورت میں تقسیم ہوا کرے اور پچاس ہزار روپیہ ان سفید پوشوں اور ضعیفوں میں تقسیم کیا جائے جو لنگر خانہ میں نہیں جا سکتے۔

۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء میں پھر یہی صورت پیدا ہوئی مگر اب کے حالات قدرے مختلف تھے۔ ابتدا میں پانی نہ برسا اور خریف کی تمام فصل خشک ہو گئی۔ آخر میں اس شدت سے مینہ برسا کہ بارش نے تھمنے کا نام ہی نہ لیا۔ یہاں تک کہ ربیع کی فصل بوئی نہ جا سکی۔ بادشاہ اس زمانے میں لاہور سے کشمیر جا رہا تھا۔ رعایا کی پریشانی دیکھ کر اس نے ان معاملات کے تصفیہ کے لیے نواب سعد اللہ خاں کو پنجاب میں چھوڑا۔ نواب سعد اللہ خاں نے صوبہ کا دورہ کر کے حالات پر قابو پایا۔ رعایا پر آسائش کے دروازے کھولے اور پھر کشمیر میں جا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ کشمیر میں بھی ان دنوں کچھ ایسے ہی حالات پیدا ہو چکے تھے۔ نہ باغوں میں رونق تھی نہ سبزہ میں تر و تازگی۔ فصلیں تباہ اور رعایا پریشان تھی۔ بادشاہ نے یہاں کے حالات بھی نواب سعد اللہ کے سپرد کیے۔ نواب نے دو ماہ کے اندر اندر رعایا کا دل مٹھی میں لے لیا۔

سعد اللہ خاں نے مالگذاری کے سلسلے میں ایک بے حد مفید ترمیم کی۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ عامل اور کروڑیوں کی سو سے کم فاضل رقم حساب میں مجرا نہ دی جائے۔ اگر رقم سو سے زیادہ ہو تو مجرا دی جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دیوان اور متصدیوں نے عاملوں کے راستے میں رقموں کے مجرا دینے میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور دقتیں عاید کر دیں۔ جب فرد محاسبہ نواب سعد اللہ خاں کے روبرو پیش ہوئی تو اس نے اس پر لکھا:۔

"اے مستوفی! مثل ہندی است۔ لینا لینا۔ دینا دینا"

جب سرکاری ضابطہ ایسا مقرر ہو چکا ہے کہ سو سے زیادہ فاضل مجرا ہو تو کس واسطے ہمارے لیے اور اپنے لیے بد دعا اور عاقبت کی خرابی پر راضی ہوتے ہو؟

نواب سعد اللہ خاں نے جمادی الآخری ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء کو وفات پائی۔ اسے قولنج کا عارضہ تھا۔ اب کے ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ شاہ جہان نے طبیبوں کو اس کے علاج کے لیے تاکید کی۔ انھیں بار بار بدل کر علاج کرایا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بیماری کے دوران بادشاہ کئی مرتبہ اس کی عیادت کو گیا۔ کہتے ہیں جب اس کے انتقال کی خبر بادشاہ کو پہنچی تو جوئے اشک اس کی آنکھوں سے بہ نکلا۔

نواب کا بڑا بیٹا لطف اللہ خاں اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ بادشاہ نے اسے اپنے منصب داروں میں شامل کر لیا۔

ایک مورخ کہتا ہے کہ نواب سعد اللہ خاں میں صوری و معنوی کمالات کے علاوہ بے شمار ذاتی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ ملکی حالات

کو کمال دیانت اور امانت سے ادا کرتا تھا۔ وزارت کے ایام میں ہرگز اس کا قدم بدعت اور مردم آزاری کے لیے نہیں اٹھا بلکہ وہ ان تمام مقدمات و محاسبات کو رفع دفع کرتا تھا جن میں عامل اور رعایا کا نقصان ہوتا تھا۔ صاحب مآثر الامرا لکھتا ہے:۔

"سعد اللہ خاں بحلیۂ علم بحسن خلق و تواضع و انصاف داشت۔ در انفصال معاملات متعلقہ براستی و دیانت می کوشید۔ در اخذ وجوہ سرکار پادشاہی روادار نہ بود کہ بر عمال و رعایا حیف و میلے رود۔ ہندوستان در وقت او رونق گرفت۔ باآنکہ مثل دارا شکوہ حرفیش بود اما شکایت او پیش نرفت۔ از ابتدائے ملازمت ہموارہ در ترقی گزرانید۔ القاب او علامی فہامی جملۃ الملک مقرر گشت۔ بہ منتہائے مراتب فائز گشت۔ برحمت حق پیوست۔ نام نکو یادگار گذاشت" [1]

الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں کہ "وہ نہایت لائق، فائق اور عاقل و ہوشیار اور چال چلن کا نیک تھا۔ یہاں تک کہ ویسا وزیر ہندوستان کے وزیروں میں کوئی نہیں ہوا۔ شاہجہان کے کاروبار میں اس وزیر باتدبیر کا ذکر بڑی عزت و شان سے ہوا ہے۔ تمام سلطنت کے کام اسی وزیر کے صلاح و مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ اورنگ زیب نے جو خطوط اور فرمان اپنی طویل طویل حکومت میں لوگوں کے نام تحریر کئے ہیں ان میں بھی اس وزیر کی راؤں اور کاموں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سب لوگ اس کی پیروی کریں۔" [2]

حاجی محمد سعید اپنے وقت کے بڑے فاضل، متورع اور عالی مشرب انسان تھے۔ زندگی فقر و فاقہ سے بسر کی۔ اور اس میں بھی علم کی آن کو قائم رکھا۔ یہاں تک کہ باپ کے ہاں سے بھی کھانا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ یہ بات جانتے تھے کہ میرا باپ ملازم ہے اور سرکار سے تنخواہ پاتا ہے اور اپنے فرائض پوری دیانت داری سے ادا کرتا ہے۔ گویا وہ رزق حلال حاصل کرتا ہے۔ پھر بھی غیرت نے انھیں اجازت نہ دی کہ وہ اپنے باپ کے دست نگر ہوں۔ کیونکہ یہ فقر کے منافی تھا۔ آپ کی پوشاک بڑی سادہ ہوتی۔ چھوٹی سی پگڑی جسے ہم پھینٹا کہتے ہیں اور دو چادریں یہ ان کے لباس کی کل کائنات تھی۔ کبھی درویشوں کی طرح ان چادروں کی کمبل مار لیتے۔ اس طرح آپ نے تحصیل علم کیا اور پھر جو کچھ پڑھا تھا۔ اس کا فیض دوسروں تک پہنچایا۔

جب آپ کا باپ فوت ہوا تو آپ باپ کی میراث کے مالک ہوئے۔ آپ نے اس پر قبضہ کیا اور اس کے ذریعے حج کا سامان کیا۔ حرمین کی زیارت کے بعد آپ واپس آئے اور مسند درس پر متمکن ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شہرت شاہجہان کے کانوں تک پہنچی۔ وہ اہل علم و فضل کا سچا قدردان تھا۔ اس نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی مگر قناعت و توکل کے اس پیکر نے وہاں جانا پسند نہ کیا۔ بادشاہ نے پھر کوشش کی۔ اب کے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی اور ملا سعد اللہ خاں کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا اور آپ کو سرکاری ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی۔ مگر آپ نے ملازمت کی پابندیوں میں گرفتار ہونا پسند نہ کیا، آزادانہ طور پر درس دیتے رہے اور دل اور دماغ کے مریضوں کی اصلاح کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ آپ نے بیضاوی کے چند اجزا پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۴۴۹

[2] تاریخ ہندوستان از الفنسٹن

ملا عصمت اللہ اپنے وقت کے زبردست عالم تھے۔ علم کی ہر شاخ کو بڑی محنت و شفقت سے حاصل کیا اور اپنے لیے ایک مخصوص مقام پیدا کیا۔ آپ نے لاہور میں درس شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی شہرت پر لگا کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ طلبہ خاصی تعداد میں آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی۔ اللہ تعالےٰ نے بصیرت کی دولت عنایت کی ہوئی تھی۔ اس لیے درس بند نہ کیا۔ پڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ آپ کب فوت ہوئے؟ کسی تذکرے نے ذکر نہیں کیا۔ آپ کا ایک لڑکا محمد شریف نامی تھا۔ اس نے نو عمری میں بیضاوی پر حاشیہ لکھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی — یہ لڑکا ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں فوت ہوا۔ (طبقات شاہجہانی ورق ۳۰۲ ب)

عہد اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء تا ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء

اورنگ زیب شاہ جہان اور اس کی محبوب بیوی ممتاز محل کی چھٹی اولاد تھا۔ وہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء کو دوحد کے مقام پر پیدا ہوا اس وقت جہانگیر نظام شاہیہ کے سپہ سالار ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف واپس آرہا تھا۔ شاہجہان نے شہنشاہ کے حضور میں ایک ہزار اشرفی کی نذر پیش کی۔ جہانگیر نے اسے قبول کیا اور بچے کا نام اورنگ زیب رکھا۔ جشن مولود اجین پہنچ کر منایا گیا۔ کیونکہ دوحد ایک معمولی گاؤں تھا جہاں اتنا عظیم الشان جشن منایا نہیں جا سکتا تھا۔ طالب، کلیم ہمدانی نے "آفتاب عالمتاب" سے تاریخ ولادت نکالی۔ ایک اور شاعر نے "گوہر تاج ملوک اورنگ زیب" سے تاریخ استخراج کی۔

اورنگ زیب کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد جہانگیر اور شاہ جہان کے تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ بیٹے نے تنگ آکر باپ کے خلاف بغاوت کردی۔ اس کی باوفا بیوی ممتاز محل نے ایک سچی رفیقہ حیات کی طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس طرح سارا خاندان دکن سے بنگال و بہار اور پھر وہاں سے دکن کی طرف مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں باپ اور بیٹے کے درمیان صلح صفائی ہوئی اور شاہجہان کے دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب والدین کے سایہ شفقت سے علیحدہ کرکے دادا کی خدمت میں یرغمال کے طور پر بھیج دیے گئے۔

اس افراتفری میں شہزادے کی تعلیم و تربیت کا کیا بندوبست ہو سکتا تھا۔ بہرحال شاہ جہان اور ممتاز محل اولاد کی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ ان سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے شہزادے کی تعلیم و تربیت کے لیے کیا۔ اورنگ زیب کے رقعات اور اس کے دور حکومت کے تمام تاریخی واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اورنگ زیب کے تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے آخر عمر تک مطالعہ کو جاری رکھا۔ اس سے اس میں وسعت نظر پیدا ہوئی۔ اس کے رقعات ادیبانہ سحر کاری کا بہترین مظہر ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں ادب اور شعر پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا تھا جتنا دوسرے مضامین پر۔ وہ ترکی خوب جانتا تھا۔ عربی کا فاضل اجل تھا۔ فارسی اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ یہ سب کچھ اس تعلیم کا اثر تھا جس کا بندوبست وقتاً فوقتاً اس کے لیے ہوتا رہا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد پہلے استاد جس سے اس نے بہت کچھ سیکھا وہ مولانا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ معقولات اور منقولات میں پوری پوری مہارت رکھتے اور اپنے وقت کے مشہور علما میں سے تھے جنھوں نے دارا شکوہ کو بھی پڑھایا تھا کثرت درس اور مطالعے سے آخیر عمر میں آپ کی بصارت زائل ہوگئی۔ شاہجہان نے ان کی خدمات کی بنا پر گزارہ مقرر کر دیا اور انھیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن مالوف جاکر علوم دینیہ کا درس جاری رکھیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳

اورنگ زیب کے دوسرے استاد میر ہاشم گیلانی تھے۔ وہ علوم دینیہ اور عربی علم و ادب کے بڑے فاضل تھے۔ ہندوستان میں درس فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ حجاز تشریف لے گئے۔ بارہ برس تک حرمین الشریفین میں مقیم رہے، منقولات شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبدالرحیم حسانی اور ملا علی سے معقولات میر نصیر الدین حسین سے حاصل کیے جو میر غیاث الدین منصور کے پوتے تھے۔ ہندوستان میں آئے تو حکیم علی گیلانی کے درس میں شریک ہوئے۔ طب اور ریاضی اُن سے پڑھی۔ پھر احمد آباد گجرات تشریف لے گئے۔ وہاں مسند درس و تدریس بچھائی اور طالبان علم کی فیض رسانی میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی فضیلت کی شہرت شاہجہان کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے قدر افزائی کرتے ہوئے احمد آباد گجرات کی صدارت اور نیابت آپ کے سپرد کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس نے اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے آپ کو منتخب کیا، آپ نے اس فریضے کو بڑی ایمانداری کے ساتھ ادا کیا، آپ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا۔[1]

ان اساتذہ کے علاوہ ملا موہن بہاری کا نام بھی اورنگ زیب کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔ ملا موہن بہاری ایک بحوبۂ روزگار ہستی تھے۔ انھوں نے سترہ برس کی عمر میں فاتحہ فراغت پڑھا اور دس برس کی عمر میں کلام اللہ حفظ کیا۔ کچھ عرصہ بہار میں درس دیتے رہے۔ آخر میں اورنگ زیب کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی۔ آپ کا اصل نام محی الدین تھا۔ قصبہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ وہیں پڑھا اور پڑھایا۔ پچاسی برس کی عمر پاکر ۱۰۶۸ھ میں فوت ہوئے۔[2]

احکام عالمگیری سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے علامی سعد اللہ خاں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ حمید الدین لکھتا ہے :-

"حضرت عالمگیر سعد اللہ خاں را خطاب عصائے پیری وزیر باتدبیر داشت۔ نزد او درس خوانده شاگرد او مقرر بودند"[3]

مولانا سید محمد قنوجی ایک بلند پایہ فاضل اور صاحب دل بزرگ تھے۔ اورنگ زیب نے ان سے امام غزالی کی تصانیف پڑھی تھیں۔[4]

ملا جیون سے بھی اورنگ زیب نے کسب فیض کیا تھا۔ وہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مشہور مفسر اور محدث تھے۔ ان کی دو کتابیں تفسیر احمدی اور نور الانوار ہندوستان گیر شہرت کی مالک ہیں۔ اورنگ زیب کا ذوق قرآنی بہت حد تک آپ کی توجہ کا نتیجہ تھا۔

فرحت الناظرین کا مصنف مشہور امیر اور فاضل دانشمند خان کو بھی جو ڈاکٹر برنیر کا مربی تھا اورنگ زیب کا استاد بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اورنگ زیب نے امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء العلوم آپ سے پڑھی مگر کوئی اور ماخذ اس کی تائید نہیں کرتا ـــ خود ڈاکٹر برنیر اس بارے میں خاموش ہے۔

یہ اورنگ زیب کے اساتذہ تھے جن کی توجہ سے اسے دینی اور دنیوی علوم حاصل ہوئے اور اس کے مذاق میں بعض ایسی باتیں رچ بس گئیں جن کی بدولت وہ اپنے خاندان اور اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ سعدی، حافظ، نظامی، نظیری،

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۲۵-۲۶

[2] تحفۃ الکرام صفحہ ۳۴

[3] احکام عالمگیری صفحہ ۴

[4] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۸۴

صائب، ملا شاہ بدخشی۔ فانی کشمیری اور ملا بیدل کے دیوان اکثر اپنے مطالعہ میں رکھا کرتا تھا۔ صائب اسے خاص طور پر پسند تھا کیونکہ اس کا کلام اکثر معرفت اور تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جس کثرت سے اس نے اپنے رقعات میں شعر لکھے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اسے شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ وہ زاہد خشک ہی نہ تھا بلکہ اگر کوئی اچھا شعر سنتا تو اس کی داد دیتا اور اپنی بیاض میں لکھ لیتا تھا۔ مخلص خاں نے ایک مرتبہ اسے دیوان صائب پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"۱۱۱۶ھ میں وہ بیمار ہوا۔ نقاہت اور ضعف کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گیا۔ اس حالت میں وہ نظامی کے مندرجہ ذیل شعر ترنم سے گنگنا رہا تھا ؎

بہشتاد و نود چوں در رسیدی ۔۔۔ بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
دراں جا چوں بصد منزل رسانی ۔۔۔ بود مرگے بصورت زندگانی

اس وقت امیر خاں بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس نے عرض کیا کہ مولانا نظامی کے یہ تمہیدی شعر ہیں جو اس شعر کی خاطر لیے گئے ہیں ؎

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری
دراں شادی خدا را یاد داری

عالمگیر نے اس شعر کو بار بار سنا اور اپنی بیاض میں لکھ لیا۔"

عالمگیر کو دینی علوم سے طبعی لگاؤ تھا اور وہ اکثر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مستعد خاں ساقی مآثر عالمگیری میں لکھتا ہے :۔

"قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی تحصیل ہے۔ جہاں پناہ حضرت امام غزالی کی تصانیف، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات، شیخ زین الدین، شیخ قطب الدین، شیخ محی الدین شیرازی کے رسائل خاص شوق سے مطالعہ کرتے۔" (مآثر عالمگیری ص ۲۸۸)

اورنگ زیب کے معاصرین میں شیخ محب اللہ الہ آبادی ایک صاحب دل صوفی اور بزرگ درویش تھے، رسالہ تسویہ ان کی تصنیف ہے۔ اس رسالے میں شیخ موصوف نے جبریل اور وحی کی حقیقت عام مسلک سے ہٹ کر بیان کی ہے۔ جب یہ رسالہ عام ہوا اور علماء نے اس کے خلاف شور برپا کیا تو عالمگیر نے بھی یہ رسالہ پڑھا۔ اسے شیخ کا بیان کھٹکا۔ اس وقت شیخ محب اللہ کے دو مرید دہلی میں موجود تھے۔ ان میں میر سید محمد شاہی منصب دار تھے۔ اور دربار کے امراء میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے شیخ محمدی درویش تھے جو کالپی کے رہنے والے تھے۔ وہ بڑے زاہد و عابد تھے۔ سب سے پہلے عالمگیر نے میر سید محمد سے تسویہ کی عبارت کی تشریح طلب کی۔ انھوں نے شیخ کی مریدی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد شیخ محمدی سے کہا گیا کہ وہ شیخ کے بیان کو شریعت کے مطابق ثابت کریں ورنہ ان کی مریدی سے کنارہ کشی کا اعلان کریں، اور کتاب کو آگ میں ڈال دیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ نہ تو مجھے ان کی مریدی سے انکار ہے نہ ہی اس سے کنارہ کشی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک ابھی رسائی نہیں ہوئی جس وقت میں اس مرتبے پر پہنچ جاؤں گا تو اعلیٰ حضرت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کی شرح لکھ بھیجوں گا اور اگر بادشاہ نے اس کتاب کو جلانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو

اس گدائے بے نوا سے کہیں زیادہ بادشاہ کے باورچی خانے میں آگ موجود ہے۔ حکم دیں کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں میسر آسکیں شاہی مطبخ میں سپردِ آتش کر دی جائیں۔ عالمگیر اس جواب کو سن کر چپ ہو گیا۔[1]

اس واقعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ [illegible] جزئیات پر بھی ویسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر۔ اس کے علاوہ علم جب عمل کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کے خوف کے سوا باقی ہر ایک کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ یہی اس وقت کی تعلیم کا مقصد تھا۔

اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ فتاویٰ عالمگیری ہے۔ کتاب و سنت کے احکام کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب نہایت لازمی ہے۔ اورنگ زیب نے ملک کے ممتاز علماء سے فرمائش کی کہ فقہ کی تمام کتابوں سے مسائل کا انتخاب کرکے ایک کتاب مرتب کریں چنانچہ ملّا محمد کاظم شیرازی عالمگیر نامہ میں لکھتا ہے:۔

"چونکہ بادشاہ سلامت کو اس کا خاص خیال ہے کہ مسلمان ان دینی مسائل پر عمل کریں جنھیں حنفی مذہب کے علماء عمل کے قابل سمجھتے ہیں لیکن یہ مسائل نہایت پریشان صورت میں اِدھر اُدھر کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کا کسی ایک کتاب میں نہ ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک مبسوط کتاب میں انھیں جمع کر دیا جائے۔ اس بنا پر بادشاہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پایۂ تخت کے علماء کی ایک جماعت شاہی کتب خانے کی ان فقہی کتب کو جو ایک مدت سے اطراف و اکناف عالم سے جمع کی گئی ہیں سامنے رکھ کر بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان مسائل کو ایک کتاب میں جمع کریں تاکہ ہر شخص اس کتاب کی مدد سے فقہی مسائل آسانی کے ساتھ معلوم کر سکے اور قاضی اور مفتی بہت سی کتابوں کو جمع کرنے اور پڑھنے سے بے نیاز ہو جائیں۔ اس کام کی ذمہ داری شیخ نظام کو سونپی گئی — تمام علماء اور فضلاء کے معقول وظیفے مقرر کیے گئے اور وہ اس کام میں مشغول ہو گئے۔ اس کام کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ شاہی کتب خانے سے ان کے حوالے کی گئیں۔ ہر سال اس کام پر ایک بہت بڑی رقم خزانہ شاہی سے صرف کی جاتی ہے۔ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو دنیا تمام فقہی کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گی اور اس کا ثواب بادشاہ کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔" (عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۷)

آٹھ سال میں دو لاکھ روپیہ صرف کرکے یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس میں جن ماخذات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے نام اتنے زیادہ ہیں کہ ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب وہی کتابیں ہیں جو شاہی کتب خانے میں موجود تھیں۔ گویا عالمگیر کا کتب خانہ مذہبی علوم و فنون کی کتابوں کا خزانہ تھا۔

فتاویٰ عالمگیری میں جن علماء نے کام کیا ان پر بڑی ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان میں بعض علماء خاص لاہور کے رہنے والے تھے۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۸۴ — مآثر الامراء جلد سوم ص ۶۰۶ — مراۃ الخیال شیر خاں لودھی ص ۱۶۶

عالمگیر کو اشاعت تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ دل کھول کر اس سلسلے میں روپیہ صرف کرتا۔ اس کے اکثر فرمان ملتے ہیں جن میں اس نے صوبائی گورنروں کو بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم کے لیے کوشش کریں، مدرسے بنائیں، دارالعلوم جاری کریں اور علماء کو مدد معاش دیں تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں۔

مراۃ احمدی کا مصنف لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے سرکاری خزانے پر یہ بوجھ ڈالا کہ ملک کے ہر طالب علم کو یومیہ دیا جائے اور تمام مملکت کے ہر حصے میں تعلیم پانے والوں کے نام اس وظیفے کے سرکاری رجسٹروں میں درج ہوا کریں۔ چنانچہ ہر طالب علم کو اس کے درجے کے مطابق یومیہ ملتا۔ پہلے درجہ کے طالب علم کو ایک آنہ دوسرے درجے والے کو دو آنے اور آخری درجے میں پڑھنے والے کو آٹھ آنے ملا کرتے تھے۔ وہ طالب علم جو کسی خاص مضمون میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا، دس آنے یومیہ مدد معاش کے ملا کرتے تھے۔ مسٹر این این لا تاریخ فرح بخش کے حوالے سے اس کی مزید توضیح کرتا ہوا لکھتا ہے کہ :-

"اورنگ زیب میزان پڑھنے والے طلبہ کو ایک آنہ منشعب پڑھنے والے کو دو آنے شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والے کو آٹھ آنے روزینہ دیا کرتا تھا۔"[1]

صاحب مراۃ احمدی اس قسم کی مدد معاش پر مزید روشنی ڈالتا ہوا لکھتا ہے :-

"کرمت خاں دیوان صوبہ کے نام حکم صادر ہوا کہ چونکہ ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہو چکا ہے کہ ہر صوبہ میں مدرس مقرر کیے جائیں، میزان سے لے کر کشاف تک کے طلبہ کو صدر الصدور یا صدر صوبہ کے استصواب رائے اور مدرسوں کی تصدیق سے اس صوبے کے خزانچی کی تحویل سے وجہ معاش دی جائے۔ اس لیے اس وقت احمد آباد پٹن اور سورت میں تین مدرس اور احمد آباد میں پینتالیس طلبہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔"[2]

عالمگیر نے بوہروں کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا اور اس سلسلے میں اس نے کسی مخالفت یا کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ تعلیم صحیح طور پر ہو رہی ہے۔ ان کے ماہانہ نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔[3]

عالمگیر کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے قصبے بھی علمی مرکز بن گئے۔ چنانچہ ۱۶۹۰ء میں جب کپتان الگزنڈر ہملٹن خلیج فارس سے ہوتا ہوا ساحل ہند پر پہنچا اور وہاں سے وہ سندھ کی سیر کے لیے آیا تو ٹھٹھہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"یہ شہر علوم فقہ، فلسفہ، ریاضی اور دینیات کے لیے مشہور ہے۔ ان علوم میں لڑکوں کی تعلیم کے لیے یہاں تقریباً چار سو کالج ہیں۔"

(نیو اکاؤنٹ آف ایسٹ انڈیا کمپنی جلد اول ص۱۲۷)

ایک انگریز مورخ عالمگیر کے رفاہی کارناموں کو سراہتا ہوا لکھتا ہے :-

---

[1] PROMOTION OF LEARNING BY N.N. LAW P.188

[2] مراۃ احمدی جلد اول صفحہ ۳۰۹ [3] مراۃ احمدی جلد اول صفحہ ۲۷۷-۷۸

"عالمگیر نے اپنی رعایا کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس نے پھانسی کی سزا ختم کی، مزراعت کو بے حد فروغ دیا۔ پُل بنوائے، کنوئیں کھدوائے اور بے شمار سکول اور کالج جاری کیے۔"

(مغل ایمپائر از کین ص ۲۳)

منشی سجان رائے بھنڈاری نے سنہ ۴۰ جلوس عالمگیری میں اپنی مشہور کتاب "خلاصۃ التواریخ" لکھنی شروع کی۔ وہ اپنی کتاب میں لاہور عہد عالمگیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"بے شائبہ تکلف شہریست بزرگ و مصریست سترگ۔ در وسعت و آبادی و انبوہ مردم مانند ایں مصر کم نشاں دہند۔ گوناگوں ہنر پیشگاں ہر دیار و ہر گونہ صنعت گران روزگار سکونت دارند و اجناس ہفت کشور و اشیائے بحر و بر بہ خرید و فروخت می رود . . . .
در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است"[1]

پنجاب میں عالمگیر کے دورِ حکومت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ اب تک فقہ اور دینیات کی کتابیں جو عوام کے لیے فائدہ رسا تھیں، سلیس فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر اس دور میں فقہ اور دینیات کے لیے پنجابی زبان اختیار کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان مضامین پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن سے مذہبی اور روحانی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی۔

عالمگیر کو تعلیم سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اس نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بڑی توجہ دی۔ ایک فرض شناس، شفیق اور دُور اندیش باپ کی طرح وہ اپنی اولاد اور بالخصوص لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی عظیم الشان سلطنت کا وارث ایک لائق، فرض شناس اور ہوشیار شخص ہو۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے میں ایسے افراد چاہتا تھا جو اس کو ہر قسم کے فتنہ و فساد سے محفوظ رکھ سکیں۔ وہ اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا اور معمولی سی معمولی لغزش پر بھی ٹوکتا، قدم قدم پر تنبیہہ کرتا۔ سفر ہو یا حضر، وہ دربار میں ہو یا دربار سے باہر، اس کی دُور رس نگاہیں ان کی ہر نقل و حرکت کو مطالعہ کرتی رہتیں۔ چنانچہ ہمیں اس کے مکتوبات سے شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ میسر آتا ہے جس سے اس کی فرض شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا سلطان محمد تھا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ وہی اس کا جانشین ہو گا۔ اس نے اسے اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور اسے پورے طور پر تعلیم دینے کی کوشش کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لیے عین عالمِ شباب میں وہ باپ کو داغِ مفارقت دے گیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لیے تعلیم و تربیت اولاد کے سلسلے میں اورنگ کے کلک گوہر بار سے ایک بیش قیمت لائحہ عمل حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہزادے کو سفر و حضر، سونے اور جاگنے، نہانے اور دھونے، کھانے پینے، ورد و وظائف، نماز و قرآن خوانی، لکھنے پڑھنے، شکار کھیلنے، دربار لگانے، دربار میں آنے، خویش و اقارب سے ملنے، امیروں سے ملنے، فوجوں کے معائنہ کرنے کے بارے میں اپنی طرف سے بڑی مفید ہدایات بھیجتا رہتا تھا۔ اس شہزادے کو تعلیم سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی جسے اورنگ زیب پسند نہ کرتا تھا اور بار بار اسے تاکید کرتا کہ وہ رغبت کے ساتھ پڑھے۔

اورنگ زیب فارسی میں نہایت شگفتہ اندازِ بیان کا مالک تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اس نے

---

[1] خلاصۃ التواریخ مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۵

ایک خط میں اسے لکھا کہ وہ شیخ ابوالفضل کا اکبرنامہ ضرور پڑھا کرے۔ تاکہ اسے پاکیزہ فارسی لکھنے میں مہارت حاصل ہو جائے۔ شہزادے نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور اکبرنامہ کی تقلید کرتے ہوئے بسم اللہ کی بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہ لکھا۔ اورنگ زیب نے اس پر بیٹے کو ٹوکا اور سرزنش کرتے ہوئے لکھا کہ

"مقصود از خواندن اکبرنامہ شیخ ابوالفضل تتبع عبارت آں کتاب است نہ اتباع مذہب مصنف کہ
از روئے بدعت اسلوب مسلوں را تغیر دادہ"

آج اگر اورنگ زیب زندہ ہوتا اور ہماری تحریروں کو دیکھتا تو خدا جانے وہ ان کے بارے میں کیا کہتا۔

ابوالفضل نے اپنی انشا پردازی کے زور میں بڑی عجیب و غریب اختراعات کی ہیں۔ وہ عریضہ کو "نشان والا" اور مہر کو "مہر خاص" لکھا کرتا تھا۔ شہزادے نے تقلیداً اپنے خط میں یہ الفاظ لکھے۔ اورنگ زیب نے اس پر فہمائش کی اور شہزادے کو سمجھایا کہ یہ الفاظ شاہی رقعہ اور مہر کے لیے خاص ہوتے ہیں۔ جب تم بادشاہ ہو گے تو انھیں استعمال کرنا۔

اسی طرح شہزادے نے لاپروائی سے کام لیتے ہوئے ایک ردی کاغذ اور بُرے مسطر میں عریضہ لکھا۔ عالمگیر کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ شہزادے کو ڈانٹا اور کہا کہ جب کبھی خط لکھو، اچھے کاغذ پر لکھو۔ بے پروائی سے حسن خط کو خراب نہ کرو۔

اسی طرح اورنگ زیب نے دوسرے شہزادوں کی تربیت کی۔ ان میں سے اکثر تعلیم میں فضیلت کے درجہ پر پہنچے۔ خاص کر شہزادہ معظم علوم دین میں بڑا بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بادشاہ کے حضور میں علوم قرآن کے ضمن میں ایک فہرست پیش کی اور کہا کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے ناظم کتب خانہ کو حکم دیا کہ اس فن پر پہلے جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں وہ شہزادے کو دکھلائے۔

اورنگ زیب کو امام غزالیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اکثر ان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد اعظم کو امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "تبر المسبوق" پڑھنے کا حکم دیا۔ مگر اس کے بیٹوں میں کام بخش باپ کی توجہ سے علوم و فنون کی تحصیل میں اپنے تمام بھائیوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ وہ خطوط کی مختلف اقسام کا ماہر تھا۔ بڑے بڑے خطاط اسے استاد زمانہ کہا کرتے تھے۔ اسے باپ کی طرح قرآن پاک حفظ کرنے کی توفیق بھی حاصل ہوئی۔ یہ سعادت اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا کو بھی میسر آئی جس سے خوش ہو کر باپ نے اسے تیس ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ وہ ایک عالم باپ کی عالم بیٹی تھی۔ بختاور خاں لکھتا ہے:۔

"از تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ"[1]

اورنگ زیب جہاں علوم و فنون کی اشاعت اور مدارس کی ترقی میں اتنی دلچسپی لیتا اور بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا وہاں وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے تخت و تاراج کا مالک ہونے کے باوجود بسر اوقات کے لیے ٹوپیاں کاڑھتا اور قرآن کی کتابت کرتا۔ چنانچہ اس نے شہزادگی کے عالم میں اپنے ہاتھ سے ایک قرآن پاک لکھا اور مکہ مکرمہ بھیجا۔ تخت نشین ہونے کے بعد قرآن پاک کی ایک اور جلد تیار کر کے مکہ مکرمہ بھجوائی۔ اس کے بعد اس نے قرآن کے دو نسخے اور تیار کیے۔ سات ہزار روپیہ ان کی جلد، لوح اور جدول پر صرف کیا۔ یہ دونوں نسخے مدینہ منورہ بھیج دیے۔[2]

اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن آج بھی ہندو پاکستان میں ملتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے قرآن پاک سے کتنا لگاؤ

---

[1] مراۃ العالم (قلمی)

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۲۲

تھا۔ اس کی آخری وصیت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :۔

"چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد وایہ بیگہ محل دار است صرف کفن این بیچارہ نمایند و سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در صرف خاص است روز وفات بہ فقرا بدہند" [1]

عالمگیر کی تعلیمی دلچسپیوں کے بارے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بعض معاندین اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ہندوؤں کی تعلیمی درسگاہوں پر پابندیاں عائد کیں اور بعض کو بالکل بند کر دیا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ اورنگ زیب نے مذہبی تعصب کی بنا پر یا ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسا نہیں کیا بلکہ ہندوؤں نے بعض ایسی حرکات کیں جن کی بنا پر اورنگ زیب کو اس بات کا جائزہ لینا پڑا کہ وہ ان کی چیرہ دستیوں کو روکے۔ انھوں نے شاہجہان کے زمانے ہی سے مساجد کو اپنی حویلیوں میں شامل کرنا اور مسلمانوں پر دباؤ ڈال کر ان کے بچوں کو اپنے مدارس میں لے کر مرتد کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاہجہان نے اس کی روک تھام کی۔ کشمیر سے واپس آتے ہوئے گجرات اور راجوری کے علاقے سے یہ شکایت موصول ہوئی کہ ہندو نہ صرف مساجد پر حملہ کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے مسلمان عورتوں کو بھی اپنے گھروں میں ڈال کر بیویاں بنا لیا ہے۔ شاہجہان نے اس کے لیے تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کی رپورٹ پر اسے موثر قدم اٹھانا پڑا۔ انہی دنوں چھبیلا رام نامی قانون گو نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے سخت سُست کہا۔ شاہجہان نے اس کے قتل کا حکم دیا مگر ہندو شرارت سے باز نہ آئے۔ اب ان شرارتوں کے مرکز ہندو مدارس تھے۔ ٹھٹھہ، ملتان اور بنارس اس کے بڑے بڑے مرکز تھے۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ

"در عرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان خصوص بنارس ..... بطالت نشان در مدارس مقرر بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند ..... و مسلمانان مسافت ہائے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آں جماعہ گمراہ می آیند" [2]

ان وجوہ کی بنا پر عالمگیر نے ان مدارس پر پابندیاں عاید کیں۔ کشمیر اور دوسرے بہت سے علاقے اس قسم کی تعلیمات سے پاک تھے۔ اورنگ زیب کی سرپرستی میں وہاں کے مدارس کو خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مولوی نظام الدین

لاہور میں جو علمی رونق شاہجہان کے وقت میں قائم ہوئی تھی وہ بدستور جاری رہی۔ ان مدارس کے علاوہ جو موجود تھے عالمگیر کے وقت میں مولوی نظام عرف پیر مُہکا نے اپنا مدرسہ قائم کیا اور پوری دلجمعی سے علوم ظاہری و باطنی کی اشاعت شروع کی۔ آپ کا فیضان دور دور پھیلا۔ صاحب تحقیقات چشتی مولوی نور احمد آپ کی پانچویں پشت سے تھے۔ آپ ۵ صفر ۱۱۱۱ھ میں فوت ہوئے آپ کا مزار علامہ اقبال روڈ پر ریلوے کالونی میں ہے۔ آپ کو پیر مُہکا اس واسطے کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے جسم پر مُہکے (دانے) نکلتے ہیں وہ آپ کے مزار پر حاضر ہو کر منت مانتے ہیں۔ جب یہ مُہکے جھڑ جاتے ہیں تو آپ کی قبر پر جاروب اور پھولوں کا سہرا چڑھاتے ہیں۔

شاہ رضا شطاری

انہی ایام میں شاہ رضا شطاری رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھے۔ آپ زبردست فقیہہ تھے۔ آپ کا فتویٰ چلتا تھا۔ علم فقہ کے متلاشی دور دور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیضیاب ہو کر واپس جاتے۔

---

[1] احکام عالمگیری صفحہ ۱۳-۱۴

[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۸۱

ملا محمد اکرم ولد یحییٰ لاہوری

اقلیم علم کا شہنشاہ تھا۔ درس سے بھی بہت مشاق تھا۔ کتب متداولہ پر کئی کئی مرتبہ درس دے چکا تھا۔ طبیعت میں حلم، بردباری، صلاح اور پرہیزگاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عالمگیر نے انھیں بلا کر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ کام بخش کا اتالیق مقرر کیا۔ اور جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کو بھی اس جماعت میں شریک کیا جو اس کام کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ آپ نے فتاویٰ کا چوتھا حصہ مرتب کیا۔ بختاور خاں کی رائے ہے کہ ملا محمد اکرم انسانی لباس میں فرشتہ تھے۔ علامہ عبدالحکیم کہا کرتے تھے کہ

"لاہور میں ملا یحییٰ کے بیٹے کی علمی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچا۔"

آپ کا انتقال سنہ ۱۰۹۴ھ میں ہوا۔

شیخ عبدالعزیز

اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالرشید تھے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل اور عالم تھے۔ انھوں نے کسب فیض اپنے والد سے کیا۔ جب جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فاضل کامل تھے۔ درس بڑے جوش و خروش سے دیتے تھے چنانچہ ہمت خاں اور بختاور خاں نے کئی مرتبہ عالمگیر کی خدمت میں شیخ کے کمالات کا ذکر کیا ....

... اور کچھ رسالے جو آپ نے تصنیف فرمائے تھے، بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ جوہر شناس تھا۔ ان کی تربیت میں مصروف ہوا اور سرخوش کے قول کے مطابق

"می خواستند کہ بمرتبہ سعد اللہ خاں برسانند"

مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ عالمگیر نے شروع شروع میں عرض مکرر کا عہدہ عطا کیا جہاں سے شیخ ترقی کا قدم بڑی تیزی سے بڑھا کر بادشاہ کا مقرب بن گیا۔ ۱۸ جلوس عالمگیری کو بادشاہ حسن ابدال کے مقام پر مقیم تھا۔ شیخ نے رخصت طلب کی۔ بادشاہ نے منظور کر لی اور شیخ لاہور چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے بختاور خاں کو یہ غزل بھیجی۔ اس غزل میں اس نے بڑے موثر انداز میں دلی جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

زدرد دل چہ نگارم کہ جوش بے تابست
زشوق جاں چہ نویسم کہ نامہ سیمابست
شب فراق چناں ریخت ... دلم
کہ باز اشک گلابی و دیدہ عنابست
چگونہ شرح دہم حال دل کہ بے تابم
زیاد تاب رخش دل کتاں و مہتابست
نشستہ ایم در بحر ناخدا چہ کند
بہ کشتی کہ زیک قطرہ آب گردابست
نماند صولت راز دلم نہاں عزت
[illegible]

شاہ عنایت قادری شطاری

عالمگیر کے زمانے میں لاہور شریعت و طریقت کا مرکز تھا۔ اس عہد میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا، ان میں شاہ چراغ اور شاہ عنایت خاص شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ عنایت رائیں قوم سے تھے۔ ان کا نام آج بھی بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ خاندان علمی تھا اور درس و تدریس آبائی پیشہ، آپ کے والد مولوی پیر محمد لاہور چھوڑ کر قصور آباد ہو گئے۔ شاہ عنایت کی ولادت بھی قصور ہی میں ہوئی۔ یہ ۱۰۵۳ھ کا واقعہ ہے۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ بڑے ذہین اور ہوشیار تھے۔ اس لیے چھوٹی سی عمر میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس وقت آپ پانچ برس کے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں آپ نے سند فضیلت حاصل کی یہ تو علوم ظاہر کی کیفیت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حصول کا ولولہ پیدا ہوا اور کسی درویش کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ گھومتے پھرتے لاہور پہنچے اور حضرت شاہ محمد رضا کے درس میں شریک ہوئے۔ ان کی صحبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی سرپرستی میں سلوک کی منازل طے کیں۔ جب آپ نے منزل مقصود کو پا لیا تو آپ کے مرشد نے حکم دیا کہ آپ قصور واپس جائیں جہاں پنجابی زبان کے دو غیر فانی شاعر سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ خلقت نے بڑی تیزی سے آپ کی طرف رجوع کیا اور ایک مدت قلیل میں آپ تقریباً تمام اہل قصور کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔

حسین خاں افغان اس وقت قصور کا حاکم تھا، وہ یہ ہجوم دیکھ گھبرایا۔ اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ حکومت میں آدمی اپنے سایہ سے بھی گھبراتا ہے۔ جس صورت میں کہ عوام دل و جان سے ایک درویش کے عقیدت مند ہو جائیں اور اس کے اشارہ چشم و ابرو پر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ رہیں تو پھر حاکم وقت کا خوف زدہ ہونا ایک لابدی امر ہے۔ اس نے طرح طرح کے حربے استعمال کئے کہ آپ پریشان ہو کر قصور چھوڑ جائیں۔ شروع شروع میں آپ نے پروا نہ کی اور چونکہ لاہور کی خاک پاک کی قسمت میں آپ کے قدم چومنا لکھا تھا اس واسطے ایک دن آپ نے اپنا دامن جھاڑ کر قصور کو خیرباد کہا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے تدریس علوم ظاہری و باطنی جاری کی۔ دور دور سے لوگ حاضر خدمت ہوتے اور عالم و صوفی بن کر آپ کی درس گاہ سے نکلتے۔ آپ کے درس میں قرآن علوم و فنون، تفسیر اور حدیث اور فقہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم، فصوص الحکم اور تصوف کی دوسری کتابوں کا درس بھی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی محفل سماع بھی منعقد ہوتی۔ بڑے بلند پایہ قوال اس میں شریک ہوتے اور اکثر خواجہ حافظ، ملا محمد شیریں مغربی، احمد جام، فخر الدین عراقی، ملا شاہ بدخشی اور مولانا روم کے دیوان، شمس تبریز کی غزلیں گائی جاتیں۔

آپ بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں غایت الحواشی کی دو جلدیں اور کنز الدقائق کی شرح خاص طور پر مشہور ہے۔

آپ پچاسی برس کی عمر پا کر محمد شاہ کے زمانے میں ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار لاہور میں چڑیا گھر کے قریب ایک کوٹھی کے احاطے میں ایک اونچے چبوترہ پر واقع ہے۔

یہاں ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

آپ کی اولاد اب تک لاہور میں موجود ہے۔

۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء تا حال

عالمگیر کی وفات ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ مغلوں کی وہ عظیم الشان سلطنت جو ہمالیہ سے راس کماری تک اور بلخ و بدخشاں سے اراکان کی انتہائی حدود تک پھیلی ہوئی تھی، اس کا سنبھالنا اور اس کے نظم و نسق کو کامیابی سے چلانا بہادر شاہ کے بس کا روگ نہ تھا۔ عالمگیر نے اپنی زندگی میں ہر چند کوشش کی کہ وہ اپنے بعد کوئی لائق اور قابل جانشین چھوڑے مگر تخت و تاج کے تمام دعویدار عالمگیر کے مقابلہ میں کوئی ایسی صلاحیت نہ رکھتے تھے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ وہ اس کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ جب یہ خیال آتا تو وہ مضطرب ہو کر رہ جاتا۔ شاہزادہ محمد سلطان البتہ کچھ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھی، اسے آدابِ شاہی سکھائے، فنونِ سپہ گری میں طاق کیا مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے عین عنفوانِ شباب میں باپ سے چھین لیا۔

بہادر شاہ بہادر شاہ تخت کے دعویداروں کو شکست دے کر تختِ طاؤس کا وارث بنا۔ وہ عالم و فاضل ضرور تھا۔ حافظِ قرآن بھی تھا اور قرأت و تجوید کا ماہر بھی۔ مستعد خاں ساقی لکھتا ہے کہ جب وہ قرآن کریم پڑھتا تو سامعین اثر میں ڈوب جاتے۔ علم حدیث میں وہ بڑے بڑے محدثوں سے بڑھا ہوا تھا۔ خوش نویسی میں بھی کچھ دسترس رکھتا تھا۔ عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں خوب ماہر تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان شیعیت کی طرف تھا۔ چنانچہ اس نے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی کے نام کے آگے وصیِّ رسول اللہ کا لفظ بڑھانا چاہا جس سے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہنگامے برپا ہو گئے۔ بہادر شاہ نے اس لفظ کی مخالفت کرنے والوں سے خود بحث مباحثہ کیا۔

جب وہ ۱۱۲۱ھ میں لاہور آیا تو یہاں بھی ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ خطیب جمعہ کے خطبے میں اس لفظ کو ضرور پڑھیں۔ اس وقت لاہور میں دو ایسے زبردست عالم تھے جو کلمۂ حق کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اسی مشغلے کو وہ اپنی زندگی کا منتہائے مقصد سمجھتے تھے۔ ان میں حاجی یار محمد اور مولانا جان محمد لقول خافی خاں "افضل الفضلائے لاہور" تھے۔ انھوں نے لاہور کے باقی علما کو اپنے ساتھ ملایا۔ ہجوم عام کے ساتھ شہر کے قاضی اور صدر کے گھر پہنچے۔ انھیں سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ مگر شاہی حکم سے وہ مجبور تھے۔ انھوں نے اس درخواست کو ٹالنا چاہا مگر عوام کے دباؤ سے انھوں نے اس کو ملتوی کر دیا۔ جب بہادر شاہ لاہور پہنچا تو اس نے اپنے اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو قلعۂ لاہور کے تسبیح خانہ میں طلب کیا۔ مولانا جان محمد، حاجی یار محمد، ملا محمد مراد تین چار اور فضلا کی معیت میں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد بادشاہ نے انھیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ عبدالقادر خان جو قاضی میر کا بھتیجا تھا دو چار اور فضلا کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ اس نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا اور بادشاہ کی حمایت کی۔ بادشاہ نے معتبر کتابوں اور حدیثوں کے علاوہ امام اعظم اور دوسرے امامانِ دین کی روایات وصی کے ثبوت میں پڑھیں۔ بات بڑھتی گئی۔ حاجی یار محمد بڑی بے باکی سے بادشاہ کے ہر قول کی تردید کرتے جاتے تھے۔ سوال و جواب کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بادشاہ طیش میں آیا۔ حاجی یار محمد نے اس طرح بادشاہ کے اقوال کے خلاف تقریر کی کہ اس سے گستاخی کا پہلو نکلتا تھا۔ بادشاہ نے بے قابو ہو کر کہا۔

"از غضب بادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلاف آداب مجلس سلاطین کلام می نمائی۔"

حاجی یار محمد نے اس کا جواب بڑے اطمینان اور سکون سے دیا۔ اور کہا۔

"میں ہمیشہ خدا وند تعالیٰ سے چار چیزوں کے لیے دعا مانگا کرتا تھا۔ وہ مجھے علم کی دولت عطا کرے۔ کلام پاک حفظ کرنے کی توفیق دے۔ حج کی سعادت عطا فرمائے اور آخر میں شہادت کی نعمت بخشے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پہلی تین نعمتیں مجھے عطا کر دی ہیں۔ ایک آرزو باقی ہے۔ مجھے امید ہے کہ عادل بادشاہ کی توجہ سے یہ بھی حاصل ہو جائے گی۔"

ان الفاظ نے بجلی کا کام کیا۔ بہادر شاہ خاموش ہو گیا۔ مجلس ختم ہوئی۔ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی روز تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ لوگوں کا جوش بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک لاکھ کے قریب شہری حاجی یار محمد کے ساتھ مل گئے۔ بادشاہزادہ عظیم الشان بھی خفیہ خفیہ حاجی یار محمد کی مدد کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ شوال ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) کے آخری دن آ گئے۔ صدر نے خطبہ کے بارے میں بادشاہ کے حضور میں عرضداشت پیش کی۔ بادشاہ نے اس پر لکھا کہ خطبہ جیسا عالمگیر کے وقت میں پڑھا جاتا تھا ویسا ہی پڑھا جائے۔ اس طرح یہ فتنہ فرو ہو گیا مگر شاہی غیض و غضب موقعہ اور وقت کی تلاش میں رہا۔ جب موقع پیدا ہوا تو حاجی یار محمد اور ان کے دونوں ساتھیوں کو کسی قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔[1]

جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ

بہادر شاہ مختصر سی حکومت کے بعد فوت ہوا تو پہلے جہاندار شاہ اور بعد میں فرخ سیر بادشاہ ہوئے۔ جہاندار شاہ نے اپنی ہوس پرستی اور فسق و فجور سے سلطنت کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ وہ ایک بازاری عورت لال کنور کے حسن پر اتنا لٹو ہوا کہ وہ شراب پی کر اس کے ساتھ بہلی میں بیٹھ کر بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی وغیرہ سب نام کے بادشاہ تھے۔ ان میں اسلاف کی کوئی خوبی نہ تھی۔ اور ویسے نادر شاہ کے حملہ کے بعد پنجاب میں سکھوں کو غارت گری کرنے اور لوٹ مار مچانے کی پوری پوری آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ ان حالات میں معارف نوازی، علم پروری اور درس و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو جانا لازمی تھا۔ پھر بھی لاہور شہر کی چار دیواری میں قدرے امن و امان تھا۔ وہاں یہ جوت جلتی رہی۔ چنانچہ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں مندرجہ ذیل عالم درس دیتے تھے۔

مولانا عابد لاہوری

آپ لاہور کے فخر تھے۔ بڑے عابد اور زاہد تھے۔ آپ کے بارے میں اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ ہر رات نماز تہجد میں ساٹھ دفعہ سورۂ یٰسین پڑھا کرتے تھے۔ جب اسہال کی وجہ سے آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس معمول میں فرق آیا۔ آپ کی علمی مجلس میں تقریباً روزانہ دو سو عالم شریک ہوتے تھے۔ آپ نے بڑے ذوق و شوق سے پا پیادہ حج کیا۔ واپس آئے تو پھر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ زہد، تقویٰ، علم و عمل میں آپ علمائے وقت سے گوئے سبقت لے گئے۔ آپ قرآن پاک کے مفسر تھے اور اپنے درس میں بڑے عجیب و غریب نکات پیدا کیا کرتے تھے۔ آپ نے ۱۱ رمضان ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) کو وفات پائی۔ بہت سی کتابیں آپ کے نام پر منسوب ہیں جن میں بیضاوی کا حاشیہ، خلاصۂ کیدانی کی

---

۱. منتخب اللباب جلد دوم واقعات ۱۱۲۱ھ

شرح رسالہ در وجود، اعجاز قرآن اور شرح قصیدہ بانت سعاد اب بھی ملتی ہیں۔

مولانا شہریار جب احمد شاہ ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کیا تو اس وقت ایک بڑے صاحب دل عالم مولانا شہریار لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کا مدرسہ چینیاں والی مسجد میں تھا۔ نہ صرف پنجاب کے طالبان علم ان کے درس میں شریک ہوتے تھے بلکہ ہندوستان کی حدود سے باہر کے لوگ بھی ان کے درس میں شریک ہونا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

مولانا محمد صدیق مولانا شہریار کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق وزیر خاں کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر خاں کی مسجد میں عید کی نماز پڑھے گا۔ چنانچہ امرا اور وزرا کے علاوہ عوام جوق در جوق نماز میں شریک ہونے کے لیے مسجد میں جمع ہوئے۔ مولانا محمد صدیق نے نماز پڑھائی۔ جب انھوں نے خطبہ پڑھنا شروع کیا تو خطبہ کے دوران احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سلطان العادل کہا۔ مولانا شہریار ذرا دور بیٹھے تھے جب خطبہ ختم ہوا تو آپ آگے بڑھے کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد نے محض خوشامد کی خاطر احمد شاہ کو سلطان العادل کہا ہے۔ حالانکہ افغانوں کے ظلم و ستم سے سارا شہر نالاں ہے۔ آپ امام کے قریب پہنچے۔ اس وقت احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا صدیق نے احتراماً اپنے اُستاد کے ہاتھ چومے۔ احمد شاہ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ مولانا محمد صدیق نے کہا آپ مولانا شہریار ہیں۔ احمد شاہ آپ کی شہرت سے واقف تھا۔ وہ بھی آداب و تسلیمات بجا لایا اور قدم بوسی کو جھکا مگر آپ نے روک دیا، اور فرمایا کہ شرعاً یہ جائز نہیں۔ پھر اپنے شاگرد کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا:—

"بیٹے! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کونسا ظلم ہے جو پٹھانوں نے اہل شہر پر روا نہیں رکھا۔ انھوں نے جبر و تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ کئی مرتبہ بادشاہ سے فریاد کی گئی مگر اس نے کوئی تدارک نہ کیا۔ نہ سپاہیوں کا ہاتھ روکا نہ سرداروں کو سرزنش کی۔

اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مولانا کی اس تقریر سے گرد و پیش کھڑے ہوئے سب لوگ تھرا اُٹھے۔ احمد شاہ نے آپ کو خاموش کرنا چاہا مگر آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ آخر اس نے کہا۔

"حضرت! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے باتیں کر رہے ہیں؟"

مولانا شہریار نے فرمایا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب احمد شاہ ابدالی ہے۔"

احمد شاہ نے کہا۔

"اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟"

مولانا شہریار نے کہا۔

"ہاں۔ شہادت یا جلا وطنی مگر میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔"

احمد شاہ نے طیش میں آ کر آپ کی جلا وطنی کا حکم دیا۔ مولانا شہر بار رٹانڈہ ضلع ہوشیارپور میں جا کر آباد ہو گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔

رنجیت سنگھ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد پنجاب میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بیٹوں اور پوتوں نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ان کے اپنے ملک میں اتنے فتنے پیدا ہو چکے تھے کہ وہ باہر کے معاملات کو سلجھا نہ سکے۔ چنانچہ سکھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تمام پنجاب کو زیر و زبر کر دیا۔ آخر رنجیت سنگھ نے مہر مراد بخش کی مدد سے لاہور پر قبضہ کیا اور سکھوں کو منظم کر کے ایک زبردست طاقت بنا دیا۔ کھویا ہوا امن و امان ایک مرتبہ پھر بحال ہوا۔ اس نے شہر کے قاضی، مفتی اور دوسرے علماء وغیرہ کو بحال رہنے دیا۔ البتہ بعض مسجدوں کو اپنی تحویل میں لے کر بارود خانہ اور اصطبل بنا لیا۔ اس دَور میں ایک مرتبہ پھر درس و تدریس میں تازہ بہار آئی اور پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ جاری ہوا۔ علماء نے مسندِ درس پھر سے بچھائی اور طلبہ ادھر اُدھر سے ان کے پاس آنے شروع ہو گئے۔ مگر پہلی سی رونق اور پہلا سا جوش و ولولہ اور تحصیل علم کا ذوق و شوق پھر پیدا نہ ہوا۔ تاہم جن علماء نے اس کام کے لیے زندگیاں وقف کیں، ان میں سے چند یہ ہیں:۔

حافظ روح اللہ لاہوری حافظ روح اللہ لاہور کی ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ ان کی زندہ کرامت یہ ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا اور اس نیت سے جہاز پر سوار ہوئے تو راستے میں رمضان شریف کا چاند نمودار ہوا۔ جس قدر ہمسفر تھے وہ آپ کے علم اور تقویٰ سے متاثر تھے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ تراویح پڑھائیں۔ آپ نے ابھی تک قرآن پاک حفظ نہیں کیا تھا۔ مگر آپ نے ان سے وعدہ کر لیا۔ روزانہ ایک پارہ حفظ کرتے اور رات کو محراب سناتے۔ اس طرح تیس دن میں آپ نے قرآن پاک حفظ کیا۔

آپ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں دُنیا میں تشریف لائے۔ بچپن ہی سے آثار رشد و ہدایت آپ کے بشرے سے ہویدا تھے۔ تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ مختلف درس گاہوں میں حاضر ہو کر صرف و نحو، منطق اور فلسفہ، معانی و بیان، حدیث و تفسیر میں کمال پیدا کیا۔ اپنے اساتذہ میں انھیں مولوی محمد سلیم لاہوری سے بہت عقیدت تھی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ سکھوں کی برچھا گردی کی وجہ سے تمام پنجاب فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کہیں بھی اطمینان و سکون میسر نہ تھا۔ ہر طرف بے اطمینانی اور پریشانی کے آثار تھے۔ سکھوں کے جتھے ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرتے۔ وہ جہاں جاتے مخلوقِ خدا کو قتل کرتے، کھیتوں کو لوٹ لیتے۔ گھروں کو آگ لگا دیتے۔ اس سے کوئی شہر اور قریہ محفوظ نہ تھا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں گھس کر لوٹ مار مچانے سے بھی سکھ دریغ نہ کرتے۔ اس پریشانی کے زمانے میں آپ نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا درس جاری رکھا۔ شریعت کے آثار قائم کیے۔ جب رنجیت سنگھ کا قبضہ لاہور پر ہو گیا اور اس نے امن و امان اور نظم و نسق قائم کر لیا تو اس کے کانوں تک آپ کی شہرت پہنچی۔ اس نے آپ کو اپنے ہاں طلب کیا۔ آپ سے باتیں کیں اور بڑی عزت و احترام سے آپ کو رخصت کیا۔ جب تک آپ زندہ رہے مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کا احترام کرتا رہا۔ آپ نے حج کیا، مدینہ منورہ میں پہنچ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری دی قدسے قیام کیا۔ پھر وہاں سے لوٹے۔ یمن میں پہنچ کر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔[1]

[1] تذکرہ علماے پنجاب صفحہ ۶۶۔

خلیفہ غلام رسول و غلام اللہ بحیثیت شاگرد کے زمانے میں یہ دونوں بھائی اچھی خاصی علمی شہرت رکھتے تھے۔ موراں طوائف امرتسر والی مہاراجہ کی خاص منظورِ نظر تھی۔ مہاراجہ نے اسے خوش کرنے کے سلسلہ میں پیسہ پر اس کے نام کی ضرب لگائی۔ اس نے شاہ عالمی دروازے کے اندر ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ایک مسجد بنوائی یہ مسجد بڑی خوب صورت اور دو منزلہ ہے۔ اس کے نیچے دوکانیں اوپر مسجد اور طلبہ کے رہنے کے لیے حجرے ہیں۔ موراں کو یہ شوق اس کی ماں بیگم جان سے ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی بافبانپورہ میں ایک مسجد بنوائی تھی۔ موراں کو مسجد کی امامت اور درس گاہ کو چلانے کے لیے قابل اور فاضل آدمی کی ضرورت تھی۔ بہت تلاش کے بعد ان دونوں بھائیوں کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ غلام اللہ کا احترام مہاراجہ خود بھی کرتا تھا۔ جب آپ اس کے بیٹوں اور پوتوں کو پڑھانے جاتے تو مہاراجہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک آپ چوکی پر نہ بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ شہزادہ شیر سنگھ کی ماں نے شکایت کی کہ خلیفہ غلام اللہ نے شہزادے کو بدنی سزا دی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مہاراجہ نے بڑے ٹھنڈے دل سے اس کی شکایت سنی اور آدمی بھیج کر آپ کو طلب کیا۔ جب آپ آگئے تو شہزادہ شیر سنگھ کو بلایا۔ جب وہ مہاراجہ کے روبرو آیا تو مہاراجہ نے خلیفہ صاحب کو ایک چابک دیا اور کہا کہ شہزادے کو خوب سزا دو۔ آپ ہچکچائے تو مہاراجہ نے ذرا تلخی سے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے شیر سنگھ کو چند بید لگائے۔ شہزادہ چیختا چلاتا جب وہاں سے چلا گیا تو مہاراجہ نے کہا اب کوئی آپ کی شکایت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ویسے آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارے بچے ذرا نازک اندام ہوتے ہیں۔ انھیں اتنی سختی سے سزا نہ دیا کیجیے۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ نے آپ کو بڑی عزت اور آبرو سے رخصت کیا۔

مسجد موراں کا درس بڑا کامیاب رہا۔ ہندو مسلم سکھ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ فارسی ادب کا درس ہوتا تھا۔ مسلمان نزدیک و دور سے منطق، معانی، صرف و نحو، حدیث اور تفسیر پڑھنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس درس کی رونق مولانا غلام اللہ کے صاحبزادے خلیفہ حمید الدین کے وقت تک قائم رہی۔ مسجد اب بھی آباد ہے۔ درس ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔

مولوی غلام فرید اپنے وقت کے علامہ تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع، زاہد و عابد اور صوفی صافی تھے۔ دنیا سے متنفر اور دنیا داروں سے دور دور رہتے تھے۔ بہت سے دنیا داروں نے آپ سے تعلق پیدا کرنا چاہا۔ مگر آپ بے تعلق ہی رہے۔ وقت کا بیشتر حصہ درس میں گزارتے اور باقی جتنا وقت بچتا اسے ذکر و فکر میں بسر کرتے۔ آپ کی وفات ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں ہوئی۔

آپ کے صاحبزادے مولوی غلام رسول اپنے زمانے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ اگر فلسفہ اور معقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے تو تفسیر حدیث اور دیگر منقولات میں یگانۂ روزگار تھے۔ علم کے طالب اور روحانیت کے متلاشی خود بخود آپ کی خدمت میں کھنچے چلے آتے تھے۔ صاحب حدائق الحنفیہ کہتا ہے کہ:-

"پنجاب میں کوئی علمائے وقت سے افادہ و افاضہ میں آپ کی ہمسری نہ کر سکتا

تھا۔ گویا خدا نے آپ کی ذات بابرکات کو دریائے فیض اور چشمۂ فضل پیدا کیا تھا"۔ ۱؎

آپ نے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولوی غلام فرید کے دوسرے صاحبزادے مولوی غلام اللہ بھی بڑے پایہ کے عالم تھے۔ آپ کی ذات میں دینی اور دنیوی دونوں علوم جمع تھے۔ سینکڑوں عالم آپ کے درس سے فاضل اجل بن کر نکلے۔ آپ کے درس میں فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، منطق اور معانی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ پنجاب میں علما کا شاید ہی کوئی خاندان ہو جو اس خاندان کا شاگرد نہ ہو۔ مولوی فقیر محمد جہلمی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "آپ تدریس و تعلیم میں متقدمین سے گوئے سبقت لے گئے تھے"۔ ۲؎

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کس مسجد میں درس دیتے تھے۔

مولوی جان محمد لاہوری

مولوی جان محمد لاہوری عالم، فاضل اور بے نظیر واعظ تھے۔ علم کی ہر شاخ پر ان کی نظر تھی۔ بڑے متقی، پرہیزگار اور سنت کے سخت پابند تھے۔ بڑی مدت تک لاہور میں درس دیتے رہے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر آج ناپید ہیں۔ وعظ بڑا پُر تاثیر ہوتا تھا۔ جو آپ کے وعظ میں شریک ہوتا تائب ہو کر اٹھتا، ہزاروں بے نمازی آپ کی توجہ سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ آپ کے درس میں شریک ہونے والے اپنے وقت کے جلیل اور بابرکت بنے۔ علم اور عمل کے پیکر بن کر پنجاب کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔ ان میں مولوی محمد عالم کھوڑی، مولوی کرامت اللہ، مولانا غلام محمد ملتانی، مولانا فخر الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے گوشے گوشے میں علم کا نور پھیلایا۔ یہ کہنا واقعات کے خلاف نہ ہوگا کہ پنجاب کا کوئی ضلع ایسا نہ تھا جو مولوی جان محمد لاہوری کے فیض سے محروم رہا ہو۔ آپ کا درس کشمیری بازار میں مسجد نور ایمان والا میں برسوں قائم رہا۔ آپ کی تصانیف میں زبدۃ التفاسیر، رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہ، شرح قصیدہ بردہ، شرح قصیدہ امالی معراج نامہ، رسالہ حرمت تمباکو، رسالہ عدم فرضیت جمعہ وغیرہ مشہور ہیں۔

آپ ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) کو وفات پا گئے۔

مولوی غلام محی الدین بگوی

ضلع جہلم میں ایک گاؤں بگہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جس میں پشت ہا پشت سے حفاظ چلے آتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر صاحب تقویٰ و سجادہ ہوتے تھے۔ مولوی غلام محی الدین بگوی بھی اسی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد حافظ نور حیات آپ کے دادا حافظ محمد شفا اور پردادا حافظ نور محمد بگوی تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بھی حافظ قرآن تھے۔ مولوی غلام محی الدین سوموار ماہ محرم ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں پیدا ہوئے۔ حافظ حسن سے ناظرہ قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم حفظ کرنے کا واقعہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ صاحب حدائق الحنفیہ لکھتے ہیں:۔

"آپ نے تھوڑے عرصہ میں قرآن شریف ختم کر لیا تھا مگر حفظ نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ آپ بڑے خوش آواز تھے اس لیے جب رمضان آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد

۱؎ حدائق الحنفیہ ص۴۷۲ ۔ ۲؎ حدائق الحنفیہ ص۴۷۹

سے درخواست کی کہ اس رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہیئے۔ اس پر
آپ کے والد نے پوچھا کہ تم قرآن شریف سنا سکو گے۔ آپ نے کہا اگر آپ میرے
ساتھ ایک پارہ روز دَور کر لیا کریں تو میں سنا دوں گا۔ اس طرح سے آپ نے اسی
رمضان میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور سنا دیا۔ آپ سے پوچھا گیا کیا آپ تمام دن میں
یاد کیا کرتے تھے۔ فرمایا نہیں صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا۔"[1]

آپ نے علمائے پنجاب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ اپنے چھوٹے بھائی احمد دین کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھا۔ وہ آپ کی ذہانت سے متاثر ہو کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے حدیث کے بارے میں بہت سے سوالات کئے جن کا جواب آپ نے تسلّی بخش دیا۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور سندِ حدیث بھی بخشی۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو نصیحت کی کہ "وطن جا کر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پھیلے۔ جاؤ۔ لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوگا۔"

آپ لاہور واپس آئے اور برابر تیس برس تک لال مسجد میں درس دیتے رہے۔ آخر مرض استسقا میں مبتلا ہو کر بگہ واپس چلے گئے۔ چودہ برس تک بیمار رہے۔ اس حالت میں بھی درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ سوموار کی رات ۲۹ یا ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[2] آپ کے دو بیٹے تھے۔ دونوں نے علوم و فنون کی بڑی خدمت کی۔ ان میں مولوی غلام محمد لاہور کی شاہی مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتے تھے اور مولوی عبدالعزیز بھیرہ کی جامع مسجد میں خطیب تھے۔ دونوں باپ کے سچے جانشین تھے۔

مولوی احمد دین بگوی

آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ آپ اپنے بھائی سے تیرہ برس چھوٹے تھے اور آپ کی وفات بھی بھائی کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ آپ کی ولادت ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں ہوئی۔ آپ نے مطول اور شرح وقایہ تک اپنے بھائی مولوی غلام محی الدین سے پڑھا۔ پھر بھائی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں چودہ برس رہے اور مختلف علوم و فنون حاصل کئے۔ حدیث آپ نے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی سے پڑھی۔ اور انہی سے اجازت حاصل کی۔ آپ کی زندگی بڑے عجیب و غریب طریقے پر بسر ہوئی۔ یا تو آپ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے یا چلتے پھرتے صحت و بیماری میں طالبانِ علم کو سبق پڑھاتے۔ مروت کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ کا کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے اسے پلاتے اور جب تک وہ بیمار رہتا اس کی تیمار داری کرتے۔ آپ چھ مہینے بگہ میں درس دیتے اور چھ مہینے لاہور میں۔ درس میں آپ اپنے بھائی مولوی غلام محی الدین کے شریک رہے۔ ہزارہا عالم ان دونوں بھائیوں سے فیض یاب ہوئے۔ چونکہ آپ ہر وقت درس یا ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے اس لیے آپ نے بہت کم تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ جو اس وقت موجود ہیں وہ بھی آپ کی نظرِ ثانی سے محروم ہیں۔ حاشیہ خیالی اور حاشیہ شرح ملّا طبقۂ علما میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کا وصال ۱۲ شوال شنبہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) کو ہوا۔ آپ کا مزار بگہ میں ہے۔

---

[1] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۷ - ۴۷۸ - [2] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۳۷۰ - حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۷ -

مولوی غلام محمد بگوی

آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے فرزند اور جانشین تھے۔ باپ اور چچا کی طرح آپ نے بھی حضرت شاہ اسحٰق دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ قرآن و حدیث کے بہت بڑے فاضل اور لاہور کے سر برآوردہ علما میں شمار ہوتے تھے۔ کئی سال شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے۔ فتویٰ بھی چلتا تھا۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ "فتاویٰ صابریہ" کے نام سے انجمن سنت الجماعت نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۶ برس تک ان کے صاحبزادے مولوی محمد شفیع شاہی مسجد کے خطیب رہے۔[1]

حافظ ولی اللہ

پنجاب میں سکھ راج قائم ہو چکا تھا خطۂ کشمیر بھی سکھوں کے قبضہ میں آگیا تھا، کشمیر ان کے بے پایاں مظالم کے باعث تباہی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اکثر کشمیری خانوادے سکھ گردی سے تنگ آکر کشمیر چھوڑ رہے تھے۔ ان میں مولوی حافظ ولی اللہ کا گھرانا بھی تھا۔ ان کے والد نے مع عیال کشمیر کو خیرباد کہا اور پسرور کے راستے لاہور پہنچے۔ حافظ ولی اللہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا۔ تین چار بھائی اور بھی تھے مگر سب اَن پڑھ۔ ولی اللہ کو بچپن میں چیچک کا عارضہ لاحق ہوا اور ان کی بینائی زائل ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ ایک بھائی کے پاس رہنے لگے مگر بھاوج کا سلوک ناروا تھا۔ اس سے تنگ آکر گھر سے بھاگ نکلے اور سیدھے مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کے پاس پہنچے۔ ان کے درس میں شریک ہوئے۔ علم دین پڑھنا شروع کیا۔ ان کے ہم درس مشہور اہل حدیث مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اسی دوران مناظرے کا شوق پیدا ہوا۔ اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ قلعہ میہاں سنگھ سے آپ لاہور آئے اور مولوی نور احمد اور مولوی احمد دین بگوی کے درس میں بھی شریک رہے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے پھر کیا مجال کہ وہ ذہن سے نکل جائے۔ کتابوں کے صفحے اور سطریں تک یاد تھیں۔ کوئی ملنے والا سالہا سال کی غیر حاضری کے بعد ملتا تو اس کی آواز سے اسے پہچان لیتے۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی عیسائی پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کھلی چھٹی مل گئی۔ بڑے بڑے پادری لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے پنجاب چلے آئے۔ پولیس ہر جگہ ان کی حفاظت کرتی۔ ان پادریوں میں ڈاکٹر فورمین، فنڈر رز، پادری عماد الدین خاص شہرت اور خاص مقام کے مالک ہیں۔ حافظ ولی اللہ نے تحریری اور تقریری مناظروں میں ان سب کو شکست دی۔

آپ کے مشہور تلامذہ میں سے خان صاحب منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کے والد منشی محمد اسماعیل وکیل، میاں عبدالعزیز سابق صدر لاہور کارپوریشن کے والد مولوی الٰہی بخش، مولوی فتح محمد ہوشیارپوری، منشی عبدالکریم لاہوری اور مولوی اسماعیل پٹی والے تھے۔ آپ بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے شاگرد محمد اسماعیل کا ہوشیارپور میں مناظرہ ہوا جس میں پادریوں کو قدم قدم پر شکست ہوئی۔ ان پے در پے شکستوں سے تنگ آکر پادریوں نے مولوی صاحب موصوف کو جھوٹے مقدموں میں پھنسانے کی کوشش کی۔ شاگرد نے حافظ ولی اللہ کو اطلاع دی۔ آپ فی الفور ہوشیارپور پہنچے۔ وہاں کے رہنے والوں کو جب آپ کی آمد کا پتہ چلا تو انھوں نے آپ کا پُر جوش استقبال کیا۔ مولوی الٰہی بخش وکیل نے آپ کو اپنے ہاں

---

[1] تذکرہ مشائخ بگویہ صفحہ ۱۴۱ -

ٹھہرایا۔ آپ نے مقامی حضرات کو ساتھ لے کر شاگرد کے لیے کوشش شروع کی۔ آخر پادری فورمین نے مداخلت کی اور فریقین میں صلح صفائی ہوگئی۔

آپ کے معاصرین میں خلیفہ حمید الدین، مولوی نور احمد مسجد نیلہ گنبد والے، مولوی حافظ سعد الدین مسجد کمان گراں بازار حویلی میاں خاں المتوفی ۱۸۵۱ء، مولوی حسام الدین سخاوالے، مولوی غلام قادر بیگم شاہی مسجد والے، مولوی غلام محمد بگوی اور مولوی محمد دین آسمان علم و عرفان کے آفتاب و ماہتاب تھے مگر عوام میں جو اثر اور رسوخ آپ کو حاصل تھا وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ شرعی معاملات میں عوام اکثر آپ ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور آپ کے فتاویٰ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عربی زبان پر آپ کو اتنا عبور تھا کہ لاہور میں اگر کوئی عرب آتا تو آپ گھنٹوں اس سے عربی میں گفتگو کرتے۔ آپ صاحب اولاد تھے مگر آپ کے سارے لڑکے آپ کی حین حیات میں فوت ہوگئے۔

آپ نے ۸۵ برس کی عمر میں جمعہ ۲۴ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو مرض اسہال سے وفات پائی۔ مزار آپ کا فلیمنگ روڈ پر قلعہ گوجر سنگھ کے قریب ہے۔ آپ کے نام پر محلہ شاہ ولی اللہ بھی مشہور ہے۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ وفات یوں کہی ہے ؎

آں حافظ شیریں زباں واعظ خوش تر بیاں
شد سوئے آں بیت رواں زیں دار پر رنج و عنا
بود از جمادی اولیں تاریخ بست و چارمیں
پنہاں شدہ در زیر زمیں آں صاحب فہم و ذکا
سال پیٹے سالش ورق بگرفت دل گفتش بسوز
بنولیس جاں دادہ بحق حافظ ولی اللہ ولی

شروع شروع میں آپ نے مسجد وزیر خاں میں درس دینا شروع کیا تھا مگر جب آپ کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تو ڈپٹی برکت علی شاہجہاں پوری نے اس بات پر اصرار کیا کہ آپ شاہی مسجد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں اور وہیں درس دیا کریں۔ چنانچہ آپ نے ڈپٹی برکت علی کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے شاہی مسجد میں درس شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہیں درس دیتے رہے۔

مولوی حافظ غلام رسول چٹ محلیا

آپ بڑے مشہور اور امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ بابا حاجی نور محمد کھیا ہے۔ ان کا محل سفید رنگ کا تھا۔ اس واسطے لوگ آپ کو چٹ محلیا کہتے تھے۔ آپ اپنے وقت کے ملک التجار تھے۔ دولت گھر کی لونڈی تھی مگر آپ کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ حافظ قرآن ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ تجارت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ آپ محلہ پیر گیلانیاں کی مسجد میں عصر سے لے کر عشاء تک وعظ کہتے اور درس دیا کرتے تھے۔ بڑی لمبی عمر پا کر سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں فوت ہوئے۔

مولوی محمد دین فوقی

اسی خاندان سے ایک اور فاضل اجل بھی پیدا ہوئے۔ ان کا نام ابوالحسن محمد معروف بہ مولوی محمد دین فوقی تھا۔ آپ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر لاہور، کشمیر اور دیگر مقامات کے مشاہیر علماء سے استفادۂ علوم کیا۔ آپ کا وعظ بڑا پُر تاثیر ہوتا تھا۔ بڑی چھوٹی عمر میں آپ نے سندِ فضیلت حاصل کی۔ ابھی آپ بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ صاحب درس ہو گئے۔ آپ اپنی مشہور تصنیف روضۃ الابرار میں لکھتے ہیں :-

"مسجد گیلانیاں واقعہ بلدہ لاہور میں میں طلبہ کو درس دیتا تھا اور سلم العلوم جو علم منطق کی کتاب ہے پر طلبہ کے سامنے تقریر کر رہا تھا کہ میر عبدالقادر اندرابی معہ اپنے فرزند میر عبدالغنی اور اپنے برادر زادہ سید نورالدین کے موجود تھے۔ اسی وقت ایک خضر صورت مسجد میں آئے۔ میری تقریر سن کر بڑی مسرت ظاہر کی اور بزبانِ کشمیری میر اندرابی مرحوم سے کہا کہ اس لڑکے کی تقریر سے فضلائے کشمیر کی تقریروں کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ نوجوان انشاء اللہ روز بروز ترقی کرے گا۔" [1]

آپ نے بادشاہی مسجد میں بھی وعظ کیا جہاں لاہور کے نامی علماء اور رؤسا بھی موجود تھے۔ اسی جگہ آپ کا تعارف خان بہادر فقیر شمس الدین مرحوم سے ہوا جو آخری دم تک آپ کی قدر کرتے رہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کے ایماء پر آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے امتحانات پاس کئے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں آپ اورینٹل کالج میں استاد مقرر کیے گئے۔ آپ عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں روضۃ الابرار، روضۃ الادباء، تفسیر فتح العظیم و تبیان الصنائع، شرح محمدی، بستان محمدی، تاریخ کشمیر، رفیقی نامہ، رسالہ در علم منطق و فلسفہ و تاریخ، ایام الجاہلیہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اسلامی مدارس کا خاتمہ

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ اس سے پہلے سکھ یہاں حکمران تھے۔ ان کا دورِ حکومت خدا کا قہر تھا جو مسلمانوں پر نازل ہوا اور جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر نیند کے ماتے ایسے سوئے کہ انھیں خبر تک نہ ہوئی کہ ان کے مٹانے کے لیے کیا ہو رہا ہے۔ سکھوں کی چند روزہ حکومت میں اسلامی ثقافت، تمدن، معاشرت اور تہذیب کو ملیامیٹ کرنے، ان کے غیر فانی نقوش مٹانے اور ان کے علوم و فنون کو تباہ و برباد کرنے کی بے حد کوشش ہوئی مگر اس کے مٹانے والے خود مٹ گئے۔

چنانچہ ۱۸۵۶ء میں مسٹر آرنلڈ ڈائرکٹر سررشتۂ پنجاب نے سب سے پہلی تعلیمی رپورٹ مرتب کی اس میں اس نے لکھا :-

"معلمی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے مسلمان طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندو طالب علموں کو بھی مسلم اساتذہ پر بے حد اعتماد ہے۔ وہ اسلامی مدارس میں بڑی کثیر تعداد میں فارسی پڑھتے ہیں۔ اگر اس چیز کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو حکومت کی تمام طاقت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے گی۔

---

[1] روضۃ الابرار صفحہ ۴۴

یہ ایسا میلان ہے جسے بہت جلد روکنے کی ضرورت ہے ۔"

برطانوی حکومت نے مسٹر آرنلڈ کی نصیحت پر عمل کیا چنانچہ اس کے چار برس بعد ۱۸۵۶ء میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب و سرحد نے جب اپنی رپورٹ تیار کی تو اس میں لکھا :-

"مسلمان اساتذہ بکثرت ان درس گاہوں میں ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بالکل واضح ہے ۔ محکمہ میں تین سو چونتیس استاد مسلمان ہیں۔ گیارہ ہندو اور چھ دوسرے فرقوں کے لیکن اس نسبت کو مساوی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حلقہ انبالہ کے سوا دیسی زبانوں کی تعلیم ہر جگہ مسلم اساتذہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک یہ استاد ہر دلعزیز ہیں ہم ان کی جگہ دوسری قوموں کے استاد مقرر نہیں کر سکتے البتہ افسرانِ ضلع رفتہ رفتہ راستہ صاف کر کے تبدیلی کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں اور وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ٹریننگ سکول میں جانے کا شوق دلائیں اور جو سکول مسلم استادوں کے تقرر پر زیادہ اصرار نہ کریں وہاں ہندو استاد متعین کئے جائیں ۔"

کپتان فلر کی تجاویز پر فوراً ہی عمل درآمد شروع ہو گیا مسلمان اساتذہ کی تعداد ہر طرح سے گھٹانے کی تجویزیں ہونے لگیں اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے شہروں اور صدر مقامات پر انگریزی مدارس بھی قائم کئے گئے جن کا سارا انتظام اور کام غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ بعد یہ معلوم ہوا کہ نئے جاری شدہ اسکولوں کے پچیس ہیڈ ماسٹروں میں کل تین مسلمان ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ واقعات و حالات میں تغیر اور انقلاب پیدا ہوا۔ پچیس سال کے عرصے میں ہوا کا رُخ بالکل بدل گیا۔ مسلمان اس میدان سے زبردستی نکال دیئے گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء کے بعد کی رپورٹوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پورے طور پر سامنے آجاتی ہے کہ محکمہ تعلیم مسلمانوں سے یکسر خالی ہو گیا۔ اور اگر کہیں خال خال مسلم اساتذہ نظر آتے تھے تو وہ صوبہ سرحد تھا جو ان ایام میں سررشتہ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھا اور ہندو اور غیر مسلم استاد وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ دوسرا رُخ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ یہ عیسائی قوم کی اسلام پر یورش تھی چنانچہ اُنیسویں صدی کے ربع اوّل میں ایک مدبر نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اسلام کی جلالت و جبروت کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے اور وہ زمانہ دُور نہیں جب چاروں طرف مسیحیت کا غلبہ ہوگا۔

انجمن حمایت اسلام کا قیام

عیسائیوں نے جا بجا مشن اسکول جاری کیے، ہسپتال بنائے اور برطانیہ کی سنگینوں کے سائے میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ مدرسوں میں انجیل کی تعلیم لازمی قرار دی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۴ء میں ایک توحید زادی تثلیث کی آغوش میں کھینچ لی گئی۔ یہ اس وقت کے مسلمانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ ان میں ہل چل پیدا ہوئی۔ حساس طبیعتوں میں جوش حمیت طوفان بن کر اُٹھا۔ عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے مدافعانہ اقدام کی ضرورت محسوس کی گئی اور انجمن حمایت اسلام وجود میں آئی۔ ابتدا میں اس انجمن کا دائرہ کار تبلیغ اسلام تک محدود تھا مگر اس نے عملی قدم اُٹھا کر عیسائیت کے اس چیلنج کا منہ توڑ جواب دیا۔

مدرسۂ حمیدیہ

انجمن نے تمام بڑے بڑے عالموں کو اپنے گرد جمع کیا اور ان کی مدد سے زنانہ و مردانہ اسلامی مدارس کے علاوہ ایک خالص دینی درس گاہ کی بنیاد بھی رکھی ۔ یہ مدرسہ حمیدیہ تھا جو لاہور کے ایک بہت بڑے عالم اور مفتی قاضی حمید الدین کے نام پر قائم ہوا ۔ قاضی حمید الدین انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں سے تھے خلیفہ شجاع الدین مرحوم انہی کے پوتے تھے۔ یہ مدرسہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک بڑی آب و تاب سے کام کرتا رہا ۔ بعد میں ناسازگار حالات کی بنا پر بند ہو گیا ۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں قاضی حمید الدین کے علاوہ مولانا غلام اللہ قصوری ، مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی ، علامہ اصغر علی روحی ، حکیم غلام مصطفےٰ اور مولانا محمد ذاکر بگوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

انجمن نعمانیہ

انجمن کے دوش بدوش ایک اور انجمن قائم ہوئی جو اب تک موجود ہے ۔ یہ انجمن نعمانیہ ہے ۔ اس درسگاہ نے ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں جنم لیا ۔ اس کے بانیوں میں مولوی خلیفہ تاج الدین ، علامہ حکیم سلیم اللہ ، حافظ عمر الدین ، ڈپٹی غلام حسین ، مولوی محرم علی چشتی ، منشی سراج الدین (جو بعد میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) تھے یہ انجمن خالص مذہبی تعلیم کے لیے عالم وجود میں آئی ۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے حالانکہ ایسے بیسیوں مواقع پیدا ہوئے ۔ اس انجمن نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ اپنی درس گاہ کے لیے بہترین اساتذہ مہیا کرے جو راسخ العقیدہ حنفی ہوں ۔ اس مقصد کے لیے اس نے تمام ہند و پاکستان کی وسعتوں سے جہاں بھی کوئی قابل ، لائق ، نیک دل عالم ملا ، اس کی خدمات ہر قیمت پر حاصل کیں ، انجمن کا دوسرا پہلو جو خاص طور پر قابل ذکر ہے ، وہ یہ ہے کہ وہ طلبہ کے طعام و قیام اور دیگر ضروریات کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے ۔ اس کے قبضے میں ایک عدیم النظیر کتب خانہ بھی ہے جسے کئی بار بعض بے دردوں نے لوٹا اور چوری پر پردہ ڈالنے کے لیے آگ بھی لگائی اس دست برد کے باوجود کسی اور دینی مدرسے کے پاس اتنا اچھا کتب خانہ نہیں ۔ البتہ اسے از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے ۔

مدرسہ نعمانیہ کے اساتذہ میں بعض بڑی نامور ہستیاں ہوئی ہیں جن میں شیخ الحدیث علامہ مفتی معین الدین اجمیری ، سید محمد دیدار علی شاہ ، مولانا عبد الحق سہارنپوری ، مفتی محب النبی ، مفتی محمد عبید اللہ ٹونکی ، مولانا غلام مرشد اور قاضی سراج احمد ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ یہاں کے فارغ التحصیل حضرات میں سید حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری ، سید مہر علی شاہ گولڑوی ، مفتی محمد شریف محدث کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ) ، پروفیسر سید محمد طلحہ ٹونکی ، مولانا نور الحق (پروفیسر اورینٹل کالج) نے بڑی شہرت پائی ہے اور تمام عمر دین کی خدمت کرتے رہے ۔ اب یہ مدرسہ کچھ ایسی قابل اطمینان حالت میں نہیں ۔

ان کے علاوہ اچھرہ میں حاجی قمر الدین مرحوم کا درس ، دہلی دروازہ میں حزب الاحناف کا دار العلوم ، شیرانوالہ دروازہ میں انجمن خدام الدین کا مدرسہ قاسم العلوم ، اہل حدیث کا جامعہ سلفیہ ، فیروز پور روڈ پر مفتی محمد حسن مرحوم کا جامعہ اشرفیہ ، مزنگ میں مدرسہ عزیزیہ اور جامع حنفیہ ، گڑھی شاہو میں جامعہ نعیمیہ اور دیگر چھوٹے چھوٹے مدرسے قدیم علوم و فنون کی اشاعت میں مصروف ہیں ۔

مساجد

[عہدِ غزنوی سے زمانۂ حال تک]

محمد عبداللہ قریشی

لاہور بہت پرانا شہر ہے۔ یہ دریائے راوی کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس کے نام کو دہلی کے راجہ دیپ چند کے بھتیجے لوہر چند یا راجہ رام چندر جی کے بیٹے لوہ یا لاو سے نسبت دے کر لوہر لپہ، لوہور، لہور، لہاوور، لہنور، لہانور وغیرہ بتلاتے ہیں مگر مسلمان جغرافیہ دان کی تصنیف "حدود العالم" سے پہلے ہندو ادب کی کسی کتاب میں، خواہ وہ افسانوی ہو یا مذہبی، اس کا ذکر تفصیل سے نہیں ملتا۔ یہ کتاب ۳۷۲ھ/۹۸۲ء کی تصنیف ہے اور فارسی میں ہے۔ اس وقت لاہور کا علاقہ ملتان کے قریشی حاکم کے ماتحت تھا مگر لاہور میں مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ موجود نہ تھی کیونکہ تمام باشندے بت پرست تھے۔ البتہ کھجور، بادام اور ناریل کے درخت یہاں بکثرت پائے جاتے تھے[1]

سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء میں شمالی ہند کا علاقہ فتح کیا۔ اس میں لاہور بھی شامل تھا۔ اس فتح کی یادگار میں اس نے قلعہ میں ایک مینار تعمیر کیا اور شہر میں ایک مسجد بنوائی جسے "خشتی مسجد" کہتے ہیں[2]۔ یہ پہلی اسلامی عمارت تھی جو لاہور میں قائم ہوئی لیکن آج اس کے کوئی آثار موجود نہیں۔ البتہ لاہور میں محمود کے پہلے باقاعدہ گورنر ملک ایاز کی قبر اب بھی رنگ محل کے چوک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ ۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء میں فوت ہو کر یہاں دفن ہوا۔ اس کی قبر کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جس میں چند نمازی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

غزنوی بادشاہوں نے لاہور کا نام ہی محمود پور رکھ دیا تھا۔ شالامار باغ کے قریب محمود بوٹی گاؤں بھی شاید اسی زمانے کی یادگار ہو ــــ شیخ احمد زنجانی نے رسالہ تحفۃ الواصلین ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں بعہد سلطان مسعود غزنوی لاہور میں بیٹھ کر لکھا۔ اس میں شہر کے علماء و فضلاء کے حالات مل جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں آگے پیچھے سید اسمٰعیل غزنوی، شاہ حسین زنجانی، حضرت علی ہجویری اور شاہ یعقوب زنجانی صدر دیوان

---

[1] ڈاکٹر محمد باقر - DIGGING LAHORE TO DISCOVER ITS PAST

لاہور تشریف لائے اور انھوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔

سید اسمٰعیل غزنوی ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں فوت ہوئے اور ہال روڈ پر ان کا مزار ہے۔[1] آپ لاہور کے پہلے واعظ تھے جو ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں بخارا سے لاہور آئے۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ کی مجالس وعظ میں مخلوق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں آپ کے وعظ سن سن کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے[1]۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس مسجد میں وعظ فرماتے تھے۔ اور ان کی تبلیغ کا مرکز کونسا تھا۔ غالباً یہی علاقہ ہوگا جس جگہ آپ کا مزار واقع ہے۔

شاہ حسین زنجانی مصری شاہ سے آگے اونچی ٹبکری پر ایک خانقاہ میں آسودۂ خواب ہیں۔ ان کی خانقاہ کے ساتھ بھی ایک مسجد اور کنواں ہے جس سے ارد گرد کا تمام علاقہ چاہ میراں (میراں دی کھوئی) کہلاتا ہے۔ مسجد کی حال ہی میں توسیع ہوئی ہے۔

سید علی ہجویری ۴۶۵ھ/۱۰۷۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کا پُر رونق مزار "دربار داتا گنج بخش"[2] کہلاتا ہے۔ اس مزار کے ساتھ بھی ایک مسجد ہے جسے ابتدا میں حضرت نے خود تعمیر کرایا تھا۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ "جو مسجد آپ نے تعمیر کرائی، اس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت تھوڑے جنوب کی طرف مائل تھی۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا کہ قبلہ صحیح نہیں۔ آپ نے علما کو دعوت دی اور خود امام بن کر نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اب دیکھو کعبہ کس سمت ہے؟ تمام حجابات درمیان سے اٹھ گئے اور کعبہ سامنے نظر آنے لگا۔ قبلہ کو اپنے سامنے بالمشافہ موجود پاکر تمام علما معذرت خواہ ہوئے اور اس کرامت کی بدولت آپ کی شہرت نزدیک و دور سب جگہ پھیل گئی۔

اس قدیم مسجد کی پہلے گلزار شاہ سادھو (کشمیری) کے حسنِ سعی سے مرمت نصیب ہوئی۔ پھر جھنڈا چوب فروش نے اس کی مرمت کرائی۔ اب ہمارے عہد کے رئیس میاں غلام رسول کھڈ والا نے ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں اس کی توسیع کرکے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اب یہ مسجد بہت شاندار ہے۔ اس وقت مسجد کے صحن کا رقبہ دو ہزار آٹھ سو سولہ مربع فٹ اور مسجد کے دالان کا دو ہزار مربع فٹ ہے۔ صحن کے ایک کونے میں وضو کے لیے حوض بھی ہے۔ اوقاف کمیٹی نے مزار کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد مسجد کی مزید توسیع کا منصوبہ بنایا ہے۔ مسجد کے دروازے پر علامہ اقبال کا کہا ہوا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

سال بنائے حرم مومناں　　　خواہ ز جبریل و ز ہاتف مجو

چشم بہ المسجد الاقصیٰ (۴۰) فگن　ھ　الذی بارکنا (۱۳) ہم بگو

شاہ یعقوب زنجانی صدر دیوان کا انتقال ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں ہوا۔ ان کا مزار میو ہسپتال کے پاس رتن چند کی سرائے کے مغرب میں واقع ہے۔ مزار کے ساتھ ایک قدیم مسجد بھی ہے۔ پہلے یہاں تین گنبدوں والی مسجد تھی جو شکستہ ہو جانے کی وجہ سے اب نئی بنا دی گئی ہے۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۳

میکلوڈ روڈ سے ذرا ہٹ کر حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی[۲] کے احاطے میں بھی مزار کی مغربی سمت ایک چھوٹی سی پرانی مسجد موجود ہے جو سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں شیخ عبدالجلیلؒ نے خود اپنی حینِ حیات میں بنوائی تھی۔ عمارت پہلے گنبددار تھی۔ اب معمولی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی مرمت ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی اور مسجد کی شرقی دیوار پر یہ کتبہ نصب کرایا :-

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ [۱]

مسجد جلیلہ

تعمیر اول قبل ۹۱۰ھ از حضرت عبدالجلیلؒ

تعمیر ثانی در ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء

تجدید فرش وغیرہ در ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء

ابوالافضل نامی متولی اوقاف اشرف

بی بی پاک دامناں کا قبرستان جو ایمپرس روڈ اور میو روڈ کے درمیان واقع ہے لاہور کا سب سے قدیم قبرستان ہے۔ اس کی قدیم عمارات میں سے ایک مسجد اب بھی موجود ہے جو مغل عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور آج سے ایک صدی پیشتر میاں نور اہی والا نے اس کی مرمت کرائی تھی۔

کوٹ خواجہ سعید میں گنبد شہزادہ پرویز اور مزار احمد علی کے درمیان ایک بلند ٹیلے پر قبروں میں گھری ایک پرانی سی محراب نظر آتی ہے جسے سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور (صفحہ ۱۶۱) میں حجرہ میر چھدی لکھا ہے۔ اس میں آدمی کھڑا ہو کر بآسانی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اس پر نہایت اعلیٰ رنگ کاری اور نقاشی کی ہوئی ہے۔ محراب کی پیشانی پر ابھرے ہوئے حروف میں لکھا ہے :-

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد بعدد من قعد وقام

اور اسی طرح محراب کے دونوں کونوں میں سورج مکھی پھول کے درمیان کلمہ طیبہ یوں کندہ ہے :-

لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ یہ کتبے خط طغرا میں ہیں جو مغلوں سے پہلے یہاں رائج تھا۔ اس لحاظ سے یہ محراب کسی ایسی عید گاہ کی ہے جس کی ساخت عہد سادات دلی کی عمارات سے ملتی جلتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء میں جب سید مبارک شاہ نے یہاں آکر لاہور کو از سر نو آباد کیا تو یہ عمارت اس نے بنوائی ہو[۲] مگر محکمہ آثار قدیمہ کے

---

[۱] تاریخ جلیلہ۔

[۲] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی " لاہور کی چھ سو سال پرانی عید گاہ " مطبوعہ پاکستان ٹائمز لاہور۔

سپرنٹنڈنٹ محمد ولی اللہ خان اپنی تحقیقات[1] میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محراب مغلوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس پر جو کلمہ اور درود لکھا ہے وہ خطِ طغرا میں نہیں بلکہ نسخ میں ہے جو سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں مقبول ہوا۔ پھر اس پر جو مسالہ استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت معمولی قسم کا ہے جو اس دور کی شاہی عمارات میں نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں یہ محراب نہ کسی مسجد کی ہے نہ عیدگاہ کی بلکہ اکبری دور کی جنازگاہ کی ہے بہرحال کچھ بھی ہو اور کسی عہد کی ہو عمارت اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔

ایسی ہی ایک شکستہ محراب جس پر کاشی کے رنگین نقش و نگار کیے ہوئے ہیں، قبرستان میانی صاحب کی جنازگاہ کے قبروں کے درمیان سوگوار کھڑی ہے۔ یہ شاہجہانی عہد کی کسی عیدگاہ یا جنازگاہ کی نشانی معلوم ہوتی ہے مگر اب اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اور اس کے نقش و نگار پر چونے کا پلستر کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے مختلف گوشوں میں اور بھی کئی عیدگاہیں تھیں جو اب مٹ چکی ہیں یا بے توجہی کا شکار ہو گئی ہیں۔

مقصدِ بیان یہ ہے کہ لاہور میں بادشاہوں، بیگموں، رئیسوں، امیروں اور اہلِ ثروت لوگوں سے لے کر بے نوا فقیروں تک نے مسجدیں تعمیر کرائی ہیں۔ تقریباً تمام خانقاہوں، قبرستانوں اور تکیوں کے ساتھ مسجدیں ہیں اور بعض بزرگ تو مسجدوں کے گوشے آباد کیے پڑے ہیں تاکہ کوئی نمازی نماز پڑھنے آئے تو ان کی قبروں پر فاتحہ بھی پڑھ جائے۔ یہ تمام مسجدیں فنِ تعمیرات کے مختلف نمونے پیش کرتی ہیں اور ان سے بنانے والوں کے ذوق، ظرف، جذبات اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں چھوٹی سے چھوٹی بھی ہیں اور بڑی سے بڑی بھی۔ کئی مسجدیں زمین کی سطح سے بلند ہیں اور کئی نیچی، شان و شکوہ والی بھی ہیں اور غریبانہ بھی جو زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ؎

غریب خانہ کے دیکھو تکلفات آ کر
کہ فرش خاک بھی ہے اس پہ بوریا بھی ہے

پھر اس کارِ خیر میں مردوں ہی نے نہیں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے اور بڑی نادر یادگاریں چھوڑ کر دین و مذہب سے اپنی شیفتگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسجدیں دیووں اور جِنوں کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں اور بعض پریوں کے شاہکار۔ بعض مساجد سے اسلام کی قوت و سطوت کا اظہار ہوتا ہے تو بعض سے مسلمانوں کی دولت و ثروت کا۔ بعض نقاشی، مصوری اور خطاطی کے لیے مشہور ہیں تو بعض فنِ تعمیر کی خوبیوں اور سنگ تراشی کے لیے۔ ؏

ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است

اب بعض مسجدیں تو انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکی ہیں مگر بعض صدیوں سے حوادث کے تھپیڑے کھا رہی ہیں اور تاریخ کے اوراق ان کا نام کبھی نہ مٹا سکیں گے۔

اس طرح لاہور کے ہر گلی، کوچے، بازار، دفتر، باغ و راغ اور بستی میں کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے اور آئے دن ان میں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے پاکستان ٹائمز لاہور بابت ۲۹ اگست ۱۹۵۵ء و ۲۳ فروری ۱۹۵۶ء۔

اضافہ ہوتا رہتا ہے تقسیم ملک سے پہلے جب ہندو اور سکھ یہاں ملی جلی آبادیوں میں رہتے تھے تو ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ مسلمانوں کے بہت سے مکان ہندو ساہوکاروں کے پاس قرضے میں چلے گئے تھے اور بعض محلوں سے تو مسلمانوں کا بالکل اخراج ہو گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی مسجدیں بھی غیر آباد ہو گئی تھیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں رہا تھا۔ ہندو جہاں بوجہ کثرت کے بستے ہوتے تھے وہ محلات ایسے تھے کہ کوئی مسلمان ان کے محلوں میں جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے یہاں سے جانے اور مسلمان مہاجرین کے یہاں آنے کے بعد وہ تمام مسجدیں پھر سے آباد ہو گئیں بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ناکافی سمجھی گئیں اور ضرورت کے مطابق کئی جگہ چھوٹی بڑی نئی مساجد تعمیر ہو گئیں۔ چند قدیم و جدید مساجد کا حال آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے:

نیویں مسجد

یہ عجیب و غریب مسجد لوہاری اور شاہ عالمی دروازہ کے درمیان چوک متی کے نزدیک کوچہ ڈوگراں میں واقع ہے۔ مسجد کی عمارت بہت پرانی ہے۔ مسجد کا صحن، چاہ، غسل خانہ و حجرہ وغیرہ سطح زمین سے منزل دو منزل نیچے ہیں۔ یہ مسجد ذوالفقار خاں نام ایک امیر نے بنوائی تھی جو لودی سلطنت کا اہلکار اور حبیب خاں صوبہ لاہور کے دربار میں سر دفتر تھا۔ چونکہ اونچی کرسی والی مسجدیں شہر میں بہت تھیں۔ اس نے یہ عجیب بات پیدا کی کہ مسجد کی زمین کو پہلے بقدر ایک منزل کے کھدوایا پھر اس پر عمارت کھڑی کی۔ اس مسجد کا پانی باہر کہیں نہیں جاتا عزقیوں کے ذریعے نیچے غرق ہو جاتا ہے۔ لوگ زینہ اتر کر مسجد میں جاتے ہیں۔ اس مسجد کی تین محرابیں ہیں اور تینوں گنبد نہایت پختہ بنے ہیں۔ مسجد اب تک آباد ہے اور اہل محلہ کی خبر گیری سے اچھی حالت میں ہے۔

مسجد نیلہ گنبد

چوک نیلہ گنبد انارکلی بازار میں جو بلند گنبد نظر آتا ہے وہ اپنے نیلے رنگ کی وجہ سے "نیلہ گنبد" کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک وسیع مقبرہ ہے جس میں سات قبریں ہیں کسی قبر پر نام درج نہیں۔ سب سے قدیم قبر ایک بزرگ شیخ عبدالرزاق مکی کی ہے جو ہمایوں کے عہد میں لاہور آئے اور یہیں فوت ہوئے۔ مقبرہ کی جگہ ان کی خانقاہ تھی جہاں بیٹھ کر وہ یاد الٰہی میں مصروف رہا کرتے اور لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔

آپ کے ارادت مندوں نے آپ کی قبر پر نہ صرف یہ گنبد تعمیر کرایا بلکہ ایک دلکشا باغ اور وسیع مسجد بھی تعمیر کرائی سکھوں کے عہد میں باغ تو برباد ہو گیا لیکن مقبرہ میں بارود کا ذخیرہ رکھا گیا اور مسجد کے حجروں سے توپ خانہ کے کوارٹروں کا کام لیا جانے لگا۔ مسجد کے ساتھ لوہاروں کے لیے چند مکان بنائے گئے جہاں وہ بندوق سازی کیا کرتے تھے۔

۱۸۴۹ء کے بعد انگریزوں نے مسجد اور مقبرہ کو صاف کر کے فوجی ہوٹل یعنی مسکوٹ بنا لیا۔ جہاں چھاؤنی انارکلی کے گورے کھانا کھایا کرتے تھے۔

جب چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہو گئی تو منشی نجم الدین ٹھیکیدار ڈبل روٹی نے درخواست دے کر مسجد کو واگزار کرایا

اور اس کی مرمت کی۔ اب سے نصف صدی پیشتر شیخ محمد نقی مرحوم رئیس لاہور کی توجہ سے یہاں "مدرسہ رحیمیہ" جاری ہوا جس میں حدیث، فقہ، تفسیر، منطق اور فلسفہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس مدرسے کے پہلے صدر المدرس مولوی عبدالعزیز تھے، جو سنانواں ضلع مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ وہ دیوبند کے فاضل اور مولانا محمود الحسن اور مولانا انور شاہ مرحوم کے شاگردوں میں سے تھے۔ موجودہ خطیب مولانا گل محمد سے پہلے ان کے والد اس مسجد کے خطیب و امام تھے۔

اس مسجد کے ساتھ بہت سی دکانیں ہیں جن کا کرایہ اس کے مصارف کا کفیل ہے۔ آج کل یہ مسجد محکمہ اوقاف کے قبضے میں ہے۔

موتی مسجد

اکبر خود تو مذہبی رسوم کا زیادہ پابند نہ تھا۔ اس کے اکثر اہلِ غرض درباری بھی اس کے مریدانِ خاص میں شامل تھے، لیکن پھر بھی بعض ایسی نیک ہستیاں موجود تھیں جو خداوند مجازی کی فرماں برداری کے ساتھ خداوندِ حقیقی کی اطاعت کا دم بھرتی تھیں۔ انہی لوگوں کے لیے بادشاہ نے ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء میں قلعہ کے دیوانِ عام کے سامنے چبوترے پر ایک مختصر سی مسجد بنوائی۔[1] درباریوں میں حکیم مصری بڑے خوش مزاج، ظریف طبع، طب میں ماہر اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں فرد وحید تھے۔ یہ فیضی سفارت دکن سے واپسی پر انھیں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ انھوں نے تعمیر مسجد پر دو شعر کہے جن کے مختصر سے ترکش میں دوسرا شعر تیرو نشتر چبھو رہا ہے ؎

شاہ کرد مسجدے بنیاد
ایہا المومنون مبارک باد
وندریں نیز مصلحت دارد
تا نمازاں گذار بشمارد

جہانگیر نے اپنے بارھویں سن جلوس میں بیگمات اور حرم کی خواتین کے لیے اس میں مناسب ترمیم کرائی۔ یہ کام اس کے میر عمارت عبدالکریم نے انجام دیا جس کا خطاب معمور خاں تھا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں شاہجہان نے اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے سنگِ مرمر کا لباس پہنایا اور اس کا نام موتی مسجد رکھا۔ اس مسجد کے صحن کا طول پچاس فٹ اور عرض ۳۴ فٹ ہے۔

قلعہ لاہور کی موتی مسجد فن تعمیر کا ایک دل پذیر نمونہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنگ مرمر کے پہاڑ سے کنول کا پھول تراشا گیا ہے جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتیں اور قلب کو تسکین میسّر آتی ہے۔ آگرہ[2] اور دہلی[3] کے قلعوں کی مسجدوں سے خوبصورتی

---

[1] دربار اکبری مولانا آزاد ص ۶۱۔

[2-3] آگرہ کی موتی مسجد ۱۶۵۴ء میں شاہجہان نے اور دہلی کی ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب نے بنوائی تھی۔

اور دلکشی میں یہ مسجد کسی طرح کم نہیں۔

رنجیت سنگھ نے موتی مسجد کا نام بدل کر موتی مندر رکھ دیا۔ بعد میں اس مسجد سے خزانے کا کام لیا جانے لگا اور اس کے گرد دیوار بنادی گئی۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ اس بڑے قفل سے جو دروازے پر ڈالا جاتا تھا، خاصا گڑھا پڑ گیا جو آج بھی نظر آتا ہے۔ بالآخر ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن نے اس مسجد کو بحال کرا دیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء تک یہ مسجد صرف نمائشی رہی۔ قیام پاکستان کے بعد سے یہ آزاد ہے اور اس میں نماز ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب سے دو سو سال قبل اس میں قلعہ کی شاہی مخلوق نماز پڑھتی تھی۔ اب قلعہ کے اندر رہنے والے عام آدمی اور محلے کے لوگ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

بیگم شاہی مسجد

قدیم شاہی عمارات میں ایک عالی شان مسجد مستی دروازے کے متصل قلعہ لاہور کے شرق میں واقع ہے عمارت اس کی نہایت پختہ ہے۔ یہ شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کی ماں مریم زمانی نے بنوائی تھی۔ اس کے شمالی دروازے پر مندرجہ ذیل قطعہ ثبت ہے ؎

منّت ایزد کہ آخر گشت کار از ابتدائی

ہم بتوفیق خدا و حکم صاحب مسندی

حضرت مریم زمانی بانئ ہذا المکان

کز عنایات الٰہی ساختہ جائے ہدیٰ

از پئے تاریخ ختم ایں بنائے چوں بہشت

فکر می کردم کہ آخر یافتم "خوش مسجدی"

"خوش مسجدی" سے اس کی تاریخ تعمیر ۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء[1] نکلتی ہے۔ مسجد کے مشرقی دروازے پر یہ شعر کندہ ہے ؎

شاہ عالمگیر نورالدین محمد بادشاہ

باد یارب در جہاں روشن چو نور مہر و ماہ

تمام عمارت خالبوتی ہے جس میں لکڑی استعمال نہیں کی گئی۔ حجرے صاف اور ہوادار ہیں۔ صحن کے عین وسط میں ایک مربع حوض ہے جہاں نمازی وضو کرتے ہیں۔ عمارت کی وضع قطع میں ہندو مسلم فن تعمیر کی آمیزش نظر آتی ہے۔

جب مسلمانوں کی حکومت لاہور سے جاتی رہی اور سکھ گردی شروع ہو گئی تو یہ مسجد بے آباد ہو گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اس مسجد پر سرکاری تسلط ہو گیا اور بارود بھر دی گئی جس سے یہ "بارود خانے والی مسجد" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ انگریزی عملداری میں بارود دریا میں پھینکوا کر مسجد خالی کر دی گئی اور داروغہ نزول قاضی فقیہ الدین نے اس کو درج رجسٹر نزول کر لیا۔ مگر میجر میکر یگر ڈپٹی کمشنر لاہور نے ۱۸۵۶ء میں مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی۔ ایک بیٹھک اور دکانیں جو متعلق مسجد تھیں وہ بھی واگذار کر دیں۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور اس کے ایک کونے میں مولوی غلام قادر بھیروی[1] اور بعض دوسرے لوگوں کی قبریں بھی ہیں

[1] تاریخ وصال ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۸ء)۔

جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اس مسجد کی خدمت کی ہے۔

اُونچی مسجد

یہ عالی شان مسجد بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں واقع ہے اس کی کرسی اُونچی ہے اس لیے یہ اونچی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کی عمارت پرانی ہے۔ محرابوں پر قرآن مجید کی آیات کے علاوہ ایک کتبہ نصب ہے جس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ اکبر کے ابتدائی عہد میں تعمیر ہوئی۔ شاہی عمارات کی طرح اس کی چھت پر کوئی باقاعدہ گنبد نہیں۔ نہ کوئی اور نشان ہی ایسا ہے جس سے اس کے بانی کا نام اور سنہ تعمیر معلوم ہو سکے۔ البتہ مقامی روایات یہ ہیں کہ یہ اس زمانے کے کسی سفیر (دماشکی) نے بنوائی تھی۔

مسجد اب تک آباد ہے۔ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء میں اس کی مرمت ہوئی تھی اور دروازہ نیا لگا تھا۔ آج کل اس کا انتظام اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔

مسجد یکی دروازہ

یہ مسجد پولیس ہسپتال یکی دروازہ کے قریب حویلی غوث[1] کے سامنے، باغ کو جانے والے راستے پر واقع ہے اور سید نجف علی خاں صوبہ لاہور کے خزانچی نے اکبر بادشاہ کے عہد میں تعمیر کی تھی۔ مسجد کا اندرونی حصہ محلے کی عام سطح سے کسی قدر پست ہو گیا ہے۔ صحن بھرتی ڈال کر اونچا کر دیا گیا ہے۔ اصل عمارت خشتی رنگی ہے۔ اس پر چونہ کی استرکاری ہوئی ہے۔ گنبد نہایت مفلوج بنے ہوئے ہیں۔ صحن مسجد کے جنوب کی طرف پرانے دفن کی دو قبریں چار دیواری کے اندر بنی ہوئی ہیں۔

مسجد امیر خاں

یہ مسجد ریلوے اسٹیشن سے میانمیر کو جاتے ہوئے علامہ اقبال روڈ پر شیخاں والا مقبرہ کے جنوب میں واقع ہے اور محمد نگر کی آبادی میں آگئی ہے۔ اسے امیر خاں نے بنوایا تھا جو اکبر کے زمانے میں ایک امیر تھا۔ امیر خاں کی اپنی قبر بھی اسی مسجد کے احاطے میں ہے[2]۔ اس کا ایک گنبد بڑا اور دو چھوٹے تھے۔ صحن وسیع ہے۔ شاہو کی گڑھی کے لوگ اسے عیدگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ آج کل اس میں دینی مدرسہ قائم ہے جسے جامعہ نعیمیہ کہتے ہیں۔ جامعہ کے کارپردازوں نے مسجد میں بہت سے نئے کمرے بنوائے ہیں اور اس کی ہیئت میں بھی خاصی تبدیلی کر دی ہے۔

---

[1] یہ حویلی ایک صدی پیشتر منشی ہرسکھ رائے کے قبضے میں تھی جو اُردو کے سب سے پہلے ہفتہ وار اخبار کوہ نور کے مالک تھے۔

[2] لطیف۔ لاہور ص ۱۷۰

عیدگاہ جہانگیری

جہانگیر نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک عظیم الشان مسجد شاہی الخفیہ خواجہ ایاز کی معرفت لاہور میں بنوائی تھی جس سے بعد میں عیدگاہ کا کام لیا جانے لگا۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ اس کے شمال، جنوب اور مغرب میں تین طرف بازار تھے جو نزپولیہ کہلاتے تھے۔ ہر بازار میں ستر دکانیں اور بالاخانے تھے جن کا کرایہ مسجد کے اخراجات کے لیے وقف تھا۔ عمارات کی تعمیر پر بیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا جو شاہی مسجد لاہور کی لاگت سے تین گنا ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تھا جس کے آثار انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت تک نہایت خستہ حالت میں موجود تھے۔ یہ عمارت لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب شالامار باغ کو جانے والی سڑک کے دائیں طرف واقع تھی۔ تحقیقاتِ چشتی کے فاضل مصنف مولوی نور احمد چشتی نے اس عمارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

"عین درمیان میں بہت بڑا گنبد ہے جو خشت و آہک سے تعمیر ہوا ہے۔ اس کا رنگ قدرے سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو دو مقابلتہً چھوٹے گنبد ہیں۔ چاروں گوشوں پر چار ہشت پہلو مینار ہیں اور ان کے اوپر مدور گنبدیاں ہیں۔ مسجد کے شرق کی طرف آٹھ محرابی دروازے ہیں۔ درمیانی محراب بہت بڑی ہے۔ اس کی بغلوں میں تین تین در محرابی اگرچہ بہت بڑے ہیں مگر درمیانی سے قدرے کم ہیں۔ اس کے علاوہ شمال جنوب میں ایک اور بلند محرابی دروازہ ہے۔ ان کے اطراف میں اوپر جانے کے لیے زینے ہیں۔ درمیانی بلند دروازے کے اوپر دو گنبدیاں چار چار دروازوں والی ہیں جن میں سے شمالی گنبدی تو موجود ہے مگر جنوبی مسمار ہو چکی ہے۔ مسجد کے اندر تین محراب ہیں جو سیڑھیاں دونوں اطراف سے اوپر جاتی ہیں ان کی تعداد تیس ہے۔ مینار ہشت پہلو ہیں اوپر جانے کے لیے ان میں بائیس زینے ہیں۔ اوپر دو درجے ہیں اوپر کا درجہ ہشت پہلو ہے۔ اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ اڑھائی بالشت چوڑا اور قدِ آدم اونچا ہے۔ ان کے باہر اردگرد ہشت پہلو چھجہ ہے جو اتنا چوڑا ہے کہ چند آدمی اس پر بفراغت سو سکتے ہیں۔ تمام عمارت استرکار اور منقش ہے۔ دیواروں پر خوبصورت گلکاری اور رنگ آمیزی کی گئی ہے۔"[1]

---

[1] وقائع جہانگیری۔

شروع شروع میں نور جہاں کے ایما پر مولوی عنایت حسین اس مدرسے کے مہتمم اور صدر المدرسین تھے۔ حافظ حبیب اللہ مسجد کی امامت کرتے تھے۔ سید مقبول حسین اس سلسلے وقف کے امین تھے۔ ان کے علاوہ پچاس کے قریب دیگر مدرس منشی اور خادم اس مسجد اور مدرسے کے ساتھ وابستہ تھے۔

شاہ جہان کے عہد میں یہاں خوب رونق تھی۔ درس باقاعدہ ہوتا تھا۔ مدرسہ پورے عروج پر تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملہ تک اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی اس کے بعد یہ عمارت لوٹ گھسوٹ کا شکار ہوگئی۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد میں مسجد کا ایک حصہ ریلوے افسروں کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جب اسٹیشن کو وسعت دی گئی تو یہ مسجد شہید کردی گئی۔ اب یہاں مال گودام قائم ہے۔ سید محمد لطیف نے اپنی کتاب تاریخ پنجاب ۱۸۸۸ء میں تصنیف کی۔ وہ عیدگاہ جہانگیری کے متعلق صفحہ ۴۹ کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ قدیم عمارت اثنائے انسداع کتاب میں منہدم کردی گئی۔"

دولت خاں کا باغ اور سرائے بھی اس کے قرب و جوار ہی میں تھے مگر اب ان کا بھی کوئی نشان باقی نہیں۔

مسجد خراسیاں

لوہاری منڈی کے چوک میں سرراہ ایک اونچی سی مسجد نظر آتی ہے جسے مسجد خراسیاں کہتے ہیں۔ اس کی سیڑھیوں میں سرخ پتھر کی ایک سل پر مندرجہ ذیل کتبہ خطِ نستعلیق میں کندہ ہے جس کے حروف ابھرے ہوئے ہیں:۔

اللہ اکبر

کریمی سیدی صدر جہانی ملجاء عالم

کہ در عہد جہانگیری شدہ این بقعہ را بانی

خلیل آسا بتوفیق خدا اندر عجم کردہ

بناء خانۂ دیں بہر ترویج مسلمانی

چو شان کعبہ دارد مسجد او بہر تاریخش

سخن جیم اگر گویم بناشد کعبۂ ثانی

یہ کتبہ عبداللہ الحسینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس نے لاہور کے گورنر قلیج خاں کے لیے بہت سے قطعے لکھے تھے جن میں سے چند ایک فقیر سید مغیث الدین کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ اس کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۶ء میں بزمانۂ جہانگیر صدر جہاں نے بنوائی تھی۔ یہ وہی میراں صدر جہاں ہیں جن سے شہزادگی کے زمانے میں جہانگیر نے چہل حدیث پڑھی تھی۔ بعد میں آپ کو صدارت کل کا عہدہ اور دو ہزاری منصب دیا تھا۔ بہت مجبر تھے۔ ایک سو بیس سال کی عمر پا کر ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء میں فوت ہوئے[1]

---

[1] مآثر الامراء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب زمانہ سے یہ مسجد خستہ ہو گئی تھی اہل محلہ نے چندہ کر کے پرانی بنیادوں پر ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں اس کی تجدید کی اور پرانا پتھر سیڑھیوں میں لگا دیا۔ مارشل لاء سے پہلے یہ مسجد انجمن خواجیاں کی تحویل میں تھی اور چوہدری مولا بخش اس کے نگران تھے اب یہ محکمہ اوقاف کے قبضے میں ہے۔ سکھوں کے عہد میں یہاں مدرسہ قائم تھا جس میں قرآن و حدیث کا درس ہوتا تھا۔

مسجد وزیر خاں

لاہور کی قدیم تاریخی عمارتوں میں مسجد وزیر خاں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وسعت، پائیداری اور زنگارنگ نقش و نگار کے باعث ماہرین فن تعمیر اس مسجد کو ایک خاص درجہ دیتے ہیں۔ یہ شہر کے ایک نہایت پر رونق اور گنجان آبادی والے حصے میں واقع ہے اور اسلامی ثقافت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

اس مسجد کے بانی حکیم علیم الدین انصاری الملقب بہ نواب وزیر خاں تھے جو چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ عربی اور فلسفہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طبابت کی جانب متوجہ ہوئے اور اس فن میں کمال حاصل کر کے شاہجہانی دربار میں پہنچے۔ جہاں سے ترقی کر کے پہلے دیوان بیوتات اور پھر نواب وزیر خاں کا لقب حاصل کر کے پنجاب کے گورنر مقرر ہو گئے۔ انھیں رفاہِ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ لاہور میں ان کے حمام، بازار، محلات، مساجد، باغ، بارہ دری اور دکانیں سب اسی کارِ خیر کا نتیجہ ہیں۔ گو ان میں سے بہت سی چیزیں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی ہیں مگر اب بھی بہت سی عمارتیں ان کا نام زندہ رکھنے کو باقی ہیں۔ وزیر آباد بھی انھیں کا بسایا ہوا ہے۔

نواب وزیر خاں کی سب سے بڑی قابلِ ذکر یادگار مسجد وزیر خاں ہے۔ یہ رفیع الشان مسجد ہندی ایرانی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ اور شہر لاہور کا زیور ہے۔ یہ دہلی دروازہ کے اندر چوک وزیر خاں میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں سید محمد اسحاق بن شہر یار گازرونی عرف میراں بادشاہؒ کے مزار پر رکھی گئی تھی۔ حضرت میراں بادشاہؒ فیروز تغلق کے عہد میں وارد لاہور ہوئے آپ کا وصال ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں ہوا۔ آپ کی وصیت کے مطابق قبر خام اور احاطہ پختہ خشتی بنایا گیا مگر آپ کی وفات کے قریباً اڑھائی سو سال بعد مسجد کی تعمیر کے وقت آپ کا مزار اس ترکیب سے پختہ کر دیا گیا کہ مسجد کے عین وسط میں حوض کے متصل آپ کی دوہری قبر تیار ہو گئی۔ اوپر نقلی مزار ہے لیکن مسجد کے فرش سے دس چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں اتر کر اصلی قبر ایک بلند چبوترے پر دکھائی دیتی ہے۔

مسجد کی کرسی بازار کی عام سطح سے بہت اونچی ہے۔ اوپر چڑھنے کو سیڑھیاں بنی ہیں۔ ڈیوڑھی ڈاٹ دار چھت کے نیچے ہے اور اس میں شمال، جنوب اور مشرق تین طرف سے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ چوتھی جانب پھر ایک دروازہ ہے جو مسجد کے بلند چبوترے پر کھلتا اور مسجد کی خوبصورت پیشانی اور وسیع صحن کی بہار دکھاتا ہے اندر اور باہر تمام دیواروں پر کاشی کاری، نقاشی اور منبت کاری کی گئی ہے۔ بیرونی دیواروں اور ڈیوڑھی کے آثار اگرچہ اب کچھ کچھ ماند پڑ گئے ہیں لیکن نقش و نگار صاف کہے دیتے ہیں کہ یہ بہترین قلم کاری اور نقوش سے مزین ہوں گے۔

چوک کی طرف کے مشرقی دروازہ کلاں پر اُوپر سے نیچے تک کاشی چینی کا نہایت نفیس کام کیا گیا ہے۔ بہت سے کتبے منقوش ہیں جو مختلف رنگوں کی روغنی ٹائیلوں کو خاص شکل اور ترکیب سے جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ محققین کی رائے ہے کہ اس فن کی ابتدا چین میں ہوئی۔ وہاں سے یہ ایران ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ لفظ کاشی شہر کاشان سے نسبت رکھتا ہے جو فارس کا ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں یہ ہنر زمانۂ وسطیٰ میں زوروں پر تھا غالباً وہیں سے اس فن کے کاریگر شاہ جہان کے عہد میں ہندوستان لائے گئے۔

سب سے اُوپر فارسی رسم الخط میں "افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" نہایت جلی قلم لکھا ہے۔ اس کے نیچے ڈاٹ کے دائیں بائیں اور کتبے ہیں۔ دوسرے کتبے میں یہ عبارت منقوش ہے:۔

" در عہد ابو المظفر صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ
غازی اتمام یافت "

تیسرے کتبے میں یہ لکھا ہے:۔

" بانی بیت اللہ ثانی فدوی باخلاص مرید خاص الخاص
قدیم الخدمت وزیر خان "

چوتھا کتبہ یوں ہے:۔

ھو الجامع

این خانہ کہ ہست چوں فلک مظہر فیض — دارد چوں حریم کعبہ سر در سر فیض
بر چہرۂ اہل قبلہ این در بمراد — تا حشر کشادہ باد ہمچوں در فیض

پانچویں کتبے میں یہ درج ہے:۔

سال تاریخ بنائے مسجد عالی مقام — از خرد جستم بگفتا "سجدہ گاہ اہل فضل"
۱۰۴۴ھ

چھٹے کتبہ میں یہ شعر لکھا ہے:۔

تاریخ این بنائے چو پرسیدم از خرد — گفتا بگو کہ "بانی مسجد وزیر خان"
۱۰۴۴ھ

اور سب سے نیچے یہ عبارت درج ہے:۔

دہقان درو دکشترائے نیک سرشت
در مزرعہ جہان ہر آں چیز کہ کشت
در باب عمل بنائے خیرے بگزار
کاخر ہمہ راہست ازیں در بہ بہشت

مسجد کی ڈیوڑھی میں ڈاٹ دار چھت کے نیچے چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے شہ نشین اور گلی میں دونوں جانب حجرے ہیں جن میں کبھی صحاف، نقاش، کتاب فروش اور جلد ساز بیٹھتے تھے مگر کچھ عرصہ سے بزاز کپڑا بیچتے تھے۔ نئی سکیم کے ماتحت

کپڑے کی منڈی یہاں سے اٹھا دی گئی ہے۔ بزازوں کو جنرل اعظم خاں کلاتھ مارکیٹ میں جگہ مل گئی ہے اور دکانیں خالی پڑی ہیں۔

مسجد کے وسیع صحن میں نمازیوں کے وضو کرنے کے لیے آب مصفا سے لبالب ایک سو مربع گز کا حوض ہے جس کے پاس ہی کرسی کی محراب دار چھت کے نیچے ایک تہ خانہ اور تہ خانے میں حضرت میراں بادشاہ کا مزار ہے۔ سارے صحن میں خشتی فرش ہے اور تین طرف طالب علموں اور درویشوں کے لیے حجرے بنے ہیں جن میں سے ایک جلد ساز اور ایک نقاشوں کے پرانے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ آج کل بابا میراں بخش نقاش کے فرزند میاں محمد حیات وہاں بیٹھ کر پرانے طرز کی نقاشی کا کام کرتے ہیں۔

صحن کے اختتام پر مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جو پانچ محراب دار دروں اور گنبد دار چھت پر مشتمل ہے۔ درمیانی محراب بڑی اور دائیں بائیں کی دو دو محرابیں کسی قدر چھوٹی ہیں۔ محرابوں پر قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث نبوی لکھی ہیں جو نقاشی اور منبت کاری دکار ونگ کا بہترین نمونہ ہیں۔ درمیانی محراب پر کانسی کار کتبے میں آیت الکرسی بخط نسخ تحریر ہے باقی کتبوں میں صحابہ کبار کے نام درج ہیں۔ یہ حاجی یوسف کشمیری نے ۱۰۴۲ھ میں لکھے تھے۔

مسجد کے اندر نہایت عمدہ رنگین نقاشی کی گئی ہے اور بعض بعض جگہ منبت کاری بھی ہے۔

صحن کے چاروں کونوں پر چار خوبصورت ہشت پہلو بلند مینار ہیں جن پر موزوں چوکھٹوں میں کانسی کا نہایت خوبصورت کام ہے۔ سکھوں کے عہد میں ان میناروں کے اوپر کی برجیوں کے دو دو در بند کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ کسی بھونچال کے صدمے سے انہیں ضعف نہ پہنچے۔ مگر اب برجیوں کے نیچے سرخ پتھر کے ستون کھڑے کر کے در کھول دیئے گئے ہیں۔

یہ مسجد اس قدر ریختہ، اتنے اچھے مسالے اور ایسے نیک کاریگروں کے ہاتھوں بنی ہے کہ سوا تین سو سال سے آج تک کبھی کسی خاص مرمت کی منت کش نہیں ہوئی۔ اس کی وضع قطع اور نقش و نگار کے اعلیٰ و ارفع ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ پنجاب کی سب سے مشہور درس گاہ میو سکول آف آرٹس کے بالغ النظر لڑکوں کو اسی کے طاقچوں کے نمونے مشق کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ مسٹر جے۔ ایل کپلنگ سابق پرنسپل سکول مذکور اپنی ایک سرکاری رپورٹ بابت سال ۹۰-۱۸۸۹ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ خوب صورت عمارت کیا ہے؟ فن نقاشی کا بہترین سکول ہے مگر افسوس کہ لوگ اس کی صحیح نگہداشت نہیں کرتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا رجحان اس کی غور و پرداخت کی طرف بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نقش و نگار آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو اندیشہ ہے کہ یہ عدیم المثال نمونے آسیب روزگار اور امتداد زمانہ کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو جائیں گے ایسی حالت میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے صحیح صحیح چربے اتار کر لاہور کے

عجائب گھر اور اسکول میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ کیونکہ ہمارے نوجوان
مصوروں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی ہے[1]

اس مسجد کا انتظام بانیٔ مسجد کی وصیت کے مطابق متولیوں کے ہاتھ میں تھا۔ متولی اپنے آپ کو نواب وزیر خاں کی اولاد سے بیان کرتے تھے۔ ان کے پاس نواب وزیر خاں کا وصیت نامہ بھی موجود تھا۔ یہ وصیت نامہ سید محمد لطیف جج اور مولوی نور احمد نے تاریخ لاہور اور تحقیقاتِ چشتی میں نقل کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے واقف کی دلی خواہش اور مسجد کی حفاظت کے متعلق مجوزہ انتظامات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بانیٔ مسجد ان تمام مکانوں اور دکانوں کا مالک تھا جو مسجد اور چوک وزیر خاں سے دہلی دروازہ تک بازار کے دونوں طرف چلے گئے ہیں۔ اس میں وہ کٹڑی بھی شامل تھی جس میں حضرت سید سربلند کا مزار واقع ہے اور اس تمام جائیداد کی آمدنی اس مسجد کی رونق و آبادی پر صرف کی جاتی تھی۔ اب ان دو کانوں کے سوا جو مسجد کے نیچے واقع ہیں باقی تمام جائیداد لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئی ہے۔ بلکہ جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر کے مسجد کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

مسجد کی ملحقہ سرائے اور حمام جو دہلی دروازہ کے متصل واقع ہیں لاہور کارپوریشن کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کی اسکیموں کے ماتحت انھیں گرانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ حمام ترکی ساخت کے تھے اور ان میں گرم اور سرد پانی کے تالاب بنے ہوئے تھے۔

مسجد کے ساتھ دو کنویں بھی تھے جن میں سے ایک پر نل لگا کر بجلی سے تالاب میں پانی پہنچایا جاتا ہے مگر دوسرا کنواں آبادی میں آگیا ہے اور مسجد سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

بانیٔ مسجد کی خواہش تھی کہ مشرقی دروازہ کے باہر کی دکانیں اور ان کے اوپر کے بالاخانے اسلامی کتب کے صحافوں کے لیے ہمیشہ بے کرایہ مخصوص رہیں۔ نیز یہ شرط کی تھی کہ مسجد میں ایک خطیب و امام۔ ایک موذن اور دینی علوم کی تدریس کے لیے دو مدرس اور چند خادم رکھے جائیں جن کو وقف کی آمدنی سے تنخواہ دی جائے۔ اس طرح کہ امام اور خطیب کو روزانہ ایک سے دو روپیہ تک، موذن کو چار آنہ یومیہ اور ہر ایک مدرس کو ایک روپیہ یومیہ اور جو شخص واقف کی اولاد سے وقف مذکورہ پر متصرف ہو وہ ہر مہینے میں اوقاف کی آمدن میں سے چھٹا حصہ اور جو شخص اقربا میں سے ہو، نواں حصہ لے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور جو کچھ عمارت اور ملازمین اور دیگر حاجاتِ ضروریہ مثلاً محرر، روشنی کرنے والا، فرش بچھانے والا کے خرچ سے بچے وہ ان مستحقوں پر صرف کیا جائے جو اس مسجد میں رہتے ہوں اور تنگی کے وقت (جب آمدنی کم ہو جائے) صرف ملازموں پر صرف کیا جائے۔

یہ وصیت نامہ یکم رمضان المبارک سنہ ۱۰۵۱ھ ۱۶۴۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر قاضی یوسف (جو شاہ جہان کے عہد میں لاہور کے قاضی القضاۃ تھے) نواب وزیر خاں وصیت کنندہ، موسوی خاں صدر الصدور اور مولانا محمد فاضل ولد مولانا محمد شاہ کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ نواب وزیر خاں کی مہر حسب ذیل عبارت کی حامل ہے:۔

۱۔ تاریخ لاہور مصنفہ جج محمد لطیف صفحہ ۲۱۵۔

زلطف شاہ جہاں بادشاہ بندہ نواز
وزیر خاں بہ جہاں ساودان بود ممتاز

نماز پنجگانہ، جمعہ اور عیدین کے علاوہ شاہ جہانی اور عالمگیر کے عہد میں یہ مسجد لاہور کا ایک بہت بڑا علمی مرکز بھی اور علمی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی تھی۔ لاہور کے ارباب فضل و کمال فصحائے خوش بیان، شعرائے شیریں زبان اور دوسرے شوقین لوگ جو ایران، توران اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے لاہور آئے ہوتے تھے اس مسجد میں جمع ہو کر آپس میں مبادلۂ خیالات کرتے تھے اور اس طرح شعر و شاعری کی مجالس گرم ہو جاتی تھیں[1]۔ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے زمانے تک مسجد وزیر خاں کا صحن علمی اور ادبی مجالس کے لیے استعمال ہوتا تھا[2]۔ چنانچہ آپ اپنے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں فرماتے ہیں:۔

"شاہ آفرین لاہوری[3] نے حاکم لاہوری سے ذکر کیا اور حاکم نے میرے سامنے بیان کیا کہ پچھلے دنوں مسجد وزیر خاں کے صحن میں شعراء مجلس سخن آراستہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی جو ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں شریک ہوئے۔ وہاں ناصر علی سرہندی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

صریر خامہ ، می دانم کہ با طبعت نمی سازد
دریدی نامہ ، دل صد پارہ شد، قاصد رسید اینجا

(ترجمہ) قلم کی آواز میں جانتا ہوں کہ تیری طبیعت کو موافق نہیں۔ مگر تو نے خط پھاڑ ڈالا جس سے دل کے سو ٹکڑے ہو گئے اور قاصد پریشان ہو کر واپس آگیا۔

"اعجاز نے اس پر اعتراض کیا کہ عاشق دور دراز سے جب خط لکھتا ہے تو قلم کی آواز معشوق کی طبیعت کو ناگوار گزرتی ہے۔ پھر خط پھاڑنے کی آواز جو قلم کی آواز سے زیادہ شوخ ہے اسے کس طرح پسند آسکتی ہے؟ شاہ آفرین نے جواب دیا کہ معشوق کو اپنے قلم کی آواز گوارا نہیں۔ یہ سن کر اعجاز خاموش ہو گیا۔ اس پر فقیر مؤلف (آزاد بلگرامی) نے حاکم سے کہا

---

[1] چہار چمن مصنفہ چندر بھان برہمن (قلمی)
[2] خزانۂ عامرہ۔
[3] شاہ آفرین گوجر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ رجب ۱۱۴۷ھ / ۱۷۳۴ء کو وارد لاہور ہوئے۔ ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء میں انتقال فرمایا۔ شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری نے تاریخ وفات کہی "رفت نغاد معنی از عالم" مثنوی ابیان معرفت ان کی یادگار ہے۔

کہ عاشق کا خط لکھنا معشوق کی طبع کے موافق نہیں۔ لیکن عاشق کے خط کو
پھاڑنا اس کی طبع کے موافق ہے۔ یعنی اس میں وہ خاص لذت محسوس کرتا
ہے۔ اس لیے عاشق کے قلم کی آواز اسے پسند نہ آئی اور خط پھاڑنے
کی آواز اسے پسند آگئی۔"

مسجد کے اندر اور باہر کتب فروشوں کی دکانیں ہوتی تھیں اور نوشت و خواند کا تمام سامان یہاں فروخت ہوتا تھا۔ چنانچہ چندر بھان برہمن اپنی کتاب "چہار چمن" میں لکھتا ہے :۔

"کتب بے شمار از عربی و فارسی و دیگر نسخہ ہائے معتبر از تواریخ و مثنوی
و دواوین متقدمین و نوشتہ جات خوش نویسان روزگار و رسالات
واردات عشق از ہر قسم و ہر جنس بغرض خرید و فروخت می آید چو
آزادیے کتب نشینان مخصوص این روز (جمعہ) است۔ از ہر
کوچہ و ہر کوئے جوانان نورسیدہ بیاض در دست و گل بر سر
بمقتضائے عہد شباب خراماں خراماں بہ سیر بازار کتاب می آیند۔"[1]

یہ بازار پہر تک قائم رہتا۔ اس کے بعد لوگ نماز جمعہ کی تیاری کرتے۔ اس بیان کی تصدیق و تائید بعض دیگر کتب سیر و تواریخ سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ لاہور کے ایک مشہور روحانی بزرگ شاہ بلاول قادریؒ کے حال میں لکھا ہے کہ جب وہ اپنے والد کی وفات کے بعد لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئے تو سامانِ نوشت و خواند خریدنے کے لیے اسی مسجد میں آئے۔ یہیں سے ایک شخص انہیں یہ کہہ کر لے گیا کہ آپ میرے ساتھ شاہدرہ چلیں تاکہ میں آپ کو سستی سیاہی بنانے کا نسخہ بتاؤں۔[2]

یہ سلسلہ سکھوں کے عہد تک جاری رہا۔ مسجد میں نہ صرف سامانِ نوشت و خواند فروخت ہوتا تھا بلکہ مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور نادر کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ یہاں ہر وقت ایسے کاتب، مصور، صحاف، جدول ساز وغیرہ موجود رہتے تھے جن کا ذریعہ معاش مختلف کتابوں کی نقل اتارنا اور انہیں مصور و منقش کرنا ہوتا تھا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں مرزا اکرم بیگ ایک خاندانی فاضل مسجد وزیر خاں کی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ شہر کے ہندو مسلم عمائد و اکابر کے فرزند ان سے فارسی پڑھتے تھے۔ اس دور کے مشہور علم دوست بزرگ دیوان امرناتھ اکبری نے اپنی کتاب ظفرنامہ رنجیت سنگھ میں ان کے علم و فضل کی بے حد تعریف کی ہے اور انہیں اپنا استاد قرار دیا ہے۔

مسجد میں وقتاً فوقتاً جو اساتذہ درس دیتے رہے ہیں ان کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ خطیبوں اور اماموں کا ذکر بعض تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان میں ایک تو ملا محمد صدیق تھے جو مولانا شہر یار[3] کے شاگرد تھے اور جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کی موجودگی میں فتح لاہور کے

---

[1] چہار چمن قلمی ورق ۴۰ ۔ [2] پیش لفظ دیوان قلندر شاہ لاہوری ۔

[3] مولانا شہر یار چینیاں والی مسجد کے امام تھے۔ انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے منہ پر اسے ظالم کہا تھا۔ ابدالی نے انہیں شہر بدر کر دیا تھا۔ مدفن ان کا ٹانڈہ ضلع ہوشیارپور میں ہے۔

بعد ۱۷۴۷ء میں یہاں عید کی نماز پڑھائی تھی، وہ عربی کی ایک کتاب سلک الدرر کے مصنف بھی تھے۔ ۲۹ محرم یوم دوشنبہ ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء کو بعہد فرخ سیر لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں بعہد تیمور شاہ درانی انتقال فرمایا۔[1]

دوسرے خطیب مولانا غلام محمد قادری عرف امام گاموں تھے جو تصوف کی ایک منظوم کتاب گنج مخفی کے مصنف ہیں۔ وہ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار مسجد کی جنوبی دیوار کے باہر کنوئیں کے پاس واقع ہے جس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے چند مشہور خطیبوں اور اماموں کے نام یہ ہیں۔ مولوی اکرام الدین بخاری۔ مولانا عبداللہ پشاوری، مولوی عبدالحق۔ حافظ غلام نبی۔ قاری شمس الدین۔ مولوی سید دیدار علی شاہ۔ مولوی عبدالعزیز۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد مرحوم۔

مسجد کے باہر مشرق کی طرف ایک وسیع سرائے یا جلوخانہ ہے جسے 'چوک وزیر خاں' کہتے ہیں۔ اس چوک کے ساتھ بھی بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ اس وقت اس چوک کے تین محرابی دروازے ہیں۔ ایک دروازہ مسجد کے محاذ میں مشرق کی طرف ہے جسے "سفید دروازہ" یا چٹا دروازہ کہتے ہیں۔ دوسرا دروازہ چوک کے شمال میں راجہ دینا ناتھ کی حویلی سے ملحق ہے۔ تیسرا دروازہ مسجد کے شمالی زینہ کے پاس ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں چوتھا دروازہ بھی ہو مگر اب اس کے کوئی آثار نہیں۔

چوک میں دو گنبد بھی ہیں۔ ایک خانقاہ حضرت سید صوف کا اور دوسرا راجہ دینا ناتھ کے کنوئیں کا۔ اس کے قریب ہی وزیر خاں کا کٹڑہ اور حضرت سربلند کا مزار ہے۔ حضرت سید صوف اور سربلند دونوں بزرگ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں فوت ہو کر یہاں دفن ہوئے اور ان کے مزار مسجد کی تعمیر سے پہلے یہاں موجود تھے۔

۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں جب حضرت سید صوفؒ مغل حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے شہید ہو کر یہاں دفن ہوئے۔ تو اس جگہ کو رڑہ محلہ کہتے تھے آپ کی قبر ایک معمولی سے چبوترے پر بنائی گئی جس پر کوئی چھت نہ تھی۔ لودھی بادشاہوں کے زمانے میں جب نادر خاں نام ایک امیر نے اپنی حویلی بنوائی تو اس نے مزار کے گرد ایک خشتی حجرہ بنوا کر اس کو اپنی حویلی کے وسیع صحن میں لے لیا۔ وہ حویلی شاہجہان کے زمانے تک موجود تھی۔ نواب وزیر خاں نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خرید کر یہاں مسجد تعمیر کرائی اور مزار کو نئے سرے سے بنوا دیا۔

سکھوں کے زمانے میں وزیر خاں کے چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر لیے جس سے مسجد کی زیب و زینت میں فرق آگیا۔ راجہ دینا ناتھ کی حویلی اور کنواں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں سرکار انگریزی کے حکم سے چوک کے اندرونی مکانات گرا دیے گئے اور چوک کو پھر ایک وسیع میدان بنا دیا گیا۔

آج سے نصف صدی قبل اس چوک کا ماحول ایسی رفیع الشان مسجد کے شایان شان ہرگز نہیں تھا۔ بازار بہت تنگ تھا۔ سڑک کے کنارے کہیں تو دودھ دہی اور فالودہ بیچنے والوں کی کھپریل کی کچی دکانیں تھیں جہاں ہر وقت مکھیاں بھن بھناتی رہتی تھیں۔ کہیں مچھیرے مچھلیاں لیے بیٹھے رہتے تھے جن کی بدبو سے دماغ پھٹ جاتا تھا۔ کسی جگہ طباخ ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور کہیں پکوڑے تلنے والے تیل جلا جلا کر آنے جانے والوں کا دم ناک میں کرتے تھے۔ چوک میں جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے رہتے تھے جن پر ڈنبے چرتے اور

---

[1] روضۃ الاولیاء از مولوی محمد الدین مطبوعہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۱۹۴ و تذکرہ علماء و المشائخ مؤلفہ منشی محمد الدین فوق مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۳۔

گدھے لوٹتے تھے۔

مسجد کے "زیرِ سایہ خرابات" کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ چوک کی جانب نعل بندوں اور آہن گروں کی بھٹیوں نے دیواروں کا قلعی بیان تک بگاڑ رکھا تھا کہ جدھر نگاہ پڑتی تھی سیاہی ہی سیاہی دکھائی دیتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسجد مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی پر ماتم کرنے کے لیے سیاہ پوش ہو گئی ہے۔

مسجد کی تاریخی عظمت اور شان و شوکت کے پیش نظر ۱۹۳۰ء میں راقم الحروف نے اس وقت کے متولی آنریبل خان بہادر سر میرزا ظفر علی جج ہائی کورٹ لاہور کی خدمت میں گذارش کی کہ مسجد کا ماحول یکسر تبدیل کریں، بازار کشادہ کرائیں، دکانیں نئی وضع کی بنوائیں اور انھیں ایسے کرایہ داروں کے سپرد کریں جو ہر وقت انھیں صاف ستھرا رکھ سکیں تاکہ اسلام کی عظمت کا نقش ہر رہگذر کے دل پر بیٹھتا رہے۔

مسجد کے صدر دروازے کا منظر حسین بنانے کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوک صاف کرایا جائے، اس میں سرسبز و شاداب باغ لگایا جائے۔ اسے روشوں اور چمنوں سے آراستہ کیا جائے اس میں فوارے چھوڑے جائیں اور لوگوں کی نشست کے لیے جا بجا قرینے سے بنچوں کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح مسجد کی خوبصورتی کو بھی چار چاند لگ جائیں گے اور اندرون شہر کی تفریح گاہوں میں بھی بیش بہا اضافہ ہو گا۔

یہ اور اسی قسم کی دیگر تجاویز ۸ ر اگست ۱۹۳۰ء کے انگریزی اخبار ٹریبیون، ۷ ر اگست کے مسلم آؤٹ لک، ۲۲ ر اگست کے زمیندار، ۱۲ ر اگست کے ہفتہ وار اخبار کشمیری اور حمایت اسلام لاہور میں شائع ہوئیں لیکن اس وقت ان پر کسی نے خاص توجہ نہ دی البتہ مسجد کے صحن کا فرش جو خراب ہو چکا تھا متولی نے درست کرا دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہاں کپڑے کی دکانیں لگتی گئیں یہاں تک کہ سارے چوک میں بزازی کی اچھی خاصی مارکیٹ قائم ہو گئی۔ لیکن تئیس سال گذرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں ہم نے اپنے خواب کی تعبیر یوں دیکھی، کہ مارشل لاء کے حکام کی مدد سے لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کی نگرانی میں چوک صاف کرایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ پانچ پانچ چھ چھ فٹ کھدائی کرنے سے پرانے فرش کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں دکانیں گرا دی گئی ہیں۔ باغ باغیچے اور روشوں کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ خیال تھا کہ سڑک وسیع کی جائے گی اور چوک مسجد کے شایان شان خوبصورت بنایا جائیگا۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، آج (۱۹۶۱ء میں) ہم دیکھتے ہیں کہ چوک میں سڑک کے ساتھ ساتھ پھر بزازی کی دکانیں قائم ہو گئی ہیں اور وہی گہما گہمی شروع ہو گئی ہے البتہ اب مسجد کا انتظام متولیوں کے ہاتھ سے نکل کر صوبائی اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں آگیا ہے۔

مسجد خورد نواب وزیر خاں

یہ قدیم طرز کی چھوٹی سی مسجد ٹکسالی دروازے کے جانب جنوب بازار سمیاں میں واقع ہے۔ اسی مقام پر نواب وزیر خاں صوبہ لاہور نے شاہجہانی عہد میں اپنا زنانہ محل تعمیر کرایا تھا جو اب گر چکا ہے سکھوں کے وقت میں مدت تک اس محل کے آثار اور کھنڈر موجود رہے۔ انگریزوں نے اس زمین کو ہموار کرا دیا۔ یہ مسجد اسی محل سے متعلق تھی جہاں صوبہ لاہور کے گھر کی عورتیں نماز

پڑھا کرتی تھیں۔ یہ راستہ محل کے اندر سے تھا۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور مسلمان اس میں معبودِ حقیقی کی عبادت کرتے ہیں۔ عمارت اس مسجد کی نہایت عمدہ، پختہ، سادہ اور بے گنبد ہے۔ دیواروں پر کانسی کا کام ابھی تک روشن ہے۔

مسجد پری محل

یہ مسجد نواب وزیر خاں صوبہ لاہور کی بنائی ہوئی شاہ عالمی دروازہ کے اندر سر بازار واقع ہے۔ اس کی تعمیر کا باعث یہ ہوا کہ جب نواب نے مردانہ محل تعمیر کر کے "پری محل" اس کا نام رکھا تو یہ چھوٹی سی مسجد اپنی اور اپنے متوسلین کی سہولت کے لیے تعمیر کی۔ یہ مسجد اب تک آباد ہے بکرمی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں لاہور کے مشہور رئیس میاں چراغ دین والی گرہ کی معرفت اس کی تجدید ہو چکی ہے۔ اب یہ لال مسجد کہلاتی ہے۔ اس کی کرسی زمین سے ایک منزل اونچی ہے نیچے دکانیں ہیں۔ دروازے پر سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس پر کندہ ہے :-

سالِ آغازِ تعمیر

چو ایں مسجد لباسِ نو بپوشید	چراغِ دیں فروغِ نو بہ بخشید
چو تاریخِ بنائش جست فیضی	"چراغ و مسجد" آمد سالِ تجدید ۱۳۱۷ھ

سالِ اختتامِ تعمیر

جَزَى اللهُ بانِيهِ دَارَ النَّعِيم	وَيَهْدِيهِ نَحْوَ صِرَاطٍ قَوِيم
اَبُوالْفَيْضِ فِي عَامِ تَجْدِيدِهِ	يَقُولُ - لِبَانِيهِ نَفْعٌ عَظِيم ۱۳۱۷ھ

مسجد چنگڑ محلہ

یہ قدیم زمانے کی مسجد دہلی دروازہ کے اندر محلہ چنگڑاں میں واقع ہے۔ عمارت نہایت مضبوط ہے۔ اندرونی حصہ کسی قدر پست ہے صحن بھرتی ڈال کر اونچا کیا گیا ہے۔ نواب وزیر خاں کی عمارات میں گھر جانے کی وجہ سے اسی کے نام سے مشہور ہے۔ مرمت کے بعد اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مولانا سید دیدار علی شاہ مرحوم اسی جگہ دفن ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوالبرکات نے بھی یہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ کے مرید ملا خواجہ بہاری بھی اسی مسجد میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ "جب شاہجہان دارا شکوہ سے ملنے گیا تو دہلی دروازہ کے راستے گیا جہاں ملا خواجہ کا مکان بھی تھا" تحقیقات چشتی نے تو یہاں تک نشاندہی کی ہے کہ "یہ مسجد متصل مسجد نواب وزیر خاں تھی" یہ ممکن ہے نواب سعد اللہ خان وزیر شاہجہان بھی اسی مسجد میں پڑھتے رہے ہوں[1]۔

---

[1] تذکرہ علمائے لاہور صفحہ ۳۶۔

مسجد شاہ ابوالمعالی

یہ پختہ ریختہ کار مسجد شاہ خیرالدین المخاطب بہ شاہ ابوالمعالی قادری کے مقبرے کے غرب میں واقع ہے ۔ اندر باہر فرش پختہ ہے ۔ تینوں محرابیں قالبوتی عالی شان ہیں ۔ سقف قالبوتی اس پر تین گنبد مدوّر مقطع ہیں ۔ یہ مسجد شاہ ابوالمعالی (پیدائش دہم ماہ ذوالحج روز عید سنہ ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء ، وفات ۱۷ ربیع الاوّل سنہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء بعہد شاہ جہاں) نے اپنی زندگی میں بنوائی تھی مگر سکھوں کے وقت غوثی خاں جرنیل توپ خانہ نے اس مسجد کو دوبارہ بنوایا جو اب تک موجود ہے ۔ اب اس میں اور بھی کئی قسم کی تبدیلیاں ہو گئی ہیں ۔

مسجد سرائے شاہجہانی

مقبرہ جہانگیر کے غرب کی سمت دیوار بدیوار ایک عالی شان سرائے ہے جو شاہ جہان بادشاہ نے سنہ ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۷ء میں تعمیر کرائی تھی ۔ بعض لوگ اسے سرائے اکبری کہتے ہیں مگر اس میں اکبر کے دَور کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ پھر ملّا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں اسے جلوخانہ روضہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرۂ جہانگیر کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی ۔ اس سرائے کی عمارت نہایت پختہ ہے ۵۴۷ فٹ لمبے اور ۵۶۰ فٹ چوڑے باغیچہ نما صحن کے چاروں طرف بلند چبوترے پر ۱۸۰ حجرے ہیں ۔ ہر حجرہ تقریباً ۱۰½ فٹ مربع ہے ۔ حجروں کے آگے پختہ قالبوتی برآمدے ہیں ۔ کبھی یہ حجرے مقبرے کے محافظوں ، خادموں اور مسافروں کے استعمال میں آتے ہوں گے مگر اب مدت سے بے آباد پڑے ہیں ۔ سنہ ۱۸۸۰ء سے پہلے یہ جگہ محکمہ ریل کے قبضے میں تھی اور یہاں انجنوں کے کل پرزے اور کوئلے کے ذخیرے پڑے رہتے تھے ۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں یہاں رستم ہند غلام پہلوان اور دلیپ ہند کیکر سنگھ کی مشہور کشتی ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں یہاں تک کہ برہما ، بمبئی ، مدراس ، کلکتہ ، دلّی ، حیدرآباد دکن اور برار سے بڑے بڑے شوقین رئیس اور جاگیردار شرکت کے لیے آئے تھے ۔ اس موقعہ پر ریلوے نے شاہدرہ تک اسپیشل ٹرینیں چلائی تھیں ۔ یہ غلام پہلوان وہی ہیں جنھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے باپ پنڈت موتی لال نہرو سنہ ۱۹۰۰ء کی عالمگیر نمائش میں اپنے خرچ پر پیرس لے گئے تھے جہاں انھوں نے اپنے ملک کا نام روشن کیا تھا ۔

اس سرائے کے تین دروازے ہیں ۔ جنوبی دروازے کی ڈیوڑھی میں محکمہ آثار قدیمہ کا عملہ رہتا ہے ۔ مشرقی دروازہ سے مقبرہ جہانگیر میں داخل ہوتے ہیں ۔ اس دروازے کے محاذ میں یعنی اس کے جواب میں سرائے کی غربی دیوار کے ساتھ ایک عالی شان مسجد پختہ گنبد دار تعمیر کی ہوئی اب تک موجود ہے ۔ اس مسجد کے تین در ہیں ۔ ایک کلاں اور دو خورد ۔ صحن مسجد میں ایک عمدہ حوض ہے ۔ یہ مسجد صرف دن کے وقت زائروں کی وجہ سے آباد رہتی ہے ۔

ٹکسال والی مسجد

یہ مسجد ٹکسالی دروازے کے اندر سر بازار واقع ہے ۔ اگرچہ تمام مسجد گر چکی ہے مگر اب بھی ایک حصّہ باقی ہے ۔

اس کی دیواروں پر کاشی کا کام ہے اور اب تک روشن ہے۔ شاہجہان بادشاہ نے اس کے پاس دارالضرب تعمیر کیا تھا جہاں روپیہ مضروب ہوتا تھا یہ مسجد اسی مکان سے متعلق تھی۔ اب دارالضرب کا تو نام و نشان باقی نہیں البتہ مسجد کا کسی قدر حصہ باقی ہے۔ اس مسجد کو اب مسلمانوں نے مرمت کرکے آباد کر لیا ہے۔ یہ مسجد فدائی خاں کوکہ کے نائب عبداللہ خاں نے بنوائی تھی۔

مسجد بازار طبی (حکیماں)

یہ مسجد بھی شاہجہانی دور کی بنی ہوئی ہے۔ سکھوں کے وقت مہاراجہ کی بارود اس میں بھری رہتی تھی۔ انگریزی حکومت کی ابتدا میں یہ چند سال غیر آباد رہی۔ آخر مولوی غلام قادر نے سرکار میں درخواست کرکے اس مسجد کو آباد کرنے کا حکم لیا، اور امام بخش قصاب نے جس کے پاس گوروں کو گوشت پہنچانے کا ٹھیکہ تھا بہت سا روپیہ صرف کرکے اس کی مرمت کرائی۔ مولوی غلام قادر کی وفات کے بعد ان کا بھانجا مولوی نظام الدین اور ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے مولوی عزیز الدین و علی الدین اس مسجد کی امامت کرتے رہے۔ بانی اس مسجد کا کوئی امیر تھا جس کا نام غلام مہدی خاں کتبہ میں لکھا ہوا ہے مگر سنہ پڑھا نہیں جاتا۔ یہ مسجد پرانی تحصیل کے پاس بازار طبی یا حکیماں میں ہے اور مدرسہ نعمانیہ سے ملحق۔ اس کی تعمیر میں دورِ شاہجہانی کی تمام فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

مسجد محمد صالح کمبوہ

یہ چھوٹی سی منقطع خوبصورت مسجد موچی دروازے کے اندر واقع ہے۔ جب کوئی دروازے میں داخل ہوتا ہے تو سامنے ہی اس کی رنگین کاشی کار عمارت نظر آتی ہے۔ تینوں گنبد مدور صورت عمدہ شکل کے ہیں۔ مسجد کی تینوں محرابوں کے اوپر اور گوشوں کی دیواروں پر کاشی کا کام زرد رنگ میں اور اس میں حروف لاجوردی رنگ کے ہیں اکثر آیات قرآنی اور احادیث فارسی نسخ اور نستعلیق خط میں تحریر ہیں۔ مسجد کی عمارت سنہ ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ملا محمد صالح کمبوہ نے اس کو تعمیر کیا۔ اس نے اپنی حویلی بھی اس کے قریب ہی مشرق کی جانب بنوائی۔ ملا محمد صالح صوبہ پنجاب کی دیوانی میں بڑا فاضل شخص تھا اس نے شاہجہانی دور کی تاریخ "عمل صالح" کے نام سے لکھی ہے۔ اس مسجد کے دروازے پر تین طاقچے کاشی کار بنے ہوئے ہیں۔ دو میں لکھا ہے ؎

بانیۂ ایں مسجد زیبا نگار　　　　بندۂ آل محمد صالح است

تیسرے میں سنہ ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء لکھا ہے۔ اس مسجد کی کرسی اونچی ہے اور نیچے دکانیں ہیں مگر بازار کی سطح اونچی ہو جانے کے سبب سے دکانیں آدھی آدھی زمین میں غرق ہو گئی ہیں۔ دروازہ بھی چھوٹا سا رہ گیا ہے۔

مسجد چینیاں والی

یہ بھی زمانہ سلف کی عمارتوں کی یادگار ہے اور حصار شہر کے اندر محلہ چابک سواراں میں واقع ہے۔ اس کی ایک دیوار

حویلی نواب سعد اللہ خاں المشہور میاں خاں کے ساتھ لگتی ہے۔ مغلوں کے آخری دور میں اس مسجد کے قریب ہی نواب شاہ نواز خاں پسر نواب زکریا خاں نے اپنا فیل خانہ اور نواب آدینہ بیگ نے اپنی حویلی بنوائی تھی مگر اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد نہایت وسیع صحن والی ہے۔ تینوں محرابیں اس کی مسجد وزیر خان کی محرابوں کی طرح کاشی کار منقش ہیں۔ مسجد کی نصف زمین مسقف ہے اور نصف بطور صحن کھلی چھوڑی گئی ہے۔ سقف پر تین گنبد بیٹھویں قطع کے بنے ہیں۔ بوقت تعمیر اس کی کرسی اونچی رکھی گئی تھی مگر اب کوچہ کی زمین اتنی بلند ہو گئی ہے کہ کرسی جاتی رہی ہے۔ مسجد کا شرقی دروازہ نہایت خوبصورت ابری کا بنا ہوا تھا اور ڈیوڑھی کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ سہ حاکمانِ لاہور کے زمانے میں گوجر سنگھ نے اس کی سلیں اکھڑوا لیں اور دہلیز جو سنگِ مرمر کی تھی سو بھا سنگھ نے اتروا لی۔ منہدمہ دروازے کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

طرفہ معمار خرد تاریخ سال

گفت زیبا مسجد از افراز خاں

اس مصرع سے ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء تاریخ نکلتی ہے حالانکہ اندر کی محراب پر ۱۰۸۰ھ تحریر ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ اندر کی عمارت اور بیرونی دروازے کی تعمیر میں دو سال لگے۔

اس مسجد کی تین محرابیں عالی شان کاشی کاری ہوئی ہیں۔ ہر ایک محراب میں تین تین کتبے ہیں جن میں کلمہ و آیات قرآنی اور اشعار فارسی تحریر ہیں۔ نقش و نگار نہایت خوش رنگ ہیں۔ زمین بسنتی اور حروف لاجوردی ہیں۔ اندر کی دیواریں ریختہ کار پختہ ہیں۔ صحن میں پہلے حوض بھی تھا مگر اب اسے بند کر کے اس پر کمرے بنا لیے گئے ہیں۔

اس مسجد کے بانی کا نام سرفراز خاں تھا جسے افراز خاں بھی کہتے ہیں۔ عہد شاہجہانی و عالمگیری میں صوبہ لاہور کی فوجداری اس کے سپرد تھی۔ پانچ ہزاری منصب تھا۔

یہ مسجد اہل حدیث فرقہ کے قبضے میں ہے اور آباد ہے۔ بہت سا روپیہ صرف کر کے اس کی مرمت و توسیع کی گئی ہے اس کے ساتھ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس کا نام "مدرسہ بنات المسلمین" ہے۔

اس سے قبل بھی اس مسجد میں ہمیشہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ۱۷۴۷ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر پہلا حملہ کیا تو مولانا شہر یار اس مسجد کے امام تھے۔ وہ بڑے جید عالم تھے اور ان کا درس بہت مشہور تھا۔ انھوں نے حملہ آوروں کی لوٹ مار اور تشدد سے متاثر ہو کر احمد شاہ ابدالی کے منہ پر اد میاں یعنی او ظالم کہا (میاں ترکی زبان میں ظالم کو کہتے ہیں)۔ ابدالی نے ناراض ہو کر انھیں لاہور سے نکال دیا۔ آپ ٹانڈہ ضلع ہوشیارپور چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولوی عبد اللہ الغزنوی بھی کچھ عرصہ یہاں رہے ہیں۔ وہ نہایت نامور عالم اور متقی بزرگ تھے ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء میں بہادر خیل (نواح غزنی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے علماء و مشائخ کا درجہ رکھتے تھے۔ حدیث و تفسیر اور کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس سلسلے میں بہت سی تکالیف بھی اٹھائیں۔ امیر دوست محمد خاں والیٔ کابل نے آپ کو جلا وطن کر دیا۔ آپ نے دہلی اور لاہور میں کچھ عرصہ رہ کر امرتسر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہیں ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا۔ علامہ اقبال نے اپنے ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کے ایک مکتوب میں منشی محمد الدین فوق کو لکھا :-

"مولوی عبد اللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے
کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کئے جانے کی خبر ملی ایک
منٹ تامل کیا۔ پھر طلبہ کو مخاطب کر کے کہا۔
"ما برضائے او راضی ہستیم۔ بباید کہ کار خود بکنیم"
یہ کہہ کر پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ مخلص مسلمان اپنے
مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے[1]

مولوی عبد اللہ غزنوی کے فرزند مولوی عبد الواحد غزنوی بھی جید عالم اور صالح بزرگ تھے۔ وہ ساری عمر مسجد چینیاں والی کے امام رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء کے اوائل میں انتقال فرمایا اور مرتسر میں دفن کئے گئے[2]

۱۹۳۱ء کے بعد سے آپ کے پوتے مولوی داؤد غزنوی خلف مولوی عبد الجبار اس مسجد میں دین و سیاست کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ملک کی متعدد تعلیمی، تنظیمی اور سیاسی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔

مسجد دایہ لاڈو

شاہ عالمی دروازے کے باہر، وَن یونٹ ہسپتال کے شرق کی طرف، سڑک کا فاصلہ چھوڑ کر، یہ قدیم مسجد واقع ہے۔ اسے شاہزادہ سلیم یعنی جہانگیر بادشاہ کی دودھ پلانے والی دایہ لاڈو نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا اور اپنی قبر بھی اس کے صحن میں تیار کرائی تھی۔ اس کے خاوند کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ دونوں میاں بیوی عابد شب زندہ دار تھے۔ اس محلے کو مغلوں کے وقت میں ٹِلّا کہتے تھے۔ اس دایہ کی حویلیاں اور باغ بھی اسی محلے میں تھے۔ یہ دایہ ۱۱۰۹ھ میں فوت ہوئی اور محمد شکور اس کا بیٹا اس مسجد کا نگران رہا۔ اس کے وقت میں مولوی عصمت اللہ ایک فاضل یہاں درس دیتے تھے۔

جب سلطنت مغلیہ برباد ہو گئی تو باہر کے محلے سب اُجڑ گئے۔ لوگ بھاگ کر شہر کے محفوظ مقامات میں چلے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ایک سنیاسی ہندو جوگی بسنت گر نام اس مسجد پر قابض ہو گیا۔ اس نے ایک طرف شوالہ اور دوسری طرف ٹھاکر دوارہ بنا کر قریب تیس سال اس میں قیام کیا۔ جب انگریزی دور دورہ شروع ہوا تو سائیں مہر شاہ قادری نے لاہور کے چند مسلمانوں کو ساتھ ملا کر بزور اس ہندو جوگی کو بے دخل کر دیا۔ مسجد پھر آباد ہو گئی اور گرد و نواح کی کوٹھیوں کے مسلمان وہاں نماز پڑھنے لگے۔ جب تک سائیں مہر شاہ زندہ رہا اس مسجد کے ایک کوٹھے میں مقیم رہ کر اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کے بعد یہ مسجد انجمن اسلامیہ کی تولیت میں چلی گئی اور اب اوقاف کمیٹی کے انتظام میں ہے۔

یہ مسجد پختہ چونے کی عمارت ہے اور نہایت مضبوط بنی ہوئی ہے۔ تین محرابیں ہیں اور ایک گنبد عالی شان سقف

---

[1] نقوش مکاتیب نمبر صفحہ ۳۲۳
[2] تاریخ حریت اسلام صفحہ ۳۹۳

قالبوتی ہے۔ صحن وسیع ہے۔ کنواں اور حوض پُر کر دیا گیا ہے۔ صحن کے شرق کی طرف دایہ لاڈو کی قبر تھی۔ سائیں مہر شاہ کی قبر بھی تھی جو فرش کے ساتھ ہموار کر دی گئی ہے۔

مسجد دایہ انگا

یہ عالی شان مسجد شاہجہان بادشاہ کے عہد میں دایہ انگا نے ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں تعمیر کرائی تھی۔ دایہ انگا جہانگیر کے دولت خانہ میں رہتی تھی۔ نام اس کا زیب النساء بیگم اور انگا خطاب تھا۔ انگ جسم کو کہتے ہیں اور انگا اس دایہ کو جو شہزادوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ دایہ انگا نے شاہجہان کو دودھ پلایا تھا اور اس کے خاوند کا نام مراد خاں تھا۔

یہ مسجد مغلیہ سلطنت کے وقت بہت رونق پر تھی۔ بہت سی جائداد بادشاہ نے اس کے ساتھ وقف کی تھی۔ مگر زمانہ پلٹ گیا۔ شہر غارت گروں نے لوٹ لیا۔ باہر کی آبادی ویران ہو گئی۔ یہ مسجد کس مپرسی کی حالت میں باقی رہ گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس سے بارود خانہ کا کام لیا جانے لگا۔ انگریزوں نے مسجد خالی کرا کے اسے نزول میں درج کر لیا۔ مسٹر ہنری کوپ مہتمم مطبع لاہور کرانیکل نے سرکار سے اجازت لے کر اس کو اپنی کوٹھی بنا لیا۔ چند سال بعد جب کارخانہ ریل جاری ہوا تو یہ مسجد ریل والوں نے بارہ ہزار روپے میں خرید لی اور اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر دیا۔ منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم نے نومبر ۱۹۰۱ء میں جب اپنا اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو پہلے ہی پرچے میں اس مسجد کے ناجائز استعمال کے خلاف آواز اٹھائی۔ آہستہ آہستہ باقی مسلم پریس نے ہمنوائی و تائید کی۔ آخر لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں مسجد مسلمانوں کو واگذار کر دی۔

یہ مسجد لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۱ کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب ہے۔ اندر باہر سے کاشی کار ہے۔ محرابوں پر بسنتی رنگ کا نہایت عمدہ کام ہے جس پر قرآن پاک کی آیتیں اور درود شریف بخط نسخ تحریر ہیں۔ مسجد کی تین عالی شان محرابیں قالبوتی خوش قطع ہیں۔ دو چھوٹی اور ایک بڑی ہے۔ بڑی محراب کی پیشانی پر "اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، حسنؓ، حسینؓ" تحریر ہیں۔ ایک کتبہ تاریخ کی نشاندہی کرتا ہے:

"بہ اہتمام خود مقبول بہ اتمام رسیدہ"

کتبہ ابراہیم ۱۰۴۵ھ

تمام عمارت خشتی منقش ہے۔ اندر سے بھی مسجد کے تین درجے ہیں۔ سقف قالبوتی اور سقف کے اوپر تین گنبد مدور عالیشان بنے ہیں۔ پہلے اس کے چار مینار تین تین منزلہ تھے۔ اب اگلے دو مینار باقی رہ گئے ہیں۔ پچھلے گر گئے ہیں۔ ایک ایک منزل موجودہ میناروں کی بھی گر گئی ہے۔

اب یہ مسجد آباد ہے اور یہاں ریلوے دفاتر کے اہلکار اور اردگرد کی کوٹھیوں کے مکین نماز ادا کرتے ہیں۔

مسجد خواجہ ایاز

یہ قدیم طرز کی عمارت موضع باغبانپورہ میں خانقاہ مادھو لال حسین کے متصل واقع ہے۔ خواجہ ایاز ایک امیر کبیر اور

فن تعمیرات کا ماہر تھا۔ شاہ جہانی عہد میں نواب علی مردان خان کے ماتحت کام کرتا تھا۔ جب شالامار باغ تعمیر ہوا تو خواجہ ایاز ہی مہر عمارت تھا۔ اس نے اپنی یادگار یہ مسجد چھوڑی اور ایک باغ بھی اپنے نام سے شالامار باغ کے شرق میں احداث کرایا جو اب تک مع چار دیواری پختہ و بارہ دری کے موجود ہے۔

اس مسجد کی تین محرابیں اور تین گنبد عالی شان پختہ ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ مسجد کے چاروں طرف چار چار گز بلند دیوار بنی ہے۔ درمیان میں ایک حوض دس گز مربع اور بیچ میں فوارہ ہے۔ خاص مسجد کی بیرونی دیوار کے دونوں گوشوں میں دو زینے اوپر جانے کے لیے بنے ہیں، درمیانی محراب پر ایک سل سنگ مرمر کی لگی ہے اور اس پر حدیث شریف عربی خط میں لکھی ہے۔ نیز بندہ درگاہ خواجہ محمد ایاز تحریر ہے۔ بیرونی دیوار کے مرغولوں اور بازوؤں پر رنگین پُرتکلف کتبہ ہے۔ ایرِ گنبد و اندرون مسجد بھی سب عمارت رنگین اور منقش ہے۔ زمین پر پختہ فرش ہے۔ جنوب کی طرف دو حجرے پختہ بنے ہیں۔ اس مسجد پر مہر مہنگا کی اولاد کا قبضہ ہے اور یہ اکثر بند رہتی ہے۔

مسجد ستارہ بیگم

میاں سلطان کی سرائے کے مشرق میں ٹیکنیکل سکول کے پاس ستارہ بیگم کی نہایت خوبصورت مسجد تھی۔ یہ ستارہ بیگم شہزادہ دارا شکوہ کی بیوی تھی جو قدسیہ بیگم کہلاتی تھی۔ مسجد فن تعمیر کا نہایت نفیس نمونہ تھی۔ عمارت دو منزلہ تھی جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک خستہ حالت میں موجود تھی۔ نچلی منزل کے دالان اور کمرے جو طلبہ، اساتذہ اور درویشوں کی رہائش کے لیے قالبوتی بنائے گئے تھے، نہایت مضبوط اور آرام دہ تھے۔ ان میں روشنی اور ہوا کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ ہر جگہ بفراغت تمام بیٹھ کر لکھا پڑھا جا سکتا تھا۔ حجروں کے درمیان ایک چاہ کلاں اور ساتھ سرد خانہ تھا۔ اور صحن کے ایک گوشے میں حوض اور حوض کے شمال جنوب میں بلند نشست گاہیں تھیں۔ سقف پر جانے کے لیے زینہ، چھت پر تین گنبد اور چاروں کونوں پر چار مینار تھے بقول نور احمد چشتی کسی مسجد کے نیچے ایسی عمارت دیکھنے میں نہیں آئی۔"[1]

انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں اس جگہ مسٹر اوڈلبی رہا کرتے تھے جو لاہور کرانیکل کے مینجر تھے۔ اس کے بعد یہ عمارت ریلوے کے کسی افسر کے قبضے میں چلی گئی جس نے میاں سلطان کے ہاتھ بیچ دی۔ میاں سلطان نے اینٹوں کے لالچ میں اس شاندار عمارت کا صفایا کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میاں سلطان کا زوال اسی کے بعد شروع ہوا۔ اس پر خدا کا گھر ڈھانے کا یہ وبال پڑا کہ اس کا حال پتلا ہو گیا اور اس کے بعد وہ مالی پریشانیوں کا شکار ہو کر چل بسا

مسجد شہید گنج

لنڈا بازار میں جس جگہ کو اب شہید گنج کہتے ہیں وہاں مزار شاہ کاکو چشتی متوفی ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۲ء مقبرہ میر بیں الملک

---

[1] تحقیقات چشتی۔

عرف میر منو[1] (وفات ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء) اور ایک پختہ مسجد ہوتی تھی جس کے ساتھ حمام بھی تھے۔ مسجد کے تین گنبد اور تین محرابیں تھیں۔ یہ مسجد دارا شکوہ کے خانساماں عبداللہ خاں[2] نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء میں بنوائی تھی۔ بعد میں وہ لاہور کا کوتوال ہو گیا تھا اور اسی مسجد کے قریب نخاس میں جلوس لیا کرتا تھا۔ سکھوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس مسجد اور مقبرہ کو گوردوارہ میں تبدیل کر کے شہید گنج نام دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس جگہ مغلوں کے آخری گورنر نواب میر معین الملک عرف میر منو نے فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں سکھوں کو قتل کیا تھا اور وہ ان کی یاد باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میر منو کا مقبرہ جو بارہ دری کی صورت میں تھا اسی وقت مسمار کر کے اس کی لاش ضائع کر دی تھی مگر باقی اسلامی عمارتیں انگریزوں کے عہد تک کسی نہ کسی طرح برقرار تھیں۔ مسلمان ان کا مطالبہ کرتے تھے مگر سکھ نہیں مانتے تھے۔ آخر ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کی رات کو ماسٹر تارا سنگھ کے مشورے سے اکالی جماعت نے انگریزی کرنیوں اور انگریزی پولیس اور فوج کی حفاظت میں اس مسجد اور مزار شاہ کاکو چشتی کو مسمار کر دیا۔

مسلمان اس واقعہ پر تلملا اٹھے۔ ان کی آنکھوں سے اشکوں کی بجائے خون برسنے لگا۔ وہ جتھے بنا بنا کر مسجد حاصل کرنے کی خاطر شہید گنج کی جانب روانہ ہوئے۔ حکومت نے انھیں روکنے کے لیے سڑک پر خاردار جنگلے لگا دیے۔ مولوی ظفر علی خاں، ملک لال خاں، مولانا سید حبیب اور اس تحریک کے دیگر پُرجوش رہنماؤں کو نظر بند کر لیا اور ۱۹ - ۲۰ جولائی کو کئی سرفروش گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کر دیے۔ اس وقت ایمرسن صاحب پنجاب کے گورنر اور مسٹر ایس پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور تھے جو خود بھی سکھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد سے تقسیم پاک و ہند تک پولیس کی خاص چوکیاں گوردوارہ شہید گنج اور سکھوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ اب بھی یہ جگہ سکھوں کے لیے محفوظ ہے اور مسلمان سپاہی پہرا دیتے ہیں۔

---

۱ - میر منو نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ کا فرزند تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دلیر تھا۔ سکھ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کا مزار ایک بارہ دری کی صورت میں تھا۔ راجہ شیر سنگھ کے عہد میں اس کی قبر اکھاڑ کر اس کی آرامگاہ مٹا دی گئی اور اس کی جگہ شراب کی دکان قائم کر دی گئی۔

۲ - "عبداللہ خاں دراصل سعید خاں بہادر ظفر جنگ کا چوتھا لڑکا تھا۔ اسے اپنے والد کی وفات پر جو شاہ جہان کے پچیسویں سال میں واقع ہوئی، منصب دو ہزاری سے سرفراز کیا گیا۔ وہ شہزادہ اورنگ زیب کے ہمراہ کابل گیا۔ اس کے بعد کابل کا والی بھی مقرر ہوا۔ آخر عہد شاہ جہانی میں شہزادہ سلطان شکوہ کے ساتھ رہا۔ جنگ تخت نشینی کی ابتدا میں سموگڑھ کے مقام پر وہ دارا شکوہ کے ساتھ تھا۔ جب دارا شکوہ لاہور آیا تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ہمراہ ہو گیا اور پھر وہیں رہا۔ ممکن ہے اس نے اپنے قیام لاہور کے دوران یہ مسجد تعمیر کی ہو۔"

(لاہور کے آثار قدیمہ - امروز لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۵۵ء)

مسجد محمد صالح سندھی

یہ قدیم زمانے کی مسجد قلعہ گوجر سنگھ سے جانب شرق نہایت منقطع گنبد دار بنی ہوئی ہے۔ محمد صالح سندھی صوبہ لاہور کے دیوان نے شاہ جہان کے عہد میں تعمیر کرائی تھی۔ سکھوں کے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اس میں بارود بھری رہتی تھی۔ انگریزوں کے عہد میں یہ مسجد خالی ہوئی تو نواب علی رضا خاں نے اس کی مرمت کرائی۔ یہ مسجد اندر باہر سے پختہ ہے۔ اس کی تین محرابیں ہیں، اور تینوں ہی عالی شان گنبد۔ صحن بھی ہے اور چاہ بھی۔ شہر کی بیرونی آبادی کے وقت یہاں محلہ حاجی مولے آباد تھا اور شیخ محمد صالح حاجی مولے کا برادر زادہ اور امیر کبیر تھا۔ اس نے اپنی امارت کے زمانے میں یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ مسجد اب ہسپتال کے احاطے میں آ گئی ہے۔

بادشاہی مسجد

یہ مسجد قلعہ لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری ہے جسے جلو خانہ بھی کہتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے بعد یہ چار دیواری اورنگ زیب کی سرائے کہلاتی تھی۔ روشنائی دروازے کے دائیں بائیں کے حجروں میں شاہی محافظ دستے رہا کرتے تھے۔ جب بادشاہ نماز پڑھنے جاتا یا سواری کے لیے نکلتا تو یہ دستے گرز اور عصا اٹھا کر آگے آگے چلتے۔ بارہ دری اور باغ کی جگہ صرف ایک چبوترا تھا جو قلعہ اور مسجد کو آپس میں ملاتا تھا۔

مسجد کے صدر دروازے میں داخل ہونے سے پیشتر بائیس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ سب سے نچلی سیڑھی کا طول ۱۲۶ فٹ ۶ انچ عرض ۹ فٹ ۴ انچ اور سب سے اوپر والی سیڑھی کوئی ۹۷ × ۴۴ × ۳ فٹ ہے۔ ان سیڑھیوں میں کابلی سنگ ابری استعمال کیا گیا تھا مگر اب تازہ مرمت کے وقت سنگ سرخ لگا دیا گیا ہے۔ سیڑھیوں کے دائیں بائیں حجروں کے آگے خالی چبوترے پر علامہ اقبال اور سر سکندر حیات خاں کی قبریں ہیں۔

دروازہ اپنی شان و شوکت اور رفعت کے لحاظ سے بے عدیل ہے۔ یہ سنگ رخام اور سنگ مرمر سے بنا ہے۔ ڈیوڑھی تقریباً مربع ہے جس کی پیمائش ۶۶ فٹ ۷ انچ ضرب ۶۲ فٹ ۱۰ انچ ہے اوپر دو منزلہ عمارت ہے جس میں کبھی خطیب یا امام وغیرہ رہتے ہوں گے مگر اب تبرکات نمائش کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی محراب کے دونوں جانب نہایت خوب صورت کنگرے بنے ہیں جو سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے ہیں۔ دروازے کے عین وسط میں محراب کی پیشانی پر سنگ مرمر کا ایک تختہ نصب ہے جس پر کلمہ طیبہ اور اس کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت بخط طغرا کندہ ہے:-

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"مسجد ابو الظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی

سنہ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

باہتمام کمترین خانہ زادان فدائی خاں کوکہ"

یہ مسجد عالمگیر کے حکم سے ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء میں تیار کی گئی تھی اور اس پر چھ لاکھ روپیہ سے زیادہ صرف ہوا تھا۔ مسجد کے اخراجات کے لیے ملتان کا خراج وقف تھا۔[1]

ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد وسیع صحن نظر آتا ہے جو تقریباً مربع ہے۔ اس کا طول شمالاً جنوباً ۲۸۲ فٹ ۸ انچ اور عرض شرقاً غرباً ۲۵۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس کا فرش پہلے پختہ اینٹوں کا تھا اور نمازیوں کی سہولت کے لیے سنگ موسیٰ اور سنگ رخام سے مصلے بنے تھے مگر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور اس میں کئی جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اب اینٹوں کی جگہ سنگ سرخ کی سلیں لگا دی گئی ہیں۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس کے مسلمانوں پر اٹلی کی یورش سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان ہے "حضور رسالت مآبؐ میں"۔ یہ نظم مسلمانوں کے ایک اجتماع کے سامنے اسی صحن میں روبرو کر سنائی گئی تھی۔ نظم بانگِ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے اور اس کا آخری بند یہ ہے ؎

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں ۔۔۔ وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کی نماز جنازہ بھی اسی صحن میں ادا کی گئی تھی۔

اس صحن کے وسط میں مربع شکل کا ایک حوض ہے جس کا ہر ضلع ۵۰ فٹ ہے۔ حوض میں پانی ایک نل کے ذریعے اس قدیم کنوئیں سے لایا جاتا ہے جو مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں باہر کی طرف ہے۔ تازہ مرمت کے بعد حوض کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور وضو خانہ صدر دروازے کے دائیں بائیں جانب والے حجروں کے اوپر بنا دیا گیا ہے جہاں ۲۸ ٹونٹیوں کا انتظام ہے۔ پینے کے لیے پانی کے نل علیحدہ لگائے گئے ہیں۔

حوض سے گزر کر ایوان تک دو زینے بلند ایک چبوترہ ۲۲۵ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس سے آگے بڑھو تو مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جسے درگاہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بلند محرابوں اور تین سفید سنگ مرمر کے گنبدوں پر مشتمل ہے۔ جن کے سنہری کلس سورج کی روشنی میں خوب چمکتے ہیں۔ اس دالان کا طول ۲۲۵ فٹ اور عرض ۱۱۵ فٹ ہے۔ اس کی کرسی مسجد کے فرش سے کوئی چھ فٹ بلند ہے۔ چھت نہایت خوب صورت ہے دیواروں پر مختلف قسم کے پتھروں اور رنگوں سے نقاشی اور پچی کاری کی گئی ہے تمام عمارت قالبوتی ہے۔ اس میں لکڑی استعمال نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ "اس قسم کی پرچین کاری یعنی پتھر پر پتھر کے نقوش بھرے گئے ہوں اور پھر اُبھرے ہوئے ہوں دُنیا بھر کی کسی عمارت میں نہیں ملتے"۔

---

[1] خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی۔

سب سے بڑے اور درمیانی گنبد کے نیچے سنگ مرمر کا بنا ہوا نہایت خوبصورت منبر ہے جس پر چڑھ کر خطیب جمعہ اور عیدین کے خطبے پڑھتا ہے۔ مسجد کے اس حصے میں فرش پر مرمر کی سلیں استعمال کی گئی ہیں۔ دیواروں پر موٹی تہ کی استرکاری ہے جس میں بھی نقوش ابھرے ہوئے ہیں۔ ازارہ سنگ ابری کا ہے جس کا حاشیہ کالے اور زرد رنگ کے پتھر سے پچی کاری کیا ہوا ہے۔ ایوان کے منڈیر پر کنگرے اور کونوں پر سنگ مرمر کی شرفہ دار برجیاں ہیں جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔

مسجد کے چاروں کونوں پر چار نہایت بلند مینار کھڑے ہیں جو سب پورے سرخ پتھر سے بنے ہیں۔ یہ مینار اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے اگرچہ سادہ ہیں مگر میلوں سے نظر آتے ہیں اور مسجد کی عظمت اور خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ ہر ایک مینار کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۴ انچ اور سیڑھیاں تعداد میں ۲۰۴ ہیں۔ چوٹیوں پر سنگ مرمر کے گنبد بنے ہیں۔ چھتری والی منزل تنہا ۳۰ فٹ ۹ انچ بلند ہے اور آٹھ آٹھ ہشت پہلو ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے میناروں سے کچھ عجیب نسبت رکھتے اور اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی بھی مینار پر چڑھ کر مقبرہ کے میناروں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین نظر آتے ہیں۔ ایک اوجھل رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مقبرہ کے کسی مینار پر چڑھ کر دیکھا جائے تو شاہی مسجد کے بھی تین ہی مینار نظر آتے ہیں۔ ان میناروں کی چار چار منزلیں ہیں۔ دور باہر کی جانب سے ۶۷ فٹ اور اندر کی جانب سے ۸½ فٹ ہے۔ اوپر والی منزل جس پر گنبد دار چھت ہے سنہ ۱۸۴۰ء کے زلزلہ میں ناکارہ ہو گئی تھیں۔ اس لیے گرا دی گئی تھیں اور میناروں کی بلندی ۱۴۴ فٹ رہ گئی تھی۔ اب تازہ ترین مرمت کے بعد مینار اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور ان پر روشنی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔

یہ مینار لاہور کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کے محاصرہ کے لیے اپنے آدمی متعین کیے تو انھوں نے انہی میناروں سے آتش باری کر کے مہارانی چند کور کی ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔

شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جب سردار ہیرا سنگھ سندھانوالہ نے لاہور کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی انہی میناروں پر زنبورہ توپیں نصب کیں اور قلعہ والوں کو شکست دے کر وزارت حاصل کی۔

سکھوں کے آخری دور میں مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے۔ انگریزوں کے آنے تک مسجد کی حالت نہایت خراب و خستہ ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے مسجد مسلمانوں کو واگزار کی اور اس میں ایک بار پھر خدا کا نام گونجنے لگا۔

اس پر لاہور کے شہری مسلمانوں نے اپنے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کرنے کے لیے ایک سپاسنامہ مرتب کیا جس پر سترہ ممتاز اور سرکردہ شہریوں کے دستخط تھے۔ ان میں قاضی حفیظ الدین، نواب عبدالرحمٰن اور نواب احمد اللہ خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سپاسنامے کے ذریعے مسجد کی بحالی پر حکومت کا شکریہ ادا کیا گیا اور یہ اطلاع بھی دی گئی کہ سید بزرگ شاہ بن قاضی غلام شاہ کو جن کے بزرگ شاہی دفتروں سے اس مسجد کے متولی چلے آ رہے تھے ہر فرقہ و ہر خیال کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر ایک بار پھر مسجد کا متولی مقرر کر دیا ہے۔ سید بزرگ شاہ کے خاندان میں شاہی فرمان اور پرانے دستاویزات اب تک موجود ہیں۔

مسجد کے شمال اور جنوب میں چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں۔ ان حجروں میں وہ طالب علم رہا کرتے تھے جو دور دراز علاقوں

سے تحصیل علم کی خاطر آتے تھے۔ مسجد کے نام پر جو جاگیریں وقف تھیں ان کی آمدنی ان طلبہ کے سامان خورد و نوش پر صرف کی جاتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند اس مسجد میں تشریف لائے انھوں نے طلبہ سے قرآن مجید سنا اور فارسی میں گفتگو بھی کی۔

مسجد کے شرقی دروازے کی ایک منزل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی چند یادگاریں تبرکاً شیشوں میں محفوظ ہیں۔ ان تبرکات کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ سید محمد لطیف مرحوم اپنی کتاب تاریخ لاہور میں فقیر سید عزیز الدین کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ۲۳ جمادی الآخری ۸۰۳ھ کو جب امیر تیمور نے دمشق فتح کیا تو وہاں کے عمائد سادات اس کی خدمت میں زر و جواہر کے ساتھ چند نایاب اور متبرک اشیاء لے کر حاضر ہوئے۔ امیر انھیں حاصل کر کے بہت خوش ہوا۔ پھر یکم ربیع الاول ۸۰۵ھ کو جب اس نے سلطان بایزید یلدرم والئ روم کو شکست دی تو اس نے بھی چند تبرکات امیر کی خدمت میں پیش کیے۔ امیر یہ تمام تبرکات لے کر سمرقند واپس چلا آیا۔

امیر تیمور کی وفات کے بعد یہ تبرکات نسلاً بعد نسلٍ اس کے وارثوں کے قبضے میں رہے۔ بابر انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لایا۔ اس طرح یہ تبرکات یہاں پہنچے۔ جب احمد شاہ ابدالی کے بیٹے کی شادی مغلانی بیگم دختر ملکہ زمانی و محمد شاہ کے ساتھ ہوئی تو ملکہ زمانی اپنی لڑکی کی رخصتی اور محمد شاہ کی وفات کے بعد ان تمام تبرکات کو لے کر جموں چلی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد جب مغلانی بیگم فوت ہو گئیں اور ملکہ زمانی کی خواہش کے مطابق اس کی لاش افغانستان سے جموں لائی گئی تو ملکہ زمانی کی مالی حالت نہایت مخدوش تھی۔ چنانچہ اس نے یہ تبرکات پیر محمد اور شاہ محمد رضا کے ہاتھ اسی ہزار روپے میں فروخت کر دیے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی رقم کے بموجب یہ تبرکات آپس میں تقسیم کر لیے اور اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔ چنانچہ پیر محمد یہ تبرکات لے کر رسول نگر (موجودہ رام نگر) چلا گیا۔ سمت ۱۸۴۰ بکرمی میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے والد سردار مہا سنگھ نے رسول نگر پر حملہ کیا تو دیگر مال و اسباب کے ساتھ یہ تبرکات بھی اس کے قبضے میں آئے۔ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء میں جب شاہ زمان کے حملے کی افواہ ملک میں گرم ہوئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا تمام قیمتی سامان اور یہ تبرکات اپنی رانی مہتاب کور کے ہمراہ ٹکیریاں بھیج دیے۔ یہ قلعہ اس وقت اس کی خوش دامن مائی سدا کور کے قبضے میں تھا۔ ایک دن اچانک اس قلعہ میں آگ لگ گئی۔ تمام مال و اسباب جل گیا مگر وہ کمرہ جس میں یہ تبرکات محفوظ تھے آگ کی لپیٹ سے محفوظ رہا۔ حالانکہ اس کی نچلی منزل میں آتش گیر مادہ جمع تھا۔ تمام مسلمان اور سکھ یہ واقعہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اس دن سے ان کا احترام اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جب شاہ زمان کابل چلا گیا تو مہاراجہ نے اپنا تمام مال و اسباب مائی سدا کور سے طلب کیا۔ اس نے ان تبرکات کے سوا سب کچھ لوٹا دیا۔

مائی سدا کور کی وفات کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ ان کا وارث ہوا۔ وہ ان تبرکات کو چونڈہ کے قلعہ میں لے گیا جہاں وہ اسوج سمت ۱۹۰۰ بکرمی تک محفوظ رہے۔ جب مہاراجہ شیر سنگھ مارا گیا تو اس کی جائیداد خالصہ سرکار کے قبضے میں آئی۔ سردار ہیرا سنگھ وزیر نے ان تبرکات کو اپنی حویلی میں منتقل کر لیا۔ اور جب راجہ ہیرا سنگھ بھی مقتول ہوا تو یہ تبرکات قلعہ لاہور میں آ گئے۔ سردار جواہر سنگھ وزیر نے اپنے ایک معتبر سائیس کو ان کا مہتمم مقرر کیا۔ آخر مہارانی جنداں کے حکم سے یہ تمام تبرکات شاہی توشہ خانہ میں جو قلعہ کی خواب گاہ میں تھا جمع کر دیے گئے۔ حافظ بدر الدین وہاں ہر روز دیا جلا کر پھول چڑھایا کرتا تھا۔

فتح پنجاب کے بعد یہ تبرکات سرکار انگلشیہ کی معرفت مسلمانوں کو واگذار کیے گئے۔

تبرکات کا وہ حصّہ جو محمد رضا کے قبضہ میں تھا، فقیر سیّد نورالدین نے خرید کر مسلمانوں کے حق میں وقف کیا چنانچہ یہ تمام تبرکات اس دن سے شاہی مسجد کی ڈیوڑھی پر آج تک موجود ہیں۔

ان تبرکات میں جن کی مجموعی تعداد ۲۳ ہے، ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا سبز عمامہ مع ٹوپی ہے۔ ایک سبز جبّہ، سفید پاجامہ، نعلین، نقش قدم مبارک، سفید علم جس پر قرآن پاک کی آیات منقوش ہیں، حضرت علیؓ کے قرآن پاک کا سیپارۂ اوّل بخط کوفی، عمامہ مع کلاہ اور ایک تعویذ اور حضرت سیدۃ النساءؓ کا رومال، جائے نماز، امام حسینؓ کا صندلی عمامہ، کلاہ، علم اور رومال خون آلودہ۔ جناب غوث الاعظمؒ کا عمامہ، لحاف اور جائے نماز۔ کربلائے معلّٰی کی سرخ مٹی اور خواجہ اویس قرنیؓ کا شکستہ دانت اور دیگر بہت سے تبرکات بھی شامل ہیں۔

مسجد کا مہتمم عمارت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، فدائی خان کوکہ تھا جس کا اصل نام مظفر حسین تھا اور وہ اورنگ زیب کا کوکلتاش دِرضاعی بھائی) تھا۔ وہ ۱۳ سنہ جلوس میں لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔ ۲۱ سنہ جلوس میں وہ بہار کی گورنری کے لیے نامزد ہوا مگر قضا نے آن گھیرا۔ چنانچہ وہ ۹ ربیع الآخر ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء کو رحلت کر گیا۔ فدائی خان کو عمارات سے دلی شغف تھا۔ اس نے لاہور میں اپنے رہنے کے لیے نہایت عظیم الشان حویلی بنوائی تھی۔ اکثر ناظمان لاہور اسی میں قیام کیا کرتے تھے۔

مورخین نے اس مسجد کی تاریخ بنا کے متعلق عجیب عجیب قصے بیان کیے ہیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جس مقام پر یہ مسجد واقع ہے یہاں دراصل شہزادہ دارا شکوہ کا وہ کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر ویدانت اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ تھا جب دارا شکوہ قتل ہوا تو اورنگ زیب نے ان کتابوں کو اکبرآباد طلب کر کے مختلف علما میں تقسیم کر دیا۔ اور کتب خانہ کی عمارت کو جو بالکل ایک شوالہ کی طرز پر بنی ہوئی تھی گرا دیا اور اس کا سامان لے کر یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اس میں شک نہیں کہ دارا شکوہ کو سنسکرت اور علم ویدانت سے دلی لگاؤ تھا مگر اس کا قیام زیادہ تر دہلی یا آگرہ میں رہا کرتا تھا۔ لاہور وہ شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس کا کتب خانہ لاہور میں موجود تھا۔ تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔

جج محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کے مزار کی عمارت کے لیے یہ پتھر جمع کیا تھا جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے یہ پتھر مسجد کی عمارت میں صرف کر دیا اور ایک سادہ سی عمارت حضرت میاں میرؒ کے مزار پر بنا دی۔ یہ بیان بھی قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ اگر دارا شکوہ کو حضرت میاں میرؒ سے دلی عقیدت تھی تو عالمگیر بھی آپ کے روحانی کمالات کا معترف تھا بلکہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا کرتا تھا۔ پھر حضرت میاں میرؒ تیموریوں کی خانہ جنگی سے بہت عرصہ پہلے یعنی ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں وفات پا چکے تھے اور آپ کے مزار کی عمارت شاہجہانی دور کی عمارتوں سے ملتی جلتی ہے۔ وہی نقش و نگار ہیں اور وہی رنگ آمیزیاں حالانکہ عالمگیری دور کی عمارات اس سے بالکل مختلف طرز کی ہیں اور یہ مسجد تو آپ کی وفات کے چالیس سال بعد ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں تعمیر ہوئی۔

ایک اور تاریخ کا بیان ہے کہ دارا شکوہ نے اپنے محل سے لے کر حضرت میاں میرؒ کے مزار تک ایک سڑک سرخ پتھر کی تیار کرائی تھی۔ جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو اس نے سڑک کھدوا کر اسی پتھر سے یہ مسجد تیار کرائی۔ یہ بیان بھی یار لوگوں کا تراشا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر نے خاص اس مسجد کے لیے تمام پتھر اجمیر اور جے پور سے خود منگوایا تھا اسے بڑے شوق سے بنوایا تھا اور اس میں نماز بھی ادا کی تھی۔

اس مسجد کی امامت و خطابت پر ہمیشہ حنفی عقیدہ کے نامور عالم مامور رہے ہیں۔ عالمگیر کے بیٹے بہادر شاہ ثانی کے عہد میں حاجی یار محمد اس کے خطیب تھے۔ وہ فقہ و فتنہ کے بہت بڑے فاضل تھے۔ بہادر شاہ نے اپنے برس کے چوتھے سال ۱۱۲۱ھ / ۱۷۱۰ء میں بعض امامیہ علما کے ایما سے حکم دیا کہ خطبے میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ داخل کیے جائیں۔ اس حکم کی ہر جگہ مخالفت ہوئی۔ احمد آباد گجرات، دہلی، آگرہ، کشمیر اور لاہور میں حالات اتنے خراب ہوئے کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

سنہ ۱۷۱۱ء میں جب بہادر شاہ راجپوتوں اور سکھوں کی بغاوت فرو کر کے لاہور آیا تو اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر حاجی یار محمد، محمد مراد اور چند دیگر علما کو قلعہ لاہور کے تسبیح خانے میں طلب کیا۔ حاجی یار محمد نے نہایت بے باکی سے بادشاہ کے دلائل رد کیے۔ بادشاہ طیش میں آ گیا مگر حاجی یار محمد نے کہا :۔

"عالی جاہا! میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ چار چیزوں کی دعا کرتا رہا ہوں۔ اوّل یہ کہ وہ مجھے علم کی دولت عطا کرے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوم وہ مجھے قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت نصیب کرے۔ سوم حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف فرمائے اور چہارم یہ کہ مجھے شہادت کی موت مارے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری پہلی تینوں آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں۔ صرف ایک تمنا باقی رہ گئی ہے۔ خدا کرے کہ بادشاہ سلامت کے ہاتھوں یہ بھی پوری ہو جائے۔"

حاجی صاحب کی اس حق گوئی پر بادشاہ نے انھیں گرفتار کر کے آگرہ بھیج دیا۔

اسی گڑبڑ میں رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو گیا۔ بادشاہ نے جمعہ کے روز شہزادہ عظیم الشان کو ایک خطیب کے ساتھ جامع مسجد بھیجا کہ جدید خطبہ وہاں پڑھا جائے مگر خطیب نے ابھی مسجد میں قدم ہی رکھا تھا کہ کسی نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے اسلام خاں کو حکم دیا کہ وہ مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر شہر جائے اور خطیبوں کو مجبور کرے کہ وہ خطبہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق پڑھیں۔ لیکن یہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۷۱۱ء کو خطبہ اسی پرانے طریقے سے پھر پڑھا گیا جس طرح عالمگیر کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ اس پر اس نے سات سرکردہ مولویوں کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ لوگ اور بھی مشتعل ہوئے یہاں تک کہ بادشاہ نے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ رمضان شریف کے آخر میں اپنا حکم واپس لے لیا چنانچہ عید الفطر کا خطبہ پہلے کی طرح بڑی شان سے پڑھا گیا۔

سکھوں کی عملداری میں یہ مسجد ضبط سرکار ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے جب اسے مسلمانوں کو واگذار کیا تو مولوی غلام محمد بگہ والے اس کے امام مقرر کیے گئے۔ وہ فقہ، حدیث، اصول اور معانی کا درس بھی دیتے تھے اور دور دور سے تشنگانِ علم سیراب ہونے کے لیے آتے تھے۔ مولوی صاحب بگہ (بھیرہ ضلع شاہ پور) کے رہنے والے تھے۔ آخری عمر میں اپنے وطن چلے گئے تھے۔ وہیں

انتقال ہوا۔ مولوی محمد ذاکر مرحوم جو اسلامیہ ہائی سکول لاہور میں مدرس اور بڑے زاہد و پرہیزگار تھے، انہی کے داماد تھے۔
ہمارے عہد میں مولوی محمد احسن رام پوری اور ان کے بھائی مولوی ریحان حسین بھی بہت نامور خطیب ہوتے ہیں۔ آجکل
مولانا غلام مرشد خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سکھوں کے غلط استعمال کی وجہ سے مسجد کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اس کا قبضہ مسلمانوں کو سونپا تو یہ کافی مرمت طلب تھی۔ فرش نماز پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۸۶۶ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد کی صفائی اور درستی کی طرف توجہ کی اور ۱۸۶۹ء میں خان بہادر برکت علی خاں مرحوم کی تحریک سے انجمن اسلامیہ قائم ہوئی جس نے مسجد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر چندے کی اپیل کی۔ ۱۸۷۶ء میں ہزاروں روپے کے صرف سے فقط دروازہ درست ہو سکا۔ اگلے سال حکومت نے پانچ ہزار روپیہ اس شرط کے ساتھ مرمت فرمانا منظور کیا کہ اس کا دو چند اس ملک کے لوگوں سے بطریق چندہ جمع کیا جائے۔ چندہ دینے والوں کی فہرست میں مسلمانوں کے علاوہ یہ نام بھی ملتے ہیں۔

"راجہ ہرنبس سنگھ راں کے چندے سے بڑھ کر کسی شخص واحد کا چندہ اس فہرست میں نہیں۔ پنڈت موتی لعل۔ پنڈت بدری ناتھ۔ منشی ہر سکھ رائے مالک اخبار کوہ نور۔ لالہ نہال چند وغیرہ۔"[1]

ایڈورڈ ہفتم جب شہزادگی کے زمانے میں یہاں تشریف لائے تو انھوں نے بائیس ہزار روپیہ مسجد کی مرمت کے لیے دیا۔ دس ہزار روپیہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے بھی ملا۔

لارڈ کرزن نے اپنے عہدِ حکومت (۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء) میں جب محکمہ آثار قدیمہ قائم کر کے پرانی عمارتوں اور قدیم یادگاروں کی حفاظت و نگہداشت کا بیڑا اٹھایا تو تین لال ٹینیں اس مسجد کو اپنی طرف سے عنایت کیں جن میں سے بڑی اب تک مسجد کے صحن میں لگی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں حکومت نے چوراسی ہزار روپیہ کچھ مرمت پر صرف کیا۔ ۱۹۱۲ء میں بیگم صاحبہ بھوپال نے اس مسجد کو دیکھا اور چھ ہزار روپیہ مرمت فنڈ میں عطا کیا۔ عوام بھی حسب توفیق اس میں حصہ لیتے رہے۔ اور فرش کا کچھ کچھ حصہ درست ہوتا رہا مگر یہ فرش پرانے فرش کے مطابق پختہ اینٹوں سے بنایا جاتا تھا اور اس کی رفتار اتنی سست تھی کہ پانچ دس سال میں جتنا حصہ بنتا تھا موسمی تھپیڑوں سے اس سے زیادہ اور مرمت طلب ہو جاتا تھا۔ آخر ایک وقت آیا کہ بعض بعض میناروں کو خطرناک سمجھا جانے لگا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ وسیع پیمانے پر مسجد کی مرمت کا بندوبست کیا جائے۔

۱۹۳۹ء میں مسجد کی خستہ حالی کے پیشِ نظر پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کرایا جو اکیس برس کی لگاتار محنت کے بعد ۱۹۶۱ء کے آغاز میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انھوں نے اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلمان زمینداروں پر خاص ٹیکس عائد کیا۔ ابتدا میں یہ کام محکمہ آثار قدیمہ کو سونپا گیا لیکن بعد ازاں

---

[1] اقتباس از مضمون "اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار" از قلم زدہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی مطبوعہ رسالہ "اردو" بابت اپریل ۱۹۳۵ء۔

ی محکمۂ تعمیرات عامہ کو منتقل کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد یہ کام صوبائی محکمۂ تعمیرات نے انجام دیا۔

اس عرصہ میں ... کی مرمت اور تزئین و آرائش۔ لاؤڈ اسپیکر اور روشنی کے جدید انتظامات، غسل خانوں اور وضو خانوں کی معمولی کنوؤں کی بجائے ٹیوب ویل سے پانی کی بہم رسانی اور دیگر مفید تبدیلیوں پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں۔ یہ رقم مسجد کی اصل لاگت سے دس گنا زیادہ ہے مگر اس سے مسجد کو ایک دفعہ پھر نئی زندگی نصیب ہو گئی ہے اور عمارت اپنی عمر سے جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس مسجد کی دیکھ بھال پہلے انجمن اسلامیہ پنجاب کرتی تھی۔ اب صوبائی محکمۂ اوقاف نے اس کا انتظام سنبھال لیا ہے اور ملحقہ املاک بھی اپنے قبضے میں کر لی ہے۔

لاہور کی بادشاہی مسجد وسعت کے لحاظ سے دنیا کی تمام مساجد سے بڑی ہے اس میں کم و بیش ستر پچھتر ہزار نمازی بیک نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اس نے لاہور کو عیدگاہ کی ضرورت سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔

مسجد کہنہ قصاب خانہ والی

قصاب خانہ ایک بہت بڑا محلہ شہر کے باہر محلہ گنج و تیلی پورہ کے شمال مغرب کی طرف آباد تھا جس کی حدود خانقاہ میاں وڈا تک تھیں۔ اب صرف یہ مسجد اس محلے کی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ اس مسجد کے تین گنبد ہیں، ایک بہت بڑا بیچ اور دائیں بائیں والے ہیں منقش قالبوتی ہے اور تین در دروازے محرابی مرغولی۔ اندر مسجد کے دیواروں پر استرکاری ہے۔ فرش پختہ ہے۔ مسجد کا صحن بہت وسیع تھا جو صحن پختہ تھا جس کی اینٹیں کرنیل گلاب سنگھ نے جو کورٹ والی پلٹنوں کا افسر تھا اکھڑوا کر اپنے ہاں لگوا لیں اور مسجد میں بارود ذخیرہ کی۔ سکھی سلطنت کے بعد جب یہ مسجد خالی ہوئی تو میاں احمد دین سجادہ نشین دربار میاں وڈا نے پھر قبضہ کر لیا اس میں بنا ... میاں جان محمد جو اس مسجد میں درس پڑھاتے تھے وہ میاں وڈا کے مرید تھے۔ قبر اس کی بجانب ایک حجرہ چار دیواری میں ہے۔ یہ جان محمد پرانے فضلا میں بہت مشہور تھے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے۔

مسجد شاہ چراغ

سید عبدالرزاق بن سید عبدالوہاب گیلانی نام کے ایک بزرگ جن کا خطاب شاہ چراغ تھا، قصبہ اُچ علاقہ ریاست ...ہور سے آکر قصبہ ستگھرہ ضلع منٹگمری میں اور وہاں سے لاہور میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ چونکہ ان کا سلسلۂ نسب پیران پیر سے ملتا تھا، لوگ ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ اس موقع پر جہاں اب ان کا مقبرہ ہے، محلہ لنگر خان بلوچ واقع تھا۔ ... کا مرید تھا۔ ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء کو ان کی وفات کے بعد عالمگیر کے حکم سے یہیں ان کا مقبرہ تعمیر ہوا۔

خان بہادر زکریا خاں کی والدہ بھی اس خاندان کی مریدہ تھیں، انھوں نے مقبرہ کے مغرب کی سمت یہ عالی شان مسجد ... اور وصیت کی کہ میری قبر اس جگہ ہو اور میرے زیور سے مسجد کی تعمیر کی جائے۔ مسجد پختہ جو نہ رنگ تھی جس کی پانچ عالی شان ...ب اور پانچ گنبد تھے۔ انگریزی عملداری سے قبل اس مسجد میں سکھوں نے میگزین ڈال رکھا تھا۔ انگریزوں نے پہلے پہل اس

کوٹھی کے طور پر استعمال کیا اور ڈپٹی کمشنر یہاں رہتے رہے۔ پھر اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر قائم ہو گیا۔ بعد میں سیشن جج بھی یہاں بیٹھتے رہے۔ جب مسجد شہید گنج کا قضیہ شروع ہوا تو حکومت نے مسلمانوں کی تالیف قلوب کی خاطر اس مسجد کو واگذار کر دیا۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور اس کی مرمت و توسیع بھی ہوئی ہے۔

مسجد نقیباں

شاہی وقتوں کی یہ پرانی مسجد قلعہ گوجر سنگھ کے گوشہ شمال مغرب میں موجود ہے۔ اس کی تین محرابیں اور تین گنبد ہیں۔ تینوں محرابیں قالبوتی منقش ہیں۔ سقف بھی قالبوتی خشتی ہے۔ درمیانہ محراب کے اوپر جو کتبہ ہے اس میں آیت الکرسی لکھی ہے۔ صحن میں پختہ فرش ہے۔ سکھوں کی عملداری میں اس مسجد میں بارود بھری رہتی تھی۔ انگریزوں نے بارود نکال کر مسجد خالی کی تو صوبہ شاہ نقیب نے دعویٰ کر کے مسجد واگذار کرا لی۔

یہ مسجد عہد بہادر شاہ میں محمد واصل نام ایک امیر نے جو سہارنپور کا رہنے والا تھا اور دہلی سے شاہی خدمت کے لیے لاہور میں متعین تھا بنوائی تھی۔ اس کے بعد اس کی اولاد صوبہ لاہور کے پاس نقابت پر مامور رہی۔ اس سبب سے یہ مسجد نقیبوں کی مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔

مسجد نواب زکریا خاں

مادھو لال حسین کے مزار کے مغرب کی سمت نواب زکریا خاں صوبہ لاہور کی تعمیر کردہ یہ مسجد موجود ہے۔ مسجد کے شرق میں چاہ کلاں چرخی دار اور غسل خانے ہیں۔ صحن کا فرش پختہ ہے۔ صحن کے گرد قد آدم دیوار ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب پر بخط ثلث کاشی کار آسمانی رنگ میں بسم اللہ و کلمہ شریف لکھا ہے۔ شمالی محراب پر بھی ایک کتبہ کاشی کار ہے جس میں یہ اشعار لکھے ہیں ؎

خواست در دور شاہ ملک پناہ — شاہ ہندوستاں محمد شاہ
عالم و عادل و سخیٔ زماں — در صف معرکہ چو شیر ژیاں
زبدۂ بارگاہ او نواب — زکریا خاں صوبۂ پنجاب
بخواہش اگرچہ جمشید است — ذرہ در تن فتادہ چوں بید است
نیک نام آنکہ نیک نامیٔ او — ہمچو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد ز خود بنا بکند — عالی و خوب و خوشنما بکند
محض بہر خدا کند ایں کار — تا نمازی شود نماز گزار

باز ہر چہ ثواب نہاں آید
بسوئے بانیش شود عابد

جنوبی محراب پر بھی ویسا ہی خوشنما کاشی کار کتبہ ہے جس میں یہ اشعار ہیں ؎

یارب از فضل خود نگاہش دار — از شکستن تو در پناہش دار
کرد احداث مسجد محکم — نیز خوش دور جاہ مستحکم
نزد درگاہ صاحب عرفان — واقف سر حضرت رحمان
آنکہ معروف شد بہ لال حسین — خاک نعلین اوست سرمہ عین

مسجد کی تاریخ بنا مندرجہ ذیل قطعہ سے برآمد ہوتی ہے ؎

چو این سجدہ گہ از پئے خاص و عام — بنا یافت از سرورِ نیک نام
ز تاریخ او ہر کہ جوید شمار — بداند ہزار و صد و چہل و چہار
۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء)

مسجد آباد ہے ۔

مسجد بیگم پورہ

لاہور سے شالامار باغ کو جاتے ہوئے راستے میں انجنیئرنگ کالج کے قریب بیگم پورہ کی آبادی واقع ہے جس کے بہت سے حجرے، مقبرے اور مکانات اب تک موجود ہیں۔ یہ سب خان بہادر زکریا خاں صوبہ لاہور کے خاندان کے ہیں۔ نواب خان بہادر کی والدہ بیگم جان نے یہاں محلات اور باغ بنوائے اسی کے نام پر یہ بیگم پورہ مشہور ہے۔

انھیں میں ایک عالی شان کاشی کار مسجد بھی ہے جس کے تین در محرابی مقطع خوبصورت بنے ہیں۔ محرابوں پر کلمہ طیبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے :-

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الموت — عجلوا بالتوبۃ قبل الفوت

گوشہ جنوب مغرب میں پختہ زینہ مسجد کے اوپر جانے کے لیے ہے۔ چاروں گوشوں پر چار مینار کاشی کار رنگ سبز و بسنتی ہیں اور مسجد کی سقف کے درمیان نہایت خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے۔ مسجد کا منبر سنگِ مرمر کا تھا جو سکھوں نے لوٹ لیا۔

سکھوں کے وقت اس آبادی پر بڑے بڑے صدمے آئے۔ جو شخص قابض ہوا وہ اس کی عمارات گرا کر اینٹ پتھر لے جاتا رہا۔ سردار گوجر سنگھ نے یہاں کی عمارات گرا کر قلعہ گوجر سنگھ آباد کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت میں پہلے خزانہ نام افسر توپ خانہ اس پر قابض ہوا اور اس نے اس میں زمیندار آباد کر کے گاؤں کی صورت بنا دی۔ چند سال بعد راجہ سنسار چند کانگڑہ سے لاہور آیا تو مہاراجہ نے یہ جگہ اسے رہنے کے لیے مرحمت کی۔ وہ چند ماہ اس میں رہا اور جاتی دفعہ یہ جگہ اپنے برہمنوں کو بخش گیا۔ انھوں نے بہت سی قبریں گرا دیں۔ پتھر اتار لیے اور اینٹیں فروخت کر دیں۔ اس کے بعد ویسا سنگھ پسر لہنا سنگھ مجیٹھیہ نے یہ جگہ برہمنوں سے لے لی اور ان کو معاوضے میں دوسری جگہ دے دی۔ انہی دنوں نواب غازی خاں جو خان بہادر زکریا خاں کا وارث تھا کابل سے آیا اور دعویدار ہوا مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سمت ۱۸۹۵ بکرمی میں جرنیل گلاب سنگھ پھوونڈیہ کی فوج کی چھاؤنی بیگم پورہ کے پاس مقرر ہوئی۔ جرنیل گلاب سنگھ نے مسجد کو اپنا مسکن بنایا۔ اور

ہزاروں روپیہ کی اینٹیں ان مکانات سے کھدوا کر چھاؤنی کی تعمیر میں لگائیں۔ اور مسجد کی چھت پر اپنے رہنے کے لیے کوٹھی بنائی۔ اتنے انقلابات اور لوٹ کھسوٹ کے باوجود مسجد کے تینوں دروں کے اوپر اور راست وچپ جو کاشی کا کام ہے اب تک تازہ و خوش رنگ نظر آتا ہے۔ درمیانی محراب کی پیشانی پر ایک سل سنگ مرمر کی لگی ہے جس پر کلمہ شریف کندہ ہے اور جنوب و شمال کی دونوں محرابوں کے اندر دو حدیثیں لکھی ہیں۔ آج سے قریباً اسی برس قبل رائے کنہیا لعل مصنف تاریخ لاہور نے سرکار کی طرف سے اس مسجد کی مرمت کرائی تھی۔ مسجد اب تک آباد ہے۔ اس کے قریب دار القرآن کی عمارت بن گئی ہے جس کی وجہ سے مسجد میں اور بھی رونق ہو گئی ہے۔

سنہری مسجد

یہ مسجد لاہور کے نہایت پُر رونق حصے ڈبی بازار اور کشمیری بازار کے وسط میں نہایت مقطع اور خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ تینوں بڑے گنبد اور چھوٹی برجیاں طلائی ہیں اور سونا تانبے کے تختوں پر ایسی خوبصورتی اور مضبوطی سے چڑھایا گیا ہے کہ مدت مدید گزر جانے کے باوجود سونے میں ابھی تک وہی چمک دمک موجود ہے۔ مسجد کی تحتی عمارت نہایت مضبوط ایک منزل اونچی کرسی پر ہے۔ نیچے تین طرف دکانیں ہیں جن کی آمدنی مسجد کے ضروری اخراجات میں صرف کی جاتی ہے۔ مسجد کے چاروں طرف بازار ہے اور درمیان میں اس کی عالی شان اور مطلا عمارت نہایت مطبوع و دل پسند کھڑی ہے۔

اس مسجد کا بانی نواب سید بھکاری خاں تھا جو محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے میر معین الملک عرف میر منو کے ماتحت نائب صوبہ پنجاب و سرہند کے عہدے پر ممتاز تھا، یہ شخص نہایت دیندار، سخی، فقیر دوست، ناظم اور عالم و فاضل تھا۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگ میراں سید جھیک چشتی سے خاص ارادت تھی ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء میں قتل کر دیا گیا۔

جس جگہ اس مسجد کا بیرونی زینہ اور دروازہ ہے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد پہلے سے موجود تھی۔ علما کی مخالفت کے باعث نواب اسے گرانے کی جرأت نہ کر سکا۔ ناچار دو طرفہ راستہ مسجد کو ڈیے کر دونوں طرف زینہ بنا دیا گیا جو نہایت ناموزوں تھا۔ انگریزی عملداری میں کپتان نسبٹ صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور نے وہ پرانی مسجد خورد جو بے آباد پڑی رہتی تھی گروا کر شرقی دروازہ مسجد کا بنوا دیا۔ زینہ بھی شرقی تجویز ہو گیا اور وہ دو طرفہ قدیم زینہ گرا کر زمین اس کی صحن مسجد میں شامل کر دی۔ اس کارروائی سے مسجد کی زینت بہت بڑھ گئی۔ اب اس جدید دروازے کے ذریعے مسجد کی اندرونی محراب دُور سے نظر آتی ہے۔

یہ مسجد ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں تعمیر ہوئی۔ یہی سن بیرونی محراب مسجد پر آیت الکرسی کے نیچے لکھا ہے۔ مسجد میں سنگ مرمر کے اور بھی کئی کتبے نصب ہیں۔ دروازے پر جو کتبہ لگا ہے اس میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے:۔

"یا بھیکیہ مسجد قلبی و انت فیہ مقیم"

مسجد کی تینوں محرابیں اور تینوں گنبد مقطع و بلند ہیں۔ گوشوں پر چھوٹے چھوٹے مینار اندر باہر سے منقش استر کار ہیں۔ صحن کے اندر پختہ دروازہ۔ حوض سنگین، چاہ آبدار بنا ہوا ہے۔ اس مسجد کی آبادی سکھوں کے وقت میں بھی بدستور رہی۔ صرف تھوڑے عرصے کے لیے اس پر اکالیوں نے قبضہ کر کے گرنتھ رکھ دیا تھا اور اسے باؤلی کے محال میں شامل کر لیا تھا لیکن بعد میں مسلمانوں کی عرض داشت

پہلے سے واگذار کر دیا گیا۔ دکانیں پھر بھی انگریزوں کے وقت تک ضبط رہیں جو نواب نوازش علی خاں و خان بہادر محمد برکت علی خاں کی کوششوں سے ہیرٹن صاحب لفٹننٹ گورنر پنجاب نے واپس کیں۔ اب یہ مسجد نہایت آباد ہے۔ اس کا انتظام پہلے انجمن اسلامیہ کے ہاتھ میں تھا۔ اب اوقاف کمیٹی کرتی ہے۔ وہی دکانوں کے کرائے وصول کرتی ہے اور وہی مسجد کے خطیب مؤذن اور دوسرے خدمت گاروں کو تنخواہ دیتی اور دیگر ضروری انتظامات کرتی ہے۔

محمد امین کی مسجد

بی بی پاک دامناں کے مزار کے پچھواڑے ایک بہت بڑی مسجد ہے جو آج کل خستہ حالت میں ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں ایک بڑا اور دو چھوٹے۔ دروازے کی ڈاٹ پر عربی اور فارسی کے کتبے ہیں جو زرد رنگ کی روغنی ٹائلوں پر نیلے رنگ سے نہایت خوبصورت لکھے ہوئے ہیں۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لیے شمال اور جنوب میں پختہ سیڑھیاں بنی ہیں۔ مسجد کا فرش بھی پختہ اینٹوں کا ہے۔ شمالی محراب پر جو کتبہ ہے اس میں یہ آیت لکھی ہے :۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ
ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

درمیانی محراب پر یا فتاح، کلمہ طیبہ اور یہ حدیث شریف لکھی ہے :۔

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الموت

جنوبی محراب پر یہ کتبہ ہے :۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

یہ مسجد محمد امین بیگ نے بنوائی تھی جو نواب زکریا خاں صوبہ لاہور کے دربار میں ایک امیر تھا جس زمانے میں نواب بیگم پورہ والی مسجد بنوائی، اسی زمانے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی اس مسجد کی ساخت اور روغنی کام کی بناوٹ بالکل بیگم پورہ والی مسجد سے ملتی جلتی ہے۔ مسجد کے مشرق میں محمد امین بیگ نے باغ بھی لگوایا تھا جس کا اب کوئی نشان نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے وہاں کاشت ہوتی تھی۔ اب عمارتیں بن گئی ہیں۔ محمد امین بیگ کی اولاد موچی دروازہ کے اندر چوہٹہ میں آباد تھی۔[1]

مسجد موراں طوائف

یہ مسجد شاہ عالمی دروازے کے اندر بازار پاپڑ منڈی میں واقع ہے بانیہ اس کی موراں طوائف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محبوبہ تھی جس پر مہاراجہ اتنا مہربان تھا کہ اس کے نام کا سکہ تیار کیا۔ اس نے اپنے اقتدار و اختیار کے زمانے میں یہ مسجد ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء

---

[1] سید محمد لطیف۔ تاریخ لاہور صفحہ ۲۱۲ - ۲۱۳ -

میں تعمیر کرائی۔ یہ رباعی ابتک مسجد کے بیرونی دروازے پر لکھی ہوئی موجود ہے ؎

بفضلِ ایزدِ دارائے افلاک
چو موران مسجدے آراست برخاک
بتاریخ بنائش گفت ہاتف
شدہ تعمیر للہ مسجد پاک
۱۲۴۴ھ

مسجد سر بازار بجانب شمال بنی ہے۔ دروازہ بھی اسی طرف ہے۔ کرسی بہت بلند ہے۔ زینہ اور دروازے کے شرق و غرب دونوں طرف دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد پر صرف ہوتا ہے۔ دکانوں کے اوپر نشست گاہیں اور حجرے بنے ہیں۔ صحن کشادہ ہے۔ ایک کونے میں چاہ و غسل خانہ و حجرہ ہے۔ عمارت پختہ چونہ گچ ہے۔ تین محرابیں اور قالبوتی چھت کے اوپر تین گنبد مدور متعلق بنے ہیں جن پر سبز رنگ کے کلس لگائے گئے ہیں۔

جب یہ مسجد بن کر تیار ہوئی تو مہاراجہ کے حکم سے امامت مولانا غلام رسول و غلام اللہ کے سپرد ہوئی کیونکہ اس وقت لاہور میں ان کی ٹکر کا کوئی مولوی اور مدرس نہ تھا، جب وہ دونوں اکابر اس مسجد میں قیام پذیر ہو کر درس دینے لگے تو مسجد کی بہت شہرت ہوئی۔ اور دور دور سے طالب علم یہاں آنے لگے سکھوں کے زوال تک یہ مدرسہ جاری رہا۔ جب مولوی غلام رسول اور مولوی غلام اللہ فوت ہو گئے تو انگریزی عملداری میں یہ مدرسہ بند ہو گیا۔

مولوی غلام رسول کا انتقال ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوا "بادیٔ نیک نظر" مادہ تاریخ ہے[1]۔ ان کا ایک ہی بیٹا خلیفہ غلام یٰسین تھا جو نوجوانی میں فوت ہو گیا۔

مولوی غلام اللہ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں فوت ہوئے "مرجع الفضلا" ان کا مادۂ تاریخ ہے[2]۔ ان کے پانچ صاحبزادوں میں سے خلیفہ احمد دین و خلیفہ حمید الدین نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ موخر الذکر بہت عالم اور فاضل تھے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے بانیوں میں سے تھے۔ خان بہادر خلیفہ عماد الدین انسپکٹر مدارس انہیں کے فرزند تھے جو ۱۱ راگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں فوت ہوئے ہمارے عہد کے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ایم اے۔ ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لاء اس نامور خاندان کے ایک روشن ستارے تھے۔ وہ خلیفہ عماد الدین کے صاحبزادے، انجمن حمایت اسلام کے صدر اور پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ان کا انتقال ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ مطابق ۸ راکتوبر ۱۹۵۵ء کو ہوا اور اسلامیہ کالج لاہور میں دفن کئے گئے۔

رانی موراں کی مسجد کے قریب ہی اکالیوں کا ایک گوردوارہ تھا جہاں نہنگ سکھ رہا کرتے تھے مسجد میں پانچوں وقت اذان ہوتی تھی جو اکالیوں کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔

---

[1] حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۲۔
[2] تذکرہ علماء و المشائخ صفحہ ۲۰۔

ایک دن چند اکالی فریاد لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مسجد میں اذان ہونے سے ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ بلکہ ہمارے گیان دھیان اور نت نیم میں بھی فرق پڑتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اذان دینے سے حکماً روک دیا جائے۔

مہاراجہ نے شہر کے قاضی اور مسجد کے امام کو بلایا اور یہ شکایت ان کو سنا کر دریافت کیا کہ تمہارا بانگ دینے سے مدعا کیا ہے۔ قاضی نے بتایا کہ بانگ دینے سے مدعا یہ ہوتا ہے کہ مؤذن کی بلند آواز سے اردگرد کے مسلمان مقررہ اوقات پر نماز کے لیے مسجد میں جمع ہو جایا کریں اور اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکیں۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہوتی جس سے کسی کا دل دُکھے۔ صرف یہی کہا جاتا ہے کہ اللہ اکبر یعنی اللہ بڑا ہے۔ نیکی کی طرف آؤ۔ نماز پڑھو۔

قاضی صاحب کی بات سن کر مہاراجہ نے فرمایا کہ اچھا اگر اذان کا مطلب لوگوں کو نماز کے لیے بُلانا ہی ہے تو اس کی تعمیل ہم کسی اور طریقے سے کرا دیتے ہیں۔ آپ محلہ کے مسلمانوں کے ناموں کی فہرست مرتب کر کے اکالیوں کو اس کا گورمکھی ترجمہ کرا دیں۔ وہ مسلمانوں کو نماز کے مقررہ اوقات پر مسجد میں جمع کر دیا کریں گے۔

پھر تو اکالیوں کے ڈر کے مارے اور کچھ مذہبی جوش کی بنا پر مسلمان پہلے کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں نماز کے لیے جمع ہونے لگے اور مسجد کی رونق بڑھ گئی۔

یہ انتظام کچھ دن چلتا رہا۔ آخر اکالی اس خدمت سے تنگ آ گئے۔ ہارے درجے پھر مہاراجہ کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ کہا۔ سرکار پہلے تو اذان کی آواز سے ہماری نیند خراب ہوتی تھی۔ اب مسلمانوں کو پانچوں وقت نماز پڑھانے کے لیے سارا دن بلکہ صبح سے لے کر رات تک در در پھرنا پڑتا ہے اور کسی وقت آرام لینا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیں اس نوکری سے سبکدوش کیا جائے۔

مہاراجہ نے ہنس کر کہا۔ اگر تم اس تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتے تو اذان بدستور جاری رہے گی۔ اکالیوں نے باول ناخواستہ اس بات کو منظور کر لیا۔ مہاراجہ نے مسلمانوں کو اذان کہنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح مہاراجہ کے حسنِ تدبیر سے دونوں قومیں خوش ہو گئیں اور اکالیوں نے پھر کبھی اذان کی بندش کا سوال نہ اٹھایا مبادا نماز بخشوانے جائیں اُلٹے روزے گلے پڑیں۔

مسجد بوکن خاں

یہ عالی شان مسجد ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں بوکن خاں داروغہ اصطبل خاص مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈھل محلہ موچی دروازہ میں تعمیر کی۔ اس سے پہلے بھی اس جگہ ایک وسیع مسجد بنی ہوئی تھی جسے بوکن خاں نے گرا کر ازسرِنو بنوایا۔ دروازہ اس کا بجانب شمال ہے جس پر سنگِ مرمر کی اینٹ پر فرید شاعر لاہور کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے:

چون ز بوکن خاں والا منزلت — شد بنا ایں مسجد ذی الاحترام
بہر تاریخش ز ہاتف شد ندا — کعبۂ ثانی بنا شد ایں مقام
۱۲۵۷

دروازے کے اندر داخل ہوں تو ایک وسیع میدان آتا ہے۔ ابتدا میں یہ باغیچے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جنوبی

صحن میں درویشوں کے رہنے کے لیے چند حجرے بنے ہیں۔ چاہ و غسل خانہ و سقاوہ بھی ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں عالی شان بنی ہیں۔ درمیانی محراب پر کلمہ شریف تحریر ہے۔ مسجد کی عمارت پختہ چونہ گچ منقش ہے۔ سقف چوبی رنگین ہیں۔ کچھ عرصے سے مسجد میں بچوں کا مدرسہ بھی قائم ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو چہارشنبہ کے روز اسی مسجد کے صحن میں لاہور کے مسلمانوں نے جمع ہو کر انجمن حمایت اسلام لاہور کے اغراض و مقاصد کا باقاعدہ اعلان کیا تھا اور اسی تاریخ سے انجمن کی کارروائی ضبط تحریر میں آنی شروع ہوئی تھی۔ اب بھی اس انجمن کا یوم تاسیس خیال کیا جاتا ہے اور ہر سال ۲۴ ستمبر کو انجمن کے تمام اداروں میں تعطیل منائی جاتی ہے۔

مسجد کہنہ حمام والی

لوہاری دروازہ کے علاقے میں ایک محلہ ہے جسے چلیہ کا حمام کہتے ہیں۔ اس میں ایک کہنہ مسجد شاہانِ سلف کے وقت کی ہے۔ عام طور پر اسے اکبری دور کی عمارت بتایا جاتا ہے۔ یہ مسجد نواب شیخ غلام محبوب سبحانی مرحوم کی حویلی کے دیوار بدیوار ہے۔ مسجد کی دیواروں کے آثار بہت چوڑے ہیں۔ سقف قالبوتی نہایت پختہ ہے۔ دیواروں کی عمارت خشتی ہے مگر اوپر استرکاری بہت موٹی ہے جو کئی جگہ سے اتر گئی ہے۔

مسجد شیخ نواب امام الدین خاں

یہ مسجد بھی محلہ چلیہ کا حمام میں بنی ہوئی ہے۔ بہت عالی شان ہے۔ بانیٔ مسجد نواب شیخ امام الدین رنجیت سنگھ کی طرف سے ناظم صوبہ کشمیر تھے۔ نواب امام الدین سے پہلے ان کا باپ شیخ غلام محی الدین کشمیر کی نظامت پر مامور تھا۔ انھوں نے وہیں وفات پائی۔ بعد میں ان کا بیٹا اسی خدمت پر مقرر ہوا اور اس وقت تک رہا جب تک انگریزوں نے لاہور فتح کر کے کشمیر کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے پاس فروخت نہ کر دیا۔

یہ مسجد ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوئی۔ کرسی ایک منزل بلند ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ صحن وسیع اور پختہ ہے شمال کی طرف ایک چوبی مکلف دالان ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب کے اوپر سنگِ مرمر کی تختی پر کلمہ شریف کے نیچے یہ چار مصرعے کندہ ہیں ؎

امام الدین خاں نواب ذی جاہ
عمارت کرد مسجد حسب دلخواہ
چو تاریخش بجستم ہاتف غیب
بگفتا فی الحقیقت کعبۃ اللہ

۱۲۶۶ھ

مسجد کے اندر عمارت نہایت عمدہ منقش ہے۔ سقف قالبوتی ہے۔ چھت کے اوپر تین عالی شان گنبد اور دو مینار ہیں

درمیانی گنبد کے چاروں طرف چار شعر کا قطعہ لکھا ہے ؎

زہے نواب عالی شان کہ از تائید یزدانی | موافق شد پئے تعمیر مسجد از خدا دانی
چو مسجد قبلہ گاہِ عارفاں و معبد نیکاں | مقام فیض ربّانی مکان لطف سبحانی
ہمہ ابنوہ ازیں تعمیر تسبیح و دعا سالم کرد | خریدہ دولت باقی عقبیٰ از زر فانی

مرا عدا انگندہ گفت ہاتف سال تعمیرش
بدنیا از امام الدین بنا شد کعبۂ ثانی
۱۲۶۶ھ

صحن کے جنوبی دالان کی دیوار پر بھی چند اشعار تاریخی درج ہیں۔ بانی[1] مسجد کا بیٹا نواب غلام محبوب سبحانی[2] رئیس لاہور جب تک زندہ رہا اس مسجد کی خبرگیری کرتا رہا۔ مسجد اب بھی آباد ہے۔

مسجد شاہ محمد غوث

حضرت شاہ محمد غوث قادری جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پشاور سے چل کر سارے ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے آخر ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں لاہور آکر فوت ہوئے تھے دہلی دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان باغ میں آسودۂ خواب ہیں اور ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

---

[1] و [2]۔ نواب شیخ امام الدین اور نواب غلام محبوب سبحانی دونوں علم دوست تھے اور حضرت علی ہجویری کے عقیدت مند۔ دونوں کی قبریں داتا گنج بخش رح کے احاطے میں ہیں۔ اوّل الذکر ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے ان کے مقبرہ پر امام ویردی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل کتبے سنگ مرمر پر کندہ ہیں ؎

چوں کہ نواب شیخ امام الدین | شد ز دنیا و رو بہ خلد نہاد
گفت ہاتف ز سالِ تاریخش | احمد مجتبےٰ شفیعش باد
۱۲۷۵ھ

چوں بہ خاکم بگذری دامن کشاں | از سر اخلاص الحمدی بخواں

از خانۂ عفو آں خداوند غفور | کز صنع وجود بشر از خاک سرشت
بر تربت نواب امام الدین خاں | آرام گہش بہشت تاریخ نوشت

نواب غلام محبوب سبحانی کا انتقال ۹ر جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں ہوا جب وہ دربار میں شرکت کے لیے سرکاری مہمان کی حیثیت سے وہاں گئے ہوئے تھے۔ آپ فارسی کے نہایت اچھے شاعر تھے اور صاحب دیوان۔ (پنجہ فولاد ۱۴ر جنوری ۱۹۰۳ء)

آپ کے مزار کے غرب کی سمت ایک پختہ مسجد گنبددار بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد غلام نبی کوٹھی دار نے بنوائی تھی۔ فرش مسجد کا پختہ ہے اور حوض دہ در دہ عرض وطول کا ہمیشہ پُر آب رہتا ہے۔ مسجد کے درمیانی طاق پر کلمہ شریف کے نیچے یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

سال بنا گفت دل از ذلئے دیں ۔۔۔ مسجد زیبائے غلام نبی

پئے تعمیر مسجد گشت تاریخ ۔۔۔ عبادت خانۂ زیبائے اعلیٰ

اس مسجد اور مزار کا انتظام پہلے متولیوں اور سجادہ نشینوں کے ہاتھ میں تھا اب محکمہ اوقاف نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

مسجد امام شاہ والی

یہ مسجد ڈھل محلہ میں سرراہ بنی ہے۔ پہلے ہی یہاں مسجد تھی۔ ۱۲۹۴ھ میں نواب عبدالمجید خاں[1] رئیس لاہور نے موجودہ عمارت اپنی لاگت سے تعمیر کی۔ دروازہ اس مسجد کا شرق کی طرف ہے اندر جائیں تو وسیع صحن آتا ہے جس میں پختہ فرش بنایا گیا ہے۔ ایک گوشے میں چاہ وغسل خانہ وسقاوہ بنا ہوا ہے۔ خاص مسجد کی تین محرابیں منقطع ہیں جن کے اندر لکڑی کے دروازے لگے ہیں۔ مسجد کے اندر کی عمارت بھی نہایت خوبصورت منقش ہے۔

مسجد مفتیاں

یہ مسجد حویلی میاں خاں کے قریب محلہ کوٹلی مفتیاں میں واقع ہے جسے کبھی محلہ علاؤل لوہانی بھی کہتے تھے۔ اسے سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں مفتی کمال الدین نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد کا صحن بہت فراخ اور حجرے بہت سے تھے۔ چھ پشت تک مفتی کمال الدین کی اولاد یہاں درس دیتی رہی۔ سکھ گردی میں حجرے گر گئے اور لکڑیاں لوگ اٹھا کر لے گئے۔ صرف مسجد باقی رہ گئی۔ کنور نونہال سنگھ کے داروغہ اصطبل دلاور خاں نے مسجد کے صحن کی زمین پر زبردستی اپنی حویلی تعمیر کر لی۔ وارثان مسجد مفتی غلام رسول اور مفتی غلام محمد مہاراجہ کھڑک سنگھ کے پاس مستغیث ہوئے۔ مہاراجہ نے دلاور خاں کو سخت تنبیہہ کی اور کرایہ نامہ زمین کا امام کے نام لکھوا دیا اس طرح مسجد چھوٹی رہ گئی مگر اپنی قدامت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ ایک دفعہ برسات میں مسجد کی چھت بھی گر گئی تھی جسے نواب عبدالمجید خاں رئیس لاہور نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ مشہور مورخ مفتی غلام سرور لاہوری بھی اسی مسجد کے قرب میں رہا کرتے تھے۔ ان کا پرانا خستہ مکان اب تک وہاں موجود ہے۔

---

[1] نواب عبدالمجید خاں لاہور کے نامی رئیس ہی نہ تھے بلکہ علم طب اور علوم عربی وفارسی میں بھی اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا دادا نواب مظفر خاں ملتان کا والی تھا۔ وہ ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے جنگ کرتا ہوا اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ شہید ہو گیا تھا۔ ان بیٹوں میں نواب عبدالمجید خاں کا باپ شہزادہ شاہ نواز خاں بھی تھا۔ نواب عبدالمجید خاں کا انتقال ۲۶ فروری ۱۹۰۲ء کو لاہور میں ہوا (تذکرہ علمائے لاہور صفحہ ۶۴)

مسجد تکیہ سادھواں

یہ مسجد ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں نور محمد سادھو نے تعمیر کرائی تھی۔ سادھو قوم کے لوگ سکھ حاکمان لاہور کے زمانے میں کشمیر سے آ کر اس محلے میں آباد ہوئے جو اس وقت محلہ عادل لوہانی کے نام سے مشہور تھا۔ مسجد کی جگہ پر پہلے ایک میدان تھا جسے گنج شہیداں کہتے تھے۔ سادھوؤں نے اپنی نشست کے لیے تکیہ بنایا اور ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد رکھی۔ نور محمد نے اس مسجد کو گرا کر اور تکیہ کی زمین اس میں شامل کر کے یہ مسجد بنوائی جس میں بہت سا روپیہ برادری اور دوسرے لوگوں کا صرف ہوا۔ مسجد کی کرسی اونچی ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔

اب سے پہلے پیر عبدالغفار شاہ کے مدرسہ غوثیہ کی وجہ سے مسجد کو بہت شہرت حاصل تھی۔ اس میں فقہ اور تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی اور مثنوی مولانا روم شرح کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی۔ تعلیم مفت اور عام تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پیر اشرف شاہ نے ان کی گدی سنبھالی۔ حال ہی میں اس مسجد کی ایک چھت اور ایزاد کی گئی ہے۔ بلند مینار بھی بنا ہے۔ آبادی اور رونق روز افزوں ہے۔ لاؤڈ اسپیکر سے دور دور تک خدا کے نام کی گونج سنائی دیتی ہے۔

مسجد مرزا محمد عرف میرزا موٹا

یہ مسجد شاہ نواز کے طویلہ کے متصل واقع ہے اور بہت پرانی ہے پہلے ضابطہ خاں کی مسجد کہلاتی تھی جو ایک عابد و زاہد شخص اس مسجد میں رہتا تھا وہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں فوت ہو گیا۔ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں اس مسجد کو گرا کر مرزا محمد نے از سرِ نو بنوایا۔ یہ شخص سکھی سلطنت کا ملازم تھا انگریزی عملداری میں خانہ نشین رہا مگر پیسہ والا اور دیندار تھا۔ اس نے بہت سا روپیہ صرف کر کے مسجد کی کرسی ایک منزل اونچی کی۔ شرق و جنوب کی طرف مسجد کے نیچے دکانیں بنوائیں جن کی آمدنی سے مسجد کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک نشست گاہ بھی مسجد کے متصل بنی جو امام کی رہائش کے لیے وقف ہے، دروازے پر سنگِ مرمر کا ایک تختہ لگا ہے جس پر یہ شعر کندہ ہیں ؎

چونکہ از مرزا محمد مسجدے　　شد بنا و خوب با تدبیر شد
ہاتفِ شمسا پئے تاریخ گفت　　اے چہ احسن مسجدے تعمیر شد
۱۲۷۹

صحن کے جنوب کی طرف چاہ ہے جو مسقف ہے۔ مسجد کے اوپر اگرچہ گنبد نہیں مگر دیوار کی منڈیروں کے تین حصے کر کے مدور بہ شکل گنبد بنا دیئے گئے ہیں۔ اس مسجد کی دیواریں چونہ گچ و منقش ہیں۔ اندر کی محرابوں پر اشعار لکھے ہیں اور باہر کی وسطانی محراب پر کلمہ شریف۔

مسجد امیر شاہ وردی میر

یہ پختہ قبول صورت سی مسجد مرزا محمد کی مسجد کے قریب سرِ راہ واقع ہے۔ پہلے بھی یہاں مسجد تھی مگر بہت چھوٹی۔ امیر شاہ نے اس کے ساتھ والا مکان خرید کر مسجد میں شامل کیا اور مسجد کو وسیع کر کے از سرِ نو ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں بنوایا۔ اگرچہ گنبد نہیں ہیں مگر وضع قطع

سنہری مسجد کی سی ہے۔ صحن بھی ہے۔ مسجد کی تینوں محرابیں بھی مقطع بنی ہیں۔ سقاوہ اور چاہ بھی ہے اور امام کے لیے نشست گاہ بھی۔ بانی اس مسجد کا سید امیر شاہ تھا جو انگریزی فوج میں وردی میجر کا عہدہ رکھتا تھا۔ آدمی بہت نیک تھا۔

صوفی والی مسجد

یہ مسجد سرِ راہ کشمیری بازار میں واقع ہے۔ بہت پرانی مسجد ہے صوفی نام ایک ملا مدت تک اس میں امامت کرتا رہا۔ اسی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس مسجد کی کرسی بہت بلند ہے۔ دروازہ شمال کی طرف کوچہ کوٹھی داراں میں ہے۔ بازار کی طرف دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد پر صرف ہوتا ہے۔

مسجد میاں نور ایمان والا

یہ مسجد پرانی کوتوالی میں ہے۔ بانی اس کا ایک مخیّر تاجر نور محمد تھا جو گھوڑوں کی کاٹھیاں بیچا کرتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کی ایمانداری اور دیانت سے خوش ہو کر اسے "نور ایمان والا" کا خطاب دے رکھا تھا۔ یہ شخص سخاوت بھی کرتا تھا اور کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مسجد وزیر خاں کی مرمت پر ہزار ہا روپے صرف کئے اور چاروں میناروں کے اوپر کی برجیوں کے آٹھ آٹھ دروں میں سے چار چار در بند کرا کے انھیں گرنے سے بچا لیا۔ کئی دیگر مسجدوں کی تعمیر میں بھی حصہ لیا اور بزرگوں کے روضے بھی بنوائے۔

یہ مسجد اس نے ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں بنوائی تھی۔ عمارت نہایت مستحکم چونہ گچ ہے۔ کرسی ایک منزل بلند ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ نیچے دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد کے مصارف میں صرف ہوتا ہے۔ اوپر کنواں، سقاوہ، غسلخانہ بنا ہوا ہے۔ مسجد کا صحن وسیع ہے۔ تین محرابیں عالی شان بنی ہوئی ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ اوپر تین گنبد مدور نہایت خوبصورت ہیں۔ مسجد کی میانہ محراب کے اوپر سنگِ مرمر کی اینٹ پر یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

نور محمد بعطائے کریم ساختہ مسجد چو فلک مستقیم
جست چو تاریخ بنائش خرد ہاتف گفتا زہے اجرِ عظیم ۱۲۳۹ھ

مسجد ثانی نور محمد ایمان والا

یہ مسجد کشمیری بازار میں سرِ راہ بنی ہے۔ اس کے شمال کی طرف ایک کوچہ میں نور ایمان والے کی حویلی تھی۔ جب مسجد تیار ہوئی تو مولوی جان محمد سکھوں کے عہد کے ایک مشہور واعظ اس کے امام مقرر ہوئے۔ وہ نہایت متقی، صاحبِ تصنیف اور عالم باعمل تھے۔ ہر جمعہ کے روز وعظ کہتے تھے اور لوگ شوق سے سنتے تھے۔ ایک جمعہ کو نور ایمان والا خود بھی وعظ سننے آیا۔ وعظ ختم ہو چکا تو اس نے مولوی جان محمد کو نذر نقد و خلعت کے علاوہ حویلی مسکونہ بھی بخش دی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ اسی وقت گھر سے نکل کر دوسرے مکان میں چلے جائیں اور جس قدر اسباب خانہ داری، ظروف و پارچات وغیرہ ہیں سب وہیں چھوڑ دیں۔ سوا ان کپڑوں کے جو پہن

...کھے ہیں کچھ ہمراہ نہ لے جا سکیں۔ مولوی جان محمد جب تک زندہ رہے اسی حویلی میں رہے۔ ۱۰ محرم ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات کے بعد یہ ان کی اولاد مولوی فضل حق وغیرہ کے قبضے میں چلی گئی۔ جنہوں نے مسجد میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔

یہ مسجد اگرچہ چھوٹی سی ہے مگر نہایت منقش اور کرسی دار ہے۔ نیچے دکانیں ہیں۔ مسجد کی جنوبی دیوار پر جانب بازار یہ شعر لکھے ہیں جو تجدید و ترمیم کا سال ظاہر کرتے ہیں ؎

زمسجد یکہ مظہر نور محمد است — در وے ہنوز امامت جان محمد است
از فضل حق فرید چہ سال بناش گفت — این سجدہ گاہ سلامت جان محمد است
۱۲۷۹ھ

ایضاً

مسجد نبوی بحکم فضل حق تعمیر کرد — ہست بیت اللہ ثانی شد ملائک را مقام
جست عاشق تکضوی چوں از سر ابجاد سال — گفت ہاتف سجدہ گاہ فضل حق بادا مدام
۱۲۷۶ھ

مسجد سردار خاں

احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ اور سہ حاکمان لاہور کے زمانے میں شیخ عبداللہ بلوچ لاہور کے نامور عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ پنجابی زبان کے نہایت اعلیٰ شاعر بھی تھے۔ حافظ غلام محمد عرف امام گاموں جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مسجد وزیر خاں کے امام تھے، آپ ہی کے مرید تھے۔ شیخ عبداللہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں فوت ہوئے۔ مزنگ کا محلہ کوٹ عبداللہ آپ ہی کے نام پر آباد ہے۔

سردار خاں بلوچ نمبردار مزنگ نے ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں جب آپ کا مقبرہ بنوانا شروع کیا تو اس کے ساتھ ایک بہت بڑی خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی جو اس وقت بیرونی بنگلوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ اس مسجد کا بلند مینار بھی بنوانا چاہتا تھا مگر موت نے مہلت نہ دی۔ ابھی مسجد پوری طرح مکمل نہ ہوئی تھی کہ اس کی عمر کا جام لبریز ہو گیا اور اس کے انتقال کے بعد باقی عمارت کی تکمیل ہوئی۔ مسجد پختہ ہے اور لاہور کے شایانِ شان۔

مسجد تاجے شاہ

تاجے شاہ لاہور میں ایک مجذوب فقیر تھا۔ بہت سے لوگ اسے کشف و کرامت والا بزرگ مانتے ہیں۔ اس نے ایک سو برس کی عمر پا کر روز دوشنبہ ہفتم ماہ بیساکھ سمت ۱۹۰۱ بکرمی مطابق ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا اور موچی دروازہ کے باہر چیمبرلین روڈ پر سبزی منڈی کے پاس اس جگہ دفن ہوا جہاں اب یہ مسجد واقع ہے۔ بقول مفتی غلام سرور لاہوری "خورشید عالم" مادۂ تاریخ ہے۔

پہلے یہ مسجد چھوٹی سی تھی۔ باقی جگہ میں باغیچہ اور فقیروں کے رہنے کے مکانات تھے۔ اب یہ مسجد وسیع ہو گئی ہے۔ تکیہ کی ساری زمین صحن میں آ گئی ہے۔ بازار کی سمت دکانیں ہیں جن کی آمدنی مسجد پر صرف ہوتی ہے۔ سبزی منڈی اور اردگرد کی

آبادی کی وجہ سے مسجد میں ہمیشہ رونق رہتی ہے۔

مسجد پٹولیاں

یہ مسجد لوہاری منڈی میں واقع ہے۔ بہت پرانی ہے۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں میاں عمر دین سب اوورسیر محکمہ پارک یاسٹری نے بہت سا روپیہ صرف کر کے اپنے والد کے نام پر اس کی تجدید کی۔ مسجد کرسی دار نہیں۔ سر بازار اس کا دروازہ ہے۔ چاہ، غسل خانہ اور سقاوہ کے علاوہ وسیع صحن اور تین محرابیں ہیں جن کی عمارت پختہ و منقش ہے۔ تینوں دروازوں میں چوبی چوکھٹیں اور دروازے لگے ہیں۔ مسجد کے اندر عمارت بھی منقش پختہ چونہ گچ ہے۔ اندر کی تینوں محرابوں پر کلمہ شریف اور اشعار لکھے ہیں۔ باہر کے درمیانی دروازے کے اوپر سنگ مرمر کی سل نصب ہے جس پر چار مصرعے اور ۱۲۸۲ھ کندہ ہے۔ یہ مسجد ہمیشہ آباد رہی ہے۔ اب اس کا انتظام اوقاف کمیٹی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

مسجد رنگ محل

یہ مسجد بازار رنگ محل متصل مشن ہائی اسکول واقع ہے۔ پہلے بھی یہاں مسجد تھی۔ حفیظ چابک سوار نے اس کو از سر نو تعمیر کیا اور بقدر ایک منزل کے کرسی اونچی رکھی۔ جنوبی و غربی سمت مسجد کے نیچے دکانیں ہیں جن کا کرایہ مسجد کے مصارف کے لیے وقف ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ صحن وسیع ہے اور عمارت پختہ چونہ گچ منقش۔ تین محرابیں ہیں، درمیانی محراب کے اوپر سنگ مرمر کی سل پر کلمہ شریف کندہ ہے۔ مسجد کے اندر محرابوں پر بھی ابیات تحریر ہیں۔ سقف قالبوتی ہے۔ اوپر تین گنبد اور دو چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔

محمد حفیظ سرداران سندھانوالیہ کے گھر کا چابک سوار تھا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد میں جب سرداران سندھانوالیہ لاہور سے بھاگ گئے تو محمد حفیظ لاہور میں رہا۔ مہاراجہ نے اس کے دونوں ہاتھ قطع کرا دیئے۔ اس روز سے یہ حفیظ ٹنڈا مشہور ہو گیا۔ چابک سواری میں اس وقت اس کا کوئی ثانی نہ تھا، آخری عمر میں حفیظ کو مہاراجہ نیپال نے اپنے پاس بلا لیا اور یہ قریب دس سال وہاں رہا۔ بینائی جاتی رہی تو پھر لاہور واپس آ گیا۔ یہیں ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں فوت ہوا۔

مسجد کمان گراں

رنگ محل سے موچی دروازہ کو جاتے ہوئے حویلی میاں خاں کے متصل بازار کے دائیں طرف ایک خوبصورت سی چینی کار مسجد آتی ہے جسے مسجد کمان گراں کہتے ہیں۔ یہ مسجد بہت پرانی ہے۔ اس کے بنانے والے برادری کمان گراں کے بزرگ تھے جو اسی محلہ میں رہتے تھے۔ اب بھی انہی کی ذریت اس محلے میں آباد ہے۔

پہلے یہ مسجد چھوٹی اینٹوں کی تھی، ایک منزلہ تھی، نہایت سادہ تھی اور اس میں لکڑی کے خوب صورت ستون کھڑے کر کے چھت ڈالی گئی تھی۔ صحن میں امرود، شہتوت، کیلا اور آم کے پیڑ سایہ کیے رہتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں اس برادری کے ایک

فرد میاں احمد دین کے دل میں اس مسجد کی تجدید کا خیال پیدا ہوا۔ وہ خود بہترین نقشہ نویس، باکمال مصور و نقاش، ماہر تعمیرات اور جدت پسند و مخترع تھے۔ کمرشل آرٹ میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ لاہور کی مشہور فرم پیکو لیمیٹڈ کی ابتدائی شہرت میں ان کا خاص حصہ ہے۔ پیکو لمیٹڈ کے رنگین عکسی قرآن مجید اور ہفت رنگ پنجسورے ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے وہ نہایت خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش کردار، خوش مزاج، ہر دلعزیز اور عبادت گزار تھے۔ انھیں تزئین و آرائش کا خاص شوق تھا۔ ان کی اپنی نشست گاہ بھی ایک چھوٹا سا عجائب خانہ ہوتا تھا جس میں دنیا بھر کی نادر و نایاب اشیا نہایت قرینے سے سجی رہتی تھیں وہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو فوت ہو گئے۔

میاں احمد دین نے اپنے عزیزوں کے تعاون سے اس مسجد کا ڈھانچہ بدلا اور عمارت کو اڑھائی منزل بلند کر کے زیادہ سے زیادہ نمازیوں کے لیے گنجائش پیدا کی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء (۱۳۵۱ھ) کو حاجی سیٹھ بہاؤ الدین قریشی خلف حاجی عمر الدین قریشی کے زیر اہتمام عمارت تکمیل کو پہنچی۔ نچلی منزل میں فرش سے لے کر چھت تک تمام دیواروں پر جاپانی ٹائلیں لگی ہیں۔ ازارے کی ٹائلیں پھولدار ہیں باقی سفید جنھیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ چھت سفید گچ کی ہے اور اس کے نیچے خوبصورت ڈاٹ بھی ٹائلوں کی ہے۔ فرش پر سنگ مرمر کے مصلے بنے ہیں۔ تین محرابی دار دروازے صحن میں کھلتے ہیں۔ تینوں میں لوہے کے تہہ ہو جانے والے پھاٹک ہیں۔ روشنی، پانی اور ہوا کا معقول انتظام ہے۔ امام اور درویش کی نشست گاہ کے لیے حجرے موجود ہیں۔ کنوئیں غسلخانے اور وضو خانے کے اوپر نہایت کاریگری سے پختہ مکان بنا ہے۔ یہ حاجی عمر الدین قریشی مرحوم نے اپنے صرف سے بنوا کر مسجد کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اس کے کرایہ کی آمدن سے مسجد کے مصارف کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ باقی ضروریات چندے سے پوری کی جاتی ہیں۔ جمعہ اور جماعت باقاعدہ ہوتی ہے۔ صدر دروازے کا پتھر پر دیں رقم کا اور درگاہ کی پیشانی پہ کلمہ طیبہ اور اللہ محمد کے نام حاجی دین محمد کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسجد نفاست اور حسنِ مذاق کی آئینہ دار ہے اور اس کا انتظام محلہ کمیٹی کی طرف سے راقم الحروف کے ہاتھ میں ہے۔

مسجد ملّا مجید

یہ مسجد موچی دروازہ کے اندر محلہ چلہ بیبیاں میں واقع ہے اسے ملّا مجید ایک ولایتی تاجر نے پہلے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں اور پھر ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں تعمیر کیا۔ بہت سا روپیہ سید حیدر شاہ سپروائزر محکمہ انہار نے بھی اس پر صرف کیا، یہ مسجد نہایت منقش خوبصورت اور پختہ بنی ہوئی ہے۔ بیرونی دروازہ نہایت عمدہ بنا ہوا ہے، مسجد کے اندر سب کی طرف چاہ و غسل خانہ وسقاوہ ہے اس سے آگے بڑھ کر ایک وسیع حجرہ ہے جس میں کبھی مولوی محمد بخش درس پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے جنوب کی طرف خاص مسجد ہے۔ صحن نہایت عمدہ ہے۔ تینوں محرابیں قالبوتی ہیں۔ درمیانی محراب پر دو کتبے ہیں۔ بالائی کتبہ پر جلی حروف میں کلمہ شریف۔ بانی مسجد کا نام اور ۱۲۴۵ھ سال تعمیر سابق و ۱۲۹۴ھ تعمیر حال تحریر ہے۔ مسجد کے اندر کی عمارت بھی نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ چھت قالبوتی ہے۔ اور اوپر تین گنبد مدور منقش بنے ہیں۔ کرسی اونچی ہے۔ اس میں ہمیشہ رونق رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نادر و ہائی شیعہ خواجگان نے رفیع الشان امام باڑہ تعمیر کیا ہے۔

مسجد کریم بخش

یہ خوبصورت سی مسجد میاں کریم بخش[1] نے سنگھے منڈی پانی والے تالاب کے قریب بنوائی تھی۔ میاں کریم بخش پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکیدار لاہور کے میونسپل کمشنر اور نہایت دیندار آدمی تھے۔ باہر کے جنوبی دروازے پر سنگ مرمر میں چند ابیات اور یہ اشعار کندہ ہیں :-

کرد است کریم بخش ز الطاف کریم
للہ چنیں مسجد عالی تعمیر
سرور بہ بنای سجدہ گاہ والا
وا گفت شد ایں مسجد عالی تعمیر

اندرونی دروازے پر :-

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ایں بیت حق کہ کرد بنائش کریم بخش
روز جزا وسیلۂ غفران اوبس است
سال بنائش جستم و آمد ندا ز غیب
کایں بقعۂ کریم مکان مقدس است
(۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء))

مسجد کی کرسی اونچی ہے نیچے دکانیں ہیں عمارت پختہ ہے۔

مسجد شہید

شاہ عالمی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد سرخ پتھر کی بنی نظر آتی ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ نیچے دوکانیں اور اوپر مسجد ہے۔ اس مسجد کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ ابتدا میں یہاں ایک کچا سا چبوترہ تھا جس پر لوگ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک مندر تعمیر ہوا۔ مسلمانوں کو مسجد پختہ کرنے کا خیال آیا تو حکومت نے ہندو مسلم فساد کے پیشِ نظر اس کی اجازت نہ دی۔ مئی ۱۹۳۲ء میں ایک روز بعض پرجوش نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کر کے راتوں رات یہاں مسجد کھڑی کر دی۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد کام پر لگے اور فجر کی نماز کے بعد فارغ ہو گئے۔ اقبال علیہ الرحمۃ نے یہ اشعار اسی واقعہ کی بنا پر لکھے تھے :-

---

[1] ان کا انتقال ۲۲ نومبر ۱۹۰۴ء کو اسّی سال کی عمر میں ہوا۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

چونکہ یہ مسجد میونسپل کمیٹی کی اجازت کے بغیر زبردستی کھڑی کی گئی تھی اس لیے حکومت نے پولیس کی مدد سے زبردستی گرا دی ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۴ء میں اسی جگہ منظوری کے ساتھ مسلمانوں کے چندے سے انجمن اسلامیہ نے یہ عمارت تعمیر کی جو آج بھی موجود ہے۔ اس کا ڈیزائن بہت ہی خوبصورت ہے اور انتظام دوسری مساجد کے ساتھ اوقاف کمیٹی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔

مسلم مسجد

یہ عالی شان اور وسیع مسجد لوہاری دروازے کے باہر باغ میں واقع ہے۔ قیام پاکستان تک اس کی کل کائنات ڈیڑھ مرلہ زمین تھی جس میں چند بزرگوں کے مزار بھی تھے اور ایک کنواں بھی۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں انجمن خادم المسلمین قائم ہوئی جس کی تبلیغی مساعی اور مولانا محمد بخش مسلم کی تقریروں کے فیض سے ہر جمعہ کو ہزارہا مسلمان جمع ہونے لگے۔ اسی وجہ سے یہ مسجد مسلم مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ مسجد حصولِ پاکستان کی تحریک کا ایک زبردست مرکز تھی۔ مسجد کے منبر سے ہر جمعہ کو پاکستان کی تائید میں تقریریں کی جاتیں یہاں تک کہ ملک آزاد ہو گیا۔ غیر مسلم اجنبی تسلط ہمیشہ کے لیے ختم ہونے کے بعد طبیعتوں میں اسلامی جوش اور ولولہ اتنا بڑھا کہ یہ چھوٹی سی مسجد نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ناکافی نظر آنے لگی چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ مسجد کی توسیع کے ساتھ ساتھ بزرگوں کے مزاروں کے اوپر ایک شاندار گنبد اور مینار تعمیر کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے دورِ ایمان کی یاد تازہ ہو جائے۔

حضرت عبدالصمدؒ بانی سلسلہ صمدیہ نے ۹ رجب ۱۳۶۵ھ بعد جمعہ اس مسجد کی پہلی اینٹ رکھی اور پونے دو لاکھ روپیہ کے صرف سے دس سال میں یہ حسین و جمیل مسجد اور اس کا بلند و عالی شان مینار بن کر تیار ہوا۔ اب یہ مسجد لاہور کی قابلِ دید عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس مسجد کا فنِ تعمیر آپ اپنی نظیر ہے۔ اس میں نمازیوں کی سہولت اور آرام کے لیے جو انتظامات کیے گئے ہیں وہ شاید اس سے بڑی مساجد میں بھی نہیں ہوں گے۔ یہاں دلوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ دماغ بھی منور ہوتے ہیں اور جسمانی شفا بھی ملتی ہے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں یہاں مدرسہ کریمیہ کے شعبہ تجوید کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں قرأت و تجوید کے علاوہ حفظ قرآن کا انتظام بھی ہے۔ پھر جامعہ مدنیہ کے تعاون سے ایک دار العلوم قائم کیا گیا جہاں تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کے علاوہ درجہ پرائمری کے مطابق مروجہ نصاب کی تعلیم دی جاتی اور بچوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہے۔

اس مسجد کی کرسی زمین سے ایک منزل بلند ہے، مسجد، صحن اور حوض وغیرہ سب اوپر ہیں نیچے دکانوں کے علاوہ ایک پریس اور فری ہسپتال ہے جس کے مندرجہ ذیل تین شعبے خوب کام کر رہے ہیں :-

۱۔ فری ڈسپنسری

۲۔ فری ڈینٹل ہسپتال

۳۔ بہبود زچہ و بچہ۔

کئی اور منصوبے زیرِ تجویز ہیں۔ سالانہ آمد و خرچ کا آڈٹ شدہ حساب باقاعدہ شائع کیا جاتا ہے۔

چیفس کالج لاہور کی مسجد

چیفس کالج لاہور جسے کبھی راجکمار کالج بھی کہتے تھے، ہندو راجوں اور رئیس زادوں کے علاوہ مسلمان نوابوں اور رئیسوں کے لڑکوں کی تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا اور اب بھی ہے لیکن آج سے ساٹھ پینسٹھ برس قبل وہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ بہاولپور کے نواب محمد بہاول خاں عباسی نے ایّامِ طالب علمی میں اپنے اتالیق مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں کی تحریک و ترغیب پر یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور چودہ ہزار روپیہ صرف کر کے یہ خوب صورت عمارت تیار کی۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی سامنے یہ شعر نظر پڑتے ہیں جن کے آخری مصرع سے ۱۳۱۹ھ نکلتی ہے جو مسجد کی تاریخ بنا ہے ؎

چو نواب مبارک سپے بہاول خاں عباسی
بنا کرد ست در عہد تعلم خوشنما مسجد
بگفتا ہاتف ہادی بما تک سالِ تعمیرش
بکالج از بہاول خاں بہم شد بنا مسجد

اس کے اردگرد آیتیں وغیرہ نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہیں۔ صحن بہت وسیع ہے۔ مسجد کے دروازے کے ایک پہلو میں وضو کرنے کی جگہ ہے اور دوسرے پہلو میں "محل درسگاہ قرآن" ہے۔ صحن سے گزر کر جب اندرونی محراب پر نظر جاتی ہے تو یہ اشعار دکھائی دیتے ہیں ؎

بندۂ پروردگارم اُمتِ احمد نبی
دوستدارِ چار یارم تابع اولادِ علیؑ
مذہب حنفیہ دارم ملتِ حضرت خلیلؑ
خاک پائے غوثِ اعظم زیرِ سایہ ہر ولی

اس کے مقابل مفصلہ ذیل اشعار جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں ؎

گر ترا معرفت بخشد یقیں
دوستیِ چار یاراں را گزیں
ہر یکے را با مراتب داں بزرگ
تا شوی مقبولِ عالم برگزیں

جنوبی دیوار پر یہ شعر مندرج ہے ؎

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا ست
کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

اور شمالی دیوار پر لکھا ہے ؎

محمد مدنی افتخار ارض و سماست
کسے کہ طالب آن ست تاج بر سر او

اشعار کے علاوہ باری تعالیٰ کے ننانوے نام اور اکثر آیتیں نہایت خوشخط حرفوں میں زیب دیوار اور زینت مسجد ہیں عمارت کی سادگی کو بیل بوٹوں اور نقش و نگار نے چار چاند لگا رکھے ہیں۔ اندر کے دروں کا فرش اور منبر سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔

مسجد دا لگراں

محمد بخش ٹھیکیدار لاہور میں سب سے زیادہ کوٹھیوں کے مالک تھے۔ یہ مسجد ان کی والدہ زیب النساء نے ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ملحقہ جائداد وقف کی۔ اس وقف کی رجسٹری بموجب حکم عدالت عالیہ پنجاب ۱۹۲۰ء میں عمل میں آئی[1]۔ یہ مسجد شہر سے ریلوے اسٹیشن کو جاتے ہوئے برانڈرتھ روڈ اور ریلوے روڈ کے مقام اتصال پر دونوں سڑکوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ امر موجب افسوس ہے کہ بانیوں کے پڑنے کے قرض میں ملحقہ جائداد قرق ہو گئی۔ مسجد آباد ہے اور اس میں جامعہ نعیمیہ مزید رونق کا باعث ہے جس میں حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہے۔

آسٹریلیا مسجد

یہ مسجد لاہور کے بہت بڑے رئیس خواجہ محمد بخش دائیں، سوداگر آسٹریلیا والے نے میلا رام کے تالاب کے سامنے لاکھوں روپیہ کے صرف سے تعمیر کرائی تھی۔ خواجہ صاحب کے بزرگ سکھوں کے عہد میں بے سروسامانی کی حالت میں کشمیر سے لاہور آئے اور یہ خود معاش کی تلاش میں آسٹریلیا تک گئے۔ وہاں ادنیٰ مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا مگر جب واپس آئے تو دولت ساتھ لائے۔ یہاں آکر انھوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد لاہور میں پیدا کی۔ آسٹریلیا بلڈنگ اور کشمیر بلڈنگ کے علاوہ ان کے لڑکوں خواجہ محمد رشید، خواجہ محمد امیر بخش اور خواجہ محمد بشیر نے آسٹریلیشیا بنک قائم کیا جس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔

جس جگہ یہ مسجد کھڑی ہے، برادران وطن بانئ مسجد سے یہ قطعہ زمین منہ مانگی قیمت دے کر مندر تعمیر کرنے کے لیے لینا چاہتے تھے۔ خواجہ محمد بخش نے دل میں سوچا کہ جب یہ لوگ اپنا معبد بنانے کے لیے لاکھوں روپیہ صرف کرنے پر آمادہ ہیں

---

[1] تاریخ جلیلہ ص ۳۸

تو میں کیوں عبرت حاصل نہ کروں[۵۱] ۔ خدا نے توفیق دی۔ مسجد تعمیر ہو گئی۔

بانی نے مسجد کی دیوار میں ایک کتبہ نصب کرایا ہے جس میں لکھا ہے :۔

"وقف ہذا کی رجسٹری ۲۶ ر اکتوبر کو اور انتقال کی تصدیق
۴ ر اپریل ۱۹۲۵ء کو ہوئی "

پیمائش حسب ذیل دی ہے :۔

"شمال ۲۳ فٹ ۸ انچ ۔ جنوب ۲۶ فٹ ۔ مشرق ۹۱ فٹ
مغرب ۱۰۰ فٹ ۔ سڑک جانب مغرب ۲۰ فٹ "

لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ مسجد ہر وقت آباد رہتی ہے ۔ اس میں ہر طرح کی ضروریات مہیا کی گئی ہیں ۔ برقی روشنی اور پنکھے لگے ہیں ۔ پانی کی فراوانی ہے ۔ جگہ خوب صاف ستھری ہے خطیب و مؤذن مقرر ہیں ۔ مسجد کے باہر بانی کی قبر ہے ۔ سنگ مرمر کے تعویذ پر تاریخ وفات ۳ ر ذوالحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۳ ر مئی ۱۹۲۹ء کندہ ہے ۔

جامع اشرفیہ

آج سے نصف صدی پیشتر امرتسر میں مدرسہ نعمانیہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ ملک کے سب سے بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے استاد حدیث مفتی محمد حسن مرحوم یہیں پڑھتے اور بعد میں درس دیا کرتے تھے ۔ اگست ۱۹۴۷ء میں امرتسر کے اجڑ جانے کے بعد مدرسہ نعمانیہ لاہور میں منتقل ہو گیا ۔ مفتی محمد حسن[۵۲] کی مساعی جمیلہ سے بازار نیلا گنبد سے پیوست ایک گلی کے موڑ پہ ایک بلڈنگ الاٹ ہو گئی جہاں دسمبر ۱۹۴۷ء سے درسیات کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ چونکہ حضرت مفتی صاحب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دامنِ عقیدت سے وابستہ تھے اس لیے جامعہ نعمانیہ کا نام بدل کر جامعہ اشرفیہ رکھ دیا گیا اور اب جامعہ کی اپنی عمارت فیروز پور روڈ پہ ایک انتظامیہ کی نگرانی میں تیار ہو چکی ہے جس کا کچھ حصہ ابھی زیر تکمیل ہے اس عظیم الشان عمارت جس پر پچیس لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں عہد سلف کے فن تعمیر کی یاد دلاتی ہے ۔

درس گاہ سے ہم رشتہ ایک عظیم الشان مسجد ہے یا یہ کہیے کہ اس جامع مسجد کے ہم رشتہ یہ درس گاہ ہے جو تقریباً پچاس کنال میں پھیلی ہوئی ہے ۔ اسی میں دارالافتاء اور مدرسوں کے کوارٹر بھی ہیں ۔ قاری عبید اللہ اس کے مہتمم اور مولانا ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث ہیں ۔ مسجد کا صدر دروازہ نہایت رفیع الشان ہے اندر بہت بڑا ہال اور دو بغلی وسیع بسامدے ہیں ۔ ہال کے سامنے پھر ایک وسیع و عریض برآمدہ ہے ۔ بالائی حصے میں دونوں طرف مستورات کے لیے باپردہ گیلریاں ہیں ۔

---

۵۱ تاریخ جلیلہ مؤلفہ پیر غلام دستگیر نامی ص ۸۰ ۔ ۸۱ ۔

۵۲ یکم جون ۱۹۶۱ء کو مفتی صاحب کا انتقال کراچی میں ہوا ۔

مسجد شیرانوالہ دروازہ

شیرانوالہ دروازہ میں داخل ہوتے ہی اسلامیہ ہائی اسکول کے سامنے سڑک کے دائیں طرف ایک وسیع و عریض اونچی سی مسجد نظر آتی ہے جو مولانا احمد علی[1] کے درس اور خطبوں کی مقبولیت کے سبب سے انہی کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے یہ مسجد بہت چھوٹی تھی اور اس میں پولیس لائن کے ملازم نماز ادا کیا کرتے تھے اس بنا پر اسے مسجد لائن سبحان خان کہتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں جب مولانا احمد علی نظر بند کی حیثیت سے لاہور لائے گئے تو انھوں نے پہلے شیرانوالہ دروازہ کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں قرآن مجید کا درس شروع کیا پھر جب وہاں لوگ زیادہ آنے لگے اور جگہ تنگ ہوگئی تو وہ اس مسجد میں اٹھ آئے اور آپ کی تحریک سے لوگوں نے اس مسجد کی عمارت کو وسیع کر کے نہایت شاندار بنا دیا۔ اب مسجد کی درگاہ اور صحن اتنا ہے کہ اس میں ہزاروں نمازی سما سکتے ہیں۔

اسی مسجد میں درس کے دوران ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں انجمن خدام الدین کی بنیاد پڑی جس نے مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا جو نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مدرسے کا افتتاح ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے کیا تھا۔

جامع قاسمی

جامع قاسمی فیض باغ لاہور کی غالباً سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کی بنیاد ریلوے ورکشاپ مغلپورہ لاہور کے چند دیندار مزدوروں اور حضرت مولانا محمد مطیع الحق مرحوم و مغفور کی کوششوں سے رکھی گئی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ان مزدوروں نے وفد کی صورت میں دروازے دروازے پھر کر چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور دو تین سال میں اتنی رقم اکٹھی کر لی کہ زمین کا ایک قطعہ خرید کر مختصر سی عمارت تعمیر کر سکیں۔

حضرت مولانا مطیع الحق مرحوم انجمن حمایت الاسلام کے شیرانوالہ گیٹ ہائی اسکول میں بطور مدرس ملازم تھے، اس کے علاوہ تبلیغی اور اصلاحی کاموں میں بھی وقت دینا پڑتا تھا اس لیے آپ نے حافظ قاری شفاعت احمد صاحب کو دیوبند سے بلا کر اس مسجد کا امام اور مسجد سے متعلق مدرسہ مصباح العلوم کا مدرس مقرر فرمایا اور یہ انتخاب ایسا موزوں اور مفید ثابت ہوا کہ اب یہ مسجد فیوض و برکات کا گہوارہ ہے۔

---

[1] مولانا احمد علی ۲ رمضان ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء کو قصبہ جلال گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جلال اور نلونڈی کے سکولوں میں قرآن مجید اپنی والدہ سے اور دینی تعلیم مولانا عبدالحق اور مولانا عبیداللہ سندھی سے حاصل کی۔ حضرت سندھی نے آپ کو اپنی فرزندی میں لیا اور اپنے ہمراہ دہلی لے گئے جہاں سندِ نیابت عطا کی۔ دہلی ہی سے مولانا احمد علی کو "ریشمی خطوط" کی سازش میں گرفتار کر کے شملہ، جالندھر اور راہوں جیل میں رکھنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں مستقل طور پر لاہور میں نظر بند کر دیا گیا جہاں سے انھوں نے ایک عظیم قرآنی تحریک جاری کی جو اب تک چل رہی ہے۔

حافظ صاحب قبلہ نے مدرسے اور مسجد کی ذمہ داریاں قبول فرمانے کے ابعد اس کی توسیع اور استحکام کی مہم شروع کی اور ۱۹۴۶ء تک اس قابل ہو گئے۔ کہ مزید زمین خرید کر مسجد کی نئی عمارت کی داغ بیل ڈال سکیں۔

اب یہ مسجد ۲ کنال اور گیارہ مرلے زمین پر استادہ ہے۔ اور اپنی خوبصورتی، مضبوطی اور کشادگی کے لحاظ سے اس علاقے میں بے مثال ہے۔ اس کی اصل عمارت کی لمبائی پچاس فٹ، چوڑائی ۱۹ فٹ اور اونچائی ۲۲ فٹ ہے۔ محراب اسپینی عربوں کے طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے اور بے حد خوبصورت ہے۔ میناروں پر سفید سیمنٹ کا پلستر کیا گیا ہے جس سے انھیں خوب آب و تاب حاصل ہوئی ہے۔

مسجد کا صحن ۵۰ فٹ لمبا اور ۴۵ فٹ چوڑا ہے اور اس کے آخری حصے پر ۵۰ فٹ لمبا خوبصورت برآمدہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس برآمدے کے سامنے ہی وضو کے لیے سقاوہ اور غسلخانے ہیں۔ کنواں بھی اسی کے ساتھ ہے۔ مسجد کی عمارت کے ساتھ شمال کی طرف مدرسہ مصباح العلوم کے لیے پانچ کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔ جنوب کی جانب صدر دروازہ اور دو حجرے ہیں۔ ان میں سے ایک بطور اسٹور اور دوسرا نشست گاہ امام کے لیے استعمال ہوتا ہے ان کے اوپر ایک رہائشی مکان تعمیر کیا گیا ہے جس کا کرایہ مسجد کے اخراجات کا بار ہلکا کرتا ہے، بالائی مکان کے علاوہ اس حجرے میں باہر کی طرف دکانیں بنائی گئی ہیں جو کرایے پر چڑھی ہوئی ہیں۔ دروازے تین ہیں۔ ایک جنوبی (صدر دروازہ) دوسرا مشرقی اور تیسرا شمالی۔

مسجد کی موجودہ عمارت ۱۹۴۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۵۳ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ کیونکہ چندے کی رقوم سے کام ہو رہا تھا اس لیے مختلف حصوں کی تعمیر میں تھوڑا تھوڑا وقفہ آیا۔

مدرسہ مصباح العلوم قاری شفاعت احمد صاحب قبلہ کی مساعی اور خلوص کی وجہ سے اس علاقے کے لیے ایک بہت بڑی برکت ثابت ہوا ہے۔ اب تک اس مدرسے سے ۷۸ حفاظ اور تقریباً تین ہزار ناظرہ خواں طلبہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ قاری صاحب کے اس فیصلے نے درس کو اور مفید بنا دیا ہے کہ جو بچے قرآن شریف حفظ کریں انھیں اردو اور حساب وغیرہ کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ جب وہ مدرسے سے فارغ ہوں تو کسی مڈل اسکول میں داخل ہو سکیں۔ پرائمری کی تعلیم کے چکر میں نہ پڑنا پڑے۔

جن لوگوں نے اس مسجد اور مدرسے کی تعمیر میں نمایاں طور پر حصہ لیا ہے میرے علم کے مطابق ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :- (۱) حضرت مولانا محمد مطیع الحق مرحوم (۲) بابا نور دین مرحوم (۳) حاجی شیخ محمد شفیع مرحوم۔ انھوں نے تقریباً بیس ہزار روپے کے عطیات سے امداد کی۔ (۴) مستری زبردین مرحوم۔ (۵) خلیفہ جی مرحوم۔ (۶) حافظ قاری شفاعت احمد صاحب امام و صدر مدرس (۷) مستری عبدالکریم صاحب (۸) مستری شمشیر خاں صاحب (۹) محمد الیاس صاحب۔ انھوں نے تقریباً پندرہ ہزار روپے دیے۔ مسجد کا کنواں بابا نور دین مرحوم نے بنوایا۔

جمعہ اور عیدین کی نماز کے لیے شامیانے اور لاؤڈ اسپیکر مسجد کی ملکیت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں عمدہ کوالٹی کی خریدی گئی ہیں۔

نمازیوں کے لیے پانی اور روشنی کا انتظام بھی نہایت عمدہ ہے۔

مدرسے کے زنانہ حصے میں بچیوں کو کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔

اس مسجد پر اندازاً ایک لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں۔"

جامع مسجد فیض باغ لاہور

جامع قاسمی کے بعد فیض باغ کے علاقے کی یہ دوسری بڑی مسجد ہے۔ اگرچہ اس کا رقبہ زیادہ نہیں، اندازاً پندرہ بیس مرلہ زمین [illegible] ہوئی ہے لیکن اہلِ محلہ کی توجہ نے اسے کافی خوبصورت بنا دیا ہے، روشنی اور پانی کا نہایت اچھا انتظام ہے اور مدرسہ اسلامیہ فیض العلوم کے نام سے ایک دینی درسگاہ بھی قائم ہے۔

فیض باغ لاہور کی ان نوآبادیوں میں سے ہے جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ عالمِ وجود میں آئیں اور اس وقت سے اب تک برابر ترقی کر رہی ہیں۔ بستی کی آبادی زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مسجد بھی وسیع ہوتی ہے، بالکل ابتدا میں اس جگہ حاجی مہر دین کا کنواں تھا اور پنجاب کے عام دستور کے مطابق اس کنویں کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے چھوٹا سا چبوترا بھی بنا لیا گیا تھا۔

سہارن پور کی ریلوے ورکشاپ ٹوٹنے کے بعد جب ریلوے ملازمین کی کافی تعداد لاہور آئی اور اپنی سہولتوں کے مدِ نظر ان لوگوں نے اس محلے میں رہائش اختیار کی تو چبوترے کی جگہ چھوٹی سی مسجد تعمیر کر لی گئی۔ یہ کام اہلِ محلہ کے چندے سے ہوا اور اس میں مستری عبدالرحمٰن، حاجی قادر بخش، چودھری امیر علی، بابو الٰہ بخش اور مستری الٰہ بخش وغیرہ حضرات نے خاص طور سے حصہ لیا۔ سہارنپور کے ریلوے ملازمین نے بھی کافی دلچسپی لی۔ یہ ابتدائی عمارت اندازاً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد جب محلے کی آبادی اور زیادہ ہوئی تو آس پاس کی زمین حاصل کر کے موجودہ عمارت تیار کی گئی۔ یہ اضافہ غالباً ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ہوا۔

جامع مسجد ماڈل ٹاؤن

لاہور کی آبادی جیسے جیسے بڑھتی گئی اردگرد کی ہزاروں ایکڑ مزروعہ اراضی۔ رہائشی مکانوں اور کوٹھیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ گذشتہ نصف صدی میں ماڈل ٹاؤن، مسلم ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، سمن آباد، گلبرگ، کرشن نگر، سنت نگر، بھارت نگر، شام نگر، شاد باغ، وسن پورہ، فیض باغ، فاروق گنج، حبیب گنج، عثمان گنج، بلال گنج، تاج پورہ، راج گڑھ، سعدی پارک، اور بریچ پارک وغیرہ کئی نئی آبادیاں بن گئی ہیں۔ مگر یہ سب کی سب آبادیاں کسی خاص منصوبہ بندی کے ماتحت عمل میں نہیں آئیں۔ گلبرگ، سمن آباد اور شاد باغ تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیداوار ہیں۔ مگر سب سے اوّل جو قابلِ ذکر آبادی لاہور میں قائم ہوئی وہ ماڈل ٹاؤن ہے۔

لاہور میں اچھی طرز کی آبادی کا خیال سب سے پہلے دیوان کھیم چند کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے اپنی تجویز ۱۹۱۹ء میں عوام کے سامنے پیش کی۔ جس کی پذیرائی ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں ماڈل ٹاؤن کوآپریٹو سوسائٹی لاہور کی بنیاد رکھی گئی۔
۱۹۲۳ء میں اس سوسائٹی نے لاہور سے تین چار میل دور فیروز پور روڈ پر رکھ کوٹ لکھپت میں دو ہزار ایکڑ زمین حکومت سے خریدی۔ یہ زمین اس وقت ایک گھنا جنگل تھا جو جھاڑ جھنکار سے اٹا پڑا تھا اور درندوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ کوئی

شخص اکیلا دکیلا دن کے وقت بھی اس میں گھسنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جگہ کبھی آباد ہوگی اور رانوں کا شہر بن جائے گی۔

سیکرٹری اور ڈائرکٹروں کی ان تھک کوشش سے آہستہ آہستہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی، جنگل صاف ہوگیا، زمین ہموار کر دی گئی، دو دو چار چار چھ چھ کنال کے ٹکڑوں میں سینکڑوں کوٹھیاں بن گئیں۔ ہر کوٹھی کے ساتھ باغ باغیچہ لازمی شرط تھی۔

اس قسم کا مثالی شہر اس وقت تک سارے ایشیا میں نہیں تھا جس کا اپنا کلب گھر، اپنا سکول، اپنا ہسپتال، اپنا ڈاک خانہ، اپنا تار گھر، اپنا واٹر ورکس، اپنا بجلی گھر، اپنی عبادت گاہیں اور اپنا ذریعہ آمد و رفت ہو۔ ان سہولتوں کے علاوہ ایک بہت بڑا پبلک باغ، کھیل کا میدان، مصنوعی پہاڑی اور درمیان میں خوبصورت جھیل بنانا بھی سوسائٹی کے پیش نظر تھا مگر انقلاب ۱۹۴۷ء نے یہ سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اصلی مکینوں کی جگہ مہاجر آبسے جو اپنے اپنے مسائل کے چکر میں ایسے پھنسے کہ تعمیر و توسیع کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دے سکے۔

جامع مسجد۔ ماڈل ٹاؤن بھی اس آبادی کے شایانِ شان بنائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کے متعلق جو کچھ مولانا محمد بہاؤ الحق قاسمی خطیب جامع کے ذریعے معلوم ہو سکا وہ حسب ذیل ہے :۔

یہ مسجد ۱۳۵۹ھ مطابق سنہ ۱۹۴۰ء میں اسلامک ٹرسٹ ماڈل ٹاؤن کی مساعی سے عالم وجود میں آئی۔ مسجد اور اس کے ملحقہ قطعات کا کل رقبہ آٹھ ایکڑ ہے۔ زمین ماڈل ٹاؤن کوآپریٹو سوسائٹی نے بلا معاوضہ مسجد کے لیے ٹرسٹ کے حوالے کی اور تعمیر کے مصارف امدادی چندوں سے پورے ہوئے۔ چنانچہ ٹرسٹ کی پہلی ہی مجلس میں آٹھ ہزار روپے کے وعدے ہوئے۔

نقشہ اور ڈیزائن ایک مشہور ماہر تعمیرات انگریز مسٹر بی بریٹیفور مقیم لاہور نے تیار کیا جسے ٹرسٹ نے منظور کرایا اور سمت قبلہ کی تعیین کے بعد مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین کے دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد رکھوائی گئی۔ ٹرسٹ کی درخواست پر مقامی اور غیر مقامی مسلمانوں نے چندہ دیا۔ معطی حضرات کے نام سنگ مرمر کی سلوں پر کندہ ہیں جو مسجد کی ڈیوڑھی کی دیواروں میں نصب ہیں۔ ان میں نظام حیدر آباد کا نام بھی شامل ہے۔ سرمایہ کی فراہمی کے سلسلے میں حاجی تاج الدین مرحوم سپرنٹنڈنٹ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ خان بہادر مغل باز خاں مرحوم ممبر پبلک سروس کمیشن، کرنل مولوی ضیا الدین مرحوم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سندھ۔ خان بہادر میاں نظام الدین مرحوم چیف انجنیئر ریلوے کا ذاتی اثر و رسوخ بہت کام آیا۔ چالیس ہزار روپے جمع ہوئے جو مسجد کی عمارت پلاٹوں کی ترتیب و تزئین، بیرونی چار دیواری اور آہنی پھاٹکوں کی تیاری اور حدود مسجد کی اندرونی سڑکوں کی تعمیر پر صرف ہو گئے۔ حاجی تاج الدین مرحوم تمام کاموں کو چھوڑ کر از اوّل تا آخر تعمیر کی نگرانی فرماتے رہے۔ شیخ محبوب عالم سوداگر نے بھی انتظامی امور میں سرگرم حصہ لیا۔ آپ بقیدِ حیات ہیں اور مسجد کے زیر سایہ اپنی کوٹھی میں رہتے ہیں۔

مسجد کی خوب صورتی بلاشبہ قابلِ دید اور قابلِ داد ہے۔ لیکن ٹرسٹ کے ممبروں سے ایک چوک ہو گئی وہ یہ کہ مسجد کے ساتھ کوئی ایسی جائیداد وقف نہیں کی گئی جس سے ٹرسٹ اپنے آئندہ مستقل مصارف کے لیے چندوں کی فراہمی

سے بے نیاز ہو جاتا۔ حسب فیصلہ ہر کوٹھی دار بجلی کے بل کے ساتھ ایک ایک روپیہ ماہوار اسلامک ٹرسٹ کی امداد کے لیے ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کے دفتر میں جمع کراتا ہے اور ٹرسٹ کا محصل وہاں سے جمع شدہ رقوم وصول کرکے ٹرسٹ کے فنانشل سیکرٹری کے پاس جمع کرا دیتا ہے۔ بعض مخیر حضرات عطایات کی صورت میں بھی ٹرسٹ کی امداد فرماتے ہیں اور ان تمام جمع شدہ رقوم سے جامع مسجد مذکور کے علاوہ قبرستان اور مسجد عیدگاہ جی بلاک کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں۔ قبرستان اور عیدگاہ کا انتظام بھی ٹرسٹ ہی کے ذمے ہے۔

جامع مسجد کی خطابت اور عیدین کی امامت مولانا محمد بہاؤالحق قاسمی امرتسری کے سپرد ہے جو ۱۹۵۲ء سے یہ فرائض ادا کر رہے ہیں۔ مولانا موصوف تقسیم ملک سے پہلے انٹرمیڈیٹ ایم اے او کالج امرتسر میں بحیثیت استاد اسلامیات اور ایم اے او ہائی سکول میں بحیثیت صدر مدرس دینیات اٹھارہ بیس برس تک کام کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے اڑھائی سال تک مرکزی جامع مسجد آتشبہ راولپنڈی کے خطیب رہ چکے ہیں۔ بعض اسلامی جرائد و رسائل مثلاً القاسم۔ الارشاد۔ عنایت الاسلام امرتسر اور ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ ضلع سرگودھا کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ متعدد دینی و مذہبی کتب و رسائل کے مصنف بھی ہیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء سے ایم بی ہائی سکول وزیرآباد میں صدر مدرس دینیات تھے کہ ۱۹۵۲ء میں اسلامک ٹرسٹ کی دعوت پر اسے ترک کرکے ماڈل ٹاؤن کی مسجد میں چلے آئے اور اس وقت سے اب تک یہیں اپنے فرائض نہایت خلوص سے ادا کر رہے ہیں۔

جامع مسجد (عکس جمیل) سمن آباد

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد نئی نئی آبادیوں کی داغ بیل پڑنے کی رسم سرعت کے ساتھ عمل میں آنے لگی۔ سمن آباد کی نو آبادی بھی اسی عمل کا نتیجہ ہے۔

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے جب سمن آباد کے تعمیری منصوبے کی تکمیل شروع کی اور لوگ یہاں آباد ہونے لگے، تو اللہ کے نیک بندوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ یہاں اپنے گھروں کے علاوہ خدا کا بھی ایک گھر ہونا چاہیئے لہذا پہلے پہل اللہ کی زمین پر معمولی حد بندی کرکے نماز پنجگانہ کی ادائیگی کا بندوبست کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی رونق میں اضافہ ہونے لگا اور اس قطعہ زمین پر جہاں یہ عالی شان مسجد کھڑی ہے ایک چھپر ڈال دیا گیا جس سے یہ مسجد چھپر والی مسجد کے نام سے پکاری جانے لگی۔

اب ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ کسی طرح اس قطعہ اراضی کو امپرومنٹ ٹرسٹ سے مسجد کے لیے حاصل کیا جائے۔ چنانچہ بستی کے لوگوں نے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی جس کا نام سمن آباد ریذیڈنٹس ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ اس انجمن کے فرائض میں جہاں ٹرسٹ سے اس بستی میں بسنے والوں کے لیے مراعات حاصل کرنا اور جائز شکایات پیش کرکے اپنے مطالبات منوانا تھا، وہاں اس مسجد کے لیے باقاعدہ زمین حاصل کرنا، چندہ فراہم کرنا اور اس کی تکمیل کا کام بھی تھا۔

ابتدا میں صرف دو قطعے اراضی امپرومنٹ ٹرسٹ نے دینے منظور کیے لیکن یہ رقبہ کافی نہ تھا۔ اس لیے مسلسل

دستشنش کے بعد موجودہ چاروں قطعات کا سرکاری طور پر قبضہ مل گیا اور ٹرسٹ کے پہلے چیئرمین جناب ظفر الاحسن نے یہ وعدہ بھی کیا کہ انجمن جس قدر روپیہ فراہم کرے گی، ٹرسٹ اسی قدر رقم اپنے پاس سے مسجد کی تعمیر میں لگائے گا۔

جب دس ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو یہ رقم ٹرسٹ میں جمع کرا دی گئی تاکہ ٹرسٹ حسب وعدہ اسی قدر رقم شامل کر کے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرے۔ مگر سرکاری کام بڑی سست رفتاری سے ہوتے ہیں۔ دن، مہینے اور سال لگ گئے لیکن یہ وعدہ شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔ اسی اثنا میں چیئرمین صاحب تبدیل ہو گئے اور نئے چیئرمین نے سابقہ وعدے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ طے پایا کہ اپنا ہی روپیہ نکلوا کر مسجد کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔

کافی تگ و دو کے بعد یہ روپیہ واپس حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس وقت انجمن مذکورہ نے ایک سب کمیٹی "مسجد کمیٹی" کے نام سے تشکیل کی اور اس کمیٹی کے سپرد مسجد کی تعمیر کا کام کیا۔ یہ مسجد کمیٹی پانچ عہدہ داروں اور پانچ ممبروں پر مشتمل تھی۔ اس نے مسجد کی تعمیر کے کام کا بیڑا اٹھایا اور لوگوں کے تعاون سے مسجد کا ایک عالی شان ہال، ایک دو منزلہ برآمدہ دو شاندار مینار، ایک وضو خانہ، ایک صدر دروازہ، تین غسل خانے، تین طہارت خانے، ایک فلش بیت الخلاء، چار دکانیں اور ایک مکان برائے رہائش پیش امام کھڑا کر دیا۔ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے اس پر صرف ہو چکے ہیں۔ ابھی ایک بلند مینار، آٹھ دکانیں، دکانوں کے اوپر درس گاہ قرآنی، مسجد کے اندر چہار طرفہ برآمدہ، ایک مزید صدر دروازہ، صحن پختہ وغیرہ تعمیر ہونے باقی ہیں۔ اس بقیہ کام کے لیے مزید ایک لاکھ یا اس سے زائد رقم کی ضرورت ہو گی۔ جس رفتار سے چندہ جمع ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آئندہ پندرہ سال کے عرصے میں بھی یہ کام شاید مکمل نہ ہو سکے گا۔ تاوقتیکہ

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

مسجد میں درس گاہ قرآنیہ عرصہ قریباً تین سال سے جاری ہے جس کا انتظام درسگاہ سب کمیٹی کے سپرد ہے۔ اس درس گاہ میں قریباً ایک سو پچاس بچے اور بچیاں ناظرہ قرآن پڑھتے ہیں۔ چند بچے قرآن مجید حفظ بھی کر رہے ہیں۔ تین اچھے اور قابل قاری اس کام پر مقرر ہیں۔ اس وقت مسجد کی چار دکانوں اور ایک عارضی چھوٹی دکان سے مبلغ دو سو پچاس روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی ہے جو خطیب و امام کے وظیفے، خادم اور صفائی کرنے والے کی تنخواہ اور بجلی وغیرہ کے بل کی کفیل ہے۔

گلبرگ، شاد باغ، وسن پورہ، چوبرجی کوارٹرز، قلعہ لچھمن سنگھ، جناح باغ، کرشن نگر اور دیگر نئی آبادیوں میں بھی نہایت شاندار مساجد تعمیر ہوئی ہیں جن کے حالات پھر کبھی لکھے جائیں گے۔

کتب خانے

نور الٰہی

(لائبریرین، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور)

برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ہر طالب علم لاہور کی تاریخی و ثقافتی اہمیت سے آشنا ہے۔ یہ نہ صرف قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے، بلکہ ہر تاریخی دور میں علم و حکمت کا مرکز بھی رہا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے عہد میں اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں تھی، جہاں تک تعلیمی ترقی کا تعلق تھا، وقت کے حکمرانوں کی بیشتر توجہ اس شہر کے فروغ پر مرکوز تھی۔ سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ اس امر کی روشن دلیل ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی یہ شہر ہماری تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کی سب سے قدیم اور مشہور یونیورسٹی اسی شہر میں ہے۔ کالجوں اور اسکولوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ اسی میں ہے، علمی دنیا میں اس کی مرکزی حیثیت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہاں کتب خانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جہاں علوم و فنون کے ہر شعبہ پر بے شمار کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کتب خانوں کی اجمالی کیفیت اس مقالہ کا موضوع ہے۔

لاہور کے معتبر کتب خانوں کی نوعیت حسب ذیل ہے۔ ہر کتب خانے کا ذکر ہم اس کے عنوان کے تحت کریں گے۔

۱۔ عوامی کتب خانے

۱۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور

۲۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری

۳۔ میونسپل لائبریری، شاہ محمد غوث

۴۔ ادارہ تعمیر نو (بی، این، آر) کا دار المطالعہ

۵۔ لاہور پبلک لائبریری، علامہ اقبال روڈ

۲۔ کلب لائبریری

۱۔ جم خانہ کلب لائبریری

۳۔ اداری کتب خانے

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۲۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لائبریری

۴۔ کالجوں کے کتب خانے

ا۔ آرٹس کالج

۱۔ گورنمنٹ کالج لائبریری

۲۔ فورمین کرسچین کالج لائبریری

۳۔ اسلامیہ کالج لائبریری، سول لائنز

۴۔ ایم۔ اے۔ او، کالج لائبریری

۵۔ دیال سنگھ کالج لائبریری۔

۶۔ ایچیسن کالج لائبریری

۷۔ لاہور کالج فار وومن لائبریری

۸۔ اسلامیہ کالج فار وومن لائبریری

۹۔ کینیرڈ کالج لائبریری

ب۔ سائنس کالج (فنون مفیدہ کے کالج)

۱۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لائبریری

۲۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لائبریری

۳۔ گورنمنٹ کالج آف اینیمل ہسبنڈری لائبریری

۴۔ گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لائبریری

۵۔ ڈی مانٹ مورنسی کالج آف ڈینٹسٹری لائبریری

۶۔ ہوم اینڈ سوشل سائنس کالج لائبریری

۷۔ نیشنل کالج آف آرٹس لائبریری۔

ج۔ یونیورسٹی کے قائم کردہ، دیگر علوم و فنون کے کالج

۱۔ ہیلی کالج آف کامرس لائبریری

۲۔ لاء کالج لائبریری

۳۔ اورینٹل کالج لائبریری۔

د۔ تعلیمی تربیتی کالجوں کے کتب خانے

۱۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لائبریری

۲۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لائبریری۔

۵۔ ٹیکنیکل کتب خانے ، (مخصوص الاغراض کتب خانے)

۱۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری لائبریری ، پنجاب یونیورسٹی

۲۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی لائبریری ، پنجاب یونیورسٹی

۳۔ ہائی ٹنشن اینڈ نکلیر ریسرچ لیبارٹری ، گورنمنٹ کالج

۴۔ ویسٹ ریجنل لیبارٹریز لائبریری

۵۔ پاکستان ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس لائبریری

۶۔ اریگیشن ریسرچ انسٹیٹیوٹ لائبریری

۶۔ گورنمنٹ کی لائبریریاں (محکمانہ کتب خانے)

۱۔ اسمبلی لائبریری

۲۔ بورڈ آف اکنامک انکوائری ، پنجاب ، لائبریری

۳۔ پنجاب اینڈ وائبریشن بورڈ فار ٹکس لائبریری

۴۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ لائبریری ۔

۵۔ ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لائبریری

۶۔ ویسٹ پاکستان سول سیکرٹیریٹ لائبریری

۷۔ ڈائرکٹوریٹ آف پبلک ہیلتھ لائبریری ، ویسٹ پاکستان

۸۔ لائبریری محکمہ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی ، ویسٹ پاکستان

۹۔ آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ لائبریری

۱۰۔ ڈائرکٹوریٹ آف انڈسٹریز لائبریری ، ویسٹ پاکستان

۱۱۔ لاہور میوزیم لائبریری

۱۲۔ جی ، ایم (جنرل منیجر) لائبریری ، پی ، ڈبلیو ، آر ، ہیڈ کوارٹرز

۷۔ عدالتی کتب خانے

۱۔ سپریم کورٹ لائبریری

۲۔ ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ لائبریری

۳۔ بار ایسوسی ایشن لائبریری

۸۔ علمی و ادبی اداروں کے کتب خانے

۱۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لائبریری

۲۔ ادارہ مجلس ترقی ادب لائبریری ۔

۹ - سفارتی اور غیر ملکی کتب خانے

۱ - یو-ایس - انفارمیشن سروس لائبریری
۲ - برٹش کونسل لائبریری -
۳ - پاکستان جرمن کلچرل سنٹر لائبریری -
۴ - خانہ فرہنگ ایران
۵ - عرب کلچرل سنٹر لائبریری
۶ - مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری
۷ - ٹیکنیکل ریفرنس لائبریری آف دی یونائیٹڈ سٹیٹ آپریشن مشن ٹو پاکستان -

مندرجہ ذیل اصطلاحات ہر لائبریری کے ذکر میں استعمال ہوئی ہیں جو فنی نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہیں، ان کی تشریح ہم نے مقالہ کے آخر میں کر دی ہے وہاں سے ملاحظہ فرمائیں :-

(۱) کھلی الماری OPEN SHELF
(۲) مقفل یا بند الماری CLOSE SHELF
(۳) کارڈ کیٹیلاگ
(۴) ڈکشنری کیٹیلاگ
(۵) کلاسیفائیڈ کیٹیلاگ
(۶) ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن DEWEY DECIMAL CLASSIFICATION

۱ - عوامی کتب خانے

۱- پنجاب پبلک لائبریری، لاہور: پنجاب پبلک لائبریری اس وقت مملکتِ پاکستان کا بہترین کتب خانہ اور سب سے بڑا علمی سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ عمارت جس میں لائبریری کی بنیاد رکھی گئی اور جو آجکل بھی لائبریری کا ایک حصہ ہے، "بارہ دری نواب وزیر خاں" کہلاتی تھی۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت اور دلکش عمارت ہے اس کے چاروں کونوں پر چار خوش وضع برجیاں اور اس کے اندر نہایت نفیس محرابیں ہیں، یہ عمارت نواب وزیر خاں مرحوم نے بنائی تھی، نواب صاحب موصوف عہدِ شاہجہانی کے معتمد اور جلیل القدر امراء میں سے تھے۔ ۱۶۳۴ء میں اس نے شاندار مسجد کی تکمیل کے بعد جسے آجکل مسجد وزیر خاں کہتے ہیں۔ انھوں نے شہر سے باہر ایک وسیع و عریض باغ کی بنیاد ڈالی، جس کے وسط میں یہ دلکش عمارت بھی تعمیر کی، مورخین کا بیان ہے کہ اس باغ پر زرِ کثیر صرف ہوا، اور یہ دلفریبی اور رعنائی میں اپنی مثال آپ تھا، اس میں بہت سے کھجور کے درخت لگائے گئے تھے، اس مناسبت سے اسے "نخلیہ" بھی کہتے تھے، باغ تو دست بردِ روزگار کی نذر ہو گیا، مگر بارہ دری حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہی، مختلف مواقع پر اس عمارت سے مختلف کام لیے گئے۔ سکھوں کے عہد میں یہ چھاؤنی کا ایک حصہ تھی، ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب کا الحاق برٹش عملداری سے ہوا، تو انگریزوں نے اپنے ابتدائی

دور میں اسے فوجیوں کے کوارٹروں کے طور پر اور دیگر فوجی اغراض کے لیے استعمال کیا، اس کے بعد اس میں محکمہ بندوبست کا دفتر بنا دیا گیا۔ کچھ عرصے کے لیے یہ عمارت تار گھر اور اس کے بعد عجائب گھر کے طور پر بھی استعمال ہوتی رہی، اور آخرکار ۱۸۸۴ء میں اس عمارت کا فرعہ فال پنجاب پبلک لائبریری کے نام پڑا، جہاں لائبریری قائم ہوئی، اور بتدریج وسیع ہوتی رہی۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قیام ۱۸۸۴ء میں حکومت پنجاب کی خواہش اور اعانت سے ایک قرارداد کے بموجب عمل میں آیا۔ قرارداد کا مفہوم یہ تھا: "لفٹننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن کی خواہش ہے، کہ لاہور میں ایک پبلک لائبریری عوام کے لیے قائم کی جائے، جس میں سرکاری تصانیف کے علاوہ ہر قسم کی علمی و ادبی کتابیں فراہم کی جائیں" چنانچہ ایک کمیٹی کا تقرر ہوا، جس کا کام حکومت کو اس کام کی تکمیل میں اعانت اور اس سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا تھا، اس کمیٹی میں مسٹر ایس ڈبلیو ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ اور مسٹر جے۔ لاک وڈ کپلنگ، پرنسپل میو سکول آف آرٹس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر نامور انگریزی ادیب رڈیارڈ کپلنگ کے والد بزرگوار تھے۔

اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ سول سکریٹریٹ لاہور میں ۱۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ اور اس نے بڑی مستعدی اور تن دہی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ کمیٹی سب سے پہلے حکومت سے بارہ دری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس وقت یہ خیال تھا کہ جب تک لائبریری کے لیے کوئی موزوں و مناسب عمارت تعمیر نہیں ہوتی، اس عمارت کو عارضی طور پر استعمال میں لایا جائے۔ مگر اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی عمارت لائبریری کی مستقل عمارت ہو جائے گی۔ کمیٹی کے لیے کتابوں کی فراہمی دوسرا اہم کام تھا۔ کمیٹی کی تجویز پر سرکاری محکموں اور شعبوں نے وہ تمام کتابیں لائبریری کو منتقل کر دیں، جن کے استعمال کی انھیں فوری ضرورت نہ تھی۔ خود چارلس ایچیسن نے ۵، کتابوں کا گراں قدر عطیہ لائبریری کو پیش کیا۔ ان کی اس نیک مثال کی تقلید میں بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں نے بھی قابلِ قدر تحائف کتاب کی صورت میں پیش کیے۔ چنانچہ انہی تحائف سے لائبریری کی ابتدا کی گئی۔ جب ایک سال کے عرصے میں لائبریری کے قیام کے ابتدائی مراحل طے پا گئے تو ۲۱ دسمبر ۱۸۸۵ء کو لفٹننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن نے دربارِ عام منعقد کر کے لائبریری کی رسم افتتاح ادا کی۔

ان ضروری امور سے فارغ ہونے کے بعد کمیٹی نے بہت سے علم دوست اصحاب سے تعاون کی استدعا کی۔ اور جن حضرات کے پاس ذاتی کتب خانے تھے، ان سے بھی درخواست کی گئی۔ کہ وہ اپنے عطیات سے لائبریری کو نوازیں۔ مسٹر ٹی، ڈبلیو، ایچ، ٹولبورٹ سول سروس کے آدمی تھے، اُنھوں نے بڑی عرق ریزی سے کتابوں کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا، حکومت کی اعانت سے یہ کتب خانہ لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس ذخیرے سے لائبریری کو کثیر تعداد میں ایسی قابلِ قدر کتابیں ہاتھ لگیں، جو اور کسی جگہ سے میسر نہ آ سکتی تھیں۔ اس کے بعد لفٹننٹ گورنر کی وساطت سے ریاست بہاولپور کے سردار عطر سنگھ کا ذاتی کتب خانہ لائبریری میں منتقل کیا گیا۔ اس کتب خانے میں مشرقی علوم پر اُردو اور فارسی میں بیش قیمت کتابیں تھیں۔ ان کے ساتھ سردار عطر سنگھ نے بھی فارسی کے چند قلمی نسخے لائبریری کو بطور عطیہ پیش کیے، مگر سب سے گراں قدر عطیہ جس نے نہ صرف لائبریری کی کتابوں میں اضافہ کیا، بلکہ اس کی شہرت کو دو بالا کر دیا، فقیر سید جمال الدین کا کتب خانہ تھا۔ سید صاحب مرحوم لاہور کے فقیر خاندان کے چشم و چراغ تھے، وہ بڑے علم پرور اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے، انھوں نے بڑی محنت اور صرفِ کثیر

سے کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا تھا۔ مرحوم نے وفات سے پیشتر علم و حکمت کے اس مخزن کو لائبریری کے لیے مرحمت فرمایا، اس کتب خانے میں عربی کی مطبوعہ مگر نایاب کتب کے علاوہ بہت سے قلمی نسخے بھی تھے۔ جن میں سے چند نسخے پرانے اور قیمتی ہیں۔

۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کے مشہور کتب فروش منشی نولکشور نے اپنی طرف سے اردو فارسی کی ۲۰۰ کتابیں لائبریری کو ہدیۃً دیں۔ ان نیک سیرت اصحاب کی مخلصانہ اور مربیانہ کوششوں سے لائبریری کی بنیاد مستحکم ہوتی چلی گئی۔

اس وقت یہ لائبریری تین وسیع عمارتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پرانی عمارت یعنی بارہ دری یا عشرت کدہ کے ایک جانب ایک شاندار اور پختہ عمارت ہے جس میں لائبریری کا شعبہ انگریزی واقع ہے، دوسرے پہلو میں ایک اور نئی عمارت ہے جو علوم مشرقی کی کتابوں کا شعبہ (یعنی اورینٹل سیکشن) ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں کتابوں کی مجموعی تعداد سوا لاکھ سے متجاوز ہے، اس میں ہر سال تقریباً ڈھائی ہزار کتابوں کا اضافہ ہوتا ہے، کتابوں کی خرید پر تقریباً ۲۵ ہزار روپے اور جرائد کی خریداری پر تین ہزار روپے سالانہ خرچ کیے جاتے ہیں۔

کتابوں کا انتخاب مینیجنگ کمیٹی کے سپرد ہے، جو ماہرین کے مشورے سے کتابوں کا ایک جچا تلا انتخاب کرتی ہے تقریباً تمام علوم و فنون کی کتابیں خریدی جاتی ہیں، فلسفہ، مذہب، سیاسیات، معاشیات، ادبیات اور تاریخ پر بعض ایسی بلند پایہ کتابیں موجود ہیں، جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری سے طلبا اور اساتذہ کے علاوہ عوام اور پرائیویٹ ریسرچ سکالر (مصنفین و محققین علوم) بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری میں سرکاری مطبوعات اور سرکاری رپورٹوں کا بہترین ذخیرہ ہے۔ بعض سرکاری مطبوعات اور رپورٹیں ایسی ہیں، جو پاکستان بھر میں کسی جگہ موجود نہیں۔ اکثر سرکاری حکام ضرورت کے وقت پنجاب پبلک لائبریری ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لائبریری میں حکومت پاکستان کے PATENTS AND DESIGNS کا مکمل سیٹ موجود ہے، حکومتِ پاکستان نے پنجاب پبلک لائبریری کو ان دستاویزات کے ملاحظہ کے لیے مرکز مقرر کر رکھا ہے۔ عوام بآسانی لائبریری میں ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

کوئی بھی پبلک لائبریری اچھی لائبریری کہلانے کی مستحق نہیں، جب تک اس میں بچوں کے لیے علیحدہ شعبہ نہ ہو۔ ابتدا ہی سے بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کرنا بہت ضروری ہے، پبلک لائبریری کا فرض ہے، کہ وہ ایسے ذرائع پیدا کرے جس سے بچوں میں لائبریری سے رغبت اور وابستگی پیدا ہو، پنجاب پبلک لائبریری میں بچوں کے لیے اردو اور انگریزی کے دو علیحدہ علیحدہ سیکشن ہیں۔ اردو سیکشن میں بچوں کی خوب چہل پہل دیکھنے میں آتی ہے، کتابوں کے انتخاب کے وقت ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جہاں ان کے لیے کہانیاں ضروری ہیں، وہاں اسلامی تاریخ اور سائنس کے متعلق بھی ضروری معلومات کی ابتدائی کتابیں فراہم ہوں۔ خواتین کے لیے لائبریری میں مطالعہ کا خاص انتظام ہے اور اورینٹل اور انگریزی دونوں شعبوں میں علیحدہ کمرے ان کے لیے مخصوص ہیں۔ جو ان کی ضروریات کے مطابق آراستہ ہیں۔

آج کل ایک کشادہ اور ساز و سامان سے آراستہ آڈیٹوریم پبلک لائبریری کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے، اس میں پروجیکٹرز، ٹیپ ریکارڈر، اور ریڈیو گرام کا ایک سیکشن بھی ہونا چاہیئے، تاکہ لائبریری کا آڈیٹوریم کتابی نمائش، پبلک لیکچر اور سیمینار

کا انتظام کر سکے۔ اس قسم کے انتظامات لائبریری کو صحیح معنوں میں علمی روشنی کے پھیلانے کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پنجاب پبلک لائبریری میں آڈیٹوریم کا ابھی کوئی انتظام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نئی انتظامیہ کمیٹی نے بدلے ہوئے کوائف و حالات کے پیش نظر لائبریری کی ضروریات کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے ان کی توجہ شعبہ اردو، فارسی، عربی کی طرف مبذول ہوئی۔ کیونکہ اس شعبے کی حالت قومی نقطہ نظر سے غیر تسلی بخش تھی۔ اس شعبے کو اچھا اور مفید بنانا اور اس میں خوشگوار تبدیلیاں کرنا آغاز ہی سے ضروری تھا، چونکہ کتابوں کی فہرست کسی خاص سائنٹیفک سکیم کے تحت تیار نہیں کی گئی تھی، اس لیے تلاش اور جستجو میں بہت دشواری پیش آتی تھی، اور لوگوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا تھا، فیصلہ کیا گیا کہ عالمگیر اعشاری سکیم کے مطابق کتابوں کی مضمون وار تقسیم کر کے کارڈ فہرست تیار کی جائے۔ چنانچہ اس کام کو مکمل کر لیا۔

اس شعبے میں افسانے اور ناول پڑھنے والے اصحاب کی کثرت ہے، جہاں ان کی مانگ کا خیال رکھا جاتا ہے، وہاں ایسی کتابیں مہیا کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے، جو مختلف علمی شعبوں کی تحقیق میں معاون ہو سکیں۔

عربی، فارسی، اور اردو کے قلمی نسخوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، اگرچہ یہ تعداد زیادہ نہیں، لیکن بعض قلمی کتابیں اپنی کمیابی، نایابی، افادیت اور تاریخی اہمیت کی بنا پر نہایت قابلِ قدر ہیں، عربی مخطوطات کی تفصیلی فہرست شائع ہو چکی ہے جس میں ہر مخطوطہ کی قدر و قیمت اور مصنفین کے سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فارسی اور اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست اسی نہج پر زیر طبع ہے۔ جو عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ لائبریری میں سنسکرت، ہندی اور گورمکھی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخے بھی موجود ہیں، جن میں بعض نہایت نادر اور اس وجہ سے قابلِ قدر ہیں۔

سابق گورنمنٹ پنجاب نے محکمہ اسلامیات کی چار ہزار کتابیں اس لائبریری میں منتقل کر دیں۔ بیگم محمد علی قصوری نے اپنے مرحوم خاوند کی اڑھائی ہزار کتابوں کی بیش قیمت لائبریری جو کہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کتابوں پر مشتمل تھی، لائبریری کی نذر کر دی۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم، سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری ان کے فرزند سید احسان الحق صاحب کی مساعی جمیلہ سے لائبریری کو ملی ہے، یہ لائبریری بھی اردو، انگریزی اور قلمی کتب پر مشتمل ہے، ان جملہ عطیات سے لائبریری میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے اور اسے بہت تقویت پہنچی ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری کا خاص مقصد یہ ہے، کہ عوام میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس لیے عوام کی ہمہ جہتی سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے، سردیوں میں لائبریری تقریباً تمام دن کھلی رہتی ہے۔ گرمیوں میں بھی دن میں نو گھنٹے کھلتی ہے۔ اتوار کو بھی لائبریری صبح تین گھنٹے کے لیے کھلتی ہے، ہر مہینے کے آخری پیر کو لائبریری میں تعطیل ہوتی ہے۔ لائبریری کے ریڈنگ روم کو عوام بغیر کسی معاوضے کے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن گھر میں کتابیں استعمال کرنے کے لیے لائبریری کا باقاعدہ ممبر بننا پڑتا ہے، یہ ممبر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک لائف ممبر اور دوسرے سالانہ ممبر۔ لائف ممبر کو ۷۵ روپے کی یکمشت رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ سالانہ ممبروں کو آٹھ روپے چندہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ چندہ سہ ماہی قسطوں کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا ہے۔ چندہ کے ساتھ دس روپے یا بیس روپے ضمانت کے طور پر دینے پڑتے ہیں۔ دس روپے زرِ ضمانت پر بیک وقت دو کتابیں اور بیس روپے پر چار کتابیں جاری کر دی جاتی ہیں۔ ممبر ایک ماہ تک کتاب اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

سال میں پچاس ہزار کتابیں بہ طور اوسط گھر میں پڑھنے کے لیے اشو ہوتی ہیں۔ تین لاکھ بیس ہزار کتابیں جن میں جرائد اور روزانہ اخبارات بھی شامل ہیں، لائبریری میں پڑھی جاتی ہیں۔ لائبریری میں روزانہ آنے والوں کی اوسط ۷۲۵ ہے، اگرچہ اس لائبریری کے ممبر وہ حضرات بھی ہیں جو لاہور سے باہر رہتے ہیں، پھر بھی لاہور جیسے شہر میں جو تعلیم کا مرکز ہے، یہ اعداد تسلی بخش نہیں۔

لائبریری کے ارباب بست و کشاد نے نابینا افراد کے لیے انگریزی میں بریل سسٹم کے مطابق تیار کردہ کتب انگلستان سے حاصل کیں، مگر ان کتابوں کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، ہمیں امید ہے کہ اردو بریل سسٹم جب رائج ہوگا تو اس کوشش کو بہت فروغ حاصل ہوگا۔

لائبریری کا نظم و نسق ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت ہے، ڈائرکٹر تعلیم، لاہور ریجن - ڈپٹی کمشنر لاہور، اس کمیٹی کے بحیثیت عہدہ دار ممبر ہیں، چودہ ممبر بشمولیت پریذیڈنٹ اور سیکرٹری حکومت نامزد کرتی ہے۔ سیکرٹری کا انتخاب مینجنگ کمیٹی خود کرتی ہے، صدر اور سیکرٹری تنظامی افسر ہیں، لاہور سٹی کارپوریشن اور پنجاب یونیورسٹی بھی اپنا اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجتی ہے، لائف ممبر بھی اپنے دو نمائندے انتظامیہ کی مدد کے لیے انتخاب کرتے ہیں۔ گورنمنٹ جو نمائندے نامزد کرتی ہے وہ ماہرانِ تعلیم اور سرکاری افسر ہوتے ہیں۔

اورینٹل سکشن میں ڈیوی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔ انگریزی سکشن میں کتابوں کی کلاسیفکیشن ایک "خود ساختہ" سکیم کے تحت ہوتی ہے۔ کارڈ کیٹیلاگ، ڈکشنری کی طرز پر ترتیب دیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء تک کی کتابوں کی مطبوعہ فہرستیں بھی موجود ہیں۔ ہر ماہ جو کتابیں خریدی جاتی ہیں، ان کی ایک سائیکلو سٹائلڈ فہرست بھی عوام کی واقفیت کے لیے تیار ہوتی ہے، جو کہ لائبریری سے مل سکتی ہے۔

دوسرے پنج سالہ گورنمنٹ منصوبہ کے تحت ایک ویسٹ پاکستان پراونشل لائبریری لاہور میں قائم ہو رہی ہے خیال ہے ۱۹۶۵ء تک اس کی عمارت مکمل ہو جائے گی، اور یہ دونوں لائبریریاں یک جا کر دی جائیں گی۔

۲- دیال سنگھ پبلک لائبریری

یہ لائبریری سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کا عطیہ ہے۔ سردار صاحب موصوف ایک مخیر، بے لوث اور فیض رساں انسان تھے۔ انھوں نے اپنی جاگیر خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی۔ دیال سنگھ ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ اس ٹرسٹ کے خرچ پر ایک اخبار جاری ہوا، جو عرصہ تک ایک خاص فرقہ کی ترجمانی کرتا رہا۔ دیال سنگھ کالج قائم کیا گیا، اور دیال سنگھ پبلک لائبریری کی بنا ڈالی گئی۔ لائبریری کی ابتدا ۱۹۰۸ء میں ایک ریڈنگ روم سے ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں یہ ریڈنگ روم ایک اچھی خاصی لائبریری میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ لائبریری بھارت بلڈنگ میں منتقل ہوئی اور ۱۹۲۸ء میں یہ اپنی موجودہ عمارت میں پہنچ گئی۔ لائبریری کی یہ شاندار بلڈنگ دو لاکھ روپے میں تیار ہوئی تھی۔ تقسیم سے پہلے اس میں تیس ہزار کتابیں ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی اور مذہبی موضوعات پر تھیں۔ یہ صوبہ کی اچھی لائبریریوں میں شمار ہوتی تھی۔

قیامِ پاکستان کے وقت دیال سنگھ ٹرسٹ کے غیر مسلم ٹرسٹیوں کے بھارت چلے جانے کے بعد یہ لائبریری بند ہو گئی۔ اور تیرہ برس تک بند رہی۔ اس طرح لائبریری کے بند رہنے سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ جون ۱۹۵۸ء میں نئی ٹرسٹ کمیٹی کی تشکیل ہوئی، مسٹر جسٹس محمد شریف اس کے چیرمین مقرر ہوئے، نئے ٹرسٹیوں کی دو سال کی مسلسل کوششوں سے اس کے دروازے علم دوستوں پر دوبارہ کھول دیئے گئے۔ ۵ فروری ۱۹۶۱ء کو امریکی قونصل جنرل ڈاکٹر

اینڈ رو کری نے اس کا افتتاح کیا۔ علم دوست طبقے میں کتابوں کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے، اس لیے دیال سنگھ لائبریری کے دوبارہ اجرا سے لاہور کے موجودہ کتب خانوں میں ایک مسرت بخش اضافہ ہوا ہے۔

جسٹس شریف نے اعلان فرمایا ہے، کہ ٹرسٹ فنڈ میں سے بیس ہزار روپیہ ان بہت سی کتابوں کی خرید کے لیے منظور کیا گیا ہے۔ جو کہ لائبریری کے بند رہنے کے دوران میں غائب یا تلف ہو گئی ہیں۔ ہر چند کہ یہ رقم بہت ہی ناکافی ہے مگر ٹرسٹ فی الحال اپنے محدود ذرائع آمدنی کے پیش نظر یہی کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹرسٹ نے بیس ہزار روپے کتب و جرائد کی خرید کے لیے سالانہ گرانٹ مقرر کی ہے۔

لائبریری کھلنے کے اوقات موسم سرما میں ایک بجے دن سے ۸ بجے شام تک ہیں۔ اور موسم گرما میں ۱۲ بجے دوپہر سے ۸ بجے شام تک ہیں۔ البتہ ریڈنگ روم ہر موسم میں دن کو بارہ گھنٹے کھلا رہتا ہے۔

اگر کوئی لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرے تو اس سے کوئی رقم وصول نہیں کی جاتی، البتہ گھر میں مطالعہ کے لیے کتابیں لے جانے کے لیے بیس روپے زر ضمانت اور چھ روپے سالانہ چندہ پیشگی ادا کرنا پڑتا ہے۔ لائف ممبری کی فیس پچاس روپے ہے۔ دو کتابیں چودہ دن کے لیے ایشو کی جاتی ہیں۔ البتہ مفصل کے ممبروں کو دس دن زیادہ ملتے ہیں۔

ڈیوئی ڈیسیمل سکیم اور بند المارئی کا طریق رائج ہے، کارڈ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر ہے، ایک کیٹلاگ کتابی صورت میں بھی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ لائبریری کا انتظام لائبریری کمیٹی کے سپرد ہے جو بورڈ آف ٹرسٹیز کی قائم کردہ ہے۔

۳۔ میونسپل لائبریری، شاہ محمد غوث

یہ لائبریری لاہور شہر کے عین وسط میں بیرون دہلی دروازہ واقع ہے۔ اس لائبریری کی عمارت میں کسی زمانے میں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی لائبریری تھی، اور اخبار اکبر، رہی یہیں سے نکلتا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی جو منہدم ہو چکی ہے۔ یک منزلہ عمارت میں اب میونسپل لائبریری ہے۔ ۱۹۲۶ء میں میونسپل لائبریری کا آغاز ہوا۔ اس لائبریری میں پندرہ ہزار کتابیں ہیں، جو اردو، فارسی، ہندی گورمکھی اور انگریزی زبانوں پر مشتمل ہیں۔ ۹۵ کے قریب رسائل و جرائد و اخبارات اس لائبریری میں آتے ہیں۔ لاہور کے شہری اور لاہور سٹی کارپوریشن کے ملازمین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سالانہ چندہ مبلغ تین روپے اور زر ضمانت مبلغ دس روپے ہیں۔ مگر مستقل میونسپل ملازمین چندہ اور سیکورٹی سے مستثنیٰ ہیں، ممبران لائبریری قواعد کی رو سے دو کتابیں ایک وقت ایک ماہ کے لیے حاصل کر سکتے ہیں، اس لائبریری میں لیجر سسٹم رائج ہے۔ مستعار کتب ایشو رجسٹر کے ذریعے جاری ہوتی ہیں۔ لائبریری کا کیٹلاگ فہرستوں کی صورت میں مضمون وار مرتب ہے۔ کتابیں بند الماریوں میں مضمون وار رکھی گئی ہیں۔ صبح و شام دونوں وقت کھلتی ہے، سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن، لاہور سٹی کارپوریشن اس لائبریری کے انتظامیہ افسر ہیں۔ اس لائبریری کے زیر انصرام تقریباً چالیس لائبریریاں اور دار المطالعے ہیں، جو کہ شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مبلغ بارہ ہزار روپے کتب، جرائد اور اخبارات کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔

۴۔ ادارہ تعمیر نو (بی۔ این۔ آر) کا دار المطالعہ

دینا ناتھ مینشن میں ادارہ تعمیر نو کے زیر اہتمام یکم ستمبر ۱۹۶۰ء کو اس دار المطالعہ کا قیام عمل میں لایا گیا، یہ اپنے دلکش ماحول

اور علمی سہولتوں کی بنا پر طالب علموں اور بچوں میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر گیا ہے۔ اس کے قیام کا مقصد بھی طلبا اور عوام میں مطالعہ کے شوق کو فروغ دینا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت یہاں ہر موضوع پر تقریباً تین ہزار کتابیں رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ معقول تعداد میں رسائل و جرائد (انگریزی میں چالیس اور اردو میں ستائیس) بھی آتے ہیں۔ بچوں کے لیے ایک علیحدہ گوشے کو مخصوص کر دیا گیا ہے، جہاں ان کی سہولت کے پیش نظر فرنیچر اور الماریاں بھی چھوٹے سائز کی ہیں۔ اب بچوں میں سماجی شعور کی تحریک اور مطالعہ سے دلچسپی میں اضافہ کے لیے "ینگ فوک لیگ" کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے، جس کی انچارج ایک خاتون ہیں۔ لیگ کے ہفت روزہ اجلاس ہوا کرتے ہیں۔ دارالمطالعہ کے ساتھ ایک خوبصورت سا ہال بھی ملحق ہے، جو ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تقریبات کے لیے بیس روپے ضمانت (واجب الادا) پر لیا جا سکتا ہے۔ اس دارالمطالعہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے ماتحت لاہور کے مختلف علاقوں میں چالیس دیگر ایسے ہی مراکز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، ان میں سے سات خواتین کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

دارالمطالعہ میں کھلی الماری کا طریقہ رائج ہے، کٹیلاگ کارڈوں پر ہے مگر کتابوں کی ترتیب ڈیوی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق نہیں ہے۔

ادارہ تعمیر نو سے مختلف اوقات میں جو پمفلٹ شائع کیے جاتے ہیں، ان کی تقسیم بھی اسی دارالمطالعہ کے ذریعے عمل میں لائی جاتی ہے۔

ڈپٹی ڈائرکٹر ادارہ تعمیر نو اس کے افسرِ اعلیٰ ہیں مگر ذیلی امور افسر تعلقاتِ عامہ کے ذریعے طے پاتے ہیں۔

۵۔ لاہور پبلک لائبریری، علامہ اقبال روڈ لاہور پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم کا قیام ۱۹۵۰ء میں لاہور پبلک ایسوسی ایشن کے تحت عمل میں آیا۔ ۱۹۵۱ء میں لاہور پبلک ایسوسی ایشن کا نام آل پاکستان سوشل سروس میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس آرگنائزیشن کے پچیس ارکان ہیں۔ جو اپنے ماتحت اداروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہی اصحاب لائبریری کی مجلسِ منتظمہ کے ارکان ہیں۔

اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد چھ ہزار ہے، پچیس عدد رسائل اور چار عدد اخبارات باقاعدہ آتے ہیں، موضوعات کتب تاریخی، ادبی، اصلاحی، سماجی، رومانی، نفسیاتی اور معلوماتی ہیں۔

سٹی کارپوریشن آف لاہور چھ سو روپے سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔ کچھ چندہ ممبروں سے جمع ہوتا ہے، عہدیدار دو روپے عام ممبر ایک روپیہ، طالب علم پچاس پیسے ماہانہ چندہ دیتے ہیں، اور غریب طالب علموں سے کچھ نہیں لیا جاتا۔

لائبریری میں انگریزی اور اردو کتابیں ہیں۔ کٹیلاگ کتابی صورت میں موجود ہے۔ اوسطاً ڈیڑھ سو اشخاص روزانہ اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ لائبریری کھلنے کا وقت روزانہ ۴ بجے شام سے ۹ بجے شب تک ہے۔

۲۔ کلب لائبریری

۱۔ جم خانہ کلب لائبریری جم خانہ کلب لائبریری کلب کے وسیع ہال کے مغربی گوشہ میں دوسری منزل پر واقع ہے،

یہاں کم و بیش پچیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ پندرہ کے قریب رسائل و جرائد منگوائے جاتے ہیں۔

یہ لائبریری صرف کلب کے اراکین کے لیے مخصوص ہے، ہر رکن کلب کی رکنیت اختیار کرنے کے وقت لائبریری کا بھی لازماً ممبر بنتا ہے۔ اور اس کو لائبریری کے لیے بارہ روپے سالانہ چندہ ادا کرنا پڑتا ہے، ہر ممبر کو ایک وقت چھ کتابیں مل سکتی ہیں۔ ممبروں کی ایک اور قسم بھی ہے، جسے "فیملی ممبر" کہتے ہیں۔ اس صورت میں تمام کنبے کے لیے ایک ہی کارڈ ملتا ہے جس پر آٹھ کتابیں ایشو ہوتی ہیں۔

یہاں کھلی الماری کا طریقہ مروج ہے، کیونکہ لائبریری سے کتابیں گم ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ لائبریری کی قدامت کے پیش نظر یہاں بہت پرانی کتابیں بھی مل جاتی ہیں، افسانوی ادب، تاریخ اور سوانح کا حصہ بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم پر بھی کتابوں کی کئی الماریاں بھری پڑی ہیں۔

پہلے صرف انگریزی کتابیں ہی رکھی جاتی تھیں، مگر اب اردو کتابیں بھی منگوائی جاتی ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے، بچوں کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے، یہاں ان کے ذوق کے مطابق کتابوں کا بندوبست ہے۔

اس کتب خانے میں کلاسیفکیشن کا کوئی سائنٹیفک طریقہ مروج نہیں ہے۔ کتابوں کو مضمون و مصنفوں کے نام کے لحاظ سے رکھ دیا جاتا ہے، کارڈ کیٹلاگ کی جگہ رجسٹر رکھ دیا گیا ہے، جس میں تمام کتابوں کا اندراج مصنف وار ہوتا ہے۔

۳۔ اداری کتب خانے

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

پنجاب یونیورسٹی لائبریری اگرچہ ۱۸۸۲ء میں قائم کی گئی تھی، مگر صحیح معنوں میں اس کی تنظیم ۱۹۱۲ء میں (جب اس کو نئی عمارت میسر آئی) عمل میں آئی۔ اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد پنجاب یونیورسٹی کے اس زمانے کے چانسلر لفٹیننٹ گورنر سر لوئی ڈین نے ۲ فروری ۱۹۱۱ء کو رکھا تھا۔ ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو پہلے حصے کا افتتاح بھی چانسلر موصوف ہی نے کیا۔ لائبریری کی عمارت کی تکمیل فروری ۱۹۱۶ء میں ہوئی، جس پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے صرف ہوئے۔

یونیورسٹی لائبریری کے سنگِ بنیاد رکھنے کے ایک ماہ بعد لائبریری کو ایک غیر متوقع ذریعے سے ایک بہت ہی بیش قیمت ذخیرہ مل گیا۔ مسٹر ایم۔ ایچ۔ ریسیول، ایم اے، آئی، ای، ایس، پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں جب وہ ریٹائر ہوئے، تو انھوں نے اپنی چھ ہزار پانچ سو (۶۵۰۰) کتابوں کا ذخیرہ جو انھوں نے پینتیس ہزار روپے کے صرف کثیر سے اکٹھا کیا تھا، لائبریری کی نذر کر دیا، یہ ذخیرہ تب سے ایک علیحدہ سیکشن کی صورت میں لائبریری میں قائم ہے۔ اس مجموعہ میں فلسفہ، ادب اور شاعری پر بیش بہا اور قابل قدر تصانیف ہیں۔

دو اور بیش قیمت ذخیرے بھی میسر آ گئے۔ ۱۹۱۳ء میں آغا محمد ابراہیم نے اپنے جلیل القدر باپ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی ۵۵۲ کتابوں اور ۳۸۹ مخطوطات کا مجموعہ ہدیۃً لائبریری کو منتقل کر دیا، یہ ذخیرہ زیادہ تر عربی ادب پر مشتمل تھا۔ سر ایڈورڈ میکلیگن جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے انھوں نے بھی ۳۸۹ بہت ہی بیش قیمت جرائد

لائبریری کو پیش کیے، کتابیں جو بتدریج جمع ہوتی گئیں، ان کی تنظیم و ترتیب ۱۹۱۶ء میں مسٹر اے سی ڈکنسن نے کی جو لائبریری سائنس میں ایک امریکی ماہر تھے، یہ ترتیب ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق کی گئی۔ انھوں نے لائبریری ٹریننگ کورس کا بھی اجرا کیا۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں پیرزادہ محمد حسین نے ۸۰۹ کتابیں اور ۶۵ قلمی مسودات اور مئی ۱۹۳۴ء میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ۵۹۰ کتب، اور ۱۲ قلمی کتابیں لائبریری کے سپرد کردیں۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں سرشہاب الدین کی ۴ ہزار کتب لائبریری کو ملیں، قیام پاکستان کے بعد یونیورسٹی لائبریری میں اور بھی اضافہ ہوا، کیونکہ بہت اچھے اچھے ذاتی کتب خانے مثلاً منوہر لال کے کتب خانے کی ۲۴۵۴ کتب اور پروفیسر برج نرائن کی ۲۳۸۰ کتب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل کردی گئیں۔ اسی طرح سر گنگا رام کی ۵ ہزار کتب، مولوی محبوب عالم کی ۶۵۰۰ کتب، حکیم عبدالمجید غنیمی کی ۱۸۰۰ کتب، پروفیسر اقبال کی فلسفہ الٰہیات اور مذہب پر ۱۷۱۳ کتب، میاں احمد شفیع کی ۱۱۱۳ کتب، پروفیسر ایم جی سنگھ کی ۲ ہزار کتب کے مجموعے اس لائبریری کو حاصل ہوئے، اور حافظ محمود شیرانی کی سترہ سو قلمی کتب کا نہایت ہی قابل قدر ذخیرہ بھی اس لائبریری میں منتقل ہوگیا۔ غرضیکہ یہ لائبریری جو پروفیسر یوول اور سرشہاب الدین کے قیمتی عطیات سے پہلے ہی مالا مال تھی، اور بھی زیادہ دامن دراز ہوتی گئی۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے انگلش سیکشن میں جملہ علوم و فنون کی کتابیں شامل ہیں، مثلاً سائنس، فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ، مذہب، لسانیات، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ تمام علوم کی وہ کتابیں موجود ہیں، جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بعض فنی کتابیں مثلاً طب، قانون، اور انجنیئرنگ کی کتابوں کے ذخیرے متعلقہ کالجوں میں جمع ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری میں کتابوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ نوّے ہزار ہے، انگلش سیکشن میں کم و بیش ایک لاکھ پندرہ ہزار کتابیں موجود ہیں، عربی، اُردو، فارسی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد چھبیس ہزار ہے، کوئی سولہ ہزار کتابیں سنسکرت، ہندی اور پنجابی میں ہیں۔ مقتدر علمی رسائل کی تعداد ان کے علاوہ ہے، اس وقت ۴۳۲ رسالے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آتے ہیں۔ ان میں اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، جرمن، فرینچ، سب زبانوں کے رسائل شامل ہیں۔

کتابوں کی خرید پر سالانہ تیس ہزار روپے کی رقم خرچ کی جاتی ہے۔

یونیورسٹی لائبریری کے انگلش سیکشن میں یوں تو جملہ علوم و فنون کے ہر شعبہ کی کتابیں مطالعہ کرنے والوں کا مرکز توجہ ہیں، لیکن سائنس، ادب انگریزی اور تاریخ و معاشیات اور سوانح حیات کے شعبے خصوصیت کے ساتھ اپنی افادی حیثیت میں ممتاز ہیں۔

یونیورسٹی کے مختلف تدریسی شعبوں کی سیمینار لائبریریاں موجود ہیں، یہ شعبے اپنی طرف سے بھی کتابیں ان سیمینار لائبریریوں کے لیے خریدتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عربی، فارسی، اُردو اور سنسکرت کے بیش بہا قلمی ذخائر موجود ہیں۔ عربی، فارسی، اُردو کی کم و بیش ۹ ہزار قلمی کتابیں جمع ہیں۔ مخطوطات کا یہ نادر مجموعہ کئی سال کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے

جمع کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد شفیع سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس مجموعے میں بہت سی پرانی اور کمیاب کتابیں موجود ہیں۔ ایک پرانی کتاب "المدونہ" کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا، یہ کتاب مالکی فقہ کے متعلق ہے، اور ہرن کی کھال پر کوفی خط میں مرقوم ہے، اور ۴۱۲ھ کی کتابت شدہ ہے، یہ اس شعبے کی سب سے پرانی کتاب ہے اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب اس لائبریری کی بڑی قیمتی ملکیت ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سنسکرت مخطوطات کا ذخیرہ بھی خاصا اہم ہے جس کی جمع آوری میں ڈاکٹر وولنر اور ڈاکٹر لکشمی سروپ نے بڑا حصہ لیا۔ ڈاکٹر وولنر اس یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، بعد میں وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے، اس ذخیرے میں قلمی کتابوں کی تعداد کم و بیش ۸ ہزار ہے۔ ان میں بعض کتابیں درختوں کی چھال پر مرقوم ہیں۔

یہ لائبریری اعلیٰ مطالعہ و تحقیق کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، اس میں ریسرچ کے لیے بہتر سے بہتر مواد اور طلبا و محققین کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں موجود ہیں۔ ہر لحاظ سے یہ لائبریری ایک علمی لائبریری کہلانے کی مستحق ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا لائبریری ٹریننگ اسکول بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ درسگاہ ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی، اور کافی عرصے تک فنی تعلیم اسی واحد درسگاہ سے ملتی رہی، بعد میں متحدہ ہندوستان میں پیشہ ورانہ تربیت کے اور مراکز بھی کھل گئے تقسیم کے بعد سے بھی یہ اسکول بڑی باقاعدگی سے چل رہا ہے، پاکستان میں اس اسکول کے تربیت یافتہ تقریباً سب لائبریریوں میں کام کر رہے ہیں۔

یونیورسٹی لائبریری کا انتظام یونیورسٹی کی مجلسِ حاکمہ یعنی سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ہاتھ میں ہے، اس کی عملی تنظیم ایک کمیٹی کے سپرد ہے، جو یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں کے صدر صاحبان اور کالجوں کے مختلف پرنسپلوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس سے فائدہ اٹھانے والے پبلک لائبریری کی طرح عام لوگ نہیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ، پوسٹ گریجوایٹ طلباء اور تحقیق و مطالعہ کرنے والے وہ لوگ ہیں، جن کو کمیٹی نے استفادہ کا مستحق سمجھ کر اجازت دے دی ہو۔ اسی سبب سے لائبریری کی رکنیت کا دائرہ نسبتاً محدود رہتا ہے۔ تصنیفی یا تحقیقی مقاصد کے لیے پُرسکون ماحول کی سخت ضرورت ہے، جو اس وقت میسر نہیں، البتہ امید واثق ہے کہ مستقبل قریب میں جو یونیورسٹی ٹاؤن آباد ہوگا، اس میں لائبریری کے لیے اس کے شایانِ شان ایک خوبصورت اور وسیع عمارت تعمیر کی جائے گی۔

سال میں ۵۷ ہزار کتابیں گھر میں پڑھنے کے لیے اشو ہوتی ہیں۔ روزانہ لائبریری میں آنے والوں کی اوسط دو سو بیس ہے۔ کھلی الماری کا طریق رائج ہے، کتابیں ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق مضمون وار رکھی ہیں۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لائبریری

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا۔ ادارے کی لائبریری ۱۹۵۸ء میں قائم کی گئی۔ اس لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے سپرد ہے۔ جو بڑی محنت اور توجہ سے لائبریری میں کتابوں کا اضافہ کر رہی ہے۔ نظم و نسق لائبریری کے بارے

میں آخری فیصلہ لائبریری کمیٹی کی سفارش پر بورڈ کی مجلس کے اختیار میں ہے۔

لائبریری میں اس وقت چھ ہزار کتابیں ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر اچھا معیاری ذخیرہ ہے۔ بالعموم ثانوی تعلیم کے فہم مطلب کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ ریفرنس کی کتابیں خصوصیت کے ساتھ مہیا کی جا رہی ہیں۔ چودہ ہزار روپے ہر سال کتب و رسائل کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔ اس وقت پچیس جرائد لائبریری میں باقاعدگی سے آتے ہیں۔ فی الحال اساتذہ، ریسرچ سکالر، جو کہ لاہور سٹی کارپوریشن کی حدود میں رہتے ہیں۔ ملازمین محکمہ تعلیم، دفتر انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن کے ملازمین، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ممبر اور بورڈ کے دیگر ملازمین اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہنوز طلباء کی اس لائبریری تک رسائی نہیں۔ شاید یہ اس وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ سیکنڈری بورڈ کے شایان شان لائبریری کی بلڈنگ تعمیر ہو۔

کتابیں بند الماریوں میں ہیں۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اور ڈکشنری کارڈ کیٹیلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴۔ کالجوں کے کتب خانے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ شہر لاہور علوم و فنون کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور اس میں متعدد کالج ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ لائبریریاں ہیں، جن کالجوں کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے ہے۔ ان کے کتب خانوں کی کیفیت مختصراً درج ذیل ہے۔

(ا) آرٹس کالج

۱۔ گورنمنٹ کالج لائبریری

اس لائبریری کا نام فضل حسین میموریل لائبریری بھی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور پاکستان کے بہترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں بھی اس کی بہت شہرت تھی۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۳ء میں رکھی گئی۔ جب کہ ڈاکٹر لائٹنر اس کے پرنسپل تھے، ایک طویل مدت تک لائبریری کلاسز کے چند کمروں کی زینت رہی۔ ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین نے وفات پائی۔ وہ سابقہ پنجاب کے سربرآوردہ اصحاب میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے وفات تک صوبائی وزیر نیز مرکزی حکومت کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن رہے۔ اس وقت کی برٹش گورنمنٹ میں بھی ان کو بڑا دخل تھا۔ مسلمانوں کی بھی انھوں نے بڑی خدمت انجام دی تھی۔ وفات کے وقت صوبہ کی (UNIONIST PARTY) یونینسٹ پارٹی (جو ہندو، مسلمان اور سکھ کی مخلوط پارٹی تھی) کے لیڈر تھے، میاں صاحب مرحوم گورنمنٹ کالج کے اولڈ طلباء میں بھی تھے، ان کی وفات پر ایک یادگار قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ڈاکٹر ایچ، بی، ڈنی کلف پرنسپل گورنمنٹ کالج نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کی موجودہ لائبریری کو توسیع دے کر اس کا نام فضل حسین میموریل لائبریری رکھا جائے۔ اور اس کے لیے مستقل عمارت بنائی جائے۔ چنانچہ اس خیال کو بہت سراہا گیا، ۴۷۸۵۰ روپے چندہ آن واحد میں جمع ہو گیا۔ راجے، مہاراجوں، نوابوں اور ملک کے سربرآوردہ لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی، چنانچہ بلڈنگ اور فرنیچر پر ایک لاکھ ۲۹ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ یہ بلڈنگ بالکل تیار ہو گئی تو گورنر سر ہنری کریک نے ۲۲ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اس کا افتتاح کیا۔ یہ یادگار عمارت کالج کی عمارت سے ملحق ہے۔ اور بالکل کالج ہی کے نمونہ کی بنی ہوئی ہے۔ کالج کی بلڈنگ اور لائبریری میں امتیاز

کرنا مشکل ہے، اوپر کی منزل میں لائبریری ہے جس کے گرد ایک گیلری ہے، ایک کشادہ آراستہ ہال بھی ہے جس میں کہ ایک سو طالب علم بیک وقت بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہال کا ماحول مطالعہ کے لیے بہت سازگار ہے۔

اس لائبریری کے ماتحت ہم سکشنل (شعبہ جاتی) لائبریریاں بھی ہیں جو حسب ذیل چار شعبوں کے متعلق ہیں:۔

(۱) ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی اینڈ سائیکولوجی۔

(۲) فزکس ڈیپارٹمنٹ

(۳) کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ

(۴) بائیلوجی اور باٹنی ڈیپارٹمنٹ۔

گورنمنٹ کالج لائبریری میں پچاس ہزار کتابیں ہیں جو آرٹ اور سائنس کے مضامین پر ہیں۔ سو کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ لائبریری کا نظم و نسق پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔ اساتذہ اور طلبا اس لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن، کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ فورمین کرسچین کالج لائبریری

ہر چند کہ یہ لائبریری اس نام سے مشہور ہے، لیکن اس کا اصل نام یوئنگ میموریل لائبریری ہے، کالج کی ابتدا ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ لائبریری بھی تب ہی سے قائم ہے۔ یہ لائبریری ۱۹۴۱ء میں اپنی موجودہ شاندار اور جدید سائنٹیفک اصول کے مطابق بنی ہوئی عمارت میں منتقل ہوئی۔

لائبریری میں ۵۳ ہزار کتابیں ہیں، اکاون ہزار انگریزی زبان میں، ایک ہزار اردو، فارسی، عربی میں اور ایک مختصر سا مجموعہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، لاطینی، یونانی اور ہندی زبانوں میں ہے، ان کے علاوہ پچاس مخطوطات اور ۳۴۵ نادر کتابیں ہیں۔ پانچ روزانہ اخبارات اور ۲۶ جرائد، ہفتہ وار، ماہانہ اور سہ ماہی باقاعدگی سے آتے ہیں۔

لائبریری میں اناجیل کے کثیر التعداد نسخے ہیں، عمومی موضوعات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے، پوسٹ گریجوایٹ طلبا کے لیے ایک ضمنی کتب خانہ یوئنگ ہال، نیلا گنبد میں بھی موجود ہے، بند الماری اور کھلی الماری دونوں کا انتظام ہے، جس سے اساتذہ اور طلبا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مبلغ چار ہزار روپے ہر سال کتب و جرائد کی خریداری پر صرف ہوتے ہیں کتابیں اور رسالے ہدیۃً بھی موصول ہوتے ہیں۔ کالج کے پرنسپل اس کے سربراہ ہیں، ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن، کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، حال ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ رنگین روشنی (FLORESCENT TUBES) کا انتظام کیا جائے اور لائبریری دن کے علاوہ شام کو بھی کھلی رہے۔

۳۔ اسلامیہ کالج لائبریری، سول لائنز

انجمن حمایت اسلام نے ۱۸۹۲ء میں اسلامیہ کالج قائم کیا اور تب ہی سے لائبریری کی بنیاد رکھی، ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ریلوے روڈ پر ہائی سیکنڈری کلاس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بی اے اور ایم اے کی تعلیم سول لائنز میں دی جاتی ہے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں اب ۱۴ ہزار کتابوں کا ذخیرہ ہے جن میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

متحدہ کالج میں ۳۵ ہزار کے قریب کتابیں تھیں اور رسائل و جرائد کی تعداد جو ہر سال منگوائے جاتے تھے ستر تھی۔
بٹوارہ کے بعد اب اس کالج میں ۱۲ ہزار کتابیں ہیں اور پچاس رسائل منگوائے جاتے ہیں۔ جن میں غیر ملکی رسالے بھی شامل ہیں۔
اردو، فارسی اور عربی کی بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ساتھ تاریخ، انگریزی ادبیات فلسفہ اور نفسیات پر کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض ایسی نادر کتابیں بھی موجود ہیں، جو اب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء سے پہلے کی کتابیں عام حالات میں اشو نہیں کی جاتیں۔ اس لائبریری کی سالانہ گرانٹ دس ہزار روپے ہے۔ ۸ ہزار کتابوں کی خرید کے لیے اور دو ہزار جرائد کے لیے۔ لیکن اس مرتبہ ۵۰ ہزار روپے کی رقم خطیر گمشدہ کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے منظور کی گئی ہے۔ اس رقم سے تمام جماعتوں کی درسی کتابیں بھی خریدی جائیں گی۔ اساتذہ اور طلبا اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری کا طریقہ رائج ہے، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴ - ایم اے او کالج لائبریری

ایم اے او کالج سنہ ۱۹۳۳ء میں امرتسر میں قائم ہوا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد دوبارہ اس کا قیام لاہور میں عمل میں آیا۔ اس لائبریری میں کم و بیش پندرہ ہزار کتابیں ہیں۔ جو عام موضوعات پر ہیں۔ انگریزی ادب اور اقتصادیات کے شعبے کافی اچھے ہیں۔ مبلغ ۴ ہزار روپے سالانہ کتب و جرائد کی خرید پر ہر سال صرف ہوتے ہیں۔ لائبریری سے طلبا، اساتذہ اور انجمن اسلامیہ کے ممبر استفادہ کرتے ہیں۔ لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت ہے جس کے ارکان پرنسپل، فیکلٹیوں کے ممبر اور چند کالج کونسل کے ممبر ہیں۔
بند الماری کا طریقہ رائج ہے، ڈیوی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق کتابوں کی ترتیب ہوتی ہے۔ ڈکشنری کیٹلاگ کتابوں کی صورت میں ہے۔

۵ - دیال سنگھ کالج لائبریری

مشہور مخیر اور علم دوست سردار دیال سنگھ کے نام پر سنہ ۱۹۱۰ء میں اس کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کالج کے اخراجات کا کفیل بھی دیال سنگھ ٹرسٹ ہی ہے۔ لائبریری بھی کالج کے ساتھ ہی قائم کی گئی تھی۔
اس وقت اس میں کم و بیش ۳۴ ہزار کتابیں ہیں۔ اور ۴۰ کے قریب رسائل و جرائد خریدے جاتے ہیں۔ یہ لائبریری نہ صرف طلبا کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، بلکہ اس میں بعض ایسی کتابیں بھی موجود ہیں، جو کسی بھی ریسرچ سکالر کے کام آ سکتی ہیں۔ اسی طرح ریفرنس کے لیے بھی سب طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ انگریزی اور تاریخ کے شعبے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے ذمے ہے۔ اسے بہتر بنانے کے لیے مزید کوشش جاری ہے۔ گزشتہ سال تقریباً ۲ ہزار روپے کے صرف سے کتابوں میں اضافے کیے گئے۔ بند الماری، ڈیوی ڈیسیمل سسٹم، اور کارڈ کیٹلاگ رائج ہیں۔ کالج کے اوقات ہی لائبریری کے اوقات ہیں۔

۶ - ایچیسن کالج لائبریری

ایچیسن کالج سنہ ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا تھا۔ تعلیم ایف اے اور ہائر سینئر کیمبرج تک دی جاتی ہے۔ لائبریری بھی کالج کے ساتھ ہی قائم ہوئی، مگر بڑے مختصر پیمانے پر۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں یہ لائبریری نئے (WING) بازو میں منتقل ہوئی، لیکن صحیح معنوں میں اس کی تنظیم جون سنہ ۱۹۵۹ء سے شروع ہوئی۔ کتابوں کی تعداد ساڑھے گیارہ ہزار

ہے جس میں انگریزی کتابوں کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ بقیہ اُردو، فارسی، عربی کی کتابیں ہیں۔ ادب اور تاریخ اسلام پر بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ لائبریری کا بجٹ دس ہزار روپے ہے۔ اس میں مزید کتب کے علاوہ اسٹیشنری، فرنیچر، اور جلد سازی کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ کتابیں خریدنے میں طلبات کے تعلیمی معیار کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ لائبریری کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی ہے جس کے صدر کالج کے پرنسپل اور سیکرٹری لائبریرین ہیں۔ دارالمطالعہ لائبریری سے بالکل الگ ہے جہاں تیس رسالے اور مقامی اخبارات آتے ہیں۔

کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابوں کی ترتیب ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۷ - لاہور کالج فار وومن لائبریری

۱۹۲۲ء میں یہ کالج معرض وجود میں آیا۔ اس میں بارہ ہزار آٹھ سو مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ایک درجن کے قریب رسائل آتے ہیں۔ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ دو ہزار روپے ہر سال کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ اُستانیاں اور طالبات اس لائبریری سے استفادہ کرتی ہیں۔ ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ اس لائبریری کی زمام انتظام کالج کی لیڈی پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔

۸ - اسلامیہ کالج فار وومن لائبریری

یہ کالج ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ اس میں عام موضوعات پر تقریباً ساڑھے چھ ہزار کتابیں ہیں۔ چھبیس کے قریب رسائل آتے ہیں۔ ۴ ہزار روپے کتابوں اور ۵۰۰ روپے رسائل کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ طالبات اور اساتذات اس کو استعمال کرتی ہیں۔ کھلی الماری اور ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہیں۔ کلاسیفائیڈ کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ لیڈی پرنسپل لائبریری کی انتظامی افسر ہیں۔

۹ - کنیرڈ کالج لائبریری

کنیرڈ کالج ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اور لائبریری بھی اس کے معاً بعد ہی معرض وجود میں آئی تھی۔ اس سے صرف کالج کی اساتذات اور طالبات استفادہ کر سکتی ہیں۔ ادب کے علاوہ بیشتر کتابیں ان مضامین سے متعلق ہیں۔ جو کالج میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً فلسفہ، سیاست، معاشیات، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ۔

کتابیں ڈیوئی کے اعشاری نظام کے تحت ترتیب دی گئی ہیں۔ یہ نظام تقریباً نو، دس سال قبل رائج کیا گیا تھا۔ بند الماری سسٹم رائج ہے۔

لائبریری کی ترقی و توسیع آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ سات سال قبل لائبریرین کی مدد کے لیے ایک کل وقتی اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔

گزشتہ سالوں میں ایشیا فاؤنڈیشن، برٹش کونسل، اور کولمبو پلان کی کتابوں کے عطیات سے لائبریری کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ کولمبو پلان کے تحت ۱۹۵۹ء کے آغاز میں سائنس کی کتابوں کا ایک بہت بڑا عطیہ موصول ہوا تھا۔ اس زمانے میں کالج کو سائنس کی کتابوں کی اشد ضرورت تھی۔ کالج میں بی۔ ایس سی کلاسز ۱۹۵۷ء میں شروع ہوئی تھیں اور یونیورسٹی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ کتابوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ چنانچہ سہولت کے لیے سائنس لائبریری کو مرکزی لائبریری سے الگ کر کے سائنس بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس وقت کالج کے شعبہ سائنس میں کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے جس میں امریکہ اور برطانیہ کی تازہ ترین مطبوعات بھی موجود ہیں۔ سائنس کی اساتذات خود ہی اس شعبہ میں کتابیں جاری کرتی اور کتابوں کی نگرانی کرتی ہیں۔ اس کے متعلقہ انتظامی امور لائبریرین

کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

شعبہ انگریزی کے پاس ایک الگ مختصر سی لائبریری بھی ہے، جس میں انگریزی زبان اور ادب پر کتابیں موجود ہیں۔ شعبہ انگریزی کے اساتذہ اور لائبریرین باہمی تعاون سے مل کر اس لائبریری کا انتظام کرتے ہیں۔

کل کتابوں کی تعداد تیرہ چودہ ہزار کے درمیان ہے۔ زیادہ تر کتابیں انگریزی میں ہیں، اردو ادب کا بھی ایک حصہ ہے۔ فرانسیسی اور فارسی میں بھی کتابیں موجود ہیں۔

کالج میں طالبات کی ایک لائبریری کمیٹی بھی ہے۔ جس میں جماعت انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے نمائندے شامل ہیں۔ حال ہی میں اساتذات کی بھی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ جس کا کام بجٹ کی تقسیم کے سلسلے میں لائبریرین کی امداد کرنا، نئی کتابوں کی سفارش کرنا اور شکایات کا تدارک کرنا ہے۔ ماضی میں لائبریری کے اوقات صبح آٹھ بجے سے تین بجے بعد دوپہر تک تھے، لیکن نئی تجویز کے بموجب اب لائبریری ساڑھے چار بجے تک کھلی رہا کرے گی، اور ہفتہ میں چار دن رات کو پونے آٹھ بجے سے پونے دس بجے تک بھی کھلی رہا کرے گی۔

ب۔ سائنس کالج۔ فنون مفیدہ کے کالج

۱۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لائبریری

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ۱۸۶۰ء میں طب جدید کی تعلیم کے لیے قائم ہوا۔ یہ کالج برصغیر پاک و ہند میں کلکتہ میڈیکل کالج کے بعد دوسری قدیم درسگاہ ہے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو اس کالج کی صد سالہ برسی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی۔ اس کو آج تمام مملکت پاکستان میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کرنے والے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پوسٹ گریجوایٹ ڈپلوموں۔ ڈی۔ایم۔آر۔ای، ڈی۔او، ڈی۔ایل۔او کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ میڈیسن (علم الادویہ) اور سرجری (جراحی) کی کسی شاخ میں پنجاب یونیورسٹی کی ایم۔ڈی اور ایم۔ایس کی ڈگری حاصل کرنے کی آسانیاں بھی مہیا ہیں۔ نیز بی۔ڈی۔ایس، اور بی۔فارمیسی کے گریجوایٹوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ میو ہسپتال جس میں کہ ۹۵۰ بستروں کی گنجائش ہے کالج کے ساتھ مربوط ہے۔ جس میں میڈیسن اور سرجری کی تمام برانچوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لیڈی ولنگڈن ہسپتال اور لیڈی ایچیسن ہسپتال میں دایہ گری اور امراض نسواں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کالج کی لائبریری میں طبی موضوعات پر کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ جن کی مجموعی تعداد کم و بیش سترہ ہزار ہے، ۱۲۵ کے قریب رسائل و جرائد برطانیہ، امریکہ اور دیگر ممالک سے آتے ہیں۔ لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے ذمے ہے، جس کے ارکان زیادہ تر مختلف شعبوں کے سربراہ ہیں۔ بند المارئ اور ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لائبریری

فاطمہ جناح میڈیکل کالج ۱۹۴۸ء میں قائم کیا گیا، لائبریری کی بنیاد بھی اسی سال پڑی، یہ کالج صرف لڑکیوں کی طبی تعلیم کے لیے مخصوص ہے، اس لائبریری میں کم و بیش ڈھائی ہزار کتابیں ہیں، جو زیادہ تر طب، سرجری، اور پبلک ہیلتھ کے موضوعات پر ہیں۔ ۴۵ رسائل و جرائد بھی لائبریری میں آتے ہیں۔ اس سے کالج کی اساتذات اور طالبات فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بند المارئ اور ڈیوئی ڈیسیمل

کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پہ تیار کیا گیا ہے۔

۳۔ گورنمنٹ کالج آف اینیمل ہسبنڈری[1] لائبریری

ویٹرنری کالج لاہور ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا نام بدل کر "گورنمنٹ کالج آف اینیمل ہسبنڈری" رکھ دیا گیا ہے۔ اس کالج کی لائبریری میں ۴ ہزار کتابیں ہیں۔ نیز کے قریب رسائل آتے ہیں۔ فن بیطاری کے متعلق کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ لائبریری کالج کے پرنسپل کے ماتحت ہے۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پہ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۴۔ گورنمنٹ کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لائبریری

پنجاب کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا نام تبدیل کر کے گورنمنٹ کالج آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی رکھ دیا گیا ہے۔ اس کالج کی لائبریری کالج کی مرکزی عمارت کی پہلی منزل پہ واقع ہے۔ اس میں انجینیرنگ کے متعلق پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ انجینیرنگ کے تقریباً بیس رسالے آتے ہیں۔ جو لوگ انجینیرنگ کی تعلیم کے لیے بیرونی ممالک میں جانا چاہتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لیے امریکہ اور برطانیہ کی اکثر یونیورسٹیوں کے کیلنڈر بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ حوالے کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ جن سے طلبا اور اساتذہ صرف لائبریری میں بیٹھ کر استفادہ کر سکتے ہیں۔ دیگر کتب حسب قاعدہ اشو ہوتی ہیں۔ لائبریری کا کچھ حصہ عام مطالعہ اور طلبا کے دیگر علمی مشاغل کے لیے وقف ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد اس لائبریری میں تقریباً سات ہزار کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اب انجینیرنگ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے کالج کی لائبریری کو ایک بڑی اور علیحدہ عمارت میں منتقل کیا جائے گا۔ اور کتابوں میں بھی بڑے پیمانہ پر اضافہ متوقع ہے۔

بند الماری اور ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کا طریق رائج ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پہ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔ کالج کے طلبا اور اساتذہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

۵۔ ڈی مانٹمورنسی کالج آف ڈنٹسٹری لائبریری

۱۹۳۴ء میں کالج کے ساتھ اس لائبریری کا بھی اجرا ہوا۔ اس وقت اس میں ۱۰۲۳ کتابیں صرف دانتوں کی بیماریوں، ان کے علاج اور دندان سازی کے طریقوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں سات میگزین بھی آتے ہیں۔ سٹاف اور کالج کے طلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیرونی اشخاص سے ۵ روپے زرِ ضمانت اور دس روپے سالانہ چندہ لیا جاتا ہے۔ گو اب تک اس میں کارڈ کیٹلاگ اور کلاسیفکیشن کا کوئی مناسب طریقہ نہ تھا۔ مگر اب کیٹلاگ کارڈ کی صورت میں تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔ اس میں بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ لائبریری کا افسرِ اعلیٰ کالج کا پرنسپل ہے۔

۶۔ ہوم اینڈ سوشل سائنس کالج لائبریری

لڑکیوں کے اس کالج کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس کا قیام ۱۹۵۵ء میں عمل میں لایا گیا۔ کتابوں کے انتخاب میں پڑھائے جانے والے مضامین

---

[1] GOVERNMENT COLLEGE OF ANIMAL HUSBANDRY

کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں غذا، خوراک، لباس، خانہ داری، بچوں کی نفسیات، موسیقی، فنونِ لطیفہ، گھریلو اقتصادیات، عمرانیات، اور اس کے متعلقہ علوم کی کتابیں ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کی خرید کا بجٹ دو ہزار روپے سالانہ ہے، لیکن دو ایک مرتبہ پچاس پچاس ہزار روپے بطور سپیشل گرانٹ بھی منظور کئے گئے ہیں۔ ادارہ فورڈ فاؤنڈیشن سے بھی کتابیں بطور تحفہ ملتی رہی ہیں۔ اس وقت کتابوں کی کل تعداد ۵۰۰۶ (انگریزی [۴۲۸۴]، اردو ۷۲۲) ہے، ۳۵ جرائد منگوائے جاتے ہیں۔

دیگر کالجوں کی روایت کے برعکس یہاں کھلی الماری کا طریقہ رائج ہے، لیکن طالبات میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے ان سے ۵۰ روپے بطور ضمانت لیے جاتے ہیں۔ دو روپے ماہوار لائبریری فنڈ لڑکیوں کو دینا پڑتا ہے۔

لائبریری کے انتظامی امور سرانجام دینے کے لیے اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔

اس لائبریری میں ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم رائج ہے، کارڈ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر ہے، اوقات لائبریری صبح ۸ بجے سے شام ۴ بجے تک ہیں۔

ج - یونیورسٹی کے قائم کردہ دیگر علوم و فنون کے کالج

۱ - ہیلی کالج آف کامرس لائبریری

ہیلی کالج آف کامرس ۱۹۲۷ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی لائبریری میں کم و بیش ۷ ہزار کتابیں ہیں۔ تیس کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ کتابوں کا یہ مجموعہ اکنامکس (معاشیات) کامرس (تجارت) بزنس (کاروبار) انڈسٹری (صنعت) بینکنگ (بنکاری) اور فنانس (مالیات) کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ طلباء اور اساتذہ اس لائبریری سے مستفید ہوتے ہیں۔ طلبائے قدیم کو بھی لائبریری استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اور کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کیٹلاگ مضمون وار کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، ہر سال چار ہزار روپے خرید کتب، ڈیڑھ ہزار روپے رسائل و جرائد اور پانچ سو روپے دیگر متفرق ضروریات پر خرچ ہوتے ہیں۔ لائبریری روزانہ ۹½ گھنٹے کھلی رہتی ہے۔

۲ - لاء کالج لائبریری

لاء کالج ۱۸۶۸ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ اس کالج کی لائبریری میں قانون کی کم و بیش بارہ ہزار کتابیں اور بیس ہزار رپورٹ ہیں۔ لائبریری کے سربراہ پروفیسر انچارج اور کالج کے پرنسپل ہیں۔ کلاسیفکیشن کسی خاص اسکیم کے ماتحت نہیں ہے۔ کتابوں کو مضمون وار حروفِ ابجد کے لحاظ سے ترتیب دے کر چھپی ہوئی کتابی صورت میں ایک فہرست تیار کر دی گئی ہے۔ بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ ہر سال دس ہزار روپے کی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اور لائبریری بارہ گھنٹے کھلی رہتی ہے۔ جس سے طلباء اور اساتذہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری کا ایک FRIENDS SERVICE SECTION (شعبہ خدمت رفقاء) بھی ہے، جس سے نادار طلباء کو کورس کی کتابیں پورے سال کے لیے مہیا کی جاتی ہیں۔

۳ - اورینٹل کالج لائبریری

ہر چند کہ اورینٹل کالج ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا تھا، لیکن اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اس لائبریری کی عمر نسبتاً بہت کم ہے، کیونکہ اورینٹل کالج کے طلباء یونیورسٹی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔

۱۹۵۲ء میں طلباء کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں زیادہ تر اُردو، فارسی، عربی، ادبیات ان کی تاریخ اور تاریخی و انتقادی ادب پر کتابیں ہیں۔ تنقید پر انگریزی کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ کورس کی کتابیں کافی تعداد میں ہیں۔ مجموعی طور پر کتابوں کی تعداد ۵۳۰۰ کے قریب ہے۔ ایک سو کے قریب علمی و ادبی جرائد بھی آتے ہیں۔ لائبریری کے افسر اعلیٰ کالج کے پرنسپل ہیں۔ کھلی الماری اور ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن رائج ہیں۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

د۔ فنونِ لطیفہ کے کالجوں کے کتب خانے

۱۔ نیشنل کالج آف آرٹس لائبریری

۱۸۷۵ء میں میوسکول آف آرٹس کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا کہ عوام کو عملی فنون اور دست کاری کی تعلیم دی جائے۔ بلاشبہ ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس میں فن کارانہ ذوق رکھنے والے طلباء کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ ابتدا میں یہاں ڈرائنگ، جیومیٹری، ماڈلنگ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی رہی۔ بعد میں پیشہ ورانہ تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اور لکڑی اور لوہے کے کام کی جماعتوں کا بھی اجرا ہوا۔

جب ۱۹۵۸ء میں اسے ایک باقاعدہ کالج کا درجہ دے دیا گیا تو طلبا اور اساتذہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کی لائبریری کی بھی تشکیل نو کی گئی۔ اس لائبریری میں تقریباً ۴ ہزار کتابیں ایک وسیع کمرہ میں رکھی گئی ہیں۔ پڑھائے جانے والے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے یہاں عمارت سازی، ڈیزائن، مجسمہ سازی، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی کتابیں ہیں، ان کے علاوہ ادبیات پر بھی کافی کتابیں موجود ہیں، جن میں بعض بہت قیمتی اور نایاب ہیں۔ لائبریری میں بعض فارسی زبان کے مخطوطات اور قدیم ایرانی مصور کتابیں بھی ہیں۔ فنونِ لطیفہ پر تقریباً دو درجن رسائل و جرائد بھی خریدے جاتے ہیں۔

بند الماری، ڈیوی ڈیسیمل سسٹم اور کارڈ کیٹلاگ رائج ہیں۔ کالج کے پرنسپل انتظامی امور کے سربراہ ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں بورڈ آف سٹڈیز کے مشوروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ہ۔ تعلیمی تربیتی کالجوں کے کتب خانے

۱۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لائبریری

۱۸۸۱ء میں اس کالج کو اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے قائم کیا گیا۔ اس لیے اس میں عام دلچسپی کی کتابوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر درس و تدریس، طریقِ تعلیم، نفسیات اور بچوں کی تربیت پر کتابیں ہیں۔ اس وقت کتابوں کی تعداد ۴۲ ہزار ہے اور پچاس کے قریب رسائل و جرائد آتے ہیں۔ ان کے انتخاب میں تعلیمی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ گو اس میں پہلے بند الماری کا طریقہ مروج تھا، مگر اب تجرباتی طور پر جزواً کھلی الماری کا طریقہ بھی اپنا لیا گیا ہے تاکہ طلباء میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو سکے۔

دیگر کالجوں کی مانند یہ لائبریری بھی صرف طلباء اور اساتذہ کے لیے مخصوص ہے، ڈکشنری کارڈ کیٹلاگ اور ڈیوی ڈیسیمل طریقہ رائج ہے۔ کالج کے اوقات ہی لائبریری کے اوقات ہیں۔ کالج کے پرنسپل لائبریری کے سربراہ ہیں۔

بچوں کے لیے ڈھائی ہزار کتابوں کا علیحدہ سیکشن ہے، جس کو زیرِ تربیت اساتذہ بچوں کی تعلیمی اغراض اور رہنمائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لائبریری

سنہ ۱۹۳۳ء میں کالج کے ساتھ اس لائبریری کی بنیاد پڑی۔ اس لائبریری میں کم و بیش چھ ہزار کتابیں ہیں۔ چھ اخبارات اور دس جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ چار ہزار روپے کتابوں کی خرید پر اور چھ سو روپے اخبارات اور جرائد پر صرف ہوتے ہیں۔ بچوں کی کتابوں کا علیحدہ انتظام ہے جس سے تربیت حاصل کرنے والی استانیاں اپنا سبق تیار کرتی ہیں۔ کالج کی پرنسپل انتظامی امور کی نگران ہیں۔ استانیاں اور طالبات اس لائبریری سے استفادہ کرتی ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابوں کی ترتیب ڈیوئی ڈیسیمل اسکیم کے مطابق ہے۔ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۵۔ ٹیکنیکل کتب خانے (مختص الاغراض کتب خانے)

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری، پنجاب یونیورسٹی

یونیورسٹی کیمیکل لیبارٹری کی تعمیر سنہ ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں یونیورسٹی پروفیسر آف ان اورگینک کیمسٹری مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک فزیکل کیمسٹری کا پروفیسر تعینات کیا گیا۔ جس کو کہ ڈائریکٹر آف لیبارٹریز بھی بنا دیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں آنرز سکول ان ٹیکنیکل کیمسٹری کا کورس شروع کیا گیا، جس کی تعلیم میں یونیورسٹی کیمیکل لیبارٹری کے شاف مدد دیتے رہے، سنہ ۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی نے اورگینک کیمسٹری میں ایک ریڈر مقرر کیا۔ اور اس طرح یہ ایک اچھا خاصا کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ بن گیا۔ جس میں کہ فزیکل، آرگینک، ان اورگینک اور ٹیکنیکل کیمسٹری کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس کا نام انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری میں تبدیل کر دیا گیا۔

کتابوں کی تعداد ½ ۷ ہزار ہے، جن میں تخمیناً ۲۰۰۰ جرائد بھی شامل ہیں، ۳۵ جرائد ہر ماہ باقاعدگی سے آتے ہیں۔ کتابوں کی خرید پر ہر سالی پانچ ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔ کتابیں زیادہ تر جنرل، ان اورگینک، آرگینک، فزیکل، ٹیکنیکل، انالیٹیکل انڈسٹریل اور بائیو کیمسٹری کے موضوعات پر ہیں۔

کلاسیفکیشن ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم پر ہے۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے، اور بند الماری کا طریق رائج ہے لائبریری کے اوقات صبح ۸ بجے سے شام ۴ بجے تک ہیں۔

اساتذہ، متعلمین اور پی ایچ ڈی کے طلباء اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں، بیرونی احباب کو لائبریری کے استعمال کے لیے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔

۲۔ انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی لائبریری

یہ ادارہ پنجاب یونیورسٹی نے انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی کے نام سے اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء میں قائم کیا۔ چونکہ ملک میں صنعتی ترقی سرعت کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے، اس لیے اس انسٹیٹیوٹ کی افادیت اور اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں کے گریجوایٹ طلبا

فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام ملک میں پرائیویٹ اور گورنمنٹ فیکٹریوں میں ذمہ دارانہ عہدوں پر کام کرتے ہیں۔

اس انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ چالیس کے قریب جرائد آتے ہیں۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ کتب و جرائد کی خرید پر صرف ہوتا ہے۔ زیادہ تر کتابیں کیمیکل، انڈسٹریل، آرگینک، ان آرگینک، اور جنرل انڈسٹریل کیمسٹری پر ہیں۔ ایم۔ ایس۔ سی ٹیکنیکل اور ایم۔ ایس۔ سی (ٹیکنیکل آنرز) کے طلباء اور اساتذہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ تدریسی کتب کے علاوہ اعلیٰ تحقیق و مطالعہ کا مواد بھی موجود ہے۔ لائبریری کا وقت صبح ۸ بجے سے شام کے چھ بجے تک ہے۔ لائبریری کا انتظام پروفیسر انچارج انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حسب ہدایت کرتے ہیں۔ کلاسیفکیشن خود اپنی ایجاد کردہ ہے، کیٹلاگ کتابی صورت میں ہے جس کی ترتیب موضوعات کے لحاظ سے ہے۔ فنی تربیتی مقاصد کے لیے نہایت سودمند ادارہ ہے۔

۳۔ ہائی ٹنشن اینڈ نکلیر ریسرچ لیبارٹری، گورنمنٹ کالج لاہور

یہ لیبارٹری گورنمنٹ کالج فزکس ڈیپارٹمنٹ (شعبہ طبیعات) کا حصہ ہے۔ ۱۹۵۸ء میں قائم ہوئی، ۱۹۵۹ء میں باقاعدہ طور پر اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔

گورنمنٹ کالج کا فزکس ڈیپارٹمنٹ دو حصوں میں منقسم ہے۔ کالج کی لیبارٹریز میں الیکٹرونکس (برقیات) کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ لیبارٹری نکلیر ریسرچ کے لیے مخصوص ہے، اس لیبارٹری سے ایم۔ ایس۔ سی کے طلباء، پوسٹ ایم۔ ایس۔ سی سکالرز اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلباء استفادہ کرتے ہیں۔

لائبریری میں کتابوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے مگر ریسرچ لٹریچر (تحقیقی مواد) بہت زیادہ ہے، جو کہ اس لائبریری کا اہم جزو ہے۔ اور جس پر تمام تر ریسرچ کا انحصار ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا کے بہترین فزکس کے جرائد اس لائبریری میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ برطانیہ کے گزشتہ دس سال کے فزکس جرائد کا مکمل اور نہایت قابل قدر سیٹ اس لائبریری میں موجود ہے۔ برٹش کونسل نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک کے فزکس کے جرائد ہدیۃً لائبریری کو پیش کیے ہیں۔ فنی افادی حیثیت سے یہ کتب خانہ نہایت ہی اہم اور قابل قدر ادارہ ہے۔

۴۔ ویسٹ ریجنل لیبارٹریز لائبریری

۱۹۵۴ء میں ادارہ پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا جس کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے، کونسل کے قائم کرنے کی غرض یہ تھی۔ کہ جدید سائنسی اور صنعتی علوم کی تحقیق و تفتیش کے نتائج سے عوام کو روشناس کر کے اس باب میں ان کی رہنمائی کی جائے۔ تاکہ ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہو۔

اس ادارہ کی شاخ لاہور کی لائبریری ۱۹۵۵ء میں قائم کی گئی۔ اس وقت اس میں پانچ ہزار کتابیں ہیں، جو سائنسی عمومی موضوعات بالخصوص کیمسٹری پر ہیں۔ ۱۵۰ رسائل و جرائد منگوائے جاتے ہیں۔ یہ تمام سائنٹیفک اور ٹیکنیکل رسالے ہیں۔ ان رسائل کے گزشتہ سالوں کے تمام سیٹ بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ جو کہ عہد جدید کی فنی ترقیات کی تحقیق کے لیے بہت ضروری ہیں۔

ۓ HIGH TENSION & NUCLEAR RESEARCH LABORATORY.
(کتب خانہ تحقیقات ہائی ٹنشن و مدار)

۲۵ ہزار سے ۴۰ ہزار روپے سالانہ تک کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ کراچی کا مرکزی دفتر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ غیر ملکی نئی جرائد لائبریری کو مہیا کرے۔

اس لائبریری سے بالعموم ریسرچ سٹاف (تحقیقاتی عملہ) مستفید ہوتا ہے، ریسرچ سٹاف کے ارکان بیشتر ایم ایس سی اور پی، ایچ، ڈی ہوتے ہیں۔ بیرونی حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ کونسل کی اپنی گورننگ باڈی (ہیئت منتظمہ) ہے۔ جو کہ لائبریری کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ لائبریری صبح آٹھ بجے سے شام ۴ بجے تک کھلی رہتی ہے۔

کھلی الماری کا طریق رائج ہے۔ کتابیں اور جرائد ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم کے مطابق مضمون وار رکھی ہیں۔ ڈکشنری کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۵۔ پاکستان ایسوسی ایشن فار دی اڈوانسمنٹ آف سائنس لائبریری[1]

ایسوسی ایشن کا دفتر ڈیسٹ پاکستان ریجنل لیبارٹریز وانع فیروز پور روڈ لاہور ہے۔ جس کے ساتھ یہ لائبریری بھی وہاں موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری اس لائبریری کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس میں تین ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں اور ڈھائی سو جرائد ان کے علاوہ ہیں۔ یہ کتابیں سائنٹیفک ٹیکنیکل اور صنعتی موضوعات پر ہیں۔ ایسوسی ایشن کے ممبر ہی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن کے مطابق کتابوں کی ترتیب دی گئی ہے۔ کیٹلاگ کارڈوں پر تیار کیا گیا ہے۔

۶۔ اریگیشن ریسرچ انسٹیٹیوٹ[2]

اریگیشن ریسرچ یا ادارہ نہری تحقیقات کی لائبریری ۱۹۲۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ نہری ادارے کو جن مسائل پر تحقیق کرنا تھی، ان سے متعلق بہت سے رسالے فراہم کیے گئے تھے۔ اس انسٹیٹیوٹ کی اپنی مطبوعات بھی اس لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمام مواد بھی موجود ہے، جو بیرونی ممالک سے ان مطبوعات کے عوض حاصل کیا گیا ہے۔

۱۹۴۴ء میں انسٹیٹیوٹ کے ایک ڈائریکٹر نے اس لائبریری کو سیکرٹریٹ کی پی، ڈبلیو، ڈی لائبریری میں مدغم کر دیا۔ لیکن یہ تبدیلی مفید ثابت ہونے کی بجائے نقصان دہ اور تحقیقی مقاصد میں دشواری کا موجب ثابت ہوئی، لہذا جلد ہی پرانا طریقہ پھر رائج کر دیا گیا۔ اور انسٹیٹیوٹ کے لیے ایک الگ لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جس کے بعد کام میں زیادہ سرگرمی پیدا ہوئی اور اس میں تازہ ترین کتابیں، رسالے، اور انسٹیٹیوٹ کی مطبوعات جمع کی گئیں۔ اس وقت اس لائبریری میں ۱۵۶۲ کتابیں موجود ہیں، ۴۱ رسالے آتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سی بیرونی مطبوعات انسٹیٹیوٹ کی مطبوعات کے تبادلے میں آتی ہیں۔

ہر سال کتابوں کی خرید پر ۱۴۵۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالوں پر ۵۰۰ روپے کا زر مبادلہ صرف ہوتا ہے۔

---

[1] PAKISTAN ASSOCIATION FOR THE ADVANCEMENT OF SCIENCE LIBRARY
(کتب خانہ ادارہ ترقی علوم طبعیہ)

[2] IRRIGATION RESEARCH INSTITUTE.

اس لائبریری میں جو کتابیں خریدی جاتی ہیں، وہ بہت بلند معیار کی ہوتی ہیں۔ ہائیڈرالکس (ہائیڈرولکس) (بہتر قابہات) فزکس (خواص مادہ) اور سوائیل سیمنٹ (ننگرابہات) پر بہت بلند پایہ کتابیں موجود ہیں۔

محکمہ انہار کے حکام اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ واپڈا کے افسران بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ڈیوی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔ کیٹلاگ رجسٹر کی صورت میں ہے، جس پر مضمون وار کتابیں مندرج ہیں۔

۶ - گورنمنٹ کی لائبریریاں (محکمانہ کتب خانے)

۱ - اسمبلی لائبریری

اسمبلی لائبریری ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل لائبریری کے نام سے قائم ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں یہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی لائبریری (کتب خانہ مجلس آئین ساز، پنجاب) کہلانے لگی۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے بعد اسے مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی لائبریری کہا جانے لگا۔ مختلف محکموں، کمیشنوں، کمیٹیوں، اور بورڈوں کی رسمی اور غیر رسمی مجالس کی رودادوں کے علاوہ اس میں تقریباً دس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک برطانوی دارالعوام کی کارروائی کا مکمل سٹ بھی موجود ہے۔

لائبریری کی زیادہ تر کتابیں حوالہ جات، قانون، دستور، معاشرت، ادب اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے قبل صوبائی اسمبلی کے ارکان اور اس کا عملہ لائبریری سے استفادہ کرتے تھے۔ اسمبلی ٹوٹ جانے کے بعد سے مارشل لا ایڈمنسٹریشن زون بی کے عہدہ داران اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ دستور کمیشن اور صوبائی ایجوکیشن کمیشن کے اراکین بھی اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ یہ لائبریری حکومتِ مغربی پاکستان کے ماتحت ہے اور مغربی پاکستان کی ترقیاتی مشاورتی کونسل WEST PAKISTAN DEVELOPMENT ADVISORY COUNCIL کے سیکرٹری اس کے منتظم ہیں۔ کتابوں کو ڈیوی کے اعشاری نظام کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ لائبریری صبح ساڑھے سات بجے سے دوپہر ڈیڑھ بجے تک کھلی رہتی ہے۔

۲ - بورڈ آف اکنومک انکوائری، پنجاب، لائبریری[1]

بورڈ آف اکنومک انکوائری، پنجاب، ایک تحقیقاتی ادارہ ہے۔ جو اقتصادی امور کی تحقیقات کرتا ہے، اور اپنی رپورٹیں شائع کرتا ہے، . . . . اس کی ایک ڈیپارٹمنٹل لائبریری ہے جو عرصہ سے قائم ہے۔ اس لائبریری میں چار ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ جو خریدی بھی گئیں اور ہدیتہً بھی موصول ہوئیں۔ اس کے تعلقات مختلف قومی اور بین الاقوامی ایجنسیوں سے ہیں۔ جن میں باہمی تبادلہ کتب ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم ایجنسیاں یو، این، او۔ ڈبلیو، ایچ، او۔ آئی، ایل، او۔ آئی، ایم، ایف، اور بعض امریکہ، برطانیہ، اور یورپ کی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے ہیں۔ لائبریری سے استفادہ زیادہ تر بورڈ کا ریسرچ سٹاف ہی کرتا ہے، سرکاری افسروں اور یونیورسٹی کے ریسرچ سکالروں کو بھی لائبریری میں بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت ہے، تیس³ کے قریب رسائل و جرائد بھی اس لائبریری میں آتے ہیں۔ کتابیں زیادہ تر

---

[1] BOARD OF ECONOMIC ENQUIRY PUNJAB, LIBRARY. (ادارہ اقتصادی معلومات کا کتب خانہ)

اقتصادیات، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعتی اقتصادیات کے مضامین پر ہیں۔

بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ آتھر کیٹلاگ کتابی صورت میں ہے۔ اور مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے۔

۳۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس لائبریری

محکمہ تعلیم کی مرکزی لائبریری ۱۸۹۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ جس کے تحت اس وقت دو لائبریریاں کام کر رہی ہیں۔ ایک ایڈوائزری بورڈ فار بکس لائبریری (تالیفات کی مشاورتی مجلس کا کتب خانہ) ہے، اور دوسری پبلیکیشنز سیکشن کی ٹیکسٹ بک لائبریری (شعبہ مطبوعات کتب نصاب کا کتب خانہ) ہے۔ دونوں لاہور کے علاقائی محکمہ تعلیم سے متعلق اور حکومت مغربی پاکستان کے ماتحت ہیں۔

دونوں لائبریریاں خاص نوعیت کی حامل ہیں۔ ان میں تعلیم اور دوسرے مضامین کی کتابیں جمع کی جاتی ہیں، اس وقت ان میں تخمیناً بیس ہزار کتابیں موجود ہیں جن کے منجملہ تقریباً تین چوتھائی شعبہ انگریزی میں اور بقایا مشرقی زبانوں کے شعبے میں ہیں۔ پچاس کے قریب ملکی اور غیر ملکی رسائل بھی آتے ہیں۔ سابق پنجاب کے منظور شدہ تعلیمی اداروں کے اساتذہ ان لائبریریوں کے ممبر بن سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ زیر تربیت اساتذہ اور ہیڈ کوارٹر ڈائریکٹوریٹ (صدر دفتر محکمہ تعلیم) کے ملازمین بھی ممبر بن سکتے ہیں۔

ڈیوی ڈیسیمل اسکیم، ڈکشنری کارڈ کیٹلاگ، اور بند الماری سسٹم رائج ہیں۔

۴۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ لائبریری (کتب خانہ محکمہ تعمیرات عامہ)

اس لائبریری میں ٹیکنیکل کتابیں ہیں، جن کی تعداد تیرہ ہزار کے قریب ہے۔ یہ لائبریری محکمہ انہار اور عمارت اور سڑک کے محکمہ تعمیرات کے لیے ہے۔ افسران محکمہ انہار و بی اینڈ آر اس کی کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انجنیئرنگ (فن تعمیرات) ایک ایسا علم ہے، جس کے فارمولے (اصول) آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اور جدید تحقیقات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ان تجربوں اور تحقیقات کی بنا پر نئی نئی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور ہر سال جدید کتب خریدنی پڑتی ہیں۔ لائبریری کا سالانہ بجٹ پانچ ہزار روپے ہے۔ اس کا انتظام محکمہ انہار کے سپرد ہے، اس لائبریری میں تعمیرات کے متعلق کم و بیش بیس رسالے اور جرائد باقاعدہ آتے ہیں۔

۵۔ ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن لائبریری

مغربی پاکستان بیورو آف ایجوکیشن اکتوبر ۱۹۵۸ء میں قائم کی گئی۔ اس بیورو کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مغربی پاکستان میں تعلیم کے بارے میں ہر سطح پر اعداد و شمار اور دیگر معلومات فراہم کرنا۔

۲۔ جہاں تک تعلیمی مواد کا تعلق ہے۔ اس کے حصول میں ڈوکومینٹیشن سنٹر (مرکز استناد) کا فرض ادا کرنا۔

۳۔ مطلوبہ تعلیمی موضوعات کا خود یا دوسرے قابل اداروں کی شرکت میں جائزہ لینا۔

۴۔ رپورٹ، بلیٹن، جرائد۔ اور کلاس روم مواد وغیرہ شائع کرنا۔

۵ - ہر قسم کی تعلیمی اطلاع مرکزی حکومت، سرکاری محکموں، ماہرانِ تعلیم، بیرونی حکومتوں، اوارات اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مہیا کرنا۔

اس وقت بیورو کی لائبریری ——— میں ۵۰۴۴ کتابیں اور پمفلٹ ہیں، ساٹھ رسائل و جرائد ملکی اور غیر ملکی اس میں آتے ہیں۔

کتابیں زیادہ تر تعلیم اور اس کے متعلقہ مضامین پر ہیں، چونکہ لائبریری ڈوکومنٹیشن سنٹر کا حصہ ہے، اس لیے ڈوکومنٹیشن اور لائبریری سائنس (فنِ کتاب داری) کے متعلق مواد بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

حکومتِ مغربی پاکستان اس ادارے اور لائبریری کی سربراہ ہے۔

ہر سال پانچ ہزار روپے کتابوں کی خرید پر خرچ ہوتے ہیں۔ آئندہ پنج سالہ منصوبے میں اس کے لیے ۵۲ ہزار روپے مزید رقم رکھی گئی ہے۔

یہ ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری ہے۔ اور اس کا کیٹلاگ کلاسیفائیڈ ہے۔ ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفکیشن اسکیم رائج ہے۔

اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے، کہ اس میں تعلیمی امور کے متعلق سرکردہ اخبارات میں جو مواد شائع ہوتا ہے، ان کے تراشے باقاعدگی سے رکھے جاتے ہیں۔

۶ - ویسٹ پاکستان سول سیکرٹریٹ لائبریری

یہ لائبریری ۱۸۵۸ء میں قائم ہوئی تھی، اور ویسٹ پاکستان گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔ اس میں کم و بیش اکسٹھ ہزار کتابیں ہیں۔ پندرہ کے قریب جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ کتابیں عام موضوعات پر ہیں۔ گورنمنٹ رپورٹوں کا خاصا ذخیرہ ہے۔ چار ہزار روپے ہر سال کتابوں کی خرید پر صرف ہوتے ہیں۔ ویسٹ پاکستان گورنمنٹ کے محکمے اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں بند الماری کا طریقہ رائج ہے، کتابوں کو مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے، اور کارڈ کیٹلاگ ڈکشنری کی طرز پر تیار کیا گیا ہے۔

۷ - ڈائرکٹریٹ آف پبلک ہیلتھ لائبریری، برڈ وڈ روڈ

اس لائبریری میں طب، جراحی، اور صحتِ عامہ پر آٹھ سو مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ڈائرکٹر آف ہیلتھ اس کے سربراہ ہیں۔ دس جرائد باقاعدگی سے لائبریری میں آتے ہیں۔ ڈائرکٹریٹ آف پبلک ہیلتھ کے افسر اور سٹاف اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ بند الماری کا طریقہ رائج ہے۔ مضمون وار کتابوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اور کتابیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ دفتری اوقات کے ساتھ لائبریری کھلی رہتی ہے۔

۸ - لائبریری محکمہ رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹی، ویسٹ پاکستان گورنمنٹ

اس لائبریری میں اقتصادیات، زراعت، تعلیم اور قانون پر ۲۵۰۰ مطبوعہ کتابیں ہیں، ۵ جرائد آتے ہیں۔ بند الماری کا طریق رائج ہے۔ کیٹلاگ چھپا ہوا ہے اور مضمون وار ترتیب

دیا گیا ہے۔ محکمہ کے افسر اور عملے کے لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

۹۔ آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ لائبریری، قلعہ لاہور (کتب خانہ محکمۂ آثارِ قدیمہ)

یہ لائبریری ۱۹۴۶ء میں قائم ہوئی۔ سپرنٹنڈنٹ آف آرکیولوجی اس کے سربراہ ہیں۔ اس لائبریری میں چار ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ جو تاریخ، آثارِ قدیمہ، فنِ تعمیرات اور سیاحت پر ہیں۔ یہ ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری ہے۔ اس میں سے کتابیں جاری نہیں ہوتیں۔ کتابوں کو مضمون وار ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۰۔ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز لائبریری، ویسٹ پاکستان (محکمہ صنعت و حرفت، مغربی پاکستان کی لائبریری)

انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ (محکمہ صنعت و حرفت) مغربی پاکستان کے ساتھ اس لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس لیے اس محکمہ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں یہ لائبریری بھی مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتی رہی۔ اور بالآخر ملتان روڈ پر واقع محکمہ کی عمارت کے ساتھ اس کے لیے بھی ایک جگہ مخصوص کر دی گئی۔ بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر اب اس میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

دس ہزار کتابوں پر مشتمل اس لائبریری میں ٹیکنیکل (صناعی)، کمرشل (تجارتی) موضوعات پر بہت کارآمد اور مفید تالیفات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ معاشیات، تاریخ، اور آرٹ پر بھی کافی کتابیں ہیں۔ اگرچہ کتابوں کا انتخاب محکمہ کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ تاہم عام دلچسپی کے موضوعات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب پرانی گورنمنٹ رپورٹس (سابقہ حکومتوں کی روداد صنعت و حرفت) اور گزیٹیئر بھی موجود ہیں۔ حوالہ جات کے انسائیکلوپیڈیا، ٹریڈ ڈائرکٹری، ٹیکنیکل ڈکشنری (کاروباری اور پیشہ ورانہ کتب لغات) نیز امریکہ اور پاکستان کے STANDARD SPECIFICATIONS. بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ رسائل کی تعداد ۵۰ ہے، جس میں فنی اور کمرشل جرائد اور عام دلچسپی کے پرچے بھی شامل ہیں، گو یہ لائبریری صرف محکمانہ ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کی گئی ہے، لیکن محکمہ کے افسروں اور عملے کے علاوہ بیرونی اصحاب سے بھی تعاون کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب ایسے لوگوں کو اہم اور قیمتی کتابیں دینے کی بجائے PHOTOSTAT کرانے کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔

ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کی لائبریری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ محکمہ صنعت و حرفت کے دیگر اداروں اور علاقائی دفاتر کے تمام کتب خانے اس لائبریری کے ساتھ ملحق ہیں۔ اب ان تمام لائبریریوں کی ایک یونین کیٹیلاگ (مشترکہ فہرست) مرتب کرنے کا پروگرام بنا لیا گیا ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کی کتابوں سے استفادہ میں آسانی رہے۔

لائبریری میں بند الماری کا طریق مروج ہے۔ لیکن اب بتدریج کھلی الماری کی طرف قدم بڑھایا جا رہا ہے، اور غالباً جلد ہی مکمل طور سے کھلی الماری کے طریقِ کار کو اپنا لیا جائے گا۔

پہلے یہاں مطبوعہ کیٹیلاگ ہوتی تھیں۔ بعد میں مضمون وار فہرستیں ٹائپ کرا کر رکھی گئیں۔ لیکن اب کارڈ کیٹیلاگ بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے۔

انتظامی امور کو سرانجام دینے کے لیے ۹ افسران کلاس I پر مشتمل ایک ایڈوائزری بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے جس کے

صدر سائنٹفک ڈائرکٹر ہیں۔ لائبریرین بطور اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا ہے۔ مگر اختیارات ڈائرکٹر کے ہاتھ میں ہیں۔

کتابوں اور رسالوں کی خرید پر تقریباً ۵ ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہے، اس کے لیے کوئی بجٹ مخصوص نہیں ہے۔ ضروریات کے مطابق رقم حاصل کی جاتی ہے۔

۱۱۔ لاہور میوزیم لائبریری (عجائب خانہ لاہور کی لائبریری)

۱۸۶۴ء میں میوزیم کے ساتھ ہی اس لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں تقریباً ۴ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ جو فنون لطیفہ، آثار قدیمہ، سکہ سازی، کتبہ گری اور تاریخ کے موضوعات پر مشتمل ہیں، اس میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ اور فنون لطیفہ کے بارے میں بعض بیش بہا کتابیں ہیں۔ آثار قدیمہ کے بارے میں بعض سرکاری رپورٹوں کے مکمل سیٹ موجود ہیں۔ اگرچہ لائبریری سرکاری نوعیت کی ہے، لیکن ایم اے تاریخ اور فنون لطیفہ کے طلبا، طالبات اور ریسرچ سکالر بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں کوئی تربیت یافتہ لائبریرین نہیں ہے، اس لیے کتابوں کی ترتیب اور فہرست کی تیاری کسی فنی اصول پر نہیں ہو سکی؟ اس وقت بند الماری کا طریقہ رائج ہے، کتابوں کی خرید پر سالانہ دو ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔

۱۲۔ جی، ایم (جنرل منیجر) لائبریری، پی، ڈبلیو، آر (ہیڈ کوارٹرز)

یہ لائبریری مغربی پاکستان ریلوے (پی، ڈبلیو، آر) کی دفتری ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کی گئی ہے، وجود دفتر کے ساتھ ہی معرض وجود میں آئی، کتابوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ یہ کتابیں انجینئرنگ، ریلوے ایڈمنسٹریشن (نظام محکمہ ریل) مواصلات، شماریات، قانون، تاریخ اور فنانس (مالیات ریلوے) وغیرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں محکمانہ ضروریات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور صرف محکمے کے افسروں کے استعمال کے لیے ہے، اس کی حیثیت ایک ریفرنس لائبریری کی ہے۔

یہاں ۱۶ جرائد منگوائے جاتے ہیں۔ جن میں سے نصف صرف ریلوے کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی عام نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان رسائل کو لائبریری میں محفوظ رکھنے کی بجائے متعلقہ شعبہ جات کو بھیج دیا جاتا ہے۔

لائبریری میں ریلوے تنظیم کے متعلق بعض قدیم اور نایاب رپورٹیں، نیز بیرونی اور ملکی ٹیکنیکل اور فنی اداروں کی کارروائیوں کی رودادیں موجود ہیں، کتابوں کے انتخاب میں دفتری ضروریات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

کیٹلاگ مضمون وار کتابی صورت میں حروف تہجی کے اعتبار سے تیار کیا گیا ہے، بند الماری کا طریقہ مروج ہے، اختیار جنرل منیجر کے ہاتھ میں ہے۔

کچھ عرصہ قبل اس لائبریری کی تقریباً ایک ہزار کتابوں کو علیحدہ کر کے ایک جداگانہ فنی لائبریری قائم کی گئی جس کا نام "پی اینڈ ڈی" لائبریری ہے۔ اس میں ڈرائنگ، ڈرافٹنگ اور سروے کے متعلق کتابیں ہیں۔ اور محکمہ کے بھی شعبے ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۷ - عدالتی کتب خانے

۱ - سپریم کورٹ لائبریری

۱۹۴۷ء میں سپریم کورٹ کے ساتھ ہی اس لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تقسیم ملک کے وقت تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابیں کورٹ کی ملکیت تھیں۔ لیکن تقسیم کتب کے وقت اس لائبریری کے حصہ میں صرف سو کتابیں آئیں۔ اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ کیونکہ یہ کتابیں بازخستہ حالت میں تھیں اور یا بالکل ہی ناکارہ ہو گئی تھیں۔ لائبریری کی ابتدا ان ہی سو کتابوں سے ہوئی لیکن آج یہاں دس ہزار کتابوں کا ایک ایسا قابل قدر ذخیرہ موجود ہے جو عدالتِ عالیہ کے جج صاحبان کی تمام ضروریات کی کفالت کر سکتا ہے۔

کیونکہ انقلاب سے پہلے عدالت آئینی مسائل کا جائزہ لیا کرتی تھی، اس لیے اس وقت اس کی تمام کتابیں اسی نقطۂ نظر سے فراہم کی جاتی تھیں، اور گو بعد میں سول لا پر بھی کتابوں کی خرید شروع کر دی گئی، لیکن اس کا اہم ترین حصّہ اب بھی CONSTITUTIONAL LAW. (آئین دستور سازی) پر مشتمل ہے۔

یہاں نہ صرف پاک و ہند کی عدالت ہائے عالیہ کی رپورٹس یا فیصلے موجود ہیں۔ بلکہ دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک کے عدالتی فیصلوں کے بارے میں بھی مکمل رپورٹس موجود ہیں۔ برطانوی عدالت ہائے عالیہ کے ۱۸۶۲ء سے لے کر اب تک کے تمام فیصلوں کی نقول اور امریکہ میں جب سے سپریم کورٹ نے کام شروع کیا، اس وقت سے اب تک کی تمام رپورٹوں کے مکمل سیٹ فراہم کر لیے گئے ہیں۔

یہ لائبریری صرف عدالتِ عالیہ کے ججوں کے لیے مخصوص ہے۔

اس میں ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم رائج ہے، البتہ کیٹلاگ رجسٹر کی صورت میں ہے جو مضمون وار ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف وار بھی ہے۔ دس ہزار روپے سالانہ خریدِ کتب پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۲ - ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ لائبریری

یہ لائبریری چیف کورٹ کے قیام کے وقت سے قائم ہے۔ چیف کورٹ کو بعد میں ہائی کورٹ کا درجہ دیا گیا جو مغربی پاکستان کی وحدت کے بعد ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تیس ہزار کتابیں ہیں جو ہائی کورٹ کے جج صاحبان کے لیے مخصوص ہیں، وکلا بھی ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں کلاسیفکیشن کا کوئی سائنٹیفک طریقہ مروّج نہیں۔ کیٹلاگ ایک رجسٹر کی صورت میں ہے، کتابوں کی خرید پر پندرہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے۔

۳ - بار ایسوسی ایشن لائبریری

یہ لائبریری بھی ہائی کورٹ کی عمارت میں واقع ہے، اور اس وقت سے قائم ہے جبکہ یہاں چیف کورٹ کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے قیام کا مقصد ایڈووکیٹوں و وکلا کے لیے مطالعہ، تحقیق اور حوالہ جات کی فراہمی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا تھا، اس سے صرف بار ایسوسی ایشن (جمعیت وکلا) کے اراکین ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اراکین کو مطالعہ کی سہولتیں پہنچانے کے لیے ایک علیحدہ ریڈنگ روم موجود ہے۔ قانون پیشہ اصحاب، یہاں عدالت کے ہنگامہ پرور ماحول سے جدا ہو کر سکون سے کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

کتابوں کی تعداد ۵ ہزار ہے اور پاک و ہند کی عدالت ہائے عالیہ کی مکمل رپورٹیں موجود ہیں۔

کلاسیفکیشن سائنٹیفک اصول پر نہیں ہے۔ کیٹلاگ مطبوعہ صورت میں موجود ہے، چنانچہ اسے مکمل رکھنے کے لیے ہر سال اس کے نئے اڈیشن طبع کرائے جاتے ہیں۔

کتابوں کی خرید پر سالانہ دس ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔

۸ - علمی و ادبی اداروں کے کتب خانے

قیام پاکستان کے بعد مندرجہ ذیل ثقافتی مراکز لاہور میں قائم ہوئے جن کے ساتھ ان کے اپنے کتب خانے بھی ہیں۔ مطالعہ اور علمی تحقیق کی بہت سی سہولتیں ان کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱ - ادارہ ثقافت اسلامیہ یہ ادارہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ گورنمنٹ اس کو مالی امداد دیتی ہے۔ اس ادارے کا مقصد دینِ اسلام کی روشنی میں حیاتِ جدیدہ کی تشکیل ہے۔ تصنیف و تالیف و ترجمہ کا کام اس ادارے کے ذمے ہے۔ اب تک متعدد کتابیں اس ادارے سے شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے اکثر بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ایک ماہنامہ بنام "ثقافت" بھی باقاعدہ نکل رہا ہے۔

اس ادارے کے کتب خانے میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کی ۵۵۰۰ کتابیں ہیں، کتابیں تقریباً ہر موضوع پر موجود ہیں۔ تیس کے قریب رسائل آتے ہیں۔ جو زیادہ تر مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر ہیں۔ بالعموم وہ حضرات جو ادارے سے وابستہ ہیں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی تحقیق کا شیدائی بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو اس کو بھی محروم نہیں کیا جاتا، کتابوں کی تقسیم ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم کے مطابق ہے، کیٹلاگ کارڈوں کی صورت میں ہے۔

۲ - ادارہ مجلس ترقی ادب یہ ادارہ بھی ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ حکومت مغربی پاکستان کا سرکاری ادارہ ہے، اس کا مقصد اُردو کے ذریعے اہل پاکستان کو جدید فکری رجحان سے روشناس کرانا ہے۔

اس ادارے نے اب تک کئی قابلِ قدر کتابیں شائع کی ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے شعبہ دار الترجمہ کی طرح دوسری زبانوں کی بہت سی کتابوں کے تراجم اُردو میں شائع کیے ہیں۔

اس ادارے سے ملحق لائبریری میں دو ہزار کتابیں ہیں۔ تقریباً ایک درجن جرائد آتے ہیں۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی زبان میں کتابوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، مجلسِ ترقی ادب کے اراکین لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ کتابوں کی فہرست کتابی شکل میں ہے، اس ادارے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر اب اس لائبریری کو مزید وسعت دینے کا منصوبہ ہے۔ چنانچہ اس سال ۵ ہزار روپیہ فراہمی کتب کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

۹ - سفارتی اور غیر ملکی کتب خانے

ان کتب خانوں کے علاوہ بیرونی سفارت خانوں کی نگرانی میں درس و مطالعہ کے چند اہم مراکز بھی قائم ہو چکے ہیں،

ان میں امریکی، برطانوی، جرمنی، ایرانی اور متحدہ جمہوریہ عربیہ کے ادارے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی بنیادی غرض و غایت کچھ بھی ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ ان کے وجود نے لاہور کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں گوناگوں و بوقلموں اضافہ کر دیا ہے۔ علم و مطالعہ کے شیدائی سینکڑوں کی تعداد میں اپنی فکری و ذہنی تشنگی دور کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ان اداروں کی تاسیس کا فائدہ ایک طرف تو یہ ہے، کہ ان ممالک کے ساتھ پاکستان کے علمی، تعلیمی اور ثقافتی تعلقات و روابط استوار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف علوم و فنون کے بین الاقوامی ذخائر سے افادہ و استفادہ کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے سفارتی کتب خانوں کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

۱۔ یو، ایس انفرمیشن سروس لائبریری
(کتب خانہ شعبہ اطلاعات ریاستہائے متحدہ امریکہ)

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں امریکی جنگی اطلاعات کے محکمے نے ایک ریفرنس (حوالہ جاتی) لائبریری لندن میں قائم کی، جو کہ امریکی مفاد کی اشاعت میں اس قدر مؤثر ثابت ہوئی، کہ اس قسم کی اور لائبریریاں ملبورن، سڈنی، ویلنگٹن، جوہنزبرگ، قاہرہ، سٹاک ہالم، لزبن اور میڈرڈ میں کھول دی گئیں۔

یہ سمندر پار لائبریریاں خبر رسانی کا ایک ایسا کارگر ذریعہ ثابت ہوئیں، کہ ۱۹۴۲ء میں یو، ایس کانگرس نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو اس قدر رقم مہیا کی، کہ وہ موجودہ لائبریریوں کے اخراجات کو باقاعدگی سے چلا سکیں۔ اور دوسرے ممالک میں بھی ایسی لائبریریاں کھولیں، تاکہ امریکہ کی کہانی آزاد دنیا کے لوگوں تک پہنچے۔ چنانچہ آج ایسی ۱۶۵ لائبریریاں یورپ، لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید کے ۶۵ ممالک میں قائم ہیں۔ یہ ادارے امریکی شعبہ اطلاعات کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں۔ اور ان کا خاص مقصد حکومت امریکہ کے اغراض و مقاصد کی تشریح کرنا، امریکی کلچر اور امریکی طرزِ زندگی سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔

امریکی شعبہ اطلاعات ایجنسی اپنے کتابی پروگرام کو ایک وسیع پیمانہ کی تعلیمی مہم تصوّر کرتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ سمندر پار امریکہ کے بارے میں اچھی رائے اور پائیدار دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لیے ایسی کتابوں کی ترویج و اشاعت ناگزیر ہے۔ کیونکہ انہی مطبوعات کے ذریعے تمام روئے زمین کے لوگ امریکی اقتصادیات، عمرانیات، اور ملک کی سیاسی اہمیت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

ادارہ یو، ایس، آئی، ایس لاہور کے کتب خانے میں اس وقت بارہ ہزار کتابیں انگریزی زبان کی اور دو سو کتابیں اردو زبان کی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے ۲۲۰ جرائد باقاعدہ آتے ہیں۔ ممبران کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے۔ اوسطاً ۶۰۵۰ اشخاص روزانہ لائبریری میں آتے ہیں۔ کتابیں دو سو سے ۲۵۰ تک روزانہ اشو کی جاتی ہیں۔ سال میں اوسطاً کوئی ۲۸،۰۰ استفسارات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں لائبریری ۸½ بجے صبح سے ایک بجے تک اور شام کو ۴½ بجے سے ۷ بجے تک کھلتی ہے۔ سردیوں میں ۹½ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک کھلی رہتی ہے۔

گشتی کتب خانے۔ امریکی شعبہ اطلاعات کے افسروں کو پاکستانیوں کی طرف سے بہت سے خطوط موصول ہوئے، جس میں انھوں نے پاکستان میں گشتی کتب خانے چلانے کی تجویز پیش کی، ان مراسلات میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ دور افتادہ علاقوں میں رہنے والوں کو مطالعہ کتب سے مستفید ہونے کی سہولت مہیا کی جائے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اس گشتی

کتب خانہ کا افتتاح کیا گیا، اور دو گشتی کتب خانے قائم کئے گئے۔ ہر گشتی کتب خانے میں ۲۰۰۰ کتابیں تقریباً ہر موضوع کی ہوتی ہیں۔ ان کے عنوانات افسانوں سے لے کر انجنیرنگ تک اور بچوں کی مصور کتابوں اور رسالوں سے لے کر فلسفہ تک تعلق رکھتے ہیں۔ کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی ہوتی ہیں۔

ان گشتی کتب خانوں کا مقصد صرف اسکولوں اور کالجوں کے طلبا اور اساتذہ کی ضروریات کو پورا کرنا نہیں ہے، بلکہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی خدمت کرنا ہے، بیرونجات کے رہنے والے تمام اشخاص اس کے ممبر بن سکتے ہیں۔

ہر ممبر کو ایک ماہ کے لیے ایک کتاب اشو کی جاتی ہے۔ سروس فری ہے، ٹریولنگ لائبریری سروس تین ماہ گرمیوں میں گرمی کی شدت، اسکولوں اور کالجوں کے بند ہونے اور بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے بند رہتی ہے، ٹریولنگ لائبریری لاہور سے سوات تک کا دورہ کرتی ہے۔

گشتی کتب خانے میں کتابوں کی تعداد ۹۹۷۳ ہے۔ جن کے منجملہ ۷۱۲۲ انگریزی اور ۲۸۵۱ اردو زبان میں ہیں۔ ۹ ماہ میں تینتیس ہزار کتابیں اشو ہوتی ہیں۔ ممبروں کی تعداد ۲۷۰۰ ہے، ۵۴ شہروں میں یہ کتب خانے جاتے ہیں جسب ذیل ۱۲۲ ادارے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں:

لڑکوں کے کالج	۱۵
لڑکیوں کے کالج	۳
لڑکوں کے اسکول	۳۷
لڑکیوں کے اسکول	۱۹
میونسپل لائبریریاں	۱۵
فیکٹری، کلب اور گورنمنٹ دفاتر	۳۳

۲ - برٹش کونسل لائبریری

برٹش کونسل کا ثقافتی ادارہ آج سے ۲۵ سال پیشتر برٹش گورنمنٹ کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی غرض و غایت سیاسی اور کاروباری تعلقات کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ علمی، تعلیمی اور ثقافتی روابط قائم کرنا تھی، یہ ادارہ کرۂ ارض کے ۷۰ ممالک میں کام کر رہا ہے۔ جس میں ایسے ممالک بھی شامل ہیں جو کامن ویلتھ ر دول مشترکہ برطانیہ کے رکن نہیں ہیں۔ کونسل کے ذمے جہاں بہت سے دوسرے کام ہیں، وہاں سب سے اہم اور ضروری کام ان ممالک میں سو ایسی لائبریریوں کا انتظام کرنا ہے، جہاں سے حوالہ جاتی کتابیں مستعار لی جا سکیں، چنانچہ ان لائبریریوں سے ہر سال ۱۵ لاکھ کتابیں مستعار لی جاتی ہیں۔

لاہور میں برٹش کونسل لائبریری ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی۔ اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۲۱۶۲ ہے، ۱۶۲۰۷ کتابیں عام قسم کی اور ۵۹۵۵ کتابیں نصاب کی ہیں۔ اس لائبریری کی یہ خصوصیت ہے کہ طلبا کے لیے انگلستان کی مطبوعہ نصابی کتابیں مہیا کرتی ہے۔ کالج کے طلبا کو اس سے بہت فائدہ اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہ نصابی کتب گھر میں مطالعہ کے لیے

بھی دی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تعداد میں لائبریری کے لیے مہیا کی جا رہی ہیں۔ اُمید ہے اس سال کے آخر تک یہ تعداد دس ہزار تک ہو جائے گی۔

لائبریری کے کھلنے کے اوقات ۹ بجے صبح سے شام کے ۷ بجے تک ہیں۔ جمعہ کے روز لائبریری ½۱۲ بجے سے ½۲ بجے دن تک بند رہتی ہے، اتوار کو تعطیل ہوتی ہے۔

۱۴۰ رسائل انگریزی زبان میں مختلف موضوعات پر موصول ہوتے ہیں۔ اس لائبریری میں مطالعہ کرنے والوں کی اوسط تعداد روزانہ دو سو پچاس ہے۔

ہر شخص ممبر بن سکتا ہے، مگر اسے کسی معروف شخص کی تعارفی چٹھی لانی ضروری ہوتی ہے۔ اگر کتاب کے واپس کرنے میں زیادہ تاخیر ہو جائے تو ان صاحب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

ممبری کی فیس صرف پانچ روپے سالانہ ہے۔

۳ - پاکستان جرمن کلچرل سنٹر لائبریری

جرمن ریڈنگ روم ۳۰ر اگست ۱۹۵۸ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ سنٹر کے افتتاح کی سادہ رسم (CENTRAL BANK) سنٹرل بینک بلڈنگ کی دوسری منزل میں ادا کی گئی۔ قرآن پاک کی تلاوت کی سعادت ایک جرمن مسلمان مسٹر محمد امان ہوبوم کو نصیب ہوئی۔

یہ ریڈنگ روم آہستہ آہستہ ثقافتی مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ اس مرکز کا مقصد پاکستانیوں کو نہ صرف جرمن ثقافت سے روشناس کرنا ہے، بلکہ جرمنوں نے پاکستان کلچر کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان سے پاکستانی عوام کو آگاہ کرنا اور اسی طرح جرمن کلچر کے بارے میں پاکستانی علماء کی معلومات سے دوسروں کو واقف کرانا بھی ہے، تاکہ پاکستان اور جرمنی کے درمیان باہمی ثقافتی اور دوستانہ تعلقات زیادہ استوار ہو سکیں۔

پاکستان میں جرمن کلچرل سنٹر کی لائبریری کے قیام سے پاکستانی عوام کو جرمنی مطبوعات، کتابیں، رسالے، اخبارات اور معلوماتی مواد کے حصول میں بڑی سہولت حاصل ہوئی ہے۔

پاکستانی مطالعہ کرنے والے جو لائبریری میں آتے ہیں۔ انھیں نہ صرف فیڈرل پبلک جرمنی کے بارے میں اساسی معلومات مہیا کی جاتی ہیں، بلکہ یورپ کے ان ممالک کے بارے میں بھی جو جرمن زبان بولتے ہیں، اور ان میں جو مختلف علوم ترقی پذیر ہیں یا رہے ہیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کو یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق اور یورپ کے جرمن زبان بولنے والے علاقوں نے باہمی ذہنی اور عقلی مساعی میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔

اس لائبریری میں دو ہزار کتابیں ہیں، جن کو ۲۴ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں جرمن، انگریزی، اور اردو زبانوں میں ہیں، موضوعات عام نوعیت کے ہیں، میکس پلانک کی مشہور کتاب تھیوریٹیکل فزکس سے لے کر لڈوگ ارہارڈٹ (ARNARDT) کی کتاب اکنومک ریکوری آف فیڈرل ریپبلک جرمنی تک یہاں موجود ہیں۔ گوئٹے کا فاؤسٹ، لڈوگ کرٹیس (CURTIUS) کا یورپین لٹریچر اینڈ لیٹن مڈل ایجز (LATIN MIDDLE AGES)

تمام انگریزی میں ہیں۔ بہت سی جرمن سے ترجمہ شدہ کتابیں اُردو میں ہیں۔ لائبریری میں ڈاکٹر محمد اقبال کی کتابیں اور ان پر لکھی ہوئی کتابیں بھی موجود ہیں۔

لائبریری کے ساتھ ایک اخبارات اور رسائل کا شعبہ بھی ہے جس میں پاکستان اور جرمنی کے روزنامے، میگزین اور رسالے مصوّر اور غیر مصوّر باقاعدگی سے آتے ہیں۔

اس لائبریری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک انفرمیشن سیکشن ہے جس میں جرمنی کے بارے میں ہر قسم کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔

یہاں جرمن زبان پڑھانے کے لیے ایک کلاس بھی جاری ہے۔

۴ - خانۂ فرہنگ ایران (ایرانی کلچرل سنٹر)

خانہ فرہنگ ایران، لاہور کا افتتاح ۱۹۵۵ء میں ہوا، لاہور سے پہلے اس طرح کا ایک ادارہ کراچی میں ایرانی سفارت کے زیر انتظام کام کر رہا تھا۔ اس کا تعلق براہِ راست ایرانی کلچرل کانسلر (مشیر ثقافت) کے ہاتھ میں تھا، اور اس کے مربی امیر کبیر ایران ہیں۔ یہ دونوں ادارے ایران کی وزارتِ فرہنگ (تعلیم) کے قائم کردہ ہیں۔ اور انھیں وہیں سے مالی اعانت ملتی ہے۔

خانۂ فرہنگ لاہور میں ایک کتاب خانہ اور ایک قرائت خانہ (دارالمطالعہ) ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جدید فارسی کی کلاس ہوتی ہے، جو دوسرے ثقافتی مرکزوں میں موجود نہیں۔

کتاب خانے میں فی الحال کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ کتابیں دو نوع کی ہیں۔ درسی اور علمی و ادبی۔ درسی کتابیں جو وزارت فرہنگ ایران مہیا کرتی ہے، ایران کے محکمہ تعلیم کے حکم کے مطابق طلبا کو مفت دی جاتی ہیں۔ نصابی کتابوں کے سینکڑوں نسخے موجود ہوتے ہیں۔ تاکہ نئے طلبا کو کوئی دقت نہ ہو۔

علمی کتابوں میں سر دست ایسی کتابیں زیادہ ہیں جو سائنسی مضامین پر مشتمل ہیں، اور بالعموم یورپین زبانوں کا ترجمہ ہیں۔ ادبی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کتب خانے کو کوئی چار ہزار کتابیں جلد وصول ہونے والی ہیں۔

اخبارات و رسائل میں تقریباً تمام اہم چیزیں ایران سے ہر ہفتے اور ہر مہینے پہنچتی ہیں۔ جن میں چند قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں:-

۱- ادبی مجلات

الف۔ یغما - ماہنامہ

ب۔ سخن

ج۔ مجلہ ادبیات تہران

د۔ مجلہ ادبیات تبریز

۲- فنی مجلات

الف۔ مجلہ موسیقی

ب۔ مجلہ رادیو ایران

۳۔ بچوں اور عورتوں کے رسالے

۴۔ ہفتہ وار اخبارات

ا۔ اطلاعات

ب۔ روشنفکر

۵۔ کچھ روزانہ اخبارات بھی بذریعہ ہوائی ڈاک آتے ہیں۔

یہ تمام رسالے اور اخبار فارسی میں ہیں۔ ان کے علاوہ سرکاری اداروں کے کچھ رسالے یا سالانہ روداد یں بھی باقاعدہ پہنچتی رہتی ہیں۔

کتابوں کی کمی کے باعث ابھی تک ممبرشپ کا سلسلہ جاری نہیں کیا گیا۔ البتہ لوگ دارالمطالعہ (قرأت خانہ) میں جو کتاب چاہیں بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

کلاسیں شام کو ہوتی ہیں۔ تاکہ ہر شخص فرصت کے اوقات میں شریک ہو سکے۔ ایک کلاس ابتدائی ہوتی ہے، اور ایک اس سے اونچی۔ جس میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طلباء ہوتے ہیں۔ یا وہ حضرات جو پہلے سے فارسی جانتے ہیں۔ اور فقط اپنا لہجہ درست کرنے اور فارسی بول چال کی مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

خانہ فرہنگ صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک اور پھر شام کو ۴ بجے سے ½ ۷ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ ان اوقات میں موسم کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔

۵۔ عرب کلچرل سنٹر

مرکز الثقافی العربی کی اصل غرض و غایت علوم ثقافتی کی توسیع و اشاعت ہے۔ اور اس طرح علوم عربیہ کی اشاعت کی غرض یہ ہے، کہ متحدہ جمہوریہ عربیہ کی عمرانی، ثقافتی اور ادبی ترقیات سے پاکستانی عوام کو روشناس کرایا جائے۔ اور عربی زبان کی تعلیم و تدریس بھی ہو سکے، چنانچہ عربی زبان میں کلاسوں کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے۔

کتب خانے کی کتابیں ہنوز موصول نہیں ہوئیں۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی کتابوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو جائے گی، جو علوم اسلامی، لغتِ عربی، ادب، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، اور اقتصادیات پر مشتمل ہوں گی، یہ کتابیں عربی میں بھی ہوں گی اور انگریزی میں بھی۔ عربی اخبارات و رسائل کے علاوہ پاکستان کے عربی مجلے بھی منگوائے جائیں گے۔

بچوں اور عورتوں کے لیے بھی علیحدہ شعبے قائم کیے جائیں گے۔ ایک چھوٹا سا ہال بھی لائبریری سے ملحق ہوگا۔ جہاں مختلف موضوعات پر تقریریں کرائی جائیں گی، اس کی رکنیت کے لیے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ خواہشمند اصحاب بلاتکلف اس لائبریری کے رکن بن سکیں گے۔

۶۔ مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری

یہ ادارہ امریکن فرینڈز آف دی مڈل ایسٹ ۱۹۵۹ء میں کراچی میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد شمالی افریقہ سے افغانستان اور پاکستان

ملک کے رہنے والوں میں باہمی شناسائی پیدا کرنا، اور آپس میں معاشرتی، اقتصادی، اور ملکی روابط کا استوار کرنا ہے۔ نیز یہ ادارہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں کو مشرقِ وسطیٰ کے تاریخی واقعات و حقائق اور بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے جو طلباء امریکی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں، ان کی مدد کرنا، اور ان طلباء کو امریکی ماحول سے روشناس کرانا بھی، اس کے اغراض میں داخل ہے۔

اس ادارہ کے تحت ایک لائبریری بنام مڈل ایسٹ ریسرچ لائبریری ۱۹۵۸ء ہی میں قائم کی گئی۔ ماہِ اگست ۱۹۶۱ء میں یہ ادارہ اور لائبریری کراچی سے منتقل ہو کر سرِ دست حبیب اللہ روڈ، جو ڈیوس روڈ لاہور کی ایک شاخ ہے، میں آگئے ہیں۔ لیکن اس ادارہ اور لائبریری کے لیے ایک موزوں اور مناسب عمارت کی تلاش جاری ہے۔

اس لائبریری میں اڑھائی ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ۷۰ جرائد باقاعدگی سے آتے ہیں۔ یہ کتابیں ممالک مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے معلوماتی اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ لائبریری دراصل ایک تحقیقی لائبریری ہے۔ اس لائبریری سے زیادہ تر استفادہ محققین ہی کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص جس کو مشرقِ وسطیٰ کے معاملات سے دلچسپی ہے اس کا ممبر بن سکتا ہے۔

اس لائبریری کے لاہور میں منتقل ہو جانے سے لاہور کی لائبریریوں میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

کتابوں کی ترتیب ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم کے مطابق ہے۔ ڈکشنری اور کلاسیفائیڈ دونوں طرز کے کیٹیلاگ موجود ہیں۔ جو کارڈوں پر تیار کئے گئے ہیں۔ دن کے ایک بجے سے شام ۷ بجے تک روزانہ کھلی رہتی ہے۔

۷۔ ٹیکنیکل ریفرنس لائبریری آف دی یونائیٹڈ سٹیٹ آپریشن مشن ٹو پاکستان[1]

یہ لائبریری ریاستہائے متحدہ کے پاکستانی تجارتی مشن لاہور نے اپنے دفتر واقع لاہور میں قائم کی ہے۔

اس لائبریری کے قیام کی غرض امریکی سامان اور مصنوعات کے متعلق کاروباری اور تجارتی معاملات کے سلسلے میں مفید معلومات اور طریق کار سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس کے دائرۂ کار میں زراعت، پرورش حیوانات، اور دوسرے صنعتی اور اقتصادی امور داخل ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے امریکی صنعت کاروں کی فہرست، ان کے دستور نامے، سامان کی جانچ پڑتال کے موضوعات پر مشتمل بہت بڑا ذخیرہ معلومات اس لائبریری میں موجود ہے۔ جس سے درآمد کنندگان کو بڑی مدد ملتی ہے، پاکستان میں ہر نوعی کاروباری ادارہ چالو کرنے اور مختلف صنعتی و تجارتی اقدامات کے اجرا کے لیے جن اعداد و شمار، تجاویز اور تخمینوں کے فراہمی کی ضرورت پڑتی ہے یہاں کا معمم کتب خانہ ان سب امور کے متعلق معلومات مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور اگر ضروری ہو تو فہرست سامان مطلوبہ کی فرمائشوں کی ترتیب میں مدد دیتا ہے۔

امریکی تجارتی مشن کا یہ کتب خانہ صرف اہلِ تجارت ہی کے لیے سہولت کار کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے اقتصادی اور معاشرتی ذرائع ترقی کے لیے بھی سود مند ہے۔

---

[1] TECHNICAL REFERENCE LIBRARY OF THE UNITED STATES OPERATION MISSION TO PAKISTAN. (امریکی امورِ تجارت کی معلوماتی لائبریری)

چند اصطلاحات کی تشریح

(۱) کھلی الماری OPEN SHELF اور مقفل یا بند الماری CLOSE SHELF یہ دو اصطلاحیں کتب خانے کی کتابوں سے مستفید ہونے کے دو مختلف طریقوں کے نام ہیں۔ مقفل یا بند الماریوں کا طریقہ یہ ہے، کہ عام حالت میں پڑھنے والوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ خود الماریوں سے مطلوبہ کتاب انتخاب کر سکیں۔ اگر انھیں کسی کتاب کی ضرورت ہو، تو وہ ایک پرچہ پر کتاب کا نمبر لکھتے ہیں جسے لائبریری کے کارندے شلف پر سے لا کر انھیں دے دیتے ہیں، کھلی الماریوں کے طریق کار میں پڑھنے والوں کو عام اجازت ہوتی ہے، کہ وہ لائبریری میں آزادی سے گھومیں، سیدھے شلف پر جائیں اور کتابوں کا انتخاب وہیں کریں۔

مقفل یا بند الماری کو آج رجعتی اور قدیم طریق تصور کیا جاتا ہے۔ اور کھلی الماری کو ترقی پذیر اور آگے بڑھتا ہوا قدم خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ اب تک ہمارے بیشتر کتب خانوں میں بند الماری کا طریقہ رائج ہے، کیونکہ باوجود آزاد ہونے کے ہم میں ابھی تک قومی شعور پیدا نہیں ہوا، اور اندیشہ ہے، کہ اگر کھلی الماری رکھی جاتے تو بہت زیادہ کتابیں گم ہوں، اور لائبریری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔

(۲) فہرست کتب کی تیاری کے دو طریقے ہیں۔ ایک کتابی صورت میں، دوسرے کارڈوں کے اوپر، کتابی کیٹلاگ کے جہاں فائدے ہیں۔ ان میں ایک کمی یہ ہے کہ ایک بار فہرست کتب کے کتابی صورت میں چھپ جانے کے بعد پھر اس کے ضمیمے شائع کرنے پڑتے ہیں، تا اشاعت ضمیمہ کیٹلاگ نامکمل رہتا ہے۔ اگر کسی بڑی لائبریری میں بہت سے ضمیمے چھپے ہوئے ہوں۔ تو قاری کو مطلوبہ کتب کی دریافت کے لیے متعدد فہرستوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ جس سے بعض اوقات طالبِ کتاب گھبرا جاتا ہے۔ اور کافی وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ پرانا طریقہ ہے، جدید طریقہ یہ ہے، کہ کارڈوں پر کیٹلاگ تیار کیا جاتا ہے، ہر کتاب کے کئی کارڈ بنائے جاتے ہیں۔ اور پھر فوراً ہی انھیں کارڈوں کے ڈبے میں اپنے مقام پر منسلک کر دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کیٹلاگ ہر وقت مکمل رہتا ہے۔ وقت کی بچت ہو جاتی ہے، اور فی الفور کتاب کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

پھر ان فہرستوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ڈکشنری کیٹلاگ (الفبائی فہرست) اور دوسرا کلاسیفائیڈ کیٹلاگ (مضمون دار فہرست کتب)۔ ڈکشنری کیٹلاگ کو عام ڈکشنری کی طرز پر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کی ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے ہوتی ہے، کلاسیفائیڈ کیٹلاگ کی ترتیب مضمون وار ہوتی ہے، بیشتر لائبریریوں میں ڈکشنری کیٹلاگ تیار کیا جاتا ہے۔

(۳) ڈیوئی ڈیسیمل کلاسیفکیشن (ڈیوئی کی اعشاری تقسیم) یہ ایک امریکی تقسیم ہے، جس کے ذریعے علم کے مختلف شعبوں کی مربوط طریق سے درجہ بندی کی گئی ہے، جس میں ہر موضوع کی فطری ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ ایک بہت عام فہم اور ہردلعزیز اسکیم ہے، جو دنیا کی بہت سی لائبریریوں میں رائج ہے، پاکستان کی تقریباً سب ہی لائبریریوں نے اسی اسکیم کو اختیار کیا ہے۔

شاہی قلعہ

پروفیسر یوسف جمال انصاری

قلعۂ لاہور مغلوں کے فنِ تعمیر کا ایک بے نظیر شاہکار ہے۔ فنِ تعمیر کو دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں ہمیشہ ایک عظمت حاصل رہی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے فنِ تعمیر ہی ایک ایسا فن ہے جس پر علمائے مذہب نے کوئی گرفت نہیں کی ورنہ موسیقی، رقص، حتیٰ کہ مصوری اور شاعری تک بعض علماء کے نزدیک قابلِ اعتراض رہی ہیں لیکن جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے اسے روحِ اسلام کا پیکر کہنا درست ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن نے اسلامی دور میں دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلے پر زیادہ ترقی کی ہے۔ جہاں جہاں اسلامی تہذیب پھیلی مسلمانوں نے نادر و پائدار عمارات بنائیں جن میں سے بعض بجا طور پر دنیا کی بہترین عمارتیں قرار دی گئی ہیں۔ اس میں مشرق و مغرب کی تخصیص نہیں، برِصغیر پاک و ہند میں مغلوں کا دور اسلامی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ چنانچہ قلعۂ لاہور، قلعۂ دہلی، قلعۂ اکبر آباد، جامع مسجد دہلی، شاہی مسجد لاہور، تاج محل آگرہ اسلامی فنِ تعمیر کے نوادرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فنِ تعمیر کسی قوم کے تہذیبی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کسی قوم کا کردار معلوم کرنا ہو تو آپ اس قوم کی بنائی ہوئی عمارتیں دیکھیں۔ اگر وہ قوم جنگجو اور عبادت گزار ہے تو وہ قلعے اور عبادت گاہیں تعمیر کرے گی۔ اگر وہ قوم عیش پسند ہے تو کلب گھر اور شراب خانے بنائے گی اور جمہوریت پرست ہے تو اس کے شہر کھلے ہوئے اور وسیع ہوں گے۔ انھیں شہر پناہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایوان اور محل بنانے کی بجائے وہ اسمبلی ہال اور پارلیمنٹ چیمبر اور ٹاؤن ہال تعمیر کرے گی۔ بصورتِ دیگر وہاں اونچے اونچے ایوان اور عشرت کدے بنانے کا رواج پایا جائے گا۔ اسی طرح فنِ تعمیر ادوارِ زمانہ کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر دور کے اپنے معاشرتی اور تہذیبی سانچے ہوتے ہیں۔ بارود کی ایجاد سے پہلے جب جنگ تلواروں اور نیزوں سے ہوتی تھی ضرورت تھی کہ ہر شہر کے گرد شہر پناہ ہو اور ہر شہر پناہ کے متصل ایک مضبوط قلعہ جس کی دیواریں محاصرہ کرنے والوں پر خندہ زن ہوں، اُدھر حملے کی خبر آئی اِدھر شہر پناہ کے دروازے مقفل کر لیے گئے، قلعے کا پھاٹک بند ہو گیا، اب محاصرہ کرنے والے ہیں کہ تیر پر تیر چلا رہے ہیں اور اہلِ قلعہ و اہلِ شہر ہیں کہ اندر مطمئن بیٹھے ہیں لیکن بارود کی ایجاد نے ثابت کر دیا کہ مضبوط سے مضبوط قلعہ بھی سر کیا جا سکتا ہے۔ ٹینک بنائے گئے، توپیں ایجاد ہوئیں اور آخر میں ہوائی جہازوں سے حملے کیے جانے لگے۔ اس کے بعد مضبوط قلعے اور شہر پناہ چنداں اہم نہ رہے۔ ٹینک تو خود ہی چلتا پھرتا قلعہ ہے اور توپوں کی زد پر کیسی ہی مضبوط عمارت کیوں نہ ہو تو وہ خاک سے زیادہ وقیع نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں کھلے شہر اتنے ہی محفوظ یا غیر محفوظ ہوں گے جتنے کہ وہ مقامات جن کے گرد بھاری بھرکم دیواریں ہوں۔ اسی لیے موجودہ زمانے میں کھلے شہر بسائے جاتے ہیں۔ صنعتی ترقی کے دور میں کارخانوں، ملوں اور دفتروں کی تعمیر پر زور ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا زمانہ یورپ میں بارھویں صدی سے سولھویں صدی تک کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ مشرق میں یہ دور اٹھارویں صدی تک ہے۔ جب انگریز یہاں پہلے پہل آئے اس وقت بھی برصغیر پاک و ہند میں وہ خصوصیات ختم نہ ہوئی تھیں جو قرونِ وسطیٰ سے مخصوص ہیں۔ وہی جاگیردارانہ نظام تھا۔ وہی امراء کے محل اور قلعے، وہی تلواریں، نیزے، بھالے اور زیادہ سے زیادہ توڑے دار بندوقیں یا پرانی وضع کی توپوں سے جنگ کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ مغلوں کے دور میں اگرچہ بارود کا استعمال شروع ہی سے پایا جاتا ہے اور مغل بادشاہ بابر کا ابراہیم لودھی پر کامیاب ہونا بندوق کی فوقیت کا بیّن ثبوت ہے تاہم بابر کا دور مشرقی تہذیب کے اعتبار سے قرونِ وسطیٰ ہی کا دور تھا اور بابر سے اورنگ زیب تک بلکہ اس کے کچھ عرصے بعد بھی قرونِ وسطیٰ کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی نمائندہ تعمیریں دو ہیں۔ قلعہ اور عبادت گاہ، چنانچہ یورپ میں اس دور میں عظیم الشان قلعے اور عظیم الشان گرجا گھر تعمیر ہوئے۔ اس اندازِ تعمیر کا نام گوتھک (GOTHIC) ہے۔ عمارات کا رُخ آسمان کی جانب ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ انسان آسمان تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ گرجا گھر کے مینار اپنی بلندی کے ذریعے توحید و تثلیث کی علامت تصور کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی عمارات سطحِ زمین پر وسیع ہوتی ہے اور جتنی بلند ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی چوڑائی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک باریک نقطے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی طرزِ تعمیر میں گرجا کی جگہ مسجد نے لے لی۔ چنانچہ مغلوں کی بنائی ہوئی مساجد میں وہی امتیازی خصوصیات ہیں جو قرونِ وسطیٰ کے کلیساؤں کی شانِ امتیاز ہیں۔ مغل مساجد عظمتِ الٰہی کی علامت ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عظمت و رفعت کا تصور مقبول تھا۔ خواہ اسلامی مسجد ہو، خواہ مسیحی کلیسا۔ مغربی وضع کا قلعہ ہو یا ہندوستانی طرز کا قلعہ عظمت و رفعت کا تصور دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسجد کے دونوں جانب ایک ایک مینار اور درمیان میں ایک سب سے اونچا مینار یہ تصور پیش کرتا ہے کہ لامحدود عظمت کو محدود کر کے اس کا رشتہ خدائے واحد کی عظمت سے منسلک کیا جائے۔ درمیانی مینار گویا اس منبع عظمت کی جانب اشارہ کر رہا ہے جو سرچشمۂ توحید ہے۔ مسجد کے علاوہ قرونِ وسطیٰ میں عظیم و پائدار قلعے تعمیر ہوئے جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے قلعہ اس دور کی اہم ترین ضرورت تھی۔ مسجد کا تعلق عوام کی روحانی زندگی سے ہے اور قلعے کا تعلق اس خاص دور میں عوام کی مادی زندگی سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں نے عظیم و پائدار قلعے تعمیر کیے۔ یہ قلعے آج بھی ہمیں اسلامی سطوت کی یاد دلاتے ہیں۔ لاہور کا قلعہ دہلی اور آگرے کے قلعوں کی طرح مغلوں کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

قلعۂ لاہور کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی وہ ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کی سطح شہرِ لاہور کی سطح سے بلند تر تھی۔ مغل قلعوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قلعوں کو ٹیلوں پر تعمیر کرنا فنِ حرب کی آگاہی پر دلیل ہے اس لیے کہ بلند مقام سے محاصرہ کرنے والی فوج کے خلاف آسانی کے ساتھ جنگی کاروائی کی جا سکتی ہے اور خود قلعے کی مدافعت میں بھی آسانی رہتی ہے۔ چنانچہ لاہور کی شاہی مسجد اور لاہور کا قلعہ ایک سطحِ مرتفع پر واقع ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں قلعۂ لاہور کے گرد و پیش جو کھدائی ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور ایک پرانا شہر ہے۔ قدیم لاہور کے آثار جو اس کھدائی سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جس ٹیلے پر قلعہ لاہور واقع ہے وہ پرانی تہذیبوں کا مدفن ہے۔ پرانی تہذیبوں کی مختلف تہیں ایک پر ایک جمی ہوئی ہیں۔ سب سے نیچے اینٹوں کی بنی ہوئی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ کبھی اس مقام پر ایک بت پرست قوم آباد تھی۔ پھر اسلامی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ پرانے سکے جو اس کھدائی کے بعد دستیاب ہوئے ہیں ان میں محمود غزنوی کا طلائی سکہ بھی موجود ہے۔ بہر حال جب شہنشاہ اکبر نے یہ مقام قلعے کے لیے منتخب کیا ہوگا اس وقت یہ ٹیلہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا جس کے نیچے خواہ کتنے ہی تہذیبی خزانے محفوظ ہوں اوپر مٹی ہی مٹی ہوگی۔ یہ قلعہ شہرِ لاہور کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے بعد غالباً کوئی آبادی نہ تھی

اور یہاں آکر قدیم شہر ختم ہو جاتا تھا۔ شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور دریائے راوی پار کرنے کے بعد جب شہر لاہور پر حملہ کرنا چاہتے تو یہ قلعہ ان کی راہ میں حائل ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے لاہور کی مدافعت کے لیے اس سے بہتر جگہ ممکن نہ تھی۔

بنا بریں ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ موجودہ قلعۂ لاہور سے پہلے بھی اگر کوئی قلعہ یہاں ہوگا جو امتدادِ زمانہ سے نابود ہو گیا تو وہ یہیں کہیں ہوگا جہاں اب قلعہ لاہور واقع ہے۔ تاریخ کے معلم البیرونی کے زمانے سے قلعہ لاہور کا ذکر سنتے چلے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ البیرونی سے لے کر ابوالفضل تک جن مورخین نے قلعۂ لاہور کا ذکر کیا ہے ان کی نظر میں مختلف قلعے ہوں گے جو مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئے ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے ہوں گے۔ اس امر پر جملہ مورخین متفق ہیں کہ ہر قلعہ شہر لاہور سے متصل ہی تھا اور یہ بھی کہ ہر قلعہ شمال سے آنے والے حملہ آوروں کی مدافعت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر محمد سام کے حملۂ لاہور (۱۱۸۶ء) کے موقع پر یہاں ایک قلعہ موجود تھا۔ منگول حملہ آوروں نے ۱۲۴۱ء میں ایک قلعے کو منہدم کر دیا۔ بلبن نے ۱۲۶۷ء میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جب تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے لاہور کا قلعہ ۱۳۹۸ء میں مسمار کر دیا۔ مسمار قلعے کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ غالباً وہ قلعہ بھی وہیں واقع تھا جہاں موجودہ قلعہ واقع ہے۔ ہم آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اسلامی عہد سے پہلے اور اسلامی عہد میں جتنے قلعے تعمیر ہوئے وہ سب محلِ وقوع کے اعتبار سے ایک ہی مقام پر تعمیر ہوئے۔ یہ محلِ وقوع وہی ہے جہاں اب قلعۂ لاہور واقع ہے۔ اکبرِ اعظم کے متعلق آئینِ اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے موجودہ قلعہ تعمیر کرنے سے پہلے ایک پرانے قلعے کو منہدم کرایا جو کچا تھا اور مٹی سے بنا ہوا تھا۔ یہ غالباً وہی قلعہ تھا جو سلطان مبارک شاہ نے ۱۴۲۱ء میں تعمیر کیا تھا۔

قلعۂ لاہور کی تعمیر کس سن میں شروع ہوئی اور کب تکمیل کو پہنچی اس کے متعلق ابھی تک ہمارے پاس کوئی حتمی شہادت موجود نہیں ہے۔ آئینِ اکبری سے یہ توقع رکھنی بجا ہو سکتی تھی لیکن آئینِ اکبری حیرت انگیز طور پر اس باب میں خاموش ہے تاہم یقین کیا جا سکتا ہے کہ ۱۵۶۶ء میں یہ قلعہ تعمیر ہو چکا تھا۔ ۱۵۶۶ء میں مرزا محمد حکیم نے شاہنشاہ اکبر کے خلاف بغاوت کی۔ اس سلسلے میں آئینِ اکبری میں قلعۂ لاہور کا ذکر آتا ہے جس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قلعۂ لاہور ۱۵۶۶ء میں موجود تھا لہٰذا اس کی تعمیر کئی سال پہلے سے ہو رہی ہوگی۔ لاہور قدیم و جدید (PAST AND PRESENT) مصنفہ ڈاکٹر محمد باقر میں شہنشاہ اکبر کے ۱۲ سنہ جلوس کو قلعے کی تاریخ تعمیر بتایا گیا ہے۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس طرح لاہور کا قلعہ ۱۵۶۸ء میں تعمیر ہونا چاہیے لیکن آئینِ اکبری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا محمد حکیم کی بغاوت کے وقت یعنی ۱۵۶۶ء میں یہ قلعہ موجود تھا البتہ اس قلعے میں دورِ اکبری سے دورِ شاہجہانی تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا یعنی اندرونِ قلعہ میں عمارات کی توسیع ہوتی رہی اور نئی عمارتیں بھی بنائی جاتی رہیں۔ یہ صورت سکھ دور میں اور انگریزی عمل داری میں بھی رہی۔ ان دونوں زمانوں میں قلعے کے اندر تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کا مفصل حال آئندہ آئے گا تاہم یہ نتیجہ نکالنا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کی چار دیواری ۱۵۶۶ء میں تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور تاریخ میں قلعۂ لاہور کا نام اکبری قلعہ کے نام سے رواج پا چکا تھا۔

قلعۂ لاہور چار منزلوں میں تعمیر ہوا ہے۔ کچھ عمارات وہ ہیں جو بانیٔ قلعہ شہنشاہ اکبر نے اپنے دور کے مختلف اوقات میں بنوائیں ——

دیوان خانۂ عام دورِ اکبری ہی کی تعمیر ہے۔ چنانچہ بدایونی نے جو اکبر کا ہمعصر تھا دیوانِ عام کا نقشہ اپنی تاریخ میں کھینچا ہے۔ تعمیر کے وقت سے اب تک دیوانِ عام کی عمارت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ۲۲ ربیع الثانی ۹۹۶ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۵۸۷ء (سالِ جلوس ۳۳ سنہ یا ۳۲ سنہ) میں اکبر نے دولت خانۂ عام میں نوروز کا دربار منعقد کیا تھا۔ اکبر شاہی عمارتیں اس دیوانِ عام کے علاوہ کون کون سی ہیں؟ یہ وثوق کے ساتھ

نہیں کہا جا سکتا بلکہ ممکن ہے کہ بعض عمارات میں جہانگیر اور شاہجہان نے ترمیم کی ہو اور اب یہ کہنا ممکن نہیں کہ اصل عمارت کی صورت کیا تھی۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ قلعے کے صحن میں کتنے ہی محل اور ایوان ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شمال کی جانب جو محل تعمیر کیے گئے ان کی سطح نسبتاً نیچی ہونی چاہیے تھی اس لیے ان کے نیچے تہ خانے تعمیر کیے گئے تاکہ عمارات کی سطح اونچی رہے۔ اکبر کے دور کی عمارات شمال مشرق میں واقع ہوں گی جو اب اکثر و بیشتر مٹ چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کو دانستہ بھی گرایا گیا ہوگا تاکہ ضروریات کے مطابق نئی عمارات بنائی جا سکیں۔ دولت خانۂ جہانگیری اور دیوانِ عام شاہجہانی (۱۶۲۸ء) تعمیر کرتے وقت اکبری عہد کی عمارات کو گرانا پڑا ہوگا یا ان میں سے بعض کو نئی عمارتوں میں ضم کر دیا گیا ہوگا۔

قلعۂ لاہور کی دوسری منزل وہ ہے جہاں شہنشاہ جہانگیر نے اپنا محل تعمیر کرایا جو جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل ۱۶۱۸ء میں بن کر تیار ہوا اور تزک جہانگیری میں درج ہے کہ معمور خان نے اس کی تعمیر اور نگرانی میں حصہ لیا۔ جہانگیر نے اس محل کو دولت خانہ کہہ کر پکارا ہے ۱۶۱۹ء میں شاہجہان نے (جو اس وقت شہزادہ تھا) لاہور آ کر اس نو تعمیر محل کی سیر کی اور اگلے سال خود شہنشاہ جہانگیر نے اس محل میں قدم رنجہ فرمایا۔

قلعۂ لاہور کی تیسری منزل وہ تعمیرات ہیں جو دورِ شاہجہانی میں مکمل ہوئیں۔ ہاتھی پول یعنی وہ دروازۂ خاص جو شاہجہان کے حکم سے بنایا گیا ۱۰۴۱ھ مطابق ۳۲-۱۶۳۱ء میں تیار ہوا۔ دولت خانۂ خاص و عام کی تعمیر شاہجہان کے حکم سے ۱۶۲۸ء میں عمل میں آئی اور ۱۶۳۱ء میں شاہ برج تعمیر ہوا۔ یہ وہی عمارت ہے جو شیش محل کے نام سے مشہور زمانہ ہے۔ ڈاکٹر باقر نے اپنی کتاب میں ایک عام غلطی کا ازالہ کیا ہے۔ شاہ برج کی بعض عمارات کو جہانگیر سے اور بعض کو اورنگ زیب سے منسوب کر کے عام مورخین نے غلطی کی ہے۔ ڈاکٹر باقر نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ عمارات شاہجہان کی تعمیر کردہ ہیں۔ شاہ جہان نے اور بھی کئی عمارتیں قلعے میں تعمیر کیں۔

قلعۂ لاہور کی چوتھی منزل وہ عمارات ہیں جو شہنشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کرائیں۔ قلعے کا مغربی دروازہ عالمگیری دروازہ کہلاتا ہے اور حضوری باغ کے متصل ہے۔ اس دروازے کے بالکل سامنے شاہی مسجد کا صدر دروازہ ہے۔ اورنگ زیب نے موتی گاہ کے نام سے ایک عمارت امرا کے لیے تعمیر کروائی۔ غرضیکہ قلعۂ لاہور کی تعمیر ان چار منزلوں پر ہوئی۔

آئیے اب ہم قلعۂ لاہور کی سیر کریں۔ اس قلعے کی سیر کو ایک خلقت جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد دنیا کی مشہور شخصیتیں جنھوں نے اس قلعے کی سیر کی اگر شمار کی جائیں تو ان کی تعداد کے لیے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں:

۱۔ شہنشاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی (۱۰ر مارچ ۱۹۵۰ء)

۲۔ شہزادۂ عراق عبداللہ مرحوم (۱۹ر مارچ ۱۹۵۴ء)

۳۔ شاہ عراق فیصل دوم مرحوم (۱۹ر مارچ ۱۹۵۴ء)

۴۔ صدر جمہوریۂ ترکی جلال بایار (۲۳ر فروری ۱۹۵۵ء)

مادام بایار (” ”)

۵۔ شاہ حسین اوّل شاہ اردن مع ملکہ زین اشرف مادر شاہ (۱۰ر مارچ ۱۹۵۵ء)

۶۔ عدنان مندریس مرحوم وزیر جمہوریہ ترکیہ (۲۰ر مارچ ۱۹۵۶ء)

۷۔ سکندر مرزا سابق صدر جمہوریہ پاکستان (۲ر اپریل ۱۹۵۶ء)

۸ - چو این لائی وزیر اعظم چین (۲۹ دسمبر ۱۹۵۶ء)

۹ - ڈیوک آف ایڈن برا (۱۰ فروری ۱۹۵۹ء)

۱۰ - ملکہ الزبتھ ثانی ملکۂ انگلستان (۱۹۶۰ء)

سیر بینی کے نقطۂ نظر سے قلعۂ لاہور کی عمارات کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اکبر کی تعمیرات (۲) جہانگیر کی تعمیرات (۳) موتی مسجد (۴) شاہجہان کی تعمیرات (۵) حلوت خانہ (۶) شیش محل

اکبر کے سلسلۂ تعمیرات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر عمارت اب موجود نہیں۔ باقی پانچ سلسلۂ عمارات میں سے چند عمارتیں اس قابل ہیں کہ ان پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جاسکتی ہے۔

مستی گیٹ جو مسجدی دروازہ یا مسجدی گیٹ کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۱۵۶۶ء میں اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ مستی غالباً مسیت (پنجابی زبان میں مسجد) کی ایک صورت ہے۔ مستی گیٹ اس مسجد کے نام پر ہے جو اب بھی اس دروازے کے بالمقابل موجود ہے اور جسے شاہنشاہ اکبر کی چہیتی ملکہ مریم زمانی نے ۱۶۱۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ان دنوں قلعۂ لاہور کے صرف دو دروازے تھے۔ مشرق میں مستی گیٹ اور دوسرا جو عالمگیر نے ۱۶۷۳-۷۴ء میں از سرِ نو تعمیر کرایا اور اب عالمگیری دروازہ کہلاتا ہے۔ مستی گیٹ ایک بلند اور مضبوط عمارت ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ بہت اہم ہے۔ اس میں دو مثمن برج ہیں اور مدافعت کے لیے دندانے دار فصیل ہے۔ اس قسم کی سوراخ دار فصیل قلعۂ لاہور میں اس دروازے کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ دیوانِ عام شاہجہانی جسے شاہجہان نے تخت نشینی کے اگلے سال ۱۶۲۸ء میں تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ تین برس میں بن کر تیار ہوا ۱۶۳۱ء میں دیوانِ عام آصف خان کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچا۔ اس میں چالیس ستون ہیں، یہ قلعے کے بیچوں بیچ واقع ہیں اور اس کے جنوب میں صحن خانہ ہے۔ سکھ دور میں رنجیت سنگھ کی بیوہ مہارانی چند کور کے خلاف جب شیر سنگھ نے شاہی مسجد کے میناروں سے گولہ باری کی تو دیوانِ عام کا بڑا حصہ مجروح ہو گیا جس کو ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے قلعۂ لاہور پر تسلط کرنے کے فوراً بعد ہی دوبارہ تعمیر کر دیا۔ یہ نئی تعمیر انگریزی طرزِ تعمیر کے مطابق ہے اس طرح اس عمارت کی متعلقہ ہیئت تبدیل ہو گئی۔ چبوترے کے گرد سرخ پتھر کی جھالر اکبر کے عہد کی ہے۔ دراصل دیوانِ عام "جھروکہ" کے متصل بنایا گیا تھا۔ جھروکے کی تعمیر سنگِ مرمر کے ایک بالاخانے اور سرخ مسالے کے چار ستونوں پر مشتمل ہے اور دیوانِ عام کی پچھلی طرف واقع ہے۔ یہیں قریب ہی ایک چار گوشہ عمارت اکبری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ وہ غالباً جہانگیر کے دور میں تعمیر ہوئی بہر حال جھروکہ عوامی روایت کے مطابق اکبر سے منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ۱۵۶۶ء میں جب اکبر نے دولت خانۂ خاص و عام تعمیر کروایا تو جھروکہ بھی بنوایا۔ یہ دیوانِ عام سنگِ مرمر کی بنی ہوئی موجودہ عمارتوں میں غالباً سب سے پہلے کی تعمیر ہے۔ دولت خانۂ جہانگیری اکبر کے دور میں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا لیکن جہانگیر کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا سنہ تکمیل ۱۰۲۷ھ ہے جو ۱۶۱۷-۱۸ء کے مطابق ہے۔ اس پر سات لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ سامنے کا حصہ سرخ مسالے کا ہے جس پر ہندو طرزِ تعمیر کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اصل عمارت جہانگیر کے آرام کرنے کے لیے خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی چنانچہ اس کا نام "خواب گاہ" پڑ گیا ہے اگرچہ انگریزی عہد میں اس کو عجائب خانے میں تبدیل کر دیا۔ یہ عجائب خانہ اسلحہ جات ہے اور یہاں سکھوں کے زمانے کے وہ جنگی ہتھیار موجود ہیں جو قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کے ہاتھ لگے تھے۔ فتح کابل کے بعد انگریزی فوجیں جو اسلحہ اپنے ساتھ لائیں۔ ان میں سے کچھ توپیں اس عجائب خانے میں ملتی ہیں۔ پرانے زمانے کے پستول، زرہ بکتر، خود، سینہ پوش، مختلف قسم کی بندوقیں اور گولہ بارود، تلواریں، خنجر، تیر کمانیں اور ملبوسات یہاں سجائے گئے ہیں

سکھ دور اور انگریزوں کے ابتدائی زمانہ حکومت کی چند تصاویر بھی ایک کمرے میں آویزاں ہیں۔ برآمدے میں امیر شیر علی شاہ افغانستان کے دور کی اٹھائیس ۲۸ توپیں ہیں جو کابل کی ڈھلی ہوئی ہیں، اونٹوں کی توپیں اور پہاڑی توپیں اور لمبی نالی والی بندوقیں مشرقی برآمدے میں رکھی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پوتا کنور دلیپ سنگھ جو بعد کو عیسائی ہو گیا تھا۔ اسی عمارت میں پیدا ہوا تھا۔

جہانگیر کی بنوائی ہوئی ایک عمارت "مکاتیب خانہ" کہلاتی ہے جو معمور خان کے زیرِ اہتمام ۱۶۱۷-۱۸ء میں تیار ہوئی۔ یہ ان محرّرین کے بیٹھنے کے کام میں آتی رہی ہے جو قلعے میں آنے والے سیّاحوں کے ناموں کا اندراج کرتے تھے۔ اس کے مشرق میں مائی جنداں کا محل ہے۔ نیچے کی منزل جہانگیر کے محل کا ایک حصّہ ہے اور اوپر کی منزل سکھوں کے دور میں تعمیر ہوئی ہے۔ مکاتیب خانہ موتی مسجد کے متصل ہے۔ موتی مسجد ۱۶۴۵ء میں شہنشاہ شاہجہان نے تعمیر کرائی۔ مغل بادشاہوں نے تین موتی مسجدیں بنوائی تھیں۔ ان میں سب سے پہلی قلعۂ لاہور کی موتی مسجد ہے، دوسری قلعہ اکبر آباد کی موتی مسجد بھی شاہجہاں ہی نے ۱۶۵۴ء میں بنوائی۔ تیسری قلعۂ دہلی کی موتی مسجد ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب نے تعمیر کروائی۔ لاہور کی موتی مسجد خوبصورتی میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس کی چھت سنگِ مرمر کی ہے۔ اس کی محرابیں خصوصیت کے ساتھ دلکش ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا نام بدل کر موتی مندر کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اور انگریزی دور میں بھی یہ مسجد خزانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پھر اس میں نماز ادا کی جانے لگی ہے۔

شیش محل کی تعمیر ۱۰۴۱ھ مطابق ۱۶۳۱-۳۲ء میں شاہجہان کے حکم سے ہوئی۔ ممتاز محل جب لاہور آتی تو یہیں قیام کرتی تھی۔ شیش محل کا اصلی نام شاہ برج ہے۔ اس کے دروازے پر حسبِ ذیل فارسی اشعار کندہ ہیں:۔

شاہ جم جاہ سلیماں قدر کیواں بارگاہ	کز سپہر و مہر برتر بردہ رایاتِ جلال
ثانیِ صاحبقِراں شاہ جہاں کز عدل و جود	ہیئتش نوشیرواں مانند و افریدوں ہمال
شاہ برجے حکم کرد احداث کز خاطِ علو	ہست بیروں ہمچو عرش اعظم از وہم و خیال
در صفا و رفعت و لطف و ہوا بے چنیں	از حصارِ چرخ ننمودست و ننماید جمال
بندۂ یک دل مرید معتقد عبدالکریم	بعد اتمامِ عمارت یافت ایں تاریخ و سال

داتما چوں دولتِ ایں پادشاہ جم سپاہ

ایں ہمایوں برج عالی باد راشت بے زوال ۱۰۴۱ھ

ملا عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ شاہ برج جھروکے کے بالمقابل تعمیر ہوا۔ شاہ برج کے شمال مغربی جانب مثمن برج بنایا گیا۔ ہاتھی پول یعنی شاہ جہانی دروازہ اسی مقصد سے بنایا گیا تھا کہ اس میں داخل ہو کر مثمن برج اور شاہ برج تک آسانی کے ساتھ پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے شاہ برج شاہجہاں کے زمانے میں سارے قلعے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے بھی یہ عمارت عجیب و غریب بلکہ بے مثال حیثیت رکھتی ہے۔ آئینہ کاری، منبت کاری، پچی کاری، محرابوں اور جالیوں کے سلسلے جن پر اقلیدسی شکلیں اور گلکاری کے نمونے سجاوٹ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ جالیاں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک خوبصورت آبشار اور ایک چھوٹا سا حوض درمیان میں ہے۔ سنگِ مرمر کے ساتھ ساتھ سنگِ ابری، سنگِ مریم، سنگِ سیاہ، سنگِ زرد، سنگِ بدل اور دوسری قسم کے قیمتی پتھر استعمال کرنے سے تنوع کا احساس پیدا کیا گیا ہے۔ اس آبشار پر نظر ڈالیں، تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پتھر میں لہریں

پڑ رہی ہیں۔ شیش محل کے اندر ایک عمارت جسے بنگلہ کہتے ہیں اور جو اس لحاظ سے "نولکھا" کہلاتی ہے کہ اس کی تعمیر پر نو لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے سنگ مرمر کے کام کا ایک نہایت ہی پاکیزہ اور نازک نمونہ ہے۔ اس میں قیمتی پتھروں اور جواہرات کا استعمال اس فراوانی اور چابکدستی سے ہوا ہے کہ خود شاہ جہاں کی دوسری تعمیرات میں بھی نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ فنِ تعمیر کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔ ایرانی مصوری کا چربہ پتھر کی عمارت میں اتار دیا ہے اور جابجا گلکاری کے نظر افروز نمونے آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ غرض یہ بنگلہ یعنی "نولکھا" مغل آرٹ کا ایک نادر شاہکار ہے۔ بہ اعتبار صورت یہ ایک شاہی خیمے کا تصور پیش کرتا ہے۔ مثمن برج کے متعلق سید محمد لطیف کے بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ کوئی علیحدہ مینار تھا جو شاہ برج کے ساتھ ساتھ جھروکے کے بالمقابل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس غلطی کی طرف ڈاکٹر محمد باقر نے توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ جس مینار کے متعلق سید لطیف نے بادشاہ نامہ سے ایک عبارت نقل کرتے ہوئے قطعۂ ذیل نقل کیا ہے ؎

باپشتِ گاؤ و ماہی در اصل ہم قریں با برج گاؤ و ماہی در فرع ہمقراں
بتواں از و مشاہدہ کردن بچشم سر کیفیت کواکب و اشکال آسماں

——— غالباً یہ کوئی الگ مینار نہ تھا جو اب امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے بلکہ بادشاہ نامے کے مصنف کا اشارہ مثمن برج کی جانب معلوم ہوتا ہے یہ ایک سر بہ فلک عمارت ہے جو شاہ برج کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ برج مثمن کا تفصیلی نقشہ بادشاہ نامے کے مصنف نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے۔ اگرچہ اس نے اسے برج مثمن کہہ کر نہیں پکارا ہے۔ کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں بتایا ہے کہ مثمن برج کے تہ خانے میں سرکاری شراب کا ذخیرہ ہے اور یہ شراب گوروں کو دی جاتی ہے۔ سرکاری میگزین کا ذخیرہ بھی مثمن برج ہی میں رہتا ہے۔ ہاتھی پول جسے ہاتھی پیڑیا دروازہ جس کو کنہیا لال نے ہاتھی پوڑ کہا ہے بادشاہی عہد میں یہ دروازہ بند رہتا تھا اور رنجیت سنگھ کے وقت بھی بند تھا لیکن انگریزی عہد میں جب مشرقی اور مغربی دروازے بند کر دیے گئے تو ہاتھی پوڑ کا دروازہ آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا' اس پر گوروں کا پہرہ رہتا تھا۔ اس علاقے کی بے شمار شاہی عمارتیں گرا کر گوروں کے رہنے کے لیے بارکیں بنا دی گئیں۔ شمالی دروازے کا نام روشنائی دروازہ بھی ہے۔ بقول کنہیا لال اس کو شہر کا ایک دروازہ کہنا چاہیے۔ جنوب کی سمت جو دروازہ ہے وہ قلعے کی حدود کو شہر کی حدود سے الگ کرتا ہے۔

دیوانِ خاص شاہجہان کے حکم سے سنہ ۱۶۴۵ء میں تعمیر ہوا۔ یہ خالص سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور نقش و نگار اور قلبی نمونوں سے اس کی سجاوٹ کی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں مغل فنِ تعمیر کا یہ شاہکار فوجی گرجا گھر میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح اس کے ایک بڑے حصے کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ اس کے شمال مغرب میں لال برج ہے جو سنہ ۱۶۳۱ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ لال برج کا اندرونی حصہ سکھ دور کی نقاشی سے مزین ہے۔ عمارت کا فرش غالباً سنگِ مرمر کا تھا لیکن اب اینٹوں کا ہے۔ یہ عمارت سہ منزلہ ہے۔ پہلی دو منزلیں جہانگیر اور شاہجہان کی بنوائی ہوئی ہیں اور تیسری منزل کا اضافہ سکھ دور میں کیا گیا ہے' اسے لال برج کا نام بھی سکھ دور ہی میں دیا گیا ہے۔ اس عمارت کی ابتدا سنہ ۱۶۱۷ء میں اور تکمیل سنہ ۱۶۳۱ء میں ہوئی تھی۔

حمامِ شاہی شاہ جہاں کے عہد میں سنہ ۱۰۴۲ھ میں تعمیر ہوا اور شاہ جہاں کی خوابگاہ کے متصل ہے۔ اب یہ عمارت بوسیدہ ہو چکی ہے۔ یہ ترکی حماموں کے نمونے پر بنائی گئی تھی۔ اس میں نیم گرم اور گرم پانی کے حمام ہیں۔ مغرب کی طرف شاہی بیت الخلا ہے۔ درمیان

میں ایک چھوٹا سا حوض ہے جس میں مختلف رنگ کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یہ یقین کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ شاہی حمام کا فرش سنگِ مرمر کا تھا، جسے سکھ دور میں اکھاڑ کر حضوری باغ کی بارہ دری میں لگا دیا گیا۔ ۱۶۳۳ء میں شاہ جہاں نے ایک غسل خانہ تعمیر کرایا جسے خلوت خانہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ پائیں باغ شہزادیوں اور شاہی خواتین کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ شمالی حصے میں مغل بادشاہ اقامت پذیر رہتے تھے لیکن حرم سرا کے طور پر جو حصہ استعمال ہوتا تھا وہ شاہی اقامت گاہ سے الگ تھا۔ خلوت خانے کے آس پاس اور بھی کئی عمارتیں تھیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں۔ جنوب مغرب میں ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ہے جو سنگِ مرمر اور سرخ سلسلے سے بنی ہوئی تھی اور جس میں شاہی خواتین نماز ادا کرتی تھیں۔ پائیں باغ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پردے کے لیے قناتیں تنی رہتی تھیں۔ صبح اور شام کو شاہی خواتین اس باغ میں سیر کرتی تھیں یہاں کے درخت سایہ دار اور پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک وسیع چبوترہ تھا جس پر ایک حوض تھا۔ ہاتھی پول سے پائیں باغ تک محل سرا کی خواتین ہاتھیوں پر بیٹھ کر سیر کیا کرتی تھیں۔

کالا برج جو ۱۶۱۷ء سے ۱۶۳۱ء تک رفتہ رفتہ تعمیر ہوتا رہا۔ لال برج سے مشابہت رکھتا ہے اور خلوت خانے کے شمال مغربی جانب واقع ہے۔ اس کی سب سے اونچی منزل سکھ دور میں تعمیر ہوئی اور اس کی مرمت اور اس میں ردّ و بدل انگریزی عہد میں ہوا یہاں انگریزی راج میں شراب کا ذخیرہ تھا اور شراب پینے کا انتظام بھی تھا۔ اس کا نام کالا برج سکھوں کے زمانے میں پڑا۔ "اٹھ دره" رنجیت سنگھ کی تعمیر ہے جو اس نے مغل عمارات کے ملبے سے بنایا۔ اٹھ درہ رنجیت سنگھ کی کچہری کا کام دیتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے دربار میں جو فن کار ملازم تھے انھوں نے رزمیہ عشق لیلا سے خیالات مستعار لے کر اس عمارت میں تصاویر بنائی ہیں۔ ان فن کاروں کا تعلق نقاشی کے کانگڑہ سکول سے تھا۔

عالمگیری دروازہ اورنگ زیب نے غالباً شاہی مسجد کے ساتھ ساتھ تعمیر کرایا۔ اس میں عالمگیر کے کردار کی فوجی خصوصیت جھلکتی ہے۔ اس میں لطافت اور حسن کا امتزاج ہے۔ یہ دروازہ غالباً ۱۶۷۳ء میں تعمیر ہوا۔ عالمگیری دروازہ جسے انگریزوں نے اینٹوں سے چن دیا تھا ۸ نومبر ۱۹۴۹ء کو سردار عبدالرب نشتر نے دوبارہ کھول دیا۔ یہ تقریب شان و شوکت سے منائی گئی۔ اس وقت سردار نشتر نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کے مترادف ہے۔

یہ ہے لاہور کا شاہی قلعہ جس کا ایک مختصر اور ادھورا سا خاکہ سطورِ بالا میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ قلعہ شہر لاہور کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ قلعے کی دیوار سرخ پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے آگرے اور دہلی کے قلعوں کی طرح قلعہ لاہور بھی اپنے سرخ رنگ کی مناسبت سے لال قلعہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کی چار دیواری مستحکم پختہ اور بلند ہے اور بقول کنہیا لال چوڑی اس قدر کہ توپ اس پر چل سکتی ہے۔ اس کی لمبائی پانچ سو گز اور چوڑائی تقریباً چار سو گز ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہے مگر مکمل طور پر مستطیل نہیں، کیونکہ مغربی فصیل کا شمالی دروازہ باہر کو نکلا ہوا ہے۔ دیواریں بندوقچیوں کے لیے سوراخ ہیں جن میں سے وہ محاصرہ کرنے والی فوج پر گولیاں برسا سکتے تھے۔ جب راوی نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تو شمال کی طرف قلعے کی دیوار کے پیچھے رنجیت سنگھ کے عہد میں خندقیں کھودی گئیں یہ قلعے کے استحکام میں ایک مزید اضافے کی صورت تھی۔ سکھ اور انگریزی دورِ حکومت میں قلعے کے اندر چند در چند تبدیلیاں کی گئیں مائی جنداں کی حویلی اور کھڑک سنگھ کا محل سکھ دور کی تعمیرات ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں اس قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا چنانچہ ۱۹۲۷ء تک یہ انگریزی فوج کے تسلط میں رہا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومتِ وقت نے اس کو محکمہ آثارِ قدیمہ کی حفاظت میں دے دیا لیکن قلعے کی فوجی نوعیت ختم کرنے کے لیے

انگریزی حکومت نے اندرونِ قلعہ کی کئی عمارتیں منہدم کر دیں۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۷ء تک یعنی انگریزی فوج کے تسلط کے زمانے میں قلعے کے اندر جدید وضع کی کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور شاہی عمارات میں خاصا ردّ و بدل کیا گیا تاکہ ان کو بارکوں، ہسپتالوں، کوارٹروں، گوداموں، گرجا گھروں اور شراب خانوں کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ دیوانِ عام کے سامنے جہاں اب سرسبز کھلا ہوا میدان ہے فوجی دور میں بارکیں اور کوارٹر تھے۔ دیوانِ عام خود ہسپتال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اس میں ایک وسیع برآمدے کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ جہانگیری سلسلۂ عمارات میں بھی کئی تغیرات کیے گئے۔ ایک بڑے حوض کو پاٹ کر اس کے اوپر ٹینس کا لان بنایا گیا۔ دیوانِ خاص کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ شاہی حمام کو باورچی خانے اور لال برج کو شراب خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے فوجی دور کی یادگاروں کو جہاں تک ممکن تھا زمین کے ساتھ ہموار کر دیا ہے۔ اب بھی قلعے کی سیڑھیوں اور عالمگیری دروازے کے درمیان کا حصہ حکومت کے قبضے میں ہے اور یہاں پولیس کے دفتر قائم ہیں جس دروازے سے ہو کر سیاح قلعے میں داخل ہوتا ہے وہ انگریزوں کی تعمیر ہے اور یہیں سے ٹکٹ بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

قلعۂ لاہور کی سیر کرنا کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم آپ کی رہنمائی کی کوشش کریں جب آپ ٹکٹ خرید کر قلعے میں داخل ہوں تو اوّل شاہ برج کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے ہاتھی پیڑ کے دروازے سے شیش محل کی طرف روانہ ہوں شیش محل، نولکھا، کالا برج، لال برج، دیوانِ خاص، شاہی حمام، خلوت خانہ، جہانگیری محل، عجائب خانہ، دیوانِ عام، مکاتیب خانہ اور موتی مسجد کی سیر کریں۔ اگر آپ کے پاس وقت باقی ہو تو تہ خانے دیکھیں اور ان عمارتوں پر بھی توجہ دیں جو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

عجائب گھر

ملک شمس

فنونِ لطیفہ، آثارِ قدیمہ، سکہ سازی اور تاریخ کے بعض اہم نوادر و عجائبات کے ذخیروں کے لحاظ سے لاہور کا عجائب گھر پاکستان بھر میں سب سے قدیم اور عظیم عجائب گھر ہے۔ اس کا آغاز ۱۸۶۴ء میں ایک صنعتی نمائش (پنجاب ایگزیبیشن) سے ہوا جو گوشت اور سبزی والی مارکیٹ کی عمارت میں ۲۰ جنوری ۱۸۶۴ء سے اپریل کے پہلے ہفتے تک منعقد رہی۔

اس نمائش کا مقصد پنجاب کی قدرتی پیداوار، صناعی اور ہنرمندی کے اعلیٰ اور حسین نمونے پیش کر کے لوگوں کو دعوتِ نظارہ دینا تھا۔ اس اہم کام کے لیے مقامی، صوبائی اور مرکزی حکومت کا ہزارہا روپیہ صرف ہوا۔ بڑی بڑی ریاستوں، رئیسوں، پنجاب کے امیروں، سرداروں اور جاگیرداروں سے طرح طرح کی عجیب چیزیں، قسم قسم کے زیورات، قیمتی مرصع و مطلا ریشمی، مخملی اور سوتی ملبوسات، شال، دوشالے، پشمینہ، قالین اور کشمیر کی دیگر مصنوعات، پرانے خوشنویسوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، وصلیاں اور قطعات اور مشہور مصوروں کی نقاشی کے دلکش نمونے اس عجائب گاہ میں رکھے گئے۔ ہر قسم کے اناج، ادویات، جڑی بوٹیاں، اوزار، ہتھیار، تلواریں جن کے قبضوں پر مرصع کام تھا، برچھے، نیزے، خنجر، زرہ بکتر، تبر، سپر، تیر، کمان، قرابین، بندوق وغیرہ نیز پارچات انواع و اقسام ساختہ ملتان و جھنگ از قسم لنگی و ازاچہ و کھیس و پارچات از قسم سوسی شہر بٹالہ، مخمل، دریائی و پاپوش ساختہ لاہور، راولپنڈی، بھیرہ خوشاب و مصنوعات چوبی، ہاتھی دانت، عاج و آہن و طلا و نقرہ، صندوقچی ہائے نگینہ و قلمدان ہائے عجیبہ و اقسام مصنوعات چرمی از قسم حقہ و ظروف برنجی و مسی و نقرئی، قسم قسم کے پتھر، طرح طرح کے نمک، رنگ رنگ کے قیمتی جواہرات اور جانور، طیور و حشرات از قسم سانپ و مگرمچھ وغیرہ۔ یہ جانور مردہ تھے مگر اس ترکیب سے آئینہ دار بکسوں میں رکھے گئے تھے کہ سب زندہ معلوم ہوتے تھے۔ ہر قیمتی چیز زیورات، جواہرات و ملبوسات وغیرہ آئینہ دار بکسوں میں رکھ کر لوگوں کو دکھائی گئی۔ اس طرح موجودہ مارکیٹ میں (جس کا نام ٹولنٹن مارکیٹ ہے) لاہور کے عجائب گھر کی داغ بیل ڈالی گئی۔

نمائش کے اختتام پر دستکاریوں کے چیدہ چیدہ نمونے مستقل نمائش کے لیے رکھ لیے گئے جس کی عمارت مارکیٹ کے قریب ہی بعد میں تعمیر ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں جب اس عجائب خانے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو دیوان امرناتھ اکبری نے اس کی تاریخ اس طرح کہی ؎

چو تعمیر عجائب خانہ گردید — بحکم حاکم فرخندہ انتساب
فراہم شد دراں اشیائے ہر ملک — عیاں گردید صنع حق زہر باب

بنا شد بر زمیں چوں او مکانے | نہ بیند ثانئے آں چرخ در خواب
ز بحث بیشتر از بحث فیہ در | بزینت خوب تر از در نایاب

رقم زد اکبری تاریخ سالش
عجب ایں خانۂ اعظم بہ پنجاب

۱۸۶۲ء

یہ نمائش بے حد کامیاب رہی۔ ہزارہا لوگ دیکھنے کے لیے آئے۔ یہاں تک کہ نمائش کے بعد آہستہ آہستہ صناعی کے نمونوں کے علاوہ قدیم عہد کے پہلے وقتوں کے سکے اور دیگر پرانی اشیاء بھی فراہم ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ تیس سال کے عرصے میں قدیم و جدید اشیاء کا اس قدر وسیع ذخیرہ ہو گیا کہ کسی دوسری عمارت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۹۴ء میں لاہور عجائب گھر کی موجودہ عمارت کی بنیاد اس چندے سے رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں فراہم کیا گیا تھا۔

تکمیل عمارت پر عجائب گھر کی اشیاء اس عمارت میں منتقل ہوئیں اور اس کے ذخیروں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر لاہور عجائب گھر کے ذخیرے اور نوادر ان شعبہ جات پر مشتمل تھے:۔

صنعت و حرفت کے نمونے، ازمنہ قدیم کے آثار، پرانے سکے، پتھروں اور معدنی اشیاء کے نمونے، اسلحہ، فن مصوری اور نقش نگاری کے نمونے، مسودات، محکمہ جنگلات، محکمہ زراعت اور محکمہ اصلاح دیہات سے متعلق اشیاء اور ماڈل، نباتاتی نمونے اور مردہ حیوانات کا ذخیرہ، کتبات وغیرہ۔

لیکن آہستہ آہستہ لاہور عجائب گھر کا دائرہ محدود کیا جاتا رہا اور یکے بعد دیگرے کئی شعبے یہاں سے ہٹا دیے گئے۔ مثلاً مردہ حیوانات کا شعبہ یہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کیا گیا۔ وہاں اس کا ایک الگ عجائب خانہ قائم ہوا۔ اب لاہور کا عجائب گھر صرف فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ تک محدود کر دیا گیا ہے تاکہ یہ اپنے مخصوص شعبوں سے متعلقہ اشیاء کو فراہم اور محفوظ کرے اور ان سے متعلقہ علم کی تحقیق اور نشر و اشاعت کرے۔ چنانچہ لاہور کا عجائب خانہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا سب سے عظیم ادارہ ہے جس کی چار دیواری کے اندر مختلف قوموں اور زمانوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہماری بصارت و بصیرت کو دعوت دیتی ہیں۔

اس عجائب گھر میں انسانی تہذیب کے کہنہ ترین نشانات ہزارہا برس پہلے کے پتھر کے ہتھیار ہیں جنھیں انسان کی اولین صنعت کہا جا سکتا ہے۔ پتھر کے ان ترشے، رگڑے اور گھسے ہوئے مدور اور نوکدار ٹکڑوں میں ہمارے ازمنہ قبل تاریخ کے مورثوں کی داستان کے دو ابواب مضمر ہیں جنھیں قدیم و جدید حجری زمانوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج سے کوئی پانچ چھ ہزار سال قبل انسان نے بڑی بڑی اہم ایجادات کیں جن کی بدولت ہم تہذیب کے بام بلند پر پہنچے ہیں۔ اسی نوع کی پانچ ہزار سالہ کہنہ تہذیب کے آثار موہن جو ڈرو واقع سندھ اور ہڑپہ پنجاب سے بے نقاب ہوئے ہیں جو ہمارے عجائب گھر کی ایک چھوٹی سی گیلری میں پڑے زبان حال سے ہمیں اپنے وارثوں کے معاشرے، ان کے مذہب، ان کی صنعت و حرفت، ان کے علوم و فنون اور افکار کا پتہ دیتے ہیں۔

موہن جو ڈرو اور ہڑپہ کے آثار جس تمدن کے مظہر ہیں۔ وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں تمام

مغربی پاکستان میں اور اس سے پرے ہمارا شہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے حامل تانبہ اور ٹین ملا کر کانسی کے ہتھیار اور ظروف بناتے تھے۔ وہ سونے چاندی کے زیورات بناتے اور انھیں دور دراز ممالک سے تجارت کے ذریعے حاصل شدہ جواہرات سے مرصع کرتے۔ ان کی خوراک کاشت سے حاصل کئے ہوئے گیہوں پر مشتمل تھی۔ وہ مچھلی کا شکار کانٹے سے کرتے تھے۔ دنیا میں سب سے پہلے کپاس بونے اور اسے کات کر سوتی کپڑا بننے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ دو پہیوں والی گاڑی کا استعمال بھی ان کے ہاں تھا۔ وہ مجسمہ سازی کا فن بھی جانتے تھے۔ ظروف کو نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے۔ فطرت کی دیوی یعنی ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فن تحریر بھی رائج تھا جو تصویروں کے ذریعے اظہار مطلب اور حروف تہجی کے بین بین تھا مگر ان کی تحریروں کو، جو یقیناً بیش قیمت معلومات کی حامل ہیں، ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ان کے رہائشی مکانوں اور مذہبی تعمیرات، شہروں کی فراخ اور سیدھی سڑکوں اور چوکوں اور شہری صفائی کے انتظامات سے ہر کوئی حیرت زدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑے کا نشان نہیں ملتا اور نہ وہ لوہے جیسی دھات سے آشنا تھے۔

مغربی پاکستان کی یہ عظیم الشان تہذیب آریا حملہ آوروں کے ہاتھوں کوئی ۱۵۰۰ق م کے لگ بھگ تہ و بالا ہوئی مگر ساتھ ہی اس تہذیب نے آریاؤں کی طرز معاشرت اور ان کے مذہبی تصورات پر گہرا اثر ڈالا۔ عجائب گھر لاہور کے گندھاری بت بے حد تاریخی، فنی اور ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں گوتم بدھ کے پیروکار پہلی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر چوتھی صدی قبل مسیح تک تراشتے رہے۔ ان مجسموں کا مسکن وہ علاقہ ہے جسے ویدوں کے زمانے سے گندھارا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو وسط افغانستان سے لے کر راولپنڈی کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقائی نسبت کی وجہ سے ان کو گندھارا کے بت کہا جاتا ہے۔

گندھارا کے بت بیشتر گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ جن میں تقریباً اس کی زندگی کے تمام واقعات تراشے گئے ہیں۔ ان بتوں کے عروج کا زمانہ کشان شہنشاہوں کا دور تھا بالخصوص شہنشاہ کنشک کا زمانہ گندھارا کے صنم سازوں نے ہی سب سے پہلے گوتم کی وفات کے کوئی پانچ سو سال بعد اس کی مورتی تراشنے کی جرأت کی۔ گندھارا کے بت بدھ مت کے اندر ایک عظیم انقلاب کے مظہر ہیں جبکہ مہایان فرقہ وجود میں آیا۔ گندھارا کی بت طرازی کی ایک نمایاں خصوصیت یونانی، رومی عناصر ہیں۔ یہ ان اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جن کا تعلق یونان کی ہیلنی دور کی تہذیب سے ہے۔ یعنی وہ تہذیب جو اسکندر اعظم کی مشرقی فتوحات کے بعد اس کے جانشینوں کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔

گندھارا کے بتوں میں ہیلنی اثرات ایشیائے کوچک اور شام کے رومی علاقوں سے کوشانیوں کے عہد میں آئے جن کا رومنوں سے گہرا تجارتی تعلق اور ثقافتی رشتہ تھا اور جو رومی ہیلنی تہذیب و ثقافت کے علمبردار تھے چنانچہ گندھارا کے بتوں میں یونانی تناسب اعضا اور یونانی نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔ کہیں بدھ کے روپ میں اپالو کے خدوخال ہیں۔ کہیں رعد کا دیوتا زیس گوتم کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ کہیں محبت کا دیوتا ایروس سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کہیں مشہور یونانی دیوی منروا جلوہ گر ہے، کہیں اٹلس دنیا کو سر پر اٹھائے کھڑا ہے، کہیں بقس کی مے خواری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی جمالیاتی اعتبار سے گندھارا کی مورتیوں کا مقام اتنا زیادہ بلند نہیں مگر ان کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تبت، چین، منگولیا، کوریا، ترکستان اور جاپان تک بدھ دھرم گندھارا ہی کے راستے اور ذریعے سے پھیلا چنانچہ گندھارا کے آرٹ نے بھی مشرق بعید کے ایشیا کے بدھوی آرٹ پر اثر ڈالا۔

قطع نظر فن کے، گندھارا کی مورتیاں اس چار سو سالہ بدھوی تمدن کی بھی آئینہ دار ہیں جن کا امتزاج متعدد ملکی و غیر ملکی عناصر سے ہوا اور جو بالآخر پانچویں صدی عیسوی میں ہن وحشی قوموں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

لاہور کے عجائب گھر میں کچھ مورتیاں عہد گپت کی بھی ہیں جو قرون وسطیٰ کی ہند و ثقافت کا زریں زمانہ کہلاتا ہے۔ ان میں سے ایک عورت کا دھڑ گپتا آرٹ کا بلند ترین شاہکار ہے جس میں نسوانی اعضا کا تناسب مثالی طور پر حسین ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس کے نسوانی حسن و جمال کے تخیل کو پتھر کی ایک مورتی میں ہمیشہ کے لیے منتقل کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے عجائب گھر کا ایک مایہ ناز ذخیرہ سکہ جات ہیں۔ ان میں باختری، یونانی، سیتھین، پارتھی اور کوشان فرمانرواؤں کے سکوں کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اگر یہ سکے نہ ملتے تو شمال مغربی پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم قدیم باب جو تقریباً دو سو سالوں پر مشتمل ہے، ناپید ہو جاتا۔ ان سکوں ہی کے مطالعہ سے سکندر اعظم کے ان یونانی جانشینوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے جو موریا سلطنت کے زوال پذیر ہونے پر باختر سے اٹھ کر شمال مغربی پاکستان پر حملہ آور ہوئے اور جن کی بدولت اس خطے میں عرصۂ دراز تک ہیلینی آرٹ اور تمدن کا دور دورہ رہا۔ باختریوں کے یہ سکے آرٹ کے بھی بلند پایہ نمونے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاید دنیا میں اس سے پیشتر اور اس کے بعد اتنے حسین سکے مضروب نہیں کیے گئے۔ ان سکوں کے ذریعے ہماری تاریخ کا ایک اور اہم عقدہ بھی حل ہوا ہے۔ انہی کی مدد سے خروشتی زبان جو مردہ ہو چکی تھی، پڑھی گئی ہے اور اس سے بہت قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ سلاطین غزنہ و دہلی کے سکوں کا بھی ایک بے نظیر مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مغل شہنشاہوں کے سکے بھی ایک لاثانی مجموعے کی شکل میں فراہم ہیں۔ ان سے ہمیں بے شمار دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پاک و ہند کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے لاہور عجائب گھر کے ان سکوں سے کافی مدد ملتی ہے۔

اس عجائب گھر کے تصویر خانے کی زینت وہ حسین تصویریں ہیں جنھیں پہاڑی تصویریں کہنا چاہیے۔ یہ تصویریں اٹھارویں صدی عیسوی میں کانگڑہ کے چھوٹے چھوٹے راجپوت راجاؤں کی سرپرستی میں بنائی گئیں۔ اگرچہ یہ تصویریں مغل مصوری کے فنی تاثرات ہی کا نتیجہ ہیں، ان کی تکنیک مغل مصوری ہی کی تکنیک ہے مگر ان کی روح مغل تصویروں سے جدا ہے اور ان کے اسلوب کی جاذبیت الگ نوعیت رکھتی ہے۔ ان تصویروں میں ایک تغزل کا سا حسن ہے اور رعنائی سی کشش ہے۔ ایک دلفریب رومانیت اور دلآویز ڈراما ئیت ان کی فضا اور موحول افسانوی حسن و جمال کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان پہاڑی تصویروں کا مقصد انسانوں کے حقیقی اور اصلی خدوخال کی نقش کشی نہیں بلکہ جذبات نگاری ہے۔ یہ عشقیہ تصویریں ہیں جن کا محبوب ترین موضوع حسن و عشق کی رنگین داستانیں ہیں۔ ان میں وہی جذبات ہیں جو ماہیوں اور ڈھولوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ پیا سے جدائی، اس کا انتظار کرنا، اس سے ملنا اور روٹھنا، غرض ان میں پریت کی وارداتوں کی نقش کشی ہے جو یہ تصویریں اپنے دل لبھانے والے انداز میں کرتی ہیں۔ آیئے ذرا ایک تصویر پر چھپتی ہوئی نظر ڈالیں جس میں اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی عورت کی دلی کیفیات کو مصورانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ساون کا مہینہ ہے۔ پروا چل رہی ہے۔ یکایک آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ادھر موروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بادل بھی گرجنے لگے اور کالی کالی بدلیوں سے بجلی بھی چمکنے لگی۔ برکھا رت کی اس ولولہ انگیز فضا میں ایک پر شباب لڑکی لب بام کھڑی اپنے پردیس گئے ہوئے پریتم کی راہ تک رہی ہے جس کا خیال اس کے دل میں بے اختیار چٹکیاں لے رہا ہے۔

عجائب گھر کی یہ چند جھلکیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کے بوسیدہ پتھر اور ٹھیکریاں، اس کے شکستہ بت، اس کے پرانے وقتوں کے سکے اور اس کی تصویریں، تاریخ و تمدن کے وہ اوراق ہیں جن سے چشم بینا بہت کچھ پڑھ سکتی ہے۔

چڑیا گھر

پروفیسر یوسف جمال انصاری

لاہور کا چڑیا گھر برصغیر پاک و ہند کے بہترین چڑیا گھروں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اگرچہ کئی مشہور چڑیا گھر تھے۔ لیکن ان میں لاہور، لکھنؤ اور کلکتہ کے چڑیا گھر سر فہرست ہیں۔ پاکستان میں لاہور کا چڑیا گھر سب سے بڑا ہے۔ یہ چڑیا گھر عوامی تفریح گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نوعمر لوگ خصوصیت کے ساتھ بڑی تعداد میں روزمرہ چڑیا گھر کی سیر کو جاتے ہیں۔ تعطیل کے ایام میں اور بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ چڑیا گھر کی سیر زندہ دلانِ پنجاب کا محبوب مشغلہ ہے۔

چڑیا گھر سے مراد حیوانات کی نمائش گاہ ہے۔ برصغیر ہند و پاک ہی سے مخصوص نہیں تمام مہذب ممالک میں اس قسم کے چڑیا گھر (نمائش گاہِ حیوانات) قائم ہیں۔ یہ نمائش گاہیں باغات میں واقع ہوتی ہیں۔ جیسے لاہور کا چڑیا گھر باغِ جناح میں، اس قسم کی نمائش گاہوں کے قیام کے اسباب پر نظر ڈالی جائے، توکم از کم تین اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اس طرح کی نمائش گاہیں دنیا بھر میں قائم ہیں۔ پہلا سبق تفریحی ہے۔ انسان کو ہمیشہ سے دوسرے حیوانات کے وجود سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی امر ہے۔ غیر شعوری طور پر ہم دوسرے حیوانات کے وجود سے اپنے کو مربوط کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ نوعمروں ہی سے مخصوص نہیں کہ وہ باغوں میں جائیں۔ اور پرندوں درندوں اور دوسرے حیوانات کو دیکھ کر خوش ہوں۔ دوسرا سبق فنی اور سائنسی ہے۔ زمین اور پانی کی مخلوقات کا مطالعہ علم الحیوانات کا ایک اہم شعبہ ہے۔ طلبا کو محض کتابوں کے ذریعہ یہ سمجھانا کہ کونسا حیوان کس وضع و قطع کا ہے۔ یا اس حیوان کی تصویر دکھا دینا کافی نہیں۔ اس لحاظ سے علم الحیوانات کے طلبا کے لیے چڑیا گھر کی حیثیت درسگاہ کی سی ہے۔ تیسرا سبق جو نہایت اہم ہے۔ یہ ہے کہ ارتقائے عالم کے ساتھ ساتھ بعض حیوانی نسلیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جاتی ہیں جن کے نمونوں کو محفوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ ایک دن آئے گا جب وہ قطعاً نابود ہو جائیں گی۔ اس حیثیت سے چڑیا گھر بعض اقسام کے حیوانات کا حفاظت خانہ ہے۔ پرانی تاریخوں اور قصے کہانی کی کتابوں میں ایسے حیوانات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو اب کہیں نہیں پائے جاتے۔ لیکن جو زمانہ ماقبلِ تاریخ میں یا تاریخ انسانی کے ابتدائی ادوار میں موجود تھے۔ ہمارے چڑیا گھر ان حیوانوں سے خالی ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم ان کو فرضی داستانوں کی زینت قرار دے کر خارج از بحث کر دیں۔ اس لیے کہ زمین کی کھدائی کے دوران عجیب الخلقت جانوروں کا دریافت کیا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور ہم آئے دن سنتے ہیں کہ اس قسم کے ڈھانچے کھدائی کرنے پر برآمد ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیاب قسم کے حیوانات کی حفاظت انسان کا ایک اہم فرض بن گئی ہے۔ ارتقا کے دو پہلو

ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ نمائش گاہ حیوانات میں یہ دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ منفی پہلو یہ ہے۔ کہ جو حیوانات ارتقا کی دوڑ کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کے نمونوں کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ وہ بھی مستقبل میں فرضی داستانیں ہو کر رہ جائیں گے۔ ایسے حیوانات چڑیا گھروں میں اب بھی موجود ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ رفتہ رفتہ جانوروں کے ڈھانچے بدلتے جاتے ہیں۔ عجائب گھر میں پہاڑی بکرے جنگلی گھوڑے اور اس قسم کے دوسرے جانور موجود ہوتے ہیں جو پالتو ہو جانے کے بعد اپنی ہیئت بدل چکے ہیں۔ اور پہاڑوں پر جنگلوں میں اپنی اصلی ہیئت میں اب بھی موجود ہیں۔ اس طرح ان حیوانات کے ارتقا کی تاریخ نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

جنگلی درندے خواہ ان کی ہیئت تبدیل نہ بھی ہوتی ہو۔ جنگل میں کچھ اور ہی آن بان رکھتے ہیں۔ اور چڑیا گھر کے پنجرے میں ان کی شان دوسری ہوتی ہے۔ شیر جب چڑیا گھر میں بولتا ہے۔ تو اس کی آواز جنگل والے دھاڑنے والے شیر سے مختلف ہوتی ہے۔ ہاتھی جب جنگل میں چنگھاڑتا ہے تو اس کی ہیبت دلوں پر بیٹھ جاتی ہے۔ مگر چڑیا گھر میں اس کی آواز خوفناک معلوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ اور دبلی جو ہوں سے بھی کان کترواتی ہے۔ یہ مثل حیوانات پر صادق آتی ہے۔ پنجرے کے اندر شیر بھی بکری کی طرح سیدھا سادا اور بے ضرر نظر آتا ہے۔ لیکن یہی شیر جنگل میں ہو تو جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ افریقہ کا شیر اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ جنگلی بھینسے کو جو طاقت میں مست ہاتھی سے کسی طرح کم نہیں ہوتا آن کی آن میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہی افریقہ کا شیر لاہور کے چڑیا گھر میں دیکھیے بچے معصوم بچے تک اس سے نہیں ڈرتے۔ یہی حال جنگلی ہاتھی کا ہے۔ ہاتھی ایک نہایت ہی خوفناک اور طاقتور حیوان ہے۔ جو لوگ ہاتھی کا شکار ہاتھی دانت حاصل کرنے کے لیے بنگال اور برما کے جنگلوں میں کرتے آتے ہیں۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ حیوان کتنا خوفناک اور کیسا طاقتور ہے۔ لاہور کے چڑیا گھر میں یہی ہاتھی بالکل گائے معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں اور بچے اس پر سوار ہو کر چڑیا گھر کی پہاڑی کے گرد دن بھر چکر لگاتے ہیں۔ اور یہ ہاتھی کان تک نہیں ہلاتا۔ غرضیکہ چڑیا گھر بھی ایک درس گاہ ہے جہاں جا کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگلی حیوانات کیونکر اپنی عادتیں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اور حضرت انسان جو اشرف المخلوقات ہیں کس طرح حیوانات کی تربیت کرتے ہیں۔

ضمناً چڑیا گھر کا ایک اور فائدہ بھی ہے۔ دیہاتی یوں تو عالم فطرت سے قریب تر ہیں۔ اور شہریوں کی نسبت ان کو حیوانات کے دیکھنے کا زیادہ اتفاق ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے دیہات میں جو حیوانات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً گیدڑ، لومڑی، بھیڑیا وہ دیہاتیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ بعض مقامات پر چیتے۔ بلکہ شیر تک بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ قسم قسم کے حیوانات اور حیوانات کی وہ اقسام جو غیر ملکی ہیں۔ اگر دیکھ سکتے ہیں تو وہ کسی چڑیا گھر ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے لاہور کے چڑیا گھر میں روزانہ ایک بڑی تعداد ان دیہاتیوں کی ہوتی ہے۔ جو سیر کرنے لاہور آئے ہوتے ہیں۔ انارکلی بازار اور مال روڈ اور عجائب گھر ہی ان لوگوں کے دامنِ دل کو نہیں کھینچتے۔ چڑیا گھر بھی انھیں دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

نمائش گاہِ حیوانات خواہ وہ لاہور میں ہو یا کراچی۔ کلکتہ میں ہو یا لکھنؤ میں اگر قائم کی جاتی ہے۔ تو شہروں ہی میں قائم کی جاتی ہے۔ یہاں دیہاتیوں سے زیادہ شہری اور پختہ عمروں سے زیادہ نو عمر سیر میں جمع ہوتے ہیں جب دیکھیے ایک میلہ لگا ہوا

ہوتا ہے۔ چھٹی کے دن تو وہ ریل پیل ہوتی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لاہور کو مغربی پاکستان میں جو حیثیت حاصل ہے۔ اس کے پیش نظر یہاں کے چڑیا گھر میں سیر بینوں کا اژدہام آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو یہ چڑیا گھر بھی پاکستان میں ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ یہ کچھ آج سے قائم نہیں۔ یہ پچھلے نوّے برس سے قائم ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اب اس کو قائم ہوئے سو برس ہونے کو آتے ہیں۔ نہ صرف لاہور کے شہریوں کو بلکہ دُور دراز کے دیہاتیوں تک کو چڑیا گھر کی سیر کا چسکا پڑ گیا ہے۔

لاہور کا چڑیا گھر مال روڈ کے کنارے اسمبلی چیمبر کے قریب گورنر ہاؤس کے سامنے لارنس گارڈن (باغ جناح) کے ایک گوشے میں قائم ہے۔ یہ ۱۸۷۲ء کی بات ہے۔ جب سر رابرٹ ڈیویز (DAVIES) پنجاب کا لفٹنٹ گورنر تھا۔ سر رابرٹ ڈیویز ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۷ء تک لفٹیننٹ گورنر پنجاب کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاؤس میں متمکن رہا۔ اسی کے زمانے میں لاہور کا چڑیا گھر قائم ہوا۔ اُس وقت چڑیا گھر کی صورت اب سے بہت مختلف تھی۔ یہ تھوڑے سے رقبے میں قائم ہوا تھا۔ بعد کو چڑیا گھر کی توسیع اور ترقی ہوتے ہوتے ۱۹۴۲ء میں یہ اس صورت کو پہنچا جس میں ہم اس کو آج دیکھتے ہیں۔ گویا ۱۹۴۲ء سے چڑیا گھر کا دَورِ ثانی شروع ہوتا ہے یہ زمانہ سر برٹرم گلانسی (BETRAM GLANCY) کی گورنری کا تھا۔ پہلا دَور یعنی ۱۸۷۲ء چڑیا گھر کا ابتدائی دَور تھا۔ موجودہ زمانے میں چڑیا گھر بیس ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ توسیع شدہ رقبہ بھی کچھ زیادہ دل خوش کن نہیں۔ اس لیے کہ چڑیا گھر کے لیے کم از کم پچھتر ایکڑ کا رقبہ درکار ہوتا ہے۔ اور ہمارا چڑیا گھر اس لحاظ سے تقریباً ایک چوتھائی رقبے میں ہے۔ مگر اس بیس ایکڑ کے احاطے میں عجیب و غریب حیوانات کا وہ انبوہ کثیر ہے۔ جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

آئیے اب چڑیا گھر کی سیر کریں۔ احاطے کے باہر محرابی شکل میں ’’چڑیا گھر‘‘ اُردو میں اور انگریزی میں (ZOOLOGICAL GARDENS) لکھا ہوا ہے۔ پھاٹک کے دہنی جانب ٹکٹ ملتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر سیر کرنے والے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اندر ایک وسیع کھلا ہوا میدان ہے۔ جس میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ہے۔ اس وسیع میدان کو کئی حصوں میں حسب ضرورت تقسیم کیا گیا ہے۔ جا بجا حیوانات کے لیے عمارتیں ہیں۔ عمارت کا سلسلہ ختم ہونے پر تھوڑا سا کھلا ہوا میدان آجاتا ہے۔ اس کے بعد پھر سلسلۂ عمارات اور پھر کھلا میدان ہے۔ غرضیکہ عمارتوں اور کھلے میدانوں کا ایک تسلسل ہے۔ یہ عمارتیں زندہ دلان پنجاب کی زندہ دلی کا بیّن ثبوت ہیں۔ پہلے ہی بلاک پر کرنل سر عمر حیات خان ٹوانہ کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ عمارتوں کے اس بلاک کی تعمیر کرنل ٹوانہ نے جون ۱۹۲۳ء میں کرائی تھی۔ اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف بلاک بنتے رہے یا پہلے کی بنی ہوئی عمارات کی توسیع ہوتی رہی۔ چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ رؤسائے پنجاب کو چڑیا گھر سے کس قدر دلچسپی رہی ہے۔ عمارت کے بلاک اور حیوانات کے عطیے اہلِ مقدرت کی فراخ دلی کی شہادت دیتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے پنجاب کے راجے مہاراجے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس چڑیا گھر کی خدمت میں حصہ لیتے تھے۔ انگریز حکام اور مسلمان رؤسا بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

چڑیا گھر میں ہر نسل کے حیوانات کے لیے مناسب و موزوں انتظام ہے۔ وحشی درندوں شیر، چیتے اور بھیڑیوں کے لیے جو عمارتیں مخصوص ہیں۔ ان کے دروازوں میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ اور ان کے لیے جو صحن ہیں ان کے گرد اونچی سلاخیں نصب ہیں کہ چھلانگ لگا کر یہ خونخوار درندے باہر نہ نکل آئیں۔ بارہ سنگھے اور ہرن اس قدر شدید حفاظت میں نہیں

رکھے جاتے۔ ان کے لیے سرسبز کھلے ہوئے احاطے ہیں۔ گویا مصنوعی طور پر ایک جنگل اگایا گیا ہے جس میں یہ جنگل کے باسی بظاہر آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت میں ان کے گرد بھی ایک جالی دار حصار کھچا ہوا ہے۔ جسے توڑ کر یہ باہر نہیں آسکتے۔ جنگلی پرندے کشادہ احاطوں میں جن پر جالی کا خول ہے۔ آزادانہ چہکتے اور اڑتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آبی مخلوقات کا کچھ اور بھی انتظام ہے۔ ان کی خاطر ایک لمبی سی مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ اودبلاؤ مگرمچھ وغیرہ الگ اپنے اپنے مختصر کمروں میں رہتے ہیں جن کے گرد جالی لگی ہوئی ہے۔ نیچے پانی ہے۔ کیونکہ خشکی ان کو مرغوب نہیں۔ لیکن آبی پرندے مصنوعی جھیل میں بالکل آزاد ہیں۔ ان میں طرح طرح کی مرغابیاں ہیں اور قسم قسم کے بطخ اور مچھلیوں کے لیے الگ انتظام ہے۔ بندروں کے لیے آہنی کٹہرے کے اندر درخت ہیں۔ جن میں وہ اچھلتے کودتے اور جھولتے رہتے ہیں۔ ریچھوں کے لیے مصنوعی غار ہیں۔ جو کمروں کے اندر بنائے گئے ہیں۔ کمروں کے باہر مضبوط آہنی جنگلا لگا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حیوانات اپنے فطری گرد و پیش میں رہ کر چڑیا گھر میں اپنے کو قیدی یا اجنبی نہ محسوس کریں۔ ہر قبیل کے حیوانات کے لیے مطابق فطرت انتظام موجود ہے۔

چڑیا گھر میں سب سے پرکشش شخصیت جنگل کے بادشاہ کی ہے۔ سب سے زیادہ ہجوم اس کے چاروں طرف ہوتا ہے۔ شہری تو ایک طرف اگر دیہاتی بھی سن پائیں کہ شیر آگیا تو سہم کر رہ جائیں۔ اور گھر کے دروازے بند لیں۔ لیکن چڑیا گھر میں بے پناہ خلقت شیر دیکھنے کو آتی ہے۔ اس جانور میں اپنے قد و قامت سے ہزاروں گنا زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ چستی اور پھرتی میں بھی اس کی مثال نہیں۔ آدمی تو آدمی جنگل کے درندے بھی اس کی قوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جرأت و ہمت کا یہ عالم ہے کہ جری سے جری اور بہادر سے بہادر انسان کو شیر سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ چڑیا گھر میں دو قسم کے شیر ہیں۔ ایک تو ببر یعنی افریقی نسل کا شیر اور دوسرا ٹائیگر (TIGER) جسے عرف عام میں شیر کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ شیر ببر سے مختلف ہے۔ اور شیر ببر کے مقابلے میں فضیلت نہیں رکھتا۔ ہمارے چڑیا گھر میں پانچ ببر شیر ہیں جن میں تین مادہ اور دو نر ہیں۔ ان میں ایک جوڑا پاکستانی ہے جو ۱۹۴۱-۴۲ء میں اسی چڑیا گھر میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں ایک عجیب سانحہ ہوا۔ کہ رکھوالوں کی غفلت سے ایک شیر کے جنگلے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ شیر نے باہر نکل کر ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعے سے کھلبلی مچ گئی آخر ڈپٹی کمشنر مسٹر کے ایچ ہینڈرسن کے حکم سے اسے گولی سے مار دیا گیا۔ ان ببر شیروں کے علاوہ دو ٹائیگر (TIGER) یا عام شیر ہیں ان میں سے نر ڈھاکے سے آیا ہے اور مادہ اسی چڑیا گھر میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئی۔ یہاں آٹھ چیتے ہیں۔ ان میں سے دو کالے چیتے ایسے ہیں جو ابھی پاکستان میں نووارد ہیں یہ اسی سال سنگاپور سے آئے ہیں۔ چھ چیتے یہیں کے ہیں ان میں ایک ڈھاکہ سے آیا ہے۔ اور دو جناب فاروق و فرخ صاحبزادگان آغا احمد رضا خاں ڈپٹی کمشنر کا عطیہ ہیں۔ ایک چیتا ۱۹۵۲ء میں اسی چڑیا گھر میں پیدا ہوا۔ ان شیر چیتوں کی خوراک جنگل میں تو خدا جانے کیا کچھ ہوگی۔ چڑیا گھر میں شیروں کو فی کس دس سیر گوشت اور چیتوں کو فی کس چار سیر گوشت روزانہ کھلایا جاتا ہے۔

چڑیا گھر میں دو ہاتھی ہیں جو ڈھاکہ سے آئے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے لیے یہ ہاتھی سامانِ تفریح ہیں۔ جب بھی چڑیا گھر جائیے یہی دیکھنے میں آئیگا کہ عورتیں اور بچے ہاتھی پر سوار پہاڑی کا چکر لگا رہے ہیں۔ ہاتھی پر بیٹھنے کا الگ

ٹکٹ ہے۔ تماشائی ٹکٹ لے کر کھڑے ہاتھی پر سیڑھی کے ذریعے چڑھ جاتے ہیں۔ یہ ہاتھی دوسرے تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں۔ اس لیے کہ یہ تماشائیوں سے بے حد مانوس ہیں۔ یہ کوئی شیر تو ہیں نہیں کہ ان کو دیکھ کر کوئی ڈر جائے یہ تو سواری کے ہاتھی ہیں۔ اشارہ پایا اور چل دیئے۔ چکر ختم ہوا تو ٹھہر گئے۔ پھر جب تک دوبارہ ٹکٹ نہ لیجئے یہ چلنے والے نہیں۔ غرض کہ ان ہاتھیوں کی بدولت بڑی رونق رہتی ہے۔ مگر وہ جو مثل مشہور ہے کہ اپنے گھر ہاتھی باندھنا آسان نہیں۔ وہ یہاں بھی صادق آتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہاتھی روزانہ پانچ من گنے کھاتے ہیں۔

ہر دل عزیز ہونے میں ہاتھیوں کا مقابلہ اگر کوئی کر سکتا ہے۔ تو وہ چڑیا گھر کے بندر ہیں۔ یوں تو بندروں کی شوخیاں ضرب المثل ہیں۔ لیکن چڑیا گھر کے بندر کمال درجے کے شوخ ہیں۔ چھوٹے بچوں میں تو بندر ہاتھی سے بھی زیادہ مقبول ہیں۔ چڑیا گھر میں داخل ہونے سے پہلے بچے بالعموم بندروں کے لیے کھانا خریدتے ہیں۔ ان کو چنے کھلانے کا رواج بہت عام ہے۔ بعض بچے شکر بھی اور پھل انھیں کھلاتے ہیں اور بندر شکریہ کے طور پر طرح طرح کے منہ بناتے ہیں۔ قسم قسم کے ناچ ناچتے ہیں اور اپنے حرکات سے بچوں کو خوب ہنساتے ہیں۔ شریر بچے بڑوں کی آنکھ بچا کر بندروں کی تواضع کنکروں سے بھی کرتے ہیں۔ موقع پایا اور چپکے سے کنکر یا ڈھیلا دے مارا۔ ہزار نگرانی کرنے کے باوجود بچے باز نہیں آتے۔ بندر بھی اس کا بدلہ لینے کے درپے رہتے ہیں۔ دو ایک بندر تو ایسے شریر ہیں کہ اور کچھ نہ ملے تو دھول ہی اٹھا کر تماشائیوں کی آنکھوں میں جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چڑیا گھر میں کئی قسم کے بندر ہیں۔ لنگور۔ بن مانس۔ عام بندر وغیرہ۔

چڑیا گھر میں سات ریچھ ہیں۔ سر ہربرٹ ایمرسن (۱۹۳۲-۳ء) گورنر پنجاب کے لڑکے ایمرسن نے ایک ریچھ چڑیا گھر کے لیے تو شہر سے بھیجا تھا۔ دو ریچھ والیٔ سوات کا عطیہ ہیں اور دو گلگت سے اسی سال آئے ہیں۔ ریچھ اور انسان کی دوستی مشہور ہے۔ اس کا ایک نمونہ گلی کوچوں میں نظر آتا رہتا ہے۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں مداری ریچھوں کو لیے پھرتے ہیں جہاں ٹھہر گئے وہیں ڈگڈگی بجا کر ریچھ کو نچانے لگے۔ آخر میں ریچھ لیٹ کر اپنا پیٹ دکھاتا ہے یعنی کھانے کو مانگتا ہے۔ اس بہانے مداری تماشائیوں سے پیسے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ غرضکہ ریچھ کو سدھانا کچھ ایسا مشکل نہیں کہنے کو تو ریچھ ایک خوفناک درندہ ہے مگر اس کی خوراک بناسپتی ہے۔ یہ گوشت خور جانور نہیں البتہ شیر اور ریچھ کی آپس میں نہیں بنتی۔ شیر جنگل کا بادشاہ سہی ریچھ اس کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے۔ چڑیا گھر میں ریچھوں کے پنجرے شیروں کے پنجروں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں مگر چڑیا گھر میں آکر حیوانات کی آپس کی دشمنی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ نہ کوئی کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی کو ڈراتا ہے۔

ان وحشی درندوں کے علاوہ یہاں بھانت بھانت کے جانور ہیں کئی قسم کے ہرن، بارہ سنگھے، گھڑیال، نیل گائے۔ پہاڑی بکرے یہاں نظر آتے ہیں۔ بارہ سنگھوں کی تو کئی اقسام ہیں۔ اور ان کے سینگ مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر جنگل کی فضا یاد آجاتی ہے اور چڑیا گھر میں ان کے رہنے کا جو انتظام ہے وہ جنگل کی فضا سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

یہاں انواع و اقسام کے پرند بھی ہیں۔ کچھ ان میں صحرائی ہیں اور کچھ آبی۔ دس قسم کے کبوتر ہیں۔ ان میں مقدس کبوتر۔ سفید لکے۔ مٹیالے رنگ کے۔ ایرانی شیرازی۔ پیغامبر۔ جیکوبن۔ کلغی دار سبھی شامل ہیں۔ طوطے بھی کئی قسم کے ہیں ان میں ہالینڈ آسٹریلیا۔ افریقہ۔ انڈونیشیا کے ولایتی طوطے بھی ہیں۔ اور رنگ برنگ دیسی طوطے بھی۔ ان میں نیلا اور زرد مسکاڈ بھی ہے جو

جنوبی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ نام سے پراگ ڈینے تک پایا جاتا ہے۔ اس قسم کا ولایتی طوطا نواب صاحب و بیگم صاحبہ بہاولپور کا عطیہ ہے جو انہوں نے ۱۹۵۲ء میں چڑیا گھر کو مرحمت کیا۔ زرد رنگ کا ایک مکاؤ جو شمالی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ اسی چڑیا گھر میں ۱۹۵۹ء میں پیدا ہوا۔ ہر قسم کے مور یہاں موجود ہیں۔ سفید مور تو بے حد خوبصورت ہیں۔ دھاری دار سر والا مک جس کا سر سفید ہوتا ہے اور دو فصل کی شکل کی سیاہی مائل دھاریاں سر اور گردن کی پچھلی طرف ہوتی ہیں۔ گردن کی دونوں طرف لمبائی میں سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ اوپر کے پر کچھ ندوی لیے بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور پیٹ سفید ہوتا ہے۔ بے حد جاذب نظر ہیں یہ مک برما اور وسط ایشیا کا پرندہ ہے۔ ایسے ہی جانے کتنے پرندے اور ہیں جن کی فہرست یہاں دینا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

آبی مخلوق کے بھی یہاں بہت سے نمونے ہیں۔ ان میں سات لودھر ہیں جن میں سے دو والیٔ سوات کا عطیہ ہیں۔ یہ دضع قطع میں نیولے سے مشابہ ہیں اور پانی میں رہتے ہیں۔ یہاں ایک مگرمچھ بھی ہے۔ جب اس کا جی پانی سے گھبراتا ہے تو خشک گھاس پر کروٹ بدلنے کے لیے باہر آجاتا ہے۔ آٹھ سفید اور سات سیاہ بطخیں بھی ہیں جو بڑی نسل کی ہیں۔ چند کلنگ ہیں۔ کچھ چھوٹی نسل کی بطخیں بھی ہیں۔ مچھلیاں اور اود بلاؤ بھی ہیں۔ آبی مخلوق دوسرے تمام حیوانات پر اپنی قدامت کی وجہ سے فوقیت رکھتی ہے۔ اور تخلیق کائنات کے اس دور کی یاد دلاتی ہے۔ جب ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور انسان اور دوسرے چلنے پھرنے والے حیوان موجود نہ تھے۔

اب ہم حیوانات کی اس مختصر سی دنیا کی سیر کر چکے یہاں ہم نے بہت کچھ دیکھا۔ جس کا ہلکا سا نقش سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ چرند و پرند کی مختلف اقسام پر نظر ڈالی۔ جن کی فہرست اگر مکمل طور پر قلمبند کی جائے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیات گنوائی جائیں تو چڑیا گھر کا یہ خاکہ ایک دفتر ہو جائے۔ لیکن یہ ہمارا مقصد نہیں۔ لاہور کا چڑیا گھر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محض بیان کرنے کی چیز نہیں۔

چڑیا گھر کی سیر سے چند اثرات مرتب ہوتے ہیں اور چند تجاویز ذہن میں آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ دوسرے متمدن مقامات کی نمائش گاہ حیوانات کی طرح لاہور کے چڑیا گھر کے لیے بھی چند ماہر مقرر کئے جائیں۔ جو پرورش حیوانات کا کام جانتے ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس چڑیا گھر کے لیے موزوں گائیڈ بکس لکھوائی جائیں۔ جن میں مکمل معلومات متعلقہ موجود ہوں۔ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی بین الاقوامی قانون کے مطابق کم از کم پچھتر ایکڑ زمین کا رقبہ چڑیا گھر کے لیے مختص ہونا چاہیئے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے پنج سالہ منصوبے میں چڑیا گھر کے لیے ستر ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ یہ نیا دور چڑیا گھر کی ترقی کا تیسرا دور ہوگا۔ اور امید ہے کہ اب جو کچھ کمی سیر بینوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔ وہ مستقبل قریب میں پوری ہو جائیگی۔ آج بھی دیکھ بھال پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ جو تخمیناً ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ہے۔ اس میں سے کوئی ستو روپیہ روزانہ حیوانات کی خوراک پر صرف کیا جاتا ہے۔

دروازے

حافظ عباد اللہ فاروقی

سید محمد لطیف ہسٹری آف لاہور میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے شہر لاہور کے گرداگرد ۳۰ فٹ اونچی فصیل بنوائی۔ تاکہ شہر کو بیرونی حملہ آوروں کی ترکتازی سے بچائے رکھے۔ یہ فصیل شروع میں نہایت پختہ تھی لیکن امتدادِ زمانہ سے اس میں شگاف پڑ گئے چنانچہ ۱۸۱۲ء میں رنجیت سنگھ کے عہد میں مرمت طلب ہوگئی۔ رنجیت سنگھ نے نہ صرف اس کی شکست و ریخت کو بند کروایا بلکہ حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس فصیل کی اونچائی بجائے ۳۰ کے ۱۵ فٹ کرا دی فصیل کے باہر اس نے خندقیں بھی کھدوائیں۔ لیکن مرورِ ایام سے ان خندقوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ جہاں خندقیں تھیں وہاں اب باغات بن گئے ہیں۔ فصیل کے آثار بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ البتہ کشمیری دروازہ اور شیرانوالہ دروازہ کے درمیان اب بھی اس فصیل کے آثار ملتے ہیں۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور کے صفحہ ۵۰ پر یوں رقمطراز ہیں:

> "اکبر بادشاہ نے اس کے (لاہور کے) گرد پختہ حصار بنوایا فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی۔ ایک ایک دروازہ کے درمیان دس دس برج کلاں بنوائے دروازے پختہ تعمیر کیے۔ قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ وہ فصیل آخر سلطنت سکھی تک قائم رہی۔ انگریزی عہد میں اس قدر بلند فصیل فضول تصور ہو کہ پہلے بقدر نصف کے گرائی گئی۔ دوسری دفعہ باقی ماندہ گرا دینے کا حکم مل گیا اور اس کی جگہ ایک مختصر دیوار پختہ بنوا دی گئی۔"

اس شہر کے بارہ دروازے ہیں (اور ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے جسے موری دروازہ کہتے ہیں)۔

۱۔ دہلی دروازہ

چونکہ یہ دروازہ دہلی کی جانب ہے اس لیے دہلی دروازہ کہلایا۔ یہ لاہور کے مشرق کی سمت واقع ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن اس کے پاس ہی ہے۔ جو لوگ باہر سے آتے ہیں زیادہ تر اسی دروازے سے شہر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسی دروازے کے اندر رستہ سیدھی سڑک قلعہ کو جاتی ہے مسجد وزیر خان بھی دہلی دروازے کے اندر واقع ہے۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ سرائے وزیر خاں و حمام وزیر خاں جو مسجد

کے اوقات میں سے شمار ہوتے ہیں اسی دروازے کے اندر ہیں۔ پرانی عمارت اکبری اس دروازے کی انگریزی عہد تک موجود تھی۔ مگر نہایت بوسیدہ و خراب اور دروازہ پست و زمین دوز ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ہاتھی کا مع عماری گزرنا محال تھا۔ سرکار انگریزی نے بنظر رفع اس تکلیف کے پہلے دروازے کو گرا دیا۔ اور محمد سلطان ٹھیکہ دار کی معرفت عمارت موجودہ حال بنوائی۔ یہ دروازہ محمد سلطان ٹھیکیدار نے دوبارہ اپنی گرہ سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ دروازہ دو منزلہ نہایت مقطع بنایا گیا ہے۔ دونوں طرف دروازے کے دو منزلہ عالیشان عمارت ہے۔ اور وسط میں دروازہ ہے۔ نیچے کے دو طرفہ مکانات میں پولیس کے سپاہی رہتے ہیں اور اوپر کی منزل میں ایک طرف تو مکان نشست کچہری صاحبان آنریری مجسٹریٹان و میونسپل کمیٹی کے ممبروں کے اجلاس کے لیے مکلف و مصفا بنا ہے جس میں کچہری ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف پولیس کے افسر رہتے ہیں جن کی تعیناتی دروازے کی حفاظت پر ہوتی ہے۔ مصنف تاریخ لاہور نے لکڑی کے طاقوں کا ذکر نہیں کیا جو نہایت وزنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے کسی آہنی دیوار سے کم نہیں اس میں جا بجا لوہے کی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جبکہ ہاتھیوں کے ذریعے دروازوں کو توڑا جاتا تھا۔

۲۔ اکبری دروازہ یہ دروازہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کے ساتھ غلہ منڈی بھی بنوائی۔ جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اکبری منڈی اب بھی موجود ہے۔ لیکن اکبری دروازہ ڈھے چکا ہے۔ سرکار انگریزی کے عہد میں قدیمی طرز پر از سر نو بنایا گیا تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ دروازہ گرا دیا گیا ہے۔ اس دروازے کے ساتھ ایک سرائے بھی تھی جس میں اب پولیس کا تھانہ قائم ہے۔

۳۔ موتی دروازہ (موچی دروازہ) یہ دروازہ جنوب کی طرف واقع ہے۔ اکبری عہد کے ایک ہندو جمعدار کے نام سے موسوم ہے۔ جو تمام عمر اس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا۔ سکھی عہد میں موتی دروازہ کی بجائے موچی دروازہ مشہور ہوا۔ اب بھی اس نام سے موسوم چلا آتا ہے۔ انگریزی عہد میں یہ دروازہ مع دونوں برجوں کے گرا دیا گیا تھا۔ اور اس کی اینٹیں فروخت کر دی گئی تھیں۔ اس دروازے کی دونوں جانب مساجد بنی ہوئی ہیں۔ دائیں جانب ملا محمد صالح کی شاہجہانی عہد کی مسجد ہے۔ بائیں طرف بالائی منزل پر مسجد ہے نیچے دکانیں ہیں۔ ملا محمد صالح کی مسجد کے نقش و نگار زبانِ حال سے داستانِ ماضی سنا رہے ہیں۔ دہلی دروازے کی طرح بیرون موچی گیٹ میں مسلمانانِ لاہور کے اکثر جلسے اور تقاریر ہوتی رہی ہیں۔

۴۔ شاہ عالمی دروازہ یہ دروازہ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے اور جانشین محمد معظم شاہ عالم بہادر کے نام سے موسوم ہے۔ جو ۲۸ فروری ۱۷۱۲ء کو بمقام لاہور فوت ہوا۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا۔ بعد میں شاہ عالمی دروازہ پکارا جانے لگا۔ یہ دروازہ بھی انگریزی عہد میں دوبارہ پہلے دروازے کی قطع پر تعمیر ہوا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اسے گرا دیا گیا۔ دروازہ چھوٹی اینٹوں کا تھا۔ اوپر کی منزل میں پولیس کی نشست گاہ تھی۔ اب فقط نام رہ گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے یہ دروازہ دیکھا ہے۔ وہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس کے آثار ڈھونڈنے لگتے

کچھ عرصہ ضرور ٹھہر جاتے ہیں بلکہ ان کے پاؤں خود بخود یہاں رک جاتے ہیں ؎

پایم بہ پیش از سر آں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

اندرون شاہ عالم گیٹ مشہور عمارات یہ ہیں ۔ بڑی محل ۔ لال مسجد ۔ رنگ محل ۔ مقبرہ ایاز ۔ حویلی مبارک خاں وغیرہ۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں کی جلی ہوئی عمارات گرا کر یہاں سر لفٹک نئی عمارتیں بنا دی گئی ہیں ۔ جو طرز اور ہیئت میں امریکی وضع کی عمارات کے مشابہ ہیں ۔

۵ ۔ لوہاری دروازہ اس کا اصلی نام لاہوری دروازہ ہے ۔ غلط العام لوہاری دروازہ مشہور ہے لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ راجہ جے پال بن انگپال کو لاہور سے بیدخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کر لے ۔ تو راجہ جے پال چند ماہ تک اس شہر میں محصور ہو کر لڑتا رہا آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگا دی رعایا کو قتل کیا ۔ جس سے شہر بالکل ویران و برباد ہو گیا۔ رعایا کے لوگ کچھ قتل ہوئے کچھ بھاگ گئے ۔ چند سال یہ شہر غیر آباد رہا۔ آخر جب ملک ایاز پنجاب کے انتظام کے لیے مامور ہوا تو اس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا سب سے اول آبادی شہر کی اسی محلہ سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے اول یہی دروازہ تعمیر ہوا ۔ جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا ۔ اس دروازے کی سابقہ عمارت نہایت بوسیدہ اور خستہ تھی ۔ انگریزی عہد میں قدیمی قطع وضع پر اس کو از سر نو بنوایا گیا۔ اس کا بھی لکڑی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ موجود ہے اور دروازے کے اوپر رفع کنی کمرے بھی ہیں ۔

۶ ۔ موری دروازہ یہ شہر کے تمام دروازوں سے چھوٹا دروازہ ہے ۔ اس کا محل وقوع لوہاری اور بھاٹی دروازہ کے درمیان ہے ۔ انگریزی عہد میں اس دروازے کو کشادہ کیا گیا تھا ۔ آج کل اس کا دروازہ مفقود ہو چکا ہے ۔ موری دروازہ بھی ملک ایاز کے عہد کی یاد تازہ کر رہا ہے ۔ کیونکہ جب ملک ایاز نے شہر لاہور کو دوبارہ آباد کیا تھا تو فتح کی یادگار کے طور پر اس جگہ دروازہ قائم کر دیا تھا ۔ لیکن اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی ۔ لالہ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں "کہ یہ دروازہ بھی موری دروازے کے نام سے بعہد ملک ایاز موسوم ہوا ۔ اس واسطے کہ جن دنوں میں بعہد راجگی راجہ جے پال سلطان محمود نے شہر کو محصور کیا ہوا تھا ۔ راجہ تو شہر سے بے خبر بھاگ گیا ۔ مگر شہر کے لوگ بدستور لڑتے رہے ۔ سلطان نے چاہا کہ شہر میں داخل ہو کر شہر والوں کو سزا دیوے مگر کسی راستہ سے داخلہ نہ ملا ۔ آخر اس مقام سے دیواروں کو گرا کر داخل شہر ہوا" اب سوال یہ ہے کہ کیا محمود غزنوی کا اس چھوٹے سے راستہ سے شہر کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے اس کا نام موری دروازہ قرار پایا ؟ ۔ یا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سکھوں کے عہد میں اس دروازہ سے شہر کا کوڑا کرکٹ باہر نکالا جاتا تھا ؟ میرے خیال میں یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس راہ سے شہر کا کوڑا کرکٹ باہر پھینکا جاتا ہوگا ۔ اور لفظ موری بمعنی بدرو کے استعمال ہوتا ہوگا ۔ ملک ایاز کے زمانہ میں لفظ موری کا بدرو کے معنوں میں استعمال ہونا متصور نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ اس دروازہ سے کوڑا کرکٹ کا باہر پھینکنا قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ جبکہ تمام شہر نذر آتش ہو چکا تھا اور اس کا کچھ حصہ لاہوری دروازہ کے پاس نیا تعمیر ہوا تھا ۔

۷ ۔ بھاٹی دروازہ ۔ یہ دروازہ لاہور کے مغرب کی جانب ہے ۔ یہاں سے سیدھا راستہ شاہی مسجد کو جاتا ہے ۔ یہ دروازہ

بھاٹ قوم سے منسوب ہے۔ جو بعد آبادی اپانڈ کے اس دروازہ کے اندر یکجا آباد ہوئے تھے۔ اس کا قدیم دروازہ شکستہ ہو گیا تھا۔
چنانچہ انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں اس کو گرا کر انگریزی قطع کا دروازہ بنوا دیا تھا۔ جو اب تک موجود ہے۔ اس دروازے کی
محراب قدیم دروازوں کی محرابوں سے بالکل مختلف ہے نیز بخلاف قدیم عہد کے دروازوں کے اس کے اوپر نہ رہنے کے لیے کمرے
ہیں نہ نیچے چوکیداروں کی قیام گاہیں ہیں۔ دروازے کے ساتھ ہی تھانہ بھاٹی گیٹ ہے۔ اس دروازے کے طاق بھی نہیں کیونکہ
یہ جس عہد میں دوبارہ بنا۔ اس عہد میں شہر بندی کی رسم نہ تھی۔ اور عین ممکن ہے شہر کی فصیل بھی اس وقت موجود نہ ہو بھاٹی درواز
کے اندر بازار حکیماں ہے۔ جہاں بڑے بڑے نامور طبیب رہا کرتے تھے۔ اونچی مسجد اور ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی بڑی بڑی
حویلیاں موجود ہیں جو تقریباً سکھ عہد کی یادگار ہیں۔ سکھوں کے عہد کا کوچہ فقیر خانہ بھی موجود ہے۔ جہاں فقیر خاندان کے لوگ
رہائش پذیر ہیں۔ فقیر میر مغیث خلف الرشید فقیر سید جلال الدین مرحوم اسی بازار میں رہتے ہیں۔ اسی دروازہ کے اندر بازار
حکیم محمد لطیف بھی ہے جو ہسٹری آف لاہور کے مصنف ہیں۔ تحصیل بازار بھی اسی کے اندر ہے۔ اور مدرسہ نعمانیہ بھی اس کے آخر
میں واقع ہے۔

۸۔ ٹکسالی دروازہ

یہ دروازہ لاہور کی غربی جانب ہے۔ شاہان سلف کے عہد میں اس دروازہ کے اندر دارالضرب
شاہی ایک عالیشان مکان کی صورت میں تھا جہاں سکے مسکوک و مضروب ہوتے تھے۔ اس ٹکسال
کے سبب سے اس کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوا۔ اگرچہ ٹکسال کے آثار اب باقی نہیں رہے البتہ مسجد ٹکسال باقی ہے جس کے
دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں کاشی کار عمدہ مسجد بنی ہوگی۔ آج کل اس دروازے کے اندر رنڈیوں کا چکلہ ہے جسے
ہٹی یا ہیرا منڈی کہتے ہیں۔ جہاں جنسی سوداگری میں روپے کی جھنکار قدیم ٹکسال کے سکوں کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

۹۔ روشنائی دروازہ

یہ دروازہ مسجد بادشاہی اور قلعہ لاہور کے واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں امرا و رؤسا کے
مکانات ہوا کرتے تھے جہاں بڑے بڑے چراغ روشن کیے جاتے۔ ان چراغوں کی روشنی کی
وجہ سے یہ دروازہ روشنائی دروازہ کہلایا۔ اس دروازہ کی اگرچہ آجکل بھی بڑی شان ہے۔ لیکن وہ چراغان اور ضیا پاشی نہیں
جس کے باعث چاروں طرف سے روشنی کی کرنیں پھوٹتیں۔ سید محمد لطیف کا یہ بیان لالہ کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور کے بیان سے
قدرے مختلف ہے۔ لالہ کنہیا لال روشنائی دروازہ کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ بسبب مسجد شاہی اور دروازہ غربی قلعہ لاہور چونکہ ملازمان
شاہی کی آمد و رفت یہاں زیادہ رہتی تھی اس سبب سے اس دروازہ کے اندرونی میدان اور باہر ہر روز مرہ پادشاہی حکم سے روشنی ہوا کرتی
تھی۔ اس مناسبت سے اس کا نام روشنائی دروازہ رکھا گیا۔ اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ یہ دروازہ اصل میں قلعہ کا دروازہ
ہے۔ مگر بسبب اس کے کہ قلعہ کی غربی دیوار کے باہر اور فصیل شہر کے اندر تھا۔ شہر کا دروازہ شمار ہونے لگا۔ یہ دروازہ اپنی ہیئت
کے اعتبار سے قدیم ترین دروازہ ہے۔

۱۰۔ مستی دروازہ

اس دروازے کا اصل نام بقول سید محمد لطیف مصنف ہسٹری آف لاہور مسجدی دروازہ ہے۔ اس
دروازے کے پاس شہنشاہ اکبر کی والدہ مریم مکانی کی مسجد ہے اس مناسبت سے یہ دروازہ مسجدی
دروازہ کہلایا۔ بعد میں اس کا نام مستی دروازہ مشہور ہوا۔ لالہ کنہیا لال نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "یہ دروازہ بھی ایک شاہی

لازم کے نام سے مشہور ہے جس کا نام مستی بلوچ تھا۔ اور حفاظت اُس کی بادشاہ کے حکم سے اُس کے سپرد تھی۔ اور مدت العمر اسی خدمت پر مامور رہا۔ اس کی قدامت اور نیکو خدمتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہی حکم سے یہ دروازہ اُس کے نام سے ہم نام کیا گیا تاکہ اُس کا نام تاقیام دروازہ زندہ رہے۔ پُرانا دروازہ اب بحکم حکام انگریز گرا دیا گیا ہے اور مختصر پھاٹک اُس کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں مذکورہ بالا بیان کس حد تک درست ہے البتہ پھاٹک اب وہاں نہیں رہا نہ اُس کے کوئی آثار وہاں پائے جاتے ہیں۔

۱۱۔ کشمیری دروازہ

چونکہ اس دروازے کا رُخ کشمیر کی طرف ہے اس سبب سے یہ کشمیری دروازہ کہلایا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سکھ عہد کی ایک حویلی آتی ہے جہاں آج کل لڑکیوں کا ہائی سکول ہے۔ یہ دروازہ نہایت خستہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا اس لیے سرکار انگریزی نے انگریزی وضع قطع پر بھاٹی گیٹ کی طرح اسے بھی از سر نو تعمیر کروا دیا۔ اس دروازے کے باہر دریائے راوی کی گذرگاہ تھی۔ دروازے کے پاس جو ڈھلوان ہے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ فصیل اور دروازوں کے باہر دریا یہاں سے گزرتا تھا۔

۱۲۔ شیرانوالہ یا خضری دروازہ

اس دروازے کا اصل نام خضری دروازہ ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانۂ سلف میں دریائے راوی شہر کے بہت نزدیک بہتا تھا۔ خصوصاً اس دروازہ کے آگے کشتی چلتی تھی۔ چونکہ خواجہ خضر کو دریاؤں اور سمندروں کے ساتھ خاص نسبت ہے۔ اس لیے اس دروازہ کا نام خضری دروازہ رکھ لیا۔ لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس دروازہ کا نام شیرانوالہ دروازہ تبدیل ہو گیا۔ اس زمانہ میں دو شیروں کے پنجرے اس دروازہ کے اندر رکھے رہتے تھے۔ جو لوگ دروازوں کی حفاظت کرتے تھے وہی شیروں کی بھی محافظت کرتے تھے۔ انگریزی عہد میں وہ پنجرے اٹھوائے گئے مگر دروازے کا نام شیرانوالہ دروازہ بحال رہا۔ اب اس دروازے کے اوپر دائیں اور بائیں طرف دو شیروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جو سکھ عہد کے شیروں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ خضری دروازہ کا نام اگرچہ بدل گیا ہے۔ تاہم اس دروازے کے پاس خضری محلہ موجود ہے۔ جو خضری دروازہ کی نشاندہی کر رہا ہے۔

۱۳۔ ذکی دروازہ (یکّی دروازہ)

یہ دروازہ پیر ذکی شہید کے نام سے مشہور ہے جن کی دو قبریں ہیں۔ یعنی ایک دروازے کے اندر ہے جہاں ان کا سر دفن ہے۔ دوسری قبر باقی حصّہ جسم کی ہے۔ جو دروازے کے ساتھ ایک طویلہ میں ہے۔ عقیدت مند لوگ دونوں قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ بزرگ مغلیہ محاصرے کے وقت اس دروازے کے محافظ تھے جب شہر فتح ہوا اور رعایا کا قتل عام ہوا تو یہ بھی دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ مشہور یوں ہے کہ پیر ذکی کا سر گردن سے جدا ہو گیا۔ تو باقی جسم اُس مقام تک دشمنوں سے لڑتا چلا گیا جہاں اب اس کی قبر ہے۔ یہ دروازہ بسبب کہنہ اور بوسیدہ ہونے کے انگریزی عہد میں گرا دیا گیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ تک شہر کی فصیل اور دروازے اچھی حالت میں رہے۔ فصیل کے باہر خندق تھی اور دوہرے دوہرے دروازے تھے۔ غرض غنیم کبھی شہر پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ جب انگریزوں کا زمانہ آیا خندقیں مٹی سے بھروا دی گئیں اور اُس زمین پر باغیچے لگا دیئے گئے۔

انگریزی دور کی چند تعمیرات

پروفیسر یوسف جمال انصاری

فنِ تعمیر کا ارتقا اس طور پر ہوا ہے کہ دورِ جدید میں اس کا بنیادی فلسفہ سہولت، رفاہِ عامہ اور سائنس کی ترقیوں سے ہم آہنگی ہے۔ شخصی حکومت کا دور گزر چکا۔ جاگیردارانہ نظام ایک مدت ہوئی پارہ پارہ ہو گیا۔ موجودہ زمانے کی تعمیرات عوام کی بھلائی کو مدِنظر رکھ کر کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا دور عوامی دور ہے۔ عوام کی سہولت ہر طور دوسرے مقاصد پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے آج کل کی تعمیرات سڑکیں، پل، ہسپتال، دفاتر، ہوٹل، مدرسے، فیکٹریاں، مل اور بنک ہیں۔ سائنس کے دور میں ہماری تعمیرات کا سائنس کی رو سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔ وہ دن گئے کہ عظمت اور رفعت فنِ تعمیر کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ آج عظمت اور رفعت کی جگہ افادیت اور سہولت نے لے لی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اپنے ساتھ چند مخصوص مسائل لے کر آئی ہے جن سے عہدہ برآ ہونا فنِ تعمیر کے سپرد ہے۔ آج کے مکانات نہ پہلے کی طرح وسیع اور کشادہ ہو سکتے ہیں نہ غیر ضروری طور پر خوبصورت اور مرصع۔ معماروں اور انجینئروں کا اولیں فرض یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل کریں۔ اور دوسرا فرض یہ ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ آسائش کم سے کم جگہ میں مہیا کریں۔ اب مکانات محض نمائش نہیں ہوتے۔ موسموں کا لحاظ، حوادث (مثلاً زلزلہ، طوفان) بیماریوں اور اسی قسم کے ارضی و سماوی حالات کا لحاظ معمار کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ دفاتر، مل اور فیکٹریاں فلک بوس عمارات میں واقع ہوتی ہیں۔ امریکہ اور انگلستان اور اب تو پاکستان اور ہندوستان میں بھی ایک عام رجحان یہ ہے کہ کئی کئی منزل کی عمارتیں تعمیر کی جائیں۔ جن تک پہنچنے کے لیے صنعتی وسائل لفٹ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ فنِ تعمیر کی علامت قلعہ اور عبادت گاہ نہیں۔ دفتر، ہسپتال اور فیکٹری ہے کیونکہ یہ عوامی، صنعتی اور سائنسی دور ہے۔

لاہور کی شہر پناہ اب موجود نہیں۔ اب لاہور کا شہر اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ شہر پناہ میں رہنے والوں کا قدیم لاہور شہر لاہور کے ایک گوشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں شہر لاہور میں ضم ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مزنگ، اچھرہ، مغلپورہ، دھرمپورہ وغیرہ اپنی الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ اور شہر لاہور کے چاروں طرف قصبے اور گاؤں کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ آج یہ بستیاں شہر لاہور کے مختلف محلوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چھاؤنی میاں میر میں قائم ہونے کے بعد لاہور کینٹ شہر لاہور کا ایک جدید حصہ ہے۔ جس میں انگریزی دور کی بے شمار تعمیرات موجود ہیں۔ جو فوجی ضرورت کے لحاظ سے بنائی گئی ہیں۔ مال روڈ انگریزوں کے عہد کی اہم ترین شاہراہ ہے۔ جو چھاؤنی کو شہر سے ملاتی ہے۔ لاہور کی جدید عمارات بیشتر مال روڈ کے کنارے واقع ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر اہم ہیں کہ ان کا تذکرہ کیے بغیر لاہور کی عمارات کا کوئی بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ انگریزی دور میں جو تعمیرات ہوئیں۔ ان کا سرفہرست گورنمنٹ ہاؤس ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس

انگریزی دور میں گورنمنٹ ہاؤس انگریز گورنر کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس جگہ پر گورنمنٹ ہاؤس

واقع ہے۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا جس کو گنبد کشتی والا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بقول بعض یہ مزار سید عبدالرزاق گیلانی کا ہے۔ جن کے نام سے قریب ہی ایک محلہ بھی آباد تھا۔ لیکن اکثر مورخین کا خیال ہے کہ یہ مزار صدری قاسم خاں کا تھا جو شہنشاہ اکبر کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔ سکھ دور میں یہ مقام بعض سکھ سرداروں کے ہاتھ آیا جن سے سرکار انگریزی نے اس کو خرید کر لیا۔ اور یہ جگہ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر کے لیے تجویز ہوئی۔ ان دنوں اس کی صورت ایک کوٹھی کی سی تھی۔ جس کے چاروں طرف باغ تھا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں فتح پنجاب کے بعد اس کوٹھی کے مالک راجا تیج سنگھ سے یہ کوٹھی انگریزوں نے خرید لی۔ اور اسے لیفٹیننٹ گورنر کی قیام گاہ قرار دیا۔ اس حیثیت سے اس پر کرنل سر ہنری لارنس کا قبضہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس عمارت میں اضافے ہوتے رہے اور پرانی کوٹھی جس میں سکھ سردار رہا کرتا تھا۔ اس وقت کسی صورت میں بھی موجود نہیں۔ البتہ گورنمنٹ ہاؤس کے وسیع کھانے کے کمرے میں اس قدیم مقبرے کے نشانات موجود ہیں جس پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی ہے۔ عمارت کے وسط میں ساڑھے بتیس فٹ لمبا چوڑا مربع ہال ہے۔ جس کی اونچائی ۳۲ فٹ ہے۔ ہال کے اطراف میں کمرے ہیں۔ جو ملاقاتیوں کی نشست گاہ اور دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔ برآمدے وسیع ہیں۔ جابجا نقش و نگار ہیں۔ عمارت کے چاروں طرف ایک خوبصورت باغ ہے۔ باغ میں ساٹھ فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا اور تیرہ فٹ گہرا زینہ دار حوض ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ملازمین کے کوارٹر، اصطبل، گودام وغیرہ بھی ہیں۔

۱۸۴۹ء سے ۱۹۲۱ء تک گورنمنٹ ہاؤس لیفٹیننٹ گورنروں کی اقامت گاہ رہا۔ ۱۹۲۱ء کے بعد لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کا عہدہ گورنر پنجاب قرار پایا اس لحاظ سے ۱۹۲۱ء کے بعد سے اس عمارت میں گورنر پنجاب رہتے چلے آئے ہیں۔ پہلا لیفٹیننٹ گورنر سر ہنری لارنس تھا جو ۱۸۴۹ء میں گورنمنٹ ہاؤس میں فروکش ہوا تھا۔ آخری لیفٹیننٹ گورنر سر ای۔ ڈی میکلیگن ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ ہاؤس میں آباد ہوا۔ اسی کے زمانے میں لیفٹیننٹ گورنری کا عہدہ ختم ہو گیا۔ اور سر میکلیگن جنوری ۱۹۲۱ء میں پنجاب کا پہلا گورنر قرار پایا۔ جو اپنے عہدے کی بنا پر گورنمنٹ ہاؤس میں اقامت پذیر ہوا۔ موجودہ گورنر نواب امیر محمد خان نواب آف کالا باغ ہیں۔ بڑی بڑی بین الاقوامی شخصیتیں جب حکومت پاکستان کی مہمان ہوتی اور لاہور آتی ہیں تو انھیں گورنمنٹ ہاؤس ہی میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عمارت سرکاری مہمان خانہ بھی ہے۔

لارنس و منٹگمری ہال

سرجان لارنس پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر (۱۸۵۹ء) اور سر رابرٹ منٹگمری پنجاب کے دوسرے لیفٹیننٹ گورنر (۱۸۵۹-۶۵ء) کی یادگار میں یہ دو وسیع ہال انگریز حکام اور مخیر حضرات و روسا کے چندے سے مال روڈ اور لارنس گارڈن کے سنگم پر تعمیر کیے گئے۔ سرجان لارنس کا تعلق لاہور کے ساتھ لارنس گارڈن، لارنس ہال اور مجسمہ لارنس کے وجود سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ پنجاب کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ جس کا تقرر ۱۸۵۹ء میں عمل میں آیا۔ لیکن جو اپنی علالت کی بنا پر اسی سال واپس انگلستان چلا گیا۔ بعد کو سرجان لارنس لارڈ لارنس کے نام سے وائسرائے ہند مقرر ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر مامور رہا۔ لارنس کے بعد سر رابرٹ منٹگمری جو پنجاب کا دوسرا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۵ء تک اس عہدے پر قائم رہا۔ چنانچہ منٹگمری ہال اور منٹگمری روڈ لاہور کے ساتھ اس تعلق ثابت کرتی ہیں۔

لارنس ہال و منٹگمری ہال دو الگ الگ یادگاریں ہیں جنھیں ایک درمیانی تعمیر کے ذریعے آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ لارنس ہال ۱۸۶۱-۶۲ء میں سرجان لارنس کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ اس عمارت کا خاکہ مسٹر سٹون (STONE) سول انجینیر نے تیار کیا تھا۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ساڑھے بتیس فٹ لمبا۔ ساڑھے تیس فٹ چوڑا اور تینتیس فٹ اونچا ہے۔ اس کا فرش لکڑی کا ہے۔ اس کے مشرق اور مغرب میں ایک ایک چھوٹا کمرہ ہے۔ پوری عمارت کی لمبائی ۲۰۵ فٹ ہے۔ تینوں کمروں کی چھت ایک ہی ہے۔ لارنس ہال کو جلسہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے پہلے زمانے

میں یہاں ڈرامے بھی اسٹیج کیے جاتے تھے۔ اس عمارت کی تعمیر پر ۳۴۰۰۰ روپیہ صرف ہوا تھا جس کا بیشتر حصہ یورپین صاحبانِ اقتدار کے چندہ سے فراہم ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل نیول کی گائیڈ بک متعلقہ لاہور میں ایک عجیب غلطی کا ازالہ کرنل گولڈنگ نے اپنی کتاب قدیم لاہور میں کیا ہے۔ نیول نے لارنس ہال کو "سرخ اینٹوں" کی بنی ہوئی ایک خوبصورت عمارت بتایا ہے۔ حقیقت میں یہ "سرخ اینٹوں" کی بنی ہوئی عمارت نہیں ہے

منٹگمری ہال وسعت میں لارنس ہال سے بھی بڑا ہے۔ منٹگمری ہال کی تعمیر ۱۸۶۶ء میں عمل میں آئی۔ عمارت کا خاکہ مسٹر گرڈن (GORDON) سول انجنیئر نے تیار کیا۔ رؤسائے پنجاب نے اس ہال کی تعمیر کے لیے دل کھول کر چندہ دیا۔ اس عمارت پر ایک لاکھ چوہتر ہزار روپیہ صرف ہوا۔ جس میں چھیاسٹھ ہزار روپیہ مرمت کی مد میں شامل ہے۔ اصل عمارت ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ میں تیار ہوئی تھی۔ لیکن اس کی چھت بعد کو ناقص ثابت ہوئی۔ اور بڑے پیمانے پر مرمت کرانی پڑی۔ یہ مرمت رائے بہادر کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور و اگزیکٹو انجنیئر کے زیر نگرانی ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ منٹگمری ہال کا بڑا کمرہ ایک سو چھ فٹ لمبا، چھیالیس فٹ چوڑا، اور اڑتیس فٹ اونچا ہے۔ اس کا فرش بھی لارنس ہال کے فرش کی طرح دیودار کا ہے۔ اس ہال کے چار گوشوں پر چار دو منزلہ کمرے ہیں۔ ستونوں پر اعلیٰ درجہ کا ماہی پشت کا کام ہے۔ لارنس ہال و منٹگمری ہال کی دیواریں اور چھتیں روغنی ہیں۔ برآمدے میں ایک دارالمطالعہ ہے اور یہیں کہیں جم خانہ بھی واقع ہے۔ لارنس ہال کی طرح منٹگمری ہال بھی پبلک اور سرکاری تقاریب کے کام آتا ہے۔ یہاں مشہور انگریز حکام کی تصاویر بھی آویزاں ہیں۔ منٹگمری ہال کا فرش مغربی رقص کے لیے مناسب ہے۔

اسمبلی چیمبر گول میز کانفرنس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بموجب برصغیر پاک و ہند کے صوبوں کو حکومتِ خود اختیاری قائم کرنے کا جو حق ملا۔ اسے کام میں لاتے ہوئے اپریل ۱۹۳۷ء میں صوبۂ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی۔ چوہدری سر شہاب الدین پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے پہلے اسپیکر مقرر ہوئے اور سر سکندر حیات خاں سب سے پہلے وزیر اعظم بنے۔ اب یہ ضروری ہوا کہ قانون ساز اسمبلی کے لیے ایک مستقل اور موزوں عمارت ہو۔ جس میں اس کے اجلاس منعقد ہو سکیں۔ عمارت کے لیے شاندار ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ اس عمارت کی تقریباً وہی حیثیت ہونی تھی جو انگلستان میں پارلیمنٹ ہاؤس کی ہے۔ اس عمارت میں صوبۂ پنجاب کے سیاسی نمائندوں کو یکجا ہو کر ملک اور قوم کے لیے قانون بنانے تھے۔ جمہوری نظام کی روشنی میں قومی نمائندوں کا قانون ساز ایوان وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو مطلق العنانی کے دور میں شاہی محل۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اس قومی ایوان کا سنگِ بنیاد سر جوگندر سنگھ نے رکھا۔ اور ۱۹۳۸ء میں یہ تکمیل کو پہنچی۔ چنانچہ اس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

اسمبلی چیمبر انگریزی دور کی عمارات میں اہم ترین عمارت ہے۔ نہ صرف اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ عمارت دوسری عمارتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ فن تعمیر کا ایک شاہکار بھی ہے۔ اس کا محل وقوع بھی نہایت مناسب ہے۔ اس کی وسعت اس کی پختگی اس کا ڈیزائن۔ اس کی کاریگری لائق ستائش ہیں۔ سرکاری انجنیئر مسٹر سلیمن کے زیر نگرانی یہ عمارت بننی شروع ہوئی تھی۔ مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی ریٹائرڈ ہو کر واپس انگلستان چلے گئے۔ اور مسٹر پی۔ ایل ورما کی نگرانی میں یہ اختتام کو پہنچی۔ اس پر اندازاً سولہ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

اسمبلی چیمبر مال روڈ پر لارنس گارڈن کے بالمقابل گورنمنٹ ہاؤس کے قریب واقع ہے۔ اس کے سامنے وکٹوریا کا مجسمہ تھا جس کو اب وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اب صرف سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک گنبد نما کٹہرہ موجود ہے۔ اور مجسمے کا وجود نہیں لیکن اس گنبد کو اب بھی ملکہ کا بُت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسمبلی چیمبر ایک ہشت پہلو عمارت ہے۔ جس میں پچاس کمرے ہیں۔ یہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے جس کے نیچے تہ خانے ہیں۔ بالائی منزل میں اسمبلی کے ممبروں کے لیے ایک عظیم الشان ہال ہے۔ جس میں کم و بیش تین سو اشخاص بیک وقت بیٹھ کر مشاورت اور بحث و تمحیص کر سکتے

ہیں۔ گیلری میں تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ چھوٹی کمیٹیوں کے اجلاس کے لیے چھ کمیٹی روم مختص ہیں۔ دو کمروں میں لائبریری قائم ہے جس میں ضروری مسائل پر لٹریچر ہے۔ ایک چائے خانہ ہے۔ متعلقہ اہل کاروں کے لیے کمرے بھی ہیں۔ یہ ایک جدید وضع کی عمارت ہے۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے یہ عمارت مغربی وضع کی ہے۔ اور اس پر کسی مغربی ملک کے ایوانِ نمائندگان کا گمان ہوتا ہے۔ مغربی وضع کی جو عمارتیں لاہور میں ہیں۔ اسمبلی چیمبر ان میں بہترین ہے۔

ہائی کورٹ

ہائی کورٹ کی عمارت ہند عربی وضع کی ایک عالیشان عمارت ہے۔ جو مال روڈ کے کنارے مزار شاہ چراغ کے متصل اور جنرل پوسٹ آفس کے قریب واقع ہے۔ پہلے اس عمارت میں پنجاب چیف کورٹ کا اجلاس ہوتا تھا۔ چنانچہ اب بھی پرانے لوگوں کی زبان پر اس عمارت کے لیے ہائی کورٹ کی بجائے چیف کورٹ کا لفظ ہی آتا ہے۔ یہ عمارت ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوئی اس کا ڈیزائن ایک ماہرِ فن تعمیر مسٹر بروسنگٹن (BROSSINGTON) نے تیار کیا۔ اور اس کی تعمیر مسٹر ہلٹن (HILTON) اگزیکٹو انجنیئر کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ اس پر تین لاکھ اکاسی ہزار آٹھ سو سینتیس روپیہ صرف ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں اس عمارت میں ہائی کورٹ قائم ہوا۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد سے اس میں سپریم کورٹ بھی قائم ہے۔

لاہور کی قدامت لاہور کی اسلامی تہذیب و ثقافت اور لاہور کی عام فضا کے ساتھ ہائی کورٹ کی یہ ہند عربی وضع کی عمارت مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ قومی اور سرکاری تقاریب پر جب چراغاں ہوتا ہے تو اس عمارت کی پیشانی پر جو میزانِ عدل کا نقش ہے وہ اور بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔ اور پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عمارت پاکستانی عدلیہ کی علامت (SYMBOL) ہے۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد عدل کا تصور واضح طور پر موجود ہی نہ رہا تھا۔ انگریزی دور میں یہ تصور ابھرا اور قیامِ پاکستان کے بعد عدل کے تصور میں اسلامی رنگ پیدا ہو گیا۔ یہ عمارت جس میں سپریم کورٹ بھی شامل ہے۔ عدلیہ کے مختلف مدارج پر حاوی ہے۔ اور اس حیثیت سے لاہور کی عمارات میں امتیازی شان رکھتی ہے۔

یہ ایک وسیع عمارت ہے۔ جس کے صحن میں سنگِ مرمر کا ایک فوارہ ہے اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے خیاباں ہیں۔ جو اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اصل عمارت چہار گوشہ ہے اور پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے جس پر چونے کے مسالے کا کام ہے۔ جا بجا محرابیں اور کارنسیں ہیں جن پر آرائشی کام ہے اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ پتھر میں جالی کا کام نہایت دیدہ زیب ہے۔ ایک خصوصیت اس عمارت کی یہ ہے کہ اس میں ثابت اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ چاروں گوشوں کے جانب چاروں طرف وسیع برآمدے ہیں۔ اس عمارت پر دہلی کے قطب مینار کی وضع کے دو مینار ہیں۔ جن کی طرزِ تعمیر اسلامی ہے۔ کونوں پر دو برجیاں ہیں۔ میناروں کی بلندی بچانوے فٹ اور برجیوں کی بلندی بہتر فٹ ہے۔ سامنے کے رخ والے برآمدوں میں شہد کے چھتے کے نمونے کی قدیم عربی وضع کی کارنسیں ہیں۔

عمارت کے بڑے ہال کا فرش سنگِ مرمر کا ہے۔ اور دوسرے کمروں کا فرش ہشت پہلو چوکوں کا ہے۔ شہتیر دیودار کے ہیں۔ اس عمارت میں جا بجا نوشہرے کا سنگِ مرمر صرف ہوا ہے۔ ولایتی سیمنٹ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بڑا ہال پچپن فٹ لمبا اور پینتیس فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دونوں رخ دو دو وسیع کمرے ہیں۔ جو ماتحت عدالتوں کے کام آتے ہیں۔ اطراف میں ججوں کے لیے چار کمرے ہیں۔ اس عمارت میں رجسٹرار کا کمرہ لائبریری۔ کمیٹی روم۔ انگریزی اور فارسی مسودات کا ریکارڈ روم۔ شعبۂ ترجمہ کا کمرہ اور دوسری قانونی ضروریات کے لیے مناسب انتظام ہے۔ وکیل اور بیرسٹر صاحبان کے لیے بار روم بھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بار روم ضلع کچہری کے قریب کورٹ اسٹریٹ میں تھا چنانچہ اب تک متعدد وکیل صاحبان کورٹ اسٹریٹ ہی میں رہتے ہیں۔

مرکزی تار گھر

دفتر اکونٹنٹ جنرل کے نزدیک اور جنرل پوسٹ آفس کے بالمقابل ایک جدید وضع کی وسیع و عریض عمارت مرکزی تار گھر کے نام سے موسوم ہے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں بہ نگرانی رائے بہادر کنہیا لال اگزیکٹو انجینئر و مصنف "تاریخ لاہور" یہ عمارت بننی شروع ہوئی۔ اور مارچ ۱۸۸۱ء میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کی تعمیر پر تقریباً پینتالیس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ بقول سید محمد لطیف اس پر پینتالیس ہزار دو سو سولہ روپیہ خرچ آیا۔ یہ عمارت انگریزی وضع کی ہے۔ اور پختہ چونے اور انگریزی وضع کی بڑی اینٹ سے بنائی گئی ہے۔ اس کا طول ایک سو پچیس فٹ ۶ انچ اور عرض اڑسٹھ فٹ چھ انچ ہے۔ اصل عمارت تیرہ کمروں ایک ہال دو غسل خانوں اور ایک ڈیوڑھی پر مشتمل ہے۔ بڑے ہال کا فرش سرخ پتھر کا اور باقی کمروں میں پختہ چوکوں کا ہے۔ بیرونی برآمدے میں بارہ در محرابی ہیں۔ اور ڈیوڑھی میں تین چھوٹے مدمحرابی اور دو بڑے در ہیں۔ یہ عمارت کوئی دس بارہ ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔

جس علاقے میں اب تار گھر واقع ہے وہ ایک بزرگ کے مزار کا علاقہ ہے۔ یہ بزرگ حاجی محمد سعید تھے اور ان کا مزار اب بھی بینک سکوائر میں موجود ہے۔ جس زمانے میں انارکلی میں انگریزی فوج کی بارکیں تھیں اور چھاؤنی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں تار گھر کی عمارت میں گرجا قائم تھا۔ چنانچہ تار گھر کی موجودہ عمارت اس گرجا کی عمارت کی ہیئت کو تبدیل کر کے بنائی گئی ہے۔ جب ہم تار گھر کے وسیع صحن میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے درمیان ایک خوبصورت فوارہ نظر آتا ہے۔ فوارے کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے چمن ہیں۔ اس کے بعد اصل عمارت ہے۔ باہر ڈیوڑھی ہے۔ اندر ایک وسیع ہال کو مختلف حصوں میں حسب ضرورت تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ان کے اندر لکڑی کا کٹہرہ ہے جس میں کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ اہلِ ضرورت کھڑکیوں کے باہر سے اہل کاران محکمہ کو تار کے فارم دیتے ہیں۔ محکمے کا عملہ کٹہرے کی دوسری جانب مصروف کار رہتا ہے۔

مواصلات کی کئی شکلیں ہیں۔ کوئی پیغام کہیں بھیجنا ہو تو ڈاک تار ٹیلیفون وائرلیس غرض کہ کئی طریقے اس متمدن زمانے میں رائج ہیں۔ ان میں تار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کہیں بجلی کی لائن موجود ہو وہاں تار بھیجنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون کے مقابلے میں تار یعنی ٹیلیگرام کم خرچ اور محفوظ تر ہے۔ ٹیلیفون اگر ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجا جائے اور اس طرح ٹیلیفون کا بین الملکی نظام رائج ہو تو اس پر ایک کثیر رقم خرچ ہو گی۔ پھر بھی الفاظ کے سننے میں غلطی کا احتمال موجود رہے گا۔ لیکن ٹیلیگرام یعنی تار میں نہ تو اتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اور نہ پیغام کے غلط وصول ہونے کا کوئی خطرہ ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بجلی کا سلسلہ موجود ہو۔ پیغام بھیجنے والا اس شہر کے تار گھر میں بیٹھ کر کنجی (KEY) کو دباتا ہے اور دوسرے شہر میں تار گھر کے اندر نصب ساؤنڈر (SOUNDER) یعنی ساؤنڈ بکس اس کا پیغام وصول کرتا ہے۔ یہ پیغام چھوٹی اور لمبی آوازوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ جن کی مثال نقطہ اور لکیر سے دی جا سکتی ہے۔ انگریزی کے جملہ حروف کو ان چھوٹی بڑی آوازوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بڑی خوبی اس نظام مواصلات میں یہ ہے کہ پیغام بھیجنے اور وصول کرنے میں کم از کم وقت صرف ہوتا ہے۔ لاہور کا تار گھر پاکستان بھر میں سب سے بڑا تار گھر ہے۔

جنرل پوسٹ آفس

ریل گاڑی یا ہوائی جہاز کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ اگرچہ مقامی نوعیت کے پیغام ٹیلیفون کے ذریعے بھیجنے کا رواج بھی کچھ عرصے سے رائج ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھی ٹیلیفون کے ذریعے ہی پیغام بھیجے جاتے ہیں۔ تاہم ٹیلیفون ڈاک کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ٹیلیفون عام لوگوں کی رسائی سے ابھی تک بالا ہے۔ اسی طرح صرف ضروری اور مختصر نوعیت کے پیغام تار کے ذریعے بھیجنے کا رواج بھی ہو چکا ہے۔ لیکن تار صرف

مخصوص حالات ہی میں بھیجا جاتا ہے۔ اس متمدن دور میں بھی اگر کسی کے نام تار آئے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ خدا جانے کیا افتاد پڑی ہے جو یہ تار بھیجا گیا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاک کے ذریعے خط و کتابت اس قدر عام ہے کہ اسے معاملہ فطرت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

قدیم زمانے میں جب نہ ریل گاڑی تھی نہ ہوائی جہاز، پیغام رسانی کا سلسلہ مختلف طریقوں سے رائج تھا۔ سب سے آسان تو یہ تھا کہ زبانی پیغام دے کر کسی قاصد یا ہرکارے کو دوڑا دیا جاتا تھا۔ آج بھی دیہات میں شادی اور غمی کے مواقع پر پیغام رسانی کا کام نائی انجام دیتے ہیں۔ اگر ڈاک کے ذریعے خط بھیجا جائے تو لوگ اس کو ذاتی دعوت خیال نہیں کرتے۔ اور تقریب میں شمولیت سے گریز کرتے ہیں۔ جب تعلیم ذرا عام ہوئی۔ تو نائی کا کام یہ ٹھہرا کہ رقعہ لے کر چلا جائے اور دعوت دے آئے۔ شاید اسی مناسبت سے رقعے کا نام خط ٹھہرا۔ خط اگانا یعنی چہرے پہ سبزہ آغاز ہونا، خط بنانا یعنی ڈاڑھی مونڈھنا اور خط لے کر جانا یعنی پیغام رسانی کرنا ان تینوں حالات میں کام خط ہی سے پڑتا ہے۔ اس لیے نائی کا تعلق خط کے ساتھ حجامت کے طور پر بھی ظاہر ہے۔ اور پیغام رسانی کے لحاظ سے بھی واضح ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ڈاک کے لیے گھوڑے گاڑیاں استعمال ہونے لگیں۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی ڈاک گاڑی سے مراد وہ گھوڑا گاڑی تھی جس میں مسافروں کے علاوہ خطوط بھی ہوتے تھے۔ ڈاک عموماً ایسی گھوڑا گاڑی میں بھیجی جاتی تھی جس کے گھوڑے حد درجہ تیز رفتار ہوتے تھے۔ ہر منزل پر گھوڑے تبدیل کئے جاتے تھے۔ ہرکاروں کا استعمال بھی متروک نہ تھا۔ جو مقامات دُور افتادہ ہوتے تھے۔ اور سڑک سے فاصلے پر واقع ہوتے تھے۔ وہاں ہرکارے ہی خط لے کر جاتے تھے۔ اردو شاعری قاصد کا کام کبوتر کو سپرد کرتی چلی آئی ہے۔ یہ محض شاعری ہی نہیں حقیقت ہے۔ کہ قدیم زمانے میں قاصد کبوتروں کو خاص طور پر سدھایا جاتا تھا اور ان سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی کبوتر یہ کام انجام دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں کبوتروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جنگ کے دوران کبوتروں کے علاوہ پیغام رسانی کا کوئی محفوظ طریقہ موجود نہیں تاہم دورِ حاضر میں پیغام رسانی کا عوامی طریقہ ڈاکخانے کے ذریعے خط بھیجنا ہے۔

ڈاک خانے کا موجودہ نظام انگریزی دَور کی پیداوار ہے۔ جب انگریز اس برصغیر پر قابض ہوئے۔ اور انھوں نے اہم مقامات کو سڑکوں اور ریلوں سے ملا دیا تو ڈاکخانے کے ذریعے پیغام رسانی کا کام آسان ہو گیا۔ یوں تو ڈاک تین ذرائع سے بھیجی جاتی ہے یعنی سمندر کے ذریعے، ریل گاڑی اور موٹر کے ذریعے اور ہوائی جہاز کے ذریعے۔ لیکن بحری مواصلات سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ہوائی ڈاک پچھلے دو تین برس پہلے تک عام نہ تھی۔ البتہ موٹروں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے خطوط کی مواصلت اس ملک میں ہمیشہ سے عام رہی ہے۔ ریل گاڑی اگر تیز رفتار ہو تو وہ ڈاک گاڑی یعنی میل ٹرین کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ خطوط کم رفتار ریل گاڑی کے ذریعے نہیں بھیجے جاتے۔ تیز رفتار میل ٹرین یا ڈاک گاڑی ہی کے ذریعے ارسال ہوتے ہیں۔ چنانچہ عوام کی زبان میں ڈاک کا تعلق تیز رفتاری سے ہے۔ اب کچھ عرصے سے ریل گاڑی اور موٹر کے علاوہ ہوائی جہاز بھی ترسیل خطوط کا ایک عام طریقہ بنتا جا رہا ہے۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ ہوائی جہاز شہر شہر قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں ترسیل خطوط نہیں کر سکتا۔ اس لیے ریل گاڑی کی اہمیت میں فی الحال کسی خاص کمی کا خطرہ نہیں۔ جہاں ریل کا گزر نہیں لیکن پکی سڑک موجود ہے۔ وہاں موٹریں اور لاریاں ڈاک لاتی لے جاتی ہیں۔

انگریزی دور میں جنرل پوسٹ آفس انارکلی کے علاقے میں عجائب گھر کے قریب ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوا۔ یہ ایک بارک نما عمارت تھی۔ اس کے قریب ہی پوسٹ ماسٹر کا بنگلہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں موجودہ خوشنما جدید وضع کی عمارت تعمیر ہوئی جو اب جنرل پوسٹ آفس کے نام سے پکاری

جاتی ہے۔ اس کا انتظام محکمہ ٹیلیگراف کے سپرد تھا۔ چنانچہ ڈائریکٹر محکمہ ٹیلیگراف کی نگرانی میں یہ جنرل پوسٹ آفس تعمیر کیا گیا۔ تقریباً مدور عمارت ہے۔ جو اس قدر وسیع ہے کہ نیچے کی منزل میں تینتیس کمرے اور بالائی منزل میں انیس کمرے ہیں۔ اس میں ایک کشادہ میدان ہے۔ جو عملے کی تفریح اور کھیل کود کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے احاطے میں عملے کے لیے ایک ہسپتال اور ایک مسجد بھی ہے۔ یہ ایک جدید وضع کی عمارت ہے جس میں ایک کلاک ٹاور اور چار برجیاں ہیں۔ کلاک ٹاور کی گھڑی دور سے نظر آتی ہے اور راہگیروں کو وقت بتاتی ہے۔ اس میں مختلف شعبے اور دفاتر ہیں۔ مثلاً سارٹنگ۔ رجسٹریشن۔ منی آرڈر۔ ریڈیو لائسنس۔ ملٹری پنشن۔ سیونگ بنک۔ خزانہ۔ ہوائی ڈاک۔ غیر ملکی ڈاک۔ یہاں ایک محکمے سے متعلق تربیت گاہ (TRAINING CENTRE) ہے۔ اور شبینہ ڈاک خانہ بھی ہے۔ جو تین بجے شام سے دس بجے رات تک کھلا رہتا ہے۔

ایک پریس نوٹ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ اب ڈاک اور تار کے محکمے اتنے وسیع ہو گئے ہیں کہ حکومت پاکستان نے ان کو الگ الگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو۔ ورنہ ابھی تک یہ دونوں محکمے ایک ہی ڈائریکٹر کی نگرانی میں تھے۔

ٹولنٹن مارکیٹ و کمرشیل بلڈنگ

انارکلی کے علاقے میں یونیورسٹی کے بالمقابل عجائب گھر کے متصل مال روڈ پر ایک خوبصورت عمارت ہے جو ٹولنٹن مارکیٹ کہلاتی ہے۔ ایک زمانے میں اسے میونسپل مارکیٹ بھی کہا کرتے تھے۔ یہاں سے گول باغ تک جو سڑک جاتی ہے۔ وہ نمائش روڈ کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی وجہ تسمیہ ۱۸۶۴ء میں منعقد ہونے والی نمائش ہے۔ یہ نمائش ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت ہی میں ہوئی تھی۔ گول باغ میں ان دنوں ہفتے میں دو بار فوجی بینڈ بجا کرتا تھا۔ اس بنا پر گول باغ کا نام بینڈ اسٹینڈ گارڈن (BAND STAND) پڑ گیا۔ ۱۸۶۴ء والی نمائش پنجاب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نمائش جنوری سے اپریل ۱۸۶۴ء تک رہی۔ اور اس میں قدیم ہندو اور مسلم زمانوں کے عجائبات منظر عام پر لائے گئے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت خاص اس نمائش کے لیے تعمیر ہوئی تھی۔ یہی تاریخی نوادر بعد کو موجودہ عجائب گھر میں منتقل کر دیے گئے۔ اس لحاظ سے ایک مختصر عرصے کے لیے اس ٹولنٹن مارکیٹ کی حیثیت عجائب گھر کی سی رہی۔ اب اس عمارت میں الحمرا اسٹور۔ پنجاب سٹور۔ مٹن مارکیٹ۔ فش مارکیٹ وغیرہ قائم ہیں اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں یہاں فروخت ہوتی ہیں۔

کمرشیل بلڈنگ ایک وسیع سلسلۂ عمارات ہے۔ جو ٹولنٹن مارکیٹ اور جنرل پوسٹ آفس کے درمیان مال روڈ پر واقع ہے اور انارکلی کے علاقے میں ہے۔ یہ سلسلۂ عمارات دوکانوں کی ایک خوشنما قطار ہے۔ اوپر کی منزل میں مکانات ہیں۔ نیچے کی منزل میں دوکانیں ہیں۔ انگریزی والوں کی کئی دوکانیں یہاں ہیں۔ یہاں کئی دار اللباس ہیں۔ دو تین دوکانیں جوہریوں کی ہیں۔ عام سامان کے سٹور بھی ہیں۔ یہ دوکانیں شہر لاہور کے سب سے بارونق اور جیتے جاگتے حصے میں واقع ہیں۔ اس لیے خوشحال طبقے کی توجہات کا مرکز ہیں۔

آج جہاں کمرشیل بلڈنگ ہے۔ ایک زمانے میں یہاں دھوبی منڈی تھی۔ جس کی شمالی دیوار کو توڑ کر اب دوکانیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ پشت کی جانب آج بھی دھوبیوں کی آبادی ہے۔ پہلے یہ دھوبی منڈی اتنی وسیع تھی کہ اس کی جنوبی دیوار کپورتھلہ ہاؤس تک پہنچی تھی۔ اس جنوبی دیوار میں ایک بڑا پھاٹک تھا۔ جس سے دھوبی منڈی تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ لیکن اب نہ وہ شمالی دیوار ہے اور نہ یہ جنوبی دیوار۔ جنوب کی طرف بھی دفاتر اور مکانات بن چکے ہیں۔ اور شمال کی جانب کمرشیل بلڈنگ کی دوکانوں کا سلسلہ ہے۔

یونیورسٹی سینٹ ہال

یونیورسٹی ہال ۱۸۷۶ء میں تعمیر ہوا۔ یہ ہال پنجاب یونیورسٹی کے اعلیٰ ارکان کے اجلاس کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی سے متعلق اعلیٰ مقصد کے جلسے یہاں منعقد ہوتے ہیں۔ جب ۱۸۶۹ء میں لاہور یونیورسٹی کالج کی توسیع ہوئی اور اس کا دائرۂ عمل صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ تمام صوبہ پنجاب کا تعلیمی نظام اس کے تحت لایا گیا تو یہاں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی پہلی مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ قانونی طور پر تسلیم کی گئی۔ اور ایک مجلس انتظامیہ قائم ہوئی جسے سینٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سینٹ ہال کی عمارت جو ۱۸۷۶ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ ۱۸۸۲ء سے سینٹ کے اجلاس کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ علوم مشرقی۔ علوم مغربی۔ سائنس۔ قانون اور دوسرے شعبہ ہائے تعلیم اس سینٹ کے زیر نگرانی ہیں۔

سینٹ ہال کی تعمیر تاریخ لاہور کے مصنف رائے بہادر کنہیا لال اگزیکٹو انجینئر کے اہتمام سے ہوئی۔ اس عمارت پر چونتیس ہزار روپیہ صرف ہوا۔ سینٹ ہال پر ہز ہائی نس نواب صاحب بہاولپور کا نام کندہ ہے۔ اس لیے کہ یہ عمارت نواب صاحب بہاولپور کا عطیہ ہے اور انھیں کے روپیہ سے یہ عمارت بنی ہے۔ عمارت کا محل وقوع انار کلی کے علاقے میں ہے۔ اس کے قریب ہی سرکاری محکمۂ تعلیم کا دفتر واقع ہے۔

عمارت پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور بقول کنہیا لال اس کا طول ۱۲۸ فٹ اور عرض ۸۰ فٹ ہے۔ ستونوں اور محرابوں میں بڑی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ اور باقی حصوں میں معمولی سائز کی اینٹیں لگائی گئی ہیں۔ باہر سے اس ہال کا رنگ سرخ ہے۔ اندر سفید پلاسٹر ہے۔ چھت کے اوپر سلیٹ کا پتھر لگا ہے۔ شہتیر دیودار کے ہیں۔ سینٹ کا بڑا کمرہ ۷۱ فٹ لمبا اور ۴۲ فٹ چوڑا ہے اور دوسرا کمرہ مغربی سمت ۴۹ فٹ چوڑا۔ اور ۲۰ فٹ لمبا ہے۔ ان سے ملحق اور بھی کئی چھوٹے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں سے تین کمرے رجسٹرار کے دفتر کے لیے مخصوص ہیں۔ سینٹ ہال کے برآمدے وسیع ہیں۔ یہ عمارت جس مقصد کے لیے تعمیر ہوئی ہے اس کے لیے نہایت موزوں ہے۔ سینٹ کے جلسوں کے علاوہ یہاں علمی اور ادبی جلسے اور مشاعرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ہال نہایت کشادہ ہے۔ اور محل وقوع کے اعتبار سے بھی بہت موزوں ہے۔

ٹاؤن ہال

۱۸۸۷ء میں سر چارلس ایچی سن (AITHISON) لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ٹاؤن ہال کی بنیاد رکھی۔ یہ سال ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا سال تھا۔ کیونکہ ملکہ وکٹوریہ ۱۸۳۷ء میں پورے حقوق کے ساتھ سریر آرائے حکومت ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس عمارت کا نام وکٹوریہ جوبلی ٹاؤن ہال قرار پایا۔ فروری ۱۸۹۰ء میں اس عمارت کا رسمی طور پر افتتاح ڈیوک آف کلارنس نے کیا۔ یہ عمارت مسٹر بل (BULL) کے زیر نگرانی تیار ہوئی تھی۔ اور اس پر ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ عمارت کا ڈیزائن مسٹر پاگسن (POG-SON) نے تیار کیا تھا۔ جس پر انھیں پانچ سو روپیہ انعام دیا گیا تھا۔

یہ ایک بلند و عظیم الشان عمارت ہے۔ دوسری منزل پر ایک وسیع ہال ہے جس کی لمبائی ۸۰ فٹ اور چوڑائی ۴۰ فٹ ہے۔ اس کے محراب خاص طور پر خوبصورت ہیں۔ جن کی زمین زرد ہے اور اس پر سفید استرکاری ہے۔ نقش و نگار سرخ رنگ کے ہیں اور فرش مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ جیسا ناچ گھروں کا ہوتا ہے۔ اس بلند عمارت کی چھت سے آس پاس کے علاقوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ ٹاؤن ہال کے باہر ایک دلکش فوارہ ہے جو سبز رنگ کا ہے۔ یہ ایک قطعہ میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف خوشنما درخت ہیں۔ یہ فوارہ راجہ ہرنس سنگھ کا عطیہ ہے۔ غرض کہ یہ عمارت موجودہ زمانے کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ٹاؤن ہال کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ شہری حقوق کے نمائندوں کے لیے مل بیٹھنے اور اہالیان شہر کے اجتماعی

مفادات پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک موزوں جگہ فراہم کرنا ہے۔ لاہور میونسپلٹی کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی۔ ان دنوں لاہور میونسپلٹی کا دفتر بھاٹی دروازے کے باہر پولیس چوکی کے نزدیک ایک بنگلے میں تھا۔ ۱۸۶۲ء سے جب میونسپلٹی قائم ہوئی ۱۸۹۰ء تک جب "ٹاؤن ہال" کا افتتاح ہوا اٹھائیس سال کی مدت میں میونسپلٹی کے اجلاس اس بنگلے میں ہوا کرتے تھے۔

۱۸۹۰ء سے آج تک ٹاؤن ہال کی عمارت نمائندگان شہر کی باہمی مشاورت کے کام آتی ہے۔ مختصر پیمانے پر لاہور کے ٹاؤن ہال کی حیثیت پارلیمنٹ ہاؤس کی سی ہے۔ سیاسی اور معاشرتی امور پر "بزرگان شہر" یہاں بحث و تمحیص کر کے عوامی بھلائی کی تجویزوں کے لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔

لاہور کا ٹاؤن ہال قدیم و جدید شہر کا سنگم ہے اور ایک مرکزی مقام پر واقع ہے۔ یہاں مال روڈ ختم ہوتی ہے۔ اس کے ایک طرف گول باغ ہے اور دوسری طرف عجائب گھر اور یونیورسٹی ہال۔ سامنے ایک چبوترے پر زمزمہ ہے۔

ریلوے اسٹیشن

لاہور کا اسٹیشن ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ جا بجا مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ جن سے اس عمارت کا بچاؤ ہنگامی حالات میں فوجی نقطۂ نظر سے کیا جا سکتا ہے۔ جب انگریزوں نے افغانستان پر فوج کشی کی تو اس وسیع اسٹیشن پر چوبیس گھنٹے کے مختصر عرصہ میں چھہتر ریل گاڑیاں گزرنے کا انتظام تھا۔ اس سے ریلوے اسٹیشن کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کا سنگِ بنیاد سر جان لارنس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ۱۸۴۹ء میں رکھا۔ ۱۸۶۰ء[1] میں اس اسٹیشن پر پہلی ریل گاڑی چلائی گئی۔ جو لاہور سے امرتسر گئی۔ لاہور اسٹیشن کی تعمیر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے مشہور ٹھیکیدار محمد سلطان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس عمارت کا نقشہ مسٹر برٹن (BURTON) انجینئر نے تیار کیا تھا۔ اس اسٹیشن کے آٹھ پلیٹ فارم ہیں۔ مسافروں کی آسائش کے لیے متعدد انتظار گاہ ہیں۔ اس اسٹیشن کے پانچ پل ہیں جن میں سے تین ریلوے مسافروں کے لیے خاص پلیٹ فارم پر ہیں۔ چوتھا پل ریلوے ملازمین کو ورکشاپ لے جاتا ہے۔ اور پانچواں پل گڑھی شاہو کی سڑک اور گرینڈ ٹرنک روڈ کو ملاتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر متعدد دفاتر ہیں۔ جو محکمہ ریلوے سے متعلق ہیں۔ تار گھر اور ڈاک خانہ بھی ہے۔ مسافروں کی آسائش کے لیے یورپین اور پاکستانی وضع کے کھانے کے کمرے ہیں۔ غرض کہ مسافروں کی جملہ ضروریات کے مطابق انتظام موجود ہے۔ ہر پلیٹ فارم پر ایک بڑی گھڑی نصب ہے۔ لیکن سب سے بڑی گھڑی لاہور اسٹیشن کی ڈیوڑھی کے اوپر لگی ہوئی ہے۔ جو دور سے گزرنے والوں کو بھی وقت بتاتی ہے۔

---

[1] ریلوے اسٹیشن کی بنیاد کے متعلق کنہیا لال اور لطیف کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۴۹ء میں پڑی اور پہلی ریل گاڑی ۱۸۶۰ء میں چلائی گئی لیکن مؤلف "تاریخ مخزن پنجاب" میں بنیاد ۱۸۵۹ء اور پہلی ریل گاڑی کا اجرا ۱۸۶۲ء درج ہے (ص ۱۵۷)

خواجہ محمد حسن شعری کاشمیری ایک مشہور فارسی شاعر تھے۔ جن کا دیوان "مرآۃ الخیال" چھپ چکا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں جب پنجاب میں پہلے پہل ریل جاری ہوئی تو وہ امرتسر میں موجود تھے۔ انھوں نے ذیل کے قطعہ میں اس کی تاریخ کہی ہے

مبارک باد جشنِ عام ہر دم پیر و برنا را — کہ شد بر خشک و تر جاری رسوم خیرِ دنیا را

سوارِ ریل چوں باشند تعجب نیست در یکدم — سحر امروز اگر خواہد بگیرد شام فردا را

چو شد پاسے عدد تاریخ سالش زد رقم شعری

کہ بنمودہ مسخر شاہ ما از ریل دنیا را

۱۸۶۱ء

لاہور ریلوے اسٹیشن پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کی عمارت نہ صرف خوبصورت بلکہ پائیدار بھی ہے۔ وسعت کے اعتبار سے بھی یہ پاکستان کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے۔ یہاں ریلوے لائنوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا ہے۔ اسٹیشن کی عمارت پر تقریباً پانچ لاکھ روپیہ بوقت تعمیر صرف ہوا تھا۔ لاہور چونکہ پاکستان کی تقریباً سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ اس لیے لاہور اسٹیشن تجارتی اشیا کی درآمد اور برآمد کا ایک نہایت اہم مرکز ہے۔

لاہور مغربی پاکستان ریلوے کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ یہاں کا ریلوے ورکشاپ ایک سو چھبیس ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے جس میں ہزارہا مزدور ملازم ہیں۔ یورپین، غیر ملکی اور ملکی انجینئر اور مکینک ان مزدوروں کے کام کی نگرانی کرتے ہیں۔ ریلوے ورکشاپ ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا۔ اور اس کی عہد بعہد ترقی ہوتی رہی ہے۔ اس میں ریلوے انجنوں اور ڈبوں کی مرمت ہوتی ہے۔ جدید سے جدید مشینری اور نئے سے نئے نمونے یورپین ممالک سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ لاہور کی ریلوے ورکشاپ ایک نہایت ترقی یافتہ ورکشاپ ہے۔ یہاں کیرج شاپ، لوکو موٹو شاپ، مرمت گھر وغیرہ کی اپنی اپنی الگ الگ عمارتیں ہیں۔ اور ایک تربیت یافتہ عملہ ہے جو مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ ہم غیر ممالک سے مشینیں، ڈبے اور انجن منگوانے کے محتاج نہ رہیں گے۔ لاہور کی ریلوے ورکشاپ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے بھی ہندوستان کی عظیم ترین ورکشاپوں میں شمار ہوتی تھی۔ اور پاکستان قائم ہونے کے بعد اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔

قومی تہواروں اور مخصوص تقاریب کے موقعوں پر لاہور اسٹیشن کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے باہر عالیشان ڈیوڑھی کے سامنے ایک مختصر سا دلکش پارک ہے۔ جس کی سرسبزی ایسے مواقع پر رنگا رنگ روشنیوں میں اور بھی بہار دکھاتی ہے۔ ایسے مواقع پر ریلوے اسٹیشن پر رنگ برنگ کی روشنی کی جاتی ہے۔ جسے دیکھنے لاہور کے شہری جوق در جوق آتے ہیں۔ اور آدمی پر آدمی ٹوٹ پڑتا ہے۔ غرض یہ اسٹیشن قابل دید ہے۔

کوتوالی

لاہور میں اندرون دہلی دروازہ ایک مقام پرانی کوتوالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ سکھوں کے زمانے میں ایک مختصر سی کوٹھڑی تھی۔ جس میں حوالاتی بند رکھے جاتے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا۔ جس سے مجرموں کو باندھ دیا جاتا تھا۔ اور انھیں عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان دنوں حوالاتیوں کو سرکار کی طرف سے کھانا نہیں ملتا تھا۔ سات سات قیدی ایک ایک سپاہی کے ذمہ ہوتے تھے۔ سپاہی قیدیوں کو لے کر بازار بازار گھومتا تھا اور قیدی دکانداروں اور آنے جانے والوں سے اپنا حال زار بنا کر فقیروں کی طرح سوال کرتے تھے۔ لوگ رحم کھا کر کچھ نہ کچھ انھیں دے دیتے تھے۔ اس رقم سے انھیں کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سکھوں کے دور میں سزائیں بھی عبرت ناک دی جاتی تھیں۔ ناک، کان اور ہاتھ کاٹنے کا رواج تھا۔ کوتوالی کے سامنے جو درخت تھا اس سے باندھ کر مجرموں کو مارا پیٹا جاتا تھا۔ اور بعض کے ہاتھ، کان اور ناک کو قطع کیا جاتا تھا۔ انگریزی دور میں اس عمارت میں توسیع ہوئی۔ اور کوٹھڑی سے لے کر درخت تک جو رقبہ واقع تھا اس میں ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کی گئی۔ جو کوتوالی کہلاتی تھی۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں پرانی کوتوالی تعمیر کی گئی۔ شمال کی جانب حوالات کا دروازہ رکھا گیا۔ مشرق کی طرف کوتوال شہر کے دفتر کا کمرہ تھا۔ آنریری مجسٹریٹوں کے لیے ایک کمرہ تھا جس میں اجلاس ہوتا تھا۔ غرض کہ یہ عمارت طویل و عریض تھی۔ لیکن اب صرف اس کا نام باقی رہ گیا ہے۔ البتہ اندرون دہلی دروازہ ایک علاقہ آج بھی پرانی کوتوالی کے نام سے موسوم ہے۔

موجودہ کوتوالی دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ یہ ایک شاندار قلعہ نما عمارت ہے۔ اس عمارت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم

رتا ہے کہ گویا شاہی وضع کی عمارت ہے۔ جو آس پاس کی عمارتوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ پولیس کا دفتر اس عمارت میں قائم ہے۔ ضرورت کے مطابق اس عمارت میں بے شمار کمرے اور برآمدے ہیں۔ یہ عمارت نہایت مضبوط اور مستحکم ہے۔ پرانی کوتوالی موجودہ ضروریات کے مطابق تھی۔ لاہور کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر موجودہ کوتوالی کی عمارت پرانی کوتوالی کی نسبت کہیں زیادہ طویل و عریض ہے۔ اور محل وقوع کے اعتبار سے بھی اندرون دہلی دروازہ کی بجائے اسے دہلی دروازے کے باہر بنانا زیادہ موزوں تھا۔ موجودہ کوتوالی مسٹر ہیر سکاٹ (HARE SCOT) سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دور میں قائم ہوئی۔ اس تعمیر کی اصل تجویز کرنے والے (مسٹر گلاس کاک) تھے۔

پنجاب پولیس کا نظام برٹش پولیس کے نظام سے مشتق ہے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال میں اس قسم کا نظام رائج کیا تھا۔ اس کے بعد مدراس میں اور پھر جہاں جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہوئی ہیں اس قسم کا نظام قائم ہوا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اسلامی دور میں کوئی ایسا نظام موجود نہیں تھا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے سے اسلامی ہندوستان میں محکمہ پولیس قائم تھا۔ اور خلجیوں کے دور میں تو اس کو بہت ترقی ہوئی۔ ویسے قدیم ہندوستان میں بھی پولیس موجود تھی۔ اشوک کے زمانے سے پولیس کا محکمہ ہندوستان میں موجود تھا۔ دور ہر طبقے کی نفسیات کے پیشِ نظر اہل کاران پولیس کو مختلف قسم کی تربیت دی جاتی تھی۔ تاکہ جرائم کی بیخ کنی کی جا سکے۔ پولیس کا مقصد ہمیشہ سے امن و قانون کی حفاظت کرنا ہے۔ پاکستانی پولیس اور خصوصاً پنجاب کی پولیس اپنی کارکردگی کے سبب سے بجا طور پر قابلِ فخر ہے۔

راوی کا پُل

راوی کا ریلوے پل لاہور کو شاہدرہ سے ملاتا ہے۔ ضلع لاہور اور ضلع شیخوپورہ کو آپس میں ملانے کا ذریعہ بھی یہی پل ہے۔ یہ پل اگر کام میں نہ لایا جائے۔ تو لاہور شمال مغربی پاکستان سے کٹ جائے گا۔ اس طرح اس پل کی دوہری اہمیت ہے۔ اس لیے کہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی اس پل پر شمال مغربی پاکستان کی حفاظت کا انحصار ہے۔

یہ پل نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ ابتدا میں انگریزی حکومت یہ چاہتی تھی۔ کہ لاہور سے پشاور تک چھوٹی لائن کی گاڑیاں چلائی جائیں۔ چنانچہ اس پل کا عرض اسی لحاظ سے رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد کو یہ طے ہوا کہ بڑی لائن کی گاڑیاں چلائی جائیں اس لیے پل کی چوڑائی میں اضافہ کیا گیا۔ کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں اس پل کی تعمیر کو یوں بیان کیا ہے:۔

> "دریا کے بہاؤ کے اندر کوٹھیاں گلا کر پختہ پائے چونے کے خشتی بنائے گئے ہیں۔ چھتیس پائے اور چھتیس در پانی کے بہاؤ کے واسطے رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک در ایک سو فٹ مقدار میں ہے۔ اور کل پل تین ہزار تین سو فٹ لمبا ہے۔ اور زیریں راستہ چھ فٹ چھوڑا لوگوں کی آمد و رفت کے واسطے رکھا گیا ہے۔ اس کے اوپر راست و چپ آہنی قینچیاں ڈال کر دوسری چھت آہنی ڈالی گئی ہے جس پر ریل چلتی ہے۔"

یہ زیریں راستہ اب استعمال نہیں کیا جاتا۔ اور ایک مدت سے بند ہے۔ اس زیریں راستے کے متعلق مصنف مذکور نے یوں اظہار رائے کیا ہے:

> "نیچے کے راستے سے گھوڑا۔ ٹٹو۔ پیادہ۔ آدمی۔ گائے۔ بیل وغیرہ دریا کے وار پار آتے جاتے ہیں۔ اونٹ اور گھوڑا مع سوار آ جا نہیں سکتا۔ کہ بالائی سقف بہت اونچی نہیں۔"

یہ ریلوے پل ۱۸۷۶ء میں تعمیر کیا گیا۔

اس دقت کو رفع کرنے کے لیے ریلوے پل سے کچھ فاصلے پر کامران کی بارہ دری کے پاس کشتیوں کا ایک پل بنایا گیا۔ جس پر پیدل، سوار، گھوڑے گاڑیاں اور بیل گاڑیاں بھی گزرتی تھیں۔ ہر مسافر اور گاڑی والے سے محصول لیا جاتا تھا۔ پل کے عملے کا دفتر کامران کی بارہ دری میں تھا۔ پختہ پل کی تعمیر کے بعد یہ پل منہدم کر دیا گیا۔

آنے جانے والوں کی سہولت کے لیے اب ایک نیا اور وسیع پل تعمیر کیا گیا ہے۔ جس سے وہ دشواریاں جاتی رہی ہیں جن کا ذکر قدیم مصنفین مثلاً کنہیا لال اور سید محمد لطیف نے کیا ہے۔ یہ پل جو ۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو کھولا گیا ریلوے پل کے متوازی ہے اور لمبائی میں بھی اس کے برابر ہے۔ مگر عرض میں اتنا کشادہ ہے کہ دو بسیں یا لاریاں بیک وقت گزر سکتی ہیں۔ لیفٹیننٹ گورنر سر میکل فرانسس اوڈوائر کے زمانے میں یہ پل بہ اہتمام مسٹر آر۔ ایس میغلیگن چیف انجینئر اور مسٹر ڈی میک فارلین اگزیکٹو انجینئر تیار ہوا۔ غرض کہ اب ایک کی جگہ راوی کے دو پل ہیں۔ ایک پر سے ریلیں گزرتی ہیں اور دوسرے پر سے لاریاں، بسیں، گاڑیاں، پیدل آنے جانے والے اور ڈھور ڈنگر گزرتے ہیں۔ یہ دونوں پل انجینئرنگ کے اعلیٰ ترین کارناموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ لاہور ہمیشہ سے دریائے راوی کے سیلاب کی زد پر ہے۔ لیکن یہ پل تاحال کسی سیلاب سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔ دو ایک مرتبہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ان پلوں کو سیلاب کی شدت سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں راوی کا سیلاب اتنا شدید تھا کہ ریلوں کی آمد و رفت معطل کرنا پڑی تھی۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں بھی سیلاب کی شدت غیر معمولی تھی۔ تاہم راوی کے پل اپنی جگہ قائم رہے۔

جیل خانے

اس متمدن دور میں جیل خانے کی حیثیت محض قید خانے کی سی نہیں رہی۔ پرانے زمانے میں مجرموں کو قیدی بنا کر رکھا جاتا تھا۔ اور زمانۂ اسیری میں انھیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی اور سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس آجکل مجرموں کو اچھے شہری بننے کی تربیت دینا ہر متمدن حکومت کا فرض اولین ہے۔ آج کل کے جیل خانے تربیت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قیدیوں کو ان کی صلاحیت اور رجحان کے مطابق اس قسم کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے کہ جیلوں سے نکل کر وہ کار آمد شہریوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ اکثر مجرم ارتکابِ جرم اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں کوئی مفید کام کرنا نہیں آتا۔ اگر ان کے لیے روزی کمانے کے دیانتدارانہ ذرائع موجود ہوں تو وہ ارتکابِ جرم پر کبھی مائل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر جیل خانہ ایک صنعتی ادارہ ہوتا ہے۔ لاہور کے جیل خانے اس لحاظ سے تربیت گاہیں اور صنعتی ادارے ہیں۔ جیلوں میں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ ان میں کاریگری کا معیار اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ وہ چیزیں نہ صرف اندرونِ ملک فروخت کی جاتی ہیں بلکہ غیر ممالک کو بھی برآمد کی جاتی ہیں۔

لاہور میں چار جیل خانے ہیں۔ سب سے بڑا جیل خانہ سنٹرل جیل ہے۔ دوسرا ڈسٹرکٹ جیل، تیسرا زنانہ جیل اور چوتھا بورسٹل جیل ہے۔ سنٹرل جیل ان سب میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بڑی میعاد کے قیدی یا سیاسی مجرم سنٹرل جیل ہی میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ جیل مختلف مدارج میں تعمیر ہوئی ہے۔ چار دیواری اور ملحقہ عمارتیں جن میں ہسپتال گودام وغیرہ شامل ہیں۔ سنہ ۱۸۵۰ء سے بننی شروع ہوئیں اور ۱۸۵۴ء میں تکمیل کو پہنچی تھیں۔ بیرونی دیوار کا احاطہ ایک ہزار چھ سو سولہ فٹ لمبا اور نو سو چون فٹ چوڑا ہے۔ دیوار کی اونچائی اٹھارہ فٹ ہے۔ جیل کا بڑا دروازہ شمال کی جانب ہے۔ آگے چل کر ایک اندرونی پھاٹک ہے۔ مغربی سمت سپرنٹنڈنٹ جیل کا بنگلہ اور ملازمین کے کوارٹر ہیں۔ مشرقی جانب بھی افسران جیل اور سپاہیوں کے کوارٹر ہیں۔ جیل کا خاص دروازہ پختہ محرابی ڈاٹ دار عالیشان اور مضبوط ہے۔ اس جیل کا احاطہ (۳۲) ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ جس حصے کا بیان سطور بالا میں ہے اُسے سرکل نمبر ۱ کہا جاتا ہے۔ سرکل نمبر ۲ سنہ ۱۸۶۲ء میں تعمیر ہوا۔ یہ دونوں سرکل ہشت پہلو ہیں۔ اندر آہنی جنگلے ہیں۔ درمیان میں ایک مینار ہے۔ قیدیوں کے لیے آٹھ بارکیں ہیں۔ جن کا مجموعی طول ۴۰۰ فٹ اور عرض ۲۲ فٹ ہے۔

ان کی اونچائی ۱۵ فٹ ہے۔ ہر بارک اندر سے چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس جیل کی تعمیر پر دو لاکھ روپیہ کی رقم صرف ہوئی۔ اس جیل میں تقریباً دو ہزار قیدیوں کے رہنے کا انتظام ہے۔ اس میں دس یورپین قیدیوں کے رہنے کا مخصوص انتظام بھی ہے۔ یورپین قیدیوں کے رہنے کے لیے ایک کشادہ بنگلہ ۹۶ فٹ لمبا ۶۳ فٹ چوڑا اور ۲۳ فٹ اونچا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا مکان یورپین قیدیوں کے لیے ہے۔

سنٹرل جیل سے ملحق کم عمر لڑکوں کا قید خانہ بورسٹل جیل کہلاتا ہے۔ جس میں چھاپہ خانہ بھی ہے۔ بورسٹل جیل سنٹرل جیل کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ کم عمر لڑکوں کو عادی مجرموں اور پختہ عمر کے قیدیوں سے بچانے کے لیے تمام متمدن ممالک میں بورسٹل جیل قائم ہیں۔ اسی قسم کی ایک جیل یہ ہے۔ بورسٹل جیل کو قید خانے کی بہ نسبت مدرسہ کہنا موزوں تر ہوگا۔ لڑکوں کو نہ صرف چھاپے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ بلکہ مختلف قسم کی صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ان کی صحت، خوراک، ورزش وغیرہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جیل میں ان کے لیے کھیل کے میدان بھی ہیں۔ مقررہ اوقات میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ نوعمر لڑکے کھیلتے کودتے ہیں۔ یہاں تک کہ گاتے اور ناچتے بھی ہیں۔

زنانہ جیل خانہ جو عرف عام میں بڈھی خانہ کہلاتا ہے، سنٹرل جیل کے متصل ہے۔ سنٹرل جیل کی طرح زنانہ جیل خانے کے بھی دو سرکل ہیں۔ یہ جیل خانہ ایک مربع احاطے میں واقع ہے۔ جو سات سو ستر فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ بیرونی احاطے کی چار دیواری سے پچاس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر اصل قید خانے کی دیوار بنائی گئی ہے۔ جس کا دروازہ مغربی جانب ہے۔ اصل قید خانے کی عمارت دائرے کی شکل میں ہے۔ اصل قید خانے اور چار دیواری کے درمیان ۱۸ فٹ چوڑا راستہ ہے۔ اس عمارت میں تقریباً دو سو پچاس قیدی عورتوں کا انتظام ہے۔ جنوب مغرب کی جانب چار یورپین قیدی عورتوں کا انتظام ہے۔ ضرورت پڑنے پر دو سو چھیانوے عورتیں اس عمارت میں رکھی جا سکتی ہیں۔ زنانہ جیل خانے میں سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے زنانہ عملے کے لیے کوارٹر بھی موجود ہیں۔ طبی سہولت کی خاطر لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی یہاں رہتی ہیں۔ اس جیل خانے کے اندر گودام اور کارخانے بھی ہیں۔ یہ عمارت ایک لاکھ اکیس ہزار تین سو اکسٹھ روپیہ کے صرف سے رائے بہادر کنہیا لال کے زیر نگرانی ۱۸۷۰ء میں بنی تھی۔ قیدی عورتوں کو زنانہ دستکاری اور سینے پرونے کی تعلیم دینے کا انتظام بھی موجود ہے۔

ڈسٹرکٹ جیل کی تعمیر ۷۶-۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ یہ عمارت سنٹرل جیل کے مغرب میں ہے۔ اور پرانی گولہ والا سرائے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس میں ضلع لاہور کے مرد قیدی رکھے جاتے ہیں۔ جن کی قید کی میعاد عموماً مختصر ہوتی ہے۔ یہاں ایسے چھ سو چورانوے قیدیوں کا انتظام ہے۔ اس جیل کا دروازہ مغربی جانب ہے اور پختہ بنا ہوا ہے۔ قریب ہی داروغۂ جیل کا کوارٹر ہے۔ ڈسٹرکٹ جیل ۷۲۰ فٹ لمبی ۶۵۰ فٹ چوڑی اور ۱۴ فٹ اونچی دیوار سے گھری ہوئی ہے۔ اندرونی میدان دو احاطوں میں منقسم ہے۔ پہلا احاطہ دوسرے احاطے سے چار سو سات فٹ زیادہ چوڑا ہے۔ اس میں اسپتال، گودام، ڈاکٹر کا کوارٹر، بیمار قیدیوں کے لیے وارڈ وغیرہ موجود ہیں۔ سپاہیوں کے رہنے کے لیے کوٹھریاں بھی ہیں۔ یہاں دو سنگین بارکیں ہیں۔ جن میں قیدی رکھے جاتے ہیں۔ ان بارکوں کا طول ۲۴۶ فٹ عرض ۲۰ فٹ اور اونچائی ۱۸ فٹ ہے۔ یہاں چار ورکشاپ ہیں۔ جن میں قیدی کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض خشت سازی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لاہور کے جیلوں میں بھی قیدیوں کو کارآمد شہری بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان جیلوں میں مختلف صنعتیں قائم ہیں۔ کمبل، شالیں اور قالین سازی، کپڑے بننے کی صنعت، کاغذ بنانا، چٹائیاں بنانا، دریاں بنانا، چھاپے کا کام، جلد سازی، مشتریاں بنانا، خشت سازی، دستکاری، کاڑھنے، سینے اور بننے کا کام، جیلوں کی صنعتوں کے چند اہم شعبے ہیں۔ فن کاری اور کاریگری کا جو معیار لاہور کی جیلوں

میں رہنے والے قیدیوں نے قائم کیا ہے۔ وہ اتنا بلند ہے کہ جیل کی صنعتوں کی قدر بیرونی ممالک میں بھی کی جاتی ہے۔ لاہور کی جیلوں میں متعدد کانگرسی، مسلم لیگی اور انقلابی رہنما سرکاری مہمان رہ چکے ہیں۔

میو ہسپتال

یونانیوں کی حکمت جب وراثت میں مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ تو طب یونانی نے حیرت انگیز ترقی کی۔ فن طب جسے یونانی طریقۂ علاج کہا جاتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کے پاس ہے۔ یہاں تک کہ آج طب یونانی اور طب اسلامی ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے یونانی طریقۂ علاج جب مغرب میں پہنچا تو اس میں ایک تدریجی ارتقا ہوا۔ اور آج وہ اپنی ترقی یافتہ صورت میں میڈیکل سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی طریقۂ علاج ایک فن بن کر رہ گیا۔ اور اس کے مقابلہ مغربی طریقۂ علاج ایک جیتی جاگتی روز افزوں ترقی کرنے والی سائنس ہے۔ فن اور سائنس میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آرٹ یا فن میں درجۂ کمال تو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن تدریجی ترقی ہونا ممکن نہیں۔ دوسری جانب سائنس جب تک اس میں تدریجی ترقی نہ ہو۔ سائنس نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں میں میڈیکل سائنس اتنی اہم ہو گئی کہ یونانی اطبا اپنے کمالات کے باوجود گوشہ نشین ہو گئے اور ان کا حلقۂ اثر محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے برخلاف انگریزی حکومت کی سرپرستی میں برصغیر کے ہر گوشے میں ہسپتال قائم ہوئے۔ جن میں طب مغرب کے سند یافتہ ڈاکٹر عوام کی خدمت کرتے ہیں۔

انسانی خدمت کا وہ جذبہ جو بیماروں کی جان بچانے اور انھیں تکلیف سے نجات دینے کا محرک ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جسے انسانی خدمت کا بلند ترین جذبہ کہنا چاہیے۔ اس جذبے کی بنیاد خدا ترسی اور انسان دوستی پر ہے۔ مغربی ممالک میں اطبا اور ڈاکٹروں کو ایسی ہی تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسے روحانی پیشواؤں اور مذہبی رہنماؤں کو۔ اہل مغرب کے نزدیک حضرت مسیح خود ایک بہت بڑے طبیب تھے۔ جو نہ صرف روحانی بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ اور انھیں حق و صداقت کا راستہ دکھاتے تھے۔ بلکہ جو جسمانی امراض دور کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور جن کا معجزہ یہ تھا کہ ان کی آواز سے ایک طرف مردہ زندہ ہو جاتا تھا اور دوسری طرف اندھے کو آنکھیں مل جاتی تھیں۔ غرض کہ ہسپتالوں کا قائم کرنا اہل مغرب کے نزدیک انسانی خدمت بھی ہے اور مذہبی فرض بھی۔ بیمار انسانیت کو جسمانی عوارض سے نجات دینے کا جذبہ خلق خدا کی خدمت ہے۔ یہ صرف مسیحیوں سے مخصوص نہیں۔ اسلام کی تعلیم بھی بعینہ یہی ہے۔ چنانچہ انگریزی دور میں جو ہسپتال پاکستان کے طول و عرض میں قائم ہوئے۔ وہ اب روز افزوں ترقی کر رہے ہیں اور نئے نئے ہسپتال جگہ جگہ قائم کیے جا رہے ہیں۔ ایک لاہور ہی کو لیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں چھوٹے بڑے بے شمار ہسپتال موجود ہیں۔ جن میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا علاج معالجہ باقاعدگی کے ساتھ ہوتا ہے اور سینکڑوں مریض شفایاب ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

لاہور کے ہسپتالوں میں سب سے بڑا ہسپتال میو ہسپتال ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے ترقی یافتہ ہسپتال ہے۔ یہ ہسپتال سرائے رتن چند اور انارکلی بازار کے درمیان واقع ہے۔ اس سے ملحق کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ہے۔ جس کے طلبا و طالبات میو ہسپتال ہی میں تربیت پاتے ہیں۔ میو ہسپتال کے ساتھ اگر میڈیکل کالج کی عمارت کو بھی ملا لیا جائے تو میو ہسپتال کی حد نیلا گنبد تک پہنچتی ہے۔ میو ہسپتال کی عمارت رائے بہادر کنہیا لال کی زیر نگرانی ۱۸۷۰ء میں بن کر تیار ہوئی اور اس پر ایک لاکھ پچپن ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اصل عمارت ایک دو منزلہ مکان ہے۔ جو برمی اینٹ سے بنایا گیا ہے اور جس کا طول چار سو اڑتالیس فٹ، عرض ساڑھے اکاون فٹ اور بلندی پینتالیس فٹ ہے۔ اس کے چار چھوٹے مینار ہیں۔ جو چاروں کونوں پر ہیں اور درمیان میں ایک بلند مینار ہے۔ جو ایک سو دس فٹ اونچا ہے۔

اور دُور سے نظر آتا ہے۔ اس پر گھڑی لگی ہے۔ اس لیے اس کو کلاک ٹاور کہتے ہیں۔ اور جو کمرہ اس کے نیچے واقع ہے وہ ہال ٹاور یعنی بڑے مینار کے نیچے والا ہال کہلاتا ہے۔ چاروں گوشوں پر واقع چھوٹے مینار ستہتر فٹ بلند ہیں۔ اس عمارت میں دس کمرے ہیں۔ دو بڑے کمرے جن کی لمبائی ایک سو پندرہ فٹ اور چوڑائی بائیس فٹ ہے۔ ہال کے مشرق اور مغرب میں واقع ہیں۔ ایک کمرے میں زینہ ہے جس پر سے بالائی منزل میں جاتے ہیں یہیں لارڈ میو کا مجسمہ بھی ہے۔ اوپر کی منزل میں بھی مشرق و مغرب کی سمت اتنے ہی طویل و عریض کمرے بنے ہوئے ہیں جتنے نیچے۔ اس عمارت کے بڑے مینار کی چار منزلیں گنبد کے علاوہ ہیں۔ جنوب کی طرف جو دو چھوٹے مینار ہیں۔ ان کی زیریں منزل میں بیماروں کے نہانے کے لیے حوض ہیں۔ غرض کہ یہ ایک وسیع عمارت ہے جو ہسپتال کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑا ہے جس میں اتنی گنجائش ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن اب بھی مزید اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میو ہسپتال کے وسیع احاطے میں کئی بنگلے تھے اور ان میں سے ایک بنگلہ حیوانات کے ہسپتال کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں تک کہ حیوانات کا ہسپتال ضلع کچہری کے قریب ایک موزوں عمارت میں قائم کیا گیا۔ میو ہسپتال کی عمارت جہاں تعمیر کی گئی ہے یہ جگہ وہی ہے جہاں ہری سنگھ کا پختہ باغ تھا۔ یہاں ہسپتال بن جانے کے بعد سے اب تک بے شمار چھوٹی بڑی عمارتیں ہسپتال سے متعلق تعمیر کی جا چکی ہیں۔ ان میں اکثر مریضوں کے وارڈ ہیں۔ یا ہسپتال کے مختلف شعبے ہیں۔ یہ وارڈ پنجاب کے راجہ مہاراجہ اور رؤسا و اہلِ ثروت کے بنوائے ہوئے ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام مختلف عمارات پر تحریر ہیں۔ یہاں مردانہ و زنانہ ٹی بی وارڈ۔ فیملی وارڈ۔ خوشحال طبقے کے لیے پرائیوٹ گورا وارڈ۔ گلے، ناک اور کان کی بیماریوں کا وارڈ۔ دل کے امراض کا وارڈ۔ زچہ و بچہ وارڈ۔ بخار کا وارڈ۔ پیشاب پاخانے اور خون کے امتحان کا وارڈ۔ اور اسی قسم کے دوسرے وارڈ ہیں۔ کوئی وارڈ جالندھر وارڈ کہلاتا ہے۔ کوئی امرتسر وارڈ۔ کوئی لائل پور وارڈ۔ کوئی سیالکوٹ وارڈ اور کوئی لاہور وارڈ۔ یہاں ریڈیم اور بجلی کے ذریعے سے بھی علاج کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک بلڈ بینک قائم ہے جس میں خون کی ایک کثیر مقدار جمع رہتی ہے جو ان مریضوں کے کام آتی ہے جنھیں خون کی ضرورت لاحق ہو۔ یہاں ایک (CASUALTY) وارڈ ہے اور ایک مردہ خانہ ہے۔ میو ہسپتال ایک ایسا عظیم الشان ادارہ ہے کہ اس کے مختلف شعبوں کے نام اور کام بتانے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس میں جدید ترین آلات، بہترین ماہرینِ فن اور تمام امکانی وسائل و ذرائع یکجا ہیں۔

میو ہسپتال کے آس پاس کئی دوسرے ہسپتال بھی ہیں۔ جن میں سے ایک لیڈی ایچی سن ہسپتال ہے جس میں عورتوں کا علاج ہوتا ہے۔ یہ ہسپتال لیڈی ایچی سن کے نام سے منسوب ہے جو سر چارلس ایچی سن لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی اہلیہ تھیں۔ اسی قسم کے دوسرے زنانہ ہسپتال اور بھی ہیں مثلاً لیڈی ولنگڈن ہسپتال۔ گلاب دیوی ہسپتال۔ جانکی دیوی ہسپتال۔ لاہور میں دانتوں کا ایک بڑا ہسپتال بھی ہے۔ جو مونٹ مورنسی ڈینٹل ہسپتال کہلاتا ہے۔ سر گنگا رام کا بنوایا ہوا ایک عظیم الشان ہسپتال جس کا نام گنگا رام ہسپتال ہے۔ میو ہسپتال کے بعد لاہور کا سب سے بڑا ہسپتال ہے۔ گنگا رام ہسپتال کے بالمقابل فاطمہ جناح میڈیکل کالج ہے۔ جس میں لڑکیوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دماغی امراض کے لیے ایک بہت بڑا ہسپتال ہے جو پاگل خانہ کہلاتا ہے۔ یہ گلبرگ میں واقع ہے۔ یہ ایک بے مثال ادارہ ہے جو روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کی اصل عمارت سکھوں کے زمانے کی ہے جو پہلے لہنا سنگھ کی چھاؤنی کے نام سے مشہور تھی۔ جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو اوّل پنجاب یونیورسٹی کے احاطے میں ایک پرانی بارک کے اندر دماغی ہسپتال کھولا گیا۔ لیکن بعد کو یہ ہسپتال لہنا سنگھ کی چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک اس میں تدریجی ترقی ہوتی رہی ہے۔ اتنے ہسپتالوں کے باوجود لاہور جیسے بڑے شہر کے لیے ابھی مزید ہسپتالوں کی ضرورت ہے۔ موجودہ انتظامات بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ناکافی ہیں۔

مندر

فدا حسین اسیر

چاندرات | ہم چاندرات مندر کے بارے کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ راجہ جنک کی راجدھانی صوبہ بہار کے جس علاقہ کو ترہت کہتے ہیں وہ پراچین زمانہ میں متھلا کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں دربھنگہ کے پاس ہی جنک پور نامی ایک شہر تھا۔ موجودہ نیپال کی شمالی حدود تک ان کی سلطنت کی حدود کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مہاراجہ رامچندر جی کی شادی اسی جنک کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ جب بن باس کا زمانہ کاٹ کر اپنی راجدھانی میں واپس آئے۔ تو سونی اور تاریک بستی ایک دم قمقموں، گھا گھی اور چراغاں کی روپہلی روشنی سے جلوہ گر ہو گئی۔ امن کا دور دورہ شروع ہوا۔ رامچندر جی اکثر رات کی تنہائیوں میں لباس و وضع تبدیل کر کے شہر کا گشت کرتے۔ رعایا کے اندرونی حالات انصاف کی روشن آنکھ سے دیکھتے اور اس کا علاج حسن کارکردگی سے کرتے۔

ایک دفعہ رات کے تین پہر گزر جانے کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ایک دھوبی کی بیوی رات بھر گھر سے غیر حاضر رہنے کے بعد جب اپنے گھر پہنچی تو دھوبی نے اُسے دروازے پر ہی روک دیا اور کہا کہ جہاں تم نے گناہ کی سیج پر آبرو کو بھینٹ چڑھایا ہے۔ وہیں اسی وقت رات کی خاموشیوں میں اپنی منحوس صورت لیے ہوئے چلی جاؤ۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ میں رام نہیں ہوں کہ تمہیں پھر گھر میں بسا لوں گا۔ یہ کہا اور۔ . . . اسی وقت اس عورت پر اپنے رحم و کرم کا دروازہ بند کر دیا۔

دھوبی کی یہ بات رام کے دل میں کھٹکی۔ گھر آئے۔ سیتا اس وقت رات کی خاموشیوں میں نیند کے مزے لے رہی تھی۔ رام نے بے چینی اور کشمکش میں رات کا بقیہ حصہ گذارا۔ صبح نے اپنی روپہلی روشنی ہر طرف بکھیری تو سیتا حسب دستور اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ رام کھڑکی سے باہر کسی نظارے میں محو ہیں۔ چندے توقف کے بعد اس نے رام کے پاؤں کو چھونا چاہا۔ مگر رام نے اپنے پاؤں کھینچ لیے۔ سیتا پریشانیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ جب محویت کی نقاب ہٹی تو رام وہاں موجود نہ تھے۔

رام سیدھے اپنے بھائی لچھمن کے پاس آئے اور اُسے حکم دیا کہ سیتا کو گاڑی میں بٹھا کر کہیں دور جنگل میں چھوڑ آؤ۔ اگرچہ بھائی کا اخلاق مانع تھا مگر اپنے بھائی کے امر کو اپنا اولیں فرض جانتے ہوئے اس نے سیتا کو گاڑی میں بٹھایا۔ اور ارادی جسے اب دریائے راوی کہتے ہیں کے کنارے پر سیتا کو گاڑی سے اتار دیا۔ یہاں اس دور میں ایک گھنا جنگل تھا۔ سیتا بالمیک رشی کے بھون میں آ گئی۔ اس رشی کا مکان جہاں سیتا رہتی تھی۔ قدیم کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک موجود ہے۔

جب لچھمن سیتا کو چھوڑ کر واپس ہوئے تو ایک برگد کے سایہ میں آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ شام کا وقت ہو چکا تھا۔ وہیں رات بسر کی

صبح کو چند لوگ وہاں آئے انہوں نے لچھمن کی زیارت کی۔ لچھمن نے حاضرین کو طویل نصیحت کی اور اجودھیا لوٹ گئے۔ لوگوں نے اس جگہ کو متبرک جان کر اُسے پوجا پاٹ کا ایک مرکز بنا لیا۔

کئی برس گذر گئے متذکرہ جگہ کے ارد گرد ویرانے آبادیوں کی صورت میں نظر آنے لگے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ جہاں ایک عورت کو بعض تکالیف کی زندگی بسر کرنے کے لیے بن باس دیا گیا تھا۔ ایک دن امن حاصل کرنے کے لیے شہر کی صورت میں نظر آئے گی۔ تاریخ اپنے گذشتہ واقعات اکثر دہرائی رہتی ہے اور دھندلے نقوش روشن ہو کر دنیا کے سامنے پیش ہو جایا کرتے ہیں جنھیں چشم بینا دیکھ لیتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ سیتا کے بیٹے لوہ نے اپنی ماں کی یاد میں اسی جگہ قدیم و بے ترتیب آبادی کو لاہور شہر کی صورت میں ظاہر کیا۔ مگر کہیں کہیں ہندوؤں کی کتب میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ رام کے تین بیٹے تھے۔ لوہ۔ کسو اور اچھو۔ لوہ نے لاہور۔ کسو نے قصور اور اچھو نے اچھرہ آباد کیا۔ چاند رات مندر اسی اچھرہ کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ جگہ اچھرہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اور چاند رات کے نام سے مشہور ہے۔ ہر ماہ کی آخری رات کو لاہور اور اس کے گرد و نواح کے ہندو یہاں آیا کرتے۔ ماتھا ٹیکتے اور عقیدت سے پھول چڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ یہ جگہ رام چندر کے بھائی لچھمن کی جائے نشست تھی اس لیے پُرانے وقتوں میں یہاں صرف ایک تھڑا تھا۔ اس کے بعد یہاں ایک کچی مڑھی بنی جس میں ماہ کے آخری ایام میں چراغاں ہوا کرتا تھا۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد اس مندر کو پختہ کیا گیا اور یہاں مندر کی دیواروں پر گنیش۔ ہنومان۔ بھیرو۔ کشن مہاراج۔ واسشٹ بھوجی دیوی۔ راجہ رسالو۔ راجہ ہوڈی۔ ہیر رانجھا۔ گورو نانک۔ گورکھ ناتھ۔ مچھندر ناتھ جوگی وغیرہ کی تصاویر نقش کی گئیں۔

پیپل اور بڑ کے دو دیو قامت درختوں کے نیچے تھڑے اور گرد چار دیواری اندر سے سات فٹ اور باہر سے بارہ فٹ مرتفع تھی چونہ گچ کی سفید بٹری میں گز طویل اور چودہ گز عریض تھی۔ شمال کی طرف داخل ہونے کا ایک دروازہ جس کے پانچ زینے اور زینہ کے ہر دو طرف پختہ دالان تھے مشرق کی طرف ایک پختہ و مکمل دو رہ جنوبی درہ شکستہ و بوسیدہ۔ احاطہ کے اندر ایک کنواں جاری ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چرخی دار کنواں ہے جس کے شمال میں تین سمادھیں ہیں۔ یہ سمادھیں قدیم ہیں۔ ان کی غربی جانب ایک اور مکان اور چار دیواری ہے جس کا طول بیس گز اور عرض چوبیس گز ہے۔ ایک سہ درہ دالان ہے جس کے احاطہ میں مڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ بدھ ناتھ۔ مہری ناتھ۔ بھبوت ناتھ۔ سدھ ناتھ۔ سہج ناتھ۔ پھول ناتھ۔ اونکھ ناتھ وغیرہ جوگیوں کی ہیں۔

بھیرو کا مندر

عہد شاہجہانی میں گودر نامی ایک شخص شہر بنارس میں داراشکوہ کا ملازم تھا۔ حساب میں کمی بیشی کرنے کے باعث اس کے ذمہ کچھ شاہی رقم نکلی۔ داراشکوہ نے اس کو پھانسی کی سزا کا حکم دے دیا۔ تحقیقات چشتی کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ وہ معتوب شخص بھیرو کا پجاری تھا۔ جس روز صبح اس کو پھانسی ملنی تھی اسی رات بھیرو انسانی روپ میں اس جگہ آ پہنچی اور اسے قید و بند کی تکالیف سے نجات دلا کر باہر لے آئی۔ اور کہا کہ آنکھیں بند کر۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ لاہور شہر میں تھا اور اتوار کا دن تھا۔ اونچی سواری نے صرف اتنا ہی کہا کہ میں بھیرو ہوں۔ اور اسی جگہ اچھرہ میں جہاں اب یہ مندر ہے روپوش ہو گئی۔

گودر یہ معاملہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور یادداشت کے لیے اسی جگہ ایک کچی مڑھی بطور نشان کے بنا دی۔ اور خود لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے اندر پری محل کے سامنے آ کر رہنے لگا۔ وقت گذرتا رہا اور حالات بدلتے رہے۔ ایک روز اس نے اچھرہ کے ہندو مالکوں کو بلا کر کہا کہ یہ بھیرو جی کا استھان ہے اس پر تم ہمیشہ چراغاں کیا کرو۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں بھی تمہاری خدمت کیا کروں گا۔

گودڑ نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ وہ تا زندگی ہر اتوار کو وہاں جاتا اور عقیدت کے پھول چڑھاتا۔ جب ۱۸ اسوج ۱۰۹۱ بکرمی کو وہ مر گیا۔ تو اس کے بعد اس کا بیٹا دستی رام اس کام پر مامور رہا۔ اس نے یہاں ایک خشتی چبوترہ بنوایا اور گنبد کے شمال میں ایک کنواں جاری کیا۔ ۱۱۵۰ بکرمی میں دستی رام بھی مر گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے چند اور کچے مکان بنوائے۔

اسی دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظور نظر موراں طوائف کی ماں کو جن کا سایہ ہوا۔ اس وقت جوالا ناتھ بن دستی رام لاہور میں مشہور جادوگر تھا۔ سکھوں کے عہد میں صرف اس کی دکان پر دال لی جاتی تھی۔ اگر کوئی اور شخص طمع کے لالچ میں اس کاروبار میں ہاتھ ڈالتا اور دکان نکال لیتا تو جوالا ناتھ جادو کے زور سے اس کی دکان جلا دیتا۔ لوگ اس سے بہت خائف تھے۔

ایک دن موراں طوائف نے جوالا ناتھ کو بلوایا اور کہا کہ میری والدہ سے اس نحس سایہ کو دور کرو۔ اس نے جواباً کہا کہ یہ تو ابھی دور ہو جائے گا۔ مگر مجھ سے ایک اقرار کرو کہ جب تمہاری ماں روبصحت ہو جائے گی تو جتنے گاؤں اس کے تصرف میں ہیں ان سے ایک ایک گاڑی اینٹوں کی دینی ہو گی۔ بات معمولی تھی۔ موراں نے فوراً قبول کر لی۔ چنانچہ تندرست ہونے پر ایک سو مواضع جات سے ایک سو گاڑی اینٹوں کی منگوا دی۔ اور کافی زر نقد بھی دیا۔ جوالا ناتھ نے ان اینٹوں سے وہاں عمارت بنوا دی اور ایک ہزار چار سو روپیہ کی رقم لگا کر ایک بارہ دری بھی بنوائی۔ جوالا ناتھ کا اس پر کافی مدت قبضہ رہا۔ ایک دن اس نے ایک شخص کاہنا مصر نامی کو وہاں بٹھا دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدلتی رہتی ہے۔ ویرانے آباد اور آبادیاں ویرانیوں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ سانول مل کے بھتیجے رام چند نے اس عمارت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی جگہ نئے روپ میں موجودہ مندر بنوایا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں راجہ لال سنگھ نے بھی کچھ عمارتیں چار دیواری کے اندر بنوائیں۔

۱۸۸۰ بکرمی میں باوا دھنی ناتھ خورد سالی میں یہاں آیا۔ جوالا ناتھ نے اس کو جوگی سمجھ کر لاہور میں اپنے مکان میں رکھا۔ اس جوگی کی ملاقات ایک معزز سردار دیوانی بھائی گوربخش سنگھ سے ہو گئی۔ دھنی ناتھ اس کی بہت خاطر داری کیا کرتا تھا۔

جوالا ناتھ بھی بھائی گوربخش سنگھ کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ ایک روز بھائی گوربخش سنگھ نے جوالا ناتھ سے کہا کہ اگر تم باوا دھنی ناتھ کو جیبو کے مندر میں رہنے کے لیے جگہ دے دو۔ تو یہ بہت فائدہ مند ثابت ہو گا اور اس جگہ کی خوب دیکھ بھال کیا کرے گا۔ اپنے رہنے کے لیے خود اپنی گرہ سے کوئی مکان بھی بنا لے گا۔ جوالا ناتھ نے قبول کر کے اسے حکم دے دیا اور دھنی ناتھ نے اپنے رہنے کے لیے وہاں ایک کچا مکان بنا لیا۔

دھنی ناتھ مقبول ہوتا گیا۔ اور اس کے گیان دھیان کی دور دور تک شہرت ہو گئی۔ وقت نے کروٹ لی اور اس نے چیلے بنانے شروع کر دیے۔ پہلے اس نے ایک شخص نہند نامی کے کان کاٹے اور اس کے بعد رام ناتھ کے۔ پھر اس کا یہ معمول ہو گیا کہ لاہور کی طرف جاتا اور گدائی میں کافی مال و زر اکٹھا کر کے واپس چلا آتا اور وہیں رہتا۔

ایک دن دھنی ناتھ کے چیلے نہند و ناتھ نے کاہنا مصر سے جو جوالا ناتھ کا بٹھایا ہوا تھا کہا کہ اگر تم میرے بٹھائے ہوئے یہاں بیٹھنا پسند کرو تو بہتر ہے ورنہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اس نے کہا کہ میں قدیم سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں تم کون ہو؟ اس تلخ نوائی پر جوگیوں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا اور وہ اپنا مال متاع سمیٹ کر مندر کو خیرباد کہہ لاہور چلا آیا۔ اتفاقاً دو روز کے بعد اتوار کو وہاں میلہ تھا۔ باوا دھنی ناتھ شہر کے سرداروں کو ساتھ لے کر جوالا ناتھ کی دکان پر آیا۔ اور کہنے لگا کہ تو میرے گودڑ کی جگہ ہے۔ وہاں چل کر رات کی عبادت میں مشغول ہو۔ جوالا ناتھ

نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ تم میرے مکان کے غاصب ہو۔ باوا دھنی ناتھ نے اس شرط پر اس سے راضی نامہ کر لیا کہ چڑھاوے کی آمدنی سے پچاس فیصد روپیہ سالانہ مجھ سے لیا کرو۔ یہ بات تحریری صورت میں ہوئی۔ چنانچہ جب باوا دھنی ناتھ مر گیا تو رام ناتھ گدی نشین ہوا۔ ۱۸۰۹ء کے میں جوالا ناتھ المشہور ہوالا سہائے بھی مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بدری ناتھ وہ رقم لیتا رہا۔

رفتہ رفتہ جب رام ناتھ ہر دلعزیز ہو گیا تو اس نے اُن مالکوں کو صاف جواب دے دیا۔ بدری ناتھ نے محکمہ بندوبست میں جناب پنڈت من پھول صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے حضور نالش کی۔ رام ناتھ نے اپنے بیان میں لکھوایا کہ یہ مکان بانیوں کا ضرور ہے لیکن تیس برس سے یہاں قابض ہیں۔ پنڈت صاحب خود وہاں موقعہ پر گئے اور تحقیقات کی۔ بدری داس کا بیان تھا کہ لوگوں نے محض رام ناتھ کی خاطر بے ایمانی سے کام لیا۔ اور حق بات کو بھول گئے۔ سب نے مل کر یہی چاہا کہ اصل مالک بدری بے دخل رہے۔ اس بنا پر وہ مقدمہ خارج ہو گیا۔

لاہور سے شمال مغرب میں فیروز پور روڈ پر تین میل کے فاصلہ پر ہندوؤں کی عبادت گاہ ہے۔ اس کا صدر دروازہ جنوبی دیوار میں ہے۔ دروازہ بہت بڑا ہے۔ دروازہ کے آگے ایک ڈیوڑھی ہے جس کا عرض تین گز اور طول تیرہ گز ہے۔ قالبوتی چھت ہے۔ مشرقی اور مغربی طرف لوگوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی ہے۔ جنوب کی طرف سے جہاں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ بغیر چھت کے ایک کھلا مکان بنا ہوا ہے جو سترہ گز لمبا اور گیارہ گز چوڑا ہے۔ ڈیوڑھی راجہ لعل سنگھ نے بنوائی تھی۔ ایک ہندو دیوار میں ایک لوہے کی زنجیر لٹکی رہتی تھی۔ غربی دیوار کے سامنے ایک لنگر خانہ بنا ہوا ہے۔ جہاں سے زائرین کو کھانا ملتا تھا۔ مشرق کی طرف ایک مکان ہے۔ جہاں ہر روز رات کو چراغاں ہوتا تھا۔ اس سے آگے مندر کا صحن ہے جو تمام خشتی بنا ہوا ہے۔ جنوبی کونے میں آٹھ پہلو خشتی چبوترہ بنا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک کنواں ہے جس پر دو چرخیاں تھیں۔ یہ باوا لہر ناتھ نے ۱۸۲۵ بکرمی میں بنوایا تھا۔

اس کنوئیں کے جنوب میں بھیرو کا مندر تقریباً آٹھ گز اونچا چار گز چوڑا پختہ تھڑہ پر بنا ہوا ہے۔ مندر کے نیچے بارہ پہلو خشتی تھڑا ہے۔ مندر بہت بڑا آٹھ پہلو ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں میں باہر کی طرف محرابیں ہیں جن کے سروں پر تین تین گنبد تھے۔

مشرقی دیوار کے ساتھ ہی اس مندر سے کم سطح پر ایک اور چار دیواری ہے۔ مندر سے اس طرف آنے کے لیے دو دروازے ہیں۔ اس کی دیواریں تین گز لمبی اور فرش اینٹوں کا ہے۔ اس کے درمیان ایک پختہ آٹھ پہلو تھڑہ ہے۔ اس پر آٹھ پہلو سمادھ تین دروں والی ہے جس کی کرسی تھڑہ سے نصف گز اونچی ہے۔ یہ سمادھ ۱۸۹۰ بکرمی میں لھندی ناتھ نے بنوائی۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے سیاہ اور اندر سے سفید ایک تھڑہ پر باوا دھنی ناتھ کی سمادھ ہے۔

بیکنٹھ داس کا ٹھاکر دوارہ

یہ قدیمی ٹھاکر دوارہ چوک چکلے کے سرے پر واقع ہے۔ ہندوؤں کے عقائد کی بنا پر ہزاروں سال پرانا مندر ہے۔ لیکن عمارت دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عمارت کا اب کوئی نشان موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے یہ بھی نہ بچ سکا ہو اور بعد میں نئی طرز تعمیر سے پھر وجود میں آیا ہو۔ پرانی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عمارت پریتم داس نے بنوائی تھی۔ جس میں بہت سے لوگوں نے چندہ دیا تھا۔ مندر حویلی نما صورت میں ہے۔ اندر اور باہر سے چونہ گچ اور منقش عمارت تھی۔ مکان کی ایک منزل سطح زمین کے نیچے اور دو منزلیں اوپر ہیں۔ ہر منزل میں کوٹھڑیاں اور خوبصورت دالان ہیں۔ درمیانی منزل میں ایک دالان اور اس کا طاق نہایت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ جو زمانہ کی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ اسی میں ایک پتھر کی مورتی کرشن مہاراج کی تھی اور دوسری مورتی رادھیکا کی تھی۔ دالان میں ہنومان کا بت ایک خشتی عمارت میں بنا ہوا تھا۔ چڑھاوے کی آمدنی پر مندر کا خرچ چلتا تھا۔

شوالہ ٹبی والا

یہ مندر محلہ ٹبی کے ساتھ سوچیت سنگھ کی حویلی کے مشرقی طرف جہاں پرانی تحصیل تھی واقع ہے۔ یہ قدیم شوالا شہر لاہور کی آبادی کے وقت تعمیر ہوا تھا۔ اس کی بناوٹ بتاتی ہے کہ جب یہ مندر بنایا گیا ہوگا تو اس کی کرسی سطح زمین سے اونچی ہوگی مگر اب اس مندر کی سطح زمین سے ڈیڑھ منزل نیچے ایک تہ خانہ میں ہے۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ ہزاروں برس گذرنے کے بعد سطح زمین اونچی ہوتی گئی اور مندر کی سطح ڈیڑھ منزل نیچی ہو گئی۔

سکھوں کی عملداری میں اس کا بالائی گنبد زمین کے برابر تھا۔ مہاجہ دینا ناتھ نے وہ گنبد اترواکر ایک اور عالیشان گنبد اونچا کر کے بنوایا۔ باوجودیکہ روشندان باہر کی سطح زمین سے گز بھر اونچے ہیں۔ پھر بھی مندر میں اندھیرا ہی رہتا ہے۔ تمام دن چراغ جلتے رہتے تھے۔ اس مندر کا بیرونی دروازہ جنوب کی طرف کوچہ کے اندر ہے۔ جب اندر داخل ہوں تو ایک ڈیوڑھی آتی ہے۔ دوسرا دروازہ مشرقی طرف کھلا رہتا تھا۔ اس سے گزریں تو ایک وسیع صحن آتا ہے۔ اس صحن کے تینوں طرف پختہ محرابی دالان اور پختہ خشتی فرش ہے۔ صحن کے درمیان دو گنبد والی پختہ سمادھیں قدیم مہنتوں کی ہیں۔ بڑ اور پیپل کے دو درخت تمام صحن کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جنوبی طرف بھی ایک دالان ہے۔ اس دالان کے اندر مندر کا پتھریلا دروازہ ہے۔ دروازہ سے گذریں تو سرخ پتھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اندازاً ۲۰ سیڑھیاں اتر کر تہ خانہ کے صحن میں پہنچنا پڑتا ہے۔ مندر کی زمین پر بھی سرخ پتھر کا فرش ہے اور دیواریں بھی سرخ پتھر کی ہیں۔ اوپر قالبوتی چھت اور عالیشان کلس دار گنبد ہے۔ مندر کے درمیان سرخ پتھر کا عالیشان چبوترہ ہے۔ اس پر شیو جی رکھے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا گھنٹہ چھت کے ساتھ لٹکا رہتا تھا۔ بہت دور دور کے ارادت مند لوگ اس مندر کی پوجا کے لیے آتے تھے۔

چڑھاوا بہت چڑھتا تھا۔ جس پر مہنتوں اور پجاریوں کی گذر اوقات ہوتی تھی۔ اسی تہ خانہ میں ایک قدیمی کنواں بطور غرقی بنا ہوا ہے اور شیو جی پر جس قدر پانی مسی گاگر سے شب و روز ٹپکتا رہتا تھا۔ وہ اسی غرقی میں غرق ہوتا تھا۔

شوالہ پنڈت رادھا کشن

یہ مندر گمٹی بازار کے قریب اس راستے پر بجانب جنوب واقع ہے جو محلہ سید مٹھا کو جاتا ہے۔ مکان اگرچہ چھوٹا ہے مگر عمارت پختہ و عالیشان بنی ہوئی ہے۔ شمال کی طرف اس کا دروازہ ہے۔ دروازہ سے داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا طولانی صحن ہے جس کے جنوبی حصہ میں یہ عالیشان مندر بنا ہوا ہے۔ مندر کے اندر ایک چھوٹا چبوترہ سنگ سرخ کا ہے جس پر شیو جی کی مورتی ہے۔ سر پہ جلہری اور اس پر مسی گاگر رکھی ہے۔ دیواریں مندر کی پختہ ریختہ کار اور چھت قالبوتی ہے۔ چھت کے اوپر طولانی گنبد ہے۔ اس گنبد کی بالائی منزل سنہری ہے۔ اور بجائے کلس کے ہنومان کی مورتی بٹھائی ہوئی ہے جو سر سے پاؤں تک طلائی ملمع کا ہے۔ یہ شوالہ سمت ۱۸۷۲ بکرمی میں پنڈت رادھا کشن لمردار یا ور دار زریش نے بنوایا تھا۔

مندر کالی دیوی

یہ مندر گمٹی بازار کے کوچہ کالی ماتا میں ہے۔ کوچہ کے سر راہ بجانب غرب پختہ دریچہ بنا ہوا ہے۔ دونوں طرف زینے دار دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ نشست گاہ سے شمال کی طرف ہے اور دوسرا جنوب کی طرف۔ دونوں طرف سیڑھیاں اوپر کی منزل میں جانے کے لیے بنی ہوئی ہیں۔ سیڑھیوں کے آگے چھت والی ڈیوڑھیاں ہیں۔ جنوبی دروازہ اکثر بند رہا کرتا تھا۔ اور شمالی دروازہ سے آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ جنوبی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں تو مسقف عمارت کی ڈیوڑھی آتی ہے۔ اس کے آگے شمالی طرف ایک اور دروازہ آتا ہے۔ یہ دروازہ اس نشست گاہ کا ہے جس کے مغربی حصہ میں دیوی کا مندر ہے۔ نشست گاہ کے تین دریچے کوچہ کی طرف ہیں۔ صحن مسقف ہے۔ مغربی حصہ علیحدہ کیا ہوا ہے۔ اس میں ایک پختہ سنگین چبوترہ ہے۔ اس پہ چھوٹا سا مندر ہے جس پر کالی ماتا کی سیاہ پتھر کی بنی ہوئی

مورتی تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ اس کے اوپر چھوٹا سا سنہری گنبد بنا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا سنہری چبوترہ دیوی کے سر پر بنا ہوا تھا۔ دوسرا بڑا چتر گنبد کے اوپر ہے۔ یہ مندر لاہور کے مشہور مندروں میں سے ہے۔

ٹھاکر دوارہ پنڈت رادھا کشن

یہ ٹھاکر دوارہ محلہ سید مٹھا میں ہے۔ جب اس مکان کے اندر داخل ہوں تو ایک کھلا صحن آتا ہے جس کے چاروں طرف عالیشان عمارت ہے۔ شمالی حصہ میں یہ ٹھاکر دوارہ بنا ہوا ہے چند زینے چڑھ کر جب اوپر جائیں تو اس ٹھاکر دوارہ میں داخل ہوتے ہیں خاص مندر کے آگے صحن مسقف ہے جس کی چار دیواری پختہ منقش بنی ہوئی ہے۔ اس صحن کے غربی حصہ میں مندر بنا ہوا ہے جس کا عالیشان سنگین دروازہ ہے۔ تمام دیواریں سنہری منقش ہیں۔ چھت قالبوتی ہے اور اس پر بہت بلند طلائی گنبد بنا ہوا ہے۔ کلس سنہری ہے۔ مندر کے اندر چھوٹی سی دو مورتیاں سری کرشن اور رادھا کی تھیں جو اب نہیں ہیں۔

یہ ٹھاکر دروازہ سمت ۱۸۹۰ بکرمی میں تعمیر ہوا۔ پنڈت رادھا کشن اس مندر کے بانی تھے۔ ان کی موت کے بعد پنڈت رکھی کیش اس مندر کا سرپرست تھا۔ یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔

سیتلا مندر

یہ مندر لوہاری اور شاہ عالمی کے درمیان نویں بازار کے سامنے برسر راہ واقع ہے۔ اس کو سیتلا دیوی کا استھان بھی کہتے ہیں۔ کبھی اس مندر میں بہت چہل پہل ہوتی تھی۔ ہندوؤں کو اس جگہ سے بہت عقیدت تھی۔ مگر جب چیچک کی بیماری کا زور ہوتا تو ہزاروں لوگ جن کے بچے اس موذی مرض سے نجات پاکر صحت یاب ہوتے وہ بڑی خوشی سے یہاں آکر پوجا کرتے۔ اور نذرانے بھی چڑھاتے یہ مندر ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا مرجع تھا۔ کئی جاہل مسلمان بھی اپنے بچوں کو ماتا کی بیماری سے شفا پانے کے بعد یہاں لاتے اور مٹھائی وغیرہ چڑھاتے۔

سکھوں کے دور سے پہلے ایک مختصر سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ سکھوں کے دور میں بہت بڑا مکان بن گیا۔ اور بہت سی لاوارث زمین جو مہنت نے اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھی وہ بھی اسی مندر کی ملکیت میں شامل ہو گئی۔ اس کا تمام کرایہ مہنت وصول کیا کرتا تھا۔ چڑھاوے کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔

اس مندر کا احاطہ بہت بڑا بنا ہوا ہے اور چار دیواری پختہ ہے۔ مندر کا صدر دروازہ شمال کی طرف ہے۔ دروازہ کے دونوں طرف شرقاً غرباً پختہ دکانیں ہیں جو کرایہ پر چڑھی رہتی ہیں۔ دروازہ مکان کا پختہ بنا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی کے اوپر بھی ایک چوبارہ تھا۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک وسیع میدان آتا ہے جس کا غربی حصہ بلند ہے۔ اس پر زینہ سے چڑھ کر جاتے ہیں۔ اس چبوترہ پر چند درخت پیپل اور بڑ کے ہیں۔ جن کو لوگ پوجتے تھے اگر چیچک کی کوئی پھنسی پک جاتی تو اس درخت کے پتوں کا سفوف اس پر ڈالتے تھے۔ جس سے بیمار اچھا ہو جاتا تھا۔

اس بلند چبوترے کے غربی حصہ میں چند کوٹھریاں بنی ہیں جن میں مہنت رہا کرتا تھا۔ اسی چبوترہ پر ایک چوبی دار کنواں بھی ہے۔ کنوئیں کے شرقی کی طرف خاص مندر سری دیوی کا پختہ چونے گچ بنا ہوا تھا اس مندر کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے ایک برآمدہ ہے۔ مندر کے اندر کی عمارت بھی پختہ چونہ گچ اور منقش تھی۔ دروازہ کی دیوار میں ایک طاق ہے۔ جس میں سنگین مورت سری دیوی کی رکھی ہوئی تھی۔ اسی کو ہندو لوگ ماتھا ٹیکتے اور پوجا کرتے تھے۔ مندر کے باہر برآمدہ کے اندر ایک پتھر کا شیر ایک چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ مندر کی چھت قالبوتی ہے اور اوپر خوشنما گنبد بنا ہوا ہے۔ مندر کے ایک طرف بہت سے مکان اور کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جن میں سادھو لوگ رہتے تھے یا مہنت کے گائے بیل بندھے رہتے تھے۔ مندر کے دروازہ سے باہر کے دروازہ تک سیدھی سڑک بنی ہوئی ہے۔ سڑک سے غرب کی سمت کو وہ اونچا چبوترہ ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ مشرق کی طرف چوبی دار کنواں اور چند پختہ سمادھیں ہیں۔ یہ پہلے مہنتوں کی ہیں۔

ایک مندر شوالہ پختہ چونہ گچ گنبددار بنا ہوا ہے اس کے اندر شیو جی رکھے ہوئے تھے۔ جو لوگ دیوی کی پوجا کے لیے آتے تھے وہ یہاں بھی حاضر ہو کر شیو جی کی پرستش کرتے تھے۔ احاطہ کے اندر اور بھی بہت سے مکانات ہیں ایک دروازہ احاطہ کی جنوبی دیوار میں بھی ہے جس کے ذریعے سے اس طرف آمدورفت ہوتی ہے اس طرف بھی دیوار کے باہر بہت سی زمین متعلقہ مندر ہے۔ زمین کا کچھ حصہ انگریزی حکومت نے ہسپتال کے لیے سیدھی سڑک نکالنے پر ان سے خرید لیا تھا اور زمین کے عوض زمین بھی دی تھی۔

رانی جھجی کا ٹھاکر دوارہ

یہ ٹھاکر دوارہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی رانی جھجی نے بنوایا تھا۔ یہ مندر برلب موجودہ اقبال پارک کے نالہ دریا راوی کے کنارے پر بنا ہوا ہے۔ اس کی عمارت بڑی پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے۔ اس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے ایک عالیشان برآمدہ بطور نشست گاہ بنا ہوا ہے۔ جس کی چند سیڑھیاں ہیں۔ برآمدہ کا یہ دروازہ مندر کا بیرونی دروازہ ہے۔ اس جگہ پختہ فرش ہے اور دیواریں بھی پختہ ہیں چھت قالبوتی ہے۔ اس سے آگے مندر کا دوسرا دروازہ آتا ہے۔ اس دروازہ کی چوکھٹ پتھر کی ہے۔ اندر مکان کی تمام دیواریں پختہ منقش چونہ گچ ہیں۔ شمالی دیوار میں دو طاق بنے ہوئے تھے جو ضائع ہو گئے ہیں۔ ان میں سنگین مورتیاں سری کرشن، رادھا، رامچندر، سیتا، لچھمن وغیرہ کی تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ مندر کے باہر چاروں طرف نہایت سرسبز باغیچہ تھا۔ اس میں ہر قسم کے پھلدار درخت تھے ایک رہٹ بھی جاری تھا۔ تقریباً دس گھماؤں زرعی زمین اس مندر کے ساتھ شامل تھی۔ جس میں کاشت وغیرہ ہوتی تھی۔ اس مندر کے علاوہ صرف ایک سمادھ پختہ چونہ گچ باوا لچھمن داس بیراگی کی بنی ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں رام داس بیراگی اس مندر کا پجاری تھا۔ اب یہ مندر بالکل خستہ و تباہ حال ہے۔

مندر باوا جھنگر شاہ المشہور "ستھرا"

یہ مندر لاہور کے نامی گرامی مندروں میں سے ہے۔ جھنگر شاہ حضرت عالمگیر اورنگزیب کے عہد میں ہوا ہے۔ ہندو اسے صاحب کمال مانتے تھے۔ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ستھرے شاہی فقیر اب بھی بہت گداگری کرتے پھرتے ہیں۔ جھنگر شاہ ستھرے کی ہزاروں نقلیں اور کہانیاں۔ اس کی صاف گوئی اور بے ریائی کی اب بھی ہزاروں لوگوں کی زبان سے سننے میں آتی ہیں۔ ستھرا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنے پاک و صاف کے ہیں۔ اسی لیے اُسے ستھرا کہتے تھے کہ حق گوئی بغیر کسی جھجک کے کہہ دیتا تھا۔

یہ مکان شاہی قلعہ لاہور کی شمالی دیوار کے ساتھ ہے۔ جھنگر شاہ ستھرا گوردھر رائے کا بیٹا تھا حضرت عالمگیر بادشاہ کے حکم سے ہر ایک شہر میں سالانہ ایک روپیہ فی دکان اس کا مقرر تھا۔ اصلی وطن اس کا لاہور ہی تھا۔ آخر اسی جگہ وہ فوت ہوا یہاں ہی جلایا گیا جس جگہ اب اس کی سمادھ بنی ہوئی ہے۔

احاطہ مکان پختہ بنا ہوا ہے۔ لمبا زیادہ اور چوڑا کم ہے۔ مکان کا دروازہ مشرق کی طرف ہے۔ جب دروازہ سے صحن میں داخل ہوں تو صحن کے شمال و جنوب میں فقرا کے رہنے کے لیے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ بڑ کا ایک دیو قامت درخت کھڑا ہے۔ جس کا سایہ صحن اور دو طرف دالانوں پر ہے۔ جب اس سے آگے بڑھیں تو پختہ فرش اور کنواں آتا ہے۔ اس کنواں کے جنوب کی طرف ایک نشست گاہ کنویں کے چبوترے کے برابر اونچی کرسی پر بنی ہوئی ہے اس نشست گاہ کی عمارت پختہ چونہ گچ منقش ہے۔ کنویں کے شمال کی طرف بھی ایک اچھی نشست گاہ بنی ہوئی ہے جس پر زینہ چڑھ کر جاتے ہیں۔ اس کے اندر تین دریچے بطرف میدان پریڈ موجودہ اقبال پارک رکھے گئے ہیں جس میں بیٹھ کر اقبال پارک کے سبزہ زار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس بیٹھک سے آگے بڑھ کر ایک اور مکان چونہ گچ بنا ہوا ہے۔ اس میں گرنتھ رکھا رہتا تھا۔ اس سلسلہ کے فقرا اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

اس مکان سے جنوب کی طرف قلعہ لاہور کی دیوار کے ساتھ مکان سمادھ جھنگر شاہ ستھرا کا پختہ گنبددار عالیشان بنا ہوا ہے۔ اس کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ مندر کے اندر کی عمارت چونہ گچ اور منقش ہے۔ دیواروں پر گروؤں کی تصاویر منقش ہیں۔ چھت قالبوتی ہے۔ اور اس کے اوپر عالیشان گنبد

بنا ہوا ہے۔ مندر کے درمیان اصل سمادھ جھنگڑ شاہ کی سنگِ مرمر کے ایک چبوترہ پر ہے یہ چبوترہ نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ سنگِ مرمر کے اندر بیل بوٹے عقیق اور سلیمانی وغیرہ پتھروں کے رنگا رنگ بنائے گئے ہیں ـــ اس کے اوپر چھوٹی سی سمادھ سنگِ مرمر کی ہے۔ چبوترے کے چاروں کناروں پر چار سنگین ستون قائم کر کے ایک خوبصورت گنبدی بنائی گئی ہے۔

ٹھاکر دوارہ چور مور والا

یہ مندر رمائی بھولی کے کوچہ میں ہے۔ اڑھائی منزلہ عمارت نہایت پختہ چونہ گچ اور منقش ہے۔ اس مندر کی بنیاد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں رکھی گئی تھی۔ کنہیا کمبو کی ماں نے اپنے ذاتی روپے سے اس کو تعمیر کرو دیا۔ اور ایک خدا پرست سادہ مہنت برام داس کی تحویل میں دے دیا۔ مہنت کچھ عرصہ کے بعد ہی ہر دلعزیز ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اکثر اس کی زیارت کو آیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے اس مندر کی اور بھی مشہوری ہو گئی۔ ایک دفعہ مہنت نے چور اور مور کی ایک کتھا مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سنائی۔ مہاراجہ اس کو سن کر بہت خوش ہوا۔ اور چور مور کا سادھ کو خطاب دلایا۔ پھر تو تمام لوگ اسے چور مور والا سادھ کہنے لگے حتیٰ کہ چند برسوں میں یہ ٹھاکر دوارہ بھی چور مور والا مشہور ہو گیا۔ وہ مہنت تا دمِ زیست اس ٹھاکر دوارہ میں رہا۔ اس کے بعد رام داس مہنت ہوا پھر بھگوان داس۔

یہ ٹھاکر دوارہ بطور حویلی کے بنا ہوا ہے جس کی اڑھائی منزلیں ہیں۔ چاروں طرف پختہ چونہ گچ دالان اور کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ مندر ایک حجرہ کی شکل میں ہے جس پر تمام سنہرا کام کیا ہوا تھا۔ اس حجرے کے اندر چند سنگین مورتیاں دیوتاؤں اور اوتاروں کی طاقچوں میں رکھی ہوئی تھیں سب سے بڑی مورتی سری رام چندر کی تھی۔ دوسری لچھمن کی رام چندر کے بائیں طرف اور دائیں طرف سیتا کی مورتی تھی۔ چوتھی مورتی رگھناتھ کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے بت تھے۔ مندر کی دیواروں پر شیشہ کاری کا کام کیا ہوا تھا۔

شوالہ ترپولیہ

یہ مندر بھی لاہور کے مشہور قدیم مندروں میں سے ہے۔ زمانہ سلف سے بے کر وقتاً فوقتاً اس کی مرمت ہوتی رہی۔ سکھی دور میں اس کی تمام عمارت بالکل نئے انداز میں بن گئی۔ پریم ناتھ جوگی کافی عمر تک اس مندر میں قیام پذیر رہا۔ اس لیے یہ پریم ناتھ کے شوالہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ترپولیہ بازار کے سرِ راہ مشرق کی طرف یہ مندر واقع ہے۔ مکان کا دروازہ مغرب کی طرف ہے۔ دروازہ کے آگے بازار مسقف کر کے ایک مکان بنا ہوا تھا جس کے دونوں طرف دریچے تھے۔ انگریزی عملداری میں وہ مسمار کر دیا گیا۔ دروازہ کی طرف ایک دریچہ سے برہمن لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ دروازہ سے داخل ہوں تو ایک صحن آتا ہے۔ اس کے شمال کی طرف چرخی دار کنواں ہے۔ اس سے آگے مشرق کو جائیں تو ایک کشادہ صحن آتا ہے۔ اس کے ایک گوشہ میں ایک چبوترے پر مندر بنا ہوا ہے۔ مندر کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ اور ایک دریچہ غربی سمت صحن کی طرف کھلتا ہے۔ دریچہ میں سنگِ مرمر کا پنجرا لگا ہوا تھا۔ مندر کے اندر درمیان میں ایک اور چھوٹا چبوترہ ہے۔ جس پر شو جی کی مورتی تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ مندر کی دیواریں اندر سے پختہ چونہ گچ ہیں۔ چھت قالبوتی ہے۔ اس پر کلس دار گنبد ہے۔ مندر کے سامنے باہر صحن میں ایک درخت پیپل کا ہے۔ شمالی اور جنوبی دالانوں میں پہلے مہنتوں کی سمادھیں ہیں۔ صحن کی ملحقہ عمارتیں چاروں طرف بہت بلند دو منزلہ و سہ منزلہ بنی ہوئی ہیں۔ جن میں مندر کے جوگی اور پجاری رہا کرتے تھے شمالی عمارت خاص کر بہت بلند ہے جو غرب و شمال کی طرف بازار میں دکانیں ہیں وہ بھی مندر کی ملکیت ہیں۔ ان سب کا کرایہ مہنت لیتا تھا۔ یاد رہے کہ سریانوالہ بازار سے ایک راستہ سادھوؤں کے تکیہ کی طرف جاتا ہے اور بائیں طرف جو بازار کشمیری بازار میں جا نکلتا ہے اس کو ترپولیہ بازار کہتے ہیں۔

گرجے

سردار خاں

دین و مذہب کے معاملہ میں اکبر کی متجسس طبیعت نے گوا سے رومن کیتھولک مشنریوں کو ۱۵۹۴ء میں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک شمالی ہند میں بھی مدراس اور گوا کے علاوہ کوئی باقاعدہ مسیحی ادارہ موجود نہ تھا اور شمالی ہند تو غیر ملکی عیسائیوں کی آمد و رفت سے بھی بالکل خالی تھا مگر ۱۵۹۵ء میں جبکہ اکبر لاہور میں مقیم تھا ۵ رمئی سنہ مذکور کو تین مسیحی علماء اس شہر میں پہنچے۔ یہ لوگ ۳ دسمبر ۱۵۹۴ء کو گوا سے روانہ ہوئے تھے اور اکبری فرمان کے مطابق جس میں ان کی جان اور مال کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا تھا چھ ماہ کی مدت میں راستہ طے کر کے لاہور پہنچے تھے۔

ان علماء کے نام یہ تھے: (۱) فادر جیروم زیویئر (۲) فادر عمانوایل پینرو (۳) برادر بینیڈکٹ ڈے گوس۔

رومن کیتھولک مؤرخین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے ان علماء کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ مشرقی طرز پر ان کی مہمان نوازی اور خاطر و مدارات کی گئی۔ انھیں قیام کے لیے ایک آرام دہ مکان دیا گیا اور انھیں عبادت خانہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی دی چنانچہ انھوں نے ۱۵۹۷ء میں لاہور میں ایک گرجا تعمیر کیا جس کا خرچ حکومت نے برداشت کیا۔

جب اس گرجا کی رسمِ تقدیس ادا کی گئی تو شہنشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے تھے اس لیے لاہور کا گورنر اس رسم میں بذاتِ خود شریک ہوا۔ افسوس ہے کہ رومن کیتھولک مؤرخ اس موقع پر لاہور کے گورنر کا نام نہیں لکھتا۔ آگے چل کر مؤرخ یوں رقم طراز ہے کہ اُس سال اس گرجے میں بڑا دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا اور برادر بینیڈکٹ ڈے گوس نے ایک انتہائی خوبصورت چرنی تیار کی تھی جسے اہلِ شہر بڑی کثرت سے دیکھنے آتے تھے اور ایک مہینہ تک لوگ اس کی زیارت کرتے رہے۔ اس چرنی کے لیے شاہی خاندان کے ایک شہزادے نے بڑی بڑی قندیلیں عطا کی تھیں اور اس دن شاہی خاندان کے افراد نے غرباء کو خیرات تقسیم کی۔ شہزادہ سلیم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ان مسیحی علماء سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا اور درباری امراء بھی اس گرجے میں آتے تھے۔ لیکن اب اس گرجے کا کوئی نشان باقی نہیں نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں بنا تھا۔

اس کے بعد گوا سے مغل دربار میں مسیحی علماء کی آمد و رفت جاری رہی مگر عالمگیر کے زمانہ میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انگریزی اقتدار کی تاریخ کے ساتھ شمالی ہند میں پھر عیسائی پادری نظر آنے لگے یہ پادری صاحبان انگریزی فوجوں کے ساتھ ۱۸۴۰ء سے رہتے تھے مگر ان کا دائرہ خدمت صرف چھاؤنیوں تک ہی محدود تھا اور تبلیغ مذہب سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، مگر

رومن کیتھولک مشن کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۴۰ء میں چند فادر بہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بغرض تبلیغ دین لاہور آئے تھے جن کی مہاراجہ نے بہت عزت تکریم کی۔ اس کے بعد، ۱۸۴ء میں ایک مشنری مسمی فادر کیفرل آگرہ سے لاہور آیا اور مقامی عیسائیوں کی مدد سے اس نے ایک گرجا تعمیر کیا جس کا طول ۷۵ فیٹ اور عرض ۳۹ فیٹ تھا اور اس کی رسم تقدیس ۱۸۴۷ء میں ادا ہوئی مگر اب اس گرجے کا بھی پتہ نہیں کہ کہاں تھا۔

البتہ ایک قدیم گرجا گورنمنٹ کالج کی پشت پر موجود ہے یہ عمارت اس وقت جمنیزیم کہلاتی ہے اور اس پر سنہ تعمیر ۱۸۵۸ء تحریر ہے۔ اس عمارت کی طرز تعمیر رومن ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی گرجا ہو جو فادر کیفرل نے تعمیر کیا تھا البتہ اس کے طول و عرض کی پیمائش کرنی ضرور ہے۔

۱۸۵۱ء میں انگریزی حکومت نے لاہور کی رومن کیتھولک مشنریوں کی امداد کے لیے چھ ہزار آٹھ سو چھیانوے (۶۸۹۶) روپے کی رقم منظور کی۔ اس کے علاوہ انگریزی فوج کے سپاہیوں نے بھی چندہ دیا اور بیس ہزار روپے کی لاگت سے انارکلی کا رومن کیتھولک گرجا تعمیر ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں اس کی تعمیر ختم ہوئی۔ اس گرجے میں چار سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اسی گرجے سے متعلق ایک زنانہ اسکول بھی ۱۸۷۵ء میں قائم کیا گیا تھا جو ۱۹۱۶ء میں جیزس اینڈ میری اسکول بن گیا اور اب ڈیورنڈ روڈ پر موجود ہے۔ انارکلی کے گرجے کا پہلا بشپ ڈاکٹر بین فورس موآرد تھا۔

اب تک لاہور، سیالکوٹ اور فیروزپور میں رومن کیتھولک مشنری ہی کام کر رہے تھے جو پرتگال، اسپین اور اٹلی کے رہنے والے تھے۔ امریکن پروٹسٹنٹ مشنریوں کا ابھی ادھر گزر نہ ہوا تھا مگر ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء کو دو جوان مشنری مسٹر جان نیوٹن اور مسٹر چارلس فورمین لاہور میں آئے۔ ان دونوں کے لاہور میں آنے کا منشا انگریزی تعلیم کو عام کرنا تھا۔ اس زمانہ میں غیر ملکی لوگوں کو رہنے کے لیے مناسب مکان ملنا مشکل تھا۔ بہت تلاش کے بعد ان دونوں جوانوں کو ہیرا منڈی میں ایک مکان مل گیا۔ اس وقت یہ محلہ موجودہ غلاظت سے پاک تھا۔ یہاں ڈاکٹر فورمین نے ۱۹ دسمبر ۱۸۴۹ء کو ایک سکول کھولا جس میں صرف تین طالب علم تھے، دو ہندو اور ایک مسلمان، ان طالب علموں کو فی کس دو پیسہ یومیہ وظیفہ دیا تھا یہی سکول آج ترقی کر کے رنگ محل مشن ہائی سکول بن گیا ہے جس میں ڈھائی ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ رنگ محل کی عمارت ۹ فروری ۱۸۹۹ء کو چار سو روپے میں خریدی گئی تھی۔

انگریزی حکومت نے وہ جگہ جہاں آج کل اسٹیشن بنا ہوا ہے اور اس کے جنوب کا تمام علاقہ جو ۱۳ ایکڑ اور ۵ مرلے زمین تھی مبلغ ۸۰۰ روپے میں ۱۸۶۰ء میں ڈاکٹر فورمین کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جب اس جگہ اسٹیشن تعمیر ہونے لگا تو وہ جگہ جہاں آج کل نولکھا گرجا اور مشنری صاحبان کی کوٹھیاں ہیں تبادلہ میں دے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۸ ایکڑ ۲ کنال اور ۱۲ مرلے زمین مشن کو حکومت نے عطیہ دے دیا تھا۔

ڈاکٹر فورمین نے جو پہلا گرجا ۱۸۶۱ء میں تعمیر کرایا تھا وہ میکلوڈ روڈ پر دفتر زمیندار کے بالمقابل تھا اب اس کا کوئی نشان موجود نہیں البتہ جہاں آج کل نولکھا گرجا موجود ہے یہاں ایک عمارت بعد میں بنائی گئی تھی جو ۱۹۳۵ء تک موجود تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اس قدیم عمارت کو گرا کے موجودہ نئی عمارت امریکن طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ گرجا نولکھا گرجا کہلاتا ہے

اسٹیشن کے جنوب میں ایمپرس روڈ پر جہاں اب اومنی بس کا اسٹیشن ہے یہاں ایک کوٹھی تھی جو مسٹر جان نیوٹن نے تعمیر کرائی تھی اس کا نام نیوٹن ولا تھا۔ موجودہ پلخن کا درخت نیوٹن صاحب ہی کا لگایا ہوا ہے جو ایک سو سال سے زیادہ کا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر فورمین نے ۱۸۹۸ء میں نیلے گنبد کے مشرق میں ۱۶ ایکڑ ۴ کنال زمین کالج کے لیے خریدی تھی۔ اب کالج مسمار کر دیا گیا ہے اور وہ زمین فروخت کر دی گئی ہے صرف ایک یونٹنگ ہال باقی ہے جو موجودہ پرنسپل ایف سی کالج کے والد صاحب کے نام پر بطور یادگار بنایا گیا تھا۔

ان پروٹسٹنٹ پادریوں کی یادگار ایک گرجا انارکلی میں بھی موجود ہے جو ۱۸۹۸ء میں تعمیر ہوا تھا۔

مال روڈ پر سی ایم ایس مشن کا کیتھیڈرل نہایت عظمت و شان کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد ۲۵ جنوری ۱۸۸۷ء کو رکھا گیا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر انگریزی ہے۔ اس کا نقشہ مسٹر سکاٹ نامی ایک انجینئر نے تیار کیا تھا اور تعمیر کا کام کلکتہ کی ایک فرم میسرز برن اینڈ کمپنی کے زیرِ انتظام ہوا تھا۔ اس گرجے میں جتنا کام پتھر کا ہے اس کے اخراجات کمپنی مذکور نے خود برداشت کیے تھے۔ اس گرجے سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں دینِ مسیحی کے متعلق وہ کتابیں موجود ہیں جو پروٹسٹنٹ مذہب کے نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔ جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو مع فرنیچر اس پر چار لاکھ آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس عمارت کا طرزِ تعمیر ایسا ہے کہ گرمیوں میں اندر سے ٹھنڈی رہتی ہے۔ جب تک مذکورہ مشن کے لیے یہ عمارت تعمیر نہ ہوئی تھی تو انارکلی کا مقبرہ بطور عبادت گاہ استعمال ہوتا تھا۔

لاہور کی قدیم مسیحی تعمیرات میں سے ایک سینٹ جان ہوسٹل بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس ہوسٹل کا پرانا نام ڈوی نٹی اسکول (مدرسہ الٰہیات) ہے۔ یہ ہوسٹل مشن روڈ پر مہاسنگھ باغ میں واقع ہے۔ تقریباً ۱۸۶۰ء میں یہ باغ ایک مشنری مسمی ٹی۔ وی فرنچ نے جو چرچ مشنری سوسائٹی کے ممبر تھے مہاسنگھ کے بیٹے ہرداپا سنگھ سے خرید لیا تھا۔ لاہور کے پہلے بشپ نے ۱۸۷۰ء میں یہاں مقامی عیسائیوں کے لیے ایک دینی تربیت گاہ قائم کی۔ اب تو یہ مقام ویران ہے اور اس کا نصف حصہ فروخت کر دیا گیا ہے جہاں اب ایک سینما اور لوگوں نے مسکونہ مکانات تعمیر کر لیے ہیں ورنہ ۱۸۷۰ء میں یہ پُر رونق مقام تھا۔

اُس وقت یہاں متعدد کلاس روم، کتب خانہ، استادوں کے رہنے کے لیے مکانات اور پرنسپل کے لیے قیام گاہ بنائی گئی تھی۔ اب کتب خانہ کی عمارت اور استادوں کے مکانات تو منہدم ہو چکے ہیں البتہ پرنسپل کی اقامت گاہ اور گرجا ابھی حالتِ قدیم پر قائم ہے۔ گرجا اچھی حالت میں ہے۔ یہ گرجا گھر اسی مدرسہ الٰہیات کے استاد مسٹر جی ایم گارڈن کی یادگار میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر شمالی اٹلی کے طرز کا نمونہ ہے۔ جو کمرے باقی رہ گئے ہیں ان میں لاہور کے مختلف اداروں میں پڑھنے والے مسیحی طالب علم رہتے ہیں۔

ریگل سینما کے محاذ میں ٹمپل روڈ اور لارنس روڈ کے چوک پر رومن کیتھولک کیتھیڈرل کی نکاک بوس عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۰۴ء میں بشپ ڈاکٹر گاڈفری نے رکھا تھا اور وہی اس کے بانی تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے اسی سنہ میں انتقال کیا اور انھیں اس کی تکمیل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

اس گرجا کی عمارت رومن طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک بلند مینار، ایک وسیع گنبد اور چند چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ بڑے مینار کی بلندی ۱۶۵ فٹ ہے اور گنبد ۱۲۰ فیٹ بلند ہے۔ یہ گرجا درحقیقت اپنی عظمت و شان کے لحاظ سے رُوما کے بعض گرجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اس کے ستونوں کے لیے آگرہ سے سنگِ سفید منگوایا گیا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں اور نشستیں ساگوان کی لکڑی کی ہیں۔ تمام گرجا کا طول دو سو فیٹ ہے اور تالار کا عرض ۶۸ فیٹ ہے اور اصلی تالار کا طول ۱۲۵ فیٹ ہے۔

اس کی کھڑکیوں کے شیشوں پر مسیحی مقدسین کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جنھیں بلجیم کے ایک مشہور فنکار نے تیار کیا تھا۔ تالاریں دو بڑے خوش قطع مجسمے رکھے ہیں۔ ایک جناب مسیحؑ کا اور ایک حضرت مریمؑ صدیقہ کا۔

اس عمارت کا نقشہ شہزادی ٹورپ (بلجیم) کے ایک ماہر عمارت نے تیار کیا تھا۔ غرض یہ عمارت ۱۹۰۷ء میں بن کر مکمل ہوئی۔

موجودہ سٹیٹ بنک کے قریب ایک گرجا گھر ہے جو اپنی قدامت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ نکلسن روڈ پر برگد والے چوک کے قریب ایک گرجا ہے اور وارث روڈ پر ایک میتھوڈسٹ گرجا موجود ہے مگر یہ دونوں عبادت گاہیں نسبتاً نئی ہیں۔

الغرض لاہور میں یوں تو عیسائی مشنریوں کی آمد بہ عہدِ اکبری ۱۵۹۵ء سے شروع ہو گئی تھی لیکن اس عہد کی کوئی تعمیری یادگار موجود نہیں ہے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے سب سے قدیم عمارت گورنمنٹ کالج کی پشت پر جنہیرلیم کی ہے اور جدید ترین عمارت نولکھا گرجے کی ہے جو پادری ٹھاکر داس صاحب کی کوشش سے تعمیر ہوا ہے۔

کالج

وحید الحسن ہاشمی

متعدد مؤرخین نے لاہور کے متعلق مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ لاہور ایک قدیم شہر ہے اور اس کی تاریخ کی قدامت ہزاروں نکات اپنے سینے میں پنہاں کیے ہوئے ہے۔ یہاں کے باغات، مزارات اور نوادرات اسلاف زمانہ کی تصویر لیے ہوئے ہیں۔ یہاں کی مساجد مسلمانوں کے زریں عہدِ گزشتہ کی یادگار ہیں۔ یہاں کا قلعہ، شالامار باغ، جہانگیر کا مقبرہ مغل دورِ حکومت کی یاد دلاتا ہے حضرت داتا گنج بخشؒ اور میاں میرؒ کے مقابر مسلمانوں کی روحانیت کے علمبردار ہیں۔ یہاں کے کالج تعلیم و تدریس کی ایک ایسی شمع روشن کیے ہوئے ہیں جس کی روشنی سے سارا پاکستان جگمگا رہا ہے۔

لاہور کے کالجوں کی تاریخ ایک ایسا دلآویز موضوع ہے جو لاہور کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اسلام سے قبل لاہور میں تعلیم کا کیا حال تھا۔ اسلامی عہدِ حکومت خصوصاً شاہانِ مغلیہ کے وقت میں یہاں تعلیم کا کیا معیار تھا۔ تعلیم و تدریس کے ذرائع کیا تھے۔ عوام اس نعمت سے کس حد تک مستفیض ہوتے تھے۔ یہاں کتنے مدرسے تھے، طریقہ تعلیم کیا تھا اس زمانے کے طلبا کی ذہنی استعداد کیا تھی۔ یہ اور اسی قبیل کے تمام موضوعات ہماری اس بحث سے خارج ہیں فقط انگریزی دور اور پاکستان بننے کے بعد جو کالج یہاں قائم ہوئے ان کا ذکر ذیل کے مضمون میں کیا جا رہا ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ لاہور کے تمام کالجوں کا تذکرہ اس مضمون میں آ جائے۔ ان کا تعلیمی معیار، تعلیم کے متعلق اساتذہ کی سرگرم کوششیں، طلبا کی تعلیمی دلچسپیاں، کھیل کے میدان میں ان کے کارنامے، جدید طریقہ تدریس کے نتائج، سیکنڈری بورڈ لاہور اور یونیورسٹی کے امتحانات کے نتائج، غرض تعلیم کے متعلق ہر قسم کی معلومات اس مضمون میں شامل کر دی گئی ہیں۔

لاہور کے کالجوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ یہ کالجوں کا شہر ہے۔ یہ شہر اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں سے چھپنے والے اخبارات اور رسائل کی تعداد پاکستان اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

ذیل کے مضمون میں ہم نے فقط ان کالجوں کا ذکر کیا ہے جن کی شہرت تسلیم شدہ ہے اور ان کالجوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو پرائیویٹ طور پر چلائے جا رہے ہیں۔ ان کالجوں کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جن کے کارکنان نے باوجود خطوط روانہ کرنے، ٹیلیفون کرنے اور ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرنے کے ہم سے تعاون نہیں کیا بلکہ ہم سے وعدے بھی کیے لیکن وہ شرمندۂ ایفا نہ ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور، قیام: ۱۸۶۴ء
تعداد طلبہ: ۲۰۰۰

اہلِ ہند کو مکمل غلامی کے طوق میں جکڑنے اور لارڈ میکالے کی مذموم اور متعصبانہ پالیسی پر عمل کرنے کے لیے ۱۸۶۴ء میں لاہور کالج جاری کیا گیا اور اس کا نصاب وہی متعین ہوا جو کلکتہ یونیورسٹی کا تھا گویا بنگال کی تاریخ کو پنجاب میں دہرانے کا ایک اور عزم کیا گیا۔ اسی سال ڈاکٹر لیٹنر کو جو کنگز کالج لندن میں عربی کے پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج کا پرنسپل بنایا گیا۔ شروع شروع میں یہ کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک حصے میں کھولا گیا۔ یہاں کھولنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ضلع اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ہیدی سے کالج کے قیام میں امداد ملتی رہے۔

پہلے سال کالج میں طلبا کی تعداد نو تھی۔ پہلے سال کا نتیجہ سو فی صد تھا بلکہ ہر طالب علم کو دس سے پندرہ روپے ماہوار کے حساب سے وظیفہ بھی ملا۔ چند سالوں کے بعد یہ رقم ۲۰ روپے ماہوار کر دی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس کالج سے ایف اے کا امتحان دینے کے لیے چند طلبا کلکتہ بھیجے گئے جن میں سے ۵ پاس ہوئے، اسی سال عربی پڑھانے کے لیے مسٹر علمدار حسین کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ طلبا میں جرأت اور ہمت پیدا کرنے کے لیے ایک DEBATING SOCIETY بنائی گئی۔ چونکہ کلکتہ یونیورسٹی کا نصاب پنجابی جوانوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لیے ڈاکٹر لیٹنر نے اس نصابِ تعلیم کی سختی سے مخالفت کی۔ ۱۸۶۶ء میں میجر فلر کی جگہ پر کرنل ہالرائڈ کا تقرر ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں اس کالج سے سانجی مل نے بی اے کیا انھیں بعد میں رائے صاحب کا خطاب بھی ملا۔ چونکہ امتحان دینے کے لیے کلکتہ جانا پڑتا تھا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا اس لیے پنجاب یونیورسٹی کی تحریک شروع کی گئی۔ ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کالج کو انارکلی کے قریب ایک بلڈنگ میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تک طلبہ کی تعداد ۴۵ ہو چکی تھی۔ تین سال کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کا تقرر عمل میں لایا گیا جنھوں نے کالج کے نام کو آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا۔ انھوں نے انجمن ہال میں شاعرے کرائے، تنقیدی جلسے منعقد کرائے اور مغربی خیالات سے اردو زبان کو مالا مال کر دیا۔ ۱۸۷۶ء میں یہ کالج اپنی موجودہ عمارت میں آ گیا۔ یہ عمارت تقریباً ۴ لاکھ روپے سے بنائی گئی تھی۔ پرنسپل کی رہائش کے لیے لوئر مال پر ایک بنگلہ تھا۔ ۱۸۸۰ء میں خان بہادر شیخ انعام علی مرحوم نے اس کالج میں داخلہ لیا۔ مرحوم وہی شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ۱۸۸۷ء میں طلباء کے لیے مزنگ میں ایک بورڈنگ ہاؤس کھولا گیا لیکن یہ جگہ کالج سے قدرے دور تھی اس لیے طالب علموں نے اس میں رہنے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۹۷ء میں ایک نیا بورڈنگ ہاؤس کالج ہی کے قریب بنایا گیا۔ اسی سال کالج میں ایک ڈرامیٹک کلب قائم کی گئی جس نے شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے اسٹیج کیے۔ یہ کلب اب بھی بڑی شان و شوکت سے ڈرامے منعقد کرتی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں علامہ اقبال کو صرف ۶ ماہ کے لیے انگریزی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مرحوم انگلینڈ چلے گئے اور ان کی جگہ پر مسٹر نور الٰہی ایم اے کا تقرر ہوا۔ ۱۸۹۸ء سے قبل کالج میں لائبریری تو تھی مگر لائبریرین نہ تھا اسی سال ایک لائبریرین کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں اس کالج کی سالانہ گرانٹ چار سو روپے تھی۔ ۱۹۰۰ء میں اس کالج کی طرف سے ایک میگزین "راوی" کے نام سے جاری کیا گیا جو اب تک بڑی باقاعدگی سے نکلتا ہے۔ اس میگزین کی اپنی پالیسی کوئی نہیں، بلکہ پرنسپل صاحبان کے نظریے کے مطابق اس کا معیار گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اس کالج کی کلب کے لیے لیک روڈ اور ملتان روڈ کے درمیان ایک میدان لیا گیا جو آج یونیورسٹی گراؤنڈ کہلاتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں مسٹر کھوسلا ایم اے کا تقرر ہوا، ۱۹۱۰ء میں لالہ آتما رام ایم اے اس کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کالج کے طلبہ کی تعداد ۶۰۰ کے لگ بھگ تھی اور تین سو طلبا کی درخواستیں نامنظور کی گئیں۔ چونکہ طلبا دور دور سے کھنچ کھنچ کر آ رہے تھے اس لیے ۱۹۲۲ء میں ایک اور بورڈنگ ہاؤس

تعمیر کیا گیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل اس کالج کے پرنسپل سید احمد شاہ بخاری تھے۔ پاکستان بننے کے بعد طلباء کی تعداد گھٹ کر ۱۰۰ رہ گئی اور یہ اندیشہ کیا جانے لگا کہ کہیں کالج ہی نہ ٹوٹ جائے لیکن ۱۹۵۴ء تک یہ تعداد ۱۲۰۰ اور اب ۲۰۰۰ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بخاری مرحوم تھوڑا ہی عرصہ پرنسپل رہے اور بعد میں پاکستان کی طرف سے یو این او میں مستقل مندوب کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت کے ایک آرڈر سے طلباء کا داخلہ میٹرک کے امتحان کے نمبروں کے معیار سے ہونے لگا لیکن اس طریقہ کار کے نتائج اچھے نہ نکلے کیونکہ اس طرح ہر وہ نقال طالب علم یا رٹو لڑکا جو زیادہ نمبر حاصل کر لیتا تھا ذہین سمجھا جاتا تھا اور داخلہ کا مستحق ہو جاتا تھا۔ اگلے سال اس طریقے میں تبدیلی ہوئی یعنی ۷۰ فی صد امتحان کے نمبروں پر اور ۳۰ فی صد کالج کے اساتذہ کی صوابدید پر۔ ۱۹۵۸ء میں اس کالج کا نتیجہ بے حد خراب نکلا اور یہ یقین کر لیا گیا کہ محض نمبروں پر داخلہ فعلِ عبث ہے۔

عام طور سے اس کالج کو ٹوڈی کالج کہا جاتا ہے صرف اس لیے کہ اس کالج کے بہت سے فارغ التحصیل طلبہ بڑے لوگوں کے بچے ہوتے تھے مگر آج کل اس کالج میں غریب طلبا کی تعداد بہت ہے۔

۱۹۴۷ء میں کالج کے اسٹاف ممبر تقریباً ۵۰ تھے لیکن نئے مضامین کی وجہ سے یہ تعداد بڑھتی گئی اور اب ۱۰۰ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس تعداد میں سے ۴۲ فی صدی ایسے اساتذہ ہیں جن کے پاس فارن ڈگریاں ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے اساتذہ میں اب صرف ڈاکٹر نذیر ہی رہ گئے ہیں جو پرنسپل ہیں۔

اس کالج میں بہت سی انجمنیں ہیں لیکن سب سے بڑی اور اہم COLLEGE UNION ہے جس کے تمام عہدے دار منتخب ہوتے ہیں۔ الکشن کے موقع پر بڑا ہنگامہ ہوتا ہے، وعدے وعید ہوتے ہیں، ووٹ توڑے جاتے ہیں، رشوتیں دی جاتی ہیں، نئی دوستی کے عہد استوار ہوتے ہیں، پرانی دوستی کے ٹوٹنے کی جھنکاریں آتی ہیں، کبھی کبھی اصول کے نام پر ووٹ مانگے جاتے ہیں اور کبھی برادری کے نام پر، لیکن اس تمام ہنگامے میں اساتذہ خاموش رہتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے "WE SEE NOT WE HEAR NOT" اس یونین کے تحت بڑے بڑے مباحثے ہوتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی بہ ٹرافیاں اس کالج کے حصے میں آچکی ہیں۔ کالج میں ایک مجلسِ اقبال بھی ہے جو ہر جمعرات کو ۴ بجے شام کالج کے ایک مخصوص کمرے میں اپنا اجلاس کرتی ہے۔ اگرچہ اس مجلس کی رونق لاہور کی بڑی بڑی ادبی ہستیاں ہوتی ہیں لیکن طلباء میں یہ مجلس جمعراتی کلب کے نام سے مشہور ہے ——— فائن آرٹ سوسائٹی تصویروں کی نمائش کا انتظام کرتی ہے۔ ڈرامیٹک کلب سال میں دو ڈرامے اسٹیج کرتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسے کردار سامنے آتے ہیں جن پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ جاگرافیکل سوسائٹی ملک کا سروے کرتی ہے۔ بزمِ فارسی کے ممبران ایران تک پہنچ گئے۔ ہسٹاریکل سوسائٹی کے طلبہ کاغان، سوات، کشمیر، کراچی کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔

کھیل کے میدان میں یہاں کے طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ BOXING کے علاوہ ہر کھیل کھیلا جاتا ہے۔ باکسنگ اس لیے بند کر دیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے اسی سلسلے میں ایک طالب علم کی جان چلی گئی تھی۔ کرکٹ اس کالج کا روایتی کھیل ہے خصوصیت سے گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کا میچ دیکھنے کے لیے یونیورسٹی گراؤنڈ بھری ہوتی ہے۔ میچ کے درمیان آوازے کسے جاتے ہیں، جملہ بازیاں ہوتی ہیں لیکن بعد میں دونوں پارٹیاں ہنسی خوشی چائے پیتی ہیں۔

اس کالج کی اہم پاکستانی شخصیتوں میں بخاری مرحوم کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھیں معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا تھا۔ بے تکان

گفتگو کرتے تھے اور ہزاروں کے شیدائی تھے۔ انشا پردازی ان کا فن تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اپنی حاضر جوابی سے لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ مسٹر کرامت جو کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اسی کالج میں پروفیسر تھے چونکہ مغرب میں تعلیم پائی تھی مغربیت میں رنگے گئے۔ قاضی محمد اسلم مرحوم نرم طبیعت کے انسان اور فلسفہ کے ایم۔ اے تھے۔ لوگوں سے تعلقات بڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ پروفیسر سراج صاحب تعمیرات کے بے حد شوقین ہیں ان کے دور اقتدار میں روز گارڈن بنا۔ بارہ دری بنی اور کالج گراؤنڈ میں بھی توسیع ہوئی۔ ہر طالب علم سے اس کے مزاج اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ خواجہ منظور احمد کی وضع قطع کم سخن، متحمل اور اردو کے بہترین ادیب ہیں۔ کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج اور ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق انگریزی کے پروفیسر اور اردو کے نامور ادیب آہنی ڈسپلن کے مالک۔ آج کل دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہیں۔ سید کرامت حسین جعفری فلسفے کے استاد ہیں۔ نفسیات کی ابتدائی کتابیں لکھ کر بڑا نام پیدا کیا۔ ان کتابوں کا ترجمہ ہندی زبان میں بھی ہوا ہے۔ آج کل لائل پور میں پرنسپل ہیں۔ کسی زمانے میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر اثر بھی تھے۔ علامہ اقبال پر بے جھجک تنقید کرتے تھے۔ سنا ہے کہ جب لاہور آئے تھے تو سب سے پہلے مزار اقبال کی زیارت کو گئے تھے۔ پروفیسر سلطان نباتیات کے پروفیسر ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر اے حمید تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں۔ ان میں جذبۂ حریت اور دماغ میں قومی شعور کا احساس رچا بسا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک ملک کے باہر رہے۔ جب تک کسی مسئلے پر عبور نہ ہو اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔ خود پرنسپل صاحب حیوانیات کے پروفیسر ہیں۔ سادہ مسکین طبیعت قومی روایات سے گہری وابستگی ہے۔ سائنسی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے کے زبردست حامی۔ اردو کے انشا پرداز اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حامی۔

اورینٹل کالج لاہور (قیام ۱۸۷۲ء)

اگرچہ لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے میں اہلِ ہند و پاک کو ایک مخصوص نظام تعلیم میں منسلک کرنے کا انتظام کر لیا گیا تھا لیکن اس نظام کو تدریجاً ایک ایک صوبے میں پھیلایا گیا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے پاؤں سرزمینِ پنجاب میں گڑنے لگے۔ ۱۸۵۴ء میں پنجاب میں ایک تعلیمی محکمہ کھولنے کی سفارش بھی کی گئی اور ۱۹۵۶ء میں یہ محکمہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کام کرنے لگا۔

ڈاکٹر لیٹنر کی آمد سے پنجاب کے ادبی حلقوں میں ایک جان سی پڑ گئی۔ ڈاکٹر لیٹنر علوم مشرقیہ کے رسیا تھے۔ ادبی تاریخ کا ذوق ازل سے لے کر آئے تھے۔ پنجاب آ کر انھیں یہاں کے عربی اور فارسی دان حضرات سے ملنے کا موقع ملا ان کا یہ خیال تھا کہ اگر مشرقی زبانوں کا پودا اس سرزمین پر لگایا گیا تو چند ہی برسوں میں اس کے پھل پھول لانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اسی خطے میں ایک مجلس "انجمن پنجاب" کے نام سے تشکیل کی۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مشرقی زبانوں کے رس کو انگریزی زبان میں گھول دیا جائے۔ ان کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ہر قوم کو اسی کی قومی زبان میں تعلیم دینی فلسفۂ عمرانیات کا ایک زریں اصول ہے۔ ان کے خیال میں انگریزی کی نشوونما مشرقی زبانوں کے ساتھ وابستہ ہے الگ نہیں۔ ۱۸۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا اعلان ہوا۔ انجمن پنجاب نے چند اور ادارے بھی اپنی تحویل میں لے رکھے تھے جنھیں بعد میں صرف اس لیے بند کر دینا پڑا کہ جس فنڈ سے یہ ادارے چلائے جا رہے تھے اس کا تعلق یونیورسٹی کالج سے تھا۔ ۱۸۷۰ء میں لوگوں کو علوم مشرقی سے روشناس کرانے کے لیے اورینٹل کالج کھولا گیا اور ۱۸۸۲ء میں اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ چونکہ اس کالج کے پاس اپنی کوئی عمارت نہ تھی اس لیے اسے گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت میں کچھ عرصے

کے لیے رہنا پڑا' اس وقت اس کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل تھے :-

۱ - مشرقی علوم و فنون کی ترقی

۲ - دیسی زبانوں کی حوصلہ افزائی

۳ - اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر اورینٹل کالج اور مشرقی زبانوں کا بیج ہی واسطہ نہ ہوتا تو یونیورسٹی کو یہ امداد جو پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے نے دی نہ مل سکتی - کچھ عرصے تک اس کالج میں طب یونانی اور آریہ وید کی جماعتیں بھی ہوتی رہیں لیکن یہ پروگرام کچھ مدت کے بعد بند کر دیا گیا ۱۹۱۹ء کے بعد عربی' سنسکرت اور فارسی کی ایم - اے جماعتیں بھی اسی کالج سے متعلق کر دی گئیں - ۱۹۲۸ء میں اردو و ہندی اور پنجابی کے لیے لکچرار مقرر کیے گئے - پاکستان کے قیام سے پہلے یہ ادارہ اپنے تحقیقی عمل' تنقیدی کام اور تدریسی مشاغل کی وجہ سے شمالی ہندوستان کا سب سے بہتر ادارہ متصور ہوتا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس کی بساط الٹ گئی' ہندی' سنسکرت اور پنجابی کے اکثر پروفیسر ہندوستان چلے گئے - قیام پاکستان کے بعد ملک کی زبان اردو قرار پائی اس لیے ۱۹۴۷ء میں اردو ایم - اے' ادیب عالم اور ادیب فاضل کی کلاسیں کھولی گئیں - کچھ عرصہ کے بعد ہسپانوی' رومی' فرنچ اور جرمنی' زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے - خیال ہے کہ آئندہ ترکی' پشتو اور پنجابی کی بھی باقاعدہ تدریس شروع کر دی جائے گی -

اپنے زمانۂ قیام سے آج تک اس کالج نے جو وعدے کیے تھے انھیں پورا کیا - آج بھی کلاسیکی ادب پر ضخیم ضخیم کتابیں اسی ادارے سے شائع ہوتی ہیں - کسی زمانے میں اس کالج کے طلبا سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی جس کا بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگ اپنے علمی ورثے کو بخوبی حاصل کرتے تھے - چونکہ علم کی پیاس میں شدت تھی' خلوص بھی تھا اس لیے بہتر سے بہتر ماہرین فن اس ادارے سے منسلک رہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں اور جریدے یہاں سے نکلتے رہے جن میں سے چند کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے -

۱ - ڈاکٹر لیٹنر کی کتاب سنین اسلام جدید اسلامی رنگ کی پہلی کتاب ہے -

۲ - سر ارل ساٹن آثار قدیمہ کے ماہر تھے اور اس فن پر کافی مواد جمع کر گئے ہیں -

۳ - ڈاکٹر وولنر نے پراکرتوں پر محققانہ کام کیا ہے -

۴ - مولوی فیض الحسن کی شرح معلقات دنیائے ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے -

۵ - مولانا عبدالعزیز میمن کی ابوالعلاء المعری کے متعلق تصنیف مصر و عرب کے علماء سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے -

۶ - پروفیسر شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' ہمارے ادبی ذخیرے کا ایک گراں بہا حصہ ہے -

۷ - ڈاکٹر محمد شفیع نے لاہور کی تاریخ پر اتنا مواد جمع کر دیا اور فن خطاطی پر اتنے مقالے تحریر کیے ہیں کہ طلبا ان سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں -

۸ - پروفیسر اقبال کی آئینہ دانش' اور مولوی انعام علی کی 'مخزن الحکمت' نایاب کتابیں ہیں ——— اس کے علاوہ موجودہ اساتذہ نے بھی کئی کام کی کتابیں لکھی ہیں -

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر شفیع کی کوششوں سے ایک ریسرچ جرنل بھی جاری ہوا تھا جو تا دم تحریر نکل رہا ہے - اس کالج سے ایک

سہ ماہی رسالہ "یونیورسٹی کالج میگزین" بھی نکلتا ہے جو پاکستان و ہندوستان میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی لاج رکھے ہوئے ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ڈاکٹر برکت علی قریشی اس کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر عبداللہ نے اس کالج کی ذمہ داری سنبھالی اور آج تک اسی آن بان سے اپنے فرضِ منصبی کو سرانجام دے رہے ہیں۔

موجودہ اسٹاف نہایت قابل اور ذی علم پروفیسروں پر مشتمل ہے اور تعلیم کے ہر میدان میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ سہل انگاری کے مقابلے میں دشوار پسندی کے قائل ہیں۔ ان کی طبیعت میں تحقیق اور تنقید کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن زمانے کی موجودہ روش اور خصوصیت سے پاکستان کا ادبی ماحول ہر فنِ طلائیت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں بعض حضرات ڈاکٹر صاحب کی اس "دشوار سلیقہ پسندی" کے قائل نہیں۔

اس کالج میں طلبا کی تنقیدی مجالس ہوتی رہتی ہیں جن کا معیار بہت پست ہے، غالباً سبب یہ ہے کہ اساتذہ کے مشاغل اتنے زیادہ ہیں کہ وہ طلبا کے ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہیں پاتے۔ گاہے ماہے اس کالج میں عظیم اجلاس بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں اکثر کا مقصد قومی زبان کی نشوونما اور مشرقی علوم کا ارتقاء ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اردو زبان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں طبی اور سائنسی تعلیم دی جا سکے ان کا صحیح اور معقول جواب اس کالج نے سائنسی علوم پر اردو میں تقریریں کرا کے مہیا کر دیا ہے، درس و تدریس کے سلسلے میں دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخر میں ایک پنج روزہ کانفرنس بلائی گئی جس میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ اردو کا صحیح مقام کیا ہے اور تدریسِ اردو کے ذرائع اور طریقے کیا ہونے چاہئیں۔

سنٹرل ٹریننگ کالج

قیام: ۱۸۸۰ء
تعداد طلبہ: ۳۸۰

اگرچہ انگریزی زبان کی درس و تدریس ۱۸۵۷ء سے قبل شروع ہو چکی تھی لیکن پنجاب میں ۱۸۶۰ء سے پہلے اس اسکیم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ گورنمنٹ کالج کے قیام کے بعد اچھے استادوں کا مسئلہ حکومت کے زیرِ غور رہا کیونکہ اچھے طالب علم کے لیے اچھا اور تربیت یافتہ استاد بھی ضروری ہے۔ پرائمری جماعتوں کے لیے ایک نارمل اسکول کھل چکا تھا لیکن انگریزی طرز کا کوئی کالج نہ تھا جس میں باقاعدہ تعلیم و تعلّم کے مسائل حل کیے جائیں۔

ایک ٹریننگ کالج کے قیام کی وجہ طلبا کی روز افزوں تعداد بھی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلّم کا فن ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۱۸۸۰ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور پروفیسر ڈوک کو جو گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے، پرنسپل کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ اس کالج کی اپنی کوئی عمارت نہ تھی اس لیے شروع شروع میں حضوری باغ کے ایک حصے میں رہا، بعد میں گورنمنٹ کالج کی عمارت میں منتقل ہو گیا چونکہ ابتدائی دور کے طلبا کو گورنمنٹ کالج میں بھی وظیفہ ملتا تھا اور اس کالج میں بھی اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہی طالب علم ہر دو مقام پر وظیفے لیتا تھا۔ اس دو عملی کو بند اور ٹریننگ کالج کی اپنی فضا پیدا کرنے کے لیے ۱۸۸۸ء میں یہ کالج اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہوا۔ ابھی تک اس کالج میں بی۔ٹی کی کلاسیں نہ تھیں بلکہ نارمل اسکول کی تعلیم کا معیار پیشِ نظر تھا۔ پروفیسر ڈوک کے بعد ہیڈن کوپ اس کالج کے پرنسپل ہوئے اور ۵ سال تک اس عہدے پر رہے۔ انھوں نے کالج کی عمارت میں توسیع کی اور اپنا زیادہ کام اپنے جانشین ایچ ٹی نولٹن کے سپرد کر دیا۔ پروفیسر نولٹن وہ فاضل اور قابل ایڈمنسٹریٹر ہیں جنھوں نے کالج کو کالج بنا دیا اور آج جو سرگرمیاں ہمیں اس کالج میں نظر آ رہی ہیں وہ انھی کے ذوقِ عمل کی رہینِ منت ہیں ۱۸۹۳ء میں وہ اس عہدے پر آئے اور ۱۹۱۹ء تک اسی کالج میں بطور پرنسپل کام کرتے رہے گویا اپنی ساری عمر اسی کالج پر قربان کر دی۔ انھوں نے اس کالج کو ماڈرن لائنز پر چلانے کا تہیہ کیا اور جدید نفسیات سے کام لیتے ہوئے پہلی بار تعلیمی نفسیات کا ایک مضمون اور بڑھا دیا۔ ان کا

یہ خیال تھا کہ اگر استاد تعلیمی نفسیات کا ماہر نہیں تو کلاس روم میں اپنے طلبہ سے کام نہیں لے سکتا۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ محض سلیبس کی کتابوں کا مطالعہ نہ کرے بلکہ بچوں کو اپنے تجربات اپنے علم اور اپنے مشاہدے سے ایسی ایسی متعلقہ باتیں بتا دے جو سلیبس کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ہوتیں اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک استاد کا اپنا مطالعہ وسیع اور اپنی نظر کشادہ نہ ہو۔ اساتذہ میں کشادگی نظر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کالج کے انتظامی ڈھانچے کو از سر نو ترتیب دیا اور ایک قاعدے کی رو سے طلبہ کو یہ حکم دیا کہ وہ کلاس میں جانے سے پہلے اسباق کی تیاری کر لیں۔ الفاظ و محاورات کے مقاصد سمجھ لیں اور ذہنی طور پر تیاری کرنے کے بعد اسے صفحۂ قرطاس پر بھی آ جانا چاہیے۔ گویا LESSON NOTES کا موجودہ قاعدہ سٹرٹن کے دماغ کی اختراع ہے۔ وہ عمل کے رسیا اور حرکت کے پجاری تھے محض نظریاتی تعلیم کو وہ افلاطونی تعلیم سمجھتے تھے اس لیے عملی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے بی۔ ٹی کی پہلی کلاس جاری کی۔ ان کے زمانے میں بی۔ ٹی، ایس۔ اے وی، ایس وی، کلریکل کمرشل سرٹیفکیٹ کلاس سینئر ورناکیولر کلاس اور ڈرائنگ ماسٹرز کلاسیں تھیں۔ زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے ایک ماڈل اسکول ضروری تھا اس لیے انہی کے دور میں ایک سنٹرل ماڈل اسکول اس کالج سے متعلق کر دیا گیا۔ تیاری کے لیے زیرِ تربیت اساتذہ کو ایک کتاب دے دی جاتی تھی۔ وہ دو ایک دن پہلے اس کتاب کے جملہ محاسن کو دیکھ بھال لیتا تھا اور جب اسے کلاس روم میں بھیجا جاتا تھا تو دیگر اساتذہ کو اس پر تنقید کرنے کے لیے روانہ کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے اساتذہ چار گروہوں میں تقسیم ہو جاتے تھے ایک گروہ موادِ سبق کی جانچ کرتا تھا، دوسرا تلفظ زبان کی، تیسرا ادائے مطالب یا طریقۂ بیان کی، چوتھا تنقیدی معیار پیشِ نظر رکھتا تھا۔ یہ چاروں گروہ نام محاسن و معائب اپنی اپنی کاپیوں پر لکھتے جاتے تھے تاکہ اس زیرِ تربیت استاد کی اصلاح ہو جائے۔ اس سے ایک طرف تو اصلاحِ حال ہوتی تھی تو دوسری طرف مقابلے اور " COMPETION " کا شوق ابھرتا جاتا تھا۔ یہ طریقۂ تعلیم اگرچہ آج بھی رائج ہے لیکن ترمیم کے ساتھ بلیک بورڈ کا سب سے پہلے استعمال انہی کے دور میں ہوا تاکہ بچے اندرونِ نظر کے علاوہ ظاہری نظروں سے بھی کام لیں اور اسباق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کالج کا پنجاب یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق ۱۹۰۴ء میں ہوا اور ۱۹۰۶ء میں پہلا بی۔ ٹی کا امتحان ہوا۔ اس سے پہلے ایس اے وی اس کالج کی اعلیٰ جماعت تھی۔ انہی کے زمانے میں کالج کی بعض سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ کالج میگزین اسی وقت سے نکلنا شروع ہوا۔ کالج میں شیکسپیئر سوسائٹی قائم ہوئی۔ ہسٹاریکل اور جیاگریفیکل سوسائٹیز بنائی گئیں۔ کالج میں ڈسپلن کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ ٹائم ٹیبل از سرِ نو مرتب ہوا۔ نصاب میں وسعت دی گئی اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان زیرِ تربیت اساتذہ کے کھیل کا بھی بندوبست کیا گیا۔ کالج سے متصل ایک کرکٹ گراؤنڈ بنائی گئی اور ہفتہ میں دو بار کھیل ضروری کر دیا گیا تاکہ جسمانی ورزش ہوتی رہے۔ شروع شروع میں بی ٹی کا دو سالہ کورس تھا لیکن بعد میں ایک سال کر دیا گیا۔ یہاں کے پاس شدہ S.A.VS مڈل اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہو سکتے تھے۔ J.A.VS پرائمری اسکولز میں ہیڈ ماسٹر بن سکتے تھے۔ ایس۔ وی صرف ورناکیولر اسکولوں میں کام کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں ڈرائنگ کی تعلیم ضروری ہو گئی تھی اس دور میں ٹیکنیکل تعلیم کا زور رہا۔ سخت ڈسپلن اور فوجی پریڈ کی سختی کی وجہ سے چونکہ طلبا اسے سنٹرل جیل کہتے تھے اس لیے طلبا کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۰۶ء میں یہ وظیفہ اور بڑھا دیا گیا۔ طریقۂ تعلیم میں یوں تو تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن اسی زمانے سے ڈائرکٹ میتھڈ شروع کیا گیا۔ ایس وی کے لیے شام کی کلاسیں بھی جاری کر دی گئیں اور MANUAL WORK ضروری قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں معیار سخت ہو گیا۔ اب ایم اے بھی آنے لگے اور " UNTRAINED " اساتذہ بھی کثرت سے داخلہ لینے لگے۔ ۱۹۱۹ء میں مسٹر وائٹ پرنسپل بنے۔ ۱۹۲۱ء میں WOOD WORK بھی شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کالج میں صرف بی۔ ٹی، ایس۔ اے۔ وی اور

جے۔ اے۔ وی کی کلاسیں رہ گئیں۔ مسٹر وائٹ ریفریشر کورس کے بڑے مداح تھے۔ اسی سال ریفریشر کلاسیں بھی جاری کی گئیں۔ مسٹر وائٹ نے تدریسِ انگریزی پر ایک مستند کتاب لکھی ہے جو اس فن کی بہترین کتاب شمار کی جاتی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہائٹ ہاؤس پرنسپل ہوکر آئے۔ ان کے زمانے میں فزیکل ٹریننگ شروع ہوئی۔ جو طلباء پاس ہوتے تھے نارمل اسکولوں میں بھیج دیے جاتے تھے۔ ان کے دور میں ملٹری ڈرل ضروری قرار پائی۔ ۱۹۲۷ء میں پارکنسن پرنسپل ہوئے۔ انھوں نے میٹرک کے طلباء کے لیے ایک نظم کی کتاب تالیف کی تھی جو ۱۹۲۰ء میں تبدیل ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں کیمپ ٹریننگ لازمی ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں جے۔ اے۔ وی کا اس کالج سے خاتمہ ہوا۔ اسکالرشپ کی تعداد دس کر دی گئی۔ چونکہ یہ زمانہ مالی مشکلات کی وجہ سے پُرآشوب ہو رہا تھا اور طلبا کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی اس لیے اب زیرِ تربیت اساتذہ سے فیس بھی لی جانے لگی۔ ایس۔ اے۔ وی کی فیس ۱۵ روپے مقرر ہوئی اور بی۔ ٹی کی ۲۰ روپے۔ اس زمانے میں کافی تعداد میں ایم اے، ایم ایس سی آنے لگے۔ لڑکیاں بھی ٹریننگ حاصل کرنے لگیں اور یہ سلسلہ ۱۹۳۲ تک اس کالج میں کو ایجوکیشن ہوتی رہی۔ پی۔ ٹی ماسٹروں کی کلاس بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں او۔ ٹی کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں لیکن ۱۹۳۱ء میں بند کر دی گئیں۔ ۱۹۳۲ء میں لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کھلا۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے الحاق ہوا اور باقاعدہ نام لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج پڑا۔

کالج کی بہتری کے لیے مسٹر پارکنسن نے ڈسپلن بورڈ، ہیلتھ بورڈ، ادبی بورڈ، کھیلوں کے الگ الگ بورڈ بنوائے۔ سائنس ایسوسی ایشن کا قیام بھی انھی کے زمانے میں ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں خان بہادر نور الٰہی پرنسپل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں چٹرجی کو چارج دے کر رخصت ہوئے۔ اس دور میں آرٹ اور کرافٹ کی کلاسیں شروع ہوئیں۔ کالج کا میگزین SWAN کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ اسی دور میں پنجاب ایجوکیشن جرنل بھی نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں نصابِ تعلیم میں پھر تبدیلی آئی اور کالج میں ہندی، اُردو زبانیں بھی پڑھائی جانے لگیں۔

ڈائرکٹ میتھڈ چونکہ مادری زبان کی نفی کرتا ہے اس لیے اس طریقۂ تعلیم کو اپنانے کے لیے کالج سے ملحقہ عمارت میں ۱۹۴۴ء میں ایک جونیر ماڈل اسکول قائم کیا گیا اور کالج کے طلباء اس اسکول سے تجربہ حاصل کرنے کے لیے کنڈر گارٹن طریقۂ تعلیم کے اصول اپنانے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں ایس۔ اے۔ وی کی کلاسیں بھی ختم کر دی گئیں اور کالج میں صرف بی۔ ٹی کی کلاس رہ گئی۔ ۱۹۴۶ء میں چٹرجی کے ریٹائر ہونے پر مسٹر شریف پرنسپل بنائے گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بی۔ اے ہاشمی صاحب اس کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ان کے عہد میں حکومت مسلمانوں کی تھی، انتظام مسلمانوں کا تھا، اساتذہ مسلمان تھے، طلبا مسلمان تھے غرض کالج کی ساری فضا اور سارا ماحول مسلمان تھا۔ اب نظریوں میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ شعورِ آزادی بیدار ہوا۔ سب سے پہلے انھی کے عہد میں اسلامیات کی لازمی تعلیم جاری کی گئی۔ عیسائی اور غیر اقوام کے طلبا کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ انگریزی مسائل کی جگہ پاکستانی مسائل نے لے لی۔ اُردو زبان کو سہارا ملا۔ ۱۹۴۸ء میں ہسٹری آف ایجوکیشن کا ایک پرچہ اور بڑھا دیا گیا۔ ہر شعبہ اور ہر مضمون کی کتابیں سلیس اُردو زبان میں شائع کی گئیں۔ مسٹر علوی نے تعلیمی نفسیات پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔ حاجی فضل احمد نے تدریسِ تاریخ و شہریت پر بڑے پیارے انداز میں اُردو میں ایک کتاب لکھی۔ ڈاکٹر فارانی نے اُردو زبان اور اس کی تعلیم پر ایک لاجواب کتاب لکھی۔ کئی سال کے بعد اسی کتاب پر موصوف کو یونیورسٹی نے انعام دیا۔ پروفیسر معزالدین نے تدریسِ ریاضی

کے نام سے اردو میں ایک کتاب شائع کی۔ فضل محمد نے ثانوی مدارس کا نظم و نسق کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ ۱۹۵۰ء میں عملی اردو کو ضروری قرار دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد بی۔ٹی کے طلبہ کو ۵۰ روپے اور سی۔ٹی کے طلبا کو ۳۰ روپے وظائف ملنے لگے۔ سی۔ٹی کلاسیں ۱۹۴۹ء میں کھلی تھیں اور ۱۹۶۰ء میں بند کر دی گئیں۔ ۱۹۵۵ء میں مخدومی صاحب پرنسپل بنے۔ آپ دینیات کمیٹی کے سیکرٹری بھی تھے۔ آپ کے عہد میں امریکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر شیورنگ اسباب تعلیم کا درس دینے کے لیے تشریف لائے۔ آپ ہی کے دور میں کالج کا ایک نیا ہوسٹل بنا اور طلباء کی تعداد ۱۵۰ سے تجاوز کر گئی۔ ۱۹۵۹ء میں نامدار خاں صاحب پرنسپل بنے۔ ان کے عہد میں نصاب تعلیم پھر بدلا۔ ہر شعبۂ حیات میں تصور پاکستان کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اختیاری مضامین میں اضافہ ہو گیا۔ ایک جنرل سائنس کا پرچہ مزید بڑھا دیا گیا۔ یوں تو سمعی بصری امداد ہر دور میں ضروری سمجھی گئی لیکن اس زمانے میں اس بات پر بڑی توجہ دی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں نامدار خاں صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن حیدر آباد بنا دیے گئے اور ان کی جگہ پر اسی کالج کے دیرینہ طالب علم پروفیسر خواجہ عبدالحمید پرنسپل بن کر آئے۔ آپ کے آنے سے شاہی رعب و دبدبہ کی فضا کا خاتمہ ہوا اور عوام دوستی کا دور دورہ شروع ہوا۔ آپ کی کوشش ہے کہ اس کالج کو ایک مثالی کالج بنا دیا جائے۔ چونکہ موجودہ اسٹاف اسکولوں کے پرانے اساتذہ پر مشتمل ہے اور باہر کی دنیا کا کوئی شخص یہاں نہیں آسکتا اس لیے معیار تعلیم میں روز بروز انحطاط آتا جا رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اچھے آدمی جہاں سے ملتے اس کالج کو ترقی دینے کو سہارا دینے کے لیے یہاں ملازم رکھ لیے جاتے اور پھر اندازہ ہوتا کہ صحیح اور موزوں ترین اساتذہ اس کالج کو کہاں سے مل سکتے ہیں۔ اس کالج میں تعلیمی کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ادبی مجلس بھی ہے لیکن بے عمل۔ طلبہ تفریح کے لیے دوسرے صوبوں میں جاتے رہتے ہیں اور اس کام پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ موجودہ پرنسپل صاحب جن پر بس کم ہیں اور طالب علم زیادہ، چاہتے ہیں کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا ہم پلہ بنا دیا جائے اور یہاں تحقیقی اور تدریسی کام ہو تاکہ دوسرے ممالک میں پاکستان کی کوئی اہمیت ہو۔ اساتذہ کی بڑی تعداد خارجی ڈگریوں کی مالک ہے۔ اس وقت تعداد طلبا ۸۰۰ ہے لیکن جگہ کی قلت ہے۔ سنا گیا ہے کہ یہ کالج وحدت کالونی کے قریب اپنی نئی بلڈنگ میں منتقل ہو رہا ہے اور گورنمنٹ کالج کی ایف۔اے کلاس یہاں آ رہی ہے۔

فورمین کرسچین کالج (ایف سی کالج)

قیام: ۱۸۶۶ء
تعداد طلبہ: ۱۰۰۰

حکومت برطانیہ کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ کسی کے مذہب میں ڈائرکٹ کوئی دخل نہ دیا جائے۔ انگلینڈ ہو یا ہندوستان و پاکستان انگریزوں نے کبھی کھل کر کسی مذہب پر چوٹ نہیں کی۔ ہندوستان میں لارڈ ولیم بینٹنگ کے زمانے میں فارسی اور عربی رسالوں کے بجائے انگریزی زبان پر زور دیا جانے لگا۔ اس زبان کی کماحقہ ترویج کے لیے انگریز مشنریوں کی ضرورت تھی یہی سبب ہے کہ جن جن علاقوں میں ان مشنریوں کو بھیجا گیا انھوں نے انگریزی تعلیم و تعلم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے کچھ دنوں کے لیے مشنریوں کی تبلیغ کی کمر توڑ دی لیکن چند ہی سالوں میں مشنریوں کا ایک قافلہ پھر اس غرض سے ہندوستان روانہ کیا گیا کہ وہ آہستہ آہستہ تبلیغ مذہب و زبان کریں۔ پنجاب میں جو تین پادری اس اہم مقصد کے سبب آئے تھے ان میں چارلس ڈبلیو فورمین کا نام نامی سرفہرست ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جس کے نام پر آج بھی ایف سی کالج فخر کرتا ہے۔

اس کالج کا درحقیقت نام مشن کالج تھا جو آج بھی مشن اسکول کے نام سے رنگ محل میں موجود ہے۔ اس کالج کو ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا تھا لیکن تین سال کے بعد اسے بند کر دیا گیا اور پھر ۱۸۸۶ء میں فورمین کرسچین کالج کے نام سے جاری کیا گیا۔

ڈاکٹر فورمین حقیقت میں ایک ولی تھے۔ ان کا دل ریاست پاک اور دردِ انسانیت سے لبریز تھا۔ خلقِ خدا کی خدمت ان کا نصب العین، غرض ان کا مرنا جینا خود ان کے لیے نہیں بلکہ لاہوریوں کے لیے تھا۔ وہ خود کہتے رہتے کہ "میرے لیے خاکِ لاہور کا ہونا ہوتا ہے۔" انھوں نے ایف سی کالج بنا کر قوم کی وہ خدمت کی ہے کہ آج بھی ہندوستان و پاکستان کے لوگ ان پر فخر کرتے ہیں اور یہاں کے طلباء اپنے کو فارمنائٹ کہلاتے ہوئے جھجکتے نہیں فخر محسوس کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک اس کالج میں طلبہ کی تعداد ۱۰۰ سے زائد نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے اس کالج کے خلاف فتوے دیے اور اس کی ٹکر پر اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج کھڑے کرنے کی فکر میں مشغول ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس اندازِ فکر سے فائدہ اٹھایا اور دھڑا دھڑ انگریزی سیکھنے کے لیے اس کالج میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں کو ہوش آیا لیکن بعد میں۔ ہندوؤں میں سوامی رام تیرتھ جنھیں راوی کی موجیں بہا لے گئیں بڑی عزت و احترام کے مالک تھے، مسلمانوں میں پروفیسر سراج الدین بڑی روحانیت کے حامل تھے لیکن تبدیلیٔ مذہب نے ان کے ذات پر ٹھیس لگائی۔

ڈاکٹر فورمین کے بعد اس کالج کے سب سے بڑے شہسوار ڈاکٹر جیمس ایونگ ہیں۔ انھوں نے اس کالج کو زمین سے اٹھا کر آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا۔ خود سات سال تک پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور عرصہ دراز تک امریکہ میں بورڈ آف فارن مشن کے صدر بھی رہے۔ ان کے بارے میں یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر امریکہ میں ہوتے تو امریکی سینیٹ کے صدر ہوتے۔ انہی کی یاد میں نیلے گنبد کے قریب ایک ایونگ ہال تعمیر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ایونگ کے بعد ڈاکٹر لوکاز (LOCAS) آئے اور ۱۹۴۶ء تک اس کالج سے وابستہ رہے۔ وہ رسوم و قیود کے خلاف اور اپنی دھن کے پکے انسان تھے یہ انہی کی ذات تھی کہ موجودہ عمارت میں کالج دکھائی دے رہا ہے۔ خوشنما باغات، دلفریب روشیں اور شاندار ہوسٹل ڈاکٹر لوکاز کے ادنیٰ کارنامے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس کالج کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر آر ایم ایونگ ہیں۔ انھوں نے کالج کا وقار بلند کیا۔ پاکستان بننے سے قبل (۱۲) کالج میں ۸۰۰ ہندو، ۳۰۰ سکھ اور ۲۰۰ مسلمان تھے۔ تقسیم کے بعد اس کالج کے طلباء کی تعداد ۲۵۰ رہ گئی مگر موجودہ تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔ یہ موجودہ پرنسپل کی دور اندیشی اور دیانت ہے کہ یہ کالج لاہور کیا ایشیا کا سب سے بہتر کالج ہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ تجویز تھی کہ اس کالج کو بیروت کی طرز پر امریکن یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے لیکن یہ تجویز نامکمل رہی اور اب کالج اسی آن بان سے پاکستانی طلباء کی ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔ سردست کالج کا اسٹاف ۷۰ اساتذہ پر مشتمل ہے۔ کالج کی گراؤنڈ سے متصل ایک یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال بھی ہے جسے قیامِ پاکستان کے موقع پر مہاجرین کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ یہاں رات دن کی سروس ہوتی تھی تاکہ مجروحین اور دیگر مریضوں کو علاج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ یہ اسپتال ڈاکٹر نیبلس نے جاری کیا تھا۔

کالج کے وسیع باغ میں ایک مسجد رضوان ہے جسے صدر شعبہ تاریخ پروفیسر بھٹی نے تعمیر کرایا۔ اس مسجد کو امریکہ کی نوری مسجد بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنی خوبصورتی اور بانکپن کی بنا پر تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں کالج کے کارکنوں نے بھی دل کھول کر حصہ لیا۔

اس کالج کے طلباء زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں حصہ لیتے رہے اور اب بھی کوئی محکمہ ایسا نہیں جہاں اعلیٰ عہدے پر کوئی نہ کوئی

فارمنائٹ نہ ہو اس لیے پرنسپل صاحب کا یہ کہنا کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں فارمنائٹ چلا رہے ہیں، مبالغہ نہیں کیونکہ دونوں طرف اعلیٰ عہدوں پر اسی کالج کے قدیم طلباء فائز ہیں۔

پروفیسر بھٹی نے جو اسی کالج کے قدیم طالب علم اور قدیم استاد ہیں بتایا کہ کسی ضلع میں ایک مقدمہ ایسا پیش ہوا جس میں جج، وکیل، مدعی، مدعا علیہ اور گواہ سب کے سب فارمنائٹ تھے۔ جب جج کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اسے گھر ہی میں طے ہو جانا چاہیے اور یہ مقدمہ عدالت کے باہر باحسن وخوبی طے پا گیا۔

پاکستان ایجوکیشن کمیشن کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ یہ دراصل ایف سی کالج سب کمیٹی کی رپورٹ ہے کیونکہ اس کمیشن کے ۱۱ ممبروں میں سے ۹ فارمنائٹ ہیں۔

اہمیت :- کالج کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ اس کالج میں

۱۔ ڈسپلن لاہور کے تمام کالجوں سے بہتر ہے۔

۲۔ سب سے پہلے کو ایجوکیشن یہاں شروع ہوئی۔

۳۔ سب سے پہلے یونین کا تصور پیش کیا گیا۔

۴۔ سب سے پہلے ٹیکنیکل ٹریننگ کی طرف توجہ دی گئی۔

۵۔ سب سے پہلے سوشیالوجی کی کلاسیں جاری ہوئیں۔

۶۔ سب سے پہلے تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا خیال پیدا ہوا۔

۷۔ سب سے پہلے میڈیکل کی تعلیم شروع ہوئی۔

۸۔ اور جس طرح سکندر نے کہا تھا کہ روئے زمین پر اب کوئی علاقہ ایسا نہیں جس پر ہمارا قبضہ نہ ہو اسی طرح کرکٹ کے میدان میں کوئی ٹیم ایسی نہیں جو ایف سی کالج ٹیم سے ہار نہ چکی ہو۔

ایچی سن کالج

قیام : ۱۸۸۶ء
تعدادِ طلباء : ۶۰۰

انیسویں صدی کے آخری ربع میں برطانوی ہند نے میدانِ تعلیم میں سرعت سے ترقی کرنا شروع کی۔ حالات میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ تعلیمی رجحانات بدل گئے اور پرانی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا آغاز ہوا۔ مغربی علوم نے اثر و رسوخ بڑھایا اور عوام کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں لیکن نوابوں اور راجاؤں کے بیٹوں کی تعلیم کا ابھی کوئی خاص انتظام نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کے ماحول کے مطابق شاہزادوں کا عام مدارس میں تعلیم پانا ممکن نہ تھا اس لیے یہ فکر لاحق ہوئی کہ قوم اور ملک کے ان سربراہوں اور امراء و رؤساء کے ان صاحبزادوں کو بھی پرانے طریقۂ تعلیم سے ہٹا کر اور گھریلو اتالیقوں کی تعلیم سے نکال کر اسکولوں میں بھیجا جائے جہاں یہ اپنے ہم مرتبہ شاہزادوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کریں اور اجتماعی زندگی کے وہ طور طریقے سیکھیں جو صرف اتالیقوں کی تعلیم سے حاصل ہونا ممکن نہ تھے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس برِصغیر میں اجمیر، لاہور، راج کوٹ، اندور اور رائے پور کے مقامات پر پانچ چیفس کالج قائم کیے گئے۔ اس سلسلے میں اس وقت کے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر "سر چارلس ایچی سن" نے شمالی ہند کے شاہزادوں اور یہاں کے حکمرانوں کی اولاد کے لیے لاہور میں ایک کالج قائم کیا اور اس کالج کے لیے انگلستان کا ایٹن کالج بطور نمونہ سامنے رکھا گیا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہاں کا ماحول اس طرح کا بنایا جائے کہ باوجود مغربی تعلیم حاصل کرنے کے

شہزادے مغرب زدہ نہ ہو جائیں اور یہ کہ یہاں پر ایچی سن کالج کی صرف انہی باتوں پر عمل کیا جائے جو ہمارے ماحول کے لیے مناسب اور منفعت بخش ہوں اور اس نظریہ کے تحت اُردو، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا خاص خیال رکھا گیا اور آخر ۱۸۸۶ء میں یہ کالج تعمیر ہو گیا۔

شروع شروع میں اہلِ انگلش کے عادی شہزادے اور آرام پسند رئیس زادے کالج کی سپاہیانہ زندگی کے لیے تیار نہ ہوئے مگر کب تک؟ آخر اس کالج کی افادیت کو محسوس کیا گیا اور نوابوں اور راجاؤں اور رؤسا نے اپنے بچے یہاں بھیجنا شروع کر دیے "مسٹر رابنسن" پہلے پرنسپل مقرر ہوئے اور ان کے بعد مسٹر گاڈلے کالج کے انتظامی امور کے لیے جنرل بلیک کو منتخب کیا گیا۔

جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اس کالج نے بھی زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کر دیا اور اس کے دروازے عوام کے لیے کھلنے گئے حصولِ آزادی کے بعد ہندو اور سکھ اس کالج سے رخصت ہو گئے اور کالج نے ایک اور کروٹ لی اور یہ ایک قومی ادارہ بن گیا۔ آج اس کے دروازے ہر ایک بچے کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو تعلیم کی اہمیت رکھتا ہو، جس کے والدین اخراجات کے کفیل ہو سکتے ہوں۔ تین وظیفے تو پہلے ہی سے ہیں اور موجودہ حکومت نے بھی سات وظیفے سالانہ مقرر کیے ہیں جن کی وجہ سے درمیانہ طبقہ کے مستحق طلبہ کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اس کالج کی سالانہ فیس، دارالاقامہ میں رہنے والے طلباء (BOARDERS) کے لیے اٹھارہ سو روپے سے لے کر دو ہزار دو سو پچاس تک اور باہر سے آنے والوں کے لیے نو سو روپے سے لے کر ایک ہزار تین سو بیس تک ہے۔ حال ہی میں اس کالج کی ایک نئی مجلسِ انتظامیہ تشکیل ہوئی ہے جس کے صدر مغربی پاکستان کے گورنر ہیں۔

اس وقت تقریباً چھ سو طلباء زیرِ تعلیم ہیں جن کی عمر تقریباً پانچ سال سے لے کر اٹھارہ سال تک ہے تعلیم کے علاوہ تمام کھیلوں کا بہت عمدہ اور مستقل انتظام ہے۔ کھیلوں کے سب سے بڑے عمدہ میدان ہیں۔ دینیات کی تعلیم کا خاطر خواہ اہتمام ہے۔ مغرب کی نماز کالج میں مقیم تمام طلباء کے لیے مسجد میں باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ مشرقی زبانوں، خاص طور پر قومی زبان اُردو کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے بچوں میں ادبی شوق پیدا کرنے کے لیے مجلسِ اقبالیات اور بزمِ ادب کی انجمن قائم ہیں جن کے ماتحت اجلاس منعقد کیے جاتے ہیں۔ کالج میں ایک نمایاں مقام پر ایک تختہ سیاہ آویزاں ہے جس پر اقبال کے شعر اور ان کی آسان تشریح لکھی جاتی ہے اور اس طرح انھیں قومی ادب سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ہفتہ وار تقریری مقابلے اور مباحثے منعقد ہوتے ہیں۔ طلبہ باہر کے بین الجامعی مباحثوں اور مذاکروں میں بڑی کامیابی سے حصہ لیتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ اور بہت سے مشاغل یہاں کے طلباء کے لیے رائج ہیں جو خاص طور پر اساتذہ کی نگرانی میں انھیں تعلیم کیے جاتے ہیں۔

کالج کے اساتذہ بیشتر اوقات اور دن کا تمام تر حصہ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے ہیں۔ کالج کا مقصد تعمیرِ ملک کے لیے مسالہ فراہم کرنا ہے اور اس کا عزم قوم کی خدمت ہے۔ کالج ایک عرصہ سے اور خصوصاً اس دور میں تعمیرِ قوم میں منہمک ہے۔ اس کا مقصد ایسے نوجوانوں کو پیدا کرنا ہے جو نہ صرف تعلیم حاصل کریں بلکہ ایسے احساسات لے کر جائیں جو انھیں نیک نیتی اور پاک دلی سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنے پر مجبور کر دیں۔ کالج کا مقصد اپنے طلباء کو ایسی تعلیم دینا ہے اور وہ تربیت مہیا کرنا ہے جو اس وقت ان کے پاس رہے اور ان کے کام آئے جب وہ اسکول اور کالج کے نصاب کی پڑھی ہوئی کتابوں کے سبق بھول جائیں اور یہ مقصد انھیں بلند آہنگی اور استقلال کی تعلیم دے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج قیام ۱۸۸۸ء

۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ سرزمین ہند پر انگریزی اقتدار کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے لیکن حکومت کا ہر فرد اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اہلِ ہند کو ذہنی طور پر غلام بنا دیا جائے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ صورت نکالی گئی کہ انگریزی تعلیم جلد از جلد عام اور سستی کر دی جائے چنانچہ ۱۸۵۴ء میں ہندوستان کے ہر صوبے میں ایک محکمۂ تعلیم کھولا گیا۔ پنجاب میں اس عمل کا نفاذ ۱۸۵۶ء میں ہوا اور چار ہی سال کے بعد ۱۸۶۰ء میں میڈیکل اسکول کی بنیاد پڑی۔ اس اسکول سے قبل صرف کلکتہ میں ایک میڈیکل کالج تھا لیکن تریاق کو عراق سے لانے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ شمال مغربی صوبوں کے لوگ چاہتے تھے کہ ان کے صوبے میں ایک میڈیکل کالج قائم ہو اور وہ اسی کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن میں رہیں۔ ۱۸۶۰ء ان کی امیدوں کا سال تھا۔ میڈیکل اسکول تو انارکلی کے قریب کھولا گیا لیکن ہسپتال انارکلی سے ایک میل دور ٹبی پولیس اسٹیشن کے قریب رہا۔ اس زمانے میں اس میڈیکل اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر اسکریون تھے جو کلکتہ کالج سے یہاں تبدیل ہو کر آئے تھے۔

شروع شروع میں انگریزی کلاس میں پانچ اور ہندوستانی کلاس میں چالیس طلبا تھے۔ انگریزی کلاس کا نصاب پانچ سال کا تھا اور ہندوستانی کلاس کا تین سال کا۔ اوّل الذکر کا مقصد اسسٹنٹ سرجنوں کی آسامیاں پُر کرنا اور ایم بی ایس کی تیاری کرنا تھا، ثانی الذکر حکمت اور ایم پی ایل کے لیے طلبا کو تیار کرتا تھا۔

کھلنے کو تو یہ اسکول کھل گیا لیکن مصائب اور تکالیف کے بادل گھر گھر کر آنے لگے۔ نہ تو اسکول کی عمارت خاطر خواہ تھی نہ ہسپتال کی، ایک طرف صحیح اور موزوں اساتذہ کا قحط تھا تو دوسری طرف اس قدر رقم نہ تھی کہ مقصد براری میں ممد و معاون ہوتی۔ ڈاکٹر اسکریون کے لیے یہ نہایت سخت گھڑی تھی لیکن انھوں نے ان دقتوں کو در خورِ اعتنا نہ سمجھ کر کم کرنے کی کوشش کی۔ مقدر اچھا تھا رفیقِ کار اچھے مل گئے۔ ڈاکٹر میر اسمتھ، ڈاکٹر برٹن براؤن، ڈاکٹر رحیم خاں اور ڈاکٹر محمد حسین خاں کی کوششوں سے یہ لڑکھڑاتا ہوا بچہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ دس سال تک ڈاکٹر اسکریون اس فضا پر چھانے کے بعد انگلینڈ چلے گئے اور ان کی جگہ پر ڈاکٹر برٹن براؤن پرنسپل ہوئے۔ ان کے عہد میں ہیرا منڈی میں واقع اسپتال موجودہ میو اسپتال میں آ گیا۔ اس اسپتال کا نام ارل میو وائسرائے ہند کے نام پر میو اسپتال اسی زمانے میں پڑا۔ اگلے سال اسکول بھی انارکلی سے میو اسپتال میں منتقل ہو گیا۔ کالج کی اپنی عمارت ۱۸۸۳ء میں بنائی گئی اور ۵ نومبر ۱۸۸۸ء کو کالج کا یومِ تاسیس منایا گیا۔

ڈاکٹر برٹن براؤن اس کالج میں تقریباً ۲۹ سال رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے خدمت اور محنت کے زرّیں اصول اپنائے اور کالج کو وہ مقام عطا کیا کہ ایشیائی ممالک کے طلبا یہاں تدریس و تعلّم کے لیے آنے لگے۔ ۱۸۸۹ء میں ان کے ریٹائر ہونے پر کرنل براؤن پرنسپل ہوئے۔ ان کے زمانے میں یہ درسگاہ دو شعبوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک کالج جو یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری کراتا تھا، دوسرا اسکول جس میں حکیموں اور ہسپتال اسسٹنٹوں کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں کرنل براؤن تبدیل ہو کر بنگال گئے اور ان کی جگہ پر کرنل ہیری تشریف لائے۔ ان کے عہد میں ایل۔ ایم۔ ایس کی پرانی ڈگری ایم بی بی ایس میں تبدیل کر دی گئی اور ایم بی بی ایس کے لیے کیس طلبا کا پہلا جتھا ۱۹۰۶ء میں داخل ہو کر ۱۹۱۱ء میں کامیاب ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہ کالج تمام شمالی ہندوستان، جنوبی ہندوستان اور برما کی اہم ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا۔ آج جس حالت میں ہم کالج کا ناک نقشہ اور رنگ روپ دیکھ رہے ہیں، اس کی کامیابی کا سہرا کرنل سدرلینڈ کے سر ہے۔ انھوں نے نئے نئے شعبے کھولے۔ معیارِ قابلیت کو بلند کیا اور انہی کے زمانے میں اسکول کا شعبہ کالج سے علیحدہ

کیا گیا۔ گویا اس کالج کے صحیح معنوں میں معمار کرنل سدرلینڈ تھے۔ انھوں نے کنگ ایڈورڈ میموریل اسکیم کے تحت حکومت کی امداد قبول کی اور انھی کے زمانے میں اس کالج کا نام بھی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج رکھا گیا۔

جنگِ عظیم اوّل اپنے ساتھ تباہیوں کی ایک دنیا لائی۔ کچھ پروفیسر تو محاذِ جنگ پر چلے گئے اور کچھ کالج کے اندرونی خلفشار کے شکار ہو کر بیٹھ رہے لیکن ہندوستانی سپوتوں نے اس آڑے وقت میں کالج کا ساتھ دیا۔ رائے بہادر بال کشن کول، ڈاکٹر یار محمد خاں، ترلوک چند نندا، رام ناتھ شرما اور اسی پائے کے دوسرے پروفیسر کالج میں آ گئے۔ جنگ کے خاتمے پر کالج کے وقار کو بڑھانے کی کوششیں پھر سے شروع ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں اس کالج میں نہ صرف ایشیائی بلکہ یورپی ممالک کے طلبا بھی تعلیم کے لیے آنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں راوی روڈ پر لیڈی ولنگڈن اسپتال کھولا گیا جو نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب کے باسیوں کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ اسی سال کرنل ہارپر کالج کے پرنسپل بنے۔ انھوں نے کالج کے رفاہی کاموں کی طرف توجہ دی۔ کالج کے طلبہ کے لیے ہوسٹل اور گراؤنڈ انھی کے زمانے میں تیار ہوئے۔ بعد میں آنے والوں نے تحقیقی اور معلوماتی مضامین پر اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں لیکن کالج کی یہ ترقی زمانے کو ایک آنکھ نہ بھائی اور جنگِ عظیم دوم کے سبب بیشتر میڈیکل آفیسر انڈین میڈیکل کور میں بلا لیے گئے جہاں پہنچ کر انھوں نے دشمنوں سے بھی دادِ شجاعت اور دادِ خدمت حاصل کی۔

جنگ کے خاتمہ پر کالج کے چہرے پر جوانی کا نکھار آیا۔ اس دور میں ڈاکٹر صدیقی نے اناٹومی عجائب گھر بنا کر دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا اسی طرح کرنل ہیز نے لیڈی ولنگڈن اسپتال کو ایشیا کا سب سے بہترین اسپتال بنا دیا۔ قیامِ پاکستان تک کرنل فرائی اس کالج کے پرنسپل رہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد اس کالج کا ہندو عملہ بھارت چلا گیا اور کرنل الٰہی بخش کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ آپ جالندھر کے رہنے والے تھے اور کسی زمانے میں جاپانیوں کی قید بھی کاٹ چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم کے طبیبِ خاص کی حیثیت سے کوئٹہ گئے اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہو کر اگلے سال لاہور میں انتقال کر گئے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ تقسیم کی وجہ سے کالج جن آفتوں اور بلاؤں سے دوچار ہو گیا تھا، کرنل الٰہی بخش مرحوم نے اسے بچایا اور ایک نئی راہ پر لگا دیا جس راہ میں ترقیوں اور بلندیوں کے خزینے ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ کرنل مرحوم نے درس و تدریس اور انتظامی معاملات میں مشغول ہونے کے باوجود ۷۵۳ صفحوں کی ایک کتاب MODERN MEDICAL TREATMENT تحریر کی ہے جسے اپنے دور کی سب سے بہتر کتاب تسلیم کیا گیا۔

قیامِ پاکستان سے اب تک جن جن شعبوں میں بتدریج ترقی ہوئی ہے اس کا خاکہ درج ذیل ہے:۔

اسٹاف:۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد اب تک سات عہدوں پر پاکستانی پروفیسروں کا تقرر کیا جا چکا ہے۔

شعبے:۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک پانچ نئے شعبے کھولے گئے ہیں اور ہر ایک شعبے کا انچارج ایک پاکستانی پروفیسر ہے۔

ہوسٹل:۔ تین نئے بلاک بنوائے گئے ہیں جن میں سے دو طلبا کے لیے اور ایک طالبات کے لیے ہے۔

ہسپتال:۔ (اے) ایک بچوں کا اسپتال کھولا گیا ہے جس میں پچاس بستروں کی گنجائش ہے۔

(بی) رتن باغ کے علاقے میں ایک نیا بلاک مریضوں کے لیے بنایا گیا ہے۔

(سی) تیئیس پرائیویٹ مریضوں کے لیے ایک الگ عمارت کا حصہ بنایا گیا ہے۔

(ڈی) کورٹ لکھپت میں ۵۰۰ بستروں پر مشتمل ایک لاہور جنرل اسپتال کھولا گیا ہے۔

(ای) رتن باغ کے علاقے میں ایک "RADIUM INSTITUTE" کھولا گیا ہے۔

تحقیقی کام۔ پاکستان بننے کے بعد طلباء کی تعداد یک بیک بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیقی کاموں کی طرف توجہ نہ دی جا سکی لیکن ۱۹۴۷ء سے اب تک کوئی ۱۴۳ اشاعتیں اس کالج کی نکل چکی ہیں جن میں سے اکثر اشاعتوں کو انگلینڈ اور امریکہ میں بھی سراہا گیا ہے۔

پوسٹ گریجویٹ:۔ اس کالج سے پاکستان بننے کے بعد جو طلباء ڈگریاں اور ڈپلومے لے کر نکلے ان کی تعداد درج ذیل ہے:۔

ایم ایس	۳۲
ایم ڈی	۲۹
ڈی ایم آر ای	۴۳
ٹی ڈی ڈی	۴۰
ڈی ایل او	۱۱
ڈی او	۳

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد نئی حکومت نے تعلیمی اور انتظامی امور کو الگ الگ کر دیا۔ میڈیکل کمیشن کی رپورٹ کے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس کالج کو پھر وہی رتبہ نصیب ہو جائے گا جو اسے پہلے حاصل تھا۔

اسلامیہ کالج سول لائنز

قیام ۱۸۹۲ء / ۱۹۵۵ء — تعداد طلباء ۱۵۰۰

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کو اپنے زیرنگیں کیا اور اسی زمانے سے عیسائی مشنریوں کا اس سرزمین پر آنا جانا شروع ہوا۔ بنگال میں تبلیغ مذہب کی کامیابی اور کامرانی یہاں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ پنجاب میں بھی ان کی سرگرمیوں کا مرکز یہی لاہور قرار پایا۔ ہندوؤں نے اس تحریکِ عیسائیت کے خلاف آریہ سماج کی تحریک چلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کی ضد تھیں لیکن دونوں اسلام کے خلاف تھیں۔ اُدھر سر سید احمد خان نے مسلمان قوم کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دی اِدھر پنجاب کے چند اہلِ دل مسلمانوں نے دینِ اسلام کی تبلیغ اور مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد پڑی۔ ۱۸۸۶ء میں انجمن نے ایک کرایے کے مکان میں مدرسۃ المسلمین قائم کیا۔ دو سال کے بعد یہ مدرسہ مڈل اور ۱۸۸۹ء میں ہائی سکول بن گیا۔ ۱۸۹۲ء میں اسے کالج کے درجے تک تعلیم دینے کی اجازت مل گئی۔ شروع شروع میں اس کالج کے لیے شیرانوالہ اسکول سے دو کمرے لیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں اس کالج کے قبضہ میں ایک کمرہ اور آ گیا۔ ۱۹۰۱ء میں ان تینوں کمروں کے اوپر بالائی منزل تیار کی گئی۔ ۱۹۰۷ء تک یہ کالج اسی عمارت میں روشنی بن کر چمکتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں انجمن نے ریلوے روڈ پر پچاس کنال اراضی خریدی، اور ۱۹۰۷ء ہی میں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی موجودہ عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال ریواز ہوسٹل کی تعمیر شروع ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں اسی ہوسٹل میں کالج کی جماعتیں لائی گئیں۔ یہ عمارت ۱۹۱۲ء میں مکمل ہوئی اور اس پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں ایک لائبریری اور ایک ریڈنگ روم تعمیر کیا گیا لیکن چونکہ کھیل کا کوئی میدان نہ تھا اس لیے اس عمارت کو گرا دیا گیا۔ اسی سال کالج کی جمناسٹک کے لیے ایک اور عمارت تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کا نقشہ میاں محمد عبداللہ مرحوم کا بنایا ہوا ہے

اس کالج میں ایم۔ اے تک کی جماعتیں رہیں، تقریباً بیس سال تک اسی کالج میں جے۔ اے۔ وی تک کی کلاسیں رہیں۔ ۱۹۲۷ء میں ان جماعتوں کو بند کر دیا گیا۔ اس کالج کے ساتھ تین ہوسٹل بنائے گئے۔

۱۔ ریواز ہوسٹل کالج کے احاطے میں ہے۔

۲۔ دوسرا ہوسٹل کریسنٹ ہوسٹل کے نام سے مشہور ہے۔ انجمن نے ۱۹۲۱ء میں ایک کوٹھی خریدی تھی اور بعد میں مسمار کر کے اسے زنانہ اسلامیہ کالج کو دے دیا گیا۔

۳۔ تیسرا ہوسٹل حبیبی ہوسٹل تھا۔ یہ عمارت ۱۹۲۶ء میں سینتالیس ہزار روپے میں خریدی گئی اس عمارت میں انجمن کا وطن اسلامیہ ہائی سکول کام کر رہا ہے۔ شروع شروع میں اس کالج میں تیس طلبا تھے لیکن اب پندرہ سو بتیس ۱۵۳۲ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس کالج پر طلباء کی زبردست یلغار ہوئی آخر کار ۱۹۵۵ء میں ڈگری کلاسیں ڈی۔ اے وی کالج کی متروکہ عمارت میں منتقل ہو گئیں چونکہ یہ عمارت یونیورسٹی سے قریب ہے اس لیے اسے ڈگری کالج بنا دیا گیا۔ متروکہ عمارت ہونے کی وجہ سے یہ عمارت مرمت طلب ہے۔ اس عمارت میں کچھ نئی عمارتوں کا بھی اضافہ ہوا ہے، خصوصیت سے سائنس کی تعلیم کے لیے ایک نیا بلاک بنانے کی تجویز ہے۔

کالج کے اندر متعدد علمی اور ادبی مجالس قائم ہیں۔ بزم فروغِ اردو ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں قائم کی تھی۔ یہ بزم اسی آن بان کے ساتھ کام کر رہی ہے انگریزی کے STUDY CIRCLE نے بہت سے جلسوں کا بندوبست کیا جس میں برطانوی اور امریکی اربابِ علم نے مقالات پڑھے۔

اس کالج میں ۶۵ اساتذہ ہیں جن میں چند ایک چوٹی کے نقاد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ پروفیسر مرزا عبدالحمید بیگ وہی شخص ہیں جنھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے اکثر پہاڑوں کو زیرِ نگیں کیا ہے اور MOUNTAINEERING کا فن آپ کے دم سے زندہ ہے۔

کالج کا اپنا ایک میگزین فاران کے نام سے نکلتا ہے۔ یہ میگزین اپنے اسٹینڈرڈ کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس میں کالج کے طلباء اور اساتذہ مل کر مضامین لکھتے ہیں دوسرے کالجوں کی طرح اس کالج کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ اپنا اچھا برا کام ملک کے صاحبانِ علم کے سامنے پیش کیا جائے لیکن موجودہ دور میں یہ نظریہ بہت پرانا ہے اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اگر گاہے گاہے ان میگزینوں میں بیرونی حضرات بھی لکھتے رہیں تو معیار بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے کیونکہ مقصود تشہیرِ فن ہے نہ کہ ذات۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ

قیام: ۱۸۹۲ء
تعداد طلبا: ۲۳۰۰

یہ وہی ادارہ ہے جو شیرانوالہ دروازے سے منتقل ہو کر ۱۹۰۸ء میں اس عمارت میں آیا تھا۔ اس کالج کو ملک میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ پاکستان میں یہ اولین کالج تھا جس نے اسلامی علوم و فنون کو مغربی علوم کے ساتھ پیوند کیا۔ اسی کالج نے مسلمان قوم کی پسماندگی کی طرف سب سے پہلے توجہ دی کیونکہ امرا اور نواب زادے تو گورنمنٹ اور ایف سی کالج میں چلے جاتے تھے اور اوسط درجے کے لوگوں کے بچے اس کالج میں قدم رکھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کالج کے اولڈ بوائز کی فہرست طویل ہے، آج تقریباً ہر محکمہ، ہر کالج، ہر مقام پر اس کالج کے طالب علم موجود ہیں۔ موجودہ پرنسپل کا یہ کہنا کہ اگر اسلامیہ کالج کی خدمات کو نظرانداز کر دیا جائے تو پاکستان کا سماجی اور تعلیمی ڈھانچہ

ناقابلِ یقین حد تک بدل جائے گا کوئی مبالغہ نہیں یہ وہی کالج ہے جس کے اسٹیج پر سر سید، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال نے اپنا پیغام پیش کیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسی کالج میں قائداعظم نے اپنی سرگرمیوں کا مفصل ذکر کیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم بھی کئی بار اس کالج میں آئے۔ غرض ملک کی اعلیٰ اور مادی ہستیاں اس کالج سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۴۶ء میں تو یہ کالج سول نافرمانی کا مرکز بن گیا۔ حصول پاکستان کے اس عظیم الشان مقصد کی آخری جدوجہد میں اساتذہ اور طلباء نے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی اور مصر شتری کے چیتے سے اُٹرانے والے یہیں کے طلباء اور اساتذہ تھے۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی اور پروفیسر یوسف جمال انصاری اسی زمانے میں قید ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں اس کالج کے طلباء کی تعداد ۲۳۰۰ تھی۔ اتنی بڑی تعداد کے لیے کم سے کم موجودہ عمارت بالکل ناکافی ہے۔ اکثر جماعتوں میں طلبہ کی تعداد سو سے زائد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت میں انفرادی توجہ کیا دی جا سکتی ہے مگر نتائج دیکھ کر مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ایک کے سوا تمام مضامین میں اس کالج سے کامیاب ہونے والے طلباء کا فی صد تناسب سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے تناسب سے زیادہ ہے۔ ایک ایسے ادارے سے جس کا دارومدار قومی چندوں پر ہو اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

کالج کے تدریسی شعبوں کے اعداد و شمار کے ضمن میں شعبہ انگریزی کو بھاری ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے تمام طلبہ کو ۵۲ گروپ میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر گروپ میں ۸۰ طلباء ہیں۔ خیال ہے کہ اس کالج میں ڈبل شفٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔

اسی کالج میں پروفیسر علم الدین سالک بطور صدر شعبہ اردو و فارسی خدمات انجام دے رہے ہیں جو ایک بہترین مؤرخ، آتش بیان مقرر اور بے مثال ادیب ہیں۔ ان کی سرپرستی میں اس کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیاں اپنی روایاتِ سابقہ کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ کالج میں ایک بزمِ عروجِ ادب ہے جس کی ہفتہ وار مجلس ہوتی رہتی ہے سیکرٹری مجلس پوری کوشش سے کام کر رہے ہیں۔ مشاہیر شعراء کو اس کے اجلاس میں دعوت دی جاتی ہے۔ مقالے پڑھے جاتے ہیں، شاعری ہوتی ہے۔ یہ مجلس عام طلباء میں ادبی دلچسپی پیدا کرتی رہتی ہے، جو قابلِ تحسین ہے۔ کالج میں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ پچھلے سال کے مشاعرے کی صدارت جسٹس جمیل حسن رضوی نے کی مشاعرے کا معیار طلباء کے ادبی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ غزلوں کے رنگ میں قدیم و جدید شاعری کی قدریں سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

اس کالج میں اسلامیات کا درس بڑی باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی صاحب اس خدمت کو بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ پچھلے سال مراکش کے سید محمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر، مولانا محمد بخش مسلم، خواجہ محمد شفیع اور علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب نے اسلامیات کے متعدد مضامین پر تقاریر کیں۔

سائنس ایسوسی ایشن اس کالج کی زندہ اور فعال مجلس ہے۔ پچھلے سال ڈاکٹر اے جی چودھری ریڈر شعبہ طبیعات پنجاب یونیورسٹی نے "خلائی سفر" کے موضوع پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ دوسرا مقالہ "پاکستان میں زر سازی کے فن" پر مسٹر اے کے نقوی انجینئرنگ کالج نے پڑھا۔ تیسرا مقالہ وائرلیس کی خدمت پر مسٹر ایم شاہ نے سنایا۔ آپ بھی انجینئرنگ کالج کے پروفیسر ہیں۔

کھیلوں میں بھی اس کالج کو بہت بڑا امتیاز حاصل ہے۔ لاہور میں اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کا میچ حقیقت میں ایک میلے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پرانے کھلاڑیوں میں امتیاز، فضل محمود، نثار، ڈاکٹر جہانگیر، میاں نذیر، کاردار، نذر محمد، خان محمد، سعید، شجاع الدین بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

اس کالج کے قدیم طلباء ہندوستان اور پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خواجہ دل محمد مرحوم جن کی ریاضی دانی کا اعتراف یورپ والوں

نے بھی کیا" اسی کالج کے طالب علم تھے۔ ہندوستان میں آزادیٔ کشمیر کے رہنما شیخ محمد عبداللہ بھی اسی کالج کے پرانے طالب علم ہیں۔ پاکستان میں آزادیٔ کشمیر کے روحِ رواں سردار ابراہیم کا بھی اسی کالج سے تعلق ہے۔ اساتذہ میں علامہ عبداللہ یوسف علی اپنی وجاہت اور قابلیت میں ایک عالم میں انتخاب تھے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم شعر گوئی اور تنقید میں شہسوارِ زمانہ تھے۔ شیخ تاثیر کی طرح شاعر ہوئے اگرچہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں منعقد ہوتے ہیں لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ مسٹر شریف جو فلسفہ کے پروفیسر تھے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ آج کل ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے صدر ہیں۔ آخری پرنسپل کرنل محمد اسلم مرحوم تھے جن کا ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ مرحوم اپنی تنظیمی قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے کالج کے لیے اپنا تن من دھن ایک کر کے لٹا دیا۔ ان کے نظم و ضبط کی بہترین مثال اس موقع پر ملتی ہے جب [illegible] سنہ یوم جبلپور کے موقع پر دفعہ ۱۴۴ لگا دی اور دیگر کالجوں کے طلباء نے اس دفعہ کو توڑنے کی ٹھہرائی۔ کرنل مرحوم کے کہنے سے اس کالج کا کوئی طالب علم اس ہنگامے میں شریک نہ ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلمانوں کے لیے جان دینے والے طلباء اگر منع کر دیے جائیں تو مسلمانوں کے بڑھتے قدم روک بھی سکتے ہیں۔

دیال سنگھ کالج

قیام ۱۹۱۰ء
تعداد طلباء: ۱۵۰۰

سردار دیال سنگھ ہندو سوسائٹی کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ان کے دل میں قومی درد کی کسک اور ملی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چونکہ لاولد تھے اس لیے ان کی ہمیشہ خواہش یہ رہی کہ ملک کے نوجوانوں کے لیے ایک قومی ادارہ یا قومی مدرسہ اس طرز کا قائم کر دیا جائے جس سے ملکی خصوصیات وابستہ ہوں۔ پنجاب کے امیروں اور نواب زادوں کے لیے گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج آغوش پھیلائے ہوئے تھے۔ غریب عوام کے بچے تعلیم کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر انھوں نے ایک مثالی کالج کھولنے کا پختہ ارادہ کر لیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۸۹۸ء میں ایک وصیت نامہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وصیت نامے میں اپنی بیوی کی جائداد کے علاوہ تین ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز تھی۔

۱۔ دیال سنگھ کالج ٹرسٹ

۲۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری ٹرسٹ

۳۔ ٹربیون اخبار ٹرسٹ

کالج کے سلسلے میں یہ توضیح کی گئی تھی کہ اس کالج میں صرف موحدین کی اولاد ہی تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور اساتذہ بھی موحد ہوں۔ یہ بھی تحریر تھا کہ یہ کالج کسی رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر سارے فرقوں کے لیے کھلا جائے گا۔ ان کی موت کے ۱۲ برس بعد ۱۹۱۰ء میں یہ کالج کام کرنے لگا۔

سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ امرت سر کے ایک گاؤں مجیٹھہ میں پیدا ہوئے تھے اسی نسبت سے انھیں مجیٹھیا کہا جاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں نے انھیں تلاوت قرآن پاک کرتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ بھی خبر تھی کہ وہ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان کی موت نے اس کا پردہ رکھ لیا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مسلمان مرے یا ہندو بہرحال یہ صحیح ہے کہ وہ سکھ نہیں مرے جیسا کہ عام طور پر معروف و مشہور رہے۔

یہ کالج شروع ہی سے آزادیٔ افکار اور قومی تقاضوں کا محمل بن گیا۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک کے کچھ نقوش اس کالج میں ابھرنے لگے اور شاید اسی تحریک کا اثر تھا کہ کالج سے متصل ایک رام موہن رائے ہوسٹل تعمیر کیا گیا۔ ان کی اہلیہ نے ٹرسٹ کی بڑھتی ہوئی

آمدنی کو دیکھ کر ٹرسٹ پر مقدمہ دائر کر دیا لیکن اس مقدمے میں انھیں غلط فہمی ہوئی تھی اس لیے شکست کھانی پڑی۔ یہ کالج وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکات کی آماجگاہ بھی بنتا گیا۔ کوئی بھی سیاسی لیڈر ایسا نہیں جو لاہور آئے اور دیال سنگھ کالج میں اس کی ضیافت نہ ہو۔ ۱۹۴۶ء تک یہی کیفیت رہی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد کالج کے اسٹاف میں پروفیسر عابد علی عابد اور پروفیسر عاشق محمد ہی رہ گئے بقیہ تمام ہندو اور سکھ اساتذہ ہندوستان چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کے ساتھ ساتھ کالج کی ساکھ ٹوٹ گئی۔ اس وقت اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر شیخ عبدالحق سابق لیگل ریممبرنسر تھے۔ انھوں نے پروفیسر عابد علی عابد کو ٹرسٹ کا ممبر بنا دیا اور خود مختار نامہ حاصل کر کے ٹرسٹ کے سیکرٹری بن گئے۔ اس وقت کے ٹرسٹیوں میں ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ملک عبدالقیوم مرحوم سابق پرنسپل لا کالج، ڈاکٹر محمد شفیع، کپتان علی قریشی اور شیخ نسیم حسن سابق ایڈوائزر حکومت پنجاب کے والد ماجد شیخ محمد حسن تھے۔

شروع زمانے سے لے کر اس دور تک اس کالج میں کو ایجوکیشن تھی ———— پروفیسر عابد علی عابد نے تعلیم کے اس پہلو پر بہت کچھ کام کیا لیکن سیکرٹری ٹرسٹ سے ممبر ٹرسٹ کی نہ بنی اور آج تک یہ کالج سیاسی گٹھ جوڑ کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اس ٹرسٹ کی بہت سی جائداد ایسٹ پنجاب میں تھی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس کالج کو خسارہ پر کام کرنا پڑا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر عابد علی عابد علیحدہ کیے گئے اور ان کے بعد پروفیسر سعادت علی خاں بطور پرنسپل کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر غلام عباس نے کالج کی عنان سنبھالی اور تین سال تک کالج کی خدمت کر کے علیحدہ ہو گئے آپ کے ہٹانے میں سید جمیل حسین رضوی پیش پیش تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج کے ڈاکٹر رفیق صاحب جو رضوی صاحب کے علی گڑھ میں استاد بھی رہ چکے تھے بطور پرنسپل آئے اور اس وقت تک دیال سنگھ کالج کے تمام سیاہ و سپید کے مالک وہی ہیں۔ نئے ٹرسٹ میں جسٹس شریف وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی چیئرمین ہیں۔ جسٹس چنگیز اور جسٹس جمیل حسین رضوی اس کے ممبر ہیں۔ حکومت اس ادارہ کو پچیس ہزار روپے گرانٹ دیتی ہے۔ طلباء کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ ہے اور اسٹاف چالیس ممبران پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق جو انگریزی کے ایم اے ہیں شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں۔ پروفیسر عاشق محمد (ایم اے اُردو، ایم اے فارسی، ایم اے انگریزی) شعبۂ فارسی کے صدر ہیں۔ یہ وہی عاشق صاحب ہیں جو پاکستان کے بہترین براڈکاسٹر ہیں۔ پروفیسر شجاع تاریخ کے شعبہ کے صدر ہیں اور صادق قریشی صاحب ایم اے سماجی تحریکات کے انچارج ہیں۔

اس کالج کے دو ہوسٹل ہیں۔ ایک رام موہن رائے ہوسٹل دوسرا مجیٹھیہ ہوسٹل، دونوں میں طلباء کی تعداد تقریباً دو سو کے قریب ہے۔ عمارت پرانی اور بوسیدہ ہے۔ ٹیٹوریل گروپ کے لیے اساتذہ کو جو کمرے ملے ہیں انھیں جیل کی کوٹھڑیوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

کالج کے طلباء کی ایک یونین ہے جو کالج کے حسنِ انتظام میں امداد کرتی ہے۔ اسی یونین کے تحت مجلسِ ادب اور دیگر جلسے ہوتے رہتے ہیں۔

"دیال سنگھ کالج میگزین" اس کالج کا سہ ماہی جریدہ ہے۔ اگرچہ اس جریدے کے سرپرست خود پرنسپل صاحب ہیں اور یہ رسالہ ایک پروفیسر صاحب کی نگرانی میں نکلتا ہے۔

کینیرڈ کالج لاہور (قیام: ۱۹۱۲ء تعداد طالبات: ۳۵۰) | انگریز اور امریکن مشنریوں کی امداد سے طلباء کے کئی کالج اس

سرزمین پنجاب پر کھل چکے تھے جہاں سے وہ فیض یاب ہو کر ملکی نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو رہے تھے لیکن طالبات کے لیے سارے صوبے میں کوئی اسکول نہ تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مسٹر کینرڈ نے ریلوے اسٹیشن کے قریب چرچ کے نزدیک ایک اسکول کھولا جسے کینرڈ ہائی اسکول کہا جاتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں اس مدرسے میں ایک کالج بھی کھول دیا گیا جو ۱۲ سال تک اسی مقام پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں پہلی انٹرمیڈیٹ کلاس امتحان میں شریک ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں بی۔ اے کی کلاس کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصے تک یہ کالج ایک روڈ پر چرچ کے نزدیک بھی رہا لیکن رائے صاحب موہن رائے نے جب اس بلڈنگ کو خرید لیا تو ۱۹۳۸ء میں یہ اپنی موجودہ بلڈنگ میں آ گیا۔ یہ بلڈنگ کسی ایک واحد ادارے کی نہیں بلکہ ایف سی کالج لاہور، مرے کالج سیالکوٹ، گورڈن کالج راولپنڈی اور زنانہ بائیبل اینڈ میڈیکل مشن کے ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی نے اس کالج کے قیام میں بڑی مدد کی۔ اس کالج کی سب سے پہلی پرنسپل مس جان میکڈانلڈ تھیں جنھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد سول سکریٹیریٹ کے قریب اپنا ایک پرائیویٹ ادارہ خود کھول لیا تھا اور آج تک برقرار ہے۔

ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحبہ نے بتایا کہ شروع شروع میں اس کالج میں طالبات کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تعلیم نسواں کا اس ملک میں کوئی خیال ہی نہیں رکھا جاتا تھا چنانچہ اس زمانے کی پرنسپل نے میٹرک میں پاس ہونے والی طالبات کو خطوط لکھے اور اس طرح بہ مشکل سات یا آٹھ طالبات سے کالج کی ابتدا ہوئی۔ پرنسپل نے بتایا کہ اگر یہ کالج نہ ہوتا تو حکومت کا تعلیم نسواں کے بارے میں خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اسی کالج کی طالبات نے ملک کے دوسرے حصوں میں عورتوں کی تعلیم کو عام کیا۔ بیگم فدا حسن جن کی سماجی کوششوں سے عورتوں میں شعور زندگی پیدا ہوا اسی کالج کی قدیم طالبہ ہیں۔ مس انور علی محمد جو ان دنوں لاہور کالج فار ویمن کی پرنسپل ہیں اسی کالج کی فارغ التحصیل ہیں۔ ڈاکٹر عذرا رحمان جنھیں اسلامیہ کالج کی پرنسپل ہونے کا شرف حاصل ہے اسی کالج کی طالبہ ہیں۔ ہائر سیکنڈری اسکول گلبرگ کی پرنسپل اور لائل پور کالج کی مس نعیمہ عبداللہ اسی کالج سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مس میکنیر اس کالج کی پرنسپل ہوئیں۔ ۱۹۵۰ء سے اب تک مس منگت رائے اس عہدہ پر فائز ہیں کالج میں کل طالبات کی تعداد ۳۵۰ ہے اور تقریباً ۳۰ اساتذہ پر مشتمل اسٹاف ہے۔ پرنسپل نے بتایا کہ طالبات کی تعداد اس لیے کم رکھی جاتی ہے کہ تعلیم کا معیار بلند کیا جا سکے۔ انھوں نے پچھلے سال کے امتحانات کے نتائج مندرجہ ذیل بتائے:۔

انٹر آرٹس	۹۴ فی صد
انٹر سائنس	۸۹ فی صد
بی اے	۹۰ فی صد
بی ایس سی	۸۰ فی صد

اس کالج کے چار ہوسٹل ہیں جن میں ۱۴۰ طالبات مقیم ہیں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں ہیں ایک سائنس ہوسٹل کی تعمیر زیر غور ہے۔ حکومت کی طرف سے ۲۵ ہزار روپے کی گرانٹ ملتی ہے لیکن یہ رقم ناکافی ہے۔ پرنسپل نے بتایا کہ گورنمنٹ کالج کے مقابلے میں ہماری استانیاں بہت کم تنخواہ پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر کی تنخواہ مشن کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ان کا یہ جذبہ سراہنے کے قابل ہے۔

اس کالج کا سب سے بڑا کارنامہ نرسنگ کی تعلیم ہے۔ اس غرض کے لیے لندن سے ایک سند یافتہ استانی تشریف

لاتی ہیں اور نرسنگ کلاس میں ۲۲ طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ چونکہ یہ کالج مشنری طرز پر چلایا جا رہا ہے اس لیے کرسچین طالبات کو مسلمان بچیوں کے مقابلے میں زیادہ رعایتیں حاصل ہیں۔

کالج کی طرف سے کرسچین طالبات کو تقریباً ۲۸ ہزار کی رقم بطور امداد دی جاتی ہے اور مسلمان طالبات پر تقریباً ۱۵ ہزار خرچ کیا جاتا ہے۔

طالبات کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل نے بتایا کہ اس کالج میں ہر سال دو چار ڈرامے غریبوں کی امداد کے لیے ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں بنگال کے مظلوم مسلمانوں کے لیے اس کالج نے ایک کثیر رقم روانہ کی۔ راجگڑھ کی نادار آبادی میں کالج نے بچوں کے لیے سوکھا دودھ سپلائی کیا۔ اس کالج کی طالبات دوسرے ممالک کی سیر بھی کرنے جاتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں وینس میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے مس شمیم مال کو فرانس بھیجا گیا۔

کالج میں کئی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ مس شمیمہ انور DEBATE SOCIETY کی انچارج ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں اسی کالج کی طالبہ نیلوفر نے روچی رام ساہنی مقابلہ بیان میں اول انعام حاصل کیا۔ بی این آر کے مباحثے میں اسی کالج کی طالبات نے ٹرافی جیتی۔ فورمن کالج مباحثے میں ٹرافی اسی کالج کو ملی۔ گورنمنٹ کالج مباحثے میں ٹرافی اسی کالج نے جیتی۔

کھیل کود کے میدان میں بھی اس کالج نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور سکنڈری بورڈ کے کئی ایک ریکارڈ اسی کالج کی طالبات نے بہتر کیے۔

طالبات کی علمی پیاس بجھانے کے لیے کئی ایک انجمنیں بنی ہوئی ہیں جن میں علمی مباحث زیر غور آتے رہتے ہیں۔ پروفیسر حمید اللہ بیگ اور مسز معطر اس مجلس کے انچارج ہیں۔ اسی کالج کی مس ڈل کو پچھلے سال ایران بھیجا گیا تھا وہاں انھوں نے اپنا بہترین مقالہ پڑھ کر داد حاصل کی۔ مس شیلا کی کتاب PAKISTAN AND THE WEST لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مس کیمن نے فلاسفی کانفرنس کراچی میں اپنا یادگار مقالہ پڑھا۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ موجودہ پرنسپل مس سنگت رائے کے والد پنجابی اور والدہ بنگالی ہیں۔ اس لحاظ سے آپ پوری پاکستانی پرنسپل ہیں جن سے ملک کے دونوں حصے بجا طور پر بہتری کی توقعات رکھ سکتے ہیں۔

لاہور کالج برائے مستورات (قیام ۱۹۲۲ء)

انگریزی حکومت نے تعلیم نسواں کی طرف ایک عرصے تک کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مشرقی طرز تمدن میں حاکمیت محض مردوں کی تسلیم کی گئی ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم دلانا اور انھیں اس قابل بنانا کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کر سکیں ایشیا والوں کے لیے بہت دور کی بات تھی۔ لاہور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اگرچہ کینیرڈ اسکول اور کالج کھل چکے تھے لیکن ان میں بھی صرف فارغ البال گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں لاہور کالج برائے مستورات کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شروع شروع میں اسے انٹرمیڈیٹ کالج رکھا گیا لیکن تین سال کے بعد ڈگری کالج بنا دیا گیا اور پھر اکیس سال کے بعد ۱۹۴۶ء میں اس کالج میں ایم۔ اے کی کلاسیں جاری کی گئیں۔ اس کالج کی دو خصوصیات بہت اہم ہیں۔

۱۔ یہ گورنمنٹ کا کالج ہے اور محض طالبات کی تعلیمی اور تمدنی زندگی کو سنوارنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

۲۔ اس کالج میں پردے کا عام رواج ہے اور قیام پاکستان کے بعد اس کی چار دیواری بہت مستحکم کر دی گئی ہے۔

یہ کالج جیل روڈ سنٹرل جیل کے سامنے قیام پذیر ہے اور اس کا الحاق ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہو چکا ہے مجوزہ وہ سکی تمام مروجہ تعلیم اس کالج میں دی جاتی ہے۔ کالج کا اسٹاف پچاس استانیوں پر مشتمل ہے اور کالج کی پرنسپل ڈاکٹر مس علی محمد صاحبہ کی استانیوں میں اکثر فارن یونیورسٹی کی ڈگریاں رکھتی ہیں۔

کالج میں مختلف مجلسیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔

۱۔ اقبال فلاسفیکل سوسائٹی

۲۔ بزم ادب

۳۔ ڈرامیٹک سوسائٹی

۴۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی

کالج کے پاس اپنی گراؤنڈ ہے جس میں ٹینس، نٹ بال، ہاکی اور والی بال کھیلے جاتے ہیں۔

طبیہ کالج لاہور

قیام: ۱۹۲۶ء
تعداد طلبہ: ۱۵۰

طبیہ کلاسوں کا اجرا پنجاب یونیورسٹی کے ہاتھوں ۱۸۷۶ء میں اورینٹل کالج میں عمل میں لایا گیا تھا، پھر ان کو میڈیکل اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں قلت گنجائش کے باعث ان جماعتوں کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سپرد کر دیا گیا اور تعلیم اسلامیہ کالج بلڈنگ میں ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے جزوی اخراجات کے لیے ۲۰۷ روپے کی سالانہ گرانٹ منظور کی۔ اس وقت صرف ایک لکچرار تھا جو ہفتہ میں دو تین مرتبہ شام کے وقت دو ایک گھنٹے لکچر دیا کرتا تھا۔ چونکہ انجمن بھی اپنی حیات کی ابتدائی منزل پر تھی اس لیے بیشتر توجہ ادبی تعلیم پر رہی اور اس طرف کما حقہٗ دھیان نہ دیا جا سکا۔ ۱۹۲۰ء تک یہ جماعتیں پرنسپل اسلامیہ کالج کے ماتحت ایک سپرنٹنڈنٹ کے زیر اہتمام رہیں۔ اب انجمن نے ادھر بھی توجہ دی چنانچہ کالج کمیٹی نے طبی تعلیم کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی، اسٹاف میں اضافہ کیا گیا اور چند ضروری انتظامات بھی کیے گئے۔

۱۹۲۶ء میں ان جماعتوں کے انتظام کے لیے انجمن کی جنرل کونسل نے اس کالج کو اسلامیہ کالج سے علیحدہ کر دیا اور علم طب کی تعلیم باقاعدہ کالج کی صورت میں شروع ہوئی۔ بجائے دو گھنٹہ صبح کے شام کے ۲½ گھنٹے اور صبح کو عملی تعلیم کے لیے دو گھنٹے مقرر ہوئے۔ ایک مکمل کیمیاوی لیبارٹری ایک یونانی اور ایک ڈاکٹری شفاخانے الگ الگ قائم کیے گئے۔ پروفیسروں کی تعداد ۵ کر دی گئی۔ پنجاب کے مشہور و معروف حکیم محمد حسن صاحب قرشی کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں پرنسپل بنا دیا گیا۔ یونانی شفاخانہ ریاست بہاولپور کے سابق طبیب پروفیسر حکیم محمد زکریا صاحب کی تحویل میں دیا گیا۔ ایک میوزیم اور ایک دار الادویہ بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں تشریح کی تعلیم کے لیے MODELS اور DIAGRAMS مہیا کیے گئے۔ لائبریری میں بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں اوقات تعلیم میں ایک گھنٹہ اور بڑھا دیا گیا۔ اسی سال فرسٹ ایڈ اور ریسی ٹیشن کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں زبدۃ الحکماء کی جماعتوں کو پوسٹ گریجویٹ کلاس بنا دیا گیا اور تعلیم کے لیے انجمن نے برانڈرتھ روڈ کے کنارے اپنی دکانوں کے اوپر متعدد کمرے بنا کر طبیہ کالج کے سپرد کر دیے جہاں اب باقاعدہ دن کے وقت

مسلسل ۵ گھنٹے تعلیم دی جاتی ہے۔ پروفیسران کی تعداد سات کر دی گئی اور ان کے سالانہ اخراجات کے لیے ۱۰ ہزار روپے منظور ہوئے۔ اس ادارے کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی کھلے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ایک مرکزی دواخانہ کھولا گیا جس میں مفرد اور مرکب یونانی دوائیں تیار ہوتی تھیں۔ اس دواخانے میں کالج کے طلبہ کو مفرد ادویہ کی شناخت اور مرکبات کی تیاری کی عملی تعلیم دی جاتی تھی اور عوام صاف اور اچھی دوائیں حاصل کر سکتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں اس کے جملہ شعبہ جات میں توسیع ہوئی۔ حکیم حاذق کا کورس بجائے دو کے تین سال مقرر ہوا۔ اس وقت سے اب تک یہ کالج برابر ترقی کر رہا ہے۔

یونانی شفاخانہ (خیراتی) طلبائے طبیہ کالج کی عملی تعلیم کے لیے قائم ہے۔ جو کچھ انھیں طبیہ کالج میں تعلیم دی جاتی ہے یہاں اس پر عمل ہوتا ہے۔ یہاں مریضوں کو مفت دوائیں اور مفت مشورے دیے جاتے ہیں۔ موجودہ اسٹاف ایک طبیب انچارج، ایک دوا ساز اور ایک خاکروب پر مشتمل ہے۔ مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور ۱۹۶۰ء میں یہ تعداد ۵۹ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کالج میں طلباء کی تعداد تقریباً ۱۵۰ ہے اور اب کالج کی پرنسپل کے فرائض حکیم فضل الٰہی صاحب انجام دے رہے ہیں۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء ملک کے ہر حصے میں قوم کی طبی خدمات کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ شہر کے مختلف محلوں میں شفاخانے کی طرف سے کیمپ لگا کر عوام کی خدمت کی جاتی ہے اور مستحقین کو طبی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

ہوسٹل کے لیے کھلی فضا میں عمارت نہ ملنے کی وجہ سے سردست اکبری دروازے کے اندر لاہور کی تاریخی بلڈنگ آزاد منزل میں طلباء کو ٹھہرایا گیا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی موزوں عمارت مل جائے تاکہ تمام BOARDERS ایک جگہ ہو جائیں۔

۱۹۶۰ء میں نتائج مندرجہ ذیل ہوئے:

حکیم حاذق	۸۰ فی صد
زبدۃ الحکماء	سو فی صد

اس کالج کو چلانے اور اس کے انتظام کو درست کرنے کے لیے کالج کی ایک انتظامیہ کمیٹی بنی ہوئی ہے جس کے چیئرمین حکیم محمد حسن صاحب قرشی ہیں۔ انتظامیہ میں حکیم نیر واسطی، حکیم مرزا یحییٰ، ڈاکٹر صادق صاحب ایم بی بی ایس، حکیم چودھری عبداللطیف اور حکیم محمد طالب صاحب ہیں۔ انجمن کی طرف سے شیخ مقبول احمد صاحب ریٹائرڈ سیشن جج اس کالج کے انچارج ہیں۔

ہیلی کالج لاہور — قیام: ۱۹۲۷ء — تعداد طلبہ: ۶۰۰

پنجاب کا صوبہ شاہان دہلی کے زمانے سے شمشیر زن رہا ہے۔ مسلمانوں نے نصاب کتاب کی باتیں قیامت پہ اٹھا رکھی تھیں لیکن انگریز قوم کے وجود سے صنعت و حرفت اور تجارت میں مہارت پیدا ہوئی۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں تجارت اور بینکنگ کے اصول وضع کیے اور اسی غرض کے لیے ۱۹۲۷ء میں ہیلی کالج آف کامرس کی بنیاد پڑی۔ دراصل اس کالج کو یونیورسٹی پنجاب کا ایک شعبہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کالج آجکل جس عمارت میں ہے یہ سر گنگا رام نے عطا کی تھی۔ اس عمارت کے ساتھ ساتھ ایک ہوسٹل بھی تھا جس میں طلباء کی رہائش کا بڑا معقول انتظام تھا۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے ایک ہال، دو کمرے ایک ٹک شاپ اور ایک نیا ہوسٹل اور تعمیر کیا۔ اس کالج کا سارا انتظام یونیورسٹی کے تحت ہے۔ انتظامیہ میں ایسے ایسے حضرات شامل ہیں جو ملک میں صنعتی اور تجارتی ترقیوں کے موجب ہیں۔

۱۹۵۳ء تک اس کالج میں B.COM تعلیم کی آخری منزل تھی لیکن ۱۹۵۴ء میں چند امریکی پروفیسروں کی آمد سے M.COM کی ایک سالہ کلاس بھی جاری کر دی گئی۔ واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی نے ایم کام کے لیے پروفیسروں کے علاوہ سینکڑوں کتابیں بھی دیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کالج کے دو پروفیسروں کو مدعو کیا۔ پروفیسر میتھیز اور ڈاکٹر کینجی (KENJI) سے نے مل کر اس کالج کی دو برس تک خدمت کی اور یاکستانی طلباء میں اکاؤنٹنسی اور بینکنگ کا ذوق پیدا کیا۔ اس کالج کے طلباء کو درس دینے کے لیے لاہور کے دوسرے کالج کے پروفیسر حضرات بھی تشریف لاتے ہیں۔

اس وقت کالج میں تقریباً ۶۰۰ طلباء زیر تعلیم ہیں اور بیس حضرات اسٹاف میں شامل ہیں۔ پرنسپل صاحب کا اسم گرامی محمد حسن ہے اور ابھی حال ہی میں اکاؤنٹنسی کی انڈین سوسائٹی نے موصوف کو لائف فیلو شپ کا اعزاز دیا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے چھ برس سے اس کالج میں سہ سالہ ڈگری کورس کی رسم چلی رہی تھی جسے حکومت نے اب تمام ملک کے لیے مفید سمجھا اور جاری کر دیا۔ اس سال بی کام کا سالانہ نتیجہ ۵۱ فی صد اور ایم کام کا ۹۰ فی صد رہا۔ اس سال سے کالج میں چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کی جماعتیں بھی جاری کر دی جائیں گی۔

اس کالج میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں تقریباً ۱۷ ہزار کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں بینکنگ، معاشیات، اقتصادیات اور دوسرے مضامین کی کتب شامل ہیں۔

اس کالج کے میگزین کا نام "الاقتصاد" ہے۔ یہ سال میں صرف ۲ مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میگزین سے طلباء کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

کالج میں طلباء کے آرام کے لیے اور تجارتی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کے لیے ایک کواپریٹو سوسائٹی بنی ہوئی ہے۔ پچھلے سال اندازاً آٹھ ہزار کا سامان فروخت ہوا جس میں ساڑھے آٹھ سو روپے کا منافع ہوا۔ اس سوسائٹی کے صدر نصیر صاحب ہیں۔

ایم۔اے۔او کالج

قیام : ۱۹۳۳ء
تعداد طلباء : ۱۲۰۰

اگر آپ سول سکرٹریٹ لاہور سے جو ہرجی کی طرف چلیں تو چند قدم پر سیکلیگن انجینئرنگ کالج کے سامنے ایک بوسیدہ سی عمارت نظر آئے گی جسے ہر ہر رنگ سے خوش وضع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی عمارت محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج ہے جسے عرف عام میں ایم اے او کالج کہتے ہیں۔

یہ کالج انجمن اسلامیہ امرتسر کی تحویل میں کام کر رہا ہے جس کا دائرۂ عمل محض مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی جدوجہد تک محدود ہے۔ انجمن اسلامیہ کو جس کا نام مجلس اسلامیہ امرتسر تھا یہ فخر حاصل ہے کہ مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے پنجاب میں علم و عمل کا چرچا اس نے شروع کیا۔ سرسید کے جس مشن کو حضرات ادھر نے سینے سے لگایا اسے اہل امرتسر نے سب سے پہلے اپنا کر ۱۸۷۲ء میں ایک مجلس کی بنیاد ڈالی۔ دو سال کے بعد ۱۸۷۴ء میں یہ درخت بارور ہوا۔ خان بہادر آغا کلب عابد مرحوم اسسٹنٹ کمشنر امرتسر اور خان بہادر منشی محمد مہدی خاں مرحوم سابق وزیراعظم ریاست بہاولپور نے اپنے لہو سے اس انجمن کو سینچا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۸۸۵ء میں اسی انجمن کے تحت ایک ہائی اسکول کام کرنے لگا۔ یہی ہائی اسکول ایم اے او ہائی اسکول کہلایا اور ۱۹۳۳ء میں ایم اے او کالج بن گیا۔ انجمن کی اس کوشش کو اس لیے سراہا گیا کہ ہندوؤں کے ۳۲ دانتوں میں مسلمانوں کی ایک زبان تھی۔ ایک طرف سرسید کے مشن کے تحت طلباء انگریزی کے دلدادہ ہوتے جا رہے تھے تو دوسری طرف علماء کے زیر اثر دینیات کی تعلیم کا تقاضا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا

اس کالج کے اغراض و مقاصد کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارکنانِ انجمن کو دینی تعلیم کا احساس بے حد تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اس کالج کے اغراض میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت خاص طور پر رکھی حالانکہ مسلمانوں کا اوّل ایمان اطاعتِ خدا و رسولؐ ہے۔

تحریکِ پاکستان میں اس کالج کے طلباء نے دل کھول کر حصہ لیا۔ دیہاتی مسلمانوں کے شعور کو بیدار کیا، شہروں میں سیاسی بے چینی کے آثار رونما ہو چکے تھے ضرورت فقط تھی اور شناس رہبروں کی تھی۔ قائدِ اعظم کی نرم مگر دل ہلا دینے والی آواز نے کالج کے نوجوانوں میں ایک تڑپ ایک ہلچل اور ایک بے چینی پیدا کر دی۔ انھوں نے آزادی کے لیے سر اور دھڑ کی بازی لگا دی اور خون سے ہولی کھیلتے ہوئے پاکستان کے جھنڈے کو بلند رکھا۔ اس دور میں کالج کے پرنسپل مسٹر دلاور حسین ایم اے علیگ تھے۔

۱۹۴۷ء میں کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ انجمن اسلامیہ کے ۳۱ اراکین جمع ہوئے اور موجودہ متروکہ عمارت پر قبضہ کر کے کالج کا سنگِ بنیاد پھر سے رکھا گیا۔ کالج کے لیے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی جس میں سراج الدین پال ایڈووکیٹ اور چودھری ظہور الدین کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ اغراض و مقاصد میں چند ترمیمیں ہوئیں، پاکستان سے وفاداری اور اسلامی سیاست کا شعور طلباء کی زندگی کا جزو بنا۔ مسٹر دلاور حسین صاحب ہی پرنسپل منتخب ہوئے اور آج تک اس کالج کو بڑی حسن و خوبی سے چلائے جا رہے ہیں۔

چونکہ اس کالج کے انتظام میں انجمن کے کارکنان کا دخل بہت زیادہ ہے اس لیے انجمن کی سیاست کے ساتھ ساتھ کالج کی بھی سیاست بدلتی رہتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ شیخ غلام صادق صاحب جو شیخ صادق حسن صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر حکومت پنجاب کے والد تھے صدر کی مسند پر تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے ۴۰ سال بعد انجمن کی صدارت اب پھر اسی گھر میں واپس آئی ہے اور اب جناب شیخ مسعود صادق صاحب سابق وزیر بحالیات پنجاب جو شیخ غلام صادق صاحب مرحوم کے پوتے ہیں صدر منتخب ہوئے ہیں۔

اس کالج کی امتیازی شان کا ذکر کرتے ہوئے جناب پرنسپل صاحب نے بتایا کہ اس انجمن یا اس کالج نے آج تک کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا، نہ چندہ بازی اس درس گاہ کے طلباء کا شعار بنایا گیا۔ خیال تو یہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد حکومت خود اس کالج کی سرپرستی کرتی لیکن ہوا تو یہ ہوا کہ انجمن کے اکثر کلیم بھی منظور نہ ہوئے اور کالج کو خسارہ برداشت کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک کالج اپنی عمارت کو مکمل نہ کر سکا۔ حکومت کی طرف سے کالج کو ۲۰ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔

کالج کی علمی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحب نے بتایا کہ قوم کے اکثر طلباء جب کسی کالج میں داخلہ نہیں پاتے تو یہی کالج ان کی دست گیری کرتا ہے پھر بھی اس سال بی ایس سی کا نتیجہ گورنمنٹ کالج کے بعد سب سے اچھا رہا۔ اسٹاف ۳۰ ممبران پر مشتمل ہے جن میں اچھی قابلیت اور وسیع تجربے کے اساتذہ بھی ہیں۔ طلباء کی کل تعداد ۱۲۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس کالج میں دو ہوسٹل ہیں جن میں کئی سو طلباء رہائش پذیر ہیں۔

کالج کا انتظام ایک کالج کونسل کرتی ہے جس کے ذمہ مندرجہ ذیل امور ہیں:۔

۱۔ جملہ انتظامی امور

۲۔ مالیات کا کنٹرول

۳۔ ہوسٹل کا قیام

کالج کا ایک میگزین بھی ہے جس کا نام شفق ہے لیکن دیکھنے میں کم آتا ہے۔

اسلامیہ کالج برائے مستورات

قیام : ۱۹۳۹ء
تعداد طالبات : ۱۲۳۰

دلی میں مولوی نذیر احمد اور پنجاب میں خلیفہ عماد الدین، حاجی شمس الدین اور بابائے انجمن حمایت اسلام منشی نجم الدین کو لڑکیوں کی تعلیم کا بے حد خیال تھا لیکن ان کے عہد حیات میں ان کی تمنائیں پوری نہ ہو سکیں۔ ہاں ان کی آرزو ۱۹۳۹ء میں اس طرح پوری ہوئی کہ انجمن نے کوپر روڈ پر ۱۹۲۱ء میں ایک کوٹھی خریدی تھی اور اسے مسمار کر کے زنانہ کالج کے لیے ایک عالیشان عمارت بنا دی اس کالج کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ نوجوان مسلم طالبات کو اسلامی روایات کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے لاہور میں بہت سے اسکول تھے جن میں "کو ایجوکیشن" ہو رہی تھی اور ہماری بہت سی ذہین اور بیٹیاں زمانے کی نیرنگیوں کا سامنا دینے کے لیے تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ لیکن ترقی پسند مسلم سوسائٹی کے لیے اعلیٰ اور مفید تعلیم فراہم کرنا ایک اہم فریضہ تھا۔ بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ساتھ چلنا اور اپنی قومی روایات کو نہ چھوڑنا دینا یہی اس کالج کی وجہ بنیاد تھا مسلسل اکیس سال سے یہ کالج مسلمان لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے اور آج اس کالج میں طالبات کی کل تعداد ۱۲۳۰ ہے۔

ابھی تعلیم کے لیے مناسب عمارت اور وافر جگہ کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کالج میں شجاع الدین ہال کی تعمیر ہوئی ہے اور کچھ حصے پر کمرے بھی تعمیر ہوتے ہیں لیکن تعلیم کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ ۱۹۶۰ء میں سائنس بلاک بن کر تیار ہو گیا اور اب اس کالج میں ایک بہترین لیبارٹری پوری سے آلات سے مزین موجود ہے۔ ابھی تک کالج کے کمروں ہی میں دفتر قائم تھا لیکن اب دفتر کی بلڈنگ علیحدہ تعمیر ہو گئی ہے اس لیے دفتر کے کمرے بھی طالبات استعمال کر سکیں گی۔ انجمن نے تین کمروں کے بنانے کی اور اجازت دے دی ہے اور آئندہ یہ کمرے بی کلاس کے لیے استعمال ہو سکیں گے۔

طالبات کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ہوسٹل میں بھی تعداد طالبات بڑھنے لگی اس لیے طے پایا کہ مزید پانچ کمرے تعمیر کر کے اس کمی کو پورا کیا جائے۔

حکومت کی طرف سے اس کالج کو ۱۵ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ ملتی ہے یہ رقم کالج کے کل اخراجات کا ۹ فی صد ہے ظاہر ہے کہ بقیہ رقم چندے سے حاصل ہوتی ہے اور ایسے اداروں میں جہاں آمدنی کا کوئی تخمینہ نہ ہو حالات صحیح اور مناسب نہیں رہ سکتے۔ ایسے نازک وقت میں حکومت کا اولین فرض ہے کہ ان اداروں کی ہمت افزائی کرے ورنہ واقعات اور حالات کی رو اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جلد یا بہ دیر ایسے کالجوں کو بند کرنا پڑے گا۔

ایجوکیشن کمیشن نے کالجوں پر جو بوجھ ڈالا ہے یہ کالج اسے بخوبی پورا کر رہا ہے۔ سہ سالہ ڈگری کورس کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن آئندہ کے لیے تنگی جا کا مسئلہ ابھی سے پریشان کر رہا ہے۔ دوسرے ممالک میں پبلک اداروں کو چلانے کے لیے اعزازی پروفیسر امداد کرتے ہیں لیکن پاکستان میں اس قسم کا تصور بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اس کالج میں کچھ اعزازی پروفیسر کام کرتے ہیں مگر تابکے، آئندہ سال میں مزید لکچراروں کی ضرورت ہے اور ارکان انجمن ابھی سے مشوش ہیں۔

اس کالج کی لائبریری کی عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی ہے اور ضرورت ہے اسے مسمار کر کے دوسری عمارت بنائی جائے یہی سبب ہے کہ لائبریری کو ایک کلاس روم میں منتقل کر دیا گیا ہے اس وقت لائبریری میں تقریباً سات ہزار کتابیں ہیں لیکن مزید کتابوں کی ضرورت ہے۔ یہ کالج ہر سال ایک مینا بازار لگاتا ہے اور اس سے ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ جمع کر کے کبھی کالج ہال کبھی کمرے اور کبھی لائبریری روم

تیار ہونا ہے۔

اس کالج کا معیار تعلیم بلند ہے۔ ۱۹۶۰ میں ایف اے کا نتیجہ ۷،۶۶ر۱ جبکہ بورڈ کا نتیجہ ۳۲ فی صد تھا۔ اس کالج کا بی اے کا نتیجہ ۹۶ء۴۰ تھا جبکہ یونیورسٹی کا نتیجہ ۳۲ فی صد تھا۔

یہ کالج اپنی پسماندگی کے باوجود ۲۴۳ طالبات کو وظیفہ دیتا ہے جس میں انجمن کی طرف سے فیسوں کی رعایت بھی شامل ہے۔ مجموعی رقم جو طالبات کو ادا کی جاتی ہے ۲۹۴۹۰ روپے ہے یعنی حکومت کی سالانہ گرانٹ سے ۴۰۹۰ روپے زائد۔ ایسے حالات میں اگر مخیر حضرات بھی اپنا ہاتھ روک لیں (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو یہ کسی ایک انجمن کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ کل قوم کا عظیم نقصان متصور ہوگا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے میدان میں بھی اس کالج نے نام پیدا کیا ہے۔ سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے ۱۹۶۰ میں ہونے والے انٹر کالج اسپورٹس میں پچاس اور سو اور دو سو میٹر فلیٹ ریس میں اسی کالج کی طالبہ جمیلہ اوّل آئیں۔ ریلے ریس میں بھی اس کالج کو اوّل انعام ملا۔

تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کالج میں ادبی سرگرمیوں کا بھی زور ہے۔ ہر سال ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں کراچی، پشاور اور ڈھاکہ سے شاعرات تشریف لاتی ہیں۔ اس مشاعرے کی آمدنی بھی ہال فنڈ میں جمع ہو جاتی ہے۔ پچھلے سال اس کالج کی طالبات روشن آرا اور نزہت نے انٹر کالج گلبرگ کی ٹرافی جیتی۔

اس کالج کی طالبات کے ذوق کی تسکین کے لیے ایک کالج میگزین بھی نکلتا ہے جس میں اُردو اور انگریزی مضامین شامل ہوتے ہیں۔ مجلہ کا معیار ایک اعلیٰ کالج کے معیار کے مطابق نہیں ہے۔

انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگ

قیام: ۱۹۵۷ء
تعداد طلباء: ۴۰۰

لاہور میں تعلیم کی بڑھتی ہوئی رفتار اور مقامی کالجوں میں نکلتی ہوئی "نو ایڈمیشن" کی تختیوں کو دیکھ کر حکومت پنجاب نے گلبرگ میں ایک نیا کالج ۱۹۵۷ء میں اس لیے کھولا کہ قوم کے نوجوانوں کو علم کی پیاس بجھانے کے مواقع میسر آ جائیں۔ اس کالج کے لیے حکومت کے پاس کوئی عمارت نہ تھی اس لیے گلبرگ میں ۴۰۰ روپے ماہوار کرایہ پر ایک کوٹھی جس میں محض چند کمرے ہیں کچھ عرصے کے لیے لے لی گئی۔

اس کالج کی اپنی عمارت سمن آباد میں دس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہو رہی ہے۔ جس وقت کالج شروع کیا گیا نہ طلباء تھے نہ اساتذہ مجبور ہو کر کچھ فیل شدہ طلباء کو لے کر کلاسیں شروع کی گئیں۔ ڈاکٹر اُپل اس کالج کے پرنسپل بنائے گئے اور طلباء کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اُپل صاحب کے بعد سید رضا حسین صاحب ڈپٹی سیکرٹری تعلیم نے پرنسپل کے فرائض ادا کیے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد چودھری محمد اسلم صاحب نے اس کشتی کی ناخدائی کی۔ چودھری صاحب کے بعد پروفیسر شبیر احمد نے اس کالج کے انتظامات کو سنبھالا لیکن آپ جھنگ میں پرنسپل ہو کر چلے گئے اور آج کل ایم آر طوسی صاحب پرنسپل ہیں گویا ۴ سال میں پانچ پرنسپل آئے۔ ان تمام حضرات نے اس کالج کی خاطر کیا کچھ کیا ہوگا اس کے بتانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ موجودہ پرنسپل صاحب اپنے تجربہ کے لحاظ سے بہت سینئر آفیسر ہیں لیکن اس کم ظرفی کا کیا علاج کہ کالج تو گلبرگ میں ہے لیکن گلبرگ کے تمام طلباء یا تو ایف سی کالج میں زیر تعلیم ہیں یا گورنمنٹ کالج میں نتیجہ یہ ہے کہ لاہور (بستی) کے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد اس کالج میں موجود ہے جن کی حیثیت خراب اور حالت خستہ ہے۔

جب کالج کی اپنی کوئی عمارت نہیں تو ہوسٹل کا سوال ہی بیکار ہے۔ سنا گیا ہے کہ ہوسٹل کے لیے حکومت کی مشینری کو بار ہا تکلیف دی گئی ہے

لیکن نتائج وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔ اس کالج میں کئی انجمنیں ہیں جن میں کالج یونین بڑی مستعد ہے۔ چونکہ طلباء اور اساتذہ دور دراز سے یہ تشریف لاتے ہیں اس لیے یونین بجتے ہی روانگی کی فکر کرنے لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یونین کا اجلاس ہفتہ کو کالج ٹائم ہی میں کر دیا جاتا ہے تاکہ کم سے کم شریک ہو کر یونین کے احساس وجود سے تو واقف ہو جائیں۔

کالج میں ایک لائبریری ہے۔ لائبریری کی کتابوں کے لیے حکومت نے ۶۰۰۰ روپوں کی گرانٹ دی ہے کتابیں فورڈ فاؤنڈیشن والوں نے عطا کی ہیں۔ طلباء کے مذاق کی کتابیں مفقود ہیں۔

ایف اے میں اُردو لازمی ہو جانے کے بعد ضروری تھا کہ ۴۰۰ طلباء کے لیے کم سے کم تین لکچرار رکھے جاتے لیکن سر دست انٹر اور سیکنڈ ایئر کے لیے صرف ایک ہی اُردو کے لکچرار ہیں اور وہی شعبہ اردو کے صدر بھی ہیں۔ پرنسپل صاحب نے اپنے حسن انتظام سے طلباء کی ضرورت کو کسی حد تک پورا کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ کچھ پیریڈ لائبریرین صاحب کو دے دیے جاتے ہیں جو اس کالج میں اپنا ڈویژن IMPROVE کے لیے رکھے گئے ہیں۔ باقی اوقات فلسفے کے استاد کو مل گئے ہیں جنھوں نے اس بار کو بخوشی منظور کر لیا ہے۔

اس کالج کا نتیجہ خراب ہے اور جب تک حکومت اس کالج پر توجہ نہ دے گی یہ خرابی بدستور رہے گی۔

نیو مسلم کالج

قیام: ۱۹۶۱ء
طلبہ: ۴۰

مسلمان طلباء اور طالبات کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے دیگر اسلامی انجمنوں کی طرح احمدیہ اشاعتِ اسلام نے بھی شہر لاہور میں دو ہائی اسکول اور ایک کالج "تعلیم الاسلام کالج" جاری کیا تھا تعلیم الاسلام کالج ۱۹۵۵ء میں ربوہ میں منتقل ہو گیا اور اس کی بلڈنگ میں اس وقت اسلامیہ کالج سول لائنز کام کر رہا ہے۔ انجمن اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ لاہور میں اسی انجمن کے تحت ایک کالج قائم کیا جائے چنانچہ اسی سال مسلم اسکول نمبرا کی عمارت میں نیو مسلم کالج کے نام سے ایک کالج قائم کر دیا گیا اور اس کے پرنسپل جناب محمد شفیع صاحب بھٹی مقرر ہوئے ہیں۔ بھٹی صاحب وہی شخص ہیں جنھیں ایف سی کالج نے تادمِ حیات پروفیسر کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ پہلا اعزاز ہے جو کسی پاکستانی کو پاکستان میں ملا ہے۔

پرنسپل موصوف نے بتایا کہ سکنڈری بورڈ نے اس کالج کی منظوری کے لیے احکام صادر کر دیے ہیں۔ سرِ دست اس کالج میں صرف بارہ اساتذہ ہیں اور ۴۰ کے لگ بھگ طلباء ہیں لیکن اس کالج کے اغراض و مقاصد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج میں ۴۰۰ طلباء تک کی تعداد رکھی جائے گی

پرنسپل موصوف نے اپنے کالج کی چار خصوصیات کا تذکرہ اپنے دستور العمل میں کیا ہے۔

(۱) خدمتِ خلق (۲) حب الوطنی (۳) پابندیٔ وقت (۴) فرض شناسی

آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کالج کے طلباء انشاء اللہ ان اصولوں کے پابند رہیں گے۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ جس عمارت میں یہ کالج کھولا گیا ہے وہ اسکول کے قبضے میں ہے اور عمارت کے ½ حصے پر کچھ اور لوگوں کا زبردستی قبضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم انھیں نکال کر حکومت کے لیے پریشانی کا موجب تو نہیں بننا چاہتے مگر جب ہمارے پاس بیٹھنے کی جگہ نہ ہو تو آخر ہم بھی کیا کریں۔ اس عمارت میں ایک تالاب بھی ہے جس کی حالات اچھی نہیں۔

موسیقار

سراج نظامی

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح لاہور تعلیم، شعر و شاعری، ادب، صحافت، مصوری اور پہلوانی میں مغربی پاکستان کا مرکز ہے اسی طرح موسیقی کا بھی مرکز ہے۔ اگر اسے اقبال، ظفر علی خاں، سر عبدالقادر، عبدالرحمٰن چغتائی، استاد اللہ بخش اور گاماں پہلوان پر فخر ہے تو استاد کالے خان، علی بخش خان، غلام علی خاں، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر غلام احمد چشتی، فیروز نظامی اور خواجہ خورشید انور جیسے موسیقاروں پر بھی بجا ناز ہے۔

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد لاہور کے موسیقاروں میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں سب کے حالات بیان نہیں کئے جا سکتے، ہم یہاں صرف مشہور و معروف موسیقاروں کے حالات پر اکتفا کریں گے۔

ہم نے لاہور کے موسیقاروں کو بارہ قسموں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) گویّے	(۲) ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے	(۳) گانے والیاں	(۴) سارنگی نواز
(۵) طبلہ نواز	(۶) ستار نواز	(۷) قوال	(۸) میوزک ڈائرکٹر
(۹) کلارنٹ نواز	(۱۰) پیانو نواز	(۱۱) نَے نواز	(۱۲) سرود نواز

۱- گویّے

۱- کالے خان آپ پنجاب کے مردم خیز شہر قصور کے مطربوں کے کلاونت خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے آباؤ اجداد کابل کے افغان سرداروں کے ساتھ پنجاب میں وارد ہوئے اور قصور میں مقیم ہو گئے، جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کو اس عہد کے مشہور موسیقار استاد فتح علی خاں پٹیالوی کے سپرد کیا گیا جنھوں نے کمال تندہی سے آپ کو استادی موسیقی کی تعلیم دی، اور بہت جلد آپ کا شمار پنجاب کے چوٹی کے موسیقاروں میں ہونے لگا۔ آپ کا رنگ بہت سیاہ تھا، آنکھیں بڑی بڑی، تن و توش پہلوانوں کا سا تھا، اور چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں، جن سے آپ کا چہرہ بڑا بارعب لگتا تھا، جنھوں استاد بڑے غلام علی خاں کو دیکھا ہے وہ کالے خاں کے جسم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ طبیعت عجیب پائی تھی، ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اسی لیے عوام میں کالے خان شوری کے نام سے مشہور تھے، عام لوگوں میں اس بات کا چرچا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے استاد

فتح علی خان کے ساتھ مل کر گانے لگے، تو مقابلہ پر اُتر آتے۔ فتح علی خان نے کہا، "جارے پگلے" بس اسی دن سے ان کی طبیعت میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا اور استادوں سے دادِ تحسین حاصل کی۔ جب آپ خیال یا ترانہ گاتے اور تانیں مارتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ کالے خان اور بھائی ارد گرد دربار داتا گنج بخشؒ میں گا رہے تھے، میں اُن دنوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا، مجھے اُن کی تانوں کی آواز سکول کی گراؤنڈ میں صاف سنائی دے رہی تھی، اس سے آپ ان کی آواز کا اندازہ لگا لیں۔

آپ کے متعلق عجیب و غریب حکایات مشہور ہیں۔ آپ حویلی میاں خان کے سامنے کٹڑہ نادر شاہ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے خوب گھی اور مسالے ڈال کر گوشت بھونا، اور دیگچی کو الماری میں رکھ دیا، اتفاق سے پولیس کسی چوری کے سلسلہ میں آپ کے محلہ میں آگئی، انھوں نے جو دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں ایک کالا کلوٹا پہلوان لنگوٹ باندھے بیٹھا ہے، تو انھوں نے شبہ میں آپ کی کوٹھڑی کی بھی تلاشی لینا چاہی۔ آپ اُچھل کر کھڑے ہو گئے، اور الماری کے ساتھ پشت لگا کر کہنے لگے، کہ الماری کے سوا ہر جگہ کی تلاشی لے لیں۔ پولیس والوں کا شبہ اور قوی ہو گیا، اور وہ الماری کی تلاشی لینے پر مصر ہو گئے، لیکن جب تلاشی لی گئی، تو اس میں سے دیگچی کے سوا کچھ نہ نکلا، پولیس منفعل ہنسنے لگے، کالے خان بولے: "اب اس گوشت کو تم ہی لے لو، میں نہیں کھاؤں گا، اسے نظر لگ گئی ہے!"

آپ کا معمول تھا کہ ہر روز گوشت بھونتے، دیسی شراب کا ایک پوا پیتے، اور تیل، صابن اور لنگوٹ ان تمام اشیا کو ایک گٹھڑی میں ڈال لیتے، اور ٹکسالی دروازہ کے باہر کارپوریشن باغ میں پہنچ جاتے، چھتری زمین میں گاڑ دیتے، لنگوٹ کستے تیل ملتے اور پھر دونوں ہاتھوں کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر ڈنڈ پیلتے، اور ساتھ ساتھ تانیں بھی مارتے جاتے، اور یوں موسیقی کی ریاضت کرتے، کسرت کے بعد نہر میں نہاتے، کپڑے پہنتے، گوشت کھاتے، شراب پیتے اور وہاں سے سیدھا ٹبی اور ہیرا منڈی کو ہو لیتے، ایک مرتبہ آپ اسی حالت میں چلے آرہے تھے کہ کسی نے آپ کو اپنے ہاں بٹھا لیا اور پوربی راگ سنانے کی فرمائش کی، آپ کہنے لگے: "وہ کونسا راگ ہے، مجھے تو نہیں آتا" لیکن چند منٹ کے بعد کہنے لگے: "لو بھئی پوربی آگیا!" پھر جو گائے تو یوں معلوم ہونے لگا جیسے فضا میں پوربی کا ہی تسلط ہے۔

ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ڈیرہ دار نے موسیقی کی محفل منعقد کی، اور کالے خان کو گانے کی دعوت دی، قصور کے ایک مشہور سارنگی نواز غلام محمد سے ان دنوں ان کی بول چال نہ تھی، لوگوں نے خواہش کی کہ کالے خان گائیں اور آپ کے ساتھ غلام محمد قصوری سارنگی پہ سنگت کریں، جن لوگوں نے یہ محفل دیکھی ہے اور کالے خان کا گانا اور غلام محمد کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی سر دھنتے ہیں، دونوں فنکاروں نے اپنا پورا زور لگا دیا، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں رونے لگے اور بغلگیر ہو گئے، اور یوں دونوں کی رنجش جاتی رہی۔

مرنے سے کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ میں گانا سنایا، جہاں سے کافی انعام ملا، آپ نے شراب پی، دریائے گومتی کے کنارے پہنچے اور پچاس روپے گومتی میں پھینک کر کہا "لے خواجہ خضر، یہ تیری نذر ہیں!" پھر اصغر علی محمد علی

عطر والوں کی دوکان پہنچے اور اچھی خاصی رقم کا عطر خریدا، تھوڑا سا کپڑوں پر لگایا اور باقی سارا اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر مل لیا۔ عطر والوں نے حیران ہو کر پوچھا "خان صاحب یہ کیا کیا آپ نے؟" کہنے لگے: "بھیا یہ کپڑے تو یہیں رہ جائیں گے مگر کم بخت مونچھیں تو قبر میں ساتھ جائیں گی!"

اس کے چند دن بعد آپ کا انتقال ہو گیا، حقیقت یہ ہے کہ کالے خان کی جگہ ابھی تک کسی موسیقار نے پُر نہیں کی۔

۲۔ علی بخش خاں

آپ کالے خاں کے سگے بھائی تھے، اور خیال، ترانہ، ٹھمری گانے اور سرگم کرنے میں بے بدل تھے پہلے پہل آپ دلربا بجایا کرتے تھے، ایک مرتبہ غالباً کانپور میں ایک طوائف کے مکان پر محفل موسیقی منعقد ہوئی، کالے خاں گانے کے لیے بیٹھے، اور علی بخش خان سے کہنے لگے کہ ذرا طنبورہ چھیڑ کر میرے ساتھ آواز لگاتے جاؤ، علی بخش آواز لگانے لگے مگر کہاں کالے خاں کی آواز اور کہاں علی بخش خان کا گلا، مصیبت میں پھنس گئے، خیر جوں توں کر کے وقت نبھایا لیکن غیرت جو آئی تو سیدھا گوالیار جا پہنچے، وہاں ہندوستان کی مشہور مغنیہ گوہر جان کی سفارش پر بھیا نتھو جی کے شاگرد ہو گئے، اور چند برسوں میں سرگم کے استاد بن گئے، اب جو واپس آ کر اپنے بھائی کالے خان کو گانا سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ہاں اب تو میرا حقیقی بھائی ہے، اس کے بعد جس محفل میں دونوں بھائی گاتے، کالے خان تان کہتے اور علی بخش خاں تان کی سرگم کرتے تو ہر طرف سے واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگتے۔

کالے خان کی وفات کے بعد علی بخش خان تنہا گاتے رہے اور بڑی بڑی ریاستوں سے انعام و اکرام حاصل کیا۔ آپ کی وفات لاہور ہی میں ہوئی۔ کالے خان کے مقابلے میں علی بخش خان نہایت ہی خوب رو تھے۔

۳۔ بڑے غلام علی خاں

آپ کالے خاں کے بھتیجے اور علی بخش خان کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کا شمار پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم کالے خاں اور علی بخش خاں سے حاصل کی، اور جن لوگوں نے آپ کا گانا سنا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ چچا اور والد دونوں کا رنگ آپ کے گانے میں نمایاں ہے، جب آپ تانیں مارتے ہیں تو کالے خاں دکھائی دیتے ہیں اور جب تانوں کی سرگم پر آتے ہیں تو علی بخش خاں نظر آتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آواز اتنی پاٹ دار اور رسیلی ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرسوتی دیوی گا رہی ہے اور کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

گانے کے علاوہ آپ سارنگی بھی بجاتے رہے ہیں۔ ریاستوں اور موسیقی کی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں آپ نے کافی حصہ لیا ہے، اور اپنا لوہا منوایا ہے، مہاتما گاندھی جی بھی آپ کے گانے سے محظوظ ہوئے تھے جشن استقلال میں ہر سال دربار کابل میں گاتے ہیں۔

آپ نے کچھ عرصہ استاد عبدالوحید خان کیرانوی سے بھی گانا سیکھا، مگر زیادہ تر آپ پٹیالہ کے مکتب موسیقی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ناقدری زمانہ کے باعث آپ بمبئی چلے گئے، اور ہندوستانی قومیت اختیار کر لی، آجکل آپ وہیں مقیم ہیں، فالج کے حملے نے کمزور کر دیا ہے۔

۴۔ مبارک علی خاں علی بخش خاں کے فرزند اور بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے، آپ نے موسیقی اپنے والد اور بھائی سے سیکھی، اور بہت اچھا گانے لگے۔ خیال اور ٹھمری بہت عمدہ گاتے تھے، ۸
کچھ عرصہ آپ نے فلمی اداکاری بھی کی، آخری عمر میں آپ نے ایک میوزک سکول بھی کھولا، مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی، اور یہ جوان سال مغنی داغ مفارقت دے گیا۔

۵۔ امانت علی خاں آپ بھی بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور گانے اور آواز کے رسیلے پن میں خاندانی روایات کے حامل ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں، قرائن بتا رہے ہیں کہ اگر آپ اسی طرح گاتے رہے تو باپ دادا کا نام روشن کریں گے۔

۶۔ چھوٹے غلام علی خاں قصور کے مطربوں کے نقیب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ابھی چھوٹے ہی تھے کہ موسیقی کی محفلوں میں گانے لگے اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث اچھے گانے والوں میں شمار ہونے لگے۔ نہایت خوبصورت اور خوش خلق ہیں۔ خیال، ترانہ، ٹھمری، دادرا اور غزل گانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے اکثر استاری موسیقی نشر کرتے ہیں۔ نجی محفلوں میں بھی گاتے ہیں۔ محرم الحرام میں سوز خوانی بھی کرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ خوب کرتے ہیں۔ خلوص کا پیکر ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی اکثر بڑی بڑی میوزک کانفرنسوں میں شریک ہو کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۷۔ اختر حسین خاں آپ پٹیالہ کے مشہور گھرانے کے فرد، مشہور موسیقار علی بخش خاں عرف جرنیل صاحب کے فرزند ارجمند اور فتح علی خاں کے بھتیجے ہیں۔ فتح علی خاں اور علی بخش خاں اپنے وقت کے استاد مانے جاتے تھے، مہاراجہ پٹیالہ کے درباری موسیقار تھے، انھوں نے ان کے فن کی داد دیتے ہوئے فتح علی خاں کو کرنیل اور علی بخش خاں کو جرنیل کہا، اور وہ اسی عرف عام سے مشہور ہو گئے۔ روایت ہے کہ جب ان دونوں موسیقاروں کے والد نے انھیں استادی موسیقی کی کماحقہٗ تعلیم دے دی، تو انھیں ساتھ لے کر ہندوستان کے دورے پر نکلے اور اکثر مقامات پر لوگوں کو ان کا گانا سنایا اور داد لی، اسی اثنا میں ایک ریاست میں پہنچے جس کے دربار میں استاد مربج نامی ایک سارنگی نواز ملازم تھا اور کسی گویے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسی دربار میں فتح علی خاں اور علی بخش خاں جرنیل گائے اور مربج خاں نے سارنگی پر سنگت کی، دونوں طرف سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، آخر مربج خاں ہار گیا اور اس نے سارنگی زمین پر پھینک کر کہا، "کم بخت ہاتھ کا ساز تھا نا، گلے کا ساتھ نہ دے سکا" اور اسی غم میں خودکشی کر لی۔

اختر حسین خاں نے انہی جرنیل صاحب یعنی اپنے والد سے تعلیم حاصل کی، انھوں نے انھیں استادی موسیقی کی ہر صنف کی تعلیم دی، اور آپ نے لاہور کی کئی محفلوں میں کمال فن کا مظاہرہ کر کے داد لی، اس وقت پٹیالہ کے گھرانے کے خلیفہ آپ ہی ہیں۔

۸۔ امانت علی خاں فتح علی خاں یہ دونوں جواں سال موسیقار اختر حسین خاں کے بیٹے اور جرنیل صاحب پٹیالوی کے پوتے ہیں۔ دونوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اور تھوڑے

عرصہ میں اچھے موسیقاروں کی فہرست میں شمار ہونے لگے، سچی بات تو یہ ہے کہ پٹیالہ کی گائیکی کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ فنِ موسیقی کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ فتح علی خاں میں اپنے دادا جرنیل صاحب کی ساری صفات، و صلاحیتیں موجود ہیں اور اگر یہ اسی طرح ریاضت کرتے رہے تو ان کا نام زندہ رکھیں گے۔

۹۔ عاشق علی خاں آپ پٹیالہ کے مشہور موسیقار فتح علی خاں کے فرزند ارجمند تھے۔ ابھی بچہ ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اور آپ لاہور چلے آئے، یہاں کس مپرسی کی حالت میں رہنے لگے۔ کہنے کو تو لاہور کے سارے موسیقار فتح علی خاں کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں، مگر اُن کے یتیم فرزند کا ہاتھ کسی نے نہ پکڑا۔ اگر سردار بائی کا دم نہ ہوتا تو پتہ نہیں اس دُرِ نایاب کا کیا حال ہوتا۔ بچپن ہی سے طبیعت میں لا اُبالی پن تھا، عرصہ تک بھنگ اور چرس کے رسیا رہے۔ جب نشہ میں آتے اور گاتے تو عجب لطف آتا۔ آپ کی آواز میں عجب رس تھا، کچھ عرصہ بعد یکایک کایا پلٹی اور آپ نے اپنے ماموں سے گانے کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے عاشق علی خاں اپنے وقت کے تمام گویوں پر چھا گئے، ہندوستان میں جس طرف بھی گئے اپنے فن کا لوہا منوا کر ہی آئے۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک میوزک کانفرنس میں استاد احمد جان تھرکوا ان کے ساتھ طبلہ بجانے بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ کونسا تال بجاؤں، آپ نے کہا جونسا آپ کا جی چاہے، پھر جو تانیں اڑائی اور گرہ لگانا شروع کیا تو سامعین کا یہ حال تھا کہ تالیاں بجاتے اور کرسیوں سے اُچھلتے تھے۔ لاہور میں بھی آپ نے سینکڑوں مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا، آپ کے بے شمار شاگرد ہیں، جن میں سے زیادہ مشہور امرتسری مختار بیگم اور فریدہ خانم ہیں۔

آپ لاہور ہی میں فوت ہوئے اور تکیہ مراثیاں چیمبرلین روڈ میں دفن ہوئے۔

۱۰۔ پیارے خاں آپ جنڈیالہ گورو ضلع امرتسر کے باشندے تھے اور مشہور موسیقار بنے خاں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ موسیقی آپ نے پٹیالہ کے جرنیل صاحب سے سیکھی، اور چند برسوں کی ریاضت کے بعد چوٹی کے موسیقاروں میں شمار ہونے لگے، آپ ہندوستان کے اچھے اچھے گویوں کے ساتھ گائے۔ زیادہ تر علاقہ سندھ میں رہے، اونچے لمبے کڑیل جوان تھے، جب لمبے لمبے ہاتھ ہلا کر گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ گوردوارہ بھمن شاہ ضلع منٹگمری کے صاحب ذوق مہنت آپ کے قدردانوں میں سے تھے۔ مرحوم نواب تہیر پور بھی آپ کے مداحوں میں سے تھا۔ آپ عرصہ تک اس دربار سے منسلک رہے۔ طبیعت بڑی خوش باش تھی، آپ لاہور میں فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے۔

۱۱۔ امید علی خاں پیارے خاں صاحب کے بڑے فرزند ہیں۔ اور پاکستان کے اچھے موسیقاروں میں شمار کئے جاتے ہیں آپ نے موسیقی اپنے والد سے سیکھی، اور بہت جلد اس میں نام پیدا کر لیا۔ اہلِ لاہور کو وہ محفلیں اچھی طرح یاد رہیں گی جن میں بڑے غلام علی خاں، عاشق علی خاں اور امید علی خاں نے اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور سامعین سے داد لی آپ بھی والد کی طرح سندھ میں رہے۔ پاکستان ریڈیو پر اکثر استادی موسیقی نشر کرتے ہیں۔ خیال، ترانہ، دھرپد، ٹھمری، سندھی کافی نہایت مہارت سے گاتے ہیں۔

۱۲۔ غلام رسول خاں ۔ آپ امید علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں، اور نوجوان موسیقاروں میں اچھے مانے جاتے ہیں۔ جب

گانے میں خوب چمک کر گاتے ہیں۔

۱۳۔ مچھر خاں آپ کا اصلی نام جمال خاں تھا مگر تیز تان اور گانے کے انداز کے سبب لوگوں میں مچھر خاں کے نام سے مشہور تھے، خیال اور کافی خوب جم کر گاتے تھے، اور جب تیز تان مار کر سم پر آتے تھے تو لوگ بے اختیار واہ واہ پکار اٹھتے تھے۔

۱۴۔ مراد علی خاں آپ امید علی خاں کے رشتہ دار ہیں۔ پہلے گوردوارہ کھیم شاہ کے ٹھنت کے منشی تھے، چونکہ استادی موسیقی کا چرچا خاندان میں تھا، اور خود بھی اس میں سر جھ بدھ رکھتے تھے اس لیے قیام پاکستان کے بعد گانا شروع کر دیا، اور سچ پوچھئے تو اس عمر میں اتنا اچھا گانا بلاشبہ قابلِ داد ہے۔ آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر استادی موسیقی اور کافیاں نشر کرتے ہیں۔

۱۵۔ نزاکت علی خاں سلامت علی خاں غیر منقسم ہندوستان میں ضلع ہوشیار پور کے قصبہ شام چوراسی میں ایک گھرانا تھا جو شام چوراسی والوں کا گھرانا کہلاتا تھا، اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہندوستانی موسیقی کی قدیم اور مشکل صنف دھرپد تھا۔ نزاکت علی خاں سلامت علی خاں دونوں سگے بھائی ہیں اور اسی گھرانے کے ایک فرد ولایت خاں کے فرزند ہیں۔ ولایت خاں کے آباؤ اجداد میں چاند خاں سورج خاں حد زبردست گویّے گزرے ہیں جنھوں نے شہنشاہ اکبر کے دربار میں میاں تان سین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ان سے داد لی، نزاکت علی سلامت علی نے موسیقی اپنے والد سے سیکھی، اور ابھی چھوٹے سے تھے کہ محفلوں میں گانے لگے، اور داد و تحسین حاصل کرنے لگے، جب دونوں بھائی گاتے ہیں تو سننے والوں کو ان کی استادی موسیقی کی پختگی پر حیرت ہوتی ہے، دونوں بھائی متعدد بار بھارت جا کر اپنے فن کی داد لے چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے اکثر استادی موسیقی نشر کرتے ہیں، یقین ہے کہ دونوں بھائی ابھی اور بہتر فن کا مظاہرہ کریں گے۔

۱۶۔ عبدالوحید خاں آپ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ کے باشندے تھے۔ آپ کا گھرانا استادی موسیقی کا مشہور گھرانا مانا جاتا ہے، اور اس میں بڑے بڑے مشہور موسیقار گزرے ہیں جن میں بندے علی خاں بینکار، حیدر بخش، عبدالغفور خاں، عبدالشکور خاں، عبدالکریم خاں اور عبداللطیف خاں بہت ہی مشہور ہیں۔ آپ نے علم موسیقی اپنے ماموں حیدر بخش خاں سے حاصل کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے مشہور و معروف مغنیوں میں شمار ہونے لگے، آپ کانوں سے قدرے بہرے تھے، اس لیے بعض انھیں بہرے خاں بھی کہتے تھے، استادی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی ان کی بات ہوتی تو لوگ کان پکڑ لیتے اور کہتے "ہاں وہ بہرا!" آپ نے بڑی بڑی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد پائی، حقیقت یہ ہے کہ جتنا صحیح راگ وہ گاتے تھے، اور کوئی نہ گاتا تھا۔ ان کی اپنی خاص روش تھی، اور کرشمن گانے سے تھے، خود کہا کرتے تھے کہ میرے بعد صرف کوہاپور والے میاں اللہ دتا کی موسیقی کا لطف آسکتا ہے۔ آپ لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، کیونکہ وہ ایک بزرگ فقیر عالم صاحب کے مرید ہو گئے تھے اور ان کی محبت زنجیر پا بن گئی تھی، پیر پرست اتنے تھے کہ مرشد کے جیتے جی ان کا مزار باغبانپورہ کے پاس بنا دیا تھا، اور جب وہ فوت ہوئے تو ان کو وہیں دفن کیا، اور پھر اپنے وطن چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

آپ بمبئی میں بھی کافی عرصہ رہے اور وہاں بھی اپنی مہارت کا سکہ جمایا، آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں سے استادی

موسیقی نشر کی، آپ کا دستور تھا کہ جب گانے لگتے تو "یا اللہ" الاپ کر راگ شروع کرتے، آل انڈیا والوں نے اعتراض بھی کیا مگر آپ نے اپنی عادت نہ بدلی۔

آپ کے شاگردوں میں فیروز نظامی، بھائی لال، وحیدہ خانم، ہیرا بائی بڑودکر، منی بائی، اختری بائی فیض آبادی بہت مشہور و معروف ہیں۔

۱۷۔ سردار خاں آپ امراؤ خاں صاحب دہلوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ اور ہندوستان کے شاہی موسیقار میاں تان رس خاں کے پوتے ہیں، ان کا بھی اپنا گھرانا ہے، اور اس گھرانے کی موسیقی کی بھی اپنی خاص روش ہے، آپ نے علم موسیقی اپنے والد سے سیکھا، اور بہت جلد ہی اس میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ آپ کو اپنے گھرانے کی خاص چیزیں یاد ہیں، اور جب کبھی آپ انھیں پیش کرتے ہیں تو عجب لطف آتا ہے، آپ کے شاگردوں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں آپ کا خاندان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ آل انڈیا میوزک کانفرنسوں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے استادی موسیقی نشر کرتے ہیں۔

۱۸۔ فیروز نظامی آپ لاہور کے شوقیہ گانے والوں میں سے ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور کے گریجوایٹ ہیں۔ بچپن ہی سے استادی موسیقی سیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ گانے کی مشق بھی جاری رکھی، جب استاد عبدالوحید خاں کیرانوی لاہور میں وارد ہوئے تو اُن کی گائیکی نے آپ کو مسحور کر لیا، اور آپ نے باقاعدہ اُن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، اور استادی موسیقی حاصل کی، وحید خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ فیروز نظامی میرا بلاٹنگ پیپر ہے، جو بتاتا ہوں فوراً جذب کر لیتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بہت جلد استادی موسیقی میں مہارت حاصل کر لی، اور سب سے پہلے اپنے فن کا مظاہرہ ایس۔پی۔ایس کے ہال میں کیا اور عوام و خواص سے داد تحسین حاصل کی، پھر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر کے لاہور، دہلی اور لکھنؤ کے سٹیشنوں پر مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اور اس عرصہ میں ملک کے اچھے اچھے موسیقاروں سے داد حاصل کی، پھر استعفےٰ دے کر بمبئی چلے گئے۔ اور وہاں بھی فن کا مظاہرہ کیا، پھر میوزک ڈائرکٹر بن گئے اور مشہور فلم جگنو اور نیک پروین کے گانوں کی دھنیں بنائیں تقسیم ہند کے وقت اپنے وطن لاہور آ گئے اور چن وے۔ دو پٹہ وغیرہ فلموں کی دھنیں بنائیں۔ آپ نے موسیقی پر دو قابلِ قدر کتابیں اسرار موسیقی اور رموز موسیقی بھی تصنیف کیں، ریڈیو پاکستان کے مختلف سٹیشنوں سے آپ استادی موسیقی نشر کرتے ہیں، اور موسیقی پر تقاریر بھی کرتے ہیں جو علمی حلقوں میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ آپ الحمرا میں موسیقی کے نگران بھی ہیں۔

۱۹۔ بھائی اروڑہ لاہور کے مشہور رہابی خاندان کے فرد تھے، اور استادی موسیقی کے ماہر تھے۔ آپ فتح علی خاں پٹیالوی کے شاگرد تھے، آپ نے اچھی اچھی محفلوں میں استادی موسیقی پیش کر کے داد لی۔ ایک مرتبہ کالے خاں مرحوم کے ساتھ بھی گاتے تھے۔ آپ شام کے وقت عموماً مخمور رہا کرتے تھے۔

۲۰۔ بھائی لال آپ امرتسر کے رہابی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور استادی موسیقی میں بمبئی کے مشہور موسیقار پنڈت بھاسکر راؤ کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ نے ہندوستان اور پاکستان کی کئی کانفرنسوں اور نجی محفلوں میں استادی موسیقی گا کر داد حاصل کی ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ نے چوک سرجن سنگھ لاہور میں ایک میوزک سکول بھی کھولا، جہاں بہت سے

نوجوانوں نے آپ کے علم سے فیض حاصل کیا، آجکل آپ ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازم ہیں۔

۲۱۔ غلام حسن شگن بھائی لال کے صاحبزادے ہیں اور انھیں سے آپ نے تعلیم حاصل کی ہے۔ استادی موسیقی میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اگر ریاضت کرتے رہے تو بہت اچھے ہو جائیں گے۔

۲۲۔ میاں علم الدین والد کا نام میاں محمد بخش تھا، شوقیہ گانے والوں میں سے تھے، جب آپ جوان ہوئے تو آپ کو استاد محمد بوٹا کھتے والے کے سپرد کر دیا گیا جنھوں نے کمال تندہی سے آپ کو ابتدائی تعلیم دی پھر آپ پٹیالہ کے مشہور موسیقار میاں جان اور احمد جان کے والد بابا نبی بخش کے شاگرد ہوئے، اور نہایت اچھا گانے لگے، بعد ازاں آپ کئی تھیٹریکل کمپنیوں میں بطور اداکار اور میوزک ڈائرکٹر ملازم رہے، آپ نے کئی نجی محفلوں اور مہاراجہ سکیت کے دربار میں اپنے گانے کا کمال دکھایا اور داد وصول کی۔ آپ نے لاہور کے کئی معزز گھرانوں کے بچوں کو ہلکی پھلکی اور استادی موسیقی کی تعلیم دی، مثلاً خان بہادر میاں دین محمد، سید بشیر حیدر پی۔ سی۔ ایس۔ مسٹر جی۔ احمد انڈین پولیس اور فقیر سید نجم الدین، فقیر صاحب نے خود بھی آپ سے دلربا بجانا سیکھا، سلیم اقبال جو شیخ جلی، گھر جوائی، کرتار سنگھ اور دروازہ کے میوزک ڈائرکٹر ہیں آپ ہی کے فرزند ہیں۔

۲۳۔ خواجہ خورشید انور لاہور کے شہرۂ آفاق بیرسٹر خواجہ فیروز الدین احمد مرحوم کے صاحبزادہ ہیں اور شوقیہ موسیقاروں میں ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ تھا، کالج کی زندگی ہی میں گانے لگے تھے، آپ بمبئی چلے گئے اور وہاں کئی فلموں کی دھنیں بنائیں۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور آگئے اور اب یہاں میوزک ڈائرکٹر ہیں۔ کوڑ مائی، پروانہ، انتظار، جھومر اور کوئل کی دھنیں آپ نے ہی تیار کی ہیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

۲۴۔ رفیق غزنوی راولپنڈی کے باشندے ہیں، اور گریجوایٹ ہیں۔ بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا، خوب ریاضت کی اور دنوں میں چمک اُٹھے، آپ نے ہندوستان کی بہت سی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ اور خوب داد لی، کچھ عرصہ آپ فلمی اداکاری بھی کرتے رہے، پھر میوزک ڈائرکٹر بن گئے، اور بمبئی میں کئی فلموں کی دھنیں تیار کیں، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بھی منسلک رہے اور استادی موسیقی اور ٹھمریاں نشر کرتے رہے، آپ کی آواز میں ایک خاص رس ہے، اور ٹھمری میں تو ایک خاص انداز کے مالک ہیں، آجکل غالباً آپ کراچی میں ہیں۔

۲۵۔ عبد اللطیف خاں آپ پٹیالہ کے مشہور و معروف موسیقار عبد العزیز خاں صاحب کے فرزند ہیں جو وچتر وینا بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جب وہ وینا کی تاروں کو چھیڑتے تھے تو سامعین وجد میں آجاتے تھے۔ عبد اللطیف خاں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور بہت جلد اس میں نام پیدا کر لیا، آپ سارنگی بھی بہت اچھی بجاتے ہیں۔

۲۶۔ چھوٹے عاشق علی خاں علی بخش میرو والی کے فرزند ہیں۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم بڑے عاشق علی خاں سے حاصل کی اور نال اور ہیا میاں فقیر حسین پشاوری سے سیکھی، دس بارہ سال کی ریاضت کے بعد

آپ اچھے گانے والوں میں شمار ہونے لگے۔ آپ نے کئی کانفرنسوں میں حصہ لیا اور داد وصول کی۔ ریڈیو پر بھی آپ خیال اور ٹھمریاں نشر کرتے ہیں۔

۲۔ ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے

۱۔ برکت علی خاں علی بخش خاں قصوری کے فرزند اور بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ آواز میں اتنا درد، لوچ، لچک اور رسیلا پن ہے کہ سننے والے وجد میں آجاتے ہیں۔ ٹھمری، دادرا، غزل، گیت گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اچھے اچھے شعرا کا کلام اور کافیاں آپ کو یاد ہیں۔ کئی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں شریک ہو چکے اور داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کے سٹیشنوں سے ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں۔

۲۔ علی بخش قصوری یہ جوانا مرگ موسیقار بھی قصور کے سرودی خاندان کا فرد تھا۔ والد کا نام حیدر بخش ہے جو مشہور طبلہ نواز ہیں۔ جوانی ہی میں ہلکی پھلکی موسیقی میں نام پیدا کیا۔ اور ٹھمری اور گیت گانے میں کمال حاصل کیا۔ آپ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر گانے نشر کیا کرتے تھے۔ اگر موت مہلت دیتی تو اور چمکتے۔

۳۔ نیاز حسین شامی آپ ضلع ہوشیار پور کے شام چوراسی کے مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی نسبت سے شامی کہلاتے ہیں۔ خیال، دھرپد، ٹھمری، گیت، غزل غرضیکہ موسیقی کی ہر صنف پر آپ کو قدرت حاصل ہے۔ آواز میں درد ہے۔ آجکل آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں جہاں سے آپ ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں اور دھنیں بھی تیار کرتے ہیں۔

۴۔ بشیر ماھی آپ بشیر علی قصوری کے فرزند اور کالے خاں کے نواسے ہیں۔ ہلکے پھلکے گانے گاتے ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ خوب گاتے ہیں۔ ریڈیو سٹیشن لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے ہیں۔ اور نجی محفلوں میں بھی گاتے ہیں۔ آواز اپنے بھائی علی بخش کی طرح رسیلی اور لوچدار ہے۔

۵۔ علی بخش ظہور استاد برکت علی گوئیے والے کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں جواب نہیں رکھتے۔ ٹھمری، غزل، گیت، کافیاں، سلطان باہو کے ابیات نہایت خوش اسلوبی سے گاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے ہیں۔

۶۔ شریف غزنوی شوقیہ موسیقار ہیں، ٹھمری، غزل، گیت، کافی گاتے ہیں، مگر وارث شاہ کی ہیر ترنم سے پڑھنے میں بے مثال ہیں، جو مزہ ہیر کے ابیات کا ان سے سن کر آتا ہے اور کسی سے نہیں آتا۔ بہت سی محفلوں اور کانفرنسوں میں ہیر سنا کر داد حاصل کر چکے ہیں۔

۷۔ نذیر امرتسری آپ امرتسر کے مطربوں کے مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آواز نہایت پیاری اور رسیلی پائی ہے اور اس میں اتنا درد ہے کہ سننے والا وجد میں آجاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے گانے نشر

کرتے ہیں۔

۸۔ حامد علی بیلا لاہور کے مشہور رباؔبی خاندان کے فرد ہیں اور ہلکے پھلکے گیت اور لوک گیت گانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ریڈیو پر اکثر گانے نشر کرتے ہیں۔

۹۔ عبدالشکور بیدل آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے گریجوایٹ ہیں، اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، ٹھمری غزل، گیت، کافی گانے میں مشہور ہیں۔ سلطان باہو کے ابیات تو اس طرح ترنم سے ادا کرتے ہیں کہ سامعین جھوم جھوم جاتے ہیں، آجکل ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں۔

۱۰۔ مہدی حسن ہلکے پھلکے گیت اور ٹھمری گانے میں مشہور ہیں، سرمنڈل بجا کر گاتے ہیں، ہندوستان کے موسیقار افضل حسین نگینہ والے کی طرح ان کا بھی اپنا رنگ ہے، اور دوسرے گانے والوں سے الگ روش پر گاتے ہیں۔ آواز میں لوچ اور رسیلا پن موجود ہے۔

۱۱۔ سائیں اختر امرتسر کے رباؔبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ہلکے پھلکے گیت، اور مرزا صاحباں کے دوہے گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، آواز بہت بلند اور پاٹ دار ہے، اور جب گاتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں، سوزخوانی اور نوحہ خوانی بھی کرتے ہیں، اور اس درد اور عقیدت سے کرتے ہیں کہ سامعین کو رلا دیتے ہیں۔

۱۲۔ عنایت حسین بھٹی لاہور کے مشہور موسیقار ہیں، آواز نہایت رسیلی ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے ہلکے پھلکے گیت اور لوک گیت نشر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں فلموں میں پلے بیک گانے بھی گاتے ہیں، لاہور کے اکثر فلموں کے گانے آپ نے گائے ہیں۔

۱۳۔ سلیم رضا لاہور کے پلے بیک موسیقاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اور متعدد فلموں میں گانے گا چکے ہیں، آپ کی آواز مائیک کے لیے نہایت موزوں ہے۔ فلم سات لاکھ میں آپ کا "یارو مجھے معاف رکھو میں نشہ میں ہوں" کافی مقبول ہوا ہے، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں، اگر ریاضت جاری رکھی تو مستقبل میں اور چمکیں گے۔

۱۴۔ فضل حسین آپ بھی پلے بیک گانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، آواز میں لوچ، رس اور لچک موجود ہے، آپ لاہور کی مشہور فلموں میں پلے بیک گانے گا چکے ہیں، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی گانے نشر کرتے ہیں، موسیقار ہونے کے علاوہ آپ ایک اچھے اداکار بھی ہیں۔

۱۵۔ امداد حسین لاہور کے مشہور رباؔبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، کچھ عرصہ آپ لاہور ریڈیو سٹیشن سے منسلک رہے اور وہاں سے ہلکے پھلکے گانے اور لوک گیت نشر کرتے رہے، پنجابی دیہاتی بولیاں گانے میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ریڈیائی ڈراموں اور فیچروں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں، آجکل آپ فلموں میں اداکاری کرتے ہیں اور پلے بیک گانے بھی گاتے ہیں، طبیعت میں مزاح اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، جب کسی محفل میں باتیں کرتے ہیں تو اسے زعفران زار بنا دیتے ہیں۔

۱۶ - منیر حسین :- آپ بھی لاہور کے پلے بیک موسیقار وں میں ہیں اور متعدد فلموں میں پلے بیک گانے گا چکے ہیں۔

۱۷ - برکت علی گونے والے آپ شوقیہ گانے والوں میں تھے، اور ٹھمری اس انداز سے گاتے تھے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ اس بارے میں آپ انفرادی حیثیت کے مالک تھے، آجکل ٹھمری گانے میں آپ ہی کی روش کی پیروی کی جاتی ہے، آپ کے شاگردوں میں علی بخش ظہور زیادہ مشہور ہیں۔

۱۸ - ظریف لاہور کے مشہور مزاحیہ اداکار تھے، آپ نے کئی فلموں میں مزاحیہ کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ہلکی پھلکی موسیقی بھی گایا کرتے تھے، ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر گانے نشر کرتے تھے، اور ڈراموں اور فیچروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

۲ - گانے والیاں

۱ - سردار بائی آپ پٹیالہ کے استاد فتح علی خاں کی شاگرد تھیں، اور استادی موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ آپ نے کئی نجی محفلوں، مہاراجوں اور نوابوں کے درباروں میں استادی موسیقی سنا کر لوگوں کو مسحور کیا، اور داد تحسین حاصل کی۔

۲ - زیب النساء آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم پٹیالہ کے گھرانے سے حاصل کی، اور بہت جلد اس میں مہارت حاصل کی۔ رقص کی تعلیم آپ نے جے پور کے مشہور و معروف کتھک پنڈت گوپال سے حاصل کی، ستیال، ترانہ، ٹھمری، کافی، غزل گانے اور ساتھ نرت کرکے بتانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں، لاہور کی نجی محفلوں میں استادی موسیقی کے قدردانوں سے داد تحسین حاصل کی اور کئی ریاستوں میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا، آپ چھوٹی عمر میں ہی فوت ہوگئیں۔

۳ - انور بائی آپ عرف عام میں انور بائی تواری منڈی والی کہلاتی تھیں، اور اپنے زمانہ کی مشہور و معروف مغنیہ تھیں۔ استادی موسیقی کے علاوہ آپ ناچ اور نرت میں جے پور کے کتھک پنڈت گوپال کی شاگرد تھیں، عورتوں میں پنڈت جی کی شاگرد آپ سے اچھی کوئی نہ تھی۔ پنڈت گوپال ہندوستانی رقص کی جملہ اصناف پر قدرت رکھتے تھے، بوڑھا سا قد تھا، اور جسم میں اتنا لوچ، اتنی لچک تھی کہ جب کسی ٹھمری کے بول یا غزل کے شعر کو نرت کرکے بتاتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نازک اندام معشوقہ نرت کر رہی ہے۔ استاد کی یہ جملہ صفات انور بائی میں بدرجہ اتم موجود تھیں، ٹھمری اور غزل کے ساتھ جب نرت کرتیں تو دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک نجی محفل میں ایک غزل گائی جس کا ایک شعر تھا ؎

عذر ان کی زبان سے نکلا
تیر گویا کمان سے نکلا

مصرع ثانی پر انھوں نے بایاں گھٹنا زمین پر ٹیک دیا اور تیر کو کمان کھینچ کر جو چھوڑا تو سامنے بیٹھے ہوئے سامعین ڈر گئے۔ یہ کیفیت تو رقص اور نرت کے کمالات کی تھی، جب گاتیں تو لوگ داد تحسین دیتے نہ تھکتے تھے، ان تھک اتنی کہ ساری رات گا رہی

ہیں لیکن نہ آپ ٹھکتی ہیں اور نہ آواز ہی بیٹھتی ہے۔ آپ لاہور ہی میں فوت ہوئیں۔

۴۔ شمشاد بیگم آپ بھی لوہاری منڈی کی رہنے والی ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں تقسیم ہندوستان سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے متعدد سٹیشنوں سے موسیقی کے دلربا نغمات ہوا میں بکھیرتی رہیں۔ فلمی موسیقی میں تو وہ کمال حاصل ہے کہ بڑی بڑی گانے والیاں آپ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ آج لتا کی بڑی دھوم ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس فلم میں ان دونوں نے گیت گائے شمشاد بیگم نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ آپ نے ریڈیائی ڈراموں، فیچروں اور غنائیوں میں بھی حصہ لیا ہے، ایک دفعہ میں نے فضل شاہ کی سوہنی مہینوال میں سے ایک غنائیہ ریڈیو پر پیش کیا جس میں شمشاد بیگم نے سوہنی کا کردار ادا کیا، میں نے کہا "شمشاد بیگم تب جانوں کہ مجھے رُلا دو" میں قسمیہ کہتا ہوں کہ جب سوہنی کے چناب میں غرق ہونے کا منظر آیا، اور آپ نے فضل شاہ کے اشعار گائے تو میں بے اختیار رو دیا۔ آجکل آپ بمبئی میں مقیم ہیں اور پلے بیک سنگر ہیں۔ ہندوستان کے متعدد فلموں میں پلے بیک گا چکی ہیں۔

۵۔ عیدن بائی اکھیاں والی آپ لاہور کی مشہور مغنیہ تھیں، چونکہ آپ کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت تھیں اس لیے اکھیاں والی کہلاتی تھیں، آپ اپنے عہد کی ممتاز گانے والیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ٹھمری، غزل، نعت، پنجابی گیت گانے میں بے مثال تھیں، آواز اتنی لوچدار اور رسیلی تھی کہ سامعین سن کر مسحور ہو جاتے تھے آپ نے سینکڑوں نجی محفلوں اور مہاراجوں، نوابوں کے درباروں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کیا، اور داد تحسین حاصل کی، آپ نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئیں۔

۶۔ بہار بخش یہ بھی اپنے زمانے کی مشہور مغنیہ تھی۔ سرو قد، جسم بھرا ہُوا، آواز نہایت پاٹ دار اور سریلی تھی۔ نجی محفلوں میں لوگ اس کے گانے کو بہت پسند کرتے تھے۔ غزل، ٹھمری اور پنجابی گیت خوب گاتی تھی۔ اَن تھک گانے والی تھی۔ لوگ اسے بہار دمشین کہتے تھے۔

۷۔ عیدن بائی ہسیاں والی آپ بھی اپنے زمانہ کی ایک مشہور و معروف مغنیہ تھیں، آپ قصور کے چھوٹے کالے خاں سارنگی نواز کی شاگرد تھیں، ٹھمری، غزل، گیت، دادرا، کافی اس پیارے انداز سے گاتی تھیں کہ سامعین داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے، کئی نجی محفلوں اور ریاستوں کے درباروں میں گائیں اور داد وصول کی افغانستان کے جشنِ استقلال کے موقعہ پر تقریباً ہر سال کابل تشریف لے جاتیں اور وہاں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتیں، آپ کا اُردو فارسی، پنجابی اور پشتو کا تلفظ حیرت انگیز تھا۔ آپ ایک خاص رنگ سے گاتی تھیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کے بعد کوئی مغنیہ اس رنگ سے مجرا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ آپ حج حرمین سے بھی مشرف ہوئیں، اور آپ نے دو مسجدیں بھی تعمیر کروائیں، آپ کی وفات کو تقریباً آٹھ نو سال ہو چکے ہیں۔

۸۔ خورشید بائی آپ لاہور کی ممتاز گانے والیوں کے زمرہ میں ہیں، آپ نے موسیقی کی تعلیم مشہور سارنگی نواز غلام محمد سرودی قصوری سے حاصل کی، اور آپ نے اس تندہی سے آپ کو خیال، ترانہ اور دیگر استادی موسیقی کی تعلیم دی کہ آپ اوائل عمر ہی میں اچھی گانے والیوں میں شمار ہونے لگیں، آپ نے لاہور کی نجی محفلوں اور ہندوستان

کی مشہور ریاستوں اندور، بڑودہ، دھن پور، کشمیر، بہاولپور، خیرپور، نابھ، اسکیٹ اور منڈی کے درباروں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور داد وصول کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے متعدد سٹیشنوں سے استادی موسیقی، ٹھمریاں اور غزلیات خصوصاً کلام غالب و اقبال نشر کیا۔ اور پشاور کی بزم غالب اور لاہور کی بزم اقبال سے مرصع طلائی تمغے حاصل کئے۔

۹۔ عنایت بائی ڈھیروالی آپ لاہور کی عظیم موسیقار ہیں۔ اللہ نے آواز ایسی سریلی عطا فرمائی ہے کہ کوئل بھی رشک کرتی ہے۔ آپ نے موسیقی کی تعلیم بڑے غلام علی خاں اور ان کے شوہر سے حاصل کی۔ اور بہت جلد اس میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ ٹھمری، راگ، غزل، سندھی کافی گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، مدتوں آپ ریڈیو پر اپنے رسیلے اور سریلے نغمے بکھیرتی رہی ہیں۔ پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کا کوئی علاقہ ہوگا جہاں آپ نے اپنے فن کا کمال نہ دکھایا ہو۔ کلام اقبال ترنم سے نہایت اچھا گاتی ہیں۔ آج بھی جبکہ قدیم موسیقی دم توڑ رہی ہے لاہور میں آپ کا دم غنیمت ہے۔

۱۰۔ روشن آرا بیگم آپ کا اصلی نام وحید النسا بیگم تھا، مگر ایک بزرگ کے ارشاد کے مطابق روشن آرا بیگم کر دیا گیا۔ آپ کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی۔ قرآن مجید، اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پہلے آپ ندن خاں صاحب کی شاگرد ہوئیں، بعد ازاں بمبئی جا کر استاد عبدالکریم خاں سے استادی موسیقی سیکھی، استاد نے پورے پانچ برس تک تعلیم دی، اور اپنی ساری صفات اپنی اس لائق شاگرد میں جمع کر دیں۔ استادی موسیقی کی کونسی باریکی اور خوبی ہے جو اس مغنیہ کے نورانی گلے میں نہیں، کوئی راگ ڈیڑھ دو گھنٹے سے کم نہیں گاتیں، جنھوں نے استاد عبدالکریم کی ٹھمری "پیا بن ناہیں آوت چین" سنی ہے، اور انھوں نے روشن آرا بیگم سے بھی یہی ٹھمری سنی ہے۔ وہ ذرا دونوں میں فرق تو پیدا کر کے دکھا دیں، ذرہ بھر بھی فرق نہیں۔ یہی حال استادی موسیقی میں بھی ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ روشن آرا نہیں عبدالکریم خاں گا رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں کیرانہ کی گائیکی کی آپ بہترین نمائندہ ہیں، بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے ریڈیو سٹیشنوں کے سامعین اکثر ان کے دلنواز نغمات سے محظوظ و مسرور ہوئے ہیں۔ مدت ہوئی ایک مرتبہ آپ لاہور تشریف لائیں اور گنڈ شہباز میں وحیدہ خانم کے ہاں ایک محفل میں گائیں، جہاں عبدالوحید خاں کیرانوی، بڑے غلام علی خاں اور بڑے عاشق علی خاں بھی موجود تھے، ان عظیم فن کاروں کے سامنے روشن آرا نے ملتانی راگ چھیڑا۔ ان کے ساتھ مشہور سارنگی نواز عبدالشکور خاں کیرانوی نے سنگت کی، گانے والی اور ساتھ سنگت کرنے والے دونوں کیرانہ کی گائیکی کے ماہر تھے اس لیے وہ لطف آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ روشن آرا جو تان گلے سے ادا کرتی عبدالشکور وہی سارنگی میں سے نکالتے۔ دونوں چمک اٹھے، اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے، عبدالوحید خاں نے شکور خاں کو منع کیا، مگر روشن آرا نے کہا "استاد جی انھیں منع نہ کریں، بجانے دیں۔ مجھے لطف آ رہا ہے۔" یہ بات ایک ماہر اور عظیم فن کار کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم تو آج بھی اس محفل کو یاد کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ آجکل آپ لالہ موسیٰ میں مقیم ہیں اور ریڈیو سٹیشن لاہور اور دیگر کئی کانفرنسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ کو حکومت پاکستان نے انعام سے نوازا ہے۔ اور آپ حقیقت میں مستحق بھی ہیں۔ آپ نے فلموں میں بھی پلے بیک گانے گائے ہیں اور اپنی روایتی شان کو ان میں بھی برقرار رکھا ہے۔

۱۱۔ مختار بیگم امرتسری آپ کی پیدائش امرتسر میں ہوئی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوگئیں، آپ کلکتہ میں بھی رہیں اور آغا حشر کاشمیری مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہوئیں۔ اُستادی موسیقی آپ نے مشہور موسیقار عاشق علی خاں پٹیالوی سے حاصل کی، اور پنجاب کی مشہور گانے والیوں میں شمار ہونے لگیں ہندوستان کی وہ کونسی ریاست ہے جس میں آپ نے اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ اُستادی موسیقی اور ٹھمری گانے میں آپ اتنی ماہر ہیں کہ اب خود بھی اس کی تعلیم دیتی ہیں۔ آپ کی مشہور شاگردوں میں نسیم بیگم امرتسری ہیں۔ آجکل غالباً آپ کراچی میں ہیں۔

۱۲۔ فریدہ خانم آپ مختار بیگم امرتسری کی چھوٹی ہمشیرہ ہیں۔ آپ نے استادی اور ہلکی پھلکی موسیقی کی تعلیم عاشق علی خاں پٹیالوی اور مختار بیگم سے حاصل کی اور بہت جلد اچھا گانے لگیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر آپ راگ، ٹھمری، غزلیات وغیرہ نشر کرتی ہیں۔

۱۳۔ نورجہاں ان کا خاندان قصور سے آکر لاہور میں آباد ہوا۔ آپ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ماسٹر غلام محمد قصوری سے تعلیم موسیقی حاصل کی، اور ۹ سال کی عمر میں ہی گانے میں مشہور ہوگئیں۔ آپ کی آواز میں خداداد رس اور کشش ہے، آپ اس وقت ملکۂ ترنم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے فلمی اداکاری شروع کی اور اس میں بھی نام پیدا کیا اور اپنی اداکاری اور گلوکاری کا بہترین مظاہرہ کیا، آجکل آپ فلموں میں پلے بیک گانے گاتی ہیں۔

۱۴۔ شمشاد کوثر آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم مشہور موسیقار امید علی خاں سے حاصل کی اور چند سالوں کی محنت اور ریاضت کے بعد نہایت اچھا گانے لگیں، آپ کے گانے میں اپنے استاد کی گائیکی کی دلآویز خوشبو آتی ہے، آپ ریڈیو پر بھی استادی موسیقی اور سندھی کافیاں نشر کرتی رہی ہیں۔

۱۵۔ زاھدہ پروین آپ کا شمار مغربی پاکستان کی نہایت اچھا گانے والیوں میں ہوتا ہے۔ اسنادی موسیقی، سندھی کافی اور گیت گانے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں، کئی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کرچکی ہیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے اکثر آپ نغمات بکھیرتی، اور سامعین کو اپنے دل نوازانداز سُریلی آواز سے محظوظ کرتی ہیں۔

۱۶۔ نسیم بیگم امرتسری آپ قیام پاکستان کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں، اُستادی موسیقی میں مختار بیگم امرتسری کی شاگردہ ہیں، پکے راگ خوب گاتی ہیں اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی مہارت رکھتی ہیں، لاہور ریڈیو سٹیشن سے موسیقی کے پروگرام میں حصّہ لیتی ہیں، آپ کی سریلی آواز پر اکثر نورجہاں کا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ نے متعدد فلموں میں پلے بیک گانے بھی گائے ہیں۔

۱۷۔ اقبال بانو آپ دراصل رہتک کی رہنے والی ہیں لیکن پاکستان بنتے ہی آپ لاہور تشریف لے آئیں اور گنپت روڈ لاہور پر رہنے لگیں۔ آپ میٹریکولیٹ ہیں اور اُردو، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ رکھ ہیں۔ آپ کو استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی پر یکساں قدرت حاصل ہے، اور نہایت اچھا گاتی ہیں، ریڈیو سٹیشن لاہور دہلی وغیرہ سے نغمات نشر کرچکی ہیں اور اب بھی کرتی ہیں، کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کرچکی ہیں، کئی فلم

ہیں پلے بیک گانے گا چکی ہیں، آجکل آپ ملتان میں رہتی ہیں ۔

۱۸- وحیدہ خانم لاہور کی مشہور مغنیہ ہیں، گو آجکل راولپنڈی ریڈیو سٹیشن سے گانے نشر کرتی ہیں، مگر زندگی کا کافی حصہ لاہور ہی میں گزارا ہے۔ آپ نے استادی موسیقی استاد عبدالوحید خاں کیرانوی سے حاصل کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اچھا گانے لگیں، خیال، ترانہ وغیرہ بہت اچھا گاتی ہیں ۔

۱۹- زینت بیگم وحیدہ خانم کی ہمشیرہ ہیں، اور ہلکے پھلکے گیت گانے میں مہارت رکھتی ہیں، آپ نے بمبئی اور لاہور کے بیشتر فلموں میں پلے بیک گانے گاتے ہیں، آپ کی آواز نہایت میٹھی اور رسیلی ہے ۔

۲۰- آشا پوسلے لاہور کی مشہور اداکارہ ہیں، ہلکی پھلکی موسیقی نہایت اچھی گاتی ہیں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کے اکثر ڈراموں اور فیچروں میں بھی حصہ لیتی ہیں، آواز نہایت سُریلی ہے ۔

۲۱- کوثر پروین نذیر جعفری کی شاگرد ہیں اور ہلکے پھلکے گانوں میں کافی مشہور ہیں۔ آپ آشا پوسلے کی ہمشیرہ ہیں۔ اور لاہور کی متعدد فلموں میں پلے بیک گانے گا چکی ہیں آپ ایک مقبول اور ہر دلعزیز فنکارہ ہیں۔

۲۲- آئرن پروین ریڈیو پاکستان لاہور سے ہلکے پھلکے گانے نشر کرتی ہیں، اور فلموں میں پلے بیک گانے گاتی ہیں، اور کامیاب فنکارہ ہیں ۔

۲۳- زبیدہ خانم امرتسر میں پیدا ہوئیں مشہور فلم ڈائرکٹر نذیر انھیں فلمی صنعت میں لے آئے اور آپ پلے بیک گانے گانے لگیں، ریڈیو پر بھی ہلکی پھلکی موسیقی پیش کی۔ لاہور کی متعدد فلموں میں آپ نے گانے گائے ہیں، نہایت اچھا گاتی ہیں ۔

۲۴- منوّر سلطانہ آپ لدھیانہ کی رہنے والی ہیں، اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے میں کافی مشہور ہیں، اُردو اور فارسی غزلیات بھی نہایت مہارت سے گاتی ہیں، ریڈیو سٹیشن لاہور کے کئی غنائیہ فیچروں میں حصہ لے چکی ہیں اور گانے بھی نشر کرتی ہیں علاوہ ازیں آپ ایک کامیاب پلے بیک مغنیہ بھی ہیں ۔

۲۵- نور جہاں جونیئر آپ بھی ایک اچھی مغنیہ ہیں، استادی موسیقی میں سردار خاں دہلوی کی شاگرد ہیں۔ ریڈیو سٹیشن لاہور سے گانے نشر کرتی ہیں اور فلموں میں پلے بیک گانے گاتی ہیں ۔

۲۶- امۃ الرشید لاہور ریڈیو کی مشہور فنکارہ ہیں۔ ہلکی پھلکی موسیقی نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتی ہیں، آواز میں قدرتی سوز موجود ہے۔ آپ بینائی کی دولت سے محروم ہیں ۔

۴- سارنگی نواز

۱- بڈھے خاں قصوری اپنے عہد کے مشہور و معروف سارنگی نواز تھے، آپ قصور کے مطربوں کے سرودی خاندان کے چشم و چراغ تھے، پہلے اپنے گھر والوں سے سارنگی سیکھی پھر علم کا شوق آپ کو ہندوستان لے گیا، جہاں آپ ریاست ریوا کے مشہور استاد میاں ولادر علی خاں کے شاگرد ہو گئے اور کئی سال تک استاد کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا۔

اور سارنگی نوازی میں مہارت تامہ حاصل کرکے لاہور آگئے، یہاں آپ نے کئی محفلوں میں بڑے استادوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی اور داد حاصل کی۔ ریاضت کا یہ عالم تھا کہ ریت کی پوٹلیاں ہاتھوں سے باندھ کر ریاضت کیا کرتے تھے، جن لوگوں نے آپ کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی یاد کرکے سر دھنتے ہیں۔ یوں تو آپ نے بہت سے شاگرد بنائے مگر زیادہ تر مشہور غلام محمد سرودی قصوری ہیں جنھوں نے اپنے استاد کے نام کو زندہ رکھا۔

۲۔ غلام محمد قصوری آپ قصور کے سرودی خاندان کے نورِ نظر تھے اور حاجی امیر بخش سارنگی نواز کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے استادی موسیقی اور سارنگی نوازی کی تعلیم مشہور سارنگی نواز بڈھے خاں سے حاصل کی اور بہت جلد اچھے سازندوں میں شمار ہونے لگے، لاہور کی بہت سی نجی محفلوں میں اچھے اچھے گویوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی۔ ایک دفعہ کلے خاں مرحوم کے ساتھ سنگت کرکے سامعین سے داد تحسین حاصل کی۔ آپ کی شاگردوں میں خورشید بائی بہت مشہور ہیں، جن کے ساتھ آپ نے ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں سارنگی بجائی اور مہاراجگان سے انعام و اکرام حاصل کیا۔

۳۔ حیدر بخش فلوسا یہ بھی خطۂ قصور کے مطربوں سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت ماہر سارنگی نواز تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ تھیٹروں اور گراموفون کمپنیوں میں کام کیا۔ پھر عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرنے لگے۔ فلموں میں بھی سارنگی بجائی۔ آخر میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہوگئے اور یہیں سے نغمات بکھیرتے رہے۔ بے حد شریف، کم زبان اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ سانولا رنگ، جسیم و شحیم جسم، دراز قد، موٹے موٹے نقش، ململ کا کھلی آستینوں کا کرتہ، نیچے سفید تہمد باندھ میں بنیر، خراماں خراماں چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ساڑھے تین من کی لاش تھی۔ اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کوئی ناواقف ان کو دیکھ کر خیال بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ راگ و دیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھاتے بھی بہت تھے۔ ان کی بسیار خوری کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ موری دروازے کے باہر چنگڑ محلہ کے شروع میں ایک ہندو ہوٹل تھا۔ ہوٹل والوں کی شامت جو آئی تو انھوں نے ایک بورڈ پر لکھ دیا:

"سالن بیچئے۔ چپاتیاں مفت"

ایک دن استاد فلوسا وہاں جا پہنچے۔ دو تین قسموں کے سالن کا آرڈر دیا اور کھانے بیٹھ گئے چپاتیاں آنے لگیں، دو، چار، چھ، آٹھ۔ جب بھی ہوٹل کا بیرا پوچھتا، ادھر سے بل من مزید کی صدا آتی۔ ہوٹل والے اعلان سے مجبور تھے۔ چپاتیاں دیتے گئے۔ یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہوگیا۔ چند دنوں کے بعد فلوسا کی طبیعت پھر لہرائی۔ یہ پھر وہاں جا دھمکے۔ لیکن بہت مایوس ہوئے۔ کیونکہ اب ہوٹل والوں نے اپنا وہ بورڈ اتار لیا تھا۔

اس تن و توش کے باوصف استاد فلوسا دل کے بہت کمزور اور نازک مزاج تھے۔ ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ بیوی نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر رضا مرزا کا مطلب پاس ہی تھا مگر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ کہا ڈاکٹر صاحب کو یہیں بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے اچھی طرح معائنہ کرکے کوئی ٹیکہ تجویز کیا۔ یہ بہت گھبرائے۔ نہایت لجاجت سے درخواست کی۔ کوئی اور دوا تجویز فرمائیے۔ انھوں نے کہا۔ ٹیکے میں کونسی قباحت ہے۔ جلد صحت ہوجائے گی مگر استاد نے انجکشن کی سوئی جسم میں داخل ہونے کا تصور کرکے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے ٹیکہ نہ لگائیے۔ میں مرجاؤں گا" ڈاکٹر صاحب نے

ان سنی کر کے ٹیکے کا سامان درست کرنا شروع کیا۔ استاد نے نہایت حسرت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: "کیا اپنے سامنے ہی مروا دو گی۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکے گی۔ میں مر جاؤں گا۔" اتنے میں ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ لگا دیا۔ یہ پھر بھی چیختے رہے کہ ڈاکٹر صاحب ٹیکہ نہ لگانا۔ میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے فرمایا: "بھئی میں تو ٹیکہ کبھی کا لگا بھی چکا۔ خواہ مخواہ مرے جا رہے ہو۔"

ریڈیو والوں نے ایک دفعہ ان سے انٹرویو لیا۔ اور پوچھا۔ استاد جی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ استاد صاحب نے جواب دیا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ "اللہ دے اور بندہ کھائے۔"

استاد فلو سا اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ لاہور میں انتقال کیا۔

۔ - **چھوٹے کالے خاں** آپ بھی قصور کے مطربوں سے تھے اور سارنگی خوب بجاتے تھے۔ استاد فن موسیقی بھی نہایت اچھی طرح گاتے تھے۔ آواز کوئل سے زیادہ سریلی تھی۔ جب گاتے تھے تو سریلے نغمے فضا میں مر جاتے تھے۔ آپ کی چوٹی کی شاگردوں میں عیدن بائی ہے۔ یہاں والی بہت مشہور مغنیہ گزری ہیں۔ آپ حویلی میاں خاں کے سامنے کٹڑہ درشاہ میں رہتے تھے۔ یہیں فوت ہوئے۔

۷ - **بابا علی بخش** آپ کمیریاں ضلع ہوشیارپور کے رہنے والے تھے۔ سارنگی نوازی کے رموز اپنے بزرگوں سے حاصل کیے نوجوانی میں لاہور چلے آئے۔ کوچہ لٹھہ مارا اندرون موچی دروازہ میں رہائش اختیار کی۔ سانولا رنگ دراز قامت، تیز نقش، داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ شاگردوں کو گھر پر بھی تعلیم دیتے تھے۔ بڑے بڑے استادوں کے ساتھ سنگت کی۔ آخری عمر میں مذہب کی طرف زیادہ توجہ ہو گئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ زیارات عراق و عرب، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے مشرف ہونے کے بعد صرف مجالس میں سوز خوانی کرتے تھے۔ فن کے دیگر مشاغل ترک کر دیئے تھے۔ عمر کے آخری ایام میں موچی دروازہ کے اندر گانے کی ایک محفل میں تشریف لائے جس میں استاد عاشق علی خاں گا رہے تھے۔ کہنے لگے برسوں کے بعد گانا سن رہا ہوں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ دیکھوں فتح علی کا لڑکا کتنے پانی میں ہے۔ واقعی عاشق علی خاں فن کے لحاظ سے اپنے بزرگوں کا صحیح جانشین ہے۔"

قیام پاکستان سے کچھ پہلے ایک سو پانچ برس کی عمر پا کر داعیِ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان مومن پورہ لاہور میں دفن ہوئے۔

۹ - **بلے خاں** آپ لاہور کے مطربوں میں سے تھے، گورا چٹا رنگ، جسم متناسب، آنکھیں بلیوں کی طرح نیلی، اس لیے آپ کو بلے خاں کہنے لگے۔ اصل نام مہران بخش تھا، آپ نے پٹیالہ کے فتح علی خاں سے علم موسیقی حاصل کیا۔ اور بہت جلد سارنگی نوازی اور گانے میں نام پیدا کیا۔ آپ نے لاہور کے مشہور موسیقاروں کے ساتھ سارنگی بجائی اور ممتاز گانے والیوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی۔ جن میں بہار بخش، خورشید بائی، انور بائی، زیب النساء زیادہ مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مطربان لاہور نے ایک تھیٹریکل کمپنی بنائی جس نے گلرو زرینہ ڈرامہ شاہ عالمی دروازے کے تھیٹر میں سٹیج کیا۔ استاد بلے خاں نے بادشاہ کا پارٹ کیا اور اپنے سریلے گانوں سے ڈرامے کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ اپنی شاگردوں کے ساتھ کوئٹہ چلے گئے، جہاں آپ بھونچال کا

شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۷۔ **برکت علی** بلے خاں مرحوم کے صاحبزادہ ہیں اور نوجوان سارنگی نوازوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ سارنگی، استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی پیش کرنے پر یکساں قادر ہیں۔ سارنگی نوازی کے ساتھ ساتھ گانے میں بھی ماہر ہیں۔

۸۔ **چنوں خاں** آپ بھی لاہور کے مطربوں میں سے ہیں پہلے سارنگی نوازی کرتے تھے پھر استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی گانے لگے۔ اللہ نے آپ کو بڑی دردبھری اور رسیلی آواز دی ہے۔ آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد حاصل کی ہے۔

۹۔ **ننھو خاں** آپ امرتسر کے مطربوں میں سے ہیں اور سارنگی نوازی میں جواب نہیں رکھتے۔ آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں سارنگی نوازی کا مظاہرہ کر کے لوگوں سے کما حقہٗ داد حاصل کی ہے، ریڈیو پر بھی آپ سارنگی سے نغمات نشر کرتے ہیں۔

۱۰۔ **پھنتو خاں** امرتسر کے مطربوں کے ایک مشہور گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ راگ ودیا نہایت اچھی طرح جانتے ہیں، اور سینکڑوں خیالوں کی استھائیوں کے مالک اور حافظ ہیں۔ سارنگی نوازی بھی کرتے ہیں، اور استادی موسیقی کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ پٹیالوی گائیکی کے کامیاب نمائندہ ہیں۔

۱۱۔ **نبی داد خاں** جالندھر کے مشہور مطرب اور سارنگی نواز تھے، آپ نے کئی سال لاہور میں مشہور گانے والیوں کے ساتھ سارنگی پر سنگت کی، نہایت اچھی سارنگی بجاتے تھے۔ آپ کی مشہور شاگرد گلزار بیگم عرف گگ تھیں، جو اپنے زمانے کی مشہور مغنیہ تھیں۔

۱۲۔ **جھنڈو خاں** آپ بھی جالندھر کے مطرب اور مشہور سارنگی نواز ہیں۔ جن لوگوں نے میڈن تھیٹر کے فلموں میں آپ کی سارنگی کے دلکش سریلے نغمات سنے ہیں وہ آج بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۱۳۔ **فضل الٰہی** آپ جالندھر کے مطربوں اور سارنگی نوازوں میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں، سارنگی نوازی کے ساتھ ساتھ آپ استادی موسیقی کے بھی ماہر ہیں، اور اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں، نہایت سریلا گاتے ہیں۔

۱۴۔ **گل محمد عرف گلو** آپ پٹیالہ والے نبی بخش خاں صاحب کے شاگرد تھے، اور سارنگی بجاتے تھے، استادی موسیقی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور نہایت عمدگی سے گاتے تھے، آپ نے لاہور میں کئی مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد وصول کی، آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

۱۵۔ **حسین بخش** آپ گل محمد کے فرزند ہیں اور سارنگی بجاتے ہیں۔ اپنے والد کی طرح استادی موسیقی میں بھی استاد ہیں۔ آپ کو ہندوستانی موسیقی کے راگوں کی بے شمار استھائیاں یاد ہیں۔ آپ کے شاگرد بھی بے شمار ہیں۔

۱۶۔ **مہر دین خورشید** آپ کے والد کا نام محمد بوٹا ہے۔ آپ کھنتے والے کہلاتے ہیں، سارنگی کی تعلیم میاں اللہ دتا جموں والے موری والے سے حاصل کی۔ استادی موسیقی امام الدین خاں سیالکوٹی سے سیکھی اور نال اور لے نقیر بخش پشاوری سے سیکھی۔ آپ بمبئی تشریف لے گئے اور سروج فلم کمپنی، رنجیت فلم کمپنی اور پھر لاہور میں پنچولی

اور شوری پکچرز میں سارنگی نوازی کا کمال دکھایا۔ کولمبیا گراموفون کمپنی میں ماسٹر غلام حیدر کے زیرِ ہدایت کام کیا۔ اور لاہور کی مشہور گانے والیوں مثلاً خورشید بائی، عیدن بائی علی پوری، عنایت بائی ڈھیرو والی اور ملکہ مہر النسا، جموں والی کے ساتھ سنگت کرتے رہے۔

۵۔ طبلہ نواز

۱۔ قادر بخش آپ میاں فقیر بخش پکھاوجی کے فرزند ارجمند تھے، پکھاوج اور طبلہ نوازی میں آپ کا خاندان قدیم زمانے سے مشہور چلا آتا تھا۔ آپ کے گھرانے کے شاگردوں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے والد کی وفات کے بعد کئی برسوں تک طبلہ نوازی کی ریاضت کی۔ اور آخرکار استادی کے درجہ پر فائز ہوئے۔ لاہور میں سینکڑوں مرتبہ آپ نے بجی محفلوں میں اپنے فن کی نمائش کی، کئی کانفرنسوں میں بھی طبلہ بجایا۔ اور ہندوستان کی متعدد ریاستوں کے والیان سے تمغے اور انعام و اکرام حاصل کیا، پکھاوج، قاعدہ، گت توڑا، ریلا غرضیکہ اس فن کی ہر صنف اور باریکی پر پوری طرح حاوی تھے، جب طبلہ بجاتے تھے تو اس میں غرق ہو جاتے تھے اور چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے، گو ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے مگر طبلہ نوازی کی روزانہ مشق باقاعدگی سے کرتے تھے۔

۲۔ اُستاد بڈھے خاں ان کا تعلق قصور کے خاندان سے تھا۔ موچی دروازہ میں رہتے تھے۔ دہلی والے کالے خاں کے شاگرد تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ بڑے وضعدار اور باذوق تھے۔ لاہور کے مشہور رئیس رائے صاحب موہن داس کے گھرانے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ بے حد خوش عقیدہ تھے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی جوتی اور پگڑی اتار دیتے اور امام حسینؑ کے سوئم کے بعد پھر پہنتے۔ نویں محرم کو ہر سال باقاعدگی سے نیاز دیتے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔ ان کے بیسیوں شاگرد ہیں۔ جن میں منظور خاں ان کے بیٹے اور علی بخش بہت مقبول طبلہ نواز ہیں۔

۳۔ فقیر بخش پشاوری آپ پشاور کے رہنے والے تھے، بڑے موٹے تازے تھے، رنگ سیاہ تھا چہرے پر چیچک کے داغ، چپٹی ناک، بڑے بڑے موٹے ہاتھ تھے، آپ قادر بخش کے والد میاں فقیر بخش کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ نے کئی سال تک ان سے طبلہ بجانا سیکھا۔ بعد میں آپ نے ہندوستان کے مشہور طبلہ نواز استاد علی قدر سے بھی فیض حاصل کیا۔ اُن کے بھدے موٹے ڈھنگ ہاتھوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ آپ طبلہ بجاتے ہوں گے، لیکن جب دایاں بایاں چھیڑتے اور گت شروع کرتے تو آپ کے ہاتھوں کی لوچ اور نزاکت کو دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبلہ کا دایاں بایاں آپ کے ہاتھوں کے نیچے باتیں کرتا تھا۔ میرے نزدیک یہ کمال آج تک کسی کے ہاتھوں کو نصیب نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے کلیر شریف کی ایک محفل سرود میں اُستاد شبیر خاں مراد آبادی کو اُن کے طبلہ کی تال پر جھومتے دیکھا ہے۔ جب انھوں نے واہ واہ کہی تو فقیر بخش کہنے لگے "حضرت میں کیا اور میری بساط کیا!" تو استاد شبیر خاں بولے: "ارے فقیرو، طبلہ بجانے والے تو بہتیرے ہیں لیکن واللہ جو کیوڑہ تیرے ہاتھوں میں ہے وہ کسی کے نصیب میں نہیں" اس سے بہترین داد اور کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج انھیں فوت ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اس میں بھی شک نہیں

کر طبلہ بجانے والے بھی بہت سے ہیں لیکن جو کیورہ فقیر بخش کے ہاتھوں میں تھا وہ ابھی تک کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آپ نے بہت سے چوٹی کے موسیقاروں کے ساتھ طبلہ پر سنگت کی جن میں فتح علی خاں پٹیالوی، سردار بائی، گلزار بائی، بہار بخش خورشید بائی، ظہیر بائی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں سے حاجی فدا حسین، استاد نیاز علی اور خادم حسین قابل ذکر ہیں۔

۴۔ حاجی فدا حسین آپ مزنگ کے استاد علی بخش کے فرزند ارجمند تھے۔ بچپن میں آپ نعیشنیکل کمپنی سے منسلک ہو گئے، بعد میں آپ فقیر بخش پشاوری سے طبلہ سیکھنے لگے۔ اور اس میں شہرت حاصل کی، یوں تو فقیر بخش کے سینکڑوں شاگرد اس وقت موجود ہیں، لیکن استاد کی خوشبو اگر کسی سے آئی تو وہ صرف حاجی فدا حسین ہی تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ فقیر بخش ہی بجا رہے ہیں۔ گویئے کے ساتھ سنگت کرنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ مشہور مغنیہ جدن بائی لاہور میں آئیں، ایک محفل موسیقی میں گانے لگیں، طبلہ نواز ان کے ساتھ نہ تھا، حاجی صاحب نے اُن کے ساتھ سنگت کی اور اس خوبی سے کی کہ محفل کے اختتام پر جدن بائی نے انھیں نذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اس خوبی سے سنگت کی ہے کہ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں کسی غیر کے ساتھ گا رہی ہوں۔ آپ نے لاہور کی مشہور گانے والیوں مثلاً انور بائی، زیب النساء، اقبال بیگم اور خورشید بیگم کے ساتھ سنگت کی۔ طبلہ نوازی کے علاوہ آپ نے نرت کاری اور رقص کی تعلیم جے پور کے کتھک پنڈت گوپال سے حاصل کی، وہ اس فن میں بھی اپنے استاد کی جملہ خصوصیات کے حامل تھے۔

۵۔ خادم حسین حاجی فدا حسین کے چھوٹے بھائی ہیں، آپ نے بھی طبلہ استاد فقیر بخش پشاوری سے سیکھا، آپ کو بھی سنگت کرنے میں مہارت ہے، اور دُھن کے ساتھ گت توڑے نکالنے میں تو جواب نہیں رکھتے۔

۶۔ الطاف حسین خادم حسین کے فرزند ہیں، اور استاد قادر بخش مرحوم کے شاگرد، ابھی کم عمر ہیں، لیکن اس عمر ہی میں اچھی اچھی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ یقین ہے کہ مستقبل قریب میں طبلہ نوازی میں نام پیدا کریں گے۔

۷۔ عنایتی خاں آپ امرتسر کے باشندہ ہیں، طبلہ نوازی میں استاد قادر بخش کے شاگرد ہیں، اور بہت اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔ آپ نے بہت سی محفلوں میں اور ریڈیو اور کانفرنسوں میں طبلہ نوازی کا کمال دکھا کر داد تحسین وصول کی ہے۔

۸۔ شوکت حسین آپ نوجوان طبلہ نوازوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، آجکل آپ لاہور ریڈیو سے منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا کر نام پیدا کر چکے ہیں۔

۹۔ طفیل علی آپ بھی نوجوان طبلہ نواز ہیں، اور اپنے فن میں صاحب کمال ہیں، کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا چکے ہیں آج کل آپ ریڈیو سے منسلک ہیں۔

۱۰۔ کرم الٰہی قصوری ۔ آپ قصور کے سرودی مطربوں میں سے تھے اور مشہور طبلہ نواز استاد فتح دین کے شاگرد۔ آپ نے

طبلہ نوازی میں کمال حاصل کیا، بڑے بڑے استادانِ فن آپ کو مانتے تھے، آپ نے کئی مہاراجوں کے درباروں میں طبلہ بجا کر تمغے اور انعام حاصل کیا، آپ کے شاگرد بہت سے ہیں، جن میں حیدر بخش نقارچی، محمد بخش قصوری، امام الدین مجرے والا اور فضل حسین قصوری بہت زیادہ مشہور ہیں۔

۱۱۔ **فضل حسین قصوری** آپ مشہور سارنگی نواز غلام محمد قصوری کے فرزند اور استاد کرم الٰہی طبلہ نواز کے شاگرد رشید ہیں۔ ابھی آپ نوجوان ہیں لیکن طبلہ نوازی میں پختہ کار ہیں اور لاہور کی کئی محفلوں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۱۲۔ **نبی بخش کالریا** آپ استاد فتح دین قصوری کے شاگرد تھے اور طبلہ نوازی کے فن میں ماہر ترین استاد مانے جاتے تھے۔ آپ نے بڑی بڑی محفلوں میں طبلہ نوازی کے کمال کا مظاہرہ کر کے داد وصول کی، آپ کے شاگردوں میں حبیب خاں اور کریم بخش پیرنا بہت مشہور ہیں۔

۱۳۔ **میراں بخش گل والیہ** آپ ضلع گوجرانوالہ کے موضع گل والی کے باشندہ تھے، والد کا نام مولا بخش تھا۔ استاد فتح دین قصوری کے شاگرد تھے، بعد میں بابا غلام صابر خاں دہلوی اور مظفر خاں دہلوی سے بھی کسبِ فیض کیا، اور چند ہی سالوں کی ریاضت کے بعد اپنے فن میں یکتا شمار ہونے لگے۔ آپ نے کئی محفلوں اور ریاستوں میں طبلہ بجایا، اور ہر جگہ داد حاصل کی، آپ نواب خیرپور کے درباری طبلہ نواز تھے۔ آپ کے شاگرد بے شمار ہیں۔

۱۴۔ **کریم بخش** آپ میراں بخش گل والیہ کے فرزند تھے، آپ نے طبلہ نوازی پہلے اپنے والد سے سیکھی پھر نبی بخش کالریا کے شاگرد ہوئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے فن میں مشہور ہو گئے، آپ نے کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں طبلہ بجا کر داد حاصل کی، ابھی جوان ہی تھے کہ ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر فوت ہو گئے۔

۱۵۔ **استاد نیاز علی** آپ گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں، پہلے میاں نصیر بخش پشاوری سے طبلہ نوازی کی تعلیم حاصل کی، پھر استاد قادر بخش کے شاگرد ہوئے۔ آپ کو طبلہ نوازی کے جملہ اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ تین تال بجانے اور اس کے سولہ لگاؤ، خالی بھری دکھانے، نغمہ کے ساتھ پھرت، اور خالی سے خالی سم سے سم تک بجانے میں یدِ طولےٰ حاصل ہے، سولہ ماترہ تال بھی خوب بجاتے ہیں، لاہور کی کئی محفلوں میں بڑی کامیابی سے طبلہ سنا چکے ہیں، انہوں نے ہمیشہ داد لی ہے۔ عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرتے ہیں۔

۱۶۔ **صادق حسین دھانی دھاڑا** آپ فیروز چیلوں والے کے شاگرد ہیں۔ اور خوب طبلہ بجاتے ہیں۔ چونکہ آپ دھانی دھاڑا کی گت بڑی تیزی اور خوش اسلوبی سے بجاتے ہیں اس لیے ان کا نام "دھانی دھاڑا" پڑ گیا ہے۔ نوجوان طبلہ نوازوں میں اچھے مانے جاتے ہیں۔

۱۷۔ **فتح دین گلدم** آپ کا تعلق قصبہ دھونکل کے مطربوں سے ہے، آپ تھیٹروں میں اداکاری بھی کرتے رہے ہیں گلدم کا پارٹ خوش اسلوبی سے ادا کرنے پر "گلدم" معروف ہو گیا۔ تھیٹریکل طبلہ اور استادی طبلہ بجانے میں ماہر تھے اور تال ادھیا اور لے کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے۔

۱۸۔ ارشاد علی آپ فتح دین گلدم کے صاحبزادے اور فقیر بخش مراثی والے کے شاگرد ہیں۔ گت توڑا اور قاعدہ بہت اچھا بجاتے ہیں، فلموں میں فلمی موسیقی کے ساتھ طبلہ، ڈھولک، تال اور اونگا بونگا بجانے میں یکتا تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۶۔ ستار نواز

۱۔ محمد شریف پونچھ والے آپ کے والد کا نام میاں رحیم بخش ہے، ابتدا میں آپ نے ستار نوازی اپنے والد ہی سے سیکھی بعد میں عنایت خاں کلکتہ والے کے شاگرد ہوئے، اور وہاں خوب ریاضت کی۔ اب سے پہلے الہ آباد میوزک کانفرنس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد تحسین وصول کی۔ مہاراجہ نیپال نے بھی اپنے دربار میں بلا کر ان کا کمال دیکھا اور داد دی۔ آپ آج تک کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں ستار بجا کر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

۲۔ فتح علی خاں پٹیالوی آپ پٹیالہ کے رہنے والے ہیں، اور ستار نوازی میں صاحب کمال ہیں، کئی کانفرنسوں میں ستار نوازی کا کمال دکھا چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور فلموں میں بھی بجاتے ہیں۔

۳۔ سراج احمد قریشی سب سے پہلے جے پور والے استاد حیدر حسین خاں سے تعلیم حاصل کی، بعد میں کئی اور استادوں سے بھی فیض پایا۔ ۱۹۳۷ء سے محکمہ ریڈیو میں ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے ایک نیا ساز ایجاد کیا جو ستار کی طرح مضراب سے بجتا ہے۔ اور اس کا نام فردوس بہار رکھا۔ آپ اکثر ستار اور فردوس بہار کا مظاہرہ ریڈیو پر کرتے رہتے ہیں۔

۷۔ قوال

۱۔ علی بخش خاں آپ لاہور کے پرانے قوالوں میں سے تھے، سانولا رنگ، بھاری جسم، ساری عمر داتا گنج بخشؒ کے مزار پر قوالی میں گزار دی۔ اردو، فارسی، پنجابی کلام بڑی خوش اسلوبی سے سناتے تھے، قوالی کے ساتھ طنبورہ یا ستار بجاتے تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ تھی، اور بذلہ سنجی میں بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ قلعہ گوجر سنگھ کی ایک محفل میں قوالی کرنے گئے، وہاں ایک پیر صاحب جو پہلے امین آباد کے قصائی تھے بیٹھے تھے، انھیں حال آ گیا، اور وہ پوچھنے لگے "یہ کیا ہو رہا ہے"؟ علی بخش خاں نے جواب دیا "قوالی"۔ پیر نے پوچھا "تم کون ہو"؟ جواب دیا "داتا کا قوال ہوں"۔ پیر نے کڑک کر پوچھا "میں کون ہوں"؟ علی بخش خاں نے برجستہ جواب دیا "امین آباد کا قصائی!" یہ سنتے ہی پیر صاحب کا حال اتر گیا اور محفل زعفران زار بن گئی، آپ استادی موسیقی کے بھی ماہر تھے اور اچھی اچھی محفلوں میں گاتے تھے۔

۲۔ مبارک علی خاں فتح علی خاں جالندھر کے مشہور قوالوں میں سے ہیں، اور ہندوستان اور پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ جب یہ دونوں فن کار اور ان کے ہمنوا قوالی کرتے ہیں تو لوگ وجد میں آجاتے ہیں۔ تلفظ اتنا صحیح ہوتا ہے کہ ان پر اہلِ زبان کا گمان ہوتا ہے۔ قوالی کے فن سے کماحقہ واقف ہیں۔ غزل، قلبانہ جو بہت کم لوگوں کو یاد ہے

نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ کلام اقبال خاص طور پر گاتے ہیں، اور بلا مبالغہ ان جا بیوں کو ہزاروں اشعار از بر ہیں۔ قوالی کے علاوہ آپ استادی موسیقی بھی نہایت اچھی طرح پیش کرتے ہیں، ریڈیو پاکستان سے اکثر قوالیاں نشر کرتے ہیں۔

۳۔ محمد بوٹا بیگم کوٹی لاہور کے قریب ایک موضع بیگم کوٹ ہے، جس میں ایک بھائی قوال الٰہی بخش رہتے تھے۔ یہ واحد قوال تھے جن کا ہیری، مریدی کا سلسلہ جاری تھا، اور لوگوں میں یہ قطب قوال کے نام سے مشہور تھے، محمد بوٹا الٰہی بخش کے فرزند تھے، آپ نے سارنگی اور استادی موسیقی کی تعلیم گل محمد خاں سے حاصل کی، لیکن پھر قوالی کرنے لگے۔ ہم نے آج تک ایسی شیریں اور رسیلی آواز والا قوال کہیں نہیں سنا۔ آخری چہار شنبہ کی رات جب آپ داتا گنج بخش کے مزار پر اچھا سہرا خوب بنایا" گاتے تھے تو وہ کونسی آنکھ تھی جو آنسو نہ بہاتی تھی، مگر افسوس کہ قضا نے ہم سے ایک ایسے فنکار کو جوانی ہی میں چھین لیا۔

۴۔ بسنتو خاں نہایت اچھے قوال ہیں، آپ نے بھی نہایت شیریں آواز پائی ہے، آپ کی قوالی بھی وجد آور ہوتی ہے مجھے قوالی کی ایک محفل یاد ہے، جس میں آپ نے "توں تاں مہر بار نہ ملایا میں کیہہ جاناں تیری خدائی" کچھ اس انداز سے گایا کہ سننے والے سر دھننے لگے، آپ مزارات کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے بھی قوالیاں نشر کرتے ہیں۔

۵۔ بشیر احمد فریدی یہ امرتسر کے راجپوت خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے دادا امیاں تابا اپنے وقت کے بڑے اچھے قوال تھے۔ بشیر احمد نے پہلے بھائی لال امرتسری سے استادی موسیقی سیکھی، پھر آپ مبارک علی فتح علی خاں کے شاگرد ہوتے اور ان سے قوالی سیکھی، اور حق یہ ہے کہ شاگردی کا حق ادا کر دیا، آپ اس وقت بڑے باکمال قوالوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ رشید احمد آپ امرتسر کے بشیر احمد فریدی کے سگے بھائی ہیں۔ آپ نے بھی مبارک علی خاں فتح علی خاں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور قوالی کا فن سیکھ کر اس میں کمال پیدا کیا، آپ پاکستان کے ہر دلعزیز قوالوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۷۔ محمد علی فریدی آپ بھی پاکستان کے ممتاز قوالوں میں سے ہیں، اور بڑے موثر انداز سے قوالی کرتے ہیں، بابا فرید گنج شکرؒ کے دربار سے وابستہ ہیں، اور اسی نسبت سے فریدی کہلاتے ہیں۔

۸۔ حافظ عطا محمد حافظ قرآن ہیں، اُردو، فارسی، پنجابی، گیت، غزلیات اور نعتیں گانے میں جواب نہیں رکھتے، آواز نہایت رس بھری ہے، اور گلے پر پورا قابو حاصل ہے، آواز جہاں چاہے لے جا سکتے ہیں، قوالی کے علاوہ آپ کے راگ، ٹھمریاں اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔

۹۔ بھائی بوڑا لاہور کے مشہور ربابی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور قدیم قوالوں میں شمار کیے جاتے تھے، اُردو، فارسی اور پنجابی کلام نہایت دلآویز ترنم سے پیش کرتے تھے، بعض دفعہ منہ سے گھنگھروؤں کی آواز پیدا کر کے محفل میں سماں باندھ دیتے تھے۔ صوفیائے کرام کا کلام یاد تھا، اور تلفظ بھی بہت عمدہ تھا جس محفل میں قوالی کی، داد لیے بغیر نہ رہے، آپ یادگار زمانہ انسانوں میں تھے۔

۸۔ میوزک ڈائریکٹر

۱۔ ماسٹر غلام حیدر۔ لاہور کے مشہور ربابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اوائل زندگی میں تھیٹریکل کمپنیوں میں اداکاری کی،

پھر لاہور کی کولمبیا کمپنی کی ریکارڈنگ کرتے رہے، بعد ازاں لاہور اور بمبئی کی مختلف فلم کمپنیوں کے فلموں کی دُھنیں تیار کیں، اور ہندوستان کے مشہور ترین میوزک ڈائریکٹروں میں شمار کئے جانے لگے، موجودہ فلمی موسیقی آپ ہی کے کمالات کی مرہونِ منت ہے، اگر آپ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو فلمی موسیقی کو چار چاند لگا دیتے۔

۲۔ ماسٹر غلام احمد چشتی آپ بھی ہند و پاکستان کے ممتاز ترین میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس کے ساتھ ہی طبع اتنی موزوں ہے کہ اردو اور پنجابی شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ فلمی دُھنیں بنانے کی مشین ہیں، آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے متعدد فلموں کی کامیاب دُھنیں بنائی ہیں جو بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ مرنجاں مرنج انسان ہیں، اور طبیعت میں تکلف نام کو بھی نہیں، بذلہ سنجی میں بھی جواب نہیں رکھتے۔ ایک دن چوک کشتی میں بیٹھے بڑے گوشت کے تکے نہایت مزے سے کھا رہے تھے، سلیم اقبال میوزک ڈائریکٹر اُدھر سے گزرے تو اُنھیں بُلا کر کہنے لگے "دیکھو لوگ بڑے سے بڑا گناہ چھپ کر کرتے ہیں لیکن چشتی بڑا گوشت صبح چوراہے میں کھا رہا ہے"۔ پاکستان کی فلمی موسیقی کے مستقبل کی بہت سی امیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہیں۔

۳۔ ماسٹر عنایت حسین پاکستان کے نوجوان موسیقار اور میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ آپ نے استادی موسیقی کی تعلیم بڑے غلام علی خاں سے حاصل کی اور بہت جلد اچھا گانے لگے، پھر اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے کولمبیا گراموفون کمپنی میں ڈائریکٹر مقرر ہو گئے، بعد ازاں فلمی دنیا میں شامل ہوئے اور فلموں کی دُھنیں تیار کرنے لگے، آپ اس وقت پاکستان کے بہترین میوزک ڈائریکٹروں میں شمار کئے جاتے ہیں، قاتل، گمنام، انارکلی اور شمی وغیرہ فلموں میں آپ نے بڑی اچھی موسیقی ترتیب دی ہے۔

۴۔ رشید عطرے آپ امرتسر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں فلمی دنیا میں شریک ہو کر میوزک ڈائریکٹر بن گئے۔ آپ اس وقت تک سات لاکھ، نیند وغیرہ متعدد فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔ آپ بھی پاکستان کے بہترین میوزک ڈائریکٹر ہیں۔

۵۔ تصدق حسین پاکستان کی فلمی دنیا کے اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک کئی اچھی فلموں کی دُھنیں تیار کر چکے ہیں جن میں روپ متی باز بہادر، غالب، وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

۶۔ صفدر حسین ناگن، ہیر، حمیدہ وغیرہ کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں، اور ایک کامیاب میوزک ڈائریکٹر ہیں، ابھی اور فلموں میں بھی موسیقی ترتیب دے رہے ہیں۔

۷۔ طفیل فاروقی پہلے پہل آپ آل انڈیا ریڈیو لاہور سے منسلک رہے اور وہاں سے پکے گانے، ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے رہے، اور ڈراموں اور فیچروں میں حصہ لیتے رہے۔ اُستادی موسیقی میں آپ فیروز نظامی کے شاگرد ہیں۔ آپ بمبئی جا کر فلمی دُنیا میں شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے۔ آپ اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک بھروپیا، وحشی، برکھا وغیرہ فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔

۸۔ سلیم اقبال ۔ لاہور کے مشہور شوقیہ موسیقار میاں علم الدین مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ پہلے استادی موسیقی کی تعلیم اپنے

والد سے حاصل کی، پھر فیروز نظامی کے شاگرد ہوئے۔ کامیاب میوزک ڈائریکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس وقت تک "شیخ چلی"، "گھونگھٹ"، "گھر جوائی"، "کرتار سنگھ" اور "دروازہ" کی موسیقی ترتیب دے چکے۔ ان کی دھنیں مقبول ہو کر زبان زدِ عوام ہیں۔

۹۔ **شہر یار** استادی موسیقی میں فیروز نظامی کے شاگرد رہے ہیں، اچھے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور اس وقت تک "بے گناہ"، "ممتاز"، "تین تال" میں اچھی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں۔

۱۰۔ **اختر حسین** آپ ماسٹر عنایت حسین میوزک ڈائریکٹر کے شاگرد ہیں اور کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں، جن میں سے "پاٹے خاں" کی دھنیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔

۱۱۔ **عاشق حسین** آپ بھی ماسٹر عنایت حسین کے شاگرد ہیں، بہت ہونہار میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ "جبرو" کی موسیقی آپ ہی نے ترتیب دی ہے۔

۱۲۔ **مصلح الدین** آپ بنگال کے رہنے والے ہیں، اور اس وقت تک کئی فلموں کی دھنیں تیار کر چکے ہیں۔ "زمانہ کیا کہے گا" کی موسیقی آپ ہی نے ترتیب دی ہے۔

۹۔ کلارنٹ نواز

۱۔ **ماسٹر سوہنی** لاہور میں پیدا ہوئے۔ موسیقی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ دس برس کی عمر میں اللہ دتا تعارجی کی شاگردی اختیار کی، اُن سے لے اور تال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی محمد دین سے کلارنٹ سیکھی پھر میاں علم دین مرحوم اور توکل خاں صاحب سے استادی موسیقی حاصل کی، اور پھر ماسٹرس وائس گرامو فون کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ متعدد فلموں میں کلارنٹ بجائی، کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد حاصل کی، لاہور میں آپ کا براس بینڈ مشہور ہے۔ جب آپ عالم رنگ و بو میں پکے راگ اور فلمی دھنیں بجاتے ہیں تو فضا سریلے نغمات سے لبریز ہو جاتی ہے۔

۲۔ **ماسٹر عالمگیر** امرتسر کے مشہور براس بینڈ کے مالک جہانگیر مرحوم کے صاحبزادہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ کلارنٹ میں پکے راگ بڑی خوش اسلوبی سے بجاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی استاد گویا گا رہا اور تانیں مار رہا ہے، فلمی دھنیں بھی بجاتے تھے، افسوس اس فن کار کو بھی قضا نے ہم سے چھین لیا۔

۳۔ **صادق علی مانڈو** لاہور کے اچھے کلارنٹ نواز ہیں، مدت سے ریڈیو لاہور سے منسلک ہیں اور وہیں سے پکے راگ اور ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے ہیں، کئی کانفرنسوں میں بھی اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔

۴۔ **فیروز الدین** لاہور کے کہنہ مشق کلارنٹ نواز ہیں پہلے بینڈ میں شریک تھے، پھر لاہور ریڈیو سے منسلک ہو گئے، آپ اکثر وہاں استادی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی نشر کرتے رہتے ہیں۔

۱۰۔ پیانو نواز

۱۔ **ماسٹر اللہ دیا** — میاں فتح دین کے صاحبزادہ ہیں، موسیقی کی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ پھر این۔ ڈبلیو۔ آر میں

ملازمت اختیار کی، شوقیہ پیانو بجاتے تھے اور ایسا بجاتے تھے کہ سامعین عش عش کر اٹھتے۔ آج سے چالیس سال پہلے جب کہ ٹاکیز فلموں کا رواج نہ تھا آپ گیٹی تھیٹر لاہور (حال ناولٹی سینما) میں فلم کے ساتھ حسب موقع پیانو بجاتے تھے اور اس میں کمال کر دیتے تھے۔

۲۔ ماسٹر عنایت حسین ماسٹر اللہ دیا کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ ایک بہترین مصور بھی ہیں اور عبدالرحمٰن چغتائی کے شاگرد ہیں۔ پیانو آپ نے اپنے والد سے سیکھا، نہایت عمدگی سے بجاتے ہیں۔ اپنے والد کی ساری خوبیاں آپ کی انگلیوں میں موجود ہیں۔

۳۔ ماسٹر صادق علی میاں امام الدین ڈھولک والے کے صاحبزادہ ہیں۔ مادرزاد نابینا ہیں۔ لیکن اللہ نے دماغ ایسا دیا ہے کہ جس فن میں چاہتے ہیں کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ پہلے طبلہ نوازی شروع کی، تو اس میں بھی نام پیدا کیا، اب پیانو اور کلارنٹ بجاتے ہیں، اور اتنے رسیلے اور سریلے انداز سے بجاتے ہیں کہ سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے انگلیاں بجلی کی سی تیزی سے سروں پر دوڑتی ہیں۔ اس وقت تک آپ کئی فلموں میں پیانو نوازی کا کمال دکھا چکے ہیں، اور کئی کانفرنسوں میں بھی پیانو بجا کر داد حاصل کر چکے ہیں۔

۱۱۔ نَے نواز

۱۔ سائیں اللہ دتا پاکستان کے ممتاز نَے نوازوں میں سے ہیں، جب آپ بانسری سے استادی موسیقی یا ہلکی پھلکی موسیقی بجاتے ہیں تو عجیب سماں باندھ دیتے ہیں۔ آپ نے کئی نجی محفلوں اور کانفرنسوں میں بانسری بجائی اور داد حاصل کی، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی آپ نغمات نشر کرتے ہیں، اور فلموں میں بھی بجاتے ہیں۔

۲۔ بابو خاں یو۔پی کے باشندہ ہیں، لیکن مدت سے ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں، نہایت اچھی بانسری بجاتے ہیں آپ متعدد فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۳۔ حاجی عمر حیات آپ ہرفن مولا فنکار ہیں۔ پہلے ہارمونیم سیکھا، پھر کلارنٹ بجانے لگے اور خوب بجایا، اب بانسری بجاتے ہیں، کئی نجی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ سانس کا یہ عالم ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ آج کل آپ ایک نئی قسم کی بانسری کی ایجاد میں مصروف ہیں، اس کے لیے گذشتہ دو تین سال سے محنت کر رہے ہیں، اور بلا مبالغہ ہزاروں بانسریاں بنا کر توڑ چکے ہیں، ابھی انھیں اپنی ایجاد میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی، مگر آپ "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" پر کاربند ہیں۔

۱۲۔ سرود نواز

۱۔ بھائی مہر لاہور کے مشہور ربابی خاندان سے ہیں، اور سرود بجانے میں مشہور ہیں۔ پہلے آپ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی سے منسلک رہے، ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی سرود کے نغمات نشر کرتے رہے، اور کئی محفلوں اور کانفرنسوں میں سرود نوازی کا کمال دکھایا اور داد وصول کی۔

۲۔ فیض فرید آپ بھی ربابی خاندان کے فرد ہیں، اور سرود نوازی خوب کرتے ہیں، مدت سے لاہور ریڈیو سے منسلک ہیں اور سرود پر نغمے نشر کرتے ہیں، علاوہ ازیں آپ نے کئی کانفرنسوں میں بھی سرود بجا کر داد لی ہے۔

اکھاڑے

سراج نظامی

قرآن مجید نے جناب طالوت کا قصہ بیان فرما کر قوموں کے ضعف و قوت، اور فتح و شکست کے متعلق ایک ٹھوس حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک اور نبی کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تو بنی اسرائیل نے ان سے کہا کہ ہمیں جنگوں کے لیے ایک سپہ سالار کی ضرورت ہے، نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا سپہ سالار منتخب کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے، کیونکہ طالوت امرا کے طبقہ سے نہ تھے، اور بنی اسرائیل کے نزدیک ہر بات کا معیار سرمایہ داری تھا۔ اس لیے انھوں نے اعتراض کیا کہ ہم اس غریب شخص کو سپہ سالار کس طرح تسلیم کرلیں۔ نبی نے جو جواب دیا وہ قرآن کی سورہ البقرہ کی ۲۴۷ ویں آیت میں موجود ہے ارشاد ہے:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

"کہا بے شک اللہ نے اسے تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت میں وسعت دی ہے۔"

قرآن مجید نے مختصر الفاظ میں جسمانی قوت کی فضیلت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان فرما دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی اس ٹھوس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ؎

اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوت ہر ملت از جمعیت است

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یونان، روما، اسپارٹا، قرطاجنہ، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں جسمانی ورزش پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہاں کے رومیؔ تن پہلوانوں اور سپہ سالاروں مثلاً ہرقلیز، ہنی بال، حمزہؓ، علیؓ، معدی کربؓ، رستم، سہراب، اسفندیار، افراسیاب، بھیم اور ارجن نے چاردانگ عالم میں شہرت حاصل کی، اور تاریخ عالم میں اپنے نام سنہری حروف میں لکھا گئے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہ، مہاراجگان اور امراء و روسا شہ زور پہلوانوں کی سرپرستی کرتے اور انھیں خلعتوں اور انعام اکرام سے نوازتے تھے۔ ہندوستان میں بھی پہلوانی اور کشتی کا فن زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا۔ اور ہر جگہ بڑے بڑے اکھاڑے قائم تھے، جن میں بہترین استادوں کی زیرنگرانی جوانوں کو کشتی کے فن کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان اکھاڑوں نے عظیم الشان پہلوان پیدا کیے جنھوں

نے اپنے کارناموں سے اس شریف فن کا نام زندہ رکھا۔

لاہور ایک قدیم تاریخی شہر ہے، ناممکن تھا کہ یہاں یہ فن رائج نہ ہوتا۔ تاریخ کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس شہر نے بھی بڑے بڑے مشہور پہلوان پیدا کئے، جنہوں نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان عظیم الشان دنگلوں میں فتح پائی اور لاہور کا نام بلند کیا۔ اس فن کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور میں بیسیوں اکھاڑے ہیں جن میں پہلوان ورزش کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔

لاہور میں پہلوانوں کے تین گروہ ہیں۔ ہر گروہ کے ممبروں کو وف دار کہتے ہیں:۔

۱۔ **کالو والے**۔ اس گروہ کے بانی استاد کالو مرحوم تھے۔

۲۔ **نورے والے**۔ اس گروہ کے بانی استاد نورا مرحوم تھے۔

۳۔ **کوٹ والے**۔ کوٹ پنجابی میں فصیل کو کہتے ہیں، چونکہ اس گروہ کے بانی الٰہی بخش پہلوان بھاٹی دروازہ کے باہر ماموں بھانجے کے پیپل کے نیچے فصیل (کوٹ) کے پاس ایک اکھاڑے میں ورزش کرتے تھے، اس لیے یہ کوٹ والے کہلاتے تھے۔

شروع شروع میں کوٹ والے اور کالو والے آپس میں کشتیاں نہیں لڑتے تھے، بلکہ یہ دونوں نورے والوں سے لڑتے تھے، تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوا کہ بھاٹی دروازہ کے حاجی بلاسے کوشش کر کے اور ہزار ہا روپیہ صرف کر کے امام بخش پہلوان اور گونگا پہلوان کا دنگل کرا دیا، اس دنگل کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ سارے منٹو پارک میں شہتیروں سے ایک گول پنڈال بنادیا گیا تھا۔ اور ہندوستان کے ہر شہر سے لوگ یہ دنگل دیکھنے آئے تھے۔ امام بخش کوٹ والے تھے اور گونگا کالو والے، اس لیے اس دن سے آج تک ان تینوں اکھاڑوں کے پہلوان ایک دوسرے سے کشتیاں لڑتے ہیں، آجکل کوٹ والوں کے بڑے خلیفہ سردار محمد پہلوان ولد خلیفہ بوٹی مرحوم ہیں۔ کالو والوں کے خلیفہ عبداللہ اور نورے والوں کے مشہور پہلوان خلیفہ غلام محی الدین ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کو مشہور اکھاڑوں کی جملہ تفاصیل سے کماحقہٗ آگاہ کر دیا جائے۔

کالو والے

اکھاڑہ خلیفہ بوٹا اس اکھاڑے کو کھائی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں، کالو والے اکھاڑوں میں یہ سب سے بڑا اکھاڑہ ہے۔ یہ شاہی قلعہ کے جنوب کی طرف لیلا پارک میں بجلی گھر کے قریب واقع ہے، اس اکھاڑے نے ہندوستان کے بہترین شہ زور پہلوان پیدا کئے ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ **بوٹا پہلوان مرحوم**۔ آپ لاہور کے نامی پہلوان تھے، جسم نہایت سڈول اور خوبصورت تھا۔ یوں بھی بہت حسین تھے، و بدہ زیب لباس پہنا کرتے تھے، آپ نے پنجاب کے اکثر نامی گرامی پہلوانوں سے مقابلہ کیا اور انھیں گرایا، علاوہ ازیں آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں ریاستی پہلوانوں کو پچھاڑا اور انعام و اکرام حاصل کیا، امرتسری دیو پیکر پہلوان رمزی

کو بھی آپ نے چار دن میں چت گرا دیا تھا۔

[آپ کو رستم ہند کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی ریاستوں میں آپ کی بڑی عزت تھی۔ رئیس قدر کرتے تھے کہ آپ کی پشت لگتے کبھی، میں نہیں دیکھی، دنگل میں کسی سے ہار نہیں مانی، بڑے بڑے پہلوان آپ کی شہ زوری کا لوہا مانتے اور اُستادی کے قائل تھے۔ ریاست بڑودہ سے آپ کو جاگیر کے علاوہ معقول وظیفہ ملتا تھا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ والیٔ جودھپور نے آپ کو پاؤں کے طلائی کڑے عطا کیے تھے جو خاص مصاحبوں، اعلیٰ جاگیرداروں اور بھائی بندوں کے سوا کسی کو نہ ملتے تھے۔ آپ ایک ریاست کی طرف سے راجہ کے ہمراہ یورپ بھی گئے تھے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۰۰ء کو کیکر سنگھ اور کلو پہلوان کی کشتی میں آپ کو ایمپائر (رنج) مقرر کیا گیا۔ ۱۸ اپریل کو اپنے وطن لاہور میں انتقال کیا اور میاں مانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ چونکہ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے اور بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے اس لیے منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم کی تحریک پر فصیح الملک بہادر مرزا داغؔ دہلوی، نواب فصاحت جنگ بہادر، سید جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری، منشی وجاہت حسین صاحب وجاہتؔ جھنجھانوی اور دیگر کئی شعراء نے قطعات تاریخ لکھے۔ جن میں سے چند ایک بطور یادگار یہاں درج کیے جاتے ہیں —— ادارہ]

داغ دہلوی ——

وہ دلاور اور وہ شہ زور دنیا سے گیا ۔۔۔ جس کی شہ زوری سے تھا شیر نیستاں منفعل
داغؔ نے یہ مصرعِ تاریخ برجستہ کہا ۔۔۔ رستم ہند آہ بوٹا پہلوان دل‌ دل
۱۳۲۲

جلیل مانکپوری ——

یوں تو مرنا سب کو ہے لیکن ستم ہے اس کی موت ۔۔۔ جو کسی فن میں ہو وجہِ افتخارِ روزگار
مٹ گیا ہائے وا ہے بوٹا پہلواں کا بھی وجود ۔۔۔ کیا بساطِ زندگی کیا اعتبارِ روزگار
زور و طاقت میں یگانہ تھا فنِ کشتی میں فرد ۔۔۔ معرکہ آرائیوں میں یادگارِ روزگار
زالِ دنیا رو رہی ہے اس تہمتن کے لیے ۔۔۔ کہہ رہی ہے ہائے ہائے اسفندیارِ روزگار
فوقؔ نے لکھا مجھے تاریخ کہنے کے لیے ۔۔۔ خلق جن کا ہے بہارِ سبزہ زارِ روزگار

ان کے لکھنے سے کہی تاریخ میں نے اے جلیلؔ
رستم ہند آہ بوٹا نامدارِ روزگار

وجاہت جھنجھانوی ——

چل دیئے ملکِ عدم کو اب میاں بوٹا بھی آہ ۔۔۔ جن کے دم سے پہلوانی کا گلستاں تھا نہال
رستمِ ہندوستاں تھا وہ جوانِ پنجاب کا ۔۔۔ فنِ کشتی میں سمجھتے تھے اسے سب باکمال
جس کی شہرت تھی مسلمانوں کی عزت کا سبب ۔۔۔ موت اس کی ہو نہ کیونکر باعثِ رنج و ملال
غیر ممکن گو نہ ہو، اس میں مگر کچھ شک نہیں ۔۔۔ اب نظر آئے گی مشکل سے کوئی ایسی مثال
کس کی ہو گی ایسی عزت ایسی قدر و منزلت ۔۔۔ ہند میں اب کون پا سکتا ہے یہ جاہ جلال

اپنے مخلص کا بھلا میں حکم کب سکتا تھا ٹال   کی تھی فرمائش جناب فوقؔ نے تاریخ کی

یہ لکھا میں نے وجاہتؔ مصرعِ سالِ وفات

<u>کر گیا عالم سے جب اب رستمِ ہند انتقال</u>

۱۹۰۴ء

۲۔ چوہا پہلوان مرحوم۔ آپ بوٹا پہلوان کے بھائی تھے اور کشتی کے فن کے ماہر، آپ نے بھی متعدد کشتیاں لڑیں اور اُن میں کامیاب رہے، آپ نے ریاستوں کے دنگلوں میں بھی کافی نام پیدا کیا۔

۳۔ مہنی پہلوان ریتی والا مرحوم۔ یہ جواں سال پہلوان اگر کچھ عرصہ زندہ رہتا تو بڑا نام آور ہوتا، آپ نے چھوٹی سی عمر میں عظیم الشان دنگلوں میں کامیابی حاصل کی، بڑے دل گردے کے مالک تھے، اور شیر کی طرح اپنے حریف پر جھپٹتے تھے، آپ نے رحیم پہلوان سلطانی والا، کلو پہلوان امرتسری، حسن بخش ملتانی اور کالا پرتابا پہلوان سے کشتی لڑی اور اُن کو چاروں شانے چت کرایا۔ آپ نے آخری کشتی میں اتنا زور لگایا کہ گھر آ کر آپ کی موت واقع ہو گئی۔

۴۔ گاموں پہلوان بالی والا مرحوم۔ آپ بڑے پہلوان رستمِ ہند کے شاگرد تھے، نہایت خوبصورت جسم کے مالک تھے، داؤ پیچ اور لڑنت میں جواب نہیں رکھتے تھے، آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے بیشتر شہ زور پہلوانوں سے مقابلہ کیا، اور انہیں گرایا۔ نانی والا پہلوان ملتانی اور رحیم پہلوان سلطانی والا کو گرایا، مشہور و معروف گونگا پہلوان آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے، آخری کشتی مدو برہمن سے لڑے اور ہار گئے۔

۵۔ گونگا پہلوان مرحوم۔ یہ وہ پہلوان تھے جن پر پاکستان کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ آپ گاموں بالی والے کے سب سے بڑے فرزند تھے، نام فیروز الدین تھا، بچپن میں تپ محرقہ کے باعث گونگے ہو گئے، اس لیے گونگا کے نام سے مشہور ہوئے، آپ شہ زوری اور فن کشتی میں نہایت ماہر تھے آپ نے کئی دنگلوں میں ہندوستان کے نامی گرامی پہلوانوں کو اپنی خداداد مہارت سے چاروں شانے چت گرایا، یوں تو آپ نے کئی کشتیاں لڑیں، مگر جو کشتی آپ نے امام بخش پہلوان رستمِ ہند سے لڑی وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی، ایسا دنگل اور ایسا وسیع پنڈال آج تک نظروں سے نہیں گزرا، تقریباً ساری منٹو پارک ہی پنڈال بن گئی تھی، ہم اس کشتی میں اکھاڑے کے بالکل قریب بیٹھے تھے، اور ہمارے پیچھے اُس عہد کے دو نامی گرامی پہلوان بیٹھے تھے یعنی کلو پہلوان امرتسری اور رحیم پہلوان سلطانی والا، یہ دونوں پہلوان اکھاڑے میں اُترنے والے ہر پہلوان کے متعلق باتیں کرتے اور رائے دیتے تھے۔ جب امام بخش اور گونگا اکھاڑے میں آمنے سامنے ہوئے، اور دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کشتی شروع کی تو رحیم سلطانی والا کہنے لگا: ”پہلوان گونگا امام بخش کے رعب میں نہیں آ رہا ہے“ تھوڑی دیر بعد کلو پہلوان نے دونوں پہلوانوں کی طاقت کا اندازہ لگا لیا، انہیں معلوم ہو گیا کہ امام بخش طاقت میں گونگے سے کم ہیں، آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور کہا ”خدایا میرے تبرک کی خیر“ اشارہ امام بخش کی طرف تھا۔ اس کے بعد چشم زدن میں امام بخش اوپر تھے اور گونگا نیچے، لیکن دوسرے لمحہ گونگا کھڑا ہو گیا، دونوں پہلوان لڑتے ہوئے کھائی میں جا گرے۔ نواب محمد علی قزلباش مرحوم اور خان بہادر شیخ محمد نقی مرحوم منصفان تھے، دونوں نے فیصلہ گونگے کے حق میں دے دیا مگر امام بخش اس فیصلہ سے متفق نہ ہوئے اور کشتی دوبارہ ہوئی، لاہور کے ڈپٹی کمشنر بھی موقعہ پر آن پہنچے اور گونگا پہلوان نے پھر امام بخش کو گرا لیا۔

اس کے علاوہ گونگا نے نانی والا پہلوان ملتانی، حیدر پہلوان امرتسری، فضلا پہلوان جالندھری، گاماں کلو والا امرتسری، حمیدہ پہلوان امرتسری، بچا سنگھ پہلوان، گنگا سنگھ پہلوان، رحیم بخش پہلوان سلطانی والا اور بلھڑ پہلوان سے کشتی لڑی اور ان میں سے اکثر کو چاروں شانے چت گرا دیا۔

دو مرتبہ امام بخش پہلوان سے شکست کھائی۔ ایک مرتبہ پٹیالہ میں اور دوسری مرتبہ لاہور میں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ بنگال و بہار سے لاہور آ رہے تھے کہ ریل کے حادثے کا شکار ہو کر فوت ہو گئے۔

ان نامی پہلوانوں کے علاوہ اس اکھاڑے نے اور بھی پہلوان پیدا کئے جن میں سے جانی چنّو والا، جانی ڈنگر، ساجا گھکھڑ، ساجا کبابی، کالا خراسیہ، برکت ناگاں والا، عمر دراز، محمد حسین، شیدا پہلوان بہت مشہور ہیں۔

اس اکھاڑے کے موجودہ خلیفہ ساجا پہلوان کبابی ہیں۔

۲۔ اکھاڑہ تکیہ تاجے شاہ

یہ اکھاڑہ تکیہ تاجے شاہ، بیمبر لین روڈ میں واقع ہے، اس کے مشہور خلیفہ مہتا خراوی اپنے فن کے بہت ماہر مانے جاتے ہیں، اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں نجے شاہ بہت اچھے پہلوان ہیں، بدن نہایت خوبصورت ہے اور لڑتے بھی بہتر ہیں، آجکل اس اکھاڑے کے خلیفہ بھی آپ ہی ہیں۔ مہتی پہلوان ریتی والا بھی کبھی یہیں ورزش کیا کرتا تھا۔

۳۔ اکھاڑہ چھنن قصائی

یہ اکھاڑہ لنڈا بازار عقب لاہور سٹی کوتوالی میں واقع ہے۔ یہ اکھاڑہ شہر کے پرانے اکھاڑوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس میں اچھے اچھے نامور پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل بہت زیادہ مشہور ہیں:۔

۱۔ **چھنن پہلوان قصائی ستارۂ ہند مرحوم۔** بڑے گرانڈیل پہلوان تھے، اور فن کشتی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے نامی پہلوانوں سے کشتی لڑی اور بیشتر کو شکست دی، اسی لیے آپ ستارۂ ہند کہلائے۔

۲۔ **ننھا چنگڑ پہلوان۔** آپ نے کئی دنگلوں میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا اور اپنے قدر دانوں سے داد حاصل کی۔ بڑے جیالے پہلوان ہیں۔ بوقت ضرورت چیتے کی طرح حملہ کرنے اور داؤ پیچ کو کمال تک پہنچانے میں آپ نے کئی مشہور پہلوانوں کو شکست دی، ننھا پہلوان، بجرے گوجر کو گرا دیا، مہاجا پہلوان ملتانی والا اور گاماں کلو والے کے ساتھ کشتی برابر رہی۔ مگر افسوس کہ ہندو مسلم فساد کے سلسلہ میں آپ کو عبور دریائے شور کی سزا ہو گئی اور آپ انڈیمان بھیج دیئے گئے، جب آپ واپس آئے تو طاقت جواب دے چکی تھی پہلوانی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ آج کل آپ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں۔

۳۔ **جمال چنگڑ پہلوان۔** آپ ننھا چنگڑ پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں، طویل القامت ہیں، قوی جثہ کے مالک ہیں۔ طاقت، داؤ پیچ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی کئی قابل ذکر دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اہالیانِ لاہور اُن لمحوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو جمال پہلوان اور کمال پہلوان جوڑ کے درمیان ہوئیں، جب یہ دونوں نامی پہلوان کشتی لڑتے تو لوگ عش عش کرتے۔

اس اکھاڑے کے موجودہ خلیفہ کا نام حبیبہ دادا ہے۔

۴۔ اکھاڑہ اُستاد شیش گر یہ اکھاڑہ مستی دروازہ لاہور کی تاریخی مسجد بیگم شاہی کے عقب میں واقع تھا۔ آجکل وہاں موٹروں کی مرمت کی دکانیں بن گئی ہیں، موجودہ خلیفہ استاد شیش گر کے صاحبزادہ ہیں۔

۵۔ اکھاڑہ نزدیک پل مصری شاہ یہ اکھاڑہ مصری شاہ کے پل کے باہر نئی میوہ منڈی کے پاس واقع ہے، ایک چھوٹا سا مزار بھی وہاں موجود ہے۔ اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں جلال الدین کوٹلوں والا بہت نامی پہلوان گزرا ہے۔ اس نے کئی دنگلوں میں اپنے فن کی داد وصول کی، اور بہت سی کشتیاں کامیابی سے لڑیں۔

کوٹ والے

اکھاڑہ ویام شالہ لاہور کا نیا اکھاڑہ ہے، اور ٹکسالی دروازہ کے باہر نوحی روڈ کے شروع میں واقع ہے، پہلے یہ لاہور کے ہندو پہلوانوں کا اکھاڑہ تھا، اور یہاں اُن کے دنگل ہُوا کرتے تھے، قیام پاکستان کے بعد جب امرتسر کے مشہور پہلوان گاماں کلّو والا لاہور آ گئے، تو انھوں نے یہاں اکھاڑہ بنا لیا، اس اکھاڑہ میں پاکستان کے نامی گرامی پہلوان ورزش کرتے ہیں، مندرجہ ذیل عالمگیر شہرت کے مالک ہیں:۔

۱۔ بھولو پہلوان رستم ہند۔ رستم زماں گاماں پہلوان کے بھتیجے اور رستم ہند امام بخش پہلوان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ بڑے گرانڈیل جوان ہیں، ریاضت کا یہ عالم ہے کہ لنگوٹ کس کر جب اکھاڑے میں اُترتے ہیں تو بیسیوں پہلوانوں کو ورزش کرا دیتے ہیں۔ ابھی آپ کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن آپ پاکستان اور ہندوستان کے بیشتر شہ زور پہلوانوں کو پچھاڑ چکے ہیں، حقیقت میں آج کوئی پہلوان اُن کے جوڑ کا موجود نہیں اور اگر کوئی اُٹھتا بھی ہے تو آپ کے چھوٹے بھائی اس کا کس بل نکال دیتے ہیں۔

۲۔ اسلم پہلوان عرف اچھا۔ ۳۔ اکرم پہلوان عرف اکّی۔ ۴۔ گوگا پہلوان ۵۔ اعظم پہلوان۔

یہ چاروں جواں سال پہلوان بھی امام بخش پہلوان رستم ہند کے صاحبزادے اور بھولو پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں، قدیم کشتی اور جدید فری سٹائل کشتی کے فن میں پوری طرح ماہر ہیں، کم عمر ہیں پھر بھی کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں، پاکستان، ہندوستان اور بیرون پاکستان کے کئی مشہور پہلوانوں کو چاروں شانے چت گرا چکے ہیں، پاکستان کو اس خاندان پر ناز ہے۔

۶۔ اکھاڑہ بھورے شاہ کبھی نامی اکھاڑہ تھا، او رتکیہ بھورے سائیں بیرون ٹکسالی دروازہ میں واقع تھا۔ اس اکھاڑے نے بھی اچھے اچھے پہلوان پیدا کئے تھے، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ کریم بخش پہلوان پوٹی والا مرحوم۔ اپنے وقت کے بہت مشہور پہلوان تھے، اور اچھے اچھے پہلوانوں کے ساتھ مقابلہ کر کے اُنھیں شکست دی تھی۔ آپ مہاراجہ جودھ پور کے درباری پہلوان تھے۔

۲۔ یوسف پہلوان پناں والا۔ بڑے گرانڈیل پہلوان ہیں اور لاہور اور بیرون لاہور کے کئی نامی پہلوانوں سے کشتی لڑ چکے ہیں۔ آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں کے دنگلوں میں بھی اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اور داد وصول کی ہے آپ کریم بخش پہلوان پوٹی والے کے شاگرد ہیں۔

۳۔ لال پہلوان پلپنجہ۔ استاد کریم بخش پہلوان پوٹی والے کے شاگرد اور اچھے پٹھوں میں ہیں۔ داؤ پیچ اور طاقت

خوب جانتے ہیں، لاہور والے ان کی کشتیوں کو ابھی تک یاد کرتے ہیں۔

۴۔ عاشق پہلوان بوٹی والا۔ آپ سردار محمد پہلوان کے فرزند اور مشہور خلیفہ بوٹی مرحوم کے نواسے ہیں آپ نے بھی کئی دنگلوں میں فن کا مظاہرہ کرکے داد لی ہے۔ آپ اچھا پہلوان ہونے کے ساتھ ایک کامیاب جراح بھی ہیں اور ہڈیوں کے جوڑنے میں ماہر ہیں۔

۵۔ غلام مینوں والا۔ ۶۔ دین پہلوان۔ ۷۔ امام دین ارائیں۔ ۸۔ جیجا پہلوان۔ یہ سارے پہلوان اپنے زمانہ کے بہترین پٹھوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور انھوں نے لاہور کے کئی دنگلوں میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور لوگوں سے داد لی تھی۔

اب اس اکھاڑے کا نام و نشان موجود نہیں، کیونکہ تکیہ موجود نہیں۔

۳۔ اکھاڑہ تکیہ شیر علی | یہ اکھاڑہ تکیہ شیر علی بیرون ٹکسالی دروازہ میں واقع تھا، اور اس میں تقریباً دو سو جوان ورزش کیا کرتے تھے، جو اکھاڑہ تکیہ بھورے شاہ میں کرتے تھے، اب یہاں کوئی اکھاڑہ موجود نہیں۔

۴۔ اکھاڑہ پیر مکی | راوی روڈ پر گوروں کے قبرستان کے پاس مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا مکان ہے، یہ اکھاڑہ اس مکان کے عقب میں واقع ہے، اس اکھاڑے نے بھی اچھے اچھے پہلوان پیدا کئے ہیں مثلاً علماں راج، پیجاں پہلوان، ننھا پہلوان، عاشق پہلوان دھوبی، جو کئی دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۵۔ اکھاڑہ تکیہ پیر از غیب | دربار داتا گنج بخش رح کے سرہانے کی طرف ایک تکیہ ہے جسے پیر از غیب کہتے ہیں، اسی تکیہ میں کبھی یہ اکھاڑہ ہوا کرتا تھا، اس اکھاڑے میں بھی کافی پہلوان ورزش کیا کرتے تھے، نانا جھیورا اسی اکھاڑے کا مشہور پہلوان تھا۔ اب قبریں بننے کی وجہ سے یہ اکھاڑہ یہاں سے ہٹ گیا ہے۔

۶۔ اکھاڑہ خلیفہ بخشی | یہ بالکل نیا اکھاڑہ ہے، اور لوہاری دروازہ کے باہر مسکین سائیں کے تکیہ میں واقع ہے، اس اکھاڑے کے خلیفہ بخشی ہیں، خالو پہلوان آپ ہی کے شاگرد ہیں، اور آجکل کے نامی گرامی پٹھوں میں ہیں، اور کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر اچھے اچھے پہلوانوں کو پچھاڑ چکے ہیں۔

۷۔ اکھاڑہ جانی پہلوان | یہ اکھاڑہ جانی پہلوان پسر الٰہی بخش نے بادشاہی مسجد کے پاس بنایا تھا، اور اس میں جانی پہلوان، ساجا گھگھو پہلوان وغیرہ ورزش کرتے تھے، جب شاہی مسجد کی مرمت شروع کی گئی اور باغات بنائے گئے تو اس اکھاڑے کو یہاں سے ہٹا دیا گیا۔

۸۔ اکھاڑہ گھدو شاہ | اسے بھائیوں کا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے خلیفوں میں حکیم بھائی گلاب سنگھ اور حکیم مادھو سنگھ بڑے مشہور گزرے ہیں، یہ سرکلر روڈ پر لوہاری دروازہ اور موری دروازہ کے درمیان تکیہ گھدو شاہ میں واقع ہے، جس طرح کھائی والا اکھاڑہ کالو والوں کا سب سے بڑا اکھاڑہ ہے، اسی طرح یہ اکھاڑہ کوٹ والوں کا سب سے ممتاز اکھاڑہ ہے، اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور و معروف پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ رستمِ زماں گاماں پہلوان مرحوم - آپ لُڈن پہلوان کے خاندان کے فرد تھے، دس سال کی عمر میں آپ نے پہلی کشتی لڑی اور حریف کو پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد مرنے تک دنیا کے کسی پہلوان نے آپ کی پیٹھ نہیں لگائی، جسم لوہے کی طرح سخت تھا اور طاقت و شجاعت میں بے مثال تھے۔ عالم شباب (۱۹۱۱ء) میں ایک غیر ملکی آپ کو اور امام بخش کو اپنے ساتھ یورپ لے گیا، اٹلی اور فرانس میں کوئی پہلوان آپ کے مقابلہ میں نہ آیا پھر لندن پہنچے، ان دنوں لندن میں دنیا بھر کے شہ زور جمع تھے۔ مثلاً ترکی کا رستم محمود، امریکی پہلوان رولینڈ، اطالوی رستم جان لیمب، انگلستان کا رستم ہاک سمتھ، روسی دیو زبسکو۔ جب گاماں پہلوان نے چیلنج کیا تو ان پہلوانوں نے کہا کہ پہلے تم چھوٹے پٹھوں سے کشتی لڑو۔ گاماں پہلوان نے اعلان کر دیا کہ جو پہلوان مجھ سے ۵ منٹ تک کشتی لڑے گا اس کو پانچ پاؤنڈ انعام ملے گا، چنانچہ گلاسگو، لورپول، مانچسٹر وغیرہ میں چالیس کشتیاں ہوئیں لیکن کوئی مائی کا لال آپ کو پچھاڑ نہ سکا، بعد میں آپ نے امریکی رستم رولینڈ سے کشتی لڑی اور چند منٹوں میں اسے گرا لیا۔ باقی پہلوان کنی کاٹ گئے، البتہ روسی دیو زبسکو آپ سے نبرد آزما ہوا۔ تین گھنٹے کشتی ہوئی، ایک گھنٹہ تک دونوں شہ زور کھڑے زور آزمائی کرتے رہے، پھر گاماں نے زبسکو کو نیچے گرا کر دو گھنٹوں تک خوب رگیدا، جب زبسکو نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں اور ایک ہفتہ بعد لڑوں گا تو کشتی چھڑا دی گئی، لیکن وقت موعودہ پر زبسکو نہ آیا، اور آپ کو رستم زماں کی طلائی بیلٹ اور گرز دے دیا گیا۔ ان کشتیوں کو انگلستان میں لاکھوں انسانوں نے دیکھا، اور گاماں کی شجاعت اور طاقت کی دھاک بیٹھ گئی۔ کئی سال بعد پٹیالہ میں زبسکو پھر گاماں سے نبرد آزما ہوا، لیکن دو ہی منٹوں میں گاماں نے اسے پچھاڑ دیا۔ اس فتح کی خوشی میں مہاراجہ پٹیالہ نے بہت سے قیدی رہا کئے اور بےشمار لوگوں کو کھانا کھلایا۔ کیونکہ انگلستان سے واپسی کے بعد آپ مہاراجہ پٹیالہ کے درباری پہلوان بن گئے تھے اور قیام پاکستان تک اسی دربار سے منسلک رہے۔ ان کشتیوں کے علاوہ آپ نے ہندوستان کے مندرجہ ذیل پہلوانوں کو عظیم الشان دنگلوں میں نہایت خوش اسلوبی سے پچھاڑا۔

۱۔ دھکڑ سنگھ پہلوان کو ریاست ٹیکم گڑھ میں۔

۲۔ رحیم پہلوان سلطانی والا سے چار بار کشتی ہوئی۔ جوناگڑھ، اندور، لاہور کی کشتیاں برابر رہیں۔ البتہ الہ آباد میں آپ نے اسے چاروں شانے چت گرایا۔

۳۔ خلیفہ غلام محی الدین سے ریاست دتیہ اور لاہور میں دو دفعہ کشتی ہوئی۔ ایک دفعہ تو انہیں دتیہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے انعام ملے تھے۔

۴۔ علی سائیں پہلوان کو ریاست اندور میں۔

۵۔ کاموں پہلوان بالیوالہ کو ریاست اندور میں۔

۶۔ حسن بخش پہلوان ملتانی کو کلکتہ اور لکھنؤ میں۔

۷۔ فرانس کے مشہور پہلوان پیٹرسن کو پٹیالہ میں۔

ان کشتیوں میں کامیابی حاصل کرنے پر آپ کو متعدد تمغے اور گرز انعام میں ملے جو آج بھی آپ کے خاندان میں محفوظ ہیں، پاکستان بننے پر آپ لاہور میں مقیم ہو گئے یہاں انہیں ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا مگر وہ اپنی غیر معمولی صحت

کی وجہ سے اس حادثے سے تو بچ گئے۔ لیکن نا قدری زمانہ کے باعث تنگدستی کی حالت میں ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء کو فوت ہو گئے آپ کا مرقد قبرستان پیر مکی میں ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر اسی برس تھی۔

۲- امام بخش پہلوان رستم ہند - آپ رستم زماں گاماں پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ بھی چھوٹی سی عمر میں کشتی لڑنے لگے تھے، اور اپنے بھائی کے ساتھ یورپ کے دورے پر گئے تھے۔ لندن میں آپ نے اطالوی رستم جان لیمب کو تین منٹ میں چاروں شانے چت گرایا۔ آپ دیو ہیکل پہلوان ہیں، اور چہرہ اتنا رعب دار ہے کہ بڑے بڑے پہلوان کشتی لڑنے سے پہلے آپ کے چہرے کی ہیبت سے لرزاں ہو جایا کرتے تھے۔ آپ نے حسن بخش ملتانی، رحیم پہلوان سلطانی والا کو گرایا۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں کے تقریباً تمام پہلوانوں سے مقابلہ کیا۔ اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر کے فتح پائی اور زبردست انعام و اکرام حاصل کیا، گونگا پہلوان سے تین مرتبہ کشتی ہوئی، پہلی مرتبہ لاہور میں گر پڑے۔ لیکن دوسری اور تیسری مرتبہ لاہور اور پٹیالے میں بڑی چابکدستی سے گونگے کو پچھاڑ دیا۔ آپ بھی گاماں پہلوان کی طرح قیام پاکستان تک دربار پٹیالہ سے منسلک رہے۔ نہایت شریف طبع اور مرنجاں مرنج انسان ہیں، اور آپ میں ایک بہادر کی تمام خصوصیات موجود ہیں، بہادر ہمیشہ اپنے بہادر حریف کی تعریف کرتا ہے، گونگا پہلوان آپ کا حریف تھا، تین مرتبہ آپ سے کشتی لڑ چکا تھا، اور ایک مرتبہ آپ کو گرا بھی چکا تھا، لیکن جب بھی کسی نے آپ سے گونگے کے متعلق پوچھا آپ نے ہمیشہ اس کی شہ زوری کی تعریف ہی کی۔ ایک مرتبہ ہم گونگے اور بلھڑی کی کشتی دیکھ رہے تھے، آپ اور حمیدہ پہلوان مرحوم بالکل ہمارے پیچھے کھڑے تھے، جب کشتی شروع ہوئی۔ تو امام بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا "جیو میرے پہلوان جیو۔ ارے حمیدہ دیکھ گونگا پہلوان کیا کر رہا ہے!" اس سے آپ کے قلب وسیع کا اندازہ ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھولو، اچھا، اکی، گوگا اور اعظم جیسے دیو پیکر فرزندان عطا کئے ہیں، جو اپنی شہ زوری اور مسلسل کامرانیوں کے باعث اس خاندان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

۳- بیجا پہلوان کھیپے والا مرحوم - گاماں پہلوان کے شاگرد رشید تھے، اور شیر کا سا دل رکھتے تھے، یوں بھی بڑے حسین پہلوان تھے، بڑے دل گردے سے کشتی لڑتے تھے، دنوں میں آسمان شہرت پر جا پہنچے۔ اور آپ نے غوثہ پہلوان، لو پہلوان، کریم پہلوان اور کئی دوسرے اچھے اچھے پٹھوں کو پچھاڑ دیا۔ آپ نے کئی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور مہاراجگان سے انعام و اکرام پایا۔ افسوس کہ آپ عین عالم شباب ہی میں اپنے قدردانوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

۴- پھجی لونڈی۔ ۵- بالا جھبور۔ ۶- غلام محی الدین۔ ۷- جانی پہلوان۔ ۸- خدا بخش ہاتھی والا۔ ۹- عاشق پہلوان - اس اکھاڑے کے نہایت شہ زور پٹھے ہیں۔ گاماں پہلوان کے شاگرد ہیں، اور بڑے بڑے دنگلوں میں اچھے اچھے نامی پہلوانوں سے کشتی لڑ کر اس اکھاڑے کا نام روشن کر چکے ہیں۔

نورے والے

۱- اکھاڑہ بندر شاہ | یہ اکھاڑہ بندر شاہ کے تکیے میں واقع تھا۔ جو موچی دروازہ کے باہر احاطہ نواب صاحب کے قریب تھا، آج وہاں مکان بن گیا ہے، صرف قبر باقی رہ گئی ہے۔ اس اکھاڑے میں بھی اچھے

اچھے پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ جن میں سے چراغ عالی والا بہت مشہور گزرے ہیں۔

چراغ پہلوان عالی والا۔ بہت نامور پہلوان تھے، مہاراجہ جودھ پور کے پاس ملازم تھے۔ آپ نے کئی کشتیاں لڑیں، جن کی وجہ سے آپ نے نام پیدا کیا، امرتسر کے مشہور پہلوان غلام کی کشتی آپکے ساتھ ریاست جودھ پور میں ہوئی، اُس زمانہ میں چراغ پہلوان عالی والا عمر کے آخری پیٹے میں تھے، اور غلام پہلوان بھرپور جوان تھے، اس کے باوجود چراغ پہلوان نہایت جابکدستی سے لڑا، اور کشتی برابر رہی۔ ان کے شاگردوں میں خلیفہ معراج اور خلیفہ حسن علی عرف بچھو پہلوان بہت مشہور رہیں۔

۴۔ اکھاڑہ خلیفہ حسینا یہ اکھاڑہ دل محمد روڈ پر واقع تھا۔ اب وہاں چشتی فونڈری بن گئی ہے۔ اس نے بھی کئی نامی گرامی شہ زور پہلوان پیدا کئے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ **خلیفہ معراج پہلوان مرحوم۔** آپ پاکستان کے مشہور و معروف پہلوان خلیفہ غلام محی الدین کے بڑے بھائی تھے۔ بدن کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق آج تک مشہور ہے کہ ساتویں دن جانگیہ تبدیل کروایا کرتے تھے۔ آپ چراغ پہلوان کے شاگرد تھے، اور ریاست جوناگڑھ کے درباری پہلوان تھے۔ آپ نے کئی پہلوانوں کو پچھاڑا۔ اکبری دروازے کے باہر جہاں اب پولیس چوکی ہے، یہاں سرائے تھی، اسی سرائے میں آپ نے ایک دنگل میں اُس عہد کے مشہور پہلوان گاموں بالی والے کے ساتھ کشتی لڑی جس کو آپ نے دو منٹوں کے اندر چاروں شانے چت گرا دیا۔

۲۔ **خلیفہ غلام محی الدین۔** آپ نوریے والے اکھاڑے کے بانی خلیفہ نور مرحوم کے قرابت دار ہیں اور اس اکھاڑے کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں۔ آجکل جب کہ کشتی کا قدیم فن دم توڑ رہا ہے آپ کا دم غنیمت ہے۔ آپ اس فن کے ماہر ترین اُستاد مانے جاتے ہیں، اور تینوں اکھاڑوں کے پہلوان آپ کی خداداد قابلیت کے معترف ہیں۔ اچھے اچھے پہلوان آپ کے شاگرد ہیں، مشہور مرہٹہ پہلوان بلہڑ کولہاپوری بھی آپ ہی کا شاگرد ہے۔ آپ کے پاس تقریباً تمام بڑے بڑے پہلوانوں کی تصاویر اور اُن کی کشتیوں کی یادداشتیں محفوظ ہیں۔ آپ کے پاس رمزی پہلوان کی صدری اور اسی قسم کے دیگر نوادرات بھی موجود ہیں۔

آپ اپنے زمانہ کے شہ زور پہلوان تسلیم کئے جاتے ہیں، آپ مہاراجہ ونیر، نواب جوناگڑھ اور مہاراجہ کولہاپور کے درباروں سے منسلک رہے ہیں، دربار کولہاپور سے آج بھی آپ کو پنشن ملتی ہے۔ آپ نے مہاراجہ کولہاپور کی ملازمت باون برس کی ہے۔ اس عرصہ میں آپ نے کئی کشتیاں لڑیں اور نامی پہلوانوں کو پچھاڑا، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

(۱) گھمان ملتانی - ۲۔ امامی والا - ۳۔ بدھو ڈالی والا - ۴۔ خلیل ٹم ٹم والا - ۵۔ دھکڑ سنگھ۔

ان کے علاوہ آپ نے رستم زمان گاماں، رستم ہند امام بخش اور رحیم سلطانی والا سے بھی کشتی لڑی جو برابر رہی۔

آپ نے یورپ کی سیاحت بھی کی، لندن کی نمائش میں تین کشتیوں میں فتح پائی، فرانس میں بورڈو میں ایک مشہور فرانسیسی پہلوان کو چاروں شانے چت گرایا۔

اس اکھاڑے کے مندرجہ ذیل پہلوان بھی کافی مشہور ہیں۔

۱۔ رمضان بٹ	۲۔ وہاب پہلوان
۳۔ ملو پہلوان	۴۔ نبو پہلوان
۵۔ جیجا گڈیاں والا	۶۔ سروار گڈیاں والا
۷۔ گاماں چاولوں والا	۸۔ بکو تلعی گر (۱۹۶۶ء میں فالج کا شکار ہو کر فوت ہوا)

۳۔ اکھاڑہ تکیہ ننھے شاہ اسے گوندی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔ بالکل نیا اکھاڑہ ہے۔ اسے فرید پینٹر پہلوان نے قائم کیا ہے۔ اس میں بڑے بڑے اچھے پہلوان ورزش کرتے ہیں اور کئی معرکے کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو پچھاڑ چکے ہیں۔ ان پہلوانوں میں شیر پنجاب کالا پہلوان، عاشق راج، شیدا نواں بازار والا بہت مشہور ہیں۔ کالا پہلوان نے اچھا گوجرانوالیہ، اکی پہلوان پسر امام بخش اور غلام محی الدین پہلوان کو چاروں شانے چت گرایا۔

۴۔ اکھاڑہ تکیہ کھوتیاں والا یہ بھی بہت پرانا اکھاڑہ ہے۔ اور ریگل روڈ پر واقع ہے۔ اس میں بھی اچھے شہ زور پہلوان ورزش کرتے تھے، جن میں سے گلو پہلوان، صدیق پہلوان اور ملو ہانجی پہلوان بہت زیادہ مشہور ہیں، انھوں نے کئی دنگلوں میں کشتی لڑ کر دادِ تحسین حاصل کی ہے۔

۵۔ اکھاڑہ چوک برف خانہ یہ اکھاڑہ ریلوے روڈ لاہور پر واقع ہے، اس میں بھی نامی پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:۔

۱۔ **بدو پہلوان برہمن۔** آپ ہندوؤں کے بہت بڑے پہلوان تھے، برہمن تھے، لیکن بڑے جیالے، گرانڈیل بدن، اور جسم پتھر کی طرح سخت تھا، آپ نے پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں کے بڑے بڑے پہلوانوں سے کشتی کا مقابلہ کیا اور فتح پائی، گاموں پہلوان، جو پنجاب کے شہ زور پہلوان اور گونگا پہلوان کے والد تھے، کو بھی آپ نے پچھاڑ دیا تھا۔

۲۔ **جھاجا بلاقی والا۔** اپنے زمانہ کے بہترین پہلوانوں میں شمار ہوتے تھے اور شجاعت، لڑنت اور داؤ پیچ میں یکتا مانے جاتے تھے۔ آپ نے بھی اچھے اچھے حریفوں کو پچھاڑا تھا۔ کچھ عرصہ بعد آپ اکھاڑہ بنو پہلوان بیرون شاہ عالمی دروازہ میں ورزش کرنے لگے تھے۔

۶۔ اکھاڑہ گھیا سائیں رام گلی یہ اکھاڑہ نورسے والوں کا مشہور اکھاڑہ ہے، اس میں بھی نامی پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں، پرانے پہلوانوں میں سلطان شو خا مشہور ہیں، آج کل اس اکھاڑے نے دو شہ زور پٹھے پیدا کئے ہیں، ایک کا نام اسلم مہنی والا اور دوسرے کا افضل مہنی والا ہے، دونوں کشتی کے فن میں تاک ہیں، اور خوب لڑتے ہیں، دونوں نے کئی دنگلوں میں اپنا کمال دکھا کر نام پیدا کیا ہے۔ یقین ہے کہ ابھی اور چمکیں گے۔

۷۔ اکھاڑہ چنن کبابی مصری شاہ مصری شاہ میں سفید مسجد کے پاس واقع ہے، چنن پہلوان کبابی اس اکھاڑہ کے مشہور و معروف پہلوان گزرے ہیں، جیجا گھیئے والا مرحوم بھی کچھ عرصہ یہیں

ورزش کرتے رہے تھے

۸ - اکھاڑہ بوٹا مل نورے والوں کا سب سے ممتاز ترین اکھاڑہ ہے، یہ اکبری دروازہ کے باہر واقع ہے۔ یہی وہ اکھاڑہ ہے جس کے شہ زور پہلوانوں نے کالو اور کوٹ والوں کے نامی گرامی پہلوانوں کے ساتھ مقابلے کئے ہیں، اور نورے والوں کا نام روشن رکھا ہے، پنجاب کے اکثر مشہور پہلوان اس اکھاڑے میں ورزش کرتے رہے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:-

۱۔ **کریم بخش پہلوان پیلڑے والا مرحوم۔** آپ پیلڑے پہلوان کے فرزند ارجمند تھے، ڈیل ڈول، شکل صورت اور جسم نہایت خوبصورت اور مناسب تھا، آپ تعلیم یافتہ پہلوان تھے، پہلوانی کے فن میں ماہر اور اس کی فنی باریکیوں سے کماحقہ واقف تھے، نورے والوں کے اکثر پٹھے آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ آپ نے پنجاب کے نامی گرامی پہلوانوں سے کشتیاں لڑیں۔ آپ نے جیون پہلوان قصاب، گاموں پہلوان بالیوالہ اور غلام پہلوان امرتسری کو پچھاڑا۔ ہندوستانی ریاستوں کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو گرا گرا کر گرانقدر انعامات حاصل کئے، اور پھر خود اپنی مرضی سے کشتی لڑنا ترک کر دیا۔ پیشہ ور پہلوانوں کے علاوہ خان بہادر میاں محمد نقی مرحوم بھی آپ کے شاگردوں میں تھے مرحوم پہلوانی کے بڑے دلدادہ تھے اینگلو انڈین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بی۔ ڈی آپ کے فن کا بڑا مداح تھا۔

۲۔ **بستا پہلوان۔** آپ بھی اس اکھاڑے کے نامی پہلوان ہیں۔ تن و توش اور شجاعت میں جواب نہیں رکھتے۔ عالم شباب میں نہایت قوی ہیکل پہلوان تھے، آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے کئی پہلوانوں سے کشتی لڑی ہے۔ اور اپنے اکھاڑے کا نام بلند کیا ہے۔

۳۔ **غلام محمد قلعی گر**
۴۔ **بڈھا ساون والا**
} یہ پہلوان بھی بڑے اچھے پٹھوں میں سے تھے، اور انھوں نے بھی کئی کشتیاں لڑیں۔ اور اُن میں اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ کرکے عوام سے داد لی۔ بڈھا ساون والا نے جیون پہلوان قصاب کو پچھاڑا تھا۔

۵۔ **الٰہ بخش سائیں والا۔** بڑے نامی پہلوان تھے پہلے گاماں پہلوان کے شاگرد تھے، پھر کریم بخش پیلڑے والے کے شاگرد ہوئے، آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے اچھے اچھے پٹھوں کو چاروں شانے چت گرایا ہے، ابھی جوان ہی تھے کہ اس فن سے کنارہ کش ہو گئے۔ اب سنا ہے کہ آپ فقیر بن گئے ہیں۔

۶۔ **بھماں پہلوان چوڑیگر۔** اس اکھاڑے کو اس بے مثال پہلوان پر جتنا بھی ناز ہو بجا ہے۔ آپ نہایت مضبوط اور خوبصورت جسم رکھتے ہیں، پنجاب اور ریاستوں کے کئی نامی گرامی پٹھوں سے کشتی لڑ کر انھیں گرا چکے ہیں۔ لوگ آپ کے از حد قدردان ہیں۔ پروفیسر رام مورتی جو خود بھی اچھے پہلوان تھے، بھماں پہلوان کے بڑے قدردان تھے، آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ لاہور سے باہر ریاستوں میں بسر کیا اور نام پیدا کیا ہے، اہل لاہور آج بھی کشتی کے اُن مقابلوں کو یاد کرتے ہیں جو بھماں پہلوان اور جمال جنگر پہلوان کے درمیان ہوئے۔ اکھاڑہ نتھے شاہ کے خلیفہ جیون کے انتقال کے بعد ۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو بھماں پہلوان کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا اور دستار بندی کی رسم ادا کی گئی۔

۸ - لالہ راج پری پیکر - آپ بھی اس اکھاڑے کے ممتاز پہلوان ہیں، جسم کی رعنائی کی وجہ سے پری پیکر کہلاتے ہیں، داؤ پیچ میں مہارت حاصل تھی، اور ملتانی داؤ خوب چلاتے تھے اور حریف کو چشم زدن میں پچھاڑ دیتے تھے، اب آپ نے عین عالم شباب میں کشتی لڑنا ترک کر دی ہے۔

۹ - اکھاڑہ لالو سائیں | یہ اکھاڑہ مستی دروازہ اور کشمیری دروازہ کے درمیان تکیہ لالو سائیں میں واقع ہے، غونثہ پہلوان اسی اکھاڑے میں ورزش کرتے رہے ہیں۔ آپ نے پنجاب اور ریاستوں میں اچھے اچھے دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۰ - اکھاڑہ خلیفہ بخشی | شاہ عالمی دروازہ کے باہر، لاریوں کے اڈے کے قریب واقع تھا نتو پہلوان اس اکھاڑے کے مشہور پہلوان ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا اکھاڑوں کے علاوہ بالمیکیوں کے بھی چند اکھاڑے ہیں۔ جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں، یہ اپنے آپ کو کالووالوں میں شمار کرتے ہیں۔

۱ - اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون ٹکسالی دروازہ | خلیفہ دتا، خلیفہ ہازی، چراغ مکھن والا اس اکھاڑے کے مشہور خلیفہ تھے، موجودہ خلیفہ کا نام چودھری گاماں ہے، مندرجہ ذیل پہلوان قابل ذکر ہیں:۔

۱۔ چراغ مکھن والا۔ ۲۔ لال پہلوان۔ ۳۔ کالو پہلوان۔ ۴۔ بکھا پہلوان۔ ۵۔ جیانا پہلوان۔ ۶۔ جاغو پہلوان لمبر والا۔ ان بالمیکی شہ زوروں نے کئی دنگلوں میں اچھے اچھے پہلوانوں سے کشتی لڑی ہے، مثلاً چراغ مکھن والا نے بھی نوندلی سے، لال پہلوان نے کھیڑی پہلوان سے، کالو پہلوان نے ملکی پہلوان سے، بکھا پہلوان نے خلیفہ شہاب سے، جیانا پہلوان نے نانک پہلوان امرتسری سے، جاغو پہلوان نے آنو پہلوان سے۔

۲ - اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون بھاٹی دروازہ | اس اکھاڑہ کے پہلے خلیفہ بودن تھے، اب خلیفہ نتھّہ ہیں، مندرجہ ذیل پہلوان مشہور ہیں، اور کشتی لڑنے میں نام پیدا کر چکے ہیں:۔

۱۔ ببھا پہلوان۔ ۲۔ دتا پہلوان۔ ۳۔ دین پہلوان۔ ۴۔ پیر اندنہ پہلوان۔ ببھا پہلوان سوئی دھاگہ پہلوان سے کشتی لڑ چکا ہے اور دتا پہلوان نانک امرتسری سے، دین پہلوان مولا پہلوان سے اور پیر اندنہ پہلوان چراغ پنیر سے۔

تکیے

مسعود نظامی

مدت ہوئی ایک غیر ملکی سیاح لاہور میں وارد ہوا۔ اور جب اس نے اس میں سرسبز و شاداب باغات دیکھے تو کہنے لگا "LAHORE IS THE CITY OF GARDENS." (لاہور باغات کا شہر ہے)۔ لیکن اس نے لاہور کے تکیے نہ دیکھے۔ اگر وہ تکیوں کی تعداد کو دیکھ لیتا تو بے اختیار پکار اٹھتا: "LAHORE IS THE CITY OF TAKIAS." (لاہور تکیوں کا شہر ہے)

قدیم لاہور، ایک مضبوط فصیل کے اندر گھرا تھا۔ اس کے تیرہ ۱۳ دروازے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ ٹکسالی دروازہ، بھاٹی دروازہ۔ موری دروازہ، لوہاری دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، موچی دروازہ، اکبری دروازہ، دہلی دروازہ، یکی دروازہ، شیرانوالہ دروازہ، کشمیری دروازہ، مستی دروازہ اور روشنائی دروازہ۔

ان میں سے شاید ہی کوئی دروازہ ایسا ہوگا جس کے باہر ایک یا ایک سے زیادہ تکیے موجود نہ ہوں۔

تکیہ، فارسی زبان کا لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں، وہ چیز جس پر سہارا لگایا جائے، جس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھا جائے۔ آرام کرنے کی جگہ، فقیر کے رہنے کی جگہ، دیہات میں تکیہ کو دارا، دائرہ اور چوپال کہتے ہیں۔ ان معانی سے تکیہ کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

پرانے زمانے میں ان تکیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ دستور تھا کہ شام کے بعد شہر پناہ کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے تھے اس لیے جو مسافر رات کے وقت آتے وہ شہر میں داخل نہ ہو سکتے، بلکہ، انہی تکیوں میں رات بسر کرتے، جہاں تکیہ کا فقیر ان کی ہر طرح خدمت کیا کرتا۔ جب دن چڑھتا اور شہر کے دروازے کھلتے تو یہ مسافر شہر میں داخل ہو جاتے۔ علاوہ ازیں ایک لاوارث جس کا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ ہوتا انہی تکیوں میں رہتا تھا۔ اس لیے پرانے وقتوں میں یہ تکیے REST HOUSES کا کام دیتے تھے۔

دن کے اوقات میں مختلف علاقوں کے بوڑھے اور نوجوان اپنی فرصت کے لمحات انہیں تکیوں میں گزارتے۔ ہر تکیہ میں کنواں اور اس کے ساتھ غسل خانے موجود رہتے۔ یہیں لوگ غسل کرتے اور چٹائیوں پر بیٹھ کر چوسر، شطرنج اور تاش کھیل کر دل بہلاتے۔ اور یوں یہ تکیے کلبوں کا کام دیتے تھے۔

شادی اور غمی کی تقریبات یہیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ برادریوں کے تنازعات کے فیصلوں کے لیے پنچائتیں یہیں لگا کرتی تھیں۔ تقریباً ہر تکیہ میں ورزش کرنے کے لیے ایک اکھاڑہ تھا، جہاں لوگ ورزش کرتے اور کشتی کا فن سیکھتے۔ جدید اصطلاح میں یہ تکیے HEALTH CLUBS ہیلتھ کلبیں تھے۔

رفتہ رفتہ زمانہ نے رنگ بدلا، اور اس کے ساتھ ان تکیوں کا نقشہ بھی بدل گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان پر بھنگ پینے والوں، چرس کا دم لگانے والوں اور چنڈو بازوں کا قبضہ ہو گیا، معززین نے تکیوں میں جا کر بیٹھنا ترک کر دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ جو شخص تکیہ میں جائے اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

آئیے آپ کو لاہور کے مشہور تکیوں کی سیر کرائیں۔

تکیہ صابر شاہؒ

یہ تکیہ روشنائی دروازہ کے باہر شاہی مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ اور لاہور کے خوبصورت تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں دو بزرگوں کے مزار بھی ہیں۔ ایک کا اسم گرامی حضرت صابر شاہؒ ہے جو احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ لاہور میں وارد ہوئے اور دوسرے سائیں گھنگھرو کے نام سے موسوم ہیں۔ تکیہ میں بڑھ اور گوندنی کے درختوں کی بھرمار ہے اور لوگ ان کی چھاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں ایک ہیلتھ کلب بھی ہے جس میں نوجوانوں کو باکسنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔ جمعرات کو یہاں اچھی رونق ہوتی ہے۔ کبھی یہاں مشہور حلوائیں چوری دینے آیا کرتی تھیں۔ لیکن اب یہ دستور نہیں رہا۔ تکیہ میں ایک مسجد بھی ہے جو مولوی محرم علی چشتی نے تعمیر کرائی تھی۔ حضرت صابر شاہ کے مزار کے موجودہ متولی مشہور فلم اسٹار و ہدایت کار سید آصف جاہ صاحب ہیں۔ اور گھنگھرو سائیں کے مزار کے متولی سائیں بنا صاحب ہیں جو ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔

تکیہ بھورے سائیں

ٹکسالی دروازہ سے جو سڑک باغ منشی لدھا کی آبادی کو جاتی ہے۔ اس کے شروع ہی میں بائیں ہاتھ یہ تکیہ واقع تھا۔ لیکن اب وہاں چند دکانوں، قبروں اور کھجور کے درخت کے سوا کچھ موجود نہیں۔ کبھی یہ ایک پُرفضا تکیہ تھا۔ بازار حکیماں، ٹھٹھی ملاحاں اور رتی بازار کے باشندے عموماً اپنے فرصت کے اوقات یہیں گزارتے تھے۔ پاس ہی ایک کنواں تھا جو لاہور میں "ٹھنڈا کھوہ" کے نام سے مشہور تھا۔ موسم گرما میں یہ کنواں ایک نعمت تھا۔ لوگ دُور دُور سے آکر یہاں نہاتے اور بھورے سائیں کے تکیہ کے درختوں کی چھاؤں تلے آرام کرتے تھے۔ پنجابی کے مشہور شاعر لالہ مکھی رام نے اسی کنوئیں پر ایک نظم بنام "ٹھنڈے کھوہ دی چڑیل" لکھی تھی۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی تھا جس میں کریم بخش پوپی والا اور محمد یوسف پہاں والا جیسے مشہور پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔

تکیہ شیر علی

ٹکسالی دروازہ کے باہر میاں مبارک دین اینڈ سنز کی دوکان کے ساتھ واقع ہے۔ اس تکیہ کے باہر ٹمبر مرچنٹس کی دوکانیں ہیں۔ اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ تکیہ ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ یہ ایک پُررونق تکیہ تھا۔ اور یہاں بھی لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں اور عرس ہوتا تھا۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی تھا۔ جس کے مشہور پہلوان لال بچہ اور رحما سائیں تھے۔ یہاں شیر علی صاحب کا مزار بھی ہے کثراہ ولی شاہ جو ہٹہ مفتی باقر کے سادات کا قبرستان بھی یہیں ہے۔

تکیہ بالمیکیاں

یہ تکیہ ٹکسالی دروازہ کے باہر موہنی روڈ کے شروع ہی میں بدرو کے کنارے بائیں ہاتھ واقع ہے۔ یہ بھی لاہور کے پرانے تکیوں میں سے ہے اور بالمیکی برادری کے افراد یہیں اپنے فرصت کے اوقات کاٹتے ہیں۔ ایک اکھاڑہ بھی موجود ہے اور مہارشی بالمیک جی کا مندر بھی ہے۔ جہاں بالمیکی پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔

تکیہ پیر مکی

ٹکسالی دروازہ اور بھاٹی دروازہ کے درمیان راوی روڈ پر پاکستان کے مایہ ناز مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے دولت کدہ کے بالکل پیچھے ایک بہت بڑا تکیہ ہے۔ گو یہاں پیر مکیؒ کا مزار موجود نہیں۔ لیکن یہ مشہور اسی نام سے ہے۔ تکیہ میں کنواں، اکھاڑہ اور مسجد بھی ہے۔ جس کی مرمت اب ہو رہی ہے۔ مشہور و معروف پہلوان اس تکیہ کے اکھاڑہ میں ورزش کرتے رہے ہیں۔ اب بھی نور محلہ، چومالہ، بازار حکیماں وغیرہ کے مکین یہیں آکر اپنے اوقات گزارتے ہیں۔

تکیہ ذیلداراں

بھاٹی دروازہ کے باہر اسلامیہ ہائی سکول کے دائیں طرف ذیلدار روڈ کے شروع میں واقع تھا۔ بڑا خوبصورت تکیہ تھا۔ بھاٹی دروازہ کی ارائیں برادری کے افراد یہیں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ لاہور کے ذیلدار میاں خدا بخش کی محفل یہیں

لگا کرتی تھی۔ اب تکیہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اس جگہ اب عالیشان مکانات بن چکے ہیں۔

تکیہ حیدر شاہ

موہنی روڈ پر الراعی بلڈنگس کے پاس واقع ہے اور لاہور کے قدیم تکیوں میں سے ہے۔ کبھی یہ بہت پُرفضا مقام تھا۔ لیکن اب تکیہ کے اردگرد مکانات تعمیر ہو چکے ہیں اور تکیہ ان کے درمیان گھِر کر رہ گیا۔ مزار، مسجد اور کنواں باقی رہ گیا ہے۔ جمعرات کو زائرین اور قوالی کی وجہ سے کچھ رونق ہو جاتی ہے۔ کبھی یہاں بٹیربازی، تیتربازی اور مرغ بازی کی پالیاں لگا کرتی تھیں۔

تکیہ گوندی پیر

داتا گنج بخشؒ کے عقب میں قطب روڈ پر کباڑیوں کی دوکانوں کے درمیان واقع ہے۔ گوندی پیر کی قبر پر گوندنی کے بے شمار درخت اُگے ہیں۔ اب اس تکیہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اردگرد گھوڑوں کے اصطبلوں کی وجہ سے لید کی بدبو سے دماغ پھٹ جاتا ہے اور ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا۔

تکیہ کھڑکی پیر

لاہور کے خوبصورت تکیوں میں سے ہے۔ داتا گنج بخشؒ کے عقب میں قطب روڈ کے شروع میں کھیتوں کے درمیان واقع ہے۔ بیری اور نیم کے درخت اتنے گھنے ہیں کہ کھڑکی پیر کا مزار نظر نہیں آتا۔ جمعرات کو قوالی اور زائرین کی وجہ سے اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ چشیش اور چرس کے متوالوں کا خاص مقام ہے۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ اور لاہور کے خوش باش افراد اچھی خاصی تعداد میں یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

تکیہ قطب شاہ

لاہور کے قدیم ترین تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ دربار کے عقب میں قطب روڈ پر واقع ہے۔ جو اسی بزرگ کے نام پر قطب روڈ کہلاتی ہے۔ مزار، کنواں اور چھوٹی سی مسجد بھی موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ تکیہ لاہور کے وسیع ترین تکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن اب یہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بن گئے ہیں۔ صابون سازی کے کارخانے ہیں۔ چوڑی گروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ جن میں چوڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔ جمعرات کو قوالی ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک محرم الحرام میں جو تعزیے نکالے جاتے ہیں وہ دسویں محرم کی شام یہیں ٹھنڈے کیے جاتے ہیں۔

تکیہ سردار شاہ

یہ تکیہ بھی داتا گنج بخشؒ کے عقب میں ویلدار روڈ کے قریب واقع ہے۔ کبھی بڑا وسیع تکیہ ہوتا تھا۔ مگر اب سڑک نکل جانے کی وجہ سے گھٹ کر رہ گیا ہے۔ شاہ صاحب کا مزار موجود ہے۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ اور صحن سے ملحق ایک کوٹھی نما مکان ہے۔ جمعرات کو قوالوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور حال کھیلنے والے بھی آ دھمکتے ہیں۔ بعض کو بڑ کے درخت سے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے اور وہ اسی حالت میں حال کھیلتے ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے۔ اور دل پھینک نوجوانوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔

تکیہ پیر از غائب

داتا گنج بخشؒ کے مزار کے سرہانے یہ تکیہ بھی پرانے تکیوں میں سے ہے۔ کبھی یہاں بڑ کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں بڑی پُرلطف ہوتی تھی۔ اور جمعرات کو یہاں قوالی کے باعث بڑی رونق ہوتی تھی۔ ایک اکھاڑہ بھی تھا جس میں اچھے اچھے پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجاور صاحبان کا لالچ رنگ لایا۔ اور انھوں نے لوگوں سے روپیہ وصول کر کے یہاں قبریں بنانی شروع کر دیں۔ اب اس تکیہ کے باہر کباڑیوں کی دوکانیں ہیں اور صحن میں قبریں۔ مشکل سے لوگوں کے گزرنے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ داتا گنج بخشؒ کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ سکیں۔

تکیہ بالمیکیاں

بالمیکی بھنگیوں کا دوسرا تکیہ ہے۔ جو بھاٹی دروازہ کے باہر ہیرا ماونٹ ٹاکیز کے بالکل ساتھ واقع ہے۔ کبھی یہ تکیہ بڑا

وسیع ہوتا تھا اور برگد کے درخت عجیب بہار دیتے تھے، مگر اب یہ تکیہ کھوکھوں سے بنے ہوئے ہوٹلوں اور دوکانوں میں گھر کر رہ گیا ہے۔ رشی بالمیک جی کا مندر یہاں بھی موجود ہے۔ جہاں بالمیکی پوجا کرتے اور مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

تکیہ گھُدّو شاہ

بھاٹی دروازہ اور موری دروازہ کے عین درمیان سرکلر روڈ کے کنارے لاہور کے پرانے تکیوں میں سے ہے کبھی بڑا پُرفضا اور پُررونق تھا اور نیم کے درختوں کی چھاؤں عجیب بہار دکھاتی تھی۔ بھاٹی دروازہ اور موری دروازہ کے احباب یہیں محفل جماتے تھے۔ شاہ صاحب کا مزار بھی موجود ہے۔ جن کا اصلی نام غالباً عبدالقدوس شاہ تھا۔ بگڑ کر قدوس شاہ اور پھر گھدو شاہ رہ گیا۔ بھاٹی کا مشہور اکھاڑہ یہیں ہے۔ اور یہ وہ مایہ ناز اکھاڑہ ہے جس نے رستم زماں گاماں اور رستم ہند امام بخش جیسے پہلوان پیدا کیے۔ درختوں میں سے اب صرف بڑ کا ایک درخت باقی رہ گیا ہے۔ تکیہ کے ایک طرف ایک بڑی خوبصورت مسجد تعمیر کر دی گئی ہے۔ جہاں جمعہ بھی ہوتا ہے۔ سرکلر روڈ والی طرف ایک سنیاسی نے اپنی ادویات کے پٹارے پھیلا رکھے ہیں اور جاہل مریض آ آ کر اس سے علاج کرواتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس تکیہ میں پنجابی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب مشاعروں کے بجائے تکیہ سے ملحقہ کارپوریشن باغ میں بوڑھے اور نوجوان دوپہر کے وقت اکٹھے ہوتے ہیں اور ہیر وارث شاہ، سسی پنوں فضل شاہ اور ناول سُن سُن کر محظوظ ہوتے ہیں۔

تکیہ مسکین سائیں

یہ نیا تکیہ ہے۔ اور موری دروازہ اور لوہاری دروازہ کے درمیان کارپوریشن باغ میں واقع ہے۔ دوپہر کو یہاں ہیر پڑھنے والوں اور چوسر کھیلنے والوں کے باعث اچھی رونق ہو جاتی ہے۔ مسکین سائیں کے مزار کے پاس لاہور کے مشہور خلیفہ بخشی کا اکھاڑہ ہے۔ مشہور پہلوان خالو اسی اکھاڑے سے تعلق رکھتا ہے۔

تکیہ املی والا

لاہور کے قدیم ترین تکیوں میں سے ہے۔ کبھی بڑا وسیع اور پُرفضا تھا۔ مگر اب جھونپڑیوں میں گھر کر اس کی وہ شان نہیں رہی۔ یہ موری دروازہ کے باہر چابک سواراں محلہ میں واقع ہے۔ کبھی یہاں سادات گیلانی کی قبریں تھیں جن پر سنگ مرمر لگا تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اتروا لیا۔ پیر نظام الدین بودیالوالہ کے وقت تک یہاں قوالی کی محفلیں جمتی تھیں۔ شاید اب بھی جمعرات کو رونق ہو جاتی ہو۔

تکیہ تاجے شاہ

چیمبرلین روڈ پر میوہ منڈی کے پاس واقع ہے۔ قدیم ترین تکیوں میں سے ہے۔ کبھی بڑا بارونق تکیہ تھا۔ بٹیر بازی کی بڑی بڑی پالیاں یہیں لگتی تھیں۔ مگر ایک مرتبہ تھانہ گوالمنڈی کے تھانیدار مسٹر حسنہ نے چھاپہ مار کر بہت سے بٹیر بازوں کو پکڑ لیا جن میں لاہور کے معززین بھی شامل تھے اس واقعہ کے بعد پھر بٹیروں کی پالی یہاں غالباً نہیں لگی۔ اب ایک نہایت خوبصورت مسجد یہاں بنا دی گئی ہے۔ ایک اکھاڑہ بھی ہے۔ جس نے اچھے اچھے نامی گرامی پہلوان پیدا کیے ہیں۔

تکیہ مراثیاں

بہت پرانا تکیہ ہے۔ اور یہ بھی تکیہ تاجے شاہ کے قریب موچی دروازہ کے باہر چیمبرلین روڈ پر واقع ہے۔ یہ تکیہ دراصل لاہور اور قصور کے مطربان کا ہے۔ کافی وسیع ہے۔ اس میں ایک مسجد، کنواں، غسلخانے اور اکھاڑہ بھی ہے۔ مطرب حضرات جن میں لاہور اور قصور کے علاوہ اب مہاجرین بھی شامل ہیں۔ فرصت کے اوقات یہیں بسر کرتے ہیں اور جن لوگوں کو یہاں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب یہ حضرات آپس میں فن موسیقی اور اس کے ادائے پر بحث کرتے ہیں اور پرانے گویوں کے حالات سناتے ہیں تو لطف آ جاتا ہے اور جب جگت بازی اور مزاح پر اترتے ہیں تو ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی مشہور موسیقار ہوگا جس نے اس تکیہ میں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ یہی وہ تکیہ ہے جس کی بدولت اہالیان لاہور رفیق علی خاں، جرنیل صاحب، احمد جان خان، کالے خان، علی بخش خاں،

غلام علی خاں، چھوٹے غلام علی خاں، امید علی خاں، امراؤ خاں، قادر بخش، پیارے خاں وغیرہم جیسے موسیقاروں کے فن سے لطف اندوز ہوتے، اور بعض محفلیں تو یہاں ایسی منعقد ہوئیں کہ رہتی دنیا تک یاد رہیں گی۔ محرم الحرام کی ساتویں تاریخ کو حضرت امام قاسم کی مہندی یہیں سے نکالی جاتی ہے۔ پٹیالہ کے عاشق علی خاں نے آخری عمر میں اپنے فن کا مظاہرہ یہیں کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

تکیہ کھوتیاں والا

یہ تکیہ بل روڈ پر واقع ہے اور پرانے تکیوں میں سے ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے جس نے لاہور کے مشہور پہلوان پیدا کئے ہیں۔

تکیہ لالو سائیں

یہ تکیہ کشمیری دروازہ کے باہر سرکلر روڈ پر واقع ہے۔ اور پرانا تکیہ ہے۔ کافی وسیع اور خوبصورت تکیہ ہے۔ اس میں حضرت کمال شاہ صاحبؒ قادری نوشاہی بھیاری کا مزار ہے۔ مزار کے پاس ہی لالو سائیں کی چھوٹی سی قبر ہے، اسی لالو سائیں کے نام پر یہ تکیہ لالو سائیں کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے۔ جس میں غونشہ جیسے مشہور پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں، اب یہ تکیہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔

تکیہ کبوتر شاہ

کشمیری دروازہ میں داخل ہو کر گھاٹی چڑھیں تو بائیں ہاتھ چوک چونہ منڈی میں اس قدیم و مشہور تکیہ کا دروازہ دکھائی دیتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی کبوتر شاہ صاحب کے مزار پر نظر بعد میں پڑتی ہے پہلے دائیں بائیں لوہے کے بڑے بڑے کڑاہے دکھائی دیتے ہیں، جن میں رنگریز کپڑے کے تھان رنگتے ہیں۔ اب سے چند سال پہلے یہ تکیہ بہت بارونق تکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں ملحقہ محلوں کے باشندوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ بٹیروں کی پالی لگتی تھی، اور چونکہ لاہور کے چند مشہور مطرب اور ربابی حضرات کے مکانات بھی پاس ہی تھے۔ اس لیے موسیقی کی محفلیں بھی اس کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں۔ پاکستان کے مشہور طبلہ نواز استاد قادر بخش مرحوم نے اس تکیہ میں کئی مرتبہ طبلہ بجا کر سامعین سے داد تحسین حاصل کی۔ کبوتر شاہ صاحب کی ایک کرامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اگر کسی شخص کو جے باری یعنی تیجے کا بخار چڑھتا ہو آپ کے مزار پر سے ایک کنکر اٹھا کر اپنے بازو سے باندھے تو اُس کا بخار اتر جاتا ہے۔ یہ بھی اُن تکیوں میں سے ہے جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنی شان و شوکت کھو بیٹھے ہیں۔

تکیہ گڈی سائیں

یہ تکیہ بالکل نیا ہے اور ہمارے سامنے تعمیر ہوا ہے۔ یہ مستی دروازہ کی مشہور و معروف بیگم شاہی مسجد کے عقب میں ہے۔ جس میں گڈی سائیں صاحب کا چھوٹا سا مزار ہے۔ یہ سائیں صاحب مجذوب تھے۔ لمبا سا چغہ پہنتے اور ہر وقت گڈی دکنکوے اور ڈورے سے دل بہلاتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ گڈی سائیں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لاہور کے خوش اعتقاد لوگ ان سے سٹے کا نمبر دریافت کیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد ان کے معتقدین نے انھیں بصد احترام یہاں دفن کر دیا۔ جمعرات کو یہاں رونق ہو جاتی ہے۔ قوالی بھی ہوتی ہے اور طوائفوں کی چوکیاں بھی۔

تکیہ شیر شاہ ولیؒ

لاہور کے قدیم ترین اور خوبصورت ترین تکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ درختوں کی کثرت اور بیل بوٹوں کی سجاوٹ متولیوں کے ذوق سلیم کا پتہ دیتی ہے۔ لاہور کے تقریباً سب محلوں کے لوگ یہاں آتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں، یہ قلعہ لاہور کے شمال کی طرف قلعہ کی دیوار کے بالکل نیچے واقع ہے۔ یہاں حضرت شیر شاہ صاحبؒ کا مزار ہے۔ جو صاحب کرامات بزرگ بیان کئے جاتے ہیں۔ عام لوگوں میں مشہور ہے کہ کبھی کبھی رات کے وقت ایک شیر آ کر یہاں جاروب کشی کرتا ہے۔ جمعرات کے دن عورتوں اور مردوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ طوائفوں کی چوکیاں مجرے ہوتے ہیں، سالانہ عرس بڑے ٹھاٹھ سے منایا

جاتا ہے اور دو تین دن خوب رونق رہتی ہے۔ تکیہ کے متولیوں میں سے بابا چراغ شاہ اور سائیں جلا بہت مشہور گزرے ہیں۔ کئی حضرات کا خیال ہے کہ اکبری دور کا مشہور فارسی شاعر جمال الدین عرفی شیرازی یہیں دفن ہوا تھا اور بعد میں کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف اشرف لے گیا تھا۔ اس طرح اس کی اپنی پیشین گوئی پوری ہوئی ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنند و گر بہ تتار

تکیہ جھنگی یہ بھی پرانا تکیہ ہے۔ اور منٹو پارک میں واقع ہے۔ اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے جھنگی کہلاتا ہے یہ بھی ان مشہور تکیوں میں سے ہے جس میں لاہور کے تقریباً سب محلوں کے لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ اس میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد اور کنواں اور ایک مزار بھی ہے۔ جو سید علی شاہ المتوفی ۱۲۲۵ھ کا ہے۔ اور بھی چند قبریں ہیں۔ اسی جگہ چودھری محمد حسین مرحوم جو علامہ اقبالؒ کے رفیق تھے مدفون ہیں پاکستان کے قیام سے پہلے جب ہندوؤں نے موہنی روڈ پر ایک پختہ و عالی شان تعمیر کی تو مسلمانوں نے بھی اس تکیہ میں ایک مدوّر اکھاڑہ تعمیر کیا۔ جس میں مسلمان پہلوانوں کے کئی ناقابل فراموش دنگل ہوتے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ حضرات نے یہاں ایک کلب بھی بنایا ہے جس کا نام مسلم ہیلتھ کلب ہے۔ یہ کلب نوجوانوں کو ورزش اور فری سٹائل کشتی کی تربیت دیتا ہے۔ چنانچہ صبح و شام بہت سے نوجوان یہاں مختلف قسم کی ورزشیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں قدیم طرز کا اکھاڑہ بھی ہے۔

تکیہ نتھے شاہ یہ تکیہ قلعہ لاہور کے پاس لیلا پارک میں واقع ہے اور بہت پُر فضا تکیہ ہے۔ گوندنی، نیم اور بڑ کے درخت عجیب بہار دیتے ہیں اور لوگ گرمیوں میں ان کی چھاؤں میں آرام کرتے ہیں نتھے شاہ صاحب کا مزار بھی یہیں ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ بھی ہے جس میں بھماں جوڑی گر اور کالا پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔

تکیہ کھائی والا مشہور تکیہ ہے۔ اور تکیہ نتھے شاہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ اس میں وہ مشہور اکھاڑہ ہے جس نے رستم ہند بوٹا پہلوان، مہنی ریتی والا، چوہا پہلوان، گاموں پہلوان بالی والا، گونگا پہلوان اور کالا اخراسیا پہلوان پیدا کئے جنھوں نے ملک سے اپنی قوت کا لوہا منوایا۔

تکیہ سر مہ سائیں یہ تکیہ شاہی محلہ کی طرف شاہی مسجد کے باغ میں واقع ہے۔ سید چراغ شاہ اور سرمہ سائیں دونوں ایک ہی بزرگ کے مرید تھے۔ جب چراغ شاہ تکیہ شیر شاہ ولی کے متولی بنے تو سرمہ سائیں نے یہاں ایک قبر پر قبضہ جما کر درخت وغیرہ لگا دیئے اور ایک جھونپڑی بنا لی۔ رفتہ رفتہ اس نے تکیہ کی صورت اختیار کر لی۔ بعد ازاں سرمہ سائیں نے تکیہ کو اور وسیع کرنا چاہا اور ایک کنواں کھدوایا مگر انجمن اسلامیہ پنجاب نے مداخلت کر کے روک دیا۔ سرمہ سائیں فوت ہوگئے، جھونپڑی مسمار ہوگئی۔ جب محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی نے شاہی مسجد کی مرمت کی تو قبر کو بھی مسمار کر دیا۔ اور اس کی جگہ سنگ مرمر کا ایک تختہ نصب کر کے اس پر کلمہ طیبہ کندہ کرا دیا۔

تکیہ سبز پیر لاہور کا مشہور تکیہ ہے اور کوچہ پیر سبز میں تھانہ ٹبی کے بالکل عقب میں واقع ہے۔ اس میں ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت شیریں اور ٹھنڈا ہے۔ مسجد بھی ہے اور مزار بھی، صاحب مزار کا اصل نام سید بدر الدین شاہ عالم بخاری تھا۔ چونکہ سبز پیراہن پہنتے تھے اس لیے سبز پیر کے نام سے مشہور ہوئے، کبھی یہ تکیہ بھی بہت وسیع اور پُر فضا تھا۔ پیپل اور نیم کے درختوں کی چھاؤں عجیب بہار دیتی تھی۔ دُور دُور سے لوگ آکر یہاں دل بہلاتے تھے۔ چونکہ ٹبی اور ہیرا منڈی کے بالکل قریب تھا۔ اس لیے جمعرات کو یہاں طوائفیں

مجرا کیا کرتی تھیں اور بڑے بڑے فنکار فنِ موسیقی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آج بھی جمعرات کو زائرین کے دم سے رونق ہو جاتی ہے۔ لیکن تکیہ کی رونق کو کباڑی دوکانوں نے چھین لی ہے اور اب تکیہ کباڑیوں کا اڈہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس بزرگ کا سالانہ عرس بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ مگر اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔

تکیہ چیت رام یہ تکیہ پنجاب ڈینٹل ہسپتال کے قریب موجودہ چیت رام روڈ پر واقع تھا۔ یہ ایک ہندو فقیر جو چیت رام کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ جو ضلع لاہور کے موضع بھوکے کا باشندہ تھا۔ چیت رام سید محبوب چشتی جلالی کا مرید تھا۔ جب سید محبوب شاہ فوت ہو گیا تو چیت رام اس کی قبر کے ساتھ چپٹ کر سو گیا۔ اُسے خواب میں حضرت مسیح کی زیارت ہوئی۔ اور وہ مسیح کا بھی قائل ہو گیا اور اس نے چیت رامی فرقہ کی بنیاد رکھی۔ وہ دو تثلیثوں کا قائل تھا۔ پہلی خدا، مسیح اور روح القدس اور دوسری اللہ، پرمیشور اور خدا، چنانچہ جب یہ تکیہ قائم کیا گیا تو یہاں مسجد کے ساتھ ساتھ ایک کوٹھڑی پر ایک چھوٹی سی صلیب نصب کر دی گئی۔ گو وہاں گرجا نہ بنا، لیکن صلیب مدت تک گڑی رہی۔ اس فرقہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور اچھوت ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ چونکہ تکیہ مسلم آبادی میں واقع تھا۔ اس لیے یہاں چیت رامیوں کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ جب موجودہ چیت رام روڈ نکالی گئی تو گورنمنٹ نے تکیہ کی آدھی سے زیادہ زمین حاصل کر لی اور تکیہ جو بہت ہی وسیع اور پُر فضا تھا چند کوٹھڑیوں پر مشتمل ہو گیا۔ بعد میں اس کی تولیت پر تنازعات پیدا ہو گئے اور آخر سید محبوب شاہ کے ورثا نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسجد، گرجا اور امام باڑہ سب کو مٹا کر رہائشی مکان کی شکل دے دی۔ اب تکیہ تو موجود ہے۔ مگر دراصل اب وہاں ایک تنور اور ایک صابون کا کارخانہ بنا دیا گیا ہے جن سے باقاعدہ کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔

تکیہ سادھواں لاہور کا یہ مشہور و معروف تکیہ شہر کے اندر محلہ پیر گیلانیاں اور کوچہ چابک سواراں کے درمیان چینیاں والی مسجد کے قریب واقع ہے۔ گو اب یہاں تکیہ کے کوئی نشانات نہیں۔ لیکن بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہاں کشمیری سادھو برادری کا تکیہ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ تجارت کرتے یا لوگوں کا علاج معالجہ کیا کرتے تھے۔ اور اُن کے گھوڑے اسی تکیے میں باندھے جاتے تھے۔ نور محمد سادھو نے ۱۲۶۰ھ میں یہاں ایک مسجد تعمیر کر دی اور اسی مسجد میں لاہور کے ایک بزرگ پیر غفار شاہؒ کا مزار بنایا گیا۔ بعد میں اُن کے صاحبزادہ پیر اشرف شاہ صاحب نے اُن کا جسدِ مبارک یہاں سے میانی صاحب کے قبرستان میں منتقل کر دیا۔ اب ان کا مزار گل بیگم کے باغ کے پاس ہے۔ جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے۔ اب سادھو برادری نے اس مسجد کو اور حسین تر بنا دیا ہے۔ صبح سویرے اس کے بلند مینار سے لاؤڈ سپیکر پر لحن عربی میں اذان کی صدا نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ہم نے لاہور کے تقریباً تمام مشہور تکیوں کے حالات لکھ دیے ہیں۔ اگر ان تکیوں کو بھی شمار کیا جائے جو مال روڈ، اچھرہ، مزنگ، نواں کوٹ، باغبانپورہ، کوٹ خواجہ سعید وغیرہ میں ہیں۔ تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ہم نے وہی تکیے لیے ہیں جو قدیم لاہور کے قرب و جوار میں موجود تھے یا ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو اگر ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیں اور کوشش کریں کہ ان تکیوں کو غلط عناصر سے پاک کر کے ہر تکیہ کو ہیلتھ کلب اور ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیں، مسلم ہیلتھ کلب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ کام کٹھن ضرور ہے مگر اس کے لیے ایک منظم تحریک کی ضرورت ہے۔

میلے

مسعود نظامی

میں ابھی بچہ ہی تھا جب ہمارے محلہ میں دو ڈھنڈورچی آیا کرتے تھے۔ ایک کا نام سائیں فیروز تھا، سفید داڑھی سرخ رنگ پہلوانوں کا سا جسم، عام طور پر سرکاری اعلانات اور عظیم الشان دنگلوں کی منادی کیا کرتا تھا، جب کبھی وہ ڈھول کی لے کے ساتھ گھنٹی بجا چوک میں کھڑا ہوتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور جب وہ اپنی گرجدار آواز میں منادی کرتا تو عجیب سماں باندھ دیتا۔ دوسرا ڈھنڈورچی ایک کشمیری نوجوان تھا جو غالباً موچی دروازہ کا رہنے والا تھا۔ سرخ و سفید رنگ تھا اور ایک آنکھ گل تھی۔ یہ عام طور پر بزرگان دین کے مزارات پر ہونے والے عرسوں کی منادی کیا کرتا تھا۔ جب یہ منادی کرنے آتا تو اس کے سر پر چھوٹا سا سبز پٹکا، ایک ہاتھ میں گھنٹی اور دوسرے میں چھوٹا سا سبز جھنڈا ہوتا، وہ اپنی منادی کو ہمیشہ ان الفاظ سے شروع کیا کرتا:—

سجنو! ایہہ لاہور اے
ست دن تے اٹھ میلے
گھر جاواں کیہڑے ویلے

(دوستو! یہ لاہور ہے، جہاں ہفتہ کے سات دنوں میں آٹھ میلے ہوتے ہیں۔ اب میں گھر کس وقت جاؤں)

میں ان کے اس فقرہ پر حیران ہوا کرتا تھا، لیکن جب میں نے بچپن کی حدود و پھاندیں اور محلہ کے حصار سے باہر نکلا تو اُن کے اس فقرے کی حقیقت بالکل واضح ہو گئی، اور یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سولہ آنے سچائی پر مبنی ہے۔ میں جس دن بھی گشت کے لیے باہر نکلا تو یہی دیکھا کہ کہیں کسی مزار پر میلہ لگا ہے۔ کسی بزرگ کا عرس ہے، قوالی ہو رہی ہے، تبرک تقسیم ہو رہا ہے، کشتیاں ہو رہی ہیں، اور دوست احباب مل کر رنگ رلیاں منا رہے ہیں، کہیں بٹیر بازی کی پالی لگی ہے، کہیں تیتر لڑ رہے ہیں، کہیں مرغ بازی ہو رہی ہے کہیں مینڈھوں کی ٹکریں ہو رہی ہیں، کہیں کسی اکھاڑے میں ایک مشہور پہلوان کو کشتی کی ریاضت کرتے دیکھنے کے لیے لوگوں کا جمگھٹا لگا ہے۔ غرض صبح سے شام تک میں ان میلوں کی دلچسپیوں میں کھویا رہا اور گھر لوٹنے کی سدھ بدھ نہ رہی، اور یوں معلوم ہو گیا کہ لاہور شہر میں ہفتہ کے دنوں سے میلوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اگر ان تمام میلوں کے جو سال بھر میں ہوتے ہیں، حالات تحریر کیے جائیں، تو ان کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا، اس لیے اس مضمون میں صرف اُن میلوں کا حال لکھا جائے گا جو زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

میلہ چراغاں | لاہور کے میلوں میں سب سے بڑا میلہ ہے جو ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ اتوار کو مغلوں کے حسین ترین

باغ شالامار میں لگتا ہے، لیکن اگر رمضان ہو تو اس کی تاریخ تبدیل کر دی جاتی ہے اور پھر رمضان کے بعد لگتا ہے۔ موسم بہار کا یہ میلہ اپنی شان و شوکت میں بے مثال ہے۔ ہفتہ کی شام کو درگاہ حضرت مادھو لعل حسین میں، جو شالامار سے چوتھائی میل کے فاصلہ پر باغبانپورہ کے قریب واقع ہے۔ بے شمار چراغ جلائے جاتے ہیں۔ جس سے یہ درگاہ اور اس کے گرد و نواح کا منظر بقعہ نور بن جاتا ہے۔ زائرین اور میلہ میں شریک ہونے والے شوقین اس درگاہ پر بھی ٹھہرتے ہیں اور شالامار میں بھی، چراغاں گو درگاہ مادھو لعل حسین پر ہوتا ہے، مگر میلہ شالامار ہی میں لگتا ہے۔ اسی چراغاں کی وجہ سے اسے میلہ چراغاں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میلہ کے دنوں میں باغات کا منظر بہت دلکش اور دل آویز ہوتا ہے، تالاب اور حوض پانی سے لبالب بھرے ہوتے ہیں، فوارے چھوٹتے ہیں، رنگ مرمر کی آبشار سے جب پانی گرتا ہے تو "مسرا بسنگ می زنی و نمی گریستی" کا سماں بندھ جاتا ہے۔ درختوں اور گل بوٹوں، اور لوگوں کے رنگا رنگ لباسوں کی بوقلمونی سے مغل شہنشاہ شاہجہان کا یہ باغ پرستان کا منظر پیش کرتا ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات، شیخوپورہ، امرتسر، جالندھر، فیروزپور اور ملتان سے لوگ یہ میلہ دیکھنے آتے تھے، شہریوں کے علاوہ دیہاتیوں کی کثیر تعداد بھی میلہ میں شریک ہوا کرتی تھی، ہندو، مسلم اور سکھ دیہاتیوں کی ٹولیاں ساری رات اور سارا دن میلہ میں بولیاں اور لوک گیت گا کر لطف اٹھاتی تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے بھی سامان تفریح مہیا کرتی تھیں۔

اب سے چالیس سال پہلے ہفتہ کی رات جب چراغاں ہوتا تو شالامار میں عجیب چہل پہل ہوتی تھی، امرا اور رؤسا کے شاندار خیموں میں موسیقی کی محفلیں سجائی جاتیں، جن میں لاہور کی مشہور گانے والیوں کے مجرے ہوتے، بھانڈوں کی نقلیں ہوتیں، بہروپیوں کے سوانگ بھرے جاتے تھے، اور رات انہیں رنگ رلیوں میں بسر ہو جایا کرتی تھی۔

باغ کے اندر دوکانیں لگتی تھیں، جہاں سے ہر چیز دستیاب ہو جاتی تھی۔ ہفتہ کی رات اور اتوار کے دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا دیہاتی رات بھر لوک گیتوں اور بولیوں سے میلہ کی رونق میں اضافہ کرتے۔ پچھلے سال کی بعض ٹولیوں کی بولیاں مجھے یاد رہ گئی ہیں آپ بھی سنیں ۔

۱۔ کھٹن چلیا تے کیہہ کھٹ لیاندا
کھٹ کے لیاندے پیڑے
تیویاں بنان والیا
تیرے وچ جنتاں دے ڈیرے

۲۔ گوری نہا کے چھپڑ وچوں نکلی
سلفے دی لاٹ ورگی

۳۔ بیریاں نوں بیر لگ گئے تینوں کجھ نہ لگا میٹیارے

۴۔ کاہنوں ڈھانیئے گلی دے وچ چرخہ
بھتیاں دے خون ہون گے

اب دو سال سے حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ میلہ شالامار کے اندر نہ لگے بلکہ باہر لگے، تاکہ باغ خراب نہ ہو۔

بسنت کا میلہ بسنت کا میلہ بھی لاہور کا مشہور میلہ ہے۔ عام طور پر جنوری یا فروری میں لگتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ میلہ باغبانپورہ میں درگاہ حضرت مادھو لال حسین پر لگا کرتا تھا۔ لوگ دور دور سے آکر میلہ کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ مسلمان اس درگاہ پر نذرانے چڑھا کر اظہار عقیدت کرتے تھے۔ حضرت لال حسین کا مشہور شعر ہے ؎

رُت آئی بسنت بہار دی
سانوں ہک ہے مادھو یار دی

سکھ حضرات گوردوارہ گورو مانگٹ صاحب میں حاضر ہو کر بسنت کا میلہ مناتے تھے، اور وہاں کنکوے اڑاتے تھے۔ ہندو صاحبان حقیقت رائے کی سمادھ پر میلہ مناتے تھے۔ یہ سمادھ بھی باغبانپورہ کے قریب ہے۔ ہندو اور سکھ حضرات سروں پر بسنتی (زرد) پگڑیاں باندھتے اندر بیبیاں زرد کپڑوں اور ساڑھیوں میں ملبوس ہوتیں۔ ارد گرد سرسوں کے کھیت ہوتے اور سرسوں کے بسنتی پھولوں کے درمیان زرد پگڑیاں اور زرد سوٹ عجیب منظر پیش کرتے۔

اندرون شہر کوٹھوں پر نوجوانوں کی ٹولیاں کنکوے بازی میں مشغول ہوتیں۔ اور صبح سے شام تک لاکھوں روپے کنکوے بازی پر خرچ ہو جاتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں بھی یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اور اس کے درباری زرد لباس زیب تن کرتے اور جب ان کا جلوس قلعہ لاہور سے شالامار کی طرف روانہ ہوتا تو سرسوں کے کھیتوں کے زرد زرد پھولوں کے درمیان سے اس زرد پوش جلوس کا منظر بہت دلفریب ہوتا۔ لیفٹیننٹ الیگزینڈر برنیز، جو انہی زمانے میں لاہور آیا اس نے بسنت کا آنکھوں دیکھا منظر یوں کھینچا ہے:

"بسنت کا تہوار جو بہار کا تہوار ہے۔ ۶ فروری کو بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیں اس تقریب میں مدعو کیا اور ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس میلہ کی بہار دیکھنے چلے جو بہار کا خیر مقدم کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ لاہور سے میلہ تک دو رویہ مہاراجہ کی فوج کھڑی ہوتی ہے۔ مہاراجہ گزرتے ہوئے اپنی فوج کی سلامی لیتا ہے۔ میلہ میں مہاراجہ کا شاہی خیمہ نصب تھا۔ جس پر زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں خیمہ کے درمیان ایک شامیانہ تھا۔ جس کی مالیت ایک لاکھ روپیہ تھی۔ جس سے موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں آویزاں تھیں۔ اس شامیانہ سے شاندار چیز کوئی نہیں ہو سکتی۔ مہاراجہ نے بیٹھ کر پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سُنا۔ پھر گرنتھی کو تحائف دیئے۔ اور مقدس کتاب کو دس جزدانوں میں بند کر دیا گیا۔ سب سے اوپر والا جزدان بسنتی مخمل کا تھا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں پھل اور پھول پیش کئے گئے اور ہر وہ بوٹی جس کا رنگ زرد تھا۔ بعد ازیں امراء، وزراء اور افسران آئے جنھوں نے زرد لباس پہن رکھے تھے۔ انھوں نے نذریں پیش کیں ——— اس کے بعد طوائفوں کے مجرے ہوئے اور مہاراجہ نے دل کھول کر انھیں انعامات عطا کیے۔"

قیام پاکستان کے بعد بھی بسنت کا میلہ ہر سال درگاہ حضرت مادھو لال حسین پر منایا جاتا ہے۔ کوٹھوں پر کھڑے ہو کر کنکوے بازی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ زبان سے "وہ کاٹا" کے نعرے لگانے کے بجائے لاؤڈ سپیکروں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور فلمی گانوں کے ریکارڈ اس شور و غوغا میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

قدموں کا میلہ [حضرت رسول پاکؐ کے مجاوروں میں سے ایک بزرگ زین العابدین نام سلطان ناصرالدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہندوستان آئے اور ملتان سے ۱۲ میل مشرق کی جانب قصبہ شاہ کوٹ میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں آپ کے ہاں دو فرزند پیدا ہوئے جن میں چھوٹے کا نام سید احمد تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے لاہور پہنچے اور ایک عرصہ تک یہاں کے علماء و صلحا کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا۔ لاہور میں ان کا حجرہ اب تک شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک مکان کے نیچے موجود ہے۔ ان کی بخشش و سخاوت کی بنا پر لوگ انھیں سخی سرور لکھ داتا کہتے ہیں۔

لاہور سے وہ سیر و سیاحت کے شوق میں شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرے اور بغداد تک پہنچے۔ وزیر آباد کے قریب قصبہ دھونکل میں آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ وہاں آپ کی یادگار ایک مسجد، چشمہ اور تالاب اب تک قائم ہے۔ مزار آپ کا ڈیرہ غازی خاں سے بجانب غرب کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ وہ جگہ آپ ہی کے نام سے سخی سرور کہلاتی ہے۔ اس کے قریب ہی درہ سخی سرور ہے جو کبھی قندھار اور ڈیرہ غازی خاں کے درمیان ایک تجارتی ذریعہ تھا۔

قدموں کا میلہ انہی بزرگ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ میلے کے اصلی دن چار ہیں یعنی ۱۰ اپریل سے ۱۳ اپریل تک۔ لیکن آپ کے عقیدتمندوں کے گروہ جن کو سنگ کہتے ہیں فروری مارچ ہی میں بوریا بستر باندھ کر سفر کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، جھنگ۔ لائلپور اور دیگر اضلاع سے دھونکل اور دھونکل سے نکل کر لاہور آتے ہیں جہاں ان کے آستانے سے لے کر پرانی انار کلی تک میلہ لگ جاتا ہے۔ سید محمد لطیف نے ہسٹری آف لاہور میں درست نہیں لکھا کہ آپ کا مزار انار کلی میں ہے ـــــ ادارہ]

ڈھول بجانے والے دیہاتی جن کو عرف عام میں شیخ کہتے ہیں اس آستانے پر بڑی عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں اور زور زور سے ڈھول بجا کر اس کے ساتھ ناچتے اور "پھمنیاں" کا رقص پیش کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ سخی سرورؒ کو معصوم اور چھوٹے بچوں سے محبت تھی، اور وہ اُن کے گریبی مانے جاتے ہیں، عورتیں اپنے بچوں کو لے آتی ہیں اور یہ شیخ ان بچوں کو گود میں لے کر عجیب انداز سے ناچتے ہیں اور ساتھ ساتھ گاتے بھی جاتے ہیں ؎

لوری لال نوں دیواں نکے بال نوں دیواں

لال وسے لے لے لوری

درگاہ کے علاوہ یہ میلہ موری دروازہ اور دہلی دروازہ کے باہر بھی لگتا ہے۔ جہاں یہی شیخ بچوں کو لوریاں دیتے ہیں اور ناچتے ہیں، حلوائیوں اور کھلونوں کی دوکانیں لگتی ہیں، جھولے ڈالے جاتے ہیں، جن میں بچے بڑے شوق سے چڑھتے ہیں۔ اس میلہ کی سب سے بڑی سوغات تیل کے قفلے اور مٹی کے برتن ہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے اس میلہ کی رونق کم ہو گئی ہے۔

چھڑیوں کا میلہ کبھی یہ لاہور کا مشہور میلہ تھا جو گرمیوں میں مستی دروازے کے باہر لگا کرتا تھا۔ دراصل یہ میلہ ایک بزرگ شاہ مدار کی یاد میں ہندوستان بھر میں منایا جاتا ہے اس میں لمبی لمبی چھڑیوں کے کمالات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ لمبے لمبے بانسوں کو ایک

دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے کس کر باندھا جاتا۔ سو سہ منزلہ مکان جتنے اونچے ہو جاتے۔ پھر ان کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے باندھ دیتے۔ ماہر چھڑی باز ان چھڑیوں کو ہر حالت میں سیدھا کھڑا رکھنے میں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے۔ کبھی وہ اس چھڑی کو ٹھوڑی پر کھڑا کرتے۔ کبھی پیشانی پر، کبھی ہاتھ پر چلاتے اور کبھی صرف انگوٹھے پر۔ کمال فن یہ تھا کہ چھڑی متوازن رہے اور گرنے نہ پائے۔ اس کے ساتھ دف بجا کر گایا بھی جاتا تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ سے یہ فن مٹ گیا۔ اب صرف چوہٹہ مفتی باقر میں چھڑی بازوں کا خاندان ہے مگر وہ اس فن کو ترک کر چکے ہیں۔ اب یہ میلہ بھی نہیں ہوتا۔

اس میلہ میں کبھی کبھی لاہوری سورماؤں کی جھڑپیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اس میلہ کی ایک لڑائی آج تک بڑے بوڑھوں میں مشہور ہے جو موچی دروازہ کے نصرو پہلوان اور استاد نور دین کا ہڈا کی پارٹی اور بھاٹی دروازے کے حاجی بلد کی پارٹی کے درمیان ہوئی تھی، جس میں خوب چاقو چلے تھے اور یہی لڑائی اس میلہ کے زوال کا باعث بنی۔

پار کا میلہ

یہ میلہ دریائے راوی کے پار مغل شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ میں لگتا ہے، اسی لیے پار کا میلہ کہلاتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے جب ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی نہ تھی۔ یہ میلہ بھی میلہ چراغاں کی طرح بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ رات کو مقبرہ پر چراغاں ہوتا۔ لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ساری ساری رات مقبرہ میں رنگ رلیاں مناتے۔ پکوان پکتے۔ کشتیاں ہوتیں۔ کبڈی کے مقابلے ہوتے۔ بھانڈوں کی نقلیں ہوتیں، بازی گروں کے تماشے ہوتے۔ مشہور طوائفوں کے مجرے ہوتے۔ غرض کہ یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔

کچھ عرصہ بعد لاہور کے خوش باش لوگوں نے اس میں ایک عجیب جدت پیدا کی، شاہدرہ میں کوٹھے کرایہ پر لیے جاتے اور ساری رات خوب جوا ہوتا جس میں ہزاروں روپے کی ہار جیت ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ وبا مقبرہ میں بھی آ دھمکی۔ اور وہاں بھی رات بھر جوئے بازی ہوتی۔ حتیٰ کہ مقبرہ کے مینار بھی اس لعنت سے نہ بچے۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوتیں، ایک مرتبہ ایک پولیس والے کو مینار پر سے دھکا دے دیا گیا۔ حکومت نے جوئے پر کڑی نگرانی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس میلہ میں وہ چہل پہل نہیں رہی جو آج سے بیس سال پہلے تھی۔

عرس داتا گنج بخش رح

لاہور کا یہ مشہور و معروف میلہ حضرت علی ہجویریؒ عرف داتا گنج بخشؒ کے مزار مقدس پر لگتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ غزنی کے رہنے والے تھے۔ آپ شیخ ابو الفضل بن حسنؒ کے مرید تھے۔ آپ محمود غزنوی کے فرزند مسعود کے لشکر کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے اور سنہ ۴۳۱ھ میں لاہور میں ہی مقیم ہو گئے جہاں ۳۴ سال تک آپ خدمت دین میں مصروف رہے۔ ہزارہا لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور بہت سے اولیا کرام آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کی وفات سنہ ۴۶۵ھ میں ہوئی۔

آپ کا سالانہ عرس ہر سال ۲۰ ماہ صفر کو منعقد ہوتا ہے۔ اس عرس پر عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ مختلف شہروں سے زائرین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ بجلی کے قمقموں کی روشنی سے سارا مزار بقعہ نور بن جاتا ہے۔ قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ جن میں ملک کے مشہور قوال حصہ لیتے ہیں۔ ہزارہا دوکانیں لگتی ہیں۔ جہاں سے ہر قسم کی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں۔ ٹکسالی دروازے سے مزار تک اور مزار سے بھاٹی دروازہ تک خلقت کے ہجوم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انسان کو راستہ بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دو دن تک میلہ میں رونق رہتی ہے۔ اب یہ مزار حکومت کے محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ اور وہی اس میلہ کا انتظام کرتا ہے؛ قدیم مجاوروں کا اب اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا۔

میاں میرؒ صاحب کا میلہ

حضرت میاں میرؒ صاحب کا میلہ آپ کے مزار پر سالانہ عرس کے موقعہ پر لگتا ہے اور داتا گنج بخشؒ کے عرس کی طرح بڑی رونق والا میلہ ہے۔ حضرت میاں میرؒ سیستان میں ۹۵۷ھ میں پیدا ہوئے

اور بعمر ۸۰ سال لاہور میں ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظمؓ سے ملتا ہے۔ آپ زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری میں یکتا تھے. اور ہزارہا لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔ آپ کے معتقدین میں بڑے بڑے بادشاہ اور امرا شامل ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کا بہت ہی معتقد تھا۔

جب یہ میلہ لگتا ہے تو لاہور سے میاں میر تک تانگوں، موٹروں، سائیکلوں اور گڈوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ سینکڑوں زائرین پاپیادہ چل کر میلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ درگاہ کے تبرک کے علاوہ لاہور اور مضافات کی مختلف برادریاں اپنی طرف سے دیگیں پکا کر لوگوں میں تبرکاً تقسیم کرتی ہیں۔ مزار پر چراغاں ہوتا ہے۔ قوالیاں ہوتی ہیں۔ دوکانیں لگتی ہیں۔ اور دو دنوں تک میلہ میں خوب رونق رہتی ہے۔

بھدر کالی کا میلہ

لاہور سے سات میل دُور موضع نیاز بیگ کے پاس ہندوؤں کی مشہور دیوی بھدر کالی کا استھان تھا۔ یہ میلہ جون کے مہینے میں اسی استھان میں لگا کرتا تھا۔ پاکستان کے قیام سے بہت پہلے جب ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی نہ تھی۔ دونوں فرقوں کے لوگ اس میلہ کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ اس استھان میں ایک بڑا سا تالاب اور گھنا باغ تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں جون کے مہینہ کی شدید گرمی میں نعمت تھیں۔ لوگ تالاب میں اشنان کرتے اور سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر میلہ سے لطف اندوز ہوتے بعدازاں اس میلہ میں صرف ہندو صاحبان ہی حصہ لیتے تھے۔ اب اس استھان کی وہ رونق باقی نہیں رہی۔

بیساکھی کا میلہ

یہ میلہ ماہ بیساکھ کی یکم تاریخ کو لگتا تھا۔ اور ہزارہا ہندو مسلمان اور سکھ مرد و زن دریائے راوی پر پہنچ جاتے تھے اور دریا میں اشنان کرتے تھے۔ دیہاتی ڈھول کی لَے کے ساتھ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر گاتے اور بھنگڑا ڈالتے تھے۔ بعد میں جب ہندو مسلم تعلقات خراب ہو گئے تو مسلمانوں نے اس میلہ میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ اس کے باوجود قیام پاکستان تک اس میلہ کی رونق جوں کی توں رہی۔

جوڑ کا میلہ

لاہور کے شاہی قلعہ کے سامنے سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک گوردوارہ ہے، جو گوردوارہ ارجن دیو کے نام سے مشہور ہے، اور اپنے سنہری کلس کی وجہ سے بہت شاندار معلوم ہوتا ہے۔ یہ میلہ اسی گوردوارہ میں گورو ارجن دیو کی یادگار میں منایا جاتا تھا جس میں دُور دُور سے سکھ یاتری آیا کرتے تھے۔ سکھوں کی گوردوارہ تحریک سے قبل ہندو بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ بعدازاں انھوں نے اس میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ جب یہ میلہ لگتا تو چوک ہیرا منڈی سے لے کر گوردوارہ تک سڑک کے دو رویہ دوکانیں لگتیں، مخیر حضرات ٹھنڈے پانی، دودھ، لسی اور شکر کے شربت کی سبیلیں لگاتے تھے۔ گوردوارہ میں ملک کے مشہور راگی کیرتن کرتے اور زائرین ہزاروں روپے کے چڑھاوے چڑھاتے۔ اب بھی سکھ حضرات بھارت سے آکر ہر سال یہ میلہ مناتے ہیں۔

دسہرا اور دیوالی کا میلہ

اگر ہندوستان میں لکھنؤ کا محرم الحرام مشہور تھا تو پنجاب میں لاہور کا دسہرہ اور دیوالی بھی بے مثال تھے۔ دسہرہ کا میلہ دس دن تک سری رامچندر جی کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ واٹر ورکس لنگے منڈی کے پاس ایک میدان میں ہر روز شام کو رام لیلا رچائی جاتی تھی۔ جس میں نوجوان رامچندر، لچھمن، سیتا، ہنومان اور راون کا سوانگ بھر کر رام بن باس کا ڈرامہ پیش کرتے اور بعد میں راون کے ایک قدآدم کاغذی بُت کو آگ لگا کر جلا دیتے۔ دسویں دن سری رامچندر کا جلوس نکالا جاتا جس میں سینکڑوں گاڑیوں پر لوگ رامچندر وغیرہم کا سوانگ بھر کر بیٹھے ہوتے۔ یہ جلوس ہیرا منڈی میں سے گزرتا ہوا منٹو پارک میں اس مقام پر پہنچ جاتا، جہاں آج کل نمائش ہو رہی ہے۔ یہ سارا میدان لاکھوں مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوتا، جو بہترین لباس زیب تن کئے بال بچوں سمیت میلہ میں شریک ہوتے۔ سب سے پہلے ہنومان جی لنکا کو جو بانسوں اور کاغذ سے بنائی جاتی، آگ لگاتے۔ بعد میں راون کے متعدد مجسموں کو جو شاہی مسجد کے مینار کی ایک منزل سے اونچے ہوتے آگ لگا دی جاتی۔ ان مجسموں میں گولے

پٹاخے بھرے ہوتے۔ جب انھیں آگ لگتی اور ان میں سے آتش بازی چھوٹتی تو عجیب لطف آتا۔

دسہرا کے میلے کے چند دن بعد ہندو دیوالی کا میلہ مناتے اور جس طرح چودہ سال کے بن باس کے بعد رامچندر کی واپسی پر اجودھیا میں چراغاں کیا گیا تھا۔ اسی طرح اپنے مکانوں پر چراغاں کرتے۔ انارکلی بازار کے ہندو دوکاندار اپنی دوکانوں کو بجلی کے قمقموں سے روشن کرتے۔ اور رات کے وقت انارکلی میں بھیڑ کا یہ عالم ہوتا کہ چلنا مشکل ہو جاتا۔ کالج کے لڑکوں کے نصیب جاگ اٹھتے اور وہ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس ہندو دیویاں کو اتنا تنگ کرتے کہ توبہ ہی بھلی۔

پتنگ بازوں کا میلہ

شاہی محلہ میں جس جگہ اب مکانات بن گئے ہیں اور ڈینٹل ہسپتال تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ تمام علاقہ ایک کھلا میدان تھا۔ جس میں بڑے بڑے تناور درخت تھے۔ دن کے وقت ان کی چھاؤں میں گوجر اپنے مویشی ٹھہراتے اور سہ پہر کے وقت لاہور کے مختلف علاقوں کے پتنگ باز یہاں جمع ہو جاتے اور پتنگوں کے پیچ لڑاتے۔ جن کو وہ پنجابی میں "سندیں" کہتے تھے۔ میرے بچپن میں یہ میلہ تقریباً ہر روز لگتا تھا۔ جب شاہی محلہ آباد ہو گیا تو یہ "سندیں" منٹو پارک میں ہونے لگیں۔ اب یہ میلہ ہفتہ میں دو بار جمعہ اور اتوار کو آج تک منٹو پارک میں ہوتا ہے جہاں سینکڑوں روپے ان پتنگوں کے پیچوں پر صرف ہو جاتے ہیں۔ ان میلوں میں بلا مبالغہ سینکڑوں نوجوان، بوڑھے اور بچے شریک ہوتے ہیں۔ زمانے کے انداز بدل گئے ہیں جہاں کبڈی، گلی ڈنڈا کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں وہاں اب پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ بھی ہونے لگے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے سچ فرمایا تھا ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے ‏ ‏ نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اس میں کوئی شک نہیں کہ انداز بدلے گئے ہیں مگر لاہور کے میلوں کا انداز وہی ہے۔ گو اب بٹیر بازی، مرغ بازی اور مینڈھوں کی ٹکریں نہیں ہوتیں لیکن آج بھی آپ کو ایک دن میں کئی میلے لگے ملیں گے۔ کہیں کرکٹ میچ ہو رہا ہے کہیں سافٹ بال کا مقابلہ ہے، کہیں کسی مزار پر عرس ہو رہا ہے اور سینماؤں کے باہر میلہ لگا ہے۔ میں جب بھی یہ مناظر دیکھتا ہوں تو اپنے دوستوں کے سامنے اس کشمیری ڈھنڈورچی کے یہ الفاظ دہرایا کرتا ہوں:-

سجنو! ایہہ لاہور اے
ست دن تے اٹھ میلے
گھر جاواں کیہڑے ویلے

ڈراما اور تھیٹر

عشرت رحمانی

ابتدا

اُردو ڈراما اور تھیٹر کی تاریخ پر تفصیلی نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس برصغیر میں ہمارے تھیٹر نے جس ماحول میں جنم لیا اور اس کی تعمیر میں جن بنیادی خامیوں کو دخل تھا وہ اپنے اسی ابتدائی دور سے متاثر رہیں۔

۱۸۵۲ء کا ہندوستان تھا۔ ملک کی عام انحطاطی معاشرت و تہذیب ادبار کے بادلوں میں سیاہ رنگ ہو رہی تھی۔ جو محفلیں جہاں جہاں جس رنگ میں آراستہ تھیں وہ محض بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کی یاد ہی منا رہی تھیں۔ فراغت و اطمینان کی بزم آرائیوں کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ملکی فضا تیرہ و تار تھی اور اس گھٹا ٹوپ میں یہ رنگ رلیاں بجلی کی چمک کا درجہ رکھتی تھیں جہاں بادل کی گرج دلوں کو دہلا کر ہر آن کسی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھی۔

اس دور میں سلطان واجد علی شاہ والیِ اودھ کے قیصر باغ میں رقص و نغمہ اور شاہی تمثیلی مجالس جمی نظر آتی تھیں جن کی حیثیت بھی "عشرتِ رفتہ تذکرِ مکرر" کی تھی۔ عوام جن کا گزر شاہی محفلوں میں نہ ہو سکتا تھا حسبِ مقدور اُجڑی اُجڑی بزمِ طرب کے نقشے جمانے پر اکتفا کرتے تھے۔ تعلیمی اور اقتصادی بدحالی عام تھی، مشرق و مغرب کا تصادم بھی درپیش تھا، تہذیب و معاشرت میں لطافت کی جگہ عامیانہ پن بڑھتا جا رہا تھا جو دورِ زوال کا خاصہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کی ترقی اپنے عہدِ عروج کا سنبھالا لے رہی ہوتی تھی۔ شاعری ہر مرض کی دوا سمجھی جا رہی تھی اور مشاعروں کی محفلیں ہمہ وقت آراستہ ہوتی رہتیں۔ چنانچہ اس دور میں امانت لکھنوی کی "اندرسبھا" نے جنم لیا اور اُردو کی پہلی تمثیل قرار پائی۔ اس کا پس منظر وہی تھا جو اس عہد کی مسخ شدہ تہذیب اور فنی روایات کا تقاضا تھا۔ امانت لکھنوی کا یہ تخلیقی کارنامہ بجائے خود قابلِ ستائش اور فنی کاریگری کی معقول مثال ہے لیکن ناسازگار فضا کی یادگار بن کے رہ گیا۔ اگر اپنی تہذیب، اپنا فن، اپنا ادب اور اپنے علمی و لسانی تقاضے ہموار و محفوظ ہوتے تو اس تمثیل کا آغاز کسی اور ہی انداز میں ہوتا۔ سکون و اطمینان اور فارغ البالی کے دور میں اس تمثیلی افتتاح میں صحت و سلامتی کی شان ہوتی اور اس پہلے ناٹک پر دانش و حکمت کی مہر ثبت ہوتی۔

لیکن ایسا ہونا بوجوہ ممکن نہ تھا اس لیے اس ناٹک پر اپنے انحطاطی دور کے راگ رنگ اور شاعری کا رنگ غالب رہا اور نقشِ اوّل کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں جتنے نقوش بھی بنائے گئے وہ بہتر ہونے کے بجائے "نقل مطابق اصل" ہی رہے اور اس لیے ہمارے ڈرامے، اسٹیج اور تھیٹر کی تعمیر ناپختہ بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اور آخر عہد تک ہر ترقی میں بنیادی کجی کے ناخوشگوار و ناپائدار اثرات موجود رہے۔

ستم بالائے ستم ــ ملکی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے حتیٰ کہ ملک و قوم نے غلامی کا طوق پہن لیا۔ چپہ چپہ اور شعبہ شعبہ پر غلامی کی چھاپ لگ گئی۔ ہر ترقی پر تنزل کے آثار اور ہر بناؤ میں بگاڑ کے انداز ہونا قدرتی تھا۔

بجائے اس کے اگر دوسرے آزاد ممالک کی طرح ہمارے اسٹیج اور ڈراما کا آغاز بھی آزادی و فراغت کے ساتھ ہوتا اور یہ اپنی روایات کو حسبِ منشا کھلے بندوں ترقی و عروج کے مواقع اور سامان میسر آتے تو یقیناً ہم بھی آج اس فن میں دوسرے فنون کی طرح ہر ترقی یافتہ ملت کے مقابلے پر نظر آتے لیکن ہمارے دوسرے فنونِ لطیفہ کی ترقی دورِ آزادی ہی میں ہو چکی تھی اور چونکہ سلف سلاطین تمثیل گری کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے تھے اس لیے آخری اودھ شاہی دور سے پہلے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی گئی۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سلطان واجد علی شاہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ترقی پسند حکمران تھا جس نے علم و فن اور ملکی اصلاح و تعمیر و ترقی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا لیکن عہد ملکی تسلط نے آ دبوچا اور اس کی روشنیِ طبع ہی بلا ثابت ہوئی۔ سلطان کا آزادی و عروج کا خواب بھیانک تعبیر کی صورت میں ظاہر ہوا مگر فطرتِ آزاد و طبعِ خداداد لیے جوہر کہیں یوں بھی دبتے ہیں۔ مٹیا برج کی چار دیواری میں اسیرِ فرنگ ہو کر بھی سلطان کی جدت طرازیاں اپنے رنگ جماتی رہیں اور فنونِ لطیفہ کے نت نئے نقوش کھلاتی رہیں تاہم فنی ترقی کے امکانات مفقود اور تہذیب و ثقافت کے انداز بدلے ہوئے نظر آنے لگے۔ غرض ہمارے اسٹیج کی ترقی میں بھی تنزل کے آثار تھے تاہم ہمارے اربابِ بست و کشاد (معدودے چند) نے اپنی سی بہت کچھ کی اور محدود ذرائع کے باوجود اپنے غیر ملکی معاصرین کے مقابلہ میں بھی اپنی بے بضاعتی کے جوہر دکھا کر داد و ستائش حاصل کر ہی لی لیکن زمانہ کی ناسازگاری نے فکر و نظر کے جوہر آشکار نہ ہونے دیے۔

اس برصغیر کا اسٹیج جس عہد میں ختم ہوا ہے اس پر وہی آثار و بار طاری تھے جو انگلستان میں سولھویں صدی عیسوی کے اختتام کے اوائل میں نظر آتے تھے لیکن وہاں آزادی و فراغت نے ترقی کے ہر ممکن اسباب فراہم کیے اور منزل بہ منزل عروج حاصل ہوتا رہا۔ اس کے برعکس ہم بہ پہلو چلتے رہے۔

ہمارے قومی انحطاط اور غلامی کی بے سر و سامانی، تہذیبی و تعلیمی پستی نے بھی ہمارے تھیٹر کو پنپنے کا موقع نہ دیا۔ ہمارے ڈراما نگاروں اور کارپردازوں کی (بلا استثنائے چند) عمومی حالت و حیثیت پست و ادنیٰ درجہ کی تھی۔ خواص نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اعلیٰ ادیبوں نے کوئی سہارا نہ دیا۔ نتیجہ یہ کہ اُردو ڈراما اور تھیٹر کو فکر و تخیل کی بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

جناب مہدی حسن احسن لکھنوی نے جو ملک کے خوش فکر شاعر اور بلند پایہ ڈراما نگار تھے اُردو اسٹیج کی نسبت اظہارِ خیال کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا ہے :-

"ڈراما نویس اپنے چال چلن کی وجہ سے بدنام ہیں۔ ان کی شخصیت میں کوئی ایسا وزن نہیں ہے جو اپنے افعالِ قبیح کا کفارہ ادا کر سکے۔ ڈراما نگاروں میں ایک اور طبقہ ہے جس نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ ادنیٰ پیشوں میں صرف کیا اور آخر میں ڈراما کی دنیا میں خروج کیا۔ وہ غیر معتمد اور مشتبہ لوگ ہیں جو مالِ مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر خود مالک بن بیٹھے۔ پھر تماشا یہ تھا کہ موضوعِ شاعری پر جب بڑے بڑے اہلِ قلم کے مضامین شائع ہو رہے تھے تو وہ لوگ ہندوستان میں ڈراما کی کمی کی شکایت کرتے تھے مگر چراغ تلے اندھیرا" ان کے تقدس

ان کے زہد و ورع نے کبھی اسٹیج پر تشریف لانے کی تکلیف نہ کی۔ وہ بزرگوار مر گئے مثلاً جناب شبلی یا جناب حالی، خدا اغریقِ رحمت کرے۔ وہ اسٹیج کو شرمناک مذبلہ اور ڈراما کو دیا لام کا قصہ سمجھتے رہے۔ تھیٹر کا نظارہ ان کے لیے باعثِ تعجب، ڈراما نویس ان کے نزدیک عاصی و گنہگار۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا چاہتے تھے اور وہ ڈراما کس چیز کو سمجھے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر پیش تھا اور وہ منہ پھیرتے رہے۔ ہمارا فرض ایک بے اثر نالہ تھا کہ کسی کے کان تک نہ پہنچا، ایک بیہودہ فریاد تھی کہ کسی نے نہ سُنی۔ دل خون ہو گیا اور رائی جبنت پہ رونا پڑا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ تھیٹر ہال کے محدود دائرہ میں ایک وقتی ہمہمہ ہو جاتا تھا۔ اس سے ڈراما نویس کی ہمت میں بالیدگی پیدا ہو جاتی تھی اور تعریفِ ناشناس ہی مرہمِ زخمِ جگر ہو جاتی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ اُردو ڈراما کے ترقی آثار دور میں بھی فکر و فن کے وہ حیات انگیز اور بصیرت افروز نمونے نظر نہ آسکے جن سے تھیٹر اور اسٹیج میں جان پڑتی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو سکتی۔ گو پارسی سیٹھوں نے جن میں سے بعض فن کے قدر دان اور اہلِ دل بھی تھے اُردو تھیٹر کو سہارا دینے کی بڑی کوشش کی لیکن تنِ مُردہ میں جان ڈالنا کس کے بس کا تھا۔ لاکھ ساز و سامان میسر سہی اُردو ڈرامے میں زندگی کے آثار سرے سے ناپید تھے چنانچہ ترقی کا نشان ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکا اور زوال شروع ہو گیا۔

میرے مضمون کا موضوع "لاہور میں ڈراما اور تھیٹر" ہے لیکن لاہور ہو یا کوئی اور مقام ابتدائی پس منظر سامنے لائے بغیر ہم اس موضوع کی مختصر تاریخ کا جائزہ نہیں لے سکتے اس لیے اجمالی طور پر یہ تفصیل ازبس ضروری تھی۔

قدیم اسٹیج کا آغاز اور انجام

لاہور اپنی گوناگوں خصوصیات اور حیات آفریں ماحول کے ساتھ ہمیشہ سے علم و فن کا مرکز رہا ہے زندہ دلانِ لاہور ہر شعبۂ حیات میں پیش پیش رہے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیوں میں ہر عہد میں وافر حصہ لیا البتہ تھیٹر کا آغاز لکھنؤ اور ڈھاکہ سے بیک وقت ہوا بعد ازاں پارسی اسٹیج بمبئی میں آراستہ ہو گیا لیکن ترقی کے سامان شروع ہوتے ہی لاہور کے اربابِ فن و اہلِ فکر نے اس طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے تو پارسی اسٹیج کے ترقی یافتہ دور کی کوئی بڑی یا چھوٹی کمپنی ایسی نہ تھی جو لاہور آئی ہو اور اس نے اہلِ لاہور سے قرار واقعی دادِ نہ حاصل کی ہو۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے آغاز سے لاہور بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح تھیٹر کی قدردانی کا مرکز بنا رہا۔ گو بمبئی کی طرح یہاں ابتدا میں کوئی بڑی تھیٹریکل کمپنی قائم نہ ہوئی تھی لیکن لاہور سے خصوصاً اور سابق صوبۂ پنجاب کے کل اضلاع سے عموماً متعدد فن کار بمبئی کی اصل کمپنیوں میں داخل ہونے لگے تھے اور اپنے کمالات کے جوہر دکھانے لگے تھے۔ تھیٹر کے اکثر مشاہیرِ فن لاہور کے باشندے تھے جن میں بعض باقیات الصالحات کے طور پر موجود ہیں۔ تھیٹر کے نامی گرامی نغمہ کار اور منشی نیز مشہور و مقبول ایکٹر اور ایکٹرسیں اکثر اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔

لاہور میں تھیٹر کے مرکزی اسٹیج بیڈن روڈ کا بریڈلا ہال، بھاٹی دروازے کے ہال جو اب سینما گھر ہیں اور میکلوڈ روڈ کے چند ہال بنے ہوئے تھے یا کہیں میدان میں منڈوے بنا لیے جاتے۔

دورِ وسطیٰ میں کئی تھیٹر کمپنیاں بھی قائم ہوئیں اور رفتہ رفتہ بمبئی کی طرح لاہور نے بھی مرکزیت کا مقام حاصل کر لیا لیکن دوسرے

درجہ پر چھوٹی کمپنیوں کا تو ذکر ہی کیا مشہور کمپنیوں میں البرٹ تھیٹریکل کمپنی، گلوب تھیٹر، پریم پرچارنی، ناٹک منڈلی، جمعدار تھیٹر اور پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے لاہور سے ابتدا کی اور ملک بھر میں اپنے فنی کمالات کی دھوم مچائی۔ ڈرامائی کمپنیوں میں ماسٹر رحمت علی رحمت نے اپنی اس عہد کی اداکاری اور نغمہ نوازی کی بدولت ملک گیر مقبولیت وشہرت حاصل کی۔ آغا رحمت علی جنھوں نے پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی اپنی ملکیت میں قائم کی تھی بڑے باذوق اور سجیلے فنکار تھے۔ ان کے علاوہ علی اطہر، عباس اور رتنگ چند نے بھی اپنے اپنے زمانے میں دھومیں مچائیں۔ ڈراما نگاروں میں منشی عباس علی، ماسٹر رحمت، ماسٹر قمر، میر غلام عباس، سید دلاور شاہ، ابراہیم محشر، محمد اسمٰعیل، محمد شاہ اور حکیم احمد شجاع خاص تھے۔ یہ حضرات ان مشاہیر میں ہیں جنھوں نے تھیٹر کے قدیم رنگ اور اسلوب کے مطابق اس دور کے خاصے کامیاب ڈرامے لکھے۔ حکیم احمد شجاع نے آخری دور میں قدیم ڈرامے کی بدذوقی کو اپنے اصلاحی رنگ سے بدلنے کی خاصی سعی کی۔ وہ اپنے کو آغا حشر کاشمیری کے خاص تلامذہ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے طرزِ نگارش میں حشر کی رنگ آمیزی وتقلید کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ آغا حشر نے اپنی عمر کا خاصا حصہ لاہور میں بسر کیا۔ تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ کئی بار آئے۔ خود اپنی انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی لے کر سب سے پہلے لاہور پہنچے۔ علاوہ ازیں متعدد بار یہاں آکر مہینوں قیام کیا حتیٰ کہ ان کی محبوب اہلیہ کی وفات یہیں ہوئی اور یہیں دفن ہوئیں۔ آخر خود بھی لاہور ہی میں وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ لاہور کی سرزمین سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ لاہور کے اور بھی کئی اربابِ قلم ڈراما نگاری کی جانب ذوق وشوق سے مائل ہوئے لیکن ان میں سے اکثر کے ڈرامے بوجوہ اسٹیج کی زینت نہ بن سکے۔ کسی کو مالک کمپنی نے تجارتی مصلحت کے خلاف کہہ کر اسے کھیلنے سے پہلوتہی کی اور کوئی کھیلا گیا لیکن مقبول نہ ہو سکا۔ ان حضرات میں قابلِ ذکر ہیں (۱) خان محمد حسین خاں (ایڈیٹر شباب اردو لاہور) مصنف ڈراما "بازارِ حسن" (۲) امتیاز علی مصنف ڈراما "جہانگیر" (ترجمہ ہیملٹ) اور "البرٹ بل" (سیاسی) (۳) سید امتیاز علی تاج مصنف ڈراما "انارکلی" (۴) منشی دوارکا پرشاد افق مصنف "سری رام ناٹک" (۵) لالہ کنور سین مصنف "برہمانند ناٹک" (۶) پنڈت سدرشن مصنف "قوم پرست" "محبت کا انتقام" "عورت کی محبت" وغیرہ۔ دورِ وسطیٰ کے ڈراما نگاروں میں (۱) منشی عباس علی مصنف "گل رُو زرینہ" "جامِ جم" (۲) ماسٹر قمر مصنف "شیریں فرہاد" (۳) میر غلام عباس عباسؔ جنھوں نے تقریباً پچاس ڈرامے لکھے اور ان میں سے اکثر اسٹیج ہو کر مقبولیت اور شہرت کے آسمان پر چمکے۔ ان کے ڈراموں میں اسلامی اور تاریخی ونیم سیاسی رنگ کے ڈرامے سب سے زیادہ مقبول ہوئے خصوصاً (۱) نورجہاں (۲) جہاں آرا (۳) نورِ اسلام (۴) شانِ رحمت (۵) دارالاسلام (۶) پنجاب میل (۷) شرمیلی مجری (۸) لیڈی لاجونتی (۹) موہنی بی اے (۱۰) شاہی فرمان ـــ

(۷) ماسٹر رحمت علی رحمت۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر ان کی اپنی اداکاری اور نغمہ نوازی کی بدولت قبولیتِ عام کے مالک ہوئے۔ ان میں خصوصیت سے (۱) دردِ جگر (۲) باوفا قاتل (۳) تصویرِ رحمت زیادہ مشہور رہیں۔ حکیم احمد شجاع نے متعدد ڈرامے لکھے لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور "باپ کا گناہ" ہوا۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے تین بنگالی ڈراموں کے ترجمے بھی پیش کیے (۱) مینا (۲) منتوش (۳) تارا ـــ

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے زندہ دلانِ لاہور کا ذوقِ فنونِ لطیفہ کے سلسلہ میں مسلّم ہے چنانچہ یہاں ابتدائی دور سے آخر تک جہاں اچھی کمپنیوں کو ان کے کمالِ فن کی معقول داد ملی وہاں اکثر معمولی درجہ کی کمپنیاں ذوقِ بلند کی تاب نہ لا کر یہیں دفن بھی ہوئیں۔ آخری

دور میں کلکتہ کی اسٹیج و فلم کی مشہور فنکار جہاں آرا کجن اپنی ذاتی تھیٹر کمپنی "جہاں آرا تھیٹریکل کمپنی" کے نام سے لاہور میں لے کر آئیں اور بڑے اہتمام سے پہلی بار اس جدت کو ملحوظ رکھ کر قدیم ڈرامے اسٹیج کیے کہ ان کی طوالت و قدامت کو کم کر کے صرف دو گھنٹے میں کھیلے جائیں۔ اس کمپنی پر زر کثیر صرف ہوا۔ انتہائی محنت و کاوش کی گئی لیکن اداکاری کے فرسودہ و روایتی انداز کو لاہور کے ارباب ذوق نے قبول نہ کیا۔ آخر اس کمپنی کا جنازہ ہی نکلا — یہی حشر اور کئی ادنیٰ کمپنیوں کا ہوا لیکن اس سے پہلے میرٹھ کی بیاکل بھارت تھیٹریکل کمپنی نے روایتی ڈرامے قدیم انداز ہی میں پیش کیے اور چونکہ ڈرامے اور اداکاری کا انداز معیاری تھا اس کمپنی کے ہر کھیل نے لاہور کے عوام و خواص ہر طبقہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان میں مقبول و کامیاب ترین ڈرامے تھے (۱) چندر گپت (۲) تیغ ستم (۳) گوتم بدھ۔

آخر کار جب رفتہ رفتہ قدیم تھیٹر کا انداز پامال و فرسودہ سمجھا جانے لگا اس دور میں بھاٹی دروازے کے باہر کئی ناٹک منڈلیاں ادنیٰ ساز و سامان اور گھٹیا اداکاروں کے ساتھ پرانے ڈرامے دکھاتی رہیں لیکن ان کا رنگ نہ جما۔ ملک کے دیگر مقامات کی طرح لاہور میں بھی تھیٹر سے بددلی پیدا ہونے لگی اور اسٹیج کی رونق ماند پڑ گئی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران لاہور میں پرانے تھیٹر نے اپنی آخری بہاریں دکھا کر اسٹیج کے چراغ کو گل کر دیا۔ اب ان کی جگہ فلم سازی نے لے لی اور تمام فن کار و باذوق ادیب فلم نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے متعدد فلم کمپنیاں بنیں اور بگڑیں لیکن ان میں مشہور و مقبول ترین فلمی ادارہ سیٹھ دل سکھ پنچولی آنجہانی کا تھا جن کے بلند اخلاق، خوش ذوقی اور معاملہ فہمی نے تمام فلم کاروں اور فلم نگاروں کو ایک مرکز "پنچولی آرٹ پکچرز" میں جمع کر لیا۔

اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بمبئی کی فلمی مرکزیت کی سالمیت اور اعلیٰ کامیابی کو برقرار رکھنے کے ضامن زیادہ تر خاص لاہور اور اس کے مضافات کے فن کار اور اداکار ہی ہوتے۔ چونکہ میرے زیر بحث مضمون کا موضوع صرف تھیٹر ہے۔ اس لیے فلمی سرگرمیوں کی تفصیل نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہے۔ فلمی ہنگامہ آرائی کے دور میں ایک بار سیٹھ پنچولی نے بعض ارباب ذوق کے مشورہ سے لاہور میں تھیٹر کے احیاء کی بھی کوشش کی اور کثیر رقم صرف کر کے دہلی کی ایک تھیٹر کمپنی معہ ساز و سامان اور اہل عملہ کے خرید لائے۔ اس کمپنی کا ایک مشہور و کامیاب کھیل "لیلیٰ مجنوں" بھی تھا جس میں ماسٹر روپ اور   کو خاص مقبولیت حاصل تھی لیکن لاہور کے معیار پر پورا نہ اتر سکا اور ہر ممکن سعی و نقصان کثیر کے باوجود تھیٹر کے قیام میں ناکامی ہوئی۔ گو اب بھی لاہور کی کئی ناٹک منڈلیاں عامیانہ انداز میں پرانی شراب کو نئے پیمانوں میں پیش کر رہی ہیں جن کے نام تک سے باذوق حضرات واقف نہیں اور ان کا کام تھیٹر کے حیلہ سے فلمی گانے اور منتخب قدیم ڈراموں کے مکالمے پیش کر کے منڈیاں (میلے) کمانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد روایتی تھیٹر اور ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔

کالجوں میں

جس زمانہ میں روایتی تھیٹر کی دھوم دھام تھی اس وقت بھی لاہور کے تمام کالجوں بلکہ سکولوں میں منتخب اردو و انگریزی ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے۔ کالجوں کے ڈراموں میں سب سے زیادہ کامیاب گورنمنٹ کالج لاہور کا اسٹیج مانا جاتا تھا اور اس کالج کا سنہری دور وہ تھا جبکہ پروفیسر سوندی پرنسپل کالج، حکیم احمد شجاع، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) اور ان کے رفقا کار ڈرامائی کاریگری میں مصروف تھے۔ ان کے اداکاروں میں سید امتیاز علی تاج جیسے فن کار شامل تھے۔ اسٹیج کے نت نئے تجربے کیے جاتے۔ شان و اہتمام سے ڈرامے چھپتے اور لکھے جاتے۔ ان ڈراموں میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے تراجم کے ساتھ آغا حشر کاشمیری کے چند منتخب ڈرامے بھی شامل ہوتے۔ پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم اور رفیع پیرزادہ بھی ان کارپردازوں میں نمایاں تھے۔

اس کے بعد دیال سنگھ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے مدارج بھی قابلِ ذکر تھے۔ پروفیسر خادم محی الدین کا نام بھی ہدایت کاری، ڈراما نگاری میں لائقِ فراموش نہیں۔ پروفیسر سوندی کے ڈرامائی کارناموں میں ایک زندہ یادگار لارنس باغ (باغِ جناح) کا اوپن ائیر تھیٹر ہے جس کی تعمیر میں ان کی تجویز و سعیٔ بلیغ خاص طور پر شامل تھی۔ جی چاہتا ہے کہ اس عہد کی اسٹیجی سرگرمیوں کا تذکرہ شرح و بسط سے کیا جائے لیکن تنگیٔ دامانی سے معذور ہوں۔ افسوس کہ رفتہ رفتہ گورنمنٹ کالج اور دوسرے کالجوں کی ڈرامائی سرگرمیوں کا عروج بھی زوال پذیر ہوتا گیا اور ایک زمانہ وہ آیا کہ لاہور میں اہلِ لاہور تھیٹر اور اسٹیج کے نام کو ترسنے لگے اور پرانی یادوں کے سہارے اس عہد کے چرچوں ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی محفل میں ڈراما اور تھیٹر کے ذکر آ جاتے تو قدیم اسٹیج کی ہنگامہ آرائیوں کو یاد کر کے چٹخارے لیتے یا پھر گورنمنٹ کالج کی بزم آرائیوں کا مزے لے لے کر ذکر کرتے۔

پاکستان — جدید دور

درحقیقت آغا حشر مرحوم کے ساتھ قدیم تھیٹر تو دفن ہی ہو چکا تھا۔ پروفیسر پطرس کے محکمۂ نشریات کی نظامت سنبھالنے کے بعد گورنمنٹ کالج کی ڈرامائی سرگرمیوں میں وہ جوش و ولولہ نہ رہا۔ گو ان کے ساتھیوں نے بعد میں اس سلسلہ کو جاری رکھا لیکن ان میں سے اکثر حضرات اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب اور کچھ کالج سے فراغت حاصل کر کے سبکدوش ہو چکے تھے اس لیے ایک مدت تک لاہور کی دنیائے تھیٹر میں سکوت و جمود رہا۔ کچھ سیاسی سرگرمیوں کی شدت نے بھی ڈرامے کا بازار سرد کر رکھا تھا البتہ آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد نشری ڈراموں کا نیا سلسلہ شروع ہوا اور ریڈیو کے ذریعہ ہوائی لہروں پر ایک نیا اسٹیج جو کلیتاً سماعی و قیاسی تھا وجود میں آیا۔ اس سے کم از کم ڈرامے کا نام لوگوں کی زبان پر پھر آنے لگا۔ لاہور ریڈیو کے اربابِ بست و کشاد میں گورنمنٹ کالج کے بعض ذی ہوش فارغ التحصیل طلباء قدیم اور چند نئے اساتذہ شریک تھے اور پھر مرکزی قیادت پطرس بخاری کے ہاتھ میں تھی۔ یار لوگوں نے ہر مقامی اسٹیشن کو ڈرامائی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا۔ لاہور میں آغا بشیر احمد (موجودہ ریجنل ڈائرکٹر) ڈراما انچارج تھے۔ انھوں نے سید امتیاز علی تاج، رفیع پیرزادہ اور سید عابد علی عابد و دیگر اہلِ ادب و فن کی اعانت حاصل کر لی۔ نئے نئے خیالات اور نشری تجربات سے انھیں اکسایا۔ نشری محفل گرم ہوئی۔ ڈرامے کا جال بچھ گیا لیکن "مولوی مدن" کی سی بات کہاں! اسٹیج سونا ہی رہا۔ نشری ڈرامے کے تقاضے اسٹیج سے مختلف تھے۔ یہ ایکانکی ڈرامے کی ایک مخصوص قسم سمجھنا چاہیے جسے آنکھوں سے سنا اور کانوں سے دیکھا جاتا ہے۔

بہر حال ڈراما تو شروع ہوا اور ریڈیو لاہور اسٹیشن کو یکے بعد دیگرے اراکین میں ڈرامے کے اربابِ فن میسر آتے رہے جن میں خصوصیت سے ملک حبیب احمد، محمود نظامی مرحوم، حفیظ جاوید، میاں لطیف الرحمٰن، ایس اے حمید، ابو سعید قریشی، ملک نسیم الظفر اور شوکت تھانوی و اشفاق احمد وغیرہ شامل تھے۔ میرا تعلق بھی ۱۹۴۷ء سے تا حال کسی نہ کسی حیثیت سے رہا۔ گو تبادلہ کی کشاکش کے سبب دوسرے مقامات پر جاتا رہا لیکن پھر پھر کر لاہور دوسرے تیسرے سال ضرور آیا اور کئی کئی سال رہا اور لاہور کے ڈرامائی ہنگاموں میں شریک رہا۔ کتابی ڈراما ادبی رسائل نے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جن میں سے اکثر اسکولوں اور کالجوں میں سالانہ اسٹیج ہوتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی چند سال تو قومی و ملکی تشکیل کے جدید مسائل و مشکلات سے دوچار رہے اس لیے اربابِ فکر اسٹیج کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کے احیاء کی باکار تدبیر نہ کر سکے۔ چند اربابِ علم و ادب نے پاکستان آرٹ کونسل قائم کی۔ اس کے بانیوں میں آغا بشیر احمد، فیض احمد فیض، خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تصدق حسین خالد وغیرہم تھے اور صدارت جسٹس ایس اے رحمان کے سپرد تھی جو اب تک قائم ہے۔ سید امتیاز علی تاج کونسل کے جنرل سکریٹری تھے اور آفس سکریٹری خلیل صحافی مقرر ہوئے جنھوں نے دوسری فنی سرگرمیوں کے ساتھ

اسٹیج کو از سرِ نو زندہ کرنے کی سعیِ بلیغ کی لیکن حالات نے پوری طرح ساتھ نہ دیا تاہم خلیل صحافی اپنی سی بہت کچھ کرتے رہے اور دوسری ثقافتی مجالس کے ساتھ کبھی کبھی مفت کا ڈراما بھی دیکھنے میں آتا رہا ——— میں نے ملک حبیب احمد اور سید امتیاز علی تاج و شوکت تھانوی وغیرہ احباب کے ساتھ مل کر تھیٹر گروپ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لائحہ عمل مرتب ہوا۔ لاہور کے تمام تھیٹر ہال سینما گھر بن چکے تھے، کوئی اسٹیج موجود نہ تھا، ڈراما کھیلیں تو کہاں؟ تاج صاحب نے ڈرامے کے فقدان کا حل تو اس طرح تلاش کر لیا کہ آغا حشر کے چند مشہور اور جاندار ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کر کے انھیں جدید لوازمات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسٹیج کی تلاش میں محکمۂ بحالیات سے رجوع کیا گیا، شہر کے قدیم مشہور تھیٹر بریڈلا ہال کی طرف نظریں دوڑائی گئیں۔ حکومت کے ذمہ دار اراکین کو آمادہ کر لیا گیا کہ یہ ہال جدید ڈرامائی سرگرمیوں کے لیے خالی کرا دیا جائے۔ محکمۂ بحالیات کے حکام نے ہمدردانہ غور کے بعد میکلوڈ روڈ کا سٹی اسٹوڈیو (جو شوری اسٹوڈیو کے نام سے بھی مشہور ہے) اس کام کے لیے الاٹ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں اور تاج صاحب دوڑے دوڑے گئے قفل کھلوایا اور اس ہال کا جائزہ لیا گیا لیکن بات بنتی نظر نہ آئی۔ بریڈلا ہال کا معاملہ بھی کچھ ہمارے تذبذب اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر التوا میں پڑ گیا اور تھیٹر گروپ کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ اس دوران میں نفیس خلیل نے ایک گروپ بنا کر اسلامی ڈراما "بت شکن" کھیلا جس میں قدیم اسٹیج کے کارکنوں کے علاوہ چند نئے اداکار بھی شامل تھے جن میں آج کل کی مشہور فلم اسٹار صبیحہ خانم پہلی بار اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ اس کے بعد میں نے آغا حشر کے ڈراما "رستم و سہراب" کی جدید مختصر تشکیل کی اور صبیحہ خانم، ایوب رومانی، اقبال شیخ، غلام محمد مرحوم، آغا پیر جان، سلطان علی کھوسٹ اور دوسرے فنکاروں کے ساتھ اسے کھیلنے کی تیاری شروع کی۔ اسی زمانہ میں (ریہرسل مکمل نہ ہونے پائی تھی) میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ اس دوران میں ریڈیو کے فنکاروں نے مل جل کر یکے بعد دیگرے کئی ڈرامائی پروگرام پیش کیے۔ ان میں قابلِ ذکر "مرزا غالب کی بیوی" "کیا کریگا قاضی" "نوکروں کا جلسہ" و دیگر ڈرامے تھے اول الذکر ڈراما لاہور کی مجلسِ خواتین (اپوا) کے زیرِ اہتمام کھیلا گیا جس میں مرزا غالب کا کردار شوکت تھانوی نے ادا کیا اور "بیوی" کا کردار شمیم بیگم کے سپرد تھا۔ دوسرا ڈراما راجہ فاروق علی خاں (ریڈیو کے بھائی جان) کی ایک نثری تمثیل تھی جو انہی کی زیرِ ہدایت اسٹیج ہوئی۔ اس کے نمایاں کرداروں میں مشہور فلم اسٹار بیگم پروین اور قدیم اسٹیج فلم و ریڈیو کے مقبول فنکار محمد حسین مرحوم تھے۔ خلیل صحافی پاکستان الحمرا آرٹ کونسل کو زندہ رکھنے کی خاطر کبھی کبھار کسی گروپ کو جمع کر کے کوئی کھیل کرا دیتے یا گورنمنٹ کالج میں سال کے سال دوسرے کالجوں کی طرح کی انگریزی تمثیل کا ترجمہ پیش کر دیا جاتا۔ اس عرصہ میں اسکولوں اور کالجوں کے ڈرامائی پروگراموں میں زیادہ تر نثری تمثیلات کھیلی جانے لگیں جنھیں اسٹیج کی ضروریات کے پیشِ نظر قطع و برید کر کے کھیل لیا جاتا۔ قابلِ ذکر ڈراموں میں دیال سنگھ کالج کے اسٹیج پر ایوب رومانی کی نگرانی میں سید عابد علی عابد کا ڈراما "روپ متی باز بہادر" بھی تھا جس میں "روپ متی" کا کردار ریڈیو کی مشہور فنکار موہنی حمید نے ادا کیا۔ گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور اردو کے ملے جلے ڈرامائی پروگرام سال کے سال جاری رہے، ان میں صوفی غلام مصطفٰے تبسم کا "ساون رین کا سپنا" (شیکسپیئر کے "MID SUMMER NIGHT DREAM" کا ترجمہ) سید امتیاز علی تاج کے چند ریڈیائی ڈرامے اور "گورنمنٹ انسپکٹر" خاص تھے۔ ان کے علاوہ چند انگریزی کھیل انگریزی ڈرامیٹک گروپ نے کھیلے۔ ان اردو و انگریزی سب ڈراموں کے اداکاروں میں صفدر میر، اسکندر شاہین، صوفی وقار، سمیع احمد، خالد سعید بٹ، افضل کمال، شاہد عزیز، نعیم طاہر، سمیعہ عزیز، ماہ وسیم، سکندر اقبال، انور عظیم خاص تھے۔

۱۹۵۴ء تک لاہور کے مختلف تھیٹر گروپ بنتے بگڑتے رہے۔ ریلوے اسٹاف کے کارکنان اور گورنمنٹ پریس کے

اہلکاروں نے علیحدہ علیحدہ تھیٹر کلب قائم کرکے اپنے اپنے اسٹیج پر چھوٹے بڑے کئی ڈرامے کھیلے۔ گورنمنٹ پریس کے ڈراما کلب کی روح و رواں علی امام صاحب تھے اور ان کی سرکردگی میں اس کلب نے کئی طبعزاد اور ترجمے خاصے پیش کیے لیکن اداکاری اور ہدایت پر دقیانوسی انداز نمایاں تھا۔

الحمرا آرٹ کونسل نے اپنی نئی تنظیم کی اور علیحدہ علیحدہ چند سب کمیٹیاں بنا کر ثقافتی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ صفدر میر کی زیر ہدایت سید امتیاز علی تاج کا ایک قدیم نشری ڈراما "میری جان کس نے لی" (ترجمہ WHO KILLED ME) "میرا قاتل" کے نام سے اور ایک انگریزی کومیڈی "بوکس اینڈ کوکس" کی اردو تشکیل کھیلے گئے۔ پھر علی احمد نے ایک انگریزی کھیل کا چربہ "ذات شریف" پیش کیا۔ اظہار کاظمی نے جے بی پریسٹلے کے ڈرامے "این انسپکٹر کالز" کو "مجرم کون؟" کے نام سے اردو میں منتقل کرکے الحمرا تھیٹر گروپ کی شرکت سے کھیلا۔ تینوں کھیل اپنی اپنی جگہ خاصے تھے لیکن "مجرم کون" اظہار صاحب کی محنت، جانفشانی اور ہوشمند تدبیر کاری کا زیادہ کامیاب نمونہ تھا اس لیے اس نے تماشائیوں کو اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور اس نے خاصا رش لیا۔ متذکرہ بالا ڈراموں میں کام کرنے والوں میں الحمرا ڈراما گروپ کے فنکاروں نے کام کیا جن میں صفدر میر، یاسمین امتیاز علی، سکندر شاہین، وقار صوفی، اظہار کاظمی، خورشید شاہد، خالد بٹ، کاسیہ، نعیم طاہر وغیرہ نمایاں رہے۔ علی احمد کا اپنا ڈراما گروپ بھی "تھیٹر سنٹر" کے نام سے تھا اس میں محسن رضوی، نذیر ضیغم، شاہد عزیز، کامیداد وغیرہ نمائندہ فن کار تھے۔ اب تک کوئی تھیٹر گروپ اس لحاظ سے باضابطہ طور پر منظم نہیں ہو سکا تھا جس نے تھیٹر کے احیاء کا بیڑا اٹھایا ہو۔ کئی گروپ غیر منظم طور پر اپنی اپنی جگہ چند نئے شوقیہ اور قدیم فنکاروں کو اکٹھا کرکے انگریزی کھیلوں کے تراجم پیش کرتے رہے تاہم ان نئے اداکاروں نے پورے حوصلہ و ہمت سے کام لیا۔

اس دوران میں ۱۹۵۵ء میں فلم، ریڈیو اور اسٹیج کے چند فنکاروں نے ایک باقاعدہ ادارے کی تنظیم کا بیڑا اٹھایا اور میری نگرانی میں انٹر تھیٹر اکاڈمی قائم کی جس نے رجسٹرڈ تھیٹر گروپ کی حیثیت سے تشکیل پائی۔ اس کے اراکین میں محمود نظامی مرحوم، حمید چوہدری، صفدر علی، سعید نقوی، اقبال شیخ، محمد حسین مرحوم، ناصرہ خانم، سلمیٰ ممتاز، سمیعہ ناز، آغا حامد رضا، نذیر حسین، قمر چوہدری، عطیہ کوثر، نجمی، اسلم چوہدری وغیرہ شامل تھے۔ پہلا ڈراما آغا حشر کاشمیری کا "رستم و سہراب" نئی تشکیل سے میری ہدایات کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال میں کھیلا گیا جس نے اسٹیج کی تنگ دامانی کے باوجود اپنی استادانہ تدبیر کاری اور رفتار رانہ عمل و حرکت کے سبب نمایاں کامیابی حاصل کی اور دو ہفتے تک عوام و خواص ذوق و شوق سے دیکھتے رہے مگر وائی ایم سی اے کی اپنی سرگرمیوں کے سبب ہال چھوڑنا پڑا اور شائقین کی مانگ پوری نہ کی جا سکی۔ اسی دوران میں روسی اکابرین کا ایک وفد لاہور میں آیا ہوا تھا۔ محکمہ اطلاعات سامر کی دعوت خاص پر وفد کے تمام اراکین نے یہ ڈراما دیکھا اور زبان سمجھے بغیر اداکاری سے متاثر ہو کر بے حد سراہا۔ اس ادارہ نے دوسرا کھیل آغا حشر کا "اچھوتا دامن" نئے انداز میں پیش کیا جسے سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اس نے بھی خاصی قبولیت حاصل کی۔

تھیٹر کے احیاء کے سلسلہ میں اہل لاہور کو سب سے بڑی دشواری اسٹیج کی ناپیدگی ہے۔ الحمرا آرٹ کونسل کو مختصر و محدود ہال ہونے کے باوجود کم سے کم اس دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ باقی دوسرے ادارے جو ڈرامائی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ان کی راہ میں سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ مانگے کے اسٹیج سے کام چلاتیں ——— اور چونکہ کوئی باقاعدہ تھیٹر ہال شہر بھر میں موجود نہیں۔ لے دے کے وائی ایم سی اے یا ریلوے برٹ انسٹی ٹیوٹ چند دنوں کے لیے عارضتاً حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ان دونوں مقامات کو حاصل کرنا بھی دشوار امر ہے۔ پھر حصول کے بعد ان کی اپنی مصروفیات کے پیشِ نظر ریہرسلوں وغیرہ میں بھی آسانیاں میسر نہیں۔ چنانچہ کئی اور ادارے ایکمی تھیٹر، راوی آرٹ سرکل وغیرہ قائم ہوئے۔ انھوں نے الحمرا آرٹ کونسل کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے کئی کھیل کھیلے۔ تھیٹر کی ہمت افزائی کے لیے تاج صاحب اور سابق آفس سیکرٹری خلیل صحافی صاحب نے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ آخر یہ ادارے اپنی مساعی میں ناکام ہو گئے۔ علی احمد اپنے تھیٹر سنٹر کا نام لے کر کراچی سدھارے اور وہاں پاکستان آرٹ کونسل کے تعاون سے اپنے پرانے اور نئے کھیل کرنے میں یہاں سے زیادہ کامیاب ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسٹار تھیٹر کو بھی اسٹیج کی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ الحمرا آرٹ کونسل کے اسٹیج پر بیک وقت اس ادارہ نے تین طبعزاد نئے کھیل جدید اور مختصر انداز میں پیش کیے۔ ان میں سعادت حسن منٹو مرحوم کا مزاحیہ کھیل "خودکشی"، مرزا ادیب کا "حملہ" (الجزائر) اور میرا ایک غنائیہ "عمر خیام" شامل تھے۔ آرٹ کونسل کی نئی تنظیم درپیش تھی۔ ہال بے حال ہو رہا تھا۔ سخت دشواری سے اسٹیج حاصل ہوا۔ ریہرسلوں میں مشکلات حائل رہیں لیکن یہ تینوں کھیل اداکاری اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے عوام و خواص میں مقبول ہوئے اور اسٹار تھیٹر نے روایتی دور سے شروع کر کے جدید انداز کا آغاز کر دیا۔ بعض جانب دار حضرات نے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے نہایت بیباکی مگر ناانصافی کے انداز میں اپنے دو ایک مضامین میں جہاں خود ستائی کا طور اختیار کیا وہاں اسٹار تھیٹر کا ذکر اس طریقہ سے کیا ہے کہ جیسے ان کی غیر حاضری یا بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اس ادارہ نے پوشیدہ طور پر دو ایک کھیل کھیل ڈالے اور اس طرح گویا ان کی حق تلفی ہوئی ورنہ اس میدان کے واحد اجارہ دار تو وہی ہیں اور شاید اسی نفسانفسی کے سبب لاہور میں اب تک باضابطہ و منظم طور پر تھیٹر کا احیاء و عروج ممکن نہ ہو سکا حالانکہ فن کسی ذاتِ واحد یا کسی ایک ادارے کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ یہ قومی فرض ہے اور ہر اہلِ فکر و فن کا اس کی ادائیگی پر مساوی حق ہے۔ پاکستان میں تھیٹر کا وجود نہ تھا ضرورت تھی کہ اربابِ فن سر جوڑ کر اس کے احیاء اور ترقی کے لیے لائحہ عمل تیار کرتے اور غور و خوض کے بعد مشترکہ طور پر عملی قدم اٹھاتے ابتدا میں ہر کام میں خامیاں اور کمیاں ہوتی ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے صرف ہمت اور کام کی داد دی جاتی ہے۔ اسی طرح لاہور میں جو نئے نوجوان ڈراما اور تھیٹر کی توسیع و اشاعت کے لیے کوشاں ہوتے یا ہیں ان کو ماہرینِ فن سے رجوع کر کے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی اور ماہرینِ فن کو ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی ——

دوسروں کے کام پر جلنے کڑھنے اور تخریبی پہلو نکالنے میں جو بے جا غور و فکر اور وقت کا اصراف ہوتا ہے اگر اسے صرف تعمیر ہی میں صرف کیا جاتا رہے تو یقیناً نتائج بہتر نکلیں —— لیکن ابتدا سے نئے شوقیہ کام کرنے والوں کا عام رجحان یہ رہا ہے کہ تعمیر سے زیادہ اپنی تعریف میں رطب اللسان رہے اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے مصداق اپنوں اپنوں کے چھوٹے سے کام کا بھی بڑا نام بنانے کی کوشش کرتے اور دوسروں کی اچھائی میں بھی انھیں خواہ مخواہ برائی کے پہلو نظر آتے غالباً اس لیے کہ ان کی اجارہ داری میں فرق نہ آ جائے —— مظفر علی سید نے اپنے ایک مقالہ میں "لاہور کے ڈراموں" کا ذکر کرتے ہوئے معقول بات کہی کہ "لاہور ترجموں کا مخزن بن گیا۔ بڑے بڑے جغادری اہلِ فن ڈراما نگار ہونے کے باوجود یہاں مدت سے کوئی طبعزاد ڈراما پیش نہ کیا جا سکا۔" مگر صرف الحمرا آرٹ کونسل کے ڈراموں پر اس امر کا اطلاق ہوتا ہے جہاں صرف ایک ہی نمونے کینڈے کے تراجم پیش کیے گئے۔ برخلاف اس کے دیگر اداروں کے کھیلوں میں طبعزاد اور ترجمے دونوں قسم کے موجود ہیں

اور ان میں رنگا رنگی اور تنوع بھی پایا جاتا ہے خصوصاً اسٹار تھیٹر کے ڈراموں میں مختصر مدت میں قدیم و جدید دونوں رنگ کے ڈرامے اسٹیج کیے گئے اس کے علاوہ ان میں ٹریجڈی، کومیڈی، غنائیہ ہر نوع کی چیزیں شامل رہیں اور نئی نئے تجربے کیے گئے۔ علی احمد گروپ نے بھی تنوع کو مدِ نظر رکھا۔ نوجوان فنکاروں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ضیاء محی الدین کی کوشش ہے جنھوں نے اپنے قیامِ لاہور کے دوران چند ڈرامے پیش کیے لیکن چونکہ ان کے کام میں خلوص اور فنی مہارت کو پورا دخل تھا۔ ان کی سنجیدہ مساعی قابلِ قدر ثابت ہوئیں۔ ان کی سب سے پہلی پیش کش "لال قلعے سے لالوکھیت تک" تھی جسے کراچی آرٹسٹ کی ٹیم کے ساتھ لے کر آئے اور پاکستان آرٹ کونسل کراچی کی طرف سے لاہور کے برٹ انسٹی ٹیوٹ میں اسٹیج کیا۔ گو ڈرامے فنی چابکدستی اور تدبر کاری کا کوئی اچھا نمونہ نہ تھا لیکن ہدایت کاری نے حرکت و عمل اور موزوں و مناسب روشنی کے امتزاج سے کامیاب بنایا۔ پاکستان میں یہ پہلا ڈرامائی تجربہ تھا جو موسیقی اور سازندوں کے بغیر پیش کیا گیا اور اس کی اداکاری کی مضبوط گرفت نے ناظرین کو خاصا متاثر کیا۔ کچھ عرصہ بعد ضیاء نے گورنمنٹ کالج لاہور کے اسٹیج پر شیکسپیئر کے انگریزی ڈراما "جولیس سیزر" کا کامیاب اردو ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ حفیظ جاوید کی اعلیٰ سعی و کاوش کا نتیجہ تھا اور اداکاروں میں ضیا، حفیظ جہاں، خورشید شاہد و دوسرے فنکار شریک تھے۔ اس ڈرامے میں کمال احمد رضوی پہلی بار اسٹیج پر اداکار کے روپ میں نمودار ہوئے۔ ضیاء محی الدین نے اس کے بعد الحمرا آرٹ کونسل اور گورنمنٹ کالج میں دو انگریزی کھیل گورنمنٹ کالج کے ہونہار طلبا کی اداکاری میں خوبی سے پیش کیے اور انھیں بعد میں کراچی بھی لے جا کر اسٹیج کیا جنھوں نے دونوں جگہ مقبولیت حاصل کی۔ الحمرا کے اسٹیج پر کمال احمد رضوی نے الحمرا آرٹ کونسل کے چند احباب کے ساتھ کئی مختصر ایکانکی کھیل اسٹیج کیے۔ ان میں سعادت حسن منٹو کے افسانہ کی ڈرامائی تشکیل "ایک دن کی بادشاہت" اوپندر ناتھ اشک کا کھیل "صبح و شام" اور آغا شرف بٹ کا "چھوٹے میاں" شامل تھے۔ افسوس کہ ہمارے ماہرینِ فن حضرات نے ڈرامائی پیشکش میں کوئی قابلِ ذکر عملی حصہ نہ لیا۔ سب سے زیادہ توقعات حکیم احمد شجاع، رفیع پیرزادہ اور سید امتیاز علی تاج حضرات سے وابستہ تھیں۔ رفیع پیرزادہ نے کسی حد تک سرگرمی دکھائی اور چند تجربہ کار فنکاروں کی شرکت سے اپنا مشری ڈرامہ "عقبیٰ کا مہربان" اپنی ماہرانہ خوبیوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس میں پیرزادہ صاحب نے خود بھی کام کیا اور صفدر میر اور دوسرے ماہر فنکاروں اور نئے اداکاروں نے قابلِ تعریف کام کیا۔ ضرورت تھی کہ پیر صاحب اپنی نگرانی میں چند معقول ڈرامے سنجیدگی سے اسٹیج کرتے ورنہ نئے نوخیز اداکاروں کو ان سے کچھ سیکھنے کا موقع ملتا۔ شاید ان کے لیے اسٹیج کی دشواری حائل رہی، اور اسی کام کی توقع سید امتیاز علی تاج سے بھی کی جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ پاکستان اور خصوصاً لاہور میں ڈرامائی ذوق کی تربیت ہوتی رہی۔ الحمرا آرٹ کونسل کی جدید تنظیم عمل میں آئی اور فیض احمد فیض اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ماتحت ثقافتی سرگرمیوں کے لیے کئی سب کمیٹیاں بنائیں۔ اس میں (۱) ڈراما کمیٹی (۲) میوزک کمیٹی (۳) فلم کمیٹی (۴) لٹریری کمیٹی، اور (۵) آرٹ پینٹنگ کمیٹی خاص تھیں۔ لٹریری کمیٹی تو برائے نام ہی رہی باقی کمیٹیوں کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مخصوص انداز سے کام کرنے کا موقع ملتا رہا اور آرٹ کونسل پہلے سے کہیں زیادہ سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ پیرزادہ صاحب اور کمال رضوی کے علاوہ صفدر میر کی زیرِ ہدایت "انگوٹھا کا کھیل" نہایت عمدگی اور صفائی سے اسٹیج کیا گیا۔ نعیم طاہر جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں گورنمنٹ کالج میں اداکاری کا تجربہ حاصل کرتے رہے تھے اور ریڈیائی ڈراموں میں بھی حصہ لیتے رہے تھے آرٹ کونسل میں ایک ڈراما گروپ مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس گروپ میں نعیم طاہر،

سکندر شاہین، شعیب ہاشمی، یاسمین امتیاز علی، وقار صوفی، پیرزادہ خورشید شاہد، طارق حمید، کمال احمد رضوی، میمونہ ایوب خاص اداکار تھے۔ نعیم طاہر نے اپنی زیرِ ہدایت انگریزی کھیل "SHE STOOPED TO CONQUERE" کا ترجمہ "آداب عرض" کے نام سے کیا جو یاسمین امتیاز علی اور نعیم طاہر کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھا۔ الحمرا کا مختصر ہال تماشائیوں سے کئی راتیں بھرا نظر آتا رہا اور لوگوں نے ذوق و شوق سے دیکھا۔ نعیم طاہر ہونہار ذہنی نوجوان ہیں اور طالب علمی کے زمانہ سے ڈرامائی سرگرمیوں سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اسی طرح سکندر شاہین اور شعیب ہاشمی ذوق و شوق سے مصروفِ عمل رہے ہیں۔ ان کی سعی و کوشش میں فنکارانہ خلوص اور حوصلہ و ہمت ہے۔ نعیم طاہر کو ہدایتکاری کا جو موقع ملا خوش قسمتی سے انھیں مخلص فنکاروں کی اعانت میسر آگئی۔ یاسمین امتیاز علی کے قلمی و عملی اشتراک اور تاج صاحب کی ماہرانہ سرپرستی اور فنی مشاورت نے ان کی صلاحیتوں کو جلا دی۔ اگر وہ صرف فنی خلوص سے کام میں مصروف رہتے تو یقیناً جید نتائج پیش کرتے۔ لیکن زعمِ باطل نے انھیں معاندانہ اُلجھنوں میں پھنسا دیا ہے تاہم ان سے توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اگر وہ عمل میں خلوص پیدا کریں۔

اسی زمانہ میں محکمۂ تعمیرِ نو کی امداد سے حمید واثق نے اپنے تھیٹر گلڈ کی جانب سے اوپن ائیر تھیٹر میں "تین تین نو" کے عنوان سے تین مختصر ایکانکی کھیل پیش کیے۔ حمید واثق اپنے جدید ڈرامائی مطالعہ اور پُرخلوص فنی وقوف کی بناء پر ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور کراچی میں تھیٹر گلڈ قائم کر کے کئی اُردو و انگریزی ڈرامے کامیابی سے پیش کر چکے ہیں۔ اس پیشکش میں حصہ لینے والے نذیر ضیغم، سکندر شاہین، شاہد، نسرین، فرخ بسمل، سمیعہ ناز، کمال احمد رضوی تھے اور سب سے زیادہ داد اصغر بٹ کے مزاحیہ کھیل "شغل خیری" کو ملی "تین تین نو" نے اوپن ائیر تھیٹر کے وسیع میدان میں خاصا رش لیا اور تین راتیں چلا۔

اس کے بعد حمید شیخ نے اپنے مخصوص ڈرامائی ذوق کی رعایت سے سرکاری امداد کے ساتھ "لاہور پلے ہاؤس" کا اوپن ائیر تھیٹر میں اجرا کیا اور مختلف اداکاروں کی ٹیم کے علاوہ تین چار ہدایت کار بھی شریک کیے ——— پہلا ڈراما آسکر وائلڈ کا شاہکار "سلومی" منتخب ہوا جسے اُردو میں کمال احمد رضوی نے ترجمہ کیا۔ اس ڈرامے کا ترجمہ "دخترِ بابل" کے نام سے محمود نظامی مرحوم بھی کر چکے تھے اور آل انڈیا ریڈیو و ریڈیو پاکستان کے متعدد اسٹیشنوں سے بار بار نشر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم اور رشید انعام ناصری کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ رضوی صاحب کا ترجمہ ان سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس ڈرامے کی ہدایات پہلے صفیہ ڈین کے سپرد ہوئیں۔ چند سے بعد کمال احمد ریہرسل کراتے رہے اور آخر میں حمید واثق کی نگرانی میں آیا۔ اداکاروں میں خورشید شاہد، حمید واثق، شعیب ہاشمی، کمال احمد، سمیعہ ناز وغیرہ شامل تھے لیکن اسی زمانہ میں نعیم طاہر نے یاسمین امتیاز علی کے اشتراک سے "ویسٹ اینڈ" کا ایک ترجمہ "سوتے کہاں" کے نام سے اور تیار کیا اور اس کی ریہرسل شروع کی۔ شعیب ہاشمی اور خورشید شاہد ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ الحمرا تھیٹر گروپ نے اپنی کاسٹ میں کچھ تبدیلیاں کیں، سکندر شاہین اور کمال احمد کا تعلق اس گروپ سے منقطع ہو گیا، "سلومی" اداکاروں کے بکھر جانے سے ادھورا رہ گیا اور اس گروپ کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ "سوتے کہاں" کئی ہفتوں کی مسلسل محنت و کوشش سے تیار ہوتا رہا۔ اس کے اداکاروں میں یاسمین، سلیمہ فیض، نعیم طاہر، شعیب ہاشمی، خورشید شاہد، طارق حمید وغیرہ کام کر رہے تھے۔

اس ڈرامے میں اصل سے قطع نظر پلاٹ میں چند تبدیلیاں بھی کی گئیں جن میں ایک "مولانا" کا کردار اخلاقیات کے طالب علم کی حیثیت سے نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا۔ "مولانا" کو نہایت بیوقوف قسم کا آدمی دکھایا گیا جو اخلاق کے پردے میں اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کرتا ہے اور عوام کو بے سمجھے خواہ مخواہ ہنسنے کا بہانہ ملتا ہے۔ یہ کردار نعیم طاہر نے خوبی سے ادا کیا۔ غالباً انھوں نے

یہ رول اپنے ہی لیے لکھا تھا۔ باقی ڈرامے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تذبذب اور عروج کے بغیر سپاٹ سا کھیل تھا جو آخر میں غیر متوقع طور پر یونہی ختم ہو جاتا ہے لیکن سلیمہ فیض نے بوڑھی اور بوڑھی عورت کا کردار اس خوبی اور کامیابی سے ادا کیا جو سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ لیکن اصل مسودے میں اس کی کمزوری اور ہدایت کی خامی نے پوری طرح اُبھرنے نہ دیا ورنہ اگر اس کردار کو معقولیت سے اُبھارا جاتا تو ڈرامے کی جان ہوتا اور کلائمکس میں اس سے بڑی مدد ملتی ——— تاہم بحالتِ موجودہ اس ننھی اداکارہ نے مختصر مدت اور محدود دائرہ میں بہت کچھ کر دکھایا۔

اگست ۱۹۶۱ء میں لاہور پلے ہاؤس (اوپن ائیر) کی نئی تنظیم کا از سرِ نو منصوبہ تیار کیا گیا۔ خلیل صحافی سابق سیکرٹری الحمرا آرٹ کونسل نے شہر کے مختلف تھیٹر گروپ اور اربابِ فن کو جمع کر کے ایک نمائندہ مرکز بنانے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ غور و فکر کے بعد ایک لائحہ عمل تیار ہو گیا ——— میں نے اسٹار تھیٹر اکاڈمی کے اراکین کو اس تجویز پر متوجہ کیا اور ہم چند دیوانوں نے مل کر اس تنظیم کی تکمیل کے سامان کیے۔ میرا ایک قدیم مسودہ ("براندن تھامس" کے شہرۂ آفاق کومیڈی "چارلیز آنٹ" کا ترجمہ) آغازِ کار کے لیے چُنا گیا جسے میں نے از سرِ نو جدید ضروریات اور تقاضوں کے ماتحت مرتب کیا اور ریہرسل شروع کر دی۔ اداکاروں میں یمینہ ناز، بلا آٹھا، چاندنی، حمید واتن، کمال احمد رضوی، منیر حسینی، قمر چودھری، کامیدار، پرویز اسلم نیازی شامل تھے۔ میری زیرِ ہدایت ۲۱ اکتوبر کو اوپن ائیر تھیٹر میں یہ ڈراما "ہنسی ہنسی میں" کے نام سے کھیلا گیا اور تکلف برطرف ڈرامے کی منضبط تدبیر کاری، سنجیدہ مزاح اور اداکاروں کی جانفشانی و کاریگری کے سبب اس ڈرامے نے بے پناہ رش لیا۔ ارادہ تھا صرف تین روز کھیلا جائے گا کیونکہ اوپن ائیر کی سیڑھیوں پر دو ہزار سے تین ہزار تک شائقین بیٹھ سکتے ہیں مگر مسلسل ۱۲ اکتوبر تک ڈراما اپنی بے مثال مقبولیت کے سبب چلتا رہا اور مجمع کا یہ عالم تھا کہ بیٹھنے کو جگہ نہ ملے تو کھڑے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بیک وقت تین ہزار شائقین نے روزانہ اس ڈرامے کو ملاحظہ کیا ہے اور جاری رکھنے کا اصرار جاری تھا لیکن اوپن ائیر میں ایک دوسری تقریب الحمرا آرٹ کونسل کی جانب سے ۲۲ اکتوبر سے ہونے والی تھی اس لیے کھیل روکنا پڑا۔ دور دور سے اربابِ ذوق نے آ کر ملاحظہ کیا۔ مقتدر اخبارات نے قابلِ قدر تبصرے اور تعریفیں چھاپیں۔ راولپنڈی، منگلا ڈیم، کراچی اور حیدر آباد سے چند ذمہ دار اداروں نے لاہور پلے ہاؤس کو ڈرامے کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت سن کر مدعو کیا کہ ان مقامات پر جا کر کھیلا جائے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کو پاکستان پولیس کے صد سالہ جشن کی تقریبات کے موقع پر (جس میں اکثر بیرونی ممالک کے معزز مہمان شرکت کے لیے آئے تھے) محکمہ کی خاص فرمائش پر اس ڈرامے کو ضلع پولیس لائن کے وسیع میدان میں شامیانے اور قناتوں کا عظیم ہال و اسٹیج تعمیر کر کے پھر کھیلا گیا۔ اداکاروں میں نذیر ضیغم بھی شریک تھے۔ بیک وقت پانچ ہزار سرکاری و غیر سرکاری مہمان اس ہال میں موجود تھے۔ اسٹیج پر کئی مائیکروفون اور ہال میں لاؤڈ اسپیکر نصب کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ ڈراما پہلے سے بھی زیادہ کامیاب ہوا۔ اکتوبر کے اوائل میں الحمرا آرٹ کونسل میں ایک انگریزی ڈراما اور کئی مختصر ڈرامے دوسرے کالجوں اسکولوں میں بھی کھیلے گئے۔ انگریزی ڈرامے کے ہدایت کار سلمان پیرزادہ لاہور کے ہونہار نوجوان فنکار ہیں۔ انھیں ان کے والد بزرگوار رفیع پیرزادہ کی فن میں خاص تعلیم و تربیت حاصل ہے۔ خوش ذوق اور محنتی ہیں۔ ہدایت اور اداکاری کے علاوہ اسٹیج ڈیزائن کرنے کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا یہ ڈراما "DO YOU REMEMBER" مسلسل دس راتیں چلتا رہا اور ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اہلِ ذوق نے خوب داد دی۔

نعیم طاہر انھی دنوں حسبِ معمول الحمرا گروپ کے لیے یاسمین امتیاز علی کی شرکت میں فلپ کنگ کے ایک خاص ڈارسس ———

"SEE HOW THEY RUN" کو اُردو میں تیار کر رہے تھے۔ شب و روز کی محنت اور لگاتار ریہرسلوں کے بعد یہ کھیل جسے انگریزی میں "FARCICAL FARCE" اور شاید اُردو میں بھٹی یا نقل کہنا مناسب ہوگا، نومبر کے اواخر میں اسٹیج کیا گیا اور غالباً ایک مہینہ کے قریب چلایا گیا۔ اس طرح راتوں کا ریکارڈ قائم ہو گیا گویا تقریباً ۳۰ راتیں چلتا رہا اور اس حساب سے دیکھنے والوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ ہال کی کل نشستوں کے لحاظ سے ساری مدت میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار ہزار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ڈراما کراچی میں پاکستان آرٹ کونسل کے اشتراک سے بھی کئی روز اسی گروپ نے کھیلا اور مقبولیتِ عام حاصل کر کے آیا لیکن اس فارس کو خواہ عوام سے کتنی ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور خواص کے منتخب طبقہ نے بھی پسند کیوں نہ کیا ہو منصفانہ طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے عامیانہ اور مبتذل کھیل تماشے ہمارے جدید ترقی یافتہ اسٹیج کے لیے قطعی موزوں اور مناسب نہیں خصوصاً پاکستان آرٹ کونسل کے شایانِ شان نہیں۔ فلپ کنگ کا اندازِ تحریر دوسرے مختلف زبانوں کے ڈراما نگاروں کی طرح ایک خاص مزاج کا حامل ہے اور اس فارس میں اس نے اپنے ماحول اور مقامی فضا کو مدِ نظر رکھ کر جو کچھ لکھا اور اپنے کرداروں کا جو مزاج بنایا وہ یقیناً ہمارے لیے نامانوس اور اجنبی ہے۔ ڈرامے کا تمام تر ماحول اسی اجنبیت کا اظہار کرتا ہے اور ہماری معاشرت کو یہ باتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں جن کی اس میں کھلم کھلا نمائش کی گئی ہے۔ تماشائیوں کو اگر ہنسی آتی ہے تو تمام کرداروں کی غیر مانوس بدحواسی اور فضول بوکھلاہٹ دیکھ کر، جن کے عمل و حرکت میں کوئی توازن ہے اور نہ معقول تدبیر گری، ہر کردار ایک دوسرے کو بیوقوف سمجھتا یا بناتا ہے اور ایک دوسرے کے تعاقب میں بے مقصد دوڑ لگاتا نظر آتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ تماشائیوں کو یہ دکھانا ہے کہ "دیکھنے! وہ کیسے دوڑتے ہیں"۔ مکالموں کی زبان ابتدا میں تو بڑی حد تک رکیک اور مبتذل تھی۔ چند روز بعد اس میں تبدیلی کی گئی۔ غرض اس ڈراما کا انفرادی اور مجموعی تاثر دونوں سستی تفریح سے آگے نہ بڑھ سکے۔ تفصیلی طور پر فنی خامیوں اور بے ڈھنگے پن کو بیان کرنا طولِ امل ہے۔ کہانی کا عنصر سرے سے مفقود ہے اس لیے اس سے بحث ہی بے کار ہے۔ واقعات کا تانا بانا بے جوڑ حماقت آمیز حد تک عجیب ہے۔ شاید انھیں حماقتوں پر لوگوں کو بے اختیار ہنسی آتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ حد سے زیادہ کھلے تفنن کے طور پر دیکھنے کی چیز تھی باقی ڈرامائی کیفیت کشمکش اور تذبذب بالفاظِ عروج کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ افغانی قیدی کی گرفتاری (جو بجائے خود مہمل بات ہے) کے لیے پشاور یونیورسٹی کے ذمہ دار حکام وائس چانسلر، کالج کے پروفیسر، وائس پرنسپل اور دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسر آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں اور رات بھر برانڈی کے نشہ آور ماحول اور حماقتوں کے فضول ہنگامہ زار میں بے سوچے سمجھے بے چارے دوڑائے جاتے ہیں۔ اگر اس کھیل کا لکھنے والا کوئی غریب پرانے اسٹیج کا ڈراما نگار ہوتا تو اسی گروپ کے ہدایت کار اور سرپرستوں کی صلواتیں سُنتا۔ لیکن اس دور کی جدید فارس سمجھ کر اسے بزعمِ خود سراہا جا رہا ہے البتہ بعض فنکاروں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر قابلِ تعریف اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان میں سلیمہ فیض اور شعیب ہاشمی پیش پیش رہے۔ ان کے بعد یاسمین اور میمونہ بیگم کے کام خوب ہیں۔

کاش نعیم طاہر اپنی صلاحیتوں کو سنجیدگی سے اُجاگر کریں اور ان کی تربیت کا لحاظ رکھیں۔ انھیں تاج صاحب جیسے فن دان ادیب کی مشفقانہ سرپرستی اور ہدایات میسر ہیں۔ اگر ان کے مفید مشوروں سے وہ اور یاسمین اور ان کے گروپ کے فنکار سنجیدہ اور مقصدی ڈراموں کی طرف شایانِ شان توجہ اور معقول محنت کریں تو الحمرا آرٹ کونسل اور فن کے لیے مفید ہو سکیں ورنہ ہنسی کا

گول گپا عرف بھان متی کا پٹارا یا چوں چوں کا مربہ تو بھاتی کے باہر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس پیشکش کے آغاز سے کچھ پہلے ۲۷ اکتوبر کو الحمرا میں ادبی آرٹ سرکل کے اراکین نے بھی آغا بابر کا ایک کھیل بڑا صاحب پیش کیا تھا جو "انسپکٹر جنرل" ڈرامہ کا منتخب شدہ چربہ ہے۔ یہ کھیل بھی کئی روز چلتا رہا۔ اداکاروں میں اس سرکل کے چند افراد اور فلمی فنکار (ایکسٹرا) شریک تھے جو چنداں قابلِ ذکر نہیں۔

دسمبر میں اُردو تدریس کانفرنس کا انعقاد ہوا اور اس کے مختلف تعلیمی پروگراموں میں ڈراما بھی شامل کیا گیا۔ اس کی نگرانی میرے سپرد تھی اور لاہور پلے ہاؤس کا تعاون حاصل کیا گیا۔ چنانچہ پلے ہاؤس کے فنکاروں کے ساتھ میں نے دو یکبابی کھیل گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول کے اسٹیج پر پیش کیے۔ ان میں ایک تعلیمی سنجیدہ ڈراما "امانت کے بعد" تھا مرزا مقبول بیگ بدخشانی کا تحریر کردہ اور دوسرا اصغر بٹ کی مختصر کومیڈی "آپ کون" (انگریزی سے ماخوذ) شامل تھے۔ اوّل الذکر ڈراما مغلیہ دور کے اصلاحی پلاٹ پر مبنی تھا جو ملبوسات زیب و زینت اور موزوں ترتیب اور روشنی کے مناسب امتزاج اور صوتی اثرات کے ساتھ بعض اداکاروں خصوصاً انور سجاد و نذیر حسین کے اثر انگیز کام کے سبب بہت پسند کیا گیا۔ دوسرے مزاحیہ کھیل میں حمید واثق، سکندر شاہین اور قمر چودھری کامیاب رہے۔ مقررہ پروگرام میں صرف ۲۸ دسمبر کو کیا جانا تھا لیکن ۳۰ دسمبر کو خاص فرمائش پر پھر پیش کرنا پڑا۔ اداکاروں میں متذکرہ بالا فنکاروں کے علاوہ ہلا آنٹیا، آغا حامد رضا، جمشید اقبال، مسعود اختر اور شاہد حسین شریک تھے جنھوں نے محنت سے اپنے اپنے کردار ادا کیے۔

بہرنحیں لاہور میں ڈراموں کی سرگرمیاں جو اس مختصر مضمون کے لکھنے تک دیکھنے میں آئیں۔ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے سینئر گروپ اس انور سجاد، شمشاد حسین اور دوسرے طلبا انور سجاد کا ڈراما ۲۶ جنوری سے پیش کر رہے ہیں۔

یہاں اس سلسلہ میں لاہور پلے ہاؤس کے حالیہ اعلان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ڈراما و تھیٹر کے خوش آئند مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ اس اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ لاہور پلے ہاؤس کے زیرِ اہتمام ڈراما اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے جس کے ذریعہ فنی تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ نیز ماہ اپریل ۱۹۶۲ء میں "جشنِ تمثیل" کا شاندار پروگرام بھی مرتب ہوا ہے۔ الحمرا آرٹ کونسل کی جانب سے بھی آئندہ سہ ماہی میں ایک دو نئی تمثیلیں پیش کرنے کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ نیز لاہور پلے ہاؤس اپنا مقبول مزاحیہ کھیل "ہنسی ہنسی میں" فرمائشوں کی تعمیل میں دوبارہ پیش کرنے کی تیاری اور نئی تنظیم میں مصروف ہے۔ توقع ہے کہ اس دوران میں نیشنل تھیٹر کی تعمیر کا منصوبہ بھی مکمل ہو سکے گا اور مستقبل قریب میں ہم اپنے عالیشان قومی تھیٹر کو آراستہ پیراستہ دیکھ سکیں گے اور پاکستان میں ڈراما اور تھیٹر کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہوں گی۔

اختتامیہ آخر میں لاہور کی جدید فنی مساعی پر کسی قدر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے ناظرین اس سے تو واقف ہیں اس لیے اس کے ابتدائی دور پر اجمالی نظر ڈالنا دلچسپی میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا۔

۱۹۵۶ء کے بعد لاہور میں ڈراما اور تھیٹر کی سرگرمیاں کچھ تیز ہو گئیں۔ گورنمنٹ کالج، الحمرا آرٹ کونسل اور اسٹار تھیٹر اکیڈمی، یہ تین ادارے پہلو بہ پہلو نئے نئے ڈرامے اسٹیج کرتے نظر آتے۔ اوّل الذکر ہر دو مقامات پر زیادہ تر غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا ملخصات پیش کیے گئے۔ ضمناً یہاں ان چند ڈراموں کی پیش کش پر دو آزاد رائیں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں سے اکثر ڈراموں کا ذکر پہلے آ چکا ہے اب ان کی مختصر روئیداد ملاحظہ کیجیے۔

الحمراء گروپ کے ڈرامے" باکس اور کاکس" کی نسبت ہفتہ وار" لیل و نہار" رقمطراز ہے :۔

"باکس اور کاکس" یہ طربیہ کھیل سید امتیاز علی تاج نے انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا تھا۔ صاف، شستہ، بامحاورہ اور رواں۔ یہ اور بات ہے کہ اداکار ٹھیک طور پر انہیں نبھا نہ سکے ـــــ خود اس کھیل کے پیش کار (سید امتیاز علی تاج) نے کھیل شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر آ کر سامعین سے اس امر کی معذرت چاہی تھی کہ " بعض مجبوریوں اور مشکلوں کے سبب ہم پورے طور پر تیار نہیں ہو سکے ۔"

اسی دوران گورنمنٹ کالج میں مولئیر کی کومیڈی "بخیل" کا ترجمہ کالج کے اوپن ایئر تھیٹر کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اس کی نسبت "لیل و نہار" رقمطراز ہے کہ :۔

"سکندر شاہین نے حاجی (عبدالقدوس) کا پارٹ بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ سکندر میں اسٹیج ایکٹنگ کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ رقیہ حسن نے ماہ لطیفن کا مشاطگی کا رول بڑے سلیقے سے نبھایا۔ ان کی اداکاری سب سے زیادہ پختہ، بے ساختہ اور رچی ہوئی تھی۔ عزالدہ (کوکب) اداکاری کے فن سے بالکل نابلد معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا لہجہ اور تلفظ بھی ناقص تھا۔ خالد سعید کھلنڈرے نوجوان (شاہد) کے روپ میں بہت کامیاب رہے البتہ نعیم طاہر (ارشد) کی اداکاری بالکل بے جان اور سپاٹ تھی ۔"

اسی سال الحمراء میں دو مختصر ڈراموں کا پروگرام ہوا۔ ان میں ایک تھا" یوجین اونیل " کے ڈراما " دی روپ "(THE ROOP) کا اُردو ترجمہ جو اظہار کاظمی نے کیا اور دوسرا" گونگی جورو " انگریزی کے ڈرامے (THE DUMB WIFE) کا ترجمہ۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے " لیل و نہار" لکھتا ہے :۔

" یہ ڈراما اس سے پہلے ریڈیو سے بھی متعدد مرتبہ نشر ہو چکا ہے اور سید امتیاز علی تاج نے اسے اُردو کا جامہ پہنایا ہے لیکن فاضل مترجم نے نہ اب اور نہ پہلے یہ اقرار کیا ہے کہ یہ ڈراما کسی دوسری زبان سے ماخوذ ہے۔ ڈرامے کا ترجمہ اتنا خوبصورت اور رواں ہے کہ جن لوگوں نے اصل ڈراما نہیں پڑھا انہیں اس کے ماخذ ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ ڈرامے میں سب سے مشکل اور اہم کردار گونگی بیوی کا ہے جسے ندرت الطاف نے بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ ڈرامے کے دوسرے کردار (جج) خالد سعید بٹ (جج کا دوست) سکندر شاہین (ملازم) نسیم محمود اور (ڈاکٹر) فاروق ضمیر اپنی اپنی

جگہ پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض صوفی وقار احمد نے انجام دیے ہیں۔"

"پیسہ" کی نسبت رائے تھی کہ:۔

"ڈرامے کا سسپنس (تذبذب) شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کامیدار نے بڑھے کا کردار ادا کر کے اسٹیج پر اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ کنول حمید نے کمسن زرینہ کا کردار جس فطری بھولپن سے نبھایا ہے اسے دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ بچی پہلی مرتبہ ایکٹنگ کر رہی ہے۔ مرجانہ کا کردار نفیس بانو نے ادا کیا ہے اور اس لحاظ سے کامیاب ہیں کہ یہ ان کا پہلا موقع ہے لیکن یہ سوال حل طلب ہے کہ مرجانہ کی پلکیں تک کس طرح سفید ہو سکتی ہیں جبکہ اس کی عمر صرف ۳۵ سال ہے۔"

الحمراء کے ڈرامے "مجرم کون" کے بارے میں "پاکستان ٹائمز" نے اظہار رائے کیا تھا کہ:۔

"اگر سماعی طور پر اس ڈرامے کی خوبی کا اندازہ لگایا جائے تو یقیناً کامیاب کہا جائے گا لیکن حسن نظر کے لیے اس پیشکش نے کوئی قابل اطمینان تاثر قائم نہ کیا۔ خصوصاً ڈرامائی قطار بندی بے ربط اور بے جوڑ تھی۔ لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ ناقص اور انسپکٹر کا رول بے جان رہا۔ اس ڈرامے میں صرف ایک کردار بیٹے کا تھا جو سکندر شاہین نے نہایت موزوں طریقہ اور بڑی کامیابی سے ادا کیا۔"

یہاں ہمیں یہ اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب سے لاہور میں جدید اسٹیج منصۂ شہود پر آیا جس انداز اور رنگ ڈھنگ سے بھی تھا ان میں الحمراء اور گورنمنٹ کالج کے اسٹیج پر نمایاں فنکاروں میں سکندر شاہین اور خالد سعید پیش پیش رہے۔ سکندر شاہین شوقیہ اداکاروں میں یقیناً بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور جدید ڈرامے کی اٹھان اور نئے شوقیہ تھیٹر میں ابتدا سے آج تک ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ بڑے ذوق و شوق اور مخلصانہ جانفشانی سے جدید ڈرامے کی ترقی کے لیے تن من دھن سے مصروف کار ہیں۔ اگر ان کے اس والہانہ پن میں یہی خلوص کارفرما رہا تو جدید تھیٹر کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

اسٹار تھیٹر کے افتتاحی پروگرام 'رستم و سہراب' کو 'پاکستان ٹائمز'، سول ملٹری اور دوسرے اُردو اخبارات نے پُرزور الفاظ میں سراہا اور جب اس ادارہ نے قدیم و جدید تھیٹر کے امتزاج سے جو ایک نیا آغاز کیا تھا ۱۹۵۸ء میں ترقی کا ایک قدم آگے رکھا اور جدید ڈرامے پیش کرنے لگا چنانچہ جولائی میں الحمراء آرٹ کونسل میں اس سلسلہ کا پہلا پروگرام 'جمیلہ'، 'عمر خیام' اور 'خودکشی' پیش کیے گئے تو دوسرے اخبارات کے علاوہ محکمہ تعلقات عامہ کے سرکاری آرگن LAHORE AFFAIRS میں ادارۂ ہٰذا کی خدمات کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

"لاہور اپنی علمی، ادبی اور ثقافتی روایات کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے لیکن دورِ جدید میں ادبی سرگرمیوں کی ہمہ ہمی تو دیکھنے میں آتی ہے لیکن ابھی تک باقاعدہ اسٹیج کی رونق ماند ہے۔ ڈرامے کے باقاعدہ احیاء اور صحیح معنوں میں ایک مکمل ہال کی موجودگی کے

> بغیر اس کی تکمیل دشوار ہے۔ چند مقامی کالجوں کے طلباء نے کچھ عرصے سے کسی حد تک باقاعدگی سے ڈرامے پیش کرنا شروع کیے ہیں لیکن ان کے کاموں میں تو مشقی نظر آتی ہے جو صرف شائقین کو ہی اپنی طرف بخوبی متوجہ کرنے میں ناکام نہیں رہی ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسٹیج کی کمی کو پورا کرنے میں اس کوشش کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا البتہ کچھ عرصہ سے اسٹار تھیٹرز نے اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے اراکین میں اسٹیج اور تھیٹر کے درجہ اوّل کے فنکار و اہلِ ذوق موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے افتتاحیہ کھیل آغا حشر کے 'رستم و سہراب' کی پیش کش نے ہی نہ صرف اسٹیج کے احیاء کے امکان پیدا کر دیے بلکہ ان کی منظم مساعی سے ٹکسلہ کی خاص توقعات وابستہ ہو گئی ہیں۔ ان کا دوسرا کھیل آغا حشر کا 'اچھوتا دامن' تھا اور اب الحمراء آرٹ کونسل میں جو جدید ڈرامائی پیشکش عمل میں لائی جا رہی ہے وہ ان کے تجرباتی پروگرام کی جدید کڑی اور عملی تکمیل کی طرف ایک مبارک فنی اقدام ہے جسے عشرت رحمانی کی زیرِ ہدایت پیش کیا جا رہا ہے۔"

اور پروگرام کی نسبت اظہارِ رائے کرتے ہوئے علیحدہ علیحدہ تفصیل سے اسے قابلِ داد کہا اور ڈرامہ "جمیلہ" کے سلسلہ میں بجا طور پر اظہارِ خیال کیا کہ "الحمراء اسٹیج اس قسم کے ڈراموں اور عملی و فنی پیش کش کے لیے بہت محدود ہے۔ اسٹار تھیٹر کے کام کے لیے اس اسٹیج کا دامن بہت تنگ ہے۔"

چونکہ اس ادارہ سے میں بھی متعلق تھا اس لیے تفصیلی تبصرے اور تعریفوں کی سندیں یہاں پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مختصر یہ کہ حالیہ ادارہ لاہور پلے ہاؤس نے جب لاہور کے مختلف تھیٹر گروپ اور فنکاروں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی سعی کی اس وقت اس مبارک آغاز میں سب سے پہلے اسٹار تھیٹر نے لبیک کہا اور اس کے تمام فنکار عملی اشتراک پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت سب سے زیادہ توقع لاہور پلے ہاؤس سے ہے جو اپنی جدید عملی تنظیم کی تکمیل میں مصروفِ کار ہے۔ الحمراء آرٹ کونسل سے بھی اس کے ذرائع کے لحاظ سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ سنجیدہ غور و تدبر سے کام لیا جائے اور ان کی ڈرامائی مساعی لاہور پلے ہاؤس کے نقشِ قدم پر قومی افادیت اور تعمیری نصب العینوں کی جانب بھی توجہ کریں۔ کیونکہ تھیٹر سے صرف ادنیٰ تفریح و تفنن کا کام ہی نہیں لینا ہوتا بلکہ اصلاحِ معاشرت اور قومی کردار کی تعمیر میں اس فن کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

فلم

احمد سعید

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان پر جو حملہ آور قابض ہوتا وہ لاہور پر اپنا پرچم گاڑتا ہوا دہلی کو ہی اپنا پایۂ تخت بناتا۔ اس لیے کہ درہ خیبر نہایت دشوار گذار ہونے کے باوجود ہر اولوالعزم اور جنگجو فاتح کے لیے ہر وقت کھلا رہتا۔ اس کے باعث لاہور کی تاریخ کی ابتدا ایک پُر اسرار دھند میں گم ہو جاتی ہے۔ اور لَو اور کُش۔ اس کے بانیوں کی LEGEND بن کر رہ جاتی ہے۔ حال ہی میں حویلی دھیان سنگھ، نزد شاہی قلعہ میں جو کھدائی ہوئی ہے اُس سے اس شہر کی ماقبل تاریخ منکشف ہونے کا امکان ہے۔ لیکن لاہور کی باقاعدہ تاریخ عہدِ غزنوی ہی سے شروع ہوتی ہے۔

لاہور کی فلمی تاریخ اور بحیثیت فلم نگر بھی قدرے یہی عالم نظر آتا ہے۔ کیونکہ لاہور کے موجودہ نگارخانے اس کے عہدِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیش محل کی طرح، جس کے اندر زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے اور ہو رہی ہے، جن میں مترنم قہقہوں، رقص و سرود، زندگی کے زیر و بم کو فلم میں مقید کیا جاتا ہے، ان کے نام، بلکہ وجود تک سے تو نئی پود بھی واقف ہے۔ لیکن یہاں کے چند ایک نگارخانے ایسے ہیں اور تھے جو داستانِ پارینہ ہو گئے ہیں اور اب کھنڈر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے کھنڈر تک مٹ چکے ہیں اور کچھ ایسے جن کی یاد ان چند گنے چنے فلمی تاریخی کرداروں کے سینوں میں مدفون ہے جنھیں نہ صرف زمانے نے بھلا دیا ہے بلکہ جن کے اپنے بھی پرائے ہو گئے ہیں۔ جب درخت سوکھ جاتا ہے تو اس کی لکڑی کام میں لائی جاتی ہے لیکن فلمی دُنیا رگوں میں خون دوڑنے پھرنے کی ہی قائل ہے۔ بقول لاہور کی ایک زندہ تاریخ ہسپانوی بل فائٹنگ لڑنے والے (میٹا ڈور) کی طرح جب اس کے ایک ہیرو کا بیل خون کر دیتا ہے تو ابھی یہ سوکھ بھی نہیں پاتا کہ ناظرین اکھاڑے میں اُترتے ہوئے نئے فاتح ہیرو کی تحسین میں تالیاں پیٹنا اور نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں —— پرانے ہیرو کا نہ جنازہ اُٹھتا ہے، نہ مزار بنتا ہے۔ تماشائیوں کو تو فقط کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے —— کھیل جسے کسی طور بند نہیں ہونا چاہیے۔ لاہور کی فلم نگری میں بھی ایسے کئی "ہیرو" نے جنم لیا کئی سپردِ خاک ہوئے، بہتوں کی ہڈیاں راوی بہا کر لے گیا لیکن بہت سے سپوتوں نے ہندوستان کے دیگر فلم نگروں کو فتح کیا اور مدتوں ان پر راج کیا اور بعض اب تک یا تو خود اس کے سنگھاسن پر براجمان ہیں یا ان کی نسل اب تک وہاں حکمران ہے۔ دِلی کی طرح یہ مرکز، لاہور بھی کئی دفعہ بسا اور اُجڑا اور یہاں کے پنچھی پکھیروں نے بمبئی اور کلکتہ جیسے دائمی گلستانوں کا رُخ کیا جہاں کے گل چیں اُنھیں طرح طرح سے سجا سجا کر، مختلف روپ میں ہندوستان بھر میں پیش کرتے رہے حتیٰ کہ وہاں کی تاریخ میں بھی حصولِ

آزادی کے ساتھ ایک ایسا طوفان آیا کہ کئی پنچھی وہاں سے اُڑ کر لاہور آ گئے اور انھوں نے اس گلستان کو پھر آباد کیا۔ اس کے "شبستان محلوں" میں پھر شمعیں جلانی شروع کیں۔ لیکن لاہور کے فلمی نشاۃ الثانیہ کے احیا کا حال بتانے کے لیے ہمارے لیے اس کی ابتدا اور ارتقا کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۳۶ برس قبل لاہور نے تین چار منچلے فاتحین کو جنم دیا جن میں دو تین کا طوطی بعد ازاں ہندوستان بھر میں بولنے لگا۔ ۱۹۲۴ء میں عبدالرشید کاردار (بعد ازاں جو اے۔ آر۔ کاردار کے نام سے مشہور ہوئے) اور محمد اسماعیل (ایم۔ اسماعیل) نے فلم میں اداکاری اور ہدایت کاری کے شوق کے تحت بمبئی ہندوستانی ہالی ووڈ میں قسمت آزمائی کرنے کے لیے اس کا رُخ کیا۔ انھی دنوں روپ کے۔ شوری (روپ۔ ایل شوری) کے والد امریکہ فوٹوگرافی میں تربیت حاصل کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے لیکن ایم اسماعیل اور کاردار کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کی تکمیل کے لیے انھیں وطن واپس لوٹنا پڑا یعنی لاہور۔ یہاں وہ کچھ عرصہ تک تو کتھے مل کر اپنے پرانے مرغوب مشغلہ پوسٹر بنانے سے دل بہلاتے رہے لیکن فلمی عشق انھیں کہاں چین سے بیٹھنے دیتا تھا ——— چنانچہ عبدالرشید کاردار نے نہ صرف تن من بلکہ دھن بھی لٹا کر نہ صرف ایک سائن کیمرہ خریدا بلکہ اپنی فلم کمپنی بھی قائم کر لی ——— اس کے کیمرہ مین ایک امریکی تربیت یافتہ صاحب جے۔ کے مہتہ تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر سی لیبارٹری بھی قائم کر رکھی تھی جو ایک چھوٹے سے ٹینک پر مشتمل تھی۔ موصوف غالباً مہتہ نیوز کا بھی کام کرتے تھے لیکن اُن دنوں بیشتر فلمیں آؤٹ ڈور میں بنتی تھیں۔ ان خاموش فلموں کے لیے فقط ایک کیمرہ اور چند ری فلیکٹر درکار ہوتے۔ ان کے سٹ بھی باہر لگتے اگر ان دنوں بھی آج کل کی طرح دن کو سورج کی مطلوب روشنی میں مخصوص اوقات میں ہی شوٹنگ ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ لاہور میں پہلا کھلا (OPEN) سٹوڈیو بریڈلا ہال کے سامنے قائم ہوا۔ اس میں PREMUM FILM CO کے جھنڈے تلے لاہور یعنی پنجاب کی پہلی مکمل فلم DAUGHTERS OF TODAY تیار ہوئی۔ اس میں دو اداکاروں ایم اسماعیل اور وجے کمار نے بعد میں ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ مذکورہ سٹوڈیو میں چند ایک فلمیں اور بھی بنیں لیکن انھیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

۱۹۲۶ء میں آر۔ کے۔ شوری نے امریکہ سے واپسی کے بعد اے۔ آر۔ کاردار سے مل کر ایک سٹوڈیو نما کمپنی قائم کی لیکن یہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ حتیٰ کہ موخر الذکر نے ۱۹۲۸ء میں UNITED PLAYERS کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا اور اس کے جھنڈے تلے یکے بعد دیگرے سات آٹھ کامیاب فلمیں جو بڑی سپٹ ثابت ہوئیں۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ MYSTERIOUS EAGLE، صفدر جنگ BRAVE HEART GOLDEN DAGGER KING SHEIKH وغیرہ۔ WANDERING DANCER اور SWEET HEART نامکمل رہ گئیں۔ اس عرصہ میں آر۔ کے شوری اور چند دیگر پروڈیوسروں نے بھی اکا دکا فلمیں بنائیں جو سطح آب پر گاہے گاہے خفیف لہروں کے پیدا ہونے کے برابر ایک نامعلوم سا منظر تھا۔ بہرنوع اس فن اور کاروبار نے شہر کی چند ممتاز ہستیوں کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کر لی۔ اس کے نتیجے کے طور پر بہت جلد نہایت وسیع پیمانے پر لاہور میں سٹوڈیوز قائم کرنے کے پروگرام مرتب ہوئے۔ اس دوران فلمسازی کے مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کرنے کے لیے چند نوجوان جرمنی اور دیگر ممالک بھی گئے۔ ان میں جے۔ کے نندا اور ملہوترا کا نام قابل ذکر ہے۔ موخر الذکر سے بعد ازاں اے۔ آر کاردار نے بمبئی پہنچ کر اشتراک بھی کرنا چاہا لیکن یہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اس عرصہ میں متکلم فلموں کی ایجاد کے باعث جہاں عالمی فلمی دنیا میں انقلاب پیدا ہوا وہاں ہندوستانی صنعت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ جب لاہور کا مرکز فلم سازی منظم ہو رہا تھا ہندوستان میں پہلی متکلم فلم "عالم آرا" ۱۹۳۱ء میں تیار ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں پنجاب فلم کمپنی کے نام سے ایک اور سٹوڈیو قائم کیا گیا۔ اس نے دو مشہور فلمیں "خیبر" اور "بلا" اور "نئی روشنی" (متکلم) بنائیں۔ اسی سال PLAYAR-PHOTOTONE کے نام سے اے۔ آر۔ کاردار اور حکیم رام پرشاد نے مشترکہ طور پر ایک کمپنی قائم کی اور اس کے تحت موجودہ ریجنٹ سینما کے عقب میں ایک سٹوڈیو قائم کیا۔ اس یونٹ کے پرانے ارکان میں جن میں ایم اسماعیل بھی شامل تھے، اس کے "گرو ڈر" اپنے کندھوں پر اٹھا "ٹھاکر" اسے استوار کیا۔ اس میں اے۔ آر۔ کاردار نے ہیر رانجھا اور گوپی چند تیار کیں۔ ہیر رانجھا میں جہاں ایم اسماعیل نے یکتا کردار نگاری کا مظاہرہ کیا وہاں رفیق غزنوی کو موسیقار کی حیثیت میں فلمی دنیا سے روشناس کیا گیا۔ لیکن متکلم فلم بنانے کا تجربہ نہ ہونے کے باعث کاردار کی یہ دونوں فلمیں کامیاب نہ ہو سکیں ——— لیکن اب لاہور کا فلمی مرکز باہر کے فلمسازوں کی توجہ کا مرکز بننے لگا۔ یہاں ایک فلم ایسی بنائی گئی جو غیر ممالک میں بھی دکھائی گئی۔ اور جس نے ہندوستان کے فلمی مرکز بمبئی سے دو چار نام اور متعارف کرائے۔ یہ فلم LOVES OF A MOGHAL PRINCE تھی۔ جو کئی برس بعد بمبئی ٹاکیز کے بانی ہمنسو رائے آنجہانی نے LIGHT OF ASIA کے بعد بنائی۔

اس فلم میں امتیاز علی تاج اور دیوان شرر اور غالباً رفیع پیرزادہ نے بھی کام کیا۔

ہیر رانجھا اور گوپی چند کی ناکامی کے باوجود اے۔ آر۔ کاردار اور ان کے یونٹ کی دھوم کلکتہ اور بمبئی تک پہنچ گئی اس لیے انھیں وہاں سے کئی پیشکش ہوئیں۔ اس کے نتیجہ میں موصوف کلکتہ چلے گئے جہاں انھوں نے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے جھنڈے تلے متعدد کامیاب فلمیں بنائیں۔ آب حیات۔ عورت کا پیار۔ زر بیہ۔ ملاپ۔ چندر گپت۔ باغی سپاہی۔ اور غالباً ایک انڈین ٹوئنٹی۔ شہنشاہ۔ ان میں زر بیہ۔ عورت کا پیار اور باغی سپاہی کو بے پناہ مقبولیت ہوئی۔ یہ ان کی تاریخ پر مبنی۔ فنی اعتبار سے چندر گپت ایک بلند پایہ فلم تھی۔ اس میں نذیر نے چانکیہ کا اہم رول ادا کر کے اپنے لیے ہندوستانی فلمسازی میں اونچا مقام پیدا کر لیا۔ کلکتہ کے بعد موصوف بمبئی چلے گئے جہاں انھوں نے پے در پے کئی کامیاب فلمیں بنائیں اور آخر کار کاردار سٹوڈیو قائم کیا۔ فلمسازی کے ہر شعبہ میں بے پناہ کمال رکھنے کے باعث وہ ملک کے چوٹی کے ٹیکنیشنوں اور ہدایت کاروں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے ہندوستانی فلموں میں ایک اور طرح جو ڈالی وہ چربہ سازی تھی جس کے باعث نہ صرف دوسروں نے ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا بلکہ بالآخر خود ہی اس کا مہلک شکار ہو کر رہ گئے۔

یہاں ان کے دو ایسے لعد ازاں ممتاز شاگردوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا ...... ایم صادق اور ایس۔ یوسفی۔ یہ دونوں لاہور ہی سے ان کے ہمراہ بحیثیت مصنف اور نائب ہدایت کار کلکتہ، و بمبئی گئے اور ایک دن ایسا آیا جب انھوں نے رتن اور میلہ وغیرہ جیسی کامیاب فلمیں دے کر ہندوستانی فلمسازی میں بلند مقام حاصل کر لیا۔

لیکن ایک پہاڑ سے کئی چشمے اور کئی دریا نکلتے ہیں۔ کچھ تو راستے کی گرمیوں یا ریگستانوں ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔ کئی انہی جگہوں کو پار کر کے ان کو سیراب کرتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ لاہور سے ایسے ہی کئی جوہر نکلے اور

جوہر شناسوں کی تلاش میں کلکتہ اور بمبئی پہنچ گئے جنہوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس وقت جگدیش سیٹھی، پرتھوی راج، غلام محمد (مرحوم) اور کئی اداکار ہندوستانی سکرین پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ موسیقی میں ماسٹر جھنڈے خاں (مرحوم) نے اپنے لیے کلکتہ سٹیج پر پہلے ہی بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہ بعد ازاں فلموں میں موسیقی دینے کے باعث چترلیکھا میں لافانی موسیقی دے کر لازوال ہو گئے۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں لاہور میں غالباً پنجاب فلم کمپنی کے نام سے ڈاکٹر دولت رام نے گاف روڈ پر ایک عظیم الشان سٹوڈیو قائم کیا۔ اس کے سے ایک وسیع کوٹھی کو سٹوڈیو میں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ اتنے ساز و سامان سے لیس تھا کہ آدمی جتنا جھوٹ بولے کم ہے۔ اور تو اور بقول راوی اس کے ٹیکنیشن بھی اس کی کئی چیزوں کو استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ یہاں غالباً دو فلمیں ہی بنیں۔ سورگ کی سیڑھی اور سہاگ کا دان۔ اول الذکر بندر (ہیرو) اور رام اخیا بیگم کی وجہ سے ہی یاد رہی۔ دوسری فلم غالباً سید امتیاز علی تاج نے لکھی اور جے۔ کے نندہ نے ڈائرکٹ کی۔ لیکن یہ بھی ناکام رہی۔

اس عرصہ میں یہاں ایک نیا ساؤنڈ سسٹم۔ فیضی ساؤنڈ سسٹم — بھی ایجاد ہوا لیکن یہ ناکارہ ثابت ہوا۔ ادھر پنجاب فلم کمپنی کے سٹوڈیو کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ اور لاہور کے فلمی پنچھیوں نے کلکتہ اور بمبئی کے چمنستانوں میں جا بسیرا کیا۔ کاردار کے بعد روپ کے شوری اور روپ۔ ایل شوری ہی باقاعدہ لیکن اکا دکا فلم بناتے رہے۔ وہ بھی بیشتر کلکتہ میں، گو یا لاہور ہی کے اداکاروں اور عملے قبیلے کے ساتھ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہاں لاہور کے فنکاروں کو بمبئی سے بھی زیادہ ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کے امکانات اور آسان راستہ ملتا تھا۔ کلکتہ تھیٹر کا گھر تھا، حتیٰ کہ متکلم فلم کے آغاز نے اسے تہس نہس کر دیا اور سٹیج کے مالکان نے اسی عملے فیلے سے اُلٹی سیدھی فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ کلکتہ دراصل فلمی فنکاروں کے لیے اُن کی منزلِ مقصود — بمبئی — ان کے خواب (تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ تھا۔ یہیں سے پرتھوی راج کپور۔ جگدیش سیٹھی۔ کاردار۔ سہگل (آنجہانی) ماسٹر جھنڈے خاں نجم الحسن۔ کیدار ناتھ شرما وغیرہ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ انہیں منہ مانگی قیمت پر بمبئی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ان میں سے کئی فن کاروں کو بمبئی چھوڑ کر کلکتہ آنا پڑا اور بعد میں پھر بمبئی واپس لوٹنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کو کلکتہ کی آب و ہوا ہی راس آئی۔ مثلاً شوری باپ بیٹے۔ میوزک ڈائرکٹر چشتی۔ کیمرہ مین جی سنگھ۔ یو۔ پی کے سبطین فضلی جو پہلے نیو تھیٹرز میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر تربیت لیتے رہے۔ اور بعد ازاں چورنگی، معصوم اور قیدی جیسی فلمیں بنا کر بمبئی ہجرت کر گئے۔ شوکت حسین رضوی جو فلم کارپوریشن میں ایڈیٹر تھے۔ جی سنگھ کیمرہ مین اور سی۔ ایم لطیف ایڈیٹر۔ داؤد چاند ڈائرکٹر کلکتہ ہی میں رہے۔

اس عرصہ میں لاہور کا فلم نگر اجڑ گیا اور کلکتہ منتقل ہو گیا اور پنڈی کڑی۔ ہیر سیال جیسی پنجابی فلمیں وہیں سے بن کر آئیں۔ ان میں سے ہیر سیال کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ گو فنی اعتبار سے یہ نہایت کمزور اور خام فلم تھی لیکن اس میں ایم اسماعیل نے کیدو کا کردار اتنا ڈوب کر کیا کہ یہ ہندوستان کے چوٹی کے اداکاروں میں شمار ہونے لگے۔ لاہور میں اپنی فلموں کی کامیابی دیکھ کر نیو تھیٹرز کلکتہ نے یہاں ۱۹۳۴ء میں نیو انڈیا فلمز کے نام پر نشاط سینما کے قاضی خورشید حسن کے اشتراک سے ایک سٹوڈیو قائم کیا۔ اس نے اپنے یونٹ سے یہاں دو فلمیں 'کاروانِ حیات' اور 'جوشِ انتقام' بنائیں۔ لیکن انہیں چنداں کامیابی

حاصل نہ ہوئی چونکہ کلکتہ سے لاہور کا کام سنبھالنا ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا یہ سٹوڈیو بند کر دیا گیا۔ اسے بعد ازاں روپ شوری نے اپنی تحویل میں لے لیا اور یہاں کلکتہ کے ہی سرمایہ دار فلمساز سیٹھ سمپت لال کرنانی سے مل کر فلمیں بنانا شروع کیں۔

اس اثنا میں دیوان سرداری لال (آنجہانی) نے ۱۹۳۲ء میں اپر مال پر چشتیوں کی ایک فیکٹری کرائے پر اشتراک میں سٹوڈیو میں منتقل کروا دیا اور اس کا نام SUPER SOUND-STUDIO رکھا۔ یہی سٹوڈیو بعد ازاں پنچولی سٹوڈیو کی بنیاد ثابت ہوا۔ ڈی۔ ایم۔ پنچولی۔ آر۔ سی۔ اے اور آر۔ کے۔ او ریڈیو کے مشہور تقسیم کار ادارے سے منسلک تھے۔ ان کا ہیڈ آفس کلکتہ ہی میں تھا۔ انھوں نے وہاں ایک آدھ پنجابی فلمیں اشتراک میں بنائی تھیں۔ اس لیے انھوں نے لاہور میں مذکورہ سٹوڈیو میں پنجابی کی ایک اور فلم گل بکاؤلی بنا کر لاہور کو ایک مستحکم فلمی مرکز بنانے کی طرف سرعت سے ایک جرأت مندانہ قدم بڑھایا۔ اس فلم میں موسیقی کی دنیا میں ایک ستارہ طلوع ہوا جس نے بعد میں سارے ہندوستان کو چکا چوند کر دیا جس نے اپنی آواز سے ایسا جادو جگا دیا کہ بڑے بڑے استاد دانتوں میں انگلی داب کر رہ گئے اور جس نے لاہور کو بمبئی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ——— یہ بیبی نور جہاں تھی؛ جو بعد میں نور جہاں ہو کر چمکی اور اپنے ساتھ شوکت حسین رضوی کو ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے کلکتہ سے لے آئی اور اسے بھی چند سالوں میں ملک کے نامور ڈائرکٹروں میں لا کھڑا کروایا۔ نور جہاں نے بھی کلکتہ میں سٹیج پر سہیلیوں کے ساتھ نمودار ہو کر اور مہر سیال میں گا کر خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ جوہری شناس شوکت حسین رضوی اور دلسکھ ایم پنچولی کی نگاہِ انتخاب ان پر پہلے ہی پڑ چکی تھی کہ یہ بیبی کرن ایک روز ضرور دنیا کو مسحور اور منور کرے گی۔ یہاں غلام حیدر مرحوم کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کلکتہ سے ہی واپس لاہور لائے گئے۔ انھوں نے یہاں ییلا جٹ اور خزانچی میں جدت انگیز موسیقی مرتب کر کے فلمی موسیقی میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ لتا منگیشکر بھی انہی کی دریافت ہیں۔

گو یہ گل بکاؤلی انتہائی محدود فنی وسائل سے بنائی گئی لیکن اسے اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ ڈی۔ ایم پنچولی نے اب لاہور میں فلمسازی کا باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ڈاکٹر دولت رام کی چشتیوں کی منتقل شدہ فیکٹری میں یکے بعد دیگرے ییلا جٹ (پنجابی) اور خزانچی (اردو) جیسی ایسی فلمیں بنائیں جنھوں نے باکس آفس کے ریکارڈ نہ صرف توڑ دیئے بلکہ لاہور کو ہندوستان کے فلمی مراکز میں لا کھڑا کیا۔ نہایت مختصر ہونے کے باوجود پنچولی سٹوڈیوز میں فلم فیکٹری کے پیمانے پر کام کیا گیا۔ یہ ڈی۔ ایم پنچولی کی غیر معمولی قوتِ انتظامیہ اور کاروباری شعور کا نتیجہ تھا۔ پنچولی کمپنی میں کلکتہ اور لاہور کے بیشتر لاہوری فن کار ہی مجتمع کیے گئے۔ کیمرہ مین بدری پرشاد (آنجہانی) برکت مہرہ (آنجہانی) (سابق ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور ڈائرکٹر) نور جہاں۔ ایم اسماعیل۔ ماسٹر غلام حیدر۔ اجمل (نئی دریافت) پران۔ وغیرہ ان میں غیر لاہوری کلکتہ کی گمنام لیکن نہایت اعلیٰ اداکارہ رمولا اور بمبئی کے ڈائرکٹر موتی۔ بی۔ گڈوانی تھے۔ موخر الذکر نے خاموش فلموں میں کافی نام پیدا کیا تھا اور چند متکلم فلمیں بھی بنا چکے تھے۔

اس عرصہ میں سابق نیو انڈیا سٹوڈیو، جو بعد ازاں کملا مووی ٹون سٹوڈیو میں منتقل کر دیا گیا، کے قریب ہی ایک اور سٹوڈیو بنام ناردرن انڈیا سٹوڈیو قائم کیا گیا۔ اس کی اپنی تو ایک ہی فلم سہتی مراد بن پائی۔ یہ بھی خاصی کامیاب ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی صنعتِ فلمسازی کو ایک اور نیا چہرے سے تعارف کرایا ——— راگنی! اس کی موسیقی کا بھی خاصا چرچا ہوا۔ اور بہت جلد غلام حیدر کے نام کے علاوہ اس میدان میں دو تین نام اور چمک اٹھے۔ حسن لال، بھگت رام اور شیام سندر وغیرہ

پلے بیک میں بھی چند تہلکہ انگیز آوازیں لاہور سے اٹھیں اور بنگال اور بمبئی کے دلوں کو گرمانے لگیں۔ یہ منور سلطانہ۔ زینت اور شمشاد تھیں۔ روپ کے شوری نے بھی اس اثنا میں دیگر پروڈیوسروں کی سہتی مراد، راوی پار جیسی کامیاب فلموں کے علاوہ ایک نہایت کامیاب فلم منگتی بنا کر لاہور کے فلمی مرکز کو خاصی تقویت پہنچائی اور بمبئی کو ایک نیا چہرہ ممتاز شانتی پیش کیا۔ تاہم ڈی۔ ایم۔ پنچولی کی بے پناہ ہمتیں اور تجارتی قابلیت نے ہی لاہور کے فلمی مرکز کو استحکام بخشا۔ انھوں نے اب وسیع پیمانے پر فلمیں بنانے کے لیے پروہان پکچرز کی اساس ڈالی اور اس کے تحت نہ صرف "متروکہ" نیو اور ناردرن انڈیا سٹوڈیوز کرائے پر حاصل کرنے بلکہ وہ بڑے دو اتنی کامیاب تصاویر بنائیں جن کے باعث لاہور کی فلمی حیثیت ہندوستان بھر میں مشہور ہو گئی اور یہاں کی تصاویر کلکتہ اور بمبئی کی فلموں کا کاروباری اعتبار سے مقابلہ کرنے لگیں۔ مذکورہ فلمیں چوہدری اور خاندان تھیں۔ چوہدری نے جہاں نورجہاں کو مکمل ہیروئن کے روپ میں پیش کیا اور سحر انگیز پنجابی گانوں کے ذریعے نئے ریکارڈ کامیاب کیے وہاں خاندان نے لاہور مرکز کے فنی امکانات کو بھی کلکتہ اور بمبئی پر فیصلہ کن انداز میں اجاگر کر دیا۔ بلکہ بمبئی کی صنعت فلمسازی کا رخ بدل دیا۔ یہ نہ صرف مسلم سوشل پکچر بنانے کا خوف دور کرنا بلکہ ان میں کاروباری اور فنی اعتبار سے غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے پر مشتمل تھا محبوب کی "نجمہ" اور ظہور خاں (مرحوم) کی "پہلی نظر" اسی عالی حوصلگی کے نتائج تھے جس کا ڈی۔ ایم پنچولی نے پہلے پہل مظاہرہ کیا بلکہ اس اعتبار سے ایک بہت بڑا "ہوا" بھی دور کیا۔

خاندان اور چوہدری کی کامیابی کا سہرا درحقیقت تین فن کاروں کے سر تھا۔ کلکتہ کے نوجوان فلم ایڈیٹر شوکت حسین رضوی جو مشہور و معروف ہالی وڈ کے تربیت یافتہ ایڈیٹر۔ ڈائرکٹر عذرا میر کے شاگرد رشید تھے۔ شوکت کو پنچولی کی ہر نئی فلم کی تدوین کے لیے کلکتہ سے بلوایا جاتا۔ چوہدری (پنجابی) کی ہدایت کاری کا بیشتر کام بھی انھیں اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا گو ٹائٹل برڈیکن کا ہی نام دیا گیا جنھوں نے اسے شروع کیا تھا۔ شوکت، نورجہاں اور غلام حیدر نے مل کر امتیاز علی تاج کے تصنیف کردہ فلم کو اتنا کامیاب کیا کہ موخر الذکر کی کسی اور فلم کو اتنی شہرت نصیب نہ ہوئی۔

اس وقت "ہندوستان" پر جنوبی ہند سے ایک اور خطرناک حملہ جاری تھا۔ یہ حملہ اس کے بے شمار بہادروں نے اکا دکا طور پر نہیں کیا تھا بلکہ اس کے نئے تعمیر شدہ قلعے سے ہوا تھا ——— لاہور کے نئے فلم نگر سے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بمبئی، جو ہندوستانی فلموں کا سب سے بڑا فلمی مرکز ہونے کے باعث لاہور سے سہمنے لگا تھا، اس کے سپاہی اور سردار منہ مانگی قیمت پر اپنے ہاں بھرتی کرنے لگا۔ چنانچہ اداکاروں میں پنجاب سے نہ صرف نئے نکور چہرے بلکہ اس کے ابھرتے ستارے بھی اس کے اپنے آسمان کو چمکانے کے لیے اڑائے جانے لگے۔ وینا۔ ممتاز شانتی۔ شمیم۔ ثریا اور کئی "مغویہ" چہروں کے علاوہ نورجہاں کو بھی اب شوکت حسین رضوی اور غلام حیدر کے ساتھ اس پائے سلطنت کا دربار سجانے کے لیے بمبئی لایا گیا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ یہ ہر فنکار کا خواب تھا۔

بمبئی کی جوہر شناس نگاہیں بے تاب۔ لاہور کے ہیروں کی قدر و قیمت جانتی تھیں۔ اس کے باوجود پنچولی نے ایک آدھ اور ریکارڈ توڑ فلم داسی بنائی۔ یہ تصویر نہ صرف موسیقی بلکہ کہانی اور اداکاری اور فنی اعتبار سے بھی بڑی کامیاب ہوئی لیکن بمبئی نے آخری دفعہ پنچولی کے تمام حربے بے کار کر دیے۔ راگنی اب بمبئی کے آسمان پر چمکنے لگی اور اس کا بنگالی ڈائرکٹر ہرن بوس

ناقدری کا شکار ہو کر کلکتہ واپس چلا گیا۔ وہ بھی دراصل پنچولی کی نگاہِ انتخاب اور عالی حوصلگی اور تجرباتی رجحان کا مرہونِ منت تھا۔

واپسی کے بعد پنچولی نے جتنی تصاویر بنائیں وہ سب کی سب مجموعی طور پر ناکام رہیں۔ لیکن آغا جانی نے لاہور کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ اب بمبئی تک کے فن کار ان کی تصاویر میں کام کرنے کے خواہشمند ہو گئے۔ اس لیے جاگیردار جیسے عظیم فن کار اور شانتا آپٹے جیسی مشہور مغنیہ اور ستارہ کے علاوہ مینا جیسی کفرتولہ ہیروئن، کسم دیش پانڈے جیسی سیماب پا رقاصہ، الناصر اور نجم الحسن جیسے البیلے ہیرو (جن میں سے بیشتر لاہور ہی کی پیداوار تھے) ٹیکنیشن میں جمنا داس صوبیدار جیسے بلند پنچولی کی مختلف تصاویر کے لیے بمبئی سے بلائے گئے لیکن زمیندار۔ شہرت سے دور۔ بگڑ مڈی۔ کسی سے نہ کہا حتیٰ کہ پنچولی کی بیش بہا لاگت کی طلسماتی فلم، شیریں فرہاد بھی پنچولی کے نام ہی پر چل پائیں۔ پنچولی کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ان کی چربہ سازی کی عادت تھی۔ غیر ملکی، بالخصوص ہالی وڈ کی کامیاب فلموں کے پلاٹ، مناظر اور سائنس تک اڑانے اور ان کا ملغوبہ بنانے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اس کی بدترین صورت بعد ازاں پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نقالی کی کہ وہاں کی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے پنچولی سٹوڈیوز کے علاوہ شوری اور اپرا انڈیا سٹوڈیوز بھی قائم کیے گئے۔ پنچولی کے قریب ایک فلور پر مشتمل گروو بہار سٹوڈیو بھی قائم کیا گیا۔ اس کی فلورز، ناردرن انڈیا کی فلور کے لگ بھگ تھی۔ شوری سٹوڈیو نئے ساز و سامان سے بھی لیس کیا گیا لیکن اس میں بنائی ہوئی نہ تو کوئی فلم کامیاب ہوئی نہ ہی اس سٹوڈیو کو کوئی ذرہ بھر خوش اسلوبی سے چلا سکا۔ شوری فلمسازی کا تجربہ رکھنے کے باوجود بمبئی سے چندر موہن اور بیگم پارہ منگا کر ان سے "شالیمار" کامیاب نہ کرا سکا۔ یہ تصویر اس تاریخی سٹوڈیو واقع عقب ریجنٹ سینما میں بنائی گئی جہاں ناطق فلموں کے آغاز میں اے۔ آر۔ کاردار نے حکیم رام پرشاد سے مل کر دو فلمیں ہیر رانجھا اور گوپی ناتھ بنائی تھیں جو نئی ایجاد کے باعث کامیاب نہ ہو سکیں۔

ایک حکمران کی بنیادی کمزوری کے باعث جیسے اس کی آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے پنچولی کی چربہ سازی اور نئی دریافتوں کے بمبئی ہجرت کر جانے کے بعد لاہور کا فلمی مرکز قیامِ پاکستان سے پہلے پھر لڑکھڑانے لگا۔ فسادات کے دوران اس میں ایک ایسا خوفناک زلزلہ آیا کہ اس سے اس کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی آتشِ سیال نے یہاں کے ایک سٹوڈیو 'اپرا انڈیا' کو تو جلا کر خس و خاشاک اور ایک کو خاصا چاٹ کر رکھ دیا۔ یہ شوری سٹوڈیو تھا۔ سکرین پر تشدد گی اور لوٹ کھسوٹ دکھانے والے خود اس ہیبت ناک ڈرامے کے شکار ہو گئے جو ہندوستان کے طول و عرض میں خیبر سے لے کر راس کماری تک کھیلا جا رہا تھا۔ فقط پنچولی سٹوڈیوز واقعہ مسلم ٹاؤن ہی اس کی دست برد سے کسی حد تک بچا رہا۔ اس کی غیر منقولہ لیبارٹری کے علاوہ شوری سٹوڈیو کی طرح اس کے کیمرے وغیرہ بارڈر پار پہنچا دیئے گئے اور اس کا گھریلو استعمال کے قابل ساز و سامان اس کے محافظوں کے ہاں نظر آنے لگا۔

ایک سال بعد حالات قدرے معمول پر آنے کے بعد اس سٹوڈیو کا تالا کھولا گیا۔ لیکن اس وقت اس میں کام کرنے والوں کو ایک اور دھچکا لگا کہ یہاں تو ایک سابق اسسٹنٹ کیمرہ مین اور ساؤنڈ ریکارڈ سیکشنوں اور آرٹ ڈائرکشن کے شعبہ سے متعلق چند آدمیوں کے علاوہ کوئی مکمل طور پر تربیت یافتہ ٹیکنیشن ایک مسلمان صناع بھی نہ ملتا تھا۔ البتہ مدراس کے

پیگ اپ انڈیا میں ضرور ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے۔ تب یہ حقیقت وا ہوئی کہ غیر مسلم فلمساز مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی تعصب کی بنا پر اور پسماندہ رکھنے کے لیے انھیں فلم سازی کا کام سیکھنے کا کم موقع دیتے تھے۔ بلکہ مسلمان خود بھی اس سے گریز کرتے تھے۔ یہ کلیہ ہندوستان کے دیگر فلمی مراکز پر بھی صادق آتا تھا کیونکہ اُن دنوں ہندوستان میں صرف تین مکمل تربیت یافتہ اور تجربہ کار کیمرہ مین کام کر رہے تھے۔ کلکتہ میں یوسف مولجی، پونہ میں عزیز، بمبئی میں احمد اللہ اجمیری۔ صدا بندی میں روشن۔ جیلانی اور دو ایک اور کہیں چھوٹی موٹی فلمیں ریکارڈ کر لیتے۔ فقط شیراز علی پا بانی نے بی۔ ٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ آرٹ ڈائرکشن میں تو کوئی ایک مشہور تھے۔ اس میدان میں شیخ فتح لال کا نام ہمیشہ سر فہرست آتا رہا۔ لاہور کے این۔ ایم خواجہ نے جو مہاجر ہو کر لاہور واپس آ گئے بمبئی میں اپنے لیے قابلِ احترام جگہ پیدا کر لی تھی۔

لیکن ہندوستان میں مسلمان فن کاروں، ہدایت کاروں اور اداکاروں اور مصنفین اور گیت نگاروں کے مقابلے میں لاہور کی حیثیت پاسنگ برابر بھی نہ تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت ڈائرکٹروں میں شوکت حسین رضوی۔ سبطین فضلی۔ نذیر اور ڈبلیو۔ زیڈ احمد۔ اداکاروں میں نور جہاں، سورن لتا، نینا۔ گیت نگاروں میں تنویر نقوی، میوزک ڈائرکٹرز میں غلام حیدر (مرحوم) فیروز نظامی۔ سرمایہ دار اور فلمسازوں میں سیٹھ شیراز علی، حکیم جیسی ممتاز شخصیتیں بڑے سہانے خواب اور درخشاں نصب العین لے کر پاکستان آئیں۔ ان میں سے ارباب اقتدار نے کس کو "ففٹی ففٹی" کی بنا پر مدد دینے کا وعدہ کیا اور ان میں سے کون اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اس کا ذکر بے سود ہے۔ آزاد ملک میں فلم کے لیے کسی نے بھی کوئی جگہ پیدا نہیں کی نہ ہی ان کے ذہن میں قومی تعمیر اور صحت مند سامان تفریح کے لیے اس موثر ترین ذریعے کو استعمال کرنے کا پہلے تصور ہی آیا تھا۔

چنانچہ ڈیڑھ ایک برس تک تو مذکرہ مہاجرین کراچی اور لاہور کے درمیان شٹل بنے رہے۔ قرعہ فال ... لاہور کے نام ہی نکلا۔ اس کا فلمی نشیمن ہی انھیں جائے پناہ دے سکتا تھا۔ ان کی حیثیت اس وقت ایک ایسے سپاہی کی سی تھی جس نے گولہ بارود خود ہی بنا کر اس سے لڑنا ہو۔ وہ بھی اپنا گھر جلا کر! اس وقت نہ ہی تو سرمایہ میسر آتا، نہ ہی ڈھب کے ... ہاتھ لگتے۔ جنھیں فلم بنانے کا تجربہ تھا، انھیں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑا۔ شروع شروع میں ناکندہ تراشوں اور عطائیوں نے ڈو کیو تیرہ اور ایک ایک، دو دو یا تین تین ریل کی فلمیں بنائیں۔ اور یوں پنچولی سٹوڈیو کا تالا کھلنے پر پاکستانی فلمسازی کے پرانے، اکلوتے مرکز کو وہی دورِ گذشتہ دیکھنا پڑا جس کے باعث یہ کبھی ہندوستانی فلمسازی میں رشک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو بمبئی کا ہر فلمی چوبدار اور نامور ہستیوں کا خوشہ چیں یا حواری بھی خاندانِ مغلیہ کا سچا چشم و چراغ بن کر اترانے لگا اور فلمی تخت پر بیٹھنے لگا۔

اس وقت فقط ڈائرکٹر پروڈیوسر نذیر ہی جرأت رندانہ سے کر پہلے میدان میں اُترے۔ انھوں نے ٹوٹے پھوٹے سازوسامان کے ساتھ پھیرے' (پنجابی) بنائی۔ یہ پکچر سلور جوبلی ثابت ہوئی اور ایک لحاظ سے پاکستانی صنعت فلمسازی کی سنگِ بنیاد پڑی۔ موصوف نے حوصلہ شکن اور غیر یقینی حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے سرعت سے فلمیں بنا بنا کر اور چلا چلا کر اپنے اُن مہاجر ساتھیوں کا حوصلہ بندھایا جن میں سے بیشتر اب تک ساحل پر کھڑے یا تو طوفان کا نظارہ کر رہے تھے یا ایک ایسی کشتی کی تلاش میں تھے جو ان کی جان بہرصورت بچانے کی گارنٹی دے!

ان دنوں شوکت حسین رضوی کی تازہ ترین بمبئی کی فلم جگنو ہر جگہ کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے باوجود انھیں آسانی سے سرمایہ فراہم نہ کرا سکی۔ بہرنوع دونوں میاں اور بیوی (نور جہاں) نے مل کر شوری سٹوڈیو الاٹ کروا کر اس میں شاہ نور سٹوڈیو کی داغ بیل ڈالی اور یہاں اپنی ذاتی فلم "چن وے" بنائی۔ اس کی موسیقی جگنو ہی کے شہرت یافتہ لاہور کے مہاجر میوزک ڈائرکٹر فیروز نظامی نے ترتیب دی۔ یہ پکچر خاصی چلی۔

اس دوران میں شہزادہ مزاج سبطین فضلی نے بھی "دوپٹہ" بنانے کا عمل شروع کیا جو دو اڑھائی برس میں پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس میں نور جہاں اور فیروز نظامی کے علاوہ ایک ایسے مقامی آرٹسٹ بطور ہیرو پیش کیا گیا جو بعد ازاں پاکستان کے مقبول ترین آرٹسٹوں میں شمار ہونے لگا۔ یہ سدھیر (شاہ زمان) تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد پہلے کی طرح پرشکوہ، وسیع پیمانے پر کام کرنے کے منصوبے تیار کرتے رہے حتیٰ کہ وہ حکومت سے نو دس لاکھ روپیہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے انھوں نے فلم کو آپریٹو کی بنا ڈالی۔ اس میں انھوں نے اپنے سابق اسسٹنٹ مسعود پرویز کو بطور ڈائرکٹر، مشہور میوزک ڈائرکٹر خورشید انور جنھوں نے "کڑمائی" "پروانہ" اور "اشارہ" میں خاصی شہرت حاصل کی تھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ اس میں لاہور کے ایک اور خوب رو فن کار نجم الحسن شامل تھے۔ جنھیں دیویکا رانی کے ساتھ "جوانی کی ہوا" میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور جو بعد ازاں کلکتہ اور لاہور کی چند فلموں میں ہیرو کا کام کر چکے تھے۔ قبل از پاکستان انھوں نے ایک فلم نہ صرف تصنیف کی بلکہ ڈائرکٹ بھی کی۔ بیگم ڈبلیو۔ زیڈ احمد کو بھی کمپنی کا ایک اہم شعبہ بطور انچارج سونپا گیا۔ فلم کو آپریٹو نے اپنا مال مالا پنچولی سٹوڈیو ملے الاٹ کروا کر سال میں بارہ تصاویر بنا کر دینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ان میں سے صرف ایک ہی "پردہ" بمشکل پایۂ تکمیل پذیر ہوئی۔ اُدھر سکرین اینڈ ساؤنڈ سٹوڈیوز کے نام سے ایک اور نیم سرکاری ادارہ قائم کیا گیا۔ اسے بھی حکومت نے مدد کے طور پر نو لاکھ کے قریب روپیہ دیا لیکن یہ بھی لاہور کی قدیم اور فلمسازی کی مہلک ترین بیماری۔ عیش و عشرت۔ اور ناتجربہ کار اور بزخود غلط لوگوں کی نذر ہو گیا۔

اس عرصہ میں "شاردا" اور "مجبور" جیسی کامیاب فلموں کے مصنف، نذیر اجمیری بھی بمبئی سے یہاں چلے آئے۔ منشی دل پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ اوّل الذکر نے بعد ازاں کئی فلمیں بنائیں لیکن ان میں سے بدقسمتی سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ منشی دل کے پاؤں بمبئی کی طرح پھر جم گئے۔ ان کی پہلی پنجابی فلم "..." خاصی کامیاب ہوئی۔

سبطین فضلی اور شوکت رضوی اپنی مخصوص طبائع حالات اور کاروبار کی نوعیت کے باعث پہلے کی طرح فلمیں بنانے سے قاصر تھے۔ پرانی پود میں سے کلکتہ کے داؤد چاند ہی سے اپنی قسم کی کامیاب فلمیں بنانے کی توقعات وابستہ تھیں۔ انھوں نے بعد ازاں چند کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی صنعت فلمسازی کے استحکام میں کسی حد تک حصہ بھی لیا۔

شروع شروع میں بمبئی کے ہونہار "مشترکہ" ہدایت کار لقمان نے "شاہدہ" بنا کر انور کمال پاشا کا فلمی دنیا سے تعارف کرایا۔

اس جگہ چند مشہور ادیبوں اور فلم نویسوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا جو کچھ عرصے میں جہاں فلم [illegible] فقدان تھا وہاں تربیت یافتہ فلم نویسوں کا [illegible]

بیدی وغیرہ یہاں واپس نہ آئے۔ یہ بیشتر ایسے لاہوری فن کاروں کی طرح تھے جو یا تو سیاسی مجبوریوں کے تحت لاہور واپس نہیں آ سکتے تھے یا اپنی کے لیے بمبئی کی فضا زیادہ موزوں پاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پاکستان فلمسازی کو مستحکم ہوتے اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات کو دیکھ کر ہی یہاں آنے کے لیے پر تولنا چاہتے تھے۔ ایسے مصنفین میں سعادت حسن منٹو، تنویر نقوی اور کسی حد تک قدیر اجمیری ہی ایسے لوگ تھے جنھیں بمبئی چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ ملکی صنعت فلمسازی کی زبوں حالی، تاریک مستقبل اور فلمسازوں کے گھٹیا وطیروں اور ہتھکنڈوں، حکومت کی سرد مہری سے سب کے سب نالاں تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو شاید واپس چلے جاتے۔

اگر ایک طرف نا تجربہ کار صناعوں کا گلہ تھا تو دوسری طرف سرمایہ کی کمی کی شکایت۔ اس صورت میں ملکی صنعت کی جس کا منبع و مرکز لاہور تھا (چونکہ یہاں کے علاوہ ملک میں کہیں اور فلمیں نہیں بنتی تھیں) سب سے بڑا حریف، ہندوستانی فلموں کی بلا روک ٹوک ملک میں آمد اور نمائش تھی۔ اس حالت میں مجموعی طور پر چیونٹی کو ہاتھی سے ٹکرانا تھا۔ چنانچہ لاہور میں ۱۹۵۳ء تک سال میں اوسطاً چھ سات فلمیں ہی بن پاتیں۔ مقابلتاً نہایت وسیع وسائل سے تیار شدہ ایسی فلموں کا پاکستانی فلموں کو پچھاڑ دینا یا زیادہ کامیاب ہونا عین فطرتی تھا۔ اس لیے ان کی کھلی درآمد پر کسی نہ کسی طرح پابندی لگانے کے لیے پہلے تو حکومت سے اپیل کی گئی۔ اس کے بعد ہندوستانی فلموں کا پاکستانی فلموں سے شرح تبادلہ کرنے کے فارمولے وضع کیے گئے۔ ہندوستانی فلمساز حیران تھے کہ انہی کے آزمودہ اور شہرت یافتہ ہدایت کاروں اور فن کاروں کو پاکستان (لاہور) آکر کیا ہو گیا تھا کہ اب وہ پہلی سی اعلیٰ فلمیں نہیں بنا سکتے تھے۔ اس کا جواب محدود وسائل، سرمایہ کی کمی اور محدود مارکیٹ تھا۔

جون ۱۹۵۴ء میں ہندوستانی فلمیں بند کروانے کے لیے بمبئی کی ایک فلم "جال" پر لاہور کی صنعت نے ہندوستانی فلموں کے بائیکاٹ کے طور پر اس کے خلاف ہڑتال شروع کر دی۔ یہ لہر ملک کے بڑے بڑے شہروں تک پہنچ گئی۔ وہاں بھی ہمدردی کے طور پر اس تصویر کے خلاف پبلک نے مظاہرے کیے۔ لاہور میں اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ چند سرمایہ دار اور با رسوخ تقسیم کاروں کی مخالفت کے باوجود اس کے کارکنان اور رضا کاران نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے گرفتاریاں دینی شروع کر دیں۔ اس کے نتیجے میں دو تین ہفتوں تک نگارخانوں میں تالے پڑ گئے اور کئی فنکاروں کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس تحریک کی قیادت بمبئی ہی کے مہاجرین نے کی۔ ان کے سربراہ کی غداری کے باوجود حکومت نے پانچ برس کے لیے ملکی صنعت کے تحفظ کے لیے اسے فروغ دینے کی خاطر ہندوستانی فلموں پر پابندی لگا دی۔ کہ ایک پاکستانی فلم کے عوض میں ایک ہندوستانی فلم کو درآمد کرنے کی اجازت دی جائیگی۔ یعنی جب تک ایک پاکستانی فلم ہندوستان برآمد نہ کی جائے تب تک کوئی شخص وہاں سے فلم لا کر ملک میں نہیں چلا سکتا۔ اس کے ساتھ ایک اور شرط عائد کر دی گئی کہ ایسے کاروبار کے لیے فلمساز ہونا ضروری ہے۔ یعنی کوئی غیر فلمساز (تقسیم کار) پاکستانی فلم خرید کر اس کے عوض ہندوستان سے اس کے تبادلے میں فلم نہیں لا سکتا۔

اس کے نتیجے میں پاکستانی صنعت فلم سازی میں ایک نیا دور شروع ہوا —— قریباً ہر تقسیم کار فلمسازی کے میدان میں کود پڑا۔ اس نے یا تو پیش کار کا یا فلمساز کا روپ دھار لیا۔ اور تو اور بعض نمائش کنندوں نے بھی فلمسازی کی طرف بلاواسطہ یا بالواسطہ رجوع کیا اور دیکھتے دیکھتے سال میں پہلے کی چھ یا سات فلموں کے برعکس چالیس کے لگ بھگ فلمیں بننے لگیں۔ آئے دن نئی فلموں کے مہورت ہوتے اور پرانی فلمیں ختم ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب کہ شہر کے چاروں سٹوڈیوز میں (جن میں ایک نیا

ایورنیو سٹوڈیو کا بعد ازاں اضافہ ہوگیا) شوٹنگ کے لیے بیسیوں جگہ نہ مل سکتی۔ صنعت کے علاوہ باہر سے بھی سرمایہ بڑی آسانی سے ملنے لگا۔ دو تین برس تو پچاس فیصدی سے زیادہ فلمیں کامیاب بھی ثابت ہوئیں۔ اتنی کامیاب کہ بظاہر انھوں نے ملکی صنعت میں ایک زرّیں باب کھول دیا۔

اس کامیابی کی ذمہ داری ہندوستانی فلموں پر کڑی پابندی اور دیگر عوامی تفریح کے ذرائع کی عدم موجودگی تھی۔ لیکن سب نگار خانوں سے ایک ہی قسم کی آواز آتی۔ (ملکہ سٹوڈیوز (سابق پنچولی عدا اپر مال) شاہ نور (سابق شوری) اور پنجاب آرٹ (سابق پنچولی نمبر ۲۔ مسلم ٹاؤن) اور ایورنیو، جنھیں نئے سامان سے بھی لیس کیا گیا اور جن میں مزید توسیع بھی کی گئی) ... سٹیج کی آواز ہر جگہ جیسے آغا حشر فلمایا جا رہا ہو۔ ایسی چند فلموں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہونے کے باعث سو فیصدی متکلم اور گیت دار فلمیں بننے کی ریت پڑ گئی۔ آغا حشر کے ڈراموں کو مختلف صورتوں میں پیش کیا جاتا، اس کے مکالمے مختلف جگہ تھوڑی بہت رد و بدل کر کے فٹ کیے جاتے یا وہی تھا کے نیچے رکھ کر انھی پر کاربن پیپر کے ذریعے دوسرے کاغذ پر اتار لیے جاتے۔ حکیم احمد شجاع کے لڑکے انور کمال پاشا اس تجدید کے بانی تھے۔ ان کی پانچ چھ تصادیر دو آنسو، غلام، گمنام، قاتل، سرفروش وغیرہ نے اسی وجہ سے حیرت انگیز کامیابی کی اور اس کٹھن دَور میں نذیر کے بعد ملکی صنعت کو عصا سنبھالا دیا۔ اسی مدرسۂ فکر کے ایک ممتاز نمائندے، کہنہ مشق اور آزمودہ کار مصنف شاطر غزنوی نے اس احیا میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس عام روش میں، بلکہ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کے مطالبے کے سامنے ہر مصنف کو اپنی بقا کے لیے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس قسم کی غیر فلمی فلموں نے اتنا زور پکڑا کہ ان میں نئے رجحانات کو پنپنے کا تو کیا کہنا، ابھرنے تک کا موقعہ نہ ملا۔ تین چار برس میں یہ نسخہ بھی بے کار ہو گیا۔ چونکہ چند فلمساز، ہدایت کاروں کے علاوہ جن میں شوکت حسین رضوی، سبطین فضلی اور ڈبلیو۔ زیڈ احمد شامل تھے، ناکندہ تراشی اور خود ساختہ ہدایت کار تھے بلکہ ملکی صنعت کے لیے فلمسازی کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔ نہ ہی ملک میں کوئی تربیت گاہ تھی جس میں فلم کے مختلف شعبوں میں تعلیم و تربیت دینے کے لیے انتظام ہوتا۔ اس لیے لاہور کو ——— پاکستان کی فلم سازی کو ——— تھیٹریکل فلموں کا ہی سہارا لینا پڑا۔ ان کی نظر میں آغا حشر اس کا بہترین نمائندہ تھا۔

ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی روحی اور اشفاق ملک (اے۔ آر کاردار کے بھانجے اور شاگرد) نے ڈگر سے ہٹ کر پہلے پہل دو فلمیں ضرور بنائیں۔ روحی میں ایک ناقص ماحول کی پیداوار لڑکی کی داستان تھی۔ اس کا پس منظر غریب مہاجر تھے۔ اشفاق ملک کی پرواز ایک غریب لڑکے کی ترقی کرنے کے متعلق ایک نفسیاتی فلم تھی۔ روحی کی ناکامی کا سبب اس کی ڈاکیومنٹری طرز اور پروپیگنڈا کا انداز تھا۔ اس کے مکالمے اور موسیقی بھی خاصے کمزور تھے۔ اس کے برعکس پرواز، گو کہ یہ اے پلیس ان دی سن سے متاثر ہو کر بنائی گئی، سینریو، ٹریٹمنٹ، شوٹنگ، ایڈیٹنگ اور ہدایت کاری کے اعتبار سے انتہائی اچھوتی فلم ہونے کے باوجود نفسیاتی مطالعہ ہونے کے باعث کاروباری نقطۂ نگاہ سے ناکام ثابت ہوئی۔ اسی موضوع کو فائل میں تھیٹریکل انداز میں کاروباری اعتبار سے بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا۔

اس اثنا میں "سہتی" نے ایک اور طرح ڈالی۔ یہ فارمولہ اور ملبوساتی فلم تھی۔ رومان، مار دھاڑ، ڈرامہ، کامیڈی، ملیح گانے وغیرہ کا ایک ورائٹی شو بنانا بھی مقبول ہوتا چلا گیا۔ دلا بھٹی اور سردار اس کی معراج تھے۔

ان کی ایک ترقی یافتہ صورت قدرے صحت مند ایکشن پکچر تھی۔ ان کا خالق کردار کتبۂ فکر کا پاکستانی نمائندہ اشفاق ملک ثابت ہوا۔ پرواز جیسے دقیق اور نازک موضوع کی ناکامی کے بعد انھوں نے مجبوراً کامیاب مغربی فلموں کے پاکستانی چربے نہایت محنت وکاوش اور دلآویز انداز میں یکے بعد دیگرے "باغی" اور "آخری نشان" میں پیش کیے۔ اس کے بعد انھوں نے یکلخت اپنا انداز بدل کر اپنے ماموں کی انتہائی کامیاب فلم شارو اکو دوبارہ اتنی ہی کامیابی سے پاکستانی قالب میں ڈھالا۔ لیکن اب وہ پھر ایکشن پکچر کی طرف اپنی نئی فلم اجنبی میں مراجعت کر رہے ہیں۔ باکس آفس کے ڈر نے انھیں اچھوتے موضوعات پر فلم بنانے سے روک دیا ہے اور رفتہ رفتہ تقسیم کار بھی اب ان کو ایکشن پکچر بنانے کا ماہر سمجھنے لگے ہیں۔ بہرحال اب بھی اشفاق ملک سے پاکستانی فلمسازی کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

پچھلے تین چار برس سے اس صنعت میں جو بحران شروع ہوا اس کی سب سے بڑی وجہ وہ شرمناک سوقیانہ پنجابی فلمیں تھیں جن پر اب ان کے بنانے والے خود بھی نادم نظر آتے ہیں۔ یہ فلمیں "ماہی منڈا" اور "بکے والی" تھیں۔ ان میں جہاں کئی شوخ دھنیں بنانے اور سنوانے کا موقعہ دیا گیا وہاں انھیں لغو اور ذومعنی مذاق کا مرقع بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ایسی تعداد بڑھنے لگی۔ پرواز۔ قسمت۔ گلنار۔ وعدہ وغیرہ جیسی چند صاف ستھری فلموں کی قسم کو بننے سے روک دیا۔ مذکورہ پنجابی فلموں کی بے پناہ مقبولیت کے بعد فلم شڈیو مندروں کی بجائے ہنگڑ خانوں اور فلم کمپنیاں عشرت گاہوں کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ اور ہر فحش بیان کو بڑھ چڑھ کر فلمیں بنانے کا کسی نہ کسی صورت میں موقعہ ملنے لگا۔ ان سے ملکی صنعت فلم سازی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے باعث سوسائٹی میں اس کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ فلمی پریس نے ایسے لوگوں کو جہاں بے نقاب کیا وہاں اس کا دامن خود بھی اس کے باعث داغدار ہو گیا۔ جب یہ حکومت کی توجہ اس زبوں حالی کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی مدد کرنے کی بجائے اس سے متنفر ہوتی چلی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے۔

یہ راز اب انکشاف طلب نہیں رہا۔

بہرنوع موجودہ بحران کے باوجود ملکی صنعت فلمسازی کا مستقبل تاریک نہیں۔ اگر اسے گذشتہ سیاسی بحران کا پرتو اور انھی حالات واسباب کی پیداوار کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ کوئی پودا ہوا میں نہیں اُگ سکتا۔ چنانچہ ملکی صنعت فلمسازی کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ اسے زمین کی ضرورت تھی۔

جو دریا خشک ہو چکے ہوں وہ مرغزاروں کی آبیاری کیا کریں گے۔ ہمارے پرانے فلمساز بھی اب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ نئے معرکے نہیں مار سکتے۔ نئے موضوعات پر نئے ڈھنگ اور نئی موج سے فلم بنانے کے لیے نئے دماغوں کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بزرگوں کے تجربات سے اس ضمن میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ بیشتر جدید فنکار، بر خود غلط اور خود پسند لوگ دانشوری کا نقاب پہن کر اس حقیقت کو بھی فراموش کر گئے ہیں کہ انھیں چند بنیادی اصول سیکھنے کے لیے اب بھی اپنے فلمی بزرگ اساتذہ کی ضرورت ہے۔ دیا دیے سے جلتا ہے اور جب تک دیے کا نعم البدل تلاش نہ کر لیا جائے پرانی شمعوں کو بجھا دینا خود کو تاریکی میں دھکیل دینا ہے۔ ہمیں کبھی کبھی اس قسم کی

روشنی کی مدھم سی کرن دکھائی دے جاتی ہے۔ چند مذکورہ بالا فلموں کے علاوہ ہمیں کالا آدمی، ڈھولا، زہرِ عشق، کوئل، فرشتہ اور سہیلی وغیرہ میں ایسی جھلکیاں ملتی ہیں۔ نئی پود میں سے بعض کو خاصی شدت سے احساس ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں اپنی فلموں میں جدت پیدا کرنی چاہیے۔ اشفاق ملک۔ ڈبلیو زیڈ احمد۔ خورشید انور، مسعود پرویز، ایس۔ ایم یوسف اور بعض دیگر گنے چنے ہدایت کاروں سے ملکی صنعت کو دوبارہ منظم کرنے کے لیے خاصی مدد مل سکتی ہے۔ فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے اور اس سے حتی الامکان فائدہ اٹھانے کے لیے پاکستان فلم گلڈ اور پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے سرکردگان جب تک مخلصانہ طور پر ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگا دیتے ملکی صنعت کا استحکام حاصل کرنا ویرانے کا خواب بن کر رہ جائے گا۔ حکومت سے مدد مانگنے سے پہلے ان کے طلب گاروں کو دیانت داری سے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا ہو گا کہ وہ اس کے کس حد تک مستحق ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی لاہور نے صبیحہ جیسی بلند پایہ فنکارہ پیدا کی ہے، شمیم آرا اور نیر سلطانہ۔ علاؤالدین اور طالش جیسے آرٹسٹ کو جلا بخشی ہے۔ ماسٹر عنایت اور مصلح الدین وغیرہ میوزک ڈائرکٹر، سیف الدین سیف، منیر نیازی، فیض احمد فیض اور دیگر فن کاروں کو پنپنے کا موقعہ دیا ہے۔ لاہور میں اس وقت رضا میر۔ نبی احمد جیسے کیمرہ مینوں کے قابلِ فخر کارنامے دیکھے ہیں۔ ہمیں پچھلے سال پریذیڈنٹس فلم ایوارڈز کے سلسلے میں قائم شدہ فلمی میلے کا آغاز ہوا۔ اکیس برس پہلے ہمیں غالباً پی۔ سی بروا کی صدارت میں ایک فلم کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اور سہیلی کو سال کی بہترین فلم قرار دے کر انعام دیا گیا۔ یہ فلم فنی اعتبار سے خواہ مطلوب حد تک بلند پایہ نہ ہو لیکن اسے ہندوستانی فلم فیسٹیول کے تحت ہندوستان میں بڑے بڑے شہروں میں ریلیز کرنے کے بعد اسے جتنی شاندار کامیابی ہوئی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں جوہر کی اتنی کمی نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں، صرف ایسے نگینوں کو تلاش کر کے تراشنے کی ہے جو بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان سے بہتر کئی اور تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ہمارے ہی کئی بتوں کی روشنی ہمیں اب ہندوستانی فلموں میں خیرہ کیے دیتی ہے۔

ضرورت صرف تنظیم، شعور اور صنعت کو فروغ دینے کے لیے متحدہ جدوجہد اور جرأت رندانہ کی ہے — دراصل لاہور کی صنعت فلم سازی کا نشاۃ الثانیہ اب شروع ہوا ہے۔ آندھی اور جھکڑ چلنے کے بعد ہی گنگناتی ہوئی بارش ہوتی ہے اور اس کے بعد آسمان میں سات رنگا جھولا پڑ جاتا ہے!

اطبّاء

(عہدِ مغلیہ سے دورِ حاضر تک)

حکیم محمد موسیٰ

اس تاریخی مضمون کو جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے، میں نے چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّہ اوّل عہدِ مغلیہ سے پہلے کے اطبّاء، حصّہ دوم عہدِ مغلیہ اور سکھوں کے عہد کے اطبّاء، حصّہ سوم انگریزی عہد کے اطبّاء۔ حصّہ چہارم، موجودہ عہد کے زندہ اطبّاء۔

۱۔ عہدِ مغلیہ سے پہلے کے اطباء

ضیاء الدین عبدالرافع

یہ غزنوی خاندان کے آخری سلطان خسرو ملک بن خسرو شاہ کے عہدِ حکومت (۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) میں لاہور میں موجود تھے۔ اس عہد کے تذکرہ نویس "محمد عوفی" نے "لباب الالباب" میں ان کا حال لکھا ہے جو بحوالہ "مآثر لاہور" درجِ ذیل ہے:۔

"طب میں ماہرِ کامل اور پہلے دربار خسرو ملک میں معزز و محترم تھا۔ ایک رسالہ "جلالیہ" نامی بادشاہ سے معنون کیا تھا۔ نہایت قادر الکلام شاعر مانا گیا ہے۔ ایک قصیدہ مدح امتحان کے موقع پر بقول عوفی ایسا لکھا کہ کسی اور ہم عصر سے بن نہ پڑا۔" [1]

مطلع ہے ؎

جاناں مپوش بر گل رخسار آستیں ۔۔۔ و ز خون مرا مخواہ چو گلنار آستیں

خسرو ملک کے زوال کے بعد ضیاء الدین عبدالرافع کو معزالدین غوری معروف بہ شہاب الدین کے عہد میں بہت زیادہ فروغ نصیب ہوا۔[2]

---

[1] مآثر لاہور ص ۱۴۹ بحوالہ لباب الالباب ج ۲ ص ۲۲

[2] بحوالہ مذکور

رائے گھمن عرف سلو دہرہ

"تذکرہ قطبیہ" (فارسی) حضرت عبدالجلیل قطب العالمؒ کے حالات و کرامات پر مشتمل ہے۔ اس کے مؤلف شیخ جمال الدین ابوبکرؒ برادرِ قطب العالمؒ ہیں۔ اس تذکرے میں حکیم رائے گھمن کا ذکر یوں ہوا ہے کہ حضرت موصوف بیمار ہو گئے اور آپ کے مرید حکیم صاحب مذکور کو جو مسیحائے زماں تھے، علاج کے لیے لے آئے۔ انھوں نے یہ قاطع بلغم نسخہ تجویز کیا۔ زنجبیل خشک، زنجبیل تر، چراغتہ، قرنفل، تربدؔ[1]۔

حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ سلطان بہلول لودھی کے عہد میں لاہور وارد ہوئے اور سلطان سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں ۹۱۰ھ میں فوت ہوئے لہٰذا رائے گھمن کو سلاطین لودھی کے عہد کا طبیب سمجھنا چاہیے۔

۲۔ مغلوں اور سکھوں کے عہد کے اطباء

نجیب الدین ہمام

حکیم ہمام، حکیم ابوالفتح گیلانی متوفی ۹۹۷ھ کے برادرِ خورد تھے۔ بڑے تجربہ کار اور فاضل طبیب تھے۔ ان کو دربارِ اکبری میں خاص مقام حاصل تھا۔ دربار کی مجلسِ مقننہ کے ممبر تھے، منصب حاصل تھا۔ توزک میں جہانگیر نے ان کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ حکیم ہمام نے دو ماہ بعارضہ دق بیمار رہ کر ۶ ربیع الاول ۱۰۰۴ھ کو بمقام لاہور انتقال کیا اور اپنے بھائی حکیم ابوالفتح کے پاس "حسن ابدال" میں مدفون ہوئے۔ ان کے لڑکے حکیم حاذق اور حکیم خوشحال تھے۔

جلال الدین مظفر اُردستانی

یہ اردستان قسمت اصفہان میں پیدا ہوئے، نوعمری میں شاہ طہماسپ کے طبیب مقرر ہو گئے۔ جالینوس دوراں ہونے کے مدعی تھے۔ طب کے حصۂ عملی میں آپ کو بہت زیادہ ملکہ حاصل تھا۔ نہایت خوبصورت تھے، جب شاہ طہماسپ کے دربار میں پہنچے تو ابھی داڑھی نہ نکلی تھی، شاہ موصوف نے آپ کو دیکھتے ہی یہ کہا ع

"خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم"

حکیم مظفر زمانۂ شباب ہی میں ہندوستان آ گئے تھے۔ عہدِ اکبری میں دو صدی منصب حاصل تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے "تزک" میں اس طبیب کی لیاقت و حذاقت کا حال یوں بیان کیا ہے :۔

"اس کا معاصر حکیم بو علی علم و فضیلت میں اس سے بڑھ کر تھا۔ معالجہ، مبارک قدمی، صحیح مشورہ
اور عادات و اطوار کی پاکیزگی میں حکیم جلال الدین مظفر اُردستانی حکیم بو علی سے بڑھ کر تھا اور
اس بات میں دنیا کے دوسرے اطباء و حکماء کو بھی حکیم مظفر سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔
اچھا طبیب ہونے کے علاوہ اس میں بہت سی اور خوبیاں تھیں۔ مجھ سے اخلاص رکھتا تھا[2]۔"

حکیم موصوف نے جب لاہور میں اپنا رہائشی مکان بنایا تھا تو آپ کی درخواست پر جہانگیر بادشاہ آپ کے مکان پر تشریف لائے تھے۔ توزکِ جہانگیری میں مسطور ہے :۔

"اس نے لاہور میں گھر بنایا تھا تو مجھ سے درخواست کی تھی کہ اس کے گھر جانے کا شرف

---

[1] تذکرہ قطبیہ مطبوعہ لاہور ص۴۳   [2] ترجمہ توزکِ جہانگیری مطبوعہ لاہور ص۲۱۶

اسے بخشوں میں نے اس سے گہرا ربطِ خاطر رکھنے کی وجہ سے اس کی درخواست قبول کرلی تھی۔[1]

حکیم جلال الدین مظفر سِل کے عارضہ میں چند سال مبتلا رہے۔ آخر یہی مرض ان کی موت کا سبب بنا۔ چونکہ کثرتِ جریانِ خون کے سبب فوت ہوئے تھے اس لیے شبہ ہوا کہ شاید کسی نے زہر دے دیا ہے۔ قلیج خاں حاکمِ لاہور کو اس سے مطلع کیا گیا تو اس نے اس امر کی پوری پوری تحقیقات کی جس کے بعد ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔[2] تاریخِ وفات ۲۲ رجب ۱۰۰۵ھ ہے ـــــ ان حکیم صاحب نے کوئی قابل اولاد اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکیم مظفر آج سے پونے تین سو سال قبل فصد کا سخت مخالف تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ راے اور نابغہ تھا۔

علی گیلانی | یہ گیلان کے رہنے والے تھے، انھوں نے طب اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین اور حکیم فتح اللہ شیرازی سے پڑھی تھی۔ نکبت و افلاس کے مارے واردِ ہند ہوئے مگر آتے ہی شاہی ملازمت مل گئی جس کے سبب باقی تمام عمر آرام و آسائش سے بسر ہوئی۔ نہایت ذہین، تجربہ کار اور فاضل یگانہ طبیب تھے۔ دورِ مغلیہ میں اس مقام کا ذہین طبیب و علامہ کوئی نہیں ہوا۔ لکھا ہے:۔

"شروع شروع میں جب وہ دربار میں آیا ہے تو بادشاہ کے حکم سے اس کی فراست و تجربہ کاری کے امتحان کی غرض سے مختلف قسم کے قارورے اس کو دکھائے گئے جو بیں تندرست اور مریض آدمی اور گائے نیز گدھے کا قارورہ بھی تھا۔ حکیم نے قارورے دیکھ کر سب کے صحیح صحیح حالات بیان کر دیے۔ اس وقت سے بادشاہ کی نگاہ میں اس کی بہت وقعت ہو گئی۔"[3]

حکیم علی گیلانی، اکبر کے عہدِ حکومت میں لاہور میں رہے تھے اور انھوں نے یہاں اپنے مکان میں ایک عجیب و غریب حوض بنایا تھا جس کو دیکھنے کے لیے اکبر بادشاہ بھی گئے تھے۔ یہ حوض ۲۹ جلوس مطابق ۱۰۰۲ھ میں تعمیر کیا تھا، اس کا عرض و طول ۲۰×۲۰ تھا اور گہرائی بھی گز تھی۔ حوض کے اندر ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں دس بارہ آدمی بخوبی بیٹھ سکتے تھے۔ کمرہ خوب روشن تھا لیکن ہوا کا رُخ اس طرح قائم کیا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی کمرہ کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ کمرہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ رہتا تھا۔ "ماثر الامرا" میں حوض اور اکبر کے سیر کرنے کا حال یوں لکھا ہے:۔

"در کنج حوض حجرے بہ آب فرو بُردہ دو سہ زینہ پائیں رفتہ بداں خانہ در آمد، بسیار بہ تکلف آراستہ در غایت روشنی جائے دہ، دوازدہ کس ست، فرش خواب و رخت پوشش مہیا و حاضری طعام موجود، چند جلد کتاب در طاق ہا گذاشتہ، ہوائی گذاشت کہ یک قطرہ آب اندرون در آید و چوں بادشاہ رفتہ درنگ فرمود عجب حالتے بر مردم بیروں رو آوردہ۔"[4]

لاہور والے اس حوض کا ذکر جہانگیر نے "تزک" میں بھی کیا ہے۔ اسی طرح کا ایک حوض حکیم علی نے اکبر آباد (آگرہ) میں بھی تیار کیا تھا جس کو دیکھنے شہنشاہ جہانگیر گئے تھے، یہ بھی اپنے والد کی طرح حوض میں سے ہو کر کمرے میں گئے اور کچھ دیر ٹھہر کر باہر آئے اور حکیم صاحب کو دو ہزاری کا منصب عطا کیا۔[5]

---

[1] تزک صفحہ ۱۴۶ [2] تزک صفحہ ۱۴۷ [3] اطبائے عہدِ مغلیہ صفحہ ۱۳۵ [4] ماثر الامرا جلد اوّل صفحہ ۵۷۷ [5] تزک جہانگیری صفحہ ۱۴۷

حکیم علی نے عہدِ اکبری میں شیخ ابنِ سینا کی کتاب "القانون" کی شرح لکھی تھی۔ اس کے مطالعہ سے بے اختیار ان کی فضیلتِ علمی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ —— آپ کا مذہب اثنا عشری تھا۔ آسمانِ علم کا یہ ماہِ کامل ۵ محرم ۱۰۱۸ھ جمعہ کے دن ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا[۱]۔ —— راقم الحروف کو معلوم ہوا ہے کہ حکیم علی کا دودمانِ گرامی لکھر پور سید ان تحصیل کولگام ضلع اننت ناگ (مقبوضہ کشمیر) میں اب بھی موجود ہے۔

بینا

آپ نے معالجات پر "مجرباتِ حکیم بینا لاہوری" کے نام سے ۹۹۶ھ میں ایک کتاب تالیف کی[۲]۔ —— مختلف تذکروں اور تاریخوں میں عہدِ اکبری کے اطبا میں حکیم بینا سرہندی کا ذکر مرقوم ہے جن کے فرزند نواب مقرب خاں بڑے لائق طبیب اور جراح تھے۔ ان پر جہانگیر بہت مہربان تھا۔ اس نے ان کو کیرانہ میں جاگیر دی تھی۔ حکیم مقرب خاں نے امراضِ چشم پر ایک رسالہ بنام "انیس الکحال" لکھا تھا جس کا اُردو ترجمہ حکیم شہزادہ احمد اختر کیرانوی نے کیا جو ۱۸۹۹ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

کتاب "مجرباتِ حکیم بینا لاہوری" بھی عہدِ اکبری کی تالیف ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حکیم بینا سرہندی کا مولد لاہور ہو گا بعد میں سرہند جا بسے ہوں گے۔ —— ہمدرد صحت کراچی میں اس کتاب کا ایک سطری تعارف لکھنے والے صاحب کا ماخذ غالباً پیرس کے قومی کتب خانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست ہے۔ اگر اصل کتاب صاحبِ مضمون کے سامنے ہوتی تو ضرور مزید روشنی ڈالتے جس سے کسی نتیجے پر پہنچ کر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا کہ حکیم بینا سرہندی ہی لاہور کے رہنے والے تھے۔

عبدالوہاب

یہ حکیم علی گیلانی کے بیٹے تھے۔ تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ انھوں نے لاہور کے سادات پر دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد حکیم علی نے ان کے پاس اسّی ہزار روپے بطورِ امانت رکھے تھے مگر اب یہ دینے سے انکاری ہیں۔ سادات نے سختی سے انکار کیا اور قاضی القضاۃ کے ذریعے بادشاہ تک خبر پہنچی تو اس نے آصف خاں کو اس معاملہ کی تحقیقات پر مامور کیا اور یہ ہدایت کی کہ

"جھگڑے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس قدر کوشش اور باریک بینی سے کام لے کہ صحیح صورتِ حال معلوم کرنے میں قطعاً کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔"

پھر لکھا ہے:

"اگر وہ امرِ واقعہ کو پوست کندہ طریقے سے معلوم نہ کر سکے گا تو ہم اپنے حضور میں تحقیقات کرائیں گے۔ حکیم زادہ نے یہ بات سُنی تو گھبرا کر اپنے کچھ دوستوں کو مصالحت کرانے کے لیے کہا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ سادات سے کہیں کہ تحقیقات میں آصف خاں سے تعاون نہ کریں میں دعویٰ سے دست برداری اور اپنے حق سے درگزر کرنے کی تحریر لکھ دیتا ہوں۔ آصف خاں اس کی طلبی کے لیے آدمی بھیجتا رہا لیکن وہ جھوٹا ہونے کی وجہ سے خائف ہو کر مختلف بہانوں سے حاضر ہونے سے کتراتا رہا[۳]۔"

آخر کار آصف خاں نے جبراً طلب کیا اور پوچھ گچھ کی تو اس نے اپنی جعل سازی کا اعتراف کر لیا۔ آصف خاں نے اس کا تحریری بیان بادشاہ کو بھیج دیا تو بادشاہ نے اس کو اپنی نگاہوں سے گرا دیا اور اس کے منصب اور جاگیر میں تبدیلی کر دی۔ —— حکیم عبدالوہاب کے اس سے

---

[۱] تزک صفحہ ۱۷۶ [۲] ہمدرد صحت کراچی جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۸ [۳] تزک جہانگیری صفحہ ۲۹۰

زیادہ حالات نہیں مل سکے۔ ماثر الامرا میں بھی اتنا ہی لکھا ہے۔

علیم الدین انصاری (وزیر خاں)

یہ چنیوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام عبداللطیف اور دادا کا اسم گرامی حسام الدین تھا۔ عربی اور فلسفہ کی تحصیل کے بعد اس وقت کے مشہور طبیب حکیم داؤدی سے علمِ طب پڑھا اور تکمیلِ فن کے بعد بیس برس کی عمر میں لاہور آ گئے۔ اس وقت جہانگیر کا عہدِ حکومت تھا۔

حکیم علیم الدین کچھ عرصہ لاہور قیام کرنے کے بعد دہلی چلے گئے مگر جب وہاں بھی روزگار کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو آگرہ روانہ ہو گئے اور وہاں تھوڑے عرصے ہی میں آپ کا مطب بہت مشہور و مقبول ہو گیا۔ شہزادہ خرم (شاہ جہان) کی ملازمت مل گئی۔ رفتہ رفتہ آپ بادشاہ، شہزادگان اور تمام بیگمات کے معالج بن گئے اور اس درجہ رسوخ حاصل ہوا کہ "دیوان بیوتات" پھر "میر ساماں" کے مراتب حاصل کیے اور بعد میں "دیوان" کے بلند پایہ عہدے پر فائز ہوئے۔ شہزادہ خرم آپ کی بے حد عزت کرتا تھا اور حکیم صاحب بھی اس کے بڑے فدائی تھے حتیٰ کہ جب جہانگیر اور شاہجہان کی مخالفت ہوئی تو آپ نے شاہجہان ہی کا ساتھ دیا۔

دراصل حکیم علیم الدین کو مکمل عروج اس وقت حاصل ہوا جبکہ ان کے علاج سے ملکہ نور جہاں صحت یاب ہوئی۔ اس معاملے کا مختصر حال یہ ہے کہ نور جہاں کو "عرق النسا" کا مرض لاحق ہوا جو کسی طبیب کے علاج سے رفع نہ ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں حکیم علیم الدین کو بھی علاج کے لیے طلب کیا گیا تو انھوں نے شافی برحق کے حضور میں ملکہ کی شفایابی کے لیے دعا کی اور یہ منت مانی کہ اگر میرے علاج سے نور جہاں شفایاب ہو جائے تو انعام و اکرام کے طور پر جو دولت مجھے ملے گی اس سے ایک مسجد تعمیر کراؤں گا۔

عرق النسا یعنی "رینگن باؤ" کے درد کا بہترین علاج رگِ عرق النسا کی فصد ہے چنانچہ حکیم صاحب نے کمال ہوشیاری کے ساتھ ملکہ کو بالکل بے خبر رکھ کر فصد کیا، تھوڑا سا خون بہنے ہی ملکہ کو صحت ہونی شروع ہو گئی۔ نور جہاں نے لاہور آ کر غسلِ صحت کیا تو حکیم صاحب کو ایک لاکھ روپے کا خلعت مرحمت کیا اور سات لاکھ روپے نقد عطا فرمائے، نیز اپنا زیور بھی اتار کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ اس پر حرم کی بیگمات اور کنیزوں نے اپنے زیورات اتار کر ملکہ پر نچھاور کر دیے۔ ملکہ نور جہاں نے یہ تمام زیورات بھی حکیم صاحب کو بخش دیے۔ ان سب انعام و اکرام کو جمع کر کے قیمت لگائی گئی تو بائیس لاکھ روپے ہوئے۔ حکیم علیم الدین وزیر خاں نے منت پوری کرنے کے لیے اس رقم سے لاہور میں مسجد وزیر خاں تعمیر کرائی، جو مغلیہ فنِ تعمیر کا بہترین اور شاندار نمونہ ہے۔

۱۰۳۷ھ میں جب شاہجہان سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکیم صاحب کی خدماتِ جلیلہ کے پیشِ نظر خلعتِ فاخرہ اور خنجر مرصع مرحمت فرمایا۔ ایک گھوڑا با زینِ مطلا، ایک اونٹ، ایک علم، ایک نقارہ اور ایک لاکھ روپے نقد انعام دیا اور پانچ ہزار ذات و سہ ہزار سوار کے منصب جلیلہ و عظیمہ پر سرفراز فرمایا۔[1]

پنجم سالِ جلوس میں جب فتح خاں دولت آبادی نے خراج ادا کرنا بند کر دیا تو شاہجہان نے حکیم صاحب کے سواروں میں اضافہ کر کے ان کا منصب پنج ہزاری ذات و پنج ہزار سوار کر کے دولت آباد کی تسخیر اور فتح خاں کی سرکوبی کے لیے دس ہزار سواروں کے ساتھ برہان پور سے روانہ کیا۔ فتح خاں کو حکیم صاحب کی روانگی کا علم ہوا تو ڈر گیا اور اپنے بڑے بیٹے کے ہاتھ بہت سے تحائف

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۱۱۱

ونے کر دربار میں بھیج دیا۔ اس پر حکیم صاحب کو لوٹ آنے کا حکم ملا۔ بادشاہ نے ان کی اس مبارک قدمی پر خوش ہو کر "وزیر خاں" کا خطاب دیا اور صوبہ لاہور کا ناظم مقرر کر کے لاہور بھیج دیا۔ حکیم علیم الدین انصاری المخاطب بہ وزیر خاں متواتر سات برس اس عہدے پر مامور رہے۔ ۱۰۵۰ھ کو جب شاہجہان لاہور سے گزر رہا تھا تو حکیم صاحب نے نہایت قیمتی تحفے اس کی خدمت میں نذر کیے۔ بادشاہ نے اسی وقت ایک خلعت خاصہ، ایک گھوڑا مع طلائی ساز کے اور ایک ہاتھی انھیں عنایت فرما کر "صفدر خاں" کی جگہ آگرہ کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔

حکیم صاحب کو آگرے میں حکومت کرتے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بعارضہ قولنج بیمار ہو کر ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۲ھ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے[1]۔ نواب وزیر خاں کے دو بیٹے تھے۔ سعید خاں اور صلاح الدین خاں میر تزک۔

وزیر خاں کا نام اکثر کتابوں میں علم الدین اور بعض میں علیم الدین دیکھنے میں آیا ہے۔ علیم الدین چونکہ زیادہ موزوں اور بامعنی ہے اس لیے میں نے یہی لکھا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری خطیب مسجد وزیر خاں کا خیال تھا کہ وزیر خاں کے نام کو علم الدین پڑھنا چاہیے۔

ستی النساء

یہ خاتون ملک الشعرا طالب آملی متوفی ۱۰۳۶ھ کی بہن اور حکیم رکنا کاشی متوفی ۱۰۶۶ھ کی بھاوج تھی۔ اس کی شادی "نصیرائی کاشی" سے ہوئی تھی جو "مسیح کاشی" کا بھائی اور مرزا صائب متوفی ۱۰۸۰ھ کا استاد تھا۔ ستی جہانگیر کے زمانے میں طالب آملی کو ملنے کے لیے ہندوستان آئی تھی، اس کا وطن "آمل" تھا جو "مازندران" کا ایک شہر ہے۔ نصیرائی کی وفات کے بعد ستی النساء ممتاز محل زوجہ شاہجہان کی پیش خدمت مقرر ہو گئی۔ "ممتاز محل" نے اس کی لیاقت اور فن طب کی مہارت سے متاثر ہو کر اس کو "مہرداری" کی خدمت تفویض کر دی۔ اس کو قرآن مجید زبانی حفظ تھا، فن قرأت اور فارسی ادب سے خوب واقف تھی لہٰذا جہاں آرا بیگم دختر شاہجہان کی معلمہ مقرر کی گئی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہان نے اس کو حرم شاہی کا صدر کل یعنی مدارالمہام بنا دیا۔ ستی النساء وفات سے قبل لاہور میں قلعہ کے باہر اپنی قیام گاہ میں مقیم تھی۔ ۲۶ اور ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کی درمیانی شب کو اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ حکیم مسیح الزماں اور رحمت خاں نے علاج شروع کیا مگر چند ساعت ہی میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ شاہجہان ستی النساء کا بے حد احترام کرتا تھا، اس کی وفات سے بہت دلگیر ہوا۔ دس ہزار روپے اس کی تجہیز و تکفین کے لیے خزانے سے خرچ کرنے کا حکم دیا۔ لاہور میں بطور امانت دفن کیا گیا۔ تیس ہزار روپے کی لاگت سے اس کا مقبرہ آگرے میں ممتاز محل کی قبر سے مغرب کی طرف جلو خانہ کے قریب بنا کر، ایک سال بعد اس کی لاش کو لاہور سے لے جا کر وہاں دفن کیا گیا[2]۔

مسیح الزماں صدرا مسیح اللّٰہی

یہ فخر الدین شیرازی حکیم کے فرزند تھے، ان کا سلسلہ نسب حارث بن کلدہ ثقفی سے ملتا ہے[3]۔ حارث عرب کے مشہور طبیب تھے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف بھی ہوئے تھے۔ حکیم صدرا ۱۰۱۱ھ میں ہندوستان آئے اور حکیم علی گیلانی سے رشتہ تلمذ قائم کیا، نہایت ذہین و فطین تھے۔ آپ کی فنی قابلیت "بادشاہ نامہ" کی حسب ذیل عبارت سے خوب واضح ہوتی ہے:۔

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم صفحہ ۲۶۳ [2] اطبائے عہد مغلیہ صفحہ ۱۰۵ [3] شاہجہان نامہ جلد سوم صفحہ ۲۸

"و علمِ طب از حکیم محمد باقر پسر حکیم عمادالدین محمود در ایران اندوختہ بہ ہندوستان آمدہ و
در یر) جانبہ پیش حکیم علی گیلانی کہ سرآمد اطبائے عہد دولت عہد حضرت عرش آشیانی
بود، تلمذ نمودہ"

شہنشاہ جہانگیر نے ۱۰۲۱ھ میں حکیم صدرا کو پانصدی ذات و بیس سوار کے منصب پر فائز کر کے "مسیح الزماں" کا خطاب عنایت کیا[1]۔ پھر تین ہزاری منصب حاصل کر لیا جسے شاہجہان نے بحال رکھا۔ حکیم صدرا شعر بھی خوب کہتے تھے۔ جہانگیر کی فرمائش پر ایک رباعی کہی جس کے صلے میں ایک ہزار طلائی مہریں جہانگیر نے عنایت کیں وہو ہذا ؎

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش | ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش | آں را شمریم حاصل شاہی خویش

آپ کا تخلص "مسیح الملک" تھا۔ مذہب امامیہ رکھتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آخر عمر میں شاہی ملازمت چھوڑ کر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے۔ موسم گرما میں کشمیر چلے جاتے اور سرما میں لاہور رہتے۔ جب کسی ضرورت کے تحت دربار میں بلائے جاتے تو چلے جاتے۔ اٹھارھویں جلوس شاہجہانی میں بیگم صاحبہ کے علاج میں کوشاں رہے تو سالیانہ میں دس ہزار کا اضافہ کر کے پچاس ہزار کر دیا گیا اور دس ہزار روپے انعام میں دیے گئے[2]۔ ۱۰۶۱ھ مطابق ۲۴ سنہ جلوس بمقام کشمیر فوت ہوئے۔

احمد بن عبداللہ لاہوری شیخ فاضل احمد بن عبداللہ بن ملی محمد بن علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی اپنے وقت کے سربرآوردہ علمائے فنونِ حکمیہ میں سے ایک تھے۔ اصل وطن ان کا "دوان" تھا۔ ان کے والد نے پشاور آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ حکیم احمد پشاور میں پیدا ہوئے اور وہیں تحصیلِ علوم کی خصوصاً طب میں کمال پیدا کیا۔ پھر ناہرہ علاقہ سیالکوٹ میں چلے گئے اور وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ مریضوں کا علاج پوری توجہ سے کرتے تھے اور امرا کو غربا پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ سالِ وفات ۱۰۸۰ھ ہے[3]۔ لاہور میں ان کے قیام کا زمانہ نہیں بتایا، صرف نام کے ساتھ لاہوری لکھا ہوا ہے۔

انتون مسیح فرنگی یہ نواب امانت خاں میرک معین الدین ناظم لاہور کے عہد میں بڑے مقبولِ خاص و عام تھے۔ حکیم نور محمد والد حکیم محمد اسحاق نے ان سے طب کی تحصیل کی تھی۔ قریباً ۱۰۸۶ھ میں امانت خاں لاہور میں مقرر ہوئے تھے۔

نکولاس منوچی یہ "وینس" اٹلی کا باشندہ تھا، سیاحت کرتا ہوا براہ "اصفہان" ۱۶۵۵ء میں "سندھ" پہنچا۔ پھر "سورت" گیا اور وہاں سے آگرے اور یہاں سے دہلی آ گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ہندوستان میں اور وہ بھی مغلیہ دربار میں بسر کیا ہے۔"

نکولاس منوچی نے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد اپنی عمر کے آخری ایام میں اپنے سفر اور قیامِ ہند کے حالات اور واقعات بنام "سٹوریا ڈو موگر" لکھے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ملک راج شرما نے "ہندوستان عہدِ مغلیہ میں" کے نام سے کیا جو پانچ حصوں میں لاہور سے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۰۲ [2] شاہجہان نامہ جلد دوم ص ۳۲ [3] نزہت الخواطر عربی جلد ۵ ص ۵۵ بہ حوالہ تذکرۃ العلماء
[4] رجز فغفوری ص ۱۳۷ و ص ۱۴۵

شائع ہوا۔ اس سفرنامے میں "نکولاس" نے جابجا اپنی طبابت کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ میں شہزادہ شاہ عالم کا طبیب خاص رہا ہوں مگر یہ شخص بہت زیادہ فسانہ طراز اور کاذب تھا، اور اس سفرنامے کے اکثر مقامات مؤلف کے متعصب اور فاسد ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لیے متعصب ہندو ملک راج شرما نے اس کا ترجمہ کرنے کی زحمت اٹھائی۔

ڈاکٹر نکولاس نے لکھا ہے کہ جن دنوں محمد امین خاں لاہور کا حاکم تھا میں لاہور آیا اور "برق انداز خاں" مع الامکان کرایے پہلے کر رہنے لگا اور اپنے ملازموں کو کہہ دیا کہ جو شخص میری بابت پوچھے اسے کہہ دیا کرو کہ "یہ ایک فرنگی طبیب ہیں"۔ ——— اس کے مطب کی ابتدا یہیں سے ہوئی مگر یہ شخص طب باقاعدہ پڑھا ہوا نہ تھا، صرف چند ٹوٹکے اس کا سرمایہ افتخار تھے۔ یہ اپنی رطب البیانی اور طلاقت لسانی کے ذریعے عوام کو اپنی حذاقت کا قائل کر لیتا تھا۔ اتفاق سے اس کو لاہور کے قاضی کی اہلیہ کا علاج کرنے کا موقع مل گیا جو اس کے معالجہ سے شفایاب ہو گئی اس سے خوب مشہور ہو گیا۔ لوگ جوق در جوق اس کے پاس آنے لگے[1] ——— یہ لاہور ہی میں تھا کہ "فدائی خاں" نے ایک زبردست باغی کا سر قلم کرایا، جو بے حد فربہ اندام تھا۔ نکولاس نے فدائی خاں سے درخواست کی کہ یہ لاش میرے حوالے کر دی جائے کیونکہ میں اس کی چربی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ فدائی خاں نے لاہور کے کوتوال کو لکھ دیا کہ مقتول کی لاش نکولاس کو دے دی جائے تاکہ یہ اس سے چربی نکال لے۔ چنانچہ نکولاس نے اس میں سے اٹھارہ سیر چربی نکالی جس کو یہ مرہم بنانے میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لاش کی اس بے حرمتی پر علماء اور عوام نے بہت احتجاج کیا جس سے اس کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا[2]۔

نکولاس کئی سال لاہور میں رہا اور اس عرصے میں اس نے خوب دولت کمائی۔ پھر اس کو اپنے ہم مذہبوں میں رہائش اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا تو لاہور سے "سورت" چلا گیا اور وہاں سے "بندورا" جا پہنچا مگر یہاں پہنچتے ہی لٹ گیا اور بے نیل مرام پھر دہلی آ گیا۔ یہاں ۱۶۷۸ء میں شاہزادہ شاہ عالم بن اورنگ زیب غازی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بطور طبیب کے رہنے لگا۔ شاہ عالم نے تین سو روپے ماہوار اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور "منصب دار" کا خطاب دیا[3]۔

نور محمد

لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندر جو "بازار حکیماں" ہے وہ پہلے "محلہ کھاری کھوئی" کے حدود میں شامل تھا جس کا ذکر "تذکرہ قطبیہ" میں ملتا ہے[4]۔ اس محلے میں شیخ سادھا خلیفہ حضرت عبدالجلیل کا مزار اب تک موجود ہے۔ حضرت مراد شاہ لاہوری متوفی ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء نے "مثنوی مراد المحبین" (قصہ چار درویش) منظومہ ۱۲۱۲ھ میں اس محلے کا ذکر یوں ہوا ہے ؎

محلہ جو آباؤ اجداد سے — وراثت میں ہے اپنی اسناد سے
گذر چوک[5] مانک سند میں ہے نام — ولے چاہ کھاری ہے مشہور عام

اس محلے میں آپ کے بزرگوں کی حویلی، دیوان خانہ اور کھاری کھوئی جو اب تک موجود اور خاکروبوں کے قبضے میں ہے۔ اسی محلے میں حکیم نور محمد کی اولاد در اولاد کا قیام چلا آ رہا ہے۔ ان مقبول انام و مرجع خلائق اطباء کی سکونت کے باعث اس محلے کا

---

[1] ہندوستان عہد مغلیہ میں، حصہ دوم صفحہ ۱۹۵ [2] حوالہ مذکور صفحہ ۲۰۰ [3] ہندوستان عہد مغلیہ میں حصہ دوم صفحہ ۲۱۸
[4] تذکرہ قطبیہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۷۸ [5] گذر چوک مانک کی وسعت سید مٹھا سے دروازہ ٹکسال کی فصیل اور شاہ برج تک تھی۔
(اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۲ء)

نام تبدیل ہو کر "بازار حکیماں" ہو گیا۔ یہ نام سنہ ۹ء کے ابتدا میں پڑا۔ پھر مراد شاہ کے وقت تک یہ نام نہیں تھا۔

حکیم نور محمد کے والد شیخ عبدالحمید بن شیخ محمد ملتانی لاہور آئے تھے[1] شیخ عبدالحمید کو بادشاہوں کی طرف سے جاگیریں بھی ملی تھیں ـــــ حکیم نور محمد کے مستند اور تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ "رجز فغفوری" میں آپ کے حالات کے سلسلے میں متضاد تحریریں ملتی ہیں مثلاً مصنف "رجز فغفوری" کا بیان ہے:۔

"یہ حضرت بخدمت ماہرو صاحب سجادہ نشین حضرت داؤد بندگی صاحب[2] بزمرہ مقربان ملازم رہے اور باجازت ماہرو صاحب لاہور میں آ کر حکیم انتون مسیح عیسائی اور حکیم علی گیلانی سے جو اپنے وقت کے مسیحا خیال کیے گئے تھے ان سے علم طب حاصل کیا۔" ص ۱۳۷

اگلے صفحہ پر لکھا ہے:۔

"خلیفہ نور محمد صاحب سرکار ماہرو کی جانب سے جو حضرت داؤد بندگی صاحبؒ کے سجادہ نشین تھے کاننا صوبہ لاہور میں یعنی نواب امانت خاں صوبہ دار لاہور کے پاس کاروبار کرتے تھے اور روپیہ ماہیانہ وغیرہ اسی دفتر سے ملتا تھا۔" ص ۱۳۸

حکیم شجاع الدین مرحوم مصنف "رجز فغفوری" نے کسی اپنے سے متقدم کی ایک فارسی تحریر نقل کی ہے۔ اس میں حکیم نور محمد کے متعلق مرقوم ہے:۔

"حسب الایمائے نواب صاحب موصوف (امانت خاں) از حکیم انتون مسیح فرنگی علم طب تحصیل نمودہ در اندک زماں تجربہ کامل بہم رسانیدہ جہت حصول علم طب یونانی بخدمت حکیم علی گیلانی کہ امیر کبیر دربار سلاطین چغتائی بود رسید، بعد تحصیل علم گوئے سبقت از حکمائے زماں بردہ بعمدۃ الحکماء از پیش گاہ سلاطین ملقب گردیدند چنانچہ فن طبابت از حکیم صاحب موصوف باین خاندان سلسلہ وار می آید۔" (رجز فغفوری ص ۱۴۵)

حکیم علی گیلانی سے حکیم نور محمد کا پڑھنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ حکیم علی سنہ ۱۰۲۰ھ میں لاہور میں مقیم تھے اور اس کے بعد وہ یہاں سے چلے گئے ۱۰۱۸ھ میں آگرے میں ان کا انتقال ہو گیا ـــــ حکیم نور محمد کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں مگر یہ لکھا ہے کہ ان کے دوسرے فرزند حکیم محمد اسحاق انصاری ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا اس وقت تک ان کا زندہ ہونا ثابت ہے مگر اس وقت ان کی عمر ہرگز سو برس کی نہ ہو گی۔ کیونکہ بچے پیدا کر رہے تھے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرک معین الدین احمد المخاطب "امانت خاں" کا عہد بھی بہت بعد کا ہے۔ میرک معین الدین عہد شاہجہانی میں ۱۰۵۰ھ میں ملازم ہو کر صوبہ اجمیر میں واقعہ نویسی پر مامور ہوئے اور عہد عالمگیری میں انہیں "امانت خاں" کا خطاب ملا اور پھر

---

[1] رجز فغفوری ص ۱۳۴

[2] حضرت داؤد بندگیؒ کا مزار شیر گڑھ ضلع منٹگمری میں ہے۔ آپ اکبر کے عہد میں تھے اور اکبر کی ملحدانہ روش کے سخت مخالف رہے۔

اٹھارھویں (۱۸) سال جلوس عالمگیری قریباً ۱۰۸۵ھ میں ان کو لاہور کی قلعہ داری نیز دیوانی صوبہ کے عہدے تفویض ہوئے[1] اور بائیسویں سال جلوس میں صوبہ ٹھٹھہ و دکن کی دیوانی پر مامور کر دیے گئے اور ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوئے مادۂ سالِ وفات "سید بہشتی شد" ہے۔

ممکن ہے حکیم نور محمد نے حکیم عبدالوہاب ابن حکیم علی گیلانی سے طب پڑھی ہو جن کا قیام لاہور میں تھا۔

حکیم نور محمد کے دو بیٹے مشہور طبیب ہوئے جن کے نام حکیم محمد حیات اور حکیم محمد اسحاق ہیں۔ لاہور کے اس خاندانِ حکیماں میں طبابت سلسلہ وار چلی آ رہی ہے۔ لاہور میں ایسا اور کوئی طبی خاندان نہیں جس میں اتنے عرصے سے طبابت چلی آنے کے علاوہ اس کثرت سے طبیب پیدا ہوئے ہوں۔ ہمارے عہد کے مشہور ادیب خان بہادر حکیم احمد شجاع اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نے کبھی بھی طبابت نہیں کی مگر خاندانی اعزاز لفظ "حکیم" ان کے نام کا جز ہے۔ آپ کا معزز خاندان لاہور میں "خاندانِ حکیماں" کے نام سے مشہور ہے۔[2] خاندان کے دیگر اطباء کے حالات اپنے اپنے موقع پر درج ہوں گے۔

محمد اسحاق بن حکیم نور محمد بن شیخ عبدالمجید ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام "شیخ اسحاق" ہے۔ آپ نے علمِ طب اپنے والد حکیم نور محمد اور بڑے بھائی حکیم محمد حیات سے پڑھا اور بہ حیثیت طبیب زبردست شہرت حاصل کی۔ نواب زکریا خاں ناظم لاہور نے آپ کو "ملک الحکماء" کا خطاب دیا تھا۔ "تذکرۂ اسحاقیہ" فارسی زبان میں آپ کی مبسوط طبی تالیف ہے۔[3] مسیحا نفس طبیب نے ایک سو گیارہ برس کی عمر پا کر ۱۱۹۱ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ آپ کے تین صاحبزادے حکیم عبداللہ، حکیم غلام محمد اور حکیم خدا بخش تھے ـــــ

علیم اللہ ارشاد یہ حکیم محمد حیات برادرِ اکبر حکیم محمد اسحاق مذکور کے فرزند اور پیر مراد شاہ لاہوری کے شاگرد تھے۔ مطب آپ کا محلہ کھاری کھوئی حال بازار حکیماں میں تھا۔ ان کا ذکر مراد شاہ نے "مثنوی مراد المبین" میں اس طرح کیا ہے:

محبوں میں اپنے ستودہ صفات ۔۔۔ علیم اللہ ابن محمد حیات
حکیم اور ہیں اپنے مخلص قدیم ۔۔۔ ہمیشہ محلے کے اپنے مقیم
اگرچہ وہ ہیں صاحب علم و فن ۔۔۔ اس احقر سے کرتے ہیں مشقِ سخن
تخلص ہیں ارشاد معروف ہیں ۔۔۔ غرض ہر صفت بیچ موصوف ہیں

حکیم علیم اللہ کے استاد حضرت مراد شاہ نے آپ کو "ابن محمد حیات" لکھا ہے مگر حکیم شجاع الدین مرحوم انصاری نے رجز فغفوری مطبوعہ ۱۸۸۸ء میں "حکیم علیم اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم محمد حیات" لکھا ہے۔ معاصر کی روایت کو زیادہ صحیح سمجھنا چاہیے قصہ چار درویش (مثنوی مراد المبین) بزبانِ اردو انہی حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر حضرت مراد شاہ نے نظم کیا تھا۔ یہ قصہ ڈاکٹر باقر صاحب نے دیباچہ لکھ کر رسالہ "اردو دہلی" اکتوبر ۱۹۴۲ء میں شائع کرایا تھا۔

خدا بخش یہ حکیم محمد اسحاق انصاری متوفی ۱۱۹۱ھ کے دوسرے فرزند تھے، ایسے عالم و فاضل تھے کہ قانونِ بوعلی آپ کو حفظ تھا۔ یہ اپنی لیاقت اور علمی فضیلت کے باعث نواب زکریا خاں ناظم لاہور اور نواب ادینہ بیگ خاں سے خطاب وزارت

۱؎ مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۲۶۳ ۲؎ رجز فغفوری صفحہ ۱۴۵

وفرزند خانی و ملک الحکماء سے ملقب تھے[1]۔ حکومت کی طرف سے حکیم صاحب کی بیوگان اور متعلقان کو بطور معافی موضع اچھرہ میں زمین دی گئی تھی۔ زمین کا معافی نامہ [illegible]ھ میں لکھا گیا، اس سے ظاہر ہے کہ حکیم خدا بخش اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ نقل معافی نامہ "رموز فغفوری" میں درج ہے۔

عبداللہ انصاری

یہ حکیم محمد اسحاق کے بیٹے تھے، والد کی زندگی ہی میں بڑے باعزت اور بامرتبہ ہو گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے عہد میں کشمیر کے عدالتی رہے اور ملقب بہ القاب "حکیم بادشاہی" ہوئے۔ قبران کی باغیچہ اندرون ٹکسالی دروازہ میں بنے[2]۔

مفتی رحمت اللہ قریشی

یہ اپنے وقت کے فاضل اجل بزرگ تھے، ہزاروں طالبانِ علم ان سے فیض یاب ہوئے خصوصاً علمِ طب میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ دور و نزدیک سے لوگ معالجہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مفتی غلام سرور مرحوم کے اجداد میں سے تھے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:-

"بندہ غلام سرور مؤلف کتاب کا نسب نامہ اس بزرگ کے ساتھ اس طرح ملتا ہے کہ غلام سرور بن مفتی غلام محمد بن مخدوم مفتی رحیم اللہ بن حکیم رحمت اللہ"[3]

جب مجھے مفتی رحمت اللہ قریشی کی تاریخ وفات کسی کتاب سے معلوم نہ ہو سکی تو حکیم مفتی محمود عالم صاحب ہاشمی (جو مفتی غلام سرور مرحوم کے نواسہ ہیں) کی طرف رجوع کیا، انھیں نے لکھا:-

"حضرت مولانا رحیم اللہ جو آپ کے فرزند تھے ان کی تاریخ وفات ۱۲۳۵ھ خزینۃ الاصفیا میں درج ہے۔ حضرت مولانا مفتی رحمت اللہ کے والد ماجد مولانا حافظ محمد تقی ۱۰۵۳ھ میں فوت ہوئے۔ قیاس ہے کہ مفتی رحمت اللہ کا عہد گیارھویں صدی ہجری کا آخری اور بارھویں صدی کا ابتدائی حصہ ہوگا۔ قطعی طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔"

عیسٰی (مصنف "خیر منکھ")

"خیر منکھ" منظوم پنجابی رسالہ، پنجاب کے دیہاتی اطباء میں بہت مقبول ہے۔ مصنف کا پورا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ "عیسٰی" بطور تخلص نظم میں کئی جگہ مسطور ہے۔ حکیم عیسٰی کا لاہور میں قیام ثابت ہے۔ رسالہ کے حصہ معالجات کے خاتمہ پر لکھا ہے ؎

ناؤں ایس کتاب دا دھریا "خیر منکھ"	دارو کریں جے ایس تھیں رب کریسی سکھ
باراں سو ستانویں ہجرت باجھ تمام	آہی سال رسول دے کیتی ختم کلام
اکیہویں ماہ رمضان دے ساعت جمعہ سعید	کیتی وچہ لاہور دے ہوئی خوشی مزید

میرے پیشِ نظر ۱۲۹۴ھ کا مطبوعہ رسالہ خیر منکھ ہے۔ جدید الطبع بعض نسخوں میں "باراں" کے بجائے "باراں" لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے کیونکہ اگر یہ کتابچہ ۱۲۵۷ھ میں تصنیف ہوا تو ۱۲۹۴ھ میں زمانہ تالیف سے تین سال پہلے کیسے شائع ہو گیا؟

---

[1] رموز فغفوری ص ۱۴۷ [2] رموز فغفوری ص ۱۴۲ [3] مخزنِ حکمت مؤلفہ مفتی غلام سرور ص ۱۴

فقیر غلام محی الدین شاہ

آپ کے والد کا نام "غلام شاہ" تھا۔ فقیر صاحب چونیاں سے لاہور آئے تھے۔ آپ کے تین فرزند، حکیم فقیر عزیز الدین آزاد، فقیر امام الدین، حکیم فقیر نور الدین تھے۔ بڑے ذہین و فطین تھے۔ پیر مراد شاہ لاہوری نے ایک منظوم خط جو اپنے چھوٹے بھائی پیر فرح بخش فرحت کی نعت "اذکار قلندری" کو ۱۲۰۱ھ میں لکھا تھا، اس میں فقیر غلام محی الدین شاہ حکیم کا ذکر یوں فرماتے ہیں :-

افتخار دوستان بے ریا   آں غلام شاہ محی الدین ما
عارف باللہ حکیم حاذقے   دوستے در دوستی ہا صادقے
ہم سرش نہ بود کسے در ہم سراں   مثل و ثانی نیست او را در جہاں
می رساند ہم سلام و ہم دعا   می کند بہر تو ہر صبح و مسا
می رساند ہم عزیز الدین سلام   آں عزیز است از عزیزاں تمام
ہم امام الدین و نور الدین دگر   نیز صدر الدین فرخندہ سیر
بندگی ہا می رساند از نیاز   یا الٰہی عمر شاں بادا دراز[1]

یہ خط اس وقت کا ہے جبکہ فقیر صاحب کے لڑکے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاں وزارت پر مامور نہیں ہوئے تھے اور بازار حکیماں کا نام بھی "بازار حکیماں" نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کا لاہور میں آغاز حکومت تھا کہ پیر مراد شاہ فوت ہو گئے۔

فقیر غلام محی الدین شاہ نے شروع میں امراء و رؤسائے لاہور و سکھ حاکموں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے مگر فقیر امانت شاہ قادری کے مرید ہو کر حقیقی معنوں میں "فقیر" کو اپنا لیا اور گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور اپنے نام کے ساتھ لفظ "فقیر" ایزاد کر لیا جو آج تک آپ کی اولاد میں بطور یادگار قائم ہے۔

فقیر صاحب اور ان کے افراد خاندان کی قبور اندرون بھاٹی گیٹ "فقیر خانہ" کے بالمقابل گلی میں ایک چار دیواری کے اندر بڑے کمرے میں ہیں۔ اس کمرے کے دروازے پر ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ کندہ ہے: "مزار حضرت فقیر الی اللہ سید غلام محی الدین شاہ صاحب بخاری، قادری، نوشاہی الملقب بہ نوشاہ ثانی نور اللہ مرقدہٗ"۔ ناصب سنگ کا نام "میجر سید فقیر مغیث الدین" لکھا ہے۔

آپ کی تاریخ رحلت کتابوں سے نہیں مل سکی۔ سنگ لوح مزار جو کسی وجہ سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو کر ایک کونے میں پڑا ہے اس سے سال وفات ۱۲۲۹ھ پڑھا جا سکتا ہے۔

نور محمد

بن حکیم خدا بخش بن حکیم محمد اسحاق بن حکیم نور محمد، بڑے صاحب علم و حلم اور عالم اجل طبیب گزرے ہیں۔ تمام لاہور کے باشندے آپ کا احترام کرتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی رسائی تھی۔ انھوں نے ایک کتاب بنام "نہایۃ الطبیب" بھی تالیف کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۲۳۷ھ میں ہوا۔ حکیم نور محمد کے بیٹے حکیم گل محمد بھی بڑے لائق طبیب تھے۔[2]

---

[1] تاریخ جلیلہ مؤلفہ پیر غلام دستگیر نامی صاحب صفحہ ۲۴۹

[2] ہجو غفوری صفحہ ۱۵۲

لالہ حاکم رائے

یہ لاہور کے اعلیٰ طبیب تھے، حکیم فقیر غلام محی الدین شاہؒ کے ہم عصر اور ان کے فرزند حکیم فقیر عزیز الدین کے استاد تھے اور ان ہی کے ذریعے فقیر عزیز الدین کی مہاراجہ تک رسائی ہوئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ کو آنکھوں کا مرض ہوا تو لالہ حاکم رائے حکیم کو دربار میں طلب کیا گیا مگر انھوں نے اپنے شاگرد فقیر عزیز الدین کو بھیج دیا۔ فقیر صاحب کے معالجہ سے مہاراجہ کو صحت ہوگئی اور وہ ان کی حذاقت کا قائل ہوگیا[1]۔ کے، ایل ریلیا رام نے لکھا ہے کہ "سدا کور" جو کہ مہاراجہ کی ساس تھی، اس کے مشورے پر لالہ حاکم رائے کو طلب کیا گیا۔ چونکہ لالہ صاحب شفا کے متعلق زیادہ پُرامید نہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے ہونہار شاگرد عزیز الدین کو بھیجنا ہی مناسب سمجھا[2]" ہوسکتا ہے کہ لالہ صاحب نے رنجیت سنگھ کو بھی ان سے پہلے سکھ حاکموں جیسا غیر مدبر سمجھ کر خود دربار میں جانے سے پہلوتہی کی ہو کیونکہ اس وقت تک رنجیت سنگھ کے متعلق بھی ویسا ہی گمان ہوسکتا تھا۔

مولوی حافظ نور اللہؒ

یہ ۱۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے، بڑے فاضل بزرگ تھے۔ صرف، نحو، منطق، معانی، حدیث، تفسیر اور طب میں ان کا ثانی نہ تھا۔ مولانا حافظ محمد سلیم لاہوری کے شاگرد رشید تھے۔ حکام عہد مثل رنجیت سنگھ وغیرہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کا فتویٰ تمام ممالک میں جاری تھا اور علم میں کوئی ان کی برابری کا دم نہ بھرتا تھا۔ جب مکہ معظمہ گئے تو وہاں صرف تیس دن میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ واپسی پر بمبئی میں ۱۲۴۴ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں[3]۔

فقیر عزیز الدین آزاد

یہ حکیم فقیر غلام محی الدین شاہؒ کے فرزند اکبر تھے، انھوں نے علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد طب لالہ حاکم رائے حکیم لاہوری سے پڑھی اور رخیر پور جا کر حکیم محمد یار سے طب کے علاوہ دیگر علوم پڑھے[4]۔ ڈاکٹر مارٹن سے دواسازی اور کیمیاگری سیکھی[5]۔ ۱۷۹۹ء میں یہ رنجیت سنگھ کے دربار میں معالج کی حیثیت سے پہنچے اور اپنی لیاقت و حذاقت کے باعث مہاراجہ کو گرویدہ کرلیا۔ رنجیت سنگھ کو آپ پر بے حد اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو وزیرِ خارجہ بھی بنا دیا تھا۔ آپ کی سیاسی خدمات بہت زیادہ ہیں، جن کا بیان موجبِ طوالت ہوگا۔ فقیر عزیز الدین بڑے باذوق، سخن شناس اور سخنور بھی تھے۔ ہم عصر اہلِ علم سے آپ کے گہرے مراسم رہے، حضرت قلندر شاہ، پیر مراد شاہ اور پیر سکندر شاہ سے آپ کی منظوم خط و کتابت رہتی تھی۔ حضرت پیر غلام دستگیر نامی صاحب نے دو تین خط بطور نمونہ "تاریخ جلیلہ" میں درج کیے ہیں۔ فقیر عزیز الدین کا تخلص آزاد تھا۔ فارسی میں شعر خوب کہتے تھے۔ کتاب "رئیسانِ پنجاب" سے تین شعر درج ذیل ہیں[1]

چوں سایۂ درخت ندارد جہاں قرار — اے دل اگر نگاہ نمائی بہ اعتبار

در عالمِ خیال ترا اضطرار چیست — در کارہائے خویش نداری چو اختیار

بگذار کارِ خود بخداوند کارِ خویش — خود را بہ پرورندۂ خود ہم ز دل سپار

ایک روایت ہے کہ دیوانِ آزاد قلمی آپ کے خاندان میں محفوظ ہے ——— مفتی غلام سرور مرحوم نے آپ کی وفات کی تاریخ یہ کہی تھی ـــ

شد عزیز الدیں چو با عزت بخلد — بہرِ سالِ آں عزیزِ مومنیں

پرتو افگن شد ز دل "خورشید علم" — از خرد شد جلوہ گر "منظورِ دیں"

۱۲۶۰ھ — ۱۲۶۰ھ

---

۱ رئیسانِ پنجاب مؤلفہ سر لیپل، ایچ گریفن مترجمہ موتی لعل کاظمو صفحہ ۲۵۰ ۲ "لاہور کے ایک فقیر کے گھر میں پوشیدہ خزانہ" (انگریزی) صفحہ ۲ ۳ گنج تاریخ صفحہ ۲۸

۴ رموز الاطباء جلد دوم صفحہ ۲۵ ۵ رسالہ الطبیب لاہور نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۱

۱۲۶۱ھ کے مطابق ۱۸۴۴ء ہے مگر رئیسانِ پنجاب میں آپ کی وفات کا سال ۱۸۴۵ء درج ہے۔ مفتی صاحب کے سامنے حکیم صاحب کا انتقال ہوا تھا اس لیے میرے خیال میں ان کی روایت کو صحیح سمجھنا مناسب ہوگا۔

سید عنایت شاہ قادری

یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری اطبا میں سے تھے۔ مہاراجہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب شاعر بھی تھے۔ عنایت تخلص تھا۔ حضرت محمد باقر معروف بہ "چھٹانکی شاہ" قادری کے مرید صادق تھے۔ ان چھٹانکی شاہ کا مزار کوچہ چھٹانکی بیر بصری شاہ لاہور میں ہے۔ چھٹانکی شاہ عہدِ رنجیت سنگھ کے آخری حصے میں فوت ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے مرشد کی تعریف و توصیف میں تین چھٹانکی نامے منظوم تصنیف کیے۔ دو اُردو اور ایک فارسی میں ہے۔ یہ چھٹانکی نامے و دیگر اوراد و وظائف یکجا مجلد قلمی، حکیم صاحب کی نواسی کے صاحبزادے سید واجد علی شاہ ایڈووکیٹ محلہ چلہ بی بیاں لاہور کے پاس محفوظ ہیں۔

حکیم صاحب کی آخری آرام گاہ ان کی نشست گاہ واقع بازار چھیاراں مابین کوچہ حکیم عنایت شاہ موصوف و کوچہ "رڑا ٹیلیاں" ہے۔ آپ کے مسقف مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر آپ کی تاریخ وفات ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ مطابق ۴ جنوری ۱۸۴۵ء بروز جمعہ لکھی ہے۔

حکیم صاحب اولادِ ذکور سے محروم تھے صرف ایک صاحبزادی تھی جس کے بطن سے حکیم سید مراتب علی شاہ اور حکیم سید نوازش علی شاہ میونسپل کمشنر تھے۔

"تاریخ لاہور" مؤلفہ رائے بہادر کنہیا لال میں لکھا ہے کہ نعمت شاہ حکیم، عنایت شاہ کے اجداد میں سے تھے جن کی تصانیف "تبصرۃ الطبا" و "سراج الشفا" ہیں اور حکیم محمد شاہ، حکیم بہادر شاہ و حکیم بزرگ شاہ حکیم عنایت شاہ کے بھانجے تھے۔

فقیر نورالدین منور

یہ فقیر عزیز الدین آزاد وزیر خارجہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ رنجیت سنگھ کے سرکاری دواخانہ کے نگران تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر مارٹن سے انگریزی دوا سازی سیکھی تھی۔ شعر کہتے تھے اور منور تخلص تھا۔ سنا ہے کہ ان کا "دیوان منور" ان کی اولاد کے پاس محفوظ ہے۔ حکیم صاحب کے متعلق مفتی غلام سرور مرحوم نے لکھا ہے:۔

"از اعاظم امرائے لاہور مردے صاحبِ علم و حلم و سخاوت و لطف و کرم بود، در علم طب یدِ بیضا داشت و مہاراجہ رنجیت سنگھ او را بسیار محترم داشتے۔" (گنجِ تاریخ)

حکیم صاحب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء فوت ہوئے۔ "گنج تاریخ" میں یہ قطعہ تاریخ لکھا ہوا ہے:۔

پرتو افگن گشت بر اوجِ بہشت	چوں جناب نور دیں نور یقیں
شد "چراغ دیں" بسالش جلوہ گر	ہم بخواں "نور الکرامت نور دیں"
۱۲۶۸ھ	۱۲۶۸ھ

بلینت (BENET)

یہ ڈاکٹر ایک اچھے معالج اور ماہر یورپین سرجن تھے اور ۱۸۳۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں تین سو روپے پر فیملی ڈاکٹر تھے۔[1]

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ پروفیسر سیتا رام صفحہ ۳۵۱

ہاروے یہ ڈاکٹر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ سات سو روپیہ ماہوار تھی[1]۔ اس زمانہ کے سات سو روپے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت لائق ڈاکٹر ہوں گے جبھی ان کو اتنی معقول تنخواہ ملتی تھی۔

مارٹن ڈاکٹر مارٹن کو سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اس کی عمر کا اکثر حصہ سیاحی میں صرف ہوا۔ اس کا پورا نام جان مارٹن ہانگسبرگر تھا۔ یہ ۱۷۹۵ء میں ہنگری کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ وطن ہی طبی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۱۵ء میں جبکہ اس کی عمر بیس برس کی تھی گھر سے چل کھڑا ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں قاہرہ پہنچا اور وہاں مطب کرتا رہا۔ قاہرہ سے دمشق گیا اور یہاں سے بغداد پہنچ گیا۔ بغداد میں اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تعریف سنی تو مسلمانوں کے بھیس میں ہندوستان چل کھڑا ہوا۔ یہ عربی، فارسی اور ترکی خوب بولتا تھا، اکثر مسلمانوں کے بھیس میں سفر کرتا اور کھاوے کی نماز بھی پڑھ لیتا۔

لاہور میں آتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ملازم ہو گیا۔ یہ ۱۸۳۳ء میں لاہور آیا تھا۔ تین برس یہاں رہ کر وطن چلا گیا لیکن ۱۸۳۶ء میں سکندریہ سے ہوتا ہوا دوبارہ لاہور میں وارد ہوا۔ اس وقت رنجیت سنگھ فالج کا شکار ہو چکا تھا۔ مارٹن نے علاج شروع کیا تو مہاراجہ کو افاقہ ہوا ——— ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ کی وفات کے بعد یہ لاہور ہی میں مقیم رہا۔ راجہ دلیپ سنگھ کا بھی معالج تھا۔ اس کو نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

پنجاب میں انگریزوں کا تسلط ہو جانے پر "مارٹن" انگریزوں کا ملازم ہو کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی حیثیت سے کام کرتا رہا "اکلہ" بیک گریگر سے مخالفت ہو جانے کی وجہ سے مستعفی ہو کر کشمیر چلا گیا۔ وہاں زراعت کا کام شروع کیا مگر ناکام ہو کر پھر لاہور آنا پڑا اور یہاں ایک کشمیری خاتون سے شادی کی جس کے بطن سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کو "میسوری" کے ایک انگریزی سکول میں تعلیم دلانے کے لیے داخل کیا ——— ڈاکٹر مارٹن ۱۸۵۰ء میں اپنے وطن چلا گیا ——— مارٹن نے اپنے سفر کے حالات کتابی شکل میں شائع کیے تھے۔ اس سفرنامے کا نام "مشرق میں پینتیس ۳۵ سال" ہے جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا[2]۔

سید خیر شاہ یہ حکیم اعلیٰ کے شاگرد تھے۔ مولوی سید رجب علی نے لکھا ہے کہ میں نے قریباً ۱۸۱۸ء میں لاہور آ کر علوم طبیہ کو سید خیر شاہ تلمیذ حکیم اعلیٰ سے حاصل کیا[3]۔ ان کے فرزند حکیم حاکم شاہ بڑے نامی گرامی طبیب تھے[4]۔ حکیم سید منیر علی خاں آشفتہ بریلوی نے مسئلہ بحران پر حاکم شاہ سے مباحثہ بھی کیا تھا[5]۔ حکیم حاکم شاہ کے بیٹے عادل شاہ "تحقیقات چشتی" کی تصنیف کے وقت ۱۲۸۴ھ میں زندہ تھے۔ ان کی جائداد چوک جھنڈا میں تھی اور گورستان حکیم حاکم شاہ شمال رویہ مزار حضرت حسو تیلی ہے۔

حاکم شاہ نامی ایک طبیب کا ذکر تاریخ لاہور مصنفہ کنہیا لال میں بھی ہوا ہے جن کو حکیم سید عنایت شاہ کی ہمشیرہ کا نواسہ لکھا ہے ان کے لڑکوں کے نام عباس علی و دلاور علی لکھے ہیں[6]۔

حیدر علی شاہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے طبیب خاص تھے، فتح گڑھ میں آپ کو بہت سی زمین اور ایک کنواں دربار سے ملا تھا جو اب تک "چاہ سیداں" کے نام سے موسوم ہے[7]۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۲۵۲ [2] اطبائے عہد مغلیہ مؤلفہ حکیم کوثر چاندپوری صفحہ ۱۶۸ [3] تحقیقات چشتی صفحہ ۱۱۸
[4] تحقیقات چشتی صفحہ ۱۸۸ [5] رموز الاطباء جلد اول صفحہ ۳۴۵ [6] تاریخ لاہور صفحہ ۶۰
[7] رموز الاطباء صفحہ ۷۶۳

مفتی غلام محمد آپ مفتی غلام سرور مصنف خزینۃ الاصفیا کے والد ماجد تھے۔ سلسلہ نسب آپ کا حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملتا ہے۔ آپ ہمیشہ درس و تدریس، طبابت اور کتابت قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ مسجد بلوچاں موضع مزنگ کے امام تھے اور اسی موضع میں حویلی تیار کی تھی[1]۔ اشراق کی نماز پڑھ کر بیماروں کو دیکھنا شروع کرتے تھے ان سے فارغ ہو کر کتابت قرآن میں مشغول ہو جاتے کیونکہ آپ اسی سے قوت حلال حاصل کرتے تھے۔ آپ ۹ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو فوت ہوئے[2]۔ مفتی غلام سرور نے "گنج تاریخ" میں یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے ؎

مفتیٔ دیں غلام محمد چو از جہاں! — بہ رود گشت و یافت بملک جناں وصال

گو "مظہر اسلام" بتاریخ رحلتش! — "جانِ جہاں غلام محمد" بخواں وصال

۱۲۷۶ھ — ۱۲۷۶ھ

حیدر علی خاں یہ دہلی کے شاہی اطباء کی اولاد میں سے تھے[3]۔ ۱۲۴۰ھ میں لاہور چلے آئے اور سلک حکمائے مہاراجہ رنجیت سنگھ میں منسلک ہو گئے۔ سکھوں کے زوال کے بعد گوشہ نشیں ہو کر تالیف و تصنیف میں مصروف ہو گئے[4]۔

"تسہیل العلاج" فارسی اور "مجمع البحرین" جس میں یونانی و انگریزی طریق علاج کو یکجا بیان کیا گیا ہے، تصنیف کیں۔ تسہیل العلاج پہلی بار مصنف کی زندگی میں ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ طبع ہوئی اور دوسری بار مصنف کی وفات کے بعد ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں حکیم سید غلام مصطفےٰ کی نظر ثانی کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ مجمع البحرین ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی ——— رائے بہادر کنہیا لال نے لکھا ہے کہ امرائے دربار، خاندان راجہ دینا ناتھ و دیوان گنگا رام کے خاندانی معالج تھے اور ان کے بھائی حکیم منیر علی خاں کو پنشن مل رہی ہے۔ حکیم حیدر علی قریباً ۱۸۷۰ء میں فوت ہوئے۔

سید ولی شاہ حکیم صاحب کے اجداد میں سے مولوی سید نور محمد وارد لاہور ہوئے تھے جن کو اورنگ زیب بادشاہؒ نے شاہی مسجد لاہور کا امام مقرر کیا تھا اور غالباً یہ مولوی صاحب اس مسجد کے سب سے پہلے امام تھے۔ مولوی نور محمد کے لڑکے سید عتیق اللہ تھے۔ ان کو محمد شاہ بادشاہ نے "داور خاں" کا خطاب دیا تھا اور احمد شاہ ابدالی نے "داور خاں" کو پنجاب کا نائب السلطنت مقرر کیا تھا[5]۔ اس تقرری کا فرمان موجود ہے جس پر احمد شاہ کی مہر اور دستخط ثبت ہیں۔ اس نادر فرمان کے علاوہ اور بھی بہت سے تاریخی کاغذات اس کے خاندان کے ایک فرد سید ناصر علی شاہ کے پاس محفوظ ہیں اور راقم نے ان کو دیکھا ہے۔

حکیم سید ولی شاہ گردیزی مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ والیٔ کشمیر کے طبیب خاص تھے اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے[6]۔ مہاراجہ شیر سنگھ پسر مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی آپ سے علاج کراتا رہا اور اس نے حکیم صاحب کو علاقہ سانڈہ میں زمین بھی عطا کی تھی۔ انگریزی عہد میں بھی حکیم سید ولی شاہ کی بڑی قدر و منزلت رہی۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے ۱۸ اپریل ۱۸۵۰ء کو آپ کی چھ سو روپیہ پنشن مقرر کی۔ ۱۸۵۶ء میں لاہور میں ہیضہ کی وبا پھیلی۔ حکیم صاحب کے علاج سے دنیا کو بہت فائدہ ہوا تو کمشنر لاہور نے آپ کو

۱؎ تاریخ لاہور صفحہ ۸۴ ۲؎ خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۲۹۳ ۳؎ تاریخ لاہور صفحہ ۶۱ ۴؎ تسہیل العلاج صفحہ ۲

۵؎ اس بیان کی تصدیق کتب تاریخ سے میں نہیں کر سکا (مرتب) ۶؎ رموز الاطبا جلد اول صفحہ ۲۸۹

ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا جس میں آپ کی حذاقت کا اعتراف کیا۔ یہ سرٹیفکیٹ دس اکتوبر ۱۸۵۶ء کا محررہ ہے۔

حکیم صاحب ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں بمقام جموں فوت ہوئے اور وہیں آپ کا مزار بنا۔ آپ کے بیٹے حکیم رستم علی شاہ بڑے لائق طبیب تھے جو کشمیر میں راجہ کے ملازم تھے۔ حکیم ولی شاہ کی اولاد کٹڑہ حکیم ولی شاہ موصوف اندرون موچی گیٹ لاہور میں رہ رہی ہے۔

راقم الحروف نے حکیم ولی شاہ اور ان کے بھانجے حکیم بزرگ شاہ متولی شاہی مسجد لاہور کے حالات سید ناصر علی شاہ ساکن محلہ کٹڑہ ولی شاہ سے معلوم کیے اور ان کے پاس جو نادر کاغذات ہیں ان سے اخذ کیے ہیں۔ سید ناصر علی صاحب کا کہنا ہے کہ ہم گردیزی سید ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد افغانستان سے ہندوستان میں آئے تھے۔

غلام دستگیر آپ سکھ عہد کے بلند پایہ اطبا میں سے تھے، علم و فضل میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ سکھوں کے دربار میں آپ کی بڑی عزت تھی۔ آپ کا بیٹا غلام محمد المعروف گاما نوجوانی ہی فوت ہو گیا تھا[1]۔ حکیم صاحب کے شاگردوں میں سے حکیم علاؤ الدین المعروف الہ دین، حکیم سید چراغ شاہ اور حکیم الہ یار انگریزی عہد کے اطبا میں سے بہت مشہور ہوئے ہیں۔ مولوی حکیم نور الدین صاحب بھیروی شاہی طبیب ریاست جموں و کشمیر نے لکھا ہے کہ میں ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) کے قریب لاہور آ کر بعارضہ خناق بیمار ہو گیا تو میرے بھائی مجھے سید مٹھا بازار میں حکیم غلام دستگیر کے پاس لے جا کر علاج کراتے رہے[2]۔ حکیم غلام دستگیر انگریزی عہد میں چند سال گزار کر فوت ہو گئے۔

(۴) انگریزی عہد کے اطبّا

اس حصے میں انگریزوں کے ابتدائی دور سے لے کر مئی ۱۹۶۱ء تک کے مرحوم اطبا کا ذکر ہے۔ ان میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے پاکستان میں کئی سال گزارنے کے بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ گو ان لوگوں کی کام کی زندگی کا غالب حصہ اسی عہد میں گزرا اس لیے عنوانِ بالا ہی کے تحت ان کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔

سلطان محمود آپ شمس الاطباء حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی مصنف "مخزنِ حکمت" اور حکیم مولوی غلام محی الدین کے والدِ ماجد تھے۔ اپنے وقت میں ان کی حذاقت کا بڑا شہرہ تھا۔ عربی و فارسی کے ماہر تھے۔ سینکڑوں طلبا نے ان سے علمِ طب پڑھا۔ قریباً ۱۸۸۰ء میں اس دارِ فنا سے دارِ بقا میں رحلت کر گئے[3]۔

سید چراغ علی شاہ سبزواری یہ حکیم غلام دستگیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے[4]۔ نسباً سید سبزواری اور مسلکاً چشتی قادری تھے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے فاضل علما ہو گزرے ہیں۔ حکیم صاحب خود بڑے اوصاف کے مالک تھے۔

لاہور کے مشاہیر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نور احمد چشتی ان کے متعلق اپنی مشہورِ عالم کتاب "تحقیقاتِ چشتی" میں تحریر

---

[1] تاریخ لاہور صفحہ ۱۹۱ [2] بیاض نور الدین مطبوعہ قادیان صفحہ ۱ [3] ماہنامہ شمس الاطبا ستمبر ۱۹۳۲ء [4] تاریخ لاہور صفحہ

فرماتے ہیں ———

"تلقینِ طلباء و علاجِ بیماراں میں مصروف رہتے ہیں اور خلقِ محمدی کا یہ حال ہے کہ جو بیمار آتا ہے آپ کے جمالِ باکمال کو دیکھ کر اور کلامِ شیریں سُن کر نصف مرض اس کا دور ہو جاتا ہے۔"[1]

حکیم صاحب کے تین فرزند تھے (۱) سید حاکم علی شاہ (۲) سید بہادر علی شاہ جو ادیب و شاعر بھی تھے (۳) سید نادر علی شاہ

حکیم چراغ علی شاہ نے ایک تکیہ باغیچہ متعلقہ خطہ گورستانِ میانی ۱۸۵۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ آپ ۱۸۸۲ء میں تاریخ لاہور کی تدوین کے زمانہ تک زندہ تھے کیونکہ رائے بہادر کنہیا لال نے ان کو اپنے وقت میں موجود بیان کیا ہے۔

کریم بخش

یہ باغبانپورہ لاہور کی ارائیں برادری کے بڑے ممتاز فرد تھے۔ نہایت خوش اخلاق اور پسندیدہ خصائل بزرگ تھے۔[2] ان کے بڑے بھائی مولوی قادر بخش کا مقام بھی بہت بلند تھا جنھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایما پر جرنل کورٹ لینڈ فرانسیسی افسر فوج سے توپ خانہ اور بندوق سازی کا فن سیکھا اور اس فن میں بزبانِ فارسی "مفتاح القلعہ" کتاب لکھی۔ مولوی قادر بخش کے صاحبزادے کا نام مولوی نظام الدین تھا اور ان کے فرزند تھے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین مرحوم۔[3]

سید محمد شاہ

تجربہ کار اجلّہ اطباء لاہور میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ علم و عمل طبابت میں ید بیضا رکھتے تھے۔ "توحید وجودی" کے قائل تھے اور اس خیال کے فقراء سے آپ کے بڑے تعلقات تھے اور تادم آخر اسی عقیدے پر بڑی مضبوطی سے قائم رہے۔ آپ شیعہ و سُنی عقائد کے پابند نہ تھے۔[4] حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کے ماموں تھے۔[5]

حکیم سید محمد شاہ کے چھوٹے بھائی حکیم سید بہادر شاہ اور حکیم سید بزرگ شاہ لاہور میں نامی طبیب ہوئے ہیں اور آپ کے فرزند حکیم سید عالم شاہ تو تمام متحدہ پنجاب میں معروف تھے۔ آپ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فوت ہوئے اور مفتی غلام سرور نے یہ تاریخ کہی ؎

رفت از دنیائے فانی در بہشتِ جاوداں — چوں محمد شاہ والا منزلت اہلِ وقار

سال تاریخش بسرور شد ندا از آسماں — گو "حبیب جاں محمد شاہ عالی اقتدار"

۱۲ ھ ۹۱

محمد بخش

یہ انیسویں صدی کے نامور اطباء میں سے تھے۔ فنِ طب میں حکیم غلام محمد والدِ مفتی غلام سرور کے شاگرد تھے۔ بڑے بڑے فضلائے دہر نے ان سے طب پڑھی تھی جن میں سے حکیم احمد الدین شارح موجز، مفتی حکیم سلیم اللہ خاں اور حکیم مولوی غلام مصطفےٰ ایم او ایل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حکیم صاحب ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء واصل بحق ہوئے۔[6]

مفتی غلام سرور صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی ؎

چوں بتقدیرِ ایزدِ متعال — رخت بست از جہاں محمد بخش

سرورا سالِ انتقالِ او — کن رقم "مہرباں محمد بخش"

۱۲ ھ ۹۲

---

[1] تحقیقاتِ چشتی ص ۱۸۲ [2] سلیم التواریخ ص ۹۵۴ [3] سلیم التواریخ ص ۵۰۵ [4] گنج تاریخ ص ۲۱۴ [5] تاریخ لاہور ص ۶۰ [6] گنج تاریخ از مفتی سرور صاحب، ص ۱۱۳

مہتاب الدین

آپ حکیم گل محمد متوفی ۱۲۷۵ھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ پہلے دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ کے پاس جو وزیر تھا ملازم تھے۔ پھر نواب صاحب ممدوٹ کے پاس رہے۔ آخر میں مہاراجہ کشمیر کے ملازم ہو گئے تھے ۱۲۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کے دو بیٹے تھے حکیم ضیاء الدین و حکیم شہاب الدین۔

بزرگ شاہ گردیزی

یہ حکیم سید ولی شاہ کے بھانجے تھے۔ لاہور کے سربرآوردہ اطباء اور معزز لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا سکھوں کے عہد میں لاہور میں مطب کرتے تھے۔ آخر عمر میں حکیم ولی شاہ کے ہمراہ جموں میں ریاست کے ملازم ہو گئے تھے۔ آپ کے خاندان کے ایک فرد سید ناصر علی کے پاس اس خاندان کے بزرگوں کے نام فرمانات شاہی و دیگر اہم کاغذات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حکیم بزرگ شاہ کو انگریزوں نے بادشاہی مسجد کا متولی مقرر کیا تھا۔ مسجد کو واگزار کرنے کا حکم جو ۲۷ اپریل ۱۸۵[illegible]ء کو کمشنر کے دستخط سے گورنر کے ایماء پر جاری ہوا، اس میں بھی لکھا ہے کہ بزرگ شاہ کو مسجد کا متولی مقرر کیا جاتا ہے۔ حکیم صاحب کٹڑہ حکیم ولی شاہ میں مطب کیا کرتے تھے۔ ۱۸۸[illegible]ء میں فوت ہوئے اور تکیہ سردار علی میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

گل محمد

بن حکیم نور محمد بن حکیم خدا بخش بن حکیم محمد اسحاق انصاری (متوفی ۱۱۹۱ھ) بڑے نامور اور حاذق طبیب گزرے ہیں۔ علم ہیئت، نجوم کے علاوہ سنسکرت کے بھی زبردست عالم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری زندگی میں ان کے معالجوں میں رہے اور مہاراجہ کی وفات کے بعد جاگیر کی آمدنی اور مطب پر کفایت کرتے رہے۔ آپ ۱۲۷۵ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔[1]

ان کے چار لڑکے تھے حکیم مہتاب الدین، حکیم حسام الدین، حکیم وجیہہ الدین جو ۱۲۹۶ھ میں لاولد فوت ہو گئے تھے اور شجاع الدین جن کے بیٹے حکیم احمد شجاع صاحب ہیں۔ حکیم حسام الدین راقم الحروف کے مولد امرتسر میں مطب کرتے تھے۔ آج تک امرتسریوں کو ان کی حذاقت کی حکایتیں یاد ہیں۔

علاؤ الدین معروف بہ الہ دین

یہ حکیم شمس الدین کے فرزند تھے۔ انھوں نے طب حکیم غلام دستگیر سے پڑھی تھی۔ ان کا شمار لاہور کے معتمد اطباء میں ہوتا تھا۔ بڑے بڑے فاضل اطباء نے ان کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی تھی۔ مولوی حکیم نورالدین صاحب بھیروی طبیب مہاراجہ جموں و کشمیر نے بھی آپ سے کسی قدر طب پڑھی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"حکیم الہ دین صاحب لاہوری مقیم گمٹی بازار میرے استاد مقرر ہوئے اور مجھے موجز پڑھاتے تھے عربی عبارت نہایت صحیح پڑھتا اور تلفظ میں بڑی احتیاط کرتا یہ ان کو ہمیشہ مدِ نظر تھا۔"[2]

حکیم نورالدین صاحب ۱۸۵۸ء میں آپ سے پڑھتے تھے۔[3]

حکیم علاؤ الدین کثیر الاولاد تھے مگر آپ کی وفات کے وقت صرف تین لڑکے زندہ تھے۔ ایک حکیم احمد الدین شارح موجز، دوسرے حکیم چراغ دین، تیسرے حکیم فیروز الدین جو ماہنامہ "رفیق الاطباء" اور ماہنامہ "الحکیم" کے ایڈیٹر تھے۔[4] حکیم صاحب اسّی برس کی عمر پاکر قریباً ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے۔

"جواہرِ خمسہ" اور "مرغوب الاطباء" کے نام سے آپ نے ضخیم کتابیں تالیف کیں جو زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔

---

[1] رجز فغفوری ص ۱۵۲ [2] رجز فغفوری ص ۱۵۳ [3] بیاض نورالدین مطبوعہ قادیاں ص ۳ [4] الحکیم لاہور جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۰

پنڈت کنہیا وید و حکیم یہ ویدک اور یونانی طب کے فاضل تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ان کا مطب بڑا کامیاب تھا۔[1]

جیون جان لاہور کے بلند پایہ اطبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے شیریں زبان، خوش خلق اور ہمدرد و حلیم تھے۔[2] ۱۸۸۲ء میں آپ کا مطب مرجع انام تھا۔

شرف علی بن احمد علی، لاہور کے نامی گرامی اطبا میں سے تھے۔ علم و فضل میں بھی یکتا تھے۔[3] ۱۸۸۲ء میں آپ کا مطب لاہور میں شفا بخش مریضاں تھا۔

بالک رام یہ لاہور کے بڑے مشہور طبیب تھے، مطب آپ کا مرجع انام تھا۔ ۲۰ر اگست ۱۸۹۹ء کو فوت ہوئے۔[4]

شجاع الدین بن حکیم گل محمد بن حکیم نور محمد بن حکیم خدا بخش، بن حکیم محمد اسحاق انصاری متوفی ۱۱۹۱ھ بن حکیم شیخ نور محمد، لاہور کے جلیل القدر اطبا میں سے تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:۔

"حکیم شجاع الدین لاہور میں قیام پذیر ہے یہ شخص عالم، فاضل و طبیب ہے۔ بہت رسالے علوم متنوع میں لکھے ہیں۔ نظم فارسی، عربی عمدہ لکھتا ہے، طبابت بھی کرتا ہے اور سرکاری ملازموں میں بھی ہے۔"[5]

"رموز غفوری فی تردید اطلاع ضروری" بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔ آپ کے خاندان حکیماں ساکنان اندرون بھاٹی گیٹ کے حالات راقم نے اسی کتاب سے لیے ہیں۔ حکیم احمد شجاع صاحب انہی حکیم شجاع الدین مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں جن کا وجود جملہ خاندان حکیماں کے لیے باعث فخر ہے۔

پنڈت خوشحال آپ ویدک اور یونانی طب کے ماہر تھے۔ لاہور میں آپ کی بڑی شہرت تھی۔[6] ۱۸۸۲ء میں تاریخ لاہور کی تدوین کے وقت زندہ موجود تھے۔

بہادر شاہ یہ حکیم بزرگ شاہ متوفی ۱۹۰۶ء کے بڑے بھائی تھے۔ تمام پنجاب میں ان کی حذاقت کا شہرہ تھا۔ ان کے جسم کا نچلا دھڑ معطل تھا مگر اس کے باوجود پلنگ پر پڑے پڑے مریضوں کو دیکھتے رہتے تھے ان کے ہاں مریضوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ بمشکل تمام ایک دو بجے دوپہر تک ان کو فرصت ہوتی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں فوت ہوئے۔

محمد اکبر بیگ یہ محمد اعظم بیگ اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے فرزند تھے، اسلامبول ترکی کے مکتب طبی شاہی میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ترکی میں بیٹھ کر "صحت نامۂ ازدواج" نامی کتاب بزبان اردو تصنیف کی جس کو حکومت ترکی کی اجازت سے عمدہ کاغذ پر اعلیٰ ٹائپ میں مطبع محمود بک قسطنطنیہ سے ۱۳۰۰ھ میں طبع کرایا اور اس قیمتی علمی کتاب کو ہم وطنوں کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر

---

[1] تاریخ لاہور ص ۵۹ [2] تاریخ لاہور ص ۶۲ [3] تاریخ لاہور ص ۶۱ [4] بزرگان ہنود (قلمی) ص ۱۵۷ [5] تاریخ لاہور ص ۵۹
[6] تاریخ لاہور کنہیا لال ص ۵۹

حاصل کیا۔[1] یہ کتاب اپنے موضوع پر حاوی ہے۔ ڈاکٹر اکبر بیگ انگریزی اور یونانی طب کے اعلیٰ درجہ کے واقف اور ماہر تھے۔

پنڈت جنار دھن یہ ویدک اور طب یونانی دونوں کے فاضل تھے، ہندی طریق پر معالجہ کرتے اور پنجاب یونیورسٹی میں ویدک پڑھاتے تھے۔[2] ایک عرصہ تک میونسپل کمیٹی لاہور کی جنرل کمیٹی کے رکن رہے تھے۔ لاہور کے معززین میں آپ کا شمار تھا۔ انگریزی حکومت نے آپ کو "رائے بہادر" کا خطاب بھی دیا ہوا تھا۔

پنڈت جی بے حد دولت مند اور سخی تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں پر لاکھوں روپے خرچ کر گئے۔ آپ نے "نیا شالامار باغ" کے نام سے ایک بڑی نفیس سیرگاہ بنوائی تھی جو ملتان روڈ پر "نواں کوٹ" کے پیچھے متصل موضع "نوناریاں" واقع ہے۔ یہ سیرگاہ ۱۹۴۷ء تک عوام کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ تقسیمِ ملک کے بعد اس کی خوبصورت اور قیمتی عمارات کو لوگوں نے برباد کر دیا۔ آج اگر یہ باغ اصلی حالت میں ہوتا تو واقعی لاہور کے اعلیٰ ترین باغوں میں شمار ہوتا۔ آپ نے اندرون شاہ عالمی ایک "جنج گھر" بھی بنایا تھا جس کو شادی بیاہ کی ضرورتوں کے لیے ہر مذہب کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ یہ جنج گھر بھی تقسیمِ ملک کی تباہ کاریوں کی نذر ہو گیا۔

پنڈت جنار دھن نے ایک طبی رسالہ بھی لکھا تھا جس کا نام "رسالہ امراضِ چیچک" ہے جو بڑے سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۹ء میں ڈبلیو بال پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور میں زیورِ طبع سے مزین ہوا تھا۔ اس پر مؤلف کا نام یوں تحریر ہے:۔

"پنڈت جنار دھن جی ولد پنڈت سرپت سرب سُکھ جی مہاراج بن پنڈت سری مہاراج
دھرنی دھر جی ساکن امرت سر"

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد یا آپ خود امرت سر سے لاہور آئے تھے۔ "رشی بھون" نامی وسیع ترین کوٹھی واقع برانڈرتھ روڈ لاہور میں آپ کی رہائش تھی اور رشی بھون کے گرد و نواح میں کئی مکانات آپ ہی کے تھے۔ نیز ایک کوٹھی شالامار باغ کے پاس بھی تھی۔ تقسیم کے بعد آپ کی اولاد دہلی جا بسی۔

پنڈت جی کا سال وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ تاریخ لاہور ۱۸۸۴ء میں تصنیف ہوئی تھی اور اس وقت آپ کا طوطی لاہور میں بول رہا تھا۔ لاہور کے ایک پیرِ کہن سال کی روایت ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب آپ فوت ہوئے۔

محمد اللہ یار یہ حکیم غلام دستگیر کے شاگرد تھے، وطن قاضی کوٹ ضلع گوجرانوالہ تھا۔ تقریباً ۱۸۵۵ء میں لاہور میں مطب جاری کیا، آنکھوں کے بہت اچھے معالج تھے۔ ان کا دواخانہ بھی تھا۔ مریضوں کو اپنے پاس سے تیار شدہ دوائیں دیتے تھے۔[3]

بزرگ شاہ انیسویں صدی میں لاہور میں جو نامی گرامی اطباء ہوئے ان میں سرِفہرست حکیم سید محمد شاہ، حکیم سید بہادر شاہ اور حکیم سید بزرگ شاہ کے نام آتے ہیں۔ یہ تینوں سگے بھائی تھے۔ ان کو حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بھانجے کا شرف بھی حاصل تھا ——— حکیم بزرگ شاہ کا مکان "رتن نیلیاں" میں بر عقب مکان حکیم سید عنایت اب بھی موجود ہے۔ آپ بڑے صاحب ثروت و دولت تھے، جب فوت ہوئے لاہور کی بہترین عمارت "بزرگ محل" اور دیگر بہت سی جائیداد کے علاوہ نقد ایک لاکھ روپے چھوڑ گئے۔

---

[1] "مقدمہ صحت نامۂ ازدواج" ص ۸ [2] تاریخ لاہور ص ۵۹ [3] تاریخ لاہور ص ۶۸ [4] تاریخ لاہور از کنہیا لال ص ۶۱

آپ کا انتقال ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ آخری آرام گاہ قبرستان شیعاں میکلوڈ روڈ لاہور میں ہے۔ قبر ٹوٹ پھوٹ چکی ہے لوحِ مزار ایک طرف گری پڑی ہے۔ تاریخ وفات اسی لوح سے ملی ہے۔ حکیم صاحب کے پوتے تمام جائداد اور بزرگ محل کو فروخت کر کے کراچی جا چکے ہیں۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

لاہوری مل سہگل

ان کے والد لالہ برکت رام سہگل سکھوں کے عہد میں "جونڈہ" ضلع امرت سر سے لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی پھر حکیم قاسم بیگ صاحب ہیڈ ماسٹر مشن سکول لاہور سے اسکول ٹائم کے بعد ان کے گھر جا کر طب پڑھتے رہے اور ساتھ ہی "وید سوامی کیول نند گر جی" سے آیورویدک کی تحصیل کرتے رہے، ۱۸۶۵ء میں سنٹرل میوزیم یعنی عجائب گھر لاہور میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد ریلوے میں ملازمت کر لی مگر چند سال بعد ان نوکریوں کے خیال کو خیرباد کہہ کر طبابت کرنے لگے اور بڑے کامیاب معالج ثابت ہوئے[1] ۱۹۱۱ء میں آپ کی عمر ۷۸ سال کے قریب تھی۔ اس کے بعد ہی کسی سال میں وفات پائی۔

غلام نبی ایڈیٹر "حافظِ صحت"

بہ موضع اعوان تحصیل اجنالہ ضلع امرت سر میں پیدا ہوئے، والد کا نام خلیفہ ملی محمد تھا۔ اعوان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم گاؤں ہی میں پائی، اس کے بعد امرت سر کے جید علماء سے تحصیلِ علم کی جن میں سے مولانا مفتی غلام رسول قاسمی کشمیری ثم امرت سری متوفی ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پھر لاہور چلے آئے یہاں حکیم حاذق و زبدۃ الحکما کے امتحانات پاس کیے اور یہیں مطب شروع کیا۔ ایک طبی رسالہ جاری کیا جس کا نام "حافظِ صحت" رکھا۔ یہ رسالہ تا حال نکل رہا ہے مگر حکیم صاحب کے زمانے والی بات نہیں۔

زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی بڑے بارسوخ اور مذہبی انسان تھے، لاہور کے معززین سے آپ کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ صوفیا سے بھی بڑی ملاقاتیں رہتیں۔ حضرت پیر جماعت علی شاہؒ حضرت مولانا شاہ سلمان پھلواری جن کے فرزند مشہور مجتہد مولانا جعفر پھلواری ہیں اور مولوی محرم علی صاحب چشتی لاہوری آپ کے بڑے تعلقات تھے۔

حکیم صاحب مہاراجہ نابھہ کے علاج کے لیے تشریف لے گئے تھے، مہاراجہ نے شفایاب ہو کر نقد روپے دینے کے علاوہ طلائی کڑے بھی دیے۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو سر میر فیض محمد خاں والیٔ خیرپور کے علاج کے لیے گئے۔ پیر صاحب پگارو بھی آپ سے معالجہ کراتے تھے۔

آپ کی تالیفات چالیس کے قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر وقتی حیثیت رکھتی تھیں مگر بعض کی قدر و قیمت اب بھی بہت زیادہ ہے۔

حکیم صاحب ۲ اگست ۱۹۱۶ء کو وفات پا گئے۔ برلب بہاولپور روڈ قبرستان میانی میں مقبور ہوئے شمس الدین شائق مؤلف منظوم ترجمۂ قرآن نے تاریخ ذیل کہی جو لوحِ مزار پر کندہ ہے:۔

غلام نبی آں حکیم یگانہ　　الٰہی بجنات مسرور بادا
بوقتِ وفاتش زا فکار شائق　　بشد سال تاریخ "مغفور بادا"
　　　　　　　　　　　　　　　۱۳۳۴ھ

[1] روزنا الاطباء جلد اول ص ۲۵۰

مولوی غلام محی الدین انصاری

یہ نومبر ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ شمس الاطباء ڈاکٹر و حکیم غلام جیلانی کے برادرِ بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور طب کی تعلیم اپنے والد حکیم مولوی سلطان محمود انصاری سے حاصل کی، نیز علامۂ عصر مولوی فیض الحسن سہارن پوری سے بھی مستفید ہوئے۔ فنِ کتابت میں منشی ممتاز علی "نزہت رقم" دہلوی کے شاگرد تھے اور خود کو "زینت رقم" لکھتے تھے۔ حکیم صاحب عرصہ تک گوالیار اور بمبئی میں رہے۔ "انڈیا گزٹ بمبئی" نام سے ایک ہفتہ وار پرچہ بھی نکالا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں بغرضِ ملاقاتِ احباب لاہور آئے مگر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ گمٹی بازار میں آپ کا مطب تھا۔ آپ حضرت علی حسین شاہ کچھوچھوی سے بیعت تھے۔

حکیم صاحب نے بنام "ارمغانِ قادری" ایک کتاب لکھی جس میں شریعت و طریقت کے مسائل کو معتبر کتب سے اخذ کر کے جمع کر دیا ہوا ہے۔ ایک حمائل شریف اپنے ہاتھ سے لکھ کر شائع کی تھی جس میں یہ ندرت ہے کہ اگر ایک صفحہ کی پہلی سطر الف سے شروع ہوتی تو اس صفحہ کی آخری سطر کا ابتدائی حرف بھی الف ہے۔ اسی طرح اُوپر کی دوسری سطر کے مقابلے میں نیچے سے اوپر کی دوسری سطر ایک ہی لفظ یا حرف سے شروع ہوتی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس ——— اور دوسری صنعت یہ ہے کہ صفحہ اوّل کی درمیانی سطر جس حرف سے شروع ہوگی اس کے سامنے والے صفحہ کی درمیانی سطر کا پہلا لفظ بھی وہی ہوگا۔ اس صنعتی حمائل کے متعلق یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حکیم صاحب مرحوم کو اس صنعت کا موجد نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ بالکل اسی صنعت کا ایک قلمی نسخہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے کتب خانہ میں تھا۔ حافظ صاحب نے محترم پیر غلام دستگیر نامی صاحب کو یہ نادر مخطوطہ دکھایا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی ایسے قدیم نسخہ سے انھوں نے نقل کی ہو اور توارد کا بھی سو فی صدی امکان ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حکیم مولوی غلام محی الدین ۱۱ ذی الحجہ بروز اتوار ۱۳۳۷ھ کو اس دارِ فنا سے رحلت کر گئے۔ قبر آپ کی حضرت طاہر بندگیؒ کے جوار میں جانب شرق ہے، لوحِ مزار پر "رفت در جنت" مادہ سال وفات کندہ ہے اور ان کے ساتھ ہی شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی مدفون ہیں مگر ان کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں۔

۱۳۳۷ھ

عبدالعزیز کامل

انھوں نے عربی، فارسی اور فقہ وغیرہ کی کتابیں اپنے والدِ ماجد مولانا پیر حاجی عبدالکریم لاہوریؒ سے پڑھیں اور علمِ طب کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی جن میں سے حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری ثم لاہوری ثم امرتسری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت کامل نہایت ذہین و فطین تھے، بہت تھوڑے عرصے میں آپ کی قابلیت کی شہرت تمام ہندوستان میں ہو گئی تھی۔ آپ نے ۱۹۰۰ء میں لاہور سے ایک ادبی رسالہ بنام "کامل" جاری کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اخبار "حکمت" کی ادارت کی ذمہ داری آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور "حکمت" کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ "کاشف رموز کیمیا" و دیگر کئی کتابیں تصنیف کیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کامل صاحب صرف ۳۷ سال عمر پا کر ۲۰ مئی ۱۹۱۹ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ لاولد تھے۔ محترم جناب حکیم حاجی عبدالمجید صاحب عتیق آپ کے برادرِ خورد ہیں۔

سید عبدالقدیر

آپ کے والدِ ماجد حکیم سید محمد اسداللہ بن مولانا حکیم سید فیض علی شاگرد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱۸۲۵ء میں قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ سے نقل مکانی کر کے امرت سر آ گئے تھے۔ حکیم عبدالقدیر صاحب نے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ طب اپنے والد سے پڑھی اور مولانا غلام علی قصوری مشہور اہلِ حدیث عالم اور مولانا حبیب اللہ خاں پشاوری سے بھی تحصیلِ علوم کی۔

سیاحت کے شوقین تھے۔ امرتسر کو چھوڑ کر اطراف و اکناف ہند میں گھومتے رہے۔ پھر ریاست لوہارو میں افسر الاطباء کے عہدہ پہ مامور ہو گئے، اور نواب صاحب کے معالج خصوصی بھی رہے مگر جلد ہی مستعفی ہو گئے[1]۔ ۱۸۹۲ء کے قریب لاہور آ گئے اور یہاں مطلب جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ لاہور میں زندہ تھے اور عمر قریباً پچاس سال تھی۔

چراغ دین آپ حکیم علاؤ الدین معروف بہ الہ دین کے فرزند اور لاہور کے معروف طبیبوں میں سے تھے۔ ریاست فرید کوٹ سے آپ کا خاص تعلق تھا۔ آپ کے صاحبزادے حکیم فضل الدین بھی لاہور میں مشہور طبیب ہوئے جو عین عالم شباب میں فوت ہو گئے تھے[2]۔

مولوی احمد الدین یہ حکیم مولوی علاؤ الدین کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ حکیم فیروز الدین ایڈیٹر "رفیق الاطباء" و "الحکیم" لاہور آپ کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ حکیم مولوی احمد الدین نے مروجہ علوم کی کتابیں مولانا غلام محمد بگویؒ خطیب بادشاہی مسجد اور مولانا فیض الحسنؒ سہارنپوری سے پڑھیں۔ طب کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ آپ کچھ عرصہ مہاراجہ فرید کوٹ کے معالج خصوصی کی حیثیت سے فرید کوٹ میں رہے۔ چھ سات کتابیں آپ نے تالیف کیں جن میں سے شرح موجز خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سال وفات معلوم نہیں ہوا آپ کے وارث بھی بے خبر ہیں۔

فیروز الدین یہ لاہور کے مشہور و معتبر طبی جرائد "رفیق الاطباء" و "الحکیم" کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے والد حکیم علاؤ الدین معروف بہ الہ دین لاہور کے اعاظم اطباء میں سے تھے۔ حکیم فیروز الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "رموز الاطباء" کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ حکیم فیروز الدین مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی مغفور و مبرور کی طبی تحریکوں کے ہمیشہ نہایت سرگرم کارکن رہے۔ بڑے صاحب ہمت اور باحمیت تھے۔ ۱۹۲۸ء آپ کا سن وفات ہے۔

مفتی محمد انور قریشی یہ مفتی غلام سرور مؤلف "خزینۃ الاصفیا" کے فرزند تھے۔ آپ نے طب کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ پھر حکیم سید نجف علی شاہ سے جو لاہور کے مشہور طبیب تھے فیض یاب ہوئے اور ڈاکٹر حاکم دین مرحوم سے انگریزی طب پڑھی۔ آپ بڑے حاذق طبیب تھے۔ فاضل اجل پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور نواب صاحب لوہارو کے معالج خصوصی ہونے کا آپ کو شرف حاصل تھا۔ آپ نے "مجربات انوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو طبع نہیں ہو سکی[3]۔ ۲۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ آپ کا مطلب کوچہ مفتیاں لاہور میں تھا۔

محمد ابراہیم آپ "بستی غناں" جالندھر میں مولوی حکیم محمد بخش کے ہاں رجب ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے[4]۔ عربی، فارسی کے فاضل اور طب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ حکیم امام الدین پاک پٹنی مصنف "مخزن اکسیر" و طبیب شاہی ریاست کپور تھلہ سے طب کی تحصیل کی تھی۔ آپ نے ایک عرصہ تک لاہور میں مطلب کیا اور سینکڑوں کو طب پڑھائی۔ ۱۸۹۶ء کے قریب آپ امرتسر جا کر مطلب کرنے لگے اور تین چار سال وہاں گزار کر پھر لاہور آ گئے مگر پھر یہاں دل نہ لگا اور واپس امرتسر چلے گئے۔ مطلب آپ کا ہر جگہ مرجع خلائق رہا۔ حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم دہلوی آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حکیم صاحب ابراہیم کے منجھلے صاحبزادے حکیم حاجی غلام جیلانی امرتسری مصنف کتب کثیرہ کی فنی شہرت

---

[1] رموز الاطباء جلد اول ص ۲۲۴ [2] رموز الاطباء جلد اول ص ۱۲۷ [3] رموز الاطباء جلد اول ص ۹۳۴ [4] رموز الاطباء جلد اول ص ۲۹۶

تمام ہند و پاک میں ہے۔ راقم الحروف کے والد فخر الاطباء حکیم فقیر محمد چشتی امرتسری مرحوم کو بھی حکیم ابراہیم صاحب سے تلمذ تھا۔ آپ کا سالِ وفات ۱۳۲۲ھ ہے۔[۱]

مولوی غلام مصطفٰے ایم، او، ایل

ابن حکیم مولوی فضل الدین ابن حکیم قطب الدین ابن حکیم کریم بخش ابن قدوۃ العارفین حکیم محمد عظیم ساکن گوجرانوالہ، لاہور کے مشہور فاضل طبیب حکیم مولوی محمد بخش کے شاگرد رشید تھے طب کے علاوہ دیگر کئی علوم و فنون کے بھی بہت بڑے فاضل تھے۔ ۱۸۸۳ء تک آپ نے مولوی عالم، مولوی فاضل، منشی فاضل، انٹرنس، ایف، او، ایل۔ بی، او، ایل۔ ایم، او، ایل کے امتحانات پاس کر لیے تھے۔ پھر حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کی سندات بھی حاصل کیں۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۸۹ء تک اورینٹل کالج میں طب یونانی کے مدرس رہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کے قائم مقام عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ۱۸۹۱ء میں معقول مشاہرے پر آپ کو لندن طلب کیا مگر آپ نہ گئے۔ ۱۸۹۵ء میں مستقل طور پر گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام میں آخر زندگی تک پڑھاتے رہے۔[۲]

حکیم صاحب نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن کے نام یہ ہیں:— "حل جبر و مقابلہ" "حل علم مثلث" (غیر مطبوعہ) "تاریخ التقدیم" اس میں ابتدائے دنیا سے پانچ سو سال بعد مسیح کی تاریخ ہے۔ "قرابادین مصطفائی" "خلاصۃ الرشیدیہ" (عربی) "رسالۃ التوجیہ المسمٰی باحسن الاعتقاد اسلام" "رسالۃ النادرہ فی تشریح الشرائین والاوردہ" اور "تشریح الابدان" "ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل اورینٹل کالج کی تصنیف "سنین اسلام" میں مولوی فیض الحسن مرحوم اور حکیم غلام مصطفٰے کا تعاون مصنف کے شاملِ حال رہا۔[۳]

حکیم صاحب الٰہی والی مسجد چوک نواب اندرون موچی گیٹ کے قریب رہتے تھے۔ اب بھی ان کی اولاد اسی مکان میں رہ رہی ہے۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے فیروز الدین زبدۃ الحکماء بھی فوت ہو چکے ہیں۔ آپ کے سالِ وفات کا صحیح علم ان کی ورثا کو بھی نہیں ہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۲۴ء میں فوت ہوئے ہوں گے کیونکہ جب "تشریح الابدان" ۱۹۲۵ء میں دوسری بار شائع ہوئی تو اس سے پہلے آپ وفات پا چکے تھے۔

مولوی غلام مصطفٰے ایم، او، ایل مخدومی حضرت مولانا محمد عالم آسی امرتسری متوفی ۱۳۶۳ھ کے نانا کے رشتہ دار تھے اس لیے حضرت آسی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

مفتی سلیم اللہ خاں

یہ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مفتی عظیم اللہ خاں پشاوری تھا۔ مفتی صاحب نے منطق، فلسفہ، حدیث اور فقہ کی کتابیں لاہور کے مشہور فاضل بزرگ خلیفہ حمید الدین سے پڑھیں۔ طبی تعلیم حکیم الٰہی بخش اور حکیم مولوی محمد بخش سے حاصل کی۔ مفتی سلیم اللہ خاں کی تمام زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ کتابیں پڑھنے میں آپ کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ اپنے وقت آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہزارہا طالبانِ علم طب آپ سے فیض یاب ہوئے۔ ہند و پاک کے علاوہ بلخ، بخارا، افغانستان اور ایران تک کے طلبا آپ سے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ بڑے بڑے طبیہ کالجوں کے مقابلے میں اکیلے آپ کی تدریسی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ انجمن اطباء لاہور اور انجمن نعمانیہ لاہور کے صدر رہے۔ مدرسہ نعمانیہ کی ترقی کے لیے آپ ہمیشہ کوشاں رہے۔ بعارضہ فالج ۱۹۲۵ء میں واصل بحق ہوئے اور احاطہ مزار حضرت

---

[۱] مجربات فخر الاطباء ص ۷ [۲] رموز الاطباء، جلد اوّل ص ۱۵۴ [۳] اس زمانہ کے بعض ادیبوں کا قول ہے کہ سنین اسلام، ڈاکٹر لائٹنر نے مولوی محمد حسین آزاد سے لکھوائی تھی اور اپنے نام سے شائع کی۔

شاہ ابوالمعالی علیہ الرحمۃ میں دفن کیے گئے۔

شمس الاطباء غلام جیلانی آپ ۱۵ مئی ۱۸۸۳ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے، والد کا نام حکیم سلطان محمود انصاری تھا۔ شمس الاطباء نے عربی اور فارسی پڑھنے کے بعد میڈیکل کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں ایل، ایم ایس کا ڈپلومہ حاصل کیا اور اسی سال سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ ایران میں برٹش ایجنٹ مقرر ہوئے۔ دولت ایران نے آپ کو شاہی مجلس حفظ صحت کا ممبر منتخب کیا۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت ترک کرکے لاہور چلے آئے اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کام میں آپ کو بے حد کامیابی نصیب ہوئی آپ کی تصانیف اطراف و اکناف ہند میں مقبول و مروج ہوئیں۔ کل آٹھ کتابیں آپ کی زیر ہدایت تصنیف ہوئیں اور بار بار زیور طباعت سے آراستہ ہوتی رہیں مگر مخزن حکمت کو بہت زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کے اٹھارہ ایڈیشن حکیم صاحب کی زندگی میں نکل چکے تھے۔ یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری ہے کہ یہ کتابیں صرف شمس الاطباء کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی تدوین میں بہت سے مصنفین کا حصہ ہے۔ رسالہ شمس الاطبا "جیلانی نمبر" میں لکھا ہے :۔

> "تالیف و تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان کے اکثر مشہور و معروف طبیب اور ڈاکٹر صاحبان مرحوم کی زیر ہدایت کام کرتے رہے جن میں سے حکیم مولوی کبیرالدین صاحب مدیر المسیح دہلی ڈاکٹر و حکیم مرزا امام الدین صاحب مدیر حامی الصحت، ڈاکٹر سعیدالدین صاحب، حکیم خورشید حسن صاحب مدیر مصباح الحکمت، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، حکیم مستجاب حسن صاحب مرحوم، حکیم فیروزالدین صاحب طغرائی مرحوم، حکیم قاضی عظیم اللہ صاحب وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں"[1]

حکیم صاحب طبیہ کالج لاہور کے ممتحن تھے۔ انگریزوں نے آپ کو "خانصاحب" کا خطاب بھی دیا ہوا تھا۔ اس مجدد فن نے ۲۳ر فروری ۱۹۲۶ء کو وفات پائی اور حضرت طاہر بندگیؒ کے جوار میں اپنے برادر بزرگ حکیم غلام محی الدین کے قریب ہی دفن کیا گیا۔ شمس الاطباء کے چوتھے صاحبزادے ڈاکٹر محمد محمود انصاری کتب خانہ شمس العلماء کو چلا رہے ہیں اور چھوٹے صاحبزادے ایم مسعود سی۔ ایس۔ پی اس وقت حکومت پاکستان کے ایک محکمہ کے کمشنر ہیں۔

آغا علی ان کے والد مہدی علی خاں تھے اور ان کے والد کا نام نواب امیر علی خاں تھا جو نواب بہادر علی خاں والئ ریاست بہادر گڑھ متصل دہلی کے بھائی تھے۔ بہادر گڈھ روڈ دہلی میں اب بھی مشہور شارع ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔

نواب بہادر علی خاں لاولد تھے اس لیے ان کے جانشین نواب امیر علی قرار پائے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب صاحب نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا، اس جرم میں ریاست چھن گئی اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حکیم آغا علی خاں کے والد نواب مہدی علی خاں لاہور چلے آئے۔ انگریزی حکومت نے ان کی پولیٹیکل پنشن مقرر کر دی تھی۔

---

[1] ماہنامہ شمس الاطباء ستمبر ۱۹۳۴ء

حکیم صاحب نے طب کی تحصیل حکیم بہادر شاہ لاہوری سے کی، بڑے ذہین و فطین تھے، بہت جلد آپ کا مطب مرجع انام ہو گیا۔ پنجابی کے شاعر تھے، آغا تخلص تھا۔ محمد افضل خاں ابن گشتہ امرتسری مرحوم، استاد گام اور دیگر کئی نامور پنجابی شعراء آپ سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ ہیضہ کی پیشین گوئی آپ کو برابر ملتی رہی۔ تقریباً ۷۴ برس کی عمر پا کر ۲ر جنوری ۱۹۲۶ء کو انتقال کیا۔ آپ کے صاحبزادے حکیم اعظم علی اچھے طبیب اور باعزت شخص ہیں —[1]

عالم شاہ — یہ لاہور کے مشہور طبیب سید محمد شاہ کے صاحبزادے تھے، ان کا مطب واقع نو رنگی نزد طویلہ نواب صاحب اندرون موچی گیٹ لاہور مرجع انام تھا۔ اطبائے سلف کا نمونہ تھے۔ حکیم صاحب فنِ کتابت کے بھی ماہر تھے۔ غرضیکہ بڑے اوصاف سے اللہ نے انہیں نوازا تھا۔ عزت، عظمت اور دولت آپ کی خانہ زاد تھیں۔ آپ کے دستِ شفا کی حکایتیں آج تک زبان زدِ عوام ہیں۔ نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں انتقال کر گئے اور کربلا گامے شاہ میں مولانا محمد حسین آزاد کی مسقف قبر کے ساتھ جانبِ شرق مدفون ہوئے۔ قبر آپ کی بھی مسقف ہے مگر قبر پر کوئی کتبہ لگا ہوا نہیں ہے جس سے صاحبِ قبر کا نام معلوم ہو سکے۔

سید ظفریاب علی — یہ نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی، پھر دیوبند اور مدرسہ عالیہ رام پور سے اکتسابِ علم کیا۔ طبی تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی سے حاصل کی اور ایک عرصہ تک مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم کے پیش کار رہے۔ مسیح الملک کے ارشاد کے مطابق ہی لاہور میں مطب شروع کیا۔ یہاں آپ کا مطب مرجع انام تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بعارضہ ذیابیطس فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کے فرزند حکیم ظفر عسکری صاحب لاہور کے ایک کامیاب طبیب ہیں۔

سید مراتب علی شاہ موسوی — بن سید بہادر شاہ ۵ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۱ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے نانا حکیم سید عنایت شاہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اطباء میں سے تھے۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۹ء کو فوت ہو کر اپنے نانا کے قرب میں مدفون ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم نوازش علی شاہ میونسپل کمشنر لاہور بڑے با اثر شخص تھے۔ حکیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے سے استفسار پر معلوم ہوا کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؓ سے ملتا ہے اسی لیے موسوی کہلاتے ہیں۔

کوبراج ہیمراج وید — یہ لاہور کے ایک بزاز کے گھر ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے والد کے ساتھ دوکان پر کام کرتے رہے پھر علم کا شوق ہوا اس کے حصول میں لگ گئے۔ اردو اور سنسکرت پڑھنے کے بعد اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے اور "پراجینہ" کا امتحان پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۰ء میں "وشارد" اور ۱۸۹۱ء میں "شاستری" کا امتحان پاس کیا۔ میڈیکل کالج میں اناٹمی پڑھی ان کے علاوہ اور طبی کئی امتحان پاس کیے ہوئے تھے۔ اخبار "بھارت سگھتی پتر" کو ۱۹۱۱ء تک ایڈٹ کرتے رہے۔ لاہور میں ان کا مطب بہت کامیاب تھا۔[1] اس کے بعد جلد بعد ہی فوت ہو گئے تھے۔

احمد علی خاں — یہ چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی نواب خاں تھا۔ مولانا نور احمد ساکنہ چنیوٹ سے تحصیلِ علم کی۔ طبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے آئے اور یہاں کے مختلف اساتذہ فن سے فیض یاب ہو کر "زبدۃ الحکما" کا امتحان پاس کیا، کچھ عرصہ میڈیکل کالج میں بھی پڑھے۔[2] بارہ کے قریب آپ کی تصانیف ہیں۔ تکمیل البحرین ۷ جلد، قرابادین احمدیہ ۴ جلد، معمولاتِ احمدیہ ۲ جلد۔

---

[1] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۴۳۴ [2] رموز الاطباء جلد اوّل ص ۱۷۵

مشیر النساء، مشیر الاطفال وغیرہ طب میں تصنیف کیں۔ اسرار تصوف دو حصے اور تفسیر القرآن پارۂ اول بھی لکھی۔ رسالہ "تکمیل الحکمت" بھی جاری کیا جو غالباً ۱۸۸۰ء میں نکالنا شروع کیا تھا۔ آپ ایک سو پندرہ برس کی طویل عمر پا کر ۵ فروری ۱۹۳۰ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کے صاحبزادے حکیم محمد علی خاں عقب مسجد وزیر خاں میں رہتے ہیں۔ رموز الاطباء میں حکیم احمد علی خاں کی عمر غلط درج ہے۔ حکیم محمد علی صاحب سے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔

فیروز الدین فیروز طغرائی

علامہ طغرائی ۱۸۸۰ء میں امرت سر کے ایک معزز کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے طب مولانا حکیم غلام رسول اور تفسیر قرآن مولانا علامہ غلام رسول قاسمی کشمیری المعروف رسول بابا متوفی ۱۹۰۲ء سے پڑھی۔ عربی ادب کی بعض کتابیں مولانا محمد عالم آسی متوفی ۱۹۴۳ء (۱۳۶۳ھ) سے دیکھیں۔ طغرائی صاحب کو طب، عروض، فارسی اور عربی کے علاوہ دینیات میں بھی عبور حاصل تھا۔ غایت درجہ کے ذہین و فطین تھے۔ سبعہ معلقہ، متنبی، عرفی، نظیری اور بیدل کے کلام کا اکثر حصہ آپ کو ازبر تھا۔

جناب طغرائی خود بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے اردو، فارسی اور عربی کلام میں یکساں روانی پائی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ گرامی کے بعد پنجاب نے اقبال اور طغرائی جیسے فارسی شعراء پیدا نہیں کیے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ آپ کا کلام بلاغت نظام بنام "کلیاتِ طغرائی" بہ سعی صوفی غلام مصطفےٰ تبسم لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔[1]

حکیم صاحب "وکیل امرت سر" ——— "تہذیب الاخلاق امرت سر" ——— مسیحا امرت سر ——— ایشیا امرت سر ——— کے ایڈیٹر رہے۔ قریباً ۱۹۱۵ء میں لاہور آ کر شمس الاطباء ڈاکٹر غلام جیلانی کے ساتھ مل کر تالیف و ترجمہ کا کام کرتے رہے۔ "علاج بالمفردات" کی تکمیل میں زیادہ تر آپ ہی کا حصہ ہے۔ "مخزن حکمت" کے حصہ یونانی علاج بھی آپ ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے ——— ماہنامہ "رفیق الاطباء" لاہور میں بھی کام کرتے رہے۔ آپ کئی سال لاہور میں گزارنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں امرت سر چلے گئے اور ۱۹۲۹ء میں دوبارہ لاہور چلے آئے اور یہاں انجمن حمایت اسلام کے شعبۂ تالیف و اشاعت میں مصحح کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد بیمار ہو کر پھر امرتسر چلے گئے اور وہاں ۸ فروری ۱۹۳۱ء بروز ہفتہ فوت ہوئے۔ "مغفورِ خدا" مادہ تاریخ ارتحال ہے۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور علامہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری کو آپ کا شاگردِ خاص ہونے کے علاوہ جانشینی کا شرف بھی حاصل ہے۔ حکیم صاحب جہاں بھی رہے مطب ضرور کرتے رہے اور طلباء کو طب بھی پڑھاتے رہے۔

مرزا امام الدین

آپ ۱۸۷۹ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام حکیم حسین بخش تھا۔ میڈیکل کالج لاہور سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور طبیہ کالج لاہور سے یونانی طب کی تحصیل کی۔ ۱۹۱۶ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی بعدہٗ امیر حبیب اللہ خاں والیِ افغانستان کی حرم سرا کے شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ محمد نادر خاں کے زمانہ میں "شفاخانہ مرکزی عسکری" کابل کے انچارج بن گئے۔ ۱۹۳۵ء میں بمقام ہرات حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کیا۔ آپ نے لاہور میں بھی کچھ عرصہ مطب کیا تھا

---

[1] کلیاتِ طغرائی ص ۱۶

اور یہاں سے "حامی الصحت" نامی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ آپ کے فرزند حکیم مرزا محمد یحییٰ اس وقت لاہور میں مطب کر رہے ہیں۔[1]

کرنل بھولا ناتھ آئی، ایم، ایس

ان کے والد جالندھر سے آکر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے۔ کرنل صاحب کو عربی، فارسی اور اردو سے کافی واقفیت ہونے کے علاوہ پنجابی ادب میں بھی کمال حاصل تھا اور انگریزی لیاقت بھی بہت اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے۔ آپ نے تمام زندگی سرکاری ملازمت میں گزاری۔ صوبجات متحدہ کے انسپکٹر جنرل رہے، آپ پہلے ہندوستانی تھے جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ کرنل صاحب اور خان بہادر حکیم رضی الدین دہلوی متوفی ۱۹۱۹ء شہنشاہ جارج پنجم کے آنریری فزیشن کے اعزاز سے بھی ممتاز ہوئے تھے۔

ڈاکٹر بھولا ناتھ انگریزی طب کے ماہر ہونے کے علاوہ طب یونانی پر بھی اچھا عبور رکھتے تھے۔ لیکن یونانی طب سے انھیں کچھ بیر سا ہو گیا تھا۔ اُردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ "علم و عمل طب" آپ کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں "جنسی امراض اور ان کا علاج" اور "تاریخ شہر لاہور" پنجابی بھی قابلِ تعریف ہیں مگر "تاریخ لاہور" میں صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۲ پر "مسئلہ وحدت الوجود" کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی مقامات محلِ نظر ہیں مگر یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں اور نہ ہی موضوع سے ان باتوں کا کچھ تعلق ہے۔ کرنل صاحب ۱۳ جنوری ۱۹۳۶ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔[2]

فقیر محمد چشتی

ان کا مولد "جگراؤں" ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کی تحصیل کے بعد انھوں نے "مدرسہ طبیہ دہلی" میں داخل ہو کر طب پڑھی۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم آپ پر بڑے مہربان تھے۔ ۱۹۰۹ء میں لاہور آکر مطب جاری کیا اور تھوڑے عرصے ہی میں آپ کی حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ غربا اور امرا سب ہی یکساں آپ سے فیض یاب ہوتے رہے۔

سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو گردے کا عارضہ لاحق ہوا۔ ہندوستان کے سربرآوردہ ڈاکٹر آپ کے علاج سے عاجز آگئے تو ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا کہ اب آپ یورپ جا کر علاج کرائیں۔ اس پر سر سکندر شفاء الملک کی خدمت میں بغرض علاج حاضر ہوئے اور ان کے علاج سے بہت جلد شفایاب ہو گئے۔ اس معالجہ نے حکیم صاحب کو بہت زیادہ مشہور و معروف کر دیا۔ غالباً اسی معالجہ کے بعد آپ کو سرکاری طور پر "شفاء الملک" کا خطاب ملا تھا۔

شفاء الملک ایک اعلیٰ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ادیب، خوش نویس اور بلند پایہ مصور بھی تھے ——

پنجاب پراونشل طبی کانفرنس کا اجلاس اوّل جو ۱۹۲۶ء میں برکت علی ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا اس میں شفاء الملک مرحوم کی بنائی ہوئی جالینوس کی تصویر آویزاں تھی جس کو اہلِ ذوق حضرات نے بہت زیادہ پسند کیا۔ فنِ کتابت میں آپ کے کمال کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ لاہور کے مشہور خوش نویس جناب منشی عبدالمجید پرویں رقم مرحوم جو اپنے فن میں اجتہاد و امامت کا درجہ رکھتے تھے حکیم صاحب سے ہمیشہ مشورے لیتے رہے اور اکثر فرماتے تھے کہ میری لکھائی میں خیال حکیم صاحب کا اور قلم میرا ہوتا ہے۔

حکیم صاحب بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ دوستوں پر جان فدا کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری نہیں کی مگر اس کی پوری

---

[1] حیات کانفرنس مطبوعہ لاہور ص ۱۷۱ [2] الحکیم مارچ ۱۹۳۶ء

صلاحیت رکھتے تھے۔ غرضیکہ قدرت نے بے شمار خوبیاں آپ کو ودیعت کی تھیں۔ بے اولاد تھے اس لیے اپنا رہائشی مکان "شفاءمنزل" طبیہ کالج دہلی کے نام وقف کر دیا تھا۔ طبِ یونانی کا یہ آفتاب ۲۶ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کو غروب ہو گیا۔ وقتِ رحلت آپ کی عمر ۶۷ برس کی تھی۔ قبرستان مہاوٹی میں مدفون ہوئے۔

احمد دین (موجد طبِ جدید) آپ نے مختلف اساتذہ فن سے طبی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، مسمرازم، ہپناٹزم اور نیچروپیتھی کی کتابوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام مروج طریقِ علاج نامکمل اور ناقص ہیں۔ چنانچہ آپ نے تمام طبّوں میں سے اپنے خیال کے مطابق اچھائیاں لے کر ایک نئے طریقِ علاج کی بنیاد رکھی جس کو "طبِ جدید" کے نام سے موسوم کیا۔ آپ نے ان خیالات کی اشاعت کے لیے انجمن خادم الحکمت شاہدرہ لاہور قائم کی۔ "نبعوالتجا" نامی رسالہ جاری کیا جس کے ایڈیٹر مختلف زمانوں میں مختلف لوگ رہے لیکن نگرانی حکیم صاحب کی رہی۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "طبِ جدید" اور "استاذ الاطباء" بھی آپ نے نکالے اور مختلف طبی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "کلیاتِ طبِ جدید" مشہور ہے۔ شاہدرہ میں طبِ جدید کی تعلیم کے لیے ایک درسگاہ بھی قائم کی۔ حکیم صاحب اپریل ۱۸۶۸ء میں بمقام شاہدرہ پیدا ہوئے تھے اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو راہگیرے ملکِ بقا ہوئے۔

محمد افضل ۱۸۸۴ء میں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے۔ لاہور آ کر تعلیم حاصل کی۔ منشی فاضل، ادیب فاضل، بی۔ اے اور زبدۃ الحکما کے امتحانات پاس کیے۔ ہومیوپیتھی کے بھی اچھے ماہر تھے۔ مفتی سلیم اللہ خاں سے طب پڑھی تھی۔ عملی طبابت سے زیادہ سیاسیاتِ طب کے ماہر تھے۔ مدتوں پنجاب طبی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری رہے۔ صاحبِ تصانیف تھے۔ "حیات کانفرنس" اور "قانونِ علاج" و دیگر کئی کتب تالیف کیں۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے۔

محمد زکریا آپ ضلع مظفر نگر یو۔ پی کے رہنے والے تھے، تعلیم دہلی میں پائی۔ ریاست بھوپال میں طبیب رہے۔ ۱۹۲۳ء میں لاہور آ کر "طبیہ کالج لاہور" میں پروفیسر ہو گئے۔ نبض و قارورہ دیکھنے کی خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں "تشریح النبض" اور "تشریح البول" کے نام سے مفصل کتابیں بھی تصنیف کیں۔ شروع ۱۹۴۷ء میں رہگیرے ملکِ بقا ہوئے۔

شہزادہ غلام محمد ان کے والدِ ماجد حکیم شہزادہ سلطان محمود پشاور کے جاگیردار تھے۔ ان کا سلسلہ نسب احمد شاہ ابدالی سے ملتا ہے۔ حکیم غلام محمد صاحب پشاور میں پیدا ہوئے۔ طب اپنے والد اور حکیم عبدالمجید دہلوی مرحوم و مغفور سے پڑھی۔ پھر دھولے والا (سچے پور) ڈیرہ غازیخاں اور پشاور میں مدت تک مطب کیا۔ ۱۹۰۵ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو سرگودھے میں بھیج دیا۔ تو سرگودھے میں رہنے لگے۔ مہاراجہ کشمیر آپ کی حذاقت سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ علاوہ ان کے اور کئی ریاستوں کے والی بھی آپ سے علاج معالجہ کراتے رہتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں لاہور چلے آئے اور یہاں مصری شاہ میں مطب جاری کیا۔ موسم گرما کشمیر میں گزارتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کا قیام کشمیر ہی میں تھا اور ایک عرصہ تک وہیں رُکے رہے۔ جب مقبوضہ کشمیر پر قبائلیوں نے حملہ کیا اس وقت سرینگر سے بدقت نکل کر پشاور چلے گئے اور وہیں فروکش رہے۔ آپ ۱۹۵۵ء میں راہگیرِ ملکِ بقا ہوئے اور حضرت شاہ محمد غوث لاہوری کے والد حضرت سید حسن بادشاہ پشاوری کے جوار میں سپردِ خاک کیے گئے۔

شہزادہ صاحب کے نبیرہ حکیم سید احمد حسن شاہ آپ کے مطب واقع مصری شاہ میں طبابت کر رہے ہیں جو حضرت شاہ محمد غوث کی اولاد میں سے ہیں۔

فقیر محمد چشتی امرتسری

آپ بلند پایہ طبیب اور شب زندہ دار عابد و زاہد بزرگ تھے، راقم الحروف کے والد ماجد تھے مولد و منشا آپ کا امرت سر تھا۔ فارسی و عربی کی تحصیل کے بعد حصولِ طب کی طرف متوجہ ہوئے تو ابتدائی طبی کتابیں گھر میں ہی پڑھیں۔ پھر حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری ثم امرتسری تلمیذ حکیم امام الدین پاکپتنی اور مولانا حکیم حیدر علی صاحب بجنوری سے طب کی بلند پایہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا علامہ محمد عالم آسی امرت سری سے بھی مستفید ہوئے۔ ہندی بھی باقاعدہ پڑھی تھی۔

طریقت میں حضرت الحاج میاں علی محمد صاحب چشتی نظامی ہوشیارپوری مدظلہ سے بیعت تھے۔ آپ نے ۱۹۰۰ء میں امرت سر میں مطب شروع کیا تھا جو ہمیشہ مرجع انام رہا اور تمام زندگی دنیا کی نعمتوں سے سرفراز رہے۔ تقسیم ہندوپاک پر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ آپ کے مجربات و افاداتِ عالیہ "مجربات فخر الاطبا" کے نام سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ آپ کے حالاتِ زندگی کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کتابچہ کے شروع میں مسطور ہیں جو آپ کے شاگرد مولانا حکیم معین الدین کے مرقومہ ہیں۔ فخر الاطبا حکیم فقیر محمدؒ ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۱ھ بعمر ۸۶ سال اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں مدفون ہوئے۔ قبر پختہ ہے۔ لوحِ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس کا تاریخی شعر یہ ہے ؎

تاریخِ رحلتش بہ دل نامی حسنیں
"فوت طبیب اندر شب معراج" آمدہ

۱ ۷ ـ ۱۳

مولانا سلطان محمدؒ

آپ شیخ نور الدین صدیقی کے فرزند تھے۔ تحصیلِ علوم کے بعد آپ نے پرنٹنگ کا کام سیکھا اور ایک پریس میں ملازمت کر لی، پھر اسی سلسلے میں نوشہرہ چھاؤنی چلے گئے تو یہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر آپ کا دل نہایت رنجیدہ ہوا اور اسی وقت سے انگریز کے خلاف جذبۂ نفرت آپ کے دل میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے ملازمت ترک کر کے اپنا پریس لگایا اور اس میں جعلی نوٹ بھی بنانے شروع کیے۔ اس آمدنی سے مسلمانوں کی بے حد مالی امداد کی اور کئی مدرسے قائم کیے۔ آزاد قبائل کی وہ جماعت جو حکومت کے خلاف نبرد آزما تھی اس کی نقدی اور راشن کی صورت میں امداد کرتے رہے۔ اس کے راوی خود امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہیؒ ہے۔ مولانا سلطان محمد صاحب انگریز کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر ایسا کرنا جائز سمجھتے تھے۔ آپ نے لاہور کے اکثر مسلمانوں کو دوکانیں کرائیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کئی عالیشان فرمیں آج بھی ایسی چل رہی ہیں جن کا قیام حکیم صاحب کی اعانت سے ہوا تھا۔ آخر ایک مستقل امداد حاصل کرنے والے کی مخبری سے حکومت نے گرفتار کر لیا اور جرم ثابت ہونے پر چودہ سال کی سزا ہوئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا نے جعلی نوٹوں میں سے اپنی ذات پر کبھی ایک پائی تک خرچ نہیں کی تھی۔ نوشہرہ سے واپس آ کر آپ نے لاہور میں مطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ گرفتار بھی لاہور سے ہوئے تھے۔ شیرانوالہ گیٹ میں آپ کا مطب تھا۔ حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں خطبہ جمعہ دیتے تھے۔ اچھے طبیب اور بے باک خطیب تھے۔ صوفیا سے آپ کا تعلق ہمیشہ رہا۔ حضرت سلطان نور احمد سجادہ نشین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ "نماز سلطانی" اور "احکام اسلام" آپ کی تصانیف ہیں۔ "مدرسہ تعلیم الاسلام" نوشہرہ اور "مدرسۃ القرآن جامعہ قادریہ سلطانیہ" واقع ہربنس پورہ لاہور آپ نے قائم کیے تھے جو تا حال تعلیمی و دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ قریباً ۸۰ برس کی عمر میں ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء مطابق ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۱ھ کو آپ نے جان جانِ آفریں کے حوالے کی

اور حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ مزار کے اندر مدفون ہوئے۔

محمد حسین مرہم عیسیٰ قریباً ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا رحیم اللہ سے قرآن پڑھا۔ طب حکیم ضیاء الدین، حکیم مفتی سلیم اللہ خاں حکیم نورالدین بھیروی سے پڑھی۔ حکیم صاحب بڑے عالم و فاضل تھے۔ مذہباً نہ صرف احمدی بلکہ مبلغ تھے اور اس سلسلے میں مناظرے بھی کیا کرتے تھے۔ بیرون دہلی گیٹ لنڈا بازار میں آپ کا رہائشی مکان اور مطب تھا۔ رسالہ "حکیم حاذق" ایک نکالتے رہے۔ آپ کے مجربات "طبی ماتہ عامل" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ آپ قریباً ۶۵ سال کی عمر میں ۲۸ ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو فوت مرہم عیسیٰ کے نام سے اس لیے مشہور تھے کہ طبی کتابوں میں جس "مرہم عیسیٰ" کا نسخہ مسطور ہے اسے بنا کر فروخت کرتے تھے اور اس کا یہ نام مرہم حضرت مسیح کے زخموں کے لیے بنایا گیا تھا۔

ٹھاکر دت ملتانی یہ لاہور کے مشہور وید تھے۔ شاہدرہ میں ان کی بہت سی زمین تھی جس میں جڑی بوٹیاں کاشت کراتے تھے ملک میں ان کو سپلائی کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ انھوں نے دہلی پہنچ کر کناٹ پلیس میں "ملتانی آیور ویدک فارمیسی" دوبارہ قائم کی تھی جو تا حال موجود ہے۔

ابوالمعالی تاج الدین تاج عرفانی آپ کے والد کا نام ملا محمد بخش تھا جو بالکل ان پڑھ ہونے کے باوجود اخبار نکالتے رہے۔ ملا صاحب نے لاہور میں تاج الہند پریس قائم کیا۔ ہفتہ وار اور اخبار "ہنٹر" جاری کیے۔ ملا محمد بخش متوفی ۱۹۲۳ء کے والد محمد عبداللہ پال کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

حکیم تاج صاحب ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ بڑے اعلیٰ شاعر اور بلند پایہ اخبار نویس تھے۔ "ہنٹر" کے ایڈیٹر رہے، یہی شعر کہتے تھے[1]۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری سے آپ بیعت تھے۔ طبابت کے علاوہ کئی طبی رسائل کو بھی ایڈٹ کرتے مزاج کے بڑے تشدد تھے، علامہ اقبالؒ کی شاعری اور مولانا ظفر علی کے عقائد ہمیشہ تاج صاحب کے ہدف تنقید رہے۔ مومن خاں کے بے حد مداح تھے۔ ان کے تتبع میں بہت غزلیں لکھیں۔ مزاج کی تیزی اور گوناگوں مصروفیات کے باعث آپ فنِ طب کی کوئی خاص خدمت نہ دے سکے۔ جناب فدا حسین فدا آپ کے شاعری میں شاگرد ہیں۔ تاج صاحب ۱۳ ر مئی ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۸ھ کو فوت ہوئے۔

نوازش علی شاہ بخاری یہ چونیاں ضلع لاہور میں پیدا ہوئے، والد کا نام ناصر علی شاہ تھا۔ بغرض حصولِ تعلیم لاہور آئے اور یہیں ہو کر رہ گئے۔ حکیم حاذق اور زبدۃ الحکما تھے۔ مفتی سلیم اللہ خانؒ سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ ۱۹۵۹ء کو قریباً ۶۶ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ چونہ منڈی لاہور میں آپ کا مطب تھا۔ بڑے لائق معالج تھے۔

شیخ فضل حق آپ بٹالہ میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آپ نے مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد حکیم نورالدین صاحب بھیروی ثم قادیانی سے پڑھی اور بٹالہ ہی میں مطب شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے آئے یہاں مزنگ روڈ پر مطب جاری کیا۔ حکیم صاحب قریباً ستر سال کی عمر میں ۱۹۵۸ء میں فوت ہوئے اور حسبِ وصیت ربوہ میں دفن کیے گئے آپ کے لڑکے شیخ افتخار الحق بار ایٹ لاء ہیں۔ حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ ظفر الحق اے' ڈی' ایم تھے جو ۱۹۵۹ء میں فوت ہوئے۔

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر ص ۴۸۴

حکیم فضل حق کے شاگردِ خاص حکیم مفتی سردار احمد بٹالوی قادری آرام گلی (رام گلی) میں مطب کر رہے ہیں۔ یہ بڑے نیک صفت انسان ہیں۔ مفتی صاحب کے خاندان میں کئی پشت سے طبابت چلی آ رہی ہے۔

عبدالقادر دہلوی

یہ حکیم نابینا مرحوم کے فرزند تھے۔ تعلیم کا بیشتر حصہ اپنے والد مرحوم سے حاصل کیا۔ کچھ دن بنارس میں مطب کیا، پھر پٹیالہ میں چند ماہ طبیب ریاست رہے۔ وہاں سے غالباً ۱۹۲۹ء میں لاہور چلے آئے اور نیلا گنبد میں مطب کا آغاز کیا۔ آپ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، غربا کو دوائیں مفت دیتے اور اُمرا سے بھاری رقمیں وصول کرتے مثلاً غریب کو جو دوا بلا قیمت دیتے امیر سے اسی کے سو روپے لیتے تھے۔ تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کو آپ نے انتقال کیا۔

حافظ جلیل احمد انصاری

آپ ۱۹۰۱ء میں بمقام قصبہ "بھوکرہیڑی" ضلع مظفر گڑھ (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی پھر دارالعلوم دیوبند، طبیہ کالج دہلی اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے علومِ دینیہ اور طبِ یونانی کی تکمیل کی۔ شفاء الملک حکیم عبدالمجید مرحوم سے خاص طور پر مستفید ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے وائس پرنسپل ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں آپ لاہور چلے آئے اور یہاں طبیہ کالج انجمن حمایتِ اسلام میں شیخ المعالجات مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں اسی کالج کے وائس پرنسپل اور ۱۹۴۹ء میں پرنسپل ہو گئے۔ آپ کو طبی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے حفظ ہو چکی تھیں۔ شعر و ادب سے آپ کو بڑی مناسبت تھی۔ شاعری میں بیخود دہلوی سے شرفِ تلمذ تھا۔ کئی قابلِ قدر طبی تصانیف آپ نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ بہترین مدرس، بلند پایہ معالج اور اعلیٰ درجے کے مصنف ہونے کے علاوہ نہایت حلیم و خلیق تھے۔ ۵ اگست ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ بروز جمعہ جاں بحق ہوئے۔[1]

عبدالمجید سیفی

آپ سدا کبوہ متصل بھیرہ ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ طب حکیم مولوی عبدالرسول صاحب بھکروی سے پڑھی۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ خانقاہ سراجیہ کندیاں ضلع میانوالی کے خلیفہ تھے۔ سیفی صاحب نے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی کئی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کرائیں۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو بلاکوں سے چھپوانے کے لیے ان کی کتابت کروا رہے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا اور یہ عظیم کام غالباً ہمیشہ کے لیے ہی معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ آپ نے ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور راقم نے "سیفی شد در بہشت" تاریخ کہی۔

محمد شریف

یہ لاہور کے ایک پرانے طبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی جوانی میں ایک کامیاب قانون دان تھے۔ طب کی طرف طبعی رجحان کی وجہ سے آپ نے وکالت کو ترک کر کے طبابت کو اپنا لیا تھا۔ حکیم فیروز الدین ایڈیٹر الحکیم کی رحلت کے بعد "الحکیم" کی ادارت کے فرائض کئی سال تک آپ ہی سر انجام دیتے رہے۔ پھر "الطبیب" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو ایک عرصہ تک بڑی کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ طب کی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "مصباح الحکمت" بڑی جامع ہے۔ آپ کو طب کے علمی حصے پر بہت زیادہ عبور تھا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ راقم نے "شریف فوت شد" تاریخ کہی۔ آپ کے فرزند
۱۳۸۰ھ
حکیم محمد انور صابری آپ کے جانشین ہیں۔

---

[1] مجلہ طبیہ لاہور جبلی نمبر اگست ۱۹۶۰ء

نوازش علی شاہ موسوی ولد سید بہادر شاہ موسوی لاہور کے بڑے بارسوخ آدمی تھے۔ ایک مدت تک میونسپل کمشنر رہے۔ حکیم سید عنایت شاہ طبیب مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کے نانا تھے۔ آپ ہی نے حکیم عنایت شاہ کے مزار پر کتبہ نصب کرایا تھا۔ بازار چمیاراں میں اپنے نانا والے مکان میں رہتے تھے۔ مذہباً اثنا عشری تھے۔ ۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو فوت ہوئے۔

شیخ محمد مودود ان کا آبائی وطن "سجان پور" ہے جو ضلع گورداسپور میں واقع ہے مگر پیدا لکھنؤ میں ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۲۴ء میں طبیہ کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے مگر یہاں صرف چند ماہ زیر تعلیم رہ کر طبیہ کالج دہلی میں منتقل ہو گئے اور وہیں سے تکمیل فن کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور آ کر مطب جاری کیا جو کامیاب رہا۔ حکیم صاحب ابتدائی زندگی میں بڑے رنگین طبع و شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے مگر جلد ہی ان کی طبیعت کا رخ تصوف کی طرف ہو گیا جس کی وجہ سے دنیا سے جاتے وقت آپ نہ صرف طبیب بلکہ صوفی بھی تھے۔ بوقت رحلت ان کی عمر قریباً ۵۴ برس تھی ـــــ ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء مطابق ۱۳۸۰ھ کو جان جاں آفریں کے حوالے کی۔

مولانا غلام محمد ترنم امرتسر کے ایک غریب کشمیری گھرانے میں قریباً ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ طغرائی مرحوم، مفتی عبد الصمد کشمیری اور مولانا محمد عالم آسی سے تحصیل علوم کی۔ مولانا ترنم بہت اعلیٰ خطیب اور اچھے طبیب تھے۔ امرتسر میں ان کا بڑا اثر تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا ؎

ترنم چاند ہے اس شہر میں علم اور حکمت کا
درخشاں اس کے دم سے ہیں مسلمانانِ امرتسر

تقسیم ہند و پاک پر آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں سول سیکرٹریٹ کی مسجد کے خطیب تھے۔ امرت دھارا بلڈنگ میں آپ کا مطب تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ جمعیت العلماء پاکستان کے نائب صدر اور آل پاکستان آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے روح رواں تھے۔ ۱۷ محرم ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۵۹ء فوت ہوئے۔ راقم نے آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخیں "فاضل حکمت" اور "ترنم داخل خلد"
۱۳۷۹ھ ۱۹۵۹ء
کہیں۔ حضرت ترنم کی آخری آرام گاہ گورستان میانی بہاولپور روڈ کے کنارے واقع ہے۔

(۴) موجودہ عہد کے زندہ اطباء

اس حصے میں لاہور کے ان اطبائے نامدار کا ذکر جمیل ہے جو لاہور یا اس سے باہر زندہ و موجود ہیں۔ چونکہ یہ باب تاریخ سے زیادہ تذکرہ ہے اس لیے ان حضرات کے ناموں کو حروف تہجی کے لحاظ سے درج کیا ہے اور یہاں اوپر والی ترتیب قائم بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

اعظم علی خاں آپ حکیم آغا علی خاں مرحوم کے فرزند، ۱۹۰۲ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے، ۱۹۲۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم حاذق کے امتحان میں اوّل آئے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد آپ کو پولیٹیکل پنشن مل رہی ہے۔ مطب آپ کا مشہور ہے۔ حکیم صاحب کے اعزہ و اقربا آپ کو اب بھی "نواب صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں مگر آپ اتنے سادہ مزاج ہیں کہ اپنے نام کے ساتھ "خاں" لکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اندرون موچی گیٹ بالمقابل حویلی میاں خاں آپ کا مطب ہے۔

ٹھاکر دت شرما

یہ ۱۸۸۲ء میں بمقام موضع فتح وال ضلع امرتسر پیدا ہوئے۔ ڈی۔اے۔وی کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اساتذہ سے ویدک پڑھی۔ بڑے ذہین تھے، بہت جلد کامیابی کی منازل طے کر کے آسمانِ شہرت پر پہنچ گئے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک طبی ہفتہ وار اخبار نکالا جس کا نام "ویش اپکارک" تھا۔ یہ عرصہ دراز تک نکلتا رہا۔ "امرت دھارا" بنا کر اس سے لاکھوں روپے کمائے۔ امرت دھارا بلڈنگ، ریلوے روڈ، امرت پریس لاہور میں آپ کی یادگاریں ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی انگریزی اور ہندی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان تراجم و تالیفات کی تعداد قریباً اسّی ہے۔ یورپ کی سیاحت کے لیے بھی گئے تھے واپسی پر اس سفر کے حالات بنام "سیرِ یورپ" دو حصوں میں شائع کیے۔ تقسیم ہند پر پنڈت جی اپنی لاکھوں روپے کی جائداد اور بیش قیمت دواخانہ بصد حسرت و یاس چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔ آج کل "ڈیرہ دون" میں صاحبِ فراش ہیں۔ راقم کو آپ کے صاحبزادے کا خط ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ ممکن ہے اس مضمون کے شائع ہونے کے وقت آنجہانی ہو چکے ہوں۔ حالت ایسی ہی نازک تھی۔ ان کے صاحبزادے نے لکھا تھا کہ "پتا جی نہ بول سکتے ہیں، نہ ہل جل سکتے ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں۔"

حبیب اشعر

نام حبیب احمد اور اشعر تخلص ہے۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ خاندانِ شریفی سے تعلق رکھتے ہیں تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ یہاں شاہی محلہ میں مقیم ہیں اور ان کا "حاذق دواخانہ" بھی یہیں ہے۔ عربی کے بہت اچھے مترجم ہیں۔ آپ کے تراجم بڑے مقبول ہیں۔ گزشتہ سال سے آپ کی ادارت میں ایک طبی رسالہ نکل رہا ہے جس کا نام "حاذق" ہے۔ تصنیف و تالیف کی طرف آپ کی طبیعت کا میلان بہت زیادہ ہے اس لیے طبیب سے زیادہ ادیب مانے جاتے ہیں۔

کویراج خزان چند بی۔اے

آپ یکم اپریل ۱۹۰۶ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ملازمت کو خیر آباد کہہ کر دیانند آیورویدک کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو سال زیرِ تعلیم رہ کر کویراج کا ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ نیز آپ کی قابلیت کے پیشِ نظر ڈی۔اے۔وی کالج کی مینجنگ کمیٹی نے آپ کو طلائی تمغا بھی عطا کیا۔

کویراج خزان چند ماہرِ جنسیات تھے۔ آپ نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ آپ جنسی امراض کی تشخیص میں پوری مہارت رکھتے تھے۔[1]

خورشید حسن خورشید

آپ کے والد کا نام مولوی محمد صدیق تھا۔ سلسلہ نسب آپ کا حضرت سید قیس ساڈھوروی سے ملتا ہے جو پیرانِ ساڈھورا کے نام سے مشہور رہیں۔ حکیم خورشید صاحب قریباً ۱۲۹۰ھ میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پھر کئی ریاستوں میں بطور طبیب ملازم رہنے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں بہت سے علمی کارنامے انجام دیے رفیق الاطباء کے سب ایڈیٹر رہے۔ ماہنامہ "مصباح الحکمت" جاری کیا اور اس دنیا میں یونانی طب کی سب سے پہلی کتاب "فصول بقراط" کا منظوم ترجمہ و شرح کی جو قابلِ قدر طبی کارنامہ ہے۔

حکیم صاحب اس وقت الکاسب میں مقیم ہیں۔

---

[1] دی پنجاب ہوراز ہو (انگریزی) صفحہ ۱۵۲

آغا دوست محمد خاں

آپ شہر "چودھواں" ضلع ڈیرہ غازیخاں میں ۲۷ رمضان ۱۳۲۸ھ کو پیدا ہوئے۔ طبی تعلیم تکمیل الطب کالج "لکھنؤ" سے حاصل کی۔ اچھے طبیب اور باعزت شہری ہیں۔ مطب آپ کا مرجع انام ہے۔

دینا ناتھ کوہلی

آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے، طب یونانی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں بمقام موضع "بٹالہ" ضلع امرتسر مطب کا آغاز کیا اور ۱۹۲۸ء میں لاہور چلے آئے۔ یہاں چیمبرلین روڈ پر آپ کا دواخانہ اور مطب تھا۔ آپ نے کئی طبی کتابیں تالیف کیں[1]۔ کوہلی صاحب قابلِ رشک صحت کے مالک تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت منتقل ہو گئے۔

پنڈت رام گوپال شاستری

آپ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں سنسکرت کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور ۱۹۱۵ء میں ڈی۔ اے۔ وی سکول لاہور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں ملازمت چھوڑ کر "کانگریس" میں شامل ہو گئے۔ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آیورویدک کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔

جیل سے آزاد ہونے کے بعد مطب شروع کیا اور نیز کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کرشن نیتی، بدھ ویدک، چھترپتی، سیواجی، ستیا اور اہنسا اور وید ماتی آیوروید (AED MAI AYUR VED) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں آیورویدک کے ممتحن اور آل انڈیا آیورویدک کانفرنس کے بھی ممتحن تھے[2]۔

"ویدرتن" پنڈت شو شرما آیورویدک اچاریہ

یہ لاہور کے بڑے نامی گرامی وید تھے، مطب ان کا ریلوے روڈ پر تھا۔ بی۔ اے تھے اور "ویدرتن" کا امتحان بھی پاس کیے ہوئے تھے۔ ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھولا ہوا تھا۔ آل انڈیا آیورویدک منڈل کے صدر رہے۔ اب بہارستان بومن جی روڈ کیپا لاہل بمبئی میں مطب کر رہے ہیں۔

عبدالمجید عتیقی

عتیقی صاحب ۱۹۰۱ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اُردو، انگریزی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے طب حکیم مفتی سلیم اللہ خاں اور مولوی حکیم محمد ابراہیم جالندھری ثم امرتسری سے پڑھی۔ شاعری میں حضرت بیدل شاہجہانپوری سے شرف تلمذ ہے۔ ذہانت و فطانت کے مجسمہ ہیں، زمانے کی مختلف سیاسی و غیر سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ آٹھ مرتبہ قید و بند کے مصائب برداشت کیے، زندگی کا بہترین حصہ جیل یا ریل میں گزارا۔ سیاسی، فنی، ادبی اور اصلاحی تحریکات میں صفِ اول میں آپ کا نام رہا۔ ایک عرصہ تک ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی لاہور کے صدر رہے۔ عین عالم شباب میں بینائی سے محروم ہو گئے مگر آپ کی فعال زندگی میں کسی قسم کا فرق نہ پڑا۔ مطب اور دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا، چھوٹی بڑی ساٹھ کے قریب آپ کی تصانیف ہیں، جن میں سے "جامع العقائد" اور "ارکان احرار" مشہور و مقبول ہیں اور یہ ضیاع بصارت کے بعد کی تصنیف کردہ ہیں۔ اس وقت فنِ طب کے بقا اور تحفظ کے لیے کوشاں ہیں۔ پاکستان طبی کانفرنس جو ملک کی سب سے مقتدر طبی جماعت ہے، اس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ آپ نے اپنی ذاتی لائبریری کی کئی ہزار کتابیں "یونیورسٹی لائبریری لاہور" کو دے دی ہیں جہاں "عتیقی سیکشن" علیحدہ ہے۔ حکیم عبدالعزیز کامل مرحوم عتیقی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔

---

[1] دی پنجاب ہو از ہو انگریزی صفحہ ۱۴۲ [2] دی پنجاب ہو از ہو (انگریزی) صفحہ ۱۴۲

عبدالوہاب عمر

آپ مولوی حکیم نورالدین صاحب بھیروی کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۰۸ء کو بمقام قادیان ضلع گورداسپور پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی پھر طبیہ کالج دہلی سے طب کی تحصیل کی۔ آپ کا دواخانہ و مطب قادیاں میں تھا۔ تقسیم ہند و پاک پر لاہور چلے آئے۔ آپ کی اہلیہ امتہ اللطیف صاحبہ بھی طبیہ کالج دہلی کی فارغ التحصیل ہیں اور باقاعدہ مطب کرتی ہیں۔ حکیم صاحب نے قادیاں سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس کا نام "شمع نور" تھا۔ لاہور آ کر بھی یہ رسالہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ رتن باغ کے سامنے جودھامل بلڈنگ میں مطب کرتے ہیں اور "دواخانہ نورالدین" کے مالک ہیں۔

چودھری عبداللطیف شادائی

آپ ۲۶ جنوری ۱۹۱۰ء کو بمقام دسوہہ ضلع ہوشیارپور پیدا ہوئے۔ آپ کی عام تعلیم بی۔ اے تک ہے اور طب کی تحصیل طبیہ کالج دہلی سے کی اور مطب دسوہہ میں شروع کیا۔ تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ یہاں مطب آپ کا کامیاب ہے۔ مغربی پاکستان یونانی طبی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

قاضی عظیم اللہ

آپ مئی ۱۹۰۱ء میں شیخ احمد صاحب کے ہاں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں طبیہ کالج دہلی سے کامل الطب و الجراحت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور آ کر طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام مسلمہ و معاونہ حکومت پاکستان کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور تا حال اسی کالج سے منسلک ہیں۔ آپ کئی طبی اور غیر طبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے لاہور سے "ہیلتھ میسج" نامی رسالہ بھی نکالا تھا۔[1]

سیّد علی احمد نیّر واسطی

نام علی احمد اور تخلص نیّر ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یو۔ پی کے ایک قصبہ "نہٹور" ضلع بجنور کے واسطی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد مظفر حسین نگینہ ضلع بجنور کے ممتاز وکیل تھے۔ نیّر صاحب نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولانا امتیاز حسین اور مولانا حامد حسن گنگوہی سے کی۔ ازاں بعد دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے بھی مستفید ہوئے۔

شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ بارہ سال کے تھے کہ شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں سیّد نقی حیدر سے استفادہ کیا اس کے بعد دہلی پہنچ کر نواب سراج الدین سائل، مولانا وحید الدین بیخود اور مولانا ناصر الدین فراق سے مستفید و مستفیض ہوئے۔

حکیم صاحب ۱۹۲۴ء میں لاہور آئے اور یہاں مطب کا آغاز کیا جو بہت جلد مرجع عوام بن گیا۔ طبیہ کالج لاہور میں پروفیسر بھی رہے۔ آپ کی علمی زندگی کا اصل موضوع تاریخِ طب ہے اور اس سلسلے کی کئی زبانوں کی کتابیں آپ کے مطالعہ سے گزر چکی ہیں۔ طب اور تاریخ طب کے مطالعہ کے لیے آپ نے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے اکثر ملکوں کا دورہ بھی کیا۔

استنبول یونیورسٹی کے ادارہ تاریخ طب نے آپ کو ادارہ کا اعزازی ممبر منتخب کیا اور پروفیسر آف ہسٹری آف میڈیسن کے اعزاز کا ڈپلوما مرحمت فرمایا۔ اپریل ۱۹۵۹ء کے پہلے ہفتے میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ترکی زبان کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۶۰ء میں "جمعیت اخوان پاکستان و ترکیہ" کے صدر منتخب ہوئے اور اسی سال سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو یوم جمہوریہ پاکستان کی تقریب پر حکومت پاکستان نے آپ کی طبی خدمات کے پیش نظر "ستارۂ خدمت" کا اعزاز عطا کیا۔ اسی سال آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا ——— نیّر صاحب نے نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً "میکدہ" آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ "اختر و سلمیٰ" اس میں اختر شیرانی کی حیات و معاشقہ ہے۔ "شعر و حکمت" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے

---

[1] حیات کانفرنس ص ۳۸۱

"طب العرب" یہ مشہور مستشرق براؤن کی کتاب "عربین میڈیسن" کا اردو ترجمہ ہے اور اس پر آپ کی تشریحات اور تنقیدات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ "ترکی نظامِ طب کی تاریخ" ایک ترکی کتاب کا ترجمہ ہے۔ نہایت بااخلاق، علم دوست اور خوش مزاج بزرگ ہیں۔

"امامِ طب" فرید احمد عباسی

بن مولانا سید محمد عباسی وکیل، سادات بنی عباس سے ہیں۔ آپ ۱۲ رشوال ۱۳۰۹ھ کو بمقام امروہہ پیدا ہوئے۔ فنِ طب میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں خلد آشیاں دہلوی کے شاگردِ رشید ہیں اور جناب حکیم واصل خاں و مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے مستفید ہوئے۔ علمِ طب کے علاوہ دینیات کے بھی ماہر ہیں۔ آپ عرصہ تک نواب صاحب بھیکم پور کے پاس معالجِ خصوصی کی حیثیت سے رہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب کے ایما پر نواب صاحب کی ملازمت چھوڑ کر طبیہ کالج دہلی میں معالجات کے پروفیسر لگ گئے۔ پھر وائس پرنسپل کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔

آپ بڑے اعلیٰ مضمون نگار اور بلند پایہ مصنف ہیں۔ ایک زمانہ تک آپ کے قیمتی طبی مضامین "مجلہ طبیہ" دہلی میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے جو بے حد مقبول ہوئے اور "سیرۃ العباس"۔ "سیرۃ آلِ عباس" اور "مدارِ اعظم" جو سید بدیع الزماں قطب مدار کی سوانح عمری ہے آپ کی قابلِ قدر تصانیف ہیں۔ "سیرۃ آلِ عباس" اور "مدارِ اعظم" کی اہمیت کے پیشِ نظر نواب صاحب حیدر آباد دکن نے حکیم صاحب کو ان تصانیف پر پانچ پانچ سو روپے انعام دیے۔

عباسی صاحب ایک عرصہ تک حضرت حاذق الملک کے زیرِ دستی نسخہ نویسی کرتے رہے اور دہلی میں طبیہ کالج کے فری شفاخانہ کے انچارج بھی رہے۔ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ خالص یونانی طریقِ علاج پر نسخہ نویسی کرتے ہیں اور علاج بالمفردات کے ماہر ہیں۔ کوڑیوں کی دواؤں سے وہ کام لے لیتے ہیں جو دوسرے اطبا سینکڑوں روپے کی دواؤں سے نہیں لے سکتے۔

تقسیمِ ہند پر آپ لاہور چلے آئے۔ اس وقت ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔ اس پیران سالی میں بھی اپنی حذاقت کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ آپ اس وقت عمر، تجربہ اور علم کے لحاظ سے منفرد ہیں، تمام اطبا آپ کا احترام ہے۔ آپ کا تمام خاندان علم و فضل سے بہرہ مند ہے۔ آپ کے صاحبزادے بڑے لائق ہیں۔ محمود احمد عباسی مؤلف "خلافتِ معاویہ و یزید" حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔

زبدۃ الحکماء فضل الٰہی پرنسپل طبیہ کالج لاہور

آپ طبیہ کالج لاہور میں ایک زمانہ سے تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں کالج کے کلینیکل شعبہ میں اسسٹنٹ مقرر ہوئے ۱۹۳۵ء میں پروفیسر ہو گئے اور ۱۹۴۹ء وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حکیم حافظ جلیل احمد انصاری پرنسپل شپ سے مستعفی ہوئے تو ۲ رجنوری ۱۹۵۹ء سے آپ بطور قائم مقام پرنسپل کالج کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور عنقریب آپ کے پرنسپل ہو جانے کی قوی امید ہے۔ اس موقع پر اگر لاہور کے اس واحد طبیہ کالج کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی جائے تو شاید غیر موزوں نہ ہو۔ ۱۸۶۵ء میں لاہور میں انجمن اطبائے پنجاب کے نام سے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد صوبہ پنجاب میں مشرقی علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کرنا تھا اور حکیموں، ویدوں کے علوم میں اضافہ کرنا نیز ان کے حقوق کی نگہداشت اس انجمن کے لائحہ عمل میں شامل تھی۔ اس انجمن کے قریباً دو سو ممبر تھے۔ اس انجمن کی کوششوں سے یونیورسٹی میں حکیموں اور ویدوں کے امتحان ہونے لگے۔ یونانی طب کے امتحان پاس کرنے والوں کو عمدۃ الحکماء اور زبدۃ الحکماء کی سندیں ملتی تھیں۔ وید کے امتحان پاس کرنے والوں کو "بید بیاکرن" اور "ودیا بیاکرن" کے ڈپلومے ملتے تھے۔

۱۸۸۲ء سے پہلے جو اطبا باقاعدہ مطب کر رہے تھے ان کو مناسب ثبوت بہم پہنچانے پر زبدۃ الحکماء کی اعزازی سندیں دی گئی تھیں

چنانچہ ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء میں حکیموں اور ویدوں کی تعداد علی الترتیب ۳۲ اور ۲۰ تھی۔

۱۸۷۵ء میں بیس حکیموں اور ویدوں نے میڈیکل سکول لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم بھی باقاعدہ حاصل کی جن کا امتحان ۱۸۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے لیا تھا۔

۱۸۷۶ء میں یونیورسٹی کی طرف سے طبیہ کلاسز کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں ان کلاسز کو اورینٹل کالج لاہور میں جگہ دی گئی، پھر ان کو میڈیکل سکول میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۸۹۵ء میں میڈیکل سکول میں قلت گنجائش کا عذر پیش کر کے یونیورسٹی نے طبیہ کلاسز کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے اسلامیہ کالج اور دیانند اینگلو ویدک کالج ڈی۔ اے وی کالج لاہور کے سپرد کر کے ان کالجوں سے ملحق کر دیا۔ طبیہ کلاسز کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی ان دونوں کالجوں کو باقاعدہ گرانٹ دیتی رہی ——— مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے ان فنون سے اپنی سرپرستی ختم کرنے کے لیے یہ پہلا قدم اٹھایا تھا ———!

۱۹۲۰ء تک طبیہ کلاسز صرف ایک سپرنٹنڈنٹ کے زیر اہتمام تھیں۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام نے ان کلاسز کی ترقی کے لیے مزید قدم اٹھایا چنانچہ ان کے انتظام کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی بنا دی گئی جس میں انجمن کے معزز ممبروں کے علاوہ پبلک کے مشہور ارباب فن کو بھی شریک کیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن نے اس کو باقاعدہ کالج بنا دیا اور اس کے اسٹاف میں مزید اضافہ کر دیا چنانچہ آج تک اس کالج میں برابر ترقی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس وقت کالج کی شاندار عمارت علیحدہ ہے اس کے طلبہ کی علمی تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ کالج میں میوزیم اور لیبارٹری بھی ہے اور ایک شاندار لائبریری ہے جس میں ہر سال کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

طبیہ کالج لاہور کو حکومت نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ حکومت مغربی پاکستان کالج کو اور لاہور کارپوریشن اس کے یونانی شفاخانے کو سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔ حکومت نے نوٹیفکیشن ۲۷-۱۸۸۲ ۵ مورخہ ۸/۵ ۲۷ کے ذریعے اس کالج کے سند یافتہ اطباء کو ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں میں ملازمت کے حقوق عطا کیے ہوئے ہیں اور اس وقت کالج ہٰذا کی ڈگریوں کے نام حکیم حاذق اور زبدۃ الحکما بموجب گورنمنٹ ایکٹ نمبر ۱۶ ۱۹۰۸ء رجسٹری شدہ ہیں ——— لاہور میں صرف یہی ایک طبیہ کالج ہے جس میں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور صرف اسی کالج کے سند یافتہ ہی مستند طبیب کہلانے کے حق دار ہیں۔

علامہ کبیر الدین

ان کا وطن شیخ پورہ ضلع مونگیر (بہار) ہے۔ قریباً ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر کان پور، لکھنؤ، دہلی اور لاہور کے فضلائے باکمال سے علوم و فنون کی تحصیل کی۔ عربی ادب کی انتہائی کتابیں "مدرسہ نعمانیہ" لاہور میں داخل ہو کر پڑھیں۔ ۱۹۱۴ء میں طبیہ کالج لاہور سے زبدۃ الحکما کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے پاس ترجمہ و تالیف کا کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد یہاں سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مطب کرنے لگے اور "شرح اسباب" کو سلیس اردو کا جامہ پہنا کر شائع کیا جو بے حد مقبول ہوئی، کئی سال لاہور میں رہتے گزر گئے تھے کہ حکیم اجمل خاں دہلوی نے ان کو طبیہ کالج دہلی کے دارالتصنیف میں کام کرنے کے لیے بلا لیا اور کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ علامہ کبیر الدین نے دہلی میں کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں جن کی بدولت ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کرنل بھولاناتھ صاحب نے طب یونانی پر جو اعتراضات کیے تھے علامہ کبیر نے ان کے جوابات پر مشتمل "برہان" نامی

کتاب لکھی جو مُنکت تھی۔ اسی کتاب سے متاثر ہو کر نظامِ دکن نے ان کو آصفیہ طبیہ کالج دکن میں بُلالیا اور آج تک حیدر آباد ہی میں مقیم ہیں۔ حکیم صاحب کا بے مثال کتب خانہ جو قرول باغ دہلی میں تھا، ہندوؤں نے جلا کر راکھ کر دیا۔

صوفی لچھمن پرشاد | یہ ۱۸۸۶ء میں ضلع فیروزپور کے ایک موضع میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام لالہ جوالا پرشاد تھا۔ صوفی صاحب نے ایف، ایس، سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد آیورویدک اور یونانی طب پڑھی۔ اس کے بعد لاہور آ کر مطلب کرنے لگے اور ۱۹۱۲ء میں رسالہ "متانہ جوگی" جاری کیا جو باقاعدگی کے ساتھ لاہور سے ۱۹۴۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ ماہنامہ بڑا مقبول تھا اور اسی کے ذریعے صوفی لچھمن پرشاد نے شہرت عام حاصل کی۔ آپ نے ان ہی بھی متعدد تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں (۱) سائنس کی روشنی میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں (۲) مخزن الجواہرات (۳) مجربات طبِ قدیم و جدید (۴) بھارتی سفرنامے چار جلد۔

آپ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں جنگ پورہ میں مقیم ہیں اور رسالہ "متانہ جوگی" نکال رہے ہیں۔ حال ہی میں فارمیسی بھی قائم کی ہوئی ہے۔

شفاء الملک محمد حسن قرشی | آپ ۱۸۹۶ء میں بمقام گجرات (پنجاب) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں اس وقت کی عظیم درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" میں داخل ہو کر پڑھتے رہے، یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر پنجاب یونیورسٹی سے بھی اسناد حاصل کیں، پھر حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کے امتحانات پاس کیے، طبیہ کالج دہلی سے بھی مستفید ہوئے اور اسی کالج میں پروفیسر رہے۔ ازاں بعد بمبئی چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ مطلب کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں لاہور چلے آئے۔ یہاں مطلب جاری کیا اور طبیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ قرشی صاحب اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے ماہر ہیں۔ آپ کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ ہے۔ وقت کے بلند پایہ اہلِ علم سے آپ کے مراسم رہے جن میں سے علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شفاء الملک علامہ قرشی صاحب نے بہت سی طبی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے "جامع الحکمت" بہت مشہور و مقبول ہے۔ کئی عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ آپ کی طبی خدمات کی بنا پر حکومت برطانیہ نے آپ کو "شفاء الملک" کے خطاب سے ممتاز کیا۔ سیاسیات طب میں آپ کی حیثیت ہمیشہ قائدانہ رہی۔ اس وقت آل پاکستان طبی کانفرنس کے صدر ہیں۔ غرضیکہ آپ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ طبیب، ادیب، خطیب، مصنف اور مفکر ہیں۔ آپ کے صاحبزادے زبدۃ الحکماء آفتاب احمد قرشی بھی بڑے شریف النفس انسان ہیں۔ ماہنامہ "مشیر الاطباء" آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔

قرشی صاحب حج بھی کر آئے ہیں۔ حجازِ مقدس میں آپ شاہ سعود کے مہمان خاص کی حیثیت سے رہے۔ بے شمار خوبیوں کے علاوہ آپ میں ایک خوبی یہ ہے کہ طب یونانی کی ترقی و تحفظ کے لیے دل سے کوشاں رہے ہیں اور آپ کی ان مساعی پر حضرت حکیم اجمل خاں مرحوم علیہ الرحمۃ ہمیشہ مطمئن رہے اور پاکستان کے نوّے فی صد اطباء آپ کو اپنا قائد تسلیم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

محمد نبی جمال سویدا | بن مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں بن مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی، ۱۱ر نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے وقت کے فضلائے باکمال سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ طب، آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ ذہانت و فطانت آپ کا خاندانی ورثہ ہے۔

حکیم صاحب تقسیمِ ہند کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں "دواخانہ حکیم اجمل خاں" امرت دھارا بلڈنگ ریلوے روڈ پر

قائم کیا، جس کی بڑی شہرت ہے مگر خود جمالؔ صاحب دواخانہ اور مطب میں بہت کم تشریف لاتے ہیں۔

آپ شعر و ادب کے دلدادہ ہیں۔ ابتدا میں سویداؔ تخلص کرتے تھے پھر اجملؔ اور جمیلؔ کی مناسبت سے جمالؔ تخلص اختیار کر لیا۔ آپ کے پاس مختلف علوم و فنون کے نادر و نایاب مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔

بابائے نیچرو پیتھی مہر الدین

آپ قریباً ۱۸۸۰ء میں بمقام امرت سر پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد طب یونانی مولانا حکیم مرید احمد خاں امرت سری سے پڑھی۔ علامہ محمد عالم آسی امرت سری اور حکیم طغرائی سے بھی مستفید ہوئے۔ ہومیو پیتھی کے سی ہنیتش ہومیو پیتھک کالج لاہور میں داخل ہو کر پڑھی۔ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر لوئی کوہنی جرمن کی کتابیں دیکھیں تو آپ ان کے نظریۂ علاج کے حامی ہو گئے اور "نیچرو پیتھی" کے اصولوں کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ معالجۂ بیماراں کرنے لگے ——

"لوئی کارنورو" باشندۂ وینس کی تصنیف "ہاؤ ٹو لِو لونگ" جو قریباً آج سے تین سو پچاس سال پہلے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی آپ نے اس کا اُردو ترجمہ کیا جو "درازیٔ عمر کا راز" نام سے شائع ہوا تھا۔

حکیم مہر الدین صاحب تقسیم ملک پر لاہور چلے آئے۔ اس وقت سمن آباد میں مقیم ہیں۔

کویراج ہرنام داس بی۔ اے

تقسیم سے پہلے ان کا مطب بیرون لوہاری گیٹ سرکلر روڈ پر تھا۔ تقسیم کے بعد یہ دہلی چلے گئے۔ بڑے سمجھ دار انسان ہیں۔ ان کی تصانیف ہدایت نامہ خاوند —— ہدایت نامہ بیوی —— اور —— ہدایت نامہ غذا، بڑی مقبول ہیں۔ دہلی پہنچ کر انھوں نے وہاں اپنا مطب دوبارہ جاری کیا جو اب تک چل رہا ہے۔

کتابیات

اس مضمون کی تیاری میں خاص طور پر جن کتابوں اور رسالوں سے مدد ملی وہ یہ ہیں: —

عملِ صالح (شاہجہان نامہ)، مآثر الامرا۔ بادشاہ نامہ۔ تزکِ جہانگیری۔ تذکرۂ قطبیہ۔ خزینۃ الاصفیا۔ گنج تاریخ۔ نزہت الخواطر (عربی) مطبوعہ حیدر آباد (دکن)۔ تاریخ جلیلہ۔ تاریخ لاہور از کنہیا لال۔ تحقیقاتِ چشتی۔ مخزنِ حکمت از مفتی سرور۔ قاموس المشاہیر دو جلد۔ فرہنگ امیر کبیر مطبوعہ ایران۔ سلیم التواریخ۔ مجربات کانفرنس۔ حیات کانفرنس۔ رموز الاطبا۔ اسرار الاطبا۔ رجز فغفوری۔ رئیسانِ پنجاب۔ مآثر لاہور از سید ہاشمی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از سیتا رام کوہلی۔ اطبائے عہد مغلیہ از کوثر چاند پوری۔ رسالہ الحکیم لاہور۔ رسالہ ہمدردِ صحت کراچی۔ مجلہ طبیہ لاہور (بزرگانِ مہو قلمی)

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا۔ میں ان سب کا نہایت درجہ شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علمی کارناموں کو زندگیٔ جاوید بخشے۔ آمین!

اُردو صحافت

(۱۸۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۸۴۹ء میں لاہور انگریزوں کے زیرِ نگیں آیا اور ڈیڑھ برس کے اندر اندر وہ تحریک شروع ہوئی جس نے پنجابی اور فارسی کی بساط اُلٹ دی اور اُردو کو مسند پر لا بٹھایا۔ پنجابی زبان عوامی زبان تھی۔ اسے صحیح معنوں میں شاہی سرپرستی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ سکھوں کے عہد میں یہ رائج رہی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ اسے راج پاٹ حاصل تھا۔ حکمران اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن عالی نسب نہ ہونے کے سبب سے وہ حیثیت حاصل نہ ہوئی جس کی یہ مستحق تھی۔ اسی طرح جیسے امیر لوگ ادنیٰ ذات کی دوشیزہ سے معاشقہ تو فرما لیتے ہیں لیکن اس سے نکاح نہیں کرتے۔ سکھوں کے عہد میں بھی پنجابی زبان صرف زبان تک محدود رہی جہاں قلم آتا پنجابی گوشہ نشین ہو جاتی اور عالی خاندان، عالی نسب فارسی پردھان بن جاتی۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں تمام فرامین فارسی میں لکھے جاتے تھے بلکہ سرکاری وقائع نگار اور اخبار نویس مرکز کو دور دور کے علاقوں کی خبریں مہیا کرنے کی غرض سے جو قلمی اخبارات مرتب کرتے وہ بھی فارسی میں ہوتے تھے۔ انگریز آئے تو انھوں نے پنجابی کو تو اسی پرانے مقام پر لا بٹھایا جہاں وہ صدیوں سے پڑی تھی اور فارسی کو منظم طور پر ختم کر کے اُردو کو سرکاری دفاتر کی رانی بنا دیا۔

برِعظیم پاک و ہند میں اُردو انگریزوں کی سرپرستی میں پھلی پھولی اس لیے نہیں کہ انگریزوں کو اس زبان سے عشق تھا بلکہ اس لیے کہ حکمران طبقہ فارسی کو ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ مسلمانوں کے اقتدار کی بچی کھچی نشانی ختم ہو جائے اور کہیں فارسی انھیں یہ یاد نہ دلائے کہ کبھی حکومت ان کے ہاتھ میں تھی۔ گویا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چونکہ سنسکرت مُردہ تھی اور ہندی بے اثر، اس لیے انگریزوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اُردو کی سرپرستی کریں۔ پہلے فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام اُردو کو فروغ ملا، پھر اسے ہندوستان بھر میں عدالتی زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد آگرہ میں حکومت کی نگرانی میں مختلف موضوعات پر اُردو کتابیں چھاپی گئیں۔ اُردو اخبار نکالے گئے اور جب پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں سے بھی فارسی زبان کو دیس نکالا ملا اور ہر طرف اُردو زبان کا طوطی بولنے لگا۔

لاہور میں اس تحریک کا آغاز "کوہِ نور" سے ہوا جو ۱۸۵۱ء کے آغاز میں نکلا۔ اس اخبار کو منشی ہرسکھ رائے نے جاری کیا جو سکندر آباد (یو۔پی) کے ایک کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انگریزوں کے ممدوح تھے اور انگریز ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے بلکہ الحاقِ پنجاب کے فوراً بعد بجائے اس کے کہ انگریز کسی مقامی شخصیت کو اعتماد میں لیتے اور اخبار جاری کرنے میں اس کی مدد کرتے، انھوں نے سکندر آباد سے منشی ہرسکھ رائے کو بُلا بھیجا۔ انھیں چھاپہ خانہ بنانے میں مالی امداد دی۔ چھپائی کا سارا سرکاری کام ان کے سپرد کیا

اور "کوہ نور" جاری ہوا تو اس کے لیے خریدار بھی دیے۔ "کوہ نور" اُردو میں نکلتا تھا اور اُردو زبان کا بڑا حامی تھا۔ وہ فارسی کے مقابلے پر اُردو کے حق میں وہی دلائل دیا کرتا تھا جو آج ہم انگریزی کے مقابلے پر اُردو کے حق میں دیتے ہیں۔ ۸ راپریل ۱۸۵۶ء کے شمارے میں ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں :۔

> "حتی الامکان اپنی زبان میں اگر تعلیم علوم کی ہووے تو دوسری زبان کی نسبت جلد حاصل ہوتی ہے۔ خیال کیجئے کہ اگر اُردو میں سب علوم کی کتابیں بن جاویں تو وہی علوم جلد تر عوام کو حاصل ہوں گے۔ عربی، فارسی، خواہ سنسکرت والوں کو اس قدر جلد حاصل ہوں گے، کیا معنی؛ پہلے تو زبان ہے۔ سیکھتے سیکھتے اون کے چھ سات برس گزر جائیں گے۔ غرض اس بارہ میں صواب آرائے مہتم کوہ نور بہت درست ہے بلکہ جیسے انگریزوں نے زبان ہائے یونانی و سنسکرت سے اپنی بھاکر میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے ویسے ہی اُردو و فارسی و انگریزی و سنسکرتی والوں کو چاہیے کہ ہر علوم کو ہر ایک زبان سے لے کر اُردو میں ترجمہ کیا کریں۔"

"کوہ نور" میں مقامی خبریں نہایت باقاعدگی سے چھپتی تھیں۔ جرائم کا حال، موسم کی کیفیت، تہواروں اور میلوں کی اطلاعات، اہم عدالتی فیصلے، افسروں کی نقل و حرکت کی خبریں ——— غرض سب کچھ دیا جاتا تھا لیکن خبروں کی تلخیص اس حد تک ہو جاتی تھی کہ قارئین تشنگی ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔ غیر ملکی خبریں بھی چھاپی جاتی تھیں جن میں افغانستان اور ایران کی خبروں کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ خبروں کے حصول کا عام طریقہ اس زمانے کے اُردو، فارسی اور انگریزی اخبارات کے سلسلے میں ایک ہی ڈھب کا تھا۔ خبر رساں ایجنسیاں ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ہر اخبار کے اعزازی نامہ نگار مختلف مقامات پر مقرر تھے جو مختلف قسم کی خبریں بھیج دیا کرتے تھے۔ حکومت بھی بعض خبریں مہیا کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ اخبارات کا عام رواج یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی حاصل کی ہوئی خصوصی خبریں باقاعدہ حوالہ دے کر نقل کر لیتے تھے۔ (بغیر حوالے کے خبروں اور مضامین کو نقل کرنے کی رسم اُردو صحافت کی "ترقی" کے ساتھ ساتھ بڑھی) اس طرح گویا اخبارات کے درمیان خبروں کے رضاکارانہ تبادلے کی رسم قائم تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر اخبار تقریباً تمام ضروری خبریں اپنے قارئین تک پہنچا دیتا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات پرانی خبر چھاپنے سے شرماتے نہیں تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ تمام اہم خبریں ریکارڈ ضرور ہو جائیں۔ یہ امر جدید صحافت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اگر ادارے کی غلطی سے کوئی نہایت اہم خبر درج ہونے سے رہ جائے تو اس سے قارئین کو بالکل ہی محروم کر دیا جاتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی قاری یہ کہہ دے کہ اس اخبار سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"کوہ نور" کے بارے میں یہ صحیح کہا جاتا ہے کہ یہ اخبار سرکارِ دولت مدار کا فرزندِ دلبند تھا اور انگریز کی خوشامد کرتا تھا لیکن کبھی کبھی رسّہ تڑا کے بھاگنے کی سعی بھی کرتا تھا چنانچہ ایسے مواقع آئے کہ اس نے تلخ لہجے میں سرکار کو للکارا۔ مثلاً ایک مرتبہ ضلع کے نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی۔ اخبارات پہ پابندی لگانے کی تحریک چھپی تو "کوہ نور" نے "آزادگیٔ مطابع" کے عنوان سے یہ اداریہ چھاپا:۔

> "اخبار نویسان و وقائع نگاران ملک ہند اور رہنمان اور مالکان مطابع کو واضح ہووے کہ دریں ولا مجلس لیجسلیٹو کونسل ہند میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ ایک قانون ایسا اجرا پاوے

جس سے چھاپہ والوں کو اختیارات چھاپنے پر مضامین کے نہ رہیں اور سرکار کی طرف سے مزاحمت اور مداخلت ہووے۔ پس سب کو لازم ہے کہ یک دل اور یک رائے ہو کر بہ کمال مستعدی پیروی اس امر کی کریں کہ ایسا قانون جاری نہ ہووے ورنہ سب کو ضرر ہے اور پھر اخبار اور چھاپہ کی کچھ ہستی نہ رہے گی مگر قیاس نہیں چاہتا کہ سرکار جس نے یہ اختیارات دیے ہیں بلا وجہ اس میں مداخلت کرے۔"

(۲۹ ر اپریل ۱۸۵۶ء)

اودھ کے الحاق کے بارے میں جتنی خبریں درج کی گئیں ان میں بار بار یہ اشارہ کیا گیا کہ لوگ انگریزوں کے آنے سے ناخوش ہیں۔ ۲۶ ر فروری ۱۸۵۶ء کے شمارے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"اب اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے ناخوش ہیں۔ ہزارہا امیدواران نوکری شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار کو سوائے ملکِ اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیمی ملازمین بجز چند آدمیوں کے، سب برخاست ہو گئے، ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے حقوق کا لحاظ کیا جاوے گا۔ اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے۔ بادشاہ نے جو ہر معاملے میں سرکار کی اطاعت کی یہ بہت اچھی تجویز ہوئی۔ بعضے لوگ اس بات سے ناراض بھی ہوئے اور ایک رئیس یا مفسد نے یہاں تک کیا کہ پوشاک زنانی بھیج کر پیغام دیا کہ تم کو یہ لباس زیب ہے کیونکہ اس طرح سے بلا تکرار ملک میں دخل دے دینا اسی لائق ہے کہ عورت کا لباس پہن کر بیٹھو۔ جب سے ۵۲ رجمنٹ شاہی اور توپ خانہ پیدل شہر میں آیا ہے، باشندگانِ شہر کی نظر میں انگریزوں کی اہانت ہوئی۔ گورہ لوگوں نے بہ حالتِ مستی شراب کے شہر میں جا کر بہت نامعقول حرکات کیں اور جبر کیے۔ بعض لوگوں کو تو حیرت ہے کہ انگریز اور گورہ میں کیا فرق ہے؟"

۱۱ ر مارچ کے شمارے میں یہ خبر دی گئی:-

"ہم بہ افسوس بیان کرتے ہیں کہ اب کے ہفتے میں اس مطبع پر ایک صدمۂ عظیم عائد ہو گیا یعنی منشی ہرسکھ رائے ایڈیٹر کوہ نور کو صاحب ضلع نے تین سال کو قید کر دیا اس سبب اب کی دفعہ اخبار کے پرچے میں توقف پڑا........"

سوال یہ ہے کہ منشی ہرسکھ رائے کیوں پکڑے گئے اور وہ کون سا سنگین جرم تھا جس کی پاداش میں حکومت نے اپنے فرزندِ دلبند کو تین سال کے لیے پسِ دیوارِ زنداں بٹھا دیا؟ اس کا جواب نہ "کوہ نور" دیتا ہے نہ کوئی اور ذریعہ۔ ممکن ہے سرکار نے منشی ہرسکھ رائے کی وہ بے تکلفی پسند نہ فرمائی ہو جو انھوں نے اپنے آقایانِ نامدار سے برتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ منشی صاحب نے کسی افسر کے خلاف کچھ لکھ دیا ہو

کیونکہ اس کے تین مہینے بعد "ریاض نور" (ملتان) کے مدیر محمد مہدی حسین خان کو تحصیلدار صاحب بہادر کی شان میں گستاخی پر ایک نہ دو اکٹھے سات سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا۔ بہرحال "کوہ نور" اور اس کا مطبع برابر قائم رہے اور منشی ہرسکھ رائے غدر کے بعد بھی سرکار کے محبوب بنے رہے اور "کوہ نور" کو جملہ مراعات حاصل رہیں۔ منشی موصوف بلدیہ لاہور کے رکن نامزد ہوتے اور ان کا شمار رؤسائے لاہور میں ہوتا رہا۔

"کوہ نور" اردو صحافت کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے ایک اچھا اخبار تھا۔ اس میں نہ صرف تمام ضروری خبریں درج ہوتی تھیں بلکہ اعلیٰ پایہ کے علمی مضامین بھی چھپتے تھے اور شعراء کا کلام بھی درج کیا جاتا تھا۔ دوسرے بر عظیم کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق ۱۸۵۴ء میں اس کی اشاعت ۳۴۹ (تین سو انچاس) تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر اردو اخباروں کی اشاعت پچاس اور سو کے درمیان ہوتی تھی۔ جن اخباروں کی سرپرستی حکومت کرتی تھی ان کی اشاعتیں دو دو سو تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ یہ فخر صرف "کوہ نور" کو حاصل تھا کہ اس کی اشاعت ۳۴۹ تک پہنچ گئی۔ یہ درست ہے کہ حکومت نے بھی اسے خریدا ہوا تھا لیکن ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ "کوہ نور" کی تیسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہا اور یہ امتیاز شاید "اودھ اخبار" کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا اور چوتھی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "کوہ نور" ایک "سکول آف جرنلزم" کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن اخبار نویسوں نے یہاں کام کیا اور صحافتی تجربہ حاصل کیا انھوں نے بعد میں اپنے اخبار جاری کیے مثلاً نادر علی شیفتی، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ منشی نولکشور بھی "کوہ نور" سے منسلک رہے۔ میری تحقیق کے مطابق یہ بیان غیر صحیح ہے۔ جس زمانے میں انھیں "کوہ نور" سے وابستہ بتایا جاتا ہے اس زمانے میں وہ آگرہ سے "سفیر آگرہ" نکالتے تھے اور ان میں ایسے روحانی کمالات موجود نہیں تھے کہ آگرہ اور لاہور میں بیک وقت دو اخباروں کی ادارت کا فرض سرانجام دیتے۔

لاہور میں یوں تو سب اخباروں میں علمی مضامین چھپتے تھے اور ایک آدھ پندرہ روزہ اخبار خاص اشاعتِ علم کے لیے جاری ہوا لیکن لاہور کا پہلا علمی ماہنامہ "خورشید پنجاب" تھا جو جنوری ۱۸۵۶ء میں مطبع کوہ نور کے اہتمام میں جاری ہوا۔ اس کے پہلے تین پرچے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں جن سے اس کے خدوخال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کا سائز وہی تھا جو آج کے علمی اور ادبی رسائل کا ہے۔ اڑتالیس صفحات ہوتے تھے اور سرورق الگ ہوتا تھا۔ پہلے پرچے میں جو "تمہید" درج کی گئی اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

> "واجب یہ ہے کہ سب سے پہلے سببِ طلوع اور وجہِ شیوع اس "خورشیدِ پنجاب" کا ظاہر کیا جاوے جس سے دقیقہ سنجانِ حقیقت آگاہ کو واضح ہو کہ شیوع اس خورشید سے کیا مقصود ہے اور طلوع اس نیرّ سے کیا فائدہ متصوّر ہے سو گزارش کیا جاتا ہے کہ غرضِ اصلی اجرائے اس نسخۂ دلپذیر بہتر از اکسیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبانِ اُردو کا ربط ابھی اچھی طرح نہیں ہوا ہے اور بہ سبب اس کے کہ فی زمانہ زبانِ اُردو کو بدرجہ غایت اقتدار ہے۔ دفاترِ سرکاری میں بھی اسی کا رواج ہے شعر و سخن میں بھی اس کو لطیف کہتے ہیں۔ بول چال میں بھی اس کی فصاحت پر توجہ فرماتے ہیں اور دفاترِ سرکاری

> کے عملگان بعض ایسے ہیں کہ تنگیٔ معاش کے باعث مکتب سے اٹھتے ہی تلاشِ نوکری میں مصروف ہو گئے اور نوکری بہم پہنچا کر تحصیلِ آئندہ سے محروم ہو رہے ہیں یا اکثر لوگ ایسے ہیں کہ مشاہرہ کی کمی کے سبب کتب قیمتی قوانین سرکار اور دیگر علوم و فنون کو تو خرید نہیں سکتے اور اسی باعث سے ترقیٔ آئندہ سے مجبور رہتے ہیں سو اس میں اکثر ایسے مضامین درج ہوا کریں گے کہ جن سے زبانِ اُردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہو گی اور اس زبان کے شائقوں کو نفعِ خاطر خواہ بہ آئینِ بہین حاصل ہو گا اور عملگان کچہریوں سرکاری کو اس کے مطالعہ سے ترقیٔ علوم و فنون و بہم کار سررشتہ ہو گی۔ آئین اور قانون سے واقفیت بہم پہنچے گی اور ان کی طبیعت علوم کی طرف متوجہ ہو گی۔"

اس کے بعد علم کے فضائل بیان کیے گئے۔ مواصلات اور حمل و نقل کے مشینی ذرائع کا ذکر کیا گیا اور بتایا گیا کہ "خورشیدِ پنجاب" میں تہذیب، اخلاق، نظامِ تعلیم، تہذیب رسم و عاداتِ نیک، بحثِ علمی، بحثِ قانونی، علمِ طبعی، تجارت اور پیداوارِ ملک، عمارات و انہار، جغرافیہ، تاریخ اور طلسمات کے موضوع پر مقالے چھپا کریں گے۔ "بحثِ علمی" کے عنوان سے ایک مقالہ تین اقساط میں چھپا جس میں بتایا گیا کہ برطانیہ کے عہد میں اشاعتِ علوم کا جو سلسلہ شروع ہو رہا ہے اس سے ایک ایسا انقلاب آئے گا کہ صورت و سیرت دونوں بدل جائیں گی۔ پھر حفظِ علم کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ مختلف علوم کے مطالعہ سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ ایک مقالہ "اخلاق" پر ہے، ایک نظامِ تعلیم پر جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ذریعہ تعلیم اُردو ہو اور نظامِ تعلیم اور طریقِ تعلیم ایسا ہو کہ اس میں کم از کم تضیعِ اوقات ہو۔ "سراج العلم" کے عنوان سے ایک مفصل مقالے میں مختلف علوم کا تھوڑا تھوڑا حال بیان کیا گیا ہے۔ سائنسی موضوعات پر چند اچھے مضامین چھاپے گئے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے اور کوئی ایسی گمبھیر سائنسی اصطلاح نہیں ملتی جس کی سمجھ نہ آئے۔ افسوس! یہ رسالہ بہت جلد بند ہو گیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ ۱۸۵۱ء میں "کوہِ نور" جاری ہوا۔ چند ماہ بعد اس کا ایک حریف میدان میں داخل ہوا۔ اس کا نام "دریائے نور" تھا۔ اسے فقیر سراج الدین کی سرپرستی حاصل تھی اور ادارت پر شہسوار الدین فائز تھے۔ یہ اخبار سرکاری امداد سے محروم تھا۔ نظم و نسق کی خرابیوں پہلے دے کرتا تھا۔ پولیس والوں کو ان کی بدعنوانیوں پر ٹوکتا تھا۔ عام لوگوں میں مقبول تھا لیکن اشاعت ایک سو سے کچھ اوپر تھی۔ چونکہ "کوہِ نور" کا حریف تھا اس لیے دونوں میں صحافتی چشمکوں کا سلسلہ بھی جاری ہوا لیکن یہ نوک جھونک زیادہ عرصہ نہ رہی کیونکہ "دریائے نور" کو نقصان اٹھا کر بند ہونا پڑا۔

چند سال بعد ایک اخبار "لاہور گزٹ" جاری ہوا۔ اس نے بھی "کوہِ نور" پر یورش کی اور آؤ پر سے اس کے مہتمم کو "علم سے بے بہرہ" قرار دیا گیا۔ اخبار کے ساتھ ایک مطبع بھی تھا جس کے کارکنوں کو چھ سات مہینے تنخواہ نہ ملی تو انھوں نے ہڑتال کر دی۔ یہ ۱۸۵۶ء کا ذکر ہے اور یہ ہڑتال لاہور میں کارکنوں کی پہلی ہڑتال تھی۔

غدر کے دوران "کوہِ نور" سنسر ہونے لگا اور سنسر شپ کا سلسلہ اس کے سات آٹھ سال بعد تک رہا اور اس دوران میں جتنے اخبار نکلے، سب پر سنسر شپ عائد تھا۔ غدر کے دوران انگریزوں کو احساس ہوا کہ اس بغاوت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی

سرگرمیوں کی مناسب نشر و اشاعت کا بندوبست موجود نہیں تھا چنانچہ غدر کے بعد حسب حالات معمول پر آتے ہی یکم مئی ۱۸۵۸ء کو حکومت نے "سرکاری اخبار" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا جس کے مدیر پنڈت اجودھیا پرشاد تھے۔ غالباً مولانا محمد حسین آزاد بھی کچھ عرصہ اس سے منسلک رہے۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کی وساطت سے مجھے اس کا ایک شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۲۴ فروری ۱۸۶۹ء کا ہے۔ کتابت اور طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ $\frac{22 \times 18}{4}$ کے سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ لدھیانہ، ریواڑی، بھوانی اور ڈیرہ غازی خان کی خبریں درج ہیں۔ ایک مضمون ہندوستان میں ریلوے کے نظام پر ہے۔ ایک کا عنوان ہے "حیدرآباد دکن میں شفاخانوں کا انتظام" اور ایک مقالہ مولانا محمد حسین آزاد نے غالب کی وفات پہ لکھا ہے جس کے آخر میں چار تواریخ وفات درج ہیں۔ صفحہ اوّل پر لکھا ہے:۔

"یہ اخبار ہفتہ وار بدھ کے دن چھپ کر ناظرین کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔ خبریں نئی اور معتبر ہوتی ہیں۔ ریاستوں کی خبریں گورنمنٹ سے عنایت ہوتی ہیں۔ مضامین سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ افسر تحریر کرتے ہیں قیمت رفاہِ عام کی غرض سے دو روپے سال مقرر کی ہے۔"

یاد رہے کہ پہلے اس کا چندہ سالانہ صرف بارہ آنے تھا۔ پھر ایک روپیہ ہوا اور رسائز بڑا کرنے پر دو روپیہ کر دیا گیا۔

"سرکاری اخبار" "کوہِ نور" کے ہم عصروں میں ممتاز ترین تھا۔ اس کی اہمیت کی وجوہ یہ تھیں کہ اوّل اس کی اشاعت عام اخباروں کے مقابلے پر کہیں زیادہ تھی۔ پہلا شمارہ ۱۶۱۳ (ایک ہزار چھ سو تیرہ) کی تعداد میں چھپا اور اشاعت برابر بڑھتی چلی گئی۔ دوسرے یہ پہلا اخبار تھا جس کی قیمت بے حد کم یعنی ایک پیسہ تھی اور اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومت نے مالیے پر ایک فی صدی CESS لگایا تھا۔

"کوہِ نور" کا دوسرا اہم ہم عصر اخبار "پنجابی اخبار" تھا۔ یہ بھی اردو میں نکلتا تھا۔ بقول انور قریشی "پنجابی اخبار" ایک سنجیدہ مذاق کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کی پالیسی مذہب اور ذاتیات سے بالا تھی۔ یہ اخبار اپنے نامہ نگاروں کے خطوط کو نمایاں مقام پر چھاپتا تھا۔ اس میں نیم سیاسی مضامین، انگریزی اخبارات کے ترجمے، مقامی اور بیرونی خبریں، تار کی خبریں، موسمی حالات، غرضیکہ سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ یہ اخبار منشی محمد عظیم نے جاری کیا جو لاہور کے سب سے پہلے انگریزی اخبار "لاہور کرانیکل" کے بانی تھے۔ وہاں سے بے دخل ہو کر انھوں نے "دی پنجابی" کے نام سے ایک اور انگریزی اخبار نکالا۔ ان کے فرزند سید محمد لطیف مشہور مؤرخ تھے جنھوں نے لاہور اور پنجاب کی تاریخیں مرتب کیں۔

۱۸۶۴ء کا ذکر ہے۔ لاہور میں علوم مشرقی کے مشہور ہمدرد ڈاکٹر لائٹنر (LEITNER) کی صدارت میں "انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب" قائم ہوئی۔ اس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ یہی وہ انجمن تھی جس نے پنجاب یونیورسٹی کالج بنایا اور اسی کالج نے چند سال کے اندر اندر پنجاب یونیورسٹی کی صورت اختیار کر لی۔ انجمن کے مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء
۲۔ دیسی زبانوں کے وسیلے سے عام علمی ترقی
۳۔ حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنے کے لیے علمی ترقی، معاشرتی مسائل اور نظم و نسق کے مسائل پر تبادلۂ خیالات۔
۴۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنا۔
۵۔ ملک کی عام ترقی اور شہری نظم و نسق کی درستی کے لیے کوشاں رہنا۔
۶۔ حاکم و محکوم میں رابطۂ اتحاد و موانست کا ترقی دینا۔

۱۸۶۵ء میں اس انجمن نے ایک ماہنامہ جاری کیا جسے "رسالہ انجمن پنجاب" کا نام دیا گیا۔ اس کی ادارت مولانا محمد حسین آزاد کے سپرد تھی جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۰ء کے آغاز تک جاری رہا۔ اس میں علم و ادب، سائنس، جغرافیہ، معاشیات اور معاشرتی مسائل نیز تاریخی واقعات پر مضامین درج ہوتے تھے۔ چند مضامین کے عنوان یہ ہیں: "اہلِ ہند کو اپنی سود و بہبود میں آپ ہمت کرنی لازمی ہے"، "محصول کتب معاف کیا جائے"، "نہر سویز"، "غبارہ"، "بچوں کی تربیت"، "علم بھاکا"، "قوسِ قزح"، "تہذیبِ اخلاق" وغیرہ۔ اس رسالے میں انجمن کے تمام اجلاسوں کی مفصل رُوداد چھپا کرتی تھی۔ انگریزی اور ہندی میں بھی کبھی کبھار ایک آدھ مضمون دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد کے علاوہ مضمون نگاروں میں پنڈت من پھول، مولوی علمدار حسین، سید ہادی حسین، منشی نوبہی چند رائے، منشی دیوان چند، برکت علی خان اور پنڈت رادھا کشن شامل تھے۔

یکم اپریل ۱۸۷۰ء کو "رسالہ" کی جگہ انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام "ہمائے پنجاب" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری ہوا۔ مصنف "اخترِ شہنشاہی" کا یہ بیان غلط ہے کہ پنڈت گوپی ناتھ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس کی ادارت حقیقت میں پہلے مولانا محمد حسین آزاد پھر محمد لطیف کے سپرد ہوئی۔ ایک سال بعد "ہمائے پنجاب" بند کرکے اس کی جگہ "اخبار انجمن پنجاب" جاری ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ابتدائی دور میں مولانا آزاد ہی ایڈیٹر تھے۔ "آبِ حیات" کا مواد مضامین کی صورت میں اسی اخبار میں چھپتا رہا۔ نیچرل شاعری کا پہلا مشاعرہ جو مولانا آزاد نے کرایا تھا۔ اس کی رُوداد جون ۱۸۷۴ء کے ضمیمے میں چھپی۔ موضوع "زمستان" تھا اور اس پر شاہ انور حسین ہما، میرزا اشرف بیگ خان اشرف، مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری، مولوی الٰہی بخش رفیق، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی محمد مقرب علی زائر، مولوی امو جان ولی، مولوی قادر بخش اور مولوی عطاء اللہ نے نظمیں پڑھیں۔ ۲۰ اپریل ۱۸۷۷ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مناظمہ "صبح کی سیر" پر ہوا اور اگلے مہینے کے لیے "شبِ مہتاب" موضوع قرار پایا۔

"اخبار انجمن پنجاب" اعلیٰ پایے کے علمی مضامین دیتا تھا۔ خبریں بھی چھاپتا تھا۔ غیر ملکی خبریں ملک کے انگریزی اخبارات اور استنبول کے عربی اور فارسی اخبارات سے ترجمہ کی جاتی تھیں۔ ملکی خبروں کے بارے میں اس پرچے میں یہ مختلف بات دیکھی گئی ہے کہ یہ اپنے ہم عصر اُردو اخبارات سے خبریں نقل نہیں کرتا تھا البتہ مضامین حوالے دے کر کبھی کبھی شائع کر دیتا تھا۔ خبروں پر عنوان شاذ ہی دیے جاتے تھے۔ عام دستور یہی تھا کہ جس شہر سے خبر آئی اس شہر کا نام عنوان کے طور پر دے دیا جاتا تھا اگرچہ یہ اخبار نیم سرکاری تھا اس کے باوجود یہ ظلم و نسق پر نکتہ چینی کرتا رہتا اور بعض اوقات انگریزی عہدِ حکومت پر بڑے کھلے انداز میں تنقید سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اداریے کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں برطانوی حکومت اور اس سے پہلے کے نظامِ حکومت کا موازنہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

"...... بہ عہدِ سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں، رعایا خوشحال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی ملک میں تھی۔ دس لاکھ فوج تھی اور اس پر شاہی خزانہ اور کارخانہ معمور رہتے تھے۔ عجب ہے کہ اب ترپن کروڑ میں صرف دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے از حد قرض ہے

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

سالانہ بجٹ خوب بنتا ہے لیکن جب بچت نہیں تو محض لفافہ ہے۔ بارک ماسٹری اور

کسرپٹ اور رہم وغیرہ میں کروڑوں روپیہ پانی پھر جاتا ہے جس کا حال سن کر حیرت ہوتی ہے۔ سرکار ایسی الکہ گٹ ہے کہ پنڈارہ کی لوٹ بھی اس صیغہ نے مات کر دی۔"

(۲۴ر نومبر ۱۸۷۶ء)

۱۸۷۸ء میں منشی نثار علی شہرت اس اخبار کی ادارت پر فائز ہوئے۔ موصوف دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ پہلے "کوہ نور" "پنجاب پنچ" اور "خیر خواہ عالم" (دہلی) میں کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ جے پور، میرٹھ اور ریاست جموں کشمیر میں ملازمت بھی کی۔

جس سال اخبار "انجمن پنجاب" جاری ہوا، اسی سال ۱۸۷۱ء میں "اخبار عام" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ پہلے ہفت روزہ تھا، پھر ہفتے میں تین بار نکلنے لگا اور صدی کے آخر میں روزنامہ ہو گیا۔ اس کے مالک پنڈت مکند رام اور ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ ہم نے اس کا ۱۸۸۳ء کا فائل دیکھا ہے۔ اس زمانے میں یہ سہ روزہ تھا۔ ماہانہ چندہ صرف چار آنے تھا۔ تقطیع [illegible] × ۱۰ انچ تھی اور آٹھ صفحوں پر مشتمل تھا۔ ان دنوں اس کی اشاعت دو ہزار سے زائد تھی۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں اور بہت بڑی تعداد میں۔ اداریے مختصر ہوتے تھے۔ تحریر کا انداز سادہ، واضح اور کسی قدر شوخ ہوتا تھا۔ غیر اخباری مضامین درج نہیں ہوتے تھے۔ یہی حال غزلیات کا تھا البتہ پولیٹیکل غزلیں اور نظمیں بالالتزام چھاپی جاتی تھیں۔ گویا یہ صحیح معنوں میں "اخبار" تھا۔ اس کا ایک اداریہ ملاحظہ ہو جس میں البرٹ بل کا ذکر کیا گیا ہے جو اس زمانے میں انگریزوں کو اس لیے ناپسند تھا کہ اس کی رو سے انگریز ملزموں کو بھی ہندوستانی عدالتوں میں پیش ہونا تھا:۔

"لارڈ ڈلٹن صاحب ہندوستان کے انگریزوں کے ساتھ اس امر میں متفق الرائے ہیں کہ البرٹ بل پاس ہونے سے ان انگریزوں کو سخت بے عزتی، شرم، مصیبت اور بربادی برداشت کرنی پڑے گی لیکن ہم لوگ ان سے ہاتھ جوڑ کر، ٹوپی اتار کر، اپنے گالوں میں تھپڑ مار کر، اپنا سر پیٹ کر، اپنا گلہ پھاڑ کر عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کا سراسر خیالِ خام ہے کیونکہ انگریز لوگ کئی مقامات اور علاقہ جات میں ہندوستانیوں کے ماتحت ہیں، انگریز لوگوں کے کل دیوانی مقدمات ہندوستانی فیصل کرتے ہیں۔ انگریز لوگ برابر ہندوستانی حاکموں کے اجلاس میں کام پڑنے پر ٹوپی اتار کر جاتے ہیں۔ انگریز لوگ کتنے ہی راجہ مہاراجوں کے یہاں نوکر ہیں۔ انگریز کتنے ہی بڑے آدمیوں کے پہرہ دار کوچبان ہیں۔ انگریز لوگ لاکھوں روپے کے ہندوستانیوں کے قرضدار ہیں۔ انگریز لوگ دو دو آنے میں ہندوستانی لوگوں کو تماشے دکھاتے ہیں۔ ان باتوں میں انگریز لوگ بے عزت نہیں ہوتے۔ وہ بے عزتی اب فقط عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے جسم میں جا چھپی ہے۔ ہندوستانی کالے جنگلی، دھوکا باز، حاسد سب ہیں اور انگریز گورے، مہذب، بہتر، ہر ایک سے انصاف کے،

ود خدا کے اوتار سہی لیکن عدالت تو دونوں کے ماننے لائق ہے۔۔
ریز لوگ عدالتوں میں جانے کو ہی بے عزتی سمجھتے ہیں تو ہم انہیں صلاح دیتے
سے کبھی ایسا کام مت کرو جو عدالت میں جانا پڑے۔ ہندوستان میں بھی ایسے
آدمی بہت سے ہیں جو مر جانے پر بھی عدالت میں جانا منظور نہیں کریں گے۔
کیا ایسی صاف باطنی اور پاکیزہ مزاجی انگریز لوگوں میں نہیں ہو سکتی؟"

(۱۲ مئی ۱۸۸۳ء)

جدید اُردو صحافت کا آغاز دو اخباروں سے ہوا۔ اوّل "اخبارِ عام" دوم "پیسہ اخبار"۔ مؤخر الذکر کے بانی مولوی محبوب عالم تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے گاؤں فیروزوالہ (گوجرانوالہ) میں بیس سال کی عمر میں مطبع خادم التعلیم قائم کیا۔ پہلے "زمیندار" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ پھر ہفت روزہ اخبار "ہمت" نکالا اور ۱۸۸۷ء میں "پیسہ اخبار" کا آغاز کیا۔ یہ ہر ہفتے آٹھ چھوٹے چھوٹے صفحوں پر نکلتا تھا۔ سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا البتہ ڈاک خرچ کے لیے تیرہ آنے اس پر مستزاد تھے۔ ابتدائی زندگی افلاس میں گزری۔ اخبار جاری کیا تو خود ہی بیک وقت مدیر، مینجر، کاتب، سنگساز اور کلرک تھے اور ذاتی محنت سے کام کیا کہ چند سال کے اندر اندر وہ لاہور میں اخبارات و رسائل کے ایک عظیم "ذخیرہ" کے مالک بنے۔ ایک پریس قائم کیا جس میں سترہ مشینیں نصب تھیں۔ ایک پبلشنگ ہاؤس بنایا جس سے سات سو کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ "ذخیرہ" کا سب سے بڑا اخبار "پیسہ اخبار" تھا جو صدی کے آخر میں روزنامہ بنا اور اس کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھی کہ وہ اپنے اہم ترین ہم عصر "اخبارِ عام" سے بازی لے گیا اور جب تک "زمیندار" منظرِ عام پر نہ آیا صحافت کی دنیا میں اسی کا چرچا رہا۔ "پیسہ اخبار" کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن نکلتا تھا۔ "انتخابِ لاجواب" کے نام سے لطائف و معلومات و اقتباسات پر مشتمل ایک ہفت روزہ جاری تھا۔ عورتوں کے لیے "شریف بی بی"، بچوں کے لیے "بچوں کا اخبار"، زمینداروں کے لیے "باغبان" اور طلباء کے لیے "کلیدِ امتحان" نکلتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں مولوی محبوب عالم انگلستان گئے۔ وہاں کے مشہور اخبار "ٹٹ بٹس" (TIT-BITS) کو دیکھ کر یہاں سے "انتخابِ لاجواب" جاری کیا۔

اُردو صحافت کی ترقی میں "پیسہ اخبار" سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "کوہِ نور" کے بعد یہ پہلا اخبار تھا جہاں مستقبل کے کئی صحافیوں نے اوّلین تربیت حاصل کی یا اس میں نمایاں کام کیا مثلاً لالہ دینا ناتھ جنھوں نے بعد میں "ہندوستان" جاری کیا۔ حکیم غلام نبی جو بعد میں "الحکام" کے مدیر ہوئے۔ منشی احمد دین جنھوں نے "غمخوارِ عالم" جاری کیا۔ منشی محمد الدین فوق جنھوں نے "کشمیری میگزین" نکالا اور بے شمار اچھی کتابیں تصنیف کیں اور مولوی شجاع اللہ جنھوں نے بعد میں "ملت" کی ادارت سنبھالی۔ ان سب سے نمایاں شخصیت میر جالب دہلوی کی تھی جو "پیسہ اخبار" کے مدیر رہے۔ بقول والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک "اس زمانے میں پیسہ اخبار کے افتتاحیے نہایت پُرمغز ہوتے تھے کیونکہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں نظر آتا۔" "پیسہ اخبار" سے نکل کر مرحوم "ہمدرد" اور "ہمدم" میں کام کرتے رہے۔

"پیسہ اخبار" کی دوسری خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس پر سرسید کی صحافت کا پَرتو تھا اس لیے تبصروں میں توازن ہمیشہ نمایاں تھا۔ "اخبارِ عام" یوں تو غیر فرقہ دار اخبار تھا لیکن کبھی کبھی ہندوؤں کے حق میں لکھ جاتا تھا۔ اس کے مقابلے پر "پیسہ اخبار"

اسلامی اخبار تھا اور اسلامی حقوق کا علمبردار تھا۔ اُردو صحافت کی پرانی روایت کے برعکس اس پر "اخباریت" غالب تھی اور مضامین اور اداریے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا لوگوں کی روزمرہ زندگی کے مسائل سے تعلق تھا۔ "پیسہ اخبار" تجارتی اصولوں پر نکالا گیا۔ قیمت کم تھی اور اشتہارات کی فراہمی پر زور دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بے شمار اخبار سسک سسک کر جان با گئے وہاں یہ اخبار نصف صدی سے زیادہ عرصہ زندہ رہا۔

اور آخری بڑی خصوصیت اس اخبار کی اشاعت تھی۔ ۱۸۹۷ء میں ہفت روزہ "پیسہ اخبار" کی اشاعت گیارہ ہزار تھی اور پانچ چھ ہزار تو ایک عرصے تک رہی۔ روزانہ اخبار کی اشاعت البتہ دو ہزار کے قریب رہی لیکن یہ اعزاز بھی کسی اور روزنامے کو اس صدی کے آغاز تک نصیب نہ ہوا۔ تقریباً بیس سال ہوئے "پیسہ اخبار" کے ذخیرہ کا کوئی اخبار باقی نہیں رہا اور آج صرف پیسہ اخبار سٹریٹ مولوی محبوب عالم کے عظیم صحافتی کارنامے کی یاد دلاتی ہے۔

پچھلی صدی میں جو دوسرے اخبار نکلے ان میں ایک "رہبرِ ہند" تھا جس کی ادارت سید نادر علی سیفی کے سپرد تھی۔ یہ اخبار ۱۸۸۵ء میں روزانہ بھی ہوا۔ اسی سال خواجہ احمد حسن نے "روزنامچۂ پنجاب" کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالا جو بہت جلد بند ہو گیا۔ ۱۸۸۷ء میں مولوی سیف الحق ادیب نے "شفیقِ ہند" جاری کیا اور دو روزنامے جاری کیے۔ ایک صبح کے وقت نکلتا تھا اس کا نام "نسیمِ صبح" تھا، دوسرا شام کو نکلتا تھا اسے "شامِ وصال" کا نام دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء ہی میں مولوی محرم علی چشتی نے "رفیقِ ہند" نکالا جو اعلیٰ پایے کا ہفت روزہ تھا۔ پہلے سرسید احمد خاں کا بڑا حامی تھا، پھر مخالفت پر آیا تو سرسید اور مولوی نذیر احمد پر بڑے رکیک حملے کیے۔ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی اور نہ ۱۹۰۰ء میں بند ہو گیا۔

اس سے پیشتر کہ ہم بیسویں صدی کی صحافت کا ذکر کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان رسائل کا ذکر کر دیا جائے جو بیسویں صدی کے آغاز میں نکلے۔ ان میں سرِ فہرست "مخزن" تھا۔ یہ اعلیٰ پایے کا ادبی رسالہ شیخ عبدالقادر مرحوم (بعد میں "سر" کا خطاب پایا) نے جاری کیا۔ اس کی ادارت وقتاً فوقتاً مختلف حضرات کے ہاتھ میں رہی لیکن روحِ رواں شیخ صاحب مرحوم ہی تھے۔ "مخزن" حقیقت میں ایک ادبی رسالہ ہی نہیں ایک ادبی تحریک کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ انگریزی پڑھے لکھے لوگ بھی اُردو ادب کی ترقی میں حصہ لیں اور اُردو ادب کو نئے تصورات اور نئے تجربات سے آشنا کریں۔ چنانچہ پہلے رُبع صدی میں اُردو کے جتنے ادیب پیدا ہوئے ان کی نگارشات پہلے پہل "مخزن" ہی میں شائع ہوئیں۔ "مخزن" کی تحریک اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس مختصر سے مقالے میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اسی دور میں سید ممتاز علی مرحوم (بعد میں شمس العلماء بنے) نے دو اعلیٰ پایے کے ہفت روزہ اخبار جاری کیے۔ ایک مستورات کے لیے جس کا نام "تہذیب النسواں" تھا۔ دوسرا بچوں کے لیے جس کا نام "پھول" تھا۔ ان دونوں کے عملے میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، غلام عباس (جو آج کل "آہنگ" کے مدیر ہیں) پنڈت ہری چند اختر، حفیظ ہوشیارپوری، احمد ندیم قاسمی جیسے حضرات شامل رہے۔ سید ممتاز علی مرحوم کے صاحبزادے جناب سید امتیاز علی تاج بھی ان رسالوں کی ادارت کرتے رہے۔ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں جو ادیب پیدا ہوئے۔ ان سب نے ان دو رسالوں میں ضرور مضمون لکھے۔ جنگِ عظیم کے بعد سید امتیاز علی تاج نے "کہکشاں" کے نام سے ایک نہایت اعلیٰ درجے کا ادبی رسالہ نکالا۔ تاج اس کے مدیر تھے اور مولانا سالک ان کی معاونت کرتے تھے۔ اس رسالے میں خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبدالغفار اور برِّ عظیم کے تقریباً تمام ممتاز ادیب لکھتے رہے۔ افسوس! دو سال بعد اس رسالے کو بند کرنا پڑا

اسی دور میں خان احمد حسین خان کا "شباب اُردو" جاری ہوا۔ اس میں بھی بڑے بڑے ادیب لکھتے تھے لیکن اس کا پایہ اتنا بلند نہیں تھا۔

صدی کے آغاز میں اُردو میں سیاسی صحافت زیادہ نمایاں ہوئی۔ مولوی انشاء اللہ خاں نے ۱۹۰۲ء میں "وطن" جاری کیا ۱۹۰۰ء میں یہ روزنامہ ہوا اور اس کی اشاعت خاصی ہوگئی۔ "زمیندار" کا ریلا آیا تو "وطن" کچھ عرصہ بعد پھر ہفت روزہ بن گیا۔ مولوی انشاء اللہ خاں ۱۹۳۰ء میں انتقال کر گئے اور پانچ سال بعد "وطن" بند ہوگیا۔ ۱۹۰۴ء میں لالہ دینا ناتھ اور رام بھج دت نے "ہندوستان" جاری کیا یہ ہفت روزہ آہستہ آہستہ اتنا ہر دلعزیز ہوا کہ اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کے زیر اہتمام "دیپک" کے نام سے ایک روزنامہ جاری ہوا جو جلد بند ہوگیا۔ خود "ہندوستان" ۱۹۱۹ء میں ختم ہوگیا۔ لالہ دینا ناتھ نے "ہندوستان" سے الگ ہوکر "دیش" کے نام سے ایک اور اخبار نکال لیا۔ یہ چند سال جاری رہنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں بند ہوگیا۔ انہی کی ادارت میں "ہمالہ" بھی کچھ عرصہ نکلتا رہا۔

۱۹۰۳ء میں مولوی سراج الدین احمد خان نے لاہور سے ہفت روزہ "زمیندار" جاری کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ زمینداروں، کسانوں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد یہ اخبار کرم آباد منتقل ہوگیا۔ اس نرم رو اخبار کی زندگی میں پہلا طوفان اس وقت آیا جب نہری نو آبادیوں میں آباد کسانوں پر حکومت نے کچھ پابندیاں لگا دیں اور چودھری شہاب الدین (جو بعد میں ایک عرصے تک پنجاب کونسل اور پنجاب اسمبلی کے اسپیکر رہے) نے "پگڑی سنبھال او جٹا" کے عنوان سے "زمیندار" کے لیے ایک "ہاڑا" لکھا۔ یہ سکھ نو آبادکاروں میں بہت ہر دلعزیز ہوا۔ "سول" اور "پاؤنیر" نے اس کے تراجم چھاپے۔ اس تحریک میں لالہ لاجپت رائے مانڈلے میں نظر بند کر دیے گئے۔ آخر حکومت جھک گئی۔ پابندیاں اٹھالی گئیں اور "زمیندار" نے اسے اپنی جیت سے تعبیر کیا۔ اس وقت اس کی اشاعت صرف دو ہزار تھی۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہوا۔ مولانا ظفر علی خان نے اخبار کی ادارت سنبھالی اور اسے لاہور لے آئے۔

اس کے بعد مسلمانانِ ہند کے لیے ابتلا کا ایک دور آیا۔ تقسیمِ بنگال منسوخ ہوئی۔ مسجد کانپور کی تحریک میں مسلمانوں کا شدید جانی ضیاع ہوا، بیرونِ ملک بھی مسلمانوں کی حالت خراب تھی۔ مغربی طاقتوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف ایک نئی مہم جاری کر رکھی تھی۔ اٹلی نے طرابلس کی سرزمین کو شہداء کے خون سے لالہ رنگ کر رکھا تھا۔ جنگِ بلقان میں ترکوں سے کئی علاقے چھن گئے اور پہلی جنگ عظیم میں جرمن کے ساتھ ترکیہ کے اتحاد نے برِعظیم کے مسلمانوں کو ایک اور بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ اس دوران میں "زمیندار" روزنامہ ہوکر مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ترجمان بن گیا۔ چونکہ اس کا لہجہ پرجوش تھا، انداز خطیبانہ تھا، خبروں کی بہم رسانی کا اعلیٰ انتظام موجود تھا اس لیے یہ جلد اپنے معاصرین پر چھا گیا۔ یہاں تک کہ پورے برِاعظم میں یہی اخبار مسلمانوں میں مقبول تھا۔ حکومت نے اس سے کئی ضمانتیں طلب کیں۔ چھاپہ خانے ضبط کیے۔ دورانِ جنگ میں مولانا ظفر علی خان نظر بند ہوگئے اور "زمیندار" بند ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے سر مائیکل اوڈوائر کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ انھیں پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے اور "ستارۂ صبح" کے نام سے ایک غیر سیاسی ہفت روزہ چلائیں گے۔ یہ عرضداشت قبول ہوئی تو "ستارۂ صبح" نکلا اور جنگ کے بعد "زمیندار" کا احیاء ہوا۔ یہ اخبار ۱۹۳۷ء تک نیشنلسٹ اور کانگرسی رہا اور اسے پہلے کا سا عروج نصیب نہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء

سے" زمیندار" مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا اور پاکستان بننے کے بعد اس کی اشاعت کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ ختم نبوت کی تحریک میں بند ہوا تو اس کے بعد کھوئی ہوئی اشاعت حاصل نہ ہو سکی۔ آج کل اس کی اشاعت اتنی کم ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ "زمیندار" ابھی زندہ ہے۔

"زمیندار" کی اہمیت کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں یہ ہیں:۔

۱۔ "زمیندار" نے اس صدی کے پہلے ربع میں عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا کیا اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لیے نہیں تھی لیکن اس سے آنے والی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ ہوا۔

۲۔ "زمیندار" پہلا مسلم روزنامہ تھا جس نے ۱۹۱۳ء میں رائٹر اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں کی سروس حاصل کی اور جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ بڑی تقطیع سے اُردو صحافت کو روشناس کیا۔

۳۔ "زمیندار" نے پہلی مرتبہ مستقل روزانہ مزاحیہ کالم شروع کیا۔ اس کا نام "افکار و حوادث" تھا اور اسے مولانا سالک مرحوم لکھا کرتے تھے۔

۴۔ "زمیندار" میں اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور اخبار نویسوں نے کام کیا مثلاً نیاز فتح پوری، وحیدالدین سلیم پانی پتی، عبداللہ العمادی، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت، نصراللہ خاں عزیز، خدا بخش اظہر، حاجی لق لق۔

۵۔ "زمیندار" نے آزادی صحافت اور حریت خیال کی حفاظت میں عدیم المثال قربانیاں دیں۔ اس کے تقریباً تمام ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ اس نے ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ رقم ضمانتوں کی صورت میں حکومت کو ادا کی، چھاپہ خانے ضبط کرائے اور یہ خصوصیت بھی "زمیندار" کو حاصل ہے کہ اس کی ساری ضمانتیں قوم نے چندہ جمع کر کے مہیا کیں۔

۶۔ اُردو صحافت میں سیاسی شاعری نے "زمیندار" میں عروج پایا جس کے واحد منزاوار مولانا ظفر علی خان تھے۔

"زمیندار" سے اُردو صحافت کو جو نقصان پہنچا اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس صدی کے آغاز تک اُردو صحافت کا انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دلیل اسلوب پر حاوی تھی۔ مولانا ظفر علی خان نے یہ سنجیدگی ختم کر دی، سنسنی خیزی کو فروغ دیا اور حالت یہ ہوئی کہ اُردو اخباروں کے قارئین جہاں سنسنی اور چٹ پٹا پن نہ دیکھتے انھیں مزا ہی نہ آتا۔ چنانچہ عوام کا مزاج ایسا بگڑا کہ اس کے آثار اب بھی موجود ہیں اور غالباً اب انھیں پھر فروغ مل رہا ہے۔ دوسرا نقصان یہ کہ "زمیندار" کی زبان اگرچہ بہت فصیح و بلیغ تھی لیکن وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھی اور ایک عرصہ دراز تک ہماری صحافت "مشکل پسند" رہی۔

۱۹۱۹ء میں مولانا سید حبیب نے "سیاست" نکالا۔ یہ ۱۹۲۷ء تک باقاعدہ نکلتا رہا لیکن اس میں جان نہیں تھی۔ نہ مقالے اچھے تھے نہ اداریے اور نہ خبر رساں ایجنسیوں کی سروس کا اہتمام تھا۔ بہرحال مولانا سید حبیب مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے اور "سیاست" کے آخری دور میں سر سکندر حیات سے جنگ مول لینے میں انھوں نے خاصی جرأت سے کام لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جنگ میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوؤں کے بڑے بڑے اخبار نکلے۔ سب سے نمایاں "پرتاب" تھا جسے مہاشے کرشن نے جاری کیا۔ یہ اخبار آج کل دہلی اور حیدرآباد دکن سے نکلتا ہے اور اب بھی مہاشے کرشن ہی اسے ایڈٹ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے فرزندان کی

مدد کر رہے ہیں۔ مہاشے کرشن سلجھے ہوئے دماغ کے صحافی ہیں۔ ان کے اداریوں میں بڑی جان ہوتی ہے اور ان کا اندازِ بیان مثبت، مدلل رہا ہے۔ پرتاب کا سب سے بڑا مدِ مقابل "ملاپ" تھا (یہ بھی دہلی اور حیدر آباد دکن سے نکل رہا ہے) اس کے مدیر مہاشہ خوشحال چند خورسند تھے جو اب سنیاس اختیار کر چکے ہیں اور ملاپ کی ادارت ان کے فرزند مہاشہ رنبیر کے سپرد ہے۔ مہاشہ خورسند بھی اچھے اخبار نویس تھے لیکن مہاشے کرشن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دونوں اخبار آریہ سماجیوں کے تھے۔ ان کے مقابلے پر سناتن دھرمی ہندوؤں نے گوسوامی گنیش دت کی رہنمائی میں "ویر بھارت" جاری کیا۔ ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے نے ایک مشترکہ سرمایے کی کمپنی قائم کر کے "بندے ماترم" جاری کیا۔ پہلے اس کی اشاعت خاصی تھی لیکن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ یہ اخبار دو تین بار بند ہو کر دوبارہ نکلا۔ اس کے مدیروں میں پنڈت میلا رام وفا بھی شامل رہے۔ لالہ شام لال کپور نے ۱۹۲۱ء میں روزنامہ "کیسری" جاری کیا۔ اسے بھی دو ایک بار بند ہو کر دوبارہ نکلنا پڑا اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ تقسیم سے چند سال پہلے لالہ نانک چند ناز نے "پربھات" جاری کیا۔ بھائی پرمانند نے "ہندو" نکالا۔ سکھوں نے "اجیت" جاری کیا جس کی ادارت سادھو سنگھ ہمدرد کے ہاتھ میں تھی اور جاٹوں نے "رہبرِ ہند" نکالا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے "زمیندار" سے الگ ہو کر "انقلاب" جاری کیا۔ اوّل الذکر اپنے مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" کے لیے اور موخر الذکر اپنے پُرمغز اداریوں کے لیے مشہور تھے۔ ان دونوں نے چالیس دوستوں سے ایک ایک سو روپیہ قرضِ حسنہ یا چندہ خریداری برائے زندگی کے طور پر لے کر چار ہزار روپے کے سرمایے سے جاری کیا اور یہ اتنا کامیاب رہا کہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ فنی لحاظ سے یہ اعلیٰ پایے کا اخبار تھا۔ خبروں کی ہمہ رسانی اور ترتیب، حالاتِ حاضرہ پر اچھے مقالوں کی اشاعت، ٹھوس اداریوں اور مزاحیہ کالم کی اشاعت — اس کی نمایاں خصوصیات تھیں لیکن "انقلاب" کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ یہ اخبار سنجیدہ اور مدلل صحافت کا علمبردار تھا۔ اس کی اشاعت محدود تھی۔ زیادہ سے زیادہ سات ہزار اور کم از کم تین ہزار رہی لیکن اس کا حلقۂ اشاعت مؤثر تھا اور اسے تعلیم یافتہ اور علم دوست طبقے میں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ اخبار اس دور میں معرضِ وجود میں آیا جب مسلمان حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں مدلل اور ٹھوس قسم کی صحافت درکار تھی اور "انقلاب" نے یہ ضرورت بوجہ احسن پوری کی۔ وہ علیحدگی کی سیاست کا ترجمان تھا۔ سائمن کمیشن کی آمد پر اس نے اسلامی سیاست کا زاویۂ نگاہ پیش کیا۔ جب کانگرس نے ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے نہرو رپورٹ منظور کی اور حکومت کو چیلنج دیا کہ وہ اسے قبول کرے، ورنہ سول نافرمانی ہوگی تو "انقلاب" نے نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے منافی قرار دیا اور مسلمان عوام کو کانگرس کے طلسم سے بچایا اور مسلمان من حیث القوم کانگرس سے الگ رہے۔ "انقلاب" نے مسٹر محمد علی جناح اور سر محمد شفیع کی متوازی مسلم لیگوں کو متحد ہونے میں مدد دی۔ گول میز کانفرنس کے موقع پر "انقلاب" نے پھر اسلامی نقطۂ نگاہ کی مدلل ترجمانی کی۔ جب سر شفیع نے بعض شرائط پر مخلوط انتخاب قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ان کی شدید مخالفت کی۔ "انقلاب" نے کمیونل ایوارڈ کو غیر تسلی بخش لیکن اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر قابلِ قبول قرار دیا۔ صوبائی خود مختاری کے آغاز پر "انقلاب" کی پالیسی یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کو یکجا رکھ کر مشترکہ مفاد کے لیے ان ہندو عناصر سے تعاون کیا جائے جو کاشتکاروں کی بہتری کے لیے کام پر آمادہ ہوں چنانچہ اس نے اتحاد پارٹی کی حمایت کی۔ آل انڈیا سطح پر وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے موقف کی بڑے زور و شور سے تائید کرتا رہا۔ ۱۹۲۸ء میں "انقلاب" نے "ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن" کے عنوان سے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کے چار مقالے چھاپے اور ۱۹۲۷ء سے اس اخبار

میں پاکستان کے حق میں مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی تجاویز قبول کر لیں تو "انقلاب" نے اسے قراردادِ لاہور اور اسلامی مفاد کے منافی قرار دیا اور اس وقت تک چین نہ لیا، جب تک مسلم لیگ نے یہ تجاویز مسترد کر کے حسبِ سابق قراردادِ پاکستان پر زور دینا نہ شروع کیا۔ یہ اخبار مسلم لیگ کی صوبائی قیادت کا مخالف تھا اس لیے تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے اس کی ہر دلعزیزی میں نمایاں فرق آ گیا۔

"انقلاب" کے اجراء کے بعد کئی اور مسلمان اخبار جاری ہوئے مثلاً آزاد، جمہور، پاسبان اور ترپاق۔ لیکن سب بند ہو گئے صرف "احسان" باقی رہا جسے ملک نور الٰہی صاحب نے صوبائی خود مختاری کے آغاز سے قبل جاری کیا۔ اس کے مدیر مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش تھے۔ آپ اس سے پہلے "زمیندار" اور "انقلاب" میں کام کر چکے تھے بلکہ فارسی زبان کے ایک ہفت روزہ "افغانستان" کی ادارت بھی کرتے رہے تھے۔ آپ ایک مشاق اخبار نویس اور اچھے افتتاحیہ نگار تھے۔ ان کے نائب مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت کا آغاز کلکتہ کے اخبار "آفتاب" سے کیا جس میں وہ "نئی دنیا" کے نام سے ایک مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور قلمی نام "کولمبس" تھا۔ وہاں سے لاہور آئے اور "زمیندار" میں "فکاہات" لکھتے رہے۔ "احسان" میں آئے تو یہاں "مطائبات" ان کے سپرد ہوئے اور انھوں نے خوب نام پیدا کیا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ مزاحیہ کالم نویسی میں سالک و حسرت نے جو کمال پیدا کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ میکش و حسرت کے علاوہ اس اخبار میں باری علیگ کام کرتے تھے جو "انقلابِ فرانس" اور "کمپنی کی حکومت" کی وجہ سے نوجوان طبقے میں مقبول تھے۔ مولانا انعام اللہ خان ناصر اور اشرف عطا بھی اسی اخبار میں کام کرتے رہے۔ "احسان" بھی سوائے چند مستثنیات کے علیحدگی کی تحریک کا حامی رہا۔ اتحاد پارٹی سے اس نے بھی تعاون کیا لیکن آخری سالوں میں مسلم لیگ سے مکمل طور پر وابستہ ہو گیا۔ یہ اخبار بھی فنی لحاظ سے اعلیٰ پایے کا تھا۔

اس کے بعد میکش، حسرت اور باری "احسان" سے الگ ہو گئے اور روزنامہ "شہباز" نکال لیا۔ یہ ایک جاندار، پُر رونق اور اچھا اخبار تھا اور اس کی پالیسی "انقلاب" اور "احسان" سے ملتی جلتی تھی۔ جب پرچے کی مالی حالت سقیم ہوئی تو یونینسٹ پارٹی کے ایک لیڈر سید امجد علی شاہ (فرزند سر سید مراتب علی شاہ) نے اسے خرید لیا۔ سردار شوکت حیات کی وزارت سے اختلافِ رائے کی وجہ سے حسرت، میکش اور باری نے اسے چھوڑ دیا اور مولانا وقار انبالوی ایڈیٹر بن گئے۔ وقار انبالوی پہلے "احسان" میں اور اس سے پہلے بعض ہندو اخبارات میں کام کرتے رہے تھے۔ موصوف بڑے چابکدست اخبار نویس رہے ہیں اور جہاں گئے ہیں اپنا رنگ خوب جمایا ہے۔

اس کے بعد "نوائے وقت" آتا ہے۔ اسے جناب حمید نظامی نے ۲۳ مارچ ۴۰ء کو ایک چھوٹے سے پندرہ روزہ اخبار کی حیثیت سے نکالا اور ۱۹۴۴ء میں مکمل روزنامہ بنا دیا۔ جناب حمید نظامی انگریزی کے ایم۔ اے ہیں۔ پہلے ایک سیاسی رسالے "ساربان" کے مدیرِ معاون تھے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ سیکھی۔ مسلمانوں کی خبر رساں ایجنسی اورینٹ پریس آف انڈیا کے مینجر رہے۔ تحریر و تقریر دونوں میں نمایاں تھے، آج کل صرف تحریر میں نمایاں ہیں۔ تحریر کا آغاز مزاح نویسی سے کیا۔ لیکن اب مزاح نویسی بہت کم کرتے ہیں اور اداریہ نویسی میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج پاکستان بھر کی اُردو صحافت میں بہترین اداریہ نویس وہی ہیں۔ "نوائے وقت" کی پالیسی شروع سے مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں رہی ہے لیکن اس

اخبار کا مزید ذکر ہم تقسیم کے بعد اُردو صحافت کے پیرایے میں بیان کریں گے۔

تقسیم سے پہلے اُردو صحافت دو حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے سنسنی خیز صحافت اور سنجیدہ صحافت۔ سنسنی خیز صحافت کی نمائندگی تمام ہندو اخبار (سوائے بھائی پرمانند کے اخبار "ہندو" کے) اور "زمیندار" کرتے تھے۔ "زمیندار" کی اشاعت تو خاص نہ بڑھی لیکن ہندو اخباروں کی اشاعتیں بہت زیادہ تھیں یعنی یہی دس اور پندرہ ہزار کے درمیان۔ ان اخباروں کی زبان سادہ تھی عوام کو چٹپٹی اور مسالے دار اور ہر قسم کی جھوٹی سچی خبریں مہیا کرتے تھے۔ نظموں کا معیار پست تھا لیکن وہ عوام پسند ضرور تھیں۔ مزاحیہ کالم بعض اچھے بھی تھے لیکن ان میں بھی صرف ایک ہی بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ عام لوگ انھیں پسند کریں۔ چنانچہ اگرچہ یہ سب اخبار مسلمانوں کو بُرا بھلا کہتے تھے، مسلمان لیڈروں کو گالیاں دیتے تھے لیکن اس کے باوجود بہت سے مسلمان انھیں خریدتے تھے۔ سنجیدہ اور مدلل صحافت کی نمائندگی انقلاب، احسان، شہباز (دورِ اوّل میں) اور نوائے وقت کرتے تھے۔ نوائے وقت کی اشاعت آخری سالوں میں کافی بڑھ گئی لیکن سنجیدگی کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے۔ ہندو اخباروں کے پاس سرمایہ زیادہ تھا اس لیے وہ خبر رسانی کے زیادہ ذرائع حاصل کر سکتے تھے۔ نیز سنڈے ایڈیشنوں پر زیادہ روپیہ صرف کر سکتے تھے۔ مسلمان اخبار سوائے سے محروم تھے اس لیے ان کے سنڈے ایڈیشن اُتنے دلچسپ نہیں ہوتے تھے۔

تقسیم سے پہلے اُردو کی ہفت روزہ صحافت نہ ہونے کے برابر تھی البتہ "شیرازہ" اس کلیّے سے مستثنٰی تھا۔ یہ مزاحیہ ہفت روزہ مولانا چراغ حسن حسرت نے نکالا اور اس میں ملک کے تمام نامور مزاح نگار لکھتے تھے۔ مولانا سالک ایک عرصے تک اس میں "حوادث و افکار" لکھتے رہے۔ غیر مزاحیہ ہفت روزہ جرائد میں "خیام" نمایاں تھا جسے شبلی بی کام مرتب کرتے تھے۔

اُردو رسائل کی دنیا خوب پُر رونق رہی۔ جنگِ عظیم کے بعد "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کا ایک عرصے تک غلغلہ رہا۔ ان دونوں رسائل میں ملک کے مشہور ادیب اپنی نگارشات بھیجتے تھے۔ ان دونوں کے سالنامے اور عید نمبر اور دوسرے خاص نمبر بہت شاندار ہوتے تھے اور ان میں ملک بھر کے ادیبوں کی تازہ ترین تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان میں تصاویر بھی ہوتی تھیں۔ عام طور پر استاد اللہ بخش اور عبدالرحمٰن چغتائی کے شاہکار انہی رسالوں میں آتے تھے۔ "نیرنگِ خیال" کے مدیر حکیم یوسف حسن تھے بلکہ ہیں۔ کیونکہ یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے اور "عالمگیر" کے حافظ محمد عالم۔

"نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کے بعد "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" نمایاں ہوئے۔ "ہمایوں" کے مدیر میاں بشیر احمد تھے۔ آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ نہایت ہی شائستہ قسم کا ادبی رسالہ تھا جس کے ادارۂ تحریر سے مولانا حامد علی خان، حفیظ ہوشیارپوری اور ابتدا میں مولانا تاجور نجیب آبادی منسلک رہے تھے۔ اس رسالے میں ایک عکسی تصویر ہوتی تھی۔ "جہاں نما" کے زیرِ عنوان مہینے بھر کی خبروں کا اختصار دیا جاتا تھا۔ حالاتِ حاضرہ پر چند ٹھوس شذرے دیے جاتے تھے۔ چند افسانے، چند علمی مضامین، غزلیں اور نظمیں اور تراجم اور کتابوں پر تبصرے۔ یہ رسالہ چند سال ہوئے بند ہو گیا۔ "ادبی دنیا" مولانا تاجور نجیب آبادی نے جہازی سائز پر نکالا۔ اس کے بعد اسے منصور احمد مرحوم اور مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا۔ یہ رسالہ نہایت خوبصورت تھا۔ اس میں بھی ہر مہینے ایک اعلیٰ درجے کی عکسی تصویر دی جاتی تھی۔ حالاتِ حاضرہ پر مقالے درج ہوتے تھے۔ آخر میں ہم عصر رسائل سے اقتباس دیے جاتے تھے اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ایک ادبی رسالے کے لیے ضروری ہے۔ دوسری

عالمی جنگ نے اس کی صورت بگاڑ کر رکھ دی۔ اگرچہ مواد کا معیار بدستور بلند رہا اور پاکستان بننے کے بعد اب یہ رسالہ سہ ماہی ہو گیا ہے اور حسنِ ادارت اور مواد کی پاکیزگی اور بلند معیاری پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد کا ذوق بدستور جوان ہے۔

جب ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی تو "ادبِ لطیف" اور "سویرا" نمایاں ہوئے۔ ان دونوں رسالوں میں ملک بھر کے ترقی پسند ادیب لکھتے رہے اور اب بھی لکھتے ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے "سویرا" نے ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ "ادبِ لطیف" کی ادارت پہلے جناب احمد ندیم قاسمی کرتے تھے، آج کل میرزا ادیب ایڈیٹر ہیں۔ ان دونوں رسائل نے نئے انداز کی افسانہ نگاری شاعری اور تنقید کو فروغ دینے میں بڑی مدد دی ہے۔

تقسیم کے بعد اُردو صحافت

جب پاکستان بنا تو لاہور کے تمام غیر مسلم اخبار یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور یہاں صرف چار اُردو اخبار رہ گئے۔ "زمیندار"، "انقلاب"، "احسان" اور "نوائے وقت"۔ ان میں "زمیندار" سب سے کثیر الاشاعت تھا اور اس کی یہ حیثیت ۱۹۵۳ء تک رہی۔ "نوائے وقت" اشاعت میں اس کے بعد تھا لیکن یہ بڑا صاحب اقتدار اور با اثر اخبار تھا۔ "احسان" کی اشاعت درمیانہ درجے کی تھی لیکن اپنی غیر ہر دلعزیز پالیسی کی وجہ سے ایسا گرا کہ پھر نہ سنبھلا اور اب محض "ڈمی" کے طور پر جاری ہے۔ "انقلاب" کی اشاعت ڈھائی تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے "اپوزیشن" کی صورت اختیار کی لیکن حالات ناساعد تھے، حکومت مغربی پنجاب نے اس کے اشتہار بند کر دیے بلکہ کاغذ کا کوٹا دینا بھی بند کر دیا۔ حکومت سرحد نے قیوم وزارت پر نکتہ چینی کی وجہ سے سرحد میں اس کا داخلہ بند کر دیا۔ اُدھر ہندوستان نے بھی اس کا داخلہ ممنوع کر دیا۔ ایک طرف یہ مصائب تھے۔ دوسری طرف سرمایے کی کمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نومبر ۴۹ء میں یہ بند ہو گیا اور اُردو صحافت کے قارئین سالک کے افکار و حوادث اور مہر کے اداریوں سے محروم ہو گئے۔

پاکستان بنتے ہی لاہور میں ضمیموں کی وبا شروع ہوئی۔ جس کے پاس پچاس ساٹھ روپے کا اثاثہ ہوتا تھا، وہ ایک ضمیمہ نکال لیتا تھا جس میں چند جھوٹی سچی سنسنی خیز خبریں، دو ایک سستے سے اشتہار اور ایک آدھ لچر سا افتتاحیہ ہوتا اور بس۔ مہاجر آ رہے تھے اور ان کی دلخراش داستانیں سننے کو ہر شخص کا جی چاہتا تھا اور ان ضمیموں نے جھوٹی سچی داستانیں چھاپیں اور اشاعتیں بڑھائیں۔ لیکن ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بے شمار ضمیمے نکل آئے اور مقابلہ اتنا سخت ہوا کہ تقریباً سب ختم ہو گئے۔

کئی نئے اخبار وجود میں آئے مثلاً "آغاز" جسے ملک احسان الٰہی نے شروع کیا۔ "طاقت" جس کے مالک علی محمد برق تھے۔ وقار انبالوی نے "سفینہ" جاری کیا۔ شریف حسین سہروردی نے بڑی سج دھج سے "مغربی پاکستان" نکالا۔ احرار کے اخبار "آزاد" کا احیاء ہوا۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے "قاصد" اور "تسنیم" نکلے جن کی ادارت مولانا نصر اللہ خان عزیز کرتے تھے۔ موصوف پہلے "مدینہ" (بجنور) کے مدیر تھے، یہاں آ کر پہلے "زمزم" جاری کیا اور اس کے بعد "قاصد" و "تسنیم" ——— "نوائے پاکستان" کو مولانا مرتضیٰ احمد خان ایڈیٹ کرنے لگے۔ روزنامہ "خاتون" برِ اعظم میں عورتوں کا واحد روزنامہ تھا جس کی ادارت مشہور قومی کارکن فاطمہ بیگم (منشی فاضل) کرتی تھیں۔

لاہور کے نئے اور اہم اخبارات میں "امروز" کا نام سرِ فہرست ہے۔ یہ اخبار پروگریسو پیپرز لمیٹڈ نے مولانا چراغ حسن حسرت کی ادارت میں نکالا۔ محمد سرور (جامعی) اور ایوب کرمانی ان کے معاون تھے۔ ان تین حضرات کے علاوہ "امروز" کے تمام

کارکن صحافی تعلیم یافتہ نوجوان لیکن نومشق صحافی تھے۔ انھیں حسرت کی تربیت میسر آئی اور حسرت جدید انداز صحافت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ یہ اخبار ظاہری ٹیپ ٹاپ کے لحاظ سے ایک واقعی نیا اور مختلف اخبار معلوم ہوتا تھا۔ ایک عرصے تک "امروز" کی اشاعت محدود رہی۔ "پاکستان ٹائمز" کی اشاعتی مشینری کی مدد کے باوجود اس کی اشاعت بڑھنے نہ پائی۔ غالباً چھ ہزار ہی رہی۔ اس کے بعد حسرت صاحب نے استعفٰے دیا۔ سرور صاحب پہلے نکل چکے تھے اور جناب احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر بن گئے۔ اتنے میں ختم نبوت کی تحریک کے رہنماؤں کی تصاویر چھاپ کر "امروز" کی اشاعت خود حاصل کر لی۔ یہیں سے اس کی وسیع اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب پروگریسیو پیپرز پر حکومت نے قبضہ کر لیا تو احمد ندیم قاسمی مستعفی ہو گئے اور مدیر معاون جناب ظہیر بابر اس کے مدیر بن گئے۔

"آفاق" بھی اس دور کا ایک اچھا روزنامہ تھا۔ اس کے مدیر محمد سرور تھے اور عملے میں اچھے اچھے کارکن صحافی موجود تھے۔ جن دنوں "آفاق" نکلا۔ "نوائے وقت" دولتانہ وزارت سے برسرپیکار اور اس کے زیرعتاب تھا۔ "نوائے وقت" سے ضمانت طلب ہوئی۔ ایک تکنیکی غلطی کی بناء پر دولتانہ وزارت نے اس کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا اور ایک بڑی زیادتی یہ کی کہ "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن کسی اور صاحب کو دے دیا۔ یہ ایک ایسی زیادتی تھی جس کی مثال تاریخ صحافت میں نہیں ملتی۔ "نوائے وقت" نے "جہاد" کے نام سے ایک اور اخبار نکال لیا۔ اس پرچھاپہ خانہ والوں پر دباؤ ڈالا گیا اور انھوں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نوائے وقت پبلی کیشنز نے "نوائے پاکستان" کا ڈیکلریشن استعمال کیا۔ آخر حکومت کو عقل آئی اور "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن لوٹا دیا گیا۔ "نوائے وقت" کی یہ طویل ابتلاء "آفاق" کے آڑے آئی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا چنانچہ "آفاق" کی اشاعت بڑھ گئی لیکن جب "نوائے وقت" دوبارہ نکل آیا تو اس نے اپنی کھوئی ہوئی اشاعت دوبارہ حاصل کر لی اور "آفاق" کی اشاعت مختصر ہو کر رہ گئی۔ سرور صاحب یہاں سے نکل گئے اور "آفاق" کی شہرت کو اس بات سے سخت نقصان پہنچا کہ دولتانہ وزارت نے ختم نبوت کی تحریک کے دوران اس کی ضرورت سے زیادہ سرپرستی کی اور آخر اس مرتے ہوئے اخبار کو مشہور صنعت کار سعید سہگل نے سہارا دیا۔ میر نور احمد مینجنگ ایڈیٹر اور مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر مقرر ہوئے لیکن مولانا مہر کو اس کی فضا راس نہ آئی اس لیے وہ الگ ہو گئے۔ بہرحال اس پرچے کی اشاعت محدود رہی۔ آخر سعید سہگل اس سے اتنا تنگ آئے کہ انھوں نے یہ پرچہ کارکن صحافیوں کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کر دیا۔ انھوں نے کمپنی بنالی۔ پھر میر نور احمد صاحب نے اپنے حصے بیچ دیے اور حصہ داروں میں جھگڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرچہ ہی بند ہو گیا۔ بہرحال چند روز تک اس کا اجراء ہونے والا ہے۔

جن دنوں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" خواجہ نذیر احمد صاحب کی ملکیت تھا۔ اس کے اہتمام میں "ملت" کے نام سے ایک اور روزنامہ جاری ہوا۔ جس طرح "امروز" نے اُردو صحافت کی تکنیک میں بعض خوبیاں پیدا کیں، اسی طرح "ملت" نے بھی تکنیکی پہلو سے اُردو صحافت کو آگے بڑھایا۔ یہ اخبار کافی عرصہ قسمتِ علمی و ادبی کو "آف سیٹ" پر چھاپتا رہا۔ نیز اُردو اخبارات میں اس لحاظ سے اولیت حاصل ہو گئی کہ اس نے اخباری تصاویر کو مستقل فیچر بنا دیا۔ بہرحال یہ اخبار بھی نہ چل سکا اور اسے بند کرنا پڑا!۔

پچھلے چند سال میں لاہور کی اُردو صحافت میں نمایاں ترین اضافہ "کوہستان" کا ہوا۔ یہ اخبار پہلے راولپنڈی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر اعلیٰ مشہور ناول نگار جناب نسیم حجازی ہیں۔ موصوف پہلے "تعمیر" (راولپنڈی) کے مدیر تھے، وہاں سے الگ ہوئے تو "کوہستان" نکال لیا اور پھر "کوہستان" کا لاہور ایڈیشن شروع کیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں لاہور کی صحافت کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ اس کے آنے سے پہلے لاہور میں "نوائے وقت" اور "امروز" کثیر الاشاعت اخبار تھے اور دونوں اپنی اشاعت ایک دوسرے سے زیادہ بتاتے تھے بہرحال

دونوں نہایت متین اور سنجیدہ اخبار تھے اور دونوں میں سے کسی نے اشاعت بڑھانے کے مقابلے میں سنسنی خیزی کو اختیار نہ کیا۔ "کوہستان" نے ایک طرف اسلامی اقدار سے وابستگی اختیار کی اور اتوار کی قسمتِ علمی و ادبی کے علاوہ ایک "اشاعتِ ملی" کا اضافہ کیا۔ دوسری جرائم کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر دینا شروع کیا۔ اس لیے اس کی اشاعت بڑھنے لگی۔ پہلے تو "نوائے وقت" اور "امروز" نے اس مقابلے سنجیدہ مقابلہ نہ سمجھا لیکن جب "کوہستان" نے آٹھ صفحے کر دیے تو اس سے ان دونوں اخباروں کی اشاعت پر اثر پڑا۔ چنانچہ "امروز" نے باوجود بڑی تقطیع کے آٹھ صفحے کر دیے۔ اُدھر "نوائے وقت" نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر کوہستان نے پہلے دو اور پھر چار صفحے "وین ڈائک" پر چھاپنے شروع کیے جس میں ایک تو چھپائی زیادہ خوبصورت اور صاف ہوتی ہے، دوسرے تصاویر کے لیے ڈبل پرنٹنگ (دوہری چھپائی) کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس پر "امروز" نے دو صفحے "آف سیٹ" پر چھاپنے شروع کر دیے۔ اس طریقِ طباعت میں اور بھی زیادہ حسن ہوتا ہے نیز کھیلوں اور تجارت کے لیے انگریزی اخباروں کی طرح الگ صفحے مخصوص کر دیے اور ہفتہ وار اشاعت میں دو صفحے تصاویر کے دینے شروع کر دیے۔ "نوائے وقت" کو اگرچہ اپنے مستقل گاہکوں کی پائیدار وابستگی پر پورا بھروسہ تھا لیکن اسے مقابلے میں پیچھے رہنا منظور نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ہفتے میں دو مرتبہ خاص اشاعتیں چھاپنی شروع کیں اور ان میں "آف سیٹ" کا طریقِ طباعت اختیار کیا اور تصاویر بھی چھاپنی شروع کر دیں اگرچہ انھیں اخباری تصاویر نہیں کہا جا سکتا۔ اخباری تصاویر میں اصل مقابلہ "کوہستان" اور "امروز" ہی کے درمیان ہے۔ اب "کوہستان" نے ایک اور قدم آگے (یا پیچھے) بڑھایا۔ اس نے جرائم کی خبریں زیادہ تفصیل سے اور زیادہ چٹپٹے انداز میں دینی شروع کر دیں اور ملزموں مجرموں تھانیداروں، وکیلوں اور عدالت کے افسروں تک کی تصاویر چھاپنے لگا۔ یہاں "امروز" پیچھے رہ گیا کیونکہ وہ اس مزاج کا اخبار نہیں ہے اور "نوائے وقت" تو شاید کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "کوہستان" اشاعت کی دوڑ میں بازی لے گیا۔ بہرحال اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باقی دونوں سے بہتر اخبار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے اُردو اخباروں میں اسی قسم کا مقابلہ شروع ہے جو اس صدی کے پہلے رُبع میں لندن کے قومی اخباروں میں ہوا تھا۔ وہاں نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اخبارات دو حصوں میں بٹ گئے۔ "پُروقار" اخبار اور "ہردلعزیز" اخبار۔ "پُروقار" اخباروں کی اشاعتیں محدود ہیں کیونکہ ان کا معیار اعلیٰ ہے، وہ سنجیدگی پسند کرتے ہیں اور انھیں تعلیم یافتہ اور ہوشمند اور ذہین طبقہ پڑھتا ہے اور ظاہر ہے ایسے طبقے کی تعداد کم ہوتی ہے۔ بہرحال ان کی قوتِ خرید زیادہ ہوتی ہے اس لیے اشتہاروں کے معاملے میں یہ اخبار گھاٹے میں نہیں رہتے۔ ان کے مقابلے پر "ہردلعزیز" اخبار ہیں۔ ان کا معیار عام پسند ہوتا ہے۔ انھیں سنجیدگی سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا اور یہ خبریں ایسی پیش کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر نیم تعلیم یافتہ لوگ مزا لیتے ہیں۔ بین الاقوامی خبریں "پاپولر" انداز میں اور اختصار سے دیتے ہیں۔ گویا نیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق۔ ان اخباروں کی اشاعتیں بے انتہا ہیں، یعنی تیس لاکھ اور پینتالیس لاکھ کے درمیان۔ ان کے قارئین کی قوتِ خرید کم ہوتی ہے لیکن چونکہ اشاعتیں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے انھیں بھی اشتہاروں سے بہت آمدنی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تقسیم اتنی واضح نہیں کیونکہ نہ "کوہستان" مکمل طور پر "ہردلعزیز" اخبار بنا ہے نہ "امروز" اور "نوائے وقت" کاملاً "پُروقار" اخبار بنے ہیں۔ بہرحال رجحان واضح ہے۔

فنی لحاظ سے لاہور کی اُردو صحافت کا تقسیم سے پہلے کی صحافت سے مقابلہ کریں تو چند نمایاں حقیقتیں اُبھرتی ہیں جو مختصر طور پر یہ ہیں ——

۱۔ خبروں کی بہم رسانی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ تمام اچھے اخبار زیادہ سے زیادہ ملکی اور غیر ملکی ایجنسیوں کی سروس لیتے ہیں

ہر اخبار کے چند مقامی نامہ نگار اور فیچر نگار ضرور ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں اور بعض حالات میں غیر ممالک میں بھی اُردو اخباروں کے نامہ نگار مقرر ہیں۔

۲۔ تقسیم سے پہلے خبروں کے صفحات کا میک اَپ بدصورت ہوتا تھا۔ نئے میک اَپ کا آغاز قومی آواز (لکھنؤ) سے شروع ہوا۔ تقسیم کے بعد "انقلاب" نے اسے اختیار کیا، پھر "امروز" نے اسے رواج دیا اور بہت جلد تمام اُردو اخبارات نے نیا انداز قبول کر لیا۔

۳۔ تقسیم سے پہلے اُردو اخبار عموماً سیاسی مباحث پر اداریے چھاپا کرتے تھے اب ہر قسم کے موضوع پر لکھے جاتے ہیں۔

۴۔ تقسیم سے پہلے اُردو صحافت پر ایسے اخبار نویس چھائے ہوئے تھے جو بیک وقت ادیب اور صحافی تھے اس لیے صحتِ زبان کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اب صحافیوں کی غالب تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ادیب نہیں محض اخبار نویس ہیں اس لیے صحتِ زبان کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے البتہ "خبریت" ضرور بڑھ گئی ہے۔

۵۔ اداریہ نگاری میں ترقی اور تنزل دونوں کے آثار ملتے ہیں۔ ترقی اس لحاظ سے کہ موضوعات متنوع ہو گئے ہیں اور اداریے مختصر انداز میں لکھے جاتے ہیں اور تنزل اس لحاظ سے کہ سوائے ایک آدھ استثنے کے اداریے پُرمغز نہیں ہوتے۔

۶۔ اخبارات اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خبروں، ان کے پس منظر اور اداریوں اور خصوصی مضامین کے علاوہ بچوں، عورتوں، طلباء، دیہاتیوں، فلمی شائقین، ثقافت کے دلدادہ اور دین سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں سب کی دلچسپی کی چیزیں چھاپتے ہیں۔ اس کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی لیکن اس مقالے کی تنگ دامانی اس کی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

۷۔ اخباری تصاویر یعنی وہ تصویریں جو خبروں کے ساتھ ساتھ چھپیں تقسیم سے پہلے نہیں ہوتی تھیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ پڑھنے والوں کا مواد کم ہو رہا ہے۔

۸۔ مزاحیہ کالم نویسی کی رسم جاری ہے۔ بعض کالم نگار اچھا لکھتے ہیں لیکن سالک، حسرت والی بات نہیں۔ نئی صحافت نے کوئی خاص طور پر نمایاں مزاحیہ کالم نویس پیدا نہیں کیا۔

صحافت کی دنیا میں چند اور اہم تبدیلیاں بھی مختصراً یوں پیش کرتا ہوں :-

۱۔ اخبارات کے "زنجیرے" (CHAINS) معرضِ وجود میں آ رہے ہیں مثلاً پاکستان ٹائمز، امروز (جو لاہور اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے) لیل و نہار، سپورٹس ٹائمز اور ایشیا میگزین ایک ہی ملکیت میں ہیں۔ نوائے وقت لاہور، راولپنڈی اور ملتان اور قندیل کا الگ زنجیرہ ہے۔ کوہستان لاہور، راولپنڈی اور ملتان بھی زنجیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ اخبارات انفرادی ملکیت سے نکل کر جائنٹ سٹاک کمپنیوں کی ملکیت میں آ رہے ہیں مثلاً مطبوعات نوائے وقت، پروگریسو پیپرز، آفاق، سول، کوہستان۔

۳۔ صحافت میں اُردو ٹائپ کے رواج کا امکان اب ختم ہو چکا ہے کیونکہ لیتھو کی جگہ آفسٹ طباعت لے رہی ہے اور اسی کا مستقبل روشن ہے۔

۴۔ صحافتی بورڈ کے ایوارڈ نے اُردو اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں کو انگریزی صحافیوں کے برابر حیثیت دلا دی ہے۔ اگر اس ایوارڈ پر پورا عمل ہوا تو اگرچہ اخبارات کی تعداد گھٹ جائے گی لیکن اُردو صحافیوں کا مجموعی طور پر ضرور بھلا ہو گا۔

تقسیم سے پہلے لاہور سے صرف ایک ہفت روزہ اخبار "خیام" نکلتا تھا جسے قابلِ ذکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب ہفت روزہ صحافت نے بھی ترقی کی ہے اور چٹان، اقدام، قندیل، لاہور اور لیل و نہار اچھے ہفت روزے ہیں۔ ان میں چٹان، اقدام اور لاہور تو محض ہر دلعزیزی کی بنا پر چل رہے ہیں۔ ان اخباروں میں بالترتیب شورش کاشمیری، م۔ ش اور ثاقب زیروی کو الگ کر دیجئے تو باقی کچھ بھی نہیں رہے گا۔ "قندیل" سکولوں اور کالجوں کے طلبا اور طالبات اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہایت اچھا اخبار ہے لیکن "لیل و نہار" اس پر بھاری ہے۔ یہ نیوز میگزین بھی ہے اور ادبی ہفت روزہ بھی اور تصاویر اور طباعت کے لحاظ سے دنیا کے اچھے اچھے ہفت روزہ جرائد کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ادبی رسائل کی دنیا میں "نقوش" نمایاں اور بیش قیمت اضافہ ہے۔ اسے پہلے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور مرتب کرتے تھے۔ پھر وقار عظیم آئے اور اس کے بعد محمد طفیل صاحب کے زمانے میں اس نے اپنے عظیم اور شاہکار نمبر پیش کیے لیکن شاید "نقوش" کے بارے میں اس سے زیادہ اسی رسالے میں لکھنا موزوں نہ ہو اور شاید طفیل صاحب اسے پسند نہ کریں۔ رسائل کی دنیا میں ایک اور رسالے "اردو ڈائجسٹ" کا ذکر ضرور کروں گا کیونکہ یہ پرانی ڈگر سے الگ ہے اور ہر قسم کی معلومات پیش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ہے۔ ہمارے ادبی رسائل میں ایک کمی مجھے بہت کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان رسائل میں صرف "ادب" موجود ہوتا ہے حالانکہ ایک رسالے میں مصوری، موسیقی، عکاسی، سنگ تراشی اور دوسرے فنونِ لطیفہ پر مضامین بھی آنے چاہئیں بلکہ حالاتِ حاضرہ پر اور معاشرتی علوم اور عمرانیات پر مقالے بھی آئیں تو بہتر ہے کیونکہ ان موضوعات پر الگ رسالے موجود نہیں ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا جائزہ لاہور میں اردو صحافت کے ۱۱۲ سالوں کا، مجھے ہرگز یہ دعوےٰ نہیں کہ یہ جامعیت کا حامل ہے کیونکہ ایک مقالے کے اندر اردو صحافت کے اتنے طویل عرصے کی داستان قلمبند کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال میں نے چند نمایاں نقوش پیش کر دیے ہیں۔

فارسی گو شعرا

خواجہ عبدالحمید یزدانی ایم اے

پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان و ادب کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یوں تو اس سے بھی پہلے اس برصغیر اور ایران کے درمیان تعلقات قائم تھے، لیکن وہ محض تجارتی تھے۔ البتہ محمود غزنوی کے حملے ایران و ہند کے ثقافتی و ادبی تعلقات کے آغاز کا سبب بنے۔ بعض ایرانی شعرا سلطان محمود کے ہمراہ یہاں آئے، اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ اس کے بعد جب پنجاب غزنوی قلمرو کا حصّہ ہو گیا، تو یہ روابط اور بھی زیادہ استوار ہو گئے۔ بعض ایرانی سپاہی یہاں آباد ہوئے۔ صوفیائے کرام کی آمد شروع ہو گئی۔ اور شعر و سخن کی مجلسیں قائم ہوئیں۔ لاہور چونکہ اُن دنوں پایۂ تخت تھا، اس لیے غزنوی سلاطین کی علم دوستی اور داد و دہش کے باعث یہاں وہی غزنی کی سی علمی و ادبی فضا قائم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ، بقول جناب سعید نفیسی، لاہور ان دنوں "غزنیِ خورد" کے نام سے مشہور تھا۔ (لاہور کو ایک اور بہت بڑا فخر یہ بھی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی سب سے پہلی نثری تصنیف، کشف المحجوب از حضرت علی ہجویریؒ یہیں لکھی گئی)۔ اس دور میں دو ایک چوٹی کے فارسی گو شاعر یہاں پیدا ہوئے۔ اور اگرچہ غزنوی عہد کے بعد بھی فارسی شعر و ادب اس برصغیر میں خوب پھلا پھولا، لیکن اس دوران جتنے خاندان برسرِ اقتدار آئے اُن سب نے لاہور سے ہٹ کر ملتان اور دہلی وغیرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اس لیے زیادہ تر انھی علاقوں میں فارسی شعر کو فروغ ہوا۔ اور لاہور اپنی مرکزیت کھونے کے سبب فارسی کا کوئی اچھا شاعر پیدا نہ کر سکا۔ اور اگر اس بہت بڑی مدت میں (خاتمۂ عہدِ غزنوی سے آغازِ دورِ اکبری تک) یہاں کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا بھی ہوگا، تو اس بارے میں معلومات دستیاب نہیں۔ ہاں اکبری دور میں آ کر ہمیں پھر لاہور کے بعض اچھے شعرائے فارسی کا پتہ چلتا ہے اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس مقالہ میں ایسے ہی شعرا کا تذکرہ مقصود ہے۔ اِن شعرا میں اکثر وہ ہیں جو یہیں لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی شاعری پھلی پھولی۔ کچھ ایسے ہیں جو باہر سے آ کر یہاں بس گئے اور جنھوں نے یہاں کی محافل کو اپنی شاعری سے گرمایا۔ اور چند ایک وہ ہیں جو کچھ عرصہ یہاں رہے، یا جن کا کسی نہ کسی طریقے سے لاہور سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا۔

روزبہ نکتی سدید الدین محمد عوفی نے لباب الالباب میں اس کا نام ابوعبداللہ لکھا ہے۔ اس کے قول کے مطابق یہ لاہور کے فارسی گو شعرا میں سب سے قدیم شاعر ہے۔ روزبہ نکتی سلطان مسعود بن محمود غزنوی (۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ

کے مداحوں میں سے تھا۔ اس لحاظ سے جیسا کہ ذبیح اللہ صفا نے لکھا ہے، یہ پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں حیات تھا۔ نمونۂ کلام ؎

به نرگس بنگری چون جام زرّین ... بزیر جام زرّین چشمه چشمه
تو گوئی چشم معشوقست مخمور ... ز ناز و نیکوی گشتند کرشمه

ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار :-

روی آن ترک نه روئیست و برِ او نه برست
که برین نار بہارست و بر آن گل بَبرست
بطرازی قد و خرخیزی زُلفین دراز
رستخیز ہمه خوبانِ طراز و خزرست
ور بجای مه و خورشید بود یار مرا
اندرین معنی ہم جای حدیث و نظرست
ماه که سرو قد و سیم تن و لاله رخست
ماه که نوش لب و نازبر و جعد ورست

ابوالفرج رُونی

عوفی نے اسے "العمید الاجل الکامل" وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ بقول اس کے رُونی کا مولد و منشا "خطہ لوہور" تھا۔ اسی طرح صاحب ہفت اقلیم نے بھی اس کا مولد لاہور ہی کو قرار دیا ہے لیکن تاریخ گزیدہ، آتشکدہ اور مجمع الفصحا کے مؤلفین کا کہنا ہے۔ کہ رُونہ خراسان یا اعمالِ نیشاپور سے تھا۔ ذبیح اللہ صفا نے اس قول کو درست مانا ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ رونی کی اصل رُونہ ہی سے سہی لیکن مسعود سعد سلمان کی مانند اس کا مولد و منشا لاہور ہی ہے۔

مسعود اور رونی کی آپس میں گہری چھنتی تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے مسعود کے ایک قطعہ سے جس میں یہ شعر آیا ہے:

بو الفرج شرم نایدت کاز خبث
در چنین حبس و بندم افگندی

یہ اندازہ لگایا ہے کہ مسعود کے زندانی ہونے کا ذمہ دار یہی ابوالفرج رونی ہے لیکن اس سلسلے میں صفا نے یہ لکھا ہے کہ رونی اس قدر اعلیٰ سرکاری عہدہ پر نہ تھا جو اسے قید کروا سکتا، بلکہ یہ تو دوسرا شخص ابوالفرج نصر بن رستم تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی صفا نے مسعود کے حالات میں خود اپنے اس قول کی تردید یوں کی ہے کہ اصولاً یہ بات بعید نہیں کہ رونی ان پرانے تعلقات کو ایک طرف رکھ کر مسعود کے زورمند دشمنوں سے مل گیا ہو۔ بہر حال رشید یاسمی مرحوم مرتب دیوانِ مسعود نے کسی اور شخص کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

درمغانِ پاک میں اس کا سنہ وفات ۴۸۲ھ[1] دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے ۴۹۲ھ[2] کے بعد اور صفا

---

[1] ارمغان پاک مطبوعہ تہران ص۱۔ [2] لے ہسٹری آف بہرام شاہ آف غزنی حاشیہ ص۳۸

نے سلما ۴۹۲ھ کے بعد لکھا ہے۔ رونی کا ایک مختصر سا دیوان روسی مستشرق چایکین نے شائع کیا ہے۔

رونی کی شاعری کا شہرہ ابراہیم بن مسعود (سنہ ۴۵۱ھ - سنہ ۴۹۲ھ) کے دربار سے متعلق ہونے پر ہُوا۔ یہ اپنے دَور کا بہت بڑا شاعر مانا گیا ہے۔ انوری جیسا بلند پایہ شاعر بھی اس کی شاعری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ ایک جگہ اپنے ممدوح کی مدح میں کہتا ہے :

ازمتانت خیل اقبالت چو شعر بُلفرج
وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

عوفی کا کہنا ہے کہ انوری نے اس کا تتبع بھی کیا ہے۔ اس نے شاعری میں ایک نیا طرز اختیار کیا۔ بقول صفا اس کے کلام میں عربی الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ اصطلاحات و افکار علمی اور نئی نئی تراکیب، استعارات و تشبیہات استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے علاوہ دِقّتِ خیالات اور مشکل ردیفیں بھی اس کے یہاں بہت ہیں۔ نمونۂ کلام :

بادبان برکشید بادِ صبا — معتدل گشت باز طبع ہوا
خاک دیبا شدست پرصورت — جانور گشته صورت دیبا
شاخ چون کرم پیله گوہر خویش — بر تند گرد تن ہمی عمدا
سبزه اندر حمایتِ شبنم — سر ز پستی کشید زی بالا
ابر بی شرط مهر و عقد نکاح — گشت حاصل بلؤلؤ لالا
اینک از شرم آن ہمی فگند — لؤلؤ نارسیده بر صحرا
چشمها برگشاده غنچۂ گل — تا ببیند جمالِ خسروِ ما

رُوی چون حاصل نکوکاران — زلف چون نامۂ گنهکاران
غمزه مانند آرزوی مُضر — در کمینگاه طبع بیماران
چہرہ اندر کرشمۂ چشمش — ذوقِ مستان و ہوشِ ہشیاران

مسعود اس کے باپ کا نام سعد بن سلمان تھا۔ عوفی اسے "العمید الاجل سعد الدولة والدین" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، اور یہ کہ وہ "از نوادر ایام و افاضل انام بود"۔ مسعود ایک مہاجر ایرانی خاندان سے تھا۔ اگرچہ عوفی اور تقی الدین کاشی نے اس کا مولد ہمدان بتایا ہے۔ لیکن شفق کا کہنا ہے کہ اصل اس کی ہمدان سے اور مولد لاہور ہے۔ اسی طرح صفا نے بھی لاہور ہی کو اس کی جائے ولادت قرار دیا ہے۔ کیونکہ مسعود نے اپنے اشعار میں خود کو اس شہر کا "فرزندِ عزیز" کہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے لاہور کا جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں اس سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے (ایسے اشعار اسی مضمون کے دوسرے حصے میں آئیں گے)۔ ہاں اتنا ہے کہ اس کے ابّ و جد کی اصل ہمدان سے تھی۔ اس کا باپ سعد خاندانِ غزنوی کے دَورِ اوّل میں بہت بڑے عہدے پر مامور تھا۔ سنہ ۴۲۷ھ میں جب مجدود بن مسعود

ہندوستان آیا، تو سعد اسی کے ساتھ چلا آیا۔ اور پھر یہاں لاہور میں مسعود پیدا ہوا۔ محمد قزوینی مرحوم نے اس کی تاریخ پیدائش ۴۳۸ھ اور ۴۴۰ھ کے درمیان نکالی ہے۔

مسعود کی شاعری کا آغاز بھی سلطان ابراہیم غزنوی ہی کے عہد میں ہوا۔ جب سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ۴۶۹ھ میں والیِ ہند ہوا، تو مسعود اس کے ندیموں کے ساتھ ہندوستان چلا گیا۔ جہاں اسے خاصی شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سیف الدولہ کو بقول شفق، کسی سوءِ ظن کی بنا پر والد کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ اس کے ندیموں کو بھی دھر لیا گیا۔ ادھر مسعود کو جو انہی دنوں بعض حکام کے ظلموں کے خلاف شکایت کرنے غزنی گیا ہوا تھا، بعض حاسدوں کی لگائی بجھائی کے باعث زنداں میں ڈال دیا گیا۔ چنانچہ سات سال تک سو اور دہک کے قلعوں میں اور تین سال تک قلعہ نائی میں محبوس رہا۔ اس کا ذکر اس کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔ رشید یاسمی کا کہنا ہے کہ جو شخص اس کے قید ہونے کا باعث بنا وہ ایک شاعر رشیدی تھا۔ بہر حال اس دس سال کے عرصے میں مسعود نے سلطان ابراہیم کے کئی ایک قصیدے لکھے۔ آخر سلطان کے ایک مقرب عمید الملک کی سفارش پر اس کی رہائی ہوئی۔ رہائی کے بعد یہ اپنے باپ کی جاگیر پر چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بونصر پارسی وزیر امیر عضد الدولہ بن مسعود غزنوی نے اسے جالندھر کی حکومت عطا کی۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد بونصر معتوب و مغضوب ہوا۔ اور اس کے ساتھ مسعود کو بھی معزول کر کے مرنج میں قید کر دیا گیا۔ جہاں سے ۵۰۰ھ میں ایک امیر کی سفارش پر اس کی رہائی ہوئی۔ یہاں آٹھ سال قید کاٹی۔ ۵۱۵ھ میں بعمر اسی سال وفات پائی۔

مسعود درجۂ اول کے قصیدہ گویوں میں سے تھا۔ عوفی نے اس کے تین دیوانوں عربی، ہندی اور فارسی کا ذکر کیا ہے۔ فارسی کا دیوان رشید یاسمی مرحوم نے مرتب کر کے تہران سے شائع کیا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی مشہور تصنیف مجمع النوادر (چہار مقالہ) میں مسعود کے حبسیات کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کی حبسیات بہت بلند اور بڑی فصاحت میں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنسو آنکھوں میں مچلنے لگتے ہیں۔ دولت شاہ کا کہنا ہے کہ مسعود کا دیوان عراق و طبرستان میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے کلام میں بقول صفا نئی نئی تراکیب و تشبیہات ملتی ہیں۔ نمونۂ اشعار:

چرا نگرید چشم و چرا ننالد تن ‏ ‏ کزین برفت نشاط و از آن برفت وسن
چنان بگریم کم دشمنان بہ بخشایند ‏ ‏ چو یاد م آید از دوستان و اہل وطن
سمر شوم ز غم و پیرہن بتن بدرم ‏ ‏ زبہر آنکہ نشان تنست پیراہن
ز رنج و ضعف بدان جایگہ رسید تنم ‏ ‏ کہ راست نایداگر در خطاب گویم من
صبور گشتم و دل در بر آہنین کردم ‏ ‏ بخاست آتش ازین دل چو آتش از آہن
نبود یارم از شرم دوستان گریان ‏ ‏ نکرد یارم از بیم دشمنان شیون
ز درد و اندہ ہجران گذشت بر من دوش ‏ ‏ شبی سیاہ تر از روی و رای اہرمن
نخفتہ ام ہمہ شب دوش و بودہ ام نالان ‏ ‏ خیال دوست گدای منست و نجم پرن

نشسته بودم کآمد خیال او ناگاه   چو ماه روی و چو گل عارض و چو سیم ذقن
مرا بیافت چو یک قطرهٔ خون جوشان دل   مرا بیافت چو یک تار موی نالان تن
ز بس که کند دو زلف و ز بس که راندم اشک   یکی چو دُرِّ ثمین و یکی چو مشکِ ختن
مرا و او را از چشم و زلف گرد آمد   ز مشک و لؤلؤ یک آستین و یک دامن
بنا گفت که از دیده بیش اشک مریز   بمهر گفتم کز زلف بیش مشک مکن
درین مناظره بودیم کز سپهر کبود
ز دوده ظلمت بنمود چشمهٔ روشن

در ماه چه روشنی که در روی تو نیست   در خلد چه خرمی که در کوی تو نیست
مشکِ ختنی چو زلف خوشبوی تو نیست   یکسر هنری، عیب تو جز خوی تو نیست

ای می لعل، راحتِ جان باش   طبع آزاده را بفرمان باش
روزگارم بخست، مرهم شو   درد مندم ز چرخ، درمان باش
بیتو بیجان نشست جام بلور   تن پاکیزه جام را جان باش
دلم از قحط مهر خشک شدست   بر دلم سودمند باران باش

اندیشه مکن بکارها دو بسیار   کاندیشهٔ بسیار بپیچاند کار
کاری که بر لعبت آید آسان بگذار   در تو آنی بکار دانان بسپار

حمید الدین مسعود بن سعد شالی کوب | عوفی نے اس کے متعلق صرف یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ وہ احرارِ خطۂ لاہور میں سے اور طبعِ ذکی رکھتا تھا۔ شاعری میں وہ عنصری اور رودکی کا ہم پلّہ ہے۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے لاہور میں ایک بزرگ سے سُنا کہ شالی کوب نے قلم کی صفت میں ایک قطعہ کہا جو "الحق لطیف و مشهور است"۔ وہ قطعہ یہ ہے :

حبذا ملک[1] همایون تو کآب چشمش   بی گمان دارد خاصیت آبِ حیوان
هست اسرار نهان در دل او بسیاری   تا نبرّی سرش پیدا نکند سرِّ نهان
دو زبان باشد نمام و درین نیست شکی   نیست نمّام چه گر هست مر او را دو زبان
گه گهی زار شود گر بد چون ابر بهار   از غم آنکه تنی دارد چون برگ خزان
بخورد مشک پس از دیده فرو بارد دُر   مشک خوارے نبد بدم که بُود دُر باران
نکند هرگز در فضل و هنر یک دعوی
بیک بنماید از فضل و هنر صد برهان

۱؎ لباب الالباب مطبوعہ لیڈن جلد دوم ص ۲۴۱۔ دراصل یہ لفظ کلک ہونا چاہیے۔

خطیر الدین محمد بن عبدالملک عوفی نے اس کے فضل و براعت اور زہد و اتقا کی بے حد تعریف کی ہے اور اسے اپنے وقت کا ابو جنید شبلی اور جنید کہا ہے۔ لاہور کے مشائخ اور " افاضلِ اماثلِ جمہور" میں سے تھا۔ احوالِ روزگار کے متعلق اس کے یہ اشعار مشہور ہیں :-

گردش روزگار پُر عبر ست — نیک داند کسی کہ معتبر ست
چرخ پُر شعبدہ ست و پُر نیرنگ — ہمہ نیرنگہاش کارگر ست
ہست عمالِ آب و دریا، ابر — خاک را حقہ ہای پُر دُرّ است
اندرین روزگار نا سامان — ہر کہ با عاشقیست (؟) با ہنر ست
ہمچو روباہ ہست کشتہ دم — ہمچو طاؤس مبتلاء پر است
اختر و آخشیج بی جوہر ند — اگر این مادر ست و آن پدر ست
از چنین مادر و پدر چہ عجب — گر موالید ماندہ دربدر ست

ابن منہاج لاہوری اگرچہ جائے ولادت اس کی لاہور ہی ہے لیکن " منشا او سمرقند بود"۔ عوفی اسے ملک الکلام اور فصیح العجم کے القاب سے یاد کرتا ہے۔ وہ چمن محاورہ میں عندلیبِ فصاحت تھا۔ اور جب " در نوا آمدے حسان پیش فلماتِ حسانِ او بی نوا آمدی"۔ اس کے اشعار اپنے دور میں بڑے مشہور تھے۔ اس نے اپنے منشآت میں اپنی کئی ایک رباعیاں بھی درج کی ہیں، جن میں چند ایک یہ ہیں :

آن دل کہ ز ہجر ورد ناکش کردی — وز ہر شادی کہ بود پاکش کردی
از خوی تو آگہم کہ ناگہ ناگہ — آواز در افتد کہ ہلاکش کردی
دل را بر رخ خوب تو میل افتادست — جان دیدہ بر امید لبت بگشادست
چشم آب زند خاک درت خواہد بود — گر عمر وفا کند قرار این دادست

ابو جعفر عمر بن اسحاق لاہور کے ائمہ و علما میں سے تھا اور دانش و بزرگی اور فضل و کمال میں اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں بلاغت بہت ہے۔ عوفی لکھتا ہے کہ میں نے لاہور میں خواجہ ادیب شرف الدین احمد سے سُنا کہ جس وقت نجیب الملک شرف الخواص نے اس کا امتحان لینا چاہا تو اس سے ایسا قصیدہ لکھنے کو کہا جس کے ہر شعر میں چار جنسوں کا آنا لازم تھا۔ چنانچہ ابو جعفر نے ایسا قصیدہ کہا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

ای پاک ہمچو آب[1]، چو خاکم[2] مدار خوار — لطفی بکن چو باد[3] و مسوز این تنم چو نار[4]
داری قبای رومی و رومی تو ششتری[1] بیست[2] — واندام نو تمیز[3] ز خز و بز[4] ہزار بار
چشمت بسانِ نرگس و عارض چو نسترن[2] — رخسار ہمچو لالہ و لب ہمچون گل انار

انتخاب اشعار :

دوش در سودای دلبر بودہ ام — بالبِ خشک و رخ تر بودہ ام

در خمارِ عہدِ مخمورِ او / دیدہ باز از غم چو مخمور بودہ ام
وز نم چشم و تفِ دل ہر زمان / گوئی اندر آب و آذر بودہ ام
ہمچو بحر و کان ز آب و خون اشک / پُر ز دُر و پُر ز گوہر بودہ ام

فیضی | اکبری دَور کا گُل سرسبد فیضی پیدائش کے لحاظ سے اکبر آبادی ہے۔ لیکن اکبر سے وابستہ ہونے کے سبب کئی ایک سال لاہور میں بھی گزارے۔ اس کے علاوہ بقول عبدالغنی صاحب "میخانہ" اس کی وفات لاہور ہی میں ہوئی (بعد میں اس کی نعش آگرہ لے جا کر دفن کی گئی)۔ ۹۵۴ھ میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ مشہور عالم شیخ مبارک کا بڑا بیٹا اور ابوالفضل کا بڑا بھائی تھا۔ تعلیم و تربیت والد ہی سے حاصل کی۔ ایک موقع پر دشمنوں کی لگائی بجھائی کے سبب ان باپ بیٹوں کو عتاب شاہی کے خوف سے مختلف علاقوں میں چھپنا پڑا۔ بعد میں جب فضا ہموار ہوئی تو ۹۷۴ھ میں اکبر نے بڑے احترام سے دربار میں بلایا۔ دربار میں اس کی خاص عزت و تکریم ہوئی۔ وہ ایک مہم پر دکن بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اور آخر ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی۔ اکبر اسے شیخ جیو کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ بقول بدایونی مختلف فنون مثلاً شعر، معما، عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشا وغیرہ میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

خمسۂ نظامی کا جواب لکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ذکر خود ایک خط میں اس نے کیا ہے۔ لیکن وہ ایک ہی مثنوی یا دو مکمل کر پایا، باقی یا تو نامکمل رہیں یا صرف ان کے نام کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں موارد الکلم، سواطع الالہام (بے نقط تفسیر) وغیرہ اس کی تصنیفات ہیں۔ شاعری میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ نمونہ کلام:

ای ہمنفسان محفل ما / رفتید ولی نہ از دل ما
ما دست ز غم نہادہ بر سر / غم پای فشردہ در گل ما
دریای غمیم و گوہر اشک / کشتی کشتی بساحل ما

آن گمان خواب را بخلوت راز / چہ خبر از خروش "یارب ما"
ای فلک سوی او رہم بنمای / ورنہ آتش تو نم بکو کہما

درای غنچہ صدا مید بہ بانگ بلند / کہ کاروان چمن در کمینگہ تلف است

چہ شد کہ چشمۂ خورشید زرد می خیزد / ز صبح عیش نفسہای سرد می خیزد
ہزار غوطہ فلک را بخون زدیم و ہنوز / غبار از ین صدف لاجورد می خیزد
می ریخت بدامان من از غایت مستی / گر خون من دلشدہ می ریخت بحل بود

دو در جہان تمام شد و عدہ ہنوز پنہان / وہ چہ دراز کردہ ای سلسلۂ ہنوز را
بچشم عزیزان مرا خوار دارد / بہ پیرانہ سالی غم خرد سالان

انسی قندھاری | بابر کے ساتھ قندھار و ہند ہوا۔ واقعہ نویس تھا۔ بعد میں ہمایوں کے پاس بھی مختلف مناصب پر رہا۔ ۹۶۳ھ میں لاہور میں وفات پائی۔

سرشکم رفتہ رفتہ بی تو دریا شد تماشا کن ——— بیا در کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن
خنجر بمیان تیغ بکف چین بجبین باش ——— خونریز جفا پیشہ کن و بر سر کین باش

مُلا شیری

بدایونی نے لکھا ہے کہ پنجاب کے ایک قصبہ کوکووال کا رہنے والا تھا۔ لیکن صاحب طبقات اکبری نے اسے لاہوری لکھا ہے۔ اس کا باپ بقول بدایونی ایک مشہور اور بڑے قبیلے "ماجہان" میں سے تھا۔ والدہ سیدزادی تھی۔

مولانا یحییٰ کی خدمت میں تحصیل علم کی تھی۔ ملا نظام اور بدایونی دونوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ "عامی" تھا۔ لیکن بڑا عالی فطرت اور وضع ہموار کا مالک تھا۔ بقول ابوالفضل شاعری میں درک اکبر ہی کے سبب ہوئی۔ شعر گوئی میں پوری پوری مہارت تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے ایک رات میں تیس غزلیں کہیں۔ ملا نظام لکھتے ہیں "حدت طبعش بحدے بود کہ در اندک زمانے قصیدہ ترتیب داد"۔ بدایونی نے اس کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ معاصر شعرا میں سے کوئی بھی "تنکوبات" گوئی میں اس سے بہتر نہ تھا۔ اور قصیدہ و قطعہ گوئی میں تو معاصرین میں سب سے آگے تھا اور "دست فصاحت دیگران را بستہ، مہر سکوت بر دہان ناطقۂ ایشان نہادہ"۔ صاحب مآثر رحیمی کا کہنا ہے اس کا کلام ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ طبقات اکبری میں ہے کہ اس نے "نیر اعظم" کی مدح میں ایک ہزار اشعار کہے اور اس کا نام "شمع جہان افروز" رکھا۔ اس نے سنہ ۹۹۴ھ میں "کوہستان یوسفزئی" میں وفات پائی۔ نمونہ کلام :

در آن دلی کہ تو بی باد دیگری کردن ——— درون کعبہ پرستید نیست عزّی را
ہجوم ناز چنان گرد و پیش ناز گرفت ——— کہ راہ نیست در آن تنگنا تمنا را
بکف تیغ ستم از بہر قتلم نیز می آید ——— ز بیدادآنچہ می گویداز آن خونریز می آید
چرا ای اشک در چشم از وداع یار میگردی ——— کجا بودی کہ اکنون مانع دیدار میگردی

سراپا جانی ای باد صبا در قالب شوخم
سرت گردم مگر در کوی او بسیار میگردی

ایک قصیدہ سوال و جواب کے چند اشعار :

گفتم ایدل ز چہ اوضاع جہان گشت بدل ——— گفت خاموش کہ در مغز فلک رفتہ خلل
گفتم از چاہ امید آب تمنا نرسد ——— گفت کوتہ بود از وی رسن طول امل
گفتم آسایش اگر ہست بگو نیز کجاست ——— گفت در خواب نما بند لیں از خواب اجل
گفتم آیا نفسی شاد توان برد بسر ——— گفت تو نیست کہ ہرگز نہ در آید بعمل
گفتم آن یار چرا ابروی پر چین دارد ——— گفت با صاحب بدخو نتوان کرد جدل
گفتم آئینہ دانش ہمہ جا زنگ گرفت ——— گفت کو مصقلہ جود کہ گیرد صیقل
گفتم اہل سخن آرایش مجلس باشند ——— گفت اینہا نتوان گفت با رباب دول

گفتم افسوس ازیں مردم دُور از معنی — گفت فریاد ازیں قوم جفا جوی دغل
گفتم از بخت بتفصیل شکایت دارم
گفت بادشہنشاہ بگوی مجمل

عُرفی

محمد جمال الدین عرفی اکبری دَور کا ایک عظیم شاعر ہے۔ یوں تو اسے خود برصغیر ہند و پاک میں صرف چند سال گزارنے کا موقع ملا، لیکن اس کی زندگی کے آخری چند ایام لاہور میں گزرے اور یہیں اس سے وفات پائی، اس لیے یہاں اس کا تذکرہ کرنا کچھ مناسب ٹھہرا۔

عرفی کی پیدائش ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء اور تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی۔ شروع ہی سے شاعری کی طرف رغبت تھی۔ سب سے پہلے ۹۸۹ھ میں اس نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ایران کے دَورِ قیام میں اس نے کوئی چھ ہزار اشعار کہے جو ضائع ہو گئے۔ ۹۹۴ھ میں واردِ ہند ہوا۔ شروع میں فیضی سے تعلق رہا۔ جلد ہی حکیم ابوالفتح سے منسلک ہو گیا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی وفات پر عبدالرحیم خان خانخاناں کے پاس آ گیا۔ لیکن یہ تعلق مبارک ثابت نہ ہوا کیونکہ جلد ہی، یعنی ۹۹۹ھ میں موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے عین شباب میں آ لیا۔ بقول والہ داغستانی لاہور میں مدفون ہوا۔ اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا اور دفن کر دیں۔

صاحبِ طرز شاعر تھا۔ تمام تذکرہ نویس، خصوصاً صاحبِ مآثرِ رحیمی اور ملا بدایونی، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا دیوان گلی کوچوں میں لوگ بیچتے پھرتے ہیں اور عراق اور ہندوستان کے لوگ اسے تبرکاً خریدتے ہیں۔ انتخاب:

کلیدِ میکدہ ہا سا ہیں و ہیہہ کہ من — نہ آن کسم کہ باندازہ مست میگردم
فغان زغمزۂ شوخی کہ وقت تنہائی — بہانہ بجو دآغاز کردہ در جنگ است
طفیان نازبین کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نیمکنند
زِ بُت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابرُوئے — بحیرتم کہ دل برہمن زکف چون شد
ای آنکہ رفتہ ست عنانِ دلت از دست — یک لحظہ تماشائی آن دست و عنان باش

بیا ای عشق رسوائی جہانم کن کہ یکچندے
نصیحت ہای بیدردان شنیدن آرزو دارم

رفت آن آفت جان از برم اے ہوش بیا
تا بہ بینم کہ جفا بر سر ایمان رفتہ ست

خواجہ حسین ثنائی مشہدی

خواجہ حسین نام، ثنائی تخلص۔ مشہد کا رہنے والا تھا۔ ایران میں سلطان ابراہیم میرزا وغیرہ کی مدح میں کئی ایک قصائد لکھے۔ بقول بدایونی اس کے واردِ ہند ہونے سے پہلے ہی اس کے کلام سے یہاں کی محافل آراستہ ہوتی تھیں اور اس کے اشعار یہاں تبرکاً پڑھے جایا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ

یہاں آیا تو" آنہمہ شوق از حسد بفسردگی مبدل شد و درگوشۂ مجہولی افتادہ نشانۂ صد تیر اعراض بودہ" بہرحال اکبر نے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ اور اسی سبب سے ثنائی تا آخر عمر شاہی عنایت و نوازشات سے مستفید ہوتا رہا۔ تا آنکہ بقول صاحب میخانہ اس نے ۱۰۰۵ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ لیکن اس کی نعش بطور امانت کے دفن کی گئی اور بعد میں اس کے عزیز و اقارب نے اس کی ہڈیاں مشہد میں لے جا کر دفن کر دیں۔

اس کی شاعری کی تعریف سب تذکرہ نویسوں نے کی ہے۔ بدایونی کا کہنا ہے۔ کہ اس کا دیوان بہت مشہور ہے اور وہ غیر از توحید و موعظت وغیرہ کے تمام اقسام شعر میں طرفہ دستگاہ کا مالک ہے۔ عبدالنبی لکھتا ہے: "قصیدہ نادرہ گو، سخنوری پسندیدہ نکتہ دوست۔ اشعار آبدار آں سخن آفرین بغایت رنگین و حاردات بر کار آں معنی گزین بی نہایت متین است"۔ اسی طرح صاحب طبقات اکبری نے لکھا ہے کہ وہ اقسام شعر کو خوب اور استادانہ کہتا ہے۔ لیکن بدایونی نے تعریف کے بعد آخر میں لکھا ہے "قصیدہ ہای بلند دارد اما عبارت پست و ہمان مثل ست کہ:

خانہا شان بلند و ہمت پست

یارب این ہر دو را برابر کن

بقول صاحب میخانہ اس کے اشعار کا مجموعہ تین ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ (تذکرۂ حسینی میں "پانچ ہزار اشعار" لکھا ہے) اس کے علاوہ ایک مثنوی سکندر نامہ جو مثنوی (رومی) کی بحر میں تھی۔ اس نے ایک ساقی نامہ بھی لکھا تھا۔ جس کا ایک خاصا انتخاب "میخانہ" میں مندرج ہے۔

ثنائی نے خانخاناں کی مدح میں بڑے طویل قصائد لکھے۔

نمونۂ کلام:

قاصد شوق دگر قطرہ زنان می آید — کہ بدل شوق کسی از پی جان میآید

شرط شفقت کہ ہم باز بدل بسپارند — سخن دوست کہ از دل بزبان می آید

در حوصلۂ نہ فلک از عشق نگنجید — ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہ ہوا رفت

تذکرۂ حسینی میں اس کا یہ انتخاب درج ہے:

روزیکہ وقف روی تو کردم نظارہ را — دیدم بدامن این جگر پارہ پارہ را

خوشا خجلت آن عاشق کہ در شب ہجر — بخوابش آئی و از شرمسار برخیزد

نام قیامت مبر حرف ز محشر مگو — گردش بالین من در شب ہجران او

رباعی |
آزار گرفت بدر شہوار رسد — کی از ستم چرخ جفا کار رسد
تنگست دہان تو، از تنگی جای — ناچار لبسا کنانش آزار رسد

احسن | احسن اللہ خاں نام، ظفر خاں خطاب اور احسن تخلص۔ اسے بقول خان آرزو شاہجہانی دور کا رحیم خاں خانخاناں کہنا چاہیئے۔ مآثر الامرا کے مطابق اس کا باپ خواجہ ابوالحسن تربتی اکبری عہد میں خراسان سے وارد ہند ہوا۔ اور اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں مختلف مناصب پر فائز رہا۔ شاہجہان کے عہد میں شش ہزاری و شش ہزار سوار

کے منصب کے علاوہ اسے کشمیر کا علاقہ بھی ملا۔ اس کی وفات پر احسن مراحم خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ ویسے وہ جہانگیر ہی کے دور میں ظفر خاں کے خطاب اور کابل کی گورنری سے نواز اگیا تھا۔ اس کے بعد شاہجہان نے اسے ابوالحسن کی زندگی ہی میں کشمیر کا گورنر بنا دیا تھا۔ کچھ مدت یہ ٹھٹھہ کا حاکم بھی رہا۔ بقول آزاد اس کی آخری عمر لاہور میں گزری۔ اور بقول صاحب مآثر الامرا لاہور ہی میں اس نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی اور اپنے باپ کے مقبرے میں دفن ہوا۔

اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق مآثر الامرا میں ایک لطیفہ درج ہے اور وہ یہ کہ ایک دن بادشاہ کے حضور میں یہ مذکور ہوا کہ خواجہ ابوالحسن سارے دن میں ایک مرتبہ پانی پیتا ہے۔ ملا حقفلی حاضر تھے انھوں نے عرض کی کہ "قد قصیر ظفر خان ازین سبب تخم ندہ آبی ست"۔

احسن ورستی تدبیر اور رسائی و دانش میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس نے شعرا کی بھی بے حد قدر دانی کی۔ چنانچہ مآثر الامرا میں ہے کہ اس کی اسی قدر دانی اور فیاضی کے سبب "سخنوران صاحب استعداد ل از اوطان بر داشتہ روی امید بدرگاہش می گذاشتند"۔ صائب سے وہ مشق سخن کرتا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ خود صائب جیسا بلند پایہ شاعر اس کی شاعری کا مداح ہو گیا۔ اس کے علاوہ ظفر خاں نے جب کبھی صائب کے کلام میں کوئی خردہ گیری کی تو خود صائب نے اس کی داد دی۔ اس کے ذوق شاعری کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بیاض تیار کروائی جس میں اپنے عہد کے تمام شعرا کا کلام انہی کے ہاتھوں سے لکھوایا اور ساتھ ہر ایک کی تصویر منسلک کی۔ خود بھی صاحب دیوان تھا۔ دو مثنویاں میخانہ راز، اور لاہور، پنجاب وغیرہ کی تعریف میں بھی لکھیں۔

انتخاب کلام از سرو آزاد :۔

در گوشۂ میخانہ ہمین گفت و شنید ست — یاران برسانید دماغے شب عید است

گوشۂ چشمی اگر ساقی بما دارد بجاست — عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

شادم بدل شکستگی خود کہ پیش من
قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

دلم بکوی تو امید وار می آید — نگاہ دار کہ روزی بکار می آید

انتخاب کلام از کلمات الشعرا :

بہ تیغ بی نیازی نا توانی قطع ہستی کن
فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

از سبزہ تیغ بہ کمر گل بہار بست — گر تو بہ خضر وقت شوی جان نمی برد

نہ بہر مستیم کی کار با جام شراب افتد
مرا از گفتگوی بادہ سرخوش میتوان کردن

آشنا میرزا محمد طاہر المتخلص بہ آشنا ظفر خاں احسن کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن کی بیٹی تھی۔ ابھی سات سال ہی کا تھا جب شاہجہان نے اسے منصب سے نوازا۔ اس کے بعد ہزار و پانصدی کے منصب سے سرفراز ہوا۔ اور ساتھ ہی "داروغہ حضور" کا عہدہ، جو صرف خاندان کے معتبر اراکین کے لیے مخصوص تھا، پایا۔ شاہجہان نے ہمیشہ اسے اپنا ندیم خاص بنائے رکھا۔ عہدِ شاہجہانی کے آخر میں کتب خانۂ شاہی کا داروغہ مقرر ہوا۔ اگرچہ آخری عمر کشمیر میں گزاری لیکن لاہور سے بھی اس کا خاصا تعلق رہا ہے۔ عالمگیر کے دور میں اس کے لیے چوبیس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر تھا۔ بقول آزاد ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوا۔

شاہنواز خاں کے علاوہ دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ شاہنواز لکھتا ہے کہ معنی بندی اور سخن سنجی میں استاد ہے۔ تذکرہ نصر آبادی میں ہے کہ شاعری میں اسے بڑی قدرت تھی۔ سرخوش نے اس کی انشا پردازی کی بھی تعریف کی ہے۔

بڑا شوخ طبع تھا۔ چنانچہ صاحبِ تذکرہ نصر آبادی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے دوستوں، کلیم اصفہانی اور دوسرے شعرا کو گھر میں دعوت پر بلاتا اور کھانے کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی نشہ آور شے ملا دیتا۔

بقول آزاد بلگرامی اس کا دیوان قصائد، غزلیات، مثنویات اور دیگر اقسام شعر پر مشتمل ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں اس نے متعدد لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے شاہجہان کے تیس سالہ واقعات بھی قلمبند کئے، جو سرخوش کے لفظوں میں "از ملا حمید وغیرہ فصیح تر نوشتہ۔ اما بہ اعتقادِ فقیر از منطوقہ "خیر الکلام ما قل و دل" این نیز بہرہ نداشت"۔ انتخاب: ساقی نامہ کا ایک شعر:۔

حکیمانہ ساقی بہ مجلس نشست		چو انبض مینا بگیرد بدست

ہر دم نوید لطف دگر می دہد مرا		دل می برد ز دست و جگر می دہد مرا

کشتی بدست آور دنت کشت مہتاب است

مدعای میخواران سپہر عالم آب ست

گر پوستم چو نافہ کشد آسمان بجاست

مو شد سفید و تیرگیِ دل ہمان بجاست

ناقصان ہم بدرش چشم طمع دوختہ اند		کو رہ پیوستہ نظر جانب بالا دارد

چشم آن لحظہ کہ در ہجر تو بیدار شود		خار پشت مژہ ام غیرت گلزار شود

عقل ناچار کشد زحمت آلایش نفس		دایہ پرہیز کند طفل چو بیمار شود

ما بزندانِ غمت خو بانشستن کردہ ایم		گاہ گاہی نالہ برخیزد از زنجیر ما

لقمۂ چرب خوشامد نکند رام مرا		دلِ من از سگ کوی تو وفادار تر ست

از بسکہ دستِ من ز تعلق بریدہ است		رنگ گرفتہ را بہ حنا باز می دہد

ہر کجا بود مرا نشۂ صفت با خود داشت ہرگز می نتوانست کہ بیخود سازد

چشم بسان آئینہ در عیب خلق نیست

پیوستہ ہیچ عکس خودم در کمین خویش

منیر لاہوری | ابو البرکات نام منیر تخلص۔ ۱۲ رمضان المبارک ۱۰۱۹ھ کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ والد کا نام ملا آزاد بن عبد المجید ملتانی تک ہے لیکن محمد صالح کنبوہ نے عبد الجلیل ابن حافظ ابو اسحق لکھا ہے۔ جو درست ہے۔ منیر پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ بچپن ہی میں طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ چودہ سال کی عمر سے خود شعر کہنے لگے۔ فغانی، ثنائی اور انوری کی پیروی کی۔ شروع کا کلام چونکہ خامیوں سے پُر تھا اس لیے کوئی پندرہ ہزار اشعار کے قریب ضائع کر دیئے۔ ان کا موجودہ کلیات پچیس ہزار کے قریب اشعار پر مشتمل ہے۔

۱۰۴۸ھ میں منیر اکبرآباد گئے اور سیف خان کے ہاں ملازم ہو گئے اور دو سو بیس[۲۲۰] روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ سیف خاں نے ان کی بہت قدر دانی کی۔ اور ان کا زمانہ سیف کی صحبت میں نہایت مسرت و فارغ البالی سے گزرا۔ سیف جب بنگال گیا تو منیر بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور وہیں اپنی مثنوی در صفت بنگالہ لکھی۔ ۱۰۴۹ھ میں سیف خاں فوت ہو گئے تو یہ پٹنہ آ گئے۔ وہاں سے الہ آباد آئے پھر اعتقاد خاں نے انھیں جونپور بلوا لیا۔ جہاں چار روپیہ روزانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن جلد ہی یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ کیونکہ اعتقاد خاں نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ اور تنخواہ کم کر دی۔ آخر وہاں سے آگرہ چلے آئے۔ یہاں وہ دربار شاہی کے شعرا میں داخل ہو گئے۔ ۱۰۵۰ھ میں اپنے رقعات کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۰۵۲ھ میں شعرائے ہند کے حالات میں ایک تذکرہ لکھا۔ اس میں کچھ خامیاں رہ گئی تھیں۔ ان کی اصلاح کسی اور موقع پر اُٹھا رکھی۔ ۱۰۵۴ھ میں اصلاحیں کی گئیں۔ دیباچہ باقی تھا جسے محمد صالح نے ۱۰۷۰ھ میں پورا کر دیا۔ یہ تذکرہ بقول حافظ محمود شیرانی مرحوم بالکل مفقود ہے۔

منیر نے عین عالم شباب میں بعمر ۳۶ سال ۱۰۵۵ھ میں بمقام اکبرآباد وفات پائی۔ (آزاد نے ۱۰۵۴ھ لکھا ہے)۔ بقول آزاد بلگرامی نعش وہاں سے لا کر لاہور میں دفن کی گئی۔

ان کی شاعری کے بارے میں صالح لکھتا ہے کہ اگرچہ یہ لاہور میں پیدا ہوا لیکن اس کا کوکب بخت دقیقہ سنجی معانی میں اہل ایران سے بھی ہزار درجہ ارتقا پذیر ہوا۔ تذکرہ حسینی میں مرقوم ہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی پر دوسرے شعرا کی مانند اس نے بھی سکہ کہا جو بہت پسند کیا گیا۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر

شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اشرفی کی خاطر لفظ "بدر" کی بجائے "مہر" داخل کیا۔ عالمگیر جب اس سے محظوظ ہوا تو منیر کو انعام کی توقع ہوئی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ ہمارے سکے میں تم نے اپنا نام داخل کر لیا۔

منیر کی انشا بہت مشہور ہے اس کے علاوہ شاعری میں بھی اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ چنانچہ صالح لکھتا ہے:

"طبعش مانند ماہ چاردہ[۱۴] درست و روشن، در انگیزش معانی و پردازش خیالات

بی انبار، و در ابداع عبارات بدیعہ و مضامین عالیہ از سایر نکتہ وران ممتاز ؔ"

اسی طرح صاحب تذکرہ حسینی نے اسے " شاعر ماہر و منشی دلپذیر " لکھا ہے ۔ (اس کی مثنوی در صفت بنگالہ، ادارہ مطبوعات حکومت پاکستان نے شائع کی ہے) ۔

بشارت بادای دل، دلنوازی کردہ ام پیدا ۔۔۔ نگاری شوخ چشمی عشوہ سازی کردہ ام پیدا
سرم واند چو می سجدہ گری پرپرو بی ۔۔۔ ز طوف کعبہ و دیر احترازی کردہ ام پیدا

باز وقت آمد کہ از کیفیت فیض ہوا ۔۔۔ ابر گرد د نرد ماغ و گل شود رنگین ادا
مسطر ش از رشتۂ باران کند ابر بہار ۔۔۔ چون نگارد وصف گل بر کاغذ ابری ہوا
از تماشای چمن نظارہ رنگین می شود ۔۔۔ میتوان بستن کنون بہ پنجۂ مژگان حنا

کشتۂ آن شوخ بیباکم کہ در محشر منیر ۔۔۔ ہر نگاہِ تازۂ او خونبہای دیگر است

امشب نگاہ گرم تو " گرم آشنای " کیست ۔۔۔ رخسار دلفروز تو شمع سرای کیست
رفتار دلکشت رہِ ہوشش کہ می زند ۔۔۔ بالای تو بجلوہ فروشی بلای کیست
بی نور گشتہ دیدۂ آئینہ بی رخت ۔۔۔ اکنون خیال روی تو حیرت فزای کیست
ما خود بہ نیم ناز تو کردیم جان فدا ۔۔۔ چین جبین و عقدۂ ابرو برای کیست
صد دل شہید تیغ ادای تو گشتہ اند ۔۔۔ ناز و کرشمۂ تو، بگو، خونبہای کیست

پیش از کرشمۂ تو ستم در جہان نبود ۔۔۔ تا او نبود عربدہ جو در جہان نبود

رخت بدامن صبح آفتاب می ریزد ۔۔۔ لبت بجام تبسم شراب میریزد
بہار حسن ترا نازم ای بہشتی رو ۔۔۔ کہ دستہ دستہ گل اندر نقاب میریزد

من و آتش محبت تو و آتش جوانی ۔۔۔ من و عشق جاودانہ تو و حسن جاودانی
نہ مرا زبان شکوہ نہ ترا دہان خندہ ۔۔۔ من و رنج بی زبانی تو و قید بی دہانی

چو نسیم نوبہاری چو ہوای صبحگاہی ۔۔۔ سخنم بتازہ روئی، نفسم بگل فشانی
ز متانت و جزالت ہمہ لفظ و معنی من ۔۔۔ چو خرد بکہنہ سالی، چو ہوس بنو جوانی
چو روم سوی گلستان غزل مرا سرایند ۔۔۔ ہمہ بلبلان گلشن زدہ مزاج دانی

بیخود ملا محمد جامی تخلص بیخود ۔ سرخوش نے اسے لاہوری لکھا ہے ۔ بقول صاحب تذکرہ حسینی نامدار خان سے وابستہ تھا اسی وجہ سے سرخوش نے اسے نامدار خانی لکھا ہے ۔ صاحب دیوان اور شاعر غرا تھا ۔ اس کے قطعات و قصائد بقول سرخوش بڑے دلچسپ اور رسا ہیں ۔ تاریخ گوئی میں اسے بڑی مہارت تھی ۔ چنانچہ عمدۃ الملک امیر الامرا اسد خاں کے بیٹے کے تولد پہ یہ تاریخ کہی :

" ز برج اسد زاد نور آفتاب "

کامگار خاں کے بیٹے یار خاں کی ولادت پر تاریخ ذیل کہی:

"شرف یار کامگار"

ایک امیر کے بیٹے کی ولادت پر تاریخ کہی۔ جب وہاں سے کچھ نہ ملا تو ایک فحش قطعہ لکھ کر کسی دوسرے موقع پر پیش کیا۔ نامدار خاں کے نام پر ایک مثنوی حسن و دل لکھی جس میں سرخوش کے مطابق، داد سخنوری دی ہے۔ اس مثنوی کا تاریخی نام "حسن نامدار خانی" رکھا۔ بقول دوست سنبھلی اس نے ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی۔ سرخوش نے اس کے اپنے کہے ہوئے مصرع

"جاتی از جام حمد بیخود شد"

سے تاریخ وفات نکالی۔

جب وہ نواب جعفر خاں کے پاس نوکر ہوا تو مجلس میں بیٹھنے کے لیے اس نے ایک قطعہ گزرانا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بود طاعتت فرض ہمچو نماز م | بفرماگهی بنده از جا نشیند
ہمین طاعت حق نماز است در وی | گہی بنده ایستد گه از پا نشیند

اور اس طرح بیٹھنے کی اجازت اور مصاحبت حاصل کر لی۔ نمونۂ کلام:

ہر کس که دل از مدار دنیا برداشت | عبرت ز شمار کار دنیا برداشت
گویند زمین بر سر گاو است، بلی | گاو است کسی که بار دنیا برداشت

مُلّا شاہ

مُلّا شاہ حضرت میاں میرؒ لاہوری کے خلفا میں سے اور دارا شکوہ کے مرشد تھے۔ بقول صاحب عمل صالح بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ والدین کی زندگی میں طلب علوم میں مشغول رہے۔ علوم رسمی اور فنون عقلی و نقلی کے حصول کے بعد درد طلب دامنگیر ہوا تو وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور بقول صاحب مفتاح التواریخ، وہاں سے کابل پہنچے اور ایک تاجر کے ہمراہ کابل سے لاہور آ گئے جہاں میاں میرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (صالح نے لکھا ہے کہ ۱۰۲۳ھ میں یہاں آئے) یہاں انھوں نے بہت ریاضت کی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ مسلسل تیس۳۰ سال تک بالکل نہیں سوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ صالح کا کہنا ہے کہ مرشد کے کہنے پر کشمیر گئے۔ لیکن بیل (BEALE) لکھتا ہے کہ میاں میرؒ کی وفات کے بعد گئے۔ بہرحال بعد میں انھوں نے گرمیوں کا موسم کشمیر میں اور سردیوں کا موسم لاہور میں گزارنا شروع کیا۔

شاہجہان، دارا شکوہ اور کئی ایک امرا کو ان پر بہت اعتقاد تھا۔ چنانچہ بقول مؤلف ظفر نامہ رنجیت سنگھ جب دارا شکوہ اورنگزیب کے خوف سے ان کے پاس آیا تو انھوں نے اسے کہا "ترا دولت اخروی است۔ چشم بر بند" اور جب اس نے آنکھ بند کی تو عالمگیر کو بادشاہ بنے اور خود کو جنت میں دیکھا۔ بقول بیل شاہجہان کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں ۲ دو شاہ ہیں ایک شاہجہان اور دوسرا مُلّا شاہ۔ مگر بعد میں شاہجہان کے محبوس ہونے اور دارا شکوہ کے قتل کے بعد الحاد سے متہم ہوئے۔ اور عالمگیر نے جبراً انھیں کشمیر سے طلب کیا۔ مجبور ہو کر لاہور پہنچے۔ اثنائے راہ میں عالمگیر کی تخت نشینی کی تاریخ

لکھ کر مجھوائی :-

صبح دل من چون گل خورشید شگفت　　　حق ظاہر شد و غبار باطل را رُفت
تاریخ جلوس شاہ اورنگ مرا　　　ظل الحق گفت الحق این راحق گفت

بادشاہ نے جب رباعی پڑھی تو دربار میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا اور حکم دیا کہ وہیں لاہور میں رہیں۔ مراۃ جہاں نما میں ہے کہ سنہ ۱۰۷۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ خزینۃ الاصفیاء میں سنہ ۱۰۶۹ھ اور عمل صالح میں سنہ ۱۰۷۲ھ سن وفات دیا ہے۔ (موخر الذکر زیادہ مستند ہے)

ملا شاہ نے تقریباً ہر صنف سخن مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی اور مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ بقول صالح ان کے اشعار بڑے آبدار ہیں۔ اور بقول تماس ولیم بیل عارفانہ اور موحدانہ اشعار کہتے تھے۔ (ملا شاہ کی مثنویات اور رباعیات کے مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں) - انتخاب :-

از شش جہتم روی نمودی آخر　　　از ہر طرفی دام ربودی آخر
بیرون و درون جلوہ گری می دیدم　　　بر تحقیق آمدم تو بودی آخر
ای بندہ بپای وقفل بر دل ہشدار　　　وی دوختہ چشم پای در گل ہشدار
عزم سفر مغرب و رُو بہ مشرق　　　ای راہرو پشت بمنزل ہشدار
مشکل کہ شود ز عقل یک مشکل حل　　　حال است کہ دست وضع امراض علل
بے حال محال حق شناسی از عقل　　　روشن نشود جہان ز نور مشعل
ای دوست مگو ز دروپای درودان　　　وز گرمی آگہی مگو با سردان
آگاہی حق شریعت مردانست　　　غفلت نام شریعت نامردان

برہمن رائے چندر بھان نام اور برہمن تخلص۔ باپ کا نام پنڈت دھرم داس تھا۔ برہمن لاہور میں پیدا ہوا۔ اور یہیں پرورش پائی۔ اس نے اپنی ایک تصنیف "چہار چمن" کے تیسرے چمن میں اپنے کچھ سوانحی حالات دیئے ہیں وہ کہتا ہے "میں پنجاب کا برہمن ہوں۔ میرا باپ دھرم داس منشی گری کا کام کرتا تھا۔ اور شاہی منصبداروں کے ذیل میں صاحب امتیاز تھا۔ بعد میں وہ ترک ملازمت کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ میرے دو بھائی اور تھے، رائے بھان اور اودے بھان۔ میں نے اور رائے بھان نے تجرد اختیار کیا۔ کیونکہ ہمارے سر میں آزادی کی ہوس تھی۔ اودے بھان عاقل خان رازی کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد رائے بھان بھی ملازم ہو گیا۔ اور آخر مجھے بھی عاقل خاں کی وساطت سے ملازمت مل گئی۔ خان مذکور نے مجھے ایک ہاتھی دے رکھا تھا تاکہ سواری کے وقت اس کا ہم کلام رہ سکوں۔ مجھے عبدالحکیم سیالکوٹی سے تلمذ حاصل ہے۔"

دراصل برہمن تعلیم سے فارغ ہو کر میر عمارات لاہور و اکبر آباد امیر عبدالکریم سے وابستہ ہوا۔ اس کے بعد افضل خاں (امیر ملا عبدالشکور شیرازی)، جو وزیر بااقتدار تھا، کے سیکرٹری کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتا رہا۔ اور زیادہ تر اس کا لاہور ہی میں رہا۔ افضل خاں کی وفات (۱۰۴۸ھ) کے کچھ عرصہ بعد جب شاہجہان لاہور آیا تو اس نے اسے اپنی خدمت کے لیے

منتخب کیا۔ اور پھر ترقی کرتے کرتے وقائع نویس حضور ہو گیا۔ جس کے سبب وہ دربار میں حاضر رہتا اور ہر روز کے واقعات لکھتا۔

دارا شکوہ کو اس سے خاص رغبت تھی۔ چنانچہ اس نے شاہجہان سے کہہ کر اس کی خدمات حاصل کیں اور اسے اپنا میر منشی بنا یا۔ جب علامہ سعداللہ فوت ہوتے تو شاہجہان نے اسے واپس اپنے پاس بلا لیا۔ اور ساتھ ہی اسے رائے کے خطاب سے بھی نوازا۔ جب دارا شکوہ قتل ہوا تو یہ بھی شاہی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ اور بقول مؤلفین بہارستان سخن و مراۃ الخیال سبکدوشی کے بعد بنارس میں جا کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اور وہیں وفات پائی۔ بلقول صاحبانِ بہارستان سخن اور مراۃ الخیال ۱۰۷۳ھ اور مراۃ جہاں نما کے مطابق ۱۰۶۸ھ میں فوت ہوا۔ تذکرۂ شمع انجمن میں سنہ وفات ۱۰۹۲ھ دیا ہے۔ لیکن اول الذکر دونوں تذکروں کی روایت زیادہ صحیح ہے۔

برہمن طبعاً مذہبی آدمی تھا۔ اسے مذہبی امور سے خاص دلچسپی تھی۔ اسے اپنے ہندو ہونے پر فخر تھا۔ فنِ خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ تذکرۂ خوش نویسان میں بطور خوش نویس کے اس کا ذکر درج ہے۔

میر عظمت اللہ بیخبر نے سفینہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان نے اسے چند شعر سنانے کے لیے کہا۔ جس پر برہمن نے یہ شعر پڑھا:۔

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ کی طبیعت اس سے منغض ہو گئی۔ لیکن افضل خاں نے سعدی کا یہ شعر

خر عیسےٰ اگر بمکہ رود   چوں بیاید ہنوز خر باشد

پڑھ کر زمین ہموار کر دی۔

ذیل کا مشہور شعر بھی اس سے منسوب کیا جاتا ہے:۔

ببین کرامتِ بتخانۂ مرا ای شیخ   کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

لیکن شفیق کا کہنا ہے کہ یہ شعر اس کا نہیں ہے۔ سرخوش لکھتا ہے کہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ شعر کسی اور ہندو کا ہے۔ اور یہ کہ ایک دن مرزا محمد علی ماہر نے اس سے پوچھا کہ یہ شعر تمہارا ہے۔ کہنے لگا "شاید میں نے ہی کہا ہو مجھے یاد نہیں"۔

دیوان کے علاوہ، جس میں بقول حسرت موہانی کے شاید ہی کوئی غزل پانچ اشعار سے زیادہ کی ہو، اس کی دیگر تصنیفات یہ ہیں:

(۱) چہار چمن - (۲) سوال و جواب لعل داس و دارا شکوہ (۳) انشائے برہمن (۴) تحفۃ الانوار (۵) گلدستہ (۶) نگارخانہ (۷) تحفۃ الفصحا اور (۸) مجموعۃ الفقرا۔

محمد صالح کنبوہ نے اسے شاہجہانی دور کے ممتاز شعرا میں شمار کیا ہے۔ سرخوش کے مطابق وہ "طبع درست" کا مالک اور قدما کی طرح صاف و شستہ شعر کہتا تھا۔ اور "درہندوان غنیمت بود"۔ نمونۂ کلام:

ہر نفس بوی محبت آید از گفتار ما   می توان فہمید از گفتار ما کردار ما

عشرت آن بود کہ در عالمِ نادانی بود ——— خواہم از رُتبۂ انجام بہ آغاز افتم
ای برتر از تصور و وہم و گمانِ ما ——— ای در میانِ ما و برون از میانِ ما
در جہان باش و لیکن ز جہان فارغ باش ——— ہر کہ فارغ ز جہانست جہانی با اوست
گذشت عمر درین فکر و من ندانستم ——— کہ جرم کفر کدام و ثوابِ ایمان چیست
چو ہر دو را نظری بر بہار رحمت اوست ——— بہم نزاعِ دلِ کافر و مسلمان چیست
فکر بیہودہ غمہای جہان نتوان کرد ——— خویش را در گرد سود و زیان نتوان کرد
بحر دُنیاست کہ او سیل حوادث بسیار ——— تکیہ بر رہگذر آب روان نتوان کرد
صورت حال گواہ دل غمگین کافیست ——— شرح این راز بتقریر و بیان نتوان کرد
راز عشق است کہ در سینہ نہان باید داشت ——— با کسی مصلحت راز نہان نتوان کرد

برہمن جز رہ تسلیم سپردن نتوان
سعی در پردہ تقدیر توان ؟ نتوان کرد

رباعی

تا چند ز جورِ فلک آزردہ شوی ——— وز گردش روزگار افسردہ شوی
چون غنچہ بہ جمعیت خود راضی باش ——— زان بیش کہ چون گل شوی پژمردہ شوی

برہمن اس کا نام چندر بھان رائے اور تخلص برہمن تھا۔ بقول شفیق اورنگ آبادی لاہور کا باشندہ تھا اور "قشقۂ قبول بر جبین ما شست" فارسی اور عربی میں اس نے خاصی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ میرزا محمد طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرے میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ سات سال ہونے کو آئے ہیں کہ وہ لاہور سے آکر یزد میں مقیم ہے "بسبب این کہ سودا با مردم داشت"۔ یزد کے عمال نے اس پر کچھ ظلم کیا جس کے باعث اس کا مال ضائع ہو گیا۔ ۱۰۹۱ھ میں طاہر اس سے یزد میں ملا۔ اس کا کہنا ہے کہ "شعر را بد نمی گوید" حضرت ائمہ کی شان میں اس نے بہت سے شعر کہے ہیں۔ غرض کہ عجیب و غریب اطوار کا مالک ہے "اگرچہ قواعد ہنود را دارد اما شیعہ است"۔ انتخاب:

گر گشاید مطلع حسن تو از فکرم نقاب ——— دعوی روشن دلیہا می کنم با آفتاب
خواب می دیدم کہ سرسبز مرادم کردہ اند ——— می خورد کشت تمنایم ز ابر رحمت آفتاب
با مسیحا دعوی بالانشینی می کنم ——— محضری در دست خود دارم بہ مہر آفتاب
چون شدم بیدار امیدا این چنین تعبیر کرد ——— کز ثنای مرشد کامل شود دل کامیاب
مہر اوج کامگاری شہ سلیمان آنکہ ہست ——— خاکساران را معین و سرفرازان را مآب
حذبۂ امرت بہ مردم گر کند نہی خطا ——— تا قیامت کاتب اعمال ننویسد ثواب

بر سر ہر کس گذارد دست قدرت تو کلاہ
می نشیند بکبر گردن بلند از آفتاب

مخلص اپنا ئے واس نام اور مخلص تخلص۔ لاہور کا رہنے والا اور قوم دردہ بھنڈہ میں سے تھا۔ خوشگو نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک خلیق، شفیق اور بڑا "گرم جوش" جوان ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس نے جگہ کر رکھی ہے۔ استعداد و قابلیت کے لباس سے آراستہ ہے انشا میں اسے مہارت حاصل ہے۔ خط شکستہ درستی سے لکھنا اور معاملہ فہمی و کاردانی میں یگانہ ہے۔

مخلص کچھ عرصہ نواب ابوالبرکات خاں صوفی عامل بٹالہ کے پاس منشی گری کی خدمت پر مامور رہا۔ لوگوں کے کام سنوارنے میں بڑی کوشش کیا کرتا۔

قدیم رنگ میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ ایک موقع پر نواب مذکور صوفی تخلص نے ایک غزل طرح کی جس کے جواب میں مخلص نے ایک غزل کہی جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

خمیر لعل تو از شہد و شور ریختہ اند — دہان تنگ تو از چشم مور ریختہ اند
جنون ماست بجوش از بہار فیض ازل — گل مراد بجیبم نہ دو در ریختہ اند

قصیدہ کے چند اشعار :

دشمن از خوف نہنگ تیغ خون آشام او — ہمچو ماہی سنقنقور از جہان نایاب شد
ذرہ کو سایۂ دست بلندت یافتہ — پنجہ تاب پنجۂ خورشید عالمتاب شد
دریا ز عکس روی تو شد کان آفتاب — آئینہ از رخ تو شبستان آفتاب
با لطف لفظ و معنی تحسینت نمی رسد — گر بر فلک رود ہمہ دیوان آفتاب

زان پیشتر کہ ساقی جام اجل چشاند
از بادۂ انا الحق سرشار کن دل ما

آفرین لاہوری شاہ فقیر اللہ نام آفرین تخلص۔ بقول آرزو لاہور کا رہنے والا تھا۔ اصلی وطن معلوم نہیں۔ حاکم لاہوری نے اسے "لاہوری الاصل" لکھا ہے۔ سرو آزاد میں ہے کہ وہ "محلہ بخارای لاہور" میں سکونت پذیر تھا۔[1]

عنفوان شباب میں اس نے تحصیل علم و فضل کی۔ بڑا فاضل اور جید عالم تھا۔ علم رمل میں بھی مہارت تھی۔ ناظم صوبہ استاد حفظ اللہ خاں پسر سعد اللہ خاں وزیر کے یہاں ان دنوں علمی محافل برپا ہوا کرتی تھیں۔ جن میں آفرین بھی اپنا کلام سنایا کرتا۔ اور اس طرح اس کی خاصی شہرت ہو گئی۔ ایک مرتبہ اسی حفظ اللہ کی مجلس میں، جس میں شعرائے وقت شرکت کے متمنی ہوتے اور بار نہیں پاتے تھے، آفرین نے یہ شعر پڑھا :۔

آفرین تا دل ما گرد تعلق افشاند — مشت خاکی بہ سر مردم دنیا کردیم

---

[1] یہ محلہ اس جگہ تھا جہاں آجکل سرائے رتن چند اور میو اسپتال وغیرہ واقع ہیں (ادارہ)

نواب نے یہ سن کر بڑا محسوس کیا اور کہا کہ تم بھی داخلِ دنیا رہے ہو۔ آفریں نے کہا جس وقت ہمارے دل نے گرہِ تعلق چھاڑ دی ہم دنیا سے باہر آ گئے۔ اس پر نواب خاموش ہو گیا۔

بقول حاکم صغر سنی میں آفریں اپنے والد کے ہمراہ ناصر علی سرہندی سے ملا۔ اس نے تبرک کے طور پر اپنی ایک مثنوی عنایت کی۔ اور کہا کہ جب کبھی تیری چشمِ ہوش کھلے، اس کا مطالعہ کرنا۔ میرزا بیدل غائبانہ طور پر اس کی بڑی تعریف و توصیف کیا کرتا اور اس کا یہ شعر اکثر پڑھتا:

حجاب عشقم نداد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
اندلمی آید این مروت ز من نمی آید این تقاضا

ناصر علی کو اس کا شعرِ ذیل بہت پسند تھا:

نسیمی میکند نیلوفری صبح بیا گرشنت نغان ہای شب ہجران شنیدن ہا چہ میدانی

آفریں علوم عربی میں بھی فارغ التحصیل تھا اور شعر و شاعری سے اسے بیحد رغبت تھی۔ مثنوی مولانا روم پڑھا عبور تھا۔ اس کے علاوہ اساتذۂ قدیم کے بہت سے اشعار اسے زبانی یاد تھے۔ اس کمال کے باوجود خود کو حقیر جانتا تھا۔ غربا و فقرا سے انکسار اور تواضع سے پیش آتا۔ بقولِ خانِ آرزو بڑا خوش مشرب، آزاد، متوکل اور مرد آدمی تھا۔ دنیوی اغراض سے بے اعتنا تھا۔ اسی وجہ سے اغنیا کی مدح وغیرہ نہیں کی۔ لاہور کے صوبہ دار خصوصاً سیف الدولہ عبدالصمد خاں اور اس کا بیٹا زکریا خاں اس کی بہت تکریم و تعظیم کرتے تھے۔ خود یہ امرا وغیرہ سے بڑے استغنا اور کبر سے ملتا۔ حاکم لکھتا ہے نواب عبدالصمد خاں سیف الدولہ اس سے ملاقات کا بڑا خواہشمند رہتا لیکن اس نے ہمیشہ ملنے سے احتراز کیا۔ آخر کسی عزیز کے مجبور کرنے پر اس سے ملا۔ نواب نے بڑی تکریم کی، اپنی مسند پر بٹھایا اور ایک روپیہ یومیہ مقرر کیا۔ آفریں اسلاف کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتا اور تمام کو اپنا استاد و مرشد سمجھتا۔ اور اسی وجہ سے اس نے کبھی کسی کے شعر پر اعتراض نہیں کیا۔

ان دنوں مسجد وزیر خاں کے صحن میں اکثر شعرائے معنی داں اکٹھے ہوا کرتے اور مشاعرہ منعقد ہوتا۔ آفریں بھی ان مشاعروں میں شرکت کرتا۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ملا اعجاز نے ناصر علی کے ایک شعر پر اعتراض کیا تو آفریں نے اس کی اس طرح وضاحت کی کہ اعجاز خاموش ہو گیا۔

اسّی سال کی عمر میں ۱۱۵۴ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ حاکم نے تاریخ کہی
"رفت نقاد معنی از عالم"

پانچ چھ ہزار اشعار کا دیوان جس میں غزلیات و قصائد ہیں، اور تین مثنویاں ابجدِ فکر عہد عالمگیر میں، انبانِ معرفت بہادر شاہ کے زمانے میں اور ہیر رانجھا فرخ سیر کے دور میں، اس سے یادگار ہیں۔ (آزاد بلگرامی جب ۱۱۴۳ھ میں اس سے ملا ہے تو اس وقت ہیر رانجھا لکھنے میں مصروف تھا) مؤخر الذکر مثنوی امرتسر میں چھپ چکی ہے لیکن مطبع والوں نے غلطی سے اسے کسی اکبر علی شاہ پنجابی سے منسوب کیا ہے۔

آرزو اسے خوش زبان، تازہ خیال شاعر کہتا ہے۔ تذکرہ حسینی میں اس کی تعریف یوں آئی ہے "شاعر متین .... مسلم

شعر خوب میگفت و انواع لآلی معانی در سلک الفاظ می سفت" بقول حاکم، میرزا صائب اور ناصر علی کے رنگ میں شعر کہتا تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

خوشا دوری که در عالم بیازی بود و محمودی　　　وفا عنقا، محبت کیمیا شد در زمان ما
مانند تبسمان بر دهانش بخط خوش شیم　　　چون روزه دار صبح امیدست شام ما
بپای لغزم عشق می خورد و سوگند　　　خیال ندمی تو کردن هنوز بی ادبی ست
آفرین دستی که وا می کرد و آن بند قبا　　　حلقه‌ام شب بر در چاک گریبان می زند
کجا رفتی که قربان گاه کردی بزم عیشم را　　　ز جوش اشک خونین جای بسمل آستینم شد
یکی ادا نشود با هزار عمر ابد　　　اگر بقدر جفاها وفا توانی کرد
شب کرا بود به بر نخل تو کان سیب ذقن　　　گوی چوگان زده از گردش رنگست هنوز
ای خداوند دل "درد گرفتارش" ده　　　شبنم از خون جگر به گل رخسارش ده
اوبش مست جنون همچو من غمزده کن　　　بعد از آن ره به پریخانه دیدارش ده

- - - - -

هنوز دامن حسنت ز صبح پاکتر است　　　هنوز ماه تو ایمن ز داغ رسوائی است
نهال مهر و وفا تا چه بار می بندد　　　بهار حسن ترا آفرین تماشائی است

واقف

نورالعین واقف، بقول خانِ آرزو اس کے باپ دادا بٹالہ کے نامی تھے۔ خود واقف بھی بٹالہ ہی کا تھا، لیکن اس نے، جیسا کہ حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ واقف تیس سال سے مجھ سے آشنا ہے اور شاہ آفرین کے یہاں ہماری صحبتیں رہی ہیں۔ لاہور میں ایک خاصی عمر گزاری۔ غالباً اسی وجہ سے غنی فرخ آبادی نے "تذکرۃ الشعرا" میں اسے لاہوری لکھا ہے۔

آرزو لکھتے ہیں کہ واقف علوم سے بہرہ ور اور شعر خوب کہتا ہے۔ مجھ سے اس نے اصلاح لینا چاہی لیکن مجھے خود اپنی استادی کا گمان نہیں اس لیے میں نے چند بار احتراز کیا۔ آخر اس کے اصرار پر ایک آدھ اصلاح کر دی۔ مشق سخن میں وہ پختہ ہو گیا۔ اگر اسی طرح مشق جاری رہی تو میرا خیال ہے اعلیٰ پائے کو پہنچے گا۔

حاکم لاہوری نے اس کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق وغیرہ کی تعریف کرنے کے بعد اس کی شاعری کی یہ خوبیاں گنوائی ہیں۔ "اس کے افکار آبدار، بڑے پُر تاثیر اور پُر درد ہیں۔ معانی بلند و پاکیزہ اور شستہ و رواں الفاظ نے اس کے کلام کو تازگی بخشی ہے۔" اگرچہ آرزو نے شمس الدین فقیر کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ واقف پنجاب کا شمس الدین ہے۔"

۔ چھ سات ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا۔ نعمانہ بھی لکھے۔ ایک ترجیع بند بھی لکھا جو قدما میں بھی کم ہی کسی نے لکھا ہو گا۔ غزل کا عاشق اور رباعی خوب کہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے سیدھا دل میں اترتا ہے۔ تلاش و لطف سے خالی نہیں۔ اس کے کلام سے اس کی استادی اور پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

واقف نے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

انتخاب :

یار ناپایدار را چه کنم　　　عمر بی اعتبار را چه کنم

دل اگر خوش کنم بوعدۂ وصل   کاہشِ انتظار را چہ کنم
نہ بوصل است سازشم نہ بہجر   طبعِ ناسازگار را چہ کنم
گر تو ام نا امید می سازی   دل امیدوار را چہ کنم
گر نہ دیوانگی کنم واقف   خود بگو ما بہار را چہ کنم

———

ہر غنچہ بشگفت الّا دل من   ای وا دل من صد وا دل من
دیباچۂ عشق معمورۂ حسن   مجنون دل من لیلیٰ دل من
مقبول دیر و مردود کعبہ   کافر دل من ترسا دل من
در کوی جانان جان داد آخر   بیکس دل من تنہا دل من
یارب چہ سازم با سنگ طفلان   نازک دل من مینا دل من

حاکم لاہوری حکیم بیگ نام حاکم تخلص۔ بقول آرزو مغلیہ خاندان سے تھا۔ اس کے والد کو شادمان خان کا خطاب ملا تھا۔ دادی کی طرف سے سیّد۔ (دادی اس کی قاضی میر یوسف کی اولاد سے تھی جو ہرات کے معتبر سادات میں سے تھا) اور والد کی جانب سے اوزبک اور رغ تھا۔ خود بقول حاکم اس کا باپ عالمگیر کے عہد میں بلخ سے دکن میں آیا۔ پھر مراد آباد میں سکونت پذیر ہوا۔ جہاں سنہ ۱۱۲۰ھ میں حاکم پیدا ہوا۔ شادمان خان منصب ہفت صدی پنجاہ سوار پر سرافراز تھا۔ فرخ سیر کے دور میں سہ ہزاری اور محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری کے عہدے سے نوازا گیا۔

حاکم ابھی بچہ ہی تھا جب فرخ سیر کے اول سال جلوس میں یہ لوگ لاہور آکر مقیم ہو گئے۔ ۱۵ سال کا تھا جب محمد شاہ کے پنجم سالِ جلوس میں اس کا باپ فوت ہو گیا۔

حاکم کو لڑکپن ہی سے کتب فارسی اور اشعار اساتذۂ قدیم کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اور پھر یہی شوق اسے شاہ فقیر اللہ آفرین کے پاس لے گیا۔ جن کی اس نے باقاعدہ شاگردی اختیار کی۔

ایک موقع پر پنجاب کے صوبہ دار نے اس پر ظلم کیا اور اس کی جاگیر ضبط کر لی جس کے سبب اسے لاہور سے دہلی جانا پڑا۔ سنہ ۱۱۶۱ھ میں رائے بریلی گیا۔ صفدر جنگ وزیر اور اعتماد اور عماد الملک کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد یہ صفدر جنگ کے ساتھ اودھ چلا گیا۔ اس کی وفات کے بعد واپس دہلی آگیا۔ پھر حج بھی کیا۔ بہر حال اس کی عمر کا بیشتر حصّہ یہیں لاہور میں گزرا۔ جس کے باعث یہ لاہوری مشہور ہوا۔ چنانچہ غنی فرخ آبادی صاحبِ تذکرۃ الشعرا نے اس کا وطن لاہور ہی لکھا ہے۔ بقول غنی اس نے سنہ ۱۱۸۲ھ میں وفات پائی۔

خان آرزو نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ حاکم طبع ہموار اور سلامت مزاج کا مالک ہے۔ شعر میں اس نے خاصی مہارت بہم پہنچائی ہے۔ کلام میں معنیٔ تازہ کی تلاش رکھتا ہے۔ حسنِ اخلاق پاسِ آشنائی اور اخلاص میں یگانۂ روزگار ہے۔

ایک دیوان کے علاوہ تذکرۂ مردم دیدہ، جسے حال ہی میں جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے مرتب کر کے پنجابی اکادمی

کی طرف سے شائع کیا ہے، اس کی قلمی یادگار ہے۔ ذیل کے چند اشعار خانِ آرزو کے انتخاب کردہ اشعار میں سے لیے گئے ہیں:

در گلشنی کہ مدعی آنجا چو گل شگفت — ہرگز مرا چو بلبلِ "خزان دیدہ" بار نیست

نیست معلوم کہ جان واد ز ما دل شدگان
این قدر ہست کہ در کوی تو غوغای ہست

چون غنچۂ فسردہ کہ نشگفت در بہار — گفتم بوصل ہم دل من وا شود، نشد
ہستند زان دلیر بخون ریختن بتان — کز یک ادا ادای دو صد خونبہا کنند

نہ بدرد آشنائی نہ بہ عشق راہ دارد
بہ چکار آید این دل کہ کسی نگاہ دارد

ہلاک چشم تو باشم مگر نگیرد ناز — دہد بگوشۂ ابرو جواب ورنہ خاک

وجدان

میر معصوم وجدان بقولِ آرزو "عالی نسب خان" کے خطاب سے مخاطب اور میر محمد زمان راسخ کا بیٹا تھا۔ حاکم لاہوری کا کہنا ہے حضرت سید میر کلال ساداتِ سرہند کی اولاد سے تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں میر جملہ کے ہمراہ لاہور آیا۔ کچھ عرصہ کے لیے دہلی چلا گیا لیکن جب وہاں کوئی سلسلہ نہ بنا تو واپس لاہور چلا آیا۔ یہاں سیف الدولہ عبد الصمد کے پاس ملازم ہو گیا۔ نواب مذکور شعر فہم اور شاعر نواز تھا۔ اس نے اس کی خاصی مدد کی۔ اور اپنا ہمدم بنا لیا۔ اور ہر روز عصر سے پہلے یہاں ایک مشاعرہ ہوتا جس میں یہ سرخیل شعرا ہوتا۔ نواب سیف الدولہ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے زکریا خاں کے پاس رہا۔ بقول آرزو اپنی فضول خرچی کے سبب ہمیشہ قرضدار رہتا تھا۔ بعارضہ فالج ۱۱۶۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ کچھ اوپر ساٹھ سال کی عمر پائی۔

بقول حاکم قصائد و مثنوی کے علاوہ اس کا ایک ضخیم دیوان بھی ہے جو کوئی بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے بہت صاحبِ قدرت و تلاش تھا۔ شوخی، رنگینی، مضامینِ تازہ، اور زمین ہائے سنگلاخ میں طبع آزمائی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ انتخاب:

نالہ پر سوختہ، اشک آبلہ پا — کہ برد رقعۂ لختِ دل ما
نیامدی، شب آمد ز بی حواسیہا — گہی زمین نگرم گاہ آسمان تنہا
دلی بہار و میخانہ عاشقانہ درآ — بگو کہ شیشہ فروشم باین بہانہ درآ

چرا از می پرستی باز دارم در چمن خود را
کنم شرمندۂ ابر و گل و سرو سمن خود را

گل کی دم ہمسری با او زند — این شاخچہ بندی بہار است

خوش خرامی کند در وازہ برون سیرش نیست
گاہ بیگاہ اگر جلوہ کند کبک دریست

میر ترا — ابوالحسن قابل خان میر ترا کے آبا و اجداد ایران کے تھے۔ خود یہ اس برصغیر میں پیدا ہوا۔ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں وارد لاہور ہوا۔ منصب داران شاہی میں سے تھا۔ لاہور میں شاہ آفرین لاہوری سے مجلسیں رہیں۔ پُر تمکین اور "اکابر وضع" تھا۔ نواب دلیر جنگ اس کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھا۔ قصائد کے علاوہ ایک مثنوی بھی لکھی۔ جو پختہ مشقی کی دلیل ہے۔ بقول شفیق، محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۶۰ھ کے درمیان فوت ہوا۔

نمونہ کلام:

آتش عنان بتان فرنگ اند چون شرر — شوخند ہمچو شعلہ و سنگ اند چون شرر

دیگر چہ فغان کردم اندبسکہ ہوس بود — ہر اشک کہ از چشم می افتاد جرس بود

یاد ایامے کہ از مستی نشانی داشتم — در ہوا چون صبح گرد استخوانی داشتم

در نمازم جنبشِ مژگان بار آمد بیاد — از طپیدن صد جماعت را بیک تکبیر زدیم

یک طلب آئینہ گردیدہ از شوق رخت — از تو ہر چند امید نگہے نیست مرا

مقیمائی — میرزا مقیمائی بخارا کا باشندہ تھا۔ تیس سال میرزا صائب کی خدمت میں گزار کر عہد عالمگیر میں وارد دکن ہوا۔ پھر فرخ سیر کے عہد میں لاہور پہنچا اور عبدالصمد دلیر جنگ سے وابستہ ہو گیا۔ نواب مذکور نے اس کی خاص عزت و توقیر کی۔ قریب ایک سو سال کی عمر پا کر محمد شاہ کے اوائل عہد میں فوت ہوا:

پی سپردم چمن شوخیٔ نیرنگش را

غنچہ گردیدم و گل گشتم و برگ دیدم

تمنا — ساجو بیگ تمنا لاہور میں نواب دلیر جنگ کے بخشی سعید قلی خان کے بیٹے زکریا قلی خان کی رفاقت میں رہا بلکہ بقول شفیق اورنگ آبادی اس کا "صاحب مدار سرکار" تھا۔ ہر فن میں صاحب سلیقہ تھا۔ خصوصاً انشا اور تیر اندازی میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ شاہ آفرین لاہوری سے تلمذ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دیوان مرتب کیا۔ محمد شاہ کے اواخر عہد میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:

از طرز خرام تو سراپا روشش اعجاز

ہر گرد کہ برخاست ز جا کبک دری بود

یتیم — میرزا نصر اللہ خان یتیم، اس کا باپ منعم بیگ، لاہور کے صوبہ دار زبردست خان کے ملازموں میں سے تھا۔ اس نے شاعری میں آفرین لاہوری کی شاگردی اختیار کی۔ بقول حاکم صاحب تلاش اور خوش فکر نوجوان تھا۔ آخر میں دیوانہ ہو گیا۔ جنون یہاں تک ہوا کہ گلی کوچوں میں ننگا پھرتا۔ دیوانگی کے کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔ بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ حاکم لکھتا ہے کہ "اگر یہ زندہ رہتا تو استادی کے درجے کو پہنچتا"۔ انتخاب:

آزاد پس از مرگ دلم کے ز غم اوست — خشت لحدم تختۂ مشق ستم اوست

بود یک برگ گل از گلشن عشق

کوہ کن، تیشہ کہ بر سر زدہ است

مُلّا عارف

ملّا عارف لاہوری ایک ماہر شاعر تھا۔ ہمت خاں جو اس پر بہت مہربان تھا۔ بقول سرخوش دیوان مرتب کیا اور ایک مثنوی مہر و ماہ لکھی، جس میں نئے نئے مضامین پیدا کیے تھے۔ نمونۂ کلام:

بی برگیٔ منعم بود از کثرت سامان — لب تشنگی بحر ز بسیاری آب است

تیزی مژگان خوبرو بہتر ترا حاصل نکرد — تیغ ہای آہنین ہر چند بر سنگ زد

فائق

نام میر سید احمد تخلص فائق، اور میر جلال الدین سعادت کا بھائی تھا۔ لاہور میں منصب و خدمتِ خزانہ پر مامور تھا۔ شاعر خوش فکر تھا اور سرخوش کے لفظوں میں معنی کے نشہ و کیفیت سے غافل نہ تھا۔ انتخاب:۔

از شرم چشم مست تو خوبان نهفته اند — در آستین چو غنچۂ نرگس پیاله را

فزون بود رگ روان تشنه در بیابان سوخت — مشو به دام فریب سراب فن بافند

تا نرگست به بزم فسون نگه نشست — چشم بتان ز سرمه بخاک سیه نشست

فرخ لاہوری

ملا فرخ حسین لاہوری، بقول دوست حسین سنبھلی ایک معنی یاب اور خوش گو شاعر تھا۔ اس نے فرخ سیر کی مدح میں بھی کچھ شعر کہے۔ انتخاب

شب که بی روی تو دل جز گریه دمسازی نداشت — تا نه چون مرغ در آب افتاده پروازی نداشت

دلی که هر شام از هوسها تازه سامان میشود — چون سراپے رهروان هر صبح ویران میشود

باسر و سامان چنین بی اعتبارم کرده اند

چون امام سبحه بیرون از شمارم کرده اند

بیرنگ

میرزا محمد بیگ بیرنگ ایک فاضل حکیم اور شاعر تھا۔ لاہور میں زندگی بسر کی۔ عبدالصمد خاں بہادر دلیر جنگ کے یہاں ملازم تھا۔ اس سے پہلے "جرگہ منصبداران" میں سعادت قلی خاں کا ساتھی تھا۔ دلیر جنگ نے اسے اپنا مصاحب بنا لیا۔ ایک موقع پر ایک قصیدہ نواب کی مدح میں کہہ کر گذرانا۔ جس پر خلعت اور تحسین و آفرین سے سرفراز ہوا۔

بقول حاکم ایک دیوان، جو چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں زیادہ تر نعت و منقبت ہیں، اور ایک مثنوی اس سے یادگار ہیں۔ اگرچہ اسے استادی کا درجہ حاصل تھا اور اس دور کے استاد شعراء کے ساتھ ہم مشق و ہم طرح تھا، لیکن اسے شہرت نصیب نہ ہوئی۔ جلال اسیر کے طرز کا شیدائی تھا۔ باتمکین اور صاحب علم و حلم تھا۔ کچھ اوپر ساٹھ کی عمر پائی اور لاہور کے قریب ہی ایک جگہ پر انتقال کیا۔

انتخاب:

قطره قطره می بارد ابر تا چه میخواهد — ساقی اندکی دریاب کاین هوا چه میخواهد

این زندگی بلاست ز سر وا نمی شود — سر بارها به تیغ بریدیم ہمچو شمع

آشفتہ

میرزا محمد صالح آشفتہ کابل کے نجبا میں سے تھا۔ گردشِ زمانہ کے سبب اسے لاہور آنا پڑا۔ طبع آزاد رکھتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ کم آمیز تھا۔ ۱۱۷۲ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام

خدا نکرده اگر چهره پر عتاب کند — بگردش نگهی عالمی خراب کند

می روددل بسر کوی تو پنہان از من بدگمان گشتہ ندانم بچہ عنوان از من

سیادت میر جلال الدین نام، سیادت تخلص، مشہور محدث میر جمال الدین کا بیٹا تھا۔ سرخوش، دوست سنبھلی اور غنی نے اس کا وطن لاہور لکھا ہے۔ سرخوش لکھتا ہے "صاحب فکر معانی و تلاش بلند بود" لیکن میری طرح شہرت و قبولیت اس کے نصیبے میں نہ تھی۔ دوست نے اسے خوش گو شاعر کہا ہے۔

مالذت حیات، ز غفلت نیافتیم چون نشۂ شراب کہ در خواب بگذرد

خبر ز زندہ دلی نیست اہل مدرسہ را کہ دل بسان مگس در کتاب می میرد

گر ستارۂ بختم شرار کاغذ بود

کہ تا فسوخت مرا از سرم نگہ و گذر

فدا شیخ خیر اللہ فدا، شیخ عبداللہ امانت خانی کا بیٹا اور لاہور میں سکونت پذیر تھا۔ خواجہ سنگین خان کی صحبت میں زیادہ وقت گزارا۔ خواجہ مذکور کی وفات کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی اور تا حین حیات توکل و قناعت سے وقت کاٹا۔ میرزا محمدی بیرنگ سے تلمذ تھا۔ بقول حاکم لاہوری مثنوی گوئی میں اس کا کوئی بدیل نہ تھا۔ مثنویوں میں معنی ہائے بلند اور مضمون ہائے دلپسند باندھتا تھا۔ الفاظ کی تلاش اور شوخی میں زلالی کا ثانی تھا۔ سبعۂ سیارہ کا جواب لکھنا چاہتا تھا، اور چار مثنویاں کہہ بھی ڈالی تھیں، مگر باقی کے لیے فرصت نہ ملی۔ لاہور میں اپنے دور کا بے مثال شاعر تھا۔ اور اس کے اشعار استادانہ ہوتے تھے۔

چند اشعار حاکم لاہوری کی تعریف میں لکھے تھے جن میں سے دو تین یہ ہیں:-

ای شدہ در ملک قدیم سخن حاکم باللہ و حکیم سخن

نبض شناس نگہ ناتوان محرم بیماری چشم بتان

درد دلم را کہ دوا می کنی کار بقانون شفا می کنی

مکتبی از مکتب تو درس خوان لیلی و مجنون بسواد روان

قلندر شاہ قلندر شاہ لاہوری ایک صوفی بزرگ اور حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی کے احفاد میں سے تھے۔ ۱۱۰۵ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے چچا پیر خدا بخش سے پائی۔ انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھومنے کا خاصا موقع ملا۔ بریلی میں بدر الدین رہتکی کی بیعت کی۔ ۱۱۹۷ھ میں واپس لاہور آ گئے۔ ۱۲۳۲ھ میں بعہد رنجیت سنگھ لاہور ہی میں وفات پائی اور اپنی زمین موضع رتہ میں مدفون ہوئے۔ یہ موضع انہی کی وجہ سے رتہ پیراں کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا فارسی دیوان، جو ادبی اور تاریخی خصوصیات کا حامل ہے، جناب غلام دستگیر نامی نے شائع کروایا ہے۔ سارا کلام متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ نمونۂ کلام:

چو در چشم تو کحل ناز کردند در فتنہ بعالم باز کردند

دل سودا زدہ با زلف تو سر پیدا کرد بر تو دیوانہ ولیکن ہنرے پیدا کرد

ما لبا سیر چمن خواہد و پروازے چند در قفس بلبل من بال و پرے پیدا کرد

تاب دیدار تو بے پردہ تمنا دارد   عاشق دلشدہ جان و جگرے پیدا کرد
از لب بام سحر جلوہ چو خورشید نمود   گریہ و زاری شبہا اثرے پیدا کرد

ماہیم و کوئے عشق و ہزاران ملامتے
یارب درین مقام دہی استقامتے

برق عالم سوز یارب یا کہ آہ ماست این   یا شرر یا شعلہ یا آتش موسیٰ ست این
ارغوان باغ غم یا لالۂ داغ جنون   یا کہ اشک لالہ گون عاشق شیداست این
یارب این گل یاسمن یا ماہ یا مہر منیر   یا کہ روی رشک ماہ دلبر زیباست این
یا کہ حرف قُم باذنی ہست یا آب خضر   یا کلام جان فزایت یا دم عیسیٰ ست این

بادشاہ و ملک حسن دیا گدائے کوی دوست
یا قلندر یا کہ رندے بے سر و بے پاست این

میرزا اکرم بیگ چغتائی بقول صاحب ظفر نامہ رنجیت سنگھ یہ خاندان قاآنی میں سے اور نواسہ زاد "جنت مکانی" تھا۔ اس کا باپ عبدالکریم ایک بہت نیک آدمی تھا۔ والدہ اس کی مسجد وزیر خاں لاہور کے پیش نماز ملا صدیق کی لونڈی کے بطن سے تھی۔

میرزا اکرم کو لاہور کے کسی نعلبند کے لڑکے الٰہی بخش سے عشق ہو گیا۔ اور وہ لڑکا مدت تک اس کا محبوب و منظور نظر رہا۔ چنانچہ اسی کے غم ہجران اور سرور وصال میں اس نے ایک مثنوی "الٰہی بخش نامہ" لکھی۔ اس مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے صرف و نحو، میزان و معانی، اور احادیث و تفاسیر وغیرہ کا علم حاصل کیا تھا۔ اور یہ کہ ایک رات میں تمام قرآن کریم پڑھ ڈالا۔

انتخاب مثنوی: (محبوب کی تعریف میں کہتا ہے):

از آن جملہ الٰہی بخش ماہے   بملک حسن و خوبی پادشاہے
مہ و مہر از رخش یابندہ تابے   تعالی اللہ بخوبی آفتابے
دو ابرویش دو محراب عبادت   مقام سجدۂ اہل سعادت
خیال عارض آن ماہ تابان   کنان سازو بدلہا جامۂ جان

دیوان امر ناتھ اکبری اس کے آبا و جد کاشمیری الاصل تھے جو شاہجہان کے عہد میں مختلف عہدوں پر مامور رہے محمد شاہ کے عہد میں اس کے بزرگ لاہور چلے آئے۔ اور یہاں اس کا باپ دینا ناتھ اچھے عہدے پر فائز رہا۔ اکبری بقول مرتب ظفر نامہ جناب سیتا رام کوہلی ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ مولوی احمد بخش چشتی سے تعلیم حاصل کی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا منظور نظر تھا۔ بقول خود اس کے ۱۸۳۲ء (بعمر گیارہ سال) میں مہاراجہ کے حکم پر ظفر نامہ لکھنا شروع کیا۔ ظفر نامہ کے آخر میں اکبری نے اپنی مثنوی کے کچھ اشعار درج کیے ہیں جن میں تصوف کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

اس مثنوی کے آخر میں مہاراجہ کی مدح کی ہے۔ انتخاب :

اے بجمال تو ز وحدت صفاست — جلوۂ ذات تو برون از ثناست
پرتو ذات تو بود سینہ سوز — نور جہاں تاب ز اختر فروز
کون و مکان جلوۂ وحدت ز تست — پرتو کثرت کسرت ز تست
منزلِ جان مظہر اسرار تست — منظر دل روزن دیدار تست
چشم خرد باید و بیدار دل — تا برسد بر سر اسرار دل
ذکر تو در سینۂ جانہا سرور — نام تو مشعل کشش نور ظہور
ماندہ قلم در رہ تو سرنگون — بہر تو دل غنچہ صفت گشتہ خون
اہل دلان نور صفا از تو اند — مہبط الطاف و عطا بودہ اند
آتش سوز تو بجان آمدہ — راز تو از پردہ عیان آمدہ
نافۂ شوق تم برہ آرزو — شد بعد لئے ز جرس در گلو
ہمچو جرس گریہ زنم زار زار — آبلہ در دل چو جرس پر فگار
سوز تو در سینہ ام آتش ز بست — شوق بدلہا ز تو برق انگیخت
شور تو داغم نمک آلودہ کرد — حال مرا شوق تو فرسودہ کرد
دیدۂ حیرت ز تو گردید باز — عمر بسے کوتہ و راہت دراز
کوتہی ما بنمو آمد گواہ — در صفتت گشتہ زبان عذر خواہ

محبوب غلام محبوب سبحانی، رئیس اعظم لاہور، ۱۸۴۲ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ نواب امام الدین خاں کا لڑکا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس کے بزرگ ہوشیار پور سے لاہور آ گئے تھے۔ اس کا دادا غلام محی الدین پہلے جالندھر دوآب کا گورنر تھا۔ پھر کشمیر آ گیا۔ اس کے مرنے پر ۱۸۴۵ء میں محبوب کا باپ اپنے والد کا قائم مقام بنا۔ معاہدہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے وقت جس کے تحت لاہور دربار نے کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کو سونپ دیا، نواب امام الدین کشمیر کا گورنر تھا۔ اسے بعد میں انگریزی حکومت سے خاصی جاگیر بھی عطا ہوئی۔ چنانچہ اسی جاگیر سے غلام محبوب سبحانی نے اپنا وقت کاٹا۔ آخر میں حکومت کی جانب سے اعزازی مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندر جن مشاعروں میں حضرت علامہ اقبال اور ارشد گورگانی وغیرہم شامل ہوا کرتے تھے — وہ اسی کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔ وفات دہلی میں دہلی دربار کے موقع پر ہوئی۔ نعش وہاں سے لاکر داتا گنج بخش رح کے مزار کے احاطہ میں دفن کی گئی۔

بقولِ لطیف، سبحانی عربی فارسی کا عالم تھا۔ لطیف نے اس کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال اگرچہ وہ کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھا تاہم صاحبِ دیوان تھا۔ ۱۳۱۲ھ میں اس کا دیوان مطبع رفاہ عام لاہور نے بڑے سائز پر شائع کیا۔ جس کے سرورق پر اسے انوری و خاقانی کا ہم مثل قرار دیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

ای رشک زردی تو گل یاسمنے را ——— نہا دسپہ بدل از غیرت کو بہت چمنے را

ہر جا کہ قدم رنجہ کنی گلبد ہا ——— رشک چمن خلد کنی انجمنے را

بزن آہستہ تر تیغم بوقت سر بریدنہا ——— فزیج عشقم و دارم بدل شوق طپیدنہا

تاب بردی تو سوخت ہستی ما ——— درد چشمت فزود مستی ما

منزل عشق چون نشیمن ماست ——— برتر از اوج عرش پستی ما

با صنم یکدمے بوسم گل ——— بہ زصد سالہ پارسائیہا

باز جوش جنون بسر دارم ——— مژدہ بادای برہنہ پائیہا

خواہیم بادۂ کہن دیار نوجوان
بیعت بدست پیر مغان کردہ ایم ما

فیض | مولانا فیض الحسن تخلص بہ فیض و خیال سہارنپور کے ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام خلیفہ علی بخش تھا۔ اس خاندان کے افراد اپنی علم دوستی کے باعث "خلیفہ" کے لقب سے لوگوں میں مشہور تھے۔

مولانا ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے بے حد ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی شرارتی تھے۔ لڑکپن کھیل کود اور کنکوے بازی میں کٹا۔ آغاز جوانی میں پہلوانی کا شوق چرایا۔ لیکن جلد ہی طبیعت اکتا گئی۔ اور آپ تحصیل علم کی طرف راغب ہوئے۔ فارسی کی کئی ایک کتب والد سے پڑھیں۔ بعد میں آپ کا ذوق اتنا بڑھا کہ بعمر ۲۰ سال فیض الحسن منطقی کے نام سے مشہور ہوگئے اور بسے لگاؤ کے سبب گھر بار چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ کچھ عرصہ مفتی صدر الدین آزردہ سے اکتساب فیض کیا۔ پھر اخون صاحب ولایتی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ آخر میں مولانا فضل حق خیر آبادی سے معقولات اور ادب کی کتب پڑھیں۔ اور فلسفہ کی تکمیل کی۔ اب آپ فیض الحسن ادیب کے نام سے مشہور ہوگئے۔

دہلی کے علاوہ آپ نے رام پور اور لکھنؤ میں بھی جاکر علم کی خوشہ چینی کی۔ اس عرصہ میں آپ کی خاصی شہرت ہوچکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۶ء میں سر سید احمد خاں مرحوم نے دہلی میں آپ سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند ایک قصائد پڑھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ سہارنپور واپس چلے آئے۔ کچھ عرصہ وہاں ایک رئیس کی ملازمت کی اور پھر علی گڑھ کا رُخ کیا۔ جہاں آپ عربی کی بعض کتب کا ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے۔ لیکن وہاں طبیعت نہ لگی۔ آخر موقع ہاتھ لگنے پر آپ ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ جب اس کالج سے عربی کا رسالہ "شفاء الصدور" جاری ہوا تو اس کی ادارت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ اس رسالہ کے ذریعے مولانا نے کالج کے ماحول کو علمی رنگ میں رنگ دیا۔ اور اپنے شاگردوں میں عربی تحریر و انشاء کا ذوق پیدا کیا۔

لاہور میں آپ کوئی پندرہ سولہ برس تک علوم مشرقی کے استاد رہے۔ اور سینکڑوں شاگردوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ بقول صاحب سیر المصنفین" مولانا اپنے عصر کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی ہندستان گیر

شہرت یہیں لاہور سے شروع ہوئی، پھر یہ عالم ہوا کہ بڑی بڑی دور سے شائقین علم و ادب کھنچ کر یہاں آنے لگے۔ چنانچہ علامہ شبلی مرحوم جیسے بلند پایہ عالم نے یہاں آکر آپ سے حماسہ کا درس لیا۔

کہتے ہیں کہ آپ کی علمی شہرت کے سبب پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد نے حکومت سے آپ کے لیے "شمس العلما" کے خطاب کی سفارش کی۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا، بلکہ یہ کہا کہ شمس العلما تو میرے شاگرد ہیں۔ میرے لیے اگر کوئی خطاب موزوں ہو سکتا ہے تو وہ "شمس شموس العلما" ہے۔

آپ نے اکہتر برس کی عمر میں ۶ر فروری ۱۸۷۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔ وفات کے وقت سہارنپور کے مولوی ظہور الدین آپ کے پاس تھے۔ وصیت کے مطابق ان کی نعش سہارنپور لے جا کر دفن کی گئی۔

آپ فارسی، عربی اور اردو کے قادر الکلام شاعر اور باکمال ادیب تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔

آپ کا فارسی کلام چھپ چکا ہے جو ایک دیوان "نسیم فیض" اور دو مثنویوں "روضۂ فیض" اور "چشمۂ فیض" پر مشتمل ہے۔ بقول محمد عبداللہ قریشی صاحب آپ کے کلام میں بندش کی چستی، خیالات کی رنگینی، تراکیب کا تنوع، تغزل کا درد و لیست اور الفاظ کا ترنم پوری طرح موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ صرف انہی خیالات کو شعری جامہ پہنانے، جو ان کے دل میں موجزن ہوتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

امشب کہ دامن ہمت رعنا گذاشتم — بال ہما و شہپر عنقا گذاشتم
چون پای خود بدامن راحت نمی کشم — آسودگی بہ نقش کف پا گذاشتم
شرم آمدم کہ شکوۂ درد جگر کنم — دست طبیب و پای مسیحا گذاشتم
کارم خراب بود کہ می کردم آرزو — خود رام شدم کہ تمنا گذاشتم
جز یک گلیم کہنہ دگر بر سرم نبود — وآن ہم بحکم ہمت والا گذاشتم
این است فیض صحبت پیر مغان کہ بانہ
زہد و صلاح و توبہ و تقویٰ گذاشتم

در عنفوان عیش درین خانہ سوختیم — گاہی چو شمع و گاہ چو پروانہ سوختیم
ما خانۂ یگانہ و بیگانہ سوختیم — یعنی کہ خانقاہ و صنم خانہ سوختیم
سیماب پارہ ایست کہ قائم نمی شود — از اضطراب این دل دیوانہ سوختیم
چون گل درین بہار شگفتیم چند روز — آخر بسان سبزۂ بیگانہ سوختیم
ای فیض ضبط آہ شرربار تابہ کی
آہی کشیدہ ایم کہ ویرانہ سوختیم

چہ تاب دست کہ دست ستم بہانہ کند — زبان بہ لرزہ فتد از تلفظ بیداد

کرا مجال کہ سوئیش نظر کند بی پاک — کرا دماغ کہ بویش بدم کشد آزاد
حجاب عفت او مانع وصول نظر — شکوہ نکہت او میل دیدہ حسّاد
بحکم عصمت او کو مناط عفت اوست — ہنوز او نتوان غنچہ لب بخندہ کشاد

مثنوی چشمۂ فیض کا اختتام :-

الٰہی حسرت درد آلود دارم — بہ سوز محبت درکنارم
منم مشتاق عشق آتش افروز — منم در بند سودای خود سوز
ندارم آرزوی گلشن و باغ — ندارم جز تمنای گل داغ
بہ داغ لالہ و نسرین ندارم — سر آن و ہوای این ندارم
الٰہی آتشی خواہم کہ بگلخت — چو خار خشک سوز د خانہ و رخت
نمی خواہم کہ بر بستر نشینم — مگر روزی بہ خاکستر نشینم

سرورؔ مولانا حاجی حکیم مفتی غلام سرور لاہوری کے با کمال اہلِ قلم اور "صد در یک" کی حیرت انگیز مثال تھے۔ آپ حضرت بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۴۴ھ لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم مفتی غلام محمد اپنے وقت کے ایک بلند پایہ عالم اور حاذق طبیب تھے۔

سرورؔ نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد تفسیر و حدیث، فقہ و تاریخ، صرف و نحو اور معانی و منطق کا درس مولانا غلام اللہ فاضل لاہوری سے لیا۔ آخر میں اپنے والد سے علم طب پڑھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ ۱۸۸۲ء میں رائے بہادر کنہیا لال نے جو لاہور ڈویژن کے ایگزیکٹو انجنیئر اور آپ کے شاگرد تھے، اپنے محکمہ میں ملازمت دلادی۔ لیکن آپ نے تھوڑی ہی مدت بعد استعفےٰ دے دیا۔ ۱۸۹۰ء میں آپ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ اگست ۱۸۹۰ء میں جب حج کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے تو راستہ میں مسافروں میں اچانک ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ آپ بھی اس موذی وبا سے بچ نہ سکے۔ اور آخر ۲۰ ذی الحج ۱۳۰۷ھ کو آپ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ بیر ابو الاحسانی میں جو مضافاتِ جنگِ بدر میں سے ہے۔ دفن ہوئے۔ مولوی غلام دستگیر قصوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ کی تصنیفات بیس کے قریب ہیں۔ جن میں خزینۃ الاصفیا، حدیقۃ الاولیا، گنجینۂ سروری، تاریخ مخزن پنجاب دیوان نعت سرورؔ، فارسی اور اردو نعتوں پر مشتمل، اور کلیات نعت بہ در خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نعتیہ رنگ اس قسم کا ہے :

از لامکان بلند مکان محمدؐ است — بالا ز عرش عزت و شانِ محمدؐ است
مفتاحِ علم و فضل دہانِ محمدؐ است — گنجینہ وار فیض زبانِ محمدؐ است
ناطق کلام حق بہ زبانِ محمدؐ است — شرح بیان حق ز بیانِ محمدؐ است

نور محمد است زهر نور جلوه گر — از هر نشان ظهور نشان محمد است
بی مثل و بی بهاست به بازار معرفت — هرگوهری که گوهر کان محمد است
شکر خدا که هیچ خدا بهر مغفرت — در روز حشر و نشر ضمان محمد است
با خاص و عام کرد عطا گنج معرفت — این فیض دست فیض رسان محمد است
جسم نبی است باعث ایجاد هر وجود — روح وجود ان نتیجهٔ جان محمد است

مهرو مدار باک که انجام کار تو
در حفظ احمدی و امان محمد است

ہندی رائے بہادر کنہیا لال تخلص ہندی، قوم سے کائستھ اور اصل وطن جلیسر تھا۔ اس کی پیدائش جیسا کہ خود اپنے فارسی دیوان مخزن توحید میں تصریح کی ہے، لاہور میں ہوئی۔ منشی غلام سرور لاہوری سے تلمذ تھا۔
کنہیا لال لاہور میں اگزیکٹو انجینئر کے عہدہ پر مامور تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کا ذکر مخزن توحید کے شروع میں کیا ہے۔ ان میں ظفر نامہ رنجیت سنگھ، اکبر نامہ (فارسی مثنوی)، تاریخ پنجاب، تاریخ لاہور اور مخزن توحید دیوان فارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فارسی کلام معمولی درجے کا ہے۔ ویسے تمام کلام میں تصوف کا رنگ غالب نظر آتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی صوفی شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔
ہندی نے ۲۳ر فروری ۱۸۸۸ء کو بمقام لاہور وفات پائی۔

نمونۂ کلام:-
اگر تو مرد نکوکاری و نکو اندیشی — ز نقش پای ہدایت قدم مکن پس و پیش
چرا بعیب دگر کس نظر کند نادان — بچشم غور نه بیند چرا بحالت خویش
به پیش بندهٔ وحدت پرست یکسانست — بهای کسوت شاهی و خرقهٔ درویشی

بفکر عاقبت کار باش ای ہندی
اگر تو صاحب عقلی و مرد دور اندیش

ز جام عشق بنوشد هر آنکه پیمانه — برد بدور زمانه همیشه مستانه
خدا ز نور محبت درین سرای جهان — چو شمع کرد منور تمام کاشانه

ز حد خلق و ادب پا برون مکش ہندی
مکن بوحدت حق گفتگو دلیرانه

گلت چهره نماید از گلستان — اگر تو عندلیب زار باشی
مسیحا خود قدم رنجه نماید — اگر بیچاره و بیمار باشی
نیفتد چون به پیش زی اختیارت — در تلاشش مال حیرانی چه پیدا
رفتنت آخر چو از دنیای دون — در تلاشش آب حیوانی چه پیدا؟

حکیم الامت علامہ اقبال

علامہ مرحوم کے متعلق اب تک سینکڑوں کتب و مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر اس مضمون میں ان کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ مضمون تشنہ رہے گا۔

علامہ شیخ محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک کاشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کاشمیری برہمن تھے۔ جن کے بعض افراد نے کوئی اڑھائی سو سال پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کے والد شیخ نور محمد بڑے زاہد و عبادت گزار انسان تھے۔

مولانا سید میر حسن جیسے متبحر عالم سے تعلیم حاصل کی۔ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آکر داخلہ لیا۔ یہاں انہیں پروفیسر آرنلڈ جیسے فاضل استاد مل گئے۔ ۱۸۹۹ء میں یونیورسٹی پنجاب سے ایم اے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ مدن کے پروفیسر رہے۔ کچھ مدت گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے استاد رہے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ جہاں ٹرینٹی کالج کیمبرج سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں سے جرمنی جا کر میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ انہی دنوں وہ بیرسٹر بھی ہو گئے اور عارضی طور پر استاد عربی کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کے قائم مقام رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے واپس لاہور آ گئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں سرکار برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس لندن میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ہمراہ نادر شاہ کی دعوت پر کابل کے جشنِ استقلال میں شرکت کی۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو دنیائے اسلام و علم و ادب کا یہ مہر درخشندہ اسی لاہور کی سرزمین میں غروب ہو گیا۔ (گویا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزرا) آپ کی فارسی کی منظوم تصانیف یہ ہیں:-

(۱) اسرارِ خودی (۲) رموزِ بیخودی (۳) پیامِ مشرق (۴) زبورِ عجم (۵) جاوید نامہ (۶) مثنوی پس چہ باید کرد۔ (۷) ارمغانِ حجاز۔

انتخاب:-

انسان کہ رُخ ز غازۂ تہذیب بر فروخت
خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر
افسونیِ قلم شد و تیغ از کمر کشود

این بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت
رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید
جز "یَسْفِكُ الدِّمَا"، "خَصِيْمٌ مُّبِيْن" نبود

از چشمِ ساقیِ مست شرابم
بے مے خرابم، بی مَی خرابم

شوقم فزون تر از بی حجابی
بینم نہ بینم در پیچ و تابم

چون رشتۂ شمع آتش بگیرد
از زخمۂ من تارِ رُبابم

از من برون نیست منزلگه من   من بی نصیبم راہی نیابم
تا آفتابے خیزد ز خاور   مانند انجم بستند خوابم

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو زکجاست؟   بسوزِ ماست ولی بادہ دربسوزِ کجاست
گرفتم این کہ جہاں خاک وما کفِ خاکیم   بہ ذرہ ذرۂ ما دردِ جستجو زکجاست؟

نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد
جنونِ ما زکجا شورِ ہای وہوزکجاست؟

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گران   دلبران، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم بران
درچمن قافلۂ لالہ وگل رخت کشود   ازکجا آمدہ اند این ہمہ خونیں جگراں
ای کہ در مدرسہ جوئی ادبِ دانش و ذوق   نخرد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گران
خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ   سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں
برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب وگل تست   ای زخود رفتہ تہی شوز نوائے دگراں
کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم   آں متاعم کہ شود دستِ زدِ بی بصراں

شمس مینائی

شیخ عبدالرحمٰن نام، ابوالمعالی کنیت، تخلص اُردو میں شمس اور فارسی میں مینائی۔ ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام امرتسر ہوئی۔ ناسا عد حالات نے تعلیم میں مڈل سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ حافظہ ملا کا پایا تھا۔ آبائی پیشہ پیتل تانبے کے برتنوں کی خرید و فروخت تھا۔ چنانچہ انھیں بھی تعلیم چھوڑ کر اپنے والد کے ساتھ یہ کام کرنا پڑا۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی چلے گئے۔ جہاں چاندی کے ظروف بنانے والے ایک کارخانہ میں ملازم ہوگئے۔

بمبئی ہی میں ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کے باعث شعر گوئی کا چسکا پڑا۔ کچھ عرصہ رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ (جس میں طرحی غزلیں ہوا کرتی تھیں) پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ اپنے ایک دوست کی وساطت سے وہاں کے بعض شعراء حفیظ جونپوری وغیرہ سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ اِن سب باتوں نے مل کر آتشِ شوق کو اور تیز کیا۔ چنانچہ ایک آدھ مرتبہ غزل لکھ کر خدنگ نظر کو بھیجی جو شائع ہوگئی۔ یوں ذوقِ شعری بڑھتا گیا۔ اور پھر باقاعدہ مشاعروں میں شرکت شروع کردی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں واپس امرتسر چلے آئے۔ یہاں مسلسل مطالعہ اور ذہنی قابلیت کے سبب فارسی زبان میں خاصی مہارت بہم پہنچائی۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے بعض جلسوں میں بھی انھیں اپنی نظمیں پڑھنے کا موقع ملا۔

یوں تو پاکستان سے قبل بھی لاہور میں ان کا آنا جانا تھا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور ہی میں آباد ہوگئے۔ رام گلی میں قیام ہوا۔ آخری عمر میں نورِ بصارت سے محروم ہوگئے۔ یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کو سدھارے۔

مینائی نے قدیم اور جدید دونوں طرزوں اور تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۴۶-۱۹۴۷ء میں انھوں نے اپنا فارسی و اُردو کا مجموعۂ کلام (جامِ مینائی) کے نام سے امرتسر میں چھپوایا تھا۔ جو بدقسمتی سے، سوائے ایک کاپی کے، تمام کا تمام وہیں فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مینائی کے کلام کے مطالعہ سے ان کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔

انتخابِ کلام:

طمع مدار ز نا امیدِ آرزوے دل
خوش است آنکہ ز امیدِ آرزو پاک است

چگونہ رازِ غمِ عشق را نہان سازم
کہ رنگِ چہرۂ من زرد و چشم نمناک است

مے دزد در چمن صبا چہ کند
غنچہ را لب کند نہ وا چہ کند

عمر بے مہر و عالمے رنجور
یک دلِ درد آشنا چہ کند

چارہ ساز است زیرکے - اما
چارۂ دردِ لادوا چہ کند

از تپِ سوزِ ہجر میناؔئی
نہ کند حشر گر بپا چہ کند

مرا مپرس ز داغی کہ در جگر دارم
بہ بین بچہرۂ من زرد و چشم تر دارم

مرا بہ عشق و محبت دگر چہ مے باید
کہ سینہ دارم و دل دارم و جگر دارم

گدائے گوشہ نشینم بشہ کرم مسند ما
ز فرطِ لطفِ تو امید یک نظر دارم

مرا بہ گردشِ دورِ جہان چہ میناؔئی
نہ مستِ بادۂ پندارم نہ سر دارم

ہر کرا طاقتِ گفتار و کلام است اینجا
رہبرِ راہِ سخن ہست و امام است اینجا

من بہ حیرانم از فلسفۂ زاہدِ خشک
مے کہ در خلد حلال است حرام است اینجا

ساقیا دور مےِ ناب بگیر و فرصت
وجہِ جمعیتِ دل گردشِ جام است اینجا

تیرہ بختم چہ مرا سود دہد نورِ ازل
مطلعِ حسنِ تو صد ظلمتِ شام است اینجا

من گنہگارم و ہم منفعلم میناؔئی
آن کہ بے جرم و خطا است کدام است اینجا

سالک

عبدالمجید خاں نام، سالکؔ تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام قادر مرحوم پٹھانکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

سالکؔ مرحوم کی ابتدائی تعلیم پٹھانکوٹ میں ہوئی۔ میٹرک بٹالہ میں لیا۔ کچھ عرصہ ملازمتوں کے چکر میں رہے لیکن ادبی ذوق زیادہ عرصہ ملازمت کرنے میں مانع آیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں ملازمت ترک کر کے پٹھانکوٹ سے ایک ادبی رسالہ "فانوسِ خیال" نکالا۔ اس رسالہ کو صرف نو یا دس ماہ کی زندگی میسر آئی۔

۱۹۱۵ء میں لاہور چلے آئے۔ اور یہاں "تہذیبِ نسواں" اور "پھول" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو تحریکِ عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ جیل ہی میں انگریزی کے مطالعہ کا خاصا موقع ہاتھ لگا۔ چنانچہ جب نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر پھر زمیندار سے منسلک ہوئے تو ادارت کے ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کے امتحانات بھی پاس کئے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناب غلام رسول صاحب مہر سے مل کر روزنامہ انقلاب

جاری کیا، جو قیام پاکستان تک بدستور شائع ہوتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مرکزی محکمہ اطلاعات کراچی میں چلے گئے۔ دو تین سال کراچی میں رہ کر ۱۹۵۳ء میں واپس لاہور آ گئے۔ اور تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو اپنی ایک کتاب "ہندوستان میں اسلامی تمدن" پر یونیسکو کی طرف سے ۸۰۴ ڈالر کا انعام ملا۔ حکومتِ پاکستان نے بھی آپ کی علمی خدمات کے صلے میں آپ کو پانچ سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دینا شروع کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔ آپ ایک بہت بڑے صحافی، شاعر، ادیب اور مزاح نگار تھے۔

سالک مرحوم نے اردو، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ چونکہ زیادہ مدت آپ صحافت میں مصروف رہے اس لیے شعر و سخن کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے۔ اسی سبب سے شعری سرمایہ محدود ہے۔ حال ہی میں ان کے فرزند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان کا مجموعۂ کلام "راہ و رسم منزل‌ہا" شائع کیا ہے۔ انتخاب کلام:-

شبیر شہید

واعظ شہر! چہ ترسانیم از خوف وعید — کہ منم عاشق دلدادۂ شبیر شہید
آن شہیدی کہ جہان دگران پاک بسوخت — آن شہیدی کہ جہان دگری را کارید
پشت پا زد بوجودی کہ نیرزد بجوی — مژدہ پرواز حیات ابدی را ورزید
ای خدا لمحہ کہ بر ریگ روان غلطان بود — ای خوشا لمحہ کہ در خلوت فردوس خزید
قطرۂ شبنم شاداب ز بستان رسول — کہ دمی برگل اسلام درخشید و چکید
دامن عشق چرا نہ گرفت و نگذاشت — مصلحت دید تقاضای خرد دید و ندید
لذت اندوزی آسانی منزل بفروخت — پای پر آبلہ در وادی پرخار خمید
می عرفان بجوانان فداکار آورد — لای این بادہ بہ پیران سحرخوان بخشید
انقلابی بدل اہل جہان برپا کرد — کس ندید آن روش دہر کہ چشمش وا دید
باغبان چمن دہر ہمیشہ دارد — شاخساری کہ از آن این گل نوبادہ دمید

سالک دل زدہ مداح حسین است ولی
از می حسن عمل آہ کہ جامی نکشید

غم فراق نگاری کہ داشتم دارم — بہ سینہ داغ بہاری کہ داشتم دارم
[illegible] امیدی کہ بجوان جہان گزری — نظر بہ راہ گذاری کہ داشتم دارم
چنان نہاد من از آتشی پر است کہ بود — ز سوز عشق شراری کہ داشتم دارم
[illegible] بلای الفت زلف و تصور گیسو — بہ کلبہ ام شب تاری کہ داشتم دارم
[illegible] گدای میکدہ ام و معتقد ساقی — بہ بزم بادہ خماری کہ داشتم دارم

شدند ہمنفسان وقفِ کار و بارِ خود   من جنون زدہ کاری کہ داشتم دارم

بہ باد رفت بہارِ دیارِ من سالک

غمِ بہارِ دیاری کہ داشتم دارم

بقولِ عبدالرشید صاحب تبسم، سالک مرحوم کو اپنا ذیل کا شعر بے حد پسند تھا اور وہ اسے اکثر گا گا کر سنایا کرتے تھے:

نہ اندیشد کہ جدت ریختن بر آشیان بلبل

الٰہی آفرین برقی کہ بر روی آشیان بندد

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں بھی بہت سے فارسی کے شعرا موجود ہیں۔ جن کا کلام فارسی و اردو کے موقر مجلات و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے ایرانیوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ ان موجودہ شعرا پر انشاء اللہ العزیز آئندہ فرصت میں لکھا جائے گا۔

---

(۲)

فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر

لاہور ——— یہ "مہ جبینوں کا شہر"، یکتا کے الفاظ میں "جلوہ خانۂ نور"، یہ رشکِ جناں باغوں اور روشوں کا شہر، یہ سرزمینِ عشق و محبت، یہ لالہ رُو مہ جبیں دلبروں کا شہر ——— کچھ آج ہی اس سحر انگیز کشش کا حامل نہیں ہوا بلکہ شروع ہی سے اس نے بڑے بڑے جہاں پناہوں، عاشقوں، خدا رسیدوں، شاعروں، سیاحوں غرض ہر قسم کے انسانوں کو اپنے عشق و حسن کا گرویدہ بنایا ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں وغیرہ میں کئے بغیر نہ رہ سکے۔

یوں تو اس شہرِ نگاراں کا ذکر مختلف کتبِ تواریخ میں بکھرا پڑا ہے، لیکن اکثر فارسی شعرا نے اپنے اشعار میں اس کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اشعار میں اس شہر سے اپنے والہانہ لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض وہ ہیں جو اپنے تاریخی قصائد وغیرہ میں اس کا نام بر سبیلِ تذکرہ لائے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مضمون میں اس قسم کے تمام اشعار آ گئے ہیں، تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اسے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لاہور کا ذکر سب سے پہلے ہمیں غزنوی دور میں ملتا ہے۔ جس کی وجہ محمود غزنوی کے حملہ ہائے ہندوستان کے دوران بعض فارسی شعرا کا اس کی ہمراہی میں یہاں آنا ہے۔ محمودی شعرا نے مدحیہ قصائد کے علاوہ کچھ ایسے طویل قصیدے بھی لکھے ہیں جن میں مدح کے علاوہ محمود کی بیشتر فتوحات کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ ان میں لاہور[1] کا تذکرہ ایک قدرتی امر تھا۔

---

[1] فارسی شاعری میں لفظ لاہور مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ کہیں یہ لہاور ہے تو کہیں لوہاور، کہیں لہانور ہے تو کہیں لاہوار، لاہنور یا لاہور وغیرہ۔

ایسے قصائد میں عنصری اور فرخی کے قصائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سید محمد لطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں "خلاصۃ التواریخ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود کے حملۂ پنجاب کے دوران یہاں (لاہور میں) سخت قحط پڑا۔ محمود نے نئے سرے سے یہ شہر بسایا۔ مورخین نے اس کی تاریخ ان اشعار میں نکالی :-

محمود بنا کرد چو لاہور لہانور ۔۔۔ در ہند یکی کعبۂ مقصود بنا کرد

اندیشہ چو کردم پی تاریخ بنایش ۔۔۔ فی الفور خرد گفت کہ "محمود بنا کرد"

(اس کے عدد ۳۷۵ھ بنتے ہیں لیکن لطیف نے "ک" کو ساقط کر کے ۳۹۵ کے عدد لکھے ہیں ملاحظہ ہو جدید ایڈیشن ص ۳۵۳)

غضایری رازی عراق کے بڑے شعرا اور امرائے دیلمی کے مداحوں میں سے تھا۔ محمود کی بھی مدح وستائش اس نے کی ہے۔ بقول ذبیح اللہ صفا اس نے ۴۲۶ھ میں وفات پائی۔ اپنے ایک قصیدہ میں (یہ قصیدہ عنصری کے دیوان میں شامل ہے) جس کا مطلع ہے :

اگر کمال بجاہ اندر است وجاہ بمال

مرا ببین کہ ببینی کمال را بکمال

اپنے حاسدوں کا ذکر کر کے سلطان محمود کی مدح کی ہے۔ اسی میں ایک جگہ لاہور کا ذکر اس طرح کرتا ہے :

زہی ملک کہ حلال چنین بود دینار ۔۔۔ بہ تیغ مالد و در خون خصم کرد سفال

خراج قیصر روم ست و سر کشہ[1] فغفور ۔۔۔ بہار و ہند لی لاہور با جیپال

بلای برہمنانست و آفت دجال ۔۔۔ ہلاک اہرمنان است و آفت دجال

ابوالقاسم حسن عنصری بلخ کا رہنے والا اور محمود کا ملک الشعرا تھا۔ ۴۳۱ھ میں اس نے وفات پائی۔ یوں تو اس نے اپنے بعض قصائد میں محمود کے ہندوستان پر حملوں کی تفصیل دی ہے۔ لیکن اس کے مختصر سے دیوان میں جو لکھنؤ میں چھپا ہے ، بظاہر لاہور کا ذکر نہیں۔ البتہ یہاں کے حکمران جیپال کا تذکرہ اکثر مواقع پر ملتا ہے۔ اس طرح بالواسطہ ، اس وقت کے لاہور کی فوجی حالت وغیرہ کا نقشہ اس کے ایسے اشعار میں آ گیا ہے۔ مثلاً ایک قصیدے میں مختلف شہروں پر حملے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

شنیدہ ای خبر شاہ ہندوان جیپال ۔۔۔ کہ بر سپہر برینش ہمی بسود افسر

فزون ز لشکر او بر فلک ستارہ نبود ۔۔۔ گر نبود بر وی زمین برو نہ مدر

بدین صفت سپہی بود دست بستہ بخون ۔۔۔ بدست ایشان شمشیر با جرم سمر

---

[1] یہ لفظ دیوان عنصری مطبوعہ ایران بعہد ناصر الدین شاہ قاچار اور دیوان عنصری مطبوعہ لکھنؤ میں اسی طرح ہے۔ لیکن غالباً یہ سرگزہ ہے جس کے معنی جزیہ کے ہیں۔ ممکن ہے شاعر نے ضرورت شعری کے لیے "ہ" آزاد کی ہو ویسے یہ شعر ہی غلط چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چو دود تیره مداد آتش زبانه زبان — تو گفتی آنکه پراگنده شد بدشت سقر
ز بیم ایشان از مغزها رمیده خرد — ز هول ایشان در چشمها شمیده بصر

اسی قصیدہ میں ایک اور جگہ کہتا ہے :

شنیده‌ای که چه کرد او در بزم جیپال — بکامش اندر زهر کشنده کرد شکر
زمین و لشکر او موج و سپر دریا بود — ز گرد ایشان گیتی سیاه در روز اغبر

فرخی سیستانی (متوفی ۴۲۹ھ) غزنوی دور کے شعرائے بزرگ میں شمار ہوتا ہے۔ بہت سے معرکوں میں یہ محمود کے ہمراہ رہا۔ اسی سلسلے میں اسے ہندوستان آنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہاں پہ محمود کے حملے کی تفاصیل اس کے قصائد میں بہ نسبت دوسرے شعرا کے زیادہ بہتر رنگ میں ملتی ہیں۔ اپنے ایک قصیدہ "در ذکرِ مراجعتِ سلطان محمود از فتح ہندوستان در فتح ثانی" میں محمود کی مدح کرتے ہوئے لاہور کا ذکر یوں لایا ہے :

ایا شجاعت را نوکِ نیزهٔ تو پناه — ایا شریعت را تیغ تیز تو معیار
بسا بتا که تو برداشتی ز بتکده ها — جهان بتان که ز لاهور بگرفتی بار

ممکن ہے اس کے کلام میں لاہور کا ذکر اور جگہوں پہ بھی ہو، لیکن راقم کو اس کے "انتخاب" مطبوعہ لاہور میں صرف یہ شعر ملا)

جے پال کے متعلق لکھتا ہے :

ز جیپال سپه را بشب گذاشته بود — به پیل از آب و از آن سو گرفته راه گذار
نمود هیبتِ پیلانِ آهنین دندان — کشاده بازوی مرغانِ آهنین منقار
سرِ ملوک عجم چون بنزدِ کوه رسید — صفِ سپاه عدو دید با سکون و قرار

اسی لاہور کے ایک اور شاعر ابوالفرج رونی (متوفی بعد از ۴۹۲ھ) جسے بعض ایرانی تذکرہ نگار خراسان کا بتلاتے ہیں لیکن عوفی نے لباب الالباب میں اس کا مولد و منشا خطۂ لاہور لکھا ہے، کے مختصر سے دیوان، مطبوعہ روس میں لاہور کا ذکر چند ایک مواقع پہ آیا ہے۔ مثلاً سلطان ابراہیم غزنوی کی مدح میں ایک جگہ کہتا ہے :

سپهرِ دولت و دین آفتاب هفت اقلیم — ابوالمظفر شاه مظفر ابراهیم
کشید رایت منصور سوی لوهاور — بطالعی که تولا کند بدو تقویم

سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں :-

حضرتی شد بزرگ چون غزنین — لاهوار از قدومِ شاهِ زمین
پشتِ مسعودیان ملک مسعود — روی بازارِ آلِ ناصر دین

"در مدحِ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم":-

نظامِ ملک و ولایت، جمالِ تاج و کلاه — سرِ محامد محمود شاهزاده و شاه

بلاهور در آمد میانِ موکب خویش — به زینتی که بر آید شب چهاردہ ماه [14]
قضا بردی همی رفت پیش او همه دشت — قدر بدیده همی رفت پیش او همه راه

اب ایک ایسے شاعر کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں، جو اسی لاہور کا تھا اور جسے لاہور سے اس قدر محبت تھی کہ شاید کسی سچے عاشق کو اپنے محبوب سے بھی اتنی محبت نہ ہو۔ مسعود سعد سلمان، لاہور میں سنہ ۴۴۰ھ کے قریب پیدا ہوا۔ ایرانی تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ پیدائش تو اس کی لاہور ہی کی ہے، لیکن اصل اس کی ہمدان سے ہے۔ اس برصغیر کے غزنوی حکمران سلطان ابراہیم غزنوی وغیرہ کے دربار سے متعلق تھا۔ پھر محمود بن ابراہیم غزنوی سے وابستہ ہوا۔ اس بدنصیب شاعر کو بعض بدخواہوں کی لگائی بجھائی کے سبب کوئی بیس سال لاہور سے دور قید خانوں میں گزارنے پڑے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے کلام میں جہاں کہیں لاہور کا ذکر آیا ہے، بڑا ہی پُر درد ہے۔ جیسے کوئی ہجر زدہ عاشق اپنے محبوب کے لیے بڑی طرح تڑپ رہا ہے: (۵۱۵ھ میں اس نے وفات پائی)

از زمانه نکرده ام گله ای — تا بدانسته ام که مجبوراست
مر مرا گاه گاه رنج دهند — همه ام بر یه (از آرزو) لهاوور است

ایک اور قصیدے میں لاہور کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس شہر میں اس کا محبوب اقامت گزیں ہے:

با دلی پر آتش و دو دیدهٔ پر خون — رفتم از لاوهور خرم بیرون
تا فته از دشمنان و شیفته از دوست — سوخته از روزگار و خسته ز گردون
گردان از عشقت ای نگار چو لیلی — گرد بیابان و کوه و دشت چو مجنون
باشد هرگز که باز بینم و بوسم — دو رخ گلگون یار و دو لب میگون

دیگر:-
مرا که گوید کای دوست عید فرخ باد — نگار من بلهاوور و من بنیشاپور
ره دراز و غریبی و فرقت جانان — اگر بنالم، دار بدیر مرا معذور

اور:-
نه پایگاه من از حشمتش فزود شرف — نه اسنگاه من از خلقتش گرفت جمال
چه گویم آخر با مردمان لوهاور — چو باز گردم و از حال من کنند سوال

ایک جگہ شاہِ غزنی کی ایک مجلس عیش کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

گرچه خرم سرشت لوهاور — باشد آن کس که میخورد معذور
منظر شاه عشلد را ماند — که بر آورد ابر گوهر افشاند

لاہور سے دوری کے غم نے جب اسے بہت ستایا تو یوں پکار اُٹھا:

دانی تو که با بند گرانم یارب — دانی که ضعیف و ناتوانم یارب
شد در غم لوهور روانم یارب — یارب که در آرزوی آنم یارب

اس کا ذیل کا قصیدہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ دیکھئے اس میں لاہور کو کس دلسوزی سے مخاطب کیا ہے:

ای لاوهور ویحک بی من چگونه ای　　بی آفتاب تابان روشن چگونه ای
ای آنکه باغ طبع من آراسته ترا　　بی لاله و بنفشه و سوسن چگونه ای
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار　　با من چگونه بودی و بی من چگونه ای
ناگه عزیز فرزند از تو جدا شده است　　با درد او به نوحه و شیون چگونه ای
نفرستی ام پیام و نگوئی بحسن عهد　　کاندر حصار بسته چو بیژن چگونه ای
گر ز حصن برکشدت وازگونه بخت　　از اوج بر فراخته گردن چگونه ای
در هیچ حمله هرگز نشکسته ای سپر　　با حمله زمانه توسن چگونه ای
باشد ترا ز دوست بیکبارگی تهی کنار　　با دشمن نهفته بدامن چگونه ای
از دوستان ناصح مشفق جدا شدی　　با دشمنان ناکس ایمن چگونه ای
آباد جای نعمت نامه ترا بچشم　　محنت زده بویران معدن چگونه ای
ای چهره باز دست گذاشتگار دوست　　بسته میان تنگ نشیمن چگونه ای
بر ناز دوست هرگز طاقت نداشتی　　امروز با شماتت دشمن چگونه ای

ای دم گرفته زندان گشته مقام تو
بی دلگشاده طارم و گلشن چگونه ای

لاہور کی برسات پر ایک نظم میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا ہے:

جستند ابرهای پر نم تر　　خرما سبزه های خرم تر
بسکه خرم شده است لوهاور　　باشد آن کس که می خورد، معذور

سید اشرف الدین حسن غزنوی بہرام شاہ غزنوی کا درباری شاعر تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ بہرام کے حملہ ہائے ہندوستان میں یہ اس کے ہمرکاب تھا۔ ۵۵۶ھ میں اس نے وفات پائی۔ ۵۱۳ھ میں جب بہرام نے محمد ابو حلیم والسالار ہند کی بغاوت فرو کی، تو اس وقت حسن نے ایک قصیدہ لکھا جس میں ایک جگہ کہتا ہے:

زهی رونق ملک از سر گرفته　　بیک تاختن هفت کشور گرفته
برانده به لاهور فال سعادت　　بنام خدا دین پیمبر گرفته

۵۲۴ھ کے بعد محمد بن منصور تابینی والسرائے ہند مقرر ہوا تو سید حسن نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ جس میں لاہور کا تذکرہ کوئی دو ایک مرتبہ آگیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عمرم برای لهاوور برده بود　　همت بر آن سعادت مقصور بوده بود
نزدیک تر نمودی از جان به نزد من　　زان پس که خود ز من چو دلم دور بوده بود
نزدیک نور نیک بدیع است و بس عجب　　گوئی که آفتاب مگر دور بوده بود

نی نی چنین بہ وضع لطافت دوری بود   این نکتہ بر ضمیرم مستور بودہ بود
دیدم کنون کہ خاصیت نور آفتاب   در ہمت محمد منصور بودہ بود

فرید بشار ایک بہت بڑے ادیب اور فاضل کامل اپنے وقت کے تھے۔ فارسی نظم و نثر میں بھی، لبقول عوفی، انھیں ایک مقام حاصل تھا۔ شیخ زکی، جو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے، جب حج کے ارادہ سے ہرات پہنچے تو وہاں کے علما فضلا وغیرہ نے ان کے بارے میں فارسی اور عربی میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ چنانچہ اسی ضمن میں فرید بشار نے بھی چند اشعار لکھے، جن میں لاہور کا ذکر اس طرح آیا ہے :

زہی ز خاطر تو لشکر سخن منصور   خہی بہمت تو کشور ہنر معمور
سزد کہ خط غلامی ستاند از آفاق   چو ہست مسکن تو خواجہ خطۂ لاہور
ز مدح پاک تو شاہ زمانہ می جوید   چو آفتاب کہ از عرش دوام خواہد نور

امیر خسرو دہلوی (متوفی سنہ ۶۹۸ھ) کے نام نامی سے کون آگاہ نہیں۔ انھوں نے اپنی مثنوی "قران السعدین" میں ایک جگہ مغول کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے لاہور کا نام بر سبیل تذکرہ لیا ہے :

از قدم شوم مغل آن بلاد   نام و نشانی ز عمارت نداد
از حد سامانہ و تا لکھنور   ہیچ عمارت نہ مگر در قصور

طالب آملی، جہانگیر کا ملک الشعرا، آمل کا رہنے والا، لاہور کے حسن فسوں کار سے نہ بچ سکا۔ اور اسے اس شہر محبوباں کا ذکر والہانہ انداز میں کرنا ہی پڑا۔ بیچارہ سنہ ۱۰۳۶ھ میں عین شباب میں چل بسا۔ ورنہ شاید اس سے بھی زیادہ لاہور کا ذکر کرتا۔ اس حسن خیز سرزمین نے ایک تو پہلے ہی اسے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں اس کے مرشد کی موجودگی بھی اس شہر سے اس کے زیادہ لگاؤ کا سبب بنی۔ اور اسے ایک پوری نظم اس کی توصیف میں لکھنا پڑی۔ اس کے خیال کے مطابق ہفت کشور میں کوئی بھی شہر، لاہور کی سی آب و تاب کا حامل نہیں ہے۔ یہاں کا خالص شہد ایسا میٹھا پانی آب حیات کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ایک خضر آب حیات پر قابض ہیں تو یہاں کا پانی ہزاروں ہی خضر رکھتا ہے وغیرہ۔ ذرا شاعر ہی کے الفاظ میں یہ سب کچھ سنیے۔

خوشا لاہور و فیض آب لاہور   لطافت ہای شیخ و شاب لاہور
نیابی ز اہل ہندستان گروہی   بدل نزدیکی ارباب لاہور
گمانم نیست اندر ہفت کشور   بود شہری بآب و تاب لاہور
سکندر گو کہ عمر خضر یابد   ز آب ہمچو شہد ناب لاہور
کہ گر یک خضر آب زندگی داشت   ہزاران خضر دارد آب لاہور
بود لاہور شہری جملہ آرام   نیابی مضطرب سیماب لاہور
میان بگشا و خوش ما کش کہ در ہند   فراغت نیست جز در خواب لاہور
برسم کاسبان از صبح تا شام   کتان بافی کند مہتاب لاہور

بچنگ زہرہ مشکین تار بستہ   سر زلف بریشم تاب لاہور
بزخم سکہ پیشانی عزا شد   زد خورشید را مضراب لاہور
ز طاق ابروی زناربان تر سس   نشان مسجد و محراب لاہور
قلم چون تیر سازم نقش گیرد   ہزاران فتنہ از القاب لاہور
کنم ز آن رو مرید آسا شب و روز   کرامت ہا بیان در باب لاہور
کہ پیر دستگیر و مرشد من   یکی قطب است از اقطاب لاہور

خدایا زندہ جاوید دارش
بآب خضر یعنی آب لاہور

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی ایک نظموں میں لاہور کا نام آیا ہے۔ مثلاً ہند سے قندھار جاتے ہوئے اس نے ایک قصیدہ لکھا۔ اس میں ایک جگہ کہتا ہے:

نگاران لاہور و خوبان دہلی   بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکی چہرہ سودی بچشم و کامم   یکی بوسہ دادی بزلف عنانم
فشاندی یکی در بغل یاسمینم   ہنادی یکی در دہان برگ پانم

جب قندھار کے لیے آگرہ سے براستہ لاہور، ملتان پہنچا تو راستے میں شدید بارشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

ز آگرہ تا بخیابان گلشن لاہور   رفیق بودم با ابرہای بارانی
بعزم ملتان چون زو رقی شدم چو ہلال   زدا ز سر شکم نیلاب کرش عمانی   (دریا کا نام)

ایک موقع پر، بقول شبلی مرحوم، طالب آملی ایک مشہور شاعر شاپور طہرانی سے لاہور میں ملا۔ وہ نور جہاں کے والد کا چچا زاد بھائی تھا۔ طالب نے اس واقعہ کا ذکر ایک غزل میں کرتے ہوئے پھر لاہور کا تذکرہ چھیڑا اور اس طرح اس سے اپنی دلبستگی کا اظہار کیا:-

بحمد اللہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم   ہمان رشک عطارد شاعر مشہور را دیدم
چہ خوشحالم کہ بعد از مدت یکسالہ مہجوری   خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

ابو البرکات منیر لاہور کے ایک مشہور فارسی گو شاعر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "مثنوی در صفت بنگالہ" خاصی مشہور ہے۔ انھوں نے ۱۰۵۵ھ میں وفات پائی۔ ایک غزل کے مقطع میں اپنی شاعری پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آشنا گشتم بطرز تازہ چون عرفی منیر
فیض اشعار ترم لاہور را شیراز کرد

محمد جان قدسی، شاہجہان کا ملک الشعراء تھا۔ بقول صاحب شاہجہان نامہ مشہد مقدس کا رہنے والا تھا۔ آزاد بلگرامی مؤلف

سرو آزاد کے مطابق اس نے ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی۔ اس کی ایک نعت جس کا مطلع ہے :

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

خاصی مشہور ہے۔ مطبع افغانی امرتسر میں ۱۳۲۲ھ میں اس کی ایک مثنوی چھپی جس میں ایک آدھ جگہ لاہور کا ذکر بر سبیل تذکرہ آ گیا ہے شاہجہان جب تخت نشین ہوا، تو دارا شکوہ، سلطان شجاع اور اورنگ زیب پنجاب سے اس جشن میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے قدسی نے لکھا :۔

سلیمان شکوہاں والا جناب — روان آصف عہد شان در رکاب
ز لاہور کردند عزم سفر — سوی اکبر آباد با کر و فر

شہزادہ دارا شکوہ، شاہجہان کا بڑا بیٹا جس نے ۱۰۶۹ھ میں وفات پائی۔ قادری تخلص اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ چونکہ دارا شکوہ کے مرشد لاہور میں مقیم تھے، اس لیے اس شہر سے اسے روحانی اور دلی لگاؤ تھا جس کا اظہار اس نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً غزل ذیل میں اس شہر کے لیے مختلف دعائیں مانگی ہیں :۔

بود آباد دائم شہر لاہور — وبا و قحط ز ینجا دور دارد
بود فخرش بخاک حضرت پیر — کہ در خود ہمچو او مشہور دارد
ہمیشہ اولیا خیزد ازین ملک — خدا این قوم را منظور دارد
خطاب او خدا کردہ الم نور — مدام این شہر را پر نور دارد

ہمیشہ شہر خرم باد و سیراب
بخوبی در جہان مشہور دارد

ملا شاہ بدخشی بقول محمد صالح کمبوہ ۱۰۲۳ھ میں وارد ہند ہوئے اور پھر لاہور آ کر حضرت میاں میرؒ کے مرید ہوئے ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ مثنویاں کثرت سے لکھی ہیں۔ کلیات کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ لاہور کا ذکر اکثر جگہ کیا ہے۔ مثلاً

کرد خورشید چونکہ عزم عبور — ہمزد از سند جانب لاہور
کرد لاہور جای خود تعیین — آفتاب یقین محی الدین (یعنی حضرت میاں میرؒ)
تربیت کرد خلق را آن ماہ — گشت روشن دل محمد شاہ
گل تحقیق شاہ بر سر زد — آفتابی ز ماہ سر بر زد

ایک اور جگہ اپنے مرشد ہی کے ذکر میں کہتے ہیں :۔

بلاہور باکہ در کشمیر — ہمہ بودند جمع پیش فقیر

اور :۔ روی شاہ ملوک را دیدم — بود شاہ ملوک توحیدم

گشت این شاہ فتح در لاہور   دائم آباد باد معدن نور

بود آن خانہ جای اللہ داد   ہست جنت بروش باد کشاد

مشہور تمثیل گو شاعر صائب تبریزی، ظفر خاں کے دربار سے وابستہ تھا۔ کچھ عرصہ ہندوستان میں رہ کر واپس اپنے ملک میں چلا گیا، جہاں سنہ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔ اس کے یہاں بھی چند ایک مواقع پر لاہور کا ذکر ملتا ہے۔ بقول شبلی مرحوم ۱۰۳۹ھ میں شاہجہان نے دکن کا رُخ کیا۔ ظفر خاں اس کے ہمرکاب اور صائب اس کی ہمراہی میں تھا۔ جب برہانپور پہنچے تو چونکہ یہاں کی زمین نہایت غبار انگیز تھی، صائب نے کہا :-

تو تماشا سازد غبار آگرہ، لاہور را

چشم من تا خاک مال گرد برہانپور خورد

ایک اور موقع پر جب کہ اس کا ستر سالہ باپ اسے لینے کے لیے ایران سے یہاں پہنچا تو اس نے ظفر خاں سے رخصت چاہی اور ایک مدحیہ قصیدہ لکھا جس میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا :-

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند   افتادہ است توسن عزم مرا گذار

ہفتاد سالہ والد پیریست بندہ را   کز تربیت بود بمنش حق بی شمار

آوردہ است جذبۂ گستاخ شوق من   از اصفہان باگرہ ولاہورش اشکبار

سعید اے گیلانی عہد شاہجہان کا مشہور شاعر اور زرگر تھا۔ تختِ طاؤس جیسا عظیم صنعتی کارنامہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ سنہ ۱۰۴۳ھ میں شاہجہان کے آٹھویں جشنِ تخت نشینی پر ایک طویل قصیدہ لکھ کر گزرانا۔ جس میں ایک جگہ کہتا ہے :-

باکبرآباد از جہد کامران بسر برد   جلوس کہ ز تائید عالم منان

ز کامرانی نوروز عزم کردہ نمود   سوی مدینۂ لاہور بر جہان شادان

ہزار گونہ بود گل بجوہ ہر قدمش   ہزار چشمہ ولی بہ ز چشمہ حیوان

مشہور شاعر عبدالقادر بیدل سنہ ۱۰۸۳ھ میں اکبر آباد میں تھے۔ ایک موقع پر افسردگی کے عالم میں دہلی گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی ان کے دل کی افسردگی برقرار رہی۔ یکایک وہاں سے پنجاب جانے کا خیال پیدا ہوا، اس سے کچھ سکون ہوا اور طبیعت بھی قدرے کھل گئی۔ چنانچہ اس موقع پر ایک تاریخ کہی۔ جس میں لاہور کا ذکر بھی آیا ہے :

شوق را از عزیمت لاہور   تازگی ہای مژدۂ شادیست

یعنی از دامگاہ افسردن   چند گاہم نوید آزادیست

سالِ تاریخ این عزیمتِ شوق

بی تکلف شنو "خدا دادیست"

نواب احمد یار خاں المتخلص بہ یکتا دورِ عالمگیرؒ کے آخر میں ٹھٹھہ ۱۰۸۵ھ کے صوبیدار رہے۔ ان کے والد الہ یار خاں لاہور، ٹھٹھہ اور ملتان کے صوبہ دار رہے۔ یکتا نے بقولِ صاحبِ سروِ آزاد مختلف فنون میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ سنہ ۱۱۴۷ھ میں بمقام خوشاب وفات پائی۔

چونکہ یکتا ایک عرصہ لاہور میں رہے اس لیے انھیں اس شہر سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی مثنوی "داستان ہیر و رانجھا" میں کیا ہے۔ پنجاب کی تعریف کرتے کرتے جب لاہور کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان کا اشہبِ قلم یوں جولانیاں کرنے لگ جاتا ہے:

(پنجاب)

گرچہ ہر گوشہ اش طرب خیز است — از مئ شوق جام لبریز است
لیک لاہور مصرِ محبوبی است — یوسفستانِ عالمِ خوبی است
شہر فش ماه آنقدر رفعت — کہ بشانش نمی رسد شوکت
از بلندی گذشت پایۂ او — نہ فلک پست زیرِ سایۂ او
از صفا لوحِ سینۂ ابرار — صدق، جنسِ دوکانِ ہر بازار
صبحِ صادق کہ مطلعِ نور است — یکی از کوچہ ہای لاہور است
آسمان گنبدِ نمودارش — کہکشان، رستۂ ز بازارش
از ہوائش کہ رنگ مہر بزد — با غبارش فرنگ می ریزد
ہست ہر باغِ آن خجستہ دیار — دائم از جوشِ گل ہمیشہ بہار
صبحِ دلفامش زِ رنگِ جلوہ گری — گردشِ چشمِ عشوہ ریز پری
خوب رویانِ آن بہشت او رنگ — ہمہ آدم فریب گندم رنگ
ہر طرف خیل خیل ماه رویان — صندلی چہرہ عنبرین مویان
ہر یکی نونہالِ سرو اندام — جلوہ بدمست موجِ نشہ خرام
غمزہ ہا برق ریزِ خرمنِ دل — مژہ ہا فوجِ دشنۂ قاتل
چشم دابرو بکینہ ہمہ ستان — تیغ در کف صفِ سپہ مستان
شہر بستان و لالہ رویان گل — سنبل و سبزہ اش خط کاکل
از ہمین شہرِ جلوہ خانۂ نور — رستہ این شعلہ ہای آتشِ طور
حسن، آتش بہارِ جلوۂ ناز — عشق غمدیدہ ای بسوز و گداز
تا زمین شہرِ حسن بنیاد است — چمنِ محفلِ پریزاد است
تا سوادش ز دور کردہ نگاہ — از حسد مردی ہند گشتہ سیاہ

دیدۂ عالم است، مطلعِ نور
چشم بد زین سوادِ اعظم دور

ایک اور مثنوی "قصہ ہیر رانجھا" (مطبوعہ ۱۳۱۹ھ امرتسر) میں لاہور کا ذکر آیا ہے۔ یہ مثنوی کسی اکبر علی شاہ پنجابی کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ لیکن در اصل یہ تصنیف شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کی ہے۔ آفریں بقولِ صاحبِ "مجمع النفائس"

لاہور کا رہنے والا، ایک خوش مشرب، آزاد اور متوکل قسم کا اور عہد عالمگیر کے شعرا میں سے تھا۔ صاحبِ مردم دیدہ نے اس کی وفات ۱۱۶۱ھ میں بتائی ہے۔ مثنوی ہذا میں لاہور کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے :

(پنجاب)

در آن مُلک آن لاہور عین السرور | بہشتی ست پر از حور و قصور
ز بس حافظِ مصحف از ہر مزار | زوان دلکشا قبرستان بخطِ غبار
ز ارباب فضل اندر و ہر طرف | چو اوراق مصحف سراسر شرف
چہ لاہور آن زینت روم و چین | چہ بینی بود زیب روی زمین
بود نحو حسنی خدا داد خویش | زلیخا ست بر یوسف آباد خویش
ز رعنا خرامان زرین کفش | چو قوس قزح دادہ سرخ بنفش
جدا ہر قسم کلک ہر کوچہ اش | مرقع بود سلک ہر کوچہ اش
تہی از ریا چون دلِ صادقان | پُر از عشق چون سینۂ عاشقان
مسیحا ہوا دایہ دہر بین اوست | خضر تشنۂ آب شیرین اوست
ز آئین بازار و برزن مپرس | بیان عمارت خود از من مپرس
پری خانہ ہا تنگ و پہلو بہم | ہمہ حلقہ چون زلف بر روی ہم
بہ ہر پای دیوار دیوانہ ای | بہ ہر سایۂ شمع پروانہ ای
جوان سیر ست و پیر کامل ہمہ | کہن گشتہ و تازہ بسمل ہمہ
ز بس باورع بہر نیکی کدہ خوش ست | برات بہشت از مفیان اوست
ز خوبی دلان نیز ہم عالمیست | بہ ہر گوشہ بہار عیسی دمیست

بہ آراستہ انجمن ہر کسی
بافسانہ ہمسر در انجمن بسی

بارھویں صدی میں سسّی پنّوں کی داستان کو کسی اندرجیت منشی نے فارسی نظم کا جامہ پہنایا اور اس کا نام "نامۂ عشق" رکھا۔ (یہ مثنوی حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کی ہے)۔ اس میں شاعر اپنے سفر کا حال لکھتے ہوئے لاہور کا نام بھی ایک جگہ لے آیا ہے۔

سن ہجری ہزار و یک صد و چل (۱۱۴۰) | کہ از لاہور بستم محمل دل
بملتان آمدم ہمراہ نواب | دل خورسند و طبع شاد و شاداب

"ظفر نامہ رنجیت سنگھ" مؤلفہ دیوان امرناتھ میں بھی دو ایک جگہ لاہور کا ذکر آیا ہے۔ (یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں دانشگاہ پنجاب کی جانب سے شائع کی گئی)۔ دیوانِ مذکور نے کسی مصر بیلی رام کے حوالے سے لکھا ہے کہ استاد اکرم بیگ چغتائی قاآنی (مشہور ایرانی قصیدہ گو) کے خاندان میں سے اور نواسہ زادہ جنت مکانی تھا۔ استادِ مذکور کو نعلبندوں کے ایک لڑکے الٰہی بخش سے عشق ہو گیا۔ یہ لڑکا اس کا بہت

محبوب اور منظورِ نظر تھا۔ اس کے "غم ہجران" اور "سرورِ وصال" میں استاد نے ایک مثنوی "الٰہی بخش نامہ" لکھی جس کے چند اشعار "ظفر نامہ میں" بطور تبرک" دیئے گئے ہیں۔ ان میں لاہور کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

معشوق کے انساب کے ذیل میں کہتا ہے:

که در شهرِ مبارک شهر لاهور   بحرِ آملی محله جای مشهور
شریف الذات مردی اشرفش نام   بفنِ نعلبندی مرجعِ عام
سه فرزندش گرامی چون مه و مهر   همه سیمین تن و زیبا و گلچهر
از آن جمله الٰهی بخش ماهی   بمُلکِ حسن و خوبی پادشاهی
مه و مهر از رخش یابنده تابی   تعالی الله بخوبی آفتابی

اپنے نام و نشان کے متعلق:-

بدرِ سلطنت یعنی که لاهور   الٰهی از سوادش چشم بد دور
میانِ مسجدِ جامع، که ثانی   ندارد، آفرین بر روحِ بانی
بزرگی، نامداری، کامگاری   بتدریسِ علومش کار و باری
کریم الطبع میرزا اکرمش نام   محبت ورزی او شهرهٔ عام
اگرچه بود وی مشهور از افاضل   بعلمِ عشقبازی نیز فاضل

ولیکن پاکباز و پاک‌باز بود
بهر پاکیزه رُوی در گرو بود

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی اسرار و رموز میں ایک جگہ ایک نوجوان کی حکایت بیان کی ہے جو حضرت علی ہجویری کے پاس آتا ہے۔ اس میں چلتے چلتے لاہور کا بھی ذکر آ گیا ہے:

سیدِ ہجویر مخدومِ امم   مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
بندهای کوهسار آسان گسیخت   در زمینِ هند تخمِ سجده ریخت
عهدِ فاروق از جمالش تازه شد   حق ز حرفِ او بلند آوازه شد
خاکِ پنجاب از دمِ او زنده گشت   صبحِ ما از مهرِ او تابنده گشت
نوجوانی قامتش بالا چو سرو   وارد لاهور شد از شهرِ مرو
رفت پیشِ سیدِ والا جناب   تا رباید ظلمتش را آفتاب
گفت محصورِ صفِ اعداستم   درمیانِ سنگها میناستم

با من آموز ای شهِ گردون مکان
زندگی کردن میانِ دشمنان

ابوالاثر حفیظ جالندھری کے استادِ گرامی، غلام قادر گرامی مرحوم جالندھر کے رہنے والے اور نظام دکن کے شاعر خاص تھے۔ ۱۳۴۵ھ میں فوت ہوئے۔ اپنی ایک چھوٹی سی مثنوی میں، جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی، لاہور کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

نظم دلکش بجوان ابلہ رز دکر — مولدِ تست شہر جالندھر
ذرہ اس ہر ستارہ چشمک ریز — خاکِ جالندھر ست مردم خیز
ای لگدکوبِ ترہاتِ غرور — بی ادب طفل مکتبِ لاہور
من ترا ای بزم بانجمنی — انجمن نی کہ عبرتِ چمنی

ایک اور جگہ ایک شعر میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر کو "یوسف" کہہ کر لاہور کو مصر سے تشبیہہ دی ہے:-

از ہوشیار پور بہ لاہور ست شد عزیز
یوسف بمصر رفت ز کنعان فتنہ خیز

محمد تقی بہار ملک الشعرائے ایران (متوفی سنہ ۱۹۵۱ء) کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حکیم الامت اقبال کے کلام سے متاثر ہونے کے سبب پاکستان سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے کئی ایک قصیدے بھی لکھے جن میں لاہور کا ذکر آیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اپنے ایک قصیدہ "پاکستان نامہ یا پیام ملت ایران بہ ملت پاکستان" میں لاہور کو ان لفظوں سے خطاب کیا:

سزد کراچی و لاہور قبۂ الاسلام — کہ ہست باری اسلام کار پاکستان
سوادِ اعظم اسلام نام بخش او را — کہ نیستمان دگری در شمار پاکستان
درود باد بہ روح مطہر اقبال — کہ بود حکمتش آموزگار پاکستان

صادق سرمد (متوفی ۹ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء) ایران کے ملی شاعر تھے۔ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں جب شاہ ایران پہلی مرتبہ شاہی مہمان کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے تو سرمد مرحوم ان کے ہمراہ تھے۔ جب وہ لاہور آئے تو سرمد نے ۱۰ مارچ کو "ماہ پنجابی" کے عنوان سے ایک غزل کہی جس میں لاہور کو یوں خراج تحسین و عقیدت ادا کیا:-

چون قدم بر مقدم آن ماہ پنجابی زدم — سجدہ بر آن قبلۂ ابروی محرابی زدم
شہر لاہور لاہورم بہشت آمد بچشم — در صفایش راہ، رنج راہ و بیخوابی زدم
تاب حسنش گرچہ در تابِ تب عشقم بسوخت — حاش للہ گر کہ یکدم دم ز بی تابی زدم
گردش ایام چون در کوی جانانم فگند — آفرین بر گردش این چرخ دولابی زدم

سنہ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار پاکستان کے سفارت خانے نے ایران میں یوم اقبال منایا، سرمد نے وہاں اپنے ایک قصیدے میں لاہور کا ذکر اس طرح کیا:-

درود باد بلاہور و خطۂ پنجاب — کہ زاد و پرورد این شاعر خجستہ خصال

برغم ہر چہ چمن زاد و ناز پروری است — زخاک مردہ دمید آیت جمال و جلال[1]

جولائی ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے ایک علمی وفد ایران گیا، جس میں محترم ڈاکٹر محمد شفیع، صوفی تبسم اور عندلیب شادانی وغیرہم تھے۔ ان کے ورود ایران پر سرمد نے ایک قصیدہ "کاروان علم و ایمان" لکھا۔ اس میں پاکستان اور پاکستانیوں کی تعریف کرتے ہوئے لاہور کو یوں یاد کیا :

ہر کہ در پنجاب ز مہمان لاہور نو گردد — باغ شالیمار می‌آید بچشمش باغ رضوان
یاد ایامی کہ من مہمان لاہور نو بودم — شعرہا خواندم بتحسین و بتحلیل فراوان
گرچہ چنین میزبانان نالہ از مہمان نزیبد — نالہ ہا کردم بیاد نالۂ مسعود سلمان
یاد آن ایام شہری میزبان مہمان ما شد — مہمان شد میزبان یا میزبان گردید مہمان

اپریل ۱۹۵۵ء میں یونیورسٹی اسلامبول کے رئیس شعبۂ ادبیات زبان ترکی ڈاکٹر علی نہاد تارلان، اقبال اکاڈمی کی دعوت پر پاکستان آئے۔ ۲۳ اپریل کو لاہور تشریف لائے۔ یہاں جس گرم جوشی سے ان کی پذیرائی ہوئی اس سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے فی البدیہہ چند اشعار "قونیہ دوم" کے عنوان سے لکھ کر مزار اقبال پر پڑھے۔ ان میں لاہور کو قونیہ دوم کے نام سے پکارا ہے :

بشنو از من ای بلندی را پناہ — چون فغان میکردم از بخت سیاہ
نالہا میکردم از دوری تو — آہ زین دوری و مہجوری تو
تو کہ "مولانای" ما را پیروی — تو شنیدی این فغان معنوی
شکر و منت آن خدای پاک را — شکر و منت آن شہ لولاک را
کین کمینہ دید خاک درگہت — بوسہ زد در خاک پاک درگہت
تربت تو سجدہ گاہی شد مرا — روح پاک تو پناہی شد مرا
من کہ چون بوی وزیدہ زان دیار — ملی نمودہ بحر و دشت و کہسار
ہمرہ باد آمدم از کوی دوست — آوریدم نغمۂ ای از لوی دوست
بوی گل آوردم از "باغ مرام" — از بہار قونیۂ جنت مشام
بو کہ بوی بشنوی زآن پیر روم — پیر قدسی مرشد آن مرز و بوم
قونیۂ دوم شدہ لاہور تو — از فیوض عشق نور انور تو
آری اینجا ہست یک "باغ مرام" — باغ جنت "تربت اقبال" نام

---

[1] اس میں اقبال کے شعر ذیل کی طرف اشارہ ہے جس میں انھوں نے گوئٹے سے اپنا مقابلہ کیا ہے :

او چمن زادی چمن پروردہ ای — من دمیدہ از زمین مردہ ای

کعبۃ العشاق باشد این مقام   ہر کہ اینجا ناقص آمد شد تمام

استادِ گرامی ڈاکٹر وحید قریشی نے چند سال پہلے ایک نظم "مسعود سعد سلمان — ایک خود کلامی" لکھی تھی - اس میں بھی ایک جگہ لاہور کا نام آگیا ہے :-

برای این کہ شود ختم کار دشمن من   نگاہ دیدۂ بد اشک کار پیکان کرد
بحکم آن شہِ والا نشان بود کہ کنون   ہمای اوج سعادت مرا سلیمان کرد
کسی نبود کہ دامن بدست خود گیرد   خدا بحال من ناتوان چہ احسان کرد
ز مہر اوست کہ اکنون سوی لہور شدم   ز لطفِ اوست کہ لہ دوم قرین ... مان کرد

ثنا کنم بخدا و سخن کنم کوتہ
بنام او کہ مرا ہمنوای حسان کرد

مآخذ

اس مضمون کے لیے کتب و مجلاتِ ذیل سے استفادہ کیا گیا :-

لباب الالباب	سدیدالدین محمد عوفی	مطبوعہ لیڈن
منتخب التواریخ	ملا عبدالقادر بدایونی	ر لکھنؤ (۱۲۸۴ھ)
طبقات اکبری	نظام الدین احمد	ر لکھنؤ
شاہجہان نامہ (عمل صالح) جلد سوم	محمد صالح کمبوہ	ر لاہور
انشائے منیر لاہوری	ابوالبرکات منیر	ر لکھنؤ
کلمات الشعرا	محمد افضل سرخوش	ر لاہور
سرو آزاد	میر غلام علی آزاد بلگرامی	ر لاہور
گل رعنا (مشاہیر شعرائے ہنود)	لچھمی نارائن شفیق	
تذکرہ مردم دیدہ	عبدالحکیم حاکم لاہوری	ر لاہور
ظفر نامہ رنجیت سنگھ	دیوان امرناتھ اکبری	ر لاہور
تذکرہ حسینی	دوست حسین سنبھلی	ر لکھنؤ
مفتاح التواریخ	تھامس ولیم بیل	ر لکھنؤ (۱۲۸۴ھ)
تذکرۃ الشعرا	محمد عبدالغنی غنی	ر علیگڑھ
لاہور اِٹس ہسٹری	خان بہادر محمد لطیف	ر لاہور

سلطنتِ غزنویاں	استاد خلیلی	مطبوعہ کابل
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	″ دہلی
کلیات ملا شاہ	مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری	
بہرام شاہ آف غزنین	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	″ لاہور
شعرالعجم جلد ۳	مولانا شبلی نعمانی	″ لاہور
تاریخ ادبیات در ایران	ذبیح اللہ صفا	″ تہران
تاریخ ادبیات ایران	رضا زادہ شفق	″ اصفہان
بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	″ اعظم گڑھ
بزم تیموریہ	″	″
تذکرۂ شعرائے جدید	ڈاکٹر عبدالوحید	″ لاہور
دیوان عرفی	عرفی شیرازی	″ لکھنؤ
دیوان واقف	واقف بٹالوی	″ ″
دیوان قلندر	قلندر شاہ لاہوری	″ لاہور
دیوان محبوب	غلام محبوب سبحانی	″ ″
پیام مشرق	علامہ اقبال مرحوم	″ ″
مثنوی اسرار و رموز	″	″ ″
زبور عجم	″	″ ″
ارمغان پاک	شیخ محمد اکرام	″ تہران (چاپ سوم)
اورینٹل کالج میگزین	شمارہ مئی سنہ [illegible]ء	″ لاہور
مجلہ ہلال میگزین	شمارہ ہائے مسلسل نمبر ۷، ۱۲، ۱۹/۲۲	″ کراچی
مجلہ معارف	شمارہ مارچ سنہ ۴۷ء	
مجلہ سروش	شمارہ ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء	
مآثر الامرا جلد دوم	شاہنواز خاں	″ کلکتہ
میخانہ عبدالنبی	عبدالنبی فخر الزمانی	″ لاہور
دیوان فیضی	فیضی فیاضی	″ ″
دیوان مخزن التوحید	کنہیا لال ہندی	″ ″ (سنہ ۱۸۸۵ء)
نیرنگ خیال	جون سنہ ۱۹۴۲ء	لاہور

رسالہ نقوش لاہور — مئی، اگست، اکتوبر ۱۹۶۱ء — مطبوعہ لاہور
دیوان عنصری — " — لکھنؤ
قصائد قرنی (انتخاب) — " — لاہور
دیوان استاد ابوالفرج رونی مرتبہ پروفیسر چایکین مطبع شوروی ۱۳۲۰
قران السعدین — از امیر خسرو — " — لکھنؤ
مثنوی قدسی — حاجی محمد قدسی — " مطبع افغانی امرتسر
دیوان صائب — " — لکھنؤ
مثنوی یکتا — مرتبہ پروفیسر مولوی محمد باقر — " — لاہور
قصہ ہیر رانجھا — " — امرتسر
نامۂ عشق — مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی — " — لاہور
دیوان گرامی — " — "
ورای کاروان — " — تہران
انتخاب شعرائے معاصر ایران — ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی — " — لاہور
نیا ایرانی ادب — ڈاکٹر ظہیر الدین احمد — " — "
رسالہ مخزن (گرامی نمبر) — اگست ۱۹۲۷ء — " — "
جام مینائی — شمس مینائی — لاہور

ادیب اور مُصنّف

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

طفیل صاحب مدیر نقوش نے جب اس مضمون کے لیے مجھ سے کہا تو میں نے اسے بہت معمولی اور آسان کام سمجھا اور شی خوشی وعدہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس مشاہیر کے نام اور حالات لکھ دینے سے مضمون مکمل ہو جائے گا ور اس طرح میرا پیچھا آسانی سے چھوٹ جائے گا۔ مگر میرے حال پر ٹھیک وہی مثل صادق آئی کہ ؎

عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

ب مضمون مرتب کرنے بیٹھا تو پتہ لگا کہ کام اتنا آسان اور سہل نہ تھا جتنا میں سمجھا تھا۔ ابھی تھوڑا سا کام کرنے پایا تھا کہ مجھ پر نمونیہ سخت حملہ ہوا اور میں بیکار محض ہو کر پلنگ پر پڑ گیا۔

اسی دوران میں میں نے سنا کہ "لاہور نمبر" کی کتابت زور شور سے ہو رہی ہے۔ اور عنقریب رسالہ شائع ہو جائیگا ماچار بیماری کا خیال نہ کیا اور مضمون تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ چار دن مسلسل کام کیا اور دو راتیں تین تین بجے رات تک اس کے لیے قف کیں۔ تب مار مار کر کے یہ مضمون تیار ہوا۔ خدا کرے طفیل صاحب کو اور ناظرین کرام کو پسند آئے۔ میں نے اپنی طرف سے اس مضمون کے مرتب کرنے میں تلاش اور جستجو کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ لیکن کوئی انسانی کوشش کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

میں نے اس مضمون میں صرف "مرحوم" ادیبوں کے حالات لکھے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ شاید زندوں کے اس لیے نہیں لکھے کہ ان پر تنقید کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ یہ بات تو نہیں مگر قصہ مختصر، آپ یہی سمجھ لیجئے۔

مرحوم ادیبوں میں میں نے اُن تمام اصحاب کو شامل کیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی رنگ میں ادب اور علم کی خدمت کی ہے۔ خواہ وہ شاعر ہیں خواہ نثر نگار۔ خواہ مضمون نویس ہیں خواہ انشا پرداز۔ خواہ ناول نویس ہیں خواہ افسانہ نگار۔ خواہ مؤلف ہیں خواہ مصنف۔ خواہ سوانح نگار ہیں خواہ مورخ۔ میں نے اُن علمائے کرام کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیا ہے جو صاحب تصنیف ہیں اور اُن محترم بزرگوں کے حالات بھی لکھے ہیں جنھوں نے اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی مگر علمی انجمنوں۔ ادبی محفلوں اور تعلیمی کوششوں کی قدردانی اور ہمت افزائی کی ہے اور اُن کی حتی الامکان شوق اور خلوص سے امداد اور اعانت کی ہے۔ چونکہ صحافت بھی ادب کا ایک ضروری حصہ ہے اس لیے میں نے اس مضمون میں مرحوم مدیران جرائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ مجھے اعتراف ہے کہ لاہور کے تمام اخبارات و رسائل کے مرحوم ایڈیٹروں کے حالات میں اس مضمون میں جمع نہیں کر سکا۔ اور صرف چند نام ہی لکھ سکا۔

یہ بات بھی ظاہر کردوں کہ صرف اُردو کے ادیبوں کے حالات میں نے اس مضمون میں لکھے ہیں۔
چونکہ "لاہور کے اطبا" اور "لاہور کے مورّخ" دو مضمون پہلے ہی "لاہور نمبر" میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس لیے ایسے اصحاب جو ادیب ہونے کے ساتھ حکیم اور مورّخ بھی تھے میں نے یہاں درج نہیں کیے۔

جن ادیبوں کے حالات میں نے اس مضمون میں لکھے ہیں وہ تین قسم کے ہیں:-

(۱) وہ اصحاب جو لاہور ہی کے رہنے والے تھے اور ساری عمر یہیں رہے۔

(۲) وہ حضرات جو باہر سے آ کر لاہور میں رہے اور باقی عمر یہیں بسر کر دی۔

(۳) وہ اشخاص جو باہر سے آکر کچھ عرصہ تک لاہور میں مقیم رہے اور پھر یہاں سے تشریف لے گئے لیکن بعد میں اکثر لاہور آتے رہے۔

سخت ناشکری ہوگی اگر تمہید کو ختم کرنے سے پہلے میں اپنے اُن محترم احباب کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس مضمون کے مرتب کرنے میں از راہِ کرم میری مدد کی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شکر گذار میں مکرمی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کا ہوں، جنھوں نے حقیقت یہ ہے کہ بے انتہا خلوص کے ساتھ اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کے حالات لوگوں سے پوچھ کر، اُن کی اولاد کے پاس جا کر۔ اُن کی قبروں کے کتبے پڑھ کر۔ پرانی کتابوں کو تلاش کر کے۔ اخباروں کے فائلوں کو دیکھ کر میرے لیے فراہم کیے۔

محترمی پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کا بھی بالواسطہ ممنون ہوں کہ اُن کی قلمی یادداشتوں سے مجھے بہت سے ادیبوں کی تاریخ ہائے وفات کا علم ہوا۔ ان یادداشتوں کو بھی حکیم محمد موسیٰ صاحب نے بڑی محنت سے مطالعہ کر کے ضروری تاریخوں کو میرے لیے نقل کیا۔ یہ اُن کا مجھ پر مزید احسان ہے۔

مشفقی مولوی محمد عبداللہ صاحب قریشی بی اے اور محبی کسریٰ صاحب نے بھی دو تین اصحاب کے حالات مجھے دیئے اُن کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

باقی طفیل صاحب کو خود میرا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ میں نے اُن کے لیے یہ مضمون لکھا۔

میں نے یہ حالات بہت ہی مختصر لکھے ہیں۔ اگر مفصّل لکھتا تو "لاہور نمبر" انہی سے بھر جاتا اور مزید مضامین کے لیے طفیل صاحب کو "دو لاہور نمبر" شائع کرنے پڑتے۔

مولانا ابوالحسنات [1] سید محمد احمد قادری المخاطب بہ مولانا ابوالحسنات مولانا دیدار علی کے فرزند اور لاہور کی مسجد وزیر خاں کے خطیب تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ختمِ نبوت کا جو ہولناک طوفان مغربی پاکستان میں برپا ہوا۔ اس کا مرکز بھی مسجد وزیر خاں تھی اور مولانا "مجلسِ عمل" کے صدر رہے۔ اس سلسلہ میں قید و بند کی تکالیف بھی آپ کو بھگتنی پڑیں۔ عربی و فارسی کے اچھے عالم اور صاحبِ تصنیف شخص تھے۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ صبح نور۔ النافع اوراق غم۔ رفیق السفر الی بلد خیر البشر۔ مصنف ہونے کے ساتھ ہی آپ شاعر اور طبیب بھی تھے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء تاریخ

---

[1] میں نے اس مضمون کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے تاکہ ہر شخص کا نام آسانی سے مل جائے۔

دفن ہے۔ اور "داتا گنج" کا احاطۂ مزار آخری آرام گاہ۔

مجتہد العصر مولانا سید ابوالقاسم یہ ایک کشمیری الاصل فاضل اور شیعہ صاحبان کے مشہور مجتہد تھے۔ معقول و منقول پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ممالک اسلامیہ کی بھی آپ نے سیاحت کی تھی اور ہر جگہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ آپ نے لاہور میں شیعی طلباء کے لیے مدرسہ امامیہ جاری کیا جو عرصہ تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ قرآن کریم کی ایک نہایت مفصل تفسیر آپ نے لکھنے کا ارادہ کیا تھا جس کے متعلق خیال تھا کہ ۳۰ جلدوں میں ختم ہو گی۔ مگر ابھی بارہ جلدیں لکھی گئی تھیں کہ پیغام اجل آ گیا اور آپ نے ۱۴ محرم ۱۳۲۴ھ کو انتقال فرمایا۔ مولانا سید علی الحائری آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے۔

سید ابوالقاسم دلاوری لاہور کے ایک صاحب قلم اور مشہور ادیب تھے جنھوں نے تاج کمپنی اور شیخ غلام علی اینڈ سنز وغیرہ کے لیے بعض مفید اور اعلیٰ پایہ کی اسلامی کتابیں لکھیں۔ مثلاً رکعات التراویح جس میں ۲۰ رکعت پڑھنے کے ثبوت دیئے گئے ہیں (اہل حدیث آٹھ تراویح پڑھتے ہیں۔ اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ اُن کے جواب میں یہ کتاب سید صاحب نے لکھی تھی)

"عماد الدین" فقہ حنفیہ کے مطابق نماز کے نہایت مفصل مسائل۔

" شمائل کبریٰ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں تشریف لا کر کس قدر بے نظیر اخلاقی تعلیم دی۔ اس کی تشریح۔

"خلافت الہیہ"۔ "رئیس قادیان" اور "ائمہ تلبیس" کے علاوہ ان کی دو غیر مطبوعہ کتابیں "محسن اعظم" اور "توہمات فرہنگ" بھی ہیں۔ جو عنقریب چھپنے والی ہیں۔

آپ نے مدرسہ نعمانیہ لاہور میں تعلیم پا کر علوم کی تحصیل کی تھی۔ ایک ماہنامہ موسوم بہ "درویش" کے بھی ایڈیٹر تھے۔ اوائل ۱۹۵۹ء میں انتقال کیا۔

احسن مارہروی نام سید علی احسن۔ وطن مارہرہ ضلع ایٹہ۔ پیدائش ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ۔ عربی اور فارسی کے فاضل، ماہر لسانیات اور اردو کے مستند ادیب تھے۔ فن شعر کا ذوق صغر سنی سے تھا۔ ۱۸۹۶ء میں وطن سے شعر و سخن کا ایک ماہوار گلدستہ ریاض سخن جاری کیا۔ جس کا نام بعد میں بدل کر ریاض خلیل کر دیا مگر رسالہ چل نہ سکا اور احسن حیدر آباد تلاش معاش میں چلے گئے ۱۹۰۳ء میں وہاں سے چلے آئے۔ اس کے بعد لاہور آئے اور یہاں لالہ سری رام ایم اے کے پاس تیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ جو اُس زمانہ میں خمخانہ جاوید لکھ رہے تھے۔ پھر یہاں سے نوکری چھوڑ کر مطبع مفید عام میں ملازم ہو گئے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں فصیح الملک کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن چلے گئے اور وہیں ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔ فن شعر میں داغ کے شاگرد تھے تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

فصیح اللغات۔ تاریخ نثر اردو۔ کارنامۂ غم۔ تحفۂ احسن۔ چپ کی فریاد۔ کسوف الشمسین۔ اردو شکر۔ شاہکار عثمانی۔

اپنے اُستاد کے کلام کے دو مجموعے جلوۂ داغ اور منتخبات داغ کے نام سے شائع کئے۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ بھی انشائے داغ کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔

خان احمد حسین خاں بی۔ اے آپ لاہور کے رئیس خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خاں آنریری مجسٹریٹ کے فرزند مشہور ادیب اور مصنف تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ فن شعر میں مرزا ارشد گورگانی کے شاگرد تھے۔ ادب سے

خاص ذوق اور شغف تھا۔ اسی شوق کے باعث آپ نے لاہور سے ماہنامہ شباب اُردو جاری کیا۔ جو مدتوں اعلیٰ پایہ کے ادبی مضامین، دلکش نظمیں اور دلچسپ فسانے شائع کرتا رہا۔ تصنیف و تالیف کی کثرت کا یہ حال تھا کہ آپ نے ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں لکھیں جن میں زیادہ ناول تھے۔ تعجب ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ادیب کو لوگ بہت جلد بھول گئے اور ہمارے نوجوان ادیب اب آن کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "آبِ بقا" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۱۸۶۹ء آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۶۰ برس تک ادب، علم اور صحافت کی خدمت کرنے کے بعد یہ بوڑھا ادیب یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو ہمیشہ کے لیے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ آن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

سیرتِ احمدی (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری)۔ بعض ناول یہ ہیں: نظیر بیگم۔ سوزِ حسرت۔ جگنی آرا۔ آہ۔ آپ بیتی۔ واہ۔ سحرِ سحر۔ پری بانو۔ آئینہ روزگار۔ نازنین مہ جبین۔ سادھو کی کرتوت۔ مکافاتِ عمل۔ پارۂ دل۔ درد۔ شرح حروف۔ وہ عورت جس نے کر دکھایا۔ ابلیس و جمیلہ۔ اسرارِ امرتسر۔ کوہِ شملہ۔ تصویرِ رسوائی۔

لالہ زار آن کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

مولوی احمد دین لاہور کے پرانے وکیل تھے۔ آپ کی وکالت خوب چلتی تھی اور آپ لاہور کے نہایت کامیاب اور نمایاں وکیلوں میں سے تھے۔ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد بزرگ تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام اور انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور سے آخری دم تک تعلق رہا۔ اور آپ ہر طرح سے ان دونوں اداروں کی اعانت کرتے رہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ذوق تھا۔ چنانچہ (۱) عالمگیر (۲) اقبال اور (۳) سرگذشتِ الفاظ تین کتابیں آپ نے بڑی محنت سے لکھی ہیں۔ سرگذشتِ الفاظ پر انعام بھی ملا تھا۔

مولوی احمد بابا مخدومی ۱۵ر جون ۱۸۶۵ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے جوان ہو کر لاہور چلے آئے اور پھر ساری عمر یہیں گذار دی۔ شروع میں ریلوے کی ملازمت کی مگر مضمون نگاری کے شوق اور تصنیف و تالیف کے ذوق نے بہت جلد نوکری سے متنفر کر دیا اور مستعفی ہو کے ادب اور علم کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ آپ انجمن حمایتِ اسلام کے ابتدائی معاونین میں تھے۔ اور آپ نے تمام عمر نہایت خلوص کے ساتھ انجمن کے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ التنقیح فی ولادتِ مسیح اور آخری مضامین سر سید آپ کی تالیفات ہیں۔ ۶۳ برس کی عمر میں ۸ رجون ۱۹۲۷ء کو وفات پائی۔

انجمن کا "رسالہ حمایتِ اسلام" جب جاری ہوا تو اُس کے سب سے پہلے ایڈیٹر آپ ہی تھے۔ ابتدا میں یہ پرچہ ماہوار شائع ہوتا تھا۔

مولوی احمد بخش یکدل یہ بڑے فاضل اور عالم شخص مولوی نور احمد چشتی مؤلف تحقیقاتِ چشتی اور مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر رفیقِ ہند کے والد تھے۔ پہلے لاہور کی منڈی کے مدرسہ میں مدرس رہے۔ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دیوان راجہ دینا ناتھ کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جب آپ راجہ دینا ناتھ کے بھائی دیوان کدار ناتھ کی شادی میں دہلی گئے تو بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے پر وہاں سے فخر الشعرا کا خطاب سند، تیرہ پارچہ کا خلعت، دو رقم جواہر آپ کو ملا۔ لاہور کے بڑے بڑے معزز سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپ سے اکتسابِ علم کیا ہے۔ مولوی صاحب کو فنِ تاریخ پر زبردست عبور حاصل تھا چنانچہ آپ نے ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۸۶۰ء تک کی مسلسل روزانہ واقعات کی مفصل ڈائری ۲۰ جلدوں میں مرتب

کی تھی جو سنہ ۱۹۳۲ء تک اُن کے وارثوں کے پاس غیر مطبوعہ حالت میں تھی۔ یہ پتہ نہیں کہ اب بھی ہے یا نہیں۔ (تحقیقات چشتی صفحہ ۱۶ مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ گربخش صفحہ ۸)

احمد علی مولوی احمد علی شاہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی، فارسی اور دینیات کے پروفیسر بڑے اور عالم انسان تھے۔ دس بارہ سال تک شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے۔ مدرسہ غوثیہ کے شیخ الحدیث بھی تھے۔ کتاب الشفا کے ترجمے پر آپ کا پورا نام اس طرح لکھا ہوا ہے "جناب مولانا مولوی حافظ احمد علی شاہ بٹالوی حنفی نقشبندی چشتی نظامی پروفیسر دینیات و عربی اسلامیہ کالج لاہور"

آپ کی تالیفات میں ایک کتاب کا نام نور الشمعہ فی ظہر الجمعہ ہے اور دوسری کا نام سرور الخاطر الناظر فی ندا یا شیخ عبد القادر۔ آپ نے عربی و فارسی سے مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے اُردو میں کئے:

۱۔ نفحات الانس از مولانا جامی

۲۔ تحفۃ القلوب و ہدیۃ الارواح (فارسی) مؤلفہ شیخ عثمان جالندھری۔

۳۔ مشکٰوۃ الانوار از امام غزالی۔

۴۔ بہجۃ الاسرار و معدن الانوار۔ از شیخ نور الدین ابی الحسن بن یوسف شافعی (مناقب غوث الاعظم)

۵۔ الشفا بحقوق المصطفیٰ از قاضی عیاض۔

آپ نے سنہ ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

پنڈت ہری چند اختر لاہور کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص حیثیت کے شخص تھے۔ لاہور کی تمام ادبی محفلوں اور تمام مشاعروں میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ بہت اعلیٰ قابلیت کے انسان اور بہت اچھے ادیب تھے۔ رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں انھوں نے بہت سے نہایت دلچسپ مضمون فارسی میں لکھے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت تک لاہور میں مقیم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور وہیں یکم جنوری سنہ ۱۹۵۸ء کو انتقال کیا۔ اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔

اختر شیرانی فاضل اجل علامہ حافظ محمود شیرانی کے فرزند اور بہت اعلیٰ درجہ کے شاعر۔ اچھے ادیب اور مشہور انشا پرداز تھے۔ طبعاً بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے مگر شراب نوشی کی عادت نے اُن کے تمام محاسن اور اخلاق پر پردہ ڈال دیا تھا۔ فطرتاً کریم النفس نیک نہاد۔ خلیق، دوست نواز اور بڑے غیور تھے۔ ساری عمر قلندرانہ حالت میں گزاری۔ انھوں نے اپنی زندگی میں متعدد رسالے جاری کئے مگر کوئی بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ جو رسائل انھوں نے وقتاً فوقتاً نکالے اُن کے نام یہ ہیں: انتخاب۔ بہارستان۔ خیالستان۔ رومان اور مخزن۔

آپ کی نظموں کے سب ذیل مجموعے شائع ہوئے: صبح بہار۔ اختر ستان۔ لالۂ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز۔ شہرود۔ نغمہ حرم۔ پھولوں کے گیت۔

ان کے نثر کے مضامین کے مجموعہ کا نام دھڑکتے دل ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اس سے قبل "ضحاک" اور "آئینہ خانے" نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ آپ نے عوفی کی جوامع الحکایات کا فارسی سے دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔ نیز

مجمع البحرین، مطلع السعدین اور جامع اللغات ہر چہار جلد کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ اس قابل اور لائق نوجوان کو صرف ۴۳ برس کی عمر میں شراب کھا گئی۔ اور یہ ادب اردو کا چہکتا ہوا بلبل ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ آپ ۴ مئی [illegible]۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے تھے۔

مولوی سیف الحق ادیب

مولوی شاہ عبدالحق محدث کی اولاد میں سے تھے اور ۱۸۴۶ء میں دہلی کے محلہ مفتی والان میں پیدا ہوئے۔ ذہن نہایت عمدہ اور طبیعت نہایت تیز پائی لہذا بہت چھوٹی عمر میں فارسی، عربی اور انگریزی کی اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ تحصیل علم کے بعد سرکاری نوکری کی اور عدالت منصفی میں نائب ناظر ہو گئے۔ مگر طبیعت نوکری کے مناسب نہ تھی اس لیے تھوڑے دنوں بعد استعفیٰ دے کر اخباری لائن میں قدم رکھا اور میوگزٹ نامی ایک پرچہ جاری کیا جس میں بہت اچھے شاعرانہ مضامین اور غزلیں ہوتی تھیں۔ مگر جب وہ نہ چلا تو اُسے بند کر کے مختلف اخباروں میں نظم و نثر مضامین لکھنے لگے۔ جس سے آپ کی بڑی شہرت ہوئی۔ پھر انجمن قصور کے سیکرٹری ہو کر قصور چلے گئے اور انجمن قصور کے ماہوار رسالہ کو بھی ایڈٹ کرتے رہے۔ مگر جلد ہی یہاں سے جی اچاٹ ہو گیا اور آپ لاہور چلے آئے اور یہاں سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے پھر یہاں اطمینان سے بیٹھ کر نہایت کثرت سے اخباروں میں علمی مباحث پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ ذرا کسی سے ناراضگی ہو گئی جھٹ اس کے خلاف ایک مضمون لکھ مارا اور جواب الجواب کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا۔ اس کے بعد آپ اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر ہو گئے اور مدتوں اس کو بڑی کامیابی سے ایڈٹ کرتے رہے۔ ازاں بعد مولوی محرم علی چشتی کے اخبار رفیق ہند کے توڑ پر ایک ہفتہ وار اخبار شفیق ہند نکالا اور بڑے زور کے معرکے دونوں اخباروں میں ہوتے رہے۔ شفیق ہند کے ساتھ اس کے دو ضمیمے بھی نکلتے تھے۔ نسیم صبح اور شام وصال۔ فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ پھر گورنمنٹ ریلویٹر ہو کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ شراب کے بڑے عادی تھے۔ اور اسی عادت نے جان لی۔ اور دہلی میں ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔

ارشد گورگانی

شاہان مغلیہ کی یادگار مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی عرصہ دراز تک لاہور میں رہے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد بھی ہمیشہ یہاں آتے رہے۔ شاعری میں مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔ بہت نیک طینت اور شستہ و شائستہ شخص تھے۔ بہت اچھے ادیب اور نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور نظم شکوہ ہند پر آپ نے جو تضمین لکھی ہے وہ حسنِ بیان اور لطافت زبان کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ تضمین ارشد اُس کا نام تھا اور لاہور ہی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ طرزِ قدیم اور طرزِ جدید دونوں قسم کی نظمیں لکھنے میں اُنھیں بڑی مہارت تھی اور بڑی صفائی کے ساتھ اپنے خیالات کو نظم کر سکتے تھے۔ ملکہ وکٹوریا کی سوانح عمری اُنھوں نے نظم میں لکھی تھی جس کا نسخہ میں نے مولانا حالی کی لائبریری میں دیکھا تھا بڑی سلیس اور فصیح و بلیغ نظم تھی۔ ارشد، مولانا حالی کے خاص دوستوں میں سے تھے اور باہم بڑے گہرے تعلقات تھے۔ جب مولانا حالی لاہور میں مقیم تھے تو دونوں کی بڑی پُر لطف صحبت رہتی تھی۔ دونوں انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں میں بھی نہایت شوق سے شامل ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں قلعہ معلیٰ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور غدر کے بعد پنجاب آ کر محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور پھر ساری عمر یہیں گزار دی۔ آخر ۲۱ فروری ۱۹۰۶ء کو ملتان میں انتقال کیا۔

مولانا حالی کو اپنے اس جگری دوست کی وفات کا سخت صدمہ ہوا تھا۔

پروفیسر آرنلڈ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ کیمبرج کے گریجوایٹ بڑے مشہور مستشرق۔ نہایت با اخلاق۔ حد سے زیادہ غیر متعصب اور انگریزی۔ فرنچ۔ عربی اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ جنوری ۱۸۸۸ء میں مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہو کر لندن سے آئے۔ جس خیر خواہی۔ جس تندہی اور جس شوق کے ساتھ وہ علی گڑھ کالج میں طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔ اُس کی یاد اُن لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوگی جنھوں نے اُن سے پڑھا ہے۔ علی گڑھ پہنچنے پر انھوں نے اپنے یورپین لباس کو چھوڑ کر خالص ہندوستانی مولویوں جیسا لباس اختیار کر لیا۔ اسی وضع سے وہ کالج میں آتے اور اسی لباس میں اسلامی جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ اُنھیں مولانا آرنلڈ کہتے تھے۔ علی گڑھ پہنچتے ہی اُنھوں نے طلبا کی دینی نگرانی کا کام بڑے خلوص کے ساتھ اپنے ذمہ لیا۔ وہ نمازوں کے اوقات میں مسجد میں پہنچ جاتے تھے اور جو طالب علم غیر حاضر ہوتا تھا خود اُس کے کمرہ میں جا کر اُس سے پوچھتے تھے کہ آج آپ نماز کے وقت مسجد میں نہیں آئے کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟ اس طرح مارے شرم کے لڑکا پانی پانی ہو جاتا تھا۔ اس بے نظیر طرزِ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے زمانے میں نماز دن میں طلبا کی حاضری سو فیصدی ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے سرسید سے کہہ کر قرآن کریم کا درس کالج میں لازمی کرایا۔ مولانا شبلی درس دیا کرتے تھے اور آرنلڈ بھی اپنا قرآن لے کر درس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ پرنسپل بھی درس میں شریک ہوتے تھے مجلس اخوان الصفا کے روحِ رواں وہی تھے۔ سرسید کے کہنے سے انھوں نے بڑی تحقیق اور تلاش سے کتاب پریچنگ آف اسلام لکھی۔ یہ ایسی بے نظیر کتاب ہے کہ اُن کے نام کو ابد تک زندہ رکھے گی۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ اور تمام ممالک میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ بیان کی ہے۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی نے سرسید کی فرمائش پر اس کا اُردو ترجمہ دعوتِ اسلام کے نام سے کیا۔ فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہو کر آ گئے پھر اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے۔ یہیں اُنھوں نے عربی کی مشہور لغت سواء السبیل الی معرفۃ المعرب والدخیل، قاضی ظفرالدین احمد پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کی مدد سے ۱۹۰۲ء میں لکھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ انڈیا آفس کے اسسٹنٹ لائبریرین ہو کر لندن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں بھی زبردست امداد کی ۱۹۲۱ء میں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۹ رجون ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔ مولانا شبلی اور ڈاکٹر اقبال اُن کے شاگرد تھے ؛

پنڈت راج نرائن ارمان آپ کا قدیمی وطن سری نگر ہے۔ مگر آپ نے اپنی عمر کا بہت کافی حصہ لاہور میں گذارا۔ اُردو کے بہت اچھے شاعر اور ایک سو کے قریب فسانوی۔ تاریخی صنعتی۔ تجارتی اور مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فن شعر میں رآسخ دہلوی اور مضطر خیر آبادی اور داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اخبار ظریف سہارن پور۔ رسالہ تصویر سخن سہارن پور۔ پٹیالہ اخبار پٹیالہ۔ پنجاب سماچار لاہور۔ ہنکاری لاہور۔ راجپوت گزٹ لاہور۔ برہمن گزٹ راولپنڈی کے ایڈیٹر رہے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار ارجن جاری کیا۔ آپ کے کلام کا نمونہ خمخانہ جاوید جلد اول میں درج ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا۔

ارمان سرحدی۔ اصلی نام امان اللہ خاں تھا۔ امید تھی کہ یہ پاکستان کے ادیبوں میں بہت جلد اپنا ایک خاص مقام پیدا

کر بیٹھے اور خود اُن کو بھی اپنا مستقبل نہایت درخشاں نظر آتا تھا۔ مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے بہت جلد تمام آرزوؤں اور امنگوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا اور یہ نوجوان اور ہونہار ادیب صرف ۴۱ سال کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور صرف ڈیڑھ ماہ علیل رہ کر ۴ راگست سنہ ۱۹۶۱ء کو اُنھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مرحوم بڑی عمدہ صلاحیتوں کے مالک اور بہت پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے۔ بہت اچھے ادیب اور بہت اعلیٰ درجہ کے مترجم تھے۔ تحریر کی قابلیت اور انشا کی لیاقت ان میں بہت اچھی تھی۔ ابتدا میں فیروز سنز کے ہاں اُردو انسائیکلوپیڈیا کا کام کرتے رہے پھر شیخ غلام علی اینڈ سنز سے تعلق قائم ہو گیا۔ جہاں انھوں نے بہت عمدہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ مثلاً غوث اعظم۔ ترجمہ غنیۃ الطالبین ترجمہ فتوح الغیب۔ احسن الکلام۔ دُنیا کے ظالم حکمران۔ مشاہیر کے رومان اور جدید نفسیات وغیرہ۔

مولوی محمد حسین آزاد دہلی کے رہنے والے مشہور ادیب اور انشا پرداز ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں باپ کے مارے جانے اور گھر کے تباہ ہونے کے بعد بحال تباہ شہر سے نکلے اور پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور یہیں کے ہو رہے۔ لاہور میں آپ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر اور سرکاری رسالہ اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس دوران میں کابل بخارا اور ایران کے سفر بھی کئے۔ ۱۸۸۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کی ابتدا ہوئی اور یہ مرض آخر تک رہا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی میں وفات پائی اور امام باڑہ کاشی شاہ میں دفن ہوئے۔ سخندانِ پارس۔ آبِ حیات۔ دربار اکبری وغیرہ آپ کی مہتم بالشان تصانیف ہیں۔ (خمخانہ جاوید جلد اول صـ۲۳ مـ۲۷)

ازل ان کا نام ابو الاعجاز منشی عبد المجید تھا۔ یہ صاحب اپنے وقت میں لاہور کے حلقہ میں کافی نمایاں حیثیت کے مالک تھے اور مشاعروں میں خوب غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ بہت سے ناموروں کے ساتھ دنیا انھیں بھی بھول گئی۔ ان کی غزلوں کا دیوان ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ کلام بعد میں "ارمغانِ ازل" کے نام سے شائع ہوا۔ ایک دلچسپ نظم حضرت فاروق اعظمؓ کے ایمان لانے کی کیفیت کے بارہ میں بھی آپ نے لکھی تھی جسے لاہور کی انجمن دائرۃ الاصلاح نے شائع کیا تھا آج سے ۹ سال پہلے ۱۹۵۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ازل لاہور کے قدیمی باشندے تھے اور فن شعر میں داغ کے شاگرد تھے۔ محکمہ انہار پنجاب لاہور میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔

مرزا اشرف بیگ دہلی کے رہنے والے ایک نہایت قابل اور فاضل بزرگ تھے ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی علوم میں مفتی صدر الدین آزردہ کے اور فن شعر میں غالب کے شاگرد ہیں۔ اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی کی بے نظیر قابلیت رکھتے تھے۔ مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں لاہور آئے اور مولانا حالی کے بعد پنجاب بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر مقرر ہو گئے۔ جہاں آپ انگریزی سے اُردو میں طلبا و مدارس کے لیے کتابیں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ بعد ازاں عربی و فارسی کے اعلیٰ امتحانوں کے ممتحن بھی مقرر ہو گئے تھے۔ عمر صرف ۴۳ سال کی ہوئی اور ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔

اشک پانی پتی ان کا نام ضیاء الدین تھا۔ اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ مشہور ادیب اور مورخ مولوی کریم الدین پانی پتی ان کے نانا تھے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور یہیں رہنے لگے مگر عین جوانی کے ایام

ہیں بعمر ۴۲ سال ۱۸۹۳ء میں لاہور ہی میں انتقال کیا۔ طبیعت بڑی موزوں پائی تھی اور اشک تخلص کرتے تھے۔ (خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۳۱۸)

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب آپ دہلی کے ایک معزز رئیس تھے اور وہیں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پرانے دہلی کالج کے تعلیم یافتہ اور بڑے شستہ مذاق کے آدمی تھے۔ غالب سے نہایت گہرے تعلقات تھے۔ تخلص آشوب تھا۔ ۱۸۶۹ء میں لاہور آئے اور سررشتۂ تعلیم پنجاب کے کیوریٹر مقرر ہوئے اور اپنے فرائض کو پندرہ سولہ برس تک بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۵ء تک دہلی اور جالندھر کے انسپکٹر مدارس رہے۔ اور اسی سنہ میں ریٹائر ہو کر دہلی چلے گئے اور وہیں ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ قصص ہند۔ رسوم ہند تاریخ انگلستان وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔

سید امجد علی اشہری علوم مشرقی کے اچھے فاضل۔ اعلیٰ درجہ کے مضمون نگار اور مشہور ادیب اور مصنف تھے ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آغاز شباب ہی سے شعر و شاعری کا چسکا پڑ گیا اور مضمون نویسی کا بھی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کے خلاف نیر ہند، بی صدی اور آگرہ اخبار میں بڑے زور شور کے مضامین لکھے۔ ۱۸۸۱ء میں آپ نے بھوپال سے اخبار دبیر الملک جاری کیا۔ جہاں آپ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور ۲۲ برس تک وہاں بڑے اطمینان سے رہے۔ دو مرتبہ حیدر آباد گئے اور وہاں سے دونوں مرتبہ پانچ پانچ سو روپے ملے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور آئے اور ۱۹۰۵ء تک دفتر پیسہ اخبار میں کام کرتے رہے۔ پھر وطن چلے گئے اور وہیں ۲۸ مئی ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ صاحبِ تصنیف بھی تھے ان کی چند کتابوں کے نام لالہ سری رام نے خمخانہ جاوید میں یہ لکھے ہیں۔ حدیقہ شاہجہانی۔ گلدستہ سلطانی۔ ترانہ معرفت۔ ایشیائی شاعری۔ گلدستۂ اردو۔ دیہیم خسروی لغات الخواتین۔ مرقع تاجپوشی۔ حجابِ نورجہاں۔ تاریخ اردو۔

اصغر علی مولانا اصغر علی روحی ایم۔ او۔ ایل مولوی فاضل۔ منشی فاضل اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر رہے۔ بڑے فاضل اور قابل انسان تھے ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔ دبیر عجم، العروض والقوافی۔ مانی الاسلام وغیرہ محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک ماہوار دینی اور علمی رسالہ الہدیٰ بھی آپ نے لاہور سے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا تھا۔ جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ عربی، فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ دبیر عجم میں نمونۂ کلام موجود ہے۔

اصغر گونڈوی ان کا نام اصغر حسین تھا۔ اور یہ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ فنِ شعر میں امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں۔ آپ کو نظم اور نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ جیسی نظم لاجواب ہوتی تھی ویسی ہی نثر دلچسپ ہوتی تھی۔ کپور اینڈ سنز لاہور کی مشہور فرم نے ایک زبردست اشاعتی ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ اس کے نہایت سرگرم کارکن تھے۔ اردو کے اس عاشق نے ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ نشاطِ روح اور سرودِ زندگی اُن کے کلام کے مجموعے ہیں۔

خدا بخش اظہر امرتسری لاہور کے مشہور اخبار نویس اور روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔ اچھے شاعر اور کامیاب مصنف اور ایک سلجھے ہوئے ادیب تھے۔ شروع میں کانگرس کے زبردست حامیوں اور کارکنوں میں سے تھے۔ مگر ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے پاس ہونے پر مسلم لیگ کے پُرجوش ممبر بن گئے۔ عمر کا آخری بہت سا حصہ لاہور میں گذرا۔

ایک بہت دلچسپ کتاب "خونی تحریکیں" آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ۹ ردسمبر ۱۹۵۸ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے یک لخت انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۴۲ سال کی تھی۔

مرزا اعجاز حسین دہلوی آپ کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ مگر والد مرزا سرفراز حسین نے غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی سے نکل کر پنجاب کا رُخ کیا اور بسلسلہ ملازمت مختلف اضلاع میں پھرتے رہے۔ شعر کا مذاق شروع ہی سے تھا اور نوجوانی میں بڑے معرکتہ الآرا مشاعروں میں شریک ہوئے۔ اعجاز تخلص تھا۔ ۲۱ برس کی عمر میں ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۸۹۹ء کے شروع تک پنجاب چیف کورٹ میں بحیثیت مترجم کام کرتے رہے۔ قیام لاہور کے دوران میں آپ نے سوئمن کی تاریخ عالم اور لیڈ کی سائیکولاجی کا اُردو میں ترجمہ کیا جس پر پنجاب یونیورسٹی نے ان کو انعام دیا۔ ۱۸۹۹ء میں لاہور سے انبالہ چلے گئے اور وہاں وکالت شروع کر دی۔ فن شعر میں میر مہدی مجروح کے شاگرد ہیں۔ ان کا کلام بڑی کثرت کے ساتھ مخزن میں چھپا کرتا تھا۔ سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ (خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۳۳۵)

منشی مہدی حسن افسر لاہور کے سب سے پہلے اور مشہور اخبار کوہ نور کے توڑ پر لاہور ہی سے اُس زمانہ میں ایک صاحب نے اخبار "دریائے نور" کے نام سے جاری کیا۔ افسر صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور نہایت سختی کے ساتھ کوہ نور کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ پھر ملتان جا کر اخبار "ریاض نور" نکالا جو ملتان کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ ۱۸۵۶ء میں ان پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم ہو گیا اور سات برس کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ قید کاٹنے اور رہا ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور "اودھ اخبار" میں ملازم ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد وہیں انتقال کیا۔

چودھری افضل حق لاہور میں سابق جماعت احرار کے بہت بڑے لیڈر بلند پایہ سیاست دان۔ گاندھی کے مرید۔ کانگرس کے حامی۔ اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز اور زبردست ادیب تھے۔ اُن کی زندگی کا آغاز پولیس کی سب انسپکٹری سے ہوا۔ تحریک عدم تعاون کے دوران میں انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور باقی تمام عمر انگریز کی سخت مخالفت اور کانگرس کی انتہائی حمایت میں گزار دی۔ اسی سلسلہ میں آٹھ نو برس قید بھی رہے۔ لیکن بہت جلد لوگ اُن کو بھول گئے۔ بقول شورش وہ زندگی میں بھی مفلسی کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر ہیں۔ دنیا میں دوزخ۔ قید خانہ کے کوائف۔ میرا افسانہ۔ جواہرات شعور۔ محبوب خدا۔ دینِ خدا۔ تاریخ احرار اُن کی مشہور کتابیں ہیں مگر سب سے زیادہ شہرت اُن کو اُس کتاب کو حاصل ہوئی جس کا نام "زندگی" ہے۔ انتقال کی تاریخ ۲ رجنوری ۱۹۴۲ء ہے۔

منشی دوارکا پرشاد اُفق منشی بہاری چند کایستھ مالک مطبع ثنائی لکھنؤ کے فرزند اور فنِ شعر میں منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد ہیں۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ اُفق تخلص کرتے تھے۔ فارسی سنسکرت اور انگریزی سے خوب واقف تھے لکھنؤ سے نظم اخبار نکالا۔ مگر پھر اُسے بند کر کے ۱۹۰۲ء میں لاہور چلے آئے اور پنجاب سماچار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بہت سی کتابیں آپ نے ترجمہ اور تالیف کی ہیں مثلاً ٹاڈ راجستان۔ رامائن۔ مہابھارت۔ افضل التواریخ۔ سروش سخن۔

اقبال شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو کون نہیں جانتا کہ جن کے تعارف کی ضرورت ہو۔ اب تک ان کے متعلق بیسیوں کتابیں شائع ہوئیں اور سینکڑوں مضامین لکھے گئے جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کراچی اور لاہور میں اُن کی یاد تازہ رکھنے اور

اُن کی تصنیفات اور کلام کو شائع کرنے کے لیے اقبال اکیڈمی اور مجلسِ اقبال قائم ہیں اور پرائیویٹ طور سے بھی اُن کے متعلق بے انتہا اشاعت ہوئی ہے۔ آپ اُردو کے مسلمہ شاعر اور فارسی کے بے نظیر ناظم مانے جاتے ہیں۔ آپ کی کتابوں کے تراجم انگریزی اور عربی اور ہندی میں بھی ہوئے اور آپ کی شہرت لاہور سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچی۔ آپ کے حالاتِ زندگی ہر شخص کو معلوم ہیں اور آپ کے کلام سے ہر پڑھا لکھا بخوبی واقف ہے لہٰذا تفصیلات کی ضرورت نہیں مختصر یہ کہ آپ ۱۸۷۵ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ایک نہایت کامیاب زندگی گذارنے کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار شاہی مسجد لاہور کی سیڑھیوں سے نیچے مرجع خلائق ہے آپ کے کلام اُردو و فارسی کے مختلف مجموعے چھپ چکے ہیں اور اُن کی شرحیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اُردو کے بلند پایہ ادیب۔ بہت سی اعلیٰ درجہ کی تاریخی اور تحقیقی کتب کے مؤلف۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر اور ملک کے مشہور انشا پرداز تھے ۱۸۵۷ء میں نجیب آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں نجیب آباد ہی میں سکول ماسٹری کی پھر اُسے چھوڑ کر قادیان چلے گئے یہاں مدتوں رہے یہیں آپ نے اپنی سب سے پہلی کتاب مرآۃ الیقین شائع کی جو اپنے پیر اور اُستاد حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب بھیروی کی بڑی ہی عجیب سوانح عمری ہے۔ پھر لاہور چلے آئے یہاں اخبار پیغام صلح کی عرصہ تک ایڈیٹری کرتے رہے۔ پھر زمیندار کے ایڈیٹر ہو گئے دیال سنگھ کالج کے پروفیسر بھی رہے۔ پھر وطن چلے گئے اور وہاں سے رسالہ عبرت جاری کیا۔ جو تاریخی واقعات کا بہترین مرقع ہوتا تھا آپ کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت تاریخ اسلام کو حاصل ہوئی جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ آئینہ حقیقت نما آپ کی نہایت محققانہ کتاب ہے۔ اسلامی سپاہیانہ زندگی۔ مذہب اور تلوار۔ معیار العلماء۔ نظامِ سلطنت اور مقدمہ تاریخ ہند بھی آپ ہی کی تالیفات میں سے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ آپ کی کتابوں کی کماحقہٗ قدر نہیں ہوئی۔ اور آپ کا نام بہت ہی جلد قعرِ گمنامی میں چھپ گیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۸ء کو ہند و پاک کے اس بہت بڑے مؤرخ اور ادیب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

دیوان امرناتھ اکبری رنجیت سنگھ والیٔ لاہور کے دیوان راجہ دینا ناتھ کا بیٹا، اور اپنے زمانہ کے نہایت فاضل شخص مولوی احمد بخش چشتی کا شاگرد تھا۔ اعلیٰ درجہ کا مؤرخ اور فارسی کا بہت اچھا ادیب تھا۔ مہاراجہ کی فرمائش پر اس کی زندگی کے حالات ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۶ء تک کے لکھے۔ جو نہایت مفصل اور مکمل ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں اس کتاب کو پروفیسر سیتارام کوہلی نے اپنی شرح کے ساتھ ظفر نامہ رنجیت سنگھ کے نام سے شائع کیا۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ مصنفہ کوہلی ص۵)

سیّد اولاد علی ایک بہت لائق اور قابل شخص تھے۔ عرصہ تک سرکاری نوکری کی۔ ریٹائر ہونے کے بعد دفتر اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور کے دفتر میں بحیثیت سکرٹری کام کرتے رہے۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو وفات پائی آپ نے مرقع ملتان ایک بڑی محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں ملتان کے تمام آثارِ قدیمہ۔ اس کے مقابر اور معابد اور اس کے تمام مشاہیر کا حال بڑی تفصیل سے اور نہایت تحقیق کے بعد درج کیا ہے۔ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔

باری علیگ روزنامہ احسان لاہور کے ایڈیٹر اور بہت ذی علم اور مشہور ادیب تھے۔ لاہور کی علمی اور ادبی مجلسوں میں ان کی موجودگی بہت رونق کا باعث ہوتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اور ترجمہ کی نہایت عمدہ قابلیت رکھتے تھے۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی کی مشہور عالم کتاب "شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنز" کا آپ ہی نے ترجمہ کیا تھا۔ اور اس پر

مفید حواشی مولانا علم الدین سالک نے لکھے تھے اور صوفی تبسم نے اس کی نظر ثانی کی تھی "تاریخ اسلام" کے نام سے اُردو اکیڈمی لاہور نے مدت ہوئی شائع کیا تھا۔

میر باقر علی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کے ایک مشہور شاعر تھے۔ باقر تخلص کرتے تھے۔ مدت تک لاہور میں رہے۔ حکیم مومن خاں کے ہمعصر تھے۔ کلام بہت اچھا ہوتا تھا۔ (خمخانہ جاوید جلد اول صـ۳۳۵)

خان بہادر برکت علی خاں لاہور کے مشہور و معروف رئیس، اعلیٰ سرکاری عہدیدار، انجمن اسلامیہ کے بانی۔ لاہور میونسپلٹی کے وائس پریذیڈنٹ، پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی تمام سرگرمیاں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بہتر بنانے میں وقف کر دیں۔ سرسید کے بڑے زبردست معاونوں اور مددگاروں میں سے تھے۔ لوگ انھیں "پنجاب کا سرسید" کہا کرتے تھے۔ لاہور میں میکلوڈ روڈ پر "برکت علی محمڈن ہال" اُنہی کی یادگار ہے۔ ۱۹۰۵ء میں وفات پائی اور درگاہ شاہ محمد غوث میں دفن ہوئے۔ اصل وطن شاہجہانپور (یو۔پی) تھا۔

مولانا ابوسعید بزمی ایم اے سید ابوسعید بزمی ایم اے لاہور کے مشہور اخبار نویس اور بڑے اچھے ادیب اور مصنف تھے۔ بھوپال وطن تھا۔ مگر عمر کا کافی حصہ لاہور میں گذارا۔ مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق بھوپال کے قاضی القضاۃ اور ایک بڑے کتب خانہ کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑے شوق سے بزمی کو عربی اور فارسی پڑھائی اور بزمی نے اُن کے کتب خانے سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ والد کے انتقال کے باعث سولہ ہی برس کی عمر سے معاش کی فکروں میں مبتلا ہو گئے۔ مگر اسی حالت میں بڑے استقلال کے ساتھ ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اُن کی مشہور کتاب "تاریخ انقلابات عالم" ہے جو دو جلدوں میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ انتقال ۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ آخر میں آپ روزنامہ احسان کے مدیر اعلیٰ تھے۔ اُن کی ایک دوسری کتاب بھی بہت مشہور ہے جس کا نام ہے "اور جب خون بہہ رہا تھا"۔

بیدل دہلوی منشی مرزا بیگ خان بیدل دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر لاہور آکر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہاں اُن کا کام کتابوں کی تصحیح اور درستی تھا۔ یہ کام وہ یہاں ۳۰ برس تک کرتے رہے۔ شاعر بھی تھے اور بیدل تخلص کرتے تھے۔ اکثر درسیہ کتب کی ترتیب میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں ۵۶ سال کی عمر تھی۔ کلام کا کچھ نمونہ صاحب خمخانہ جاوید نے جلد اول میں دیا ہے۔ (خمخانہ جاوید جلد اول صـ۶۷۷)

منشی طالب علی پابند آپ لاہور کے مشہور اخبار نویس اور مصنف گذرے ہیں۔ عرصہ دراز تک ماسٹر جگت سنگھ مالک رسالہ رہنمائے تعلیم کے ہاں ملازم رہے اور رسالہ کو ایڈٹ کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں رہنمائے تعلیم سے علیحدہ ہو کر اپنا اخبار "تعلیم" کے نام سے ہفتہ وار جاری کیا۔ جو طلبہ اور مدرسین کے لیے نہایت مفید اور کارآمد پرچہ تھا۔ عام شائقین کے لیے بھی اس میں دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہوتی تھیں۔ کثیر الاشاعت اور مقبول عام پرچہ تھا اور معقول حجم کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اڈیٹری کے علاوہ آپ نے بہت سی تعلیمی کتب بھی لکھی ہیں جو سکولوں میں بڑی کثرت سے فروخت ہوتی تھیں۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۵ء کو عید کی نماز پڑھنے شاہی مسجد میں گئے۔ واپسی کے وقت دروازہ مسجد میں ہجوم کی کثرت کے باعث کچل کر

رہ گئے۔ اور سات آٹھ آدمیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس عظیم سانحہ کا اُس وقت سارے شہر لاہور میں سخت ماتم کیا گیا جب سے انتظام کچھ بہتر ہونے لگا ہے۔

آپ شاعر بھی تھے اور ساؔبد تخلص کرتے تھے۔

پطرس آپ کا نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ اور نہایت اعلیٰ درجہ کے ادیب اور مشہور مزاح نویس تھے۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور عمانویل کالج کیمبرج میں تعلیم پائی۔ ازاں بعد سنٹرل ٹریننگ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بنے۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندہ مقرر ہوئے اور وہیں ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

پطرس کے مضامین " آپ کے ادبی نوادرات کا مجموعہ ہے۔ نقوش نے آپ کی یاد میں پطرس نمبر شائع کیا ہے۔

پروفیسر محمد دین تاثیر ایم اے لاہور کے نہایت باذوق۔ ذی علم۔ ادیب۔ انشاپرداز اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ پہلے ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پھر آزاد کشمیر چلے گئے آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ شادی ایک یورپین خاتون سے کی تھی۔ جنہوں نے مسلمان ہو کر اپنا نام بلقیس تاثیر رکھا۔ نظم و نثر کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ آتشکدہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نہایت با اخلاق۔ ملنسار۔ شریف الطبع اور بے ریا انسان تھے۔ رحمدلی اور ہمدردی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور ہی میں وفات پائی۔ "عزیزم کے نام" ان کے خطوط کا مجموعہ بہت دلچسپ ادبی شاہکار ہے جو ادارہ فروغ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔

تاج ابوالمعانی مولانا تاج الدین احمد تاجؔ ملا محمد بخش مالک جعفر زٹلی کے فرزند اور اپنی اعلیٰ شاعرانہ قابلیتوں۔ مذہبی جوش و خروش۔ اپنی انشاپردازی اور اخباری تجربہ کے باعث لاہور کی نہایت ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۹ء تک آپ نے سات ماہوار۔ ہفتہ وار اور روزانہ رسائل و اخبارات جاری کئے۔ اردو کے علاوہ پنجابی میں شاعری کرتے تھے اور مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کیا کرتے تھے۔ (تاریخ اقوام کشمیر صفحہ ۴۸۶)

آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲ مئی ۱۹۵۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

تاجور نجیب آبادی شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں لاہور چلے آئے تھے اور باقی زندگی یہیں گزار دی۔ ابتدا میں ہمایوں کے دفتر میں نہایت معمولی تنخواہ پر کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے گئے۔ لاہور کے مشہور ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ مدتوں رسالہ شاہکار نکالتے رہے۔ جو بہت اعلیٰ پایہ کا علمی اور ادبی ماہنامہ تھا اور اتنے بڑے سائز پر شائع ہوتا تھا کہ آج تک کوئی ماہنامہ ایسی شان سے شائع نہیں ہوا۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ دیال سنگھ کالج کے پروفیسر رہے۔ اور دیال سنگھ لائبریری کے سیکرٹری اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ متعدد کتابوں کے مؤلف اور مصنف ہیں۔ اردو مرکز کے مشہور سلسلہ کی کتابیں آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے اور ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تپش شیخ عبداللطیف تپش ایم اے منشی فاضل پاکستان کے نہایت فاضل علم دوست اور باخبر اصحاب میں سے تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو پسرور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور میں پائی۔ شعر گوئی کا نہایت اعلیٰ اور شستہ مذاق رکھتے تھے کلام میں شیرینی۔ پختہ پن اور اثر و جذب پایا جاتا ہے۔ سر شیخ عبدالقادر مرحوم آپ کے خسر تھے۔ گورنمنٹ کالج پسرور اور ایمرسن کالج ملتان میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

ترنم مولانا غلام محمد ترنم امرتسر کے رہنے والے تھے تقسیم ملک کے وقت لاہور چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اچھے شاعر اور زبردست خطیب تھے۔ فن طب سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ ۲۴ جون ۱۹۵۹ء تاریخ انتقال ہے۔

منشی محمد علی تشنہ ایک خوش فکر۔ خوش کلام شاعر دہلی کے رہنے والے تھے۔ ذوق اور طپش کے شاگرد تھے۔ وضع درویشوں کی اور مزاج آزادوں کا رکھتے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ صدہا غزلیں اور نظمیں نوک زبان تھیں۔ ۱۲۳۰ھ میں لاہور آئے اور کچھ دنوں یہاں رہے۔ شراب بکثرت پیتے تھے اور اکثر بدمست رہتے تھے داغ، انور اور ظہیر وغیرہ کے ہم مشق اور ہم صحبت تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔

جالب اردو کے نہایت قابل اور لائق انشا پرداز۔ اعلیٰ درجہ کے مضمون نگار بڑے مشہور اور چوٹی کے اخبار نویس۔ اور مختلف علمی و تاریخی معلومات کا ایک سمندر رکھتے تھے۔ نام سید بشارت علی تھا۔ ۱۸۶۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے اردو ادب میں حضرت شمس العلما مولانا حالی کے اور فن شعر میں مجروح و داغ کے شاگرد تھے۔ مگر اپنی بڑھی ہوئی قابلیت، اعلیٰ علمی لیاقت، طبیعت کی جودت، اور ذہن کی جولانی کے باوجود مالی لحاظ سے ہمیشہ تنگدست اور مفلس رہے۔ اور زندگی کے بیشتر ایام بالعموم عسرت تنگی اور تکلیف میں بسر ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں لاہور آئے اور پیسہ اخبار روزانہ میں جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہو گئے اور ۱۹۱۲ء تک اسی اخبار سے متعلق رہے۔ پیسہ اخبار کے علاوہ حسب ذیل اخبارات و رسائل کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اکمل الاخبار دہلی۔ اودھ اخبار لکھنؤ۔ اخبار وکیل امرتسر۔ اخبار پنجاب امرتسر۔ اخبار شریف امرتسر۔ روزانہ اخبار دہلی۔ اخبار وطن لاہور۔ رسالہ مخزن لاہور۔ آخر عمر میں روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ بعد وہاں سے چھوڑ کر اپنا پرچہ ہمت جاری کیا مگر نہ چلا آخر اسی کس مپرسی اور بیکسی کی حالت میں کئی دن تک لکھنؤ میں ہسپتال میں زیر علاج رہ کر ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔

منشی جنگ بہادر جنگ شہر میرٹھ کے رہنے والے خاندانی شخص تھے۔ عرصہ تک عدالت کلکٹری اور محکمہ بندوبست میں ناظر رہے۔ پھر سرکاری نوکری چھوڑ کر اخبار انیس ہند کے ایڈیٹر ہو گئے اور عرصہ تک بڑی لیاقت کے ساتھ اس کی ادارت کرتے رہے۔ صاحب تصنیف بھی تھے اور اچھے شاعر بھی۔ جنگ تخلص کرتے تھے۔ بڑے حاضر جواب اور سخن سنج تھے۔ آخر عمر میں لاہور چلے آئے تھے اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۰۷ء کو ۵۰ سال کی عمر میں یہیں دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ آپ کی تصانیف میں سے چمنستان دلچسپ۔ چمنستان معرفت اور چمنستان صحت شائع ہو چکی ہیں۔ کلام کا نمونہ خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۲۶۹ پر درج ہے۔

منشی الہ یار جوگی - ان کے والد میجر خان محمد خان فوجی ملازمت کے باعث عرصہ تک دکن میں رہے۔ جوگی ۱۸۸۷ء میں

بمقام پونا پیدا ہوئے۔ مگر ہوش لاہور آکر سنبھالا اور لاہور کے اسلامیہ سکول میں انٹرنس تک تعلیم پائی۔ فن شعر میں آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہیں۔ گائے کی حفاظت اور ہندو پرستی کے نشہ میں سرشار ہو کر لاہور سے گئو ماتا کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی نکالا۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۲۹۴)

حالی خواجہ الطاف حسین نام۔ حالی تخلص اور شمس العلماء خطاب ہے۔ پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے مقامی اساتذہ سے عربی و فارسی کی تعلیم پانے کے بعد ۱۸۵۲ء میں دہلی گئے۔ اور وہاں مولوی نوازش علی وغیرہ علماء سے علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ پھر حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں گھر آکر بیٹھ رہے اور تحصیل علم کرتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے ہاں ان کے مصاحب اور ان کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور آٹھ برس تک جہانگیر آباد میں رہے۔ ۱۸۹۶ء میں نواب صاحب کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے کچھ دنوں کے بعد پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ناظر ادبی ہو کر لاہور آ گئے اور ۱۸۷۴ء تک یہاں رہے پھر دہلی میں اینگلو عربک سکول کے اوّل مدرس فارسی ہو کر چلے گئے۔ ۱۸۹۰ء میں ایچیسن کالج کے طلباء کے اتالیق ہو کر پھر لاہور آئے مگر پھر واپس دہلی چلے گئے اس کے بعد استعفیٰ دے کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں انتقال کیا۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ دیوان حالی۔ حیاتِ سعدی۔ یادگار غالب اور حیاتِ جاوید آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ مسدس حالی نے آپ کے نام کو حیاتِ جاوید بخشی۔

پیر وزیر علی شاہ حامی داغ کے شاگرد اور بہت اچھے شعر گو اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ حامی تخلص کرتے تھے۔ امرتسر میں بکنگ کلرک تھے۔ پھر نوکری چھوڑ کر لاہور چلے آئے اور باقی عمر یہیں گزار دی۔ ۲۰ صفر ۱۳۴۹ھ کو ۶۵ سال کی عمر میں بمرض فالج انتقال کیا۔ (تاریخ جلیلہ ص ۲۸۲)

اُن کی ایک کتاب "نعتیہ کلام حامی" ہم نے بھی دیکھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں ۳۶ نعتوں کا مجموعہ ہے اور ۱۹۲۸ء میں کریمی پریس لاہور میں ۴۶ صفحات پر چھپا ہے۔

سیّد حبیب پنجاب کی سیاست اور صحافت میں ان کا نام مدتوں نہایت نمایاں حیثیت سے مشہور رہا۔ اپنے حریفوں اور ہمعصروں سے ان کی قلمی جنگ بڑے زور کی رہا کرتی تھی۔ روزنامہ سیاست ۱۹۰۹ء میں لاہور سے جاری کیا اور اُسے مدت تک چلاتے رہے۔ کئی مرتبہ قید و بند کی تکالیف بھی برداشت کیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس۔ بہت اچھے مقرر اور اسلامی تاریخ کے خوب واقف شخص تھے۔ شعر و شاعری سے بھی بہت اچھا لگاؤ تھا چنانچہ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ آپ کی یادگار ہے۔ آخری عمر بہت افلاس۔ غربت اور بیکسی میں گذری۔ ۱۸۹۱ء میں بمقام جلال پور جٹاں پیدا ہوئے اور فروری ۱۹۵۱ء میں بمقام لاہور وفات پائی۔

حسرت مولانا چراغ حسن حسرت لاہور کے ادیبوں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت زندہ دل۔ خوش فکر اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اعلیٰ درجہ کے ادیب۔ بلند پایہ شاعر۔ بہترین مصنف، فکاہات اور مضحکات کے استاد۔ ہر ادبی محفل کی جان اور ہر علمی مجلس کی روح رواں تھے۔ صاف۔ سلیس اور صحیح اُردو لکھنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بہت سے اخباروں

کے ایڈیٹر اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ " پربت کی بیٹی " اُن کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ سندباد جہازی آپ کا قلمی نام تھا۔

منشی عبداللہ المتخلص بہ حسرتی ریاض الاخبار کے ایڈیٹر تھے اور بہت سے اخباروں کے نامہ نگار اور وقائع نگار۔ عرصہ تک لاہور کے مشہور رئیس پنڈت جنارد من کے ہاں وظیفہ خوار رہے۔ کیفر کردار اور دو تین اور ناول ان کی یادگار ہیں۔ (مخمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۴۲۶)

آغا حشر اُردو کے نہایت مشہور ڈراما نویس تھے۔ نام آغا محمد شاہ تھا۔ اپنے فن کی ابتدا بمبئی سے کی۔ پھر کلکتے چلے گئے۔ آپ نے نہایت کثرت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ غزل گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاعر بھی بہت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آخر عمر میں لاہور چلے آتے تھے اور ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ شکریہ یورپ اُن کی نہایت مشہور نظم ہے جو اُنھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی۔

غلام حسن المتخلص بہ خرم یہ شخص فارسی شعر (قصیدہ اور غزل و مثنوی) میں لاہور میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ پنج گنج ایک بہت ہی بے نظیر کتاب اس نے فارسی میں لکھی تھی۔ جو نوادرات زمانہ کا عجیب نمونہ تھی۔ اس میں آنحضرتؐ اور چاروں خلفا کا حال بیان کیا گیا ہے (تاریخ لاہور ص ۵۵)

مولانا محمد یار خلیق آپ موضع جوڑہ کلاں (سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ علوم عربیہ و فارسیہ کی تحصیل مدرسہ علوم شرعیہ بھیرہ شریف (سرگودھا) سے کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور ۴۸ سال تک برابر سنہری مسجد کے خطیب رہے۔ عربی، فارسی اور اُردو میں اشعار بھی کہتے تھے اور خلیق تخلص کرتے تھے۔ مذہباً حنفی نقشبندی تھے۔ ایک سو بارہ برس کی طویل عمر پا کر ۲۴ جون ۱۹۳۷ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں اُن میں سے نہرا لشہادتین۔ مجموعہ مذہب خلیق اور نافع الصلوٰۃ بہت مشہور ہیں۔ (تاریخ جلیلہ طبع اول ۱۹۳۸ء عطا کردہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری)

مولوی خلیل الرحمن عربی اور انگریزی کے نہایت اعلیٰ پایہ کے مترجم۔ پڑھے لکھے علم دوست۔ نہایت با اخلاق بہت شریف الطبع اور بڑے نیک مزاج بزرگ تھے۔ اسلامی تاریخ کو عربی اور انگریزی سے اُردو میں منتقل کرنے کی جو کامیاب کوشش اُنھوں نے اور اُن کے نہایت قابل اور فاضل فرزندوں نے کی وہ صد ہزار تحسین کی مستحق ہے اور کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ سراوہ (ضلع میرٹھ) کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں ۱ شوال ۱۲۸۷ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں لاہور آئے اور چیف کورٹ میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد دفتر ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے اور تعجب ہے کہ ایسے غیر شاعرانہ عہدہ پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے ایسی اعلیٰ بے نظیر کتابیں لکھیں جن کی افادیت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ یورپ کے مشہور مصنف رائڈر ہیگرڈ کی عجیب و غریب کتاب شی کا آپ نے عذرا کے نام سے ترجمہ کیا۔ پھر مشہور امریکن مورخ ایس۔ پی سکاٹ کی بے نظیر تاریخ " ہسٹری آف دی مورش ایمپائر اِن یورپ " کا تین نہایت ضخیم جلدوں میں اخبار الاندلس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب کا جس میں اُس نے مسلمانان اندلس کی بربادی و تباہی کا نہایت دردناک حال لکھا ہے مولدین کے نام سے ترجمہ کیا۔ علامہ شہاب الدین ابو العباس کی مشہور عالم کتاب " نفح الطیب " اور جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفا کو عربی سے اُردو میں منتقل کیا۔

۲۴ فروری ۱۹۳۹ء کو یہ آفتابِ علم لاہور میں غروب ہو گیا۔ آپ نے نہایت لائق و فائق فرزند اپنی یادگار چھوڑے جن کے نام یہ ہیں۔ جمیل الرحمٰن۔ نعیم الرحمٰن۔ محمد مقصود الرحمٰن۔ محمد بذل الرحمٰن۔ مقتدر کلیم الرحمٰن۔ معتز حمید الرحمٰن۔

خوش دل نام محمد ابراہیم اور تخلص خوش دل ہے۔ لاہور کے مشہور علمی خاندان "چشتی" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد قاضی ضیاء الحق ایران سے اس ملک میں آئے اور لاہور کے محلہ گڑھی شاہو میں اقامت اختیار کی۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی۔ مولانا خوش دل کے پڑپوتے ہیں۔ مولانا نے ۱۳۲۱ھ میں انتقال کیا۔ "رضی اللہ عنہ" ان کا مادۂ تاریخ ہے۔ اردو کلام کا نمونہ پنجاب میں اُردو کے صفحہ ۲۹۲، ۲۹۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (پنجاب میں اُردو ص ۲۹۱)

پروفیسر تاج محمد خیال اُردو زبان کے زبردست حامی۔ تعلیم کو عام کرنے کے زبردست مبلغ۔ مشرقی اقدارِ حیات کے نمائندے بہت بڑے ماہرِ تعلیم اور نہایت سادہ وضع کے بزرگ تھے۔ خیال تخلص کرتے تھے اور بہت اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں بمقام کپور تھلہ پیدا ہوئے۔ رندھیر کالج کپور تھلہ میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں گورنمنٹ کالج سے نفسیات اور فلسفہ کے مضامین میں ایم اے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ سروس میں داخل ہوئے اور گورنمنٹ کالج ملتان میں پڑھانا شروع کیا اور ۱۹۴۲ء تک وہاں پروفیسر رہے اس دوران میں ایک سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی نفسیات کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر پنجاب میں "ثانوی تعلیم کی عبوری کمیٹی کے رُکن بنائے گئے۔ زاں بعد محکمہ تعلیمات پنجاب کے ترقیاتی افسر کے عہدے پر کام کیا۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام پر اُنھیں محکمہ تعلیم میں کالجوں کے شعبہ کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ حکومتِ مغربی پاکستان کے محکمہ تعلیم کے ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہوئے فروری ۱۹۵۸ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیرمین کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۶۱ء تک قومی تعلیمی کمیشن اور نصاب کمیٹی میں اہم تعلیمی فرائض انجام دیئے اور ۱۹۶۱ء ہی میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ اس معزز عہدے پر پانچ ماہ ہی کام کرنے پائے تھے کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث انتقال کر گئے۔

(امروز لاہور ۱۵، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

خواجہ دِل محمد لاہور کے نہایت مشہور و معروف ادیب مصنف۔ شاعر اور ماہر ریاضی گذرے ہیں۔ اور مدتوں آپ کا نام تعلیمی دُنیا میں بہت کافی مشہور رہا ہے۔ حساب اور الجبرے کی بہت سی کتابیں آپ نے طلبا کے لیے لکھیں اُن میں سے اکثر سرکاری طور پر نصاب میں داخل تھیں۔ خواجہ صاحب لاہور کی شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم شیرانوالہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں پائی پھر اسلامیہ کالج سے ایم اے پاس کیا۔ زاں بعد اسی کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ بہت اچھا علمی مذاق رکھتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور لاہور کارپوریشن کے ممبر تھے۔ لاہور کی وہ سڑک جو چوک دالگراں سے بیڈن روڈ تک جاتی ہے۔ آپ کے نام سے دل محمد روڈ کہلاتی ہے۔ حساب اور الجبرے کی بہت سی کتب کے علاوہ بھی اکثر نظم و نثر کی کتابیں آپ نے لکھی ہیں جن میں صد پارۂ دل بہت مشہور ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کا انتقال ہُوا۔ بھگوت گیتا کا بھی آپ نے منظوم ترجمہ کیا تھا۔

مولانا دیدار علی لاہور کے ایک مشہور فاضل۔ عالم۔ مفسرِ قرآن اور محدّث تھے اور مسجد وزیر خاں میں درس و تدریس کا سلسلہ آپ نے مدت تک جاری رکھا۔ جس سے بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے۔ عقیدے کے لحاظ سے آپ حنفی مشرب تھے اور اسی سلسلہ

ہیں آپ نے یہاں انجمن حزب الاحناف کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں ایک دارالعلوم کی شکل اختیار کر لی۔ آپ کی ساری زندگی دینی خدمات کے لیے وقف رہی۔ پہلے ریاست رام پور کے مدرسہ ارشاد العلوم میں مدرس اوّل رہے پھر بمبئی چلے گئے ۱۹۰۸ء میں اپنے وطن میں واپس آکر "نصرت الاسلام" کے نام سے ایک دار العلوم قائم کیا۔ پھر لاہور آکر انجمن نعمانیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے ۱۹۱۷ء میں آگرہ چلے گئے ۱۹۲۲ء میں پھر لاہور آ گئے اور ہمیشہ کے لیے لاہور کے ہو کر رہ گئے۔ فن حدیث میں آپ کے استاد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری ہیں۔ ۲۲ رجب ۱۳۵۴ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ علامہ ابوالحسنات اور ابوالبرکات آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی بعض تصنیفات یہ ہیں: ہدیۃ الغوی۔ رسول الکلام۔ ہدایۃ الطریق الاستعانت۔ فارسی دیوان وغیرہ۔

منشی دین محمد

آپ کی شہرت اخبار میونسپل گزٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی۔ فن شعر کا بھی آپ بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں آپ نے "مشاعرہ" کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ بھی جاری کیا تھا جس میں مشہور شاعروں کی منتخب غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ آپ ایک کامیاب ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ دربار تاج پوشی کی تاریخ ۱۹۰۳ء۔ ایک ناول "دوستی" ۱۹۱۱ء کے دربار تاج پوشی کی تاریخ آپ کی کتابیں ہیں۔ سیر و سیاحت بھی آپ نے خوب کی۔ اور بہت سی انجمنوں کے سیکرٹری اور صدر رہے ۱۸۶۸ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔

پنڈت رادھا کشن

سکھوں کے زمانہ میں لاہور کا نہایت فاضل اور لائق پنڈت تھا۔ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے یگانۂ زمانہ تھا۔ اس کی تصانیف ہر علم اور فن میں موجود ہیں۔ انگریزوں کا زمانہ آیا تو اس کے علم و فضل کے باعث انگریزی گورنمنٹ نے اسے "چیف پنڈت" کا خطاب دیا۔ ۱۸۶۹ء سے پیشتر انتقال کیا۔ اس کا بیٹا پنڈت رکھی کیش بھی بڑا فاضل گذرا ہے۔ (تاریخ لاہور ص ۵۲)

لالہ رگھوناتھ سہائے

ایک بہت ہی خلیق۔ نیک دل۔ متواضع۔ خاکسار اور مخلص بزرگ تھے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر لاہور چلے آئے اور تقسیم ملک تک لاہور میں مقیم رہے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو لاہور سے بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار "گلدستہ" کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۴۷ء تک نہایت عمدگی کے ساتھ اُسے ایڈٹ کرتے رہے۔ معلمین اور اساتذہ کے لیے "رفیق التعلیم" ایک ماہنامہ نکالا اور اُسے نہایت کامیابی سے نکالتے رہے۔ کئی اخلاقی کتابیں بھی آپ نے لکھیں۔ دیال سنگھ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور دیال سنگھ ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے۔ برہم سماج سے تعلق رکھتے تھے اور تعصب کے زہر سے پاک تھے۔ تقسیم ملک کے وقت ہندوستان چلے گئے اور وہیں سولن میں آپ کا انتقال ہوا۔

سالک

مولانا عبدالمجید سالک بی اے لاہور کے مشہور ادیب۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ بہت بڑے اخبار نویس۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ نہایت زندہ دل۔ بذلہ سنج اور اپنے دور کے بے نظیر مزاح نویس تھے۔ زمیندار اور انقلاب کے "افکار و حوادث" اُن کی مزاح نویسی کے لازوال نمونے ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ نہایت بااخلاق بامروت اور نہایت ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ دوسروں کا کام کر کے۔ دوسروں کی سفارش کر کے۔ دوسرے کی اعانت کر کے انہیں روحانی خوشی ہوتی تھی۔ حسنِ اخلاق اور شیریں کلامی میں پرانے بزرگوں کا بہت اچھا نمونہ تھے۔ بہت سی دلچسپ کتابوں کے مصنف۔ مؤلف اور مترجم ہیں جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو مسلم ٹاؤن لاہور میں وفات پائی۔

عبدالسلام خورشید ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اُن کے لائق فرزند ہیں۔

منشی سراج الدین کرم آباد ضلع گوجرانوالہ کے رئیس اور ایک نہایت صلح کل اور مرنج و مرنجان بزرگ اور نہایت نیک اور صالح انسان تھے۔ ہمیشہ اپنے زمیندار بھائیوں کی فلاح اور بہبود میں مصروف رہے۔ اور اُنہی کی اصلاح اور ترقی کے لیے آپ نے ابتداً لاہور سے اخبار "زمیندار" جاری کیا۔ جو شروع میں ہفتہ وار تھا اور صرف زمیندار طبقہ کی بہبودی اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں مولوی صاحب اسے اپنے وطن کرم آباد میں لے گئے اور آن کے انتقال کے وقت تک یہ اخبار کرم آباد ہی سے نکلتا رہا۔ آپ کا انتقال ۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ہوا۔ آپ کے فرزندوں میں سے مولوی ظفر علی خاں نے آپ کے بعد زمیندار کو زبردست ترقی دی۔ ظفر علی خاں کے علاوہ آپ کے پانچ فرزند اور ہوئے۔ غلام حبیب خاں۔ محمد اکبر خان۔ محمود احمد خاں۔ حامد علی خاں۔ حمید احمد خاں۔ محترمی حامد علی خاں رسالہ ہمایوں کے سابق ایڈیٹر اور ادارہ فرینکلن کے ڈائرکٹر ہیں۔ کرمی حمید احمد خاں اسلامیہ کالج سول لائنز کے پرنسپل ہیں۔

لالہ سری رام دہلی کے باشندے مولانا حالی کے گہرے دوست، رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا کے فرزند اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے بھتیجے تھے۔ ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں جگہ ہوئی۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد لاہور میں عرصہ دراز تک منصف رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ اُردو ادب سے نہایت گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ساری عمر اُس کی ترویج و اشاعت میں بسر کر دی۔ آن کی بے نظیر اور لاثانی تصنیف "خمخانۂ جاوید" اُردو شاعروں کی انسائیکلو پیڈیا ہے اور اس کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں لاہور ہی سے شائع ہوئی تھی۔ عمر کے آخری ایام خانگی تنازعوں کے باعث نہایت رنج و غم میں بسر ہوئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو وفات پائی۔

پیر سکندر شاہ لاہوری آپ حضرت کرم شاہ کے فرزند اور حضرت مراد شاہ مشہور شاعر و صوفی کے چھوٹے بھائی اور بہت خوش گو شاعر تھے۔ امداد تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں اور مخدومی نامی صاحب نے اپنے رسالہ "تبرک کلام" میں ان کا اُردو اور فارسی کلام دیا ہے۔ دو اُردو شعر آپ بھی سن لیجیے ؎

شب میں احوال اُس کا کہہ نہ سکا
شیشہ ہر چند کہہ رہا تھا قُل قُل

قل قل صراحی میں سے پانی کے گرنے کی آواز کو بھی کہتے ہیں اور قل قل کے معنے یہ بھی ہیں کہ کہہ کہہ۔ اس ذو معنی لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔
دوسرے شعر میں کتنی صفائی۔ سادگی اور سلاست ہے۔ سُنیے ؎

دیکھ کر اُس پری کو ہوش و حواس
آہ پرواز کر گئے بالکل

سکھوں کی چیرہ دستیوں اور لوٹ مار سے تنگ آکر اپنے والد پیر کرم شاہ اور اپنے بھائی پیر مراد شاہ کے ہمراہ لاہور

سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سات سال رہنے کے بعد ۱۲۰۷ھ میں پیرمراد شاہ کے ساتھ واپس لاہور آگئے۔ بگڑ وطن آئے ہوئے
ابھی چند سال ہی ہوئے تھے کہ عین عنفوانِ شباب میں بعمر ۲۰ سال ۱۲۱۰ھ میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر محمود شیرانی نے سنہ وفات ۱۲۱۴ھ
لکھا ہے اور ناتی صاحب نے ۱۲۱۰ھ۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیں۔ تبرک کلام ص۳۶۔ پنجاب میں اردو ص۳۰۔ تاریخ مجلہ
ص۱۹ رسالہ تاریخ و تحقیق ص۲۱۔

جماعت احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے نہایت لائق اور قابل فرزند
خان بہادر مرزا سلطان احمد اعلیٰ درجہ کے ادیب بہت بڑے انشا پرداز اور بہت سی اعلیٰ پایہ کی اخلاقی اور
علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عرصہ دراز تک لاہور میں بحیثیت سرکاری ملازم متعین رہے۔ گوجرانوالہ کی ڈپٹی کمشنری سے ریٹائر ہونے
بعد قادیان میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲ر جولائی ۱۹۳۰ء کو وفات پائی۔
آپ کے اُن فلسفیانہ اور علمی و اخلاقی مضامین کے ۲ مجموعے ربوہ کی مرکزی لائبریری میں محفوظ ہیں۔
مولانا سلیم ادبی قابلیت۔ علمی لیاقت کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے
مولوی سید وحید الدین سلیم تھے۔ آپ اُردو کے اُن چند مشاہیر میں سے تھے جن پر ہماری زبان اور لٹریچر کو بجا طور
پر فخر ہو سکتا ہے۔ اُردو میں جدید اصطلاحات کے وضع کرنے میں۔ الفاظ کے بنانے اور زبان کی تحقیق میں اُردو کا کوئی بھی انشا پرداز
سلیم کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ سلیم کا کلام ظاہری حسن۔ باطنی خوبیوں اور ادبی جدت طرازیوں سے مالا مال ہے۔ وہ عربی کے
بہت بڑے فاضل۔ فارسی کے زبردست ادیب اور اُردو کے بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ اعلیٰ درجہ کے خطیب اور مقرر بھی تھے
شعر ایسی سرعت اور روانی کے ساتھ تصنیف کرتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ بہت سی اعلیٰ اور عمدہ کتابوں کے بھی آپ مصنف،
مؤلف اور مترجم ہیں۔ لیکن وہ سب آجکل ناپید اور نایاب ہیں۔ آپ سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ۔ رسالہ معارف اور علی گڑھ
انسٹیٹیوٹ کے مدیر اور مسلم گزٹ کا نپور اور زمیندار لاہور کے عرصہ تک ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار
مقرر ہو گئے اور آخر وقت تک اسی عہدے پر رہے۔ اور سات ماہ کی نہایت تکلیف دہ بیماری کے بعد ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء کو حیدر آباد
(دکن) میں فوت ہوئے۔ ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ عرصہ تک لاہور میں رہ کر مولوی فیض الحسن اور
مولوی عبداللہ ٹونکی سے تحصیلِ علم کرتے رہے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "افکار سلیم" کے نام سے ہم نے ۱۹۳۸ء میں پانی پت
سے شائع کیا تھا۔

سہا آپ کا نام سید ممتاز حسین مجددی تھا۔ اور آپ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ بلند شہر سے آپ بھوپال چلے گئے
تھے اور بھوپال سے لاہور آگئے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب حکیم احمد شجاع نے لاہور سے رسالہ ہزار داستان جاری کیا تو
حصہ نثر کی ادارت اپنے ذمہ لی اور حصہ نظم کا مدیر سہا کو مقرر کیا۔ جو عرصہ تک اس کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے
علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا تھا اور شعر و سخن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے جس وقت مشاعروں میں غزل پڑھنے کھڑے ہوتے تو
ایک سناٹا چھا جاتا تھا۔ لطف یہ کہ آپ کا قد صرف تین فٹ تھا۔ جسے دیکھ کر اکثر لوگ مذاق اُڑاتے لیکن جس وقت کلام سنتے تو
حیران ہو جاتے۔ لاہور میں سہا مشاعروں کی بہت بڑی رونق تھے۔ اور ہر جگہ بڑے شوق سے بلائے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ آپ

لاہور سے جے پور چلے گئے اور واپس نہیں آئے۔ اُن کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔

مولوی سید احمد اردو زبان کے مشہور ادیب۔ بہت سی عمدہ عمدہ کتابوں کے مصنف۔ اُردو کی مشہور و معروف لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مؤلف اور نہایت باذوق اور خوش طبع انسان تھے۔ ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تصنیف۔ ۔ لکھنے پڑھنے، مضمون نگاری اور شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مسٹر فیلن کے ساتھ سات برس تک رہ کر اُن کو اُردو کی لغت لکھنے میں مدد دی۔ پھر مہاراجہ الور نے اپنا سفرنامہ مرتب کرنے کے لیے بلوا لیا۔ پھر لاہور آکر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم کے عہدے پر کام کرنے لگے اور عرصہ تک یہاں رہ کر انگریزی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی اُردو عبارت محاورہ اور روزمرہ کے مطابق درست کرتے رہے۔ بعد میں گورنمنٹ نے خان صاحب کا خطاب دیا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا۔ فرہنگ آصفیہ کی چار ضخیم جلدوں کی تالیف آپ کا نہایت اعلیٰ ادبی کارنامہ ہے جس کو آپ نے ۴۲ سال کی محنت میں انجام دیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے ۵۲ کے قریب کتابیں لکھیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: انشائے ہادی النساء۔ لغات النساء۔ علم اللسان۔ رسوم دہلی۔ اُردو ضرب الامثال۔ قصہ مہر افروز بیگم۔ تسخیر شوہر وغیرہ۔

سید نادر علی سیفی اچھے قابل ادیب اور شاعر تھے۔ سیفی تخلص کرتے تھے۔ ہوشیارپور میں ضلع سکول کے مدرس تھے۔ وہاں سے چھوڑ کر لاہور چلے آئے اور اخبار کوہِ نور کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ عرصہ دراز تک یہاں کام کرنے کے بعد "پنجابی اخبار" کے ایڈیٹر ہو کر پٹیالہ چلے گئے۔ پنجاب کی ابتدائی اخبار نویسی کے زمانہ میں بہت مشہور اہلِ قلم اور کامیاب مضمون نگار تھے۔ عربی کے ماہر اور فارسی کے فاضل تھے۔ شعر بھی بہت اچھے کہتے تھے۔ اُن کے کچھ اشعار مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت میں درج کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور صـ ۲۴۳۔

سیتا رام کوہلی ایم اے لاہور میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر اور انگریزی اور فارسی کے ماہر تھے۔ تاریخ سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ پنجاب نے ان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ لاہور کی حکومت کا ریکارڈ مرتب کرنے کے لیے مقرر کیا۔ یہ کام انھوں نے بڑی محنت و کاوش کے بعد ۱۹۱۹ء میں مرتب کیا۔ "خالصہ دربار ریکارڈ" کے نام سے یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ دیوان امرناتھ کی کتاب ظفرنامہ رنجیت سنگھ (فارسی) کو بھی انھوں نے اپنی شرح کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

عرصہ دراز کی تحقیق و تلاش اور سینکڑوں کتابوں سے اخذ و انتخاب کے بعد انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک مفصل سوانح عمری اُردو میں مرتب کی جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔ کتاب ۳۷۶ صفحے کی ہے۔ اور بڑی قابلیت سے مرتب کی گئی ہے۔

شمس الدین شائق لاہور کے ایک خوش گو شاعر تھے۔ مگر فضول نظموں کے کہنے اور بیکار غزلوں کے لکھنے میں انھوں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی شعری قابلیت کو اسلام کی خدمت میں لگایا اور قرآن پاک کا نہایت سلیس اور عام فہم اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ جو ایک پارہ کا چھپ بھی چکا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور میں آپ نے انتقال کیا۔ مشہور شاعر خواجہ دل محمد ایم اے نے تاریخ کہی ہے

آہ شمس الدین شائق چل بسے
دوستوں کو رنج بے پایاں ہوا
عرض کی دل نے یہ تاریخ وفات
انتقالِ ناظمِ قرآں ہوا
۱۹۳۹ء

مرحوم بہت اچھے شاعر ہونے کے علاوہ بہت اچھے تاریخ گو بھی تھے۔

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی شعر العجم کے قابل مصنف اور سیرت نبوی کے فاضل مؤلف مولانا شبلی سے کون شخص واقف نہیں۔ لہٰذا اُن کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت مولانا بھی مدتوں لاہور میں رہ کر مولانا فیض الحسن سے تحصیلِ علم کرتے رہے ہیں۔ اُس زمانہ میں سفر آسان نہ تھا۔ بڑی مصیبت اور مشکلات کے ساتھ اعظم گڑھ سے لاہور پہنچے۔ ایک روپیہ ماہوار پر مکان کرایہ پر لیا۔ اور مولوی فیض الحسن صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اپنے شاگردوں کے زمرہ میں شامل کر لیں۔ مولانا اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے۔ وہاں کس طرح پڑھاتے۔ کالج کے اوقات کے بعد بھی بہت سے طلبا اُن سے پرائیوٹ طور پر پڑھا کرتے تھے اس لیے اُن کے پاس کوئی بھی فارغ وقت نہیں تھا آخر اُستاد شاگرد میں یہ طے ہوا کہ گھر سے کالج آنے کے دوران میں اور کالج سے گھر آنے کے وقت میں شبلی سبق پڑھ لیا کریں۔ مولانا شبلی نے نہایت صبر، نہایت سعادت مندی اور نہایت محنت کے ساتھ اس عجیب و غریب طریقہ سے لاہور میں رہ کر علم سیکھا۔ اور واپس چلے گئے۔ اُستاد کی لیاقت اور قابلیت کا شبلی کے دل پر ہمیشہ بڑا اثر رہا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں سے نہایت درجہ تعریفی الفاظ میں مولانا فیض الحسن صاحب کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ اُن کے انتقال پر بڑا پُردرد مرثیہ شبلی نے فارسی میں لکھا تھا۔ مولانا شبلی مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو یہ علم کا آفتاب اُردو کا زبردست انشا پرداز، تاریخ اسلام کا بلند پایہ مورخ دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

مولوی شجاع اللہ خاں مولوی انشاء اللہ خاں کے چھوٹے بھائی اور بہت قابل شخص تھے۔ آپ کو بچپن ہی سے مضمون نگار اور مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ آپ کی صحافی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۲ء سے ہوتی ہے جبکہ آپ نے گوجرانوالہ سے ایک انگریزی اور اُردو اخبار اینگلو ورنیکلر جاری کیا۔ پھر اُسے بند کر کے وکیل امرتسر کی ادارت کے فرائض ادا کیے مگر جلد ہی مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے اور یہاں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے، بڑے ہیڈ ہو کر لدھیانہ چلے گئے مگر جلد ہی واپس آ کر ۱۹۱۰ء میں اپنا اخبار "ملت" جاری کیا جو عرصہ تک نکلتا رہا۔ آپ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی تاریخ پیدائش ۱۸۷۶ء ہے اور مقامِ پیدائش لاہور۔

حاجی میر شمس الدین لاہور کے نہایت مقدس، محترم بزرگ اور مسلمانوں کے دلی خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔ مسلمانوں کی اور اخلاقی ترقی و فلاح میں اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور ساری عمر قوم کی غم خواری اور آ کی اصلاح و فلاح میں گزار دی۔ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جمال میر کشمیر سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں آپ نے شہر کے دوسرے ہمدرد بزرگوں سے مل کر انجمن حمایتِ اسلام کی بنیاد ڈالی اور ۴۰ سال تک بڑے خلوص کے ساتھ اس کی

خدمت کی۔ آپ انجمن مذکورہ کے لائف پریذیڈنٹ تھے۔ اور آپ کی ان تھک اور پر خلوص کوشش اور سعی سے انجمن بڑی زبردست ترقی کی۔ اور آجکل تو اس کی عظمت و شان بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مگر افسوس کوئی شمس الدین جیسا لائق اور پر خلوص کارکن اُسے نہیں ملا۔ بغرض مسلمانوں کی علمی۔ مذہبی۔ تعلیمی اور سیاسی خدمات ۴۰ سال تک بڑے خلوص نہایت جوش کے ساتھ انجام دینے کے بعد ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ (تاریخ اقوام کشمیر ص ۶۷)

شمس مینائی ان کا نام شیخ عبدالرحمن۔ کنیت ابو المعانی۔ تخلص اُردو میں شمس اور فارسی میں مینائی تھا۔ ۱۸۶۶ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی چلے گئے۔ وہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور جلد ہی بہت اچھے شاعر بن گئے۔ آپ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے اور اپنا مجموعۂ کلام "جام مینائی" کے نام سے شائع کیا۔ تقسیم ملک کے وقت امرتسر سے لاہور چلے آئے اور آخر وقت تک یہیں رہے۔ یکم ستمبر ۱۹۵۲ء کو وفات پائی +

رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم لاہور کے مشہور وکیل۔ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اُن کی نظمیں اکثر اُس زمانہ کے رسائل میں بڑے طمطراق سے چھپا کرتی تھیں۔ ۱۸۵۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں لاہور ہی سے وکالت کی سند حاصل کی اور پنجاب کے بڑے قابل وکیلوں میں سے ہوئے۔ ۱۹۰۸ء تک جالندھر میں وکالت کرتے رہے۔ پھر لاہور چلے آئے۔ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب سے بھی بڑا شوق رکھتے تھے۔ تاریخ سے بھی آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اسی ذوق اور شوق کے باعث آپ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ اور پنجاب میں اس مذہب کے زبردست مبلغ تھے مجھے بھی انھوں نے پالی پٹ بدھ مذہب کے متعلق دو تین کتب تحفتہً بھیجی تھیں۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں آپ حیات تھے۔ اس کے بعد کسی تاریخ میں وفات پائی۔

اُن کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں: کشمیری پنڈت (کشمیری پنڈتوں کی سوشل اصلاح کے متعلق) تحفۂ شمیم (اصلاحی حکایات کا مجموعہ)۔ بدھ مت (بدھ کے حالات اور تعلیمات) وغیرہ۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے "شمیم ہند" کے نام سے ایک اخبار جالندھر سے جاری کیا تھا۔ جو ڈیڑھ سال بعد بند ہو گیا۔ آپ ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں سے نہایت نفرت کا اظہار کرتے تھے اور دونوں کو ہمیشہ اتفاق اور اتحاد کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔

میر نثار علی شہرت آپ اُنیسویں صدی کے مشہور ادیبوں شاعروں مصنفوں اور صحافیوں میں سے ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے اگرچہ آپ دہلی کے رہنے والے تھے مگر مدت تک لاہور میں مقیم رہ کر علم و ادب اور صحافت کی خدمت کرتے رہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں آپ جن اخباروں کے ایڈیٹر رہے اُن کے نام یہ ہیں۔ اخبار کوہ نور، اخبار انجمن پنجاب اور پنجاب پنچ۔ فن شعر میں آپ حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب لاہور میں انتقال کیا۔

ظفر علی خاں نہایت نامور صحافی۔ شعلہ بیان خطیب۔ بلند پایہ شاعر۔ مسلّمہ ادیب۔ اعلیٰ درجہ کے مترجم اور بہت بڑے سیاست دان تھے۔ لاہور اور پنجاب بلکہ تمام ہندوستان میں مدت دراز تک ان کا طوطی بولتا

روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر ہونے کے لحاظ سے ان کو زبردست شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ اس میں مضامین اور ایڈیٹوریل لکھتے تھے جس کے نتیجہ میں متعدد مرتبہ قید و بند کے مصائب بھی جھیلنے پڑے۔ کئی مرتبہ اخبار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں اور ضمانتوں کے سلسلہ میں مولانا نے قوم سے چندہ کر کے تقریباً دو لاکھ روپے گورنمنٹ انگریزی کے خزانے میں داخل کیے۔ زمیندار کے علاوہ دکن ریویو، پنجاب ریویو اور ستارۂ صبح کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ملک کے متعدد ادیبوں نے زمیندار کے دفتر ہی میں رہ کر اخبار نویسی میں نام پیدا کیا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں زمیندار اردو کے تمام روزناموں میں سب سے زیادہ چھپتا تھا اور بہت ہی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور مدت تک فالج میں مبتلا رہنے کے بعد نہایت لاچاری و مجبوری کی حالت میں اور بہت بیکسی اور حسرت کے ساتھ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو اپنے وطن کرم آباد میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ معرکۂ مذہب و سائنس اور خیابان فارس ان کے مشہور ترجمے ہیں۔ نظموں کے بھی تین چار مجموعے شائع ہوئے۔ غرض اپنے وقت میں زبردست شہرت کے مالک تھے۔ شمس العلماء مولانا حالی نے بھی ان کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جسے انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ بار بار شائع کیا۔

شیخ عبدالعلی ہروی الطہرانی شیعہ صاحبان کے ایک مشہور فاضل، عالم اور مجتہد تھے۔ مشہد مقدس میں ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن ہرات تھا۔ تحصیل علم مشہد مقدس میں کی۔ پھر طہران چلے گئے، اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۰ برس کی تھی۔ مگر آپ کی علمی شہرت آپ سے پہلے طہران پہنچ چکی تھی۔ جب طہران پہنچے تو شاہ ایران ناصر الدین قاچار نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ وہاں جب بابیوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو آپ نے اُن کے قتل کا فتویٰ دیا جس کے نتیجہ میں آٹھ ہزار بابی قتل ہوئے۔ اس کے بعد آپ کی وہاں سخت مخالفت شروع ہو گئی جس کے نتیجہ میں ان کو طہران سے نکل کر روس جانا پڑا۔ بعد ازاں آپ نے تمام یورپ، ترکی اور مصر اور عراق کی سیاحت کی اور وہاں کے اہلِ علم سے زبردست علمی مذاکرے رہے۔ پھر کراچی چلے آئے اور کراچی سے لاہور پہنچے اور عرصہ دراز تک یہاں قیام کیا۔ وقتاً فوقتاً پنجاب کے دوسرے شہروں کا دورہ بھی کرتے رہے اور ہر جگہ پہنچ کر محرم کی مجالس اور ذکرِ حسینؑ کی محافل کو رونق بخشتے رہے۔ ایک رسالہ تجسم اعمال پر، ایک معاد جسمانی کے ثبوت پر، ایک رسالہ قضا و قدر پر آپ کی تالیفات ہیں۔ فارسی تو آپ کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ عربی، ترکی، فرنچ، روسی، انگریزی، پشتو، پنجابی اور سندھی خوب جانتے تھے۔ اُردو میں بھی تقریر کر سکتے تھے۔ ۶۴ سال کی عمر پائی۔ جن میں سے ۱۲ سال اس ملک میں رہ کر گزارے۔ اور ۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کے مواعظ کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔

سر شیخ عبدالقادر ۱۸۷۴ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قصور میں پائی۔ بی۔ اے لاہور سے کیا۔ پھر منٹگمری کے ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے ماہنامہ "مخزن" جاری کیا۔ جو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا خالص ادبی پرچہ تھا۔ ان کی ادبی اور علمی شہرت اسی رسالہ کے ذریعہ ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے اور ۱۹۰۷ء میں واپس آکر دہلی میں پریکٹس شروع کی پھر لاہور چلے آئے۔ بعد ازاں لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں وزیر تعلیم پنجاب۔ ۱۹۲۷ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۴ء میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہو کر لندن چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۹ء میں واپس آئے۔ ۱۹۴۲ء میں بہاولپور کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ اور ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو لاہور میں وفات پائی۔ نہایت بلند اخلاق اور نہایت بلند کیرکٹر کے مالک تھے۔ اردو

کی ترقی و اشاعت میں نہایت نمایاں حصہ لیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر رہے اور پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے بھی۔ لندن میں احمدیوں کی مسجد کا افتتاح کیا۔ آپ کے لائق فرزند شیخ منظور قادر آجکل پاکستان کے وزیر خارجہ ہیں۔ ایسے علم دوست۔ ایسے با اخلاق۔ ایسے شگفتہ مزاج۔ ایسے با اصول اور ایسے وضعدار بزرگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبداللہ عمادی مشہور و معروف فاضل۔ زبردست ادیب اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس اور بے نظیر قابلیت کے انسان تھے۔ عرصہ دراز تک لاہور میں زمیندار اور ستارۂ صبح کی ایڈیٹری کی۔ پہلے امرتسر میں وکیل اور تہذیب الاخلاق کو ایڈٹ کرتے رہے۔ بہت سی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ عرصہ تک دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں ترجمہ اور تالیف کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اور آخر وہیں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو انتقال کیا۔

علامہ عبداللہ یوسف علی ۴ اپریل ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ بڑے مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ قرآن شریف کا آپ نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ حیدرآباد میں محکمہ صنعت و حرفت کے وزیر رہے۔ لاہور میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ نہایت شستہ اور شائستہ علمی مذاق رکھتے تھے۔ بہت با اخلاق اور نیکدل انسان تھے۔ اخبارات میں سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ بعض کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے فاضل تھے۔ ادب پر بہت اچھا عبور تھا۔ میر۔ غالب اور اقبال کے بکثرت شعر ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے اُردو بڑی صاف اور شستہ بولتے تھے۔ آخر عمر میں لندن چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ آپ کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ ایک ہندوستان کے اقتصادی حالات اور دوسری انگریزی ہند میں ہندوستان کے عدل کی تاریخ۔

حکیم ابوتراب محمد عبدالحق امرتسری ۱۸۶۸ء میں خواص پور میں پیدا ہوئے جوان ہوتے ہی طلب علم کے لیے گھر سے نکلے اور سہارنپور۔ کانپور۔ دہلی میں علم اور طب کی تحصیل کی ۱۹۱۵ء میں امرتسر سے اخبار اہل سنت والجماعت جاری کیا جو عرصہ دراز تک جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں لاہور آ گئے اور یہیں ۲۱ اگست ۱۹۵۱ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اعلیٰ درجہ کے فلسفی۔ بہت بڑے فاضل اور نہایت با اخلاق اور شریف الطبع بزرگ تھے۔ کشمیر کے ڈار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں فلسفہ میں بی۔ اے کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اسی طرح ایم۔ اے میں اوّل آئے۔ ۱۹۲۵ء میں لندن سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر آئے اور عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر لگ گئے۔ فلسفہ آپ کا خاص مضمون تھا مگر شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے آئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قائم ہونے پر اس کے ڈائرکٹر بنا دیئے گئے۔ جہاں آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔ آپ کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: فکرِ اقبال۔ حکمت رومی۔ اسلام کا نظریہ حیات۔ تشبیہاتِ رومی۔ اسلام کی بنیادی حقیقتیں۔ اقبال اور مُلّا وغیرہ۔

سید عبدالقادر ایم۔ اے آپ اسلامیہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور تاریخ اسلام پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ جو آپ نے انٹرنس کے طلباء کے لیے لکھی تھی۔ طلباء کے لیے جو تاریخیں

لکھی گئی تھیں اُن میں نہایت نمایاں کتاب تھی۔ اور بھی کئی کتابیں آپ نے لکھیں۔ آپ کا نہایت بیش قیمت کتب خانہ فسادات ۱۹۴۷ء میں جالندھر میں جلا کر خاک کر دیا گیا۔ پاکستان آکر جو کتابیں آپ نے جمع کیں وہ اُن کی وفات کے بعد پنجاب پبلک لائبریری لاہور کو دے دی گئیں۔ ۱۹۵۰ء میں فوت ہوئے۔

مولوی علمدار حسین یہ صاحب لاہور کے مشہور اور فاضل اصحاب میں سے تھے۔ جب لاہور میں گورنمنٹ کالج قائم کیا گیا تو اس میں عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے جو پروفیسر سب سے پہلے مقرر کیا گیا وہ یہی مولوی علمدار حسین تھے آپ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بجائے مولوی محمد حسین آزاد کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

مولانا مفتی غلام احمد یہ فاضل اجل عالم دین موضع کوٹ اسحٰق ڈاک خانہ دنیکے تارڑ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ اپنے وقت کے جید علمائ اور ادبا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ قریباً ۴۰ سال تک لاہور کی مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" میں صدر مدرس رہے اور قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ ہزاروں تشنگان علم آپ کے وجود سے سیراب ہوئے۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر پائی اور ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔

مفتی غلام سرور لاہور کے مشہور عالم مفتی غلام محمد کے تیسرے لڑکے اُردو اور فارسی کے زبردست فاضل بہت سی فاضلانہ کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ ان کا سب سے بڑا سب سے مفید۔ اور سب سے شاندار علمی کارنامہ فارسی کتاب خزینۃ الاصفیا کی تصنیف ہے جو اولیائے وقت۔ فضلائے زمانہ۔ اور صوفیائے کرام کے حالات کی گویا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اور بے انتہا محنت اور کاوش کے بعد جمع اور مرتب کی گئی ہے۔ دو مبسوط جلدوں میں سینکڑوں اولیائے کرام کے حالات ہیں۔ ہر ایک کی تاریخ وفات بحساب جمل مفتی صاحب نے نکالی ہے۔ کتاب کی عبارت بحد سلیس اور عام فہم ہے۔ فارسی کا معمولی طالب علم بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ آجکل نایاب ہے اشد ضرورت ہے کہ یہ مفید کتاب مع ترجمہ کے دوبارہ شائع ہو۔ مفتی صاحب کی دوسری نظم و نثر کتابیں یہ ہیں۔ گلدستہ کرامت۔ گنجینہ سروری۔ اخلاق سروری۔ مخزن حکمت۔ حدیقۃ الاولیا اور تحفہ سروری۔ (تاریخ لاہور ص ۵۰۸)

۱۸۳۵ء میں یہ لاہور میں پیدا ہوئے اور ۴ اگست ۱۸۹۰ء کو مکہ اور مدینہ کے درمیان وفات پائی۔ جہاں آپ حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ آپ کے حالات اور آپ کی تصنیفات کے متعلق ایک مفصل مضمون اکتوبر ۱۹۶۱ء کے نقوش میں شائع ہوا ہے۔

مولانا غلام قادر مولانا غلام قادر بھیروی ایک یگانہ روزگار فاضل اور نہایت پابند مذہب بزرگ تھے۔ اورینٹل کالج لاہور میں عرصہ تک پروفیسر رہے۔ بیگم شاہی مسجد لاہور کے خطیب تھے صلوٰۃ حضوری اور اسلام کی گیارہ کتابیں آپ کی تالیفات ہیں۔ آپ نے ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو انتقال کیا۔

ملک غلام محمد آپ ملک محمد رمضان کے فرزند اور کشمیری الاصل تھے۔ فن زراعت اور باغبانی کے ماہر تھے۔ اور اسی فن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ گئے اور وہاں تین چار سال تک زراعتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور واپس آئے اور ایک ماہوار پرچہ نکالا جس کا نام تھا "رسالہ مشیر باغبانی" یہ رسالہ بہت جلد مشہور و مقبول ہو گیا اور

زمیندار طبقہ میں بڑی رفعت سے دیکھا جانے لگا۔ (تاریخ اقوام کشمیر ص ۵۲۵)

فدوی لاہوری بقول پروفیسر محمود شیرانی فارسی اور اُردو میں کامل تھے۔ ایران میں عرصہ تک رہے ہیں۔ تجارت ذریعہ معاش تھا مشہور ہجوگو شاعر مرزا سودا سے بڑے زور کے معرکے ہوتے تھے۔ سودا نے ان کی بھی زبردست طریقہ سے ہجو کہی ہے۔ ان کی مشہور تصنیف قصہ یوسف زلیخا فارسی کا اردو نظم میں ترجمہ ہے۔ اردو کلام کا نمونہ "پنجاب میں اُردو" میں ملاحظہ فرمائیں۔ (پنجاب میں اردو ص ۲۹۴)

یہ پہلے ہندو تھے۔ ایک صاحب صابر علی شاہ صابر کی تلقین سے مسلمان ہوئے تھے۔ اور فن شعر میں انہی کے شاگرد تھے پچاس سال سے زائد عمر پاکر ۱۷۹۸ء میں وفات پائی۔

منشی غلام قادر فرخ ۱۶ر جولائی ۱۸۶۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ چند روز بعد ان کے والدین امرتسر چلے گئے۔ اور یہ وہیں رہنے لگے۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق، مصنف بننے کا شوق اور ایڈیٹر ہونے کی آرزو تھی۔ قدرت نے ان کی تینوں امیدیں بہت عمدگی کے ساتھ پوری کیں۔ آپ نے اپنی نظموں کی ابتدا ٹمپرنس سوسائٹی کے لیے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھنے سے شروع کی۔ ۱۹۰۳ء میں رسالہ مہر وا کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۱۲ء میں اپنا رسالہ انسان جاری کیا۔ اس کے علاوہ روزنامہ تنظیم۔ ہفتہ وار کشمیر۔ ٹمپرنس گائیڈ۔ ٹمپرنس میگزین۔ اتالیق اور گل خنداں کے بھی ایڈیٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں لاہور چلے آئے اور یہیں ۲۰ر نومبر ۱۹۵۸ء کو انتقال کیا۔

مولوی فریدالدین فرید سکھوں کے عہد میں لاہور کا نہایت مشہور شاعر تھا اور اُردو اور فارسی میں بہت اعلیٰ پایہ کے اشعار کہا کرتا تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی کامل استعداد رکھتا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں زندہ تھا۔ (تاریخ لاہور ص ۳۰۸)

فلک پیما میاں عبدالعزیز فلک پیما لاہور کے ایک بلند پایہ ادیب اور نثر نگاری میں طرزِ خاص کے مالک تھے۔ رسالہ ہمایوں میں ان کے بکثرت مضامین شائع ہوتے تھے اور بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ مضامین فلک پیما کے نام سے چھپ چکا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے ریاست کپورتھلہ کے وزیر اعظم تھے۔ تقسیم کے بعد سابق پنجاب میں فنانشل کمشنر کے عہدے پر ممتاز رہے۔ ۷۲ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے کے باعث ۷ر مئی ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

فیروزالدین احمد فیروز طغرائی ۱۸۸۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر مختلف علوم و فنون اور طب میں زبردست مہارت پیدا کی۔ کئی اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر رہے۔ بہت سی کتابیں تالیف اور تصنیف کیں۔ عرصہ دراز تک مختلف اوقات میں لاہور میں آپ کا قیام رہا۔ جہاں آپ برابر علمی اور تصنیفی کاموں میں مصروف رہے شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کی کتابوں کے اکثر حصے آپ ہی نے مرتب کیے۔ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کیا۔ آپ کے اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ کلیات طغرائی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ مختلف اوقات میں رسالہ مسیحا۔ ایشیا۔ تہذیب الاخلاق۔ حاذق۔ اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر رہے۔ ۸ر فروری ۱۹۳۱ء کو چھ ماہ کی مسلسل بیماری کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

مولوی فیض الحسن سہارن پور کے رہنے والے نہایت فاضل عالم۔ ادیب۔ شاعر اور مصنف تھے۔ کبھی فیض اور کبھی خیال تخلص کرتے تھے۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے باکمال ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ فن شعر میں مولانا صہبائی کے شاگرد رہے تھے۔ عرصہ تک اورینٹل کالج لاہور میں نہایت فاضلانہ طور پر طلبا کو درس دیتے رہے۔ بقول مولوی عبداللہ قریشی "ان کے دم قدم سے پنجاب میں اردو کا باغ لہلہا رہا تھا۔ ان کی موجودگی سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بڑی رونق ہوتی تھی اور وہ اپنے لائق شاگردوں کے ساتھ اس کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے۔" انھوں نے عربی اور فارسی میں بکثرت تالیفات کی ہیں۔ اردو میں بھی تین کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی صبح عید۔ فیضیہ۔ اور گلزار فیض (اردو دیوان)۔ سرسید۔ مولانا شبلی۔ مولانا حالی۔ مولانا وحید الدین سلیم۔ مولوی عبداللہ ٹونکی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی وغیرہ جیسے فاضل اور یگانہ روزگار بزرگ ان کے شاگرد رہے تھے۔ اس سے استاد کی جلالت قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے اساتذہ میں ہم کو مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے بے نظیر فضلا کے نام ملتے ہیں۔ مولانا ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۲ فروری ۱۸۸۷ء کو ۷۱ برس کی عمر پا کر لاہور میں انتقال کیا۔ محترم دوست مولوی عبداللہ قریشی نے آپ کے متعلق عرصہ دراز کی ریسرچ کے بعد ایک بے نظیر اور محققانہ مضمون نقوش کے گذشتہ دو نمبروں میں بڑا مفصل شائع کیا ہے۔ مفصل حالات شائقین رسالہ مذکور کے نمبر ۸۷، ۸۸ میں ملاحظہ فرمائیں۔

مفتی محمد صادق یہ صاحب اسلام کے بہت بڑے اور مشہور مبلغ بہت سی کتابوں کے مصنف۔ کئی اخباروں کے ایڈیٹر۔ آٹھ سات زبانوں کے ماہر۔ اور نہایت نیک نفس اور پاکباز انسان تھے۔ صورت سے شرافت ٹپکتی تھی۔ اور بول چال اور گفتگو بڑی پُر وقار ہوتی تھی۔ مخالفین اسلام کے نہایت برجستہ اور فی البدیہہ جواب دینے کی ان میں حیرت انگیز قابلیت تھی۔ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ میں سات سال تک اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور ایک ہزار کے قریب غیر مسلموں کو مسلمان بنایا۔ ۱۳ فروری ۱۸۸۲ء کو بھیرہ (ضلع شاہ پور) میں پیدا ہوئے۔ قرآن۔ حدیث اور تفسیر کا علم مولانا حکیم نور الدین شاہی طبیب مہاراجہ کشمیر سے حاصل کیا۔ انگریزی کی تعلیم سکول میں پائی۔ والد کے بے وقت انتقال کے باعث گھر کے اخراجات کا سارا بار ان پر آ پڑا۔ لہذا تعلیم چھوڑ کر بھیرہ کے سکول میں نوکری کر لی۔ پھر جموں چلے گئے۔ ۱۸۹۰ء میں لاہور آ گئے اور انجمن حمایت اسلام کے ہائی سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۶ء میں اس ملازمت کو چھوڑ کر اکاؤنٹنٹ جنرل لاہور کے دفتر میں آڈیٹر مقرر ہو گئے۔ جہاں عرصہ تک کام کیا اور پھر قادیان چلے گئے اور وہاں مدت تک اخبار البدر کی ایڈیٹری کی۔ ۱۹۱۳ء میں اس کے بند ہونے پر ماہنامہ صادق جاری کیا۔ ۱۹۱۷ء میں تبلیغ اسلام کے لیے انگلستان گئے اور انگلستان۔ فرانس اور امریکہ میں سات سال تک اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ امریکہ سے آپ نے ایک تبلیغی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ پھر واپس چلے آئے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں آ کر عرصہ تک رہے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔ ذکر حبیب۔ بائبل کی پیشگوئیاں آنحضرت کے متعلق۔ تحقیق قبر مسیح۔ تحفہ بنارس۔ صادق بینی وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا محمد صالح ۔ آپ لاہور کے رہنے والے ایک نیک دل۔ پاکباز اور بہت صالح بزرگ تھے۔ عالم اور فاضل ہونے کے

ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کئی کتابوں کے کئی کئی اڈیشن چھپے اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ پردہ اور اسلام۔ نماز حنفی دو جلد۔ آداب الرسول وغیرہ۔ وفات سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب جاننے پر بسوط اور ضخیم کتاب لکھی۔ اس کی کتابت کروا چکے تھے لیکن ابھی چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ پیغام اجل آ گیا اور قریباً ۶۵ سال کی عمر پا کر ۱۹۵۶ء میں عالم بقا کو سدھارے۔

محمد وارث کامل نجیب آباد کے رہنے والے ایک مسلم لیگی۔ خاموش طبیعت۔ سنجیدہ مزاج اور فاضل بزرگ تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے سہ روزہ مدینہ بجنور کو ایڈٹ کرتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں اخبار چٹان اور روزنامہ زمیندار کے دفتروں میں کام کیا۔ آخر عمر میں ایک رسالہ "فروغ اسلام" کے نام سے جاری کیا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ عبدالحمید زہراوی کی کتاب خدیجہ کا آپ نے ترجمہ کیا۔ محمد حسین ہیکل کی کتاب حیات محمدؐ کا بھی آپ نے نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا تھا جو ہنوز زیر اشاعت ہے۔ اساس اسلام کے نام سے بھی ایک کتاب ایف۔ اے کے اسلامیات کے طلبا کے لیے لکھی۔ اور بعض دیگر تالیفات بھی کیں۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کو صبح کے وقت لاہور میں انتقال کیا۔

مولوی کریم الدین آپ پانی پت کے رہنے والے انیسویں صدی عیسوی کے مشہور و معروف اہل قلم۔ ادیب مصنف مورخ۔ سوانح نویس اور صحافی تھے۔ ۱۲ر جون ۱۸۲۱ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر تحصیل علم کے لیے دہلی آئے اور یہاں صرف و نحو۔ منطق۔ فلسفہ۔ طب۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور یہاں ہندسہ۔ ہیئت۔ جبر و مقابلہ اور تاریخ ادب کی تعلیم پائی۔ آپ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے دہلی میں ایک مطبع جاری کیا جس میں آپ نے بہت اعلیٰ پایہ کی تاریخی کتابیں شائع کیں کریم الاخبار اور گل رعنا دو ماہنامے بھی نکالے۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر تباہی اور بربادی اور غارت گری کا طوفان آیا تو یہ وہاں سے نکل کر آگرہ پہنچے اور وہاں آگرہ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں پنجاب چلے آئے اور حلقہ لاہور کے ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر عرصہ دراز تک کام کیا۔ لاہور آ کر بہت سی کتابیں تالیف اور ترجمہ کیں جو لاہور کے سرکاری مطبع نے شائع کیں۔ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ترجمہ تاریخ ابوالفدا۔ طبقات شعرائے ہند۔ تاریخ شعرائے عرب۔ واقعات ہند۔ مفتاح الارض وغیرہ۔ کریم اللغات اُن کی سب سے مشہور کتاب ہے جس کے اب تک بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

منشی مولا بخش کشتہ جولائی ۱۸۷۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اُردو میں شعر کہتے تھے۔ بعد میں پنجابی شاعری میں نام پیدا کیا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے امرتسر سے ضیاء الاسلام کے نام سے ایک مذہبی اور اسلامی ہفتہ وار جاری کیا۔ ۱۹۱۶ء میں ایک اور اخبار "اتحاد" شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں لاہور آ گئے اور یہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ امرتسر کے قیام کے دوران میں آپ نے ایک ادبی اور تنقیدی ماہنامہ "مسیحا" کے نام سے بھی جاری کیا جو ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔

خواجہ کمال الدین ۔ ووکنگ مشن لندن کے بانی اور امام اور نہایت پُرجوش مبلغ اسلام تھے۔ ساری عمر آپ نے اشاعت اسلام

کے کام میں وقف کر دی اور یورپ میں ہزارہا لیکچر اسلام کی حقانیت اور سچائی پر دیئے۔ بہت سی کتابیں اسلام کی تائید اور عیسائیت کی تردید میں لکھیں۔ ایک ماہوار رسالہ اشاعت اسلام کے بھی ایڈیٹر تھے جو لاہور سے مدتوں نکلتا رہا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ۱۸۷۰ء آپ کا سال پیدائش ہے۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: براہین نیرہ۔ اُم الالسنہ۔ اسوۂ حسنہ۔ اسلام اور دیگر مذاہب۔ لمعات انوار محمدیہ۔ ورثات عالم کا مذہب۔ مسیح کی الوہیت پر ایک نظر۔ اسلام اور علوم جدیدہ۔ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ بائبلیات یا انجیل عمل۔ ضرورت الہام۔ توحید فی الاسلام۔ روحیانیات فی الاسلام۔ مطالعہ اسلام۔ ہستی باری تعالیٰ۔ مذہب محبت۔ سیر افکار۔ لمعات انوار محمدیہ۔ سلک مروارید۔ مقصد مذہب۔ پیام اسلام۔ سیرۃ نبوی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان اُردو کتابوں کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی بہت سی کتابیں اسلام کی تائید اور عیسویت کی تردید میں لکھی ہیں آپ نے اشاعت کے لیے ایک انگریزی ماہنامہ اپنے لندنی مرکز مسجد ووکنگ سے ۱۹۱۳ء میں جاری کیا تھا جس کا نام اسلامک ریویو تھا جو آج بھی بہت شان کے ساتھ جاری ہے۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اُردو کے بڑے بزرگ ادیب۔ نہایت قادر الکلام شاعر نہایت کامیاب مصنف اور بڑے جید انشاپرداز تھے۔ اگرچہ ہندو تھے مگر ساری عمر نہایت خلوص کے ساتھ اُردو کی خدمت میں گذار دی۔ فنِ شعر میں حضرت شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کے شاگرد تھے۔ اور بے انتہا عقیدت اور محبت کے ساتھ اپنے محترم اُستاد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُردو کے تو مسلم الثبوت انشاپرداز تھے ہی مگر اس کے علاوہ ہندی۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی کے بھی فاضل تھے۔ عرصہ دراز تک لاہور میں مقیم رہے۔ جہاں اُن کالرڈ کا انگریزی اخبار ٹربیون کا ایڈیٹر تھا۔ یہاں آپ کا قیام ماڈل ٹاؤن میں رہا۔ اور زمانہ قیام لاہور میں آپ برابر ادب اور فن کی خدمت کرتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو میں مولوی عبدالحق کے بعد آپ ہی کا درجہ تھا۔ پرانے بزرگوں کے اخلاق کا آپ ایک بہت ہی اچھا نمونہ تھے۔ گفتگو۔ تقریر اور تحریر نہایت شستہ اور شائستہ ہوتی تھی اور ہر شخص سے بہ حد اخلاق اور مروت سے پیش آتے تھے۔ تعصب کا آپ میں نام و نشان بھی نہ تھا اور نہایت صلح کل بزرگ تھے۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو سفر کرتے ہوئے قصبہ غازی آباد میں انتقال فرمایا۔ مسدس بھارت۔ دربن۔ تزک قیصری۔ منشورات۔ کیفیہ۔ مراۃ خیال۔ چراغ ہدایت۔ نہتا راجہ۔ راج دلاری۔ مراری داوا۔ آپ کی مشہور تصنیفات ہیں "واردات" کے نام سے مجموعہ کلام بھی چھپ گیا ہے۔

گرامی ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی ۱۸۵۶ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر تحصیل علم کے لیے لاہور آئے۔ اور اورینٹل کالج میں داخل ہو کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر یہیں رہ کر وکالت کا امتحان دیا۔ غرض کافی عرصہ آپ لاہور میں مقیم رہے جب وکالت نہ چلی تو امرتسر میں مدرس فارسی ہوگئے۔ پھر کپورتھلہ چلے گئے۔ اور پھر لدھیانہ میں مدرسی کی۔ کچھ دنوں پولیس کی نوکری بھی کی اور اس سلسلہ میں پٹیالہ۔ رام پور۔ مالیر کوٹلہ وغیرہ میں پھرتے رہے۔ اس کے بعد دکن چلے گئے۔ جہاں اُن کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا۔ نظام حیدرآباد نے اپنا اُستاد بنا کر بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا۔ اور ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ ۳۵ سال دکن میں بڑے اعزاز اور اکرام سے گزارے۔ ۱۹۱۶ء میں بیمار ہو کر واپس پنجاب آئے۔ ذیابیطس کا

مرض تھا اور اسی مرض میں ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو انتقال کیا۔ فارسی کے نادرالکلام شاعر تھے مگر اُردو میں بھی کہتے تھے۔ اُن کے کچھ اُردو اشعار تذکرہ شعرائے پنجاب کے صفحہ ۳۲ پر درج ہیں۔ اُن کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے۔ اقبال اُن کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔

لاجپت رائے ایک متعصب کانگرسی اور لاہور کے مشہور رئیس اور سیاسی کارکن تھے۔ لاہور سے روزنامہ بندے ماترم انہی کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا۔ آپ اُردو کی دو مشہور کتابوں کے مؤلف ہیں ایک راجہ اشوک کی مفصل سوانح عمری اور دوسری تاریخ ہند قدیم۔ مؤخرالذکر کتاب اگرچہ متعصبانہ ذہنیت کے ساتھ لکھی گئی ہے مگر ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے کا لاہور میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر لائٹنر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی پرنسپل گورنمنٹ کالج و اورینٹل کالج اور رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی ایک نہایت باذوق۔ ذی علم اور فاضل انسان تھے۔ ۱۸۴۰ء میں ہنگری (یورپ) میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں قسطنطنیہ چلے آئے جہاں عربی اور ترکی سیکھی۔ ۱۸۵۶ء میں برطانیہ کی فوج میں مترجم کے طور پر ملازم ہو گئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر پادری بنے۔ پھر اسے چھوڑ کر کالج میں اسلامی قانون پر لکچر دینے لگے۔ نومبر ۱۸۶۴ء میں ہندوستان آکر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ جہاں یہ طلباً کو عربی اور فارسی پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مختلف علوم اور مختلف فنون اور ۵ کے قریب مشرقی اور مغربی زبانوں کے فاضل تھے اور عرصہ دراز تک اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی اُنھوں نے کی تھی۔ جہاں اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام ملا عبدالرشید سیاح رکھا تھا۔ اور اپنے اسلام کی تصدیق میں بخارا اور سمرقند کے علماء سے تصدیق نامے بھی حاصل کر لیے تھے۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں اُنھوں نے ایک نہایت جامع اور مکمل "تاریخ اسلام" بھی اُردو میں دو جلدوں میں لکھی تھی۔ جس کی جلد اوّل ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی اور جلد دوم ۱۸۷۶ء میں۔ آغا محمد اشرف نے اپنے ایک کتابچے میں قطعاً غلط لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب لاہور میں مولانا آزاد سے لکھوائی تھی۔ اس کتاب کا اسلوبِ بیان ہرگز آزاد کا نہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے سرورق پر صاف اور نمایاں حروف میں چھپا ہوا ہے کہ "بمدد مولوی کریم الدین ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر" اگر مولانا آزاد نے یہ کتاب خود لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دی تھی تو انھوں نے مولوی کریم الدین کا نام کتاب پر کیوں لکھا اور جب مولوی کریم الدین کا نام کتاب پر شائع ہوا تھا تو مولانا آزاد نے اس کی تردید کیوں نہ کی۔ ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۸۶ء میں لاہور سے چلے گئے۔ ووکنگ (لندن) کی مسجد انھوں ہی نے بنوائی تھی۔ ۲۲ اپریل ۱۸۹۹ء کو ان کا جرمنی میں انتقال ہو گیا۔

حاجی لق لق یہ مشہور مزاح نگار اور صحافی آج سے ۷۴ برس پہلے پٹی تحصیل قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عطا محمد تھا۔ ۱۹۱۹ء میں فوج میں بھرتی ہوئے اور دس گیارہ سال تک مشرقِ وسطیٰ میں متعین رہے۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور آگئے اور روزنامہ زمیندار میں ملازم ہو گئے۔ جہاں بیس سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد احسان۔ شہباز۔ مساوات اور زمیندار وغیرہ روزناموں کی ادارت میں شامل رہے۔ علاوہ ازیں کئی دیگر ماہناموں اور ہفت روزہ جرائد کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنا بھی ایک اخبار تغلق کے نام سے نکالا لیکن چلا نہیں سکے۔ اُردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی سنجیدہ نظمیں ابوالعلا چشتی کے اور مزاحیہ نظمیں حاجی لق لق کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ "در دانتی" ان کے فسانوں کا مجموعہ ہے اور "ماڈرن غزلیں" مزاحیہ کلام کا۔ علاوہ ازیں

اردو اللغات - عالمی معلومات - جاح اور پاکستان - رفتارِ پاکستان اور دو رہبرِ دہلی اُن کی تصانیف ہیں۔ مشہور اخبار نویس - اعلیٰ مصنف بہترین مزاح نگار اور بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود آخر عمر نہایت بیکسی میں گزری - لاچاری اور افلاس میں کٹی - اس غربت اور تنگ دستی نے بسترِ مرگ تک ساتھ نہ چھوڑا - یہاں تک کہ ۲۶ اور ۲۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کی درمیانی شب کو میو ہسپتال میں جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی -

مجید لاہوری اردو کے مشہور شاعر اور مزاح نگار اور گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر لاہور میں حصولِ معاش کے لیے چلے گئے اور عرصہ دراز تک یہاں رہنے کی وجہ سے مجید لاہوری کے نام سے مشہور ہو گئے۔ پھر کراچی چلے گئے اور وہیں ۴۴ سال کی عمر میں ۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔ اپنے اخبار نمکدان میں آپ نے اپنی ظرافت اور مزاح کے بہت دلچسپ نمونے چھوڑے ہیں - موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی۔

پنڈت لیکھرام آریہ مسافر یہ شخص آریہ سماج کا لیڈر - بہت سی کتابوں کا مصنف اور اپنے زمانہ میں بڑا مشہور آدمی تھا۔ مگر ساتھ ہی نہایت درجہ متعصب - دشمنِ اسلام اور دریدہ دہن تھا۔ اپنی ہر کتاب میں خدا تعالیٰ۔ قرآنِ کریم - آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم - اور اسلام کے متعلق ہرزہ سرائی کرتا رہتا تھا۔ جب خدا و رسولؐ کے متعلق اس کی بد کلامیاں اور بد زبانیاں حد سے بڑھ گئیں تو بالآخر حضرت مرزا غلام احمد قادیانی نے ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء کو اُس کی ہلاکت کی پیشگوئی کی جس کے نتیجہ میں یہ ۶ مارچ ۱۸۹۷ء کو لاہور میں اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے دن کے وقت ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ قاتل گرفتار نہ ہو سکا اور بھاگ گیا - آریہ سماجیوں نے بڑے زور سے دعویٰ کیا کہ "اس کا قاتل مرزا ہے"۔ چنانچہ اُن کے مکان کی فوراً تلاشی لی گئی لیکن کوئی چیز برآمد نہ ہوئی - پھر آریہ سماج نے فوراً اشتہار دیا کہ قاتل کے گرفتار کرنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا مگر قاتل کا پتہ آج تک نہ لگا۔

مولانا محمد دین فوق نے لکھا ہے کہ "اپنے لیڈر کے قتل سے مشتعل ہو کر لاہور کے ہندو حلوائیوں نے بطور انتقام مسلمانوں کے بچوں کو مٹھائیوں میں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ جس پر لاہور کے مسلمانوں نے ہوشیار ہو کر ہندوؤں سے مٹھائی خریدنی قطعاً بند کر دی اور یہی قتل اس امر کا باعث ہوا کہ شہر لاہور میں مسلمان حلوائیوں کی دکانیں بکثرت ہر محلہ میں کھل گئیں اور وہ دودھ - دہی اور مٹھائیاں ہندوؤں سے خریدنے سے رک گئے"۔ پنڈت لیکھرام کی بعض تصانیف یہ ہیں: تکذیب براہین احمدیہ - خبط احمدیہ - کرسچن مت درپن - صداقت اصول و تعلیم آریہ سماج - جہاد احمدی - حجتِ اسلام - تاریخ دنیا - صداقت رگ وید - آئینۂ انجیل - عطر روحانی - تعلیم نسواں - مورتی پرکاش - آریہ ہندو اور نمستے کی تحقیقات - اُس کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں کا مجموعہ "کلیات آریہ مسافر" کے نام سے چھپا تھا۔

مولوی محبوب عالم جس طرح مولوی عبدالحق "بابائے اردو" کہلاتے ہیں - اسی طرح مولوی محبوب عالم "بابائے صحافت" کے لقب کے مستحق ہیں۔ کیونکہ بہت سے نامور ادیبوں اور مشہور اخبار نویسوں نے جنھوں نے بعد میں اُردو صحافت میں بڑا نام پیدا کیا۔ انھوں نے ابتدا میں مولوی محبوب عالم ہی کی زیرِ تربیت اور انہی کے اخبار کے دفتر میں رہ کر صحافت

کے فن کو سیکھا۔ اُردو صحافت میں اس لحاظ سے پیسہ اخبار کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہ مشہور پرچہ جسے اپنے زمانہ میں بڑی زبردست شہرت حاصل ہوئی مولوی صاحب نے اپنے وطن فیروز والہ سے ۱۸۸۸ء میں نکالا تھا۔ پھر وہ اسے گوجرانوالہ لے آئے اور اس کے بعد ۱۸۹۸ء میں لاہور آ گئے۔ لاہور ایسے آئے کہ پھر اسی شہر کو اپنا مستقر اور مرکز بنا لیا اور یہاں اُنھوں نے بڑی زبردست ترقی کی۔ اُن کے ہفت روزہ پیسہ اخبار نے جلد اتنی زبردست شہرت حاصل کی کہ مولانا اسے روزانہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور مولوی صاحب نے لاہور میں ایک بڑی عظیم الشان عمارت اسی پیسہ اخبار کی آمدنی سے تعمیر کرائی جو آج بھی موجود ہے۔ گورنمنٹ نے پیسہ اخبار کے نام سے ڈاک خانہ بھی جاری کر دیا اور کارپوریشن نے جس محلہ میں اس کا دفتر تھا اُس کا نام بھی پیسہ اخبار سٹریٹ رکھ دیا جو آج بھی لاہور کا ایک نہایت بارونق علاقہ ہے۔ پیسہ اخبار کے علاوہ مولوی صاحب نے اور بھی کئی رسالے اور اخبار جاری کئے اور سینکڑوں کتابیں اپنے مطبع میں مختلف علوم و فنون کی لوگوں سے لکھوا کر اور خود لکھ کر شائع کیں۔ ۲۷ مئی ۱۹۳۳ء کو ان کی وفات ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے تاریخ کہی جو اُن کی قبر پر کندہ ہے۔

خان بہادر مولوی محرم علی چشتی ۱۱ اگست ۱۸۶۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے کانگرس کے زبردست حامی اور سر سید احمد خاں مرحوم کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں لاہور سے اخبار رفیقِ ہند جاری کیا جو عرصہ تک جاری رہا۔ ۱۹۰۱ء میں وکالت شروع کی۔ لاہور کے نہایت کامیاب وکیل اور مشہور اخبار نویس تھے۔ اپنے اخبار میں اپنے مخالفین پر بڑے سخت اور شدید حملے کرتے رہتے تھے جس میں مقدمہ بازی تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ ۸ دسمبر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے "اسلامی زندگی کا دنیوی پہلو"

ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ایک نہایت ہی قابل اور لائق شخص تھے۔ اصلی لد آبائی وطن دہلی تھا۔ لاہور کے میڈیکل کالج میں عرصہ تک پڑھ کر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہوئے۔ پھر کافی دنوں تک میو ہسپتال لاہور میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۹ء تک پنجاب کے مختلف شہروں میں اسسٹنٹ سرجن رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سول سرجن ہو کر مختلف اضلاع میں کام کیا۔ ۱۹۳۶ء میں گوجرانوالہ سے ریٹائر ہوئے اور ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو وفات پائی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی تاریخ کو ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے وقت میں تمام پنجاب میں بہترین سرجن مانے جاتے تھے۔ آنکھوں کے آپریشن میں تمام ملک میں اُن کا نظیر نہ تھا۔ نہایت خوش مزاج۔ خوش طبع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اخلاق۔ ہمدردی اور رحم و مروّت کا مادہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے فن کے ماہر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے صوفی۔ بہت پاکباز اور پرہیزگار اور متقی شخص تھے۔ بہت اچھے لیکچرار۔ نہایت بلند پایہ ادیب۔ بڑے شیریں مقال شاعر اور بہترین فسانہ نگار قرآنی معارف اور نکات بیان کرنے میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ جو شخص ایک مرتبہ ان سے مل لیتا تھا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ مجھے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ان سے تعلق رہا۔ میں نے مختلف قابلیتوں اور مختلف لیاقتوں کا ایسا بے نظیر شخص اور کوئی نہیں دیکھا۔ بخار دل اُن کی پاکیزہ نظموں کا اور آپ بیتی اُن کے فسانوں کا مجموعہ ہے۔ اخلاق کے متعلق "کرنہ کر" اُن کی لاجواب کتاب ہے "مقطعات قرآنی" بڑی محققانہ کتاب انھوں نے لکھی ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ آپ اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور بہت صاحب ذوق اور ذی علم انسان تھے تصنیفی قابلیت

نہایت اعلیٰ تھی۔ انگریزی سے نہایت عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتے تھے۔ چنانچہ انجمن ترقی اُردو کے لیے انھوں نے ایک بہت ہی بلند پایہ اور محققانہ ضخیم کتاب انگریزی سے اُردو میں بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ ترجمہ کی تھی اُس کا نام تھا "ایران بعہد ساسانیان"۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

شیخ محمد الدین سلیم بہت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مذاقِ سلیم کے مالک تھے۔ ناظر تخلص کرتے تھے۔ اگرچہ کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ شعر کیا کرتے تھے۔ آپ کشمیر کے وانچو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد حیات آپ کے دادا کا نام تھا۔ جو ہندو سے مسلمان ہوگئے۔ اور ۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۴۵ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے لڑکے عبدالرحمٰن کو جب مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت تکلیف دی گئی تو آپ مجبوراً کشمیر سے نکل کر ۱۸۴۹ء میں لاہور چلے آئے۔ اور یہاں آکر تجارت میں بڑا عروج حاصل کیا۔ محمد الدین انہی کے لڑکے ہیں جو ۱۸۵۸ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ بڑے ہوکر نہایت اعلیٰ قابلیت کے مالک ہوئے اور چھوٹی عمر میں منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔ ڈاکٹر لائٹنر ڈائرکٹر تعلیمات نے آپ کی طبیعت کا رجحان دیکھ کر لاہور کے وٹرنری کالج میں داخل کرادیا جہاں ہر امتحان میں اوّل آئے۔ کالج سے فراغت کے بعد آپ نے لاہور سے ایک ماہوار ۱۸۸۸ء رسالہ "طب حیوانات" کے نام سے جاری کیا۔ جو تمام پنجاب میں نہایت قبولیت کے ساتھ پڑھا جانے لگا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد آپ مہاراجہ شمشیر پرکاش والیٔ ریاست ناہن کے ہاں ملازم ہوکر چلے گئے۔ مگر تین سال کے بعد مستعفی ہوکر واپس لاہور آگئے۔ اور اپنا ذاتی مطب شروع کردیا جو نہایت کامیابی سے چلا۔ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی نہایت ذوق تھا۔ آپ کے اشعار تاریخ اقوامِ کشمیر کے صفحہ ۵۵۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔
آخر ۱۴ ار ۱۹۲۳ء کو رحلت فرمائی۔

سید محمد امین اندرابی قادری وکیل لاہور کے قدیمی باشندے اور اُردو، فارسی اور عربی کے فاضل تھے تصوف سے بڑا لگاؤ اور صوفیا سے بڑا عشق تھا۔ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔
تصنیفات یہ ہیں: انیس المشتاقین۔ القول المقبول۔ جذب الاصفیا فی حقوق المصطفیٰ۔

مولوی محمد انشاء اللہ خاں لاہور کے بہت مشہور ادیب۔ مورخ۔ مصنف اور اخبار نویس تھے۔ ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ ۱۸۹۵ء میں اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر ہوئے اور یہاں آپ نے سولہ سترہ کتابیں تالیف کیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے لاہور سے اپنا اخبار وطن جاری کیا۔ (محترمی مولانا محمد الدین صاحب فوق نے اپنی کتاب اخبار نویسوں کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ اخبار ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا) یہ اُن کا سہو ہے واقعہ یہی ہے کہ یہ اخبار ۴ جنوری ۱۹۰۱ء کو جاری ہوا اور اُردو زبان میں بیسویں صدی کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ اس اخبار نے بہت جلد نہایت زبردست شہرت حاصل کی۔ اور روزانہ شائع ہونے لگا۔ اُس کی روز افزوں کثیر اشاعت کے پیشِ نظر گورنمنٹ نے وطن پوسٹ آفس بھی جاری کردیا۔ جو آج تک قائم ہے مگر اخبار ۱۹۳۰ء میں بند ہوگیا! اس سے دو سال پہلے مولانا کا بھی ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوگیا۔ جو کتابیں آپ نے لکھیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ بست سالہ عہد حکومت سلطان عبدالحمید خاں۔ تاریخ خاندان عثمانیہ۔ محاربات پلیونا۔ محاربات تھسلی۔ ٹرکی کی موجودہ حالت۔ مظالم آرمینیا

واقعات روم ۔ تاریخ حجاز ریلوے ۔ ترجمہ مقدمہ تاریخ ابن خلدون ۔ میں نے مولانا کے متعلق ایک مفصل مضمون یکم جنوری ۱۹۰۶ء کے لیل و نہار لاہور میں لکھا تھا ۔ زیادہ تفصیل کے شائقین اُسے ملاحظہ فرمائیں ۔

ملاّ محمد بخش یہ شخص عجیب غیر معمولی قابلیت کا انسان تھا ۔ حالانکہ بالکل اَن پڑھ اور جاہل محض تھا ۔ مگر اس کے باوجود دو ہفتہ وار اخباروں جعفر زٹلی اور پنچ کا ایڈیٹر اور پبلشر اور مالک تھا ۔ ایک مطبع بھی تاج الہند پریس کے نام سے جاری کیا جس میں یہ دونوں اخبار چھپتے تھے ۔ جعفر زٹلی ایک مزاحیہ اخبار تھا جو سر سید اور احمدیوں کا مذاق اُڑانے اور اُن پر پھبتیاں کسنے کے لیے وقف تھا ۔ اور آخر وقت تک اسی نہج پر قائم رہا ۔ ملا محمد بخش بمقام لاہور ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۳ء میں یہیں اس کا انتقال ہوا ۔ (تاریخ اقوام کشمیر صفحہ ۴۸۶)

مفتی محمد حسن لاہور کے بہت بڑے فاضل ۔ عالم اور دیندار بزرگ تھے ۔ مدت تک امرتسر میں صدر مدرس رہے ۔ امرتسر ہی میں بڑے بڑے فضلا سے آپ نے تعلیم پائی ۔ تقسیم ملک کے وقت لاہور چلے آئے اور یہاں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی ۔ جو ایک مثالی درسگاہ ہے ۔ یکم جون ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا ۔

چودھری محمد حسین ایم ۔ اے آپ علامہ اقبال کے نہایت گہرے دوستوں اور بڑے عقیدتمندوں میں سے تھے ۔ اور بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے ۔ پریس برانچ مغربی پاکستان لاہور کے سپرنٹنڈنٹ تھے اس لیے بڑی گہری تنقیدی نظروں سے صوبہ میں شائع ہونے والے تمام اخبارات و رسائل اور مختلف موضوعات پر چھپنے والی کتب کا غور سے مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ جس کی وجہ سے اُن کی عام معلومات اور واقفیت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا ۔ ۸ مارچ ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ جولائی ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا ۔ حضرت نعمت اللہ ولی کی پیشگوئی کے متعلق ایک مناظرانہ رنگ کی کتاب کے بھی آپ مؤلف ہیں ۔

سیّد محمد سبطین قصبہ سرسی ضلع مراد آباد (یو ۔ پی) میں پیدا ہوئے منصبیہ کالج میرٹھ میں تعلیم پانے کے بعد لاہور چلے آئے اور ۱۹۰۹ء میں اورینٹل کالج سے عربی کی آخری سند حاصل کی ۔ اور اس کے بعد مدت تک لاہور میں قیام کیا ۔ یہیں آپ کی ملاقات "سرکار علامہ شیخ عبدالعلی ہروی الطہرانی" سے ہوئی ۔ اور آخر وقت تک اُن سے تعلقات قائم رہے ۔

ازاں بعد آپ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو کر چلے گئے اور وہاں رسالہ البرہان کی ادارت بھی کرتے رہے ۔ یہ رسالہ خالص شیعہ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف تھا ۔ اور سیّد صاحب کی وفات تک برابر شائع ہوتا رہا ۔ آپ کے انتقال کی تاریخ ۲ اگست ۱۹۴۷ء ہے ۔ کربلائے معلیٰ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے ۔

حافظ محمد عالم عالمگیر ایک بہت اعلیٰ درجہ کا ادبی اور علمی ماہنامہ تھا ۔ جو سید مٹھا بازار سے نکلا کرتا تھا ۔ حافظ صاحب اُس کے مالک اور ایڈیٹر تھے ۔ اور مدتوں بہت شان اور بہت عمدگی کے ساتھ وہ اُسے شائع کرتے رہے ۔ اس رسالہ کے خاص نمبر بھی بہت اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوا کرتے تھے ۔ حق یہ ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ حافظ صاحب نے اُردو کی خاص خدمات انجام دی ہیں ۔ خاکسار راقم نے بھی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں کچھ عرصہ حافظ صاحب کے ماتحت اس رسالہ کی

ادارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ حافظ صاحب نے ایک برقی پریس بھی عالمگیر سٹیم پریس کے نام سے جاری کیا تھا۔ اور عالمگیر بکڈپو کے نام سے ایک دارالاشاعت کا بھی اجرا کیا تھا جس کے ذریعہ بہت اعلیٰ درجہ کی علمی اور ادبی کتابیں انھوں نے بکثرت شائع کیں۔

رسالہ کے علاوہ ایک ہفتہ وار اخبار بھی انھوں نے خیام کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۱ء کو حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ افسوس اُن کا کوئی جانشین ایسا نہ ہوا جو اُن کے قائم کئے ہوئے اداروں کو چلاتا۔

مولوی محمد علی ایم۔ اے آپ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے فاضل۔ قرآن کریم کے انگریزی مترجم اور احادیث نبویؐ کے بے نظیر شارح تھے۔ اپنی ساری عمر علم کی تحصیل۔ دینی کتابوں کی تصنیف اور مذہبی امور کی تبلیغ میں گذار دی۔ اور آخر وقت تک اسی شغل میں مصروف رہے۔ دسمبر ۱۸۷۴ء میں کپورتھلہ کے ایک گاؤں مرار میں پیدا ہوئے۔ اور ایم اے تک اپنی تمام تعلیم لاہور میں رہ کر پوری کی۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر لگ گئے۔ ازاں بعد اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر وکالت کرنے کا ارادہ کیا۔ (کیونکہ ایم اے کے بعد آپ نے وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا) لیکن جب مشورہ کرنے کے لیے قادیان گئے (آپ ۱۸۹۷ء میں حضرت مرزا صاحب کی بیعت کر چکے تھے) تو حضرت مرزا صاحب نے سب دھندا چھوڑ کر اُن کو اسلام کی خدمت کرنے کی ترغیب دی چنانچہ اپنے امام کے حکم کی تعمیل میں آپ اپنی دنیوی ترقی اور عروج کے تمام ارمانوں کو خیرباد کہہ کر قادیان چلے گئے اور وہاں ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ پھر قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر کرنے کے لیے انجمن کی طرف سے مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں یہ اُس ترجمہ اور تفسیر کو لے کر لاہور چلے آئے اور یہاں پہنچ کر اسے مکمل کیا اس کے بعد آخر وقت تک لاہور ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ طویل علالت کے بعد ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی بکثرت تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں۔ تفسیر بیان القرآن ۳ جلد۔ ترجمہ صحیح بخاری دو جلد۔ سیرت خیر البشرؐ۔ جمع قرآن۔ مقام حدیث۔ تاریخ خلافت راشدہ

احادیث العمل۔ وغیرہ۔

حافظ محمود شیرانی اُردو زبان کے نامور محقق اور مانے ہوئے انشا پرداز تھے۔ ٹونک میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آ کر سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہوئے پھر اُسے چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں چلے گئے اور ۱۸۹۹ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ بعد اسی کالج میں پروفیسر ہو گئے اس سے پہلے کچھ دنوں اسلامیہ کالج میں بھی رہے۔ آپ کی ادبی شہرت کا باعث آپ کی کتاب "پنجاب میں اُردو" ہوئی۔ آپ کی دوسری کتاب "تنقید شعر العجم" بھی اہل علم کے طبقہ میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ آپ کے محققانہ مضامین کا مجموعہ مقالات شیرانی کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔ اختر شیرانی آپ ہی کے فرزند تھے۔

مراد شاہ لاہوری حضرت پیر مراد شاہ لاہور کے ایک صوفی بزرگ تھے۔ جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ہی نے سب سے پہلے لفظ "اُردو" کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔ آپ اُردو کے اولین شعراء میں سے ہیں۔ اُردو کے متعلق آپ کا مشہور شعر ہے ؎

وہ اُردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

اُردو کی تعریف میں آپ کا یہ شعر خاص طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے۔

پسند طبع وزرا و شہاں ہے
غرض جو کچھ ہے اب اُردو زباں ہے

آپ کی منظوم اُردو کتاب نامہ مراد کو نامی صاحب نے چھاپ کر مفت تقسیم کیا۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہوئی اور صرف ۳۰ برس کی عمر میں ۳۰ مئی ۱۹۰۰ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ نامہ مراد کے علاوہ آپ کا دیوان بھی چھپ چکا ہے جو ۲۰۵ غزلوں اور ۲۴ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ مثنوی مراد الجنین یعنی قصہ چہار درویش بھی آپ کی تصنیف ہے جو آپ نے میر امن کی باغ بہار سے پہلے نظم کیا تھا۔ ان اُردو کتب کے علاوہ ایک فارسی مثنوی مراد العاشقین بھی آپ نے لکھی تھی جو نامی صاحب نے شائع کی ہے۔

شمس العلما مولوی سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء کو دیوبند (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد قاسم نانوتوی اور مولوی محمد یعقوب سے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم پائی۔ انگریزی کی تعلیم کچھ پرائیویٹ۔ کچھ سکولوں میں پائی۔ ۱۸۷۶ء میں لاہور چلے آئے۔ اور ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ ۱۸۸۴ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے اور ۱۸۹۱ء تک رہے پھر آپ نے لاہور میں رفاہ عام پریس قائم کیا۔ جہاں سے نہایت بلند پایہ کتابیں بہترین طباعت اور کتابت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ یکم جولائی ۱۸۹۸ء سے آپ نے عورتوں کے لیے ایک اعلیٰ پایہ کا ہفتہ وار اخبار تہذیب النسواں جاری کیا۔ جو ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ ۱۹۰۹ء میں بچوں کے لیے اخبار پھول کا اجرا کیا جو تقسیم ملک کے بعد تک نکلتا رہا۔ گورنمنٹ نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں شمس العلما کا خطاب دیا۔ سرسید سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ اخلاق و مروت کے لحاظ سے ایک بہترین انسان اور نہایت منکسر المزاج اور با اصول بزرگ تھے۔ ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کے لائق فرزند سید امتیاز علی تاج آج کل انجمن ترقی ادب کے ڈائرکٹر ہیں۔

سعادت حسن منٹو اُردو کا یہ مشہور و معروف افسانہ نگار ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمرالہ ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوا امرتسر میں پرورش پائی۔ تعلیم میٹرک تک تھی۔ پہلے پہل روزنامہ مساوات امرتسر میں لکھنا شروع کیا پھر لاہور آکر ہفت روزہ پارس میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں کے ہفتہ وار اخبار مصور کو ایڈٹ کرتے رہے۔ بمبئی سے دلی ریڈیو اسٹیشن میں چلے آئے۔ پھر بمبئی واپس چلے گئے۔ اور فلم کے لیے کہانیاں لکھیں تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے آئے اور یہیں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ شراب نوشی اور عریاں نویسی آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ انتقال کے بعد آپ کی یاد میں نقوش کا ایک منٹو نمبر بھی خاص شان سے شائع ہوا تھا جس میں منٹو کے مداحوں نے دل کھول کر منٹو کو خراج تحسین عطا کیا تھا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ منٹو کے افسانے۔ منٹو کے ڈرامے۔ تین عورتیں۔ جنازے

کو روٹ ۔ بیعد سرد کی خدائی ۔ خالی بوتلیں خالی ڈبے ۔ آپ کی کتاب "ٹھنڈا گوشت" کو خاص شہرت حاصل ہوئی جس پر فحش نویسی کے سلسلہ میں آپ پر مقدمہ بھی چلا۔

منشی سورج نرائن مہر آپ دہلی کے کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ جب وہ ۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو اسی وقت سے اُن کو شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُن کے اشعار نہایت صاف ستھرے اور بہت اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہو گئے اور عرصہ تک راولپنڈی اور دہلی کے انسپکٹر مدارس رہے ۔ کرنیل ہالرائڈ کے زمانہ میں آپ لاہور میں ریورٹران کمس کے عہدے پر عرصہ تک کام کرتے رہے ۔ بچوں کے لیے آپ نے نہایت دلچسپ اور دلآویز نظمیں لکھی ہیں اور آپ کے کلام کا مجموعہ کلام مہر کے نام سے دو جلدوں میں چھپا تھا ۔ آپ کو انگریزی ۔ فارسی ۔ اُردو ۔ سنسکرت اور ہندی پر پورا عبور حاصل تھا ۔ آپ کا طرز بیان صاف ستھرا اور کلام خلوص کا آئینہ ہے ۔ ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء کو پیدا ہوئے اور ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔

میرا جی اصلی نام ثناء اللہ تھا ۔ سابق پنجاب ۔ کے مشہور نوجوان شاعر اور نقاد تھے ۔ حلقہ ارباب ذوق کے رکن تھے ۔ ادبی دنیا کے سابق ایڈیٹر رہے ۔ آپ کی نظمیں نہایت سلیس اور شگفتہ ہوتی تھیں ۔ فسانے اور ادبی مضامین بھی بہت دلچسپ لکھتے تھے ۔ ان کی نظموں اور فسانوں کے مجموعے چھپ گئے ہیں اور عام طور سے بازار میں ملتے ہیں ۔ شراب کے بڑے رسیا تھے اور اسی کثرت ام الخبائث کے باعث زندگی بڑی تلخ گذری ۔ آخر عالم کس مپرسی میں بمبئی کے ایک ہسپتال میں چند روز بیمار رہ کر ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو فوت ہو گئے ۔ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کی تصانیف "میرا جی کی نظمیں ۔ میرا جی کے گیت اور نگار خانہ ہیں ۔

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ۱۹۰۴ء میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں پردم میں پیدا ہوئے ۔ ابھی پڑھتے ہی تھے کہ تحریک ہجرت کے سلسلے میں افغانستان چلے گئے ۔ مگر وہاں سے نہایت ذلت و خواری کے ساتھ واپس آئے اور ۱۹۲۳ء میں زمیندار کے عملے میں شامل ہو گئے ۔ اس کے بعد انقلاب میں کام کیا ۔ پھر ایک فارسی اخبار "افغانستان" نکالا جس کے ایک مضمون پر گرفتاری عمل میں آئی کر سزایاب ہوئے ۔ واپس آ کر احسان اور شہباز میں کام کیا ۔ پھر اپنا روزنامہ انصاف نکالا ۔ اس کو بند کر کے نوائے پاکستان اور مغربی پاکستان میں کام کرتے رہے ۔ اپنے زمانہ میں لاہور کی صحافت میں ان کا طوطی بولتا تھا ۔ آخری ایام بڑی عسرت اور تکلیف میں گذرے ۔ آخر اسی حالت میں ۲۷ جولائی ۱۹۵۹ء کو قلب کی حرکت بند ہو گئی ۔ تاریخ اقوام عالم اُن کی مشہور کتاب ہے جو دو مبسوط جلدوں میں ہے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں انھوں نے لکھی ہیں ۔

پیر غلام دستگیر نامی جب نقوش کے اس "لاہور نمبر" کی کاپیاں نہایت سرعت سے لکھی جا رہی تھیں اور چھ سو صفحے لکھے جا چکے تھے تو اچانک لاہور کے اس مشہور و معروف ادیب ۔ شاعر اور مصنف کا ۱۶ دسمبر کو دن کے دس بجے انتقال ہو گیا ۔ اُن کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہوئی اور وہ مشرقی تہذیب کا بہت اچھا نمونہ تھے ۔ تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے اسلامی وراثت کے قوانین سے لاہور بھر میں اُن سے زیادہ واقفیت کسی کو نہ تھی ۔ ۸۰ کے قریب چھوٹی موٹی اسلامی ۔ تاریخی اور اخلاقی کتابوں کے مصنف تھے اور ۳۰ کے قریب انھوں نے ضخیم تصانیف شائع کیں جو سب کی سب چھپوا کر بلا قیمت تقسیم کرتے تھے اُن کی

آخری مطبوعہ کتاب تاریخ جلیلہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جو بڑی تقطیع کے ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جو بالکل مفت تقسیم ہوئی تاریخ بزرگانِ لاہور اُن کی بے مثل کتاب ہے جسے افسوس ہے وہ اپنی زندگی میں چھپوا نہ سکے۔ مگر کتاب کو مکمل کر گئے۔ دوسری کتاب شیخ سعدی کی آپ بیتی ہے۔ یہ زیرِ طبع ہے۔ اُن کی میت کو اُن کے ورثا اپنے آبائی گاؤں موضع رتہ ہیراں ضلع شیخوپورہ میں دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ جہاں دوسرے دن ۱۷ دسمبر کو اُن کی تدفین عمل میں آئی۔

علاوہ کتابوں کے انھوں نے ہزاروں مضامین بھی مختلف اوقات میں مختلف اخباروں اور رسالوں میں لکھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری تھا یہاں تک کہ اُن کی موت نے اس سلسلہ کو بند کر دیا۔ اُن کی یادداشتوں کے تین چار رجسٹر محفوظ ہیں جن میں ہر قسم کی ہزاروں علمی۔ ادبی۔ تاریخی یادداشتیں نامی صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔ پچاس برس سے زیادہ کی علمی کاوشوں اور علمی تحریکوں۔ اور سیاسی حالات کا یہ رجسٹر نہایت عجیب اور بہترین مجموعہ ہے۔

جن ایام میں خاکسار راقم لاہور کے مصنفین اور راویوں کا یہ تذکرہ مرتب کر رہا تھا تو ایک روز نامی صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ ہمارے حالات زندگی بھی اس میں لکھ دو۔ میں نے ہنس کر کہا کہ حضرت پیر صاحب آپ مر جائیے میں فوراً آپ کا ذکر اس تذکرہ میں کر دونگا۔ کیونکہ میں اس مضمون میں صرف مرحوم مصنفین لاہور کا ذکر کرونگا۔ کیا خبر تھی کہ اتنی جلد نامی صاحب مرحوم ہو جائیں گے اور مجھے اُن کا تذکرہ لکھنا پڑے گا۔

نامی صاحب کی وفات پر جو تاریخیں مختلف اصحاب نے کہی ہیں وہ اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ مگر میرے مکرم دوست حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے جو تاریخ کہی ہے اور جو ابھی تک کہیں نہیں چھپی میرے نزدیک نہایت ہی عمدہ اور موزوں ہے وہ تاریخ یہ ہے :

<u>بجھا آج ہائے چراغِ علوم</u>
۱۳۸۱ھ

مولوی نبی بخش حلوائی اگرچہ آپ مٹھائی بنانے اور دودھ بیچنے کا کام کرتے تھے۔ اور اسی لیے حلوائی کہلاتے تھے مگر اس غیر شاعرانہ پیشے کے باوجود حیرت ہے کہ اُردو۔ فارسی۔ عربی اور پنجابی کے فاضل اور صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ لوگ جب اُن کو دوکان پر حلوا پوری بیچتے دیکھتے اور آپ کو مسجد میں قرآن اور حدیث کا درس دیتے ہوئے دیکھتے تو تعجب کرتے۔ اور جب آپ کی تصانیف پڑھتے تو حیران ہو جاتے۔ آپ مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد اور علامہ غلام دستگیر قصوری اور جماعت علی شاہ علی پوری کے مرید تھے۔ والد کا نام محمد وارث تھا۔ ارائیں قوم سے تعلق رکھتے تھے اور لاہور کی اکبری منڈی میں رہتے تھے۔ کوتوالی کے متصل مسجد آپ ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ اور آپ کی قبر بھی اسی مسجد میں ہے۔ آپ پنجابی کے اچھے شاعر اور اُردو کے بڑے ادیب تھے۔ آپ کا بڑا مذہبی کارنامہ تفسیر محمدی ہے جو پندرہ مبسوط جلدوں میں قرآن پاک کی منظوم تفسیر ہے اور پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے۔ پنجابی میں اس بلند پایہ تفسیر کے علاوہ آپ نے اُردو نثر میں جو کتابیں تحریر فرمائیں اُن کے نام یہ ہیں۔ یہ سب کی سب خالص مذہبی اور دینی مسائل کے متعلق ہیں اور اہم مباحث پر مشتمل ہیں۔

(۱) النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ رضؓ (۲) سبیل الرشاد فی حق الاسناد
(۳) تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان (۴) اطلاع الناس فی طلاق الثلاث

(۵) احسان الاموات فی الصدقات والاسقاط (۶) جامع الشواہد
(۷) اظہار انکار المنکرین۔

قریباً ایک سو برس کی عمر میں آپ نے ۱۴ ذی قعدہ ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) کو وفات پائی۔

مولوی نجم الدین آپ سیوہارہ (ضلع بجنور) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ مدرسہ دیوبند کے سند یافتہ تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں کئی برس تک سید ممتاز علی صاحب مرحوم کے مطبع رفاہ عام میں ملازم رہے۔ سیرۃ الشافعی اور رسوم جاہلیت آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم ص۱۷۰)

مولوی سید ممتاز علی کی نہایت مشہور و معروف کتاب تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کی تالیف و تدوین میں آپ کا زبردست ہاتھ تھا۔ ۱۹۲۸ء کے قریب وفات پائی۔

نشتر سردار عبدالرب نشتر کو لوگ شاعر کے طور پر کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں۔ ۱۳ جون ۱۸۹۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اور پریکٹس کے ساتھ تحریک خلافت میں بھی سرگرم حصہ لینا شروع کیا۔ کانگرس میں بھی شامل رہے۔ اور نو ماہ کی قید بھی کھگتی۔ پھر کانگرس کی مسلم کش پالیسی سے متنفر ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی، اردو، پشتو اور انگریزی میں نہایت فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے تھے۔ مذاق سخن نہایت صاف ستھرا تھا۔ فن شعر میں اکبر الہ آبادی سے تلمذ تھا۔ انتقال کی تاریخ ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء ہے۔

مولانا خواجہ نور بخش گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر اور انجمن نعمانیہ کے "ناظم التعلیم" تھے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ اور بڑی ٹھوس قابلیت کے مالک تھے۔ ۱۸۷۷ء میں موضع چک قاضیاں (ضلع لدھیانہ) میں پیدا ہوئے اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو لائل پور میں وفات پائی۔ تصنیفات یہ ہیں تذکرہ مشائخ نقشبندیہ۔ حلیۃ النبیؐ۔ معجزات النبیؐ۔ غزوات النبیؐ۔ شرح قصیدہ بردہ۔ شرح ہدیہ یوسفیہ۔ اقوال الصحیح کتاب البرزخ۔ مقدمہ تفسیر القرآن۔ تفسیر سورہ بقرہ۔ صدائے حقانی در حقیقت محبوب سبحانی وغیرہ۔

سید غلام بھیک نیرنگ آپ انبالہ کے مشہور و معروف قومی کارکن بہت اچھے شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالہ میں سرکاری وکیل بھی رہے اور بہت سی تعلیمی اور اسلامی انجمنوں کے صدر اور سکرٹری کے فرائض بھی انھوں نے انجام دیئے۔ بہت اچھا علمی مذاق رکھتے تھے۔ مذہب کا بھی آپ کے دل میں خاصا ذوق تھا۔ چنانچہ تبلیغ اسلام کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ آپ کا شمار پنجاب کے شاعروں کے اُس گروہ سے ہوتا ہے جو مولانا حالی کے بعد سرسید سے متاثر ہوئے اور جنھوں نے اُردو شاعری میں زندگی کے مسائل کو شامل کیا۔ آخر عمر میں لاہور چلے آئے تھے اور یہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو وفات پا کر میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی نظموں کے مجموعے کلام نیرنگ اور غبار افق کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

مولوی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی آپ کا آبائی وطن جھنجھانہ (یو۔پی) تھا مگر آپ کی والدہ کوچہ صوبیدار (اندرون بھاٹی گیٹ) لاہور کی رہنے والی تھیں اور آپ یہیں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کو شعر و شاعری کا شوق اور مضمون نگاری کا ذوق بچپن سے تھا۔ شاعری میں آپ داغ کے شاگرد ہیں مضمون نگاری آپ نے ۱۶ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کی پہلی کتاب فتوح عبدالحمید خان شائع ہوئی۔ جس میں جنگ روم و یونان کے حالات تھے۔ مختلف جگہ ملازمت کرنے کے بعد آپ ۳ مئی ۱۹۰۳ء کو مستقل طور پر لاہور آگئے اور مولوی سید ممتاز علی صاحب کے اخبار تالیف و اشاعت کے مدیر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے فصیح الملک نام ایک ماہوار رسالہ نکالا جس میں غزلیں اور نظمیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں اصلاح سخن جاری کیا۔ جو خالص ادبی پرچہ تھا۔ اقبال بھی اس میں اپنا کلام بھیجا کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں روزانہ زمیندار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور آخر عمر تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ آپ کی مصنفہ کتابوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ قومی ماتم (مرثیہ جات سرسید) اخلاق اللسان۔ سفر نامہ بمبئی۔ اور نظم وجاہت جو ان کی نظموں کا مجموعہ تھا اور جس کو آزادیٔ خیال کے باعث گورنمنٹ نے ضبط بھی کر لیا تھا۔ آپ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

کرنیل ہالرائڈ محکمہ تعلیم پنجاب میں شروع سے اب تک جس قدر انگریز ڈائرکٹر آئے اُن میں اُردو کی سرپرستی، حمایت اور امداد کے لحاظ سے کرنیل ہالرائڈ کا نام غالباً سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صاحب ۱۸۶۷ء سے ۱۸۹۰ء تک ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب رہے۔ ان کا نام اس لحاظ سے تاریخ ادب اُردو میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اُردو کی جدید اخلاقی، اصلاحی اور نیچرل شاعری کا سنگ بنیاد آپ ہی کے عہد میں۔ آپ ہی کی امداد سے اور آپ ہی کی زیر سرپرستی رکھا گیا۔ جس پر بعد میں قصرِ اُردو کی عظیم الشان عمارت تیار کی گئی۔ اس جدید اور سربفلک عمارت کے اوّلین معمار حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد تھے۔ اور کرنیل ہالرائڈ کی مرضی و ایما سے اور ان کی سرپرستی اور انتظام کے ماتحت اس عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ چنانچہ حضرت شمس العلماء مولانا حالی مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ کے شروع میں فرماتے ہیں:

> "۱۸۷۴ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا جو کہ مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اُس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔"

مولانا نے حسبِ عادت از راہِ انکسار یہاں اپنا نام نہیں لکھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی اس مشاعرہ کی روح رواں اور جدید اُردو شاعری کے مجددِ اعظم تھے۔

کرنیل ہالرائڈ کا عہد اس لحاظ سے بھی خاص طور پر بڑا اہم ہے کہ اُن کے زمانہ میں بہتر کتابیں طلباء مدارس کے لیے

انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں اور اردو زبان کو تراجم کے لحاظ سے بڑی زبردست وسعت حاصل ہوئی۔ انہی کے عہد میں اور انہی کے ماتحت رہ کر مولوی محمد حسین آزاد نے نثر میں شاعری کی اور حضرت مولانا حالی نے شاعری میں اخلاق و موعظت کی بنیاد رکھی۔ یعنی نثر اور نظم کے یہ دونوں مجدد کرنیل ہالرائڈ ہی کے زمانہ میں ہوئے اس لحاظ سے ان کا عہد اردو کی ترقی کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا اور اس لحاظ سے بلا شبہ کرنیل ہالرائڈ کا نام اردو کے سرپرستوں اور حامیوں کی صف اوّل میں لیا جا سکتا ہے اور اسی مناسبت سے اس تذکرہ میں ان کا ذکرہ کیا گیا ہے۔

کرنیل ہالرائڈ کا عہد اس لحاظ سے اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اُن کے زمانہ میں طلبا کیلئے بکثرت کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ ان کتابوں کی زبان کو درست کرنے کے لیے کرنیل ہالرائڈ نے مولوی محمد حسین آزاد اور حضرت مولانا حالی جیسے یگانہ روزگار فاضلوں کو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ سرسید اپنی تقریر میں جو انھوں نے ۱۸۸۹ء میں لاہور میں کی تھی فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک نہ صرف پنجاب میں بلکہ شمال و مغربی اضلاع اور اودھ کو بھی کرنیل ہالرائڈ صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ اُنھوں نے جس قدر کتابیں چھاپی ہیں میں اُن کے ایک ایک فقرہ کی تعریف کرتا ہوں۔ اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے مگر جانتے ہو اُس کے کرنے والے کون ہیں؟ وہی دلّی والے (آزاد اور حالی) اگر تلوار ایک اناڑی کے ہاتھ میں ہو تو کچھ کام نہیں کرتی۔ یہ ہالرائڈ صاحب کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اُس سے اچھے اچھے کام لیے۔" (اخبار سرمور گزٹ ناہن مورخہ ۲۳ جنوری ۱۸۸۹ء صفحہ ۷، کالم ۲)

منشی ہرسکھ رائے یہ صاحب ذات کے بھٹ نگری کائستھ اور سکندرآباد ضلع بلندشہر (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے (تاریخ صحافت اردو میں غلط لکھا ہے کہ سکندرآباد مضافات دہلی میں واقع ہے دیکھو جامع اللغات تحتی حرف س) جوان ہوکر یہ صاحب لاہور چلے آئے اور یہاں سے جنوری ۱۸۵۰ء میں کوہ نور کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ جو لاہور کا سب سے پہلا اخبار تھا اور بعد کے زمانہ میں اس کو زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ مہاراجہ کشمیر منشی ہرسکھ رائے کی اخبار کا مالک اور ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے بڑی عزت اور آؤبھگت کرتا تھا۔ اور جب یہ ریاست میں جایا کرتے تھے تو سرحد پر مہاراجہ کا ہاتھی انھیں لینے آیا کرتا تھا۔ اور منشی صاحب بڑے ٹھاٹھ سے بطور شاہی مہمان وہاں قیام کرتے تھے۔ واپسی پر خلعت اور گیارہ سو روپے رخصتانہ انھیں مہاراجہ کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ منشی صاحب لاہور میں بھی بڑی شان سے رہا کرتے تھے۔ ان کے اخبار کوہ نور کی اس قدر عزت تھی کہ اُس وقت کے بڑے بڑے نامور اور مشہور ادیب اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ منشی صاحب نے ۲ ستمبر ۱۸۹۰ء کو انتقال کیا۔ مگر کوہ نور بعد میں بھی جاری رہا اور ۱۹۰۴ء میں بند ہوا۔ اس کے آخری ایڈیٹر مولوی محمد الدین فوق تھے۔ (یہ حالات میرے محترم دوست مولوی عبداللہ صاحب قریشی بی۔ اے نے وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ کے ایک پُرانے پرچے سے نقل کر کے مرحمت فرمائے ہیں)

ہمایوں: جسٹس میاں محمد شاہ دین ہائی کورٹ لاہور کے چیف جج ہونے کے علاوہ نہایت پاکیزہ ادبی ذوق رکھتے تھے

ہمایوں تخلص کرتے تھے اور اعلیٰ پائے کی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ اُردو اور انگریزی میں بہت فصیح و بلیغ تقریر بھی کر سکتے تھے۔ بلند اخلاق کے مالک اور پاکیزہ سیرت کے حامل تھے۔ سر سید احمد خاں کے نہایت زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سے تھے۔ آپ کی زندگی ہمہ تن عمل تھی اور اصلاحِ قوم کے لیے وقف۔ مطالعہ آپ کا نہایت محبوب مشغلہ تھا۔ ۲ اپریل ۱۸۶۹ء کو باغبان پورہ میں پیدا ہوئے اور ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ جذباتِ ہمایوں آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ آپ کے نہایت لائق اور قابل فرزند میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے محترم والد کی یادگار میں ایک رسالہ ہمایوں کے نام سے جاری کیا۔ جس نے عرصہ دراز تک ادب، علم اور زبان کی نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ جب یہ ماہنامہ مکرمی و محترمی حامد علی خاں صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا تو سارے پنجاب میں ایک بھی پرچہ اس کے مقابلہ کا نہ تھا۔ یہ اعلیٰ پایہ کا رسالہ میاں بشیر احمد صاحب نے جنوری ۱۹۲۲ء میں جاری کیا تھا اور جنوری ۱۹۵۷ء تک یہ رسالہ جاری رہا۔

شیخ یعقوب علی

یہ صاحب بہت عرصہ تک منشی محبوب عالم کے پیسہ اخبار میں بحیثیت نائب اڈیٹر کام کرتے رہے پھر امرتسر چلے گئے۔ اور وہاں سے ۸ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ایک ہفتہ وار اخبار الحکم کے نام سے جاری کیا۔ بہت سی اسلامی اور دینی کتابوں کے مصنف اور بہت اچھے شاعر تھے۔ پہلے تراب تخلص کرتے تھے۔ پھر عرفانی لکھنے لگے۔ یورپ کا سفر بھی کیا اور اپنا نہایت دلچسپ سفرنامہ "مشاہداتِ عرفانی" کے نام سے شائع کیا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔ اُن کے لڑکے کراچی میں شہباز اور نونہال دو رسالوں کے اڈیٹر ہیں۔ عرفانی صاحب کی تحریر بہت پُر اثر اور دلچسپ ہوتی تھی۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ اسماء الحسنیٰ۔ حقیقت نماز۔ کتاب الآدب۔ احکام القرآن۔ رحمۃ للعالمین فی کتاب مبین۔ تاریخ القرآن۔ کتاب الاخلاق۔ اسماء القرآن فی القرآن۔ قرآنی دعاؤں کے اسرار۔ البیان فی اسلوب القرآن۔ اعجاز القرآن۔ ما یثبت القرآن۔ کتاب الزکوٰۃ۔ کتاب الحج۔ کتاب الصیام وغیرہ۔

شیخ محمد احمد پانی پتی (بیٹے کی سرگذشت باپ کی زبانی)

میں نے بڑے شوق۔ نہایت تلاش اور بے حد کاوش کے بعد اپنے محترم دوست طفیل صاحب مدیر نقوش کی فرمائش پر لاہور کے مرحوم ادیبوں اور انشا پردازوں کا تذکرہ لکھا۔ مگر مجھ بدبخت اور بدنصیب کو کیا پتہ تھا کہ مجھے اپنے لختِ جگر اور نورِ بصر محمد احمد کو بھی اس تذکرہ کی بھینٹ چڑھانا ہوگا جو اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت زندہ سلامت اور بالکل نوجوان تھا۔ اور جس کے متعلق وہم بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ اس قدر جلد گل ہو جائے گا۔ اُس کی عمر صرف ۴۲ برس کی ہوئی مگر اس قلیل عرصہ میں اُس نے ادب۔ علم اور اسلام کی اس قدر کثیر خدمت کی کہ میں نے اپنی ۷۰ برس کی عمر میں اس کا دسواں حصّہ بھی نہیں کیا۔ وہ تقسیم ملک کے وقت ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو پانی پت سے لاہور پہنچا۔ اور ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کی صبح کو میو ہسپتال لاہور میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ وہ عربی زبان کا مشہور مترجم۔ بہترین ادیب اور بہت اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز تھا۔ اُس کے قلم میں بڑی سلاست اور روانی تھی۔ اُس کے ترجمے نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے۔ مترجمہ کتابوں پر عالمانہ اور محققانہ حواشی اور نوٹ لکھنے میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ ادبی۔ علمی سوانحی اور تاریخی اسلامی لٹریچر کا جو پاکیزہ ذخیرہ اُس نے یادگار چھوڑا ہے۔ وہ اُردو ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ مصر، شام اور لبنان کے مشہور و معروف اور چوٹی کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی جن بہترین کتابوں کا اُس نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا

اُن کے نام یہ ہیں :-

۱۔ نبی امیؐ ۔ ۲۔ سید العربؐ ۔ ۳۔ خلفائے محمدؐ ۔ ۴۔ ابوبکر صدیق اکبرؓ ۔ ۵۔ خدیجہؓ ۔ ۶۔ عائشہؓ ۔ ۷۔ الزہراؓ ۔ ۸۔ الحسینؓ ۔ ۹۔ سوانح حیات حضرت بلالؓ ۔ ۱۰۔ خالدؓ سیف اللہ ۔ ۱۱۔ خالدؓ اور اُن کی شخصیت ۔ ۱۲۔ عمروؓ بن العاص ۔ ۱۳۔ فاتح مصر ۔ ۱۴۔ معاویہؓ ۔ ۱۵۔ ابن تیمیہؒ ۔ ۱۶۔ آل محمدؐ کربلا میں ۔ ۱۷۔ علیؓ اور عائشہؓ ۔ ۱۸۔ الہارون ۔ ۱۹۔ سلطان محمد فاتح ۔ ۲۰۔ عہد نبوی کی اسلامی سیاست ۔ ۲۱۔ اسلام کا نظام عدل ۔ ۲۲۔ جغرافیہ تاریخ اسلام ۔ ۲۳۔ اشک پیہم ۔ ۲۴۔ تاریخ ادب العربی ۔ ۲۵۔ اُس نے تمام قدیم سیر و رجال کی عربی کتابوں سے اخذ و انتخاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ۵۳ صحابہ کا مبسوط تذکرہ "غلامانِ محمدؐ" کے نام سے لکھا جو دنیا کی ظاہری نظر میں غلام تھے ۔ ۲۶۔ بچوں کے لیے جو "قاعدہ تعلیم القرآن" اُس نے لکھا وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ ۲۷۔ طلبا کے لیے "سیرۃ النبیؐ" نہایت آسان زبان میں لکھی ۔ ۲۸۔ مولانا حالیؒ کے عربی خطوط کا ترجمہ کیا ۔ ۲۹۔ کتاب کلیلہ دمنہ کی تاریخ عربی سے ترجمہ کی ۔ ۳۰۔ محمد خضری کی مشہور عربی تاریخ سے ہارون الرشید کے سوانحی حالات ترجمہ کئے ۔ ۳۱۔ عبداللطیف شرارہ کی عربی کتاب حجاج بن یوسف کا ترجمہ شروع کیا ۔ ان کے علاوہ بہت سے نفیس اور اعلیٰ پایہ کے ادبی تحقیقی اور تاریخی و اسلامی مضامین محزن نقوش ۔ صحیفہ ۔ قندیل ۔ لاہور ۔ زیب النساء ۔ تشحید الاذہان ۔ خالد ۔ الفضل ۔ امروز اور لیل و نہار میں لکھے ۔ اس کی زندگی خالص طالبعلمانہ تھی اور اُس نے اپنی ساری عمر نہایت خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت میں گزار دی ۔ اور کسی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ۔ نہ کبھی کسی کھیل تماشے میں شریک ہوا ۔ نہ لاہور میں رہتے ہوئے کبھی کوئی سینما دیکھا ۔ دن رات لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف سے کام تھا ۔ اور آخری وقت تک اس مشغلہ میں مشغول رہا ۔ ذاتی طور پر نہایت نیک ۔ صالح ۔ کم گو ۔ شریف طبیعت ۔ مہمان نواز اور ہمدرد نوجوان تھا ۔ دوستوں سے نہایت اخلاص سے ملتا اور ملنے والوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا ۔ کبھی اُس نے زبان یا ہاتھ یا قلم سے کسی کو تکلیف نہیں دی ۔ غرض ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم کو سانس کی تکلیف عرصہ سے تھی اور اُس کے دورے مہینہ مہینہ دو دو مہینے بعد پڑتے تھے ۔ آخری دورہ اتنا شدید ہوا کہ اُس کو مجبوراً رات کے دس بجے میو ہسپتال میں داخل کرانا پڑا ۔ وہاں ڈاکٹروں نے اس کے علاج میں انتہائی کوشش کی مگر تقدیر کے آگے تدبیر ہمیشہ ناکام رہی ہے ۔ ؎

دلِ مجبور! راضی ہو رضا پر
تیرا چاہا ۔ نہیں چاہا خدا نے

غمگین و پژمردہ اسماعیل پانی پتی

مؤرخین لاہور

کسری منہاس

ایک فلسفی کا قول ہے کہ تاریخ کا دوسرا نام ثقافت ہے۔ اس قول کی روشنی میں مورخین کا رتبہ ثقافت کے محافظوں کا سا ہو جاتا ہے۔ تہذیبیں پیدا ہوتی رہی ہیں، پروان چڑھتی رہی ہیں، اور مٹتی رہی ہیں، لیکن تاریخ میں ان کا نقش موجود ہے۔ لاہور ایک قدیم و عظیم شہر ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اسے ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس سرزمین نے انقلابات کے عجیب عجیب نظارے دیکھے ہیں۔ اور بڑے بڑے نامی گرامی مشاہیر جو اپنے فن اور علم میں یگانۂ روزگار تھے، یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا مکمل اور مفصل تذکرہ اگر مرتب کیا جائے تو بلا مبالغہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔

تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر مورخ آنے والے مورخین کے لیے مواد مہیا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے جن مصنفین نے عام اس سے کہ وہ شاعر ہوں، یا تذکرہ نگار یا تاریخ نویس، تاریخ لاہور لکھنے میں مدد کی ہے۔ ان کا مورخین لاہور پر بڑا احسان ہے۔ ہمیں ایک اشارہ کہیں سے اور ایک کہیں سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور جب ان کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو شہر لاہور کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم ان تمام مصنفین کو مورخینِ لاہور ہی میں شمار کریں گے۔ خواہ انھوں نے کوئی مستند تاریخ نہ لکھی ہو۔ اور صرف اپنے تذکروں، سفرناموں، روزنامچوں یا اشعار ہی میں اس شہر یا اس کے کسی واقعہ کا ذکر کیا ہو۔ اس شہر کی تاریخ سے متعلق جا بجا مختلف کتابوں میں اتنے اشارے پائے جاتے ہیں کہ اگر کوئی محقق ان کو یکجا کرے تو بہت سے نئے نتائج برآمد ہوں گے۔ مثال کے طور پر لاہور کو تاریخ میں بیسیوں ناموں سے پکارا گیا ہے۔ الاہوار، لھور، لوہاور، لوہور، لہانور، لوہاوور، لہاوور، للوہور، لہاور، لانہور، لہاوار اور لاہور۔ یہ سب نام مختلف کتابوں، تذکروں اور شعرائے کرام کے کلام میں ملتے ہیں۔ جن سے مورخین لاہور کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

اس مضمون کا مقصد چند مورخین لاہور کی تصانیف اور حالاتِ زندگی کا قارئین کرام سے تعارف کرانا ہے۔ اس سے کم و بیش جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارے مضمون کی حدود سے خارج ہے۔ چنانچہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس مورخ نے اپنی تصنیف میں کون کونسی غلطیاں کی ہیں۔ نہ ہم یہ گنانا چاہتے ہیں کہ کس مورخ نے اپنا مواد کہاں سے حاصل کیا۔ اور حاصل کرنے کے بعد حوالہ تک نہ دیا۔ بعض مورخین نے سنین میں غلطیاں کی ہیں۔ ہم نے ان پر بھی قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بعض نے اپنی تحقیقات تاریخ کے مستند حقائق سے چشم پوشی کر کے برآمد کی ہیں۔ مثلاً کوئی عمارت یا کوئی مقبرہ جس کے وجود پر بیشتر مورخین متفق چلے آرہے ہیں۔ ان محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتا۔ محض روایت کی بنا پر تاریخوں میں آگیا ہے۔ مگر ہم نے ان محققین سے نہ اتفاق کیا ہے نہ اختلاف۔ وہ اس لیے کہ ہمارا زاویۂ نظر اس مضمون میں تحقیقی نہیں بلکہ تعارفی ہے۔

بعض تصانیف ہمارے سامنے نہ آ سکیں۔ جن کی اس موقع پر ضرورت تھی۔ کچھ مورخین لاہور جن کا تاریخ لاہور پر بڑا احسان ہے ان کے سوانح حیات دستیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے ایسے بزرگان کرام کے حالات بوجہ مجبوری مرتب نہ ہو سکے۔ البتہ مضمون کے آخر میں ایک فہرست ان کتب اور ان مصنفین کی دے دی ہے۔ جنھوں نے لاہور کی تاریخ کے متعلق خدمات انجام دی ہیں۔ اور لاہور کی تاریخ کا مواد فراہم کیا ہے۔

مورخین لاہور کی طویل فہرست میں سے ہم نے سولہ مورخین کو نمائندہ قرار دیا ہے۔ ان میں کچھ مغلیہ دورِ حکومت کے نمائندے ہیں کچھ انگریزی دورِ حکومت کے نمائندے ہیں اور کچھ پاکستانی ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف اور مختصر سوانح حیات کا تعارف اس نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کہ اسلامی۔ انگریزی اور پاکستانی دورِ حکومت میں لاہور کے مورخین کے کام کا اندازہ ہو سکے۔ یہ سوانحی کوائف مستند اور معتبر کتب سے پوری کد و کاوش سے اخذ و انتخاب کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل تذکرہ میں بیشتر اصحاب تو ایسے ہیں جن کا وطن لاہور تھا۔ دو ایک ایسے بھی حضرات ہیں جو عرصۂ دراز تک لاہور ہی میں مقیم رہے۔ اور اس لحاظ سے وہ "لاہوری" کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ دو ایک ایسے بھی اشخاص ہیں جنھوں نے لاہور کے متعلق کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ مگر وہ لاہور کے رہنے والے نہ تھے۔

ملّا عبدالحمید لاہوری (المتوفی ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء)

عبدالحمید کا مولد و مسکن لاہور تھا۔ علامی ابوالفضل سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ محنتِ شاقہ سے مسجع طرزِ انشا میں مہارتِ تامہ حاصل کی لیکن زمانے کی نامساعدت سے ٹھٹھہ[1] میں آ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اس کے ادب و انشا اور دوسرے کمالات کے متعلق جب شاہ جہاں کو خبر ملی تو اُسے دربار میں طلب کر کے "اکبر نامہ" کی طرز پر عہد شاہجہانی کی تاریخ کی تدوین سپرد کی۔

عبدالحمید لاہوری کی انشا پردازی، صلاحیت، قابلیت، فن اور سخن طرازی کے متعلق عمل صالح[2] میں یہ ذکر ملتا ہے۔

"روش سخن پیرائی از کلام شیخ ابوالفضل فرا گرفتہ از فیض صحبت آں قدوۂ اہلِ فضل بہرۂ تمام اندوختہ۔ ہماں دستور قلمرانی می کند۔ و در جادۂ سخنوری پی بر پی آں پیش خرام ہنجار نکتہ دانی مے ہند و در فنِ انشا رکامل است و در نکتہ دانی سرآمد اقران و اماثل۔ شیخ تلاش از گلہاے سخن بہرہ ور است و بہر خروش با عصاے خامہ رہ سپر۔ چوں در ایام جوانی ہنجار مراتب علمی در نوردیدہ و فن انشا را نیک ورزیدہ بود اکنوں باوجود پیری در فن سخن طبعش جوان است و در ادراک معنی توانائی تمام دارد۔ اگرچہ از غایت ضعف مشتِ استخوانی بیش نیست، تا بقوتِ خرد مغز بہر دستِ سخن می رسد و ہنگام نگارش مطالب واجد عبارت آرائی می دہد۔ حسب الامر خاقان جہاں نواز بجمع و ترتیب بیست سالہ احوال آں حضرت پرداختہ و در ضمن عبارت آں قدرت طبع ارجمند بلطف ادا ہویدا ساختہ۔ در سال ہزار و شصت ہزاری و پنج ہجری بسبب کبر سن و ضعف قویٰ از کار باز ماندہ در ہماں ایام برحمتِ حق پیوست۔"

---

1. ایلیٹ ٹھٹھہ کی بجائے پٹنہ لکھتا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن اورینٹل لائبریری پٹنہ کے نا کیٹالاگر نے صاف طور پر بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھہ ہے۔ پٹنہ کتابت کی غلطی ہے۔ ملاحظہ ہو کیٹالاگ ج ۷ ص ۲۵ (بزم تیموریہ)
2. عمل صالح جلد سوم صفحہ (۴۲۷) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

عبدالحمید لاہوری سے پہلے بادشاہنامہ کی ترتیب مرزا محمد امین بن ابوالحسن قزوینی کے سپرد تھی۔ قزوینی نے ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۴۶ھ تک دہ سالہ واقعات سپرد قلم کئے ہیں۔ جس میں شاہجہاں کی ولادت اور اس کا نسب نامہ جہانگیر سے امیر تیمور تک درج ہے۔ اس تاریخ میں مورخ اول کے دہ سالہ واقعات کے علاوہ مشاہیر عہد کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ لیکن شاہجہاں کے سی سالہ دور حکومت کی مفصل تاریخ جو بادشاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ اس کا نام بھی بادشاہ نامہ ہے۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں منقسم ہے۔ جلد اول میں ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۴۷ھ تک۔ جلد دوم میں ۱۰۴۷ھ سے ۱۰۵۷ھ تک اور جلد سوم میں ۱۰۵۷ھ سے ۱۰۶۸ھ تک کے حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ پہلی دو جلدیں ملا عبدالحمید لاہوری کے اور تیسری جلد محمد وارث[1] کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ملا عبدالحمید لاہوری چونکہ علامہ ابوالفضل کا شاگرد تھا۔ اس لیے اس کی عبارت آرائی میں علامہ موصوف کی تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے ادب و انشاء کے اکثر نمونے ابوالفضل کی تحریر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہی تشبیہیں، وہی استعارے، وہی مجاز، وہی مبالغہ، وہی پیچیدہ بیانی۔ لیکن اس کی مہارت اور مشق کا یہ عالم ہے کہ کہیں بیان کو ناہموار نہیں ہونے دیا۔ خیالات کو نہایت صفائی سے پیش کیا۔ دقیق معانی کو کچھ اس صفائی اور پختگی سے تحریر کیا ہے کہ اس کی استادی اور ہنرمندی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ لیکن ابوالفضل کی تحریر میں شوکت الفاظ کا جو معیار قائم کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس کی قدر و قیمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول صاحب عمل صالح شاہجہاں اس کی خدمات سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے اس کو دو مرتبہ روپے میں تلوا کر انعام دیا۔
یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ پہلی جلد ۱۸۶۷ء اور دوسری جلد ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی ہے۔

ملا عبدالحمید لاہوری کا بادشاہ نامہ ایک طرح کا شاہجہانی دور کا روزنامچہ ہے۔ ابتدا میں ابوالفضل کے انداز میں شاہجہاں کا یومیہ پروگرام دیا ہوا ہے۔ جس سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغل بادشاہ کتنی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مصروفیت اور خدمتِ رعایا میں بسر ہوتا تھا۔ اس باب کی زبان پر ابوالفضل کے انداز بیان کا دھوکا ہوتا ہے۔ دوسرے بادشاہنامے میں جا بجا شاہی عمارات اور باغات کے بارے میں اہم تفصیلات ملتی ہیں۔ شاہجہان نے لاہور میں شالامار باغ بنوایا۔ باغ کی ساخت اس کے تختوں کی تقسیم۔ اس کی عمارات اور چمن آرائی کے بارے میں ایک نہایت مفصل اور واضح بیان ہے۔ جس سے اس باغ کی عظمت اور مغل باغات کی خصوصیات پیکرِ تصویر بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ملا حمید نے شاہی قلعہ کی بعض عمارات کا ذکر بھی بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور جو قلعے میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے اسے بھی زبان قلم سے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس دور میں کچھ خانقاہیں اور مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں جن کی تفصیل بادشاہ نامہ میں ملتی ہے۔

---

[1] ملا عبدالحمید جب ضعف پیری کے سبب آخری دہ سالہ واقعات لکھنے سے مجبور ہو گیا تو بادشاہ نے محمد وارث کو یہ سلسلہ جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ محمد وارث کو وارث خاں کے لقب سے سرفراز کیا۔ اس نے دور سوم کے واقعات بڑی محنت اور قابلیت سے لکھے۔ جو بادشاہنامہ کی تیسری جلد کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ حصہ نواب سعد اللہ خاں علامی اور علاء الملک تونی المخاطب بہ فاضل خاں کی اصلاح سے مزین ہے۔ وارث خاں نہایت ذہین اور فکر رسا رکھتا تھا۔ خطاطی اور انشا میں اس کا شمار مشاہیر وقت میں ہوتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ۱۰ ربیع الاول ۱۰۹۱ھ کو ایک طالب علم نے قلمتراش سے زخمی کر کے اس کو مار ڈالا۔ (مآثر عالمگیری ص ۱۹۲)

بادشاہ نامہ کا ایک اور دلچسپ حصہ کشمیر کے بارے میں ہے۔ شاہجہان جب پہلی مرتبہ کشمیر گیا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ کیا۔ وہ سب بادشاہ نامے میں محفوظ ہے۔ مگر اس باب میں بھی سب سے دلکش حصہ کشمیری باغات کے متعلق ہے۔ ان کے باغات کے متعلق ملا عبدالحمید نے جزویات تک بیان کی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یہاں تک لکھ دیتا ہے کہ ایک درخت پر اتنے پھول ہیں۔ اسی طرح کابل کے باغات وہاں کی سیرگاہوں کا تذکرہ بھی بادشاہ نامے میں محفوظ ہے۔ بابر کے مزار کے بارے میں جتنا واضح بیان بادشاہ نامہ میں ملتا ہے۔ ایسا کسی اور تاریخ میں ہمیں دستیاب نہیں ہوتا۔

مغل حکومت ایک مہذب۔ ترقی یافتہ اور ادب نواز حکومت تھی۔ مختلف اوقات میں بادشاہ نے جن علماء و شعرا کی قدردانی کی۔ ملا صاحب نے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے آخر میں علما۔ صلحا۔ شعرا اور حکما کا ایک مختصر سا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ بادشاہنامہ محض تاریخی واقعات کی کھتونی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی تاریخ ہے۔ جس کی مدد سے ہم ایک ایسی تاریخ مرتب کرسکتے ہیں جو اس ملک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے اور یہ ایک بڑا اور شاندار علمی کارنامہ ہے۔

بادشاہ نامہ کی تلخیص "ملخص" کے نام سے کی گئی۔ ملخص کی ترتیب محمد طاہر آشنا المخاطب بہ عنایت خان نے کی ہے۔ یہ تاریخ ہر سہ بادشاہ نامہ (قزوینی۔ عبدالحمید لاہوری اور وارث) کی تلخیص ہے۔ اور اسی لیے اس کا نام ملخص رکھا گیا ہے۔ ملا طاہر آشنا نے پیچیدہ انداز بیان کی جگہ سادہ اسلوب نگارش اختیار کیا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بادشاہ نامہ کو امکانی حد تک سہل بنا دیا ہے۔

ملا عبدالحمید کا بیان ہے کہ ہفتم ربیع الاول ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء کو اسے سونے سے تولا گیا جس کی قیمت تین ہزار روپیہ تھی۔ چہارم ذی الحجہ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کو بادشاہ نے اسے ایک ہتھنی عطا کی۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں وہ بادشاہ کے ہمراہ لاہور آیا اور جشن نوروز کے موقعہ پر اسے چار ہزار روپے انعام ملے (بادشاہ نامہ جلد دوم)

شاہزادہ داراشکوہ (المتوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء)

داراشکوہ شاہنشاہ ہند شاہجہان کا فرزند تھا۔ ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر میں پیدا ہوا۔ بہترین اساتذہ وقت اس کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیے گئے جن میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری۔ ملا میرک اور شیخ ہروی کے نام ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں بھی لکھے ہیں۔ خطاطی کی تعلیم کے لیے عبدالرشید ایسا یگانہ روزگار استاد اُسے نصیب ہوا۔ شعر و شاعری کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ چنانچہ علمی اعتبار سے تیموری شہزادوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ یہ ایک باکمال مصنف۔ اعلیٰ درجے کا انشاپرداز۔ خوش فکر شاعر اور مشاق خطاط تھا۔ جس کے حسن خط کی دھوم تھی۔ اس کی تصانیف سے اس کے علم و فن اور دوسرے خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **سفینۃ الاولیا** :۔ صوفیائے کرام کے متعلق نفحات الانس۔ کشف المحجوب۔ تذکرۃ الاولیا اور طبقات سلطانی میں جس پیرائے میں حالات قلمبند کیے گئے تھے۔ داراشکوہ ان سے مطمئن نہ تھا۔ وہ ایک ایسے تذکرے کی تدوین کی ضرورت سمجھتا تھا جس میں ان بزرگوں کے حالات سلسلہ بہ سلسلہ علیحدہ علیحدہ لکھے جائیں۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات کی تفصیل بھی دی جائے اور دوسرے حالات جو ان کی سوانح حیات کا جزو ہیں ان کو ترتیب وار مندرج کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب سفینۃ الاولیا لکھی یہ کتاب ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو ختم ہوئی۔ جبکہ اس کی عمر پچیس ۲۵ سال تھی۔ اس کتاب میں اہم بزرگان دین کے مختصر حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ کتاب دو فصلوں پر منقسم ہے۔ اس کتاب کے

شروع میں حضرت رسول مقبول صلعم کا ذکر مبارک ہے پھر خلفائے راشدین اور پھر حضرت امام حسن و امام حسین علیہ السلام اور اس کے بعد ائمہ کے مناقب مندرج ہیں۔ پھر قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ سلاسل کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ کچھ حالات متفرق سلسلوں کے بھی لکھے ہیں۔ آخر میں ازواج مطہرات و بنات طاہرات آنحضرت صلعم کا بیان ہے۔ اور اس کے بعد ان خواتین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے راہ سلوک میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ کتاب مختلف مطبعوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی۔ اس کتاب میں اس نے اپنے آپ کو حنفی المذہب کہا ہے اور تصوف میں سلسلۂ قادریہ سے متوسل قرار دیا ہے۔ آگرہ سے جو نسخہ منشی بیل کے اہتمام میں چھپا ہے اس کے صفحات کی تعداد ۲۱۶ ہے۔

سکینۃ الاولیا :۔ یہ کتاب ۱۰۵۲ھ میں لکھی گئی جبکہ دارا کی عمر اٹھائیس برس کی تھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنے پیر ملا شاہ محمد بدخشانی کے مرشد حضرت میاں میر (ملا جیو) کے حالات، ملفوظات، کرامات اور ان کے خاندان اور خلفا کے احوال پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس نے اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ لکھی ہے "کہ سکینۃ الاولیا ——— اور کتابوں کی طرح اولیائے حق کے معتقدوں اور مخلصوں کے لیے بطور یادگار رہے اور معلوم ہو جائے کہ کوئی زمانہ عالی گروہ سے خالی نہیں رہا۔ اور نیز یہ کہ اس زمانے میں جب ۱۰۵۲ھ ہے اس قسم کے لوگ ہیں اور تھے؟"

دارا نے راہ سلوک کے منازل کیونکر طے کیے اس کے متعلق وہ لکھتا ہے :۔

"جمعرات کے روز چوبیس ۲۴ سال کی عمر میں خواب میں فرشتہ نے مجھے آواز دی۔ اور چار مرتبہ کہا ــ مجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا۔ جو روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے دل میں سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہو گی ـــ اور بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ دولت بخشے گا۔ ان اللہ غفور الرحیم۔ میں ہمیشہ اس دولتِ عظمیٰ کا طالب رہا یہاں تک کہ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۴۹ھ کو ایک عارف باللہ کی صحبت میں پہنچا۔ وہ مجھ پر نہایت مہربان ہوا۔ جو بات دوسرے لوگوں کو ایک مہینہ میں حاصل ہوتی تھی وہ مجھے پہلی رات میں مل گئی اور جو کچھ دوسرے ایک سال میں حاصل کرتے تھے مجھے ایک مہینہ میں حاصل ہو گئی۔ جہاں اور کوئی طالب مجاہدوں۔ ریاضتوں سے پہنچا ہے میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بغیر ریاضت یکبارگی پہنچ گیا۔ دونوں جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی اور فضل و رحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا ہے"[1]

دارا کو اپنے مرشد (ملا جیو) سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ بھی اُس سے غیر معمولی شیفتگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ دارا نے اپنے مرشد کی کرامات کو تفصیلاً لکھا ہے۔ اور ان کی روحانی عظمت آشکار کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آخر میں اپنے مرشد کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کے احوال و کرامات بھی لکھے ہیں۔ حضرت میاں میر کے خلفا کا ذکر بھی اس کے بعد کر دیا ہے۔ حضرت میاں میر صاحب جن کے وقت میں جن مقامات اور باغات میں مصروف عبادت رہے۔ ان کا ذکر بھی اس میں درج ہے۔ ان میں سے بعض مقامات کی نشان دہی اس وقت کرنا مشکل ہے بہر حال ان سے لاہور کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں اس فن کی مختلف کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشف المحجوب

---

[1] سکینۃ الاولیا۔ صفحہ ۵ مطبوعہ قومی منزل نقشبندیہ۔ لاہور

نفحات الانس، نفیتہ الطالبین، تفسیر عرائس، تفسیر قشیری، بحر الحقائق، معجم البلدان سے اس نے اکثر استفادہ کیا ہے۔ اور ان کتابوں کو غور سے مطالعہ کیا ہے۔

۳۔ **رسالہ حق نما** :۔ ۲۹ ذوالحجہ ۱۰۴۹ھ کو اس نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد رسالہ حق نما لکھا۔ یہ رسالہ واصل بحق ہونے کے مختلف مدارج کے بیان میں ہے۔ اور اس رسالہ میں اس امر کی بھی ہدایت کی ہے کہ اس رسالہ کا مطالعہ اس وقت کیا جائے جب مرشد موجود ہو۔ ایک اور بات بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشفِ رموز و حقائق کے کتنے سربستہ اسرار اس پر کھول دیئے ہیں۔ ایک شہزادہ ہونے کے باوجود اور بغیر کسی کڑی ریاضت اور مشکل عبادت کے عرفان کے دروازے کس طرح اس پر کھل گئے۔

۴۔ **حسنات العارفین یا شطحیات** :۔ دارا نے اس تصنیف میں حضرت رسول مقبول صلعم، خلفائے راشدین رضؓ، صوفیائے کرام و علمائے عظام کے ان اقوال کو اکٹھا کیا ہے جو اس کے خیال میں شطحیات کے ضمن میں پیش کئے جا سکتے ہیں (شطحیات عربی لفظ ہے جس کے معنی بے ہودہ باتیں۔ کلمات خلاف ظاہر شریعت زبان پر لانا) اس رسالہ میں اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ توحید و معرفت کے منازل اور مدارج طے کرتے ہوئے ایک ایسا مقام بھی آتا ہے۔ جہاں ایک سالک شریعت و طریقت کفر و ایمان، خیر و شر سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زبان سے بے خودی کی حالت میں بعض کلمات ایسے بھی نکل جاتے ہیں۔ جو ظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کلمات کو قابل مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا۔ وہ خود اس کتاب کی تمہید میں لکھتا ہے۔ کہ

> "وجد و ذوق کی حالت میں اس کے منہ سے ایسے کلمات بلند حقائق نکل جاتے ہیں جن کو سن کر "پست فطرت" "دون ہمت" اور "زاہد خشک" نے اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتوے دیے۔ اس تکفیر سے بچنے کے لیے اس نے یہ کتاب تالیف کی"

۵۔ **مجمع البحرین** :۔ یہ کتاب دارا شکوہ نے اپنی عمر کے بیالیسویں سال ۱۰۶۵ھ میں تصنیف کی تھی۔ اس میں اسلام اور ہندو دھرم کو ایک ہی دریائے معرفت کی دو نہریں بتایا ہے۔ اور ان دونوں مذاہب کو ایک ہی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں۔ توحید کے متلاشی ان دونوں میں سے جس راستے پر چاہیں چلیں بالآخر حقانیت کی منزل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ اس کتاب کو پروفیسر محفوظ الحق نے مرتب کر کے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا ہے۔

۶۔ **سرِ اکبر** :۔ دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ۱۰۶۷ھ میں اوپنشد کے پچاس ابواب کا ترجمہ کیا۔ علمی حیثیت سے اس ترجمہ سے یہ فائدہ ہوا کہ اوپنشد کا متن مکمل طور پر ہمارے سامنے آ گیا۔ بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں اس نے ترجمہ دارا ہی کے اس ترجمے کی بدولت ہوئے۔ مولانا شبلی نے بھی اس کتاب کا ذکر مقالات شبلی جلد ہفتم صفحہ ۱۰۱ پر کیا ہے: "عالمگیر نے دارا شکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا۔ کہ دارا شکوہ بدعقیدہ اور بے دین ہے۔ اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بد دینی پھیل جائے گی۔ عام مورخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا۔ نہ دارا شکوہ بے دین تھا۔ اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا۔ دلوں کا حال خدا کو معلوم

ل یہ دارا شکوہ کا نہایت غلط خیال ہے خالص توحید اور خالص بت پرستی ایک کس طرح ہو سکتے ہیں۔

ہے۔لیکن اس کتاب کے دیباچے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر ممکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے۔"

۷۔ **بھگوت گیتا** :۔اس کتاب کو بھی داراشکوہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا جو نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس کے فہرست نگار نے اس نسخے کے ترجمہ کو داراشکوہ ہی کے نام سے مرقوم کیا ہے۔ اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابوالفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں (انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول کالم ۱۰۸۹)

۸۔ **نادر النکات** :۔ یہ کتاب بھی انڈیا آفس کے فہرست نگار نے داراشکوہ کی طرف منسوب کی ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب رسالہ حق نما یا مکالمہ بابا لال و داراشکوہ کا دوسرا نام ہے۔

۹۔ **دیوان** :۔ داراصاحب دیوان بھی تھا اور قادری تخلص کرتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ دارا کا کوئی دیوان نہیں۔ لیکن کلمات الشعرا میں سرخوش اور طاہر نصیر آبادی نے اپنے تذکرہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ داراصاحب دیوان تھا۔ ریاض العارفین میں رضا قلی ہدایت نے اس کی تائید کی ہے۔ مولانا علم الدین سالک نے "داراشکوہ کا دیوان" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ نقوش کے ادب عالیہ نمبر (جولائی سنہ ۱۹۶۰ء) میں تحریر کیا ہے۔ اس دیوان کے متعلق ان کی رائے بڑی وقیع ہے:۔

> "دیوان قادری اپنے دور کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف شستہ اور سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ ہیں جنھیں دارا بڑی آسانی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں سرمستی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انھیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر تصوف کے نہایت اہم ترین مسائل ہمہ اوست اور فنا کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے متعلق کہتا ہے ؎

ہر سو کہ نظر کنی ہمہ اوست　　وجہ اللہ عیاں ست رو برو را
خویشتن را جدا امنے دائم　　لیک خود را خدا لمنے دائم

چند اور کتابوں کے نام بھی مختلف فہرست نگاروں نے لکھے ہیں۔ جو داراشکوہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں رسالہ معارف۔ دارا کی ایک فارسی مثنوی (مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء) دارا کی ایک تزک (پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل (جلد دوم نمبر ا) اور نگارستان منیر کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کتابوں پر تفصیلی نوٹ دستیاب نہیں ہوتے۔

کچھ کتابیں داراشکوہ کی زیر سرپرستی لکھی گئیں۔ جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ **مکالمہ داراشکوہ و بابا لال** :۔ منشی چندربھان برہمن کے قلم نے اسے محفوظ کیا ہے۔ اس مکالمہ کی روح اس خیال کی تائید میں ہے۔ کہ حق و صداقت کسی مذہب یا فرقہ کی میراث نہیں ہے۔

۲۔ **جوگ بششت** :۔ یہ سنسکرت کی ایک کتاب "یوگ وششت" کا فارسی ترجمہ ہے۔ جو ایک درباری نے سنہ ۱۶۵۶ء

میں دارا کے حکم سے کیا۔

۱۳۔ **تاریخ شمشیر خانی**: - یہ کتاب شاہنامہ کی تلخیص ہے جو دارا کے حکم سے کی گئی۔

چند کتابیں اس کے نام سے بھی معنون کی گئیں جن میں قصص الانبیاء، طب داراشکوہی یا علاجات داراشکوہی، اقوال واصلی کے نام کتابوں میں ملتے ہیں۔

دارا فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ نستعلیق اور نسخ دونوں میں اسے پوری مہارت تھی۔ پروفیسر محفوظ الحق نے مجمع البحرین کے دیباچہ میں اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک قرآن مجید کے نسخہ کی عزیز لائبریری حیدرآباد دکن میں نشان دہی کی ہے جس کے حروف شروع سے آخر تک سنہرے ہیں۔ ایک مطلا مجسورہ کا نسخہ بخط نسخ اور ایک "دہ پند ارسطو" کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں محفوظ ہے۔ رسالہ حکمت ارسطو۔ اور شرح دیوان حافظ آصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ بعض کتابوں پر اس کے دستخط اور تحریریں بھی ملتی ہیں جو خطاطی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور نادرات میں شمار ہوتی ہیں۔

یہ تیموری خاندان کا شہزادہ جو ہمہ صفت موصوف تھا۔ غازی اورنگ زیب کی سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گیا۔ اس باکمال انسان کو غلط طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس دور کے مورخین نے بھی اس کے ساتھ انتہائی بے دردی کا سلوک کیا۔ بلکہ اس کے کردار اور افعال پر سراسر معاندانہ تنقیدیں کیں۔ آخر اسے ۲۱ ذوالحجہ ۱۰۶۹ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء کو قتل کر دیا گیا۔ کسی نے تاریخ کہی ؂

عقل پائے ادب گرفت و گفت
قتل داراشکوہ شد تاریخ (۱۰۶۹ھ)
۱۰۶۷ + ۲

لیکن ——— ساموگڑھ کا معرکہ سر کرنے والے اس کی علمی شہرت کو تباہ نہ کر سکے۔ اس دور کے شاہی پروردہ مورخ اس کی ذاتی عظمت نہ چھین سکے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے۔ داراشکوہ کی تصانیف کی وقعت بیش سے بیشتر ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحبان علم و فضل اس کی تصانیف کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش کریں۔ اگرچہ عالمگیری پروپیگنڈے اور تحریف کی لاتعداد تہیں اس پر چڑھی ہوئی ہیں جن میں اس صوفی منش شہزادے کا کمال چھپ کر رہ گیا ہے اگر اب بھی ملک کے لائق مورخین نے اس کی طرف توجہ کی تو اسے "فلسفہ ہمہ اوست" میں ارتداد کی بجائے حق پرستی معرفت الٰہی جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ کیونکہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔

چندر بھان برہمن (المتوفی ۱۰۷۳ھ / ۱۶۶۲ء)

منشی چندر بھان برہمن منشی دھرم داس لاہوری متصدی شاہی کا فرزند تھا۔ اعلیٰ طبیعت پائی تھی۔ اس وقت کے مشاہیر میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ نظم و نثر دونوں میں اس کی تصانیف دستیاب ہوتی ہیں جس سے اس کی شاعرانہ عظمت اور عالمانہ استعداد کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

فاضل اجل ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ فارسی زبان میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ شروع میں امیر عبدالکریم میر عمارت لاہور کی ملازمت اختیار کی۔ پھر امیر الامرا افضل خاں علامی دیوان کل کے ساتھ بحیثیت دبیر وابستہ رہا۔ اس کے بعد اپنے بھائی اودے بھان کی وساطت سے امیر عاقل خاں کے ذریعے شاہجہان کے دربار تک رسائی حاصل کی اور خط شکستہ میں ایک رباعی لکھ کر

خدمت میں پیش کی ؎

شاہے کہ مطیع او دو عالم گردد　　ہر جا کہ سرے پیش او خم گردد
از مسلکہ بدورش آدمی یافت شرف　　خواہد کہ شرف نیز آدم گردد

شاہجہاں نے اس کو وقائع نویسی کے عہدہ جلیلہ پر مامور کیا۔ اس عہدہ پر برہمن ہمیشہ فخر کرتا تھا۔ کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر ہر روز کے واقعات اور حالات سے بادشاہ کو باخبر رکھتا تھا۔ شاہجہاں نے برہمن کو متعدد مرتبہ انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ایک دفعہ فرائض منصبی سے خوش ہو کر ایک ہاتھی انعام عطا کیا۔ چند سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے ایک دفعہ رانا اودے پور کی خدمت میں بھی بھیجا گیا۔

دارا شکوہ برہمن کی نظم و نثر کا گرویدہ تھا۔ اس لیے اس کو اپنا میر منشی مقرر کیا۔ دارا جب قندھار کی مہم پر گیا تو برہمن بھی ہم رکاب تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامی سعد اللہ کی وفات کے بعد برہمن پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا۔ اور دفتر شاہی میں میر منشی کے فرائض انجام دیتا رہا اور رائے کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔ عالمگیر جب تخت نشین ہوا۔ تو اس موقع پر اس نے یہ رباعی کہی ؎

شاہا عالم مطیع فرماں تو باد　　لبریز ادائے شکر احسان تو باد
چوں ذات تو خلق را گمراہ باشد　　ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

برہمن کیونکہ دارا کا حامی تھا۔ اس لیے ایک خط میں اورنگ زیب عالمگیر سے یہ شعر لکھ کر اپنے قصوروں کی معافی مانگی ؎

شدیم پیر بہ عصیاں و چشم آں دارم
کہ جرم ما بجوانانِ پارسا بخشد

عالمگیر کے دور حکومت میں وہ جہانگیر کے مقبرہ کی نگرانی کے لیے بھی مامور کیا گیا تھا۔

منشآت برہمن سے پتہ چلتا ہے کہ برہمن کے تین بھائی اور ایک بیٹا تھا۔ اودے بھان عاقل خان ناظم شاہجہان آباد کی سرکار میں ملازم تھا۔ اور متصدی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی رائے بھان اور اندر بھان تارک الدنیا ہو کر درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ منشآت میں جو خطوط برہمن نے اپنے ان دونوں بھائیوں کو لکھے ہیں۔ ان سے اس کی برادرانہ محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے۔ برہمن کو اپنے بیٹے تیج بھان سے بھی محبت تھی۔ ایک خط میں اُسے عربی و فارسی کی تحصیل کے لیے تلقین کی۔ اس ایک بیٹے کے سوا دوسری کسی اولاد کا حال معلوم نہیں۔

بیلؔ صاحب نے لکھا ہے کہ برہمن نے آگرہ میں ایک اچھی رہائش گاہ بنوائی تھی جس کے آثار اب ناپید ہو گئے ہیں۔ "امرائے ہنود" میں ہے کہ اب تک آگرہ میں ایک باغ "باغ برہمن" کے نام سے مشہور چلا آ رہا ہے۔ تفریح العمارات میں برہمن کی بہت سی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔

اس کی سیرت کے متعلق تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ برہمن سلیم الطبع، صوفی منش، مرنجان مرنج اور صلح کل مشرب کا دلدادہ تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے کہ "ہر چند بصورت ہندو ست۔ لیکن دم در اسلام مے زند" اپنی تحریروں میں وہ ہندوانہ مراسم کا ذکر نہایت تعظیم اور عزت سے کرتا ہے۔ صاحب "مراۃ الخیال" نے اسے "زنّار دار" کہا ہے۔ وہ بھی اپنے لیے "زنّار دار" کہنا پسند کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں اس نے اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے ؎

مرا برشتۂ زنّار الفتی خاص است　　بیادگار من از برہمن ہمیں دارم

وہ گداز طبیعت کا مالک تھا۔ دل میں انسانی ہمدردی کی شمع روشن تھی۔ ضرورت مندوں کی خدمت کرنا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ منشآت میں بے شمار سفارشی خطوط ملتے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف امرا کو لکھے ہیں۔ اور مفلوک الحال ابنائے وطن کے لیے ان سے اعانت کی درخواست کی ہے۔

دارا شکوہ کی سرکار میں برہمن کا رتبہ بہت بلند تھا۔ دارا بھی اس کی نظم و نثر اور طرز بیان کا دلدادہ تھا۔ تذکروں میں آیا ہے کہ ایک دفعہ دارا کو برہمن کی ایک غزل بے حد پسند آئی اور خصوصاً غزل کا یہ شعر سن کر سر دھننے لگا ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

وہ برہمن کو لے کر شاہجہاں کے حضور میں حاضر ہوا۔ اور غزل کی تعریف کی۔ فرمائش پر برہمن نے اپنی غزل سنائی۔ جب مذکورہ شعر شاہجہاں نے سنا تو اس کی بے باکانہ جسارت پر آگ بگولا ہو گیا اور برہمن کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم نے جو برہمن کے مربی اور قدر دان تھے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ حضرت سعدی شیرازی بہت پہلے فرما گئے ہیں ؎

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ برند
چوں بیاید ہنوز خر باشد

اس سند کے سننے سے بادشاہ کا غصہ فرو ہوا۔ اور غریب برہمن کی جان بچ گئی۔ اس روایت کی صحت میں کلام نہیں۔ لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ برہمن اپنے وقت کا آتش نوا شاعر تھا۔ اور دارا شکوہ کی سرکار میں اُسے خصوصیت حاصل تھی۔

مختلف تذکروں اور منشآت میں برہمن کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) تحفۃ الفصحا
(۲) گلدستہ
(۳) تحفۃ الانوار
(۴) نگار خانہ
(۵) مجموعۃ الفقرا
(۶) منشآت
(۷) دیوان
(۸) چہار چمن

(۹) فارسی زبان کا ایک تذکرہ بھی برہمن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

(۱۰) برٹش میوزیم کی مطبوعہ کتابوں میں "نازک خیالات" کے نام سے "آتم بلاس" کسی سنسکرت کتاب کے ترجمے کا بھی ذکر ہے۔

(۱۱) خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی میں "مکالمات بابا لال" کو بھی برہمن کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

بابا لال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا۔ لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) میں تھا۔ میاں جیو کا دوست تھا اس لیے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی۔ اپنی کتاب "شطحیات" میں بابا لال کے متعلق لکھتا ہے:۔

"بابا لال مندیہ کہ از کمال عرفاست و در ہنود بعرفان و متانت وے کسے دیدہ نشدہ مرا گفت۔ ہر قومے عارف و کامل مے باشد کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ بہ برکت او آں قوم را نجات مے دہد و تو منکر ہیچ قومے مباش" (ص ۲۳ مجتبائی)

مجمع البحرین میں بابا لال بیراگی کا نام مسلمان صوفیہ کرام کے ساتھ آیا ہے (ص ۲۶) دارا شکوہ ۱۰۶۲ھ میں قندھار کی مہم سے واپس آیا۔ تو لاہور میں بابا لال سے ملا۔ اور دونوں کی گفتگو سات مجلسوں میں ختم ہوئی۔ ان مکالموں کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندر برہمن نے قلمبند کر لیا تھا۔

برہمن کی تصانیف ہیں۔ منشآت۔ دیوان اور چہار چمن بہت مشہور ہیں۔

برہمن کی نثر صاف اور سلیس ہے۔ لیکن اس کی فارسی پر ہندوستان کا رنگ چڑھا ہوا ہے مثلاً وہ ہند کی عمارتوں کا حال اس طرح لکھتا ہے۔

"عمارات منازل جنت مشاکل سرکار نواب نامدار کہ بمقتضائے حسن مکان و وسعت فضا و غایت
صفا بانواع آرائش و آراستگی یادہ از قطع بہشت سے داد۔ تماشا نمودہ در ہر مکان و ہر محل دعائے
دولت نواب فرشتہ صفات را وردِ زبان ساخت" (منادید عجم ص۲۴۳)

نظم میں حلاوت و شیرینی ہے۔ سادہ بیانی اس کی شاعری کی جان ہے۔ اردو اور فارسی میں اس کا کلام ملتا ہے۔ اس کی ایک غزل اردو زبان میں لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۵۰۷ پر لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے　　نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یارو　　نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالہ ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے　　نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل بانجب دیکھے ہوں　　نہ برچھی ہے نہ کرچھ ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

زبان کی قدامت سے قطع نظر مضامین کی نفاست اور سادگی ہر شعر میں جھلک رہی ہے۔

فارسی میں مضامین عالی نظم کئے ہیں خصوصاً غزل میں ہر شعر ذوق سلیم کا شاہد ہے۔ برہمن کی مثنوی میں واقعات نہایت خوبی سے نظم ہوئے ہیں مثلاً باغ کی تعریف کس لطیف انداز میں کرتا ہے ؎

دریں گلشن ز گلہا دستہ دستہ　　صبا در ہر طرف گلدستہ بستہ
ہوائش دلکشا و دل نشین است　　طراوت خانہ زاد این زمین است
شگفتہ ہر طرف گلہائے لالہ　　گرفتہ برکف عشرت پیالہ
چو دیدم آب و رنگ بوستاں را　　صلائے عیش دادم دوستاں را

زباں در وصفِ گل بے تاب گردید
سخن تا بر لب آمد آب گردید　　(منادید عجم صفحہ ۲۴۴)

برہمن کی دوسری تصانیف بھی اہم ہیں لیکن چہار چمن ایک خاص قسم کی انشا ہے۔ جس میں سادہ اور صاف انداز بیان میں شاہجہان کے زمانے کی کچھ بیش بہا معلومات یکجا کر دی ہیں۔ عالمگیریات کے سب سے بڑے ماہر سر جدو ناتھ سرکار نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور غالباً وہ پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اس کتاب سے پورا پورا استفادہ حاصل کیا ہے۔ اور اس دور کی تاریخ کا بڑا اہم ماخذ قرار دیا ہے۔

چہار چمن میں شاہجہان اور اورنگ زیب کے امرا کے تفصیلی حالات بھی ملتے ہیں۔ اس میں شاہجہان کی روزمرہ زندگی کا پروگرام بھی درج ہے۔ اور ان واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جو چندر بھان برہمن کو شاہجہان کے دربار میں پیش آئے۔ وہ مختلف اوقات میں شاہنشاہ

کی خدمت میں پیش ہوتا رہا۔ اور اکثر موقعوں پر اس نے غزلیں بھی پیش کیں اور انعامات بھی حاصل کئے۔
اس کتاب کا ایک حصہ شہر لاہور کے باغات اور عمارت کے بارے میں بھی ہے۔ آخر میں جو خطوط ہیں۔ جن میں سے اکثر منشآت میں درج کر دیئے ہیں۔ اس میں ایک خط اس کے بیٹے تیج بھان کے نام ہے۔ جس میں اس زمانے کی تعلیم اور تعلیم کے مقاصد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ برہمن کے معاصرین میں سے ملا قدسی نے اس کے بارے میں یہ شعر کہا تھا ؎

چو ار چمن ساخت برہمن
مے زند از عالم دیگر سخن

یہ کتاب بھی اس کی دوسری تصانیف کی طرح غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے زیادہ کثرت سے دستیاب نہیں ہوتے۔
برہمن با الکمال ہندو انشا پرداز شاعر و مورخ لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اور داراشکوہ کے قتل کے بعد تارک الدنیا ہو گیا۔ دنیا کے جھگڑوں سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی اور یاد خدا میں مشغول ہو گیا۔ آخر اسی حالت میں ۱۰۷۳ھ میں بنارس میں انتقال کیا۔

محمد صالح کنبو (المتوفی ۱۰۸۵ھ)

شیخ عنایت اللہ لاہور کے کنبوؤں میں سے تھے۔ جنھوں نے اپنی خداداد قابلیت سے شاہجہان کے دربار میں میر منشی کے عہدہ جلیلہ تک رسائی حاصل کی۔ حضور شاہی میں ان کی باریابی کی تقریب بھی بغیر کسی سفارش کے عمل میں آئی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک مفلوک الحال اور پریشاں روزگار برہمن نے ایکدفعہ شیخ صاحب سے شاہنشاہ کے نام اپنی لڑکیوں کی شادی کے لیے امداد حاصل کرنے کے واسطے ایک عرضداشت لکھوائی۔ شیخ موصوف نے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو سطریں لکھ کر حوالہ کیں۔ درخواست کا مضمون یہ ہے :-

"جہاں پناہا! ایں عاجز بہ بار دو عاجزہ عاجز ؎
چوں عاجز رہانندہ دانم ترا — دریں عاجزی چوں نخوانم ترا
فدوی فلاں برہمن"

اس مختصر تحریر میں فصاحت و بلاغت سے قطع نظر صنعت ایجاز سے شیخ صاحب نے جس قابلیت سے کام لیا ہے وہ علم بیان و معانی جاننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔

شیخ عنایت نے عمر بھر منشی گری کی خدمات انجام دیں۔ اسی لیے انھیں شستہ فصیح اور ادبی فارسی لکھنے میں ایک خاص ملکہ تھا۔ بہار دانش ان کی تصنیفات میں ایک اہم اور مشہور کتاب ہے۔ اگرچہ یہ کتاب "تریاچرتر" یعنی عورتوں کے مکر و فریب کی داستانیں لیے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی شستگی، عبارت آرائی اور فصاحت میں کلام نہیں۔ زبان فصیح ہے اور اعلیٰ انشا کے نمونے اس کتاب میں کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی نثر کے گراں بہا آثار میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ نفس مضمون شائستگی و تہذیب کے منافی ہے۔ لیکن بیان کی شستگی و برجستگی کے وافر نمونے اس میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔
ان کی ایک اور کتاب انشائے اشرف الصحائف کے نام سے ہے۔ اس میں دو دو رقعے ایسے ہیں۔ جن میں کوئی حرف منقوط نہیں آنے دیا۔ اسی طرح صنعت مہملہ میں بادشاہ کی تعریف میں ان کا قصیدہ بھی ہے جس کے دو شعر نمونے کے طور پر ذیل میں درج ہیں ؎

عماد عالم و عادل، سوار عرصۂ ملک — اساس طارم اسلام و سرور عالم
ہم او وہم دل و دار عدل را عماد — ہم او وہم حرم او دوائے ملک را مرہم

اس باکمال ادیب نے ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں وفات پائی۔ اور لاہور میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر محمد صالح کمبو نے جو مقبرہ بنوایا تھا۔ وہ آج تک موجود ہے۔

شیخ عنایت اللہ کی ادب نواز آغوش میں محمد صالح کمبو[1] کی تربیت ہوئی۔ کیونکہ شیخ مذکور کی رسائی دربار شاہی تک پہلے ہی سے تھی۔ اس لیے صالح کمبو کو اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ ان کی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے۔ اور آخر وہ صوبۂ لاہور کے دیوان کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جو مسجد محمد صالح کے نام سے آج بھی اندرون موچی دروازہ موجود ہے۔ لالہ کنہیا لال مصنف تاریخ لاہور نے لکھا ہے:۔

"یہ عجیب و غریب مسجد موچی دروازے کے اندر ہے۔ جو کوئی موچی دروازے سے شہر میں داخل ہوتا ہے تو سامنے اسی مسجد کی عالیشان و رنگین عمارت نظر آتی ہے۔ چھوٹی سی مسجد نہایت مقطع و خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ سب عمارت اس کی خشتی پختہ و پختہ کار بنی ہوئی ہے۔ تینوں گنبد مدوّر صورت عمدہ شکل کے ہیں۔ مسجد کے تینوں محرابوں کے اوپر اور گوشوں کی دیواروں پر کاشی کا کام زرد رنگ کا ہو رہا ہے۔ اور اسی میں حروف لاجوردی رنگ کے لکھے ہیں۔ اکثر آیات قرآنی و احادیث و عبارت فارسی اس پر تحریر ہیں۔ کاشی کا رنگ اب تک ایسا شوخ نظر آتا ہے۔ گویا آج ہی طاقچہ بنایا گیا ہے اور آج ہی نقش و حروف لکھے گئے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر ۱۰۷۰ھ میں ختم ہوئی اور منشی محمد صالح دیوان پنجاب نے اس کو تعمیر کیا۔"

یہ مسجد آج سے تقریباً تین سو گیارہ (۳۱۱) سال قبل کی بنی ہوئی ہے۔ شاہی مسجد اور مسجد وزیر خان کے بعد نفاست میں اسی کا درجہ ہے۔ مسجد کے دروازے پر یہ شعر مرقوم ہے ؎

بانی ایں مسجد زیبا نگار — بندۂ آل محمد صالح است[2]

مصنف کی حیثیت سے منشی محمد صالح کمبو کا درجہ بہت بلند ہے۔ عمل صالح ان کی ایک ایسی عظیم تصنیف ہے جس کی وجہ سے وہ رہتی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ تاریخ شاہجہان کی پیدائش سے لے کر قید و وفات تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی ۳۰ سالہ حکومت سے لیکر موت تک کے اہم ترین واقعات اس میں ملتے ہیں۔ شاہجہانی دور کی تاریخ کا یہ ایک ایسا ماخذ ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اکثر واقعات کو مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ وقائع کی نقل میں نہایت انصاف اور چھان بین سے کام لیا ہے اور حقیقت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگرچہ ملخص مرتبہ محمد طاہر آشنا المخاطب بہ عنایت خان۔ شاہجہان نامہ مصنفہ منشی محمد صادق المخاطب بہ صادق خان۔ شاہجہان نامہ (نامکمل) مصنفہ مرزا جلال طباطبائی اصفہانی۔ شاہجہان نامہ مصنفہ علاء الملک تونی المخاطب بہ فاضل خان۔

---

[1] پروفیسر ڈوسن نے میر صالح کشفی کو عمل صالح کا مصنف سمجھا ہے جو غلط ہے کیونکہ کشفی نے ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی اور عمل صالح ۱۰۷۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کا مادۂ تاریخ لطیفۂ فیض الٰہی ہے۔ ۱۰۷۰ [2] اس مصرع سے مترشح ہوتا ہے کہ محمد صالح سادات میں سے نہ تھے نیز کوئی سید کمبو نہیں کہلاتا (کسری)

اقبال نامہ مصنفہ معتمد خان۔ بادشاہ نامہ مصنفہ محمد امین بن ابوالحسن قزوینی مرزا امین۔ بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری اور بادشاہ نامہ مصنفہ محمد وارث سے شاہجہانی دور کے متعلق ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اوران میں بھی واقعات کا بیان شاہجہانی نقطۂ خیال کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن عمل صالح میں جس اہتمام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے اس تاریخ کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے۔

فارسی نثر میں یہ کتاب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ فارسی زبان کو مسجع عبارتوں میں بعض بعض جگہ ایسا مزین کیا گیا ہے کہ وہاں مستانہ وار جھومنے لگتا ہے۔ یہ کتاب متقدمین کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس دور کی اکثر شخصیتوں کے حالات اس میں آگئے ہیں۔ جن سے عام تذکرے خالی ہیں۔ شاہجہانی دور کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے یہ تاریخ کبھی عمومی تاریخ کو جو کر نظرانداز نہیں کی جائے گی۔ یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کی تھی۔ اب انجمن ترقی ادب لاہور نے بھی اسے شائع کر دیا ہے۔

ملا محمد صالح کمبو کی ایک اور نادر تصنیف بہار سخن ہے۔ مولانا شبلی نے اسے بہارستان سخن کہا ہے۔ لیکن دوسرے تذکرہ نویس اس کو بہار سخن ہی کا نام دیتے ہیں۔ یہ ملا صالح کی فارسی نثر نگاری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

بہار سخن چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں امرا و سلاطین کے خطوط ہیں۔

دوسرے حصے میں مؤلف کے ذاتی مکتوبات ہیں۔

تیسرے حصے میں شاہجہان آباد۔ آگرہ اور لاہور کی عمارات کا تذکرہ ہے جو مسجع و مقفیٰ عبارت میں تحریر کیا گیا ہے۔

چوتھے حصے میں اس دور کی تصانیف پر تقاریظ لکھی ہیں۔ ان میں تیسرا اور چوتھا حصہ خاص طور پر اہم ہے۔ عمارات۔ فن تعمیر اور اس فن کی اصطلاحات کا ذکر خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ملا صالح نے خود بھی کچھ عمارات بنوائیں۔ اور اس دور میں دوسرے امرا نے بھی لاہور کو عروس البلاد بنانے کی کوشش کی۔ یہ دور کاشی کاری کا بہترین دور تھا۔ کاشی کاری میں جس قدر بہترین نمونے ہمیں اس دور میں ملتے ہیں دوسرے دوران سے یکسر خالی ہیں۔ ملا صالح نے اس فن کے بارے میں بہت سی معلومات یکجا کر دی ہیں۔ مگر اس کی رنگین نگاری کی وجہ سے بہت کم لوگوں نے اس سے کما حقہٗ استفادہ حاصل کیا ہے۔

چوتھے حصے میں ملا محمد صالح نے تقاریظ لکھتے وقت صاحب کتاب کے حالات اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر درج کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے مصنف ہیں۔ جو ان کے عزیز اور قرابت دار تھے۔ بعضوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور بعضوں سے انھیں ملنے کا اتفاق تھا۔ اس واسطے یہ حالات ہمیں اس زمانے کے تذکروں میں نہیں ملتے۔ اس دور کی ادبی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ہم اس حصے کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ اسے ایک نہایت اہم ماخذ قرار دیتے ہوئے مستفیض ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کتاب اس زمانے کی فارسی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیونکہ خیال بندی کا آغاز بھی اسی دور سے شروع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ پبلک لائبریری لاہور میں اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب[1] ۱۶۵۹ء کی تصنیف ہے یا یہ کتاب[2] ۱۰۷۲ھ میں مرتب ہوئی۔

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۲۷ [2] مضمون محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ عالمگیر تاریخ نمبر ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۶۸

اس باکمال مورخ اور انشا پرداز کے حالاتِ زندگی درطۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ اس جید عالم و فاضل نے جہاں ادب فارسی کی خدمت کی ہے۔ وہاں اپنی جنبش قلم سے ہزاروں باکمال شخصیتوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بھی کیا ہے۔ کسی تذکرہ نویس نے ان کے مکمل حالاتِ زندگی لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ عمل صالح میں بس اسی قدر مرقوم ہے۔

"کمترین داعیان دولت ابد پیوند بود"

بجز شیخ عنایت اللہ مصنف بہار دانش اور مولانا ابوالبرکات منیر کے احوال سے جو اس کتاب کے آخر میں مندرج ہیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ شیخ عنایت ہی سے تلمذ حاصل تھا۔ اور ان ہی کی زیر تربیت ترقی کے منازل طے کئے۔

ملا محمد صالح کمبو کا نام۔ شیخ عنایت سے ان کا رشتہ اور چند دوسری معلومات سے متعلق ایک پراز معلومات تحریر ماہنامہ عالمگیر لاہور کے تاریخ نمبر ۱۹۴۲ء میں میرے محترم دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ جسے بجنسہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"تاریخ ہند میں ایلیٹ صاحب نے میر محمد صالح خوشنویس[1] پسر میر عبداللہ مشکیں قلم جو فارسی میں کشفی تخلص کرتا تھا کے نام کیساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

"اس میں شک نہیں کہ محمد صالح وہی آدمی ہے۔ جس نے اپنی کتاب میں اپنا نام خوشنویسوں کے زمرے میں لکھا ہے[2]۔"

حالانکہ خوش نویس مذکور کی وفات کا حال عمل صالح میں ۲۴ سنہ جلوس مطابق ۱۰۶۱ھ کے واقعات میں موجود ہے۔ صاحب موصوف کو یہ خیال غالباً کرنیل لیس کے اس قول سے پیدا ہوا۔ جو اس نے بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری کے باب میں رائل ایشاٹک سوسائٹی کے جرنل (جلد سوم سلسلہ جدیدہ) میں شائع کرایا ہے۔ یعنی

"بادشاہ نامہ کی دوسری جلد کا وہ نسخہ جو طبع "ببلیو تھیکا انڈیکا" کی خاطر استعمال کیا گیا۔ بہترین قلمی نسخہ ہے جو میری نظر سے گزرا۔ یہ محمد صالح کمبو مصنف عمل صالح کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور اس کے حاشیہ پر شاہجہان کے دستخط ثبت ہیں۔"

لیکن مولوی غلام یزدانی صاحب پروفیسر السنۂ شرقیہ گورنمنٹ کالج راجشاہی کا بیان ہے کہ

"میں نے اس بات کی تحقیق و تصدیق کے لیے اصل نسخہ کا بچشم خود ملاحظہ کیا۔ مگر اس پر محمد صالح الکاتب لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کرنیل لیس نے اسے محمد صالح کمبو کس بنا پر قرار دیا۔

(دیباچہ عمل صالح مطبوعہ رائل ایشاٹک سوسائٹی بنگال)

اس عہد کی دیگر کتب تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک محمد صالح الکاتب یا میر محمد صالح خوشنویس میر عبداللہ مشکیں قلم کا

---

[1] خوشنویس مذکور کے حالات کے لیے بادشاہنامہ عبدالحمید لاہوری کے صفحات ۴۱م-۳۵۵ اور ۷۹۶ ملاحظہ ہوں۔

[2] تاریخ ایلیٹ جلد ہفتم صـ ۱۲۳

فرزند تھا۔ جسے ۱۰۵۶ھ میں شاہی کتب خانہ کی داروغگی تفویض ہوئی تھی۔ چنانچہ مذکور ہے۔

"درسنہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری خدمت داروغگی کتب خانہ معلیٰ از رشید اسیٔ خوش نویس
بار مفوض شدہ بود۔"

اور بہت ممکن ہے کہ اس حیثیت سے اس نے شاہی کتب خانے کے لیے کتابیں بھی نقل کی ہوں۔ اور دوسرا میر محمد صالح روشن قلم کا بھائی تھا۔ جسے بھائی کی وفات کے بعد فرمان نویسی کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے میر محمد صالح فرمان نویس اور میر محمد صالح خوشنویس داروغہ کتب خانہ معلیٰ دو جداگانہ ہستیاں ہیں۔ اور عمل صالح میں دونوں کے مناصب الگ الگ مندرج ہیں۔ چنانچہ میر محمد صالح فرمان نویس پانصد بیست سوار کے منصب سے سرفراز تھا۔ اور میر محمد صالح داروغہ کتب خانہ نعمدی بعد سوار کے منصب سے ممتاز تھا۔ میر محمد صالح فرمان نویس اور میر محمد صالح کمبو کو ایک ہستی تسلیم کرنا بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شیخ عنایت اللہ کی طرح جسے کوئی خطاب نہ ملا تھا۔ اور جس کا ذکر دو تین بار نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے۔ روشن قلم کا ذکر عمل صالح میں ضرور آتا۔ حالانکہ فرمان نویسی کی خدمت کا تذکرہ جو بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری میں درج ہے۔ عمل صالح میں موجود ہے۔

عہدہ حاضرہ کے تمام مورخین شیخ عنایت اللہ کو (علی حسب اختلاف الروایات) محمد صالح کمبو کا ہم زلف اور برادر حقیقی قرار دیتے ہیں۔ لیکن عمل صالح کے مطالعہ سے اس جماعت کا قول جو برادر حقیقی کا دعویدار ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ محمد صالح نے اپنے نام کو ہر مقام پر "آں محمد" کے لقب سے زینت دی ہے اور یہ صرف سادات کے لیے جائز ہے۔ لیکن عنایت اللہ کو ہر جگہ شیخ عنایت اللہ لکھا ہے۔ ان مورخین کو یہ غلط فہمی غالباً "برادر کلاں" کے الفاظ سے پیدا ہوئی ہے جس سے محمد صالح نے شیخ موصوف کو ہر بار خطاب کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان میں "برادر" کا خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق برادر حقیقی، عم زادہ اور ہم زلف سب پر یکساں ہوتا ہے۔

ملا محمد صالح کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی تحقیق نہیں ہو سکی اور وفات کے باب میں مختلف اور متضاد روایات بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ سید محمد لطیف اپنی مشہور کتاب "تاریخ لاہور" کے صفحہ ۲۰۹ پر لکھتے ہیں کہ محمد صالح ۱۰۸۵ھ میں فوت ہوا اور صاحب تحقیقات چشتی اس کی وفات اس سے دس سال قبل بیان کرتے ہیں۔ لیکن تعجب انگیز یہ بات ہے کہ محمد صالح نے شیخ عنایت اللہ کی وفات کا ذکر جو ۱۰۸۰ھ میں واقع ہوئی تھی اپنی کتاب عمل صالح میں کیا ہے۔ ایسی صورت میں ۱۰۷۵ھ میں اس کا انتقال کر جانا کسی حالت میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں عمل صالح کی وہ عبارت جو پبلک لائبریری لاہور کے قلمی نسخے کے اختتام پر مرقوم ہے۔ اور جو یہاں بجنسہٖ نقل کی جاتی ہے۔ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ اس کا رشتۂ حیات ۱۱۲۰ھ تک منقطع نہیں ہوا تھا:۔

"ختم شد نسخۂ عمل صالح من تصنیف جامع الکمالات صوری و معنوی میاں محمد صالح سلمہ اللہ تعالیٰ
روز یک شنبہ بتاریخ بست و ہفتم صفر سنہ ۳ جلوس والا مطابق سنہ ۱۱۲۰ھ"

یہ مورخ بھی اپنی وفات کے بعد اپنے آبائی مقبرہ میں شیخ عنایت اللہ کے پہلو میں دفن ہوا۔ یہ مقبرہ ایمپرس روڈ پر ریلوے کے جدید دفاتر کے متصل واقع ہے اور گنبد کمبوہاں کہلاتا ہے۔ یہ عمارت سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ اس کی شکل ہشت پہلو ہے۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں اسے بارود خانہ میں تبدیل کیا گیا۔ انگریزی عہد میں یہ مقبرہ ایک کوٹھی ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک یہ "سیمور صاحب کی کوٹھی" کہلاتا رہا جس کے گنبد یا درچی خانہ اور گھی خانہ کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ اب اس کے ساتھ دو اور کمرے شامل کر کے اسے گرجے کے طور پر استعمال

کیا جا رہا ہے۔ آج کل یہ مقبرہ "سینٹ اینڈریوز پارش چرچ" کے نام سے موسوم ہے۔"

فاعتبروا یا اولی الابصار

گولڈنگ اور تھارن ٹن (۱۸۶۰ء — ۱۹۲۴ء)

کرنل ایچ۔ آر۔ گولڈنگ (H.R. GOULDING) کی کتاب قدیم لاہور (OLD LAHORE) ۱۹۲۴ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور سے چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو دو برس ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مسلسل شائع ہوتے رہے تھے۔ مسٹر میکلیگن (MACLAGAN) نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اس بات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ کرنل گولڈنگ نے یہ کتاب لکھ کر یورپین باشندوں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ قابلِ قدر ہیں۔ کرنل گولڈنگ کا تعلق لاہور کے ساتھ تقریباً نصف صدی تک رہا۔ لاہور اور اس کی عمارتوں سے کرنل گولڈنگ کو جو محبت تھی۔ یہ کتاب اس کا ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ اس نے اس کتاب میں انارکلی کا مقبرہ۔ لارنس کا مجسمہ۔ بادشاہی مسجد اور بدھو کا آوا کے حالات شامل کئے ہیں۔ یہ کتاب قدیم لاہور۔ لاہور کی عمارات اور شاہراہوں وغیرہ وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہے اور ۸۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

کرنل گولڈنگ نے اپنی کتاب قدیم لاہور میں بطور ضمیمہ مسٹر جے۔ ایچ تھارن ٹن (J.H. THORNTON) سیکرٹری حکومت پنجاب کا ایک طویل مقالہ بھی شامل کیا ہے۔ یہ مقالہ ۱۸۶۰ء میں ایک (LAHORE) کے نام سے ایک محدود ایڈیشن کی صورت میں شائع ہوا تھا جو ایک مدت سے کمیاب تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اسے مسٹر گولڈنگ نے اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ دوبارہ شائع کر دیا۔

مسٹر تھارن ٹن کا مقالہ صفحہ ۵۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۴ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تاریخ لاہور سے متعلق ہے۔ یعنی لاہور کا نام اس کی تاریخ اور بنیاد۔ لاہور اسلامی دور سے پہلے۔ اسلامی دور میں اور سکھوں کی حکومت میں۔ یہ ایک تاریخی داستان ہے۔ دوسرا حصہ بیانیہ ہے۔ یعنی لاہور کا محل وقوع۔ رقبہ۔ مختلف ادوار میں شہر لاہور کی حالت۔ لاہور اسلامی دور سے قبل۔ اسلامی دور میں اور سکھوں کے زمانے میں۔

گولڈنگ ۱۹۲۴ء:۔ کرنل گولڈنگ نے لاہور کا جو نقشہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ ہمارے زمانے میں بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ بہت سے مقامات کے نام تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور بہت سی عمارات کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے۔ اگر قدیم لاہور کا یہ تذکرہ ہم تک نہ پہنچتا۔ تو بہت سی پرانی باتیں معلوم نہ ہو سکتیں۔ شہر لاہور کے متعلق تحقیق کرنے میں یہ کتاب نہایت کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہے مثلاً مقبرہ انارکلی کے سلسلے میں مصنف نے بتایا ہے کہ کس طرح اس عمارت کو گرجا کے طور پر مدتوں استعمال کیا جا چکا ہے۔ البتہ کرنل گولڈنگ کو مقبرۂ انارکلی کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ اور اس افسانے کو حقیقت سمجھتا تھا کہ انارکلی شہنشاہ اکبر کی ایک کنیز تھی جسے ۱۵۹۹ء میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ اور شہنشاہ جہانگیر نے ۱۶۱۵ء میں یہ مقبرہ تیار کروایا تھا۔ بر سبیل تذکرہ مصنف نے یہ نشان دہی بھی کی ہے۔ کہ بعض تاریخی عمارات میں سرکاری دفتر قائم رہے ہیں۔ اور بعض میں اہم شخصیتیں متمکن رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ریلوے اسٹیشن کے قریب والی اٹکہ کی مسجد میں لاہور کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر ہنری کوپ (HENRY COPE) ۱۸۵۰ء-۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں فروکش رہے تھے اور اس کے بعد یہ مسجد ریلوے ٹریفک منیجر کا دفتر بنی رہی تھی۔ اسی طرح محمد قاسم خاں جو شہنشاہ اکبر کا عزیز تھا۔ اس کے مقبرے کا حال ہے۔ محمد قاسم خان پہلوانوں کا مربی تھا چنانچہ اس کے مقبرے کو گنبد کشتی والا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سکھوں کے دور میں جمعدار خوشحال سنگھ نے اسے اپنے مکان کے طور پر استعمال کیا۔

حکومت پنجاب نے اس کو راجہ تیج سنگھ سے جائداد کے بدلے میں حاصل کیا۔ مارچ ۱۸۵۱ء سے ۱۸۵۲ء تک گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر جاری رہی۔ اب یہ مقبرہ گورنمنٹ ہاؤس میں شامل ہے۔ اور مسجد شاہ چراغ مدتوں اکونٹنٹ جنرل کا دفتر رہی ہے۔ اور جن دنوں مصنف نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس مسجد میں سشن کورٹ قائم تھی۔ جنرل پوسٹ آفس اب سے پہلے ایک پرانی بارک نما عمارت میں قائم تھا۔ یہ عمارت ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ موجودہ جنرل پوسٹ آفس تعمیر کیا گیا جس کی عمارت بہت خوبصورت ہے جو بقول مصنف بیس برس پہلے تعمیر ہوئی۔ اس تمام علاقے میں فوجی عمارتیں گرا کر جنرل پوسٹ آفس، پبلک لائبریری اور سیکرٹریٹ تعمیر کئے گئے۔

اب جہاں گورنمنٹ کالج ہے، سکھوں کے عہد میں وہاں ایک فوجی بارک تھی۔ پرانی انارکلی میں فوجی بارکیں اور بنگلے تھے جن میں فوجی سپاہی اس وقت تک قیام پذیر رہے جب تک میاں میر کے قریب چھاؤنی کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سی پرانی بارکوں میں دفاتر وغیرہ قائم کئے گئے۔ انارکلی بازار اور گول باغ کے درمیان اس قسم کی دو بارکیں تھیں ان میں سے ایک میں لڑکوں کے لیے اور دوسری میں لڑکیوں کے لیے ہائی سکول قائم کئے گئے۔ انھیں بارکوں میں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے دفاتر بھی تھے۔ ان بارکوں کو گرا کر پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری تعمیر کی گئی۔ یہیں دن کے بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی۔ بیشتر اس کے کہ یہ توپ ٹیلیگراف دفتر لے جائی گئی۔ پھر وہاں سے لارنس گارڈن (جناح باغ) میں منتقل کر دی گئی۔

گورنمنٹ کالج کی عمارت ۱۸۷۷ء میں مکمل ہوئی۔ یہاں بھی پہلے ایک پرانی فوجی بارک تھی۔ گھوڑا اسپتال اور اس کے متعلق کالج جب تعمیر ہونے لگا، تو کرنل گولڈنگ نے ہی اس کا محل وقوع تجویز کیا اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ذریعہ حکومت کو رائے دی کہ موجودہ محل وقوع ہی اس عمارت کے لیے موزوں ترین ہے۔ اس سے قبل گھوڑا اسپتال ایک پرانے بنگلے میں تھا۔ جو اب میو اسپتال میں ضم ہو گیا ہے۔

شالامار باغ کے متعلق مصنف نے بیان کیا ہے کہ ایک زمانے میں یورپین جوڑے ماہ عسل (ہنی مون) منانے کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ ۱۸۴۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں اہلیان لاہور کے لیے شالامار یا شاہدرہ تک کا سفر آسان نہ تھا۔ کیونکہ راستے اتنے محفوظ نہ تھے۔ جتنے آج ہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے خاص انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ لاہور اور ان مقامات کے درمیان آبادی نہ تھی۔ شالامار کے متصل چبوترے کے دائیں جانب جو ڈاک بنگلہ تھا، وہ ہنی مون کے لیے اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہواخوری کے لیے جو یورپین لاہور آتے تھے۔ وہ بھی یہاں ہی ٹھہرنا پسند کرتے تھے۔ آخر میں مصنف نے شالامار باغ کے آموں کے درخت گرائے جانے پر سخت احتجاج کیا ہے۔ یہ درخت اس لیے گرائے گئے تھے تاکہ ان کی جگہ گلاب کے پودے لگائے جائیں۔

شاہدرہ کی سیر ڈولیوں اور ڈاک گاڑیوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ یہ سفر بقول مصنف کافی مہنگا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب شاہدرہ کا ریلوے اسٹیشن تعمیر ہوا، تو اسٹیشن سے ملحق رہائشی کوارٹر بھی بنائے گئے۔ جن میں یورپین افسر رہنے لگے۔ مقبرہ جہانگیر دریائے راوی کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سیلاب کے خطرے سے دوچار رہتا ہے۔ اس خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۱۸۵۴ء میں چھ ہزار روپیہ کی رقم چیف کمشنر نے منظور کی تھی تاکہ مقبرے کو سیلاب کی زد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ بارہ دری میں ۱۸۶۰ء کے بعد کچھ عرصے تک یورپین سپرنٹنڈنٹ کا قیام تھا۔ جس کے ماتحت راوی کا پل اور کشتیوں کا عملہ تھا۔ اس کے بعد یہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا رسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چھوٹے راوی کا پل ۱۸۵۲-۵۴ء میں لفٹننٹ فیگن (FAGAN) انجینئر انچارج نے تعمیر کیا تھا۔ یہ اتنا ناقص تھا کہ اس کا نام فیگن کی حماقت پڑ گیا۔ کیونکہ جب سیلاب آتا تھا۔ تو چھوٹے راوی کا پانی پل کو پار کر کے قلعے کی دیوار تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح اس پل کی تعمیر

محض بے کار ثابت ہوئی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن سے شالامار جانے والی سڑک کے سیدھی جانب ایک مقام بدھو کا آوا کہلاتا ہے۔ بدھو کا آوا اب معدوم ہو چکا ہے۔ جہاں وہ واقع تھا، وہاں ریلوے اسٹیشن کا ورکشاپ اور گودام تعمیر ہو چکے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں بدھو کا آوا لاہور کا سب سے بڑا آوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک افسانہ بھی مربوط ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ آوا اصل میں بدھو کا نہیں تھا بلکہ سدھو کا آوا تھا۔ سدھو شاہی کمہار تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں شاہی عمارات۔ محلات اور امرا کے مکانات کے لیے پختہ اینٹوں کی فراہمی اس کے ذمہ تھی۔ سدھو کے متعدد آوے تھے۔ جن میں سب سے اہم آوے کا نام سدھو کے لڑکے کے نام پر بدھو کا آوا پڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ میاں میرؒ کے مرید عبدالحق درویش ایک روز ہاتھ تاپنے بدھو کے آوے پر گئے۔ لیکن بدھو کے ملازمین نے درویش کو وہاں سے بھگا دیا۔ اس پر انھوں نے بددعا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آوا بے کار ہو گیا۔ بدھو نے ہزار توبہ کی۔ معافی مانگی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک فرانسیسی جنرل تھا جس نے بدھو کے آوے کے اوپر ایک خوبصورت مکان بنایا۔ جسے ۱۸۵۰ء میں اس لیے گرا دیا گیا کہ اس علاقے میں چھاؤنی تعمیر ہونا تھی۔ چنانچہ کرنل گولڈنگ نے اس حرکت کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے۔ یہیں بدھو کے آوے کی بارہ دری بھی تھی۔ جس کی اینٹوں کو فوجی بارکیں بنانے کے کام میں لایا گیا۔ بدھو کی قبر یا چھتری اب شکستہ حالت میں ہے۔

کرنل گولڈنگ نے مال روڈ کی تعمیر کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سڑک برصغیر پاک و ہند کی بہترین سڑکوں میں شمار ہوتی ہے۔ لفٹنٹ کرنل نیپیر (NAPIER) نے جو ان دنوں سول انجینئر تھے۔ ۱۸۵۱ء میں اس سڑک کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ سڑک انارکلی سے میاں میر تک جاتی ہے۔ کرنل نیپیر نے اس سڑک کی تعمیر پر دس ہزار چار سو اٹھائیس (۱۰۴۲۸) روپیہ خرچ ہونے کا تخمینہ لگایا۔ اس کی نیچے کی سطح پختہ اینٹوں اور اوپر کی سطح کنکر کی ہونا تھی۔ تاہم حکومت ہند کا اندازہ تھا کہ یہ سڑک شاہراہ عام ہو گی۔ اس لیے اس کو مضبوط بنانا فضول خرچی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہو گی۔ یعنی اینٹوں کی بجائے اوپر اور نیچے کی سطحیں کنکر ہی کی ہونا چاہئیں۔ اس سڑک کا نام مال روڈ قرار پایا۔

انارکلی سے میاں میر جانے والی سڑک اپر مال کیوں کہلائی جانے لگی۔ اس کا علم نہیں۔ ابتدا میں صرف ایک ہی مال روڈ تھی جس کو اب لوئر مال روڈ کہا جاتا ہے۔ اور جو ڈپٹی کمشنر کی عدالت سے ملتان روڈ تک واقع ہے۔ ان دنوں لاہور قدیم کی معاشرتی زندگی کی آماجگاہ یہی سڑک تھی جو اب لوئر مال کہلاتی ہے۔ اور جو پہلے کی نسبت کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ یہاں سے گول باغ بھی کچھ دور نہیں۔ جہاں ہفتے میں دو بار بینڈ بجا کرتا تھا۔ غرض کہ تاریخی مال روڈ وہ ہے۔ جو سیدھی انارکلی سے میاں میر جا رہی ہے۔ میاں میر سے آتے ہوئے نہر پار کرنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف چٹیل میدان تھے۔ ایک دو منزلہ بنگلہ بھی تھا۔ جو بعد میں مہاراجہ پٹیالہ کی ملکیت قرار پایا۔ اور جس میں لاہور کا پادری (بشپ آف لاہور) رہا کرتا تھا۔ اور آگے چل کر اس سڑک پر لارنس گارڈن۔ لارنس ہال۔ منٹگمری ہال اور گورنمنٹ ہاؤس ہیں۔ پھر قدیم پنجاب کلب ہے۔ اس کے بعد نیڈوز ہوٹل پھر چیرنگ کراس۔ لارنس کا مجسمہ۔ مسجد شاہ چراغ جنرل پوسٹ آفس۔ ٹیلیگراف آفس ایف۔ سی کالج۔ عجائب گھر۔ ٹولنٹن مارکیٹ (TOLLINTON MARKET) الحمرا اسٹورز واقع ہیں۔

غرض کہ مصنف نے ان تمام مشہور عمارات کا حال بیان کیا ہے۔ جو دور انگریزی میں تعمیر ہوئیں۔ جو سابقہ ادوار کی یادگاریں تھیں۔ لیکن ان کی شکل بدل گئی ہے۔ سب سے قیمتی معلومات وہ ہیں جو ان عمارات کے متعلق ہیں۔ جن کا نام و نشان اب نہیں ملتا۔ لیکن جو مصنف

کے زمانے تک کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں۔

پرانی تاریخی عمارات مثلاً شاہدرہ۔ شالامار باغ۔ بادشاہی مسجد۔ سنی ہوئی یادگاریں۔ خصلاً بدھو کا آوا۔ سب کا حال اک یورپین مصنف کے اختلاف نظر سے تحریر کیا گیا ہے۔

تھارن ٹن ۱۸۶۰ء: مترجمہ۔ ایچ تھارن ٹن (J. H. THORNTON) نے اپنے مقالے کے تاریخی حصے میں شہر لاہور کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ مقالہ سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے ماخذ پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی دور سے پہلے لاہور کے متعلق کوئی مبسوط جائزہ نہیں ملتا۔ البتہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے اشارات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مثلاً راجپوتانہ اور کشمیر کے وقائع کے سلسلے میں لاہور کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ اسلامی زمانے میں شہر لاہور کی مسلسل تاریخ ہماری رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے۔ لیکن اس تاریخ کی نوعیت عمومی ہے۔ تاریخ فرشتہ نظام الدین احمد اور عبدالقادر کی تاریخوں میں یا تاریخ الفی یا اقبال نامہ جہانگیری میں اس شہر کے مخصوص حالات پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ عبدالمجید لاہوری کی تصنیف باسفینۃ الاولیا یا دوسری کتابیں جو مسلمان بزرگوں کے مقبروں سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات کو نظر انداز کرتی ہیں۔ اور غیر دلچسپ جزویات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ لاہور کے متعلق جو جو افسانے اور روایات عوام کی زبانوں پر ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی مبالغہ انگیز ہیں کہ نہ تو ان سے معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی لطف ہی موجود ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی تاریخ سے بے پروا ہیں۔ ہندوؤں کی روایات لاہور کو شہزادہ رامچندر جی کے بیٹے لوہ سے منسلک کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہندو راجاؤں کے عہد میں لاہور کو جنگ اور شجاعت کی روایات میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ ان روایات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ لاہور کی بنیاد راجپوتوں نے ڈالی۔ لاہور راجپوت ریاستوں میں سے قدیم ترین ریاست کا دارالحکومت تھا۔ اور جب ساتویں صدی سے دسویں صدی عیسوی تک ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے ہوئے۔ تو لاہور ہندو طاقت کا گڑھ تھا۔

لاہور کا نام تاریخ میں مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ موجودہ شہر لاہور کے علاوہ بھی لاہور نام کے شہر پرانے زمانے میں موجود تھے۔ ایک لاہور افغانستان میں بھی تھا۔ جہاں کسی زمانے میں راجپوتوں کی ایک نوآبادی تھی۔ دوسرا لاہور پشاور کے ضلع میں تھا۔ لوہار کے نام سے ایک شہر راجپوتانے کی ریاست میواڑ میں تھا۔ مسلمان مصنفین نے لاہور۔ لوہار۔ لوہر۔ لہاور۔ لھاور۔ لوہاور۔ لہانور۔ لہاوار کے نام سے لاہور کا ذکر کیا ہے۔ راجپوتانے کے وقائع میں لاہور کا نام لوہ کوٹ۔ لاوپور اور اس سے پہلے لوہاوار آیا ہے جو غالباً لاہور کا صحیح ترین نام بھی ہے۔ البیرونی نے بھی (جو محمود غزنوی کا معاصر اور مصاحب تھا اور جو ہندوستان کے ادب میں مہارت رکھتا تھا) یہ نام استعمال کیا ہے۔ لوہاوار سے مطلب قلعہ لوہ ہے اور لوہ کوٹ سے بھی یہی مراد ہے۔

لاہور کی بنیاد کب پڑی۔ یہ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے اختتام سے پہلے لاہور ایک بڑی ریاست کا دارالحکومت تھا۔ اسی طرح یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر پہلی صدی عیسوی میں لاہور موجود تھا۔ تو کم از کم اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔

لاہور نام کا کوئی شہر یونانی مورخین کے علم میں نہ تھا۔ اور نہ سکندر اعظم کے حملے کے سلسلے میں اس شہر کا کہیں نام آتا ہے۔ برنیز (BURNES) نے سانگلہ اور ایرین (ARRIAN) نے کتھوئی یا کیتھری کے نام کے دو شہروں کا تذکرہ کیا ہے جو راوی کے کنارے اسی جگہ آباد تھے جہاں اب لاہور واقع ہے تاہم اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر اعظم نے راوی کو لاہور کے قریب سے

پار کیا ہوگا۔ اور وہ وہیں سے گزرا ہوگا۔ جہاں اب لاہور جدید آباد ہے۔ قاہرہ کے رہنے والے یونانی الاصل جغرافیہ نویس تالمی (PTOLEMY) نے جو ۱۵۰ء میں زندہ تھا۔ ایک شہر کا ذکر کیا ہے جو لابوکلہ (LABOKLA) کے نام سے مشہور تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شہر لاہور سے پچیس میل کے فاصلے پر آباد ہوگا۔ اس لحاظ سے اسے لاہور قدیم کہا جا سکتا ہے۔

تھارن ٹن نے اسلامی دور میں لاہور کی تاریخ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ غزنویہ خاندان کا لاہور سے تعلق یوں ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود ثانی نے ۱۰۹۸ء سے ۱۱۸۶ء تک لاہور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ غوریوں اور خاندانِ غلاماں کے دور میں لاہور حکومت کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا۔ ۱۲۴۱ء میں چنگیز خاں کی افواج نے لاہور کو فتح کیا اور خوب تاخت و تاراج کیا۔ ۱۲۸۶ء میں شہزادہ محمد جو سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا تھا۔ منگولوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور راوی کے کنارے امیر خسرو کو منگولوں نے گرفتار کر لیا۔ خلجی اور تغلق خاندان کے زمانے میں لاہور کی کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی۔ البتہ گکھڑوں نے اس کو لوٹا۔ اور مغل یہاں آباد ہو گئے۔ چنانچہ مغلوں کی آبادی اب تک مغلپورہ کے نام سے موجود ہے۔ ۱۳۹۲ء میں تیمور نے لاہور کو فتح کیا۔ لیکن لوٹ مار نہ کی۔ غالباً یہ شہر متمول نہ تھا۔ اس کے بعد لاہور کبھی شاہانِ دہلی کے تسلط میں آجاتا تھا۔ اور کبھی گکھڑوں کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر لودھیوں کا قبضہ ہوا۔

اس کے بعد مغل دورِ حکومت شروع ہوتا ہے۔ ۱۵۲۴ء میں بابر نے لاہور کو فتح کیا۔ اگلے سال بابر نے دوبارہ فوج کشی کی۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کا دور لاہور کی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ یہ شہر شاہانِ وقت کی اقامت گاہ رہا۔ یہاں باغ لگائے گئے۔ مقبرے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ آبادی بڑھی۔ اور ابوالفضل کے الفاظ میں "یہ شہر تمام قوموں کی آماجگاہ بن گیا" آج بھی اس شہر میں مغل عمارات ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ہمایوں نے یہ شہر اپنے بھائی کامران کے حوالے کر دیا۔ شیر شاہ سوری اور ہمایوں کی طویل جنگ کے دوران لاہور مغلوں کا قلعہ تھا۔ جلاوطنی کے بعد ہمایوں جب ایران سے ہندوستان میں واپس آیا۔ تو اس نے ۱۵۵۴ء میں جشن منایا۔ ہمایوں کے مرنے پر یہ شہر اکبر کے بھائی مرزا حکیم کے قبضے میں آیا۔ جو ۱۵۶۳ء میں لاہور کا گورنر تھا۔ ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور اکبر کا دارالحکومت رہا۔ اکبر نے شہر سے باہر دو عمارات بنوائیں۔ ایک کا نام خیر پور تھا۔ جو یہودیوں۔ آتش پرستوں اور مسلمانوں کے واسطے تعمیر ہوئی۔ اور دوسری عمارت کا نام دھرم پورہ تھا۔ جو ہندوؤں کے لیے وقف تھی۔ ہفتے وار جلسے ہوتے تھے۔ جس میں بیربل۔ فیضی۔ ابوالفضل اور دوسرے آزاد خیال علما و فضلا حصہ لیتے تھے۔ خیر پور کا ایک حصہ اب بھی امتدادِ زمانہ سے بچ رہا ہے۔ جو دائی انگہ کے قریب میاں میر والی سڑک کے بائیں جانب موجود ہے۔ جہانگیر کو یہ شہر بہت عزیز تھا۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو شہزادہ خسرو نے اس سے بغاوت کی اور لاہور پر قابض ہو گیا۔ جہانگیر کے حکم سے خسرو کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ شہر لاہور سے سات سو قیدی باہر لائے گئے۔ اور ان کو قلعہ میں بند کیا گیا۔ جہانگیر کو یہ شہر اتنا عزیز تھا۔ کہ اس نے آرزو کی کہ وہ مرنے کے بعد بھی یہیں دفن کیا جائے۔ چنانچہ شاہدرہ میں جہانگیر کا پُرعظمت مقبرہ آج بھی موجود ہے اور نور جہاں بیگم کی بارہ دری جو اس کی آخری آرامگاہ ہے وہ بھی یہیں واقع ہے۔

شاہجہاں کے دور میں لاہور میں امن و امان رہا۔ اورنگ زیب کے برسرِ حکومت آنے پر لاہور میں داراشکوہ کی ہمدردی کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ داراشکوہ لاہور میں رہتا تھا اور اہلِ لاہور میں بے حد مقبول تھا۔ داراشکوہ مشہور بزرگ میاں میرؒ کا مرید تھا۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کی جائداد ضبط کر کے اس کی دولت سے بادشاہی مسجد بنائی۔ دورِ مغلیہ کے انحطاط اور سکھوں کے عروج۔ نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی شاہ زمان کے حملوں کے دوران میں لاہور پر جو کچھ بیتی مصنف نے اس کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

تھارن ٹن کے مقالے کا دوسرا حصہ بیانیہ ہے مصنف نے سب سے پہلے لاہور کے رقبے پر نظر ڈالی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لاہور کا رقبہ اس سے بہت بڑا ہے۔ جتنا آج شہر لاہور گھیرے ہوئے ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ لاہور کے مختلف حصے تاریخ کے مختلف ادوار میں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ لیکن یہ وسیع رقبہ کبھی ایک وقت میں پورے کا پورا آبادی سے معمور نہیں رہا ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ لاہور کا رقبہ پہلے چھتیس ۳۶ قطعوں پر مشتمل تھا۔ ان کو گزر بھی کہتے تھے۔ جن میں سے جدید شہر لاہور میں صرف نو قطعے شامل ہیں۔ گویا یہ شہر سکڑ گیا ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ شہر لاہور اپنے موجودہ رقبے سے کبھی نہیں بڑھا۔ چنانچہ کھدائی کی جائے تو مقبروں اور باغ کی دیواروں کے نشاں پائے جاتے ہیں جو اس بات کی روشن دلیل ہیں۔ کہ پرانا لاہور بھی اسی رقبے کے اندر آباد تھا۔ غالباً یہ شہر بہت گنجان تھا۔ امرتسر کی طرف جانے والی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی جانب ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ہے جو عیدگاہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ مسجد پرانے لاہور کے درمیان کہیں واقع ہو گی۔ اگرچہ یہ موجودہ لاہور سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اکبر کے زمانے کے ایک مصنف نے لاہور کے ایک قطعہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ لاہور کا سب سے آباد حصہ ہے۔ لیکن یہ قطعہ اب ویران ہے اور موجودہ شہر سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ شاہجہان کے دور میں جب یہ شہر اپنے عروج پر تھا۔ اس کا رقبہ سولہ سترہ میل ہوگا۔ قدیم لاہور کا وہ حصہ جو شہر پناہ کے باہر واقع ہے۔ کسی زمانے میں بڑا گنجان آباد تھا۔ جس میں لمبے لمبے بازار تھے۔ جو شہر پناہ کے دروازوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ شہر پناہ کے اندر اور باہر بسنے والی آبادی کے درمیان مقبرے۔ باغات اور مسجدیں تھیں۔ موتی محل کے آس پاس جو قدیم لاہور میں واقع ہے۔ اب بھی سونے چاندی کے سکے اور جواہرات تیز بارش کے بعد نکل آتے ہیں۔ لاہور کی عظمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ بہت کم ایسے شہر ہوں گے۔ جو لوٹ مار۔ بدنظمی کا اس قدر شکار رہے ہوں۔ جتنا لاہور انگریزی عملداری سے پیشتر ایک سو بیس برس تک رہا۔ آٹھ مرتبہ احمد شاہ درانی کی فوجیں لوٹ مار کرتی ہوئی یہاں سے گزریں۔ مرہٹوں اور سکھوں نے اس کی تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی عمارات خاص طور پر زیر زمین ہو گئیں۔ اس لیے کہ موسم کا مقابلہ کرنا اس قسم کی عمارات کے لیے مشکل تھا۔ ہندوؤں سے کر پٹھانوں تک کے زمانے تک اس شہر میں قابلِ ذکر عمارات تعمیر نہیں ہوئیں۔ صرف مغل دور میں اس قسم کی اہم عمارات بنائی گئیں۔ یہ عمارتیں مغل فن تعمیر اور کاریگری کا نمونہ ہیں۔

تھارن ٹن نے صناعوں اور کاریگروں کی بے حد تعریف کی ہے! ان کی کاریگری کے نمونوں کو بے حد سراہا ہے کہ انھوں نے رقبہ کی حد بندی میں کمال دکھایا ہے۔ تراشے ہوئے پتھر کے پائے اور ان میں تزئین و آرائش کا استعمال۔ ستونوں کے اندر نکیلی کمانیں۔ کمانوں کی شکلوں پر مخصوص و دلچسپ تزئین۔ سنگ مرمر پر عقیق و فیروزہ اور دوسرے قیمتی پتھروں کے ٹکڑے جمانے کا کام مورچہ بند منڈھیریں۔ طشتری نما گنبد اندرونی گنبدوں میں بیل بوٹوں اور کتبوں کے شاہکار۔ سنگ مرمر کی کھودی ہوئی جالیوں کی بہار۔ پتھروں پر منبت کاری۔ نگار خانوں پر نقش و نگار۔ محلات کے اندرون سقفی حصوں پر رنگین شیشوں کا حیرت انگیز کام اس دور کی سنگی تعمیر کاری کی ناقابلِ فراموش یادگاریں ہیں۔

مصنف نے مغل عمارات کے علاوہ اس دور میں جو صنعت و حرفت میں ترقیاں ہوئیں اس کا بھی حال لکھا ہے کہ لاہور کس طرح مشرق کی اہم ترین منڈی بن گیا۔ پھر اس کے بعد سکھوں کی حکومت میں لاہور کی عمارات کس طرح تباہ ہوئیں۔ ان حالات کے علاوہ آخر میں مغل اور سکھ فن تعمیر پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور لاہور میں مغل اور سکھ عمارتوں کے جو نمونے پائے جاتے ہیں ان سے فن تعمیر کے متعلق اہم نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ تھارن ٹن کی یہ کتاب LAHORE اس دور کی اہم ترین کتاب ہے۔ جو لاہور کی قدیم تاریخ پر ایک امٹ کارنامہ ہے بلکہ یہ مختصر تاریخ لاہور کے دوسرے مورخین کی ضخیم تاریخی کتابوں پر بھی بھاری ہے۔

نورُ احمد چشتی (المتوفی ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء)

مولوی نور احمد نام تخلص چشتی۔ آپ کے بزرگوں کا وطن ایران تھا۔ ان کے اجداد میں سے مولوی محمد عاقل ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اور مدت تک دکن میں عہدہ ہائے جلیلہ سرفراز رہے۔ ۱۰۵۴ھ میں مولوی محمد عاقل صاحب کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ اور مولوی نظام اللہ اپنے وطن ایران واپس چلے گئے اور وہاں اولاد شہ طہماسپ کی اتالیقی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ نادر شاہ کے عہد میں مولوی ضیاء الحق بہاء الحق خلف مولوی عنایت اللہ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت مولوی نظام الدین ان کے ہمراہ تھے۔ یہ خاندان اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے مشہور رہا۔ اور اپنے علم کی وجہ سے ہمیشہ سرفراز رہا۔

چنانچہ مولوی احمد بخش یکدل (ابن غلام حسین ابن محمد ابراہیم ابن ضیاء الحق) جو مولوی نور احمد چشتی کے والد بزرگوار تھے۔ ان کو دیوان دینا ناتھ کی سرکار میں خصوصیت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیوان امر ناتھ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ یکدل عربی۔ فارسی کے متجر عالم تھے۔ چنانچہ دیوان امر ناتھ نے ان کے سایہ عاطفت میں خوب ترقی کی۔ اسی اثنا میں ملک سکندر خان وکیل منگیرہ لاہور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملاقات کے لیے آئے تو انھوں نے پوچھا کہ کیا لاہور میں کوئی مولوی بہاء الحق و ضیاء الحق کی اولاد میں سے ہے۔ انھوں نے مولوی احمد بخش یکدل کا نام لیا۔ جن سے ملاقات کے بعد وہ بہت محظوظ ہوئے۔ اس دوران میں ملتان فتح ہو گیا۔ اور اس فتح کی خبر سرکار لنڈن کو بھیجنے کے لیے مولوی احمد بخش ہی کے نام قرعہ پڑا۔ چنانچہ تاریخ میں اس مراسلہ کی نقل آج تک محفوظ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خواہش تھی کہ وہ مولوی یکدل کو سکھ سرکار میں عہدہ جلیلہ سے سرفراز کرے۔ لیکن مولوی یکدل کی متوکلانہ طبیعت نے اپنے موروثی پیشہ معلمی کو ترجیح دی۔ لیکن اس پر بھی ایک چاہ موضع لبانوالہ، شریف پور۔ تلواڑہ اور پکی تھٹی اور ایک موضع جگ پوار۔ اور ایک ہوشیار پور اور ایک جالندھر میں عطا کیا۔ اس کے علاوہ موضع سانده میں ایک باغ جس کی زمین چالیس بیگھہ ہے عنایت کیا جس کی آمدنی چھ سو روپیہ سالانہ تھی۔

مولوی غلام حسین جو مولوی بہاء الحق کی اولاد میں سے تھے اور جن کی وساطت سے مولوی احمد بخش یکدل نے سرکار دیوان امرناتھ تک رسائی حاصل کی تھی۔ جب وہ کابل سے واپس آئے اور لاہور میں بدستور اس خاندان عالیشان کے اتالیق مقرر ہوئے تو پھر مہاراجہ نے وظیفہ میں اضافہ کر دیا۔ جو مولوی غلام حسین مولوی احمد بخش یکدل و مولوی نور احمد چشتی کو سرکار انگریزی کے خزانے سے باقاعدہ ملتا رہا۔

مولوی غلام حسین جیدّ عالم دین ہونے کے علاوہ عابد و زاہد مشہور تھے۔ آخری عمر میں پچیس برس شب بیداری میں بسر کی۔ محبتِ غربا و فقرا ان کو بہت پسند تھی۔ ملاقاتِ امرا سے حتی الامکان احتراز کرتے تھے۔ اگر چار و ناچار کسی امیر کے ہاں جانا ہو گیا تو دیر تک وہاں اجلاس نہ فرماتے تھے۔ علائق دنیا سے پہلو تہی کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز عشا کے بعد نجف اشرف کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتے اور مولانا جامی کا یہ مناقب نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے ؎

علی شاہ مرداں اماماً کبیراً

کہ بعد از نبی شد بشیراً نذیراً

اور نیم شب کے وقت حافظ شیرازی کے اس مناقب کو بصمیم قلب پڑھتے ؎

میرم حسین است و حسن
آرامِ جان و جسم و تن

زبان میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر بخشی تھی تمام اہلِ محلہ بیدار اور سراپا گوش ہو کر یہ مناقب سنتے تھے۔

مولوی احمد بخش یکدل کو مولوی غلام حسین[1] سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے فیض سے فیض یاب ہوتے۔ وہ مولوی یکدل صاحب کو ہمیشہ یہی تلقین کرتے۔ کہ اے احمد بخش یکدل تم دنیا دار ہو۔ اور مجھ کو سفرِ عاقبت درپیش ہے مجھے گھریلو معاملات میں تکلیف نہ دیا کرو۔ یہ بزرگ جن کی صحبت میں مولوی نور احمد چشتی اور ان کے والد مولوی احمد بخش یکدل نے ایک مدت فیض حاصل کیا تھا سنہ ۱۲۶۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ سرور لاہوری نے کیا خوب تاریخ وفات کہی ہے

مولوی شیخ چشت اہلِ بہشت ۔۔۔ مدح خوانِ علیؑ وصیٔ نبیؐ
سرور زار سالِ ترحیلش ۔۔۔ گفت پاکیزہ دل غلام علی
۱۲۶۰ھ

نور احمد چشتی کے والد مولوی احمد بخش اپنے وقت کے مشاہیر ادبا میں شمار ہوتے تھے۔ شروع شروع میں لاہوری منڈی میں آپ ایک مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں راجہ دینا ناتھ کے خاندان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مدرسہ سرکار انگریزی میں بھی معلمی کے خدمات بجا لاتے رہے۔ نظم و نثر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ راجہ دینا ناتھ کے ایما سے شاہجہان آباد میں دیوان کندار ناتھ کے صاحبزادے کی شادی کی تقریب میں گئے۔ اچانک بعارضہ فالج وہاں سنہ ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔

مولوی نور احمد چشتی سنہ ۱۲۴۴ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ میاں محمد بخش صحاف کی صاحبزادی تھیں۔ ابھی چشتی کی عمر چھ سال کی تھی کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور والد کی سرپرستی میں علم و ادب کی تکمیل کی۔ دستور کے مطابق عربی و فارسی میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ اور اس دور کے مشاہیر میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ حسبِ معمول بزرگان مدرسے میں لڑکے پڑھانے پر مامور رہے۔ دیوان کرپا رام۔ بیلی رام۔ ہری سنگھ سائیں والا۔ اور دیوان بھیم سین ان سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں حسب ایماء ڈاکٹر لوکن مدت تک فوجی افسران بھی اُن سے استفادہ کرتے رہے۔ اور انھوں نے بھی اپنے فرائضِ منصبی نہایت تندہی اور جانفشانی سے انجام دیئے۔ اس درس و تدریس کے دوران میں انھوں نے تحفۂ چشتیہ[1] شعر صرف و نحو اردو۔ فارسی و عربی تصنیف کی۔ یہ کتاب چار مرتبہ شائع ہوئی۔ دوسری کتاب یادگارِ چشتی[2] (حسب الحکم حکامِ انگلشیہ) جس میں دستورِ اہلِ اسلام پنجاب سے بحث کی گئی ہے شائع ہوئی۔ یہ کتاب مطبع کرائکل میں طبع ہو کر لنڈن اور فرانس میں بھیجی گئی۔ پھر ایک کتاب عجائباتِ چشتی[3] صرف و نحو اور مصادر کی تشریح میں مرتب کی۔ اور ایک دوسری کتاب خیالاتِ[4] دانش لطائف و ظرائف پر مشتمل شائع کی۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں تالیف ہوئی ہیں۔ اور اہلِ ذوق آج تک ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

مسٹر ولیم کولڈ سٹریم اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے حکم سے انھوں نے ایک اور کتاب تحقیقاتِ چشتی[5] کے نام سے تالیف کی اس کتاب کی تاریخ اشاعت سرور لاہوری نے لکھی ہے

بلطفِ حق ہوئی جس دم تھی تیار ۔۔۔ عجب یہ عمدہ تصنیفاتِ چشتی
لکھی سرور نے تب تاریخ تالیف ۔۔۔ کہ ہو مقبول تحقیقاتِ چشتی
سنہ ۱۹۲۱

---

[1] مولوی غلام حسین کا شروع میں نام غلام علی تھا۔ حضرت فخر الدین مشہور بہ فخر عالم نے ان کا نام غلام حسین رکھا اور یہ بھی فرمایا کہ ہمارا آخری نام غلام حسین ہوگا۔ چنانچہ "غلام حسین" سے ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۹۹ھ برآمد ہوتی ہے۔

عیسوی سال اس طرح لکھا ہے ؎

بسال عیسوی سرور رقم کرد ‏ ‏ کہ عالی جاہ تصنیفات چشتی ‏ ‏ (۱۸۶۷ء)

سنہ ہجری یوں کہا ہے ؎

ہوا جو مطبوع جملہ عالم ‏ ‏ یہ نسخہ بن کر کے سارا سالم
بسال تصنیف بولا سرور ‏ ‏ نئی کتاب عجیب چشتی[1] ‏ ‏ (۱۲۸۴ھ)

تحقیقات چشتی اسسٹنٹ کمشنر لاہور کے ایما سے لکھی گئی۔ اس کتاب میں جناب چشتی نے عمارات، مزارات، مقابر، مساجد و نواح لاہور کا مفصل حال درج کیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں چشتی صاحب نے بہت سی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ تحقیقات چشتی کے صفحہ (۱۸) پر لکھتے ہیں :-

"کتاب روضۃ الاحباب۔ معارج الولایت۔ تذکرہ العارفین۔ حقیقۃ الفقرا۔ حقیقۃ الفواد۔ قصص الاولیا۔ محبوب الواصلین۔ تذکرۃ العاشقین۔ نفحات الانس۔ کتاب شیخ چوہڑ بندگی۔ مرات الہند۔ جام جم۔ سفینۃ الاولیا۔ سکینۃ الاولیا۔ حق نما۔ کیمیائے سعادت۔ دلیل العارفین۔ فوائد الفواد۔ حبیب السیر۔ شاہجہان نامہ۔ توزک جہانگیری۔ اکبر نامہ۔ تحفۃ الواصلین۔ مخبر الواصلین۔ حقیقۃ العرفان۔ حقیقۃ الحقائق۔ اکسیر ولایت۔ کتاب رضوانی۔ تذکرہ المحبوبین۔ مناقب چشتیہ۔ مناقب سہروردیہ۔ مہرا الاولیا۔ مناقب مداریہ۔ مظہر الولایت۔ کشف المحجوب۔ تصدیق الکرامت۔ مصداق العاشقین۔ مفتاح السماع وغیرہ بکوشش تمام کچھ تو مستعار اور کچھ خرید کر کے یہ کتاب تحقیقات چشتی ختم کی۔"

اس کتاب میں بزرگان اسلام جو لاہور میں مدفون ہیں۔ ان کا ذکر آیا ہے۔ لاہور کی تاریخی عمارات کے متعلق اس کتاب میں بہت کچھ ملتا ہے۔ معابد و مراسم اہل ہنود پر تبصرہ کیا ہے۔ روئے زمین سے اولیاء اللہ اور حتی الامکان ہر ایک خانوادہ کا حال لکھا ہے۔ اس ترتیب میں مطبوعہ کتب کے علاوہ مسموع شواہد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جو باتیں خاص اشخاص کی زبانی معلوم ہوئی ہیں ان کو بھی درج کتاب کر دیا ہے۔ اگرچہ کتاب کا یہ پہلو محل نظر ہے۔ یہ کوشش بھی کی ہے کہ صاحب مقبرہ کب اور کس زمانہ میں کہاں تولد ہوئے۔ ان کی شہرت کا کیا باعث تھا۔ ان کی کرامات سے عوام نے کیا فیض حاصل کیا۔ آخر کب اور کہاں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات کیا تھی۔ کون کون ان کے خلیفہ و مرید و معتقد ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین کون کون تھے۔ اب کون موجود ہے۔ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اب ان کی اولاد میں سے کون زندہ ہیں۔ اور کس مقام پر سکونت پذیر ہیں۔ کیا وہ مقبرہ رجسٹر نزول سرکاری میں درج ہے یا نہیں۔ اس مکان یا مقبرہ۔ یا شوالہ یا گوردوارہ یا ٹھاکردوارہ وغیرہ کے ساتھ کیا کیا معافی ہے

---

[1] جناب سرور نے نئی کے (۶۰) عدد لیے ہیں۔ حالانکہ نئی کے (۷۰) عدد ہوتے ہیں۔ جانشین امیر مینائی حضرت جلیل کی ایک تاریخ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جلیل مصرع تاریخ بے بدل نکلا ‏ ‏ نئی بہار دکھاتی ہے نہر کی سالگرہ

اس تاریخ میں (نئی) کے ستر عدد محسوب ہوئے ہیں اور مصرع اولیٰ میں "بے بدل" کہہ کر (۸۴) کا تخرجہ کیا ہے۔ لغات فن جمل نئی کے (۷۰) عدد لیتے ہیں (۶۰) نہیں۔ (کسری)

زمین ہے۔ یا گاؤں۔ یا نقدی اور اس تقرر کا باعث کیا ہے۔ یہ معافی کس قدر ہے۔ اور کس کے حکم اور کس وجہ سے یہ پہلے پہل مقرر ہوئی۔ یہ جاگیر یا پنشن حین حیات سجادہ نشین ہی تک تھی۔ یا نسلاً بعد نسل سجادہ نشین کو عطا ہوئی ہے۔ اور سالانہ اس پر کیا خرچ ہوتا ہے۔ اور خرچ میں کتنی پتیاں ہیں۔ عرس وغیرہ کس تاریخ کو مقرر ہے۔ اور عرس پر کیا کیا تقسیم ہوتا ہے۔ عرس پر لوگ کس تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ خانقاہ میں کتنی قبور ہیں۔ اور کون کون بزرگ ان میں مدفون ہیں۔ عمارت یا مکان کس زمانے میں تعمیر ہوئے۔ ان کے بنانے والے کا کیا نام تھا۔ کس زمانے میں اس کا کچھ حصہ مسمار ہوا۔ اور پھر کس قدر عمارت ایزاد کی گئی۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے۔ اس خانقاہ میں کس قدر چار دیواریاں تھیں۔ کتنی کوٹھریاں۔ کتنے احاطہ قبور اور کتنے دالان تھے۔ طول و عرض وار تفاع اس عمارت کا نہایت کوشش سے پیش کیا ہے۔ اس قسم کی باتیں بھی مندرج ہیں کہ مزارات کا حال کیا وارث حقیقی ہیں یا غاصب ان کو کیونکر قبضہ حاصل ہوا۔ اور حقیقی وارث کس طرح بے دخل ہوئے۔

یہ کتاب لاہور کے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت (۸۷۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے کتاب عیوب سے پاک نہیں۔ بعض سنین غلط ہیں۔ کہیں واقعات اصل حقائق سے ہٹ گئے ہیں۔ بعض سنی سنائی باتیں جو مورخ کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں درج کر دی گئی ہیں۔ تنقید نگار اور مورخ چاہے اس کتاب میں ہزار عیب نکالیں۔ لیکن لاہور کے متعلق ان کی کاوش و محنت ہرگز نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آج مورخین نے جو صحیح حالات بعض واقعات کی تحقیق کے بعد لکھے ہیں۔ ان کی جستجو و کاوش میں تحقیقات چشتی نے آئینہ کا کام کیا ہے۔ اگر یہ کتاب ان کے سامنے نہ ہوتی تو شاید بہت سے واقعات کی پردہ کشائی ممکن نہ تھی۔ لاہور کا یہ مورخ جس نے معلمی سے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ تحقیقات چشتی کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور آنے والا مورخ ان کی اس سعی بلیغ کو ہمیشہ بنظر استحسان دیکھے گا۔ مولوی نور احمد چشتی موزوں طبع بھی تھے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۲ فروری ۱۸۵۸ء کے اخبار کوہ نور لاہور سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی نور احمد چشتی میلہ چراغاں احباب کے ساتھ منا رہے ہیں اور فی البدیہہ یہ اشعار فرما رہے ہیں ؎

وہ جو پہلو سے اٹھے درد دل ایسا اٹھا ضبط کی تاب نہ باقی رہی چلا اٹھا
حالت عشق مری دیکھ کے وہ ہنستا تھا کیوں رے ہاں اب تو بتا شور یہ کیسا اٹھا
اس کی الفت سے بھلا فائدہ کیا نکلا ہے نام بدنام ہوا مفت میں پیسا اٹھا
عشق کی رمز و کنایہ کی سمجھ میں یار د
مجنوں مشہور تھا پر چشتی بھی ویسا اٹھا

یہ مورخ لاہور میں ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔ سرور لاہوری نے شاعر چشتی (۱۲۸۴ھ) سے مادہ تاریخ وفات حاصل کیا ہے۔

رائے بہادر لالہ کنہیا لال (ایم۔ ای۔ سی۔ ای)
(المتوفی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء)

لالہ کنہیا لال ذات کے کائستھ ماتھر اور ہندی تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام لالہ ہزاری لال تھا۔ اصلی وطن جلیسر ضلع ایٹہ تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کی زندگی کا وافر حصہ لاہور میں گزرا۔ اسی سرزمین میں انھوں نے تالیف و تصنیف کی طرف رغبت کی۔ قدرت نے انھیں مفتی غلام سرور ایسے شفیق استاد سے کسب علم و فن کرنے کا موقع دیا۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے وقت کے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کی سرپرستی میں لالہ کنہیا لال ہندی کے

جوہر کمالات چمکنے لگے اور ان کا فطری ذوق جلا پانے لگا۔

فارسی و اُردو میں انھیں کامل دستگاہ تھی۔ ان دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف ملتی ہیں۔ جس سے ان کے تبحر علم اور فطری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی باریک اندیشی اور نازک خیالی کے نمونے ملتے ہیں۔ اخلاقیات پر بھی ان کو عبور کلی حاصل تھا۔ تصوف کے مسائل پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ چنانچہ مناجات ہندی میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی چند دوسری تالیفات بھی وقیع ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں :۔

۱۔ **گلزار ہندی :**۔ یہ ایک منظوم کتابچہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں پند و نصائح کے مضامین قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب چار بار چھپ کر شائع ہوئی۔

۲۔ **بندگی نامہ :**۔ اس مختصر کتاب میں دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔ اس میں سوا صدانہ اشعار۔ تصوفانہ مضامین اور عاشقانہ خیالات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

۳۔ **ما مقیمانِ کوئے دلدار ایم** کی بحر میں ایک ترکیب بند نہایت شستہ زبان میں لکھا۔ اگرچہ اشعار کچھ زیادہ نہیں لیکن حلاوت زبان اور خوبیٔ بیان سے نہایت مصبوع ہے ۔

۴۔ **یادگارِ ہندی :**۔ یہ کتاب بھی منظوم فارسی زبان میں ہے ۔ جس کے چار حصے ہیں ۔ پہلے حصے میں اوتاروں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں پیغمبروں کا حال درج ہے۔ تیسرے حصے میں حکماء کے حالات قلمبند کئے ہیں اور چوتھے حصے میں نیک بادشاہوں کی طینت اور سیرت پر لکھا گیا ہے ۔

۵۔ **مناجاتِ ہندی :**۔ یہ دیوان اردو زبان میں ہے ۔ حمد و ثنا کے مضامین کثرت سے اس میں نظم کئے گئے ہیں۔ صوفیانہ خیالات کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندؔی کی طبیعت میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فن شعر اور اشعار قدیم سے انھیں خاص دلبستگی ہے۔ عروض و قافیہ اور علم بیان و معانی کو خوب سمجھتے ہیں۔

مناجات کے چھ اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ غزلوں کے علاوہ ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مسدس، رباعیات اور قطعات اس میں موجود ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندؔی کو تمام اصناف سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ مؤلف نے اپنی اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

> " یہ مبارک کتاب اور ہر دلعزیز دیوان ہر ایک چھاپے کے وقت بڑھ کر چھپا ہے۔ اگر اس کو بڑھتی دولت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

۶۔ **مخزن التوحید :**۔ یہ دیوان فارسی میں ہے اور زبان سادہ اور سلیس ہے ۔

۷۔ **اخلاقِ ہندی :**۔ یہ کتاب نظم اردو میں لکھی گئی ہے ۔ اخلاقیات پر بڑی گرانمایہ تصنیف ہے ۔ ہر بات کے آخر میں دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک حکایت بھی درج کر دی ہے ۔

۸۔ **ظفر نامہ رنجیت سنگھ المعروف بہ رنجیت نامہ :**۔ یہ نظم فارسی زبان میں سکندر نامۂ نظامی گنجوی کی طرز اور بحر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے متعلق لکھی گئی ہے ۔

۹۔ تاریخ پنجاب : ۔ یہ ریاست ہائے پنجاب کی ایک عام تاریخ ہے۔ اس میں بابا نانک کے وقت سے سکھوں کے دسوں گوروؤں کے تفصیلی حالات کا مفصل حال اور سکھوں کی بارہ مثلوں کے ظہور کی مشرح تشریح کی گئی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عروج کی کہانی اور زوال کی داستان بھی اس میں مندرج ہے۔ موجودہ جموں و کشمیر کی من و عن کیفیت بھی اس میں تحریر ہے۔ یہ کتاب دو بار طبع ہو چکی ہے۔ لالہ سیتارام کوہلی رنجیت سنگھ کے دیباچہ میں اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب زیادہ تر EUROPEAN ADVENTURES IN NORTHEREN INDIA مصنفہ سی۔ بی گرے کی کتاب پر مبنی ہے۔

۱۰۔ انگاریں نامہ : ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہیر رانجھا کے قصے کو لیے ہوئے ہے۔ اس عاشقانہ داستان کو ہندی نے بڑی قابلیت سے فارسی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ رنگین نظم ایک ہی بار طبع ہوئی۔

۱۱۔ تاریخ لاہور : ۔ لالہ کنہیا لال کی منظوم اور منثور تصانیف میں تاریخ لاہور ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تاریخ ۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی۔ مصنف نے خود اس کی طبع پر قطعاتِ تاریخ کہے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ اردو میں ہے اور دوسرا فارسی میں۔ دونوں قطعے نذر ناظرین ہیں۔

قطعۂ فارسی

بحمد اللہ کہ مطبوع جہاں گشت ۔۔۔ بالطاف خدا تاریخ لاہور
بخوش خلقی طرز خوش کلامی ۔۔۔ بچشم اہلِ بینش گشت منظور
مذاق تازہ شد حاصل زباں را ۔۔۔ ازیں نادر بیانِ تازہ مذکور
بہر صفحہ است ذکر تازہ مرقوم ۔۔۔ بہر سطر است حال تازہ مسطور
بہر خاطر ازاں جمعیت آمد ۔۔۔ بہر یک دیدۂ روشن از و نور
دل ہر اہلِ دل زد گشت خورسند ۔۔۔ طبیعت خورم و خوشحال و مسرور
مرتب گشت بعد از محنت و رنج ۔۔۔ کتابے بے بہا نور علیٰ نور
مؤلف کرد در انجام ایں کار ۔۔۔ عرق ریزی نہایت سعی موفور
کمر بند مشقت بر میاں بست ۔۔۔ بہر کارے کہ از دل بود مامور

چو شد مطبوع ہندی سال طبعش
بگو مطبوع شد تاریخ لاہور

۱۸۸۴

قطعۂ اردو

یہ تاریخ لاہور اب چھپ چکی ۔۔۔ خدا نے مری سعی مشکور کی
خدا سے بر آیا مرا مدعا ۔۔۔ مری التجا حق نے منظور کی
مرے دل میں اس کام کے واسطے ۔۔۔ جو تھی بیقراری وہ سب دور کی
جہاں میں بہر ملک و شہر و دیار ۔۔۔ خدا نے یہ تاریخ مشہور کی
رقم کی یہ ہندی نے تاریخ طبع ۔۔۔ ہوئی شائع تاریخ لاہور کی

۱۸۸۴

اس کتاب کی ضخامت (۴۰۰) صفحے ہے۔ اور وکٹوریہ پریس لاہور میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ لاہور لالہ کنہیا لال نے اپنے چند مخصوص احباب کی فرمائش سے لکھی تھی۔ چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> "بعض دوستانِ صداقت کیش و محبانِ محبت اندیش ملتفت حال نیاز مآل ہوئے اور فرمایا کہ تم بفضلِ ربانی و تفضلاتِ سبحانی تیس برس سے افسر و سرپرست محکمہ پارک ماسٹری ہو۔ مکاناتِ قدیمہ و جدیدہ و شہر لاہور کا حال جیسا تم کو معلوم ہے کسی کو نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں سرکاری جو فی الحال باعثِ زیب و زینت و فخر و اقتدار شہر لاہور ہیں۔ سب تمہارے ہاتھ سے تعمیر ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں نہایت ضروری ہے کہ ایک تاریخ خاص شہر لاہور کی جس میں مفصل حالات، مکانات قدیمہ و جدیدہ اندرونی و بیرونی شہر ہوں لکھی جائے تاکہ یہ تاریخ اور توابعث و تصانیف کی طرح تمہارے نام سے زمانہ ناپائدار میں یادگار رہے۔ پس راقم نے بتعمیل فرمانِ محبانِ محبت عنوان کمر ہمت کی چست باندھ کر اس کا مسودہ لکھنا شروع کیا۔"
>
> (تاریخ لاہور صفحہ ۵)

تاریخ لاہور لالہ کنہیا لال کی فکر و کاوش کا ایک ایسا مرقع ہے۔ جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ اردو زبان میں اس سے بہتر لاہور کے حالات لکھے ہی نہیں گئے۔ واقعات کی ترتیب اور تحقیق و جستجو میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ نتائج کے اخذ کرنے میں اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ ہر واقعے کی چھان پھٹک میں پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے جس سے اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلے حصے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شہر لاہور کب آباد ہوا؟ اس کو کس نے آباد کیا۔ کس کس زمانے میں اس کی آبادی میں ترقی ہوئی؟ کس کس دور میں اس شہر نے غارت و انہدام کے صدمے برداشت کیے؟ اس وقت اس کی صورتِ حال کیا تھی؟ کون کون قومیں یہاں آباد تھیں؟ اس زمانے کے مشہور رؤسا۔ حکما۔ فضلا۔ علما۔ اطبا و شعرا کون تھے۔ اور کسب ہنر میں کون کون اشخاص صاحب اعزاز اور مشہور تھے؟

دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مغلیہ دورِ حکومت میں جب شاہی قلعے کے باہر آبادی ہوئی تو اس آبادی کا رخ کس کس سمت کو تھا؟ اس آبادی کے مشہور دروازے اور محلے کون کون تھے؟ اور ان محلوں میں نامور مکانات اور کٹڑے کہاں کہاں واقع تھے اور کس کس رئیس کی ملکیت تھے؟ کیا ان قدیم مکانات کا اب کوئی نشان باقی ہے کہ نہیں؟

تیسرے حصے میں شہر لاہور کے اندرون و بیرون ان مکانات کی تشریح کی گئی ہے جو زمانہ سلف یا حال میں تعمیر ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔ ان میں عمارات، حویلی، باغیچہ، مقبرہ، مسجد، مندر وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ اس حصے کو انھوں نے تین فصلوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلی فصل میں ان مکانات کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کے مذہب سے متعلق ہیں۔ یعنی شوالہ۔ ٹھاکردوارہ و دیوی دوارہ وغیرہ۔ دوسری فصل میں ان مکانات کی تصریح کی ہے جن کا تعلق ملت اسلامیہ سے ہے۔ اس میں مساجد، خانقاہ آگئے ہیں۔ تیسری منزل میں ان مکانات کی تشریح کی ہے جو کسی مذہب و ملت سے علاقہ نہیں رکھتے۔ اس میں حویلی۔ باغ اور کٹڑہ وغیرہ کا بیان ہے نیز تیسرے حصے کی تینوں فصلوں میں یہ التزام قائم رکھا ہے کہ شہر کے اندرونی مکانات کا ذکر علیحدہ بیان کیا ہے اور شہری بیرونی عمارات کا ذکر علیحدہ۔ جس سے ان دونوں اقسام کی جداگانہ حیثیت میں آج بھی امتیاز باقی ہے۔

چوتھے حصے میں ان تعمیرات کا ذکر کیا ہے۔ جو انگریزوں کے زمانہ میں تعمیر ہوئیں۔ ان میں کوتوالی، کچہری، عدالت ضلع، ہسپتال، کالج وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ کیونکہ اس حصے کی بیشتر عمارات کی تعمیر ان کی زیر نگرانی انجام پذیر ہوئی ہے اس لیے یہ حصہ زیادہ مکمل اور آنکھوں دیکھی معلومات پر مبنی ہے۔

لالہ کنہیا لال مدت مدید تک پبلک ورکس کے محکمہ سے منسلک رہے۔ اور گورنمنٹ برطانیہ نے ان کو رائے بہادر کے معزز خطاب سے بھی سرفراز کیا تھا۔ یہ پہلے ہندوستانی ہیں جو اگزیکٹو انجنیئر کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے اور پنشن یاب ہوئے۔ یہ میونسپل کمیٹی لاہور اور کالسٹھ سبھا لاہور کے پریذیڈنٹ بھی تھے۔ آخر ۲۴ فروری ۱۸۸۸ء کو بمقام لاہور وفات پائی۔

لالہ کنہیا لال ہندی کی تصانیف میں جو بلند خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے جذبات تعصب سے سراسر خالی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر وہ ہمیشہ بڑی عقیدت سے کیا کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

ایک مورخ کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کی کتاب تاریخ لاہور تاریخی دنیا میں ایک امٹ تالیف ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر مواد مولف کے ذاتی تجربات کا شاہد ہے۔ اپنے محکمے کی رعایت سے انھوں نے اکثر عمارات کا رقبہ تک درج کر دیا ہے۔ اور یہ ایسی خدمت ہے۔ جو دوسری تالیفات میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو زبان میں یہ کتاب لاہور کے متعلق قابل قدر معلومات سے لبریز ہے۔ جس کی تعریف نہ کرنا حقیقت سے کھلا انکار ہے۔ اور یہی کتاب آج لالہ کنہیا لال کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ ان کی دوسری تالیفات بھی موجود ہیں۔ اور وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری (المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء)

مفتی غلام سرور ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں محلہ کوٹھی مفتیاں نزد حویلی میاں خان اندرون موچی دروازہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مفتی غلام محمد تھا۔ جو حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی سہروردی کی اولاد سے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے مدارج اپنے والد ماجد کی سرپرستی میں طے کئے۔ اور آخر ان ہی کی توجہ سے فن طب کی تکمیل کی۔ پھر مولانا غلام اللہ فاضل لاہوری کے درس میں شامل ہو کر جملہ علوم مروجہ میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ اور فارغ التحصیل ہو کر تصنیف و تالیف میں ہمہ تن معروف ہو گئے۔ اور بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

ان تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تین "تذکروں"[1] میں اولیائے کرام کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ دو کتابوں کا موضوع "تاریخ"[2] ہے۔ دو کتابوں میں مادہ ہائے تاریخ[3] جمع کئے ہیں۔ چار دواوین[4] یادگار چھوڑے ہیں۔ دو کتابیں "مناقب[5]" پر لکھی ہیں۔ ایک کتاب میں انشا[6] کا نمونہ دیا ہوا ہے۔ دو کتابیں پند و نصائح[7] سے مملو ہیں۔ تین کتابوں میں "اخلاقیات[8]" سے بحث کی ہے۔ اور دو کتابیں لغت[9] کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

(۱) تذکرے

خزینۃ الاصفیا :۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ زبان نہایت سادہ اور فصیح ہے۔ اس میں متقدمین و متاخرین صوفیا، علما و شعرا

---

[1] تذکرہ بزرگان ہنود قلمی (صفحہ ۵۳۳)۔ مرتب کا نام درج نہیں۔ یہ قلمی مخطوطہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کے کسی دوست کی ملکیت ہے۔

کے حالات نہایت تحقیق اور کوشش سے فراہم کئے ہیں۔ یہ ایک جامع تذکرہ ہے جس میں بہت سے ایسے بزرگوں کے حالات آگئے ہیں۔ جن سے دوسرے تذکرے خالی ہیں۔ یہ تذکرہ دو جلدوں میں ختم ہوا ہے۔ اس کی ضخامت (۱۱۸۰) صفحات ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۰ھ میں شروع ہو کر ۱۲۸۵ھ میں پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔ خزینۂ ابرار اس کا سال آغاز ہے اور خزینۃ الاصفیا سال اختتام۔ اس تذکرے میں سات مخزن ہیں جن کی ترتیب یہ ہے:-

مخزن اول میں رسول مقبول صلعم۔ خلفائے راشدین اور ائمہ دین کا ذکر ہے۔
مخزن دوم میں مشائخ خاندان قادریہ کا بیان ہے۔
مخزن سوم میں چشتیہ خاندان کے حالات ہیں۔
مخزن چہارم میں سلسلۂ نقشبندیہ کے کوائف مرقوم ہے۔
مخزن پنجم میں بزرگان سہروردیہ کا تعارف کرایا ہے۔
مخزن ششم میں متفرق خانوادوں کو پیش کیا ہے۔
مخزن ہفتم چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں حضرت سرور کائنات کی ازواج مطہرات دوسرے حصے میں دختران آنجناب۔ تیسرے حصے میں عورات صالحات و عارفات جو اہل ولایت وکرامت تھیں۔ چوتھے حصے میں ماضی وحال کے مجانین و مجاذیب کے حالات دیئے ہوئے ہیں۔

حدیقۃ الاولیا:- یہ تذکرہ اردو زبان میں ہے۔ اور فقط ان اولیائے کرام کے حالات پر مشتمل ہے جو پنجاب میں گزرے ہیں۔ اس میں سات چمن ہیں۔

پہلے چمن میں اولیائے خاندان قادریہ۔ دوسرے چمن میں اولیائے خاندان چشتیہ۔ تیسرے چمن میں اولیائے خاندان نقشبندیہ۔ چوتھے چمن میں اولیائے خاندان سہروردیہ۔ پانچویں چمن میں خانوادہ ہائے متفرقات۔ چھٹے چمن میں عورات صالحات و عارفات کا حال بیان کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں طبع ہوا تھا۔

مدینۃ الاولیا:- یہ تذکرہ بھی اولیائے کرام کے حالات میں ہے۔ (۱۲۸۰) صفحات ہیں۔ یہ تذکرہ چار سال کی محنت کے بعد مکمل ہوا۔

(۲) تاریخ

بہارستان تاریخ:- اس کتاب کا دوسرا نام گلزار شاہی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں لاہور اور دوسری مرتبہ اضافہ و تصحیح کے ساتھ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔

پہلے حصے میں مہاراجگان متقدمین و متاخرین کے حالات ہیں۔ اس میں دو چمن ہیں۔

دوسرے حصے میں مسلمان سلاطین کے حالات عہد حضرت رسالت مآب صلعم سے اپنے زمانہ تک ۵۲ چمنوں میں قلمبند کئے ہیں جس میں مسلمانوں کے معروف وغیر معروف تمام خاندانوں کا ذکر آگیا ہے۔ مسلمان ریاستوں کا ذکر بھی اس میں ملتا ہے۔

تیسرے حصے میں سلاطین انگریزی کے حالات ابتدائے سلطنت سے لے کر ملکۂ وکٹوریہ تک مختصر لیکن جامع مندرج ہیں۔

تاریخ مخزن پنجاب: مفتی غلام سرور لاہوری کی یہ تصنیف پنجاب کے متعلق ہر قسم کی معلومات سے مملو ہے۔ پنجاب کا رقبہ۔ دو آبے دریا، اضلاع، ریاستیں، مشہور قصبے اور بستیاں، مردم شماری، میدانی علاقے۔ کوہستانی سلسلے۔ آب و ہوا، مسلمانوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہیں، مزارات، باغات، مقابر، قلعے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مختلف قوموں۔ مذاہب، عقائد، یہاں تک کہ تجارت، برآمد و درآمد کا مفصل حال اس کتاب میں درج ہے۔ اس کا وہ حصہ جو ضلع لاہور سے متعلق ہے بڑا اہم ہے، جس کا مختصر ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ دوسرے حصے میں شہر لاہور کا ذکر ہے۔ اس کے تمام نام، لہاور، لہانور، لاہوار وغیرہ سے بحث کی ہے۔ سرائے محمد سلطان، سرائے دیوان رتن چند، قلعہ لاہور، شالامار باغ، مقبرہ جہانگیر، سرائے شاہجہانی، مقبرہ آصف جاہ، مقبرہ نور جہاں بیگم، گورنمنٹ ہاؤس، صدر کچہری ضلع لاہور، میو ہسپتال، نیو کالج، سینٹ ہال، سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لاہور کے مضافات اچھرہ، کاہنہ، بیگم پورہ، مزنگ، حسن پور، باغبانپورہ، شاہدرہ وغیرہ کے حالات نہایت تحقیق سے لکھے ہیں۔

پانچویں حصے میں صوفیائے کرام کے مزارات کا حال دیا ہوا ہے۔ سید علی ہجویری گنج بخش کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے بعد بادشاہ، لال حسین، مقبرہ میراں محمد شاہ موج دریا، شاہ چراغ گیلانی، شاہ ابو اسحاق، موسیٰ سہروردی، عبد الجلیل چوہڑ قریشی سہروردی، ابو المعالی، محمد غوث، شاہ بلاول، طاہر لاہوری، میاں میر، ملا شاہ قادری، بی بی پاکدامناں، حضرت ایشاں، گھوڑے شاہ، میاں وڈا، سید جان محمد حضوری کا حال درج ہے۔ مسجد وزیر خان، مسجد طلائی، بادشاہی مسجد کا ذکر ہے۔ زیارات عالیات قلعہ لاہور بھی دیئے ہوئے ہیں۔ فقیر خاندان کے زیارات عالیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ غرضیکہ تمام کتاب کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ہم نمونے کے طور پر فقیر خاندان کے زیارات کا ذکر ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ سرور لاہوری نے لکھا ہے کہ ان زیارات عالیات میں گیارہ زیارتیں حضرت خاتم الانبیا صلعم کے متعلق ہیں۔ اوّل موئے مبارک برنگ سیاہ۔ دوم جبہ مبارک۔ سوم نقش پنجۂ دست مبارک کالے پتھر پر۔ چہارم تاج مبارک برنگ سیاہ۔ پنجم نعل چرمی، ایک پاؤں جس کے ساتھ کا دوسرا قلعہ کی زیارت میں ہے۔ ششم قدم مبارک پتھر پر۔ ہفتم موئے مبارک حنائی رنگ۔ ہشتم شانہ مبارک۔ نہم العی۔ دہم مسواک۔ یازدہم پانی پینے کا جام۔ حضرت عمرؓ ابن خطاب خلیفہ دوم کی صرف ایک تسبیح ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق پانچ زیارات موجود ہیں۔ پہلا موئے مبارک۔ دوسرا جبہ مبارک۔ تیسرا تاج۔ چوتھا عصائے مبارک۔ پانچواں پنجہ مبارک پتھر پر۔ اور زیارت حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون قیامت علیہا السلام صرف ایک روپٹہ مبارک ہے اور تبرکات متعلق حضرت امام حسن علیہ السلام سات ہیں۔ اوّل موئے مبارک۔ دوم کمربند۔ سوم زلف۔ چہارم اوراق قرآن شریف حضرت کے دستخطی ہرن کے چمڑے پر۔ پنجم و ششم دونوں زلفیں۔ ہفتم تمام و کمال قرآن شریف حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق چار نادرات ہیں۔ پہلا کمربند۔ دوسرا زلف مبارک۔ تیسرا قرآن شریف کے کچھ اوراق ہرن کے چمڑے پر لکھے ہوئے۔ چوتھا تسبیح۔ اور زیارات حضرت امام زین العابدین علیہ السلام دو ہیں۔ اوّل قرآن شریف کے اوراق حضرت کے ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ دوم فرہ علم مبارک حضرت عباس کا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام صرف ایک کتاب جامع بخط حضرت ہاں لکھی ہوئی موجود ہے اور تبرک متعلق ہر دو امام حسن و حسین علیہما السلام دونوں حضرات کی دو زلفیں یکجا رکھی ہوئی ہیں۔ چند متفرق زیارتیں بھی ہیں۔ یہ تعداد میں سات ہیں۔ اوّل علم مبارک خاص کربلائے جنگ کا۔ دوم تسبیح خاک شفا۔ سوم ایک ڈبہ خاک کربلا سے بھرا ہوا۔ چہارم ایک مشجر کپڑا جس پر سورۂ انا فتحنا لکھی ہے۔ پنجم بیت اللہ کا غلاف۔ ششم روضۂ غلاف عالیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہفتم غلاف روضۂ عالیہ امام حسن علیہ السلام۔ یہ تمام زیارات عالیات تبرکات اور نادرات بڑی حفاظت سے ایک عالیشان مکان میں رکھے ہوئے ہیں۔ فقیر کرم الدین

نے کمال محبت اور شوق بہت سا روپیہ صرف کرکے ان کو چاندی سونے کی نلکیوں میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ (ص ۵۲۱)

مصنف نے اس کتاب کے صفحہ (۳۲۰) پر نور پور شاہاں کا ذکر کیا ہے اور صفحہ (۵۲۴) پر مقبرہ شاہ لطیف بری قادری سے متعلق تحریر کیا ہے۔ نور پور شاہاں کی شہرت حضرت شاہ لطیف بری ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ قصبہ پہلے چور پور کہلاتا تھا جب حضرت بریؒ نے نزول اجلال فرمایا۔ تو یہ قصبہ چور پور سے نور پور شاہاں بن گیا اس کی طرف مصنف نے اشارہ نہیں کیا۔ نیز حضرت بری شاہ لطیف کو خدا معلوم الفون نے سلسلہ قادریہ کے سلسلے میں کیونکر منسلک کر دیا ہے۔ سید شاہ لطیف امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا سلسلہ خانوادۂ قادریہ سے ہرگز منسلک نہیں۔ ان کے بزرگ (سید) ضلع راولپنڈی سے نقل مکانی کرکے (کرسال) ضلع جہلم میں چلے گئے تھے۔ اب تک ان کی اولاد میں سید ولایت حسین شاہ (المعروف باوا پیر ولایت) مشہور زمانہ بزرگ زندہ ہیں اور ان کا سلسلہ کشف و کرامات ائمہ طاہرینؑ سے منسلک ہے۔

(۳) مادہ ہائے تاریخ

گنجینۂ سروری: اس کتاب کا دوسرا نام گنج تاریخ ہے۔ اور گنج تاریخ ہی سے سال اشاعت بھی برآمد ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کئی ہزار مادۂ تاریخ جمع کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں بھی مفتی صاحب نے بے شمار مادۂ تاریخ کہہ کر پیش کیے۔

چمن بے نظیر: چمن بے نظیر (۶۴) صفحے پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد گلشن مشاہیر (۶۵) صفحے سے (۱۰۰) تک ہے۔ گلشن مشاہیر میں بھی مفتی صاحب کے کہے ہوئے بہت سے قطعات تاریخ شامل ہیں۔ یہ کتاب امرتسر سے نیاز علی خان تاجر کتب مالک مطبع افغانی امرتسر نے شائع کی تھی۔ اگرچہ یہ مجموعہ گنج تاریخ اور دوسرے تذکروں ہی سے مرتب کیا گیا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ چھپنے کے بعد اس میں کچھ ایسے مادے بھی نکل آئیں جو گنج تاریخ اور تذکروں میں محفوظ نہیں۔

مفتی صاحب تاریخ گوئی کے استاد تھے۔ میں انشاء اللہ ان کی تاریخوں پر مستقبل قریب میں ایک مقالہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اس مختصر مضمون میں ان کتابوں کے شایان شان تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔

(۴) دواوین

دیوان نعت سروری: یہ دیوان سنہ ۱۸۸۱ء میں طبع ہوا۔ یہ دیوان نعت میں ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔

دیوان حمد ایزدی: یہ دیوان سنہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ حمد باری تعالیٰ میں سر نیاز خم کیا گیا ہے۔

دیوان سروری: حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت اس دیوان میں ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا۔

کلیات نعت سروری: یہ دیوان بھی نعت میں ہے۔ جس میں ان کا تمام نعتیہ کلام آگیا ہے۔ سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۸۸۴ء تک ہزاروں کی تعداد میں اس کے نسخے چھپ کر مشتہر ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں جب مفتی صاحب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ تو ان کے فرزند مفتی غلام صمد وکیل نے "دیوان وصال سرور" کے نام سے وہ تمام نعتیں شائع کر دیں۔ جو مفتی صاحب نے اثنائے سفر حج میں تصنیف کی تھیں۔ اس کے بعد دیوان وصال سرور بھی ان کے مطبوعہ نعتیہ دواوین میں شامل کرکے ان کے ورثا نے شائع کر دیا۔ اور کلیات نعت سروری اس کا نام رکھا۔

(۵) مناقب

مناقب غوثیہ: حضرت شیخ محمد صادق شیبانی کی فارسی کتاب کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔

گلدستۂ کرامات:۔ یہ کتاب اردو نظم و نثر میں ہے اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب اس میں درج ہیں۔

(۶) انشاء

انشائے یادگارِ اصغری:۔ یہ کتاب بھی اردو نظم و نثر میں ہے۔ جو مفتی صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام پر لکھی تھی۔

(۷) پند و نصائح

مخزنِ حکمت:۔ یہ کتاب اردو نثر میں ہے اور پہلی مرتبہ ۱۲۸۵ھ میں اور پھر ۱۲۹۶ھ میں تصحیح اور اضافے کے بعد لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں حکمائے متقدمین و متاخرین کے حالات اختصار سے لکھے ہیں۔ نیز ان کے اقوال۔ افعال۔ اخلاق۔ آداب نکات۔ حکایات اور پند و نصائح جمع کئے ہیں۔ جو طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں۔

تحفۃ الابرار:۔ پند نامہ فرید الدین عطار کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی پند و نصائح میں مفتی صاحب کی یادگار ہے طلبہ کے لیے بے حد کارآمد ہے۔

(۸) اخلاقیات

گلشنِ سروری:۔ یہ ایک مثنوی ہے جو ۱۲۹۵ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب مذہبی خیالات اور پند و نصائح پر مبنی ہے۔ اس کے ۲۴ باب ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ عباداتِ خدا۔ خدمتِ استاد۔ مدد محتاج قناعت پارسائی۔ جرات وغیرہ خاص و عام دونوں کے لیے چراغِ ہدایت ہے۔

تحفۂ سروری:۔ گلشنِ سروری کی طرح ایک مثنوی ہے۔ سات حصوں میں منقسم ہے۔ اس کتاب میں بھی اخلاقی مضامین ہیں۔

اخلاقِ سروری:۔ یہ کتاب بھی علم اخلاق پر ایک نادر چیز ہے۔ اس میں اخلاق کی اصلاح اور دوسرے اخلاقی نکات سے روشناس کرایا گیا ہے نثر اور نظم دونوں کی حامل ہے۔

(۹) لغات

لغاتِ سروری:۔ اس لغت کا تاریخی نام زبدۃ اللغات ہے۔ پانچ برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ۱۲۹۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس لغت میں قدیم طرز و ترتیب حروف بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

جامع اللغات:۔ یہ لغت ان کی آخری تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی۔ مفتی صاحب کو لغت نویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ہزاروں ترکی۔ عربی۔ فارسی۔ الفاظ اس میں آ گئے ہیں۔ محاورات و اصطلاحات کے مطالب و معانی اردو میں نہایت قابلیت سے لکھے ہیں۔ لغت مبسوط اور جامع ہے۔

مفتی صاحب اردو۔ فارسی۔ عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ ان کی تمام تصانیف مفید اور کارآمد ہیں اور اہلِ علم ہمیشہ اُن سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

آخری عمر میں مفتی صاحب مرحوم حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۸۹۰ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ان کی تاریخ وفات ان کا اپنا ہی کہا ہوا یہ مصرع ہے۔ ؎

اجی سرور نے کی ہے سرورِ عالم کی پابوسی

۱۳۰۷ ہجری

شمس العلماء خان بہادر سید محمد لطیف جج (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء)

سید محمد لطیف دہلی کے باشندہ تھے۔ آپ کے جدِ بزرگوار مولانا محمد عرب صاحب شاہجہان کے دورِ حکومت میں مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لائے اور محکمۂ اوقاف کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ یہ عہدہ ان کی اولاد میں پشت ہا پشت تک قائم رہا۔

سید محمد لطیف ۱۸۴۶ء میں سید محمد عظیم[1] کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے وہ ذہین و فطین تھے۔ اُردو فارسی، عربی اور انگریزی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان ۱۸۶۲ء میں پاس کیا۔ اُن کے والد ماجد سید محمد عظیم نے لاہور میں ۱۸۴۹ء میں ایک پریس قائم کیا۔ پنجاب میں یہ اوّلیں پریس تھا جس میں فارسی اور انگریزی کے شعبے علیحدہ علیحدہ تھے۔ یہ پریس ایک شاہی عمارت میں جو نولکھا کے نام سے مشہور تھی قائم کیا گیا تھا۔ نولکھا کی یہ عظیم عمارت جہاں اب ریلوے سٹیشن ہے وہاں واقع تھی۔ نولکھا تھانہ آج بھی اس کے نام کی یاد کو تازہ کر رہا ہے۔ سید محمد عظیم نے یہیں سے اخبار "لاہور کرانیکل" انگریزی زبان میں جاری کیا۔ یہ اخبار سرکار انگلشیہ کی پالیسی کی زبان تھا۔ حکومت کی نظر میں اس کی وقعت تھی۔ ملکی خبروں کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا جاتا تھا۔ کسی وجہ سے جب اس اخبار کے عملے میں پھوٹ پڑ گئی اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی تو سید عظیم نے اس سے علحدگی اختیار کی اور ایک دوسرا اخبار "پنجابی اخبار" کے نام سے نکالا۔ جو پہلے انگریزی میں طبع ہوتا تھا۔ پھر اردو میں بھی چھپنے لگا۔

اسی علمی ماحول میں سید محمد لطیف کی پرورش ہوئی۔ اور اس کے مطابق ان کا مذاق ڈھلنے لگا۔ شروع جوانی ہی سے وہ اردو انگریزی اخبارات میں مضامین لکھنے لگے جن سے ان کی استعداد اور شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اُردو انگریزی دونوں زبانوں کے انشا پرداز تھے۔ ان کی زبان میں سادگی اور ندرت تھی۔ ملک بھر میں ان کی تحریروں کی دھوم تھی۔ اور خاص و عام میں ان کو زبردست شہرت و مقبولیت حاصل تھی۔

سید محمد لطیف صاحب نے لاہور میں بیٹھ کر پہلے تاریخ پنجاب ۱۸۸۹ء میں اردو زبان میں لکھی۔ اس کتاب کے متعلق سیتارام کوہلی نے مہاراجہ "رنجیت سنگھ" نامی کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ پیتان مرے۔ میک گریگر اور کننگم نے ۱۸۲۴ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیانی عرصہ میں جو کتابیں شائع کی ہیں۔ ان ہی کی بنیاد پر اس کے بعد سر لیپل گرفن اور سید محمد لطیف نے اپنی تصانیف مرتب کیں۔ سید محمد لطیف نے مہاراجہ کے زمانے کی لکھی ہوئی فارسی کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تاریخ پنجاب کی ترتیب و تدوین سے اہلِ ذوق نے ان کی قابلیت کا اندازہ لگایا چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے انھیں اخبار انجمن پنجاب کی ادارت سپرد کر دی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد چیف کورٹ میں ہیڈ مترجم کی ضرورت پیش آئی —— تو ڈاکٹر لائٹنر نے آپ کو ججوں کے سامنے پیش کیا۔ جنھوں نے ان کی قابلیت کا جائزہ لینے کے بعد ہیڈ مترجم کا عہدہ بھی انھیں تفویض کر دیا۔ حکومت پنجاب بنظرِ غائر ان کی لیاقت کا مطالعہ کرتی رہی۔ آخر ان کی وفاداری اور قابلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں

---

[1] سید محمد عظیم نے ۲۷ جنوری ۱۸۸۵ء کو وفات پائی اور قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے۔ سب سے بڑے سید محمد لطیف۔ منجھلے شمس الدین جو سب جج ہو کر ریٹائر ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ سب سے چھوٹے سراج الدین تھے۔ جو بہاولپور میں چیف جج تھے۔ انھوں نے ۲۷ یا ۱۹۲۶ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیا۔ اور ملتان تعیناتی کر دی۔ جہاں انھوں نے انگریزی زبان میں تاریخ ملتان ۱۸۸۹ء میں لکھی۔ پھر انگریزی زبان میں تاریخ پنجاب لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ پھر تاریخ لاہور ۱۸۹۲ء میں لکھی اور آخر میں تاریخ آگرہ ۱۸۹۶ء میں تحریر کی۔

جس طرح تاریخ پنجاب، تاریخ ملتان اور تاریخ آگرہ میں انھوں نے بہت سے تاریخی مواد کو یکجا کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ لاہور میں انھوں نے خوب داد تحقیق دی۔ یہ کتاب ایک مدت سے نایاب تھی۔ اب ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی ہے جس کے دیباچے سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب (۴۲۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

لاہور اگرچہ تاریخی عمارات کے اعتبار سے دہلی یا آگرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یہاں بے شمار تاریخی یادگاریں موجود ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں کسی ایک شہر کو اتنے شاہی خاندانوں کا دارالحکومت رہنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ جتنا کہ لاہور کو حاصل رہا ہے۔ آریوں کی افواج اور ویدک دھرم کے بھجن گانے والوں کا صدر مقام بھی یہی تھا۔ اس سبب کہ باہر سے آنے والے لاہور ہی سے گزر کر اندرونی ملک تک پہنچے۔ شمالی پنجاب بدھ مت کا گھر تھا۔ اور یہیں سے بدھ مت کی تبلیغ اور اشاعت دوسرے ممالک میں کی جاتی تھی۔ آج بھی بدھ دھرم کے نشانات اس علاقے میں موجود ہیں۔ سکندر اعظم کی فتوحات سے ہندو دھرم پر جو اثرات پڑے۔ اس کے نتائج ان قدیم مجسموں سے ظاہر ہوتے ہیں جو اس علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ سیاسی نقطہ نظر سے پنجاب کو برصغیر پاک و ہند میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس برصغیر کے نیزے کا پھل اور قلعے کی دیوار ہے۔ چنانچہ یہ سرزمین بہادروں کی سرزمین ہے۔ اور اس برصغیر میں دستِ شمشیر زن کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہر لاہور ہندو و مسلمان شاہان سلف کا دارالسلطنت رہا ہے۔ دو صدیاں اس پر ایسی گزری ہیں۔ جب یہ ہندو دھرم اور اسلام کی جنگ میں سب سے اہم چھاؤنی تھی۔ یہ دور سبکتگین اور محمود غزنوی کا دور ہے۔ آخر ریگ زار عرب کا مذہب اس خطے میں قائم ہو گیا۔ اس شہر میں اکبر اعظم شاہانہ دربار کرتا تھا۔ اس سرزمین میں جہانگیر اور نور جہاں کی محبت پروان چڑھی۔ یہیں شاہجہان پیدا ہوا۔ اور پھر یہیں پاک نفس گورو نانک نے وحدت کے گیت گائے اور انسانوں کی مادی اور روحانی تباہی سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کے اور ان کے جانشینوں کے اپنے مذہبی خیالات کو پھیلانے کے کام میں اس شہر نے بڑا اہم حصہ لیا۔ اس لیے کہ جب خاندان تیمور کا زوال ہوا تو گورو کے چیلے جنگجو سپاہی بن گئے۔ اور ان کے ماننے والوں نے کھیتی باڑی چھوڑ کر مذہبی جوش میں تلوار سنبھال لی۔ چنانچہ آخر کار لاہور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا صدر مقام بنا۔ اور اس کے بعد انگریزی دور میں اس صوبے کا پایۂ تخت ٹھہرا۔ جس کی سرحدیں بہترین آریہ بہادروں کے وطن تھیں۔ اس شاہانہ شہر کی ایک تاریخ کی ضرورت تھی۔ جس میں ماضی کے شاندار واقعات کا حال اور ان عظیم افراد کا تذکرہ ہو۔ جنھوں نے ملک کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی تاریخی یادگاروں کا بیان بھی ہو۔ ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ یوں کہنے کے لیے لاہور کی ایک مختصر تاریخ مسٹر تھارن ٹن (THORNTON) نے ۱۸۷۶ء میں شائع کی تھی۔ مگر یہ ایک مختصر کتاب تھی۔ جس میں بہت سی ضروری باتوں کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے موجودہ کتاب LAHORE لکھی گئی۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ جس میں اسلامی دور کے اہم واقعات کو یکجا کیا گیا ہو۔ زمانہ ماقبل اسلام کی تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات پائی جاتی تھیں۔ اسی لیے قدیم عمارات اور عجائبات پر روشنی ڈالنا اور بھی مشکل تھا۔

خزینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، طبقات اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، منتخب التواریخ وغیرہ سے صوفیائے کرام اور حکمرانانِ وقت کے حالات جس مبالغہ آمیز بلکہ ناقابل فہم طریق سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ وہ ان کتابوں سے پوری طرح استفادہ حاصل نہیں ہونے دیتے۔ شاہجہان نامہ ملا محمد صالح لاہوری، خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی، بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری۔ تواریخ مجددیہ، تحفۃ الواصلین شیخ احمد زنجانی۔

تاج المآثر حسن نظامی لاہوری۔ تاریخ داؤدی مصنفہ عبداللہ۔ تاریخ رشیدی مصنفہ حیدر مرزا۔ تاریخ چغتائی مصنفہ محمد ہادی۔ تاریخ آنند رام مخلص۔ تاریخ احمد شاہی سے جستہ جستہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

عمارات لاہور کے سلسلے میں ہمیں ان عمارتوں سے حکم لگانا چاہیئے۔ جو آج موجود ہیں اور امتداد زمانہ سے بچ رہی ہیں۔ افغانوں اور سکھوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ لاہور کی عمارات کو تباہ کیا۔ بہت سی بے مثال عمارتیں قطعاً منہدم ہو گئیں۔ اور اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ بعض عمارات ایسی ہیں کہ شکست و ریخت کے بعد بھی ان کا ڈھانچہ باقی ہے۔ آج بھی یہ عمارتیں گزری ہوئی حکومتوں اور مٹی ہوئی تہذیبوں کی مرثیہ خواں ہیں۔ اور اپنے ساتھ ایک یادگار وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ عمارات لاہور پر دو کتابیں موجود ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کی کتاب "تحقیقات چشتی" اور رائے بہادر لالہ کنہیا لال کی کتاب "تاریخ لاہور"۔ تحقیقات چشتی میں بہت سی سنی سنائی اور فرضی کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور تاریخ لاہور میں کوئی نئی بات نہیں۔ چنانچہ مصنف کو اپنے کام کا مواد نہ مل سکا اور اس سے شہر کے پرانے باشندوں ارباب علم و فضل۔ بڑے بوڑھے اور دوسرے لوگوں کے پاس جا جا کر معلومات فراہم کرنا پڑی۔ پھر اس معلومات کو دوسری کتابوں اور حوالہ جات کی روشنی میں پرکھنا پڑا۔ ریاض الاحباب۔ تذکرۃ العارفین۔ قصص الاولیا۔ نفحات الانس۔ مراۃ الہند۔ حبیب السیر۔ کتاب رضوانی۔ کشف المحجوب۔ حقیقت الفقراء۔ دلیل العارفین وغیرہ اور ان کے علاوہ بھی بے شمار کتابوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ چنانچہ اسلامی دور کے خاتمے پر جن عمارتوں کو سرے ہی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کے متعلق پوری تحقیق کی گئی ہے اور جو قدیم عمارتیں شہر لاہور کے اندر یا قریب واقع ہیں۔ ان کی جزئیات فراہم کی گئی ہیں۔

آخر میں مصنف نے انگریزی دور حکومت پر اظہار اطمینان کیا ہے کہ اس سے قبل کا دور مسلمانوں کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور کی تمام مسجدوں میں گولہ بارود وغیرہ ذخیرہ کر رکھا تھا۔ اور بعض مساجد میں فوجیوں کے گھوڑے تک باندھے جاتے تھے۔ مصنف کا دعویٰ تو یہ ہے کہ خود اسلامی دور میں بھی جان و مال کی حفاظت ایسی نہ تھی۔ جتنی انگریزی عملداری میں ہے یہاں تک کہ اکبر اعظم کے عہد زریں میں ایسی خوشحالی اور اطمینان اہالیان لاہور کو حاصل نہ تھا۔

یہ کتاب ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اب تک اس کی بے حد مانگ رہی ہے۔ طبع ثانی ۵۷-۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب میں سو سے زائد نقشے اور شہر لاہور کا ایک نقشہ شامل ہے۔ بعد کے مورخین لاہور نے خواہ حوالہ دے کر خواہ حوالہ دیئے بغیر اسی کتاب سے اپنا مواد حاصل کیا۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول:۔ اس میں لاہور کا تاریخی حال ہے۔ لاہور کا نام اور بنا کی تاریخ۔ لاہور اسلامی دور حکومت سے پہلے غزنوی خاندان۔ غوری خاندان۔ خاندان غلاماں۔ خلجی۔ تغلق خاندان۔ لودھی خاندان۔ دور مغلیہ۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ اورنگ زیب اور جانشینان اورنگ زیب۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے جانشین۔ انگریزوں کی فتح پنجاب۔ اس دور میں لاہور پر کیا گزری۔ اور ان حکمرانوں کا اس شہر کے ساتھ کیا تعلق رہا؟

باب دوم:۔ یہ باب بیانیہ ہے۔ اس میں دریائے راوی۔ شہر پناہ۔ اور اس کے تیرہ دروازے (روشنائی دروازہ کشمیری دروازہ۔ مستی دروازہ۔ خضری دروازہ۔ یکی دروازہ۔ دہلی دروازہ۔ اکبری دروازہ۔ موچی دروازہ۔ شاہ عالمی دروازہ۔ لوہاری دروازہ۔ موری دروازہ۔ بھاٹی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ) مغلوں کے ابتدائی دور کا لاہور۔ لاہور کے مختلف محلے اور بازار۔ مہاراجہ رنجیت اور اس کے جانشینوں کے

زمانے میں۔ لاہور کی عمارتیں ہندو عہد حکومت۔ پٹھان دور حکومت۔ مغل اور سکھ ادوار حکومت۔ مختلف بادشاہوں اور شاہزادوں کے مزارات۔ مقبرہ جہانگیر۔ مزار نور جہاں۔ بارہ دری کامران۔ بادشاہی مسجد۔ مسجد وزیر خاں۔ سنہری مسجد۔ حضوری باغ۔ قلعہ۔ رنجیت سنگھ کی سمادھی۔ مسجد مریم زمانی۔ شالامار باغ۔ مقبرہ انار کلی۔ چوبرجی کا ذکر ہے۔

باب سوم:۔ یہ باب بھی بیانیہ ہے۔ اور موجودہ زمانے سے متعلق ہے۔ اس میں انار کلی۔ میاں میر۔ لاہور کی آبادی۔ موسم۔ درخت۔ پھل۔ پھول۔ ترکاریاں۔ لوگوں کے رسومات۔ میلے ٹھیلے۔ جدید عمارتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نیشنل آرٹس کالج۔ اورنیٹل کالج۔ ڈی اے وی کالج۔ ریلوے سٹیشن۔ میو ہسپتال۔ گورنمنٹ ہاؤس۔ تار گھر۔ سنٹرل جیل۔ جنرل پوسٹ آفس۔ سینٹ ہال۔ گورنمنٹ کالج۔ پنجاب یونیورسٹی۔ پنجاب ریلیجس سوسائٹی۔ مسجد کریم بخش۔ مسجد صفدر خاں۔ راوی کا پل۔ پنجاب پبلک لائبریری اور لاہور کے مشہور خاندانوں کا تذکرہ دیا ہوا ہے۔

باب چہارم:۔ اس میں لاہور کے عجائبات۔ سنٹرل میوزیم۔ بدھوں کے مجسمے۔ کوہ نور ہیرے کی تاریخ۔ زمزمہ (توپ) نواب علی مردان خاں کے بزرگوں کے حالات۔ پرانے سکہ جات کا حال اور ان کی ۱۱۲ تصاویر ہیں۔

سید لطیف ایک باکمال مورخ تھے۔ ان کی تحریر بہت سلجھی ہوئی ہے۔ تاریخی واقعات کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص روانی اور ندرت ہے جس سے ان کی تاریخ نویسی میں ادبی چاشنی بھی ہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں آپ نے ڈسٹرکٹ جج اور ڈویژنل جج کا عہدہ بھی حاصل کیا۔ لیکن فرصت کا کوئی وقت بھی بے کار نہیں جانے دیا۔ مسٹر پلوڈن ریذیڈنٹ حیدرآباد (دکن) نے ایک مرتبہ آپ کو چیف جج کے لیے حیدر آباد بلایا اور باضابطہ آپ کا تقرر بھی منظور ہو گیا۔ مگر آپ کے مخلص احباب نے آپ کو وہاں نہ جانے دیا۔

چونکہ انھوں نے تحقیق و جستجو سے ایک اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس لیے گورنمنٹ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شمس العلماء اور خان بہادر[1] کے معزز خطابات سے ان کی عزت افزائی کی۔ وہ ایف۔ آر۔ اے۔ ایس، ایف۔ آر۔ جی۔ ایس تھے۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ممبر اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ان کے قلم کی جنبش نے ہزاروں تاریخی واقعات کو مٹنے سے بچایا۔ ہزاروں شخصیتوں کو گمنامی کے گڑھے سے نکال کر زندہ کیا۔ تاریخ ان کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کرے گی۔ آخر یہ باکمال مورخ گوجرانوالہ میں جہاں وہ بطور جج خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۰۲ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی نعش لاہور لائی گئی۔ اور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ سر سید احمد خان کے خاندان سے تھیں ان کا انتقال جون ۱۹۱۸ء میں ہوا تھا۔

تو ہی باقی رہے گا یا باقی

کرنل بھولا ناتھ (المتوفی ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء)

کرنل بھولا ناتھ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ذی عزت راجپوت خاندان سے تھا۔ مذہباً عیسائی تھے۔ ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں ہوئی۔ پھر میڈیکل کالج سے ۱۸۸۷ء میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انگلستان جا کر انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں لیفٹیننٹ ہوئے۔

---

[1] خان بہادر کا خطاب ۱۸۹۰ء اور شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۸ء میں ملا۔

پھر کرنل ہو گئے۔ انگلستان سے واپسی پر بی بی بھگوتی دیوی سے شادی کی۔ وہ بھی شریف راجپوت گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ وہ تمام زندگی بطور ایک دوسرے کے معاون صلاح کار اور غم گسار رہے۔ مسز بھولا ناتھ کی وفات کے چند روز بعد ۲۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو کرنل صاحب خود بھی چل بسے۔ ان کی وفات حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی۔

۲۰ سال فوجی اور سول ملازمت کے بعد ۱۹۲۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن لے کر لاہور ہی میں اقامت اختیار کی۔ اور خدمتِ خلق میں مصروف رہے۔ علمی و فنی مشاغل ان کی زندگی کا جزو تھے۔ سیر و سیاحت سے اکثر جی بہلایا کرتے تھے۔ اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ ادبی محفلوں میں اردو، فارسی اور پنجابی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ وارث تخلص تھا۔ اچھے شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے اپنے پیشے کی رعایت سے دوران ملازمت میں ایک کتاب "علم و عمل طب" کے نام سے لکھی۔ یہ بڑی مستند کتاب ہے جس میں طبی معلومات کا ایک خزانہ جمع کر دیا ہے۔ ایک دوسری کتاب اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال قبل "جنسی امراض اور ان کا علاج" مرتب کی۔ یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن کتب خانہ لطف زندگی اندرون موچی دروازہ سے شائع ہو چکے ہیں۔

چونکہ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ ان کے نام کے ساتھ (آئی۔ ایم۔ ایس ی۔ ایس۔ آئی سابق ڈائرکٹر میڈیکل سروس (الہ آباد) وجنرل انچارج برٹش فیلڈ ہسپتال عراق آنریری فزیشن ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم) لکھا جاتا تھا۔ فن طب میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کی فطری صلاحیت اور تجربے نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی جہاں ان کا دل خدمت خلق کے جذبے سے مملو تھا۔ وہاں وہ ادبی ذوق کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ علمی و ادبی کام بھی کئے ہیں۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کی۔ ادبی انجمنوں کی استدعا پر بعض اوقات صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور تقاریر بھی کیں۔ ابنائے وطن میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ تگ و دو کی۔ اُردو ہی کی نہیں۔ بلکہ پنجابی کی بھی سرپرستی کی۔

پنجابی زبان میں ان کی ایک گراں قدر تصنیف تاریخ شہر لاہور ہے۔ یہ کتاب اردو رسم الخط میں پروپرائٹر سارنگ آفس گنپت روڈ لاہور نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔ کتاب کے ۲۵۷ صفحات ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ شریمتی بھگوتی بھولا ناتھ کے نام معنون کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ سارنگ میں چھپتے رہے۔ انھوں نے اس کتاب کے صفحہ (۲۴۵) میں اس امر کا ذکر کیا ہے۔ کہ شہر لاہور کے مضمون دو سال تک رسالہ سارنگ میں چھپتے رہے۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر تھے۔ ان سے اجازت حاصل کر کے ان مضامین کا یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ کتاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے راج کے وسط تک لکھ کر چھوڑ دی گئی۔ مہاراجہ کے زمانے سے لے کر ۱۸۹۵ء تک پچاس برس ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں بے شمار دلچسپ تاریخی واقعات پیش آئے۔ جو کرنل بھولا ناتھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان پچاس ساٹھ برس کے حالات پر علیحدہ کتاب لکھیں گے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اور ان کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔

"شہر لاہور دی تاریخ" لکھتے وقت کرنل بھولا ناتھ نے یہ التزام قائم رکھا ہے کہ لاہور کے جس قدر قدیم نام جب ان کا شمار کیا ہے۔ لوپور۔ لولوک۔ لوکلا (لولوک اور لوکلا کو کئی مورخ لاہور ہی سمجھتے ہیں)۔ لوہکوٹ۔ لہاور۔ لوپور۔ لوہار۔ لوہر۔ راہوار۔ یہ لاہور کے نام لکھنے

کے بعد ابوریحان بیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ محمود غزنوی کے ہمراہ لاہور آیا۔ تو اس وقت اس کو لاہور ہی کہتے تھے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کی پرانی متبرک کتابوں (وید۔ مہا بھارت۔ رامائن پران۔ راج ترنگنی) میں لاہور کا کہیں نام نہیں آیا۔ بدھ مت کی کتابوں میں بھی یہ نام نہیں ملتا۔ اگرچہ پرش پور (پشاور) ٹیکسلا۔ قصور، جالندھر، سالکوٹ کے نام سیاحوں نے لکھے ہیں۔ لاہور کا ذکر ان میں بھی نہیں۔ چینی سیاحوں نے ان تمام اقوام کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اس زمانے میں پنجاب میں مختلف مقامات پر قابض تھیں۔ لیکن انھوں نے بھی لاہور کا کہیں نام نہیں لیا۔ یہ بحث طویل ہے اور کرنل صاحب نے اسے نہایت قابلیت سے آسان پنجابی میں پیش کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو اس زبان پر پوری دسترس حاصل ہے۔ آخر انھوں نے خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دے کر یہ قطعہ تاریخ نقل کیا ہے ؎

محمود بنا کرد چو لاہور بسا نور ۔۔۔ در بند یکے کعبۂ مقصود بنا کر

اندیشہ چو کردم پے تاریخ بنائش ۔۔۔ فی الفور خرد گفت کہ محمود بنا کر

ذکر محمود بنا کرد کے ۲۹۵ عدد لئے ہیں (کہ کے بیس عدد لئے ہیں۔ کہ میں ہائے ہوز کو شمار نہیں کیا) جو ۲۹۵ھ کے مطابق بتایا گیا ہے۔ آگے چل کر اس پر بھی تنقید کی ہے کہ لاہور کی فتح کے متعلق تاریخ فرشتہ۔ طبقات اکبری اور سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور ۴۱۲ھ میں فتح ہوا اور محمود غزنوی نے لاہور کو محمود پور کا نام دیا۔ محمود پور کی کرنل صاحب نے یہ حد بندی کی ہے۔ ایاز کی قبر کو ایک نشان مانا ہے دوسرا نشان داتا گنج بخش کا مزار ہے۔ اور تیسرا نشان شیش محل جو جواہرات کی خرید و فروخت کرنے والوں کا بازار تھا۔ یہ ضلع کچہری کے پاس تھا محمود پور کی نشان دہی کے بعد پرانے لاہور کی جائے وقوع کے متعلق قیاس آرائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہجہان آباد کے اجمیری دروازے کا منہ اجمیر کی طرف۔ کشمیری دروازے کا رُخ کشمیر کی طرف اور دلی دروازے کا رخ پرانی دلی کی طرف تھا۔ اسی طرح پرانے بغداد کے چار دروازے تھے باب شام۔ باب کوفہ۔ باب بصرہ و باب خراسان ان دروازوں کا رخ شام۔ کوفہ بصرہ اور خراسان کی طرف تھا۔ یہی حال لاہور کا ہے۔ دلی دروازے کا رخ دلی کی طرف، کشمیری دروازے کا رخ کشمیر کی طرف اور لاہوری دروازے کا رُخ پرانے لاہور کی طرف تھا یعنی پرانا لاہور لاہوری دروازے کے باہر واقع ہونا چاہیئے۔ یہ بحث طویل بھی ہے اور اس پر کافی نقد و تبصرہ کرنے کی گنجائش ہے۔

کرنل صاحب نے غزنوی۔ سلجوقی۔ غوری۔ ایبک۔ غلاماں۔ تغلق۔ لودھی۔ خلجی۔ یونانی اور مغلیہ خاندان کے حکمرانی کے زمانے میں لاہور کی جو حالت ہوتی رہی بیان کی ہے۔ مغلیہ دور کو خاص طور سے لکھا ہے اور داد تحقیق دی ہے۔ واقعات کے ذکر کے ساتھ مناسب فارسی اشعار بھی استعمال کئے ہیں۔ جو ان کے فارسی زبان سے شغف پر دال ہیں۔

اس کتاب میں کرنل صاحب نے ایک نہایت اہم عنوان قائم کیا ہے "پنجابی بولی اتے دیاں دوسرے دا اثر" اس باب میں انھوں نے لکھا ہے کہ پنجاب کے خطے کی زبان پر مسلمانوں کے اثر سے کس قدر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ برج بھاشا میں عربی اور فارسی الفاظ بغیر کسی تحریک کے داخل ہونے شروع ہوئے۔ اسلامی تمدن اور ہندو تہذیب کے ملاپ سے کتنے الفاظ عوام کی زبانوں میں بے تکلف داخل ہو گئے۔ فارسی زبان میں بھاشا کے الفاظ آہستہ آہستہ شامل ہونے لگے۔ یہ ملاپ کچھ اس طرح واقع ہوا کہ نئی زبان سانچے میں ڈھلنے لگی۔ لیکن اس کو جدا زبان نہیں کہا جا سکتا۔

(۱) اس ضمن میں انھوں نے چند ایسے عربی و فارسی الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو تغیر کے ساتھ پنجابی زبان میں شامل ہو گئے۔ مثلاً

فارسی عربی	پنجابی	فارسی عربی	پنجابی
مشعل	مشال	پلید	پلیت
سوز	سوج	مسجد	مسیت
تعویذ	تویت	تاریخ •	تریک
بغل	بکل	فریب	پھریب
کاغذ	کاگت	زکوٰۃ	جکاتاں

(۲) ایک حرف آگے پیچھے کر کے چند الفاظ اس طرح رائج ہو گئے۔

محتاج	مہتاجی	فتیلہ	پلیتہ
قفلی	قلفی	قفل کنجی	کلف کنجی

(۳) ایک حرف گھٹا کر نئے الفاظ بنائے گئے۔

بادام	بدام	فالودہ	پھلودہ
روزینہ	رجینہ	بازار	بجار

(۴) لفظ کو بالکل بدل دیا گیا۔

ذات الجنب	جاتل جم	چوزہ	چوچا
دہل	ڈھول	منفج	مخش

(۵) سے نئے پنجابی الفاظ ڈھالے گئے۔

مزاج	مجاجی	جراحت	جراحی
پلید	پلیتی	نماز	نماجی
پیغمبر	پیگمبری	موج	موجاں

(۶) بنے بنائے الفاظ پنجابی زبان میں شامل ہو گئے۔

فوج سے متعلق الفاظ :۔ قلعہ۔ نیل۔ برج۔ خندق۔ مینار۔ قواعد۔ پیادہ۔ سوار۔ توپ۔ بندوق۔ تیر کمان۔ رکاب۔ زین۔ لگام۔ نمدہ۔ برق انداز۔ گولنداز۔ زرہ۔ زنجیر۔ بادشاہ۔ حاکم۔ وزیر۔ تخت۔

پہننے کے کپڑوں وغیرہ کے الفاظ :۔ پجامہ۔ جامہ۔ سلوار۔ کلاہ (کلا) لنگی۔ کمربند۔ ازاربند۔ تہمت (تہ بند) لباس۔ لحاف (نیف) رومال۔ چغہ۔ چادر

کھانا پکانے سے متعلق الفاظ :۔ حلوا۔ پلاؤ۔ قورمہ۔ زردہ۔ قیمہ۔ کباب۔ شکرپارہ۔ شوربا۔ نان۔ خطائی۔ باقرخانی۔ خمیری۔ برف۔ شربت۔ کلفی (قلفی)

دین و مذہب سے متعلق الفاظ :۔ اللہ۔ خدا۔ رب۔ الٰہی۔ رسول۔ نبی۔ پیغمبر۔ مرشد۔ فقیر۔ پیر۔ مرید۔ حلال۔ حرام۔ موت۔ حیات۔ دوزخ

بہشت۔ قبر۔ مقبرہ۔ روضہ۔ جنازہ۔ کفن۔ نماز۔ روزہ۔ وضو۔ غسل۔ فرشتہ۔ بانگ۔ قرآن۔ پارہ۔ حافظ۔ مسجد۔ مولوی۔ قاضی۔ مفتی۔

گھر سے متعلق الفاظ:۔ دیوار۔ بالاخانہ۔ برانڈہ (برآمدہ) منزل۔ بارہ دری۔ دلان۔ صحن۔ شہنشیں۔ تہ خانہ۔ سرد خانہ۔ پاخانہ۔ میز۔ کرسی۔ دروازہ

رنگ کے متعلق الفاظ:۔ قرمچی (قرمزی، جمردتی (زمردی) عنابی۔ نافرمانی۔ گلابی۔ پیازی۔ سرمئی۔ جنگالی (زنگاری)

رشتوں کے متعلق الفاظ:۔ مرد۔ خاوند۔ بیوی۔ رشتہ داری۔ مالک۔ غلام۔ پردہ۔ برقع۔ داماد۔ شادی۔ نکاح۔ طلاق۔ حق مہر

باغ سے متعلق الفاظ:۔ باغ۔ باغیچہ۔ پھوارہ (فوارہ) تختہ۔ سرو۔ گل۔ بلبل۔ نرگس۔ عاشق۔ معشوق۔ نہر۔ دریا۔ لہر۔ زلف۔ رخسار۔ ابرو۔ بوسہ۔ شراب۔ ساقی۔ پیالہ۔ خمار۔ مستی۔ نشہ۔ بہار۔ ہوا۔ بارش۔ ہجر۔ وصل۔

اسی طرح حکومت سے متعلق میوہ، سبزی کے متعلق، پیشے سے متعلق، پنجابی ناموں کے متعلق، طب سے متعلق الفاظ کی انھوں نے فہرست دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ پنجابی زبان نے عربی اور فارسی سے قدم قدم پر مدد لی ہے۔ اور سینکڑوں الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

کرنل صاحب نے یہ تاریخ نہایت اہتمام سے لکھی ہے۔ بڑی محنت سے تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ اپنے بیان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ضعیف روایات کا سہارا بھی لیا ہے۔ کیونکہ پنجابی زبان میں کوئی دوسری تاریخ مرتب نہیں ہوئی۔ اس لیے مورخ اسے وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت اہم اور مفید باتیں اور تاریخی تفصیلات اس کتاب میں درج کر دی ہیں جو پڑھنے کے بعد سمجھنے اور سمجھنے کے بعد پڑھنے کی دعوت دیتی ہیں ——— اگر یہ کتاب تعصب کو بالائے طاق رکھ کر لکھی جاتی اور تنقید و تبصرہ میں دیانتدارانہ پہلو اختیار کیا جاتا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ پھر بھی کرنل صاحب کی یہ مساعی جمیلہ ہمیشہ مورخین سے خراج تحسین حاصل کرتی رہے گی۔ اگرچہ اس کتاب میں غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

منشی محمد دین فوق (المتوفی ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء)

منشی محمد دین فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام مولوی لدھا خان تھا۔ جو ریاست پونچھ (کشمیر) میں سررشتہ داری کے عہدے پر فائز تھے۔ پہلے آپ شوق تخلص فرماتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اپنا کلام رسالہ "انتخاب" لکھنؤ میں برائے اشاعت بھیجا تو اس زمانے میں چونکہ شوق نیموی عظیم آبادی کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لیے مدیر "انتخاب" نے ان کو لکھا کہ حضرت شوق کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شوق کے کلام کی اشاعت کا امکان اس رسالہ میں نہیں۔ اور ساتھ ہی انھوں نے مشورہ دیا۔ کہ وہ اپنا کلام شوق کی بجائے فوق کے نام سے اگر ارسال کریں۔ تو وہ شائع کر دیا جائے گا۔ چنانچہ منشی صاحب مرحوم نے یہ تجویز پسند کی۔ اور فوق تخلص اختیار کر لیا۔

ابتدائی تعلیم جامکے (ضلع سیالکوٹ) سے شروع ہوئی۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۴ء تک مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے علمی ذوق اور فطری مناسبت کی وجہ سے اپنے احباب میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ زمانۂ طالب علمی میں حضرت نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم "کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس وقت وہ علم عروض سے محض نابلد تھے لیکن طبیعت میں موزونیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے ترجمہ میں کہیں عروضی سقم نہ تھا۔ اس کمال کو دیکھ کر ان کے اساتذہ اور احباب بہت خوش ہوئے جس سے ان کی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ جامکے سے خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ اور اس کے بعد ایچی سن مڈل سکول لاہور میں بھی آپ نے تحصیل علم کی۔ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کر کے سیالکوٹ میں پٹوار کا کام سیکھنا شروع کیا۔ وہاں ملازمت کی توقع پر جموں تشریف لے گئے۔ جموں سے ۱۸۹۶ء میں پھر لاہور کا رخ کیا۔

لاہور میں مشاعروں کا زور تھا۔ "انجمن اتحاد" جس کی بنیاد حکیم شجاع الدین محمد نے سنہ ۱۸۹۰ء میں ڈالی تھی خوب چمک رہی تھی اور منعقد ملا مشاعرے اندرون بھاٹی دروازہ ہو رہے تھے سب پہلے اس انجمن کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان پر ہوتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں حکیم شجاع الدین محمد کے انتقال کے بعد یہ مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی کی سرپرستی میں ہوتے رہے۔ خان احمد حسین خاں مدیر "شباب اردو" اس انجمن کی جان تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی ان مشاعروں میں خاص طور سے شرکت کرتے تھے۔

شاعرانہ چشمک کی بنا پر انجمن دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ نئی انجمن نے بزم قیصری کے نام سے میر ناظر حسین ناظم لکھنوی کی سرپرستی میں جلوہ مشاعرے کرنے شروع کئے۔ یہ مشاعرے حضوری باغ میں ہوتے تھے۔ خان احمد حسین خان کی طرف سے "شور محشر" اور ناظم صاحب کی طرف سے "سخن" طرحی غزلوں کے گلدستے ماہوار شائع ہوتے تھے۔ "انجمن اتحاد" اور "بزم قیصری" دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی پوری کوشش کرتی تھیں۔ ان دونوں مشاعروں کی گہما گہمی سے عوام میں صحیح شعری ذوق بیدار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرحی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اسی زمانے کا یہ مقطع ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

فوق صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور داد سخن دیتے۔ اسی زمین میں ان کا ایک شعر ہے ؎

بہائے آنکھ نے شرم گنہ سے اس قدر آنسو
کہ ہر اشک ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا

مشاعروں میں شرکت اور طرح پر غزلیں کہنے سے فوق صاحب کی مشق سخن بڑھنے لگی۔ چنانچہ انھوں نے جہاں استاد حضرت داغ سے اصلاح کلام کی استدعا کی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۶ء میں آپ حضرت فصیح الملک مرحوم کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ اور ان کا کلام حضرت داغ کے ملاحظے کے بعد روشن سے روشن تر ہونے لگا۔ استاد اور شاگرد میں والہانہ محبت تھی۔ استاد اپنے شاگرد کا دل بڑھاتے۔ شاگرد اپنے استاد کے فیض کے گن گاتا۔ اسی دور کا ایک شعر یادگار ہے ؎

داغ کا فیض اگر یونہی رہے گا اے فوق
مان جائیں گے سخنور بھی فصاحت میری

چنانچہ داغ کے کمال کا رنگ شاگرد کے کلام میں جھلکنے لگا۔ ان کا کلام ماہوار گلدستوں میں چھپ کر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرنے لگا۔ چنانچہ نظم میں انھوں نے تمام اصناف سخن پر یکساں داد سخن دی ہے۔ جس سے ان کی کہنہ مشقی آشکارا ہے۔

وہ ایک آتش بیاں شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک بہت بڑے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے "پنجۂ فولاد" سنہ ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ حضرت فصیح الملک نے قطعہ تاریخ کہا ؎

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری — خریدارو نیا اخبار دیکھو
جناب فوق کی گلکاریوں سے — ہوا اخبار یہ گلزار دیکھو
نئی خبریں بہت اچھی ملیں گی — جو ہو کر طالب دیدار دیکھو

نظر چڑھ جائے گر اہلِ نظر کی	پھر اس کی گرمیٔ بازار دیکھو
یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو	نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو
اٹھا کر دیکھ کے سو سو بار اس کو	اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جوہر بار دیکھو
۱۹ ۱۳ ۱۲

یہ اخبار اس دور کے بہترین اخبارات میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے "کشمیر میگزین" کے نام سے ایک ماہوار رسالے کا اجرا کیا۔ جو ۱۹۱۳ء میں ترقی کرتے کرتے ہفتہ وار اخبار کی شکل اختیار کر گیا۔ تیس برس یہ اخبار نکلتا رہا۔ جس نے علم و ادب کے ترویج کے علاوہ معاشرتی اور سماجی خدمات ایک مدت تک انجام دیئے۔ ۱۹۳۴ء میں آخر یہ اخبار بند ہو گیا۔ منشی صاحب مرحوم نے پیسہ اخبار اور پنجاب کے اولین اخبار "کوہ نور" کے بھی ادارتی فرائض انجام دیئے۔ جس سے ان کا شمار پنجاب کے اولین اخبار نویسوں میں ہوتا ہے۔

منشی صاحب ایک نغز گو شاعر اور کامیاب اخبار نویس ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک مایۂ ناز مورخ اور صاحب نظر مصنف بھی تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں:۔

کشمیر کے متعلق

۱۔ تاریخ کشمیر جلد اوّل (راجگان قدیم)
۲۔ تاریخ کشمیر جلد دوم (شاہانِ اسلام)
۳۔ تاریخ کشمیر جلد سوم (سکھ اور ڈوگرہ راج)
۴۔ رہنمائے کشمیر (کشمیر گائیڈ)
۵۔ تاریخ اقوام کشمیر (تین جلد)
۶۔ شاہی سیر کشمیر
۷۔ سفرنامہ کشمیر
۸۔ غنی کاشمیری
۹۔ للہ عارفہ
۱۰۔ کشمیر کی رانیاں
۱۱۔ مشاہیر کشمیر
۱۲۔ خواتین کشمیر
۱۳۔ شباب کشمیر
۱۴۔ حکایاتِ کشمیر
۱۵۔ کشمیری زمیندار
۱۶۔ تذکرہ سلطان زین العابدین
۱۷۔ تاریخ بڈشاہی (سوانح سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ)۔ اس تصنیف پر مصنف کو حکومت کشمیر کی طرف سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا گیا۔
۱۸۔ تاریخ اقوام پونچھ (دو جلد)
۱۹۔ حکمت کے موتی (بارھویں صدی کے ایک کشمیری مورخ کے حالات و نصائح)
۲۰۔ جغرافیہ پونچھ
۲۱۔ دربار بھمبر

عام تاریخی کتابیں

۲۲۔ تاریخ حریت اسلام
۲۲۔ تاریخ کا روشن پہلو

۲۴۔ تاریخ شالامار باغ

۲۵۔ سوانحات عمر ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مع تاریخ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ

۲۶۔ تاریخ انگورہ

۲۷۔ تذکرہ خواتین دکن

۲۸۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور

۲۹۔ جمال الدین افغانی

۳۰۔ مکمل سوانح عمری داتا گنج بخشؒ

۳۱۔ حیات مولانا روم

۳۲۔ حالات شمس تبریزؒ

۳۳۔ یاد رفتگاں یا تذکرہ صوفیائے لاہور

۳۴۔ حیات فرشتہ (حیات مولف تاریخ فرشتہ)

۳۵۔ تذکرہ ابراہیم ادھم

۳۶۔ محب وطن خواتین ہند

۳۷۔ سعد زاغلول پاشا

۳۸۔ سیرت فریدیہ (سوانح نواب فریدالدین احمد وزیر شاہ دہلی)

۳۹۔ تذکرۃ الصالحین

۴۰۔ سوانح عمری ایڈورڈ ہفتم

۴۱۔ تان سین کے حالات

۴۲۔ فاتح ملتان

۴۳۔ راجہ بیربر

۴۴۔ حالات راجہ ٹوڈرمل

۴۵۔ حالات نورجہاں و جہانگیر

۴۶۔ ماتم پہلوانی (سوانح غلام پہلوان)

۴۷۔ حالات مہاتما بدھ

۴۸۔ آفتاب بندھیل کھنڈ

۴۹۔ لاہور عہد مغلیہ میں

۵۰۔ بتان حرم (ان ہندو رانیوں کے حالات جو مسلمان بادشاہوں کے حرم میں داخل ہوئیں)

۵۱۔ محمد بن قاسم

۵۲۔ ہندوستانی وی سی (وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والوں کے حالات)

۵۳۔ سر جگدیش چندر بوس

۵۴۔ اہلیا بائی

۵۵۔ اخبار نویسوں کے حالات

۵۶۔ آئینہ اخلاق (بانیان مذاہب اور رہنمایان اقوام کے حالات)

منظومات

۵۷۔ کلام فوق

۵۸۔ نغمہ و گلزار

۵۹۔ قومی ترانے

۶۰۔ سکاؤٹوں کے گیت

۶۱۔ روایات اسلامی

۶۲۔ اذان بت کدہ (ہندوؤں کا نعتیہ کلام)

ناول، قصے اور لطیفے

۶۳۔ عصمت آرا

۶۴۔ خانہ بربادی

۶۵۔ مسٹر بزاٹ امرتسر

۶۶۔ غم نصیب

۶۷۔ انارکلی (جس کی داغ بیل پر بعد میں اردو و بنگالی و ہندی ڈرامے تصنیف ہوئے)

۶۸۔ مہذب ڈاکو

۶۹۔ محروم تمنا

۷۰۔ نیم حکیم خطرۂ جان

۷۱۔ اکبر

۷۲۔ ماما کہانی

۷۳۔ زنانہ حاضر جوابیاں

۷۴۔ استادوں اور شاگردوں کے لطیفے

۷۵۔ ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے

۷۶۔ سبق آموز کہانیاں

۷۷۔ دیوان حافظ کی تاریخی فالیں

متفرق تصانیف

۷۸۔ ناسخ مشفق

۷۹۔ امتحان پاس کرنے کا گر

۸۰۔ ہمدرد زمینداراں

۸۱۔ وجدانی نشتر (اس کا دوسرا نام سوز و گداز بھی ہے)

غیر مطبوعہ تصانیف

۸۲۔ تمدن کشمیر

۸۳۔ تذکرہ شیخ نورالدین ولی

۸۴۔ مزار الشعرائے کشمیر

۸۵۔ مہاراجہ گلاب سنگھ

۸۶۔ راجہ سکھ جیون مل

۸۷۔ کشمیر کا نادر شاہ (افغان گورنر آزاد خاں کے حالات)

۸۸۔ دیہات سدھار

۸۹۔ تذکرہ رہنمایان ہنود

۹۰۔ موجد اور ایجادیں

۹۱۔ چہدہ حکائتیں

۹۲۔ مآثر لاہور (چار جلدوں میں)

۹۳۔ بے نشاں نامور

۹۴۔ سرگزشت فوق (خود نوشت حالاتِ زندگی)

۹۵۔ مضامین فوق

یہ فہرست کتب ان کے گوناگوں ذوق اور فطری رجحانات کا آئینہ ہے۔ انھوں نے جہاں کشمیر کی تاریخ کی تدوین میں کوشش کی۔ وہاں انھوں نے لاہور کے متعلق بھی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ چنانچہ لاہور کے متعلق ان کی کتب بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ موجودہ دور کے مورخ ان کی تحقیقات کو اپنی تصانیف میں بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔ جو ایک بڑی کامیابی ہے۔ ان کی تصانیف میں سے اکثر کتابیں حکومت نے لائبریریوں کے لیے منظور کی ہوئی ہیں۔ جس سے ان کے کام کی وقعت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لاہور کے متعلق ان کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) یاد رفتگاں:۔ یہ ہندو مسلمان صوفیائے لاہور کا ایک نادر تذکرہ ہے۔ مقدمہ میں کئی عنوانات قائم کرکے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا راگ، سرود و سماع جائز ہے کہ نہیں۔ اگر جائز ہے تو اس کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ راگ سننے اور سنانے والے کن کن خیالات کے حامل ہونے چاہئیں۔ گانا کس مضمون پر اور حاضرین محفل کے اخلاق و عادات کن اوصاف سے متصف ہوں۔

تصوف ایک مخصوص طریقت ہے اور مخصوص مذہبی عقائد کا مجموعہ ہے۔ اس موضوع میں بڑی وسعت ہے۔ ان عقائد کا اظہار منظوم اور منثور دونوں طرح سے بڑے زور شور سے ہوا ہے۔ اصلاح حال۔ خود پرستی چھوڑنے۔ صفائے قلب بے غرض خدمتِ خلق۔ حق کی پیروی ریاضت۔ سلوک۔ اعتکاف۔ سکوت۔ تربیت روح۔ تجرد۔ اعتزال۔ طریقت۔ ترک دنیا۔ ترک علائق۔ قناعت۔ اخلاص عبادات۔ ایثار کسب معرفت۔ یہ چند مخصوص عقائد ہیں۔ جن پر صوفیائے کرام پابند چلے آرہے ہیں۔

منشی صاحب مرحوم نے دیباچے میں نہایت خوبی سے صوفیائے کرام کے اقوال سے اپنے دلائل کو مضبوطی سے پیش کیا ہے۔ یہ مقدمہ پڑھنے اور پڑھنے کے بعد سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔

مقدمہ کے بعد لاہور کی گذشتہ اور موجودہ حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شاہ ابوالمعالی۔ شاہ چراغ۔ موج دریا۔ گرو ارجن۔ شاہ محمد غوث شاہ جمال۔ مادھو لال۔ میاں وڈا۔ صابر بندگی۔ شاہ بلاول۔ گھوڑے شاہ۔ پیر کی۔ سید جان محمد حضوری۔ میراں بادشاہ۔ بابو بھگت۔ گرو رسری چند۔ حضرت ایشاں۔ حضرت لال حسین۔ حضرت شیخ مادھو۔ داتا گنج بخش اور حضرت میاں میر کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ صفحہ (۸۴) سے (۱۰۱) تک لاہور کے دوسرے (۴۲) مشہور صاحب کمال فقرا کا ذکر بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ اس میں بعض معلومات ایسی بھی ہیں جو دوسرے تذکروں میں دستیاب نہیں ہوتیں۔

(۲) شالامار باغ:۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء کی تصنیف ہے۔ لیکن بعد میں اضافہ کے ساتھ متعدد بار شائع ہوئی۔ اس وقت اس کے سلسلۂ جدید کا پہلا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں شالامار باغ اس کے شاہی ایوانات۔ محل سراؤں۔ سیرگاہوں کا حال درج ہے۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں شالامار باغ پر کیا بیتی یہ الم ناک داستان بھی ہمیں اس کتاب میں ملتی ہے۔ کشمیر دہلی پنجاب کے آٹھ اور باغات جو شالامار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے حالات و کوائف بھی اس کتاب میں دیئے ہوئے ہیں۔ شالامار کے مختلف نام۔ اس کی وجہ تسمیہ۔ استاد حاجی میر عمارت شالامار باغ کی لاگت و سال تعمیر۔ شالامار کے تین تختے (باغ فیض بخش۔ حیات بخش اور فرح بخش)۔ انگوری باغ۔ عنایت باغ۔ مہتابی باغ۔ گلابی باغ۔ شاہی حمام۔ سنگ یشب کا بیش قیمت حوض۔ بارہ دری کلاں۔ سرد خانہ۔ آبشار کلاں اور سنگ مرمر کا تخت۔ فوارے اور بارہ دریاں۔ ساون بھادوں کا نظارہ۔ میلہ شالامار کی رونق۔ شالامار باغ شاہان مغلیہ کے دور میں۔ شالامار میں آتش بازی اور چراغاں۔ ان عنوانات پر بڑی عرق ریزی سے معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ایک انگریز کیپٹن کرسول نے "انڈین آرکیالوجیکل" ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء کے شمارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اسلامی عمارات کے متعلق معتبر تاریخی اور روایتی معلومات بہم پہنچانے والی چند کتب کے مصنفین کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستانی مصنفین میں فقط دو صاحبوں کا نام اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ اول سید محمد لطیف اور ان کی تاریخ لاہور اور دوسرے محمد الدین فوق اور ان کی تصنیف سیر شالامار باغ۔

شالامار باغ پر یہ کتاب اہم معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ منشی صاحب مرحوم نے بڑی محنت سے مواد فراہم کیا ہے۔ جس کی داد کچھ اہل نظر ہی دے سکتے ہیں۔

(۳) لاہور عہد مغلیہ میں:۔ منشی صاحب مرحوم کے چند مضامین شباب اردو (لاہور) ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء اور صوفی (پنڈی بہاؤالدین) میں لاہور کے متعلق طبع ہوئے۔ شباب لاہور کے نام سے ایک مضمون "قوس و قزح" لاہور کے سالانہ نمبر ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔ احباب کی تحریک سے ان مضامین کو یکجا کر دیا گیا۔ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ عالمگیر کے عہد حکومت میں لاہور کی حالت کیا تھی۔ بارہ دری میرزا کامران کا حال۔ قلیچ خاں اندجانی گورنر لاہور کے زمانہ میں چند شاہی محلات و عمارات۔ مقبرہ جہانگیر۔ قلعہ لاہور کے مفصل حالات لاہور شاہ عالم بہادر شاہ کے وقت میں رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین۔ نورجہاں کی آخری آرامگاہ۔ بدھو کا آوا۔ مقبرہ آصف جاہ کا مقبرہ۔ عہد مغلیہ کے چند گورنر (شاہ ابوالمعالی۔ حسین خاں ٹکریہ۔ حاجی محمد خاں سیستانی۔ مرزا حسین۔ قلیچ۔ قوام الدین خاں اصفہانی۔ میر معین الدین احمد المخاطب بہ امانت خاں اور نواب زکریا خاں) انارکلی۔ باغ میاں بائی (جوجری) بیگم پورہ۔ ملکۂ لاہور (مراد بیگم) کا حال اس کتاب میں نہایت خوش اسلوبی سے درج ہے۔

(۴) **داتا گنج بخش**:- یہ کتاب حضرت علی مخدوم ہجویری جلابی کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب پہلے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے تاریخ لاہور از رائے بہادر کنہیا لال۔ حدیقۃ الاولیا از سرور لاہوری۔ تحقیقات چشتی۔ سفینۃ الاولیا مصنفہ شہزادہ دارا شکوہ۔ اذکار قلندری۔ کشف المحجوب۔ گنج تاریخ از سرور۔ نفحات الانس از مولانا جامی اور فرہنگ آصفیہ سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب جامع ہے۔ جس میں حضرت داتا گنج بخش کی پیدائش سے لے کر وفات تک مکمل حالات درج ہیں۔ اس کتاب میں چند عنوانات صوفیائے کرام کے مشرب کے متعلق ہیں۔ صوفی کی تعریف۔ تصوّف کی آٹھ قسمیں۔ فقرا اور صوفیا کے پاس لوگ کس غرض سے جاتے ہیں۔ درویش کو کیا چاہیے؛ حو لیں مرقع پوشوں کی جماعت۔ صوفیہ کے گر ملاقیہ کا طریق کیا ہے۔ اس فرقے کے متعلق داتا صاحب کے خیالات نفس کی موافقت بندہ کی ہلاکت ہے۔ معجزہ اور کرامت میں کیا فرق ہے۔ جلالی اور جمالی توبہ اور صوفیوں کی اصطلاحات کا ذکر بڑا اہم ہے۔

(۵) **ماتم پہلوانی**: یہ کتاب مشہور زمانہ غلام پہلوان کی سوانح حیات ہے جو رستم ہند کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۶) **کلام فوق و نغمہ دلگزار**: یہ دونوں مجموعے فوقؔ کے منظوم کلام کو لیے ہوئے ہیں۔ منشی صاحب کو تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کے مطالعے سے اس زمانے کے لاہور کی علمی و ادبی صحبتوں کا تذکرہ اور مشاعروں کا حال ملتا ہے۔ بعض واقعات اور بعض شخصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

(۷) **انار کلی**:- یہ ایک ناول ہے۔ جس کی زبان بڑی پیاری ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد بنگالی اور اردو میں بہت سی گراں قدر کتابیں اس عنوان پر لکھی گئیں۔ لیکن اس کتاب کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔

جب اس نامور مورخ اور ادیب نے ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پائی تو ان کے ورثا میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اُن کے ادھورے مسودات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہلیت رکھتا۔ چنانچہ مشہور محقق اور ادیب مولوی محمد عبداللہ صاحب قریشی جو فوقؔ صاحب کی زندگی ہی میں ان کے دستِ راست تھے اور جن کی خدمات کا اعتراف خود منشی صاحب نے تاریخ بڈشاہی کے دیباچے میں بھی کیا ہے نے بڑا کام کیا۔ انھوں نے تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد جو فوقؔ صاحب ایک سو چالیس صفحات تک لکھ کر فوت ہو گئے تھے اس کی تکمیل کی اور اس کام کو اس قابلیت سے پورا کیا کہ جیسے یہ کام ایک ہی مصنف کے قلم کا رہون منت ہے۔ کہیں بیان میں جھول نہیں۔ اور تاریخی واقعات اسی طرز پر مرتب کیے ہیں کہ اگر فوقؔ مرحوم زندہ ہوتے تو وہ اس کتاب کی تکمیل اسی طرح کرتے جیسے جناب قریشی صاحب نے کی ہے۔ یہ کتاب اب (۴۴۳) صفحات پر محیط ہے۔ اور اس میں کشمیری ذاتوں اور گوتوں کا مبسوط تذکرہ ہے۔

اسی طرح مآثر لاہور کے مسودے میں بھی بعض مقامات نامکمل تھے۔ کہیں اہم واقعات کے سنین مندرج نہیں تھے۔ کہیں کوئی عنوان ہی لکھ دیا گیا تھا۔ اور اس کے متعلق کوئی واقفیت بہم نہیں پہنچائی گئی تھی۔ کوئی حصہ تھوڑا سا لکھا تھا۔ ابھی اس پر مزید تحقیقی روشنی ڈالنا تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی معلومات ابھی توجہ طلب تھیں۔ جنھیں موت نے ان کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس ادھورے کام کی تکمیل ایک کٹھن مرحلہ تھا لیکن قریشی صاحب نے اسے پوری کوشش سے مکمل ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس میں اضافے بھی کیے اور آج یہ مسودہ اشاعت کے قابل ہو گیا ہے۔

کرنل نیول (۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

لاہور (پنجاب کا دار الخلافہ) مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل ایچ۔ اے۔ نیول (H.A. NEWELL) آئی۔ اے۔ ایف۔ آر۔ جی۔ ایس جو ۱۹۲۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اسّی صفحات پر مشتمل ہے۔

کرنل نیول "گائیڈ بک" قسم کی کتابیں لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے امرتسر، احمد آباد، بنارس، جے پور، مدورا، رامیسرم، چنگل پٹ اور کانجی ورم کے سات مندر، تنجور، ترچناپلی، لکھنؤ، انبالہ سے پشاور تک موٹر کار سے، تین دن دہلی میں، تین دن آگرہ میں، لاہور پنجاب کا دارالخلافہ، بمبئی، کلکتہ اور مدراس پر گائیڈ بکیں لکھی ہیں۔ خالص فوجی نوعیت کی ایک کتاب سپلائیز (SUPPLIES) ایس اینڈ ٹی افسروں کے لیے گائیڈ بک کے طور پر تحریر کی۔ ایک نفسیاتی کتاب "آپ کے دستخط" کے عنوان سے تحریر کی روشنی میں کردار کے مطالعہ سے متعلق تھی۔ ان کی بیشتر کتابیں یورپین سیاحوں اور انگریز افسروں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں ایک سیاح کے سفر نامے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرنل نیول کو سیر و سیاحت کا از حد شوق تھا۔ چنانچہ تاریخی مقامات کی سیاحت جو انھوں نے کی۔ اسی کو گائیڈ بک کے نام سے قلمبند کر دیا۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ کتاب محض گائیڈ بک یا سفر نامہ معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ فن تعمیر اور علم تاریخ کے ایک اچھے متعلم کے نقوش کا آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر قدم پر انھوں نے عمارتوں اور یادگاروں کے متعلق تحقیق کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کی طرزِ تحریر بے حد دلکش ہے۔ وہ اپنی خوبیٔ تحریر سے تاریخی بیان میں بھی فسانوی رنگ بھر دیتے ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ کے طور پر کرنل نیول نے لاہور کی فوجی اہمیت پر نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ شمال کی طرف سے آنے والا ہر حملہ آور دریائے سندھ کو پار کر کے لاہور کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے شیر شاہ سوری کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جو ۱۵۴۵ء میں قلعہ کالنجر میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ اس نے لاہور شہر کو نیست و نابود کرنے سے کیوں چھوڑ دیا۔ "اتنا بڑا شہر جو ایک حملہ آور کے راستے میں پڑتا ہے قائم نہیں رہنا چاہیے۔ جونہی وہ اس شہر پر قبضہ کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ اتنے ذخائر آ جاتے ہیں کہ وہ اپنے ذرائع کو مستحکم کر لیتا ہے۔" اس قول کی روشنی میں یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اگر شیر شاہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو شبکلا، قنوج اور سومنات کی طرح (جو اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی حکومت کے مرکزی مقامات رہ چکے تھے) پنجاب کا دارالخلافہ لاہور بھی زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا ہوتا۔

کرنل نیول نے بتایا کہ کس طرح لاہور کی ابتدا ہندوؤں کے دور میں ہوئی۔ کس طرح دو صدی تک یہ شہر مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر کس طرح وہ محمود غزنوی کے ہاتھ میں آیا۔ اور یہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں اسلامی اسلحہ خانہ قرار پایا اور غیر شعوری طور پر آنے والی مغل حکومت کا سنگِ بنیاد بن گیا۔ کس طرح لاہور میں شیر شاہ کے حملے سے بھاگتے ہوئے ہمایوں نے حمیدہ بانو کو دیکھا۔ اور یہیں دونوں کی شادی ہوئی۔ پھر یہیں سلیم نے مہرالنسا کو دیکھا۔ جس کی نسبت اکبر اعظم کے ایک فوجی جرنیل سے ہوئی۔ یہی مہرالنسا ہندوستان کی تاریخ میں نور جہاں بن کر چمکی۔ اور آج جہانگیر اور نور جہاں دونوں کے مقبرے اس لاہور میں واقع ہیں۔ شاہجہاں بھی لاہور ہی میں پیدا ہوا۔ اور لاہور ہی میں اس نے شہریار کی آنکھیں نکلوائیں اور اسے موت کی سزا دی۔ آخر میں یہی لاہور مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر رنجیت سنگھ کے قبضے میں پہنچ گیا۔ اور سکھ حکومت کا مرکز بن گیا۔ غرض کہ لاہور ماضی کی یادگاروں سے گونجتا ہوا ہے اور اس شہر کا چپہ چپہ تاریخی روایات سے معمور ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ظاہر میں گائیڈ بک کے طور پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے ہمیں مصنف کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ کرنل نیول غالباً تحقیق و تاریخ کا شیدائی تھا۔ کتاب کی ابتدا میں شہر لاہور کا عہد در عہد تذکرہ ملتا ہے۔ یہ ایک تاریخی جائزہ ہے۔ کرنل نیول نے یہ ثابت کیا ہے کہ لاہور کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہونا چاہیے۔ اس شہر کی بنیاد "ست جگ" میں پڑی۔ جب دنیا میں نیکی اور خیر کا بول بالا تھا۔ مغربی مورخین کی تحقیق کی رو سے رامائن کا زمانہ حضرت مسیح کی پیدائش سے چھ صدی سے لے کر سولہ صدی کا درمیانی زمانہ تھا۔ لاہور کی بنیاد اس زمانے میں کس وقت

بڑی مقامی روایت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پرانا لاہور اچھرہ سے تین میل مغرب میں واقع تھا۔ اس کی بنیاد سے قطع نظر موجودہ زمانے میں شہر لاہور دریائے راوی سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اونچی سطح پر واقع ہے۔ دریائے راوی موجودہ دور سے پہلے قلعے کی دیوار کے نیچے بہتا تھا۔ شہر لاہور کو سترھویں صدی میں راوی کے سیلاب سے بہہ جانے کا خطرہ لاحق ہوا جس کے پیش نظر اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے چھٹے سال میں ایک مضبوط دیوار چار میل کے فاصلے پر تعمیر کرائی تاکہ دریا کا رُخ شہر کی جانب سے پھیر دیا جائے۔ اس دیوار کے سہارے ایک مضبوط بند بنایا گیا جسے "بند عالمگیری" سے پکارا جاتا ہے۔ بند بن کر تیار ہوا ہی تھا کہ دریائے راوی نے اپنا راستہ تبدیل کر دیا۔ اور شمال کی جانب بہنے لگا۔

معنوی طور پر پنجاب پانچ دریاؤں کا علاقہ ہے۔ پنجاب کے زیریں علاقے میں یہ پانچوں دریا مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور کراچی کے قریب بحیرہ عرب میں گرتے ہیں۔ راوی ان میں سب سے چھوٹا دریا ہے۔ یہ ایراوتی کا مخفف ہے۔ ایراوتی اس ہاتھی کا نام تھا جس کا مالک اندر دیوتا تھا۔ ہندوؤں کے شاستروں میں راوی کی وجہ تسمیہ یہی دی گئی ہے۔ یونانی مصنفین راوی کو ہائیڈروٹیز (HYDRAOTES) کہتے ہیں اور گیارھویں صدی کے مورخ البیرونی نے اسے اراوا (IRAWA) کے نام سے موسوم کیا۔

ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ پنجاب سے ہوتا رہا۔ یہیں آریہ لوگ دریائے سندھ پار کر کے پہلے پہل آباد ہوئے۔ پنجاب کے بیابانہ ہندوؤں کے مقدس ویدوں کے منتروں سے گونجے۔ یہیں ہندوؤں کی تہذیب قائم ہوئی۔ قبل از تاریخ آریہ تہذیب کے دور اور چوتھی صدی قبل مسیح کے درمیان (جب سکندر اعظم ہندوستان پر حملہ آور ہوا) کسی وقت آریہ راجا لو یا لوہ نے لاہور کی بنیاد ڈالی۔ جب بدھ مت نے پنجاب کے شمال مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت بھی لاہور پر بدھ مت کا کوئی اثر نہ پڑا۔ تقریباً دس صدی بعد از مسیح تک لاہور راجپوتوں کا مرکز رہا۔ اور محمود غزنوی کے بعد سے اسلامی طاقت کا ایک مضبوط قلعہ بن گیا۔ مغلوں کے زمانے میں اس شہر کو سب سے زیادہ آب و تاب نصیب ہوئی۔ بابر نے یہاں سڑکیں بنائیں۔ درخت لگائے اور ایرانی پہیے کو رواج دیا۔ جو دراصل ایک چینی اختراع تھی۔ جسے چنگیز خاں کی بدولت رواج نصیب ہوا تھا۔ مصنف نے عہد مغلیہ کے لاہور کا تدریجی جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے آخر میں کرنل نیول نے سرے سے شہر لاہور کی مفصل تاریخ بیان کی ہے۔ جس میں ہندو دور سے انگریزی عملداری تک شہر لاہور کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔ آخر میں اس نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لاہور منظم اور پُر سکون رہا۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو ایک فوجی فرمان شائع کیا گیا۔ جس کے ذریعے چھاؤنی میں مقیم سپاہیوں سے ہتھیار واپس لے لیے گئے۔ اس طرح قلعے پر قبضہ کرنے اور میگزین کو حاصل کرنے کی سازش ناکام بنا دی گئی۔ جب سے اب تک لاہور بڑی ترقی کر رہا ہے۔

چوک دارا: اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اور تیسرا حصہ تاریخی ہے۔ اور دوسرا حصہ سفر نامہ یا گائیڈ بک۔ جس مقصد سے یہ کتاب تالیف کی گئی ہے وہ دوسرے ہی حصے میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس حصے میں لاہور کی مختلف تاریخی یادگاروں۔ عمارتوں، مقبروں۔ باغوں اور محلوں کا تذکرہ ہے۔ تاریخی یادگاروں کا حال بھی ہے۔ مثلاً زمزمہ توپ کا مختصر تاریخی حال۔ محلوں کے تذکرے میں مصنف نے چوک دارا کو اہمیت دی ہے۔ یہ چوک دارا شکوہ کے نام سے منسوب ہے۔ دارا شکوہ شاہجہاں کا چہیتا بیٹا تخت و تاج کا وارث۔ حسین اور ہر دلعزیز مغل شہزادہ تھا۔ یہ محلہ دہلی دروازے کے باہر اس جگہ واقع تھا۔ جہاں اب لنڈا بازار ہے۔ چوک دارا کا راستہ ایک عظیم الشان دروازے میں سے تھا۔ اس چوک میں دو رویہ دوکانیں تھیں۔ اور یہ لاہور کا کاروباری مرکز تھا۔ اس کے قریب ہی نخاس تھا۔ جہاں گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس علاقے کا نام اب شہید گنج ہے۔ چوک دارا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہاں دارا کا محل اور امرا کے دولت خانے تھے۔ دارا شکوہ وارث تخت ہونے کی حیثیت سے بے شمار امرا کو اپنی

معاجت میں رکھتا تھا۔ جنھوں نے اس علاقے میں مکانات تعمیر کر لیے تھے۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی تھی۔ اس علاقے میں جواہر بازار کے نام سے جوہریوں کی دکانوں کی ایک قطار تھی۔ سکھوں کے زمانے میں جوہری بازار تباہ ہو گیا۔ انگریزی عملداری ہونے کے فوراً بعد یہ علاقہ محمد سلطان نامی ایک مشہور ٹھیکیدار کو دے دیا گیا۔ جس نے دارالشکوہ کی خوبصورت مسجد کو اس لیے ڈھا دیا کہ اس کی اینٹوں سے لنڈا بازار کی دوکانیں تعمیر کی جائیں۔ سرائے سلطان اسی کی تعمیر اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔

زمزمہ:۔ غالباً دنیا کے کسی ہتھیار نے اتنے نشیب و فراز نہ دیکھے ہوں گے۔ جتنے کہ اس عظیم ساڑھے نو انچ دہانے کی توپ نے دیکھے ہیں۔ جو عجائب گھر کے بالمقابل یونیورسٹی ہال کے سامنے ایک پتھر کے چبوترے پر رکھی ہوئی ہے۔ یہ زمزمہ کہلاتی ہے۔ یعنی قلعوں کو فتح کرنے والی۔ اس کے نام کی دوطرح سے تاویل کی جاتی ہے۔ ایک معنی میں یہ شیر کی دہاڑ ہے اور دوسرے معنی میں تحسین و آفرین کہنے والی۔ یہ چودہ فٹ ساڑھے چار انچ لمبی ہے اور ہندوستان کی بنی ہوئی توپوں میں سب سے بڑی ہے۔ اس پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے اژدھے کے سر سے مرصع کیا گیا ہے اور اس پر متعدد اشعار و عبارات کندہ ہیں۔ جس میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔

یہ دیو قامت توپ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی کے حکم سے لاہور میں ڈھالی گئی۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ایک اور توپ بھی احمد شاہ کے حکم سے ڈھالی گئی اور زمزمہ اور یہ دوسری توپ دونوں ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی لڑائی میں استعمال کی گئیں۔ فتح حاصل کرنے کے بعد کابل جاتے ہوئے احمد شاہ لاہور میں مقیم ہوا تو زمزمہ کو لاہور ہی چھوڑ گیا۔ دوسری توپ اس کے ہمراہ تھی۔ جو چناب میں غرق ہو گئی۔

۱۷۶۲ء میں ہری سنگھ نے جو بھنگیوں کا سردار تھا لاہور پر حملہ کیا اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ اس وقت زمزمہ اس کے ہاتھ آئی۔ اور اس نے اس کا نام "بھنگی کی توپ" رکھ دیا۔ دو برس یہ توپ قلعہ لاہور کے شاہ برج میں پڑی رہی۔ جب لہنا سنگھ اور گجر سنگھ نے لاہور پر حملہ کیا تو یہ توپ مال غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ آئی۔ وہاں سے یہ گوجرانوالہ لے جائی گئی اور اس پر قابض ہونے کی خاطر سکھ سرداروں میں خون خرابہ ہوا۔ گوجرانوالہ سے یہ گجرات پہنچی۔ اور وہاں سے رام نگر لے جائی گئی۔ جہاں وہ ایک برس تک رہی۔ آخر یہ امرتسر پہنچی اور ۱۸۰۲ء تک بھنگی قلعے میں ایک باعزت جگہ پر رکھی گئی۔ اس وقت اس سے متعلق بہت سی روائتیں بلکہ اوہام منسوب ہو گئے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہو گیا کہ اس توپ پر مہادیو کا سایہ ہے۔ یعنی شیو دیوتا کا۔ بلکہ بعض تو اس کو شیو جی کا اوتار تصور کرنے لگے۔ بہرحال ایک خیال جس پر سب متفق تھے یہ تھا کہ اس توپ میں طلسماتی قوت ہے اور فتح اسی کی ہوگی۔ جس کے قبضے میں یہ توپ ہے۔ ۱۸۰۲ء میں زمزمہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ آئی اور اس نے اس توپ کو ڈسکہ، قصور، سجان پور، وزیر آباد اور ملتان کے معرکوں میں استعمال کیا۔ جنگ ملتان میں ایک حادثے کی وجہ سے یہ توپ بے کار ہو گئی۔ اور لاہور واپس لائی گئی جہاں اسے دہلی دروازے کے باہر نصب کر دیا گیا۔ ۱۸۶۰ء تک یہ وہیں رہی۔ جب ۱۸۷۰ء میں ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف ایڈن برا نے لاہور کا دورہ کیا تو یہ توپ پرانے عجائب گھر کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس کے بعد اسے موجودہ مقام پر لایا گیا۔ جہاں وہ ایک پتھر کے چبوترے پر یونیورسٹی ہال کے سامنے نصب ہے۔

پیر غلام دستگیر نامی (سال پیدائش ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ)

غلام دستگیر نام تخلص نامی۔ آپ یکم مئی ۱۸۸۳ء (۱۳۰۰ھ) کو موضع "رتہ پیراں" ضلع شیخوپورہ میں پیر حامد شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۰۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ (لاہور) سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ لیکن حصول تعلیم میں برابر کوشاں رہے۔ آپ ایک عرصہ تک سنٹرل ٹریننگ کالج میں خزانچی وغیرہ رہے اور وہیں سے ۱۹۳۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

ناؔمی صاحب کو حضرت عبدالجلیل قطب عالم چوہڑ شاہ بندگیؒ لاہوری کے دامادِ سلطان بہلول لودھی کی اولاد سے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تبلیغ و اشاعت دین میں کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں سے حضرت قلندر شاہؒ، حضرت سکندر شاہؒ، پیر فرخ بخش فرحتؒ اور پیر مراد شاہؒ لاہوری صاحب کمالات بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت عبدالجلیلؒ ہندوستان کے اولین مشائخ سہروردیہ میں سے تھے۔ جن کی تبلیغ سے ہزارہا لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ میکلوڈ روڈ (لاہور) پر ان بزرگ کا مزار اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔ ناؔمی صاحب نے اپنے ماموں صاحب پیر محمد اشرف عالم شاہ جاگیردار "سرتہ پیراں" و "سریتاں" وغیرہ کو توجہ دلائی جس سے اس خانقاہ کی آبادی اور عرسوں کے انتظام کے لیے بہت سی زمین وقف ہو چکی ہے۔ یہ زمین درگاہ سے ملحق ہے۔ اور اس کی قیمت کا اندازہ بیس لاکھ روپے ہے۔

پیر محمد اشرف عالم شاہ صاحب اپنے بعد ناؔمی صاحب ہی کو خانقاہ و اوقاف کا متولی مقرر کرنے کی وصیت کر گئے تھے۔ چنانچہ ناؔمی صاحب اس درگاہ جلیلہ کا انتظام نہایت قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی قلمی تالیفات مثلاً تذکرہ قطبیہ۔ تذکرہ حمیدیہ۔ اذکار قلندری۔ قصائد قلندری۔ دیوان قلندر شاہ اور نامۂ مردہ وغیرہ شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ اس کے علاوہ تاریخ جلیلہ دو مرتبہ طبع کرائی۔ اور مفت اہل علم کی نذر کی ایک سو کے قریب کتابیں اور رسائل آپ نے تصنیف کیے۔ جن میں سے صرف چند ایک ہی کے حقوق محفوظ رکھے ہیں۔

آپ کو مسائل میراث پر پوری دسترس حاصل ہے۔ ان مسائل پر آپ کو اتنا عبور ہے کہ بڑے بڑے علما و فضلا مشکل مسائل میراث میں آپ سے مشورہ لیتے ہیں۔ اس موضوع پر آپ نے "انیس الوارثین" اور "اسلامی قانون وراثت" دو کتابیں لکھی ہیں۔ جو وراثت کے بہت سے اہم مسائل کا آخری حل بتاتی ہیں۔ یہ کتابیں متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔

نظم و نثر دونوں میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کو تاریخ گوئی سے بھی شغف ہے۔ سینکڑوں مادہ ہائے تاریخ آپ نے مختلف مواقع پر کہے ہیں۔ یہ مجموعہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ملک کے اخبارات اور جرائد میں آپ کے علمی ادبی اور تاریخی مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ جنھیں اہلِ ذوق دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں "تاریخ جلیلہ" بہت مشہور ہے۔ یہ تاریخ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب دوسری مرتبہ ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں ناؔمی صاحب نے حضرت قطب عالم شیخ عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگیؒ لاہوری اور ان کے دودمانِ کبریٰ و بزرگان خاندان۔ اولاد۔ خلفا اور مریدانِ عقیدت مند کے حالات نہایت جستجو و تلاش سے لکھے ہیں۔ نیز لاہور و بزرگانِ لاہور کی مختصر تاریخ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

اس کتاب کے (۹۴) صفحے پر لاہور کو آپ نے دیار جلیل کہا ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آمد کے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے کہ مسلمان پہلے پہل عہد خلافت سوم و چہارم میں آئے۔ کیونکہ لاہور مستقل طور پر اسلامی حکومت کے ماتحت محمود غزنوی کے عہد میں آیا۔ اس لیے کتاب کے (۹۵) صفحے پر ایک نقشہ بھی دے دیا ہے۔ جو افادیت کے پیشِ نظر درج ذیل ہے۔

•

---

[1] حال میں اس درگاہ کا انتظام محکمہ اوقاف نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔

پنجاب کے حکمران

نام خاندان	سال آغاز حکومت	نام بادشاہ	نام خاندان	سال آغاز حکومت	نام بادشاہ
	عیسوی ہجری			عیسوی ہجری	
غزنوی	۱۰۰۱ء مطابق ۳۹۲ھ	محمود تا خسرو ملک	پٹھان	۱۴۵۰ء مطابق ۸۵۴ھ	بہلول تا ابراہیم
غوری	۱۱۸۸ء " ۵۸۴	شہاب الدین غوری	مغل	۱۵۲۶ " ۹۳۲	بابر تا ہمایوں
غلام	۱۲۰۶ " ۶۰۲	قطب الدین ایبک تا کیقباد	پٹھان	۱۵۴۰ " ۹۴۷	شیر شاہ تا محمد شاہ
خلجی	۱۲۸۸ " ۶۸۷	جلال الدین فیروز تا مبارک شاہ	مغل	۱۵۵۳ " ۹۶۱	ہمایوں تا محمد شاہ
تغلق	۱۳۲۱ " ۷۲۱	غیاث الدین تغلق تا محمود شاہ	درانی	۱۷۴۸ " ۱۱۶۲	احمد شاہ
مغل	۱۳۹۸ " ۸۰۱	تیمور	سکھ	۱۷۶۲ " ۱۱۷۶	گوجر سنگھ وغیرہ تا راجہ دلیپ سنگھ
سید	۱۴۱۴ " ۸۱۶	خضر خاں تا علاؤ الدین شاہ	برطانیہ	۱۸۴۹ " ۱۲۶۶	[1]

لاہور کے عروج و زوال کی داستان بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر اعظم کے عہد ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۶ء سے پہلے لاہور کوئی عظیم شہر نہ تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان کا عہد لاہور کی عظمت اور شوکت کا زمانہ ہے۔ باغات، مقابر، مساجد اور محلات جا بجا تعمیر ہوئے۔ شاہجہان کے زمانہ میں یہ شہر سولہ سترہ میل کے دائرے میں بستا تھا۔ دیوار شہر کے باہر میلوں تک آبادی چلی گئی تھی۔ شہر سے سب طرف سڑکیں جاری تھیں۔ اور جو فاصلہ آبادی کے درمیان تھا۔ وہاں باغات اور مقبرے بنا دیئے گئے تھے۔ اس کی وسعت میاں میر، اچھرہ اور شالامار تک تھی۔ عالمگیر کے عہد کے بعد بیرونی حملوں اور سکھ گردی سے یہ آبادی بہت گھٹ گئی تھی۔ شہر پناہ کے اندر لاہور ایک قصبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ جس کے گرد کھنڈرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گزر لنگر خان کے متمول باشندوں نے اپنے خوبصورت مکانات کو خیرباد کہہ کر شہر کی دیواروں کے اندر امن کی صورت اختیار کی۔ سوداگر امرتسر بھاگ گئے۔ صناع کابل یا ہندوستان کی طرف چلے گئے۔ ۴ مئی ۱۸۰۹ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۲۴ھ کو ایک انگریز افسر نے شہر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "شہر عظمت پارینہ کی دلخراش یاد پیش کرتا ہے۔ رفیع الشان مساجد و مکانات جو پچاس سال پیشتر آسمان سے باتیں کرتے تھے اور جو ایک کاروباری آبادی کے سبب باعث فخر تھے۔ اب خاک اور گرد و غبار سے اٹے پڑے ہیں۔ اگر یہی حالت بدستور رہی تو پچاس سال تک بالکل خاک بوس ہو جائیں گے۔ میں نے ویرانوں میں کوئی متنفس نہیں دیکھا۔ ہر سو ہُو کا منظر دکھائی دیتا ہے۔"

اس کے بعد نامی صاحب نے مختصر مگر جامع الفاظ میں لاہور کی بربادی کی تاریخ لکھی ہے۔ ۱۲۱۸ء مطابق ۶۱۵ھ میں جلال الدین خوارزم نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے تعاقب میں چنگیزی افواج جب پہنچیں تو لاہور، پشاور اور ملک پور کو خوب لوٹا۔ سلطانہ رضیہ کے بے رحمانہ قتل

---

[1] برطانیہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے دو حصے کر کے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی بنیاد قائم کر کے رخصت ہوا۔ اب لاہور پر پرچم پاکستان لہرا رہا ہے۔

کے بعد مغل خراسان اور غزنی سے پھر داخل پنجاب ہوئے۔ دسمبر ۱۲۴۱ء مطابق جمادی الآخر ۶۳۹ھ قتل عام کا بازار خوب گرم رہا۔ پھر مغلوں کے برباد کردہ قلعے کو سلطان غیاث الدین نے اچھی طرح مرمت کرادیا۔ تیمور نے ۲۴ ستمبر ۱۳۹۸ء کو دریائے سندھ عبور کیا تو مبارک خاں صوبہ دار پنجاب مزاحم ہوا۔ تیموری افواج نے دہلی جانے سے پہلے پنجاب اور ملتان کو تاخت و تاراج کیا۔ وہاں سے واپسی پر خضر خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا جو بانیٔ سلطنت سادات ہوا۔ سید حکمرانوں کے بعد لودھی برسر اقتدار آئے۔ ابراہیم لودھی کے عہد میں دولت خاں نے بابر کو بلایا جو لاہور تک بڑھتا چلا گیا۔ بہار خاں اور مبارک خان وغیرہ لودھی امرا نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی۔ بابر نے غصہ میں آکر شہر کو لوٹا اور بازاروں کو نذر آتش کردیا۔ میر عبدالعزیز کو گورنری سونپ کر واپس کابل چلا گیا۔ بابر نے پانچویں حملہ میں ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں لودھی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی تو وہ لاہور میں پناہ گزیں ہوا۔ مگر شیر شاہ کی آمد کی خبر سن کر ۳۱ اکتوبر ۱۵۴۰ء کو راوی عبور کرکے جان بچا گیا۔ خواص خان گورنر مقرر ہوا۔ شیر شاہ کا خیال تھا کہ لاہور کو نقشے سے محو کرکے یکسر مٹا دیا جائے کیونکہ اتنے بڑے شہر کو سرحدی حملہ آوروں کے راستے میں نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ اس شہر سے سامان فراہم کرکے مزید فتوحات کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ شیر شاہ کی وفات کے دس سال بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کو پھر لاہور پر قابض ہونے کا موقع ملا۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی۔ جو ۱۶۰۶ء میں فرو ہوئی۔ عالمگیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا۔ جو مائل بہ تشیع تھا اس نے حکم دیا کہ خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ ولی اللہ وصی رسول اللہؐ کہا جائے۔ اس سے اہل تسنن میں بڑا جوش پیدا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطیب ابھی مذکورہ الفاظ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے گئے اور خطبہ عہد عالمگیری کی طرح سے پڑھا جانے لگا۔ الغرض شاہنشاہ اورنگ زیب کے بعد اور انگریزی راج سے تقریباً سوا سو برس پہلے آٹھ دفعہ احمد شاہ درانی کی فوجیں لاہور سے گزریں اور مرہٹوں اور سکھوں نے بھی اس کی بربادی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد سولیہ قحط پڑا۔ ۱۷۸۳ء میں دہ سیر قحط ۱۸۱۲ء میں ست سیرا قحط اور ۱۸۳۳ء کے مرکا نوالہ قحط نے اہل شہر کو بھوکوں مارا۔ موجودہ جنگ عظیم کے بعد چھ سیرا قحط پڑا تھا۔ مگر روپیہ کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں کو محسوس نہیں ہوا۔

ناؔمی صاحب نے حضرت قطب عالم شیخ جوہر شاہ بندگی سے پہلے جو بزرگ لاہور میں تشریف لائے تھے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ جن میں حضرت داتا گنج بخشؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، شیخ مکی جنیدیؒ، پیر بلخیؒ، حضرت سید مٹھا اور میراں بادشاہؒ کا مختصر حال ملتا ہے۔ نیز انھوں نے ان بزرگان دین کا بھی تذکرہ کیا ہے جو شیخ جلیلؒ کے بعد یہاں آئے۔ شیخ ابو اسحاقؒ، موج دریا بخاریؒ، شاہ ابوالمعالی قادریؒ، شیخ طاہر بندگیؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت ایشاں نقشبندی، شاہ چراغؒ، شیخ میاں وڈاؒ، شاہ محمد غوثؒ اور شیخ حامد قادری کے نام اس ضمن میں تحریر کیے ہیں۔ کچھ درگاہوں کے چشم دید حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ جن میں درگاہ داتا گنج بخشؒ، درگاہ میاں میرؒ، درگاہ میاں وڈاؒ صاحب اور درگاہ موج دریا بخاریؒ کا تذکرہ کیا ہے۔

لاہور کے دیگر مشہور مقابر و مساجد کا ایک نقشہ بھی دیا ہے۔ جس میں عمارت کا نام۔ بانی عمارت کا نام مع سال بنا اور محل وقوع نہایت تحقیق سے بتایا ہے۔ یہ مختصر نقشہ مختصر مفید کا حکم رکھتا ہے۔

ناؔمی صاحب کی یہ تصنیف حضرت قطب عالم شیخ جلیلؒ کی خاندانی تاریخ کے علاوہ لاہور کے ممتاز بزرگان دین کا ایک مختصر جامع تذکرہ بھی ہے۔ لاہور اور لاہور کے باغات و مزارات پر بھی انھوں نے تحقیق و تجسس سے قیمتی مواد فراہم کردیا ہے۔ جس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی

ہو سکتا ہے۔ آپ کا شمار زندہ مورخین لاہور میں ہوتا ہے۔ عمر کے تقاضے اور مختلف عوارض کے باعث آپ بہت کمزور اور نحیف ہو گئے مگر اس حالت میں بھی تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری تھا۔ آپ کی تازہ تالیف ایک بہت ہی مفید کتاب ہے جس کا نام "بزرگانِ لاہور" آپ نے رکھا ہے۔ اس میں لاہور کے ان بزرگوں کے حالات علیحدہ علیحدہ چار حصوں میں قلمبند کئے گئے ہیں جو صوفیا کے چاروں سلسلوں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کتاب کے پانچویں حصہ میں لاہور کے متفرق خاندانوں کے اولیاء، علماء، مجذوبوں اور خواتین صالحات کا ذکر ہے۔ کتاب قریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور انشاء اللہ عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو گی۔ یہ کتاب ناقی صاحب نے عرصہ دراز کی محنت و کاوش اور تلاش و تحقیق کے بعد مرتب کی ہے اور طبع ہونے کے بعد تاریخ لاہور میں ایک نہایت شاندار اضافہ کا باعث ہو گی۔

سید ہاشمی فرید آبادی (سال پیدائش ۱۳ جنوری ۱۸۹۰ء)

سید ہاشمی جنوری ۱۸۹۰ء میں بمقام فریدآباد (نزد دہلی) پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد میر احمد شریف صاحب بڑے نیک اور علم دوست بزرگ تھے۔ ہاشمی صاحب نے ۱۹۰۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ جنگ بلقان کے موقع پر ہاشمی صاحب نے چند نظمیں حکومت برطانیہ کے خلاف لکھیں۔ جن کی پاداش میں حکومت نے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو مجبور کیا کہ ان کو سرٹیفکیٹ دے کر کالج سے نکال دیا جائے کیونکہ ان کی موجودگی سے کالج کی فضا کے مکدر ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً ہاشمی صاحب کو علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ پھر حیدرآباد (دکن) اور پھر اسٹیٹ کے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ۱۹۳۹ء میں پنشن پر ریٹائرڈ ہوئے۔ پھر انجمن ترقی اردو (ہند) میں جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد ۱۹۵۰ء تک پاکستان میں انجمن کے جوائنٹ سیکرٹری کے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ آج کل "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" پہ REVISION (نظرثانی) کا کام کر رہے ہیں۔

ہاشمی صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان تصانیف میں بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ کچھ علمی، ادبی اور تاریخی مقالات بھی مختلف جرائد میں لکھے ہیں۔ جس سے ان کے ادبی شغف اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے کام کی فہرست طویل ہے۔ جن میں سے چند ایک کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

تصانیف

(۱) تاریخ یونان قدیم:۔ یہ یونان کی مفصل تاریخ ہے۔ جس پر ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے تبصرہ کیا تھا۔ اور اس کی بیحد تعریف کی تھی۔

(۲) دکن کی تاریخی کہانیاں

(۳) ہندوستان کی تاریخ:۔ مڈل اور میٹرک کے لیے ٹیکسٹ بکس۔

(۴) ہندوستان کی تاریخ:۔ (عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے چار جلدوں میں)

لہ افسوس کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو محلہ چابک سواراں لاہور میں ناقی صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی میت ان کے آبائی قبرستان رتہ پیراں ضلع شیخوپورہ میں لے جا کر دفن کی گئی (ادارہ)

(۵) تاریخ فرشتہ پر نوٹس:- تاریخ فرشتہ پر نہایت قابلیت سے حاشیے لکھے۔ جس کو عثمانیہ یونیورسٹی کے کارکنان نے شائع کیا۔

(۶) تاریخ مسلمانان پاک و بھارت (دو جلدیں)

(۷) مآثر لاہور

(۸) ترقی اردو کے پچاس سال:- انجمن اردو کی پچاس سالہ تاریخ۔ اس میں انجمن ترقی اردو کے متعلق بیش بہا معلومات یکجا کی گئی ہیں۔

(۹) سہ نظم ہاشمی:- ہاشمی صاحب کی تین نظموں کا مجموعہ جو مولوی عبدالحق مرحوم نے انجمن کی طرف سے شائع کیا تھا۔

(۱۰) مشاہیر یونان و روما:- (PLUTARCH) کی تصنیف کا اردو ترجمہ (چار جلدوں میں)

(۱۱) جغرافیۂ عالم:- (ترجمہ) دو جلدیں۔ مصنف (MARSDEN)

(۱۲) یورپ کا عہدِ حاضرہ (ترجمہ)۔ مصنف (FYFFE)

(۱۳) یونانِ قدیم ترجمہ۔ مصنف (J. BURY)

(۱۴) تاریخ سلطنت روما ترجمہ۔ مصنف (J. BURY)

(۱۵) تاریخ انگلستان (دو جلدیں)

(۱۶) تاریخ شاہانِ مغل (ترجمہ) مصنف (IRVING)

(۱۷) تاریخ معاشیات اکبر سے اورنگ زیب تک (دو جلدیں) ترجمہ۔ مصنف (MOORLAND)

(۱۸) اسلامی فن تعمیر (ترجمہ) مصنف (E.H. HANMUM)

(۱۹) اندرونِ ہند (ترجمہ) مصنفہ خالدہ ادیب خانم

(۲۰) سیاسیاتِ اسلامی (ترجمہ) مصنف سعید حلیم پاشا

(۲۱) تاریخ خلفت عربی (ترجمہ) از فلپ حتی:- ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد ابھی شائع نہیں ہوئی۔ دوسری جلد کا مسودہ انجمن ترقی اردو کے پاس موجود ہے۔

(۲۲) غانیان تہذیب۔ ترجمہ و تالیف

(۲۳) قدیم علوم و جدید تہذیب:- جارج سارٹن کی تصنیف کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

(۲۴) سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی ترتیب و تدوین میں بھی انہوں نے خاصا کام کیا ہے۔

(۲۵) انہوں نے چند مقالات انگریزی زبان میں بھی لکھے ہیں جو اسلامک کلچر حیدر آباد اور لنڈن کے جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

(۲۶) شعر گوئی سے فطری لگاؤ ہے۔ مجموعہ کلام منتشر حالت میں ہے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ "سہ نظم ہاشمی" کے سوا ان کا کوئی دوسرا منظوم مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا۔

ہاشمی صاحب نے لاہور کی چند شخصیتوں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں حضرت داتا گنج بخش، ابوالفرج، امیر ایاز (غلام محمود) اور لاہور کا پہلا حاکم قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے ایک تحقیقی مقالہ قطب الدین ایبک پر بھی لکھا ہے۔ یہ چاروں مقالے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں

شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی ایک مستقل تصنیف "مآثر لاہور" ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

ہاشمی صاحب نے مآثر لاہور کی وجہ اشاعت بیان کرتے ہوئے دیباچے میں تحریر کیا ہے کہ لاہور ایک قدیم شہر ہے جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسلمانوں کی جہاں بانی کا محور رہا ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے برصغیر پاک و ہند میں بہت سے نئے شہر آباد ہو گئے۔ سندھ میں عرب بہادروں نے منصورہ۔ محفوظہ۔ بیضا وغیرہ کئی شہر آباد کیے جن کے نشانات امتداد زمانہ کی نذر ہو کر رہ گئے۔ دلی۔ بدایوں۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ احمد آباد وغیرہ ایک عرصہ تک مسلمانوں کے زیر حکومت رہے۔ لیکن یہ لاہور کی قدامت کو نہیں پہنچتے۔

اگرچہ لاہور کی کئی تاریخیں انگریزی اور اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن مسلم لاہور کا اولین دور قدرے تاریکی میں ہے۔ یہ دور مزید تحقیق کا طلبگار ہے "اس عہد کے تعمیری آثار کی طرح تحریری اخبار بھی بہت کچھ محو ہو گئے۔ ان پرانے کھنڈروں پر عمارت کھڑی کرنا اور منتشر تراشے چپکا کر کتاب جوڑنا شوق سے بڑھ کر محنت شاقہ کا طلبگار ہے"[1]

اس کتاب کے متعلق مصنف نے یہ دعوی کیا ہے کہ انھوں نے کتاب کی ترتیب میں واقعات کی نسبت افراد اور سیاست سے زیادہ ثقافت کو مدنظر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب تاریخ کے بجائے ایک تذکرہ کی خصوصیات کی حامل ہے۔ اگرچہ افراد کے سوانح تاریخی واقعات ہی سے مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دعوی ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں تمام تاریخی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر غلط فہمیاں یورپین مورخین کی لائی ہوئی ہیں۔ ان کا تجزیہ کیا ہے اور پوری چھان بین کرنے کے بعد انھیں لکھا ہے۔

مآثر لاہور کے دو حصے ہیں۔

حصہ اول:- اس حصے میں ارباب سیف و سیاست کا ذکر ہے۔ لاہور پر محمود غزنوی کی یلغار۔ غزنی سے لاہور کا الحاق۔ اس فتح کی اہمیت اور اس کی مجمل تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ پرانا لاہور کہاں آباد تھا۔ اس کی آبادی کیا تھی۔ کیا یہ شہر "لو" سری راجندر جی کے بیٹے کے نام پر آباد کیا گیا تھا یا نہیں۔ کتاب الہند (بیرونی) زین الاخبار (گردیزی) تاریخ بیہقی اور خلاصۃ التواریخ کی روایات کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ مسلم لاہور کی نشان دہی حضرت داتا گنج بخش اور قطب الدین ایبک کے مزارات سے کی گئی ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت۔ لاہور کے سب سے پہلے سپہ سالار عبداللہ قراتگین کے حسن انتظام۔ قاضی ابوالحسن۔ سپہ سالار اریارق۔ احمد نیال تگین وغیرہ کی انتظامی صلاحیتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

ابوالنجم ایاز کی عزت۔ منزلت۔ ذہانت۔ فطانت اور حسن خدمت کا حال نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لاہور پر اس کی حکومت۔ ادبیات عالیہ میں اس کی شہرت اور تاریخ کے صفحات پر اس کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

لاہور کا پہلا عروج۔ سلطان مودود اور اس کے دو بیٹوں کا حال۔ سیف الدولہ محمود ابن ابراہیم ابن مسعود کے متعلق کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ تاریخ جہاں حالات کی تحقیق میں رہنمائی نہیں کرتی۔ وہاں اس دور کے شعرا (مسعود سعد لاہوری اور ابوالفرج مسعود رونی) کے قصائد سے کارآمد تاریخی معلومات فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت کے لاہور کی وسعت۔ شہرت اور خوشحالی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانے میں لاہور چھاؤنی میں چالیس ہزار چیدہ سواروں کا باقاعدہ لشکر موجود رہتا تھا۔ جس میں غزنی، غور اور خراسان وغیرہ کے جوان شامل تھے۔ لاہور کے گردو نواح میں چند بستیوں اور جاگیروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ شہر میں شاندار عمارات جو غزنوی عمائدین مسعود و سعد سلمان۔ ابوالفرشد رشید نے

---

[1] مآثر لاہور صفحہ ۶

غزنوائی تھیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ سیف الدولہ محمود کی افتاد اور علاء الدولہ مسعود کی سربلندی کے متعلق بھی لکھا ہے۔ چند عمائدین عصر جنھوں نے شہر لاہور کی توسیع و تزئین میں بڑا حصہ لیا تھا۔ ان کا حال بھی ملتا ہے۔ جن میں خواجہ عبد الحمید احمد۔ عبد الصمد۔ (اولاد حسن میمندی) بہروز۔ منصور بن سعید بن احمد۔ طاہر ابن علی۔ ابو سعد بابو۔ ابو النصر فارسی اور نصر بن رستم قابل ذکر ہیں۔ "بزم شیراز" میں قدیم لاہور کے محافلِ نشاط کے اراکین کا ذکر مسعود سعد سلیمان کی مثنوی سے لیا ہے۔ اس بزم طرب کے اراکین و شرکا کے سلسلے میں خواجہ بو نصر پارسی۔ امیر بہمن۔ سید ابو الفضائل۔ امیر ماہو۔ امیر کیکاؤس۔ امیر شاہین۔ ابو القاسم دبیر۔ حسین طبیب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور ارباب طرب میں محمد نے نواز۔ اسفندیار چنگی نواز۔ حسن بربطی۔ مطرب پری و بانو اور ماہو رقاص کے نام بھی موجود ہیں۔ قدیم لاہور کے تمدن کی جھلک اور عہد سلاطین غوری و دہلی اور حملہ مغلول کا حال بھی درج ہے۔

حصہ دوم:۔ اس حصے میں صاحبانِ علم و قلم۔ بزرگانِ معرفت۔ شعرائے نامدار علما اور مصنفین کا مختصر تذکرہ ہے۔ بزرگان معرفت میں "بی بی پاکدامناں" شیخ محدث واعظ بخاری۔ داتا صاحب۔ داتا صاحب کے بعد کے درویش۔ شیخ احمد۔ شیخ فخر الدین۔ شیخ حسین۔ سید یعقوب (یہ چاروں بزرگ زنجانی تھے۔ زنجان آذربائیجان کا ایک ضلع ہے) سید احمد توختہ۔ شیخ عزیز الدین اور سید میٹھا کا بھی اس ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔ کشف المحجوب جو تصوف میں داتا گنج بخش کی ایک گراں بہا تالیف ہے۔ اس پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شعرائے نامدار میں استاد رونی۔ مسعود سعد سلمان اور چند اور شعرا کا ذکر بھی ہے۔ آخر میں چند علما و مصنفین جن میں سراج الدین ابن منہاج نصر اللہ فرقدی۔ امام خطیب الدین۔ زکی الدین احمد۔ امام حسن بن محمد صغانی کا حال بھی درج ہے۔ ارباب سیف و سیاست کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جنھوں نے لاہور پر ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء سے ۶۲۹ھ/۱۲۴۱ء تک حکومت کی۔ ان حکمرانوں کی تعداد چھبیس ۲۶ ہے جن میں پہلا سالار عبد اللہ قراتگین ہے اور آخری حکمران کا نام اختیار الدین قراقش ہے۔

مآثر لاہور کی تالیف میں فرید ہاشمی صاحب نے بڑی محنت کی ہے۔ انھوں نے لاہور سے متعلق مطبوعہ تاریخوں کے علاوہ اس زمانے کے شعرائے کرام کے تہنیتی قصائد سے اہم معلومات اخذ کی ہیں۔ پھر ان معلومات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے۔ کتاب میں جو زبان اختیار کی گئی ہے۔ وہ تاریخی واقعات کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ لیکن ان کی کہنہ مشقی کے جوہر سطر سطر میں اہلِ نظر سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر (سال پیدائش ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء)

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی مصنف لاہور کا ماضی اور حال (LAHORE PAST & PRESENT) کا شمار ماہرینِ علوم شرقیہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر ۱۲/اپریل ۱۹۱۰ء کو گجرات میں ملک حاکم دین کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ دون پبلک سکول (ڈیرہ دون) میں ۱۹۳۶-۳۷ء میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک لندن یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کے شعبے میں لیکچرار رہے۔ اور اسی زمانے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کرتے رہے۔ ۱۹۳۹ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ ترکی، شام، عراق اور ایران میں آپ نے اس مقصد سے سفر کیے۔ تاکہ وہاں کے مسلمانوں کی ثقافتی، سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں سے پوری واقفیت حاصل کی جائے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد آپ شروع میں اسلامیہ کالج لاہور اور اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں آپ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے منسلک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں آپ نے رائل انڈین ایئر فورس میں خدمات انجام دیے۔ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد حکومت ہند نے آپ کی خدمات محکمہ تعلیم کو مستعار دے دیں۔ تقسیم ہند کے بعد رائل پاکستان ایئر فورس نے آپ کو واپس بلا لیا۔ جہاں سے آپ کو ۱۹۵۰ء میں سبکدوشی حاصل ہوئی۔ آپ ۱۹۵۰ء سے پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبۂ فارسی کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر باقر نے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے۔ جن سے ان کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر باقر کا مزاج تنقیدی ہونے کے علاوہ تحقیقی بھی ہے۔ چنانچہ اردو و فارسی، انگریزی، پنجابی ادب پر آپ نے خاصا کام کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء سے آپ کا تنقیدی و تحقیقی کام شروع ہوتا ہے۔ اس سنہ میں آپ نے نظامی گنجوی پر ایک مقالہ زمانہ کانپور میں لکھا۔ علاوہ ازیں علامہ اقبالؒ کی بالِ جبریل اور مولانا رومؒ کے تصوف پر بھی آپ کے مقالے موجود ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں اردو سے قدیم پر آپ کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا۔ اردو کے جرمن شاعر فراسو (FARASU) پر آپ کا مقالہ اورینٹل کالج میگزین بابت ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ پنجابی کے جن مشہور و معروف قصوں کو فارسی کا جامہ پہنایا جا چکا ہے۔ آپ نے ان کی تحقیق کی، ان پر مقالے لکھے۔ شہر لاہور کے نام اور اس کی بنیاد کی تاریخ پر آپ کا تحقیقی مقالہ اسلامک کلچر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ لاہور اسلامی حکومت سے قبل اسلامک کلچر ۱۹۴۷ء میں چھپا۔ شالامار باغ پر آپ کا مضمون ۱۹۵۲ء کے اورینٹل کالج میگزین میں نکلا۔ لاہور کے مورخوں اور سیاحوں پر پاکستان ریویو بابت ۱۹۵۵ء میں آپ کا مقالہ شائع ہوا۔ آپ کے مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو مختلف عنوانات پر بڑی تحقیق سے سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔

آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد پچیس ۲۵ کے قریب ہے۔ جن میں "سفینۂ زیب النسا"، "تاریخ کوہ نور"، "تذکرہ شعرائے پنجاب"، "تاریخ ساسانیہ"، "تہذیبِ امن"، "لاہور کا ماضی و حال" (LAHORE PAST AND PRESENT) اور ان کے علاوہ افسانوں اور خطوط کے مجموعے بھی ہیں۔

شہر لاہور کی قدیم تاریخ اور شالامار باغ پر مصنف نے زیادہ توجہ دی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر شالامار کی تحقیق کا کچھ حصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے تحقیقی کام کا طریقہ اور مرتبہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

شالامار باغ پر مصنف نے ایک تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اوّل تو انھوں نے تاریخی ماخذ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ شالامار باغ شاہی خاندان کی تفریح کے لیے تعمیر کیا گیا۔ نام اور تاریخ تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شالامار بعضوں کے نزدیک "شہلا باغ" تھا۔ بعض کے نزدیک یہ شالا باغ ہے کہ شالا پنجابی زبان میں خدا کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک "شعلہ ماہ" یعنی چاند کا شعلہ اور بعض کے نزدیک سالہ ماہ کہ سالہ سنسکرت میں گھر کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک شالامار کشمیر کے ایک باغ کے نام سے مستعار ہے۔ کسی بادشاہ سلف نے کشمیر میں ایک باغ بنوانے کے لیے جگہ پسند کی وہاں ایک گیدڑ کو شکاری کتے نے پکڑ رکھا تھا۔ اس مناسبت سے اس باغ کا نام شالامار مشہور ہوا کیونکہ کشمیری زبان میں گیدڑ کو شالا کہتے ہیں۔ اور مار ایک قسم شکاری کتے کی ہے۔ (تحقیقات چشتی) تھارن ٹن نے لکھا ہے کہ شالامار کے اصلی معنی کیا ہیں۔ یہ معلوم نہیں۔ قیاساً "شالِ مار" اور "شاہی امارت" کی بگڑی ہوئی صورت ہو سکتی ہے۔ سنسکرت میں شالامار مقامِ عشق کو بھی کہتے ہیں۔ مار سے مطلب خدا کی محبت اور شالا گھر کی ایک صورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق کے مطابق بیان کیا ہے کہ لاہور کے شالامار باغ کا سب سے پہلا تذکرہ سبحان رائے (معاصر عالمگیر) نے اپنی مشہور کتاب خلاصۃ التواریخ میں کیا ہے۔ سید محمد لطیف کا خیال ہے کہ شاہجہان کے چھٹے سال جلوس یعنی ۱۶۳۴ء میں شالامار باغ کی تیاری شروع ہوئی۔ اور وھیلر کی رائے میں ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں یہ باغ تکمیل کو پہنچا۔ رائے کنہیا لال نے اس کی تکمیل ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں بتائی ہے۔ وھیلر نے اپنی کتاب تاریخ پاکستان کے پانچ ہزار سال میں قطعۂ ذیل نقل کیا ہے ؎

چوں شاہجہاں بادشہ حامیٔ دیں — آراستہ شالامار باطرز متیں
تاریخ بنائے ایں ز رضواں جستم — گفتا کہ بگو نمونۂ خلد بریں
۱۰۴۷

یہ قطعہ وحید سے پہلے شالامار باغ کے سلسلے میں بار بار نقل کیا گیا ہے۔ رائے کنہیا لال۔ مولوی نور محمد چشتی اور ج لطیف نے بھی اس قطعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر باقر کے نزدیک یہ قطعہ تاریخ عہد شاہجہان کے بعد کسی گمنام شاعر نے کہا ہوگا۔ اس لیے کہ شاہجہان کے زمانے میں اس باغ کا نام شالامار نہ تھا۔ محمد صالح کنبو مصنف عمل صالح اور عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ دونوں نے اس باغ کی تکمیل کی تاریخ شعبان ۱۰۵۲ھ میں بتائی ہے۔ جو ۱۶۴۲ء کے مطابق ہے۔ شاہجہان نے سب سے پہلے ۶ شعبان ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۶۴۲ء کو اس باغ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس باغ کی تکمیل میں ایک سال پانچ ماہ اور چار دن صرف ہوئے۔

لاہور کا ماضی و حال (LAHORE PAST AND PRESENT) میں ڈاکٹر باقر نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ جو مورخین کو جہان بین کی دعوت دیتی ہے۔ یہ کتاب قدیم ماخذ پر مبنی ہے۔ جس میں شہر لاہور کے حالات بیان کئے ہیں۔ اور پنجاب یونیورسٹی پریس میں ۱۹۵۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ تعداد صفحات (۵۶۷) ہے۔ ستائیس تصاویر اور ایک لاہور کا نقشہ شامل اشاعت ہے۔

شروع میں مصنف کا مختصر سا پیش لفظ ہے۔ جس میں آپ نے بتایا ہے کہ شہر لاہور کی یہ تاریخ اٹھاون بادشاہوں اور ایک سو تئیس حاکمان شہر کے حالات پر مبنی ہے جنھوں نے اس کی تاریخ کے ابتدا سے یعنی سن ۹۹۰ء سے سن ۱۹۵۲ء تک اس شہر پر حکومت کی مصنف نے ذکر کیا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے کتب ہائے تاریخ کے علاوہ مستند وقائع۔ سوانح عمریوں۔ درباری شعرا کے منظومات۔ شاہی فرمانوں۔ سکہ جات۔ کتبات اور دوسرے ماخذ سے کام لیا ہے۔ درباری مورخین میں یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی مصنف تاریخ مبارک شاہی۔ مرزا حیدر مصنف تاریخ رشیدی۔ عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ۔ تذکرۃ الواقعات مصنفہ جوہر آفتابچی۔ میر مبارک علی۔ ارادت خاں مصنف تاریخ ارادت خان۔ لطیف۔ کنہیا لال۔ چشتی اور ایسے بے شمار ذرائع سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تاہم مصنف نے یہ احتیاط برتی ہے کہ ان کے پیش رو مورخین لاہور۔ ج لطیف۔ لالہ کنہیا لال اور نور احمد چشتی نے جن عمارات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ان کا حال درج کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اور اس طرح فرضی قصوں اور روایاتی تذکروں سے بھی پرہیز کیا ہے۔ آخر میں لاہور ڈائرکٹری کے زیر عنوان اہم معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی نے شائع کی اور انگریزی زبان میں ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں شہر لاہور کی تاریخ ہے۔ یہ حصہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں لاہور کے نام اور اس کی ابتدائی تاریخ سے بحث ہے۔ دوسرے باب میں لاہور ہندو حکمرانوں کی حکومت کے ایام میں۔ تیسرے باب میں لاہور غزنویوں کا دور حکومت میں۔ چوتھے باب میں لاہور غوری اور خاندان غلاماں کے دوران سلطنت میں۔ پانچویں باب میں خلجی اور تغلق فرمانرواؤں کے وقت میں۔ چھٹے باب میں سید۔ لودھی بادشاہوں کے زمانے میں بابر کے حملے تک۔ ساتویں باب میں مغلوں۔ افغانوں اور بعد کے مغل بادشاہوں کے عہد میں۔ آٹھویں باب میں اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور عالمگیر کے دور میں۔ نویں باب میں عالمگیر کے جانشین مغل بادشاہوں کے وقت میں۔ دسویں میں سکھوں اور گیارھویں باب میں سرکار انگلشیہ اور بارھویں میں لاہور قیام پاکستان کے بعد کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ بارھویں باب میں پاکستان کے اکابر مثلاً قائداعظم۔ سردار عبدالرب نشتر کا حال۔ مارچ سن ۱۹۵۰ء میں شہنشاہ ایران کی تشریف آوری۔ پنجاب یونیورسٹی۔ پنڈی سازش۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ وغیرہ درج ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں شہر لاہور کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ تیرھویں باب میں لاہور کا رقبہ اور اس کی حدود وغیرہ۔ چودھویں باب میں تاریخی عمارات کا حال تحریر کیا گیا ہے۔ لاہور کی مساجد۔ باغات۔ محلات و دیگر اہم عمارات خصوصاً قلعہ پر روشنی

ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں ہندو راج۔ اسلامی۔ سکھ۔ برٹش دورِ حکومت اور پاکستانی عہد کی عمارات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ خاص کر قابلِ قدر ہے۔

یہ حصہ (۲۴۰) صفحے سے (۴۲۲) صفحے تک پھیلا ہوا ہے۔ اور قدیم عمارات کی تشریح سے شروع ہو کر علامہ اقبالؒ کے مزار تک جا پہنچا ہے۔ اس کے قابلِ قدر ہونے کی خاص وجہ یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر باقر کو فنِ تعمیر سے ایک خاص دلچسپی ہے۔ عمارات کے حالات کا بیان تاریخی معیار کے لحاظ سے کیا گیا ہے کہ کس دور میں کونسی عمارت تعمیر ہوئی۔ یہ جائزہ خاصا مبسوط ہے۔ مصنف نے جا بجا مورخین کی آرا نقل کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خود اپنی رائے بھی دے دی ہے۔ کیونکہ اس باب میں انھیں خاص دسترس حاصل ہے۔ عمارات کا حال بیان کرتے وقت انھوں نے ہر عمارت کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ عمارات کی ساخت سے سالِ تعمیر کا تعین کرنا اور اس دور کی تہذیب تک پہنچنا ایک خاص فن ہے۔ جو ماہر تعمیرات ہی جانتے ہیں۔ اس سے تاریخ کی تدوین میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر لاہور کی عمارات کو دیکھا جائے تو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں بہ نسبت ان معلومات کے جو صرف تاریخی ریکارڈ سے مرتب کی جائیں۔

مورخینِ لاہور میں ڈاکٹر محمد باقر کو اپنے پیشروؤں پر اس لحاظ سے فضیلت حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سامنے متقدمین کا پورا کام موجود تھا۔ جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ متاخرین میں لالہ کنہیا لال انجینئر اور سید محمد لطیف جج کی کتابوں کو بجا طور پر تاریخی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ لاہور مرتب کرنے میں ان دو مصنفین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہاں بھی ڈاکٹر باقر کو یہ سہولت حاصل رہی ہے کہ ان کے سامنے لالہ کنہیا لال اور جج لطیف دونوں کی تحقیقات موجود تھیں۔ اس لیے یہ کتاب ان تصانیف کا بھی نچوڑ ہے۔ یہ کتاب ان کے مقابلے میں کافی ضخیم ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر باقر کو عمارات کے ساتھ مخصوص دلچسپی ہے اور تاریخی عمارات کی ساخت اس دور کی تاریخ مرتب کرنا اور تاریخی حالات کا اندازہ لگانا ان کا مشغلہ ہے۔ اس لحاظ سے عمارات لاہور پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے۔ اس سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ بہتر ہوتا اگر یہ کتاب قومی زبان میں تصنیف کی گئی ہوتی۔ کیونکہ انگریزی پر ہر ایک کو دسترس حاصل نہیں ہے یا اس کا وہ خود مستند اردو ترجمہ بھی پیش کر دیتے۔

آخر میں ایک قابلِ قدر ضمیمہ درج ہے جو سوا سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک باب کتابیات کا ہے جو بڑی جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے۔ لاہور سے متعلق اتنی مکمل فہرست کتابیات اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔

کتابیات

ضمیمہ ۱

لاہور کا ذکر عربی و فارسی کتب میں

۱۔ بادشاہ نامہ	مصنف عبد الحمید لاہوری	مطبوعہ کلکتہ	جلد اول ۱۸۶۷ء جلد دوم ۱۸۶۸ء
۲۔ عمل صالح	ملا محمد صالح کنبو	کلکتہ ۱۹۲۷ء	لاہور ۱۹ء
۳۔ تزک جہانگیری	شہنشاہ نور الدین جہانگیر	علی گڑھ ۱۸۶۴ء	
۴۔ اقبال نامہ جہانگیری	معتمد خان	(تین جلدوں میں) دو نایاب	جلد سوم کلکتہ ۱۸۶۵ء
۵۔ اقبال نامہ	معتمد خان	مسودہ امپریل لائبریری کلکتہ و کتب خانہ خدا بخش خان۔ پٹنہ	
۶۔ مآثر عالمگیری	محمد ساقی مستعد خان	کلکتہ ۱۸۷۱ء	

۷۔ خلاصۃ التواریخ	سجان رائے بھنڈاری	دہلی ۱۹۱۸ء
۸۔ مآثر الکرام	غلام علی آزاد بلگرامی	(دو جلدیں حیدر آباد دکن میں طبع ہوئیں)
۹۔ سفینۃ الاولیا	شہزادہ دارا شکوہ	آگرہ ۱۸۵۳ء
۱۰۔ سکینۃ الاولیا	" "	(فارسی نسخہ نایاب ہے)
۱۱۔ چہار چمن برہمن	منشی چندر بھان برہمن	قلمی (یونیورسٹی لائبریری لاہور)
۱۲۔ تاریخ احمدی	عبدالکریم علوی	کانپور ۱۸۴۹ء
۱۳۔ تاریخ پنجاب	منشی عبدالکریم	لاہور ۱۲۶۵ھ
۱۴۔ آئین اکبری	ابوالفضل	کلکتہ ۱۸۷۷ء
۱۵۔ اکبر نامہ	" (تین جلدوں میں)	کلکتہ ۱۸۷۷-۸۶ء
۱۶۔ فتوح البلدان	بلاذری	قسطنطنیہ ۱۹۰۱ء
۱۷۔ خزانۂ عامرہ	غلام علی آزاد بلگرامی	کانپور ۱۸۷۱ء
۱۸۔ سیر المتاخرین	غلام حسین خان	لکھنؤ ۱۸۹۷ء
۱۹۔ ہمایوں نامہ	شہزادی گلبدن بیگم	لندن ۱۹۰۲ء
۲۰۔ جہاں کشائے نادری	محمد مہدی	بمبئی ۱۲۰۹ھ
۲۱۔ عمدۃ التواریخ	سوہن لال	لاہور ۱۸۹۱ء
۲۲۔ تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی	کلکتہ ۱۹۳۱ء
۲۳۔ قران السعدین	امیر خسرو	علی گڑھ ۱۹۱۸ء
۲۴۔ کشف المحجوب	حضرت علی ہجویریؒ (ترجمہ اردو)	لاہور ۱۹۴۵ء
۲۵۔ بہار سخن	ملا محمد صالح کنبو	قلمی
۲۶۔ گنجینۂ سروری	غلام سرور لاہوری	لکھنؤ ۱۸۸۹ء
۲۷۔ خزینۃ الاصفیا	" "	۱۲۸۵ء
۲۸۔ تواریخ پنجاب بوٹے شاہ	قلمی نسخہ	پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۲۹۔ طبقات اکبری	نظام الدین احمد	کلکتہ ۱۹۲۶ء - ۱۹۳۵ء
۳۰۔ منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی (تین جلدوں میں)	کلکتہ ۱۸۶۸ء

ضمیمہ ۲

لاہور کا ذکر اردو کتب میں

۱۔ تحقیقات چشتی	نور احمد چشتی	لاہور ۱۸۶۴ء
۲۔ تاریخ لاہور	لالہ کنہیا لال	لاہور ۱۸۸۴ء

۳۔ تاریخ پنجاب	لالہ کنہیا لال	لاہور سنہ ۱۸۸۶ء
۴۔ یادِ رفتگاں	منشی محمد دین فوق	سنہ ۱۹۰۴ء
۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور	منشی محمد دین فوق	لاہور سنہ ۱۹۲۳ء
۶۔ شالامار باغ	" "	لاہور سنہ ۱۹۰۰ء، سنہ ۱۹۲۴ء
۷۔ لاہور عہدِ مغلیہ میں	" "	لاہور سنہ ۱۹۲۶ء
۸۔ داتا گنج بخش	" "	لاہور سنہ ۱۹۱۴ء، سنہ ۱۹۳۰ء
۹۔ تاریخ جلیلہ	پیر غلام دستگیر نامی	لاہور سنہ ۱۹۲۶ء، سنہ ۱۹۶۰ء
۱۰۔ مآثر لاہور	سید ہاشمی فرید آبادی	لاہور سنہ ۱۹۵۶ء
۱۱۔ بزمِ مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	اعظم گڑھ سنہ ۱۹۴۹ء
۱۲۔ بزمِ صوفیہ	" " "	" "
۱۳۔ تاریخ مخزنِ پنجاب	مفتی غلام سرور لاہوری	لاہور سنہ ۱۲۸۵ھ
۱۴۔ حدیقۃ الاولیا	" "	لاہور۔ لکھنؤ سنہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء
۱۵۔ مدینۃ الاولیا	" "	نولکشور۔ کانپور۔ لکھنؤ
۱۶۔ نقدِ رقعاتِ عالمگیر	سید نجیب اشرف ندوی	اعظم گڑھ سنہ ۱۹۴۳ء
۱۷۔ بزمِ تیموریہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	" سنہ ۱۹۴۶ء
۱۸۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ	پروفیسر سیتا رام کوہلی	الہ آباد سنہ ۱۹۳۳ء
۱۹۔ صنادیدِ عجم	مہدی حسین ناصری	" سنہ ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء
۲۰۔ قلعۂ لاہور	ولی اللہ	لاہور سنہ ۱۹۶۱ء
۲۱۔ بادشاہی مسجد	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	" سنہ ۱۹۵۵ء
۲۲۔ ہمارا پنجاب	عزت اللہ	" سنہ ۱۹۴۱ء
۲۳۔ حالاتِ ضلع لاہور	مفتی تاج الدین	اورینٹل کالج میگزین سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء
۲۴۔ مورخینِ ہند	شمس اللہ قادری	حیدرآباد
۲۵۔ سکینۃ الاولیا	دارا شکوہ (اردو ترجمہ)	لاہور
۲۶۔ شالامار باغ کی سرگزشت	مسعود اکرام کلیم	" سنہ ۱۹۵۰ء
۲۷۔ تاریخ پنجاب	غلام محی الدین	
۲۸۔ لاہور کے ضلع کا جغرافیہ	سنہ ۱۸۷۷ء محکمۂ تعلیم	لاہور سنہ ۱۹۰۰ء
۲۹۔ آثار الصنادید	سر سید احمد خان	

۳۰۔ تاریخ ہند — مولانا ذکاء اللہ — کراچی سنہ ۱۹۶۰ء
۳۱۔ رہنمائے قلعہ لاہور — مولوی محمد حمید خاں

ضمیمہ ۳

لاہور کا ذکر پنجابی زبان میں

۱۔ شہر لاہور دی تاریخ — کرنل بھولا ناتھ — لاہور سنہ ۱۹۳۳ء
۲۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ — مولا بخش کشتہ — ، سنہ ۱۹۶۰ء

ضمیمہ ۴

لاہور کا تذکرہ انگریزی کتب میں

۱۔ LAHORE — سید محمد لطیف — لاہور سنہ ۱۸۹۲ء، سنہ ۱۹۵۶ء
۲۔ LAHORE PAST AND PRESENT — ڈاکٹر محمد باقر — لاہور سنہ ۱۹۵۲ء
۳۔ اولڈ لاہور — کرنل ایچ۔ آر۔ گولڈنگ — لاہور سنہ ۱۹۲۴ء
۴۔ ANCIENT GEOGRAPHY OF INDIA — از کنگھم الگزنڈر — کلکتہ سنہ ۱۹۲۴ء
۵۔ PRINCIPALS REPORTS ON THE MAYO SCHOOL OF ARTS FOR (1889-90) — جے ایل کپلنگ — لاہور سنہ ۱۸۹۰ء
۶۔ ہسٹری آف دی پنجاب — سید محمد لطیف — کلکتہ سنہ ۱۸۹۱ء
۷۔ روئدادہائے محکمہ آثار قدیمہ — ۱۹۰۳-۴ء، ۱۹۰۴-۱۹۰۵ء، ۱۹۰۶ء
۸۔ لاہور عجائب گھر کے سکے — (ضرب لاہور)
۹۔ REVISED LIST OF OBJECTS OF ARCHAEOLOGICAL INTREST IN THE PUNJAB. — از RODGERS — لاہور
۱۰۔ THE LAND OF THE FIVERIVERS AND SINDH. — از DAVIDROSS — لنڈن سنہ ۱۸۸۳ء
۱۱۔ دیوان عام قلعۂ لاہور — از GORDEN SANDERSON — کلکتہ سنہ ۱۹۱۱ء
۱۲۔ آثار قدیمہ کی رپورٹ — (سنہ ۱۹۰۹ء) — کلکتہ سنہ ۱۹۱۱ء
۱۳۔ مغلوں کے باغات — از STUART — لنڈن سنہ ۱۹۱۳ء
۱۴۔ LAHORE — از J.H.THORNTON — لاہور سنہ ۱۸۶۰ء، سنہ ۱۹۲۴ء
۱۵۔ THE MASTER BUILDERS OF THE LAHORE PALACE. — از VOGEL
۱۶۔ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی — جلد ۱ا۱ — شمارہ: ۱ — کلکتہ سنہ ۱۹۱۴ء
۱۷۔ قلعۂ لاہور کی کاشی کاری — از VOGEL — کلکتہ سنہ ۱۹۲۰ء

۱۸- لاہور ڈسٹرکٹ گزٹ از WALKER لاہور ۱۹۱۹ء

۱۹- پاکستان کے پانچ ہزار سال از R.E.M. WHEELER لنڈن ۱۹۵۰ء

۲۰- لاہور پاکستان پبلشرز کراچی

۲۱- COMPARATIVE GEOGRAPHY OF INDIA. از F. WILFORD لنڈن ۱۸۵۱ء

۲۲- رچ مانڈ براڈ فٹ لاہور میں از مسٹر ظہیر الحسن

۲۳- ہنری لارنس روس ناتھ ۱۸۴۹ — ۱۹۰۹

۲۴- " " روشن لال ۱۸۴۹ — ۱۹۵۲

۲۵- جان لارنس بطور چیف کمشنر پنجاب پریم پرشاد ۱۸۵۲ — ۱۸۵۸

۲۶- سر فریڈرک کیوری ریذیڈنٹ پنجاب مس کارنواس ۱۹۵۳ء

۲۷- تواریخ پنجاب اسٹائن بیک (STEIN BACH)

۲۸- پنجاب کے ابتدائی انتظامات مس من چندا ۱۹۳۵ء

۲۹- پنجاب کی انتظامی ترقی منظر احمد ۶۸-۱۸۶۴ء

۳۰- عیسائی مشنری پنجاب میں مدن گوپال چوپڑہ ۱۸۸۵ء — ۱۸۲۵ء

۳۱- پنجاب چیف کمشنر کے ماتحت انوار ہاشمی ۵۷-۱۸۵۲ء

۳۲- پنجاب میں جان لارنس کی پالیسی ۱۸۵۲ء تک عبدالحفیظ ۱۹۳۶ء

۳۳- لاہور BLASCHECK

۳۴- لاہور گائیڈ ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین لاہور ۱۹۵۶ء

۳۵- لاہور محمد ولی اللہ خان لاہور ۱۹۵۵ء

۳۶- لاہور اینڈ اٹس امپارٹنٹ مانومنٹس محمد ولی اللہ خان لاہور ۱۹۵۶ء

۳۷- ہسٹاریکل نوٹس آف دی آرکیالوجی مانومنٹس ایٹ لاہور لاہور ۱۹۵۹ء

۳۸- لاہور ایچ نیول لنڈن مطبوعہ ۱۹۲۱ء

ضمیمہ ۵

سفرناموں میں لاہور کا ذکر

۱- اکبر اور عیسائی از DE JARRIC

۲- جہانگیر اور عیسائی از GUERRIRO

۳- اکونٹ آف انڈیا از DE LEAT

۴- کمنٹری از MONSERRATE

۵- جہانگیرز انڈیا از PELSAERI

۶۔ ہسٹری آف دی مغل انڈیا از PELSAERI (اس کا DE LAET نے لاطینی میں ترجمہ کیا اور برج نارائن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا)

۷۔ EARLY TRAVELS IN INDIA. از FOSTER

۸۔ A VOYAGE TO EAST INDIA. از FAWARD TERRY

۹۔ TRAVELS IN INDIA. از JEAN BAPTIST

۱۰۔ سفرنامہ از PETER DELLAVALLE

۱۱۔ سفرنامہ از PETER MUNDY

۱۲۔ ACCOUNT OF HIS MISSION & TRAVELS. از MANRIQUE

۱۳۔ سفرنامہ از سرٹامس ہربرٹ

۱۴۔ VOYAGE از MIDDLETON

۱۵۔ GENERAL DISCRIPTION OF INDIA از VAN TWIST

۱۶۔ ACCOUNT OF TRAVELS OF GEORGE ″ ARDRIES

۱۷۔ (اس کا انگریزی ترجمہ ارون نے کیا) STORY OF MOGHAL INDIA ″ MANUCCI

۱۸۔ سفرنامہ ہند از برنیر

۱۹۔ سفرنامہ از TAVERNIER

۲۰۔ سفرنامہ ″ ہملٹن

۲۱۔ سفرنامہ ″ مورکرافٹ (جو مسٹر ولسن نے شائع کیا)

۲۲۔ سفرنامہ بیرن ہوگل (جرمن زبان میں) مسٹر جورس نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۲۴۔ سفرنامہ ڈاکٹر مارٹن (DR MARTIN HONIGBERGER)

۲۵۔ سرسید کا سفرنامہ پنجاب سید اقبال علی علی گڑھ سنہ ۱۸۸۴ء

ضمیمہ ۶

پنجاب یونیورسٹی میں لاہور کے متعلق تحقیقی مقالات

(۱۹۲۷ء)

۱۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں پنجاب کے محکمہ مال کی پالیسی از پریم نارائن بہان (BEHAN)

(۱۹۲۸ء)

۲۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اور پنجاب از سرداری لال

۳۔ لاہور برٹش ایجنسی ۱۸۴۶ء از نرائن سنگھ

۴۔ پنجاب، سوہن لال کی عمدۃ التواریخ کی روشنی میں از محمد اقبال

۵۔ پنجاب، اورنگ زیب کے عہد میں از رام کمار

۶۔ جنوری ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۰ء تک پنجاب کا انتظام — از محمد یونس
۷۔ ایک کتاب راجہ لال سنگھ کے عنوان سے — از نرندر سنگھ
۸۔ لاہور میونسپل کمیٹی ۱۹۲۱-۳۵ء — از اعجاز احمد
۹۔ سر رابرٹ منٹگمری پنجاب میں — از کیشو نارائن بھٹناگر
۱۰۔ دو سکھ لڑائیوں کے درمیان پنجاب کی حالت — از رام چندر اگروال

(۱۹۴۰ء)

۱۱۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور پنجاب — از سرواری لال
۱۲۔ لارڈ رپن کے وائسرائے ہونے کے زمانے تک پنجاب کی تعلیمی ترقی — از چرن جیت لال
۱۳۔ پنجاب انتظامات ۱۸۵۲-۱۸۵۷ — از محمد حسین
۱۴۔ پنجاب انتظامات کی تاریخ انگریزی قبضے سے لے کر صوبائی خود مختاری تک — از جگت سنگھ
۱۵۔ پنجاب کے بارے میں جی۔ آر۔ کلارک کی خط و کتابت
۱۶۔ عیسائی مشنریوں کا پنجاب میں سماجی اور تعلیمی کام — از شمس الدین
۱۷۔ لارڈ ڈلہوزی اور پنجاب — از افتخار احمد نسیم
۱۸۔ پنجاب میں انگریزی تعلیم کی تاریخ — از سعید مظفر

(۱۹۴۱ء)

۱۹۔ فقیر عزیز الدین — از الطاف حسین شوکت
۲۰۔ پنجاب کی سیاسی حالت ۱۸۴۲-۱۸۳۹ء — از بلونت سنگھ
۲۱۔ پنجاب جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے — از ارودھ چند
۲۲۔ لاہور ریذیڈنسی — از لودھی پرشاد شنگلو
۲۳۔ لاہور دربار ۱۸۳۸-۱۸۴۳ء — از بلونت سنگھ
۲۴۔ لاہور مشاف مشن — از امیر احمد صدیقی
۲۵۔ لاہور ایجنسی — از بلدیو راج کپور

(۱۹۴۴ء)

۲۶۔ مہاراجہ شیر سنگھ کی وفات سے لاہور کی سلطنت کا زوال — از موہن لال اہلووالیا

(۱۹۴۵ء)

۲۷۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کے متعلق — از شیام سندر
۲۸۔ پنجاب کا الحاق — از کلدیپ سنگھ نارنگ
۲۹۔ پنجاب میں تعلیم کی تاریخ ۱۸۴۹-۱۹۱۹ء — از مسز ایشور دیوی گپتا

(۹۰-۱۹۴۵ء)

۳۰- پنجاب میں ۱۸۵۷ء تک اُردو صحافت کی تاریخ از انور قریشی (۱۹۵۷ء)

ضمیمہ ۷

رسائل و اخبارات میں لاہور کا تذکرہ

(جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی)

		جلد	شمارہ	سال
مقبرہ جہانگیر	جے۔ پی۔ ٹامسن	۱	۱	۱۹۱۱
ابتدائی غیر ملکی سیاح	ای۔ ڈی میکلیگن	۱	۲	۱۹۱۲
لاہور عجائب گھر میں یونانی بدھی مجسمے	دوگل	۱	۲	۱۹۱۲
جے سوٹ (JESUIT) مشن لاہور میں	فادر فلیکس	۵	۷	۱۹۱۶
جنرل ونطورا	پنڈت شیو نارائن	۶	۲	۱۹۱۷
(جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی)				
پنجاب یونیورسٹی کی مختصر تاریخ	جے ایف بروس	۲	۲	۱۹۳۳
انارکلی کی کہانی	بی۔ کرسے	۳	۱	۱۹۳۴
پنجاب کے دریاؤں کے قدیم راستے	گلشن رائے	۳	۱	۱۹۳۴
تاریخ پنجاب	محمد باقر ملک	۴	۲	۱۹۳۵
پنجاب کی سماجی حالت سکھوں کے زمانے میں	پی۔ این کھیڑا	۵	—	۱۹۳۸
عمدۃ التاریخ	لالہ سوہن لال سوری	۸	—	۱۹۴۴
ظفرنامہ	جنرل ونطورا	۸	—	۱۹۴۴
ظفرنامہ رنجیت سنگھ	دیوان امرناتھ	۸	—	۱۹۴۴
انارکلی	پروفیسر علم الدین سالک	سالنامہ نیرنگ خیال لاہور		۱۹۲۸
لاہور نمبر	نیرنگ خیال لاہور	جنوری		۱۹۲۷

عالمگیر۔ نیرنگ خیال۔ ہمایوں۔ ادبی دنیا۔ شاہکار۔ قوس و قزح۔ مخزن۔ شباب اُردو۔ اورینٹل کالج میگزین۔ رہنمائے تعلیم۔ فردوس۔ یادگار۔ جہلم۔ الفرقان کی فائلوں میں لاہور کا تذکرہ ملتا ہے۔

پاکستان ٹائمز۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ امروز۔ نوائے وقت۔ آفاق۔ کوہستان۔ لیل و نہار۔ قندیل میں مختلف مضمون نگاروں کے مضامین جن میں پروفیسر سید عبد القادر۔ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی۔ محمد عبد اللہ قریشی۔ پروفیسر علم الدین سالک۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ محمد شجاع الدین اور دوسرے مورخین کے مختلف موضوعات پر تاریخی مقالات لاہور کے متعلق ملتے ہیں۔

چند خونچکاں مناظر

سکھوں کی حکومت کا ابتدائی اور آخری دور

غلام رسول مہر

سلطنتوں کے انقلاب اور بادشاہوں کے تداول میں لوگوں کو جو نقصان پہنچتے رہے ان کے مفصل نقشے شاید ہی کبھی پیش ہوئے ہوں یا منظرِ عام پر آئے ہوں۔ مجھے بارہا خیال آیا کہ تاریخ کا یہ پہلو بھی خاص توجہ کا محتاج ہے لیکن ایک ایک انقلاب کے احوال کی تحقیق و تجسس کے بعد نقشے مرتب کرنا ایک فرد کا کام نہیں۔ ایک جماعت ہی اس کے سرانجام کا ذمہ اٹھا سکتی ہے۔

اس قسم کے انقلابات میں سب سے بڑھ کر صدمے ان مقامات کے باشندوں کو برداشت کرنے پڑے جو حکومت کے مرکزوں میں مقیم تھے مثلاً دہلی خدا جانے کتنی مرتبہ غارت گری کا ہدف بنا اور چند مرتبہ لوہاں قتلِ عام کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے قتل و غارت دونوں کا نہایت خوفناک مظاہرہ کیا تھا جس کی نظیریں سرگزشت میں نہیں مل سکتیں۔

لاہور کو بھی ابتدا ہی سے مرکزی حیثیت حاصل رہی چنانچہ زدوکشت کی خونچکانیوں اور غارت گری کی بے دردیوں میں اس کا حصہ بھی خاصا ماتم خیز ہے۔ اس پر بھی انقباض و انبساط اور بست و کشاد کے کئی دور گزرے۔ کبھی یہ اتنا پھیلا کہ میلوں تک اس کی آبادی چلی گئی۔ دور دور تک بنگلوں اور باغوں اور سیرگاہوں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں، پھر برباد ہونا شروع ہوا۔ ہر طرف ملبے کے انبار جمع ہوتے گئے اور شہر کی آبادی سمٹ کر فصیل کے اندر پہنچ گئی۔

آسمانی قہر

بعض اوقات ایسے گروہ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں جن کے نزدیک لوٹ مار کو ہر مصلحت پر تقدم حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک بدترین گروہ وہ تھا جو تقریباً ۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۹ء تک لاہور پر مسلط رہا اور جسے "حکومت سہ گانہ" کہتے ہیں یعنی تین آدمی لاہور نیز پنجاب کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اول گوجر سنگھ، دوم لہنا سنگھ اور سوم سوبھا سنگھ۔ انھوں نے شہر کو تین حصوں میں بانٹ لیا تھا۔ اس دور کے متعلق نرم سے نرم لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی قہر کی بجلیاں تھیں جو مسلسل چونتیس سال تک لاہور کی فضا میں کوندتی رہیں۔ آج کیونکر بتایا جا سکتا ہے کہ چونتیس سال کی اس مدت میں لاہور کے باشندوں نے زندگیاں کس حالت میں گزاریں؟ ہمیں صرف یہ تصور کر لینا چاہیے کہ یہاں کی فضا میں یکایک ایک مہیب تاریکی چھا گئی تھی۔ اس میں بیک وقت ہر طرف سے توپیں چھوٹتی تھیں، گولیاں چلتی تھیں، تلواریں برستی تھیں، گولے پھٹتے تھے، خون بہتے تھے، مال لٹتے تھے اور کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ تاریکی کب زائل ہوگی اور اس حالت میں کب تبدیلی آئے گی؟ بڑے ہی دردناک المیے کے آخری سین کا پردہ کب گرے گا؟

اور اس شبِ دیجور کی صبح کب دریچۂ افق سے آشکارا ہوگی؟ دوسری جنگ میں سیروشیا اور ناگا ساکی کے واقعات کو بے حد خوفناک مانا جاتا ہے۔ یقیناً وہ بڑے خوفناک تھے مگر وہاں کیا پیش آیا؟ ایک ایک بم گرا، چند لمحوں میں دور دور تک تباہی پھیل گئی اور معاملہ ختم ہوگیا مگر لاہور کے سیاہ نصیب باشندوں نے حکومت سرگانہ کے تحت چونتیس سال کے طویل زمانے ویسی ہی تکلیفوں اور اذیتوں میں گھٹ گھٹ کر بسر کیے جیسی تکلیفیں اور اذیتیں ہیروشیما اور ناگا ساکی پر نازل ہوئیں اور چشم زدن میں ختم بھی ہوگئیں۔

چند مناظر

اس کے بعد رنجیت سنگھ کا دور آیا جو کم وبیش چالیس برس جاری رہا۔ اس کی عمومی حیثیت خواہ کیسی ہی ہو مگر وہ ہراس، بدنظمی، غارت گری اور قزاقی کا دور نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پھر بدامنی شروع ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دور کے بعض مناظر ان تاریخوں میں سے پیش کردوں جن میں سے ایک کتاب ۱۸۴۷ء میں چھپ چکی تھی اور اس وقت تک انگریز لاہور پر مسلط نہیں ہوئے تھے بلکہ یہاں دلیپ سنگھ حکمران تھا۔ دوسری کتاب ۱۸۷۵ء میں مرتب ہوئی تھی۔ اس کا مصنف مختلف واقعات کا عینی شاہد ہو یا نہ ہو مگر اس نے جو کچھ بھی لکھا یا تو مختلف تحریری دستاویزوں کی بنا پر لکھا یا ان لوگوں سے سن کر لکھا جو تمام حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ یہ کتابیں آج کل کمیاب ہیں اس وجہ سے ان کے اقتباسات پیش کرنا اس لحاظ سے بھی مناسب معلوم ہوا کہ ان کی مختلف معلومات خوانندگانِ کرام کے ملاحظہ سے گزر جائیں گی۔

واضح رہے کہ یہاں تمام واقعات کی چھان بین اور تحقیق مقصود نہیں، صرف مختلف واقعات کی وہ کیفیت پیش کردینا منظور ہے جو ان واقعات کے عینی شاہدوں یا قریب العہد وقائع نگاروں نے پیش کی۔

بعض اہم کردار

یہاں یہ بیان کردینا چاہیے کہ رنجیت سنگھ کے آخری عہد میں جموں کے ڈوگرہ خاندان نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ یہ تین بھائی تھے۔ دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ۔ دھیان سنگھ بڑا مدبر شخص تھا۔ اسے دربار میں سب سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ گلاب سنگھ وہی شخص ہے جس کے ساتھ انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کا سودا کیا تھا۔ سچیت سنگھ مارا گیا تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ایک نہایت اہم شخصیت دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کی تھی۔ رنجیت سنگھ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور جلا پنڈت جس کا ذکر آگے آئے گا، رنجیت سنگھ ہی کے حکم سے ہیرا سنگھ کا اتالیق مقرر ہوا تھا۔

دربار میں ایک اہم فریق سندھاں والوں کا تھا جو رنجیت سنگھ کے ہم جد اور رشتہ دار تھے۔ اس خاندان کے افراد نے بھی ان واقعات میں نمایاں حصہ لیا جو پیش نظر مضمون میں پیش کیے جارہے ہیں۔

کھڑک سنگھ اور دھیان سنگھ

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بڑا بیٹا کھڑک سنگھ ہی وارثِ مسند تھا۔ رانیوں میں سے دو ——— راج دئی اور ہردئی دختران راجہ سنسار چند والیٔ کانگڑہ ——— ستی ہونے کو تیار ہوگئیں دھیان سنگھ بھی رنجیت سنگھ کے ساتھ ہی جل مرنے پر تُل گیا تھا اور اس نے حکم دے دیا تھا کہ میرا کل مال نقد و جنس جمع کیا جائے تاکہ سب کچھ خیرات میں دے دیا جائے۔ کھڑک سنگھ اور سب لوگ اسے روک رہے تھے۔ آخر ستی ہونے والی رانیوں نے حکم دے کر اسے روکا ——— گیتا جی کو رنجیت سنگھ کی چھاتی پر رکھا اور دھیان سنگھ سے کہا کہ اب مہاراجہ کے جسم کو ہاتھ لگا کر گیتا جی پر قسم کھاؤ کہ ملک کا انتظام خیرخواہی اور نمک حلالی سے کروگے۔ دھیان سنگھ قسم کھا چکا تو رانیوں نے کھڑک سنگھ سے کہا، تم بھی اسی طرح قسم کھاؤ کہ دھیان سنگھ کو

مختار و مدار المہام رکھو گے۔ اس کے بعد دونوں رانیاں گیارہ کنیزوں کے ساتھ ستی ہو گئیں۔ کھڑک سنگھ مہاراجہ بن گیا۔ دھیان سنگھ معمول کے مطابق وزارت و مختاری کے فرائض انجام دینے لگا۔ (تاریخ پنجاب کنہیا لال ۳۷۹، ۳۸۰)

کشمکش کی ابتدا

یوں معاملات بظاہر درست نظر آنے لگے مگر حقیقتاً حالت ایسی تھی جیسے آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ تھوڑی دیر کے لیے سکون پذیر ہو گیا ہو اور اس کے اندر کا لاوا زیادہ شدت سے ابلنے کے لیے جمع ہو رہا ہو۔

چند روز کے بعد اختلافات بروئے کار آنے لگے۔ دھیان سنگھ کو رنجیت سنگھ کے وقت میں زنانے کے اندر آنے کی اجازت بھی حاصل تھی۔ کھڑک سنگھ نے اسے روک دیا نیز وہ اپنے ایک آدمی چیت سنگھ کو مدار المہام بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ دھیان سنگھ نے اس پر کھڑک سنگھ کے بیٹے کنور نونہال سنگھ اور اس کی والدہ مہارانی چند کور کو ساتھ ملا لیا۔ نونہال سنگھ کو پشاور سے بلایا گیا اور سمائتھ کے بیان کے مطابق اسے یقین دلا دیا گیا کہ چیت سنگھ اور کھڑک سنگھ انگریزوں کی حفاظت اور ماتحتی قبول کر لینے پر آمادہ ہیں۔ نونہال سنگھ ویسے بھی یہی چاہتا تھا کہ جس طرح پہلے سے انتظام کا سلسلہ دھیان سنگھ کے ماتحت چلا آ رہا ہے بدستور جاری رہے اور کوئی نیا انتظام نہ کیا جائے۔ اس نے باپ (کھڑک سنگھ) کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر فیصلہ کر لیا گیا کہ کھڑک سنگھ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر معاملات کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے نکال لی جائے۔ دربار کے تمام ارکان اور بڑے بڑے فوجی افسر اس پر متفق ہو گئے۔ چنانچہ چیت سنگھ کو:

> "کنور نونہال سنگھ نے عین مکان مثمن برج (قلعہ) کے اندر قتل کر ڈالا۔ اس کے قتل ہونے سے مہاراجہ کھڑک سنگھ کمال ناراض ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہاراجہ قلعہ سے اٹھ کر اپنی قدیمی حویلی واقع لاہوری دروازہ میں آ گیا اور انتظام سلطنت سے بالکل دست بردار ہو گیا۔"
> (تاریخ پنجاب کنہیا لال ص ۳۸۲)

سمائتھ کا بیان

سمائتھ کا بیان زیادہ مفصل اور بعض جزئیات میں کنہیا لال سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سازش کی تکمیل کے بعد دھیان سنگھ، اس کے دونوں بھائی، سرداران سندھاں والے قلعے میں پہنچے۔ تڑکا تھا اور کھڑک سنگھ معمول کے مطابق عبادت میں مصروف ہو گیا تھا۔ دو سکھ بھائی ملے، انھیں بے تامل قتل کر دیا گیا۔ کھڑک سنگھ کے "گڈوئی" نے سرداروں کے ایک مجمع کو اندر آتے دیکھا تو دوڑ کر مہاراجہ کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔ دھیان سنگھ کے ہاتھ میں انگریزی رائفل تھی فوراً گڈوئی کو گولی مار دی اور وہ گر گیا۔ گلاب سنگھ اس پر سخت ناراض ہوا اور کہا کہ ایسے موقع پر صرف تلوار سے کام لینا چاہیے تاکہ کم سے کم شور ہو۔

محافظ سپاہیوں نے روکنا چاہا۔ دھیان سنگھ آگے بڑھا اور اس کے اشارے پر سپاہی ایک طرف ہو گئے۔ کھڑک سنگھ کو تو نقصان پہنچانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، چیت سنگھ کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ بھاگ کر ایک تاریک کمرے میں جا چھپا تھا۔ دیکھا تو ایک کونے میں کھڑا تھا دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ رکھی تھی۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا اور بچے کی طرح رو رو کر رحم کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ سپاہی اسے کھینچ کر دروازے میں لائے، دھیان سنگھ نے دیکھتے ہی تلوار دو مرتبہ اس کے جسم میں سے گزاری۔ وہ گر گیا تو سپاہیوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ کھڑک سنگھ کو قلعے ہی میں ایک مقام پر بند کر دیا گیا اور نونہال سنگھ اختیارات حکومت کا مالک بن گیا۔ (لاہور کے حکمران خاندان کی سرگزشت ص ۳۰)[1]

---

[1] THE HISTRY OF THE REIGNING FAMILIES OF LAHORE BY SMYTHE

نونہال سنگھ کی وفات رنجیت سنگھ کے بعد اس کے خاندان میں سے نونہال سنگھ کو بہترین فرد مانا جاتا تھا ـــ کنہیا لال نے لکھا ہے :-

"کنور نونہال سنگھ اگرچہ اس وقت کم عمر نوجوان تھا مگر عقل خداداد ہے۔" (۲۸۲)

سائتھ کہتا ہے کہ اس کامیابی سے نونہال سنگھ کا طرۂ افتخار بہت بلند ہوگیا۔ برہمن، جوتشی اور فقیر آآ کر بشارت دینے لگے کہ آج آپ کی سلطنت بڑی پائدار و استوار رہے گی۔ آپ کی فوج فتح مندیوں میں امتیازِ خصوصی حاصل کر لے گی۔ آپ دہلی کو بھی مسخر کریں گے اور آپ کی حکمرانی کا دامن بنارس تک پھیل جائے گا۔

چنانچہ مختلف برہمنوں نے بنارس کے آس پاس جاگیروں کے پروانے پیشگی حاصل کر لیے جن پر عمل اس وقت ہوتا جب بنارس نونہال سنگھ کے زیرِ نگیں آجاتا۔ (ص ۳۱)

نونہال سنگھ ایسے ہی خیالوں میں مست رہا۔ دھیان سنگھ کی نگرانی میں انتظامی مشینری بخوبی چلتی رہی۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دھیان سنگھ کے وسیع اختیارات کی بنا پر خود نونہال سنگھ کے دل میں بھی کدورت پیدا ہو چکی تھی۔ ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو کھڑک سنگھ نے وفات پائی۔ اس کی نعش جل چکی تو نونہال سنگھ واپس ہوا۔ گلاب سنگھ کا بیٹا ادھم سنگھ ساتھ تھا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے چل رہے تھے۔ قلعے سے سلامی کی توپیں سر ہو رہی تھیں جن کی آواز سے زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ قلعے کے دروازے میں پہنچے تو اچانک اوپر سے پتھر گرے۔ ادھم سنگھ تو ایک ہی لمحے میں ختم ہو گیا۔ نونہال سنگھ بے ہوش تھا، دھیان سنگھ نے خود اسے اٹھا کر پالکی میں لٹایا اور اندر لے چلا۔ لہنا سنگھ مجیٹھیہ ساتھ ساتھ چلا۔ دھیان سنگھ نے اسے روک دیا اور دروازے بند کرا دیے، یہاں تک کہ نونہال سنگھ کی والدہ کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ باہر جو سردار جمع تھے ان سے کہہ دیا گیا کہ نونہال سنگھ صرف زخمی ہوا ہے، اچھا ہو جائے گا۔ آخر دھیان سنگھ خود قلعے سے نکلا اور مہارانی چند کور والدۂ نونہال سنگھ سے مل کر بیٹے کے مرنے کی خبر دی۔ ساتھ ہی کہہ دیا کہ اس خبر کو فی الحال مخفی رکھیے کیونکہ تخت کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے۔

جانشینی کا مسئلہ اب جانشینی کے معاملے نے نازک صورت اختیار کر لی۔ ایک فریق کا جس میں خود دھیان بھی شامل تھا فیصلہ یہ تھا کہ کنور شیر سنگھ (ابن رنجیت سنگھ) کو گدی پر بٹھایا جائے، دوسرا فریق جس کے سرخیل سندھاں والے تھے اس کے لیے تیار نہ تھا۔ انھوں نے رانی چند کور والدۂ نونہال سنگھ کو مسند نشین کرنا چاہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح پوری سکھ سلطنت کی مختاری خود ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔

چند کور نے دھیان سنگھ کے سامنے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی :-

۱۔ نونہال سنگھ کی بیوی حاملہ ہے، مناسب ہے کہ بالفعل اس کے بچہ پیدا ہونے تک میں نیابۃً حکومت کا کاروبار چلاؤں۔

۲۔ اگر میرے بیٹے کے گھر بیٹا ہوا تو وہ مہاراجہ ہوگا اور تم بدستور مدار المہام رہو گے۔

۳۔ اگر بیٹا نہ ہوا تو میں تمہارے فرزند ہیرا سنگھ کو گود میں لے کر اپنا بیٹا بنا لوں گی اور وہی مہاراجہ ہوگا۔ بڑے مہاراجہ (رنجیت سنگھ) بھی اسے فرزند ہی کہتے تھے۔

یہ سب سخن طرازی تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ دھیان سنگھ چند کور کو مسند پر بٹھا دے۔ نہ نونہال سنگھ کی بیوی حاملہ تھی، نہ چند کور ہیرا سنگھ کو بیٹا بنانا چاہتی تھی اور نہ سکھ اس کے لیے تیار ہو سکتے تھے کہ اپنی حکومت ڈوگروں کے حوالے کر دیں۔ دھیان سنگھ بھی ان تمام حقیقتوں کو خوب

بچہ بیٹھا تھا۔ اس نے شیر سنگھ کے پاس خاص قاصد خفیہ خفیہ بھیج دیے۔ خود پورا منصوبہ تیار کر کے جموں چلا گیا۔ اپنے بھائی گلاب سنگھ اور دوسرے رفیقوں کو منصوبے کے مطابق کام کرنے کی تاکید کر گیا۔

منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ جب تک شیر سنگھ کی کامیابی ہر پہلو سے یقینی نہ ہو جائے اس وقت تک چند کور پر یہی ظاہر کیا جائے کہ مسند آپ کے لیے ہے اور آپ ہی اس کی حقدار ہیں۔ گلاب سنگھ نے یہ کام بڑے عمدہ طریقے پر انجام دیا۔

شیر سنگھ کی مسند نشینی

شیر سنگھ لاہور پہنچا۔ اس کے اور چند کور کے معاملے میں دھیان سنگھ اور اس کے بھائیوں نے کس طرح اپنے آپ کو ہر الزام سے بچائے رکھا اور کیونکر شیر سنگھ کو سلطنت ملی؟ یہ امور پیش نظر موضوع سے خارج ہیں البتہ کنہیا لال کا یہ بیان یہاں ضرور درج کر دینا چاہیے کہ:-

"شیر سنگھ ... بہ ارادہ مسند نشینی لاہور آیا اور بشام کے بعد دہلی دروازے سے قلعہ تک دو طرفہ بازار لوٹ لیا۔ چھتہ بازار میں جہاں جوتیاں بکتی ہیں آگ لگا دی اور آٹھ روز تک سکھوں نے منشیوں کو لوٹا، اس عداوت سے کہ یہ منشی دفتر میں نوکر ہو کر ہماری تنخواہوں میں سے کاٹ کرتے ہیں۔ اچھے اچھے عزت دار منشی ملازمان دفتر ملکی و فوجی لُٹ گئے بلکہ مولوی ملا اس جرم میں غارت ہوئے کہ یہ لوگ منشیوں کو پڑھاتے ہیں۔ ہلکان فوج کوچہ کوچہ منشیوں اور مولویوں کے گھروں کو تلاش کر کے لوٹتے رہے۔" (تاریخ لاہور ص ۳۵)

یہاں صرف چند خونچکاں مناظر پیش کرنے منظور ہیں اور پورے حالات تاریخی ترتیب سے لکھنے منظور نہیں۔

سندھاں والے اور چند کور

شیر سنگھ نے مسند نشین ہوتے ہی سندھاں والے سرداروں سے اچھا سلوک نہ کیا کیونکہ وہ چند کور کے طرفدار تھے۔ وہ ستلج پار انگریزی علاقے میں چلے گئے۔ بڑے بڑے سرداروں نے کہہ سن کر صفائی کرائی اور انھیں واپسی کی اجازت مل گئی۔

چند کور کے لیے جاگیر مقرر ہو گئی لیکن شیر سنگھ اس کی طرف سے مطمئن نہ تھا چنانچہ اس نے چار کنیزوں کو جاگیر کا لالچ دے کر چند کور کے قتل پر آمادہ کیا اور خود وزیر آباد چلا گیا۔ کنیزوں نے چند کور کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالا۔ (حاشیہ ص ۶۹) کنہیا لال کا بیان ہے کہ شیر سنگھ کے کہنے سے چند کور کی کنیزوں نے گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ (۲۹۰) کنیزوں میں سے دو کے ہاتھ کاٹے گئے تیسری ایک فقیر کی سفارش پر چھوڑ دی گئی۔ چوتھی نے فدیے میں بہت بڑی رقم دے کر رہائی پائی۔ (حاشیہ ۶۹)

شیر سنگھ اور پرتاب سنگھ کا قتل

اب سندھانوالے سرداروں نے اپنے سازباز کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ دھیان سنگھ اور شیر سنگھ دونوں کو ختم کر کے خود تمام امور سنبھال لیں۔ انھوں نے ایک طرف مختلف تدبیروں سے کام لے کر شیر سنگھ سے دھیان سنگھ کے محضر قتل پر دستخط لے لیے اور دوسری طرف دھیان سنگھ کو سب کچھ بتا کر اس سے ایک پروانے پر دستخط لے لیے کہ شیر سنگھ کا قتل ضروری ہے۔ یہ طے کر لیا تھا کہ شیر سنگھ کے بعد رنجیت سنگھ کے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا جائے گا۔

۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو شیر سنگھ باغ شاہ بلاول میں ٹھہرا ہوا تھا، اجیت سنگھ سندھاں والا ایک عمدہ ولایتی فرابین لایا اور عرض

کی کہیں نے یہ چودہ سو روپے میں خریدی ہے اور اس لائق ہے کہ مہاراجہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ شیر سنگھ نے قرابین کے لیے ہاتھ بڑھایا اجیت سنگھ نے لبلبی دبا دی۔ گولیاں شیر سنگھ کے جسم کو چھید گئیں۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، صرف یہ الفاظ زبان سے نکلے "ایہہ کی دغا؟" (یہ کیا فریب کیا)

اس کا بیٹا پرتاب سنگھ غالباً تیرہ سال کا تھا۔ وہ باغ میں اپنے آپ کو غلے، چاندی اور سونے کے ساتھ تلوا رہا تھا۔ خیرات لینے والے لوگ جمع تھے، لہنا سنگھ سندھاں والا اچانک وہاں پہنچا۔ لوگ بھاگ گئے، پرتاب سنگھ نے لہنا سنگھ کی بہت منتیں کیں:

> پاؤں پر سر رکھا اور کہا کہ چچا! میں تمہارے گھوڑوں کی لید اٹھاؤں گا، تم مجھ کو قتل نہ کرو۔ (کنہیا لال ص ۴۹۳)

لہنا سنگھ سندھاں والا کے سامنے اپنے خاندان کا دائمی اقتدار تھا۔ وہ ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر چکے تھے، اب ایک سیزدہ سالہ بچے کی رکاوٹ کو کیونکر علیٰ حال چھوڑ سکتے تھے بلکہ وہ رنجیت سنگھ کے ہم جد تھے، رنجیت سنگھ کی نسل ختم ہوتی تو سلطنت وراثتاً سندھاں والے خاندان کو پہنچتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسند کا راستہ صاف ہو رہا ہے، کوئی جھاڑی یا کوئی کانٹا کیوں باقی رکھا جائے انھوں نے جو مقصد چند کوششوں کے ذریعے سے پورا کرنا چاہا تھا اور پورا نہیں ہوا تھا اس کی تکمیل کے اب بدرجہا بہتر مواقع سامنے آ گئے تھے۔ جب انسان کے ضمیر پر ذاتی اغراض کی تیرگی چھا جاتی ہے تو انسانیت کا ہر شریفانہ احساس موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ لہنا سنگھ سندھاں والا کی کیفیت بھی اس وقت یہی تھی۔ مظلوم پرتاب سنگھ کی التجائے رحم صدا بہ صحرا رہی اور لہنا سنگھ کی تلوار نے اسے بھی باپ سے چند لمحے بعد موت کی آغوش میں سلا دیا۔

دھیان سنگھ کا قتل

اس خوفناک خونریزی کے بعد انھوں نے شاہ بلاول کے قلعے کا رخ کیا۔ راستہ میں دھیان سنگھ سے ملاقات ہوئی جو شاہ بلاول کی طرف جا رہا تھا۔ اسے سب کچھ بتا دیا اور ساتھ لے کر قلعے میں پہنچے احتیاط یہ کی کہ اپنے آدمی تو خاصی بڑی تعداد میں ساتھ رکھے مگر دھیان سنگھ کے تقریباً سب آدمی قلعے سے باہر ہی چھوڑ دیے۔ اب دھیان سنگھ کا مال ان کے قبضے میں تھا۔ حکمران کو وہ راستے سے ہٹا چکے تھے۔ وزیر و مدار المہام کا وجود ختم ہو جاتا تو مسندِ حکومت یا اس کے اختیارات پر قبضے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بے باک ہو گئے۔

دھیان سنگھ کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا جس کی زبردست گرفت میں وہ اچانک آ گیا تھا۔ اس سلسلے میں کنہیا لال کا بیان یہ ہے کہ سندھاں والے سرداروں نے بہ آوازِ بلند دھیان سنگھ سے کہا کہ چلو اب دلیپ سنگھ کو تخت نشیں کریں:

> ناظمانِ ملک اور افسرانِ فوج کے نام پروانہ جاری کریں کہ اب سلطنت مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ہو گئی ہے، ہر کوئی اپنے آپ کو نوکر مہاراجہ دلیپ سنگھ کا تصور کرے۔ یہ بات سن کر راجا دھیان سنگھ نے کچھ جواب نہ دیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ دوسری ڈیوڑھی پر جا کر سردار لہنا سنگھ نے جو پیچھے آتا تھا حکم دے دیا کہ ڈوگرہ سپاہی کوئی آنے نہ پائے چنانچہ جس قدر تھوڑی بہت فوج اس وقت راجا دھیان سنگھ کے ساتھ تھی پیچھے رہ گئی اور راجا تنہا دشمنوں کے نرغے

میں آگیا۔ اس وقت سردار اجیت سنگھ نے پوچھا کہ شیر سنگھ نے رانی چند کور کو کس جگہ ہلاک کرایا تھا؛ اس وقت راجا کو ثابت ہوگیا کہ یہ اب میرے بھی قتل کی فکر میں ہیں۔ ..... اس وقت اجیت سنگھ نے قریب آکر دھیان سنگھ پر قرابین سر کی جس سے وہ لئیق وزیر فی الفور جاں بحق تسلیم ہوا۔ (کنہیا لال ص ۲۹۳، ۳۹۴)

دوسرا بیان

سائنٹہ کا بیان اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے یعنی قلعے کے بیرونی دروازے پر پہنچے تو پانچ چھ سو سپاہی ساتھ تھے۔ دوسرے دروازے پر پہنچے تو سندھانوالے سرداروں کے بعض اشاروں پر دھیان سنگھ کے سپاہی چپ چاپ روک دیے گئے۔ اس وقت دھیان سنگھ کے دل میں شبہات پیدا ہوئے مگر اجیت سنگھ نے مختلف معاملات کے متعلق باتیں چھیڑ کر وزیر کی توجہ دوسری طرف منعطف کرنے کی کوشش کی تاہم اسے اجیت سنگھ کی عام روش اور اندازِ گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خوف کے اظہار سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جب دھیان سنگھ نے دیکھا کہ اجیت سنگھ کے آدمی جا بجا پہرے پر کھڑے ہیں تو پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب ملا کہ وہ سب اپنے آدمی ہیں۔

> راجا انہی آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اجیت سنگھ نے انگلی کا اشارہ کیا اور پیچھے سے ایک آدمی نے راجا کے گولی ماری، پھر ایک اور گولی ماری گئی۔ آخر تلواروں سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ دراصل وہ پہلی ہی گولی کھا کر مر چکا تھا۔ جو چند ملازم راجا کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں سے ایک مسلمان نے مزاحمت کی، اسے بھی فی الفور ختم کر دیا گیا۔ اس کی اور اس کے آقا کی لاشیں کوڑے کرکٹ کے اس گڑھے میں ڈال دی گئیں جو قلعے کے اندر توپوں کے کارخانے سے متعلق تھا۔ (ص ۷۷)

اس وقت لہنا سنگھ اور اس کے ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ لہنا سنگھ اجیت سنگھ کی جلد بازی پر سخت خفا ہوا۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ دھیان سنگھ کے علاوہ ڈوگروں کے دوسرے سرداروں کو بھی قلعے میں بلا کر سب کو ایک دم ختم کیا جائے۔

سندھانوالوں کا خاتمہ

اب قلعے کے اندر سندھاں والوں کا عمل دخل تھا۔ باہر جو فوج تھی اسے کوئی بھی لیڈر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ ہیرا سنگھ نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو سکھ فوج کے سامنے ایک پرجوش تقریر کی جس کا مفاد یہ تھا کہ سندھانوالے سردار ہندوستان میں تھے تو انھوں نے انگریزوں سے ساز باز کر لیا تھا۔ اب وہ انگریزوں کو اس ملک پر مسلط کر دیں گے۔ تم سے ہتھیار لے لیے جائیں گے، کھیتی باڑی کے سوا تمھارے لیے کوئی مشغلہ نہ رہے گا۔ مہاراج کے خزانے بھرے پڑے ہیں، مجھے ان کی ضرورت نہیں، میں اپنے باپ اور چچاؤں کی دولت سے ایک لاکھ فوج ملازم رکھ سکتا ہوں۔ میں سرکاری روپیہ سب تم پر خرچ کروں گا۔ سب کی تنخواہیں ڈیوڑھی کر دی جائیں گی۔ پیادوں کو فی کس بارہ روپے اور سواروں کو فی کس تیس روپے ماہوار ملیں گے۔

غرض اس طرح چالیس ہزار آدمی ہیرا سنگھ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب سندھاں والا سرداروں کو عرصۂ حیات تنگ نظر آیا تو انھوں نے دھیان سنگھ کی لاش پالکی میں رکھی، اس پر عطر چھڑکا، کشمیری شال اڑھایا اور قلعے سے باہر بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ

یقین دلایا کہ دھیان سنگھ ایک اتفاقی حادثے میں مارا گیا، ہمارا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔

انتقام کے سیل کو کوئی تدبیر روک نہ سکی۔ کوئی ایک گھنٹے میں قلعہ فتح ہو گیا۔ اجیت سنگھ بچ نکلنے کی کوشش میں گرفتار ہوا اور اس کا سر کاٹ کر دھیان سنگھ کی لاش کے قدموں پر رکھ دیا گیا۔ لہنا سنگھ روپوش ہو گیا تھا مگر پکڑا گیا۔ اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ بھی مارا گیا۔ دلیپ سنگھ کے راج کا اعلان کر دیا گیا اور ہیرا سنگھ وزیر بن گیا۔ یہی زمانہ ہے جس میں ہیرا سنگھ کے اتالیق پنڈت جلّا کا طوطی بولتا رہا۔

اتنا اور عرض کر دوں کہ کنہیا لال کے بیان کے مطابق اجیت سنگھ اور لہنا سنگھ نیز ان کے ایک مسلمان مصاحب مہر گسیٹا کی لاشوں کے پاؤں میں رسی ڈال کر شہر کے بازاروں میں گھسیٹتے رہے اور خوب مُردہ ان کا خراب کیا۔ (ص ۴۹۵)

مختلف قتل

میں اس داستانِ خونریزی کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور صرف چند خاص مقتولوں کے اجمالی ذکر کے بعد آخر میں ہیرا سنگھ کے انجام پر اسے ختم کر دوں گا۔

۱۔ رنجیت سنگھ کے دو بیٹوں کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کو سیالکوٹ میں جاگیر دے دی گئی تھی۔ دلیپ سنگھ کو مسند پر بٹھایا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا حق دلیپ سنگھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ دونوں یکے بعد دیگرے مختلف مقامات پر مارے گئے۔

۲۔ سچیت سنگھ کو اس بات پر سخت غصہ آیا کہ بھتیجا (ہیرا سنگھ) وزیر بن گیا اور وہ خود چچا ہونے کے باوجود کچھ نہ بن سکا۔ وہ لاہور پہنچا اور میاں اسماعیل عرف میاں وڈا کی خانقاہ میں قدم جا کر بیٹھ گیا جہاں ایک سو درویش رہتے تھے۔ ان میں نابینا بھی شامل تھے۔ میاں شرف الدین وہاں کا سجادہ نشین تھا۔ گولہ باری میں مسجد اور خانقاہ ویران ہوئی۔ نابینا درویش شہید ہوئے۔ بینا اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ سچیت سنگھ بھی مارا گیا۔

۳۔ رانی جنداں کا بھائی جواہر سنگھ مختارِ کل بننا چاہتا تھا۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا۔ اپنے بھانجے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو گود میں بٹھا لیا کہ سکھ اس کا احترام کریں۔ سکھوں نے مہاراجہ کو الگ کیا اور جواہر سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۴۔ عطر سنگھ سندھاں والا پہلے ہندوستان بھاگ گیا تھا، پھر وہ دریائے ستلج کو عبور کر کے بھائی بیر سنگھ کے ڈیرے میں پہنچ گیا جسے سکھوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بیر سنگھ نے اعلان کیا کہ دلیپ سنگھ خورد سال ہے اس کا وزیر اور مدار المہام سکھ ہونا چاہیے ہیرا سنگھ سکھ نہیں، اسے معزول کر کے عطر سنگھ کو یہ منصب دیا جائے۔ اس کے ڈیرے پر بھی گولہ باری ہوئی اور دوسرے آدمیوں کے علاوہ بھائی بیر سنگھ بھی مارا گیا۔

۵۔ اکابر میں سے مصر بیلی رام اور بھائی گورمکھ سنگھ الگ مارے گئے تھے۔

ہیرا سنگھ اور پنڈت جلّا

میں نے یہ واقعات تاریخی ترتیب ملحوظ رکھے بغیر اجمالاً پیش کر دیے۔ اب صرف ہیرا سنگھ کا انجام بیان کروں گا۔

ہیرا سنگھ کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے کا اصل ذمہ دار پنڈت جلّا تھا جو عام روایات کے مطابق بڑا ہی بدزبان اور بے لگام تھا۔ حتیٰ کہ وہ مہارانی جنداں کے خلاف بھی ایسے ناشائستہ کلمات کہہ دیتا تھا جس سے تمام ارکانِ دربار کو سخت رنج ہوتا تھا۔

آخر مہارانی اور دوسرے لوگوں نے سکھوں کو خوب بھڑکایا۔ ہیرا سنگھ پنڈت جلّا کو الگ کر دیتا تو غالباً محفوظ رہتا مگر اسے پنڈت جلّا کی علیحدگی منظور نہ تھی لہٰذا حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے۔ آخر ہیرا سنگھ نے فیصلہ کیا کہ لاہور سے چپ چاپ نکل جائے۔

اس نے جواہرات، اشرفیاں، قیمتی پارچات اور دوسری بیش بہا چیزیں سمیٹیں۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۴ء کو رات کے وقت لاہور سے نکلا۔ پنڈت جلا، سوہن سنگھ (گلاب سنگھ کا بیٹا) اور دوسرے ڈوگرے ساتھ تھے۔ یہ لوگ دریائے راوی کے قریب پہنچے تو سکھوں کو اطلاع مل گئی۔ چنانچہ لاہور سے پانچ میل پر سکھوں نے اسے جا گھیرا۔ پھر پانچ میل کا راستہ یوں طے کیا کہ سکھ قریب پہنچ جاتے تو ہیرا سنگھ اشرفیوں کی ایک تھیلی زمین پر پھینک دیتا، سکھ لوٹ میں مشغول ہو جاتے۔ آخر ہیرا سنگھ اور ساتھی مارے گئے، ساری دولت لٹ گئی۔

> بعد قتل و تاراج کے سکھوں نے چاروں (ہیرا سنگھ، جلا، سوہن سنگھ اور راجو سنگھ) کے سر کاٹ لیے اور فتح کا نقارہ بجاتے ہوئے لاہور میں داخل ہوئے...... ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا کے سر کئی مہینے تک بازار کی موریوں اور نجاست گاہوں میں پڑے ہوئے لوگوں کو نظر آتے تھے......... غرض وہ حالت ان سروں کی ہوئی کہ خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے آخر لاہور کی رعایا کے چند آدمیوں نے مل کر رات کے وقت ان سروں کو ایک پوشیدہ جگہ میں دفن کر دیا اور جسم ان پہلوانوں کے اسی مقام پر جہاں وہ قتل ہوئے تھے کئی روز تک میدان میں پڑے رہے سکھوں کے ڈر کے مارے کوئی انھیں نہ تو دفن کرتا اور نہ جلاتا آخر طعمۂ زاغ و زغن ہو گئے۔ (کنہیا لال ص ۴۱۳-۴۱۴)

میں نے جن مقامات پر نقطے لگائے ہیں وہاں سے بعض عبارتیں نظر بہ تلخیص حذف کر دیں۔ بعض عبارتیں اس لیے حذف کرنی پڑیں کہ میرے نزدیک مُردوں سے بدسلوکی کے نہایت مکروہ مناظر کا لفظی اعادہ بھی مناسب نہ تھا۔ یہ مقالہ ہے، تاریخ کے صفحات پر البتہ وہ سب کچھ درج کرنا پڑے گا جو پیش آیا اور جسے کنہیا لال نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

سیاسی تحریکیں

شورش کاشمیری

عنوانِ بالا کا احاطہ کرنا بظاہر آسان ہے لیکن عملاً دشوار بھی ہے اور محنت چاہتا ہے۔ لاہور کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسے راجہ رام چندر کے بیٹے لو نے بسایا تھا، یہ فیصلہ تو تاریخ دان ہی کر سکتے ہیں کہ تحقیق کیا کہتی ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور اس برِصغیر کا اتنا ہی پرانا شہر ہے جتنا کہ خود تاریخ یا ہندوستان کے تاریخی ماخذ اور ان کی بوقلمونی۔ اگر ہم سیاسیات کے لفظ کو وسیع کر لیں تو زمانہ کے الٹ پھیر اور اتار چڑھاؤ کے زیرِ نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لاہور کا سیاسی کردار وقت کے مفہوم سے ہمیشہ ہی آشنا رہا ہے اور شاید ہی کوئی ممتاز و منفرد دور ایسا گزرا ہوگا جس میں لاہور نے حصّہ نہ لیا ہو یا لاہور کو سیاسی اہمیت نہ دی گئی ہو۔ لاہور کے شرف کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً دورِ افتادہ ماضی میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ نے لاہور ہی کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تھا۔ وہ غالباً دوسرے روحانی پیشوا تھے جنھوں نے اپنے وجودِ گرامی سے لاہور کو اسلام کی حقیقی روح سے متعارف کیا۔ ان کی وفات ۱۰۷۲ء میں ہوئی۔ آج تک ان کا مزار بندگانِ خدا کا مرجعِ ارادت ہے، ان سے پہلے لاہور میں جس روحانی پیشوا کا سراغ ملتا ہے، وہ شیخ اسمٰعیل لاہوری ہیں۔ آپ بخاری سید تھے اور ۱۰۰۵ء میں لاہور وارد ہوئے۔ داتا گنج بخشؒ کے بعد جس بزرگ نے پنجاب میں خلعتِ کمال حاصل کیا وہ سید احمد المعروف سلطان سخی سرور ہیں۔ آپ نے لاہور میں مولوی محمد اسحٰق سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی، وزیر آباد کے قریب موضع سوہدرا میں دفن ہیں مگر لاہور میں آج تک ان کی یاد سے منسوب قدموں کا میلہ ہوتا ہے جس میں ڈھول بجا کر فقیروں کی ٹولیاں ناچتی اور بچوں کو لوریاں دیتی ہیں۔ شاید توختہ ترمذی، شاہ صدر۔ دیوان زنجانی، پیر عزیز الدین مکیؒ اور حضرت سید مٹھہ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ لاہور کو مشرف بہ اسلام کرنے میں ان کے روحانی کمالات کا حصّہ ہے۔ اس ضمن میں کوئی سی تاریخ بھی ان کے تذکرے سے خالی نہیں گو لاہور کسی زمانے میں بھی بوجوہ ہندوستان کا دارالحکومت نہ بن سکا اور اب پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اس شرف سے محروم رہا مگر ہمیشہ پنجاب کی راجدھانی رہا۔ اب صوبوں کے ادغام کے بعد مغربی پاکستان کا دارالحکومت ہے، غرض یہ امتیاز اس کو شروع سے حاصل ہے کہ وہ نہ صرف برِصغیر کے شمال مغربی حصّے کا سب سے بڑا شہر رہا ہے بلکہ اس کی اہمیت سیاسی اور عسکری لحاظ سے دہلی کے بعد ہمیشہ مقدم تسلیم کی گئی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتحیابیوں کے بعد اس کے جانشینوں کی بدولت لاہور علم و فن کا گہوارہ بن گیا۔ ابراہیم غزنوی کے زمانۂ حکومت میں (۱۰۵۹-۹۸ء) بہ الفاظ عوفی لاہور گویا علم و فضل کا مرکز تھا، لوگ اِدھر اُدھر کے ملکوں سے کھنچ کر یہاں جمع ہو گئے تھے ——

اس برِصغیر میں نقشبندی سلسلے کے داعیٔ اوّل خواجہ باقی باللہ مشائخ بخارا سے فیض پا کر لوٹے تو سب سے پہلے لاہور ہی میں قیام فرمایا، یہاں سال بھر رہے پھر حضرت مجدد الف ثانی کو لاہور کے لیے نامزد کیا اور خود دہلی چلے گئے۔ آپ کے وصال تک حضرت مجدد الف ثانی نے لاہور ہی میں ارشاد و ہدایت کا فیض جاری رکھا جس سے بے شمار مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچا۔ اگر اس عہد کے اسلامی فکر کو مسلمانوں کے موجودہ سیاسی وجود کا جزو لاینفک قرار دیا جا سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس عمارت کی نیو اٹھانے میں ان بزرگانِ اسلاف کے ارشاد و ہدایت کا خاصا دخل ہے۔

لاہور کے اس شرف کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی اور جامع مسجد دہلی کے معمار بھی لاہور ہی کے باشندے تھے۔ اس مہندس خاندان کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں بوضاحت روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا یہ انجینئر خاندان تاریخ کے بے بصر اوراق میں مدفون رہا۔

عبدالرحیم خانخاناں کی پیدائش کا شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہے اور فخر و ناز کا یہ تمغا لاہور کی قبائے فضیلت سے کوئی شخص بھی اتار نہیں سکتا۔ خانخاناں ہی نے بیس سال کی عمر میں اکبر کے ایما پر گجرات کی مہمیں سر کیں۔ سندھ کی فتوحات میں نام پیدا کیا اور دکن کے مورچوں پر کامیاب رہا۔ اگر اس کے اس کمال کو حذف کر دیا جائے تو بھی وہ ادب و شعر میں اتنا نام پیدا کر گیا ہے کہ صرف ہندی شاعری ہی میں صفِ اوّل کا شاعر شمار ہوتا ہے ـــــ ہندی کے ایک شاعر گنگا کو قصیدہ لکھنے پر اس نے ۳۶ لاکھ روپے انعام دیے تھے۔ نظیری نے ایک مرتبہ کہا کہ اس نے کبھی یکمشت ایک لاکھ روپیہ نہیں دیکھا ہے، خانخاناں نے فوراً ایک لاکھ روپیہ منگوایا اور اس کی نذر کر دیا۔

ـــــ مغلوں کے عہد فرمانروائی کی واحد دانشور ملکہ نورجہاں اسی لاہور میں آسودۂ خاک ہے۔ ہندوستان کا پہلا مسلمان فرمانروا قطب الدین ایبک اسی لاہور میں ابدی نیند سو رہا ہے ـــــ جہانگیر یہیں پڑا ہے۔ ممتاز محل کا والد آصف خاں بھی یہیں محوِ خواب ہے۔ انارکلی کے واقعہ میں اگر کوئی سچائی ہے تو اس شہرت کی نازنین بھی لاہور ہی کی مٹی میں استراحت کر رہی ہے ـــــ حتیٰ کہ مشرق کی نشاۃ ثانیہ کے محرک اور پاکستان کے نقاش علامہ اقبال علیہ الرحمۃ بھی اسی خاک کے مدفن میں سوئے ہوئے ہیں ـــــ سکھوں کے پہلے اور آخری تاجدار مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی بھی لاہور ہی میں ہے۔

ـــــ اب اس پس منظر میں ہم اگر لاہور کی سیاسی نشوونما کا جائزہ لیں تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد علم و عمل اور قلم و زبان کے سانچوں میں سیاسیات کا جو خمیر پختہ ہو رہا تھا اس کے پیشِ نظر فخر و ناز کا یہ سرمایہ بھی لاہور ہی کے ہاتھ آتا ہے کہ رواجی اور روایتی شاعری کا جو بت ٹوٹا گیا اور نظم و نثر کی جو نئی راہیں سامنے آئیں اس مہم کے دونوں سالاروں الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے لاہور ہی میں اپنی مشعلیں روشن کی تھیں ـــــ محمد حسین آزاد تو لاہور ہی میں دفن ہیں ـــــ

مجرد سیاست کا تصور جہاں تک تحریکوں اور تنظیموں کے قومی و اجتماعی ہونے کا تعلق ہے پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے نتائج سے پیدا ہوا اور پھر مختلف شاخوں میں بٹ کر پروان چڑھتا رہا لیکن لاہور اس سے بھی پہلے سیاسی طور پر میدان میں آ چکا تھا۔ کئی نوجوانوں نے بنگال کی تقلید میں یہاں بھی ٹیررسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی، گو یہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے مگر جہاں تک واقعات کا تعلق ہے یہ عجیب و غریب بات ہے کہ کلکتہ کے بعد ٹیررسٹ تحریک کے سب سے زیادہ مظاہر لاہور ہی میں ہوتے رہے اور لاہور

ہی کے کالجوں سے اس تحریک کے لیے انقلابیوں کو کھیپ ملتی رہی ہے، باغی لٹریچر بھی سب سے پہلے لاہور ہی میں چھپا اور تقسیم ہوا پنڈی داس، لالہ مگھل کشور اور لال چند اس مہم میں پیش پیش تھے، انھیں طویل سزائیں دی گئیں۔ یہ لوگ اعلانِ آزادی کے اواخر تک جیل ہی میں رہے — جب ملک میں اجتماعی تحریک کی داغ بیل رکھی گئی تو انھوں نے خود اور اپنی اولاد سمیت اس میں حصہ لیا۔

— بانگِ درا میں علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ نے سوامی رام تیرتھ کو بڑے زوردار الفاظ میں خراج ادا کیا، ان کی تحریک شخصیت کے پس منظر میں قومی بیداری ہی کا سیاسی جذبہ کارفرما تھا۔

۱۹۰۷ء میں سردار اجیت سنگھ نے بھارت ماتا کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی اور اسی نام کا ایک پرچہ نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور، سیاسی اعتبار سے پکڑ دھکڑ کا ایک شہر بن گیا۔ لالہ لاجپت رائے، سردار اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرشاد وغیرہ کو کے ریگولیشن کی بنا پر جلاوطن کر دیا گیا، لالہ لاجپت رائے تو کچھ عرصہ بعد واپس آ گئے اور کلکتہ کانگرس (۱۹۲۰ء) کے صدر بنے امبا پرشاد جلاوطنی ہی میں انتقال کر گئے اور ایران میں غالباً دفن کیے گئے — سردار اجیت سنگھ وغیرہ کو کانگرس کے برسرِ اقتدار آ سالہا سال کی جلاوطنی کے بعد واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ ریشمی رومال کی تحریک کے بانی مبانی اگرچہ علمائے دیوبند تھے اور سے زیادہ حضرت شیخ الہندؒ کا دماغ اس میں کارفرما تھا مگر جب نقشہ تیار ہو چکا تو یہ چیز بعض لوگوں کے لیے شاید نئی ہو کہ مجاہدین کا میں جن پندرہ انگریزی تعلیم یافتہ طلباء نے حصہ لیا وہ لاہور ہی کے طالب علم تھے۔ انھوں نے فروری ۱۹۱۵ء کو اپنی درسگاہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور یاغستانی علاقے میں انقلاب برپا کرنے کی غرض سے چلے گئے — اس لحاظ سے یہ شرف بھی لاہور ہی سر رہا کہ طلباء کی پہلی تحریک اور اس کی قربانی اسی شہر کے طلباء کے حصہ میں آئی۔ کاماگاٹامارو ۲۹ ستمبر ۱۹۱۴ء کو بج بج کے کلکتہ گھاٹ پر پہنچا تو فوج اور پولیس نے نرغہ میں لے لیا کیونکہ مخبروں کی معرفت غدر پارٹی کا پورا حال معلوم ہو چکا تھا، تمام ملک میں گر کا تانتا بندھ گیا۔ کئی شہروں میں سازش کے مقدمات قائم کیے گئے، پھانسی پانے والے زیادہ تر مسلمان نوجوان تھے۔ لاہور میں بیک آٹھ ہزار کے قریب گرفتاریاں ہوئیں اور مقدمات چلائے گئے، چھ نوجوانوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے صلہ میں ملک کو رولٹ ایکٹ ملا یا امرتسر کا جلیانوالہ باغ، نہر کی کا نیا پانچ کر دیا گیا اس پر ملک بھر باقاعدہ سیاسی تحریکوں کا لاوا پھوٹا۔ اس سے پہلے سیاسی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں مگر ان پر معتدل رہنماؤں کا قبضہ تھا — اب ملک لیڈرشپ گاندھی جی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور دوسرے نوجوان رہنماؤں کے ہاتھ میں آ گئی۔ پہلی لیڈرشپ کو گوشہ نشین ہونا پڑا القصہ یہ وہ زمانہ تھا جب تنظیموں کی کوکھ سے تحریکوں نے جنم لیا۔ ۱۹۱۹ء سے پیشتر کانگریس کا سالانہ سیشن، پنڈت مدن موہن مالو زیرِ صدارت لاہور میں ہو چکا تھا لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد لاہور سیاسی تحریکوں کا بعض اعتبارات سے سرچشمہ، ماخذ، رہنما اور داعی گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جن کی والدہ لاہور ہی کی باشندہ تھیں ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے صدر بنے۔ اسی لاہور نے ان کی گل ہند کا نام ہوا — اور یہ شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہے کہ آل انڈیا کانگرس نے پہلی دفعہ درجۂ مستعمرات کا موقف اختیار کر کے کا آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اس کو اپنا نصب العین بنایا — جس سے کانگرس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ نہرو رپورٹ کو لاہور ہی میں غرقِ راوی کیا گیا — خان عبدالغفار خان نے بھی پہلی دفعہ اپنی سرخپوش جماعت کے ساتھ لاہور کانگرس سیشن میں شرکت کی جس روز یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کامل آزادی کا نصب العین اختیار کیا گیا انھوں نے اپنے سرخپوش دستوں سمیت نئے سال کے سر آ

پھر رقص کیا اس رقص میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے سوا سبھی شریک تھے، مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے رقص کے فوراً بعد معرکہ کی ایک نظم کہی جو اگلے روز بچے بچے کی زبان پر تھی۔

ـــــ مسلم لیگ نے لاہور میں اپنا پہلا اجلاس ۱۹۲۴ء میں کیا، لطف کی بات یہ ہے کہ اس اجلاس کے صدر بھی قائد اعظم ہی تھے اور ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا جو تاریخی اجلاس لاہور میں ہوا اس کی صدارت بھی قائد اعظم نے فرمائی۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے "قرار داد پاکستان" پاس کی جو مسلمانوں کا ملی موقف قرار پایا ـــــ گویا کانگرس کو کامل آزادی اور مسلم لیگ کو پاکستان کا نصب العین دینے والا لاہور تھا ـــــ اس لاہور نے جواہر لال کو ہندوستان کا فرزندِ جلیل اور محمد علی جناح کو قائد اعظم بنا دیا اور لاہور اس پر بجا طور پہ فخر کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے فکر و نظر کی ساری عمر اسی لاہور میں بسر ہوئی۔ یہیں انھوں نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا قصرِ رفیع تعمیر کیا۔ اُردو صحافت کا بول بالا بھی لاہور ہی سے ہوا ـــــ اگر جنگِ عظیم کے بعد کی اُردو صحافت، سیاست ہی کا حصہ ہے تو بلاشبہ لاہور کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ ایک وقت میں جتنے اُردو اخبار لاہور سے شائع ہوتے رہے ہیں اتنے دہلی اور لکھنؤ سے بھی شائع نہیں ہوئے۔ اس زمانے کے صحافی براہ راست سیاسی رہنما بھی تھے اور سیاسی تحریکوں کے محرک بھی "الہلال" کلکتہ اور "ہمدرد" دہلی کے کردار سے قطع نظر واقعی امر یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار" نے نصف صدی تک لاہور کی وساطت سے پورے اسلامی ہندوستان کی ذہنی آبیاری کی ہے ـــــ مولانا ظفر علی خان نے سیاسی لاہور کے تحریکی ذہن کو پیدا کرنے میں ایک تنہا انجمن کی طرح حصہ لیا ہے۔ ان کی بدولت لاہور کو نہ صرف سیاسی تحریکوں ہی سے آشنائی ہوئی ہے بلکہ انھوں نے اپنے دبستان میں سیاسی رہنماؤں، قومی کارکنوں اور مدیرانِ اخبار کی ایک نامور کھیپ کو پروان چڑھایا ہے ـــــ کانگرس سے وابستہ طلباء کی تحاریک کا سنگِ بنیاد بھی اوّل بار لاہور ہی میں رکھا گیا اور مسلم لیگ کی ہم نوا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی لاہور ہی میں زندگی کا پہلا سانس لیا، طلباء کی ان ہر دو انجمنوں نے جتنے نمائندہ حروف نوجوان پیدا کیے ان کی بڑی تعداد لاہور ہی کے کالجوں کی تربیت یافتہ اور لاہور کے سیاسی آغوش کی پروردہ ہے۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن ملک کے سیاسی مستقبل کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان وارد ہوا تو مختلف شہروں سے پھرتا پھرا لاہور پہنچا۔ تمام ملک کی طرح یہاں بھی مقاطعہ بازار گرم تھا ـــــ لاجپت رائے، ظفر علی خاں، عطاء اللہ شاہ، افضل حق، ستیہ پال وغیرہ کی قیادت میں لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم اسٹیشن پر مظاہرہ کرنے کے لیے موجود تھا ـــــ پولیس نے لنڈا بازار کے نکڑ پر خاردار جنگلے لگا دیے تھے ـــــ قصہ کوتاہ پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہو گیا۔ مسٹر سکاٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے عوام پر ڈنڈے برسوائے یہ ڈنڈے لالہ لاجپت رائے کے سینے پر ضربات چھوڑ گئے، اسی شب ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے لالہ جی نے نوجوانوں کو للکارا کہ ان کے بڑھاپے کی بے عزتی کا بدلہ لینا اب ان کا فرض ہے، نتیجتہً نوجوان بھارت سبھا کے نوجوان جو لاہور نیشنل کالج کے فارغ التحصیل طلباء میں سے تھے، بھڑک اُٹھے، صوبہ بھر میں ایکا ایکی دہشت پسندی کا دور دورہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو تین بجے سہ پہر کے وقت دہشت پسند نوجوانوں نے مسٹر سکاٹ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دھوکے میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سانڈرس کو گولیوں سے ہلاک کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں بہت سے نوجوانوں پر مقدمہ چلا، آج کل جہاں ڈائرکٹر اینڈ سٹریز مغربی پاکستان کا دفتر ہے وہاں بڑے دنوں تک مقدمہ چلتا رہا۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو ـــــ ان تین نوجوانوں کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

بی۔ کے وقت کو عمر قید اور کئی باقی نوجوانوں کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں۔ جسٹس آغا حیدر سماعت کنندہ ٹریبونل کے رکن تھے ــــ انھوں نے سرکاری گواہوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ پھر بھگت سنگھ کی اس اپیل پر کہ وہ اس تماشے میں شریک نہ ہوں، ٹریبونل سے الگ ہو گئے ــــ اس مقدمہ سازش کے تمام ملزموں نے قیدیوں کی حالت زبوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لاہور بورسٹل جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ چونسٹھ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ایک نوجوان جتندر ناتھ داس گھل گھل کر جان ہار گیا۔ اس کے خونِ ناحق کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیل خانوں کا نظام یکسر بدلنا پڑا اور "اے" اور "بی" کلاس کی بنیاد رکھی گئی۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو لاہور سنٹرل جیل میں ضابطے کے خلاف شام کے وقت پھانسی پر لٹکا دیا گیا ــــ پھر ان کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ستلج کے کنارے جلایا گیا ــــ اور راکھ موجوں میں بہا دی گئی۔ اس واقعہ نے تمام ہندوستان کے نوجوانوں کو لرزا دیا اور وہ غصے سے بیتاب ہو کر دہشت پسندی پر اتر آتے، اواخر ۱۹۳۳ء تک بم پھینکنے اور گولی چلانے کے بہت سے واقعات ہوئے، دوسرا مقدمہ سازش بھی لاہور ہی میں چلا۔ تقریباً سبھی ملزموں کو عمر قید کی سزا ہوئی لیکن ۱۹۳۷ء کے بعد ملک میں ٹیررسٹ موومنٹ ختم کر دی گئی۔ ان انقلابی نوجوانوں کے لاہور سنٹرل جیل میں ایک "ٹیررسٹ وارڈ" بنایا گیا، جہاں انھوں نے عمریں گزار دیں ــــ راقم الحروف کو بھی اسی وارڈ میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے تقریباً تین سال رہنے کا موقع ملا ہے اب یہاں وحدت ہسپتال کی اضافی شاخیں بنائی جا رہی ہیں ــــ بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں بہت سے نوجوان مفرور ہو گئے تھے۔ انہی میں ایک چندر شیکھر آزاد تھے، دوسرے بھگوتی چرن۔ چندر شیکھر لاہور سے غائب ہو کر الٰہ آباد چلا گیا اور وہاں لڑتا بھڑتا گولیوں سے مارا گیا۔ بھگوتی چرن راوی کے کنارے واقع ذخیرے میں بم بناتے ہوئے اس بری طرح زخمی ہوا کہ اس کا ایک بازو اور جسم کا ایک حصہ بالکل ہی اڑ گیا ــــ اس نے ساتھیوں سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ اور خود رینگ رینگ کر راوی کی سرکش موجوں میں ڈوب گیا تاکہ پولیس اس کے جسم کو چھو بھی نہ سکے ــــ اس کے الفاظ تھے میں اپنا جسم دشمن کے حوالہ کرنا نہیں چاہتا۔ انگریزوں کی زنجیروں سے راوی کی لہریں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔

ادھر اس انقلابی لاہور کے پہلو بہ پہلو سرکار پرست لاہور بھی چمکتا اور دمکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ خطاب یافتگانِ برطانیہ کی ایک پوری نسل یہاں آباد تھی۔ ہندوؤں میں تو خطاب یافتگانِ پیشین کا یہ گروہ شکست کھا چکا تھا اور اس کے ارکان صرف مجلسی زندگی کے نورتن ہو کر رہ گئے تھے مگر مسلمانوں میں ان کا رسوخ باقی تھا بلکہ آخر وقت تک رہا۔ مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کیا تو "جناح لیگ" کے مقابلہ میں سر محمد شفیع نے لاہور میں شفیع لیگ کی بنیاد رکھی اور کمیشن سے تعاون کا اعلان کیا۔ یونینسٹ پارٹی کا سنگِ بنیاد بھی لاہور ہی میں رکھا گیا جس کے پیشوائے اوّل سر میاں فضل حسین تھے۔ ان کی رحلت پر یہ تاج سردار سکندر حیات نے پہنا۔ پھر ملک خضر حیات نے دستار باندھی مگر ان کا طرّہ چھوٹو رام کے ہاتھ رہا، آخر مسلم لیگ نے پاکستان کے موقف پر الیکشن جیت کر پاپ کی اس ناؤ کو ڈبو دیا ــــ

لاہور میں یہ بھی ہوتا رہا کہ بعض خاص لوگ جو وفاداری بشرطِ استواری کے تحت جی رہے تھے نہ صرف احتجاجی جلوسوں اور قومی جلسوں کو اُجرت پر خراب کرتے رہے بلکہ ان میں بعض مکروہ چہرے ایسے بھی تھے جن کا کام اسکولوں اور کالجوں کی ابتدائی جماعتوں کے سیاسی طلباء کو اغوا کرنا اور ان سے گرہ لگانا تھا ــــ چونکہ اس تذکرے میں چہروں اور ساغروں کی نقاب کشائی کر کے قارئین کے لطفِ مطالعہ کو

بدمزہ کرنا مقصود نہیں اس لیے ان سے صرف نظر ہی بہتر ہے اور نہ ابھی خاص قسم کے دماغوں کی فضا اس تلخ نوائی کو قبول کرنے کی متحمل ہے۔

۱۹۲۲ء میں چورا چوری کے واقعہ کی آڑ لے کر گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کو ختم کر ڈالا جس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں میں فسادات چھڑ گئے۔ لاہور نے بھی اس میں حصہ لیا۔ دونوں طرف کے اخبارات معرکہ آرا ہو گئے ـــ ظاہر ہے کہ فسادات دیرپا نہیں ہوتے۔ دو چار دن ہنگامہ رہا پھر امن ہو گیا لیکن اختلافات پھیلتے ہی گئے حتیٰ کہ مسلمانوں ... ان کرنا پڑا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں جن کا سراپا ہمسایہ قوم سے مختلف ہے۔

ـــ ان فسادات کا بیج تو لاہور سے نہیں پھوٹا تھا کیونکہ شدھی کے کرتا دھرتا سوامی شردھانند دہلی میں تھے اور فساد کی اس فصل کا پہلا خوشہ کوہاٹ میں پھوٹا تھا مگر لاہور میں ہندوؤں کی جاندار صحافت نے جلتی پر تیل کا کام کیا ـــ پرتاپ کے مہاشہ کرشن اور ملاپ کے مہاشہ خوشحال چند آریہ سماج کی دونوں شاخوں کے اپنی اپنی جگہ پردھان منتری تھے بھائی پرمانند۔ پہلے نیشنلسٹ ہندو تھے پھر عمر قید کی سزا پاتے ہی تائب ہو گئے اور باقی زندگی مہاسبھا کے لیے وقف کر دی۔ ان کا سماجیوں پر خاصا اثر تھا غرض ان کی بدولت جو نہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف لاہور کے ایک پبلشر مہاشہ راجپال نے ـــ رنگیلا رسول (خاکم بدہن) نامی کتاب شائع کی یہ مصنف ایک پروفیسر چھوپتی تھا۔ اس ناقابلِ برداشت کتاب کا چھپنا تھا کہ مسلمانوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حکومت نے پبلشر پر مقدمہ چلایا مگر عدالت نے ملزم کو بری کر دیا۔ آخر بازار سرپانوالہ کے ایک نوجوان علم دین نے راجپال کو سرِ عام قتل کر ڈالا۔ علم دین میانوالی جیل میں پھانسی پا گیا اور وہیں اس کو دفن کر دیا گیا ـــ لاہور کے مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ لاش لاہور آنی چاہیے، حکومت بضد ہو گئی، نوجوانوں نے کرِ ہمت کس لی، آخر جب سرکار نے محسوس کیا کہ ناراضی پھیلے گی تو مسلمان سٹی مجسٹریٹ کی معرفت لاش کو لاہور لایا گیا۔ ـــ اتنا عظیم الشان جنازہ تھا کہ فی زمانہ شاذ ہی کسی عاشقِ رسول کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

علم دین کی لاش لاہور لانے کی تحریک کے رہنما ابتداً عبدالمجید قرشی، منور شیر دل، بیرسٹر غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر وغیرہ تھے بعد میں اس کی عنان منقسم ہو کر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ کے سرخیل مولانا ظفر علی خاں اور چودھری افضل حق تھے دوسرے کے سرغنہ سر میاں محمد شفیع اور ان کے متبعین۔ علامہ اقبال نوجوانوں کی پشت پناہی کرتے اور ان کا جی بڑھاتے تھے ـــ

مولانا ظفر علی خاں نے ان حالات سے کچھ فاصلہ پر برطانوی سرکار کے مظالم کی مذمت میں ترنگے کی ایک نظم کہی تھی جس میں ایک مصرع تھا ـــ ؎

خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

اُدھر ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کر کے بزرگوں کی قبروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے۔ ان واقعات نے پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں کفر سازی کا بازار گرما دیا ـــ جو لوگ سرکار کے ساتھ تھے وہ بریلوی عقاید کے علماء کی تنظیم میں داخل ہو گئے، ابن سعود کے "کفر" سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ مولانا ظفر علی خان کی اس نظم کو بھی لپیٹ میں لے لیا گیا ـــ انگریز ابن سعود کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے تحریکِ خلافت سے مسلمانوں کے داخلی جذبے کا اندازہ کر لیا تھا، اس سارے شیرازے کو منتشر کرنے کے لیے ان کے گماشتے کفر سازوں کے پشت پناہ ہو گئے ـــ فتویٰ دیا گیا کہ مولانا ظفر علی خاں کافر ہیں اور جو "زمیندار" پڑھے گا اس کا نکاح ساقط ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ...... گھمسان کا رَن پڑا۔ مدت العمر انگریز دشمن رہنماؤں کے جلسوں میں خشت باری اور گلوخ اندازی ہوتی رہی، آخر یہ دور بھی نکل گیا ـــ کیونکہ رفتہ رفتہ لوگ

پر منکشف ہونے لگا کہ انگریز نہ صرف ابن سعود سے شریف مکہ کے عزل کا بالواسطہ انتقام لے رہا ہے بلکہ ان لوگوں کی عوامی طاقت بھی کم کرنا چاہتا ہے جنھوں نے تحریک ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت میں اس کے وقار کو ملا دیا تھا اور جو پنجاب کی سرزمین میں اس کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو رہے تھے۔

—— لاہور کانگرس کے قومی دنوں میں ملک لال دین قیصر کے زیرِ قیادت چھپن فی صدی کی تحریک نے پر پرزے نکالے —— مطلب یہ تھا کہ مسلمان جب پنجاب میں چھپن فی صد بستے ہیں تو انھیں حقوق بھی اسی نسبت سے ملنے چاہئیں، اس تحریک کے رہنما پس منظر میں سر محمد شفیع وغیرہ تھے —— اور پیشِ منظر میں مدیرانِ انقلاب، کانگرس کا لاہور سیشن ختم ہو گیا تو اس تحریک کا جوش و خروش بھی ماند پڑ گیا بلکہ یار لوگوں نے دفتر ہی لپیٹ دیا۔

۳۱-۱۹۳۰ء میں کانگرس کی سول نافرمانی نے خاصا رنگ باندھا۔ لاہور میں مولانا عبد القادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور لالہ دُنی چند بار ایٹ لا نے بیک وقت نمک بنا کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اسی زمانے میں نوجوان بھارت سبھا بنی اور بال بھارت سبھا نے جنم لیا —— بال بھارت سبھا کا صدر ڈی۔ اے وی ہائی سکول میں نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور انتہائی خوبصورت جیسے شہابی رنگ مکھن میں گھل مل گیا ہو —— اپنی تیزیِ زبان کے باعث پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اس سے سٹی کوتوالی میں تمام رات کنسٹیبل بھنت ہوتے رہے، آخر اس کی جان نکل گئی پھر اس کی لاش کو اٹھا کر گوالمنڈی سے قریب بانس بازار میں رتن چند کے تالاب کی نذر کر دیا گیا۔ اگلے روز اس کی لاش تیر کر سطح آب پہ آ گئی، چہرہ کالا سیاہ ہو چکا تھا اور عام نظریں اسے پہچان بھی نہ سکتی تھیں۔

گاندھی ارون سمجھوتے (۱۹۳۱ء) کے بعد گول میز کانفرنس کا چرچا رہا مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ احرار نے کراچی کانگرس سے فارغ ہوتے ہی لاہور میں جماعت احرار کو عملاً قائم کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال میں منعقد ہوئی، آخری دن سب سے بڑا جلسہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں منعقد ہوا جس میں جداگانہ انتخاب کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ مولوی مظہر علی اظہر استقبالیہ کے چیئرمین اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے —— مجھے یاد ہے کہ میرے والد جو مع بسلسلۂ ملازمت لاہور آ گئے اور شاہ کو امرتسر لے جاتے تھے مجھے اس کانفرنس میں اپنے ساتھ امرتسر سے لاہور لائے تھے۔ گو اس زمانے میں کوئی خاص سیاسی شعور نہ تھا لیکن اتنا اب تک یاد ہے کہ شاہ جی نے لوگوں پر جادو کر دیا تھا —— ملک میں کوئی سا بڑا لیڈر ہو گا جس نے لاہور کو خطاب نہ کیا ہو، سر سید، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، دادا بھائی نارو جی، پنڈت مالویہ، لاجپت رائے، قائد اعظم، مولانا ابو الکلام، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال، گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سروجنی نائیڈو، حسرت موہانی، محمود الحسن، سید انور شاہ، سید سلیمان ندوی، بہادر یار جنگ، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر اشرف، سبھاش چندر، سردار پٹیل، لیاقت علی خاں یہ سب لاہور میں گونج گرج چکے ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جو مقرر لاہور میں کامیاب ہو جائے وہ برِ صغیر کے کسی گوشے میں بھی ناکامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال کے دورِ اول میں حزب اللہ کی داغ بیل ڈالی تو سب سے پہلے انھوں نے لاہور کی جامع مسجد ہی میں لوگوں سے امیرِ جماعت کے طور پر بیعت لی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی لاہور ہی میں سید انور شاہؒ کی تحریک پر پانچ سو علماء کے مجمع میں امیرِ شریعت چنا گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے خود بیعت فرمائی —— قائد اعظم کی قیادت عظمیٰ اور پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارتِ اوّل

کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے کہ اس امتیاز میں بھی لاہور ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ علامہ مشرقی نے اپنی تحریک کا آغاز لاہور ہی سے کیا۔ لیکن چھینے سے لے کر بڑھاپے تک بلکہ گورکنارے پہنچنے تک ان کی تحریک لاہور سے وابستہ رہی اور لاہور ہی ان کے وجود و قیام کا مرکز رہا۔ یہیں انھوں نے ادارہ علیہ قائم رکھا۔ یہیں وہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ یہیں ان کا ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء میں سکندر وزارت سے خونی تصادم ہوا اور آخر کار یہیں تحریک کا حرفِ آخر ہو گیا ———

شہید گنج کی تحریک میں پیر جماعت علی شاہؒ اسی لاہور میں امیرِ ملت منتخب ہوئے۔ اس تحریک کا جو حشر و انجام ہوا، وہ بالکل دوسری بات ہے لیکن اس تحریک کا ایک نقش کبھی نہ بھولنے والا ہے کہ نوجوانوں نے دو روز تک دہلی دروازے کے باہر ڈٹ کر گولیاں کھائیں ۱۷ اور ۱۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو جس مردانگی، جاںنثاری، سرفروشی اور فداکاری کا ثبوت مسلمان نوجوانوں نے دیا اس کی مثال ڈھونڈے ہی سے مل سکتی ہے۔

ملک کی کوئی بڑی جماعت ایسی نہیں رہی جس نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد نہ کیے ہوں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے دو اجلاسات (۱۹۱۹ء میں بہ صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ اور ۱۹۲۹ء میں بہ صدارت پنڈت جواہر لال نہرو) کا ذکر پہلے آ چکا ہے لیکن اس سے بھی پہلے ۱۸۹۲ء میں ایک اجلاس دادا بھائی نارو جی کی صدارت میں یہاں منعقد ہوا۔ دوسرا ۱۹۰۰ء میں این جی چندرا کر کے زیرِ صدارت مرحوم خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس ۱۹۲۹ء میں بھی یہیں ہوا، مولانا محمد علی جوہر صدر تھے۔ جمعیتہ العلماء ہند نے ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اپنا سالانہ اجلاس یہیں منعقد کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے زیرِ صدارت آخری اجلاس ہوا۔ غرض لاہور اس میدان میں کبھی پیچھے نہیں رہا ہے۔

۱۹۳۱ء میں احرار کو کانگرس سے علیحدہ ہوتے ہی (دہلی کانفرنس کے فوراً بعد) مغلپورہ ایجی ٹیشن سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ قضیہ یہ تھا کہ مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل مسٹر وہٹکر نے طلبہ کی روایت کے مطابق اسلام کے خلاف کلمات استخفاف کہہ دیے تھے۔ طلبا اسے نکلوانے پر تُلے بیٹھے تھے۔ احرار رضاکاروں نے اہالیٔ لاہور کی ہمراہی میں پکٹنگ کیا۔ پولیس نے لاٹھی چارج سے تواضع کی۔ دوسرے تیسرے روز مولانا ظفر علی خاں مدراس سے واپس آ گئے تو ان کی مداخلت سے معاملہ طے پا گیا۔ وہٹکر نے معافی مانگ لی۔ طلباء کلاسوں میں چلے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم کہی تھی۔ شعر اول تھا ؎

نتیجہ جاں نثارانِ پیمبر کا نکل آیا

حکومت جھک گئی پنجاب میں اسلام کے آگے

احرار کے سر یہ تحریک مڑھی جا رہی تھی مگر انھوں نے بہ عجلت نپٹا دیا، کیونکہ کشمیر کے مسلمان ڈوگرہ شاہی کے شکنجہ میں پھنس کر لاچار ہو رہے تھے، غرض کشمیر میں ایک طوفانِ قیامت برپا تھا۔ میرزا بشیرالدین محمود کی سیادت میں اس مقصد کے لیے ایک کشمیر کمیٹی بنائی گئی علامہ اقبال بھی اس میں شامل تھے۔ احرار نے سب سے پہلے قادیانیوں کو لیا۔ علامہ اقبال احرار کی حمایت میں کمیٹی سے مستعفی ہو گئے احرار نے پہلے تو ۱۹۳۱ء میں سری نگر ایک وفد بھیج کر جائزہ لیا، پھر ریاست کی ڈوگرہ شاہی پر چڑھ دوڑے۔ انگریزی سرکار کا اندازہ تھا کہ احرار زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار آدمی قید کرا سکیں گے لیکن حالت یہ ہوئی کہ گیارہ نوجوان ڈوگرہ فوج کے نیزوں کی انی سے شہید ہو گئے، بیالیس ہزار لوگ قید ہوئے جن میں پانچ ہزار کے لگ بھگ نوجوان دوسرے صوبوں ہی سے آئے تھے۔ اکیس افراد جیلوں میں

نوشہرہ سے ہلاک ہو گئے۔ اس ساری تحریک کا مرکز لاہور ہی رہا۔ مولانا مظہر علی اظہر لاہور ہی سے پہلا قافلہ لے کر کشمیر گئے اور پانچ سال کے لیے قید ہو گئے تھے۔ فی الجملہ لاہور نے وہ کام کر دکھایا جو ایک زمانہ میں بارڈولی نے کیا تھا۔ مسٹر شفیع نے گول میز کانفرنس میں احرار کی ان بے پناہ گرفتاریوں کا اعتراف کیا اور گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانوں کے فعال ہونے کی دلیل قائم کی مگر جب احرار نے انگریزی حکومت سے ٹکر لی تو سرکاری لوگ اشارہ پاتے ہی تتر بتر ہو گئے۔ اس دوران میں احرار کے خلاف سرکاری حلقوں میں کسی سازش کا فرضی مقدمہ تیار ہونے لگا مگر چودھری افضل حق نے اطلاع ملتے ہی روزنامہ احرار میں انگریزی کے ایک صفحہ کا اضافہ کر دیا تاکہ اعلیٰ حکام محض سرکاری گماشتوں کی جھوٹی مخبریوں پر انحصار نہ کریں اور جماعت احرار کسی گروہ کے ذاتی انتقام کا شکار نہ ہو جائے۔

اس تحریک نے احرار کو بے حد چمکا دیا۔

جب کشمیر کے معاملات کا رخ پلٹا اور گلینسی کمیشن کے تقرر سے صورتِ حال کا ایک نیا رُخ بنا تو قید و بند کا جوش مدھم پڑ گیا، اگرچہ احرار نے اس پندرے میں پھنسنے سے انکار کر دیا لیکن عوام کا رجحان ہوتا ہے وہ بگولے کی طرح اٹھتے، آندھی کی طرح چھا جاتے اور گرد کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ احرار نے اس سے فارغ ہو کر قادیانیوں سے دو دو ہاتھ کرنے شروع کیے جس سے اس جماعت کو تبلیغ کے میدان میں سخت نقصان اٹھانا پڑا حتیٰ کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی اور مجلسی اداروں سے بھی انھیں نکال باہر کیا۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں کی کسی سیاسی اور ملی تنظیم میں قادیانی ممتاز نہ ہو سکے۔

فروری ۱۹۳۲ء میں خاکسار تحریک کا لاہور میں سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ علامہ مشرقی اس وقت تک محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے غالباً گورنمنٹ ہائی سکول پشاور کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو خاکسار سپاہیوں کا پہلا دستہ لے کر پشاور پہنچے، سرحدی حکومت نے جائزہ لینا شروع کیا تو علامہ صاحب نے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ملازمت سے استعفیٰ داغ دیا۔ خاکسار تحریک کے چوبیس اصول وضع کیے گئے۔ پہلا کتابچہ قولِ فیصل کے نام سے لکھا گیا جس میں یہ اصول اور تحریک کا مقصد درج تھا، ان اصولوں میں سے بعض اصول یہ تھے:

(۱) مجاہدانہ اور سپاہیانہ قابلیتیں پیدا کرنا (۲) اپنے سالاروں کے احکام بلا چون و چرا بجا لانا (۳) روئے زمین کی بادشاہت اور اسلام کا غلبہ پیشِ نظر رکھنا (۴) فوج کی طرح مارچ اور سپاہیانہ قواعد کرنا (۵) خاکی وردی پہننا اور اس پر اخوت کا سُرخ نشان لگانا (۶) آپس میں فوج کے طریق سے سلام کرنا (۷) صرف خاکساروں سے سودا لینا (۸) مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی عقاید سے بحث نہ کرنا، وغیرہ۔

بیلچہ خاکساروں کا ہتھیار قرار دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خاکسار تحریک شباب پر آ گئی اور اس تیزی سے اس تحریک نے اپنے بال و پر پیدا کیے کہ حکومت نے کڑی نگرانی شروع کر دی۔ لاہور ہیڈ کوارٹر تھا۔ علامہ مشرقی نے اپنے مکان واقع اچھرہ میں ادارہ علیہ قائم کیا اور وہیں سے متعلقہ احکام جاری کرتے رہے۔ سب سے پہلے اس تحریک کا نوٹس سٹیٹسمین دہلی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے لیا جو اس وقت حکومت انگریزی کے نقیب سمجھے جاتے تھے۔ علامہ مشرقی نے خاکساروں اور جانبازوں کو کھلم کھلا فوجی کیمپ لگا کر عسکری تعلیم دینا شروع کی۔ خاکساروں نے پہلی ٹکر سرحد میں خان وزارت سے لی۔ پھر سکندر حیات کی وزارت سے تصادم پیدا کیا لیکن پہلی دفعہ قضیہ مطالبات تک ہی محدود رہا۔ اُدھر لکھنؤ میں مدح صحابہ اور تبرا کا زور تھا۔ اس تحریک کو بہ جبر بند کرانے کے لیے علامہ ایک ہزار خاکساروں کی معیت میں لکھنؤ پہنچے۔ پنت کی وزارت نے گرفتار کر لیا، علامہ نے مستقلی رہائی حاصل کر لی اس پر خاکسار بھڑک اٹھے

پنت وزارت اور خاکساروں میں مقابلہ ہوگیا۔ بلند شہر میں کئی نوجوان شہید ہوگئے۔ ابھی یہ الاؤ روشن ہی تھا کہ حکومتِ پنجاب نے ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء کو دوسری عالمگیر جنگ کے مضمرات کا اندازہ کرتے ہوئے عسکری تنظیموں پر پابندی لگا دی۔ خاکساروں نے اسے اپنے خلاف سمجھا۔ علامہ مشرقی ہدایات دے کر خود دہلی چلے گئے۔ خاکساروں نے ۱۹ مارچ کو جلوس نکالا نتیجۃً ہیرا منڈی کے چوک میں پولیس اور خاکساروں میں ٹکراؤ ہوگیا۔ خاکساروں نے کھلم کھلا بیلچے استعمال کیے۔ مسٹر بیٹی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تو وہیں دم توڑ دیا۔ مسٹر لورن ڈپٹی کمشنر کو زخم آئے۔ مسٹر گینفورڈ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ پولیس نے جواب الجواب قتلِ عام شروع کر دیا۔ پچاس نوجوان شہید کیے گئے۔ انتقام کا یہ عالم تھا کہ رنڈیوں کے مکانوں میں سے چھپے ہوئے خاکساروں کو چن چن کر نکالا جاتا اور دوسری یا تیسری منزل پر چڑھا کر نیچے پھینک دیا جاتا۔ علامہ مشرقی کو دہلی سے گرفتار کر کے مدراس کی طرف ویلور جیل میں قید کر دیا گیا۔ خاکساروں نے لاہور کی مسجدوں میں مدت تک مورچہ لگائے رکھا مگر بالآخر تھک ہار کر رہ گئے۔ علامہ ۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو رہا کر دیے گئے مگر خاکسار جیسی عظیم تحریک جس نے بے شمار جاں نثار پیدا کیے تھے اپنے ہی لیڈر کے عاجلانہ فیصلوں کا شکار ہو کر پٹ گئی۔ پھر اس کے لیے عروج و قبول کا کوئی لمحہ کبھی روشن نہ ہو سکا۔

—— اس سے پہلے جولائی ۱۹۳۵ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد شہید گنج کے انہدام کا مقابلہ کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ مولانا محمد اسحاق مانسہروی، سید حبیب، ملک لال خان اور میاں فیروز الدین احمد ان کے دست و بازو تھے۔ جب یہ رہنما مختلف شہروں میں نظر بند کر دیے گئے تو نوجوانوں نے از خود لیڈرشپ پیدا کر کے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا نعرہ لگایا۔ دو روز تک دہلی دروازے کے باہر گولی چلتی رہی۔ نوجوانوں نے بڑی بے جگری سے جانیں قربان کیں۔ مولانا اختر علی خاں مدیر زمیندار کے ہاتھ جوڑنے پر یہ مورچہ ختم ہوگیا۔ مقدمہ لڑا گیا، کانفرنسیں ہوئیں، امیرِ ملت منتخب کیے گئے۔ غرض بہت سے جتن ہوتے رہے لیکن تحریک کا نتیجہ انتخاب پر ختم ہوا۔ مسجد تو ملی البتہ احرار جو اس وقت تک مسلمانوں میں بے حد مقبول اور فعال گروہ سمجھے جاتے تھے اس تحریک میں حصہ لے کر مسجد کے ملبے تلے آ گئے اور اس بری طرح مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہوئے کہ مسلم لیگ کے زمانۂ شباب میں ان کا بڑھاپا خود بخود عود کر آیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس غرض سے مجلس اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر مسلم لیگ میں ضم ہوگئی۔ احرار نے دوسری جنگِ عظیم چھڑتے ہی فوج کی بھرتی کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ سب سے پہلا فقید المثال جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ شیخ حسام الدین، شورش کاشمیری، مظہر علی اظہر، حبیب الرحمٰن، افضل حق اور سینکڑوں رہنما و رضاکار طویل عرصہ کے لیے قید کر دیے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا جو سرکاری رپورٹر لدھا رام کے پھر جانے سے لاہور ہائیکورٹ میں منتقل ہوگیا۔ شاہ جی مسلسل سماعت کے بعد رہا کر دیے گئے۔ چودھری افضل حق مرض الموت میں مبتلا تھے کہ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ کچھ دنوں سنبھالا لیا پھر وفات پا گئے۔ غرض جنگ کے دنوں میں احرار کے بیشتر زعماء جیل ہی میں رہے۔

پاکستان کا نصب العین اختیار کرنے کے بعد مسلم لیگ نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ قائدِ اعظمؒ سوادِ اعظم کے تنہا لیڈر بن گئے۔ مسلمانوں کی دوسری جماعتیں اور شخصیتیں مقابلتاً متروک ہوتی گئیں۔ مسلم لیگ نے اپنی پہلی اور آخری آزمائشی جنگ ملک خضر حیات سے لاہور میں لڑی۔ یونی نسٹ پارٹی اور مسلم لیگ دو الگ الگ جماعتیں بن گئیں۔ پھر جنگ کے فوراً بعد جنرل انتخابات میں لیگ نے مخالفوں کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس سے پہلے سردار شوکت حیات کی وزارت سے سبکدوشی نے لیگ کو ایک نیا ولولہ دیا تھا۔ ملک خضر حیات نے نئے انتخابات کے بعد کانگرس سے سمجھوتہ کر کے وزارت بنائی مگر وہ مستعفی ہونے تک سخت کشمکش میں رہے۔

آخر لیگ کی ساری تاریخ میں یہ شرف بھی لاہور ہی کو حاصل ہوا کہ لیگی رہنما جو جیلخانوں کے تصور سے نابلد تھے ملک خضر حیات کی وزارت سے ٹکر لے کر جیل گئے۔ لاہور میں زبردست جلوس نکالے گئے، مظاہروں پر مظاہرے ہونے لگے۔ ان دنوں لاہور کے مسلمانوں نے جس زندہ دلی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا وہ بے شبہ اپنی نظیر آپ تھا۔ اسی تحریک میں پہلی دفعہ مسلمان عورتیں پردہ سے باہر آئیں اور خضر وزارت کے دانت کھٹے کر دیے۔ ایک طالبہ نے بڑھ کر سکریٹریٹ پر لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تمام صوبہ تحریک کی پشت پناہ بن گیا۔ یونی نسٹ وزارت کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ آخر ایک صبح کو لوگ سو کر اٹھے تو انھیں اخبارات کی شہ سرخیوں سے پتہ چلا کہ ملک خضر حیات خان ٹوانہ وزارت سے مستعفی ہو گئے ہیں اور یونی نسٹ پارٹی مسلمانانِ لاہور کے اسی سیلابِ عظیم میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی ہے۔

لاہور کی آزادی سے پہلے یہ آخری سیاسی تحریک تھی جس نے عروج و کمال اور فتح و نصرت حاصل کی۔ اس کے بعد فسادات کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے لاہور اسمبلی چیمبر کے باہر تلواریں اور کرپانیں لہرا لہرا کر اعلان کیا کہ وہ پاکستان نہیں بننے دیں گے مگر پاکستان بن کے رہا البتہ ان عریاں تلواروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور کا آٹھواں حصہ جل گیا۔ ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے آنچل اجنبی ہاتھوں میں آبروؤں اور عصمتوں کا کفن ہو گئے۔ غلام لاہور مر گیا، آزاد لاہور زندہ ہو گیا۔

یہ ہے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کی سیاسی تحریکوں کا افسردہ و حصار جس سے ایک طویل تاریخ کے گم شدہ خطوط ابھر کر سامنے آ جاتے اور کرگزراں راستوں کا پتہ دیتے ہیں جن کی کسک ہی دل میں باقی رہ گئی ہے۔

فقیر خاندان کے تاریخی نوادر

پروفیسر یوسف جمال انصاری

لاہور کے قدیم خاندانوں میں فقیر خاندان کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس خاندان سے علم و فن کی سرپرستی کی جو روایات وابستہ ہیں ان کی مثال کسی دوسرے خاندان میں ملنا مشکل ہے۔ فقیر خاندان کی حویلی جو بھاٹی دروازے میں واقع ہے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو مخزنِ نوادر کہنا بجا ہوگا۔ سکھ دورِ حکومت میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نور الدین نے جو اہم کردار ادا کیا۔ اسے پنجاب کی تاریخ میں بھلایا نہیں جا سکتا مشہور ہے۔ کہ ۱۷۹۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ آشوبِ چشم میں مبتلا ہوا۔ اور اس نے لالہ حاکم رائے کو علاج کی غرض سے طلب کیا۔ لالہ حاکم رائے ایک حاذق طبیب تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد فقیر سید نور الدین کو مہاراجہ کے علاج کی خدمت تفویض کی۔ مہاراجہ حکیم نور الدین سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ اس نے ان کو ایک جاگیر بخش دی اور مستقلاً اپنے عملے میں شامل کر لیا۔ حکیم نور الدین فقط طبیب ہی نہ تھے۔ وہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مہاراجہ سے ان کا تعلق مدت العمر رہا۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی فقیر سید عزیز الدین کو بھی مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ رفتہ رفتہ فقیر صاحبان مہاراجہ کے مزاج میں اتنے دخل انداز ہو گئے۔ کہ حکومت کا سیاہ و سفید انھیں کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہاں تک کہ مہاراجہ کے ذاتی اور خاندانی معاملات میں بھی انھی کی رائے چلنے لگی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو بیش بہا تحائف دیئے۔ جو آج فقیر خانے کی زینت ہیں۔ ان دنوں ہندوستان کے بڑے حصے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہندوستانی مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے جو گورنر جنرل مقرر ہو کر آئے انھوں نے رنجیت سنگھ سے تعلقات قائم کئے۔ اس سلسلے میں دونوں جانب سے فقیر سید عزیز الدین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز گورنر جنرلوں نے بھی فقیر صاحب کو متعدد قیمتی تحفے دیئے۔ جو آج تک اس خاندان کے پاس ہیں فقیر خاندان خود بھی تاریخی نوادر جمع کرنے کا شوق رکھتا تھا۔ تحائف سے قطع نظر اس خاندان کے سربراہوں نے اپنے حسنِ ذوق کی بنا پر بہت سی ایسی چیزیں حاصل کیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ غرضیکہ فقیر خانہ بجا طور پر نوادر کا خزانہ ہے یوں تو پرانے خاندانوں میں نوادر کا پایا جانا ان خاندانوں کی عظمت کی دلیل ہے اور لاہور کے دوسرے قدیم گھرانوں میں بھی بیش بہا فن پاروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس باب میں فقیر خانے کو جو فضیلت حاصل ہے وہ کسی اور خاندان کے حصے میں نہیں آئی۔

تاریخی نوادر کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ مال و دولت اور سونے چاندی کے انبار دیکھ کر دل میں حسد کا جذبہ

بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ زر اپنے خزانوں کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ مبادا دیکھنے والے کے دل میں حسد کی آگ مشتعل نہ ہو جائے اور اس کی نیت میں فساد نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن علم و فن کے قیمتی شہ پاروں کا عالم دوسرا ہے۔ دیکھنے والے کے دل میں حسد یا لالچ نفسیاتی طور پر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ علم و فن کے شہ پارے تہذیبِ نفس کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالنا شادابیٔ خیال اور تسکینِ روح کا موجب ہوتا ہے۔ اور ہم بے ساختہ عش عش کرنے لگتے ہیں۔ وہ خاندان جو علمی اور فنی خزانوں کے مالک ہیں۔ اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ اظہارِ شکرگزاری کیا جائے۔ کہ انھوں نے علم و فن کے ایسے نمونوں کو جمع کیا۔ محفوظ رکھا اور ہماری رسائی ان تک ہوئی۔ تاریخی نوادر کی علمی حیثیت یہ ہے۔ کہ ان میں سے بیشتر انسانی صنعت کے قابلِ قدر نمونے ہوتے ہیں۔ اور فنی شاہکار ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان نمونوں کے ساتھ دستکاری اور صناعی کی پوری تاریخ وابستہ ہوتی ہے۔ مثلاً کونسا نمونہ کس دَور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور کس مکتبِ فکر سے متعلق ہے۔ گویا ہر نمونے میں ایک دَور کی تاریخ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اور ہر نمونہ کسی فن کار کی بہترین کوششوں کا انفرادی نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فقیر خانے کے نوادر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کہ ہمارے زمانے میں یہ ذخیرہ تہذیبِ نفس کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ محض تاریخی حیثیت سے بھی مورخ ان نوادر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان سے سکھ دَور میں سکھ مسلم تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور سکھ حکمرانوں کا مذاقِ طبع اور سکھ دَورِ حکومت میں علم و فن کی سرپرستی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں۔ کہ اس خاندان کے سربراہوں کا فنی ذوق کتنا بلند تھا اور ہے کیونکہ ہر زمانے میں اس کے سربراہ اس ذخیرے میں اضافہ کرتے رہے ہیں چنانچہ فقیر سید جلال الدین مرحوم کے بعد اب میجر فقیر مغیث الدین اس خزانے کو بڑھا رہے ہیں —

لاہور کے فقیر خانے کو "آرٹ میوزیم" کہنا مناسب ہو گا۔ اس میں نقاشی، مصوری، منبت کاری۔ قالین بافی ظروف سازی، خطاطی، چوبی نقش کاری، مجسمہ سازی وغیرہ بیش قیمت نمونوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ ملکہ وکٹوریہ۔ لارڈ ایمرسٹ۔ لارڈ آک لینڈ۔ لارڈ ایلن برا۔ لارڈ ہیسٹنگز۔ لارڈ ولیم بینٹنک۔ لارڈ ہارڈنگ اور دوسری عظیم شخصیتوں نے اس خاندان کے سربراہوں کو وقتاً فوقتاً تحفے میں دیئے۔ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے جو سلسلہ تحائف اس خاندان کو موصول ہوا۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ کی وہ قیمتی تصویر بھی شامل ہے جس کا فریم خالص سونے کا تھا۔ اور گھڑی بھی شامل ہے جو اندھیرے میں بھی وقت بتاتی تھی۔ ملکہ نے فقیر نور الدین کے لیے ایک گھوڑا گاڑی بھی بھیجی تھی۔ جو لاہور کی سڑکوں پر استعمال نہ کی جا سکی۔ اور اسے فروخت کر دیا گیا۔ ملکہ کی طرف سے لارڈ منٹو نے جو ان دنوں گورنر جنرل تھے۔ فقیر نور الدین کو ایک توپ بھی تحفے میں دی۔ جس میں ایک دھوپ گھڑی لگی ہوئی ہے۔ دن کے بارہ بجے اور توپ خود بخود چل گئی۔ یہ توپ اس خاندان کے پاس اب بھی موجود ہے۔ غرضکہ ملکہ کی تصویر، گھڑی اور خود کار توپ کا شمار نہ صرف نوادر میں ہوتا ہے بلکہ انگریز حکمرانوں اور فقیر خاندان کے باہمی تعلقات کا بھی ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پیش کردہ قرآن پاک کا ایک نسخہ بھی نوادر میں شامل ہے۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک غریب خوش نویس نے اس کی کتابت کی تھی۔ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے اس پر نقش و نگار بنائے تھے۔ تقطیع اور وزن کے اعتبار سے اس نسخے کا اٹھانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اپنے کام سے فارغ

ہونے کے بعد حب خو بیب خوش نویس ایک گاڑی میں رکھ کر یہ نسخہ ریاست ٹونک کے حکمران کے پاس لے جانے کی نیت سے روانہ ہوا۔ اور قلعۂ لاہور کے نیچے سے گزرا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نظر اس پر پڑی۔ مہاراجہ نے خوش نویس کو جاگیر کے علاوہ گیارہ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ اور یہ نسخہ فقیر نورالدین کو پیش کر دیا۔ مہاراجہ کے تحائف میں ایک بیش بہا مالا بھی شامل ہے جس کی قیمت دس ہزار روپیہ ہے۔ ایک بار فقیر نورالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اس وقت مہاراجہ بھی مالا جپنے میں مصروف تھے۔ تسبیح پڑھنے کا اسلامی طریقہ چونکہ مالا جپنے سے مختلف ہے۔ تسبیح دائیں سے بائیں کو اور مالا بائیں سے دائیں کو پھیرتے ہیں۔ اس لیے اچانک مہاراجہ نے پوچھا۔ کہ فقیر صاحب! ان دونوں طریقوں میں سے کونسا درست اور مستحسن ہے۔ فقیر نورالدین بلا کے حاضر جواب تھے۔ انھوں نے کہا۔ کہ دونوں طریقے نہایت مناسب ہیں۔ مہاراج کا طریقہ وہ ہے کہ جس سے خدا اپنے بندوں کو مالا مال کرتا ہے۔ اور میرا طریقہ وہ ہے جس سے شیطان دور رہتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ اپنی قیمتی مالا گلے سے اتار کر فقیر صاحب کی گود میں ڈال دی۔ اب بات حاضر جوابی کی چل نکلی ہے۔ تو یہ واقعہ قلمبند کیے بغیر بھی رہا نہیں جاتا۔ ایک بار فقیر عزیزالدین کو (جو فقیر نورالدین کے بڑے بھائی تھے) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک سے ملنے شملے جانا پڑا۔ لارڈ بینٹنک نے فقیر عزیزالدین سے نجی ملاقات میں پوچھا۔ کہ تمھارے مہاراجہ کی کونسی آنکھ خراب ہے۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا "مہاراجہ کے چہرے پر آفتاب کا سا جلال ہے۔ مجھ میں اتنی تاب کہاں کہ نظر بھر کر دیکھ سکوں۔ اس لیے میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں"۔ غرضکہ این خانہ تمام آفتاب است۔ قرآن پاک کا وہ نسخہ اور مہاراجہ کی مالا ایسے تحائف ہیں جن سے فقیر خاندان کے سکھ حکمرانوں کے ساتھ باہمی تعلقات پر تاریخی روشنی پڑتی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے الطاف و عنایات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس کے دیئے ہوئے تحفوں کی فہرست بنانا بھی مشکل ہے۔

فقیر خانے میں اسلامی نوادر کا ایک وقیع ذخیرہ ہے۔ قرآن مجید کے نادر نسخے ساٹھ کے قریب ہیں۔ ایک نسخہ تو جناب علیؑ کے ہاتھ کا ہے اسی طرح ایک نسخہ امام حسنؑ اور ایک امام حسینؑ کے ہاتھ کا ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمۂ اطہارؑ کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ ان نادر و نایاب قلمی نسخوں کی زیارت روحِ ایمان کو بالیدہ کرتی ہے۔ اور ثواب دارین کی مستوجب ہے۔ علاوہ ازیں فقیر خانے میں مختلف زمانوں اور مختلف رسم الخط کے قرآن مجید ہیں۔ ثواب دارین کے علاوہ اسلامی خطاطی کے نقطۂ نظر سے بھی قرآنی نسخوں کا یہ ذخیرہ قابلِ لحاظ ہے۔ فقیر خانے کے ذخیرے میں کم و بیش چالیس تبرکات ایسے ہیں کہ نویں محرم کو ہر سال ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اور ان کی زیارت کے لیے دور و نزدیک سے لوگ آتے ہیں۔ یہ تبرکات بالکل نایاب ہیں۔ اور اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ تبرکات سے قطع نظر کوئی چھ سو قلمی کتب اور ساڑھے چار سو قطعات ہیں۔ قلمی کتب کے ذیل میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسی کتابیں آتی ہیں۔ جو بالکل غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں۔ قطعات میں سر فہرست حضرت امام حسین علیہ السلام کے قلم مبارک کا لکھا ہوا ایک قطعہ بخط محقق ہے۔ دوسرے قطعات عبدالرشید دیلمی۔ میر علی جگن ناتھ (اکبری)۔ عبداللہ الحسینی۔ یاقوت مستعصمی۔ میر عماد۔ ابوالبقاء الموسوی۔ حافظ نوراللہ۔ حافظ ابراہیم۔ پیر علی۔ میر محمد امیر پنجہ کش۔ آغا مرزا۔ رحیم اللہ۔ محمد عاقل۔ مجد الحسینی۔ امام ویردی۔ محمد یعقوب۔ مرزا احمد علی۔ عباداللہ۔

فتح علی ملتانی - میاں علی بخش - فضل الدین صحاف - عبدالمجید پروین رقم - خلیفہ سید احمد - خلیفہ نور احمد - تاج الدین زریں رقم، شیخ احمد - ملک علی محمد وغیرہم کے ہیں اور دو سو نایاب تاریخی دستاویزات ہیں جو سکھ حکومت کے متعلق ہیں۔

تصاویر کے اعتبار سے تحفہ خانہ گویا نگار خانہ ہے۔ ان کی تعداد چار سو سے کم نہ ہوگی۔ مغل اسکول - راجپوتانہ اسکول - دکن اسکول - کانگڑہ اسکول اور سکھ اسکول کی نایاب قلمی تصاویر سے تحفہ خانہ مزین ہے۔ ان میں ایک قلمی تصویر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے رہوار لیلیٰ کی ہے۔ اس گھوڑے کو حاصل کرنے کی خاطر مہاراجہ کو پشاور کے گورنر سردار یار محمد خاں سے جنگ آزمائی کرنا پڑی تھی۔ مغل تصاویر کے ساتھ سکھ حکمرانوں کا شغف سکھ مسلم تعلقات کے شگفتہ ہونے کی دلیل ہے۔ لکڑی اور ہاتھی دانت پر کام کے بعض بہت اچھے نمونے یہاں نظر آتے ہیں۔ لکڑی پر منبت کاری اور ہاتھی دانت پر مرقع کاری کے کوئی سو نمونے ہوں گے۔ ہاتھی دانت پر شاہ جہاں اور ممتاز محل کے دربار کا نقش ان میں خاصے کی چیز ہے۔ ریشم پر مصوری کے کوئی ڈیڑھ سو نمونے ہوں گے جن میں سے بعض چینی اور جاپانی ہیں۔ چین - روس - جاپان اور ایران کے بنے ہوئے تقریباً تین سو چینی کے ظروف ہیں۔ ایرانی اور ہندوستانی قالین سازی کے ساٹھ نمونے ہیں۔ ہندوستانی قالینوں میں وہ قالین بھی شامل ہیں جو خاص لاہور کے بنے ہوئے ہیں۔ ایرانی قالین ایران کے مختلف خطوں کی کاریگری کے شاہکار ہیں۔ پتھر اور انگشتریوں پر حکاکی کے بے نظیر نمونے موجود ہیں۔ ایک انگشتری پر تو ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس انگشتری کی بھی عجب داستان ہے۔ خلیج بنگال پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چڑھتے چاند کا زمانہ تھا۔ بادلوں کی شکل ہندوستان کے نقشے کی سی تھی۔ اس نظارے کا عکس انگشتری پر اتار لیا گیا۔ یہ انگشتری کشمیر کے متعلق قدرت کی پیش گوئی کا نقش پیش کرتی ہے۔ ہندوستان کے اس نقشے میں کشمیر کا حصہ شامل نہیں ہے۔ یوں بھی چڑھتا چاند پاکستان کا قومی نشان ہے۔ جب چاند چڑھے گا تو کشمیر ہمارا ہوگا۔ یہی قدرت کو منظور ہے۔ اور انگشتری کی پیشین گوئی بھی یہی ہے۔ پتھر اور مختلف دھاتوں کے مجسموں کی بھی تحفہ خانے میں کمی نہیں۔ پتھر کے بت - گندھارا - قدیم ہندو طرز بت تراشی - چینی و اطالوی مجسمہ سازی۔ غرض مختلف ادوار اور زمانوں کے مجسمے ہیں۔ برونس، کلازونی، پیتل اور تانبے کے پرانے برتن بھی ہیں۔ کوئی پچاس قدیم مہریں اور ایک ہزار ایرانی - یونانی - مغل اور سکھ دور کے سکے ہیں۔ مختلف قیمتی پتھروں کی کوئی ستر تسبیح اور مالے ہیں۔ کشمیری شال - جامہ وار - سوزنیاں - چغے - میز - کرسیاں - تپائیاں - مینٹل پیس۔ ملا جلا کر سینکڑوں کی تعداد تک پہنچتے ہیں۔ قدیم اور نایاب اسلحہ کے نمونے بھی یہاں موجود ہیں۔ یعنی تلوار - تبر - خنجر - خود وغیرہ۔

تحفہ خانہ کیا ہے۔ عجائب گھر ہے۔ کس کس چیز کو گنوایا جائے۔ اور کس کس کو بیان کیا جائے۔ اسی لیے ہم نے اس مختصر سے تعارف پر قناعت کی ہے۔ ورنہ پورے بیان کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوتے۔

خوش نویس

ملک علی محمد

عروس البلاد لاہور اپنی ابتدا سے لے کر آج تک ہر علم و فن کے باکمالوں کا مرکز رہا ہے۔ اچھے اچھے خوش نویس بھی ہمیشہ یہاں موجود رہے ہیں۔ ان میں بعض تو یہاں کی مٹی سے اُٹھے اور یہیں سما گئے اور بعض ایسے تھے جو ابتدائے عمر میں یہاں تحصیل علم و فن کے لیے آئے اور پھر یہاں سے لوٹ کر نہ جا سکے۔

جہاں تک فن خوش نویسی کا تعلق ہے، یہ ایران کی وساطت سے یہاں پہنچا اور پھلا پھولا۔ ہر شخص اس حقیقت کا معترف ہے۔

فن خطاطی سے دلچسپی رکھنے والے مورخین اور اہلِ علم حضرات نے اس فن کے کئی اُستادوں کا تذکرہ مختلف کتابوں میں کیا ہے مگر جن خوش نویس بزرگوں کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ ہمارے عہد سے بہت قریب کے لوگ ہیں اور ان کے حالات ابھی سینہ سے سفینہ تک منتقل نہیں ہوئے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ لوگ زندہ تھے جنھوں نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اب بھی شاید کوئی موجود ہو۔ میری تحریر کی بنیاد انہی بزرگوں کی بتائی ہوئی معلومات ہیں۔

میں اس مضمون کی ابتدا میرزا امام ویردی جیسے باکمال اُستاد سے کرتا ہوں جنھوں نے یہاں کی خوش نویسی کو وہ جلا بخشی کہ اس سے پہلے کی خوش نویسی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

میرزا امام ویردی

آپ بڑے فاضل ادیب اور نہایت اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ آج سے سوا سو سال پیشتر کابل سے لاہور تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ ان کو لاہور کے خوش نویسوں کا امام کہنا چاہیئے۔ کیونکہ ان سے بہتر کوئی خوش نویس اُس وقت کیا آج بھی موجود نہیں۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات لاہور میں عام ملتے ہیں۔ بعض مساجد اور قبروں کے کتبات بھی ان کے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُمرا ان کے بے حد قدر دان تھے۔ نواب شیخ امام الدین مرحوم گورنر کشمیر اور نوابان قزلباش سے ان کے روابط نہایت گہرے تھے۔ نواب شیخ امام الدین نے سوتر منڈی میں مسجد بنوائی تو اس کی دیواروں پر میرزا صاحب نے کتنے ہی اشعار لکھے جو مرمت کے دوران صاف ہو گئے۔ شاید اب بھی کوئی نشان باقی ہو۔ نواب امام الدین کی والدہ کی قبر مزار بی بی پاک دامناں کے احاطہ میں اور خود نواب صاحب کی قبر داتا گنج بخشؒ کے ایک دالان میں ہے۔ دونوں قبروں پر میرزا صاحب کے لکھے ہوئے کتبے آج بھی

موجود ہیں۔ اور دیکھے جا سکتے۔

نوابانِ قزلباش کے امام باڑہ واقع چوک نواب صاحب میں میرزا صاحب کے لکھے اور کندہ کئے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے قطعات بھی شائقین فن سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔ قریباً ایک انچ موٹے قلم سے ہفت بند محتشم کاشی کے بیس پچیس اشعار لکھے گئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستان ایک نمائش میں نظر سے گزری تھی۔ یہ نمائش غالباً شاہ ایران کی پہلی دفعہ آمد پر میو سکول آف آرٹس میں لگائی گئی تھی۔ گلستان دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جس کے کسی نقطے پر انگلی رکھی جا سکے۔ آپ لکھنے میں نہایت محتاط تھے۔ کوئی ناپسندیدہ حرف باقی نہ چھوڑتے۔ فوراً ضائع کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قطعات بڑی قیمت پاتے تھے۔

میرزا صاحب کندہ کاری اور نقاشی میں بھی ماہر تھے۔ خود ہی لکھتے، خود ہی نقاشی کرتے اور خود ہی پتھر کھودتے۔ میاں علی بخش مرحوم فرماتے تھے کہ میرزا صاحب کو ابتدائے عمر ہی سے اس فن کا اتنا شوق تھا کہ کابل کی ایک مسجد میں جو سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی روزانہ قلم دوات لے کر چلے جاتے۔ پہلے اس کی دیواروں پر جہاں تک ہاتھ جاتا لکھتے۔ پھر فرش پر لکھتے اور نمازیوں کے آنے سے پہلے پہلے اسے دھو کر صاف کر دیتے۔ اس طرح انھیں اچھا لکھنے کی مشق ہو گئی۔

لاہور میں ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ جن میں استادِ محترم میاں علی محمد عرف میاں علی بخش خطاط اور مولوی شیخ احمد جوہر کانی بہت قابل ہوئے ہیں۔ ڈاٹر کٹری طرز لکھنے والوں میں آج بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا فیض یافتہ نہ ہو۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ نے تو اپنے کاتبوں کے لیے پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا کہ وہ میرزا صاحب سے فن خوش نویسی کی اصلاح لیں اور ان کی روش اختیار کریں۔

میرزا صاحب کا انتقال سنہ ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ چنانچہ ۱۹ فروری سنہ ۱۸۸۰ء کے اودھ اخبار لکھنؤ نے لکھا:-

"پنجابی اخبار لاہور سے یکتائے زمانہ خوش نویس یگانہ امام ویردی مرحوم مغفور
کے انتقال کی خبر سن کر ہم کو نہایت افسوس ہوا۔ امام ویردی مرحوم خوشنویسی
میں اپنے وقت کے امام اور میر پنجہ کش مرحوم دہلوی کے قائم مقام تھے"

میرزا صاحب کا خاندان آج بھی لاہور کے محلہ چونے منڈی میں آباد ہے۔ ان کے پڑپوتے میرزا کاظم صاحب زندہ و سلامت ہیں مگر وہ میرزا صاحب کے حالات اور مدفن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میرزا صاحب کو قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں دفن کیا گیا تھا مگر ان کی قبر کا نشان اب مٹ چکا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ باکمال جو اپنے ملنے والوں کے نام کا لنقش فی الحجر کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیتا تھا آج کس مٹی میں مل گیا ہے۔ میاں علی بخش کے بھتیجے منشی معراج علی مرحوم نے ایک دفعہ راقم سے کہا تھا کہ وہ میرزا صاحب کی قبر کا نشان بتا دیں گے مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ بتلاتے خود ہی بے وقت موت کا شکار ہو کر بے نشان ہو گئے۔

شیخ احمد جوہر کانی

جوہر کانہ ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے قطعات کے نیچے اپنے نام کے ساتھ جوہر کانی لکھتے تھے۔ میرزا امام ویردی کے شاگرد تھے۔ موٹے سے موٹا قطعہ

بڑی بے تکلفی سے لکھ جانتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات آج بھی بہت سے لوگوں کے پاس ہیں۔ چنانچہ میاں محمد حیات نقاش مسجد وزیرخاں کے پاس شیخ احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۲۸۵ھ کا ایک قطعہ اب تک موجود ہے جس پر یہ شعر اتنے پختہ خط میں لکھا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

از تواضع میتواں کردن مسخر عالمے

خاتم دست سلیمانی ہمیں پشت دوتاست

موچی دروازہ کے اندر کوچہ مغل حویلی میں مرزا محمد علی مرحوم کا امام باڑہ نہایت عمدگی سے سجتا تھا۔ اس میں شیخ احمد جوہر کا ہی کے لکھے ہوئے بیسیوں قطعات تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ۔ مگر اس خاندان کے زوال کے بعد یہ قطعات آنکھوں سے اوجھل اور منتشر ہو گئے۔ آپ ابتدا میں محکمہ بندوبست کے رجسٹروں کے عنوانات لکھا کرتے تھے۔ اس سے اتنی مشق ہو گئی کہ اپنے وقت کے نامور خوش نویسوں میں شمار ہوتے۔ بھاٹی دروازہ کے اندر تحصیل بازار کے پیچھے ایک مسجد میں امامت کرتے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔

مولوی سید احمد امین آبادی آپ میرزا امام ویردی کے ہمعصر تھے اور محلہ چڑی ماراں اندرون لوہاری دروازہ میں رہا کرتے تھے۔ نشست ڈیرہ کانیاں چوک متی میں تھی۔ وہیں کتابت کرتے تھے۔ ڈیرہ کانیاں قیام پاکستان سے پہلے قریباً سو برس لاہور میں خوش نویسوں کا مرکز رہا اور وہاں سے بڑے اچھے اچھے کاتب تربیت پا کر نکلے۔ لاہور کے بے شمار خوش نویس مولوی سید احمد کے خاندان کے فیض یافتہ ہیں۔

مولوی سید احمد بڑے دیندار اور خوش پوش بزرگ تھے۔ گندمی رنگ، سرخ داڑھی، سفید عمامہ اور سفید غرارہ پہنتے تھے۔ بڑے باکمال تھے۔ آپ کی لکھی ہوئی وصلیاں آپ کے کمالِ فن کا پتہ دیتی ہیں۔ آپ لاہور میں پہلے کاتب تھے جن کا کام سرکاری پریس میں سب سے پہلے طبع ہوا۔ میرزا امام ویردی کی مطبوعہ وصلیاں جو آج بھی بعض لوگوں کے پاس موجود ہیں، آپ ہی کی کوششوں سے لندن میں طبع ہوئی تھیں مگر یہ بات میرزا صاحب کو ناگوار گزری اور وہ مولوی سید احمد سے ناراض ہو گئے۔ مولوی سید احمد موضع سانده کلاں کے قبرستان میں اپنے مرشد کے پہلو میں آسودۂ خواب ہیں۔

آپ کے دو فرزند خلیفہ نور احمد اور خلیفہ غلام محمد تھے۔ دونوں بہت اچھے خوش نویس تھے۔ آپ کے ہمعصروں میں مولوی فقیر محمد، پنڈت دیارام، قاضی شمس الدین اور چراغ علی وغیرہ لائق تعریف خوش نویس تھے۔ جن کا ذکر رائے بہادر کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں بھی کیا ہے۔

خلیفہ غلام محمد آپ مولوی سید احمد کے بڑے فرزند تھے۔ مولوی صاحب نے ان کو میرزا امام ویردی کا شاگرد کرایا اور ایک سو روپیہ نقد، پگڑی اور شیرینی پیش کی۔ میرزا صاحب ان کو مدت تک اصلاح دیتے رہے۔ آپ نے بڑی ترقی کی اور استادوں سے اگا کھانے لگے مگر افسوس کہ عین عالم شباب میں عازم دار البقا ہوئے۔ مولوی سید احمد کو اس قابل فرزند کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ خلیفہ غلام محمد کا سال وفات ۸۹۶

ہے۔ آپ میانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

حافظ خلیفہ نور احمد آپ مولوی سید احمد کے چھوٹے فرزند اور انہی کے شاگرد تھے۔ خوش نویسی میں بے مثال تھے ورزشی جسم، چھریرے، پوچھک کے داغ مٹنے گرمی کی وجہ سے مرجھا گئے تھے، کسرت کے شوقین تھے۔ اپنے فن میں اتنے باکمال تھے کہ کچی کاپی کے دس بیس قلم ایک ہی جیسے علی الصبح تیار کر کے قلمدان میں رکھ لیتے اور لکھنا شروع کر دیتے۔ ایک قلم خراب ہو جاتا تو دوسرا اٹھا لیتے۔ باریک سے باریک لکھائی انہی سے کرتے۔ بڑے زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ لکھائی اتنی تیز، عمدہ اور مضبوط تھی کہ آج لوہے کے قلم سے بھی اس جیسی لکھنی مشکل ہے۔ شہر بھر میں ان کی استادی کا چرچا تھا۔ آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی لاہور سے جاری کیا جس کا نام "شمشیر قلم" تھا۔ خود ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا اور میانی صاحب کے قبرستان میں پیوند زمین ہوئے۔

خلیفہ محمد حسن آپ خلیفہ غلام محمد کے صاحبزادے اور مولوی سید احمد کے پوتے تھے۔ خوش نویسی کا فن اپنے باکمال چچا خلیفہ نور احمد سے سیکھا اور اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ پرانی طرز کے نہایت اعلیٰ لکھنے والوں میں تھے۔ سنگین سے سنگین کام نہایت عمدگی سے کرتے تھے۔ اپنے وقت کے بہترین خطاط تھے۔ مہاراجہ جموں و کشمیر نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ کشمیر کے طبقۂ اُمرا و رؤسا میں بھی خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چونکہ آپ استادوں کے خاندان سے تھے اس لیے تمام خوش نویس آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے۔ بڑے خوش باش، مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ خوش الحان بھی تھے۔ نعت خوب پڑھتے تھے۔ جب کوئی مسودہ لکھنے بیٹھتے تو اسے بلند آواز سے لے کے ساتھ پڑھتے جاتے۔ خوش خور بھی تھے۔ تھوڑا مگر عمدہ اور لذیذ کھانا پسند فرماتے تھے۔

آپ زیادہ تر جموں و کشمیر میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر مہینے دو مہینے کے لیے لاہور آ جاتے اور ڈیرہ کاتباں میں قیام کرتے۔ آپ کے بے شمار شاگرد ہیں جن میں حکیم مراد بخش اس وقت لاہور میں معروف ہیں۔ راقم الحروف نے ان سے بھی فیض پایا ہے۔ آپ نے جموں میں بعارضہ تشنج ۷۵ سال کی عمر میں ۱۶ نومبر ۱۹۳۷ء کو انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لاہور میں کاتبوں کی سٹرائیک کرا کے ان کی اجرتیں بڑھوائیں اور ان کی زندگی کا معیار بلند کیا۔ خلیفہ احمد حسن سہیل رقم جو مشہور خوش نویس، آرٹسٹ اور آرٹس کلاس کے لکچرار ہیں، آپ ہی کے فرزند ہیں۔

منشی عبدالغنی نھتو عبدالغنی نام تھا مگر اپنے عرف "میاں نھتو" ہی سے زیادہ مشہور تھے۔ کوچہ چابک سواراں اندرون لوہاری دروازہ میں رہتے اور مولوی سید احمد مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ درسی طرز پر ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور اصلاحیں آج بھی مبتدیوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کی ابتدائی شہرت انہی کے دم سے تھی۔ ان کے شاگردوں میں منشی عبدالغنی، منشی فرزند علی اور منشی سیتا رام قابل ذکر ہیں۔ حاجی دین محمد صاحب بھی ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ اپنے وقت کے بہترین خوش نویس تھے۔ تاریخ انتقال معلوم نہیں ہو سکی۔

منشی سیتا رام میاں نھتو کے شاگرد تھے اور بہت عمدہ لکھتے تھے۔ میاں نھتو کے ساتھ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں کام کرتے تھے۔ آخر وقت تک نوک پلک درست رہی۔ انھوں نے اصلاح کے قلم سے

چند قطعات لکھے تھے جو طبع بھی ہوئے تھے اور نستعلیق کا اچھا نمونہ تھے۔ یہ قطعات میرے پاس بھی تھے مگر کہیں کھو گئے۔

مولوی فضل الدین صحاف سکھوں کے وقت میں میاں پیر بخش کوفت گر فارسی کے نہایت اچھے خوش نویس تھے جن کی عزت تمام امرائے دربار بلکہ خود مہاراجہ تک کرتا تھا۔ اکثر امیروں کے لڑکے اصلاح لینے کے لیے ان کے مکان پر جاتے۔ وہ سب کو مفت اصلاح دیتے اور کسی سے کچھ نہ لیتے۔ اپنی گزر بسر کوفت گری[1] کے کام سے کرتے۔ مہاراجہ نے ملازمت چاہا کر نوکری قبول کر لیں مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ مولوی فضل دین صحاف انہی کے شاگرد تھے۔

آپ جو ہمیشہ معنی باقر میں رہتے اور خط نسخ و نستعلیق کے ماہر تھے مگر ان کی زیادہ تر شہرت خط نسخ کی وجہ سے تھی۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعات اور کتابوں کی بڑی قدر تھی۔ لوگ خوش ہو کر ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مدت تک اخبار کوہ نور میں کتابت کرتے رہے۔ پھر محکمہ ڈائرکٹری میں ملازم ہو گئے۔ اپنے شاگردوں سے نہایت مہربانی سے پیش آتے۔ اگر کوئی راہ چلتے بھی فن کے متعلق بات پوچھتا تو بتانے میں دریغ نہ کرتے اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو اصلاح دے دیتے۔ محکمہ میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ آخری زمانہ میں مطبع سرکاری کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۴ء تک زندہ تھے۔ ہمارے عہد کے علامہ علاؤ الدین صدیقی آپ ہی کے پوتے ہیں۔

میرزا احمد علی کشمیری آپ سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے اور اپنے والد میرزا صادق علی مرحوم کے شاگرد تھے۔ بڑے باکمال خوش نویس تھے۔ لاہور میں موچی دروازہ کے اندر ان کے عزیز رہتے تھے۔ یہ ان کے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کافی عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ اس دوران آپ نے بہت سے قطعے لکھے جن میں سے بعض آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میجر فقیر مغیث الدین کے پاس بھی ان کے کچھ قطعات موجود ہیں۔ موچی دروازہ کے اندر جہاں اب رہائش جدید ہے میرزا نیاز بیگ کا امام باڑہ تھا۔ اس میں میرزا احمد علی کے لکھے ہوئے سات قطعے تھے جو بہت بڑے بڑے تھے۔ چھ مصرعے چھ قطعات میں لکھے گئے تھے اور ایک طغرا تھا۔ یہ مصرعے فارسی کے تھے جن میں سے ایک یہ تھا۔ ع

گہ گہ بہ کنی بندر بال مگسی

ہر مصرع کی لمبائی کوئی ۱۰-۱۱ فٹ اور اونچائی $2\frac{1}{2}$ فٹ تھی۔ قلم $2\frac{1}{2}$ موٹا تھا۔ ہم نے یہ قطعات اپنے بچپن میں دیکھے جس وقت کچھ سمجھ نہ تھی۔ خطاط اعظم حاجی دین محمد صاحب کہتے ہیں کہ میں ان قطعات کو گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا اور طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ وہی قطعات میرے فن کی ترقی کا باعث ہوئے۔ افسوس کہ یہ قطعات بوسیدہ ہو جانے کے باعث ضائع ہو گئے اور آج کے خوش نویس ان کی زیارت سے محروم ہیں۔

حاجی دین محمد صاحب ۱۹۰۷ء میں کشمیر گئے تو وہاں میرزا احمد علی مرحوم سے بھی ملے۔ انھوں نے کھانے کی دعوت دی اور اپنے قطعات بھی دکھائے۔ حاجی صاحب متواتر سات گھنٹے ان قطعات سے آنکھیں روشن کرتے رہے یہاں تک کہ کھانے کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ حاجی دین محمد نے دو ایک موقعوں پر میرزا صاحب کو پھر لاہور بلانے کی کوشش کی مگر حالات چونکہ سازگار نہیں تھے اس لیے وہ نہ آ سکے۔ طبیعت قناعت پسند تھی۔ جو کچھ تھوڑا بہت وطن میں رہ کر مل جاتا تھا اسی پر ساری عمر گزار دی۔ آپ بڑے

---

[1] لوہے یا کسی دوسری دھات پر بیل بوٹے یا عبارت کھود کر اس میں سونا چاندی بھرنے کو کوفت گری کہتے ہیں۔

عابد اور زاہد بزرگ تھے۔ لاہور میں ان کے شاگردوں کی تعداد کم ہے۔ کیونکہ یہاں انھیں زیادہ عرصہ قیام کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی فتح علی ملتانی اور ملک صفدر علی قابلِ ذکر ہیں۔

فتح علی ملتانی آپ میرزا احمد علی کشمیری کے شاگردِ رشید اور بڑے کامل تھے۔ ابتدائے جوانی میں لاہور آ گئے یہاں سے فن کی تکمیل کے لیے میرزا صاحب کے پاس کشمیر چلے گئے اور برسوں ان کی خدمت میں رہ کر اصلاح لیتے رہے۔ فارغ ہونے کے بعد پھر لاہور آ گئے۔ یہ ان کے بڑے زور کا زمانہ تھا گتے کی سیاہی سے قطعات لکھنے کا سودا سر میں سمایا ہوا تھا۔ کام صرف اتنا ہی کرتے تھے جس سے دال روٹی چل سکے۔ ان کی رہائش محلہ شیعاں میں تکیہ سنتے شاہ کے بالمقابل بازار میں تھی۔ لاہور میں ان کے بیسیوں قطعے آج بھی موجود ہیں جو ان کی استادی اور مشاقی کے گواہ ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی ایک قطعہ جلی قلم میں موجود ہے جس میں لکھا ہے ؎

گر شیر در زمان بہار عدالتت
بیند رخِ غزالہ کہ از لالہ احمر است
ور نرگس تب کند کہ مبادا گماں کنند
کیں زردی از طپانچۂ ظلمِ غضنفر است

آپ چند روز کے لیے منشی عبدالمجید پروین رقم مرحوم کی بیٹھک اندرون لوہاری دروازہ میں چلے گئے تھے وہیں پلیگ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ دوست اس غریب الوطن بے کس کی لاش موچی دروازہ میں لے آئے اور غسل کفن کے بعد مومن پورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ سالِ وفات ۱۹۱۹ء ہے۔

میاں علی بخش میاں علی محمد عرف میاں علی بخش کربلائی لاہور میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے بعد تیرہ چودہ برس کی عمر میں میرزا امام ویردی کی شاگردی اختیار کی اور اس قدر مشق کی کہ استاد مانے گئے۔ خطِ نستعلیق، نسخ، طغرا، ناخن، شکستہ میں ماہر تھے۔ خطِ معکوس میں جگت استاد مانے گئے۔ ابتدا میں کوہ نور پریس میں ملازم تھے وہاں خطِ معکوس کا نمونہ طبع کرا کے اس برصغیر کے تمام معکوس نویسوں کو چیلنج کیا اور اپنا استادی کا لوہا منوایا۔ آج لاہور میں جتنے بھی معکوس نویس اور سنگ ساز ہیں ان کی شاگردی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح میاں علی بخش تک پہنچتا ہے۔

کوہ نور پریس بند ہو گیا تو میاں علی بخش رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں چلے آئے اور پھر ساری عمر وہیں عزت کے ساتھ رہے اور اعزاز کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے بیسیوں قطعات لاہور کے امام باڑوں میں موجود ہیں۔ ان کے شاگردوں میں مشہور معکوس نویس منشی صفدر علی، منشی رکن الدین، منشی اشرف علی، منشی معراج علی وغیرہ تھے۔ راقم خود بھی ان کے شاگردوں میں سے ہے۔

مطبع مفید عام سے سبکدوش ہونے کے بعد میاں علی بخش نوابان قزلباش کے بچوں کے دینیات کے اتالیق مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں انتقال کیا اور قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں دفن ہوئے۔ ان کے وقت میں سنگ سازوں کو اجرت کے بارے میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں اور انھوں نے کام بند کر دیا تھا۔ مگر رائے صاحب منشی

گلاب سنگھ نے میاں علی بخش کو بلا کر اختیار دے دیا کہ وہ اپنی اُجرتیں آپ مقرر کرلیں چنانچہ اُنھوں نے جو چاہا وہ ہوگیا۔

ملک صفدر علی آپ مرزا احمد علی کشمیری کے شاگرد تھے، عربی اور اُردو خوب لکھتے تھے۔ خطِ معکوس لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ تمام عمر مفید عام پریس میں گزاری۔ کچھ عرصہ شمس العلما مولوی سید ممتاز علی کے رفاہ عام پریس میں بھی کام کیا۔ اس زمانے میں مولوی سید احمد دہلوی کی کتاب فرہنگ آصفیہ چھپ رہی تھی۔ اس دوران ... پر کتاب کی صحت اس قابلیت اور خوبی سے کی کہ مصنف نے اعتراف کے طور پر مندرجہ ذیل خط لکھا :-

"حافظ صفدر علی صاحب مصحح سنگ رفاہ عام پریس نامور نے میری کتاب فرہنگِ آصفیہ کی جلد چہارم کے پتھر تقریباً نصف سے زیادہ بنائے۔ میرا خیال تھا کہ منشی علی بخش صاحب سے زیادہ اس کام میں دوسرا شخص مہارت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اوّل تو وہ گورنمنٹ بک ڈپو میں میرے ماتحت ۱۸۶۹ء میں رہ کر ہمیشہ تحسین و آفرین کے مورد رہے۔ دوسرے یہ کہ حافظ صاحب کے اُستاد بھی رہے ہیں لیکن چونکہ منشی علی بخش صاحب نے تقاضائے عمر سے یہ کام بالکل چھوڑ دیا ہے، اس وجہ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس وقت حافظ صفدر علی صاحب سے بہتر لاہور میں کوئی سنگ ساز نہیں ہے۔ اُنھوں نے صفحے کے صفحے میری کتاب کے از سرِ نو پتھر پر لکھ کر اکثر اوقات خط سے خط ملا دیا۔ غلطیوں کو نہایت احتیاط اور دیدہ ریزی سے بنایا بلکہ املا میں کہیں غلطی نہیں کی۔ انگریزی اور ناگری کے الفاظ بھی خوب بنائے۔ بس اس سے زیادہ کیا لیاقت ہوسکتی ہے؟ میں نے خوش ہوکر ان کو کچھ پان کھانے کے واسطے بھی دیا۔ لیکن میں خوش جب ہوتا کہ اس وقت ان کی خدمت جیسا دل چاہتا تھا ویسی کرسکتا اور مجھ کو اس وقت عسرت مانع نہ آتی۔ فقط" سید احمد دہلوی بقلم خود۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۰۱ء[1]

ملک صفدر نے ۱۹۲۲ء میں بعارضہ فالج انتقال کیا اور مومن پورہ میں دفن ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی محمد دین سلیمان علی اور سید محمد شاہ بہت اچھے خوش نویس تھے۔ مگر سب اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔

منشی عبدالمجید پرویں رقم آپ کے والد منشی عبدالعزیز اور دادا مولوی پیر بخش خوش نویس تھے جو امین آباد کے رہنے والے تھے۔ منشی عبدالمجید نے ابتدا میں خلیفہ نور احمد مرحوم سے اصلاح لی مگر بعد میں اپنے اکثر شاہکاروں پر اپنے نام کے ساتھ حکیم فقیر محمد چشتی کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ آپ پیدائش ہی سے ایسا دماغ لے کر آئے تھے جو کسی اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا۔ جو ہر گوشے سے متمتع ہوتا اور ہر خرمن سے خوشہ حاصل کرلیتا ہے۔

منشی عبدالمجید نے خداداد ذہانت سے فنِ خوش نویسی میں ایک نئی طرز ایجاد کی جو ان کے پیش رووں سے قدرے

۱۔ [illegible]

مخلف اور خوب صورت ہے۔ آج کا ہر خوش نویس اسی کی پیروی کر رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام کی کتابت کے لیے انھی کو پسند کیا۔ آپ کے لکھے ہوئے قطعات دلکشی میں بے مثال ہیں اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

منشی عبدالمجید لوہاری منڈی میں رہتے تھے۔ بڑے خوش پوش اور خوب صورت تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں بڑی نرم و نازک تھیں۔ یہی نزاکت ان کے فن میں بھی تھی۔ آخری عمر میں تصوّف کے غلبے کی وجہ سے کام چھوڑ کر دیا تھا۔ درود وظائف میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ لباسِ فاخرہ بھی ترک کر دیا تھا۔ نہایت سادہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بازار میں بھی چلتے تو تسبیح ہاتھ میں ہوتی تھی۔ آخر یہ گوہر آبدار ۱۹۴۳ء میں قریباً ۷۵ برس کی عمر پا کر اور اپنے فن کا لوہا منوا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

آپ کے بے شمار شاگرد ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ آج کا ہر خوش نویس طرز کے لحاظ سے انھی کا پیرو کار ہے۔ آپ کے صاحبزادے منشی محمد اقبال ہیں جنھوں نے مزارِ اقبال کے فارسی اشعار بڑی خوبی سے لکھے ہیں۔ شاہ ایران نے انھیں پسند فرما کر "خوش نویسی خوب است" کے جملے سے داد کمال دی ہے۔

منشی غلام محمد ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ریلوے ٹیکنیکل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے نامور باپ خطاطِ اعظم حاجی دین محمد سے خوشنویسی کی اصلاح لی۔ انھوں نے اپنی تمام خوبیاں اپنے اکلوتے بیٹے میں منتقل کر دیں۔ والد کے ساتھ کام شروع کیا۔ خوش نویسی، بورڈ نویسی، ڈرائنگ نقاشی بلکہ بڑھئی تک کا کام بھی کر لیتے تھے۔ خوش نویسی میں نسخ نستعلیق اور طغرا وغیرہ یکساں مہارت اور تیزی سے لکھتے تھے۔ بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں حاجی دین محمد صاحب حیدر آباد دکن گئے ہوئے تھے کہ یہ بیمار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

منشی فضل الٰہی مرغوب رقم چوک متی میں ان کی بیٹھک تھی۔ خوب لکھتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں مولانا حالی، مرزا ارشد گورگانی، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی، خان احمد حسین خان، آغا حشر کاشمیری، میر غلام بھیک نیرنگ، خواجہ دل محمد اور دوسرے بلند پایہ شاعر جو نظمیں پڑھتے تھے، وہ پڑھنے سے پہلے طبع کرا لی جاتی تھیں۔ منشی مرغوب رقم ان سب کی کتابت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام بہت مشہور ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں دیکھ کر آج بھی جی خوش ہوتا ہے۔

قاضی فضل حسین کوچہ قاضی خانہ میں رہتے تھے۔ بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ دائیاں ہاتھ کسی وجہ سے بیکار ہو گیا تھا۔ بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ آج سے چالیس سال پیشتر زندہ تھے۔ قطعات بھی لکھتے تھے۔ جن کے نیچے نام یوں ہوتا تھا:-

"کاتب الحروف فضل حسین بدست چپ"

ان کا ایک قطعہ فقیر سید مغیث الدین کے ذخیرۂ نوادرات میں موجود ہے۔

مولوی نور الدین۔ منشی عبد الحفیظ شاہ عالمی دروازہ کے اندر مسجد موراں کے بالمقابل کوچہ ڈوگراں کی طرف ایک اور مسجد ہے جس کے امام مولوی نور الدین نے خوش نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا یا ہوا

تھا۔ وہ منشی گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے میں ملازم تھے اور میاں نظو کے ہونہار شاگرد تھے۔

مولوی نور الدین نے اپنے فرزند عبدالحفیظ کو مجتہدِ فن منشی عبدالمجید پروین رقم کا شاگرد کرایا اور وہ نہایت اچھا لکھنے لگا۔ خیال تھا کہ پختگی کی عمر کو پہنچ کر اُستادوں میں شمار ہوگا مگر یہ ہونہار خوش نویس عین جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرحوم منشی تاج الدین زرّیں رقم اور راقم خاکسار کا ہم مکتب و ہم جماعت تھا۔ ہم تینوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں برسوں زیرِ تعلیم رہے۔ وفات کے وقت حفیظ مرحوم کی عمر بمشکل ۳۰ برس ہوگی۔

تاج الدین زرّیں رقم

منشی تاج الدین زرّیں رقم ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی دروازہ لاہور میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے ماموں الحاج منشی نور احمد صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور برسوں مشق کرتے رہے۔ ابتدا میں بچوں کا ہفتہ وار اخبار نونہال لکھتے تھے۔ جو ان دنوں جناب حکیم احمد شجاع صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں "مرقعِ زرّیں" کے نام سے اپنی اصلاحیں اور رباعیات طبع کرائیں جو بڑی شہرت کا باعث ہوئیں۔ مرقعِ زرّیں، مبتدیوں سے لے کر صاحبِ فن حضرات تک رہبری کا باعث بنا۔ اسی سال خوش نویس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے خوش نویس یونین کی شاخیں قائم کرنے کے لیے ملک بھر کا کامیاب دورہ کیا۔ دِلّی ۔ بمبئی ۔ حیدرآباد دکن ۔ پشاور اور کراچی تک گئے۔ خوشنویسوں کو ایک باوقار مقام عطا کرنے کے لیے شب و روز کوشاں رہے۔ یہ آپ ہی کی اَن تھک مساعی کا نتیجہ تھا کہ اخبارات کے کاتبوں کی اُجرتیں دوگنا بلکہ چار گنا ہو گئیں۔ ان کی مساعی سے خوشنویس یونین اتنی مضبوط تھی کہ خوشنویسوں کے کسی ایک معاملہ میں ملاپ اور پرتاپ سے ٹھن گئی اور مالکانِ اخبار کسی طرح خوشنویسوں کے مطالبات ماننے کے لیے راضی نہ تھے۔ چنانچہ صدر کی حیثیت سے منشی صاحب نے مالکان سے کہہ دیا کہ یا تو ہمارے مطالبات مان لیجیے ورنہ فلاں تاریخ کو خوشنویس ہڑتال کر دیں گے اور آپ کے اخبارات شائع نہ ہو سکیں گے۔ مالکان تُلے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ گورنمنٹ تو ہمارے اخبارات بند نہ کرا سکی۔ آپ کیا کرائیں گے۔ بعد میں پرتاپ سے کوئی سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اس لیے محاذ کا رُخ صرف ملاپ کی طرف رہا ——— مگر صحافتی دنیا نے دیکھ لیا کہ مالکان کی ہزار جدوجہد کے باوجود ملاپ جیسا بڑا اخبار شائع نہ ہو سکا ——— غرض کہ جہاں کسی خوشنویس کو کوئی مشکل پیش آتی یہ وہاں اس کی امداد کو پہنچتے۔ فن اور فن کار کی جتنی خدمت انھوں نے کی۔ وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

آپ خفی، جلی، نسخ، نستعلیق اور ثلث وغیرہ نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ بڑے بڑے بورڈ اور پوسٹروں کے عنوان آنکھ جھپکنے میں لکھ ڈالتے تھے۔ جلی لکھنے اور تیز لکھنے میں ان کا کوئی مثیل پیدا نہ ہوا۔

آپ نے ایک مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بے شمار قطعات لکھے۔ (تقریباً دو سو) آپ کا خیال اپنے شاہکاروں کی نمائش منعقد کرنے کا تھا۔ مگر یہ کام ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے رہ گیا۔ ضرورت ہے کہ اب کوئی انھیں یکجا کر کے ان کی نمائش اور اشاعت کا بندوبست کرے۔ سنا ہے کہ مرحوم کے ایک فرزند نے انھیں نہایت ہی قلیل اُجرت پر کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے ——— ۴۵ برس کے سن میں ۱۳ رجون ۱۹۵۴ء کو عارضہ دماغ خون و فالج انتقال کر گئے۔ آپ کے شاگردوں اور مداحوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں حافظ یوسف، صوفی خورشید اور سید انور حسین نفیس رقم بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

منشی اشرف علی آپ میاں علی بخش کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ عربی اردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ عبارت کو پھول پتوں سے سجانا بھی جانتے تھے۔ خطِ معکوس میں بھی ماہر تھے۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات ان کے عزیزوں کے پاس موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں وفات پائی اور مومن پورہ میں دفن ہوئے۔

خلیفہ عزیز الدین شاہ عالمی دروازہ کے اندر مسجد موراں میں کتابت کرتے تھے۔ غالباً میاں نتھو کے شاگرد تھے۔ پہلے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام میں کام کرتے تھے۔ بعد میں لالہ عطر چند کپور کے درسی سلسلہ کی کتابت کرنے لگے۔ بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ میانی صاحب کے قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

حکیم محمد چراغ حکیم غلام علی کے فرزند اور منشی عبد الغنی تنخو کے شاگرد تھے۔ جو بٹی کابلی مل ڈبی بازار میں رہتے تھے تمام عمر مطبع مفید عام میں گزاری۔ قیامِ پاکستان کے بعد نتعا ضائے سن کام چھوڑ دیا تھا اور صرف طبابت کرنے لگے۔ درسی کتب نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ خطِ نسخ اور نستعلیق میں بڑے پختہ مشق تھے۔ مسطر کشی میں کمال حاصل تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی اور میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

منشی اسد اللہ خاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے جوانی میں لاہور آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو گئے۔ اپنی طرز کے واحد لکھنے والے تھے۔ ان کی لکھائی پر دہلی کا اثر غالب تھا۔ درسی کتب کی کتابت کرنے والوں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ قطعات بھی لکھتے تھے مگر رباعی کے قلم سے موٹا کم ہی لکھا ہے۔ دیوانِ غالب مرقع چغتائی کا مصور ایڈیشن آپ کے کمالِ فن کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ انجیل وغیرہ کی کتابت بھی خوب محنت سے کی۔ نہایت با اخلاق اور شریف الطبع تھے۔ بازار سریانوالہ نزد کشمیری بازار میں رہتے تھے۔ ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولوی عبد الرشید عادلی ان کا لقب محبوب الرقم تھا۔ عربی فارسی کے اچھے فاضل اور بہت مشہور خطاط تھے۔ شعر و ادب کا مذاق بھی رکھتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں موضع عادل گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ برس کی عمر میں عربی خط کی مشق شروع کی۔ زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ اڑھائی مہینے میں پورا قرآن مجید لکھ لیا کرتے تھے۔ دس برس تک پشاور میں رہنے کے بعد لاہور آئے ۲۵ برس یہاں رہے۔ ساٹھ برس فن خطاطی کی خدمت کی۔ بینائی اتنی اچھی تھی کہ آخری عمر تک چشمہ استعمال نہیں کیا۔ ۸۵ برس کی عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اپنے گاؤں عادل گڑھ چلے گئے۔ جہاں تین برس تک بیمار رہنے کے بعد ۲۹ نومبر سنہ ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ مرحوم نسخ کی ایک خاص طرز کے مالک تھے جسے عادل گڑھی طرز کہتے ہیں۔

مولوی محمد عبد اللہ وارث کوٹ ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ تمام عمر لاہور میں قرآن پاک کی کتابت کرتے رہے۔ بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ان کی طرز عادل گڑھی طرز سے قدرے مختلف تھی۔ انھوں نے بیسیوں قرآن مجید لکھے نستعلیق بھی لکھتے تھے مگر زیادہ تر نسخ ہی کی طرف توجہ رہی۔ لاہور ہی میں فوت ہوئے۔ ان کے فرزند عنایت اللہ نے انجمن خدام الدین کا قرآن مجید بڑی محنت سے لکھا ہے۔

میر قمر زند علی آپ بھی میاں عبدالغنی ننھو کے شاگرد تھے۔ مدت العمر پھول اخبار اور دارالاشاعت لاہور کی کتابیں لکھتے رہے۔ آپ کی لکھائی نہایت واضح ہوتی تھی۔ پیوند کھول کر لگاتے تاکہ بچے پڑھنے میں دقت محسوس نہ کریں۔ بڑے خوش وضع، خوش پوش، خوش خور اور مہمان نواز تھے۔ خط منحنی بھی جانتے تھے۔ ۸۰ برس کی عمر پا کر ۱۹۵۵ء میں بعارضہ سرطان فوت ہوئے۔

سلیمان علی موچی دروازہ کے اندر رہتے تھے۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ درسی کتابیں نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ بڑے محنتی تھے۔ سنگ سازی میں بھی ماہر تھے۔ ملک صفدر علی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ۵۵ برس کی عمر پا کر بعارضہ نمونیہ انتقال کیا۔

منشی محمد انور آپ غالباً خلیفہ نور احمد مرحوم کے شاگرد تھے۔ نہایت دبلے پتلے، قد چھوٹا، کمر کسی وجہ سے کبڑی ہو گئی تھی۔ چوک متی میں ان کی بیٹھک تھی۔ برسوں وہاں رہے۔ رسالہ ہمایوں کی کتابت کرتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ بڑے شگفتہ مزاج اور سخن فہم تھے۔ آخری عمر میں حضری شاہ جا رہے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔ ان کے دو بھائی منشی محمد افضل اور منشی محمد عالم بھی خوش نویس تھے جو ڈیرہ کاتباں میں کام کرتے تھے اور پنڈت ٹھاکر دت شرما موجد امرت دھارا کے خاص کاتب تھے۔

منشی رحمت علی موچی دروازہ میں رہتے اور ڈیرہ کاتباں چوک متی کے سردار محمد عالم کے شاگرد تھے۔ نہایت صاف ستھرا اور عمدہ خط تھا۔ آخری عمر میں دارالاشاعت لاہور میں سید امتیاز علی تاج کی کتابیں وغیرہ لکھتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہایت صاف ستھری چھپتی تھیں۔ انارکلی، الحمرا اور لیلیٰ عرف محاصرۂ غرناطہ کی کتابت ایسی عمدگی سے کی کہ معلوم ہوتا ہے آفسٹ پر چھپی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں تقریباً ۶۴ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

منشی جمیل احمد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، درمیانہ قد، چھوٹا سر، دبلا پتلا جسم، بے حد کم گو اور محنتی تھے۔ لڑکپن ہی میں لاہور آ گئے تھے۔ شیرانوالہ دروازہ سے جو راستہ پرانی کوتوالی کو آتا ہے اس میں ایک دکان لے کر رہتے اور کتابت کرتے تھے۔ ان کے پاس ہی محمود حسین پینٹر کی دکان تھی جو خوش نویس بھی بڑے اچھے تھے اور حاجی دین محمد کے شاگرد تھے۔ اسی جگہ کریمی پریس بھی تھا جو اس زمانے میں حسنِ طباعت کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔

منشی جمیل احمد نے یہاں رہ کر بڑی ترقی کی۔ لکھنے کی طرز پنجابی تھی۔ پھول پتے بھی خوب بناتے اور اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ آراستہ و پیراستہ کرتے تھے۔ رسالہ عالمگیر برسوں لکھتے رہے۔ ان کے پوسٹر بہت ہی دلکش ہوتے تھے اور بے حد پسند کیے جاتے تھے۔ کریمی پریس کے یہاں سے اُٹھ جانے کے بعد یہ بھی لائن سبحان خاں میں مولوی احمد علی صاحب کی مسجد کے پاس ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ قیام پاکستان سے قبل کثرتِ کار کے سبب دق کا شکار ہو گئے۔ عمر کوئی زیادہ نہ تھی۔

منشی فضل الٰہی کیمبل پور کے رہنے والے تھے۔ بچپن ہی میں لاہور آ گئے۔ منشی عبدالمجید پروین رقم کے شاگرد ہوئے اور بہت اچھا لکھنے لگے۔ ہر قسم کا کام بڑی عمدگی سے کرتے تھے۔ برسوں لاہور میں رہے مگر آخری عمر میں پھر کیمبل پور چلے گئے۔ وہیں پچھلے برس انتقال کیا۔ میرے خیال میں ان کی عمر ۵۵ یا ۶۰ برس ہو گی۔ رنگ گورا، نقش تیکھے، قد لمبا، بڑے خوبصورت اور خوش پوش تھے۔ کانوں سے بہرے تھے۔ بات کرنے میں زبان رکتی تھی۔ آواز نہایت باریک تھی مگر تھے بڑے ذہین۔ بات کرنے والے

کے لبوں کو ہلتا دیکھ کر مطلب سمجھ جاتے تھے یا اپنے ہاتھ کی ہتھیلی مخاطب کے آگے کر کے اس پر انگلی سے اپنا مطلب سمجھانے کو کہتے تھے۔ وہ انگلی سے لکھتا جاتا اور یہ جواب دیتے جاتے۔

صبی بن قوی مولانا قوی امروہی بڑے فاضل ادیب شاعر اور خوش نویس تھے۔ دہلی سے رسالہ سوز و ساز نکالتے تھے۔ کتابت اتنی باریک اور سنگین کرتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھی۔ صبی ان کے فرزند تھے۔ خوش نویسی کا فن اپنے باکمال باپ سے سیکھا اور نوجوانی ہی میں لاہور چلے آئے۔ نہایت دبلے پتلے، لمبے تڑنگے، سانولے سلونے خوبرو نوجوان تھے۔ رسالہ ادب لطیف کی کتابت کرتے تھے۔ زیادہ تر باریک ہی لکھتے تھے۔ خط بڑا مضبوط اور سنگین تھا۔ جوانی ہی میں بعارضۂ دق انتقال کیا۔

یہ لاہور کے چند باکمال خوش نویسوں کا مختصر سا تذکرہ ہے جو اس دنیا سے عالمِ بقا کو سدھار چکے ہیں۔ اور بھی کئی قابلِ ذکر شخصیتیں ہوں گی جن کے حالات تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ بہرحال اتنا تو ہو گیا کہ اس موضوع پر جو بھی قلم اٹھائے گا اسے تھوڑا بہت مواد اس مضمون سے حاصل ہو جائے گا۔

لاہور میں اب بھی خوش نویسوں کی کمی نہیں۔ بلکہ شاید پاکستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہی ہوں گے۔ ایک سے ایک بہتر اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں بے مثال۔ انھوں نے کتابوں اور اخباروں کی کتابت کا معیار جتنا بلند کر دیا ہے اس سے پہلے ایسا کبھی نہ تھا۔ آنے والی نسلیں ان پر فخر کریں گی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ اسی طرح عزت اور احترام سے کریں گی جس طرح آج ہم اپنے بزرگوں کا کر رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے چند بڑے خوشنویس یہ ہیں: حاجی دین محمد۔ محمد شریف ابن سلطان القلم منشی محمد حسین (شاہ)۔ انور حسین نفیس رقم۔ منشی محمد صدیق الماس رقم۔ حافظ محمد یوسف سدیدی۔ محمود اللہ صدیقی۔ صوفی خورشید عالم۔ محمد شریف عباسی۔ محمد اقبال عباسی۔ اقبال ابن پروین رقم۔ پیر عبدالحمید۔ مولوی محمد حسین عالیؔ۔ احمد حسین سہیل رقم۔ خوشی محمد خوش رقم۔ صوفی نور الحسن۔

"نقوش" کی کتابت کرنے والے خوش نویس: ——— محمد سرور صدیقی۔ حامد محمود۔ سیف اللہ سیف رستم۔

اور سنگ ساز ——— منشی محمد حسین صاحب کپور آرٹ والے، محمد دین، محمد عمران۔

———

چند بڑے ادیب

سیّد عابد علی عابدؔ

اصل مضمون کو شروع کرنے سے پہلے کچھ باتوں کی توضیح مجھ پر واجب ہے۔ ایک تو یہ کہ "ادیب" میں نے اس کلمے کے وسیع ترین معانی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ انشا پرداز، شاعر اور ادب کی سرحدوں کو چھونے والے صحافی بھی ان میں شامل ہیں۔ وہ انتقاد بھی تخلیقی ادب ہے۔ جو اپنے اسلوبِ نگارش اور رفعت و عظمتِ معانی کی مطابقت اور اعتبار سے تبصروں، تقریظوں، تمہیدوں اور دیباچوں سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جس کی صراحت لازم ہے وہ یہ ہے کہ کوشش یہی کی گئی ہے کہ تاریخی ترتیب قائم رہے۔ لیکن نقوش کے فاضل مدیر نے میرا دائرہ عمل یوں متعین کر دیا کہ جن لوگوں کا میں ذکر کروں۔ ان کا ادبی مقام متعین و مشخص کر دوں۔ مقصود فقط یہ ہے کہ جن ادیبوں کا میں ذکر کروں، اردو ادب میں ان کے رتبے اور مقام کی نشاندہی کر دوں۔ ادبی مقام کا تعین اصولِ انتقاد کے مطابق کیا گیا ہے لیکن جزئیات میں اختلافِ رائے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے آپ کے پسندیدہ ادیب کا مقام میں نے آپ کی دانست میں صحیح متعین نہ کیا ہو تو خفا ہونے سے پہلے اس بات پر غور فرما لیجیے کہ یہ میری ذاتی رائے کا اظہار ہے (ہر چند کہ بنیادی امور میں اصولِ انتقاد کا پابند ہے) یہ بات میں نہایت تفصیل سے اپنی تالیف اصولِ انتقادِ ادبیات میں کہہ چکا ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جن ادیبوں کا اس مضمون میں ذکر ہے۔ ان کی علمی اور ادبی زندگی یا اُس کا کوئی پہلو لاہور سے مربوط ہے۔ لاہور نے اُن سے فیض اٹھایا ہے اور وہ لاہور کے علمی ماحول سے متاثر ہوئے ہیں یا پھر وہ بکثرت لاہور آتے جاتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ادیب بھی شامل ہیں جن کا وطن ہی لاہور ہے۔ کچھ ادیب ایسے ہیں کہ ملازمت میں برصغیر پاک ہند کے اُس حصّے سے لاہور آئے جسے اب بھارت کہتے ہیں۔ اور کچھ عرصہ یہاں رہ کر چلے گئے، لیکن لاہور کا سینہ ان کی یادوں کا خزینہ ہے۔ انھوں نے بھی لاہور کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور اپنی تحریروں میں کبھی محبت سے اور کبھی حسرت سے لاہور کا ذکر کرتے رہے۔ جو پرانے وقتوں سے علم و فضل کا مصدر و ماخذ رہا ہے۔ اور جہاں ادب نے نت نیا رنگ بدل کر بتایا ہے۔ کہ اس دیار کا علمی اور ادبی مزاج جامد و ساکت نہیں۔ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ یہی زندگی کی علامت ہے۔ غزنویوں کے زمانے سے لے کر جو آلِ سلجوق کے فشار سے مجبور ہو کر پنجاب چلے آئے تھے۔ آج تک (کہ ۱۹۶۲ کا آغاز ہے) یہاں متنوع، متعدد اور مختلف و متضاد ادبی تحریکات پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی ہیں اور ہمیشہ تمام مل کر ایک جُو کی کل ہو گئی ہیں۔ جو اپنے دامن میں ہر تنوّع اور تغیر کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ شاید لاہور ہی کے لیے کسی نے کہا ہے۔ ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (ولادت[1] سنہ ۱۸۳۳ء)

ادب میں ان کا مقام متعین کرنے سے پہلے یہ حق بات میں کہہ دینی چاہیے کہ پنجاب میں اردو کو جو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کے مختلف عوامل و محرکات میں آزاد کی بے چین اور بے قرار طبیعت بھی تھی۔ جو ادب کے مختلف شعبوں میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مرزا محمد سعید (جو کبھی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے استاد تھے اور جن سے احمد شاہ بخاری مرحوم (پطرس) نے بہت فیض اٹھایا ہے) یہ کہتے ہیں کہ آزاد کے اسلوب نگارش کی انفرادیت مسلم ہے۔ لیکن یہ انفرادیت ایسے مقام تک جا پہنچی ہے کہ کوئی ادیب ہزار کوشش کے باوصف اس کا تتبع نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب ان کے ساتھ ہی پروان چڑھا اور ساتھ ہی اردو ادب کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بن کر نوادر میں شامل ہو گیا۔

اگر ادب کے عجائبات تاریخی بھی متعین کیے جا سکتے ہوں، تو آزاد کے اسلوب کو انہی عجائبات و طلسمات میں شمار کرنا پڑے گا۔ مرزا صاحب کا یہ قول کہ آزاد کا تتبع نہیں کیا جا سکتا درست ہے لیکن ان کے کلام سے جو یہ تبادر ہوتا ہے کہ یہ اسلوب بے ثمر رہا کہ کوئی اس کی تقلید نہ کر سکا یہ بات محل نظر ہے۔ آزاد کے اسلوب کا تجزیہ کرنے سے پہلے میں یہ بات بہ وضاحت کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر آزاد کا اسلوب نگارش ہمارے سامنے نہ ہوتا تو ہم یہ کبھی نہ جان سکتے کہ انداز تحریر۔ اسلوب نگارش یا ابلاغ و اظہار کا طریق مخصوص جسے انگریزی میں STYLE (سٹائل) کہتے ہیں کیا چیز ہے۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اسلوب کی انفرادیت کس مقام تک پہنچ سکتی ہے اور نقادوں کا یہ دعوےٰ کہ بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ انتقادی فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے کہ فلاں تحریر فلاں ادیب کی ہے یا مجہول ہے۔ بقطع و تیقن درست ٹھہرا۔ یہ بڑی بات ہے کہ ہم نے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صاحب طرز انشا پرداز کا رنگ ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔

میرے خیال میں (ان کے علمی و ادبی کارناموں سے قطع نظر) آزاد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلوب کی اہمیت ہم پر واضح کر دی اور طرز نگارش کی انفرادیت کو یہاں تک لے گئے کہ ان کی نثر دوسرے انشا پردازوں کی نثر سے بیک نظر جدا کی جا سکتی ہے۔ اسلوب کی انفرادیت کا یہ نمونہ سامنے نہ ہوتا تو بیشتر ادیب اس نکتے سے بے خبر رہتے کہ تخلیقات ادبی میں اظہار ذات کی تکمیل تبھی ہوتی ہے کہ نگارش میں انفرادیت ہو۔ اسلوب میں کچھ خصوصیات ہوں۔ جو دوسروں کے اسلوب میں بیک وقت اس طرح نظر نہ آئیں۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کے اسلوب نگارش کے وہ اجزا کیا ہیں۔ جن سے ان کی انفرادیت متعین ہوتی ہے تو میں یہ بات واضح کر دوں کہ نقاد کا زور بیان صرف اسلوب کی خصوصیات کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کر سکتا کہ اسلوب کا تجزیہ یوں کرے کہ آپ بھی انہی خصوصیات سے متصف ہو کر محمد حسین آزاد بن جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جو یہ کوشش کی تھی کہ اردو ایک علمی زبان بن جائے اور ہر قسم کے مطالب و معانی کو بوجہ احسن ادا کر سکے۔ آزاد بھی اسی تحریک کے علمبرداروں میں سے ہیں۔ لیکن ان دونوں ادیبوں کے نقطہ ہائے نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سر سید احمد خاں چاہتے ہیں کہ مطالب علمی و تحقیقی سلیس اور رواں زباں میں ادا ہو جائیں۔ وہ اظہار معانی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اگر کہیں کہیں نثر سپاٹ ہو جائے تو اسے بھی گوارا کر لیتے ہیں کہ ابلاغ میں فرق نہ آئے۔ گویا ان کا اسلوب نگارش پرانے مرصع اسلوب کی ضد ہے۔ اس کے برخلاف آزاد کی روش یہ ہے کہ وہ زبان جو محض مرصع نگاری تھی اسی کو تمام مطالب کے اظہار ابلاغ کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کوشش میں انھیں جو کامیابی ہوئی اس کے عوامل اور محرکات کا ڈھونڈھنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ ذوقؔ کے شاگرد تھے جو زبان کا ماہر تھا۔ اور اردو کے محاورات

---

[1] مدمد شعرائے اردو

پہچان تمام رکھتا تھا۔ شعری روایت کی تمام نزاکتوں اور دلالتوں سے باخبر تھا۔ اس کے باوصف اس کی زبان میں خاص گھلاوٹ تھی جسے فراق اُردو پن کہتے ہیں۔ یہ گھلاوٹ شیرینی اور رس ذوقؔ کے مطلعوں میں بہت نمایاں ہے۔ مثلاً

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدہ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

بوسے کے مانگتے ہی پھیر نے چتون کو گئے　　ایسے کیا لعل لب غیرت گلشن کو گئے

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

داغؔ نے اسی گھلاوٹ اور رس کو تیکھا پن بخشا۔ اور اپنے لہجے میں وہ ڈرامائی اسلوب پیدا کیا۔ جو اس سے مخصوص ہے۔ آزادؔ نے داغؔ کی طرح گھلاوٹ۔ رس۔ شیرینی اور اُردو پن تو ذوقؔ سے لیا۔ لیکن انھوں نے کلاسیکی شاعری کے جتنے علائم و رموز تھے۔ پیش نظر رکھے۔ استعارات اور تشبیہات کو یوں اپنے کلام میں سمو دیا کہ گھلاوٹ اور رس میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ لیکن ایک منفرد اسلوب وجود میں آیا جس میں قدیم انشا پردازوں کی مرصع نگاری کے تمام اجزائے خوب و محبوب موجود تھے۔ لیکن جس میں تکلف نام کو بھی نہ تھا۔ واضح رہے کہ آزادؔ کے اسلوب کی بے تکلفی بظاہر بے تکلفی نظر آتی ہے۔ وہ اظہار مطلب و معانی کے لیے بڑا سر کھپاتے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ کہ "آدھی رات کو چراغ جلا کر اپنی تحریر سے فضا کو روشن کر دیتے ہیں" ان کی کوشش یہ تھی اور وہ اس میں بدرجہ اتم کامیاب ہوئے کہ نفس مضمون ادبی ہو یا علمی۔ تحقیقی ہو یا انتقادی۔ اسلوب ایسا مرصع۔ دلکش اور دلپذیر رہے کہ پڑھنے والا اردو زبان کی ممکنات سے بوجہ احسن آگاہ ہو جائے۔ آزادؔ کو فارسی پر تو عبور تھا ہی۔ عربی کے استاد تھے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں ان کی نشست میں۔ پھر جملوں کی ترتیب میں اتنی جانکاہی سے کام لیتے ہیں کہ وہی شخص دراصل ان کے کمال سے واقف ہو سکتا ہے جو الفاظ کی تمام دلالتوں سے آگاہ ہو اور نفس مضمون سے کما حقہٗ آگاہ ہو۔

دوسری بات جو آزادؔ کے اسلوب کی ایک خصوصیت ہے یہ ہے کہ وہ تصویر نگاری میں پیکر تراشی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ "آب حیات" ہو یا "قصص ہند" "نیرنگ خیال" ہو یا "دربار اکبری" جہاں وہ کسی کردار کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ دو تین فقروں میں ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ کردار جیتا جاگتا۔ روشن اور ہنستا بولتا نظر آتا ہے۔ آب حیات کی مقبولیت کا یہی راز ہے کہ اس تذکرے میں سیاسی اور معاشرتی فضا کا پس منظر ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کردار تمام زندہ ہیں۔ ان کی طلسم کاری کا ثبوت اس سلسلے میں اس سے زیادہ کیا ہو گا۔ کہ انھوں نے غلط بات بھی لکھ دی تو پتھر کی لکیر ہو گئی۔ ذوقؔ کو غالبؔ سے بلند تر مقام پر بٹھا دیا۔ اور ابھی تک بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اسی فیصلے پر قانع ہیں۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) اور انارکلی کی داستان (کبوتروں والا قصہ) مختصر سے لفظوں میں ایسی قلمبند کیں کہ اس افسانے کی تردید میں بعض محققوں کو صدہا صفحات لکھنا پڑے۔ پھر بھی اس افسانے کی فسوں طرازی قاری کو مبہوت کئے دیتی ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ آزادؔ کی بے قرار اور بے چین طبیعت ہر صنفِ ادب سے عہدہ برآ ہونا چاہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ

نثری کارناموں کے علاوہ جدید نظم کی منظم تابیس کا سہرا انہی کے سر باندھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ ایک شخص جو اصلاً نثر نگار ہو اور قدیم انشا پردازی کے ماحول میں پلا ہو بے قافیہ نظم بھی لکھے۔ ان کی تالیف نظم آزاد اردو میں ایک کارنامہ ہے۔ انھوں نے پہلی بار اس سلسلے میں اُردو کی ممکنات کی وضاحت کی۔ جدید نسل آزاد کے فیض سے مستفید ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی نسل ایسی نہ ہوگی جو آزاد کے کارناموں سے متاثر نہ ہو۔

ان کے اسلوب کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے سلسلے میں ان کے مقام کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن اب بتصریح لکھتا ہوں کہ سرسید نے جو تحریک شروع کی تھی۔ اس کے علمبرداروں میں آزاد کو میں پہلا مقام دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ہر تخلیق کو ادبیت کے مقام جلیل تک پہنچا دیا۔ ذرا غور فرمایئے لسانیات میں "سخندان فارس" تاریخ میں "دربار اکبری" تذکرے میں "آب حیات" مثالیہ[1] (ALLEGORY) میں "نیرنگ خیال" درسیات میں "قصص ہند" یہاں تک کہ گرامر میں جامع القواعد (فارسی زبان سے متعلق لیکن اُردو میں لکھی ہوئی) ان سب کتابوں کا اسلوب ایسا ہے کہ تحقیق بھی اور انتقاد بھی تاریخ بھی اور تدریس بھی ادب کا پیرہن زرنگار پہن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے اس تنوع کو دیکھئے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آزاد انیسویں صدی کے اواخر کے یا بیسویں صدی کے اوائل کے سب سے بڑے انشا پرداز تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ادبیت سے رنگین ہے۔ بے شک "آب حیات" پر اعتراضات ہوئے۔ "قصص ہند" بھی اغلاط سے خالی نہیں۔ "دربار اکبری" میں بھی شخصی رجحان کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ "سخندان فارس" میں جو ابواب خالص لسانیات سے متعلق ہیں۔ وہ اب زیادہ کام کے نہ رہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ان تمام تصانیف کی ادبی حیثیت سے اور ان کے مقام جلیل سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ انشا پردازی اس مقام تک تو پہنچی ہوئی ہو کہ مولف غلط لکھے اور پھر بھی پیارا ہو بلکہ ادب کی آنکھ کا تارا ہو۔ ان کے تنوع کو شرر نے اپنایا لیکن مولوی مدن کی سی بات "پیدا نہ ہوئی۔ ان کا تذکرہ "آب حیات" حافظ محمود شیرانی کی تنقید کے باوصف ایسی کتاب ہے کہ اُسے پڑھ کر اردو کے شعری سرمایے کا مزید مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فکری تنوع کی حد ہو گئی کہ ادھر آزاد نظم جدید کے موسس ہیں۔ ادھر اردو میں لسانیات پر پہلی تصنیف کے مولف ہیں۔ اور ساتھ ہی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں توقیف[2] کے اصول مدون کرتے ہیں۔ آخر بات یہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کا سب سے بڑا انشا پرداز صاحب طرز اور فسوں پرداز مولف آزاد ہے۔ اس کی تقلید ناممکن ہے اور اس کی تردید ممکن۔ لیکن جو شخص اس کی انشا پردازی کی فسوں گری سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ بے ذوق ہے۔ اقتباس دوں تو کس کتاب سے دوں کہ شاداب اور شگفتہ پھولوں کا ایک باغ ہے جو سامنے ہے۔ کسے توڑوں کسے چھوڑوں۔ تاہم "آب حیات" جسے انتقاد کے سلسلے میں معمولی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں سے سودا کے متعلق جو انھوں نے لکھا ہے اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ ان کا انتقادی شعور کتنا بلند اور ذوق سلیم کتنا صحیح تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے

---

[1] مولوی عبدالحق نے ALLEGORY کا ترجمہ مثالیہ کیا ہے۔ یہ تسلی بخش نہیں۔ لیکن بکثرت استعمال کیا گیا تو اصل کلمے کی دلالتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی۔ ترجمہ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ قریب ترین لفظ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

[2] PUNCTUATION (علامات اوقات کی تعیین)

> جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی - بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس
> دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں - گویا ولایتی طپنچہ کی جانیں چڑھی ہوئی ہیں - اور یہ
> خاص ان کا حصّہ ہے - چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی
> لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا؟ (بہ انتخاب)

ارباب نظر پر روشن ہے کہ آزاد سوداؔ کے مشہور اوصاف کا ذکر کر رہے ہیں - لیکن ہم نے ان اوصاف کے اظہار کے لیے انتقادی زبان دوسری اختیار کی ہے - آج کل کی اصطلاح میں وہ یہ کہہ رہے ہیں ا -

(۱) سوداؔ کے ہاں مطابقت الفاظ و معانی بوجہ احسن پائی جاتی ہے -

(۲) سوداؔ انتخاب الفاظ میں بہت محتاط اور کامیاب ہیں -

(۳) وہ ابلاغ معانی کے لیے وہی الفاظ لاتے ہیں جو گویا روز ازل سے ان کے لیے مخصوص تھے -

(۴) لفظوں کی ترتیب اور نشست کے آہنگ کا شعور کامل رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظوں کے ادھر ادھر کرنے سے آہنگ اور لہجہ بدلتا ہے اور لفظوں کے بدل دینے سے معانی متغیر ہوتے ہیں -

چند فقروں میں ایسا انتقاد کرنا آزاد جیسے انشا پردازی کا حصّہ ہے کہ اختصار بھی قائم رہا جو جان کلام ہے اور بات بھی کاملاً کہہ دی گئی - یوں میں چاہوں جو اوصاف ہم نے آج کی زبان میں گنوائے ہیں - انھیں کو پھیلا کر سوداؔ پر ایک اعلیٰ درجے کا مضمون لکھ سکتا ہوں - گویا "آبِ حیات" مزید انتقاد کا خزینہ اور خیالات بکر اور نوادر فکر کا دفینہ ہے -

مولانا گرامی جالندھری (ولادت ۱۸۵۶ء)

مولانا گرامیؔ نے نہ تو کسی کالج میں تعلیم پائی نہ کہیں سے پی - ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی - جالندھر کے رہنے والے تھے - عمر کا بیشتر حصّہ دکن اور جالندھر میں گزر گیا - کبھی ایران بھی تشریف نہیں لے گئے - لیکن فارسی شاعری کی روایات سے اور اس کے علائم و رموز سے ان کی آگاہی کا یہ عالم ہے کہ علامہ اقبال مرحوم شعر کے معاملے میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے -

گرامیؔ نے ایران کے اساتذہ کا کلام گویا اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا - فارسی محاورات - ضرب الامثال - تشبیہات و استعارات - اشارات و کنایات سے وہ ایسے باخبر تھے کہ کوئی ایرانی شاعر کیا ہوگا - علامہ اقبال نے سالک مرحوم کے قول کے مطابق انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عرفیؔ و نظیریؔ کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامیؔ ہے - آج گرامیؔ کو سُن لو - کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامیؔ کو سُنا ہے - گرامیؔ بھی علامہ مرحوم کے مقام بلند سے واقف تھے کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یہ غالبؔ کی مشہور زمین ہے اور اس کا یہ شعر حاصل غزل ہے ؎

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بر منبر نتواں گفت

---

(۱) نقوش، شخصیات نمبر

جب گرامی کی غزلوں کی شہرت ہوئی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ جالندھر میں ایک نغز سرا ایسا ہے جو عرفی، نظیری، کلیم، طالب اور بیدل و غالب کی یاد تازہ کرتا ہے تو ہر طرف سے فرمائش ہونے لگی کہ وہ جلسوں میں اپنا کلام سنائیں۔ لیکن گرامی نہایت مستغنی المزاج، قلندر منش اور درویش صفت شاعر تھے۔ جی میں آیا تو چلے گئے نہیں تو چاہنے والے آس لگائے بیٹھے رہے۔

ان کی مقبولیت کلام اور حسن سخن کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر میر محبوب علی خاں نظام دکن نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور وہ استاد نظام قرار پائے۔ مولانا سالک کا بیان ہے کہ ابتدا میں علامہ اقبال مرحوم اپنے فارسی اشعار میں ان سے باقاعدہ مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہ بات اقبال کی طبیعت سے مستبعد نہیں، انھوں نے جہاں چشمۂ فیض جاری دیکھا۔ وہاں سے آب زلال ضرور پیا۔ سید سلیمان سے بھی انھوں نے بغایت انکسار طالب علمانہ وضع میں استفادہ کیا۔ ان کی نظر میں سنین عمر کے زیادہ یا کم ہونے سے استفادہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ عالم کی یہی شان ہے کہ استفادہ کرنا مقصود ہو تو چھوٹے سے بھی کرتا ہے بڑے سے بھی کرتا ہے۔ بہرحال گرامی کا ذکر ہو رہا تھا۔ گرامی نے حیدرآباد میں خوب ٹھاٹھ سے زندگی بسر کی۔ ان دنوں فصیح الملک داغ دہلوی بھی وہاں موجود تھے۔ ان دونوں شعراء کے روابط بہت خوشگوار تھے۔

نوری نے داغ کے جو سوانح مرتب کئے ہیں۔ ان میں گرامی کی حیدرآباد کی زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ گرامی کے کلام کی بلندی کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ محض ذوقِ شعر کی بنا پر علامہ اقبال مرحوم سے ان کے خاص دوستانہ مراسم تھے۔ یوں تو گرامی نے بہت سے کلاسیکی ایرانی شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً چند است۔ پند است۔ امید بہ دیوانہ ہر مردے وہر کار۔ لیکن جو غزل علامہ اقبال مرحوم کی نظر میں ان کا کارنامہ تھی۔ پہلے اس کے کچھ شعر سن لیجئے ؎

شب ہائے وصل و گوشہ چشمے عنایتے	مائیم و زلف یار و مسلسل حکایتے[1]
عصیان ما و رحمت پروردگار ما	آں را نہایتے نیست ایں را نہایتے[2]
ہاں دارئی نکتہ مضمون باغ خلد	خوانی اگر ز مصحف رخسار آیتے
تا چند امتحان تغافل بہ تیغ	دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

ایک شعر اور سن لیجئے کہ واقعی نظیری اور عرفی کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

محبت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی، شکستی، سوختی، انداختی، رفتی

---

[1] زلف یار اور حکایت مسلسل کے ربط باہمی کو ملحوظ خاطر رکھئے گا۔

[2] علامہ مرحوم نے اس شعر کی بہت تعریف کی ہے۔ نیاز الدین خاں کے نام لکھتے ہیں "شعر مندرجہ عنوان کے اثر سے دل سوز و گداز سے معمور ہے۔ گرامی صاحب اپنے شعر کا اثر دیکھتے تو نہ صرف میری ولایت کے قائل ہو جاتے بلکہ اپنی ولایت میں بھی انھیں شک نہ رہتا۔ اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہئے مجھے یقین ہے فارسی لٹریچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔ انسان کی بے نیازی کا ثبوت دیا ہے مگر اس انداز سے کہ موحد کی روح وجد میں آ جائے۔ یہی ہے کمال شاعری جو الہام کے پہلو بہ پہلو ہے۔" (تلخیص اقبال نامہ جلد اوّل ۲۱۸-۱۹-۲۰ مقتبس از "شعر اقبال" تالیف راقم السطور مطبوعہ بزم اقبال لاہور)

اسی طرح ایک اور شعر بھی سن لیجیے۔ اس کا مضمون اور صنعت گری بے مثال ہے ؎

آں ہم بسر راسے ما ہم بسر باسے
دیوار با میدے - امید بدیوارے

یوں کہنا چاہیے کہ برصغیر پاک و ہند میں فارسی کلاسیکی شاعری کا آخری ترجمان گرامی تھا۔ اس کے بعد تو چراغ ہی گل ہو گیا۔ اندھیرا تو ہر طرف ہے اب پگڑی غائب ہونے کی دیر ہے۔

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی (ولادت ۱۸۵۷ء)

شبلی نعمانی بھی آزاد ہی کی طرح تنوع فکر کے اعتبار سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں اسلوب نگارش کی وہ دل نشینی اور فسوں آفرینی نہیں جو آزاد میں ہے۔ جب سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے معاشرتی، سیاسی اور ملی احیاء کا لائحہ عمل مرتب کیا تو انھوں نے شبلی کو اس غرض کے لیے منتخب کیا کہ وہ مسلمانوں کو ان کی قدیم عظمت کی یاد دلائیں۔ مقصد یہ تھا کہ مغربی تہذیب تیزی سے عموماً پھیلتی ہوئی یہ شعور جو پیدا کرتی چلی جاتی ہے کہ مسلمان برباد ہی ہونے کے سزاوار رہتے۔ اس کا سدباب کیا جائے۔ مسلمانوں کو یاد دلایا جائے کہ ان کے ہاں بھی بڑے بڑے فرمانروا، سیاست دان، ہنر پرور، سائنسدان، مورخ، فلسفی اور فقیہہ موجود ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں نے یونان کے افکار کو اپنے قالب میں ڈھالا اور مغرب نے انھی افکار و تصورات سے جلا پائی۔ غنی نے کیا خوب کہا ہے ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مراد یہ ہے کہ عرب جہاں گئے وہاں انھوں نے اپنے افکار اور مقامی ثقافت کے امتزاج سے نئی تحریکات کو فروغ دیا۔ پھر صرف یہی نہیں کہ مسلمان خشک مزاج، مفکر، فلسفی یا فقیہہ ہی تھے۔ فنون لطیفہ کی طرف بھی انھوں نے توجہ کی۔ شرعی جواز سے بحث نہیں صرف واقعے کا اظہار ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی میں اتنی ترقی کی کہ دنیا ان کے نغموں سے گونج اٹھی۔ کتاب الاغانی جیسی ضخیم کتاب جو بے تکلف ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے، غنا ہی سے بحث کرتی ہے۔ ضمناً اور داستانیں بھی ہیں۔ لیکن اصلاً مغنیوں ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ مصوری میں یورش تاتار سے پہلے بھی ایران مشہور تھا۔ جب منگولوں نے چین فتح کر لیا۔ اور ایک نہایت بڑی شاہنشاہیت قائم کی تو ثقافتی تال میل زیادہ ہوا اور چین کی مصوری کے مختلف دبستان ایران اور دوسرے اسلامی ممالک میں مقبول ہوئے۔ آل تیمور نے خاص طور پر اس فن کی طرف توجہ دی۔ اور صفویوں کے زمانے میں بہزاد نے نقاشی کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ مصوری اور موسیقی کے متعلق فقہی امتناع کے جھگڑے بھی تھے۔ لیکن جہاں تک فن تعمیر کا تعلق ہے، مسلمانوں نے اسے واقعتاً کمال عروج تک پہنچا دیا۔ مختصر یہ ہے کہ کیا علوم میں اور کیا فنون میں مسلمانوں نے ایسے کرشمے دکھلائے کہ دنیا محو حیرت ہو گئی۔ صدیوں تک بو علی سینا اور ابن رشد کی تصانیف مغرب کی دانشگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ رازی نے طب میں جو تجربے کیے تھے۔ ان سے بھی یورپ متاثر ہوا۔ عمر خیام اور محقق طوسی نے ریاضیات میں اور امام غزالی نے منطق و روحانیات میں جو کام کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ مستشرقین ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں۔ گویا دیو زاد مفکروں کا ذکر کر رہے ہوں۔

جب اسلامی ممالک روبہ زوال ہوئے اور برصغیر پاک ہند میں بھی یہ زوال پذیری صاف نظر آنے لگی تو یہاں کے مسلمانوں نے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کوشش کی کہ اپنی ثقافت کے احیاء کے لیے پہلے سیاسی آزادی حاصل کریں۔ اس کا نتیجہ مختلف تحریکات کی

صورت میں رونما ہوئے مثلاً ریشمی رومال کی تحریک۔ وہ جنگ آزادی جسے انگریز غدر کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں اور ٹیپو سلطان کی منظم معرکہ آرائیاں۔
جب اغیار کی حکومت سے سازش کے جال بچھا کر اور ٹیپو کے اقربا اور امراء کو لالچ کے ذریعے اپنا کر میسور کی سلطنت ہی ختم کر دی تو جنگ آزادی کا ناکام ہونا عملاً یقینی تھا بہرحال یہ جنگ ناکام ہوئی اور اغیار نے بیشتر مسلمانوں ہی کو قصوروار قرار دے کر انھیں ملیا میٹ کر دینا چاہا۔ ان حالات میں سرسید نے یہ تحریک شروع کی (جسے علی گڑھ تحریک بھی کہتے ہیں) کہ اغیار کے اسلحہ سے کام لے کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے، مغرب کے علوم و فنون پر عبور حاصل کیا جائے لیکن اس طرح کہ حکومت کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان تمام باتوں کا مقصد مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی احیا رہے۔

جب سرسید نے یہ کوشش شروع کی تو مخلص رفقائے کار کی ایک جماعت بھی اپنے ساتھ لی۔ اس جماعت کے ہر فرد کو مخصوص کام کرنے پر متعین کیا گیا۔ حالی کو مدوجزر اسلام یا مسدس لکھنے کی ترغیب دلائی گئی کہ مسلمانوں کے ماضی و حال کا تقابل کیا جا سکے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اس بات کی طرف مائل کیا گیا کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی تبلیغ کریں۔ شبلی کو ان کے متعدد کمالات دیکھ کر اس بات کے لیے منتخب کیا گیا کہ مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی تصویر کشی کریں۔ خاص طور پر جہاں جہاں مستشرقین نے مسلمانوں پر اعتراضات کئے ہیں وہ رفع کریں اور ثابت کریں کہ مغرب کی ترقی مسلمانوں کی علم پروری کا نتیجہ ہے۔ شبلی نے یہ کام کاملاً تو نہیں لیکن جزواً ضرور سرانجام دیا۔ کیونکہ وہ طبعاً اور اصلاً ادیب تھے۔ مورخ نہ تھے۔ اس کے باوصف انھوں نے الفاروق۔ المامون۔ سیرت النعمان۔ الغزالی اور الکلام لکھ کر مسلمانوں کو بتایا کہ ان کے ماضی کی شاندار روایات کیا تھیں۔ ساتھ ہی انھوں نے خالص ادبی کام بھی کیا۔ شعر العجم لکھی کہ فارسی کا ذوق مٹنے نہ پائے۔ موازنہ انیس و دبیر سپرد قلم کیا۔ ایک طرح یہ دونوں کتابیں بھی مسلمانوں کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر لکھ کر انھوں نے وہ تمام اعتراضات کاملاً رفع کئے جو اس بانکمت بادشاہ پر کئے جاتے تھے لیکن ان کا جو کارنامہ سب سے زیادہ مقبول اور مشہور رہا ہے۔ وہ سیرت النبی ہے۔ اس کی تالیف کی وجہ بھی یہی تھی کہ مستشرقین رسول پاک کی ذات پر رکیک اور ناروا حملے کرتے تھے۔ پادری اور دوسرے عیسائی مبلغ ایسی باتیں کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ ہمیشہ رسول پاک کو ہدف انتقاد بناتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کی ذات گرامی میں خدانخواستہ عیوب نکل آئے تو اسلام مٹ کے رہے گا۔ سرسید نے اپنی تفسیر قرآن میں پرانی تفاسیر پر مستشرقین کے جو اعتراضات تھے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا طریق کار غلط تھا یا صحیح۔ شبلی نے سیرت النبی کی تالیف میں یہ مقصد پیش خاطر رکھا کہ رسول پاک کی ذات قدسی صفات کے تمام گوشے بے نقاب ہو جائیں۔ مغربی مصنفوں کے اعتراضات رفع ہو جائیں اور ایمان میں جو تزلزل پیدا ہونے کا امکان ہے۔ دور ہو جائے۔ وہ اس تالیف کی تکمیل نہ کر سکے۔ لیکن ان کے نقش قدم پر چل کر سید سلیمان ندوی مرحوم نے بقایا کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا اور عمر کا بیشتر حصہ اس مبارک کام میں صرف کر دیا۔

مقالات شبلی کی اشاعت کے بعد (جو کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں) یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا نہایت غیرت مند اور وقت شناس مؤلف تھے۔ جہاں کسی نے اسلام کے کوائف پر اعتراض کیا۔ ان کے علم میں آیا تو انھوں نے فوراً جواب دیا۔

نقاد کی حیثیت سے شبلی کا مقام بہت بلند نہیں کہ شعر العجم میں وہ اکثر شعرا کے اوصاف یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے متمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ خاص کلمات و تراکیب بھی وہ انتقاد میں تکرار تقریباً ہر شاعر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً زور کلام، جوش بیان، جدت استعارات و تشبیہہ مضمون آفرینی خیال بندی وغیرہ وغیرہ۔ ان تراکیب اور کلمات کے معانی مبہم رہتے ہیں۔ البتہ انھوں نے جو

شعر منتخب کیے۔ وہ نہایت خیال افروز ہیں اور ان کے انتخاب سے خود ان کا ذوقِ سلیم نمایاں ہے۔ شعر العجم پڑھنے کے بعد فارسی شاعری کا مزید مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

موازنۂ انیس و دبیر میں انھوں نے دبیر سے کچھ زیادتی کی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ "المیزان" میں اور "حیاتِ دبیر" مولفہ ثابت لکھنوی میں شبلی کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے دبیر پر کیے ہیں اور حق یہ ہے کہ بہت اچھا جواب دیا گیا ہے۔

شبلی کے اسلوب میں وہ بات نہیں جو آزاد کے ہاں ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کی نثر کبھی سپاٹ ہو جائے۔ ان کی تحریر میں ہمواری ہے۔ کہیں کہیں البتہ وہ نہایت مرصع نثر لکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے اندازِ بیان سے خود رائی اور خود آرائی کا اظہار ہوتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے تنقید شعر العجم میں شبلی کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ کیونکہ شعر العجم کا قاری باوجود اس انتقاد کے فارسی شعر کا مطالعہ کرے گا۔ یہی شبلی کی کامیابی ہے۔ اردو ادب میں اُن کا مقام یہ ہے کہ آزاد سے قطع نظر کر لیجئے تو اُن کے معاصروں میں ان کی انشا پردازی کا کوئی حریف نہیں رہتا۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں دلچسپ اور دلکش اسلوب میں علمی موضوعات پر مقالات لکھے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک حد تک تحقیقی مقالے کی راہ انھیں نے کھولی۔ ان کے مقالات کے تنوع کو دیکھ کر آزاد کا فکری تنوع یاد آتا ہے۔ اگرچہ وہ اصلاً مورخ اور سوانح نگار نہ تھے۔ لیکن اردو میں الفاروق اور المامون جیسی کتابیں پہلے موجود نہ تھیں۔ سوانح نگاری کا ڈھنگ اس کی وضع اور سلیقہ بھی شبلی ہی نے متعین کیا۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کی عظمت کی اس انداز سے نشاندہی کی کہ اس کے اثرات اب تک نمایاں ہیں۔ شرر کے تاریخی ناول۔ شبلی کی تاریخی تالیفات کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اور ہمارے آج کل کے نام نہاد تاریخی ناول بھی ایک طرح انھیں کی کاوشوں کے مرہونِ منت ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے شبلی پر انتقاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کی کتابوں کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔" مجھے یہ فیصلہ زیادتی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور ان کی کتابوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میرے دعوے کی دلیل ہے۔

شبلی نے بعض دفعہ قلمی ناموں کا نقاب اوڑھ کر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جو نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی دوسری منظومات کا بھی یہی عالم ہے۔ لیکن یہ نظمیں شبلی کا کارنامہ نہیں۔ یہ گویا ان کی ضمنی فعالیت ہے۔ تاہم ادبیات کی تاریخ میں ان نظموں کا ذکر ضرور آئیگا۔ کہ جن لوگوں نے سیاسی ماحول کو اپنے اشعار میں سمویا ہے اور اس عہد میں سمویا ہے جو شبلی سے مخصوص تھا۔ ان کی تعداد بہت کم ہے کہ حکومت کا احتساب سخت گیر تھا۔ اور خوف سے گویا زبانوں پر پہرے لگے تھے۔ ان دنوں سیاسی نظمیں کہنا۔ اس اعتبار سے اہم ہے کہ نہ صرف عوام کے سیاسی شعور کو مہمیز کرتا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ عوام کے دلوں کو تقویت بخشتا ہے اور ان میں جرأت و بسالت کے جذبات پیدا کرتا ہے

شبلی نے فارسی میں غزل بھی کہی ہے اور ان کی غزل گوئی کے محرکات[1] بھی اب ہمیں معلوم ہیں۔ فارسی غزلوں میں ان کا لہجہ گرچہ بالکل ایرانیوں کا سا نہیں۔ لیکن انھیں اس زبان کے محاورات پر اتنی قدرت ہے کہ ہر غزل سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر جو نہایت لطیف کیفیات سے لبریز ہے نقل کرتا ہوں ؎

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال　　　به من آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

---

[1] دیکھیے "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" اور ادبی دنیا میں عطیہ بیگم فیضی کا متعلقہ خط

شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی (ولادت ۱۸۶۲ء)

سید صاحب بھی اسی کاروانِ جلیل کے ایک نامور رکن ہیں۔ جو سر سید کی تحریک کے علمبردار کہلاتے تھے۔ انھوں نے عمر بھر جلسے اور رسالے اس بات کی کوشش کی کہ عورتوں کو وہ مقام حقوق حاصل ہو جائیں جو شرعاً انھیں حاصل ہونے چاہئیں۔ طلوعِ نیرِ اسلام سے پہلے عورت کا مقام معاشرے میں بہت پست تھا۔ استثنائی صورتوں سے قطع نظر وہ گویا مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور دنیا کے بعض خطوں میں تو اسے کسی چیز کی ملکیت حاصل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مالِ غنیمت میں عورت کنیز بن کر ساغر دست گرداں بن جاتی تھی اور کبھی اس محفل کو اور کبھی اس مجلس کو گرماتی تھی۔ زمانہ ماقبل اسلام میں خود عرب یہ خیال کرتے تھے کہ کسی کے ہاں بیٹی کا پیدا ہو جانا گویا لعنت ہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اکثر و بیشتر عورت صرف ایک کھلونا تھی جو مردوں کی خواہشات کے مطابق حرکت کرتی تھی۔ ایسی صورت میں یہ توقع رکھنا کہ عصمت و عفت بن عورتیں ایک مقام بلند کھیں گی، بیکار ہے۔

اسلام نے یہ تعلیم دی کہ مرد اور عورت کم و بیش مساوی حقوق اور فرائض کے حامل ہیں۔ عورت کسی کی ملکیت نہیں، وہ صحت مند معاشرے کا ایک ضروری جزو ہے۔ اس کی آغوش میں قوم کے وہ سپوت پرورش پاتے ہیں جو اس کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ممالک میں عورتوں نے بھی تحصیل علوم و فنون میں مردوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ رابعہ بصری سے لے کر قرۃ العین زرین تاج تک اور زرین تاج سے لے کر قرۃ العین حیدر تک عورتوں نے روحانیات سے لے کر فنونِ لطیفہ تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

جب اسلامی تہذیب کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور اخلاقی اقدار کو گھن لگ گیا تو معاشرے میں عورت کا مقام پھر بتدریج گرنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ذرا پہلے برصغیر پاک و ہند میں عفیف اور پاکباز عورتوں کی کمی نہ تھی (ہر چند شوق کی مثنویوں کے مطابق لکھنؤ میں ایسی عورتیں بھی پائی جاتی تھیں جو عیاش مردوں کو شہ مات دیں) لیکن بہرحال اکثر و بیشتر وہ تعلیم سے عاری تھیں۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے کہ لوگ کہتے تھے عورتوں کو پڑھانا ٹھیک نہیں کہ مردوں کو عاشقانہ خطوط لکھیں گی یا آزاد خیال ہو کر بے راہ ہو جائیں گی۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ انیسویں صدی کے وسط میں کیفیت کیا ہو گی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ سر سید احمد خاں کی تحریک کا ایک ضروری اور لازمی جزو یہ تھا کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے اور ان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ باشعور، ہوشمند، بہ خبر و جسور بچوں کی پرورش کر سکیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس سلسلے میں اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پر زور دیا۔ سید ممتاز علی کے کارناموں کو نذیر احمد کی کارگزاری کا منطقی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے پنجاب میں بیٹھ کر لاہور کو اپنی کارگزاری کا مرکز بنا کر ساری عمر اس بات کے لیے وقف کر دی کہ عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں اور حسن ترتیب سے پیراستہ کہ قوم کے نونہال انھیں کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اپنے کام کی تکمیل کے لیے انھوں نے مشہور رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا اور ہفتہ وار رسالہ "پھول" کی اشاعت کی بنیاد بھی رکھ دی۔ یہ دونوں رسالے گویا ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔ "تہذیب نسواں" میں عورتوں کے مقامی اور آفاقی مسائل سے بحث ہوتی تھی اور "پھول" میں بچوں کی تربیت ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ یہ دونوں رسالے بہت مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بہت سی عورتوں نے پہلی بار "تہذیب نسواں" کی مدد سے لکھنے کا ڈھنگ سیکھا۔ سید صاحب کا مقصد بھی یہی تھا کہ عورتیں نہ صرف امورِ خانہ داری سے واقف ہوں بلکہ لکھنے پڑھنے کی طرف بھی مائل ہوں۔ نذر سجاد حیدر یعنی سجاد حیدر یلدرم کی بیگم صاحبہ (قرۃ العین حیدر کی والدہ) "تہذیب نسواں" کے لیے لکھتی تھیں۔ اسی طرح اور ممتاز خواتین بھی اس رسالے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی تھیں۔

دہلی میں راشد الخیری جو رسالہ "عصمت" کے ذریعے عورتوں کے حقوق کے لیے محاذ قائم کیے ہوئے تھے، سید صاحب سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے، چنانچہ دار الاشاعت لاہور نے (یہ سید ممتاز علی کے اشاعتی ادارے کا نام ہے) ان کی تصانیف بھی شائع کیں جن میں بیشتر عورت کی مظلومیت اور بے کسی کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ سید صاحب کی اپنی متعدد تصانیف بھی دار الاشاعت نے شائع کیں۔ مثلاً شیخ حسن (ترجمہ) مولانا سالک مرحوم کے قول کے مطابق۔ ان کا کارنامہ بے نظیر کتاب تفسیر البیان (مطالب آیات القرآن) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ گویا قرآن مجید کی آیات کے مطالب کی ایک جامع و مانع فہرست ہے۔ اور ایک طرح دیکھیے تو قرآن مجید کا انڈکس یا اشاریہ ہے۔ ہر مسئلے کے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات یکجا کر دی گئی ہیں اور آیات کا اردو ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مردوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ عورتوں کے حقوق پہچانیں اور بہت سی عورتوں کو لکھنے کے ڈھنگ اور گر سکھا دیے۔ یوں عورتیں نسبتاً بے خوف ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگیں اور ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ انشا پردازی مردوں کے لیے مخصوص نہ رہی۔ یہ شبہ کہ مرد لکھتے ہیں اور عورتوں کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں، رفع ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان میں (بالکل نئی نسل کے سوا) کم ہی عورتیں ہوں گی جو تالیف و تصنیف میں مصروف رہی ہوں اور جنھوں نے "تہذیب" سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ عورتوں کی یہ ذہنی بیداری، ان کے شعور کی پختگی، ان کا اصرار کہ ان کے جائز حقوق انھیں دیے جائیں، ان کی تصنیف و تالیف پر قدرت آخر کار اس بات پر منتج ہوئیں کہ مردوں نے آخر کار یہ پہچانا کہ عورت ہر حیثیت سے سزاوار احترام ہے۔ ماں ہو تو تربیت اس کے ذمے ہے، بیوی ہو تو زندگی کی رفیق ہے اور دکھ سکھ کی ساتھی، علاوہ ازیں مخلص ترین مشیر کار ہے۔ اس فضا کی تخلیق میں خود سید صاحب کی تحریروں نے بڑا حصہ لیا، وہ جو کچھ لکھتے تھے بہت سوچ کر لکھتے۔ بغایت اختصار لکھتے تھے، مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت سلیس اور رواں زبان میں بیان کرتے تھے۔ جب دار الاشاعت نے سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں رسالہ "کہکشاں" کا اجرا کیا تو اس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقائے اصل انواع کے متعلق سید صاحب کے کچھ مضمون شائع ہوئے جو میرے خیال میں اپنی نظیر آپ تھے۔ سائنس کے خشک اور ادق مسائل انھوں نے ایسی سلیس زبان میں بیان کیے تھے کہ ان کی قدرت کلام دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کے کچھ مسودات تاج صاحب کے پاس محفوظ ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان میں ایک لغت بھی ہے۔ اگر سید صاحب کے تمام مضامین یکجا شائع کر دیے جائیں تو اردو ادب پر بڑا احسان ہو گا، بالخصوص سائنس کے متعلق ان کے جو مضامین تھے وہ ایک کارنامہ ہیں۔ تاریخ ادبیات اردو میں ان کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا کہ انھوں نے عمر بھر اس نہج سے صنف نازک کا مقام بلند کرنے کے لیے کوشش کی کہ آخر ہزار مشکلوں کے باوجود وہ کامیاب ہوئے اور ایسی عورتیں سامنے آئیں جو انشا پردازی میں کسی طرح مردوں سے کم نہ تھیں، یوں کہنا چاہیے کہ سید صاحب جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ادیب گر تھے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (ولادت ۱۸۶۶ء)

یہ مسلم ہے کہ کیفی فارسی، اردو اور انگریزی پر قدرت تام رکھتے تھے (ان کا ایک لڑکا مشہور انگریزی اخبار ٹربیون لاہور کا ایڈیٹر تھا جو عین عالم شباب میں فوت ہو گیا) عربی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ مؤلف جدید شعرائے اردو کے قول کے مطابق ہندی کے کامل فن استادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

پنڈت جی کشمیر میں بھی رہے۔ دہلی بھی رہے۔ لیکن تقسیم سے پہلے ان کا قیام زیادہ تر پنجاب ہی میں رہتا تھا۔ آپ انجمن ترقی اردو سے بھی منسلک رہے ہیں۔ یوں تو پنڈت جی نے لکھنے کو غزلوں پر مولانا حالی سے اصلاح لی ہے اور میر مہدی مجروح کی آنکھیں دیکھی ہیں

لیکن سچ پوچھیے تو ان کا جوہر نظم میں نہیں بلکہ نثر میں کھلتا ہے۔ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھے۔ اس لیے انتقاد میں بڑی نیرنگی اور بوقلمونی کا عالم ہوتا ہے۔ ان کی مطبوعہ تالیفات میں منشورات اور کیفیہ کا مقام بہت بلند ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں "مبادیات فصاحت" اور "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" ایسے مضامین ہیں۔ جن کے مطالعے سے اردو ادب کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مبادیات فصاحت میں انھوں نے معانی اور بیان کی پرانی کتابوں اور قدیم نظریات کو ہدف انتقاد بنایا ہے اور متعین کیا ہے کہ فصاحت کے صحیح معانی کیا ہیں۔

دوسرے مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ نظم جدید کے موسس شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ہیں بدگل رعنا کے مصنف نے یہ دعوے کیا تھا کہ حقیقت حال کچھ مبہم سی ہے اور صاحب شعر الہند نے تو نظم جدید کی تاسیس کا سہرا حالی کے سر باندھ دیا۔ کیفی نے بدلائل قاطع یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بیل آزاد نے منڈھے چڑھائی ہے تو چڑھی ہے۔ خود حالی اپنی تالیف مجموعہ حالی کے دیباچے میں لکھتے ہیں "جب راقم ——— لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔" اس شہادت کے بعد کسی کا موقف یہ نہیں ہو سکتا کہ حالی نظم جدید کے موسس ہیں۔ بہرحال کیفی نے اندرونی اور بیرونی شہادتوں کو کھنگال کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ مشاعرہ جہاں نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ کس طرح آزاد کی تحریک پر منعقد ہوا۔

"کیفیہ" میں بقول مولف کے "اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی انشاء اور املا وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے بحث" کی گئی ہے۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے اور مولف نے دعوے کیا ہے کہ میں نے اس میں برسوں کی تحقیق کے نتیجے محفوظ کر دیے ہیں۔ کتاب کے عنوانوں سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ (۱) اردو زبان کا تاریخی مطالعہ (۲) حروف تہجی (۳) لفظ (۴) اسم (۵) تذکیر و تانیث (۶) حروف (۷) مصدر (۸) فعل (۹) روزمرہ (۱۰) محاورہ (۱۱) کلام (۱۲) چند نکات (۱۳) اسلوب (۱۴) عروض (۱۵) مطائبات (۱۶) خط و کتابت (۱۷) املا (۱۸) نئے لفظ (ساتھ ہی ناموں کا انڈکس بھی ہے) اس کتاب کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف امتحانوں میں جزو نصاب ہے۔ اردو زبان کا اور ادبیات کا کوئی طالب علم اس کا مطالعہ کیے بغیر اپنے علم کو کافی نہیں کہہ سکتا۔ یہ کتاب سوچنے کی نئی راہیں کھولتی ہے۔ نہایت سلیس، صاف اور واضح انداز میں لکھی گئی ہے۔ علمی تحقیق کا جو غیر جانبدارانہ انداز ہے۔ وہ اس کے مطالعے سے روشن ہوتا ہے۔ مباحث کی نزاکت کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ مولف نے مترادف اور مرادف الفاظ میں امتیاز کرنا چاہا ہے۔ روزمرے اور محاورے میں فرق بتایا ہے۔ کلام کے نقائص سے نئے انداز میں بحث کی ہے۔ اسلوب کلام سے مختصراً تعرض کیا ہے۔ پندرھویں باب میں مطائبات کی شجرہ بندی کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ظرافت، مزاح، ہزل، بذلہ، طنز اور پند میں کیا فرق ہے۔ واقعی یہ کتاب کیفی کی عمر بھر کی تحقیق کا نچوڑ ہے۔

کیفی نے ان تصانیف کے علاوہ ایک اور اہم کام بھی کیا ہے۔ مشہور تذکرہ "خمخانۂ جاوید" کی تالیف رک گئی تھی۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا اس کام کو آگے بڑھایا۔ میرے علم میں اگرچہ یہ کام مکمل نہیں ہوا۔ لیکن کیفی اس سلسلے میں خاصا کام کر گئے ہیں۔

علامہ اقبال (ولادت ۱۸۷۳ء)

علامہ اقبال تقریباً ربع صدی تک لاہور کی علمی زندگی کے مصدر و ماخذ بنے رہے۔ انھیں کے دولتکدے سے مختلف فکری تحریکات کے سوتے پھوٹتے تھے۔ یہیں ممتاز انشاپرداز ادیب اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ یہیں افلاطون کے فلسفے سے لیکر گاندھی جی کی سیاست تک ہر چیز معرض بحث میں آتی تھی۔ ان کے مقام کے تعین میں ان کی تحصیلات علمی کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ تب معلوم ہوگا کہ ان کی تحقیقات فکر کے تنوع کا کیا عالم ہے۔ معلم ہوئے تو فلسفہ انھوں نے پڑھایا اور انگریزی اور عربی بھی انھیں نے پڑھائی۔ تحصیل دانش کی طرف مائل ہوئے تو ایران کے فلسفے کے اس شعبے پر مقالہ لکھا جو مابعد الطبیعیات

سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعر کہے تو اردو اور فارسی میں یکساں کمال حاصل کیا۔ فلسفے میں تخصص کا مقام حاصل کیا تو یہ صورت پیدا ہوئی کہ خود تم کے ایک نئے معانی متعین کیے۔ اور اس کے متعلق ایک نیا نظریہ بھی پیش کیا۔ اسلامی فکر کو اور مسلمان دانشوروں کے دقیق معانی کو آج کل کے فلسفے کی زبان بخشی۔ اور وہ کتاب لکھی (انگریزی میں) جسے اردو میں "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کہتے ہیں۔ "علم الاقتصاد" پر اردو میں پہلی کتاب لکھی۔ جب برِ صغیر پاک ہند میں کچھ ایسی تحریکات ابھریں جو اسلام کی بنیادی اقدار سے متصادم ہوتی تھیں تو انھوں نے شدید علالت کے باوصف طویل مضمون لکھے۔ ملت۔ قوم اور وطن کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم دین کو بعض باتوں کا مسکت جواب دیا اور مضمون کے آخر میں لکھا ––

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ایک ممتاز سیاستدان اور منصب دار نے کچھ ناگوار سے الفاظ میں وظیفہ دینا چاہا تو مسترد کر دیا اور دنیا پہ واضح کر دیا کہ علم کی خودداری اور دانشوری کا احترام کیا چیز ہے۔

یوں ان کی طبیعت کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ علمی معاملات میں بے تکلف ہر چشمہ فیض سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ دیکھتے تھے کہ کسی بات سے کسی خاص طبقے کی دلآزاری ہوتی ہے تو قلم روک لیتے تھے۔ اسرار خودی کے پہلے اوڈیشن میں حافظ کے متعلق جو اشعار تھے اور جن پر عام لوگوں کو اعتراض تھا۔ وہ انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیئے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ محض ایک ضمنی مخالفت کی بنا پر لوگ کتاب کے مطالعے سے نہ رک جائیں اور ان کے افکار و تصورات کا اظہار و ابلاغ تام ہوتا رہے۔

جس شخص کو مشرق و مغرب کے دانشوروں نے خراج عقیدت پیش کیا ہو جس کی شہرت عالمگیر ہو اور جس کے علم کی حدود کا تعین مجھ جیسے عامی کے لیے ناممکن ہو۔ اس کا علمی مقام متعین کرنا بہت دشوار ہے۔ ادبی مقام کی تعیین میں البتہ مجھے سہولت حاصل ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک ان کے علمی اور ادبی کمالات کو ملا کر ان کی تحقیقات کو نہ پرکھا جائے۔ ان کے مقام کی بلندی واضح نہیں ہوتی۔ بہر حال میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔ نثر کی تصانیف سے قطع نظر جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اقبال کی شعری عظمت کی نشاندہی بھی لازمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اردو اور فارسی غزل کو ایک نیا لہجہ بخشا اور اظہار معانی کی ایک نئی قدرت عطا کی۔ انھوں نے اس وقت تہذیب مغرب کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا۔ جب اغیار کی حکومت نے زبانوں پہ تالے ڈال رکھے تھے اور ذہنوں پہ اپنے تفوق کی مہریں لگا دی تھیں۔ اس احتجاج کی صورت انھوں نے یہ اختیار کی کہ غزل کے جو کلاسیکی علائم و رموز تھے۔ ان کو نئے معانی بخشے۔ علاوہ ازیں کچھ نئے علامتیں اور اشارے بھی مقرر و معین کیے۔ اور غزل کے پیرائے میں وہ باتیں کہنے لگے جو کوئی معمولی نظم یا نثر میں کہتا تو حکومت کے عتاب کا ہدف بنتا۔ ان علائم و رموز میں قلندر۔ لالہ۔ شاہین۔ پروانہ۔ جگنو۔ جوئے کہسار زیادہ اہم ہیں۔ لالہ امت محمدیہ سے عبارت ہے کہ شہادت اسلام میں بہت بڑی اخلاقی قدر ہے اور لالے کی سرخی خون شہیداں کی یاد دلاتی ہے۔ سویدائے دل لالہ۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلمان کا دل سوز حیات سے لبریز ہے اور نور عشق و ایمان سے روشن شاہین کے متعلق خود انھوں نے اپنے مکاتیب میں بہ تفصیل بحث کی ہے۔

پہلے علامہ مرحوم نے علامتوں۔ استعاروں اور کنایوں میں بات کی۔ لیکن جوں جوں مسلمانوں کا سیاسی شعور پختہ ہوتا چلا گیا –– اور جرأت ایمانی کی حرارت سے دل زندہ ہو گئے انھوں نے واشگاف الفاظ میں تہذیب مغرب کے خنجر خون ریز دو دم یعنی فلسفے سے مسلح ہو کر اس تہذیب پر مہلک وار کیے اور مسلمانوں کو اس بات کا شعور دلایا کہ مغربی تہذیب ہر طرح عربی تہذیب (مسلمانوں کی تہذیب) سے فروتر ہے۔

ہمیں مذہب اور فقہ میں علم اور عمل میں اسی تہذیب کی طرف لوٹتا ہے۔ اپنے زور بازو سے پرواز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا ہے

در چمن بال و پر خویش کشودن آموز | کہ پریدن نتواں با پر و بال دگراں
اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں ز نگاہ | ہجر تو خوشتر م آید ز وصال دگراں

انھوں نے اُردو غزل کے افق کو اتنا وسیع کر دیا کہ اب فلسفیانہ تعقلات اور ادراکات جذبے میں سمو کر شعری قالب میں سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وجدان و کشف اور علم بالحواس کے درمیان جو تضاد ہے۔ وہ ان کی شعر گوئی کا ایک موضوع خاص ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت دلنشیں اور خوبصورت شعر کہے ہیں ہے

ہے نور تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی | جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

وہ امام غزالی کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ محض علم بالحواس حقیقت مطلقہ کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ کشف و شہود اور الہام و القا کی قوتیں بھی برسر کار ہوں تب انسان حقیقت کی کلیت کا احاطہ کرتا ہے۔

ان کی تصانیف میں "پیام مشرق"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ"، "اسرار خودی" اور رموز بیخودی بہت اہم ہیں۔ جاوید نامے میں معراج کی سی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے مشرق و مغرب کے دانشوروں سے استفادہ کیا ہے۔

نئی نسل کے تمام شاعر اقبال کے کلام سے متاثر ہیں۔ اور ان کا شعور ذات یقیناً علامہ مرحوم کی تصانیف کا فیضان ہے جو بند ریج کنایوں اور اشاروں سے تہذیب مغرب پر کھلے ڈلے حملے تک جا پہنچے۔ ضرب کلیم کا ذیلی عنوان ہی ہے۔ اعلان جنگ عصر حاضر کے خلاف۔ اقبال کی طویل نظموں میں شکوہ اور جواب شکوہ۔ شمع اور شاعر بہت مقبول ہیں۔ یہی دونوں نظموں کے اسلوب کلام میں وہ گہرائی، خود اعتمادی اور تکمیل ذات کا شعور ہے جو بیسویں صدی کے اعلیٰ درجے کے ادب سے مخصوص ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ کیا شعر میں اور کیا علم و دانش میں اقبال کا فیضان نئی نسل کی تخلیقات پر بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں کلاسیک ہو چکا تھا۔ اور یہ ادب کی تاریخ میں بہت بڑی بات ہے۔

سر شیخ عبدالقادر (ولادت ۱۸۷۴ء)

شیخ عبدالقادر کا وطن تو قصور ہے لیکن ان کے علمی کارنامے تمام لاہور سے مربوط ہیں۔ انھیں زندہ جاوید بنا دینے کے لیے یہی واقعہ کیا کم تھا کہ جب علامہ اقبال نے یورپ پہنچ کر ترک شعر گوئی کا عزم کر لیا تو شیخ عبدالقادر نے انھیں ترغیب دلائی کہ وہ اپنے جوہر خداداد کے فیضان سے اپنی قوم و ملت کو محروم نہ رکھیں۔ شیخ عبدالقادر کے سوا کسی شخص نے علامہ اقبال کے اُردو یا فارسی کلام پر دیباچہ نہیں لکھا۔ ان سے علامہ نے ایک نظم بھی منسوب کی ہے جس کا پہلا شعر ہے ہے

اٹھ کے ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
دہر میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اس نظم کا آخری شعر بھی شنیدنی ہے ہے

ہر چہ در دل گذرد وقف زباں دارد شمع | سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

یہ بھی کسی شخص کے لیے بڑا اعزاز ہے کہ وہ علامہ مرحوم کے کلام پر دیباچہ لکھے اور پہلی بار انھیں پڑھنے والوں سے متعارف کرائے۔

شیخ عبدالقادر پہلے پنجابی ادیب ہیں جن کی زبان اتنی صاف، سلیس اور رواں ہے کہ ان کے اہل زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ سادگی، اظہار و معانی پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نثر بے عیب اور بے داغ ہوتی ہے۔ ایسی نکھری نکھری اجلی اجلی نثر کہ پڑھنے والا گھنٹوں پڑھتا جائے اور طبیعت سیر نہ ہو۔

پنجاب میں صحافت کا مقام انھیں نے متعین کیا۔ وہ ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ لیکن یہ ملازمت ترک کر کے اخبار "آبزرور" کے نائب مدیر ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ادارت کاملاً انھیں کے سپرد ہو گئی۔ انھوں نے عین اوائل جوانی میں لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا جو مرتے دم تک قائم رہا۔ ان کی پہلی تصنیف انگریزی زبان میں ہے۔ اردو میں اس کے عنوان کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے "اردو ادبیات کا دبستان جدید" اس تالیف میں انھوں نے علی گڑھ تحریک کی اہمیت کی نشاندہی کی تھی۔ اور سر سید کے معاصر اور رفقا کار انشاپردازوں کی خوبیاں اجاگر کی تھیں۔ یہ تالیف اب تک میوہ نورس کی طرح تازہ ہے۔ زبان بھی بہت پیاری میٹھی اور بے عیب ہے۔

شیخ عبدالقادر نے بہت جلدی یہ حقیقت پا لی تھی کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان ایک ہو اور وہ اردو ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی۔ کچھ عرصے کے بعد یعنی سنہ ۱۹۰۱ء میں ان کی ادارت میں "مخزن" جاری ہوا۔ یہ وہی جلیل القدر جریدہ ہے۔ جس کے مضمون نگاروں میں ابوالکلام آزاد، شاد، داغ، افضل علی، سجاد حیدر، مرزا سلطان احمد، غلام بھیک نیرنگ، ناصر نذیر فراق اور بیسیوں ایسے ادیب شامل تھے۔ جن کی تحریریں آج سرمہ چشم بصیرت ہیں۔ مخزن کی ادارت سے بھی بڑے نکلنت آرا ادیب وابستہ رہے ہیں۔ مثلاً شیخ عبدالقادر، بیدل شاہجہان پوری، تاجور نجیب آبادی اور حامد علی خاں۔ ان لوگوں نے ادب میں اپنے لیے جو مقام پیدا کیا اس کی وضاحت کرنا تحصیل حاصل ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ شیخ عبدالقادر پنجاب کے سب سے بڑے ادیب گر ہیں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحافت کو ادب کی سرحد تک پہنچا دیا۔ ان خوبیوں کے علاوہ ان کی اردو تحریریں ایسی برجستہ، بے ساختہ، بے تکلف لیکن پرمعنی زبان میں ہیں جو اپنی نظیر آپ ہے۔

مخزن کے لیے انھوں نے بہت سے اچھے مضمون لکھے۔ مقام خلافت کے نام سے قسطنطنیہ کا سفرنامہ لکھا جو اب نایاب ہے۔ انگلستان کی سیر کے مناظر قلمبند کیے۔ فیروز سنز لاہور نے مخزن ادب میں ان کے مضامین اور مقام خلافت کے بعض اجزا شائع کیے ہیں۔ یہ ادبی خدمت واقعی سزاوار تحسین ہے۔ شیخ عبدالقادر مرتے دم تک ادبی تحریکات سے وابستہ رہے۔ مناصب بلند پر پہنچے۔ لیکن ادیبوں کو اپنی برادری سمجھ کر ان کو بے تکلف ملتے رہے۔ ان کی یہ روش اور ان کا اخلاق کریمانہ ایسا تھا کہ دل خواہ مخواہ ان کی طرف کھنچتا تھا۔ پنجاب میں اردو جس طرح پروان چڑھی ہے اس میں پہلا حصہ آزاد کا ہے اور دوسرا شیخ عبدالقادر کا۔

آغا حشر کاشمیری (ولادت سنہ ۱۸۷۶ء)

آغا حشر کے متعلق مجھ چراغ حسن حسرت مرحوم اور مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے کئی داستانیں، لطیفے اور کوائف بیان کیے۔ جس سے دل پر یہ اثر مرتب ہوتا تھا کہ وہ ایک باغ بہار انسان تھے۔ بذلہ سنج، شگفتہ مزاج جہاں بیٹھے لوگوں کو ہنسا رہے ہیں اور خود ہنس رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں نے خود آغا حشر کا یہ رنگ نہیں دیکھا۔ اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے وہ مستقلاً لاہور تشریف لے آئے تھے اور ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ مجھ حکیم احمد شجاع سے ان کے مراسم بے تکلفانہ تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ مدتین تقریبات پر ان سے ملنا ہوا۔ لیکن ان دنوں یعنی سنہ ۱۹۳۵ء میں خود

ان کے لفظوں میں ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار بن چکی تھی۔ اس لیے وہ شگفتہ کلامی اور خوش مزاجی بھی کم نظر آتی تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ بہرحال ان کی شعلہ نوائیاں اپنے کانوں سے نہیں سنیں۔ لیکن ڈراموں کی محشر طرازیاں ضرور پڑھی ہیں اور میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان کی طبیعت میں کتنا جوش، ولولہ اور عزم ہو گا کہ زورِ بیان اور جوشِ کلام کے رنگ میں کیا نثر سے اور کیا نظم سے ٹپکا پڑتا ہے۔

آغا حشر بھی ادیبوں کے اسی دبستان کے نامور رکن تھے جو جامع الکمالات اصحاب پر مشتمل تھا۔ کسی کو مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آغا حشر نے پہلے اپنا زورِ طبع پادریوں کے مقابلے میں صرف کیا جو اسلام پر اعتراض کرتے تھے۔ پھر ناٹک کی کمپنیوں سے منسلک ہو گئے۔ کچھ طبعزاد ڈرامے لکھے۔ کچھ انگریزی کے کھیل اردو کے قالب میں ڈھالے۔ بہرحال ڈرامے کی تحریر میں انھوں نے ایک نئے لہجے کا اضافہ کیا۔ پہلے مقفیٰ نثر لکھتے تھے۔ جگہ جگہ مرصع اشعار سے نثر کو تقویت پہنچاتے تھے۔ ایک ہی ڈرامے میں دو دو داستانیں بیک وقت چلاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ عوام کے مذاق کی سطح بلند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر اردو ڈراموں میں بھی اور خاص طور پر ہندی آمیز اردو ڈراموں میں انھوں نے ایسی زبان اختیار کی جو ڈرامائی صنعت گری کے علاوہ ہر تکلف سے پاک تھی۔

تعجب کی بات ہے کہ جہاں فطرت نے انھیں طبعاً تمثیل نگار بنایا تھا۔ وہاں شعر کا جوہر بھی ان کی فطرت میں پوشیدہ تھا جس طرح چقماق میں آگ ہوتی ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں انھوں نے "شکریہ یورپ" اور "موجِ زمزم" جیسی بلیغ نظمیں پڑھیں۔ شکریہ یورپ میں طنز اور تیکھے پن کا یہ عالم تھا کہ حکومت کی نظروں میں یہ نظم خطرناک قرار پائی۔ چنانچہ عرصے تک مکمل نظم مہیا نہ ہو سکی کہ جو شعر زیادہ تیکھے تھے ناشر انھیں حذف کر دیتے تھے۔ یا ممکن ہے حکومت کا محکمہ احتساب ان کے حذف کرنے پر ناشروں کو مجبور کرتا ہو۔ بہرحال نعتیہ کلام میں "موجِ زمزم" اور طنز میں "شکریہ یورپ" اپنے عہد کی بے نظیر چیزیں تھیں۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، تمثیل نگاری کے ساتھ انھیں غزل کہنے کا ملکہ بھی فطرتاً حاصل تھا۔ جب ایک مشہور مغنیہ سے انھیں محبت ہوئی تو گویا سونے پہ سہاگہ ہو گیا اور ان کی غزلوں میں ایک خاص بات پیدا ہو گئی۔ جو معاصر شعرا کے ہاں بالکل مفقود ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے ؎

غیر کی باتوں کا آخر اعتبار آ ہی گیا
میری جانب سے ترے دل میں غبار آ ہی گیا

جی میں تھا اے حشر اس سے اب نہ بولیں گے کبھی
بے وفا جب سامنے آیا تو پیار آ ہی گیا

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بتِ کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اتنی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے
جو یارب وہ ستم گر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

اور یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

نکھری ہوئی ہے رنگِ شفق سے عروسِ شام
لائی کہاں سے تیرا دوپٹہ رنگا ہوا

جانا نہ حشر مست نگاہوں کے سامنے
ظالم لیے ہوئے ہے طمنچہ بھرا ہوا

میں عرض کر چکا ہوں کہ اواخر عمر میں آغا حشر نے تصنع اور تکلف سے محترز ہو کر بعض بہت اچھے ڈرامے لکھے جن میں فاحش گوئی شاعری الجھن کار فرما تھی۔ مثلاً "آنکھ کا نشہ" اوائل عمر کے ڈراموں میں تکلف، تصنع اور مرصّع نگاری بہت ہے۔ لیکن بتدریج یہ باتیں کم ہوتی چلی جاتی ہیں تا آغا حشر نے سٹیج کو ایک طلسماتی سی چیز بنا دیا تھا۔ ان کے بعد پنجاب میں کم از کم بلکہ یوں کہنا چاہیئے مغربی پاکستان کا کھیل بنیا نہیں۔ سینما نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ حالانکہ غیر ملکوں میں سینما سٹیج کے کھیل سے متصادم نہیں ہوا۔

اگرچہ میری بات عام انتقادی فیصلوں کے برخلاف جاتی ہے۔ لیکن میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ آغا حشر طبعاً اور اصلاً شاعر اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے شعر بھی کہے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک ان کے اوائل عمر کے کسی مکمل ڈرامے پر تفوق رکھتا ہے۔ ہاں تمثیل نگاری میں انھیں روپیہ زیادہ ملتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ذہانت کو لیے ہوئے ادھر چلے گئے اور اردو شاعری ایک ایسے شاعر کے کلام سے محروم ہو گئی جو مومن کی طرح محرکات کے بغیر شعر نہیں کہتا تھا۔ اور اس فن پر قدرت کامل رکھتا تھا۔ میں تین شعر نقل کرتا ہوں۔ ان پر غور فرمائیے کہ معاصرین میں یا ان کے بعد کسی نے اس لب و لہجے میں شعر کہا ہے ؎

ناکامیٔ محبت و محرومیٔ وصال ۔۔۔ پیدا ہوئی ہیں قسمتِ اہلِ وفا کے ساتھ

صرف کرم تھی جانگہ ناز بزم میں ۔۔۔ میں ہی نہ کہہ سکا غم دل التجا کے ساتھ

لڑتے ہیں اختلافِ عقائد پہ حشر کیوں
یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ

حافظ محمود شیرانی (ولادت ۱۸۸۰ء)

حافظ محمود شیرانی جو اصلاً ٹونک کے رہنے والے تھے، وہاں تعلیم سے فارغ ہوئے تو لاہور آئے، اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگلستان چلے گئے، وہاں قانون کی تعلیم حاصل کی، لوٹے تو بیرسٹری کی سند کے متعلق تو تحقیق نہیں ہو سکی البتہ ذوق تحقیق ضرور ساتھ لائے۔ انھوں نے کسی مضمون میں ایم۔ اے نہ کیا تھا، اس کے باوصف پہلے اسلامیہ کالج میں ادبیات فارسی کے استاد مقرر ہوئے، پھر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ان کا تقرر ہو گیا جہاں انھوں نے ایم۔ اے کی جماعتوں تک کو پڑھایا۔ غیر رسمی طور پر میں نے بھی ان سے درس لیا ہے اور یوں بھی ہوا ہے کہ جب میرا تقرر دیال سنگھ کالج میں ہو چکا تو بعض اشعار کی تفہیم کے سلسلے میں میں نے ان سے مشورہ لیا ہے۔ وہ ایم۔ اے کو فارسی پڑھاتے تھے اور فارسی شاعری کا پرچہ ان کے سپرد تھا، حسنِ اتفاق دیکھئے کہ شاگرد استاد کا جانشین ہوا، وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو کچھ عرصے کے بعد ایم اے فارسی میں شعر فارسی کی تدریس میرے حوالے کی گئی ؎

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ان کے سبکدوش ہونے سے پہلے میں نے کچھ تحقیقی کام شروع کیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، بہت محبت سے پیش آئے اور تاکید کی کہ اب اس میدان میں اترے ہو تو ہم لوگوں سے ملتے رہا کرو، ہر طرح مدد کی۔ ابھی "تنقید شعر العجم" مطبوعہ صورت میں سامنے نہیں آئی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت ہوئی۔ حافظ صاحب نے اُردو کے وہ تمام پرچے جن میں ان کی تنقید چھپی تھی، میرے حوالے کر دیے، پہلی بار میں نے تحقیق، تدوین اور انتقاد کا یہ رنگ دیکھا کہ خارجی شہادتوں سے بھی کام لیا جا رہا ہے لیکن انحصار بیشتر اندرونی شہادتوں پر ہے اور انتقاد میں بھی یہی اندرونی شہادت ملحوظ خاطر رہی ہے۔ شبلی کے ذکر میں عرض کر چکا ہوں کہ حافظ محمود شیرانی نے "تنقید شعر العجم" جیسی ضخیم کتاب لکھ کر شبلی کی تالیف کی

پہلی دو جلدوں پر انتقاد کیا اور ان کی اغلاط کی نشان دہی کی۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ بیشتر شاعر کے کلام سے استشہاد کرتے تھے، خارجی شہادتوں میں صرف مستند بیانات پر بھروسہ کرتے تھے۔ "رکھتے ہیں" اور "کہا گیا ہے" والا قصہ ان کی تحقیق میں بالکل نہ تھا۔ "تنقید شعر العجم" جب چھپ کر سامنے آئی تو لوگوں کو عموماً معلوم ہوا کہ حافظ محمود شیرانی تحقیق کی کن کٹھن منزلوں سے گزر کر آئے ہیں اور تدقیق نے کیسے جاں گسل مرحلوں سے نتائج مطلوبہ حاصل کئے ہیں!

"تنقید شعر العجم" کی زبان میں وہ غیر جانبدارانہ علمی شان ہے جو چوٹی کے نقادوں سے مخصوص ہوتی ہے، کہیں کہیں وہ طنز کا ہلکا سا پُٹ بھی دیتے ہیں لیکن ایسی انسانی کمزوری کس میں نہیں ہوتی۔ اعظم گڑھ والوں سے ان کی علمی جنگ چھڑ گئی تھی۔ وہ لوگ تو گویا شبلی کی پرستش کرتے تھے ادھر حافظ صاحب صرف ان نتائج پر اعتماد رکھتے تھے جو مستند بیانات پر مبنی ہوں اور منطقی طور پر صحیح مستخرج ہوئے ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ پالا حافظ صاحب نے مارا۔ انھوں نے جس جاں کاہی سے حوالوں پر حوالے دے کر شبلی کی اغلاط کی نشاندہی کی وہ اپنی نظیر آپ تھی۔ بعد میں کئی باتوں کے متعلق مستشرقین کی اور خود ایران والوں کی تحقیق شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ حافظ صاحب جن نتائج پر پہنچے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔

حافظ صاحب کی طبیعت میں متضاد سے عناصر جمع تھے، وہ متحمل بھی تھے، بے چین اور بے قرار بھی۔ علمی تحقیق میں بہت صبر سے کام لیتے تھے لیکن کچھ زود رنج بھی تھے، بہرحال ادبیات کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ انھوں نے اُردو اور پنجابی کے باہمی ربط کی توضیح کی اور یہ دعویٰ کیا کہ دراصل اردو زبان کی صرف و نحو پنجابی پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی طبیعت کی اپج اور تحقیقی صبر سے کام لے کر ایسے قوی دلائل دیے کہ اب تک ان کے دعوے کا تسلی بخش جواب کوئی نہیں دے سکا۔ مثلاً یہ کہ اُردو میں حروف اضافت "کا، کے، کی" بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ پنجابی سے ماخوذ ہیں، شہروں کے نام اس دعوے کی دلیل ہیں، مثلاً "کاموکے، سادھوکے، کالا شاہ کاکو" (اور پنجابی کلمات "پکے، پکے")۔ اسی طرح "تھا" کے متعلق بڑی پتے کی بات کہی گئی ہے کہ اس کا اس کا سراغ سنسکرت اور متعلقہ پراکرتوں میں نہیں ملتا لیکن ملتانی زبان میں مصدر "تھیونا" موجود ہے جس سے ماضی مطلق "تھیا" برآمد ہوتا ہے، یہی "تھا" کا مادہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی نے دو معرکے کی کتابیں شائع کی ہیں۔ یعنی "تنقید شعر العجم" اور "پنجاب میں اردو" اور دونوں ادبیات اُردو کی تاریخ کے اجزائے لازم ہیں۔

سیماب اکبر آبادی

جوانی کجائی کہ یادش بخیر
میں یا تو لا کالج میں پڑھتا تھا یا وکالت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ فیروز سنز نے ایک تالیفی منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں سیماب کو لاہور بلوا لیا کہ کام کی نگرانی کریں، سیماب صاحب کے ساتھ ساتھ ساغر نظامی بھی آئے۔ یہ بڑے خوش وضع اور خوش مزاج نوجوان تھے۔ سیماب صاحب کا بدن دوہرا تھا اور قد چھوٹا، اس لیے ان کا بھاری بھرکم ہونا اور زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ خاصے رعب داب کے اور وضع دار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ باتیں بھی بہت نپی تُلی کرتے تھے، ممکن ہے اپنے ہم عمروں میں بے تکلفی برت لیتے ہوں لیکن میں نے تو ان کو جب دیکھا ثقاہت، سنجیدگی اور متانت کے پیراہن میں ملبوس دیکھا، یہ کوئی عیب کی بات نہیں لیکن طبعاً مجھ سے ان کے تعلقات زیادہ استوار نہیں ہوئے کہ میں ہنسوڑپن کی طرف مائل تھا اور متانت ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا تھا۔

سیماب صاحب کو میں نے مشاعروں میں بہت پڑھتے سُنا، خاص طور پر مجھے ان کا وہ مشاعرہ خوب یاد ہے جہاں اُم جمال شگر شیدا

تے صدارت کی تھی، غالباً یہ چھبیس ستائیس یا اس کے لگ بھگ کا واقعہ ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، بہرحال یہ خوب یاد ہے کہ سیماب صدر تھے، ان کی ایک غزل کا شعر مجھے اب تک نہیں بھولتا ؎

کہا بیمار فرقت جاں بہ لب ہے تم اگر سمجھو
کہا سمجھیں گے اور تم دیکھنے کیسا سمجھتے ہیں

اسی مشاعرے میں تاثیر، اللہ یار خاں جوگی، ہری چند اختر اور حفیظ جالندھری بھی شریک تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا، ایک طرح تھی:۔ "کوئی امید بر نہیں آتی" دوسری طرح کا مصرع یاد نہیں، وزن تھا ـــ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات یا فاعلن ـــ قافیہ تھا "دیوانہ پیمانہ" اور ردیف "چاہیئے" اس زمین میں تاثیر نے اور حفیظ نے بہت اچھے شعر نکالے ہیں۔ سیماب نے بھی غزل پڑھی اور ان کا یہ شعر میرے دل پر نقش ہے ؎

اے دل یہ پچھلی رات، یہ تسکین کائنات ۔۔۔ اس وقت کوئی نعرۂ مستانہ چاہیئے

لگے ہاتھوں اس زمین میں تاثیر کا شعر بھی سنتے جایئے ؎

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پُر پیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیئے

حفیظ کا شعر تھا ؎

رندان مے پرست سیہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیئے

اسی مشاعرے میں اللہ یار خاں جوگی نے مقطع پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا ؎

کیا طبیعت ہے میری جوگی جی ۔۔۔ بن پیئے رنگ پر نہیں آتی

یہ تو ذاتی تاثرات تھے۔ سیماب پروفیسر مشرف انصاری کے قول کے مطابق آگرہ دبستان کے نہایت خوش فکر ترجمان تھے ان کی منظومات اور غزلیات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے آئے تھے۔ توقع تھی کہ ان کے علم و فضل سے ملک کو مستفید ہونے کا موقع ملے گا کہ ناگہاں ۱۹۵۱ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سیماب کی نظم ہو یا غزل اس پر پختگی اور کہنہ مشقی کی مہر ثبت ہوتی ہے لیکن خیال کی اپج اور افکار بلند کو جذبات میں سمو کر شعری قالب عطا کرنا میری دانست میں ان کے بس میں ممکن نہ تھا، ان کی غزلوں میں لحن کی ہمواری تو ملتی ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی حقیقت کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غزل کے نمائندہ شعر اس طرح کے ہوتے ہیں ؎

ضبط سے نا آشنا ہیں، صبر سے بیگانہ ہم ۔۔۔ انجمن میں ہیں شریک قسمت پروانہ ہم
وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دسترس کی ۔۔۔ اک تجلی خانہ دنیا اک تجلی خانہ ہم

یاس یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاس عظیم آباد میں پیدا ہوئے تھے اور شاد کے شاگرد، بیتاب سے مشورۂ سخن کرتے تھے، پھر شاد نے انھیں اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔ اتفاق سے یاس لکھنؤ پہنچے، یہاں کی فضا کچھ ایسی پسند

آخر کو یہیں جم کر بیٹھ گئے اور یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی بھی کر لی۔ جب لکھنؤ کے شعراء سے ان کی جھڑپیں ہونے لگیں کہ یاس کا لہجہ بالکل نیا تھا اور ان کے کلام کا اسلوب معاصروں سے بالکل جدا تھا تو انھوں نے اپنا دفاع یوں کیا کہ غالب پر نہایت سخت اعتراضات کیے اور اپنے مطلب کا اظہار یوں کیا کہ کلام رکیک معلوم ہونے لگا۔ مثلاً ان کی ایک رباعی کا مصرع ہے۔ غالب میرے چچا ہیں، میں ان کا چچا ——

غالباً وہی چوبیس پچیس کا زمانہ تھا۔ میں لا کالج میں پڑھتا تھا، یا امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ میرا یاس سے تعارف ہوا۔ صورت یوں پیدا ہوئی کہ علامہ تاجور نجیب آبادی نے، عطر چند کپور کے تعاون سے لاہور میں اُردو مرکز قائم کیا کہ اُردو ادب کا مستند انتخاب شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی اور یاس یگانہ لاہور تشریف لائے کہ مولانا تاجور کی معاونت کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یاس کی آواز اردو شعر میں بالکل نئی صدا تھی۔ اس کا لہجہ جدا تھا، لحن جدا تھا، آہنگ جدا تھا۔ نفسِ مضمون پر اس کا نقطۂ نظر عام شعراء سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ لکھنؤ کے ہنگاموں سے متاثر ہو کر ایسی نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو چکے تھے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ داد دینے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ غالب پر رکیک زبان میں اعتراضات کرتے تھے۔ ایسی حالت میں لوگ ان سے خواہ مخواہ الجھ پڑتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نفسیاتی الجھنیں زیادہ پیچیدہ ہو گئیں اور وہ مخصوص کیفیت زیادہ شدید ہو گئی جس کے فشار کے ماتحت وہ غالب تک کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان الجھنوں میں یاس یگانہ (اب وہ اپنے آپ کو یگانہ چنگیزی بھی کہنے لگے تھے) کچھ اس طرح پھنسے کہ عمر بھر اس چکر سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ جن دنوں وہ اُردو مرکز میں کام کرتے تھے، میری ان کی اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور میں اب اپنے آپ کو کوستا ہوں کہ میں، جب وہ غالب پر اعتراض کرتے تھے تو جواب میں کسی بہت بڑے انگریزی نقاد کا نام لے کر کوئی دعویٰ اس سے منسوب کر دیتا تھا جس سے غالب کی عظمت ثابت ہو اور یاس کی تردید ہو جائے۔ اسی طرح جب وہ اپنا کوئی شعر سناتے تھے، جسے میں کسی اعتبار سے محلِ نظر سمجھتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ انگریزی انتقاد کے اصولوں کے مطابق یہ شعر بالکل لغو ہے۔ بیچارے بہت پریشان ہوتے تھے لیکن میں حاضر باش مصاحب تھا اس لیے میرے خلوص کو ہدفِ شکوک نہیں بنا سکتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ان دنوں یگانہ کی عظمت پوری طرح مجھ پر روشن نہ ہوئی، وہ جب لاہور سے چلے گئے اور میرا انتقادی شعور کچھ پختگی کی طرف مائل ہوا تو معلوم ہوا کہ یاس کی جلالتِ قدر کی کیا صورت تھی۔ انھوں نے غزلوں کی غزلیں ایسی کہی ہیں جن میں عشق یا مربوط کوائف کا اشارہ تک نہیں لیکن اس کے باوصف وہ تغزل کی روح سے لبریز ہیں۔ ان کو فطرت نے ایسی جودتِ طبع عطا کی تھی کہ ہمیشہ نئے انداز سے سوچتے تھے اور ظاہر ہے کہ جو نئے انداز میں سوچے گا وہ نئے انداز میں بات بھی کرے گا۔ مندرجہ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں :-

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی — مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا!
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

لاہور کے ایک مشاعرے میں انھوں نے یہ مطلع پڑھا ہی تھا کہ جیسے قیامت برپا ہو گئی! عوام الناس سے لے کر خواص تک چیخ چیخ کر داد دینے لگے، لوگ بے اختیار ہو کر جھومنے لگے، یہاں تک کہ جو معاصر شعراء اسٹیج پر بیٹھے تھے انھوں نے بھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کما کر کیا شعر کہا ہے کم بخت نے ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

مجھے شخصاً یاس کا یہ شعر بہت پیارا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وضع داری، ان کی استقامت طبع اور ان کے حوصلے پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی نفسیاتی پیچیدگیوں کا سراغ بھی دیتا ہے: ؎

ناخدائے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا تہہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ہار آیا
پار اتارتا کیسا، بار سر اتار آیا
کشتی حیات اپنی بہہ رہی تھی دھارے پہ سنگ دل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل، وہی شکستہ دل، پھر بٹے کنار آیا

جگر مراد آبادی (ولادت ۱۸۹۰ء)

جگر سے میری پہلی ملاقات اصغر گونڈوی کے مکان پر ہوئی۔ یہ بھی وہی زمانہ ہے جب اُردو مرکز کا کام شروع تھا اور اصغر نگرانِ کار تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جگر سے کس قسم کا کام لینا مطلوب تھا۔ واقعہ ہوا یہ کہ وہ آتے ہی ایسے دوستوں کے حلقہ میں گھر گئے جو انھیں شراب پینے کی شہ دیتے تھے اور ان سے عالم سرور و تواجد میں شعر سننا چاہتے تھے۔ میں ان دوستوں کی نشاندہی ضروری خیال نہیں کرتا، نہ یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی نیتوں میں کوئی فتور تھا۔ لیکن اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ ان دوست نما دشمنوں کی مہربانیوں نے جگر کو عملاً ناکارہ بنا دیا۔ وہ ہر وقت شراب پیتے رہتے یا ان پہ خمار کی وہ کیفیت طاری رہتی جو مزید شراب کی طالب تھی۔ دونوں صورتوں میں ان سے کام لینا۔ اصغر گونڈوی سے ممکن نہ تھا، جن کا احترام جگر اس حد تک کرتے تھے کہ ان کے سامنے کبھی بلند آواز سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔

لاہور میں جگر، یاس اور اصغر کے اجتماع سے ادبی ہلچل پیدا ہوئی اور جو ہنگامے برپا ہوئے ان کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ شعراء عملاً دو صفوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک جماعت مولانا تاجور کی حمایت پہ کمربستہ تھی اور دوسری جماعت کے ممتاز ارکان کا خیال یہ تھا کہ کام کم ہو رہا ہے اور روپیہ زیادہ ضائع ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ گمان بھی کیا گیا کہ مولانا تاجور عمداً پنجابی شعرا کے مقابلہ میں جمنا پار کے شعرا کی ایک جماعت منظم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ صف بندیاں، معرکہ آرائیاں، سخن پردازیاں اور جنگ طرازیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ دونوں جماعتوں سے بہت قریب رہا ہوں اور میں دیانتداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا تاجور پنجابی اور غیر پنجابی کی تفریق کو اساس بنا کر کوئی منظم جماعت ایسی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے جس کی فعالیت پنجابی شعراء کے مفاد کو زک پہنچائے۔ تاہم مولانا تاجور کے متعلق جو یہ گمانیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ قائم رہیں اور مشاعروں میں کسی حد تک دھڑے بندی کے آثار بالبداہت نظر آنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جگر ان تمام صف آرائیوں اور دھڑے بندیوں سے نفور رہتے۔ وہ شراب و شعر میں اس طرح مستغرق تھے کہ انھیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ ان دنوں بھی جگر ایسے شعر کہتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ حال ہی میں محمود علی خاں جامعی نے تذکرہ جگر کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر کا ابتدائی کلام مرزا احسان احمد کی نگرانی میں داغ جگر کے نام سے شائع ہوا۔ مولف کا قیاس ہے کہ یہ تالیف ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ ادارہ فروغ اُردو نے شعلۂ طور کے نام سے جگر کے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے اس داغ جگر کا انتخاب خود جگر ہی نے کیا اور یہ انتخاب مشتقیات جگر کلام اول کے عنوان سے صفحہ ۱۳ سے ۸۷ تک چھپا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ میں نے پہلی ملاقات میں اور لاہور کے قیام کے دوران میں جگر سے جو غزلیں اور اشعار سُنے ہیں وہ اسی دَورِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی آغازِ شعر گوئی سے لے کر ۱۹۲۸ تک کا دَور) - اس دور میں جسے جگر نے خود مشقیات کا نام دیا ہے بہت اچھے شعر بھی ملتے ہیں اور شاعر نے اپنے طبعی انکسار سے کام لے کر ان اشعار کو مشقیات کا نام دیا ہے حالانکہ بعض اشعار کی پختگی اور جلالتِ قدر کا یہ عالم ہے کہ روزِ آخر کی غزلیں یاد آتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

بغور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کے   یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا
قریبِ سرحدِ حرماں جگر ٹھہر جاؤ   سُنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گزرے گا

جس نے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا   ہائے وہ شکل چاند سی، ہائے وہ قد نہال سا

ہر بڑے شاعر کی شخصیت کم و بیش صد لخت نہیں تو دو لخت تو ضرور ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں تضاد کم و بیش قائم رہتا ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کی نزاکت صرف تخلیقی فن کار ہی جانتے ہیں۔ جگر کہتے ہیں ؎

بیٹھے ہی بیٹھے آگیا کیا جانے کیا خیال   پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم
پوچھیں گے سرگزشتِ مصیبت کی ابتدا   اب کے ملے اگر دلِ حسرت نشاں سے ہم

غالب کی مشہور زمین ہے — "دیدار بھی نہیں، تار بھی نہیں"۔ اس میں جگر نے اپنی کم مشقی اور نو عمری کے باوصف یہ دو شعر بھی کہے ہیں ؎

کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے   اور کچھ یہ ہے کہ مصلحتِ یار بھی نہیں
وہ دل کہ جس پہ حرفِ تمنا بھی بار تھا   اب عرضِ شکوہ سنجیٔ اغیار بھی نہیں

یہ مطلع کتنا شگفتہ اور شاداب ہے ؎

شمیمِ عطر بیز آئی، نسیمِ خوشگوار آئی
تم آئے سامنے یا سو بہاروں کی بہار آئی

جب مشقیاتِ جگر کا یہ عالم ہو تو دوسرے ادوار کی غزل گوئی کا معیار خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ بہرحال مجھے شخصاً ان کے یہ دو شعر بڑے پسند ہیں کہ ایک نہایت لطیف نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ہر انسان اپنے آئینۂ دل میں ایک تمثالِ خیال لیے پھرتا ہے۔ فن کار اسی معیاری پیکرِ جمال کی آرزو میں اپنی عمر گزار دیتا ہے۔ منزل نہ ملے، جستجو اور طلب کی لذت تو کہیں نہیں گئی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جو تمثالِ خیال دل میں نقش پرداز ہے، اس سے ملتا جلتا کوئی جلوہ نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے لیکن شعور مختلف وجوہ کی بنا پر اس پیکرِ جمال کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے جس میں معیاری تمثالِ خیال کے اوصاف موجود ہیں۔ اب وہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

نہیں جاتی نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی   بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی   وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل کا احترام کرنا چاہیئے۔ ہمارے عہد میں، ہمارے ہی درمیان میں سے ایک شخص کو اس آبرو کا رازدار، ترجمان اور پاسبان بنا دیا گیا۔ جگر نے غزل کو واقعی اردو شاعری کی آبرو بنا کر رکھ دیا۔

یہ درست ہے کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ تفکلات اور تصورات جذبہ میں سموئے ہوئے نہیں ملتے۔ وہ کوئی منظم نظریۂ حیات پیش نہیں کرتے، لیکن اس کے باوصف یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صوفی کی طرح وہ فکر کی راہوں پر سفر کرتے ہیں اور حسن و جمال کی تمام اداؤں اور پہلوؤں کے ماتھا رہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روپ کیا ہے، چھب کیا ہے، پھبن کیا ہے اور دلبری کی وہ مخصوص آن کیا ہے جو ماسوائے خد و خال اور بیرونِ سرحدِ جمال ہوتی ہے۔ اسی حسن اصلاً اور اساساً دلنوازی اور دلبری کا خزینہ بنتا ہے۔ جب تک شاعر کو روپ کے تمام ڈھنگ نظر نہ آئیں اور حسن کا وہ کھڑا دکھائی نہ دے جو درحقیقت حسن سے علیحدہ سی ایک چیز ہوتا ہے، وہ کبھی حسن و جمال کی اداؤں کی تصویر کشی نہیں کر سکتا۔ جگر نے اکثر حسن کی اس پراسرار صفت، اس گریز پائی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محسوس و مشہود تو ہوتی ہے لیکن نہ اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے، نہ اسے ارباب ذوق کے سوا اسے کوئی اور دیکھ سکتا ہے ؎

میری نظروں میں ہے اک جانِ وفا کا نقشہ — کس نے دیکھا ہے اس انداز و ادا کا نقشہ
تو نے دیکھا ہی نہیں تجھ سے کہوں کیا زاہد — ہائے ان شوخ نگاہوں میں حیا کا نقشہ
آج جھکتی نظر آتی ہے جبیں کو نین — دیکھنا یار کے نقشِ کفِ پا کا نقشہ

تاجور نجیب آبادی (ولادت ۱۸۹۴ء)

مولانا تاجور اوائل عمر ہی میں لاہور تشریف لے آئے تھے۔ فاضل دیوبند تو وہ تھے ہی۔ لاہور میں وہ السنۂ شرقیہ کے مختلف امتحانات میں (جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے) بسہولت کامیاب ہوئے۔ پہلے دیال سنگھ اسکول میں استاد مقرر ہوئے۔ پھر کالج میں عربی، فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ کالج میں میں نے ان کے ساتھ اکیس سال گزارے ہیں یعنی ۱۹۳۰ سے ۱۹۵۱ تک۔ اور اس سے سات آٹھ سال پہلے بھی ان سے منظم مراسم رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں دیانتداری سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی پنجابی، غیر پنجابی کی تفریق کو اہمیت نہ دی۔ ان کی رائے میں پنجاب میں اردو تبھی مقبول ہو سکتی تھی کہ دوسری قومیں یعنی ہندو اور سکھ بھی اس زبان کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوں۔ اور انھیں اس زبان کی ثقافت اور تہذیب سے اتنی ہمدردی پیدا ہو جائے کہ اس میں شعر کہنے کو جی چاہے۔ مولانا کے غیر مسلم شاگردوں میں پورن سنگھ ہنر، میلا رام وفا، اودھے سنگھ شائق، کرپال سنگھ بیدار (اور غالباً جگن ناتھ آزاد بھی) بہت ممتاز و نمایاں تھے۔ وفا روزمرے اور محاورے پر بہت عبور رکھتے تھے، اور بہت طباع و ذہین سخن طراز تھے۔ ان کا ایک شعر جو میں صرف و نحو کی تدریس میں پڑھا کرتا ہوں۔ مجھے اب تک یاد ہے ؎

وہ سُن کر حالِ فرقت ہو گا ہو گا کہتے جاتے ہیں
کہانی میری ماضی احتمالی ہوتی جاتی ہے

مولانا طبعاً مجلس ساز، انجمن طراز، محفل باز اور صحیفہ نواز تھے۔ انھوں نے لاہور میں انجمن ارباب علم قائم کی۔ جس کے اہتمام میں بڑے ٹھاٹھ کے مشاعرے ہوتے تھے۔ پھر اردو مرکز کا سنگ بنیاد رکھا۔ اصغر، جگر اور یاس کو لاہور بلوایا کہ ان کی معاونت کریں۔

رسالوں کی ادارت کا انھیں بہت وسیع تجربہ تھا۔ وہ برسوں میاں بشیر احمد کے ساتھ "ہمایوں" کے شریک مدیر رہے۔ "مخزن" کی ادارت ان کے سپرد رہی۔ "ادبی دنیا" جیسا وسیع و عریض اور ضخیم رسالہ انھوں نے شائع کیا۔ "شاہکار" (جو "ادبی دنیا" ہی کے سائز کا تھا)

کی بنیاد رکھی۔ ان صحیفوں میں بہت ممتاز اہلِ قلم بہ تسلسل لکھتے تھے۔ لیکن مولانا کی مصلحت اندیشی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ غیر قوم شعراء کو آگے بڑھائیں تاکہ اُردو اتنی مقبول ہو جائے کہ کوئی مقامی زبان یا لہجہ اس کی جگہ نہ لے سکے۔

انھیں محفل آرائی اور صحیفہ نگاری سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ مستقلاً تصنیف و تالیف کے کام کی طرف متوجہ ہوں۔ نتیجۃً انھوں نے کالج میں اُردو ادب پر جو لیکچر دیے اور جو بعض شاگردوں کو مستحضر ہیں یا تو انھیں مولانا کی علمی تحقیق تصور کرنا چاہیے یا پھر کچھ انتخابات ہیں جو انھوں نے شائع کیے تھے۔ اگر وہ محفل آرائی اور انجمن سازی سے فرصت پاتے تو اُردو ادب کی بہت ٹھوس خدمت کر سکتے تھے۔ اس کے باوصف انھوں نے نہایت اچھے رسالے شائع کیے اور نئے نئے مضمون نگاروں کو پڑھنے والوں سے متعارف کرایا۔ رسالوں کی اشاعت کے معاملوں میں وہ دُھن کے اتنے پکے تھے کہ عملاً اپنا تمام ذاتی اثاثہ اسی سلسلے میں صرف کر دیا۔ ایک دن مرحوم نے مجھ سے کہا کہ بیگم مجھ سے خفا ہیں کہ میں نے ان کے زیورات فروخت کر کے ادبی رسالوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ اگر ان کے زیورات سونے کے تھے تو ادب میں تبدیل ہو کر وہ اب کندن ہو گئے۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

محفل آرائی اور مجلس طرازی کے سلسلے میں مولانا کا دوسری شعرا کی جماعتوں سے تصادم بھی ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک ممتاز پنجابی شاعر سے ان کے تعلقات اسی لیے بگڑے کہ اس کے خیال میں وہ اسے اس مقام جلیل تک پہنچنے سے روکتے تھے جو اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ بہرحال مسرت کا مقام ہے کہ ان کی موت سے پہلے تمام رنجشیں اور کشیدگیاں دور ہو گئیں۔ معاصروں میں پھر دوستانہ روابط قائم ہو گئے۔ کم از کم ظاہراً تو کشیدگی کے آثار بالکل غائب ہو گئے۔ جہاں تک نیتوں کا تعلق ہے۔ ان پر حسن ظن رکھنا چاہیے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مولانا غیر مسلم سخن طرازوں کو آگے بڑھانے کے لیے خود غزلیں کہہ کر انھیں عطا کر دیتے تھے تاکہ عوام کی داد سے ان کا دل بڑھے اور وہ خود تخلیقی کام کی طرف متوجہ ہوں۔ میں رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور میں نویں جماعت کا طالب علم تھا کہ میرا ایک ہندو دوست مجھے ان کے ہاں لے گیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ شعر پر ان سے اصلاح لوں۔ میں نے غزل ان کی خدمت میں پیش کی تو انھوں نے بغیر کسی توضیح کے چار پانچ شعر قلم زد کر دیے اور اسی وقت دو تین شعر کہہ کر مجھے عطا کر دیے۔ اصلاح کا یہ طریقہ مجھے آبرومندانہ معلوم نہ ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد میں پھر کبھی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا۔ البتہ مراسم قائم ہو گئے جو ان کی وفات تک قائم رہے مگا ہے گاہے جو شکر رنجی ہو جاتی تھی۔ اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ آخر شکر رنجی بھی وہیں ہوتی ہے جہاں مراسم استوار ہوں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ مولانا نے کوئی ٹھوس علمی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ رسائل میں ان کے اداریے اور نوٹ موجود ہیں کہ انشا پردازی کی جان ہیں۔ شعر وہ بہت بے تکلفانہ اور برجستہ کہتے تھے۔ کیا نظم اور کیا غزل دونوں صورتوں میں ان کی شگفتگی مزاج، جودت طبع اور قدرت کلام کا اظہار ہوتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر وہ یکسر شعر کی طرف توجہ دیتے تو ان کا شمار چوٹی کے شعرا میں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ انھیں اتنی فرصت ہی نہ تھی۔ اس کے باوجود بعض غزلیں اور اشعار انھوں نے بہت بلند مقام سے کہے ہیں۔ ان کی غزل کی یہ خصوصیت تھی کہ محاورے کی چاشنی اور زبان کی مٹھاس رفعت مطالب سے گھل مل جاتی تھی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الفت ہے راز۔ راز کی حد تک ہے سرفراز ۔۔۔ جب داستان بزم بنی خوار ہو گئی
خودداری جنون نے نہ جانے دیا وہاں ۔۔۔ کم بخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی

———

نہ دل بدلا۔ نہ دل کی آرزو بدلی نہ دم بھر لے ۔۔۔ میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسمان کر لوں
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا ۔۔۔ الٰہی ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کر لوں

وہ حیات بخش رسا کے شاگرد تھے اس لیے ان کے کلام میں عشقیہ معاملہ بندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ انھوں نے خود مجھے اپنے دو اشعار سنائے تھے جو مجھے کسی انتخاب میں نہیں ملے ؎

تم نے لڑا لڑا کے نگاہیں چرائی آنکھ ۔۔۔ ہم نے ملا ملا کے نظر دل ملا دیا
دن رات ان کو کھیل یہ رہتا ہے تاجورؔ ۔۔۔ مٹی پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا

تاجورؔ مرحوم بہت باغ و بہار انسان تھے لیکن افسوس کہ ان سے اُردو ادب کو جو توقعات تھیں وہ بحیثیت مجموعی پوری نہ ہوئیں۔ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کے شاگردوں کی جماعت وہ خوبیٔ علم ہے جو انھوں نے مستقبل کو عطا کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اپنی ذہانت۔ فطانت اور جودت و ندرت طبع سے کام لے کر اُردو ادب کے سلسلے میں کوئی ایسا کام کیا ہو۔ جو واقعتاً ان کی عظمت پر دلالت کرے اور انھیں غیر فانی بنا دے۔

خلیفہ عبد الحکیم

ڈاکٹر عبد الحکیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہایت ذہین و فطین ادیب اور انشا پرداز، مفکر اور فلسفی تھے۔ جب لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم ہوا اور خلیفہ صاحب اس کے ناظم مقرر کیے گئے تو بجا طور پر یہ امید بندھی کہ اب وہ اپنے علم و فضل سے جم کر کام لیں گے۔ یہ توقعات کاملاً پوری ہوئیں۔ ادارے کے قیام سے پہلے بھی وہ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ رومیؔ کے تخصیص میں سے تھے۔ اور اقبالؔ کے فلسفیانہ کلام کی نزاکتوں کو خوب جانتے تھے۔ لیکن ادارے کے قیام کے بعد انھوں نے واقعی جم کر کام کرنا شروع کیا۔ وہ صحیح معانی میں جامع الکمالات بزرگ تھے۔ اُردو فارسی پر انھیں عبور تھا۔ انگریزی زبان کے پیچ و خم سے کماحقہٗ باخبر تھے۔ شعر کہنے کا شوق تھا۔ فلسفے سے ذوق تھا۔ فنون لطیفہ سے شغف تھا اور اخلاق و روحانیات سے دلچسپی لیتے تھے۔ پھر یہ کہ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ جسیم و ضخیم گورے چٹے۔ شگفتہ مزاج انسان تھے کہ استثنائی صورتوں کے علاوہ تبسم کی لہر بروقت ان کے لبوں پر اپنی دھوپ چھاؤں دکھاتی تھی (یہ استعارہ کچھ پیچیدہ سا ہو گیا ہے۔ لیکن امید ہے کہ نقوش کے قارئین کرام جو تمام ہوشمند ہیں میری عرض پردازی کے مفہوم سے آشنا ہو جائیں گے)

ادارہ کے لیے خلیفہ صاحب نے گویا اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لی جن میں مشرقی علوم کے ماہر تھے اور مغربی علوم و فنون سے باخبر لوگ بھی۔ خلیفہ صاحب کی کوشش یہ تھی کہ اسلام کی ان اقدار کو اجاگر کیا جائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب جامد نہیں بلکہ حرکی ہے اور زمانے کے تقاضوں کا ہمیشہ ساتھ دیتا رہا ہے اور ساتھ دیتا رہے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ادارے کے لیے گوناگوں کام کیے۔ اسلامی اسلوب فکر و نظر و معیار قدر کے متعلق انگریزی میں ایک معرکے کی کتاب لکھی۔ "فکر اقبال" کے نام سے اقبالؔ کے تصورات اور تعقلات کی پیچیدگیوں کو سلجھایا۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے اسلام کی الٰہیات کی تشکیل جدید" (علامہ مرحوم کی انگریزی تصنیف) کا خلاصہ درج کیا۔ خودیؔ اور اس کے تصور سے بہ تفصیل بحث کی۔

جو شخص اقبالؔ سے شغف رکھے گا۔ وہ رومیؔ کا مطالعہ ضرور کرے گا۔ اور خلیفہ صاحب کو اس بلند مرتبت شاعر کے افکار سے کماحقہٗ آگاہ تھے انھوں نے حکمت رومیؔ کے نام سے ایک نہایت خیال افروز کتاب لکھی۔ جس میں رومیؔ کے بنیادی تصورات سے بحث

کی گئی ہے۔ مقصاو قدر پیا انھوں نے جو باب لکھا ہے وہ بہت بلند مرتبہ ہے۔ تشبیہات رومی پر بھی ان کی تصنیف ایک کارنامہ ہے۔ ان کے ادارے کے لیے عبدالرشید تبسم نے رومی کے ملفوظات "فیہ مافیہ" کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ جو اگرچہ بوجوہ بعض مقامات پر الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو بحیثیت مجموعی اصل کے مطالب اصل کے مطالب کو بڑی دیانتداری سے اردو میں منتقل کرتا ہے۔

میری نظر میں خلیفہ صاحب کا تالیفی کارنامہ "افکار غالب" ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کے منتخب حکیمانہ اشعار کی شرح کی ہے۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے (مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور) اور اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب غالب کی نزاکت خیال کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔ بعض اشعار کی تشریح راقم السطور کی رائے میں محل نظر ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی مجموعی اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فہرست مطالب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے متفرق اشعار اور منتخب رباعیات کی بھی شرح کی ہے۔ اس تشریح کا اسلوب فلسفیانہ زیادہ ہے اور ادبی کم۔ لیکن خلیفہ صاحب سے ایسی ہی تصنیف کی توقع کی جاسکتی تھی۔ بہرحال اس کتاب کی اشاعت سے "غالبیات" ایک اچھی تصنیف کا اضافہ ہوا۔

افسوس ہے کہ مرگ ناگہاں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ ان کے سامنے کام کرنے کے اعلیٰ درجے کے منصوبے تھے اور وہ ان کی تکمیل کی خاطر اسباب و وسائل کی جستجو میں منہمک رہتے تھے۔ اب ادارے کے ناظم پروفیسر محمد شریف ہیں۔ ان کا بھی مزاج فلسفیانہ ہے۔ ذوق بلاشبہ سلیم ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں بھی فلسفیانہ تحریروں کی سی خشکی نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ وہ خلیفہ صاحب ہی کی طرح ادارے کے لیے مفید تالیفات مرتب کریں گے۔

تاثیر

تاثیر مرحوم کی ذہانت اور بذلہ سنجی کے قائل ان کے دشمن بھی تھے اور ہیں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے دوستوں کے دل میں ان کی نوا پیرائی کا کیا مقام ہوگا۔ یہ درست ہے کہ اب تک تاثیر کی کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی جس کی بنا علمی تحقیق و تدقیق پر ہو۔ میرے علم میں ہے کہ ان کے مضامین علمی اور ان کے تھیسس یعنی پی۔ ایچ ڈی کے مقالے کی اشاعت کا انتظام ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ بات کس مرحلے تک پہنچی۔ اگر یہ تمام مضامین شائع ہوگئے تو تاثیر کا صحیح علمی مقام متعین ہو سکے گا (اور ادبی بھی) ورنہ صرف بے تکلف دوست جانتے ہیں کہ اسے مختلف علوم و فنون پر کیسی عالمانہ قدرت حاصل تھی۔ عربی وہ بقدر ضرورت جانتے تھے۔ فارسی کے نکات سے آگاہ تھے۔ انگریزی کے متخصص تھے۔ فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ سازی کے دقائق پر مطلع تھے۔ کلاسیکی موسیقی کی ودیا سے بھی آگاہ تھے۔

میں لارنس کالج میں تھا اور تاثیر ایم۔ اے میں کہ ہم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ رجوں کے اس مشہور مشاعرے میں ہم دونوں ہی موجود تھے جو غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا اور جس کی صدارت رام راجپال سنگھ شیدا نے کی تھی۔ اس کا ذکر میں تفصیلاً اور جگہ کر چکا ہوں۔

جب تاثیر معلمی کی طرف مائل ہوئے اور میں وکالت کی طرف جھکا تو ہمارے درمیان بعد مکانی اور بعد زمانی قائم ہوا۔ لیکن اس قیام بُعد سے پہلے ہم ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ درمیانی کڑی حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال تھے جن کے لیے میں بھی لکھتا تھا اور تاثیر بھی۔ تاثیر کبھی اپنے نام سے لکھتے تھے اور کبھی قلمی نقاب اوڑھ لیتے تھے مثلاً نظامی فدا بی ایم۔ اے اسی زمانے میں حسن اتفاق سے یاس۔ سیماب۔ ساغر۔ جگر اور اصغر بھی لاہور آگئے اور نیرنگ خیال میں خوب خوب قلمی معرکہ آرائیاں رہیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی جو پاکستان کے مایہ ناز مصور ہیں۔ پہلی بار تاثیر ہی کی وساطت سے عام طور لوگوں سے روشناس ہوئے۔

ان کی مثنوی کے نمونے نیرنگ خیال میں شائع ہوئے اور تاثیر نے ان پر نوٹ لکھے ۔ یہ نوٹ بڑے خیال انگیز تھے اور ظاہر کرتے تھے کہ تاثیر تمام رموز سے آشنا ہے ۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ حفیظ کو یہ بات یاد ہو گی کہ نہیں کہ شملہ میں وہ تاثیر سے میری ہی وساطت سے ملے ۔ وہاں بڑے معرکے کا مشاعرہ تھا اور حفیظ، تاثیر، نظیر لدھیانوی تاجور، اختر شیرانی اور ان کے رفقا موجود تھے ۔ ہم لوگ مسلم ہوٹل میں ٹھہرائے گئے ۔ عندلیب شادانی پہلے ہی سے مقیم تھے ۔ وہ مشاعرے سے ایک ماہ پہلے آ گئے تھے ۔ ان کا اپنا شعر ہے ؎

آ ہی پہنچے زراہ نادانی حضرت عندلیب شادانی

یہیں تاثیر اور حفیظ کی ملاقات ہوئی اور یہیں گویا ذہن ملے ہوا کہ نیاز مندان لاہور علمی ادبی محاذ پر پنجاب کے شاعروں اور انشا پردازوں کی حمایت کرنے کے سلسلے میں حفیظ کو ملحوظ خاطر رکھیں گے ۔ چنانچہ ان کے مجموعہ کلام پر مرحوم بخاری نے دیباچہ لکھا اور وہ جو حفیظ کے ذہن میں قدیم رنگ اور جدید رنگ کے متضاد رجحانات کی کشمکش تھی اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا "عاشق کہ نمازباز"

جب تاثیر اسلامیہ کالج میں آئے تو ان کا گھر لاہور کے ذہین ادیبوں، نئے لکھنے والوں اور انشاپردازوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا ۔ وہ ہر ایک کو ایسا مشورہ دیتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی ایسی دھوم تھی کہ جو شخص وہاں جاتا تھا وہ ان کا معتقد اور مداح ہو کر آتا تھا ۔

شعر وہ فارسی میں بھی کہتے تھے اور اردو میں بھی ۔ اردو میں ان کی نظمیں "رس بھرے ہونٹ" ، "ید بیضا" "دیوداسی" "اگلے وقتوں کے شاعران کرام" بہت مشہور رہیں ۔ غزلوں میں آپ یہ غزل اکثر ریڈیو پر سنتے ہوں گے ؎

میری وفائیں یاد کرو گے رو ؤ گے فریاد کرو گے
محفل کی محفل ہے رنگیں کس کس کا دل شاد کرو گے
ختم ہوئی دشنام طرازی یا کچھ اور ارشاد کرو گے

ان کا یہ شعر بھی زبان زد خاص و عام ہے ؎

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے ان سے کہدی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

بات یہ ہے کہ اصلاً تاثیر غزل کے شاعر نہ تھے ۔ یہ تو مشق سخن تھی ۔ ان کی منظومات ان کی بقائے دوام کی ضامن ہیں ۔ تاہم ایک غزل ایسی ہے جس نے اردو میں ایک نئی روایت کا دروازہ کھولا ، اس غزل کا بنیادی خیال یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ایسی عورت بھی ہے جو دلکش اور دلربا ہے چاہتی ہے کہ آپ اسے چاہیں مسکراتی بھی ہے لیکن آپ کو چاہتی نہیں ۔ یعنی تاثیر نے بالفاظ دیگر یہ کہا کہ جس طرح میں عشق کرنے پر مجبور ہوں محبوبہ بھی اپنے افعال کی مختار ہے ۔ ضروری نہیں کہ میں اس سے عشق کروں تو وہ بھی مجھ سے عشق کرے ۔ یہ غزل طویل ہے میں اطناب سے بچنے کے لیے ایک شعر نقل کرتا ہوں ؎

یہ دہن کہ ہے شگفتہ یہ جبیں کہ ہے کشادہ یہ دلیل خوش دلی ہے میرے واسطے نہیں ہے[1]

---

[1] غالب کا مشہور شعر یاد کیجیے جو اس شعر کے قریب قریب ایک کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے ؎

کشتۂ اول خویشم کہ ستمگران یکسر دیدہ دلفریبی ہا گفت مہربانی ہاست

تاثیر کا مقام اُردو ادب میں تبھی متعین ہو سکتا ہے کہ اس کی تمام تحریرات ہمارے سامنے آئیں۔ آتشکدہ اور کنول کی اشاعت سے صرف اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اس کے ذہن کی جودت اور ندرت کی کیا کیفیت تھی، اگرچہ وہ انگریزی کا متخصص تھا لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ اردو ایم اے کو تعلیم دے سکتا ہے کہ نہیں تو وائس چانسلر اور حکومت نے بطور خاص اپنی منظوری عطا فرمائی۔ بخاری اور راقم الحروف کے سلسلے میں بھی یہ ہوا۔ غالباً حمید احمد خاں صاحب کو بھی بطور خاص منظوری دی گئی۔

میں اور تاثیر ایک دوسرے کو اپنی غزلیں اور اپنے مضمون دکھا دیتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ان پر کڑا انتقاد کیا جائے۔ باہمی استفادہ بھی جاری تھا۔ ان کی ذکاوت طبع اور ذہانت کی ایک عجیب و غریب مثال میرے ذہن میں ہے۔ میں غزل کہہ رہا تھا

حد افق تک پھیلا ہوا تھا ——— دشت غم دل
رک رک گئے مجھ کو چلنا پڑا تھا ——— منزل بہ منزل

میں نے مصرع کا ٹکڑا کہا

تصویر لیلیٰ ہودج نشین تھی ——— ؟

اور دوسرا مصرع کہا کہ

ذوق تماشا کیا جھانکتا تھا ——— محمل بہ محمل

مجھے پہلے مصرع کا ٹکڑا کسی طرح نہ سوجھا۔ تاثیر کو شعر سنایا۔ اس نے کہا اس ٹکڑے کے الفاظ تواز ل سے معین اور مقدر ہیں یعنی ـــ "لیلیٰ نہیں تھی" اب شعر کی یہ صورت نکلی ؎

تصویر لیلیٰ ہودج نشین تھی ـــ لیلیٰ نہیں تھی
ذوق تماشا کیا جھانکتا تھا ـــ محمل بہ محمل

اس طرح کے کئی واقعات یاد ہیں لیکن یہ مختصر مضمون ان کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ یہاں ختم کلام کرتا ہوں کہ تاثیر کا جو بلند ادبی مقام تھا اور اسے لاہور میں جو ادبی سرداری حاصل تھی اس کے پیش نظر بہت ضروری ہے کہ اس کے تمام مقالات مرتب و مدون کیے جائیں اور شائع ہوں۔ بیگم تاثیر کو فرصت نہیں لیکن آنکھیں آفتاب احمد، امجد حسین اور حمید شیخ کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ اپنے فرائض پہچانیں اور ادا کریں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا اس سے کوتاہی نہ ہو گی۔ لاہور کے ادبی حلقوں کا جانشین اللہ کو پیارا ہو جائے اور اس کی تحریریں منظم نہ ہوں، کتنے افسوس کی بات ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تاثیر کا ہر نوشتہ کتابی صورت میں شائع ہو۔ یہاں تک کہ چراغ حسن حسرت سے معرکہ آرائی بھی شائع ہو جائے۔ اس جنگ کی روداد میں نہایت دلچسپ چیزیں ملیں گی۔ حسرت کی بھی اور تاثیر کی بھی۔ اگر ایسی ہی بات ہو جو بہت تیز ہو تو وہ شعر حذف کر دیے جائیں۔ اگرچہ میں شخصاً اس کے حق میں نہیں۔

پطرس بخاری مرحوم

سنہ ۲۴-۱۹۲۵ء کا واقع ہے کہ میں لا رکالج میں پڑھتا تھا۔ پرنسپل چیٹر جی کا ایک ڈراما "ادما" نامی میں نے ترجمہ کیا اور لا رکالج میں اس کی ریہرسلیں ہونے لگیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ متین کنفکنز اپنی بیوی کو قتل کرنے کے الزام میں اور پولیس کا باقاعدہ مقابلہ کرنے کے جرم میں مارا جاتا ہے۔ یوں ادما کے ریہرسلوں کا زمانہ بالکل متعین ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں کالج میں دینا ناتھ زتشی بھی تشریف لاتے تھے جنھوں نے بعد میں ریڈیو پر اپنی آواز کے کمالات دکھائے۔

ان سے بخاری کے روابط تھے۔ غالباً وہی انھیں لا رکالج لے آئے اور میری ان سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ تاہم انھوں نے ڈرامے سے میری دلچسپی دیکھ کر مجھے برنارڈ شا کی کتاب آرمز اینڈ دی مین عطا فرمائی کہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد شا کے فن پر انتقاد کروں۔ انتقاد تو میں کیا کرتا۔ استفادہ ضرور کیا۔ اس کے بعد میں گجرات چلا گیا اور وہ لاہور ہی میں سرکاری ملازمت میں لے لیے گئے۔ جب میں گجرات سے واپس آیا اور دیال سنگھ کالج میں ملازم ہوا تو پھر دبی چنگاریاں سلگیں اور میں نے یک بابی ڈرامے کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ ان میں بیری کا ڈراما دوست بھی تھا اور ٹیگور کا ڈراما ماسا دھو بھی۔ دوست میں پروفیسر گردور معلم ادبیات انگریزی دیال سنگھ کالج اور مہی قیوم نظر نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھلائے۔ بخاری ان دنوں برابر ریہرسل دیکھنے آتے رہے۔ ایک دن وہ سوندھی کو بھی لے آئے جو گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ سوندھی نے سٹیج کریفٹ کے متعلق مجھے بہت مفید مشورے دیئے۔ سنگ مرمر کی ایک شہ نشین بہت سستے داموں سفیدے کی مدد سے تیار ہوئی۔ ایک کھڑکی میں کسی طرح نہیں دکھا سکتا تھا۔ بخاری اور سوندھی کی مجموعی ذہانت نے اس کھڑکی کا مقام متعین کیا، بخاری مرحوم کو کھیل سے اور اس کے لوازم سے دلچسپی نہیں عشق تھا۔ ان کے اپنے کالج سے تو شعلے بلند ہوتے تھے لیکن ان کی طفیل جب تک میں دیال سنگھ کالج میں رہا۔ دھواں وہاں سے بھی نکلتا دکھا گیا اور سال کے سال کھیل کھیلنے کی روایت زندہ رہی۔

بخاری کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ظرافت کی یہ صورت تھی کہ یہ چیزیں فوارے کی طرح ان سے پھوٹی پڑتی تھیں۔ جن دنوں وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے ان کے خسر کا انتقال ہوا۔ بہت سے لوگ پہنچے۔ میں بھی حاضر ہوا۔ قاضی فضل حق مرحوم استاد فارسی میرے ساتھ موجود تھے۔ میں نے ان سے پڑھا ہے اس لیے ان کے سامنے بربنائے احترام بخاری سے کھل کر باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ بخاری نے رمز شناسی سے کام لے کر اپنے چونچال پن کا اظہار شروع کیا۔ یہ گفتگو جو میں نقل کرتا ہوں۔ شاید روایت اور درایت کے تمام اصولوں پر پوری نہ اترے کہ لفظوں میں ضرور ہیر پھیر ہوگا۔ لیکن میرا حافظہ اچھا ہے اس لیے مجھے گمان ہے کہ تغیر لفظی بہت کم ہوگا۔ اب گفتگو ملاحظہ ہو۔ "ب" سے مراد بخاری ہے۔ "ع" سے عابد اور "ف" سے قاضی فضل حق مرحوم۔

ب:۔ عابد صاحب! آپ ان سے واقف ہیں۔

ع:۔ جی یہ میرے استاد ہیں۔

ب:۔ خیر۔ میرے رفیق کار ہیں۔

ع:۔ ماشاء اللہ

ب:۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ع:۔ کیوں؟

ب:۔ آپ کو پتہ ہے ان کا لڑکا ہمارے کالج میں پڑھتا ہے۔

ع:۔ جی نہیں۔

ب:۔ تو آپ مطلع ہو جائیے۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تو میں نے شفیق استادوں کی طرح پوچھا۔ برخوردار کسی مضمون میں کمزور بھی ہو۔ یعنی انگریزی کے سوا۔ تو اس پر بولا۔ جی۔ فارسی میں کمزور ہوں۔ اس پر میں نے کہا۔ فارسی نہ تمہارے باوا جان کو آئی نہ تمھیں آئے گی۔ اور آپ کو معلوم ہے۔ اس لڑکے نے کیا کیا۔ جا کے باپ سے کہہ دیا کہ بخاری کہتا ہے۔ آپ کو

فارسی نہیں آتی۔

ع :- پھر؟

ب :- پھر کیا۔ قاضی فضل حق صاحب میرے پاس آئے ان کو کہنا چاہئے تھا کہ بیٹے کے سامنے باپ کی نالائقی کا بھانڈا نہیں پھوڑنا چاہیے۔ لیکن پتہ ہے انھوں نے کہا کیا۔ فرمایا تم غلط کہتے ہو میں فارسی جانتا ہوں۔ عابد صاحب یہ سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔

ف :- عابد صاحب! آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ صرف داستان طرازی ہے۔

ب : لیکن یہ نہ بھولئے گا کہ اصل دعویٰ اسی طرح قائم ہے۔ جو شخص ان سے پڑھ کر فارسی پڑھائے گا وہ کیا پڑھائے گا؟

میں نے یہ گفتگو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کی ہے ورنہ بخاری کی ہر بات بذلہ تھی۔ ان کا ہر سخن پُر مغز تھا۔ ان کے علمی تنوع کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ ایس سی طبیعات میں پڑھتے تھے۔ کسی نے ازراہِ تفنن مشورہ دیا گیا کہ انگریزی کا ایم۔ اے کرو۔ اور سائنس کے اس طالب علم نے انگریزی پر ایسا عبور حاصل کیا اور اس کامیابی سے امتحان پاس کیا کہ صوبہ پنجاب (متحدہ) میں بلکہ غالباً برصغیر میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جو انگریزی دانیات اور اصوات کے استاد مقرر ہوئے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ مضمون اگر کسی نے پڑھایا ہوگا تو وہ انگریز ہوگا۔

مرحوم اُردو میں بھی شعر کہتے تھے فارسی میں بھی۔ ان کے کلام کا جو حصہ دستبرد زمانہ سے محفوظ رہا وہ طفیل صاحب نے نقوش کے پطرس نمبر میں جمع کر دیا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ اس پطرس نمبر کی اشاعت سے بڑے بڑے ادیبوں کے کارنامے روشنی میں آئے۔ اداکاری میں انھیں یہ کمال حاصل تھا کہ جب انھوں نے کارل چیپک (نوبل پرائز حاصل کرنے والا تمثیل نگار) کا ڈراما کھیلا اور خود مرکزی کردار ادا کیا تو دیکھنے والوں پر جیسے سحر کر دیا اور وہ طلسماتی کیفیت پیدا ہوئی جسے ڈراما کی اصطلاح میں "اداکاری کی زندہ شخصیت کا کرشمہ کہتے ہیں" امتیاز علی تاج نے اس کھیل میں حصہ لیا اور اپنے جوہر دکھائے لیکن سچ یہ ہے کہ اس سلسلے میں بخاری کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ اس نکتے سے بھی آگاہ تھے کہ اداکاری گویا اس سے پھوٹی پڑتی ہے۔ یعنی اس کی خاموشی کی وضع اور نوعیت سین کی فضا کے عین مطابق ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو خاموش اداکاری ہی میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہاتھوں اور پاؤں کو اس طرح قابو میں رکھنا پڑتا ہے کہ تمسخر کا سامان نہ بنے بلکہ اثر میں اضافہ کرے۔

سینما کی مقبولیت کے بعد انھوں نے بہت اونچے درجے کی کتابیں پڑھیں کہ فلم کی تکنیک کے رموز ان پر روشن ہوں۔ ڈائرکٹروں میں پڈوکن کی بہت تعریف کرتے تھے جس نے اپنے کھیل "دس دن جن میں دنیا تہ و بالا ہوگئی"[۱] میں کمال ذکاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔

بہرحال یہ بھی ان کے ضمنی کمالات ہیں۔ تعلیم۔ تدریس۔ انتظامی صلاحیت۔ تقریر۔ خطابت۔ طنز۔ بذلہ سنجی۔ مختصر یہ کہ وہ کسی سے ہیٹے نہ تھے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مقرر ہوئے اور تاثیر بھی دہلی متعین ہوئے تو اس شہر میں ادبی گہما گہمی پیدا ہوئی۔ بخاری کے گھر قوالی اور سرود کی بڑی معرکے کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ ان دنوں وہ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے بذلہ سنج، طنز نگار اور ظریف سمجھے جاتے تھے "مضامین پطرس" کی اشاعت کے بعد ان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ جس بے تکلفی سے وہ طنز کرتے ہیں۔ جیسا بھرپور

---

[۱] TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD.

وار کرتے ہیں۔ جس طرح معاشرے کے مفسدات کی نشاندہی کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ رشید احمد صدیقی بھی طنز اور خالص ظرافت میں ان تک نہیں پہنچے۔ مضامین مختصر سا مجموعہ ہے لیکن اس میں مزاح کی ساری اصناف موجود ہیں۔ طنز (IRONY) بھی ہے۔ ظرافت (WIT) بھی۔ چلبلا خالص مزاح (HUMOUR) بھی ہے۔ البتہ یہ مزے کی بات ہے کہ "میبل اور میں" جو لی کاک کا ترجمہ ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے اپنے مضمون و ماخذ کی نشاندہی نہیں کی۔ معلوم نہیں یہ سہو کاتب ہے یا سہو مصنف۔ "میں ایک میاں ہوں" میں ہماری معاشرت کا ایک ایسا پہلو بے نقاب کیا گیا ہے جو ذہنوں میں پرافشاں رہتا تھا۔ لیکن قرطاس پر نہیں آیا تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں اقتباسات کا نقل کرنا ممکن نہیں۔ پھر یہ کہ پطرس نمبر شائع بھی ہو چکا ہے۔ ارباب ذوق اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ اپنی نظیر آپ ہے اور اس کی نظیر اردو ادب میں اب تک نہیں ملتی۔

انھوں نے کالز وردی کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی کیا ہے یعنی "سیب کا درخت"۔ یہ ترجمہ ایسا شستہ، صاف، رواں اور مقالات کے اعتبار سے بے نظیر ہے کہ قاضی عبدالغفار خاں کی محنت رائیگاں جاتی نظر آتی ہے۔ بخاری کے ترجمے میں کردار مقامی فضا سے مخصوص زبان بولتے ہیں اور اپنے وقت کے اعتبار سے یہ کمال کارکردگی ہے۔ تائیس کا اوپرا شاید سیب کے درخت کی طرح موثر نہ ہو لیکن اس میں بھی ان کی عدیم النظیر صلاحیت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں اتنے محتاط تھے کہ نثر بھی شعر کی طرح لکھتے تھے۔ ان کے خطوط اگرچہ غالب کے خطوط کی طرح سنگ میل کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن تاہم شگفتگی، بذلہ سنجی، نکتہ طرازی قدم قدم پر قاری کا دامن کھینچتی ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اگر مجھ سے کہا جائے کہ مختصراً بخاری کی تحریروں پر انتقاد کروں اور غایت اختصار سے کام لوں تو میں کہوں گا کہ ان کی کوئی چیز پڑھیے، غزل ہو یا نظم، نثر میں خط ہو یا مقالہ، مضمون ہو یا ظرافت کا کارنامہ پڑھنے والا ایسا محو ہوتا ہے کہ اس دنیا کی تمام الجھنیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ بخاری پڑھنے والے کو اپنے دام خیال میں اس طرح گرفتار کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک طلسمی فضا میں مبہوت لیکن خوش پاتا ہے۔ یہ طلسمی اثر ہمارے عہد کے انشا پردازوں اور مصنفوں میں خال خال نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہی ادب کی جان ہے کہ پڑھنے والا کچھ عرصے کے لیے دنیا کے بکھیڑوں، دھندوں اور الجھنوں سے نجات حاصل کرے اور پڑھنے کے بعد اس پر وہ کیفیت طاری ہو جسے انگریزی میں SERENITY کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ دشوار ہے۔ اس سے مراد وہ سکون قلب اور استقامت خاطر ہے جو کلاسیکی ادب کے مطالعہ سے لازماً پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کے گھاؤ بھر جاتے ہیں اور وہ جدوجہد حیات کے لیے اپنے آپ کو مستعد اور تیار پاتا ہے۔ اسی کیفیت کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے۔ اگرچہ اسلوب عاشقانہ ہے ؎

دل شکستہ دراں کوئے می کنند درست چنانکہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

تاثیر کی طرح بخاری بھی ادبی حلقوں کے امام تھے۔ ان سے طالب علموں کے علاوہ بے شمار ادیبوں اور انشا پردازوں نے فیض اٹھایا ہے۔ راقم الحروف بھی ان میں شامل ہے کہ جب وہ ۱۹۴۷ء میں لاہور آئے تو ان کے حلقے کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی تمام محافل میں شرکت کرنا گویا میرا ایک فرض تھا۔ یہ محفلیں علمی، ادبی، تحقیقی ہر طرح کی ہوتی تھیں اور بخاری ان میں میر مجلس کی حیثیت سے جو کچھ کہتے تھے وہ بذلہ سنجی کے روپ میں عالمانہ گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتا تھا۔ اب وہ محفلیں ہی سونی ہو گئیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

(۲)

احمد ندیم قاسمی

مولانا حالی | غالب کے بعد اگر مولانا حالی کا وجود نہ ہوتا تو یہ تصور تک لرزا دیتا ہے کہ اُردو شاعری کن نشیبوں میں اُتر چکی ہوتی۔ غالب کا فن اپنے دور سے یقیناً بہت آگے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے شعرائے غالب کا اثر قبول کرنے کی بجائے "ترقیٔ معکوس" کے شکار ہو گئے اور غالب کو اُردو شاعری کی روایت سے خارج کر کے اس سے بھی نصف صدی پہلے کی شاعری کا تتبع کرنے لگے۔ یہ دراصل شعرِ غالب کا غیر شعوری ردِ عمل ہی تھا جو داغ دہلوی اور امیر مینائی کی غزلوں کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس دور میں اگر مولانا حالی ایسا فنی نابغہ پیدا نہ ہوتا تو یاد رکھئے کہ اقبال نے بھی داغ ہی سے اصلاح لینا شروع کی تھی اور صرف وہاں کی اُردو شاعری نے اقبال ہی سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ یوں آج کا اُردو شعر داغ اور امیر کی غزلوں کا بے رنگ چربہ ہوتا اور اگر زمانے اور ماحول کے تقاضے اور مطالبے اس پیرایۂ اظہار کو بدلتے بھی تو شاعروں کو کہنے کا ڈھب کہاں سے آتا۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں متذکرہ حادثہ ممکن تھا۔ اس قسم کے امکان کی ایک مثال ہندی شاعری ہے جو آج بھی اظہار و بیان کے معاملے میں توتلے پن کی شکار ہے۔

شاعر کی عظمت کا یہ پیمانہ نہایت درجہ معتبر ہے کہ اگر اسے اور اس کے فن کو تاریخِ شعر میں سے خارج کر دیا جائے تو کیا اس کے بعد کی شاعری کو کچھ نقصان پہنچتا ہے یا اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میر یا انیس، غالب، حالی یا اقبال میں سے کسی کے ساتھ یہ برتاؤ کر کے دیکھیے یکایک ان کے بعد کی شاعری سپاٹ ہوتی نظر آئے گی، موضوع محدود اور اظہار و ابلاغ کے پیمانے تنگ ہوتے دکھائی دیں گے اور ایسا محسوس ہوگا جیسے شاعری فن کی اونچی چوٹی پر سے لڑھک کر کہیں نیچے جھاڑیوں میں لٹک کر رہ گئی ہے۔ پچھلے دنوں ایک نوجوان نقاد روایت سے بغاوت کے موجودہ (اور یقیناً عارضی) فیشن کے مطابق قلم کو لٹھ بنا کر مولانا حالی کے پیچھے پڑ گئے تھے اور اپنی بے اطمینانی کے اظہار کے لیے اپنے مضمون میں مولانا حالی کو مسلسل "مولوی حالی" لکھا تھا۔ میں نے اس وقت سوچا کہ اگر یہ صاحب مولانا حالی کو تاریخِ شعرِ اُردو میں سے خارج کر کے اقبال اور پھر شاعروں کی جدید تر پود تک آتے تو کیا جب بھی وہ مولانا حالی کے کمالات اور خدمات سے انکار کرنے کا حوصلہ کرتے؟

یہ درست ہے کہ مولانا کی پند و نصائح سے بھری ہوئی شاعری کو بڑی شاعری میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن یوں تو ہمیں اپنی سیاسی تاریخ میں سے سرسید کو بھی خارج کر دینا ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں برصغیر پر ملکہ وکٹوریہ کے اقتدار کی غیر مشروط تعریفیں کی ہیں۔ مگر کیا سرسید کو اپنی سیاسی تاریخ سے خارج کر کے ہم ۱۸۵۷ء سے اب تک کی ایک صدی طے بھی کر سکیں گے؟ حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کی تلقین کے باوصف سرسید کی خدمات سے انکار کرنا ایک باشعور اور باضمیر آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی نصف صدی

مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا اصلاحی دور ہے اور اگر مولانا حالی نے اپنی شاعری کی مدد سے اس اصلاحی مہم کو بامعنی بنایا ہے تو اس کا اعتراف لازمی ہے۔ ان نظموں کو ان کی شاعرانہ قوتوں کا اظہار نہ سمجھئے، سرسید کی اصلاحی کوششوں میں مولانا حالی کی عملی شرکت کا ثبوت کہہ لیجئے (اور فنی سے قطع نظر سیاسی لحاظ سے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے) مگر مولانا حالی نے سچ مچ کی شاعری بھی تو کی ہے۔

مولانا حالی کی مسدس اور متعدد مثنویوں کے وہ اثرات بھی کچھ کم اہم نہیں جو زبان کی سلاست اور بیان کی بلاغت کی صورت میں ظاہر ہوئے مگر مولانا حالی کی غزلیں بھی اس دور کی غزلوں سے قطعی مختلف اور بہت اونچی ہیں جب اُردو دان دنیا میں داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ براہِ راست غالب، مومن، اور شیفتہ کے تغزل سے فیض یاب ہیں اور یہ اُردو شعر کی بدقسمتی ہے کہ مولانا حالی کی شاعرانہ عظمت کا جائزہ لینے والے ان کی غزلوں کی طرف کما حقہٗ متوجہ نہیں ہوئے بلکہ بعض نے تو کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے جیسے مولانا حالی مسدس نہ کہتے تو گمنام رہ جاتے۔

مولانا حالی ایک سے زیادہ حیثیتوں سے اُردو شعر و ادب کی متاعِ بے بہا ہیں۔ صاف ستھری اور خالص غزل کہنے کے علاوہ وہ بہت منجھے ہوئے نظم نگار بھی ہیں۔ پھر اُردو تنقید کو تذکرہ نگاری کے حصار میں سے نکال کر اسے بجائے خود ایک فن کی حیثیت بخشنا بھی انہی کا کام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُردو میں فنِ سوانح نگاری کے بھی امام ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کے انتقال کے نصف صدی بعد بھی آج تک ان کی حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب سے بہتر سوانح عمری اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ ایک ہی ذات میں اتنے متنوع کمالات شاذ ہی جمع ہوتے ہیں۔ لاہور کو فخر ہے کہ یہاں وہ مولانا حالی بھی مقیم رہ چکے ہیں جو اُردو شعر و ادب کی چند نمایاں ترین شخصیتوں میں شامل ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں

اُردو میں قادر الکلامی کی صحیح مثال نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی شاعری ہے۔ ان کے بعد صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کی شاعری کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں۔ کوئی مفہوم ایسا نہیں، اظہار کا کوئی پہلو ایسا نہیں۔ ابلاغ کا کوئی رُخ ایسا نہیں، جذبے کی کوئی پرت ایسی نہیں جس کے لیے ان کے پاس نو بہ نو الفاظ و تراکیب کا ایک بے پناہ خزانہ موجود نہ ہو۔ یہ دو شعرا جوش ملیح آبادی اور مولانا ظفر علی خان ہیں۔

ہر شاعر کا ایک اپنا ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی "ڈکشن" ہوتی ہے۔ اسے چند الفاظ کے ساتھ خصوصیت سے پیار ہوتا ہے۔ انہی کے متنوع استعمال سے وہ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ غالب کے اُردو کلام میں صرف "آئینہ" کا لفظ شاید ایک سو سے بھی زائد بار آیا ہوگا۔ اسی طرح میر اور اقبال کے ہاں بھی چند خاص الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں (اور یقیناً بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں) لیکن نظیر، انیس اور جوش کی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی نو بہ نو الفاظ و تراکیب کا ایک سمندر ہیں (اور سمندر خشک نہیں ہوتے) دراصل مولانا کے موضوعاتِ سخن میں اتنا تنوع ہے کہ ایک منتخب ذخیرۂ الفاظ کو اپنے لیے خاص کر کے وہ تنوع کی بوقلمونی کو برقرار نہ رکھ سکتے اور بوجھل قسم کی تکرار کا شکار ہو جاتے۔ ان کا کلام مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور رومانی موضوعات سے بھرا ہوا ہے اور ہر موضوع پر انھوں نے اتنی روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اور پھر ایسے بھرپور پن سے کہا ہے جیسے انھوں نے اس موضوع پر شاعری کی آخری حد قائم کر دی ہے۔ آخری حد کبھی قائم نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہو سکے گی لیکن جب کسی کا کلام پڑھتے ہوئے اس قسم کا احساس پیدا ہونے لگے تو یہی احساس شاعر کی عظمت کا حتمی ثبوت بن جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں مذہبی رہنما بھی تھے، سیاسی لیڈر بھی تھے، آتش نوا خطیب بھی تھے، صحافی بھی تھے، طنز نگار بھی تھے، ادیب بھی تھے، مترجم بھی تھے، شاعر بھی تھے اور ان سب حیثیتوں میں انھوں نے برصغیر پاکستان و ہند کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کا منصفانہ جائزہ

کسی ایک فرد کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ ایسے کاموں کے لیے زندہ قومیں علیحدہ اکادمیاں قائم کرتی ہیں اور یہ جائزے کئی کئی جلدوں میں شائع ہوتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کو ان کے زمانے کے حالات اور ان کی اپنی بے قرار طبیعت نے شعر و ادب کا کام جم کر نہیں کرنے دیا، ورنہ اگر وہ اپنے آپ کو صرف عالمی شاہکاروں کے ترجمے ہی کے لیے وقف کر دیتے تو آج اُردو زبان کو اس بے بضاعتی کا احساس نہ ہوتا کہ اس میں دنیا بھر کی زبانوں کے کلاسیکل لٹریچر کے معیاری تراجم موجود نہیں ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور اطالوی زبانیں اسی لیے بڑی ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کے ادب کو باہم یوں منتقل کیا ہے کہ ایک ایک زبان پوری دنیا، یا کم سے کم پوری مغربی دنیا کی ترجمان بن گئی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اُردو کو بھی حیثیت دینے کے لیے تراجم کا آغاز کیا تھا۔ ان کے تراجم آج بھی، جب اُردو زبان میں خاصی وسعت پیدا ہو چکی ہے، لاجواب حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سب ان کے نکھرے ستھرے ذوق اور اُردو زبان پر ان کے بے پناہ عبور کا کارنامہ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے سلسلے میں جب بھی کسی نے کچھ لکھا ہے، (حالانکہ بہت کم لکھا گیا ہے) اور جہاں بھی ان کا ذکر آیا ہے لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا ہے کہ وہ قوافی کے بادشاہ تھے۔ قوافی کی بادشاہت کوئی ایسی قابلِ فخر چیز نہیں ہے قوافی کے بادشاہ تو بے نظیر شاہ اور استاد ذوق بھی تھے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر قوافی کی گرفت میں آگیا ہے یا قوافی شاعر کے بس میں ہیں جن سے وہ صرف اتنی ہی مدد لیتا ہے جتنی ایک مصوّر اپنے برش سے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کی باگ قوافی کے ہاتھوں میں نہیں رہنے دی ہے بلکہ قوافی پر اس کی فکر کا سحر طاری ہے۔ اُردو شاعری میں روانی اور بے ساختگی کی جو مثال مولانا ظفر علی خاں نے قائم کی ہے (جب کہ انھوں نے بیشتر نظمیں ارتجالاً کہی ہیں) اس کا جواب نظیر، انیس اور جوش کے سوا اُردو میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی اور فن کو یوں تو برِ صغیر کی تاریخ کے ایک باب کی حیثیت حاصل ہے لیکن اگر ان کے سوانح مرتب کیے جائیں تو یہ کتاب خاص طور سے لاہور کی ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصے کی تہذیبی، فکری، فنی، سیاسی اور مذہبی تاریخ بن جائے گی۔

مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا عبد المجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیتوں میں بڑی نمایاں اور حیران کن مماثلتیں ہیں۔ البتہ مولانا حسرت اپنے ذاتی اخبار کے چکّر میں کبھی نہیں پھنسے، نہ ان کی صحافتی زندگی میں مولانا سالک کا سا تسلسل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صحافت کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کا وقت نکال لیا اور زبان و بیان میں ایسی ثقاہت پیدا کرلی کہ وہ لوگ بھی جو اُردو بولنے والے گھرانوں میں پیدا ہوئے، اس کشمیری کی شستہ و رفتہ اُردو پڑھ کر سناٹے میں آجاتے ہیں۔

ان اُردو ادیبوں کے ساتھ جو ضرورتاً صحافی بن گئے یہ المیہ مسلسل وابستہ رہتا ہے کہ اگر وہ صحافت میں نہ پھنستے تو کتنے اونچے پائے کا شعر و ادب تخلیق کر جاتے۔ مولانا حسرت کو جب بھی فکرِ معاش سے فرصت ملی، شعر و ادب کی طرف متوجہ ہو گئے اس لیے وہ اپنی علمی اور فنی شہرت کے مقابلے میں خالی ہاتھ قطعی نہیں ہیں۔ اگر ان کی غزلوں کی مختصر تعداد کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک مصرع سے ایک ایسا شاعر جھانکتا نظر آتا ہے جس نے اُردو کے کلاسیکی ادب کو پڑھا اور برتا ہے اور جس نے روایات کو سنوارا اور رچایا ہے۔ یہ غزلیں جس

شستگی اور شائستگی سے لبریز ہیں وہ بہت بڑے شاعروں ہی کے حصے میں آتی ہے مگر بُرا ہو آلام روزگار اور معیشی مجبوریوں کا کہ انھوں نے کتنے ہی ہیروں کو اپنی عظمت کے اظہار کا موقع ہی نہ دیا۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی غزل پڑھ کر جہاں ذہن اس خوبصورت شاعری سے لطف اندوز ہوتا ہے وہاں اسے اس کرب کا سامنا بھی رہتا ہے کہ کاش اس شاعر کو شعر کہنے کا اور بھی وقت مل سکتا۔

مولانا حسرت کی ایک تصنیف ہے "پربت کی بیٹی"۔ "میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ "پربت کی بیٹی" کے سوا کچھ اور نہ لکھتے تو عجب بھی ان کا نام اُردو کے ان ادیبوں میں صدیوں تک شامل رہتا جنھوں نے علم الاصنام اور شاعری کو یکجا کر کے ایسی نثر پیش کیا جس کا جواب نظم ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس تصنیف میں زبان و بیان کا جو حسن ہے وہ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار اور سید سجاد حیدر یلدرم کے باوجود لاجواب ہے۔ میں تو یہ تک کہوں گا کہ اُردو ادب میں اُردو اور ہندی کے اس خوبصورت امتزاج کی مثال فراقؔ کی رباعیاں بھی نہیں ہیں۔ پھر ان داستانوں میں جو کہانی پن ہے اسے اساطیر میں ایک اضافے کی حیثیت حاصل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو اُردو اور فارسی کا عالم ہے ہندی اتنی بے تکلفی سے کیسے لکھ جاتا ہے اور اگر اسے ہندی پر اتنا عبور حاصل ہے تو خالص اُردو لکھتے ہوئے اس کا قلم کیوں نہیں رُکتا۔

مولانا حسرت نے کبھی کبھار تنقیدیں بھی لکھی ہیں اور طویل تبصرے بھی رقم کیے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ان کے علمی تبحر اور نفاستِ ذوق کا پتہ چلتا ہے مگر تنقید ان کا میدان کبھی تھا ہی نہیں۔ ان کا اصل جوہر ان کے طنز و مزاح میں کھلتا ہے۔ میں نے یہاں صرف "مزاح" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ خالص مزاح نگاری صرف پطرس، عظیم بیگ چغتائی اور مولانا سالک وغیرہ نے کی ہے۔ طنز و مزاح کے امتزاج کی دنیا بالکل دوسری ہے۔ اس صنف میں مزاح، طنز کا محتاج رہتا ہے اور طنز ایک ایسا فن ہے جو اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک لکھنے والا زبان و بیان کی نزاکتوں اور نفاستوں پر حاوی ہونے کے علاوہ انسانی معاشرے، انسانوں کے باہمی سیاسی، اخلاقی اور انفرادی رشتوں، ان کے محرکات اور ان کے نتائج سے پوری طرح باخبر نہ ہو۔ مولانا حسرت کے مزاح میں جو طنز چھپی ہوتی ہے وہ چلتی ہوئی چیز نہیں کہ ہنسے، مسکرائے اور قصہ ختم ہو گیا۔ یہ طنز کلیجے میں کانٹا بن کر بھی اٹک جاتی ہے اور بظاہر انسان ہنستا مگر اندر سے سوچتا رہ جاتا ہے۔

مولانا حسرت نے روزناموں کے فکاہی کالموں کے علاوہ فکاہی مضامین بھی لکھے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی نقاد "باقاعدہ" مزاح نگاروں کا ذکر کرتا ہے، مولانا حسرت کا حوالہ دینا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ محض اور محض یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس تنقید کی بہت کمی ہے جو اپنے آپ کو ماضی کی تنقیدوں سے ملوث نہ ہونے دے۔ ہمارے ہاں لکیر کے فقیر تو بہت ہیں مگر نقاد اکا دُکا ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے بیس پچیس سال پہلے جو ادیب اور شاعر بڑے ادیب اور شاعر کہلاتے وہی آج بھی بڑے ادیب اور شاعر کہلاتے ہیں۔ اپنے ذہن سے سوچتے ہوئے نقاد کو ایک "مسلّمہ حقیقت" سے انحراف کرنے کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور یہ مقدس ارتکاب معمولی دل و دماغ کا کام نہیں ہے۔ یہی عالم مزاح نویسوں کا ہے اور اسی لیے مولانا حسرت اس سلوک ناروا کے مستحق قرار پائے ہیں بصورت دیگر حسرت کا طنز و مزاح درجنوں مانے ہوئے مزاح نویسوں پر بھاری ہے۔ صرف ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور کالموں کا مطالعہ شرط ہے۔

بہ حیثیت صحافی مولانا حسرت اس فہرست میں شامل ہیں جس میں (لاہور کی حد تک) مولانا ظفر علی خاں، مولانا سالک اور مولانا مہر

کے نام آسکتے ہیں۔ ایک معاملے میں مولانا حسرت ان سے آگے بھی ہیں، اور وہ اُردو اخبارات کی گٹ اَپ کا معاملہ ہے اور آج پاکستان کے اُردو اخبارات کی جو صورت ہے وہ مولانا حسرت ہی کے حُسنِ ذوق اور سُوجھ بُوجھ کی رہینِ منت ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک

یہ شاید صرف اُردو زبان ہی کی بدنصیبی ہے کہ بعض ایسی شخصیتیں جنھیں قدرت نے اُردو ادب و فن میں اضافے کی بے پناہ قوتیں دے رکھی تھیں محض کاروبارِ حیات اور مکروہاتِ معاش کے سبب ایسا نہ کر سکیں۔ انھوں نے زبان و ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ بھی بیش بہا ہے لیکن جو کچھ نہیں دے سکیں (حالانکہ دے سکتی تھیں) وہ نہ جانے کیا ہوتا اور اگر دے جاتیں تو ہمارے ادب و فن کی آسودگی کا معیار نہ جانے کتنا اونچا ہو چکا ہوتا۔

پطرس ہی کو دیکھیے کہ اگرچہ انھوں نے صرف چند مضامین لکھ کر اپنی دھاک بٹھا دی اور صرف ایک طویل انگریزی افسانے —— سیب کا درخت —— کو اُردو میں منتقل کر کے مترجمین کو دم بخود کر دیا لیکن کیا ہم یہ شبہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس ایک ترجمے اور ان چند مضامین کے بعد ان کی تخلیقی قوتیں دم توڑ بیٹھی تھیں؟ ظاہر ہے کہ وہ اپنی بے پناہ غیر ادبی مصروفیتوں کے باعث ایسا نہ کر سکے اور یہ کتنا بڑا ستم ہے۔ ایک اور مثال ڈاکٹر تاثیر کی ہے جن کی ذہانت نے ان کے دشمنوں کو بھی قائل کر دیا مگر اسی عدیم الفرصتی کے سبب نہ تو وہ اُردو تنقید کو کسی جاندار نہج پر چلا سکے اور نہ اُردو شاعری کے ذخائر میں کوئی چونکا دینے والا اضافہ کیا حالانکہ ان کی ذہانت اور علمی استعداد ایسا کرنے پر قادر تھی۔ سید امتیاز علی تاج بحمد اللہ ہمارے درمیان موجود ہیں اور خدا کرے ابھی برسوں تک موجود رہیں مگر حیرت ہے کہ "انارکلی" ایسا بے مثال ڈرامہ لکھنے کے بعد ان کے تخلیقی سوتے خشک ہو گئے ہیں اور اس ڈرامے کی اشاعت کے ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصے بعد تک ان کے قلم سے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں نکلی۔

مولانا سالک کی تخلیقات کا حجم اگرچہ پطرس، تاثیر اور تاج کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے مگر ان کی ہمہ گیر، ہمہ رنگ اور متنوع شخصیت سے اُردو کی قریب قریب تمام اصنافِ ادب کو بے شمار توقعات تھیں اور یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ یہ توقعات اس حد تک پوری نہیں ہوئیں جس حد تک ہونا چاہیے تھیں۔ وہ شاعر تھے، افسانہ نگار تھے، نقاد تھے، مزاح نویس تھے اور مترجم تھے مگر ان کی پانچوں حیثیتوں کو ان کی صحافتی سرگرمیوں نے لوٹ لیا۔ "راہ و رسمِ منزل‌ہا" ان کے کلام کا مجموعہ ہے جو ان کی قادرالکلامی کا واضح ثبوت ہے مگر کیا سالک ایسے عالی ذوق فنکار سے اُردو زبان کی اس سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں تھیں؟ ظاہر ہے کہ ان کی شاعری پر صحافت کو فتح حاصل ہوئی۔ پھر ان کی افسانہ نگاری کو تو صحافت نے ابتدا ہی میں شکست دے دی تھی۔ ان کے اِکّا دُکّا تنقیدی مضامین برسوں کے وقفوں کے بعد شائع ہوتے رہے۔ یہ مضامین اُردو تنقید میں توازن و اعتدال کی خوشگوار مثالیں تھے مگر ان کی تعداد اتنی کم ہے اور انھیں یکجا کر کے شائع کرانے کا کام اتنا طول کھینچ گیا ہے کہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ کہنا آج بھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ "افکار و حوادث" کے کالموں کے علاوہ انھوں نے فکاہی مضامین بھی لکھے اور اگرچہ ان میں سے بیشتر ریڈیو کے لیے لکھے گئے مگر بہرحال ان کی بھی ایک اپنی حیثیت ہے اور وہ بھی اب تک یکجا نہیں ہو پائے۔ پھر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے شباب میں "چترا" کا ترجمہ کر کے اربابِ اُردو کو یہ خوشگوار احساس دلایا تھا کہ تراجم اجنبیت سے پاک بھی ہو سکتے ہیں اور اُردو کی اپنی چیز بھی معلوم ہو سکتے ہیں مگر چترا کے بعد مولانا سالک کی اس حیثیت پر بھی ایک چوتھائی صدی تک پردہ گر جاتا ہے البتہ صحافتی زندگی سے کنارہ کشی کے بعد انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کو جس خوبی، نفاست اور روانی کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا وہ کچھ انھی کا حصہ ہے اور یہیں یہ خلا

بہت حد تک پُر ہو جاتی ہے۔ ان کی آخری حیثیت صحافی کی ہے۔ اس فن میں انھوں نے جو کام کیا ہے اسے اُردو صحافت کی تاریخ آسانی سے فراموش نہیں کر سکتی۔ میں ان کی خود نوشت سوانح عمری "سرگزشت" کو بھی ان کی صحافت ہی کا کارنامہ قرار دیتا ہوں ورنہ اگر وہ اپنے سوانح بحیثیت ادیب لکھتے تو سرگزشت کی حیثیت اور اہمیت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ ان کا فکاہی کالم "افکار و حوادث" بھی صحافت ہی سے متعلق ہے مگر ایک یہی صنف ایسی ہے جس کے دم سے ادب کے ساتھ مولانا سالک کا رشتہ قائم رہا۔ اگر ان کالموں کا انتخاب شائع ہو جائے تو یہ اُردو زبان اور ادب کی بڑی خوش نصیبی ہوگی اور اس طرح اُردو کے قارئین کو بھی اندازہ ہو سکے گا کہ مولانا سالک جن کا نام ادبی تذکروں میں بار بار سننے میں آتا ہے اس بار بار کے تذکرے کے کیوں مستحق ہیں اور شاید اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔

فلک پیما

فلک پیما بہت اونچے درجے کے طنز نگار تھے اور اسی "اونچائی" نے ان کے طنز کی اپیل کو محدود کیے رکھا۔ اوّل تو وہ جس طبقے کے نظریات، و خیالات کو اپنی ذہانت کا نشانہ بناتے تھے وہ عام اُردو دانوں کے دائرۂ مشاہدہ سے قطعی باہر تھا۔ پھر وہ طنز کا تیر کچھ ایسے "انٹلکچوئیل" انداز میں چلاتے تھے کہ اس تیر کی کاٹ کو صرف وہی اونچا طبقہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ ادیبوں کی بات الگ ہے کہ ان کی نگاہ اگر تیز نہ ہو تو وہ ڈھب کی بات ہی نہ کر سکیں۔ اسی لیے وہ تو فلک پیما کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر یہاں ذکر عام پڑھے لکھے لوگوں کا ہے اور عام پڑھے لکھے لوگ فلک پیما کے کمالِ طنز سے بے بہرہ نہیں تو کما حقہٗ باخبر بھی نہیں ہیں۔ اس میں کچھ قصور تو خود فلک پیما کا ہے اور کچھ اُردو ادب کے نقادوں کا۔

اُردو ادب کے نقادوں کے ہاتھوں جن بڑے بڑے لکھنے والوں کی مسلسل حق تلفی ہوتی ہے ان میں فلک پیما بھی شامل ہیں۔ چلتے سے ذکر اور اُچٹتی سی نظر کی بات نہیں کہ ان کے مستحق تو وہ ادیب بھی قرار پا جاتے ہیں جو عمر بھر کوئی اپنی بات کسی اپنے انداز میں نہ کہہ پائے ہیں۔ یہاں بات بھرپور تنقیدی جائزے کی ہو رہی ہے اور فلک پیما اس سے مسلسل محروم ہیں حالانکہ وہ اس مکمل محرومی کے مستحق نہیں ہیں۔ انھوں نے طنز کو یقیناً فلسفے کی سطح تک اٹھا دیا ہے اور ان کے طنز سے محظوظ ہونے کے لیے "درمیانے قد" کے قارئین کو پنجوں کے بل کھڑے ہونا پڑتا ہے لیکن نقاد کا یہ فرض بھی تو ہے کہ ادیب نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی پرکھے، جس انداز یا جس رُخ سے کہا ہے اس کا جائزہ بھی یقیناً تنقید کا ایک حصّہ ہے مگر پوری تنقید نہیں ہے۔

فلک پیما ایک مفکر قسم کے طنز نگار تھے۔ روزمرہ کی زندگی کی صرف وہی تفصیلیں ان کی نگاہوں میں جچتی تھیں جو کسی نہ کسی پہلو سے فکر و فلسفہ کے ساتھ متعلق ہوتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ عوامی زندگی کی بعض کمزوریوں کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کرتے تھے۔ پہلے ان کمزوریوں کا فلسفیانہ پس منظر تیار کرتے تھے اور اس کے بعد ہی ان کا ہاتھ ترکش کی طرف اٹھتا تھا۔ پھر وہ بڑے سلیقے سے تیر چلاتے تھے۔ یہی سلیقہ ان کا اسلوب ہے مگر اس سلیقے میں ایسا رکھ رکھاؤ، ایسا لیے دیے رہنے کا سبھاؤ ہے جسے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور تشویش بھی۔ تشویش اس بات کی کہ ہم ایسے خاک نشینوں کی پسند اسے میلا نہ کر دے۔

اس سب کچھ کے باوجود فلک پیما اُردو کے چند گنے چُنے طنز نگاروں میں شامل ہیں۔ مزاح نویسوں کا ذکر نہیں، میرا اشارہ صرف طنز نگاروں کی طرف ہے اور میرے اندازے کے مطابق اُردو میں طنز نگاروں کی تین قسمیں ہیں۔ کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی اور فلک پیما ان تینوں اقسام کی نمایاں مثالیں ہیں۔ کپور کے طنز سے ارفع و ادنیٰ، خواص و عوام سب محظوظ ہو سکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا طنز دانشور کا طنز ہے۔ اس کا وار بھرپور رہتا ہے مگر یہ وار خاصے وقفے کے بعد پڑتا ہے۔ فلک پیما کا پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد قاری اس کے

مجموعی تاثر ہی سے محظوظ ہوتا ہے اور یہ مجموعی تاثر بھی خاصے سوچ بچار کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ فلک پیما کے طنز کی اپیل کچھ اس قسم کی ہے جیسے کوئی شخص کسی بزم میں ایک لطیفہ سُنے مگر اس کی سمجھ میں نہ آسکے۔ پھر جب وہ گھر میں آکر اپنے بستر پر لیٹے تو یکایک اسے لطیفے کی لطافت کا سراغ ملے اور وہ تنہائی میں ہنسنے لگے۔ بظاہر نہایت بے موقع مگر دراصل نہایت جائز موقع پر۔

فلک پیما کی ذہانت بے پناہ ہے مگر نہ جانے یہ "خان بہادر میاں عبدالعزیز" کی شخصیت تھی جو انھیں کھل کر بات کہنے سے روکے رہی یا یہ ان کے سماجی طبقے کا مطالبہ تھا کہ چاہے کچھ بھی کرو مگر "سلیقے" سے کرو۔ بہرکیف فلک پیما نے اُردو کو وہ کچھ نہیں دیا جو اسے اپنی ذہانت کے توسط سے دینا چاہیے تھا البتہ جو کچھ اس نے دیا ہے وہ فراموش کردینے کے قابل نہیں ہے۔ وہ اپنے اسلوب کا آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہے اور یہ بھی اس کی جرأت اور عالی ظرفی ہے کہ وہ اپنے ہی طبقے پر یعنی اپنے آپ ہی پر ہنستا ہے، اور اپنے آپ پر ہنسنا معمولی کام نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے اپنی انا کا گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے اور ہمارے بیشتر طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کے پاس اپنی انا کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔

اختر شیرانی

اُردو شاعری میں نظم کا آغاز اصلاحی اور نیچری نظموں سے ہوا۔ حالی اور آزاد سے لے کر ایک عرصے تک نظم پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اقبال نے آکر نظم کو سیاسی اور مذہبی موضوعات مہیا کیے لیکن وہ جذبہ جس نے شاعری کو جنم دیا ہے وہ حُسنِ صورت اور حُسنِ خیال جن کے دم سے زندگی اپنی گوناگوں کلفتوں کے باوجود زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے، عشق و محبت اور حُسن و جمال کا وہ احساسِ لطیف جو شاعر کو شاعر بناتا ہے، اقبال کے ابتدائی دور تک بھی صرف اُردو غزل کا موضوع رہا اور نظم صرف مسدسِ حالی کے معنوں میں نظم سمجھی جاتی رہی۔ اُردو پر یہ اختر شیرانی کا احسان ہے کہ اس نے نظم کو صرف جلسہ گاہوں کے لیے وقف ہونے سے بچالیا اور حُسن و عشق کے موضوعات پر ایسی ایسی نظمیں لکھیں کہ اُردو شاعری کا دامن یکایک بے حد وسیع نظر آنے لگا۔ یقیناً بعد میں اقبال کی فکری نظموں اور اقبال سے بعد کے شاعروں کی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ نظموں سے اُردو نظم کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اس کے باوجود اختر شیرانی کی خصوصیات اس وقت تک فراموش نہیں کی جاسکتیں جب تک اُردو نظم زندہ ہے۔

مشکل کام ہمیشہ کسی کام کا آغاز ہی ہوتا ہے۔ ولی نے جب فارسی غزل کی روایات سے اُردو غزل کو سجانے اور نکھارنے کا آغاز کیا تھا تو اسے اپنے معاصرین سے نہ جانے کیا کچھ سُننا پڑا ہوگا۔ غالب نے جب اُردو غزل کو قلبی واردات کے علاوہ ذہنی واردات کا بھی آئینہ بنانا چاہا تو اس کے ساتھ خود اس کے زمانے نے جو برتاؤ کیا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ حالی نے جب اعلان کیا کہ اُردو غزل ایک مرض میں مبتلا ہے مگر اسے اپنے مرض کا احساس ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ روایتی غزل نگاروں نے اس کی مخالفت کی مگر یہ ولی، غالب، حالی اور ایسے ہی دوسرے شاعروں کی پامردی، عالی حوصلگی اور عظمت تھی کہ انھوں نے رسم، روایت اور فیشن کے برعکس ایک کام کا آغاز کیا اور اُردو شاعری کو وہ کچھ بنا گئے جو کچھ وہ اب ہے۔ اختر شیرانی کا شمار بھی ایسے ہی شاعروں میں ہونا چاہیے۔ اختر نے بھی اس دور میں جب اُردو نظم پند و موعظت کے حصار میں گھری جا رہی تھی، اُردو شاعری کو ان موضوعات سے روشناس کرایا جو بظاہر اجنبی تھے مگر دراصل عام انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں، ان کے خوابوں، ان کی امیدوں اور تمناؤں کے ترجمان تھے۔

اپنے زمانے میں اختر شیرانی کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ یہی تھی کہ اس نے پہلی بار جذبے اور احساس پر سے رسم و رواج کی جھلیاں اتاری تھیں۔ یاد رہے کہ اختر اس زمانے میں مقبول تھا جب علامہ اقبال کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اتنے عظیم شاعر کی موجودگی میں

اختر کا اس حد تک مقبول ہونا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ شخصیت کا سایہ بڑے بڑوں کو غائب کر دیتا ہے۔ غالب کے سب معاصر شعراء نالائق نہیں تھے، ذوق بھی تھے، مومن بھی تھے، شیفتہ بھی تھے اور وہ بڑے شاعر تھے مگر انھیں عرصے تک غالب کی شخصیت کے سائے نے ڈھانپے رکھا ہے۔ ایک بہت بڑی شخصیت کی موجودگی میں اگر کوئی دوسری شخصیت اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ دوسری شخصیت کی نمایاں انفرادیت ہے۔ انفرادیت' جو فن کی دنیا میں 'اسلوب' کہلاتی ہے۔

اختر شیرانی کو اُردو داں طبقہ بظاہر بھولتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی اُردو شاعری کے پس منظر میں اختر شیرانی کی نظمیں بہت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اختر کے ہاں فنی معیار کے نشیب و فراز بہت زیادہ ہیں لیکن ان باتوں سے اختر کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ کسی نتیجہ خیز کام کا آغاز کرنے والوں کی اہمیت کسی زمانے میں کم نہیں ہو سکتی۔ جیٹ طیاروں کے اس دور میں بھی رائٹ برادرز کو کوئی نہیں بھول سکتا جنھوں نے ہوا میں اُڑنے کے پرانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اب اگر کوئی انجینئر رائٹ برادرز کے بنائے ہوئے اس ڈھانچے کی نکتہ چینی شروع کر دے جس نے انسان کو اوّل اوّل ہوا میں اڑایا تھا تو اس سے رائٹ برادرز کی اہمیت کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ اختر ایسے شاعر کے سلسلے میں انجینئروں کا ذکر نہایت بے محل معلوم ہوگا لیکن اختر کی اہمیت کی وضاحت کے لیے مجھے یہی مثال مؤثر نظر آتی۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو نے اپنے فن کے لیے برِ صغیر پاکستان و ہند سے موضوعات اور زبان لی ہے مگر افسانہ لکھنے کا فن اس نے روس اور فرانس سے سیکھا ہے۔ منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم سے ہوتا ہے۔ پھر جب اس نے اپنے افسانے لکھنے شروع کیے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیخوف، گورکی اور موپاساں وغیرہ سے بڑی شدت کے ساتھ متاثر ہے۔ اسی لیے منٹو کے افسانوں کا گہرا اور جامع مطالعہ کرنے کے لیے روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں یا کم سے کم "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے ان خاص نمبروں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے جنھیں منٹو نے مرتب کیا تھا اور جن میں ان یورپی زبانوں کے متعدد ایسے افسانے شامل ہیں جنھیں خود منٹو نے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے پہلے مجموعے "منٹو کے افسانے" میں روس اور فرانس کی کہانیوں کے اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ بعض افسانے تو ایسے بھی ہیں (مثلاً "شغل") جن کی اشاعت کے بعد قارئین نے متعلقہ رسالوں کے مدیروں سے استفسار کیا کہ یہ کس یورپی افسانہ نگار کی تصنیف ہیں اور آپ یا مترجم آخر میں یہ حوالہ دینا کیوں بھول گئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ منٹو کے اپنے افسانے تھے۔ اس نے افسانہ لکھنے کے روسی اور فرانسیسی انداز کو اپنے خون میں کھپا لیا تھا اور یہی نکتہ اس کے اچھوتے اسلوب، اس کے گہرے مشاہدے، اس کی جزئیات نگاری اور اس کی کردار آفرینی کی اصل بنیاد ہے اور اسی نے آخر تک اس کا ساتھ دیا ہے۔

منٹو کو جنس نگار قرار دیا جاتا ہے حالانکہ "منٹو کے افسانے" کے موضوعات میں جو دلکشا تنوع ہے اس میں جنس کا عنصر صرف اتنا ہے جتنا ہر باشعور افسانہ نگار میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو تو عبدالحلیم شرر اور آج کے تاریخی داستان طراز تک فراموش نہیں کر سکے۔ ان کے شمشیر بدست ہیرو کسی نہ کسی طرح محبت میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں اور یہ محبت متصوفانہ نہیں ہوتی، خالص جنسی یعنی جسم کی پکار رہتی ہے۔ البتہ بعد میں جب منٹو کو انگلستان کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں (سومرسٹ ماہم اور ڈی۔ ایچ لارنس وغیرہ) کے مطالعے کا موقع ملا تو جنس اس کی بیشتر کہانیوں کا محور قرار پا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جنس کی طرف اس بھرپور توجہ کا

ایک اور سبب بھی تھا اور جو لوگ منٹو کے مزاج کو جانتے ہیں انھیں یہ سبب بے جان معلوم نہیں ہوگا۔

ایک بار منٹو کو شوق چرایا کہ وہ اپنے فن کے بارے میں ہر اس شخص کی رائے معلوم کرے جو فنون لطیفہ کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہو۔ اس سلسلے میں اس نے مصوروں، موسیقاروں، شاعروں، سازندوں، حد یہ کہ بعض ایسی طوائفوں تک کی آراء بھی جمع کر لیں جنھوں نے گانے ناچنے میں نام پیدا کیا تھا۔ وہ مطلوبہ شخص کے پاس جا کر اپنا قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میرے فن کے بارے میں آپ کے ذہن میں فوری طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ فوراً لکھ دیجئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آراء دو دو چار چار سطروں پر مشتمل تھیں۔ منٹو چاہتا تھا کہ ان آراء کو "چشم روزن" کے نام سے ایک مجموعے میں یکجا کر دے (نہ جانے وہ مسودہ کیا ہوا) اس سلسلے میں منٹو میرے پاس بھی آیا اور قلم تھما کر یہی فرمائش کی۔ میں نے کہا کہ مجھے کسی ایرے غیرے کے بارے میں نہیں، منٹو ایسے فنکار کے بارے میں اپنا تاثر بیان کرنا ہے اس لیے سوچ سمجھ کر لکھوں گا۔ منٹو نے خفگی کا اظہار کیا مگر خدا نے مجھے ہمت دی اور میں مُصر رہا کہ میں شام تک چند سطریں لکھ کر بھجوا دوں گا۔ منٹو مان گیا اور میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ دراصل مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے فوری طور سے وہی کچھ لکھ دیا جو میں منٹو کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مجھ سے نہ صرف خفا ہو جائے گا بلکہ برس پڑے گا۔ ڈاک سے خط بھجوانے کی بات اور تھی۔ میں نے لکھا کہ منٹو کے مزاج میں بغاوت اور ہٹ کی بڑی شدت ہے اور حکومت نے غلطی کی کہ اس نے "کالی شلوار"، "دھواں" اور "ٹھنڈا گوشت" کے خلاف مقدمے چلائے۔ اگر حکومت میں فنی حس ہوتی تو وہ "نیا قانون"، "شغل" اور "نعرہ" کے خلاف مقدمات چلاتی۔ یوں منٹو ضد میں آ کر "نیا قانون" ایسے اور بھی افسانے لکھتا اور یوں اردو افسانے میں بڑے خوبصورت، بڑے جاندار اضافے ہوتے۔ اس نے "کالی شلوار" پر مقدمہ چلایا تو منٹو نے ضد میں آ کر "بو" لکھ دیا۔ اس نے "بو" کے خلاف مقدمہ دائر کیا تو منٹو نے "دھواں" لکھ دیا۔ اس نے "دھواں" کو قابل اعتراض قرار دیا تو منٹو نے "ٹھنڈا گوشت" لکھ دیا اور یوں جنس ہی اس کے بعد کے افسانوں کا تنہا موضوع قرار پا گئی"۔ — سنا ہے کہ منٹو نے میرا یہ خط پڑھا تو غصے میں آ کر پھینک دیا مگر کچھ دیر کے بعد اٹھایا اور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ "بکواس ہے مگر کچھ ایسی غلط بکواس نہیں ہے"۔

میرا اندازہ غلط ہو یا صحیح ہو، منٹو نے ضد میں آ کر جنسی افسانوں کا طومار باندھ دیا ہو یا اس کی افتادِ مزاج کا تقاضا ہی یہی ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ منٹو نے جنس کو بھی ——— ننگی جنس کو بھی فن کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ فنِ افسانہ نگاری پر اس کے بے پناہ عبور کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں منٹو کے ان جذباتی مداحوں میں شامل نہیں ہوں جو منٹو کے افسانوں پر "عریانی اور فحاشی" کے الزام سے برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ منٹو یقیناً جگہ جگہ عریاں نگاری کا شکار ہوا ہے۔ کہیں کہیں فحاشی بھی اس سے دب نہیں سکی۔ ٹالسٹائی نے موپساں سے بالکل درست کہا تھا کہ میاں! نہانے کے بعد عورت کے جسم پر رُکے ہوئے پانی کے قطروں کا ذکر کرنا تھا تو یہ کیا ضرور تھا کہ تم ان قطروں کی رنگت بھی واضح کرتے اور کہتے کہ جسم کے رنگ کی وجہ سے پانی کے رُکے ہوئے قطرے گلابی ہو رہے تھے۔ یہیں سے تو وہ لذتیت شروع ہوتی ہے جو سیدھی فحاشی تک لے جاتی ہے۔ منٹو سے یقیناً ایسی لغزشیں ہوئی ہیں۔ ان کے جواز پیش کرنا یا ان پر تاویلوں کے پردے گرانا ممکن ہے عقیدت بھی ہو اور نیک نیتی بھی ہو مگر یہ فنی خلوص کے منافی ہے۔

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ محض اس وجہ سے منٹو کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ اس لیے کہ منٹو صرف جنس نگار نہیں تھا۔ "کھول دو" میں جو جنس ہے وہ بھی اگر جنس نگاری کے الزام سے مبرا نہیں ہے تو خدا اُردو کے ہر افسانہ نگار کو جنس نگار بنا دے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں جنس لذت کے بجائے کرب بن جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں منٹو اُردو کے افسانہ نگاروں میں بے حد نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانہ سناتے ہوئے وہ جس بے تکلفی اور سادگی سے کام لیتا ہے وہ اُردو کے شاید ہی کسی افسانہ نگار کو نصیب ہوئی ہو۔ افسانے کی تعمیر بڑی بے ساختگی سے ہوتی چلی جاتی ہے اور جب کہانی مکمل ہوتی ہے تو پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ارے! اس سادگی میں کتنی پرکاری تھی اور اس بے تکلفی میں کتنی خوبصورتی تھی۔

میراجی

اس نکتے کو کوئی ماہرِ نفسیات ہی حل کر سکتا ہے کہ میرؔاجی کی نظم میں اتنے اُلجھاؤ کیوں ہیں اور اس کی نثر اتنی سلجھی ہوئی کیوں ہے۔ نظموں میں الفاظ اس کے خیالوں کی نقابیں بن جاتے ہیں اور نثر میں یہی الفاظ قندیلوں کا روپ دھار لیتے ہیں جن سے اس کا مفہوم جگمگا اٹھتا ہے۔ نثر میں اس نے بڑے سلیقے کا مظاہرہ کیا ہے مگر نہ جانے نظم میں یہ سلیقہ کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ اندھی شخصیت پرستی کسی بحث یا دلیل سے قائل نہیں کی جا سکتی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ نظمیں میرؔاجی ایسے پڑھے لکھے اور باشعور فن کار کی ہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ خوبصورت اور مکمل ہیں، مسئلہ صرف یہ ہے کہ میرؔاجی نے نظموں میں اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو جو لباس پہنایا ہے وہ غیر موزوں ہے اور وہ شاعری میں اپنی بات کہنے کی امنگ کے باوجود اپنی بات کو چھپائے رکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔

میرؔاجی کی شاعری کے بھی دو پہلو ہیں۔ نظموں میں وہ ایسے ابہام کا شکار ہے جس کا جواز ڈھونڈنا بیکار ہے مگر گیتوں میں وہ اتنا رواں اور مترنم ہے کہ شاعری اور موسیقی کے درمیان بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے نظموں میں اس نے اسی قسم کے جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہو جن کے بارے میں کھل کر اور براہِ راست انداز میں بات کرنا بقائمی ہوش و حواس ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی نظموں کا ابہام موضوع کی مجبوری کا نتیجہ ہو مگر نظمِ معریٰ کو بھی ایک روانی، ایک بہاؤ، لفظوں کے حسین در و بست کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرؔاجی کی نظمیں شاعری کے یہ اوّلین مطالبات (بعض ٹکڑوں سے قطعِ نظر) بہ حیثیتِ مجموعی پورے نہیں کرتیں البتہ گیتوں میں وہ سب کچھ ہے جو ستھری ستھری صاف شفاف شاعری میں ہونا چاہیے۔ پھر ان گیتوں کی زبان میں اُردو اور ہندی کا جو امتزاج ہے وہ بھی کچھ کم متوازن اور حسین نہیں ہے۔

میرؔاجی کی نثر اُردو تنقید میں بالکل نئی چیز ہے۔ تنقید، ادبیات و فنون سے متعلق ہونے کے باوجود ایک ٹیکنیکل چیز ہے اور ہر ٹیکنیکل موضوع کی خاص اصطلاحیں اور خاص ترکیبیں ہوتی ہیں۔ بیشتر نقاد ان اصطلاحوں سے قطعِ نظر کر کے اپنا مفہوم کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارے ہاں کے تنقیدی مضامین کی اکثریت، زبان و بیان کے معاملے میں بے حد بھاری بھر کم ہوتی ہے۔ سلیس زبان میں تنقیدی جائزے لکھنا صرف ان نقادوں کا کام ہے جو اوّل تو اس زبان پر پوری طرح حاوی ہوں جس میں وہ تنقید لکھ رہے ہیں، دوسرے ان کے ذہن صاف ہوں اور خود اپنے نظریات اور نتائج کے سلسلے میں وہ اُلجھے ہوئے نہ ہوں۔ یہی اُلجھاؤ تحریر کو بھی گنجلک بنا دیتا ہے۔ اُردو میں سلیس تنقید نایاب تو خیر نہیں البتہ کم یاب ضرور ہے۔ مولوی عبدالحق اور فراقؔ گورکھپوری کے تنقیدی جائزے اس سلاست اور روانی کی ایک مثال ہیں لیکن میرؔاجی کی تنقید، سلاست کے معاملے میں ان سے بھی آگے ہے۔ اگر ہمارے نقاد اس سلاست، اس دلپذیر اندازِ تحریر کو اپنا لیتے تو تنقید کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں ہوا تھا تو خود میرؔاجی کے حلقۂ فکر کے نقادوں کا فرض تھا کہ وہ یہ رنگ اختیار کر لیتے مگر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرؔاجی کا اندازِ تنقید انہی کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ "مشرق و مغرب

کے لیئے" اور" اس نظم میں "میرا جی کے سُلجھے ہوئے اندازِ تنقید کے ایسے نمونے ہیں جو اُردو زبان کے لیے قابلِ فخر ہیں اور میرا جی بحیثیت نقاد کبھی نہیں مر سکتا۔

ان تنقیدی جائزوں نے بالواسطہ طور سے میرا جی کی ایک اور خصوصیت کو بھی نمایاں کیا ہے اور وہ غیر زبانوں کی نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ نظم کا نظم میں ترجمہ خود نظم کی تخلیق کا سا کٹھن کام ہے۔ اس سلسلے میں اگر اُردو میں کسی شاعر نے کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہے تو وہ نادر کاکوروی ہے۔ اس کے بعد جتنے بھی شاعروں نے منظوم ترجے کی طرف توجہ کی ہے منہ کی کھائی ہے۔ غیر زبانوں کی متعدد نظمیں اُردو نظم میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ممکن ہے مترجم نظم کے مفہوم کو بھی منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں لیکن اگر ان نظموں کی ہیئت کو دیکھا جائے تو مترجم شاعر کا عجز نمایاں ہو جاتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے مصرعے، ٹھُسے ٹھُسے قافیے، سپاٹ انداز، اصل نظم کے حُسن کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ صرف میرا جی ایسا شاعر ہے کہ اس نے نظم کو اُردو میں منتقل کرتے ہوئے اس کی ہیئت کے حُسن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ یہ تراجم پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظمیں اگر اُردو میں تخلیق کی جاتیں تو ان کی ہیئت یہی ہوتی جو میرا جی کے تراجم کی ہے۔ میرا جی کے بعد ابنِ انشا نے چینی نظموں کے ایسے ہی نپے تلے اور حسین ترجمے کر کے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے اور یوں میرا جی کی محنت ضائع نہیں ہوئی۔

ادبی تحریکیں

شہرت بخاری

میں یہاں ان ادبی انجمنوں کا ذکر کروں گا جنھوں نے اُردو ادب میں کسی نہ کسی طور کسی نہ کسی ادبی تحریک کو جنم دیا ہو یا ان کی تقویت کا سبب ہوئی ہوں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نگاہوں نے گزشتہ ایک صدی کے ورق اُلٹنے شروع کر دیے۔

ہوتے ہوتے میری نگاہیں ۹ را پریل ۱۸۷۴ء کی ایک سہانی شام پر جا کر رُک گئیں ـــــ اور جبہ و دستار میں ایک ایسی شخصیت آنکھوں کے سامنے آگئی جس کے احسانوں کے بوجھ تلے اُردو نثر و نظم دبی ہوئی ہے اور جس سے قدآور شخصیت اُردو ادب نے نہ تو پیدا کی ہے نہ ایسا ہونے کا فی الحال امکان ہے۔ ـــــ محمد حسین آزاد!

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے جب آخری شکست کی زنجیر پہن لی تو دلّی کی وہ مسیحا نفس شخصیتیں جنھیں ڈیڑھ سو برس کے خونیں جھکڑ بجھا نہ سکے ننھے خلوتوں کے طاقوں میں ابدی سناٹوں کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئیں۔ دلّی اُجڑ گئی ـــــ لکھنؤ سنسان ہو گیا ـــــ بعض طائران خوش الحان رام پور کے گلزار کی رونق بنے۔ بعض حیدر آباد کی ـــــ کوئی کہیں۔ کوئی کہیں ـــــ اور جنھیں کہیں پناہ نہ ملی وہ ایک ایسے دیار میں آ بسے جس کی روایت میں اردو زبان کا حصہ تو تھا مگر باقاعدہ اردو شعر یا نثر کی اِکّا دکّا مثال کے سوا کوئی مسلسل کڑی نہیں ملتی ـــــ لاہور ـــــ جو گزشتہ نو سو برس سے فارسی شاعری کی بڑی بڑی دل کشا اور روح فزا محفلیں دیکھ چکا تھا ایک مدت سے کسی ایسے قافلے کا انتظار کر رہا تھا جس کی زادِ راہ دکنؔ۔ شاہ حاتمؔ، شاہ مبارک آبروؔ۔ سوداؔ۔ دردؔ۔ میرؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاؔ۔ میر حسنؔ۔ جرأتؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ۔ انیسؔ۔ دبیرؔ۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ اور شاہ ظفرؔ کے تحائف پر مشتمل ہو۔

محمد حسین آزادؔ کہ نہ صرف ذوقؔ کو بلکہ کسی اردو شاعر کو ایسا شاگرد مقدر نہ ہوا۔ لاہور کی اس صدیوں پرانی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے یہاں آ اُترا۔ دنیوی لحاظ سے یہ بے سر و سامان مسافر اپنے دل و دماغ میں ایسا ایسا لعل و گہر چھپائے ہوئے تھا کہ جب اس نے پیش کیا تو پشاور سے راس کماری تک بڑا بڑا سوداگر آنکھیں ملتا ہوا پایا گیا۔ آزادؔ سے پہلے بھی کچھ بزرگ یہاں پہنچ چکے تھے مگر ان کی مثال اس پرندے کی سی تھی جسے کسی نے پنجرے میں ڈال دیا ہو ـــــ اور وہ صمٌ بکمٌ ـــــ یا تیلیوں سے سر ٹکراتا رہتا ہے مگر جونہی اسے گرفتار کرنے والا ایک دوسرے عادی قیدی پرندے کے پنجرے کو اس کے پنجرے کے سامنے لا رکھتا ہے اور یہ اس آنے والے کی غزل سرائی سنتا ہے تو بے اختیار ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کو بھول جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے ـــــ کچھ لوگ آزاد کے بعد یہاں پہنچے۔

آزادؔ ایک مدت تک فکرِ معاش میں سرگرداں رہے جب ذرا اطمینان حاصل ہوا تو وہ آگ جسے ۱۸۵۷ء کے طوفان نے

سرد کر دیا تھا دوبارہ دمک اُٹھی ——— خاص طور سے جب محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائیڈ کو اپنا ہم نوا پایا تو ان کی بھی ہمت بندھی اور اب وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں شب و روز سرگرداں رہنے لگے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اُن محفلوں کو دوبارہ رونق بخش سکیں۔ جن کا تصور بھی اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو چکا تھا ——— انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی ......

محمد حسین آزاد اور انجمنِ پنجاب ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں ——— اس انجمن کی حیثیت اردو شاعری کی تاریخ میں جس اہمیت کی حامل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ اوّلین کوشش تھی کہ شاعری کو امراء کی محفلوں سے نکال کر اسے معاشرے میں ایک اہم مقام بخشا گیا۔ شاعری اور شاعری کے ذریعے زندگی بلکہ پوری کائنات کو ایک اجنبی رویّہ A TTITUDE دیا گیا۔ شاعری ذاتی واردات سے کٹ کر اجتماعی کوائف کی آئینہ دار تسلیم کی گئی۔ فرد کو اجتماع میں ضم کر دینے کی سعی کی گئی۔ بلکہ انسان کا رشتہ محض انسان تک محدود نہ سمجھا گیا۔ کوشش یہ سمجھنے کی کی گئی کہ انسان کا رشتہ کسی معاشرے سے کیا ہے۔ انسان کا رشتہ کائنات اور اس کے مظاہر سے کیا ہے۔ انسان اور فطرت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ان تمام فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر سے قطع نظر شاعری کو ایک راستہ دکھایا گیا جس نے آگے چل کر جدید شاعری کا نام پایا اور آج ہم اس حیثیت میں ہیں کہ انجمن پنجاب سے پہلے اور انجمن پنجاب کے بعد کی شاعری میں ایک واضح تمیز کر لیتے ہیں ——— اس سے پہلے کی شاعری کو قدیم یا احتراماً کلاسیکی شاعری کا نام دینے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں وہی شاعر نئی شاعری کے علمبردار ہوئے جو انجمن پنجاب کے مختلف مناظموں میں شریک ہوسکے۔

انجمن کی بنیاد پڑنے سے پہلے پنجاب میں اردو شاعری کی کوئی روایت نہ تھی۔ یہاں کوئی قابلِ ذکر اردو شاعر پیدا نہ ہوا تھا۔ یوں ہونے کو یقیناً چند نام مل جائیں گے مگر وہ محض نام ہی ہوں گے اور انجمن کے قیام کے بعد اردو شاعری جیسے پنجاب تک سمٹ کر رہ گئی ———
چند برس گزرے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا ہم پنجاب کو بھی اردو کا کوئی دبستان کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ بعض حضرات نے میری اس کوشش کو صوبائی عصبیت اور پنجابیت کا مظہر جانا تھا۔ حالانکہ میں آج بھی اسی کشمکش میں ہوں کہ اگر کسی خاص رجحان یا رویّے کے سبب ہم دکن، دلّی اور لکھنؤ کو کوئی دبستان تصوّر کر لیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نظمیہ شاعری کو جس کی داغ بیل پنجاب میں پڑی اور جسے اس علاقے کی آب و ہوا یا مزاج نے پروان چڑھایا پنجاب کے دبستان کا نام نہ دیا جائے۔ بلکہ نظم سے گزر کر اس تحریک نے شاعری کو جو نیا اندازِ نظر اور بے تکلّف یا بے جھجک طرزِ بیان دیا تھا وہ غزل کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ نیا پن انجمن پنجاب کا مرہونِ احسان ہے۔ انجمن پنجاب نے نہ صرف اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا۔ سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک نیا نادیہ دیا۔ بلکہ اس سے بھی بڑا کام جو اس انجمن نے اور اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزاد نے کیا وہ یہ تھا کہ پنجاب میں اردو شاعری کا ذوق تربیت کیا گیا اور اردو شاعری کے ذریعے اہلِ پنجاب کو اردو سے وہ شیفتگی پیدا ہوگئی کہ آج پنجاب اور اردو دو چیزیں نہیں رہ گئیں۔ حکومت نے اٹک کے اس پار کی علاقائی زبان پشتو۔ سندھ کی زبان سندھی، بلوچستان کی زبان بلوچی اور بنگال کی زبان بنگالی تسلیم کی۔ مگر پنجاب کی علاقائی زبان بھی اردو ہی مانی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جتنی بڑی تعداد میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس علاقے سے شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں اتنی تعداد میں ان علاقوں سے شائع نہیں ہوئے جہاں کے رہنے والے اردو کو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ———
اور یہ سب کچھ انجمن پنجاب ہی کا اعجاز ہے۔

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے آزاد کو دلّی چھوڑنے پر مجبور تو کر دیا تھا۔ ان کی روح پژمردہ تھی مگر ابھی مری نہ تھی۔

لاہور میں قیام اختیار کر لینے کے بعد، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، جب ان کو قدرے اطمینان حاصل ہوا تو ان کی بے قرار روح کو شعر و شاعری کے دامن میں پناہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئی —— وہ غزلیہ شاعری سے دل برداشتہ تھے۔ وہ شاعری کو سکونِ روح ماننے کے لئے اب تیار نہ تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ شاعری محض سکون فراہم نہ کرے وہ کچھ کر کے دکھائے۔ انہیں احساس تھا کہ شاعری اور پیغمبری میں بس درجے ہی کا فرق ہے۔ جو معجزے ایک پیغمبر سے منسوب ہو سکتے ہیں وہ کسی شاعر سے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شاعری مات کو تارے گننا چھوڑ کر چڑھتے ہوئے سورج سے آنکھ ملانا سیکھے۔ انہیں اپنی زمین سے عشق تھا انہیں اپنی روایت سے جنون کی حد تک شیفتگی تھی ——

"اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں امراء القیس اور لبید نہیں تو کالیداس ہی نکال دے
اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دے"

بہرحال انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جو مشاعرے یا مناظمے منعقد ہوئے اور جنہیں جدید اردو شاعری کی بنیاد تعین کرنا چاہئے۔ وہ کوئی اچانک چیز نہ تھی بلکہ آزاد اہلِ ملک کو اس مبارک مجلسِ مشاعرہ کے لئے ایک مدت سے تیار کر رہے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۷ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں انہوں نے ایک معرکتہ الآراء مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" —— جس میں انہوں نے بیان کیا کہ

"... شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ نیچر کو گویا کر دے، درختان پا در گل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے، زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں ——

"... اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے ......"

"... یہ ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے ..."

"—— امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فنِ شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے۔ گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو۔

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا "

اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کی اس خود اعتمادی اور امید کو ٹھیس نہیں لگی۔

بہرحال ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام کے چھ بجے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مکشا سبھا کے مکان پر ایک عظیم الشان تاریخی اجلاس

منعقد ہوا جس میں ان کے ہم قافلہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب - مولوی سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ"، مولوی کریم الدین، منشی درگا پرشاد نادر - پنڈت من پھول کے علاوہ کرنل ہالرائیڈ، مسٹر جسٹس بولنو جج چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ - کرنل مکلاگن - مسٹر ینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور چند خواص لاہور مثلاً نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمرالدین وغیرہ کے اسمائے مبارک قابلِ ذکر ہیں - اس اجلاس کی صدارت مسٹر جسٹس بولنو نے کی - اس جلسے میں آزاد نے ایک زبردست خطبہ دیا جس کے بعض نکتے پیش کیے بغیر چارہ نہیں:

"—— اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ الفاظ اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کے غائب ہو گئے —— اب زمانہ کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصنیف کے گلدستے طرح طرح کے ہاتھوں میں لئے کھڑی ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ منتظر ہے کہ کوئی صاحبِ ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے۔"

"کئی پرانی موزنیں جو باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو گی اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہو گا ——"

اس طویل اور اردو شاعری کی تاریخ میں انوکھے خطبے کے بعد خود آزاد نے اپنی ایک نظم "شب قدر" کے عنوان سے پیش کی جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جو شاعر وہاں موجود ہیں یا جنہیں آئندہ مجوزہ مشاعرے میں نظم پڑھنا تھی ان کے سامنے کوئی نمونہ ہو ——

آخر میں کرنل ہالرائیڈ - مسٹر تھارنٹن - رائے مول سنگھ - پنڈت بسنت رام اور صاحبِ صدر نے تقریریں کیں - کرنل ہالرائیڈ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ——

"اس وقت مولوی محمد حسین نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر جو اشعار سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا بہت شکر گزار ہونا چاہئے۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ ہے اس طرز کا جس کا رواج مطلوب ہے ——"

ان تقریروں کے بعد طے پایا کہ ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو ایک موضوعی مشاعرہ منعقد کیا جائے - یہ مشاعرہ اپنی طرز کا بالکل نیا اور دل چسپ مشاعرہ تھا - چنانچہ تاریخ مقررہ پر انجمن کے مکان ہی پر یہ مشاعرہ ہوا - اس میں نو شاعروں نے اپنی نظمیں پیش کیں اور آئندہ مشاعرے کے لیے "امید" موضوع قرار پایا - ان نو شاعروں کے نام یہ ہیں: شاہ انور حسین ہما - مولوی میرزا اشرف بیگ خاں اشرف، رئیس دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب - منشی الٰہی بخش رفیق - مولوی محمد مقرب رئیس جگراؤں - مولوی احمد جان ولی دہلوی شاگرد میرزا غالب ہیڈ ماسٹر ورنیکولر مڈل سکول فیروز پور جھرکا - مولوی قادر بخش مدرس انبالہ - مولوی عطاء اللہ - مولوی علاء الدین محمد کاشمیری اور مولوی محمد حسین آزاد - ان شاعروں نے "زمستان" کے عنوان سے اپنی اپنی نظمیں پڑھی تھیں -

اب اس قسم کے مشاعروں کا ہر ماہ اہتمام ہونے لگا - مولانا حالی جن کا نام جدید شاعروں میں سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے - اور

وہ چوتھے مشاعرے میں اوّلین مرتبہ شریک ہوئے۔ ان مشاعروں کا انعقاد ان کے ورود لاہور سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ حالیؔ نے اپنی چار مثنویاں برکھارت۔ نشاطِ امید۔ حب الوطن۔ مناظرہ اور رحم و انصاف۔ انہیں مشاعروں کے لئے لکھیں اور پڑھیں۔

یہ مشاعرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک طرح کی جدت بھی تھی اور بدعت بھی۔ اہلِ لکھنؤ نے دل کھول کر مخالفت کی —— دہلی والے خاموش رہے مگر غالب کے ایک شاگرد مولوی سیف الحق ادیبؔ دہلوی نے جس ذوق و شوق کا اظہار کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یعنی وہ دہلی سے لاہور ان مشاعروں میں شریک ہونے کی غرض سے آئے۔ پورے ملک میں اتنا حق و مخالفت میں کہا گیا اور لکھا گیا کہ اگر جمع کر لیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔ موافقین آزادؔ کو داد دیتے نہ تھکتے تھے اور مخالفین نے آزادؔ کو ذاتیات کی حد تک رگیدنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی —— یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سبھی اخبارات نے اس تحریک کے متعلق مخالف یا موافق رائے کا اظہار کیا۔ لکھنؤ کا "سر رشتۂ تعلیم" بدترین مخالف تھا۔ مگر طرفدار اخبارات نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔ قصور جیسے قصبے سے ایک انجمن مفیدِ عام جاری ہوا تھا۔ اس کی ۱۸۷۴ء کی جلد اس موضوع پر محمد حسین آزادؔ کے تقریباً سبھی مضامین سے بھری ہوئی ہے۔ پنجاب میں تو خیر اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ پنجاب کے خمیر میں یہ چیز داخل ہے کہ ہر نئی چیز پر اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ البتہ میرٹھ نے جس انداز میں اس تحریک کو لبیک کہا کسی اور قصبے یا شہر نے نہ کہا تھا۔ میرٹھ کے ہفتہ وار اخبار "لارنس گزٹ" کی ۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں ایک مفصل افتتاحیہ اسی موضوع پر درج ہے۔ اس افتتاحیہ کے لکھنے والے اردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے تذکرے کے بعد اس وقت کی اردو شاعری کی قابلِ رحم حالت کا خاکہ اتارتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"..... اردو شاعری اب مُردوں میں سمجھی جاتی تھی مگر آفریں ہے مولوی محمد حسین آزادؔ تخلص پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انہوں نے اردو شاعری کی بے قدری کو نظر کر کے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر واقعی حالات کو شرح اور بسط کے ساتھ پورا پورا نظم میں موزوں کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں۔ جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہے کہ اول لوگ اس پر ہنسا کرتے ہیں پھر اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی ادھر ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو حضرت آزادؔ نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا جس سے پرانا مردہ زندہ ہو گیا ...."

"..... افسوس کہ میرٹھ میں صرف دو ہی جلسے نظم سوسائٹی میں ہونے پائے تھے کہ وبائی بیماری تپ و لرزہ نے لوگوں کو پراگندہ کر دیا۔ ورنہ وہ انجمن کی شاخ ہو جاتی ....."

میرٹھ کے چند شاعر لاہور کی انجمن میں مجوزہ عنوانوں پر نظمیں کہنے لگے جن میں سید محمد مرتضیٰ بیان دیزدانی رئیس میرٹھ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ آزادؔ نے میرٹھ کا سفر شاید خاص طور سے اختیار کیا اور اپنی مثنوی "امید" ایک جلسے میں پڑھی ــ اس کا مطلب ہے کہ آزادؔ "نظم" کو شاعری میں ایک ملک گیر تحریک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر خود انجمن پنجاب دس سے زیادہ مشاعرے نہ کر سکی۔

مشاعرے بند ہو گئے مگر جو بیج ڈالا گیا تھا وہ ایک عظیم درخت بن کر رہا۔

اس تحریک کا اثر نہایت دوررس اور داخلی قسم کا تھا اگر چہ اجتماعی کوشش اس مقصد کی نہ رہی مگر اکثر شاعر اس ڈگر پر چل پڑے تھے اور لاہور کو مشاعروں کا چسکا پڑ ہی چکا تھا۔ چنانچہ مختلف محلوں میں مختلف ارباب ذوق کی بیٹھکیں محافلِ مشاعرہ کے لئے وقف ہو گئیں۔ ہر چند ان مشاعروں میں اکثر روایتی قسم کی غزلیں ہی پڑھی جاتی تھیں اور یہ صحبت قہقہوں ہی سمجھنا چاہئے کہ موضوعات کی جگہ پھر طرح دی جانے لگی۔ مگر ان مشاعروں سے ایک فائدہ خاص طور سے پہنچ رہا تھا کہ اہلِ لاہور نے اردو شاعری میں دلچسپی زیادہ سے زیادہ لینا شروع کر دی۔ اور فارسی شاعری کا چرچا کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔

لاہور کا ایک مشہور بازار چکلیاں اس لحاظ سے خصوصاً تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس بازار کی ایک تنگ سی گلی کوچہ فقیر خانہ میں بڑے بڑے معرکے کے مشاعرے منعقد ہوئے جن کی شمع مرحوم قلعہ معلیٰ کے ایک چشم و چراغ نواب میرزا ارشد گورگانی تھے ــــ ان مشاعروں کی تفصیل میں جانا میرے دائرے سے باہر ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں خود یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ میں صرف ان انجمنوں یا مجلسوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا وجود کسی نہ کسی حیثیت میں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مقام رکھتا ہو۔ کوچہ فقیر خانہ کے مشاعروں کا ذکر اس لئے ناگزیر ہو گیا کہ آزاد اور حالی کی "جدید شاعری" کے بعد جس "جدید شاعری" نے جنم لیا وہ جن شاعروں کی تخلیقات سے عبارت ہے ان میں سے اکثر شاعر انہیں مشاعروں کے ذریعے متعارف ہوئے۔ اگر اوروں کا ذکر نہ بھی کیا جائے پھر بھی اقبال کا نام لینا ہی کافی ہے ـــــ اس لئے نہیں کہ اقبال نے اپنے ڈھب کی شاعری کے لئے ان محفلوں سے تربیت حاصل کی بلکہ اس لئے کہ ان محفلوں نے اس کے مذاقِ سخن کو سنوارا، ان محفلوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ روایت کوئی معمولی نہیں کہ ایک نوجوان لڑکا ایک غزل پڑھ رہا ہے اور جب یہ شعر پڑھتا ہے کہ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اس محفل کا سب سے مستند انسان اٹھ کر اس نوجوان کو گلے لگا لیتا ہے۔ ہم میں سے سبھی کو اس کا تجربہ ہو گا کہ اچھے سے اچھا شعر کسی بڑی سے بڑی محفل میں پڑھ جائیے۔ زیادہ سے زیادہ "واہ" ـــ اور بس ــــ ورنہ مسکراہٹ پر بات ختم ہو جاتی ہے۔

فقیر خانے کے ان مشاعروں کی طرح انجمنِ حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں نے اقبال اور دوسرے شاعروں کی حوصلہ افزائی کی .... اور بات آگے بڑھتی چلی گئی۔

اقبال اپنی ذات میں خود ایک انجمن اور خود ایک تحریک تھے۔ ایسی تحریک کہ اب پوری اردو شاعری اقبال کے بیشتر پیشرو اور اس کے بعد آنے والے اس کے اثر سے اگر محفوظ رہ گئے تو ان کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اردو شاعری کو کیا کچھ دیا یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بے شمار لکھا گیا اور جانے کب تک بے شمار لکھا جائے گا۔ مگر اتنا یہاں کہنا ہی پڑتا ہے کہ اقبال کی انجمن جو خود ان کی اپنی ذات تھی لاہور کے لئے اسی قدر محترم و متبرک ہے جس طرح میر یا غالب کی کہ وہ بھی کسی انجمن سے منسلک نہ تھے مگر انجمن تھے ــــ آزاد کے بعد اقبال نے ــــ ایک نے اپنی عظیم شخصیت اور ایک نے اپنی عظیم شاعری کے لئے جو تحریک اردو شاعری کو دی وہ جب تک زبان زندہ ہے زندہ رہے گی۔

اقبالؔ نے جب اپنے لئے ایک یقینی اور حتمی راہ طے کر لی تو مشاعرے ان کے کلام کو ان کی زبان سے سننے سے محروم ہو گئے۔ (سوائے انجمن حمایت اسلام کے جہاں وہ ہر سال اپنی ایک نئی نظم سے اہل لاہور کو نوازتے تھے۔)

مگر مشاعروں کا شوق اہلِ لاہور کو پڑ چکا تھا۔ مشاعرے منعقد ہوتے۔ کبھی کسی شاعر کے زیر اہتمام کبھی بعض ارباب ذوق کے۔ ہوتے ہوتے لاہور کے اکثر شاعر دو جماعتوں یا گروہوں میں بٹ گئے۔ اسی طرح سامعین بھی۔ ایک وہ جو قدیم روایت کے علمبردار تھے۔ اور دوسرے وہ جو انگریزی اثرات کو قبول کر کے شاعری میں نئی نئی راہیں تلاش کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ پہلے گروہ کے سرپرست بلکہ پیشوا شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی تھے اور دوسرے کے امام ڈاکٹر تاثیرؔ تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے پروفیسر پطرس بخاری، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، حکیم احمد شجاع، ہری چند اخترؔ، ابو الاثر حفیظ جالندھری اور پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ کے ساتھ مل کر "زندہ دلانِ پنجاب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ——— مولانا تاجور نجیب آبادی بڑے باغ و بہار بزرگ تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر ان کی قدرت کمال کے درجے تک تھی۔ زبان دانی اور اسرار و رموز شعر ان کے ناخنوں میں تھے۔ فنِ شعر سے آگہی شاید ان سے زیادہ کسی کو نہ تھی۔ وہ خود غزل کے رسیا تھے۔ ہر چند بہت سی جدید قسم کی نظمیں بھی ان کی تخلیقات میں شامل ہیں۔ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تاجور مرحوم نے لاہور میں شاعری کا ذوق سنوارنے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے شاگردوں میں احسان دانش اور اخترؔ شیرانی کا ذکر خاص طور سے کیا جا سکتا ہے۔ تاجور مشاعروں کے شائق تھے اور پرانے اساتذہ کی طرح اپنے شاگردوں کا ایک جمِ غفیر ساتھ لے کر مشاعرے میں شمولیت کیا کرتے تھے۔ انجمن ارباب علم کے نام سے بڑے بڑے ٹھاٹھ سے مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ اور اسی لاہور میں کل ہند قسم کے ایسے ایسے مشاعرے انہوں نے کرائے کہ پھر لاہور والوں نے اتنی بڑی تعداد چیدہ چیدہ شاعروں کی نہیں دیکھی۔ مولانا نے اپنی زندگی میں کئی انجمنوں کی بنیاد رکھی مگر کوئی انجمن کسی ردیّے ATTITUDE کو جنم نہ دے سکی۔ ان کے مقابلے میں اس زمانے کے بالکل نوجوان جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور جو خود کو اس غرض سے "زندہ دلانِ پنجاب" کہتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ تاجور مرحوم اہلِ پنجاب کو کور ذوق خیال کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ پنجاب والے اردو شعر کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ انہیں اردو پر وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو اہلِ زبان کو قدرتی طور سے حاصل ہے ——— یہ "زندہ دلانِ پنجاب" سب کے سب سوائے حفیظ جالندھری کے انگریزی ادبیات سے نہ صرف یہ کہ آشنا تھے بلکہ تاثیرؔ اور بخاریؔ تو اپنی انگریزی دانی میں مشہور تھے۔ یوں بھی یہ سب کے سب جدت و اختراع کا شوق حد سے سوا رکھتے تھے۔ اور پھر یہ بھی نہ تھا کہ فارسی اردو کے کوچوں سے نابلد ہوں۔ ظاہر ہے اس صورت میں نئی نسل کے ان لوگوں میں زیادہ دلچسپی تھی ——— تاجور اور ان کے مقلدین اگر نظمیں بھی کہتے تھے تو ان میں بھی روایتی ہونے کا احساس ہوتا تھا لیکن ان لوگوں کی آوازیں بالکل الگ سی معلوم ہو رہی تھیں ——— زندہ دلانِ پنجاب نے اپنے مسلک کو فروغ دینے کا بھی وہی راستہ اختیار کیا جو تاجور نے کیا تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں مشاعرے منعقد کرتے۔ تاجور مرحوم مترنم مشاعروں پر زیادہ تکیہ کرتے تھے۔ ادھر ایک حفیظ تھے جو اپنے ترنم اور اپنی نئی قسم کی نظموں اور گیتوں کے سبب بے حد مقبول ہوئے۔

یہ ادبی اختلاف ذاتیات تک پہنچ گیا۔ ایک دوسرے کے مشاعروں میں گڑبڑ پیدا کرنے لگے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ حسب نسب تک اکھاڑا جانے لگا۔ غرض یہ کہ وہ اودھم مچا کہ مصحفیؔ و انشاؔ کا زمانہ یاد آ گیا ——— مشاعروں سے ہٹ کر یہ طوفان اخبارات و رسائل تک پہنچ گیا۔ آخرکار اپنی اپنی جگہ دونوں ہتھیار ڈال گئے۔ جو چند حضرات ان دونوں سے آشنائی رکھتے تھے اور

بباطن دونوں سے انقلاب پسند تھے۔ ان میں سید عابد علی عابدؔ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

غرض یہ کہ فقیر خانے سے ایس پی ایس کے ہال (جو اب سجادیہ میڈیکل ہال اور پولیس والوں کے قبضۂ قدرت میں عبرت کا منظر پیش کر رہا ہے) تک یعنی آزاد سے تاجور تک کا پورا عہد جسے ۱۹۳۵ء تک شمار کرنا چاہیئے، تمام تر شاعروں کا زمانہ تھا، سوائے اقبال کے جو بیسویں صدی کے بالکل شروع ہی میں ایک طرح سے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ تاثیر اور حفیظ کا کام (اقبال کے علاوہ) بڑا قابلِ قدر ہے۔ تاثیر نے ایک لحاظ سے شاید نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا —— زندہ دلانِ پنجاب نے مغربی شاعری اور تنقید کی روشنی میں اردو شاعری کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور یوں یہ انجمن ایک انداز میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے دنیا کو جن تباہیوں اور بربادیوں کی دوزخ میں جھونکا تھا۔ دنیا والے بظاہر اس سے جانبر ہو رہے تھے مگر طبقاتی نزاع روز بروز بڑھتی چلی گئی اور ہر زمانہ جو اطمینان کا زمانہ معلوم ہو رہا تھا۔ دراصل اپنی جلو میں ہزاروں فتنے لئے ہوئے تھا۔ دنیا کو سائنس، نفسیات اور اقتصادیات کے جدید ترین انکشافات اور علوم نے بالکل اجنبی راہوں پہ لا ڈالا تھا۔ یہ علوم انسان کی فلاح کے مدعی تو تھے مگر حقیقت میں اس تبسم کے پردے میں آنسوؤں اور کراہوں کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا —— وہ تمام اقوام جو اس جنگ میں پیسی گئی تھیں ان طاقتوں پر اعتبار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھیں جنہوں نے اپنی اپنی ہوس ملک گیری کی تکمیل کی غرض سے انہیں چیونٹیوں کی طرح مسل کر رکھ دینا چاہا —— لیکن ان کے پاس ان کے چنگل سے نکلنے کا کوئی چارہ نہ تھا —— معاشی اور سیاسی کش مکش بڑی تیزی سے پوری دنیا کو اس آتش فشاں کے نزدیک لے آئی تھی جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں پھٹ پڑا ...... اس کش مکش نے دنیا کے ادب کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ اور دنیائے ادب و شعر کو نئی عینکوں سے دیکھنا چاہا —— اور عموماً دو عینکیں ادب خالقوں اور ادب پسندوں کو حاصل ہو گئیں۔ ایک وہ جو ادب کو زندگی کے ارتقا میں ایک اہم عملی طاقت خیال کرتا تھا۔ اس کا نعرہ تھا کہ ادب اور زندگی دو چیزیں نہیں —— اور زندگی اس وقت تک صحیح معنوں میں زندگی نہیں کہلائی جا سکتی، خواہ یہ زندگی فرد کی ہو یا اجتماع کی، جب تک کسی معاشرے میں طبقاتی نزاع اقتصادی لحاظ سے قائم رہتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تبلیغ کرنے والے روس کا حوالہ خاص طور سے دیتے تھے بلکہ روس کے ساتھ جذباتی اور ذہنی شیفتگی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کے لئے جو واضح علامتیں تراشی گئیں وہ بے دھڑک برتی جانے لگیں —— دوسری طرف ایک اور دبستان وجود میں آیا۔ اس دبستان سے دلچسپی رکھنے والے انسان کے تمام دکھوں اور سکھوں کو نفسیات کے نہاں خانوں میں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اور زندگی کو کسی ایک مخصوص زاویے سے دیکھنے یا تخلیق کرنے کے قائل نہ تھے ——

یورپ سے یہ آوازیں برصغیر کے ادیبوں کے کانوں تک بھی پہنچیں، اور یہاں لکھنؤ میں ایک کانفرنس بلائی گئی —— شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر نئی نسل کا ایسا ہوگا جس کو اس تحریک نے اپنی طرف متوجہ نہ کیا ہو اور نئے اور پرانے ادیبوں میں ایک باقاعدہ دیوار کھڑی ہوگئی —— "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم ہوئی —— اور جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی —— مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ چند ادیبوں اور شاعروں کو یہ محسوس ہوا کہ زندگی محض روٹی کا نام نہیں۔ زندگی محض سیاسی یا معاشی آئیڈیالوجی کی تبلیغ کا نام نہیں۔ روایت ہر معاشرے کی جان ہے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش قابلِ تحسین ضرور ہے مگر اس کو زندگیوں سے خارج کر دینا ایک انسان کو وہ پتا بنا دیتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے رحم و کرم پہ سڑکوں پہ اڑتا پھرتا ہے اور آخر کار فنا ہو جاتا ہے ——

اس نقطۂ نظر کے جو ادیب لاہور میں تھے وہ ایک پلیٹ فارم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اجتماعی حیثیت کو حلقہ ارباب ذوق کا نام دیا گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ہندوستان کے صوبہ یوپی یا بمبئی میں خاص طور سے بہت کامیاب ہوئی۔ اس کی وجہ شاید وہاں کے جاگیرداری اور صنعتی و تجارتی نظام سے پیدا شدہ حالات تھے۔ پنجاب میں انجمن کا اثر جماعتی لحاظ سے بہت دیر میں پہنچا ——— اسی لئے انجمن کی شاخ لاہور میں دیر سے قائم ہوئی۔ ہونے کو تو آزادی سے پہلے بھی یہاں جماعت قائم تھی مگر اس میں وہ گہما گہمی پیدا نہ ہو سکی تھی جو انجمن سے مخصوص رہی ہے۔ دراصل انجمن نے ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی زندگی کا ثبوت دیا ——— عارف عبدالمتین، احمد راہی، ساحر لدھیانوی ——— ظہیر کاشمیری، عبدالمجید بھٹی اور باری علیگ کے نام اس سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، کہ انہی کی بھاگ دوڑ نے انجمن کو لاہور میں پاؤں جمانے کا موقع فراہم کیا۔ عبدالمجید بھٹی اور باری علیگ کچھ ہی مدت بعد انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ انہیں انجمن کی تنگ نظر پالیسی سے اختلاف تھا۔ انجمن کے شروع کے اجلاس دیال سنگھ پبلک لائبریری میں منعقد ہوتے رہتے اور بہت ہی قلیل مدت میں اس کے جلسے بہت زوردار ہونے لگے۔ نظریاتی اتفاق رکھنے والے یا ہمدردی رکھنے والے ادیب و شاعر اکٹھے ہو گئے۔ تقسیم برِصغیر کے سبب ہندوستان سے بھی بہت سے ادیب اور شاعر یہاں آ گئے تھے ——— احمد ندیم قاسمی ریڈیو کی ملازمت ختم کر کے لاہور آ گئے اور ہاجرہ مسرور اور محمد طفیل کے ساتھ مل کر "نقوش" کا اجرا کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی ہمدردیاں انجمن کے ساتھ ضرور تھیں لیکن مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین (بمبئی) سے اختلاف رکھنے کے سبب وہ انجمن میں عملاً حصہ لینے سے گریز کرتے رہے مگر زیادہ مدت ایسا نہ کر سکے۔ اور جب انہیں منا لیا گیا تو ان کے ساتھ جو چند ادیب اور شاعر باہر رہ گئے تھے وہ بھی آنے لگے۔ پھر محمد صفدر میر بمبئی سے آ گئے۔ سقوطِ حیدر آباد کے بعد ابراہیم جلیس بھی یہیں آ گئے۔ سید سبطِ حسن بھی لاہور میں مستقل قیام اختیار کر چکے تھے۔ سجاد ظہیر بھی لاہور آ چکے تھے۔ فیض کی ہمدردیاں ضرور تھیں مگر عملاً وہ کبھی آگے نہیں آئے۔ بہرحال انجمن ترقی پسند مصنفین ایک زبردست فعال جماعت بن گئی۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری کے بعد انجمن کے جلسے مظہر علی خاں کے مکان (واقع نکلسن روڈ) کے احاطے میں ہونے لگے۔

پاکستان آخرکار وجود میں آ گیا ——— نئی قوم کے نئے تقاضے سامنے آئے۔ اس قوم نے بے مثال جانی اور مالی قربانیاں اس آدرش کو حاصل کرنے میں پیش کی تھیں۔ اس کی چند امنگیں بھی تھیں۔ مگر صبحِ آزادی نے جو جانگسل خونیں منظر دکھایا تھا اس نے اکثر روحوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا ——— جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے اکثر ارکان یا اس سے متعلق اکثر ادیبوں اور شاعروں نے جو ایک طرح سے باقاعدہ عملی سیاست میں شامل تھے، جو تخلیقات پیش کیں وہ بہت سے پڑھنے والوں کے لئے دل شکن تھیں اور حکومتِ وقت نے انجمن کو سیاسی جماعت قرار دے کر اس کے ارکان پر اشتراکی ہونے کا الزام لگایا اور انجمن کو قانونی طور سے غیر قانونی قرار دے دیا ——— تو کچھ ہی مدت بعد اسی انجمن سے متعلق نوجوانوں نے "انجمن آزاد خیال مصنفین" کے نام سے ایک اور پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس کے اجلاس وائی ایم سی اے کی عمارت ہی میں منعقد ہونے لگے۔ عارف عبدالمتین ایک طرح اس کے روحِ رواں تھے۔ ہرچند اس جماعت نے اپنے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا اور جس کا اعلان کیا بلکہ جس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی وہ بہت حد تک انجمن ترقی پسند مصنفین سے مختلف تھا تاہم حکومت نے اسے بھی تخریبی کارروائیوں کا مرتکب ٹھہرایا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرح اسے بھی غیر قانونی قرار دیا ——— اور یوں ہوتے ہوتے لاہور جماعتی لحاظ سے ان جماعتوں سے محروم ہو گیا جو ادب کو ایک خاص نقطۂ نظر سے پرکھنے اور اپنے خیال کے مطابق آگے بڑھانے میں کوشاں تھیں۔

اس انجمن کے ذریعے جس تحریک نے جنم لیا یا جس تحریک نے اس انجمن کو وجود بخشا وہ اردو ادب کے لئے اتنی ہی اہم اور دور رس

ثابت ہوئی جتنی انجمن پنجاب ہوئی تھی ——— اس تحریک نے ایک طرح اردو ادب کی کایا پلٹ کر دی۔ اگر یہ کہا جائے کہ انجمن پنجاب نے اپنا دائرہ عمل محض شاعری تک محدود رکھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے شاعری کے علاوہ افسانہ، تنقید اور دیگر اصنافِ ادب کو ایک ہی شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ اس تحریک نے اردو کو بالکل نیا خون بخشا اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ادیبوں اور شاعروں کو سماجی شعور بالکل اسی نہج پر دیا جس پر کسی سیاسی اور سماجی جماعت کو حاصل ہوتا ہے اگر اس کے ارباب حل و عقد جماعتی نقطہ نظر کے سلسلے میں تنگ نظری کا ثبوت نہ دیتے اور ادیب و محرر میں تمیز نہ اٹھا دیتے تو ممکن ہے یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

۹ اپریل ۱۹۳۹ء کی ایک شام میکلوڈ روڈ پر سید نصیر احمد شاہ (برادرِ خورد سید نذیر نیازی) کے مکان پر چند ادیب جمع ہوئے اور ایک مختصر سی ادبی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا نام "بزمِ داستان گویاں" منظور کیا گیا اور طے پایا کہ ہر ہفتے اس کے اجلاس منعقد کئے جائیں جن میں افسانے پڑھے جائیں اور ان پر جدید مغربی تنقید کی روشنی میں تنقید کی جایا کرے ——— اس جماعت کو قائم کرنے والے حفیظ ہوشیارپوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی، محمد افضل (مدیر تعمیر راولپنڈی) اور سید نصیر احمد تھے ..... طے پایا کہ اس بزم کا کوئی مستقل صدر نہ ہوگا صرف سیکرٹری ہوگا یا ایک مجلسِ انتظامیہ۔ ہر اتوار کو باری باری ہر رکن کے گھر پر اجلاس ہوا کرے گا ——— چنانچہ پہلے جلسے میں نسیم حجازی نے اپنا ایک افسانہ تنقید کے لئے پیش کیا اور حفیظ ہوشیارپوری صدر ہوئے ——— اس بزم کا تیسرا جلسہ محلہ فاروق گنج میں تابش صدیقی کے مکان پر ہوا اور پھر اکثر جلسے مصری شاہ اور فاروق گنج کے علاقوں ہی میں ہوتے رہے۔ افسانے پڑھے جاتے، ان پر تنقید ہوتی اور آخر میں شاعر ارکان اپنا اپنا کلام سناتے ——— ایک جلسے میں قیوم نظر آئے۔ اس سے اگلے جلسے میں ان کے ساتھ میراجی اور یوسف ظفر بھی تھے۔ یوسف ظفر نے دو چار جلسوں کے بعد ہی یہ تجویز پیش کی کہ افسانوں کی طرح شاعری پر بھی تنقید ہونی چاہئے۔ جب یہ تجویز منظور کی گئی تو پھر یہ مسئلہ بھی زیرِ غور آیا کہ اس جماعت کا نام بھی بدل دیا جائے چنانچہ اب اس "بزمِ داستان گویاں" کا نام "حلقہ اربابِ ذوق" رکھا گیا ——— یہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی بات ہے ——— ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حلقہ اربابِ ذوق کا پہلا اجلاس ایبٹ روڈ پر (نشاط سینما کے بالمقابل) شیر محمد اختر کے مکان پر منعقد ہوا ——— اور حیرت انگیز حد تک کم وقت میں لاہور کے تمام شاعر و ادیب اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ ابھی تک لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ باقاعدہ کام نہیں کر رہی تھی۔ ایک اور بڑا سبب مختلف عقائد و نظریات کے حامل ادیبوں اور شاعروں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانے کا یہ تھا کہ اس جماعت نے اپنا مسلک یہ متعین کیا تھا کہ ادب کو اول و آخر ادب ہونا چاہئے۔ نقطہ نظر یا عقیدے سے بحث بے معنی بات ہے۔ زندگی متنوع عوامل و کیفیات سے عبارت ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک اکائی بھی ہے۔ ہر فن کار زندگی اور اس سے متعلقات کے سلسلے میں جو رویہ طے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی عوامل اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور یوں جو ادیب کوئی ادب پارہ تخلیق کرتا ہے وہ اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اور چونکہ ہر ادیب اپنے معاشرے سے متعلق ہوتا ہے لہٰذا اگر وہ ادیب ہے تو اس کے معاشرے کے تقاضے تو اس کی تخلیقات میں بغیر کسی کوشش کے دھڑکیں گے ہی۔ قصہ مختصر اس جماعت کے زیرِ اہتمام جو اجلاس ہوتے ان میں تنقید کا محور ادب ہی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان لوگوں نے جو اس جماعت سے اختلاف رکھتے بلکہ خود اس کے اکثر ارکان نے "ادب برائے ادب" کو اپنا ادبی نقطہ نظر تسلیم کیا۔ مگر یہ نقطہ نظر کو جو نام دیا گیا تھا وہ محض بات کو سمجھنے کے لئے تھا ورنہ عملاً ایسی کوئی صورت نہ تھی اور یہ جماعت کسی قسم کے لیبل کو اپنانے کے لئے تیار نہیں تھی ——— اس جماعت نے جو بلاواسطہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ادب کو پرکھنے کے لئے ہر جدید زاویہ اختیار کیا۔ جدید نظم، جدید افسانہ اور جدید تنقید کو خالص ادبی یا نفسیاتی نقطہ نظر

کی کسوٹی پر پورا اتارنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور بے شمار ایسے ادیب و شاعر اسی جماعت کے ہفتہ وار جلسوں کے ذریعے متعارف ہوئے جو آج مسلّم رتبے کے حامل ہیں۔ اکثر نے یہیں لکھنا شروع کیا اور اکثر ایسے تھے جو لکھ تو رہے تھے مگر سامنے نہیں آسکے تھے۔ ایسے بھی ملیں گے جو سامنے بھی آچکے تھے مگر ان کے مقام کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اس مرحلے پر ضروری ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسے شاعر کا نام لوں جس کے بغیر حلقے کا صحیح تصور واضح نہیں ہوتا۔ وہ ہے میراجی ——— میراجی۔ تصدق حسین خالد، ن م راشد اور رفیق احمد فیض کے بعد آتے ہیں۔ مگر اس لحاظ سے ان کا مقابلہ شاید پوری جدید نسل میں کوئی بھی نہ کر سکے۔ کہ میراجی وہ واحد ادیب، نثر نگار اور نقاد ہیں جو مغرب و مشرق دونوں سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ ان کی نظر زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔ ان کے سینے کی آگ انہیں جس طرح بے تاب رکھتی تھی اور جتنے کام ان سے لے چکی ہے اسے زمانے کی ناقدری اور دوستوں کے تغافل نے ٹھنڈا کر دیا ——— میراجی گرد و غبار میں گم ہو گئے ہیں مگر زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ میراجی نے حلقے کو جو راستہ دکھایا تھا اور حلقے کے ارکان میں ادب کی جو لگن پیدا کی تھی وہ سراسر غیر مادی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حلقے کے ارکان نے خواہ وہ حفیظ ہوشیارپوری ہوں یا تابش صدیقی۔ ن م راشد ہوں کہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیوم نظر ہوں کہ یوسف ظفر۔ اور مختار صدیقی۔ سید عابد علی عابد ہوں کہ ناصر کاظمی۔ کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک ہوں کہ اعجاز حسین بٹالوی۔ اختطار حسین اور سید امجد حسین، شیر محمد اختر ہوں کہ ریاض یا دوسرے حضرات، کسی نے بھی کبھی یہ تقاضا نہیں کیا کہ انہیں ادب سے انفرادی یا اجتماعی کوئی فائدہ یا منفعت مقصود ہے۔ اس جماعت نے بار بار ایسی مالی پیش کش کو منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مختلف اوقات میں مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی طرف سے ہوئی سال بھر کا خرچ اس کے ارکان آپس میں مل جل کر جمع کر لیتے ہیں۔ ایک مدت تک سال کے سال "بہترین نظمیں" کے نام سے جدید مزاج اور ہیئت کی نظمیں انتخاب کر کے شائع کی جاتی رہیں ——— یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک حلقے کے ارکان نے حلقے کو غزل سے محفوظ رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔

ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کے ارکان اس حد تک ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق رکھتے تھے کہ غزل کو اردو شاعری سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے لئے جو جواز پیش کئے جاتے تھے وہ مختلف تھے۔ ترقی پسند ایک تو اس قدیم تر اور مقبول ترین صنف کو جاگیردارانہ عہد کی پیداوار خیال کرتے تھے دوسرے ان کی تحریک ایک عوامی تحریک تھی اور ادب کو ایک قسم کے آدرش کی تبلیغ کا آلہ بنانا تھی۔ اس لئے غزل ان کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ یوں بھی اس تحریک کا ایک مقصد، جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا گیا ہے اپنی تاریخ اور روایت سے قطع تعلق کرنا تھا کہ یہ چیزیں ترقی کے راستے میں پتھر ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق والے روایت کے صرف اس حد تک قائل تھے کہ اس کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھا جائے مگر روایت کو ساتھ لے کر چلنا ان کے نزدیک قدامت پرستی تھی۔ پھر ان کا خیال تھا کہ غزل کی ہیئت خیالی اور جذبے کے اظہار کے رستے میں رکاوٹ بنی ہے ——— اور یوں ان دونوں دبستانوں نے غزل کو گویا اکھیڑ پھینکا اور غزل ندامت کی ایک علامت بن کر رہ گئی جس کا دائرہ اثر کسی حد تک مشاعروں تک تھا اور آخر میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ جگر مراد آبادی مرحوم جیسے مشاعرے پڑھنے والے اپنے لحن داؤدی اور عام جذباتی غزل کے باوصف ان نئے شاعروں کے مقابلے میں مشاعروں سے بھی اکھڑ گئے۔ کم از کم لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں تو یہی حال تھا۔ نظم لاہور کی ایجاد تھی۔ لاہور نے اسے پروان چڑھانے میں بڑا حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء کے قیامت خیز حادثات نے پورے معاشرے کو اور معاشرے کی تمام قدروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ..... جب معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اس کی قدریں متزلزل ہو جائیں تو پھر وہ ہنگامے وہ تعصبات کیسے قائم رہ سکتے تھے جو ان سے

مربوط تھے۔ اب یہ بحث موضوع سے دور چلی جائے گی کہ کن عوامل نے غزل کی تجدید کی مگر ہوا یوں کہ حلقے میں چند بالکل نوجوان غزل گو داخل ہو گئے — جن کی آواز کچھ ایسی سہانی لگی کہ اکثر پرانے پرانے غزل دشمن اپنے اپنے مقامات کو تج کر خود غزل گوئی میں محو ہو گئے — اور اب حلقہ ارباب ذوق کا دامن تمام اصنافِ شعر سے پُر ہو گیا —

حلقہ ارباب ذوق اپنی عمر کے لحاظ سے اب بیس منزلیں طے کرنے کو ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس طویل مدت میں ایک اتوار بھی ایسی نہیں آئی کہ اس کا اجلاس منعقد نہ ہوا ہو۔ حالانکہ بعض بعض مرحلے ایسے آئے کہ گھر سے باہر قدم نکالنا جان کی بازی لگانا تھا۔ حلقے کو قدرت نے جو دیوانے عطا کئے ہیں انہیں کے سر پر حلقہ آج تک زندہ ہے اور کسی کا شرمندۂ احسان نہیں۔

جب حلقہ ارباب ذوق ایبٹ روڈ پر منتقل ہوا اور ہر خیال اور ہر نظریئے کا ادیب و شاعر اس میں جمع ہو گیا تو ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جو اس نئے ادب کو ادب ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا کہ ایک دو جلسوں میں بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر ان حضرات نے حلقے کو خیرباد کہا اور ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا نام "حلقہ ارباب علم" رکھا گیا۔ اس کے بانیوں میں مشہور رباعی داں خواجہ دل محمد اور آغا بیدار بخت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ بہت مدت تک ان کے ہفتہ وار اجلاس آغا بیدار بخت کے "دار العلوم السنہ شرقیہ" باغ بیرون دہلی دروازہ میں ہوتے رہے۔ پھر جب حلقہ ارباب ذوق مستقل طور سے وائی ایم سی اے کی عمارت میں منتقل ہو گیا تو کچھ مدت بعد حلقہ ارباب علم نے بھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں اتوار کو اسی وقت پر اپنے جلسے کرنے شروع کئے جس پر ارباب ذوق کے جلسے ہوتے تھے۔ پروگراموں کی نوعیت بھی وہی ہوتی جو ارباب ذوق کے پروگراموں کی ہوتی تھی۔ مگر شاید اس سبب سے کہ اس جماعت کو نیا، زندہ اور حقیقی خون نہیں ملا تھا چند برس بعد ختم ہو گئی اور اپنے پیچھے اپنا کوئی نقشِ قدم نہ چھوڑا۔

ان جماعتوں کے علاوہ جن کا ذکر حتی المقدور اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے، بے شمار جماعتیں وجود میں آتی رہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ ہوتا تھا اس لئے زیادہ عمر یا نام پائے بغیر مرتی چلی گئیں ... ایسی جماعتیں کسی لحاظ سے بھی قابلِ اعتنا نہیں ہوتیں۔

مصوّری اور مصوّر

سیّد عابد علی عابدؔ

شیر شاہ سُوری نے جب ہمایوں کو شکست دی تو اس کے سیاسی نتائج اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن اس واقعہ سے مربوط ثقافتی کوائف کی اہمیت کا یہ مقام ہے کہ تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ ہوا یہ کہ ہمایوں شکست کھا کر ایران پہنچا اور صفویوں سے مدد کا طالب ہوا تو انھوں نے مہمان کی پذیرائی کی بلکہ ایرانی ثقافت کے حسن و جمال کے کچھ نشان بھی واپسی کے وقت ہمایوں کے ساتھ کر دیئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صفوی عہد میں مصوّری جسے ایرانی نقاشی کہتے ہیں اپنے نقطۂ عروج پر تھی چنانچہ بہزاد جیسا مصوّر صفویوں ہی کے دربار سے منسلک تھا۔ یوں بھی یورش تاتار کے بعد ایرانی مصوّری میں مختلف دبستانوں کی آمیزش ہو گئی تھی، قراقرم، کاشغر اور چین سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک منگولوں کا جھنڈا لہراتا تھا اور مختلف ممالک کے مصوّر اپنی اپنی صنعت گری سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے تھے چین کے خطوط کی نزاکت اور باریکی، ایران کی دلپذیر رنگ آمیزی اور تفصیل نگاری مانوی دبستان کے نقاشوں کی تذہیب یہ تمام چیزیں اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ بہزاد کی مصوّری ان عناصر سے مرکب تھی اور منفرد بھی تھی۔ نقادوں کی رائے کے مطابق بہزاد نے مصوّری کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس نے مختلف رنگوں کی آمیزش، خطوط کی نفاست، افراد تصویر کے جذبات کے اظہار میں ایسی ہنرمندی اور چابکدستی سے کام لیا کہ وہ اب تک عدیم النظیر مصوّر تسلیم کیا جاتا ہے اور مانی کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے جو دراصل مصوّر نہیں تھا بلکہ ایران کا پیغمبر تھا۔ اس کی تصانیف کو نقوش سے آراستہ کرتے تھے اور یوں بھی اپنی نقاشی کے جوہر دکھاتے تھے، چنانچہ تورخان میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مانی کے معتقد مصوّر دیواری تصویریں بھی بناتے تھے (جس طرح اجنتا کی تصویریں) انھیں اصطلاح میں فریسکو (FRESCO) کہا جاتا ہے آرنلڈ کا خیال ہے (اسلام اور مصوّری[1]) کہ تذہیب یا سنہری کام جو صفویوں کے عہد میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مانوی نقاشوں کی ہنرمندی کا مرہون منت ہے۔ بالفاظ دیگر جو تحریک ایران قدیم میں نہ پنپ سکی وہ بیرون ایران میں پھلی پھولی اور پھر یورش تاتار کے بعد مختلف دبستانوں کے تال میل کے سلسلے میں ایرانی روایات نقاشی کا ایک اہم جزو بن گئی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ جب ہمایوں ایران سے لوٹا تو دو ایرانی مصوّر بھی ساتھ لایا جو ایران کے تمام دبستان ہائے مصوّری کے دقائق و رموز پر مطلع تھے۔ خود ہمایوں کو فنون لطیفہ سے شغف تھا لیکن موت نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس طرف پوری توجہ صرف کر سکتا

---

[1] PAINTING IN ISLAM.

تاہم اس کے عہد ہی میں ایران کے مہاجر مصوروں نے اس برصغیر کی مقامی مصوری کی روایات سے آگاہی حاصل کر لی۔ ہاں جب اکبر مسند آرائے جاہ و جلال ہوا تو اسے مصوروں کی تربیت کا موقع بھی ملا اور فرصت بھی۔ یہاں تک کہ مہابھارت اور رامائن کے مصور نسخے بھی تیار کیے گئے۔ شاہنامہ اور پنج گنج نظامی کے واقعات بھی تصویر کے روپ میں جلوہ افروز ہوئے جو اکبر اور اس کے امرائے دربار کے کتب خانوں کی زینت بنے۔

جہانگیر خود نہ صرف مصوری سے شغف رکھتا تھا بلکہ اس فن کے رموز سے اس حد تک باخبر تھا کہ مصوروں کی تخلیقات میں امتیاز کر لیتا تھا۔ اس کے عہد میں بلکہ اکبر ہی کے عہد میں راجپوت دبستان مصوری کی روایات کا ادغام ایرانی مصوری سے یوں ہوا کہ وہ دبستان وجود میں آیا جسے مغلوں کا دبستان مصوری یا نقاشی کہتے ہیں۔ اس دبستان میں درباری زندگی کے مرقعے بھی ہیں۔ افراد کی تصاویر یا (PORTRAITS) بھی ہیں۔ مختلف جانوروں کے پیکر بھی نوک قرطاس پر مقید کر دیئے گئے ہیں۔ گل و گلزار، دشت و کہسار، طلوع بہار کے دلکشا مناظر بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ عام لوگوں کی زندگی کے سوا ہر چیز ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری دربار اور اس کے کوائف سے مربوط تھی۔ عوام کی زندگی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور یہ انقطاع ایسا کامل تھا کہ اس دبستان کی مصوری کے نمونے دیکھ کر بالکل یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ کس طرح رہتے سہتے تھے اور عوامی زندگی کے مد و جزر کی کیا کیفیت تھی۔

مغلوں کے دبستان مصوری میں مذہب یعنی سنہری کام کا پس منظر، ہاشیوں کی دمنع قطع (اکثر افراد کے نقوش میں صاحب تصویر کے ہاتھ میں پھول یا گلدستہ ہوتا تھا) جزئیات کی نمائش یعنی تفصیل نگاری، رنگوں کی آمیزش، خطوط کی نزاکت، دھوپ چھاؤں کی پُر اسرار کیفیت ایسی تھی کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

جب مغلوں کا اقتدار گھٹنے لگا تو راجپوتوں کا دبستان مصوری اور کانگڑہ دبستان کا عہد صحیح معنی میں شروع ہوا۔ ظاہر ہے کہ راجپوت مصوری اور کانگڑہ دبستان میں بیشتر مناظر ہندو مذہب خاص طور پر رادھا اور کرشنا کی زندگی کے واقعات اور متعلقہ باتوں سے مخصوص تھے۔ رنگ آمیزی مغلوں کے دبستان کی طرح کامل نہ تھی۔ البتہ راگ راگنیوں کی صورت کشی میں کانگڑہ دبستان کے مصوروں کو کمال حاصل تھا۔ لاہور کے عجائب گھر میں مغلوں کی مصوری راجپوت اور کانگڑہ دبستان کی مصوری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ایک تصویر کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ بہزاد کی ہے کہ اس کے دستخط سے مزین ہے۔ اس پر بعض نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بہزاد ہمیشہ اپنا نام اس طرح بطریق رمز مخفی رکھتا تھا کہ جب تک پہلے ہی یہ یقین نہ ہو کہ یہ بہزاد کی ہے اس کا نام پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ کانگڑہ دبستان میں جو راگ راگنیوں کی تصویریں مقبول تھیں ان کے کچھ بہت اچھے نمونے لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان نمونوں میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پرانے اتالیقوں کے خیال میں کسی راگ یا راگنی کی کیا شکل ہوتی تھی جو مغنی کے پیش نظر رہتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مغنی گاتے وقت وہ کیفیت پیدا کرنی چاہتا تھا جو بصری صورت میں کانگڑہ دبستان میں نظر آتی ہے۔ ان نمونوں میں لکہ ہائے ابر، ماہ لقا، نازنینیں، صحت مند اور توانا شہزادے (راجپوت) کو شکیں، قصر شاہی کے مختلف حصے، جمیل کنیزوں کے جھرمٹ بڑی خوبی سے دکھائے جاتے تھے۔ مغرب کے نقاد ان نمونوں کو مصوری کی غنائی صورت کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اصناف شعر میں غزل اور گیت خاص لحن اور لہجہ رکھتے ہیں اسی طرح تصاویر میں بھی مختلف راگ راگنیوں کے یہ روپ ایک خاص مزاج رکھتے ہیں جسے نقاد غنائی یا (LYRICAL) کہتے ہیں۔ ان تصاویر میں نشاط و انبساط بھی ہے اور درد و اندوہ بھی یعنی خالصتاً بعض راگنیوں کے روپ میں نشاط و اندوہ اس طرح مل گئے ہیں جس طرح دھوپ چھاؤں کی آمیزش ہو۔

بتدریج کانگڑہ دبستان بھی روبہ انحطاط ہوا۔ لکھنؤ کے نوابی عہد میں مصوروں نے نقاشی کا جو کمال دکھایا اسے لکھنؤ قلم کہتے ہیں۔

یہ علم بھی دراصل مغلوں کے زوال پذیر دبستان کے باقیات میں سے ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مصوری دربار سے اس طرح منقطع ہو گئی جس طرح پہلے عوام سے تھی۔ نتیجتہً ایسے مصور پیدا ہوئے جو اپنی مصوری کو عوام کے مزاج کے سانچے میں ڈھالتے تھے۔ پنگھٹ پر پانی بھرتی سکھیاں اور ان کے خطوط بدن کا اظہار اور اس طرح کی تصاویر جن میں جنس ایک عنصر (امتیاز) کی طرح موجود ہو فروغ پانے لگیں یعنی مصوری کا رشتہ براہ راست عوام سے قائم ہو گیا۔ موسیقی میں بتدریج دھرپد، خیال، دادرا، ٹھمری سے گزرتے ہوئے آخر مغنی مذاق عام کے مطابق ہوری، کجری اور ساون تک پہنچے۔ اسی طرح مصور بھی درباری مرقعوں اور امرا کی محفلوں سے گزر کر اس سطح پر پہنچے جہاں عوام عکاسی کی سی ادا کو پسند کرتے تھے (فوٹو گرافک ریپریزنٹیشن) اس زوال پذیر عہد میں مصوروں نے نہ تو اپنا رُخ ایران کی طرف رکھا کہ بہزاد کی روایات قائم رہیں نہ اجنتا کی دیواری تصاویر کو ملحوظ خاطر رکھا جن میں اگرچہ صنف نازک کے بدن کے خطوط کی نمائش کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی واقعہ، کوئی جذبہ یا کوئی خاص کیفیت مدنظر رہی ہے۔ اور خطوط بدن کی نمائش کی حیثیت ثانوی رہی۔ بقول شخصے اجنتا میں عورت سرتاپا پاؤں پر حنا کی لکیر سے کر آنکھوں میں سرمہ کی تحریر تک صحت مند عورت ہے جس کے بدن سے جوانی اور جنس شعلوں کی طرح لپکتے ہیں تاہم یہ عورتیں خود موضوع نقاشی نہیں بلکہ کسی واقعے یا کسی خاص کیفیت سے مربوط افراد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں جو نمونہ یا ٹائپ عورتوں کے حسن و جمال کا اجنتا کی دیواری تصاویر میں پیش کیا گیا ہے اس کی جڑیں اس خطے میں پیوست ہیں جہاں اجنتا کی غاریں واقع ہیں اور آج بھی بمبئی، پونا، گجرات اور نواح میں وہ عورتیں دیکھی جا سکتی ہیں جن کے بدن کا لوچ، جن کے حسن کا گداز، جن کی آنکھوں کی سرشاری جن کی جنسی بے قراری اور بے اختیاری، جن کی افسردگی اور سپردگی ہم اجنتا میں دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے فنون لطیفہ غلاماں سے بحث کرتے ہوئے مصوری کے زوال پذیر موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ تصاویر ہیں جو عوام کی ذہنیت اور مذاق کے مطابق بنائی گئی ہیں مثلاً "

کودکے بر گردن بابائے پیر

بنگال میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مصوری نے ذرا پہلو بدلا اور انیسویں صدی کے اواخر میں رابندر ناتھ ٹیگور جیسا ذہین شخص بھی اپنے کوائف ذہنی کو رنگ و خطوط میں منتقل کرنے لگا (جس طرح چرچل نے اواخر عمر میں مصوری کی طرف توجہ کی)

مغلوں کے دربار سے جو مصور منسلک تھے ان میں سے کچھ بہت ممتاز مصور لاہور کے بھی تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فن تعمیر میں بھی لاہور کے مصوروں، نقاشوں، مہندسوں اور معماروں نے ایسے کارنامے دکھائے کہ آج تک ہکسلے کی مذمت کے باوجود دنیا انگشت بہ دنداں ہے[1]

استاد احمد لاہوری کے خاندان نے تاج کی تعمیر اور تزئین میں جو حصہ لیا اس سے ارباب علم و ذوق ناواقف نہیں۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اس کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے[2] بہرحال انیسویں صدی کے اواخر میں مصوری کی یہ کیفیت ہوئی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب یہ فن نااہلوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اب پنپ نہ سکے گا کہ لاہور میں اس شخص نے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کی جسے آج ہم عبدالرحمٰن چغتائی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس کی مصوری پر تفصیلی انتقاد کے لیے واقعی ایک کتاب درکار ہے۔ میں محض اشارات سے کام لے کر اس کے فن

---

[1] دیکھیے جیسٹنگ پائیلٹ تالیف آلڈوس ہکسلے جو کہتا ہے کہ تاج کی شہرت کا کوئی فنی جواز نہیں اور یونہی اس عمارت کو بے بدل قرار دیا گیا ہے۔

[2] ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسوں کی روئداد شائع ہو چکی ہے اس میں لاہوری نقاشوں اور معماروں کا ذکر بھی موجود ہے۔

کے کچھ پہلوؤں سے تعرض کرتا ہوں۔ ابتدا میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ چغتائی نے جب غالب کا مصور نسخہ شائع کیا تو علامہ اقبال نے اسے عصر حاضر کا وہ انقلاب آفریں مصور قرار دیا جو ان دیکھی دنیاؤں کے چہروں سے پردے اٹھاتا ہے جو فطرت اور اس کے مصالح کو بہ جبر و قہر مسخر کر کے اپنے افکار، تعقلات اور تصورات کو ایسا و ہیئے سانچوں میں یوں ڈھالتا ہے کہ وہ دنیا جو اس کے ذہن میں موجود تھی خارجاً متشکل ہو جاتی ہے۔ اس کی رنگ آمیزی ایرانی مصوروں کی بہترین رنگ آمیزی کی یاد دلاتی ہے۔ تفصیلات اور جزئیات کے اعطا میں وہ ایسی جانفشانی سے کام لیتا ہے کہ آنچل کی ہر شکن میں سینکڑوں خطوط موجود نظر آتے ہیں۔ افراد کی تصویر کشی میں وہ رمز اور علامت سے کام لیتا ہے۔ اس کے ہاں عکاسی کی طرح یہ کمال نہیں کہ چیز جیسی ہے ویسے نظر آئے اس کا منصب یہ ہے کہ یا تو وہ چیز کو اس طرح پیش کرے جیسے وہ اسے نظر آتی ہے یا جیسے اسے اپنے تمام امکانات کے ارتقا کے بعد ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ جسم و جان اور روح و ذہن کے امکانات کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس ارتقا یافتہ دنیا کی تصویر پیش کرتا ہے جو خارجاً موجود نہیں لیکن جو اس کے ذہن میں آباد ہے اور جسے موجود ہونا چاہیے۔ کم نظروں کے یہ اعتراضات کہ عورت کی آنکھ ایسی نہیں ہوتی یا مرد کا ہاتھ ایسا نہیں ہوتا یا تناظر و تناسب کی یہ صورت صحیح نہیں ناواقفیت پر مبنی ہیں جس طرح غزل گو شاعر رموز و علائم سے کام لیتا ہے کہ بغایت اختصار اپنا مطلب بہ صحت تمام ادا کر سکے اسی طرح چغتائی بھی غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر کے علائم و رموز سے کام لے کر اپنا مفہوم دیکھنے والے تک یوں پہنچاتا ہے کہ ابلاغ و اظہار کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے خطوط میں بھی مصوروں کی سی نفاست و نزاکت ہے۔ تناظر میں وہ مغرب کے مسلک کا پابند نہیں۔ مغلوں کے مسلک تناظر سے بھی کام لیتا ہے۔ پس منظر میں کبھی وہ چیزیں دکھاتا ہے جو اصل موضوع سے مطابقت رکھتی ہیں کہ اسے اصطلاح میں توافق کہتے ہیں۔ بعض اوقات پس منظر اصل موضوع کی ضد ہوتا ہے کہ جس کیفیت کی تصویر کشی مقصود ہے وہ زیادہ نمایاں ہو جائے۔ اسے اصطلاح میں تقابل کہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں وہ اشعار کی ذہنی کیفیت کو بصری کیفیت میں اس طرح منتقل کرتا ہے کہ تاثیر بالکل شعر کا سا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا شعر ہے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ دریا میں یا سمندر میں ایک چراغ بہا چلا جا رہا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے گل کر سکتا ہے اور پانی کی ہر لہر اسے ڈبو سکتی ہے۔ لیکن ان مزاحمتوں کے باوجود انسان خلیفۃ الارض ہے۔ جد و جہد حیات میں مصروف رہتا ہے اور کام کرنے میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ

موت کا ایک دن معین ہے

اور وہ کوئی دن ہو سکتا ہے۔ اس تصویر کی رنگ آمیزی اور اس کی علامتی اہمیت اتنی خوبصورت اور نمایاں ہے کہ عامی کو بھی جزواً اس کا مفہوم سمجھا دیا جائے تو وہ اس کے بہت سے اشارات کا احاطہ کر سکتا ہے۔ باقی رہے اہل نظر اور اہل ذوق تو وہ پہچان لیتے ہیں کہ علامتوں کا مجموعی مفہوم کیا ہے۔ شاید انیس کا یہ شعر بھی چغتائی کے ذہن میں پرفشاں ہو۔

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

تو یہ تصویر دیکھ کر ذہن کئی اور اشعار کی طرف منتقل ہوتا ہے اور کئی چیزوں کا اسے ایسا شعور ہوتا ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ

بے ثباتی، کاوشہائے انسانی کی بے ثمری سے مربوط خیالات ذہن میں آتے ہیں اور مختلف خیالات کا ایک سلسلہ افق ذہن پر ابھرنے لگتا ہے مثلاً ؎

کیا اعتبار زندگی مستعار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

———

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

———

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

———

صرف یہی نہیں بلکہ چراغ اور روشنی کے متعلق بھی مختلف المعانی شعر یاد آنے لگتے ہیں، مثلاً ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو سب نے دیکھا میرؔ
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

———

یہی فنون لطیفہ کا کمال ہے کہ فن کار علامتوں سے کام لے کر ایسے راستے کھولتا ہے۔ ایسی دنیائیں دکھاتا ہے ایسے معانی کی طرف انگلی اٹھاتا ہے۔ ایسے مطالب کو ابھارتا ہے جو بظاہر اس کی تخلیق سے متبادر نہیں ہوتے۔ فن کا یہ کمال اصطلاح میں خیال آفرینی یا (SUGGESTION) کہلاتا ہے۔ آج کل چغتائی اقبال کا کلام مصور کر رہے ہیں۔ یہ کام پورا ہو گیا اور خدا کرے پورا ہو جائے تو بڑا کام ہو گا۔ در اصل یہ نزول برکات اور صدور حسنات ہے کہ ہم میں چغتائی جیسا فن کار موجود ہے جسے مغرب کے نقاد بھی چوٹی کا مصور تسلیم کرتے ہیں اور جس کی تصاویر کی نمائش یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہو چکی ہے۔

لاہور ہی میں استاد اللہ بخش نے فنی تربیت حاصل کی جس کے نقوش و خطوط میں دیہات کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کے فن کی جڑیں اس خطے میں پیوست ہیں جس میں انھوں نے پرورش پائی۔ مغربی پاکستان کے صحت مند اور توانا دیہاتی جفاکش اور خوبصورت عورتیں، کھلنڈرے بچے۔ ناچ گدھا۔ مختصر یہ کہ دیہات کی زندگی کا روپ سروپ اور سوگ بروگ سب ان کی تصاویر میں ملتا ہے۔ اس خطے کی زندگی اصلاً دیہات کی زندگی ہے اور استاد اللہ بخش خوشہ گندم سے لے کر رہٹ تک اور رہٹ کے بیلوں سے لے کر دیہاتیوں کے میلوں ٹھیلوں تک اس زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تجریدیت کم ہے۔ عکاسی کا عنصر زیادہ ہے۔ لیکن مصوری کی یہ شاخ بھی جس میں مناظر عکس کی طرح دکھائے جاتے ہوئے نہیں چاہیے

تاکہ نقاشی محض خطوط کا امتیاز اور خود ساختہ علائم کی ترکیب پر مشتمل ہو کر نہ رہ جائے۔

جو مصور مغرب کی جدید تحریکات سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں ان میں شمزہ، زوبی، شاکر علی، حنیف رامے، مولکہ احمد زیادہ نمایاں ہیں۔ حنیف رامے نے طلسم ہوشربا کے خلاصے کو مصور کیا ہے اور اس حیرت انگیز دنیا کی فضا قائم کی ہے جس کے کوائف طلسم ہوشربا میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ بے حد کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ کم سے کم خطوط کا استعمال کرتے ہیں اور جزئیات سے قطع نظر کر کے ان بنیادی کوائف کو سامنے لاتے ہیں جن سے مطلوبہ تاثر خیال افروزی کے ذریعے پیدا ہو تاکہ وہ محض خطوط کی ترکیب و ترتیب سے بھی کام لیتے ہیں جن کی وضع ہندسی ہوتی ہے (ریاضیاتی اشکال سے مشابہ ہوتی ہے) ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور امید کامل ہے کہ وہ اپنے علم کو فن میں استعمال کر کے جدید وضع کی مصوری کو نیا رنگ بخشیں گے۔

زوبی اور شاکر علی بھی جدید تحریکات سے بہت متاثر ہیں۔ ان کی تجریدی وضع کے نقوش میں علائم و رموز کا ایک خواز مخفی ہوتا ہے۔ زوبی تمام غیر ضروری تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف وہ خطوط استعمال کرتا ہے جن سے موضوع تصویر کی طرف اشارہ ہو جائے۔ رنگوں کی شوخی، دھیمے پن اور گہرائی سے وہ بہت اثر آفریں کام لیتا ہے۔ شاکر علی کے ہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ بھی صرف مصوری نہیں بلکہ اپنے فن کے تمام نظریات سے آگاہی بھی رکھتے ہیں اور ان کا شعور ان کے ہر نقش سے نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت شاگردوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور ان سے فیض اٹھانے والے آخر کار پاکستان میں مصوری کا احیا کریں گے۔

شمزہ بھی نوجوان مصوروں میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی ترکیب و ترتیب (COMPOSITION) میں بھی وہ خاص صفت ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصور اپنے فن پر پوری قدرت نہیں رکھتا اور نقالی ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنے بطون سے ایک نئی دنیا ابھار رہا ہے۔ ان کی تصاویر میں ایک اپج (ORIGINALITY) ہوتی ہے جو انہی سے خاص ہے۔

مولکہ احمد بھی فن مصوری کی معلمہ ہیں۔ انھیں مغرب کی تمام تحریکات سے کاملاً آگاہی حاصل ہے اور وہ ہر دبستان کے رموز سے واقف ہیں۔ اس لیے ان کی تصاویر میں بڑا تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ایک مسلک کی پابند نہیں اپنے موڈ کے مطابق ہر دبستان کے اصول کے مطابق تصویر بنا سکتی ہیں۔

ان جدید تحریکات سے متاثر حضرات کے علاوہ لاہور میں ایسے مصور بھی تھے جو مسجد وزیر خاں کے نقش و نگار، پچی کاری اور تزئین (ARABESQUE) کی نقل اتارنے میں مہارت تام رکھتے تھے۔ میو سکول آف آرٹس کے طالب علم در و بام اور سقف و محراب کے نقش و نگار کی وضع قطع دیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے، مصوری کی مشق کرتے تھے اور ان استادوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ خطوط مزین کی ترتیب میں ایک خالص اسلامی فن ہے جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے سب معاصروں پر سبقت رکھتے تھے۔ مجھے عبداللہ قریشی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دبستان کے آخری نمائندے حاجی میاں محمد حیات ہیں جو اب تک مسجد ہی میں مقیم ہیں۔ بابا میراں بخش اور حاجی فیروز الدین بھی اسی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ رفع اشتباہ کی خاطر یہ کہنا ضروری ہے کہ قدیم دبستان کے پیرو جو عکاسی کے قریب رہتے تھے ان میں ایک میاں فیروز الدین اور بھی تھے جو لکھنے کے لیے تصویریں بناتے تھے اور نہایت باریک کام کرتے تھے۔ تیسرے ماسٹر فیروز الدین تھے جو میو سکول آف آرٹس کے وائس پرنسپل تھے۔

عورتوں میں رضیہ فیروز الدین یقیناً لاہور ہی سے متعلق ہیں البتہ زبیدہ آغا کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کی فنی تربیت لاہور میں

ہوئی یا کراچی میں۔ ان کی تصاویر میں ایسی زندگی، توانائی اور حرکت ہے جو کم مصوروں کی نقاشی میں نظر آتی ہے۔

الحمرا میں پرانے اور نئے مصوروں (پاکستانی) کی تصاویر کی نمائشیں بھی ہوتی ہیں اور مغربی مصوروں کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ اس طرح پاکستانی مصوروں کو دوسرے ملکوں کے جدید ترین مسالک نقاشی سے آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ یہ مفید کام جاری رہے گا۔ ہمارے نوجوان مصور ان دیکھی دنیاؤں کی طرف رواں رہیں گے۔ کاروان حیات رو بہ سفر رہے گا اور میں وثوق سے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ لاہور کے مصور پاکستان میں وہی مقام حاصل کریں گے جو یہاں کے ادیبوں، دانشوروں اور انشا پردازوں نے کیا ہے۔

لاہور وہ مہبط فیض ہے جہاں ہر وقت فن کار حُسن کی تخلیق اور جمال کی تزئین میں مصروف اور محو کار نظر آتے ہیں۔ خدا ہمارے مصوروں کو وہ موقلم عطا کرے اور اس تخیل و تصور کی نعمت بخشے جن سے کام لے کر اس سے پہلے مصوروں نے ثقافت کی دنیا میں اپنے وطن کا نام بلند کر دیا ہے۔

لاہور

اس عنوان کے تحت بہت سی چیزیں (نظم بھی نثر بھی) اکٹھی کر دی گئی ہیں تاکہ لاہور کے بارے میں ایک مجموعی سا تاثر سامنے آ جائے۔

قلمکار

حفیظ جالندھری
رشید احمد صدیقی
شوکت تھانوی
خواجہ احمد عباس
راجہ مہدی علی خاں
شیخ عبدالشکور
ڈاکٹر صفدر حسین

جسٹس کیانی
نیاز فتحپوری
شاہد احمد دہلوی
احسان دانش
نصیر انور
مصطفٰے زیدی
ہوش ترمذی

——وہی لاہور —— !

ابوالاثر حفیظ جالندھری

وہی لاہور ہے۔ وہی در و بام — وہی ہنگامۂ خواص و عوام
زلزلے۔ آگ۔ آندھیاں۔ سیلاب — لائے تشریف چل دیئے ناکام
عارضی سی شکست و ریخت کے ساتھ — چل رہا ہے وہی قدیم نظام
شجر و شاخ ہے کہ برگ و ثمر — اپنے معمول پہ ہیں پختہ و خام

ہاں ادب کی ترقیِ معکوس — اور بھی ہو گئی ہے تیز خرام
جلوتِ حسنِ فن و شعر و سخن — اب نہ خلوت میں ہے نہ برسرِ عام
موت وارد ہے جب سے نبض فروش — بن کے بیٹھے ہیں ناقدانِ کرام
علمِ شے پر ہے جہلِ شے غالب — ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام
اب نہیں ربط حرف و معنی میں — خبط سمجھا گیا وہ حسنِ کلام
اب لطافت ہے قہقہوں کی ہدف — اب کثافت کا ہے ثقافت نام
اب تمسخر کیے سے داد ملتی ہے — اب چھچھنیے ہیں واجب الاکرام
اب مدارس میں رقص کی تعلیم — بن رہی ہے روایتِ اسلام

خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں — دیر پا بنتے جاتے ہیں اسقام
صورتوں پر جما لیا ہے رنگ — سیرتوں کا سڑا بُسا ہے قوام
جو بھی ہاتھ آئے وہ حلال حلال — جس پہ قابو نہ ہو حرام حرام
فرش کو عرش کی نہیں پروا — پستیاں ہیں بہت بلند مقام
بہرِ تخریب پھر وہی تعمیر — خودکشی کی طرف نیا اقدام
گھٹ رہی ہے تسلیِ محکوم — بڑھ رہی ہے تعلیِ حکام
شور و ہنگامہ نفسی نفسی کا — زندگی ہے تو زندگی کو سلام!

وہی لاہور ہے وہی در و بام
وہی ہنگامۂ خواص و عوام

میرا لاہور

جیف جسٹس محمد رستم کیانی

محمد طفیل نے تو کہا تھا، کہ اپنے لاہور کا نہ سہی، اُن کے لاہور کے متعلق کچھ لکھوں۔ مگر جیسے طفیل لاہور کو لے کر آپ کہاں گئے۔ اور اس کو چھوڑ کر، مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں، کہ وہ کس کس گلی میں، یا کس کی گلی میں پھرتے رہے ہیں۔ اپنی گلیاں تو ہر ایک کو معلوم ہوتی ہیں، اور یہ ضروری نہیں، کہ ساری گلیاں سب کو دکھائی جائیں۔ غالباً یہی لاہور کا شہر تھا جس کی کسی گلی میں قدرت اللہ شہاب کے برہنہ سر کو کسی نے اوپر کی منزل سے دیکھ کر، اگالدان سمجھ لیا تھا۔

پھر جب سوچنے لگا، کہ کیا لکھوں، تو کوئی اچھی بات ذہن میں نہ آئی۔ خیالات پراگندہ ہونے لگے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا، کہ دو رکعت نفل پڑھوں۔ کیونکہ نماز میں نماز کے مضمون کے علاوہ دل کی ساری کھوئی ہوئی باتیں واپس آجاتی ہیں۔ بہت سے مضمون دماغ میں آئے۔ یہ غلطی کی، کہ نماز نہیں توڑی۔ نماز کے بعد سب کچھ بھول گیا۔ البتہ یہ فائدہ ہوا، کہ شاہی مسجد اور وزیر خاں کی مسجد یاد آئیں۔ میں نے خود تو ان میں نماز نہیں پڑھی، مگر عید کے اگلے دن اخباروں میں شاہی مسجد سے لوگ نکلتے نظر آتے ہیں، اور ایک سال تو آٹھ دس نمازی لوگوں کے ہجوم میں کچل کر مر بھی گئے تھے۔ ویسے نماز کے لیے سیدھی صف بنا کر کھڑے ہوتے ہیں، لیکن جب باہر نکلتے ہیں، تو اس ترتیب کو جو نماز سکھاتی ہے، مسجد میں چھوڑ کر نکلتے ہیں۔ کچھ تو قصور ان گورنروں کا بھی ہے، جو عید کے دن لوگوں سے بغلگیری کا ووٹ لینا چاہتے ہیں۔ اور اس وقت لوگ اظہار عقیدت میں کسی اور کو نہیں دیکھتے۔ کوئی اور ان کو نظر ہی نہیں آتا۔ اور تین دفعہ بغلگیر ہوتے ہیں، پہلے سر دائیں طرف نکالتے ہیں، پھر بائیں طرف۔ اور تیسری دفعہ ناک کا ناک سے تصادم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کوئی شخص جنرل اعظم کو ملنے گیا، اور کہا کہ آپ بھول گئے ہیں، مگر ہم پہلے بھی ملے ہیں۔ جنرل اعظم نے کہا، کہ مجھے تو یاد نہیں۔ اس پر انھوں نے یاد دہانی کی، کہ پچھلے سے پچھلے سال عید الفطر میں آپ سے مسجد وزیر خاں میں بغلگیر ہوا تھا۔ اب پہچانا؟

غالباً انہی مسجدوں میں سے ایک ہے، جس کے خطیب عیدوں اور جمعہ کے خطبوں پر اکتفا نہ کر کے نکاح کے موقع پر بھی آدھ گھنٹہ وعظ کرتے ہیں۔ لاہور والوں کو لادین کہیں، یا بے دین، وہ نکاح کے موقع پر بھی خاموشی سے، بلکہ مظلومانہ، یہ وعظ سنتے ہیں۔ مگر پیر شو، بیاموز۔ لاہور اتنے برس رہ کر، اتنی شادیوں کی دعوتیں کھا کھا کر، یہ تجربہ حاصل کیا ہے، کہ جب شادی کی دعوت آئے، تو پہلے پوچھتا ہوں، کہ نکاح کون پڑھے گا۔

شادی اور نکاح کے ذکر سے اب کچھ اور باتیں بھی یاد آنے لگی ہیں۔ لاہور میں شادی کے دو موسم ہوتے ہیں ایک گرمی کا، ایک سردی کا۔ اس کے علاوہ جس کو جلدی ہو، یا جس نے ولایت جانا ہو، تو جون کے حبس میں بھی کر لیتا ہے۔ جتنے بڑے لوگ خصوصاً افسروں میں سے مل سکیں، ان کو بلایا جاتا ہے۔ جن دنوں مغربی پاکستان میں ایک سے زیادہ صوبے تھے، تو کوشش ہوتی تھی، کہ دو صوبوں کے گورنر موجود ہوں۔ میرے دو ایک دوست ایسے تھے۔ کہ وہ جب شادی کے مقام پر پہنچتے تو معمولی کرسیوں میں سے ایک فرلانگ کی مسافت کاٹتے ہوئے گورنر کے صوفے تک پہنچ جاتے تھے۔ دائیں بائیں دیکھتے رہتے تھے، تاکہ کوئی ان سے یہ نہ کہہ دے، کہ یہاں بیٹھئے۔ اگر گورنر کے قریب نشستیں سب بھری ہیں، تو بھی وہ ایسی ثابت قدمی سے

اُدھر کا رُخ کرتے تھے، کہ ان کو دیکھ کر پاس ادب سے کسی کو اپنی نشست خالی کرنی پڑتی تھی۔

لاہور کی شادی میں اگر مجھے کھانے کی بجائے جائے لے جائے تو پسند کروں گا۔ کھانا سارا ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ جنوری میں کھائیں، تو خیال ہوتا ہے کہ وہی دسمبر کا کھانا دوبارہ گرم کر لیا ہے۔ وہی چاول سفید رنگ کے، جن میں پہلے چاول بھی ملا لیے جاتے ہیں۔ ان کو پلاؤ کہنا پلاؤ کی بے عزتی کرنا ہے۔ وہی نان سفید رنگ کے۔ بے ذائقہ۔ ٹھنڈے۔ جو نہ پشاور کے نان ہیں، نہ گوجرانوالہ کے۔ لوگوں کو کہا جاتا ہے، کہ یہ پشاوری ہیں۔ اور لوگ بھی ان پر مرے جاتے ہیں۔ کوئی نیم تیز نانبائی مغلوں کا شجرہ نسب لے کر یہاں پہنچ جاتا ہے، اور نانوں کے علاوہ سیخ کباب بھی بنانے لگتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا تھا کہ جی میں آتا ہے، کوہ طور کو آگ لگا دوں۔ میرے جی میں آتا ہے، کہ نوکری چھوڑ کر لاہور میں نانبائی یا کبابی کی دکان کھول دوں۔ ملک کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ ٹھنڈے کبابوں سے اور کچے نانوں سے بدنامی ہوتی ہے۔ لاہور کے لوگ قدر شناس ہوں، یا نہ ہوں، کباب شناس ضرور ہیں۔ آج کل نئی دکان کھولنی ہو، تو بھی رسم افتتاح ہوتی ہے۔ میں خود ہی افتتاح کروں گا۔ اور کہوں گا ——— "اے قوم! تو کیوں ٹھنڈے کباب پر بھی صابر و شاکر ہے؟"

میں بھی تو قدر دانی کی تلاش میں کہاں جا پہنچا۔ کیا کروں۔ ان باتوں کے تصور سے حب الوطنی کے جذبے کی بھی تسکین ہوتی ہے، اور روپیہ پیسے کی بھی کوئی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ مگر میں شادیوں کے کھانے کا ذکر کر رہا تھا۔ چند خاص گھروں کو چھوڑ کر باقی سب پر ایک ہی قسم کی مہر لگی ہوتی ہے۔ جیسے ایک ہی آدمی نے پکائے ہوں جب میں گورنمنٹ کالج میں طالب علم تھا، اور نیو ہوسٹل میں رہتا تھا، تو ہمارا باورچی محمد دین بھی اسی قسم کی مہر لگاتا تھا۔ کھانا تو اچھا پکاتا تھا، مگر ذائقہ سب کھانوں کا ایک ہی قسم کا تھا۔ کسی نے پوچھا۔ محمد دین۔ کیا بات ہے۔ آلو بھی کھاتے ہیں تو وہی مزا، اور پالک ساگ بھی کھاتے ہیں۔ تو وہی مزا۔ اس نے خوش ہو کر جواب دیا، کہ سب میں محمد دین کا ہاتھ جو ہوا۔

"اے قوم! سب چیزوں میں محمد دین کا ہاتھ کیوں ہے؟"

اس کے بعد میں نے بہتیری کوشش کی، کہ لاہور کی کوئی اور بات بتاؤں، اور اپنے حافظے کو محمد طفیل کا واسطہ بھی دیا۔ مگر کچھ نہ بنا۔ بات یہ ہے، کہ یہ سطور میں کوہاٹ میں لکھ رہا تھا۔ اس لیے بالآخر فیصلہ کیا، کہ کوہاٹ لاہور سے کچھ کم نہیں۔ اور کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ ایک ہی سڑک ہے، جس پر لوگ سیدھے چلتے ہیں۔ ایک ہی اخبار ہے، جسے لوگ سر تا سر پڑھتے ہیں۔ ایک ہی خدا ہے جس کی ایک ہی طرح پرستش کرتے ہیں۔

"اے قوم! مگر تو نے اتنے خدا کیوں بنا رکھے ہیں؟"

۳ لاہور ——— جب اور اب

شاہد احمد دہلوی

اب سے چودہ برس پہلے تک دلی اور لاہور گھر آنگن تھے۔ رات کو کھانے دانے سے فارغ ہو کر فرنٹیئر میل میں جا سوئے اور صبح نور ظہور کے وقت لاہور پہنچ گئے۔ میرا تعلق لاہور سے چالیس سال کا ہے۔ دو چار، دس بیس نہیں سینکڑوں بار لاہور جانا ہوا۔ برسوں لاہور میں رہنا بھی ہوا۔ وہ یوں کہ جب میں نے دلی سے میٹرک پاس کیا تو والد مرحوم نے فرمایا کہ تم ڈاکٹری پڑھو۔ دلی میں کوئی

میڈیکل کالج لڑکوں کے لیے نہیں تھا۔ سائنس پڑھانے کا انتظام کئی کالجوں میں تھا مگر دلّی سے ایف۔ ایس سی یا بی۔ ایس سی کرنے کے بعد ہر سال صرف دو لڑکے لاہور میڈیکل کالج میں بھیجے جاتے تھے۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لیے میں نے لاہور جا کر ایف۔ سی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ ایک امریکی مشن کا شاندار کالج تھا۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے پہلو میں۔ بعد میں نہر پار نئی عمارت میں آ گیا۔ کالج میں ہزار بارہ سو سے کم لڑکے نہیں تھے۔ مگر دلّی والا صرف میں ہی ایک تھا۔ شروع شروع میں تو اس نئے دیس میں پہنچ کر طبیعت بہت اُلجھی کہ جسے دیکھو پنجابی بولی رہا ہے۔ نامانوس زبان، نامانوس لہجہ۔ لڑکے مجھ سے باتیں کرتے تو میں اُن کا منہ دیکھتا رہ جاتا وہ حیران ہوتے اور میں شرمندہ۔ اُردو میں اُن سے بات کرتا یا انگریزی میں۔ رفتہ رفتہ سب جان پہچان گئے تو اُردو ہی میں مجھ سے بولنے لگے۔ شائستگی سے پیش آتے اور محبت سے ملتے۔ خالی وقت میں یوئنگ ہال یا نیوٹن ہال میں اپنے کمروں میں لے جاتے کھلاتے پلاتے اور اپنے کھیل تماشوں میں شریک کرتے۔ میں موچی دروازہ میں اپنے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر اجمل حسین کے ساتھ رہتا تھا۔ محلے والوں کی ملنساری کی بھی یہی کیفیت دیکھی کہ دل کھول کر ملتے اور ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں ساری مغائرت دُور ہو گئی اور میں دلّی سے زیادہ لاہور کا ہو گیا۔ اچھے اُستاد ملے، اچھے دوست ملے، اچھا ماحول اور اچھا معاشرہ ملا۔ تین سال ایف۔ سی کالج میں اور ایک سال میڈیکل کالج میں پڑھنے کے بعد جب مجھے بعض خاندانی مجبوریوں کے تحت لاہور کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے دلّی واپس جانا پڑا تو مجھے لاہور چھٹنے کا اتنا رنج ہوا کہ میں نے تقریباً ایک سال تک دلّی کے کسی کالج میں داخلہ نہیں لیا۔

لاہور اُس زمانے میں ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔ ہر چند کہ دلّی راجدھانی تھی اور پُر رونق بھی مگر لاہور کئی حیثیتوں سے دلّی پر فوقیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ لاہور تعلیمی اداروں کا شہر تھا۔ ہر طرف جونچال چہرے، پھولوں کی طرح کھلے ہوئے۔ آدھی سے زیادہ رونق تو انہی نوجوانوں کی ہوتی تھی۔ آئے دن کالجوں کی تقریبیں ہوتی رہتی تھیں۔ مقابلے، مباحثے، میچ، ڈرامے اچھے اور بُرے گانوں کے جلسے۔ بڑی زندگی تھی یہاں کے طلبا میں مگر شائستگی کے ساتھ، جو اب ہمارے طلبا میں مفقود ہو چکی ہے۔ اب تو نہ بڑے کا ادب ہے اور نہ چھوٹے کا لحاظ۔

لاہور دانشوروں کا شہر تھا۔ ہر علم اور فن کا مُنتہی لاہور میں موجود تھا۔ علوم و فنون کے چشمے اِس شہر سے جاری ہو کر پورے ہندوستان کو سیراب کرتے رہتے تھے۔ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے وہ اگلی بہاریں دیکھیں اور اُنھیں ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں رکھ لیا تاکہ ان کی یاد سے اپنی زندگی کو شاداب کرتا رہوں۔ اُسی عہدِ رفتہ کی چند جھلکیاں آپ کو دکھاتا ہوں۔

پُرانے لاہور کے گرد کبھی فصیل ہو گی جس کے چند دروازے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ چالیس سال پہلے پُرانے شہر کے چاروں طرف پارک بنا ہوا تھا اور ایک پتلی سی نہر لاہور کا طواف کرتی رہتی تھی۔ اس کچی نہر کے کناروں پر عورتیں ہاتھ ہاتھ بھر کے ڈنڈے اور صابون لیے کپڑے کوٹتی رہتی تھیں۔ اسی نہر کے حاشیے پر سُرخ بجری کی روش تھی۔ اور روش کے بعد پھر سبزہ شروع ہو جاتا تھا۔ جھاڑیں اور درخت بھی اس سبزہ زار میں کثرت سے تھے۔ گرمیوں میں لاہور تپ کر بھاڑ بن جاتا تو یہ پارک شہر والوں کے لیے دارالامان بن جاتے۔ شام کو اِن میں دلّی کے چوک کی طرح خوب چہل پہل ہو جاتی۔ ان میں بوعلی سینا اور جالینوس کے جانشین میں

جو صرف جنسی کمزوری کی دوائیں بیچتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو کسی فقیر نے نسخہ شفا رکھا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ دوا کی قیمت کسی سے نہ لی جائے۔ محض رفاہِ عام کے لیے یہ کارِ خیر کیا جائے۔ لہٰذا اعلان ہوتا ہے کہ صرف ضرورت مند طلب کریں۔ سارا مجمع ضرورت مند ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ایک ایک شیشی رکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور ترکیب استعمال بتانے سے پہلے ایک دلچسپ داستان سنانی شروع کر دیتے ہیں۔ مجمع بندھا کھڑا رہتا ہے۔ داستان ختم ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوا کی قیمت تو کچھ نہیں ہے مگر ہاں پانچ آنے اس کی لاگت کے ہیں جس میں اس کی نیاز بھی شامل ہے۔ اس اطلاع پر لوگ بغلیں جھانکتے ہیں پھر شرما شرمی پانچ پانچ آنے نکال کر دینے شروع کر دیتے ہیں۔ حکیم جی پانچ سات روپے سمیٹ کر اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ نجومی اور ہاتھ دیکھنے والے ٹوکری لگائے جا بجا بیٹھے ہیں۔ چار پیسے میں قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ پانسہ پھینک کر سلیٹ پر حساب لگاتے ہیں اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ ایک بڑے سے مجمعے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی اپنی جٹائیں کھولے اردو ہندی میں تقریر کر رہے ہیں۔ یہ کوئی آریہ سماجی ہیں۔ روزانہ گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر کھڑے ہو کر اپنے دھرم کا پرچار کرتے ہیں۔ مسلمان بھائی اس کان سن کر اس کان اڑا دیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سودے سلف والے گھومتے پھرتے ہیں۔ دہی بڑے ہیں، پھلکے ہیں، گنڈیریاں ہیں، پان بیڑی سگریٹ ہے۔ ہر دروازے کے باہر دو رویہ دکانیں ہیں۔ سب پر کھانے پینے کا سامان ہے۔ کہیں چھپا چھپ پوریاں اتاری جا رہی ہیں۔ حلوے کے چوٹی دار تھال بھرے رکھے ہیں۔ ایک طرف کبابی سیخیں بھر بھر کر سینک رہا ہے۔ برابر میں فالودے کی دکان ہے۔ قلعی دار بڑے بڑے لگنوں میں فالودے کے لچھے بھرے ہوئے ہیں۔ ان پر برف کا ڈلا رکھا ہوا ہے۔ دودھ اور شربت چوڑے منہ کی چمکتی ٹھلیوں میں بھرا ہوا ہے۔ اور آگے چلیے۔ چولہے میں لکڑ جل رہے ہیں، ان پر ایک بڑا سا لوہے کا کڑھاؤ چڑھا ہوا ہے۔ تیل کھول رہا ہے۔ دکاندار مچھلی کا ایک پارچہ بیسن میں لپیٹ کر کڑھاؤ میں چھوڑتا ہے۔ جب وہ سرخ ہو جاتا ہے تو چھلنے سے نکال کر سینی میں رکھ دیتا ہے۔ اشتہا انگیز خوشبو اڑ رہی ہے۔ برابر میں دہی کی لسی کا اہتمام ہے۔ بیسیوں کونڈے دہی کے اوپر تلے چنے ہوئے ہیں۔ گاہک ان تمام دکانوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی عورتیں بھی برابر سے کھا رہی ہیں۔ لاہور والے خوب کماتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں۔ محنت سے جی نہیں چراتے، جبھی تو ان کو انگ لگتا ہے اور صحتیں بنی رہتی ہیں۔ چونچال چہرے اور ہنستی پیشانیاں ہر جگہ دیکھ لو۔ زندگی یہاں ہنستی، گاتی، گنگناتی گزرتی ہے۔ سر سید نے انہیں زندہ دلانِ پنجاب اسی وجہ سے تو کہا تھا۔ ارے یہ بھیڑ کیسی لگ رہی ہے؟ اچھا یہ رستم زماں گاماں پہلوان کا اکھاڑا ہے۔ گاماں امام بخش کو زور کرا رہے ہیں۔ گبھرو اچھا پٹھہ تیار ہو رہا ہے۔ لاہور میں کئی اکھاڑے ہیں۔ ایک اور اکھاڑا گونگے پہلوان کا مشہور ہے۔ گونگا اجلے رنگ کا قد آور جوان ہے۔ چھوٹی جوڑیں سب مار چکا ہے۔ اب اس نے گاماں کے بھائی امام بخش کو للکارا ہے۔ یہ کشتی بڑے کانٹے کی ہوگی۔ لاہور میں اس کشتی کا بڑا چرچا ہے لاہور والے گاماں اور گاماں کے خاندان والوں کی بڑی عزت کرتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ گونگا جوان پٹھہ ہے، گینڈے کی طرح تیار۔ امام بخش ذرا بڑی عمر کا پہلوان ہے۔ سب کو یقین ہے کہ امام بخش کشتی مار لے گا۔ لیکن اگر سوءِ اتفاق سے گونگے نے مار لیا تو کیا ہوگا۔ ہونہہ، مگر نہیں جی، ایسا نہیں ہو سکتا۔ لو صاحب، کشتی کا دن آ پہنچا۔ ہم بھی دیکھنے گئے۔ دونوں پہلوان اکھاڑے میں آتے ہیں۔ پہلے ہاتھ پاؤں کھولے۔ پھر آمنے سامنے ہو کے ہاتھ ملے۔ علیحدہ ہوئے۔ پھر پنجے ملا کر دونوں تلا بجلی کی

چمکی، دیکھا تو گونگا امام بخش کے سینے پر سوار تھا۔ کوئی چالیس پچاس ہزار تماشائی موجود تھے۔ سناٹا چھا گیا۔ گونگا تراتا اور بھینسے کی طرح اراتا اکھاڑے میں اچھلتا پھر رہا تھا۔ میر کشتی بھی دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ جب اس غیر متوقع جھٹکے سے سنبھلے تو سرگوشیاں کرنے کے بعد اعلان کیا کہ کشتی نہیں ہوئی۔ سارے مجمعے نے بھی ایک آواز ہو کر چیخنا شروع کر دیا "نہیں ہوئی۔ نہیں ہوئی"۔ گونگے کے باپ کو بتایا گیا کہ امام بخش کے کھوے زمین سے نہیں لگے۔ اس نے اپنے بیٹے کو اشاروں میں بتایا۔ گونگا اس اطلاع پر بالکل جز بز نہیں ہوا۔ دوبارہ خم ٹھونک کر سامنے آگیا۔ کتنی نفرت تھی مجمعے میں گونگے کے لیے، مگر وہ سب سے بے نیاز دوبارہ لڑنے کے لیے تیار تھا۔ دوسری کشتی شروع ہوئی۔ دو منٹ تک دونوں ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے رہے۔ ایکا ایکی گونگا امام بخش کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے اور بار بار اس کے کھووں کو زمین سے لگا رہا ہے۔ میر کشتی نے گونگے کے جیت جانے کا اعلان کر دیا مگر وہ اب بھی امام بخش پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اس کے باپ نے لپک کر اسے اٹھایا اور کھینچ کر الگ کیا۔ مجمع چھٹے ہوئے گنے کی طرح دم دبا کر دنگل میں سے نکلنے لگا۔ کشتی بالکل صاف ہوئی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ امام بخش کے پچھڑنے کا لاہور والوں نے بڑا سوگ منایا۔ چھ مہینے بعد پھر ان دونوں کی کشتی ہوئی۔ اب کے کشتی تڑ پڑ نہیں ہوئی، بیس منٹ تک داؤ پیچ ہوتے رہے۔ گونگا اس کشتی میں بھی تگڑا پڑ رہا تھا۔ مگر کچھ اللہ کو اس خاندان کا وقار ہی رکھنا تھا جو امام بخش کا ایک داؤ چل گیا اور گونگا چت ہو گیا۔ مجمعے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ امام بخش پہ دھن برس رہا تھا۔ لوگوں کی جیبیں خالی ہو گئیں تو انھوں نے اپنے صافے اتار اتار کر امام بخش پر ڈالنے شروع کر دیئے۔ سینکڑوں صافوں کے انبار میں پہلوان دب کر رہ گیا۔ وہ جوش و خروش تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گونگا اپنے باپ کے ساتھ چپکے سے سٹک گیا تھا۔ اچھا ہی کیا اس نے، ورنہ یہ بپھرا ہوا مجمع اس کی تکا بوٹی کر دیتا۔ دنگل سے اونٹ پر امام بخش کا جلوس نکالا گیا۔ رنگ برنگے صافے اونٹ پر لٹکے ہوئے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ کئی کئی ڈھول بج رہے تھے۔ کئی ہزار آدمی "اڑ گئے گونگا ڈھہ گیا" کا نعرہ ٹولیاں بنا کر کورس میں کہتے جاتے تھے۔ ہنڈوں کی روشنی میں یہ جلوس سارے شہر میں گھمایا گیا۔ بالاخانوں سے پہلوان پر پھول برسائے جا رہے تھے اور نچھاور ہو رہی تھی۔ اور پہلوان گجروں اور صافوں سے لدے پھندے دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کشتی کے بعد امام بخش مسلمہ طور پر رستم ہند ہو گئے اور پھر کوئی کشتی نہیں لڑے۔ خدا کے فضل سے اب بھی جیتے ہیں۔ اب ان کے لڑکے بھولو، اسلم، اعظم، اکرم اور گوگا اپنے خاندان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

یوں تو پنجاب میں دو بڑے گھرانے قدامت سے مشہور چلے آتے ہیں۔ ایک تل ونڈی والے کہلاتے ہیں اور دوسرے شام چوراسی والے۔ یہ دونوں گھرانے دھرپدیوں کے ہیں۔ ان دونوں کے بزرگوں کا سلسلہ مغل دربار تک پہنچتا ہے۔ دھرپد گانے کا رواج محمد شاہ بادشاہِ دہلی کے زمانے تک عام تھا۔ اس بادشاہ کے زمانے میں نغمے در و دیوار سے برستے تھے۔ بادشاہ اپنی رنگ رلیوں کی وجہ سے "رنگیلے" کہلاتے۔ انہی کے دربار کے دو گائیکوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیکی کو فروغ دیا، اور اتنا کہ دھرپد کا چراغ جھلملانے لگا۔ یہیں سے دھرپد کا زوال شروع ہوا اور دھرپدیے کم ہوتے ہوتے ہماری اس صدی کے ربع دوم میں الشاذ کالمعدوم ہو گئے۔ لاہور تہذیب و شائستگی کا مرکز مغلوں کے اقتدار کے بعد بھی رہا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد شمالی ہند کی بعض ریاستوں کو عروج ہوا۔ ان میں پٹیالہ بھی تھا۔ لکھنؤ اور دلی کی بادشاہیوں کے

اُجڑنے کے بعد اہلِ ہنر اور فن کاروں نے ریاستوں کا رُخ کیا اور جس کے جہاں سینگ سمائے اُدھر نکل گئے۔ لاہور والوں نے پٹیالہ سے اپنا ناتا جوڑا۔ چار پشتوں تک اس ریاست نے اہلِ ہنر کی سرپرستی کی۔ یوں پٹیالے والوں کا بھی ایک گھرانا بنا اور مشہور ہوا مگر حقیقت میں یہ لاہور والوں ہی کا گھرانا ہے۔ انھی میں سے دو گانیکوں نے بڑا نام پایا۔ ایک فتح علی اور دوسرے علی بخش۔ دراصل یہ گانے والوں کی ایک جوڑی تھی جسے ایک مغنیہ گولھی بائی نے تیار کیا تھا۔ انھوں نے بیس بیس سال بھون رے میں رہ کر ریاض کیا تھا، چنانچہ یہ جوڑی آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی۔ مہاراجہ پٹیالہ نے انھیں جرنیل اور کرنیل کے خطاب دیئے تھے، فوج کے جرنیل کرنیل نہیں، گانے کے جرنیل بہادر اور کرنیل بہادر۔ فتح علی جرنیل ریاست ٹونک میں بھی ایک زمانے میں ملازم تھے۔ نواب ابراہیم علی خاں گانے بجانے کے بڑے رسیا تھے۔ ایسے حکمرانوں کو خیال ٹھمریاں بنانے کا خبط بھی ہوتا ہے محمد شاہ کی تقلید میں سدا رنگ بنایا کرتے تھے، ابراہیم علی خاں کی فتح علی خاں۔

فتح علی خاں کے لڑکے عاشق علی خاں تھے۔ یہ بھی پٹیالے کے ملازم تھے مگر لاہور میں زیادہ رہتے تھے۔ بدقوارہ اور بدکلو آدمی تھے۔ نہایت موٹی اور بھدی آواز تھی مگر ایسے کچھ ایسا سادھا تھا کہ کانوں میں رس گھولتی تھی۔ اور کسی بھاری آواز والے سے اتنی تیک تانیں نہیں سُنیں جتنی عاشق علی خاں سے۔ دُنیا کا کوئی نشہ ایسا نہیں تھا جو ان سے چھُوٹا ہو مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ مرتے دم تک ان کی آواز ٹھیک رہی۔ عجیب وارفتہ مزاج آدمی تھا۔ لاکھوں روپے کمائے مگر کوڑی کفن کو نہیں لگا رکھی۔ شادی ساری عمر نہیں کی اور نہ روپے پیسے کا کبھی مُنہ کیا۔ متوکل بندوں کی طرح جو کچھ ملا سب لُٹا دیا۔ خاں صاحب گھر سے نہایت عمدہ سُوٹ پہن کر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پھٹا ہوا تہمد لپیٹے واپس چلے آ رہے ہیں سارے صاحب: یہ کیا؟ بولے " پیڑی پہ ایک ننگا فقیر پڑا جاڑے میں ٹھٹھر رہا تھا " حضرت اُسے اپنا سُوٹ دے آئے اور اُس کا تہمد لے آئے۔ اتنا بڑا گویا ہونے کے باوجود عاشق علی خاں میں غرور نام کو نہیں تھا۔ بچوں کی طرح بھولی بھولی باتیں کرتے تھے۔

لاہور ہی کو ایک اور بہت بڑے اُستادِ فن وحید خاں نے اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ کیرانے کے رہنے والے تھے اور اُستاد عبدالکریم خاں کے رشتے کے بھائی تھے۔ یہ وہی عبدالکریم خاں ہیں جو روشن آرا بیگم کے اُستاد تھے۔ عبدالوحید خاں بڑے کاملِ فن اور موسیقی کے صرفی و نحوی تھے۔ ان کا دماغ شاہانہ بھی تھا اور فقیرانہ بھی۔ تُرش اور بدلحاظ آدمی تھے۔ صورت شکل اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی گاماں پہلوان سے مشابہت رکھتے تھے۔ اُونچا سُنتے تھے اس لیے بہرے وحید خاں کہلاتے تھے۔ ان کی نامور شاگردوں میں ہیرا بائی بڑودکر اور اختری بائی فیض آبادی ہیں۔ خبر نہیں لاہور کے کسی بزرگ سے مرید ہو کر لاہور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پیر کے انتقال کے بعد اُنھی کے مزار کے مجاور بن گئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ چشتی صابری ضرور لکھتے تھے۔ علمی اور فنی لحاظ سے پورے ہندوستان میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں تھا۔ اہلِ علم سے ان کی خوب گھٹتی تھی۔ چنانچہ لاہور کے بعض عالم، ادیب اور شاعر خاں صاحب کو گھیرے رہتے تھے۔ کسی گانے والے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حتیٰ کہ عبدالکریم خاں، فیاض خاں، رجب علی خاں اور عاشق علی خاں کو بھی نہیں پتیاتے تھے۔ اُن کی طرح جتنا کر اور ٹوک کر راگ سنانے والا سوائے اُستاد بندو خاں سارنگی نواز کے میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ جلال میں تو وہ اکثر رہتے ہی تھے جب

جمال اُن پر وارد ہوتا تو وہ بڑی اچھی باتیں کرتے تھے اور اُن کے بے پناہ علم کا اندازہ بھی ایسی کیفیت میں ہوتا تھا۔ راگ اُن سے زیادہ صحیح اور کوئی نہیں گاتا تھا۔ اُن کے گانے کا انداز سب سے جدا تھا۔ گھنٹوں ایک ہی راگ کھٹکتے رہتے تھے۔

لاہور میں ایک اور اچھے گانے والے غلام علی خاں تھے۔ بعد میں ایک اور غلام علی خاں بھی قصور سے آکر بس گئے تھے۔ اس لیے پہلے غلام علی خاں بڑے غلام علی خاں اور دوسرے چھوٹے غلام علی خاں کہلانے لگے۔ بڑے غلام علی خاں کی بڑی بڑی کالی مونچھیں تھیں۔ ڈیل ڈول سے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ تانگے کی سیٹ پر ایسے ہی دھرے رہتے تھے۔ بڑے ستھرے، تیار اور صاحب طرز گانے والے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اتنا خوش آواز گویا شاذو نادر ہی سننے میں آتا تھا۔ سونے کے چند گھنٹوں کے علاوہ ہر وقت اپنا سُرمنڈل لیے گاتے ہی رہتے تھے۔ خوش مذاق اور شائستہ آدمی تھے۔ لاہور سے باہر ہزار روپے روز پر جایا کرتے تھے۔ غریب شائقین شاہی محلہ میں ان کے بالاخانے پر چلے جاتے تو خان صاحب تواضع بھی کرتے اور گھنٹوں گاتا سناتے رہتے۔ خاں صاحب نے بے شمار خیال بناتے ہیں جن میں ان کا تخلص "سب رنگ" ہے۔ ان کا خرچ ایک ہاتھی کا سا خرچ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی آمدنی مسدود ہوگئی۔ ریڈیو لاہور سے انھیں دو پروگرام دو سو روپے کے ملتے تھے۔ اتنے کے تو مہینے میں وہ سگریٹ ہی پی جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کراچی آکر بھی رہے۔ یہاں بھی تنگ دستی کا شکار رہے۔ پھر سنا کہ خاں صاحب بمبئی چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ انہی کے چھوٹے بھائی برکت علی خاں ہیں جنھوں نے ٹھمری، دادرا، اور غزل گانے میں کمال پیدا کیا ہے۔

اُس زمانے میں دو مصوروں نے بہت نام پیدا کیا۔ ایک استاد اللہ بخش اور دوسرے عبدالرحمٰن چغتائی۔ دونوں لاہور ہی میں رہتے تھے۔ چغتائی نے مرقع چغتائی شائع کر کے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اچھی قیمت پر فروخت ہوتی تھیں۔ حکومت نے ازراہِ سرفرازی انھیں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اللہ نے انھیں دولت بھی دی اور عزت بھی مگر ان کی نہ تو وضع میں کوئی فرق آیا اور نہ مزاج میں۔ ورنہ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ جہاں سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اور وہ ابلی۔ چغتائی صاحب اِس کلیہ کی استثنا ہیں۔

سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ حکومت کے عمّال سے۔ تاہم مسلمانوں کے بیشتر سر آور دہ لوگ یہیں تھے۔ سب سے زیادہ "سر" بھی لاہور ہی میں تھے۔ ان میں سے ایک بہت بڑے شاعر تھے اور ایک بہت بڑے ادیب میری مراد سر محمد اقبال اور سر عبدالقادر سے ہے۔ جب خطابات واپس کرنے کی تحریک ہوئی تو ان دونوں نے اپنے اپنے خطابات واپس کر دیئے تھے۔ مگر یہ دونوں بزرگ صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں تھے۔ یہ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ یہ کیا کم ہے کہ یہ دونوں بہت بڑے انسان بھی تھے، اور اسی انسانیت کی وجہ سے قوم پر اتنے احسانات کر گئے ہیں کہ ہم ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی سادگیٔ مزاج دیکھنے کی چیز تھی۔ انھیں دیکھ کر پرانے فلسفیوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ علامہ اقبال کو کھرّی چارپائی پر تہمد باندھے اور بنیان پہنے بیٹھا میں نے دیکھا ہے۔ ہر قسم کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے ارشادات سے مستفیض ہوتے تھے۔ سر عبدالقادر

کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ ادیبوں اور شاعروں کے جلسوں سے لے کر سلوتریوں کے جلسوں تک کی صدارت کر بیٹھتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ "ریڈی میڈ" صدر کہلانے لگے تھے۔ ڈاکٹر اقبال پنجابی لہجے میں اُردو بولتے تھے، سر عبدالقادر دلّی والوں کی طرح اُردو میں بات چیت کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کا ذکر چھڑا ہے تو میں اُس زمانے کے چند اور حضرات کا سرسری سا ذکر بھی کرنا چاہوں۔

اخباروں میں دو اخبار بہت چلتے تھے۔ ایک "پیسہ اخبار" اور دوسرا "زمیندار"۔ پیسہ اخبار تو غالباً کسی زمانے میں ایک پیسے کا ہوتا ہوگا، یوں اس کا نام پیسہ اخبار رکھا گیا ہوگا مگر زمیندار کی وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آئی۔ پیسہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم تھے۔ اِن سے میرے والد کے قدیمی مراسم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اپنے والد کے ساتھ میں ان کے دفتر میں گیا تھا۔ ساٹھ کے قریب عمر ہوگی، داڑھی مونچھیں سفید تھیں۔ اچھے قد کے آدمی تھے۔ ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ نام کے ساتھ دولت بھی اچھی کمائی۔ ان کے بعد نہ تو ان کا نام چلانے والا کوئی رہا نہ اخبار۔ اب اس اخبار کے نام کا محلّہ لاہور میں البتہ رہ گیا ہے۔

زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں تھے۔ بڑی پہلودار شخصیت تھی ان کی۔ میں نے انھیں دیکھنے سے پہلے ان کی دو کتابیں پڑھی تھیں۔ "معرکۂ مذہب و سائنس" اور ایک ناول "سیرِ ظلمات"۔ یہ دونوں کتابیں ان کی تصنیف نہیں تھیں، ترجمہ تھیں، مگر کیا مجال کہ کہیں سے بھی ترجمہ معلوم ہو جائیں۔ نثر عالمانہ لکھتے تھے اور شعر سے بھی علمیت ٹپکتی تھی۔ بڑے پُر گو تھے اور قافیوں کے تو بادشاہ تھے۔ آتش بیان مقرر تھے اور مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ قد میانہ، اکہرا ڈیل، کتابی چہرہ، گول چھوٹی داڑھی۔ اکثر جبہ پہنے دکھائی دیتے تھے۔ سر عبدالقادر کی طرح لہجہ ان کا بھی بہت صاف تھا۔ ان کی زبان اور قلم دونوں سے آگ برستی تھی۔ بڑے نڈر اور متوکل آدمی تھے۔ جیل جانے سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ بار بار ضمانتیں ضبط ہوتی تھیں۔ لاکھوں روپے کا خسارہ اُٹھایا مگر اپنی روش نہیں بدلی۔ لاہور کے جتنے اردو اخباروں کے ایڈیٹر تھے تقریباً سبھی مولانا کی شاگردی کر چکے تھے۔ مولانا بڑے مذہبی خیال کے آدمی بھی تھے۔ سبحان اللہ! کیسی نعت کہی ہے کہ آج بھی ہم سب کے وردِ زباں ہے۔ ؎

"وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں"

ایک طرحی مشاعرے میں ڈاکٹر تاثیر نے اچانک مولانا کے نام کا اعلان کر دیا۔ مولانا نہایت اطمینان سے اسٹیج پر گئے۔ جیب میں سے کاغذ نکال کر غزل سُنانے لگے۔ حسبِ دستور مولانا کو ہر ہر شعر پر داد ملی۔ اُس وقت تاثیر اور اُن کے رفقا کے چہرے دیکھنے کے لائق تھے۔ منہ کھلے ہوئے، آنکھیں پھٹی ہوئیں، حیرت سے مولانا کو تک رہے تھے۔ غزل پڑھ کر مولانا اسٹیج سے نیچے اُتر آئے۔ اُن کے ہاتھ میں کورا کاغذ تھا۔

مولوی ممتاز علی عورتوں کا ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" شائع کرتے تھے۔ ریلوے روڈ پر رہتے تھے۔ میرے علاوہ ان کے مضمون نگار بھی تھے اور دوست بھی۔ والد ہی کے ساتھ میں نے مولوی صاحب کو تقریباً چالیس سال پہلے دیکھا تھا۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ زنانہ اخبار اور بچوں کا اخبار "پھول" دونوں خوب چلتے تھے۔ جو رزن

اور بچوں کے لیے بے شمار کتابیں چھاپی تھیں۔ تعلیم نسواں کے سلسلے میں مولوی صاحب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی دفتر میں ان کے بڑے صاحبزادے سید حمید علی اور چھوٹے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج کو دیکھا۔ حمید علی صاحب کا دماغ کاروبار میں خوب چلتا تھا۔ سارے کام کو انھوں ہی نے سنبھال رکھا تھا۔ ایک پاؤں میں کبھی بچپن میں ناسور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے پیر میں نقص آ گیا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا شبلی کچھ دنوں کے لیے لاہور تشریف لائے تھے تو حمید علی تو ٹانگ کی شدید تکلیف میں مبتلا دیکھ کر مولوی صاحب کو نہایت خلوص سے مشورہ دے گئے تھے کہ تم اس لڑکے کو گولی مار دو۔ خدا کی شان کہ آج جتنی لہر بہر دکھائی دے رہی ہے سب اسی لڑکے کی بدولت ہے۔ دوسرے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج کو مضامین لکھنے کا شوق تھا اور انھوں نے ایک ماہوار رسالہ "کہکشاں" بھی نکالا تھا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ انھی کے جگری دوست سید احمد شاہ بخاری کو دیکھا جن کو ان کے ایک استاد نے پیار سے پطرس کا نام دیا تھا۔ یہ ایک بانکا اجلے رنگ کا خوبصورت جوان تھا جو ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتا رہتا تھا اور انگریزی بہت اچھی بولتا تھا۔ تاج اور پطرس ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ گورنمنٹ کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ تاج کو ڈرامے سے خاص شغف تھا۔ آگے چل کر انھوں نے "انارکلی" کا ڈرامہ لکھا جو ہمارے ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے دفتر میں عبدالمجید سالک، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت نے ایڈیٹری کی تربیت پائی۔ حفیظ جالندھری کو بھی اسی دفتر میں اکثر دیکھا۔ لاہور آنے کے بعد ہی ان سب کا ذوقِ ادب پروان چڑھا۔ لاہور کی فضا شعر و ادب سے رچی ہوئی تھی۔ حفیظ کے گیتوں نے اس فضا میں اور رس گھولا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور کئی نئے شاعروں نے بھی گیت لکھنے شروع کر دیئے۔ حفیظ کے گیتوں اور ترنم نے لاہور کو نغمہ زار بنا دیا۔ لاہور کے بعض منچلوں نے اس میں اتنا غلو کیا کہ مشاعروں میں باقاعدہ ہارمونیم اور طبلے کے ساتھ اپنی غزلیں سنانی شروع کر دیں۔ بڑی زندہ دلی تھی اُن دنوں لاہور میں۔

نوجوان شاعروں میں اختر شیرانی اُبھر رہے تھے۔ انھیں نثر لکھنے کا بھی شوق تھا مگر اُس زمانے میں ایک خاص قسم کی شاعرانہ نثر لکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ لغویت ٹیگور کی نظموں کے ترجمے سے پھیلی تھی۔ نیاز فتحپوری اور ان کے گروپ (جنھوں نے اپنا نام "یارانِ نجد" رکھ لیا تھا) اِس نثر کو خوب اُچھالا۔ انھیں بہکانے میں آسکر وائلڈ کی نثر میں نظمیں بھی شامل تھیں۔ خلیفی دہلوی بھی اسی گروپ کے ادیب تھے اور اختر شیرانی کے ممدوح۔ جب اختر شیرانی نے بہارستان اور خیالستان اور رومان جیسے رسالے نکالنے شروع کئے تو اُن میں بیشتر اسی نثر کے نمونے ہوتے تھے۔ خیر یہ نثر تو ایک نقلی چیز تھی اس لیے اپنی موت آپ ہی مر گئی مگر اختر شیرانی کی شاعری بڑی جان دار تھی اور اس میں ایک نیا پن بھی تھا۔ تقریباً پندرہ سال تک اختر نے دادِ شعر دی۔ اس عرصہ میں شراب خوری کی عادت بتدریج بڑھتی گئی اور صحت گرتی گئی۔ اختر کی شاعری ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ گمنامی میں گزرا، اس کے بعد اُن کی سناؤنی ہی سننے میں آئی۔ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا، شراب نے اسے کھا لیا۔

باہر سے آ کر لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنانے والوں میں مولوی ممتاز علی کے بعد سب سے نمایاں شخصیت مولانا تاجور نجیب آبادی کی تھی۔ مولانا لاہور کے دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے۔ چند سال پہلے مخزن کی ادارت کر چکے تھے۔ لاہور میں انھوں نے "اردو مرکز" قائم کیا تھا جس میں کام کرنے کے لیے انھوں نے چند مشہور شعرا کو بلا لیا تھا۔ اس ادارہ سے چند کتابیں شائع بھی ہوئیں مگر یہ ادارہ کچھ چلا نہیں۔ بچوں کے لیے ایک رسالہ "پیام" [illegible] عجیب بات ہے کہ اتنے وسیع تجربہ اور قابلیت

سکے اور جو کوئی پرچہ کامیابی سے نہیں چلا سکے۔ مولانا کچھ ضرورت سے زیادہ اپنے رفقا پر اعتماد کرنے لگتے تھے، اور وہ رفقا انہیں ہمیشہ چرکا دے جاتے تھے۔ "ادبی دنیا" کے ادارے میں ایک صاحب میلارام وفا تھے۔ یہ طوطا رام بے وفا ثابت ہوئے، اور یوں آپ کا نام بھی پڑ گیا تھا۔ مولانا نے دوستوں کی وجہ سے بہت نقصان اٹھائے۔ بعض مقامی شعرا نے باقاعدہ ان کے خلاف محاذ بنا لیا تھا مگر شاباش ہے ان کی ہمت کو لاہور ہی میں ڈٹے رہے اور چومکھی لڑتے رہے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد تھے جو ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ مولانا کو علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں حکومت نے شمس العلما کا خطاب دیا تھا۔ بھاری بھرکم اور گول مٹول سے آدمی تھے۔ گفتگو بہت اچھی کرتے تھے۔ سنا ہے کہ استاد بھی اچھے تھے۔ دو جوان لڑکوں کی موت نے مولانا کا دھڑ توڑ دیا تھا۔ پھر خود بھی زیادہ نہیں جیئے۔ اچھے اور قابل استادوں میں اس وقت اورینٹل کالج میں اولاد علی شاداں تھے، جن کے شاگرد استاد کی نسبت سے "شادانی" کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ لگانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی تھے جنھوں نے کتاب "پنجاب میں اردو" لکھی اور شعر العجم کے بخیئے ادھیڑے۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علامہ عبداللہ یوسف علی تھے جو اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے قرآن شریف کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ اسی اسلامیہ کالج میں خواجہ دل محمد بھی تھے جو حسابیات کے پروفیسر تھے مگر بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ پطرس اور تاثیر بہت بعد میں آئے۔ ان دونوں میں دوستی بھی تھی اور لاگ ڈانٹ بھی۔ مقابل دونوں تھے اور دونوں انگریزی ادب کے فاضل تھے، اور دونوں معلم تھے۔ لہٰذا ان کا ایک دوسرے سے کھٹکنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بظاہر اچھی طرح ملتے تھے مگر بباطن ایک دوسرے سے کاوش رکھتے تھے۔

لاہور کے ادبی رسالوں میں ایک رسالہ تھا "شباب اردو"۔ اس کے ایڈیٹر تھے خان احمد حسین خان مگر رسالے کے ٹائیٹل ہی پر کوئی ایک درجن وکیلوں کے نام بطور ادارہ چھپتے تھے۔ رسالے کا آغاز خان احمد حسین خاں کی نظم سے ہوتا تھا اور خان احمد حسین خاں کے افسانے پر اختتام ہوتا تھا۔ اس رسالے کا کوئی معیار نہیں تھا۔ سب ہر قسم کے مضامین اس میں چھپتے تھے۔ تین چار سال تک تو یہ پرچہ شائع ہوتا رہا مگر جب لاہور سے ہمایوں اور نیرنگ خیال اور عالمگیر شائع ہونے لگے تو "شباب اردو" معدوم ہو گیا۔ ہمایوں بڑے شستہ مذاق کا ماہنامہ تھا جسے میاں بشیر احمد نے اپنے والد مرحوم جسٹس شاہ دین کی بطور یادگار شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ابتدا میں میاں بشیر احمد اور تاجور نجیب آبادی اس کے ادارہ میں شامل تھے۔ تاجور کی علیحدگی کے بعد منصور احمد اور حامد علی خاں کے نام چھپنے لگے۔ منصور احمد نے بعد میں تاجور سے "ادبی دنیا" لے لیا تھا مگر منصور احمد کی جواں مرگی نے ادبی دنیا کو ایک اچھے ادیب سے محروم کر دیا۔ حامد علی خاں جب تک ہمایوں کے ایڈیٹر رہے ہمایوں کی تمام خوبیاں قائم رہیں۔ ان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد ہمایوں کو بعد کے ایڈیٹر نہ سنبھال سکے۔ پرچہ برابر شائع ہوتا رہا مگر اپنی روایتی نفاست کھو بیٹھا۔ میاں بشیر احمد اپنی علالتِ مزاج کی وجہ سے توجہ نہ دے سکے، پرچے کا زوال شروع ہو گیا۔ کیا ٹھکانا ہے اس احتیاط کا کہ ہمایوں میں لفظ بوسہ نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کس قدر ثقہ پرچہ تھا۔ عظیم بیگ چغتائی کا مشہور مضمون "کولتار" ہمایوں میں نہیں چھپ سکا۔ "الشذری" اور ایک آدھ اور مضمون ہی ہمایوں میں جگہ پا سکا۔ اس کے خاص لکھنے والے "فلک پیما" تھے جن کا سنجیدہ مزاج واقعی ایک خاصہ کی چیز ہوتا تھا۔ شاعروں میں آزاد انصاری، جوش اور اثر صہبائی بالالتزام ہر اشاعت میں شریک ہوتے تھے۔ میاں بشیر احمد کی نثر و نظم صرف ہمایوں ہی میں دیکھنے میں آتی تھی۔

"نیرنگِ خیال" ایسا نکلا کہ اس نے ہمارے ادبی رسالوں کی روش ہی بدل ڈالی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے ایک نئی بات یہ کی کہ پرچے کی ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ "نیرنگِ خیال" سے پہلے رسالوں کے ٹائیٹل بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے۔ رسالے کا نام اور ایڈیٹر کا نام، بس۔ حکیم صاحب نے طرح طرح کے ڈیزائن بنوا کر کئی کئی رنگ میں بلاک کی چھپائی شروع کی۔ مضامین لکھنے کے لیے انھیں لاہور کے چند اچھے لکھنے والے مستقل مل گئے تھے۔ یہی حضرات بعد میں "نیا زمندانِ لاہور" بن گئے تھے۔ سالک، امتیاز، پطرس، اور ہری چند اختر، تاثیر اور راجم علم کے مضامین نے "نیرنگ خیال" کو ایک دم سے اُچھال دیا۔ جب اس کی ساکھ بن گئی تو ہندوستان کے تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی "نیرنگِ خیال" میں آنے لگے۔ دوسری تبدیلی حکیم صاحب نے یہ کی کہ "نیرنگِ خیال" کا سائز عام رسالوں سے بڑا کر دیا۔ تیسری اور سب سے بڑی تبدیلی جسے انقلاب کہنا چاہیئے، یہ کی کہ "نیرنگِ خیال" کے خاص نمبر اور سالنامے شائع کرنے شروع کر دیئے۔ انہی کی دیکھا دیکھی دوسرے رسالوں نے بھی خاص نمبر چھاپنے شروع کر دیئے۔ عام روش سے بچنے کے لیے حکیم صاحب نے "نیرنگ خیال" کے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اُن کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا بھی نکلا تھا۔ آسکر وائلڈ کی تمثیل "سلومی" کا ترجمہ، ڈاکٹر تاثیر کا کیا ہوا اسی خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ان کے ہر خاص نمبر میں ایک نہ ایک معرکہ کا مضمون ضرور شائع ہوتا تھا۔ مثلاً ایک میں شوکت تھانوی کا مضمون "سودیشی ریل" چھپا۔ دوسرے میں عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" اور تیسرے میں قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط"۔ ان مضامین کی اشاعت سے "نیرنگِ خیال" کی شہرت ہوئی اور "نیرنگِ خیال" کے ذریعہ ان مضمون نگاروں کو شہرت ملی۔ حکیم یوسف حسن صاحب کو ہماری برادری میں مجتہد کا درجہ حاصل ہے۔ مگر افسوس کہ ادب کے اتنے بڑے خدمتگزار اور محسن کو زمانے کی گردشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں محو کر دیا اور ناقدری نے اس عالمِ ضعیفی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مگر اس ناداری میں بھی جتنا کچھ کے حکیم صاحب "نیرنگِ خیال" شائع کر رہے ہیں۔ یہ اُنہی کی ہمت ہے ورنہ ہمایوں جیسے پرچے بھی دم توڑ چکے۔ "عالمگیر" اپنے ایڈیٹر حافظ محمد عالم کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ "ادبی دنیا" بھی کئی جھٹکے کھا چکا ہے مگر مولانا صلاح الدین احمد کی ناخدائی نے اسے بچا رکھا ہے۔

لاہور کے زندہ دلوں میں حکیم فقیر محمد چشتی ایک خاص مرتبہ کے بزرگ تھے۔ بارود خانہ میں میں نے انھیں چند بار دیکھا ہے اور ایک دفعہ ایم۔ اسلم صاحب نے، جن کی حویلی بارود خانہ ہی میں ہے، حکیم صاحب سے مجھے ملوایا بھی تھا۔ حکیم صاحب دلّی کے خاندانِ شریفی کے تربیت یافتہ تھے۔ طبیب تو وہ اچھے تھے ہی، اور کئی علوم میں بھی انھیں درک تھا۔ مثلاً خطاطی میں، ادب شعر سے بھی انھیں مناسبت طبعی تھی۔ قد آور اور جسیم شخیم آدمی تھے۔ گفتگو عالمانہ کرتے تھے مگر ظرافت اُبلی پڑتی تھی۔ پھبتی کسنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آغا حشر پر "بنارس کا لنگڑا" کی پھبتی حکیم صاحب ہی نے کسی تھی۔ عبدالمجید سالک سے ان کی اچھی گھٹتی تھی۔ سالک صاحب بھی لطیفہ باز اور ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ اپنے اخبار "انقلاب" کا مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" روزانہ لکھتے تھے۔

حکیم صاحب اور سالک صاحب کے ساتھ آغا حشر کاشمیری یاد آ گئے۔ فلم سازی کا مرکز بھی لاہور ہی تھا۔ کوئی تیس برس اُدھر آغا صاحب اپنا فلم بنانے لاہور آ گئے تھے۔ یہیں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ آغا صاحب اگر کسی سے ڈرتے تھے

تو اپنے بیٹروں سے۔ ایم اسلم صاحب کے ساتھ جب میں اُن سے ملنے گیا تو پہرا اندر پہنچتے ہی آغا صاحب باہر نکل آئے اور بڑے تپاک کے ساتھ اندر لے گئے۔ آغا صاحب اپنی تصویر سے بالکل مختلف تھے۔ کہولت نے ان کی صورت شکل بھیانک کر دی تھی۔ آواز میں بڑا کڑاکا تھا۔ سبز چوخانے کا ریشمی تہمد باندھے ہوئے تھے۔ فوراً اپنے ملازم کو آواز دی۔ اُنہی کا ہم عمر ملازم آگیا۔ اُس سے چائے لانے کو کہا۔ وہ پلٹا تو اُس سے پوچھا" بیگم صاحب" کیا کر رہی ہیں؟ اُس نے بتایا کہ سو رہی ہیں۔ پچاس برس پہلے اُس پر اور دو دو گالیاں نسا مٹی ہیں کہ مزہ آگیا۔ وہ غریب چپکا کھڑا سنتا رہا۔ آغا صاحب کو جلال چڑھا ہوا تھا۔ گرجتے برستے رہے۔

اتنے میں بیگم صاحب آگئیں۔ یہ مختار بیگم تھیں جنھیں ہم ایک فلم میں دیکھ چکے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی آغا صاحب ایک دم سے موم ہو گئے۔ ہمارا تعارف کرایا۔ تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ مختار بیگم نے چائے بنائی اور چائے پینے کے بعد وہاں سے چل گئیں۔ آغا صاحب نے نوکر کو آواز دی اور اُس سے الماری کھلوا کر تھی کی تھی مسودوں کی نکلوا کر اپنے سامنے میز پر رکھی۔

یہ اُن کے ڈراموں کے مسودے تھے جو اُن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے" میں نے اُس وقت ڈرامے لکھنے شروع کیے جب ڈراموں میں لکھا جاتا تھا، چل میری پیاری، ریل کی سواری"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے کئی ڈراموں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ سبحان اللہ! کیا عبارت تھی اور کیا انداز تھا پڑھنے کا۔ پھر غالباً" بھیشم پرتگیا" کا کچھ حصّہ سنایا۔ یہ ڈرامہ بھی ثقیل ہندی میں لکھا ہوا تھا مگر تحریر اُردو کی تھی۔ آغا صاحب نے پڑھنا ختم کر کے کہا" مجھ پر ایک صاحب نے دعویٰ عدالت میں کر دیا ہے کہ مجھے نہ تو انگریزی آتی ہے اور نہ ہندی۔ بھلا بتائیے جو شخص ایسے ڈرامے لکھتا ہو اُس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟"

میں نے کہا" یہی کہا جائے گا کہ نہایت دقیق ہندی جانتا ہے"۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ایک صاحب آغا صاحب سے ملنے گئے۔ آغا صاحب کسی قدر رُکھائی سے پیش آئے۔ اُن صاحب کے باپ کا ایک پریس تھا جس میں اُردو کے کئی اخبار چھپتے تھے۔ اُنھوں نے آغا صاحب کی رُکھائی کا بدلہ یوں لیا کہ کسی ایک اخبار میں آغا صاحب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ آغا صاحب نہ تو جتنی انگریزی جاننی چاہیے (شیکسپیر وغیرہ کے ترجمے کرنے کے لیے) جانتے تھے اور نہ ہندی رسم الخط پڑھ سکتے تھے۔

تھوڑی بہت ہندی تو ہر اُردو جاننے والا سُن کر سمجھ لیتا ہے۔ آغا صاحب کچھ زیادہ ادق ہندی بھی سمجھ لیتے تھے۔ تھے نہایت ذہین آدمی، اُردو رسم الخط میں ہندی بھی ایسی لکھی کہ ہندی لیکھکوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ جب ان کے خلاف اخبار میں لکھا گیا تو یار لوگوں کو دل لگی سوجھی۔ آغا صاحب کو مشورہ دیا کہ لکھنے والے پر دعویٰ کر دیجیے۔ اگر آپ خاموش رہے تو آپ کی ساری نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔ آغا صاحب نے بھرّے میں آکر دعویٰ کر دیا۔ اُس نے بھی جوابی دعویٰ کر دیا۔

ایک آدھ پیشی پر آغا صاحب گئے تو حریف نے ان کے آگے ہیملٹ رکھ دیا کہ کہیں سے بھی اس کی چند سطریں پڑھ دیں پھر ہندی کی کوئی کتاب پیش کی کہ اس میں سے کچھ پڑھ دیجیے۔ عدالت آغا صاحب کو جانتی تھی کہ ایک معزز اور نامور ہستی ہیں اور عدالت میں اُنھیں محض اس لیے کھینچا گیا ہے کہ اُنھیں بدنام و رُسوا کیا جائے۔ لہٰذا پہلی پیشی کے بعد آغا صاحب کے ساتھ جو احباب گئے تھے اُن سے کہا کہ فریقین کی صلح صفائی کرا کے راضی نامہ داخل کرا دیں۔ یار لوگوں نے اپنی ہی دل لگی کو کافی سمجھا اور بیچ میں پڑ کر مقدمہ ختم کرا دیا۔ دلوں اس ندان کا چرچا رہا مگر حشر کو معلوم نہیں ہوا کہ یہ حرکت ان کے دوستوں ہی کی تھی۔ جبھی تو کسی نے کہا ہے" مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔

ڈرامہ لکھنے کا شوق لاہور کے دو ادیبوں کو تھا۔ ایک حکیم احمد شجاع دوسرے سید امتیاز علی تاج۔ حکیم صاحب نے دو ایک فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھ کر ادب سے قطع تعلق کر لیا۔ سید صاحب کو ریڈیو اور فلموں نے ایسا گھیرا کہ "انارکلی" کے بعد کوئی بڑا ڈرامہ نہیں لکھ سکے۔ ہمارے بعض بہت اچھے ادیبوں کو نوکریاں کھا گئیں۔ بعد میں چند مضامین لکھنے کے بعد جب تک جیتے یہی سوچتے رہے کہ کوئی بڑا ادبی کام کریں گے۔ بڑے بڑے سرکاری عہدوں کے چکر میں پڑ جانے کے بعد ادب، اور وہ بھی بچارے اُردو ادب کو کون پوچھتا ہے؟ تاثیر بھی تمام عمر اعلیٰ ادبی صلاحیت کے باوجود کچھ نہیں کر گئے۔ چراغ حسن حسرت اگر پیسے کے پیچھے نہ بھاگتے تو شاید کچھ کام کر جاتے۔ اب تو یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا ان حضرات کو ادب کی سچی لگن تھی؟ یا انھوں نے ادب کو محض ایک ذریعہ بنایا حصولِ ملازمت اور حصولِ زر کا؟ کیا جواب دیا جائے۔ ع

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

لاہور ادیبوں کا استھان اور ادب کی کان تھا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ادیب و شاعر اس شہر میں بستے تھے۔ اُردو کے سب سے زیادہ اخبار اور رسالے اور کتابیں اسی شہر میں چھپ کر سارے ہندوستان میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی جاتی تھیں۔ ہندو اور سکھ بھی اُردو میں لکھنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اُردو میں اخبارات نکالتے تھے۔ ان کے دو بڑے اخبار "ملاپ" اور "پرتاپ" یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی اُردو ہی میں اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ اُردو سے اہلِ پنجاب کو بڑی محبت تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ اہلِ پنجاب ہی نے اُردو کو اپنا کر بچا لیا ورنہ ہندی کی تاخت کیا اسے جینے دیتی؟ لاہور کے پبلشروں کی خدمات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ لاہور کا چھپا ہوا پورا قرآن شریف آٹھ آنے میں ہدیہ ہوتا تھا۔

اُس زمانے میں لاہور میں وہی تمام بازار تھے جو اب ہیں، ہاں چور بازار نہیں تھا۔ ہر چیز اچھی اور سستی ملتی تھی۔ آٹا اٹھارہ سیر روپیہ کا۔ گھی ایک روپیہ سیر۔ دودھ دو آنے اور دہی تین آنے سیر۔ گوشت چار آنے سیر۔ ہری چھال کا کیلا ایک آنہ درجن۔ لٹھا ڈی ون کا پانچ آنے گز۔ ململ باریک چھ آنے گز۔ شکر روپے کی ساڑھے چار سیر۔ سائیکل بیس روپے کی۔ لائف بوائے صابن چھ پیسے اور سن لائٹ پانچ پیسے کا۔ کپڑے دھونے کا صابن روپے کا چھ سیر۔ اخباری کاغذ جو تیس روپے ریم تک چور بازار میں بک چکا ہے دو روپے ریم اور عمدہ سفید کاغذ جو آجکل ۲۷-۲۸ روپے ریم مل رہا ہے چار روپے چھ آنے ریم بکتا تھا۔ کہاں تک بھاؤ گنائے جائیں بیس سال میں قیمتیں چھ گنی سے دس گنی تک ہو گئی ہیں اور پھر اچھی چیز نہیں ملتی۔

لاہور میں اب بھی وہی رونق ہے۔ لاہور اب بھی ہماری ثقافت کا مرکز ہے۔ لاہور میں اب بلند قامت اہلِ ہنر نہیں ہیں، کہیں بھی نہیں ہیں۔ مگر مجھے جو خلوص لاہور میں ملتا ہے کسی اور شہر میں نہیں ملتا۔ جو اپنائیت لاہور میں دکھائی دیتی ہے کہیں اور نہیں دکھائی دیتی۔ چودہ سال کے بعد ایک ثقافتی وفد میں میں دلی گیا تھا۔ بیس بیس میل تک دلی پھیل گئی ہے مگر مجھے دلی کہیں نہیں ملی۔ دلی میں میرا دم گھٹنے لگا۔ جب لاہور واپس پہنچا تب یہ گھٹن دور ہوئی۔ اس شہر کی آغوش باہر سے آنے والوں کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ میرے بڑوں کو اس شہر نے گلے لگایا۔ میری بہترین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔

لاہور زندہ باد

ادھوری داستان

نیاز فتحپوری

میں یو۔پی میں پیدا ہوا، یہیں میرا نشو و نما ہوا۔ یہیں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن زندگی جس چیز سے عبارت ہے، اس کا احساس سب سے پہلے پنجاب ہی میں ہوا ——— کس قدر عجیب بات ہے!

طفیل صاحب مجھ سے ان تاثرات کی تفصیل چاہتے ہیں جن کا تعلق صرف لاہور سے ہے، اس لیے داستان ذرا مختصر ہو گئی ورنہ سوال پورے پنجاب کا ہوتا تو بات زیادہ بڑھ جاتی گو دلچسپ رہتی، کیونکہ رؤیائے شباب، وہ خواب جسے میں نے اوّل اوّل لکھنؤ میں دیکھا تھا اس کی تعبیر مجھے پنجاب ہی میں ملی۔

اللہ، اللہ، وہ سرزمین رومانس کے ہدایائے حسن و شباب، وہ دوشیزگان اسکنرز (SKINNER) کی جلوہ سامانیاں کہ

جامہ گلگوں می شود بر پیکرش از رنگ خویش

اب بھی جب یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔

دراں مقام کہ سرِ تو ز دل گذشت ہنوز
گہے کہ میگذرد اشکبار می گذرد

لیکن سوال لاہور کا ہے اس لیے کسی اور ذکر یہاں مناسب نہیں۔ لاہور میں میرا قیام ایک بار چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ اس لیے میرا ذاتی تجربہ لاہور اور لاہوریات کے متعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم فرمائش طفیل صاحب کی ہے اس لیے امتثالِ امر ضروری ہے۔

اب سے پورے پچاس سال پہلے کی بات ہے ——— اُس زندگی کی نہیں جو ختم ہو چکی اور جسے اب پلٹ کر آنا نہیں، بلکہ اس زندگی کی جو نصف صدی قبل لاہور میں شروع ہوئی تھی اور اب تک بلائے جان بنی ہوئی ہے۔ یعنی سلسلۂ نوشت و خواند کہ اس کا آغاز لاہور ہی ہوا اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے منشی محبوب عالم کے "انتخاب درجواب" میں میرے مزخرفات کی اشاعت شروع ہوئی اور عرصہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ میرا قیام اس وقت ریاست ٹونک میں تھا۔

۱۹۰۹ء میں میں ایک زبردست معاشی انقلاب سے دوچار ہوا، وطن چلا آیا اور الہلال و زمیندار میں میرے افکار نظم و نثر شائع ہونے لگے۔ جب ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا دردناک واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی طرف سے مجسٹریٹ کانپور کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اُس کی پیروی مسٹر مظہر الحق، سر سلیمان اور خواجہ عبدالمجید کے سپرد ہوئی اور مولانا ظفر علی خاں نے مجھے نمائندہ زمیندار مقرر کر کے ہدایت کی کہ مقدمہ کی کارروائی روز کے روز ذریعہ تار انھیں بھیجتا رہوں۔ اس سے قبل جنگ بلقان کے سلسلہ میں میرا ایک طویل مضمون زمیندار میں اور ایک نظم الہلال میں شائع ہو چکی تھی اور اسی تعارف کی بنا پر مولانا ظفر علی خاں نے مجھے ادارۂ زمیندار میں کام کرنے کے لیے بلا لیا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مولانا وحید الدین سلیم مجھ سے پہلے لاہور پہنچ گئے تھے یا میرے بعد[1]۔ بہرحال وہ اور میں دونوں ادارۂ زمیندار میں یکجا ہو گئے۔ مولانا وجاہت جھنجھانوی

---

[1] مسلم گزٹ لکھنؤ جو مولانا سلیم کی ادارت میں نکلتا تھا بند ہو چکا تھا۔

پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ بلقان کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان برپا تھا اور زمیندار نے ترکی افواج کی اعانت کے لیے بلقان فنڈ کھول رکھا تھا۔ یہ زمانہ زمیندار کے انتہائی عروج کا تھا۔ تیس ہزار کے قریب اس کی اشاعت تھی اور چاروں طرف سے روپیہ کی بارش ہو رہی تھی۔

اس وقت زمیندار کا دفتر بڑے ہنگامہ کی جگہ تھی اور مولانا سلیم کے ساتھ میں بھی اس ہنگامہ میں شامل ہو گیا لیکن فرق یہ تھا کہ مولانا سلیم ایک تجربہ کار صحافی ہونے کی حیثیت سے جو کچھ لکھتے تھے بہت ٹھنڈے دل سے لکھتے تھے اور میں جو کچھ لکھتا تھا اس میں نئے خون کا جوش و ولولہ بھی شامل تھا اور یہ مولانا ظفر علی خاں کو زیادہ پسند آتا تھا۔

میرا قیام وہاں ایک ایسی عمارت میں تھا جو بورڈنگ کی حیثیت رکھتی تھی اور میرے علاوہ چند نوجوان طلبہ بھی وہاں رہتے تھے۔ مولانا سلیم کا قیام کسی اور جگہ تھا۔

میں بہت صبح دفتر پہنچ جاتا، دوپہر کو جائے قیام پر واپس آ کر کھانا کھاتا، سہ پہر کو پھر چلا جاتا اور شام تک وہیں رہتا اس لیے بڑھی ہوئی مصروفیت کے پیش نظر مجھے لاہور دیکھنے کا بہت کم وقت ملا۔ جب کبھی فرصت ہوتی تو نہر کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا اور مردوں، عورتوں اور بچوں کو وہاں آزادی سے نہاتے ہوئے دیکھ کر ان کی آزادی و بے حجابی پر حیرت بھی کرتا اور اس سے لطف بھی اٹھاتا۔

افسوس ہے کہ اپنی فطری عزلت پسندی اور مصروفیت کار کی وجہ سے میں یہاں کے اکابر علم و ادب سے نہ مل سکا۔ ڈاکٹر اقبال کے یہاں البتہ ایک دو بار حاضری دی، لیکن ان سے ملنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ اقبال کو صرف پڑھنا چاہیے ان سے ملنا ضروری نہیں۔

چند ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مولانا ظفر علی خاں مجھ سے کچھ کشیدہ سے رہتے ہیں (جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ کسی نے ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں حکومت کا آدمی ہوں) لیکن اس کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سلیم اور میں دونوں وہاں سے چلے آئے۔ مولانا سلیم غالباً اپنے وطن چلے گئے اور مجھے مرزا آغا بیگ (جو اس وقت لاہور آئے ہوئے تھے) اپنے ساتھ ہانسی لے گئے۔

اس کے بائیس سال بعد جب ۱۹۳۵ء میں میں لکھنؤ سے پشاور گیا تو لاہور اسٹیشن پر اختر شیرانی، مولانا مہر اور رفیق اجمیری تشریف لائے اور وہیں ان سے سرسری ملاقات ہو گئی۔ پشاور سے لوٹتے ہوئے البتہ میں دو دن کے لیے ٹھہر گیا اور اختر شیرانی کا مہمان رہا۔ دسمبر کا زمانہ تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی اس لیے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی اور یہاں کے اکابر و مشاہیر سے تبادلۂ خیال کا موقع نہ مل سکا۔

یہ ہے مختصر سی روئیداد میری واقفیتِ لاہور کی جس کو نہ ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت تھی اور نہ شائع کرنے کی۔ لیکن اگر میں اس بنا پر کچھ لکھنے سے انکار کر دیتا تو غالباً طفیل صاحب اسے نہ مانتے اس لیے ان چند سطروں کی حیثیت امتثالِ امر سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر وہ پورے پنجاب کو اس موضوع میں شامل کر دیتے اور لاہور کی تخصیص نہ ہوتی

تو البتہ یہ داستان بڑی دلچسپ ہوتی۔

جنتِ دیگر

شوکت تھانوی

اگر آپ مجھ کو آئینہ دکھانے کی کوشش نہ کریں اور "یہ منہ اور مسور کی دال" کی قسم کے طعنے نہ دیں تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ میں اور ملکہ نورجہاں میں ایک عجیب و غریب قسم کی مماثلت موجود ہے۔ میں آپ سے پھر ایک مرتبہ یہ عرض کروں گا کہ اس موقع پر اگر آپ میری جگہ ہوتے اور میں آپ کی جگہ تو اس قسم کے دعوے کے سلسلہ میں یہ مصرع میں خود بھی پڑھتا کہ۔ ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

مگر آپ یہ مصرع پڑھنے سے پہلے براہ کرم یہ یقین کر لیں کہ میں ملکۂ نورجہاں کے حسن اور مرتبہ وغیرہ کے سلسلہ میں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مماثلت صرف یہ ہے کہ گشتۂ لاہور وہ بھی تھیں اللہ بخشے اور میں بھی لاہور ہی کا دم بھر رہا ہوں اور اس وقت سے لاہور کا عشق مجھ پر طاری ہے جب اگر سچ پوچھئے تو میں لاہور کا نادیدہ عاشق تھا۔ ملکۂ نورجہاں نے تو لاہور کے متعلق صرف یہی کہا ہے کہ ؎

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم

مگر میں اس سے بہتر شعر لاہور کی شان میں کہنے کی کوشش کرنے کے لیے زندگی کی مہلتیں حاصل کرتا چلا جا رہا ہوں اور انشاء اللہ اس وقت تک نہ مرونگا جب تک اس سے بہتر شعر لاہور کی شان میں نہ کہہ لوں۔ امید ہے کہ اس بہانے مجھ کو عمرِ خضر حاصل ہو کر رہے گی یعنی "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی" نہ اس سے بہتر شعر کہہ سکونگا نہ مرونگا۔

لاہور سے یہ نادیدہ عشق مجھ کو اس وقت سے ہے جب میں نے اردو ٹٹولنا شروع کر دی تھی اور میرے نام اخبار پھول جاری کرا دیا گیا تھا جو لاہور سے نکلتا تھا۔ اس اخبار پھول کے علاوہ ابا جان کے نام ایک رسالہ بھی آتا تھا مخزن۔ وہ بھی لاہور ہی سے نکلتا تھا۔ امی جان کے نام ایک اخبار آتا تھا تہذیب نسواں وہ بھی لاہور ہی سے نکلتا تھا لہٰذا میں بچپن ہی سے غائب العرفین لاہور پرست چلا آ رہا ہوں اور بچپن ہی سے لاہور دیکھنے کی تمنا میرے دل میں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ سمندِ شوق پہ ایک اور تازیانہ اس وقت ہوا جب میرے ایک خالہ زاد بھائی ڈاکٹری پاس کر کے گھر پہنچے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی لاہور ہی سے ڈاکٹری پاس کر کے آئے ہیں اور اس آؤبھگت کے مستحق ثابت ہوئے ہیں جو ان کی ہو رہی ہے لہٰذا میں نے اب قطعی طور پر طے کر لیا کہ اس دنیا میں اگر کوئی شہر ہے تو صرف لاہور ہے اور یہ میری سب سے بڑی تمنا بن گئی کہ کسی طرح میں ایک نظر لاہور کو دیکھ تو لوں کہ آخر یہ لاہور جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی۔ عمر کے ساتھ ہی ساتھ یہ تمنا بھی پروان چڑھتی رہی یہاں تک یہ پھول پڑھنے والا مخزن پڑھنے لگا۔ نیرنگِ خیال اور عالمگیر کے رسائل بھی اس کے نام آنے لگے جو سب کے سب لاہور ہی سے نکلتے تھے۔ عمر کی اس منزل پہ پہنچ کر میں نے اپنے اکثر ساتھیوں کو دیکھا جو کلتہ دن۔ کلکتہ اور بمبئی جانے کے ارمان میں بیٹھے گھلا کرتے تھے مگر مجھ کو ان میں سے کسی گاؤں کو دیکھنے کا شوق نہ تھا بلکہ تعجب ہوتا تھا ان لوگوں پر جو لاہور کو چھوڑ کر ان مقامات کی سیاحت کے پیچھے مرنے جاتے تھے میرے نزدیک ان تمام مقامات کا نام لاہور

سے مجھے ہوا آتا تھا اور میں سب سے پہلے لاہور دیکھنا اور لاہور جانا چاہتا تھا۔ میری یہ طلب صادق آخر کار ۱۹۲۸ء میں پوری ہوئی جب میری ایک عزیزہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کو ان کی سسرال پہنچا آؤں جو لاہور میں تھی۔ یہ سنتے ہی جی تو چاہا کہ میں ان کے قدموں پہ گر کر جان دے دوں یا کم سے کم اس شریف ترین خاتون کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر لاہور کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مگر میں نے بمشکل تمام جذبے کو دبائے رکھا البتہ خود اپنے کو شریک سفر بنانے کی افادیت پہ دن میں کئی کئی مرتبہ اس وقت تک روشنی ڈالتا رہا جب تک کہ اس سفر پہ روانہ نہیں ہوا کہ مبارک ہیں وہ جو میرے ساتھ سفر کرتے ہیں کہ میں ان کو ہر صعوبت سے محفوظ رکھتا ہوں پیاس لگنے سے پہلے ہی پانی لا کر دے دیتا ہوں۔ شریک سفر کو نیند آجائے تو اپنی جگہ بھی اس کے لیے خالی کر کے خود کونے میں کھڑا ہو کر سیٹی بجاتا رہتا ہوں۔ بستر کھولنے، بچھانے اور پھر باندھنے میں تو جو ملکہ مجھ کو حاصل ہے اس کا تو جواب ہی پیدا نہیں ہوا۔ قلیوں سے گفتگو کرنے کے جو آداب ہیں ان کا ہر ایک محرم نہیں ہوتا مگر یہ ڈھیلی چھتری والے کی دین ہے کہ اس نے مجھ کو یہ توفیق عطا کر رکھی ہے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنے والے اس زمانہ میں بہت کم لوگ مل سکتے ہیں مگر میں نے اس فن پر بڑا ریاض کیا ہے ورنہ یہ بات آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ رات کے بارہ بجے چوبیس کیوں بجتے ہیں۔ "آپ" کس کو کہتے ہیں اور "ڈاؤن" کیا بلا ہے۔ خطرے کی زنجیر بغیر پچاس روپیہ جرمانہ ادا کئے کس وقت کھینچی جاسکتی ہے اس کا امتیاز بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ع

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مختصر یہ کہ وہ محترمہ میرے ان تجربات سے بے حد متاثر ہوئیں اور انہوں نے طے کر لیا کہ مجھ سے بہتر شریک سفر ان کو فی زمانہ ذرا مشکل ہی سے مل سکتا ہے نتیجہ یہ کہ وہ میرے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئیں اور یہ واقعہ ہے کہ راستہ بھر میں نے بہت ہی ہوشمندی کا ثبوت دیا کہ ہر اسٹیشن کا نام ضرور پڑھ لیتا تھا تاکہ لاہور، شاہجہانپور، اور بریلی وغیرہ بن کر گذر نہ جائے اور ہم ٹرین میں بیٹھے ہی رہ جائیں بلکہ میں نے تو لاہور پہنچ کر بھی جب تک تین چار مستند قلیوں سے تصدیق نہیں کر لی اس وقت تک لاہور کے پلیٹ فارم پر قدم ہی نہ رکھا۔

لاہور پہنچ کر ان عزیزہ کو تو پہنچایا ان کی سسرال اور اب چونکہ ان کی خوشامد اور ناز برداری کی چنداں ضرورت نہ تھی لہٰذا ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ محترمہ میں ٹھہرا انشا پرداز آدمی یقین نہ آتا ہو تو وہ رسائل اٹھا کر دیکھیے جن میں میرے مضامین چھپ چکے ہیں لہٰذا میرا تو آپ کی سسرال کے اس غیر ادبی ماحول میں دم ہی نکل جائے گا میں اپنی جان سے زیادہ آپ کو بھی عزیزہ نہیں سمجھتا اور خود اپنے کسی ادبی دوست کے یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اور سیدھا پہنچا بارود خانہ میں جہاں میاں ایم اسلم رہتے تھے اور جن کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مجھ سے خط و کتابت کی رسم نباہ رہے تھے۔ میاں ایم اسلم کا مہمان بن کر اور وہاں اپنا ٹھکانا بنا کر اب مجھ کو لاہور کے قابل دید مقامات کے دیکھنے کا شوق ہوا چنانچہ سب سے پہلے جس تاریخی مقام پر میں پہنچا وہ تھا دارالاشاعت جہاں سے پھول اور تہذیب نسواں شائع ہوتے تھے اور جہاں میں سید امتیاز علی تاج کو دیکھنا چاہتا تھا جن کا نام بچپن سے سنتا اور پڑھتا چلا آرہا تھا۔ گول شیشوں کی عینک لگائے نہایت لکھنوی ٹھسے کا بیل دار باریک کرتہ اور چست بلکہ پنڈلیوں میں پیوست چوڑی دار پاجامہ اور پیروں میں کامدار سلیم شاہی جوتا پہنے ایک جوان رعنا سید امتیاز علی تاج کی حیثیت سے ملے اور ان کے قریب ہی ایک صاحب حلم پینے کے انداز سے سگریٹ پیتے نظر آئے جن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ چراغ تو خیر بجھا ہوا بھی ہو سکتا ہے

اور حسرت بھی ذرا سی کوشش سے انسان اپنے چہرے پر برسا سکتا ہے مگر اس پیکر میں مولانا ڈھونڈنا میرے لیے آسان نہ تھا مگر ظاہر ہے کہ سید امتیاز علی تاج نے غلط تھوڑی کہا ہوگا۔ اسی وقت ایک پکے پچ کے مولانا سر پر صافہ باندھے اپنی نورانی سفید داڑھی کے ساتھ جو داخل ہوئے تو سب کے ساتھ مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا معلوم ہوا کہ آپ ہیں شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ یہ نام بھی میرے لیے نیا نہ تھا اور اس نام سے جو عقیدت تھی اس کے اظہار کا بھی موقع تھا مگر سوائے نہایت عقیدت اور سعادت مندی سے مصافحہ کرنے کے میں زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد جب ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں اور مولانا چراغ حسن حسرت نے خود مجھ کو مولانا کہنا شروع کیا اور وہ بھی نہایت چبا چبا کر تو معلوم ہوا کہ میں بھی ایک قسم کا پھنسا ہوا مولانا ہوں اور اب بجائے ان کے مجھ کو نہ اپنے اندر چھپے ہوئے مولانا کی جستجو شروع ہوئی کہ اللہ اگر میں بھی مولانا ہو سکتا ہوں تو یہ مولانا آخر چیز کیا ہوتی ہے جس کا اپنے اندر خود مجھ کو آج تک احساس ہی نہیں ہوا۔ اس مختصر سی مجلس میں باتیں تو بہت سی ہوئیں مگر میں بے حد محتاط رہا کہ کہیں گفتگو میں املا کی کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں۔ اسی رات میاں ایم اسلم کے گھر رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر تاثیر سے بھی ملاقات ہوئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد محسوس یہ ہوا کہ جیسے ڈاکٹر تاثیر سے آج پہلی مرتبہ نہیں ملا ہوں بلکہ نہ جانے کب کے نہایت بے تکلف قسم کے مراسم ہیں۔ دوسرے دن سر شیخ عبدالقادر سے ملنے جا پہنچا جن سے ملنے کے لیے دو وجہ سے بے قرار تھا ایک یہ کہ ان کا مخزن پڑھ پڑھ کر بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک پہنچا تھا دوسرے یہ کہ وہ میرے تایا شیخ حبیب احمد صاحب کے نہایت دیرینہ اور قریبی دوست تھے۔ یہ مجلس ایک طرف سے شفقت اور دوسری طرف سے سعادت اور عقیدت ہی تک محدود رہی ادبی گفتگو میں ان سے خاک کرتا وہ مجھ سے میرے تایا کی باتیں کرتے رہے اور میں ان کے نیلے اپنے باپ کے بڑے بھائی سے متعارف ہوتا رہا۔ وہاں سے رخصت ہو کر جی چاہا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے اگر نہ ملا تو واپس میں کس منہ سے کہوں گا کہ میں لاہور گیا تھا۔ مگر اس بارگاہ میں جانے کی ہمت پیدا کرنا میرے لیے آسان نہ تھا نہ جانے کس طرح اپنے کو زبردستی کھینچتا ہوا وہاں تک پہنچا مگر دروازے پر پہنچ کر دل نے دھڑک کر کہا کہ "ایاز قدر خود شناسی" جی چاہا کہ بھاگ کھڑا ہوں۔ بس جہاں تک پہنچنے کے قابل تھا پہنچ چکا زیادہ حد ادب مگر آخر کار ہمت کر کے دل کو سنبھالتا ہوا اس چارپائی تک جا ہی پہنچا جس پر ایک گاؤ تکیہ کا سہارا لیے ہوئے مشرق کا یہ عظیم شاعر حقے کے کش لے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہہ دیا کہ میں لکھنؤ سے حاضر ہوا ہوں اور صرف یہ فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ میری رسائی یہاں تک ہو گئی۔ مگر علامہ اقبال نے نہایت شفقت سے اپنے قریب ہی مجھ کو جگہ دے کر اس بحث میں مجھ کو بھی شریک کر لیا جو میرے پہنچنے سے پہلے ان کی مجلس میں جاری تھی۔ اس بحث میں شرکت تو خیر میں کیا کرتا مولانا عبدالمجید سالک کی اور ان کی باتیں سن سن کر گرہ میں باندھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

یہ تھا میرا لاہور کا پہلا سفر جس سے واپسی پر اگر کسی نے جہانگیر کے مقبرے کی بات کی تو میں نے علامہ اقبال کی خدمت میں باریابی کی تفصیلات سنانا شروع کر دیں۔ اگر کسی نے شالامار باغ کی بات کی تو میں نے سید امتیاز علی تاج کی باغ و بہار شخصیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اگر کسی نے شاہی قلعہ کے متعلق پوچھا تو میں سر شیخ عبدالقادر کے ذکر پر آ گیا۔ اس لیے کہ میں نے واقعی اپنے اس سفر میں دو ہی کام کئے تھے یا ان اکابر سے ملا تھا یا میاں ایم اسلم کے افسانے سنے تھے۔ میری

بلا جانے کہ جہانگیر کا مقبرہ کیا ہے۔ شالا مار باغ کیسا ہے اور شاہی قلعہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ مقامات نہ دیکھے نہ دیکھنا چاہے مگر بغیر ان مقامات کو دیکھے میں لاہور پر کچھ اور بھی عاشق ہو کر واپس آگیا۔ لاہور سے وابستگی کچھ اور بڑھ گئی ایک مرتبہ لاہور کو دیکھ کر بار بار دیکھنے کی ترغیب لے کر لاہور سے رخصت ہوگیا۔

یہ طلب اس قدر صادق تھی کہ آخر کار لاہور میں ذرا تفصیلی قیام کا موقع ملا۔ پنچولی آرٹ پکچرز کی طرف سے یکایک ایک خط پہنچا کہ اگر تم فلمی کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے ہماری کمپنی میں آنا چاہو تو ہم سے آکر ملو۔ یہ تو پوچھنے کی بات ہی نہ تھی ایک تو فلم کمپنی دوسرے لاہور میں واقع فلم کمپنی۔ تنخواہ زیادہ۔ ماحول دلچسپ اور ترقی کے امکانات تیر کی طرح لاہور پہنچا اور سیٹھ دلسکھ پنچولی سے تمام معاملات طے کر کے لاہور ہی میں رہ گیا۔ جس لاہور کا بچپن سے شیدائی چلا آرہا تھا آخر کار اسی کی کشش نے مجھ کو کھینچ لیا۔ کچھ دن کے بعد ایک گزیٹڈ پوسٹ کی لالچ میں پھر لکھنؤ جا پہنچا مگر یہ درمیانی تین چار سال لکھنؤ میں بسر کر کے پھر لاہور آگیا اور اب کی مرتبہ جب تین چار سال لاہور میں رہ چکا تو میرے تلون کو دیکھتے ہوئے قدرت کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ اس نے ہندوستان ہی کو تقسیم کر دیا اور مجھ کو بجائے ہندوستانی کے پاکستانی بنا کر لاہور ہی کو میرا مستقل وطن بنا دیا۔ بچپن سے لاہور سے جو لگاؤ تھا اس نے آخر لاہور کو میرا اور مجھ کو لاہور کا بنا کر چھوڑا۔ اب میں خواہ کراچی میں رہوں یا بسلسلۂ ملازمت راولپنڈی میں مگر وطنی حیثیت لاہور ہی کو حاصل ہے اور اب میں بھی نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم

جی ہاں میں نے "جنتِ دیگر" لاہور ہی میں خریدی ہے۔ میری دوسری شادی لاہور ہی میں ہوئی ہے میں صحیح معنوں میں جنت نصیب بن چکا ہوں سسرال اور جنت میں جو فرق ہے وہ تو مرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے لیکن جیتے جی تو ایک متواضع سسرال ہی کو جنت کہا جا سکتا ہے۔

میری آرزو

رشید احمد صدیقی

محبی۔ تسلیم۔ آپ نے از راہِ محبت فرمائش کی ہے کہ نقوش کے لیے لاہور پر کچھ لکھ کر بھیج دوں۔ عزیزوں اور دوستوں کا کہنا بڑی مشکل سے ٹال سکتا ہوں۔ لیکن شوق اور ذمہ داری کے کاموں کو بہت کم کر دیا ہے۔ محض برائے نام اور بڑی مجبوری سے کبھی کبھی کرنا بھی پڑتا ہے۔ اپنی اس معذوری اور بے دلی کی بنا پر دوستوں اور عزیزوں سے اس کا متمنی رہتا ہوں کہ مجھے اس طرح کی فرمائشوں سے معاف رکھا کریں ——— یوں بھی لاہور سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔ زندگی میں صرف دو بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار علامہ اقبال سے شرفِ نیاز حاصل کرنے پھر کوئی بارہ تیرہ سال بعد مرحوم کی رحلت کی خبر سن کر دعائے مغفرت مانگنے حاضر ہوا تھا۔ دو ایک دوستوں سے ملا ایک آدھ تاریخی مقامات دیکھے اور بس۔ آپ ہی فرمائیں اب پھر کیا لکھوں۔ البتہ یہ چاہتا ہوں کہ جس لاہور سے علامہ اقبال اٹھے جنھوں نے ہم کو آپ کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور نئی بصیرت اور نئے حوصلے دیے وہیں سے ایک نئے سر سید اور نئی علی گڑھ تحریک کا ظہور ہو۔ ملت کے استحکام کے لیے

پھر اقبال کے بعد ایک سرسید کا آنا بہت ضروری ہے۔ مقدم و مؤخر سے قطع نظر، ہر قوم پستی سے بلندی کی طرف آنے کے لیے ایک اقبال اور ایک سرسید کی محتاج رہے گی یہ اور بات ہے کہ ہر قوم اور ملک اپنی اپنی نہاد کے اعتبار سے اپنے اپنے اقبال اور سرسید اور علی گڑھ تحریک پیدا کرتی رہتی ہے! آپ سوچیں گے تو میری آرزو یا دعا کو بالکل بے سروپا نہ محسوس کریں گے دعا مانگنا بڑا آسان مشغلہ ہے بالخصوص جبکہ وہ "دعائے کہنہ سالاں" ہو اس لیے بہت کم مقبول بھی ہوتی ہے آپ نوجوانوں سے درخواست ہے کہ دعا مجھے مانگنے دیں اور اس کے قبول ہونے کے امکان کو اپنی کوششوں سے بڑھائیں!

نورجہاں کے مزار پر

احسان دانش

شاہدرہ کی یہ زمیں یہ غم و عبرت کا دیار / ذرہ ذرہ ہے یہاں گردشِ دوراں کا شکار
خستگی بوڑھے خس و خار پہ ہے چھائی ہوئی / کہنگی بولتے ماحول پہ منڈلائی ہوئی
خشک مٹی پہ یہ سوکھی ہوئی بوندوں کے نشاں / بیتتے وقت پہ دم توڑتے لمحوں کا گماں
نیلگوں دھند کے دریا میں یہ ٹھنڈک کا رچاؤ / یہ اندھیروں کے مضافات دھندلکوں کے پڑاؤ
یہ زبوں حال فضا، نورجہاں کا یہ مزار / جس کو ہر وقت ہے گھیرے ہوئے راہوں کا غبار

بے ضیا شمعِ جہانگیر اسی خاک میں ہے
حسن کیا عشق کی تفسیر اسی خاک میں ہے

یہ ابابیلوں کا مسکن یہ خموشی کا مقام / وادیٔ خواب میں شبِ رنگ اجالوں کا قیام
لالہ و گل کا یہ مشہد یہ محبت کا حرم / یہ تجلی کے شوالے میں سیاہی کا صنم
جیسے اندوہ کی بستی غم و حرماں کا نگر / رات کو جیسے کٹی فصل کے خرمن پہ نظر
واں شاہی خس و خاشاک پہ مجبورِ نیاز / دفن کے غار میں یہ سنبل و ریحاں کا جہاز
رنگ دلہن کا یہ جز بہ غم و حرماں گلنار / یہ حوادث کی کمیں گاہ یہ زندانِ بہار
زمزموں کا یہ بسیرا یہ خموشی کا محل / سائے کی سطح پہ معصوم مصور کا عمل
سرد شعلوں کی گپھا، مردہ چراغوں کا وطن / دامنِ دشت میں مہتاب کا بھرپور گہن
اُف یہ ظلمات کا ٹیلا یہ سیاہی کی چٹان / جیسے پانی سے جلے کھیت میں دہقاں کا مچان
ڈر سے سمٹی ہوئی راتوں کی سواری جیسے / شام کی پشت پہ کہرے کی عماری جیسے

دور پتوار سے محروم سفینے کی طرح مینہہ کی بوچھاڑ میں بیٹھے ہوئے زینے کی طرح
جانے یہ جہل کا افسوں ہے کہ دولت کا فراغ
آج اس قبر پہ گل ہیں نہ صبا اور نہ چراغ
بیچ سے جس کی سمٹتے نئے جھکتے ہوئے پھول اب کوئی پوچھنے والا نہیں تعویذ کی دھول
اب مغنی کے ترانے نہ کنیزوں کی صدا سنسناتے ہوئے بے در و اندھیرے کے سوا
دور بستی کے چراغوں کا سماں کیا کہیے ننھے شعلوں پہ چتاؤں کا دھواں کیا کہیے
اژدہاؤں کی طرح راستے بل کھائے ہوئے شپرک مہری ہر اک چاپ سے گھبرائے ہوئے
جس کو ہر صبح جگاتی تھی حسیں شہنائی
اس کی تربت پہ مسلط ہے سیہ بینائی
ہر نفس پر دل مغموم یہ کرتا ہے سوال یہ ہے شاہی کا نتیجہ یہ ہے انساں کا مآل
یہ سکوت ابدی اس پہ اندھیرے کا جنوں
گم بیاباں ہیں محلات کے نغموں کا فسوں
خاک پر ڈھیر یہاں شوکت سلطانی ہے
خواب میں خواب کے احساس کی حیرانی ہے
"اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا"

"لاہور ولا قوۃ"

خواجہ احمد عباس

"السلام علیکم"
"وعلیکم السلام"
"آپ کا وطن؟"
"لاہور"
"لاہور ولا قوۃ؟"
"جی؟ ——— آپ کا مطلب؟"

مطلب کچھ نہیں، صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نوواردوں سے چھیڑ چھاڑ۔ یو۔پی والوں اور پنجابیوں کی پرانی دوستانہ چشمک۔

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ لاہور سے آئے ہوئے نوجوانوں کو اپنے شہر سے کس قدر محبت ہی نہیں عقیدت ہے۔ "لاہور، ولاہوز" کا نام آتے ہی چہرے کھل اٹھتے اور زبانیں چل پڑتیں۔ میں سال روڈ۔ انارکلی۔ لارنس گارڈن۔ شالامار۔ ہر جگہ کا ذکر نہایت رومانی انداز میں کیا جاتا۔ اور ہم جو پنجابی نہیں تھے اور لاہور کبھی نہیں گئے تھے کھسیانے ہو کر کھمبا نوچنے لگتے یعنی خواہ مخواہ لاہور اور پنجاب کی ہجو کرنے لگتے۔

میں لاہور پہلی بار شاید ۱۹۳۴ء میں گیا تھا۔ ایک آل انڈیا ڈبیٹ کے سلسلے میں۔ لیکن بچپن سے ہی یہ شہر میرے ذہن کے افق پر چمکتا رہا تھا۔

لاہور۔ جہاں سے ہر ہفتے "پھول" اخبار آتا تھا اور دارالاشاعت پنجاب لاہور کی شائع کی ہوئی دلچسپ کتابیں۔ لاہور جہاں سے ہماری بڑی بہنوں کے لیے "تہذیب نسواں" آتا تھا۔ اور نانا ابا کے لیے "پیسہ اخبار"۔

پھر جب ہم کالج میں پہنچے اور اردو ادب میں دلچسپی لینے لگے تو لاہور ہمارے لیے "نیرنگِ خیال" بن گیا "ہمایوں" اور پھر "ادبِ لطیف" بن گیا۔

پھر انقلابی سیاست کا زمانہ آیا۔ لاہور راوی کا وہ کنارہ بن گیا جہاں اکتیس دسمبر کی رات کو جواہر لال نہرو نے مکمل آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ لاہور ہمارے لیے بھگت سنگھ بن گیا۔ لاہور کی سنٹرل جیل میں بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دی گئی تو علی گڑھ میں ہم بھوک ہڑتال کر کے دو دن تک روٹھے رہے۔

اور پھر میں پہلی بار لاہور گیا۔ اس پہلی "ملاقات" کو اب چوتھائی صدی گزر چکی ہے لیکن دل پر وہ نقش اب بھی تازہ ہے۔

لاہور۔ دسمبر کا مہینہ۔ ایک خوشگوار صحت بخش موسم۔ جب رات کو اوورکوٹ پہن کر مال روڈ پر گھومنے کو جی چاہتا تھا۔ اور دن کو دھوپ میں لارنس گارڈن کی ہری ہری گھاس پر لیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ جب بھوک بے تحاشا لگتی تھی۔ جب بدن میں خون کی روانی تیز ہو جاتی تھی۔ بوڑھے اپنے آپ کو جوان اور جوان اپنے آپ کو بچہ محسوس کرنے لگتے۔

لاہور۔ مال روڈ پر خوش پوش، جامہ زیب اور صحت مند لڑکوں اور لڑکیوں کے غول۔ لاپروائی سے لٹکتے ہوئے رنگین دوپٹے۔ چست قمیصیں۔ ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی سلک کی شلواریں۔

لاہور۔ شالامار میں کھلے ہوئے گلاب کے پھول۔

لاہور۔ "لاہور کا جغرافیہ" کے مصنف پطرس بخاری سے ملاقات۔ ایک پروفیسر جو طالب علموں سے دوستوں کی طرح ملتا تھا۔ جو انگریزی ادب کا عالم اور اردو ادب کا رسیا۔ جس کی گفتگو میں دنیا کا ہر موضوع سمایا ہوا تھا۔ ادب، تاریخ، سیاست، آرٹ۔ اور پھر اتنا شگفتہ مزاج اتنا دلچسپ اندازِ بیان کہ مسلسل سات گھنٹے باتیں کرنے کے بعد بھی جی نہیں بھرا۔

لاہور۔ نائٹ کلب اور کیبرے۔ علی گڑھ کے "خشک" ماحول سے آئے ہوئے نوجوانوں کے لیے زندگی کا ایک

نیا تجربہ۔ سنسنی خیز و ہیجان انگیز۔ ایک دلفریب خواب۔ ایک گھناؤنی حقیقت۔

لاہور۔ کافی ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کے جمگھٹ۔ سیاسی ہنگامے اور ادبی مباحثے۔ تیز دماغ۔ تیز باتیں۔ ترقی پسند رجحانات۔ مذہبی جوش اور فرقہ وارانہ تعصبات یگانگی اجنبی کے لیے ہر وقت پریشانی کا سامنا۔ کون ہندو ہے؟ کون مسلمان ہے؟ ایک زبان۔ ایک لباس۔ ایک معاشرت۔ ایک تمدن۔ رام کے بیٹے لو کے نام پر بسائے ہوئے لاہور میں ہندو "رب" "ربا" اور "خدا" کی قسم کھاتے تھے۔ مسلمان بیساکھی کا تہوار مناتے تھے۔

میں ہفتہ بھر کے بعد لاہور سے لوٹ آیا۔ مگر چپکے سے لاہور کو اپنے دل میں سمیٹ لایا۔

اس کے بعد میں کئی بار لاہور گیا۔ ۱۹۴۶ء میں کئی مہینے وہاں رہا۔ ایک فلم بھی وہاں کے ایک سٹوڈیو میں بنائی۔

اب میرے لیے لاہور ایک شہر نہیں ہے۔ ایک یاد ہے۔ شالامار میں کھلے ہوئے گلابوں کی اڑتی اڑتی سی خوشبو ہے۔ کلیجے چھوٹے کا چٹخارہ ہے۔ رنگین آنچلوں کی ایک جھلک ہے۔ گرمیوں کی دوپہر میں مال پر دھول اڑاتی لو کا ایک بگولہ ہے۔ سردیوں کی رات میں اوورکوٹ کو بھی چیرتی ہوئی برفیلی سرد ہوا کا ایک جھونکا ہے۔

لاہور؟ میرے لیے لاہور "ادب لطیف" ہے۔ "سویرا" ہے۔ "نقوش" ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہے۔

لاہور۔ فیض احمد فیض ہے۔ راجندر سنگھ بیدی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ہے، اوپندر ناتھ اشک ہے۔ لاہور کرشن چندر ہے۔ ظہیر کاشمیری ہے، قتیل شفائی اور امرتا پریتم ہے۔ لاہور ساحر لدھیانوی ہے، محمد طفیل ہے، راما نند ساگر ہے، چودھری نذیر احمد ہے، لاہور امتیاز علی تاج ہے، پنڈت سدرشن ہے، حکیم یوسف حسن ہے اندر سین جوہر ہے۔ لاہور سبط حسن ہے جو لاہور کا نہیں تھا مگر اب لاہوری نمک بن چکا ہے۔ اور . . . . اور . . . . میرے دل کے نقشے پر لاہور خواجہ حبیب علی ہے اور خواجہ محبوب علی ہے اور نجم الحسن نقوی ہے اور میری بہن محمد فاطمہ ہے . . . ہر وہ رشتے دار اور دوست اور ساتھی ہے جو پہلے لاہور میں نہیں تھا اور اب لاہور میں ہے۔ یہ لاہور میرے دل میں قید ہے اور دو بڑا افسروں کی "نہیں" کے باوجود اس لاہور سے مجھے کوئی دور نہیں رکھ سکتا۔

میں دس بار لاہور گیا ہونگا یا لاہور سے گزرا ہونگا۔ مگر میں نے جہانگیر کا مقبرہ نہیں دیکھا۔ کبھی نورجہاں کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھی۔ نہ بادشاہی مسجد کے اندر گیا ہوں نہ رنجیت سنگھ کی سمادھی دیکھی ہے۔ مجھے مردہ عمارتوں سے زیادہ زندہ انسانوں میں دلچسپی ہے۔ میں نے صرف دولنگا ریسٹوران دیکھا ہے۔ کافی ہاؤس دیکھا ہے۔ مکتبۂ اردو کا دفتر دیکھا ہے۔ پنچولی سٹوڈیو (جو ہوا کرتا تھا) دیکھا ہے۔ لارنس گارڈن کا اوپن ایئر تھیٹر دیکھا ہے۔

مجھے نورجہاں کا مزار یا انارکلی کا مقبرہ دیکھنے کی اب بھی کوئی تمنا نہیں ہے۔

منٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی آرزو ضرور ہے۔

مگر منٹو آج زندہ ہوتا تو ایک زوردار قہقہہ مار کر کہتا "بس اتنی سی حماقت کے لیے اتنی دور جاؤ گے۔

لاہور دیلا نوتہ"

غالب مال روڈ لاہور پر

راجہ مہدی علی خاں

(۱)

ہزاروں لڑکیاں ایسی کہ ہر لڑکی پہ دم نکلے
بہت نکلے حسیں سڑکوں پہ لیکن پھر بھی کم نکلے

بھرم کھل جائے گا ان سب کی قامت کی درازی کا
جو ان کی "سیٹ شدہ" زلفوں کا کچھ بھی پیچ و خم نکلے

ملی آزاد نظموں کی طرح ان کو بھی آزادی
وہ آزادی کہ جس کو دیکھ کر شاعر کا دم نکلے

کوئی ہے آ کے جو ان سب کے ایڈریس ہم کو لکھوا دے
ہوئی شام اور گھر سے جیب میں رکھ کر قلم نکلے

گھروں سے سب نکل آئی ہیں "ٹاٹا" کہہ کے پردے کو
کہ گر نکلے تو سب عشاق کا سڑکوں پہ دم نکلے

گیا عہدِ کہن اور شاعروں کی آج بن آئی
جو "از راہِ ستم" چھپتے تھے "از راہِ کرم" نکلے

چلے آئے ادھر ہم بھی جوانی کا علم لے کر
کہ جن سڑکوں پہ جیتے ہیں انہی سڑکوں پہ دم نکلے

(۲)

نکلنا نوکروں کا گھر سے سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیری کوٹھی سے ہم نکلے

تیرے کتے بھی سارے شہر میں اِترانے پھرتے ہیں
کبھی بھی تیری کوٹھی سے نہیں وہ "سر بہ خم" نکلے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں سلمیٰ
پہ اتنا جانتا ہوں کل وہ آتی تھی کہ ہم نکلے

چائے خانے

ہوش ترمذی ایم اے

چائے اور قہوے کا تعلق شعروادب کے ساتھ کچھ اس دور کی پیداوار نہیں۔ یہ تعلق بہت قدیم ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو قہوہ خانے کا ادارہ جمہوریت کی ارتقاء کے ساتھ سترھویں صدی میں قائم ہوا۔ سترھویں صدی کے نصف آخر میں لندن میں جگہ جگہ قہوہ خانے کھل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی سے قہوہ برآمد کیا جانا شروع ہوا چنانچہ لندن کی تاریخ میں جس پہلے قہوہ خانے کا حال ہمیں ملتا ہے وہ ۱۶۵۹ء میں قائم ہوا تھا۔ انگلستان میں شاہی خاندان کی حکومت ۱۶۶۰ء میں دوبارہ قائم ہوئی تو جمہوری خیالات برطانوی قوم میں عام ہو چکے تھے اور جمہوری تحریکوں کے ماتحت اور تعلیم کے رواج پانے کے باعث مساوات کا جذبہ پھیلتا جا رہا تھا چنانچہ مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کے افراد آپس میں مل جل کر بیٹھنے لگے اور باہمی ملاقات کے مرکز قہوہ خانے قرار پائے۔ انگریزی ادب میں یہ دور نوکلاسیکی دور کہلاتا ہے۔ یہ دور ادبی آمریت کا دور تھا۔ چند بڑے بڑے ادیب و شاعر معاشرے میں ادبی آمر خیال کیے جاتے تھے اور ہر آمر کے گرد و پیش اس کے ماننے والوں کا ایک پورا حلقہ ہوتا تھا چنانچہ ہر آمر کا کوئی مخصوص قہوہ خانہ مقرر تھا جہاں وہ اپنے مدّاحوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اس طرح مختلف قہوہ خانے مختلف حلقوں کے لیے مخصوص ہو گئے۔ اس دور کا پہلا ادبی آمر ڈرائڈن (DRYDEN) تھا۔ اس کی نشست کے لیے ایک قہوہ خانہ مخصوص تھا۔ اسی طرح کانگریو (CONGREVE) ایڈیسن (ADDISON) اسٹیل (STEELE) پوپ (POPE) ڈاکٹر جانسن (JOHNSON) غرض کہ اس دور کے تمام نمایاں ادیب و شاعر اسی مسلک پر عمل پیرا تھے اور ان کے بیٹھنے کے لیے الگ الگ قہوہ خانے تھے۔

قہوہ خانوں میں ان انگریز ادیبوں اور شاعروں کا بیٹھنا محض وقت گزاری ہی کی خاطر نہ تھا۔ اس دور کے شعروادب میں مطالعۂ انسانیت کو اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا۔ شعروادب کے دو مخصوص شعبے اخلاقی درس اور معاشرے کے خلاف طنز سے متعلق تھے چنانچہ شاعروں اور ادیبوں پر لازم آتا تھا کہ وہ انسانیت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ اس کے لیے قہوہ خانے سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ قہوہ خانوں میں تھوڑے سے وقت میں اتنا کچھ حاصل کر سکتے تھے کہ جتنا ضخیم کتابوں سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ گویا قہوہ خانے کی حیثیت دار المطالعہ کی سی تھی اور شاعر و ادیب کی حیثیت مطالعہ و مشاہدہ کرنے والے کی۔ ہر قسم اور ہر طبقے کے شوقین لوگ جو ان قہوہ خانوں میں جمع ہوتے تھے۔ ادیب و شاعر کو دعوتِ فکر و مشاہدہ دیتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مل جل کر بیٹھنے سے شاعر و ادیب آپس میں تبادلۂ خیالات کر سکتے تھے۔ جمہوری دور میں تبادلۂ خیالات کرنا ادیبوں اور شاعروں کے معمولات میں سے ہے لیکن پچھلے دور میں جس کو جاگیردارانہ دور کہا جاتا ہے ادیب یا تو اپنے اپنے گھر پڑے رہتے تھے یا محفل آرائی منظور ہوتی تو شراب خانوں کا رُخ کرتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں مریضانہ ذہنیت پیدا کرتی تھیں۔ شراب نوشی شاعروں اور ادیبوں کی صحت پر مُضر اثرات ڈالنے کے علاوہ خاصی مہنگی بھی پڑتی تھی۔ برخلاف اس کے قہوے کی ایک پیالی دوستوں کے ساتھ پینا معمولی سے معمولی حیثیت کے لیے بھی مشکل نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قہوہ خانے ادیبوں کے معاشرے میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ اس دور کے ادب کو ہم چاہیں تو قہوہ خانوں کا مدرسۂ فکر کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک چائے نے انگلستان میں قہوے کی جگہ لے لی تھی اور قہوہ خانوں کی بجائے چائے خانے قائم ہو چکے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان، لنکا اور چین میں جم چکے تھے اور چائے بڑے پیمانے پر مشرقی ممالک سے

انگلستان پہنچ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ چائے انگلستان کا قومی مشروب بن گئی اور انگریزوں کی برکت سے خود ہندوستان میں بھی چائے خانے قائم ہونے لگے۔ اگرچہ انگلستان میں بڑے پیمانے پر چائے نوشی اٹھارویں صدی سے قائم تھی لیکن یہ صرف مالدار گھرانوں تک محدود تھی ہندوستان میں چائے خانے اوّل اوّل ساحلی مقامات پر کھلے اور بتدریج بڑے شہروں میں قائم ہوئے لیکن پنجاب عرصے تک چائے کے اثرات سے محفوظ رہا۔ یہاں چائے نوشی بیسویں صدی کے ربع اوّل تک مقبول نہ ہوئی تھی۔

اور شہروں کا تو ذکر ہی کیا ہے خود لاہور میں بیسویں صدی کے ربع اوّل میں چائے خانے اتنے کم تھے کہ ان کا عدم وجود تقریباً یکساں تھا مثلاً پورے انارکلی بازار میں صرف ایک چائے خانہ تھا جو دہلی مسلم ہوٹل کہلاتا ہے۔ یہ چائے خانہ شفیع کی سرائے کے بالمقابل تھا جہاں اب باٹا کی بڑی دوکان ہے یعنی یہ پیسہ اخبار سٹریٹ کے سرے پر تھا۔ غرض کہ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں نہ تو عرب ہوٹل تھا، نہ نگینہ بیکری تھی، نہ کافی ہاؤس اور نہ پاک ٹی ہاؤس۔ یہی وہ چند چائے خانے ہیں جو لاہور کے ادیبوں کی نشست کے لیے مشہور ہیں گروہ جو کہا جاتا ہے (TEA FOR TWO AND TWO FOR TEA) یعنی جب دو شخص جمع ہو جائیں تو چائے نوشی کی گنجائش ہے اور اگر چائے میز پر آجائے تو کم از کم دو پینے والے ضرور ہوں۔ ان دنوں بھی چند ادیب و شاعر دہلی مسلم ہوٹل کے چائے خانے میں یا شفیع کی سرائے (دہلی مسلم ہوٹل کا مہمان خانہ) میں جمع ہو جاتے تھے۔ جب بیدل شاہجہان پوری "مخزن" کے مدیر ہوئے اور انھوں نے شفیع کی سرائے میں رہنا شروع کیا تو پطرس بخاری، مولانا عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج وغیرہ ان کے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور چائے نوشی ہوتی تھی۔ یہ بات ۱۹۱۸ء کی ہے۔ تاہم دہلی مسلم ہوٹل کو لاہور کے ادبی مراکز میں شامل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اس کے ساتھ ادبی روایت مربوط نہیں ہے۔ البتہ جب ۱۹۲۶ء میں عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری میں شاعر و ادیب جمع ہونے لگے تو ایک دور ایسا شروع ہوا جسے ادب میں چائے خانوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور آج بھی جاری و ساری ہے۔ یوں تو ۱۹۲۵ء کے بعد سے چائے نوشی کا رواج اہلِ لاہور میں عام ہوا اور جگہ جگہ چائے خانے کھل گئے لیکن زیرِ نظر مقالے میں ہمارے سامنے وہ چند چائے خانے ہیں جو ادب کے مرکز کہلا سکتے ہیں اور جنھیں ادبی چائے خانے کہنا مناسب ہے۔ اس ذیل میں عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس خصوصیت کے ساتھ آتے ہیں۔ ویسے جہاں بھی چند ادیب یکجا ہو جائیں محفل جم جاتی ہے۔ چائے پینے کے لیے جس طرح وقت کی قید نہیں اسی طرح ادیبوں کے مل بیٹھنے کے لیے ضروری نہیں کہ انھی چائے خانوں میں سے کوئی ہو۔

لاہور پنجاب کا دل ہے۔ وہ پنجابی مثل تو آپ نے سنی ہوگی کہ اگر کسی نے لاہور نہیں دیکھا تو وہ پیدا ہی نہیں ہوا یعنی پاکستان کا صوبہ معرضِ وجود میں آنے کے بعد اب یہ کہنا بجا ہوگا کہ لاہور مغربی پاکستان کا دل ہے اس لیے کہ لاہور مغربی پاکستان کا مرکزی مقام ہے۔ یہ علاقہ اپنی تاریخی، عمرانی، صنعتی اور معاشی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس علاقے کی اپنی روایات ہیں جن کا عکس شہر لاہور میں اپنی پوری رنگا رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ دراصل کسی مقام کی عظمت و اہمیت اس تہذیبی و ثقافتی روایت سے وابستہ ہوتی ہے جو وہاں کے رہنے والے قائم کرتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت کوئی انفرادی عمل نہیں بلکہ ایک مجموعی طرزِ حیات کا نام ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اہلِ علم اور اہلِ فکر کے ہاتھوں تشکیل پاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو قبولِ عام اور شہرتِ دوام کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کے ورثے کی نمائندگی انھی لوگوں کے ذمے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کے مؤثر افراد اگر کسی مقام کو اپنے اُٹھنے بیٹھنے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کی جگہ مقرر کر لیں تو وہ جگہ بھی تاریخی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اس

اعتبار سے لاہور کے چند مخصوص چائے خانے ادب کے گہوارے ہیں یوں تو جب سے چائے کا رواج عام ہوا ہے۔ ہمارے ملک کی شہری آبادی کا ایک حصہ خوش وقتی کی خاطر اور کچھ دیر ہنسنے بولنے کے لیے چائے خانوں میں بیٹھنے لگا ہے چنانچہ مزدوروں سے لے کر معززینِ شہر تک ہر ایک اپنے وقت کا کچھ حصہ چائے خانوں کی نذر کرتا ہے۔ شام کا وقت ہوا اور لوگ کسی چائے خانے میں جا بیٹھے۔
لاہور میں بھی بلاشبہ سینکڑوں ہی چائے خانے ہیں جن میں بیٹھنے والے مختلف تہذیبی درجے کے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح ان چائے خانوں کے معیار بھی الگ الگ ہیں لیکن اربابِ علم و ادب کی محفلیں چند مخصوص چائے خانوں ہی میں جمتی رہی ہیں۔ شیزان، اگار ڈینیا، کسینو، ہیکوا ٹل ہوٹلے مال روڈ پر جگمگا رہے ہیں اور اہلِ زر کو دعوتِ عام دے رہے ہیں۔ یہاں آپ کو بڑے بڑے سرکاری افسر، تاجر اور رئیس نظر آئیں گے لیکن ادیب و شاعر شاید ان میں سے کوئی نہ ہوگا البتہ اسی مال روڈ پر چینیز لنچ ہوم، کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس، وائی۔ ایم سی اے ریسٹورنٹ پڑھے لکھے لوگوں، شاعروں، ادیبوں، طالب علموں، پروفیسروں اور درمیانی درجے کے سفید پوشوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں میکلوڈ روڈ پر جا نکلیے تو رائل پارک میں پاکیشیا اور ٹی لائٹ میں فلمی شاعروں، ادیبوں اور فلم کے شوقینوں کا مجمع نظر آئے گا۔ انارکلی بازار میں سے گزریے تو سرے ہی پر نگینہ بیکری ہے۔ اب تو یہ اجڑی ہوئی سی نظر آتی ہے مگر کبھی اس پر بھی شباب تھا۔ ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے صدر دروازے کے سامنے عرب ہوٹل ہے جو ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ نگینہ بیکری اور عرب ہوٹل ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ رہ چکے ہیں اسی طرح چائے خانوں کی گنتی کی جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا لیکن ہمیں اس وقت صرف انہی چائے خانوں سے سروکار ہے جن میں شاعر اور ادیب بیٹھتے چلے آئے ہیں اور یہ تعداد کے اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں۔

لاہور میں چائے خانوں کی زندگی اس قدر لذت بخش ہے کہ جسے وہاں بیٹھنے کا چسکا پڑ گیا وہ عدالت سے غیر حاضر ہو سکتا ہے، نوکری پر لات مار سکتا ہے مگر چائے خانے میں جانا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو متعدد حضرات لاہور کے چائے خانوں میں ایسے نظر آئیں گے جنھوں نے اپنی معاشی بہتری کے مواقع فقط اس لیے کھو دیے کہ انھیں لاہور سے باہر جانا پڑتا جہاں نہ ایسے چائے خانے ہیں، نہ ایسی پُرلطف زندگی۔ ان چائے خانوں میں آپ کو بعض ایسے لوگ ملیں گے جو بیس بیس سال بلکہ تیس تیس سال سے ریاضت کر رہے ہیں ان میں سے کوئی اپنے مخصوص چائے خانے کا جانا ترک نہیں کر سکتا۔ ان چائے خانوں میں سے بعض قیامِ پاکستان سے پہلے کے ہیں اور بعض بعد کی پیداوار ہیں۔ شوقین حضرات کا یہ عالم ہے کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کسی خاص چائے خانے میں اسی وقت سے نہ بیٹھ رہا ہو جب وہ چائے خانہ قائم ہوا تھا۔ ادیب، شاعر، مصنف، پبلشر، وکیل، تاجر، سیاسی کارکن، معاشرتی تحریکوں میں دلچسپی رکھنے والے غرضیکہ ہر طبقے میں ایسے نمائندے آسانی کے ساتھ مل جائیں گے جن پر شام کے وقت کسی نہ کسی چائے خانے میں بیٹھنا فرض ہو گیا ہے۔ مشاہیرِ لاہور میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسی لاہور کی کوچہ گردی کے سند یافتہ اور انھی چائے خانوں کے پلے بڑھے ہوئے ہیں۔ معاشرہ اگرچہ ان لوگوں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے آنکھوں پر بٹھاتا ہے لیکن خود ان کے بیٹھنے کا مقام یہ چائے خانے ہیں۔ ان میں سے بعض کسی بنا پر کہیں اور چلے گئے ہیں یا اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو آج تک ان کے بیٹھنے کے گوشے، نشستیں، صحبتیں اور لطیفے ان چائے خانوں کی تاریخ میں زندہ اور باقی ہیں۔ آج بھی لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ فلاں صاحب اس میز پر اس طرح بیٹھا کرتے تھے اور فلاں صاحب کے بیٹھنے کے لیے وہ گوشہ مخصوص تھا اور فلاں موقع پر انھوں نے یہ لطیفہ سنایا تھا۔ اسی طرح آج بھی ان چائے خانوں میں مستقل بیٹھنے والے اپنے بیٹھنے کا ایک مخصوص انداز رکھتے ہیں

اور ان کے آنے جانے کا وقت بھی مقرر ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ چائے خانے کی صحبت آدمی کو کسی اور کام کا نہیں چھوڑتی بعض اس کو وضع اوقات خیال کرتے ہوں گے لیکن اصل میں چائے خانے کی صحبتیں بڑی غنیمت ہیں۔ ان کا ایک مقصد تو اس پیاس کا بجھانا ہے جو انسان میں دوسرے انسان کے ساتھ ملنے اور بیٹھنے کی ہوتی ہے۔ دوسرے یہاں اربابِ علم و ادب کی باہمی گفتگو سے جو معلومات باتوں باتوں میں سننے والوں کو پہنچتی ہیں، وہ بھاری بھاری کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی مشکل ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ زندگی کے کتنے ہی مسائل ہیں جنھیں آدمی تنہا نہیں سلجھا سکتا آپس کی بات چیت میں طے ہو جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی لاہور کی تاریخ میں مل جائیں گی جب علمی ادبی سیاسی اور معاشرتی تحریکیں چائے خانوں سے شروع ہوئیں۔

بعض ادبی تحریکوں کی داغ بیل ریلوے روڈ کے عرب ہوٹل میں پڑی۔ عرب ہوٹل لاہور کے ادب نواز چائے خانوں میں قدیم ترین ہے۔ یہ ہوٹل کوہاٹ کے ایک عرب نے ۱۹۲۶ء میں کھولا۔ اس ہوٹل کی زندگی اسلامیہ کالج کی مرہونِ منت ہے۔ یہ کالج علی گڑھ یونیورسٹی کے بعد برِّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبا ایک مدت سے عرب ہوٹل کو نوازتے چلے آتے ہیں۔ لاہور کے بڑے بڑے اربابِ علم و ادب کی نشست یہاں رہی ہے۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک عرب ہوٹل لاہور کا ادبی مرکز تھا۔ خواجہ دل محمد، ڈاکٹر تاثیر، سید عابد علی عابد، ابوالاثر حفیظ جالندھری — چراغ حسن حسرت، فضل کریم خاں درانی، پروفیسر فیاض محمود اور باری علیگ، عبدالمجید بھٹی عرب ہوٹل کے جانے پہچانے بیٹھنے والوں میں سے ہیں۔ کبھی کبھی آنے والوں میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور جناب مہر اور دوسرے مشاہیر بھی شامل ہیں۔ جب چراغ حسن حسرت نے "شیرازہ" نکالا تو ان کے ملنے والے یہیں جمع ہوتے تھے۔ کتنے ہی علمی معرکے اور ادبی ہنگامے اس دور کی یادگار ہیں — "دنیا زمیندارانِ لاہور" یہاں با جماعت اٹھتے بیٹھتے تھے۔ پھر جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اسلامیہ کالج کے پرستارانِ آزادی نے بھی عرب ہوٹل کو اپنا مرکز بنایا اور صحافی تو آزادی سے قبل بھی ادھر ہی کا رخ کرتے تھے۔ شہر کی خبروں پر تبصرے اور خیال آرائی یہیں ہوتی تھی اور سیاسی حریفوں کے مضامین اور نظموں کا جواب یہیں بیٹھ کر تیار کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد وہ مجمع منتشر ہو گیا اور وہ صحبتیں ختم ہو گئیں لیکن لاہور کی ادبی تاریخ میں عرب ہوٹل کا نام آج بھی زندہ ہے اور اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبا اب بھی یہاں بیٹھتے ہیں۔

مال روڈ سے انارکلی بازار میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا ایک مشہور چائے خانہ ہے جو بمشکل دس گز لمبا اور تین گز چوڑا ہوگا۔ یہ نگینہ بیکری کہلاتا ہے اور ۱۹۲۵-۲۶ء سے قائم ہے۔ دراصل یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے لیکن تنگ و تاریک کمرے میں ایسے ایسے مشاہیر بیٹھتے رہے ہیں اور بعض تو اب تک بیٹھتے ہیں کہ اس مقام کو ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی اگر آپ نگینہ بیکری میں جا کر دیکھیں تو ایک آدھ جلا بھنا شاعر دو چار سامعین کو شعر سناتا مل جائے گا یا ڈاکٹر صابر علی ایم اے پی ایچ ڈی بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہوں گے۔ یہاں کی رنگینی اب مدھم پڑ گئی ہے۔ ابتدا میں محکمہ تعلیم کے ارکان نے یہاں آنا جانا شروع کیا تھا اس لیے کہ محکمہ تعلیم کا دفتر یہاں سے بالکل قریب ہے۔ پھر یونیورسٹی کے پروفیسر اور شہر کے شاعر و ادیب ادھر متوجہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ نگینہ بیکری، فکر و فن کا مرکز بن گئی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، دیوان چند شرما، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر صابر علی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر عاشق بٹالوی، محمد عبداللہ قریشی، آغا بیدار بخت، باری علیگ، شورش کاشمیری، مولوی

نذیر احمد، مولانا وارث کامل، گوپال متل جیسے حضرات نگینہ بیکری کے مستقل بیٹھنے والوں میں رہ چکے ہیں۔ جہاں ایسے حضرات جمع ہوتے ہوں وہاں نکتہ آفرینی اور سخن سنجی کا کونسا پہلو باقی رہ جاتا ہوگا۔ یہاں گفتگو کا مستقل موضوع علم و ادب تھا۔ "اُردو پڑھو، اُردو بولو، اُردو لکھو" کی تحریک یہیں سے اُٹھی اور اُردو کانفرنس کی داغ بیل بھی یہیں پڑی۔ پنجاب نے اُردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس خدمت کے سرچشمے لاہور کے انہی چائے خانوں سے پھوٹے ہیں۔

دبستانِ لاہور کے قیام میں جن چائے خانوں نے اہم ترین خدمت سرانجام دی ہے ان میں کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس شامل ہیں۔ کافی ہاؤس مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کے سامنے واقع ہے۔ پہلے یہ انڈین کافی ہاؤس کہلاتا تھا۔ آزادی کے بعد اسے زیلنس کافی ہاؤس کہا جانے لگا۔ یہاں کے آنے جانے والے متنوع طبیعت کے لوگ رہے ہیں۔ آزادی سے پہلے کنھیا لال کپور، دیوندر ستیارتھی، سید عابد علی عابد، عبداللہ بٹ، باری علیگ، شیخ حسام الدین اور دوسرے ادیب اور معاشرتی و سیاسی کارکن یہاں بیٹھتے تھے۔ وکلاء، یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ یہاں کی زینت رہے ہیں۔ نگینہ بیکری سے اٹھ کر بیشتر ادیب کافی ہاؤس میں بیٹھنے لگے۔ ہندو معاصرین بھارت چلے گئے۔ ہندوستان کے ادیب اِدھر آ گئے۔ اس طرح کافی ہاؤس کی زندگی میں آزادی کے بعد خاصی تبدیلی رونما ہوئی۔ سید سبطِ حسن، ناصر کاظمی، ریاض قادر، شاکر علی مصوّر، مشہور وکلاء اور مختلف ادیب و شاعر اب بھی یہاں بیٹھتے ہیں۔ آغا بیدار بخت، شورش کاشمیری، شیخ حسام الدین اور ملک اسلم حیات آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب بھی یہاں یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ و طلباء کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ اکثر حضرات کے بیٹھنے کی میزیں مخصوص ہیں۔ علمی، ادبی اور معاشرتی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے لیکن کچھ عرصے سے کافی ہاؤس پر کاروباری اور تاجر پیشہ حضرات کی توجہ زیادہ ہے چنانچہ شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بدلتا جا رہا ہے اور ان میں سے زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں تاہم کافی ہاؤس آج بھی علم و ادب کا ایک مرکز ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کے حلقے میں سب سے مقبول چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس ہے جو مال روڈ اور نیلا گنبد والی سڑک کے مقامِ اتصال پر واقع ہے۔ پہلے یہ انڈیا ٹی ہاؤس کہلاتا تھا۔ یہاں ہمیشہ سے ادیبوں کی کثرت رہی ہے۔ کنھیا لال کپور، دیوندر ستیارتھی، سید عابد علی عابد، باری علیگ غرض کہ ہندو، مسلمان اور سکھ ادیب یہاں مل کر بیٹھتے تھے اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد انڈیا ٹی ہاؤس کے سکھ مالک بھارت چلے گئے لیکن ان کی جگہ جو لوگ آئے وہ بھی شعر و ادب سے وابستگی رکھتے ہیں چنانچہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے باوجود اس مقام کی ادبی روایت بدستور قائم ہے نام البتہ بدل گیا ہے اور اب یہ "پاک ٹی ہاؤس" ہے۔ جس طرح عرب ہوٹل کی شہرت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی مرہونِ منت ہے اسی طرح پاک ٹی ہاؤس کے استحکام میں حلقۂ اربابِ ذوق کا ہاتھ رہا ہے۔ یہ جماعت جو تقسیم سے پہلے سے قائم ہے اپنے جلسے وائی ایم سی اے کی عمارت میں منعقد کرتی ہے اور اس کے ارکان پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھتے ہیں۔ اتوار کے اتوار حلقۂ اربابِ ذوق میں دلچسپی رکھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد پاک ٹی ہاؤس میں جمع ہوتی ہے۔ بعض تو جلسے کے وقت سے کافی پہلے ٹی ہاؤس میں آ بیٹھتے ہیں اور جلسے کے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ اہلِ حلقہ پاک ٹی ہاؤس کے اسیر ہیں لیکن کسی جماعت پر کیا منحصر ہے۔ لاہور بھر کے شاعر و ادیب پاک ٹی ہاؤس کے مرکز میں سمٹ آتے ہیں اور جب دیکھیے یہاں اربابِ شعر و ادب کا ایک جمگھٹا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ادیب و شاعر جب لاہور کا رُخ کرتے ہیں تو وہ بھی سیدھے پاک ٹی ہاؤس ہی میں آ کر دم لیتے ہیں۔ دو ایک

غیر ملکی محققین بھی کسی نہ کسی میز کے سامنے بیٹھے نظر آ جاتے ہیں۔ ملکوں ملکوں سے لاہور کے شاعروں اور ادیبوں کے نام اس چائے خانے کی معرفت خطوط اور پیغامات آتے ہیں۔ غرضیکہ یہ چائے خانہ مختصر طور پر دبستانِ لاہور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یوں تو وکیل، تاجر، ڈاکٹر سبھی قسم کے لوگ جو چائے کے شوقین ہوں پاک ٹی ہاؤس میں پائے جا سکتے ہیں لیکن شاعروں اور ادیبوں کے لیے رفتہ رفتہ یہ چائے خانہ ڈرائنگ روم بن کر رہ گیا ہے یعنی شاعر اگر کسی دوست کو وقت دینا چاہے تو وہ یہی کہے گا کہ فلاں وقت ... پاک ٹی ہاؤس میں مجھ سے مل لیجیے۔ بڑے شہروں میں متوسط درجے کے لوگوں کو اتنی آسائش کہاں میسر کہ اپنے ملنے والوں کو اپنے گھر پہ بلائیں، ملنا جلنا چائے خانوں ہی میں ہوتا ہے چنانچہ شاعر و ادیب جب اپنے مہمانوں کو مدعو کرتے ہیں تو پاک ٹی ہاؤس ہی میں مدعو کرتے ہیں — اہلِ ضرورت بھی یہ بات خوب جان گئے ہیں کہ شعراء اور ادیبوں کو تلاش کرنا ہو تو کہاں جانا چاہیے۔ وہ سیدھے پاک ٹی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ گھر کی بیٹھنے والی پردہ نشین خواتین جنھیں نہ اطراف و جوانب کی خبر ہے اور نہ محلوں اور مقامات کی، بہرحال "پاک ٹی ہاؤس" کے نام سے پوری طرح واقف ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ یہ خواتین ادیبوں اور شاعروں کے خاندان سے متعلق ہوں۔

پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ احسان دانش، انتظار حسین، ناصر کاظمی، شہرت بخاری، انجم رومانی، قیوم نظر، یوسف جمال انصاری، سجاد باقر رضوی، اعجاز بٹالوی، شیر محمد اختر، ریاض احمد، منیر نیازی، عمر فیضی، شہزاد احمد، شاد امرتسری، عارف عبدالمتین اور خاکسار راقم الحروف یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے معدودے چند ہیں۔ اکثر و بیشتر خصوصاً جس روز حلقے کا اجلاس ہو پرانے لوگوں میں سے بھی بعض تشریف لے آتے ہیں۔ سیّد عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر سعید اللہ، سیّد وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، میاں بشیر احمد کبھی کبھار کے آنے والوں میں سے ہیں۔ بعض شعراء کے ساتھ ان کے احباب بھی چلے ہی آتے ہیں خواہ انھیں مستقل ٹی ہاؤس میں بیٹھنے کی بیماری نہ ہو۔ ان میں پروفیسر اختر اقبال کمالی، کسریٰ منہاس، محمد عبداللہ قریشی، جناب حامد علی خاں، پروفیسر علم الدین سالک اور اسی قبیل کے دوسرے اربابِ علم و ادب ہیں۔ یہاں اگرچہ بیٹھنے والوں کی نشستیں مخصوص نہیں ہیں تاہم گروپ ضرور ہیں۔ انتظار حسین، ناصر کاظمی، شہرت بخاری اور احمد مشتاق کی چوکڑی کسی پانچویں کو اپنے میں مستقلاً شامل کرنے پر راضی نہیں۔ احسان دانش، یوسف جمال انصاری، سجاد باقر رضوی، عمر فیضی، مشکور حسین یاد، محمد خلیل الرحمان اور راقم الحروف اپنے گروپ میں مگن رہتے ہیں۔ منیر نیازی، افتخار جالب، جیلانی کامران اور انیس ناگی الگ ہی بیٹھے شعر و ادب کو نئے معنی پہناتے اور روایتِ شعری پر رحم کھاتے ملیں گے۔ اسی طرح الگ الگ حلقے ہیں جن کی الگ الگ نشست ہوتی ہے لیکن گفتگو کا موضوع شعر و ادب ہی رہتا ہے۔ یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی ہے۔

دبستانِ لاہور کی کوئی تاریخ ان ادب نواز چائے خانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مستقبل کا مورخ جب آج کل کی زندگی کا نقشہ کھینچے گا تو ان چائے خانوں کا حال اسے ضرور قلمبند کرنا پڑے گا۔ کون کون لوگ کون سے زمانے میں کس کس چائے خانے میں بیٹھتے تھے، اس کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ چائے خانے اجتماعی تبادلۂ خیالات اور تخلیقی ادب کا گہوارہ رہے ہیں۔ اگر آج آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ لاہور کے ادیب کن مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور کس طرزِ فکر

کے مالک ہیں تو لازم ہے کہ آپ کسی ادبی چائے خانے میں تشریف لے جائیں۔

کعبہ

مصطفیٰ زیدی

سلگتی راہوں سے، جلتے ہوئے مکانوں سے
میں اجنبی ترا مہمان بن کے آیا تھا
گھنے اندھیرے نے چمکائی تھی تری منزل
مشیتوں نے ترا راستہ دکھایا تھا

میں آ کے بیٹھ گیا یوں تو انجمن میں تری
بدن کے زخم دریدہ قبا سے چھپ نہ سکے
اس اہتمام سے گھر میں ہوا تھا جشنِ بہار
لہو کے داغ جبینِ صبا سے چھپ نہ سکے

اسی طرح سے کئی اور قافلے آئے
سیہ بکھیر بنائے، لٹے لٹائے ہوئے
نظر میں عظمتِ آبار کے اطلس و کمخواب
سروں پہ گرد زدہ بوریے اٹھائے ہوئے

اگر یہ چھاؤں نہ ہوتی تو ہم کہاں جاتے
نئے وطن ترے دامن کی رحمتوں کو سلام
ہمارے مسلکِ رندی کے ناز اٹھاتا کون
نئے وطن تری مسجد کی عظمتوں کو سلام
مقامِ سجدہ نہیں صرف مرقدِ اقبال
نئے وطن ترے کوچوں کے پتھروں کو سلام
فقط انارکلی ہی نہیں حریمِ نگاہ!
ازل کے عشقِ ابد کی محبتوں کو سلام

کچھ رواداری کی باتیں

شیخ عبدالشکور

لاہور میں حضرت داتا گنج بخش صاحب ہجویریؒ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ تقسیم سے پہلے عرس کے موقع پر مسلمان زائرین کے علاوہ ہندو بھی حضرت کے مزار پر اکثر نذر چڑھانے آیا کرتے تھے۔ پھر علاقہ راجا کے سکھ حضرات بھی اپنی مستورات کو ہمراہ لیے کبھی کبھی آیا کرتے اور دعا مانگ کر نذر پیش کیا کرتے۔

مزار شریف کے بالمقابل "بیلا رام کا کارخانہ" اب بھی موجود ہے۔ رائے بہادر بیلا رام کے صاحبزادے رائے بہادر رام سرن داس متحدہ پنجاب کے ایک بہت بڑے متمول اور مرنجاں مرنج طبیعت کے رئیس تھے۔ وہ کارخانے کے ساتھ والی "لال کوٹھی" میں رہا کرتے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کے تین صاحبزادے چیفس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا ایک بیٹا فلائٹ لفٹیننٹ روپ چند

بھارت سرکار کی طرف سے افغانستان کا سفیر رہ چکا ہے) ان جیسوں کی شادیوں پر رائے بہادر نے لاکھوں روپے مہمان داری پر صرف کیے اور اس کے ساتھ ہی لاکھوں روپے ہی دان میں بھی دیے۔ ان کے ہاں ہندوستان دوستوں کا ایسا دلفریب اجتماع رہا کرتا تھا کہ کیا عرض کیا جائے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے ہاں پندرہ پندرہ دن لگاتار دعوتیں رہا کرتیں اور کسی فرقہ کا امتیاز نہ ہوتا۔

۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی وبا اس شدت سے پھیلی کہ الاماں! صرف تین چار مہینوں میں ہی دو کروڑ انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ بدقسمتی سے رائے بہادر صاحب کے تینوں بیٹے بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے اور ان کے گھر سخت سراسیمگی پھیل گئی۔ کرنل بھولا ناتھ، کرنل امیر چند اور کرنل سدرلینڈ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی بمبا دلیپ سنگھ کے خاوند نیز کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل) جیسے یگانۂ روزگار ڈاکٹر علاج کے لیے صبح و شام آتے اور ہزار جتن کے باوجود ان کا درجۂ حرارت کسی صورت کم ہونے میں نہ آتا جس سے سب پریشان تھے۔

رائے بہادر کے ہندو مسلم دوست "لال کوٹھی" میں پروانہ وار جمع رہتے اور بارگاہ ایزدی میں دعائیں مانگتے۔ خود رائے بہادر صاحب فقراء میں خیرات تقسیم کرتے اور ان سے دعا کے طلبگار ہوتے۔

اب خود رائے بہادر صاحب کی زبانی بات سنیں:-

"ایک رات ہم سوئے ہوئے تھے کہ کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید ریش بزرگ، براق لباس پہنے، ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں تسبیح لیے، میرے بیٹے گوپال داس کے پلنگ کے پاس کھڑے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں سہم گیا اور چیخ کر کہا کہ آپ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور دعا پڑھنے میں مشغول رہے پھر وہ بزرگ میرے دوسرے بیٹے روپ رام کی چارپائی کے پاس گئے اور وہاں بھی دعا مانگی۔ پھر تیسرے بیٹے کے پلنگ کے قریب جا کر بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ بزرگ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:-

"میں تمہارا پڑوسی گنج بخش ہوں۔ مجھ سے تمہاری پریشانی دیکھی نہ گئی اس لیے میں دعا کرنے کے لیے خود آ گیا ہوں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو شفا دے گا۔"

اب کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس بزرگ کی دعا سے واقعی دوسرے دن بخار ہلکا ہو گیا اور وہ کچھ باتیں بھی کرنے لگے۔ جب ڈاکٹر صاحبان مریضوں کو دیکھنے کے لیے صبح آئے تو ان کی حالت اچھی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کرنل امیر چند تو ان کی ٹمپنے لگے کہ رات میں ایسی مؤثر دوائی دے کر گیا تھا کہ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس پر رائے بہادر صاحب ہنس پڑے اور گزشتہ رات کی تمام کیفیت بیان کی۔ سب حضرات اس قصہ کو سن کر انگشت بدنداں ہو گئے اور دیر تک اس پر بحث و تمحیص کرتے رہے۔

اس ایٹم اور میزائل کے زمانے میں ایسی باتیں ناقابلِ قبول ہوں گی مگر خاصانِ خدا سے ایسی ایسی محیّر العقول باتیں اکثر ظہور پذیر

جھلکتی ہیں اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

جب بیمار عورت کو مکمل شفا ہو گئی تو رائے بہادر نے دربار کے ایک سجادہ نشین کو اپنے ہاں بلا کر تمام واقعہ سنایا۔ اس کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ وہ کس انداز سے شکرانہ کی نذر پیش کریں۔ آیا کھانے کی چند دیگیں پکوا کر فقرا میں تقسیم کر دینا کافی ہوگا یا کہ نذر کسی اور صورت میں ہونی چاہیے۔ سجادہ نشین نے جواب دیا کہ کھانا تو آپ کی طرف سے ہر سال عرس کے موقع پر تقسیم ہوا ہی کرتا ہے اب تو کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جس سے مستقل فیض جاری رہے۔ اس پر رائے بہادر نے دریافت کیا کہ کیا دربار میں بجلی موجود ہے؟ جب انھیں معلوم ہوا کہ ابھی تک وہاں بجلی کا کوئی انتظام نہیں تو انھوں نے بہت خوش ہو کر فرمایا کہ بجلی کے نصب ہونے کا انتظام فوراً ان کی طرف سے کیا جائے۔ چنانچہ ایک مہینہ کے اندر سب انتظام مکمل ہو گیا۔ پھر رائے بہادر نے حاضر دربار ہو کر پہلے نذر پیش کی اور بعد میں روشنی کا افتتاح کیا۔

رواداری کی یہ ایسی نفیس مثال ہے کہ دیکھنے سننے میں کم آئی ہوگی۔

رائے بہادر صاحب کی تین صاحبزادیاں بھی تھیں۔ ایک تو لالہ باشی رام انجینئر سے، دوسری دیوان بدری ناتھ پرائیویٹ سیکرٹری مہاراجہ کشمیر سے بیاہی تھیں۔ تیسری صاحبزادی کسی رئیس کے گھر کی رونق تھیں۔ اس زمانے میں متمول ہندو گھرانوں میں فن موسیقی سیکھنے کا عام رواج تھا اور یہ صاحبزادیاں بھی اس فن میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ لاہور کے کوچہ شیعاں (موچی دروازہ) کے ایک فنکار میاں بڈھا انھیں راگ ودیا کے گر بتایا کرتے تھے۔ وہ ایک انگلی سے دونوں طبلوں پر تھاپ دینے کی بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے نوابوں اور رئیسوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ پھر وہ خود بھی بڑے عالی حوصلہ انسان تھے چنانچہ محرم کی آٹھویں تاریخ کو امام حسین علیہ السلام کی نذر بہت تکلف سے دیا کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو مدعو کیا کرتے تھے۔ عوام کے علاوہ نواب محمد علی قزلباش، ڈپٹی غلام حسین، پیر سردار حسین، خان بہادر شیخ محمد نقی اور فقیر نجم الدین جیسے رؤسا بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ رائے بہادر رام سرن داس بھی آیا کرتے اور اپنی طرف سے ایک سو روپے کی نذر پیش کیا کرتے تھے (آج کل کے حساب سے یہ رقم ایک ہزار کے برابر ہے)

ریلوے اسٹیشن کے قریب آسٹریلیا بلڈنگ کے عین سامنے "میلا رام کا تالاب" ہوا کرتا تھا۔ تالاب کے چاروں طرف چند کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جو کرایہ پر اٹھ جاتی تھیں، رائے بہادر صاحب نے وہاں کی آمدنی میاں بڈھا کے نام کر دی تھی اور وہ تا زیست اسے وصول کرتے رہے۔

وضعداری کی ایسی مثالیں اب کہاں ملیں گی؟

موجودہ نظام حیدر آباد (دکن) میر عثمان علی خان کے والد غفران مآب میر محبوب علی خان اپنے وقت کے حاتم تھے۔ کئی سال سریر آرائے سلطنت رہے اور ان کی فیاضی کے قصے ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں مشہور ہوئے۔ ان کے مرنے کے ساتھ ہی دنیا سے شاہی ٹھاٹھ اور بخشش کے قرینے بھی اٹھ گئے۔

میر محبوب علی خان کے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں دیوان چندو لعل ریاست کے دیوان تھے۔ یہ صاحب دیوان ٹوڈر مل کے خاندان سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور میں ہی بود و باش رکھتے تھے۔ علاقہ چونیاں میں ان کے خاندان کے لوگوں کی جائداد بھی تھی۔ دیوان صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد گئے اور اپنی فراست اور خوش بختی کے زور سے ریاست کے

دیوان ہو گئے۔ ان کے زمانہ وزارت میں کئی پنجابی بھی ملازمت کے لیے وہاں پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔ دیوان صاحب اپنی فیاضی اور کرم گستری کے باعث ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ حیدر آباد کو "چند ولعل کا حیدر آباد" کہنے لگے۔

دیوان صاحب موصوف کے صاحبزادے مہاراجہ سر کرشن پرشاد بھی آخری دور میں نظام کے مدار المہام ہو گئے تھے۔ یہ صاحب بڑے عالی ظرف رئیس تھے اور ساتھ ہی شیریں کلام شاعر بھی، شاد تخلص کرتے تھے اور غزلیات و قصائد کے علاوہ رسول کریم کی شان میں نعتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ نعتیں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے رسالہ "نظام المشائخ" میں عموماً چھپا کرتی تھیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضور نظام کے دربار میں داغ، گرامی اور ہوش بلگرامی جیسے قادر الکلام شاعر موجود تھے اور اس وجہ سے وہاں شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا کرتا تھا۔ گرامی نہ صرف درباری شاعر تھے بلکہ ولی عہد سلطنت میر عثمان علی خان کے استاد بھی تھے اس لیے وہ "استاد گرامی" کے نام سے مشہور رہے۔ یہ صاحب جالندھر (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ بہت سادہ مزاج اور مستعلیق انسان تھے۔ اپنی علمیت اور شاعرانہ عظمت کے باعث امرائے دکن میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ گرامی اپنے زور کلام سے ہر محفل میں چھا جایا کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل کے دو تین شعر سنیئے ؎

ما خویش را بہ نیم نظر ہاں فروختیم خود را فروختیم چہ ارزاں فروختیم
دیوانگی نبود بلا سنج امتیاز داماں بجیب و جیب بداماں فروختیم
قانونِ عقل، نسخۂ ایماں، کتابِ ہوش در امتحانِ چشم سخنداں فروختیم

ایک دفعہ مہاراجہ کرشن پرشاد نے گرامی سے دورانِ گفتگو میں کہا کہ شعراء نے زلف، کمر اور دہن کے الفاظ کو شعر میں بہت باندھا ہے۔ آپ بھی کوئی ایسا شعر کہیں جس میں یہ الفاظ مستعمل ہوں۔ گرامی فی البدیہہ کہنے میں طاق تھے، معاً یہ شعر پڑھا ؎

دہانش تنگ چوں دستِ گرامی
کمر باریک چوں فکرِ نظامی

مہاراجہ بہادر نے اسی وقت خزانچی کو بلا کر ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا حکم دیا جس پر گرامی جھک جھک کر آداب کورنش بجا لاتے رہے (یہ ایک ہزار آج کے دس ہزار کے برابر ہے)

مہاراجہ صاحب موصوف خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں سے تھے۔ ان کی شان میں کئی قصیدے بھی لکھے۔ اپنی حسنِ عقیدت کے باعث اپنے ایک فرزند کا نام "خواجہ پرشاد" رکھا تھا۔ ہر سال خواجہ اجمیری کے عرسِ مبارک پر ایک سو ایک من چاول کی دیگ ان کے خرچ سے پک کر تقسیم ہوا کرتی تھی۔ پھر خاص خاص مجاوروں کے ماہانے بھی مقرر تھے۔ جب کبھی وہ خود اجمیر شریف آیا کرتے تو ایک نہایت مطلا و مذہب غلاف بھی مزار شریف کے لیے لایا کرتے تھے۔ پھر اس موقع پر جو جو کچھ داد و دہش ہوا کرتی تھی اس کا ذکر کیا کیا جائے؟ مہاراجہ بہادر خود تعلقدار تھے اور تعلقہ سے معقول آمدنی ہوتی تھی مگر کھلے ہاتھ ہونے کے باعث کبھی کبھی مقروض بھی ہو جایا کرتے — لیکن جب حضور نظام کو اس بات کا پتہ چلتا تو وہ ان کا سب قرض فوراً چکا دیا کرتے تھے۔

ایسی ایسی بخششوں اور وضعداریوں کی مثالیں اب کہاں ملیں گی؟

اقبال علیہ رحمۃ جب لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر لاہور واپس تشریف لائے تو پہلے کچھ عرصہ اندرون بھاٹی دروازہ قیام پذیر رہے۔ پھر انار کلی میں "راجو برادرز" کی دکان کے اوپر والے حصے میں آن ٹھہرے۔ جہاں وہ ۱۹۲۳ء تک مقیم رہے۔ علامہ کی مشہور تصنیفات "مثنوی اسرار خودی"، رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق یہیں سپردِ قلم ہوئیں۔ ان تصنیفات سے ان کا نام اسلامی دنیا میں گونج اٹھا۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد ان کی چند کتابوں کا ترجمہ انگریزی اور جرمن زبان میں ہوا اور علامہ کا کلام یورپ کے مستشرقین تک پہنچا تو سب نے انہیں بے دریغ خراجِ تحسین ادا کیا اور اس طرح انہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

میں ۱۹۲۲ء میں پنجاب سکریٹریٹ میں ملازم تھا۔ دفتر سے واپسی پر انار کلی بازار میں سے گزرتے ہوئے اپنے مرحوم دوست شیخ عبداللطیف دندان ساز کی دکان پر اکثر ٹھہر جایا کرتا تھا۔ لطیف صاحب ہمارے بہت مخلص دوست تھے اور شام کو ہمارے لیے چائے پانی کا بندوبست کر رکھتے تھے۔ شیخ لطیف تپش (والد ماجد عبدالقادر)، شیخ عبدالاحد (بعد ازاں سپرنٹنڈنٹ پولیس) شیخ فضل حق (میجر) اور چند ایک دیگر احباب بھی وہاں پہنچ جایا کرتے اور وہاں خوب دھما چوکڑی مچا کرتی۔ ایک دن اسی طرح محفل ہاؤ ہو برپا تھی کہ علامہ مرحوم کے منشی شیخ طاہردین (دل روز مرہم ملتے) ادھر سے گزرے اور ہمیں وہاں بیٹھے دیکھ کر رک گئے اور سب کی خیریت دریافت فرمائی۔ شیخ صاحب موصوف بھی لاہور کی نادرِ روزگار ہستیوں میں سے ایک تھے اور اپنے حسنِ کلام سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لینے کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کو علامہ اقبال کی شاعری سے زیادہ ان کی روزی کا فکر ہوا کرتا تھا کیونکہ تب وہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور شاعری بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ چنانچہ میں نے شیخ طاہردین صاحب سے برسبیلِ تذکرہ پوچھا "کہیے جناب! آجکل ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس کا کیا حال ہے؟" اس پر وہ کچھ مسکرائے اور مجھے دکان سے باہر آنے کو کہا۔ جب میں دکان سے باہر نکل کر بازار میں کھڑا ہو گیا تو مجھے علامہ کے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ دیکھیے کیا ہو رہا ہے؟" اب میں نے یہ دیکھا کہ سامنے والے مکان کے چھجے پر دو شخص کمبل اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے مصروفِ گفتگو ہیں۔ شیخ طاہردین بولے "دیکھ لو۔ یہ ایک تو آپ کے اقبال ہیں اور دوسرے گرامی ہیں۔ ان دونوں کو یہاں بیٹھے ہوئے آج تیسرا دن ہو چلا ہے۔ اگر اقبال شعر پڑھتا ہے تو گرامی داد دینے لگتا ہے اور جب گرامی کوئی شعر سناتا ہے تو اقبال سر دھننے لگتا ہے۔ گویا کہ تین دن سے دونوں کے سر ہی ہلتے نظر آتے ہیں۔ دونوں اسی جگہ کھانا کھاتے ہیں اور جب نیند آئے تو سو بھی یہیں جاتے ہیں۔ اب تین دن سے تو یہ کیفیت ہے، ایسے میں بھلا خاک وکالت چلے گی؟ بس اللہ ہی مالک ہے!"

اللہ اللہ! کس تقوے کے لوگ تھے اور کیا شانِ قلندری تھی!!

۱۹۲۳ء میں انار کلی والے مکان کو چھوڑ کر علامہ مرحوم میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اٹھ آئے اور کئی سال وہاں رہے۔

۱۹۳۳ء میں ان کو کسی دوست کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ میو روڈ پر زمین کا ایک ٹکڑا خالی پڑا ہے جو محکمہ نزول کی ملکیت ہے۔ جائے وقوع کے لحاظ سے یہ آئیڈیل جگہ تھی اس لیے علامہ کا ارادہ اس کو خریدنے کا ہوا۔ ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی اس زمین کو خریدنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ جب محکمہ نزول کی طرف سے زمین نیلام کرنے کا نوٹس جاری ہوا تو چند ایک مسلمان خریداروں کے علاوہ کچھ ہندو ساہوکار بھی نیلام کے وقت وہاں پہنچ گئے۔

لاہور کے ہندو رؤسا میں ایک صاحب رائے بہادر دیوی چند کھنہ لکڑی کے بہت بڑے تاجر تھے۔ اور ریلوے روڈ

یہ رامت دھارا بلڈنگ کے نزدیک) ان کا لکڑی تراشنے کا کارخانہ بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ رائے بہادر صاحب کس طرح علامہ کے گرویدہ ہو گئے تھے چنانچہ جب اُن کو پتہ چلا کہ وہ زمین نیلام ہونے لگی ہے اور علامہ اس کو خریدنے کا خیال رکھتے ہیں تو رائے بہادر بھی نیلام کے وقت میو روڈ پہنچ گئے۔ یہ صاحب پہلے تو نیلام کا رُخ دیکھتے رہے لیکن جب قیمت بیس بائیس ہزار سے اُوپر جانے لگی تو انھوں نے اپنے ہندو دوستوں سے یہ کہا کہ اقبال ہمارا دوست ہے اور ہم ان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں لہٰذا آپ حضرات قیمت زیادہ بڑھانے کا قصد نہ کریں۔ پھر انھوں نے نوٹوں کا ایک بنڈل دکھا کر کہا کہ وہ خود بھی بہت سارا روپیہ ہمراہ لیکر آئے ہیں۔ اگر کسی نے قیمت مزید بڑھانے کی کوشش کی تو پھر وہ یہ زمین خود خرید لیں گے۔ اس پر رائے بہادر کے دوست تو بولی دینے سے رُک گئے لیکن چند ایک دیگر خریداروں نے قیمت تین چار ہزار روپے اور بڑھا دی۔ ان میں سے ایک دو حضرات آنریری مجسٹریٹی کے امیدوار تھے اور مسٹر ایبس پرتاپ ڈپٹی کمشنر کو خوش کر کے اس سے یہ عہدہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ بہرحال قیمت پچیس چھبیس ہزار کے لگ بھگ رہی اور آخری بولی علامہ کے نام پر ختم ہو گئی۔ بعد ازاں زمین کا داخل خارج ان کے نام ہو گیا۔ اس زمین پر ”جاوید منزل“ تعمیر ہوئی اور علامہ مرحوم تادمِ مرگ اس میں مقیم رہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر نیلام کی بولی بڑھتی رہتی تو عین ممکن تھا کہ زمین کی قیمت چالیس پچاس ہزار تک پہنچ جاتی کیونکہ چند ایک ہندو خریدار بہت متمول تھے اور اتنی قیمت دینے میں انھیں دریغ نہ ہوتا اور اس طرح علامہ زمین خریدنے سے محروم رہتے۔ لیکن رائے بہادر کے بروقت روک دینے سے قیمت زیادہ نہ بڑھنے پائی۔

رواداری کی یہ ایسی مثال ہے کہ جس پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اس واقعہ پر بھی ظاہر ہے کہ علامہ مرحوم کے کئی ایک ایسے ہندو دوست بھی تھے جو کہ گمنام رہنا پسند کرتے تھے۔

انارکلی بازار میں میسرز عطر چند کپور۔ کے نام سے ایک مشہور کتب فروش کی دکان تھی۔ محکمہ تعلیم کی مجوزہ کتابوں کے علاوہ دیگر مضامین کی کتابیں بھی ان کے مطبع میں چھپا کرتی تھیں۔ اور ان کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ اپنے مسلمان دوستوں سے ایسے برادرانہ تعلقات تھے کہ کئی ایک سے ان کی ”حاجی“ تھی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر انھیں اپنے رشتہ داروں جیسا ہی سمجھا کرتے تھے۔

لالہ عطر چند کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹوں نے جائداد کو تقسیم کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اپنا معاملہ کسی ہندو ثالث سے فیصلہ کرانے کی بجائے علامہ مرحوم کی خدمت میں گئے اور بخوشی انھیں اپنا ثالث مقرر کیا۔ چنانچہ تقسیم کے متعلق جو فیصلہ علامہ نے دیا اُسی پر وہ لوگ یعنی لالہ گوردتہ مل کپور اور لالہ رام جواہا مل کپور کاربند ہو گئے۔ لالہ رام جواہا مل نے کشمیر روڈ کے کونے پر ایک نہایت شاندار کوٹھی بنائی جہاں وہ ہر مذہب و ملت کے دوستوں کی آئے دن دعوتیں کیا کرتے تھے۔ آجکل اس کوٹھی میں سیٹلمنٹ والوں کا دفتر ہے۔

لاہور کو ”پنجاب کا دل“ کہا جاتا ہے۔ پنجاب کا دارالخلافہ اور تجارتی مرکز ہونے کے باعث ہمیشہ بہت بارونق شہر رہا ہے موسم سرما میں تو اس کا جوبن شباب پر ہوتا ہے اور مختلف اضلاع کے شوقین مزاج سیر و تفریح کیلیے یہاں پہنچ جاتے ہیں تو ان کی شاندار موٹروں سے مال روڈ اور دیگر سڑکوں پر خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ موسم بہار میں لارنس گارڈن اور گلستان فاطمہ میں رنگا رنگ پھولوں کے امتزاج سے ذہن پر فردوس کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شام کو وہاں کا ماحول اتنا پُرسکون اور ہوا اتنی عطر بیز ہوتی ہے کہ پہروں بیٹھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔

تقسیم ہند سے پچیس تیس سال پیشتر مال روڈ کی شاندار دکانوں میں یورپین اور امریکن منڈیوں کا مال بکثرت بکا کرتا تھا اور

ماڈرن ہونے کے باعث بکنا بھی خوب ہوتا تھا۔ موجودہ "فیروز سنز" والی جگہ پر مشہور فرم "وہائٹ وے لیڈلا" کی دوکان ہوا کرتی تھی جس میں آرائش اور سنگھار نیز خانہ داری کی ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔ مثنوی بدرِ منیر قسم کی چھوکریاں وہاں سیل گرلز کا کام کرتی تھیں۔ قیاس کیجئے کہ خرید و فروخت کے وقت خریداروں کے دلوں پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی۔ پھر تھامس کیمپس اور ساتھ والی دکانوں پر بھی ایسی ہی کیفیت رہا کرتی تھی۔

سڑک کے دوسری طرف سٹفل اور لورینگ کے نہایت مصفّا اور شاندار ریسٹورنٹ ہوتے تھے جن پر اس قدر ہجوم رہا کرتا تھا کہ بخاطر بیٹھ کر چائے پینے کو جگہ ملنی محال ہوا کرتی تھی۔ ان ہوٹلوں میں ہندو اور مسلمان بزنس مین ایک دوسرے کی تواضع کرتے اور لاکھوں کے سودے وہیں بیٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

چیرنگ کراس پر تقریباً سب دکانوں کے مالک یا منیجر انگریز ہوتے تھے جو اپنی ذہانت اور خوش اخلاقی سے گاہکوں کا دل فوراً ہاتھ میں لے کر ان کی جیبوں سے روپیہ اگلوانے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ پھر رینکن کی دکان کے منیجر مسٹر برچی کو لوگ "گورنر" کہا کرتے تھے۔ وہ راجاؤں اور نوابوں کو پھانسنے کے ہتھیار گر جانتے تھے۔۔ وہ علاقہ بجا طور پر لاہور کا "بانڈ سٹریٹ" سمجھا جاتا تھا۔

لاہور کا دل تو انارکلی بازار ہے جس میں کرنال شاپ، راجہ برادرز، جگلہ شو کمپنی، شیخ عنایت اللہ اور راما کرشنا کی مشہور دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ان دکانوں کے مالک بھی فنِ مکالمہ کے خوب ماہر ہوا کرتے تھے اور رواداری کی یہ کیفیت کہ کرنال شاپ پر ہندو اور سکھ گاہکوں کا بے پناہ ہجوم رہا کرتا تھا اور اسی طرح سردار جگت سنگھ کوائرا کی دکان پر مسلمانوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ پھر وضعداری کا یہ انداز کہ ہر گاہک اپنے پرانے واقف کار دکاندار کو چھوڑ کر کسی غیر کے ہاں جانا خلافِ وضع سمجھا کرتا تھا۔

راما کرشنا کی دکان پر دنیا کی بہترین کتابیں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ دکان کے مالک ایسی شاندار شخصیت اور بلند کردار کے مالک تھے کہ ان سے باتیں کر کے انسان ایک قلبی سکون محسوس کرنے لگتا تھا۔ ان کی نگاہ میں ہر مذہب و ملت کا انسان یکساں درجہ رکھتا تھا پھر وہ اپنے گاہکوں کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بھی ایک بہترین رہبر تھے کیونکہ خود ان کا مطالعہ اور تجربہ بے پناہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ہم نے سر آغا خاں کو اسی دکان پر کتابیں خریدتے دیکھا۔ وہ ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کیلئے چندہ جمع کرنے کیلئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اور نواب سر فتح علی خاں قزلباش (نواب مظفر علی خاں کے والد) کے ہاں بطور مہمان فروکش تھے۔ پھر "خوابِ ہستی" کے مصنف مرزا محمد سعید صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور ڈاکٹر ڈیزی بیک پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور جیسے مشہور ادیبوں کو اسی دکان پر اپنی علمی تشنگی کو بجھاتے دیکھا۔

راجہ برادرز (موجودہ شوکت مارکیٹ) کی دوکان کے اوپر والے حصے میں علامہ اقبالؒ رہا کرتے تھے۔ ان دنوں ایران کے ایک مجتہد سرکار شیخ عبدالعلی صاحب ہروی علامہ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ یہ صاحب کبھی ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوا کرتے تھے مگر روسی حکومت کے خوف کے مارے ایران سے نکل آئے اور لاہور میں نواب محمد علی خاں قزلباش کے ہاں مقیم تھے۔ ان کے علمی تبحر کا کیا کہنا! آج سے چالیس سال پیشتر وہ "خزائن منزل" کوچہ شیعاں میں اپنے وعظوں سے مجالسِ عزا خوب گرمایا کرتے اور دورانِ وعظ قرآن مجید کی آیات کی تفسیر ایسے دلنشین پیرایہ میں بیان فرماتے کہ بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے۔ علامہ اقبال اکثر ان کی ملاقات کیلئے نواب صاحب موصوف کی ایمپرس روڈ والی کوٹھی پر تشریف لے جایا کرتے۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ اپنی مشہور مثنوی اسرارِ خودی ختم کر رہے تھے اور وہ سرکار شیخ صاحب سے مختلف نکات پر ان سے بحث و تمحیص کیا کرتے۔ قبلہ نواب صاحب مرحوم کے صاحبزادے میرے ہم جماعت تھے اور اکثر میرا پھیرا ادھر رہتا تھا۔ اس طرح ہمیں کبھی کبھی ان دو بڑے عالموں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ پھر سرکار شیخ بھی علامہ صاحب کی ملاقات کے لیے کبھی کبھی انارکلی آیا کرتے تو پہروں وہاں علمی گفتگو رہا کرتی تھی۔

نواب ذو الفقار علی خان (مالیر کوٹلہ) بھی گاہے گاہے اُن کے ہاں آیا کرتے تو سر مہاراجہ جوگند رسنگھ سابق وزیر پٹیالہ و پنجاب ان کی معیت میں ہوتے۔ نیز مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر (محمود نظامی مرحوم کے نانا) بھی ضرور ہمراہ آتے۔ خیال تو فرمائیں کہ اُس چار یاری صحبت میں کیا کیا پر لطف باتیں ہوتی ہونگی اور ان کی زبانوں سے کیسے کیسے پھول جھڑتے ہونگے۔ علیٰ ہذا القیاس راجہ نریندر ناتھ کمشنر لاہور اور پنڈت شیو نرائن شمیم سابق جج چیف کورٹ پنجاب بھی علامہ کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور یہ دونوں بزرگوار علامہ سے اور اپنے افغان دوستوں سے ہمیشہ فارسی میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضور! اُس زمانے میں تو کشمیری پنڈتوں کے گھروں میں فارسی ہی بولی جاتی تھی اور مسلمان گھرانوں کی طرح ان کے ہاں بھی پردے کا رواج تھا!

انارکلی بازار کے وسط میں ایک دکان میسرز نرائن داس بھگوان داس کیمسٹ کی ہوا کرتی تھی۔ لالہ نرائن داس کے بیٹے لالہ دوارکا داس کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ بہت خوش مذاق انسان تھے اور اپنی دکان کو دیدہ زیب آرائش سے بقعۂ نور بنائے رکھتے تھے۔ پھر وہ بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ہر مذہب و ملت کے مفلس شاعر اور مفلس عاشق ان کی دکان پر جمع رہتے اور ان کے خوانِ کرم پر پلتے تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور شعلہ تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

خدا کی یاد میں زاہد نہ بھول دنیا کو — کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا

شاعری کے علاوہ وہ راگ کے بھی خوب رسیا تھے۔ اجمیر شریف کے مشہور قوال عظیم پریم راگی کے گانے کی اُس زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتے تو قوالی کی ایک نشست ضرور شعلہ کے ہاں ہوا کرتی تھی۔ اس موقعہ پر وہ اپنے بے تکلف سخن فہم ہندو اور مسلمان دوستوں کو مدعو کیا کرتے اور پریم راگی دو تین گھنٹوں میں سینکڑوں روپے کما کر لے جایا کرتے تھے۔

ہمارے پرانے دوست پنڈت ہری چند اختر آنجہانی زیادہ تر شعلہ صاحب کے ہاں ہی وقت گزارتے اور ان کی محفلوں کو اپنے چٹکلوں سے کشتِ زعفران بنایا کرتے تھے۔ جب اختر نے رسول کریمؐ کی شان میں ایک نعت لکھ کر حبیبیہ ہال میں پڑھی تو لاہور میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک ہندو شاعر (اور وہ بھی پنڈت) نے ایسی شاندار نعت لکھی ہے کہ جواب نہیں۔ وہ نعت اس قدر مقبول ہوئی کہ مشاعروں میں لوگ اُن سے باصرار وہ نعت پڑھوایا کرتے اور داد کے ڈونگرے برسایا کرتے تھے۔ نعت شریف کے چند اشعار سنیئے ؎

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا — کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اُس کے نام پر — اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

شالامار

ڈاکٹر سید صفدر حسین، ایم اے، پی ایچ ڈی

حریمِ حسن بنایا گیا ہے شالیمار — خبر ہے زیب دہ تخت و تاج آتی ہے
بہ اہتمام ہے مہمان کی رعایت سے — اِدھر ہے رایتِ قومی اُدھر نشانِ فرنگ
گلاب و مشک سے دھوئے گئے ہیں جادہ و صحن — برس رہا ہے در و بام سے گلال عبیر
جگہ جگہ پہ تراشے گئے ہیں تختۂ مرمر — جڑے ہوئے ہیں پرِ کاہ میں نگینۂ آب
روش روش پہ ہیں انبار لالہ و گل کے — مہک رہی ہے فضا جسمِ نازنیں کی طرح

قدم قدم پہ تناسب کا وہ حسیں احساس
کہ ہر نہال جوابِ نہال دیتا ہے

کہ جیسے رقص میں اٹھیں سہیلیوں کے ہاتھ
جواب دیں کفِ دست اپنا آئینوں کی طرح

قطارِ سرو بہ اندازِ قامتِ محبوب
ہے صحنِ باغ میں موزونیت کی آخری حد

درخت آم کے ہیبت کی شان رکھتے ہیں
محاذِ جنگ پہ جس طرح ہاتھیوں کے غول

سیاہ فام ستونوں میں آہنی زنجیر
کہ جیسے زنگیوں نے لے لیے ہوں ہاتھ میں ہاتھ

حدودِ سبز پہ دیوارِ باغ کی بندش
حسین جسم پہ رنگین جیسے بندِ کمر

وہ حسن بارہ دری میں سمٹ کے آیا ہے
کہ جیسے برجِ فلک میں ہو آفتاب کا نور

مثالِ عارضِ محبوب ہے جلو خانہ
لطافتوں کو پلا دی ہے موتیوں کی آب

ہر ایک در کے ہے محراب سے وہ خم پیدا
کہ جیسے حور نے کھولا ہو شوق میں آغوش

جواب قصر کا رکھتا ہے سطحِ آب کا عکس
سفید برج بطِ مے کی طرح تیرتے ہیں

کنارِ حوض چراغاں کا اہتمام جو ہے
تو آب میں بھی کواکب کی شمعیں روشن ہیں

لگی ہیں باغ میں سہ رنگ چھتریاں ہر سمت
انھیں کے سائے میں ہے آج اہتمامِ نشست

مری نظر نے ہٹایا جو حال کا پردہ
تو سیر ہی میں نظر آئی شکل ماضی کی

چہل پہل کے تصور نے قفل توڑ دیئے
ہر ایک سمت بکھرنے لگی شعاعِ خیال

چمن میں نور کے فوارے ایسے پھوٹ پڑے
کہ جن کو ذہن نے برسوں چھپا کے رکھا تھا

حرم سرا کا سماں یوں نظر پہ پھیل گیا
طلوعِ صبح میں کرنوں کے جیسے سیمیں پر

روش روش پہ کنیزوں کے غول بڑھنے لگے
جبیں دمکنے لگی رنگِ رخ نکھرنے لگے

کھلا ہے ابر کئی دن برس کے ساون کا
فلک پہ چھائی ہے رنگینیوں کی قوسِ قزح

پڑے ہیں باغ میں ہر سمت ریشمی جھولے
حرم سرا کے غزالوں کو جن کی لائی امنگ

تنا ہوا ہے کہیں شامیانۂ زریں
قناتیں گھیرے ہوئے جمگھٹے حسینوں کے

سمٹ کے آ گیا اس طرح سطحِ ارض کا حسن
کہ جیسے کھینچ لیا عطر خاص پھولوں کا

کسی کے چہرۂ نازک میں ارجمند کی شان
کسی کے نورِ جبیں میں ادائے نورجہاں

کسی کی مانگ سے شرمائے موتیوں کی لڑی
بنی بنائی ہوئی ہے کوئی جہاں آرا
کسی حسیں نے وہ ملہار چھیڑ رکھا ہے
پناہ مانگتا ہے آج تان سین کا فن
اُٹھی ہے رقص کو اک سمت اِک انارکلی
یہ ڈر ہے جاگ نہ جائے کہیں سلیم کی روح
نگاہ بھیڑ سے اُٹھ کر جو ایک سمت مُڑی
نورنگ و نور میں بے اختیار ڈوب گئی
کنارِ آب سے خوشبو کے ابر اُٹھے ہیں
ہجومِ ناز میں زیب النساء چمکتی ہے
نگاہِ وجد میں کیفِ صبیح چہرے پر
جبیں میں تاب جسے کہیئے آبروئے حرم
کنارِ حوض سے لٹکتے ہوئے گلابی پاؤں
قبولِ عکس سے گلرنگ حوض کا پانی
بیاض ہاتھ میں مسکر سخن میں کھوئی ہوئی
جبینِ صاف پہ ٹھہری ہوئی ملال کی گرد
نظر بچھائے ہوئے فکرِ شعر کی تمثال
اُبھرتے ڈوبتے تخیل کے حسیں پیکر
نظر اُلجھتی ہوئی آنکھ مسکراتی ہوئی
زباں پہ شعر ترنم سے گنگناتی ہوئی
"بیا بیا کہ مرا تابِ انتظار نماند
عنانِ دل زکفم رفت و اختیار نماند"
کہا یہ میں نے کہ اے آفتابِ صبحِ جمال
تری جبیں پہ بھی ٹھہری ہوئی ہے گردِ ملال
ترا بھی آئینۂ دل شکست سے نہ بچا
تری نظر کو بھی مایوسیوں نے گھیر لیا

جواب داد کہ ایں مرضیٔ مشیت بود
کہ پیشِ شمعِ محبت تمام عالم سوخت
کدام دل کہ پئے فتنۂ نگہ نہ رود
کدام دیدہ کہ آتش بخاکِ رہ نہ زدد
ز داغِ دردِ جدائی دلِ فلک سوزد
در آں زماں کہ دلے از دلے جدا گردد
نقودِ روشنیٔ دیدہ صرفِ دل کردم
ہنوز بر سرم آں بے وفا نمی آید
غمم زمانہ ندانم چہ مدعا دارد
کہ روز و شب بہ تکاپوئے قفائے ما دارد
ز دردِ دل بکہ گویم شکایت کہ کنم
کہ دشمنِ دل و جانم ہمیں نگاہِ من است
قسم بکعبۂ حاجات و احمدِ مرسل
کہ بے گناہیٔ من باعثِ گناہِ من است

یکی سے موچی تک

نصیر انور

"...... جو اجنبی صبح سویرے شہر کے دروازے میں داخل ہوگا؛ وہی ہمارا بادشاہ ہوگا......"

—لیکن لاہور کے تیرہ دروازوں میں کوئی بھی دروازہ ایسا نہ تھا جو صبح سویرے داخل ہونے والے کسی اجنبی کو تخت و تاج کا مالک بنادے۔ بادشاہت قائم کرنے کے لئے جس کسی نے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اسے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ شمال سے مغل حملہ آور ہونے تو لاہور کے ایک بزرگ پیر زکی نے آزادی کے تحفظ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ یکی دروازے کے باہر ہی حملہ آوروں نے اُن کا سر تن سے جدا کر دیا۔ مگر اُن کی روح برسرِ پیکار رہی۔ ان کی جانبازی کا ثبوت آج بھی زندہ ہے۔ اسی دروازے کے باہر ان کے دو مزار ہیں۔ ایک مزار ان کے سر کا اور دوسرا دھڑ کا ہے۔ اُنھیں اُسی جگہ دفن کیا گیا تھا جہاں وہ گرے تھے۔ اسی زندہ ثبوت کو برقرار رکھنے کے لئے اس دروازے کا نام انہی کے نام پر زکی دروازہ رکھا گیا۔

پھر یہی زکی دروازہ زبان کے الٹ پھیر سے یکی دروازہ کہلانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ زمانے نے بھی ایسا پلٹا کھایا کہ دروازے کے اندر رہنے والوں نے اجنبی حملہ آوروں کے لئے شہر کے دروازے تو بند رکھے لیکن اُن کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے۔ انہی دروازوں سے جھانک کر شیر شاہ سوری نے یہ کہا تھا۔ کہ لاہور کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔

شیر شاہ سوری کی یہ بات جذبیے والوں نے بھی سن رکھی تھی اور جب اُن کا دور آیا تو پورا لاہور انگریزی راج کی برکتوں سے نیست و نابود ہو رہا تھا۔ یہ تباہی لاہور کے دروازوں کی نہیں تھی۔ عمارتوں کی نہیں تھی، جذبۂ آزادی کی تھی۔ اُس روح کی تھی جس کی یادگار یکی دروازے سے باہر تھی۔ وہ زندہ یادگار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ تو سر فروشوں نے اپنے ہی آپ سے بیگانہ ہو کر غنڈوں کا روپ اختیار کر لیا۔ جرأت و جوانمردی کی جاندار تصویریں انگریز کے ہاتھوں گھناؤنی اور ڈراؤنی بنتی گئیں۔ یہ تصویریں اپنی ہی مسخ صورتیں تھیں، اپنے ہی لوگوں کی جنہیں دیکھ کر اپنے ہی لوگ دہل جاتے تھے۔ لاہور کے ہر گلی کوچے میں کوئی نہ کوئی غنڈہ ضرور ہوتا تھا ایک محلے کا غنڈہ دوسرے محلے کے غنڈے کو نیچا دکھانے کے لئے آکر ٹکراتا تھا۔ باہمی دنگا فساد معمول بن چکا تھا۔ مگر ایک بات تھی کہ ہر غنڈہ اپنے محلے کی عزت و ناموس کا محافظ ہوتا اور وقت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دیتا۔

غنڈہ گردی کے اس دور میں وہ زمانہ بھی آیا جب استاد ...... کی بادشاہت قائم ہوگئی۔ تو موچی دروازہ پورے ہندوستان میں بدنام ہوگیا۔ لاہور سے باہر کے لوگ یہی خیال کرتے کہ موچی دروازے کے رہنے والے سبھی غنڈے ہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ غنڈہ فقط ایک تھا، اور وہ بھی غنڈہ کہاں تھا۔ وقت ہی ایسا بُرا آگیا تھا۔ کہ اس نے اپنی تمام خوبیوں کو برائیوں میں بدل دیا تھا۔ مگر محلے والے ان برائیوں سے محفوظ تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے محلے کا محافظ تھا۔ اُس کی بیٹھک اس کا دربار تھی جہاں وہ سینہ تان کر بڑے طمطراق سے یوں بیٹھتا جیسے سلطنت کا نظام اُسی کے دم سے چل رہا ہے۔ جیسے ساری خدائی اس کی مٹھی میں ہے۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، بارعب چہرہ، تیز اور چمکیلی آنکھیں، استاد سے کون آنکھ ملا سکتا تھا۔ بڑے دبدبے کا مالک تھا۔ اُس کے دربار میں بڑے جی دار لوگ شامل تھے۔ ایسے لوگ جو اپنی اپنی جگہ بڑے دہشت ناک تھے۔ مگر استاد کے سامنے دو زانوں ہو کر یوں بیٹھتے جیسے بھیڑ کے معصوم بچے ہوں۔ استاد نے ان لوگوں کو تین گروہوں میں

تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ جیب تراشوں کا تھا۔ اس گروہ میں بڑے باکمال جیب تراش تھے۔ نوعمر آوارہ لڑکے بھی ان میں شامل تھے۔ لاہور کے بارونق علاقوں، منڈیوں، لاریوں کے اڈوں اور ریلوے سٹیشن پر جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے سیدھے بیٹھک میں پہنچ جاتے۔ کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ لوٹی ہوئی رقم میں سے کچھ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لے۔ سب کا سب جوں کا توں پورا مال استاد کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا۔ اور استاد ہر ایک کو اس کے کارنامے کے مطابق معقول معاوضہ ادا کر دیا کرتا۔ دوسرا گروہ جوا خانہ چلانے والوں کا تھا۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ جوا خانہ چلتا رہے۔ جواری نہیں آئیں تو انہیں لایا جائے۔ اور حتی الوسع یہ کوشش کی جائے کہ دولت مند لوگ آئیں اور جیت پر اپنا کمیشن وصول کرتے رہیں اور اس کمیشن کا حساب کتاب ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ ان احکامات کی خلاف ورزی کی جرأت کسے تھی۔ جوا خانہ خوب چلتا رہا۔ تیسرا گروہ لڑنے مرنے والوں کا تھا۔ یہ دراصل استاد کی فوج تھی۔ جس میں وہی لوگ شامل تھے جنہیں استاد کے اشارے پر موت کا سامنا کرنا ہوتا۔ پولیس سے مقابلہ، مخالفین سے جھڑپیں، بزنس کے سارے معرکے سر کرنا انہیں لوگوں کے ذمے تھا۔ اور وہ اپنی ذمہ داری کو نبھانے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہ کرتے۔ استاد جس سمت اشارہ کر دیتا، وہ بھوکے شیروں کی طرح اس طرف جھپٹ پڑتے مگر استاد خون خرابے کا قائل نہ تھا۔ لڑائی جھگڑوں سے پہلے وہ اپنے ان فوجیوں کو مار کٹائی کے خاص گر بتا دیا کرتا جس سے مار کھانے والا شدید زخمی ہو کر بھی اپنی جان سے محروم نہیں ہو سکتا۔ مار کٹائی اس حد تک گوارا تھی کہ رعب داب قائم رہے اور کسی کو اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ رہے اور اس کا رعب لاہور کے تمام غنڈوں پر طاری تھا۔ استاد کا یہ حکم تھا کہ لاہور کے تمام جوئے خانوں سے میرا حصہ وصول کیا جائے۔ انہی دنوں قریب قریب ہر محلے کے غنڈے نے اپنی بیٹھک کو جوا خانہ بنا رکھا تھا۔ ان جوا خانوں کے مالکوں نے استاد کے حکم پر اس کے جانباز سپاہیوں کے آنے سے پہلے ہی خود بخود ایمانداری سے استاد کا حصہ پہنچانا شروع کر دیا اور اس طرح پورے لاہور میں استاد کی دھاک بیٹھ گئی اور اس کی بادشاہت قائم ہو گئی۔

اپنی بادشاہت قائم کرنے سے پہلے اس نے انگریزی پولیس سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ چنانچہ پولیس کے کئی سپاہیوں تھانے داروں اور دوسرے کئی افسروں سے اس کا رابطہ تھا۔ اپنا نظام چلانے کے لئے اس نے سرکاری نظام چلانے والوں کو خرید لیا تھا۔ اکثر سپاہی تھانے دار اور دوسرے افسر اس سے باقاعدہ تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ اور علاقے کا جو تھانیدار اس کا تنخواہ دار نہ بنتا، اُسے وہ اپنے اثر و رسوخ سے کہیں اور تبدیل کرا دیتا۔

استاد بڑا زمانہ شناس تھا۔ ہر مسئلے کا حل اُسے فوراً سوجھتا۔ ہر مہم میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا۔ بڑی سے بڑی الجھن کو فوراً سلجھا دیتا۔ دور کی کوڑی لانے میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ ہر بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا۔ استاد کو گرد و پیش کے ماحول کا پورا پورا احساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ جس زندگی کا مالک ہے، اُسے کامیاب بنانے کے کون سے طریقے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سزا یافتہ لوگوں کو کبھی بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اُن پر ان کی باقی زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ ایسے سزا یافتہ لوگوں کے لئے استاد نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو قیدی لاہور جیل سے سزا پوری کر کے رہا ہو جائے۔ وہ سیدھا اس کے ڈیرے پر آئے۔ کھانا، کپڑا، رہنے سہنے کو جگہ اور جیب خرچ استاد کی طرف سے ملے گا۔ کئی قیدی رہائی کے بعد سیدھے اس کے پاس پہنچ جاتے۔ بہت سے اس کے گروہ میں شامل ہو جاتے اور جو واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے، استاد انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کرتا۔ اور منزل مقصود تک کا ٹکٹ دے کر ان سے کہتا تمہاری اچھی اور کامیاب زندگی کا متمنی ہوں۔ اور اگر دنیا نے اس زندگی کو بہتر اور کامیاب بننے میں رکاوٹیں پیدا کیں تو پھر میرے اس ڈیرے پر

چلے آنا۔ اس کے دروازے ہر وقت تمہارے لئے کھلے ہیں۔

استاد کے ڈیرے کے دروازے غنڈوں، بدمعاشوں اور سزا یافتہ مجرموں کے لئے ہی کھلے نہ تھے۔ یہ دروازے تو سب کے لئے کھلے تھے۔ حاجت مندوں، یتیموں اور بیوہ عورتوں کے لئے بھی جنہیں وہ باقاعدہ ہر ماہ اُن کی ضرورت کے مطابق نقد روپے دیا کرتا تھا پھر یکایک ایسے تمام لوگوں کو اس نے ایک دن اپنے ہاں آنے سے روک دیا۔ لوگ حیران تھے کہ استاد کو کیا ہوا کہ جن ضرورت مندوں کی دعاؤں سے وہ مالا مال ہوا ہے۔ انہی غریبوں کو آنے سے روکتا ہے مگر استاد کے دل کی بات بعد میں دوسروں نے سمجھی۔ استاد کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ خیرات کی نمائش کرے ——— اس نے اپنے شاگردوں سے کہا "نیکی چھپ کے کرو اور گناہ سب کے سامنے" ۔ اپنے اسی قول کو پورا کرنے کے لئے گنہگار استاد حاجت مندوں سے نیکی کا سامان پیدا کرتا رہا۔

لاہور میں دنگل ہوتے تو باہر سے آنے والے کئی پہلوان استاد کے مہمان ہوتے۔ پہلوانوں سے کہا کرتا کہ تم لاہور آئے ہو۔ لاہور میں میں ہوں اس لئے میرے پاس رہو گے۔ اور رہنے والے جب تک اُس کے پاس رہتے وہ ان کی خاطر مدارت یوں کرتا جیسے کوئی نواب راجہ یا بادشاہ کرتا ہے۔ بلکہ وہ بادشاہوں سے بڑھ کر تھا۔ بادشاہ تو رسماً مہمان نوازی کا سکہ جماتے ہیں۔ مگر استاد بڑے خلوص اور انکساری سے مہمانوں کی خدمت کرتا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ مہمانوں سے برکت ہوتی ہے اور وہ گھر بڑا برکت والا ہے جہاں مہمان آئیں۔

پھر وہ دن بھی آئے جب ؎

مصطفیٰ پاڑشاہاں دے تسیے رہاں دور بلائیاں
رو ندے مرزادے بال وے تکتے دبہلں لائیاں

فیروز الدین احمد جلوس کے آگے آگے ترکی کے لئے چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔ پورے لاہور نے دل کھول کر چندہ دیا یہاں تک کہ عورتوں اور نئی نویلی دلہنوں نے بھی اپنے زیورات چندے کے لئے پھیلی ہوئی چادر میں پھینک دیے تحریکِ خلافت کی کامیابی کے لئے لاہور میں سب سے پہلا جلوس موچی دروازے سے نکلا۔ فیروز احمد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا تو عدالت نے اسے بیس سال کی سزائے قید دی۔ آخر اس نے رہائی کی عجیب و غریب ترکیب نکالی۔ یوں تو کئی رضا کار بلکہ رہنما تک معافیاں مانگ کر رہا ہو چکے تھے۔ مگر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پاگل بن جاؤں۔ چنانچہ اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جسے کوئی بھی فرزانہ اور ہوش مند کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے بیت الخلائی غلاظت سے جیل کی دیواروں پر انٹ شنٹ لکھنا شروع کر دیا۔ جیل والوں نے زچ ہو کر قیدی کو مریض بنا کر پاگل خانے بھجوا دیا۔ وہاں وہ کوئی نو ماہ تک رہا۔ اس کے بعد اس کے والد نے درخواست دی کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی پاگل۔ اس کی سزا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب کہ ہوش و حواس کا مالک ہی نہیں۔ اس لئے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ حکومت نے سزا منسوخ کر دی۔ چند دنوں کے بعد فیروز الدین احمد پاگل خانے سے بھی آگیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس نے پاگل بن کر سب کو پاگل بنا دیا۔

شیرانوالہ دروازہ جو مغلوں کے عہد میں خضری دروازہ کہلاتا تھا۔ یہی دروازہ جہاں کبھی دریا بہتا تھا۔ اور جس کی مناسبت سے اسے خضری دروازے کا نام دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں شیرانوالہ دروازہ بنا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی ہیبت طاری کرنے کے لئے اس کے دونوں طرف اپنے دو پالتو شیر پنجروں میں رکھ دیئے تھے۔ اور اسی لئے لوگوں میں اس کا نام شیرانوالہ دروازہ مشہور ہو گیا اس دروازے کے رہنے والے بابو کے نام سے کون واقف نہیں۔ پورے ہندوستان میں وہ "کوکین کا بادشاہ" کے نام

سے مشہور تھے۔ ان کی زندگی سنسنی خیز واقعات سے بھرپور ہے۔ بیسیوں مرتبہ انہوں نے بڑی دلیری سے مسلح پولیس کا مقابلہ کیا۔ مگر ان تمام مقابلوں سے کہیں زیادہ انہیں اپنے اس مقابلے پر ناز ہے جو محلے کی عزت و ناموس کے لئے نام نہاد غنڈوں سے کیا تھا۔

بابو نے جوانی میں کوکین فروشی کا آغاز کیا تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک طویل کہانی ہے۔ یہ کہانی اپنے انجام تک سینکڑوں واقعات سے بھرپور ہے۔ کوکین فروشی کے باوجود پولیس اپنی انتہائی کوشش کے باوجود انہیں گرفتار نہ کر سکی۔ بابو ہمیشہ اپنی حکمت عملی سے بچتے رہے۔ پولیس نے ہزاروں مرتبہ چھاپے مارے مگر ہمیشہ ناکام رہی۔ ایک بار پولیس کو مخبری ہوئی کہ بابو کوکین لئے کار میں راوی کے پل پر سے گزرنے والے ہیں۔ راوی کے پل پر راستہ روکنے کے لئے پولیس نے بیل گاڑیاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ بابو مزے سے لاہور کی جانب آ رہے تھے۔ کہ یکایک راوی کے پل پر انہوں نے اپنی کار میں سے یہ سارا نقشہ دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ پولیس ان کے قریب آتے، انہوں نے ساری کوکین دریا میں پھینک دی۔ پولیس سے تصادم ہوا۔ مگر کچھ نہ برآمد کر سکی پہلے کی طرح جعلی کیس رجسٹر کر لیا مگر کوکین کا بادشاہ صاف بری ہوا۔ کئی بار انہیں جھوٹے مقدموں میں ملوث کیا گیا۔ مگر وہ ہمیشہ صاف بری ہوتے رہے۔

یہاں کے غنڈوں کی ہر ٹولی غنڈوں کی ٹولی نہیں تھی، بھٹکی ہوئی بے پناہ قوت تھی جو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے قوت بازو نہ بن سکی۔ ان غنڈوں کے سینوں میں عزائم کی بجلیاں تھیں۔ مگر کوئی بجلی ایسی نہ تھی جو غیر ملکی حکومت کے ایوان پر گرتی۔ جب بھی گری تو اپنا ہی نشیمن خاکستر پایا۔

سوختہ سامانی کے دور میں وہ دن بھی آیا جب انگریزوں کو نکالنے کے لئے دہلی دروازے کے باغ میں عام جلسے ہونے لگے اور دہلی دروازے کے اندر چوہٹہ مفتی باقر میں دودھ ملائی کی دکان کے سامنے معراج دین پنساری کی دکان پر سیاست کی بساط بچھنے لگی ہر کوئی اپنے خیال کے مطابق اپنی تحریک کے فیل و پیادہ کی چال پر تبصرہ کرتا۔ یہی تبصرے سینہ بہ سینہ دوسرے دروازے کے رہنے والوں تک پہنچے۔ گلی کوچوں کی ہواؤں میں آزادی نے سرگوشی کی تو زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ حکمران کے خلاف عام نفرت پھیل گئی۔ بہت سے انتہا پسند انگریز سے اتنے متنفر ہوئے۔ کہ وہ انگریزی زبان، انگریزی لباس اور انگریزی اطوار کے بھی دشمن ہو گئے۔ ایسے لوگ بھلا سرکاری ملازمتوں میں کیوں کر رہ سکتے تھے۔ خود ہی الگ ہو گئے یا الگ کر دیئے گئے۔ تحریک خلافت کا یہ اثر تھا۔ کہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر اسلامی ملک کا درد اپنا درد محسوس ہونے لگا مگر یہ احساس اپنے درد کا مداوا نہ بن سکا۔ بہت سی مسجدوں کے امام اور پیر حاکم وقت کی "مقدس نمائندگی" پر مامور کر دیئے گئے۔ سجدہ ریز ہو کر "ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اور تیری ہی پرستش کرتے ہیں" کہنے کے باوجود وہ سرکاری فرشتوں سے امداد لیتے رہے اور حاکم وقت کی پرستش کرتے رہے۔ آزادی کی تحریک نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ مہا سبھائی ہندوؤں کے تعصب نے اس تحریک کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور جب ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو وادی کشمیر میں قرآن مجید کی توہین کی گئی اور غازی عبدالقدیر نے نعرۂ حق بلند کیا تو مجلس احرار نے لبیک کہی اور دہلی دروازے کے باہر دیگیں چڑھا دی گئیں جن میں کھولتے ہوئے پانی میں سرخ رنگ ملا دیا گیا تھا۔ لاہور کے تمام دروازوں کے مسلمان باشندوں نے انہی دیگوں میں اپنی قمیضیں ڈبو کر سرخ کر لیں۔ پورا لاہور احرار کی سرخ دیگ میں ڈوب کر فلک شگاف آواز میں پکار رہا تھا۔

اٹھو اٹھو مومنو رخ کرو کشمیر کا
راج کر تباہ کر دو ڈوگرے بے پیر کا

لاہور کے ہر دروازے نے سرخ قمیضوں کا ٹھاٹھیں مارتا سیلاب دیکھا۔ مجلس احرار کا یہ سرخ سیلاب وادیٔ کشمیر کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آیا تو مسجد شہید گنج سے دور مجلس احرار کے دفتر میں سمٹ گیا اور جب مسجد شہید گنج شہید کر دی گئی تو اس وقت مجلسِ احرار اسی کے ملبے کے نیچے ڈھیر ہو گئی۔ ملبے کے اس ڈھیر پر نئی جماعت پیدا ہوئی۔ فضا میں ایک اور آواز گونجنے لگی۔

نہ مسلماناں نوں چھیڑ دے اسے دبی ہوئی نار اے

مولا بخش شہید گنج کی تحریک کا بانی تھا۔ اس نے اس تحریک کا آغاز کرتے ہوئے شاہی مسجد سے ایک جلوس نکالا ٹھاٹھیں مارتا ہوا یہ جلوس دہلی دروازے پہنچا تو دہلی دروازے نے اپنے آغوش میں کئی مسلمانوں کو گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے چھلنی ہوتے دیکھا۔ بوچھاڑ کے ختم ہونے پر تھوڑے سے ہی دنوں میں اس تحریک نے بھی دم توڑ دیا جیسے مخلص اور معصوم انسانوں کا خون بہانا ہی مقصود تھا۔

معراج دین پنساری کی دکان پر اپنے چنے ہوئے مہروں کو سیٹتے ہوئے "گنگا بیٹی" کے ایک رکن نے کہا "رمجن یہ ہندو تو اپنے دشمن تھے ہی، اب سکھ بھی ہو گئے۔ دادمیاں سرفضل حسین، جواب نہیں تیری چال کا!!"

کچھ دنوں بعد دہلی دروازے کے باغ میں ایک نئی تحریک چھوٹی۔ اس تحریک کے بانی مولانا ظفر علی خاں مرحوم تھے اس کا نام انہوں نے "نیلی پوش تحریک" رکھا۔ شیرانوالہ اور دہلی دروازے کے درمیان محلہ گنگے زیاں میں یہ تحریک نیلی جھنڈیوں کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ پھر موچی دروازے کے اندر حویلی میاں خاں کے دروازے کے سامنے ہی ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خاں نے کہا "ہمیں اس تحریک کو لاہور ہی میں نہیں پھیلانا وہ دن قریب آ رہا ہے جب یہ نیلی جھنڈیاں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں لہراتی نظر آئیں گی۔

مگر اُس وقت پوری دنیا تو ایک طرف لاہور کے کسی دروازے میں یہ جھنڈی دکھائی نہ دی بیسیوں تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے کے بعد لاہور کو جیسے قرار آ گیا تھا اور وہ حسبِ معمول اپنے حال میں مست رہا۔

"بلا مار کے بجھا گئی دیوا نے اکھ نال گل کر گئی چھنّی"

دلاری بائی کی چھنی کے ساتھ ساتھ بھائی چھیلا پٹیالہ والا کے گراموفون ریکارڈ بھی عوام میں بے حد مقبول تھے۔

"مارو مارو سہیلیوں ٹھنو سے نوں ...."

"آہا ہا ہا ہا، بھنگ کا لوٹا ......"

اور پھر یہ تھے بھی ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔

"یوسف پھل گلاب دا ڈھٹا میں چمن دے وچ"

"سولی چڑھ منصور پکارے مل دے عشق ہلارے نی"

"ڈھول جانی، ساڈی گلی آویں تیری مہربانی"

"ڈھول میرا دسے گھر پٹھی دی لوڑ"

"بازار وکیندی برفی، سانہوں لے دے نکی جہی پوڑی، تے دکھاں دیاں پونیاں لے دے ڈھولا"

"ہے جانو جتھے رل کے گلاں کیتیاں، او تھے سکھ دا پے گل تے"

"خصماں نوں کھا گیا گھر دے پل ہیلے تے پچھے"

"میں انگریزی پڑھ گئی آں اتا رگل وچ وڑ گئی آں"

"نیلین ایل رَن وہاں کرتو تاں" "تخلیق دا سیاپا" "یوسف زلیخا" "ککھی دا بارہ ماہ پانی" اور ایسے ہی بیسیوں منظوم قصے جگہ جگہ بکتے تھے۔ بیچنے والے گا گا کر ان قصوں کو پیسے پیسے اور دو دو پیسے میں بیچتے پھرتے۔ گلی کوچوں سے باہر موچی دروازے کے باغ میں بڑے بوڑھے مو سیقی دو زنگار نوجوان "اصلی سے وڈی" "ہیر وارث شاہ" سننے میں محو ہوتے۔ لوہاری کے باغ میں "بہرام ڈاکو عرف قاتل حسینہ" اور "حیدر عرب عرف طلسمی تلوار" جیسے ناول سننے کے لئے صبح سے شام تک لوگوں کی محفل جمی رہتی۔ دوسری طرف شاہ محمد غوث کے باغ میں بہترین چوسر کھیلنے والے جمع ہو جاتے۔ اور شطرنج کے بہترین کھلاڑی بھاٹی کے باغ میں شطرنج کے چونسٹھ خانوں میں یوں گم ہوتے جیسے ان خانوں سے باہر دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے لوگ کہتے یہ کھیل نہیں خانہ خراب تختہ ہے۔ اس پر جو آیا اسی کا تختہ ہوا۔ مگر اسی تختے پر چند لوگوں نے نام پیدا کیا اور اپنا خانہ بھی آباد رکھا۔ ان میں اکرم گھڑی ساز، شریف حسین سہروردی اور افضل ولی نمایاں ہیں۔

ایک اور نامور بازار تبز بیان کا دنیا کفنی ہے مگر وہ شاطر نہیں، اپنے وقت کے بہترین پتنگ بازوں میں سے ایک ہے اپنے پتنگ خود بناتا کیونکہ پتنگ بازی کے لئے بنے بنائے کنکوے اور پتنگ خریدنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس کی بیٹھک میں کئی پریاں اور دیو طلائی ہار پہنے دیوار پر آویزاں تھے۔ نیلم پری، لال پری، سبز پری، کالا دیو، نیلا دیو۔ اور وہ خود راجہ اندر بن کر ان سب کو بڑے فخر سے دیکھتا۔ ہر پتنگ اور ہر کنکوے کا اپنا نام اور اپنی تاریخ تھی۔ کب بنا، کس سے پیچ لڑے اور کتنے بوکاٹا کئے۔

دنیا کفنی اچھ فٹ سے زیادہ قد لمبا، شحیم، ہنس مکھ، ملنسار، مزے لے لے کر دوستوں کو بڑے بڑے پتنگ بازوں کے قصے سناتا افضل خاں کا نام بڑے احترام سے لیتا۔ افضل خاں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کُپ بنانے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ کُپ یوں بناتا کہ پہلے تتلیاں تراش لیتا اور انہیں درمیان میں سے توڑ دیتا۔ پھر اس کے بعد تری کا نیلی گوری سے اُسے جوڑتا اور کاغذ منڈھتا۔ اس طرح جو کُپ بنتا تھا وہ آج ناپید ہے۔ افضل خاں اپنا کُپ کٹ جانے پر واپس لانے والے کو پانچ روپے انعام دیا کرتا تھا۔

لاہور کے نامور پتنگ بازوں میں استاد ماموں، استاد جلال الدین، استاد پیر بخش اور چودھری بسا بڑے نامی گرامی ہیں۔ ان استادوں نے پتنگ بازی کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ ان استادوں نے بیسیوں شاگرد ہر جمعہ اور اتوار منٹو پارک میں پتنگ بازی کے جوہر دکھاتے اور یہ جانبدار استاد ریفری کے فرائض سرانجام دیتے کہ کوئی پتنگ باز اپنی جگہ سے غلط نہ ہلے اور کوئی غلط ہاتھ نہ مارے۔"

استادوں میں پیر بخش پتنگ بناتے اور پیچ میں اپنی مثال آپ تھے۔ لمبے پیچ لڑانے تھے اور اُن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اُن کے پیچ دوسری سلطنتوں تک جا پہنچتے تھے۔ جب پتنگ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ تو وہ "گھر" کے انداز سے پیچ لڑاتے تھے۔

استاد جلال تو اس فن کے عاشق تھے۔ انہوں نے اس عشق میں اپنی ساری جائیداد ہوا میں اڑا دی۔ وہ ڈھیل نہیں لڑاتے تھے۔ بلکہ کھینچ کے ماہر تھے۔ کُپ اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ اور اس پر مختلف رنگوں کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں چسپاں کر دیا کرتے تھے اور اُن کا کُپ آسمان پر یوں نظر آتا تھا جیسے کوئی فوجی جوان محاذ پر کھڑا ہے۔

استاد ماموں کا "ڈھیل" میں جواب نہیں تھا۔ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا۔ مگر جب سردار دیال سنگھ پتنگ اڑانے کا فن سیکھنے کے لئے استاد ماموں کا شاگرد ہوا تو پھر شاگرد ہی اپنے استاد کا سارا خرچ برداشت کرتا تھا۔ استاد ماموں کے

بنائے ہوئے پتنگوں کی خصوصیت یہ تھی کہ سو میں پچیس میل تک پیچ جانے پر ڈور ڈھیلی نہیں پڑتی تھی۔

"چودھری بسا بھی بڑے استادوں میں شامل تھا۔ اس کے چھپائی "پتنگ" مشہور ہیں۔ اُس کے شاگردوں میں نامور شاگرد جمعدار ابہ سردار بکرم سنگھ امرتسر والے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

پتنگ بازی کے زبردست معرکے استاد جلال اور استاد پیر کے درمیان ہوتے ہیں۔ استاد پیر اکیس پچیس گز کی گلابی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ استاد جلال پیر پرست تھے۔ اور وہ مقابلے کے وقت کسی نہ کسی پیر یا درویش کو اپنے ساتھ لاتے۔ ان دونوں استادوں کی رقابت اس حد تک بڑھی کہ دونوں تباہ ہو گئے۔ سارا اثاثہ پتنگ بازی میں ہوا ہو گیا اور آخر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی جیسے لوگ منتظر تھے۔ کہ وہ کب تباہ و برباد ہوں تو ہم دونوں کو گلے ملوائیں۔

" پتنگ بازی بغیر ڈور کے ممکن نہیں۔ ڈور لگانا بھی ایک فن ہے، وہ اس فن کا سب سے بڑا استاد صوبہ ہے۔ استاد صوبہ ڈور لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ موسم کے مطابق ڈور پر مانجھا لگاتا ..."

دینے کفنی نے استاد صوبے کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کہا "استاد صوبہ بہت بڑا استاد تھا۔ ایک بار کسی نے تلوار مار کہ ڈور استاد سے گڑوائی۔ پتنگ کٹنے پر اتفاقاً وہ ڈورا ایک بھینس کے گلے پر گری تو اس کی گردن تن سے جدا ہوتے رہ گئی لہولہان چیختی چلاتی غش کھا کر گر پڑی۔ اس کے بعد سرکار نے ایسی ڈور پر پابندی لگا دی۔

دینے کو کفنی کیوں کہتے ہیں، یہ بتانا ضروری ہے۔ کفنی اس لئے نہیں کہتے کہ وہ سر پہ کفن باندھے کسی معرکے پر گیا تھا۔ بلکہ ہوا یہ تھا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر وہ بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ مرنے والے کے ساتھ رونا دھونا سبھی کچھ ہوتا ہے۔ سبھی روتے دھوتے شام کے وقت اُس کو دفن کرنے کے لئے میانی صاحب لے جا رہے تھے۔ جنازہ کندھوں پہ اٹھائے جب عزیز و اقارب، دوست احباب اور محلے والے ہائی کورٹ کے پاس سے فین روڈ پر گزرے تو ایک شخص کندھا دینے کے لئے "کلمۂ شہادت" کہتا آگے بڑھا تو یکایک اس کے قدم رک گئے۔ اور وہ چیخ مار پیچھے ہٹ گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مردہ حرکت میں ہے۔ جنازہ وہیں سڑک پر رکھ دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دینا اٹھ بیٹھا اور کفن میں سے سر نکالتے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا "اوے مینوں کتھے لے جا رہے ہو، میرا حالی پیچ نہیں کٹیا گیا!"

دینا اسی طرح زندہ سلامت کفن میں لپٹا ہوا واپس آیا تو چاروں طرف خوشخبری پھیل گئی کہ دینا مرا نہیں، اس پر سکتہ طاری تھا۔ کفن میں لپٹے ہوئے دینے کو دیکھ کر ایک شخص نے بے اختیار کہا "او دینا کفنی۔"

بس اس کا کہنا تھا کہ دینے کا نام دینا کفنی مشہور ہو گیا۔

بسنت منانے کی تیاری پورے لاہور میں بڑے زور شور سے ہوتی۔ مہینوں پہلے ڈوریں گروائی جاتیں اور بسنت سے ایک روز پہلے مکان کی چھتوں پر دف، ڈھول، بگل، کنستر، ہاؤ ہو کا پورا سامان ہوتا۔ ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی سبھی جوش و خروش سے یہ موسمی تہوار مناتے۔ بسنت کی صبح لڑکے تاروں کی چھاؤں میں چھتوں پر جا پہنچتے۔ اور منڈیروں، ممٹیوں پہ کھڑے ہو کر، بوکاٹا کے پرشور نعروں سے سورج کا استقبال کرتے۔ سورنگ برنگی پتنگوں، کنکووں اور گڈیوں کے پیچھے سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا۔

ایک طرف لاہور کی ہر چھت پر پتنگ بازی کا شغل چراغ جلے تک جاری رہتا اور دوسری طرف منٹو پارک کے علاوہ منچلے پتنگ باز مادھو لال حسین کے مزار پر بسنت کے میلے میں اپنے ہاتھ دکھاتے۔ مادھو لال حسین کے مزار پر پتنگوں کا میلہ لگنے کی ایک خاص وجہ

ہے۔ حسین، جہانگیر کے عہد میں ایک درویش تھے۔ وہ شاہدرہ کے ایک ہندو لڑکے مادھو لال کو پیار کرتے تھے۔ اسی پیار نے دونوں کا نام ایک کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مادھو لال کو پتنگ اڑانے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ مادھو لال کے پاس کوئی پتنگ نہ رہا تو وہ دلگیر ہو گیا۔ حسین سے اپنے محبوب کی آزردگی نہ دیکھی گئی۔ وجہ پوچھی تو پتنگ کی فرمائش ہوئی۔ فقیر کے پاس پیسے کہاں تھے کہ فرمائش پوری کرتا۔ چنانچہ شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ کوئی اولاد کا طالب ہو، فقیر کے در پر ایک ٹکہ نذر کر آئے اور بیٹا پائے۔ اس طرح جتنے پیسے اکٹھے ہوئے ان سے مادھو لال کو پتنگ خرید دئے گئے۔ اسی یاد میں مادھو لال حسین کے مزار پر بسنت کا میلہ لگتا ہے۔

مادھو لال حسین کے مزار پر بسنت کے مقوڑے عرصے بعد مارچ کے آخری اتوار میلہ چراغاں کی دھوم ہوتی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ عقیدت کے نذرانے پیش کرتے، آرزوؤں کے چراغ روشن کرنے اور دوسری طرف میلے کے رسیا شالامار باغ میں زندگی سے بھرپور پاؤ ہو کے ساتھ یوں جمع ہوتے جیسے دونوں جہان کی خوشیاں ان کے چاروں طرف پھیل گئی ہیں۔ ان خوشیوں کا زیادہ احساس اُن کسانوں کو ہوتا جو فصلیں کاٹ کر جشنِ چراغاں میں دھوم دھڑکے سے شامل ہوتے۔ سکھ کسان شالیمار پہنچنے سے پہلے میٹھے مالٹے کی شراب روڑی بوتل میں لا کر پی پلا کر نشے میں دُھت بولیاں بولتے، اُچھلتے کودتے، لکڑی کے چوہے نچاتے ہیرا منڈی سے ہو کر آتے۔

یہاں سے وہ سیدھے مادھو لال حسین کے مزار پہ پہنچتے اور پھر اپنی تمام تر ہنگامہ آرائی کے ساتھ شالیمار میں قدم رکھتے جو زمین پہ ٹکتے نہیں تھے۔ شالامار میں نہ صرف ان کے لئے بلکہ سب کے لئے تمام دکانوں میں سے فقط ایک دکان باعثِ کشش ہوتی۔ اور وہ تھی بسم اللہ جان کی دکان۔ بسم اللہ جان پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ اپنے شوہر کے سامنے بیٹھی پان بیچتی تھی۔ دکان اور رہائش فلیمنگ روڈ پہ تھی اور اب بھی ہے۔ اس زمانے میں عرب ہوٹل میں بیٹھنے والے صحافی، ادیب اور شاعر بھی اسی سے پان کھاتے تھے۔ میلہ چراغاں پہ وہ شالامار اپنی دکان لگاتی تو رنگا رنگ ماحول میں دیہات سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی۔

یوں تو مقبرہ جہانگیر میں اس کے کچھ عرصے بعد بہار کا میلہ بھی لگتا مگر میلہ چراغاں ہی لاہور کا سب سے بڑا میلہ رہا۔ میلے کے رسیا رات بسر کرنے کے لئے قالین، دریاں، بستر اور چھولداریاں اپنے ساتھ لاتے۔ ایک طرف بریانی کی دیگیں چڑھی ہیں تو دوسری طرف تکے کباب مچھلی نان اور مرغ پلاؤ کی پلیٹیں خریدی جا رہی ہیں۔ کہیں طرح طرح کی مٹھائیوں کے مزے اڑائے جا رہے ہیں تو کہیں آلو چھولے، گول گپے، دہی بھلے چاٹ کے چٹخارے لئے جا رہے ہیں۔ ہفتے کی شام کو سورج نہیں ڈوبتا تھا بلکہ روشن گیسوں میں منتقل ہو کر رات بھر میلے کو جگمگاتا رہتا۔ فضا زندگی کے نغموں سے معمور رہتی۔ ایک طرف گھڑے بجے پہ کافیاں اور گیت ہوتے اور دوسری طرف طبلے اور ہارمونیم پہ غزلیں، گیت اور ٹھمریاں، گویا سب پہ چھٹے، ڈھول اور چمٹے کی لے پر گونجتی ہوئی بولیاں چھا جاتیں:

بلے بلے بلے ہو ——!!
اوئے میرے سوہرے نوں پوا دیو گھنگھرو
وہیڑے وڑدا کھڑاک نہ کرے

نی بلیے رو دیں گی چپیڑ کھا دیں گی
چپ کر کے گڈی وچ بہہ جا

بو گورے پیر سلیپٹ کا سے
منے گڈی وچوں لت ملکے

سے بیلے بیلے بو گڈی وچوں لت ملکے

اتوار کی رات تک یہ بولیاں رسمی تکلفات سے آزاد ہو کر انسانی جذبے کی ہر بات کھلم کھلا کہتی ہوئی کہیں دور دیہات کی فضاؤں میں گم ہو جاتیں اور پھر پیر کی صبح "پہلے پیر" کا میلہ شروع ہوتا۔ ــ عورتوں کا میلہ' ـــ جو ہر ماہ کے پہلے پیر شالامار میں منعقد ہوتا۔ اس میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی شریک نہ ہو سکتا تھا۔

عورتوں کے اس میلے کے علاوہ شہر میں بھی عورتوں کے دو میلے منعقد ہوا کرتے۔ ایک چلہ بی بیاں کا میلہ اور دوسرا پیر بودیاں والے کا۔ دونوں میلے لگاتار تین دن تک جاری رہتے۔ پہلا میلہ محلہ چلہ بی بیاں میں ہوتا۔ عورتیں سید واجد علی شاہ کی حویلی میں جمع ہوتیں۔ دکانیں ملے میں لگتیں۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے ہندو ہوتے۔ تیل کے تلے، لوچھولے اور تکے کباب والے مسلمان ہی ہوتے۔ دوسرا میلہ محلہ پیر گیلانیاں میں ہوتا۔ پیر صاحب کی بیٹھک کے ساتھ ہی ان کی بہت بڑی حویلی میں عورتیں جمع ہوتیں۔ دکانیں گلی کوچے میں لگتیں۔ پیر صاحب کی بیٹھک میں میلے کے دوران ہندوستان کے نامور گویّے حاضری دیتے اور گا کر ان سے دعائیں لیتے۔ دن کو گانے کی محفل بیٹھک میں اور شام کو اندر بڑے صحن میں۔

اس میلے کی گانے کی ایک محفل یاد گار ہے۔ روشن آرا بیگم بمبئی سے آئی تھیں۔ اپنے مسحور کن گانے کے بعد پیر صاحب کی دعائیں لیں تو ان کے بعد استاد بڑے غلام علی خاں نے اپنی 'کھماس' کا خاص رنگ جمایا۔ دعاؤں سے استاد کو بھی فیضیاب کیا گیا۔

پھر سب کی نگاہیں ننھی منّی سی دبلی لڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ دبلے سے گول چہرے پر چاہِ ذقن نمایاں تھا۔ اس نے اجازت پاکر ایک چنگ اٹھایا، اسے اپنے کندھے پر رکھا اور پیر رقص میں آکر سریلی آواز میں گانا شروع کیا:

شالا جوانیاں ماسنے آکھا نہ موڑیں پی ے

یہ فلمی گانا ختم ہوا تو پیر صاحب سید اصغر علی شاہ صاحب نے فرمائش کی" کوئی اپنے دیس پنجاب دا گیت سُنا!"

ننھی منّی فکر مند ہو گئی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اسے کوئی گیت یاد آگیا تھا۔ انتہائی خوشی میں لہک کر اس نے میٹھی اور سُریلی آواز میں گانا شروع کیا:

ساڈا دیس پنجاب پیارا اے
ایہہ سب دا راج دلارا اے

آواز میں سُریلی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، ساری محفل جھوم اٹھی اور جب اس نے یہ انترہ ادا کیا:

ایدی گڈی اسمان نے چڑھ جاسے

تو سُننے والوں کو یوں محسوس ہوا جیسے آواز کا ہر سُر سات آسمانوں کو چھو رہا ہے۔ اس جادو بھری آواز میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ پیر صاحب نے بے ساختہ ننھی گانے والی سے کہا" جا تیری گڈی اسمان تے چڑھ گئی اے۔۔۔!"

ننھی منّی جذبات سے مغلوب ہو کر پیر صاحب کے قدموں میں گر پڑی۔ انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ ننھی سی مغنیہ اس وقت بے بی نور جہاں تھی۔

اور آج وہی نور جہاں اب بھی جادو بھری آواز کی ملکہ ہے۔

پیر صاحب کی بیٹھک سے چار قدم در سے غلام احمد کا چھوٹا سا دواخانہ ہے جس کی نیپالی گولیاں "اس کے پڑھنے سے بندوں کا بھلا ہوگا" کے اشتہار کی بدولت ہندوستان بھر میں بکتی رہیں۔ اسی محلے میں ایک صاحب "اسلام موتی" گذرے ہیں۔ اسلام موتی کے زمانے میں ہندوؤں میں ایک شخص رام موتی تھے۔ کسرتی بدن، جسمانی طاقت کے ایسے مظاہرے کئے کہ شکتی کے اوتار مانے گئے۔ ان کے مقابلے میں اسلام موتی خم ٹھونک کر آئے۔ جسیم و جان میں رام موتی سے زیادہ طاقت ور۔ اپنے سینے پر بڑے بڑے ہتھوڑوں کی ضربوں سے بڑے بڑے پتھر تڑواتے۔ دائیں بائیں، مخالف سمت کی جانب رسہ کھینچنے والے چار چار آدمیوں کو درمیان میں رہ کر ایک ہی جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ لیتے۔ بے پناہ طاقت کے ان مظاہروں کی کامیابی کے ساتھ ہی جانے کیا سوجھی کہ دوا فروشی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ہزاروں روپے کمائے اور پھر اس راہ پر چلنے والوں نے طاقت کے مظاہرے تو نہ کئے البتہ "مجمع گیری" کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ان میں کوچہ ساودھواں کے عبدالرحیم مرحوم اور محمد حسین مرحوم قابل ذکر ہیں۔

لاہور کے گلی کوچوں میں اکثر ان کی باتیں ہوتیں۔ تھڑے پر بیٹھے ہوئے لوگ دوا فروشوں سے لے کر ایمان فروش لیڈروں تک کا ذکر کرتے۔ کہیں فیض باغ کے 'رب' کا بھی ذکر ہوتا۔ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور جس کے ہاں کی حوریں اور غلمان بھی تھے اور آخر وہ 'رب' جعلی نوٹ چھاپنے کے جرم میں دھر لیا گیا۔ کہیں علونٹ کے قصے بیان ہوتے کہ "واہ یار! رب کے اس نے کمال ہی کر دکھایا۔ علونٹ شیطان بن کر ایک طرف کونے میں دبک کر بیٹھ رہا۔ سامنے بڑے تخت پر گز بھر لمبی داڑھی والا خدا بیٹھایا جو غصے میں فرشتوں پر گرجتا اور برستا ہے۔ پوتھیاں کھلی ہیں۔ فرشتے پڑھتے اور ایک ایک نام گننے میں مصروف ہیں۔ مگر کہیں وہ نام نہیں ملتا جس کے خلاف خدا جلال میں ہے۔ آخر غیض و غضب کے عالم میں خدا نے کہرام برپا کرتے ہوئے کہا "جب میں نے اس نبی کو نہیں بھیجا تو پھر کس نے بھیجا ہے ـــ کون ہے وہ ـــ؟" ـــ اس پر علونٹ شیطان کے روپ میں آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "اے خدا! تو نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں بھیجے تو میں نے اف تک نہ کی۔ اور میں نے فقط ایک ہی بھیجا ہے تو تیری خدائی خطرے میں آگئی!!" ـــ کسی اور محلے میں ... شاہ کے فلک شگاف گانے پھوٹ کر دوسرے محلے کے در و دیوار سے ٹکراتے تو سب کے سب وہیں پہنچ جاتے جہاں کسی دکان کے تھڑے پر موتی شاہ لوگوں کی فرمائش پوری کر رہا ہے۔ موتی شاہ درویش صفت، حاضر جواب، ضلع جگت میں مراثی بھی اس کا دم بھرتے ہیں۔ گانے کے ساتھ ساتھ اپنی باتوں سے ہر محلہ کو زعفران زار بناتا کہیں اور پہنچ جاتا۔

ہر محلے کا ہر تھڑا اپنے محلے کے گرم حمام کی طرح اپنے پورے محلے کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر ہوتا۔ تھڑوں پر یا گرم حماموں میں ہنسی مذاق، دکھ سکھ، دنگل، الیکشن، مہنگائی، سودے، سیاست، سکینڈل، ہر قسم کی باتیں ہوتیں۔ ان باتوں میں چوہنے منڈی کے خلیفہ کے کباب اور مسجد وزیر خاں کی مچھلی کا بھی ذکر ہوتا۔ لوگ استاد گام کی شاعری پر بھی تبصرے کرتے۔ استاد عشق لہر اور استاد ہمدم سے کہیں زیادہ استاد گام عوام میں زیادہ مقبول تھا۔ ہمیشہ فی البدیہہ شعر کہتا اور اگر کسی نے مکرر کہہ دیا تو وہ سرے ہی سے شعر بھول جاتا۔ ان پڑھ تھا اور بازار سر یانوالہ میں کباب کی دکان کرتا تھا۔ ایک مشاعرے میں سٹیج پر پہنچا تو لوگوں نے آوازے کسے۔

"کہاپیا، وے، کہا پیا اوے . . . . " مگر استاد بڑے اطمینان سے کھڑا رہا اور قدرے توقف کے بعد لوگوں سے یوں مخاطب ہوا:

کوئی دودھ دیکھے، کوئی دہی دیکھے
کوئی بیٹھ تندورتے اَن دیکھے
لوک کندے نے گام کہاپیا اے
اے کہاب تے ویکھے تے تُن دیکھے!

تُن کی آواز پر فضا میں قہقہے پھوٹ پڑے اور پھر کسی کو ٹوکنے یا آواز کسنے کی جرأت نہ ہوئی۔

استاد گام کی دوستی تاجی لنگے کے ساتھ تھی۔ تاجی لنگا مریل سا تھا۔ آواز میں درد تھا۔ چرس کے نشے میں ہارمونیم پر کافیاں سناتا تو اس کی دردبھری آواز سے پورے ماحول پر افسردگی طاری ہو جاتی۔ لاہور کے کسی تکیئے میں چلے جایئے۔ کسی نہ کسی وقت تاجی دم لگا کر پُرسوز ویرانیاں پھیلاتا ہوا ضرور دکھائی دیتا۔ تاجی کے علاوہ ان تکیوں میں دوسرے لوگ بھی ہیں۔ آیئے ذرا ان سے مل لیں ۔

موت سُلفے کی لاٹ میں دھواں بن کر ہڈیوں کے ڈھانچے میں پھیلتے ہی پھیپھڑوں میں سمٹ گئی تو گامی نے کھانستے ہوئے زور سے نعرہ لگایا "بل بل بلی، کُل بلا ٹلی!"

تکیئے میں بیٹھ کر گامی اور اس کے ساتھی اپنی بلاؤں کو اسی طرح ٹالتے ہیں، لیکن یہ بلائیں پھر بھی نہیں ٹلتیں۔ سستی، کاہلی بے زاری اور مردنی سب پر طاری ہے۔ کسی کے جسم میں زندگی کی رمق، ہماہمی، جوش، خروش، جذبہ اور ولولہ نہیں۔ بھوبا چلم سے چرس کے ہر بلبے میں اپنے ہر غم کو دھواں بنا کر اڑانے کی مسلسل اور ناکام کوشش میں انہوں نے اپنی زندگی کو فقط ایک سانس کی نازک ڈوری بنا رکھا ہے۔ یہی ڈوری تار بن جاتی ہے۔ اسی تار کو وہ یوں چھیڑتے ہیں کہ اداسیاں، مایوسیاں اور نامرادیاں سمٹ کر وہ نام بن جاتی ہیں جس سے تار ملانے کے لئے چرس کے بلبے اٹھائے جاتے ہیں۔ ہر لمبے کش کے بعد سُرخ آنکھیں نیلے آسمان پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور تکیئے کی فضا میں یہ نعرہ گونج اٹھتا ہے " حق مولا، باقی سب رولا ای رولا!"

تکیوں میں بیٹھ کر زندگی کو سوختہ بنانے والوں کو ہم چرسی کہتے ہیں مگر تکیے کی زبان میں انہیں 'عملی' کہا جاتا ہے۔ عملی لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے یہ نہیں پوچھتے کہ کس حال میں ہو؟ ـــ بال بچے کیسے ہیں؟ ـ کچھ کھاؤ گے تو نہیں؟ ـــ وہ ان رسمی تکلفات سے قطعی محروم ہیں۔ فقط ایک بات ان کے دل میں ہوتی ہے جو دوسرے عملی کو دیکھتے ہی فوراً ان کی زبان پر آجاتی ہے ـــ مولا، پھر لگے دم!

ـــ اور پھر دما دم مست قلندر کی لے پر زندگی دھوئیں میں تحلیل ہو کر ہر جاندار شے کو راکھ میں بدل دیتی ہے۔ زندگی سے بھاگے اور ٹھکرائے ہوئے ڈھانچے اسی راکھ کو کریدتے، زندگی کی حرارت تلاش کرتے کرتے اور دم لگا کر دم توڑتے توڑتے آخر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں:

"وچ قبر دے مٹی ہونا مرنا میں نوں یاد اے!"

دم لگا کر تاجی گنگنا رہا ہے۔ تکیئے کے دوسرے عملی اس کی دردبھری آواز پر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے خلا میں گھورتے ہیں

کے سامنے بیٹھا ہوا ملنگ بابا سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے "اوئے، یہ بات اپنے پلے باندھ لو......"

"ٹھہرو ملنگ بابو، ذرا اپنا پلہ کھول لیں" جیرے نے مسکراتے ہوئے بات پیدا کی۔ ملنگ بابے کے گھٹنوں کو چھونے کے لیے آگے بڑھا تو دو چار عملی اس کے ساتھ ملنگ بابا تک پہنچ گئے۔ جیرا ملنگ بابا کا پروردہ ہے۔ وہ شاید اسی تکیے میں پیدا ہوا اور اسی تکیے کے کسی کونے میں ڈھیر بن جائے گا۔ بھوکٹ میں دم لگانے کے لیے ہر ایک کی خدمت کرتا ہے۔ ملنگ بابا کا خاص ہے۔ ملنگ بابا بقول جیرے کے غم غلط کرنے کے لیے چرس نہیں پیتا بلکہ من مارنے، یکسوئی حاصل کرنے اور حق مولا تک پہنچنے کے لیے مادم مست قلندر کے روپ میں مگن ہے۔

جیرے کے ساتھ دو چار عملی ملنگ کے قریب پہنچے تو ملنگ نے اُن سب کو مخاطب کیا "دیکھو، کسی کا دل نہ توڑو، دل توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے"

جیرا یہ سنتے ہی ملنگ کے قدموں میں جا گرا۔ اٹھا اور پھر اس کے گھٹنے کو دباتے ہوتے کہنے لگا "ہائے، کنی وڈی گل کیتی جے، نال ایمان ہے"

ایک عملی نے ملنگ بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "بابو، یہ چلم ذرا ادھر آجائے۔ ہم بھی ایک کش لگا لیں"

ملنگ بابے نے تنک کر کہا "رہنے دو۔ ابھی تو ایک سوٹا لگا چکے ہو"

اس پر اس عملی نے ہاتھ لہراتے ہوئے شکستہ آواز میں کہا "میں نے کہا، تو پھر یہ کہنے کی باتیں ہیں کہ کسی کا دل نہ توڑا کرو؟"

ملنگ بابے کا دل اچھل کر اس کی ہتھیلی میں آگیا "اوئے ظالما، یہ بات ہے — لے پکڑ، لگا سوٹا — دما دم، مٹے غم ....."

باری باری سب نے دم لگایا تو ملنگ بابے نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر آگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عملی سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "اگ اے"

جیرے نے پتے کی بات کہی "اگ تے ساڈی جان دی رنگ ہوئی"

ملنگ بابے نے جیرے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ تار طلائے وہ کہیں دور کھو یا ہوا تھا۔ اس نے گھمبیر آواز میں پھر دوسرے عملی سے پوچھا "یہ آگ کس کو لگی ہے؟"

دوسرے نے کہا "لکڑی کو...."

پھر ملنگ بابے نے فلسفیانہ لہجے میں کہنا شروع کیا "یہی لکڑی کبھی کسی درخت کو لگی تھی۔ ہرے بھرے درخت کو جس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، سمتی مراد — اور کتنے ہی نامراد اپنی اپنی بولیاں بول کر چلے گئے!"

یکایک جیرے نے ایک بار پھر ملنگ کے گھٹنے کو دباتے ہوئے کہا "ہائے صدقے جاواں کِنی وڈی گل کیتی جے نال ایمان دے"

دوسرے عملی جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھ کر اور گرد پھیلی ہوئی راکھ میں اپنی نامرادی کا ساز و سامان حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے۔

ملنگ بابے نے زور کا ایک اور دم لگایا اور تڑپ پاش ہو کر سب سے کہنے لگا "دیکھو، قسم کھاؤ جھوٹ کبھی نہ بولو گے!"

ایک عملی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "مجھے اپنی جان کی قسم....."

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جیرے نے اس کو ٹوک دیا "تیری جان کا کیا بھروسہ، کوئی اور قسم کھا!"

عملی نے جیرے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "لے، تیری جان کی قسم...."

جیرے نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میری جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ کوئی اور قسم کھا"

اتنے میں ایک اور علی پینک سے چونکا "اوئے، یہ اکیلے اکیلے کیا کھا رہے ہو۔ لاؤ اِدھر بھی۔"

جیرے نے فوراً اسے چپ کرا دیا "قسمیں کھا رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ ۔ ۔"

ملنگ بابے نے مسکراتے ہوئے نئی راہ نکالی "اچھا، تو اپنے بچوں کی قسم کھالے۔"

علی نے ایسا ہی کیا "وہی، اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے بچے مریں۔"

جیرے نے خوش ہو کر کہا "ہاں، اب مزا آیا نا!"

ـــــ مگر ملنگ بابا نے ہوش میں آ کر سب کو چونکا دیا "اوئے تیرے بچے تو پہلے سے مرکھپ چکے ہیں!"

علی نے اپنا سر یوں جھکا لیا جیسے گردن الگ ہو چکی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ٹھٹکنے کی دکھی لاٹ اس کی نگاہوں میں پانی کی بوند بن گئی۔ تاجی نے اس بوند کو اپنے دل میں سمو لیا اور پھر اجڑی ہوئی آواز میں گنگنانے لگا:

دل دیتا دلگیری سہڑی روح یتیم تا بابا

اونئیں مڑ دے واپس اللہ دے گئی موت جنہاں نوں۔

تاجی کی پُرسوز آواز کا ذکر چیمبرلین روڈ پر واقع مراثیوں کے تکیوں میں بھی ہوتا۔ اس تکیے میں پیشہ ور گانے والے جمع ہوتے اور اپنی اپنی میراث کا سے سُر کے سہارے مظاہرہ کرتے۔ یہاں کی تین یادگار محفلیں اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ پہلی محفل میں شریک ہونے والے بمبئی کے خادم حسین خاں، دلّی کے تان رس خاں اور پٹیالے کے تان کپتان فتح علی تھے تینوں اپنے وقت کے بڑے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ دوسری محفل خان صاحب عاشق علی خاں، استاد علی بخش خاں۔ خاں صاحب مشتاق حسین خاں رام پور والے اور خان صاحب توکل حسین خاں کے گانے سے یادگار بنی اور تیسری محفل بڑے غلام علی خاں کی شکر کی محفل تھی جس میں خاں صاحب عاشق علی خاں نے شرکت کی اور ان کے ساتھ استاد قادر بخش پکھاوجی نے طبلے پر سنگت کی۔

اِس تکیے کے علاوہ گانے والوں کی ایک اور بیٹھک مشہور تھی۔ اس میں زیادہ تر عطائی گویے شامل ہوتے جو سب کے سب کیرانہ گائیکی کے قائل تھے۔ یہ بیٹھک چوک سُرجن سنگھ سے ذرا آگے موتی بازار میں آباد تھی۔ بابو معراج دین کی بیٹھک کے نام سے یاد کی جاتی۔ مگر اس کا بانی کوئی اور تھا۔ اسے یہ بیٹھک قائم کرنے کا خیال یوں پیدا ہوا کہ اُس کا بیٹا رنڈیوں سے بچ جائے۔ اس کے بیٹے کو گانے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کو معیاری انداز سے پورا کرنے اور رنڈیوں سے بچانے کے لئے یہ بیٹھک وجود میں آئی۔ اس میں بابو شاہ محمد، سردار محمد، حکیم دین محمد اور بابا عبد اللہ شامل تھے۔ بابا عبد اللہ، دراز قد، درویش صفت طبلے پر سنگت کرتے۔ ان شوقیہ گانے والوں کا اتنا چرچا ہوا کہ اس محفل میں فیروز نظامی بھی آ گئے۔ استاد عبد الوحید خاں بھی اس محفل میں شرکت کرنے لگے اور پھر ان کے ساتھ کئی اور شاگرد بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پنڈت جیون لعل مٹو بھی ہر شام یہاں آنے لگے۔ ان محفلوں کی شہرت اتنی بڑھی کہ سرو قد، موٹی آنکھوں والی سانولی سلونی جیراں مراثن بھی اپنی دلنواز تانوں سے محفل کو گرمانے لگی۔

شہر کے عام لوگ ان محفلوں سے دُور رہتے۔ شہر کے گلی کوچوں میں عیدو بنیادالی، خورشید بائی بھروالی اور عنایت بائی ڈھیرو والی کے گانے مقبول تھے۔ موسم گرما میں مختلف محلوں کے لوگ جہانگیر کے مقبرے سیر کو جاتے۔ رات وہیں گزارتے۔ مجرے کراتے جو طوائفوں کے دم سے سیر کے لطف کو دوبالا کرتے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر استادوں کے گانے بہت کم ہوتے اور ان کے برعکس ہر کہیں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں۔ بڑے دھوم دھڑکے سے سوہنی یا باجوں کے بینڈ کے ساتھ برات آتی۔ خاندانی وقار اور عزت کا یہ تقاضا تھا کہ زیادہ سے زیادہ جہیز کے ساتھ لڑکی کو رخصت کیا جائے۔ چنانچہ غریب اور امیر دونوں چھوٹے چھوٹے تختوں پر جہیز کا ساز و سامان یوں لیے جاتے کہ سرمے دانی ایک تختے پر اور سلائی دوسرے تختے پر۔ سچ دھج کی یہ ترکیب کہاوت بن چکی ہے مگر اس کہاوت کو بازار سریانوالہ کے دلی قصائی نے یوں غلط ثابت کیا کہ اس کا دیا ہوا جہیز آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ رخصتی کوچہ چابک سواراں سے باہر بازار سریانوالہ سے ہوئی تھی۔ دولہا کا گھر محلہ غرادیاں میں تھا۔ شام کو سامان اٹھوایا گیا تو گئی رات تک دولہا کے گھر پہنچتا رہا۔ راستے میں کہیں خالی جگہ نہ تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دلہن کے جہیز کی سینکڑوں چیزیں پوری آب و تاب سے کہہ رہی تھیں "جہیز اس کو کہتے ہیں!!"

وہ جہیز کا دور تھا، نام و نمود اور نمائش کے دن تھے۔ اسی لیے اکثر لوگ ناشتہ تک باہر حلوائیوں، دودھ والوں اور نان بائیوں کے ہاں کرتے تھے۔ حلوا پوری، قتلمہ، پیڑوں کی لسی اور سری پائے مزے لے لے کر گھر سے باہر ہی اڑائے جاتے۔ موچی دروازے میں مہتاب حلوائی کی دکان پر ناشتے کے ساتھ ساتھ پہلوانوں کا ذکر بھی چھڑتا۔ مہتاب حلوائی عام طور پر دنگل کا منصف ہوتا۔ اس کی دکان پر لاہور کے نامی گرامی پہلوانوں کے بہت سے معرکے بیان کئے جاتے۔

کیکر سنگھ اور غلام پہلوان کی کشتی کا بڑا چرچا تھا۔ یہ کشتی شاہدرہ کی سرائے میں ہوئی تھی۔ لاہور سے باہر کے لوگ آٹھ روز پہلے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔ عام ٹکٹ سوا آٹھ روپے تھا۔ لاہور کی یہ پہلی کشتی تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم کا سوال پیدا ہوا۔ ہندو، مسلمان دونوں میں جوش و خروش تھا۔ کشتی کا منصف پولیس کا انگریز افسر ڈی ایس پی صاحب تھا۔ دونوں پہلوان اکھاڑے میں آئے تو یوں لگتا تھا کہ ان میں کوئی بھی زندہ نہ بچے گا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے، ہاتھ ملائے تو غلام پہلوان نے پوری قوت سے کیکر سنگھ کو دھول ماری اور ابھی غلام پہلوان اپنا ہاتھ واپس لایا ہی تھا کہ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان کے ٹھوڑی کے نیچے گردن پر زور کا ٹھوسا مارا۔ ٹھوسا لگتے ہی غلام پہلوان منہ کے بل زمین پر گرا۔ ٹھوسا لگنے سے غلام پہلوان کے گلے کی کنٹھی اندر کو دھنس گئی تھی۔ سانس رک گیا تھا۔ آنکھیں باہر ابل رہی تھیں اور ابھی وہ سنبھلے بھی نہ پایا تھا کہ کیکر سنگھ نے اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر اُسے اُلٹانا چاہا۔ اس سے غلام پہلوان کے گلے کی کنٹھی فوراً اپنی جگہ پر آ گئی تو وہ فوراً سنبھل گیا۔ سنبھلتے ہی وہ بجلی کی طرح آگے سے نکل کر کیکر سنگھ پر جھپٹا اور آن کی آن میں اُسے آگے رکھ لیا۔ کیکر سنگھ بھی آنکھ جھپکتے ہی نکل گیا۔ پھر دونوں میں بڑی زور آزمائی ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ دو دیو لڑ رہے ہیں۔ زمین پر گرتے تو زور کا دھما کا ہوتا اور آخر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کو چاروں شانے چت نہ گرا سکا۔ کشتی برابر رہی تو پھر اگلے سال پر ملتوی ہو گئی۔ مگر اُس کا انجام بھی یہی رہا۔

——— مگر اسی کیکر سنگھ کو کریم بخش پیلڑے والے نے پٹ مار کے ایک سیکنڈ میں گرا لیا تھا۔ کریم بخش پیلڑے والا واحد پہلوان ہے جو آج تک کسی سے نہ گرا۔ پہلوانی کے فن اور اس کے رموز سے پوری طرح واقف تھا۔ کہتے ہیں کہ اُسے تین سو ساٹھ داؤ آتے تھے۔ پہلوانی اُسے ورثے میں نہیں ملی تھی بلکہ اُس نے قوتِ ارادی سے اس فن کو اپنایا تھا اور یہ ارادہ محض ایک طعنہ سن کر دل میں پیدا ہوا۔ کریم بخش خوبصورت جوان تھا۔ میٹرک کا طالب علم تھا۔ کتابیں اٹھائے سکول جا رہا تھا۔ امرتسر کا کلو پہلوان کشتی کے سلسلے میں لاہور آیا

ہوا تھا۔ کریم بخش پر نظر پڑی تو اس نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا "لو بھئی، یہ پیلڑے والے کی بیل جا رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی کریم بخش واپس گھر لوٹا۔ کتابوں کو آگ لگا دی اور اپنے والد سے کہا کہ مجھے پہلوان بننا ہے۔ بیٹے کے اصرار پر باپ کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑا اور پھر وہ دن بھی آیا جب کریم بخش پیلڑے والے کی کشتی کلو پہلوان سے ہوئی تو کریم بخش نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا۔ اتنا گندہ کیا جیسے وہ پہلوان نہیں، مرا ہوا چوہا ہے اور جب اُسے چاروں شانے چت گرا لیا تو کریم بخش نے اس کی چھاتی پر بیٹھ کر فقط اتنا کہا "یہ دیکھ پیلڑے والے کی بیل ہے۔"

کریم بخش کی ایک کشتی کا پورے لاہور کو انتظار تھا۔ وہ کشتی گاموں پہلوان بالی والا کے ساتھ تھی۔ گاموں پہلوان بالی والا گونگا پہلوان کا باپ تھا۔ یہ کشتی شاہدرہ سرائے میں ہوئی۔ دونوں پہلوان خم ٹھونک کر آمنے سامنے آئے۔ کریم بخش نے ہاتھ ملتے ہی بڑی پھرتی سے "نقال" ماری۔ یہ داؤ یوں عمل میں آتا ہے کہ بازو پکڑ کر اپنا سر دوسرے کی بغل میں دے کر نیچے اپنی ٹانگ میں ڈال دینا۔ ٹانگ ڈالتے ہی گاموں پہلوان پہاڑ کا پہاڑ گر کر مٹی کا ڈھیر بن گیا۔

کریم بخش پیلڑے والا ایسی خوراک کا قائل نہ تھا جس سے توند بڑھے۔ آخری دم تک بوڑھا ہونے پر بھی وہ خوبصورت، باوقار اور متین رہا۔ عقاب کا سینہ، چیتے کی کمر، پیٹ اندر کو دھنسا ہوا۔ بلا کی پھرتی۔ اس کی شہرت اور فن سے متاثر ہو کر مہاراجہ اندور اُسے اپنے ہاں لے آیا۔ بعد میں دوسرے کئی نوابوں اور مہاراجوں نے بڑے بڑے انعامات اور سہولتوں کی پیشکش کی مگر کریم بخش اصول اور وضع کا پابند تھا۔ اس نے مہاراجہ اندور سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ لاہور میں اس کا ایک ہی دوست خان بہادر شیخ نقی تھا۔ دونوں دوست شام اکٹھے ہی گزارتے

گاماں پہلوان رستم زماں اور امام بخش لوہاری دروازے کے باشندے تھے۔ تاہم دلنڈ کے بعد امرتسر میں سکونت اختیار کر لی۔ لاہور میں امام بخش کی ایک کشتی کا ذکر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ یہ کشتی گونگا پہلوان کے ساتھ منٹو پارک میں ہوئی تھی۔ دونوں پہلوانوں نے اکھاڑے میں قدم رکھا تو لوگوں کے دل زور سے دھڑکنے شروع ہو گئے۔ دونوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ چلے کہ کوئی بھی کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ آخر امام بخش نے جو گونگا پہلوان کے قد سے بڑا تھا، گونگے کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر کسیں پھر اس اپنا سارا وزن اُس پر ڈال کر اُس کے اوپر چڑھتا گیا۔ سب بے اختیار تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب گونگے کا بچنا ناممکن ہے۔ لوگ دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ امام بخش پوری قوت سے اپنی گرفت مضبوط کر کے اوپر چڑھ بیٹھا ہے اور اب گونگا پچھڑنے کو ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے گونگا پہلوان اسی طرح واپس آیا، اگرچہ اس کی کمر ایک کمان کی صورت بن گئی تھی۔ اس کا واپس آنا تھا کہ لوگوں نے بے اختیار تالیاں بجائیں۔ اپنے آپ کو چاروں شانے چت ہونے سے بچانے کا یہ ڈھنگ اتنا مشکل ہے کہ کوئی پہلوان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ گونگا پہلوان، امام بخش کی گرفت سے آزاد ہو کر سامنے آیا تو تھوڑی ہی دیر میں اُس نے امام بخش کو نیچے دبا لیا۔ کافی مار کے بعد گونگے نے امام بخش کو ایک طرف الٹا یا —— لوگوں نے بے ساختہ کہا "او مارا!" گونگا پہلوان کے حواری اُسے فوراً اپنے کندھوں پر اٹھائے دنگل سے باہر لے آئے۔ دنگل میں ایک حشر برپا ہو گیا۔ کوئی کہے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے گرایا نہیں۔ کوئی وثوق سے کہے کہ صاف گرایا ہے۔ گاماں پہلوان رستم زماں بھی نہ مانے تو دنگل کے منصف بی ٹی صاحب اُسی وقت گونگا پہلوان کو اُس کے گھر سے لے آیا۔ لوگ دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کشتی شروع ہوئی تو لوگ پہلی کشتی کو بھول گئے۔ آمنے سامنے آتے ہی داؤ پیچ جونہی شروع ہوئے تو گونگا پہلوان نے امام بخش کو نیچے رکھ کر مارنا شروع کیا اور اتنا مارا کہ امام بخش نڈھال ہو گیا۔ گونگے نے "گھسا" مار کر امام بخش کو چاروں شانے چت گرا لیا اور چھاتی پر بیٹھ کر تماشائیوں کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا رہا۔

اس کشتی سے ایک پہلوانی مثل مشہور ہو گئی جب کوئی پہلوان کسی دنگل میں پچھڑ جاتا تو لوگ اسے یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ آخر ہوا کیا، امام بخش پہلوان جیسے پچھڑ گئے۔

دو سال کے بعد پھر اسی جگہ دونوں پہلوانوں کی کشتی ہوئی۔ تو امام بخش نے گونگے کو نیچے رکھ لیا اور اسی وقت چھوڑا جب وہ اُس کی چھاتی پر بیٹھا حساب برابر کر رہا تھا۔

جب ہندوستان میں ولائتی بوہا آیا تو اس وقت منٹو پارک میں چار اتوار تک دنگل ہوتے رہے۔ پہلا دنگل گاموں پہلوان بالی والا اور کالا پرتا بہ پہلوان کے درمیان ہوا۔ گاموں پہلوان نے نقال مار کر دس منٹ میں گرا لیا تھا۔ دوسرا دنگل گاماں پہلوان رستم زماں اور حسن بخش ملتانی کا تھا۔ گاماں پہلوان نے پانچ منٹ پشتک مار کر گرا لیا۔ تیسرا دنگل کلو پہلوان اور کیکر سنگھ کا تھا دونوں بڑے تنیا تھے۔ آمنے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ پوری قوت سے یوں لڑ رہے تھے جیسے دو سانڈ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ لگاتار آدھ گھنٹے تک یہی حال رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی کسی پر غالب نہ آسکا اور آخر کشتی برابر چھڑا دی گئی۔ آخری دنگل جھنی رینی والا اور وڈا کالا پرتا بہ کا تھا۔ جھنی رینی والا دبلا پتلا تھا۔ مگر اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی انگلیاں سریے کی تھیں اور اس کی کلائی لوہے کا ستون۔ کسی پر اس کی کلائی پڑ جاتی تو وہ یہیں چت ہو جاتا۔ وڈا کالا پرتا بہ سے اس کی دس منٹ تک کشتی جاری رہی کہ موقعہ پاتے ہی اس نے کلائی سے بھرپور وار کیا اور پل کی پل میں وڈا کالا پرتا بہ زمین پر لیٹا آسمان کے تارے دیکھ رہا تھا۔

پہلوانوں کے قصے وہ تاب حلوائی کی دکان پر ہی نہیں، ہر گلی کوچے میں لوگوں کی زبان پر ہوتے۔ جب بھی کوئی نیا دنگل ہوتا تو پرانی تمام کشتیوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔

پھر وہ دور بھی آیا جب سیاسی دنگل ہونے لگے۔ دہلی اور لوہاری دروازے سیاسی تحریکوں کے دروازے بن چکے تھے باقی دروازوں کے اندر قریب قریب سارے گلی کوچے ہپ ہپ راس کی پریڈ سے گونج رہے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہی پریڈ کچھ اس طرح ہوتی جیسے اسی تحریک کے بہانے ورزش ہو رہی ہے ہپ راس کرنے والوں کے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔ پیر جماعت علی شاہ کی تحریک سے عام مسلمانوں نے ہندو دکانداروں سے سودا لینا ترک کر دیا۔ شہر کے اندر بازار سریانوالہ کے حاجی حلوائی نے اس تحریک کو خوب چلایا۔ مسجد وزیر خاں کے حجرے مسلم کلاتھ مارکیٹ بن گئے۔

اور پھر ایک دن موچی دروازے نے جس کا دروازہ نہیں اپنی تعبیر کے لئے اپنے باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوتے دیکھا۔ یہ جلسہ مسلم لیگ کا تھا ؎

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

یہ آواز بڑھتی گئی۔ پھیلتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ لاہور کے تمام دروازے موچی دروازے کے چوکھاٹ اور پٹ بن گئے۔ چوہٹہ مفتی باقر کے مقابلے میں چوک نواب صاحب اس تحریک کا مرکز بنا۔ تحریک نے اس قدر مقبولیت حاصل کی چوک نواب صاحب کا نام چوک پاکستان رکھا گیا۔ استاد نور دین کاشے کی دل کی تصویر میاں فیروز الدین احمد کے روپ میں اس تحریک میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ میاں فیروز الدین احمد نے موچی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کی تحریک اور مسٹر محمد علی جناح کی شخصیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا "میں دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد اعظم ہیں!!"

لفظ "قائد اعظم" کا استعمال اتنے لگاؤ اور احترام سے ادا کیا گیا کہ یہی خطاب مسٹر جناح کی عظیم شخصیت کا ضامن ہوگیا۔ موچی دروازہ نازاں ہے کہ اس کے دل سے نکلا ہوا خطاب غیر فانی ہوگیا ہے۔

قائد اعظم کی سربلندی اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے بعد مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نیلی پوش تحریک کو ختم کرتے ہوئے اعلان کیا ؎

"شہید گنج کے مسئلے کا حل ہے پاکستان"

اس اعلان کے بعد کئی چھوٹی موٹی جماعتیں ندی نالوں کی طرح مسلم لیگ کے دریا میں گرنے لگیں۔ البتہ چوہدری مفتی باقر کا جھنڈا اپنے محور کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ موچی، شیرانوالہ اور کشمیری دروازے کے اندر کہیں کہیں خاکساروں کی چپ راس بھی ہوتی رہی۔ یہی چپ آخر رنگ لائی اور ٹکسالی دروازے کے اندر ہیرا منڈی میں ایک بار پھر مسلمانوں کو خاک و خون میں تڑپایا گیا۔

گولی چلنے کے دو ہی دن بعد لاہور کے تمام دروازوں سے مسلمانوں کی ٹولیاں روشنائی دروازے کی طرف بڑھنے لگیں اور بڑھتے بڑھتے منٹو پارک کے وسیع میدان میں پہنچ گئیں۔ جہاں قائد اعظم نے قرارداد پاکستان پیش کی، وہی مطالبہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد سے تسلیم کر لیا گیا۔

قیام پاکستان سے پہلے ان دروازوں کے اندر ایک محلہ دوسرے محلے کا مخالف تھا لیکن اب کئی دروازے دوسرے دروازوں کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ مخالف دروازوں کے رہنے والے اسی نفرت میں کھو گئے اور جگہ جگہ خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور جب امرتسر کے مسلمانوں نے موچی دروازے کے مسلمانوں کو تحفے کے طور پر چوڑیوں کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ انہیں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤ تو جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر آن کی آن میں شاہ عالمی دروازہ اپنی دیرینہ کہانیوں اور بوسیدہ عمارتوں کے ساتھ خاکستر ہوگیا۔ وہی شاہ عالمی دروازہ جسے شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹے ولی عہد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے نام پر تعمیر کیا تھا۔

—— اور پھر آگ اور خون کے ہولناک مناظر کے بعد آزادی کی حسین صبح طلوع ہوئی اور برسہا برس کے بعد لاہور کے ان دروازوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کے در و دیوار سے غلامی کا زنگ اتر گیا ہے۔ غلامی کا زنگ اترنے کے بعد ان دروازوں نے اپنے رہنے والوں کے لئے بے پایاں مسرتوں کے نئے پٹ کھول دیئے اور گزرنے والوں نے دیکھا کہ زندگی کی وہ راہیں جو کبھی محدود و مسدود تھیں اب کشادہ اور آباد ہیں۔

—— مگر ان کشادہ راہوں پر آزادی سے قدم بڑھانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ برسر اقتدار جماعت نے اسی حکمت عملی کو اپنا لیا جو آزادی، خودداری اور خود اعتمادی کی دشمن تھی۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور سکھ کی جگہ مسلمانوں کے باہمی فرقے ایک دوسرے سے لڑوا دیئے گئے۔ اور ان دروازوں کے اندر رہنے والوں کو زندگی یوں محسوس ہونے لگی جیسے وہ ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہیں۔

—— پھر یہ خواب ٹوٹا اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو نئے دور کا آغاز ہوا۔

جناب

محمد طفیل کے دلکش اسکیچوں کا مجموعہ

اور

اس کے متعلق بڑے ادیبوں کی رائے

طفیل صاحب کی یہ کتاب معنوی حیثیت سے ایک قسم کی THREE DIMENTIONAL STUDY ہے۔ (جس میں طول و عرض تو دوسروں کا ہے اور عمق خود ان کا) اور مطالعہ کی حیثیت سے ایک ایسا تجربہ ہے جس سے لطف اُٹھانا دوسروں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری

ادیبوں اور اہلِ قلم میں سے ۱۷ مجمل اور ۵ کا مفصل تذکرہ۔ ہلکی پھلکی ادبی زبان میں، آغاز بابائے اُردو کے نام سے ہوتا ہے اور بعض نام اس قسم کے ملتے ہیں قاضی عبدالغفار، شکیلہ اختر، پطرس بخاری، مجاز وغیرہ ——— فہرست میں نام زیادہ تر ترقی پسندوں ہی کے ہیں۔ لب و لہجہ کی شرافت قابلِ داد۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

جناب کے پڑھنے کا بہترین وقت مجھے وہ نظر آیا جب اتوار کی صبح کو حجام حجامت میں مصروف ہو۔ ایک گونہ ہم آہنگی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض جگہ جناب نے بھی حجامت اُتاری ہے ——— اختر شیرانی اور مولوی عبدالحق کے نقشے خصوصاً مرغوب ہیں۔

جسٹس کیانی

طفیل صاحب طبعاً مزاح نگار ہیں۔ اس لیے ان کی چٹپٹی باتیں مزاشے جاتی ہیں۔ بڑے فقرے باز بھی ہیں اور ان کے فقروں کی برجستگی ہی ان کے شگفتہ اندازِ گفتگو اور اندازِ تحریر کی جان ہے۔ (طفیل صاحب کی تحریر اور تقریر میں کوئی بیّن فرق نہیں ہے) جب وہ مخصوص بے تکلف انداز میں لکھتے ہیں تو بعض دفعہ اپنی روانی میں حفظِ مراتب کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی

کچھ باتیں، کچھ اشتہار

عنایت اللہ

ادارۂ فروغِ اُردو نے "نقوش" کے لاہور نمبر کے سلسلے میں ایک کام مجھے بھی سونپ دیا جو میں نے بڑی سادگی سے قبول کر لیا۔ خیال تھا یہ کام دنوں میں مکمل ہو جائے گا اور میں لاہور نمبر میں ایک باب کا اضافہ کر سکوں گا لیکن پورے پچیس دنوں کی کوچہ گردی اور سڑک نوردی کے بعد محسوس ہوا کہ جس کام کو میں نے چند دنوں میں ختم کر دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اس کا آغاز بھی نہیں ہو سکا۔ اُدھر لاہور نمبر کی پروف کاپیاں نکل چکی تھیں اِدھر میرے آخری باب کی تمہید بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس باب کا عنوان تھا "آج کے لاہور کا صنعتی جائزہ"۔ یہ لاہور کی صنعتی تاریخ کا باب تھا۔

ہمارا منصوبہ یوں تھا کہ لاہور کی صنعت کے تمام شعبوں کو سامنے رکھ کر ایسے صنعتکاروں اور صنعتی اداروں کی فہرست مرتب کی جائے جو لاہور کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے طویل فہرست مرتب کی جس میں انشورنس کمپنیوں سے لے کر انجینئرنگ کمپنیاں تک شامل تھیں۔ ان میں دریاں بنانے والے بھی تھے، دوائیاں بنانے والے بھی۔ خیمہ ساز بھی، تاریخی لسّی فروش اور کوکاکولا بھی، کباب فروش اور کیفے بھی، بیکو، ہیکو اور ہیکو بھی۔ اور اس طرح ہم نے صنعت و ثقافت کے ہر شعبے کے چیدہ چیدہ ایک سو پچاس صنعتی اداروں کو بڑی چھان بین سے منتخب کیا اور ان کی طرف خطوط لکھے جن میں لاہور نمبر کی وضاحت کر کے ہم نے ان سے درخواست کی کہ آپ کی فرم کے تاریخی حقائق نوٹ کرنے کے لیے ہمارا نمائندہ آپ کے ہاں آئے گا، براہِ کرم اس سے تعاون فرمائیے گا۔

یاد نہیں وہ کون سی ساعت تھی جب اس نمائندگی کے فرائض میں نے اپنے سر لے لیے تھے۔

میں جب اپنے سائیکل پر پہلے روز پہلی فرم کے بارے میں معلومات ریکارڈ کرنے اس کے دفتر کی سمت روانہ ہوا تو سائیکل کے کل پرزے بانگِ بلند اپنی بائیس سالہ تاریخ دہرا رہے تھے۔ جنوری کے آغاز کی ہوائیں تیخ بھی تھیں مخالف بھی۔ پاس سے گزرتی کاروں اور بسوں کی گرد کی اوٹ ہی اوٹ میں میں پہلی فرم کے دفتر میں داخل ہوا۔ مجھے فرموں کے مالکوں یا منیجروں سے ملنا تھا۔ اس سے کم درجے کے اہلکار مجھے مطلوبہ معلومات دینے سے قاصر تھے۔ میں اس فرم کے منیجر سے ملا، اپنا تعارف کرایا اور اپنے خط کا حوالہ دیا تو جواب ملا "آپ کے ادارہ کا خط ملا تھا لیکن ہم آپ کے پرچے میں اشتہار نہیں دے سکتے"۔ اس کی بجائے اگر یہ صاحب مجھے کہہ دیتے کہ میرے دفتر سے نکل جاؤ تو شاید مجھے زیادہ کوفت نہ ہوتی۔ ہمارے خط میں اشتہار کا ذکر تک نہ تھا۔ نہ کوئی ایسا ارادہ تھا تاہم میں نے چوٹ برداشت کرتے ہوئے وضاحت کی کہ میں اشتہار لینے نہیں آپ کی فرم کے بارے میں معلومات پوچھنے آیا ہوں۔ آپ نے کرسی پر کروٹ بدلی اور مجھے بیٹھ جانے کو کہے بغیر بولے: "آپ آئندہ ہفتے کسی دن شام چار بجے کے بعد آئیے گا"۔ چنانچہ ہم نے آئندہ ہفتے کے لیے ایک دن شام ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کیا جسے آپ نے ڈائری میں نوٹ کر دیا۔ جب میں اگلے ہفتے مقررہ دن اور وقت وہاں پہنچا تو

معلوم ہوا کہ منیجر صاحب "بن حُر" دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں تین دن تک ان کے دفتر جاتا رہا اور آپ ہر بار مسکرا کر ٹال دیتے رہے۔ آخر میں نے تھک ہار کر لاہور کی اس بڑی فرم کا نام فہرست سے نکال دیا۔

اسی دوران اسی صنعت کی ایک اور بڑی فرم میں گیا۔ پہلے روز تو متعلقہ صاحب نہ مل سکے، تیسرے روز ملے۔ بولے "... لیکن ہم روزانہ اخباروں کے سوا کسی اور کو اشتہار نہیں دیتے۔" وہاں بھی میں نے وضاحت کی کہ میں پبلسٹی ایجنٹ نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے ایجنٹ ہی سمجھتے ہیں تو مجھے اپنی فرم کے متعلق چند باتیں لکھوا دیجیے میں آپ کی پبلسٹی مفت کر دوں گا۔ آپ مسکرا کر بولے "اس میں بھی آپ ہی کا کچھ فائدہ ہوگا ورنہ اخبار رسالوں والے مفت پبلسٹی کہاں کرتے ہیں۔" اس کے بعد آپ نے اپنے متعلق کچھ بتانے بغیر مجھ سے پوچھا کہ اس کام کی مجھے کتنی کمیشن ملتی ہے اور یہ بھی کہ میں اسی صنعت کی کون کون سی دوسری فرموں کے پاس گیا ہوں اور انھوں نے اپنے متعلق کیا کچھ لکھوایا ہے۔ "پہلے وہ دکھائیے تاکہ ہم اس کے مطابق اپنی تاریخ لکھوائیں اور یہ بھی کہ کیا انھوں نے اشتہار دیے ہیں؟ اگر دیے ہیں تو ان کا مضمون ہمیں دکھائیے۔"

جی میں آئی کہ جھوٹ بولوں اور انھیں جھوٹ موٹ کے اشتہار دکھا کر ان کی "رگِ مقابلہ" بھڑکا دوں اور یہ فرم ایک آدھ اشتہار اُگل دے لیکن میرے کردار نے گوارا نہ کیا اور میں اس فرم سے بھی اُٹھ آیا۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ جس طرح صحافت کے میدان میں آکر اپنی انانیت کو قربان کرنا پڑتا ہے اسی طرح کاروباری میدان میں آکر انسان انسانی جذبات کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور اس کی سوچ و فکر پر ہی نہیں اعصاب تک بھی کاروباری پن سوار ہو جاتا ہے۔ بھلے لوگوں کے بھلے کی سوچیے لیکن اگر انھیں شک ہوا کہ میں اپنے بھلے کی سوچ رہا ہوں۔ چند اور جگہوں پر بھی مجھ پر طرح طرح کے فرضی سوالات کی بوچھاڑ ہوتی اور مجھے پبلسٹی ایجنٹ سمجھ لیا گیا۔

ادارہ نے مجھے اشتہارات کی فراہمی کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دی تھی نہ میرے دماغ میں کوئی ایسا خیال آیا تھا لیکن پہلی ہی دو چار فرموں نے میرے دماغ میں خیال پیدا کر دیا کہ یہاں صحافتی خلوص محض بیکار جذبہ ہے کرنا ہے تو کاروبار کرو۔ چنانچہ میں نے ادارہ کے انتظامیہ کو مشورہ دیا کہ پرچے کے لیے اشتہار بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ادارۂ فروغِ اُردو کی روایات میں شامل ہے کہ "نقوش" کے لیے اشتہارات کی فراہمی کے لیے شاذ ہی کبھی کوشش کی گئی ہو۔ نہ اس کام کے لیے کبھی کوئی ایجنٹ رکھا گیا۔ لاہور نمبر کے متعلق میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ نمبر سات آٹھ ہزار روپے کا نقصان پہ نکالا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر سوچا کہ یہ نقصان اشتہارات کی وساطت سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ادارہ نے مجھے کہا "منتی جائزہ لینا تمہارا اولین کام ہے اگر اشتہار مل سکتے ہیں تو "نقوش" کے وقار کا خیال رکھتے ہوئے کاروباری پہلو بھی تم ہی سنبھالو لیکن ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ تم اشتہار جمع کرتے پھر رہے ہو۔"

میں اپنے مشن سے خوب آگاہ تھا لیکن یہ جو گت بن رہی تھی میں اس سے بھی آگاہ تھا۔ میرے لیے مشکل یہ پیش آئی کہ میں ذات کا ادیب ہوں کاروبار سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ کاروباری لوگ صحافتی خلوص کو سمجھنے سے قاصر تھے، وہ صرف کاروباری زبان سمجھتے ہیں چنانچہ میں ایک روز گھر سے نکلنے لگا تو انانیت گھر پر ہی چھوڑ دی اور اپنے طور طریقے اور رویے کو یکسر بدل ڈالا۔ میں جب ایک فرم کے دفتر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرا کام آسان ہو گیا ہے۔ میں نے ادارہ کے خط کا حوالہ دے کر لاہور نمبر کے متعلق باتیں کیں اور بتایا کہ ہم آپ کی فرم کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر "ایجنٹی" کا شبہ کرتے میں نے کہہ دیا "یہ تو آپ کی مفت پبلسٹی ہے۔ اگر آپ پرچے کے لیے اشتہار بھی دے دیں تو آپ کی پبلسٹی مکمل بھی ہو جائے گی اور پُر اثر بھی۔" اس رنگ میں بات کرتے مجھے کوفت تو بہت ہوتی لیکن اپنے باب کی تکمیل کے لیے اور کوئی راہ نہ تھی۔ خلوص کو کاروباری پن سے ملوث کرنا ہی پڑا۔

منیجر صاحب نے میری بات سنی اور ہونٹوں پر کاروباری سی مسکراہٹ لا کر کہا "آپ نے اشتہار جمع کرنے کا کس قدر خوبصورت طریقہ اختیار کیا ہے دوسرے رسالوں والے تو صرف اشتہار ہی مانگنے آتے ہیں۔ کیا آپ ہم پر مضمون بھی لکھیں گے؟" جی میں آئی انھیں سچ سچ بتا دوں کہ میرا مطلب... تو نہ تھا لیکن میں بھی مسکرا دیا اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ میری مسکراہٹ بھی کاروباری تھی۔ جب دو کاروباری مسکراہٹوں کا تصادم ہوا تو اس میں سے ایک اشتہار نکل آیا۔

کاروباری میدان میں یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ صحافی نقطۂ نگاہ سے میں اسے شکست ہی کہوں گا۔

اس پہلے اشتہار کے ساتھ ہی میرے لیے اس فرم کے گرد چکروں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا کیونکہ حکم ملا تھا "کل اشتہار بھی لے جانا اور فرم کی ہسٹری بھی"۔ مکمل سات "کل" کے بعد مجھے وہاں سے دونوں چیزیں ملیں اور کم و بیش ایک گھنٹہ فی "کل" ضائع ہوا۔ اگر مجھے پہلے ہی روز فرم کی ہسٹری مل جاتی تو شاید میں اشتہار کے لیے اس قدر وقت ضائع نہ کرتا۔

اس "کل" کے چکر کے دوران میں کم و بیش بیس صنعتی اداروں، فرموں اور فیکٹریوں کا دورہ کیا۔ ان میں ناشرین کتب اور ہوٹلوں کے مالک بھی تھے۔ شربت فولاد والے حکیم اور فولاد کے کارخانہ دار بھی تھے۔ مجھے توقع تھی کہ میں اپنے تاریخی سائیکل پر ہر روز دس بارہ پروپرائٹروں یا منیجروں سے انٹرویو لے سکا کروں گا لیکن جنوری کے وسط تک یہ حال تھا کہ ایک ایک پروپرائٹر یا منیجر کو ملنے کے لیے مجھے دس دس بارہ بارہ بار جانا پڑا اور جس نے اشتہار کا "آرڈر" دیا اس نے پھیروں کی اتنی ہی مقدار مزید کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہر روز نئی سے نئی جگہ جانے سے معذور رہا۔ مجھے ملاقاتوں کے جو اوقات APPOINTMENTS ملتے تھے ان کی صرف ایک جھلک دکھاتا ہوں۔ گیارہ بجے راوی روڈ کے ایک سوداگران چوب و عمارتی لکڑی ہر قسم نے وقت دے رکھا ہے۔ اسی روز بارہ بجے گلبرگ کے انڈسٹریل ایریا کے ایک منیجر نے بلایا ہے۔ اسی روز ڈیڑھ بجے کشمیری بازار کے ایک ناشر سے ملنا ہے کیونکہ "میں اس سے پہلے یا بعد مل نہیں سکتا"۔ اسی دن دو بجے فیروز پور روڈ کے ایک صنعتکار نے وقت دے رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ مال روڈ پر جن دو حضرات سے ملنا ہے وہ چار بجے کے بعد مل سکیں گے۔

میری بدقسمتی یہ کہ یہ سب حضرات موٹروں والے ہیں اور اپنے پاس نہ موٹر نہ سکوٹر نہ آٹو سائیکل، گھسا ہوا پرانا ایک سائیکل ہے جو بعض اوقات موڑ مڑتے خود تو نہیں مڑتا اس کا ہینڈل مڑ جاتا ہے۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ کہ ان صاحبان سے ملنا ضروری ہے۔ دوسری بدنصیبی یہ کہ "قانون انسداد بے رحمی جانوراں" اس سلسلے میں لاگو نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ میں جانور ہوں نہ میرا سائیکل۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے (کیونکہ سائیکل کے ساتھ میل دکھانے والا میٹر نہیں ہوتا) کہ میرے سائیکل نے اوسطاً تیس میل روزانہ سفر طے کیا ہے۔

اس قدر سفر طے کرنے کے بعد کیا میں ہر روز منزل کو پا لیتا تھا؟ جی نہیں۔ اگرچہ منیجروں نے وقت دے رکھا ہے تو مقررہ وقت پر بمشکل دو سے ملاقات ہو سکتی تھی کیونکہ وہ یا تو اگلے کمرے میں بیٹھے کرکٹ کی کومنٹری سن رہے ہوتے تھے یا بعض "ابھی ابھی" باہر نکل گئے ہوتے تھے اور دو ایک دفتروں کے اہلکاروں نے بتایا کہ "منیجر صاحب اس وقت تو دفتر آتے ہی نہیں، معلوم نہیں انھوں نے آپ کو یہ وقت کیوں دے دیا تھا"۔

ادھر طفیل صاحب پرچے کی پروف کاپیاں بھی دیکھ چکے تھے۔ اب صرف میرے باب کے منتظر تھے اور ہر شام یاد دہانی کرا دیتے تھے: "جلدی کرو بھئی! پرچہ لیٹ ہو رہا ہے"۔ آپ یہ نمبر بہر صورت اور ہر طرح کے نقصان کے باوجود یکم فروری کو نکال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ادھر میرے کام کا بمشکل آغاز ختم ہوا تھا اور جنوری کا انجام شروع ہو چکا تھا۔ بیشتر صنعتکاروں کے رویے کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سوچا گیا کہ اس باب کو ہی نظر انداز کر دیا جائے لیکن میری گردن بُری طرح پھنس چکی تھی کیونکہ چند ایک نے تو اشتہار بھی دے رکھے تھے اور اپنی تواریخ بھی۔ ہم ان سے وعدہ خلافی بلکہ کاروباری بے اصولی کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے طفیل صاحب کو کوائف اور رفتار بتائی۔ روشنی میں بتایا کہ صنعتی تاریخ کا باب مکمل کرنا ہی ہے تو لاہور نمبر یکم اپریل سے پہلے نہ نکل سکے گا۔ ادارہ کو یہ بھی احساس تھا کہ (میرے محتاط اندازے کے مطابق) یکم فروری کو نمبر نکالنے کی صورت میں ادارہ کم و بیش دس ہزار روپے کے اشتہارات سے محروم رہ جائے گا۔ اس نقصان کے باوجود فیصلہ کیا گیا کہ ادارہ محض اشتہارات کی خاطر پرچے کو لیٹ نہ کرے گا۔

کام تو میرا اب بھی مکمل نہیں ہوا۔ اگر ادارہ مجھے پچھلے سال کی جنوری کے آغاز میں یہ کام دے دیتا تو اس سال کی جنوری کے آخر تک یقیناً مکمل ہو جاتا۔ میں معذرت خواہ ہوں (کیا معذرت خواہ صرف مجھی کو ہونا چاہیے؟) کہ لاہور کے صنعتی جائزے کا باب مکمل نہ ہو سکا اور لاہور نمبر اس کے

نمبر آپ تک پہنچ رہا ہے لیکن اس مہم کے سلسلے میں میرے چند ایک مشاہدات ہیں جو یقیناً نامکمل نہیں — میں حیران ہوں کہ مجھے تو یہ ایک ماہ مکمل کرنے کے لیے اتنی دشواریاں پیش آئیں — آخر طفیل صاحب نے اتنا بڑا نمبر کیسے مرتب کر لیا۔

سب سے پہلے میں انجمن ادبی رسائل رسائل سے خصوصاً اور "ادبی" رسائل سے عموماً ایک نہایت ضروری گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ جرائد کے لیے اشتہار فراہم کرنا اور کنوسنگ CONVASSING ایک باعزت پیشہ ہے اور باوقار فن۔ صرف لاہور میں ہی نصف درجن باقاعدہ پبلسٹی سروسیں ہیں جو بڑی بڑی فرموں کی پبلسٹی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ایجنٹ ہیں جو کسی نہ کسی اخبار یا رسالے سے متعلق ہیں اور ان کے لیے اشتہار فراہم کر کے تنخواہ یا کمیشن لیتے ہیں اور بعض ایجنٹ آزادانہ کاروبار کرتے ہیں لیکن اس پیشے کو رسوا کرنے والی بھی ایک نسل ہے جس کی کارروائیاں زمیں دوز ہیں اور صحافتی نقطۂ نگاہ سے مجرمانہ!

اس کی وضاحت یوں ہے کہ میں نے جب چند ایک فرموں کو "نقوش" کے لیے اشتہار کے لیے کہا اور نرخ بتلائے تو وہ لوگ کھل کر ہنسے اور ایک ہی نے نہیں کئی ایک نے کہا "اردو رسالوں والے آپ ہی کی طرح ایک صفحے کے دو سو روپے بتاتے ہیں اور بیس روپے پہ پورا صفحہ ٹیک کر جاتے ہیں۔ آپ بھی سیدھی بات کیجیے کہ پندرہ لیں گے یا بیس" —— بہت کوفت ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ایجنٹ نہیں ہوں — مجھے زیادہ سے زیادہ دلچسپی آپ کی فرم کی تواریخ سے ہے۔ اشتہارات کی فراہمی میرا رسمی سا کام ہے۔ نہ بھی ہوا تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ "نقوش" کا نرخنامہ چھپا ہوا ہے (جو میں نے انھیں دکھایا بھی) اور یہ بھی کہ ہمارے ہاں سودا بازی والا کاروبار نہیں ہوتا کیونکہ جہاں تک "نقوش" کا تعلق ہے یہ جریدہ کاروباری نہیں ہے، ادبی ہے۔ یہ جریدہ کبھی اشتہارات کے پیچھے نہیں بھاگا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس موضوع پر بے تحاشہ باتیں کرنا پڑیں۔ بعض قائل ہوئے بعض نہ ہو سکے۔ قائل ہوتے بھی کیوں؟ ان کا واسطہ ایسے ہی ایجنٹوں سے پڑتا رہا ہے جو دو سو روپے کا نرخ بتا کر بیس روپے پہ پورا صفحہ ٹیک کر جاتے ہیں۔

کوئی ادبی رسالہ بغیر اشتہاروں کے جی نہیں سکتا۔ خریداری کی رفتار تو جاسوسی، جنسی، فلمی اور "اسلامی تاریخی" ناولوں رسالوں نے پہلے ہی ختم کر دی ہے۔ اس کے ساتھ اس قسم کے ایجنٹوں اور رسالوں نے پبلسٹی کے باعزت پیشہ کو اس حد تک رسوا کر دیا ہے کہ بااصول قسم کے ادبی پرچوں کو اشتہار ملتے ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور شرمناک انکشاف ہوا۔ لاہور میں ایسے ہفت روزہ اور ماہانہ رسالوں کی تعداد معمولی نہیں جو نہ جانے کس گلی کوچے سے نکلتے ہیں اور جانے کس طرف نکل جاتے ہیں، کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ میں نے اکثر ایسے ہی رسالوں میں بڑی بڑی فرموں کے پورے پورے صفحے کے اشتہارات دیکھے ہیں اور سوچتا رہا ہوں کہ ایسے گمنام پرچوں کو اس قدر بڑی بڑی فرمیں کیونکر پبلسٹی دے دیتی ہیں۔ یہ راز مجھ پر میری مہم کے دوران کھلا۔ چند ایک فرموں سے مجھے پتہ چلا کہ ان کے ہاں رسالوں والے جاتے ہیں اور ان کے اشتہار مفت لے آتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن اور بلاک بھی اپنے خرچ سے بنواتے ہیں۔ فرموں سے وہ صرف تحریری آرڈر بک کراتے ہیں۔ اس طرح وہ چند ایک نامی گرامی فرموں کے اشتہارات مفت شائع کر کے رسالہ ایجنٹ کو دے دوسری فرموں کے پاس بھیجتے ہیں کہ "دیکھیے ہمارا رسالہ کس قدر مقبول ہے کہ اتنی بڑی بڑی فرمیں ہمیں اشتہار دیتی ہیں"۔ نتیجتاً دو چار صنعت کار ایسے پرچے کو کاروباری پرچہ سمجھ کر ان کے جھانسے میں پھنس جاتے ہیں اور اچھے داموں اپنی پبلسٹی دے دیتے ہیں۔ اس طرح رسالہ

بکے نہ بکے، رسالے والوں کی دال روٹی چلتی رہتی ہے اور بیچارے رسالوں کا پیٹ کٹتا رہتا ہے۔

میں نے ایک ہفت روزہ میں نصف صفحے کا اشتہار دیکھا ہے جس کا نرخ اُن کے چھپے ہوئے نرخ نامے کے مطابق ایک سو روپیہ ہے لیکن میں نے مشتہر کے پاس اس کا بل دیکھا جو صرف پچیس روپے کا تھا۔ اس مشتہر نے مجھے کہا "اشتہار بھی آپ کے سامنے ہے اور بل بھی۔ کہیئے آپ کو آپ کے نرخ پر میں کیسے اشتہار دے دوں؟"

میری نامکمل مہم کے دوران مجھے چند ایک نہایت دلچسپ شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں سے بعض تو اچھی قسم کی دلچسپ تھیں اور بعض دلچسپ ہی تھیں۔ بعض ایسے تاریخی انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھیں میں تمام عمر نہ مل سکتا اور جن سے مل کے روح بھی تر و تازہ ہو گئی۔ چند ایسے تاریخی انسانوں سے بھی ملاقات ہو گئی جو انسان تو واجبی سے ہیں "تاریخی" زیادہ ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ ادیب بھی مل گئے جو ادیب کم اور "کچھ" زیادہ ہیں۔ کوئی کسی فیکٹری میں پبلسٹی انچارج ہیں اور کوئی کسی فرم میں سیلزمین۔ میں ان کی فرموں میں گیا اور بتایا کہ میں ادارہ فروغِ اُردو کا نمائندہ خصوصی ہوں اور "نقوش" کے "لاہور نمبر" کے لیے آپ کی فرم کے بارے میں معلومات لکھنے آیا ہوں تو وہ مجھ پر ٹوٹ ہی پڑے۔

ایک نے کہا "نقوش بھی کوئی رسالہ ہے؟ الف تا ے بکواس"

دوسرے نے کہا "یہ طفیل بھی کوئی ایڈیٹر ہے؟ دو پیسے کا کلرک"

ایک کو میں ایک روز ملا تھا اور دوسرے کو کئی روز بعد۔ دونوں نے ہر پہلو سے "نقوش" کو "پھٹیچر" رسالہ ثابت کیا۔ دونوں نے ایک ایک گھنٹہ صرف کر کے مجھے "نقوش" کی "ملازمت" چھوڑ دینے کے مشورے دیئے اور رشوت کے طور پر میرے افسانوں کی خوب تعریفیں کیں۔ میں نے آخر دونوں سے باری باری پوچھا کہ وہ اس قدر معیاری پرچے کے خلاف کیوں جلے بیٹھے ہیں؟ تو ایک نے کہا "معیاری کہتے ہیں آپ اسے؟ پار سال میں نے دو غزلیں بھیجی تھیں اور آپ کے طفیل صاحب نے صرف ایک شائع کی اور وہ بھی ایسی غیر نمایاں جگہ جیسے ہم شاعر ہی نہیں۔

اور دوسرے نے افسانہ نمبر کے لیے ایک افسانہ بھیجا تھا جو مدیر "نقوش" نے قبول نہیں کیا تھا۔

ان دونوں فرموں سے نہ مجھے حالات ملے، نہ اشتہار لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اپنے افسانوں کے لیے دو کردار مل گئے ہیں۔

چند ایسے انسانوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جو "نقوش" کے قارئین ہی نہیں، شائقین ہی نہیں، مداح تھے۔ یہ "نقوش" کے خاص نمبروں کا جھوم جھوم کر تذکرہ کرتے تھے۔ لاہور نمبر کے متعلق اُنھوں نے سینکڑوں ہی باتیں پوچھیں، بیسیوں ہی مشورے دیئے۔ ان صاحبان نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا میں ادارہ کی طرف سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ "لاہور نمبر" ان صاحبان کی توقعات کے مطابق ہو گا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کاروبار میں آ کر انسان کے اعصاب پر اس حد تک کاروبار سوار ہو جاتا ہے کہ بعض تو اپنے مقام سے بہت ہی نیچے اُتر آتے ہیں۔ جہاں بعض نے ادارہ فروغِ اُردو کی ترقی، شہرت، ساکھ اور شخصیات نمبر، غزل نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح اور افسانہ نمبر کے بعد لاہور نمبر جیسے ضخیم نمبر نکالنے پر مسرت کا اظہار کیا وہاں دو تین کاروباری حضرات نے افسوس

کا پانچواں ۔۔۔ کیا ـــــ ادارہ فرد واحد تھا اور جو آج اس قدر ترقی کر گیا ہے ـــــ میں ایک ادارہ میں گیا اور جونہی کہا کہ "نقوش" کا لاہور نمبر نکلنے والا ہے تو صاحب ادارہ نے آہ سی لی پھر کرسی پہ بے چین سی کروٹ بدلی اور زیر لب بولے "ہاں بھئی! نقوش کے نمبر کیوں نہیں نکلیں گے۔ طفیل ہے نا؟ ہاں! آپ نقوش کے بیچے ہیں طفیل کو ہم جانتے ہیں" اتنا کہہ کر آپ گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور ان کے چہرے کے تاثرات ان کے دل کی بات بزبان خاموشی سنانے لگے۔ میں نے چپ سادھ لی۔ آپ یک لخت چونکے اور عتاب آلود لہجے میں بولے "جی آپ کو اشتہار نہیں ملے گا۔ آپ ہماری فرم کی تاریخ لکھ سکتے ہیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے آپ میں نہ رہ سکا۔ میں نے کہہ ہی دیا: "مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو صنعت کی فرموں میں کس نے آپ کو کیوں منتخب کر لیا تھا حالانکہ آپ سے کئی گنا بڑے اور پرانے ادارے لاہور میں موجود ہیں"۔ میں دل پہ ناگوار سا بوجھ لے کے اٹھا اور ان کے کمرے سے نکل آیا۔ یہ میری جھنجھلاہٹ تھی۔

چند حضرات ایسے بھی ملے جو اپنی فرم کے متعلق کم اور اپنی ذات کے متعلق زیادہ لکھوانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے سٹینوگرافر سمجھ کر لمبے لمبے بیانات لکھوا لئے اور ایک نے تو یہاں تک لکھوایا "...... اور مسٹر (وہ خود) نے بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کی انڈسٹری ......" میں نے انہیں بتایا کہ میں شخصیات پہ نہیں آپ کی صنعتی ترقی، آپ کی فرم اور فرم کی ارتقائی منازل پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ خفا ہو گئے۔ بولے "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی" لیکن میرے لیے ان کی بات کوئی بات نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ان کے اشتہارات کے آرڈر بھی منسوخ کر دیئے اور تاریخ تو انھوں نے لکھوائی ہی نہیں تھی۔

اس کے برعکس ملاحظہ فرمائیے کہ مجھے ایسے حضرات بھی ملے جن کا لاہور کی ادبی، ثقافتی، سیاسی اور صنعتی تاریخ میں اونچا مقام تھا۔ وہ آج کسی نہ کسی صنعت کار کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی ذات پر بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ میں نے انھیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو، کردار کی بلندی دیکھئے، انھوں نے مجھے روک دیا۔ ان میں دو حضرات ایسے تھے جن کی جوانی کی شامیں علامہ اقبال مرحوم کی محفل میں گذری ہیں۔ وہ بڑی بڑی نامور شخصیتوں کے ہمجولی تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے بات لاہور نمبر کی چھیڑی تو بات پہنچی "تیری جوانی تک"۔ انھوں نے یادِ رفتگاں کا باب کھول دیا۔ علامہ اقبال مرحوم کی محفلوں کا قصہ چھیڑ دیا۔ فضا کا رنگ ہی بدل گیا۔ عمر رفتہ کو آواز دے لی اور میں عالم محویت میں بھول ہی گیا کہ میں صحافی ہوں اور چند صنعتی معلومات فراہم کرنے آیا ہوں۔ ہم وقت و زمانہ کی پگڈنڈی پر بہت دور پیچھے نکل گئے۔ بھولی بسری چند باتوں کو دہرایا گیا۔ ان کی باتوں میں مجھے گرد کارواں دکھائی دے رہی تھی ——
اس کارواں کی گرد جو دور بہت دور افق سے بھی پرے چلا گیا ہے مگر کس قدر حسین، کس قدر دلکش یادیں پیچھے چھوڑ کر۔

باتوں باتوں میں ان شخصیتوں کا بھی ذکر ہوا جو آج ہم میں نہیں لیکن لاہور کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آج جو رونق ہے وہ انہی کی کاوشوں کا حاصل ہے جیسے ان کی روحیں آج بھی ہم پہ سایہ کئے ہمیں آگے ہی آگے بڑھنے پہ آمادہ کر رہی ہیں۔

کسی وقت عرب ہوٹل میں محفلیں جما کرتی تھیں۔ عرب ہوٹل کی دیواروں کو غور سے سنئے تو آج بھی چراغ حسن حسرت کے لطیفے اور سامعین کے قہقہے سنائی دیں گے۔ عرب ہوٹل میں اب بھی اجڑی محفل کے نشان ملتے ہیں۔ گو اب وہاں وہ بات نہیں تاہم کوئی اتنا ضرور ہے کہ میں وہاں کبھی کبھار جاتا ہوں، چائے کی پیالی پیتا ہوں اور اس تاریخی مقام کے در و دیوار کو دیکھتا رہتا ہوں۔
اب تو نت نئے ہوٹل کھل گئے ہیں جنھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں لاہور کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔

لاہور ہوٹل :- رائٹرز گلڈ کی پہلی میٹنگ جو لاہور میں ہوئی تھی اس کے مہمانوں کو لاہور ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں اس ہوٹل میں گیا۔ عجیب سماں تھا۔ یہاں بنگال اور بیرونجات کے ادیب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے کو بہت سے مقامی اور غیر مقامی "ادیب" بھی آئے ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں ادیبوں کی ٹولیاں بیٹھی تھیں اور بعض ٹولیاں تو ان کی تھیں جو ادیب کم اور گلڈ زیادہ تھے۔ وہ رونق تو گلڈ کے اجلاس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی لیکن لاہور ہوٹل اب بھی بارونق جگہ ہے۔

لاہور ہوٹل ۲۶ فروری سنہ ۱۹۵۰ء کو ایک رجسٹرڈ حصہ داری کی فرم (ہوٹل انڈسٹریز رجسٹرڈ) نے کھولا تھا۔ بلڈنگ کو کشمیر بلڈنگ کہتے ہیں جو میکلوڈ روڈ کے فراخ اور خوبصورت علاقہ میں ایستادہ ہے۔ آغاز میں ہوٹل کے پاس کل پچاس کمرے تھے جن کی تعداد اب ایک سو پچاس ہو گئی ہے۔ اور معیار پہلے سے کہیں زیادہ بلند۔ وسیع ڈائننگ اور لنچ ہال اور بلیرڈ سیلون بھی ہے۔ رات دیر سے آنے والوں کی سہولت کے لیے ایک "میٹنگ بار" بھی ہے جو دس بجے رات سے دو بجے تک کھلی رہتی ہے۔ لاہور میں غالباً یہی ہوٹل ہے جہاں چوبیس گھنٹے بکنگ ہوتی رہتی ہے۔ ہوٹل کا اپنا ٹیلیفون ایکسچینج ہے اور بیشتر کمروں میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ کمروں کے ساتھ ہی (ملحق) فلش سسٹم والے غسلخانے ہیں۔ حالانکہ اس ہوٹل میں پاکستانی کھانے پکتے ہیں تاہم غیر ملکی اس ہوٹل کو خاص طور پر پسند کرتے ہیں اور یہاں ٹھہرتے ہیں۔

اس ہوٹل کی مجھے دو چیزیں بہت ہی پسند آئیں۔ پہلی یہ کہ کوئی مہمان جلدی میں کوئی چیز (خواہ وہ ایک پیسے کی ہو یا بیش قیمت) کمرے میں یا میز پر بھول جائے تو اسے ہوٹل کے "گمشدہ اشیاء" کے محکمے کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو مالک کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہوٹل نے پوسٹ کارڈ چھپوائے ہوئے ہیں جو متعلقہ آدمی کو بھیجے جاتے ہیں۔ اگر وہ آدمی چھ مہینے تک چیز واپس لینے نہ آئے تو یہ چیز اُسی ملازم کو دے دی جاتی ہے جسے ملی تھی۔ ہوٹل کے منیجر صاحب نے مجھے ایک فائل دکھائی جس میں اس قابلِ تعریف سلسلے کا ریکارڈ موجود تھا۔ پنسل سے طلائی گھڑیوں تک مالکان کو واپس کی گئی ہیں۔

دوسری چیز ہے بل کی فاضل وصولی۔ کوئی مہمان غلطی سے زیادہ پیسے ادا کر جائے تو اس کا ایڈریس معلوم کر کے اسے اطلاع دی جاتی ہے اور فاضل رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اگر ایک عرصہ تک رقم واپس نہ ہو سکے تو رقم اسی کلرک کو دے دی جاتی ہے جس نے وصول کی تھی۔ اس کا جواز یہ ہے کہ بعض اوقات کلرک غلطی سے کم رقم وصول کر لیتے ہیں جو انھیں اپنی جیب سے پوری کرنی پڑتی ہے۔

تیسری چیز جو مجھے اس ہوٹل میں پسند آئی وہ ہے ایک تاریخی شخصیت۔ غوری صاحب جو ہوٹل کے منیجر بھی ہیں اکاؤنٹنٹ بھی بڑی ہی دلنواز شخصیت ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر اور اس پائے کی شخصیتوں کے ساتھ آپ نے جو وقت گزارا وہ یادِ رفتگاں کی ایک داستان ہے۔ آپ ادیب بھی ہیں۔

اورینٹ ہوٹل :- لاہور ہوٹل کے پاس ہی اورینٹ ہوٹل ہے جو فروری سنہ ۱۹۶۱ء میں ملک محمد اکرام الٰہی صاحب نے کھولا تھا۔ اس ہوٹل کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۶ فروری ہوٹل کھلا اور ۸ فروری ملکہ ایلزبیتھ لاہور تشریف لائیں تو حکومت نے ڈپلومیٹس کے لیے اسی ہوٹل کو بُک کیا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سفیر اور اس پائے کے دیگر لوگ (V.I.Ps) اس ہوٹل میں آتے رہتے ہیں۔ اس وقت ہوٹل میں چالیس کمرے ہیں جو جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ .... منیجر صاحب نے مجھے خاص طور پر یہ کمرے دکھائے۔ ڈائننگ ہال اور کامن روم بھی دکھایا۔ رہائشی کمروں کے ساتھ فلش سسٹم کے غسلخانے ملحق ہیں۔ گرم اور سرد پانی رواں رہتا ہے۔

کمروں کی تعداد زیادہ کی جا رہی ہے اور ایئر کنڈیشن کرنے کا بھی پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ چوتھی منزل کی تعمیر کا منصوبہ بھی تیار ہو چکا ہے۔ جو مکمل ہوتے ہی لفٹ بھی لگا دی جائے گی۔

بالائی منزلوں کے سامنے برآمدے مجھے خاص طور پر پسند آئے۔ وہاں کا ماحول بڑا ہی پُرسکون ہے۔ سردیوں میں دھوپ لگتی ہے اور گرمیوں میں دھوپ کا رُخ پھر جاتا ہے اور ہوا لگتی ہے۔

ہوٹل میں مشرقی اور مغربی کھانے ملتے ہیں۔ دونوں کی روایات کو خوب برقرار رکھا گیا ہے۔ یہی ہوٹل کی سب سے بڑی خوبی ہے جو مشرقی وضعداروں کو پسند آتی ہے۔ ہوٹل کا صحن بڑا فراخ ہے جہاں کئی کاریں پارک کی جا سکتی ہیں۔

لاہور کی دوسری تاریخی صنعت پبلشنگ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ لاہور ملک کا ادبی مرکز ہے۔ اردو بازار، ریلوے روڈ اور کشمیری بازار لاہور کے تاریخی مقامات ہیں جو ناشرین اور کتب فروشی کی بدولت ہی دور دور تک مشہور رہیں۔

ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز:- ۱۹۳۲ء کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک اَن پڑھ آدمی دل میں کتابیں چھاپنے کا ولولہ لیے میدان میں آیا۔ تعلیم سے بے بہرہ انسان نے تعلیم کی نشر و اشاعت کا کٹھن اور صبر آزما سفر اختیار کیا۔ وہ انسان آج بھی زندہ ہے۔ نام ملک سراج الدین ہے اور ان کے نام کا اشاعتی ادارہ صرف پاکستان میں ہی نہیں غیر ممالک میں بھی معروف ہے۔ کشمیری بازار میں ایک وسیع دوکان ہے جسے سیل ڈپو کہتے ہیں۔ اور قریب ہی ہیڈ آفس ہے جس کی انتظامیہ بعد معروف رہتی ہے۔ اس وقت اس پبلشنگ فرم میں سندھی، عربی، فارسی، اُردو، پشتو، انگریزی، بنگالی، پنجابی، ڈچ، چھنیانجا اور سواحلی (افریقی زبانیں) میں کتابیں چھپتی ہیں اور تقریباً تمام ممالک میں برآمد ہوتی ہیں۔ مانگ کی رفتار خاصی تیز ہے۔

یہاں درسی، تبلیغی اور مذہبی کتابیں چھپتی ہیں۔ تفسیر، احادیث اور قرآن مجید اس ادارہ کے خاص کارنامے ہیں۔ پریس اور جلد سازی کا اپنا شعبہ ہے۔ اس وقت یہ ادارہ انگریزی میں قرآن مجید چھاپ رہا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ تک حدیث کی تفسیر کے عربی، اردو اور انگریزی میں تراجم بھی مکمل ہو جائیں گے۔ منصوبہ پر عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ وقت لگے گا۔

ادارہ کا ایک ماہانہ رسالہ "گلِ خنداں" بھی نکلتا ہے جس کے لیے جانے پہچانے صفِ اوّل کے ادیب لکھتے ہیں۔ اس پرچے میں زندگی کے ہر شعبے پر مضامین اور افسانے ہوتے ہیں۔ ان میں طب اور نفسیات بھی شامل ہے۔

انتظامیہ کی کارکردگی اور تیز رفتاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کے کئی اور مدارج بہت جلدی طے کر لے گا۔ ملک سراج الدین صاحب کا حسنِ انتظام، سلیقہ اور استقلال دیکھنے والی چیز ہے اور جب خیال آتا ہے کہ آپ کی تعلیم کیا ہے! تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

مکتبۂ جدید:- اس جدید مکتبہ کا آغاز رشید احمد چوہدری صاحب نے ۱۹۴۲ء میں کیا۔ دو سال بعد آپ کے بڑے بھائی بشیر احمد چوہدری صاحب بھی آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور دو چھوٹے بھائی بھی ساتھ آن ملے۔

یہ مکتبہ سرمایہ سے نہیں تجربہ سے شروع ہوا جو کارپردازان نے اپنے بڑے بھائی چوہدری نذیر احمد صاحب (نیا ادارہ "سویرا") اور اپنے چچا چوہدری برکت علی مرحوم (پنجاب بک ڈپو) سے حاصل کیا۔ یہی تجربہ اور حُسنِ کارکردگی سرمایہ تھا جس کے بل بوتے پر اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی جس نے آج پبلشنگ کے میدان میں نت نئے تجربوں سے سنگ ہائے میل قائم کیے ہیں۔ ابتدا ادبی کتابوں سے کی گئی۔ آج کے متعدد نامور

مصنفین کو اُردو دان طبقے سے روشناس کرانے کی ذمہ داری اسی ادارے پر ہے۔ کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب جیسے ادیبوں کی پہلی پہلی کتابیں اسی ادارہ نے شائع کیں۔ بعد میں ادارہ نے نفسیاتی اور تواریخی (سوانح) کی طرف توجہ دی۔ اس ضمن میں انگریزی اور عربی سے تراجم کو فروغ دیا گیا۔

اُردو زبان میں قابلِ تحسین قدم "میری لائبریری" کا سلسلہ ہے۔ اس پاکٹ بک سلسلہ کا آغاز اسی ادارہ نے کیا۔ یہ کام کسی وقت لکھنؤ کے ایک پبلشر نے شروع کیا تھا۔ انھیں بنیادوں پر مکتبہ جدید نے کام کو نئی مہارت سے شروع کیا۔ اور آج یہ سلسلہ عوام میں مقبول ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قیمت واجبی ہے، جلد ہنر، خوبصورت اور پائیدار۔ "میری لائبریری" کے سلسلے میں پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب کتابیں خریدنا عوام کے بس کی بات ہو گئی ہے۔

ادارہ کا شوروم چوک انارکلی میں ہے اور دفتر میکلوڈ روڈ پر جو اب منتقل ہو رہا ہے۔ مشہور جریدہ "نصرت" اسی ادارہ کا ہے جو پہلے ہفت روزہ تھا اب ماہانہ کر دیا گیا ہے۔ "نصرت" نے مختصر سی زندگی میں کئی خاص نمبر نکال کر اپنا ایک الگ مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس کا تازہ خاص نمبر "ہمارے مسائل" ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے پہ نامور ادیبوں اور مفکروں نے لکھا ہے۔

تاج کمپنی لمیٹڈ:۔ کس قدر تکلیف دہ تھا وہ زمانہ جب قرآن ہندو اور سکھ چھاپا کرتے تھے۔ لاہور کے چند ایک ناشرین نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور یہ قومی فریضہ سنبھال لیا۔ ۱۹۲۹ء میں شیخ عنایت اللہ صاحب نے برانڈرتھ روڈ پر تاج کمپنی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ آج شیخ صاحب اس معروف فرم کے مینیجنگ ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ادارہ ریلوے روڈ (موجودہ جگہ) منتقل ہو گیا اور ۱۹۴۱ء میں یہ عمارت خرید لی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی میں پہلی برانچ کھولی گئی۔ ۱۹۴۸ء میں کراچی میں سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں ایک پریس نصب کیا گیا جس کا افتتاح لیاقت علی خان مرحوم نے کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ایک برانچ ڈھاکہ کھولی گئی۔

تاج کمپنی لمیٹڈ کا ہیڈ آفس اور اس کی شاخیں اس قدر ترقی یافتہ اور مشہور ہوئیں کہ خضر حیات، سر سکندر (جنھوں نے آغاز میں کافی مدد بھی دی تھی) سر فضل حق گورنر، گورمانی، قائدِ اعظم، لیاقت علی خان مرحوم، صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب اور دیگر امراء، سفراء اور وزراء کے علاوہ حال ہی میں ملایا کے بادشاہ بھی اس فرم کو دیکھنے تشریف لائے۔ تاج کمپنی ایک تاریخی مقام بن چکا ہے۔ اس وقت سرمایہ پچاس لاکھ ہے اور تنخواہ دار ملازم چھ سو کے قریب ہیں۔ ادارہ پبلک لمیٹڈ ہے۔ کم سے کم حصہ بیس روپے ہے جس سے عوام میں سرمایہ کاری کا رجحان پیدا ہو گیا ہے اور منافع توقعات کے خلاف زیادہ ادا کیا جاتا ہے۔

قرآن جو پہلے لیتھو میں چھپتے تھے۔ اس ادارہ نے عکسی بلاکس میں شائع کئے۔ اس ادارہ میں دوسری کتابیں بھی چھپتی ہیں لیکن یہ ادارہ قرآن کی اشاعت کے لیے مشہور ہے۔ میں نے قرآن کے چند نسخے دیکھے جو دیکھنے والی چیز ہے۔ یہ قرآن غیر ممالک میں برآمد کئے جاتے ہیں۔ تین سے زائد اقسام قرآن کی شائع ہوتی ہیں جن کا ہدیہ دو روپے سے تین سو روپے تک ہے۔ شاہ سعود نے ایک نسخے پر ادارہ کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا تھا۔ شاہ فیصل (عراق) نے بھی قرآن کی بے حد تعریف کی تھی۔ ایک نسخہ حکومتِ پاکستان نے ظاہر شاہ کو پیش کیا تھا۔

اس کے علاوہ تفاسیر اور تراجم بھی چھپتے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تاج آملہ ہیئر آئل مشہور تیل ہے اور سنی اور اچھی دوائیاں بھی تیار ہوتی ہیں۔

مکتبہ فرینکلن:۔ ایشیا اور افریقہ میں کتابوں کی نشر و اشاعت کی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے امریکہ کے بعض ماہرینِ تعلیم اور ناشرین نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کے ناشرین کو مدد بہم پہنچائی جائے تو وہاں بھی نشر و اشاعت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس علم میں نمایاں کام مسٹر ڈیس سمتھ کا ہے جو پرنسٹن یونیورسٹی پریس کے ڈائریکٹر تھے۔ آپ مجھے لے کر ۱۹۵۹ء میں لاہور آئے اور یہاں حقیقی کام کی ڈالی۔ حقیقی کام ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا۔ اس سال کے آخر میں موجودہ ڈائریکٹر حامد علی خاں صاحب مقرر ہوئے۔ مقامی پبلشروں سے باہمی تسم کے اشتراک سے کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ براہ راست پبلشنگ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ ادارہ (جیسا کہ مجھے بتایا گیا) ہتر جموں کے لیے نہیں نہ ہی پروپیگنڈہ کا ادارہ ہے۔ ڈاکٹر زیواگو کا ترجمہ اسی لیے نہیں شائع کیا گیا تھا کہ عام رائے کے مطابق اس شہرۂ آفاق کتاب پر پروپیگنڈے کا لیبل چپکا دیا گیا تھا۔

مکتبہ فرینکلن کے دفاتر دنیا میں کئی جگہ ہیں۔ سب سے پہلا قاہرہ میں کھولا گیا تھا اس کے بعد طہران میں اور پھر لاہور میں۔ صدر دفتر نیو یارک میں ہے جو پبلشنگ ادارہ نہیں ہے محض دفتر ہے جس نے کبھی کوئی کتاب نہیں چھاپی۔ ان دفاتر کے علاوہ جکارتا، بیروت، بغداد، کوالا لمپور میں بھی ادارے ہیں جو تمام کے تمام اسلامی ممالک کے ہیں۔ طہران میں شاہِ ایران اور ان کی ہمشیرہ نے مکتبہ کو کثیر مالی امداد دی۔ عربی میں بے شمار کتابیں چھپ چکی ہیں۔

لاہور میں ہر موضوع پر کتابیں چھپتی ہیں لیکن حامد علی خاں صاحب سائنس پر زور دے رہے ہیں۔ اس لیے آپ ایسی کتابیں چھپوا رہے ہیں جو بچوں کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ کے لیے ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس وقت ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی جا رہی ہے جو عام پڑھنے والے کے لیے ہوگی۔

حامد علی خاں صاحب نے اپنے خلاف چند شکایات کے سلسلے میں مجھے بہت کچھ بتایا جو ایک طویل داستان ہے اور مگر کم۔ اس معاملے میں میری اپنی کوئی رائے نہیں نہ ہی مجھے ذاتی طور پر حامد علی خاں صاحب کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ ہے۔

ملک دین محمد اینڈ سنز۔ ناشران قرآن مجید و تاجران کتب :۔ الحاج ملک دین محمد ۱۸۸۵ء میں لاہور میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد ماجد ملک امام دین خان صاحب سلمہ گوٹہ کا کام کرتے تھے اور آپ کے دادا مرحوم ہاتھ سے کلام پاک کی نقرئی و طلائی کتابت فرمایا کرتے تھے۔ دینی امور اور علوم مشرقی سے بزرگوں نے مالا مال کیا تھا۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ عمر بھر با اصول زندگی بسر کی۔ دیانت اور حق گوئی آپ کا شیوہ تھا۔ ذرا غور فرمایئے کہ آپ نے تین روپے کے سرمائے سے نشر و اشاعت جیسا صبر آزما کام شروع کیا۔ ابتدا نصیحت آمیز اشعار، قرآنی آیات اور مجلسی آداب کے قطعوں سے کی۔ کاروبار بڑھا تو ۱۹۰۵ء میں اشاعتِ قرآن پاک اور تبلیغی علوم کی غرض سے کشمیری بازار میں چھوٹی سی دوکان لی جو آج نیک نامی اور حسنِ کارکردگی کی بدولت اپنے میں ہی نہیں بیرونی ممالک میں بھی جانی پہچانی جاتی ہے۔

اُس دور میں اپنے ہاں کوئی ادارہ اشاعتِ قرآن پاک کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ بمبئی سے قرآن چھپ کر آتا تھا جو ہدیہ گراں ہونے کی وجہ سے عوام کی مانگ پورا نہ کر سکتا تھا۔ ملک صاحب نے یہ کارِ خیر بھی اپنے ذمہ لیا۔ آغاز کی مشکلات کو عبور کیا اور آج اس ادارے سے معرّا، مترجم، سادہ، عکسی، رنگین، ہر خط اور ہر قامت کے قرآن دستیاب ہوتے ہیں جن کا ہدیہ خاصا کم ہے اس کے علاوہ مختلف و مستند اسلامی کتب بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی، سندھی، اردو، پشتو اور بنگالی زبان میں ہر موضوع پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں جن کی برآمد غیر ممالک میں کی جاتی ہے۔

اسی فرم کے زیر اہتمام دین محمدی پریس کی لاہور اور کراچی میں اعلیٰ پیمانے پر شاخیں قائم ہیں جن کی پریس مشینری جدید ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں بھی اکثر مطبوعات انہی چھاپہ خانوں سے چھپواتی ہیں۔ مسٹر اے۔ کے۔ بروہی کی سرگزشت آفاق کتاب FUNDAMENTAL LAW OF PAKISTAN. اسی ادارہ نے چھاپی اور انگریزی کا نامی گرامی ماہنامہ MIRROR اسی پریس میں طبع ہوتا ہے۔ یہ پریس تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ گورنر جنرل اور بعض وزراء دورے پر آتے رہے اور مشینری اور انتظامیہ کو سراہتے رہے۔

اس وقت المینار مارکیٹ اور کشمیری بازار میں اعلیٰ معیار کے کتب خانے موجود ہیں جو قدیم و جدید اور مستند کتابوں سے بھرپور ہیں۔ ملک محمد عارف صاحب مہتمم اعلیٰ ہیں۔

فیروز سنز:۔ سنگِ بنیاد الحاج مولوی فیروز الدین صاحب نے ۱۸۹۴ء میں رکھا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا۔ مولوی صاحب نے بھی اس عظیم المرتبت قومی مصلح کی آواز پر لبیک کہی۔ آپ صحافی تھے۔ "پنجاب پنچ" پھر "مشیرِ ہند" جاری کیا۔ ان اخباروں کے ذریعے سرسید مرحوم کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اس دور میں اصلاحی، علمی اور ادبی کتب کی ضرورت شدید تھی۔ آپ نے "دربارِ اسلام" اور "تجرید بخاری" لکھی جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آپ کے پیشِ نظر ملک و ملت کے بچے بھی تھے۔ آپ نے ابتدائی مدارس کے لئے درسی اور عام معلوماتی کتب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اخلاقی و مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی سوجھ بوجھ اور معلومات میں بتدریج اضافہ اس سلسلہ کتب کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولوی صاحب نے ایک رسالہ "تعلیم و تربیت" بھی شائع کیا جسے ۱۹۴۱ء میں صرف بچوں کے لئے وقف کر دیا گیا۔ یہ رسالہ اب بچوں کے جرائد میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آج کل فیروز سنز کا ایک انگریزی ماہنامہ "پاکستان ریویو" بھی چھپتا ہے۔ اس جریدہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ فیروز اللغات ہے جس نے اردو علم و ادب کی ایک نمایاں کمی پوری کی ہے۔ مولوی صاحب کے ایسے قومی کارناموں کی فہرست اور داستان طویل ہے۔ آپ نے زندگی کے آخری دور میں قرآن شریف کا بامحاورہ سلیس ترجمہ بھی کیا تھا جو تسہیل القرآن کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ اس ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام قرآن مجید کی ارزاں ترین اشاعت کے علاوہ دینی کتب بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اسی ٹرسٹ کی زیر نگرانی لاہور، پشاور اور کراچی میں متعدد شفاخانے بھی قائم ہیں جن میں مفت علاج معالجہ ہوتا ہے۔

آج مولوی صاحبؒ حضرت خواجہ علی ہجویریؒ عرف داتا گنج بخشؒ کے پہلو میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ لیکن فیروز سنز ان کی ایسی یادگار ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ فیروز سنز عظیم ترین نشر و اشاعت کا ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام لاہور، کراچی اور پشاور ایسے مرکزی شہروں میں مطابع اور کتب خانے قائم ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم و مغفور کی روایات کو آپ کے فرزند خان عبدالمجید خاں، خان عبدالحمید خاں اور ڈاکٹر عبدالوحید خاں پوری تن دہی، خلوص اور راست بازی سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹڈ (نوشہرہ) ادارے کی ترقی کا ایک اور سنگِ میل ہے۔ یہ دواسازی کا کارخانہ ہے جہاں ملکی اور غیر ملکی

ماہر یونانی کی زیرِ نگرانی ایلوپیتھک دوائیاں تیار ہوتی ہیں۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ: جنوری ۱۹۶۱ء میں چند اہلِ علم و بصیرت کے تعاون اور رفاقت سے یہ ادارہ پانچ لاکھ کے سرمایہ سے شروع کیا گیا۔ یہ ایک لمیٹڈ اشاعتی ادارہ ہے جو بلند پایہ کتابیں شائع کرنے کا عزم لے کر وجود میں آیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر اہم ترین کام قرآنی تحقیق ہے۔ مفہوم القرآن اور لغات القرآن اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرت کے موضوع پر بھی کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں "سلیم کے نام خطوط"، "طاہرہ بیٹی کے نام" اور "دھتکارے ہوئے انسان" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ادارہ کا اپنا پریس ہے جس کی مشینری جدید ہے۔ اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے ناشرین کی مطبوعات بھی مل سکتی ہیں۔

ادارہ کے موجودہ مہتمم میاں عبدالخالق سے میں ملا تو آپ نے ادارہ کے پروگرام کا طویل تذکرہ کیا۔ آپ نے بڑے وثوق سے بتایا کہ دین میں اس وقت جو غلط روی چل رہی ہے۔ اسے قرآن کی تحقیقی کتابوں کے ذریعے دور کرنا اس ادارہ کا نصب العین ہے۔ حدیث کے متعلق بھی تحقیقی لٹریچر شائع کیا گیا ہے۔ ادارہ کو غلام احمد پرویز جیسے مفکر کا تعاون حاصل ہے اور ادارہ بڑی تیز رفتاری سے اپنے پروگراموں پر عمل پیرا ہے۔

صدر دفتر اور شوروم 27/8 شاہ عالم مارکیٹ میں ہے۔

دل روز: آئیے! آپ کو ایک اور تاریخی چیز سے متعارف کراؤں جسے آپ یقیناً پہلے ہی جانتے ہوں گے۔ یہ ہے ایک دوائی۔ نام ہے "دل روز"۔ مولانا گرامی چالیس برس سے ناسور میں مبتلا تھے۔ سرجنوں نے اپریشن کئے۔ ڈاکٹروں نے سب جتن کر ڈالے مگر ناسور تو جیسے آپ کے جسم کا جزو بن چکا تھا۔ مولانا اسے لاعلاج سمجھ بیٹھے تھے۔ آپ لاہور تشریف لائے اور علامہ اقبال مرحوم کے ہاں مہمان ہوئے۔ حکیم طاہرالدین مرحوم علامہ اقبال مرحوم کی محفل کے اہم فرد تھے۔ آپ نے گرامی کا ناسور دیکھا اور اللہ کو یاد کر کے "عرقِ دلروز" کا پھایا لگا دیا۔ لاہور میں گرامی نے دو ہفتے "دل روز" کا استعمال کیا اور ناسور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا۔ مولانا نے ایک مصرع کہہ ڈالا —

"اطہرم کرد طاہر از ناسور"

—— علامہ اقبال مرحوم نے مصرع ثانی لگا دیا —— "عرقش بہ زمزم کا فور"۔

"دل روز" حکیم طاہرالدین مرحوم کی دریافت ہے جسے آپ نے ۱۹۰۴ء میں شبانہ روز تحقیق کے بعد چند جڑی بوٹیوں سے تیار کیا اور جلدی امراض کا پہلا کامیاب اور سستا علاج دریافت کیا۔ یہ دوائی (حکیم صاحب کے الفاظ میں نہیں صحت یافتہ مریضوں کی رائے کے مطابق) تمام لاعلاج اور مزمن جلدی بیماریوں، ہر قسم کے پھوڑے پھنسی، لاہوری اور ملتانی پھوڑے، ناسور، بھگندر، بال توڑ، داد، چنبل، خارش، خنازیر، بال جھڑ، ماس خورہ، درد، جلن، سوجن، چوٹ، نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں کے کاٹے کا بے ضرر اور تیر بہدف علاج ہے۔

۱۹۱۴ء تک مرحوم اس قدر قیمتی دوا کو مفت تقسیم کرتے رہے۔ حالانکہ اس کی تجارتی مانگ عروج پر تھی۔ آج بھی شیخ بشیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دوا خاصی مقدار میں مفت ہی دے دی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء تک یہ دوا اس قدر مشہور ہو چکی

تھی اور مانگ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے جدید سائنسی طریقوں سے وسیع پیمانے پر تیار کیا جانے لگا اور فیروز پور روڈ پر آج انہیں ایک قسم کا کارخانہ تعمیر کرنا پڑا جو آج "دل روز دلا" کے نام سے دور دور تک مشہور ہے۔

یوں تو بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں نے اس دوا سے فائدہ اٹھایا ہے جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ میں صرف دو ایک کا ذکر کرتا ہوں۔ مسٹر بیزلے سیکرٹری گورنمنٹ آف پنجاب کے ہاتھ کا پھوڑا اسی دوا سے دور ہوا تھا۔ انہیں یہ دوائی استعمال کرنے کا مشورہ آنریبل خان بہادر شہاب الدین صدر پنجاب کونسل نے دیا تھا۔ سر ظفر اللہ خاں نے ۱۹۲۹ء میں "دل روز" کی کامیابی کا ذکر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ایک اجلاس میں کیا تھا اور سرکاری پشت پناہی کی سفارش کی تھی۔ یہ دستاویز قدرے طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ یہ دستاویز "دل روز" کی ہمہ گیر صفات کی کھلی شہادت ہے۔

اس قدر شہرت، کامیابی اور مانگ کے باوجود شیخ بشیر احمد صاحب (موجودہ مہتمم) کے خلوص کا یہ عالم ہے کہ آپ نے دوائی کی قیمت واجبی سی رکھی ہوئی ہے اور دوائی کے معیار کو بال برابر گرنے نہیں دیا۔

مکتبۂ جدید

(خوب اور خوب صورت کتابیں شائع کرنے والا ادارہ)

"یہ واقعہ ہے کہ علم و ادب کی مکتبۂ جدید سے زیادہ گراں قدر خدمات کرنے والا ادارہ اس وقت کوئی دوسرا نہیں۔"
علامہ نیاز فتحپوری

"کتابوں کی طبع و اشاعت بجائے خود ایک مستقل فن ہے، اس فن میں مکتبۂ جدید کی دسترس اور مہارت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔"
فیض احمد فیض

میری لائبریری

(اردو میں کم خرچ کاغذی کتابوں (پاکٹ بکس) کا پہلا سلسلہ)

"اگر ہم اب بھی کتابیں نہ خریدیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم کتابیں پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔"
روزنامہ "ڈان" کراچی

"میری لائبریری پینگوئن کتابوں کی طرح، اردو علم و ادب کی اشاعت میں گراں قدر حصہ لے رہی ہے"
روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور

"پاکستان میں یہ سلسلہ بہت پہلے شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ دیر ہی سے سہی شکر کا مقام ہے کہ مکتبۂ جدید نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدم اٹھایا ہے۔ اور اس کے لیے وہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔"
ماہنامہ "داستان" گو

ماہنامہ نصرت

(آزادی اور اصول ـــ علم اور عمل)

"نصرت واقعی پیارا ہے۔ نصرت نے جن امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج کیا ہمیشہ ان کی ضرورت تھی۔ انسانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لیے آرزو پیدا کرنا اور اپنے ملک و ملت کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ خود حصہ لینا اور دوسروں کو مائل کرنا نصرت کا مطمح نظر ہے۔"
ابوالاثر حفیظ جالندھری

"روحانی نشو و نما اور صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مکتبۂ جدید نے بے مثل خدمت کی ہے۔ اور اب "نصرت" بھی ان خدمات کی ایک کڑی ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ "نصرت" کے پیچھے ایک صحت مند پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے۔"
مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی

مکتبۂ جدید (انارکلی) لاہور

تین کتابیں

رات، چور اور چاند — بلونت سنگھ

ابھی تک اردو میں کل تین چار ہی تو قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں ابھی ایک اور بڑے مرتبہ کے ناول کا اضافہ ہوا ہے جسے بلونت سنگھ نے لکھا ہے۔ یہ ناول قسط وار نقوش میں شائع ہوتا رہا ہے جس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ اب بلونت سنگھ کافی عروج پر ہے۔ پنجاب کی زندگی کا بھرپور نقشہ جیسے بلونت سنگھ نے پیش کیا ہے۔ وہ انھی کا حصہ ہے۔ قیمت ۷ روپے

ممتاز کی مونالیزا — اے حمید

جتنے خوبصورت افسانے اے حمید نے لکھے ہیں، کم کسی نے لکھے ہوں گے — ساری ہی رومانوی فضا، سارے ہی رومانوی کردار — یہ خاصہ صرف انھی کے افسانوں میں ملے گا۔ یہ مجموعہ اے حمید کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا ایک ایک افسانہ دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ لکھا گیا ہے اور دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ قیمت ۴ روپے

ایک حمام میں — عشرت رحمانی

یہ ڈرامہ ایک بڑے ہی معروف ڈرامے "لارنس" کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے عشرت رحمانی نے اردو میں منتقل کیا۔ ڈرامے کی رومانوی فضا اور اس کے جاندار کردار، پھر ان سب کا فنی تجزیہ — ان سب خصوصیات نے مل کر اس ڈرامے کو ناقابلِ فراموش شہکار بنا دیا ہے۔ یہ ڈرامہ کی ایک ایک سطر من موہنی ہے۔ قیمت ۳ روپے

نقوش کی کتب

شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۷/۵۰
خلاصۂ محمدؐ	محمد ابوالنصر	۱۰/-
پاپانالہ حیات	احمد ندیم قاسمی	۲/-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۲/-
اندازے	فراق گورکھپوری	۵/-
اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	۲/-
صاحب	محمد طفیل	۳/-
جناب	محمد طفیل	۳/-
منٹو	ابو سعید قریشی	۴/۲۵
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
قول و قرار	عدم	۲/۵۰
پیچ و خم	عدم	۳/-
باغ و بہار	عدم	۲/۵۰
روزن	قتیل شفائی	۳/-
رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ	۴/-
مٹی کی مونا لیزا	اے حمید	۳/-
ایک قلم میں	عشرت رحمانی	۳/-
انتقاد	سید عابد علی عابد	۳/-
یدِ بیضا	سید عابد علی عابد	۵/-
ہماری داستانیں	سید وقار عظیم	۵/-
سیاست الٰہیہ	ابن تیمیہ	۲/۵۰
مضامین جمال الدین افغانی		۵/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۳/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۳/-
عزیزوں کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۵۰

ہماری کتابیں ادب کی آبرو ہیں

ادارۂ فروغِ اُردو نے جتنی بھی کتابیں چھاپی ہیں
ان کی اہمیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

اِسلامی کتب

بلالؓ	عباس محمود العقاد	۲/-
عہدِ نبوی کی اسلامی سیاست	عبد المتعال الصعیدی	۵/-
اسلام کا نظامِ عمل	محمود بن محمد بن عروس	۴/
خدیجہؓ	عبد المجید الزاہرادی	۲/-
نبی اُمّیؐ	محمد ابوالنصر	۵/-
عرب کے تین مدبّر	محمد ابوالنصر	۳/-

تصانیف شوکت تھانوی

بھابی	۲/۵۰	نیلوفر	۶/-
بارِ خاطر	۴/	بے قاعدہ	۲/-
مولانا	۳/۵۰	غزالہ	۶/-
خدانخواستہ	۳/-	سودیشی ریل	۲/-
کتیا	۲/۵۰	سانچ کو سانچ	۲/۵۰
سسرال	۲/۲۵	کارٹون	۳/۵۰
بادولت	۳/-	بقراط	۲/۵۰
جوڑ توڑ	۲/-	مضامین شوکت	۲/۵۰
وغیرہ وغیرہ	۳/-	نکسارہ	۳/-

غالب کے ڈرامے	۲/۵۰
قاضی جی حصہ اول	۲/۵۰
قاضی جی حصہ دوم	۳/۵
قاضی جی حصہ سوم	۳/۵

ہماری بہترین کتابیں

ناول ہی ناول

داستانِ مجاہد	نسیم حجازی	۴/-
محمد بن قاسم	,, ,,	۵/۸
آخری چٹان	,, ,,	۴/۸
شاہین	,, ,,	۶/-
انسان اور دیوتا	,, ,,	۳/۸
خاک اور خون	,, ,,	۶/۸
یوسف بن تاشفین	,, ,,	۵/۸
سو سال بعد	,, ,,	۲/۸
آخری معرکہ	,, ,,	۹/-
معظم علی	,, ,,	۷/۸
سفید جزیرہ	,, ,,	۵/۴
ثقافت کی تلاش	,, ,,	۲/۸

نسیم حجازی کا تازہ ترین معرکہ خیز ناول

اور تلوار ٹوٹ گئی	,, ,,	۹/۸
منزل	مضطر ہاشمی	۴/-
مہاجر	,, ,,	۵/-
سازش	,, ,,	۳/-
بگولے	,, ,,	۳/۸
دخترانِ صحرا	اقبال خانم	۲/-
پچاس ہزار عورتیں	رئیس احمد جعفری	۶/-

ڈرامے، افسانے

فرعون و کلیم	عبدالرحمٰن طارق	۳/-
گوشوارہ	عشرت رحمانی	۵/-
آغا حشر	,,	۴/-
شعلے کی راتیں	پروفیسر عباسی	۴/-
پہلی رات	عارف بٹالوی	۱/۱۴
حسنِ ادب	عبدالرحمٰن شوق	۳/-
نیرنگِ خیال	,, ,,	۳/-
پیغامِ سروش	ایم اسلم	۲/۸

تاریخ و سیاست

تاریخِ اسلام	عبدالرحمٰن شوق	۱۰/-
تاریخ حریتِ اسلام	محمد دین فوق	۹/-
عرب اور خلافتِ پاکستان	اشرف عطا	۲/-
قائد اعظم کے آخری لمحات	,,	زیر طبع
خطباتِ لیاقت مکمل	عارف بٹالوی	۷/-
پاکستان پس منظر و پیش منظر	حمید انور	۱۴/-
ہم آزاد ہیں	اشرف عطا	۱/۸
شب چراغ	نسیم المظفر	۱/۸

اسلامیات

رسالت مآب	رئیس احمد جعفری	۶/-
تجرید البخاری	حضرت امام بخاری	۱۲/-
کشف المحجوب	مولوی محمد حسین [illegible]	۵/-
حقوق و فرائضِ اسلام	مولوی فیروز الدین	۶/-
کیمیائے سعادت	محمد عنایت اللہ	۱۰/-
تفسیر موضح القرآن مجلد	شاہ عبدالقادر	۱۲/-
بہشتی زیور مدلل	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۲/-
حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ	۱۲/-
اللہ اور رسول کے احکام	سید امین الدین احمد دہلوی	۵/-
فلسفۂ قرآن اور تصوف	سر محمد یامین	۳/۸
تفسیر الحسنات بآیات بینات جلد اول	ابو الحسنات احمد	۱۰/-
اسلامی تعلیم	سر محمد یامین	۳/۸
نیک مسلمان	شہاب [illegible]	زیر طبع
خواتینِ اسلام کے کارنامے	,, ,,	,,
امام غزالی کے تعلیمی نظریات	انوار الحسن	۳/-
یورپ اور اسلام	عبدالقیوم ندوی	زیر طبع
اسلامی قانونِ وراثت	غلام دستگیر نامی	۲/-
معرکۂ کربلا	شیر محمد خاں	۱/-
علی اور ان کی خلافت	پیام شاہجہانپوری	۶/-
مقامِ حسینؓ	,, ,,	۶/-

ادبیات

[illegible] مکمل	[illegible]	۴/-
[illegible]	[illegible]	[illegible]
لسان العصر	[illegible]	۳/۸
فردوسِ معانی	,, ,,	۳/۸
نئی تحریریں	انتخاب	۲/-
[illegible] نعت	شیر محمد اختر	۲/-
میرے کمرے نے مجھ سے کہا	توفیق حکیم	۲/۴
دلکش دسترخوان حصہ اول	سید [illegible]	۳/۸
,, ,, ,, دوم	,, ,,	۲/۸

اقبالیات

جہانِ اقبال	عبدالرحمٰن طارق	۴/۸
معارفِ اقبال	,, ,,	۳/-
روحِ مشرق	,, ,,	۳/۸
رموزِ فطرت	,, ,,	۳/-
حدیقۂ ارم	,, ,,	زیر طبع
ٹیگور اور اقبال	ڈاکٹر [illegible] بٹالوی	۳/-
ملفوظاتِ اقبال	محمود نظامی	۴/-
اقبال کا نظریۂ تصوف	بشیر [illegible]	۲/-
اقبال اور گوئٹے	[illegible]	۲/-

منظومات

الہامِ منظوم ترجمہ مثنوی مولانا رومؒ		۱۸/-
کلیاتِ اکبر مکمل	اکبر الہ آبادی	۱۴/-
آج کچھ نغمے گل کے شعلے	[illegible] قریشی	۱/۱۴
شاخِ گل	[illegible]	۳/-
رنگ و بو	محمد اعظم چشتی	۳/-
فضائے روح	,, ,,	۱/۴
شانِ مصطفیٰ	شیر محمد [illegible]	۲/۴
شانِ حضور خیر البشر	عبداللطیف [illegible]	۴/۸

ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل بل روڈ لاہور (فون ۶۹۲۱)

12

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون ۳۵۲۵۰
رہائش ۶۴۸۹۸

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ - ۱۰۹

اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

بیسویں سالگرہ

خطوط نمبر

مدیر:-

محمد طفیل

ادارہ فروغ اردو ، لاہور

قیمت موجودہ شمارہ [redacted]

طلوع

محمد طفیل نے محمد نقوش سے کہا :۔

ارے میاں! تُو کیا کر رہا ہے؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے؟ کیوں اپنا اور اپنے بچوں کا دشمن بنا ہوا ہے؟

جب تُو نے خطوط کی دو جلدیں پہلے چھاپی تھیں تو کونسے قوم نے سُرخاب کے پَر لگا دیے تھے، جو تُو اب پھر اکٹھی تین جلدیں پیش کر رہا ہے۔ یہ دس گیارہ برس جو تُو نے خطوط اکٹھے کرنے پر صرف کیے ہیں۔ اس کی بجائے اگر تُو "امپورٹ ایکسپورٹ" کا ہی کام کر لیتا تو زیادہ فائدے میں رہتا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا تو قوم کا لیڈر ہی بن جاتا۔

قوم کے لفظ سے یاد آیا۔ یوں دیکھتے ہیں جیسے یہ قوم بہ ظاہر زندہ ہو، بہ باطن مُردہ۔ یہ زندہ باد کے نعرے لگا سکتی ہے مگر زندہ باد کا ماحول پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ہر ایک کی کارگزاری پر زندہ باد کہنے کی عادی ہے۔ اور کچھ نہیں!"

متاعِ ہُنر کی قیمت کیا پڑی؟ دو کوڑی بھی نہیں۔ خون کے چراغ جلا کے بھی دیکھ لیے، اندھیرا جوں کا توں۔ یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے دلوں کا اندھیرا بصارت کو بھی نگل گیا ہو۔

ایسے عالم میں کوئی کیا کرے؟

ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی افیون کی گولی کھا کر بیٹھ رہے۔ دوسرے یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ خدمت کے شوق میں اپنی جان اور مال کی بازی لگائے۔

محمد نقوش نے محمد طفیل سے کہا :۔

راہیں دونوں کٹھن ہیں۔ ایک باضمیر کے لیے، دوسری بے ضمیر کے لیے!

محمد طفیل

اِس شمارے میں

۱۹۵۶ء میں۔ جمال میاں فرنگی محلی سے، ایوانِ صدر میں ملاقات ہوئی تھی۔ تعارف قدرت اللہ شہاب نے کرایا۔ معلوم ہوا کہ ان کے پاس بڑے نادر قسم کے خطوط ہیں۔ شہاب صاحب نے میری سفارش کی۔ انہوں نے حامی بھرلی۔

میں خط و کتابت کرتا رہا۔ کبھی جواب ملا، کبھی نہ ملا۔ جمال میاں ڈھاکہ میں تھے۔ میں لاہور۔ دلوں کا فاصلہ ہو یا نہ ہو ویسے فاصلہ بہت ہے۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان کونسل نے جب اور مدیرانِ رسائل کے ساتھ مجھے بھی مشرقی پاکستان کی سیر کی دعوت دی تو میں نے یہ بھی سوچا۔ جمال میاں سے خطوط لیتا آؤں گا۔

پاکستان کونسل نے ہمارا پروگرام کچھ اس طرح کا بنایا ہوا تھا کہ اس میں ایک منٹ خالی نظر نہ آیا۔ پھر بھی میں نے جمال میاں تک پہنچنے کی بہت سعی کی۔ ملاقات نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اصل میں مجھے بے ایمانی والے کام راس ہی نہیں آتے۔ چونکہ پروگرام میں جمال میاں سے ملنا شامل نہ تھا۔ اس لئے ملاقات کیسے ہوتی!

پھر میں دوبارہ ۱۹۶۵ء میں ڈھاکہ اس غرض سے گیا کہ اب کے خطوط لے کے ہی لوں گا۔ چلنے سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ آیا جمال میاں ڈھاکہ ہی میں ہیں۔ جب جواب اثبات میں ملا، تو پہنچا۔ دستک دی۔ معلوم ہوا۔ وہ تو پیرس چلے گئے۔ میرا جو حال ہوا وہ پوچھئے نہیں۔ پھر تیسری مرتبہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں ڈھاکہ گیا۔ جمال میاں سے ملاقات ہو گئی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔

انہوں نے مجھے خطوط دکھائے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ معاً اداس ہو گیا۔ اگر انہوں نے یہ خطوط نہ دیئے تو کیا ہوگا۔ جب میں دل کی بات زبان پہ لایا تو انہوں نے فرمایا "میں یہ خطوط لاہور بھجوا دوں گا۔ ابھی صرف دیکھ لیں۔"

لاہور بھجوا دوں گا والی بات تو ۱۹۵۶ء سے چل رہی تھی۔ کچھ جمال میاں کی مصروفیت حائل رہی، کچھ ایسے نوادرات کا الگ کرنا مسئلہ رہا ہوگا۔ جمال میاں کے جواب پہ میں پھر ۱۹۵۶ء میں پہنچ گیا۔

اب کہوں کیا؟ کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ پریشانی اور تذبذب کا جو لمحہ مجھ پہ وہ گزرا، شاید ہی کبھی گزرا ہو۔ بالآخر ہمت کرکے کہا۔ "جناب! اب کے خطوط لے کے ہی لوں گا۔"

"ہاں ہاں! آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔ جو پورا ہوگا۔"

"میں ان خطوط کے لئے گیارہ سال سے پریشان ہوں۔ مزید حوصلہ نہیں رہا۔ پھر زندگی کا اعتبار ہی کیا۔ اب کے خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے خطوط اکٹھے کرنا شروع کر دیئے۔ وہ لمحات ہم دونوں پہ کتنے کٹھن تھے۔ کون جانے!